اردو افسانے کی تاریخ

اردو افسانے کی روایت

۱۹۰۳ء — ۱۹۹۰ء

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

اکادمی ادبیاتِ پاکستان اسلام آباد

عقابی کتب خانہ
ریختہ سپیشل
معمولی معاوضہ پر
ریختہ کی نایاب
کتب

اردو افسانے کی روایت

۱۹۰۳ء ـ ۱۹۹۰ء

اردو افسانے کی تاریخ مع انتخاب

اردو افسانے کی روایت

۱۹۰۳ء – ۱۹۹۰ء

اردو افسانے کی تاریخ مع انتخاب

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد

اردو افسانے کی روایت

۱۹۰۳ء - ۱۹۹۰ء

اردو افسانے کی تاریخ مع انتخاب

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد

نگران اعلیٰ	:	غلام ربانی آگرو
مہتمم	:	افتخار عارف
اہتمام طباعت	:	طارق شاہد
سال طباعت	:	دسمبر ۱۹۹۱ء
تعداد	:	ایک ہزار
کمپوزنگ	:	دی پلی ایڈز کمپوزنگ، اسلام آباد۔ فون ۲۱۴۷۵۶
طباعت	:	کمرشل پرنٹرز، اسلام آباد۔ پاکستان
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان
		ایچ ۸/۱، اسلام آباد۔ پاکستان

قیمت
مجلد : -/۵۰۰ روپے
پیپر بیک : -/۴۵۰ روپے

پیش لفظ

ممتاز افسانہ نگار اور صاحب نظر نقاد ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی کتاب "اردو افسانے کی روایت" (۱۹۰۳ء تا ۱۹۹۰ء) ہماری اس اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے' جو اردو زبان کے مختصر افسانوی ادب سے متعلق اردو دنیا اور عالمی سطح پر محسوس کی جاتی ہے۔
یہ اردو افسانے کی ایک ایسی جامع تاریخ اور انتھالوجی ہے' جسمیں محض رسمی اور اکتسابی تحقیق و تنقید پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ نتیجے کے طور پر اس کتاب میں آپ کو پرانا تعمیر شدہ تحقیقی اور تنقیدی ڈھانچہ منہدم ہوتا اور نیا منظرنامہ تشکیل پاتا دکھائی دے گا۔

○

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اس کتاب میں اردو کے اولین افسانہ نگاروں کی واضح نشاندہی کے ساتھ اردو افسانے کے مختلف ادوار قائم کر کے' ہر دور کے منتخب افسانہ نگاروں کے فنی مرتبے کے تعین اور تقدیم و تاخیر کے معاملات کو سمیٹنے کے ساتھ افسانہ نگاروں کے سوانحی خاکے' اصل و دستاویزی تاریخ پیدائش' وفیات نامے' اصلی اور قلمی ناموں' اولین تحریروں اور اولین مطبوعہ افسانوں کی نشاندہی کر دی ہے' نیز جملہ مطبوعہ کتب' غیرمدون قلمی آثار اور جملہ افسانہ نگاروں کے نظریہ فن کو بھی سائنٹفک انداز میں مرتب کیا ہے' جو اس سے قبل شاید ہی کہیں دیکھنے میں آیا ہو۔ یہ تمسکات' تنقید اور تحقیق کے شعبہ جات کے لیے خصوصی طور پر مستقل اہمیت کے حامل ہیں۔

○

اس کتاب کا ایک گوشہ داستان سے افسانے تک کے عبوری دور سے متعلق ہے' جس سے خواجہ ناصر نذیر فراق' عشرت لکھنوی اور میر باقر علی داستان گو کے افسانوی ادب سے متعلق اولین کام کی واضح نشاندہی ہوتی ہے۔ یوں بڑی تقطیع کے

لگ بھگ دو سو صفحات پر مشتمل طویل تنقیدی مقالے اور تین سو صفحات کے قریب تحقیقی مواد' افسانوں میں برتی جانے والی زبان کے جائزے' نادر و نایاب تصاویر اور آٹوگراف کی شمولیت نے اس کام کو ایک مستقل حوالہ جاتی دستاویز کا درجہ دلا دیا ہے۔

یقین کیا جاتا ہے کہ اکادمی کی جانب سے شائع ہونے والی اس حوالہ جاتی کتاب کو صاحبان نقد و نظر میں اعتبار حاصل ہو گا۔ میں بے حد سپاس گزار ہوں' اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشیں' جناب غلام ربانی آگرو کا' جنھوں نے مختلف مراحل میں ہماری رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی اور یوں اس ضخیم حوالہ جاتی کتاب کی اشاعت کو ممکن بنایا جا سکا۔

افتخار عارف

اردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کے نام

مزامیر

○

داستان سے افسانے تک: عبوری دور: انتخاب

○

اردو افسانہ: انتخاب (۱۹۰۳ء تا ۱۹۹۰ء)

○

ابتدائیہ

اردو افسانے کی زوال پذیری کی اولین نشاندھی ' محمد حسن عسکری مرحوم نے اس وقت کی جب وہ خود پریم چند اور ان کے مروجہ اخلاقی اقدار کے سلسلے میں راسخ العقیدہ ہونے پر ضرب کاری لگا چکے تھے ' پھر انتظار حسین نے کہا کہ اردو افسانے کا زوال تو پریم چند سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ جب جڑوں کی تلاش شروع ہوئی تو اردو افسانہ ایک بار پھر معتوب ٹھہرا اور یہ وہ وقت تھا جب اردو افسانہ بیدی اور منٹو تک مرحلے کر چکنے کے بعد بھی رائج الوقت سماجی اقدار اور مروج اخلاقیات کی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا ' اور ترقی پسند افسانے کا الگ شور و غوغا۔۔

یہ گرہ کیوں کر کھلے کہ اردو کا ناقد تو حسب معمول افسانے کے بارے میں خاموش ہے اور خیر سے ہمارے کالم نگاروں اور پوست زدہ پروفیسروں کو باقاعدہ ناقد مان لیا گیا ہے ' اللہ اللہ۔

راشد الخیری ' یلدرم اور پریم چند سے ہوتا ہوا اردو افسانہ اصلاح پسندی ' رومان ' حب الوطنی اور لینن کی ہمنوائی کے بعد منٹو اور بیدی کے اہم سنگ میل گزار کر تقسیم کی اڑائی ہوئی دھول کے بیٹھ جانے کے بعد رواں پس منظر کے سہل پسند افسانہ نگاروں کی اخباری رپورٹنگ تک آ پہنچا ' تب بھی نقاد نے بھرجھری نہیں لی۔ ایسے میں انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر بولے تھے۔ انہوں نے تبدیل ہوتے ہوئے منظر نامے اور نئی نفسی کیفیات کا مسئلہ اٹھایا تو ' لیکن سمت نمائی نہیں کی ' اس وقت تک " جدیدیت " کی اصطلاح رائج نہیں ہوئی تھی۔ کاش ایسے میں کلیم الدین احمد ' محمد حسن عسکری ' ممتاز حسین اور سلیم احمد اس طرف متوجہ ہوتے۔ بہر طور گزرا وقت گزر گیا۔

سعادت حسن منٹو نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ " پریم چند سے ہم کچھ بھی نہیں سیکھ سکتے " ماضی میں محمد علی ردولوی محض اس لیے ناکام ہو گئے تھے کہ پریم چند کے طریقہ کار کو رد کرتے تھے پھر Back to nature کے رویہ نے سنبھالا لیا ' اس لیے کہ رومان پسندی کا چلن نیا نیا تھا۔ میں تو کہوں گا کہ اگر " ترقی پسندی سے رومان پسندی " کو منہا کر دیا جائے تو بڑے بڑے بت قدموں میں آ رہیں۔

" یہ رومانی ترقی پسند " چلن ہندوستانی ادیبوں میں بھیڑ چال کی طرح عام ہوا ' نتیجہ میں ہمارے افسانے کی طبعی نشو و نما ممکن نہ ہو سکی۔ داستان سے رشتہ کیا ٹوٹا ' محمد علی ردولوی کے بجائے پریم چند کو اردو افسانے کا چیمپئن مان لیا گیا۔ محمد علی ردولوی کو ردولی کی تعلقہ داری نے مار رکھا اور یوں انکا پڑا تا۔ نہ ترقی پسندوں کی باہمی چوما چاٹی کے سبب اردو افسانے کے منظر نامے سے بارہ پتھر باہر کر دیا گیا۔

اسے بھی محض اتفاق نہیں کہنا چاہیے کہ اردو افسانے کا دوسرا چیمپئن بھی ترقی پسندوں میں سے ہی چنا گیا اور وہ تھا کرشن چندر بہت زور مارا گیا " نقوش " لاہور (افسانہ نمبر) اور " افکار " کراچی (افسانہ نمبر ۱۹۷۴ء) میں باقاعدہ اعلانات داغ دیئے گئے ' لیکن افسوس کہ کرشن چندر ' کے ادبی بہاؤ سے اٹھتے ہی یہ حال ہو گیا کہ افسانے کی زندہ روایت پر بات ہو تو ذہن پر زور ڈال کر کرشن چندر کو یاد کرنا پڑتا ہے۔

اس اثنا میں " افسانہ پن " کا گلا گھونٹا گیا۔ نعرہ بازی نے بعض بہت اچھے افسانہ نگاروں کو قاری سے محروم کر دیا یا ان کے کام کو سمجھنے اور پرکھنے کا ذوق ہی پیدا نہیں ہونے دیا گیا۔ سید رفیق حسین ' ابو الفضل صدیقی اور خان فضل الرحمٰن ـــــــ غرض کس کس کے نام گنواؤں؟ لیکن مطمئن رہیے آیندہ کا سنجیدہ طالب علم انہیں ایک بار پھر ڈھونڈ نکالے گا۔ اس کتاب میں اسی آئندہ کے لیے Spade Work کیا گیا ہے۔

منٹو کو "تحریک" سے خارج کر دینے سے کیا فرق پڑا؟

پھر منٹو کو تو بعض اوقات Own بھی کیا گیا، لیکن قرۃ العین حیدر کے ساتھ ایک زمانے تک ناروا سلوک روا رکھا گیا۔ یہ الگ کہانی ہے کہ کس طرح قرۃ العین حیدر کے Unique کام نے بڑے بڑے جغادریوں کے نیچے سے مسندیں کھینچ لیں۔

ترقی پسند ناقدین نے دم لیا تو اردو افسانے کو "نئے" اور "جدید" افسانہ نگاروں نے آگھیرا۔ گرے ہوئے بیل کا حشر ہوا اس کا۔ ایسے میں نزول افسانہ نگاری کی سطح پر ہم نے انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کی بازیافت کی اور "جدیدیے" ان دونوں میں کیڑے نکالنے پر جٹ گئے۔ یہاں تک کہ نئے لوگوں میں سے سریندر پرکاش کو "نو ترقی پسندوں" نے اس وقت مانا جب اس نے افسانہ "بجوکا" میں پریم چند کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

اب لے دے کر افسانے میں جدت اور ترقی پسندی کا تڑکا لگانا ہی زمانہ ضرورت ٹھہرا ہے، سو بیشتر افسانہ نگاروں نے اسی فارمولے کو برتا۔ اب ایک بار پھر کہانی پر آڑا وقت ہے اور ناقدین فن "نئے"، "جدید" اور "جدید ترین" افسانے کو آشیرواد دیتے ہوئے بڑی روشنائی بہا چکے ہیں۔ ضخیم ادبی رسائل کی طویل فہرستوں میں شیر اور بکری جڑواں دکھائی دیتے ہیں۔ برے بھلے میں نتارا کون کرے گا؟

آج مشرق اور مغرب کی طرز ہائے فکر کو چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود قربت کا سامنا ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا الگ زمینی بوباس اور الگ الگ ادبی روایات کے امتیازات بھی مٹ گئے؟

اصل قصہ یہ ہے کہ نئے افسانہ نگار کو زندہ روایت کا شعور ہی نہیں ہے خود مجھے "کہانی پن" اور "جدید رویہ" طرز کی ڈھلی ڈھلائی لایعنی اصطلاحوں سے چڑ رہی ہے، لیکن کیا افسانے میں افسانہ کو تلاش نہیں کرنا چاہئے؟

لیکن افسانے میں افسانہ پن کی نشاندہی کون کرے گا؟ ہمارا ناقد تو ڈی۔ ایچ لارنس کی طرح بدلحاظ اور بد زبان نہیں ہے، نستعلیق ہے۔ لیوس کی طرح شارح بننا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کے رہے ہوئے کھانچے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں، بھرنے میں نہیں آتے۔

ادب میں جب اس نوع کی صورت احوال ہو تو میرے خیال میں ناقد پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے یعنی اول تو اسے "اعلیٰ" اور "ادنیٰ" تحریروں کی پہچان ممکن بنانا ہے اور ثانیاً "Working Art" کی شرح کرنی ہے؟ اور اگر ایسے میں ناقد، تخلیق کار کی راہنمائی کر سکے تو یہ اس کی اضافی عطا ہے۔

یوں پہلی سطح پر تو وہ تخلیق کار کے تخلیقی مرتبے کا تعین کرے گا اور اچھے اور برے میں حد فاصل قائم کرتے ہوئے کاٹھ کباڑ کے انبار میں سے نزول تخلیقات کو علاحدہ کر کے بنت اور لفظ کے تخلیقی استعمال کی وضاحت کرے گا جبکہ دوسری سطح پر اسے ادب کے قاری کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دینا ہے۔ تاکہ جب پرانا کلام اپنے امکانات مکمل کر لے تو بدلتے ہوئے اسالیب اظہار اور بنت کی سطح پر احساسات کے اجنبی اور مبہم سگنلز کی قاری تک رسائی ممکن ہو سکے جبکہ ہمارے ہاں زیادہ تر محض Sweep کرنے کے انداز میں فتوے بازی کو تنقید کا نام دے دیا گیا ہے۔

اب خدا بھلا کرے "نئے ادب" ـ "جدید" اور "جدید ترین" افسانہ نگار کا، جس نے یہ موقع ایک بار پھر فراہم کیا ہے۔ ان نجات دہندوں نے اردو افسانے کو کچھ سے کچھ بنا دیا حتیٰ کہ "افسانہ پن" سے ہی نجات دلا دی۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۵ء تک کا زمانہ "نئے ادب" اور جدید نسل کے ظہور کا زمانہ ہے، دیکھا جائے تو یہی زمانہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے آخری سانس لینے کا زمانہ بھی بنتا ہے سو "نئے ادب" کے نزدیک ترقی پسندوں کی لاٹ کی لاٹ جو اپنے عہد میں بہت نئی کہلائی ۱۹۵۵ء تک آتے آتے پرانی ہو گئی۔ اب دیکھنا چاہئے کہ آنے والے کل میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور آنے والی نسلیں آج کے "نئے" "جدید" اور "جدید تر" افسانے کا کیا حشر سامنے لاتی ہیں۔

ہمارے ہاں جاگیردارانہ نظام کی شکست کے بعد اس کی جگہ لیتے ہوئے سرمایہ داری کا متبادل ---- وجودیت اور جدلیاتی مادیت کی باہم آمیزش بن سکتی ہے (جس میں فرد اور سماج کی بہتری بھی ممکن ہے) لیکن ابھی ایسا ہوا نہیں۔ جبکہ "جدید ترین" افسانہ نگار نے یکا یک ایسا تصور

کر لیا۔ اس طرح "جدید تر" افسانے اس سے میری مراد پیش منظر کا تخلیقی افسانہ قطعاً نہیں) میں سائنسی اور صنعتی تہذیب کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی پیچیدہ زندگی کا جو خاکہ بڑی شدومد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے' اس کی بنیاد براہ راست تجربے اور مشاہدے پر اتنی نہیں جتنی کہ سنی سنائی 'اندھی تقلید اور مصنوعی خام تجربے پر ہے۔

آج مشرق اور مغرب کو (ہر دو اطراف کے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود) قربت نصیب ہوئی لیکن اپنی اپنی مخصوص زندہ روایات کے سبب خارج اور داخل میں کچھ امتیازات بہر حال قائم رہے' جن کے شعور کا فقدان "جدید تر" افسانہ نگاروں کے ریوڑ کو تقلید محض کی اندھی کھائی تک لے آیا ہے۔ نتیجتاً "جدید ترین افسانے کی ایک معقول تعداد میں سے زمین کی بوباس ہوا ہوئی اور کردار اس حد تک بے چہرہ ہوئے کہ خود اپنے چہرے کی پہچان مشکل ہو گئی بیشتر "نئے" اور "جدید تر" افسانے میں جن مسائل کا بیان بڑے زور و شور سے ہوا' ان میں اقدار کی شکست اور منظم نظریات کی نا آسودگی نے کئی ہزار صفحات گھیرے' جبکہ میکانکی انداز میں جذباتی سطح پر فرد کے کھوکھلے پن کی عکاسی ہوئی یوں "صنعتی معاشرت کے ادب" کی اندھی تقلید میں نئے افسانہ نگاروں کی ایک معقول تعداد اپنے آپ کو جذبات سے عاری خیالی معاشرے میں رکھ کر خود ترحمی کا شکار ہوئی اور ایسے افسانہ نگاروں کے ہاں بے سمت جعلی محسوسات اور بے چارگی نے راہ پائی۔ اس کے برعکس پیش منظر کے تخلیقی افسانے میں اقدار کی شکست اور منظم نظریات کی نا آسودگی کے نتیجہ میں تنہائی کی کونپل پھوٹی' ایسے افسانہ نگاروں کے ہاں معاشرے کے گدلے پن سے مفاہمت کی بجائے ایک خاص قسم کے اکیلے پن نے چہرہ نمائی کی' یا شاید یہ کہنا مناسب ہو گا کہ زیست کی ناقابل برداشت جکڑ بندیوں میں رہتے ہوئے باغی کی طرز زیست نے زندگی کرنے کا ایک نیا ڈھنگ وضع کیا۔ اس نوع کے تخلیقی افسانے میں جذبات سے عاری خیالی معاشرے کا وہ روپ ظاہر نہیں ہوا' جس کا سبب صنعتی آشوب ہے' بلکہ اس میں تیسری دنیا کے شدید موسم ہیں اور مسائل۔ یہاں تنہائی' احتجاج' افسردگی اور بے سمتی کے خصوصی محسوسات کے اپنے معنی ہیں۔

میں "زندہ روایت" کا قائل ہوں' مردہ تحریکوں کے سانس نہیں گن سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر تجربہ اپنی کسی نہ کسی جہت میں روایت سے ضرور مربوط رہتا ہے لیکن ہر تبدیل ہوتے ہوئے عہد میں نرول تخلیق کار' روایت کی توسیع بھی بنتا ہے بالکل اسی طرح جیسے پیش منظر کے افسانے سے پرانا علم الکلام رخصت ہو گیا۔ آج' گزرے ہوئے کل سے ایک قدم آگے ہے' افسانے کے بدلتے ہوئے موضوعات اور نئے مسائل زیست کے شعور کے ساتھ ساتھ روایتی ہیئت اور بیان کے مروجہ اصول و قواعد بھی متاثر ہوئے اور یہ ضروری بھی تھا۔ "آج" ہم نے جس طرح اور جیسے' نئے منظر نامہ کو محسوس کیا۔ اس کا بیان بھی اس سے میل کھاتے ہوئے رنگوں کے چناؤ کے ساتھ اور "آج" کے مزاج سے قریب تر رہ کر کیا' یا کم از کم ایسا کرنے کی خواہش ضرور کی' لیکن جہاں "جدید" افسانے کی بھیڑ چال میں برخود غلط تجربہ برائے تجربہ کا چلن ہوا' وہاں روایت کے شعور نے آخری سانس لے۔

ایسے میں بہت سے "نئے" اور "جدید" افسانہ نگار وقتی شہرت سمیٹنے میں ضرور کامیاب ہو گئے' لیکن ان کا انجام معلوم ـــــ؟ بزعم خود "لو ترقی پسند" افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد اپنے آپ کو ایک ہی امام کے "چیلے" ماننے سے منکر ہے اور ان کا اصرار یہی ہے کہ ان کے لگائے ہوئے لفظوں کے ڈھیر سراسر ان کے ذاتی تجربات کے عکاس ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ لفظیات کی یک رنگی' لینڈ اسکیپ کی محدودیت اور ایک ہی طرح کی تشبیہات کا اجتماع انہیں ایک محدود حلقے کا رکن بنا کر چھوڑتا ہے۔ اگر "نیا" اور "جدید تر" افسانہ محض یہی کچھ ہے تو ہمیں چاہئے کہ جب ہم آج کے افسانے کی بات کریں تو مختصر افسانے کی موت سے اپنی بحث کا آغاز کریں۔

لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے' اور نئے منظر نامے میں تخلیقی افسانہ بھی اپنا پتا دیتا ہے تو کیوں نہ نرول تخلیق کی جڑوں کی تلاش کی جائے' نیز نرول تخلیق کاروں کی پہچان آسان بنائی جائے۔

اب جہاں تک زبان کے مروجہ قواعد و ضوابط اور روایتی ہیئت کی باغی نسل کا سوال ہے تو سوچنا چاہئے کہ اسے کس خانے میں رکھا جائے گا۔ یہ سوال نہایت اہم ہے اور پھر یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اس سے پہلے طے شدہ ذمروں کا نظام موقوف تو نہیں ہو جائے گا؟ اس سوال کا جواب

ہمارے ناقدین نے ابھی فراہم کرتا ہے' اس لیے کہ جیمز جوائس کو اپنے خیالات کے جنگل کی جھاڑ جھنکار بھی عزیز تھی۔ جارج آرویل نے "۱۹۸۴ء" قبل از وقت لکھی اور اسے اس دور میں وہ پذیرائی نصیب نہ ہوئی جو آج اس کا حصہ ہے۔ اسی طرح ایڈگر ایلن پو نے ۱۹ویں صدی کی ابتدا میں Fantasy رقم کی' خود اپنے ہاں مرزا فرحت اللہ بیگ نے نصف صدی قبل "کل کا گھوڑا" جیسی سائنس فکشن لکھی جب "جاز" اور "سٹاروارز" کا خواب تک نہیں دیکھا گیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ناقدین کیا ہوئے' جو ان متذکرہ بالا ناموں کو بڑی شدومد سے رد کیا کرتے تھے؟ کچھ یہی سبب ہے کہ فی الحال میرے نزدیک یہ بات زیادہ اہم نہیں کہ اردو ادب کا ناقد تخلیق کار کے عندیے (Intention) تک سو فیصد پہنچا یا نہیں۔ اس لیے کہ میرے نزدیک اہمیت "اظہار" کو حاصل ہے "سو فیصد ابلاغ" کو نہیں۔ اس لیے کہ بالغ تخلیقی عمل پہلے "اظہار" ہے اور اس کے بعد ابلاغ۔

یہ اگر ناممکن ہے تو اسے ممکن بنانے کے لیے سوتیں ناقد فراہم کرے گا اور قاری اگر ابلاغ کا خواہش مند ہے تو تخلیق کار کی جانب پیش قدمی کرے گا۔ فی زمانہ تو یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ لاشعور' تخیل اور خفتہ جذبات اظہار چاہتے ہیں اور عقلیت زدہ لوگ استعارے سے خوف زدہ ہیں اور ابلاغ کا واویلا کر رہے ہیں۔ اب جو لوگ لفظ کو ذریعہ مانتے ہیں وہ سو فیصد ابلاغ چاہیں تو چاہیں' میں تو تخلیقی عمل کو حیاتیاتی ضرورت سمجھنے والوں میں سے ہوں اور لفظ کے ورتارے کو مقصود بالذات سمجھتا ہوں۔ جہاں تک طے شدہ علامات برتنے کا معاملہ ہے تو وہاں ابہام پیدا نہیں ہوتا' البتہ غیر متعین علامات کا استعمال ابہام کا باعث بنتا ہے۔ اسلئے کہ طے شدہ علامات کی سپلائی لائن تو ہماری داستان' دیو مالا' ملفوظات اور حکایات سے ہے جبکہ غیر متعین یا خالصتاً نجی احساسات سے متعلق علامات برتتے ہوئے محض اعلی تدبیر کاری سے کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن یہ سب کے بس کی بات نہیں۔

اردو افسانے کو بڑھاوا دینے کے سلسلے میں اردو میں لکھے گئے افسانوں کی انتھالوجیز ہمارے ہاں شائع ہوتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن اب تک جو انتخابات کتابی صورت میں چھپ کر سامنے آئے ہیں ان کے مرتبین خاص نوع کی افراط و تفریط کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ کہ "پسند اپنی اپنی' خیال اپنا اپنا" لیکن افسانوں کے انتخاب کا کام اکثر اس کماوت سے اوپر اٹھتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ انتخاب کرنے والوں میں ہر دور کے اہم نام بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اب تک شائع شدہ اردو افسانوں کی جملہ انتھالوجیز ایک سرسری نظر ڈالنے پر ہی اس بات کا ثبوت خود فراہم کر دیتی ہیں کہ مرتبین' افسانہ نگاروں کا چناؤ کرتے وقت اپنی مخصوص گروہ بندیوں' مخصوص نظریات اور افسانہ نگاروں سے قربت کے بوجھ کو نہ سہار سکے۔ مثلاً اردو افسانے کی اولین انتھالوجی "انگارے" مرتبہ احمد علی (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) میں محمود الظفر کی شمولیت' انگریزی میں شائع ہونے والی ہندوستانی افسانوں کی اولین انتھالوجی "Indian Short Stories" مرتبہ: ڈاکٹر ملک راج آنند (مطبوعہ۔ ۱۹۴۶ء) میں عطیہ حبیب اللہ کی شمولیت' بشیر ہندی کی مرتب کردہ انتھالوجی "میرا پسندیدہ افسانہ" میں دیوانہ مصطفیٰ آبادی اور شیلا سمیر کی شمولیت محض مخصوص نظریات اور گروہ بندی کا شاخسانہ ہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

یوں دیکھا جائے تو مندرجہ ذیل انتھالوجیز میں جہاں بھرپور انتخاب کا عمل دکھائی نہیں دیتا اور ہماری مخصوص مروت زندگی آڑے آتی ہے وہیں افسانہ نگاری کے تقریباً ہر دور کی کیفیت سے کسی قدر آگہی ضرور ہو جاتی ہے۔ ان شائع شدہ انتھالوجیز کی تاریخی اہمیت بہر طور ہے اور افسانوں کے یہ انتخاب اپنے اپنے مخصوص دور کے کاٹھ کباڑ سمیت چند اچھی تخلیقات کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں' تفصیل ملاحظہ ہو۔

۱۔ "انگارے" مرتبہ احمد علی' مطبوعہ۔ نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ' لکھنؤ' طبع اول۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کل صفحات ۱۳۴۔

اس مجموعے میں کل چار افسانہ نگاروں کے نو افسانے اور ایک ڈراما ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔ "نیند نہیں آتی" "جنت کی بشارت" "گرمیوں کی ایک رات" "دلاری اور "پھر یہ ہنگامہ" (از سید سجاد ظہیر) "بادل نہیں آتے" اور "مہاوٹوں

کی رات " (از احمد علی) "دلی کی سیر" اور "پردے کے پیچھے" (ڈراما) از رشید جہاں اور "جوانمردی" از محمود الظفر۔ آخر الذکر افسانہ انگریزی میں لکھا گیا تھا جسے سید سجاد ظہیر نے اردو میں ترجمہ کیا۔

۲۔ "Indian Short Stories" مرتبہ۔ ڈاکٹر ملک راج آنند و اقبال سنگھ مطبوعہ۔ دی نیو انڈیا پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ نمبر ۱۷ اروک سٹریٹ، لندن، طبع اول۔ ۱۹۴۶ء کل صفحات ۱۹۳۔

اس مجموعے میں سولہ افسانہ نگاروں کا ایک ایک افسانہ شامل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

"Castaway" از ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور، "Drought" از سرت چندر چیٹرجی، "Resignation" از پریم چند، "Javni" از راجا راؤ، "A Kashmir Idyll" از ڈاکٹر ملک راج آنند "Coachman And The New Constitution" از سعادت حسن منٹو، "Our Lane" از احمد علی، "Fellow Feeling" از آر۔ کے نارائن، "Little Mother" از عصمت چغتائی، "The Mathematician" از لالا گو ہیرا نیم، "One Day" از جگل کشور شکلا، "The Parrot in the cage" از عطیہ حبیب اللہ، "Swallows" از خواجہ احمد عباس، "The Stars" از راجا رتنم، "When One Is In It" از اقبال سنگھ اور "Boatman Tarini" از تارا شنکر بنرجی۔

۳۔ "کامیاب افسانے" مرتبہ وزارت انصاری، سول ایجنٹ: صدیق بک ڈپو لکھنؤ: مطبوعہ حیدر آباد دکن، طبع اول: ۱۹۴۳ء علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، ایم۔ اسلم اور ظفر قریشی کے علاوہ متعدد افسانہ نگاروں کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۴۔ "معیاری افسانے" مرتبہ۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری (مصنفین اور مترجمین کے نام درج نہیں)۔ مطبوعہ۔ مجلس اردو "کتاب خانہ حفیظ" اردو بازار، لاہور طبع اول۔ ۱۹۴۳ء

۵۔ "سات تارے" مرتبہ۔ سید وصی اشرف دہلوی، سول ایجنٹ صدیق بک ڈپو، لکھنؤ طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل۔ قیسی رامپوری، ایم۔ اسلم، شاہد احمد دہلوی، انصار ناصری، فضل حق قریشی دہلوی، اشرف صبوحی اور سید ابو طاہر کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۶۔ "شاہکار" مرتبہ۔ ہنر انوری، سول ایجنٹ صدیق بک ڈپو، لکھنؤ طبع اول۔ ۱۹۳۹ء سے قبل

۷۔ "بہترین افسانے" مرتبہ: علی احمد مطبوعہ: دفتر رسالہ داستان گو، حیدر آباد دکن طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۸۔ "نگارستان" مرتبہ۔ اختر شیرانی، مطبوعہ۔ لاہور

۹۔ "ریزہ مینا" مرتبہ: شاہد احمد دہلوی مطبوعہ: ساقی بک ڈپو، دہلی، طبع دوم ۱۹۴۳ء رسالہ "ساقی" دہلی میں ۱۹۴۲ء تک شائع ہونے والے ۵۰ افسانوں کا انتخاب۔

۱۰۔ "میرا بہترین افسانہ" مرتبہ: محمد حسن عسکری، مطبوعہ: ساقی بک ڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۴۳ء کتاب میں محمد حسن عسکری کے دیباچہ پر ۳۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی تاریخ درج ہے۔

اس کتاب میں کل چودہ افسانے شامل ہیں۔ آخر میں افسانہ نگاروں کے حالات زندگی اور فن سے متعلق ان کی اپنی تحریریں شامل ہیں افسانوں کی تفصیل: "بیگن کا پودا" از اوپندر ناتھ اشک "انار کلی اور بھول بھلیاں" از اختر اورینوی "مجھے جانے دو" از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، "تیسری جنس" از چودھری محمد علی ردولوی، "سفید پوش" از دیویندر ستیارتھی، "دس منٹ بارش میں" از راجندر سنگھ بیدی، "نئی مصیبتیں" از رشید جہاں، "ہار جیت" از علی عباس حسینی، "آنندی" از غلام عباس، "جھیل سے پہلے جھیل کے بعد" از کرشن چندر، "ماتھے کا تل" از ممتاز مفتی اور "حرام جادی" از محمد حسن عسکری۔

۱۱۔ "منتخب افسانے" مرتبہ: عمر سکین، مقدمہ از مولانا وحید الدین سلیم، مطبوعہ: عالمگیر بک ڈپو سید مٹھا بازار، لاہور۔ طبع اول ۱۹۴۳ء

سے قبل۔

۱۲۔ "نئی راہیں" مرتبہ: قمر تسکین، مطبوعہ: عالمگیر بک ڈپو سید مٹھا بازار، لاہور مرکنٹائل پریس طبع اول ۱۹۴۳ء

۱۳۔ "نئی منزلیں" مرتبہ: قمر تسکین، مطبوعہ: عالمگیر بک ڈپو سید مٹھا بازار، لاہور۔ طبع اول ۱۹۴۴ء

۱۴۔ "نئی فضائیں" مرتبہ: قمر تسکین مطبوعہ: عالمگیر بک ڈپو سید مٹھا بازار، لاہور۔ طبع اول ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ۔

۱۵۔ "خوشبوئیں" مرتبہ: قمر تسکین، مطبوعہ: عالمگیر بک ڈپو سید مٹھا بازار، لاہور۔ طبع اول ۱۹۵۰ء سے قبل۔

۱۶۔ "منتخب افسانے" مرتبہ: تاجور نجیب آبادی، مطبوعہ: لاہور۔

۱۷۔ "انگڑائیاں" مرتبہ: احمد ندیم قاسمی، مطبوعہ: ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن، طبع اول: ۱۹۴۴ء

۱۸۔ "نقوش لطیف" مرتبہ: احمد ندیم قاسمی، مطبوعہ: ادارہ فروغ اردو، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۴ء
(یہ خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب ہے)

۱۹۔ "نئے پیمانے" مرتبہ: عبدالرحیم شبلی (بی۔ کام) مطبوعہ: بیسویں صدی، بیرون شاہ عالمی دروازہ، لاہور، طبع اول ۱۹۴۵ء
کرشن چندر، ممتاز مفتی، سید فیاض محمود، اختر حسین رائے پوری، راجندر سنگھ بیدی، میرزا ادیب، شفیق الرحمان سید احسان علی شاہ، ہاجرہ مسرور، سہیل عظیم آبادی، خدیجہ مستور، طفیل ملک، احمد شجاع پاشا، ظہور الحسن ڈار اور پرتھوی ناتھ شرما کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۲۰۔ "ستاروں کی محفل" مرتبہ: بشیر ہندی، مطبوعہ: ہاشمی بک ڈپو، لاہور طبع اول لگ بھگ ۱۹۴۶ء

۲۱۔ "ستاروں کے کھیل" ، مرتبہ: بشیر ہندی، مطبوعہ: ہاشمی بک ڈپو لاہور سنہ نہ دارد۔

۲۲۔ "جام دینا" مرتبہ: یوسف حسین

۲۳۔ "گناہ کے افسانے" ، مرتبہ: ڈاکٹر اختر حسین

۲۴۔ "سات ستارے" ، مرتبہ: شاہد احمد دہلوی، مطبوعہ: ساقی بک ڈپو، دہلی۔

۲۵۔ "طلوع و غروب" مرتبہ: جمیل احمد

۲۶۔ "اس بازار میں" مرتبہ: ثاقب زیروی مطبوعہ: لاہور

۲۷۔ "چاند کا گناہ" مرتبہ: راجہ مہدی علی خان

۲۸۔ "ہیبت ناک افسانے" مرتبہ: امتیاز علی تاج، مطبوعہ: دارالاشاعت، لاہور

۲۹۔ "گرد و پیش" مرتبہ: اکرام قمر

۳۰۔ "چپو" مرتبہ: ساغر نظامی "رسالہ ایشیاء" ، میرٹھ (۱۹۳۵ء تا اپریل ۱۹۴۴ء سے افسانوں کا انتخاب)

۳۱۔ "نئے زاویے" (دو جلدیں) مرتبہ: کرشن چندر،

۳۲۔ "پل کے سائے میں" مرتبہ: کرشن چندر، مکتبہ سلطانی، بمبئی۔ طبع اول: ۱۹۴۹ء

۳۳۔ "نئے کلاسیک" مرتبہ: آر پی ناتھ (صدر نشین) قاضی سلیم (کنوینر) جوگندر پال،
بشیر نواز، بھگونت راؤ دیشمکھ، ڈاکٹر نعیم الدین، ڈاکٹر صفی الدین صدیقی، ڈاکٹر بی ایچ راجور کر اور ڈاکٹر معین شاکر۔
مطبوعہ: مرہٹواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد، دکن، طبع اول: ۱۹۷۳ء
بیدی، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، منٹو، اقبال مجید، اقبال متین، جیلانی بانو، قاضی عبدالستار، جوگندر پال، کلام حیدری، انور عظیم، رام لعل، رتن سنگھ، سریندر پرکاش، شرون کمار ورما، غیاث احمد گدی، بلراج مین را، احمد یوسف، آمنہ ابو الحسن اور

ظفر اوگانوی کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۳۴۔ " میرا پسندیدہ افسانہ " مرتبہ: بشیر ہندی، مطبوعہ: اردو محل ۴۵ فیپل روڈ، لاہور۔ سنہ ندارد۔ یہ انتخاب قرارداد پاکستان سے قبل شائع ہوا۔ (لگ بھگ ۱۹۴۲ء)

۳۵۔ " دھوپ اور سمندر " مرتبہ: کمار پاشی، مطبوعہ: سطور پبلی کیشنز، دہلی طبع اول: ۷۸۔۱۹۷۷ء

قرۃ العین حیدر، غیاث احمد گدی، بلراج مین را، سریندر پرکاش، جوگندر پال، اقبال متین، رتن سنگھ، اقبال مجید، دیوندر اسر، شرون کمار ورما، کمار پاشی، امر سنگھ، بلراج کومل اور راج کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۳۶۔ " بہترین نئی کہانیاں " مرتبہ: اعجاز راہی و احمد داؤد، مطبوعہ: دستاویز پبلیشرز نانک پورہ، راولپنڈی، طبع اول مارچ ۱۹۸۰ء

" قصہ ایک رات کا " از انور عظیم، " رات " از انتظار حسین، " پاتال " از جوگندر پال، " لا " از کلام حیدری، " ڈوب جانے والا سورج " از غیاث احمد گدی، " شرمندگی " از اقبال مجید، نئی بشارت " از منصور قیصر، " مقتل " از بلراج مین را، " سمتار مس " از سریندر پرکاش، " ذرنج میں گرا ہوا قلم " از احمد ہمیش، " پرندہ " از خالدہ حسین، " کینسر " از انور سجاد، " گملے میں اگا ہوا شہر " از رشید امجد، " بارہ ماہ " از مظہر الاسلام، " پہلے آسمان کا زوال " از کمار پاشی، " سونے کی عمر " از مرزا حامد بیگ، " برسات کی رات " از سمیع آہوجہ، " نیلو " از ساگر سرحدی، " پہلا پاگل " از حمید سہروردی، " پیچ کا چہرہ " از قمر عباس ندیم، " اندر کا جنم " از علی حیدر ملک، " سیڑھی " از رضوان احمد، " اکتاب گھر نمبر ۲ " از احمد داؤد اور " نیا پل " از اعجاز راہی شامل کتاب ہیں۔

۳۷۔ " عصر جدید کی بہترین کہانیاں " مرتبہ: احمد ہمیش مطبوعہ: الباقریہ پبلی کیشنز، کراچی،

۳۸۔ " اردو کے تیرہ افسانے " مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز، مطبوعہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ طبع اول ۱۹۸۰ء،

۳۹۔ " ہمارے پسندیدہ افسانے " مرتبہ: ڈاکٹر اطہر پرویز، مطبوعہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ طبع اول: ۱۹۸۲ء

۴۰۔ " اردو افسانہ اور افسانہ نگار " مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی

(۲۵ افسانہ نگاروں کے احوال و آثار کے ساتھ ان کے اولین افسانوں کا مجموعہ

۴۱۔ " انتخاب افسانہ " مرتبہ: ڈاکٹر سید محمد عقیل، مطبوعہ: اترپردیش اردو اکیڈمی طبع اول: ۷۸۔۱۹۷۷ء

پریم چند، علی عباس حسینی، کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، غلام عباس، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، اقبال مجید، رام لعل، رتن سنگھ، جیلانی بانو، کلام حیدری اور عابد سہیل کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۴۲۔ " بیس نئی کہانیاں " مرتبہ: ڈاکٹر علی احمد فاطمی مطبوعہ: کتابستان ۳۰ چک، الہ آباد طبع اول: ۱۹۷۸ء

۱۹۷۰ء کے بعد لکھے جانے والے افسانوں کا انتخاب۔ قاضی عبدالستار، انور سجاد، اقبال آزر، عابد سہیل، خالدہ حسین، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، سریندر پرکاش اور شفق کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۴۳۔ " پریم چند صدی کے افسانے " مرتبہ: اترپردیش اردو اکیڈمی، مطبوعہ: اترپردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ طبع اول: ۸۳۔۱۹۸۲ء

یہ دسمبر ۱۹۸۰ء میں پریم چند صدی کے سلسلے میں منعقدہ دو روزہ سیمینار میں پڑھے جانے والے افسانوں کا انتخاب ہے۔ خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، رام لعل، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، جیلانی بانو، مسیح الحسن رضوی، بشیشر پردیپ، عابد سہیل، طارق چھتاری، امرت لال ناگر، رضوان احمد، عائشہ صدیقی اور صبیحہ انور کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

" اردو افسانے کی روایت " میں، میں نے اپنے معینہ Thesis سے مناسبت رکھنے والے افسانہ نگاروں اور ان کے نمائندہ افسانوں کا کھوج لگانے کے ساتھ منتخب افسانہ نگاروں کے احوال و آثار یکجا کرنے کا جتن بھی کیا ہے تاکہ ادب کے سنجیدہ قاری اور ناقد کو اردو افسانے کی

چھان پھٹک میں کسی نوع کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ افسانوں کے اس انتخاب کو ترتیب دیتے وقت کوشش کی گئی ہے کہ یہ انتھالوجی اردو افسانے کی ۸۷ سالہ زندہ روایت کی جملہ کروٹوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ ایک مربوط تاریخ کا تاثر بھی دے۔ تاکہ آج اور آنے والے کل کے ناقد اور افسانہ نگار کو مفاہمت پسندی اور نری مغرب زدگی سے نجات حاصل کرنے میں آسانی ہو اور ہماری فسانہ طرازی کے اس کھوئے ہوئے مشرقی لحن کی بازیافت کا عمل ممکن ہو سکے جس کے بغیر عالمی ادبی منظرنامے پر ہماری شناخت مٹی ہوئی ہے۔

افسانے سے متعلق اسی نوع کے کام کی دوسری جلد بہ شرط زندگی' بہت جلد۔

مرزا حامد بیگ

داستان نگاری کی روایت اور اردو افسانہ

"ہم سب گوگول کے "اوور کوٹ" میں سے برآمد ہوئے ہیں"

یہ جملہ دوستو فسکی کا ہے اور اگرچہ اس کا روئے سخن روسی افسانہ نگاروں کی طرف تھا لیکن یہ قول روس اور غیر منقسم ہندوستان' دونوں پر صادق آتا ہے۔ گوگول نے افسانہ "اوور کوٹ" ۱۸۴۲ء میں لکھا تھا اور اسی سال ایڈگرایلن پو نے مختصر افسانے کے فنی اصول وضع کیے۔ گو ہمارے ہاں مختصر افسانے کی ابتداء نہ تو گوگول کے زیرِ اثر ہوئی اور نہ ہی ایڈگرایلن پو کے وضع کردہ فنی اصول و ضوابط کے تحت' راشد الخیری کی معرفت اردو افسانے کے لیے ابتدائی ماڈل لیو لیچے نے فراہم کیا' البتہ پریم چند کی معرفت جس افسانے کا چلن عام ہوا وہ گوگول اور پو کے واضح اثرات سمیٹے ہوئے تھا۔

ہمارے فاضل محققین اور ناقدین (جن میں پروفیسر وقار عظیم پیش پیش تھے) نے اس آخری تاثر کو کچھ ایسے شدومد کے ساتھ محسوس کروایا کہ ہم تاحال پریم چند کو اردو افسانے کا بانی شمار کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ عالمی افسانے کی تاریخ میں گوگول اور پو کے حوالے سے ۱۸۴۲ء کا سال اہمیت کا حامل ضرور رہا ہے لیکن جہاں تک اردو افسانے کی ابتداء کا تعلق ہے' یہ سنہ وسال ہمارے لئے چنداں اہمیت کے حامل نہ تھے۔ اس وقت کا ہندوستان تو اپنی بقا اور آزادی کی جنگ لڑنے کی تیاریاں کر رہا تھا بقول سلطان حیدر جوش:

"تحقیق ہو چکی کہ معرکہ یا پلٹا' غدر ۱۸۵۷ء میں شروع ہو کر ۱۸۵۹ء میں زوال اودھ پر ختم ہوا۔ جب انگریز نے پنجاب سے لے کر بنگال تک کی فوجیں جمع کر کے اودھ پر چڑھائی کی اور زوال لکھنؤ کے وقت' تاریخ شاہد ہے کہ انگریزی فوجیں لکھنؤ کی گلی گلی اور دروازہ دروازہ پر سے وطن پرستوں کی لاشوں پر سے گزر کر بڑھ سکیں اور منشی جی کا توسن قلم دو مسلمان سرداروں کو اس وقت مضافات میں افیم کھا کر کسی پرانے کھنڈر کے اندر شطرنج کے مہرے لڑاتے پیش کر رہا تھا اور نہایت شستہ اردو میں"۔(۱)

یہاں سلطان حیدر جوش نے گوگول اور پو کے زیرِ اثر ڈھلے ڈھلائے مغربی افسانے کے پروردہ افسانہ نگار پریم چند پر اس کے ایک مشہور افسانے "شطرنج کی بازی" کے حوالے سے چوٹ کی ہے' جسے عالمی شہرت یافتہ ہدایت کار اور پروڈیوسر ستیہ جیت رے "شطرنج کے کھلاڑی" کے نام سے فلما چکے ہیں۔ دیکھنا چاہئے کہ اس دور کے ہندوستان کو کس نوع کے تہذیبی' سیاسی اور اقتصادی حالات کا سامنا تھا اور ہمارا کہانی کار داستان پرور ماحول سے جلاوطنی کے بعد کس نہج پر آگے بڑھنے کی سوچ رہا تھا۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ۱۷۹۶ء میں ولیم شیکسپیئر کے دو ڈراموں "ہملٹ" اور "ہنری ہشتم" کے چیدہ اقتباسات کا ترجمہ کر کے ہندوستانی ادب کو جو راہ سجھائی تھی (۲)' اس پر چلتے ہوئے ہمارے فکشن رائٹرز نے ۱۹ویں صدی کے خاتمے تک درج ذیل مطبوعہ کام یادگار چھوڑا ہے:

۱۔ "تواریخ راسلس شہزادہ حبش کی" از ڈاکٹر سیموئل جانسن / سید محمد میر لکھنوی المعروف کمال الدین حیدر مطبوعہ: گرین وے پریس' آگرہ: طبع اول ۱۸۳۹ء

۲۔ "حکایات لقمان" از حکیم لقمان / نظام الدین' مطبوعہ: بمبئی' نام مطبع ندارد' طبع اول: ۱۸۴۳ء

۳۔ "ہسٹری آف سینڈ فورڈ اور مرٹن" از ٹامس ڈے / بابو شیو پرشاد' مطبوعہ: بنارس' نام مطبع ندارد' طبع اول: ۱۸۵۵ء

۴۔ "قصہ بزرگ راہنس کروسو" از ڈینیل ڈیفو / نام مترجم ندارد' بنارس' نام مطبع ندارد' طبع اول: ۱۸۶۲ء

۵۔ "داد و دیا" از ولیم شیکسپیئر / نوشیرواں جی مہربان جی آرام' مطبوعہ: نام مطبع ندارد' طبع اول: ۱۸۷۱ء

۶۔ "اعمال نامہ روس" از ڈاکٹر والس میکنزی / پنڈت رتن ناتھ سرشار، لکھنؤ، نو کشور پریس، طبع اول: ۱۸۸۷ء

۷۔ "الیڈ" از ہومر / باسط علی خاں، آگرہ: مفید عام پریس، طبع اول: ۱۹۰۰ء

یاد رہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے احوال و آثار نے (زوال اودھ ۱۸۵۹ء سے ۲۰ویں صدی کے آغاز تک) تقریباً چالیس برس کی مدت ہمارے لاشعور کا حصہ بننے میں لی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب داستان کی رومانی فضا نے تلخ حقیقت سے شکست کھائی اور سرسید احمد خان کی منطقی حقیقت پسندی نے ہماری نثر کی وہ ساری شعریت یکلخت معطل کر کے رکھ دی، جو سرسید سے پہلے کی نثر کا طرہ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔

داراشکوہ کی شکست اور ۱۸۵۷ء کا ہنگام، جہاں داستان کی رومانوی فضا کو ملیامیٹ کر گیا وہیں داستان کی معنویت سے بھی ہم کوسوں دور جا پڑے جو ہمارے ماضی کی آئینہ دار تھی اور جہاں انسان کی حیثیت محض ٹائپ کی ہے۔

داستانوں کا علامتی مطالعہ کرنے والوں میں سوشیالوجی کے ماہرین، داستان کو انسانی معاشرے کے خاص دور سے متعلق بتاتے ہیں اور نفسیات جنسی الجھنوں کی طرف لے جاتی ہے البتہ سگمنڈ فرائیڈ، الفرڈ ایڈلر، ارنسٹ جونز اور آٹو رینک سے آگے نکل کر ماضی کے انسان کی سوچ کے تعین کے سلسلے میں کارل یونگ نے دیومالا اور مذاہب کے مطالعے سے اجتماعی لاشعور کی چھان پھٹک کرتے ہوئے تاریک گوشوں تک رسائی حاصل کی ہے۔

کارل یونگ کی اس آرکی ٹائپل (Archetypal) تنقید کے مقابلے میں جیمز فریزر (مصنف "Golden Bough") اور اس کے مقلدین، داستان کا مطالعہ اجتماعی لاشعور کے ساتھ فطرت کے عوامل کی روشنی میں کرتے ہیں، جب کہ ہنرخ زمر اور جوزف کیمبل نے بالترتیب ہماری دو داستانوں "بے تال پچیسی" اور "الف لیلیٰ" کا مطالعہ مشرق کے دیومالائی سانچوں کی روشنی میں کیا ہے۔ کاش ہمارے ناقدین اور افسانہ طرازی کے دعوے داروں کو یہ توفیق ملتی کہ داستانوں میں رواں مشرق کی اس خاص خوشبو کی پہچان کر سکتے۔ اب بھی گئے وقت کو آواز دی جا سکتی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ داستان، جو ہمارے قدیم عہد کا حال کے نام پیغام ہیں، ہم سے کہتی کیا ہے؟ (گو اس سلسلے میں بھی اختلاف رائے موجود ہے) اول: ایک خیال تو یہ پایا جاتا ہے کہ داستان انسانی شخصیت کے مختلف امکانات کو سامنے لاتی ہے، یعنی فطرت کے ساتھ انسانی انا کا تصادم ـــ اور یہ کہ تسخیر کائنات کا عمل آج بھی جاری و ساری ہے۔

دوم: مرکزی کردار کا خود اپنی ذات میں اور ذات سے باہر سفر ضروری ہے۔ (۳) سفر کے لیے محرک جذبہ عشق کا ہے اور اس سفر میں کامیابی خدا کی طرف سے توفیق ملنے پر مبنی ہے یعنی کامیابی کے لیے تائید غیبی ضروری ہے گو ہر مقصود اپنی ذات میں گم ہو کر حاصل نہیں ہوتا اس کے لیے پر خطر سفر پر نکلنا لازم ہے جبکہ تائید غیبی سے مراد کائنات کی اصل قوتیں ہیں، جو خیر طلب ہیں۔ ہماری داستانوں میں مشرقی دانش اور متصوفانہ طرز احساس کی یہ مخصوص مہک اتنی کم قیمت نہ تھی جتنا ہم نے خیال کیا۔

مختصر یہ کہ داستان ہماری آزاد خیال معاشرت کی خوشیوں، خوابوں، امیدوں اور وسوسوں کا علامتی اظہار تھا جسے داراشکوہ کی شکست اور ۱۸۵۷ء کے ہنگام کے بعد علی گڑھ تحریک کی منطقی حقیقت پسندی اور معاشرت سدھار تنظیموں نے جو ضعف پہنچایا، اس سے ہم بخوبی آگاہ ہیں۔

ہماری داستان نگاری کی روایت کے آخری بڑے نام میر باقر علی داستان گو نے خالصتاً مسلم حوالوں سے "داستان امیر حمزہ" لکھ کر داستانوی فضا کی بازیافت چاہی تو ناکام رہے اور آخر کار محمد علی جوہر کی کھدر پوش تحریک کی ہمنوائی میں "گاڑھے خاں کا دکھڑا" اور "ململ جان کی طلاق" "اڑا ڑا دھم" اور "مفت ہاتھی" جیسے رسائل یادگار چھوڑے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی اور خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی نے میر باقر علی کے تجربے کو دوہرانے کی بجائے مختصر نویسی کو شعار کیا لیکن ان کے ہاں اہمیت کے تجربات کو وہ اہمیت حاصل نہیں رہی جو ان کے بعد آنے والوں خصوصاً راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، سلطان حیدر جوش اور محمد علی ردولوی کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے خواجہ صاحب کا سارا زور ماضی قریب کے بڑے تجربے (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) کو موضوعی سطح پر سمیٹنے میں صرف ہو گیا۔ لے دے کر ان کی تحریروں سے دلی کی مسلم معاشرت، رسوم و رواج، لال قلعہ کی زندگی، امراء کے مشاغل

اور دلی کے میلوں اور تہواروں کا احوال معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ ناصر نذیر فراق کی مشہور تصنیف "لال قلعہ کی ایک جھلک" ننھی خانم المعروف بی دلہن کی سنائی ہوئی کہانیوں پر مبنی ہے۔ ننھی خانم، جنھوں نے لال قلعہ کی زندگی دیکھی تھی اور خود انھیں خواجہ صاحب نے ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں پہلی بار دیکھا اور سنا۔ (۴) یہ کتاب بقول فراق "مرحومہ کے ملفوظات ہیں اور انھیں جمع کرنے کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ ناظرین اسے پڑھ کر عبرت حاصل کریں۔ فراق نے بقیہ کتابیں "بیگموں کی چھیڑ چھاڑ"، "دکن کی پری"، "دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ"، "سات طلاقوں کی کہانیاں"، "خوبصورت بھتنا"، "درد جانستان"، "چار چاند"، اور "دلی کا آخری دیدار" بھی اسی غرض و عنایت کے تحت لکھی ہیں۔

خواجہ ناصر نذیر فراق کی کتاب "لال قلعہ کی ایک جھلک" کا اختتام دلی کی ایک قدیم رسم تورہ بندی سے متعلق وضاحت پر ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"۔۔۔ مانڈوں کے متعلق مشہور ہے "مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں، انھیں اپنے ملوے مانڈے سے کام۔" یہ معمولی تورہ ہے، ورنہ بادشاہوں کے تورہ ہزاروں نعمتوں کے سونے چاندی اور چینی کے برتنوں میں بھی ہوتے تھے، اس رسم کو بادشاہوں سے دلی والوں نے بھی سیکھ لیا تھا اور شہر میں بھی تورہ بندی ہوتی تھی۔ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے کچھ دن بعد سے موقوف ہے، اب توٹی پارٹی کی گرما گرمی ہے۔"

اردو فکشن کی سطح پر بھی یہی کچھ ہوا داستان کی تورہ بندی موقوف ہوئی اور اس کی جگہ "ٹی پارٹی" نے لے لی۔ کاش میر باقر علی داستان گو اور خواجہ ناصر نذیر فراق کی افسانوی تحریریں اردو افسانے کے لیے کسی نوع کا ماڈل فراہم کر جاتیں اور آج ہمارا رابطہ اپنی داستانوی روایت سے اس طور ٹوٹا ہوا نہ ہوتا۔

درحقیقت ہم نے اپنی داستانوں سے لفظ کے طلسم کے ہاتھوں شکست کھائی ہے، اس طلسم کو توڑ کر اندر کے چھپے ہوئے معانی کی تلاش نہیں کی۔ داستان ہمارے افسانے کے لیے ایک ایسی سپلائی لائین بن سکتی تھی، جس کا شعور، روایت کے ساتھ ہمارا رشتہ مستحکم کرتا اور ہم افسانہ نگاری کی اس زندہ روایت سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے آج پیش منظر کو مزید تاب ناک بنا سکتے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ کہ داستان کی طاقتور مشرقی سپلائی لائین سے ہم یکلخت جدا نہیں ہوئے، ہمارے اولین افسانہ نگاروں کے ابتدائی افسانے اس روایت کے تسلسل میں سامنے آئے ہیں۔

۱۔ اردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری اور سلطان حیدر جوش کے اصلاحی اور معاشرتی افسانوں میں مخصوص مشرقی روایات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے والوں کو مطمئن و مسرور کرنے کی کوشش نیز نثر میں شعریت کی بازیافت اسی روایت کا عکس ہے۔

۲۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں مناظر فطرت کی بہار آفرینیوں اور رنگینیوں کو جذبہ محبت کا پس منظر بنانے اور انسانی جذبات کی مہربان فطرت سے ہم آہنگی دکھانے کا رجحان، نیز نیاز فتح پوری کا کردار نگاری میں پرجوش رومانی عمل سے رد عمل تک کی افسانوی پیش کش داستان کے نشاط انگیز اور تخیلی اسلوب سے ہم آہنگ ہے۔ جبکہ مسز عبدالقادر نے قنار فطرت کی پیش کش میں بھی داستان سے ہی اثر قبول کیا۔

۳۔ خود پریم چند کے اولین افسانوں "دنیا کا سب سے انمول رتن"، "شیخ مخمور" اور "سیر درویش" مشمولہ: "حب وطن کے قصے معروف بہ سوز وطن و سیر درویش" (۵) کی فضا، ماحول اور افسانے کے انجام میں حق کی فتح داستان سے ہی مستعار ہے۔

۴۔ چودھری محمد علی ردولوی نے مشرقی دانش کے بیان کے لیے داستان سے بھرپور استفادہ کیا اور داستان گو کہلانے پر فخر کیا۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں افسانے کی صنف نے چار یکسر جداگانہ نقطہ نظر کے حامل افسانہ نگاروں کے زیر اثر اپنا سفر آغاز کیا اور اردو افسانے کے ایک دوسرے سے یکسر متخارب رنگ ہندوستان کی کروٹیں لیتی ہوئی سیاسی اور سماجی زندگی، نیز افسانہ نگاروں کی ذات اور اسلوب تحریر سے پھوٹے، یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے افسانے نے داستان کے زیر اثر اپنا سفر آغاز کیا اور آگے چلے کر فن افسانہ سے متعلق نت نئی نظریہ سازی کے تحت اپنی مشرقی سپلائی لائین سے دور ہوتا چلا گیا۔

ہماری افسانوی روایت کے سرسری جائزہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ داستان کے حوالے سے علامتی طریقہ کار کا تجربہ اردو افسانے کی ابتداء میں ہی ہوا لیکن اس کا چلن ممکن نہ ہوا۔ نمایاں مثالوں میں راشد الخیری کا افسانہ "چہار عالم" یلدرم کا "چڑیا چڑے کی کہانی" پریم چند کا "گلی ڈنڈا" "محمد علی ردولوی کا "دھوکا" "اختر حسین رائے پوری کا" قبر کے اندر" "میرزا ادیب کے دو افسانے "درون تیرگی" "اور "دل ناتواں" حیات اللہ انصاری کا "پچاجان" "اختر اور بیوی کا" پھلجھڑیاں اور بال جبریل" "خواجہ احمد عباس کا "تین عورتیں" کرشن چندر کا "غالیچہ" اور سراج الدین ظفر کا "تنازعہ" ہیں۔

رواں پس منظر میں تازگی کا ایک انوکھا احساس اسی روایت کے رواں پس منظر میں براہ راست انداز بیان کے باوجود اسلوب اور موضوع کی ہم آہنگی سے پیدا ہوا۔ رواں پس منظر کے جن افسانہ نگاروں کے ہاں موضوع کا تنوع تکنیک کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آیا ان میں سے ہر ایک کے ہاں علامتی، استعاراتی اور تجریدی تدبیر کاری کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں مثال کے طور پر غلام عباس کا "آنندی" "کرشن چندر کے افسانے "گڑھا" "غالیچہ" "بت جاگتے ہیں" "ہاتھ کی چوری" "نیکی کی گولیاں" "مردہ سمندر" اور خواجہ احمد عباس کے "تین عورتیں" اور "اندھیر اجالا" وغیرہ

یہاں یہ سوال اہمیت کا حامل ہے کہ آج کا افسانہ کس حد تک داستان سے کہانی کا فن سیکھ سکتا ہے اور اس طور کا ورثہ آج کے افسانوی پیش منظر میں کیا معنی رکھتا ہے؟

اس سوال کی گنجائش اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ اردو افسانے کو یکلخت اخلاقی نیم موعظانہ صورت حال اور جاگیرداری اخلاقیات سے مذہبی اور جنسی حقیقت نگاری ("انگارے" "شعلے") اور ترقی پسند تحریک کی طرف آنا پڑ گیا۔ نتیجہ زمین کے فکری اور اسلوبیاتی حوالوں سے کٹ جانے کے سبب کہانی کی روایت کا تسلسل مجروح ہوا اور افسانہ لوک دانش سے تہی دست ہو گیا۔

انتظار حسین اس ضمن میں بدنام ہے کہ اس نے داستان کی بازیافت چاہی اور لوک دانش کی جستجو کا جواز پیش کیا اور دوسری وجہ :۔

"افسانے کی اصل روایت داستانوں اور قصہ کہانیوں کی روایت ہے" (انتظار حسین)

نیز انتظار حسین نے نئے اسالیب کی جستجو کو اپنی تہذیب سے ایمان اٹھ جانے کے مترادف جانا، اس پر خاصی لے دے ہوئی۔

اب ذرا دیکھا چاہئے کہ اس کھوئی ہوئی اسلوبیاتی سپلائی لائین کی جستجو انتظار حسین سے پہلے کہاں تک ہوئی۔ اس ضمن میں اولین مثال تو خود پریم چند کے دو افسانے "دنیا کا سب سے انمول رتن" اور "شیخ مخمور" ہیں۔

اکا دکا نمایاں مثالوں میں میرزا ادیب کا افسانوی مجموعہ "صحرانورد کے خطوط"۔

مجنوں گورکھپوری کے طویل افسانے "تنہائی" "سمن پوش" اور "خواب و خیال"۔ علی عباس حسینی کے افسانے "رحیم بابا" اور "جل پری" "شفیق الرحمان کا "قصہ پروفیسر علی بابا کا" اور سراج الدین ظفر کا "الف لیلیٰ کا ایک باب" جن کی فضا بندی اور افسانوی تدبیر کاری توجہ طلب ہے۔ عزیز احمد کا افسانہ "آب حیات" ایک اور نمایاں مثال ہے لیکن داستان کے وسیع ترکینوس کی افسانے میں کامیاب ترین بازیافت طویل افسانے "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" میں ہوئی۔ اس افسانے میں گذشتہ تاریخ کی کامیاب ترین فضا بندی اور زمنی حوالوں سے مطابقت رکھنے والے کرداروں (تیمور لنگ کے حوالے سے) کی پیش کش بڑی کامیابی ہے جس کا باعث عزیز احمد کا وسیع مطالعہ اور بھرپور تاریخی شعور بنا۔

شیخ صلاح الدین (صلاح الدین عادل) کے ہاں لوک دانائی کی جستجو میں قصہ در قصہ کہانی نے جنم لیا، جس کی ایک نمایاں مثال کہانی "آورش" (مطبوعہ "راوی") ہے۔

"آورش" میں قصہ در قصہ تحیر کا سامنا ہے۔ ایک نیم خوابیدہ آبادی میں گھوڑوں کا فارم جہاں سبزہ زار پر چاندنی سبزے کا وصف بنی ہو رہی ہے۔ طبل کی تھاپ پر گھوڑے کا رقص۔ قصہ در قصہ کہانی داستانوی حیرت کی گاڑھی دھند میں نکلی جاتی ہے۔ یہاں مقصد حیات خوب ترکی

کی تلاش ہے اور کہانی کا انجام خیر اور شر کا تقابلی مطالعہ ۔

اس روایت میں انتظار حسین کی اہمیت یوں بھی ہے کہ اس نے داستانوی فضا' اس کی کردار نگاری اور اسالیب کا اپنے عصری تقاضوں کے تحت برتاؤ کرنا چاہا ہے (مثلاً "کایا کلپ" "" جل گرجے " "" گھوڑے کی ندا ") لیکن اس سے ہوا یہ کہ حیرت کا کاریلا آیا جس نے آج کے سنجیدہ قاری کے پاؤں اکھاڑ دیے ہیں' یہ کام انتظار حسین کے " سرکٹے " نے انجام دیا یا " وہ جو کھوئے گئے " کی ساختہ صورت حالات جو حقیقت سے بہت فاصلے پر ہے ۔ یہاں حقیقی اور Ethereal کرداروں سے " آخری آدمی " کے کردار زیادہ اہم ہیں اور Ethereal افسانے کی سب سے اچھی مثال "زرد کتا" ہے۔

سو کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے افسانہ طرازوں کو داستان سے ناطہ ٹوٹنے کے بعد ورثے میں جو روایات ملیں' وہ خالص افسانوی ادب کی روایات نہ تھیں بلکہ مروجہ معاشرے کی جذباتی اور ذہنی زندگی کی جھلکیاں تھیں ۔ کچھ یہی سبب ہے کہ ہمارے ابتدائی ناولوں کی اٹھان محض تمثیلی قصوں کی حد تک رہ گئی فکشن میں نذیر احمد دہلوی اس کی رکاوٹ خاص تھے ۔ ان کے نمایاں کردار کلیم' اکبری اور اصغری محض نقطۂ نظر کو واضح کرنے کا وسیلہ ہیں اور نصوح کا کردار Complex نظر نہیں آتا ۔ اس نے ماضی کی تمام متاع کو بیچ چورا ہے میں آگ لگائی اور الطاف حسین حالی نے پیروئی مغرب کی تلقین کی ۔ بس یہی وہ مقام ہے جہاں سے شاعری میں مغرب کی پیروی کو شعار کیا گیا اور فکشن میں داستان کو قابل اعتنا جاننے سے انکار کیا گیا ایسے میں ہمارا افسانہ راشد الخیری اور یلدرم کی تعلیم نسواں اور اصلاح پسندی یا پریم چند کی راجپوت نسل پرستی اور زمانے کے تلخ و ترش بیان سے بہت آگے آیا تو خواجہ حسن نظامی کے افسانے "بہرا شہزادہ" تک آ گیا ۔ دراصل ہماری مغرب زدگی نے اردو افسانے کی صنف کو یہاں کی فضا میں رچنے بسنے کا موقع ہی نہیں دیا اور آنے والے افسانہ نگاروں نے جہاں رومان پرور ماحول اور مافوق کے عمل دخل کو رد کیا وہیں فسانہ طرازی کے مشرقی لحن کو بھی خیرباد کہا ۔ قدیم قصہ گوئی اور نئی افسانہ طرازی کا کسی مقام پر کوئی سمبندھ ہی نہیں ہونے دیا گیا یہاں تک کہ جب ہمارے اولین افسانہ نگاروں نے عموماً" اور محمد علی ردولوی نے خصوصاً" اردو افسانے کا رشتہ ہماری داستانوں سے جوڑنے کا جتن کیا تو ہمارے ناقدین نے اس کام کو نئے ادبی منظر نامے سے بارہ پتھر باہر کر دیا ۔ لیکن اب اس مسئلہ حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ اگر ہمارا افسانہ مشرقی روایات کی پاسداری کرتا تو آج اور آنے والے کل میں ہمارا افسانہ مختصر افسانے کی عالمی روایت میں ایک طاقتور مشرقی لحن کے ساتھ نمایاں دکھائی دیتا اور یہ بالکل اسی نوع کا کام ہوتا' جس کا سرا بنگلہ فکشن اور شاعری کے حوالے سے رابندر ناتھ ٹیگور کے سر ہے ۔

اب بھی وقت کی ڈور کا سرا ہمارے افسانہ نگاروں کے ہاتھ میں ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے افسانوی ادب کی زندہ روایت کو سمجھنے سمجھانے کا جتن کریں اور اس مشرقی لحن کو تازہ کریں جو ہماری ازلی پہچان ہے ۔

○

(۱)۔ بحوالہ "پہلی کرن کے حضور" از ابوالفضل صدیقی، مطبوعہ: "سیپ" کراچی ۱۹۸۸ء

(۲)۔ مشمولہ "ہندوستانی زبان کے قواعد" مطبوعہ: کلکتہ، طبع اول: ۱۷۹۶ء

(۳)۔ جوزف کیمبل نے "ہیرو کے ہزار چہرے" میں داستانوی ہیرو کے کردار پر مفصل گفتگو کی ہے۔

(۴)۔ اس وقت خواجہ صاحب کی عمر چھ سات برس کی تھی (بحوالہ مقدمہ "لال قلعہ کی ایک جھلک" مطبوعہ ساقی بک ڈپو، دہلی س ۔ ن

(۵)۔ گیلانی الیکٹرک پریس بکڈپو، لاہور: ۱۹۳۹ء

واضح رہے کہ یہ مجموعہ پہلی بار "سوزِ وطن" کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے جون ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا اس وقت اس مجموعے میں "سیرِ درویش" نامی افسانہ شامل نہ تھا۔ یہ افسانہ بعد میں "زمانہ" کانپور بابت اپریل، مئی، جون، جولائی، ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔

اردو کے اولین افسانہ نگار

۲۰ ویں صدی کا آغاز سوشل ازم ' استھیٹزم (Aesthticism) اور امپرل ازم کے زور و شور کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس دور کے ہندوستان میں اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ صدیوں کے ٹھہرے ہوئے پانی میں یکلخت تلاطم پیدا ہوا تھا۔ مہاجنوں اور جاگیرداروں کی بے رحم گرفت سے نجات حاصل کرنے کے لیے کسان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور فرسودہ رسم و رواج اور تعصبات کی چکی میں پسے ہوئے انسان نے نجات کی راہیں تلاش کرنے کا جتن کیا تھا۔ خصوصاً ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء کے ہندوستان کی عوامی تحریکوں نے اس قدر شدت اختیار کر لی تھی کہ سیکڑوں میل دور روس میں لینن نے کہا تھا:

"ہندوستان کے مزدور بھی بیدار ہو گئے ہیں 'ان کی یہ جنگ اجتماعی سیاسی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے"۔

اس وقت کی مشینی زندگی نے نئے طبقات کو جنم دیا تھا اور مغربی تہذیب نے سوچنے اور رہن سہن کے نئے انداز وضع کیے تھے اور ہندوستان کی ایک آنکھ مغرب کی سمت بھی کھلی ہوئی تھی۔ رڈیارڈ کپلنگ کی تحریر دائمی برطانوی راج کی خبر دیتی تھی اور برنارڈشا کی فیبین سوسائٹی اشتراکیت کے پرچار میں جتی ہوئی تھی۔ آسکروائیلڈ جمالیات کی موشگافیوں میں مصروف تھا اور ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس نے آئرلینڈ کی اسرار پسندی ' آئرش قوم پرستی اور متصوفانہ اقدار کی بازیافت چاہی تھی۔ یہ ایڈورڈین عہد تھا 'سیاسیات اور سماجیات کے ساتھ ادب میں بھی عجب طرح کی گہما گہمی تھی۔

یہ زمانہ ہندوستان کی ذہنی ' سیاسی ' تہذیبی اور سماجی زندگی کو نئی کروٹ دے رہا تھا اور یہ تبدیلی ایک غیر ملکی نو آبادیاتی حکومت کے مفادات ' اثر پذیری اور ریشہ دوانیوں کے سبب کچھ پیچیدہ بھی تھی اور ایک حد تک مصنوعی بھی۔ مصنوعی اس اعتبار سے کہ قومیت اور قومی کلچر کے جن نئے تصورات نے یورپ کے صنعتی سماج میں جنم لیا تھا اسے حکومتی سطح پر ہندوستان میں پہنچنے سے روکا جا رہا تھا۔ ہندوستانی قلم کاروں کی تحریروں پر کڑی نظر رکھ کر سختی سے نبٹنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور یوں جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد برطانوی حکومت کی پوری کوشش تھی کہ ان کی ہندوستانی رعایا متحدہ قومیت اور وسیع تر قومی مفاد کے مشترکہ احساس شعور سے بیگانہ رہے۔

ان حالات میں ایک طرف تو مسلم علماء اور آریہ سماجی تھے اور دوسرے طرف ایک "روشن خیال" متوسط طبقہ تھا جو نئے نظام تعلیم کا پروردہ ہونے کے سبب مغربی تہذیب و تمدن کے گن گا رہا تھا۔ بابو شو پرشاد کے زیر اثر ہندوؤں میں احیائے ماضی کا جوش اٹھا تو مسلمانوں نے بھی اپنی جداگانہ تہذیبی پالیسی مرتب کرنی شروع کی ' یہاں تک کہ سید احمد خان نے قیام بنارس کے دوران اپنے دائرہ فکر و عمل پر نظر ثانی کی اور قوم کا لفظ صرف مسلم جماعت کے لیے استعمال کرنے لگے۔ یہ الگ قصہ ہے کہ آگے چل کر بابو شو پرشاد "ستارہ ہند" کہلائے ' سید احمد خان کو "سر" کا خطاب ملا اور ان کے بیشتر ساتھی "شمس العلماء" قرار پائے۔ ان تحریکوں کے اثرات اردو کے اولین افسانہ طرازوں کی تحریروں میں بہت نمایاں ہیں۔

○

۱۔ راشد الخیری ' سلطان حیدر جوش ' پریم چند اور عباشہ سدرشن۔

ہندو اور مسلم سوسائٹی کی فرسودہ رسوم و رواج 'مہاجنوں اور جاگیرداروں کی بے رحم گرفت کے خلاف مزاحمت ' قوم پرستی اور اصلاح نسواں کی روایت۔

۲۔ چوہدری محمد علی ردولوی اور خواجہ حسن نظامی
فن برائے فن کے حوالے سے داستانوی روایت کی بازیافت کا عمل اور ماضی میں پناہ ڈھونڈنے کا رویہ۔
۳۔ سجاد حیدر یلدرم' نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالغفار
رومان اور اصلاح پسندی کی روایت۔

○

۱۔ اردو کے اولین افسانہ نگار راشد الخیری سرسید تحریک کے پروردہ تھے اور مسلم متوسط طبقہ کی معاشرت کے ہر پہلو کے شناسا۔ اس سوسائٹی میں کاظم جیسے دین دار اور پرہیزگار بزرگ بھی تھے اور صالحہ جیسی حیا پرور اور خوددار لڑکیاں بھی۔ راشد الخیری کے دل پر ان دو کرداروں کا نقش انمٹ تھا۔ پھر ان کے دیکھتے دیکھتے ان کی معاصر معاشرت کی فضا مسموم ہو گئی اور راشد الخیری نے اردو کا پہلا افسانہ "نصیر اور خدیجہ" (مطبوعہ: "مخزن" لاہور دسمبر ۱۹۰۳ء) رقم کیا۔ یہ افسانہ ایک بہن کی طرف سے بھائی کے نام ایک خط کی صورت میں ہے اور افسانہ نگاری کے جملہ لوازم پر پورا اترتا ہے۔ مغربی دنیا میں لو لیپے نے پہلی بار اس تکنیک کو برتا تھا اور آٹھ خطوط پر مشتمل ایک افسانہ لکھ کر اس تکنیک کو متعارف کروایا تھا۔(۱)

راشد الخیری نے بقول پریم چند: "انفرادی فطرت نہ پائی تھی۔ ان کی فطرت کا رنگ اجتماعی تھا۔ صالحہ اور کاظم کی حیثیت افراد کی ہے۔ وہ اپنے طبقے کے نمائندے ہیں انہیں کے ذریعہ مولانا راشد سوسائٹی کی اصلاح کرنی چاہتے ہیں۔

" سوسائٹی رسوم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ توہمات اس کے گلے کا ہار ہو رہے ہیں۔ پیروں اور مریدوں نے اسے تختہ مشق بنا رکھا ہے۔ شرک نے مذہب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسراف ایک عذاب ہو گیا اور انگریزی تہذیب اپنی نمائشوں اور دلفریبیوں کے ساتھ سوسائٹی کے حقیقی اجزاء کو منتشر کرتی جا رہی ہے۔ رواداری کا خاتمہ ہوتا جاتا ہے۔ کنبہ پروری عنقا ہو رہی ہے۔ خود غرضیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ نفسانیت کا رنگ غالب ہے۔ روحانیت معدوم ہو رہی ہے عورت مظلوم ہے۔ اسے اس کے حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس پر جسمانی اور روحانی قیدیں اس کثرت سے عائد کر دی گئی ہیں کہ وہ مفلوج ہو گئی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی رفیق حیات نہ رہ کر محض اس کی تفریح کی چیز بن گئی ہے۔ اس کی ذلت اور پستی کی مثالیں آئے دن ان کے تجربے میں آئی ہوں گی اور کوئی تعجب نہیں کہ ان کا دردمند دل اس زبوں حالی پر رو اٹھتا تھا اور اس کی اصلاح کے لئے بیتاب ہو جاتا تھا۔ ان کے افسانے اور ناول زخم خوردہ دل کے نالے ہیں جن میں تاثیر کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے"۔(۲)

۲۔ " غیر مسلموں کو اگر کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے مسلمانوں کے لیے لکھا ہے' جس طبقہ کو اٹھانا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کا طبقہ ہے' اتنا ہی نہیں' کہیں کہیں تو آپ کے افسانے مذہبی تبلیغ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں"۔(۳)

پریم چند نے جو گلہ راشد الخیری سے اپنے بھرپور مضمون کے آخر میں کیا ہے' اس پر مفصل گفتگو کا موقع آگے آئے گا۔ راشد الخیری نے تو علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو افسانے میں معاشرتی اصلاح پسندی کی داغ بیل ڈالی تھی اور مسلم تعلیم یافتہ لڑکیوں کی اخلاقی زبوں حالی اور معاشرتی انحطاط کو اپنا موضوع بنایا تھا' اور یوں راشد الخیری نے جو روش "نصیر اور خدیجہ" میں اختیار کی تھی اور موضوعات کا جو دھارا پکڑا تھا تادم آخر اسے نہیں چھوڑا۔ اس اعتبار سے ان کے بیشتر افسانوں میں یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔ بہرطور راشد الخیری کا نام اصلاح معاشرت اور حقوق نسواں کے لیے جدوجہد کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ راشد الخیری کے ہاں متوسط طبقے کی پیش کش میں عورت موضوع خاص ہے اور آزادی نسواں مقصد خاص' جس کے حصول کے لیے عورت کی مظلومیت کو انتہائی دردمندی کے ساتھ سامنے لائے (مثلاً: مضامین اور افسانوں کا مجموعہ

" قطرات اشک ") اکثر اوقات افسانے میں رواں جذباتیت کے دھارے نے افسانے کے وحدتِ تاثر کو مجروح کیا ہے۔ سبق آموز، اصلاحی افسانوں میں "چہار عالم" اپنی انوکھی تدبیر کاری کے سبب نمایاں ہے جس میں کہانی کی ابتدا تاڑ کے درخت پر بنے کے گھونسلے سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ ساری کائنات پر محیط ہو جاتی ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ ہمارا پہلا افسانہ نگار صرف مسلم سوسائٹی کی اصلاح ہی نہیں چاہتا تھا بلکہ اس کے پیش نظر عالمی سیاسی منظر نامہ بھی تھا اور ہندوستان کی آزادی کا حصول بھی ایک نمایاں اور فوری مقصد تھا۔ یہ Complex صورت حالات تھی اور راشد الخیری سے متعلق ہمارے ناقدین کا سہل پسند رویہ، جس کے سبب راشد الخیری کو محض "مصور غم" اور اصلاح نسواں کا پرچارک ظاہر کیا گیا۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ راشد الخیری اور سلطان حیدر جوش نے پریم چند سے بہت پہلے حب الوطنی اور انگریز دشمنی کو اپنا موضوع خاص بنایا۔ اس حوالے سے راشد الخیری کا افسانہ "سیاہ داغ" (مشمولہ: شہید مغرب) خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ "سیاہ داغ" واضح طور پر جلیانوالہ باغ کے عظیم سانحہ سے متعلق افسانہ ہے جس میں ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔

"عدل و رحم شہر کی چار دیواری سے کوسوں دور بھاگ چکا تھا، مسلح دستوں نے گولیوں کی بوچھاڑ شروع کی۔ الیاس آباد کا دولہا، بیوہ کا لال، جو رو رو کر کہہ رہا تھا، ہم کچھ نہیں کہتے، فقط ہمارے بچے حوالے کر دو۔ وہ اپنی درخواست کے جواب میں فیر کی آواز سنتا ہے اور دیکھتا ہے کہ چہرے سے خون بہنے لگا۔ صداقت کا پتلا اور اسلام کا عاشق، وطن کا شیدا قدم پیچھے نہیں ہٹاتا اور کہتا ہے کہ اس خون کے ہر قطرے سے وطن پرست جماعت پیدا ہوگی۔ یہ خون ضائع نہ جائے گا۔ اور عنقریب وہ وقت آئے گا جب ملک اس خون پر خود قربان ہوگا۔"

("سیاہ داغ" "مشمولہ" "شہید مغرب" "از راشد الخیری سے اقتباس)

راشدی الخیری نے عالمی سیاسی منظر نامے کو دیکھتے ہوئے اپنے تین افسانوں "شہید مغرب" "" طرابلس سے ایک صدا " اور " دولہن دونوں کی " میں طرابلس پر اطالوی حملے کے خلاف آواز احتجاج بلند کی ہے جبکہ خالصتاً ہندوستان کے سیاسی اور سماجی منظر نامے کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ راشد الخیری ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں تھے اور انگریز کے خلاف انہیں متحد و منظم دیکھنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ "کلونیتاں" ہندو مسلم کشیدگی اور فرقہ واریت پر آزردگی کا کھلا اور برملا اظہار ہے۔

اردو افسانے میں اصلاح پسندی اور قوم پرستی کے حوالے سے دوسرا بڑا نام سلطان حیدر جوش کا ہے جوش کے ہاں البتہ بابو شو پرشاد کے زیر اثر ہندوانہ تبلیغی جذبے اور قوم پرستی کا رد عمل بہت واضح دکھائی دیتا ہے، جسے راجپال کی " رنگیلا رسول " ، دیانند سرسوتی کی "ستیارتھ پرکاش" اور چترسین شاستری کی "اسلام کادش ورکش" جیسی کتابوں کی اشاعت نے اور بھڑکایا۔

جوش کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ بدایوں اور اس کا مضافاتی علاقہ ہے، جس میں مسلم سوسائٹی کے عیوب کی تلاش کی گئی ہے اور اس کی اصلاح مقصود ہے۔ اس اصلاح پسندی کی شدت نے طنز کی صورت سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں اختیار کی اور یوں سلطان حیدر جوش نے اپنے مخصوص لینڈ اسکیپ اور طنزیہ لہجے کے سبب اپنا ایک مخصوص رنگ پیدا کر لیا۔

جوش نے معاشرتی سطح پر مغرب کی تقلید پر بے باک تنقید کی، جس کے اثرات رد عمل کے طور پر "انگارے" (مرتبہ: احمد علی) "شعلے" (از احمد علی) اور "عورت" (از رشید جہاں) تک بہت نمایاں ہیں۔

درحقیقت جوش کے ہاں یہ سب ہندوانہ تبلیغی جذبے کا انتہائی اظہار اور رد عمل تھا جو بعض مقامات پر ان کے افسانوں کو ناصحانہ تقریر بنا گیا۔ اسلوبیاتی سطح پر بھی راشد الخیری اور جوش دو مختلف انتہاؤں پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

راشد الخیری کی تحریر میں روانی اور سلاست ہے اور دہلی کی بیگماتی زبان لکھنے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ضرب الامثال کا ان کے پاس نہ

ختم ہونے والا ایک خزانہ ہے جو دردناک مناظر کی تصویر کشی میں کام آیا جبکہ جوش نے روزمرہ کا چٹخارہ پیدا کر کے اور طنز میں ظرافت کا پیوند لگا کر اپنا الگ اسلوب وضع کیا۔ لیکن جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، سلطان حیدر جوش کا تبلیغی جذبہ ان کے افسانوں کی تخلیقی فضا بندی کے لیے مضر ثابت ہوا۔ جوش خود اپنے فن افسانہ نگاری سے متعلق لکھتے ہیں:

۱۔ "میں اس پردہ کا حامی ہوں، جس کا حکم مذہب سے دیا گیا ہے۔ چار دیواری کی قید کو میں پردہ نہیں کہہ سکتا بلکہ ناجائز ظلم سمجھتا ہوں۔ البتہ شرعی پردہ کا حامی ہوں۔"

۲۔ "میرا مقصد "مساوات" (۴) سے صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہم آج کل اپنی قومیت، اپنے مذہب اور اپنی خوبیوں کو بھی مغربی تمدن میں فنا کرنا چاہتے ہیں اور ایسا کرنے سے ایک بڑی غلطی کر رہے ہیں۔"

("انکشافات حقیقت" مشمولہ "فسانہ جوش" صفحہ ۱۵، صفحہ ۲۷)

اسی تسلسل میں سلطان حیدر جوش نے راشد الخیری اور پریم چند کی طرح حب الوطنی اور انگریز دشمنی کو بھی بطور خاص اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور اس حوالے سے ان کے دو افسانے "خواب و خیال" اور "لیڈر" خصوصی توجہ کے طالب ہیں (۵) ان دونوں افسانوں میں جلیانوالہ باغ کے سانحے (۱۹۱۹ء) کو موضوع بنایا گیا ہے۔

۱۔ "آپ میں اور کسی دوسرے انسان میں میرے نقطہ نگاہ سے زیادہ فرق ہو سکتا ہے تو ایسا ہی جیسا اڈوائر میں اور ڈائر میں۔"

۲۔ "پہلے وہ کالے کتے کو نجس اور ذلیل جانتا تھا اب کالے آدمی کو اس سے بھی زیادہ ذلیل مانتا ہے۔"

(خواب و خیال" سے اقتباس)

۳۔ "ہندوستان کے ہیجان قومیت نے مادۂ فاسد کی طرح مختلف اجسام میں عمل گوناگوں کا اظہار اس درجہ کیا ہے کہ مسٹر مانٹیگو سے لے کر سر مائکل اڈوائر تک ہر سرخ و سفید ہستی "قلم بہ دنداں" یا "شمشیر بکف" نظر آتی ہے۔

("لیڈر" سے اقتباس)

قوم پرستی اور اصلاح پسندی کی روایت میں ہندوانہ نقطہ نظر کے حامل ابتدائی نام پریم چند اور مہاشہ سدرشن کے ہیں۔

دھنپت رائے اپنام پریم چند، جن کی اولین تحریر ایک مزاحیہ ڈراما تھی (۶)، ٹیگور اور سرشار کو پڑھتے پڑھتے، (۷) اپنے افسانوں میں یکلخت قوم پرستی، حب الوطنی اور اصلاح پسندی کی طرف نہیں آئے بلکہ ہندوانہ احساس تفاخر کو اجاگر کرنے اور مغلیہ دور حکومت کے نفسیاتی اثرات زائل کرنے کے سلسلے میں ان کی پہلی طبع زاد تحریر "پرتاپ چندر" ایک مضمون ہے جو ۱۹۰۱ء میں لکھا گیا لیکن شائع نہیں ہوا۔ (۸) رانا پرتاپ سے متعلق یہ مضمون "زمانہ" کانپور بابت نومبر ۱۹۰۶ء میں سامنے آیا۔ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۹ء کا زمانہ پریم چند نے کانپور میں گزارا تھا اور بال گنگا دھر تلک کی تحریک آزادی کی مہم میں شامل رہے۔ پریم چند پر یہ اثرات تلک کے۔ گوکھلے کے ہیں جس کا نتیجہ نومبر دسمبر ۱۹۰۵ء کے رسالہ "زمانہ" میں گوکھلے پر ایک مضمون کی صورت میں بھی ظاہر ہوا۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں "راجا مان سنگھ" پر رسالہ "زمانہ" کانپور میں ایک مضمون کے بعد مئی ۱۹۰۸ء میں "سوامی دویکانند" (مضمون) "زمانہ" کانپور میں شائع ہوا اور "رنجیت سنگھ" ۱۱ مئی ۱۹۱۱ء میں۔ مضامین کے ساتھ ساتھ پریم چند نے اپنے انہی خیالات کا اظہار طبع زاد افسانوں میں بھی کیا، اس ضمن میں "گنگا کا اگن کنڈ" (مارچ ۱۹۱۰) "رانی سارندھا" (ستمبر ۱۹۱۰ء) "وکرما دتیہ کا تیغہ" (جنوری ۱۹۱۱ء) "راجہ ہردول" (اپریل ۱۹۱۱ء) اور "آلھا" (جنوری ۱۹۱۲ء) خاص طور پر بہت نمایاں ہیں۔

پریم چند نے ان افسانوں کی ابتداء نواب رائے کے قلمی نام سے کی تھی (۹) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پریم چند جہاں اپنے قلمی نام کی

آز میں پرجوش مسلم مبلغ افسانہ نگار سلطان حیدر جوش کی تحریروں کا توڑ کرنا چاہتے تھے وہیں حب الوطنی کے حوالے سے سرکاری ملازم رہتے ہوئے انگریز راج کی مخالفت بھی کر رہے تھے۔ یہاں محض اس دور کے پریم چند کے چند نمایاں افسانوں کے اقتباسات دیکھتے چلئے:۔

۱۔ "چوہان راجہ، آداب جنگ کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ اسکی ہمت عالی اسے کمزور، بے خبر اور نامستعد دشمن پروار کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اس معاملے میں اگر وہ حسن آئین کا ایسی سختی سے پابند نہ ہوتا تو شہاب الدین کے ہاتھوں اسے روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔"

۲۔ "رنجیت سنگھ، سخاوت و شجاعت اور رحم و انصاف میں اپنے وقت کے وکرمارت تھے اس مغرور کابل کا غرور، جس نے صدیوں تک ہندوستان کو سر نہیں اٹھانے دیا تھا، خاک میں ملا کر لاہور جاتے تھے۔"

(پریم پچیسی" صفحہ ۲۱۷ تا ۲۱۸ و صفحہ ۳۱ سے اقتباسات)

ان دو ٹکڑوں کو دیکھیں تو واضح طور پر پہلا ٹکڑا قوم پرست ہندو ذہن کا عکاس ہے لیکن دوسرے ٹکڑے میں دھرتی کے حوالے سے پریم چند وہی بات کر رہے ہیں جو آج کے مسلم پنجاب کے پنجابی اور مسلم سندھ کے سندھی کی آواز ہے اور تو اور ہمارے ہاں راجہ پورس کے مقابلے میں سکندر یونانی زیادہ محترم ہے اور ہمارا بے شعور طبقہ سکندر اعظم کے ہاتھوں پورس کی شکست پر بغلیں بجاتا چلا آیا ہے۔ اس حوالے سے دیکھیں تو پریم چند کی ان ابتدائی تحریروں پر اعتراضات بے جان اور بے معنی دکھائی دیتے ہیں۔

اس ضمن میں ابو الفضل صدیقی کی معرفت پریم چند سے متعلق سلطان حیدر جوش کا ایک بیان ملاحظہ ہو:

"منشی جی نے مسلمان دشمنی کی ترنگ میں ایک تاریخی کہانی نام کی اللہ جانے کون سی دو ورقی تاریخی کتاب سے نکال کر "رانی سارندھا" اپنے نام سے دے پٹی 'بھلا اورنگ زیب شہنشاہ نہ ہوا رنجیت سنگھ ہوا' جس نے ایک گھوڑے کی خاطر ایک ملک پر چڑھائی کر دی تھی 'ادھر اورنگزیب سے بھی تین چار صدی قبل الٹی لنگور کی قلابازی جو کھائی تو قلم کی لاٹھی پکڑے محمد بن قاسم پر جا پڑے 'اور اپنے زور لٹھ سے راجہ داہر کی دونوں بیٹیوں کی آبرو ریزی کرا دی 'اور ان دونوں میں ہی فخر تاریخ ہندوستان ہستیوں کے اسمائے گرامی کے ساتھ ہندوستان کے مسلمان حضرت اور علیہ الرحمتہ کے سابقے لاحقے لگا کر ذکر کرتے ہیں اور یہ دونوں مسلمان اتہام کہانیاں منشی پریم کی پریم پچیسی کے زرین شاہکار ہیں 'اور میاں خوبصورت پیرایہ کی جو آپ نے بات کہی تو دیانند سرسوتی کی ستیارتھ پرکاش اور لاحول ولاقوۃ 'ننگ کتاب مجلد گالی چیتھڑا خاکم بدہن راجپال کی رنگیلا رسول بھی تو اردو میں ہیں۔ یہ اپنی اپنی توفیق کا فرق تھا ورنہ منشی جی ہوں یا دیانند سرسوتی یا راجپال ناتھو رام کون کون سب کا ماخذ اور اندر والا ایک تھا 'اور اردو تو ذریعہ اظہار تھا اور زیادہ سے زیادہ ان لوگوں نے مسلمانوں کی دل آزاری اور مطعونیت کے لئے ڈھٹائی کے ساتھ اختیار کیا' رعایت بھی کسی مسخرے نے نہ کی۔ منشی جی کی بالکل ابتدائی دور کی کہانیاں مولانا شرر کے کٹ کتوں پر ہیں مگر مولانا کے ہیرو ایشیاء کے مسلمان ہیں اور ولن یورپ کے عیسائی 'حتیٰ کہ اپنے ملک پر مسلط انگریزوں کو بھی نہیں بخشتے۔ جو مولانا کے زمانے میں جان جوکھم کا کام تھا۔ جب کہ منشی جی کے ہیرو ہندوستان کے ہندو راجپوت اور ولن مسلمان ملتے ہیں 'اور لطف یہ کہ گاندھی جی کی ٹھیک ٹھیک پالیسی کے مطابق گورے آقاؤں کے ذکر سے نہایت بھونڈے پن کے ساتھ پہلوتہی کرتے نظر آتے ہیں 'ویسے کانگریس کے جلوس بڑے زور شور سے نکلواتے ہیں اپنے جھول کے جھول افسانوں میں پہلے تو عنایت خاص یہی ہے کہ بیس کروڑ ہندوستانی مسلمان' مردم شماری میں مسلمانوں کے کردار ہی خال خال پیش کئے ہیں 'اور جو مسلمان منشی کے قلم کو ڈھونڈ ملا وہ چور' قاتل 'ڈاکو ورنہ احمق گھامڑ' جھڑوس ایمچی 'الو کا پٹھا 'اور تو اور کردار مسخ کرنے کا بھونڈا سلیقہ ملاحظہ کیجئے۔ تحقیق ہو چکی کہ معرکہ یا پلٹا انگریز غدر ۱۸۵۷ء میں شروع ہو کر ۱۸۵۹ء میں زوال اودھ پر ختم ہوا۔ جب انگریز نے پنجاب سے لے کر بنگال تک کی فوجیں جمع کر کے اودھ پر چڑھائی کی اور زوال لکھنؤ کے وقت تاریخ شاہد ہے کہ انگریز فوجیں لکھنؤ کی گلی گلی اور دروازہ دروازہ پر سے وطن پرستوں کی لاشوں پر سے گزر کر بڑھ سکیں 'اور منشی جی کا توسن قلم دو مسلمان سرداروں کو اس وقت مضافات میں افیم کھا کر کسی پرانے کھنڈر کے اندر شطرنج کے نوالے پیش کر رہا تھا اور نہایت شستہ اردو میں۔ اور میاں ہندوستان کی نہیں شاید منشی جی بچارے نے کبھی ساحل پر دور سے پانی

کا جواز کمزرا بھی نہ دیکھا تھا۔ مگر نام کی مسلمان دشمنی میں بہتے سات سمندر پار جا پڑے اور سات صدیوں پیچھے الٹی قلابازی کھاتے اموی دور کے اسپین میں جاگرے اور ہسپانوی عیسائی رعایا پر مسلمان فاتحین کے وہ وہ مہیب امن سوز مظالم پیش کئے کہ قاری کا کلیجہ ہلا ہلا دیا' اپنا قلم اور تاریخ کی کمر توڑ کر رکھ دی' اور مسلمان قوم کی صورت مسخ کر دی' اور پھر پوری قوم کو بھرپیٹ مطعون کر کے کسی ایک فرد مسلمان کے منہ سے اپنے بیٹے کے قاتل کو ایک جملہ میں معاف کرا کر افسانہ نگاری کے تاثر کا گویا حق ادا کر دیا۔ جس کے جواز کا تکنیک اور متن پورے افسانہ میں کہیں سراغ نہیں' صرف "عفو" افسانہ کے عنوان سے یہ کردار متعلق ہے۔ اب بتاؤ یہ ہجو نگاری ہوئی یا افسانہ نگاری۔ مگر اپنی قوم کی مت پر پتھر پڑے ہیں کہ گالیاں کھا کر بھی بدمزہ نہ ہوئی۔ اور منشی جی کا شستہ نگاری کے حسین جال میں ایسی پھنسی پڑی ہے کہ خود منشی جی تو اسے توڑ بھاگے مگر مدعی ست گواہ چست' تمام تر لسانی' سماجی' ادبی' سیاسی روگردانیوں کے باوجود منشی جی کو معاف کئے پڑی ہے۔ جب کہ بابائے اردو اور اختر حسین رائے پوری انتھک کوششوں کے باوجود ناامید ہو کر بیٹھ رہے' اور اس قطعی نتیجہ پر پہنچے کہ کانگریس کے ساتھ زبان کے مسئلہ پر کوئی سبیل مصالحت کی نہیں۔۔۔ ہوں! اور تو اور منشی جی مسلمان قوم کو بالکل ہی چوپٹ سمجھتے ہیں' گاندھی جی کے فرسودہ سیاسی اسٹنٹ "ہندو مسلم اتحاد" کی تائید میں سانحہ کربلا پر قدم اٹھا ڈالا یہ سمجھ کر کہ اس مسئلہ پر مسلمانوں کے تمام فرقے' جذباتی اور رقیق القلب ہیں۔ پتہ نہیں کہاں سے' زمین کی زمین آسمان پر تو اس کہیں پتہ نہیں قلابے ملا دیئے۔ معرکہ کربلا میں سات ہندو راجپوت برادران راجہ ساہس رائے نازل کر دیئے' گھوڑوں پر سوار' ہتھیار سجائے' "امام عالی مقام" کے حضور نذرانہ جاں لئے حاضر ہوتے ہیں اور "اشقیاء" سے مبارزت طلبی کی سب سے پہلے اجازت چاہتے ہیں' اور پھر ایک ایک کر کے "یزید لعین" کی فوج پر' منشی جی جوان راجپوت ساونتوں کو حملہ آور دکھاتے ہیں تو تیغ ہندی اور تہور راجپوتی کے جوہر پیش کر کے اپنے ڈرامہ کا اسٹیج سجاتے ہیں کہ جھوٹ کے پل اور کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں۔ بالآخر ایک ایک کر کے ساتوں شمع امامت پر پروانہ وار نثار ہو جاتے ہیں۔ خیر یہیں تک بس نہیں فرمایا کہ تاریخ پر بہتان باندھ کر رہ جاتے' حضرت امام حسین کی ذات پاک کو بھی شریک ایکٹنگ کیا' اور ان کی زبان مبارک سے مکالمہ نگاری کی ترنگ میں ان ساتوں کو کربلا کے شہید اولین کہلوایا اور جب ان کی تجہیز و تکفین کا سوال پیدا ہوا تو خاکم بدہن' "امام عالی مقام" نے فرمایا "نہیں نہیں یہ ہنود ہیں انہیں دفن نہیں کیا جائے گا انہیں سپرد آتش کیا جائے گا۔" اور ان کی چتائیں طیار کرائی گئیں اور آگ بدہن منشی جی' خاکم بدہن ان چتاؤں میں "امام عالی مقام" نے بذات خود اپنے ہاتھ سے فلیتہ لگایا۔ "معاذ اللہ۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ"(۱۰)

یہ بلاشبہ ایک انتہا پسندانہ بیان ہے اور سلطان حیدر جوش کے نکتے نظر سے بیشتر مقامات پر اختلاف ممکن ہے لیکن اس بیان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس بحرانی دور میں ہمارے اولین افسانہ نگاروں کے پیش نظر ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات و واقعات تھے اور وہ محض افسانہ نہیں لکھ رہے تھے بلکہ اپنے اپنے طبقے کی نمائندگی بھی کر رہے تھے اور اگر ادب کی سطح پر یہ صورت حالات تھی تو سماجی سطح پر کیا کچھ نہیں ہوا ہو گا جو بعد میں دو قومی نظریہ کی بنیاد بنا۔

پریم چند کے ابتدائی افسانوں کے متعلق سلطان حیدر جوش کا نقطۂ نظر تو آپ نے ملاحظہ کیا۔ لیکن اب دیکھنا تو یہ ہے کہ پریم چند کو کوئی چھوٹ بھی مل سکتی ہے یا نہیں۔

۱۔ پریم چند کا افسانہ "نیائے" پیغمبر اسلام اور صحابہ کرام کے مثالی کردار کو پیش کرتا ہے۔

۲۔ پریم چند کا افسانہ "شما" مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات (خصوصاً فتح اسپین) کے حوالے سے مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاقی اوصاف اجاگر کرتا ہے۔

۳۔ پریم چند کا ڈراما "کربلا" (۱۱) (پانچ ایکٹ کا ڈراما) حضرت امام حسین کے حضور کھلا اظہار عقیدت ہے' جس میں راہس راؤ کی سربراہی میں ایک ہندو جماعت نے امام حسین اور ان کے بہتر ساتھیوں کے ساتھ مل کر یزیدی لشکر کا مقابلہ کیا اور ظلم و استبداد کے مقابلے میں ہندو مسلم اتحاد کی اولین مثال پیش کرتے ہوئے کربلا کی خاک کا پیوند بن گئی۔

جہاں تک "پوس کی رات" "شطرنج کی بازی" اور "وجر" کا تعلق ہے تو "پوس کی رات" اور "وجر" سو فیصد ایسے افسانے ہیں جن میں پست ہمت مسلمان شہزادگان ہیں نہ کہ جملہ مسلمان۔ البتہ "شطرنج کی بازی" میں معاملہ نصف حد تک سلطان حیدر جوش کے کہے کے مطابق دکھائی دیتا ہے' لیکن کیا اس افسانے میں بھی ہندوستانی غیرت کو نہیں للکارا گیا؟

اب جہاں تک "حج اکبر" "عید گاہ" "بنسا پر موہرم" "مندر مسجد" "فاتحہ" اور "ادیب کی عزت" جیسے افسانوں کا تعلق ہے تو سیکولر ذہن کے لوگ کہیں گے کہ یہ ہندوستانی مسلمان کی روزمرہ زندگی کی عکاسی ہے جبکہ سلطان حیدر جوش کے ہمنوا انہیں کھلی اسلام دشمنی شمار کریں گے۔ فیصلہ قارئین کے ہاتھ ہے لیکن یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کے نقطۂ نظر کو دیگر حوالوں کے ساتھ بھی پرکھا جائے۔

پریم چند اپنے ایک ہندی مضمون میں لکھتے ہیں:

"فرقہ واریت ہمیشہ تہذیب کی دہائی دیا کرتی ہے۔ اسے اپنے اصلی روپ میں نکلتے شاید شرم آتی ہے۔ اس لئے وہ (اس) گدھے کی طرح ہے جو شیر کی کھال اوڑھ کر جنگل کے جانوروں پر رعب جماتا پھرتا ہے۔ فرقہ واریت تہذیب کا خول پہن کر آتی ہے۔ ہندو اپنی تہذیب کو قیامت تک محفوظ رکھنا چاہتا ہے' مسلمان اپنی تہذیب کو۔ دونوں ہی ابھی تک اپنی اپنی تہذیب کو اچھوتی سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھول گئے ہیں کہ اب نہ کہیں مسلم تہذیب ہے نہ ہندو تہذیب' نہ ہی کوئی دوسری تہذیب۔ اب دنیا میں صرف ایک تہذیب ہے اور وہ ہے اقتصادی تہذیب۔"

(بحوالہ پریم چند: "قلم کا سپاہی" صفحہ ۵۳۸)

۱۹۲۳ء میں جب آریہ سماج والوں نے شدھی تحریک کا آغاز کیا تو پریم چند نے دیا نرائن نگم (مدیر "زمانہ" کانپور) کو لکھا:
"شدھی" پر ایک مختصر سا مضمون لکھ رہا ہوں مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے"

("پریم چند شخصیت اور کارنامے" صفحہ ۱۷۳)

فروری ۱۹۲۴ء کے "زمانہ" کانپور میں یہ مضمون ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں شدھی تحریک کی مخالفت کے ساتھ نیشنل کانگریس کی پالیسی پر بھی برہمی کا اظہار کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کانگریس نے بھی اجتماعی طور پر اس تحریک سے الگ تھلگ رہنے کے باوجود انفرادی طور پر اس میں شامل ہونے میں کچھ بھی اٹھا نہیں رکھا۔ اتنا ہی نہیں' ایک بھی ذمہ دار کانگریسی نیتا نے اعلان کر کے ان تحریکوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ نہیں کیا"

("قحط الرجال" از پریم چند مطبوعہ: "زمانہ" کانپور فروری ۱۹۲۴ء)

۱۹۳۳ء میں چترسین شاستری کی کتاب "اسلام کا زہریلا درخت" (ہندی نام "اسلام کا وش ورکش") شائع ہوئی تو پریم چند نے ہندی ادیب بنارسی داس چترویدی کو لکھا:

"فرقہ پرستی پھیلانے کی یہ نہایت شرانگیز اور سستی کوشش ہے جس کا پول کھولنا ضروری ہے۔ میں خود یہ سوچ رہا تھا کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس کے بارے میں لکھوں گا اور اب جب کہ آپ نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا' میں دل و جان سے آپ کے ساتھ ہوں۔ ہم اقلیت میں ضرور ہیں لیکن ہمیں اس کی پروا نہ کرنی چاہئے۔ ہمارا مقصد مقدس ہے۔ میں آپ کا نوٹ "جاگرن" میں شائع کر رہا ہوں۔"

("پریم چند کے خطوط" صفحہ ۲۶۵)

چترویدی صاحب کا یہ اختلافی نوٹ پریم چند نے اپنے پرچے " جاگرن " میں شائع کیا اور اس ضمن میں " جاگرن " اور " ہنس " مرتبہ : پریم چند کے متعدد پرچے اس چیز کا کھلا ثبوت ہیں کہ پریم چند نے اس شرانگیزی کی مکمل کر مخالفت کی ۔ اسی طرح بینشدر کمار جین کو لکھتے ہیں:

" ان چترسین کو کیا ہو گیا ہے کہ " اسلام کا وش ورکش " لکھ ڈالا ۔ اس کی تنقید تم لکھو اور وہ کتاب میرے پاس بھیجو...... اس کیو عل پروپیگنڈے کا زوروں سے مقابلہ کرنا ہو گا۔"

(" پریم چند کے خطوط " سے اقتباس)

حب الوطنی کے حوالے سے دیکھیں تو پریم چند کا پہلا طبع زاد افسانہ " عشق دنیا اور حب وطن " (۱۲) اس سلسلے کا نقش اول ہے اور انگریز راج کے خلاف اس کی تیزی اور تپش کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس مجموعے (۱۳) میں یہ افسانہ شامل کیا گیا اسے اشتعال انگیز قرار دے کر کتاب کی بکی ہوئی تین سو کاپیاں چھوڑ کر بقیہ سات سو کاپیاں ضبط کر کے جلا دی گئیں۔ اردو ادب میں وطن پرستی کے حوالے سے یہ اولین بھرپور آواز تھی پریم چند نے " سوز وطن " کے دیباچہ میں لکھا تھا:

" ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کا نقشہ جمائیں۔"

کتاب کی ضبطی کے موقع پر اتر پردیش کے جنوبی علاقے میر پور کے ڈپٹی کلکٹر نے پریم چند سے کہا تھا۔ "تمہاری کہانیوں میں سیڈیشن بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو کر انگریزی عملداری ہے مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یک طرفہ ہیں۔ تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے۔"(۱۴)

درحقیقت اس دور کا پریم چند ہندوستان کی آزادی کا نقیب تھا اور اس کے ان افسانوں میں انقلاب کے قدموں کی چاپ اور دم توڑتے ہوئے مجاہدین کی للکار صاف سنائی دیتی ہے:

" افسوس ہے کہ تو یہاں ایسے وقت آیا جب ہم تیری مہماں نوازی کرنے کے قابل نہیں ۔ ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اس وقت ہم بے وطن ہیں ۔ مگر (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیس کے لئے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے ۔ یہ آس پاس جو لاشیں تو دیکھ رہا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اترے ہیں (مسکرا کر) اور گو کہ میں بے وطن ہوں مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقے میں مر رہا ہوں (سینے کے زخم سے چھترا نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا ۔ خون نکلنے دے اسے روکنے سے کیا فائدہ ؟ میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لئے زندہ رہوں ، نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا ۔ اس سے بہتر موت ممکن نہیں۔"

(دنیا کا سب سے انمول رتن)

افسانے کا اختتام یوں ہوتا ہے : " وہ آخری قطرہ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے ۔ " افسانے کا مرکزی کردار دل فگار محبت میں امتحان سے گزرتا ہے اور محبوب (دلفریب) کے حضور یہی بیش قیمت شے اسے نذر گزارتا ہے۔

پریم چند کے افسانوں میں سیاسی دور تک آتے آتے تحریک عدم تعاون ، خلافت کی تحریک ،کسان مزدور تحریک ، ستیہ گرہ اور سول نافرمانی کی تحریکیں اپنے عروج تک پہنچتی ہیں اور افسانے میں بقول آل احمد سرور ، پریم چند جھنڈا یا نشان بن گیا ۔ اس نے ہماری خلوتوں اور پناہ گاہوں میں گھس کر ہمارے دلوں پر کچوکے لگائے ۔ اس نے انگریز اور سرمایہ دار ، جاگیردار سے دو طرفی جنگ لڑی ۔ (مثال: سر یاترا) یہ افسانے ہندوستان کے فکری تحریکوں کے نقیب ہیں جب کہ پریم چند کے کرداروں کی مثالیت ہمیشہ باعث نزع رہی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ افسانہ "کپتان" میں جگت سنگھ مثالی باپ کی تمام خصوصیات پریم چند کے والد کی جیتی جاگتی خصوصیات ہیں اور " مستعار گھڑی " کی بیگم پریم چند کی پہلی بیوی کا

عکس ہے۔ اس ضمن میں پریم چند کے ایک برطانوی ناقد گورڈن سی۔ روڈار مل Gordon C. Rodarmel لکھتے ہیں(۱۵)

" Critics have charged that Premchand did not understand the middle

upperclasses as he did the peasants' and this may be true but such a

judgment must be weighd in terms of his literary intentions "

پریم چند کے کرداروں کا زندگی کی خوشیاں چھوڑ کر دنیا کو تیاگ دینے کا رویہ 'چونکا دینے کی حد تک ان کی جنسی کمزوری اور پھیکے رومان کی نسبت زندگی کا گہرا مشاہدہ زیادہ قابل توجہ ہے اور اگر یہ بھی کہا جائے کہ اس نے محض کسان کو اس کی تمام سچائیوں کے ساتھ موضوع بنایا تو یہ کیا کم ہے ؟ ایملی برونٹے 'مسز گاسکل اور جین آسٹن نے زندگی کے محض ایک ایک گوشے کی ہی تو تصویر کاری کی ہے۔ پریم چند کے نمائندہ افسانوں میں " بڑے گھر کی بیٹی " " " دو بیل " " گلی ڈنڈا " اور " کفن " بہت نمایاں ہیں اور اسی نوع کے افسانوں کے حوالے سے پریم چند کے ایک اور برطانوی ناقد ڈیوڈ روبن (David Rubin :) لکھتے ہیں۔(۱۶)

" Iflumced by Dickens Tolstoy and impressed by Marx Premchand very early directed

his fiction toword social reform "

ڈکنز 'یوگو 'لیو ٹالسٹائی اور رومین رولاں سے متاثر ہونے کا اقرار تو خود پریم چند نے بھی کیا ہے لیکن اپنے ہاں ہندوستان میں ایک آواز ابتداء میں بہت متاثر کن رہی ہے اور وہ ہے مہاتما گاندھی کی آواز..... بقول اسٹیفن زویگ 'گاندھی ہندوستان میں ٹالسٹائی کے خیالات کو کروڑوں انسانوں کی عملی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن یہ ساتھ بہت تھوڑی مدت تک رہا۔ گاندھی جی کی عدم تشدد کی پالیسی پریم چند کے لئے سوہان روح بن گئی اور بنگال کے بٹوارے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ تب پریم چند نے افسانہ " پریم آشرم " لکھا 'جس کا ہیرو بلراج' روس کے کسانوں کی طرح انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ ان کے افسانے " قاتل کی ماں " کو پریم چند کے تشدد کی طرف جھکاؤ کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد پریم چند صرف افسانہ نگاری نہیں ایک تحریک بن چکا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

" ادیبوں اور دانش مندوں کو عوام کے دکھ درد میں ہاتھ بٹانا ہی ہو گا۔ اس کے بعد ہی وہ امن اور کامرانی کی تلاش کر سکتے ہیں " (۱۷)

پریم چند کا یہ حوالہ انتہائی محترم ہے اور جب جب تحریک آزادی کا مطالعہ کیا جائے گا تو سیاسی تحریکوں اور سیاسی راہنماؤں کی پالیسیوں کے ساتھ پریم چند کے افسانوں کا مطالعہ بھی ناگزیر ہو گا۔

قوم پرستی اور مقصدیت کی اس روایت میں ہندوانہ نقطۂ نظر سے اردو افسانے میں اصلاح پسندی کا آخری نمائندہ سدرشن ہے۔ سدرشن نے اس نوع کے افسانوں میں دیہی آبادی کا منظر نامہ چنا اور سیاسی اور سماجی حوالوں کے ساتھ ہندو طبقے کے عمومی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

بالخصوص افلاس کے زیر اثر جنم لینے والی سماجی برائیوں اور ناانصافیوں کو موضوع بناتے ہوئے سدرشن نے چھوت چھات 'چھوٹی عمر کی شادی 'ہندو بیواؤں کے مسائل اور دیہی علاقہ جات میں تہذیب ناشناسی پر ہمدردانہ نقطہ نظر کے ساتھ قلم اٹھایا۔ ہندو پنڈتوں کے خاندان سے متعلق ہونے کے سبب سدرشن کے افسانوں میں اس تہذیبی رچاؤ کی مہک پہلی بار دیکھنے کو ملی 'جس نے راجندر سنگھ بیدی کے ہاں اساطیر کی سیلائی لائین بہم پہنچنے کے سبب " متھن " اور " گرہن " جیسے افسانوں کو جنم دیا۔

فکری سطح پر مہاشہ سدرشن کی نمایاں پہچان 'مہاتما گاندھی کے افکار کا پرچار اور تکنیکی سطح پر مخصوص نوع کی اصلاح پسندی ہے 'جس کی مثال سدرشن سے پہلے محض چند برس پریم چند کے ہاں دکھائی دی تھی۔

سدرشن لہجہ کے اعتبار سے رومانی ہیں اور ان کا اظہار شاعرانہ۔ تشبیہات سے انسانی جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ افسانوی تدبیر

کاری کے اعتبار سے سدرشن نے اردو افسانے میں نفسیاتی تجزیہ کی بنیاد رکھی اور ذھکی چھپی نفسیاتی الجھنوں پر سے پردے اٹھائے۔ یہاں اہمیت کے قابل بات یہ ہے کہ سدرشن کے کردار طے شدہ نفسیات کے حامل نہیں ہیں ارد گرد کا تبدیل ہوتا ہوا ماحول ان کی شخصیت سازی کرتا ہے۔

سدرشن کے افسانوں کا خصوصی موضوع شہر کا ہندو سفید پوش طبقہ ہے اور اس کی زندگی کا تفصیلی مطالعہ۔ (مثال: "اپنی طرف دیکھ کر" "صدائے جگر خراش" اور "خانہ داری سبق") دیہات کی سیاسی بیداری دوسرا موضوع ہے جو سراسر پریم چند کے تتبع میں آیا۔

مہاشہ سدرشن کا زندگی کے بارے میں نکتہ نظر متصوفانہ ہے۔ ان کے کردار زندگی کا تلخ تجربہ کر کے لوبھ لالچ سے دور ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ حتی کہ قناعت پسندی کی انتہائی حدوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثالیں افسانوی مجموعوں "چندن" "بہارستان" "طائر خیال" اور "سدابہار پھول" میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔

سدرشن الیہ تاثر کا افسانہ لکھنے میں ایک منفرد اسکول کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے ننانوے فی صد افسانے اسی تاثر کے حامل ہیں محض ایک مثال پندرہ افسانوں کے مجموعے "چشم و چراغ" کی لیں، سات افسانوں کا اختتام مرکزی کرداروں کی موت پر ہوتا ہے، جبکہ "گھر کھونے" کا مرکزی کردار آخر میں غائب ہو جاتا ہے۔

مہاشہ سدرشن کے افسانے نثر اور شاعری کے باہمی میل کی ابتدائی مثالوں میں شمار ہوں گے، خصوصاً افسانہ "شاعر" کامیاب ترین کوشش ہے۔ البتہ ایک خامی جس کا شکار عام طور پر سدرشن کے افسانے ہوئے وہ افسانے کے اختتام سے پہلے منتہا کی آگہی ہو جانا ہے، اور اس سے ضرور تاثر میں کمی واقع ہوئی جبکہ سدرشن کے بہترین افسانوں میں "وزیر عدالت" "جانثار" اور "آزمائش" ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

۲۔ اردو افسانہ جہاں اپنے ابتدائی چند برسوں میں ہندوستان کی سیاسی اردو سماجی دھڑکنوں کو اپنے اندر سمو رہا تھا وہیں محمد علی ردولوی اور افسانے کا رشتہ ہماری داستانوں سے جوڑنے کا جتن کر رہے تھے۔ چوہدری محمد علی ردولوی کو ہماری افسانوی روایت کا اولین اسٹائیلسٹ افسانہ نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے بقول سجاد ظہیر:

"وہ اردو لکھتے ہیں تو اس میں وہ لوچ اور لطیف طنز اور تفنن ہوتا ہے، جس سے پرانے لکھنؤ کی مہک آتی ہے لیکن باتیں کرنے پر آتے ہیں تو جنسیات اور نفسیات کے ماہرین، فرائڈ اور ہیلاک ایلس دوسری طرف ان کی زد میں ہوتے ہیں۔ بزرگوں اور بڑوں کے درمیان ہوتے ہیں تو ان سے آخرت، جائیداد اور اولاد کا تذکرہ کریں گے اور نوجوانوں میں ہوں گے تو جنسیات کے مسائل پر ایسی محققانہ گفتگو کریں گے کہ بڑے بڑے رنگین مزاجوں کی آنکھیں کھل جائیں ۔۔۔ نوجوان ترقی پسندوں کو وہ شفقت اور ہمدردی سے دیکھتے ہیں۔"

("روشنائی" از سجاد ظہیر سے اقتباس)

بغور دیکھا جائے تو سجاد ظہیر نے جتنے موضوعات گنوائے، ان پر محمد علی ردولوی نے محض گفتگو ہی نہیں کی، انہیں اپنے افسانوں میں بھی سمیٹنے کا جتن کیا ہے۔ صوبہ جات متحدہ کی ہمہ گیر ثقافتی فضا بندی ان کے افسانوں کا وصف خاص ہے اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ ضلع بارہ بنکی (اودھ) کی قصباتی فضا اور اس کی نرم رو زندگی کی پیش کش خصوصی توجہ کی طالب ہے۔ جبکہ بے عیب جنسی افسانہ لکھنے والوں میں ان کا کوئی ہمسر نہیں بقول مولانا صلاح الدین احمد:

"محمد علی کی سب سے بڑی جیت یہ ہے کہ وہ زندگی کو بیک وقت خارجی اور داخلی دونوں زاویوں سے دیکھتا ہے اور مقابل کی یہ خصوصیات ایک واحد فن کار میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ وہ اپنے خارجی محسوسات کو اپنے افکار کا لباس ایسی خوبی سے پہنا دیتا ہے کہ بیشتر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ جامہ تنگ اسی صنم عربدہ خو کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ وہ خارجی دنیا کی معمولی سے معمولی سی بات کو اپنے احساسات میں سمو کر انہیں ایک نئی زندگی اور ایک نئے معانی عطا کر دیتا ہے اور جب یہ عمل مکمل ہو جاتا ہے تو ہم نہیں معلوم کر سکتے کہ ان میں محرک کون تھا اور تحریک کس نے پائی۔ مثلاً "وہ ایک جگہ گرمیوں کی صبح میں نسیم کی آہستہ روی اور اس کی روانی میں ایک بڑی بی کی مناجات خوانی کا ذکر کرتا ہے۔ جزئیات کا یہ

مطالعہ بجائے خود بعنایت درجہ حیرت خیز ہے۔ لیکن جب۔ وہ اس تاثر سے کردار زیر نظر کے ایک عمل کی نفسیاتی تعبیر کی طرف لپکتا ہے اور لپکتے ہی تاثر کو مکمل بھی کرلیتا ہے تو حیرت اپنی انگلی دانتوں تلے دبائے رہ جاتی ہے۔" (۱۸)

ایک طرف آزادی نسواں کی تحریک چل رہی تھی اور چوہدری محمد علی ردولوی نے کہا تھا:

"عورت بدصورت ہو ہی نہیں سکتی"

اس قول کے پیچھے رومانی اثرات بھی نمایاں ہیں لیکن دراصل اس کا باعث:

"راقم الحروف انانیت کا شکار' باوجود استغفار کے بھی انانیت کا شکار ہی رہتا ہے "میں" کے استعمال سے پریشان ہے مگر" میں "اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

(محمد علی ردولوی "میرا مذہب" مطبوعہ ۱۹۳۸ء)

محمد علی ردولوی کے دیگر معاصرین خصوصاً راشد الخیری' سلطان حیدر جوش' خواجہ حسن نظامی اور عباشہ سدرشن خارج سے داخل کی طرف بالعموم رجوع نہیں کرتے جبکہ محمد علی ردولوی نے اپنے افسانوں کی بنیاد محسوسات خارجی پر رکھی ہے لیکن انہوں نے جو کچھ ظاہری آنکھ سے دیکھا ہے اسے باطنی حوالوں کے ساتھ دکھانے کا جتن کیا ہے۔ ان کی اپنے موضوع کی طرف پیش قدمی خالصتاً داخلی اور نفسیاتی حوالوں سے ہوتی ہے اور یوں محمد علی ردولوی حقیقت پسندی اور خیال آفرینی نیز انسان کی داخلی آوازوں کا ایک ایسا بے رحمانہ امتزاج متشکل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو عالمی منظرنامے پر صرف اور صرف "گریٹ ماسٹرز" کا خاصہ رہا ہے۔ انہوں نے زبان و بیان کے معاملے میں مشقت کو اپنایا اور اس طریقہ کار میں کامیابی صرف اور صرف زبان کے خلاقانہ استعمال سے ہی ممکن ہے' بقول صلاح الدین احمد:

" اپنے طویل مشاہدے اور تجربے کی بنا پر وہ زندگی کی مختلف کیفیتوں سے جن نتائج کا استخراج کرتا ہے ان صورتوں اور ان نتائج کو وہ ایک نہایت لطیف و بلیغ پیرائے میں کہ سلاست و رنگینی سے بہ یک وقت متصف ہوتا ہے' ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے اور پھر اس بات سے قطعاً بے نیاز ہو جاتا ہے کہ ہم اس پیشکش سے کس طرح متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ایک خالص آرٹسٹ ہے اور اسے اپنی تخلیقات سے یہیں تک سروکار ہے کہ وہ اس کے نہاں خانہ محسوسات سے نکل کر لباس اظہار پہن لیں۔ رہا یہ کہ ہم ان کے جمال جہاں آرا سے کیا اثر قبول کرتے ہیں اس سے اسے کوئی غرض نہیں۔ اس کا یہ انداز نظر اپنے موضوع تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اس کے ذریعہ اظہار یعنی زبان اور الفاظ کی نسبت بھی ایک انفرادی بلکہ خود سرانہ رویہ روا رکھتا ہے۔ وہ اس بارے میں کسی سمجھوتے کا بھی قائل نہیں اور وہ ایک مخصوص ذہنی کیفیت کو عین وہی الفاظ دینے پر اصرار کرتا ہے جن میں وہ اس پر وارد ہوئی اور اگر آپ قبول عام یا رواج ادب یا خوف محتسب کے پیش نظر اسے کسی متبادل لفظ یا ترکیب کی طرف متوجہ کریں تو وہ اسے سو میں سے نوے صورتوں میں رد کر دے گا۔"(۱۹)

مثال ملاحظہ ہو:

"اندر والا: سنو بی بی نا جو تم اور صغیر پردے سے لگے گھڑیوں باتیں کیا کرتے ہو۔ اور جو کوئی کچھ کہہ دے؟

ناجو: مجال ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کرتے نہیں تو ڈر کس کا۔ بھلا مجھ سے آٹھ برس چھوٹا اور پھر وہ تو مجھ کو چچی کہتا ہے۔

اندر والا: یہ تو ٹھیک ہے مگر تم جب دیکھو اس کی بی بی کا ذکر کیوں کرتی ہو؟

ناجو: تو اس میں ہرج کیا ہے۔ اگر میرے خیال میں دوسرے ہوتے تو اس کی بی بی گوڑی کا ذکر کیوں آتا۔

اندر والا: تم ہنسنے زیادہ لگی ہو۔

ناجو: ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے؟

اندر والا: پہلے کیوں نہیں ہنستی تھیں۔ ہنسی تو پھنسی پرانی مثل۔

ناجو: ہوا کرے مثل! اپنے بڈھے پر سے ہزار جوان صدقے اتارے ہیں۔ خیر اب اس کا ذکر ہی کیا۔ جب جوانی میں اس طرح کے خیال نہیں آئے تو اب بڑھاپے میں اس کا ذکر کیا ہے۔

اندر والا: بوڑھی تو تم بالکل نہیں ہو۔ اس کو تم بھی سمجھتی ہو۔

ناجو: میرے تو ایک لڑکا ہوا بھی ہے۔ اس کی بیوی تو ویسی ہی پنپیا ہے۔

اندر والا: مگر وہ صورت میں تو تمہارے تلووں کے برابر نہیں ہے۔

ناجو: یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس سے ملاپ تھوڑی ہونے کو ہے۔

اندر والا: اور جو ہو جائے!

ناجو: ہو جائے تو ہماری جوتی سے، تڑے سے، پاپوش سے، مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

اندر والا: یہ دیکھو کھلا نا، یہی تو میں کہتا ہوں۔

ناجو: ہو گا بھئی ہم کیا کریں، نیند نہیں آتی تو یہی سوچنے لگتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی خیال آئے گا ضرور۔

اندر والا: اور اسی کو سوچتے سوچتے سو بھی تو جاتی ہو۔

ناجو: ہاں سو جاتے ہیں، تب نہیں تو اب سو جاتے ہیں۔ منصرم صاحب تو ہیں نہیں۔ ہمیں ڈر کس کا پڑا ہے کر ہی لیں تو ہمارا کوئی کیا کر لے گا۔

اندر والا: ہاں اب ٹھیک راستے پر آگئیں، یہی تو میں کہتا تھا کہ جو کچھ کرو ہم سے صلاح مشورہ لے کر کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ واقعی اگر صغیر کے ساتھ ہو جائے تو بیجا نہیں۔ گو اور سب باتوں کا آرام رہا مگر ہم سن کو جی ترس گیا۔"

پھر اس کے بعد کہانی جس موڑ سے گزرتی ہے ہمیں اس وقت اس سے غرض نہیں لیکن لگے ہاتھوں اس افراتفری کی بھی ایک جھلک دیکھتے چلیے جو صغیر کے بامراد ہونے کے بعد اس کے دل میں اسی اندر والے نے مچائی۔

صغیر احمد نے ناجو کی جھلک یونہی کبھی دیکھ لی ہو گی۔ اب بامراد دیکھا۔ وہ صورت شکل، وہ رعب، حسن، وہ تناسب اعضا، وہ مزاج کی شگفتگی اور یہ ٹھہرے بھوکے بنگالی، آنکھوں میں چربی چھائی ہوئی ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ ایسے میں سن کا فرق کس کو دکھائی دیتا ہے۔ البتہ دو چار برس کے بعد کچھ کچھ فرق معلوم ہونے لگا۔

صغیر: بڑی پیاری چیز تقدیر سے ہاتھ آئی ہے۔ ہاتھ پاؤں کے گوشت میں وہ سختی نہیں ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے اور کسی بات میں بڑھاپا نہیں ہے۔

اندر والا: بڑھاپا تو نہیں ہے مگر وہ پنڈے کا کساؤ کہاں ہے؟

صغیر: اجی محبت اصل چیز ہے پنڈا ونڈا کہاں رہتا ہے!

اندر والا: محبت الگ چیز ہے، جوانی الگ ہے۔ ان دونوں کو ملاتے کیوں ہو؟

صغیر: جوانی کے دن کی ہے، محبت تو ہمیشہ کی چیز ہے۔

اندر والا: ہے تو ہمیشہ کی۔ مگر جوانی میں بھی مقناطیس کا اثر ہے۔

صغیر: محبت کا لوہا مقناطیس کو نہیں مانتا۔

اندر والا: اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ محبت جیسے پلاؤ اور جوانی جیسے بیسنی روٹی۔ ہم مانتے ہیں کہ پلاؤ پلاؤ ہی ہے اور بیسنی بیسنی ہی ہے۔

مگر کیا روز روز پلاؤ کھا کر کبھی کبھی بیسنی کو جی نہیں چاہتا"

("دھوکہ" از محمد علی ردولوی سے اقتباس)

اس خصوص میں نفسیات کے حوالے سے "گناہ کا خوف" "، "آنکھوں کی زبان" اور "تیسری جنس" ان کے نمائندہ افسانے ہیں اور افسانہ "امیری کی بو" اودھ کی مٹتی ہوئی شرافت کا دردناک مرثیہ ہے۔

محمد علی ردولوی کے ہاں یہ آخری حوالہ مٹتی ہوئی تہذیبی قدر ہے جسے عین اسی زمانے میں خواجہ حسن نظامی نے کلی طور پر اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ خواجہ صاحب نے اپنے ہنگامہ خیز عہد کی سنگینی کو ایک الگ زاویے سے دیکھا اور مٹتی ہوئی مغل تہذیب کا نوحہ رقم کیا۔ یہ ایک طرح موجود سے ماضی کی طرف فرار کا رویہ تھا لیکن جو کام میر باقر علی داستان گو، سید ناصر نذیر فراق اور خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی سے محض مضامین اور خاکوں کی سطح تک ہو سکا، خواجہ حسن نظامی اسے اپنے افسانوں میں سمیٹ پائے۔

۱۹۱۰ء کے لگ بھگ خواجہ حسن نظامی نے پیش کش کی سطح پر اس مواد کو مختلف طریقہ ہائے کار میں برتا مثلاً "دہلوی تاجدار کے ایک کنبہ کا فسانہ" "شہزادی کی چتا" اور "بنت بہادر شاہ" آپ بیتی کے انداز میں لکھے جبکہ بیشتر افسانوں میں واقعات کا انتخاب اور پلاٹ کی تعمیر کا کام اپنے ہاتھ میں لے کر تخیل کی مدد سے ڈرامائی کیفیات پیدا کیں خصوصاً اس حوالے سے "بہرا شہزادہ"(۲۰) "بیچاری شہزادی کا خاکی چھپر کھٹ" "یتیم شہزادہ کی ٹھوکریں" اور "یتیم شہزادی کی عید" یادگار افسانے ہیں۔ ان کے چند افسانوں کی ابتداء کسی مغل شہزادی یا مغل شہزادے کی ابتدائی زندگی کے منظر نامے کے ساتھ ہوتی ہے اور اس کے بعد وقت کا پہیہ زمانہ حال کی طرف مڑ جاتا ہے اور یہ متضاد کیفیات المیہ تاثر کا باعث بنتی ہیں۔ "شہزادی کی مصیبت" "غدر کی زچہ" "غدر کی سیدانی" اور "غدر کی بنا غلط فہمید" سراسر مغلیہ تاریخ کے اوراق پارینہ ہیں اور ہمارے سامنے ان حقیقی کرداروں کی چلت پھرت خواجہ حسن نظامی کی معرفت ممکن ہوئی ہے البتہ اکثر افسانوں میں ایک ہی نوع کے کرداروں اور واقعات کے دوہرائے جانے سے دل اوبھ جاتا ہے۔

"جب انگریزی توپوں نے گرجوں اور سنگینوں نے حکیمانہ جوڑ توڑ کے تخت پر قبضہ کر لیا، اس وقت میں نے بھی اپنی بوڑھی والدہ، کمسن بہن اور حاملہ بیوی کو ساتھ لے کر اور اجڑے قافلہ کا سالار بن کر گھر سے کوچ کیا۔

ہم لوگ دو رتھوں میں سوار سیدھے غازی آباد کا رخ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولاں گاہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے شاہدرہ سے واپس ہو کر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر تمام رات آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔ چھتر پور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لوٹ لیا مگر اتنی مہربانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا۔ لق و دق جنگل میں عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کیسی۔"

("دہلوی تاجدار کے ایک کنبہ کا فسانہ" از خواجہ حسن نظامی سے اقتباس)

مندرجہ بالا اقتباس کو افسانہ "بنت بہادر شاہ" میں کلثوم زمانی بیگم کے لال قلعہ سے حیدر آباد (دکن) تک کے سفر کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو ایک ہی طرح کی صورت حالات دکھائی دیتی ہے۔ اس اعتبار سے خواجہ حسن نظامی کے وہ افسانے زیادہ پر اثر دکھائی دیتے ہیں جن کے پلاٹ کی تعمیر انہوں نے خود کی اور تخیل کی مدد سے ڈرامائی کیفیات اور المیہ تاثر پیدا کیا، اس اعتبار سے "بہرا شہزادہ" اور "بیچاری شہزادی کی خاکی چھپر کھٹ" بھرپور تاثر کے حامل افسانے ہیں۔

زبان کے اعتبار سے البتہ خواجہ صاحب کے تاریخی اور آپ بیتی کی طرز پر لکھے گئے افسانے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی نوع کے افسانوں میں خواجہ حسن نظامی کا لہجہ مغل زوال کے حوالے سے شکوہ الفاظ اور خاص نوع کی بردباری کا حامل ہے، جب کہ دیگر افسانوں میں دلی کا بولی ٹھولی کا گنگا جمنی روپ قابل توجہ ہے۔

۳۔ ایک طرف تو اردو افسانے میں حب الوطنی، اصلاح نسواں، قوم پرستی، سماجی اصلاح پسندی، داستانوی رومانیت، ماضی میں پناہ لینے کا

رویہ اور داستان طرازی کی یہ ملی جلی صورتیں ظاہر ہو رہی تھیں کہ ترکی تراجم کی معرفت سجاد حیدر یلدرم یورپی وضع کی رومانیت لے کر وارد ہوئے۔ اس سے قبل ہمارے ہاں کی رومانیت کا مشرقی انگ تھا' جسے رومانی رویہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن اب سجاد حیدر یلدرم نے مروج اردو افسانے سے محض اصلاح نسواں اور سماجی اصلاح پسندی کو موضوعی سطح پر چن کر رومانی ذات کے حوالے سے معاشرے میں انتشار اور انقلاب برپا کرنے کی ٹھانی۔

سجاد حیدر یلدرم کا اردو افسانے میں ورود مسعود ہمارے ادب میں اس اصطلاحی رجحان کی رخصت کا اعلامیہ تھا' جسے علی گڑھ تحریک اور خصوصا" نذیر احمد دہلوی کی معرفت تقویت نصیب ہوئی تھی۔

اب اردو افسانے پر کلام کی بلند آہنگی اور طنز کی نشتریت کی جگہ انسانی بطون کی آوازوں نے لے لی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پہلی بار سرسید احمد خان کی نثر کو خشک' بے جان اور بے مزہ کہا گیا۔

سجاد حیدر یلدرم نے ترکی زبان سے خلیل رشدی کا ایک افسانہ "نشہ کی پہلی ترنگ "(۲۱) ترجمہ کرنے کے بعد ٹھیک چھ برس تک اسی کے اثرات کے درپے نوٹ کیئے اور ۱۹۰۶ء میں "سجت نا جنس" اور "خارستان و گلستان" جیسے ترکی افسانوں کے ترجموں کے ساتھ ساتھ اسی رومانی روایت کے حامل طبع زاد افسانے ("غربت وطن "(۲۲) اور "دوست کا خط"(۲۳) بھی لکھ لیے۔

احمد حکمت مفتی اوغلو کے ترکی افسانے کا ترجمہ " خارستان و گلستان " "ایک ڈراؤنا خواب تھا' جہاں خارا کا سرپرست بڈھا جینے کا مفہوم بتاتے ہوئے کہتا ہے:

" پریم "

" پریم کیا ہے۔ "

" عورت "

یہ رومانیت تھی جسے کروسے نے کلاسیکیت کی نہیں ' حقیقت پسندی کی ضد کہا ' داخلیت اس کا وصف خاص ہے۔ یلدرم کے ہاں "عورت" کا ظہور جنسی کشش کا کھلا اعتراف تھا جو " خارستان و گلستان " اور " چڑیا چڑے کی کہانی " میں ملتا ہے۔ یہ نیا رجحان تھا اپنے زمانے کی اخلاقی اقدار اور اس کی جکڑ بندیوں کے خلاف ایک رومان پسند کی کھلی بغاوت' یلدرم کی آئیڈیل عورت ترکی کی باسی تھی' اس نے اسے درآمد کر لیا۔

یلدرم کے ہاں زبان کے ورتارے کے پیچھے عربی' فارسی ' ترکی اور انگریزی ادبیات کی بھرپور سپلائی لائین تھی۔ کچھ یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں لفظ کے برتاؤ نیز صوتی اثرات پر خصوصی توجہ اور محنت دکھائی دیتی ہے البتہ بعض مقامات پر ان کے ہاں طنزیہ لہجے کا سبب اصلاح نسواں اور سماجی اصلاح پسندی کی مقصدیت ہے۔ اس باب میں قرۃالعین حیدر لکھتی ہیں:

" یلدرم کی رومانیت خالص مغربی رومانیت تھی انہوں نے عورت کا ذکر اس انداز سے کیا کہ اب وہ چلمن کے پیچھے جھانکنے والی سرشار کی سپہر آرانہ تھی۔ یہ عورت کو اپنے ہمراہ اپنے برابر لانا چاہتے تھے ' جو ہندوستان میں ناممکن تھا' انہوں نے اپنے قصبوں کی لڑکیوں کو لکھنؤ اور دلی کی حویلیوں کی چاردیواریوں سے نکال کر بمبئی کی چوپاٹی پر کھلی ہوا میں سانس لیتا دیکھنے کی تمنا کی تھی۔ اس لیے انہوں نے ہندوستان سے باہر ترکی کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ اس وقت ایران اور مصر بہت ہی پسماندہ تھے۔ ترکی میں یورپ بین الاقوام کے قرب کی وجہ سے زندگی کی لہر زیادہ تیز ہو چکی تھی۔"(۲۴)

کچھ یہی سبب ہے کہ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

" عورت ان کے یہاں عیاشی اور گناہ کا مظہر نہیں ' لطافت اور زندگی کے صحت مند تصور کی علامت ہے۔"

(" اردو ادب میں رومانوی تحریک " سے اقتباس)

یلدرم کا نقطہ نظر اول و آخر رومانی ہے لیکن اس رو میں وہ سستی جذباتیت کا شکار کم ہی ہوئے ہیں۔ ان کے طبع زاد افسانوں پر معاشرتی اقدار اور اخلاقی قیود توڑنے کا الزام عائد نہیں ہو سکتا بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کیا کہ ترکی افسانوں کے آزاد تراجم میں بھی مقامات اور طبقات کا خصوصی اہتمام کیا مثلاً "سودائے سنگین" اور "ازدواج محبت" کی جزئی تفصیلات کلکتہ اور بمبئی سے متعلق ہیں۔ یلدرم نے ان مقامات کو اس لیے برتا کہ یو پی اور پنجاب میں قدامت پسندی زیادہ تھی اس طرح "سودائے سنگین" میں بمبئی کے پارسیوں کو پیش کیا جن کے ہاں اس قدامت پسند عہد میں بھی عشق اور محبت پر کچھ ایسی پابندیاں نہ تھیں۔ "چڑیا چڑے کی کہانی" لکھتے ہوئے اپنے رومانی نقطہ نظر کو واضح بھی کر گئے اور کہیں سے انگلی بھی نہ اٹھی' اور اگر یہی باتیں وہ صیغہ واحد متکلم میں کہتے تو قابل گرفت قرار پاتے۔

پطرس بخاری کا یہ قیاس درست نہیں کہ یلدرم نے ترجمے کو آڑ بنایا۔ آج وقت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یلدرم نے اپنی جتنی چیزوں کو ترجمہ یا ماخوذ بتایا وہ واقعتاً ترجمہ یا ماخوذ ہیں۔

یلدرم کے افسانے تین واضح رجحانات کے حامل دکھائی دیتے ہیں:

۱۔ مرد اور عورت کا رشتہ فطری ہے' اسے ناجائز تصور نہ کیا جائے۔

۲۔ اس فطری تعلق میں سچی محبت کا دخل ہونا چاہیئے۔

۳۔ سچی محبت کی راہ میں جو چیزیں حارج ہوں انہیں دور کرنے کا جتن کرنا چاہیئے۔

پہلے رجحان کی ایک واضح مثال ترجمہ "خارستان و گلستان" ہے۔ لکھتے ہیں:

"عورت میں حسن نہ ہوتا تو مرد میں جرات اور اعلیٰ حوصلگی نہ ہوتی۔ مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی تو عورت کی خوبصورتی اور دلبری رائیگاں جاتی۔"

دوسرے رجحان کا اظہار "حکایتہ لیلیٰ و مجنوں" اور ترجمہ "ازدواج محبت" میں ہوا ہے جبکہ تیسرے رجحان کی بہت نمایاں مثال ترجمہ "صحبت نا جنس" ہے۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا نقطہ نظر رومانی ہے لیکن مقصدی اشاروں سے خالی نہیں اور یوں یلدرم سرور و سرمستی کے عالم میں بھی عقل کا دامن تھامے جمال اور وجدان کے ساتھ معاشی اور معاشرتی عوارض اور مسائل و معاملات کی تشخیص کرتے جاتے ہیں۔ مقصدیت کی اس لہر نے بعض مقامات پر انہیں براہ راست تخاطب پر اکسایا ہے جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر بیانیہ لہجہ خطابیہ بن گیا ہے۔ مثلاً "معاف کیجئے میں اب کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اس لفظ کے آتے ہی دل دھڑکنے لگا۔" وغیرہ جملے تحریر کی دلکشی کو مجروح کرتے ہیں۔ زبان کی سطح پر ترکی اثرات کے تحت ان کے ہاں شعریت نمایاں ہے۔

رومان اور اصلاح پسندی کی روایت میں یلدرم کے بعد نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالغفار نمایاں ہیں نیاز نے اپنا پہلا افسانہ بہ عنوان "ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر" ۱۹۱۰ء میں لکھا۔

اردو افسانے میں رومانیت کے یہ ابتدائی نمائندے مزاج کے اعتبار سے رومانی رویہ رکھتے تھے نیز وسیع مطالعے کے سبب بین الاقوامی سطح پر رواں (۱۹ویں صدی کا اواخر) رومانی تحریک سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے آسکر وائلڈ کی جمال پرستی' ٹیگور کی متصوفانہ اور شاعرانہ نثر' ورڈز ورتھ کی فطرت پرستی اور رائیڈر ہیگرڈ اور عمر خیام کے عالمگیر اثرات ان افسانہ نگاروں کے ہاں "رومانی انفرادیت" کے جاندار افسانوں کا باعث بنے۔

نیاز فتح پوری نے اپنا اولین افسانہ بہ عنوان "ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر" ۱۹۱۰ء میں لکھا جو جنوری ۱۹۱۳ء کے "نقاد" اور "تمدن" میں شائع ہوا ان کے افسانوں میں عشق کی رمزیں اور حسن کی توصیف کا ترانہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے لیے نیاز نے خصوصی طور پر خواص کے طبقے سے کردار چنے اور اس طرح پریم چند کے Camp Followers (۲۵) کے متوازی رومانی رو چل نکلی۔

نیاز فتح پوری کے افسانوں کی ایک قسم اپنے موضوعات کے اعتبار سے مذہب، رنگ اور نسل سے اوپر اٹھ کر انسانیت کے وسیع تر دائرے کی تکمیل چاہتی ہے۔ اس ضمن میں تین افسانوں کا مجموعہ "نقاب اٹھ جانے کے بعد" اہمیت رکھتا ہے ان تینوں افسانوں کے مرکزی کرداروں (مولانا وارث علی کاظمی قادری، خواجہ سرور شاہ نظامی، مولوی حکیم ناظم صاحب ناظم یتیم خانہ) کا شمار ہندوستان کے جید علماء کرام اور ہادیان طریقت میں ہوتا ہے۔ ہر تین اصحاب کی نجی اور اجتماعی زندگی کی لغزشیں ان افسانوں میں شمار کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں ادبی مقالات کے مجموعوں "نگارستان" اور "جمالستان" میں شامل افسانے بھی اہم ہیں جن میں اجتماعی معاشرتی سوالات اٹھا کر مسائل کے حل کی جانب بھی اشارے کیے گئے۔ رومانی رویہ کے سبب نیاز کے ان افسانوں میں زیریں لہر مذہبی کھوکھلے پن اور انتہا پسندی کے خلاف نفرت کی ہے۔ مجموعہ "شبنمستان کا قطرہ گوہریں اور دوسرے افسانے" جس میں "دنیا کا اولین بت ساز" "زہرہ کا ایک پجاری" اور "قربان گاہ حسن" شامل ہیں، اپنی خالص رومانیت اور اسلوب بیان کے باعث اہم ہے۔

وارفتہ نوائی کا شاہ کار طویل افسانہ۔ "ایک شاعر کا انجام" (مطبوعہ ۱۹۳۰ء) بھی اسی ذیل میں نمایاں مثال ہے جو دسمبر ۱۹۱۲ء کی تخلیق ہے۔ نیاز نے رومانی بیان کے لیے قدیم رومانی قصوں کو بھی چنا ہے (مثالیں: "کیوپڈ اور سائیکی" "زائر محبت" اور "حمرا کا گلاب") اسی طرح افسانوی مجموعہ "حسن کی عیاریاں" تاریخ کے گم شدہ اوراق سے رومان اور حقائق کی بازیافت ہے۔ درحقیقت نیاز کا طبعی میلان یونانی اساطیر کی طرف ہے جس کی سب سے خوبصورت مثال افسانہ "کیوپڈ و سائکی" ہے جو "تمدن" دہلی بابت نومبر۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ اس افسانے سے پہلے نیاز نے تمہیدی حصہ بھی لکھا ہے جس میں فرماتے ہیں:

"غالبا" اس سے کسی کو انکار نہ ہو گا کہ فطرت کا مطالعہ صحیح اولین فرض انسانی ہے اور اس لیے اگر ہم یہ نہیں کرتے تو کہا جا سکتا ہے کہ ہم اپنے وجود سے وہ کام نہیں لیتے جس کے لیے ہم وضع کیے گئے ہیں۔"

(تمہید "کیوپڈو سائکی" مطبوعہ ہمدم برقی پریس لکھنؤ ۱۹۱۸ء صفحہ ب تا ج)

خود نیاز فتح پوری کے مطابق افسانہ انہوں نے محض مشغلہ خلوت سمجھ کر خود لطف اٹھانے کے لیے لکھا:

"لوگ کہتے ہیں کہ تو عریاں ہے اور تیرا رقص اور زیادہ عریاں، مگر وہ نہیں جانتے کہ ہر صنعت کی تکمیل عریانی پر ہوتی ہے۔"

(افسانہ "رقاصہ" سے اقتباس)

عورت کا تصور نیاز کی رومانیت کا مرکز و محور ہے لیکن ان کے افسانوں میں جذبات و تصورات کی مطلق العنانی دکھائی نہیں دیتی بلکہ اس کی جگہ نفسیات کے پیچیدہ معاملات کی اہمیت ہے رومانی اصلاح پسندی کی اس روایت کے تیسرے بڑے نام قاضی عبدالغفار سے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ بہر طور ضروری ہے اور وہ یہ کہ ان کا لہجہ رومانی ہے لیکن رویہ کے اعتبار سے "لیلیٰ کے خطوط" رومانی نہیں شمار ہوں گے۔ اس کتاب کی حد تک قاضی عبدالغفار اصلاح پسندی اور جذباتیت کے تیز دھاروں میں ڈانواں ڈول رہے اور آگے چل کر اپنے افسانوں میں وحدت تاثر برقرار رکھنے کیلئے بیک وقت داستان اور فکشن کی نئی فارم کا باہمی ادغام سامنے لائے۔

قاضی عبدالغفار کا افسانوی مجموعہ "عجیب" اس کی مثال ہے۔ مجموعے میں جہاں گرد (چاہ نخشب) میر صاحب (رویائے صادقہ) صحرا نورد (کشمیا) اور ایڈیٹر صاحب (ہرجائی) کے فرضی ناموں سے لکھا گیا ہے:

"کاش مرد جو علم و فضل کا سب سے زیادہ کم فہم مدعی ہے۔ چند ایک لمحے عورت کی نفسیات کا مطالعہ کرنے میں گزارے۔ صرف چند لمحے جو صنف اعلیٰ کے قدیم تعصبات سے پاک ہوں۔"

("لیلیٰ کے خطوط" سے اقتباس)

" لیلیٰ کے خطوط " میں اصلاح پسندی اور مقصدیت اس درجہ غالب ہے کہ قاضی عبدالغفار ان خطوط کو ناول یا افسانہ تک کہلانا پسند نہیں کرتے "ان کے خیال میں یہ صفحات اپنی شرح خود ہیں - " ایک چھوٹا سا آئینہ جو ہندو پاک کے نام نہاد مصلحین قوم اور مذہبی رہنماؤں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس میں عورت کے متعلق اپنی غلط شعاریوں کا مکروہ چہرہ دیکھ سکیں۔"

ان خطوط میں تھکی ہوئی امیدیں اور خواہشیں ' تھکے ہوئے ارادے اور حوصلے ' تھکے ہوئے خیالات ' تھکی ہوئی محبت ' تھکے ہوئے بوسے ' تھکا ہوا غم غرض کہ ساری زندگی تھکن سے چور ہے - یہ زندہ رہنے کی خواہش ہے جو خودکشی کرنے والے کی آنکھوں میں 'دم آخر' لہراتی ہے - ان خطوط پر گوئٹے کے ورتھر کی داستان غم کا گہرا اثر ہے۔

مجموعہ " تین پیسے کی چھوکری " میں افسانہ " ڈپٹی صاحب کا کتا " اور " سراغ رساں " میں طنز کی کاٹ بہت نمایاں ہے اور اس پر قاضی عبدالغفار کا رومانی لہجہ کمال کی حدوں کو چھوتا ہوا۔ " لیلیٰ کے خطوط " کی داستانوی تدبیر ری کے تسلسل میں " قیس " اور " گھوڑا " جیسے اہم افسانے لکھے گئے ہیں۔

قاضی عبدالغفار کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت احساس جمال کی تسکین کے ساتھ علم و حکمت کی نکتہ آفرینی ہے جو اصلاح پسندی کی اس روایت میں ایک انوکھا اور دل موہ لینے والا لحن ہے۔

" ارادے خود بخود بدل جایا کرتے ہیں - منہ مشرق کی طرف ہوتا ہے اور انسان مغرب کی طرف چلتا ہے - اس کارخانے میں جس کو دنیا کہتے ہیں ہم مع اپنے ارادوں کے فرعون کے غلاموں سے بھی بدتر ہیں - رسیاں ہمارے گلوں میں ہیں اور کوئی ہمارے پیچھے ہے - چابک بدست! جس کے تازیانے کی ضربیں سوچنے اور سمجھنے کی مہلت ہی کب دیتی ہیں - یہ غلام کیا جانیں کہ کدھر سے آئے ہیں اور کدھر جانا ہے۔"

(" چاہ نخشب " از قاضی عبدالغفار سے اقتباس)

○

(۱) یہ لہجے کے افسانے سے خیال مستعار لے کر ف - م - افضل نے " آئینہ " کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا تھا جو " ہمایوں " لاہور مارچ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اپریل ۱۹۳۶ء (ہمایوں۔ لاہور) کے شمارے میں کرشن چندر نے بھی اس تکنیک کو آزمایا - قاضی عبدالغفار ' میرزا ادیب ' رشید جہاں ' حجاب امتیاز علی اور اے۔ حمید نے بھی اس تکنیک کو کامیابی سے برتا ہے -

(۲) " علامہ راشد الخیری کے سوشل افسانے " از پریم چند مطبوعہ : " عصمت " کراچی فروری ۱۹۸۶ء

(۳) ایضاً

(۴) جوش کے ایک افسانے کا عنوان مشمولہ : " افسانہ جوش " مطبوعہ : الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۳۲ء

(۵) مشمولہ " جوش فکر " ڈسٹرکٹ گزٹ پریس ' علی گڑھ سنہ ندارد

(۶) بحوالہ پریم چند " نقوش " آپ بیتی نمبر صفحہ ۱۸۷

(۷) ایضاً صفحہ نمبر ۲۰۱

(۸) بحوالہ " زمانہ " کانپور (پریم چند نمبر) ۱۹۳۷ء و " سہیل " گیا (پریم چند نمبر) جنوری فروری ۱۹۸۰ء

(۹) نواب رائے کے قلم سے ۱۹۱۰ء تک قلم کاری کی ' افسانہ " بڑے گھر کی بیٹی " ان کی پہلی تحریر ہے جو پریم چند کے قلمی نام سے شائع ہوئی ' دیکھیے : " زمانہ " کانپور بابت دسمبر ۱۹۱۰ء

(۱۰) " پہلی کرسی کے حضور " از ابو الفضل صدیقی ' مطبوعہ : " سیپ " کراچی بابت ۱۹۸۸ء

(۱۱) ہندی میں یہ ڈراما پہلی بار گنگا پستک مالا لکھنؤ نے ۱۹۲۴ میں شائع کیا۔

(۱۲) مطبوعہ : " زمانہ " کانپور بابت اپریل ۱۹۰۸ء یہ افسانہ نواب رائے کے قلمی نام سے لکھا گیا تھا۔

(۱۳) " سوز وطن " طبع اول زمانہ پریس کانپور طبع اول : جون ۱۹۰۸ء یہ مجموعہ نواب رائے کے قلمی نام سے شائع ہوا تھا۔

(۱۴) بحوالہ پریم چند کا ایک نیا مضمون : " ماڈرن ہندی لٹریچر " از اندر ناتھ۔

(۱۵) " THE GIFT OF COW " ترجمہ از گورڈن سی۔ روڈارمل مطبوعہ : برطانیہ

(۱۶) " THE WORLD OF PREMCHAND " از ڈیوڈ روبن مطبوعہ : برطانیہ

(۱۷) بحوالہ پریم چند ایک مطالعہ " از وی۔ ایس ۔ نکرو فی " (مضمون بہ زبان انگریزی)

(۱۸) " محمد علی ردولوی " از مولانا صلاح الدین احمد مطبوعہ : " ادبی دنیا " لاہور شمارہ اول۔ دور پنجم

(۱۹) " محمد علی ردولوی " از مولانا صلاح الدین احمد مطبوعہ : " ادبی دنیا " لاہور شمارہ اول۔ دور پنجم

(۲۰) خواجہ حسن نظامی کے افسانہ " بہرا شہزادہ " کی ارنسٹ ہمنگوے کے افسانے " A Clear Well Lighted Place " سے گہری مشابہت ایک انوکھا تجربہ ہے۔

(۲۱) مطبوعہ : " معارف " علی گڑھ بابت شمارہ نمبر ۴ جلد نمبر ۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء

(۲۲) مطبوعہ : " اردوئے معلی " علی گڑھ اکتوبر ۱۹۰۹ء

(۲۳) مطبوعہ : " مخزن " لاہور اکتوبر ۱۹۰۹ء

(۲۴) مطبوعہ : " یگندری " جلد دوم نمبر صفحہ نمبر ۳۶

(۲۵) مراد سہیل عظیم آبادی اور اختر اورینوی

لخت لخت آوازیں: بازگشت' بازدید

(حامد اللہ افسر' علی عباس حسینی' اختر اورینوی' اعظم کریوی' جلیل قدوائی' محمد مجیب' اوپندر ناتھ اشک' حیات اللہ انصاری' اختر انصاری دہلوی اور سہیل عظیم آبادی)

حامد اللہ افسر نے سدرشن کے برعکس مسلم متوسط طبقے کو موضوع بنایا اور اختر حسین رائے پوری کی طرح ذہنی پستی اور سیاسی امور میں نا سمجھی پر طنز کیا۔ ان کے افسانوں کی فنی پختگی خصوصی توجہ کی طالب ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کرکے اپنے ماحول کی سچی تصویریں پیش کرتے ہیں یوں حامد اللہ افسر نے اپنے کرداری افسانوں میں اعلا معیار کی جستجو کی ہے اور اس میں سب سے نمایاں مثال افسانہ "لاٹری کا روپیہ" ہے۔

علی عباس حسینی کے ہاں حقیقت پسندی میں رومانیت کے گہرے رنگ نمایاں ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس روایت کا سب سے معتبر نام بھی علی عباس حسینی کا ہی ہے۔ اس کا باعث علی عباس حسینی کا طویل ادبی سفر ہے جو ساٹھ سالہ قلم کاری پر محیط ہے۔

برٹرنڈرسل نے اپنی ۹۵ ویں سالگرہ پر برطانیہ کے وزیر جنگ (۱۹۲۴ء) اور کیپ ٹاؤن کے ایڈیٹر ۱۹۲۳ء جان ہیکسن ل (پ۔ ۱۹۰۱ء) سے کہا تھا:

"یہ میری زندگی کا نیا دن ہے"

علی عباس حسینی کی مثال بھی ییٹس' پاؤنڈ' سپنڈر اور پکاسو کی سی ہے' جو ایک تحریک سے دوسری تحریک میں جست لگاتے گئے۔ پہلے رومانی عہد میں سانس لیے' پھر ذن کا زمان دیکھا اور پھر یکے بعد دیگرے نیو کلس' آرٹ برائے آرٹ اور آخر میں علامت نگاری کی تحریک میں شامل دیکھے گئے۔

علی عباس حسینی کا فنی سفر ایک ایسے سلیقہ میں ڈھل گیا جو حقیقت نگاری میں رومانیت اور مثالیت کی اس روایت میں حسن بیان کی انتہائی حدوں کو چھو آیا (مثالیں: "میلہ گھومنی" "رفیق تنہائی")۔

اس روایت میں شمولیت کی گنجائش علی عباس حسینی کی ..دمندی نے نکالی جس کی نمایاں مثال افسانہ "سیلاب کی راتیں" ہے۔

علی عباس حسینی کے افسانوں کی ابتدا خالصتاً رومانیت اور شاعرانہ انداز نگارش سے ہوئی' جس کی مثالیں "جذب کامل" (اولین افسانہ: تخلیق ۱۸ یا ۱۹۱۷ء) اور "پژمردہ کلیاں" ہیں "جذب کامل" رسالہ "زمانہ" کانپور ۱۹۲۴ء میں چھپا۔

علی عباس حسینی کے افسانے طبعی تلون اور بے باک حقیقت نگاری کی مثالیں بھی سامنے لاتے ہیں (مثال: مجموعہ "باسی پھول") جبکہ شگفتگی تحریر کا باعث ان کی طبعی ظرافت بنی۔ حسینی نے ہندوستان کے شہر اور دیہات کی اجتماعی تحریکات کو موضوع بنایا (مثالیں "وکیل اور منشی" اور "میخانہ") جبکہ نفسیات کے بھرپور ادراک کی مثالوں میں افسانہ "بوڑھا پالا" اور "بہو کی ہنسی" ہیں حسینی کے ہاں کرداروں کا تنوع قابل لحاظ ہے خصوصاً "بیٹی" کی اینگلو انڈین لڑکی' "بدلہ" کی انگریز خاتون' "حسن رہ گزر" کی نامعلوم محبوبہ' "سیلاب کی راتیں" کا مرد مرکزی کردار اور "پہرے دار" کے شوہر نامدار کی کردار نگاری۔

علی عباس حسینی کے بہترین افسانوں میں "خوش قسمت لڑکا" (۱۹۳۹ء) "میلہ گھومنی" اور "سیلاب کی راتیں" بہت نمایاں ہیں۔

اختر اورینوی کا اولین افسانہ "بدگمانی" اور دوسرا "زود پشیمانی" تھا۔ یہ دونوں افسانے "ندیم" پٹنہ (۱۹۳۱ء) میں شائع ہوئے البتہ "نیا شوالہ" مطبوعہ "نگار" لکھنؤ (۱۹۳۲ء) کی اشاعت سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔

اختر اورینوی کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ بہار کے دیہات رہے ہیں اور یوں وہ بہار کی مخصوص خوشبو سمیٹنے میں کامیاب ہوئے۔

"گاؤں کے اکثر کھیتوں میں سے ربیع کی فصل کٹ چکنے کے بعد تال کی سیاہ کوال مٹی بہت ہی نمایاں معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی تک وہاں گیہوں اور بونٹ کے سنہرے کھیت شام کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ پچھوائی چل رہی تھی جس کی لہروں میں گیہوں کے خوشے اور بونٹ کی چھوٹی اور گداز ڈھیریاں جھول رہی تھیں۔ ہوا میں ہنوز گرمی تھی 'گاؤں کے قریب جیٹھ کی قسم کے کھیتوں میں ترکاریوں کی بیتن اور پودے اپنی ہریاول سے دل و نظر کو فرحت و تسکین بخش رہے تھے۔ ان سبز و شاداب کھیتوں کے درمیان کنوؤں پر لاٹھے لگے ہوئے جو اکثر چل رہے تھے۔"

("تسکین حسرت" سے اقتباس)

اس ماحول میں مالک اور مزارع کی کشمکش اختر اورینوی کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اختر اورینوی نے دیہات نگاری سے آگے آکر جب شہر کو موضوع بنایا تو کچلے ہوئے مزدور پیشہ افراد کی زندگی پیش کی جس کی خوبصورت مثالیں "گندے انڈے" "جونیئر" "اب؟" اور "بے بس" جیسے افسانے ہیں البتہ دیہات اور شہر کے نچلے طبقے کی زندگی کی پیش کش میں اختر اورینوی خاص طرح کی جذباتیت کا شکار ہوئے ہیں جس کی مثالیں "منظر و پس منظر" میں کثرت سے ملتی ہیں۔ نمایاں مثالوں میں "بیل گاڑی" اور "تسکین حسرت" ہیں۔ ان افسانوں میں مارکس ازم کا پرچار پمفلٹ بازی بن گیا ہے:

"کلو کا سینہ اپنے قہر کی آگ سے پھنک رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ ان سارے بنگلے اور کوٹھیوں کے رہنے والوں کے سر پر دنیا بھر کے گندے انڈے لا کر پٹک دے۔"

(گندے انڈے)

"کلیاں اور کانٹے" میں نسبتاً بردباری اور ٹھہراؤ ملتا ہے اور توازن کی اعلیٰ ترین مثال افسانہ "کیچلیاں اور بال جبریل" ہے اختر اورینوی نے زندگی کی تصوراتی ترجمانی اس طرح کی ہے کہ زندگی کی بے کیفی اور اکتاہٹ میں سے زندگی کی امنگ کی تلاش ممکن ہو سکے۔

اعظم کریوی کا نام پوربی علاقے ضلع غازی پور (یوپی) کی کردار نگاری کے ضمن میں نمایاں ہے اور منفرد اندازیہ کہ اعظم کریوی اپنے افسانوی کرداروں کو ہر طرح کی پچویشن میں ڈال کر انسانی کردار کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہیں۔

کریوی کی کردار نگاری کا نمایاں وصف کردار کی سچی پیش کش ہے اور اسی کے باعث افسانہ نگار جذبے کی شدت سے بچ گیا۔ نتیجہ انسانی جذبات کی کھری تصویر کشی ممکن ہوئی۔

اعظم کریوی کے ہاں زبان کا ورتارا خصوصیت کا حامل ہے۔ اس کا ہاں فارسی اور ہندی کے قطبین کے درمیان ایک نئے لہجے کی دریافت ہوئی جو ان کے مخصوص دیہاتی لینڈ اسکیپ کے لہجہ سے قریب تر تھا۔ دیہات کی سادگی میں انسانی زندگی اور اس کے معاشی پہلو کو کریوی کے ہاں خصوصی موضوع بنایا گیا ہے۔

اعظم کریوی کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ موضع پارہ ضلع غازی پور (یوپی) مہیا کرتا ہے۔ معاشی کشاکش یہاں بھی اہمیت رکھتی ہے۔ البتہ انفرادیت کی حامل وہ زبان ہے جو اعظم کریوی نے دیہاتی کرداروں کی پیش کش میں برتی ہے۔

اعظم کریوی زندگی کا کھرا ترجمان ہے لیکن نفسیاتی تجزیہ کی گہرائیوں اور پریم چند کے "کفن" جیسی ایمائیت سے یکسر مبرا۔ ان کے ہاں دیہات کا رومانی تصور ملتا ہے نیز انہوں نے شعوری کوشش کی ہے کہ دیہات کے موسم 'مناظر فطرت' رہن سہن 'طور اطوار' لباس اور بدلتے ہوئے موسموں کی کیفیات کے مطابق گیتوں کو جہاں تک ممکن ہو اپنے افسانوں میں سمیٹ لیں۔

وہ زبان کے ورتارے کے اعتبار سے ہمارے ابتدائی دیہات نگاروں میں سب سے مضبوط لحن کے مالک ہیں۔ جس کا سب سے بڑا سبب

عالمی ادبیات کا مطالعہ اور ترجمے کی روایت سے مطلق ہوتا ہے۔

جلیل قدوائی کا اولین افسانہ ۱۹۱۹ء میں طبع ہوا تھا اور اس کے بعد "سیر گل" اور "اصنام خیالی" کے عنوانات سے جو دو افسانوی مجموعے طبع ہوئے ان میں طبع زاد اور ترجمہ کردہ افسانوں کو یکجا کرنے سے جلیل قدوائی کا شمار ہمیشہ سے ترجمہ کرنے والوں میں ہوتا آیا ہے۔

جلیل قدوائی کی اس پہچان کو مستحکم ہمارے ناقدین نے کیا جن سے اتنا نہ ہو سکا کہ ان دو افسانوی مجموعوں کی گرد جھاڑ لیتے۔ دوسری طرف جلیل قدوائی کی اکثر تحریریں جنہیں خاکہ شمار کیا گیا' وہ در حقیقت افسانے ہیں آج سے نصف صدی قبل کے اودھ کے تبدیل ہوتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی جلیل قدوائی کا موضوع خاص رہا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب نے "اصنام خیالی" کے مقدمہ میں جلیل قدوائی کی حقیقت نگاری اور نفسیات سے خصوصی شغف کو موضوع بناتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ "اس مجموعے میں ایک بھی افسانہ ایسا نہیں ہے' جس سے فقط دل بہلانا یا تخیل کو لبھانا مقصود ہو' اور ایک سطر نہیں جو محض زیب داستان کے لیے بڑھائی گئی ہو۔ ہر تصویر کسی حقیقت کا عکس معلوم ہوتی ہے اور ہر حقیقت کسی اور بڑی حقیقت کی طرف رہبری کرتی ہے۔"

جلیل قدوائی کے افسانوں میں یہ سب کچھ تو ہے لیکن سب سے بڑھ کر ان کے ہاں زبان کا وہ جادو بولتا ہے جو دلی کی ٹکسالی کا پاکیزہ روپ ہے۔

محمد مجیب نے ۱۹۲۸ء کے لگ بھگ افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا لیکن اردو دنیا میں ان کی دھماکہ خیز آمد افسانوی مجموعے "کیمیا گر اور دوسرے افسانے" (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) کے ساتھ ہوئی۔ ان کے طبع زاد افسانوں کے علاوہ ایک اہمیت ان کے تراجم کے سبب بھی ہے۔ محمد مجیب نے خصوصی طور پر روسی افسانہ نگاروں خصوصاً چیخوف کو نہ صرف اردو دنیا سے متعارف کروایا بلکہ اپنے طبع زاد افسانوں کے ذریعے روسی فکشن کے باغیانہ لحن کو فروغ دیا۔

مجموعہ "کیمیا گر" میں شامل نو افسانے مذہبی اور معاشرتی جکڑ بندیوں سے کھلی بغاوت کا اولین اعلان تھے۔ یہ افسانے نو سٹلیجا کے زیر اثر گرد و پیش میں بکھرے ہوئے مجبور اور بے بس کرداروں اور کچلی ہوئی نفسی کیفیات کے کھرے عکاس تھے جبکہ تقریباً سب کے سب افسانوں میں رواں زیریں لہر مارکس ازم کی تھی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ محمد مجیب کے افسانوں نے ایک حد تک "انگارے" (مرتبہ احمد علی) کے لیے زمین ہموار کی۔

اوپندر ناتھ اشک کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ "یاد ہیں وہ دن" مطبوعہ ۱۹۲۸ء سے ہوا۔ ایک زمانے میں وہ پریم چند کی طرح صرف ہندی ہی ہو کر رہ گئے لیکن اس کے بعد اردو کی طرف مراجعت بھی کی۔ اردو میں کم و بیش ڈیڑھ سو افسانے لکھے' جن میں "کونپل" "ڈاچی" "ناسور" "بیگن کا پودا" "پلنگ" "ابال" "امیسڈر" اور "کاکڑاں کا تیلی" جیسے شاہکار افسانے بھی ہیں۔ اشک کا اولین افسانوی مجموعہ "نورتن" ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا اور یوں اشک منزل بہ منزل افسانے کی تکنیکی اور موضوعاتی تدبیر کاری کی نت نئی کروٹوں کا ساتھ دیتے چلے آئے ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک کے ابتدائی افسانوں میں اصلاح پسندی کا جذبہ موجزن دکھائی دیتا ہے جبکہ اس کے فوراً بعد نفسیاتی تدبیر کاری ان کا من پسند طریقہ کار رہا ہے۔

"بات یوں ہوئی کہ دودھ کو انگیٹھی پر رکھ کر وہ اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے میں محو ہو گیا تھا۔ اگرچہ دن کافی چڑھ آیا تھا اور چندن نے دوپہر کے کھانے کے لئے آٹا تک گوندھ لیا تھا لیکن وہ دونوں ابھی بستری میں تھے اور کچھ ہی دیر پہلے اس کے مالک نے وہیں سے چندن کو چائے بنانے کا حکم دیا تھا۔

اس نے دودھ کی پتیلی کو انگیٹھی پر رکھ دیا تھا اور دروازے کی طرف کان لگائے اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے لگا تھا جب سے اس کے مالک کی شادی ہوئی تھی وہ دیر سے اٹھتا تھا۔ اس سے پہلے وہ علی الصبح اٹھنے کا عادی تھا۔ نور کے تڑکے اٹھ کر وہ چندن کو اٹھاتا' مالش کرواتا'

ورزش کرتا' بار ہا سیر کو بھی جاتا لیکن اب وہ اپنی اس نئی بیوی کے ساتھ دن چڑھے تک سویا رہتا۔ اور جب جاگتا تو وہیں لیٹے لیٹے چندن کو چائے بنانے کا حکم دے کر باتوں میں مشغول ہو جاتا۔ میٹھی مدبھری باتیں۔ چندن کو ان باتوں میں رس آنے لگا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہوتے وہ بیٹھا انہیں سننے کی کوشش کیا کرتا۔

آنچ کی تیزی کے باعث دودھ پتیلی میں بے طرح بل کھا رہا تھا اور چندن اس طرف سے بے خبر ہمہ تن گوش اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"میں مجبور ہو جاتا ہوں تمہارے گال ہی ایسے ہیں۔"

"آپ کے ہاتھوں کا تو کوئی قصور نہیں۔"

"اتنے اچھے ہیں تمہارے گال کہ ...."

"جلنے لگے ہیں آپ کی چٹکیوں سے۔"

"لو میں ٹھنڈا کر دیتا ہوں۔"

اور چندن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی نرم و نازک پھول ریشم کے فرش پر جا پڑا ہو۔ تصور ہی تصور میں اس نے دیکھا کہ اس کے مالک نے اپنے ہونٹ اپنی بیوی کے گالوں سے چپکا دیئے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ اس کے اعضاء تن گئے اور تصور ہی تصور میں اپنے مالک کی جگہ اس نے لے لی۔ "افسانہ" "ابال" سے اقتباس)۔

اوپندر ناتھ اشک کا افسانوی مجموعہ "ڈاچی" انھیں اصلاح پسندوں کے گروہ میں شامل کر دیتا ہے۔ البتہ ان افسانوں میں ہندوستان کی سیاسی بیداری کا بہترین شعور ان افسانوں کی اہمیت بنا ہے۔

اشک کی رومان پسندی مجموعہ "ناسور" میں ظاہر ہوئی البتہ ان افسانوں کی تخیلاتی فضا کے باوجود اصلاح پسندی کا جذبہ انھیں سلطان حیدر جوش کی طرف لے گیا۔ اس سے پہلے اوپندر ناتھ اشک کا شمار خالصتاً پریم چند کے کیمپ فالورز میں ہوتا رہا ہے اور اس کی مثالیں "نورتن" اور "عورت کی فطرت" (مطبوعہ ۱۹۳۳ء) تک ملتی ہیں۔

لفظ کے ملٹی ڈائمنشن استعمال کی طرف حیات اللہ انصاری کی طرح اوپندر ناتھ اشک نے بہت پہلے توجہ کی۔

اوپندر ناتھ اشک کے دیگر افسانوی مجموعوں "کونپل" "ڈاچی" "قفس" "چٹان" اور "پنگ" کے خصوصی موضوعات دو ہیں' عورت اور ہندوؤں کے متوسط گھرانے کی ذہنیت' مروج رسومات اور زندگی گزارنے کے رویے۔ ایسے میں اشک نے زندگی کی نفسیاتی حقیقت بینی خوب کی ہے۔

حیات اللہ انصاری کا اولین افسانہ "بڈھا سود خوار" جامع دہلی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا اور پہلا افسانوی مجموعہ "انوکھی مصیبت" ۱۹۳۸ء میں۔ حیات اللہ انصاری زندگی کے مصور میں اور حقیقت نگاری کی روایت سے پوری طرح جڑے ہوئے لیکن فن کی نزاکتوں کو کبھی پس پشت نہیں ڈالا۔ ان کا افسانہ "بچاجان" شعور کی رو کی تدبیر کاری کا شاہکار ہے جبکہ زندگی سے جڑے ہوئے ہونے کا ثبوت ان کا افسانہ "شکرگزار آنکھیں" ہے جس میں ۱۹۴۷ء کے حوالے سے وسیع تر انسانی جدل کی شدت خود مختار دکھائی دیتی ہے۔

حیات اللہ انصاری کے ہاں موضوعات کا تنوع' باریک بینی اور زبان کے ورتارے میں متین لہجہ خصوصیت کا حامل ہے (نمایاں مثالیں "پرواز"۔ آخری "کوشش") حیات اللہ انصاری کے طویل افسانوں میں فارم ہمیشہ قابل توجہ رہی ہے اور حیات اللہ انصاری کا نام فن افسانہ نگاری میں روایتی قواعد و ضوابط کی کڑی کسوٹی۔ "شکستہ کنگورے" انصاری کا نمائندہ افسانہ ہے۔ اصلاح پسندی کی اس روایت میں حیات اللہ طنز سے کام لیتے ہیں اور یہ طنز ان کی افسانوی تدبیر کاری میں بہت کم جگہ ضعف کا باعث بنا ہے۔ زبان سلیس' رواں اور طنز کی کاٹ لیے ہوئے ہے (مثالیں مجموعہ "انوکھی مصیبت" کے بیشتر افسانے ہیں)

حیات اللہ انصاری بنیادی طور پر ناول کے وژن کے ساتھ اردو افسانے کی دنیا میں آئے تھے۔ کچھ یہی سبب ہے کہ مختصر افسانے کی حدود وقیود انہیں تا دیر راس نہیں آئیں اور وہ ناول نگاری کی طرف پلٹ گئے۔ لیکن انکے چار افسانے "آخری کوشش"، "شکستہ کنگورے" "چچا جان" اور "شکر گزار آنکھیں" مختصر افسانے کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ اگر حیات اللہ انصاری اپنے وسیع وژن سے مطابقت رکھنے والی کردار نگاری اور مختصر افسانے کی تکنیکی تدبیر کاری میں کامیاب ہو جاتے تو اردو افسانے کے کینوس پر آج ایک نیا جہان آباد دکھائی دیتا اور حیات اللہ انصاری کے افسانوں کی پیدا کردہ خود فراموش کائنات اپنے سربستہ راز افشا کرنے کا باعث بنتی اور یہ بلا شبہ اردو افسانے کا ایک الگ اور زرول تجربہ شمار ہوتا۔

اختر انصاری دہلوی کے ہاں سماجی حقیقتیں، نفسیاتی الجھنیں اور معاشرتی ناہمواریاں ان کے منفرد زاویہ نظر کے تحت افسانوں میں ڈھلتی رہی ہیں جبکہ موضوعات کا تنوع اور اس کی مناسبت کے ساتھ اسالیب اظہار کی نت نئی کروٹیں خصوصی طور پر قابل توجہ ہیں۔

اختر انصاری کے افسانوں کا آغاز شدید جذباتیت کے تحت ہوا۔ افسانوی مجموعے "اندھی دنیا" میں افسانہ نگار ساری کائنات کو اپنی مٹھی میں بھینچ لینے کی خواہش کرتا ہے۔ "نازو" کے افسانوں میں یہ جذباتی اتار چڑھاؤ اعتدال کی سمت آیا ہے جبکہ تیسرا مجموعہ "خونی" توازن کی مثال ہے، اور مجموعہ "یہ زندگی" اس کے نمایندہ افسانوں کا مجموعہ کائنات کو مٹھی میں بھینچ لینے کی خواہش آخر آخر حلقہ در حلقہ پھیلتی اکتاہٹ میں سے زندگی کی امنگ تلاش کرنے پر ٹھہری۔

اختر انصاری کی خوش طبعی، بردباری اور نفاست پسندی اس کے ہاں موضوعات کے تنوع کے ساتھ پہچان بنی۔ افسانہ نگار کے بدلتے ہوئے لہجوں اور اسالیب کی گنجائش موضوعات کے تنوع میں نکلی۔ اس کی مثالیں اختر انصاری کے دو نسبتاً تازہ افسانوں سے ملاحظہ ہوں۔ یہ افسانے "ازلی بدنصیب" اور "غیر مرئی انسان" (مطبوعہ نقوش) ہیں۔ دونوں افسانوں کا آغاز قاری کو ابتدا میں ہی اپنی مضبوط گرفت میں لیتا ہے۔ یہ چونکا دینے والی صورت حال افسانوں کے اختتام کے بارے شدید گمراہ کن ہے۔ "ازلی بدنصیب" ازل کے بھگے بھوکے انسان کا استعارہ ہے، جس کی خواہش ہے کہ وہ سب کچھ اپنے زور بازو سے کر گزرے۔ اس کی مسلسل ناکامیاں ایک کامیابی کی صورت اس وقت اختیار کرنے لگتی ہے جب اس کی لاٹری نکل آتی ہے۔ لیکن وہ تو چاہتا تھا کہ سب کچھ اپنے زور بازو سے کر گزرے۔ یہ کامیابی در اصل اس کی زندگی میں سب سے بڑی ناکامی کی صورت ہے۔

"غیر مرئی انسان" کا میجر برائٹ جو دوسری جنگ عظیم میں شدید زخمی ہو کر محض اس لیے زندہ ہے کہ کیپٹن ہنری کی خبر مل جائے کہ کس حال میں ہے لیکن جنگ اپنے شباب پر ہے، کسی کو کسی کی خبر نہیں اور جسے در اصل مرجانا چاہیے، وہ زندہ ہے۔

سہیل عظیم آبادی کے افسانے بہار سے متعلق رہے ہیں۔ جن میں بہاری زندگی نیز دیہاتی اور شہری ماحول کی مخصوص بو باس ان کی نمایاں پہچان ہے۔ سہیل عظیم آبادی کی سب سے بڑی مشکل یہ رہی ہے کہ بہار کی ہی زندگی پر ان کے ایک پیشرو اختر اورنیوی اس مخصوص لینڈ اسکیپ سے متعلق بھرپور افسانے قلم بند کر چکے تھے اور کوئی طرز خاص ہی سہیل عظیم آبادی کو نمایاں مقام دلوا سکتا تھا۔ اس طرز خاص کی جستجو میں سہیل عظیم آبادی نے اختر اورنیوی کی کرخت حقیقت نگاری کے برعکس بہاری لینڈ اسکیپ کے سکون، ٹھہراؤ اور لوک گیتوں کی فضا بندی پر توجہ صرف کی اور یہی ان کا اسلوب خاص ٹھہرا۔

سہیل عظیم آبادی نے اپنے افسانوں میں بہار کے دیہات اور شہر کی فضا کو یکجا کر کے دکھایا ہے اور ایسے میں معاشرتی اور معاشی ناانصافیاں موضوع خاص ہیں۔ یہ صورت حال تازہ ترین افسانوی مجموعے "تین تصویریں" تک چلی آئی ہے۔ سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کی تکنیک خصوصی مطالعہ کی طالب ہے جبکہ ان کے ہاں پہلی بار افسانہ بیان کرنے کے روایتی انداز کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ انحراف ایک طرف تو پلاٹ کی سطح پر ہے اور دوسری طرف کہانی کی اٹھان، ارتقا اور منتہا کی پیش کاری میں۔ سہیل کے افسانوں سے متوقع نتائج کبھی برآمد نہیں ہوتے، اس کی نمایاں مثال مجموعہ "الاؤ" کے افسانے ہیں۔

نزول رومان پسندی کی لہر

(مجنوں گورکھپوری، مسز عبدالقادر، حجاب اسماعیل (حجاب امتیاز علی) اور میرزا ادیب)

مجنوں گورکھپوری اپنے دور کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"۱۹۲۰ء کے بعد ادب لطیف کا زور تھا۔ ناول اور افسانے میں یا تو اصلاحی میلان تھا جسکی تنہا نمائندگی پریم چند کر رہے تھے یا وہی رومانی میلان تھا جو ادب لطیف کی روح رواں تھا اور جس کے نمائندے سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کی سرکردگی میں اکثریت میں تھے، میرے ناولٹ اور افسانے اسی سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔" (۱)

مجنوں گورکھپوری نے مرد اور عورت کی محبت کو معاشرتی جکڑ بندیوں سے آزاد دیکھا ہے اور اسی تصور سے نزول رومان پسندی کی ایک نئی لہر چلی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں رومان اور فلسفے کا امتزاج پیش کیا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "خواب و خیال" شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں پر بات کرتے ہوئے سید سبط حسن لکھتے ہیں:

"ان میں حقیقت اور رومان کا ایسا دلکش امتزاج ہوتا تھا کہ اٹھتی جوانیاں جذبات کے طوفان میں بہنے لگتی تھیں۔ ان کہانیوں کے کردار اور ماحول عموماً دیہاتی ہوتے اور جن لوگوں نے بستی گورکھپور یا پوربی یو۔ پی کے دیہات دیکھے ہیں وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ مجنوں صاحب نے وہاں کے درمیانہ طبقے کے رہن سہن اور مسائل زیست کی بڑی سچی تصویر کھینچی تھی۔ مجھ کو کہ پوربی بھی ہوں، دیہاتی تھی۔ مجنوں صاحب کی ہر کہانی اپنے دیس، اپنے گاؤں بلکہ اپنے گھر کی کہانی نظر آئی۔ اس وقت تک عشق کا ذاتی تجربہ تو نہیں ہوا تھا لیکن ان کہانیوں کو پڑھ کر دل میں ٹیس ضرور اٹھتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ کاش ہم کو بھی عشق ہو جائے۔" (۲)

مجنوں کے ان افسانوں میں ٹامس ہارڈی کا گہرا عکس جھلکتا ہے اور مجنوں کے کردار مذہب اور طبقاتی اختلاف اور اونچ نیچ سے بے پروا ہو کر عشق کرتے دکھائی دیتے ہیں اور بالآخر ان کی محبت کا انجام حزن و ملال یا بے بسی کی موت ہوتا ہے۔ اسی کی سب سے خوبصورت مثال افسانہ "سمن پوش" ہے، جسے پڑھ کر بریلی کے ایک نوجوان شفقت نے خودکشی کر لی۔ (۳)

مجنوں گورکھپوری کے ان افسانوں سے متعلق پروفیسر احتشام حسین کی رائے انتہائی وقیع ہے، لکھتے ہیں:

"محبت میں جو غم اور تلخی ہے، گھٹن اور ناکامی ہے، وہ ان کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کے افسانے کسی طرح بھی آج کی فضا میں عام مسائل سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتے، لیکن اس وقت کسی نہ کسی حد تک یہ صورت ضرور تھی کہ گھروں کے اندر لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، خون تھوکتے تھے، اور دق کا شکار ہوتے تھے اور ان کو سوائے اس کے اور کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا کہ وہ اپنے غم کو چھپائے ہوئے دنیا سے گزر جائیں۔" (۴)

مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کی رومانی فضا مخصوص نفسیاتی اور فلسفیانہ نظام کے تحت ہے، خصوصاً ٹامس ہارڈی اور ہیگل کے اثرات نمایاں ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کا خاص موضوع محبت اور اس کے متعلقات ہیں جنہیں روحانیت سے ملا کر انوکھی معنویت دے دی گئی ہے۔ یہاں محبت کا المیہ انجام اہم ہے اور نفسیاتی انفرادیت نمایاں ترین وصف۔

مجنوں گورکھپوری کے افسانوں میں یوپی کے سفید پوش طبقے اور ناسخہ روزگار سے افسانوی کردار ڈھالے گئے ہیں۔ یہ فلسفی شاعر اور

زندگی کرنے کی وسیع معلومات کے حامل افراد ہیں ۔ واضح رہے کہ قیسی رام پوری کا نام اسی روایت کی کڑی ہے مجنوں کی رومان پسندی اور کرداری سطح پر بقراطیت ٹھوس علمی بحث مباحثہ کے ساتھ شعر کا من لیے ہوئے ہے (مثال : " شکست بے صدا " اور " سمن پوش ") بعض اوقات افسانے میں رواں فلسفیانہ بحثیں اصل کہانی سے کٹی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور محض علم کا اظہار رہ جاتا ہے ۔

" سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے دماغ میں کوئی فتور نہیں ہے ' اور نہ واہمہ پرست ہوں جیسا کہ اکثر ناظرین کو شبہ پیدا ہو جائے گا میں نفسیات کا ماہر سمجھا جاتا ہوں ۔ میں نے قوائے انسانی اور ان کے افعال کا پورا پورا مطالعہ کیا ہے ۔ میں فلسفہ اور منطق کی تکمیل کر چکا ہوں ۔ یہی نہیں بلکہ سینکڑوں کو ان علوم میں سبق دے چکا ہوں یعنی مدتوں سے پروفیسری کر رہا ہوں البتہ میں صرف علمی اصطلاحوں میں نہیں الجھا ۔"

(افسانہ " تم میرے ہو " سے اقتباس)

" سمن پوش " مجنوں کے نمائندہ افسانے ہیں ۔ ان افسانوں کی تکنیک ایک زمانے تک قابل توجہ رہی ہے اور افسانوں میں بانیت کا موضوع بھی ۔ بیانیہ انداز میں مجنوں کا یہ اضافہ کہلائے گا کہ ان کے افسانوں کی ابتداء در اصل کہانی کی انتہا ہے اور سارا افسانہ تو سٹیٹک رویہ کا غماز ہوتے ہوئے اپنے اختتام پر المناک منظر یا دکھی کر دینے والی صورت حال سے دو چار کرتا ہے جسے المیہ کا منطقی انجام کہنا چاہیے۔

خالص رومان پسندی کی اس روایت میں مسز عبدالقادر کا نام تحیر ' خوف اور خون آشامی کی پیش کش کے حوالے سے بہت نمایاں ہے ۔ مسز عبدالقادر نے ایڈگر ایلن پو کے گہرے اثرات کے تحت افسانہ نگاری کا آغاز کیا لیکن اس باب میں ان کی اپنی مخصوص افتاد طبع اور نفسی کیفیات کو پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا ۔

مسز عبدالقادر اپنی اوئل جوانی سے ہی پر اسراریت کے زیر اثر رہی ہیں ۔ اس خاص نوع کی نفسی کیفیات سے باہر نکلنے کی انہیں صرف پندرہ برس تک مہلت ملی ' جب ان کی شادی ہوئی ۔ بقول مسز عبدالقادر " جب میرے شوہر کا انتقال ہوا تو مجھے پرانی سوچیں پھر آنے لگیں پھر میں نے سیاحت شروع کی تقریبا تمام دنیا دیکھی تمام یورپی ممالک کی سیاحت کی اور تمام اسلامی ممالک کی بھی ۔ ہندوانی چیزیں بہت دیکھیں ان چیزوں کو دیکھ کر مجھے سکون ملتا ۔ سیاحت کے دوران میں نے انجیل ' تورات ' زبور اور قرآن مجید کا تفصیلا " مطالعہ کیا ۔ اس تمام مطالعہ کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میرا فلسفہ آواگون پر یقین ہو گیا اور مجھے یہ خیال آنے لگے کہ میرا دوسرا جنم ہے اور اس لئے میرا اس دنیا میں دل نہیں لگتا ۔ لیکن یہ اعتقاد ہندو عقیدے کی وجہ سے نہیں ہوا کیونکہ مجھے ہندوؤں سے بہت نفرت ہے بلکہ میرا یہ اعتقاد مطالعہ سے اور اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر ہوا کیونکہ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ جب میں کسی چیز کو دیکھتی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں اس چیز کو پہلے بھی دیکھ چکی ہوں لیکن یہ یاد نہ آتا کہ یہ چیز پہلے کہاں دیکھی تھی ۔

اس بات کو بیس برس ہوئے کہ مجھے ایک خواب آیا کہ میں ایک سونے کے بنے ہوئے شہر میں پہنچ گئی ہوں۔ جہاں کی ہر چیز سونے کی بنی ہوئی ہے۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون سا شہر ہے تو کسی نے مجھ سے کہا کہ یہ اگلا جہان ہے تو میں نے کہا کہ یہ کون سا اگلا جہان ہے جو اتنا سنسان ہے ۔ یہ سوچتے ہوئے میں ایک مکان میں داخل ہوتی ہوں ۔ یہ مکان بھی سونے کا بنا ہوا ہے اور اندر صوفے بچھے ہوئے ہیں ۔ کمرے کے ایک طرف رجسٹر لگے ہوئے ہیں ۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ یہ نوشتے ہیں جو دنیا میں کوئی شخص کام کرتا ہے اس کے اعمال ان میں لکھے جاتے ہیں اور مجھے کہنے لگے کہ پڑھ لو لیکن میں نے ان نوشتوں کو پڑھنے سے انکار کر دیا اور کمرے سے باہر آگئی تو میں نے دیکھا کہ صحن میں دو چوکیاں بچھی ہوئی ہیں ۔ میں اس پر بیٹھ گئی ۔ ایک عورت جس کی چاند سی پیشانی تھی سفید لباس میں جس پر چاند ستارے بنے ہوئے تھے میں نے آتے ہوئے دیکھی۔ جب وہ میرے پاس پہنچی تو میں نے دیکھا کہ وہ میری سہیلی کی بیٹی تھی جو مر گئی ہوئی تھی تو وہ لڑکی کہنے لگی میں یہاں اکیلی رہتی ہوں لیکن چند دنوں تک میرا ایک ساتھی آجائے گا۔ پھر وہ مجھے کہنے لگی کہ میرے گھر آیئے۔ اس کے کمرے میں خنکی ایسی تھی جو بدن کو چبھتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہاں تو بہت سردی ہے تو وہ سونے کی قندیلیں لے آئی جس میں ایک ایک کوئلہ دھک رہا تھا لیکن مجھے سردی محسوس ہونے لگی تو میں نے

اس سے کہا کہ میں تو واپس جا رہی ہوں جب میری نیند کھلی تو میں اپنے بستر پر تھی۔ میں نے فوراً اپنے بیٹے سراج الدین ظفر کو اپنی سہیلی کے گھر بھیجا تو پتہ چلا کہ اس کی بہن فوت ہو گئی ہے۔

میں کشمیر سے واپسی پر گڑھی کے ڈاک بنگلے میں ٹھہری تو ساتھ میری بھانجی اور اس کا خاوند بشیر بھی تھے۔ رات کو میں سو گئی تو میں نے دیکھا کہ میں ایک جگہ پھر رہی ہوں اور سامنے کوٹھری کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی ہے اندر سے سورۃ یٰسین کے پڑھنے کی آواز آ رہی ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ آواز میاں محمد (جنھوں نے سیف الملوک لکھی ہے) کی ہے۔ میں نے ان سے ملاقات کرنی تھی۔ مجھے کسی نے کہا کہ وہ اپنی منزل سے فارغ نہیں ہوئے تو میں وہیں باغیچے میں ٹہلنے لگی "۔(۵)

کچھ یہی سبب ہے کہ مسز عبدالقادر کا تخیل ہیبت ناک ماحول کی بھرپور عکاسی پر قادر ہے۔ ان کا اولین افسانوی مجموعہ "لاشوں کا شہر اور دوسرے افسانے "۱۹۲۶ء میں طبع ہوا اور "صدائے جرس "۱۹۳۶ء تک کے افسانوں پر مشتمل ہے۔

"لاشوں کا شہر" سے "صدائے جرس "تک کے افسانوں پر ایڈگرایلن پو کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں خصوصاً" افسانہ "بلائے ناگہاں" اور پو کے "The Black Cat" کی مماثلت توجہ طلب ہے۔(۶)

پو کے افسانے میں مکان جل گیا لیکن دیوار پر جس میں قہر و غضب کے عالم میں بلی کو چن دیا گیا تھا' بلی کی شبیہ ابھر آئی' یہ مجبور و مقہور حیوان کا انتقام تھا' جبکہ "بلائے ناگہاں "میں دیوار سے شیر کی تصویر غائب ہو جاتی ہے اور عین اسوقت ایک درندہ اپنی خون آشامیوں کی ابتداء کرتا ہے۔

"وادی قاف "کے افسانے مناظر فطرت اور "راہبہ "کے افسانے دنیا کی گم نام سیاحت گاہوں کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان افسانوں میں قہار فطرت اور انسانی زندگی کی جد و جہد خصوصی موضوع رہا ہے۔

"اس کا بدن بخار سے پھنک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ ادھر ادھر سر پٹکتا تھا اور "مجھے بچاؤ بچاؤ "کہہ کر جگر خراش چیخیں مارتا' کبھی کہتا "ہائے چچی حفیظ گرم سلاخوں سے میرا بدن داغ رہی ہے "۔ کبھی کہتا "رحشمہ مجھے آتشیں بھالا نہ مارو۔ ہائے مجھے دوزخ کے فرشتے پابجولاں کر کے لے چلے ہیں' مجھے چھڑاؤ۔"

غرض کہ اسی طرح چیختا چلاتا صبح کے وقت مر گیا۔ ادھر طوفان بھی ختم ہو گیا تھا۔"

(افسانہ "پاداش عمل "سے اقتباس)

مسز عبدالقادر کے افسانے نہ صرف موضوعی سطح پر منفرد ہیں بلکہ اسلوبیاتی سطح پر بھی الگ ذائقہ کے حامل ہیں۔ تحیر خیزی اور دہشت ناکی کی پیش کش کے ساتھ ان کا رومانی رویہ انھیں اردو کے بڑے رومانی تخلیق کاروں میں اہم مقام دلاتا ہے اور ان کے نمائندہ افسانوں میں "بلائے ناگہاں" "کاسہ سر" "راہبہ" "ناگ دیوتا" "وادی قاف" اور "پاداش عمل "خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

حجاب اسماعیل (یا حجاب امتیاز علی) کا نام رومانی کردار نگاری اور فضا بندی کے اعتبار سے رومانی افسانے کا نقطہ عروج ہے' اجنبیت کا احساس پہلی بار حجاب کے افسانوں میں ظاہر ہوا' اس پر مستزاد حجاب کے افسانوں کا رومان پرور اور سحر آفریں ماحول تھا۔

ہندوستان کے جنوب میں ضلع کرشنا' دریائے گوداوری کے کنارے فرسا پور کے مضافات حجاب کے افسانوں کے لیے لینڈ اسکیپ مہیا کرتے ہیں۔ جہاں کنول کے مہکتے پھولوں سے بھرے تالاب اور دھان کے گہرے سبز کھیت لہلہاتے۔ کیوڑے کے جنگل' تاڑ کے نمایاں درخت اور ٹھہرے ہوئے پانی میں گہرے گلابی پروں والی قد آدم جو اسلیس' جو سارا سارا دن ایک ٹانگ پر سرنگوں کھڑی رہتی تھیں۔ کالی کھچیاں اور کالی سنکھا پوری مینائیں اور اس پر کالی راتوں میں دریا کے دونوں کناروں پر اگیا بتیاں کی ہیبت ناکی۔ حجاب نے پہلی بار بصری رومانیت کا تجربہ کیا۔ ایسے میں مولانا راشد الخیری کی المناک اور نیاز کی رومانی کہانیوں کے اثرات کا نتیجہ "ڈاکٹر گار" "چچا لوت" اور "وادی زبیدہ" جیسے پراسرار اور روحی' صبوحی' صوفی اور ریحانی جیسے رومانی نسوانی کرداروں کی صورت ظاہر ہوا۔

حجاب امتیاز علی کے افسانوں کی طلسماتی فضا اور گہری رومانیت میں ڈوبے ہوئے کرداروں کی نقل و حرکت حد درجہ پر اسرار ہونے کے باوجود ہیبت ناکی کی حدود میں داخل نہیں ہوتی اس کی سب سے بڑی وجہ ان کا مزاج ہے۔ حجاب کے افسانوں میں نفسیات، تاریخ، کلاسیکی اور بین الاقوامی ادب، سائنس، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ اور علم نجوم اپنی چھب دکھاتے ہیں اور وہ تخلیقی ادب کو کسی جغرافیے کا پابند نہیں دیکھنا چاہتیں۔

حجاب امتیاز علی اردو افسانے کے ان گنے چنے افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے ہمارے افسانوی ادب کو کئی زندہ جاوید کردار عطا کیے ہیں اور ان کرداروں میں خصوصیت کے ساتھ دادی زبیدی، جسوتی، سر جعفر، چچالوٹ، ڈاکٹر گار، روحی اور زوناش بہت نمایاں ہیں۔

دادی زبیدی ایک دبلی پتلی باوقار خاتون ہیں جو اپنا حکم منوانے میں خاص نوع کی لذت محسوس کرتی ہیں اور انہیں اپنے بناؤ سنگھار کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے۔ سر جعفر اور ڈاکٹر گار اس خاندان کے دیرینہ رفقاء خاص ہیں، جس خاندان کے سربراہ چچالوٹ ہیں، جبکہ روحی، جسوتی، صوفی، صبوحی اور ریحانی محبت کرنے والے دل ہیں ہمیشہ سدا بہار اور دائم جوانی کی امنگوں سے بھرے ہوئے اور ان کرداروں کے ہمراہ ایک بوڑھی اور بھدی حبشن کنیز زوناش ہے جو انتظامی صلاحیتوں میں جملہ ملازماؤں میں سب سے بڑھ کر ہے۔

یہ سب کردار حجاب امتیاز علی کے افسانوں کے فنٹاسٹک ماحول میں جیتے ہیں۔ یہ وہ جہان ہے جہاں مشرق اور مغرب گلے مل رہے ہیں۔ یہ حجاب کی خیالی ریاستوں کیپاس اور شموگیہ کے باشندے ہیں۔ یہ سب کردار آپ کو کبھی تو ریاست کیپاس یا شموگیہ کے ساحل سمندر پر یکجا ملیں گے اور کبھی دریائے ناشپاس کے کناروں سے ہوتے ہوئے ناشپاس کے جنگلوں میں۔ یہی نہیں حجاب کے افسانوں میں خیالی محل قصر آرفین، قصر عشرت اور قصر نسرین کی اپنی دنیائیں ہیں، جزیرہ عباس، نہر عطوس، کوہ فیروز اور کوہ الماس کا منفرد ماحول ہے۔

حجاب امتیاز علی نے اپنی اس مخصوص اور منفرد افتاد طبع سے متعلق تفصیل کے ساتھ راہنمائی کی ہے لکھتی ہیں:

"میری ادبی زندگی کا گہرا تعلق میرے بچپن کی تین چیزوں سے ہے۔ فضا، ماحول اور حالات میرے بچپن کا ابتدائی زمانہ جنوب میں دریائے گوداوری کے ہوشربا کناروں پر گزرا۔ ان کناروں کو میں نے ہوشربا کیوں کہا یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی پہلے یہ بتاتی ہوں کہ مجھے وہاں رہنے کا اتفاق کن حالات میں ہوا۔ ایک زمانے میں موسم سرما میں عموماً حیدر آباد دکن میں طاعون کی وبا ایسے ہولناک طریق پر پھیل جاتی تھی کہ دنوں میں سینکڑوں اور ہفتوں میں ہزاروں خاندان موت کے گھاٹ اتر جاتے تھے۔ ایک عرصے کے لئے گھر بار چھوڑ کر کسی نئی جگہ جا کر جمنا ایک مرحلہ بن گیا تھا۔ چنانچہ میرے والد مرحوم کو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ کچھ عرصے کے لئے جنوبی ساحل پر اقامت پذیر ہو جائیں۔ اس طرح مجھے ایک مدت تک اپنے خوابوں کے جزیرے میں رہنا پڑا۔ یہ وہ پرستانی مقام تھا جہاں کے زمین و آسمان کے درمیان حسن و شاعری کا ایک ابدی چشمہ ابلتا رہتا تھا ایک طرف کنول کے پھولوں کے مہکتے ہوئے تالاب دور تک فردوس نظر بنے ہوئے تھے تو دوسری طرف دھان کے گہرے سبز لہلہاتے ہوئے کھیت صاحب نظر کو دعوت نظارہ دیتے تھے۔ اس میں کہیں کیوڑے کے عطربیز جنگل کھڑے تھے جن کی ہوشربا مہکتوں سے وارفتہ ہو کر چاندنی راتوں میں سیاہ پھن والے ناگ اپنے اپنے ٹھکانوں سے بیتابانہ باہر نکل آتے تھے تو کہیں تاڑ کے دیو قد درختوں پر میخواری کے متوالے کوے تاڑی کی شراب پی کر بدمست ہو جاتے اور شور مچایا کرتے تھے۔ کنول کے معطر تالابوں اور چاول کے سبز پودوں میں چوبیس گھنٹے گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہوتا تھا جو دن کے وقت آفتاب کی شعاعوں میں طلائی اور شب ماہ میں ماہ تاب کی کرنوں سے نقرئی رنگ میں دمکتا رہتا تھا اور پھر سمندری ہواسلیں ۔۔۔!! گہرے گلابی پروں والی قد آدم ہواسلیں تمام تمام دن ایک ٹانگ پر سرنگوں کھڑی رہتی تھیں جنہیں دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی دقیق کائناتی مسئلے پر غور کر رہی ہیں۔ پھر کال کلیچیاں تھیں اور کالی کالی سنگھا پوری مینائیں۔۔۔ جن کی نغمہ سرائیوں سے فضا اکثر تھرا اٹھتی تھی۔ دیکھیے یہ نہ سمجھے کہ اس وقت میں آپ کو اپنی کسی کہانی کا ایک باب پڑھ کر سنا رہی ہوں۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ شاعری نہیں بلکہ خالص حقیقت ہے یقین نہ آئے تو آپ آج ہی جا کر مرے بچپن کے اس پرستان کی سیر کر آیئے۔ وہ ضلع کرشنا میں ساحل گوداوری پر واقع ہے اور اس کا نام نرساپور ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں میں نے خزاؤں اور بہاروں میں امتیاز کرنا سیکھا۔!

میں نے ابھی ابھی ان ساحلوں کو ہوشربا کہا تھا اور اس کی وجہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اس کی وجہ خوفناک ہے شاید آپ سننا پسند نہ کریں۔ اس لئے میں اسے چھوڑ دیتی لیکن چونکہ کہہ چکی ہوں کہ میں گوداوری کے کناروں کی خوفناک ہوشربائیت کی تفصیل بتاؤں گی اس لئے اب مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ ہوتا یہ تھا کہ کالی اندھیری راتوں میں گوداوری کے سنسان کناروں پر ہندوؤں کی لاشیں جلائی جاتی تھیں۔ جلانے کے دوران ہڈیاں اور سر اس قدر ڈراؤنے شور کے ساتھ چٹختے تھے کہ انہیں سن کر ہوش اڑ جاتے تھے۔ اس سرزمین پر گوشت پوست سے عاری انسانی ڈھانچے اور ہڈیاں جگہ جگہ پڑی رہتی تھیں اور چیخ چیخ کر انسان کے فانی ہونے کا یقین دلایا کرتی تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جب ان ساحلوں پر رات پڑتی تو ہڈیوں کا فاسفورس اندھیرے میں جل اٹھتا تھا اور میلوں فاصلے سے غول بیابانی کی طرح ان ویرانوں میں روشنیاں رقصاں نظر آتی تھیں۔ یہ دہشت خیز منظر ہیبت ناک کہانیوں کے لکھنے کی ترغیب دیتا تھا۔ غرض ان کا حسن اور رات کی خوفناکی یہ تھی فضا۔ ایسی فضا میں جو شخص بھی پلے اور بڑھے اس میں تھوڑی بہت ادبیت۔ شعریت اور وحشت نہ پیدا ہو تو اور کیا ہو۔

تیسری بات حالات کی تھی۔ جنہوں نے مجھے کتاب و قلم کی قبر میں مدفون کر دیا۔ مدفون کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ اگر میں نے اس زمانے میں اپنے آپ کو ادبی مشاغل میں دفن نہ کر دیا ہوتا تو میں کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ وہ زمانہ مرے لئے بے حد حزن و ملال کا تھا۔ مری والدہ ابھی جواں سال ہی تھیں کہ اللہ کو پیاری ہو گئیں ان کی موت مرے خرمن پر بجلی بن کر گری۔ اس زمانے میں میرا ذہنی توازن درست نہ تھا۔ لڑکپن تھا، اس پر شدید ذہنی دھچکا ماں کی موت کا تھا۔ ان دونوں نے مل کر مجھے اعصابی بنا دیا تھا۔" (۷)

کچھ یہی سبب ہے کہ حجاب امتیاز علی کے افسانوں میں ورڈز ورتھ، آسکر وائلڈ اور ٹیگور کے ساتھ ڈاکٹر گار، دادی زبیدہ اور چچا لوث بھی جیتے جاگتے کردار ہیں۔ ان شفقت اور محبت لٹاتے ہوئے کرداروں کے ساتھ ریحانی، صبوحی، صوفی اور روحی زندگی کی لہریں ہیں اور ان لہروں پر رواں حجاب امتیاز علی آگے اور آگے چلی جاتی ہیں۔

حجاب امتیاز علی کے منفرد رومانی انداز نگارش میں تراشی ہوئی تشبیہوں، استعاروں اور تراکیب کا در تارا قابل لحاظ ہے۔ حجاب نے اپنے تازہ افسانوں میں زندگی کے تلخ ترین حقائق کا اظہار بھی کیا ہے۔ (مثلاً "پے انگ گیسٹ" اور "عناصر میں ظہور ترتیب") لیکن ان کے افسانوں کی پراسرار طلسمی فضا قائم و دائم ہے۔

اردو افسانے میں میرزا ادیب نے ۱۹۳۶ء میں "افسانہ خونیں" لکھ کر ایک رومان نگار کی حیثیت سے قدم رکھا۔ ۱۹۴۲ء تک ان کے دو رومانی مجموعے "صحرا نورد کے خطوط" اور "صحرا نورد کے رومان" شائع ہو کر مقبول عوام ہو چکے تھے لیکن یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ میرزا ادیب اول و آخر رومانی افسانہ نگار نہیں۔ "صحرا نورد کے خطوط" اور "صحرا نورد کے رومان" البتہ لہجے کے اعتبار سے رومانی کہلائیں گے اور میرزا ادیب کی یہ اولین پہچان بھی ہے۔

میرزا ادیب کا "صحرا نورد کے خطوط" سے "صحرا نورد کے رومان" تک کا سفر داستان کے بنیادی عناصر سے اپنا تعلق رفتہ رفتہ توڑنے کا سفر ہے۔ ان افسانوں کی تحیر آفرینی کہانی کہنے کی روایت میں خاص معنویت کی حامل ہے اور میرزا ادیب کے یہ افسانے اپنے عہد کے دو متحارب رویوں (کھری رومانیت اور حقیقت پسندی) میں توازن کی مثال ہیں۔

"کل صبح جب کہ آفتاب کی پہلی کرن ریگ صحرا کی پیشانی کو چوم رہی تھی، میں ایک وادی کے نزدیک چشمے کے کنارے ٹھہر گیا، خیمہ لگایا اور ادھر ادھر پھرنے لگا، اچانک میری نظر وادی میں ایک سنگ مرمر کی تربت پر پڑی۔" (افسانہ "خونیں" سے اقتباس)

لق ودق صحرا، مصر، بابل اور نینوا کی غلام گردشوں کی نامانوس رومانی فضا اور عشقیہ قصے کے سبب یہ افسانے کھری رومانیت کے کھاتے میں ڈالے گئے۔ حتیٰ کہ انہیں داستانیں تک کہا گیا، حالانکہ "ناپ" اجنبی کردار اور یکسر اجنبی ماحول کی واحد مثال افسانہ "سماوت کا قیدی" ہے۔ بلکہ دیگر افسانوں خصوصاً "سیل حوادث" اور "حکایۂ جنوں" میں معروض اور ماورا کا بعد اس حد تک نہیں بڑھا کہ وہ داستان کہلاتے۔ رومان بندی کی اس روایت میں شمولیت سے متعلق میرزا ادیب خود لکھتے ہیں:

"خبر نہیں وہ کونسا دن تھا ۔۔ کونسی تاریخ تھی ۔۔۔ کونسا مہینہ تھا ۔ میں اس زمانے میں لمبی سیر کا عادی تھا ۔ ایک صبح منٹو پارک کے عقبی حصے سے گزرتا ہوا مستی گیٹ سے ہو کر اس جگہ پہنچ گیا جو لاہور کے شاہی قلعے کی سیڑھیوں کے آگے پھیلی ہوئی ہے ۔ یہ سیڑھیاں پہلے نہیں تھیں بعد میں بنائی گئی ہیں ۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے ان سیڑھیوں کے نیچے قدم رکھا تھا کہ یکایک ایک بڑی میٹھی ' مترنم اور دل آویز لہرائی "تم کہاں صحرا نوردی کرو گی ؟ " میں نے چونک کر دیکھا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک لڑکی چہرے سے نقاب ہٹائے اپنی سہیلی سے مخاطب تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ابدیت کے سمندر سے ایک موج اٹھی اور مجھے بہا کر لے گئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے اسے دیکھا' وہ جا رہی تھی ۔ لاکھوں آوازوں میں وہ آواز پھر کبھی سنائی نہ دی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے الفاظ میرے ذہن میں گونجتے رہے اور ایک دن میں صحرا نورد بن گیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے زندگی بھر صحرا نہیں دیکھا ۔ صحرا تو رہا ایک طرف کوئی گھنا جنگل بھی نہیں دیکھ سکا ۔ " (۸)

بس یہیں سے میرزا ادیب نے خواب سے حقیقت اور حقیقت سے خواب کی دنیا میں چہل پہل کر دی ۔ میرزا ادیب کے ابتدائی افسانے پر شکوہ اور مرصع زبان لکھنے کے حوالے سے ان کی ایک الگ شناخت سامنے لاتے ہیں جو یلدرم' نیاز' مجنوں' مسز عبدالقادر اور حجاب امتیاز علی سے یکسر مختلف لحن ہے البتہ آدرش حقیقت نگاری کے حوالے سے یہ افسانے قاضی عبدالغفار کی "لیلیٰ کے خطوط" سے اگلا قدم ہے ۔

"میری طرح ہزاروں ' لاکھوں انسان تاریکی کے بھاری بوجھ کے نیچے کچلے جا رہے ہیں ۔۔۔۔ روشنی کے بغیر جینا ' یہ کیا جینا ہے ۔ یہ کیا زندگی ہے ۔ تمسخر ' مذاق ' بے دردی ۔ انسان روشنی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔ "

(افسانہ "روشنی" سے اقتباس)

اس اعتبار سے دیکھیں تو میرزا ادیب نے جہاں نفسی تخلیق کی ہے وہیں برطانوی راج اور سماجی گھٹن کی نشاندھی بھی کرتے چلے ہیں ۔ اس حوالے سے "نئے انسان" ' "غلاموں کی بغاوت" ' "روشنی" اور "دیا" جیسے افسانے ایک الگ مطالعے کے حامل ہیں ۔ موضوعاتی سطح پر تنوع کے باوجود افسانوی مجموعوں "جنگل" اور "کمبل" سے تازہ ترین افسانوں "دیا اور چڑیا" اور "ملیا کی تلی" تک معاشرتی اصلاح پسندی اور انسانی نفسیات سے گہرا شغف پورے شدومد کے ساتھ کار فرما دکھائی دیتا ہے ۔

○

(۱) بحوالہ دیباچہ "سمن پوش اور دوسرے افسانے" مطبوعہ : کتب خانہ علم و ادب ' دہلی : طبع سوم : ۱۹۴۷ء

(۲) بحوالہ "مجنوں مجنوں ہو کے ہیں" از سید سبط حسن مطبوعہ : "افکار" علی گڑھ جنوری ۔ اپریل ۱۹۸۳ء

(۳) اس حادثے کا ذکر رسالہ "ایوان" اگست ۱۹۳۳ء اور "افسانہ کا افسانہ" از مجنوں "ایوان" گورکھپور بابت ستمبر ۱۹۳۳ء میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے ۔

(۴) بحوالہ "نگار پاکستان" کراچی "اصناف ادب نمبر"

(۵) بحوالہ مسز عبدالقادر کا ایک خط مشمولہ : "مسز عبدالقادر" مقالہ برائے ایم اے (اردو) پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لائبریری ' لاہور

(۶) "Great Tales And Poems Of Edgar Allan Poe" مطبوعہ : دی پاکٹ لائبریری نیو یارک ' مارچ ۱۹۵۲ء صفحہ ۲۸ تا ۴۹ ۔ اس افسانے کا ترجمہ حامد علی خان نے رسالہ "ہمایوں" یکم جون ۱۹۳۵ء کے لیے "کالی بلی" کے عنوان سے کیا تھا ۔

(۷) بحوالہ "میری ادبی زندگی" از حجاب امتیاز علی مطبوعہ : "نیرنگ خیال" راولپنڈی "سالنامہ"

(۸) بحوالہ "نقوش" "لاہور آپ بیتی نمبر" صفحہ ۸۸۸

"انگارے گروپ" کا باغیانہ لحن

(سید سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر)

۱۹۳۲ء میں پروفیسر محمد مجیب کا افسانوی مجموعہ "کیمیاگر اور دوسرے افسانے" اردو افسانے کو ایک نئی کروٹ دینے کے لیے بنیادیں فراہم کر گیا۔ روسی افسانہ نگاروں کے زیر اثر لکھے گئے نو افسانوں کا یہ مجموعہ مذہبی اور معاشرتی جکڑ بندیوں سے بغاوت کا اولین اعلان تھا۔ اس روایت میں توسیع "انگارے" مرتبہ احمد علی (مطبوعہ: ۱۹۳۲ء) کی اشاعت اور ضبطی ہے۔ (۱) یہ نو افسانوں کا مجموعہ تھا۔ پانچ سجاد ظہیر کے، ایک رشید جہاں دو احمد علی اور ایک محمود الظفر کا۔ یہ تمام افسانے فرائیڈ کے ساتھ فرانسیسی فطرت نگاروں اور مارکس ازم کے اثرات کے تحت لکھے گئے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ "انگارے" کے افسانے تدبیر کاری کے اعتبار سے ایمائل زولا، جیمز جوائس، ڈی ایچ لارنس اور فلابیئر موضوعاتی سطح پر سگمنڈ فرائیڈ اور نظریاتی اعتبار سے مارکس اور اینگلز کے زیر اثر تھے اور مذہب پر حملے، شدید پابندیوں کا شدید رد عمل تھا۔

"انگارے" کی اشاعت کے خلاف بھی اتنا ہی شدید رد عمل دیکھنے میں آیا۔ لوگوں نے "انگارے" کی کاپیاں بک اسٹالوں سے اٹھا کر مختلف شہروں میں نذر آتش کیں۔ "انگارے" کے جملہ افسانہ نگاروں کو Iconoclast کہا گیا اور مشرقی روایات کے ان باغیوں کا سماجی بائیکاٹ بھی کیا گیا بقول سجاد ظہیر:

"انگارے اور اس کے مصنفین کے خلاف بڑا سخت پراپیگنڈہ کیا گیا، حسب دستور مسجدوں میں ریزولیوشن پاس ہوئے۔ عبدالماجد دریابادی خم ٹھونک کر ہمارے خلاف اکھاڑے میں آ گئے، ہمیں قتل کرنے کی دھمکی دی گئی اور بالا آخر صوبہ متحدہ کی حکومت سے اس کتاب کو ضبط کروایا گیا۔"

("روشنائی" سے اقتباس)

اس مجموعے کی ضبطی سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی جدو جہد اور سماجی جکڑ بندیوں کے خلاف اندر ہی اندر پلنے والی تحریک ایک نئے مرحلے تک آن پہنچی تھی۔ یہ مرحلہ طبقاتی تضاد کے شعور کا مرحلہ بھی تھا۔ یوں "انگارے" کی اشاعت سے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کو ترویج ملی۔

اس سے قبل سجاد حیدر یلدرم نے جذبے اور شعریت کی بازیافت چاہی اور پریم چند نے "عقلیت پسندی" اور "مقصدیت" میں اصلاح اور قومیت کا تصور شامل کر دیا۔ یوں آدرش حقیقت پسندی (راشد الخیری اور سلطان حیدر جوش) اور "رومانی مثالیت" (نیاز فتح پوری) کی دو الگ الگ دھارائیں بہنے لگیں۔

ترجمہ نگاروں کی معرفت عالمی ادبی منظر نامے کے زیر اثر موضوعات اور تدبیر کاری کے نئے افق سامنے آئے اور افسانہ نگاری سے متعلق نظریہ سازی نے اہمیت حاصل کی۔

پروفیسر محمد مجیب کا افسانوی مجموعہ "کیمیاگر" اور "انگارے" (مرتبہ احمد علی) کی روایت۔ نفسیات کا ورود۔ فرائیڈ، ڈی۔ ایچ لارنس اور تکنیک کا تنوع۔ طبقاتی تضاد کا شعور۔ سیاسی اور سماجی سطح پر جدوجہد کا نیا مرحلہ:

"قیامت کے دن میں جانتا ہوں کیا ہو گا۔ یہ عورتیں وہاں چیخ و پکار مچائیں گی وہ نخرے کریں گی، وہ آنکھیں ماریں گی کہ اللہ میاں

بیچارے ......"

("نیند نہیں آتی" از سجاد ظہیر سے اقتباس)

سجاد ظہیر، احمد علی اور رشید جہاں کے ان افسانوں میں زیریں لہر کمیونزم کی ہے اور روحانی اعتقادات پر کاری ضربیں لگائی گئی ہیں۔

۱۔ "موت یا آزادی؟"

"مجھے موت پسند نہ آزادی، کوئی میرا پیٹ بھردے"۔

۲۔ "اڑ گئی سونے کی چڑیا، رہ گئی دم ہاتھ میں۔ اب چاہتے ہیں کہ دم بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ دم نہ چھوٹنے پائے۔

"شاباش ہے میرے پہلوان! لگائے جا زور! دم چھوٹ گئی تو عزت گئی۔"

"کیا کہا! عزت؟ عزت لے کے چاٹنا ہے۔ سوکھی روٹی اور نمک کھا کر کیا بانکا جسم نکل آیا ہے۔ فاقہ ہو تو ہو پھر کیا کہنا اور اچھا ہے، پھر تو عزت ہے اور عزت کے اوپر خداوند پاک ----"

("نیند نہیں آتی" از سجاد ظہیر سے اقتباسات)

۱۔ "جب دوران درس میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو طالب علم سمجھتے تھے کہ مولانا پر کیف روحانی طاری ہے۔"

۲۔ "ان کے لمبے کرتے اور قبائیں، ان کی کفش اور سلیپر، ان کی دوپلی ٹوپیاں، ان کا گھٹا ہوا سر اور ان کی متبرک داڑھیاں، جن کے ایک ایک بال کو حوریں اپنی آنکھوں سے ملیں گی۔"

("جنت کی بشارت" از سجاد ظہیر سے اقتباسات)

"سرکار ہی کچھ کیوں نہیں کرتی؟ اور نہیں تو سب کو برابر روپیہ دلوا دے اور اگر اتنا نہیں تو صرف آدھا ہی ہم کو مل جائے لیکن سرکار کی جوتی کو کیا غرض پڑی جو اپنی جان ہلکان کرے، اس کے تو خزانے پر ہیں۔"

("مہاوٹوں کی رات" از احمد علی سے اقتباس)

"انگارے گروپ" کے افسانہ نگاروں میں سید سجاد ظہیر سب سے نمایاں تھے۔ ۱۳۴ صفحات کے اس مجموعے میں ان کے پانچ افسانے بالترتیب "نیند نہیں آتی"، "جنت کی بشارت"، "گرمیوں کی ایک رات"، "دلاری" اور "پھر یہ ہنگامہ" ۶۷ صفحات گھیرے ہوئے ہیں۔

"انگارے گروپ" کے نقاد کارلو کپولا کے مطابق "انگارے" کی ضبطی کا فوری سبب سجاد ظہیر کا افسانہ "جنت کی بشارت" تھا جبکہ سارے شواہد اس بات کے خلاف جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ "انگارے" کا سب سے خوفناک افسانہ "نیند نہیں آتی" (از سجاد ظہیر) ہی کا تھا۔

سید سجاد ظہیر کے افسانوں میں شعور کی رو کے ذریعے داخلی خود کلامی، سرریلزم اور داداازم کے رویے غالب دکھائی دیتے ہیں جبکہ موضوع کے مطابق بیانیہ پر خصوصی توجہ صرف کی گئی ہے۔

رشید جہاں کا نام "انگارے گروپ" کا دوسرا بڑا نام ہے لیکن اس مجموعے میں ان کا صرف ایک افسانہ بعنوان "دلی کی سیر" شامل ہے جسے اس کتاب کا سب سے بے ضرر افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ رشید جہاں کی جو شہرت آج ہے اس کا "انگارے" میں شامل تحریروں سے کوئی تعلق نہیں۔ (۲)

رشید جہاں نے کل انیس افسانے لکھے ہیں جو " عورت اور دیگر افسانے " اور " شعلہ جوالہ " نامی مجموعوں کے علاوہ " انگارے " (مرتبہ احمد علی) اور " میرے بہترین افسانے " (مرتبہ محمد حسن عسکری) میں یکجا کیے گئے ۔

رشید جہاں نے ہندوستان کی پہلی ترقی پسند خاتون ہونے کے ناطے اپنے افسانوں میں جرات فکر اور جرات بیان کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے اس دور میں " سودا " (مشمولہ " عورت ") جیسا افسانہ لکھنا مرد افسانہ نگاروں کے بس کی بات نہ تھی ۔ رشید جہاں کے افسانوں میں چڑ کہ لگانے اور چوٹ کرنے کا عنصر بہت نمایاں ہے ۔ اسے اس دور کی ادبی فضا پر چھائی ہوئی رومانیت کا شدید رد عمل بھی کہا جا سکتا ہے لیکن بقول قرۃ العین حیدر :

" ۱۹۳۸ء تک پہنچتے پہنچتے دنیا بدل چکی تھی ۔ گھر آنگن وہی تھے مگر باہر کی دنیا میں آندھیاں چل رہی تھیں ۔ ڈیوڑھیوں پر لٹکے ہوئے ٹاٹ کے ٹکڑے اور محل سراؤں اور کوٹھوں کے ڈرائنگ رومز کے مخملیں پردے ' سب کے سب اس آندھی میں پھڑپھڑانے لگے تھے اور ان کے اٹھنے سے اندر کی ایک بالکل نئی اور غیر متوقع جھلک دکھلائی دے گئی تھی ۔ " (۳)

احمد علی نے " انگارے " کے مرتب ہونے کی حیثیت سے انگارے گروپ کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ شہرت پائی ہے اور اس شہرت کو استحکام ان کے افسانوی مجموعوں بالترتیب " شعلے " (۱۹۳۶ء) " ہماری گلی " (۱۹۴۳ء) " قید خانہ " (۱۹۴۴ء) " موت سے پہلے " (۱۹۴۵ء) اور سب سے بڑھ کر ان کے ناول " دلی کی شام " (۴) سے ملا ہے ۔

تکنیک کے میدان میں احمد علی افسانے کا باعث بنے ' انہوں نے افسانے کو ابتدائی سالوں میں ہی سر ریلسٹ انداز سے متعارف کروایا (مثال " موت سے پہلے ") اور آزاد تلازمہ خیال میں لارنس اور جوائس کی تدبیر کاری کے تحت اپنا اولین افسانہ " مہاوٹوں کی رات " (مطبوعہ ہمایوں ۱۹۳۲ء) تخلیق کیا اور بعد میں اسی تدبیر کاری کے تحت " ہماری گلی " لکھ کر آزاد تلازمہ خیال کی تکنیک کا معیار قائم کر دیا ۔

" اے کاش ! وہ ہوتے ' وہ ٹانگیں ' ایک سرسبز درخت ' گوشت اور ہڈی اور گودے کا ۔ اس کا رس خون سے زیادہ گرم اور اس کی کھال گوشت سے زیادہ نرم ۔ ایک تنا ' سبک اور مضبوط اور دو ڈالیں اور ایک تنا ' ایک دوسرے میں پیوند ۔ ایک دوسرے سے چٹی ہوئی ' ایک دوسرے میں ایک تیسری روح کی امید ' ایک پوری زندگی کا خزانہ ' ایک لمحہ کا سرمایہ ' پر نیستی میں ہستی کی طاقت ۔ آہ ! وہ ٹانگیں ' دو ناگ بل کھائے ہوئے ' اوس سے بھیگی ہوئی گھاس پر مست پڑے ہیں ۔ ایک سوئی کے ناکے میں تاگا اور دو انگلیاں تیز تیز چلتی ہوئی ۔ "

(" مہاوٹوں کی رات " از احمد علی ـــ اقتباس)

احمد علی کے افسانوں میں قبر کا استعارہ معاشرتی جکڑ بندیوں اور گھٹن کا خوبصورت تخلیقی اظہار ہے اور اس کے افسانوں میں ماتمی انداز لیے ہوئے یادوں کا دھارا اس کے منفرد اسلوب کی پہچان ۔ سرر یلسٹ تدبیر کاری اور شعور کی رو کی افسانوی تدبیر کاری کا شمار احمد علی کی اولیات میں ہو گا ۔ بیسویں صدی میں پہلی بار ڈرامائی مونو لاگ کا استعمال براؤننگ نے کیا تھا اور پھر ایلیٹ کی " Prof Rock " ۔ احمد علی کے موضوعات میں ہندوستان کی اخلاقی اور سیاسی صورت حال ' مسلم گھرانوں کی زندگی ' مذہب اور مجموعی طور پر معاشی بے اطمینانی بہت اہم رہے ہیں (مثالیں " بادل نہیں آتے " اور " مہاوٹوں کی رات " مطبوعہ " انگارے ") شعور کی رو ان کے افسانوں میں حال ' ماضی اور مستقبل کو کبھی باہم یکجا کرتی ہے اور کبھی قطع ۔ ایسے میں دہلی کی کروٹ لیتی ہوئی معاشرت اور مشرق و مغرب کا تمدنی ' اخلاقی اور فکری تصادم عجیب و غریب اظہار پاتا ہے ۔

شکست کا احساس (گزرے دنوں کی یاد) نیم سیاسی اور جذباتی (دیار شفق) اور نتیجہ میں Isolation (مثال " قید خانہ ") ۔ احمد علی کو ان موضوعات کی پیش کش میں انفرادیت بخشنے کا باعث ان کے افسانوں میں تنہائی اور افسردگی کی لہر ہے جس کی خوبصورت مثالیں " ہماری گلی " کے افسانوں میں ملتی ہیں ۔ " شعلے " مسائلی تحریروں کو افسانہ بنانے کا ایک جتن ہے جس میں بعض مقامات پر فنی تقاضوں سے پہلو تہی کی صورتیں

بھی ملتی ہیں ۔ کہانی پن اور کردار نگاری کی مثالوں میں " استاد شمو خان " اور افسانہ " ہماری گلی " نمایاں ہیں ۔ احمد علی کا نمائندہ افسانہ " میرا کمرہ " اس عہد کے فرد کا ذہنی عکاس ہے ۔ اس فرد نے زندگی کے بارے میں جو سوچا وہ ہندوستان میں مروج سچائی کا معیار ٹھہرا :

" ہم جو زندگی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کے مانند ہیں ۔ اس بات پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جس طرح اس کا جی چاہے ہم کو نچائے ۔ "

احمد علی کے اس فکری ارتکاز کی بازگشت ہم آج بھی اردو اور ہندی فکشن میں سنتے ہیں ۔

محمود الظفر کا صرف ایک افسانہ بعنوان " جوانمردی " " انگارے " میں شامل ہے ۔ (۵) جبکہ یہ افسانہ بھی محمود الظفر نے انگریزی میں لکھا تھا اور سید سجاد ظہیر نے اسے اردو میں منتقل کیا ۔ " جوانمردی " میں محمود الظفر نے مردانہ جبریت کے حوالے سے ہندوستانی جوڑے کی سچی تصویر کشی کی ہے ۔

○

(۱) ۔ " انگارے " کی ضبطی کے بارے میں بعض تحریروں نے غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں ۔ اس کی ابتداء احمد علی کے ناول " دلی کی شام " کے دیباچہ از ایڈرسن سے ہوتی ہے اور انتہا ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے مضمون " اردو افسانے کے رجحانات " مطبوعہ : " سیپ " کراچی افسانہ نمبر میں ۔

(۲) ۔ " انگارے " میں شامل رشید جہاں کی دوسری تحریر " پردے کے پیچھے " اس کتاب کا واحد ڈراما ہے ۔

(۳) ۔ بحوالہ : " افسانہ " مشمولہ : " پکچر گیلری " مطبوعہ : قوسین ' لاہور صفحہ نمبر ۳۸

(۴) ۔ " Twilght In Delhi " مطبوعہ : برطانیہ طبع اول : ۱۹۴۰ء

(۵) ۔ صاحبزادہ محمود الظفر (۱۹۰۸ء ۔ ۱۹۵۶ء) ترقی پسند تحریک کی نظریہ ساز شخصیت ' ایم اے او کالج امرتسر کے پرنسپل اور ڈاکٹر رشید جہاں کے شوہر تھے ۔

ترقی پسند تحریک

(ڈاکٹر ملک راج آنند' دیوندر ستیارتھی' خواجہ احمد عباس' اختر حسین رائے پوری' کرشن چندر' عزیز احمد' عصمت چغتائی' راجندر سنگھ بیدی' احمد ندیم قاسمی' شمشیر سنگھ نرولا اور بلونت سنگھ)

سجاد ظہیر اور احمد علی نے ۱۹۳۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری کے ایک گوشے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا ابتدائی لائحہ عمل مرتب کیا (بمطابق احمد علی کا انٹرویو از سحر انصاری ۶۹ - ۱۹۷۰ء کراچی)

احمد علی اپنے ایک مضمون " تحریک ترقی پسند مصنفین اور تحقیقی مصنف "------ (مطبوعہ "سیپ" شمارہ ۴) میں لکھتے ہیں۔

" محمود الظفر نے میرے اور رشید جہاں کے مشورہ سے ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا اعلان کیا اور چونکہ سجاد ظہیر اس وقت لندن میں تھے' ان کی رضامندی کا ذمہ لیا جو بعد میں انہوں نے خود بذریعہ خط بھیج دی۔ چنانچہ ۳۳ - ۱۹۳۲ء میں اس کے باقی بانیوں کے سامنے جو مقصد تھا وہ بالکل ادبی تھا اور اس میں سیاسی رجحانات اس سے زیادہ نہ تھے کہ:

" ہم ان تمام اہم مسائل زندگی پر آزادی رائے اور تنقیدی حق چاہتے ہیں جو نسل انسانی کی بالعموم اور برصغیر کے لوگوں کو بالخصوص در پیش ہیں " - (۱)

اسی زمانے میں لیکن اس اعلان کے بعد برصغیر کے ادیبوں کا ایک جلسہ لندن میں بھی منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر ملک راج آنند' راجا راؤ' اقبال سنگھ اور سجاد ظہیر کے علاوہ دیگر حضرات بھی شامل تھے' جنہوں نے اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا۔

جب ۱۹۳۵ء - ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا دستور العمل زیر غور تھا ان دنوں' ملک راج آنند' سجاد ظہیر' احمد علی' رشید جہاں' ڈاکٹر تاثیر' ڈاکٹر عبدالعلیم ناہی' ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری' مجنوں گورکھپوری' ڈاکٹر اعجاز حسین اور رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری انجمن کے نصاب سے متعلق بحث مباحثوں میں سرگرمی سے حصہ لینے والے اہم نام تھے۔ واضح رہے کہ ان میں سے بیشتر اصحاب انڈین کمیونسٹ پارٹی کے رکن نہیں رہے اور نہ ہی اشتراکی نظام سے سرگرم دلچسپی رکھتے تھے' خصوصاً مجنوں گورکھپوری' رگھوپتی سہائے فراق' اعجاز حسین اور اختر حسین رائے پوری وغیرہ۔

اقبال سنگھ نے اپنا افسانہ " When one is in it " اور ڈاکٹر ملک راج آنند نے " مرغزار " ' " فطرت کا دل " اور "A Kashmir Idyll" لکھ کر ترقی پسندانہ افسانہ لکھنے کا فارمولا وضع کیا۔ ملک راج آنند نے دیہات نگاری کو ترقی پسندی کا تڑکا لگایا۔

" دن بھر مطلع صاف رہا تھا' لیکن شام ڈھلتے ہی بادل گھر آئے تھے اور بارش کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی ہیبت ناک دیو چنگھاڑ رہا ہو اور اس کے نوکیلے دانتوں کی چمک سے بجلی کوند رہی ہو۔ دفعتاً بادلوں کی وحشت ناک گڑگڑاہٹ وادی میں گونج اٹھی اور کسانوں کی لڑکیاں مرغی کے چوزوں کی مانند سہم کر اپنی اپنی پھوس کی جھونپڑیوں میں دبک گئیں۔ "

(" فطرت کا دل " سے اقتباس)

اس ضمن میں اقبال سنگھ کے افسانے کا بے روزگار مرد اور عورتوں کا ہجوم '' کھمباٹا اینڈ کھمباٹا لمیٹڈ '' طرز کا کارخانہ 'بہتا ہوا خون اور مل کے مینجنگ ڈائریکٹر کا کرداری مطالعہ کرتے ہوئے سماجی موضوعات پر نفسیاتی تجزیہ بہت اہم ہے اور یوں یہ فارمولا پریم چند کے "ڈابل کا قیدی" سے ہوتا ہوا آج کے نو ترقی پسند افسانہ نگار تک پہنچا۔

شروع سے ترقی پسند افسانے میں یہ کھیلا رہا کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر پارٹی کے مرتبہ عقائد کو بار بار دہرایا گیا اور وہ بھی اس صورت میں کہ ترقی پسند اصولوں سے ذرہ برابر روگردانی نہ ہونے پائے۔ اس سے یہ تو ہوا کہ ترقی پسند مینی فیسٹو کی پابندی احسن طریق پر ہوئی لیکن ادب کا باقاعدہ قاری بار بار لکیر پیٹنے کے اس عمل سے بیزار بھی ہوا۔ البتہ ترقی پسند افسانہ اپنے عقائد زندگی کے ہر طبقہ فکر کے لوگوں تک پہنچانے کی فکر میں نئے موضوعات کی پیش کش کے امکانات بعد میں آنے والوں کے لئے ایک حد تک ختم کر گیا۔ افسانے کی فارم 'تدبیر کاری اور زبان کے ور تارے کی سطح پر البتہ ترقی پسند نظریات کا حامل افسانہ جامد نظر آتا ہے اور ایسے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ناموں کی فہرست طویل ہے جن کے افسانے ترقی پسند مینی فیسٹو کے تحت خارجیت 'حقیقت نگاری اور مقصدیت کی تثلیث کا شکار ہوئے۔ اس کے باوجود ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے کو متعدد جاندار آوازیں بخشیں۔ ایسے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر ملک راج آنند 'دیویندر ستیار تھی 'خواجہ احمد عباس 'اختر حسین رائے پوری 'کرشن چندر 'عزیز احمد 'عصمت چغتائی 'راجندر سنگھ بیدی 'احمد ندیم قاسمی 'شمشیر سنگھ نرولا اور بلونت سنگھ کے نام بہت نمایاں ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ڈاکٹر ملک راج آنند ترقی پسند تحریک کے نظریہ ساز و فارمولسٹ افسانہ نگار تھے اور یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ انہوں نے ترقی پسند افسانہ تراشنے میں پہل کی 'ایک ایسا افسانہ جو ترقی پسند مینی فیسٹو کے عین مطابق ہو اور جس کے ذریعہ طبقاتی شعور ابھار کیا جا سکے۔

ملک راج آنند نے بیک وقت انگریزی اور اردو میں لکھ کر عالمی سطح پر شہرت پائی۔ انگریزی میں ان کے ناول "The Untouchable" "Sword And the sickle" "Coolie" اور "The big Heart" بہت مشہور ہوئے۔ آپ کا تعلق پنجاب سے تھا اور پیدائش سرحد کی 'اور اس دور کا ہندوستان نا قابل برداشت یا بگذاری اور معاشرتی بغاوت کا گڑھ تھا۔ آپ نے کچلے ہوئے لوگوں کی نفسی کیفیات کو "A Kashmir Idyll" '' مرغزار '' '' فطرت کا دل '' اور '' دھرتی کا پھل '' جیسے افسانے لکھ کر کمال ہوشمندی کا مظاہرہ کیا۔ افسانوں میں سماجی موضوعات کی سطح پر طبقاتی تناؤ اور تدبیر کاری کی سطح پر نفسیاتی تجزیے ان کے من پسند موضوع رہے ہیں 'لیکن کچھ اس طرح کے ابلاغ کا کوئی مسئلہ سر نہ اٹھا سکا۔ ان کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ زیادہ تر کشمیر اور آسام کا علاقہ رہا ہے۔

'' دھرتی کا پھل میٹھا ہے!

اور محنت کا رنگ کڑوا ہے

گنگو اس گیت کو بے خودی نیم خوابی اور ماندگی کی حالت میں گائے جا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پھاوڑے سے زمین کا سینہ چاک کئے جا رہا تھا۔ اس کے دو بیل بھی تھے موتی اور دینا لیکن اس ملک میں آنے سے پہلے وہ انہیں بیچ آیا تھا 'اور آج کی تکان سے اسے وہ بیل یاد آ رہے تھے۔ موتی اور دینا!

اس کا ایک دوست تھا بوٹا۔ وہ اسے یوں ہی سبز باغ دکھا کر آسام میں لے آیا۔ چونکہ بوٹا میکنزی اسٹیٹ میں ملازم تھا۔ اس لئے گنگو کو بھی اس کی باتوں کا یقین آ گیا۔ اسے یہ کہا گیا تھا کہ تمہیں پندرہ روپے ماہوار ملیں گے چائے کے کھیتوں میں کام کرنا ہو گا اور ساتھ ہی زمین کا ایک ٹکڑا بھی مل جائے گا۔ جس میں وہ چاول وغیرہ بو سکے گا۔ یہاں پہنچ کر ایک مدت تک اسے زمین کا ٹکڑا نہ مل سکا۔ آخر ایک دن اس کی بیوی ساجنی ملیریا سے مر گئی۔ جو ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا تھا اس نے گنگو کی حالت پر ترس کھایا۔ منیجر صاحب کو بھی ڈانٹ پلائی تو اسے زمین کا ٹکڑا ملا۔ '' ('' دھرتی کا پھل '' از ملک راج آنند سے اقتباس)

دیوندر ستیارتھی کی نمایاں پہچان ترقی پسندی اور وطن پرستی ہے۔ ان کے افسانوں میں دیہی فضا کو گرفت میں لینے کے ضمن میں رنگوں اور گیتوں کی خاص اہمیت ہے۔ ابتداء میں ستیارتھی نے من کی لہر پر لکھا اور تکنیکی لوازمات کا اتنا خیال نہیں رکھا جس قدر کہ لینڈ اسکیپ اور لوک گیتوں کے حوالے سے کردار سازی پر توجہ صرف کی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کے ہاں تکنیکی تنوع اہمیت حاصل کرتا گیا اور یوں ان کے کامیاب افسانوں میں تکنیکی مہارت دھرتی کی بوباس کا انوکھا تال میل اور رابندر ناتھ ٹیگور کے طرز کی کردار نگاری ایک انوکھے تجربے میں ڈھل گئی۔

دیوندر ستیارتھی کے افسانوں کا ایک نمایاں وصف انشاپردازی کا مخصوص رنگ 'الفاظ کا مناسب ترین انتخاب اور بیان کا ٹھہراؤ ہے۔

دیوندر ستیارتھی کے افسانوں کا ہر لمحہ تبدیل ہوتا ہوا دیہاتی لینڈ اسکیپ ہمیشہ قابل توجہ رہا تھا۔ بعض اوقات ستیارتھی کے افسانوں میں دیہات 'شہر اور جنگل اپنے باسیوں سمیت باہم ایک ہو گئے ہیں اور اس نئی ترتیب کی پوری پور سے ہندوستان کی مٹی کی خوشبو اور گیتوں کی مدھر لے امڈ امڈ پڑتی ہے۔ دیوندر ستیارتھی کے ہاں جنسی الجھنیں 'معاشی ناہمواریاں اور "عورت" بنیادی موضوعات رہے ہیں۔ ایسے میں "مائی تماں" جیسی کامیاب کردار نگاری ستیارتھی کا ہی حصہ ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانوں میں تدبیر کاری کی سطح پر کیمرہ تکنیک اور بیان کی سطح پر صحافیانہ اپروچ سے کام لیا 'جس کے سبب ان کے افسانوں میں کبھی تصنع کی فضا محسوس ہوئی اور کبھی انتہائی صاف گوئی اور بے باکی کھلنے لگی۔ ان ہر دو طرح کی خامیوں یا خوبیوں کے ضمن میں خواجہ احمد عباس کو کرشن چندر کا پیش رو کہنا چاہئے۔ اسی طرح خواجہ احمد عباس کا نام اپنے اسلوب کے اعتبار سے کرشن چندر کی روایت سے متعلق ہے لیکن موضوعات کی سطح پر خواجہ احمد عباس خود کرشن چندر اور بیشتر ترقی پسند افسانہ نگاروں ابراہیم جلیس اور شوکت صدیقی کے لیے راہ نما ثابت ہوا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خواجہ احمد عباس سب سے پہلے بطور موضوع شہر کی مصروف زندگی اور کاروباری ذہنیت کو گرفت میں لینے پر قادر ہوا۔ احمد عباس سے پہلے اردو افسانے میں شہر کی خام تصویر کاری 'پریم چند' مہاشہ سدرشن 'علی عباس حسینی اور رشید جہاں کے ہاں بہت ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں مصروف کاروباری شہر اپنے تمام شر اور خیر سمیت صحافت کے وسیلے سے اپنی اصل ذہنیت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ یوں شہر کے ہنگامے اور حادثات نے افسانے کو نیا منظر نامہ مہیا کر دیا۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوی مجموعے "زعفران کے پھول" کے تینوں طویل افسانے اخباری رپورٹر کا طریقہ کار لیے ہوئے ہیں۔ زعفران کے کھیت میں کھڑی بڑھیا کا شہری بابو سے مکالمہ رفتہ رفتہ خود کلامی میں ڈوب جاتا ہے اور شہر کی جانب تیزی سے جاتی بل کھاتی ہوئی سڑک پر افسانہ نگار رواں دواں ہے "زعفران کے پھول" "اجنتا" اور "اندھیرا اجالا" بالترتیب شہر کی مقتدر ہستیوں کرشن چندر 'علی سردار جعفری اور پرتھوی راج کپور کے نام کیے گئے ہیں۔ پہلا افسانہ کشمیر کے حوالے سے لکھے گئے کرشن چندر کے افسانوں کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ جبکہ "اجنتا" سردار جعفری کے باغیانہ مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔ پرتھوی راج کے نام "اندھیرا اجالا" ہے 'جس میں انڈین فارمولا فلم کی تکنیک کامیابی سے برتی گئی ہے۔ موضوعاتی سطح پر تینوں افسانے شہر کے کھوکھلے پن کی عکاسی کرتے ہیں۔ "اندھیرا اجالا" کی ابتدا ہیرو کے تعارف سے ہوتی ہے پھر ہیروئن ہے' ہیرو کی امید کے جگمگاتے چراغ؛ ہیرو کا ہیروئن کو چھوڑ کر سنہری تتلی کی طرف جھکاؤ' ہیروئن کا عشرت کدہ اور گرتی چائے' وقفہ۔ وقفہ کے بعد ہیرو کی واپسی' ہیروئن سے قربت' ہیروئن بجائے مغموم غزل گانے کے انقلابی نعرہ بلند کرتی ہے' زہر عشق تنگجر آیوڈین ثابت ہوتا ہے' شادی کی تیاری مگر...... آخر کار ملاپ۔

اس افسانے میں فلم تکنیک کا کامیاب برتاؤ پہلی بار کیا گیا ہے جب کہ اسی تدبیر کاری کے تحت "بمبئی رات کی بانہوں میں" شاہکار ہے۔

خواجہ احمد عباس کے ہاں ایک طرف تو "چاکلیٹ اور وقت" جیسے کومل افسانے میں اور دوسری طرف "چوراہا" جیسے چونکا دینے والے

کرخت حقائق پر مبنی افسانے۔ جن میں سٹہ بازار' رام کنڈ کا پوتر پاپی' نیویارک کائن ۔ اوپن کلوز اور فلم پروڈیو سر سب ایک ہو گئے ہیں۔

خواجہ احمد عباس کا بطور افسانہ نگار سب سے بڑا جوہر ان کے مخصوص نکتہ نظر میں پوشیدہ ہے۔ وہ شدید قسم کے قوم پرست واقع ہوئے ہیں اور ان کی یہ قوم پرستی پاکستان کے کئی ملا ادبی حلقوں میں ناگوار خاطر رہی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ کیا کہتے ہیں اور اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے' اردو افسانے کی تاریخ میں خواجہ احمد عباس ایک واضح اور دو ٹوک نکتہ نظر کے حامل افسانہ نگار کے طور پر ہمیشہ باعث نزع بھی رہیں گے اور یاد بھی رکھے جائیں گے۔ البتہ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ فکری سطح پر خواجہ صاحب کے فکری نظام کے سائنٹیفک تجزیے کی ضرورت بھی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔

خواجہ احمد عباس کی طرح کرشن چندر کے ہاں شہر میں روز مرہ ضروریات کے تحت تبدیل ہوتا ہوا انسانی برتاؤ مفاہمت اور حرص کی عجیب و غریب تصویریں سامنے لاتا ہے۔ احمد عباس کے منگو (میرلین کی پتلون) اور کرشن چندر کے چندرو (چندرو کی دنیا) کی ایک سی کائنات ہے' ایک سی معصوم خواہش اور ان کے چہار جانب منافقت کا دریا رواں ہے۔ "میری لین کی پتلون" میں افسانہ نگار جو مناظر دکھا رہا ہے' اس منصب پر "بمبئی رات کی بانہوں میں" کا پریس رپورٹر" ارجن" بھی فائز ہے۔ ارجن جس نے زندگی کے پھیلاؤ سے بھاگ کر چند گھڑیاں محبوب کی بانہوں میں گزارنی چاہی ہیں۔ بڑے شہر کی تاجرانہ ذہنیت کس طرح انسانی اقدار کی صورتیں مسخ کرتی ہے اور مجرم کرداروں کے ساتھ خیر چاہنے والے کردار کیسے ہیں جو نیکی اور پاکیزگی کے خواب دیکھتے ہیں؟ ان سب کی تصویر کاری خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر کے بعد کشمیری لال ذاکر کے افسانوں میں ایک معیار قائم کرتی ہے۔

۱۹۳۶ء میں جب کرشن چندر کی اولین تحریر "ہوائی قلعے" (انشائے لطیف) رسالہ "ہمایوں" میں شائع ہوئی تو مدیر ہمایوں میاں بشیر احمد نے اسے مندرجہ ذیل الفاظ میں سراہا تھا:

"مسٹر کرشن چندر کا شمار اردو کے موجودہ ادباء کی صف اول میں ہو سکتا ہے۔ اس نوجوان ادیب کی نفیس اور زور دار زبان' میر حاصل اور رنگین تخیل اور گہرا نفسیاتی مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ یہ شخص ہماری زبان کا ایک زبردست ادیب ثابت ہو گا۔"

آگے چل کر کرشن چندر نے اپنے افسانوں کے ذریعے موضوعی سطح پر اس روایت کو آگے بڑھایا جو پریم چند سے ہوتی ہوئی کرشن چندر کے سینئر ہم عصر علی عباس حسینی تک پہنچی تھی اور جس میں حسینی نے دلکش نثر نگاری کا اضافہ کر دیا تھا۔ کرشن چندر نے اپنے بہترین افسانوں خصوصاً "مہالکشمی کا پل" "دس کا نوٹ" "جوتا" اور "چندرو کی دنیا" میں اردو افسانے کی اس پھلتی پھولتی ہوئی روایت کو اپنی تکنیکی مہارت اور شوخی بیان سے مزید سنوارا۔

اس روایت میں کرشن چندر کی ایک منفرد خوبی اس کی جرات فکر ہے' یہی وہ سبب ہے کہ اس کے افسانے تقریباً پینتیس برس پر محیط معاشرتی اور سیاسی کروٹوں کے ترجمان بن گئے۔

اختر حسین رائے پوری کی اولین شہرت ترقی پسند ادب کے نقاد کی ہے اور ان کا مضمون "ادب اور انقلاب" اردو میں ترقی پسند تنقید کی بنیاد ہے۔ بطور افسانہ نگار اختر حسین رائے پوری کی پہلی اور آخری پہچان افسانوی مجموعہ "محبت اور نفرت" کے افسانے ہیں۔ یہ الگ قصہ ہے کہ انہوں نے اس پہچان کے حصار کو طویل سفر اختیار کر کے توڑنے کی سعی کی اور ۱۹۴۷ء کے ہنگام سے بہت پہلے مسافرت کے دوران لکھے گئے نسبتاً "وسیع منظر نامے سے متعلق افسانوں کا مجموعہ "زندگی کا میلہ" ترتیب دے لیا تھا لیکن یہ مجموعہ بہت بعد میں جا کر شائع ہوا اور "محبت اور نفرت" کی شہرت جوں کی توں رہی۔

"زندگی کا میلہ" میں شامل افسانوں کو خود انہوں نے "ایک بھٹکی ہوئی روح کے سفر کا جستہ جستہ احوال" اور "انسانیت کے پر سوز المیہ کا ماتم" قرار دیا ہے۔ ان افسانوں میں شدید بے زاری' تلخی اور بے تابی کا عنصر نمایاں ہے۔

اختر حسین رائے پوری کی افسانہ نگاری کا آغاز افسانہ "زبان بے زبانی" مطبوعہ "نگار" لکھنؤ مارچ ۱۹۳۴ء سے ہوا اور انہوں نے اپنے

افسانوں میں رومان اور حقیقت پسندی کا ایک انوکھا امتزاج پیش کیا۔ اس ضمن میں وہ خود رقم طراز ہیں:

" رومان بھی زندگی کی ایک تلخ حقیقت ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کی کلفتوں کو چھپایا جائے۔ میں ایسا دن نہیں چاہتا جس کی کوئی رات نہ ہو اور نہ اس نیند کا قائل ہوں جس میں سپنے نہیں دکھائی دیتے۔ "

(دیباچہ " محبت اور نفرت " سے اقتباس)

اختر حسین رائے پوری نے سنسکرت، ہندی، بنگالی، انگریزی اور فرانسیسی فکشن کے وسیع مطالعے سے اپنے اس مخصوص اسلوب کی نوک پلک سنواری ہے۔ تقریباً سب رومان پسندوں نے رومان کو کلاسیکیت کی نہیں حقیقت پسندی کی ضد خیال کیا ہے جبکہ اختر حسین رائے پوری رومان اور حقیقت پسندی دونوں کی جانب بازو پھیلائے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے میں نے اختر رائے پوری کو رومان پسندوں میں شمار نہیں کیا۔

اختر حسین رائے پوری نے اپنے افسانوی مجموعے " محبت اور نفرت " میں اپنے افسانوں کو یہی دو عنوانات دیے۔ " محبت " کے افسانے رومانی ہونے کے ساتھ ساتھ نثر میں شعریت کی جستجو کرتے ہیں جبکہ " نفرت " کے افسانے حقیقت پسندی کی مثال ہیں۔ افسانوی تدبیر کاری کی یہی دو انتہائیں مجموعہ " زندگی کا میلہ " میں بھی نمایاں ہیں۔ جنسی اور اخلاقی پستی پر اختر حسین رائے پوری کا طنز بہت گہرا ہے اور زندگی کا میلہ کے افسانے اپنے کرداروں کی سیماب صفتی، تلخ کامی اور گرد و پیش کی صورت حال سے شدید بیزاری کے مظہر ہیں۔ (۲)

اختر حسین کے افسانوں میں لینڈ اسکیپ کا تحرک خصوصی طور پر توجہ طلب ہے۔ ایک طرف افسانہ " کافرستان کی شہزادی " چترال کی وادی میں بہت سے متعلق ہے اور دوسری طرف " دل کا اندھیرا " جنگ عظیم کے فوراً بعد کے پیرس کی پیش کش۔ اختر حسین رائے پوری کی رومانوی رو میں داستانوی انداز بہت نمایاں ہے:

" کافرستان کی شہزادی کا جسم نازنین ایک صندوق میں بند کر کے کسی پہاڑ پر رکھ دیا گیا ہے۔ امیلیا نے کسی سے شادی کر لی اور پیرس کے کسی ریستوران میں اس روز ایک دوسرے کو دیکھ کر بھی نہ پہچان سکے۔ نوجوانی میں برگد کے پیڑ کی پیری پر ہنستے تھے اور نہ جانتے تھے کہ اس ہنسی کی صدائے بازگشت آج سنیں گے۔ "

(" زندگی کا میلہ " سے اقتباس)

عزیز احمد بنیادی طور پر بیانیہ کے آدمی ہیں اور افسانے میں حقیقت واقعہ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہوئے کہانی کا پلاٹ بنانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ انھوں نے بیان کے لیے ہمیشہ تاریخ اور کہانی کو ہم اصل خیال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے خصوصاً " شعلہ زار الفت " (مطبوعہ " نگار " نومبر ۱۹۳۰)، " میرا دشمن میرا بھائی " (مطبوعہ " نقوش " شمارہ اول) " زریں تاج " اور " آب حیات " (مطبوعہ " سویرا " شمارہ نمبر ۱۰۔ ۱۱) تاریخ سے جنم لیتے ہیں۔ لیکن یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ تاریخ سے متعلق ان افسانوں کو سرکاری درباری یا تبلیغی نوعیت کے کام سے الگ کر کے دیکھنا ہو گا، اس لیے کہ عزیز احمد تاریخ سے متعلق اپنا ایک مخصوص فلسفیانہ نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ یوں یہ کہنے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ قرۃ العین حیدر کا ناول " آگ کا دریا " محمد احسن فاروقی کا " سنگم " عبداللہ حسین کا " اداس نسلیں " اور سلمان رشدی کا " مڈنائٹس چلڈرن " عزیز احمد کی اردو ادب میں پیدا کردہ روایت کی چیزیں ہیں۔

عزیز احمد کے افسانوں میں تمثیل کے زیر اثر عاشق اور محبوب پہلی دوسری ملاقات میں ہی کھل کھیلتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہمارے بیشتر داستانوی کرداروں کی طرح عاشق کا کردار حد درجہ فعال اور محبوب انتہا درجے کا عکس واقعہ ہوا ہے۔

عزیز احمد نے ترقی پسند فارمولہ کے تحت لکھے جانے والے افسانوں کی پیدا کردہ یکسانیت کے تنگ حصار کو تمثیل، داستان اور اساطیر کی زرخمنٹ سے توڑنے کا جتن کیا ہے۔ میری اس بات کو مان لینے میں اس لیے بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے کہ عزیز احمد " آورش

"حقیقت نگار" اور "ترقی پسند ادیب" ہونے کے باوجود کمیونسٹ مینی فیسٹو کے پابند لکیر کے فقیر بھی نہیں رہے۔ بقول عزیز احمد:

"اشتراکی ملک کے رہنے والا "نیا انسان" بھی جب عام معاشی مسئلے حل کر چکے گا تو وہ ایک باطنی اندرونی خلاء محسوس کرے گا، جس کے لیے وجدانی احساس کی ضرورت ہو گی۔"

("ترقی پسند ادب" سے اقتباس)

یہی وجہ ہے کہ عزیز احمد اپنے افسانوں میں اسی وجدانی احساس کی بازیافت کے لیے کوشاں رہے۔

عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری کا آغاز لگ بھگ ۱۹۳۵ء میں اس دور کے بڑے رومان پسندوں خصوصاً نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور حجاب امتیاز علی کے زیر اثر ہوا لیکن ۱۹۳۸ء تک آتے آتے عصمت چغتائی کی فکر اشتراکی سوچ کی آماجگاہ بن گئی، جس کی اولین مثال افسانہ "نیرا" (مطبوعہ "ساقی" جون ۱۹۳۹ء) ہے۔ اس تسلسل میں عصمت چغتائی نے اپنے متعدد شاہکار افسانے تخلیق کیے ہیں جن میں "لحاف"، "اف یہ بچے"، "ساس"، "چھوئی موئی"، "پنکچر"، "مغل بچہ"، "چابڑے"، "ایک بات"، "چوتھی کا جوڑا"، "جڑیں"، "مٹی مالش" اور "ننھی کی نانی" ایسے لازوال افسانے ہیں جن کی گونج اردو افسانے کے ایوان میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی جرات فکر اور جرات اظہار ہے جس کے ذریعے عصمت چغتائی نے پردے کے پیچھے بسورتی ہوئی ہندوستانی عورت کو باہر کھینچ نکالا اور حجاب امتیاز علی کی رومان پسندی کے برعکس لہر۔نہ ہندوستانی عورت کی دنیا پر توجہ صرف کی۔

عصمت چغتائی نے عورت کے جہان کی معاشرتی پیچیدگیوں اور گھٹن کے احساس کو کچھ اس طرح پیش کیا کہ مرد افسانہ نگار منہ تکتے رہ گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ عصمت کے ہاں مرد کی جبریت کا رد عمل کسی حد تک ابھر کر شدید باغیانہ لہجے میں بھی ڈھل گیا، تاہم عصمت چغتائی کی زبان و بیان پر کامل گرفت نے انہیں وہاں بھی سہارا دیا اور یوں بقول پطرس بخاری "انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں کہ جب تک وہ کھڑی تھیں، کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے۔"

عصمت چغتائی کو ہمارے ادبی ناقدین ایک زمانے تک مان کر نہیں دیے۔ ان کے اولین افسانے "کافر" (مطبوعہ: "ساقی" ۱۹۳۸ء) کی اشاعت کے بعد یکے بعد دیگرے "خدمت گار"، "بچپن" اور "ڈھیٹ" جیسے شوخ و شنگ افسانے ۱۹۳۸ کے ہی سال میں سامنے آئے تو ادبی دنیا میں کھلبلی بھی مچی اور کسی کو یقین بھی نہ آیا کہ یہ عصمت چغتائی کے ہی افسانے ہیں یہاں تک کہ عصمت کا اولین افسانوی مجموعہ "کلیاں" (مطبوعہ: ۱۹۴۰ء) چھپ کر آگیا اور "ادبی دنیا" کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد نے "لحاف" پڑھ کر کہا:

"عصمت کے فن کی غالباً سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بصیرت کی ایک نہایت بے باک اور صداقت شعار ترجمان ہیں، اور اگرچہ ان کی یہ ترجمانی ان کی نگارش کی پرکاری کا نقاب اوڑھے رہتی ہے لیکن ازبسکہ وہ ایک ہندوستانی عورت ہیں، اس لیے اس نیم پختہ دور میں انہیں اپنی جرات کی وہ داد نہیں مل سکتی جو ان کا حق ہے۔ داد تو ایک طرف اگر وہ اس بیداد سے بچ جائیں، جس کی ارزانی میں معترضوں کے دل ان کی زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے تو بسا غنیمت ہے۔"

یہاں تک کہ "چابڑے"، "مغل بچہ" اور "گلدان" تک آتے آتے عصمت چغتائی کے افسانوں کے فقروں، کتابوں، آوازوں، اشاروں، کرداروں، احساسات اور جذبات کے بلاخیز بہاؤ نے توصیف و تنقید سے بے نیاز رہ کر اپنا ایک الگ جہان خلق کیا ہے، جس کی مکین عصمت سب سے الگ اور منفرد مقام پر دکھائی دیتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی جیسے افسانہ نگار کسی زبان میں کم کم پیدا ہوتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی یہ سب سے بڑی عطا ہے کہ اردو افسانے کو بیدی جیسا افسانہ نگار ملا۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں خارجی زندگی کی پیش کش کے دوران انسانی شخصیت کے داخلی عناصر اس قدر چپکے سے شامل ہو جاتے

ہیں کہ محسوس تک نہیں ہوتا اور بیدی خارج اور داخل کا ایک ایسا مونتاج بننے میں کامیاب ہو جاتا ہے جسے زندگی کہتے ہیں۔ بیدی کے افسانوں میں سب سے بڑا محرک ان کی جذباتیت کی زیریں لہر ہے جو قاری پر نامحسوس طور پر اثر انداز ہوتی ہے اور زبان و بیان کی کمزوریوں کو بیدی کی سب سے بڑی طاقت بنا دیتی ہے۔ اس منفرد سحرکاری کا اعجاز "صرف ایک سگریٹ" "ایک روز اقیم چوہستے کے پاس کیا ہوا" "گرم کوٹ" اور "بولو" جیسے افسانوں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف بیدی کے ہاں موضوعات پر ارتکاز کے سبب تنوع کی کمی کے باوجود اہم ترین چیز ہندی اساطیر کے ساتھ گہری پیوستگی ہے جس نے اردو ادب کو "گرہن" "لاجونتی" "لمبی لڑکی" "ببل" "سونفیا" "جو گیا" اور "متھن" جیسے شاہکار بخشے ہیں جو زبان و بیان کی کمزوریوں کے باوجود کچھ اس نوع کے رچاؤ کے حامل افسانے ہیں جس کی مثال عالمی ادب میں بھی خال خال دکھائی دیتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے فن پر بات کرتے ہوئے پروفیسر مجتبیٰ حسین نے ۱۹۵۶ء میں بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ اس کے افسانوں میں تعمیر اور تکمیل کا جو ہر سب افسانہ نگاروں سے بڑھ کر ہے اور بیدی کی قوت تعمیر اپنی سست روی کے لحاظ سے ناول نگاری کے لئے نہایت موزوں۔

یاد رہے کہ اس وقت تک بیدی کا ناولٹ "اک چادر میلی سی" شائع نہیں ہوا تھا اور اس کے بعد بیدی کے آخری افسانے "بولو" کی تکمیل تک وہ کوئی ناول نہیں لکھ پائے۔ اے کاش! ایسا ممکن ہوتا۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ نے اپنے افسانوں کے ذریعے دیہات کی چہرہ نمائی کی۔ ان دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں رومانی فضا بندی اور رومانی کردار نگاری کا رنگ غالب ہے۔ لیکن شاید اس کی ایک وجہ ان دونوں کا پنجاب سے متعلق ہونا اور پنجاب کے دیہات کا ہندوستان کے دیگر دیہی علاقوں کی نسبت زیادہ رومان پرور ہونا ہے۔

اس نظریاتی رومان نگاری میں ندیم اور بلونت سنگھ کا فرق کچھ ایسا ہی ہے جیسے ولیم ورڈز ورتھ اور کولرج کی رومانی شاعری کا فرق۔ یعنی ندیم معصوم فطرت کو چنتے ہیں اور بلونت قہار فطرت کو۔ دوسری طرف بلونت سنگھ نے پنجاب کے سکھ طبقے کی ترجمانی کی اور ندیم نے مسلم معاشرت کی۔

احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ اپنے اولین مجموعوں "چوپال" اور "جگا" کے بعد حقیقت نگاری کی طرف آئے اور جہاں جہاں حقیقت اور رومان میں توازن قائم کر پائے۔ وہاں شاہکار افسانوں نے جنم لیا جیسے ندیم کا "پرمیشر سنگھ" "گنجری" "کنجرا سا" اور "لارنس آف تھلیبیا" یا بلونت سنگھ کا "اروا س" اور "کالی تیتری"۔

جس طرح سعادت حسن منٹو نے فکر رسائی کی کو زور تخیل اور جرأت اظہار سے پاٹنے کی کوشش کی، بعینہٖ ندیم اور بلونت سنگھ نے اس کمی کو اپنے اپنے مخصوص لینڈ اسکیپ اور مخصوص کردار نگاری پر توجہ مرکوز کر کے اپنی انفرادیت کو منوالیا۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ شمال مغربی پنجاب کی سطح مرتفع اور مغربی پنجاب کے تھل کا علاقہ ہے اور بلونت سنگھ کے افسانوں کی بوباس مشرقی پنجاب خصوصاً ماجھے کے علاقے سے متعلق ہے۔

دیہات کے اولین کہانی کاروں پریم چند اور سلطان حیدر جوش نے کہانی کہنے کا فن گاؤں کے حجرے میں بیٹھ کر اور دیہات میں زندگی کر کے سیکھا تھا لیکن دیہات کی اس عنایت کا شکریہ انہوں نے معاشی سطح پر آویزش اور اخلاقیات کی تبلیغ کر کے ادا کیا۔ پھر ترقی پسند تحریک کا غلغلہ ہوا تو مجبوراً احمد ندیم قاسمی نے دیہات میں غربت اور افلاس کی تلاش کی اور طبقاتی آویزش کو موضوع بنایا جس کی مثالیں "رئیس خانہ" اور "لارنس آف تھلیبیا" ہیں۔ دوسری طرف بلونت سنگھ نے مشرقی پنجاب کی مخصوص تند مزاجی اور اس کے ابنارمل جذبوں (قتل، غارت گری، اغوا اور آبروریزی) کی پیش کش میں اکھڑے ہوئے لہجوں کو گرفت میں لیا ہے۔ جذبوں کی شدت کے باعث بنے ادھورے اور کھردرے ہیں (نمایاں مثال "ناگ پھنی") اس افسانے میں بنجر، خشک زمین کے تیز نوکیلے کانٹوں والے خودرو پودے "Cactus" کی طرح ایک کردار کو ابھار کر اس کے کرانت لیکھ سے نارمل صورت حال کو ابنارملٹی کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ بلونت سنگھ نے پنجاب کی سرزمین کی مست بو کو سمیٹنے کا جتن کیا ہے۔

اس کے بیٹلے اور انا پیشہ کردار جوانی کے نشے میں دلیر زبان بولتے ہیں کرداروں کا تند اظہار بیان اور اکھڑا ہوا لہجہ بلونت سنگھ کے اسلوب اظہار کو انفرادیت سے ہمکنار کر گیا ہے:

" جہاز جیسے ڈیل ڈول والے در بھر کو دور سے ہی دیکھ کر پہچان لینا اس کے لئے مشکل نہ تھا' اسے ذرا نہ تعجب ہوا۔ اس کا تعاقب کرنے والا محض وہی ایک جوان تو نہیں تھا۔

چند قدم کے فاصلے سے در بھر سنگھ نے کھنکھیا کر ذرا زور سے پوچھا "چک میرا جاری ہو گیا؟ "

جواب میں بشنی نے ریت کی موٹی تہ میں ٹھوکر لگائی تو دھول کا چھوٹا سا بادل بلبلا کر اوپر کو اٹھا اور رکی ہوئی ہوا میں معلق ہو گیا۔"

("اُرداس" از بلونت سنگھ سے اقتباس)

احمد ندیم قاسمی کے ہاں البتہ جب موضوعات کے تنوع کی تڑپ جاگی تو انہوں نے شہری زندگی کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ اس قبیل کے افسانوں میں "گھر سے گھر تک" ان کا شاہکار ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ بلونت سنگھ تادیر اس طرف نہیں آئے اور "جگا" یا "کالی تیتری" ان کی پہچان بنے رہے یہاں تک کہ بلونت سنگھ نے اپنی سوانح سے متعلق افسانہ "عہد نو میں ملازمت کے تیس مہینے" لکھا۔ بلاشبہ شہری زندگی سے متعلق یہ اسی آن بان کا افسانہ ہے جو بلونت سنگھ سے مخصوص رہی۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں آخری بڑا نام شمشیر سنگھ نرولا کا ہے اور وہ ترقی پسند تحریک کے نظریہ ساز ادیبوں میں نمایاں تر ہیں۔ نرولا حقیقت پسند ہونے کے ناتے کسی بہت بڑے دعوے کے ساتھ ادب کی طرف نہیں آئے'' ستاروں کی محفل " (مرتبہ: بشیر ہندی) کے لیے افسانہ بھجواتے وقت انہوں نے اپنی افسانہ نگاری سے متعلق لکھا تھا:

" ترقی پسند ہوں لیکن عریاں پسند نہیں ۔۔۔۔ جنسی یا جسمانی بھوک' بیکاری یا کسی عزیز کی موت کی وجہ سے ادیب نہیں بنا۔ ادب کے ذریعے اپنے قومی و انسانی فرائض سر انجام دینا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ ہم وطنوں کو جھنجھوڑنے کا ذریعہ ہے۔ مجھے دوام کے لیے لافانی ادب لکھنے کی خواہش نہیں۔ میں اسی ایک ثانیہ کے لیے اپنے وطن عزیز کے اسی فیصلہ کن لمحہ کے لیے لکھ رہا ہوں۔ وطن پہلی اور واحد محبت ہے اور ادب اسی کے ایفا کا ایک ذریعہ۔"

شمشیر سنگھ نرولا سے اردو میں دو افسانوی مجموعے بعنوان " جالے " اور " بے زبان " یادگار ہیں' اس کے بعد وہ ہندی کی طرف چلے گئے اور زیادہ تر ناول نگاری کی۔ نرولا کی جڑیں اساطیر سے پوری طرح جڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جس کے سبب افسانوی حقیقت احوال محض یک رخی حقیقت نگاری میں جلوہ گر نہیں ہوتا' اس میں علامتی ابعاد پیدا ہو جاتے ہیں یوں کہا جا سکتا ہے کہ نرولا کی افسانوی تدبیر کاری کا جوہر ان کے مخصوص اسلوب سے وابستہ ہے۔

نرولا کے افسانوں میں موضوعی تنوع اور بھائی چارے کی فضا بندی خصوصی توجہ کی حامل ہے۔ ان کے شاہکار افسانے "گونجتیا" اور " بے زبان " کے بیشتر افسانوں میں دان کرنے کا جذبہ قومی یک جہتی کے احساس کے تحت رنگ و نسل نیز نظریے کے تفاوت کو کم کرتا ہے۔ یوں شمشیر سنگھ نرولا کے افسانوی کردار ہندوستان کے مشترک قومی ورثے کے ہوشیار محافظ دکھائی دیتے ہیں۔

○

(۱) "لیڈر" الہ آباد مورخہ ۵ اپریل ۱۹۴۳ء

(۲) دیباچہ: "زندگی کا میلہ" طبع دوم، دہلی ۱۹۵۶ء

نفسیات کا ورود

(سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری، ممتاز مفتی، سید فیاض محمود، آغا بابر، رحمان مذنب، ابو الفضل صدیقی، خان فضل الرحمان اور سید رفیق حسین)

"انگارے" کی اشاعت سے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کو ترویج ملی۔ احمد علی کا افسانوی مجموعہ "شعلے" ۱۹۳۴ء میں چھپ کر سامنے آیا، اس طرح جنس کے دائرہ کو انفرادی سطح سے اٹھا کر پورے سماج تک پھیلا دیا گیا۔ رشید جہاں کا افسانوی مجموعہ "عورت" اور احمد علی کا "ہماری گلی" سامنے آئے۔ "انگارے" اور "شعلے" کے افسانے ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور مذہبی زندگی کے عجیب اقلقت منحنی خاکوں اور ذہنی کیفیتوں کو پیش کرتے ہیں۔

"پھر ضد یہ ہے کہ تم میرا بیاہ کرواؤ۔ شرع میں چار بیویاں جائز ہیں۔"

("پردے کے پیچھے" از رشید جہاں اقتباس)

"صاحب اور میم تو بوا، دلی اسٹیشن پر اتنے ہیں کہ گنے نہیں جاتے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گٹ مٹ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتے رہتے ہیں کمبخوں کی آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں۔ ایک میرے سے کہنے لگا:
"ذرا منہ بھی دکھادو" میں نے فورا۔۔۔
"تو تم نے کیا نہیں دکھایا؟" کسی نے چھیڑا۔
"اللہ اللہ کرو بوا۔۔۔ میں ان موؤں کو منہ دکھانے لگی تھی۔" دل بلیوں اچھلنے لگا (تیور بدل کر)
"سننا ہے تو بیچ میں نہ ٹوکو" ایک دم خاموشی چھا گئی۔

("دلی کی سیر" از رشید جہاں سے اقتباس)

"انگارے" اور "شعلے" سے پہلے کا اردو افسانہ رفتہ رفتہ فکر اور جذبے کو Elevate کرنے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا کہ احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانوں نے سنسنی خیزی کی طرح ڈال دی۔ قدیم سنسنی خیز داستانوں کا تربیت یافتہ ذہن اسے قبول کرنے کو تیار بیٹھا تھا۔ سنسنی خیزی کو قبولیت کا شرف حاصل ہوا۔ جس کے نتیجے میں منٹو کے ہاں افسانے کے اختتام پر دھماکہ اور ممتاز مفتی سے واجدہ تبسم تک افسانے کا اختتام انتہائی حیران کن صورت حالات سامنے لانے لگا۔

سگمنڈ فرائیڈ کے اثرات مواد اور تکنیک دونوں میں تنوع کا باعث بنے۔ نفسیاتی الجھنوں کے ضمن میں ابتدائی نام احمد علی، محمد حسن عسکری، منٹو، شیر محمد اختر، عزیز احمد، عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی کے ہیں۔

ہنری جیمز نے کہا تھا: "نوجوان کنواری لڑکیوں کے لیے آدھی زندگی بند کتاب ہے" ڈی ایچ لارنس نے سگمنڈ فرائیڈ کے Spade work پر انسان کو محض جنسی محرک کا ایک کرشمہ دکھا کر عورت اور مرد کی باہمی کشکش کو نیا میدان فراہم کر دیا اور اردو افسانے میں

پہلی بار ہم جنسی کے موضوع پر عصمت کا "لحاف" اور عسکری کا "پھسلن" سامنے آئے۔ "لحاف" اور "بو" (سعادت حسن منٹو) "Ban" کر دیئے گئے اور ممتاز مفتی نے اس تسلسل میں کئی افسانے لکھے۔ "ترقی پسند ادب" میں عزیز احمد نے کڑی تنقید کی' ڈاکٹر اعجاز حسین ۔ منٹو کو "لذت گیر الجھنیں" پیدا کرنے والا کہا اور علی سردار جعفری نے "بو" کو نامناسب موضوع قرار دیا۔

۱۹۳۵ء کے حیدر آباد کنونشن میں ایسے جنسی اظہار کے خلاف قرار داد پیش کی گئی جس کی خود صاحب صدارت' حسرت موہانی اور جوش عبدالغفار نے شدید مخالفت کی ۔ قرار داد پر خاصے بحث مباحثے کے بعد ترقی پسند مصنفین نے اپنے طور پر یہ فیصلہ دیا کہ عصمت چغتائی' منٹو' محمد حسن عسکری اور قرۃ العین حیدر رجعت پسند ہیں ۔ اس لیے ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔ بعد میں اس فہرست میں عزیز احمد کا نام بھی شامل ہو گیا۔ بقول میرزا ادیب (خیالات ۔ منٹو کتاب نمبر) ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے موقع پر ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ متذکرہ بالا افسانہ نگاروں کے خلاف قرارداد پیش کریں اس وقت انجمن کے سیکرٹری جنرل احمد ندیم قاسمی تھے ۔ میرزا ادیب نے خود اس قرار داد کی مخالفت کی' قرارداد کی حمایت کرنے والوں میں سرکردہ نام احمد ندیم قاسمی تھا ۔ احمد ندیم قاسمی نے رسالہ "سویرا" میں ایسے موضوعات اور طرز اظہار کو رد کیا اور ان افسانوں کے بارے میں لکھا کہ یہ فاشی کو ترویج دیتے ہیں۔

ادھر لارنس اور فلابیئر پر انگلیاں اٹھی تھیں ادھر منٹو اور عصمت پر مقدمے چلے ۔ منٹو کے "لذت سنگ" میں ایسے افسانے یکجا ہیں جن پر فحش نگاری کے الزام میں زیر دفعہ ۲۹۲ مقدمات قائم کیے گئے۔

مقولہ ہے کہ "ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔" محمد حسن عسکری نے بتایا کہ ابن العربی سے متعلق فرائیڈ نے نظریہ سازی کرتے وقت اسی مقولے کو بنیاد بنایا ہے ۔ ابن العربی نے کہا "ہر جز اپنی کل کی طرف لوٹتا ہے "خدا نے آدم کو تخلیق کیا' آدم نے حوا کو اپنی پسلی سے جدا کر کے دیکھا اور اس کی طرف راغب ہو گیا۔ یہ اس کی "کل" کی طرف واپسی تھی واضح ہوا کہ واپسی کا راستہ جنس کے شاداب خطے سے ہو کر نکلتا ہے۔

ابن العربی نے معرفت حق کے خارزار کے حوالے سے حضرت ادریس کی مثال دی ۔ کوہ لبنان پھٹا اور آتشی گھوڑا برآمد ہوا۔ حضرت ادریس اس پر سوار ہوئے' یہ ایسا عمل تھا جس سے ان کی خواہشات نفسانی اپنے اختتام کو پہنچیں ۔ ابن العربی نے کہا یہ معرفت حق میں زوال کی گھڑی تھی' وجود کی خواہشات ختم ہو جانے سے معرفت حق میں کمی واقع ہو گئی ۔ پتا چلا کہ ہم اپنی نفسانی خواہشات کے حوالے سے بھی اپنی ہستی کے "جزو" کو کل کے قابل بنا سکتے ہیں۔

اوپر کا دھڑ (عقل اور شعور ـــــ کائنات کو سمجھنے کی صلاحیت) اور نچلا دھڑ (جنس کے متعلقات) دونوں فعال حالتوں میں باہم ایک ہو کر "پورے آدمی" کو تشکیل دیتے ہیں ۔ یہ "پورا آدمی" تخلیق کی ضرورت ہے۔ بقول سلیم احمد عورت بھی پورا آدمی مانگتی ہے اور پیش منظر کا فن پارا بھی۔ جنسی موضوعات کے افسانوں میں "پورا آدمی" خال خال ہی نظر آتا ہے کہیں محض اوپر کا دھڑ فعال حالت میں ہے اور کہیں محض نچلے دھڑ کی کرشمہ سازیاں ۔ منٹو جیسے کامیاب جنس نگار کے ہاں اس تفرقے کے کئی روپ ہیں ایک طرف تو اس کے ہاں جنسی فرسٹریشن کا شکار فرزندگی اور گناہ میں ڈوبا ہوا ہے ۔ (مثال: اس کے کرداروں میں دلال' بدکار عورتیں اور عیاش مرد) دوسری طرف ایشر سنگھ کا بانجھ پن ہے (مثالیں: ٹھنڈا گوشت ۔ بانجھ) یا فطری طور پر بھی فعال نہیں ہے اور اس کی وجہ معاشرے کی جکڑ بندیاں ہیں ۔ مثال: "ڈرپوک"۔

پورا آدمی جہاں جہاں ظاہر ہوا ہے وہاں اردو میں بھی لازوال افسانوں نے جنم لیا ہے ۔ اس ذیل میں سعادت حسن منٹو کے افسانے "کھول دو" "بو" "دھواں" اور "کالی شلوار"' ممتاز مفتی کے "جھکی جھکی آنکھیں" اور "ماتھے کا تل" جان فضل الرحمان کے "زہبی" اور "آبگینی" عصمت چغتائی کا "مغل بچہ" اور رحمان مذنب کا "تِکّی جان" شاہکار افسانے ہیں۔

"انگارے" "شعلے" اور "عورت" سے ہوتا ہوا ہمارا افسانہ زندگی کے ہر ہر شعبے میں جنس کی کرشمہ سازیوں کا جائزہ پیش کرتا رہا ہے۔ محمد حسن عسکری' عصمت اور بیدی نے عورت کے جنسی جذبے کی اٹھان اور بالترتیب کرسچن' مسلم اور ہندو معاشرے میں جنسی گھٹن کو

نمایاں کیا۔ منٹو نے ہیجانی جذبات کی تصویر کاری کی اور موپاساں کی طرح اس کا پسندیدہ موضوع "عورت کی تضحیک" رہا یا طوائف میں ماممتا اور نسائیت کی تلاش، عسکری اور مفتی نے براہ راست جنسی نفسیات کی طرف رجوع کر کے جنسی کجرویوں کے لاشعوری محرکات کا ٹھوس علمی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا۔ اور عزیز احمد نے فلابیئر کی طرز نگارش میں جنس کے حریری پردوں کو اٹھایا (مثالیں: "خطرناک پگڈنڈی" اور "مو شکا") اور ضمیر الدین احمد کے ہاں جنسی لذت کوشی کا متین انداز اور بیان کی ایمائیت قابل توجہ ہے۔

جس طرح عسکری، منٹو، مفتی، عصمت اور خان فضل الرحمٰن کے ہاں انسان کی جنسی جبلت بنیادی اہمیت کی حامل ہے وہیں آغا بابر اور رحمان مذنب کے ہاں ابنارمل جنس کے حوالے سے معاشرت کا مطالعہ خصوصی توجہ کا طالب ہے۔

محمد حسن عسکری نے فیصلہ کن بات کہہ دی تھی کہ:

"گندی سے گندی بات اچھا ادب بن سکتی ہے مگر جنسیت سے مغلوب ہو کر بڑا ادب پیدا نہیں کیا جا سکتا"۔

اردو افسانے پر موپاساں اور چیخوف کے اثرات دو غالب رجحانات کی صورت میں ظاہر ہوئے اور افسانے کی بلوغت کے ابتدائی چند سالوں میں ہی منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کی صورت دو نمایاں رویوں میں ڈھل گئے۔ موپاساں کے کردار مروجہ بندشوں کے خلاف لڑنے والے شکست کھائے ہوئے کردار ہیں۔ یہ اندر سے مشتعل، برانگیختہ، غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے اور خوشی کے ہاتھوں بے بس ہیجانی جذبات کا اظہار ہیں۔ اس ضمن میں Irony کی خوبصورت مثال افسانہ Necklace ہے اور اس برتاؤ کی مثال منٹو کا افسانہ "ہتک"۔

سعادت حسن منٹو اپنی ابنارمل افتاد طبع اور کثیر الجہات تجربے کے باعث اپنے بعد آنے والوں خصوصاً بیانیہ سے متعلق افسانہ نگاروں کے لیے موضوع اور تدبیر کاری کی سطح پر امکانات ختم کر گیا۔ جہاں تک اس کا اپنا معاملہ ہے تو اس نے جنس نگاری کے حوالے سے اپنی دنیا محدود تر کر لی تھی اور اس میدان میں بھی اس کے ہاں عالمی سطح کے بڑے جنس نگاروں کی طرز کا گہرا جنسی ادراک خال خال جھلک دکھاتا ہے۔

منٹو نے اپنی اس کمی کو چرب زبانی کے چٹخارے کے ذریعے پر کرنے کی کوشش کی۔ جس سے بات گہری رمزیت کو سمیٹنے کی بجائے چٹکلوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس ضمن میں منٹو کا اپنا بیان ملاحظہ ہو:

"عشق و محبت کے متعلق سوچتا ہوں تو صرف شہوانیت ہی نظر آتی ہے۔ عورت کو شہوت سے الگ کر کے میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ پتھر کی ایک مورت رہ جاتی ہے۔ مگر یہ ٹھیک بات نہیں۔ میں جانتا ہوں، نہیں میں جاننا چاہتا ہوں کہ پھر آخر کیا ہے؟ کیا ہونا چاہئے؟۔۔۔ اگر یہ نہیں تو پھر اور کیا ہو گا۔ لیکن میں عورتوں کے بارے میں وثوق سے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہی کہاں ہوا ہے۔ عورت کا وہ تصور جو ہم لوگ اپنے دماغ میں قائم کرتے ہیں ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ کس قدر افسوس ناک چیز ہے کہ عورتوں کے ہمسائے ہو کر بھی ہم ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ لعنت ہے ایسے ملک پر جو عورتوں کو ہم سے ملنے کے لئے روکے!"

("منٹو کے خطوط" مرتبہ، احمد ندیم قاسمی سے اقتباس)

منٹو کے ہاں موضوعات کے تنوع کے باوجود بمبئی کی شہری فضا سے متعلق "موذیل" اور "بابو گوپی ناتھ"، چکلے سے متعلق "کالی شلوار"، تحریک آزادی سے متعلق "نیا قانون"، تقسیم سے متعلق "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "کھول دو" اور سماجیات سے متعلق "ٹھنڈا گوشت" کل سات شاہکار افسانے نکلتے ہیں۔ منٹو کی اس ناکامی کا باعث ہمارے سماجی اور اخلاقی عقائد سے متعلق ان کا انتہائی درجے کا چونکا دینے والا رویہ ہے۔ (مثالیں: "سرمہ" اور "مسواک") جو بعض اوقات پختہ اعتقادات کے قاری کو Shock پہنچاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں قاری منٹو کی تخلیق کردہ ناقابل یقین عناصر سے پیدا کردہ فینٹسی کو رد کر دیتا ہے اور چونکہ منٹو Shock پہنچانے پر تلے رہے اس لیے تدبیر کاری اور بیان پر گرفت اتنی مضبوط نہ رہ سکی جو درجہ اول کے افسانہ نگار سے متوقع ہوتی ہے۔ یوں منٹو ہسکش بعنایت پست و بلندش بہ غایت بلند کی مثال ہے۔

محمد حسن عسکری اول و آخر افسانہ نگار تھے، یہاں تک کہ ان کے تنقیدی عمل میں بھی افسانہ نگار عسکری کا چونکنے اور چونکانے والا عمل

ایک زیریں لیکن طاقت ور لہر کی طرح جاری و ساری رہا۔ افسوس کہ افسانہ نگار عسکری کو ناقد عسکری نے کچل کر رکھ دیا۔ یہ اردو دنیا کا سب سے بڑا ادبی قتل ہے۔

محمد حسن عسکری نے محض دو افسانوی مجموعے "جزیرے" اور "قیامت ہمرکات آئے نہ آئے" یادگار چھوڑے ہیں اور ان کے تقریباً تمام افسانوی کردار اپنے گردو پیش سے خاص طرح کی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بے زاری عمر کے تقاضوں، جذباتی یا فکری اختلافات سے کہیں بڑھ کر نفسیاتی الجھنوں کے باعث ہے اور اس نوع میں خاص طرح کی نفسی کیفیت محمد حسن عسکری کے افسانوں کا موضوع بنی اور یوں افسانوی تدبیر کاری کے اعتبار سے محمد حسن عسکری شعور کی رو کو ایک نئی کروٹ سے آشنا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس نوع میں وہ جوائس کی طرح نمایاں ہیں جبکہ جوائس کی نسبت عسکری کی تدبیر کاری مختلف ہے۔ محمد حسن عسکری نے عقلیت اور منطقیت کی مطیع شعور کی رو برتی ہے۔ (مثالیں: "حرام جادی" مطبوعہ ۱۹۴۱ء اور "چائے کی پیالی" مطبوعہ اپریل ۱۹۴۲ء۔ "ادبی دنیا")۔

شعور کی رو اور نفسیاتی تجزیہ نگاری کے طفیل عسکری کے ہاں نئی وضع کی کردار نگاری نے جنم لیا، جس کی مثالیں "کالج سے گھر تک"، "پھسلن"، "چائے کی پیالی" اور "قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے" کے کردار ہیں۔

بلند شہر کا لینڈ اسکیپ عسکری کے ہاں بالکل انہیں حوالوں سے آیا ہے جو عصمت چغتائی کے ہاں لکھنؤ، علی گڑھ اور آگرہ کا گھر آنگن۔ مجمل طور پر کہا جا سکتا ہے کہ محمد حسن عسکری کی تکنیک اور لینڈ اسکیپنگ ان کے طویل مختصر افسانوں کے لیے زیادہ سود مند ثابت ہوئے جبکہ سماجی شعور کے حوالے سے ان کے مختصر افسانے بھی خاصے کی چیز ہیں۔

محمد حسن عسکری کے افسانوی مجموعوں "جزیرے" اور "قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے" کے افسانوں کو ترقی پسند ناقدین فن نے شکست خوردہ ذہنیت کا اظہار کہا۔ خوف اور فنا کے احساس کو افسانوں کی بنیادی روح کہا اور یاسیت کو قدامت پسندی۔ لیکن یہی کچھ احمد علی کے موضوعات اور تدبیر کاری ہے۔ کیا یہی محاکمہ احمد علی کے بارے دیا جا سکتا ہے؟

ممتاز مفتی نے سگمنڈ فرائڈ کو بھی نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ ملا کر قبول کیا اور اپنے افسانوں کو لاشعوری رجحانات اور دبی ہوئی خواہشات کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور یوں بعض اوقات ممتاز مفتی کا افسانہ احمد علی، محمد حسن عسکری، منٹو اور شیر محمد اختر کے کمزور افسانوں کی طرح تحلیل نفسی کا تجزیہ بن گیا، لیکن ایسا تو عالمی سطح پر تسلیم شدہ فکشن رائٹرز کے ہاں بھی ہوا مثلاً ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور گستاؤ فلابیر کے ہاں فرائڈ کے Spade Work پر انسان کو اکثر مقامات پر محض جنسی محرک کا ایک کرشمہ ثابت کیا گیا۔ زولا کی "تھریسا" اور "ناناں" میں اس نوع کی مثالیں آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہیں اور ممتاز مفتی کے اس نوع کے افسانے بلا شبہ "لذت گیر الجھاوے" پیدا کرنے والی تحریریں ہیں۔

ممتاز مفتی کے بیشتر افسانے کرداری ہیں اور منٹو یا عصمت چغتائی کے مشہور افسانوں کی طرح ان کے افسانوں کی بنیاد کوئی نہ کوئی نفسیاتی الجھاوا ہے جبکہ اس خصوص میں ممتاز مفتی کی الگ پہچان، نوجوان جذبوں کی پیش کش ہے۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں دو طرح کے کردار ہیں، ایک تو وہ، جو مفتی کے ایام جوانی کی یاد تازہ کرتے ہیں جیسے "آپا" اور "اسمارائیں" کے کردار، اور دوسرے وہ جو آج کے عہد سے متعلق ہیں جیسے "روغنی پتلے" اور "آدھے چہرے" کے کردار۔ جبکہ گذشتہ دس برسوں میں مفتی نے اردو میں ہندی کی آمیزش والے درجن بھر افسانوں میں موضوع کی مناسبت سے بیتے زمانوں کے ٹائپ کرداروں کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنے ابتدائی افسانوں میں سماجی تجزیہ نگاری کی خاطر کرداری سطح پر لاشعور اور تحلیل نفسی کا طریقہ کار برتا تھا اور یہی سبب ہے کہ ہمارے مجہول ناقدین کو مفتی کے کردار سگمنڈ فرائیڈ کی کیس ہسٹریز کی طرح لاشعور کی بھول بھلیوں میں بھٹکے ہوئے مریض دکھائی دیئے۔ جبکہ یکسر ایسا نہیں ہوا ممتاز مفتی نے اپنے طویل تخلیقی سفر میں تبدیل ہوتے ہوئے حالات کا بھرپور جائزہ لیا اور سماجی محرکات کے شعور کا ثبوت فراہم کیا۔ افسوس کے ہمارے ناقدین نے مفتی سے متعلق رائے قائم کرنے میں صرف "جھکی جھکی آنکھیں" سے "آپا" تک کے مطالعہ کو بنیاد

بنایا۔

ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور "روغنی پتلے" سے "آدھے چہرے" تک کا دور ہے' جس میں اس نوع کی سماجی حقیقت نگاری ملتی ہے جو لکیر کے فقیر ترقی پسند افسانہ نگاروں کا مقدر کبھی نہیں رہی۔ جبکہ ممتاز مفتی کے تیسرے دور کے افسانے خصوصاً "اپرا حویلی"، "کنڈی بلی رہی"، "ان پورنی" اور "اجمان آپ مین آپ" یکسر نئے فن کے حامل افسانے ہیں۔

ممتاز مفتی بنیادی طور پر بیانیہ کے آدمی ہیں اور زبان کے بناؤ سنگھار کا اہتمام مفتی کے ہاں شروع سے ہی دکھائی دیتا ہے۔ شاید اس لیے کہ راجندر سنگھ بیدی کی طرح ممتاز مفتی کو بھی اردو زبان لکھنے کا محاورہ نہیں تھا' سو شعوری کوشش کرنا پڑی۔ کاش مفتی اس شعوری کوشش میں بیانیہ کے جھول پر نظر رکھتے اور ایک جملے کی جگہ دس جملے نہ لکھتے۔

ممتاز مفتی کے تازہ ترین افسانوں کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسے پریم چند کا ہندی کی جانب سفر اور اپنے بھرپور اظہار اور کہانی کہنے کے لیے کینوس کو پھیلانے کا جتن (ناول کی طرف) پھر راجندر سنگھ بیدی کا مجموعہ "اپنے دکھ مجھے دے دو" اور کرشن چندر کا "مینا بازار" قرۃ العین حیدر کے ہاں ترکی ادب کے عمیق مطالعے کے ساتھ اپنی جڑوں کی تلاش اور محمد حسن عسکری کی ۳۵ سالہ ادبی زندگی کا وحدت الوجود کی تشریح اور تفہیم پر اختتام جو زندگی کی فلسفیانہ آسٹریکشن کی کامیاب مثالیں ہیں۔

سید فیاض محمود نے چیخوف اور مارس میٹرلنگ کے طریقہ کار کو ایک نئی تدبیر کاری میں ڈھالا اور یوں مجبور و مقہور انسان کی نفسی کیفیات کو ایک انوکھا لحن بخشا۔ ان کی کہانیاں کہرے کی مانند ہیں جو روح کے اندر ہی اندر پلتی ہیں اور دائمی غم میں ڈھل جاتی ہیں۔ اس کی نمائندہ مثالوں میں فیاض محمود کے دو افسانے "کام چور" اور "اللہ کے نیک بندے" نمایاں ہیں' جبکہ اس تدبیر کاری کا نقش اول سید فیاض محمود کا اولین افسانہ "زبیدہ" (مطبوعہ: "ہمایوں" جولائی ۱۹۳۲ء) ہے۔

سید فیاض محمود کا یہ دھیما' نرم و لطیف پیچ و خم کا رفتہ رفتہ گرفت میں لینے والا منفرد اسلوب اپنی جزئیات نگاری اور روز مرہ زندگی کے بکھرے ہوئے موضوعات سے مطابقت رکھنے کے باعث موپاساں (یا منٹو) اور چیخوف (یا راجندر سنگھ بیدی) کے نمایاں اثرات کی طرح ایک تیسرے غالب رجحان کی صورت اختیار کر گیا۔

آغا بابر کے افسانوں میں انسانی نفسیات اور خصوصی طور پر جنسی رمزیت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور اس خصوص میں بھی ابنارمل جنس کے حوالے سے معاشرت کا مطالعہ آغا بابر کی پہچان بنا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات سے متعلق اپنا مشہور افسانہ "کبو" لکھنے کے بعد آغا بابر کی معتبر پہچان ادھیڑ عمر عورتوں کی نفسی کیفیات کا بیان ہے۔ جس کی مشہور مثالیں "باجی ولایت" اور "خالہ تاج" جیسے افسانے ہیں چکلے کی زندگی اور تیسری جنس کے حوالے سے انہوں نے زندگی کے کچھ ایسے گوشوں کو بے نقاب کیا ہے جو ننانوے فیصد لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہی رہتے ہیں اور اس حوالے سے "گلاب دین چٹھی رساں" اور "چارلس ہیجڑا" ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہنے والے افسانے ہیں۔ آغا بابر سے متعلق یہ بات یقیناً حیران کن ہی رہتی ہے کہ اتنے وسیع تجربات رکھنے اور بھرپور زندگی گذارنے کے باوجود آغا بابر کی افسانہ نگاری کا مرکز و محور ہمیشہ محدود تر مشغلہ اور سماج کا محدود ترین طبقہ رہا لیکن اس میں شک نہیں کہ آغا بابر نے اس قدر Selective ہونے کا حق بھی ادا کیا۔

نفسیات سے متعلق افسانہ نگاروں میں رحمان مذنب کی نمایاں پہچان تیسری جنس اور جنسی بے راہروی سے متعلق افسانہ طرازی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کا بیشتر خام مال لاہور کے شاہی قلعہ سے متصل آبادیوں' خصوصاً عزیز تھیٹر سے متصل ہجڑوں کی بیٹھکوں' تکیائیوں کی گلی (ٹبی)' ڈیرہ داریوں کے بازار اور مدرسہ نعمانیہ کے متبرک ماحول سے چنا ہے۔

رحمان مذنب کے افسانوں میں جتنے تکیے' جوا خانے اور چنڈو خانے ہیں وہ سب کے سب ان کے روز مرہ مشاہدے میں رہے ہیں اور لاہور کا شاہی محلہ ان کی دن رات کی گزرگاہ۔ کچھ یہی سبب ہے کہ گھناؤنی زندگی نیز عورت ہی نہیں طوائف کی پیش کش میں بھی رحمان مذنب سے بڑا

افسانہ نگار کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔

رحمان مذنب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تیسری جنس، پیشہ کرانے والی عورت اور شہوت میں بھٹکتے ہوئے افراد کی نفسی کیفیات کو تمام تر جزئیات اور تاریخی پس منظر کے ساتھ اپنے افسانوں میں سمیٹنے کا جتن کیا ہے۔ بطور افسانہ طراز، رحمان مذنب اپنے پسندیدہ لینڈ اسکیپ (خصوصاً ہیجڑوں کی بیٹھک یا چکلے) پر چھوٹا کھیل نہیں کھیلتے، بڑی بازی لگاتے ہیں جس کے طفیل ان کا قاری ہیجڑے، طوائف اور تماشبین کے علاوہ نو سر باز، کباڑیے، جیب تراش، دلے اور سفید کپڑوں میں پولیس کے کارندوں کی حقیقت تک پہنچتا ہے۔ اس خصوص میں رحمان مذنب کے "گوری گالیاں"، "پتلی جان"، "کشتی"، "لال چوبارہ"، "چڑھتا سورج" اور "باسی کلی" لازوال افسانے ہیں۔

○

افسانہ طراز کا مشاہدہ اور تجربہ شہر سے بڑھ کر مضافات تک گیا اور وہیں محدود ہو گیا، اس سے آگے دشت پڑتا تھا۔ بیاباں کی دنیا دیکھی بھالی دنیا کی نسبت اجنبی تھی۔ ایسی دنیا جہاں پھول کھلتے ہیں اور داد کی خواہش میں مرجھاتے ہیں۔ جہاں گم سم تھان پیڑ اور بوٹے چپکے چپکے زندگی کا وظیفہ پڑھتے ہیں اور چرند پرند کا اپنا نظام زیست ہے۔ ایسی انجان زندگی کے اطوار فکشن میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تخلیقی سطح پر صرف نقاشی کی دنیا ہی ایسی ہے جو اس معاملے میں امیر کہلا سکتی ہے۔ ادب میں لے دے کے چند نام ہیں۔ بلجیم کا مارس مترلنک اور کیوبا کی ڈورا الونسو، دونوں نے دنیا کی حقیر مخلوقات کو اپنا موضوع بنایا۔ مترلنک نے چیونٹی، مکھی اور کتے کی زندگی کا رزمیہ لکھتے ہوئے ویرانے کے برگ و بار کو اہمیت دی۔ ڈورا نے چیونٹی چوہیا اور دیگر ارضی کیڑے مکوڑوں کی سرگذشت قلم بند کی۔ جنگل کے تخلیقی اظہار کی صورتیں برطانیہ کے رڈیارڈ کپلنگ (جنگل بک) اور جوزف کونرڈ ("Lord Jim") اور ("Heart of Darkness") افریقی رومن گیری ("Roots of Heaven") اور نائیجیریا کے اموس توتولا (نمائندہ افسانہ۔ "شریف زادہ") کے ہاں ملتی ہیں جنھوں نے بھارت اور افریقہ کے جنگلوں اور ان کی حیوانی زندگی کو پیش کیا ہے۔

اردو افسانے میں اس پیش کش کے حوالے سے صرف تین نام نمایاں ہیں۔ سید رفیق حسین، ابوالفضل صدیقی اور خان فضل الرحمن۔ ان تینوں کے ہاں دیہات سے جنگل کی طرف میلان بطور خاص قابل توجہ ہے۔ ضلع سارن پور میں شوالک کی پہاڑیوں اور گرداگرد پھیلے ہوئے جنگل کے پرندے فضل الرحمن کو بہت مرغوب ہیں۔ خان فضل الرحمن نے اپنے رومانی افسانوں میں ہجر کی کیفیات کی عکاسی کے لیے "پربت پپیہا" اور کوئل کو اس کی عادات اور خصائل سمیت چنا ہے، نمائندہ مثال "پربت پپیہا۔"

ابوالفضل صدیقی کے شکاریات کے موضوع پر افسانوں میں ترنکانہ کی پتھریلی وادیوں کو ان کے چرند پرند سمیت موضوع بنایا گیا ہے۔ اس نوع کی اکا دکا دیگر مثالوں میں بانو قدسیہ کا "کال کلچھی" (چڑیا گھر کے پرندوں اور جانوروں کی زیست کا مطالعہ) اشفاق احمد کا "بندر لوگ" (کشمیری بندروں کی عادات کے حوالے سے ہماری منافقانہ معاشرتی زندگی پر طنز) اوپندر ناتھ اشک کا "کالو" (کتے کے شب و روز) نمایاں افسانے ہیں۔

سید رفیق حسین نے بطور خاص جنگل کے لینڈ اسکیپ کو اس کی مخلوقات سمیت موضوع بنایا ہے۔ رفیق حسین کے "آئینہ حیرت" (۱) کے افسانوں میں دونوں طرح کے چوپائے (وحشی اور پالتو) بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ پالتو چوپایوں میں افسانہ "ہیرو" کا سانڈ، "گوری ہو گوری" کی گائے، "بے زبان" کی گھوڑی اور "کلوا" کا کتا ۔۔۔۔ وفاداری اور قربانی کی جبلتوں کے مختلف رنگ ہیں۔ رفیق حسین کے اس سانس لیتے ہوئے جنگل کی ایک جھلک ملاحظہ کیجیے:

"تو کاں آں ہے" آواز پھر آئی۔

رنگیا نے " ہرے رام گوری بولے "۔ کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا گائے دکھائی تو دی نہیں لیکن رم کلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا گوری ہو گوری۔ "

جواب آیا " تو کاں آں ہ "

اور پھر باغ میں سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رم کلیا نے پھر پکارا ' وہ اس کی طرف بولتی ہوئی بڑھی لیکن دور سے ایک اور آواز آئی۔

" او ماں آں ہ "

باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔ گائے اس کی آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رنگیا کا ننھا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی۔ پھر بھی اپنی سکت بھر چلائی۔

"گوری ہو گوری "۔

" ارے گوری اے آئے جا۔ "

ہائے رے میا نا ہیں آوت۔ "

"گوری ہو گوری "

گوری میا آئے جاری ۔۔۔۔۔ "

لیکن گوری نے رخ نہ بدلا۔ البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رم کلیا کی طرف دیکھا۔ اڑا کر بولی اور ادھر ہی تیرتی چلی گئی جدھر سے بچھڑے کی آواز آ رہی تھی۔ "

("گوری ہو گوری " سے اقتباس)

سید رفیق حسین کے ان راجپوتانہ کے ریگزار سے متعلق افسانوں میں جنگل سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور جانوروں کی نفسیات سے متعلق یہ افسانے اردو ادب میں ایک انوکھا تجربہ شمار ہوئے ہیں۔

سید رفیق حسین نے جنگل کے قانون کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور خود جنگل کی زندگی کو سہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جنگلی جانوروں (شیرنی ' کتے ' نیل بیل ' بلی ' بندر ' گھوڑی اور ہاتھی) کی سیرت کو اس حسن اور خوبی کے ساتھ رقم کر پائے ہیں جو محض شکاریات پر لکھنے والوں کے نصیب میں نہیں۔

منفرد لینڈ اسکیپ کے افسانوں میں ابوالفضل صدیقی اور خان فضل الرحمٰن نے بالخصوص جاگیردارانہ نفسیات اور تمدن کی عکاسی کی ہے اور یوں ان دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوں میں قرن ہا قرن کی سماجی عوامل سے مرتب شدہ تہذیبی اقدار کی بازیافت اردو افسانے میں ایک Unique Approch ہے۔

خان فضل الرحمان اور ابوالفضل صدیقی کے ہاں بے اختیار جذبوں (شدید محبتیں اور شدید نفرتیں) کی عکاسی کے باوجود رنگین ' بیانیہ اسلوب کی گرفت کہیں بھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں دیہات نے سچے سانس لیے ہیں مثالیں " پربت بیپیا " از خان فضل الرحمٰن " دن ڈھلے " اور "جوالا مکھ " از ابوالفضل صدیقی۔

خان فضل الرحمٰن کے ہاں ہندو ' مسلم ' سکھ آبادی میں انگریزوں اور اینگلو انڈین کردار نگاری کا تنوع ہے جبکہ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کی انفرادیت افسانوں میں رواں کڑوے اور میٹھے خواب ہیں۔ ہر دو قسم کے خوابوں میں اجارہ داروں ' حکومت کے پروردہ جاگیرداروں ' مزدوروں اور کسانوں کی چہرہ نمائی ہوتی ہے۔ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کا منفرد لینڈ اسکیپ " تنگنائے " کی پتھریلی وادیوں اور " ارکان " کی سنگلاخ چوٹیوں نے ترتیب دیا ہے :

"سر پہ بڑھیا قراقلی لگائے، علی گڑھ یونیفارم کی یادگار شیروانی زیب تن کیے۔ بائیں آستین میں سفید رومال اڑسے، ٹانگوں میں مخصوص علی گڑھ کاٹ کا پائجامہ اور پاؤں میں سیاہ جوتا، موزوں قد اور گداز جسم میں بڑھاپے کی سرحدوں کو چھوتے ہوئے بھی جوانی کے دم خم مچلتے تھے۔ حنا اور شمامہ میں بسے مخصوص لکھنوی انداز میں پان چباتے داخل ہوئے تو پر سنٹی کے ساتھ ساتھ عطر اور پان کی ملی جلی بکھری ہوئی خوشبوؤں نے ہم سب کو چونکا دیا۔"

("دو عیدیں" از ابوالفضل صدیقی)

یہ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کے منفرد مرکزی کردار کی ایک جھلک ہے۔ یہ داخلی طور پر خوش باش جاگیر دار طبقے کے افراد ٹھیٹھ دہلوی اور لکھنوی انداز لیے فکری طور پر برٹش گورنمنٹ کے زمانے کی یادگاریں ہیں اور ان کے ساتھ ان کی ریاست اور قدموں میں افسانہ "جوالا مکھ" کا کچلا ہوا، اخلاق باختہ طبقہ کلبلا رہا ہے۔

○

(۱) "آئینہ حیرت" پہلی بار دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد یہی افسانے "گوری ہو گوری" کے نام سے کراچی سے طبع ہوئے۔ تیسری بار یہ مجموعہ "بے زبان" کے عنوان سے میجر جنرل شاہد حامد نے راول پنڈی سے شائع کیا، چوتھی بار یہی مجموعہ: "شیر کیا سوچتا ہوگا" کے عنوان سے کتاب کار ہیلی کینٹر رام پور یو۔ پی بھارت سے شائع ہوا ہے۔

لخت لخت آوازیں

(شفیق الرحمان' کوثر چاند پوری' غلام عباس اور قدرت اللہ شہاب)

اردو افسانے میں شگفتگی بیان کی اولین مثالیں سلطان حیدر جوش کے تین افسانے '' خواب و خیال '' '' ہاں نہیں '' اور '' طوق آدم '' ہیں ۔ اس کے بعد راشد الخیری کا کردار '' نانی عشو '' سامنے آیا اور فضل حق قریشی کے بیشتر افسانوں میں شگفتگی کی لہر رواں دکھائی دی ۔ لیکن یہاں تک کے افسانوں میں مزاح سے زیادہ طنز نمایاں ہے ۔

اردو ادب میں پہلی بار ملا رموزی' عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی نے بودلیئر کی طرح اپنے آپ پر قہقہہ لگانے کا حوصلہ پیدا کیا اور یہاں سے خالص مزاح نے جنم لیا ۔

یہ قہقہہ وسیع کائنات میں انسان کی ہستی کا تعین کرتا ہے ۔ عظیم بیگ' ملا رموزی اور شوکت تھانوی کے ہاں یہ قہقہہ اس وقت ہمہ گیر نوعیت اختیار کرتا ہے جب وہ اس کی بنیادیں خانگی زندگی سے اٹھاتے ہیں ۔ ان تینوں افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں بیوی بچے' بھائی بھاوج اور یار آشنا طنز کی تلوار کی دھار پر ہیں ۔

عظیم بیگ چغتائی نے زندگی کی ناہمواریوں سے خط اٹھانے کی طرح ڈالی تھی ۔ اس کی ظرافت' مخصوص طرح کی فضا بندی نیز واقعاتی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے ۔ شاید افسانہ '' انگوٹھی کی مصیبت '' کی مقبولیت نے عظیم بیگ کو یہ راہ سجھائی اور یوں افسانوں کے پانچ مجموعے اس تسلسل میں سامنے آئے' نام ہیں '' خانم' کولتار' روح ظرافت' روح لطافت اور مضامین چغتائی (جس میں ۳۲ مضامین کے علاوہ افسانے بھی شامل تھے) عظیم بیگ کا نمائندہ افسانہ '' مہارانی کا خواب '' ہے ۔ گھر کی بے تکلف فضا کی پیش کش میں توازن کھو بیٹھنے کی مثال ملا رموزی کی تحریروں میں ظاہر ہوئی اور رفتہ رفتہ ظرافت پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اہمیت کھو بیٹھی ۔ زبان کے ورتارے کے سلسلے میں شوکت تھانوی نے ملا رموزی اور عظیم بیگ چغتائی کی لکھنویت کو نئی ترکیبی ہیئت دے کر پوربی کے مخصوص لہجوں سے آشنا کر دیا ۔ شوکت تھانوی کا اولین افسانہ '' میٹھے چاول '' تھا اور نمائندہ افسانے '' افسانہ ما '' '' دو دیوانے '' اور '' سودیشی ریل '' ۔ شفیق الرحمن کے افسانوں کی شگفتگی چلبلاہٹ اور لاابالی پن شگفتہ افسانوں کی روایت میں ایک مثال ہے :

'' بڑی مشکلوں سے ہم نے وہ میچ جیتا یا یوں کہیے کہ ہارتے ہارتے بچے ۔ سب سے زیادہ اسکور مقصود گھوڑے کا تھا ۔ اس نے صبح سے کھیلنا شروع کیا ۔ کوئی سٹروک ایسا نہ تھا جو اس نے نہ دکھایا ہو ۔ بولرز کو خوب سزا دی اور دو گھنٹے بعد تین رنز بنائیں ۔ اس کے بعد جو اچھل اچھل کر کھیلا ہے تو دوپہر تک تین سے دس تک سکور پہنچا دیا ۔ لنچ کے بعد وہ بے حد تیز کھیلا ۔ آگے بڑھ بڑھ کر وہ ہٹیں لگائیں کہ پانچ رنز کا اضافہ اور کر دیا ۔ جب ہم شام کو رو پیٹ کر جیتے اور آخری کھلاڑی نے آخری ہٹ لگائی تو مقصود گھوڑا بیس رنز بنا چکا تھا '' ۔

(نٹانوے ناٹ آؤٹ)

شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں میں رومانی سرشاری اور لطائف کو کامیابی سے سمیٹا اور ہر دلعزیز ہونے میں سب سے بازی لے گئے ان کا اولین افسانوی مجموعہ '' کرنیں '' ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا اور تب سے اب تک ان کے مزاحیہ افسانوں میں جیسے زندگی کا سارے مسائل سمٹ آئے ہیں ۔

مزاح پیدا کرنے کے لیے شفیق الرحمٰن نے پلاٹ ' واقعات ' الفاظ اور جملے بازی سے ایک قدم آگے بڑھ کر خیال کی ندرت اور کنایہ کی دوہری معنویت سے اپنے افسانوں کو سنوارا ہے :

" تمنا وہ لڑکی تھی جسے جنوبی ایران میں پہلے میں نے دیکھا اور جب شیطان نے اسے شمالی ہندوستان میں دیکھا تو فوراً عاشق ہو گیا۔ "
(" تمنا " از شفیق الرحمٰن سے اقتباس)

شفیق الرحمٰن کا یہ عجیب و غریب کردار " شیطان " اس کے متعدد افسانوں میں بہت نمایاں ہے ۔ اس کردار کی پیش کش کے ساتھ شفیق الرحمٰن نے سفید پوش طبقے میں چھپے بیٹھے دل کے چور کو پکڑا ہے ۔ شفیق الرحمٰن کے افسانوں میں یورپ اور مشرق وسطیٰ کے سفر کا بولتا ہوا تجربہ قابل رشک ہے ۔

کوثر چاند پوری کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ "گداز محبت" کی اشاعت کے ساتھ ۱۹۳۶ء میں ہوا ۔ وہ اپنے افسانوں میں موضوعات کے تنوع اور ہندوستانی معاشرے میں بھائی چارے کی فضا بندی کی پیش کش کے سبب اردو افسانے کی ایک نمایاں آواز ہیں۔

افسانوں تدبیر کاری میں کوثر چاند پوری نے موپاساں سے اثر قبول کیا ۔ ابتداء میں رومان پسند تھے ۔ آگے چل کر ہندوستانی سماج اور اخلاقیات کو موضوع خاص بنایا ۔ ہندو مسلم اتحاد ' بھائی چارے اور قومی یک جہتی سے متعلق ان کے افسانے خصوصی طور پر توجہ طلب ہیں ۔ اس خصوص میں ان کا افسانہ " میرا پیشہ " ہندوستان کے معروف ترین شہروں کی ملی جلی ہندو ' مسلم ' سکھ ' عیسائی معاشرت کا خوبصورت ترین عکاس ہے ۔

غلام عباس ' جاپانی افسانوں کے تراجم (مجموعہ : " چاند کی بیٹی ") اور بچوں کے لیے کہانیاں (مجموعے: "جادو کا لفظ" اور "ثریا کی گڑیا") لکھتے لکھتے ۱۹۴۲ء میں اچانک " آنندی " لکھ کر اردو کے افسانوی ادب میں ایک دھماکہ ثابت ہوئے ۔ کچھ یہی سبب ہے کہ " آنندی " کے بعد ان کے دیگر ابتدائی افسانوں میں بھی رومان پسندی اور جوان جذبوں کا تحس نحس کر دینے والا رویہ دکھائی نہیں دیتا۔ یوں بھی غلام عباس دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔ موضوعات کے تنوع کے باوجود ان کے افسانوں کا وصف خاص ماحول سے متعلق کامیاب جزئیات نگاری ' زندگی کا گہرا ادراک اور منفرد رمزیہ اسلوب نگارش ہے۔

غلام عباس نے اپنے بیشتر افسانوں کا تانا بانا ایسے کرداری مطالعوں سے بنا ہے ' جن کے پیچھے نفسیات کا گہرا شعور اپنا پتا دیتا ہے ۔ انہی اوصاف کا خوبصورت ادغام ان کے شاہکار افسانوں " آنندی " (۱) ' " اوور کوٹ " ' " کن رس " اور " سایہ " میں دکھائی دیتا ہے ۔

اس دور کی لخت لخت آوازوں میں قدرت اللہ شہاب آخری نمایاں نام ہے اور ان کا خصوصی موضوع سیاسی اور سماجی نا انصافیاں رہا ہے اور تدبیر کاری میں امتیازی خصوصیت تحلیل نفسی سے الگ رہ کر نفسیات نگاری ہے ۔ " غریب خانہ " ' " سب کا مالک " ' " تلاش " ' "دو رنگا" "پھوڑے والی ٹانگ" اور "ریلوے جنکشن" اس ذیل میں بہت نمایاں افسانے ہیں ' جبکہ "ماں جی" جو ان کا شاہکار شمار ہوتا ہے ' سماجیات اور اخلاقیات کا ایسا گہرا مطالعہ سامنے لاتا ہے جسے نادر و نایاب کہنا چاہیے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات سے متعلق جہاں ان کا طویل مختصر افسانہ " یا خدا " ایک عظیم شاہکار ہے ' وہیں مختصر افسانہ " اور عائشہ آ گئی " بازیافتہ خواتین کی حالت زار پر خون کے آنسو رلاتا ہے ۔

قدرت اللہ شہاب کے افسانوں میں تیسری نمایاں لہر جنسی اور نفسیاتی الجھاؤ سے متعلق ہے اور اس کی خوبصورت مثالوں میں " نفسانے " کے بیشتر افسانے اور خصوصیت کے ساتھ " شلوار " ' " سردار جسونت سنگھ " ' " جگ جگ " اور " جلترنگ " بہت نمایاں ہیں

(۱) "آنندی" مطبوعہ : "ادبِ لطیف" لاہور (مدیر فیض احمد فیض) سالنامہ ۱۹۴۸ء کے صفحہ ۹۶ پر پہلی بار سامنے آیا۔ یہ غلام عباس کا ایک ایسا شاہکار ہے جس نے عالمی سطح پر اردو افسانے کی پہچان ممکن بنائی ہے۔ لیکن یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے "افکار" کراچی میں شائع شدہ اپنے آخری انٹرویو میں کسی شدید غلط فہمی یا غلام عباس کی کردار کشی کی خاطر اس افسانے کو انگریزی فکشن سے ماخوذ بتایا تھا اور ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہے تھے۔

۱۹۸۳ء میں چیکوسلواکیہ کے افسانوں سے متعلق بین الاقوامی مقابلے میں "آنندی" کو اول انعام کا حقدار قرار دیا گیا اور حال ہی میں (۱۹۸۳ء) بھارت کے نامور ہدایت کار شیام بینیگل نے اس افسانے پر مبنی مشہور تجرباتی فلم "منڈی" (مرکزی کردار۔ سمیتا پاٹل، شبانہ اعظمی اور نصیر الدین شاہ) مکمل کی ہے۔ غلام عباس نے آصف فرخی کو بتایا (The Herald کراچی فروری ۱۹۸۲ء) کہ ۱۹۴۲ء میں دہلی کی میونسپل کمیٹی نے ایک قرارداد پاس کر کے طوائفوں کو شہر بدر کر دیا اور شہر سے باہر اجمیری گیٹ، متصل ریلوے لائین انہیں رہائش اختیار کرنے کی اجازت دے دی۔ بقول غلام عباس "آل انڈیا ریڈیو" علی پور میں قائم تھا اور دہلی سے ریلوے اسٹیشن تک آتے جاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے طوائفوں کی یہ بستی ایک گنجان آباد علاقے میں بدل گئی۔ وہیں سے اس افسانے کا بنیادی خیال اٹھا اور "آنندی" ایک ہی رات میں تکمیل پا گیا۔

یاد رہے کہ انجمن اصلاح بدکاراں، لاہور کی تحریک پر ۱۹۲۱ء میں بھی میونسپل کمیٹی لاہور نے ۱۹۱۱ء کے ایک ایکٹ کے تحت انارکلی، دھوبی منڈی، لوہاری گیٹ، لنڈا بازار، دہلی دروازہ، شالامار روڈ، موتی بازار اور قلعہ روڈ پر برسوں کی آباد طوائفوں کو مکان خالی کرنے کے نوٹس جاری کئے تھے اور بالآخر عدالتی جھگڑوں کے بعد طوائفوں کو مذکورہ علاقہ جات سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ میونسپل کمیٹی نے ان علاقہ جات سے بے دخلی کا جو اشتہار شائع کیا تھا اس پر کے ایل رلیا رام ایم ایل سی سیکرٹری میونسپل کمیٹی کے دستخط تھے اور تاریخ اجراء ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء درج تھی۔

واضح رہے کہ میونسپل کمیٹی لاہور نے ۱۹۴۳ء میں بھی ایک قرارداد نمبر ۷۴۲ کے تحت ہیرا منڈی کو ممنوعہ علاقہ قرار دے دیا تھا لیکن کوچہ یا گزر شہباز خان کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا اور یہی سبب ہے کہ ہیرا منڈی کی جملہ طوائفیں کوچہ شہباز خان اور اس کے گرد و نواح میں اقامت پذیر ہو گئی تھیں۔

اردو افسانہ آزادی کے بعد

(انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، اشفاق احمد، محمد خالد اختر، کرتار سنگھ دگل، بانو قدسیہ اور دیویندر اسر)

انسانی جدل کی تصویر کاری نے عالمی ادب کو بڑے بڑے شاہ کار دیے ہیں۔ اردو افسانے کا ایک اہم موڑ ۱۹۴۷ء کے فسادات ہیں لیکن اس تہ و بالا زندگی کی خونریزی، درندگی اور گھناؤنی بربریت کی محض تفاصیل اخباری رپورٹنگ سے زیادہ کچھ نہیں۔ صحیح فوکس میں لی گئی تصویر کا نام افسانہ نہیں، سارا کھیل تخلیقی عمل کی تکمیل کا ہے۔ پھر فسادات کے بارے "ترقی پسند فارمولا" بناوٹی اور سطحی افسانوں میں اضافے کا باعث بنا اس مصلحت کوشی کی مثالیں:

کرشن چندر (پشاور ایکسپریس) احمد ندیم قاسمی (چڑیل) خواجہ احمد عباس (انتقام) اور ممتاز مفتی (گھور اندھیرا) جیسے نمایاں ناموں کے ہاں بھی مل جاتی ہیں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات اور زوال ڈھاکہ (۱۹۷۱ء) سے متعلق دو طرح کے افسانے ملتے ہیں پہلی قسم وہ جہاں "ڈاکٹر ژواگو" کی طرح فرد بھیانک جدل میں گھرا ہوا ہے، اس کا کوئی عمل اپنا نہیں۔ حالات کا ریلا اسے جہاں چاہے گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ بہالے جائے۔ وسیع تر انسانی جدل کی شدت خود مختار ہے۔ منٹو کے دو افسانے "ٹھنڈا گوشت" اور "شرمِفن" احمد ندیم قاسمی (پرمیشر سنگھ) اشفاق احمد (گڈریا) حیات اللہ انصاری (شکر گزار آنکھیں) خدیجہ مستور (مینوں لے چلے بابلا) کے افسانے اس ذیل میں نمایاں ہیں۔

بربریت کے خاتمے پر متاثرہ افراد کی کہانیاں سامنے آئیں۔ یہ تمام کردار اپنے اپنے طور پر سچے ہیں لیکن حالات اور وقت نے انہیں جھوٹا ثابت کر دیا ہے۔ منٹو کا "کھول دو"، اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" راجندر سنگھ بیدی کا "لاجونتی" اور قدرت اللہ شہاب کا "اور عائشہ آگئی" اس ذیل میں عمدہ مثالیں ہیں۔ بازیافتہ نسوانی کرداروں کی پیش کش میں اکثر افسانہ نگار جذباتیت کا شکار ہوئے اور آخر میں آتے آتے افسانے کے المیہ انجام کی نسبت عصمت چغتائی (ڈراما: "دھانی بانکیں") کی Wishful Thinking ظاہر ہوئی اور افسانہ بگڑ گیا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے بحرانی دور کے خاتمے کے بعد بہت حد تک فسادات افسانے کا موضوع بنے رہے۔ افسانہ کے اس رواں پس منظر میں انتظار حسین کا نام سب سے اہم ہے اور تازہ ترین مثال افسانہ "ہندوستان سے ایک خط" ہے۔ انتظار حسین کے اس نوع کے افسانوں میں یادیں، بچھڑے ہوئے گلی محلوں اور بازاروں میں لیے لیے پھرتی ہیں اور انتظار حسین کے یہ افسانوی کردار لاہور کی سڑکوں پر گزری کسک تلاش کرتے ہیں جو ماضی میں بیت گئی۔

ہندوستان کی اس تقسیم کبیر کے ساتھ دونوں اطراف میں فرد کی تنہائی کا احساس حد درجہ بڑھ گیا اور افسانے میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ یہ تخلیق کار کے انفرادی محسوسات سے لے کر اجتماعی زندگی کی داخلی کیفیات تک کی تبدیلیاں تھیں۔

سیاسی مجبوری اور محکومی کا احساس ختم ہوتے ہی دونوں اطراف میں عصری حوالوں سے معاشرتی سطح پر مسائل اور ان کا حل ڈھونڈنے کی سعی کی گئی اور یہ سب محسوساتی سطح پر نسبتاً "آزاد فضا میں سامنے آیا، معروضی انداز نظر پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں اظہار کی سطح پر ترقی پسندوں کا رقت آمیز رویہ افسانے میں دم توڑ گیا۔ نئی طبقاتی تقسیم موضوع بنی تو، لیکن اجتماع کے خوف کے سبب یکہ و تنہا تخلیق کار نے استعارے اور علامت کا سہارا لیا۔ نشان متروک قرار پایا جس سے ترقی پسندوں کی صحافیانہ اپروچ اپنے منطقی انجام کو پہنچی۔ فسادات بیت گئے تھے اور اس کا

رد عمل یہ ظاہر ہوا کہ جغرافیائی سرحدوں کو بھول کر " انسان دوستی " ایک موضوع کے طور پر سامنے آئی لیکن ایسے میں سیاست کا نفوذ بعض
افسانوی تحریروں کو شاہکار بننے سے روکتا بھی رہا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں ترقی پسند اور رجعت پسند افسانہ نگار ایک سطح پر تھے۔ دونوں پراپگنڈے پر
اتر آئے ترقی پسندوں نے جو کچھ لکھا اسے محمد حسن عسکری نے تو رد کیا ہی، حسیم حجازی اور ایم اسلم کی قبیل کے لوگوں نے بھی رد کیا اور جیسے کو
تیسا۔ اس کو " ہنگامی ادب " کا نام ملا اور کھرے تخلیق کار نے جب غور کیا تو پتا چلا، سب خوامخواہ لڑتے ہیں۔ جیت تو ہندوستان میں برلا اور ٹاٹا
کی ہوئی یا پاکستان کے جاگیردار کی، عام لوگ تو ہمیشہ ہارنے والے رہے ہیں۔
قومی سطح پر تخلیقی عمل کا پہلا فیز ایسے ہی متحارب میلانات اور نظریات کا ہوتا ہے جو ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد ہماری زندگی اور ادب میں

ظاہر ہوئے۔
دوسرے فیز میں خیر اور شر کا تصادم ایک " Chaos " کی صورت اختیار کر کے آگہی کے نئے جہانوں کے در وا کرتا ہے، ایسے میں فرد
اجتماعی سطح پر اپنی شناخت کے مرحلے سے گزر جاتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں اپنے حوالوں اور زمینی بوباس کے ساتھ نزول تخلیقی عمل ظہور پاتا ہے۔

تقسیم کبیر سے ۱۹۶۵ء کی جنگ تک ایک " Chaos " کی صورت پیدا ہوئی جس کے مثبت نتائج بڑی طاقتوں کے زیر اثر قومی سطح پر صلح

صفائی کی نذر ہو گئے۔
ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ آزادی کے بعد دونوں اطراف کے افسانے میں نئے تجربات اور نفسی کیفیات کے مثبت اور منفی اثرات کا حقیقت
پسندانہ توازن ظہور پاتا لیکن اس طرز احساس کا ادارک رواں پس منظر کے افسانے میں بہت کم ممکن ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ مشترک وطنیت کا
تصور تھا جو دم توڑ چکنے کے باوجود پرانے لکھنے والوں کے ہاں تعصبات کی صورت اختیار کر گیا اور دوسری طرف نئے افسانہ نگار کی نہ تو معاشرے کی
بدلتی ہوئی اقدار پر پوری گرفت تھی اور نہ ہی وہ آزاد خیالی کے ساتھ اجتماعی نفسیات کا تجزیہ تخلیق کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ اس کا اپنا جواز کن
حوالوں سے ممکن تھا؟ اس کا اسے علم نہ تھا۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے گناہ اور ثواب " Own " کرتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رواں پس منظر
کا افسانہ نگار محسوسات اور اظہار کی سطح پر ماضی کے حقیقت پسند، رومانی یا ترقی پسند کیمپ میں پناہ گزین ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود اردو افسانے
کو انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، اشفاق احمد، محمد خالد اختر، کرتار سنگھ دگل، بانو قدسیہ اور دیویندر اسر جیسے سات اچھے افسانہ نگار میسر آئے۔
ان میں پہلا اور سب سے نمایاں نام انتظار حسین کا ہے جسے " ذہنی جلاوطن " کہا گیا۔ انور عظیم کے خیال کے مطابق یہ جلاوطن اس "
میں " کو تلاش کرنے میں سرگرداں ہے جو تہذیبی بحران میں ماضی کی کسی اندھی گلی میں کھو گیا۔
انتظار حسین کی یہ بھٹک مجموعوں: " کنکری " اور " گلی کوچے " سے ہوتی ہوئی " شہر افسوس " اور " کچھوے " کے افسانوں، یہاں تک

کہ تازہ ترین افسانے " چیلیں " تک چلی آئی ہے۔
برصغیر کے مسلمانوں کو زوال ڈھاکہ کے ساتھ دوسری بار ہجرت کا سامنا کرنا پڑا، تب انتظار حسین نے اسی تسلسل میں پورا اترتے ہوئے
اپنے کئی پرانے افسانوں کو " شہر افسوس " میں یکجا کیا اور انہیں نئے معانی سے دوچار کر دیا۔ ہجرت کے حوالے سے انتظار حسین کے ہاں خاص
طرح کی Tension جاری و ساری ہے۔ انتظار حسین نے ایک زمانے میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہا تھا اور رفتہ رفتہ " آخری آدمی " کی
بے حرمتی اور توقیری کی طرف آئے تھے لیکن اب وہاں سے واپسی بڑی شدومد کے ساتھ ہوئی ہے جس کی مثالیں: " شہر افسوس " کے افسانوں کے
بعد " کچھوے " اور " واپس " جیسے تازہ ترین افسانے ہیں۔
انتظار حسین کے چند افسانے البتہ قدیم طرز احساس سے عاری لوگوں کے لیے وہ اہمیت نہیں رکھتے جس کے وہ طالب ہیں۔ " کچھوے "
شاید انتظار حسین کو صدائے بازگشت کا اسیر کہلوائے لیکن " بادل " میں تصوف کے رچاؤ اور اجتماعی لاشعور کو ساتھ لے کر مستقبل کی جانب
اشارے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لیے میرے خیال میں شاید انتظار حسین کے بارے میں سوئے ہوئے آدمی کا بیان معتبر نہ ٹھہرے۔

محمود ہاشمی نے اس "ناسٹیلجیا" کو تاریخ کے دھارے سے خود کو کاٹ لینے کا جتن کہا ہے۔ لیکن کچھ لاجیکل چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن سے انتظار حسین کٹنے کی سرتوڑ کوشش کے باوجود بچ نہیں سکتے۔ انہیں تاریخ کی طرف پیچھے لوٹ کر جانا پڑتا ہے اور انتظار حسین تو گھر کی چیزوں کو رکھے رکھے جڑیں پکڑتے ہوئے محسوس کرتے ہیں پھر آخر ایسا کیوں نہ ہو۔

انتظار حسین نے بہت پہلے سوال اٹھایا تھا "ہماری جڑیں کہاں ہیں؟ اس زمین کے ساتھ میرا رشتہ کیسا ہے؟"۔

"شہر افسوس" اور بعد کے افسانوں میں یہی سوال دہرایا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انتظار حسین ماضی اور حال میں وجہ امتیاز یا وجہ اختلاف تلاش نہیں کرتا بقول انتظار حسین پوری تاریخ حاضر ناظر ہے۔ واقعہ کربلا لوگوں کے لیے ماضی ہو تو ہو' وہ تو اسے حاضر ناظر جانتا ہے۔ لوگ حال اور ماضی میں فرق کر کے حافظے سے محروم ہوتے چلے گئے ہیں لیکن افسانہ نگار تو ہمیشہ حافظے کی تلاش میں ہے۔ اسے زندگی کی رو سے کوئی خاص دلچسپی نہیں البتہ باطن میں جو روئیں چلتی ہیں ان کا خیال ضرور رکھتا ہے۔ یہی باطن کی غوطہ زنی اور اسلوبیاتی تنوع انتظار حسین کی پہچان ہے۔ اس کے ہاں اسلوبیاتی تنوع کے اعتراف کے ساتھ باطن کی غوطہ زنی کو فکری اور نظری پسماندگی کا نام بھی دیا گیا ہے۔ انتظار حسین کے اٹھائے ہوئے سوالات کو اتنی آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مانا کہ اس صدی کی آٹھویں دہائی میں انتظار حسین کے تعصبات سے کہیں زیادہ اہم سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ یہ بھی درست کہ اقتصادی اور سماجی مسائل جس قدر گذشتہ دو دہائیوں میں تبدیل ہو کر سامنے آئے بقول میکن مارا (۱) گذشتہ دس لاکھ سالوں میں اس قدر تبدیلیاں نہیں آئیں' لیکن انتظار حسین ان تبدیلیوں کا مکمل شعور رکھتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انتظار حسین ہر زمانے میں موجودہ معروضی صورت حال کا تجزیہ کرتا چلا آیا ہے۔ افسانہ "دوسرا راستہ" ایوب خانی عہد کے سیاسی جبر اور بے حرمتی کا احساس لیے ہوئے ہے" "شرم الحرم" عرب اسرائیل حوالے سے نمایاں ہے اور "نیند" زوال ڈھاکہ کا خوبصورت عکاس۔

انتظار حسین نے "دوسرا راستہ" کے معاشرتی حوالے سے اٹھائے ہوئے سوالات سیاسی پھیلاؤ کے سپرد کر دیئے ہیں۔ موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر یہی وہ مقام ہے جہاں سے انتظار حسین اردو افسانے کے پیش منظر میں داخل ہوتے ہیں:

"لگتا ہے کوئی جلوس ہے" کنڈکٹر نے اعلان کیا

"بادشاہو' اپنے اپنے سر اندر کر لو۔"

جو جو آدمی گردن نکالے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس نے گردن اندر کر لی۔ سب اس طرح سکڑ سمٹ گئے جیسے پوٹلی بن گئے ہیں۔"

("دوسرا راستہ" از انتظار حسین سے اقتباس)

بس کی علامت یہاں ہماری اجتماعی زندگی کا رخ اور رفتار متعین کرتی ہے اور انسانی عمل جیتے جاگتے مسائل سے آنکھیں میچ لینے کا "سفید پوش" عمل۔ انتظار حسین نے ایسے میں فرد کی انفرادی سطح پر اخلاقی جدوجہد کو بے معنی قرار دیا ہے۔ مثالیں "زرد کتا" اور "آخری آدمی" جیسے افسانے ہیں۔ یوں انتظار حسین کے ہاں بھی قومی تشخص سوائے محرومی کے احساس کے کچھ نہیں رہا۔ اس نکتے پر انتظار حسین اور پیش منظر کے تمام افسانہ نگار ایک ہی نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے اولین مجموعے "ستاروں سے آگے" میں خصوصاً بورژوا طبقے کی نوخیز لڑکی کے خواب بنے گئے ہیں' بے معنی محفلیں اور لایعنی مصروفیات۔ "شیشے کے گھر میں" میں یہی لڑکی میچورٹی تک پہنچتی ہے۔ "ستاروں سے آگے" کے افسانوں میں اس زمانے کا ہندوستان اور بنگال کا قحط دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے کہ ان افسانوں میں موضوع کی سطح پر بالائی طبقے کی محفلوں میں ما حل ا سخلو موضوع بحث ہے' لارنس اور آسکر وائلڈ کی دھوم ہے۔ اور رمبا' کتھا کلی اور برج کی محفلوں میں الجھے ہوئے بورژوا نسائی کردار۔۔۔ یہ ان کی پیش کش ہے۔۔۔

لوئر مڈل کلاس اور مڈل کلاس کی عورت کی پیش کش کے برعکس یہ قرۃ العین حیدر کی خاص عطا ہے۔

ان کا افسانہ "کارمن" مڈل اور بورژوا انسانی کرداروں کا کامیاب ترین عکاس کہا جائے گا۔

قرۃ العین حیدر کا ایک اپنا منفرد انداز تحریر ہے اور تاریخ کے گہرے مطالعے نے ان کے فکری افق کو جلا بخشی ہے۔ یوں مشرقی تہذیب کا وقار اور مغربی تمدن کا نکھار ان کے افسانوں میں کچھ اس طرح گھل مل گیا ہے کہ ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے جدا کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ رنگوں کے اس انوکھے ادغام سے حسیاتی تاثر کی موسیقیت نے جنم لیا ہے اور جس کی خوبصورت ترین مثالیں "فصل گل آئی یا اجل آئی" "یہ داغ داغ اجالا" اور افسانہ "سر را ہے" کا آغاز ہے۔ تہذیبی اور تاریخی شعور کی ابتدائی مثالوں میں "جب طوفان گزر گیا" اور آپ جی کے رنگ میں "دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم" اور "کیکٹس لینڈ" بہت نمایاں ہیں۔

اشفاق احمد کے افسانوں کا موضوع خاص جذباتی سطح پر انسان کی قلب ماہیت ہے، جس کا سب سے بڑا سبب جذبہ محبت یا جذبہ نفرت کے متعلقات ہیں۔ چاہے جانے کے جذبے کا تنوع (خصوصاً حسیاتی سطح پر اس جذبے کی متنوع صورتیں) اشفاق احمد کے ہاں اس کے نمائندہ افسانوں خصوصاً "گڈریا" "اجلے پھول" اور "قصہ گل دختی" میں ظاہر ہوا ہے۔ جبکہ لوک دانش کا حوالہ (افسانہ: "حقیقت نیوش") اور تصوف کی جانب میلان (افسانہ: "مانوس اجنبی") اشفاق احمد کے ہاں پاکیزگی اور خیر کی فضا بندی کرتا ہے۔ دوسری طرف اشفاق احمد نے "رشوت" جیسے شدید جنسی حسیت کے افسانے بھی قلم بند کیے ہیں۔ ان کے طنزیہ اور مزاحیہ افسانوں میں خاص نوع کی گہرائی پائی جاتی ہے (مثالیں "چچا سام کے دیس میں" اور "بندر لوگ") ان افسانوں میں اشفاق احمد نے تیسری دنیا کی بے بسی اور سامراج کی ریشہ دوانیوں پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات سے متعلق اشفاق احمد کا افسانہ "گڈریا" اردو کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔

محمد خالد اختر کا نام ان کے دو افسانوی کرداروں چچا عبدالباقی اور بھتیجے بختیار کی معرفت اردو افسانے کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ شفیق الرحمان کے سست رفتار ہونے کے بعد اردو افسانہ ایک خاص نوع کی اکتاہٹ کا شکار ہو چلا تھا اور عین اس مرحلے پر محمد خالد اختر نے اسے نہ صرف سنبھالا دیا بلکہ اس کی اٹھان میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

ان کے بیشتر افسانے کرداری ہیں اور ان کرداروں کی شخصی اور انتہائی نجی زندگی کی تفاصیل سامنے لاتے ہیں۔ محمد خالد اختر نے اپنے ان کرداری افسانوں کی معرفت انسانی ذات کی گہرائی میں چھپی ہوئی مضحکہ خیزی کو کامل ہنرمندی کے ساتھ بے نقاب کیا ہے اور اس ضمن میں چچا عبدالباقی اور بھتیجے بختیار سلسلے کے افسانوں کے علاوہ افسانہ "لالٹین" کے مستری مہتاب دین 'نھا مانجھی' کے مرکزی کردار اور "مقیاس المحبت" کے ڈاکٹر غریب محمد کی کردار نگاری لاجواب کہی جا سکتی ہے۔

محمد خالد اختر کے اس منفرد طرز اظہار کی سپلائی لائن بیک وقت مشرق اور مغرب کے بہترین ادب سے جڑی ہوئی ہے۔ جس کے نتیجے میں محمد خالد اختر اپنے آدرش کو افسانے کے فن سے متصادم ہونے کا موقع فراہم نہیں کرتے بلکہ افسانے کے بناؤ سنگھار میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔

کرتار سنگھ دگل نے اردو افسانے کو خیال اور طرز اظہار خصوصاً "بات کرنے کے تیکھے انداز سے تازگی اور نیا لحن دیا۔ دگل کے افسانوں میں علامت اور استعارے کے ورتارے کے باوجود ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا اور یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں۔

کرتار سنگھ دگل کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت کردار کے بجائے پلاٹ کی تعمیر پر خصوصی توجہ کا رجحان ہے جبکہ ان کے چیدہ موضوعات کی نوعیت کردار کی نفسی کیفیات کی عکاسی کی متقاضی ہے اور دگل اس کیفیت کو اجاگر کرنے کے لیے واقعات کی مختلف النوع کڑیوں کی جوڑ توڑ پر توجہ صرف کر کے مطلوبہ نتائج حاصل کر لیتے ہیں۔

معمول کے دنوں میں یکلخت غیر معمولی گھڑیاں فرد کی زندگی کا نظام تلپٹ کر دیتی ہیں۔ یہ انسانی لاشعور اور اجتماعی لاشعور کا کیا دھرا ہے۔ بعض اوقات ہم یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ماضی قریب کے بیتے ہوئے لمحات میں خود ہماری غیر معمولی حرکات کے محرکات کیا تھے۔ کرتار سنگھ دگل کے ہاں ایسی کیفیات کا بیان کرتے ہوئے محرکات کے طور پر خارج کا ماحول اور باطن کا سناٹا ایک نیا منفرد آہنگ وضع کرتا ہے۔

"میری عادت ہے، سڑک پر چلتے وقت میں آنکھیں نیچے کئے چلتا ہوں۔ اس روز نہ معلوم کیا ہوا؟ پل پار کرنے کے بعد کونے والے مکان کے قریب سے گزرتے ہوئے غیر ارادی طور پر میری نظر سامنے گیٹ پر جا پڑی۔ گیٹ سے تین پہیوں والی سائیکل چلاتا ہوا ایک بچہ نکلا۔ نیلی آنکھیں، سنہرے بال۔۔ بچہ باہر نکلا اور کسی کے ہاتھ آگے بڑھ کر گیٹ بند کرنے لگے اور گیٹ ویسے کا ویسا ہی کھلا رہ گیا ہنستی ہوئی آنکھیں، گوری گوری، سرخ سرخ مسکراہٹ، رقص نرماں چہرے پر۔۔۔ دانت موتیا کے دانے، ہلکے ہلکے لرزتے ہونٹ۔۔۔ گویا ایک لمحے کے لئے رک جانے کو کہہ رہے ہوں۔"۔

("انتظار" از کرتار سنگھ دگل سے اقتباس)

یہ معمول کے دنوں میں غیر معمولی لمحات ہیں ان کے بعد یکلخت ساری کائنات جیسے اس ایک لمحے کے زیر اثر چلی جاتی ہے۔ افسانے میں دگل نے ان لمحات کو ایک موڑ دے کر نئی صورت حال میں یہی غیر معمولی گھڑیاں Recall کر لی ہیں اور یوں افسانہ اپنا دائرہ مکمل کرتے ہوئے ایک نہ ختم ہونیوالی کہانی بن جاتا ہے۔ جس کے کردار بدل سکتے ہیں، معاشرتی اور معاشی صورتحال بدل سکتی ہے، لیکن وہ غیر معمولی گھڑیاں اپنی جگہ جوں کی توں رہیں گی۔ کرتار سنگھ دگل کے ہاں اس نوع کی مثالیں ان کے مطبوعہ افسانوی مجموعوں میں اپنی نمایاں پہچان کرواتی ہیں۔

بانو قدسیہ کی شہرت کا آغاز ان کے مشہور افسانہ "کلو" سے ہوا اور جب سے اب تک ان کے افسانوں میں مرد اور عورت کے معاشرتی، روحانی اور جسمانی روابط نت نئی کروٹیں لیتے آئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے عورت کی آدھی دنیا کو جس طرح اپنے افسانوں میں سمیٹا ہے یہ انہی کا حق ہے۔

بانو قدسیہ کے افسانوں میں نئی اور پرانی اقدار کا تصادم اور رسوم و رواج کی جکڑ بندیاں، ازدواجی زندگی کی پیچیدگیوں کے ساتھ کچھ اس طرح مربوط اور منسلک ہیں کہ انہیں الگ الگ خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس ضمن میں ان کا شاہکار افسانہ "انترہوت اداسی" ہے۔

○

واہگہ سے لے کر کھوکھرا پار تک یہ وہ مقامات ہیں جہاں ۱۹۴۷ء میں ایک عہد تمام ہوا اور دوسرے عہد نے جنم لیا لیکن ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء تک ادبی سطح پر خصوصاً پاکستانی افسانہ نگاروں کے لیے یہ مسئلہ چلا آتا تھا کہ اس نئے عہد کو جسے "پاکستان" کہتے ہیں، کیسے اور کیوں کر اپنے شعور کا حصہ بنائیں یا شاید بقول انتظار حسین یہ واردات بڑی تھی اور ہم چھوٹے تھے۔ پاکستان کی صورت میں جنم لینے والی سرزمین سے ہماری نئی نئی رشتہ داری تھی، شاید اسی لئے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء تک کے اردو افسانے میں اس دھرتی کی مہک بالغ نہ ہو پائی۔

اس کے باوجود ابو ضیاء اقبال کا افسانوی مجموعہ "دشمن" غلام الثقلین نقوی کا افسانوی مجموعہ "نغمہ اور آگ" اور لخت لخت افسانوں میں احمد ندیم قاسمی کا "کپاس کا پھول" اور انتظار حسین کا "آخری خندق" اس روحانی واردات کے گواہ ٹھہرے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب ستیش بترا، غلام محمد، مسعود اشعر اور زین العابدین اپنے افسانوں میں بنگال کے پانیوں کا مزاج جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ موسموں کے رنگ، برہم مزاج کے دریا اور لہروں کی سرگوشیاں سمجھ سمجھا رہے تھے۔ ایسے میں شہزاد منظر نے بگڑی ہوئی صورت حالات کا تجزیہ ذہنی رشتوں اور معاشی ناہمواریوں کے حوالے سے کیا تھا جبکہ افسانہ "یوٹوپیا" تک آتے آتے امن اور مشرقی پاکستان کی آنے والی نسلوں کے بہتر مستقبل کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے شہزاد منظر کے کردار اپنے ہی ملک میں جلا وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ ام عمارہ نے اس صورت حالات کی فلسفیانہ توضیح افسانہ "یہ گناہ بے گناہی" جیسے افسانے لکھ کر کی اور آخر میں جا کر پتا چلا کہ یہی سوچ کا انداز زوال ڈھاکہ کا سبب بنا۔

ان سب افسانہ نگاروں کے کام کو دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب لوگ انتظار حسین کے لیے Spad Work کر رہے تھے۔
انتظار حسین نے "وہ جو کھوئے گئے" "نیند" اور "شہر افسوس" لکھ کر یہ میدان بھی مار لیا۔

پاکستانی افسانے کی سطح پر زوال ڈھاکہ تک آتے آتے ہماری سمجھ میں یہی نہیں آیا کہ سرزمین پاکستان یا ہندوستان 'ان کی مختلف النوع قومیتوں اور لسانی مسائل پر اپنے شعور کی گرفت کیسے مضبوط کریں۔ اس بڑے سانحہ کے ساتھ پاکستان میں از سر نو اپنی دریافت کے سوال نے سر اٹھایا۔ اپنی جڑوں کی تلاش شروع ہوئی۔

"زمین سے ہمارا رشتہ کیا ہے ؟" بہت پہلے انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر نے یہ سوال اٹھایا تھا۔ اب نئے حالات میں اس سوال کا جواب بہت آسان تھا لیکن مسئلہ یہ درپیش تھا کہ وضاحت میں پہل کون کرے ؟ پھر روحانی نوعیت کے سوالات تھے۔ پرانے عقائد اور نظریات کی بنیادیں ہل رہی تھیں۔

یہ ایسی روحانی واردات ہے جو پیش منظر کے افسانہ نگار کو مقام حیرت تک لے آئی ہے۔

پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ گذشتہ ستاسی برسوں میں اردو افسانہ مصلحین اور مجاہدین کے درمیان کھینچا تانی میں جگہ جگہ سے ادھڑ گیا ہے۔ سماجی سطح پر مصلحین نے زور مارا اور سیاسی معاشی جدوجہد کے تحت مجاہدین نے۔ یہ بہت لمبا عرصہ ہے جس میں افسانہ۔ سماج دشمن 'وطن دشمن اور انسانیت دشمن عناصر کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف رہا ہے۔

پیش منظر کا افسانہ نگار مقام حیرت سے چلا اور اپنی ذات کے سفر پر نکلا ایسا سفر جس میں اپنے مشاہدے تھے اور اپنے خواب۔ افسانوی پیش منظر میں نئے رجحانات 'نئی تدبیر کاری 'اسلوبیاتی سطح پر تجربے اور لفظ کا نیا ورتارا اس عظیم تر روحانی اور فکری واردات کا نتیجہ ہے اور اس کا پس منظر سیاسی اور معاشرتی مسائل کا لامتناہی سلسلہ۔

○

(۱) بحوالہ : "تحفظ کی طاقت" از میکن مارا 'چیئرمین عالمی بینک

اردو افسانے کا نیا لحن

(سریندر پرکاش، انور سجاد، جوگندر پال، خالدہ حسین، بلراج کومل، غیاث احمد گدی، محمد منشایاد اور مرزا حامد بیگ)

۱۹۵۸ء تک کا اردو افسانہ مختلف النوع سیاسی، سماجی لہروں اور تحریکوں کے زیر اثر رہا لیکن اس کے بعد یہ کسی خاص رجحان یا تحریک کا پابند دکھائی نہیں دیتا۔ اب افسانہ نگاروں کے انفرادی کام کو اہمیت حاصل ہوئی۔

وجودیت ہمارے اپنے عہد کا فلسفہ ہے جسے انتشار کی شکار بورژوا سوسائٹی کی عطا کہنا چاہئے۔ ماضی میں پاسکل نے سائنس کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ اب سچ ثابت ہونے لگے تھے۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے جہاں انسان کو مختلف سہولتیں بخشیں، وہیں انسان کو خارج پر قادر ہونے کے باوجود جذباتی اور محسوساتی سطح پر دائمی کرب کا مریض بھی بنا دیا۔ فرد تنہا رہ گیا۔

یہ تنہا انسان اپنے اعتقادات اور روشن خیالی کے درمیان گم سم ہے۔ مستقبل غیر واضح ہے اس لیے سوال جنم لیتا ہے یہ بالکل ویسا ہی تجسس ہے جیسا غالب کے ہاں نظر آتا ہے۔ ایک تہذیب کی شکست کے بعد نئی صورتحال کو دیکھ کر سوال --- کامیو والی بغاوت نے بھی ظہور کیا۔ مختار کل اور مجبور محض انسان جس کی تنہائی، انفرادی سطح پر بھی ہے اور انبوہ میں بھی۔ یہ تنہائی جذباتی اور فکری دونوں سطحوں پر ہے۔

اس اہم موڑ پر افسانوی اظہار سریندر پرکاش، انور سجاد، جوگندر پال، خالدہ حسین، بلراج کومل، غیاث احمد گدی اور محمد منشاء یاد کی معرفت علامت، سرئیل ازم، تجریہ اور استعارہ سازی کے حوالے سے تکنیکی سطح پر علامتی ابعاد اور نئے وژن سے متعارف ہوا۔

یوں پیش منظر کے افسانے میں بھرپور اظہار کی خاطر" میں "اور بے نام کردار Persona کے طور پر ابھر کر پس منظر اور رواں پس منظر کے افسانے سے الگ، اظہاری سطح پر اپنی پہچان کراتا ہے۔ یہ "میں" انفرادی اظہار کا ذریعہ ہے، اس طرح آج کا افسانہ پس منظر کے افسانوی پبلک ویژن سے مختلف اظہاری صورت سامنے لاتا ہے۔ یہ صورت حالات حیران کن اس وقت بن جاتی ہے جب پیش منظر کے چیدہ افسانہ نگار اپنے طور پر کسی نہ کسی سیاسی نظریے سے وابستگی کے باوجود افسانہ لکھتے وقت اس نظریے کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کی بہترین تخلیقات میں ان کا سیاسی عقیدہ ایک زیریں لہر کی صورت ہر دم رواں رہتا ہے اور یہ لوگ کمال احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے فارمولا تدبیر کاری سے بچ جاتے ہیں۔ بہت ممکن ہے یہ ترقی پسند تحریک کے رد عمل کی پیدا کردہ صورت حالات ہو یا سیاسی سطح پر جبر کی عطا، لیکن ہوتا یہ ہے کہ آج کے افسانہ نگار کا زاویہ نظر اور اسلوب، خود مختار فضا میں منفرد تجربات کا اظہار بنتا ہے۔

پیش منظر کا افسانہ Economy of Expression کا افسانہ ہے جو افادی نظریات کے روایتی ٹائپ کرداروں خصوصاً جاگیردار، کسان، سرمایہ دار، مزدور، تماش بین اور طوائف سے اوپر اٹھ کر فطری وجود کے ساتھ انسانی باطن کا نزول اظہار ہے۔

سریندر پرکاش کی افسانہ نگاری کا آغاز یوں تو ۱۹۴۴ء یا ۴۵ء میں افسانہ "دیوتا" کی تخلیق کے ساتھ ہوا، لیکن انکی مستقل پہچان ۱۹۶۰ء کے عشرے میں "ادب لطیف" لاہور" "سات رنگ" کراچی" اور "شب خون" الہ آباد" میں شائع ہونے والے افسانوں سے بنی۔ سریندر پرکاش کے اجتماعی نفسیات کے حوالے سے لکھے گئے افسانے ہندوستانی کلچر اور اجتماعی انسانی ذہنیت کی تشکیل اور تعمیر کے باب میں خصوصی طور پر توجہ طلب ہیں۔ جبکہ سریندر پرکاش کا بنیادی موضوع انسانی باطن کا اندرونی اجاڑپن اور ویرانی کا شدید احساس ہے۔ یہ بنیادی احساس سریندر پرکاش کے کرداروں کو جائے پناہ ڈھونڈھنے میں سرگرداں رکھتا ہے۔ اس کیفیت کے اظہار کے لیے سریندر پرکاش کے موسم شدید ہیں، منہ زور

ہوائیں اور بے کنار پانی کی تند لہریں۔ جائے عافیت کے طور پر آسیب زدہ گھر ابھرتا ہے جس میں چوکیدار ہے اور آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیاں۔
سریندر پرکاش نے بہتے ہوئے وقت کے دھارے کو تجریدی تدبیر کاری کے تحت اپنے بس میں کرلیا ہے۔ اس کا بے پناہ تہذیبی اور تاریخی شعور امیجری اور آوازوں کے Distort ہو جانے پر بھی ایک خاص قسم کی ماورائی کیفیت برقرار رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ "چھوڑا ہوا شہر" کے ریلوے اسٹیشن کی Crud معروضی صورتحال اور سینما میں سکرین اور اجتماعی لاشعور کا پھیلاؤ باہم ایک ہو کر بھی لا معنیت کو جنم نہیں دیتے "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" اور "جنگل سے کاٹی ہوئی لکڑیاں" میں ندی کی علامت انسانی زندگی کی علامت ہے جو قرنوں سے رواں دواں ہے۔

"یہ طے پا گیا ہے کہ ندی کنارے بسے ہوئے جس نگر میں میں رہتا ہوں اس کے بڑے چوراہے پر مجھے مصلوب کر دیا جائے اور میری لاش کو اسی تابوت میں رکھ کر، اس پر میرا یوم ولادت لکھ کر ندی میں پھینک دیا جائے تاکہ آئندہ جب کبھی پھر میری ضرورت پڑے، اس وقت کے لوگ مجھے حسب خواہش مصلوب کر سکیں"۔

دونوں افسانے یقین اور رجائیت کی انتہائی زیریں لہروں سے تکمیل پاتے ہیں اور ان میں ماورائیت کا احساس سریندر پرکاش کے پختہ تہذیبی اور تاریخی شعور کا پیدا کردہ ہے۔

سریندر پرکاش کے افسانوں میں لفظوں کی طے شدہ معنویت کے پیچھے ایک اور جہان سانس لے رہا ہے جس میں داستان کی سی واقعیت اور قصے کہانی کی سی کشش ہے۔ افسانہ "جپی ژاں" بظاہر ابہام کے نیم روشن اور نیم تاریک بوجھل دھندلکے میں لپٹا ہوا ہے لیکن اس علامت کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ "جپی ژاں" کی علامت سیموئل بیکٹ کے "Waiting For Godot" کے مرکزی کردار "گوڈو" کی یاد دلاتی ہے۔ اسی طرح سریندر پرکاش کا افسانہ "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" فرد کے اندرونی اجاڑ پن، ویرانی اور ضعف کا زندہ استعارہ ہے۔

سریندر پرکاش کے دیگر نمائندہ افسانوں میں "بجوکا"، "بازگوئی"، "رونے کی آواز" اور "بمقورہ الفریم" سلسلے کے افسانوں میں علامتوں کا ایک مکمل نظام کارفرما ہے جس کے تحت فرد اپنی ابتدائی ابتدائی اپنائیت سے صنعتی عہد کے بنجرپن تک کا سفر کرتا ہے۔

انور سجاد نے اپنے افسانوں میں ہر سو دندناتے ہوئے شرکی چہرہ نمائی کی ہے۔ سیاسی جبر، معاشی ناہمواری کا احساس اور معاشرتی سطح پر زندگی کے منفی بہت دونوں افسانہ نگاروں کے خاص موضوعات ہیں جبکہ افسانوی تدبیر کاری کی سطح پر ان دونوں میں وہی فرق ہے جو Elevate اور Sublime کرنے کا ہے۔

انور سجاد کے لہجے کی کرختگی اوس بورن کی تیزابیت سے ملتی جلتی ہے اور زبان کا ورتارا ایسا کہ جیسے کوڑے برس رہے ہوں اور کھال ادھڑ رہی ہو۔ یہ کیفیت اس نے اوقاف نگاری سے پیدا کی ہے۔ سکتہ، ختمہ اور خط کے ساتھ فجائیہ یا ندائیہ اوقاف کا استعمال انور سجاد کی نثر کی نمایاں پہچان ہے۔

یوں تو انور سجاد ترقی پسند فکر کے افسانہ نگار ہیں لیکن ان کے بعض افسانوں میں لا معنیت کا فلسفہ ایک زیریں لہر کی طرح رواں دکھائی دیتا ہے، افسانہ "سنڈریلا" اس ذیل میں بہت نمایاں ہے۔ جبریت کے شدید احساس کے تحت انور سجاد کے افسانوی کردار زندگی کے مظاہر میں عملاً شرکت کر کے براہ راست نعرہ لگاتے ہیں۔ جس کی نمایاں مثالوں میں انور سجاد کے افسانے "پی ایل فور ایٹی"، "کینسر" اور "کونپل" ہیں۔

"وہ اپنی بے ہوشی میں بھی مسکراتی ہے۔
اپنے ہونٹوں پر کھڑکی میں کھلے تھا، روشن سورج کبھی کی مسکراہٹ لیے۔ اور باہر کومل ہواؤں پر سوار، اُمڈتے روشن بادلوں کے پیچھے سورج، یوں زمین اور آسمان کے اتصال میں دراڑ بناتا ابھرتا ہے کہ بادلوں کے پیچھے اس کی کومل، سرخ، نارنجی، پیلی کرنیں، نیلاہٹ مائل سرمئی

چنان کی دراڑ سے تمازت اور حدت لیے باہر کو رینگتی نکلتی کیکڑے کی ٹانگیں دکھائی دیتی ہیں۔
شاید اس لیے کہ یہ وہ دن ہیں جب سورج چوتھے برج یعنی سرطان میں طلوع ہوتا ہے۔"

("کینسر" از انور سجاد سے اقتباس)

انور سجاد کے افسانے اپنے فکری نظام اور فارم کے اعتبار سے یکسر مختلف اور نئے ذائقے کے حامل ہیں۔ انہوں نے استعارے اور علامت کو اتنی ہنرمندی کے ساتھ برتا ہے کہ ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات Transparent صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور Private Persona اس نئی ہیئت ترکیبی میں ڈھل کر Public Persona بن جاتا ہے۔ انور سجاد کے ہاں اس نوع کی خوبصورت مثالیں "گائے" "، "سرویئر درشن" "، "کیکر" اور "یوسف کموہ" ہیں۔

جوگندر پال کی اولین شہرت افسانوی مجموعہ "دھرتی کا کال" سے متعلق رہی ہے جس میں تدبیر کاری کی سطح پر داخلی خود کلامی کا طریقہ کار اپنی پہلی جھلک دکھاتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ تدبیر کاری ان کی نمایاں پہچان بن گئی (نمایاں مثالیں "پاتال" اور "باہر کا آدمی") اور جوگندر پال کے افسانوں کا مرکزی کردار "میں" مروج افسانوی پبلک وژن سے مختلف اظہاری صورت سامنے لایا۔ ایسے میں ابہام کی عمومی فضا بندی، شناخت کا مسئلہ اور یکسر جداگانہ لحن جوگندر پال کے کارگر ہتھیار رہے ہیں، جبکہ "Other Self" اور "Self" کے بارے میں فکری ارتکاز جوگندر پال کا موضوع خاص ہے۔

جوگندر پال کردار کو دولخت کر کے گہری نفسیاتی بصیرت کے ساتھ سماجی اور ثقافتی مسائل کے الجھاوے فلسفیانہ سطح پر رفع کرتا ہے۔ پستیوں میں گرتے ہوئے فرد کا ذہنی اور اخلاقی تجزیہ "روشن پہاڑ" ہے۔ لیکن ایسے افسانے لکھتے وقت جوگندر پال ہمیشہ ابلاغ کے مسئلہ کو سر اٹھائے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ اسے اپنی رو میں لکھتے ہوئے بھی غیر تربیت یافتہ قاری کی الجھنوں کا احساس ستاتا رہتا ہے۔
محض ایک افسانے "ہارویسٹ" کی ایک طویل بریکٹ ملاحظہ ہو:
"میں اپنے آپ سے وعدہ کر کے لکھنے بیٹھا ہوں کہ میری یہ کہانی بڑی شریف ہوگی، اتنی شریف کہ ہر ایک کی سمجھ میں یوں آسانی سے آجائے جیسے کوئی غیر شریف (عورت؟) بلا جھجک ہر کسی کے پرائیویٹ ایریا میں، کہ سجھ بوجھ ہر کسی کا اپنا پرائیویٹ ایریا رہی ہے۔"
افسانہ لکھتے ہوئے یہ بے تکلفی کسی دوسرے افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتی۔ مثال دیکھیے:
"لیجئے جناب۔ یا جناب! کہانی کا رنگ روپ خوب نکھر آیا ہے اور اپنے سیکس کے عین مطابق دکھائی دینے لگی ہے۔ عورت کا عورت پن، کہانی کا کہانی پن ----- میری اس بھولی بھالی کہانی نے برقع اوڑھ رکھا ہے تاکہ بری نظروں سے بچی رہے، یا کوئی منچلا اسے دیکھنے پر تل ہی جائے تو آنکھیں بند کر کے اپنی توفیق کی حد تک اسے دیکھ سکے۔"

("ہارویسٹ" از جوگندر پال سے اقتباس)

اس خصوص میں "لیکن" "، "بے ارادہ" اور "بے محاورہ" کے افسانے خصوصی طور پر بہت نمایاں ہیں۔
جوگندر پال نے افسانہ "رہائی" کے ایک داخلی مونولاگ میں اظہار کی پابندیوں اور اسالیب کے انجماد کو موضوع بنایا تھا۔
"نئے واقعات، نئے خیالات، زندگی کے نئے اسالیب کی راہیں ہم پر کیوں بند کر دی ہیں۔ ہم نے اپنی اپنی جان کی بازی کھیل کر اپنی رہائی کا یہ اقدام کیا ہے۔ آؤ، اس کھڑکی کی راہ سے نکل جائیں، آؤ جلدی کرو۔ باہر نئی زندگی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔"

("رہائی" سے اقتباس)

اور اس کے بعد جوگندر پال نے اپنی پہچان کے تمام حوالے یکسر بھلا کر اسلوب اور موضوع میں سے موضوع کا چناؤ کیا۔ جب سے اب تک جوگندر پال کے ہاں موضوع کو اولیت حاصل ہے اور انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ہر موضوع اپنا طرز اظہار ساتھ لے کر وارد ہوتا ہے۔ "سلوٹیں" کے افسانچے اسی بولڈ اقدام کے غماز ہیں۔

عورت کی دنیا کے ضمن میں پطرس بخاری نے کہا تھا کہ یہ خواتین کا وصف خاص ہے کہ ان کی جذباتی دنیا شخصی اور ذاتی ماحول تک ہی محدود رہتی ہے اور ان شخصی اور ذاتی الجھنوں کا سلجھاوا بھی اپنے پھیلاؤ میں معرکے کی چیز ہے۔ لیکن پیش منظر کے افسانے میں یہ معرکہ کون مارے گا؟ نئے منظر نامے میں یک و تنہا خالدہ حسین کا نام ہے۔ (۱)

خالدہ حسین کے ہاں صنف نازک کا احساس عدم تحفظ بنیادی موضوع ہے جبکہ خوف، نفرت، اذیت اور تشکیک عورت کا ازل سے مقدر۔

عالمی سچائیاں ایک کے بعد ایک، رد ہوتی چلی جاتی ہیں، زندگی رفتہ رفتہ گذشتہ اقدار سے خالی ہوا چاہتی ہے اور عدم تحفظ کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہی خالدہ حسین کے افسانوں کا بنیادی طرز احساس ہے۔ خالدہ حسین کے ہاں خوف، نفرت، اذیت اور تشکیک سر اٹھاتے ہیں۔ یہ سب اس کے باوجود ہے کہ خالدہ حسین کے بیشتر افسانوں کا منظر نامہ درمیانے درجے کے گھریلو ماحول سے ترتیب پاتا ہے۔ جانے پہچانے کردار فنکارانہ تدبیر کاری کے سبب تجریدی اور ماورائی فضا بندی کرتے ہوئے (مثال: "سواری"، "ایک رپورتاژ"، "پہچان") زندگی کے وسیع تر تناظر میں سوالیہ نشان بن کر پھیل جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ماورائی کیفیت سے سرشار بہتے ہوئے وقت کے وسیع تر تناظر میں "ایک رپورتاژ" ہے جو ماضی کا استعارہ ہے۔ افسانے میں دھرتی کی حیرانی نے نیم کی تیلی بن کر کھلے جسم میں گڑھے ڈال دیئے ہیں۔ یہ افسانہ ہجرت کے تجربے، جبر کی انتہائی صورتوں اور انا کی رواں منافقت کی تین پرتیں لیے ہوئے ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ خالدہ حسین کے دور اول سے متعلق افسانوں میں "سواری" کے بعد "ایک رپورتاژ" ان کا نمائندہ افسانہ ہے۔ (۲)

"مجھے چاول دو"۔ میں چارپائی سے اتر کر بیوی کے قریب آن بیٹھا۔ دونوں بچے کچھ الگ ہٹ کر بیٹھ گئے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے چھوٹے ہو گئے تھے اور آنکھیں بڑی۔ میری لڑکی کی پشت میری طرف تھی اور اس کے بال کمر تک آئے تھے۔ اس کی پشت بالکل میری بیوی کی سی لگتی تھی"۔

("ایک رپورتاژ" سے اقتباس)

ادبی منظر نامے سے تقریباً پندرہ برس الگ رہنے کے بعد خالدہ حسین کہیں زیادہ طاقت کے ساتھ دوبارہ ظاہر ہوئیں اور یکے بعد دیگرے "ڈیڈ لیٹر"، "پرندہ"، "سایہ" اور "مکڑی" جیسے افسانے لکھ کر ایک بار پھر اردو افسانے کی پہلی قطار میں نمایاں تر دکھائی دینے لگیں۔ اب ان کے افسانوں میں تصوف کا رچاؤ اور بالغ عصری شعور ایک انوکھے لحن میں ڈھل گیا ہے جس میں نہ مروج افسانے کی جھنجلاہٹ ہے اور نہ شدت۔ زندگی کی پیچیدگیوں اور اس میں روندے جانے والی نفسی کیفیات پر خالدہ حسین کی گرفت اتنی مضبوط کہ قرۃ العین حیدر کے بعد یہ خوبی کسی خاتون افسانہ نگار کے حصے میں نہیں آئی۔

پیش منظر کے افسانے میں بلراج کومل موضوعی سطح پر تنوع کی ایک مثال ہے اور یہ تنوع تکنیک کا بھی ہے اور اسلوب کا بھی۔ جب کہ اس تکنیکی تنوع میں بلراج کومل کا بیانیہ کہیں زیادہ طاقتور دکھائی دیتا ہے (مثالیں: "کنواں"، "آنکھیں اور پاؤں"، اور "تیسرا کتا")۔ اس خصوص میں بلراج کومل نے خوف، دہشت اور اسراری کیفیات سے پر منظر ناموں کا انتخاب کیا اور کمال ہنر مندی سے علامتی ابعاد پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے، جس کی خوبصورت ترین مثالیں "کنواں"، "سائے کے ناخن" اور "تصویر" ہیں۔

بلراج کومل کے افسانوی کرداروں کی مشترکہ خصوصیت ان کا بے پناہ بھولپن اور معصومیت ہے اور ان کی یہی خصلت انہیں منافق اور

بے چہرہ ہجوم میں گم نہیں ہونے دیتی۔ بلراج کومل نے ان کرداروں کی ان نفسیاتی الجھنوں کو اپنا موضوع بنایا ہے جو محبت اور نفرت جیسے طاقتور جذبوں سے جنم لیتی ہیں 'اس کی مثال افسانہ "کنواں" اور "سائے کے ناخن" ہیں۔ "کنواں" پھلانگنے کا ماہر گو لنکر 'خود کشی چاہنے والے نوجوان کے تلخ جوابات کے دوران ہمدردی اور لاتعلقی کے درمیان دیر تک جھولتا رہتا ہے۔ اور فیصلہ اس کا جسم کنویں پر سے گزرتے ہوئے قوس بنا کر کرتا ہے۔ تب خود کشی چاہنے والے نوجوان کا فوری ردعمل وہی ہوتا ہے جو گو لنکر چاہتا تھا۔

جبکہ بلراج کومل نے افسانہ "تصویر" میں بوسیدہ کباڑخانے کے ماحول میں سری نواس اور کارتک کے دو کرداروں کا مکالمہ دیا ہے۔ اول الذکر کباڑخانے کا مالک ہے اور کارتک چلتے ہوئے کاروبار کا نیا خریدار۔ اس مکالے سے ہوتے ہوئے بلراج کومل نے افسانے کے آخری پیرا گراف میں نہایت چابکدستی کے ساتھ افسانے کو ماورائی کیفیت سے دوچار کر دیا ہے:

"کارتک نے اپنی نظریں تصویر سے ہٹا کر سری نواس کے منجمد چہرے پر گاڑ دیں اور تھوڑی دیر کے لئے خود بھی منجمد ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو تصویر کے شیشے پر چھوٹی چھوٹی ندیوں کی صورت میں بہنے لگے۔"

اس مقام پر دونوں کردار دیکھی بھالی تصویر کے قیدی بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کا وجود تحلیل ہو گیا ہے۔ اب وہاں محض بوسیدہ کباڑخانہ ہے اور تصویر کے شیشے پر ندیوں کی صورت میں بہنے والے آنسو رواں ہیں۔

غیاث احمد گدی کی اولین پہچان افسانہ "سائے اور ہمسائے" (مطبوعہ: "سویرا" لاہور) ہے۔ آگے چل کر اس نوع کے افسانوں میں غلام عباس اور سید فیاض محمود کے ملے جلے اثرات نے غیاث احمد گدی کے ہاں اسلوبیاتی سطح پر ایک خوبصورت توازن قائم کیا۔

"بابا لوگ" میں شامل پانچ افسانوں "بابا لوگ" "ڈورتھی جون سین" "بدصورت سیاہ صلیب" "پیاسی چڑیا" اور "صبح کا دامن" کا تعلق اینگلو انڈین معاشرت سے ہے۔ شاید اسی لیے جوگندر پال نے لکھا تھا کہ "بابا لوگ" کا مصنف ایک طویل مدت تک آدرشوں کے سائے میں آنکھیں موندے اپنی عبادت میں مگن رہا اور پھر آدرشوں کی دیوار اچانک ڈھے کر اس پر آگری' تو وہ اچانک چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا ذہن "ناردمنی" کی بے چینی سے جھپکنے لگا' جھپک رہا ہے۔ افسانہ "ناردمنی" غیاث احمد گدی کے فنی سفر کا نیا موڑ تھا اس کی یہ پہچان دوسرے افسانوی مجموعے "پرندے پکڑنے والی گاڑی" سے واضح ہوئی۔ اس کتاب میں شامل افسانوں خصوصاً "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" "دیمک" "کیمیا گر" اور "افعی" میں سماجی حقیقت نگاری' نفسیاتی پیچیدگیوں اور قلبی وارداتوں کا بیان خصوصی طور پر توجہ طلب ہے اور استحصال کے خلاف باغیانہ لحن گدی کے بیانیہ کا اگلا قدم:

"دراصل اس روز ہم دونوں پیئے ہوئے تھے' بلکہ معمول سے کچھ زیادہ ہی پی گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے قدموں میں لرزش' ہماری حرکات غلط سلط ہو رہی تھیں اور ہم باتیں کر رہے تھے۔ چنانچہ شہر سے دور 'اسٹیشن جانے والی سڑک کی ڈھلان جیسے ہی آئی' میرا دوست نارد 'نارد کمار سین گپتا نے اپنے پاؤں کے پاس پڑے ہوئے ڈھیلے کو اٹھایا اور سامنے پیڑ کی شاخ پر جھولتے ہوئے امرود کا نشانہ لگا کر زور سے ڈھیلے کو پھینکا۔ زوو ــــ دوں کی آواز اور تڑاخ سے امرود 'ڈھیلے کی زد میں آکر اڑ گیا۔

"کہاں گیا ـــ ماں کی ـــ ب ـــ!"

"دیکھا ـــ یوں ـــ یوں ـــ اڑ جائیں گے سالے۔!" نارد زور سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

مجھ سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ"۔

میں نے کہا: "کہاں بیٹھوں' نیچے زمین ہی نہیں ہے۔"

("ناردمنی" از غیاث احمد گدی سے اقتباس)

غیاث احمد گدی کے ہاں ایسی کیفیات کا بیان کرتے ہوئے محرکات کے طور پر خارج کا ماحول اور باطن کا سناٹا ایک نیا اور منفرد آہنگ وضع

کرتا ہے۔

محمد منشا یاد نے پیش منظر کے افسانوں میں رواں فکری اور نظریاتی محاذ آرائی کی انتہائی صورتوں یا فلسفیانہ توجیہات کے مقابلے میں حجاب، سرگوشی، اسرار اور گم گشتگی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ کچھ یہی سبب ہے کہ اس کے ہاں کرداری سطح پر گہری نیند سے چونکنے اور نظارے کی تاب نہ لاتے ہوئے مضمحل ہو کر دوبارہ آنکھیں میچ لینے کی معصوم خواہش اور کوشش دکھائی دیتی ہے (مثالیں: "دھوپ، دھوپ، دھوپ" "تماشا" "راستے بند ہیں" - اور "پانی میں گھرا ہوا پانی")۔

محمد منشا یاد کی افسانہ نگاری کا آغاز سیدھے سادے روایتی افسانے سے ہوا اور ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ تشبیہاتی، علامتی اور تجریدی تدبیرکاری کے تحت ان کے ہاں فرد کے آشوب نے موضوعی سطح پر اہمیت حاصل کی۔ ان کے اولین افسانوی مجموعے "بند مٹھی میں جگنو" (۱۹۷۵ء) کے دس افسانے خصوصاً "سورج کی تلاش" "سانپ اور خوشبو" اور "تیرہواں کھمبا" اسی دور کی یادگار ہیں۔

۱۹۷۵ء کے بعد شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں "ماس اور مٹی"، "خلا اندر خلا" اور "وقت سمندر" میں محمد منشا یاد علامت نگاری سے متعلق اپنا ایک رنگ وضع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ "راستے بند ہیں" "ماس اور مٹی" "پانی میں گھرا ہوا پانی" "کچی پکی قبریں" اور "تماشا" جیسے نمائندہ افسانوں میں ان کا طاقتور منظر نامہ دیہات سے متعلق رہا ہے۔ اسی منظر نامے سے چنے گئے کردار خصوصاً گوذو فقیر، ملیانائی، مادو، شیدو مستانی، صادو ترکھان اور گاؤں کی منڈیروں پر بیٹھے کاگ کی جگ بیتی کو منشا یاد نے "ہڈبیتی" بنا لیا ہے:

"میری اس کی دوستی بھی تو کہانی ہی کی بدولت ہوئی تھی۔

ماں جی نے بتایا تھا کہ ایک روز اس نے چڑیا کے ساتھ مل کر کھچڑی پکایا۔

چڑیا دال کا دانہ لائی اور وہ چاول کا۔ کھچڑی پک گیا تو چڑیا نے اسے کنوئیں سے پانی لانے کے لئے بھیج دیا۔ وہ پانی بھر کر لوٹا تو اس دوران میں چڑیا پوری ہانڈی چٹ کر کے چکی کے نیچے چھپ گئی۔ پھر جب اس نے بوندا جلایا تو چیخنے چلانے لگی۔ ہائے ہائے میرا بوندا سڑیا۔ کیوں پرایا کھچڑ کھادا۔"

ماں جی کہانی سناتیں تو میں چڑیا کی چیخیں سن کر زور زور سے ہنستا، روند مارنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

("اپنا اپنا کاگ" از محمد منشا یاد سے اقتباس)

پنجاب کے دیہی منظر نامے سے مطابقت رکھنے کے سبب زبان کے ورتارے کی سطح پر منشا یاد نے پنجابی الفاظ کو موقع کی مناسبت سے برتا ہے۔ اس ضمن میں لسانیات سے خصوصی شغف رکھنے والے ناقدین کیا فیصلہ صادر کرتے ہیں، اس کی منشا یاد کو پروا نہیں۔ وہ تو کہانیاں بنتے چلے جا رہے ہیں اور اپنے آپ میں مگن اپنے افسانوی کرداروں کی زندگی سہنے کے جتن میں مبتلا ہیں۔

قتیل جعفری لکھتے ہیں:

"مرزا حامد بیگ نے خاص معاشرتی سیاق و سباق میں انسانی لاشعور کو نہیں بلکہ اس کے شعور کو کھرچنے اور اس سے منسلک مختلف ذہنی رویوں اور سوچ کی لہروں کو پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ پہچان کے اس سلسلے میں تنقیدی زاویہ نگاہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے یہ دکھایا ہے کہ گزرے ہوئے زمانے اور گزرے ہوئے لوگ عصری شعور پر اپنی گرفت رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو دہراتے اور یاد دلاتے رہتے ہیں۔

حامد بیگ نے بیانیہ میں عمل پر نسبتاً کم اور محرکات پر زیادہ زور دیا ہے۔ حسد، ہوس، طبقاتی امتیازات، جھوٹے اعزازات، مصنوعی شان و شوکت اور خاندانی وجاہت وغیرہ کو مصنف نے مجموعی افسانوی کش مکش کے فوری محرکات کے طور پر برتا ہے۔ انہوں نے اپنے کئی افسانوں مثلاً مغل سرائے، مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا، نیند میں چلنے والا لڑکا اور گمشدہ کلمات وغیرہ میں ماضی بعید سے متعلق واقعات، تجربات اور رسومات

کو جدید استعاراتی اور علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کہانیاں ماہ و سال کی حدود کو توڑ کر ان زمانوں اور ان انسانوں تک پہنچتی ہیں جو ظاہر ہے کہ اب نہیں رہے لیکن جن سے (رد و قبول سے قطع نظر) افسانہ نگار کو بہرحال ایک طرح کی جذباتی اور اخلاقی ہمدردی ہے۔ یہیں سے ان افسانوں میں موضوع' کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

جہاں تک حامد بیگ کے تہہ دار اور پیچیدہ استعاراتی اسلوب کا تعلق ہے یہ واضح کر دوں کہ ان کے اس اسلوب کا تعلق تجریدی معنویت سے نہ ہو کر تجزیاتی معنویت سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں لفظی ابہام کے بجائے معنیاتی ابہام نظر آتا ہے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے جملوں' منتخب اور منفرد لفظیات اور خوب صورت استعاروں کی مدد سے اپنے لئے ایک ایسا نستعلیق اسلوب وضع کیا ہے' جو ان افسانوں کو پڑھنے اور پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے قاری سے بھی کم از کم ثقافتی اور لسانی سطح پر نستعلیق ہونے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان کا نثری اسلوب بنیادی طور پر نہایت ہی پرسکون' نرم اور مدھم ہے۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں شوریدہ اور ہرانگیختہ جذبات کا اظہار بھی نرم' غیر جذباتی لیکن موثر انداز میں ہوتا ہے۔ ان کے کئی افسانے یوں شروع یا ختم ہوتے ہیں:

(الف) شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے' اور وہ دونوں ملگجے اندھیرے میں دھندلائے ہوئے متحرک دھبوں کی طرح چپ چاپ بڑھے چلے جاتے تھے۔

(مغل سرائے)

(ب) وہ ایک ایسی ہی خنک شام تھی اور میرے دروازے پر گرتے ہوئے پتوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔

(دھوپ کا چہرہ)

(ج) بادلوں کے رنگین بجرے شفاف نیلے آسمان پر تیر رہے تھے۔ عصر کا وقت ہو چلا تھا' اور دریا ایک حد تک پرسکون تھا۔

(گمشدہ کلمات)

واضح رہے کہ مظاہر فطرت کی طرف حامد بیگ کا رویہ سائنسی یا آرائشی نہ ہو کر حسیاتی اور فن کارانہ رہتا ہے --- بسا اوقات بیانیہ اور مناظر متوازی دھاروں کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ بیانیہ کرداروں کے حالات اور ان کے خارجی اعمال کا احاطہ کرتا ہے جب کہ منظر کا تعلق ان کے احساسات' شعور' لاشعور اور ماحول سے ہوتا ہے۔ دونوں مل کر تاثر کی وحدت کی تشکیل اور تکمیل کرتے ہیں" (۳)

○

(۱)۔ اولین قلمی نام: خالدہ اصغر

(۲)۔ "ایک رپورتاژ" مطبوعہ "سویرا" لاہور خالدہ اقبال کے قلمی نام سے لکھا گیا۔

(۳)۔ یہ حوالہ: "آواز" مالیگاؤں' بھارت شمارہ نمبر ۲۲ بابت اکتوبر ۱۹۸۴ء تا اگست ۱۹۸۵ء

پس منظر، رواں پس منظر اور پیش منظر:

ہمارے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کی روایت کے تسلسل میں، صادق الخیری کا نیاپن نئے تقاضوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے اور عورت کا نفسیاتی مطالعہ (مثالیں: ورناسنہ" اور "غنچہ نارس") مشرقی معاشرت اور عورت کے زندگی کرنے کا جتن صادق الخیری کا موضوع خاص ہے۔ یہاں اصلاح پسندی اور آزادی نسواں کی تحریک کا اثر معاشرت کی جکڑبندیوں پر طنز کی صورت ظاہر ہوتا ہے۔ ایک مثال: "نشیمن"

مجموعہ "بلقیس" کے تمام تر افسانے اور "شمع انجمن" کے افسانوں کی ایک معقول تعداد راشد الخیری کے گہرے اثرات لیے ہوئے ہے۔ "شمع انجمن" سے "دھنک" کے افسانوں تک آتے آتے صادق الخیری کی شخصیت اپنے منفرد رنگوں کے ساتھ اظہار پانے لگی۔

بمبئی کے قرب و جوار میں پھیلے جزیروں کا رومانی ماحول صادق الخیری کے افسانوں کی فضا بندی کرتا ہے جبکہ کرداروں کی پیش کش دہلی کے سفید پوش گھرانوں کی طرف سے ہے البتہ اکا دکا افسانے (مثال: "نگار خانہ چین") شہر کی مصروف زندگی کی نمائندگی بھی کرتے ہیں جہاں سرمایہ اور مزدور کی کشاکش رومانی اثرات کو زائل کرتی ہے۔ دہلی کی ٹکسالی زبان کا لوچ صادق الخیری کے افسانوں کا حصہ ہے۔

حکیم احمد شجاع اور حکیم یوسف حسن کے تمام تر افسانے اصلاح پسندی کی اسی روایت کا حصہ ہیں۔ احمد شجاع، حکیم یوسف حسن اور حامد اللہ افسر کے افسانے کرداری سطح پر خاص طرح کے معیار کی جستجو کرتے ہیں۔ حامد اللہ افسر کا افسانہ "لاٹری کا روپیہ" اور احمد شجاع کا "اندھا دیوتا" اس کی مثالیں ہیں۔ البتہ یوسف حسن (مجموعہ: "سوسائٹی کے گناہ" مطبوعہ: ۱۹۳۳ء) کے ہاں سماج میں مظلوم کے حال اور تلخ نوائی کے ساتھ انقلاب کی گونج بھی شامل ہو گئی ہے۔

اوپندر ناتھ اشک کا افسانوی مجموعہ "ڈاچی" انہیں اصلاح پسندوں کے اس گروہ میں شامل کر دیتا ہے۔ البتہ ان افسانوں میں ہندوستان کی سیاسی بیداری کا بہترین شعور ان افسانوں کی اہمیت بنا ہے۔

اس اخلاق سدھار، معاشرتی اصلاح کی روایت میں اکا دکا بکھری ہوئی مثالیں اور بھی ہیں۔ اس روایت میں یلدرم کے دو افسانے "ازدواجِ محبت" اور "نکاح ثانی" بھی شمار ہوں گے جن میں جنسی بے راہ روی کی نسبت بے لوث محبت کو کامیاب و کامران دکھایا گیا۔ دیگر مثالوں میں خواجہ حسن نظامی کا "شہزادی کو نمونیہ" (مطبوعہ ۱۹۲۹ء نیرنگ خیال) نیاز فتح پوری کا "کیوپڈ اور سائیکی" ل۔ احمد کا "بھینٹ"، شمیم بیگ چغتائی کا "انگوٹھی کی مصیبت" اور مجنوں گورکھپوری کا "سمن پوش" نمایاں ہیں۔ اس روایت کے رواں پس منظر میں عبدالرحمن چغتائی (مجموعے: "کاجل" اور "لگان") اور عزیز ملک کے نام نمایاں ترین ہیں۔ چغتائی کا "بہو" اور عزیز ملک کا "اچھری" اس ضمن میں اہم افسانے ہیں۔

○

۱۹ویں صدی کا آغاز تھا اور اردو افسانے کی نمو کا عہد، اور ترکی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں سے ترجمے کا زمانہ۔ اولین افسانے جو اردو میں منتقل ہوئے، ترک افسانہ نگاروں خلیل رشدی اور مفاخر بے کے تھے اور انہیں "نشے کی پہلی ترنگ" (مطبوعہ "معارف" اکتوبر ۱۹۰۰ء) اور "فطرت جوانمردی" (مطبوعہ: "مخزن" جولائی ۱۹۰۱ء) کے ناموں سے سجاد حیدر یلدرم نے ترجمہ کیا۔

سجاد حیدر یلدرم، جلیل احمد قدوائی، حامد علی خاں، منصور احمد خاں، ل۔ احمد اکبر آبادی، محمد مجیب، محشر عابدی اور فضل حق قریشی کے طبع

زاد افسانوں کے علاوہ ہر ایک کی اہمیت ان کے ترجموں کے باعث بھی ہے۔ یلدرم نے ترکی ادب، جلیل قدوائی اور محمد مجیب نے روسی افسانے کے ساتھ چیخوف کو اردو میں متعارف کروایا۔ حامد علی خاں نے انگریزی اور فرانسیسی کی چیدہ تخلیقات کا ترجمہ کیا اور بودلیئر کو متعارف کروایا۔ منصور احمد خاں نے انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمن اور جاپانی زبانوں سے ترجمے کئے۔

یلدرم، مہاشہ سدرشن، جلیل احمد قدوائی، حامد علی خاں، ل۔ احمد، محمد مجیب، محشر عابدی، فضل حق قریشی، عبدالقادر سروری، ظفر قریشی جیسے اہم اولین ترجمہ نگاروں کے بعد مولوی عنایت اللہ، محمد حسن عسکری، منٹو، انور عظیم، ظ۔ انصاری، محمد خالد اختر اور محمد سلیم الرحمٰن نے ترجمے کو تخلیق کا درجہ دلانے کی سعی کی۔

ترجمہ نگاروں میں مولوی عنایت اللہ (فرانسیسی خصوصاً اناطول فرانس) ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری (سنسکرت) ڈاکٹر عابد حسین (یونانی) منہاج الدین اصلاحی (عربی) عزیز احمد (اطالوی) محمد حسن عسکری (فرانسیسی: گستاؤ فلابیر اور ستاں دال) ریاض الحسن (جرمن) شاہد احمد دہلوی (بلجیم خصوصاً مارس میترلنک) منٹو (روسی) قرۃ العین حیدر (انگریزی، روسی) ابن انشاء (امریکن، چینی، جاپانی خصوصاً ایڈگر ایلن پو، می شنگ اور موراساکی) انتظار حسین، انور عظیم، ظ۔ انصاری (روسی) محمد سلیم الرحمٰن، منیرالدین احمد (انگریزی۔ جرمن) ۔۔۔ اپنی انفرادی حیثیت سے جو فن کار اردو میں ترجمہ ہوئے ان میں گالز وردی (قاضی عبدالغفار) ٹیگور (سجاد ظہیر، بنکم چندر چیٹرجی (مہاشہ سدرشن، فدا علی خاں، جوالا پرشاد برق، شوبرت لعل ورمن اور گوری شنکر لال اختر) لوشون (ہنسراج رہبر) خلیل جبران (بشیر ہندی۔ ابوالعلا چشتی اور حبیب اشعر) موپاساں (نوح فاروقی اور سید قاسم محمود) بالزاک اور ڈی۔ ایچ لارنس (سیدہ نسیم ہمدانی) کے نام نمایاں ہیں۔ (یہ فہرست قطعاً نامکمل ہے) یوں دنیا بھر کا افسانہ اردو میں منتقل ہوا اور اردو افسانے کی روایت میں نئے موضوعات کی پیش کش کے ساتھ تکنیک کے تنوع کا باعث بنا۔

ل۔ احمد اکبر آبادی اور جلیل قدوائی بعض اوقات ترجمہ اور طبع زاد افسانے کی ملی جلی شکلیں سامنے لاتے ہیں۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں یہ بات خصوصیت کے ساتھ روسی فضا بندی کے حوالے سے سامنے آئی ہے۔ محض ایک مثال ل۔ احمد کے افسانے "بیوی" (مطبوعہ "نقوش") سے دیکھئے۔ یہ مکتوباتی افسانہ روسی افسانہ نگار P.Romanov سے حذف و اضافہ مستعار ہے۔ البتہ ل۔ احمد اور جلیل قدوائی (مجموعہ: "اصنام خیالی") نے ایسی کہانیوں کا چناؤ کرتے وقت اپنے مزاج سے مطابقت کا ضرور خیال رکھا ہے۔ مثلاً P.Romanov کے قلم کی کاٹ اور طنزیہ انداز ل۔ احمد کو بھی مرغوب ہے۔ نیز افسانوی تدبیر کاری میں نفسیاتی تصریحات دونوں افسانہ نگاروں کی پہچان ہے۔

ل۔ احمد، محشر عابدی اور فضل حق قریشی کے طبع زاد افسانوں میں اسی عہد کے دوسرے افسانہ نگاروں مثلاً کوثر چاندپوری (ابتدائی دور کے افسانے) اور طالب بانپتی کی طرح زندگی تک حقیقت پسندانہ رسائی کی کوشش، رومانی انگ لیے ہوئے ہے۔ یوں افسانوں کی ہنت میں خاص طرح کا میکانکی انداز بھی در آیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کا پسندیدہ موضوع معاشرتی سطح پر طبقاتی کشمکش رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض افسانے جذبات سے مغلوب صورت حالات پیش کرتے ہیں، جس سے افسانے کی تعمیر کا توازن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

○

مادر سری نظام زیست سے لے کر موجود لمحے تک بطور موضوع "عورت" سربستہ راز چلی آتی ہے۔ سو اس موضوع کے اجتماعی نوعیت کے سوالات کو حل کرنے کے لیے بھی بہر طور خاتون افسانہ طراز کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی۔ ورنہ ہو گا کیا کہ عورت کا موضوع موپاساں اور منٹو کے ہاں بعض ہیجانی جذبات کی تصویر کاری بھی سامنے لائے گا اور عورت کی تضحیک بھی، اور یہ کام منٹو کے ہاں نظر آئے گا جس نے اس موضوع کو ہمہ وقتی کام سمجھا۔ ورنہ تو صاحب ناول نگار السنر میکلین اپنی تخلیقات میں عورت کا ذکر محض اس لیے نہیں کرتا کہ عورت کے کردار کی پیش کش کہانی کا ٹیمپو مجروح کرتی ہے اور دوسری طرف ہنری جیمز نے کہا اور شاید ٹھیک ہی کہا کہ فکشن لکھنا خواتین کے بس کا روگ ہی نہیں۔

کنواری لڑکی آدھی بند کتاب ہے اور دیکھا جائے تو باقی زندگی میں عورت جس قدر اپنے آپ کو فکشن تخلیق کرنے کے قابل بنا پاتی ہے' اس کے مقابلے میں جنس مخالف یا صنف کرخت کٹھن پہاڑ سر کر لیتی ہے' موضوع سے تکنیک' منفرد اسلوب اور نمکی کی دریافت تک۔ اس طرح تخلیقی اعتبار سے پوری عورت بننے تک کا وقفہ عورت کے نجی موضوعات اور محسوسات کی لولی لنگڑی تصویر بنا پایا ہے اور بعد کی زندگی میں موضوعات کی گھمبیرتا کو تخلیق کار خاتون اس کی شایان شان ٹریٹ مینٹ (Treatment) نہیں دے پاتی۔ نتیجے کے طور پر ادھوری تخلیقات کے انبار لگتے ہیں۔ اردو افسانے میں بھی کم و بیش یہی صورت حال ہے یعنی اولاً موضوعات کا محدود دائرہ کار۔ ثانیاً" موضوعاتی دائرہ کار کی یکسانیت جمع تکنیکی شعور سے شدبد کی حد تک روابط اور ثالثاً" موضوعاتی دائرہ کار کی وسعت کے مقابل محدود تدبیر کاری۔ منفرد اسلوبیاتی سطح تک رسائی تو بعد کی منزل ہے۔ ایسی منزل جس تک بہت کم خواتین تخلیق کاروں کی رسائی ممکن ہوئی۔

ہوا یوں کہ اردو افسانہ اپنی ابتدا میں ہی طبقہ نسواں کی آزادی اور اصلاح وبہبود کی راہ پر انتہائی دردمندی کے ساتھ نکل چلا۔ "عورت" کا موضوع راشد الخیری اور سلطان حیدر جوش کے ہاں نذیر احمد کی جائزہ جانشینی اور رومانویوں کے ہاں رومانوی مثالیت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ عورت کا تصور یلدرم کے ہاں زندگی کا محور اور پریم چند کے ہاں سراسر وفا سے عبارت تھا۔ نیاز کے ہاں عورت کا تصور اکتساب لذت کا باعث ہے جب کہ علی عباس حسینی کے ہاں یہی تصور محض کہانی میں المیہ تاثر پیدا کرنے کا ذریعہ۔ مجنوں گورکھپوری اپنی عالمانہ بردباری اور عورت کے مسحور کن تصور کے درمیان ڈانواں ڈول رہے جبکہ اعظم کریوی نے عورت کے تصور کے نام دیہات کا سارا رومان انتساب کیا۔ ایک طرف آزادی نسواں کی تحریک چل رہی تھی اور چودھری محمد علی ردولوی نے کہا تھا:

"عورت بدصورت ہو ہی نہیں سکتی۔"

اس قول کے پیچھے رومانی اثرات بھی نمایاں ہیں لیکن دراصل اس کا باعث:

"راقم الحروف انانیت کا شکار' باوجود استغفار کے بھی انانیت کا شکار ہی رہتا ہے۔ "میں" کے استعمال سے پریشان ہے مگر "میں" اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

(محمد علی ردولوی "میرا مذہب" مطبوعہ ۱۹۳۸ء)

یہی موضوع افسانے میں ادب لطیف اور رومانویوں کے نئے نثری آہنگ کا باعث بھی ہے۔ نیاز فتح پوری نے لکھا:

"کیا وجہ ہے کہ جو لوگ نثر میں شاعری کرنا چاہتے ہیں اس حسن کے ذکر سے تائب ہو جائیں۔"

(مقدمہ کیوپڈ سائکی)

احمد شجاع نے تو اسی موضوع کی پیش کش کے لیے مصور اور شاعر ہونے کی آرزو کی لیکن آزادی نسواں کی تحریک اور اصلاح پسندی کے جذبے تلے اس کی شاعرانہ نثر کراہ کر رہ گئی۔ قاضی عبدالغفار نے "لیلیٰ کے خطوط" لکھ کر اصلاح پسندی اور رومان کو یکجا کیا اور بعد میں کھری حقیقت پسندی کے تحت جنسی جکڑبندیوں سے بغاوت کا اعلان "تین پیسے کی چھوکری" میں کر دیا۔۔ اس سے آگے افسانے میں تکمنڈ فرائیڈ' لارنس اور فلابیر کا دائرہ کار تھا۔ حجاب امتیاز علی' رومانی نقطہ نظر اور ڈاکٹر رشید جہاں' لادین انقلابی افکار لے کر ظاہر ہوئیں تو رومانی مثالیت کے متوازی دوسری رو رشید جہاں اور عصمت چغتائی کے حوالے سے چل نکلی۔ تب سے اب تک خواتین لکھنے والیوں کا ایک مروج دھڑا رومانی ہے جو وحیدہ نسیم کی پوچ جذباتیت تک چلا آیا ہے اور دوسری مقبول ترین راہ عصمت کے بعد واجدہ تبسم نے نکالی ہے۔

زنانی بوباس کے ساتھ عورت کے احساسات اور جذبات کی اٹھان پر عصمت چغتائی کی نگراں آنکھ کھری تصویر کشی کر پائی ہے اور دوسرا بڑا نام قرۃ العین حیدر کا ہے۔

اس روایت کے رواں پس منظر میں رحمان مذنب' ہاجرہ مسرور' واجدہ تبسم اور خدیجہ مستور کا پسندیدہ موضوع' سماجی ناانصافیوں میں گھری ہوئی عورت ہے۔ مذنب کے ہاں طوائف کے گرد و پیش کے ماحول کی جزئیات توجہ طلب ہیں۔ ("گوری کلاباں" "لال چوبارہ" "چڑھتا سورج"

"باسی کلی") تکنیکی اعتبار سے ان چاروں افسانہ نگاروں کا ابتدائیہ عصمت کی طرح جزئیات نگاری کے سبب خاموشی کے ساتھ رفتہ رفتہ پھیلتا ہے اور آخر میں منٹو کے افسانوں کی طرح یکلخت سکڑ کر یا نئی ترتیبی ہیئت اختیار کر کے چونکا دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہاجرہ اور خدیجہ کے افسانوں کی مقصدیت احتجاج سے بغاوت تک آ جاتی ہے۔

تسنیم سلیم چھتاری اور رضیہ فصیح احمد کی انفرادیت ان کے نسوانی کرداروں کی Isolation اور معروضیت میں ہے۔ یہ سفید پوش طبقے کے سماجی اور نفسیاتی مسائل میں سے گزرتی ہوئی عورت کی سچی تصویر کشی ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے کچھ افسانے خارجیت اور معروضیت میں توازن کی مثالیں سامنے لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چھتاری کا "کاش" اور رضیہ فصیح احمد کا "موڑ" ادھیڑ عمر خواتین کے ایسے کردار سامنے لاتے ہیں جو زندگی کی مار کو تنہا سہہ رہی ہیں۔ ان افسانوں میں خلوص کا جذبہ اور گھریلو روز مرہ زندگی کی صداقتیں خاصے کی چیز ہے جبکہ رضیہ فصیح احمد کا افسانہ "سرخ پلنگ پوش کی رات" عورت کے ان جذبات کا اظہار ہے جن کی پیش کش مرد کبھی نہیں کر پائے گا۔

جمیلہ ہاشمی، شکیلہ اختر، جیلانی بانو، صدیقہ بیگم سیوہاروی، الطاف فاطمہ اور نکہت حسن کے ہاں یہ موضوع معاشرتی اقدار کی تبدیلی کے احساس کے ساتھ اس حیرت کی جانب مڑ گیا ہے جو داستانوی اسلوب کی بنیاد، لوک دانش کا خاصہ ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ہاں کھری سکھ معاشرت کا جادو سر چڑھ کر بولا ہے جبکہ شکیلہ اختر اور جیلانی بانو کے افسانوں میں عورت کی ابنارمل نفسیات کا وقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے۔ صدیقہ بیگم کے بیان کی شگفتگی اور ہندی گیت کی خاص فضابندی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

الطاف فاطمہ کی با محاورہ زبان اور ملازمت پیشہ نسوانی کردار نگاری خصوصاً عورت کے تجرد کی زندگی کا تجزیہ بے مثال ہے (مثال "بیچلرز ہوم")۔ شکیلہ اختر، جیلانی بانو اور الطاف فاطمہ کے افسانوں کو ان کے جذباتی لہجے نے نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی ایک وجہ ممتا کا شدید جذبہ ہے جس کی مثالیں شکیلہ اختر کے "آشا"۔ جیلانی بانو کے "ادھوری بات"۔ "اکیلا" اور الطاف فاطمہ کے "اُگیا جنال" سے ملتی ہیں جب کے بعض افسانوں میں بچوں کی صورت میں آسودگی حاصل کرنے کی تمنا بھی در آئی ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر، اختر جمال اور آمنہ ابوالحسن کے افسانوں کا خصوصی موضوع متوسط گھرانوں کی روز مرہ زندگی سے عبارت ہے جس میں یکایک نمودار ہونیوالے ان ہونے واقعات فرد کی زندگی کو تلپٹ کر رہے ہیں۔ نمایندہ مثالوں میں رضیہ سجاد ظہیر کا افسانہ "نئی نویلی" "اختر جمال کا "چکن کا کرتہ" اور آمنہ ابوالحسن کا "ستون" ہیں۔ افسانے "ستون" کی باغی لڑکی نفیسہ کا کردار ان تینوں افسانہ نگاروں کے ہاں بندھے ٹکے روایتی حالات کو کروٹ دینے کا باعث بنتا ہے۔

امرتا پریتم کے افسانوں میں پنجاب کی رہتل اور افسانوں میں امرتا پریتم کے اپنے کردار کی جلوہ نمائی ہمیشہ قابل توجہ رہی ہے۔ اس کی ایک مثال افسانہ "زندگی کا باقی" ہے، جس میں شری دیو دت کی بیوہ چیتنا کماری اور امرتا پریتم ایک ہی کردار میں ڈھل رہی ہیں اور یہی امرتا پریتم کا جامع الحیثیات کردار ہے۔ اور شاعر یگ راج دراصل ساحرلدھیانوی ہے۔ اب جبکہ خود امرتا پریم نے اس پرانی محبت اور عقیدت کا برملا اظہار کر دیا ہے، اس افسانے میں رواں دکھ اور رومانوی فضا کا تاثر دو چند ہو گیا ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں نے خالصتاً نسوانی احساسات کا ایک وسیع پینوراما ترتیب دیا ہے جو انفرادی سطح کے احساسات سے کنبہ اور پھر خاندان سے پھیل کر پوری نسوانی برادری (یا بہناپے) تک یہ دائرہ پھیل گیا ہے۔

رواں پس منظر میں محمد احسن فاروقی، آغا بابر، رام لعل اور راجندر سنگھ بیدی نے خاص طور پر جنس مخالف کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس ذیل میں محض بیدی کے افسانوں سے مثالیں دیکھیے: "بلبی لڑکی"، "ٹرمینس سے پرے"، "جو گیا"، "بل"، "متھن"، "دیوالہ"، "لاجونتی"، "گرہن"، "اغوا"، "وہ بڈھا" اور "حادثے" ہندو معاشرت میں عورت کے ہر ہر زاویے کے عکاس ہیں:

"وہ اداس تھا، اور یوں ہی ادھر بھٹک رہا تھا"

وہ اکیلی تھی اور پارک کے پاس سوکھی زمین پر بیٹھی تھی......

شاہد احمد دہلوی کا "تقلید شباب" ' ظفر قریشی دہلوی کے افسانوں کے تین مجموعے نئے محل ' "گزرگاہ خیال" اور "دریچے" اور سراج الدین ظفر کا افسانوی مجموعہ آئینے" (مطبوعہ ۱۹۴۳) اپنے طنزیہ ("مولانا" - "جنت بوالہوس کی") اور مزاحیہ افسانوں ("راکمشش" - "الف لیلیٰ کا ایک باب") کے سبب یادگار ہیں۔ اسی ذیل میں کرشن چندر کا افسانوی مجموعہ "گھونگھٹ میں گوری جلے" اور امتیاز علی تاج کی مزاحیہ کردار نگاری (خصوصاً چچا چھکن) آتی ہے۔ خواجہ احمد عباس کا افسانوی مجموعہ "کہتے ہیں جس کو عشق" اس روایت میں رومانی ادب پر شدید طنز کے سبب یادگار ہے۔

اس روایت کے رواں پس منظر میں ست پرکاش سنگر ("ہم بیاباں میں ہیں اور" ---) 'اشفاق احمد ("چچا سام کے دیس میں") 'اعجاز حسین بٹالوی ("سردخانہ") اور مشتاق قمر ("کنویں میں گرا ہو آدمی") نمایاں ہیں۔

اردو افسانے کے دوسرے دور میں جس طرح عسکری - منٹو - مفتی - عصمت اور شیر محمد اختر کے ہاں انسان کی جنسی جبلت بنیادی اہمیت کی حامل ہے اسی طرح آغا بابر (مجموعے: اڑن طشتریاں - چاک گریباں اور لب گویا) میرزا ریاض (مجموعہ: آندھی میں صدا) سید امجد الطاف (مجموعہ: "کچے دھاگے") اور ضمیر الدین احمد (مجموعہ: سوکھے ساون") ابنارمل جنس کے حوالے سے معاشرت کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جب کہ سلیم اختر کے ہاں مردانہ اور زنانہ ہم جنسی کے میلان کا مطالعہ (مثال: افسانہ "پابندی وقت") اور جنسی کجرویوں کے محرکات کی تلاش ملتی ہے۔ مثالیں "جلے پاؤں کی بلی" ' "بکری" اور "پاؤں کی جنت"۔ سلیم اختر کے ہاں بلی 'پاؤں اور گندے پانی کی موری کی جنسی علامات توجہ طلب ہیں۔

بڑے شہر کی تاجرانہ ذہنیت کس طرح انسانی اقدار کی صورتیں مسخ کرتی ہے اور مجرم کرداروں کے ساتھ خیر چاہنے والے کردار کیسے ہیں جو نیکی اور پاکیزگی کے خواب دیکھتے ہیں؟ ان سب کی تصویر کاری احمد عباس اور کرشن چندر کے بعد کوثر چاند پوری 'حیات اللہ انصاری' اختر اورینوی' سید فیاض محمود' عبدالرحمان چغتائی' اوپندر ناتھ اشک 'کشمیری لال ذاکر اور مہندر ناتھ کے افسانوں میں ایک معیار قائم کرتی ہے۔

ان افسانہ نگاروں نے شہر کی غالب آبادی (متوسط اور نچلا طبقہ) کی حسرتوں 'محرومیوں اور گراوٹوں کو اپنا موضوع بنایا' اس ذیل میں حیات اللہ انصاری کا افسانہ "آخری کوشش" ' کوثر چاند پوری کا "میرا پیشہ" اور "چاندنی کا سفر" ' اختر اورینوی کا "جونیئر" ' سید فیاض محمود کا "کام چور" ' رضیہ سجاد ظہیر کا "نئی نویلی" ' ممتاز شیریں کا "کفارہ" ' حسن منظر کا "ندیدی" ' عبدالرحمان چغتائی کا "لت پت" ' محمد عمر میمن کا "تاریک گلی" ' اوپندر ناتھ اشک کا "پیاری سی گلی" ' کشمیری لال ذاکر کا "میرا آنچل میلا ہے" اور مہندر ناتھ کا "چاندی کے تار" یادگار افسانے ہیں۔

اس روایت میں کشمیری لال ذاکر اپنے موضوعات کے تنوع اور افسانوں میں خاص طرح کی بھائی چارے کی فضا کے باعث خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ "میرا آنچل میلا ہے" ' "پہلا دن" اور "طلاق" کے مرکزی کرداروں میں دان کرنے کا جذبہ اس کے افسانوں میں فردی قسم کے اختلافات کے باوجود قومی یک جہتی کے جذبے کے تحت 'رنگ 'نسل اور نظریے کے تفاوت کو کم کرتا ہے۔ ذاکر کے کرداری افسانے ہندوستان کی مضبوط تہذیبی بنیادوں سے اپنے رنگ اور عادتیں چنتے ہیں اور اکثر افسانوی کردار اپنے مشترک قومی ورثے کے ہوشیار محافظ ہیں جبکہ مہندر ناتھ کا مجموعہ "چاندی کے تار" اس صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی کی معاشرت اور شہر کے متوسط طبقے کی جوان آرزوؤں اور امنگوں کا ترجمان رہا ہے۔

اس روایت کے رواں پس منظر میں بیشتر افسانے شہر کی مصروف زندگی کے کسی ایک رخ کی بجائے کل کو ناول کے انداز میں سمیٹنے کی کامیاب کوششیں ہیں۔ ان پیش کاروں میں رتن سنگھ 'سید قاسم محمود' سلیم اختر اور کلام حیدری نمایاں ہیں۔

رتن سنگھ اس روایت میں مختصر ترین افسانہ لکھنے کے سبب نمایاں ہے اور اس کے ہاں شہری زندگی کی معمول سے ہٹی ہوئی گھڑیوں اور اجنبی ساعتوں کی کامیاب پیش کش اس کے شاداب لہجے کے سبب ہے۔ مثالیں: "دکھ کی عمر" اور "آخری اداس آدمی"۔ سید قاسم محمود کا موضوع نجاستوں کی لپیٹ میں آیا ہوا شہر ہے۔ قاسم محمود نے اس شہر میں مقدور بھر خیر کی جستجو کی ہے۔ مثالیں: "دس پیسے" ' "تانگے والے کی لڑکی" اور "دیوتی کا قاتل"۔ اس رو میں سلیم اختر کے غیر روایتی تدبیر کاری کے افسانے نمایاں ہیں۔ "بیلنس شیٹ" ' "کولیٹا ۱۹۹۹ء" ' "محاذ ۱۹۷۱ء" اور "مسٹر اینڈ مسز ۱۹۷۱ء" جیسے افسانے تکنیکی اعتبار سے اور "پابندی وقت کے فوائد" جیسے ان چھوئے موضوعات خصوصاً" جنسی تلذذ اور ہم جنسی

اور بہت الجھے ہوئے نفسیاتی مسائل (خصوصاً "آشوب چشم" میں کمھی کی طرف دوستی کا ہاتھ) جیسے افسانے سلیم اختر کو اس روایت میں بہت نمایاں کر دیتے ہیں۔ کلام حیدری (مجموعہ: صفر) کے افسانوں میں "گیا" شہر کی زندگی قابل لحاظ ہے۔ اس کے افسانے "زندگی" کا شوہر اور "بتی" کا ایڈیٹر گھر اور گھر سے باہر جس منافقت کا تانا بانا بنتے ہیں اس کی مکروہات کلام حیدری کے "سب سیاہ" اور "لا" میں ظاہر ہیں۔

دیہات نگاری کے ضمن میں' جمیلہ ہاشمی کے ہاں سکھ معاشرت کی کھری عکاسی' مدہم سریلے بول' کرداروں کی انا پیشگی اور دھیمے دھیمے درد کی لے انوکھا اثر رکھتی ہے خوبصورت مثالوں میں "سرخ آندھی" "لہو رنگ" "آتما کی شانتی" اور "بن باس" ہیں۔ جبکہ صادق حسین (مجموعہ: "پھولوں کے محل") نے پوٹھوہار کے غیرت مند اور دلیر کرداروں کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں سے بنے ہوئے حیران کر دینے والے ثقافتی مظاہر اور رومانی فضا کے افسانے لکھے ہیں جس کی ایک مثال "پو نیچیاں" ہے جب کہ فہمیدہ اختر (مجموعے: "کشمالہ" "اپنے دیس میں") اور لطیف کاشمیری (نمایاں افسانہ: رسل جو") نے پہاڑوں کے دیہات' خصوصاً' پشاور اور کوہ مری کی کمزوری نفسیات کو اپنا موضوع بنایا۔

دوسری طرف' منفرد لینڈ اسکیپ کے افسانوں میں قاضی عبدالستار اور واجدہ تبسم نے بالخصوص جاگیردارانہ تمدن کی عکاسی کی ہے۔ ان افسانوں میں قرن با قرن کی سماجی عوامل سے مرتب شدہ تہذیبی اقدار کا شعور آج کے عہد میں ایک Unique Approach ہے۔ صرف واجدہ تبسم کے ہاں ہی خوبصورت مثالوں میں جاگیردار طبقے کا زوال "دیار حبیب" "حویلی کی ڈھیتی ہوئی فصیلیں (گلستان سے قبرستان تک) اور باطنی طور پر جاگیرداری کی زوال پذیری کی مثال "ناگن" جیسے افسانے پیش کش کا معیار قائم کرتے ہیں۔

شہر سے نکل یہ آگے بڑھتی ہوئی چاروں اطراف میں پھیلتی سڑک ان دیکھے اور ان چھوئے نیم تاریک رسوم و رواج اور روایات تک گھر کر گئی ہے۔

دیوندر ستیارتھی "نگری نگری" لے پھرے' اور یہ خانہ بدوشی کی روایت مانک ٹالہ تک آتی ہے۔ (مجموعہ "پیاسی بیل") مانک ٹالہ کے ہاں مصر کے اہرام اور افریقہ کے جنگل ---------- پیرس اور بنکاک کی سڑکوں کے شور میں بولتے ہیں۔

سکھ معاشرت کی پیش کش جمیلہ ہاشمی (سرخ آندھی۔ بن باس) ہندو سماج۔ خواجہ احمد عباس ("کرشن چندر کی محبوبہ") مسلم معاشرت' عصمت چغتائی (چوتھی کا جوڑا) کرسچین معاشرت: پریم چند (مشق دنیا اور میر درویش' نیز لندن کا مضافاتی علاقہ) محمد حسن عسکری (بیشتر افسانوی کردار) راج (سومنات کے بعد ------ پیغمبر کی موت) اعجاز حسین بٹالوی (سردخانہ) مقصود الہی شیخ (مجموعہ: "برف کے آنسو" کے بیشتر افسانے) منیر الدین احمد اور خالد ابراہیم (لمحے کا بادشاہ) کے ہاں نمایاں ہوئی ہے۔ جب کہ سرحدی اور قبائلی علاقوں کے قصے فہمیدہ اختر' مسعود مفتی اور سیدہ حنا نے لکھے بالترتیب "کشمالہ" "راضی نامہ" اور "تنہا اداس لڑکی۔"

شملہ کی کچی تصویر: اشفاق احمد (بندر لوگ") بلوچستان اور سندھ کی سیاسی اور معاشرتی صورت گری: نجم الحسن رضوی (چہروں کے پہاڑ۔ ساوتھ بیلا میں اجنبی) ---- سون سیکسر کی جھلک: احمد ندیم قاسمی (الحمد للہ - رئیس خانہ) کے ہاں ملتی ہے۔

رام لال اور رضیہ فصیح احمد نے "سفر وسیلہ ظفر" کو خوبی کے ساتھ افسانوں میں جگہ دی۔ رام لال کے ہاں بڑھاپے کا متمول تجربہ (زندگی سے آنکھ ملانے کی بات) اور رضیہ فصیح احمد کے ہاں سفرنامے اور رپوتاژ کی دھوپ چھاؤں افرادی رنگ لیے ہوئے ہے۔

ہرچرن چاولہ کے ہاں یادوں کے حوالے سے میانوالی کا لینڈ اسکیپ اور سید انور کے ہاں سمندر کا سفر (بحر بے پایاب مجھے) اور بندر گاہوں کے رومانی واقعات کے ساتھ متحدہ بنگال جلوہ گر ہوا ہے۔ سید انور کو ایک شعلہ' ایک طوفان اور ایک زلزلہ کہا جاتا رہا ہے اس بحری سفر کے حوالے سے اس نے ہر طرف سلگتی ہوئی معاشرت میں LIVE کیا ہے۔ مثال: مجموعہ: "آگ کی آغوش میں" کے افسانے۔

اے حمید کے افسانے جذبہ محبت اور فطرت کی خوبصورتی کو باہم ایک کر کے ماورائی فضا ترتیب دیتے ہیں۔ (دوگیت۔ چاندنی رات میں سفر) خود سپردگی کے نشے میں سرشار افسانہ "دیوداسی" "گلاب اور دریا" کے کردار اپنی نوع میں بہت معتبر ہیں۔ اور اس کے افسانوں کی سحر انگیز فضاؤں میں ادھوری' ناکام محبتوں کی مدھم سریں اور رومانی یادیں۔ اس کی ایک مثال افسانہ "خزاں کا گیت" ہے:

"کاسنی کے گلدان میں لگی یوکلپٹس کی ٹہنیوں کو موم بتی کے قریب کر دو اور چرچ مین کا سگریٹ سلگا کر ٹیبل لیمپ بجھا دو اور پھر مجھے بتاؤ کہ یوکلپٹس کی کمسن ٹہنیوں کے پاس موم بتی کو روشن دیکھ کر تمہیں یوں نہیں لگتا جیسے گرتی برف میں آتش دان کے پاس بیٹھے کسی قدیم اندلسی موسیقار سے بچپن کا سوگوار گیت سن رہے ہو؟ میں بھی تمہیں بچپن کا ایک سوگوار گیت سنانا چاہتا ہوں۔ یہ گیت سردیوں کی ایک ٹھٹھری سنسان گلی سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں ایک پرانے چھجے والے مکان کی کھڑکی میں چک کے پیچھے کشمیری شال میں لپٹا ہوا چہرہ ابھرتا ہے۔ نسواری آنکھوں، ناک میں سرخ کیل اور براؤن ہونٹوں والا گرم چہرہ۔"

("بارش میں یوکلپٹس کا درخت" از اے حمید)

محمد احسن فاروقی اور احمد شریف کے ہاں کرخت حقائق کے علاوہ کردار کی سطح پر عجیب طرح کی غیر متوازن صورت حال قابل توجہ ہے۔

"نہایت معمولی چہرہ بلکہ معمولی سے بھی گرا ہوا، دھنسی کنپٹیاں، چھوٹی آنکھیں، گال پھولے ہوئے ناک چپٹی تو نہیں مگر بہت چھوٹی۔"

یہ احسن فاروقی کے افسانے "چیتر" کی ہیروئن کا ناک نقشہ ہے جو تھوڑی سی رد و بدل کے ساتھ احمد شریف اور احسن فاروقی کے بیشتر نسوانی مرکزی کرداروں کی پہچان ہے۔ چاہنے والوں اور چاہے جانے کی خواہش کرنے والوں سے سماجی مرتبے اور عمروں کا تفاوت دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں عجیب و غریب صورتیں سامنے لاتا ہے۔ احمد شریف کے ہاں اس کی مثالیں: "گھر میں اجنبی" اور "چھتر کاؤ کاؤ جی" اور احسن فاروقی کے ہاں "بجھتی لٹتی ہے" میں ہیں۔ ایسے مرکزی کرداروں کی پیش کش افسانوی کرداروں کی سطح پر روایت کی توسیع ہے۔ محمد احسن فاروقی نے جنسی نفسیات کے حوالے سے محبت اور بوالہوسی کے دوسرے بعد تک کا سفر حیرت ناک کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے۔ اور وہ جو سارتر کے مجموعے "INTIMACY" کے بارے میں کہا جاتا ہے:

"محبت میں بوالہوسی کا ذہین مطالعہ" محمد احسن فاروقی کے افسانوی مجموعے: "افسانہ کر دیا" پر پورا بیٹھتا ہے۔ احسن فاروقی کے افسانوں میں مٹی ہوئی تہذیب کے گم شدہ نقوش از سر نو اجاگر ہو کر افسانے میں خاص طرح کی جاذبیت کا باعث بنتے ہیں۔

ابراہیم جلیس اور شوکت صدیقی کے افسانے زبان اور تکنیک کے تنوع کے باوجود سماجی انصاف کی خواہش اور سنسنی خیزی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس روایت میں شوکت صدیقی کی منفرد مریض اور مجرم کردار نگاری ("راتوں کا شہر" اور "خلیفہ جی") قابل لحاظ اس لیے نہیں رہتی کہ ان کے ہاں سماجی انصاف کی شدید خواہش، ان کے افسانوں کو مبالغے کی حدود تک لے جاتی ہے۔ شوکت صدیقی کے بعض افسانے تو سوشلسٹ افکار کے سٹڈی سرکل کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مثال دیکھیے: "ابوالہول کا سایہ"۔ کی ابتدا لینن کے قول سے ہوتی ہے:

"انقلابی قوتوں کو جب پوری طرح ابھرنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ زندگی کے لیے زہراب بن جاتی ہیں۔" یہ افسانہ اسی قول کی تشریح ہے۔ بھوکے زندگی سے ہارے ہوئے زخمی سپاہی کا دن ڈھل رہا ہے۔ کرفیو آرڈر کی رات میں اس کی آخری ہچکیاں اس افسانے کا موضوع بنی ہیں۔ ایسے جذباتی مقامات پر شوکت صدیقی کے طنز کی زہرناکی نے ان کے افسانوں کو ضعف پہنچایا۔

ست پرکاش سنگر بھی اسی نسل سے متعلق ہے۔ اس کے ہاں یہ حادثہ گزرا ہے کہ افسانہ نگار اپنی حاضر جوابی اور ڈرامہ نگار طبیعت کی شگفتگی سے ایک پل بھی پیچھا نہ چھڑا سکا۔ اس طرح افسانہ نگار کی نسبتاً اونچی سطح پر کھڑی ذات کے مقابل اس کا افسانہ نشیب میں اترتا چلا گیا۔ اس طرح "لنکا اشنان" اور "ہم بیابان میں ہیں" جیسے نمائندہ افسانوں کی تمام تر تازگی جملہ بازی اور شگفتگی بیان میں دب کر رہ گئی۔

راج کے افسانوں میں کرسمس کی تعطیلات اور گرجے کا ماحول اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے بعض افسانے گرجے کے اثرات سے بہت دور نکل کر بھی لکھے جو غیر معمولی لمحات کی روداد ہیں اور محبت کے متعلقات اور نفسیاتی الجھنوں کے لامتناہی سلسلے۔ راج کے افسانوں کی زندگی ملی جلی معاشرت کی ہے جس کے لیے اس نے کیمرہ تکنیک کا برتاؤ کیا ہے۔ اور اپنے افسانوی کرداروں کو ہجوم میں سے چن کر ہجوم کے پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ ایسے میں راج کے موضوعات کا نیا پن اور اسلوب کی ندرت اہمیت کی حامل ہے۔

عنایت اللہ اور میرزا ریاض کے اکثر افسانے کرداری ہیں اور ان افسانہ نگاروں کی جزئیات نگاری قابل توجہ ہے۔

عنایت اللہ اپنے کرداروں کے گرد پھیلی ہوئی لاتعلق زندگی اور اشیا میں سے معنی کی تلاش کرتا ہے۔ (نمایندہ مثال: ادھوری کہانی) عنایت کے دونوں افسانوی مجموعوں "منزل منزل دل بھٹکے گا" اور "سوز عشق جاگ" کے بیشتر افسانے لاتعلقی میں تعلق کی تلاش سے متعلق ہیں۔ بعینہ یہی طریقہ کار میرزا ریاض اس وقت اختیار کرلیتا ہے جب وہ ارد گرد کی پوری صورت حال کو مجرم کردار نگاری کا عینی گواہ بناتا ہے۔ اس کے افسانوی مجموعے "گنبد میں صدا" کے بیشتر افسانے اس کی مثال ہیں اور افسانوں میں ابنارمل جنسی نفسیات کا مطالعہ اور آپس میں الجھتے ہوئے شر اور معاشرتی گراوٹوں میں خیر کی جستجو اہمیت کی حامل ہے۔ ایک مثال: "چمگادڑ"

اس روایت میں عاشق حسین بٹالوی (مجموعہ: "سوز ناتمام") اور شمس آغا (مجموعہ: "اندھیرے کے جگنو") نے حسن و عشق کی گھسی پٹی روایتی فارمولا کہانیوں کو نئی تدبیر کاری کے تحت چونکا دینے کی حد تک قابل توجہ بنا دیا ہے۔ عاشق حسین بٹالوی اور شمس آغا کے ہاں غم و الم کی فضا بالترتیب عورت کی بے وفائی اور جوان جذبوں کی اٹھان (اور ان کی معصومیت) کے حوالے سے توجہ طلب ہے۔

رواں پس منظر میں عرش صدیقی، رام لعل، احمد یوسف، کنور سین، قمر احسن، عبدالصمد، شوکت حیات اور انور خان کے ہاں موضوعات کا تنوع اور اس کی مناسبت کے ساتھ اسالیب اظہار کی نت نئی کروٹیں قابل توجہ ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں سماجی حقیقتیں، نفسیاتی الجھنیں اور معاشرتی ناہمواریاں ان کے منفرد زاویہ نظر کے تحت افسانوں میں ڈھلتی رہی ہیں۔

رام لعل کے افسانوں میں مرد اور عورت کا جنس مخالف کے داخل سے آگہی حاصل کرنے کا عمل ازلی تکرار میں اس وقت ڈھلتا ہے جب رام لعل اس دنیا کے چل چلاؤ میں فرد کو جسمانی طور پر بھی مسافر بنا دیتے ہیں (مثالیں: "حیرت زدہ لڑکا" ۔ "اکھڑے ہوئے لوگ۔")

رام لعل کے ہاں یہ سفر حتی الامکان معنویت کا استعارہ ہے۔ ایسا سفر جو انسان کے داخل اور خارج دونوں سطحوں پر یکساں طور پر جاری و ساری ہے۔

احمد یوسف اور عرش صدیقی نے متنوع موضوعات کے برتاؤ کے ساتھ روایتی طرز اظہار سے علامت اور تجرید کے معتدل در تارے تک سفر کیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کا انسانی نفسیات سے گہرا شغف اور بیان میں شگفتگی کا عنصر قابل لحاظ ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں تیسری سمت کی تلاش بھر پور معنویت کی حامل ہے۔ قمر احسن، شفق، انور خان، کنور سین، عبدالصمد اور شوکت حیات کے افسانے اس روایت میں توسیع کا باعث بنے ہیں۔ یہ گنجائش ان کے خالصتاً منطقے کے موسموں اور رنگوں کی عطا ہے۔

انور عظیم، اقبال متین، عوض سعید، اقبال مجید، ہرچرن چاولہ اور منیر احمد شیخ نے افسانوں میں فلسفیانہ نوعیت کے سوالات اٹھائے۔ ان افسانہ نگاروں کے اجتماعی نفسیات کے حوالے سے لکھے گئے افسانے، کلچر اور اجتماعی ذہنیت کی تشکیل اور تعمیر کے باب میں توجہ طلب ہیں۔

انور عظیم زندگی کی بے معنویت کو کس طرح سماجی مسائل کے روبرو کھڑا کرتا ہے۔ اس کے افسانے "قصہ دوسری رات کا" سے مثال ملاحظہ کیجئے:

"ہر طرف اندھیرا تھا۔ کتے تھے اور کتوں کے سائے تھے اور زنجیروں کی جھنکار تھی۔ سب کا رنگ ایک تھا، سمت بھی ایک تھی، یکایک ہوا کے زور دار ہاتھوں نے کتوں کے چہروں سے نقابیں نوچ لیں۔ سارے کتے بے چہرہ تھے۔ جن کے ہاتھوں میں کتوں کی زنجیریں تھیں، وہ بھی بے چہرہ تھے۔ بے چہرہ قافلہ ایک ہی سمت چل رہا تھا۔ اپنے گنبد کی تلاش میں، جو خود ان کے اندر تھا، ریزہ ریزہ ریت کی طرح، ٹھنڈا کہرے کی طرح۔"

اقبال متین کے ہاں اس روایت میں شہری زندگی اور اس کی مناسبت کے ساتھ الجھی ہوئی کردار نگاری قابل توجہ ہے:

"ہم سڑک پر بیٹھے ہوئے ایسے لوگ ہیں جو شاید کسی حادثے کے منتظر ہیں اور انتظار۔ سچ پوچھئے تو ہم کر نہیں سکتے بلکہ زندگی اور وقت نے سازش کر کے ہمیں ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیا ہے جہاں بہرحال کسی کا انتظار ہے۔ دراصل یہ انتظار امید و بیم کے دوراہے پر وقت کی کسی سازش کا دوسرا نام ہے اور جب یہ سازش مکمل ہو لے گی، تب وہ حادثہ وقوع پذیر ہو گا ہی اور کون جانے کہ تب بھی ہو گا یا نہیں۔"

(آگہی کے ویرانے)

عوض سعید کے افسانوں (مجموعہ : رات والا اجنبی) میں انسان کی داخلی کیفیات اپنی معروضی صورتحال کے منظرنامے میں توجہ طلب ہیں۔ عوض سعید کا خاص موضوع انسانی ذات کا اس کی تمام جہتوں میں مطالعہ اور مشاہدہ ہے اور اس حوالے سے "جلاوطن" اور "مردہ گاڑی" نمائندہ افسانے ہیں۔

اقبال مجید کی افسانوی تدبیرکاری روایت اور جدت کا توازن سامنے لاتی ہے۔ تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کا سنجیدہ مطالعہ اقبال مجید کا موضوع خاص ہے نمایاں مثالوں میں "پیٹ کا کیچوا" اور "دو بھیگے ہوئے لوگ" ہیں۔

ہر چرن چاولہ کے افسانوی مجموعے "عکس آئینے کے" کا پس منظر برصغیر کی تقسیم کبیر اور اس کے تمام حوالے ہیں۔ ان افسانوں کا لینڈاسکیپ میانوالی' کیمبل پور اور سرحد کی طرف دریا پار کے علاقے خصوصاً شہبازخیل اور تھلوں کا علاقہ ہے۔ اس بوباس کو لیے ہوئے یادوں کے طویل سلسلے ہیں اور اقدار کی شکست و ریخت پر فلسفیانہ زاویہ نظر۔ ان افسانوں میں وقوعہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور اس کی بنیاد غیر منقسم ہندوستان کی یادوں پر ہے۔ نمایاں مثالوں میں "بندیا میرے نام کی" اور "چاچی گلاباں" اور مجموعہ "البم" کی کہانیاں ہیں:

"نقشے میں انگلی رکھ کر بتانے کے لیے میں اسے پاکستان کا نام دے رہا ہوں۔ ورنہ میری ماں کے پاس ان جگہوں کا نام نہ ہندوستان اور نہ ہی پاکستان بلکہ تھل' کچھ' شہبازخیل اور میانوالی تک محدود ہے۔ وہاں کے کسی بھی ذکر سے پہلے وہ سر پر ہاتھ رکھ کر ضرور کہتی: ہائے ربا' تو نے کیا کر دیا۔"

("عکس کے آئینے" سے اقتباس)

منیر احمد شیخ کے ہاں پاکستانیت کا حوالہ توجہ طلب بھی ہے اور بحث طلب بھی۔ افسانوں کی نمایاں مثالوں میں "پی۔ بی۔ ایل ۵۳۶" اور "بابو بس" ہیں اور مجموعہ: "لمحے کی بات" کے بیشتر افسانے۔

اسی روایت میں خیر اور شر کے تصادم کے حوالے سے عزیز ملک' سید انور' اختر جمال' نکہت حسن اور علی حیدر ملک نے آدرش حقیقت نگاری کی ہے۔ نمایاں مثالوں میں عزیز ملک کے "آپ میں آپ سائیوری"' "یاترا" اور "اچھری" سید انور کا "شہر کی خودکشی" اختر جمال کا "نیا کپڑا"' نکہت حسن کا "زبان" اور علی حیدر ملک کے دو افسانے "تیسری آنکھ" اور "بے زمین بے آسمان" ہیں۔ ان افسانوں میں فارم کے اعتبار سے داستان اور تمثیل کا لہجہ اور خیر طلبی ایک نئی کمپوزیشن میں ڈھلی ہے جبکہ عزیز ملک کے ہاں مذہبی۔ اختر جمال اور نکہت حسن کے ہاں تہذیبی اور سید انور اور علی حیدر ملک کے ہاں مارکسی نقطہ نظر کی یکسر متضاد دھارائیں چل رہی ہیں۔

○

افسانوی پیش منظر میں مارچ ۱۹۷۸ء میں شائع ہونے والا چودہ افسانوں کا مجموعہ "گواہی" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ "گواہی" کے افسانے ظالمانہ طبقاتی نظام اور اس کی جبریت کے خلاف شدید احتجاج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "گواہی" کے ابتدائیہ میں اعجاز راہی لکھتا ہے:

"فن اور اس کی قدریں زمانی اور مکانی صورتحال سے تبدیل ہوتی ہیں۔ اگر معصوم جسموں پر پڑنے والے کوڑوں کی ظالمانہ آوازیں ادیب کے احساسات کو مجروح نہیں کرتیں تو ادب ٹھہرے ہوئے گندے پانی کے کائی زدہ جوہڑ سے بدتر ہے۔ (جس سے کتا بھی پانی پینا پسند نہیں کرتا) میں یہ بات واضح کر دوں کہ ادیب کو سلطان یا سلطنت سے کوئی ذاتی عناد نہیں ہوتا لیکن ریاست پر ظالمانہ طبقاتی نظام کی چھاپ اس کے جذبات و احساسات پر قطرہ قطرہ تیزاب کی طرح گرتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس کے قلم سے نظام کی جبریت کے خلاف احتجاج جنم لینے لگتا ہے۔"

اس مجموعے میں احمد جاوید' احمد داؤد' اعجاز راہی' انور سجاد' رشید امجد' مرزا حامد بیگ' منشا یاد اور مظہرالاسلام کے افسانے شامل تھے۔ ان افسانوں میں مارشل لاء کی جبریت کے خلاف نفرت کا سمندر موج زن ہے۔ ہر ہر لفظ کے ور تارے میں شدید تیزابیت گھلی ہوئی ہے۔

یہ نفرت اور جھنجلاہٹ انسانی ہاتھوں کی پھولی ہوئی نسوں اور پھٹی آنکھوں کے ساتھ تخلیق کار کے اظہار میں اپنی واضح پہچان کرواتی ہے:

"میں زور سے ہنسا۔ "قومی سلامتی۔ یہ بھی خوب چیز ہے۔"

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بولا:

"عصمت فروش عورت کی انا جو بگڑ جائے تو عصمت دری کے الزام میں پکڑواتی ہے۔ ہماری قومی سلامتی بھی اسی قسم کی چیز ہے۔"

("وہسکی اور پرندے کا گوشت")

مستنصر حسین تارڑ نے خصوصی طور پر اپنے افسانوں میں فکری اور نظریاتی محاذ آرائی ان طاقتوں کے خلاف کی ہے جو ترقی پذیر ممالک میں اپنے استحصال کرنے والے پنجے گاڑے ہوئے ہیں۔ (مثال: "آکٹوپس" اور "بابا بگلوس")

پیش منظر کے افسانے میں ایک طرف تو فکری اور نظریاتی محاذ آرائی کی انتہائی صورتیں ہیں یا فلسفیانہ توجیحات اور دوسری طرف تجاہل اور سرگوشی ہے۔ لیکن یہی معروضی صورتحال اسد محمد خاں (افسانہ: "ہے للہ للہ") کے ہاں شدید طنز اور درشت لہجے کا باعث بنی ہے۔ اس سامنے کی صورتحال کو اسد محمد خاں نے یہودی اجتماعی لاشعور کے حوالے سے نئی معنویت سے دوچار کر دیا ہے۔ خصوصاً افسانہ: "یوم کپور"۔ افسانہ کا مرکزی کردار اسرائیل کی سرزمین سے چل کر ہندوستان تک آیا ہے۔ موضوع سے مطابقت رکھنے والا ایک منفرد اسلوب یہاں جنم لے گا جب عبرانی زبان کے لہجے میں پشتو اور ہندی سے اردو تک کا سفر ہو گا (افغانوں کے متعلق روایت ہے کہ وہ یہودی النسل ہیں نیز پشتو اور عبرانی زبان کے لسانی روابط بہت کچھ تلاش کیے جا چکے ہیں) "یوم کپور" میں اس منفرد اسلوب کی بنیادیں پڑتی نظر آتی ہیں۔ البتہ یہودی مابعد الطبیعات کا بیان بہت نیا نہیں رہا۔ اس ضمن میں پولینڈ کا آئزک باشیوز سنگر عالمی شہرت کا حامل افسانہ نگار' ناول نگار ہے۔ اس کے نمائندہ افسانے "بوڑھا آدمی" کا یہی موضوع ہے جو "یوم کپور" میں اسد محمد خاں نے بھی برتا۔ مرے اخراج' دیوار گریہ اور مصائب کا بیان' لیکن افسانے کا اختتامیہ سنگر کے ہاں بالآخر آزادی ہی بنتا ہے۔

اس رو میں احمد ہمیش (مجموعہ: "مکھی") کے افسانوں کا داخلی رویہ ماورائیت کے احساس کا باعث ہے اور اس احساس کا جنم انتہا کی کرخت معروضی صورتحال میں ہوتا ہے۔ (مثال: "ذرہ میں گرا ہوا قلم") ذکاء الرحمٰن اور انوار احمد کے ہاں ان چھوئے موضوعات اور بہت الجھی ہوئی نفسی کیفیتیں منفرد پیرایہ اظہار اور زندگی کے عجیب و غریب معیارات کا باعث بنی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ اور مشرقی ممالک اپنے اپنے طور پر نئے مسائل میں گھر گئے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو اضافے کئے انہوں نے انسان کو خراج پر قادر ہونے کے باوجود جذباتی اور محسوساتی سطح پر دائمی کرب کا مریض بنا دیا۔ فرد تنہا رہ گیا۔ یہ تنہا انسان اپنے اعتقادات اور روشن خیالی کے درمیان گم سم ہے۔ مستقبل غیر واضح ہے اس لیے سوال جنم لیتا ہے یہ بالکل ویسا ہی تجسس ہے جیسا غالب کے ہاں نظر آتا ہے۔ ایک تہذیب کی شکست کے بعد نئی صورتحال کو دیکھ کر سوال۔۔ البیر کامیو والی بغاوت نے بھی ظہور کیا۔ مختار کل اور مجبور محض انسان جس کی تنہائی' انفرادی سطح پر بھی ہے اور انبوہ میں بھی۔ یہ تنہائی جذباتی اور فکری دونوں سطحوں پر ہے۔ انفرادی تنہائی کی مثال کامیو کی ناول "The out Sider" ہے جس کا مرکزی کردار سوچتا ہے۔ "میری ماں کل مرگئی' یا ممکن ہے پرسوں' مجھے کچھ یاد نہیں": یہ تنہا فرد اس خوابیدگی کی حالت میں قتل کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ لیکن قتل کرنے کی وجہ اسے نہیں معلوم۔ اس فرد کی Alienation کی دوسری بڑی مثال فرانز کافکا کا Land Surveyor ہے کامیو کے ناول۔ "The Plague" میں اجتماعی تنہائی ملاحظہ ہو: خیالی شہر میں چوہوں کی موت سے انسانوں کی موت تک شہر کا رابطہ دیگر جگہوں سے کاٹ دیا گیا ہے۔ اس ذہنی اور نفسیاتی خلفشار کا اولین تجربہ یورپ کے ان ممالک کو ہوا جو صنعتی انقلاب میں پیش پیش تھے۔ پھر نفسیاتی الجھنیں' سماجی دھڑے بندیاں اور مادی مسائل انسان کا مقدر بن گئے۔ صنعتی سرمایہ کاری سے مالیاتی سرمایہ داری تک کے سفر کی عطا: انسان انسان کے خلاف نبرد آزما ہے۔ سرمایہ دارانہ جبر کا شکار فرد اپنے شہر اور اپنے گھر میں اجنبی ہے۔ مصلحت اسے کاکروچ' بندر اور گینڈا بنا رہی ہے۔ اس کے سر پر کانٹوں کا تاج ہے۔ یہ فرد نیکشر کی طرح ہے جو اپنی چتا کے [illegible]

جس نے اپنی صلیب اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھی ہے۔

پگڑی کی طرح اپنے سر سے ہرے ہرے نرم کانٹوں کا دائرہ لپیٹے' سوکھے بدن پر ارغوانی رنگ کا ٹاٹ اوڑھے' پیروں سے مونجھ کی پنڈلیاں باندھے بالساوڈ کی لمبی صلیب گھسیٹتا ہوا' اب جو اپنے گھر سے نکلا ہے تو ایک ایک رفیق کے دروازے پر دستک دیتا چلا جائے گا کہ اے رفیق الاسد اپنے مکان سے باہر آ اور اے علیم عبیداللہ کچھ قدم میرے ساتھ چل اور اے اعلیٰ اطہر نفیس اے کشادہ دل رفیق میری پیشانی کو بوسہ دے اور اے جان برادر الوداع کہہ اور واویلا کر کہ میں اپنی صلیب اٹھائے اپنے مقتل کو جاتا ہوں: (براور براور۔ اسد محمد خان)

یہ مدمقابل انسان مجموعی طور پر اجتماعی ترقی کی راہ میں حائل فطرت کے مقابل بھی رزم آراء ہے۔ یہ دوہری جنگ بین الاقوامی سطح پر جاری ہے۔ بنتے بگڑتے اقتصادی' سیاسی اور مذہبی تصورات نئی نئی صورتوں میں ظہورپذیر ہو رہے ہیں۔ آج کی نئی ضرورتیں پرانی سچائیوں کو غلط ثابت کر رہی ہیں۔ آج کا عہد فرد کا سایہ ہے جو اس کی گھات میں دفتروں' گھروں' سڑکوں' گلیاروں میں خنجر بکف چلتا ہے۔ جسم کے مسور بوش کی لرزتی اور منہدم ہوتی عمارتیں آج کے افسانوی کردار کی ڈھیتی ہوئی بدن کی دیوار ہیں۔ بدی نے چاروں کھونٹ انسان کو گھیر رکھا ہے۔

مثالیں: احمد یوسف کا "اونچی اونچی عمارتیں" "انور سجاد کا "چھٹی کا دن" "نیئر مسعود کا "مشک کافور" "رشید امجد کا "قطرہ سمندر قطرہ" "احمد داؤد کا "سانپ کی سرگزشت" "شرون کمار ورما کا "اب یا تا" "نجم الحسن رضوی کا "اکو پیٹر" اور عرش صدیقی کا "باہر کفن سے پاؤں"۔

فرد اپنی تخلیقات کا اسیر' مشینوں کا غلام خود کمپیوٹر بن گیا ہے۔ مشین کے شور میں فرد کی دبتی ہوئی آواز کی مثالیں ڈاکٹر ژواگو کا آخری ٹرام کا سفر ہے۔ اب Absurd Theater نے جنم لیا۔

○

"wating For Godut" کا اختتام: انتظار کرتے ہوئے دونوں دوست اکتا جاتے ہیں۔ پہلا دوسرے کو کہتا ہے۔ "Let us Go" دوسرا جواب میں کہتا ہے: "Yes Let us Go" اور بیکٹ نے آخر میں لکھا ہے کہ وہ دونوں حرکت نہیں کرتے' بیٹھے رہتے ہیں۔ ولیم بلیک کارخانوں کی چمنیوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں اور چنگھاڑتی سڑکوں سے بھاگ کر جنگل میں نکل گیا' جوگی بن گیا۔

چاروں اطراف پھیلی زندگی کی شور مچاتی گڑگڑاتی مشین کا ادنیٰ سا پرزہ بن جانے کا احساس آگہی ہے۔ جھوٹ' مکر و فریب' سیاست' معیشت اور اخلاقی اقدار ایسے سوالیہ نشان ہیں جن کی گرفت سخت ہے۔ فرد قریہ قریہ منافق۔۔ آزادی' فساد' خوف' نفرت' تعصب سکون کا سوال ہے بابا۔

یہ کرب کا احساس' اظہار سے مطابقت رکھنے والے پیرائے کا طالب ہے۔ افسانہ نگار جانتا ہے کہ کمزور' بونوں' ذہنی مریضوں اور نامردوں کی یہ گھناؤنی دنیا جس قدر مکروہ اور ناقابل قبول ہے اسی قدر ناقابل انکار حقیقت بھی ہے۔

"نامردو' یہ بھی تو سوچو کہ صرف اس ماں کے خصم کے ہاتھ کا پھنکارتا ہوا سانپ ہی کیوں بولتا ہے۔ وہ کیوں نہیں بولتا جو رسیوں سے جکڑا کھڑا ہے اور جس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہے۔ رنگیلے اسے پکڑنا' ستے اس تخم حرام کی خبر لو۔ وہ سور کا بچہ یہاں کیسے آ گیا۔۔۔۔۔

خلقت کی آنکھوں کے شہر روشن ہو گئے اور نوجوان بھاگتا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے رنگیلے ستے اور جانے کون کون" "اک منظرنامے کا" از احمد یوسف) یہ جبر کے خلاف پہلی آواز تھی جو ہمت کر کے اٹھائی گئی اور یکایک صورتحال الٹ گئی۔

سمیع آہوجہ کا "الوژن ڈزالوژن" جبر کی دیگر جہتیں سامنے لاتا ہے۔

اردو ادب میں آج تک اجتماعیت کا دور دورہ رہا ہے۔ افادی ادب اور ترقی پسند تحریک میں انفرادیت کے مقابلے میں اجتماعیت پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ اب جس طرح اجتماعیت سے انفرادیت کی طرف جھکاؤ بڑھا ہے پہلے افسانے کی سی اجتماعی نظریاتی وابستگی بھی نظر نہیں آتی۔ آج

افسانے کی اس کھلی فضا میں صورت حال کا تجزیہ انفرادی سطح پر ملتا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کی نئی نسل کے سامنے بہت سے سوالات ہیں' جواب کوئی نہیں۔ موجود بے معنویت کی عطا' لخت لخت فرد کی تنہائی میں خود اپنی پہچان اور انفرادیت کی تلاش ہے۔ یہ وہ سوچ کی معتوب نہج ہے۔ جو کمپیوٹر کے اس عہد میں قبولیت حاصل کر گئی ہے۔ اپنی پہچان میں نکلا ہوا تنہا فرد ہر ہر گام پر ڈگمگاتا ہے۔ اس ڈگمگاتے فرد کے Inner Self کے ظہور کی عجیب و غریب صورت کی مثالیں: بڑے ابا کی پورٹریٹ کے سامنے پریشان حال جوان لڑکی کی کہانی' خالدہ حسین کا "پہاڑی جھیل"۔ آج کے مصروف دور کے پڑوسی کا ناطہ سریندر پرکاش کا "رونے کی آواز" وغیرہ۔

بے حسی تکنیک: انور قمر کا "چوراہے پر ننگا ہوا آدمی" آج کا بدھا جسے دھیان کی کئی سیڑھیاں ابھی چڑھنی ہیں' ہانپ رہا ہے۔ ذکاالرحمن کا "وہ ایک تنہا شخص" "احمد تنویر کا "دھیان پرت پرت۔" احمد ہمیش کا "دریچے میں گرا ہوا قلم" بلراج کومل کا "تیسرا کتا" صادق موتی کا "خیالوں کے بیمار" علی امام کا "آگ اپنے اندر کی" ہیں۔ یہ فرد اپنے Pigeon Holles میں سانس لیتا ہوا ایک ٹائپ بن گیا ہے۔ یہ بیوروکریسی کا ایک تحفہ ہے کہ ہم اپنی شناخت افسانہ نگار کی بجائے ڈاکٹر اور پروفیسر کی حیثیت سے کرواتے ہیں۔ اپنی پہچان کرواتے کرواتے اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ آج کا یہ فرد Aspidistra کا وہ پودا ہے جو عموماً" برطانیہ کے مڈل کلاس گھرانے کے دروازے پر تانبے کے چمکدار مرتبان میں سجا رہتا ہے۔ جارج آرویل کے ناول Keep The Aspistra میں یہ آج کا فرد اپنی ہر جہت اور ہر اعتبار سے مضحکہ خیز ہے۔

دنیا بھر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہاتھوں پر محاذ پر پرانی اقدار کو شکست ہوئی ہے۔ خود ہمارے یہاں یہی صورتحال ہے لیکن یہاں کے عقائد اور مذاہب ابھی تک زندگی پر فوقیت رکھتے ہیں۔ گو تکنیک نے بڑے پیمانے پر اپنا اثر دکھایا ہے لیکن یہ سب اندر ہی اندر ہے ابھی بیچ چوراہے میں سوالات نہیں اٹھائے جا سکتے' فوراً ملحد ہونے کا فتویٰ لگے گا۔ آج وہ صورت حال ہے جو انیسویں صدی کے آخر میں یورپ کی تھی وہاں مذہب اور عقیدے کی جگہ پر کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی نے پورے پچاس سال لیے۔ ہمارے ہاں ابھی عقائد کے متبادل کی تلاش کا عمل جاری ہے۔ نیا سائنسی طرز فکر اپنانے میں ابھی طویل مدت درکار ہے۔۔۔۔۔۔ قدیم صداقتیں آج شک کی نظر سے دیکھی جا رہی ہیں۔ آج کا المیہ یہ ہے کہ پرانی صداقتیں اپنے معانی کھو بیٹھی ہیں اور ان کا متبادل ہمیں نہیں مل رہا۔ ایسی ہی صورتحال میں یورپ کی آواز تھی۔

"One World is Dead While The Other is Struggling to Take Birth"

ہمیں اس تکلیف دہ صورتحال کا آج سامنا ہے لیکن افسانے میں یہ نزاع کی صورتحال مستقبل قریب میں وجودیت کا Pattern اختیار کرتی نظر آتی ہے۔

اب وجودیت ہی ایسا فلسفہ رہ گیا ہے جس نے دوسری جنگ عظیم کے بارے ہوئے انسان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے یہ فلسفہ پیش منظر کے انسان کی ڈھارس بن سکتا ہے۔ وجودیت نے کائنات کو واہموں کی دنیا سے نکال کر کائنات میں مسلسل برسرپیکار انسان کے جسمانی اور ارضی وجود کی معنویت کی تلاش کی ہے گو اب تک ہمارے ادب پر اس فلسفے کا براہ راست اثر نہ ہونے کے برابر پڑا ہے لیکن یہ اس زمانے کی مجبوری بنتا جا رہا ہے۔ ہماری فکر میں وجودیت کے عناصر بالواسطہ اور غیر شعوری طور پر خود بخود شامل ہو رہے ہیں۔ وجودیت کے لیے جدلیاتی مادیت (مراد ایک طریقہ کار ہے کوئی جامد اور اٹل نظام کائنات نہیں) راہیں متعین کرتی ہے۔ ہمارے ہاں جاگیردارانہ نظام کی شکست کے بعد اس کی جگہ لیے ہوئے سرمایہ داری کا متبادل وجودیت اور جدلیاتی مادیت کی باہم آویزش بن سکتی ہے جس میں فرد اور سماج کی بقا اور بہتری ممکن ہے۔

پیش منظر میں لازم و ملزوم مرد اور عورت کے معاشرتی روابط بھی نئی کروٹ لے رہے ہیں۔ اس نئی مشکل چال ڈھال کے بارے میں جمیلہ شاہین (نئی عورت اور اردو افسانہ۔ ادب لطیف) نے افسانہ نگاروں سے توقع باندھی تھی کہ وہ نئی عورت کی تلاش اور تربیت کا کام سرانجام دیں گے جو داستانوی عورت اور قرۃ العین حیدر کی اینگلو کل عورت کے درمیان کی کڑی ہے' جس کی روح کے مسائل کے ساتھ جسمانی مسائل بھی ہیں۔

پیش منظر کے افسانے کی عورت کا گھر سے باہر قدم سرکس کے تنے ہوئے تار پر پہلا قدم ہے اور وہ خواہش کی ہڈی کو سونگھتی اپنے نحیف پنجر کے ساتھ ڈولتی سنبھلتی سفر کرتی ہے۔ توازن قائم کرنے کے لیے اس نے دونوں بازو پوری طرح پھیلا رکھے ہیں۔ علی امام کا افسانہ "رپورٹ" ایک کوئلہ چننے والی کے کردار کا مطالعہ ہے۔ جو مزدوروں کے ڈیزل سے لتھڑے جسموں کے تصرف میں ہے۔ افسانہ نگار کی نگراں آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے' اس کوئلے چننے والی کے لیے "استقاطی ٹیبلٹ" سنبھالے آگے بڑھتا ہے۔ لیکن تب تک وہ زہر اگلتی ہے' بے نام کیفیتوں کی بے نام اولاد۔

زاہدہ حنا کے افسانوں میں آج کی اسٹیکو کل عورت کا تجزیہ ہے' جس کے نزدیک وصال شفاف ندی ہے جس کے اندر کوئی رمز نہیں۔ اس کے مقابلے میں فراق جان لیوا ہے لیکن اسرار سے پر سمندر کی مانند خوبصورت ہے۔ اس عورت کا چناؤ فراق ہے۔

پیش منظر کے ملٹی ڈامنشنل افسانے کی رسائی مرد اور عورت کے دن رات سے بچپنے کی معصومیت تک ہے۔ محمد سلیم الرحمن کا افسانہ "نیند کا بچپن" گھر کی چوکھٹ پر بیٹھے ایک ننھے بچے کی سوچوں سے ترتیب پاتا ہے۔ اس کے لیے اردگرد پھیلی کائنات اسرار سے پٹی پڑی ہے۔ کیا درخت رات کو سو جاتے ہیں؟ اور بہت سے سوال' یہ سب سوچتے ہوئے وہ چوکھٹ پر ہی اونگھ جاتا ہے۔ افسانے میں خیال کی بنت تصوف کے عمیق مطالعے کا پتہ دیتی ہے۔ بچے کی متحیر کائنات پر اشفاق احمد کا "گڈریا" انور سن رائے کا "ماں کی موت" مظہرالاسلام کا "ہرا سمندر" احمد داؤد کا "گرتے آسمان کا قصہ" اور کمال مصطفیٰ کا "شہزیری" جیسے خوبصورت افسانے ملتے ہیں۔

سوبات ہو رہی تھی قدیم صداقتوں کی کہ جو دم توڑ رہی ہیں اور زندگی کرنے کے لیے مذہب اور قدیم عقائد کے متبادل کی تلاش کا عمل جاری ہے۔ بے یقینی کی صورتحال ہے۔ یہاں پاکستان میں ہم اس دھرتی پر پہلا قدم رکھنے والے پہلے مسلمان اور موہنجوداڑو کی تہذیب کے درمیان کہیں کھڑے ہیں۔ ماضی قریب تک کا لکھنے والا اس تمام تجربے سے خود گذرا ہے لیکن اس کے تجزیے کے لیے بعض اوقات اگلی نسل سے امید رکھی جاتی ہے۔ آج کی نئی نسل کا افسانہ اس تجزیہ کے باعث لاشعور اور سامنے کی صورتحال کا رچا ہوا احساس رکھتا ہے۔

یہ مسلسل تبدیلیاں اپنے نئے مزاج اور نئی Sensibility کے اظہار کے لیے نئے اسالیب بیان کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس نئی Sensibility کا اظہار نئی علامتوں اور نئے پیرایہ اظہار کے بغیر ممکن نہیں۔ آج کے افسانہ نگار نے اس ملٹی ڈامنشنل صورتحال کے اظہار کے لیے نئے اسالیب چنے ہیں۔ جن میں وہ تمام عناصر کارفرما ہیں جن سے آج تک شاعری میں کام لیا جاتا رہا۔ اس ضمن میں علامت اور استعارہ کے ساتھ شعور کی رو اور تجرید سامنے آئی ہیں۔

اپنے عہد کا ہر سچا فن کار نئے امکانات سامنے لاتا ہے اور یہ نئے امکانات دراصل نئے عہد کی صورتحال میں ماضی کے سوئے ہوئے احساسات اور تلازمہ کو نئی انسانی صورتحال میں دیکھنے کا نام ہے۔

زبان ابلاغ کا آلہ ہے اور اسلوب اس کی طاقت۔ اسلوب صرف طریقہ اظہار ہی نہیں اس کا تعلق فن کار کی سوچ کے انداز سے بھی ہے اور وہ سوچ کا انداز اس کے عہد کی عطا ہے۔ بقول سراج منیر' اسالیب کی بنیاد پر ادوار کی پہچان ہوتی ہے کہ اسلوب کسی دور کے باطن کا مسئلہ ہے۔ کروچے کے نزدیک فن اظہار کا دوسرا نام ہے۔ تو کیا فن محض حسی لذت اندوزی ہے؟ جس کی تلاش ہمارا قاری کرتا پھرتا ہے اور یہ تلاش کا عمل اسے ڈائجسٹوں کی رومانی اور جاسوسی دنیا تک لے آیا ہے۔ فن اگر محض حسی لذت اندوزی ہوتا تو یکی پکائی روٹی کی طرح ہر تہذیب یافتہ یا غیرمہذب فرد کے لیے طاقت بخش ثابت ہوتا---- لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا قطعی طور پر نہیں ہے۔ "لفظ کا جادو" تسلیم' لیکن کیا وہ ہر ایرے غیرے کے لیے بھی ہے؟

سرریلزم کے سب سے بڑے نظریہ ساز آندرے برتوں کے نزدیک تخلیق کار کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو یہ موقع بہم پہنچائے کہ وہ اپنے الفاظ میں اپنے آپ کو ظاہر کریں اس لیے سرریلسٹوں کا اسلوب اظہار اتنا غیرشعوری اور اضطراری ہوتا ہے کہ اس میں کسی طرح کی تکنیکی کوششوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ایک طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سرریلسٹ تحریر محض تکنیک ہے (یہاں تکنیک کا لفظ عام

مروج معنوں میں ہے) البتہ ایسی تکنیک جو شعوری اور عقلی نہیں ہوتی۔

ہمارے ہاں محض تکنیکی فکشن کچھ عرصہ پہلے خاصی Thrilling رہی ہے۔ میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ نئی تکنیک کا حامی ہونے کے باوجود میں تکنیک کو حاصل نہیں ذریعہ سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک محض تکنیکی نئے پن کے کوئی معنی نہیں۔ تکنیک موضوع کی عطا ہے۔ اسی طرح اسلوب اپنے عہد کا انکشاف ذات۔ فن کار اپنی تخلیقات میں تمام حیثیتوں میں ظہورپذیر ہوتا ہے۔ قاری کو صرف اپنی ذات کے ساتھ مناسبت رکھنے والی جہتیں چننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ تخلیق کی فطرت میں اپنے عہد کی ودیعت شدہ تمام بھلی بری جہتوں کا مخصوص توازن ہی فن پارے میں اظہار پاتا ہے۔

علامت و استعارے، ترسیل کے وسیلے ہیں اور بقول کونرڈ 'ادب کی عظیم تخلیقات علامتی ہیں جس کے باعث ان کی قوت، گہرائی اور حسن میں اضافہ ہوا ہے۔ بودلیر کی نظم "بدی کے پھول" علامتی طرز اظہار کا اولین خوبصورت نقش ہے۔ پھر فکشن میں ایڈگرایلن پو، ہرمن میل ویل، مارسل پروست، سارترے، کامیو، چیخوف، کافکا اور جارج آرویل سے ہوتی ہوئی علامت کا سفر آج کے پیش منظر کے افسانے کا ہم عصر ناظر ہے۔

کافکا کا اسلوب ذہنی افتاد کے باعث سرریلی ہے لیکن اس کی بڑی پہچان علامت نگاری ہی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے ہاں افسانے میں علامت نگاری کا چلن کافکا کے طفیل ہوا تو غلط نہ ہو گا۔ ہمارا افسانہ کافکا کے دو ناول The Trial اور The Castle سے متاثر ہوا ان ناولوں میں کافکا نے عجب سرشاری کی کیفیت میں علامت کو برتا ہے۔ اس کے ہاں حقیقت کا اتنا گہرا مشاہدہ ہے کہ اردگرد پھیلی کائنات Transparent صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اشیاء اپنی انتہائی گہرائیوں کے اسرار بھی کھول دیتی ہیں۔ "The Trial" کا ملزم عجب بے بسی کی تصویر ہے۔ وہ یہ تک نہیں جانتا کہ مقدمہ کیوں چلایا جا رہا ہے۔ "The Castle" اتنی بڑی کائنات میں جستجو بنتا ہے شروع سے آخر تک اس کے اسرار نہیں کھلتے، سب راستے ادھر ہی جاتے ہیں پر کوئی راستہ وہاں تک پہنچاتا نہیں "K" نام کا Land Surveyor صبح نکلتا ہے اور شام کو ناکام واپس لوٹتا ہے۔ کافکا کی کہانی Meata Morphosis جبر کی صورتحال میں مفاہمت کی داستان ہے۔ ناجائز مفاہمت کایا کلپ کا باعث بنتی ہے۔ ہیرو انساں سے کاکروچ بن جاتا ہے جس کا مقدر Dust Bin ہے۔

علامتوں کا یہ انداز ہماری داستانوں میں خیر اور شر کے جدل پر ظاہر ہوتا ہے۔ انتظار حسین کے ہاں اعلیٰ روایات کا پاسدار جان عالم، مکھی بن جاتا ہے۔ یہ کایا کلپ آنسکو کے "گینڈے" اور انتظار حسین کے "آخری آدمی" میں کامیاب علامت کا ورتارا ہے۔

ہمارے ہاں علامت نگاری، داستان سے اولیں اردو افسانے میں منتقل ہو گئی تھی۔ یہ اس لیے بھی کہ بقول سوزین کے لینگر، علامت سازی بنیادی تقاضا ہے جو صرف انسان سے مخصوص ہے۔ اس کے ذہن کا ایسا بنیادی عمل جو ہروقت ہر لمحے ہوتا رہتا ہے۔ اکثر یہ عمل شعوری ہوتا ہے اور بعض دفعہ غیر شعوری، ہم اس کے نتائج کو دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ ذہن میں سے کچھ تجربات گذرے ہیں جن کو اس نے محفوظ کر لیا ہے۔ ہمارے افسانے میں علامت نگاری ایک واضح رجحان کی صورت یورپی اثرات کے تحت ہی سامنے آئی۔ ہمارے اولین افسانوں "چڑیا چڑے کی کہانی" اور "سودائے سنگین" (یلدرم) اور "الاؤ" (سہیل عظیم آبادی) سے احمد علی تک علامت نگاری پر اسلوب کے اعتبار سے خصوصی توجہ صرف نہیں کی گئی۔ احمد علی کے "قید خانہ" "موت سے پہلے" "ہمارا گھر" کافکا کے زیر اثر اردو کے پہلے کامیاب علامتی افسانے ہیں۔ کافکا ابنارمل تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس کی تحریر میں سرریلزم نے راہ پائی۔ سرریلسٹ ٹریٹمنٹ ہمیں احمد علی کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ یہ ان کی کامیاب شعوری کوشش ہے جس کی مثالیں: "پریم کہانی" اور "گزرے دنوں کی یاد" ہیں۔

استعارہ اور علامت نگاری کے ضمن میں منٹو کا افسانہ "پھندنے" کامیاب ترین کوشش کہی جا سکتی ہے۔ اس میں کردار کا تجزیہ علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ کیا گیا ہے، وہ لڑکی جس کی کوٹھی کے ملحقہ باغ کی جھاڑیوں میں بدعادت مرغیاں انڈے دیتی تھیں، اس کی جوان نوکرانی کو انہی جھاڑیوں میں کسی نے قتل کر دیا۔ اس کے گلے میں سرخ پھندنے کا ازاربند تھا جو اس نے ایک روز پہلے پھیری والے سے خریدا تھا۔ بچپن کا یہ تجربہ اور گلی کے بھونکتے ہوئے کتے۔ ایک دن اس نے دونوں نارنگیاں نکال کر آئینے کے سامنے رکھ دیں جو اس کے سوچتے ہی بڑی ہو گئیں۔

تب کتے بھونکنے لگے' نارنگیاں فرش پر لڑھکنے لگیں۔ کوٹھی کے فرش پر اچھلیں۔ ہر کمرے میں کودیں اور اچھلتی کودتی بڑے بڑے باغوں میں بھاگنے لگیں۔ کتے ان سے کھیلتے اور آپس میں لڑتے رہتے۔

اسی طرح "دو فرلانگ لمبی سڑک" اور غالیچہ (کرشن چندر) آنندی (غلام عباس) اس کی مثالیں ہیں۔ لیکن علامت اور استعارے کے لیے سب سے زیادہ سازگار ماحول اب اس وقت پیش منظر کے افسانے میں موجود ہے۔ اس لیے کہ گزشتہ چند سالوں میں تکنیک کے اس قدر تجربے ہوئے ہیں کہ علامت اور استعارے کی مناسب ترین کھپت ممکن ہے۔ ایک مدت تک علامت نگاری اور روایتی کہانی پن دو الگ الگ دھاروں کی صورت میں جعلی فضابندی کی تخلیق کرتے رہے ہیں۔ آج کہانی کی بچی بنت' اس کے تمام شیڈز کے ساتھ پیش منظر کے افسانے میں ممکن ہے کہ یہ اس عہد کی چیز ہے۔ آج کے افسانے میں تکنیک کا تنوع ہے۔ یہ افسانہ کسی منشور کے تحت نہیں لکھا گیا' اس لیے ہر افسانہ نگار نے پس منظر اور رواں پس منظر سے تربیت یافتہ ہونے کے باوجود اپنی خاص نفسیاتی افتاد طبع کو آزمایا ہے۔ لیکن اب ابلاغ کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ افادی ادب اور ترقی پسند افسانے کا بگڑا ہوا مزاج کسی طور نہیں مانتا۔ اس ضمن میں اپنے سے پہلے افسانہ نگار سے یہ گلہ ہے کہ اس نے نئے اظہار کی علامتی شکلوں کی وضاحت پورے طور پر قدم قدم نہیں کی۔ دوسری وجہ فیشن پرست ہیں جنہوں نے علامت اور استعارے کو اپنی طرز فکر' زبان کی اپنی روایات اور اپنی دیومالا کے حوالے سے نہیں برتا۔ ابہام کی قابل مذمت صورت بے معنویت ہے اور اس کی ایک وجہ لکھنے والے کی ذاتی علامتیں ہیں جن کا تعلق غیر منطقی سوچ سے ہے اور جو تربیت یافتہ قاری کے لیے بھی مبہم رہ جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ افسانہ نگار کے لیے خود بھی وہ ہمیشہ اجنبی ہی رہتی ہیں۔

ابہام کی ایک وجہ علامت اور استعارے کا تغیر بھی ہے۔ نئے افسانے کی علامتیں اور استعارے موجود صورتحال کا تجزیہ کرنے والے نئے ذہن کی پیداوار ہیں اور آج کا افسانہ نگار انہیں Life Symbols کے طور پر برتتا ہے۔ غیر تربیت یافتہ قاری جب تک اپنے آپ کو الفاظ کے مخصوص آہنگ کے ساتھ سیڑھیاں اتارتا افسانے کی اندرونی ہیئت کے سپرد نہیں کر دیتا' افسانہ نگار تک رسائی ناممکن ہے۔ اس کی ایک وجہ تو قاری کی تنہا زندگی ہے' نئے تجربے کا فقدان اور دوسری وجہ اس کی فکر کا زمانی تعصب۔ وہ آج بھی ماضی کا باشندہ ہے۔ اس کا بس چلے تو آج ریڈیو کمرشل سروس سے کانن بالا' خورشید اور کندن لال سہگل نشر کرے۔

ابلاغ کے ضمن میں ایک مشکل یہ بھی درپیش ہے کہ تخلیق کار کے نادر افکار کے مکمل ترین اظہار کی صورت شاذ ہی سامنے آتی ہے ورنہ کوئی نہ کوئی پہلو ضرور تشنۂ اظہار رہ جاتا ہے اور سرتوڑ کوشش کے باوجود خیال اپنی تمام جہتوں کے ساتھ ظاہر نہیں ہو پاتا۔ ترسیل کی اس ناکامی کا ایک سبب شمس الرحمٰن فاروقی (ترسیل کی ناکامی کا المیہ) نے بولنے اور سننے والے کے درمیان مشترک نسب نما کا فقدان بتایا ہے۔ اس طرح جب ترسیل ناکام ہو گی تو ابلاغ بھی ناکام ہو گا۔ آج کے حالات بھی ادب کے لیے آئیڈیل نہیں۔ چونکہ آئیڈیل حالات میں بھی مکمل ابلاغ ناممکن ہے اس لیے موجودہ حالات میں ابلاغ کی سطح اور بھی گر گئی ہے۔

پھر فن کار یہ قیاس بھی کر لیتا ہے کہ جس انفرادی نوعیت کے تجربے کو وہ پیش کر رہا ہے' قاری اس کی نوعیت سے آگاہ ہے۔ یہ مفروضہ ترسیل کے مختلف ابتدائی نوعیت کے مراحل کو نظرانداز کرنے کا باعث بنتا ہے جس کے نتیجے میں قاری پہلی منزل رہ جاتا ہے اور مکمل ابلاغ کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

بعض اوقات تجربے کے مخصوص اظہار میں فن کار کے انتہائی نجی محسوسات قاری کی گرفت سے باہر رہتے ہیں۔

ابہام کے پیدا ہونے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ فن کار تخلیقی عمل کے وقت محسوس کو خارجی متعلقات سے قطعی طور پر کاٹ دیتا ہے تب اس کا استعاراتی نظام قاری کی پہنچ سے باہر رہ جاتا ہے۔ یہ بات مانی ہوئی ہے کہ لسانی تشکیل کا عمل ہی زبان کی زندگی کا باعث ہے لیکن حیثیت کا عدم توازن بھی ابہام کا باعث بنا ہے۔ ایسی مثال اس مقام پر ظاہر ہوتی ہے جب فن کار کا برتا ہوا لفظ انتہائی نجی محسوسات کا اظہار کرتے ہوئے گرد و پیش سے اپنی جڑیں ختم کر لیتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ کہ تخلیقی عمل میں اظہار کو اولیت اور ابلاغ کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

یہ بات بالکل اسی طرح ہے کہ عام بول چال میں جس طرح ابلاغ کو اولیت حاصل ہے اور اظہار کو ثانوی حیثیت' اور یہاں معاملہ الٹ ہے۔ بقول سجاد باقر رضوی ہر تخلیقی عمل' حیاتیاتی ضرورت ہے اور یہ ضرورت پہلے اظہار ہے اور بعد میں ابلاغ۔ بالکل اس معصوم بچے کی طرح جو پہلے اظہار کرتا ہے اور بعد میں ابلاغ بھی چاہتا ہے۔ سو بالغ تخلیقی عمل پہلے اظہار ہے اور بعد میں ایک خاص سطح پر ابلاغ' جس کے لیے قاری' ناظر اور سامع کو بھی پیش قدمی کرنا ہے۔ اظہار محض بچپنے کی نشانی ہے جس کی مثالیں بڑی آسانی سے ہم عصر ادب میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

دراصل ہر نیا فن کار جس کا طریق اور اک نئے عہد سے مطابقت رکھتا ہے' اپنے سے پہلی نسل کے ہم عصروں کے لیے الجھا ہوا رہتا ہے۔ جبکہ فوراً بعد آنے والی نسل کو اس کا پروردہ کہنا چاہیے' وہ اسے خوب سمجھ رہی ہوتی ہے۔ دراصل ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ فن پارے کو پرکھنے والے قاری کا ذہنی رویہ وہی ہونا چاہیے جو فن کار کا تھا۔ قاری کے ابلاغ کے ضمن میں بے اعتنائی برتی گئی۔ قاری کی تربیت کا مرحلہ ہمیشہ سے صبر آزما رہا ہے۔ ہمارا قاری تو ابھی پورے طور پر ابتدائی دور کے افسانوی ادب کے مزاج اور علامتوں سے نابلد ہے اور آج کا افسانہ نیا طرز احساس مانگتا ہے۔

لیکن ہر سطح کے قاری کو مطمئن کرنا بھی فنکار کا کام نہیں۔ کیا نظم اور غزل کے صاحب طرز مجید امجد کی غزلیں تمام لوگوں کے لیے ہیں؟ قاری کو اپنے ذوق کی تربیت بھی کرنی چاہیے' ابلاغ کے سلسلے میں اسے فنکار کا ہاتھ بٹانا ہو گا۔ ادب کا معاملہ تو افہام و تفہیم کا معاملہ بھی ہے' دو بہی کا ہاتھ دونوں طرف سے بڑھنا چاہیے ورنہ مسلسل ارتقاء پذیر زندگی ٹھہر نہیں جائے گی اور فن کار قاری کا انتظار نہیں کرے گا۔

ترسیل کی ناکامی کی ان بنیادی وجوہات میں آج کے افسانے کی تکنیک اور اسلوب کے نقائص بھی ایک وجہ ہو سکتے ہیں لیکن کیا منٹو اور بیدی اس سے مبرا ہیں؟ میں یہاں بے ہیئت' وحدت تاثر سے خالی' کہانی پن سے عاری افسانے کی حمایت نہیں کروں گا۔ لیکن نہ ہی میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ماضی کے فنی اصولوں کو بلا ضرورت برتا جائے۔ میں معیار کی شناخت کرانے سے بھی معذور ہوں۔ اس لیے کہ اعلیٰ قدر کی پہچان ممکن ہے۔ اس کی وضاحت ممکن نہیں۔

میرے نزدیک کوئی افسانہ محض اسلوب اور تکنیک کی قلابازی نہیں ہوتا' اس لیے کہ لایعنی افسانہ لکھنا ایک بددیانتی ہے اور فنکار سے اس کی توقع' میں نہیں کر سکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اظہار مکمل طور پر نہ کیا جا سکا ہو' ابہام ہو۔ اکرام باگ کے افسانے عکس فنا" (شب خون) سے مثال:

"افسانہ شروع ہوتا ہے: فرض کیجئے: وہاں ایک تنویمی ماحول میں ایک ایسی تختی رکھی ہوئی ہے۔

ممکن ہے وہاں کچھ اس قسم کی بات ہوتی ہے۔
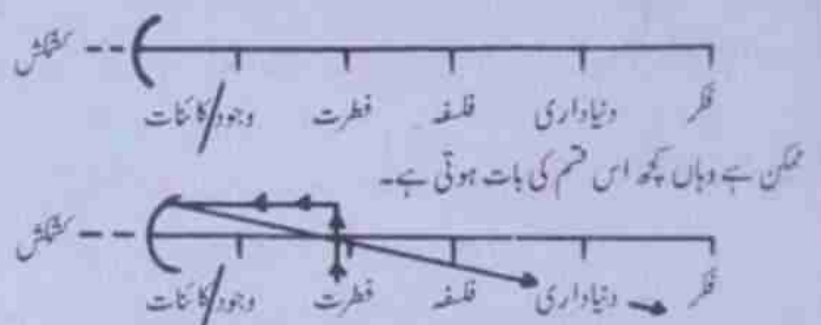
حقیقت: اس کائنات پر ٹکرانے سے ایک لمحہ پہلے اور اس کو ایک لمحہ چھوڑنے سے پہلے وہ مکمل "کیوں" بن گیا تھا۔"

(اکرام باگ۔ "عکس فنا")

دوسری مثالیں: انور سجاد کا افسانہ "کیکر" بلراج مینرا کا "کمپوزیشن چار" اسی طرح سریندر پرکاش کا افسانہ "بچی ٹراں" (شب خون) ابہام کے نیم روشن اور نیم تاریک بوجھل دھندلکے میں لپٹا ہوا ہے۔

ابہام کی مندرجہ بالا چار مثالیں میں نے کامیاب علامت نگاروں سے پیش کی ہیں۔ ایسے ناکام تجربے کامیاب اظہار کے لیے ضروری بھی

ہیں۔ انہی کے طفیل اکرام باگ "اسم اعظم" انور سجاد "کونپل" بلراج مینرا "کمپوزیشن دو" اور سریندر پرکاش "رونے کی آواز" تخلیق کر پائے ہیں۔ تخلیق کار جن تجربات سے گزرتا ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد ان تجربات سے گزرے' عام فرد وہ ذہنی اور جذباتی سطح بھی نہیں رکھتا جو فن کار کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن فنکار کے تجربات انسان کے اس اجتماعی لاشعور میں ڈوب کر ابھرتے ہیں' جس میں تمام انسان حصہ دار ہیں۔ اس لیے سطح خواہ کوئی سی ہو اعلیٰ تخلیق غیر تربیت یافتہ قاری پر بھی کم یا زیادہ اثر انداز ضرور ہوتی ہے۔ پیش منظر کے افسانے کی موسیقیت اور الفاظ کی نشست و برخاست اس کی مثال ہے۔ آج افسانے کی نثر میں نظم کے بیچ خط امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا' اس لیے کہ یہ کام نثر کے منصب کو گھٹاتا ہے۔ نثر اور نظم تصوریت آہنگ اور ترنم کے راستوں پر چلتی ایک ہو رہی ہیں۔

"زمین تاحد نظر' نظروں کے ہر زاویے کی حد میں' ان گنت رنگوں کے ملبوس میں' سبز لکیریں' پیلے دائرے' گلابی تکونیں' کالے' لال' سفید بینگنی نکتے۔۔۔ پوجا کے رنگ۔ ہوا' دھیمے دھیمے بہتی ہوئی سیٹیاں بجاتی ہوئی۔

باس' ناآشنا سرور انگیز

پھول' پیڑ اور پودے' حیران۔ تنہائی' پریشانی' اداس لرزاں۔

کھوئی ہوئی پگڈنڈیاں' بھولے بھٹکے راستے' دھوپ' پیلی اور مدھم

میں وہ دنیا دیکھا کیا' دیکھا کیا' جگ بیتتے گئے۔"

("میرا نام میں ہے"۔ بلراج مین را)

لیکن اس ضمن میں بیشتر افسانہ نگار محض بھیڑ چال میں مارے گئے۔ اور قاری نے عدم ابلاغ کا شور مچایا۔

افسانے میں وحدت تاثر بنیادی شرط ہے' جس پر پیش منظر کا افسانہ اس لیے بھی پورا اترتا ہے کہ افسانہ نگار کی ظاہر کی صورتحال کے ساتھ باطن سے بھی افسانہ گزر رہا ہے۔ اس طرح اس کا تاثر پائیدار ٹھہرتا ہے۔ بات اس طرح واضح ہو گی کہ ترقی پسندوں کے نزدیک افسانہ محض پہلے سے طے شدہ انداز نظر کے ساتھ خارج کا تجزیہ تھا یا رومانی افسانہ سراسر باطن میں غوطہ' جس کا خارج سے ناطہ ٹوٹ گیا تھا۔ افسانہ چاہے جیسا بھی ہو استعاراتی' علامتی یا تجریدی' ضرورت باہمی رابطے کی ہے۔ میری مراد یہ نہیں کہ ہم عام قاری سے گلے ملتے ملتے ماضی کی طرف لوٹ چلیں جہاں ہمارا قاری ابھی تک پھنسا ہوا ہے اور یہ نیک کام ہم صرف اپنے افسانے میں (پڑھے جانے کی صلاحیت) پیدا کرنے کے لیے سرانجام دیں۔ نہ ہی میری مراد یہ ہے کہ محض "نئے" پن کی رو میں بجزبیان کا شکار ہو جائیں۔ اردو افسانے سے جس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

جدیدیت کا نعرہ لگانے والوں نے روایت سے بغاوت کی ایک صورت یہ بھی نکالی کہ افسانے میں افسانہ ہی اپنا پتا نہیں دیتا۔ اینڈرسن نے پلاٹ کو افسانے کے لیے زہر کہا اور ای ایم فوسٹر نے کہانی پن کی جگہ نغمگی اور بیچ کے ادراک کی خواہش کی۔ کہیں اس نہج پر چلتا ہوا ہمارا افسانہ امریکی ڈرامے کا نیا فامنا "The un-comfortable Theater" نہ بن جائے۔

ہمارے ہاں افسانہ پہلے وقوعہ کی صورت تھا پھر خارجی ماحول کا عکس بنا اور اس کے بعد منٹو کے عہد میں صرف کرداروں کا تجزیہ رہ گیا۔ پیش منظر کے افسانے میں یہ تینوں عنصر روایت کے ساتھ سمبندھ کے باعث اور رواں پس منظر کے طور پر موجود ہیں۔ پیش منظر کے حقیقی افسانے کی کہانی ڈھانچے کی مانند پس منظر میں موجود ہے اور سامنے کا منظر اور واقعات دھندلے اور کردار محض ہیولے ہیں۔ ایسی صورت میں کہانی Under Current کی صورت میں چلتی ہے لیکن ٹھوس کہانی کی مانگ اپنی جگہ موجود ہے۔

اس کا باعث وہ نئے افسانے بنے ہیں جو محض افسانہ لکھنے کی خواہش میں لکھے گئے' ان پر خوبصورت طنز عصمت چغتائی "سانپ کے ٹکوے" اور منظر امام "کہانی نامکمل ہے" نے کی ہے۔ کہانی کا احیا ہم عصر تناظر کے افسانے کو وقیع بناتا ہے۔ مثال کے طور پر ظہور الحق شیخ (دھبہ) قمر عباس ندیم (تھکی ہوئی زخمی شام) رام لعل (چاپ) شمس نغمان (سون مکھی) کلام حیدری (صفر) سمیع آہوجہ (دوربین چھوٹے شیشے' بڑے شیشے) قمر احسن (صدیاں) شعیب شمس (سک رمونی) احمد جاوید (کبوتر) بدیع الزماں (کتھارسس) طاہر مسعود (سمندر کی جھیل) وغیرہ

پیش منظر کے افسانے کی تکنیک، علامتیں اور استعارے عصری تقاضوں کے تحت ہیں۔ اگر انہیں ۱۹۳۶ء کی صورتحال میں زندگی کرتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ کبھی گرفت میں نہیں آئیں گی۔ علامت اور استعارے کی الگ الگ وضاحت بھی ضروری ہے کہ انہیں ہمیشہ آپس میں گڈمڈ کر دیا جاتا ہے۔

علامت، استعارے کے بعد کا قدم ہے اور تشبیہ کے سلسلے کی آخری کڑی۔ علامت کی صورت میں تخلیق کار اور قاری کے درمیان مفاہمت کا ہونا ضروری ہے۔ جسے کالنگ وڈ نے Agreement کہا ہے لیکن یہ مفاہمت تو استعارہ میں بھی موجود تھی۔ ہم استعارے کی مفاہمت کو قانونی معاہدہ کہیں گے اور علامت کے ضمن میں غیر قانونی، علامت میں استعارہ کی طرح زبان و بیان کی پابندی ممکن نہیں۔ البتہ منطق کے اصول کی کڑی نگرانی ہوتی ہے جسے علامتی تحریک کے سرخیل ملارمے نے نظرانداز کر دیا تھا اور اس طرح ذاتی افکار و تلازمات کی طرف جھکاؤ بڑھ گیا۔ اسی طرح استعارہ کے مجازی معنی غیر تربیت یافتہ قاری کے لیے گمرہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہاں سے پہلی بار ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

علامت لاشعور کو شعور سے وابستہ کرتی ہے لیکن نئے زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے عصری شعور اپنے اندر سے گزارے۔ علامت کا استدلال قابل فہم بنایا جا سکتا ہے، لیکن اس کے غیر استدلالی عنصر کی پورے طور پر وضاحت نئے طرز احساس کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ علامت میں تاثراتی، اظہاری، شعوری و لاشعوری عناصر اپنے تمام تر تضادات کے ساتھ کارفرما رہتے ہیں۔ اس طرح یہ ان کیفیات کے بیان پر قادر ہے جن کے لیے لفظی تصورات کا فقدان ہو۔ آج کے افسانے کی بڑائی یہی ہے کہ اس میں طرز احساس کی ہر نہج اپنا پتا دیتی ہے۔ آج کے افسانے کی علامتوں میں انسانی مسائل کا راز پوشیدہ ہے اور ان میں اہمیت کا نیا تصور مضمر ہے جو زندگی اور شعور کے مسائل کو مبہم نہیں بناتا۔ یہ تو جسم اور نفس، عقل اور ہیجان، انبوہ اور تنہائی کے تضادات رفع کرنے میں مشغول ہے۔ آج کی علامتیں پرانی اصطلاحات کو ختم کرتے ہوئے زیادہ معنویت کے مترادفات پیش کر رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ علامت نگاری، رومانیت کی مسخ شدہ صورت ہے۔ حالانکہ بقول نسیم بخاری "رومانیت جس کلاسیکی مکتب فکر۔۔۔ Calssicism کا پہلا رد عمل تھی، علامت نگاری اس کا دوسرا متوازی رد عمل ہے۔" نوعیت کے اعتبار سے ان دونوں تحریکوں کی سپلائی لائن ایک ہے اور نشوونما کے زمانے مختلف، البتہ افسانے کا علامتی اظہار کئی اعتبار سے ترقی پسند تحریک کی ضد بنتا ہے۔ داخلی اور خارجی تجربات کی ضد، فنکار کی اپنی ذات اور اجتماع کی کشاکش، ذاتی علامتوں اور اجتماعی علامات کی ضد وغیرہ۔ دراصل علامتی اظہار ہے ہی معروضیت کو پھلانگنے کا وسیلہ۔ کہا جاتا ہے کہ ترقی پسندوں نے بھی علامت کا استعمال کیا ہے اور علامتی اظہار ترقی پسند اظہار کی ضد نہیں بنتا۔ حالانکہ میرا استدلال یہی ہے کہ ترقی پسندوں نے مجموعی طور پر اشاروں سے کام لیا ہے نہ کہ علامت سے، اکا دکا مثالیں یہاں اہمیت نہیں رکھتیں، ترقی پسندوں کے اشارے متعین تھے اور یہی ان کی ادبی کمٹ منٹ بھی ہے۔

○

علامت اور اشارے کا فرق بھی جاننے کی ضرورت ہے۔ یہ اپنے مفاہیم اور معنویت میں الگ الگ دائرہ عمل کے حامل ہیں۔ ٹنڈل نے "Litrary Symbol" میں Sign کو اشارہ کہا ہے۔ ایسا جو کسی یقینی شے کی جانب ہو۔ سوسن کے لینگر کے نزدیک اشارہ ایک کمتر درجے کا حامل ہے جو معنویت کے اعتبار سے ایک عام رشتہ ہے اور علامت اپنی وسعت میں نہ صرف محسوسات اور احساسات کے پراسرار سلسلوں تک رسائی رکھتی ہے۔ فرائیڈ علامت کو شے کا بدل (Substitution) اور موازنہ (Comparision) سمجھتا تھا جبکہ یونگ نے اس محدود تصور کو رد کیا اور یوں اشارہ اور علامت کا واضح فرق سامنے آیا۔

علامت، (Sign) کی طرح ایک یقینی اشارہ تو مہیا کرتی ہے مگر اس کی معنویت یقینی نہیں ہوتی اس کا سفر ہمہ جہت ہے، اشارہ کی طرح واحد معنویت کی قید سے آزاد۔ مختلف اقدار اور نظریات کے حامل ذہن علامت سے اپنے اعتقادات کی روشنی میں مطالب اخذ کرتے ہیں۔ یورپ

کی علامت نگاری کی تحریک کی طرح ہمارے ہاں بھی یک رخی' میکانکی سوچ کی ضد کے طور پر علامت نگاری کا رجحان پیدا ہوا اور پیش منظر کی صورت حال سے مطابقت کے باعث اہمیت اختیار کرگیا۔

استعارہ نادر افکار کی باریک ترین دلالتوں اور دقیق ترین کیفیتوں کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ استعارے کے برتاؤ سے لغوی مفہوم' مجازی مفہوم کے تعین میں مدد دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی استعارہ کثرت سے اور بار بار استعمال کیا جائے گا تو ہم مخصوص لفظ کے استعاری مفہوم کو لغوی معنوں میں سمجھنے لگیں گے۔ متواتر مجازی معنوں میں مستعمل ہونے کے باعث اس کے مفاہیم میں ایک قسم کی عمومیت پیدا ہو جائے گی' فلپ ویگز نے ایسے الفاظ کو مرجھایا ہوا استعارہ کہا ہے۔ ہماری لغت گویا ان مرجھاتے ہوئے استعاروں کا ذخیرہ ہے۔ استعارہ تجریدی مشاہدے کا بہترین ثبوت ہے۔ یہ تمثیلی علامتوں کو استعمال کرنے کی قوت ہے۔ ہر نیا تجربہ یا نیا تصور سب سے پہلے استعارے کا روپ دھارتا ہے۔ پھر مرجھا کر لغوی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ اس طرح یہ زبان کی زندگی کا قانون ہے۔

آج کے بکھرتے ہوئے فرد کے لیے لامعنیت میں مفاہیم پنہاں ہیں۔ وہ کسی ایک مخصوص خطہ ارض پر زندہ نہیں' اس لیے کہ دور دراز کے رہنے والے براہ راست نہ سہی اس پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اس بین الاقوامی فرد کے اظہار کے اسالیب نئے ہیں کہ وہ استعاروں میں سوچتا ہے۔ ایک مثال انور سجاد کے افسانے "سنڈریلا" کی بے بس لڑکی کا استعارہ ہے جو مامتا اور شفقت سے خالی دنیا کی بھیانک نقاب کشائی ہے۔ پیش منظر کے افسانے میں شعور کی رو کے تحت علامت اور استعارے کی کارفرمائی نے مزید جوہر دکھائے ہیں۔ اس خصوص میں حسین الحق' مسعود اشعر' شمس نعمان' علی تنہا' احمد داؤد' قمر احسن' انور زاہدی' طارق محمود اور یوسف چودھری کے متعدد افسانے خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔

شعور کی رو Stream of Consciousness فرائیڈ کے نظریہ لاشعور کی عطا ہے کہ شعور کی اور یورپ میں پرابلم ڈراموں کا باعث بنی اور سرئیلزم کو شہرت نصیب ہوئی۔ یہ موضوع سے زیادہ Method سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں دماغ میں آئے ہوئے بے ربط امور کو نئی ترتیب دی جاتی ہے۔ اس میں انتخاب اور تکرار کی اہمیت ہے۔ بیان کی بجائے اشارا اور فقرے کی جگہ جملے سے کام لیا جاتا ہے۔ شعور کی رو کی تصویروں میں ربط کسی منطق یا استدلال کی وجہ سے نہیں بلکہ ہر لحظہ ذہن کی بدلتی ہوئی کیفیت کے باعث ہے۔ اس طرح تصورات اور خیالات کا تلازم اور یادداشتیں' خارجی واقعات سب ایک ہی رو میں سامنے آتے ہیں۔ ہنری جیمز نے شعور کے مرکز کی طرف توجہ دلائی۔ اس طرح وحدت کی وہ فنی گرفت سامنے آئی جو اس تکنیک کی جان ہے۔ شعور کی رو کا شعری طور پر اثر سب سے پہلے ڈی ایچ لارنس (Son And Lovers) مطبوعہ ۱۹۱۳ء کے ہاں نظر آتا ہے۔ پھر ڈور تھی رچرڈسن نے Pilgrimage (۱۹۱۵ء) لکھی اور جیمز جوائس نے ۱۹۱۶ء میں ناول "A Portrait of the Artist as a Young man" مکمل کیا۔ ورجینیا وولف کی ناول To the Light House کا سال اشاعت ۱۹۲۷ء ہے۔

شعور کی رو کے برتاؤ میں جوائس' وولف اور مارسل پروست کے ہاں افسانوی کردار محض ذہن کا روپ رکھتے ہیں' اس طرح بخوبی لاشعور کی تجریدی کیفیت کا اظہار ممکن ہے۔ شعور کی رو کے سلسلے میں حسیاتی' تاثر' داخلی خودکلامی اور داخلی تجزیہ کی تکنیک خاصی مقبول رہی ہے۔

حسیاتی تاثر (Sensory Impression) میں فن کار اپنی ذاتی زبان برتتا ہے جو ضروری نہیں کہ مروجہ لسانی پیرائیوں سے ہم آہنگ بھی ہو۔ اس میں شاعری اور موسیقی کے اثرات نمایاں رہتے ہیں۔ ذاتی زبان برتنے کا تجربہ پہلی بار یولی سیز میں کیا گیا۔ گو جیمز جوائس کی زبان سمجھ میں نہیں آتی' لیکن اس کا مخصوص آہنگ ذہن میں خاص قسم کی کیفیت کا باعث بنتا ہے۔ ہمارے ہاں قرۃالعین حیدر ہیں جو حسیاتی تاثر کی موسیقیت بھی رکھتی ہیں:

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہم طامس بیکٹ کی ان بے چاری عورتوں کی طرح چلا رہی ہیں پتھر کو دھو' ہوا کو دھو' فضا کو دھو' ہڈیوں کو دھو' پتھر کو پتھر سے جدا کر کے دھو' جب میں پتھروں کو ہاتھ لگاتی ہوں تو ان میں سے خون رسنے لگتا ہے۔" ("فصل گل آئی یا اجل آئی")

داخلی خودکلامی (داخلی مونولاگ) میں افسانوی کرداروں کے شعور میں بننے والے خیال کے حقیقی بہاؤ کو پیش کرنے کی کوشش کی جاتی

ہے۔ دراصل یہ زبان کی گرفت میں آنے سے پہلے ذہنی تصورات کی کیفیت ہے جسے نثر کی نسبت شاعری میں زیادہ کامیابی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس تکنیک کو برتنے والے افسانہ نگار شاعرانہ وژن کے حامل ہوتے ہیں۔ بقول جان گراس 'یولی سز کی خودکلامیاں اگرچہ کھردری اور نامکمل سی ہیں۔ لیکن ان کا ڈھانچہ نہایت احتیاط کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ جوائس کا آخری ناول Finnegans Wake بھی اس کی مثال ہے۔ داخلی خودکلامی کی خوبصورت ترین مثال: "ہیمنگوے کا ناول Oldman and the Sea ہے۔ اردو میں اے حمید کی "شہر اور کلیاں" کے بعض حصے اور قرۃ العین حیدر کے افسانوی مجموعے: "شیشے کے گھر" کے افسانے خصوصیت کے ساتھ "یہ داغ داغ اجالا" اس کی مثالیں ہیں۔

"داخلی تجزیہ" میں کردار کے تجربہ اور تاثر کا خلاصہ تخلیق کار اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس طرح افسانوی کردار کی سوچ تک فن کار کی دسترس میں رہتی ہے۔ اس میں ذہن کی اس کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے جسے فرائیڈ نے قبل از شعور کا نام دیا تھا۔ شاعری میں اس کی مثال براؤننگ کی نظم "Fralippo-Lippi" ہے۔ اس میں اٹلی کے ایک قدیم مصور کو گرجا میں مقدس تصاویر بنانے پر مامور کیا گیا ہے' لیکن وہ اپنے داخلی اظہار سے مجبور ہو کر Nudes بنانے لگا۔ اس نظم کا موضوع مصور کے داخلی اظہار اور پادریوں کے احکامات کے درمیان کشمکش ہے۔ ہنری جیمز اور مارسل پروست نے اس تکنیک کو خوبی سے برتا ہے۔ اردو افسانے میں اس کی خوبصورت مثال امجد الطاف کے دو افسانے "چونے کی کھیا" اور "آملیٹ" ہیں۔

"تخلیق کار" کا مقصد تشریح کرنا نہیں بلکہ محض اشیاء کے آہنگ سے مسرت حاصل کرنا ہے۔ "تجرید کے بانی مصور مونے کا یہ قول تجرید کاری کی مکمل ترین تشریح ہے۔ اردو افسانے کے پیش منظر میں کارفرما مصوری کی اصطلاح تجرید کا باقاعدہ تحریک کی صورت ابھرنا صرف ساٹھ برس پہلے کا قصہ ہے' جب یورپ میں فطرت سے قریب مصوری نے آخری سانس لے۔ یہ تحریک یکایک Expressionism اور Cubism کے سنہری زمانے میں مصوری کی نئی کروٹ تھی۔ اسے فن برائے فن کی خوبصورت مثال کہہ لیجئے----- Cubism میں ہندسی اشکال کو اہمیت حاصل تھی یعنی مکعب نما دائرہ اور متوازی خطوط وغیرہ۔ روایت سے اس شدید بغاوت کا تعلق بہرطور فطرت سے ضرور تھا' تجرید Cubism سے آگے کا قدم ہے۔ اس میں فطرت سے رابطہ توڑ دیا گیا۔ اب آنکھ کی جگہ چہرے پر نہیں رہی وہ بدن کے کسی حساس حصے پر اگ سکتی ہے۔

مصور سیزان نے جب اس تحریک کا جواز مہیا کیا کہ "تجرید حقیقت کی عکاسی نہیں ہے بلکہ ایک نئی حقیقی منطق کی رو سے اپنی حقیقت خود تخلیق کرتی ہے۔" تو ہرایرے غیرے نے اس کام کو سہل جانا اور تصویر کو گورکھ دھندہ بنا دیا۔ اس سلسلے میں دھوکہ دہی کا اعتراف پکاسو نے LivingMuseum کے ایک انٹرویو (۱۹۶۶ء) میں کیا ہے۔ تصویر کاری سے تجرید ادب تک پہنچی۔ ہمارے ہاں تجریدیت کی تحریک کا اثر براہ راست کم پڑا ہے لیکن ہمارے طریق ادراک میں بھی وہ عناصر جو تجریدیت کی تشکیل کرتے ہیں' بالواسطہ اور غیر شعوری طور پر خودبخود شامل ہو رہے ہیں۔ یورپ کے ادب سے تجرید کی مثال پیش کرتے وقت عام طور پر فرانز کافکا کا نام لیا جاتا ہے جس کا طریقہ کار سرریلسٹ ہے' یعنی تجرید اور سرریلزم میں ہم فرق نہیں کرتے۔ سرریلزم کو خواب اور حقیقت کا سنگم کہہ لیجئے' جس کا جنم تحت الشعور سے ہے' یعنی شعور اور لاشعور کا مقام اتصال' اس سرحد (تحت الشعور) پر تخلیق کار لاشعور کی گہرائیوں سے تخلیق کار مواد اخذ کرتا ہے یہ نہایت نازک مرحلہ ہے۔ اس میں کوشش کی جاتی ہے کہ خارجی دنیا سے تشکیل شعور کا عکس نہ پڑنے پائے۔ سرریلسٹ فن کار ایک تو سامنے کی دنیا کی تصویر بناتا ہے اور ساتھ ہی دوسری دنیا کی تصویر بھی جو ظاہر حقیقت سے بالاتر ہے۔ کافکا کا انداز سرریلی ہے۔ اس لیے اس کے ناولوں میں اور دیگر کہانیوں میں باقاعدہ پلاٹ ہے اور واضح کردار بھی۔ اس کے ہاں انسانی ذہنوں کے ان سربستہ رازوں کی نقاب کشائی ملتی ہے جنہیں ظاہر کی حقیقت (سماجی اقدار۔ جبر کی صورتحال) پنپنے کا موقع نہیں دیتی۔ یہ لاشعور کے تہہ خانوں کی تڑپ ہے۔ آندرے بریتوں نے ۱۹۲۴ء میں سرریلزم کا جو باقاعدہ منشور پیش کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض طرز تخلیق نہیں بلکہ طرز زندگی بھی ہے۔ سرریلسٹوں کے دو اسکول سامنے آئے' فوٹوگرافک اور غیر منتکی۔ چونکہ سرریلسٹ شعور سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اس لیے پاگل پن' خواب' بیداری کے خواب اور خودکار تحریروں میں جھلک دکھاتی ہے مشہور سرریلسٹ بنجمن پریٹ کا ایک محاورہ مشہور ہے۔ "اپنی ماں کو اس وقت چومو جب وہ جوان ہو۔"

فرانز کافکا اپنی ذہنی افتاد کے باعث اس میں کامیاب ہوا لیکن اس کی ادبی دنیا میں بےمثال کامیابی کا باعث اس کی کامیاب علامت نگاری بھی ہے۔

تجرید کے ضمن میں یہ کہنا کہ مصوری کے اس طریقہ کار کا اردو افسانے میں منطقی جواز موجود نہیں۔ کامیاب تجریدی افسانوں سے بے خبری کی دلیل ہے۔ تجریدیت آج کے منتشر ذہن کی خوبصورت عکاس ہے۔ البتہ محض چونکانے والا کوئی بھی عمل دیرپا ثابت نہیں ہوتا۔ تجرید کار کا ضرورت سے زیادہ داخلیت پسندی کی طرف جھکاؤ ابہام کا باعث بنتا ہے۔ کامیابی حسن انتظام کا نام ہے۔ تجرید ضرورت اس وقت بنتی ہے جب موضوع کی ہمہ جہتی کا سامنا ہوتا ہے۔ غیریقینی صورتحال کا بہرصورت یقین میں ظہور تجرید سے ممکن ہے۔ کامیاب تجریدیت کا ادب میں ظہورپذیر ہونا اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ تمام فنون کا باہم رابطہ اعلیٰ فن پارے کے لیے ضرورت کے معنی رکھتا ہے۔

اردو افسانے میں تکنیک کے تجربات کے ضمن میں ایک خوبصورت تجربہ تمثیل نگاری (حکایت) کا انداز بھی ہے لیکن یہ افسانے اخلاقی حکایتیں نہیں، یہاں کسی سوچے سمجھے منصوبے پر افسانہ نگار عمل پیرا نظر نہیں آتا اس لیے بھی کہ افسانے میں کسی قسم کا عقیدہ ٹھونسنے یا درس دینے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ کام صرف Science Fiction سے لیا جا سکتا ہے جس کی کامیاب مثال اردو افسانے میں نہیں ملتی۔

کماریاشی، اکرام باگ، احمد جاوید اور شفق بنیادی طور تمثیل نگار ہیں۔ ان کے افسانے پراسرار فضا کے افسانے ہیں۔ نثر میں ماورائی کیفیت کا مکمل اظہار ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اسی مشکل سے دوچار کماریاشی ("اس کی لاش"۔ "پہلے آسمان کا زوال") اکرام باگ (آتش عنقا"۔ "دم افعی") احمد جاوید ("اشرفیاں۔ "ادھورا قصہ") شفق (آزاد بستی"۔ "پیاسا جزیرہ") تمثیل نگاری میں اپنے الگ الگ اسالیب رکھتے ہیں۔ ہمارے علامت نگاروں کے ہاں روزمرہ زندگی کے سامنے کے واقعات میں بھی اسرار دیکھنے کا میلان ملتا ہے۔ یہ خوبی تمثیل سے چھن کر علامتی اور استعاراتی افسانے کے مخصوص رچاؤ کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی ایک کوشش ہے بالکل اسی طرح کماریاشی، اکرام باگ، احمد جاوید اور شفق اپنی تمثیلی کہانیوں میں علامت کا تڑکا بھی لگاتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جہاں کہیں علامت نگاری حد سے بڑھی، افسانے پر قاری کی گرفت نہیں رہتی۔ اس کی بڑی وجہ تمثیل میں علامت کا بےجوڑ ملاپ ہے۔ تمثیل کی پہچان کرداروں اور واقعات کے مفاہیم کا تعین اور اکہراپن ہے۔ یہ کسی قسم کے داخلی الجھاوے کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی، اس کے برعکس علامت انسانی زندگی سے قربت کے باعث واقعاتی صداقتوں سے دور رہتے ہوئے بھی انہیں سے طاقت پکڑتی ہے اور معانی کی تہہ در تہہ سطحیں واضح کرتی چلی جاتی ہے۔ ان چاروں تمثیل نگاروں کے تمثیلی کردار اور واقعات مخصوص معانی کو ہی سامنے لانے کی کوشش ہیں۔ مثال: کماریاشی کے افسانے "صد سطری حکم نامہ" کا سرخ ٹائی باندھے مرکزی کردار جو بستی کے لوگوں کو ہٹانا، پہاڑ سے اترتا ہے اور جس کے پاس ایک حکم نامہ (کورا کاغذ) ہے آخر میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے، یہ واضح طور پر ایک مذہبی اساطیری کردار ہے۔ لیکن اس کے عکس علامتی افسانوں، "آخری آدمی" (انتظار حسین) "براوو۔ براوو" (اسد محمد خاں) "یوسف کھوہ" (انور سجاد) "بچھوؤں کی رات" (انوار احمد) کے کرداروں کے بارے میں ہم یہ حکم نہیں لگا سکتے۔

پیش منظر کا افسانہ اپنے موضوعات، تکنیک اور اسالیب کے اعتبار سے غیرمعمولی حد تک انوکھا اور تجرباتی ہے۔ یہ آج کی زندگی کے بطن سے جنم لینے والے تغیرات کی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کا کوئی مخصوص جغرافیہ نہیں یہ امیجز کا سیل رواں ہے۔

پیش منظر کے افسانے میں معین اصولوں سے اختلاف کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں، اس لیے کہ افسانے کا منظرنامہ تبدیل ہو گیا ہے۔ روایت سے یہ انحراف روایت کی توسیع بن گیا ہے۔ اب بیانیہ یک رخے انداز کی جگہ علامت اور استعارے نے تجریدی اور سرریلسٹ ورثارے کے ساتھ لے لی ہے۔ پیش منظر کے افسانے میں برتا گیا لفظ اپنے معانی کے بطون سے جنم لیتا ہے۔ اکثر انتہائی اظہار کے لیے لفظ کی جو نشست و برخاست ضروری تھی وہی برتی گئی ہے۔ اس طرح متنوع، پیچیدہ اور معانی کے اعتبار سے دوررس واردات کا بیان دیکھنے والی آنکھ کے زاویہ نظر کے مطابق اپنی صورت بدلتا رہتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے لیے فلابیر نے دعویٰ کیا تھا کہ ایک خیال کو ادا کرنے کے لیے مخصوص الفاظ کی خصوصی نشست و برخاست معین ہے۔ یہاں لفظ کا جوہر متنوع Dimensions میں سفر کرتا ہے، جو آج کے افسانوی اظہار کی پہچان ہے۔

پیش منظر کے افسانے کی یہ ہمہ جہتی اسے افسانوی روایت میں امتیاز بخشتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آج کا افسانہ گزرے ہوئے کل سے بہتر ہے' البتہ مختلف ضرور ہے۔ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہر فن پارے کو اس کی روایت میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ آج تکنیک اور اسالیب کے تجربات میں افسانہ نگار کا نقطہ نظر اس قدر مربوط صورت میں سامنے آ رہا ہے کہ بہت جلد پیش منظر کے تخلیقی افسانے کے بارے میں چھیڑی جانے والی یبوست زدہ سوچ کی نبضیں خود بخود چھوٹ جائیں گی۔

○

اردو افسانے میں زبان کا ورتارا

ہمارے افسانوی ادب کی پیش کش زبان کے ورتارے کی سطح پر چھ زندہ روایات کی نشاندہی کرتی ہے۔ اول اول جب نذیر احمد دہلوی کی مقصدی حقیقت نگاری نے افسانہ طرازی کی داستانوی روایت کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا دیا تو جذبہ اور شعریت کی بازیافت کے ساتھ رومانی مثالیت کو رواج ملا۔ اس کی اولین مثال اردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کے افسانے ہیں:

"بادشاہی باغ جس نے صاحبقران ثانی جیسے جلیل القدر شہنشاہ سے لے کر بے چارے بہادر شاہ ظفر تک کے جلوس اپنی آنکھ سے دیکھے تھے 'خواتین مغلیہ کے قدم اپنے سر آنکھوں پر رکھے۔ دلی سے چار میل شاہدرہ اسٹیشن کے قریب واقع ہے۔ متواتر پانچ ساڑھے پانچ صدی تک بادشاہی باغ نے جو عیش کئے ہیں ان کی نظیر پردہ دنیا پر مشکل سے ملے گی۔ برسات کے موسم میں باغ کا اندھیری حصہ ایک طلسم کدہ تھا۔ آم اور جامن کے درخت زمین میں اس طرح جھول رہے تھے کہ مالی اور باغ بان تو درکنار بہتر سے بہتر صناع دنگ رہ جاتے تھے۔ ڈھائی تین فرسنگ درختوں کی یہ دورویہ قطار اس طور پر چھائی ہوئی تھی کہ چھاجوں پانی پڑ جائے مگر ایک قطرہ زمین پر نہ پہنچے 'اندھیری حصہ کی مشرقی سمت پر جمنا لہریں لیتی تھی۔ ساون بھادوں کی اکثر راتیں اور بیشتر دن مغل بادشاہوں نے اس باغ میں بسر کئے۔ جب اودی اور سیاہ گھٹائیں آسمان پر چھاتی تھیں 'بجلی کوندتی تھی 'بادل گرجتا تھا تو یہ سیر کے رسیا جھولوں کا لطف اٹھاتے تھے 'گنگا جمنی ڈوریوں میں رو پہلی سنہری پڑیاں پڑتی جاتی تھیں 'قلعہ معلی کی پریاں لال سبز جوڑے پہن پینگیں بڑھاتی تھیں 'جھولنے والوں کی ہنسیری آوازیں زمین سے اٹھ کر کوئل کی کوک اور پپیہے کی صدا سے ٹکراتی تھیں۔ شمع آفتاب جھلملا جھلملا کر دم توڑ رہی تھی۔ روز روشن کا جنازہ دفن کرنے کے قریب تھا اور بادشاہی باغ کے درخت جو قبروں میں پاؤں لٹکائے کھڑے تھے 'اپنے دور شباب کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ پتوں کی موسیقی اور پرندوں کا نغمہ شام کا گجر بجا رہا تھا کہ فیروزہ اپنے میلے دوپٹے کے بائیں آنچل کو کندھے پر ڈالتی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکلی۔ اس کی کٹیا مصنوعی دنیا کے جھوٹے تکلفات اور ان سامانوں سے جو امیر زندگی کا جزو ہو گئے ہیں پاک تھی۔ مگر اطمینان کی ایک خاموش مسرت گھاس پھونس کے اس ڈھیر پر برس رہی تھی۔"

(بھنور کی دو دھن" از راشد الخیری سے اقتباس)

ہندوستانی فکشن میں رومان کا دیوتا مہیدیا رابندر ناتھ ٹیگور تھا۔ اس کے دونوں ابتدائی افسانوی مجموعوں "Hungry Stones" اور "Mashi" کے اثرات اردو افسانے میں نمایاں ہوئے اور ٹیگور کی دور رس تیرت پوری ہندوستانی فکشن پر چھا گئی۔

اردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کو یہ امتیاز ان کے طبع زاد افسانوں کے سبب حاصل ہوا ورنہ زمانی اعتبار سے سجاد حیدر یلدرم کے تراجم خصوصاً "غالث بالخیر" "صحبت ناجنس" "خارستان و گلستان" "فطرت جوانمردی" "نکاح ثانی" "سودائے سنگین" اور "نشہ کی پہلی ترنگ" راشد الخیری کے اس نوع کے افسانوں سے پہلے شائع ہوئے۔

راشد الخیری کے تسلسل میں زبان کے ورتارے کی سطح پر یہ پہلی بھرپور روایت یلدرم 'نیاز فتح پوری' قیسی رام پوری 'حجاب امتیاز علی' مجنوں گورکھپوری 'سر عبدالقادر اور قاضی عبدالغفار کی جذباتیت 'شعریت 'تصوریت اور نغمگی سے مملو نثری روایت ہے 'جو اسے نئید تک چلی آئی ہے۔

اے "آسمان پر قوس قزح تنی ہوئی تھی جس کے کنارے سمندر سے آکر ملتے معلوم ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوس قزح کی ملکہ کا

یہ حکم ہے کہ جسے رنگ کی لطافت سے لگاؤ نہ ہو وہ یہاں نہ رہے۔"

۲۔ "تیر ایک ہوا چاک سراسرہٹ سے اس کی طرف گیا اور گردن میں گھس گیا۔"

۳۔ "اس کے دل میں ایک طغیان غرور اٹھا۔ جس کی تمام ہیئت کذائی سے گویا بوئے فش کے بھبکے نکل رہے تھے۔"

۴۔ "اس کی سیاہ آنکھیں اندیشہ ناک تھیں' اپنے بازوؤں کو جس کی گوشت کی پھڑک کو میں نے ہر وقت ایک عجیب خوف سے دیکھا تھا' اس نے کولھوں پر

گرا دیا۔"

(یلدرم کی نثر سے چند اقتباسات)

۱۔ "عورت کا حسن ان کے نزدیک صرف دیکھنے کے لئے --- آزاد رمیدہ۔ آغوش سے دور---"

("ایک رقاصہ سے" از نیاز)

۲۔ "عورت --- ایک لذت ہے مجسم۔ ایک تسکین ہے متشکل۔ ایک سحر ہے مری۔ ایک نور ہے مادی۔"

("عورت" از نیاز)

۳۔ "ایک حسین عورت کی ہر حرکت ہے' وہ ایک نطق موسیقی ہے۔ حسن کا ساز نسائیت ہے اور صرف نسائیت ہے۔ وہ ہاتھ ہلاتی ہے تو گویا ہوا میں نقش ترنم بنا دیتی ہے۔ وہ چلتی ہے اور اپنے پیروں سے زمین پر نشان موسیقی چھوڑ جاتی ہے۔"۔

("چند دن بمبئی میں" از نیاز)

یلدرم' نیاز' مجنوں گورکھ پوری' قیسی رام پوری اور قاضی عبدالغفار کے ہاں فارس کی مٹھاس اور حلاوت کے ساتھ عربی کی فصاحت نمایاں ہے۔ اس روایت میں پھیلاؤ کی خاصی گنجائش تھی جس سے بعد میں قرۃ العین حیدر اور اے حمید نے فائدہ اٹھایا۔

نیاز فتح پوری کے ہاں جو گیرائی بعد میں پیدا ہوئی' اس کا باعث اس نثری روایت میں غرابت کا بتدریج کم ہونا تھا' جو عربیت کے غلبہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اس ذیل میں ان کے تین افسانے "دنیا کا اولین بت ساز" "زہرہ کا پجاری" اور "قربان گاہ حسن" خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

"اسے قبول کر اور جس وقت میں رومال کو تیسری بار جنبش دوں اپنی خدمت تکمیل کے ساتھ انجام دے۔"

یہ کہا اور اپنا سر تختہ پر رکھ دیا۔ شہزادہ نے سر رکھتے ہی اپنے رومال کو پہلی بار جنبش دی اور جلاد مستعد کھڑا ہو گیا جب شہزادہ نے دوسرا اشارہ کیا تو اس نے تلوار سونت لی' اور اس کے بعد ہی تیسرے اشارے پر ہوا میں شہزادے کے سر پر ایک چمک سی پیدا ہوئی اور تلوار اس کی گردن میں پیوست ہو گئی۔ ہجوم میں ایک شور پیدا ہوا' دیکھنے والوں کے چہرے متغیر ہو گئے اور دلوں پر حسرت و تاسف کا ایک گہرا سکوت مستولی ہو گیا۔ مرانڈا بے ہوش تھی۔"

("قربان گاہ حسن" از نیاز سے اقتباس)

مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کی رومانی فضا ان کے ترتیب کردہ مخصوص نفسیاتی اور فلسفیانہ نظام کے ماتحت ہے جو بقراطیت کے ساتھ شعر کا لحن لیے ہوئے ہے۔

"مجھے پلنگ پر بٹھا کر اس نے چراغ جلایا اور خود زمین پر میرے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے بھی زمین پر بیٹھنا چاہا مگر اس نے صرف **ایک نگاہ** سے مجھ کو روک دیا۔"

"ہاں تو میں تمہارا انتظار کر رہا تھا مجھے معلوم تھا کہ تم میری باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہو" حسن شاہ نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔

اس کے چہرہ کی عجب کیفیت تھی۔ میں چراغ کی دھندلی روشنی میں دیکھ رہا تھا کہ کبھی وہ آگ کی طرح سرخ ہو جاتا ہے اور کبھی خزاں رسیدہ پتی کی طرح زرد۔ وہ کسی شدید آزمائش سے گزر رہا تھا' کسی جانکاہ تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس پر ہوش و حواس اپنا غلبہ کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"کہو حسن شاہ! تم کس عالم میں رہا کرتے ہو اور تم پر کیا گزرا کرتی ہے؟ تم نے مجھ سے کون سا قصہ بیان کرنے کو کہا تھا؟"

("حسن شاہ" از مجنوں سے اقتباس)

مسز عبدالقادر نے رومان پسندی کی اس روایت میں ہیبت ناکی کا عنصر شامل کر کے اپنا ایک الگ لہجہ دیا اور حجاب امتیاز علی نے حسن و لطافت' شعر و نغمہ اور رنگ و رومان سے معمور ایک ایسی فضا پیش کی جس میں محو ہو کر قاری دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اسلوبیاتی سطح پر ان دونوں خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں عربی اور فارسی کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔

"باغ کا یہ انتہائی کونہ بالکل خشک اور ویران پڑا تھا۔ ہر طرف سوکھے پتوں کے ڈھیر لگے تھے۔ جن پر کہن سالہ اور دراز نے درختوں نے اپنا تاریک سایہ ڈال رکھا تھا۔ ان درختوں کے بے ترتیب اور ان گنت تنے اس بے ڈھنگے پن سے لٹک رہے تھے جیسے بلاؤں کے ڈھانچے اور پنجر۔ اس سونے اور متوحش ماحول میں جب کسی گلہری کی کود پھاند یا کسی نیولے کی وحشیانہ دوڑ سے گھبرا کر دم کشی کی مشق کرنے والا گوشہ نشین الو اپنے پروں کو پھڑ پھڑانے لگتا تو اس شبہ سے کہ شاید ان پنجر نما تنوں میں جان پڑنے لگی ہے' دل دہل جاتا۔"

("رابعہ" از مسز عبدالقادر سے اقتباس)

"وہ بہار کی قرمزی شام تھی۔ والد ندی کی سیر کے لئے کشتی پر چلے گئے تھے۔ دادی جان نیچے کمرہ ملاقات میں لوگوں سے ملاقات کر رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں دریچے کے پاس کوچ پر لیٹی ہوئی باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ کشتیاں ندی میں تیر رہی تھیں۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔"

("میری ناتمام محبت" از حجاب امتیاز علی سے اقتباس)

۱۹۳۶ء سے قبل اس رومانی روایت کا آخری بڑا نام قاضی عبدالغفار کا ہے' جنھوں نے اس اسلوبیاتی لہر میں احساس جمال کو تسکین پہنچانے کے ساتھ علم و حکمت کی نکتہ آفرینی کو کچھ اس طرح شامل کیا کہ مجنوں گورکھپوری کی بقراطیت اور قاضی عبدالغفار کی نکتہ سنجی و معنی آفرینی کی الگ پہچان ممکن ہوئی۔

"سانپ کے زہر میں ہلاکت کے جن اجزاء کو شامل سمجھتے ہو' وہ دراصل زہر کے اندر موجود ہی نہیں۔ وہ خود تمہارے اندر ہیں' اپنے اندرون کو ان اجزاء سے پاک کر لو' پھر سانپ کے منہ میں انگلی ڈال دو۔ ویسے ہی محفوظ رہو گے جیسا کہ میں ہوں۔"

("کشتما" از قاضی عبدالغفار سے اقتباس)

اردو میں اسالیب کی سطح پر دوسری بھرپور روایت کی سیلانی لائین عوام میں تھی ' جس کی اٹھان ہندوستان کی عوامی بولیوں سے ہوئی۔ دراصل یہ ہندوستان کے شریف وحشی (Noble Savage) کی زبان تھی۔

اردو افسانے میں اس کی دو صورتوں نے اظہار پایا۔ پہلی صورت زبان کے روزمرہ کے حوالے سے سامنے آئی۔ یہ صاف اور سادہ زبان تھی جس میں آخر آخر (پریم چند کے ہاں) سنسکرت آمیز ہندی کے اثرات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس زبان کا ابتدائی رنگ ملاحظہ ہو:

"ودیادھری نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں۔ پتلیوں کی جگہ دل رکھا ہوا تھا۔"

(افسانہ "سیر درویش" از پریم چند سے اقتباس)

اس کی دیگر خوبصورت مثالیں علی عباس حسینی اور اعظم کریوی کے ہاں ملتی ہیں۔ علی عباس حسینی کے تین افسانے: "سکھی" "سو بیگھے" اور "سیلاب کی راتیں" اور اعظم کریوی کے موضع پارہ ضلع غازی پور (یو۔پی) کے لینڈ اسکیپ سے متعلق افسانے اس کی مثالیں ہیں۔

علی گڑھ کی عقلیت پسندی اور نذیر احمد کی مقصدی حقیقت نگاری کی عمارت اسی ورثے کی روایت پر قائم ہے۔ پریم چند نے اس میں "قومیت" کا اضافہ کیا تو جذباتیت راہ پا گئی:

"اے وہ بات یاد آ گئی۔ آبدیدہ ہو کر بولی۔

"میرے لئے بھی کچھ لائیں؟"

میں: "ہاں ایک بہت اچھی چیز لائی ہوں۔"

ودیادھری: "کیا ہے۔ دیکھوں۔"

میں: "پہلے بوجھ جاؤ۔"

ودیادھری: "سہاگ کی پٹاری ہو گی۔"

میں: "نہیں اس سے اچھی۔"

ودیا: "ٹھاکر جی کی مورتی؟"

میں: "نہیں اس سے اچھی۔"

ودیا: "میرے پران آدھار کی کچھ خبر۔"

میں: "نہیں اس سے بھی اچھی۔"

ودیا: "تو کیا وہ باہر کھڑے ہیں؟"

یہ کہہ کر وہ بیتابانہ جوش سے اٹھی کہ دروازہ پر جا کر پنڈت جی کا خیر مقدم کرے ' مگر ضعف نے دل کی آرزو نہ نکلنے دی۔ تین بار سنبھلی اور تین بار گری ' تب میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور آنچل سے ہوا کرنے لگی۔"

("سیر درویش" از پریم چند سے اقتباس)

"گوشائن پور کے مفصلات شروع ہوئے۔ پختہ مکانات ' سربفلک عمارتیں دکھائی دینے لگیں۔ شہر کے پھاٹک سے ملے ہوئے آموں کے درخت کے قریب ایک اندھا فقیر بیٹھا تھا۔

"ایک پیسہ ' پاؤ بھر آٹا۔ ایک پیسہ ' پاؤ بھر آٹا۔ اندھے فقیر کا سوال " کی رٹ لگی تھی اس کے زرد زرد دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس کی میلی داڑھی کے بال الجھے ہوئے تھے۔ اس نے پاؤں کی چاپ سنتے ہی ان کی طرف رخ کیا۔ اپنا سوکھا ہوا زرد ہاتھ پھیلا دیا۔ "بابا بھلا ہو گا"

---- اندھے کا سوال 'ایک پیسہ 'پاؤ بھر آٹا۔ "

("خوش قسمت لڑکا" از علی عباس حسینی سے اقتباس)

" بڑھیا خاموش رہی۔ اس نے چوں تک نہ کی۔ بھری دوپہر میں اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ---- "ہائے میری ہی وجہ سے گھر کا دلدر دور نہیں ہوتا۔ میں گھر کی بلا ہوں۔"

وہ منہ میں بوند بھر پانی بھی نہ ڈال سکی۔ اس رات اسے بہت زور کا بخار چڑھ آیا۔ اس سے پیارے لال کی باتوں کی چوٹ نہ سہی گئی۔ وہ اس بخار میں تین دن بے سدھ پڑی رہی۔ چوتھے دن اسے کچھ ہوش آیا تو اس نے پیارے لال کو پکار کر کہا:

" بیٹا پیارے! اپنے بچے کو میری چھاتی پر رکھ دے۔ بہو کو بھی بلا لے۔ آج میرے پاس تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جا۔ میں چلتے وقت تو جی بھر کر تم سب کو دیکھ لوں۔"

("ساس اور بہو" از اعظم کریوی سے اقتباس)

" ایک دن درگا کی ایک سہیلی گورا اس سے ملنے آئی تو اس نے کہا:

" نیچی پریما کا بیاہ کب کرو گی؟ لڑکی بہت سیانی ہو گئی ہے اس کو کنواری بٹھا رکھنا بڑی شرم کی بات ہے۔ گاؤں بھر میں تمہاری بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔"

درگا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا " بہن کیا بتاؤں بہت تلاش کرنے پر بھی اب تک کوئی بر ہی نہیں ملا۔"

گورا۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن خاموش رہنے سے تو کام نہ چلے گا میرے خیال میں تم کو اب دیر نہیں کرنی چاہئے۔

درگا۔ بہن تمہیں پریما کو کہیں ٹھکانے لگا دو بڑی کرپا ہو گی۔

گورا نے کہا " اچھا میں دیکھوں گی " ۔ یہ کہہ کر گورا چلی گئی۔ دو چار دن بعد وہ پھر آئی۔ اس نے آتے ہی درگا سے کہا " نیچی مٹھائی کھلاؤ' میں نے پریما کے لئے بر ڈھونڈھ لیا ہے " ۔ درگا نے خوش ہو کر کہا " کہاں ؟"

گورا۔ مہاراج بنسی دھر کو تو جانتی ہو۔

درگا۔ وہی نا جو امرپور میں رہتے ہیں۔

گورا۔ ہاں ہاں وہی وہی۔

درگا۔ ان کی تو عمر بہت زیادہ ہے وہ اب شادی کیوں کر رہے ہیں ؟

گورا۔ عمر ضرور زیادہ ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ مرد ہیں ان کی عمر کا کون خیال کرتا ہے ان کی جتنی عمر ہے اس عمر میں تو بہت سے لوگ بیاہ کرتے ہیں اور نیچی برا نہ مانو تو کہوں تمہاری لڑکی بھی بہت سیانی ہے۔ بر بالکل چھوکرا ہونے سے بھی تو کام نہیں چلے گا۔ میرا کہنا مانو تم اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو بڑے امیر ہیں۔ بیس پچیس بیگھے موروثی کاشتکاری ہے۔ تالاب' باغ سب ہی کچھ تو ہے اور سب سے زیادہ اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ دان دہیز بھی نہ لیں گے۔ کہو منظور ہے کہ نہیں۔"

درگا بنسی دھر کے ساتھ پریما کا بیاہ کرنے کے لئے کبھی راضی نہ ہوتی لیکن جب اس نے سنا کہ دان دہیز بھی نہ دینا پڑے گا تو وہ مجبوراً راضی ہو گئی۔

گورا۔ ایک بات اور ہے' وہ یہ کہ کل کچھ عورتیں مہاراج بنسی دھر کے یہاں سے پریما کو دیکھنے آئیں گی۔

درگا۔ بہن ایسا تو میرے یہاں کبھی نہیں ہوا۔ میرا بیکہ کہاں گاؤں میں ہے۔ وہاں جب تک بیاہ نہیں ہو لیتا سسرال والے لڑکی کو نہیں

دیکھ سکتے۔

گورا۔ خیر تم ایک کام کرو۔ کل سویرے پریم کو نہلا کر صاف کپڑے پہنا دینا' امرچھ سے جب عورتیں میرے یہاں آئیں گی۔ میں کسی بہانے سے پریما کو اپنے گھر بلا لے جاؤں گی' اس طرح وہ پریما کو دیکھ لیں گی۔ اس میں کوئی ہرج نہ ہو گا" ورگا نے خوش ہو کر کہا "ہاں یہ ترکیب تو ٹھیک ہے۔"

("پریم کی چوڑیاں" از اعظم کریوی سے اقتباس)

ترقی پسند افسانہ نگاروں کی اکثریت کو اپنے "مینی فسٹو" کی پابندی کے باعث یہ اسلوب اظہار مناسب معلوم ہوا۔ پریم چند اور اس کے Camp Followers کے فوراً بعد اس زبان کے فوری چناؤ کی مثالیں اقبال سنگھ' ملک راج آنند' سجاد ظہیر' جگل کشور شکلا' اختر انصاری' اوپندر ناتھ اشک اور دیوندر ستیار تھی کے ہاں مل جاتی ہیں۔

زبان کی اس اسلوبیاتی روایت کی دوسری پرت (سرت چندر چیٹرجی کے حوالے سے) رومانی جذباتیت کی روایت کے ٹوٹنے سے سامنے آئی۔ سرت چندر چیٹرجی نے بنگال کے شہری سماج کی پیش کش Draought میں اسی زبان کو بنیاد بنایا۔

اردو افسانے میں حامد علی خان' جلیل قدوائی' سعادت حسن منٹو' عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی اس روایت کے نمایاں نام ہیں۔ اس اسلوبیاتی پرت کی بنیاد بھی عوامی بولیاں ہی بنی ہیں۔ لیکن یہاں Noble Savage کے گنوار پن اور رومانی جذباتیت کی بجائے خارجیت کا عنصر غالب ہے۔ اس کا شہری لہجہ نترا ستھرا ہے اور انتصار اس کی نمایاں خوبی۔ اس اسلوبیاتی روایت میں مختصر افسانہ لکھنے کے تجربات منٹو' رتن سنگھ اور گربچن سنگھ نے کیے۔

۱۔ "یہ رنگ برنگی عورتیں مکانوں میں پکے ہوئے پھلوں کی مانند لٹکتی رہتی ہیں۔۔۔ آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔"

("پہچان" از منٹو سے اقتباس)

۲۔ "امرتسر سے سپیشل ٹرین دوپہر کے دو بجے چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغلپورہ پہنچی۔ راستے میں کئی آدمی مارے گئے متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر ادھر بھٹک گئے۔

صبح دس بجے۔۔۔ کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں اور بچوں کا متلاطم سمندر دیکھا تو اس کی سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہو گئیں۔ وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا۔ لیکن بوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہی خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ اسکے ہوش و حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف' بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں۔ تیز روشنی اس کے وجود کے سارے ریشوں میں اتر گئی۔ اور وہ جاگ اٹھا۔ اوپر تلے اس کے دماغ پر کئی تصویریں دوڑ گئیں۔۔۔ لوٹ' آگ' بھاگم بھاگ' سٹیشن' گولیاں' رات اور سکینہ! سراج الدین ایک دم کھڑا ہو گیا اور پاگلوں کی طرح اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔

پورے تین گھنٹے وہ سکینہ سکینہ' پکارتا کیمپ کی خاک چھانتا رہا مگر اسے اپنی جوان اکلوتی بیٹی کا کوئی پتہ نہیں ملا۔"

("کھول دو" از منٹو سے اقتباس)

عام طور پر اس زبان میں ایسی تشبیہات جن میں بظاہر کوئی نیا پن نہ ہو قابل توجہ نہیں رہتیں لیکن منٹو، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی اور عصمت چغتائی کے دور رس تصور نے موزوں ترین مماثلتیں اور مشابہتیں تلاش کر کے تشبیہ کو مفہوم اور تجربے کی گہرائی بخش دی۔

"نواب سنگھ مردانہ شباب اور وجاہت کا نمونہ تھا۔ اس کے قد و قامت، ڈیل ڈول اور تیور دیکھ کر بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ رنگ بے شک گندم گوں تھا اور چہرے سے کبھی خشونت کے آثار ظاہر ہوتے تھے، پھر بھی وہ مجموعی حیثیت سے خاصا دل کش نظر آتا تھا۔ اس کے رعب داب کی تو حد ہی نہیں تھی۔ علاقے بھر کے نوجوان اور بگڑے دل غنڈوں کے دل دہل کر رہ جاتے تھے اور وہ اس کے ایک ہی جھانپڑ سے خون تھوکنے لگتے تھے۔"

("چاند اور کمند" از بلونت سنگھ سے اقتباس)

"جب فیض کی خون آلود انگلیوں نے ایک طلائی مہر اس کی حنائی انگلیوں میں تھما دی تو اندھیرا گہرا ہو گیا۔ ستارے ماند پڑ گئے۔ مڈیاں اور جھینگر چیخ اٹھے اور ملائم دہکتے ہوئے، بھیگے ہوئے گال ایک زخم خوردہ چوڑی چھاتی پر بہت دیر تک پڑے دھڑکتے رہے۔"

("طلائی مہر" از احمد ندیم قاسمی سے اقتباس)

"میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے، مٹی کے تودے۔ یہ سویٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں، یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے، جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔"

("چوتھی کا جوڑا" از عصمت چغتائی سے اقتباس)

زبان کے ورتارے کی ایک بھرپور روایت نے چوہدری محمد علی ردولوی کے افسانوں میں جنم لیا۔ بحیثیت اسٹائلسٹ محمد علی ردولوی کا نام یلدرم اور پریم چند کے بعد سب سے نمایاں ہے ردولوی کے ہاں قدیم روایات سے جذباتی لگاؤ اور ذہنی وابستگی ایک منفرد نثری آہنگ میں ڈھل گئے ہیں۔ یہ داستان کی نثری روایت کی بازیافت ہے جس میں محمد علی ردولوی نے اپنی انفرادیت زبان کے برجستہ استعمال کے ساتھ ساتھ قلم کے شوخ و شنگ Stroke اور مزاج کے بانکپن سے پیدا کی ہے۔ محمد علی ردولوی Paradoxes کا بادشاہ ہے:

"سنئے صاحب، میں کہانی لکھتا نہیں ہوں، کہانی کہتا ہوں، اچھی معلوم ہو تو سنتے جایئے۔"

اندر والا: سنو بی ناجو تم اور صغیر جو پردے سے لگے گھڑیوں باتیں کرتے ہو اور جو کوئی کچھ کہہ دے؟"

ناجو: مجال ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کرتے نہیں تو ڈر کس کا، بھلا مجھ سے آٹھ سال چھوٹا اور پھر وہ تو مجھے چچی کہتا ہے۔

اندر والا: تم ہنسنے زیادہ لگی ہو۔

ناجو: ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے۔"

("دھوکا" از محمد علی ردولوی سے اقتباس)

"راستے میں چھوٹا پھول کھلا تھا کہ مسافروں کو دیکھے گا۔ گدھا آیا اور اس کو چر گیا۔"

("کشکول محمد شاہ فقیر" سے اقتباس)

آگے چل کر زبان کے ورتارے کی اس روایت میں ابو الفضل صدیقی، خان فضل الرحمان، سید رفیق حسین اور قاضی عبدالستار کے نام ابھر کر سامنے آئے۔ ابو الفضل صدیقی کے ہاں جاگیردارانہ ماحول میں پلنے والے ٹھیٹھ دہلوی اور لکھنوی لہجے کی بازیافت ہوئی جبکہ خان فضل الرحمان نے اس اسلوب میں تلنگانہ کا مخصوص رنگ شامل کر دیا۔ سید رفیق حسین نے جنگل کو اس کے تمام رنگوں سمیت اس اسلوب کا حصہ بنا دیا اور قاضی عبدالستار نے نثریت، انگیخت اور Paradox کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ اسے ایک نیا لحن دیا۔

"اجی ٹھاکر جی آپ نے سنا نہیں کہ مار کے آگے بھوت بھاگتے ہیں۔ ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ ہے کیا بلا؟"۔ استاد رضا خان نے کہا۔ اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ پچیس تیس آدمی ایسے فراہم کیجئے جو بیزی سے نیچے گڈھے میں سے پانی اٹھا کر اس بھٹ میں بھر دیں۔"

("بازگشت" از ابو الفضل صدیقی سے اقتباس)

"دڑو کی بیوی اس سے گت تھی۔ جسے وہ سراوگیوں کے گاؤں جین پورے سے لایا تھا۔ اس کے گاؤں میں کسی نے بھی اپنی لڑکی اسے دینے کی حامی نہیں بھری تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ایک نوزائیدہ لڑکی کے لئے زچہ خانہ ہی میں شادی کا پیغام پہنچا دیا تھا اور اس کے کانوں میں گرام پاٹک کی یہ آواز پڑی تھی: "دڑو تجھے تو یہ بات کہہ کر لاجنا چاہئے۔"

("نربی" از خان فضل الرحمن سے اقتباس)

"کلوا اس جگہ کو سونگھے اور منہ اونچا کر کے خاموش کھڑا ہو جائے۔ قدرت نے آنسو نہ دیئے تھے کہ جاری ہوتے۔ بہت دیر تک یہی کیا کیا۔ پھر ایک دفعہ دم آسمان کی طرف اور ناک زمین پر، یہ روانہ ہو گیا۔ سیکڑوں ہزاروں، ہر طرح کی بوؤں میں چندو کی بو اس کے واسطے الگ تھی۔ یہ لیتا، بو ہی بو چل دیا۔"

("کلوا" از سید رفیق حسین سے اقتباس)

"سدھولی جہاں سے سیتا پور کے لیے مجھے بس ملتی ابھی دور تھا، میں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ میرے یکہ کو سڑک پر کھڑی ہوئی سواری نے روک لیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو میرا یکہ والا ہاتھ جوڑے مجھ سے کہہ رہا تھا:

"میاں ای شاہ جی، بھسول کے ساہوکار ہیں، ان کے یکہ کا بم ٹوٹ گوا ہے۔ آپ برا نہ مانو تو ای بیٹھ جائیں۔"

میری اجازت پا کر اس نے شاہ جی کو آواز دی۔ شاہ جی ریشمی کرتا اور مہین دھوتی پہنے آئے اور میرے برابر بیٹھ گئے اور یکے والے نے میرے اور ان کے سامنے "پیتل کا گھنٹہ" دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر رکھ دیا۔ گھنٹے کے پیٹ میں موگری کی چوٹ کا نشانہ بنا تھا۔ دو انگل کے حاشیے پر سوراخ میں سوت کی رسی پڑی تھی۔ اس کے سامنے قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ کا چاند اور ستارے کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور شاہ جی مجھے دیکھ رہے تھے اور یکہ والا ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یکہ والے سے رہا نہ گیا۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔۔۔ "کا شاہ جی گھنٹہ بھی خرید لایو۔"

ہاں! کل شام کا معلوم نائی، کا وقت پڑا ہے میاں پر کہ گھنٹہ دے دین بلائے کے۔ ای۔۔۔"

"ہاں وقت وقت کی بات۔۔۔ شاہ جی، نا ہیں تو ای گھنٹہ۔۔۔۔۔۔۔ اے گھوڑے کی دم راستا دیکھ کے چل۔۔۔۔۔"

یہ کہہ کر اس نے چابک جھاڑا۔"

میں "میاں کا برا وقت" چوروں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ چابک گھوڑے کے نہیں میری پیٹھ پر پڑا ہے۔"

("پیتل کا گھنٹہ" از قاضی عبدالستار سے اقتباس)

زبان کی پانچویں رو یلدرم اور پریم چند کے Camp Followers نے تشکیل کی۔ یہ آدرش حقیقت نگاری اور رومانی لہجے کی باہم آمیزش تھی ۔ اس کی ایک ابتدائی مثال خواجہ حسن نظامی کے ہاں (افسانہ "بہرا شہزادہ") ظاہر ہوئی تھی ۔ اس روایت میں حسن نظامی کا لہجہ مغل زوال کے حوالے سے شکوہ الفاظ اور بردباری کا حامل تھا۔

زبان کے ور تارے کی سطح پر رومان اور حقیقت پسندی کا یہ ملاپ ملک راج آنند سے ہوتا ہوا کرشن چندر کے ہاں ظاہر ہوا اور معیار قائم کر گیا۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں آدرش حقیقت نگاری 'رومانیت کے زیر اثر شعریت اور تمثیل کی دریافت کرتی ہے۔

"رنگی مجھ سے شادی کرو گی ۔"

چلتی ہوئی فاسٹ لوکل کا طوفانی شور ۔ پہیئے مہیب آواز کھنکھناتے ہوئے۔ ان آوازوں کی ہیبت ناک گونج میں ایک تنکے کی طرح لکھی کی آرزو بھنور میں چکر کھاتی ہوئی 'پھر شور ختم گیا۔ گاڑی چلی گئی ۔ یکایک سناٹا بہت بڑھ گیا۔

"رنگی نے کوئی جواب نہ دیا ۔ وہ ریل کی پٹری پار کرنے لگی ۔ ریل کی پٹری پار کر کے وہ دوسری طرف چلے گئے ۔ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی ایک خالی نشیبی زمین سے گزر کر اسٹیشن جانے والی سڑک سے مل جاتی تھی۔

رنگی نے وہ چھوٹی سی پگڈنڈی بھی پار کر لی ۔ اب وہ سڑک پر آگئی پھر بھی وہ کچھ نہ بولی ۔ لکھی ایک مجرم کی طرح سر جھکائے اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ماہم کا اسٹیشن قریب آرہا تھا "

("رنگی" از کرشن چندر سے اقتباس)

کرشن چندر جذبات کی Sublime صورتوں پر تو قادر ہے لیکن اس کا نثری اسلوب پھیلاؤ کی طرف مائل رہا ہے 'جس کے سبب بے جا طوالت کا احساس بھی ہوتا ہے ۔ کرشن چندر کے حوالے سے اس اسلوبیاتی روایت کا اثر قبول کرنے والوں میں رواں پس منظر کے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی بڑی تعداد ہے۔

زبان کی چھٹی بھرپور اسلوبیاتی روایت نے چیخوف کے عالمگیر اثرات کے تحت اردو افسانے میں جنم لیا ۔ یہ زبان کے تخلیقی امکانات کی دریافت کرنے کی روایت ہے ۔ یہ اسلوب ظاہر میں باطن کو دیکھنے اور دکھانے کے تخلیقی عمل کی ضرورت ٹھہرتا ہے ۔ اس میں نثری موسیقیت موضوعات کے ساتھ یکجا ہو کر شاعرانہ سطحوں کو چھونے لگ جاتی ہے ۔ اس اسلوبیاتی روایت کی داغ بیل ہندوستانی فکشن میں راجا راؤ (۱) سے پڑی:

"She was nervous and Tremeled over and say Between Her Sobs "oh mother."

The Cartman asked me to get in, I Jumped into the cart with a havy hert. Hoi - Hoi."

Cried the cartman and the bullocks stepped into the river.

Till we were on the other bank ' I could see Javni sitting on a rock and looking towards

us in my soul ' I still seemed to hear her sobs . A huge peepal rose behind her ' and

a cross the blue waters of the river and the vast sky above her ' she seemed so small

Soinsignificant - " ("Javni" - Raja Rao)

اردو افسانے میں زبان کے اس ور تارے کی ابتدائی مثالیں راجندر سنگھ بیدی اور غلام عباس کے ہاں ظاہر ہوئیں ۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں تصویر کے ظاہر میں باطن کی جھلک دیکھنے اور دکھانے کا تخلیقی عمل' تخلیقی امکانات کو روشن کرتا چلا گیا ہے البتہ زمینی بو باس اور ہندوستانی اساطیر کی انوٹ سپلائی لائن اس میں بیدی کی انفرادیت ہے ۔ اس روایت میں استعاراتی تدبیر کاری کی مثالیں "گرہن" (بیدی) اور "آنندی" (غلام عباس) "کام چور" (سید فیاض محمود) ہیں۔ اس اسلوب کی نرم و لطیف مزاجی اور باہم الجھتی راہداریاں' تخلیقی عمل کے دوران رفتہ رفتہ دیو

ملائی عناصر (بیدی) اور شائستگی اور حلاوت (غلام عباس) اور (سید فیاض محمود) کو جگہ دیتی ہیں جو ان افسانہ نگاروں کی انفرادیت ٹھہری۔

"پھر سنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی' سرپٹ بگٹٹ۔۔ وہ گرتی تھی' بھاگتی تھی' پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی' ہانپتی اور دوڑنے لگتی۔۔۔ اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا۔۔ دودھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لئے سراسیمہ ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔۔۔۔ چاروں طرف اندھیرا تھا اور دور اساڑھی سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔۔۔۔ دان کا وقت ہے۔۔۔۔

چھوڑ دو۔۔۔ چھوڑ دو۔۔۔۔ چھوڑ دو۔۔۔۔

ہر پھول بندر سے آواز آئی۔۔۔ پکڑ لو۔۔۔۔ پکڑ لو۔۔۔۔ پکڑ لو۔۔۔۔۔۔۔

چھوڑ دو۔۔۔۔ دان کا وقت ہے۔۔۔ پکڑ لو۔۔۔۔ چھوڑ دو!!"

("گرہن" از راجندر سنگھ بیدی سے اقتباس)

آگے چل کر کرتار سنگھ دگل' بانو قدسیہ' بلراج مین را اور خالدہ حسین نے اسلوب بیان کی اس کی روایت کی انتہاؤں کو چھو لیا۔

اردو افسانے میں رواں زبان کی ان بھرپور اسلوبیاتی روایات کے علاوہ بھی نئے امکانات کی تلاش جاری رہی۔ البتہ منٹو کا استعاراتی افسانہ "پھندنے" 'کرشن چندر ("غالیچہ" "انا درخت" "ہاتھ کی چوری" "گرھا" "بت جاگتے ہیں" "نیکی کی گولیاں") اور میرزا ادیب ("دل ناتواں" "درون تیرگی") کے علامتی افسانے۔ "آہ دوست" (قرۃ العین حیدر) اور "مردہ سمندر" (کرشن چندر) جیسے کامیاب تجریدی افسانے' بھرپور اسلوبیاتی روایات کی داغ بیل ڈالنے میں ناکام رہے۔ اسی طرح اختر اورینوی کے "کیچلیاں اور بال جبریل" کی اساطیری اشاریت' عزیز احمد کا "تصور شیخ" اور انتظار حسین کا "زرد کتا" اپنے ملفوظاتی لہجہ کا چلن نہ کروا سکے۔ عزیز احمد' شیخ صلاح الدین اور انتظار حسین داستانوی اسلوب کے Revival میں ناکام ہوئے۔

"میں عورت ذات پردے کی بیٹھنے والی ٹھہری' میرا تو ذکر کیا۔ تقدیر سے جس کے پلے بندھی' وہ بھی ایسے گھر گھسنے ہیں کہ باہر جانے کے نام سے دشمنوں کا برا حال ہو جاتا ہے۔ دس برس سے خاصے تیس روپے کے نوکر تھے۔ صاحب نے کہیں باہر کی بدلی کر دی۔ بس پھر کیا تھا دفتر سے جو آئے' تو بخار چڑھ آیا۔ دست چھوٹ گئے۔ اماں جان نے جو سنا' تو سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ جھلسا گئے ایسی نوکری کو' صدقے کیے تھے یہ تیس روپلی۔ بڑا جوانا مرگ پردیس بھیجنے والا آیا۔ اس بندی کا ایک تو پھونسڑا ہے۔ نا بابا' مجھے اپنے بچے کی جان پیاری ہے' روز گار پیارا نہیں۔"

("سفر ریل کا" از اشرف صبوحی سے اقتباس)

اشرف صبوحی دہلوی کے افسانوں میں دلی کی ٹکسالی زبان کا پاکیزہ روپ صادق الخیری اور اشفاق احمد' کے ہاں لوک ایمایت کے ظہور کا باعث تو بنا لیکن ٹکسالی کی تمام متانت اور پاکیزگی کو برقرار رکھتے ہوئے بھی افسانے میں کسی زندہ روایت کو جنم نہ دے سکا۔ اسی طرح انور سجاد کی ادھوری اوقاف نگاری کی نثر' کسی طاقتور نثری روایت میں نہ ڈھل سکی۔(۲)

زبان کے ورتارے کی سطح پر ان آخر الذکر ناکامیوں کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ زبان کو اس کی باطنی اور نامیاتی نشو نما کے بغیر بدلنے کی کوشش کی گئی اور یہ حرکت اس وقت سرزد ہوتی ہے جب اسالیب میں بنیادی نوعیت کی ترامیم اور اضافے کرنے سے پہلے زبان کی روایت کو نہیں سمجھا جاتا اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان لسانی تشکیلات کی ماضی کے اجتماعی تجربے اور اجتماعی شخصیت سے کوئی نسبت ہے بھی یا نہیں۔

ہندوستان میں تصوف کی باقاعدہ فکری بنیادیں ہونے کے باوجود' داراشکوہ کی شکست سے یہ صورت حالات سامنے آئی۔ "سب رس" کی

صوفیانہ تمثیل خود ہندوستان کے ایک بہت بڑے طبقہ کے لیے "راز" بن گئی۔ قاری تصوف کی اصطلاحوں اور وارداتوں سے دور ہونے کے سبب ""حسن کی ہمزاد"" "وصال کا پچھی" "اور" "حسن کی انگوٹھی" "سے کچھ بھی مراد نہ لے سکا اور اسے واقعات کی صوفیانہ تشریح کی ضرورت پیش آئی۔ دوسری طرف علمی اور اسلوبیاتی سطح پر اس کے دور رس اثرات میر امن کے علاوہ پونے دو سو سال بعد آنے والی تصنیف "فسانہ آزاد" تک نظر آتے ہیں۔

دوسری طرف ترقی پسند تحریک کے تحت زبان کے ورتارے کی سطح پر حقیقت پسندی کا اظہار یوں ہوا کہ جذبے کی آمیزش کے بغیر خارج کی اشیاء کی فہرست سازی عمل میں آئی یا یوں کہیے کہ شے کی جزوی تفصیلات بہم پہنچائی گئیں' جبکہ دوسری لہر جذبے کے زیر اثر لفظ کے برتاؤ کی تھی۔ ایسا بہت کم ہوا کہ لفظ کے حوالوں سے تجربہ کرنے کی کوشش کی گئی ہو' جس کی ایک مثال راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ "جوگیا" سے ملتی ہے۔ جہاں لفظ' رنگ ہیں اور رنگ جذبات کی چہرہ نمائی کرتے ہیں۔ حقیقت پسندی کے تحت تخلیقی استعاروں کا کال پڑا اور لفظ کا برتاؤ نشان کی حدود سے آگے نہ نکل سکا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ نثر میں بیان کو حد سے زیادہ اہمیت دی گئی یا جذبے کے برتاؤ کے سلسلے میں افسانہ نگار عوامی سطح سے ذرا اونچا نہ اٹھ سکا۔ خیال محض کی نثر کیسے وجود میں آئے؟ اردو میں گورکی' کانٹ اور ٹیگور کا ترجمہ تو ممکن ہے۔ مارسل پروست یا استاں دال کا ترجمہ ممکن نہیں۔ اس لیے کہ ہر دو' جذبات کا تجزیہ فکر محض کی زبان میں کرتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں آج تک فکر محض کی زبان کی کوئی روایت پنپ ہی نہیں سکی۔ ہم نے شستہ نثر کی جستجو کی ہے' ایسی نثر جو بقول ہربرٹ ریڈ ""پیش خیمہ ہے فکر عمیق کا۔"

محمد حسین آزاد کے ہاں اردو زبان کی تنگ دامانی قوت مدرکہ کی تسکین نہیں کرپائی۔ تخیل کا زور و شور البتہ قابل لحاظ ہے جس کے سبب نیم خوابی کی کیفیت کا اظہار حد درجہ کمال تک پہنچ گیا اور ابوالکلام آزاد ہیں جن کے لہجے کی کھنک نیاز کے ہاں نرے رومان میں ڈھل گئی ہے۔ زبان کے ورتارے کی سطح پر مل ملا کر یہی کچھ زور مارا گیا۔

رہا آج کے افسانوں میں زبان کے ورتارے کا سوال' تو اس کا جنم ہمارے آج کے طرز احساس سے ہوگا۔ ایسی زبان جو فکری اور تہذیبی سطح پر نت نئی تبدیلیوں کو اپنے اندر کھپانے کی لچک رکھتی ہو۔

پیش منظر کے افسانہ نگار کو طرز احساس کی تبدیلیاں محسوس کرنا ہوں گی اور پھر پرانے جذباتی نظام کو نیا پرانا کرنے کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔

پیش منظر کا افسانہ نگار ان موجود اسلوبیاتی روایات کی حدود سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس لیے نئی تدبیر کاری کا جتن کرنا' رواں پس منظر کو رد کرنا ہے تاکہ زندہ روایت میں پھیلاؤ کی گنجائش نکلے۔ یہی روایت سے انحراف کل روایت کی توسیع ٹھہرے گا۔

پس منظر اور پیش منظر کے افسانے کا واضح فرق اسلوبیاتی سطح پر یک رخے افسانے اور ہم جہت افسانوی تدبیر کاری کا ہے۔ تشبیہ اور نشان یا اشارہ' پس منظر کے اظہار کا وسیلہ ہیں اور استعارہ پیش منظر کے اظہار کا وسیلہ' جبکہ تشبیہ یا اشارہ کی معنوی رنج استعارے کے مقابلے میں بہت محدود ہے۔

ڈی۔ ایچ لارنس کا "لیڈی چیٹرلیز لور" اور ہیوبرٹ سلبی کا "لاسٹ اگزیٹ ٹو بروکلن" ایک معاشرت کی ٹوٹ پھوٹ اور نئی طرز زیست کے جنم لینے کے درمیانی عرصے کی پیداوار ہیں۔ (ان ناولوں کی ایک اہمیت یہ ہے کہ وہ معاشرتی بکھراؤ میں اضافے کا باعث ہے) بالکل اسی طرح پیش منظر کے افسانے میں منافق' حرام کار' آبرو باختہ' حریص اور خصی کردار آج کے افسانہ نگار کے سامنے سوالیہ نشان بنا کھڑا ہے۔ یہ بہت ٹیڑھا کردار ہے اور اس کی خصلتیں روایتی اسالیب اظہار سے باہر دم توڑ دیتی ہیں۔ اس کردار کی پیش کش کے لیے افسانے کی فارم اور زبان کے ورتارے کی سطح پر تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور یہ وہی طریقہ کار ہوگا جو ڈی۔ ایچ لارنس اور ہیوبرٹ سلبی نے اختیار کیا یعنی اپنے عہد کے ہیجڑپن' لواطت' زنا کاری اور کمینگی کو گرفت میں لینے کے لیے مروجہ تدبیر کاری کو خیرباد کہا گیا۔

آج رواں پس منظر کے افسانہ نگاروں اور نئے لوگوں کے ہاں زبان کے ورتارے کا واضح اختلاف، دو نسلوں کے خارجی اور باطنی تجربات کا

اختلاف ہے۔ پس منظر اور رواں پس منظر کا زیادہ تر افسانہ ترسیل محض کا نام ہے جبکہ پیش منظر کے افسانہ نگار نے ترسیل محض سے اختلاف کیا ہے۔ سو نیا لسانی پیرایہ اظہار تشکیل پا رہا ہے۔

آج حسیات کی حدود کو لامحدود کر دیا گیا ہے۔ اب اول درجے کی بصری اور سماعی صلاحیتوں نے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں بھی سب سے مشکل صورت حال وہاں در پیش ہو گی' جب بصارت اور سماعت کا تجربہ لامسہ اور ذائقہ کی حدود میں داخل ہو رہا ہو اور اس کا اظہار کرنا پڑ جائے۔

آئینہ آواز میں چمکا کوئی منظر
تصویر سا اک شور مرے کان میں آیا!

(ظفر اقبال)

نئے لسانی پیرائے کی شکل نثر کی مصنوعی حد بندیوں کی ٹوٹ پھوٹ سے ظاہر ہوتی ہے۔ آج کا افسانہ موسیقیت کی اس کھوئی ہوئی کیفیت کی بازیافت چاہتا ہے جو کچی شاعری میں موجود ہے' نثری اظہار میں نہیں۔ میری مراد یہاں محض اشارہ یا تشبیہ کی یک رخی طرح داری سے نہیں۔ کنایہ' استعارہ اور علامت کے ذریعہ ہمہ جہت معنوی تلازموں کی بازیافت مراد ہے یا نئے معنوی تلازموں کی جستجو کہہ لیں۔

افسانوی پیش منظر میں مستقبل کے اسالیب بیان کی تلاش جاری ہے اور اس راہ میں اب تک کوئی بھاری پتھر نہیں آیا۔

○

(۱) ریاست میسور کا نمائندہ ناول "Kantha pura" (مطبوعہ: ۱۹۳۸ء) کا اردو، انشائیہ "جونی" جو سب سے پہلے رسالہ "ایشیاء" میں چھپا' اردو ترجمہ از محمد سلیم الرحمن "سویرا" لاہور میں شائع ہوا۔ راجہ راؤ کے اسلوب پر فرانسیسی [illegible] کے اثرات نمایاں ہیں۔ راجہ راؤ کا زیادہ وقت فرانس میں گزرا۔

(۲) انور سجاد کے ہاں سکتہ' ختمہ اور خط کے ساتھ فجائیہ یا استفہامیہ اوقاف کا استعمال ملتا ہے۔ البتہ اوقاف نگاری کے دیگر اطوار مثلاً رابطہ' تفصیلیہ' ذیلیہ اور قوسین کا ورتارا نہیں ملتا اور نہ ہی مکالمہ کے لیے واوین کا برتاؤ ہوا' بلکہ ایک طویل خط کے بعد مکالمہ کی ابتداء ہوتی ہے۔

داستان سے افسانے تک : عبوری دور : انتخاب

خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی

لال قلعہ کی ایک جھلک

پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں　　جو آگ میں نہ لگا دوں تو داغ نام نہیں

جمادی الآخر ۱۰۰۳ھ میں سترھواں سال شاہجہاں کے جلوس کا دھوم دھام سے ختم ہوا تو جہاں آرا بیگم صاحبہ جنہیں بادشاہ بیگم بھی کہتے تھے ان کی سالگرہ کا جشن شروع ہوا۔ لال قلعہ میں محل سرائے سے لے کر دیوان عام دیوان خاص تک رات کے وقت جھاڑ فانوس، کنول وفدغوں کی روشنی تھی۔ شمع چربی موی بتیاں جل رہی تھیں۔ موقع موقع سے فتیل سوز چاندی سونے کے کھوپرہ اور زیتون کے تیل کی روئی کی موٹی موٹی فیتلوں کی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ لال قلعہ کے لاہوری دروازے سے شہر پناہ کے لاہوری دروازے تک اور لال قلعہ کے دلی دروازے سے شہر پناہ کے دلی دروازے تک اور تمام خاص بازار میں جامع مسجد کی سیڑھیوں تک دو طرفہ تھاڑ بندی تھی اور ان پر کڑوے تیل کے چراغ جل رہے تھے اور رات کا دن ہو گیا تھا۔ جہاں آرا بیگم کو صدر دالان میں محل کی مشاطہ دلہن بنا رہی تھیں، لباس ہزاروں کا تو زیور لاکھوں کا .... صدر دالان کے سامنے صحن چبوترے کے نیچے دور تک انگنائی میں دری چاندنی کا فرش تھا اور فرش پر رستہ بیچ کا چھوڑ کر دو رویہ قطار مردنگیوں کی۔ مردنگیاں بلور کی بھی تھیں اور سفید کانچ کی بھی۔ سب میں شمع روشن تھی۔ جب سگھڑ عورتوں نے اچھی طرح بیگم کو بنا سنوار لیا تو خاندان کی بڑی بوڑھیاں انہیں پکڑ کر بسم اللہ کرتی ہوئی انگنائی میں پہنچانے چلیں۔ جہاں تک یعنی فولادی ترازو کھڑی تھی، تک کے دونوں پلڑوں میں مخملی گہے بچھے ہوئے تھے، پاس ہی سونے چاندی کی اینٹوں کا ڈھیر لگ رہا تھا تاکہ بیگم کو ایک بار سونے کے برابر اور ایک بار چاندی کے ہموزن تول کر منوں سونا اور منوں چاندی خیرات کر دی جائے، ادنیٰ اعلیٰ عورتوں سے صحن کھچا کھچ بھر رہا تھا۔ اور سب کی نگاہ بیگم کی طرف تھی، بیگم کے پاؤں میں کھتیلی جوتی تھی جس کا تلا بہت چکنا تھا۔ صحن چبوترے کی سیڑھی سے اترنے میں پاؤں پھسلا مگر پکڑنے والیوں نے بیگم کو سنبھال لیا اس پر بھی بیگم اپنے سیدھے ہاتھ کو جھکیں اور جھکنے کے ساتھ دوپٹہ کا آنچل کوئی بال بھر اس شمع پر گرا جو سیڑھی کے پاس مردنگی میں کھڑی جل رہی تھی۔ دوپٹہ بہت ہلکی بک کا تھا آنچل نے آگ لے لی اور دوپٹہ پھر پھر ہوتا ہوا شعلہ کو سر اور چوٹی تک لے پہنچا اور بیگم نے عورتوں سے کہا خدا کے لئے مجھے چھوڑو۔ وہ ٹیک بندی جل گئی۔ سنبھالنے والیوں نے بیگم کو چھوڑا تو آگ قمیض کے گریبان کو پہنچ کر سینہ تک پہنچی اور سینے کو جلا کر شلوار میں پہنچ گئی۔ بیگم تڑپ کر فرش پر گریں اور حویلی میں شور قیامت برپا ہوا۔ ہزاروں عورتیں بیگم کے کپڑوں کی آگ بجھاتی تھیں مگر آگ نہ بجھتی تھی۔ بیگم کی چار وفادار لونڈیوں نے نمک کا حق ادا کیا بیگم کو لپٹ کر آگ بجھا دی۔ مگر بیگم کے کپڑوں کی آگ ان کے کپڑوں میں لگی۔ دونوں آگ کی جلن کی تاب نہ لائیں اور قربانت شوم کہتی ہوئی اپنی بیگم پر سے نثار ہو گئیں۔ حضرت بادشاہ اور خواجہ سرا عورتوں کے غل کو سن کر محل میں آئے اور بیگم کو اور دو پرستاروں کو زمین پر تڑپتے اور دو لونڈیوں کو مردہ پایا۔ بہ ہزار وقت بیگم کو پلنگڑی پر ڈالا کمرہ میں پہنچایا۔ بیگم برابر ہائے جلی ہائے جلی کے جاتی تھیں۔ طبیب باشی اور حکیموں۔ ویدوں، جراحوں، معالجوں سے محل بھر گیا یوں تو بقول درد:

کیا دل کے داغوں نے سرو چراغاں　　کبھی تم نے آ کر تماشہ نہ دیکھا

بیگم سر سے پاؤں تک جلی تھیں، مگر آگ نے سینہ اور پیٹ کو بھرتہ کر دیا تھا۔ یہ کیا لکھا جائے کہ بیگم کے آبلوں اور پھپھولوں پر چارہ

گروں نے کیا کیا دوائیں لگائیں۔ تقویت روح قلب کے واسطے کیا کیا عرق پلائے۔ نقد اور جنس خیرات اور تصدق میں دینے لگے ۔ بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو دریا کی طرح رواں مگر منہ سے اف نہ کرتے تھے کہ زخمی بیٹی زیادہ گھبرائے گی ۔ بیگم کی سگی بہنیں زار و قطار روتی تھیں اور کہتی تھیں ۔ آپ کو نظر لگ گئی اس بار آپ سالگرہ کی دلہن بھی ایسی بنی تھیں کہ جنت کی حوریں اور پرستان کی پریاں قربان تھیں' یہ منحوس خبر آنا" فانا" سارے شہر میں اڑ گئی ساری رعایا ہاتھ ملنے لگی ۔ جشن کی رات شب شہادت بن گئی ۔ شاہجہاں نے منت مانی کہ جب بیگم غسل صحت کر لیں گی اور سفر کے قابل ان میں طاقت آجائے گی تو خواجہ غریب نواز کے آستانہ پر اجمیر شریف حاضر کروں گا۔

عیش و نشاط کی رات مصیبت کا پہاڑ بن کر کٹی اور صبح اپنا مرہم کا فور لے کر بیگم کی مزاج پرسی کے لئے مشرق کے دارا الشفاء سے لال قلعہ میں حاضر ہوئی' بادشاہ سلامت ابھی صبح کی نماز پڑھ کر مصلے سے نہ اٹھے تھے کہ خفیہ کے محکمہ سے ایک گمنام عرضی پہنچی کہ بیگم نے اپنی جاگیر کی بے گناہ رعایا پر بڑا ظلم توڑا ہے ۔ ان کی گرم آہیں شمع کے قالب میں ڈھل گئیں اور بیگم ان سے جل گئیں ۔ جب تک مظلوم رعایا کے دل ٹھنڈے نہ ہوں' زخموں کی آگ نہ مٹے گی ۔ بیگم کو یاد دلایئے کہ آپ نے ایک خطاوار بندے کے بیجامے میں سانپ چھڑوا دیا تھا' جس نے اس خطاوار کو جا بجا کاٹا اور وہ مرگیا۔

دوران بقا چو باد صحرا بگذشت   تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت
پنداشت ستمگر کہ جفا برمن کرد   برگردن او بماند از ما بگذشت

ہر چند کہ وہ خطاوار تھا مگر اس قہر کا سزاوار نہ تھا کہ سانپ سے اسے ڈسوایا جائے' ابھی تو دنیا کی آگ نے جلایا ہے' آگے قبر کے سانپ اور دوزخ کی آگ باقی ہے۔

اس عبرتناک مضمون کو پڑھ کر بادشاہ نے ایک چیخ ماری اور وزیر کو بلا کر حکم دیا کہ ہماری قلمرو میں جتنے بھاری مجرم ہیں بندی خانوں سے آزاد کر دیئے جائیں اور سات لاکھ روپیہ بیت المال شاہی سے لے کر ان پر تقسیم کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی تلافی مافات کریں اور اس سات لاکھ کے علاوہ جو بیگم کے معالجہ اور ان کے اوپر سے صدقے کے صلہ میں روپیہ صرف ہوا اس کی تفصیل میں آگے لکھوں گا۔ اب تو میں یہ لکھتا ہوں کہ کسی طبیب یا حکیم کے علاج سے بیگم کو تندرستی نصیب نہ ہوئی تو بادشاہ نے فرمایا کہ شہر سورت سے فرنگی حکیم بلایا جائے ۔ بندر سورۃ سے شاہجہاں آباد تک ڈاک لگائی جائے اور دو مہینوں میں سوار ہو کر جلد آئے۔ چنانچہ ڈاکٹر فرنگی آیا اور اس نے علاج کیا لاکھ روپے سے اوپر اوپر لے کر چلتا ہوا اور بیگم بدستور بستر مرض پر پڑی رہیں اور اسی طرح چھ سات مہینے کٹ گئے ۔ طبیب باشی برابر یہی کہے جاتے تھے کہ مریضہ کی جانبری مشکل سے ہو گی ۔ کیونکہ خون پیپ بن کر بدن سے نکلا جاتا ہے ۔ بادشاہ دو دو پہر برابر جانماز پر بیٹھ کر اپنی لڑکی کی شفا کے لئے دعا کرتے تھے ۔ ایک روز عارف نام بیگم کے چیلے نے بادشاہ کے حضور میں عرض کی کہ فدوی کو جلے ہوئے کے لئے ایک مرہم آتا ہے اسے لگا کر مریض اچھا ہو جاتا ہے فدوی کے ہزار بار سے کم تجربے میں نہیں آیا ہے ۔ بھی خطا نہیں کی' بادشاہ علاج کرتے کرتے تنگ ہو گئے تھے مرتا کیا نہ کرتا۔ حکم دیا کہ فورا بناؤ ۔ مرہم تیار ہوا اور بیگم کے زخموں پر لگایا گیا اور زخم اچھے ہونے شروع ہوئے اور زندگی کی توقع پیدا ہونے لگی ۔

بیگم کچھ چلنے پھرنے لگیں جشن سالگرہ کی دوبارہ تیاری کی گئی اور عارف چیلہ کو چاندی میں تولا ۔ خلعت اور انعام الگ دیا ۔ مکہ مدینہ جو زر نقد اس خوشی میں بھیجا گیا اس کے علاوہ بیس لاکھ روپیہ خرچ ہوا ۔ حکیم داؤد کو ایک مہر اور ایک روپیہ' پانچ سو تولہ سونے اور چاندی مع خلعت اور منصب دو ہزاری دو سو سوار اسپ و فیل ملے ۔ حکیم سو منا دوسرے چارہ گر کو تین ہزار روپیہ سالانہ اور منصب دو صد سوا رو اسپ و فیل عطا ہوئے ۔ اور تمام فقراء حکما امرا اور ارباب طرب فیض یاب ہوئے ۔ چار لاکھ شریف مکہ اور ایک لاکھ روپیہ حرمین کے مستحقوں کے لئے احمد سعید معتمد کے ساتھ بھیج دیا گیا ۔ بادشاہ اور بیگمات نے بادشاہزادی صاحبہ کے سر پر سے خود کھڑے ہو کر جواہرات اور سونے چاندی کے پھول

نچھاور کئے۔ دوسرے دن بیگم بادشاہ کی خدمت میں تسلیم کے لیے حاضر ہوئیں تو حضور والا نے ان کی کلائی میں ایک سو تیس موتیوں کی سمرن اپنے ہاتھ سے باندھ کر دعا دی۔

پھر بہار آئی چمن میں زخم گل آلے ہوئے
پھر مرے داغ جنوں آتش کے پرکالے ہوئے

جہاں پناہ نے چاہا کہ بیگم کو منت پوری کرنے کے واسطے اجمیر شریف لے جائیں اس لئے شاہجہاں آباد سے روانہ ہو کر اکبر آباد تک یہ حاجتی پہنچ گئے تھے جو بیگم کے بھرے بھرے گھاؤ کا انگور پھٹ گیا اور حکماء نے کہا ابھی سفر اجمیر کا ملتوی کیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ راستہ کی تکان سے حرارت پیدا ہو کر ہلاکت کا باعث ہو۔ اس لحاظ سے جمنا میں کشتیوں سے شاہجہاں کی واپسی ہوئی' آگرہ سے متھرا چار دن میں بجرے پہنچے' متھرا کے فوجدار نے حاضر ہو کر شہنشاہ کی خدمت میں گذارش کی' اس شہر میں ماموں نام ایک بے نوا فقیر رہتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ چار دمڑی میں ایک مرہم بنا کر دوں گا' بیگم کے زخموں پر لگایا جائے اگر ایک اٹھوارے میں زخموں کا نام رہ جائے تو جو چور کا حال وہ میرا حال۔ بادشاہ نے فرمایا اچھا۔

ماموں مع مرہم کے دہلی حاضر ہوا اور دہلی پہنچ کر اس کا علاج کیا گیا اور تین دن میں زخم اور ناسور اچھے ہو کر خاک سے اڑ گئے اور تیسرا جشن غسل صحت کا پھر لاکھوں کے خرچ سے ہونے لگا' ماموں کو سونے چاندی میں تلوا دیا اور ارب کھرب دے کر اسے نہال کر دیا۔ بیگم ہنسی خوشی اجمیر گئیں اور منت پوری ہوئی۔

○

خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی (۱۸۶۵ء - ۱۹۳۳ء) میر درد کے نواسے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی تعلیم کے بعد طب کی طرف توجہ کی۔ رئیس دھرم پور ضلع بلند شہر کے طبیب خاص تھے' بعد ازاں علی گڑھ کالج کے سفیر کی حیثیت سے بمبئی' بڑودہ اور احمد آباد کا دورہ کرتے رہے۔ یہ کام چھٹا تو پھر اور کچھ نہ کیا اور دہلی آ کر میر درد کی بارہ دری میں بیٹھ رہے۔ مولوی سید احمد مولف "فرہنگ آصفیہ" نے آپ کو "سلطان زبان اردو" کا خطاب دیا تھا۔ مطبوعہ مطبوعہ کتب درج ذیل ہیں:

۱۔ "بیگموں کی چھیڑ چھاڑ" مطبوعہ: شاہجہاں بک ایجنسی' دہلی
۲۔ "مضامین فراق" مطبوعہ: کتب خانہ علم و ادب' دہلی
۳۔ "دکن کی پری" (ناول) مطبوعہ: کتب خانہ علم و ادب' دہلی
۴۔ "دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ" مطبوعہ: شاہجہاں بک ایجنسی' دہلی
۵۔ "چار چاند" مطبوعہ: ساقی بک ڈپو' دہلی
۶۔ "سات طاقتوں کی کہانیاں" مطبوعہ: شاہجہاں بک ایجنسی' دہلی
۷۔ "دلی کا آخری دیدار" مطبوعہ: ساقی بک ڈپو' دہلی
۸۔ "درد جانستان" (ناول) مطبوعہ: "مخزن" لاہور

۹۔ "خوبصورت بھتنا"

۱۰۔ محمد حسین آزاد کا ڈراما "اکبر" مکمل کیا (جس کے متعلق "شباب اردو" اور "ہزار داستان" میں مفصل مضامین شائع ہوئے)

۱۱۔ "ان کا پہلا افسانہ "شہید وفا"" "مخزن" لاہور جنوری ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا۔

بیگموں کی چھیڑ چھاڑ

ایک بیوی کالے محل سے مہمان آئی تھیں۔ ان کا نام تھا " حضرت بیگم " وہ بڑی اکل کھری اور مزاج کی بڑی کڑوی تھیں۔ حسن جہاں کی باتیں سن سن کر بہت کڑھتی تھیں اور بیٹھی کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا کرتی تھیں۔ بی دولتی اپنے تسے میں آپ ہی آپ کھولتی۔ کھانا پینا، چھالیہ، زردہ، الائچی، چٹنی، اچار، مربہ، مٹھائی، ناشتہ سب کچھ حسن جہاں کے تحت میں تھا۔ بیچ بیچ خالہ جان نے انہیں کل کلاں کا مالک کر دیا تھا۔ اس مارے بعض بے وقوفیں ان سے اور کھسیاتی تھیں ایک دن حضرت بیگم اور حسن جہاں بیگم کی طرف سے ناحق کا بخار تو بھرا ہی ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر ایک بیوی سے کہنے لگیں۔ "اے بوا رضیہ سلطان سنتی بھی ہو۔ قلعہ کی بیگمیں بلی کو نکٹی کہا کرتی تھیں۔ یہ چھوٹی ناک بھی کیا بری معلوم ہوتی ہے۔ کم بخت پیا پھر ہوا اور بہن مجھے تو زیادہ گوری رنگت سے بھی نفرت ہے۔ جیسے پھیکا شلجم۔"

حسن جہاں کی ناک بھی چھوٹی تھی اور رنگ بھی ان کا نکھرا پڑتا تھا سمجھ گئیں کہ پھبتی مجھ پر ہی ڈھالی گئی ہے۔ وہ بھلا کب چوکنے والی تھیں۔ کہنے لگیں۔ "پھیکا شلجم تمباکو کے پنڈے سے تو ہر طرح اچھا ہے اور مجھے بڑی ناک دیکھ کر گھن آتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے سل کا بٹہ کسی نے چہرے پر دھر دیا ہے۔ اونچی ناک سوجھے کیا خاک۔ چھوٹی ناک ساگ کا پڑا، اونچی ناک کو لاؤ چھرا۔ یہ مثل تو تم نے سنی ہوگی۔" حضرت بیگم کی رنگت بھی کالی بھٹ تھی اور ناک بھی ان کی بے ڈول اونچی تھی حسن جہاں کے اس کہنے پر سب بیویاں بیگمیں ہنس پڑیں اور بی حضرت بیگم بگڑ گئیں۔ ہنسی میں کھسی ہو گئی اور بی حسن جہاں کی اور ان کی خوب دکھو دنگ ہوئی۔

حضرت بیگم۔ " موئی لکھنؤ کی ٹھیکری، کنجری، کنچنی، پوربی، ارہر کی دال، خشکہ کھانے والی، ہمارے سامنے بڑھ بڑھ کر باتیں کرتی ہے۔ لو اور سنو۔"

حسن جہاں۔ " میں پوربی ہوں تو تم پنجابن ہو۔ لکھنؤ والے ارہر کی دال کے ساتھ خشکہ کھاتے ہیں۔ تو پنجابیوں کو اوجھری نصیب ہوتی ہیں۔ آئی تھی کہیں کی دلی۔ بلی، اجڑی، پچڑی۔"

حضرت بیگم۔ " بس بی! میں نے کہہ دیا ہے دلی کا نام ذرا منہ سنبھال کر لینا۔ دلی بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہلاتی ہے۔ اجڑیں اس کے دشمن وہ کیوں اجڑنے لگی تھی۔ وہ تو اب بھی لعلوں کی لعل ہے۔ ہاتھی لٹے گا بھی تو سوا لاکھ کا کہلائے گا۔ تمہارے بے ڈھنگے لکھنؤ سے اجڑی پچڑی بھی ہزار درجہ اچھی ہے۔ تمہیں خبر نہیں بادشاہ سلامت سات سمندر لانگھ کر دلی تشریف لائے اور بادشاہ بیگم کو بھی ساتھ لائے۔ تخت پر بیٹھے دربار کیا۔ انعام دیئے اور سدھارتے وقت دلی کو سارے ہندوستان کا سرتاج بنا گئے۔ پھر کسے بسنے کا حکم دے گئے۔ جلنے والے جلے۔ درانداز یاں کرکے ملے، دل کے پھپھولے بھی پھوڑے مگر ایک بھی نہ چلی۔ دیکھنا کوئی دن میں کیسی کینچلی جھاڑتی ہے اور کیا بہار آتی ہے۔ دلہن بنے گی دشمن ویری انگاروں پر لوٹیں گے۔"

حسن جہاں " میں نے تو آپ کی بات کا جواب دیا تھا۔ نہیں تو میں خود دلی پر جان دیتی ہوں۔ کیونکہ میری ننھیال ہے، دوسرے حضرت شاہ مرداں کی درگاہ اسی میں ہے۔ آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک دلی جم جم بسے اور جلنے والے ملیا میٹ ہوں۔"

اس جھگڑے بکھیڑے کو سن کر خالہ جان دوڑی ہوئی آئیں اور حضرت بیگم کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں۔ "خدا کے واسطے آپ بزرگ ہیں۔

اس چھوکری کے منہ نہ لگئے۔ "حضرت بیگم کہنے لگیں۔ "بہن اسے چھوکری کون کہے؟ یہ تو اچھی خاصی سانڈ ہے۔ اللہ اکبر قینچی کی طرح زبان چلتی ہے۔ "حسن جہاں نے کہا۔ "خیر سانڈ کمبخت کالی بھینس سے تو اچھا ہوتا ہے۔ "خالہ جان نے دیکھا کہ حضرت بیگم لڑائی پر تلی ہوئی ہیں تو حسن جہاں کا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف لے گئیں۔ اور انہیں سمجھانے لگیں۔ کہ "للہ ذرا اپنی للو کو روکو۔ "تو ہنس کر کہتی ہیں۔ "خالہ اماں! آپ کے سر کی قسم جو میں نے انہیں کچھ بھی کہا ہو وہ مجھے کنجی 'کنجری اور خدا جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ جھاڑ کا کانٹا بن کر مجھے چٹ گئیں۔ میرے گلے کا ہار ہو گئیں بے بات۔ مگر میں ان کے کہنے کا برا تھوڑا ہی مانتی ہوں۔ "ادھر تو یہ نو کا چوکی ہو رہی تھی۔ ادھر صدر دالان میں ڈومنیوں کا ناچ ہو رہا تھا۔ نیل پر بیل پڑ رہی تھی۔ ان ڈومنیوں سے تو کمبخت 'ہیجڑے دروازے پر آکر اچھا گاتے بجاتے ہیں۔

رات کے بارہ بجے برات آئی۔ سمدھنیں بڑے جلوے کے ساتھ اتریں۔ کمخواب 'زری 'بوٹنی 'پوتھ کی تہ پوشیاں 'نیچے نیچے کرتے' ہمارے بچپن میں کوئی بیوی کرتہ پہنے آ جایا کرتی تھی تو اس پر تیلن گھوسن پھبتیاں اڑا کرتی تھیں۔ یا اب ساری بیگموں نے یہی وضع طرح لے لی ہے سچ ہے۔ "کبھی کے دن بڑے کبھی کی رات۔ "سمدھنیں بڑے ٹسے کے ساتھ مسند پر گاؤ تکیے سے لگ بیٹھیں۔ شربت پلانے کے لئے بھی بیکل بسنت 'بی حسن جہاں اور انکا مبارک نساء کھڑی ہوئیں 'مبارک نساء کے ہاتھ میں چاندی کی کشتی 'اور اس میں شربت کا شیشہ بلور کی پیالی اور بی حسن جہاں کے ہاتھ میں ریشم کا رومال منہ پونچھنے کے لئے 'اللہ کی بندی رومال کا گھسا اس زور سے دیتی تھی کہ شربت پینے والی پھڑک جاتی تھی۔ منہ اور باچھیں چھل کر لال ہو جاتی تھیں۔ بعض جلا تن کہہ دیتی تھیں۔ "اے پھنکار یہ منہ پونچھتی ہو تو کبھی کا بیر نکالتی ہو؟"

آغائی بیگم دولہا کی بہن کا جو منہ پونچھا تو رگڑے کے ساتھ ان کی ناک کی کیل الجھ کر ناک میں سے نکل گئی۔ "شاباش بوا شاباش۔ دیکھت کی تو تم کامنی سی ہو۔ مگر ہاتھ تو ماشاء اللہ لوہے کی میخیں ہیں۔ دیکھو میری ناک کی کیل تمہارے رومال میں الجھ کر چلی گئی ہے۔"

حسن جہاں۔ "بوا اوکھلی میں سر دیا تو دھمکیوں سے کیوں ڈرتی ہو۔ خدا رکھے بھائی کو بیاہنے آئی ہو نیگ جوگ کے روپئے ڈھیر سارے تمہارے تھرے میں جائیں گے۔ سمدھن بنا ٹھٹھہ ہے۔ ابھی تو منہ ہی پچھوانے میں بولا گئیں۔ جب ڈومنیوں کی موٹی موٹی گالیاں کھاؤ گی اس وقت معلوم ہو گا کہ کیسی کا ساتھ ہوتا ہے اور بوا ناک کی کیل تو ہم نے دیکھی بھی نہیں۔ سچ کہنا بہن گھر سے پہن کر بھی آئی تھیں یا مفت خدا میں مجھے لئے مرتی ہو۔"

"رومال جھاڑا تو اس میں سے کیل نہ نکلی"

آغائی بیگم۔ "بھئی اللہ جانتا ہے 'ہماری کیل ڈھونڈو اس میں ترلی جڑی ہوئی ہے"

حسن جہاں۔ "بہن آغائی بیگم تم کیل کے مارے کیوں ہلکی جاتی ہو۔ مانگے کی تو پہن کر نہیں آئی تھیں۔ تمہاری نہ ملے گی تو میں اپنے ہیرے کی کیل تمہیں دے دوں گی۔ ذرا چھری تلے دم تو لو۔"

اتفاق کی بات کیل آغائی بیگم کی گود میں جا پڑی تھی۔ جب مل گئی تو حسن جہاں کی چڑھ بنی۔ کہنے لگی "واہ بوا بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا۔ کیل تو آپ چرائے بیٹھی ہیں اور لوگوں کے اوپر درے پکڑتی ہیں۔"

خواجہ عبدالروف عشرت لکھنوی

گھنٹہ بیگ

سلطنت اودھ کی مغل فوج میں ایک مغل ' مرزا عنایت علی بیگ بھی تھے ۔ جو رسالے میں ملازم تھے ۔ نہایت قد آور جوان لحیم شحیم گورے چٹے ۔ اس زمانے میں سواروں کی تنخواہ قلیل ہوتی تھی ۔ اس کے ساتھ ساتھ تین روپے مہینے کا سائیس گھوڑے کا دانہ گھاس وغیرہ سب کا ان کو انتظام کرنا پڑتا تھا ۔ اس لیے سواروں سے پیدل اچھے رہتے تھے ۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ مرزا اس قدر وزنی تھے کہ کوئی گھوڑا سواری میں دو مہینے سے زائد زندہ نہ رہتا تھا ۔ اول تو خود بھی گراں ڈیل تھے ۔ دوسرے فوجی اسلحہ جن کا زیب بدن کرنا لازمی تھا ۔ خود ۔ بھلتا ۔ چار آئینہ ۔ زرہ بکتر ۔ تلوار ۔ ڈھال ۔ نیزہ ۔ قرابین ۔ بندوق وغیرہ دو من کا بوجھ یہ بھی ہو جاتا تھا۔

مرزا صاحب خوش خوراک تھے ۔ محلے کی طرف جب کبھی تعینات کئے جاتے تھے تو کچھ آمدنی ہو جاتی تھی ۔ لیکن بچارے پیدل جاتے تھے۔ ایک دفعہ دس کوس کا سفر کر کے کسی سرا میں داخل ہوئے۔ تو بھٹیاری سے کہا کہ ڈھائی سیر کی روٹی' آدھ سیر گوشت' چھٹانک بھر گھی لے کر کھانا پکاؤ۔ اس نے پوچھا آپ کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟ کہنے لگے۔ آٹھ آدمی اور آتے ہیں۔ جب وہ کھانا پکا کر لائی۔ مرزا صاحب نے اکیلے بیٹھ کر ناشتہ کر لیا۔ بھٹیاری دیکھ کر حیران ہو گئی۔ آپ نے اسے بلا کر چپکے سے کہا کہ "بھٹیاری کسی سے کہنا نہیں میں آدمی نہیں ہوں۔ جن ہوں جو کچھ تم کہو گی میں تمہارا کام پورا کروں گا۔ کچھ کھانا اور بھی ہو تو لے آؤ۔" اس نے ڈرتے ڈرتے جو کچھ کھانا مسافروں سے ملا تھا اور کچھ گھر میں بچا تھا۔ سب ان کے آگے رکھ دیا۔ مرزا صاحب سب نوش جان کر گئے۔

نصیرالدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں ایک مرتبہ کسی گڑھی کے راجہ نے دو برس سرکاری مالگذاری ادا نہ کی اور مضبوط قلعہ بنوا کر فصیل میں چاروں طرف روزن رکھوائے اور بندوقیں وغیرہ کثرت سے خرید کر فوج بھی فراہم کر لی ۔ جب بادشاہی فوج اس جگہ کے راجہ کو گرفتار کرنے گئی تو اس نے قلعہ کا پھاٹک بند کر لیا ۔ اور روزن سے گولیاں برسانا شروع کیں ۔ دو مہینے تک ساری فوج قلعہ گھیرے رہی ۔ مگر کسی طرح قلعہ فتح نہ ہوا ۔ مجبور ہو کر فوج واپس چلی آئی لیکن اس کے پچاس سوار اس جنگ میں کام آئے۔

اراکین سلطنت اس تشویش کی حالت میں مختلف تجویزوں پر غور کر رہے تھے ۔ بادشاہ کو بھی بہت غصہ تھا ۔ فوج کے جمعدار ۔ رسالدار ۔ سپہ سالار سب دم بخود موجود تھے ۔ مرزا عنایت علی بیگ بھی موجود تھے ۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی ۔ "اگر حضور فدوی کو تھوڑی فوج عنایت کریں تو حضور کے اقبال سے دس دن میں قلعہ فتح کر کے راؤ کو قید کر کے لے آؤں۔" اس بات پر اراکین ہنسنے لگے ۔ اور بادشاہ نے غصے کی حالت میں فرمایا ۔ "اگر تم بھی ناکام آئے تو سر اڑا دیا جائے گا" ۔ مرزا نے کہا ۔ "حضور میں نے اپنا خون معاف کیا ۔ اسی وقت توپ دم کرا دیجئے گا۔"

اہل دربار مرزا کی حماقت پر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ اس دراز قد بیوقوف کی موت آئی ہے ۔ تاہم بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کی سرکردگی میں فوج روانہ کی جائے۔ مرزا نے اپنے ساتھ دو ہشیار بڑھئی لئے اور فوج کے سپہ سالار بن کر روانہ ہوئے ۔ قریب شام کے قلعہ سے دو تین میل کے فاصلے پر فوج کو ایک جنگل میں پوشیدہ اتار دیا۔ اور آپ نے رات کو دونوں بڑھیوں سے کہا کہ "اس کے دونوں پٹ آڑے سے کاٹ ڈالو۔" ابھی پو بھی نہ پھٹنے پائی تھی کہ پھاٹک کے دونوں پٹ کٹ گئے۔ سب سے پہلے پٹ ہٹا کر آپ تنہا قلعے میں داخل ہوئے ۔ اہل قلعہ اس آفت سے بے خبر پاؤں پھیلائے سو رہے تھے ۔ مرزا نے جاتے ہی راجہ کو دبوچ لیا اور اس کے سپاہیوں سے کہا۔ "اگر میرے پاس کوئی آیا یا مجھ پر

کسی نے وار کرنے کا قصد کیا تو راجہ کی جان کی خیر نہیں۔ اہل قلعہ اس دیو صورت انسان کو دیکھ کر ڈر گئے۔ اتنے میں مرزا کی فوج بھی قلعے میں داخل ہو گئی۔ قلعے والے کچھ بھاگ گئے۔ کچھ گرفتار ہوئے۔ فوج نے قلعہ لوٹ لیا اور راجہ کو گرفتار کر کے بادشاہ کے حضور میں لائے۔ راجہ نے بادشاہ سے معافی مانگی اور از سرنو معاہدہ کیا۔

بادشاہ نے اس خدمت کے صلے میں مرزا کو ایک ہاتھی مرحمت فرمایا۔ اور ہاتھی کی خوراک اور فیلبان کی تنخواہ اپنے خزانہ عامرہ کے ذمے لی۔ مرزا بے چارے غریب آدمی تھے۔ ان کے گھر میں ہاتھی باندھنے کی جگہ نہ تھی۔ مشکل سے گذارہ کرتے تھے۔ طوعاً" وکرہاً" ہاتھی تو لے آئے مگر دوسرے دن اسے تین ہزار روپے کو بیچ کر اور فیلبان کو بھی ہاتھی کے ساتھ روانہ کر کے آپ اپنی ذات پر روپیہ اڑانے لگے۔ البتہ صرف ہاتھی کا گھنٹہ جو اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا اتار رکھا۔

مہینے دو مہینے کے بعد بادشاہ کو پرچہ گزرا کہ مرزا نے ہاتھی بیچ ڈالا۔ چنانچہ بادشاہ نے استفسار حال کے لئے ان کو طلب فرمایا۔ آپ نے ہاتھی کا گھنٹہ اپنے گلے میں باندھ لیا۔ اور اسی حالت سے شاہی دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے پوچھا۔ "مرزا یہ آج خلاف انسانیت آپ کے گلے میں ہاتھی کا گھنٹہ کیوں پڑا ہوا ہے۔ اور ہاتھی کہاں ہے؟" دست بستہ عرض کی کہ "حضور ہاتھی میں خود ہوں۔ جس کے دم کے ساتھ ایک کنبے کا خرچ لگا ہوا ہے۔ پھر دو دو ہاتھی باندھ کر کیا کرتا۔ امیدوار ہوں کہ ہاتھی کا راتب اور فیلبان کی تنخواہ فدوی پر جاری رہے کہ اپنے کنبے کی پرورش کر سکوں۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ "چودہ سیر آٹا اور سیر بھر گھی روزانہ کے حساب سے مرزا کو ہاتھی کی خوراک کی بجائے ملا کرے۔" مرزا نے بھی اپنی وضع کو مرتے دم تک نباہ دیا۔ یعنی زندگی بھر ان کے گلے میں ہاتھی کا گھنٹہ پڑا رہا۔ اسی وجہ سے لوگوں نے ان کا نام عنایت علی بیگ کی بجائے گھنٹہ بیگ رکھ لیا۔ اور محلے والے مرزا گھنٹہ بیگ کہنے لگے۔

مرزا کا مکان حضرت عباس کی درگاہ کے پشت کی طرف زنانی درگاہ کے پاس ایک میدان میں تھا۔ اور وہیں کچھ کچھ چھوٹے مکان اور بھی بنوا لئے تھے۔ جو دو روپے ماہوار پر اور بعض ایک روپیہ ماہوار پر اٹھا دیئے تھے۔ حسن اتفاق سے ایک مرتبہ بارش اس کثرت سے ہوئی کہ شہر کے تمام کچے مکان گر گئے۔ مرزا کے مکانوں پر بھی بلا نازل ہوئی۔ اور سب مکان خاک سیاہ ہو گئے آپ نے اس کی لکڑی تو فروخت کر ڈالی اور مٹی ہر آدمی کو دو آنے روز پر دینا شروع کی۔ یعنی جس کو ضرورت ہو مرزا صاحب کو دو آنہ دے کر جتنی مٹی لے جا سکے لے جائے۔ محلے میں جن لوگوں کے کچے مکان منہدم شدہ بن رہے تھے۔ ان سب نے مٹی خریدنا شروع کر دی۔ جب مٹی ختم ہو گئی تو آپ نے زمین کھدوا کر مٹی بیچنا شروع کی۔

اسی طرح آپ سال بھر تک مٹی بیچا کئے۔ اور اس میں مکانات کی قیمت سے زیادہ روپیہ حاصل ہو گیا۔ برسات میں وہی زمین گڑھیا بن گئی۔ اور آج تک لکھنؤ میں گھنٹہ بیگ کی گڑھیا اتنی بڑی تھی کہ اس میں ہاتھی ڈوب جاتے تھے۔ اب بھی یہ کبھی خشک نہیں ہوتی اور اہل محلہ کو اس سے بہت آرام ہے۔ آج تک اس میں دھوبی کپڑے دھوتے اور جانور پانی پیتے ہیں۔ چوپائے نہلائے جاتے ہیں۔ برسات میں یہ گڑھیا ایک تالاب بن جاتی ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی مرزا اعظم بیگ تمندار نے بھی اپنا مکان کھدوا کر مٹی بیچ کر کشمیری محلہ کے قریب ایک گڑھیا بنوائی تھی۔ مگر اس میں شاید وہ خوش نیتی شامل نہ تھی۔ کیونکہ یہ گڑھیا کچھ عرصے کے بعد پٹ کر بالکل صاف ہو گئی۔ اور اب مرزا اعظم بیگ کی گڑھیا ایک میدان ہے۔ جس میں برسات میں قدرے پانی جمع ہو جاتا ہے۔ لیکن گرمی میں خشک ہو جاتی ہے۔ مرزا گھنٹہ بیگ کی خوش نصیبی دیکھیے کہ ان کی گڑھیا درگاہ کے قریب آج تک موجیں مار رہی ہے۔

مرزا گھنٹہ بیگ اسی برس کی عمر تک زندہ رہے آخری عمر میں شاہی مسخروں میں شامل ہو گئے تھے' اس میں انہیں اچھی خاصی رقم مل جاتی تھی۔ مرزا صاحب بہادر بھی تھے۔ اور خوش مزاج بھی۔ طاقتور ایسے تھے کہ املی کے دو پٹنے ہاتھ سے چیر کر رکھ دیتے تھے۔ فن سپہ گری سے بھی خوب واقف تھے۔ مگر افسوس ان کی زندگی کا آخری زمانہ بہت عسرت میں بسر ہوا تاہم وہ نہ کسی کے قرضدار اور نہ کسی کے محتاج تھے۔ کسی کے

آگے ہاتھ بھی نہیں پھیلایا۔ اپنی جائداد بیچ بیچ کر کھاتے رہے اور خانہ نشین ہو کر گھر سے باہر نہیں نکلے۔ دروازے پر ہمیشہ ایک پہرہ دار نوکر رہا۔ شریفانہ آن بان سے زندگی بسر کی۔ ہاتھی کا گھنٹہ ہمیشہ گلے میں پڑا رہا۔ امجد علی شاہ کے زمانہ سلطنت میں دنیا سے کوچ کیا۔

○

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی (۱۸۶۸ء، لگ بھگ ۱۹۱۸ء) کے جد امجد خاں بہادر عبدالغفور خاں ۱۱۹۰ھ میں بلخ سے ہجرت کر کے دہلی آئے تھے۔ فیض آباد پہنچے تو شجاع الدولہ نے ان کو قلعہ داری کے منصب اور خلعت سے نوازا۔ ۱۱۹۰ھ میں ان کی وفات کے بعد قلعہ داری کا منصب نسل در نسل اس خاندان میں منتقل ہوتا رہا۔ ننھیال کی طرف سے عشرت لکھنوی کا تعلق عبداللہ خاں کے خاندان سے تھا، جو لاہور میں جلیل القدر عہدہ رکھتے تھے۔ عشرت کی پیدائش بروز سوموار ۶ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ مطابق ۲۷ جون ۱۸۶۸ء کی ہے۔ ان کے اساتذہ میں مولوی امید علی قدوائی، مولوی مہدی حسن، مولوی فتح محمد لکھنوی اور مولوی فریاد حسین مراد آبادی کے نام لیے جاتے ہیں۔ شاعری میں شیخ محمد جان شاد سے تلمذ تھا۔ لکھنؤ کے ایک کالج میں پرنسپل کے اسسٹنٹ رہے۔ ملازمت کے علاوہ ان کا ایک تجارتی کتب خانہ بھی تھا سو فارغ البالی سے بسر ہوئی۔ ۱۹۱۸ء تک حیات تھے۔ تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

مطبوعہ کتب میں تذکرہ "آب بقا" "خم خانہ عشرت" (شاعری) "قواعد میر" "نکات اردو" (چار جلدیں) "جان اردو" "اصول اردو" اور "زبان دانی" یادگار ہیں۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

دربار دھلی کی کنکوابازی

لکھنؤ میں یہ خبر گرم ہوئی کہ دہلی میں بادشاہ کا دربار ہو گا۔ بادشاہ سلامت تخت پر جلوس فرمائیں گے۔ تمام ہندوستان کے راجہ مہاراجہ پیشوائی کو آنے لگے۔ تمام ہندوستان میں اس بات کی خوشی تھی کہ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم دہلی میں رونق افروز ہوں گے۔

لوگ اس تماشہ کو دیکھنے کے واسطے دور دور سے آ رہے تھے۔ ہر فن کے اہل کمال جمع ہو رہے تھے۔ فوجیں جنگ کا نمونہ دکھانے کے واسطے بلائی گئیں۔ مرغ بازنامی گرامی' بٹیرباز سرنام بلائے گئے۔ نیو لاک صاحب ڈپٹی کمشنر نے لکھنؤ میں سید آغا حسین صاحب کو لکھنؤ کے کنکوا بازوں میں انتخاب کیا اور بلا کر کہا کہ کچھ آپ نے سنا بھی ہے' دہلی میں دربار ہونے والا ہے۔ تمام دنیا کے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ تمام بازیوں کے کھلاڑی شاہی مہمان ہوں گے۔ آپ اپنے فن میں یکتا ہیں۔ ہم آپ کو چٹھی دیں گے۔ آپ شاہی خیمے میں شاہی مہمان ہوں گے۔ اس سے بڑھ کر آپ کی عزت نہیں ہو سکتی۔

آغا صاحب سوچنے لگے کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ دوست احباب سے مشورہ لیا' سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ آغا صاحب ایسا اچھا موقع آپ کو عمر بھر نصیب نہیں ہو سکتا ایک تو ہندوستان بھر میں عزت دوسرے امید بہبودی یعنی اگر بادشاہ کو آپ کی کنکوا بازی پسند آگئی تو کچھ جائیداد گورنمنٹ سے انعام میں مل جائے گی۔ عمر بھر چین کیجئے گا۔ یا کم سے کم تنخواہ بیش بہا' تاحیات مقرر ہو جائے گی۔ سب سے عزت کی بات یہ ہے کہ خود ڈپٹی کمشنر آپ کو اپنی طرف سے بھیجتے ہیں۔ شاہی خیموں میں آپ فروکش ہوں گے اور شاہی مہمان تصور کئے جائیں گے اور پھر سیر بھی ایسی دیکھنے میں آئے گی جس کے واسطے لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے تمنا رکھتے ہیں کہ دہلی میں قدم رکھنے کی جگہ مل جائے۔ لوگ تو اسی حسرت میں رہتے ہیں۔ یہ دن کس کو نصیب ہوتا ہے۔ نواب بنے صاحب نے فرمایا۔ "ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ آپ کو کسی بات کی تکلیف نہ ہو گی۔ لاٹ صاحب سے انگریزی میں گفتگو کر کے ایک خیمہ ڈلوالیں گے۔ اسی میں ہم آپ سب رہیں گے۔" منجھو صاحب سوز خواں نے کہا۔ "آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے ہم آپ کے ساتھ چلیں گے' آپ ڈپٹی کمشنر سے جا کر چٹھی تو لکھوا لائیے۔"

آخر بے چارے آغا صاحب سب کی اشتعالک سے ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے۔ چٹھی لکھوا کر لائے۔ اچھے کاریگروں سے عمدہ کنکوے بنوائے۔ مانجھا سنتوایا' ایک ڈیڑھ تارے پر "ویلکم" بنوا کر کہا یہ بادشاہ کے خیمہ میں گرا دیں گے۔ کنکووں کو کسا' کنے باندھے' چرخیوں پر سادی اور مانجھا چڑھا کر ان پر غلاف اطلس کے چڑھائے۔ پوشاکیں نفیس بنوا کر بکسوں میں رکھیں اور بہت سی امیدیں' بہت سے ارمان لے کر ہمراہ نواب بنے صاحب' منجھو صاحب سوز خواں' دہلی کا ٹکٹ لے کر سوار ہوئے' دیکھا تو پرانی دہلی کھچا کھچ آدمیوں سے بھری ہے اور نئی دہلی میں جہاں شاہی خیموں کا جنگل ہے' فوجی پہرے موجود ہیں۔ آدمیوں کو رستہ نہیں ملتا۔ میدان حشر معلوم ہوتا ہے' کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ بہت مشکل سے بنے صاحب اور ہم خیموں تک پہنچے۔ وہاں کمپنی کو ڈپٹی کمشنر کا خط دکھایا۔ انہوں نے بہت عزت کی۔ ایک خیمہ آغا حسن صاحب کو دیا اور اس پر گوروں کا پہرہ مقرر کر دیا۔ یہ مقام شہر سے بہت دور تھا۔ اب آغا صاحب کو کھانے کی فکر ہوئی۔ یہ سمجھے تھے شاہی مہمان ہیں' کھانے کے خوان آتے ہوں گے۔ مگر جب کھانے کو کسی نے نہ پوچھا تو یہ خیال ہوا کہ کسی ہوٹل سے کھانا منگوایا جائے مگر یہاں سرکاری خیموں میں ہوٹلوں کا ذکر کیا۔ کھانے کی بو باس پر گوروں کا پہرہ تھا اور کارونیشن ہوٹل شہر سے دو کوس کے فاصلے پر تھا۔ آخر ہم سب لوگ خیمہ چھوڑ کر ہوٹل میں مقیم

ہوئے مگر دن بھر خیموں میں رہتے ہیں۔ سرکاری کمیٹی نے حکم دیا کہ آغا صاحب آج کنکوا لڑائیں۔ دہلی کے نامی کنکوا بازان سے کنکوا لڑائیں گے۔
آغا صاحب نے چاہا کہ پہلا کنکوا بڑھا کر بادشاہی محل میں ڈھا دیں تاکہ بادشاہ کے ملاحظہ سے گذرے کیونکہ اس پر ویلکم لکھا ہوا تھا۔ مگر ہوا مخالف تھی' مجبور ہو کر خاموش رہے اور اس ناکامی پر سخت تعجب کیا۔
سہ پہر کو آغا صاحب نے کنکوا اڑایا۔ دہلی والوں نے بھی کنکوا اڑایا۔ شام تک کنکوا اڑایا کئے اور بارہ پیچ زائد ہوئے۔ شام کو کمیٹی میں بلائے گئے۔ وہاں مسٹر اس صاحب سیکرٹری کمیٹی نے کہا کہ آج آپ کے بارہ پیچ زیادہ ہوئے مگر دہلی کے لوگوں نے ہم سے کہا کہ یہ دہلی کے اچھے کنکوا باز نہیں تھے' اور انہوں نے درخواست کی ہے کہ پھر ایک دن ہم کو دیا جائے تاکہ ہم اچھے اچھے لوگوں کو پیش کریں جو کنکوا بازی میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کل پھر کنکوا لڑائیے۔
دوسرے دن پھر دہلی والوں سے لڑے' ۲۰ پیچ زائد ہوئے۔ شام کو پھر کمیٹی میں گئے تو سیکرٹری صاحب نے کہا۔ آج تو آپ کے بیس پیچ زائد رہے۔ اور سب لوگوں نے آغا صاحب کی تعریف کی اور کہا کل آپ میرٹھ والوں سے کنکوا لڑائیے۔
تیسرے روز آغا صاحب نے میرٹھ والوں سے کنکوا لڑایا اور ان سے بھی ۵۲ پیچ زائد رہے۔ کمیٹی نے شام کو آغا صاحب کو بلا کر کہا کہ سارا دربار آپ کی تعریف کرتا ہے کہ آپ سے بہتر کنکوا لڑانے والا کسی شہر میں نہیں ہے۔ آج آپ کے ۵۲ پیچ زائد رہے۔ آغا صاحب کی خوشی کو کچھ نہ پوچھئے۔ ہاتھوں دل بڑھ گیا اور کہنے لگے اب تو ضرور کوئی علاقہ سرکار سے ملے گا اور زندگی بھر عیش کریں گے۔
چوتھے روز بریلی والوں نے کنکوا لڑایا اور وہاں بھی آغا صاحب کو کامیابی ہوئی اور شام تک ۳۲ پیچ کاٹے۔
پانچواں کنکوا بڑھایا اور برابر کاٹتے رہے۔ بتیس پیچ کاٹے۔ شام کو پھر دربار میں بلائے گئے اور لاٹ صاحب کی میم صاحبہ نے اور بڑے جلیل القدر انگریزوں نے آغا صاحب کی تعریف کی اور کہا تمام ہندوستان میں آپ سے بڑھ کر کوئی کنکوا نہیں لڑا سکتا۔ ہر طرف سے تعریف ہو رہی تھی اور آغا صاحب دل میں خوش تھے کہ آج بادشاہ کی طرف سے کسی بڑے انعام کا اعلان لاٹ صاحب کریں گے۔ سب انگریزوں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ اتنے میں میم صاحبہ نے آغا صاحب کو ایک کرسی پر کھڑا کیا اور ایک روپے سے بڑا نکل کا بنا ہوا ایک تمغہ سینہ پر آویزاں کیا اور سب لوگوں نے چیرز دیے اور سرکاری فرمان بھی نہایت خوشی سے پیش کیا۔
یہ دیکھ کر آغا صاحب تو جیتے جی مر گئے' ضبط نہ ہو سکا' آخر بے اختیار ہو کر بول اٹھے۔
"میم صاحبہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہم بادشاہ کے دربار میں آئے ہیں اور پانچ سو روپیہ ہمارا صرف ہو چکا۔ خیال تھا کہ بادشاہ کی طرف سے ہماری پنشن مقرر کی جائے گی یا کوئی علاقہ انعام میں عطا ہو گا کہ بقیہ عمر عیش و آرام سے کٹے گی۔ آپ نے اس سب خدمت کے بدلے ایک روپیہ ہمارے سینے سے لٹکا دیا اور ایک کاغذ ہم کو دیا' اسے ہم لے کر کیا کریں گے؟ ہمارے کس کام کا؟ یہ تو ہمارے درد کا علاج نہیں ہے۔"
میم صاحبہ نے کہا۔ "آغا صاحب یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ تو بڑی عزت کی چیز آپ کو دی جاتی ہے جو فوجی افسروں کو جنگ کی کامیابی پر بادشاہ دیتے ہیں۔ اسی کے سبب سے آپ ہر ایک دربار میں جا سکتے ہیں اور ہر سرکاری جلسہ میں آپ کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ ہر فوجی افسر کے پاس یہی تمغہ ہوتا ہے جس سے اس کی عزت کی جاتی ہے۔ یہ بہت عزت کی چیز ہے آپ کو بادشاہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ کو اتنی بڑی عزت عطا ہوئی اور شاہی فرمان کے کاغذ میں آپ کو کامیابی کی مبارکباد دی گئی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ بادشاہ نے آپ کی بہت قدر کی۔"
آغا صاحب کا چہرہ اتر گیا اور بادل ناخواستہ اپنے اوپر ہزاروں نفرین کرتے ہوئے گھر واپس آئے اور کہنے لگے۔

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
کہ خضر آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

کہنے لگے کہ کنکوا تو ہزاروں جگہ لڑانے گئے مگر یہ سوختی کبھی نہیں ہوئی۔ اور اس کے بعد کنکوا بازی سے توبہ کر لی۔

○

فقیر کا تکیہ

شام - تھوڑا سا دن ڈوبتا سا سورج - راستہ کے دونوں طرف کھنڈرات - اینٹ - پتھر - چونا - مٹی کے ڈھیر - خودرو سبزے سے ڈھکے ہوئے، جن پر کمزور سورج کی شعاعیں پڑ کر اچٹ رہی ہیں۔ کہیں دیوار کا کچھ حصہ جو باقی رہ گیا ہے، اس کی کنگنی پر شاما بول رہی ہے - دور کسی املی کے درخت کی پھننگ پر بیٹھا ہوا پنچھی چہچہا رہا ہے۔ مغرب کی طرف پھٹے پھٹے بادل کا سلسلہ جو مساوی انجم ہوا میں رکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اتنے بطی السیر ہیں کہ نظر ان کی حرکت محسوس نہیں کر سکتی۔ آفتاب کی کرنوں نے ان کو نارنجی رنگ دیا ہے۔ ان بادلوں کے نیچے ابابیلیں بھرست کھا کر سریلے راگ گا رہی ہیں اور ہوا منہ پر لئے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اور کچھ ابابیلیں جو چکر لگاتے وقت ٹکڑی سے پیچھے رہ جاتی ہیں تو پھر ہوا پر تن کر جھومر میں آملتی ہیں۔

آثار صنادید - کہیں دروازہ کی محراب، جو کسی جگہ سے کھل گئی ہے اور فلک کی سرد مہری نے سیاہ کر دیا ہے۔ اوپر دو تین کنگرے باقی ہیں جن پر چیل کوؤں کی بیٹ کے سفید سفید نشان - کہیں دالان کی بنگڑیدار کا کچھ حصہ - کہیں شہہ نشین کی کرسی - کہیں چبوترے کا نشان۔ کسی جگہ دو تین سیڑھیاں، کہیں ---- لداؤ کی چھت کا کونہ - کہیں حوض کا کنارہ - کہیں طاق کا اجارہ - کہیں دیوار میں انگوٹھے کی علامت - کہیں کانس کا ٹکڑا۔ کسی جگہ مٹے مٹے نقش و نگار - کہیں پھول - گوکھ دریچہ - کسی دیوار میں قلیہ دبے ہوئے - غرض وہ کہنہ عمارتیں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان حال سے اگلے زمانہ کی صنعت اور کاریگری، گویا زبان حال سے اظہار کر رہی ہیں۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ　　　آثار پدید ست صنادید عجم را

تکیہ - الختصر میں اور شہر کے تماشائی جو میلہ کر کے آ رہے ہیں۔ دلی دروازے سے ایک میل کے فاصلہ پر سائیں ننگہ شاہ کا تکیہ ہے۔ ننگہ شاہ، کواڑ شاہ کے مرید اور دمڑو شاہ آپ کے دادا پیر ہیں اور ننگہ شاہ کے دو مرید ہیں۔ لیا شاہ اور جھنجی شاہ گویا بے دام کے غلام ہیں۔ میں تکیہ کے قریب آیا تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے پر دو تین درخت بڑ اور پیپل کے بلند سڑک کے دونوں طرف سایہ دار اور لب سڑک مسجد کا ایک چبوترہ، جس کے قریب شاہ صاحب کا کچا ڈھابہ، جس کی دیواروں کی مٹی بارش سے دھل گئی ہے اور منڈیروں پر کنکر ٹھیکریاں نکل آئی ہیں۔ اس ڈھابہ کی پشت کی طرف دس بارہ گز لمبا لکڑی کا پرنالہ جس کو بان سے باندھ کر منڈیر سے اٹکا رکھا ہے۔ پرنالہ کے دونوں طرف جو اچھل اچھل کر برساتی پانی بہا ہے اس نے مٹی کھلا کر منڈیر سے زمین تک لمبا گھٹہ کھول دیا ہے۔ اندر کوٹھری کے تمپوان اپلے، کچھ جنگل کے چنے ہوئے ارنے کیکر کے خاردار جھانکڑ، گلی ہوئی مکئی جوار کی جڑیں، کچھ بوسیدہ چھپر کا پھونس گیلا پڑا ہے اور اس ڈھیر کے قریب ایک بکری اور دو اس کے بچے بندھے ہوئے۔ موت اور مینگنیوں سے چونکہ برسات ہے ایک سڑا ہوا بھبکا نکل رہا ہے۔ ڈھابہ کی منڈیروں پر پرانے پٹیلہ کے بوریے کے ٹکڑے پڑے ہیں اور ان کی حفاظت کے واسطے پرانے بان کے توڑوں میں، کہیں مٹکے کا گلا بندھا ہوا ہے۔ کسی طرف اینٹ باندھ کر لٹکا دی ہے۔ کوٹھری کے دروازے کے قریب ایک مٹکا جس کا نونی لگ کر گلا جھڑ گیا ہے ---- کائی کے ٹکڑے جو خشک ہو کر چٹخ گئے ہیں، مٹکے کے چاروں طرف لپٹے

ہوئے۔ پانی مٹکے کے پیندے میں گل آلود رہ گیا ہے اور ہزاروں کیڑے اس میں کلبلا رہے ہیں۔ چپنی کی جگہ تھلیہ کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا ڈھکا ہے اور اوپر اس کے ایک دودھ کا کلھڑا کنارہ ٹوٹا ہوا' پانی پینے کو ٹھیکرے میں اوندھا ہوا۔ چوکھٹ میں اندر کی طرف ایک گدڑی بچھی ہوئی' اس پر سائیں ننگے شاہ بیٹھے۔ پچاس پچپن برس کا سن کھچڑی کڑبڑی ڈاڑھی۔ نشہ میں جو رال ٹپک کے وقت بہی ہے' اس سے ڈاڑھی کے بال چیک کر بتیاں سی بندھ گئی ہیں' سر پر ایک گاڑھے کا میلا پرانا چیتھڑا لپٹا ہوا۔ کان کی لووں میں پیتل کی دو بالیاں' گلے میں گزی کی دوہری کمری جس کا ابرا پھٹ گیا ہے اور فقط استر باقی رہ گیا ہے' ایک آستین کہنی پر سے نکلی ہوئی دوسرے شانے پر سے ندارد۔ کمر لوئی میں کوبڑی کے قریب ایک جیب' جس میں تمباکو کی چڑے کی تھیلی جس کے منہ پر ڈورا بندھا ہوا اور ڈورے کے سرے پر ایک ٹوٹی ہوئی جھنجھی کوڑی بندھی ہوئی۔ برسات کی پن بھری ہوا سے جو تمباکو کا گز پگھلا ہے تو بالشت بھر تک یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کمری یہاں سے ہے کس کپڑے کی۔

ٹانگوں میں نیلا لنگ جس پر پسینہ آ کر جو خشک ہوا ہے تو جس طرح کسی قطعہ پر موش دنداں بناتے ہیں' پسینہ کے شوریت سے ایک سفید جال سا بن گیا ہے۔ پاوں میں ایک منکا' جس کو رتوا کہتے ہیں ٹخنے کے قریب ڈورے سے بندھا ہوا' آگے ٹوٹے ہوئے مٹکے کا ایک کڑیل دھوئیں سے کالا۔ راکھ بھری ہوئی اور کڑیل کے گرد چلمیں جو امٹی گئی ہیں' تو گل تمباکو کے جلے ہوئے چاروں طرف پڑے ہیں۔ راکھ میں ایک تھپواں اپلہ دبا ہوا' کنارے پر اپلے کے تھوڑی سی آگ اور اس پر کچھ کرسیاں رکھی' شاہ صاحب لنگی کا آنچل دونوں ہاتھوں سے پکڑے جھل رہے ہیں۔ کبھی منہ سے پھونکتے ہیں' چہرے کا رنگ لال ہو گیا ہے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ کڑیل کے قریب اک مٹی کا مدار یہ حقہ جس پر نرسل کا نیچہ۔ نیچے پر جو میلی دھجیاں لپٹی ہیں وہ سٹ کر ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں اور پھٹا ہوا نیچہ نکل آیا ہے' گنا سڑ کر چیک پیدا کر لایا ہے اور حقہ پینے والوں نے جو گنا دبا دبا کر پیا ہے' گنے کے دونوں طرف گڑھے پڑ گئے ہیں آپ نے کا سرا' جس کو نسو کہتے ہیں جلا ہوا۔ اس پر ڈنڈی اور کنارہ ٹوٹی چلم رکھی ہے اور شاہ صاحب کا سامان فقیری۔ سہنکا۔ منکا۔ سیلی۔ ناگہ۔ کنٹھا۔ جھولی۔ لوٹا۔ تابنامیا۔ مندرہ۔ حلقہ تسبیح۔ الفا۔ کفنا۔ سونٹا۔ کونڈی۔ کشتی کملی۔ تسلا۔ تھلی۔ مالا۔ بندا۔ تسمہ چھڑی۔ کھڑاؤں۔ لنگ۔ جبہ۔ چادر۔ خرقہ۔ صافہ۔ ہاتھوں میں تانبے پیتل لوہے کے کڑے پڑے۔ گدڑی پر بیٹھے' بھنگ کے نشہ سے ہونٹ خشک' آنکھیں جھکی ہوئی لال لال۔ بار بار ہونٹ خشک ہونے کی وجہ سے زبان ہونٹوں پر پھیر لیتے ہیں۔ میرے اوپر جو شاہ صاحب کی نظر پڑی تو باآواز بلند کہا میر صاحب' بابا حقہ پیتے جاؤ۔ میں نے صاحب سلامت کی اور شاہ صاحب نے گمہ اینٹ کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ شاہ صاحب نے اپنے چیلے کو آواز دی۔ بٹیا یہ شاہ چلم بھرو۔ لیکن آگ جھاڑ کر اور دھو کر رکھنا۔ جھنجھی حقہ تازہ کرو اور وہ بھاو کا تنکا پڑا ہے آبنے میں پھیر لو۔ بیٹا یہ میر صاحب داستان گو ہیں۔ بڑے اٹ کی مٹ لڑاتے ہیں۔ یہ امیروں کے کھلونے ہیں۔ ان کے تو دیدار ہی مشکل سے ہوتے ہیں۔ میاں میر صاحب' آپ تو ہفتہ اور منگل کو اپنے مکان پر داستان کہتے ہیں ٹکٹ لگا کر۔ میں ان دونوں کو داستان میں بھیجوں گا۔

آپ داستان میں مرشد کا ادب۔ صبر و قناعت کی خوبیاں۔ بادہو کے فائدے۔ نفس کشی کے طریقے' ان کو سنا دینا۔ آپ تو ہر قسم کے مفید عام مضمون بیان کرتے ہیں۔ میں تو ان دونوں کو سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ گیا' یہ ایسے خچر ہیں کہ سمجھتے ہی نہیں۔

○

میر باقر علی داستان گو (دہلی) اردو داستان نگاری کے آخری بڑے نام۔ خالصتاً مسلم نوابوں سے "داستان امیر حمزہ" لکھی۔ آخری عمر میں محمد علی جوہر کی کھدر پوش تحریک میں شامل ہو کر "گاڑھے خان کا دکھڑا اور ململ جان کی طلاق" "'ازدواج و رحم" اور "مفت ہاتھی" جیسے رسائل یادگار چھوڑے۔

اردو افسانہ : انتخاب ۱۹۰۳ء تا ۱۹۹۰ء

ترتیب میں تقدیم کی بنیاد اولین مطبوعہ افسانہ ہے

اردو کا پہلا افسانہ - ایک تعارف

ہمارے ہاں اردو افسانے کی جڑوں کی تلاش کا عمل قدرے تاخیر سے شروع ہوا۔ محققین کو قدیم اردو شاعری کی چوما چاٹی سے فرصت نہ ملی تو ناقدین نے یہ فریضہ سنبھالا اور اس ضمن میں پہلا قدم ہی غلط پڑا۔

۱۹۵۵ء میں پروفیسر وقار عظیم نے پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار شمار کرتے ہوئے کہا: "ہندوؤں کا زاویہ نظر خالص سیاسی تھا مثلاً پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" اسی سیاسی رجحان کا حامل ہے" (۱) دوسری طرف ۱۹۶۱ء میں پروفیسر احتشام حسین نے سجاد حیدر یلدرم کو اردو کا پہلا اور پریم چند کو دوسرا افسانہ نگار کہا:

"------ ہم کو جو ابتدائی افسانہ نگار ملتے ہیں، ان میں دو نام نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک سجاد حیدر یلدرم کا، دوسرا پریم چند کا۔ دونوں کی افسانہ نویسی کی ابتداء کم و بیش ایک ہی زمانے سے ہوتی ہے۔ پریم چند کا پہلا افسانہ ملا ہے جو ۱۹۰۵ء کا لکھا ہوا ہے عنوان ہے "دنیا کا سب سے انمول رتن۔" (۲)

یاد رہے کہ اس سے قبل پروفیسر وقار عظیم افسانے سے متعلق اپنے اولین مضامین میں سلطان حیدر جوش اور نیاز فتح پوری کو اردو کے اولین افسانہ نگار بتا چکے تھے۔ جب کہ پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار شمار کرنے والے باقاعدہ محققین میں ڈاکٹر قمر رئیس کا نام بہت نمایاں ہے۔

پریم چند اردو کے اولین افسانہ نگار کیوں کر مانے گئے، اس کی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ۱۹۳۲ء میں پریم چند نے اپنے ہندی ادبی مجلہ "ہنس" بنارس کے "آتم کتھا نمبر" کے لیے "جیون سار" کے عنوان سے اپنی قلم کاری کی روداد لکھی، جس میں انہوں نے اپنے افسانے "دنیا کا سب سے انمول رتن" کو نہ صرف ۱۹۰۷ء کی تخلیق قرار دیا بلکہ اس کی اشاعت رسالہ "زمانہ" کانپور ۱۹۰۷ء میں بتائی۔ پریم چند کے اس بیان کا اردو ترجمہ پہلی بار رسالہ "زمانہ" کانپور (مرتبہ دیا نرائن نگم) کے "پریم چند نمبر" مطبوعہ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ پریم چند لکھتے ہیں:

"------ میری سب سے پہلی کہانی کا نام تھا "دنیا کا سب سے انمول رتن"۔ وہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ "زمانہ" (کانپور) میں چھپی۔" (۳)

پریم چند کے اس بیان پر ہمارے محققین نے آمنا و صدقنا کہا اور پھر چل سو چل، جملہ مضامین اور نصابی کتب میں پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کر لیا گیا۔

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ دیا نرائن نگم نے "زمانہ" کانپور "پریم چند نمبر" ۱۹۳۷ء میں پریم چند اور رسالہ "زمانہ" کے تعلق کے حوالے سے پریم چند کی مطبوعہ تحریروں کا جو اشاریہ مرتب کیا تھا، اس میں افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" کا حوالہ کہیں موجود نہ تھا۔ جب کہ "زمانہ" کانپور کی فائل بابت: ۱۹۰۷ء تا ۱۹۰۸ء بھی اس ضمن میں خاموش ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" کو ہی پریم چند نے اپنا اولین افسانہ کیوں شمار کیا؟ اس کے جواب کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ بطور افسانہ نگار اولیت حاصل کرنے کی خواہش۔ اس ضمن میں سلطان حیدر جوش کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔ (۴)

۲۔ افسانہ لکھا تو ۱۹۰۷ء میں ہو لیکن جون ۱۹۰۸ء ("سوزِ وطن" کا سال اشاعت) تک شائع نہ ہو پایا ہو۔ واضح رہے کہ یہ افسانہ "سوزِ وطن"

کے علاوہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا۔(۵)

۳۔۔ بہت ممکن ہے کہ پریم چند افسانہ " عشق دنیا اور حب وطن " (مطبوعہ : " زمانہ " کانپور بابت اپریل ۱۹۰۸ء) کا حوالہ دینا چاہتے ہوں اور بھول کر غلط نام کا اندراج کر گئے ہوں۔

لیکن یہاں یہ سوال بھی پیدا ہو گا کہ پریم چند نے " جیون سار " ۱۹۳۲ء میں قلم بند کیا اور ۱۹۳۶ء (سال وفات) تک اس بیان کی تردید کیوں نہ کی؟

بہر طور ' وجوہات کچھ بھی ہوں ۔ اس دور کے جملہ ادبی مجلوں کو کھنگالنے کے بعد اب یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ پریم چند کا پہلا افسانہ " دنیا کا سب سے انمول رتن " نہیں بلکہ " عشق دنیا اور حب وطن " ہے ' جو " زمانہ " کانپور بابت اپریل ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔

تحقیق کی سطح پر غلط فہمیوں کا یہ سلسلہ " مطالعہ یلدرم " (۱۹۷۱ء) از ڈاکٹر سید معین الرحمن سے ہوتا ہوا مجلّہ " سیپ " کراچی (۱۹۸۸ء) میں شائع ہونے والے سلطان حیدر جوش کے خاکے " پہلی کرسی کے حضور " از ابوالفضل صدیقی تک چلا آیا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین کے بعد ڈاکٹر سید معین الرحمن نے سجاد حیدر یلدرم (۶) اور ابوالفضل صدیقی نے سلطان حیدر جوش کو (جوش کے اپنے بیانات کی روشنی میں) اردو کا اولین افسانہ نگار شمار کیا ہے۔

یہ سب تحقیق طلب امور سے متعلق تن آسانی کا کیا دھرا ہے ' ورنہ اردو ادب کے اولین ادبی مجلوں سے کون واقف نہیں ' رسالہ " زمانہ " کانپور ' " معارف " علی گڑھ ' " مخزن " لاہور ' " اردو معلیٰ " علی گڑھ اور " اولڈ بوائے " علی گڑھ جیسے ادبی رسائل ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ جن کا حصول مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن ہرگز نہیں ۔ اور اگر اس بحث کو چند بھارتی محققین کی طرح سر سید احمد خان کی تحریر " گزرا ہوا زمانہ " (مطبوعہ " تہذیب الاخلاق " علی گڑھ بابت : یکم صفر ۱۲۹۰ ہجری ' مطابق ۳۱ مارچ ۱۸۷۳ء) تک پھیلا دیا جائے تو بھی فنی لوازم ہی حتمی رائے قائم کرنے کی بنیاد ٹھہریں گے ۔ سو لگے ہاتھوں یہ قضیہ بھی صاف کر لیا جائے ' سر سید احمد خان کی تحریر " گزرا ہوا زمانہ " دیکھتے چلیں:

گزرا ہوا زمانہ

از سر سید احمد خان

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے ' رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے ۔ گھٹا چھا رہی ہے ۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے ' آندھی بڑے زور سے چلتی ہے ' دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے ۔ بڈھا نہایت غمگین ہے ' مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے ' نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی آخیر رات پر ' وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے ' اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے ' اتنا ہی زیادہ اس کا غم بڑھتا ہے ۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے ' اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے ' جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی ۔ روپے اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی ۔ سارا گھر ماں باپ ' بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے ۔ پڑھنے کے لیے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا ۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے ۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا " ہائے وقت ' ہائے وقت ! گزرے ہوئے زمانے !! افسوس کہ میں نے تمہیں بہت دیر میں یاد کیا۔"

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا ۔ اپنا سرخ سفید چہرہ ' سڈول ڈیل ' بھرا بھرا بدن ' رسیلی آنکھیں ' موتی کی لڑی سے دانت ' امنگ میں بھرا ہوا دل ' جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی ۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ' ماں باپ جو نصیحت کرتے

تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا کہ "او ابھی بہت وقت ہے" اور بڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لیے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا! اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ "ابھی وقت بہت ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی' دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے' بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے' ہولناک آندھی چل رہی ہے' درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں' تب وہ چلا کر بولا "ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراؤنی ہے جیسی یہ رات" یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ' بھائی بہن' دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کے لیے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ' بھائی بہن' دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا' باپ کو ناراض کرنا' بھائی بہن سے بے مروت رہنا' دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ ہائے وقت نکل گیا' ہائے وقت نکل گیا' اب کیوں کر اس کا بدلہ ہو!

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑکھڑاتا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑپنا یاد آیا جس میں کہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن' نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اس نے اپنی اس نیکی کے زمانے کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا' نمازیں پڑھنی' حج کرنا' زکوٰۃ دینی' بھوکوں کو کھلانا' مسجدیں اور کنویں بنوانا یاد کر کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی' اپنے پیروں کی جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا' مگر دل کی بیقراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں' مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں اور یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنویں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر' کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا۔ جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی' اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلا اٹھا "ہائے وقت' ہائے وقت! میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا؟"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے' آندھی تھم گئی ہے' گھٹا کھل گئی ہے' تارے نکل آئے ہیں' ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی' یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجے سے پوچھا کہ تم کون ہو وہ بولی کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔ اس نے پوچھا کہ تمہاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔ وہ بولی ہاں ہے' نہایت آسان پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض اس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ "واللہ لا ازید ولا انقص" ادا کر کے انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے' انسان ہی ایسی چیز ہے جو آخیر تک رہے گا' پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل آخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی

موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے ۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں ' مگر انسان کی بھلائی آخیر تک جاری رہتی ہے ۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں ' جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے ۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو ۔ یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا ۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے ۔ نیک کام جو کیے تھے ثواب کے لالچ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کیے تھے ۔ خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا ۔ اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آیندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی ۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہو کر چلا اٹھا ۔ " ہائے وقت ' ہائے وقت ' کیا پھر تجھے میں بلا سکتا ہوں ؟ ہائے میں دس ہزار دیناریں دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا ۔ " یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی ۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آ کھڑی ہوئی ' اس کو گلے لگا کر اس کی بلی لی ۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا ۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کھڑے ہوئے ۔ ماں نے کہا بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے ؟ کیوں تو بے قرار ہے ؟ کس لیے تیری ہچکی بندھ گئی ہے ؟ اٹھ منہ ہاتھ دھو ' کپڑے پہن ' نوروز کی خوشی منا ۔ تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں ۔ تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہو گیا تھا ۔ اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا ۔ اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا کہ پشیمان بڈھے نے کیا ' بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ او یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے ' میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤں گا اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا ۔ جس نے اپنا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا ۔ او خدا ' او خدا ' تو میری مدد کر ۔ آمین۔

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو ! اور اے میری قوم کے بچو ' اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو ' تاکہ آخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ ۔ ہمارا زمانہ تو آخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے ' آمین۔

○

سرسید احمد خان کی یہ تحریر اپنے آغاز میں یقیناً افسانہ کہلانے کی مستحق ہے اور بنت کے حوالے سے اس تحریر میں شعور کی رو کا اولین استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے ' جو آگے چل کر احمد علی ' اور قرۃ العین حیدر کے ہاں فنی پختگی تک پہنچا ' لیکن اس تحریر کا وسط اور اختتامیہ اسے واضح طور پر ایک اصلاحی مضمون بنا دیتا ہے ۔ آغاز تمثیلی رنگ لیے ہوئے ہے ۔ ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی کے ظاہر ہوتے ہی سرسید احمد خان کی اصلاح پسندی اس افسانوی آغاز کو اصلاحی مضمون کی طرف کھینچ لے جاتی ہے ۔ جبکہ تحریر کا اختتامیہ تو ہے ہی اصلاحی مضمون کا ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرسید احمد خان کی جملہ تحریروں میں فن افسانہ کی طرف پیش قدمی دکھائی نہیں دیتی ۔ زیادہ سے زیادہ تمثیل یا حکایت کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں ۔ " گزرا ہوا زمانہ " ان کی واحد تحریر ہے جو افسانہ بنتے بنتے رہ گئی۔

دراصل یہ تحریر اس زمانے کی ہے جب ہمارے ہاں فکشن کے خلاف باقاعدہ ایک رد عمل کی صورت دکھائی دی ۔ علی گڑھ تحریک کے نمائندہ مجلے " تہذیب الاخلاق " علی گڑھ میں فکشن کے لیے کوئی گوشہ مخصوص نہ تھا ۔ مولانا نذیر احمد دہلوی فکشن کی طرف آئے بھی تو اصلاحی جذبے کے تحت ناول کی بجائے تمثیلی قصے کی طرف نکل گئے اور مولانا محمد حسین آزاد نے " نیرنگ خیال " (حصہ اول) کے دیباچے میں لکھا:

"اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کمائی طوطے یا مینا کی زبانی سنائیں ۔ ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں یا پریاں اڑائیں، دیو بنائیں اور ساری رات ان کی باتوں میں گنوائیں ۔ اب کچھ اور وقت ہے اور اس واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہیے"(۷)

○

ڈاکٹر آغا مسعود رضا خاکی ۱۹۹۵ء میں پنجاب یونی ورسٹی 'لاہور کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ لکھتے ہوئے رقم طراز ہوئے کہ :

"۱۹۰۳ء میں " مخزن " میں راشد الخیری کا " نصیر اور خدیجہ " شائع ہوا ۔ جس کو اردو کا پہلا افسانہ سمجھا جاتا ہے ۔ " (۸)

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر خاکی کی رسائی " مخزن " لاہور کی فائل تک نہ ہو سکی اور اپنے تحقیقی مقالہ کو شائع کرتے وقت انہوں نے پھر اسی تساہل سے کام لیا 'جس کی نشاندہی اوپر کی جا چکی ہے ۔ ڈاکٹر خاکی کی اس ادھوری تحقیق کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر انوار احمد نے " مخزن " شمارہ نمبر ۳ 'جلد ۶ بابت دسمبر ۱۹۰۳ء میں سے راشد الخیری کا یہ افسانہ بعنوان " نصیر اور خدیجہ " ڈھونڈ نکالا (۹) جو " مخزن " کے مذکورہ شمارے میں ۲۷ تا ۳۱ تک کے صفحات گھیرے ہوئے ہے ۔

ڈاکٹر انوار احمد نے تا حال اس افسانے کا متن شائع نہیں کیا اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے اس اولین افسانے کو نذر قارئین کیا جائے ۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ راشد الخیری کی کتاب " مسلی ہوئی پتیاں " میں یہ افسانہ " نصیر اور خدیجہ " کے عنوان سے شامل نہیں کیا گیا ۔ " مسلی ہوئی پتیاں " میں اس کا عنوان " بڑی بہن کا خط " ہے ۔ جو اس کتاب کے اولین ایڈیشن مطبوعہ : عصمت بک ڈپو 'دہلی : طبع اول ۱۹۳۷ء کے صفحہ ۲۸ تا ۳۲ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے ۔

یوں تاریخی اعتبار سے اردو میں طبع زاد افسانے کا آغاز درج ذیل طریق پر ہوا :

۱۔ افسانہ " نصیر اور خدیجہ " از راشد الخیری 'مطبوعہ : " مخزن " لاہور : دسمبر ۱۹۰۳ء

۲۔ افسانہ " بد نصیب کا لال " از راشد الخیری 'مطبوعہ : " مخزن " لاہور : اگست ۱۹۰۵ء

۳۔ افسانہ " دوست کا خط " از سجاد حیدر یلدرم 'مطبوعہ : " مخزن " لاہور : اکتوبر ۱۹۰۶ء

۴۔ افسانہ " غربت و وطن " از سجاد حیدر یلدرم 'مطبوعہ : " اردوئے معلیٰ " علی گڑھ : اکتوبر ۱۹۰۶ء

۵۔ افسانہ " نابینا بیوی " از سلطان حیدر جوش 'مطبوعہ : " مخزن " لاہور شمارہ نمبر ۳ : دسمبر ۱۹۰۷ء

۶۔ افسانہ " عشق دنیا اور حب وطن " از پریم چند 'مطبوعہ : " زمانہ " کانپور : اپریل ۱۹۰۸ء

یاد رہے کہ یلدرم کا افسانہ " نشہ کی پہلی ترنگ " مطبوعہ : " معارف " علی گڑھ 'شمارہ نمبر ۲ جلد نمبر ۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء خلیل رشدی کے ترکی افسانے کا ترجمہ ہے 'طبع زاد افسانہ نہیں ۔ یلدرم نے ترجمہ کرنے کے لیے خلیل رشدی کے اس افسانے کو مجلہ : " ثروت فنون " سے انتخاب کیا تھا اور یہیں سے یلدرم کی ترجمہ نگاری کا آغاز ہوا جب کہ پطرس بخاری (۱۰) ڈاکٹر معین الرحمن (۱۱) اور قرۃ العین حیدر (۱۲) نے یلدرم کے کام کو Glorify کرتے ہوئے ان کے افسانوی تراجم : " ثالث بالخیر " ' " صحبت ناجنس " اور " خارستان و گلستان " کو بھی طبع زاد قرار دیا اور یوں اس خالصتاً تحقیقی معاملے کو تادیر کھٹائی میں ڈالے رکھا ۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر ارکن ترکمان (صدر شعبہ السنہ شرقیہ 'سلجوق یونی ورسٹی ' قونیہ ۔ ترکی) نے اصل متون سے تقابلی جائزہ کے بعد ان تینوں تحریروں کو ترکی افسانوں کے تراجم ثابت کر دیا ۔ (۱۳)

" عصمت کراچی " (راشد الخیری نمبر) کے مطابق راشد الخیری کو افسانہ " نصیر اور خدیجہ " (۱۴) لکھنے کی تحریک ان کی والدہ رشید الزماں بیگم کی سنائی ہوئی دو یتیم لڑکیوں کی کہانی سے ہوئی 'جن کے ماموں نے ان کی طرف سے لاپروائی برتی ۔ اس افسانے کو سر شیخ عبد القادر نے " مخزن " لاہور کے شمارہ نمبر ۳ ' جلد نمبر ۶ بابت دسمبر ۱۹۰۳ء میں شائع کرتے وقت بطور مدیر ایک مختصر نوٹ سے مزید نمایاں کر دیا ۔ عبارت درج

ذیل ہے:

"یہ مضمون مدت کے تقاضوں کے بعد ہمیں اپنے دوست مولوی محمد عبدالراشد صاحب، مترجم عدالت بندوبست سے ملا ہے۔ صاحب موصوف شمس العلماء مولانا حافظ نذیر احمد کے عزیزوں میں ہیں اور زبان پر خوب قدرت رکھتے ہیں خصوصاً مستورات کی زبان بے تکلف لکھتے ہیں۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد صاحب کی لاجواب کتابوں کے بعد مولوی عبد الراشد صاحب کی کتاب منازل السائرہ اپنے قسم کی ایک لاجواب کتاب ہے جس میں مستورات کی زبان نہایت خوبی سے لکھی ہے۔ اس مضمون میں بڑی بہن "خدیجہ" اپنے بھائی نصیر کو خط لکھتی ہے اور دوسری مری ہوئی بہن کے بچوں کی خراب حالت کی طرف اس کی توجہ دلاتی ہے۔ خط اس بے ساختہ پن سے لکھا گیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔"

○

راشد الخیری کا اور اردو زبان کا پہلا افسانہ "نصیر اور خدیجہ" خط کی تکنیک میں لکھا گیا ہے اور یہ تکنیک اس دور کے فکشن کی مقبول ترین تکنیک کہی جا سکتی ہے۔ انگریزی ادب میں پہلی بار سیموئل رچرڈ سن (۱۶۸۹ء ۔۔ ۱۷۶۱ء) نے اس تکنیک کو اپنے تمثیلی قصے "پامیلا" میں برتا اور لیولیپے نے اس تکنیک میں آٹھ خطوط پر مشتمل اپنا افسانہ "آئینہ" مکمل کیا۔ (۱۵)

راشد الخیری عالمی سطح پر اس تکنیک کو برتنے والے تیسرے تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے "نصیر اور خدیجہ" (مطبوعہ: ۱۹۰۳ء) کے بعد یہ تکنیک اپنے دس دیگر افسانوں میں برتی۔ ان کا تیسرا طبع زاد افسانہ "عصمت و حسن" (مطبوعہ: "مخزن" لاہور ۱۹۰۶ء) "کثرت ازواج" (مطبوعہ: "مخزن" لاہور ۱۹۰۸ء) "نند کا خط بھاوج کے نام" (مطبوعہ: "عصمت" دہلی جون ۱۹۰۸ء) اور افسانوی مجموعہ "مسلی ہوئی پتیاں" (طبع اول: ۱۹۳۷ء) میں شامل کل گیارہ افسانے (زمانہ تخلیق: ۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۹ء) اسی تکنیک کے حامل ہیں۔

ترک افسانہ نگار احمد حکمت مفتی اوغلو (۱۸۷۰ء ۔۔ ۱۹۲۷ء) نے لگ بھگ ۱۹۰۵ء میں اس تکنیک کو برتا اور سجاد حیدر یلدرم اس کے ایک افسانے ("صحبت نا جنس" مطبوعہ: "مخزن" لاہور فروری ۱۹۰۶ء) کو ترجمہ کرتے ہوئے پہلی بار اس تکنیک سے متعارف ہوئے، پھر یہ تکنیک انہیں اس قدر بھائی کہ اپنے طبع زاد افسانوں "دوست کا خط" (مطبوعہ: "مخزن" لاہور اکتوبر ۱۹۰۶ء) اور "گمنام خطوط" (مشمولہ: "حکایات و احساسات" مطبوعہ: ۱۹۲۶-۲۷ء) کو اسی تکنیک میں مکمل کیا۔ یہاں تک کہ ہمارے ہاں یہ سلسلہ قاضی عبد الغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" اور میرزا ادیب کے "صحرا نورد کے خطوط" تک پہنچا، جو بلا شبہ اس تکنیک کے در تارے کا بام عروج ہے۔

○

نصیر اور خدیجہ

شاباش بھائی نصیر شاباش! چھوٹی بہن مر کے چھوٹی۔ بڑی بہن کو جیتے جی چھوڑا۔ غضب خدا کا تین تین چار چار مہینے گزر جائیں اور تم کو دو حرف لکھنے کی توفیق نہ ہو۔ حفیظ کے نکاح میں، وہ بھی چچی جان کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ملتان کی بدلی ہو گئی۔ وہ دن اور آج کا دن خیر صلاح کیسی، یہ بھی خبر نہیں کہ لاہور میں ہو یا ملتان میں۔ نصیر میاں، بہن بھائیوں کا رشتہ تو بڑی محبت کا ہوتا ہے ایسی کونسی پانچ سات بہنیں بیٹھی ہیں جو دل بھر گیا۔ دور کیوں جاؤ بھائی سلیم ہی کو دیکھ لو ایک چھوڑ دو بہنیں ساتھ ہیں اور کس طرح؟ گھر بار کی مختار اندر باہر کی مالک سیاہ کریں

چاہے سفید ۔ نہ بھائی کی اتنی مجال کہ دم مار سکے ' نہ بھاوج کی اتنی طاقت کہ ہوں کر سکے ۔ کسی کو دیکھ کر تو سکھا کرو ۔ ایک وہ بھائی ' بہنوں کو آنکھوں پر بٹھایا ' بھانجا بھانجی کی شادیاں کیں ' بھانجوں کو پڑھا لکھا کر نوکر کرایا ۔ ایک تم بھائی ہو ' کس کا بھانجہ اور کیسی بہن ۔ چاہے کوئی مرے یا جئے تمہاری بلا سے ۔ خدا کا شکر ہے ' میں تو تمہاری روپیہ پیسہ کی بھی بھوکی نہیں خالی محبت اور میٹھی زبان کی خواستگار ہوں ۔ جو کہیں خدا نخواستہ تمہارے در پر آ کر پڑتی تو کتے کے ٹھیکرے میں پانی پلوا دیتے۔ آخر میں بھی تو سنوں خطا قصور وجہ سبب ۔ کچھ تو بتاؤ ایسی لاپروائی بھی کس کام کی ' اچھے سے غرض نہ برے سے مطلب۔ بہن کے تم نہیں بھائی کے تم نہیں ۔ صادقہ مرتے مر گئی اور تمہاری صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی ۔ اماں رہیں نہیں ' ابا ادھر چلے گئے ' میں اس قابل نہیں ' بڑے بھائی اس لائق نہیں ۔ اب تمہارا دلی میں کون بیٹھا ہے جس کو خط لکھو ' تم تو خدا سے چاہتے تھے کہ کوئی موقعہ ملے تو ایک سرے سے سب ہی کو عاق کر دوں ۔ ابا کا جو جانا اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ ہو گیا ۔ بہن اور بھائی ' ماموں اور ممانی سب کو بالائے طاق رکھا ۔ چچا لاپرواہ چچی خطا وار ۔ بھائی خود غرض ' بہن گنہگار ' غرض کنبے کا کنبہ اور خاندان کا خاندان چھوٹے اور بڑے ' بڈھے اور جوان ' مرد اور عورت ' بوڑھا اور بچہ ' ایک بھی اچھا نہیں ۔ محبت نہیں مروت ہی سہی ۔ بال بچوں کا ساتھ رکھنا گناہ نہیں ہے دنیا جہاں میں ہوتی آئی ہے ۔ مگر یہ اندھیر کہیں نہیں دیکھا کہ الگ گھر کرتے ہی سب کو دھتا بتائی ۔ اماں کا مرنا ہماری تو مٹی پلید ہوئی مگر تم کو عید ہو گئی ۔ شفقت محبت پہلے ہی رخصت ہو چکی تھی ۔ جو کچھ تھوڑا بہت لحاظ تھا وہ بھی گیا گزرا ہوا ۔ اللہ تم کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے الٰہی تمہارے بچوں کو ہزاری عمر ہو ۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو اب سے دور اگلے برس ذرا ظہیر کو بخار ہو گیا تھا ۔ کیسے گھبرائے گھبرائے پھرتے تھے۔ تم کو آٹھ برس کے بچے کی یہ کچھ مامتا تھی ۔ اماں کو تمہاری کتنی ہو گی ؟ نصیر میاں دنیا کے جھگڑے تو ہمیشہ ہی رہیں گے ' بال بچے شادی بیاہ سب ہی کچھ ہو گا۔ اب اماں تمہاری صورت دیکھنے نہیں آئیں گی۔

صادقہ کے بچوں کو اماں اپنی زندگی تک کلیجہ سے لگائے رہیں ان کا مرنا تھا کہ تینوں کی مٹی ویران ہو گئی ۔ پرسوں دونوں لڑکے بسم اللہ کا حصہ لے کر آئے تھے میں باہر کی چارپائی پر بیٹھی ہوئی رضائی ٹانک رہی تھی ۔ چھوٹا آ کر گلے سے لپٹ گیا کچھ خون کا جوش تھا کہ اس کی صورت دیکھتے ہی میری طبیعت بھر آئی ۔ غلاموں کی بھی حالت اچھی ہو گی جیسی ان بچوں کی تھی ۔ پھٹا ہوا کرتہ ٹوٹی ہوئی جوتی ' پاجامہ چکٹ ' ٹوپی چوہا ' بدن پہ سیروں میل ' آنکھوں میں الغاروں چیپڑ ان بچوں کو دیکھ کر مجھ کو وہ دن یاد آ گیا کہ جب تک دونوں کی اناقیں نہ آ گئیں ۔ صادقہ رابعہ کی چوتھی میں نہ گئی ۔ دیکھ لو تین چار ہی برس کے اندر اندر کیا کیا ہو گیا ۔ برا نہ ماننا تم قیامت تک بھی اپنے بچوں کو اس طرح نہ پالو گے جس طرح صادقہ اپنے بچوں کو پال گئی ۔ خدا کی قسم بھری ہوئی عطر کی شیشیاں کھڑے کھڑے سعید نے غارت کی ہیں ۔ تقدیر کی خبر نہ تھی کہ صادقہ کی اولادیوں برباد ہو گی ۔ میں نے دیکھا نہیں مگر دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ غدر سے پہلے اس مکان پر ہاتھی جھوتا تھا ۔ آج جا کر دیکھو بے کنڈی کا ایک کواڑ چڑھا ہوا ہے اور چکنی مٹی کی ایک دیوار چنی ہوئی ہے ۔ بڑے نواب کی آنکھ کا بند ہونا تھا کہ گھر بھر میں جھاڑو پھر گئی ۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ مسعود کے بیاہ میں صادقہ کی ساس کو گنگا جمنی پنکھے جھلے جا رہے تھے ۔ لونڈیاں اور مامائیں گوندنی کی طرح زیور میں لدی ہوئی تھیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسا زمانہ پلٹا کہ آج پانی پینے کا کٹورہ بھی نہ رہا ۔ مٹکے میں آٹا برکت ' ہنچی میں کپڑے اللہ کا نام ۔ بدن میں طاقت نہیں ' ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں ' چلنے پھرنے سے مجبور ' دیکھنے سے معذور ۔ آنکھیں تھیں تو ایک آدھ کرتہ دو ایک ٹوپیاں کر کرا لیتی تھیں ۔ اب اتنی بھی نہیں ' پڑوس کا حق سمجھو خدا کا خوف جانو ۔ ہاتھ پاؤں کی خیرات کو چچی جان تین روپیہ مہینہ دیتی ہیں ۔ بس یہ کل کائنات ہے ۔ اس میں کیا آپ کھائیں کیا بچوں کو کھلائیں تین روپیہ چار دم ' ایک لڑکی کا ساتھ ' کیا کریں کیا نہ کریں ۔ تین روپیہ مہینہ کا تو سوکھا اناج چاہئے ۔ جو جو کچھ لکھا تھا سب ہی کچھ کر چکیں ۔ پکیاں پیسیں ' سلائیاں کیں ' ہاں اتنی بات رہ گئی کہ در در ہاتھ نہیں پھیلایا۔

صادقہ کے بچے کسی غیر کے بچے نہیں ہیں ۔ مری ہوئی بہن کی نشانی ہیں۔ شاباش تمہاری ہمت پر ' تم پردیس میں بیٹھے راج کرو اور صادقہ کے بچے دو دو دانے کو محتاج ہوں ۔ دلی میں آ کر دیکھو شہر میں کیا نام بدنام ہو رہا ہے۔ آخر برس میں دو برس میں اپنے ہاں کی نہیں سسرال کی شادیوں میں تو آؤ گے ۔ سب کو یاد ہے کہ اللہ رکھو لڑکی کا بیاہ سر پر آ رہا ہے یا یہ بھی وہیں کر لو گے ؟ اپنے پرائے ' کنبہ ' محلہ ' میل ملاپی جان

پہچان تمام دنیا جنم میں تھوک رہی ہے۔ کس کس کا منہ کیلو گے؟

بڑے بھائی اس لائق ہوتے تو تم سے کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بیچارے آپ ہی اپنی پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ نوکری چھوٹی، چوری ہوئی۔ مقدمہ ہارے چار روپیہ مکان کے آجاتے تھے وہ بھی نہ رہے۔ اندر کا دالان ہوا ہو ہی رہا تھا ایک ہی چھینٹے میں اڑا اڑا کر کے آن پڑا۔ اس کے ساتھ ہی لبی کوٹھڑی بھی بیٹھ گئی۔ اتنا بھی پاس نہیں کہ اینٹیں اور ملبہ تو ہٹوا دیں۔ چار سو روپیہ کے قرض دار بیٹھے ہیں۔

ایک لے دے کر مجھلی خالہ رہ گئیں وہ اکیلی کیا کیا کریں۔ صادقہ کے بچوں کو پالیں، بڑی بہو کی شل کریں، اپنے گھر کو دیکھیں، جس کا نہ کریں اسی سے بری، روپیہ پیسہ کے قابل نہیں، ہاتھ پاؤں سے باہر نہیں، جس کے ہاں ضرورت دیکھتی ہیں آموجود ہوتی ہیں۔ کنبے کو جس کا جو جی چاہے کہہ لو خلق کا حلق تھوڑی بند ہو سکتا ہے۔

ماموں اور باپ میں فرق نہیں ہوتا۔ مگر سمجھو تو۔ نہ سمجھو تو بھانجا بھانجی تو خیر، اپنی اولاد بھی غیر ہے۔ خدا گواہ ہے میری تو اگر جان تک کام آجائے تو دریغ نہیں اپنے بچے کم اور صادقہ کے بچے زیادہ۔ مگر ذرا عقل سے کام لو ساری دنیا میں بدنام ہوں، مری ہوئی ہڈیاں اکھڑواؤں، اما باوا کی ناک کٹواؤں، دادی دادا تک کو پنواؤں، جب ان کے ساتھ رکھنے کا نام لوں۔ میں خود پرائے بس میں ہوں۔ شہر کا معاملہ سسرال کی بات، ساس نندوں کا ساتھ ہر وقت کی جھک جھک، رات دن کی پٹ پٹ، کنبے بھر میں ذلیل ہونا، عمر بھر کے لئے مٹی پلید کرنی، گھروں میں لڑائیاں ڈالنی، دلوں میں فرق ڈالنے کس خدا نے بتائے ہیں۔ اماں جان تو پہلے ہی فرماتی ہیں کہ میکے کا بھرنا بھرتی ہے۔ بچوں کو رکھ لوں تو زندگی ہی دو بھر ہو جائے۔ تم کو ماشاء اللہ اسی روپیہ ملتے ہیں۔ دو میاں بیوی دو بچے کل چار دم۔ اسی روپیہ کیا کم ہیں۔ برا مانو یا بھلا جس طرح ہو سکے صادقہ کے بچوں کو پانچ روپیہ مہینہ دو۔ یہ روپیہ رائگاں نہیں جائے گا۔ یہاں نیک نام وہاں سرخرو۔ نصیر میاں حق داروں کا حق سمجھو، اللہ برکت دے گا پھلو گے پھولو گے، دنیا کی بہار دیکھو گے، روزگار میں ترقی ہوگی۔ ان بچوں کو غیر نہ سمجھو ظہیر اور حمید میں فرق نہیں ہے۔ بھائی بہن کی اولاد ایک ہوتی ہے۔ یہ بیچارے بھی کیا یاد کریں گے کہ کوئی ماموں تھا۔

دلہن بیگم کو بہت بہت دعا۔ بچوں کو پیار۔ اب تو ماشاللہ بچی پاؤں پاؤں چلتی ہوگی۔ اچھا خدا حافظ۔

روز جمعہ　　　　　　　　　　　　　　　　خدیجہ

○

(۱) سمپوزیم: "اردو افسانے میں روایت اور تجربے"، شرکاء: سعادت حسن منٹو، پروفیسر وقار عظیم، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، شوکت تھانوی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، انتظار حسین، حمید اختر اور محمد طفیل۔ مشمولہ: "نقوش" لاہور (افسانہ نمبر۔ دو جلدیں) صفحہ ۱۰۲۴ جلد دوم، ۱۹۵۵ء

(۲) اردو افسانے پر ایک سمپوزیم: منعقدہ لکھنؤ ۱۹۶۱ء، مشمولہ: "اعتبار نظر" از احتشام حسین، مطبوعہ: کتاب پبلشرز، چوک لکھنؤ نمبر ۳، طبع اول: ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۳۸

(۳) بہ حوالہ: "زمانہ" کانپور (مرتبہ: دیا نرائن نگم) پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء صفحہ ۸

(۴) بہ حوالہ : "پہلی کرن کے حضور " از ابو الفضل صدیقی ' مطبوعہ : " سیپ " کراچی ۱۹۸۸ء

(۵) "حب وطن کے قصے معروف بہ سوز وطن و سیر درویش " مطبوعہ : گیلانی الیکٹرک پریس بکڈپو ' لاہور طبع اول : ۱۹۲۹ء صفحہ ۷ تا ۱۲

(۶) بہ حوالہ : اردو کا پہلا افسانہ " از ڈاکٹر سید معین الرحمن ' مطبوعہ : " فنون " لاہور ' بابت : نومبر ' دسمبر ۱۹۸۹ء

(۷) " نیرنگ خیال " (حصہ اول) مطبوعہ : مفید عام پریس ' لاہور ' طبع اول : ۱۸۸۰ء

(۸) بہ حوالہ : " اردو افسانے کا ارتقاء " مقالہ برائے پی ۔ ایچ ۔ ڈی پنجاب یونی ورسٹی ' لائبریری اردو سیکشن ۔ صفحہ ۱۹۳ مطبوعہ : مکتبہ خیال ' لاہور ' طبع اول : اگست ۱۹۸۷ء صفحہ نمبر ۱۵۵

(۹) " اردو افسانہ ۔ تحقیق و تنقید " بیکن بکس ' ملتان ' طبع اول ۱۹۸۸ء صفحہ نمبر ۴۲

(۱۰) " یگانہ نوازی " امرتسر (یلدرم نمبر) شمارہ نمبر ۵ ' جلد ۹

(۱۱) " اردو کا پہلا افسانہ " ' مطبوعہ : " فنون " لاہور سالنامہ ۱۹۷۹ء

(۱۲) " کار جہاں دراز ہے " مکتبہ اردو ادب ' لاہور : طبع دوم : س ۔ ن

(۱۳) دیکھیے : " سجاد حیدر یلدرم اور ان کے ترکی تراجم " ' مطبوعہ " ماہ نو " لاہور : جون ۱۹۸۸ء

(۱۴) اس افسانے پر راشد الخیری کا اصل نام محمد عبدالراشد درج ہے ۔

(۱۵) لیو نیپے کے افسانے سے خیال مستعار لے کر ف ۔ م ۔ افضل نے افسانہ " آئینہ " لکھا تھا جو " ہمایوں " لاہور بابت : مارچ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ۔

راشد الخیری

نام : محمد عبد الرشید (والدین "ابی" پکارتے تھے)

قلمی نام : س۔ش۔ر / محمد عبد الراشد / راشد الخیری ("مصور غم" کا خطاب "شام زندگی کی" اشاعت پر "اسوہ حسنہ" میرٹھ کے مدیر احسان الحق نے دیا)

پیدائش : جنوری ۱۸۶۸ء بہ مقام دہلی (۱)

وفات : ۳ فروری ۱۹۳۶ء بہ مقام دہلی

تعلیم : عربک سکول دہلی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی جہاں خواجہ شہاب الدین (ہیڈ ماسٹر) مرزا احمد بیگ (انگریزی) خواجہ الطاف حسین حالی (اردو، فارسی) اور امتیاز حسین (ریاضی) پڑھاتے تھے۔ نویں جماعت میں تھے جب دادا کا انتقال ہوا اور انہوں نے اسکول جانا ترک کر دیا۔ اس کے بعد کچھ دن اپنے پھوپھا ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی شاگردی کی، کچھ مدت گورنمنٹ ایڈورڈ ہائی سکول، اورئی میں تعلیم پائی لیکن میٹرک نہ کر سکے۔

مختصر حالاتِ زندگی:

راشد الخیری کے والد عبد الماجد ریلوے میں ملازم تھے اور زیادہ وقت پردیس میں گزارا۔ اس پر مستزاد راشد الخیری کی والدہ پر ایک پور حسین سوکن لا بٹھائی۔ راشد الخیری کی والدہ رشید الزمانی اور نابینا دادا مولوی عبد القادر نے راشد الخیری کو اپنی نگرانی میں رکھا۔ نو برس کے تھے جب والد کا انتقال ہوا۔ کچھ وقت اپنے چچا ڈپٹی کلکٹر عبد الحامد کے ہاں اٹاوہ میں گزارا۔ چودہ برس کی عمر تک پتنگیں اڑائیں، گلی ڈنڈا اور گیڑیاں کھیلیں۔(۲) نوجوانی میں گلستان، بوستان شاہ نامہ، رومی، جامی، شیکسپیر، ٹینی سن اور ملٹن کو پڑھا، امام غزالی کا "احیا العلوم" کا ساتھ بڑھاپے تک رہا۔ چچا کی سفارش پر ۱۸۹۱ء میں کلرک بھرتی ہو گئے اور محکمہ بندوبست علی گڑھ سے ۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۲ء منسلک رہے۔ ۱۹۰۳ء میں مترجم عدالت بندوبست تھے۔ ۵ جنوری ۱۸۹۰ کو نور فاطمہ عرف فاطمہ خانم بنت مولوی شاہ عبد الرحیم سے شادی ہوئی۔ محکمہ بندوبست ٹوٹا تو ڈپٹی کمشنر بی جی وائٹ کے دفتر میں کلرکی کی۔ اس زمانے میں یو۔پی اور میرٹھ میں قیام رہا کئی ملازمتیں کیں اور چھوڑیں۔ آخر میں ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کے دفتر میں سب آڈیٹر ہو گئے۔ پہلا ناول "صالحات" لگ بھگ ۱۸۹۶ء میں مکمل کیا جو ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا۔ محمد احسن وکیل ("عصمت" فروری ۱۹۳۹ء) کے مطابق مولانا شاعری بھی فرماتے تھے۔ افسانے لکھنے کی ترغیب والدہ سے ملی اور ۱۹۰۳ء میں انہوں نے اردو کا پہلا افسانہ "نصیر اور خدیجہ" لکھا۔ ۱۹۰۷ء میں "مخزن" کے دہلی منتقل ہو جانے پر شیخ عبد القادر کے ساتھ مل کر پرچہ مرتب کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۸ء میں بیگم شیخ محمد اکرام کی ادارت میں دہلی سے رسالہ "عصمت" جاری کیا۔ ۱۹۱۰ء میں ملازمت چھوڑ دی۔ اپریل ۱۹۱۱ء میں دہلی سے رسالہ "تمدن" شروع کیا جس میں ابتدائی ایک برس شیخ محمد اکرام ان کے شریک کار رہے۔ رسالہ "تمدن" اپنے ذاتی پریس سے شائع کرتے تھے۔ یہ پرچہ ان کے اپنے مضمون "طرابلس سے ایک صدا" کی اشاعت پر ۱۹۱۳ء تک حکومتی پابندی کا شکار رہا اور زر ضمانت ضبط کر لیا گیا ۱۹۱۵ء میں ہفتہ وار رسالہ "سہیلی" جاری کیا جو محض چند ماہ نکل سکا۔ ۱۹۱۹ء میں تمدن پریس کو آگ لگ جانے سے "مخزن"، "عصمت"، "تمدن" اور "سہیلی" کے تمام پرانے فائل جل کر راکھ ہو گئے۔ اس کے بعد دہلی سے ہی خواتین کا پرچہ "بنات" جاری کیا۔ ۱۹۱۹ء میں کالے خاں کی مسجد اور ترکاری منڈی دہلی کے قریب رہائش تھی۔ ۱۹۲۳ء میں تربیت گاہ بنات قائم کی اور لکھنا پڑھنا تقریباً موقوف ہوا۔ ۳ فروری کی صبح ۷ بج کر ۵۵ منٹ

پر دہلی میں وفات پائی اور کوٹلہ فیروز شاہ دہلی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔(۳)

اولین تحریر:

"احسن و میمونہ" (ناول) زمانہ تصنیف ۱۸۹۴ء (۴) یہ رومانی ناول "روہیل کھنڈ گزٹ" بریلی میں ۱۸۹۴ء میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"نصیر اور خدیجہ" مطبوعہ "مخزن" لاہور جلد نمبر ۶، شمارہ نمبر ۳ دسمبر ۱۹۰۳ء۔ صفحہ ۲۷ تا ۳۱ مشمولہ: "مسلی ہوئی پتیاں" مطبوعہ عصمت بک ڈپو دہلی، طبع اول ۱۹۳۷ء۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ صالحات (حیات صالح) اس ناول میں بقول پریم چند: "انسانیت کا اونچا آئیڈیل پیش کیا گیا ہے۔"
یہ ناول ہے۔ تصنیف ۱۸۹۶ء یا ۱۸۹۷ء
ناشرین: محمد شفیع الدین مالک اقبال پرنٹنگ ورکس، دہلی، طبع اول: دہلی ۱۸۹۸ء، طبع دوم: دہلی ۱۹۰۸ یا ۱۹۰۷ء، طبع سوم: دہلی ۱۹۳۰ء

۲۔ "منازل السائرہ" (ناول) تکمیل ۱۸۹۸ء تا ۱۹۰۰ء۔ طبع اول علی گڑھ ۱۹۰۲ء۔
یہ ناول علی گڑھ سے محمد احسن وکیل نے شائع کروایا۔ دوسرا ایڈیشن سر شیخ عبد القادر نے لاہور سے شائع کیا طبع دوم: لاہور ۱۹۰۹ء

۳۔ "قطرات اشک" (افسانے اور مضامین) دارالاشاعت پنجاب، لاہور، طبع اول:
اولین افسانوی مجموعہ اس کتاب میں درجن بھر افسانے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔
جن میں "عصمت و حسن" مطبوعہ "مخزن" لاہور ۱۹۰۶ء بھی شامل ہے۔ دیگر افسانے ہیں: "ایک مظلوم بیوی کا خط" (جو "مخزن" دہلی، ۱۹۰۸ء) میں "کثرت ازدواج" کے نام سے شائع ہوا تھا) مضمون: "دار الغرور" (مطبوعہ مخزن ۱۹۰۶ء) "بد نصیب کا لال" (مطبوعہ "مخزن") "رویائے مقصود" (مطبوعہ "مخزن" ۱۹۰۷ء) "سارس کی تارک الوطنی" (مطبوعہ "مخزن" ۱۹۰۹ء) "نند کا خط بھاوج کے نام" (مطبوعہ "عصمت" دہلی اولین شمارہ جون ۱۹۰۸ء) "ساون کی چڑیاں" (مطبوعہ "عصمت" دہلی ۱۹۱۰ء "مظلوم کی فریاد" (مطبوعہ "عصمت" دہلی ۱۹۱۱ء) "ماہ جبیں اندرا" (مطبوعہ "تمدن" دہلی ۱۹۱۱ء) "دیور بھاوج کی خط و کتابت" (مطبوعہ: "تمدن" دہلی ۱۹۱۲ء) "چاندنی چوک کا جنازہ" (مطبوعہ "کہکشاں" دہلی ۱۹۱۸ء) "بھولے کی یاد" (مطبوعہ "تہذیب نسواں" ۱۹۲۱ء)۔

۴۔ "شاہین و دراج"۔ ۱۹۰۸ء "مخزن" لاہور میں قسط وار شائع ہوا طبع اول: دار الاشاعت پنجاب لاہور، طبع دوم: ۱۹۳۰ء

۵۔ "صبح زندگی" (تکمیل ۱۹۰۷ء) مخزن پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۰۹ء
۱۹۳۵ء تک اس کتاب کے ۱۸ ایڈیشن شائع ہوئے۔

۶۔ "سوکن کا جلاپا" (افسانے) دارالاشاعت پنجاب 'لاہور' طبع اول: ۱۹۲۱ء

اس کا دوسرا نام "شہید بیداد" تھا۔ اس کے کل ۹ ایڈیشن طبع ہوئے۔

۷۔ "گوہر مقصود" (۲ افسانوں کا مجموعہ) دارالاشاعت پنجاب 'لاہور' طبع اول: ۱۹۱۸ء

اس مجموعے میں شامل افسانہ 'لال کی تلاش' جون اور اس کے بعد جولائی ۱۹۱۰ء کے رسالہ "عصمت" دہلی میں شامل ہو چکا تھا۔ دوسرا افسانہ "خیالستان کی پری" "عصمت" ۱۹۱۱ء میں طبع ہوا تھا۔

۸۔ "لڑکیوں کی انشاء" (زنانہ خط و کتابت پر) دفتر "عصمت" 'دہلی' طبع اول: ۱۹۱۱ء

دارالاشاعت پنجاب 'لاہور سے اس کتاب کے چھ سات ایڈیشن مولوی سید ممتاز علی نے شائع کیے۔

۹۔ "شام زندگی" (ناول) ناشر: محمد واحدی 'ایڈیٹر نظام المشائخ' دہلی' طبع اول: اپریل ۱۹۱۷ء

نومبر ۱۹۱۷ء تک تین ایڈیشن نکل گئے تھے۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ تک ۲۷ بار چھپ چکی تھی۔ کل صفحات ۱۶۰۔

۱۰۔ "الزہرا" (فاطمۃ الزہرا کے سوانح حیات) ناشر: محمد واحدی 'ایڈیٹر نظام المشائخ' دہلی' طبع اول: ۱۹۱۷ء

مئی ۱۹۵۹ء میں اس کتاب کا ۱۳واں ایڈیشن شائع ہوا۔

۱۱۔ "سات روحوں کے اعمال نامے" (افسانے/ مضامین) ناشر: محمد واحدی ایڈیٹر نظام المشائخ دہلی' طبع اول: ۱۹۱۷ء

یہ اول اول رسالہ "خطیب" میں قسط وار شائع ہوا۔ اس میں سات کہانیاں ہیں جو باہمی طور پر آپس میں مربوط ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ء تک ۱۰ بار چھپ چکی ہے۔ دہلی یونی ورسٹی کے نصاب میں شامل رہی ہے۔

۱۲۔ "طوفان حیات" (ناول) ناشر: مولانا عبد المجید سالک' لاہور

۱۹۶۳ء تک یہ کتاب ۱۴ بار چھپ چکی ہے۔

۱۳۔ "سنجوگ" (ناول) ناشر: سید ممتاز علی برائے دارالاشاعت پنجاب 'لاہور' طبع اول: ۱۹۱۸ء

یہ ناول "تہذیب نسواں" لاہور میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۶۳ء تک اس کتاب کے ۱۰ ایڈیشن طبع ہوئے۔

۱۴۔ "ماہ عجم" (تاریخی ناول) دارالاشاعت پنجاب 'لاہور' طبع اول:

یہ ناول امتیاز علی تاج نے "تہذیب نسواں" لاہور کے لیے ۱۹۱۸ء میں لکھوایا تھا۔

۱۵۔ "بنت الوقت" (ناولٹ) ناشر: محمد واحدی ایڈیٹر نظام المشائخ' دہلی' ۱۹۱۸ء

راشد الخیری نے یہ ناولٹ اپریل ۱۹۱۸ء میں مکمل کیا تھا۔

۱۶۔ "آفتاب دمشق" (تاریخی ناول) ناشر: محمد ظہور الدین مالک رسالہ "مخزن" لاہور

یہ ناول ۱۹۱۸ء میں لکھا گیا۔ طبع دوم: مبارک علی شاہ گیلانی۔ گجراتی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے ۱۹۶۳ء تک یہ کتاب دس بار شائع ہوئی۔ ۱۹۶۰ء سے یہ کتاب پنجاب یونی ورسٹی کے ادیب عالم امتحان میں شامل نصاب رہی۔

۱۷۔ "محبوبہ خداوند" (تاریخی ناول) ناشر: احسان الحق مالک "اخبار دین و دنیا" دہلی' طبع اول:

۱۹۶۳ء تک ۹ ایڈیشن طبع ہوئے۔

۱۸۔ "جوہر قدامت" (ناول) ناشر: ملک محمد دین ایڈیٹر صوفی 'پنڈی بہاؤالدین' طبع اول: تکمیل ۱۹۱۹ء

اس ناول پر کئی فلمیں بنیں۔ قیام پاکستان سے قبل مدراس یونی ورسٹی میں نصابی کتاب رہی۔ راشد الخیری نے اس ناول پر جنوری ۱۹۳۲ء میں نظر ثانی فرمائی۔ ۱۹۶۳ء تک اس کے ۸ ایڈیشن طبع ہو چکے تھے۔

۱۹۔ "سراب مغرب" (طویل مختصر افسانہ) ناشر: محمد واحدی: نظام المشائخ' دہلی' طبع اول: فروری ۱۹۱۸ء

تکمیل: ۱۹۱۷ء ــــــ ۱۹۶۴ء تک ۱۲ ایڈیشن طبع ہوئے۔

۲۰۔ "عروس کربلا" (تاریخی ناول) مطبوعہ: صوفی پبلشنگ ہاؤس پنڈی بہاؤالدین، طبع اول: ۱۹۱۹ء

راشد الخیری نے ۱۹۳۳ء والے ایڈیشن پر نظر ثانی کرتے ہوئے ترامیم و اضافے بھی کیے۔ ۱۹۶۴ء تک اس ناول کے ۱۱ ایڈیشن طبع ہو چکے تھے۔

۲۱۔ "شب زندگی" (ناول) دو جلدوں میں مطبوعہ: دفتر "عصمت" دہلی، طبع اول: اگست ۱۹۱۹ء

یہ ناول جون ۱۹۱۸ء میں لکھنی شروع کی گئی تھی۔ جولائی ۱۹۱۹ میں مکمل ہوئی۔ پہلی جلد اگست ۱۹۱۹ء کو طبع ہوئی۔ تمدن پریس دہلی کی آتش زدگی کے بعد راشد الخیری کی یہ پہلی کتاب ہے۔ جلد اول ۱۹۶۴ء تک ۲۴ بار طبع ہو چکی۔ دوسری جلد راشد الخیری نے جنوری فروری ۱۹۲۳ء میں اپنی بہو خاتون اکرم کی رونمائی کے لیے محض پانچ ہفتوں میں مکمل کی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں ہی اس کے تین ایڈیشن چھپ کر بک بھی چکے تھے۔ دوسری جلد کے ۱۹۶۴ء تک ۱۱ ایڈیشن طبع ہوئے۔ ۱۹۶۴ء کے بعد کے ایڈیشن میں جلد اول و دوم کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

۲۲۔ "نوحہ زندگی" (ناول) ناشر: قاری عباس حسین ایڈیٹر "قوم" دہلی، طبع اول: اگست ۱۹۱۹ء

۱۹۳۱ء کے ایڈیشن میں مصنف کا دیباچہ نئی چیز ہے۔ اس ایڈیشن پر بھی راشد الخیری نے نظر ثانی کی۔ ۱۹۶۴ء تک ۱۲ ایڈیشن چھپ چکے تھے۔

۲۳۔ "مودودہ" (ناولٹ) مطبوعہ: صوفی پبلشنگ ہاؤس پنڈی بہاؤالدین، طبع اول: ۱۹۱۹ء

اس ناولٹ کے ۱۹۶۴ء تک آٹھ ایڈیشن طبع ہوئے۔ کل صفحات ۵۶۔

۲۴۔ "روداد قفس" (شعری مجموعہ) مطبوعہ: دفتر "عصمت" دہلی، طبع اول: ستمبر ۱۹۱۸ء۔ ص ۳۲

راشد الخیری کی وہ نظمیں جو افسانوں اور مضامین کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ ۱۹۲۷ء میں جب یہ کتاب چوتھی بار عصمت بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئی تو راشدی الخیری کی "عصمت" اور "سہیلی" میں شائع شدہ ان نظموں کا اضافہ کر دیا گیا جو راشد الخیری نے اپنے نام سے شائع نہیں کروائی تھیں۔ یوں کتاب کی ضخامت ۷۲ صفحات ہو گئی۔

۲۵۔ "انگوٹھی کا راز" (طویل مختصر افسانہ) ناشر: حکیم محمد یعقوب مطبوعہ: دہلی، طبع اول: ۱۹۱۸ء

اس افسانے کا ابتدائی ایک تہائی حصہ مارچ ۱۹۱۸ء کے "عصمت" دہلی میں شائع ہوا تھا۔ حکیم محمد یعقوب نے دہلی سے دوبارہ طبع کروایا۔ تیسرے ایڈیشن برائے عصمت بک ڈپو۔ دہلی کے لیے راشد الخیری نے نظر ثانی کی اور تیسری بار ۱۹۲۹ء میں طبع ہوئی۔

۲۶۔ "جوہر عصمت" (افسانے) مطبوعہ: عصمت بک ڈپو، دہلی، طبع اول: جنوری ۱۹۲۰ء

پہلے ایڈیشن میں صرف تین افسانے شامل تھے اور ضخامت صرف ۴۸ صفحات تھی۔ طبع دوم ۱۹۲۷ء کے ایڈیشن میں دس مزید افسانے شامل کر دیے گئے۔ اس مجموعے میں شامل افسانے "عصمت" اور "تمدن" میں شائع ہوئے تھے۔ اس کتاب میں مظلوم بیوی کا پاک جذبہ، بھنور کی دلہن، فسانہ نور، مامون الرشید کا دربار، اگلی محبتیں، جہانگیری عدل، ملکہ شہزاد، بلبل کی شہادت، بے گناہ کا قتل، برقع کی مستحق، بھاوج کا کینہ، غلط فہمی اور خاتمہ بالخیر کل ۱۳ افسانے ہیں۔

۲۷۔ "تائید غیبی" (ناولٹ) ناشر: ممتاز ہاشمی مطبوعہ: دہلی، طبع اول: ۱۹۲۰ء

یہ ناولٹ دس بار طبع ہوا۔ آخری ایڈیشن سی عبد الحمید مدیر "مولوی" دہلی نے "اندلس کی شہزادی" کے نام سے شائع کیے۔

۲۸۔ "فسانہ سعید" (ناولٹ) ناشر: حافظ عزیز حسن بقائی مدیر "پیشوا" دہلی، طبع اول: ۱۹۲۰ء

یہ ناولٹ حافظ عزیز نے چار بار شائع کیا۔ آخری ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں دہلی سے نکلا تھا۔ تین ایڈیشن عصمت بک ڈپو دہلی سے شائع

ہوئے۔

۲۹۔ "در شہوار" (تاریخی ناولٹ) ناشر: مدیر "قوم" دہلی، طبع اول: ۱۹۲۱ء

اس ناولٹ کے مزید ۳ ایڈیشن قاری عباس حسین نے دہلی سے طبع کروائے۔ پانچواں ایڈیشن رازق الخیری نے عصمت بک ڈپو دہلی سے طبع کروایا۔

۳۰۔ "یاسمین شام" (تاریخی ناول) مطبوعہ: صوفی پبلشنگ ہاؤس منڈی بہاؤالدین، طبع اول: ۱۹۲۱ء

کل سات ایڈیشن شائع ہوئے۔ یہ ناول پونے دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

۳۱۔ "تربیت نسواں" (ناول) مطبوعہ: لاہور، طبع اول: ۱۹۲۳ء

ناول کا دوسرا نام "سمرنا کا چاند تھا" دوسرا اور تیسرا ایڈیشن سید مبارک علی گیلانی نے گیلانی پریس لاہور سے شائع کئے۔ اس ناول کے آخری تین ایڈیشن عصمت بک ڈپو دہلی نے شائع کئے۔ کل چھ بار طبع ہوا۔

۳۲۔ "تیغ کمال" (ناول) مطبوعہ: صوفی پبلشنگ ہاؤس پنڈی بہاؤالدین، طبع اول: ۱۹۲۳ء

راشد الخیری نے یہ ناول گنگا پور میں صرف ایک ہفتے میں مکمل کیا تھا۔ یہ کتاب چھ بار طبع ہوئی۔

۳۳۔ "امت کی مائیں" (تاریخ و سیرت) ناشر: منشی عبد الحمید مالک و مدیر "مولوی" دہلی، طبع اول: ۱۹۲۵ء

ازواج مطہرات پر کیے گئے اعتراضات کا جواب۔ ضخامت ڈیڑھ سو صفحات کل چھ ایڈیشن طبع ہوئے۔

۳۴۔ "ستونتی" (طویل مختصر افسانہ) عصمت بک ڈپو دہلی، طبع اول: ۱۹۲۶ء

مشرق اور مغرب کا موازنہ۔ کل صفحات ۳۰۔ یہ کتاب دس بار طبع ہوئی ہے۔

۳۵۔ "منازل ترقی" (طویل مختصر افسانہ) مطبوعہ عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۷ء

یہ افسانہ سب سے پہلے "عصمت" دہلی بابت: اکتوبر ۱۹۱۸ء اور اس کے بعد نظام المشائخ، دہلی میں طبع ہوا تھا۔ کل صفحات ۳۰۔ کل چار ایڈیشن دہلی سے طبع ہوئے۔

۳۶۔ "بچہ کا کرتا" (مختصر افسانہ) مطبوعہ: عصمت بکڈپو دہلی، طبع اول: ۱۹۲۷ء

یہ دردانگیز افسانہ پہلے پہل "عصمت" بابت: جولائی اگست ۱۹۲۳ء مرتبہ: رازق الخیری میں طبع ہوا تھا۔ آٹھواں ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں طبع ہوا۔

۳۷۔ "امین کا دم واپس" (تاریخی افسانہ) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: مارچ ۱۹۲۷ء

یہ افسانہ پہلے پہل فروری ۱۹۱۹ء میں "خطیب" دہلی میں شائع ہوا۔ کل صفحات ۳۲۔

۳۸۔ "وڈیا کی سرگزشت" (افسانہ) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: اکتوبر ۱۹۲۷ء

کل صفحات ۳۲۔ پہلے پہل "مگر آہ وہ موتی تو وہاں بھی نہ تھا" کے عنوان سے "خطیب" دہلی میں طبع ہوا۔ کتاب کا ساتواں ایڈیشن ستمبر ۱۹۵۶ء میں عصمت بکڈپو، کراچی سے طبع ہوا۔ طبع زاد افسانہ ہے۔

۳۹۔ "گلدستہ عید" (مضامین اور افسانے) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۷ء

کل صفحات ۲۷۔ یہ مضامین اور افسانے "عصمت" دہلی بابت ۱۹۱۰ء تا ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے تھے۔ کتاب میں شامل افسانہ "ام جعفر کی عید" ۱۹۱۷ء میں طبع ہوا تھا۔

۴۰۔ "نانی عشو" (مزاحیہ قصے) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: جنوری ۱۹۲۸ء

کل صفحات ۵۶۔ "نانی عشو" سلسلے کی ابتدائی تین چار قسطیں "عصمت" دہلی بابت ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی تھیں۔ "نانی عشو"

سلسلے پر ریڈیو سے فیچر نشر ہوئے۔ یہ کتاب دس بار طبع ہوئی۔

۴۱۔ "سیلاب اشک" (۷ افسانے) مصور ایڈیشن: مطبوعہ: عصمت بکڈپو' دہلی' طبع اول: ۱۹۲۸ء

اس مجموعے میں پرستار محبت' بلوچن کے تین رنگ' طلاقن کا سفید بال' جج اکبر' عدل گل بدن' بے قصور بچی اور ثریا کا تخیل نامی کل سات افسانے ہیں جن میں سے اکثر" "عصمت" دہلی بابت ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے۔ کل پانچ ایڈیشن طبع ہوئے۔ آخری ایڈیشن ۱۱۲ صفحات مع تصاویر ۶ ورق۔

۴۲۔ "قلب حزیں" (مضامین اور افسانے) مطبوعہ: عصمت بکڈپو' دہلی' طبع اول: ۱۹۲۸ء۔

یہ ۳۰ مضامین اور افسانے راشد الخیری نے س۔ ش۔ ر کے قلمی نام سے لکھے تھے' جو ۱۹۲۷ء تک کے "عصمت" دہلی میں شائع ہوئے تھے۔

۴۳۔ "وداع ظفر یعنی نوبت پنج روزہ" (تاریخ) مطبوعہ: "عصمت" بکڈپو' دہلی' طبع اول: نومبر ۱۹۲۸ء

کل صفحات ۱۲۸۔ بہادر شاہ ظفر کے عہد سے متعلق بہادر شاہ ظفر کی زبانی نوحہ خوانی۔ ۱۹۶۳ء تک نو ایڈیشن طبع ہوئے تھے۔

۴۴۔ "طوفان اشک" (۱۲ افسانے) مطبوعہ: عصمت بکڈپو' دہلی' طبع اول: ۱۹۲۹ء

یہ افسانہ ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۷ء عصمت میں شائع ہوئے۔ ۱۹۶۳ء تک چار ایڈیشن طبع ہوئے۔

۴۵۔ "تمغہ شیطانی" (طویل مختصر افسانہ) مطبوعہ: عصمت بکڈپو' دہلی' طبع اول: ۱۹۲۹ء

یہ طویل مختصر افسانہ جنوری ۱۹۲۸ء تا ستمبر ۱۹۲۹ء کے "عصمت" دہلی میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ کل صفحات۔ ۸۸

۴۶۔ "شہید مغرب" (افسانے اور مضامین) مطبوعہ: عصمت بکڈپو' دہلی' طبع اول: ۱۹۲۹ء

اس کتاب میں شامل افسانے اور مضامین "عصمت" دہلی "تمدن" دہلی (۱۲-۱۹۱۱ء) کے علاوہ "ہمدرد" دہلی" "تنظیم" "امرت سر اور "انقلاب" دہلی میں اس سے قبل شائع ہو چکے تھے۔ کتاب میں شہید مغرب' دو آسمانی مسافر' شہید طرابلس' طرابلس سے ایک صدا' ایک عرب سیدانی' سیاہ داغ' افراط و تفریط' صدائے دل گداز' کلونتیاں اور میمونہ' کل دس چیزیں شامل ہیں۔ کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں طبع ہوا۔

۴۷۔ "تفسیر عصمت" (طویل مختصر افسانہ) مطبوعہ: عصمت بکڈپو' دہلی' طبع اول: ۱۹۲۹ء

یہ افسانہ پہلے پہل "عصمت" دہلی کے نقرئی جوبلی نمبر ۱۹۲۸ء میں طبع ہوا تھا۔ کل صفحات ۶۰۔ یہ کتاب چھ بار طبع ہو چکی ہے۔

۴۸۔ "ولائتی نخی" (مزاحیہ افسانہ) مطبوعہ: عصمت بکڈپو' دہلی' طبع اول: نومبر ۱۹۲۹ء

یہ افسانے "عصمت" دہلی میں قسط وار شائع ہو چکا تھا۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں ساتویں بار طبع ہوا۔

۴۹۔ "شہنشاہ کا فیصلہ" (تاریخی ناول) مطبوعہ: عصمت بکڈپو' دہلی' طبع اول: ۱۹۲۹ء

یہ ناول پہلے پہل "خطیب" ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا تھا۔ کل صفحات ۳۲۔ کل سات بار طبع ہوا ہے۔

۵۰۔ "وداع خاتون" (۳ مضامین) مطبوعہ: عصمت بکڈپو' دہلی' طبع اول: ۱۹۲۹ء

راشد الخیری نے یہ ۳ مضامین اپنی جواں مرگ بہو خاتون اکرم سے متعلق ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں "مہمان دلہن" "تعزیت نامہ اور آپ بیتی کے عنوان سے لکھے تھے۔ کل صفحات ۲۴۔ یہ کتاب چھ بار طبع ہوئی۔

۵۱۔ "منظر طرابلس" (تاریخی ناولٹ م) مطبوعہ: عصمت بکڈپو' دہلی' طبع اول: ۱۹۲۹ء

یہ ناولٹ پہلی بار "خطیب" ۱۹۱۸ء میں طبع ہوا تھا۔ کل صفحات ۴۰۔ کل چھ بار طبع ہوا۔

۵۲۔ "آمنہ کا لال" (مولود شریف) مطبوعہ: عصمت بکڈپو' دہلی' طبع اول: دسمبر ۱۹۳۰ء

یہ کتاب ۱۹۶۳ء تک ۱۲۸ صفحات کی ضخامت میں ۱۹ بار طبع ہوئی۔

۵۳۔ "گرفتار قفس" (شعری مجموعہ) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۱ء

نظمیں، سلام اور پہیلیاں۔ کل تین ایڈیشن طبع ہوئے۔

۵۴۔ "نسوانی زندگی" (افسانے) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۱ء

اس کتاب میں مامتا، فرشتہ بیوی، اشک ندامت اور بہن کی محبت کل چار افسانے ہیں۔ کل ۵۴ صفحات۔ ۱۹۴۷ء تک اس کتاب کے چار ایڈیشن طبع ہوئے تھے۔

۵۵۔ "سودائے نقد" (طویل مختصر افسانہ) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۲ء

یہ ۳۹ صفحات کا افسانہ پہلی بار "خطیب" ۱۹۱۸ء میں طبع ہوا۔

۵۶۔ "سیدہ کا لال" (تاریخ شہادت) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: جولائی ۱۹۳۱ء

یہ کتاب پانچویں بار ۱۹۳۵ء میں چھپی۔ ۱۹۶۳ء تک اس کے سولہ ایڈیشن طبع ہوئے۔ یہ شہادت نامہ آج تک محرم کی محفلوں میں پڑھا جاتا ہے۔

۵۷۔ "بیلہ میں میلہ المعروف، غدر کی ماری شہزادیاں" مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۲ء

اس کتاب میں کئی تصاویر ہاف ٹون بلاک کی تھیں اور ان میں تین رنگوں میں تصاویر تھیں۔ کل صفحات ۸۸۔ مئی ۱۹۲۹ء کے "عصمت" دہلی میں شائع ہونا شروع ہوا تھا اور جنوری ۱۹۳۲ء میں تمام ہوا۔

۵۸۔ "چہار عالم" (طویل مختصر افسانہ) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۵ء

یہ ۲۴ صفحات کا افسانہ "عصمت" دہلی ۱۹۲۴ء میں طبع ہو چکا تھا پھر "عصمت" کے "گلدستہ عید" میں شامل ہوا۔

۵۹۔ "عروس مشرق" (مضامین) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۶ء

یہ ۷۶ صفحات پر مشتمل کتاب کل ۵ بار طبع ہوئی۔

۶۰۔ "بزم رفتگاں" (خاکے) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۶ء

۹۴ صفحات کی یہ باتصویر کتاب کل تین بار طبع ہوئی۔ اس میں نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ام عطیہ النساء، خاتون اکرم، نجمہ اختر بانو سروردیہ، ز۔ پ۔ ش، جان بار سید، جان بار بچی مرحوم بیگم بھوپال، مولوی بشیر احمد، مرزا غالب، میر جالب، میر ناصر علی، صغرا بیگم، مولوی اشرف حسین، قاری سرفراز حسین اور اشرف گورگانی کے خاکے ہیں۔

۶۱۔ "قرآنی قصے" (مذہبی مضامین) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۶ء

کل ۱۳۴ صفحات کی کتاب ۱۹۶۳ء تک چار بار شائع ہوئی۔

۶۲۔ "بے فکری کا آخری دن" (مضامین) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۶ء

یہ مضامین کنواری لڑکیوں کے لیے ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۲ء "عصمت" اور "سہیلی" میں شائع کیے گئے یہ مجموعہ تین بار شائع ہو چکا ہے۔

۶۳۔ "نالۂ زار" (مضامین) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۶ء

یہ مضامین "عصمت" دہلی و "تمدن" دہلی میں ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۸ء شائع ہوئے۔ کتاب کے کل صفحات ۸۸۔ یہ مجموعہ تین بار شائع ہوا۔

۶۴۔ "گرداب حیات" (۲۵ افسانے) مطبوعہ: عصمت بکڈپو دہلی، طبع اول: ۱۹۳۶ء

کتاب میں شامل ۱۹ افسانے مصنف نے اپنے نام سے طبع نہیں کروائے تھے۔ یہ افسانے ۱۹۱۰ء تا ۱۹۲۲ء کے "عصمت" اور

"سہیلی" دہلی میں طبع ہوئے۔ کل صفحات ۱۳۲۔ تین ایڈیشن طبع ہوئے۔

۶۵۔ "سیاحت ہند" (سفرنامے) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی طبع اول: اگست ۱۹۳۶ء

۳۳۔ ۱۹۲۳ء میں تربیت گاہ بنات کے سلسلے میں جو دورے کیے ان کے حالات "عصمت" "بنات" "رہبر دکن" اور "تنظیم" میں شائع ہوئے تھے۔

۶۶۔ "دادا لال بجھکڑ" (مزاحیہ افسانے) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی طبع اول: ۱۹۳۵ء

اس مجموعے میں مولوی صاحب کا وعظ، شاہد رو بل، بھائی ظفر اقرار نامہ لکھ رہے ہیں اور کبڑی بیگم کل چار افسانے شامل ہیں۔

۶۷۔ "گدڑی میں لعل" (مضامین) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی طبع اول: ۱۹۳۶ء

۱۹۰۹ء تا ۱۹۲۴ء رسالہ "عصمت" دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ ۱۹۶۴ء تک ۵ بار طبع ہوا۔

۶۸۔ "بساط حیات" (۴ افسانے) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی طبع اول: ۱۹۳۷ء

بے زبانوں کا صبر (عصمت ۱۹۰۹ء) حیات انسانی پر دو پرندوں کی بحث (تمدن ۱۹۱۴ء) داستان بلبل اسیر (عصمت ۱۹۱۶ء) جانور کون ہے (نظام المشائخ ۱۹۱۷ء) کل چار افسانے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔ کل صفحات ۴۸۔

۶۹۔ "نشیب و فراز" (کہانیاں) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی طبع اول: ۱۹۳۷ء

۸ کہانیاں جنہیں علامہ نے لڑکیوں کے فرضی ناموں سے رسالہ "عصمت" ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۸ء میں لکھا تھا۔ یہ ۳۲ صفحات کا مجموعہ تین بار شائع ہو چکا ہے۔

۷۰۔ "مسلی ہوئی پتیاں" (مضامین / افسانے) مطبوعہ: عصمت بکڈپو دہلی طبع اول: ۱۹۳۷ء

۱۱ افسانوں کا مجموعہ، تمام افسانے خطوط کے انداز میں لکھے گئے ہیں جو ۱۹۰۳ تا ۱۹۱۹ء تک "مخزن" لاہور "عصمت" دہلی اور "تمدن" دہلی میں طبع ہوئے۔ اس مجموعے میں "بڑی بہن کا خط" کے عنوان سے اردو کا اولین افسانہ "نصیر اور خدیجہ" مطبوعہ: ۱۹۰۳ء مخزن لاہور بھی شامل ہے۔

۷۱۔ "بلبل بیمار" (مضامین) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی طبع اول: ۱۹۳۷ء

۱۹ مضامین کا مجموعہ یہ مضامین "عصمت" دہلی اور "خطیب" دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

۷۲۔ "احکام نسواں" (مضامین) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی طبع اول: ۱۹۳۷ء

یہ کتاب تین بار طبع ہوئی۔ یہ مضامین رسالہ "بنات" دہلی میں شائع ہو چکے تھے۔

۷۳۔ "دعائیں" (نظم و نثر) مطبوعہ عصمت بکڈپو، دہلی طبع اول: ۱۹۳۷ء

کل صفحات ۶۴۔ تین بار طبع ہو چکی ہے۔

۷۴۔ "چمنستان مغرب" (تراجم) مطبوعہ: عصمت بکڈپو دہلی طبع اول: ۱۹۳۷ء

یہ تراجم اول اول رسالہ "سہیلی" دہلی ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئے۔ کتاب کی ضخامت ایک سو صفحات سے زائد۔ اس کتاب میں لارڈ ٹنی کی "لیلیٰ" کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ تراجم علامہ نے مختلف قلمی ناموں سے کیے تھے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

۷۵۔ "محسن حقیقی" (مضامین) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی طبع اول: ۱۹۳۷ء

حضور اکرمؐ کی ذات گرامی سے متعلق ۱۸ مضامین جو پہلی بار "نظام المشائخ" دہلی میں طبع ہوئے تے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہو چکا ہے۔

۷۶۔ "حور اور انسان" (افسانے) مطبوعہ: عصمت بکڈپو، دہلی طبع اول: ۱۹۳۷ء

۷ افسانوں کا مجموعہ ۔ کل صفحات ۹۶ ۔ کتاب کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں ۔

۷۷ ۔ " یادگار تمدن " (مضامین) مطبوعہ : عصمت بکڈپو ' دہلی ' طبع اول : ۱۹۳۷ء

رسالہ " تمدن " دہلی کے لیے لکھے گئے مضامین ۔ مجموعہ تین بار شائع ہو چکا ہے ۔

۷۸ ۔ " دلی کی آخری بہار " (مضامین) مطبوعہ : عصمت بکڈپو ' دہلی ' طبع اول : ۱۹۳۷ء

۲۵ مضامین جن میں دلی کا مرثیہ لکھا گیا ہے ۔ کل صفحات ۱۲۸ ۔ کتاب ۵ بار طبع ہو چکی ہے ۔

۷۹ ۔ " داستان پارینہ " (مضامین) مطبوعہ : عصمت بکڈپو ' دہلی ' طبع اول : ۱۹۳۷ء

غیر مسلم متعصب مورخین کے اعتراضات کا ۱۸ تاریخی مضامین میں جواب ۔ یہ مضامین " عصمت " دہلی میں شائع ہوئے تھے ۔ کل صفحات ۸۸ ۔ یہ مجموعہ ۴ مرتبہ شائع ہو چکا ہے ۔

۸۰ ۔ " ساجن موہنی " (مضامین) مطبوعہ : عصمت بکڈپو ' دہلی ' طبع اول : ۱۹۳۸ء

شوہر کیوں کر بگڑتے ہیں ۔ بے وقوف بیوی وغیرہ ۱۳ مضامین کا مجموعہ تین بار طبع ہوا ۔

۸۱ ۔ " زیور اسلام " (مذہبی مضامین) مطبوعہ : عصمت بکڈپو ' دہلی ' طبع اول : ۱۹۳۸ء

کل صفحات ۱۰۸ ۔ یہ مجموعہ چار بار طبع ہوا ۔

۸۲ ۔ " عالم نسواں " (مضامین) مطبوعہ : عصمت بکڈپو ' دہلی ' طبع اول : ۱۹۳۸ء

کل ۶۴ صفحات کا یہ مجموعہ ۳ بار طبع ہوا ۔

۸۳ ۔ " فریب ہستی " (مضامین) مطبوعہ : عصمت بکڈپو ' دہلی ' طبع اول : ۱۹۳۸ء

کل صفحات ۴۸ ۔ یہ مجموعہ ۳ بار طبع ہوا ۔

۸۴ ۔ " خدائی راج " (افسانے) مطبوعہ : عصمت بکڈپو ' دہلی ' طبع اول : ۱۹۳۸ء

کل صفحات ۱۳۲ ۔ سات افسانوں کا مجموعہ تین بار طبع ہوا ۔

۸۵ ۔ " مسلمان عورت کے حقوق " (مضامین) مطبوعہ : عصمت بکڈپو ' دہلی ' طبع اول : ۱۹۳۸ء

کل صفحات ۱۰۴ ۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا ۔

۸۶ ۔ " شادی کا انتخاب " (مضامین) مطبوعہ : عصمت بکڈپو ' دہلی ' طبع اول : ۱۹۳۸ء

کل صفحات ۵۶ ۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا ۔ اس کتاب میں ایک مضمون ڈاکٹر شائستہ سہروردی (شائستہ اکرام اللہ) کا بھی شامل ہے ۔

۸۷ ۔ " بکھری ہوئی پتیاں " (نظمیں اور مضامین) مطبوعہ : عصمت بکڈپو ' دہلی ' طبع اول : ۱۹۳۸ء

یہ مضامین اور نظموں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے راشد الخیری کی بکھری ہوئی تحریریں کہنا چاہیے ۔ کچھ مضامین اور نظمیں غیر مطبوعہ بھی ہیں ۔

۸۸ ۔ " بزم آخر " (ناول) مطبوعہ : عصمت بکڈپو ' دہلی ' طبع اول : ۱۹۶۳ء

غیر مطبوعہ قلمی آثار:

۱ ۔ تربیت گاہ بنات سے متعلق بارہ تیرہ سالوں میں علامہ نے جو مضامین لکھے ان میں سے انتخاب ممکن ہے ۔

۲۔ علامہ کے خطوط اور آٹوگراف کا ایک مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔

نظریہ فن:

" مجھے معلوم ہے کہ نوجوان تعلیم یافتہ ہر مذہبی حکم کو عقل کی ترازو اور فلسفہ کی کسوٹی پر تولتے اور پرکھتے ہیں۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں تامل نہ ہو گا کہ حقوق نسواں کے سلسلے میں میری زبان سے جو کچھ نکل رہا ہے، مذہب سے علیحدہ ہو کر بھی ایک لفظ ایسا نہیں جس سے عقل سلیم متفق نہ ہو۔"

(خطبہ۔ انجمن حمایت اسلام لاہور جنوری ۱۹۲۵ء)

○

۱۔ " بہترین انشائی ادب " مرتبہ : ڈاکٹر وحید قریشی میں تاریخ پیدائش غلط درج ہے۔

۲۔ بحوالہ : " شاہجہان آباد کے عناصر اربعہ " از راشد الخیری، مشمولہ " بزم رفتگاں "

۳۔ علامہ نے بستر مرگ پر آخری شعر کہا:

ہے یہ بہار آخری، اس کو غنیمت جانیے
صحبت شب پھر کہاں راشد کے اٹھ جانے کے بعد

۴۔ بحوالہ : دیباچہ " صالحات " مطبوعہ : اقبال پرنٹنگ ورکس، دہلی طبع اول : ۱۸۹۸ء

قسیم کی سنگ دلی

قسیم دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں گھڑی آدھ گھڑی کو کھڑے کھڑے آتا۔ مزاج میں غصہ دل میں کپٹ، آنکھ میں میل، تیوری پر بل، الٹی سیدھی ایک آدھ بات کی اور دیوان خانے میں جا لیٹنا پھر یہ بھی حکم نہ تھا کہ کوئی وہاں آ سکے۔ نسیمہ تو خیر بیوی تھی اور بیوی بھی دور اندیش۔ اس نے قسیم کی محبت پر کبھی بھروسہ ہی نہ کیا۔ مگر معصوم بچے پر سخت مصیبت آ کر پڑی۔ باپ کی یہ بے اعتنائی پھول سے کلیجے پر سخت چرکا تھا ساری ساری رات اور پورے پورے دن باپ کو یاد کرتا۔ اور ابا ابا کہتا۔ تین ساڑھے تین برس کا بچہ۔ بہت سی باتیں اپنی سمجھ کے لائق خاصی سمجھ لیتا۔ گرتا پڑتا باپ کے پیچھے پیچھے اس کے پاس پہنچتا۔ اور وہ کم بخت رخ نہ کرتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ وہ ابا ابا رٹتا ہوا اور روتا بلکتا اس کے پیچھے گیا۔ اور ظالم نے بازو پکڑ کر گھر میں چھوڑ کر کنڈی لگا لی۔ بہتیرا نسیمہ اس کو بہلاتی چمکارتی اور سمجھاتی۔ مگر باپ کی یاد ننھے سے دل سے دم بھر کو بھی فراموش نہ ہوتی۔ ایک دن رات کے وقت گیارہ بجے ہوں گے۔ نسیمہ اپنے لال کو کلیجے سے چمٹائے بے خبر پڑی تھی۔ کہ باپ کے قہقہوں کی آواز سے نسیم کی آنکھ کھل گئی۔ سیدھا اٹھ کر مسکراتا ہوا باپ کے پاس چلا گیا۔ بچے کا آنا اس وقت جبکہ قسیم اپنے نئے دوستوں کی صحبت میں مزے اڑا رہا تھا، بہت ہی غضب معلوم ہوا۔ اس بیدردی سے اس کو باہر نکالا کہ دیکھنے والے بھی دنگ رہ گئے۔ قسیم کی دونوں بہنیں چند روز کے واسطے وطن گئیں اب صرف نسیمہ اور اس کا بچہ گھر میں رہ گئے تھے۔

بیس پچیس روز تک باپ کی اس سنگ دلی پر بھی نسیم پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ اس نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ اور ضبط کیا۔ مگر اس کے بعد ننھی سی جان زیادہ تاب نہ لا سکی ایک دن ادھر قسیم گھر آیا اور ادھر وہ جا کر باپ کے پاؤں میں لپٹ گیا لیکن افسوس شقی القلب باپ نے اس طرح پاؤں جھٹکایا کہ بچے کے منہ میں ایڑی لگی اور خون نکل آیا وہ تڑپتا ہی رہا اور قسیم یہ جا وہ جا۔

اس واقعے کا تیسرا روز تھا کہ نسیمہ نے بچے کو نہلایا۔ سر میں تیل ڈالا۔ کنگھی کی۔ کر چکی تو اس کی صورت دیکھی۔ پیار آیا۔ گود میں اٹھا کلیجے سے لگایا۔ مگر آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ نسیم ماں کی حالت دیکھ کر کچھ ایسا بے چین ہوا کہ اپنے کرتے کے دامن سے ماں کے آنسو پونچھے اور کہا "اماں جان! کیوں روتی ہو؟"

نسیمہ۔ "بیٹا! رو نہیں رہی چلو چل کر لیٹ جاؤ"

نسیم۔ "اماں! ابا ہم کو گود میں نہیں لیتے۔ خیر میں اب بڑا ہو جاؤں گا۔ میں بھی اماں ہی کو گود میں لوں۔ ان کو کبھی نہ لوں گا"۔

نسیمہ بچے کی بات پر مسکرا دی۔ خوب بھینچ کر پیار کیا اور کہا۔ اللہ تمہاری عمر دراز کرے تم جیتے رہو یہی سب کچھ ہے۔

" دوپہر ہو چکی تھی۔ لے کر لیٹی تو بچہ سو گیا۔ ظہر کی اذان ہوئی تو نماز کو اٹھی۔ فارغ ہو کر بچے کے پاس آئی تو اس کا پنڈا پھنکا تھا۔ کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ بچے کو تو اس غضب کا بخار پڑھا کہ ابھی تو یہ عشا کے وقت تک وہ معصوم چنوں کی طرح بھن رہا تھا۔ اتنا بڑا ڈھنڈار گھر بھاں بھاں کر رہا تھا۔ ماما چلی گئی۔ اور نسیمہ اپنے لال کو گود میں لئے پڑی رہی۔ دن کی باتیں یاد آئیں۔ کلیجے پر تیر برسے۔ لمحہ لمحہ بعد دیکھتی تھی کہ شاید بدن پسیج گیا ہو مگر وہاں تو بھاڑ بھن رہا تھا۔ قسیم آج کسی خاص جلسے میں تھا۔ معصوم بچہ ظالم باپ کو بخار کی حالت میں خواب میں دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً" آنکھ کھولی۔ ابا کہہ کر ماں سے لپٹ گیا۔ ماں نے ہر چند چمکارا۔ مگر وہ روتا پیٹتا گود سے اترا اور دیوان خانے کے دروازے پر گیا۔ اور باپ کو بلاتا رہا۔ لاکھ

نسمہ کہہ رہی تھی کہ بیٹا ابھی نہیں آئے۔ مگر وہ بلک رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ اماں جان! اندر لیٹے ہیں ٹھنڈی لگائی ہے۔ اب نسمہ بچے کو گود میں اٹھا کر اندر کے دالان میں آئی۔ منہ پر منہ رکھا۔ پیار کیا۔ چمٹایا گلے میں ہاتھ ڈالے ننھے ننھے ہاتھوں کو سینے پر رکھا اور رو کر کہا۔ "معبود حقیقی! یہ دکھیا مصیبت زدہ نسمہ کا لال تیری امانت ہے الہٰ العالمین! مجھ بدنصیب پر رحم کیجو۔ بچے آقا! اچھے معبود! دکھیاری کا لال شکستہ دل کا چراغ ہے۔" نسمہ یہیں تک پہنچی تھی کہ نسیم پھر اٹھا اور کہنے لگا۔ اچھی ماں جان! چھوڑ دو دیکھو ابا جان گملوں کے پاس کھڑے ہیں۔

نسمہ کے پاس اس کا کچھ جواب نہ تھا۔ آنکھ سے آنسو کی جھڑیاں بہہ رہی تھیں۔ کبھی اس کو سینے سے لگاتی اور اس کی ضد پر چھوڑ دیتی تین بج چکے تھے۔ چار برس کا پلا پلایا بچہ آج ماں کے ہاتھوں میں تھا۔ بارش زور شور سے ہو رہی تھی۔ اور اس عظیم الشان مکان میں ایک بدنصیب ماں اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو لئے بیٹھی تھی۔ ماتھے پر ہاتھ پھیرتی پاؤں کو پیار کرتی۔ بلبلاتی اور روتی۔ بچے نے پانی مانگا رات کا وقت تھا۔ گود میں لے کر دروازے پر آئی کہ کسی سے شربت منگوا کر معصوم کا حلق تر کر دوں۔

مگر سڑک پر سناٹا تھا۔ الٹی لوٹی اور یہ کہہ کر پانی پلا دیا۔ "کلیجے کے ٹکڑے! شربت بھی نصیب نہ ہوا۔"

نسمہ اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ نسیم کو پھر غفلت ہوئی۔ اور ماں کا منہ اس کے ہونٹوں پر تھا کہ وہ چونکا اور کہا اچھی اماں! وہ آ گئے۔ ابا آؤ ابا.....

بتیرا ہی نسمہ نے اس وقت بہلانا چاہا۔ مگر بچہ نہ سنبھلا کھڑا ہوا۔ مگر گرا۔ گرتے ہی ماں نے گود میں لیا لیٹتے ہی آنکھیں پھر لیں۔ ابا زبان سے نکلا۔ مگر پہلی ہی آواز پر اس کو ایک ہچکی آئی۔ آنکھیں ماں کی صورت پر 'اور زبان باپ کی یاد میں تھی۔ کہ نسمہ کی گود میں اس کا لال ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

سجاد حیدر یلدرم

اصل نام : سید سجاد حیدر۔
قلمی نام : خانی خان / مسٹر شولری علیگ / یلدرم۔
تاریخ پیدائش : ۱۸۸۰ء بہ مقام: موضع نہٹور، ضلع بجنور (بھارت)
تاریخ وفات : ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء رات دو بجے لکھنؤ میں انتقال کیا۔
تعلیم : ابتدائی تعلیم بنارس میں پائی۔

انٹرمیڈیٹ: ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ۔ الہ آباد یونیورسٹی کے تحت لیے گئے امتحان میں صوبہ بھر میں اول تھے لیکن ریاضی میں فیل ہو گئے۔ اس سے قبل مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ ۱۹۰۱ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں سیکنڈ رہے۔

مختصر حالاتِ زندگی:

آپ کے والد سید جلال الدین حیدر شہر بنارس کے کوتوال تھے۔ یلدرم بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ناگ پور کے راجہ اعظم شاہ کے اتالیق مقرر ہو کر ناگ پور گئے، بعد میں گورنمنٹ نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر علی گڑھ کالج بھجوا دیا۔ اس زمانہ میں بغداد کے برطانوی قونصل خانے میں ایک ترجمان کی جگہ نکلی تو کالج کے پرنسپل موریسن کی سفارش اور ترکی زبان میں شد بد کی وجہ سے یلدرم کا انتخاب عمل میں آیا اور یلدرم بغداد چلے گئے۔ وہاں سے ان کا تبادلہ قسطنطنیہ کے سفارت خانے میں ہو گیا۔ کئی برس تک سلطنت عثمانیہ اور مشرقی یورپ میں سیر و سیاحت کا موقع ملا۔ ایک بار ہندوستان آئے اور واپس بغداد نہ گئے۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نے یلدرم کو معزول امیر کابل امیر یعقوب علی خان پر سوری میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کر دیا۔ امیر یعقوب علی خان کے انتقال کے بعد پولیٹیکل سروس سے فراغت ملی تو راجہ صاحب محمود آباد کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ یہاں سے ان کی خدمات یو۔ پی سول سروس کے سپرد کر دی گئیں اور ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ جب راجہ صاحب محمود آباد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بنے تو یلدرم کی ملازمت یونیورسٹی میں منتقل کر دی گئی اور یلدرم ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے اولین رجسٹرار مقرر ہوئے۔ رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۳۰ء) کے بعد یونیورسٹی کی انتظامیہ تبدیل ہوئی تو بطور ریونیو کمشنر جزائر انڈمان و نکوبار میں رہے۔ وہاں سے واپسی پر غازی پور اور اٹاوہ کے ضلعوں میں تعینات رہے۔ ۱۹۳۵ء میں خرابی صحت کی بنا پر پنشن لے لی۔ یلدرم آخری زمانے میں راجہ صاحب محمود آباد کے پرسنل سیکرٹری تھے۔ عمر کے آخری ایام دھرہ دون میں گزارے۔ انہیں گاؤٹ کا مرض لاحق تھا، وفات حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوئی۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"غربت و وطن" مطبوعہ: اردوئے معلیٰ، اکتوبر ۱۹۰۶ء

(نوٹ) "نشہ کی پہلی ترنگ" (ترکی سے خلیل رشدی کے افسانے کا ترجمہ) "معارف" علی گڑھ۔ جلد نمبر (۳) شمارہ (۴) اکتوبر ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "خیالستان" (سات افسانے اور چھ مضامین) ادارہ "مخزن" لاہور، طبع اول: ۱۹۱۱ء

۱۔ "خارستان و گلستان" ("مخزن" میں تین اقساط میں شائع ہوا۔ گلستان کے عنوان سے جلد ۱۱ شمارہ ۳ جون ۱۹۰۶ء کے صفحات ۱ تا ۱۱ پر خارستان کے عنوان سے جلد ۱۱ شمارہ ۵ اگست ۱۹۰۶ء کے صفحات ۱ تا ۱۱ پر اور شیرازہ کے عنوان سے جلد ۱۱ شمارہ ۶ دسمبر ۱۹۰۶ء کے صفحات ۱ تا ۹ پر تیسری قسط کے اختتام پر مخلص بھی لکھا گیا ہے) ۲۔ "دوست کا خط" "مخزن" کی جلد ۱۲ شمارہ ۱، اکتوبر ۱۹۰۶ء کے صفحات ۹ اور ۱۰ پر شائع ہوا ۳۔ "غربت و وطن" ("اردوئے معلی" علی گڑھ کی جلد ۷ شمارہ ۴ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا) ۴۔ "چڑیا چڑے کی کہانی" ("مخزن" کی جلد ۱۳ شمارہ ۱، اپریل ۱۹۰۷ء کے صفحات ۲۷ تا ۳۵ پر شائع ہوا) ۵۔ "نکاح ثانی" ("مخزن" کی جلد ۱۳ شمارہ ۳، جون ۱۹۰۷ء کے صفحات ۲۲ تا ۳۵ پر شائع ہوا) ۶۔ "حکایہ لیلیٰ مجنوں" ("مخزن" میں تین اقساط میں شائع ہوا۔ پہلی قسط جلد ۱۴ شمارہ ۱، اکتوبر ۱۹۰۷ء کے صفحات ۹ تا ۲۳ پر دوسری قسط جلد ۱۵ شمارہ ۱، اپریل ۱۹۰۸ء کے صفحات ۱۹ تا ۲۶ پر اور تیسری قسط اسی جلد کے دوسرے شمارے (مئی ۱۹۰۸ء) کے صفحات ۱۲ تا ۱۹ پر موجود) ۷۔ "اگر میں صحرانشیں ہوتا" ("مخزن" کی جلد ۱۴ شمارہ ۳ (دسمبر ۱۹۰۷ء) کے صفحات ۹ اور ۱۰ پر شائع ہوا) ۸۔ "سودائے سنگیں" (پہلی قسط "مخزن" کی جلد ۱۵ کے شمارہ (۵ اگست ۱۹۰۸ء) کے صفحات ۹ تا ۲۰ پر اور دوسری قسط اگلے شمارے (دسمبر ۱۹۰۸ء) کے صفحات ۸ تا ۲۲ پر شائع ہوئی) ۹۔ "صحبت ناجنس" ("مخزن" کی جلد ۱۰ شمارہ ۵ (فروری ۱۹۰۶ء) میں لڑکیاں اور یورپی تربیت کے عنوان سے شائع ہوا یہ ترکی افسانے کا ترجمہ ہے ۱۰۔ "ازدواج محبت" (ترکی افسانے کا ترجمہ)۔

(نوٹ) اس کتاب کا ایک ایڈیشن الناظر بک ایجنسی لاہور، نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ افسانہ "چڑیا چڑے کی کہانی" کا خیال پروفیسر شہباز (اورنگ آباد۔ دکن) کے منظوم طبع زاد قصے "چڑیا چڑے کی کہانی" مطبوعہ "مخزن" لاہور شمارہ نمبر ۲ جلد نمبر ۴ بابت: نومبر ۱۹۰۲ء سے مستعار ہے۔

۲۔ "حکایات و احساسات" (۱۳ افسانے اور ۱۲ مضامین) مسلم یونی ورسٹی، پریس، علی گڑھ، طبع اول: ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۷-۱۹۲۶ء

(حکایات) ۱۔ "آئینے کے سامنے" ۲۔ "نشہ کی پہلی ترنگ" (خلیل رشدی کے ترکی افسانے کا ترجمہ) ۳۔ "فسانہائے عشق" (الف) ہندوستان کی رقاصہ (ب) مصر قدیم کی محبوبہ ہائے عاشق نواز (ج) بخت نصر کا قیدی ۴۔ "گمنام خطوط" (فہرست میں گمنام خط درج ہے) ۵۔ "بزم رفتگاں" ۶۔ "کوسم سلطان" ۷۔ "عورت کا انتقام" ۸۔ "داماد کا انتخاب" (احساسات) ۹۔ "ایک مغنیہ سے التجا" ۱۰۔ "آؤ یہ نظریں" ۱۱۔ "تیتری" ۱۲۔ "اے مادر وطن" ۱۳۔ "ویران صنم خانے"

(نوٹ) "حکایات" کے حصے کی چند چیزیں خالدہ ادیب خانم کے ترجمے ہیں۔

۳۔ "حکایات لیلیٰ مجنوں" (افسانے) الناظر بک ایجنسی، لاہور، طبع اول: ۱۹۳۴ء سے قبل۔

اس کتاب کی اکثر چیزیں "خیالستان" اور "حکایات و احساسات" سے چنی گئی ہیں۔

۴۔ "ثالث بالخیر" (ترکی ناول) از احمد حکمت (ترجمہ) طبع اول: ۱۹۰۳ء

۵۔ "زہرا۔" ترکی ناولٹ (ترجمہ) طبع اول: ۱۹۰۳ء

۶۔ "مطلوب حسیناں" ترکی ناولٹ (ترجمہ) طبع اول: ۱۹۰۳ء

۷۔ "آسیب الفت" ترکی ناولٹ (ترجمہ) مکتبہ جامعہ دہلی طبع اول: ۱۹۳۰ء

۸۔ "ہما خانم" ترکی ناول (ترجمہ) ادارۂ ادبیہ حیدر آباد دکن طبع اول: س۔ن

۹۔ "ایک کہانی چھ ادیبوں کی زبانی" (بہ اشتراک)

۱۰۔ "جلال دین خوارزم شاہ" (ترکی ڈراما) از نامق کمال (ترجمہ) طبع اول: ۱۹۳۶ء

۱۱۔ "جنگ و جدل" ترکی ڈراما (ترجمہ)

۱۲۔ "پرانا خواب" (طویل نظم ترکی زبان سے ترجمہ)

۱۳۔ "مرزا پھویا علی گڑھ کالج میں" (طویل طبع زاد نظم) طبع اول: علی گڑھ کالج میگزین ۱۹۰۳ء

۱۴۔ "پرانا خواب" (ڈرامہ۔ ناولٹ) اس کتاب میں "پرانا خواب" "آسیب الفت" اور "مطلوب حسیناں" تین مختصر کتب یکجا ہیں۔

نظریہ فن:

"ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویر" میں اردو میں اس لیے ضروری سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب پیش آ رہا ہے وہ انہیں بھی پیش آ چکا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اس نقشے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے ہیں اور اب کہاں ہیں۔"

سجاد حیدر یلدرم

("التماس مترجم" مشمولہ "ثالث بالخیر" ۱۹۰۲ء سے اقتباس)

سجاد حیدر یلدرم

دوست کا خط

تو پیارے دوست کا پیارا خط ہے! تجھ میں وہ کون سی برقی شے بھری ہے جو میرے دل کو دھڑکاتی ہے! تجھے کھولتے وقت ہاتھ کیوں کانپنے لگتے ہیں؟ آخر تجھ میں اور کاغذوں سے کیا برتری ہے؟ تو بھی کاغذ کا ٹکڑا' وہ بھی کاغذ کے ٹکڑے' بلکہ وہ تجھ سے زیادہ بڑے ہیں۔ ہاں باعث تفاخر و تفوق یہی ہے نا کہ دوست نے تجھے لکھا! لب پان خوردہ سے اف' لب پان خوردہ سے لفافہ بند کیا؟ بے شک' بے شک یہ بہت بڑا تفوق ہے۔ اچھا میں تیرا امتحان لیتا ہوں' تجھے نمبر دیتا ہوں' سو میں دیکھوں تجھے کتنے نمبر ملتے ہیں۔

ان کے ہاتھوں سے چھوئے جانے کے ۴۰

اس بات کے کہ دستہ کاغذ میں سے تجھے ہی منتخب کیا ۵۰

ان لبوں سے لفافہ کو بند کیا ۷۰

۱۶۰

ہیں! تو نے سو سے زیادہ نمبر پائے۔ نہیں یہ امتحان نہیں ہوا۔ دوسرے طریقے سے شمار ہونا چاہیے۔

اس بات کے کہ تجھے میرے لیے انتخاب کیا اور کسی دوسرے کے لیے نہیں منتخب کیا ... ۶۰

اس بات کے کہ ان کے قلم کی تحریر تجھ پر ہے ... ۴۰

اس بات کے کہ ان کے چہرے کا عکس تجھ پر پڑا۔ کیوں کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ رات کو لکھا ہے ... ۵۰۰

۶۰۰

کیا؟ پھر سو سے زیادہ ہو گئے۔ یہ ٹھیک نہیں'

اچھا تیسری بار پھر امتحان۔

اس بات کے کہ تو ان کے مژدہ صحت و خوشنودی مزاج کی خبر لایا۔

اس بات کے کہ تجھے چاک کر دیے جانے کا حکم ہے ... ۱۰۰۰

یہ کیا؟ نمبر تو سو سے پھر بڑھ گئے ......

نہیں۔ نہیں! میں بے فائدہ کوشش نہیں کرنے کا۔ تو امتحان سے بالا' موازنہ سے اعلیٰ' قید مقابلہ و مقایسہ سے آزاد' پیارے دوست کا پیارا پیارا' ہائے میں کیسے ظاہر کروں' کتنا پیارا خط ہے! تو سینہ سے لگایا جائے گا' تو نظر اغیار سے بچایا جائے گا مگر (حاشا) تو چاک نہیں کیا جائے گا۔ تو میرے پاس محفوظ رہے گا اور میں ہزاروں مرتبہ تجھے تنہا گوشوں میں پڑھوں گا۔

سجاد حیدر یلدرم

چڑیا چڑے کی کہانی

(چڑے کی زبانی)

"چوں چو چوں ' چڑچوں " "سب غلط ' سب جھوٹ! چڑیا چڑے کی کہانی بہت بہت انسانوں نے لکھی ہے مگر قلم در کف دشمن ست "چوں ' چو چوں ' چوں ' میری اور چڑیا کی لڑائی ' بہتان! چڑیا کا آنکھیں دکھنے کا بہانہ کرنا ' افترا ' چوں ' چڑچوں ' چوں چوں ' آؤ اب میں تمہیں چند باتیں سناؤں کہ تمہاری آنکھیں کھلیں:

حضرت انسان کو باتیں بنانی بہت آتی ہیں ' اور بس مجھ کو خدا نے مشاہدے کی قوت عطا کی ہے۔ ویسے دیکھو تو میں بیوقوف بھولا بھالا ادھر ادھر پھدکتا نظر آتا ہوں مگر میں دیکھتا سب کچھ ہوں ' سمجھتا سب کچھ ہوں ' کہتا بھی سب کچھ ہوں ' مگر تم نہیں سمجھتے۔

میں دیکھتا ہوں کہ خدا نے مجھے "آزاد " آزادی طلب اور آزادی پسند مخلوق بنایا ہے۔ پرندوں اور چرندوں میں بہت سے ایسے ہیں کہ انسان سے بالکل نفرت کرتے ہیں اور جنگلوں میں انسان کے گھونسلوں سے دور جا کے رہتے ہیں۔ بعض بیوقوف ایسے ہیں کہ انسانوں میں انسان کے خادم ہو کے رہتے ہیں ' مگر میں انسان کی کارستانیوں کو دیکھنے کے لیے شہر میں رہتا ہوں۔ ان کے بڑے بڑے بھونڈے گھونسلوں میں اپنا پیارا پیارا چھوٹا چھوٹا گھونسلہ بناتا ہوں ' لیکن وہ پکڑ کے مجھے رکھنا چاہیں تو کبھی نہیں رہتا۔ پنجرے میں بند کر کے رکھنے کی بات دوسری ہے۔ یا میرے پر کاٹ دیں تو وہ اور ہی بات ہے ورنہ میں کبھی حضرت انسان سے مانوس نہیں ہوتا۔ میں انہیں خود غرض سمجھتا ہوں اور پرلے درجے کا ظالم۔

مگر مجھے اپنی کہانی سنانی ہے ' ضمناً " حضرت انسان سے بھی دو باتیں ہو جائیں گی۔ (پھدک کے اور پروں کو پھیلا کے) خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسا اچھا لباس دیا ایک حد تک خوبصورت ' مگر نہ اتنا کہ انسان کی حریص نگاہوں کا ہدف بن جاؤں۔ جسم میں پھرتی دی کہ خوشی خوشی پھدکتا پھروں۔ چھوٹے پروں میں پرواز کی تیز طاقت دی کہ انسانوں کی رفیق ' ان کی ہم خصال ان کی چہیتی بلی کی دست برد سے بچوں ' جسم ایسا موزوں دیا کہ بیان نہیں ہو سکتا ' نہ اتنا بڑا کہ شاہین اور باز مجھ پر جھپٹیں ' جیسے وہ کبوتر پر جھپٹتے ہیں ' نہ اتنا چھوٹا کہ حشرات الارض کی طرح بالکل حقیری ہو جاؤں اور کوئی مجھے دیکھے ہی نہیں۔

آواز کیسی اچھی ' چوں چوں ' چڑچوں چڑچوں کہ آپ کے نزدیک اگر یہ خوش آیند نہ ہو تو نہ سہی اور میں خوش ہوں کہ آپ اسے پسند نہیں کرتے لیکن میرے ننھے دل کی خوشی اور طمانیت ظاہر کرنے کے لیے یہ بہت کافی ہے۔ چوں چوں ' چڑچوں۔ شکر ہے خدا کا کہ اس نے بلبل کا ترانہ شیریں اور نالہ رنگیں مجھے نہیں دیا ورنہ صیاد اور قفس ہی میرے رفیق ہوتے۔ بے وقوف بلبل کو دیکھیے ' قفس میں بیٹھ کے بھی گاتی ہے اور اپنی اشارت پر درد انگیز نہیں ' دل آویز نالے کرتی ہے اور یہ نہیں سمجھتی کہ یہ اس کی اسیری کو اور بڑھاتے ہیں۔

گل و گلچیں کا گلہ بلبل ناشاد نہ کر
تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

اگر ذرا بھی عقل ہوتی قفس میں پہنچتے ہی خاموش ہو جاتی اور اس وقت تک خاموش رہتی کہ یا قفس کھلتا یا موت آتی۔

میں اڑتا ہوں، پھدکتا ہوں، دانے چگتا ہوں، مگر الحمدللہ کسی کو آزار نہیں دیتا۔ خدا کی زمین سب کے لیے اور اس کے دانے سب کے لیے ہیں یہ فلسفہ قدرت نے مجھے سمجھا دیا ہے اور اس لیے میں سب سے کہتا ہوں آؤ اور کھاؤ اور خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ جہاں سے بہت سے دانے ہوئے اور ہم اپنے تمام ہم جنسوں کے ساتھ پہنچے، پھر وہاں اگر اور مخلوق چگ رہی ہے تو میں معترض نہیں ہوتا۔ کبوتر ہوں، مینائیں ہوں، فاختائیں ہوں سب کو صلائے عام ہے سب ساتھ آئیں اور کھائیں۔ میں اکل کھرا نہیں، تنہا خوری میری عادت نہیں۔

حضرت انسان کی بعض باتوں پر مجھے بے ساختہ ہنسی آتی ہے: قہ، قہ، چوں، چڑ چوں، چڑ، چوں، چوں کس قدر مغرور، مگر سادہ لوح جنس ہے میرا نام کنجشک خانگی رکھا ہے۔ یعنی جب انسان کے یہ گھونسلے جن میں وہ آج کل رہتے ہیں، نہ تھے اور وہ بہائم کی طرح غاروں اور کھوؤں میں رہتے تھے تو میں نہ تھا؟ میرا گھونسلہ نہ تھا؟ یا کیا اب میں سوائے ان کے گھونسلوں کے کسی اور جگہ اپنا گھونسلہ نہیں بناتا۔ اب بھی چمن، صحرا، مرغزار، وادی، درخت جھاڑی میرے گھونسلے کے لیے ویسے ہی موجود ہیں جیسے انسان کے گھونسلے۔

میں تو ان کے بے ہنگم، موٹے بھونڈے گھونسلوں میں اپنا گھونسلہ صرف اس لیے بناتا ہوں کہ یہاں رہ کر اس ریاکار مخلوق کے کرتوتوں کو اچھی طرح مشاہدہ کروں اور پھر اپنے ہم جنسوں میں بیٹھ کر ان خود بینوں، ان بے وقوفوں، مغروروں کے اوپر ہنسوں، اگر میں انہیں انسان خانگی کہوں تو زیادہ زیبا ہے۔

پھر ان کے گھونسلوں کا حال سنئے، ایک بڑا ہے، ایک چھوٹا ہے، ایک اونچا ہے ایک نیچا ہے، یہ کیوں؟ مساوات کیوں نہیں؟ اسے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کے گھونسلوں کے اندر کے خس و خاشاک جنہیں انسان کیا کہتے ہیں، بھول گیا، ہاں! میز، کرسی، فرش فروش مختلف رنگوں کے ہوں، کیونکہ میں بھی کہیں سے تاگا، کہیں سے تنکا، کہیں سے پتا لا کر اپنا گھونسلہ بناتا ہوں۔ لیکن، بڑائی، چھوٹائی کیوں ہے؟ ہاں، ہاں، یہ خیال نہیں رہا تھا اس کی وجہ معلوم ہوئی میں نے دیکھا ہے۔ چھوٹے گھونسلے والا انسان، بڑے گھونسلے والے انسان کے سامنے سر جھکا کے، ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوتا ہے، اس کی خدمت کرتا ہے، لاحول ولا قوۃ، کس قدر بے غیرت مخلوق ہے۔ میں نہ اپنے ہم جنس کی اور نہ کسی غیر جنس کی خدمت کرتا ہوں، اگر مار بھی ڈالو تو خدمت نہ کروں، اور کیوں کروں خدا کے فضل سے ہم سب مساوی ہیں۔ کسی کو ایک دوسرے کی خدمت کرنے کی ضرورت ہے نہ آرزو۔ اپنے بال بچوں کے سوا کسی کی خدمت کرنا، کسی کے گھونسلے پر جا کر دریوزہ گری کرنا عار کی بات ہے، ننگ کی بات ہے مگر انسان --- وہ مدعی عقل، احمق جو اپنے تئیں درس آموز قدرت خیال کرتا ہے اس نکتے کو نہیں سمجھتا۔

ہائے ریاکار انسان، اس نے ایک لفظ نکالا ہے اور اس پر اسے بہت ناز ہے، کہتا ہے سوائے میرے کسی میں حیا نہیں، سب جاندار سوائے انسان کے بے حیا ہیں، حیا و شرم کا احساس صرف مجھ میں ہے، او ڈینگ مارنے والی مخلوق، بس بس جسے تو حیا کہتا ہے وہ ریاکاری ہے۔

انسان چڑا اور انسان چڑیا، کبوتر چڑا اور کبوتر چڑیا، دانہ بدلی کرنے اور پوٹا بھرانے میں ایک ہیں۔ میں نہیں جانتا انسان نے یہ عادت کبوتر سے لی ہے یا کبوتر نے انسان کی نقل اتاری ہے۔ میں اس کی تحقیق نہیں کر سکتا کیونکہ کبوتر اگرچہ پرندہ ہے، لیکن ایسا احمق قدر حریت ناشناس پرندہ ہے کہ انسان سے بہت مانوس ہے اور ایسا کاہل ہے کہ اپنے لیے گھونسلہ بھی نہیں بناتا، انسان اس کے لیے گھونسلہ بناتا ہے اور یہ اس کے عوض میں اس کا درم ناخریدہ غلام بن جاتا ہے۔ وہ اسے پکڑتا ہے مگر پنجرے میں بند نہیں کرتا پھر بھی یہ اس سے نفرت نہیں کرتا اور اڑ نہیں جاتا۔

لیکن کبوتر، گو اسے رات دن غڑغوں کی ضربیں لگانے اور دانہ بدلی کرنے کے سوائے کوئی کام نہیں (صبح سے شام تک یہ حضرت دانہ بدلی کیا کرتے ہیں اور یہ خیال رہے کہ دانہ بدلی بچوں کا پوٹہ بھرنے کے لیے نہیں، اگر ایسا ہوتا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ بیچارے بچے اڑ نہیں سکتے اور ان کا پوٹہ ماں باپوں ہی کو بھرانا پڑتا ہے مگر کبوتر یونہی بے فائدہ ایک دوسرے سے چونچ ملایا اور پھڑ پھڑایا کرتے ہیں اور ایک منٹ دو

منت نہیں 'گھنٹوں یوں ہی کیا کرتے ہیں) گو کبوتر کو اس کے سوا 'کوئی اور کام نہیں تاہم سادہ لوح اور صاف دروں مخلوق وہ بھی انسان کی طرح چھپ چھپ کے دانہ بدلی نہیں کرتا۔

مگر حضرت انسان 'ان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ دانہ بدلی میں یہ کبوتر سے کم نہیں بلکہ بڑھے ہوئے ہی ہوں گے مگر وہی خود ایجاد حیا اور شرم کی پابندی سے اپنے گھونسلوں میں چھپ چھپ کے لیکن پہلے کہہ چکا ہوں کہ وہ حیا 'شرم نہیں ہے بلکہ وہ ریاکاری ہے۔ جو گھونسلوں میں وہ چوری چھپے کرتے ہیں 'جسے وہ علانیہ نہیں کر سکتے۔

کل ہی کی تو بات ہے یہ تمہارے پڑوس کے گھونسلے میں کئی انسان چڑیا اور چڑے بیٹھے تھے۔ میں اوپر چھت میں تھا 'وہ اپنی زبان میں چوں چوں کر رہے تھے 'میں اپنی زبان میں چوں چوں کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس گھونسلے کے ایک حصے میں جسے تم کمرہ کہتے ہو 'اور سب انسان تو چلے گئے بس ایک انسان چڑا اور ایک انسان چڑیا 'یا تمہاری زبان میں میاں بی بی رہ گئے۔ اب انہوں نے دانہ بدلی شروع کر دی اور پھر وہی پیار محبت کی باتیں ہونے لگیں۔ تم کہو گے اس میں ریاکاری کی کون سی بات ہوئی؟ سنیے۔ جب ان کے ہم جنس بیٹھے تھے 'تو اس وقت انہوں نے یہ باتیں کیوں نہ روا رکھیں؟ اگر کہو شرم کی وجہ سے 'بہت خوب! تو بعد میں بھی تو میں کمرہ میں موجود تھا 'پہلے مجھے خیال ہوا تھا کہ شاید انہوں نے مجھے دیکھا نہیں 'اس لیے میں اڑ کے اور پھڑ پھڑا کے ان کے قریب میز پر جا بیٹھا 'کرسی پر جا بیٹھا 'وہاں سے اڑ کے دیوار میں جو تصویر لگی ہوئی تھی 'اس کے چوکھٹے پر جا بیٹھا 'تب بھی ان پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ اپنے کام سے کام! آخر میں نے زور سے چلانا شروع کیا: "میں یہاں ہوں 'میں یہاں ہوں 'چوں 'چوں 'چوں۔ " 'مگر بے حیائی دیکھئے 'مجھے دیکھ کے دونوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ مجھے نہایت غصہ آیا اور میں ان کو گالیاں دیتا ہوا پھر سے کمرے سے باہر اڑ گیا 'فرمائیے! آپ ہی فرمائیے! آپ اسے کیا کہتے ہیں 'حیا یا ریاکاری؟

اسی ایک بات پر کیا منحصر ہے 'حضرت انسان کے ڈھنگوں سے میں خوب واقف ہوں۔ کوئی مجھ سے پوچھے کوئی لاکھ بار تو میں نے انسان چڑے کو انسان چڑیا کے سامنے ادعائے وفاداری کرتے سنا ہوگا۔

"آہ! میں تمہیں چاہتا ہوں 'تمہارے سوا حور بھی ہو تو اس پر آنکھ نہ ڈالوں" بے چاری بھولی بھالی چڑیا اسے یقین کرتی ہے اور محبت کی آنکھوں سے 'ان آنکھوں سے جن سے آنسو اور احسان مندی ٹپکتی ہوتی ہے اسے دیکھتی ہے۔ یہ ایسا منظر تھا کہ شروع شروع میں اس سے بہت متاثر ہوتا تھا 'لیکن میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی انسان چڑا دوسرے دن دوسرے گھونسلے میں دوسری چڑیا سے (پہلی چڑیا کی نظروں سے دور) کہہ رہا ہے: "آہ! میں تمہیں چاہتا ہوں 'تمہارے سوا حور بھی ہو تو اس پر آنکھ نہ ڈالوں۔ "اور یہ بیچاری معصوم چڑیا بھی اس دھوکے باز کے پھندے میں پھنس جاتی ہے اور اپنا محبت بھرا دل اس کے سپرد کر دیتی ہے۔

تیسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ وہی چڑا ایک اور گھونسلے میں ایک تیسری چڑیا سے کہہ رہا ہے "آہ! میں تمہیں چاہتا ہوں 'تمہارے سوا حور بھی ہو تو اس پر آنکھ نہ ڈالوں" اور تیسری تشنۂ محبت بھی ان باتوں پر یقین کر کے دل ہار بیٹھتی ہے۔ آخر کار ایک دن آتا ہے کہ تینوں کو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے اور یا کنوؤں سے چند جان باختہ انسان چڑیوں کی لاشیں نکلتی ہیں یا افیم انہیں ابدی نیند سلا دیتی ہے۔

دل چاہتا ہے 'اس ناپاک مخلوق کو ٹھونگیں مار مار کر مار ڈالوں۔ یہاں چڑیا بول اٹھی۔ چڑے کا قطع کلام تو ہوتا ہے مگر مجھے یہ کہنا ہے کہ انسان چڑیا کا بھولا پن یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے۔ میرا چڑا 'میں اس کے سامنے کہتی ہوں 'کچھ ڈرتی تھوڑا ہی ہوں 'رات دن مجھ سے کہا کرتا ہے "تم بے حد خوبصورت ہو 'تمہاری برابر دنیا میں کوئی خوبصورت نہیں "مگر خوشامد سے میرا دماغ نہیں چل جاتا۔ میں اس کان سنتی ہوں اور اس کان اڑا دیتی ہوں 'کیونکہ گو اس کی نظروں میں میں خوبصورت ہوں 'لیکن حقیقت میں خوبصورت نہیں۔ اسے میں اچھی طرح جانتی ہوں 'مگر کہیں آدم نے حوا سے کہہ دیا تھا کہ "تم بہت خوبصورت ہو "بس وہ دن اور آج کا دن کہ انسان چڑیا کے سامنے سے آئینہ نہیں ہٹتا۔ آئینہ نہیں تو آرسی ہے 'آرسی نہیں تو پانی میں اپنا عکس دیکھا جاتا ہے اور اپنے عکس کو [illegible] مارے غرور کے زمین پر قدم نہیں رکھتی۔ یہ نہیں سمجھتی کہ یہ سب چڑے کی خوشامد کی باتیں ہیں اور بس۔

پھر گھر میں بیٹھی' چڑے کو نیک اور اپنا عاشق سمجھا کرتی ہے اور چڑا اس کی غیبت میں رنگ رلیاں مناتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتی کہ "تال عرب پیش عرب" ہی رہے تو اچھا ہے۔ میں اس نکتے کو سمجھتی ہوں' اور یہی وجہ ہے کہ میں ہر وقت اپنے چڑے کے ساتھ ہوں۔ یہاں تک کہ تدارک معیشت میں بھی برابر کی شریک ہوں۔ میں چڑے کو فخر و تفوق کا موقع ہی نہیں دیتی۔ چڑے نے پھر کہنا شروع کیا اب مجھے دیکھیے یہ کچھ غرور اور ستائش کے طور پر نہیں کہتا اور نہ اپنی پیاری چڑیا کو سنانے کے لیے کہتا ہوں۔ بلکہ واقعہ بیان کرتا ہوں کہ میں ایک' بس ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں' ایک کعبہ کا طواف کرتا ہوں' ایک دیوی کے گرد پھرتا ہوں' میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں اور اس کے ساتھ پیمان وفا باندھتا ہوں اور اس پیمان کو نہیں توڑتا' مگر یہ کہ موت آ کے اسے توڑ دے۔

میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں اور اس کو پورا اختیار دیتا ہوں کہ میری کل حرکتوں کی نگرانی کرے میں جہاں جاؤں' جس مجلس میں پہنچوں میرے ساتھ ہو' لڑائی لڑوں تو میرا دل بڑھائے چہکوں تو میرا نغمہ سنے' انسانوں کی طرح ہم علاحدہ علاحدہ زندگی بسر نہیں کرتے۔

میں (سچ کہنا چاہیے) کبھی کبھی اپنے پر دوسری چڑیا کے لیے بھی پھلا دیتا ہوں' لیکن یہ محض شوخی اور کلیل ہوتی ہے۔ اس سے کوئی خاص ارادہ مقصود نہیں ہوتا اور میری چڑیا بھی اسے جانتی ہے۔ اس لیے نہ وہ ناراض ہوتی ہے اور نہ میری طرف سے اس کے دل میں شبہ بیٹھتا ہے۔

لو' تم سے باتیں کرنے میں میں بھول ہی گیا کہ مجھ پر فرائض پدری ہیں۔ میں انسان باپوں کی طرح نہیں کہ اکثر اپنے عیش میں اپنے بال بچوں کا خیال تک نہیں کرتے بلکہ بعض تو ہمیشہ کے لیے انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ نان و نفقہ بھی نہیں دیتے' میں ایسا بے غیرت نہیں' جب ان بچوں کو دنیا میں لانے کا میں ہی سبب ہوا ہوں' تو جب تک خود نہ اڑ سکیں۔ میں خود بھوکا رہوں گا لیکن ان کا پوٹہ بھروں گا۔ بڑی دیر ہو گئی وہ چونچ کھولے انتظار میں بیٹھے ہوں گے' ہاں ذرا مجھے دانے یا روئی کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر تو ڈال دو۔

آپا' تم نے میری خواہش پوری کی۔ شکریہ ادا کرتا ہوں' خدا تمہارے اور تمہارے بال بچوں کے پوتوں کو بھی ہمیشہ بھرا رکھے۔ لو اب جاتے ہیں۔

ع "پھر ملیں گے اگر خدا لایا"

اور یہ کہتے ہوئے دونوں پھر سے اڑ گئے۔

سلطان حیدر جوش

نام : سلطان حیدر
قلمی نام : جان بل / سلطان حیدر جوش
پیدائش : ۹ نومبر ۱۸۸۶ء بہ مقام دہلی (۱)
وفات : ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء بہ مقام علی گڑھ
تعلیم : میٹرک / انٹر ملیگ

ابتدائی تعلیم شیخوپور بدایوں میں حاصل کی۔ مشن اسکول بدایوں میں چوتھی جماعت میں داخل ہوئے اور ایک سال بعد انہیں دہلی منتقل کر دیا گیا۔ اینگلو عربک اسکول دہلی سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۰۵ء میں مدرستہ العلوم علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۰۶ء میں نواب محسن الملک کے خلاف طلبہ نے جو ہنگامہ کیا' اس کے سرکردہ لیڈر تھے اور جان بل کے نام سے مشہور تھے' نتیجہ میں ان کا نام ایم۔ اے۔ او کالج سے خارج کر دیا گیا اور انہوں نے فورتھ ایر میں تعلیم ہی کو خیرباد کہہ دیا۔(۲)

مختصر حالات زندگی:

شیخوپور' بدایوں کے فریدی خانوادے کے رئیس نذیر الدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کے مورث اعلی شیخ شرف الدین' نجیب الطرفین' اصل نسل شیخ تھے جبکہ والدہ کی طرف سے ان کا سلسلہ نسب حکیم احسن اللہ دہلوی سے ہوتا ہوا ۳۲ ویں واسطے سے حضرت بابا فرید گنج شکر سے جا ملتا ہے۔ اسی مناسبت سے "شیخ فریدی" کہلاتے تھے۔ نذیر الدین' جدی پشتی رئیس تھے' سو ان کے طور اطوار کے سبب' جوش کی والدہ نے زیادہ وقت میکے (دہلی) میں گزارا۔ یوں جوش کا بچپن دہلی میں گزار اور ابتدائی تعلیم و تربیت والدہ کے زیر اثر ہوئی۔ مولوی عبدالسلام سے علم منطق اور گتکہ سیکھا۔ لڑکپن میں گنگناہٹ سے شاعری کا کیریئر شروع کرنا چاہا لیکن جوانی میں چپ لگ گئی۔ (۳)

سلطان حیدر جوش کو تم جانتے نہیں
وہ ایک ہی تو لوگ ہیں پہچانتے نہیں

سلطان حیدر جوش اپنے خاندان کے پہلے انٹر پاس انگریزی دان تھے اور انگریز سرکار کے وفادار۔ دیگر روساء کی گوناگوں دلچسپیوں کے علاوہ کسرت' ڈنڈ بیٹھک' کشتی اور گھڑسواری سے شوق رکھتے تھے اور اپنے وقت کے شہ زور پہلوان تھے۔ خوبصورتی اللہ کی دین تھی اور تن سازی کا ان کا اپنا کمال۔ علی گڑھ کالج سے بے دخلی کے بعد ۱۹۱۲ء تک بے کاری کے دن گذارے۔ ۱۹۱۲ء میں ان کے چچا خان بہادر ممتاز الدین کی سفارش پر لارڈ ہیسٹن نے جوش کو نائب تحصیلدار کی ملازمت پر فائز کر دیا۔ ۱۹۱۶ء میں ہردوئی کے مقام پر قیام رہا۔ نائب تحصیلداری اور تحصیلداری سے ترقی کرکے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ڈپٹی کلکٹری کے زمانے تک اپنے سرکاری بنگلوں میں اکھاڑہ بنواتے اور کشتی سے شوق فرماتے رہے۔ اس شوق سے ایڈمنسٹریشن میں خلل پڑا تو ان کے والد نے اکھاڑہ بند کروا دیا۔ ۱۹۳۶ء میں پینشن پائی تو اپنے آبائی علاقے شیخوپور کی بجائے علی گڑھ میں

میرس روڈ پر خالد منزل کو مستقل ٹھکانہ بنایا۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کورٹ کے فاؤنڈر ممبر تھے۔ ۷۵ کے پیٹے میں اپنا رنگین افسانہ "حلالہ" قلم بند کیا جو غالباً ان کا آخری افسانہ تھا۔ آخری عمر میں قوت سماعت سے محروم ہو گئے تھے۔ ان کی ایک بیٹی عابدہ کی شادی ہندوستان کے صدر فخرالدین علی احمد کے ساتھ ہوئی' دوسری بیٹی علی گڑھ کے گرلز کالج میں پروفیسر تھیں۔ بیٹے کا نام احسان حیدر جوش تھا۔ جوش صاحب نے سرطان کے مرض میں مبتلا ہو کر ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء میں وفات پائی۔ ساری اولاد زندہ چھوڑی۔ دم آخر دو لڑکیاں اور ایک نواسی قریب موجود تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

اولین مطبوعہ تحریر:

جان بل کے قلمی نام سے ایک مزاحیہ تحریر مولانا شوکت علی کے رسالہ "اولڈ بوائے" کے لیے اپنی یادوں کے حوالے سے لکھی۔
ابتدائی تحریریں "کامریڈ" "نقیب" اور "تمدن" میں شائع ہوئیں

اولین مطبوعہ افسانہ:

"نابینا بیوی" مطبوعہ: "مخزن" لاہور شمارہ نمبر (۳) دسمبر ۱۹۰۷ء (نوٹ) بہت ممکن ہے رسالہ "نقیب" یا "تمدن" بابت ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۶ء میں سلطان حیدر جوش کا کوئی افسانہ شائع ہوا ہو' جس کا دعویٰ وہ اکثر کیا کرتے تھے۔ (۴)

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "صبر کی دیوی" (ایک افسانہ / کتابچہ) مطبوعہ: عزیزی پریس' آگرہ'

۲۔ "مساوات" (ایک افسانہ / کتابچہ)
یہ افسانہ بعد میں "فسانہ جوش" میں شامل کر دیا گیا۔

۳۔ "اتفاقات زمانہ" (ایک افسانہ / کتابچہ)
یہ افسانہ بعد میں "فسانہ جوش" اور "جوش فکر" نامی مجموعوں میں شامل کر دیا گیا۔

۴۔ "فسانہ جوش" (۶ افسانے اور ۹ مضامین) مطبوعہ: الناظر پریس' لکھنؤ' طبع اول: ۱۹۲۷ء
اس کتاب میں "مساوات" (مطبوعہ: "الناظر" مئی ۱۹۱۲ء)' "پھر بھی عمر قید" (مطبوعہ: "الناظر" اپریل ۱۹۱۳ء) "طوق آدم" ("الناظر" مارچ ۱۹۱۴ء) "تلاش عجیب" ("الناظر" یکم جنوری ۱۹۱۵ء)' "اعجاز محبت" ("الناظر" یکم اپریل ۱۹۱۶ء) کل چھ افسانے اور نو مضامین بہ عنوان "انکشاف حقیقت"' "عمر قید سے کس طرح رہائی اور نتیجہ "آئینہ خود نما"' "نرگس خود پرست"' "سنسر"' "جدید دوستی"' "مرد یا عورت"' "قرض و مقراض" اور "پہلا گناہ" شامل ہیں۔

۵۔ "جوش فکر" (۵ افسانے اور ۶ مضامین) مطبوعہ: ڈسٹرکٹ گزٹ پریس' علی گڑھ' طبع اول: س۔ ن
کتاب میں شامل "التماس" از مرتب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب "فسانہ جوش" کے بعد شائع ہوئی۔ اس کتاب میں "مسٹر ابلیس" (مطبوعہ "مخزن" لاہور جولائی ۱۹۱۱ء) "ہاں انہیں!"' "خواب و خیال" (مطبوعہ: "نقیب" فروری ۱۹۲۰ء)' "جذب دل کی دو

تصویریں" (مطبوعہ: "ہمایوں" لاہور، جون ۱۹۲۲ء) "اتفاقات زمانہ" کل پانچ افسانے اور ۶ مضامین بہ عنوان "طلسم ازدواج" "معما" "جنون ترقی" "لیڈر" "عالم ارواح" اور "خانہ جنگی" شامل ہیں۔

۶۔ "ابن مسلم" (ناول) دارالبلاغ، لاہور، طبع اول: ۱۹۵۲ء

۷۔ "نقش و نقاش" (ناولٹ سمرسٹ ماہم کے "The Moon And Six Pence" سے ماخوذ۔) نظامی پریس، بدایوں، طبع اول: ۱۹۳۵ء

۸۔ "نواب فرید" نظامی پریس، بدایوں، طبع اول: ۱۹۱۷ء

یہ کتاب بانی شیخو پور، بدایوں محتشم خان نواب فرید کی سوانح ہے۔

۹۔ "اصلاح سخن" (مختلف شعراء کے کلام پر اساتذہ کی اصلاح / تحقیق)

۱۰۔ "ہیری" (ایک انگریزی ناول کا ترجمہ / کتابچہ) مطبوعہ: دہلی، طبع اول: ۱۹۰۶ء

۱۱۔ "ہوائی" (ناولٹ۔ ارنسٹ ہمنگوے کے "A Farewel To Arms" سے ماخوذ) نظامی پریس، بدایوں، طبع اول:

غیر مدون:

اس دور کے مشہور ادبی پرچوں "صوفی" "الناظر" "مخزن" "ہمایوں" "تمدن" "کامریڈ" اور "نقیب" کی فائلوں میں جوش کے متعدد مضامین اور افسانے بکھرے پڑے ہیں۔ محض رسالہ "مخزن" لاہور میں مندرجہ ذیل چیزیں دستیاب ہیں۔

۱۔ "انقلاب" (طویل مختصر افسانہ)، پہلی قسط "سوتیلی ماں" اپریل ۱۹۰۹ء (جلد ۱۷، شمارہ ۱)، کے صفحات ۴۸ تا ۵۴ پر، دوسری قسط "خدیجہ" مئی ۱۹۰۹ء (جلد ۱۷، شمارہ کے صفحات ۳۸ تا ۴۴ پر، تیسری قسط "زبیدہ" جون ۱۹۰۹ء (جلد ۱۷، شمارہ ۳۰) کے صفحات ۱۳ تا ۳۶ پ، چوتھی قسط جولائی ۱۹۰۹ء (جلد ۱۷، شمارہ ۴) کے صفحات ۵۷ تا ۶۰ پر، پانچویں قسط اگست ۱۹۰۹ء (جلد ۱۷، شمارہ ۵) کے صفحات ۵۵ تا ۵۸ پر اور آخری قسط شیر علی کے بعد "فتح یاب زبیدہ" ستمبر ۱۹۰۹ء (جلد ۱۷، شمارہ ۶) کے صفحات ۴۱ تا ۵۱ پر)

۲۔ "دل" (مضمون) مئی ۱۹۱۰ء (جلد ۱۹، شمارہ ۲) کے صفحات ۲۵ تا ۳۰)

۳۔ "تائید غیبی" (افسانہ) ستمبر ۱۹۱۱ء (جلد ۲۲، شمارہ ۶) کے صفحات ۲۷ تا ۳۸)

۴۔ "فرق مراتب" (مضمون) نومبر ۱۹۱۸ء (جلد ۳۶، شمارہ ۱۱) کے صفحات ۳۹ تا ۵۱)

ان افسانوں اور مضامین کے علاوہ "شباب" کے عنوان سے ایک ناول بھی غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہے۔

وفات سے قبل مستقل پتا:

خالد منزل، میرس روڈ، علی گڑھ (بھارت)

نظریہ فن:

"میں نے ہمیشہ افسانہ اس وقت لکھا جب خود بخود میری طبیعت میں اس کے لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی، کبھی یہ تحریک دفعتاً" وجود میں آئی اور کبھی مہینوں میں، اس حد تک پہنچی کہ میں پوری طرح اس کو محسوس کر سکا۔ اس تحریک کے وجود میں آنے کے اسباب بھی مختلف ہوئے، کبھی

صحبت احباب، کبھی ریل کا سفر، کبھی کسی مقام کی سیر اور کبھی غیر معمولی واقعات کا مشاہدہ -------- ایسی تحریک کے پیدا ہو جانے کے بعد دوسرا مرحلہ اس کے اظہار کے لئے افسانہ بنانا ہے یہ مرحلہ اکثر و بیشتر میں نے رات کی تنہائی میں اور کچھ نہیں تو حقہ کی امداد سے، پلنگ پر لیٹے ہوئے طے کیا، واقعہ یہ ہے کہ تحریک صادق کے ساتھ محض ایک خیال، ایک مخصوص جملہ، ایک غیر معمولی تصویر یا ایک نیا مصالحہ دماغ میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ اس مخصوص تحریک کو افسانہ کے سانچے میں ڈھالنا بالکل ایسا ہی کام ہے، جیسے گوندھی ہوئی مٹی سے مختلف اقسام کے رنگ برنگ کھلونے بنانا"

سلطان حیدر جوش

(بہ حوالہ: "میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں" مرتبہ: حکیم محمد یوسف حسن
دار الادب پنجاب بارود خانہ، لاہور، طبع اول: س۔ن)

○

(۱) "اردو افسانہ" از ڈاکٹر انوار احمد اور "مطالعہ یلدرم" از ڈاکٹر معین الرحمان میں سال پیدائش ۱۸۸۸ء درج ہے جو درست نہیں۔

(۲) مختلف کتب نیز "بہترین انشائی ادب" مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی میں انہیں سال ۱۹۱۳ء میں بھی علی گڑھ یونی ورسٹی سے متعلق بتایا گیا ہے جو درست نہیں۔

(۳) بہ حوالہ: "پہلی کرسی کے حضور" از ابو الفضل صدیقی مطبوعہ: "سیپ" کراچی ۱۹۸۸ء

(۴) ڈاکٹر مسعود رضا خاکی نے "اردو افسانے کا ارتقاء" مقالہ برائے پی ایچ ڈی (پنجاب یونیورسٹی) میں جوش کی افسانہ نگاری کی ابتداء کا زمانہ ۱۹۱۳ء تا ۱۹۳۰ء بتایا ہے جو درست نہیں۔

سلطان حیدر جوش

نابینا بیوی

میرے گھر کے برابر دیوار بیچ' ایک قاضی صاحب کا مکان تھا۔ بیچارے ایک زمانے میں بڑے متمول آدمی تھے مگر ریاست کی زندگی خصوصاً ملازمت انقلاب کی تصویر ہوا کرتی ہے۔ ذرا راجہ صاحب کے کان بھرے اور بے قصور پر آفت برپا ہو گئی۔ اسی طرح ان شریف قاضی صاحب کے تمول نے افلاس کا پہلو بدلا' اور فقط پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار کی قلیل رقم بہ ہزار وقت بچ بچا کر رہ گئی۔ اسی پر صبر شکر کے ساتھ قانع تھے اور اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ پالتے تھے۔ عربی اور فارسی کی قابلیت کے لحاظ سے دور دور تک ان کا شہرہ تھا' اور باہر سے اکثر اشخاص مشکل مسئلے حل کرانے آتے تھے۔

قاضی صاحب کی صاحب زادی کی شادی کی تقریب جب ہوئی تو نکاح میں مجھے بھی مدعو کیا گیا مگر چند در چند ضروریات کی وجہ سے میں شامل نہ ہو سکا۔ مگر ہمسایہ تھا' واقعات کی خبر برابر مل گئی۔ معلوم ہوا کہ دولھا کو پہلے سے اس لڑکی کی نسبت جس سے اب اس کی قسمت وابستہ ہونے والی تھی کچھ بھی معلوم نہ تھا' اور عین نکاح کے وقت نہ معلوم کس بات کے علم پر اس نئی روشنی کے شیدا نے شادی سے قطعی انکار کر دیا۔ طرفین کی بڑی بدنامی ہوئی۔ اور آخر کار برات واپس آگئی۔ اس کے بعد خود دولھا سے میری راہ و رسم ہو گئی اور اس کی وجہ اس نے غریب لڑکی کی بدچلنی بیان کی۔ یہ سن کر میرے خیالات بھی قاضی صاحب کی طرف سے خراب ہونے لگے' اور میں نے ان سے ملنا جلنا کم کر دیا۔ راستہ میں بھی ان سے کترا کر نکل جاتا۔ وہ دراصل مجھ سے محبت کرتے اور میرے والد بزرگوار کے بڑے سچے دوست تھے۔

اسی طرح چھ مہینے گزر گئے' اب گرمی کا موسم آپہنچا۔ میری والدہ ضعیفہ تو صحن میں سویا کرتی تھیں۔ مگر میں اکیلا چھت پر لیٹا کرتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے خوب یاد ہے۔ جمعہ کا دن تھا۔ چلچلاتی گرمی تھی۔ پہر بھر دن سے ہوا بند تھی دونوں وقت ملتے ہی مارا مار کر کے میں نے کھانا کھایا اور سیدھا کوٹھے پر جا پڑا۔ چاروں طرف اجلی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور تارے اکا دکا نظر آتے تھے۔ دو تین گھنٹے یوں ہی کروٹیں بدلتے اور ہاتھ پاؤں مارتے کٹے۔ خدا خدا کر کے ۱۱ بجے ہوا ذرا سرسرائی اور کچھ جان میں جان آئی۔ نیند کی غنودگی میں یکایک مجھے یہ معلوم ہوا کہ کوئی میرے سرہانے بول رہا ہے۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ مگر آدمی تو آدمی پرچھائیں تک دکھائی نہ دی۔ اتنے میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ ایک درد بھری آواز قاضی صاحب کی چھت پر سے آئی۔ "خدا جانے کیونکر بدنامی ہوتی ہے۔ مگر خیر رب العالمین خوب جانتا ہے' مجھے کسی سے غرض ہی کیا! پاک پروردگارا! میں نہیں چاہتی کہ میری شادی ہو۔ مجھ دکھیاری اندھی کو کون قبول کرے گا؟ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ میں پاک ہوں اور باعصمت ہوں۔ آپ سے میں یہ چاہتی ہوں کہ میری بدنامی نہ ہو' اور برا کہنے والوں کا منہ تو بند کر دے۔ ان درد بھرے جملوں کے بعد پھر کوئی آواز قطعی نہ آئی۔ یہ الفاظ میرے چوٹ کھائے ہوئے دل کے ساتھ نمک کا کام کر رہے تھے' اور میری ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ صبح ہوتے ہی میں جناب والد صاحب کی اجازت پر ایک دوست کے ذریعے سے پیغام بھیجا اور قاضی صاحب کی غلامی میں اپنے آپ کو دینا چاہا۔ مگر ان سچے اور پاک باز انسان نے اس کے جواب میں آبدیدہ ہو کر کہا کہ "ان سے کہہ دینا' ابھی صاحب زادہ ہو۔ ناتجربہ کار ہو۔ کیوں اپنی زندگی تلخ کرتے ہو۔ وہ بدنصیب لڑکی اندھی ہے۔ میں تمہارے والد کا نیاز مند ہوں۔ قیامت کے دن انہیں کیا منہ دکھاؤں گا؟"

بمشکل تمام میں نے قاضی صاحب کو کئی دنوں میں مجبور کر لیا' اور اس مصیبت زدہ نابینا لڑکی سے چپ چپاتے شادی کر لی۔ اب وہ میرے

گھر میں آئی اور میری بیوی بن کر رہنے لگی۔ اس کی خصائل کی نسبت میں بلامبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ صبر' قناعت' سچائی' ہمدردی' محبت اور پاکبازی کی مجسم تصویر تھی۔ اکثر اوقات پچھلی رات کبھی میری آنکھ کھل جاتی۔ تو میں ایک عجیب موثر نظارہ دیکھتا وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے نہایت عاجزی کے ساتھ دعا میں مشغول ہوتی اور ہزار ہزار طرح سے پہروں میری ترقی' آرام اور آسائش کے لئے دعائیں مانگتی حتی الامکان میں اس کی خوشی کا خیال از حد رکھتا۔ جب تک میری والدہ ضعیفہ زندہ تھیں۔ میری نابینا بیوی کو میرے حاضر و غائب میں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچی۔ مگر انہوں نے بھی ایک دن اس دار فانی کو الوداع کہا اور انکے صدمے نے میری ہمت پست کر دی۔ اب گھر میں صرف ایک خادمہ تھی اور ذیور ھی پر ایک نوکر۔ والدہ صاحبہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی خادمہ نے اسے تکلیف پہنچانی شروع کی۔ مگر میں سچ عرض کرتا ہوں' کبھی بھول کر بھی اس نے خادمہ کی شکایت مجھ سے نہیں کی' اور مجھے قطعی اس بات کی اطلاع نہیں ہوئی۔

ایک روز اتفاقیہ خلاف معمول دوپہر کو گھر میں واپس آیا۔ جبکہ میری بیوی کھانا کھا رہی تھی' اور خادمہ دسترخوان کے پاس بیٹھی تھی۔ سالن وغیرہ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا' اور اس ماما کو برا بھلا کہنے لگا کیونکہ پورے خرچ پر بھی کھانا بہت خراب تھا' اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے اچھا کھلاتی تھی اور میری غریب نابینا بیوی کے سامنے روکھی سوکھی روٹیاں اور بچا کھچا سالن رکھ دیتی تھی اور باقی سب اچھا اچھا تیر کر جاتی تھی۔ اسی دن سے میں صبح کو جب تک میری قابل رحم بیوی ضروریات اور نماز سے فارغ نہ ہو لیتی تھی' باہر نہ جاتا' اور دوپہر سے پہلے واپس آکر کھانا اسی کے ساتھ کھاتا۔ پھر شام سے ہی گھر میں آ پڑتا اور تمام رات کہیں نہ نکلتا۔ اس کی سچی محبت اور راست بازی نے اس قدر میرے دل میں گھر کر لیا تھا کہ اکثر ماما کے نہ ہونے پر میں خود کام کرتا۔ اس کے لئے وضو وغیرہ کے لئے پانی لانے میں مجھے عار نہ تھا۔ اس طرح گھر میں گھسے رہنے کی وجہ دوست احباب مجھ پر فقرے کسنے لگے اور میرے ہم عمر میرا مذاق اڑانے لگے۔ مگر میں نے پروانہ کی اور میرے معمول میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔

اسی اثنا میں ان نئی روشنی کے نوجوان کی جس نے میری نابینا بیوی پر جھوٹا الزام لگایا تھا بڑی دھوم دھام سے شادی ایک متمول لڑکی سے ہوگئی۔ مشکل سے ایک برس گزار ہو گا کہ شکر رنجی ہوئی اور بڑھتے بڑھتے خانہ جنگیوں کی نوبت آئی۔ تمام شہر میں افواہ پھیل گئی کہ ان کی بیوی آوارہ ہے۔ انہوں نے اس کو نکال دیا۔ اس نے میکے پہنچتے ہی نان نفقہ اور مہر کی نالش ٹھونک دی' اور نئی روشنی کے نوجوان کو چھٹی کا کھایا ہوا یاد آگیا۔ غرض خوب عرضی پرچہ ہوتا رہا۔ ان پر بیوی کی ڈگری ہو گئی۔ اب انہوں نے خاندان کے بزرگوں کے سامنے منت سماجت کی اور صلح ہو گئی۔ ان کی بیوی گھر میں آگئی۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد پھر وہی تکا فضیحتی شروع ہو گئی۔ بہرحال ڈگری کے خوف سے وہ غصہ دباتے اور بیوی کی جوتیاں کھاتے رہتے۔

اس دار ناپائدار کے قانون کے موافق مجھ بدنصیب پر ایک اور مصیبت آئی۔ میری نابینا بیوی کو بخار آنے لگا میں نے ڈاکٹر' حکیم' ملا' سیانے' دوا' ٹھنڈائی' گنڈا غرض کچھ نہ چھوڑا۔ مگر بخار میں کمی نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ میں نے بالکل ہر جگہ کا آنا جانا چھوڑ دیا۔ وہ برابر چھ مہینے تک بیمار رہی۔ میں نے ہر قسم کی خدمت کی۔ یہاں تک کہ چوکی پر لے جاتا۔ دوائی پلانا وغیرہ میرا روزانہ معمول تھا۔ کئی بار میرے اگالدان اٹھاتے ہی ابکائی آئی' اور جونہی میں نے اگالدان سامنے کیا۔ اس نے ڈالنا شروع کیا جس سے میرے ہاتھ بھی بھر گئے۔ اگرچہ میں شہر میں نازک مزاج مشہور ہوں۔ لیکن بخدا کبھی مجھے ایسی کراہت نہیں آئی کہ محبت پر غالب آتی۔

ایک دن اس نے متواتر بارہ گھنٹے آنکھ نہ کھولی اور مجھے از حد تشویش ہوئی۔ رات کے تقریباً نو بجے جبکہ اس کا سر میرے زانو پر تھا۔ اسے ہوش آیا۔ اس نے چھوتے ہی کہا۔ تم اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے اور مجھے شرمندہ کئے جاتے ہو؟ میں اس شرمندگی سے مر جاؤں تو اچھا ہے۔ تمہیں ماما پر اعتبار نہ ہو۔ تو اپنی شادی کسی سے کر لو۔ وہ گھر کا انتظام خود کرے گی' اور تمہیں اس قدر دردسری نہیں کرنی پڑے گی۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے سوکن کا خیال ہو گا۔ تمہارا یہی ایک احسان کہ تم نے میرا سرتاج بننا منظور کیا' ایسا ہے۔ جس کا میں کسی طرح بدلہ نہیں دے سکتی۔ تم نے میرے ساتھ شادی کر کے واقعی اپنے اور بڑا ظلم کیا۔"

کچھ نہ پوچھئے کہ ان الفاظ نے میرے ساتھ کیا کیا۔ میرے خون میں چکر آیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔ حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ قاضی صاحب دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اس لئے اس نے اپنی والدہ کو بلایا اور وہ میرے الفاظ کے ساتھ سر معاف کر دیا" اور میں روتے روتے بے ہوش ہو گیا۔ اسی دن سے ہچکی لگ گئی۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "اگر تم کو تکلیف ہوئی تو میری روح کو صدمہ ہو گا۔"

○

سلطان حیدر جوش

طوق آدم

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں رسالہ یا اخبار کے ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے 'ضرورت ہے" والے کالم کو کیوں پڑھتا ہوں اور اس میں اس قدر دلچسپی کیوں لیتا ہوں۔ میں اس کا جواب صرف یہ دے سکتا ہوں کہ اگر آپ میری جگہ پر ہوتے اور آپ کو بھی ایسا ہی تجربہ ہوتا تو آپ بھی ایسا ہی کرتے۔

مجھے اس کے بیان کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ میری کالج کی زندگی ایک عجب آزادی کے ساتھ گزری ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا وں کہ میں کسی امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب نہیں ہوا۔ کبھی امتحان دینے کے بعد مجھے اپنی کامیابی کا یقین نتیجہ آنے سے پیشتر نہیں ہوا۔ مجھے کتاب کے نام سے بلا کسی استثنا کے نفرت تھی۔ اگر کبھی اخبار وغیرہ کے دیکھنے کی خطا مجھ سے سرزد ہوتی تھی تو محض اس خیال سے کہ کسی نئے اشتہار کو معلوم کر سکوں۔ ریاضی سے مجھے اسی قدر لگاؤ تھا جس قدر ایک مسلمان کو ہو سکتا ہے۔ لاجک سے مجھے ایک ناقابل بیان الجھن ہوتی تھی اور فلاسفی سے مجھے للہی بغض تھا۔ میں خود تعجب کرتا ہوں جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میں نے بی۔ اے کا ڈپلومہ کس طرح پا لیا۔

مستقل مزاجی مجھ سے اس طرح کوسوں بھاگتی تھی جس طرح لاحول سے شیطان۔ ہمیشہ ایک ہی چیز کو اچھا کہنا میری رائے میں اول درجہ کی جہالت تھی۔ میں کبھی فٹ بال ٹیم کے ساتھ ٹور پر جاتا تھا اور کبھی روزانہ سب کی استدعا پر بھی روزانہ کھیل میں شریک ہونے سے گھبراتا تھا۔ کالج کی زندگی نے مجھے "سیماب" کا خطاب دلوا دیا تھا' اور میں اسی خطاب سے عام طور پر مشہور تھا۔ ایسی طبیعت اور ایسا دل لئے ہوئے میں نے ڈگری لینے کے بعد سارے کالج کو خدا حافظ کہا۔ ایک بھری دنیا میری اپنی بے شمار دل چسپیوں کے ساتھ میرے سامنے موج زن تھی' اور میں ناتجربہ کار' ناواقف' حیران۔ اس کے ساحل پر کھڑا سوچتا تھا کہ آنکھیں بند کر کے کود پڑوں یا نہیں۔

یہ سن لیجئے کہ میں اپنے فرسٹ ایئر کے زمانے میں اپنے جونیئر' کم عمر' دوست کے بار بار کہنے پر اس کے ساتھ بمبئی گیا تھا۔ میں کالج میں اسی سال پاس ہو کر شامل ہوا تھا' اور وہ یعنی چراسٹ انٹرنس میں تھا۔ آپ کو چراسٹ کے سمجھنے میں دقت ہو گی۔ مگر یہ بھی ایک خطاب سمجھ لیجئے۔ جو اس کو تیسری جماعت کے زمانے میں ملا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ایک روز اپنی ریڈر کے یاد کرنے میں باآواز بلند مشغول تھا اور "سی۔ ایچ۔ آر۔ ایس۔ ٹی چراسٹ معنی عیسیٰ" کی رٹ لگا رہا تھا۔ کہ کسی بڑے طالب علم نے سن پایا اور بس اسی روز سے وہ چراسٹ مشہور ہو گیا۔ اس کے ساتھ مجھے اپنی عمر میں سب سے پہلے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ میں اسی کے یہاں مہمان ہوا' اور یہ بھی سمجھنا مشکل نہیں کہ اس کی والدہ اور اس کی نو عمر چھوٹی بہن نے مجھ سے پردہ نہیں کیا۔ بمبئی سے پردہ 'گدھے کے سر سے سینگ سے زیادہ مفقود ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ وہاں لوگ نہایت ترقی یافتہ اور آزاد خیال ہیں۔ میری رائے میں پردہ کیسی سے کیسی معتدل شکل میں بھی ایک نہایت وحشیانہ حرکت ہے...... ممکن ہے کہ آپ اس معاملہ میں میرے ہم خیال نہ ہوں مگر آپ کی کمزوری کا جواب وہ سوائے آپ کے اور کوئی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ اس گھر میں جو راحت مجھے اس قلیل زمانے میں ملی' میں اس کو کبھی نہ بھول سکا۔ اور اس گھر والوں کا بے حد خلق اور مہمان نوازی میرے دل و دماغ پر ہمیشہ نقش رہی۔ دماغ پر تو اس وجہ سے کہ اس کے بعد سے چراسٹ کے والدین کو ہمیشہ خط لکھتا رہا اور وہ انتہائے انسانیت کے ساتھ برابر جواب دیتے رہے اور دل پر اس وجہ سے کہ...... خیر اس کی نسبت آگے چل کر معلوم ہو گا۔

ہاں اس جملہ معترضہ کو چھوڑیئے۔ میں نے جب کالج چھوڑا تو اپنا سامان وغیرہ ڈھونے سے فراغت حاصل کرتے ہی مجھے بمبئی کی لو لگی۔ میں نہیں کہہ سکتا کیوں۔ مگر کوئی چیز تھی جو مجھے زبردستی لے گئی۔ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ دن کو گشت لگاتا تھا شام کو سمندر کے کنارے دل دماغ کو تازہ کرنے جاتا تھا۔ مگر پھر یہ سوچتا تھا کہ آخر میں اس بحر ناپیدا کنار میں کود پڑوں یا نہیں!

چراسٹ کے والدین مجھے قریب قریب روز ملتے تھے اور قریب قریب روز مجھے اپنے مکان میں اٹھا لے جانے پر مجبور کرتے تھے مگر میں خدا جانے کس کش مکش میں مبتلا تھا۔ میرے دل کو ایک گونہ تسلی بلاناغہ ہوتی رہتی تھی اور میری آنکھوں اپنا مشغلہ روز کم از کم ایک مرتبہ ضرور پالیتی تھیں۔ مگر میں پھر بھی یہی سوچتا تھا کہ آخر میں اس تموج جادو فریب میں کود پڑوں یا نہیں۔

ایک ایک معمولی واقعہ بیان کرنا گویا داستان کہنا ہے اور سلسلہ وار کتھا گانا ایک دقیانوسی طریقہ ہے۔ میں بلا تفریق ہر پرانی حرکت سے متنفر' لہٰذا اس قدر سن لیجئے کہ میں بھی آخر کار اس دل فریب بحر ذخار میں کودا' کودا اور آنکھیں بند کرکے کودا۔ دوسرے سال کے جاڑے میں میں اپنے ڈرائنگ روم میں چراسٹ کی نو عمر بہن حمیدہ سے' یانی زنانہ اپنی بیوی سے یہ کہہ رہا تھا "کیوں پیاری! آج تو غضب کی سردی ہے۔ بدن کانپا جاتا ہے۔"

(۲)

میں غالباً کہہ چکا ہوں اور میری ہیئت بھی ہر دیکھنے والے کو بتا سکتی ہے کہ میں مستقل مزاج نہیں ہوں اور نہ خدا نخواستہ کسی حالت میں کولہو کا بیل بننے کے لئے تیار ہوں۔ کیونکہ مستقل مزاج اور کولہو کا بیل میری نظر میں ہر لحاظ سے مرادف نظر آتے ہیں۔ جس چیز کو میں آج پسند کرتا ہوں' کوئی وجہ نہیں کہ کل بھی اسی کو پسند کروں۔ مجھے اس منطق کے صغریٰ و کبریٰ میں حصہ مشترک ہی مفقود نظر آتا ہے' جو شخص مستقل مزاجی کا حامی ہو۔ وہ بشرط فرصت مجھ سے تبادلۂ خیالات کر سکتا ہے۔ خدا جانے یہ بوسیدگی دماغ کا نتیجہ ہے۔ ترقی کے معنی ہی یہ ہیں کہ زمانے کے ساتھ برابر بڑھتے رہنا اور مستقل مزاجی کے معنی یہ ہیں کہ معاف فرمایئے گا۔ تھکے اونٹ کی طرح ایک جگہ ٹھہر جانا۔

دراصل میرا مزاج اور میری طبیعت انگلینڈ کا موسم تھی! کوئی نہیں بتا سکتا کہ کل میری حالت کیا ہوگی۔ میں کس بات میں دلچسپی لوں گا اور کس بات سے نفرت کروں گا۔ میں اس زندگی کا عادی تھا اور میرے لئے اس کو چھوڑنا ایسا ہی تھا جیسا مچھلی کا پانی کو چھوڑنا۔ میں کبھی کسی ایک چیز کا مداح برابر نہیں رہا' اور خدا کا شکر ہے کہ تقلید کی غلطی مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوئی۔ مگر یہ سچ ہے کہ حمیدہ نے میری اس عادت کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ میری گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی طبیعت کو تاڑ گئی تھی' اور میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ مجھے روز نئے نئے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی تھی۔ یہ ایک فیکٹ ہے کہ وہی ایک پہلی چیز تھی جس سے میں کبھی نہیں اکتایا۔ وہی پہلی صورت تھی جس سے میرا دل کبھی سیر نہیں ہوا۔ وہ میری طبیعت کے ساتھ ساتھ روز آنہ چٹ جاتی ہو یا کسی اور طرح میں قطعی نہیں بتا سکتا کہ وہ مجھے چھ مہینے خوش اور مطمئن رکھنے میں کیونکر کامیاب ہوئی۔

اس کی حقیقت اگر میں بلا کم و کاست بیان کروں تو غالباً آپ سمجھیں گے کہ میں اپنی بیوی کو رشک پروین بنانا چاہتا ہوں یا میں خود اس کے پیچھے رشک قیس بن گیا ہوں۔ مگر پھر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قیس عامری اور فرہاد ایرانی دونوں میری نظر میں اول درجہ کے مخبوط الحواس تھے۔ میں ایسے عشق کو جہالت سمجھتا ہوں اور سچ یہ ہے کہ ایسے آندھی اندھیر' جذبہ عشق میں سوائے حیوانیت کے اور کچھ نہیں۔ شاعروں نے اس کو چار چاند لگانے میں بہت کچھ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا ہے مگر سرے سے شاعروں ہی کی حقیقت میری نگاہ میں کچھ نہیں۔ میں نفس شاعری میں ہی کوئی بات قابل ستائش نہیں پاتا۔ شاعری اور دنیا کی اور بہت سی فضولیات سب ایک قطار میں ہیں۔ تضیع اوقات کے لئے اب دنیا نے شاعری سے زیادہ دلچسپ مشغلے ایجاد کر لئے ہیں۔ اگر آپ کی رائے اس کے خلاف ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ میں دنیا کو اپنی آنکھوں سے نہ

دیکھوں ۔ آپ کی یا اور کسی کی آنکھوں سے دیکھوں آپ یقین کیجئے موسیقی اور شاعری میں اگر کچھ اثر مانا جاتا ہے تو میں " واٹر پروف " کی طرح "میوزک پروف" یا "پوئٹری پروف" ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں کسی بات میں شاعری کرنی نہیں چاہتا۔ اس لئے میرا یہ کہنا کہ حمیدہ میرے نقطۂ خیال سے تمام خوبیوں اور حسن دلفریب سے آراستہ نظر آتی تھی۔ کافی سے بھی زیادہ ہے۔ وہ میرے مزاج اور طبیعت کے لئے نہایت موزوں تھی۔ البتہ اس میں صرف ایک عادت تھی جو آخر میرے مزاج کے خلاف ثابت ہوئی۔

وہ میرا ہی دل لبھانے کے لئے سہی روز نت نئی صورت و لباس میں جلوہ گر ہوتی تھی ۔ یہاں تک تو نہایت اچھا تھا ۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ میں روزانہ اس کی دلفریبی اور حسن کا اعتراف بھی کروں ۔ اور یہی غضب تھا ۔ میں بار بار اس سے کہہ چکا تھا' اس کے سامنے شاعری کر چکا تھا کیونکہ میں ایسے الفاظ کو نظم ہی سمجھتا ہوں کہ وہ سب سے زیادہ حسین 'سب سے زیادہ دلکش 'سب سے زیادہ دلفریب' نیچر کی انتہائی صنعت' تہذیب اور ترقی کی نقش آخریں وغیرہ وغیرہ تھی اور ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ میں ہمیشہ ان الفاظ کو طوطے کی طرح دہرایا کرتا۔ جب کبھی وہ خلوت میں ہوتی ایک شعلہ خودستائی اس میں بھڑک اٹھتا' اور اس وقت تک فرو نہ ہوتا جب تک کہ میں عملاً نہیں بلکہ قولاً الفاظ میں اس کی مدح سرائی نہ کرتا۔ میں اس کو نہایت عزیز رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ میرا نام...... کالج کا نام...... سیماب تھا۔

اس کے علاوہ حمیدہ کو ایک بات سے نفرت بھی تھی ۔ وہ کسی عورت کو میری زبان سے خوبصورت سننا برداشت نہیں کر سکتی تھی ۔ گویا اپنی دلفریبی کی تعریف اور دوسرے کے اپنے ہمسر نہ ہونے کا اقرار ۔ یہ دونوں ایسی عادتیں تھیں جو مستقل طور پر اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھیں' اور میں کسی عادت کے پابند ہونے سے اسی قدر دور تھا جس قدر قطب شمالی' قطب جنوبی سے ہے۔ وہ کسی اور کے حسن کی تعریف سننا نہیں چاہتی تھی' اور مجھے بعض اوقات بلا کسی وجہ کے اس کی دھن لگ جاتی تھی۔ تاہم ایسے لمحے جو ہماری خاموش اور مسرت انگیز زندگی میں باد صرصر کا طوفان کہے جا سکتے ہیں' اکثر واقع ہوتے تھے' لیکن یہ آندھیاں بلا کسی ظاہری نقصان کے اوپر ہی اوپر اتر جایا کرتی تھیں۔ اور بہت جلد مطلع صاف ہو جاتا تھا۔

ایک روز عین اس وقت جبکہ وہ اپنے ٹائلیٹ سے یا بالفاظ دیگر کنگھی چوٹی سے فارغ ہو چکی تھی ' اور میرے پیچھے کھڑی ہوئی اپنی دلفریبی اور حسن بے مثال کا اندازہ بڑے آئینہ میں کر رہی تھی ۔ میں ایک تصویر' انگریزی میگزین میں دیکھ رہا تھا اور ایک ایکٹریس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ غالباً وہی شعلہ خود نمائی اس کے اندر بھڑک اٹھا تھا۔ اور اس نے میرے پاس آکر دیکھا تو مجھے ایک دوسری صورت کے نظارے میں مشغول پایا۔ ممکن ہے کہ اس سے وہ شعلہ خود نمائی زیادہ مشتعل ہو گیا ہو۔ لیکن مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا۔ میرے اوپر اس تصویر کی تعریف کرنے کی خواہش آندھی کی طرح مسلط ہوتی جاتی تھی اور میں نے آخر کار کہا۔

اور کہا ۔ " پیاری حمیدہ! دیکھنا یہ ایکٹرس کس قدر خوبصورت ہے!"

"کیا خاک خوبصورت ہے' مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی معلوم نہیں ہوتی ۔ "اس نے کہا۔

وہ یہ چاہتی تھی کہ کم از کم ایک مرتبہ غور کے ساتھ اس کو سرتاپا دیکھ تو لوں' اور مجھ پر یہ جن سوار تھا کہ اسے میری ہاں میں ہاں ملانی چاہئے۔ میں نے تصویر پر نظر جمائے ہوئے پھر کہا ۔ "بھلا کیا کہتی ہو ؟ اس کی آنکھیں تو دیکھو ۔ اس کے بال تو دیکھو؟"

"ہزار حسینوں کی ایک حسین سہی ۔ مجھے کیا؟ میں نہیں سمجھ سکتی ۔ تم ایسی فضول باتوں میں کیوں اپنا اور میرا دونوں کا سر پھرایا کرتے ہو۔"

"سچ یہ ہے کہ دن کو دن کہنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ میں تو صرف اپنی رائے ظاہر کر رہا تھا۔ اگر تم اس کے خلاف ہو تو یہ تمہاری ذاتی رائے ہے۔ جس میں ممکن ہے کوئی اور وجہ بھی پوشیدہ ہو۔ مگر اختلاف رائے کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی آزاد رائے ظاہر نہ کر سکوں' اور سینکڑوں سوالات کو محض تمہاری ناپسندیدگی کی وجہ سے ایک کاگ لگی ہوئی بوتل کی طرح اپنے میں بند رکھوں۔"

یہ بحث برابر بڑھتی چلی گئی ۔ مجھ پر اور اس پر' دونوں پر اپنی محبت کے موافق ایک جن سوار تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس مرتبہ یہ آندھی بلا

نقصان عظیم کے نہیں اتری۔ حمیدہ نے بات بڑھ جانے پر اپنی ریشمیں نقاب اٹھائی اور وہ خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئی۔ چند منٹ کے بعد میں نے گاڑی کے باہر جانے کی آواز سنی اور اس وقت مجھے اپنے ایک پرانے کلاس فیلو کا فقرہ' جو وہ تمسخر کے طور پر ہمیشہ کہا کرتا تھا' یاد آیا کہ "شادی کر اور بربادی لے۔"

(۳)

پہلے روز تو میں اپنے اسی خیال میں مستغرق رہا۔ میری نگاہ میں حمیدہ کی یہ دیدہ دلیری ناقابل عفو جرم نظر آتی تھی۔ مجھے اپنی حالت پر افسوس بھی تھا۔ افسوس اور بے حد افسوس۔ صرف اس بات کا افسوس کہ میں نے اپنی بیش بہا آزادی کو محض وہ فتنہ زا آنکھوں' وہ دلکش رخساروں اور چند ایسی ہی دلفریب چیزوں کے عوض کیوں غارت کر دیا۔ میری رائے میں اس وقت شادی "زر دادن و دردسر خریدن" سے زیادہ وقیع چیز نظر نہیں آئی تھی۔ میں مرحوم غالب کی رباعی کو لفظ بہ لفظ صحیح سمجھ رہا تھا۔

بہ آدم زن بہ شیطان طوق لعنت
سپردند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن درد اسیری طوق آدم
گراں تر آمد از طوق عزازیل

دوسرے دن میرے خیالات یہ نہیں تھے۔ طبیعت کا غبار رات کے ساتھ ہوا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ جس کو میں کل پسند کر رہا تھا آج اسی کے لئے بے قرار نہ ہوتا۔ سچ ہے کہ تنہائی کا رفتہ رفتہ پڑنے والا اثر مجھے بے چین کئے دیتا تھا۔ نوکر کا تقاضا تھا کہ فرنیچر خراب ہو رہا ہے۔ مرمت کی ضرورت ہے۔ خادمہ کی ضد تھی کہ پہلے برتن دیکھ لئے جائیں' وہ بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ محض ایک حمیدہ کے نہ ہونے سے میں اپنے آپ کو کیسی مصیبت میں پاتا تھا۔ میں اور ایسی فضولیات کا حساب و کتاب ناممکن! قطعی ناممکن۔ میں کبھی ان واہیات باتوں کی طرف مشغول نہیں ہوا تھا۔ حمیدہ خدا جانے کس طرح ان سب سے برابر آتی ہو گی۔ مجھے تعجب تھا۔ تاہم اب کیا کیا جائے۔ حمیدہ کو اب واپس آنا چاہئے۔

مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی۔ کیونکہ کوچوان سے صرف اس قدر پتہ چل سکا تھا کہ وہ قلابہ کے اسٹیشن پر اتری تھی۔ بفرض محال اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو بھی اس کے پیچھے وارنٹ گرفتاری کی طرح ہر جگہ پہنچنا۔ میرے دل و دماغ کے قطعی خلاف تھا۔ خود جا کر خوشامد کرنا یا دو ایک کو درمیان میں ڈال کر اور زیادہ تشہیر کرنا۔ مجھ سے قطعی ناممکن تھا۔ پھر کیا کیا جائے۔ کچھ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حمیدہ کے بغیر اب مجھے زندگی ایک کالا پانی معلوم ہوتی تھی۔

میں سوچتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ مجھے اس سے پہلے سوچنے کا اتفاق بہت کم ہوا تھا۔ کیونکہ سوچنا میرے خیال میں ایک بہت نازیبا بات ہے۔ اس سے انسان کی پیشانی پر جھریاں پڑتی ہیں۔ اس سے طبیعت پر ایک بار معلوم ہوتا ہے۔ اس سے عمر زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس سے آدمی بڈھا ہو جاتا ہے اور؟ اور کیا نہیں۔ اس سے تمام نقصانات ہی نقصانات ہوتے ہیں۔ بہرحال بندہ مجبور ولاچار۔ سوچنا ہی پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئی چیز دماغ میں بجلی کی روشنی کی طرح پر تو افگن ہوئی۔ میں فوراً اٹھا اور ٹوپی سر پر رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

جس قدر عرصہ میں گھڑی کی بڑی سوئی نے ۲۰ منٹ کا فاصلہ طے کیا' اسی قدر عرصہ میں میں نے اپنا راستہ ختم کر لیا۔ ۲۰ منٹ کے اختتام پر

میں...... روزانہ اخبار کے آفس میں منیجر سے نہایت تعجیل کے ساتھ کہہ رہا تھا "اچھا تو آپ الفاظ کے حساب سے چارج کریں گے۔ خیر جس طرح آپ چاہیں۔ میں جو عبارت شائع کرانا چاہتا ہوں۔ وہ ابھی لکھ دیتا ہوں آپ ملاحظہ کرلیں۔"

منیجر نے میری عجلت کو تعجب کے ساتھ دیکھتے ہوئے ایک سادہ کاغذ اور قلم و دوات میری طرف بڑھایا اور میں نے کھڑے ہی کھڑے میز پر ایک ہاتھ ٹیک کر جھکے ہوئے لکھنا شروع کیا۔

"ضرورت ہے"

ایک چھ مہینے کے شادی شدہ شوہر کو اپنی حسین بیوی کی' جو دو روز سے تبدیلی مزاج کی غرض سے کہیں چلی گئی ہے۔ آنکھیں سیاہ۔ رنگ سرخ و سفید۔ بال گھونگھر والے' قد میانہ' عمر ۱۸ سال۔ نام حمیدہ۔ جو شخص مذکورہ بالا کو کسی طرح نمبر ۱۴۰ منزل نمبر ۱ بائیکلا میں اپنے ساتھ لے آئے گا۔ اس کو دو اشرفیاں بطور معاوضہ محنت نذر کی جائیں گی۔ خط و کتابت کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ مزید حالات بتائے جاسکتے ہیں۔"

بے چین شوہر۔ عبدالحی سیماب

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منیجر نے اس اعلان کو پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھا اور مسکراہٹ جو غالباً کوشش خودداری کی زنجیروں میں جکڑے جانے کی وجہ سے مسکراہٹ ہی بن کر رہ گئی تھی' ورنہ قہقہہ بننے کے لئے تیار تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بلکہ تمام چہرے پر ظاہر ہوئی۔ میں نے اجرت' بلاحجت نقد ادا کی اور خدا حافظ کہتا ہوا باہر تھا۔ میرے باہر نکلتے ہی دو چار کلرکوں اور منیجر کے دل کھول کر ہنسنے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

میں جانتا تھا کہ حمیدہ روزانہ اخبار کو دیکھتی ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کل کے پرچے میں وہ اعلان شائع ہو گیا ہے۔ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ حمیدہ ہر جدت پسند بات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ایسا اعلان ایک روزانہ اخبار میں کیا۔ کیا اور محض اس خیال سے کیا کہ حمیدہ اس کو پڑھے' میری حالت سے آگاہ ہو' جدت آمیز خیال کو پسند کرے اور چلی آئے۔ آج دوسرا دن تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس نے اخبار پڑھا ہی نہ ہو۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اس نے کل ہی پڑھا ہو گا۔ اور اگر اس نے مان لیجئے کل بھی نہ پڑھا ہو تو آج میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ اب دوپہر ڈھل چکی تھی۔ نصف سے زیادہ دن گذر چکا تھا اور میری تشویش بڑھتی جاتی تھی۔

میں اپنے ڈرائنگ روم میں اسی خیال میں غلطاں پیچاں تھا۔ ڈوبا ہوا تھا کہ میرا نوکر کواڑ کھول کر اندر گھسا اور کہنے لگا "حضور ایک شخص اور ایک نقاب پوش عورت آپ سے ملنا چاہتے ہیں" میں فوراً سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو عزیز حمیدہ کا چچازاد بھائی ہو گا۔ حمیدہ کو لایا ہو گا۔ ممکن ہے کہ کسی کو حمیدہ اپنے ساتھ لائی ہو۔ میں نے فوراً اندر آنے کی اجازت دی اور کرسی پر سے کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کے اندر نہایت سرعت کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ آخر میں کہوں گا کیا۔ دروازہ کھلا اور جاہل شخص جو صورت سے کوئی دکاندار معلوم ہوتا تھا' اندر گھسا اور یہ کہتا ہوا اندر گھسا "حمیدہ' حمیدہ اندر آؤ" اس کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان عورت جس نے نقاب اتار ڈالی تھی' اندر آئی۔ اس کا چہرہ اسکی بے باکی' اس کی وضع' غرض اس کی ایک ایک بات بتا رہی تھی کہ وہ نہایت چلتی ہوئی عورت تھی۔ جہاں تک میرا حافظہ اور ادا شناسی کام کرتی ہے' میرے خیال میں وہ کوئی بازاری آوارہ گرد عورت تھی۔ لانے والے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیجئے یہ اب یہاں موجود ہیں' یہ ہم کو ایک ہوٹل میں ملیں۔ ہم نے کل سے اخبار پڑھ کر تمام بمبئی ڈھونڈھ ڈالا۔ آج ہم کو ملی تو ہم نے فوراً پکڑ لیا۔ اس نے بہت کچھ شکایت کیا۔ تمہارا برائی کرتا ہے۔ خیر تم جانے یہ جانے۔ یہ خود کے کا تم سنے گا' اب ہمارا معاوضہ۔ بس ہم خلاص۔"

مجھے تعجب تھا' حیرت تھی' پریشانی تھی۔ میری زبان سے نکلا "تم کہتے کیا ہو؟ یہ عورت کون ہے؟"

وہ۔ "ہم کہتا ہے کہ تم نے اخبار میں لکھا کہ جو کوئی اس کو لائے گا' وہ دو گنی پائے گا۔ ہم کل بارہ گھنٹے تلاش کیا۔ رات بھر اسی خیال میں رہا۔ آج برابر صبح سے ڈھونڈھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سیاہ ہیں' رنگ گورا ہے' سرخی نہیں ہے تو وہ اس چار دن کی پریشانی میں جاتا رہا۔ بال گھونگھروالا ہے۔ قد بیچ کا ہے۔ عمر کون اس کا ۱۸ سال سے زیادہ بتا سکتا ہے؟ نام اس کا حمیدہ ہے (اس کی طرف) کیوں ہے نا؟"

اس میں شک نہیں کہ اس میں سب باتیں تھیں' مگر آخر اس جہالت کے معنی کیا؟ وہ میری پیاری حمیدہ نہیں تھی۔ نہیں خدا نہ کرے۔ میں نے جواب دیا۔ "مگر یہ میری بیوی نہیں ہے"

وہ۔ (عورت کی طرف) "کیوں یہ کیا بات ہے۔"

عورت۔ "کیا پیارے سیماب! پیارے سیماب۔ اب تم ایسے خفا ہو کہ پہچانتے تک نہیں۔ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں؟"

میں۔ "حمیدہ۔ میری طرف تو دیکھو!"

اب تک مجھے استعجاب تھا۔ مگر میرے جواب پر وہ استعجاب غصہ میں بدل گیا۔ یہ نالائق عورت اور میری بیوی۔ اس گستاخی کے معنی کیا؟ یہ بدمعاشی' یکی دغابازی' جعلسازی' غصہ سے بڑھ چلا اور میرے منہ سے نکلا۔ گستاخ عورت اس بدتمیزی کے کیا معنی......؟"

میں فقرہ بھی ختم نہ کرنے پایا تھا کہ وہی لانے والا شخص بولا "دیکھو سیٹھ۔ بدتمیزی وغیرہ کا وجہ تنہائی میں پوچھو۔ وہ چلا گیا تھا۔ اس کا قصور ہے۔ سب کے سامنے ایسا مت کہو۔ آخر وہ تمہاری بیوی ہے۔"

میں۔ (نہایت غصہ کے ساتھ) "بدمعاش! یہ پاجی عورت میری بیوی کیوں ہونے لگی......"

وہ۔ "دیکھو سیٹھ۔ ہم پر زبان مت چلاؤ۔ تم جانو تمہارا بیوی جانے۔ ہم سے کچھ مطلب نہیں۔ چاہے تم اسے رکھو چاہے نکالو۔ مگر ہمارا دو گنی ہم کو دو بس۔"

مجھے غصہ تھا' پریشانی تھی' الجھن تھی' سب کچھ تھا۔ قطعی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر لڑوں' کیا کروں۔ اتنے ہی میں دروازہ پھر کھلا۔ ایک اور گنوار جاہل' ایک عورت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اندر گھسا۔ اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "یہ لو۔ حمیدہ موجود ہے۔ میں دو دن سے مارا مارا پھرتا تھا۔ آخر میں نے ایک دکان پر کھڑا دیکھ کر پایا اور کھینچتا ہوا لایا۔ آنکھ' رنگ' بال' قد' عمر' سب دیکھ لو۔ یہ تمہاری بی بی حمیدہ ہے کہ نہیں۔ اور میرا انعام؟"

اب میرے غصے نے بھی مجھ سے بھاگنا شروع کیا۔ میں ساکت تھا' خاموش تھا' مبہوت تھا۔

دوسری عورت۔ "پیارے سیماب! کیا اب بھی تم اپنی پیاری حمیدہ سے نہیں بولو گے۔"

پہلی عورت۔ "تو کون چڑیل ہے جو میرے شوہر کو اپنا شوہر بتاتی ہے؟"

دوسری عورت۔ "چل لچے۔ تجھ جیسی مکار میں نے ہزاروں دیکھ ڈالیں۔ سیماب میرا شوہر ہے یا تیرا؟"

دونوں لانے والے۔ (تقریباً ساتھ ہی ساتھ) "بتایئے سیٹھ آپ کا بیوی کون ہے۔"

"بولو صاحب بولو۔ ہاتھ پکڑ لو ایک کا۔"

گورنمنٹ کا قانون کہئے۔ اپنی پوزیشن کا لحاظ سمجھئے۔ یکایک حیرت زدہ ہو جانا اس کی وجہ ٹھہرایئے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس خیال نے اس وقت مجھے دست درازی سے روک لیا۔ میری حالت عجیب تھی۔ میں حیرت زدہ بھی تھا۔ اور پریشان بھی۔ خائف بھی تھا اور غصہ سے لرزاں بھی۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ ملازم فوراً اندر تھا' میں یہ کہتا ہوا کہ "دیکھو پولیس کو بلاؤ اور ان سب بدمعاشوں کو ان کے حوالے کر دو" ڈرائنگ روم سے نکل کر سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں جاتے ہی پلنگ پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

برابر والے کمرے میں سے سب کے باہر جانے کی آواز میرے کان میں آئی۔ پھر کچھ تکرار نہ ہوا اور تھوڑی دیر میں سناٹا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب میں ڈرائنگ روم میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اسی طرح دس پانچ زبردستی بیوی بننے والیاں ...... میرا سلسلہ خیال کواڑ

کھلنے سے ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو پیاری حمیدہ ریشمیں نقاب ڈالے ہوئے ایک عجیب شان دلربائی کے ساتھ میرے سامنے تھی......!

تھوڑی دیر کے بعد جس میں، معمولی شکوہ و شکایت کا دفتر ختم ہو چکا تھا، وہ میری آغوش میں تھی۔ اس کا شعلہ خودستائی پھر بھی بھڑک اٹھا مگر میں اس کے بجھانے کے لئے کئی روز سے تیار تھا۔ اس وقت اور صرف اس وقت، مجھے معلوم ہوا کہ دونوں بازاری عورتیں اور اوباش آدمی حمیدہ ہی کے اشارے پر آئے تھے اور عزیز نے اس کا انتظام کیا تھا۔ میری دو اشرفیاں تو بچ گئیں۔ لیکن حمیدہ کو اس پلاٹ کے تیار کرنے میں دو گنیاں نذر کرنی پڑیں۔ آہ شریر شوخ...... پیاری حمیدہ۔

وہ دن اور آج کا دن، دو باتوں میں پورا پورا اعتقاد رکھتا ہوں، ایک تو یہ کہ اخبار کا "ضرورت ہے" والا کالم قابل فروگذاشت چیز نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ مرحوم مرزا نے سچ کہا۔

ولیکن درد اسیری طوق آدم
گراں تر آمد از طوق عزازیل

پریم چند

نام : دھنپت رائے سری واستو
قلمی نام : نواب رائے الہ آبادی، نواب رائے بنارسی، پریم چند
پیدائش : ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء بمقام ملہی گاؤں، ضلع بنارس، بھارت۔
وفات : ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء بہ مقام بنارس۔
تعلیم : بی۔اے۔ الہ آباد یونی ورسٹی، الہ آباد ۱۹۱۹ء

ابتدا آٹھ برس تک فارسی پڑھی اور گورکھ پور کے ایک مڈل سکول میں براہ راست چھٹی جماعت میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۰۲ء میں ٹیچرز ٹریننگ کالج الہ آباد (Prepartary Class) میں داخلہ لیا۔ اپریل ۱۹۰۳ء میں جونیئر کلاس کا امتحان درجہ اول میں پاس کرکے جونیئر ورنیکلر (J-V) کی سند لی۔ اسی سال اردو اور ہندی میں الہ آباد یونی ورسٹی سے سینئر ورنیکلر (S-V) کا امتحان پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان کئی بار دیا اور ریاضی میں فیل ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور ۱۹۱۹ء میں الہ آباد یونی ورسٹی سے سیکنڈ ڈویژن میں بی اے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام منشی عجائب لال کا ستھ تھا۔ جن کی سکونت موضع مڈھوا، ملی متصل پانڈے پور، بنارس میں تھی۔ پریم چند کے والد ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ پریم چند سات برس کے تھے جب ان کی والدہ آنندی دیوی کا انتقال ہوا اور ان کے والد نے دوسری شادی کرلی۔ پریم چند نے بچپن اور لڑکپن میں سخت تنگی ترشی کا زمانہ دیکھا اور سہا۔ ۱۸۹۹ء میں میٹرک پاس کرنے بعد پانچ روپے ماہانہ کے حساب سے ایک وکیل کے بیٹے کو ٹیوشن پڑھانا شروع کیا اور پھر اسی سال بنارس سے بیس میل دور چنار گڑھ، مرزا پور کے ایک چھوٹے سے عیسائی مشنری اسکول میں اٹھارہ روپے ماہوار پر اسسٹنٹ ماسٹر کے طور پر پرائیویٹ ملازمت کرلی۔ ۲ جولائی ۱۹۰۰ء کو گورنمنٹ ڈسٹرکٹ مڈل سکول بہرائچ سے سرکاری ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں ادبی زندگی کا آغاز ایک ناول بہ عنوان: "ایک ماموں کا رومان" لکھنے سے کیا، اسی سال اپنا پہلا مضمون "پرتاب چندر" لکھا۔ ۱۹۰۲ء میں ٹیچرز ٹریننگ کالج الہ آباد میں جے۔ وی کا امتحان پاس کرنے کے لیے داخلہ لیا اور اپریل ۱۹۰۴ء میں سند حاصل کی اور سینئر ورنیکلر (S-V) کا امتحان دینے قدیم الہ آباد یونی ورسٹی چلے گئے، جہاں سے جنوری، فروری ۱۹۰۵ء میں واپسی پر ان کا تبادلہ بطور اسسٹنٹ ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول پرتاب گڑھ کردیا گیا۔ پرتاب گڑھ سے ۱۹۰۷ء میں کانپور تبادلہ ہوا۔ جہاں ۱۹۰۸ء تک قیام رہا (۱) اس زمانے میں بال گنگادھر تلک کی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور تلک کی بجائے گوکھلے سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۰۶ء کے پھاگن میں شوراتری کے دن پریم چند کی دوسری شادی منشی دیوی پرشاد کی بیوہ بیٹی شورانی سے ہوئی۔ ۲۴ جون ۱۹۰۹ء میں ترقی پاکر کانپور سے مہوبا ضلع ہمیر پور کے ڈسٹرکٹ بورڈ سب انسپکٹر مدارس ہوئے۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۱۰ء تک "نواب رائے" اور "نواب رائے بنارسی" کے قلمی ناموں سے لکھا کرتے تھے، اس کے بعد پریم چند کا قلمی نام اختیار کیا۔ دسمبر ۱۹۱۰ء کے رسالہ "زمانہ" کانپور میں افسانہ "بڑے گھر کی بیٹی" پریم چند کے قلمی نام سے شائع ہوا، اس وقت پریم چند شدید بیمار تھے۔ لکھنؤ، بنارس اور الہ آباد سے علاج کروایا۔ ۱۹۱۱ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع ہمیر پور رہے۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں مہوبا سے گورنمنٹ بستی ہائی

اسکول تبادلہ ہو گیا جہاں جولائی ۱۹۱۵ء میں خرابی صحت کی بنا پر مدرسی کی طرف لوٹ آئے۔ اگست ۱۹۱۶ میں بستی سے گورنمنٹ نارمل سکول گورکھ پور تبادلہ ہو گیا۔ اگست ۱۹۱۸ء میں نارمل سکول بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ رہے جہاں فروری ۱۹۲۱ء میں پریم چند نے عدم تعاون تحریک کے سلسلے میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا جو ۱۵ فروری ۱۹۲۱ء کو منظور کر لیا گیا۔ کچھ مدت ہندی ماہنامہ "مریادا" بنارس کی ادارت کی۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں اس کے مدیر مقرر ہوئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے پوتدار جی کی امداد و اعانت سے چرخے بنانے کا کاروبار شروع کیا مگر اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو مارچ ۱۹۲۲ءمیں بنارس منتقل ہو گئے جہاں رسالہ "آج" بنارس کے ایڈیٹر رہے۔ لیکن چند دن بعد مارچ ہی میں کانپور جا کر مہاشے کاشی ناتھ کے مارواڑی اسکول میں مدرس ہو گئے۔ مہاشے کاشی ناتھ کے ساتھ نباہ نہ ہوا اور وہاں سے مستعفی ہوئے۔

اب پریم چند نے کاشی ودیاپیٹھ میں ملازمت اختیار کرنے کے ساتھ اپنا ذاتی چھاپہ خانہ "سرسوتی پریس" قائم کیا اور نقصان اٹھایا۔ ۱۹۲۷ء میں پریم چند نے نول کشور کے پرچے "مادھوری" کی ادارت سنبھالی اور دو سو روپے ماہوار پانے لگے۔ اب انہوں نے اپنا ذاتی مجلہ "ہنس" جاری کیا جس کا پہلا پرچہ سرسوتی پریس بنارس سے مارچ ۱۹۳۰ءمیں شائع ہوا اور جون ۱۹۳۰ء میں یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ۱۹۳۱ء میں نول کشور پریس میں ملازمت کے دوران' ان کی مرضی کے خلاف درسی کتب کے شعبہ میں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں نصاب ساز کمیٹی کی منظوری کے لیے نصابی کتب مرتب کیں۔ ۱۹۳۳ء میں نول کشور کی ملازمت ترک کر دی اور بنارس منتقل ہو گئے۔ پندرہ روزہ "جاگرن" بند ہونے کو تھا' پریم چند نے اسے سنبھالا اور ہفت روزہ بنا دیا۔ واضح رہے کہ اس سے قبل انہوں نے اپنے ذاتی پرچے "ہنس" بنارس کو جنوری ۱۹۳۱ء میں دوبارہ جاری کر دیا تھا۔ جسے ۱۹۳۵ء تک مرتب کرتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں پریم چند کا ہندی ناول "سیوا سدن" (مطبوعہ دسمبر ۱۹۱۸ء) اجنتا سائن ٹون' بمبئی کے ہدایت کار ڈی موہن بھاوناتی کو پسند آیا تو اس نے بنارس رابطہ قائم کیا۔ پریم چند نے اپنا پرچہ "ہنس" بنارس ہندی ساہتیہ پریشد کی نگرانی میں دے کر بمبئی کی راہ لی اور اجنتا سائن ٹون میں بطور منظرنامہ نگار' آٹھ ہزار روپے سالانہ پر ملازمت اختیار کر لی۔ اسی سال "سیوا سدن" کی کہانی پر مبنی فلم "رنگیلا راجپوت" بنی اور کامیاب رہی۔ اب پریم چند نے اجنتا سائن ٹون کے لیے "The Mill" لکھی جس میں مل مزدوروں کے مسائل کو پہلی بار انڈین سکرین کا موضوع بنایا گیا۔ سنسر بورڈ کے نامناسب رویہ کے باوجود ناقدین نے اس فلم کی دل کھول کر داد دی۔ ۱۹۳۶ء میں جب موہن بھاوناتی نے اپنا ذاتی ادارہ بھاوناتی پروڈکشنز' کو تک لاج' داور' بمبئی میں قائم کیا تو پریم چند بھی اجنتا سائن ٹون سے الگ ہو کر ادھر منتقل ہو گئے اور بھاوناتی کے لیے فلم "Awakning" لکھی' جس میں بے روزگاری کے شکار تعلیم یافتہ افراد کے مسائل کو پیش کیا۔ لیکن اس ادارے نے اپنی ساکھ بنانے میں کچھ وقت لیا اور پریم چند فلمی دنیا سے مایوس ہو کر ۱۹۳۶ء میں بنارس آ گئے۔ (یہ فلم ۱۹۳۷ء میں مکمل ہوئی) پریم چند نے ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے اولین اجلاس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت کی اور ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کی صبح بنارس میں وفات پائی۔

۱۹۳۵ء میں موہن بھاوناتی نے پریم چند کی ہندی ناول "رنگ بھومی" (مطبوعہ ۱۹۲۵ء) کو اسی نام سے فلمایا (۲) فلم "رنگ بھومی" نے ہندوستان کے ہر سرکٹ میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ لیکن اس وقت تک پریم چند کی راکھ کو گنگا کے سپرد ہوئے پورے نو برس گزر چکے تھے۔

اولین مطبوعہ تحریر:

ناول "اسرار معابد" کی پہلی قسط مطبوعہ ہفت روزہ "آوازہ خلق" بنارس: ۸ اکتوبر ۱۹۰۳ء۔ یہ سلسلہ یکم فروری ۱۹۰۵ء تک رہا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"عشق دنیا اور حب وطن" مطبوعہ: "زمانہ" کانپور' بابت: اپریل ۱۹۰۸ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "سوزِ وطن" (پانچ افسانے) ناشر: نواب رائے: زمانہ پریس کانپور، طبع اول: جون ۱۹۰۸ء

یہ کتاب دوسری بار گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو ۲۵ شپل روڈ، لاہور سے "حب وطن کے قصے معروف بہ سوزِ وطن و سیرِ درویش" کے عنوان سے ۲۹۔۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ سال اشاعت درج نہیں۔ طبع دوم میں "سیرِ درویش" نامی افسانے کا اضافہ کر دیا گیا۔

۱۔ "دنیا کا سب سے انمول رتن"، ۲۔ "شیخ مخمور"، ۳۔ "یہی میرا وطن ہے"، ۴۔ "صلۂ ماتم"، ۵۔ "عشق دنیا اور حب وطن"، ۶۔ "سیرِ درویش"

یہ کتاب تیسری بار "سوزِ وطن" کے عنوان سے ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے مرتب کر کے انجمن تہذیب نو ہیلی کیشنز، ۲۷۲ چک، الہ آباد سے ۱۹۸۰ء میں شائع کی۔

۲۔ "پریم پچیسی" دو جلدیں (پچیس افسانے) دارالاشاعت، پنجاب: جلد اول: طبع اول: ۱۹۱۵ء جلد دوم: ۱۹۱۸ء

یہ کتاب دوسری اور تیسری بار دارالاشاعت پنجاب نے ۱۹۳۹ء اور چوتھی بار ماڈرن بک ڈپو، حیدر آباد دکن نے ۱۹۴۴ء میں شائع کی۔

حصہ اول: ۱۔ ماتا، ۲۔ دکرمادت کا تیغہ، ۳۔ بڑے گھر کی بیٹی، ۴۔ رانی سارندھا، ۵۔ راج ہٹ، ۶۔ راجہ ہردول، ۷۔ نمک کا داروغہ، ۸۔ عالم بے عمل، ۹۔ گناہ کا اگن کنڈ، ۱۰۔ بے غرض محسن، ۱۱۔ آہِ بے کس، ۱۲۔ آلھا۔

حصہ دوم: ۱۔ خون سفید، ۲۔ صرف ایک آواز، ۳۔ اندھیر، ۴۔ بانکا زمیندار، ۵۔ تریا چرتر، ۶۔ امرت، ۷۔ شکاری راجکمار، ۸۔ کرموں کا پھل، ۹۔ مناؤن، ۱۰۔ مرہم، ۱۱۔ ماوس کی رات، ۱۲۔ غیرت کی کٹار، ۱۳۔ منزل مقصود۔

۳۔ "پریم بتیسی" دو جلدیں (اکتیس افسانے) زمانہ پریس کانپور، حصہ اول: طبع اول: اگست ۱۹۲۰ء حصہ دوم: دسمبر ۱۹۲۰ء

یہ کتاب دوسری بار دارالاشاعت پنجاب، لاہور نے ۱۹۴۰ء میں شائع کی۔

حصہ اول: ۱۔ سرِ پُر غرور، ۲۔ راجپوت کی بیٹی، ۳۔ نگاہِ ناز، ۴۔ بیٹی کا دھن، ۵۔ دھوکہ، ۶۔ پچھتاوا، ۷۔ شعلۂ حسن، ۸۔ اناتھ لڑکی، ۹۔ پنچایت، ۱۰۔ سوت، ۱۱۔ بانگ سحر، ۱۲۔ مرض مبارک، ۱۳۔ قربانی، ۱۴۔ دفتری، ۱۵۔ دو بھائی۔

حصہ دوم: ۱۔ بازیافت، ۲۔ بوڑھی کاکی، ۳۔ بنک کا دیوالہ، ۴۔ زنجیرِ ہوس، ۵۔ سوتیلی ماں، ۶۔ مشعلِ ہدایت، ۷۔ خنجرِ وفا، ۸۔ خوابِ پریشاں، ۹۔ راہِ خدمت، ۱۰۔ ج اکبر، ۱۱۔ آتما رام، ۱۲۔ ایمان کا فیصلہ، ۱۳۔ فتح، ۱۴۔ درگا مندر، ۱۵۔ خون حرمت، ۱۶۔ اصلاح۔

۴۔ "خاکِ پروانہ"۔ (سولہ افسانے) نگار پریس لکھنؤ: طبع اول: ۱۹۲۸ء

۱۔ خاکِ پروانہ، ۲۔ نادان دوست، ۳۔ نغمۂ روح، ۴۔ ستیہ گرہ، ۵۔ مزارِ آتشیں، ۶۔ بڑے بابو، ۷۔ عجیب ہولی، ۸۔ دعوت، ۹۔ فکرِ دنیا، ۱۰۔ خودی، ۱۱۔ مستعار گھڑی، ۱۲۔ تالیف، ۱۳۔ کپتان، ۱۴۔ ملاپ، ۱۵۔ علیحدگی، ۱۶۔ تحریک۔

یہ کتاب دوسری اور تیسری بار گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو لاہور نے ۱۹۴۴ء سے قبل شائع کی۔

۵۔ "خواب و خیال" (چودہ افسانے) لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۸ء

۱۔ حل امید '۲۔ نوک جھونک '۳۔ موٹھ '۴۔ شدھی '۵۔ شطرنج کی بازی '۶۔ عبرت '۷۔ شکست کی فتح '۸۔ دست غیب '
۹۔ دعوت شیراز '۱۰۔ مایہ تفریح '۱۱۔ فلسفی کی محبت '۱۲۔ خودی '۱۳۔ لال فیتہ '۱۴۔ ستی۔ " خودی " وہی افسانہ ہے جو "خاک پروانہ " میں شامل ہے۔
یہ کتاب دوسری اور تیسری بار نرائن دت سہگل 'لاہور نے ۱۹۴۴ء سے قبل شائع کی۔

۶۔ " فردوس خیال " (بارہ افسانے) انڈین پریس الہ آباد: طبع اول: ۱۹۲۹ء

۱۔ توبہ '۲۔ عفو '۳۔ مریدی '۴۔ نیک بختی کے تازیانے '۵۔ راہ نجات '۶۔ ڈگری کے روپے '۷۔ نزول برق '۸۔ بھاڑے کا ٹٹو '۹۔ بھوت '۱۰۔ سوا سیر گیہوں '۱۱۔ تہذیب کا راز '۱۲۔ لیلیٰ۔
یہ کتاب دوسری اور تیسری بار نرائن دت سہگل 'لاہور نے ۱۹۴۱ء میں شائع کی۔

۷۔ " پریم چالیسی " دو جلدیں (چالیس افسانے) گیلانی الیکٹرک پریس لاہور: طبع اول: ۱۹۳۰ء

پہلا حصہ: ۱۔ منتر '۲۔ کشکش '۳۔ خانہ برباد '۴۔ کفارہ '۵۔ ترسول '۶۔ بہنی '۷۔ داروغہ کی سرگزشت '۸۔ استعفیٰ '۹۔ انتقام '۱۰۔ انسان کا مقدم فرض '۱۱۔ مقدر '۱۲۔ رام لیلا '۱۳۔ دینداری '۱۴۔ چوری '۱۵۔ الزام '۱۶۔ قزاقی '۱۷۔ آنسوؤں کی ہولی '۱۸۔ سہاگ کا جنازہ '۱۹۔ دیوی '۲۰۔ قوم کا خادم '۔
دوسرا حصہ: ۱۔ دو سکھیاں '۲۔ حرزجاں '۳۔ ماں '۴۔ لیلیٰ '۵۔ مجبوری '۶۔ مزار الفت '۷۔ ابھاگن '۸۔ جہاد '۹۔ دیوی '۱۰۔ حیرت '۱۱۔ چکمہ '۱۲۔ جنت کی دیوی '۱۳۔ عفو '۱۴۔ بند دروازہ '۱۵۔ جلوس '۱۶۔ امتحان '۱۷۔ سزا '۱۸۔ گھاس والی '۱۹۔ بیوی سے شوہر '۲۰۔ پوس کی رات۔
نوٹ: اس حصے میں شامل افسانہ " لیلیٰ " اس سے قبل " فردوس خیال " میں شامل رہا ہے۔ یہ کتاب " پریم چالیسا " کے عنوان سے بھی شائع ہو چکی ہے

۸۔ " آخری تحفہ " (تیرہ افسانے) نرائن دت سہگل اینڈ سنز لاہور ' طبع اول: ۱۹۳۴ء

۱۔ آخری تحفہ '۲۔ دونیل '۳۔ وفا کی دیوی '۴۔ طلوع محبت '۵۔ شکار '۶۔ ادیب کی عزت '۷۔ قاتل '۸۔ ستی '
۹۔ ڈیمانسٹریشن '۱۰۔ برات '۱۱۔ آخری میلہ '۱۲۔ نجات ' (قاتل اور برات۔ پریم چند کے رسالے "ہنس" میں انکی بیوی شیورانی کے نام سے شائع ہوئے)
یہ کتاب دوسری بار نرائن دت سہگل 'لاہور نے ۱۹۳۸ء میں شائع کی اور بارہواں ایڈیشن بھی اسی ادارے نے دہلی سے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ واضح رہے کہ اس مجموعے کا ایک جعلی ایڈیشن " نجات " کے عنوان سے ۱۹۳۶ء میں صدیق بک ڈپو 'لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔

۹۔ " زاد راہ " ۔ (پندرہ افسانے) حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی: طبع اول: ۱۹۳۶ء

۱۔ وفا کی دیوی '۲۔ زیور کا ڈبہ '۳۔ آشیاں برباد '۴۔ خانہ داماد '۵۔ قرضدا کا '۶۔ فریب '۷۔ لاٹری '۸۔ نیور '۹۔ ہولی کی چھٹی '۱۰۔ زادراہ '۱۱۔ لعنت '۱۲۔ بڑے بھائی صاحب '۱۳۔ مس پدما '۱۴۔ حقیقت '۱۵۔ ڈامل کا قیدی ' (" آخری تحفہ " میں شامل "وفا کی دیوی" اور " زادراہ " میں شامل افسانہ ایک نہیں ')
اس کتاب کو دوسری بار گیلانی الیکٹرک بک ڈپو 'لاہور نے شائع کیا اور تیسری بار حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر 'دہلی نے ۱۹۳۹ء میں طبع کیا۔ اس کا ایک ایڈیشن اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا۔

۱۰۔ " دودھ کی قیمت " (نو افسانے) عصمت بک ڈپو 'دہلی: طبع اول: ۱۹۳۷ء

۱۔ دودھ کی قیمت '۲۔ کسم ۳۔ اکسیر ۴۔ عید گاہ ۵۔ سکون قلب ۶۔ ریاست کا دیوان۔
اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن اسی ادارے سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔

۱۱۔ "واردات" (تیرہ افسانے) مکتبہ جامعہ دہلی: طبع اول: ۱۹۳۷ء
۱۔ شکوہ و شکایت '۲۔ معصوم بچہ '۳۔ بدنصیب ماں '۴۔ شانتی '۵۔ روشنی '۶۔ مالکن '۷۔ نئی بیوی '۸۔ گلی ڈنڈا '۹۔ سوانگ '۱۰۔ انصاف کی پولیس '۱۱۔ قسم نہ داری بز سخر '۱۲۔ مفت کرم داشتن '۱۳۔ قاتل کی ماں۔
اس کو دوسری اور تیسری بار بھی اسی ادارے نے ۱۹۳۸ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کا نواں ایڈیشن جنوری ۱۹۵۹ء میں طبع ہوا۔ واضح رہے کہ اس مجموعے میں شامل افسانہ "شانتی" اس سے قبل "سکون قلب" کے عنوان سے افسانوی مجموعے "دودھ کی قیمت" میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن اردو مرکز لاہور نے ۱۹۵۴ء میں شائع کیا۔

نوٹ: پریم چند کے مذکورہ بالا مجموعوں میں شامل ایک سو نوے افسانوں کے علاوہ "کفن" اور "سبحان بھگت" جیسے متعدد عمدہ افسانے خود پریم چند یکجا نہیں کر پائے۔ پریم چند کے اپنے ترتیب دیئے ہوئے محولہ بالا گیارہ افسانوی مجموعوں کے علاوہ متعدد جعلی ایڈیشن مختلف ناموں کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔

نوٹ: نمبر شمار ۱۲ تا ۲۶ چند ایسے مجموعے ہیں جن کا تذکرہ پریم چند سے متعلق کسی کتابیات میں نہیں ملتا 'البتہ مختلف اشاعتی اداروں کی فہارس کتب میں ان کا حوالہ موجود ہے اور ان کی موجودگی کی تصدیق میں نے خود کتب خانوں سے کی ہے۔

۱۲۔ "نجات" (افسانے) صدیق بک ڈپو 'لکھنؤ: طبع اول: ۱۹۳۶ء
اس مجموعے میں برات "آخری حیلہ" آخری تحفہ 'جیل 'وفا کی دیوی 'ستی 'ادیب کی عزت 'دو بیل 'طلوع محبت 'شکار اور قاتل کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن تیرتھ رام ہربنس لال بک سیلرز لاہور نے بھی شائع کیا تھا۔

۱۳۔ "بازیافت" (افسانے) مطبوعہ: لاہور طبع اول: س-ن
یہ مجموعہ "پریم بتیسی" حصہ دوم کا جعلی ایڈیشن ہے صرف نام کی تبدیلی کی گئی ہے۔

۱۴۔ "سپیرن" (افسانے) بنگلہ زبان سے شرت چندر چیٹرجی کے افسانوں کا ترجمہ۔

۱۵۔ "میرے بہترین افسانے" (افسانے) مکتبہ شاہراہ 'دہلی' طبع اول: س-ن
اس مجموعے میں راہ نجات 'منتر 'مہاتیرتھ 'پنچ پرمیشور 'رانی سارندھا 'دو بیل 'شطرنج کے کھلاڑی 'ستی 'معافی 'پرائشچت اور سبحان بھگت کل گیارہ افسانے ہیں۔ یہ مجموعہ دوسری بار مغل بک ڈپو لاہور نے شائع کیا۔

۱۶۔ "مسافر اور دوسرے افسانے" (افسانے) کتابستان اردو 'لاہور: طبع اول: ۱۹۴۳ء
اس مجموعے میں مسافر 'موت کا خوف 'ہمدردی 'منسوس 'نوکری 'باپ 'زن و شوہر 'بماری اور کیسر کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ کیشو رام دت اینڈ سنز لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۱۷۔ "دیہات کے افسانے" (افسانے) دارالاشاعت پنجاب 'لاہور: طبع اول: ۱۹۳۹ء
اس مجموعے میں پنچایت 'بانگ سحر 'قربانی 'طلوع محبت 'وفا کی دیوی 'بیٹی کا دھن 'دو بیل 'خانہ داماد اور زادِ راہ کل نو افسانے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ دوسری بار کلاسیک لاہور نے شائع کیا۔

۱۸۔ "جیل" (افسانے) نرائن دت سہگل اینڈ سنز 'لاہور: طبع اول: ۱۹۴۰ء

۱۹۔ "فتح کالم اور دوسرے افسانے" (افسانے) کتابستان اردو 'لاہور: طبع اول: ۱۹۴۴ء سے قبل
اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہندوستانی کتاب گھر 'لاہور نے شائع کیا جو انجمن ترقی اردو 'کراچی کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔

۲۰۔ "منورما" (افسانے) عالمگیر الیکٹرک پریس، لاہور: طبع اول: ۱۹۴۳ء

۲۱۔ "طلسم مجاز" (افسانے) ہندوستانی کتاب گھر، لاہور: طبع اول: ۱۹۴۴ء سے قبل

۲۲۔ "قاتل" (افسانے) نرائن دت سہگل اینڈ سنز، لاہور: طبع اول: ۱۹۴۴ء سے قبل

(یہ کتاب "آخری تحفہ" کے چار افسانوں کا انتخاب ہے۔ ۱۔ "قاتل"، ۲۔ "آخری تحفہ"، ۳۔ "ادیب کی عزت" اور ۴۔ "دو بیل")۔

۲۳۔ "کوچوان" (افسانے / مغربی زبانوں سے تراجم) جین بک سٹال، لاہور: طبع اول: س۔ن

۲۴۔ "ہوائی محل" (افسانے / مضامین) ہندوستانی کتاب گھر، لاہور: طبع اول: س۔ن

۲۵۔ "خاموش محبت اور دوسرے افسانے" (ٹیگور کے افسانوں کا ترجمہ) نیشنل لٹریچر کمپنی، لاہور: طبع اول: س۔ن

۲۶۔ "چوگان اور دوسرے افسانے" (مغربی زبانوں سے تراجم) ہندوستانی کتاب گھر، لاہور: طبع اول: س۔ن

اس انتخاب میں ٹالسٹائی، پامر، گورکی، ٹامس ہارڈی، آرتھر مارسن، مارک ٹوئن اور وکٹر ہیوگو کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

(نوٹ): نمبر شمار ۲۳ تا ۲۶ کے سارے مجموعے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئے۔

۲۷۔ "اسرار معابد" (اردو ناول)

یہ پریم چند کا پہلا اردو ناول ہے جو ہفتہ وار اخبار "آواز خلق" بنارس میں اکتوبر ۱۹۰۳ء تا فروری ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ قسط اول پر پریم چند کا نام نواب رائے الہ آبادی درج ہے۔

۲۸۔ "کشنا" (اردو ناول)

بقول ڈاکٹر قمر رئیس پریم چند کے ایک اور رفیق بابو لال کرشن جو ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء میں الہ آباد ٹریننگ کالج میں پریم چند کے ہم جماعت تھے، ان کا پہلا ناول "کشنا" قرار دیتے ہیں جو ان کے قول کے مطابق ٹریننگ کالج کے زمانے میں ہی شائع ہوا تھا۔"

(بہ حوالہ: "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار")

۲۹۔ "ہم خرما وہم ثواب" (ناول۔ اردو) ناشر: مہادیو پرشاد ورما لکھنوی: سول ایجنٹ صدیق بک ڈپو: طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

پریم چند کے رفیق خاص منشی دیا نرائن نگم لکھتے ہیں:

"جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا، پریم چند کا سب سے پہلا ناول "ہم خرما وہم ثواب" کے نام سے مہادیو پرشاد ورما لکھنوی کے اہتمام سے.... ہلکے کاغذ پر معمولی لکھائی چھپائی میں شائع ہوا۔(۳)"

منشی پیارے لال شاکر لکھتے ہیں:

"میرے کانپور آنے سے برس ڈیڑھ برس قبل ان کا پہلا ناول "ہم خرما وہم ثواب" شائع ہوا تھا۔ میں نے اس کو ۱۹۰۷ء میں ہنوں ہی میں پڑھا تھا"(۴)

۳۰۔ "اسرار محبت" (ناول۔ اردو)

"........مدن گوپال اور امدر ناتھ مدان نے اپنی انگریزی اور ہندی کی تصانیف میں پریم چند کے پہلے ناول کا نام "اسرار محبت" بتایا ہے جو ان کے خیال میں ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا"(۵)

۳۱۔ "جلوۂ ایثار" (اردو ناول) انڈین پریس، الہ آباد: طبع اول: ۱۹۱۲ء

کل صفحات ۲۴۰۔ اسی ادارے نے دوسری بار ۱۹۲۸ء اور تیسری بار ۱۹۴۰ء میں شائع کیا۔ ایک ایڈیشن کتاب منزل لاہور نے بھی شائع کیا ہے اس ناول کا ہندی روپ "وردان" کے نام سے شائع ہوا۔

۳۲۔ "روٹھی رانی" (اردو ناول) زمانہ پریس 'کانپور' طبع اول: ۱۹۰۷ء

پانچواں ایڈیشن لاجپت رائے اینڈ سنز 'لاہور نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ یہ ناول دراصل راجپوتانہ کے ایک تاریخی قصہ کا اردو روپ ہے۔

۳۳۔ "بازار حسن" دو جلدیں (اردو ناول) دارالاشاعت پنجاب 'لاہور' طبع اول: ۱۹۱۸ء

یہ ناول ۱۹۱۶ء میں مکمل ہوا اور پہلے "سیوا سدن" کے عنوان سے ہندی میں شائع ہوا۔ دوسرا اور تیسرا ایڈیشن اسی ادارے سے ۱۹۳۸ء میں اور ایک ایڈیشن حالی پبلشنگ ہاؤس 'دہلی سے ستمبر ۱۹۵۴ء میں طبع ہوا' جس کی ضخامت ۳۴۴ صفحات ہے۔ پریم چند کی اس ناول پر بھارت میں ایک فیچر فلم بن چکی ہے۔ اس کتاب کا ایک جعلی ایڈیشن شیخ بک ایجنسی 'لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۳۴۔ "گوشہ عافیت" (اردو ناول) دو جلدیں۔ دارالاشاعت پنجاب 'لاہور' طبع اول: ۲۹۔ ۱۹۲۸ء

اسی ادارے نے ایک ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔ یہ ناول ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ سے ۴۹۵ صفحات کی ضخامت میں شائع ہو چکی ہے۔

۳۵۔ "چوگان ہستی" دو جلدیں (اردو ناول) دارالاشاعت پنجاب 'لاہور' طبع اول: ۱۹۲۷ء

اسی ادارے نے دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ ہندوستانی کتاب گھر 'لاہور نے اسے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا۔ ایک ایڈیشن مکتبہ رنگین دہلی سے ۸۴۸ صفحات کی ضخامت میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ دراصل ہندی ناول "رنگ بھوم" کا اردو روپ ہے۔

۳۶۔ "پردہ مجاز" دو جلدیں (اردو ناول) لاجپت رائے اینڈ سنز 'لاہور' طبع اول: ۱۹۳۱ء۔

پانچویں بار لاجپت رائے اینڈ سنز اردو بازار 'دہلی نے ۴۰۲ صفحات کی ضخامت کے ساتھ شائع کیا۔

۳۷۔ "نرملا" (اردو ناول) گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو 'لاہور' طبع اول: ۱۹۲۹ء۔

کل صفحات ۲۵۰۔ اس کا ایک ایڈیشن شاہین پبلی کیشنز 'راول پنڈی نے بھی شائع کیا ہے۔

۳۸۔ "غبن" (اردو ناول) لاجپت رائے اینڈ سنز 'لاہور' طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

یہ ناول تیسری بار ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد نے جون ۱۹۴۴ء میں شائع کیا۔ ایک ایڈیشن اعوان پبلی کیشنز راول پنڈی نے بھی شائع کیا ہے۔

۳۹۔ "بیوہ" (اردو ناول) ناشر: پریم چند 'سرسوتی پریس 'بنارس: طبع اول: ۱۹۳۵ء سے قبل

دوسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا اور عصمت بک ڈپو دہلی نے ۱۹۴۵ء میں چھاپا۔

۴۰۔ "میدان عمل" (اردو ناول) ناشر: پریم چند 'سرسوتی پریس 'بنارس: طبع اول: ۱۹۳۲ء

اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ میری لائبریری 'لاہور اور چوتھا ایڈیشن مکتبہ جامعہ 'دہلی نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔ ایک جعلی ایڈیشن ظفر احمد قریشی لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۴۱۔ "گئو دان" (اردو ناول) ناشر: پریم چند 'سرسوتی پریس 'بنارس: طبع اول: ۱۹۳۶ء

دوسری اور تیسری بار مکتبہ جامعہ 'دہلی نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء میں شائع کیا۔ اس ناول کا ایک جعلی ایڈیشن عشرت پبلشنگ ہاؤس 'لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۴۲۔ "منگل سوتر" (ہندی ناول) ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس 'بنارس: طبع اول:

یہ پریم چند کا آخری ناول بلکہ آخری تحریر ہے جو مکمل نہ کر سکی اسے ۱۹۳۶ء میں بستر علالت پر لکھنا شروع کیا۔ انھوں نے اسے اردو میں لکھا تھا لیکن اردو روپ سے پہلے اور پریم چند کے آنجہانی ہونے کے بعد ان کے بیٹے امرت رائے نے ہندی زبان میں

شائع کروایا۔ اصل اردو روپ تاحال شائع نہیں ہو سکا۔

۴۳۔ " سیوا سدن " (ہندی ناول) ہندی پستک ایجنسی ، کلکتہ : طبع اول : دسمبر ۱۹۱۸ء

۴۴۔ " پریم آشرم " (ہندی ناول)

۴۵۔ " رنگ بھوم " (ہندی ناول)

۴۶۔ " کایا کلپ " (ہندی ناول)

۴۷۔ " پرتاپ چندر " (ہندی ناول)

۴۸۔ " آسمان کی پری " (اردو ناول) سول ایجنٹ : صدیق بکڈپو : طبع اول : ۱۹۳۹ء سے قبل

۴۹۔ " سنگرام " (ہندی ناول)

۵۰۔ " درگا داس " (ہندی ناول)

۵۱۔ " کربلا " (اردو ڈراما) لاجپت رائے اینڈ سنز ، لاہور : طبع اول : ۱۹۴۴ء سے قبل

۵۲۔ " روحانی شادی " (اردو ڈراما) عصمت بک ڈپو ، دہلی : طبع اول : ۱۹۳۳ء

۵۳۔ " دوزخ " (اردو ناول) ہندوستانی کتاب گھر ، لاہور : طبع اول : ۱۹۴۴ء سے قبل

۵۴۔ " وفا کی دیوی " (اردو ناول) نرائن دت سہگل ، لاہور : طبع اول : ۱۹۴۰ء

۵۵۔ " عشق کا روگ " (اردو ناول) حجازی پریس ، لاہور : طبع اول : ۱۹۴۴ء سے قبل

۵۶۔ " چھٹکارا " (اردو ناول) ہندوستانی کتاب گھر ، لاہور : طبع اول : ۱۹۴۴ء سے قبل

اس ناول کا دوسرا ایڈیشن شاہین پبلی کیشنز ، راول پنڈی نے شائع کیا۔

۵۷۔ " باکمالوں کے درشن " (سوانحی خاکے) رام نارائن لال ، الہ آباد : طبع اول : ۱۹۲۹ء

۵۸۔ " سوچ وچار " (ہندی مضامین) طبع اول : ۱۹۰۳ء

۵۹۔ " مہاتما شیخ سعدی " (سوانح)

۶۰۔ " پریما " (ہندی ناول کا ترجمہ) طبع اول : ۱۹۰۷ء

۶۱۔ " رام چرچا " (رام چندر جی کی سوانح) ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس ، الہ آباد سول ایجنٹ صدیق بک ڈپو : طبع اول : ۱۹۳۹ء سے قبل

۶۲۔ " قرون وسطیٰ میں ہندوستان کی تہذیب " ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد : ہندوستانی پریس : طبع اول :

لیکچرز از رائے بہادر شنکر ہیرا چند اوجھا کا اردو ترجمہ :

۱۹۳۱ء کل صفحات ۲۳۸ ۔ ۶۰۰ء تا ۱۲۰۰ء کی ہندوستانی تہذیب ، مذاہب اور اقتصادیات کے حالات مع تصاویر۔

۶۳۔ " معاشیات کے ابتدائی اصول " (علم معاشیات) امرت الیکٹرک پریس ، لاہور ، طبع اول : ۱۹۳۶ء کل صفحات ۲۹۸۔

۶۴۔ " قسمت " (بابو گیندر ناتھ کے انگریزی ناول کا ترجمہ) ہندوستانی کتاب گھر ، لاہور ، طبع اول : س ۔ ن

۶۵۔ " مضامین پریم چند " مرتبہ : عتیق احمد : انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی ۔

۶۶۔ " مضامین پریم چند " مرتبہ : ڈاکٹر قمر رئیس ، دہلی : طبع اول : ۱۹۶۰ء

۶۷۔ " گپت دھن " (دو جلدیں) مرتبہ : امرت رائے

یہ ہندی میں ۵۶ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

۶۸۔ " من مودک " (بچوں کے لیے / ہندی)

۶۹۔ "کتے کی کہانی" (بچوں کے لیے / اردو)

۷۰۔ "جنگل کی کہانیاں" (بچوں کے لیے / اردو)

غیر مدون:

محولہ بالا مطبوعہ کتب کے علاوہ پریم چند نے اناطول فرانس کے ناول "تائیس" کا اردو ترجمہ ا ہلنکار کلکتہ اور جارج ایلیٹ کے ناول سائلس مارنر (Silas Marner) کا اردو ترجمہ سکھداس کلکتہ کے لیے کیا تھا۔ یہ دونوں تراجم تاحال شائع نہیں ہوئے۔ "سپ سروج" (ہندی ماہنامہ) میں شائع ہونے والے ہندی افسانے اس کے علاوہ ہیں۔

نظریہ فن:

"میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی، میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔"

(بہ حوالہ: مکتوب بنام: حکیم یوسف حسن مدیر "نیرنگ خیال" ۱۹۳۳ء)

○

(۱) کئی دیگر کتب میں اور ڈاکٹر وحید قریشی نے "بہترین انشائی ادب" میں پریم چند کو ۱۹۰۵ء میں کانپور میں بتایا ہے جو درست نہیں۔

(۲) سری ساؤنڈ سٹوڈیوز، دادر، بمبئی میں تکمیل پانے والی اس فلم کے موسیقار پریم ناتھ، گیت کار آرزو لکھنوی اور مکالمہ نگار بی۔ ٹی۔ چپائی تھے۔ اداکاروں میں جہد بش، بیکمی، نگار سلطانہ، سلوچنا، کے۔ این سنگھ، خاتون، گوپ، شرما اور نوین ینگ تھے۔

(۳) "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار" از ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۱۷۰

(۴) "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار" از ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۱۷۰

(۵) "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار" از ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۱۷۰

پریم چند

عشق دنیا اور حب وطن

شہر لندن کے ایک پرانے خستہ حال ہوٹل میں' جہاں سرشام سے اندھیرا ہو جاتا ہے۔ جس خطہ میں فیشن ایبل لوگ آنا ہی گناہ سمجھتے ہیں اور جہاں قمار بازی شراب خواری اور بدکاری کے نہایت عبرتناک نظارے ہر دم پیش نظر رہتے ہیں۔ اس ہوٹل میں' اس بدکاریوں کے اکھاڑے میں اطالیہ کا نامور محب وطن میزنی خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا وجیہ چہرہ زرد ہے۔ آنکھوں سے فکر برس رہی ہے۔ ہونٹ خشک ہیں اور شاید مہینوں سے حجامت درست نہیں ہوئی کپڑے میلے کچیلے ہیں۔ کوئی شخص جو میزنی سے پہلے واقف نہ ہو اسے دیکھ کر یہ خیال کرنے سے نہیں رک سکتا۔ کہ یہ بھی انہیں محروم القسمت شخصوں میں ہے' جو اپنے نفس کے غلام ہو کر ذلیل ترین حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔

میزنی اپنے خیالات میں غرق ہے۔ آہ! بدنصیب قوم! اے مظلوم اٹلی! کیا تیری قسمتیں کبھی نہ سدھریں گی۔ کیا تیرے سینکڑوں سپوتوں کا خون ذرا بھی رنگ لائے گا۔ کیا تیرے ہزارہا جلا وطن دیس سے نکالے ہوئے جاں نثاروں کی آہوں میں ذرا بھی تاثیر نہیں! کیا تو ظلم و جفا۔ غلامی اور اطاعت گزاری کے دام میں ہمیشہ گرفتار رہے گی۔ غالبا تجھ میں ابھی سدھرنے کی' خود مختار بننے کی صلاحیت نہیں آئی۔ شاید تیری قسمت میں کچھ دنوں اور ذلت و خواری جھیلنی لکھی ہے۔ آزادی! ہائے آزادی! تیرے لئے میں نے کیسے کیسے دوست جان سے پیارے دوست قربان کئے۔ کیسے کیسے نوجوان' ہونہار جنگی مائیں اور بیویاں آج ان کی قبر پر آنسو بہا رہی ہیں اور اپنے آلام و مصیبت سے بیزار ہو کر ان کی جدائیوں کی تکلیف میں بد قسمت' حرماں نصیب' آفت رسیدہ میزنی کو بد دعائیں دے رہی ہیں۔ کیسے کیسے شیر جو دشمنوں کے مقابل پیٹھ پھیرنا نہ جانتے تھے۔ کیا یہ سب قربانیاں۔ کیا یہ سب نذریں کافی نہیں ہیں؟ آزادی تو ایسی قیمتی شے ہے!! ہاں تو پھر میں کیوں زندہ ہوں۔ کیا یہ دیکھنے کے لیے کہ میرا پیارا وطن میرا پیارا دیس دغا پرست۔ جفا شعار دشمنوں کے پیروں تلے روندا جائے میرے پیارے بھائی میرے پیارے ہموطن جور و تعدی کا شکار بنیں۔ نہیں میں یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا!!

میزنی انہیں خیالات میں غرق تھا کہ اس کا دوست رفیتی۔ جو اس کے ساتھ جلا وطن کیا گیا تھا اس کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بسکٹ کا ٹکڑا تھا۔ رفیتی عمر میں اپنے دوست سے دو چار برس چھوٹا تھا۔ بشرے سے شرافت جھلک رہی تھی۔ اس نے میزنی کا شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا " جوزف! یہ لو کچھ کھا لو۔ " میزنی نے چونک کر سر اٹھایا اور بسکٹ دیکھ کر بولا " یہ کہاں سے لائے' تمہارے پاس پیسے کہاں تھے؟"

رفیتی۔ " پہلے کھا لو پھر یہ باتیں پوچھنا۔ تم نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا ہے۔"

میزنی۔ " پہلے یہ بتاؤ کہاں سے لائے۔ جیب میں تمباکو کا ڈبہ بھی نظر آتا ہے اتنی دولت کہاں ہاتھ لگی!"

رفیتی۔ پوچھ کر کیا کرو گے۔ وہی اپنا نیا کوٹ جو والدہ نے بھیجا تھا گروی رکھ آیا ہوں۔"

میزنی نے ایک ٹھنڈی سانس لی! اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ زمین پر گر پڑے۔ روتے ہوئے بولا " یہ تم نے کیا حرکت کی۔ کرسمس کے دن آتے ہیں۔ اس وقت کیا پہنو گے۔ کیا اطالیہ کے ایک لکھ پتی تاجر کا اکلوتا بیٹا کرسمس کے دن بھی ایسے ہی پھٹے پرانے کوٹ میں بسر کرے گا۔ ایں!"

رفیتی۔ "کیوں کیا اس وقت تک کچھ آمدنی نہ ہو گی۔ ہم تم دونوں نئے جوڑے بنوائیں گے اور اپنے پیارے وطن کی آنے والی آزادی کے نام پر خوشیاں منائیں گے۔"

میزنی۔ "آمدنی کی تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جو مضمون ماہواری رسالوں کے لئے لکھے گئے تھے وہ واپس ہی آگئے۔ گھر سے جو کچھ ملتا ہے وہ کب کا ختم ہو چکا۔ اب اور کونسا ذریعہ ہے؟"

رفیتی۔ "ابھی کرسمس کو ہفتہ بھر پڑا ہے۔ ابھی سے اس کی کیا فکر کریں اور اگر بالفرض یہی کوٹ پہنا تو کیا؟ تم نے نہیں میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس کے لئے میگڈالن کی انگوٹھی بیچ ڈالی تھی۔ میں عنقریب یہ واقعہ اسے لکھنے والا ہوں دیکھنا تمہیں کیا بناتی ہے۔"

کرسمس کا دن ہے۔ لندن میں ہر چہار طرف مسرت کی گرم بازاری ہے۔ صغیر و کبیر، امیر و غریب سب اپنے اپنے گھر خوشیاں منا رہے ہیں اور اپنے نفیس سے نفیس کپڑے پہن کر کلیساؤں میں جا رہے ہیں۔ کوئی مغموم صورت نظر نہیں آتی۔ ایسے وقت میں میزنی اور رفیتی دونوں اسی تنگ و تار حجرے میں سر جھکائے خاموش بیٹھے ہیں۔ میزنی ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہے، اور رفیتی رہ رہ کر دروازے پر آتا ہے اور بدمست شرابیوں کو معمول سے زیادہ بہکتے اور دیوانہ پن کی حرکتیں کرتے دیکھ کر اپنی بے نوائی اور ناداری کی فکر دور کرنا چاہتا ہے۔ افسوس! اطالیہ کا سرتاج، جس کی ایک للکار پر ہزاروں آدمی اپنا خون بہانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ آج ایسا محتاج ہو رہا ہے کہ اسے کھانے کا ٹھکانہ نہیں۔ حتیٰ کہ آج صبح سے اس نے ایک سگار بھی نہیں پیا۔ تمباکو ہی دنیا کی وہ نعمت تھی جس سے وہ دست بردار نہیں ہو سکتا تھا، اور وہ بھی آج اسے نصیب نہ ہوا مگر اس وقت اسے اپنی فکر نہیں۔ رفیتی۔ نوجوان خوشحال و خوش رو ہونہار رفیتی کی فکر اسے سوہان روح ہو رہی ہے۔ وہ پوچھتا ہے مجھے کیا حق ہے کہ میں ایک ایسے شخص کو اپنے ساتھ عسرت کی تکلیفیں جھیلنے پر مجبور کروں جس کے خیر مقدم کے لئے دنیا کی سب نعمتیں آغوش کھولے ہوئے کھڑی ہیں۔

اتنے میں ایک چٹھی رساں نے پوچھا جوزف میزنی یہاں کہیں رہتا ہے۔ اپنی چٹھی لے جا۔ رفیتی نے خط لے لیا اور جوش مسرت سے اچھل کر بولا۔ "جوزف! یہ لو میگڈالن کا خط ہے!"

میزنی نے چونک کر خط لے لیا اور بڑی بے صبری سے کھولا۔ لفافہ کھولتے ہی چند بالوں کا ایک گچھا گر پڑا جو میگڈالن نے کرسمس کے تحفہ کے طور پر بھیجا تھا۔ میزنی نے اس گچھے کو بوسہ دیا اور اسے اٹھا کر اپنے سینے کی جیب میں ٹھونس لیا۔ خط میں یہ لکھا ہوا تھا۔

"مائی ڈیر جوزف! یہ ناچیز تحفہ قبول کرو۔ خدا کرے تمہیں ایک سو کرسمس دیکھنے نصیب ہوں۔ اس یادگار کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا۔ اور غریب میگڈالن کو بھولنا مت۔ میں اور کیا لکھوں کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے۔ ہائے جوزف! میرا پیارا، میرا آقا، میرا مالک جوزف! تو مجھے کب تک تڑپائے گا اب ضبط نہیں ہوتا۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے ہیں میں تیرے ساتھ مصیبتیں جھیلوں گی۔ فاقوں مروں گی۔ یہ سب مجھے گوارا ہے۔ مگر تجھ سے جدا رہنا گوارا نہیں۔ تجھے قسم ہے تجھے اپنے ایمان کی قسم، تجھے اپنے وطن کی قسم! یہاں آجا۔ تجھے میری قسم یہ آنکھیں ترس رہی ہیں۔ کب تجھے دیکھوں گی۔ کرسمس قریب ہے! مجھے کیا۔ جب تک زندہ ہوں تیری ہوں۔ تمہاری میگڈالن

(۲)

میگڈالن کا گھر سوئٹزرلینڈ میں تھا۔ وہ ایک مرفہ حال تاجر کی بیٹی تھی اور انتہا درجہ کی حسینہ و جمیلہ۔ حسن باطن میں بھی اس کا نظیر نہ تھا۔ کتنے ہی امراء و روساء اس کا سودا سر میں رکھتے تھے۔ مگر وہ کسی کو کچھ خیال میں نہ لاتی تھی۔ میزنی جب اطالیہ سے بھاگا تو سوئٹزرلینڈ میں آکر پناہ گزیں ہوا۔ میگڈالن اس وقت بھولے بھالے شباب کی گود میں کھیل رہی تھی۔ میزنی کی سرفروشیوں کی تعریفیں پہلے ہی سن چکی تھی۔ کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ اس کے یہاں آنے لگی۔ اور باہمی ارتباط جو بڑھا اور میزنی کے محاسن باطنی کا جوں جوں اس کے دل پر نقش ہوتا گیا۔ اس کی

محبت اس کے دل میں پختہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے ایک دن خود شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر میزنی کے پیروں پر سر رکھ کر کہا مجھے اپنی خدمت میں قبول کیجئے۔

میزنی پر بھی اس وقت شباب کا عالم تھا۔ قومی تفکرات نے ابھی دل کو پژمردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ جوانی کی پرجوش امیدیں دل میں موجزن ہو رہی تھیں۔ اگر اس نے عہد کر لیا تھا کہ میں ملک و قوم پر اپنے تئیں نثار کروں گا' اور اس عہد پر قائم رہا ایک ایسی نازنیں کے نازک لبوں سے ایسی درخواست سن کر رد کر دینا میزنی ہی جیسے اعتقاد کے پکے بہاؤ کے پورے آدمی کا کام تھا۔

میگڈالن باچشم تر اٹھی۔ مگر مایوس نہ ہوئی تھی' اس ناکامی نے اس کے دل میں آتش محبت اور بھی تیز کر دی' اور گو آج میزنی کو سوئٹزرلینڈ چھوڑے کئی سال گزرے مگر وفادار میگڈالن ابھی تک میزنی کو نہیں بھولی۔ دنوں کے ساتھ اس کی محبت اور بھی گاڑھی اور سچی ہوتی جاتی ہے۔

میزنی جب خط پڑھ چکا تو ایک لمبی آہ بھر کر رفیتی سے بولا "دیکھا میگڈالن کیا کہتی ہے؟"

رفیتی۔ "اس غریب کی جان لے کر دم لوگے۔"

میزنی پھر خیال میں ڈوبا "میگڈالن تو نوجوان ہے۔ حسین ہے۔ خدا نے تجھے دولت بے انتہا عطا کی ہے۔ تو کیوں ایک غریب دکھیارے' مفلس' قلاش اور غربت زدہ شخص کے پیچھے اپنی زندگی مٹی میں ملا رہی ہے۔ مجھ جیسا مایوس آفت زدہ مصیبتوں کا مارا شخص تجھے کیوں کر خوش رکھ سکے گا۔ نہیں' نہیں میں ایسا خود غرض نہیں ہوں دنیا میں بہت سے ایسے شگفتہ مزاج خوشحال نوجوان ہیں جو تجھے خوش رکھ سکتے ہیں۔ جو تیری پرستش کرسکتے ہیں۔ کیوں تو ان میں سے کسی کو اپنی غلامی میں نہیں لے لیتی۔ میں تیری محبت' سچی نیک اور بے غرض محبت کی قدر کرتا ہوں۔ مگر میرے لئے جس کا دل قوم اور وطن پر نثار ہو چکا ہے تو بجز ایک پیاری اور ہمدرد بہن کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مجھ میں ایسی کیا خوبی ہے' ایسے کونسے اوصاف ہیں کہ تجھ جیسی دیوی میرے لئے ایسی مصیبتیں جھیل رہی ہے۔ آہ میزنی کمبخت میزنی تو کہیں کا نہ ہوا جن کے لئے تو نے اپنے تئیں نثار کر دیا وہ تیری صورت سے بیزار ہیں۔ جو تیرے ہمدرد ہیں وہ سمجھتے ہیں تو خواب دیکھ رہا ہے!" ان خیالات سے بے بس ہو کر میزنی نے قلم دوات نکالی اور میگڈالن کو خط لکھنا شروع کیا۔

(۳)

"پیاری میگڈالن! تمہارا خط معہ بیش بہا تحفہ کے آیا۔ میں تمہارا تہ دل سے مشکور ہوں کہ تم نے مجھ جیسے بیکس و بے بس شخص کو اس تحفہ کے قابل سمجھا۔ میں اس کی ہمیشہ قدر کروں گا۔ یہ میرے پاس ہمیشہ ایک سچی بے غرض اور غیر فانی محبت کی یادگار رہے گا اور جس وقت یہ جسم خاکی آغوش لحد میں جائے گا میری آخری وصیت یہ ہوگی کہ یہ یادگار میرے جنازے کے ساتھ دفن کر دی جائے۔ میں شاید خود اس تقویت کا اندازہ نہیں لگا سکتا جو مجھے اس خیال سے ہے کہ دنیا میں جہاں ہرچہار طرف میری نسبت بدگمانیاں پھیل رہی ہیں کم از کم ایک ایسی فرشتہ خصال عورت ہے جو میری نیتوں کی صفائی اور میری آلائشوں سے پاک کوششوں پر پکا اعتقاد رکھتی ہے اور شاید تمہارے ہی ہمدردی کا یقین ہے کہ میں زندگی کے ایسے سخت امتحانات میں کامیاب ہوتا جاتا ہوں۔

مگر پیاری بہن مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ تم میری تکلیفوں کے خیال سے اپنا دل مت دکھانا۔ میں بہت آرام سے ہوں۔ تمہاری محبت جیسی لازوال دولت پا کر بھی اگر میں چند جسمانی تکالیف کا رونا روؤں تو مجھ جیسا بدقسمت شخص دنیا میں کون ہوگا۔

میں نے سنا ہے تمہاری صحت روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے۔ میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ تجھے دیکھوں کاش میں آزاد ہوتا' کاش میرا دل اس قابل ہوتا کہ تیرے نذر کیا جاتا۔ مگر ایک پژمردہ' افسردہ دل تیرے قابل نہیں میگڈالن! خدا کے واسطے اپنی صحت کا خیال رکھو۔ مجھے شاید

اس سے زیادہ بات کی تکلیف نہ ہو گی کہ پیاری میگڈالن تکلیف میں ہے اور میرے لئے! تیری پاکیزہ صورت اس وقت نگاہوں کے سامنے ہے! میگا! دیکھو مجھ سے ناراض نہ ہو! خدا میں تمہارے قابل نہیں۔ آج کرسمس کا دن ہے۔ تمہیں کیا تحفہ بھیجوں۔ خدا تم پر ہمیشہ اپنی بے انتہا برکات نازل کرتا رہے۔ اپنی ماں کو میری طرف سے سلام کہنا۔ تم لوگوں کے دیدار کی بہت آرزو ہے۔ دیکھیں کب تک یہ آرزو پوری ہوتی ہے۔ تیرا جوزف"

(۴)

اس واقعہ کے بعد بہت دن گزر گئے۔ جوزف میزینی پھر اطالیہ پہنچا اور روم میں پہلی بار جمہوری سلطنت کا اعلان کیا گیا۔ تین شخص کاروبار سلطنت کے انصرام کے لئے منتخب کئے گئے۔ میزینی بھی ان میں ایک تھا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں فرانس کی زیادتیوں اور شاہ پیڈمانٹ کی دغابازیوں کی بدولت اس جمہوری سلطنت کا انتزاع ہو گیا۔ اور اس کے ارکان و مشیر اپنی جانیں لے کر بھاگ نکلے۔ میزینی اپنے معتمد دوستوں کی دغابازی و دنیا سازی پر پیچ و تاب کھاتا ہوا خستہ حال و پریشان روم کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ اس کا یہ خواب کہ روم کو میں ضرور ایک دن جمہوری سلطنت کا مرکز بنا کر چھوڑوں گا پورا ہو کر پھر پریشان ہو گیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ سے آشفتہ حال ہو کر وہ ایک درخت کے سائے میں ذرا دم لینے کے لئے ٹھہر گیا کہ سامنے سے ایک لیڈی آتی ہوئی دکھائی دی اس کا چہرہ زرد تھا۔ کپڑے بالکل سفید اور سادہ' سن تیس سال سے متجاوز' میزینی خود فراموشی کے عالم میں تھا کہ یہ نازنین جوش محبت سے بیتاب ہو کر اس کے گلے لپٹ گئی۔ میزینی نے چونک کر دیکھا۔ بولا "پیاری میگڈالن! تم ہو۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ میگڈالن نے رو کر کہا۔ "جوزف! اور منہ سے کچھ نہ نکلا۔"

دونوں خاموش' کئی منٹ تک روتے رہے آخر میزینی بولا "تم یہاں کب آئیں میگا!"

میگڈالن۔ "میں یہاں کئی ماہ سے ہوں۔ مگر تم سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی۔ تمہیں کاروبار میں محو دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اب تمہیں مجھ جیسی عورت کی ہمدردی کی ضرورت باقی نہیں تم سے ملنے کی کوئی ضرورت نہ دیکھتی تھی (رک کر) کیوں جوزف! یہ کیا سبب ہے کہ اکثر لوگ تمہاری برائی کیا کرتے ہیں۔ کیا وہ اندھے ہیں کیا خدا نے انہیں آنکھیں نہیں دیں؟"

جوزف۔ "میگا! شاید وہ لوگ سچ کہتے ہوں کہ فی الواقع مجھ میں وہ اوصاف نہیں ہیں۔ جو میں نخوت کے باعث اکثر کہا کرتا ہوں کہ مجھ میں ہیں' یا جنہیں تم اپنی سادگی اور پاک نفسی سے مجھ میں موجود سمجھتی ہو۔ میری کمزوریاں روز بروز مجھے معلوم ہوتی جاتی ہیں۔"

میگڈالن۔ "جبھی تو تم اس قابل ہو کہ میں تمہاری پرستش کروں۔ مبارک ہے وہ انسان جو خودی کو مٹا کر اپنے تئیں ہیچ سمجھنے لگے۔ جوزف! خدا کے لئے مجھے یوں مت جدا کرو۔ میں تمہاری ہو گئی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم ویسے ہی پاک و صاف ہو جیسا ہمارا یسوع تھا۔ یہ خیال میرے دل میں نقش ہو گیا ہے اور اگر اس میں ذرا کمزوری آئی تھی تو تمہاری اس وقت کی گفتگو نے اسے اور بھی مضبوط کر دیا۔ بیشک تم فرشتے ہو۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ دنیا میں کیوں لوگ اس قدر کوتاہ نظر اور کم بیں ہوتے ہیں اور خصوصاً" وہ لوگ جنہیں میں تنگ خیالوں سے بالاتر سمجھتی تھی۔ رفیقی رماری تو' پالی نو۔ برناباس یہ سب کے سب تمہارے دوست ہیں۔ تم انہیں اپنا دوست سمجھتے ہو مگر وہ سب تمہارے دشمن ہیں۔ اور انہوں نے مجھ سے میرے روبرو سینکڑوں ایسی باتیں تمہارے نسبت کی ہیں جس کا میں مر کر بھی یقین نہیں کر سکتی۔ وہ سب غلط' غلط کہتے ہیں۔ ہمارا پیارا جوزف ویسا ہی ہے جیسا میں سمجھتی تھی۔ بلکہ اس سے بھی افضل۔ کیا یہ بھی تمہاری ایک ذاتی خوبی نہیں ہے کہ تم اپنے دشمنوں کو بھی اپنا دوست سمجھتے ہو۔"

جوزف سے اب صبر نہ ہو سکا اس نے میگڈالن کے زرد ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا۔ "پیاری میگا میرے دوست بے قصور ہیں اور میں خود

خطاوار ہوں (رو کر) جو کچھ انہوں نے کہا وہ سب میرے ہی اشارے اور مرضی کے موافق تھا۔ میں نے تم سے نرو دغابازی کی۔ مگر میری پیاری بہن یہ محض اس لئے تھا کہ تم میری طرف سے بے پروا ہو جاؤ اور اپنے شباب کے باقی دن مسرت سے بسر کرو۔ میں بہت نادم ہوں میں تمہیں مطلق نہ سمجھا تھا۔ میں تمہاری محبت کی گہرائی سے ناواقف تھا' کیونکہ جو میں چاہتا تھا اس کا الٹا اثر ہوا مگر میگا میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

میگڈالن۔ "ہائے جوزف۔ تم مجھ سے معافی مانگتے ہو۔ ایں! تم جو دنیا کے سب انسانوں سے زیادہ نیک' زیادہ سچے اور زیادہ لائق ہو مگر ہاں بیشک' تم نے مجھے بالکل نہ سمجھا تھا۔ جوزف! یہ تمہاری غلطی تھی۔ مجھے تعجب تو یہ ہے کہ تم اتنے سنگ دل کیوں کر ہو گئے۔"

جوزف۔ "میگا! خدا جانتا ہے جب میں نے رفیقی کو یہ سب سکھا پڑھا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی۔ میں جو دنیا میں نیک نامی کی سب سے زیادہ وقعت سمجھتا ہوں اور جس نے حریفوں کے ذاتی حملوں کو بھی بلا کامل تردید کئے ہوئے نہ چھوڑا۔ اپنے منہ سے سکھاؤں کہ جا کر مجھے برا کہو۔ مگر یہ محض اس لئے تھا کہ تم اپنی صحت کا خیال رکھو اور مجھے بھول جاؤ۔"

حقیقت یہ تھی کہ میزینی نے میگڈالن کے عشق کو روز افزوں ہوتے دیکھ کر ایک خاص حکمت کی تھی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ میگڈالن کے شیدائیوں میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جو اس سے زیادہ شکیل' زیادہ جری' زیادہ دولت مند اور زیادہ ذہین ہیں مگر وہ کسی کو خیال میں نہیں لاتی۔ مجھ میں اس کے لئے جو خاص کشش ہے وہ میرے چند اوصاف ہیں اور اگر میرے ایسے احباب کی جن کی وقعت میگڈالن کی نگاہوں میں بھی ہے' اس سے میری شکایت کر کے ان اوصاف کی وقعت اس کے دل سے مٹا دیں تو وہ خود بخود مجھے بھول جائے گی۔ پہلے تو اس کے احباب اس فعل کے کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے مگر اس خوف سے کہ کہیں میگڈالن نے گھل گھل کر جان دے دی تو میزینی اپنی زندگی بھر ہمیں بھی نہ معاف کرے گا۔ انہوں نے یہ ناگوار کام قبول کر لیا تھا وہ سوئٹزرلینڈ گئے اور جہاں تک ان کی زبان میں گویائی تھی اپنے دوست کی غیبت اور بدگوئی میں صرف کی۔ مگر میگڈالن پر محبت کا رنگ ایسا گہرا چڑھا ہوا تھا کہ ان کوششوں کا بجز اس کے اور کوئی نتیجہ نہ ہو سکتا تھا جو ہوا۔ وہ ایک روز بیقرار ہو کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور روم میں آکر ایک سرائے میں مقیم ہو گئی۔ یہاں اس کا روز کا وظیرہ تھا کہ میزینی کے پیچھے پیچھے اس کی نگاہ سے دور گھوما کرتی مگر اسے مطمئن اور اپنی کامیابی سے خوش دیکھ کر اسے چھیڑنے کی جرات نہ کرتی تھی۔ بالآخر جب پھر اس پر ناکامیابیوں کا وار ہوا' اور پھر وہ دنیا میں بے کس و بے بس ہو گیا تو میگڈالن نے سمجھا اب اس کو کسی ہمدرد کی ضرورت ہے اور ناظرین دیکھ چکے ہیں جس طرح وہ میزینی سے ملی۔

(۵)

میزینی روم سے پھر انگلستان پہنچا اور یہاں وہ عرصے تک مقیم رہا۔ ۱۸۷۰ء میں اسے خبر ملی کہ سسلی کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہے اور انہیں میدان جنگ میں لانے کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہے۔ بس وہ فوراً سسلی پہنچا مگر اس کے جانے کے قبل شاہی فوج نے باغیوں کو زیر کر دیا تھا۔ میزینی جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر لیا گیا اور ایک زندان خانہ میں ڈال دیا گیا۔ مگر چونکہ اب وہ بہت ضعیف ہو گیا۔ حکام شاہی نے اس خوف سے کہ کہیں وہ تکالیف قید سے مر جائے تو رعایا کو شبہ ہو گا کہ بادشاہ کی تحریک سے وہ قتل کر ڈالا گیا' اسے رہا کر دیا۔ مایوس اور شکستہ دل میزینی پھر سوئٹزرلینڈ کی طرف روانہ ہوا اس کی زندگی کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اٹلی کے متفق اور متحد ہو جانے کے دن بہت قریب آ گئے تھے۔ مگر اس کی حکومت کی حالت اس سے ہرگز بہتر نہ تھی۔ جیسی اسٹریا نیبلیز کے عہد حکومت میں۔ فرق یہ تھا کہ پہلے وہ ایک غیر قوم کی زیادتیوں سے نالاں تھے۔ اب اپنے قوم کے ہاتھوں خستہ و خوار۔ ان متواتر ناکامیوں نے مستقل مزاج میزینی کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ غالباً" عوام کی ملکی تعلیم اس حد تک نہیں ہوئی کہ وہ اپنے لئے ایک جمہوری طرز حکومت کی بنیاد ڈالیں' اور اس نیت سے وہ سوئٹزرلینڈ جا رہا تھا کہ وہاں سے ایک زبردست قومی اخبار نکالے۔ کیونکہ اطالیہ میں اسے اپنے خیالات کی اشاعت کی اجازت نہ تھی۔ وہ رات بھر نام تبدیل کر کے روم میں مقیم رہا پھر وہاں سے اپنے زاد بوم جنیوا میں آیا۔ اور اپنی پاک خصال ماں کی قبر پر پھول چڑھائے' بعد ازاں سوئٹزر

لینڈ کی طرف چلا اور سال بھر تک چند معتقد احباب کی اعانت سے اخبار نکالتا رہا۔ مگر متواتر تفکرات اور مصائب نے اسے بالکل لاغر اور نحیف بنا دیا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں وہ صحت کے خیال سے انگلستان آ رہا تھا کہ کوہ آلپس کے دامن میں نمونیا کی بیماری نے سلسلہ حیات منقطع کر دیا اور وہ ایک پر ارمان دل لئے ہوئے جنت کو سدھارا۔ اٹلی کا نام مرتے دم تک اس کی زبان پر تھا۔ یہاں بھی اس کے متعدد حامی، ہمدرد شریک تھے اور ایک بڑے پر فضا فرحت بخش مقام پر ایک شفاف چشمے کے کنارے پر اس فنافی القوم کو سلا دیا گیا۔

(۶)

میزینی کو کنج لحد میں سوئے ہوئے آج تین دن گزر گئے۔ شام کا وقت تھا سورج کی زرد شعاعیں اس تازہ قبر پر حسرت ناک نگاہوں سے تاک رہی ہیں کہ ایک ادھیڑ عورت، خوبصورت، شمانے جوڑے پہنے لڑکھڑاتی ہوئی آئی۔ یہ میگڈالن تھی۔ اس کا چہرہ نہایت مغموم و پژمردہ تھا۔ گویا اب اس جسم میں جان نہیں باقی رہی۔ وہ اس قبر کے سرہانے بیٹھ گئی اور اپنے سینے پر رکھے ہوئے پھول اس پر چڑھائے۔ پھر دو زانو ہو کر صدق دل سے دعا کرتی رہی۔ جب خوب اندھیرا ہو گیا۔ برف پڑنے لگی تو وہ چپکے سے اٹھی اور خاموش سر جھکائے قریب کے ایک گاؤں میں جا کر رات بسر کی اور علی الصباح اپنے مکان کی طرف روانہ ہوئی۔

میگڈالن اب اپنے گھر کی مالک تھی اس کی ماں بہت عرصہ ہوا انتقال کر گئی تھی۔ اس نے میزینی کے نام سے ایک خانقاہ بنوائی اور خود خانقاہ نشیں، عیسائی لیڈیوں کے لباس میں وہاں شب و روز رہنے لگی۔ میزینی کا نام اس کے لئے نہایت پر درد اور دلکش نغمے سے کم نہ تھا۔ ہمدردوں اور قدردانوں کے لئے اس کا گھر، خانہ بے تکلف تھا۔ میزینی کے خطوط اس کی انجیل اور میزینی کا نام اس کا معبود تھا۔ آس پاس کے غریب لڑکے اور مفلس بیویوں کے لئے یہی بابرکت نام حصول معاش کا وسیلہ تھا۔ میگڈالن تین برس تک زندہ رہی اور جب مری تو اپنی آخری وصیت کے مطابق اسی خانقاہ میں دفن کی گئی۔ اس کا عشق معمولی محبت نہ تھا بلکہ وہ ایک پاک اور بے لوث جذبہ تھا اور وہ ہم کو ان پریم رس میں ڈوبی ہوئی گوپیوں کی یاد دلاتا ہے جو سری کرشن کے پریم میں بندرابن کی کنجوں اور گلیوں میں منڈلایا کرتی تھیں۔ جو اس سے ملے ہونے پر بھی اس سے الگ تھیں۔ اور جن کے دلوں میں پریم کے سوا اور کسی چیز کی جگہ نہ تھی۔ میزینی کی خانقاہ آج تک قائم ہے۔ اور غرباء اور فقراء ابھی تک میزینی کا پاک نام لے کر وہاں ہر طرح کی آسائش اور راحت پاتے ہیں۔

○

پریم چند

دنیا کا سب سے انمول رتن

دلفگار ایک پر خار درخت کے نیچے دامن چاک بیٹھا ہوا خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ وہ حسن کی دیوی یعنی ملکہ دلفریب کا سچا اور جانباز عاشق تھا' ان عشاق میں نہیں جو عطر پھلیل میں بس کر اور لباس فاخرہ سے سج کر عاشق کے بھیس میں معشوقیت کا دم بھرتے ہیں۔ بلکہ ان سیدھے سادھے بھولے بھالے فدائیوں میں جو کوہ و بیاباں میں سر ٹکراتے اور نالہ و فریاد مچاتے پھرتے ہیں۔ دلفریب نے اس سے کہا تھا کہ اگر تو میرا سچا عاشق ہے تو جا اور دنیا کی سب سے بیش بہا شے لے کر میرے دربار میں آ۔ تب میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کروں گی۔ اگر تجھے وہ چیز نہ ملے تو خبردار' ادھر رخ نہ کرنا' ورنہ دار پر کھنچوا دوں گی۔ دلفگار کو اپنے جذبے کے اظہار کا شکوہ و شکایات کا' اور جمال یار کے دیدار کا مطلق موقع نہ دیا گیا۔ دلفریب نے جو نہی یہ فیصلہ سنایا۔ اس کے چوبداروں نے غریب دلفگار کو دھکے دے کے باہر نکال دیا اور آج تین دن سے یہ ستم رسیدہ شخص اسی پر خار درخت کے نیچے اسی وحشت ناک میدان میں بیٹھا ہوا سوچ رہا ہے کہ کیا کروں؟ دنیا کی سب سے بیش بہا شے! مجھ کو ملے گی! نا ممکن' اور وہ ہے کیا؟ قارون کا خزانہ؟ آب حیات؟ تاج خسرو؟ جام جم؟ تخت طاؤس؟ زر پرویز؟ نہیں یہ چیزیں ہرگز نہیں۔ دنیا میں ضرور ان سے بھی گراں تر' ان سے بھی بیش بہا چیزیں موجود ہیں مگر وہ کیا ہیں کہاں ہیں۔ کیسے ملیں گی؟ یا خدا میری مشکل کیوں کر آسان ہو گی!

دلفگار انہیں خیالات میں چکر کھا رہا تھا' اور عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ میر شامی کو حاتم مددگار مل گیا اے کاش کوئی میرا بھی مددگار ہو جاتا۔ اے کاش مجھے بھی اس چیز کا جو دنیا کی سب سے بیش بہا شے ہے نام بتلا دیا جاتا۔ بلا سے وہ شے دستیاب نہ ہوتی مگر مجھے اتنا تو معلوم ہو جاتا کہ وہ کس قسم کی چیز ہے۔ میں گھڑے برابر موتی کی کھوج میں جا سکتا ہوں۔ میں سمندر کا نغمہ' پتھر کا دل' قضا کی آواز اور ان سے بھی زیادہ بے نشان چیزوں کی تلاش میں کمر ہمت باندھ سکتا ہوں۔ مگر دنیا کی سب سے بیش بہا شے! یہ میرے پر پرواز سے بہت بالا تر ہے۔

آسمان پر تارے نکل آئے تھے دلفگار یکایک خدا کا نام لے کر اٹھا اور ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔ بھوکا پیاسا' برہنہ تن' خستہ و زار وہ برسوں ویرانوں اور آبادیوں کی خاک چھانتا پھرا تلوے کانٹوں سے چھلنی ہو گئے۔ جسم میں تار مسطر کی طرح ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ مگر وہ چیز جو دنیا کی سب سے بیش بہا شے تھی نہ میسر ہوئی اور نہ اس کا کچھ نشان ملا۔

ایک روز وہ بھولتا بھٹکتا ایک میدان میں جا نکلا۔ جہاں ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ بیچ میں کئی عمامے اور عبا والے ریش قاضی شان تحکم سے بیٹھے ہوئے باہم کچھ غرفش کر رہے تھے۔ اور اس جماعت سے ذرا دور پر ایک سولی کھڑی تھی۔ دلفگار کچھ تو ناتوانی کے غلبے سے اور کچھ یہاں کی کیفیت دیکھنے کے ارادے سے ٹھٹک گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ کئی برقنداز ایک دست و پا بزنجیر قیدی کو لیے چلے آ رہے ہیں۔ سولی کے قریب پہنچکر سب سپاہی رک گئے اور قیدی کی ہتھکڑیاں بیڑیاں سب اتار لی گئیں۔ اس بدقسمت شخص کا دامن صدہا بے گناہوں کے خون کے چھینٹوں سے رنگین ہو رہا تھا اور اس کا دل نیکی کے خیال اور رحم کی آواز سے مطلق مانوس نہ تھا۔ اسے کالا چور کہتے تھے۔ سپاہیوں نے اسے سولی کے تختے پر کھڑا کر دیا۔ موت کی پھانسی اسکی گردن میں ڈالدی' اور جلادوں نے تختہ کھینچنے کا ارادہ کیا کہ بدقسمت مجرم چیخ کر بولا للہ مجھے ایک دم کے لئے پھانسی سے اتار دو تاکہ اپنے دل کی آخری آرزو نکال لوں۔ یہ سنتے ہی چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ حیرت میں آ آ کر تاکنے لگے۔ قاضیوں نے ایک مرنے والے شخص کی آخری استدعا کو روکنا مناسب نہ سمجھا اور بدنصیب سیہ کار کالا چور ذرا دیر کے لئے پھانسی سے اتار لیا گیا۔

اسی مجمع میں ایک خوبصورت بھولا بھالا لڑکا ایک چھڑی پر سوار ہو کر اپنے پیروں پر اچھل اچھل فرضی گھوڑا دوڑا رہا تھا اور اپنے عالم سادگی میں ایسا مگن تھا گویا وہ اس وقت واقعی کسی عربی رہوار کا شہسوار ہے۔ اس کا چہرہ اس سچی مسرت سے کنول کی طرح کھلا ہوا تھا جو چند دنوں کے لئے بچپن ہی میں حاصل ہوتی ہے اور جسکی یاد ہم کو مرتے دم تک نہیں بھولتی۔ اس کا سینہ ابھی تک معصیت کے گرد و غبار سے بے لوث تھا اور معصومیت اسے اپنی گود میں کھلا رہی تھی۔

بد قسمت کالا چور پھانسی سے اترا' ہزاروں آنکھیں اس پر گڑی ہوئی تھیں وہ اس لڑکے کے پاس آیا اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔ اسے اس وقت وہ زمانہ یاد آیا جب وہ خود ایسا ہی بھولا بھالا' ایسا ہی خوش و خرم اور آلائشات دنیوی سے ایسا ہی پاک و صاف تھا۔ ماں گودیوں میں کھلاتی تھی۔ باپ بلائیں لیتا تھا اور سارا کنبہ جانیں وارا کرتا تھا۔ آہ! کالے چور کے دل پر اس وقت ایام گذشتہ کی یاد کا اتنا اثر ہوا کہ اسکی آنکھوں سے جنھوں نے نیم بسمل لاشوں کو تڑپتے دیکھا اور نہ جھپکی تھیں۔ آنسو کا ایک قطرہ ٹپک پڑا۔ دلفگار نے لپک کر اس در یکتا کو ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس کے دل نے کہا" بیشک یہ شے دنیا کی سب سے انمول چیز ہے جس پر تخت طاؤس اور جام جم اور آب حیات اور زر پرویز سب تصدق ہیں۔"

اس خیال سے خوش ہوتا کامیابی کی امید میں سرمست دلفگار اپنی معشوقہ' دلفریب کے شہر مینو سواد کو چلا۔ مگر جوں جوں منزلیں طے ہوتی جاتی تھیں اس کا دل بیٹھا جاتا تھا کہ کہیں اس چیز کی جسے میں دنیا کی سب سے بیش بہا چیز سمجھتا ہوں دلفریب کی نگاہوں میں قدر نہ ہوئی تو میں دار پر کھینچ دیا جاؤں گا اور اس دنیا سے نامراد جاؤں گا۔ پر ہرچہ بادا باد۔ اپنی قسمت آزمائی ہے۔ آخر کوہ و دریا طے کرتے شہر مینو سواد میں آ پہنچا اور دلفریب کے در دولت پر جا کر التماس کی کہ خستہ و زار دلفگار بفضل خدا تعمیل ارشاد کر کے آیا ہے اور شرف قدم بوسی چاہتا ہے۔ دلفریب نے فی الفور حضور میں بلا بھیجا۔ اور ایک زرنگار پردہ کی اوٹ سے فرمائش کی کہ وہ ہدیہ بیش بہا پیش کرو۔ دلفگار نے ایک عجیب امید و بیم کے عالم میں وہ قطرہ پیش کیا اور اس کی ساری کیفیت نہایت موثر لہجے میں بیان کی۔ دلفریب نے کل روئداد بغور سنی اور تحفہ ہاتھ میں لے کر ذرا دیر تک غور کر کے بولی۔ دلفگار بیشک تو نے دنیا کی ایک بیش قیمت چیز ڈھونڈھ نکالی۔ تیری ہمت کو آفرین اور تیری فراست کو مرحبا! مگر یہ دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز نہیں اس لئے تو یہاں سے جا اور پھر کوشش کر شاید اب کی تیرے ہاتھ در مقصد لگے اور تیری قسمت میں میری غلامی لکھی ہو۔ اپنے عہد کے مطابق میں تجھے دار پر کھنچوا سکتی ہوں مگر میں تیری جان بخشی کرتی ہوں' اسلئے کہ تجھ میں وہ اوصاف موجود ہیں جو میں اپنے عاشق میں دیکھنا چاہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تو ضرور کبھی سرخرو ہو گا۔ ناکام و نامراد دلفگار اس عنایت معشوقانہ سے ذرا دلیر ہو کر بولا۔ "اے محبوب دلنشین! بعد مدتہائے دراز کے تیرے آستاں کی جبہ سائی نصیب ہوتی ہے۔ پھر خدا جانے ایسے دن کب آئیں گے۔ کیا تو اپنے عاشق جانباز کے حال زار پر ترس نہ کھائیگی' اور اپنے جمال جہاں آراء کا ایک نظارہ دکھا کر اس سوختہ تن دلفگار کو آنیوالی سختیوں کے جھیلنے کے لئے مستعد نہ بنائیگی۔ تیری ایک نگاہ مست کے نشہ سے بیخود ہو کر میں وہ کر سکتا ہوں جو آج تک کسی سے نہ ہوا ہو۔" دلفریب عاشق کے یہ اشتیاق آمیز کلمات سن کر برافروختہ ہو گئی۔ اور حکم دیا کہ اس دیوانے کو کھڑے کھڑے دربار سے نکال دو۔ چوبدار نے فورا غریب دلفگار کو دھکے دے کر کوچہ یار سے باہر نکال دیا۔

کچھ دیر تک تو دلفگار معشوقہ ستم کیش کی اس تندخوئی پر آنسو بہاتا رہا بعد ازاں سوچنے لگا کہ اب کہاں جاؤں۔ مدتوں کی راہ نوردی و بادیہ پیمائی کے بعد یہ قطرہ اشک ملا تھا۔ اب ایسی کونسی چیز ہے جسکی قیمت اس در آبدار سے زائد ہو۔ حضرت خضر تم نے سکندر کو چاہ و ظلمات کا راستہ دکھایا تھا کیا میری دستگیری نہ کرو گے؟ سکندر شاہ ہفت کشور تھا' میں تو ایک خانماں برباد مسافر ہوں تم نے کتنی ہی ڈوبتی کشتیاں کنارے لگائی ہیں۔ مجھ غریب کا بیڑا بھی پار کرو۔ اے جبرئیل عالی مقام! کچھ تمہیں اس عاشق نیم جام واسیر رنج و محن پر ترس کھاؤ۔ تم مقربان بارگاہ سے ہو۔ کیا میری مشکل آسان نہ کرو گے؟ الغرض دلفگار بیزار نے بہت فریاد مچائی مگر کوئی اسکی دستگیری کے لئے نمودار نہ ہوا۔ آخر مایوس ہو کر وہ مجنوں صفت دوبارہ ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔

دلفگار نے پورب پچھم تک اور اتر سے دکھن تک کتنے ہی دیاروں کی خاک چھانی' کبھی برفستانی چوٹیوں پر سویا' کبھی ہولناک وادیوں میں بھٹکتا پھرا' مگر جس چیز کی دھن تھی وہ نہ ملی۔ یہاں تک کہ اسکا جسم ایک تودۂ استخواں ہو گیا۔

ایک روز وہ شام کے وقت کسی دریا کے کنارے خستہ حال پڑا ہوا تھا نشہ بیخودی سے چونکا تو کیا دیکھتا ہے کہ صندل کی ایک چتا بنی ہوئی ہے اور اس پر ایک نازنین' شاہانہ جوڑے پہنے' سولھوں سنگار کئے بیٹھی ہوئی ہے۔ اسکے زانو پر اسکے پیارے شوہر کی لاش ہے۔ ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے ہیں اور پھولوں کی برکھا کر رہے ہیں۔ یکایک چتا میں سے خود بخود ایک شعلہ اٹھا۔ ستی کا چہرہ اس وقت ایک پاک جذبہ سے منور ہو رہا تھا۔ مبارک شعلے اس کے گلے لپٹ گئے۔ اور دم زدن میں وہ پھول سا جسم تودہ خاکستر ہو گیا۔ معشوق نے اپنے تئیں عاشق پر نثار کردیا اور دو فدائیوں کی سچی لافانی اور پاک محبت کا آخری جلوہ نگاہ ظاہر سے پنہاں ہو گیا۔ جب سب لوگ اپنے گھروں کو لوٹے تو دلفگار چپکے سے اٹھا اور اپنے گریباں چاک دامن میں یہ تودۂ خاک سمیٹ لیا اور اس مشت خاک کو دنیا کی سب سے گراں بہا چیز سمجھتا ہوا کامرانی کے نشہ میں مخمور کوچہ یار کی طرف چلا اب کے جوں جوں وہ منزل مقصود کے قریب آتا تھا اسکی ہمتیں بڑھتی جاتی تھیں۔ کوئی اس کے دل میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا اب کی تیری فتح ہے اور اس خیال نے اس کے دل کو جو جو خواب دکھائے ان کا ذکر فضول ہے۔ آخر وہ شہر مینو سواد میں داخل ہوا اور دلفریب کے آستان رفعت نشان پر جا کر خبر دی کہ دلفگار سرخرو اور باوقار لوٹا ہے اور حضوری میں باریاب ہونا چاہتا ہے۔ دلفریب نے عاشق جانباز کو فوراً دربار میں بلایا اور اس چیز کے لئے جو دنیا کی سب سے بیش بہا جنس تھی ہاتھ پھیلا دیا۔ دلفگار نے جرات کرکے اس ساعد سیمیں کا بوسہ لے لیا اور وہ مشت خاک اس میں رکھ کر اس کی ساری کیفیت نہایت دلسوز الفاظ میں کہہ سنائی اور معشوقہ دلپذیر کے نازک لبوں سے اپنی قسمت کا مبارک اور جانفزا فیصلہ سننے کے لئے منتظر ہو بیٹھا۔ دلفریب نے اس مشت خاک کو آنکھوں سے لگا لیا اور کچھ دیر تک دریائے تفکر میں غرق رہنے کے بعد بولی "اے عاشق جاں نثار دلفگار' بیشک یہ خاک کیمیا صفت جو تو لایا ہے دنیا کی نہایت بیش قیمت چیز ہے اور میں تیری صدق دل سے ممنون ہوں کہ تو نے ایسا بیش بہا تحفہ مجھے پیش کش کیا مگر دنیا میں اس سے بھی زیادہ گرانقدر کوئی چیز ہے' جا اسے تلاش کر۔ اور تب میرے پاس آ۔ میں تہ دل سے دعا کرتی ہوں کہ خدا تجھے کامیاب کرے۔ یہ کہہ کر وہ پردہ زرنگار سے باہر آئی اور معشوقانہ ادا سے اپنے جمال جانسوز کا نظارہ دکھا کر پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ایک برق تھی کہ کوندی اور پھر پردہ ابر میں چھپ گئی۔ ابھی دلفگار کے حواس بجا نہ ہونے پائے تھے کہ چوبدار نے ملائمت سے اسکا ہاتھ پکڑ کر کوچہ یار سے نکال دیا اور پھر تیسری بار وہ بندہ محبت وہ زاویہ نشین کنج ناکامی یاس کے اتھاہ سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

دلفگار کا ہیاؤ چھوٹ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ میں دنیا میں ناشاد و نامراد مرجانے کیلئے پیدا کیا گیا تھا۔ اور اب بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ کسی پہاڑ پر چڑھ کر اپنے تئیں گرادوں۔ تاکہ معشوق کی جفاکاریوں کی فریاد کرنے کے لئے ایک ریزہ استخواں بھی باقی نہ رہے۔ وہ دیوانہ وار اٹھا اور افتاں و خیزاں ایک سربفلک کوہ کی چوٹی پر جا پہنچا۔ کسی اور وقت وہ ایسے اونچے پہاڑ پر چڑھنے کی جرات نہ کر سکتا تھا مگر اس وقت جان دینے کے جوش میں اسے وہ پہاڑ ایک معمولی ٹیکرے سے زیادہ اونچا نہ نظر آیا۔ قریب تھا کہ وہ نیچے کود پڑے کہ ایک سبز پوش پیر مرد سبز عمامہ باندھے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں عصا لیے برآمد ہوئے اور ہمت افزا لہجہ میں بولے " دلفگار نادان دلفگار! یہ کیا بزدلانہ حرکت ہے۔ استقلال راہ عشق کی پہلی منزل ہے باایں ہمہ ادعائے عاشقی تجھے اتنی بھی خبر نہیں۔ مرد بن اور یوں ہمت نہ ہار۔ مشرق کی طرف ایک ملک ہے جسکا نام ہندوستان ہے۔ وہاں جا! تیری آرزو پوری ہو گی۔ یہ کہہ کر حضرت خضر غائب ہو گئے۔ دلفگار نے شکریے کی نماز ادا کی اور تازہ حوصلے تازہ جوش اور غیبی امداد کا سہارا پا کر خوش خوش پہاڑ سے اترا اور جانب ہند مراجعت کی۔

مدتوں تک پرخار جنگلوں' شرربار ریگستانوں' دشوار گزار وادیوں اور ناقابل عبور پہاڑوں کو طے کرنے کے بعد دلفگار ہند کی پاک سرزمین میں داخل ہوا۔ اور ایک خوشگوار چشمہ میں سفر کی کلفتیں دھو کر غلبہ ماندگی سے لب جوئبار لیٹ گیا۔ شام ہوتے ہوتے وہ ایک کف دست میدان میں پہنچا جہاں بیشمار نیم کشتہ و بیجان لاشیں بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں۔ زاغ و زغن اور وحشی درندوں کی گرم بازاری تھی اور سارا میدان خون سے شنگرف ہو رہا تھا۔ یہ ہیبت ناک نظارہ دیکھتے ہی دلفگار کا جی دہل گیا خدایا! کس عذاب میں جان پھنسی۔ مرنیوالوں کا کراہنا' سسکنا اور ایڑیاں

رگڑ رگڑ کر جان دینا۔ درندوں کا ہڈیوں کو نوچنا اور گوشت کے لوتھڑوں کو لے کر بھاگنا۔ ایسا ہولناک سین دلفگار نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یکایک اسے خیال آیا۔ میدان کارزار ہے اور یہ لاشیں سورما سپاہیوں کی ہیں۔ اتنے میں قریب سے کراہنے کی آواز آئی دلفگار اس طرف پھرا تو دیکھا کہ ایک قوی ہیکل شخص جس کا مردانہ چہرہ ضعف جاں کنی سے زرد ہو گیا ہے زمین پر نگوں پڑا ہوا ہے۔ سینے سے خون کا فوارہ جاری ہے۔ مگر شمشیر آبدار کا قبضہ پنجے سے الگ نہیں ہوا۔ دلفگار نے ایک چیتھڑا لیکر دہان زخم پر رکھدیا تاکہ خون رک جائے اور بولا "اے جوانمرد تو کون ہے؟" جوانمرد نے یہ سن کر آنکھیں کھولیں اور دلیرانہ لہجہ میں بولا "کیا تو نہیں جانتا میں کون ہوں کیا تو نے آج اس تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی؟ میں اپنی ماں کا بیٹا اور بھارت کا لخت جگر ہوں" یہ کہتے کہتے اس کے تیوروں پر بل پڑ گئے۔ زرد چہرہ خشمگیں ہو گیا۔ اور شمشیر آبدار پھر اپنا جوہر دکھانے کے لئے چمک اٹھی۔ دلفگار سمجھ گیا کہ یہ اس وقت مجھے دشمن خیال کر رہا ہے۔ ملامت سے بولا "اے جوانمرد میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ ایک آوارہ وطن۔ غربت زدہ مسافر ہوں ادھر بھولتا بھٹکتا آنکلا۔ براہ کرم مجھ سے یہاں کی مفصل کیفیت بیان کر۔ یہ سنتے ہی زخمی سپاہی نہایت شیریں لہجہ میں بولا "اگر تو مسافر ہے تو آ۔ اور میرے خون سے تر پہلو میں بیٹھ جا کیونکہ یہی دو انگل زمین ہے جو میرے پاس باقی رہ گئی ہے اور جو سوائے موت کے کوئی نہیں چھین سکتا۔ افسوس ہے کہ تو یہاں ایسے وقت میں آیا۔ جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا' اور اسوقت ہم بیوطن ہیں۔ مگر (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیس کے لئے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ یہ آس پاس جو لاشیں تو دیکھ رہا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اترے ہیں (مسکرا کر) اور گو کہ میں بیوطن ہوں۔ مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقہ میں مر رہا ہوں (سینے کے زخم سے چیتھڑا نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا خون نکلنے دے اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ کیا میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لئے زندہ رہوں۔ نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا' اس سے بہتر موت ممکن نہیں۔"

جوانمرد کی آواز مدہم ہو گی۔ اعضا ڈھیلے ہو گئے خون اس کثرت سے بہا کہ اب خود بخود بند ہو گیا۔ رہ رہ کر ایک آدھ قطرہ ٹپک پڑتا تھا۔ آخر کار سارا جسم بیدم ہو گیا قلب کی حرکت بند ہو گئی اور آنکھیں مند گئیں۔ دلفگار نے سمجھا اب کام تمام ہو گیا کہ مرنیوالے نے آہستہ سے کہا "بھارت ماتا کی جے" اور اسکے سینے سے آخری قطرہ خون نکل پڑا۔ ایک سچے محب وطن اور دیس بھگت نے حب الوطنی کا حق ادا کر دیا۔ دلفگار اس نظارہ سے بیحد متاثر ہوا اور اس کے دل نے کہا بیشک دنیا میں اس قطرہ خون سے بیش قیمت شے نہیں ہو سکتی۔ اسنے فوراً اس رشک لعل رمانی کو ہاتھ میں لے لیا اور اس دلیر راجپوت کی بسالت پر عش عش کرتا ہوا عازم وطن ہوا۔ اور وہی سختیاں جھیلتا ہوا بالاخر ایک مدت دراز میں ملکہ اقلیم خوبی اور درصدف محبوبی کے در دولت پر جا پہنچا اور پیغام دیا کہ دلفگار سرخرو و کامگار لوٹا ہے اور دربار گہربار میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔ دلفریب نے فوراً اسے حاضر ہونیکا حکم دیا۔ خود حسب معمول پردہ زرنگار کے پس پشت بیٹھی اور بولی۔ "دلفگار اب کی تو بہت دنوں کے بعد واپس آیا۔ لا دنیا کی سب سے بیش بہا چیز کہاں ہے؟" دلفگار نے پنجہ حنائی کا بوسہ لیکر وہ قطرۂ خون اس پر رکھدیا اور اس کی مشرح کیفیت' پر جوش لہجے میں کہہ سنائی' وہ خاموش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ یکایک وہ پردہ زرنگار ہٹ گیا اور دلفگار کے روبرو ایک دربار حسن آراستہ نظر آیا۔ جس کی ایک ایک نازنین رشک زلیخا تھی۔ دلفریب بصد شان رعنائی مسند زرین کار پر جلوہ افروز تھی۔ دلفگار یہ طلسم حسن دیکھ کر متحیر ہو گیا' اور نقش دیوار کی طرح سکتے میں آ گیا کہ دلفریب مسند سے اٹھی اور کئی قدم آگے بڑھ کر اس کے ہم آغوش ہو گئی' رقاصان دلنواز نے شادیانے گانے شروع کئے۔ حاشیہ نشینان دربار نے دلفگار کو نذریں گزارانیں اور ماہ و خورشید کو بہ عزت تمام مسند پر بٹھا دیا۔ جب نغمہ دل پسند بند ہوا تو دلفریب کھڑی ہو گئی اور دست بستہ ہو کر دلفگار سے بولی "اے عاشق جانثار دلفگار! میری دعائیں تیر بہدف ہوئیں اور خدا نے میری سن لی اور تجھے کامیاب و سرخرو کیا۔ آج سے تو میرا آقا ہے اور میں تیری کنیز ناچیز۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک مرصع صندوقچہ منگایا اور اس میں سے ایک لوح نکالا جس پر آب زر سے لکھا ہوا تھا:

"وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔"

پریم چند

کفن

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں' ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی' فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا' جا دیکھ تو آ۔"

مادھو دردناک لہجے میں بولا "مرنا ہی ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں۔"

"تو بڑا بیدرد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا۔ اسی کے ساتھ اتنی بیوپھائی۔"

"تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام' مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹے بھر کام کرتا تو گھنٹے بھر چلم پیتا۔ اس لئے اسے کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج بھی موجود ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار سے بیچ لاتا' اور جب تک وہ پیسے رہتے' دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے جب فاقے کی نوبت آ جاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لئے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان کی۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں' پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے ہوئے دنیا کی فکروں سے آزاد۔ قرض سے لدے ہوئے گالیاں بھی کھاتے مار بھی کھاتے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھا لیتے۔ یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور رات کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے ہوئے آلو بھون رہے تھے' جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا' مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی۔ اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا انتظام کر لیتی تھی۔ اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے۔ بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ میں مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ وہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا "جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے" "اس کی چڑیل کا پھسار ہو گا اور کیا' یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا' بولا "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا ہے۔ میں تو یہاں ہوں ہی۔"

"تو تمہیں جا کر دیکھو نا۔"

"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن تک اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں' اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں' کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا' آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں۔ اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہو گی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکیگی۔"

"میں سوچتا ہوں کہ کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ سونٹھ' گڑ' تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔"

"سب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو' جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں' وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے تو لڑکے ہوئے' گھر میں کچھ بھی نہ تھا مگر اس طرح ہر بار کام چل گیا۔"

جس سماج میں رات دن محنت کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی۔ اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں° سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بیں تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے یہ جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرپنچ اور مکھیا بنے ہوئے تھے۔ اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کر رہا تھا پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم سے کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بیجا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا' اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھے۔ اس لئے دونوں جلد جلد نگل جاتے حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی' وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا "وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں' سب کو۔ چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی چٹنی' رائتہ' تین طرح کے سوکھے ساگ' ایک رسے دار ترکاری' دہی' چٹنی' مٹھائی اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی' جو چیز چاہو مانگو۔ اور جتنا چاہو کھاؤ لوگوں نے ایسا کھایا' ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا' مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی ہوئی کچوریاں ڈال دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہئے پتل کو ہاتھ روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ دئے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بڑا پان بھی ملا مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ جھٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔"

مادھو نے ان تکلفات کا مزا لیتے ہوئے کہا "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔"

"اب کوئی کیا کھلائے گا؟ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کفایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو' کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے۔ مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کفایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی۔"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

"میں پچاس کھا جاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی' اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔" آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے۔ جیسے دو بڑے بڑے اژدہے گینڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غمزدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اس طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں مانس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے۔ چوری کی علت' میں وعدے پر کام نہ کرنے کی علت میں۔ پوچھا "کیا ہے بے گھیسوا۔ روتا کیوں ہے۔ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔"

گھیسو نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا۔ "سرکار بڑی بپت میں ہوں۔ مادھو کی گھر والی رات گذر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ گر ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک۔ تباہ ہو گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا' وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں۔"

زمیندار صاحب رحمدل آدمی تھے۔ مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں "چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ کر سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا آج جب غرض پڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا بدمعاش۔" مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہیں تھا۔ طوعاً" و کرہاً"۔ دو روپے نکال کر پھینک دیئے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکلا۔ اسکی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیئے تو گاؤں کے بنیے مہاجنوں کو انکار کی جرات کیونکر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈورا پیٹنا جانتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیئے کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپیہ کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دے دیا کسی نے لکڑی اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے اور لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں آ آ کر لاش کو دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہونچ کر گھیسو بولا۔ "لکڑی تو اسے جلانے بھر کی مل گئی ہے۔ کیوں مادھو۔"

مادھو بولا "ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کفن چاہئے۔"

"تو کوئی ہلکا سا کفن لے لیں۔"

"ہاں اور کیا! لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کفن کون دیکھتا ہے۔"

"کیسا برا رواج ہے۔ کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے' اسے مرنے پر نیا کفن چاہئے۔"

"اور کیا رکھا رہتا ہے۔ یہی پانچ روپے پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمدہ ایک شراب خانہ کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی۔ کچھ گزک لی اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا "کفن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔ "دنیا کا دستور ہے۔ یہی لوگ باہمنوں کو ہجاروں روپے کیوں دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے۔ پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں۔"

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں' ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے؟ لوگ پوچھیں گے کفن کہاں ہے۔؟"

گھیسو ہنسا۔ "کہہ دیں گے روپے کمر سے کھسک گئے بہت ڈھونڈا۔ ملے نہیں"۔

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔ "بڑی اچھی تھی بچاری مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔"

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی۔ گھیسو نے دو سیر پوریاں منگوائیں' گوشت اور سالن اور چٹ پٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے دوکان تھی' مادھو لپک کر دو پتوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پن نہ ہو گا۔"

مادھو نے فرق صورت جھکا کر تصدیق کی "جرور سے جرور ہو گا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ بولا "کیوں دادا ہم لوگ بھی تو وہاں ایک نہ ایک دن جائیں گے ہی" گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کفن کیوں نہیں دیا' تو کیا کہو گے؟"

"کہیں کے تمہارا سر۔"

"پوچھے گی تو جرور۔"

"تو کیسے جانتا ہے اسے کفن نہ ملے گا؟ تو مجھے اب گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اسکو کفن ملے

گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا' جو ہم دیں گے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ "بولا کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے۔"

گھیسو تیز ہو گیا۔ "میں کہتا ہوں اسے کفن ملے گا۔ تو مانتا کیوں نہیں؟"

"کون دے گا' بتاتے کیوں نہیں؟"

"وہی لوگ دیں گے جنھوں نے ابکی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اس طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کفن تیسری بار ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی' میخانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا' کوئی بہکتا تھا' کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا' کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا' ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلو میں ہی الو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے تو صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لئے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ درگور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں' پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا' جو کھڑا ان کی' طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور دینے کے غرور اور مسرت اور ولولہ کا' اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔ گھیسو نے کہا "لے جا کھوب کھا اور آشیرباد دے" جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی مگر تیرا آشیرباد اسے جرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے آشیرباد دے بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔" مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "وہ بیکنٹھ میں جائے گی۔ دادا بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔" گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ "ہاں بیٹا بیکنٹھ میں نہ جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے' جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کے دھونے کے لئے گنگا نہاتے ہیں اور مندروں میں جل چڑھاتے ہیں۔"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔۔۔ نشہ کی خاصیت سے یاس اور غم کا دورہ ہوا۔ مادھو بولا "مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری ہی کتنا دکھ جھیل کر"۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا "کیوں روتا ہے بیٹا! کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلد مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔۔۔ ٹھگنی کیوں نینا جھمکا دے ٹھگنی۔

سارا میخانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں میکش مخمور محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی' کودے بھی' گرے بھی' مٹکے بھی' بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشے سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

چوہدری محمد علی ردولوی

نام : محمد علی
قلمی نام : چوہدری محمد علی ردولوی / محمد علی ردولوی۔
پیدائش : ۱۸ مئی ۱۸۸۲ء بہ مقام ردولی' ضلع بارہ بنکی صوبہ اودھ (بھارت)
وفات : ۳۱ جنوری ۱۹۵۳ء تک بقید حیات تھے۔
تعلیم : مکتب (باقاعدہ کوئی سند نہ لے سکے)
کالون تعلقہ دار اسکول لکھنؤ میں داخلہ لے کر چھوڑ دیا۔

مختصر حالات زندگی:

قوم شیخ صدیقی' ساکن ردولی' آبائی پیشہ تعلقہ داری۔ نام تعلقہ امیرپورہ' ضلع بارہ بنکی' صوبہ اودھ۔ ماں باپ کا مذہب شیعہ تھا۔ جس زمانے میں شبلی نعمانی اسلامی دنیا کے سفر سے واپس آئے تو انہوں نے ہوش سنبھالا۔ میرزا عبدالقادر بیدل اور میرزا غالب کے تتبع میں قلم کاری کا آغاز کیا اور نثر میں صاحب اسلوب ہوئے۔

محمد علی ردولوی ابھی اڑھائی برس کے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہوا اور وہ خود تعلقہ دار ہو گئے۔ تعلقہ امیرپورہ ضلع بارہ بنکی کو کورٹ آف وارڈز نے اپنے انتظام میں لے لیا۔ والدہ نے مارے لاڈ پیار کے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا اور یوں اسکول کی باقاعدہ تعلیم سے محروم رہے۔ کورٹ آف وارڈز کے انگریز منیجر نے زبردستی کالون تعلقہ دار اسکول لکھنؤ میں داخلہ کروا دیا۔ جہاں انگریز سرکار کے مراعات یافتہ طبقے کی اولاد شہسواری کے ساتھ تاج برطانیہ سے متعلق درس وفاداری پاتی تھی۔ اسکول سے فرار کے بعد چوہدری صاحب نے انگریزی ادب' فلسفہ اور آرٹ کے گہرے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ اور کارل مارکس میں دلچسپی لی۔

چوہدری صاحب بطور تعلقہ دار تاج برطانیہ کے منظور نظر رہے اور اپنے کردہ یا ناکردہ گناہوں کے صلے میں مزید جاگیروں کے علاوہ "نائٹ ہڈ" کے خطاب سے نوازے گئے۔ نوجوانی میں جج کرامت حسین کے عقیدت مند اور آخر میں مجتہد ناصر حسین کے حلقہ ارادت میں رہے۔ زندگی بھر لٹریچر کو بطور مشغلہ اور فلسفہ کو اوڑھنا بچھونا کیا۔ جس زمانے میں ان کا تعلقہ کورٹ کے زیر انتظام رہا تو چند دن کے لیے بینک میں ملازمت کا شوق پورا کیا۔ چھ برس تک صوبہ کونسل میں اودھ کی نمائندگی کی۔ بہت اچھے شاعر تھے' تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ۱۹۴۹ء میں محرم کی مجالس اور تعزیہ داری یک لخت چھوڑ دی۔ سنی احباب اور اعزہ نے خوش ہو کر پوچھا کہ کیا سنی ہو گئے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ اگر سنی ہوتا تھا تو شیعہ ہی کیوں نہ رہتا۔

۱۹۵۱ء میں جب انہوں نے اپنی کتاب "میرا مذہب" مکمل کی تو شیعہ اعزہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کتاب میں حضرت ابوبکر صدیق کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ تاحال یہ نہ کھلا کہ وہ درحقیقت کیا تھے۔ چوہدری صاحب نے دو شادیاں کیں اور بہت سی کرنے کی خواہش دل میں لیے گزر گئے۔

اولین تحریر:

"اتالیق بی بی" (کتابچہ) اس کے ناشر خود چوہدری محمد علی ردولوی تھے۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "اتالیق بی بی" (مزاحیہ) دلگداز پریس، لکھنؤ

۲۔ "صلاح کار" (جنسیات) ناشر: چوہدری محمد علی ردولوی: سرفراز قومی پریس، لکھنؤ طبع اول: س۔ ن

۳۔ "نقادی کے نکتے" (قلمی تصاویر کی پرکھ سے متعلق کتابچہ) سرفراز قومی پریس، لکھنؤ: طبع اول: س۔ ن

۴۔ "خبطی" (مزاحیہ) انوار بکڈپو، لکھنؤ طبع اول: ۱۹۴۰ء

۵۔ "یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ" (سوانحی کتابچہ) ناشر: چوہدری محمد علی ردولوی۔
یہ رسالہ مفت تقسیم ہوا۔

۶۔ "گناہ کا خوف" (افسانے) ناشر: چوہدری محمد علی ردولوی۔ تقسیم کار: نیا سنسار، لکھنؤ طبع اول س۔ ن

۷۔ "میرا مذہب" (مذہبیات/ فلسفہ)

۸۔ "پردے کی بات" (ضبط تولید سے متعلق کتابچہ) ناشر: چوہدری محمد علی ردولوی۔ تقسیم کار: نیا سنسار، لکھنؤ۔

۹۔ "کشکول محمد شاہ فقیر" (افسانے/ خاکے) صدیق بک ڈپو، لکھنؤ: طبع اول: س۔ ن

۱۰۔ "گویا دبستان کھل گیا" (خطوط) اکادمی پنجاب، لاہور طبع اول: ۱۹۵۶ء

۱۱۔ "نادر کہانیوں اور افسانوں کا مجموعہ کشکول" (مرتبہ: سید علی کاظم) اردو اکیڈمی سندھ، کراچی طبع اول: ۱۹۸۰ء
اس کتاب میں "کشکول محمد علی شاہ فقیر"، "گناہ کا خوف" اور "اتالیق بی بی" تین کتابیں یکجا کر دی گئی ہیں۔

۱۲۔ "سیرۃ الاقطاب اردو" (سوانح) نو کشور، لکھنؤ طبع اول: ۱۹۴۴ء سے قبل

غیر مدون:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ مجلہ "معلومات" میں شائع شدہ ایک ایکٹ کے تین ڈرامے "عیاش کسان"، "کسان" اور "سعید و سلمہ" ہیں۔ "معلومات" اور "اودھ پنچ" میں بکھرے ہوئے مضامین اکٹھے کیے جائیں تو ایک کتاب کا مواد مل سکتا ہے۔ آسکروائلڈ کے "مقدمہ قند موت" اور برنارڈ شاہ کے "پیراداکس" کے تراجم اس کے علاوہ ہیں۔

اعزاز:

۱۔ نائٹ ہڈ (تاج برطانیہ کا اعلیٰ ترین سول اعزاز)

نظریہ فن

"ان دو چار کہانیوں میں برخلاف اس نئے طرز کے وہی پرانا رویہ برقرار رکھا گیا ہے یعنی جہاں تک ممکن ہو نیچر کی پیروی رہے۔ چھوٹا دماغ بڑا تخیل نہیں پیدا کر سکتا۔

کافر نہ تو انی شد ناچار مسلمان شو

اور

عصمت بی بی از بے چارگی

میں نے بھی وہی پرانا طرز اختیار کیا ہے۔ نئی بات نہ سہی خدا کرے قدیم ہی ڈھرے پر چلتے بن گیا ہو"

(بہ حوالہ: دیباچہ "گناہ کا خوف" از محمد علی ردولوی)

چودھری محمد علی ردولوی

گناہ کا خوف

عبدالمغنی صاحب نے مختاری کے پیشے میں وہ نام پیدا کیا تھا کہ ڈپلوما والے وکیل بیرسٹر کیا کریں گے۔ بڑے بڑے زمیندار، تعلقدار، مہاجن خوشامدیں کرتے تھے۔ کمشنری بھر میں کون ابتدائی مقدمہ ایسا ہوتا تھا جس میں عبدالمغنی صاحب دو فریق میں سے ایک کے مددگار نہ ہوں۔ ان کی ترتیب دی ہوئی مسل دیکھ کر چوٹی کے وکلا دنگ رہ جاتے تھے اکثروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر اس شخص نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا ہوتا تو یہ ہائی کورٹ کے بہترین ایڈووکیٹس میں سے ہوتا۔

عبدالمغنی صاحب نے بلا کا دماغ پایا تھا۔ پر نہیں کٹے تھے۔ صوبہ بھر میں کہیں کا مقدمہ ہو اور کیسے ہی پیچیدہ معاملات ہوں۔ اگر فریق مقدمہ ان تک پہنچ گیا تو سب مشکلیں حل ہو گئیں۔ زبان میں نہ معلوم کیا جادو تھا اور نہ معلوم کیسے انجھر یاد تھے کہ آدمی کو رام کر لینا کوئی بات ہی نہیں تھی۔ جہاں صلح کا موقعہ ہوا دوسرے فریق کے دل میں جگہ کر کے صلح کرا دی۔ جہاں لڑائی کا موقع ہوا مخالف فریق کے بہترین آدمی توڑ لئے۔ کوئی دوسرا ہزار دو ہزار میں کام نکالے یہ سو دو سو میں کامیاب ہو جائیں۔

وکیل نہ ہونے کا خود ان کو کبھی افسوس کرتے نہیں سنا، اور افسوس کرنے کا موقعہ ہی کہاں تھا۔ کام اتنا تھا کہ فضول خیالی گھوڑے دوڑانے کا موقعہ بھی نہیں ملتا تھا۔ وکیلوں کے یہاں ایک محرر ہوتا ہے۔ کوئی ایسا ہی بڑا ہوا جس کے یہاں دو ہوئے۔ ہائی کورٹ کے اونچے اونچے وکلاء کے ساتھ دو تین جونیئر لگے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں بیس آدمی کام کرنے والے تھے اور پھر نہ جونیئر کا سوال نہ سینئر کا۔ خالی ہر شخص کی فطری قابلیت دیکھ کر کام سپرد کیا جاتا تھا۔ جو اپنا کام سمجھ کر کرتا تھا ان کے جلسے میں مقدمہ کے ہر پہلو کے اسپشلسٹ موجود تھے۔ حسب حیثیت با موقع اعتبار والے دیدارو چشم دید گواہ مہیا ہو سکتے تھے۔ ان کے جلسے میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو سو پچاس برس کا سادہ کرم خوردہ کاغذ نکال دیں۔ دھواں دے کر نئے کاغذ کو پرانا بنا دیں۔ تین دن کے اندر حاشیہ کو دیمک سے چٹوا دیں، متن ویسے کا ویسا ہی رہے۔

دستاویزوں میں سے الفاظ غائب کر دیں اور عبارتیں اس طرح داخل کر دیں کہ بڑے سے بڑا تحریر شناس دھوکا کھا جائے۔ ان کے ملنے والوں میں ایک منشی صاحب تھے جو بائیں ہاتھ سے اور پاؤں سے بھی لکھ لیتے تھے اور شان خط بدل دیتے تھے۔ ہفت قلم تھے۔ اس معنی میں نہیں کہ نسخ نستعلیق شکست وغیرہ وغیرہ لکھ لیتے تھے بلکہ اس رو سے کہ مختلف لوگوں کے انداز خط کی ایسی نقل اتارتے تھے کہ خود لکھنے والا اگر کچھ دن بعد دیکھے تو نہ جانے۔

ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو اکثر ضرورت ہو تو مسل گھما دیں ریل پر سے، کچہری کے احاطے سے، گھر سے یا جہاں سے بہترین موقع ہو۔ بستے سے ضروری کاغذ غائب ہو جائے، باقی ویسے ہی رکھے رہیں۔ بالکل اسی طرح کا بستہ رکھ دیا گیا اور گواہ گھر سے کاجل کا چور اصلی بستہ لے گیا۔ اپنے یہاں کے اٹھنے بیٹھنے والوں میں سے ایک شخص کی خود تعریف کرتے تھے کہ انہوں نے وہ جرات کی اور صفائی کا وہ کمال دکھایا کہ دوسرا ہوتا تو پاؤں کانپ جاتے اور دھر لیا جاتا۔ اک بہت بوڑھے فریق مخالف عبا قبا پہنے۔ جاڑوں کے دن، بغل میں بستہ دبائے اپنے وکیل کے پیچھے کھڑے بحث سن رہے تھے ان کی بغل سے بستہ نکل گیا اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ ایسے لوگ بھی لگے رہتے تھے جو لڑائی بھڑائی میں بھی بند نہ تھے مگر یہ سب دوسروں کے لئے کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں مقدمہ بازی میں اور عشق بازی میں سب کچھ جائز تھا۔

مگر خود اپنے لئے عبدالمغنی صاحب ان تمام باتوں سے علیحدہ رہتے تھے۔ مقدمات معاملات کی اور بات ہے۔ مثلاً بیان ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک نوجوان زمیندار تھا جو بالغ ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائی پر مقدمہ چلانے والا تھا' سب سامان لیس تھا۔ صرف دعویٰ داخل کرنا تھا۔ اسٹامپ خرید لیا گیا تھا۔ میعاد میں صرف تین دن باقی تھے اگر وہ دعویٰ ہو جاتا بڑے بھائی کا دیوالیہ نکل جاتا اور یہ بھی زیر بار ہو جاتا۔ بڑا بھائی ان کے پاس آیا۔ عبدالمغنی نے شکار کے بہانے سے اس لونڈے کو پھانسا اور تین دن کے بجائے چار دن کے لئے اس کو نہ جانے کہاں الوپ کر دیا۔ کسی کو خبر تک نہ لگی۔ میعاد نکل جانے کے بعد چھوڑ دیا اور کچھ ایسی چالیں چلے کہ وہ لونڈا جس بے جا کا دعویٰ کرنا کیسا ان واقعات کا ذکر کرتے ڈرتا تھا۔ یوں بلا وجہ کسی کا رواں بھی نہیں ستایا۔ نہ اپنے ذاتی معاملات میں ان کو کسی کے ساتھ زیادتی کرتے دیکھا۔ محلہ میں ہر شخص سے یگانگی کا برتاؤ تھا اور کون ایسا تھا جس کی خدمت انہوں نے نہ کی ہو' اپنی بات کے دھنی تھے اور ارادے کے ایسے مضبوط تھے کہ جس بات پر قائم ہو گئے پھر اس سے نہیں ہٹتے تھے چاہے کچھ ہو جائے۔

ایک مرتبہ طاعون آیا۔ بیماروں کی خبر گیری' غریبوں کی تیمارداری' میتوں کا دفن کروانا' سب اپنے ذمے لے لیا۔ طاعون کے نام سے لوگ گھبراتے ہیں مگر یہ ہر جگہ پل پڑتے تھے۔ نہ معلوم کتنے مردے خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارے' لوگوں نے کہا انجکشن لے لو مگر انہوں نے پرواہ بھی نہ کی۔ ان کے مرشد نے ایک تعویذ بھیجا تھا وہ تو ضرور کرتے کے نیچے گلے میں ڈال لیا تھا۔ اور ... تعاہن کی مزاولت رکھتے تھے اور بس طاعون کی بلا ختم ہونے کے بعد عبدالمغنی کا اثر اردگرد اچھا خاصا بڑھ گیا تھا۔ اول تو ایسے آڑے وقت میں لوگوں کے کام آئے تھے۔ دوسرے رفتہ رفتہ کچھ جائداد بھی پیدا کر لی تھی' بہت سی دوکانیں بنوا لی تھیں' جن میں کرایہ دار بساتے وقت کرایہ کا خیال اس قدر نہیں کیا جاتا تھا جتنا اثر بڑھانے کا اور لوگوں کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے کا چنانچہ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ کے الیکشن میں ان کا کنیڈیڈیٹ اور ان کی پارٹی ہمیشہ جیتتی تھی۔ انہیں وجوہ سے اگر مختار صاحب کسی سے کوئی بات کہہ دیں تو اس کو ٹالنا مشکل ہو۔ چنانچہ ان کے مکان کے قریب ایک زمین تھی جو ایک شخص نے مول لی تھی۔ عبدالمغنی اس کے خواہش مند تھے۔ یہ آراضی ان کے بھی موقع کی تھی اور اس کے بھی مگر ان کے رعب کی وجہ سے وہ انکار نہ کر سکا۔ اسی زمین پر انہوں نے ایک مختصر سا مکان بنوایا تھا جو ابھی ابھی تیار ہوا تھا' اور خیال تھا کہ مہمانوں کے لئے وقف رہے گا۔ نماز روزے کے بڑے پابند تھے مگر اسی کے ساتھ ہی زاہد خشک بھی نہ تھے۔ دوست احباب کے ساتھ چوک بھی چلے جاتے تھے۔ خود ان کے گھر پر بھی اس طرح کی صحبتیں آراستہ ہو جاتی تھیں۔ ان کے کمرہ میں کونے میں طبلہ اور تان پورہ بھی رکھا رہتا تھا مگر یہ سب دوسروں کی خاطر اور آشنا پرستی میں گوارا کرتے تھے۔ خود ہمیشہ بے لوث رہتے تھے حسن پرستی تک کو جائزہ جانتے تھے۔ مگر تردامنی میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ وضع داری کا یہ حال تھا کہ ریاست پور میں کسی زمانہ میں مختار تھے اس سلسلہ کو منقطع ہوئے برسوں گزر گئے تھے لیکن ان کے نام کا مختار نامہ آج تک پڑا تھا۔ رئیس صاحب کی جائیداد چوتھائی نہیں رہ گئی تھی کچھ اسی وجہ سے' اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ انہوں نے رئیس صاحب کو مشورہ دیا کہ مختار نامہ صاحبزادے کے نام ہو جائے۔ یہ سب کچھ تھا' مگر آج تک رئیس کو اپنا آقا ہی سمجھتے تھے' اور جو کام ہوتا تھا اپنا سمجھ کر کرتے تھے۔ رئیس صاحب کے بیٹے اور یہ قریب قریب ہم سن تھے جس وقت کا یہ واقعہ بیان کرتا ہوں' عبدالمغنی صاحب چالیس اکتالیس برس کے رہے ہوں گے اور شامت علی رئیس صاحب کے بیٹے کا سن ۳۵ برس کے قریب رہا ہو گا۔ آدمی ذرا شوقین مزاج تھے مقدمات کی پیروی میں بہت آیا کرتے تھے:

فکر بازاری بھی' ہر وقت ہی درباری بھی
اک مصیبت ہے جوانی بھی زمینداری بھی

اور چونکہ عبدالمغنی صاحب کی وجہ سے کھانے اور قیام کی جگہ سے بے فکر تھے' اس لئے شوق بھی آزادی سے پورا ہوتا تھا۔ عبدالمغنی

صاحب کے گھر میں ان کا کمرہ علیحدہ تھا جو سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ اس لئے اگر رات کو انھوں نے کسی کو بلایا بھی تو کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ عبدالمغنی صاحب سے کوئی تکلف نہ تھا خود ان کا دل چاہا یا شامت علی کی خاطر سے منٹ دو منٹ کو چلے بھی آئے اور یہ دیکھ کر کہ خاصدان میں پان اور لوٹا 'گلاس پانی کا 'گھڑا سب موجود ہے چلے گئے۔

شامت علی جب مقدمہ کے سلسلہ میں آتے تھے تو عموماً دو تین دن رہتے تھے اور جب شہر کے قیام کا کوئی عذر معقول نہ رہ جاتا تھا تو چلے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ خلاف عادت کئی دن رہے چہرے کی کچھ پریشانی کچھ فکر مندی سے عبدالمغنی کو پتہ چلا 'پوچھنے لگے خیر تو ہے۔

شامت علی۔ یار کیا کہیں 'یہ سامنے درزی کی دکان نہیں ہے اس کوٹھے پر ایک رنڈی آئی ہوئی ہے۔ کہیں باہر کی ہے۔ میں نے ایکی ہی دورے میں دیکھا ہے۔ بھئی ہم تو کھیت رہے مگر وہ ظالم کسی طرح رنگ پر آتی ہی نہیں۔ کچھ ہم نے بھی حماقت کی کہ اپنے دل کا راز اس پر ظاہر کر دیا۔ اس کے بعد اب تو اس کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ گھمن خان کو درمیان میں ڈالا مگر وہ پابندی کا عذر کرتی ہے۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ خواب و خور حرام ہے۔ رات کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور جو جو ہم کوشش کرتے ہیں وہ اور کھنچتی جاتی ہے۔

عبدالمغنی۔ 'ان اونچی رنڈیوں میں یہی تو خرابی ہوتی ہے کہ یوں خاطر مدارات میں لگاوٹ سب کچھ کریں گی مگر معاملے کی بات پر عجیب مزاج کی لینے لگتی ہیں۔ اور اگر کہیں جھوٹ موٹ کی نتھ پہنے ہوئیں تو آشنائی نہ ہوئی قلعہ ہی فتح کرنا سمجھئے۔ چھوٹتے ہی بی نائکہ صاحب کہتی ہیں۔ نا صاحب 'ابھی مری بچی کم سن ہے کچھ دن آیئے جایئے 'اٹھئے بیٹھئے 'لڑکی سے مانوس ہو جایئے 'آپ اس کی طبیعت پہچان لیں وہ آپ کے مزاج سے واقف ہو جائے پھر لونڈی کو عذر ہی کیا ہو سکتا ہے۔

اگر پیشے میں آ چکی ہے تو نوکری کا سوال پہلے ہی دھرا ہے مستقل تعلق کیجئے 'پابند کیجئے 'اور خود بھی پابند ہو جئے۔ پھر سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ادھر تعلق ہوا نہیں 'ادھر عیاشی کے گزٹ میں نام چھپا نہیں۔ اگر بڑے بڑے لوگوں کے نام سے یہ اپنے کو نہ منسوب کریں تو اعلیٰ طبقے والی کہلائیں کیوں کر اگر چوری چھپے تعلق کیجئے تو اس میں بھی جب تک مہینوں حاضری نہ دیجئے اور ایک کی جگہ چار خرچ نہ کیجئے کام نہیں چلتا۔ تمہارے معاملے میں اتنا غنیمت ہے کہ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔ باہر والے کی رسائی چوری چھپے کبھی کبھی ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں دام بھلے چنگے ہاتھ آجاتے ہیں اور عام طور سے کمانے کا نام بھی نہیں ہوتا۔ خیر چلو ذرا ہم بھی دیکھیں۔ اسی طرف سے نیا مکان بھی دیکھتے آئیں گے۔ آج کئی دن سے نہیں گئے۔ تخت 'پلنگ 'کرسیاں وغیرہ تو پہنچ گئی ہیں ذرا دیکھنا ہے کہ کس طرح سے سجا جائے اس طرف سے کھڑے کھڑے وہاں بھی چلنا مکان کی آرائش وغیرہ میں تمہارے سلیقے کے ہم ہمیشہ سے قائل ہیں۔

اس رنڈی کے یہاں پہنچ کر میاں عبدالمغنی صاحب نے منھ سے تو کچھ نہ کہا 'مگر شامت علی کا ایسا ادب و لحاظ کیا گویا یہ ان کے ادنیٰ ملازم ہیں۔ ایک ایک گلوری نوش کی اور رئیس صاحب کی طرف سے کچھ دے کر دونوں آدمی اٹھ آئے۔ لیجئے صاحب وہاں رنگ ہی بدل گیا ادھر یہ لوگ رخصت ہوئے اور ادھر نائکہ نے استاد گھمن خاں کو بلایا کچھ سرگوشیاں ہوئیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاملہ روبراہ ہو گیا۔ پیغام بھیجا کہ لونڈی کو حکم میں کبھی عذر تھا نہ ہے۔ صرف بات یہ ہے کہ رات میں دوسرے کی پابندی ہے 'دن کو جب چاہے گھڑی دو گھڑی کے لئے طلب کر لیجئے۔

اب وقت یہ آن پڑی کہ رات کے لئے تو ان کا کمرہ مناسب تھا مگر دن کیلئے بالکل ناموزوں تھا۔ عبدالمغنی کے اعزاء 'نوکر چاکر 'لڑکے سب ہی موجود تھے۔ مناسب یہی معلوم ہوا کہ وہی تو تعمیر مکان تخلیہ کے لئے کام میں لایا جائے۔

عبدالمغنی کچہری جا چکے تھے۔ چنانچہ شامت علی نے ایک لڑکے کو دوڑایا کہ عبدالمغنی سے اس مکان کی کنجی مانگ لائے 'یہ بھی کہلا بھیجا کہ جب فرصت ہو تو خود بھی چلے آئیں۔ کنجی تو انھوں نے بھجوا دی اور خود تھوڑی دیر میں آنے کو کہا۔ کلید مراد ہاتھ آگئی 'اب عبدالمغنی کو کون یاد کرتا ہے۔ انھوں نے نوکر کو تو اس رنڈی کے یہاں بھیجا اور خود کنجی جیب میں لے کر اس نئے مکان کی طرف چلے۔ سب سے پہلے نل کھول کر دیکھا کہ پانی آ رہا ہے۔ اس کے بعد پلنگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ نواڑ کی پلنگڑیاں متعدد بچھی ہوئی تھیں۔ او نہ 'تکیہ بچھونا نہیں ہے نہ

سی ' کونا بھی نہیں ہے۔ مگر شیشے کی الماری میں جگ اور گلاس تو ہیں۔ یار کچھ پان منگوانے چاہئیں۔ نوکر جب آئے گا تو وہی لے آئے گا۔
شامت علی صاحب کی بے تکی بیان کر کے اپنے پڑھنے والوں پر ناگوار کاری کا الزام لگانا نہیں چاہتا۔

قصہ مختصر کچھ انتظار کے بعد معشوق محبوبہ تشریف لائیں۔ انھوں نے دھڑکتے دل سے استقبال کیا۔ نوکر کو گولیاں 'برف' بلیڈ' لینے کو بھیجا اور پاس تو بٹھایا مگر نوکر کی واپسی کے انتظار میں دست بوس اور زیادہ وقت بیٹھایا۔ ہاں جو باتیں اظہار شوق کی بالکل پیش پا افتادہ تھیں ان کا ذکر نہیں مگر نگاہ نوکر کے دھڑکے میں دروازے ہی سے لڑی رہی۔ اتنے میں نوکر بھی آ گیا اور اس کے ساتھ میاں عبدالغنی بھی دھم دھمکے ان کو دیکھ کر شامت علی صاحب کے چہرے پر مسرت 'خلوص اور شکر گذاری کا اشتہار لگ گیا۔ مگر عبدالغنی صاحب کے چہرے پر خلاف امید اور امید کی ضمانت بلکہ اس سے بھی بالاتر وہ کیفیت ظاہر تھی جو اس وقت ہوتی ہے۔ جبکہ آدمی مروت کو توڑ کر کسی دوست کے خلاف دو ٹوک فیصلہ کر لیتا ہے۔ شامت علی کا دل دھک سے ہو گیا۔ رضائی کے دوسرے پہلو میں بیٹھنے کی دعوت دی مگر عبدالغنی نہ بیٹھے۔ ایک دو سیکنڈ چپ کھڑے رہے اس کے بعد کہنے لگے۔ یار سنو۔ تم جانتے ہو کہ ہماری چیز جان مال دوستوں کے لئے وقف ہے مگر ابھی مکان میں یہ کام نہیں ہو سکتا۔ ابھی اس گھر میں میلاد شریف نہیں ہوا ہے۔

○

تیسری جنس

مدی کا اصلی نام احمدی خانم ہے۔ تحصیلدار صاحب پیار سے مدی مدی کہتے تھے، وہی مشہور ہو گیا۔ مدی کا رنگ بنگال میں سو دو سو میں اور ہمارے صوبہ میں ہزار دو ہزار میں ایک تھا۔ جس طرح فیروزے کا رنگ مختلف روشنیوں میں بدلا کرتا ہے اسی طرح مدی کا رنگ تھا۔
تھی تو کھلتی ہوئی سانولی رنگت جس کو سبزہ کہتے ہیں۔ مگر مختلف رنگ کے دوپٹوں یا ساڑھیوں کے ساتھ مختلف رنگ پیدا ہوتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ دمک اٹھتا تھا' کسی رنگ کے ساتھ تمتماہٹ پیدا کرتا تھا۔ بعض اوقات جلد کی زردی میں سبزی ایسی جھلکتی تھی کہ دل چاہتا تھا' دیکھا ہی کرے۔ شمع کی روشنی میں مدی کی رنگت غضب ہی ڈھاتی تھی۔ کبھی آپ نے دوسرے درجے کے مدقوق کو دیکھا ہے۔ اگر بیماری سے قطع نظر کیجئے تو رنگت کی نزاکت ویسے ہی تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں۔ مگر جب نگاہ نیچے سے اوپر کرتی تھی تو واہ واہ۔ معلوم ہوتا تھا مندر کا دروازہ کھل گیا۔ دیبی جی کے درشن ہو گئے۔ مسکراہٹ میں نہ شوخی نہ شرارت' نہ ہنوٹ کی شرم' نہ لبھاوٹ کی کوشش۔ لکڑی لوہے کے قلم کو کیسے موقلم کر دوں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آ جائے۔
بس یہ سمجھ لیجئے کہ خدا نے جیسی مسکراہٹ اس کے لئے تجویز کی تھی وہی تھی۔ مدی اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے کسی انداز میں بنوٹ نہ تھی۔ ہاتھ پاؤں' قد' چہرے کے اعصاب چھوٹے چھوٹے مگر واہ رے تناسب۔ آواز ہنسی' چال ڈھال ہر چیز ویسی ہی۔ میں مدی سے بہت بے تکلف تھا۔ مگر عشاق میں کبھی نہ تھا' اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی اور بھی نہیں سنا گیا۔ ایسی خوبصورت عورت بلا مرد کے حفاظت کے' زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں' بڑے تعجب کی بات ہے۔ مگر واقعہ ہے' ایک میں نے کہا مدی اگر ہم جادوگر ہوتے تو جادو کے زور سے تم کو تتلی بنا کر ایک چھوٹی سے ڈبیا میں بند کر کے اپنی پگڑی میں رکھ لیتے اس فن شریف سے واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ جو حربہ میں نے استعمال کیا تھا وہ کم خالی جانے والا تھا۔ مگر اس کے بھی جواب میں وہی بے تکلف مسکراہٹ کی ڈھال، جو تلوار کا منہ توڑ دے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اکثر خیال گذرتا ہے کہ یہ استغنا تحصیلدار مرحوم کی سفید داڑھی کے سایہ میں پرورش پانے کا اثر ہے۔ مگر پھر عقل کہتی تھی کہ ہوش حیات نے نہ معلوم کتنی سفید داڑھیوں میں پھونکا ڈالا ہے۔ وہ سفید داڑھی قبر میں پہنچ گئی اس کا اثر کہاں سے آیا۔ بہرحال قصہ سنتے جایئے اور رفتہ رفتہ رائے قائم کرتے جایئے۔ مدی کے ہر انداز میں نسوانیت کوٹ کوٹ کو بھری تھی۔ ایک بات البتہ تھی' جو گو عورتوں میں بھی ہوتی ہے۔ مگر ہم ایسے بوڑھا لوگ اس کو مردی سے منسوب کرتے ہیں' یعنی اپنے ہم طبقہ عورتوں میں اور اسی طبقے کے مردوں میں مدی حکومت خوب کر لیتی تھیں۔ ہر شخص عورت ہو کر مرد ان کا تابع فرمان رہتا تھا' اور ان کے اشارے پر چلنے کو تیار۔ اب شروع سے قصہ سنئے' تحصیلدار صاحب کا نام کیا کیجیے گا جان کر مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے۔ مگر بے عیب خدا کی ذات' کچھ خاص خاص کمزوریاں کہی جاتی تھیں۔ پرانی وضع کے لوگ تھے۔

بڑی شان سے تحصیلداری کی۔ لاکھوں کمائے اور ہزاروں اڑائے' مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی کچھ بے مرکز سی ہو گئی تھی۔ بی بی بہت دن ہوئے مر چکی تھی۔ کوئی قریب کا عزیز بھی نہ تھا۔ صرف ایک نوکر تھا وہی سیہ سپید کا مالک تھا۔ تنخواہ اسی کے ہاتھ آتی تھی اور جب پنشن ہوئی تو پنشن کا بھی وہی حق دار ٹھہرا۔ میاں کے کپڑے اور کھانا بھی میاں حسن علی ہی پسند کرتے تھے۔ حسن علی کسی کام کو بازار گئے۔ دو تھان دادھاگری ڈوریئے کے لئے چلے آتے ہیں۔ میاں کے کرتے بنیں گے مگر میاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ جب درزی قطع کرنے لگا۔

"ارے میاں حسن علی' یہ ڈوریہ کیا لائے ہو؟"

حسن علی: "آپ کے کرتوں کے لئے۔ ڈوریہ دمندار ہے۔ سلنے پر اور کھلے گا۔"

"کھلے گا تو مگر کرتے تو میرے پاس تھے۔ ابھی اس دن شربتی لے آئے۔ آج ڈوریہ لئے چلے آتے ہیں آخر پوچھ تو لیا ہوتا۔"

"پوچھ کے کیا کرتا۔ آپ یہی تو کہتے کہ رہنے دو گھر میں ایک چیز ہو گی۔ برسات کا زمانہ ہے۔ دھوبی دیر میں آیا کرے گا۔ دو جوڑے فاضل اچھے ہوتے ہیں۔"

"خیر بھئی!"

تحصیلدار کھانے پر بیٹھے ہیں۔ "میاں حسن علی آج کل بازار میں مچھلی نہیں آتی۔"

"آتی تو ہے مگر گرمیوں کی وجہ سے میں نے نہیں منگوائی۔ اس فصل میں مچھلی نقصان کرتی ہے' صبح کو مرغ پک جائے گا۔" تحصیلدار صاحب پر حسن علی کی شخصیت ایسی غالب آئی تھی کہ جو بات وہ پسند کرتے تھے۔ تحصیلدار سمجھتے تھے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اسی وجہ سے غیر ذمہ دار لوگ دونوں کا ذکر کر کے مسکراتے تھے اور آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔ میاں حسن علی کا استرے سے صفاچٹ چہرہ اور تحصیلدار صاحب کی بھو داڑھی پر چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ داڑھی مونچھوں کا صفایا صرف انگریزی دان حضرات کا حق ہے۔ اگر حسن علی ایسے اپنی چال چھوڑ کر ہنس کی چال چلیں گے۔ تو اللہ ہی نے کہا ہے۔ لوگ کوئی نہ کوئی نئی نکالیں گے۔

بہرحال اصلیت کی خبر خدا کو ہے۔ ہم تو جو کچھ بھی دیکھتے تھے' وہ یہ تھا کہ تحصیلدار کا ہمدرد دنیا جہاں میں حسن علی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ حسن علی کو بھی اس سے اچھا آقا اگر چراغ لے کے ڈھونڈتے تو نہ ملتا۔

اللہ میاں نے دو جنسیں بنائی تھیں۔ عورت اور مرد۔ یورپ کے ڈاکٹروں نے تحقیقات کر کے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنے ہی جنس کی طرف راغب ہو۔ اس جنس میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی۔ اب نہ معلوم تحصیلدار اور حسن علی اس تیسری جنس میں سے تھے یا ویسے ہی تھے جیسے ہم آپ یا بعد کو کچھ ادل بدل ہوئی۔ اس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ بظاہر ان دونوں کے افعال سے دوسروں کی سماجی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لئے ہم کو کھوج کی کوئی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ تحصیلدار صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے۔ اولاد نہ ہونے کا دکھڑا کیا روتے مگر اولاد کی تمنا اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ جب کھانا کھاتے تو حسن علی احمدی کو بلوا بھیجتے تھے کہ دسترخوان پر بیٹھ جائے۔ اسی وجہ سے کھانا تنہائی میں کھانے لگے تھے۔ نوکر کی لڑکی کو دسترخوان پر کھلاتے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر سب کے سامنے کھلاتے تو صاحب اولاد نہ ہونے کا رنج اور بچوں کی تمنا لوگوں پر کھل جاتی۔ بی احمدی خانم عرف مدی بیگم کا سن چار برس کا رہا ہو گا۔ دسترخوان پر شوربا گرانا۔ لقمہ ڈبونے میں دال کا پیالہ گھنگول دینا بچوں کا شیوہ ہے۔ اور نفیس لوگ اسی وجہ سے بچوں کو الگ کھلاتے ہیں۔ گو کہتے یہی ہیں کہ بوڑھوں والا کھانا بچوں کو نقصان کرتا ہے۔ مگر تحصیلدار صاحب کو اس میں لطف آتا تھا۔ ادھر دسترخوان پر بیٹھے اور ادھر بی مدی کی طلب ہوئی۔ رفتہ رفتہ مدی خود وقت پہچان گئیں۔ تھوڑے دنوں میں مدی تحصیلدار صاحب ہی کے یہاں رہنے لگیں۔ یا گھر میں ایک طرف چھوٹا بھیا اور بیچ میں حسن علی کی بی بی تھیں یا ان کی پلنگڑی الگ بنی۔ صاف چادر لگائی گئی۔ چھوٹے چھوٹے تکیے بنوائے گئے۔ تحصیلدار صاحب کے پاس ان کی بھی پلنگڑی بچھنے لگی۔ جوتے پہنے رہنے کی تنبیہ ہوئی کہ بچھونا میلا نہ ہو۔ لڑکی تھی پیدائشی سلیقہ مند۔ ایک بار سے دوسری بار بتانے کی ضرورت نہیں ہوئی تھی۔ پانچ چھ ہی برس کے سن میں ایسا سلیقہ آ گیا کہ آدھی بی بی معلوم ہوتی تھیں۔ تحصیلدار صاحب کے

پان خود بناتی تھی۔ دس گیارہ برس کے سن میں جنس تلواتا۔ کھانا پکواتا۔ سب کچھ مدی کے ہاتھ ہو گیا تھا۔ دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ چودھویں برس مدی کا شباب دمک اٹھا۔ دیکھنے والوں کا دل چاہتا کہ دیکھا ہی کریں۔ مدی بھی جب بال بنانے کھڑی ہوتی تھی تو آئینہ کے ساتھ خود بھی متحیر رہ جاتی تھیں۔ اب ماں کو شادی کی فکر ہوئی۔ تحصیلدار صاحب کو کہا گیا۔ انہوں نے کہا جلدی کیا ہے ہو جائے گی۔ مگر لڑکی حسن علی کے بھتیجے کو بچپن ہی سے مانگی تھی۔ ادھر سے بھی اصرار ہوا کہ جوان لڑکی کا امیروں کے گھر میں رہنا اچھا نہیں۔ لیجئے صاحب شادی ہو گئی۔ تحصیلدار صاحب نے خود تو اپنے گھر سے شادی نہیں کی۔ مگر جہیز وغیرہ خوب سا دیا۔ چوتھی چالے کے بعد پھر وہی تحصیلدار صاحب کے یہاں کا رہنا۔ مدی کے دولہا بھی تحصیلدار صاحب کے یہاں آتے تھے۔ مدی سسرال کم جاتی تھی۔ گئیں بھی تو کھڑی سواری' بہت رہیں تو ایک رات نہیں تو اسی دن واپس آگئیں۔ سسرال والے جاہل' شوہر بھی الف کے نام لٹھا نہیں جانتے۔ گو مدی بھی بغدادی قاعدہ اور عم کے سپارے کے آگے نہیں پڑھی تھیں مگر پھر بھی پڑھے لکھے ہوئے کی پالی ہوئی تھی۔ عمر بھر امیری کارخانہ دیکھا تھا مدی کا دل سسرال میں کم لگتا تھا۔ کمسنی میں بیاہ کا تجربہ کچھ اچنبھے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر عورت پر کنوار پنے کی آب نہیں رہ جاتی تو سہاگ کی رونق چہرہ چمکا دیتی ہے۔ مگر احمدی کے چہرہ نہ اسی بات کا پتہ چلتا تھا نہ اسی کا۔ میاں بیوی کے برتاو کا حال دو چار دن میں کیا کھلتا۔ مگر کسی خاص خوشی یا اطمینان کا اندازہ اس میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ بھی نہ رہ گیا اور کھلم کھلا ناخوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ شوہر صاحب کچھ دبے دبے سے تھے۔ تحصیلدار صاحب کے یہاں اگر وہ بھی اپنی شوہریت کا برتر درجہ برت نہیں سکتے تھے۔ خود اپنی نیچ سیرزی اور بی بی کی بلندی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ضرورتیں مجبور کرتی تھیں۔ نئی نئی بی بی کچھ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ آجاتا تھا۔ اس لئے چپ تھے' ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ مدی جو سو کر اٹھیں تو ایک چھڑا غائب۔ بستر پر ادھر ادھر دیکھا' دلائی جھاڑی' پائنتی جھک کے دیکھا' گھر میں ادھر ادھر تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا۔ نہ معلوم کیا سمجھ کر چپ ہو گئی۔ دوپہر کے قریب ماں سے ذکر کیا۔ ماں نے شور مچا دیا۔ تحصیلدار صاحب تک خبر ہوئی انہوں نے سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ حرکت سوائے مدی کے دولہا کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا کہ اس کے جوا کھیلنے کی خبر بھی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔ لیجئے صاحب شوہر بھی روٹھ گئے۔ دو چار دن کے بعد رخصتی کا اصرار ہوا۔ مگر چھڑے والی بات پکڑ کر مدی کے ماں باپ نے انکار کر دیا۔ ایک روز مدی کے شوہر نے حسن علی کے گھر آکر بہت سخت سست سنایا' اور غصہ میں یہ بھی کہا کہ حرام زادی کو جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا نہ لے جاؤں تب ہی کہنا۔ اس وقت تک مدی نے کسی کی جنبہ داری نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ بھی فرنٹ ہو گئی۔ اور ایسی فرنٹ ہوئی کہ مرتے دم تک پھر منہ نہ دیکھا۔ حسن علی نے بھی خیال کیا داماد ممکن ہے کچھ شہدا پن ہی کر بیٹھے اس لئے مدی کا پورے طور سے تحصیلدار صاحب ہی کے یہاں رہنا اچھا ہے۔ شوہر صاحب ہمیشہ کے لئے معطل کر دیئے گئے۔

جب سے مدی کی شادی ہو گئی تھی۔ تحصیلدار صاحب کچھ چپ سے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد وہ بھی بحال ہو گئے۔ مدی کے شوہر نے اپنی سفاہت سے یہ بھی کہا کہ تحصیلدار صاحب نے اس سے آشنائی کر رکھی ہے' مگر اس کو کون باور کرتا۔ حسن علی والی بات پر تو لوگ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ مگر اس بات کو کسی نے جھوٹوں بھی یقین نہ کیا۔ البتہ تحصیلدار صاحب تجربہ کار آدمی تھے۔ انہوں نے موت زندگی کا خیال کر کے مدی کے لئے علیحدہ گھر اور کچھ بودگی کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس واقعہ کے دوسرے سال کے اندر تحصیلدار صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تحصیلدار صاحب مرحوم کے یا تو کوئی نہیں تھا یا یکبارگی نہ معلوم کتنے وارث پیدا ہو گئے۔ اور آپس میں مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ بی مدی نے بھاری پتھر چوم کے چھوڑا۔ اٹھ کر اپنے گھر چلی آئیں۔ تخت' چارپائیوں' الماریوں پر نہ ان کا حق تھا نہ انہوں نے دعویٰ کیا۔ نقد جو کچھ تحصیلدار صاحب ان کو دے گئے ہوں وہ کون لے سکتا تھا۔ ہاتھ' ناک' گلے میں جو کچھ تھا وہ ان کا تھا ہی۔ مدی نے حسن علی کی صلاح سے یہ طریق اختیار کیا کہ اپنی طبقے سے اونچی ہو کر رہنا پسند نہ کیا بلکہ جس حیثیت کے لوگ ان کے ماں باپ تھے اسی برادری میں رہیں۔ البتہ روپیہ پیسہ اور سلیقہ ہونے کی وجہ سے اپنے طبقے میں یوں رہیں جیسے مالی کی نگاہ میں سب پھولوں میں گلاب کا پھول ہوتا ہے۔

تحصیلدار صاحب کے سال ہی بھر بعد طاعون بڑے زوروں کا پڑا۔ اس میں میاں حسن علی اور ان کی بی بی بھی چل بسیں' اب صرف بی مدی اور ان کا چھوٹا بھائی رہ گئے۔

اس وقت تک مدی نے جو کچھ اچھا برا کیا ہو گا اس کی ذمہ داری صرف ان کے اوپر نہ تھی۔ کیونکہ ہر معاملہ میں تحصیلدار مرحوم اور اس سے کم درجے تک ان کے باپ کی رائے شامل رہتی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا۔ وہ البتہ ان کے دل و دماغ کا نتیجہ تھا۔ مدی کا برتاؤ ہر شخص سے عمدہ تھا۔ کوئی شاکی نہ تھا بلکہ اڑوس پڑوس کی عورتیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی تھیں۔ ان سے بھی جو ہو سکتا تھا آنے جانے والیوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں۔ گھر میں کپڑا سینے کی مشین تھی۔ دن بھر لوگوں کے کپڑے مفت سیا کرتی تھی۔ کسی کو اگر روپے دو روپے کی ضرورت ہوتی وہ بھی قرض کے نام سے دے دیئے۔ جس کسی کا کہیں ٹھکانہ نہ لگے وہ مدی کے یہاں چلا آئے۔ روٹی اپنی پکائے دال بی مدی سے لے لے۔ پان پتا بھی بی مدی کے پاندان سے کھائے۔ اسی زمانہ میں ایک عورت نہ معلوم کہاں کی باہر سے آئی۔ اس کو بھی مدی نے رکھ لیا عورت سلیقہ مند تھی۔ اپنا بار بھی ان پر نہیں ڈالتی تھی۔ بلکہ پیسے دو پیسے کا سلوک خود ہی کر دیتی تھی۔ کچھ انگوٹھیاں' کچھ کیلیں لیں' صابون وغیرہ بیچتی تھیں۔ صبح ہوئی اور برقع اوڑھ کر نکل گئیں۔ دوپہر کو آئیں۔ کھانا کھایا' آرام کیا' اس کے بعد پھر نکل گئیں۔ شام کو لوٹیں۔ یہ مسماۃ آئی تھیں تو یہ کہہ کر کہ دو چار دن میں سودا کر کے دوسری جگہ چلی جائیں گی۔ مگر مدی سے کچھ ایسی پرگت ملی کہ گھر کی طرح رہنے لگیں۔ محبت و یگانگی کی وہ پینگیں بڑھیں کہ سگی بہنیں مات تھیں۔ صورت شکل کی تو معمولی تھیں مگر قد کشیدہ تھا۔ جب برقع اوڑھ کر راستہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد بھیس بدلے ہوئے چلا آتا ہے چال ڈھال قد کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں مردوں کی ایسی تھیں مثلاً ہاتھ پاؤں کے دیکھتے سینہ کم تھا۔ کمر' کولھے' پاؤں کی چوڑی چوڑی ایڑیاں بھی عورتوں کی ایسی نہ تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ہو گیا کہ دن کو ویسا ہی مجمع رہتا تھا مگر رات کو دوسری عورتیں کم رہنے لگیں۔ جب منہ نہیں پایا تو پرائے گھر میں کیسے ٹھہرتیں۔ پہلے تو عورتوں میں سرگوشیاں ہوئیں پھر محلے میں ہر شخص اسی کا ذکر کرنے لگا۔ مگر مدی اور اس عورت نے بجائے تردید کرنے کے ایک آزادانہ بے پروائی کا انداز اختیار کر لیا۔ ان عورتوں نے کہا ہم لوگ کسی کی بہو بیٹی ہیں یا پھر سے نکاح کرنا ہے جو ہر شخص کے آگے قسمیں کھاتے قرآن اٹھاتے پھریں۔ دنیا اپنی راہ ہم اپنی راہ۔ مدی نے کہا اگر ہمارے کوئی والی وارث ہوتا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ ایسی بات کہتا۔ زمانہ گذرتا گیا اور لوگوں کا شک یقین میں بدلتا گیا۔ قاعدہ ہے کہ پنچ برادری سے اگر دب جاؤ تو وہ اور دباتے ہیں۔ اگر مقابلہ پر تیار ہو جاؤ' تو لوگ اپنی نیکی کی وجہ سے اکثر معاف بھی کر دیتے ہیں' یہی حال ان دونوں کا ہوا کہ نہ کسی نے پوچھ گچھ کی نہ انہوں نے انکار کی زحمت اٹھائی۔

لکھنے والے کو غلام مساحقے کے ذکر میں کوئی مزا نہیں آتا۔ مگر اس کے ساتھ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر یہ چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں تو چپ رہنے سے ان میں اصلاح نہ ہو گی۔ نہ یہ طے ہو سکے گا کہ کہاں تک یہ چیزیں فطری ہیں' اور کہاں تک اسباب زمانہ سے پیش آتی ہیں۔ کسی جولاہے کے پاؤں میں تیر لگا تھا۔ خون بہتا جاتا تھا مگر دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔

ہمارے قصبے کے لوگ دراصل ہیولاک ایلس اور فرائڈ نہیں پڑھے ہیں۔ اس وجہ سے مجبوراً ہمیں ان مسائل پر بحث کرنا پڑی۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ عورت میں کچھ جزو مرد کا ہوتا ہے' اور ہر مرد میں کچھ جز عورت کا۔ جو جزو غالب ہوتا ہے اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ان میں ایسے ہوں جن کا فطرتاً اپنے ہی جنس سے اچھے تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسباب زمانہ سے بھی لوگ اس راہ لگ جاتے ہیں۔ بجائے اصلاح کی کوشش کے ہر معاملے میں یہی رائے قائم کرنا کہ یہ قدرتی تقاضا ہے اور اس لئے اصلاح کی ضرورت نہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ایسے فعل کی جس میں سماج کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو قانونی سزا ہونی چاہئے یا نہیں یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

اچھا اب قصہ سنئے۔ مدی اور اس عورت سے دو سال دوستی رہی۔ اس کے بعد لڑائی ہو گئی۔ کس بات پر بگاڑ ہو گیا یہ کسی کو معلوم نہیں وہ عورت جس راہ آئی تھی۔ اسی راہ چلی گئی۔ بی مدی اجڑی پجڑی رنڈاپا کھینے لگیں۔ جو بندہ یا بندہ۔ تھوڑے دنوں کے بعد ایک اور ہم جنس مل گئیں۔ اس کے بعد اور بھی ملا کیں مگر

نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزا میں کیا کہوں آغاز آشنائی کا

وہ پہلی سی بات پھر نہ نصیب ہوئی۔ اب روپیہ پیسہ بھی کم رہ گیا تھا اسی لئے آمدنی بڑھانے کی بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ بی مدی نے تحصیلدار کے آگے ہاتھ بڑھایا نہ پھر سے شادی کی ہوس کی۔ بلکہ خود کام کرنے پر تیار ہو گئیں۔ پراٹھے کباب بنانا شروع کئے، جاڑوں کی فصل میں انڈے اور گاجر کا حلوا بنانے لگیں۔ کچھ عورتوں کی ضروریات کا بساط خانہ بھی منگوالیا۔ چکن کورشیا کا بھی ڈھیر ڈالا بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ اردگرد کی لڑکیاں اور عورتیں سودا بیچ لاتی تھیں۔ اور حق المحنت سے زیادہ حصہ پاتی تھیں۔ بی مدی کو سوداگری کا سب سے بڑا گر نہیں یاد تھا۔ یعنی جو آدمی بہت سے کام ساتھ ہی کرتا ہے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ آمدنی سے زیادہ ہی رہا۔ یہاں تک کہ مکان بھی گروی رکھنا پڑا۔

روپیہ جانے کے بعد توقیر میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ مگر اس کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ پھر بھی لوگوں کی نظر میں ہلکی نہ ہوئی۔ کپڑے اب بھی سلیقہ کے پہنتی تھی۔ گاڑھا پردہ کبھی نہیں تھا۔ آج بھی سڑک پر ماری ماری نہیں پھرتی تھی۔ تنخواہ والے نوکر کبھی نہیں تھے۔ آج بھی کام کاج کرنے والے آسانی سے مل جاتے تھے۔ مگر اقبال مندی میں گھن بہت دنوں سے لگ چکا تھا۔ اس لئے چہرے کی آب رخصت ہو چکی تھی۔ زمانہ بدل جانے سے مزاج میں بھی فرق آگیا تھا۔ ایک دن ان کے گھر میں کئی عورتیں جمع تھیں کسی نے کہا "بن مرد کی عورت کس گنتی شمار میں ہے" بی مدی بول اٹھیں "سچ کہتی ہو بہن" ایسی بات ان کے منہ سے کبھی نہیں سنی گئی تھی۔ یہ سن کر بعض نے دوسروں کو اشارہ کیا۔ بعض نے اتفاق کیا۔ دو ایک ایسی بھی تھیں جو مدی کا منہ تعجب سے دیکھنے لگیں۔ یہ وہ تھیں جنہوں نے مدی کے منہ سے مرد کا نام بلا ناک بھوں چڑھائے عمر میں نہیں سنا تھا۔

زمانہ گذرتا گیا۔ مگر بی مدی کے دن نہ پھرنا تھے نہ پھرے۔ کچھ دنوں بعد ایک شاہ صاحب آئے۔ بہت مرجع خلائق تھے۔ عقیدتمندوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا تھا۔ بی مدی بھی دو تین بار کباب پراٹھے کی نذر نیاز پیش کر چکی تھیں۔ اتنے میں خبر اڑی کہ شاہ صاحب حج کو جائیں گے۔ ہمیشہ مرغ پلاؤ توکل پر کھایا کئے۔ اب حج بھی توکل پر کریں گے۔ جس دن شاہ صاحب چلے، لوگوں نے دیکھا مدی بھی دامن سے لگی چلی جا رہی ہیں اور لوگوں سے کہا سنا معاف کرا رہی ہیں۔ جو کچھ بچی کھچی پونجی تھی وہ بیچ کر نقد کر لیا۔ باقی کے لئے شاہ صاحب کی ذات اور توکل کا توشہ کافی ٹھہرا۔ حج سے واپسی پر وطن نہیں آئیں۔ بلکہ شاہ صاحب ہی کے قدموں سے لگی رہیں۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے بلھم باعور تھے۔ جی چاہے انگلی پر ڈال دیجئے۔ چاہے چادر کی طرح کاندھے پر لٹکا لیجئے۔ مدی میں جوانی کی کنی گھلنے میں اب بھی دیر تھی۔ مگر شاہ صاحب کو دیکھ کر خواب میں بھی آشنائی کا خیال نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر غور کیجئے۔ تو پیر بھی ایک طرح کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ جس پر مرید اسی طرح تکیہ کرتا ہے جیسے عورت مرد پر۔

○

خواجہ حسن نظامی

نام : سید علی حسن (والدین نے قاسم علی نام رکھا تھا جبکہ ماموں علی حسن پکارتے تھے۔ آخر میں یہی نام قرار پایا)

قلمی نام : سید محمد علی حسن نظامی/ خواجہ حسن نظامی (خواجہ حسن نظامی کے قلمی نام سے پہلا مضمون اخبار "وکیل" امرت سر میں شائع ہوا۔)

پیدائش : ۲ محرم بروز جمعرات ۱۲۹۶ھ بہ مطابق ۲۵ دسمبر ۱۸۷۹ء / ۱۸۸۰ء بہ مقام بستی درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ، پرانی دہلی۔

وفات : ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء بہ مقام دہلی۔ (۱)

تعلیم : پہلے ناظرہ قرآن حکیم پڑھا پھر فارسی کی معمولی کتابیں، اس کے بعد عربی صرف و نحو پڑھی۔ استاد اول مولانا محمد اسمٰعیل ساکن کاندھلہ ضلع مظفرگڑھ تھے۔ ان کے دیگر اساتذہ میں مولوی وصیت علی، مولوی عبدالعلی محدث، مولوی حکیم الدین پنجابی اور مولوی رضی الحسن (ساکن کاندھلہ) جیسے بزرگوں کے نام نمایاں ہیں۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کا تعلق مولانا سید بدر الدین اسحاق کی نسل سے ہے۔ والد کا نام سید عاشق حسین تھا، جو جلد سازی کا کام کرتے تھے یا درگاہ نظام الدین اولیاء کے چڑھاووں پر گزارا تھا۔ گیارہ برس کی عمر میں والد انہیں تونسہ شریف (ڈیرہ غازی خان) لے گئے اور حضرت اللہ بخش کے ہاتھ بیعت کروایا۔ ۱۲ برس کی عمر میں والدین انتقال کر گئے۔ ۱۶ برس کی عمر میں بڑے بھائی سید علی حسن شاہ کے ساتھ چاچڑاں شریف (بہاول پور) گئے اور حضرت خواجہ غلام فرید کے ہاتھ بیعت کی۔ چوبیس برس کی عمر میں پیر مہر علی شاہ گولڑوی کے مرید ہوئے۔ ملا واحدی کے مطابق شریعت میں ان کے استاد مولوی محمد ایوب تھے اور طریقت میں خواجہ صاحب۔ ۱۸۹۶ء میں لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۰۳ء میں مطبوعہ کتب اور تاریخی عمارات کے فوٹو، پھیری لگا کر بیچنے لگے۔ شادی مرحوم چچا سید معشوق علی کی بیٹی حبیب بانو سے ہوئی جو زیادہ مدت حیات نہ رہیں۔ جولائی ۱۹۰۹ء سے رسالہ "نظام المشائخ" مرتب کرنا شروع کیا اور ۱۹۱۳ء میں حلقہ نظام المشائخ کی ملکیت سے دستبردار ہو گئے۔ انہیں تسخیر ہمزاد، مسمریزم اور سفلی عملیات سے خصوصی شغف رہا۔ ۱۹۱۳ء میں میرٹھ منتقل ہو گئے اور اخبار "توحید" کی ادارت سنبھالی۔ ستمبر ۱۹۱۷ء میں رسالہ "مرشد" جاری کیا۔ مختلف اوقات میں دو وقتی روزنامہ، ہفت روزہ، ماہانہ اور دو ماہی اخبارات و جرائد مرتب کیے۔ "ینگ مسلم" اور "ڈکٹیٹر" کے نام سے انگریزی اخبار جاری کیے جبکہ بقول ان کے انہیں انگریزی نہ آتی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں حیدر آباد دکن میں جا بسے تھے، لیکن حالات بہتر ہوئے تو دہلی واپس آ گئے۔ مولانا آزاد اور مولانا ظفر علی خان کے ساتھ نہیں بنی لیکن شدھی اور سنگھٹن کی تحریک چلی تو تینوں نے اس کی مخالفت کی۔ خواجہ صاحب کا سوامی شردھانند سے مباہلہ ہوا اور سوامی جی میدان چھوڑ گئے۔ خواجہ صاحب نے طبابت میں بھی بڑا نام کمایا، مسمریزم کے ذریعے نفسیاتی علاج کیا کرتے تھے۔ ان کا تیار کردہ فاسفورس کا تیل بہت مشہور ہوا۔ وہ اکثر اپنے مریدوں کو نت نئے خطابات سے نوازتے تھے۔ علامہ اقبال کو "شاعر مشرق" کا خطاب بھی آپ نے ہی دیا۔ ایشیا ٹک موی ٹون لمیٹڈ لاہور کی اولین فلم "افغان شہزادہ" المعروف "ترکی خون" کے مکالمے ۱۹۳۴ء میں لکھے اس فلم کی کہانی علامہ اقبال نے تحریر کی تھی۔ (۲)

اولین مطبوعہ تحریر:

"مفلسی کے مجرب علاج" از مولانا جلال الدین سیوطی کے عربی رسالہ کا ترجمہ، مطبوعہ غالباً ۱۹۰۰ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"عرب شہید کا گھر" مطبوعہ روزنامہ "زمیندار" لاہور، ۱۹۱۲ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

نمبر	کتاب	مطبوعہ	طبع اول
۱۔	رسالہ: "مفلسی کے مجرب علاج" از مولانا جلال الدین سیوطی (عربی سے ترجمہ)		مطبوعہ: ۱۹۰۰ء
۲۔	رسالہ: "ظہور مہدی یعنی شیخ سنوسی" (جلد اول) ۳۲ صفحات	مطبوعہ: ۱۹۱۱ء	
۳۔	رسالہ: "کتاب الامر عرف امام مہدی کے انصار" از مولانا جلال الدین سیوطی (عربی سے ترجمہ) ۶۴ صفحات	مطبوعہ: ۱۹۱۱ء	
۴۔	"سفر بمبئی کا روزنامچہ"	مطبوعہ: ۱۹۱۲ء	
۵۔	"اسلام کا انجام" از شیخ توفیق بکری (عربی سے ترجمہ)	مطبوعہ: ۱۹۱۲ء	
۶۔	"اسرار" از بہاء اللہ آفندی بانی فرقہ بابیہ کا ترجمہ	مطبوعہ: ۱۹۱۳ء	
۷۔	"مجموعہ مضامین حسن نظامی" دیباچہ میرنیرنگ صفحات ۱۵۲	مطبوعہ:	طبع اول: ۱۹۱۲ء
۸۔	"سی پارہ دل" (مضامین / نثر لطیف)	مطبوعہ:	طبع اول: ۱۹۱۳ء
۹۔	"سفرنامہ مصر و شام و حجاز" صفحات ۲۱۲	مطبوعہ: اخبار "توحید" میرٹھ،	طبع اول: ۱۹۱۳ء
۱۰۔	"اعمال حزب البحر" صفحات ۱۰۰	مطبوعہ: اخبار "توحید" میرٹھ،	طبع اول: ۱۹۱۳ء
۱۱۔	"غدر دہلی کے افسانے" حصہ اول	مطبوعہ: اخبار "توحید" میرٹھ،	طبع اول: ۱۹۱۴ء
۱۲۔	"غدر دہلی کے افسانے" حصہ دوم	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۷ء
۱۳۔	"فیضان سنوسی" (جلد سوم)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: س ـ ن
۱۴۔	"تین پر ایک" (فیضان سنوسی کا چوتھا حصہ)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۴ء
۱۵۔	"ناگفتہ بہ" (فیضان سنوسی کا پانچواں حصہ)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: س ـ ن
۱۶۔	"جرمنی خلافت" (فیضان سنوسی کا چھٹا حصہ)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: س ـ ن
۱۷۔	"اردو دعائیں" صفحات ۷۰	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: س ـ ن
۱۸۔	"کم تو موت" صفحات ۱۹۰ (فنا اور بقا پر)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۷ء
۱۹۔	"قبروں کے غیبی نوشتے" (الواح قبور)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۷ء
۲۰۔	"محرم نامہ" (واقعات کربلا)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۶ء
۲۱۔	"میلاد نامہ" (میلاد نامہ و تاریخ اسلام)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۱۷ء
۲۲۔	"بیوی کی تعلیم" (زنانہ تعلیم سے متعلق)	مطبوعہ: کارکن مشائخ دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۷ء

۲۳۔ "یزید نامہ" (محرم نامے کا دوسرا حصہ)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۷ء
۲۴۔ "اتالیق خطوط نویسی" (دو جلدیں)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۶ء
۲۵۔ "مجموعہ خطوط حسن نظامی" صفحات ۱۳۰	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۷ء
۲۶۔ "محفل نامہ گیارہویں شریف" (غوث پاک کے حالات)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۸ء
۲۷۔ "کرشن بیتی" (کرشن مہاراج کے حالات) باتصویر	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۷ء
۲۸۔ "رہنمائے سیر دہلی" (دہلی کی گائڈ بک) باتصویر	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۷ء
۲۹۔ "انتخاب توحید" (مضامین)	مطبوعہ: اخبار "توحید" میرٹھ،	طبع اول: ۱۹۱۳ء
۳۰۔ "چٹکیاں اور گدگدیاں" (مزاحیہ مضامین)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۸ء
۳۱۔ "جگ بیتی" (کہانیاں) صفحات ۸۰۰	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۷ء
۳۲۔ "رسول کی عیدی" (بچوں کے لیے مضامین)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۳ء
۳۳۔ "فلسفہ شہادت" (بچوں کے لیے مضامین)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: س ـ ن
۳۴۔ "توپ خانہ" (بچوں کے لیے مضامین)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: س ـ ن
۳۵۔ "نمونہ جنگ سٹین" (خطوط)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۷ء
۶۔ "غدر دہلی کے افسانے" (حصہ اول) "بیگمات کے آنسو"	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: س ـ ن
۳۷۔ "غدر دہلی کے افسانے" (حصہ دوم) "انگریزوں کی بپتا"	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۷ء
۳۸۔ "محاصرہ دہلی کے خطوط" (انگریزوں کے خطوط)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۵ء
۳۹۔ "بہادر شاہ کا مقدمہ" (انگریزوں کے خطوط)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۳ء
۴۰۔ "گرفتار شدہ خطوط" (بہادر شاہ ظفر کے نام خطوط کا مجموعہ)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۳ء
۴۱۔ "اخبار"	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۳ء
۴۲۔ "غالب کا روزنامچہ"	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۴ء
۴۳۔ "دہلی کی جان کنی"	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۳ء
۴۴۔ "آخری سانس یا بہادر شاہ کا روزنامچہ"	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۵ء
۴۵۔ "غدر کی صبح و شام"	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۶ء
۴۶۔ "غدر کا نتیجہ"	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۳۰ء
۴۷۔ "کاناباتی" (خطبات)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۳۷ء
۴۸۔ "اپنی آنکھ اپنی دید" (مضامین)	مطبوعہ: درویش پریس، دہلی،	طبع اول: ۱۹۳۳ء
۴۹۔ "انقلاب دہلی" (شاعری)	مطبوعہ: نظامی پریس، دہلی،	طبع اول: ۱۹۳۱ء
۵۰۔ "مسلمان مہارانا" (سوانح)	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۷ء
۵۱۔ "اردو سکھانے کے مضامین" (تعلیم)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۲ء
۵۲۔ "تاریخ سلاطین عباسیہ" (حصہ اول)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۶ء
۵۳۔ "تاریخ سلاطین عباسیہ" (حصہ دوم)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	طبع اول: ۱۹۲۷ء

۵۴۔ "سلاطین بہمنی" (تاریخ حیدر آباد دکن) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۲۵ء

۵۴۔ "غزنوی جہاد" (تاریخ ہند) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: س ـ ن

۵۵۔ "دو سفرنامے" — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۳ء

۵۶۔ "سفرنامہ ہندوستان" — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۴ء

۵۷۔ "آپ بیتی" — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۲ء

۵۸۔ "علاج بالغیال" (طب) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: س ـ ن

۵۹۔ "بیوی کی تربیت" (اخلاقیات) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۱۷ء

۶۰۔ "بچوں پر ستم" (کفار کے مسلمانوں پر ظلم کی داستان) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: س ـ ن

۶۱۔ "روزنامچہ ہندوستان" (سفری روزنامچہ) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: س ـ ن

۶۲۔ "دل کی عیدیاں" (نعتیہ مضامین نظم و نثر) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: س ـ ن

۶۳۔ "دس سبق" (بچوں کے لیے) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: س ـ ن

۶۴۔ "درویشی مولود" (میلاد شریف) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: س ـ ن

۶۵۔ "داعی اسلام" (تبلیغی لٹریچر) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: س ـ ن

۶۶۔ "خدائی انکم ٹیکس" (زکواۃ کے فلسفے پر ۴۰ صفحات) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۱۷ء

۶۷۔ "حلوائی کی تعلیم" (مٹھائیاں بنانے پر) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۲۹ء

۶۸۔ "چار درویشوں کا تذکرہ" (غیر ملکی مشائخ کا ذکر) — خواجہ پریس، بٹالہ — طبع اول: ۱۳۳۱ھ

۶۹۔ "تین شہید" (طرابلس، ایران اور مراکش کے شہدا) — خواجہ پریس، بٹالہ — طبع اول: س ـ ن

۷۰۔ "پنواڑی کی دوکان" (پان سازی سے متعلق) — خواجہ پریس، بٹالہ — طبع اول: س ـ ن

۷۱۔ "تعلیم خدمتگاری" — خواجہ پریس، بٹالہ — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۷۲۔ "تسکین احساس" (تصوف) — خواجہ پریس، بٹالہ — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۷۳۔ "تسخیر مہر و قمر" (یعنی اعمال حزب البحر جدید پیرائے میں) — خواجہ پریس، بٹالہ — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۷۴۔ "پھکی اور دست پناہ" (لطائف) — خواجہ پریس، بٹالہ — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۷۵۔ "ہندو مذہب کی معلومات" — خواجہ پریس، بٹالہ — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۷۶۔ "مکاتیب اکبر" (دو جلدیں ـ اکبر الہ آبادی کے خطوط) — خواجہ پریس، بٹالہ — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۷۷۔ "مرگ نامہ" (سبق آموز قصے) — خواجہ پریس، بٹالہ — طبع اول: ۱۹۲۳ء

۷۸۔ "مرغی انڈے کی تجارت" — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۷۹۔ "محمدؐ کی سرکار" (ایک سکھ بیرسٹر کی عقیدت) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۸۰۔ "مجالس حسنہ" (نظامی کے خاص ارشادات) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۸۱۔ "لے دور کا سلام" (حضورؐ سے کلام) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۸۲۔ "لڑائی کا گھر" (عالمی جنگ کی پیروڈی) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۸۳۔ "لاہوتی آپ بیتی" (حضرت انساں کی سرگزشت) — مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۸۴۔ "کائنات جتی" (جمادات اور سیارگان کے حوالے سے معرفت) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۸۵۔ "قرآن: آسان قاعدہ" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۸۶۔ "فرانسیسی درویشوں کے ملفوظات" مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۸۷۔ "فاطمی دعوت" (شیعہ سنی بزرگان کے حوالے سے) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۸۸۔ "غزنوی فتوحات" (محمود غزنوی کے ۱۷ حملے) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۸۹۔ "عالم سکرات میں" (کہانی کے انداز میں) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۹۰۔ "طمانچہ برخسار یزید" (ناول: یزید، ابن زیاد اور شمر سے متعلق) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۹۱۔ "قرآن پاک کی آسان تفسیر" (پارہ نمبر ۱ تا نمبر ۳۰) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۹۲۔ "طریقت کی پہلی کتاب" (تصوف) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۹۳۔ "طریقت کی دوسری کتاب" (تصوف) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۹۴۔ "شیطان کا طوطا" (مغربی تعلیم کی برائیاں) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۹۵۔ "شامی جہاد" (تاریخ) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۹۶۔ "سکھ قوم" (گرو گرنتھ صاحب کے حوالے سے) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۹۷۔ "اردو کی پہلی کتاب" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۹۸۔ "اولاد کی شادی" (سماجیات) مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۹۹۔ "ایڈورڈ ڈائری" مطبوعہ: دفتر "منادی" دہلی، طبع اول: ۱۹۳۶ء سے قبل

۱۰۰۔ "جرمن نامہ" (تاریخ) مطبوعہ: حلقہ کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۱۵ء

۱۰۱۔ "جرمن خلافت" (تاریخ) مطبوعہ: حلقہ کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۱۵ء

۱۰۲۔ "حلال خور" (سماجیات) خواجہ پریس، بٹالہ، طبع اول: ۱۳۴۱ھ

۱۰۳۔ "خوشی کی زندگی" (سماجیات) مطبوعہ: حلقہ کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۷ء

۱۰۴۔ "شراب خوری اور جوئے بازی" (سماجیات) مطبوعہ: حلقہ کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۵ء

۱۰۵۔ "گاندھی نامہ" مطبوعہ: نظامیہ بک ڈپو، پٹیالہ، طبع اول: ۱۹۲۲ء

۱۰۶۔ "دست غیب" مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: س ـ ن

۱۰۷۔ "اولاد کے کان میں کہنے کی باتیں" مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی: طبع اول ۱۹۲۵ء

۱۰۸۔ "اورنگ زیب کی اصل تاریخ" (تاریخ) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۵ء

۱۰۹۔ "انگریزوں کی دعوت اسلام" مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۵ء

۱۱۰۔ "اعمال حزب البحر" (دعا کے فوائد) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع دوم: ۱۹۴۷ء

۱۱۱۔ "امام حسین کا ماڈرن کیریکٹر" مطبوعہ: حلقہ مشائخ بک ڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۱ء

۱۱۲۔ "تمباکو نامہ" "" یعنی ترک سگرٹ" مطبوعہ: حلقہ مشائخ بک ڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۳ء

۱۱۳۔ "ترغیب حساب" مطبوعہ: محبوب المطابع برقی پریس، دہلی، طبع دوم: ۱۹۳۶ء

۱۱۴۔ "نوکری" مطبوعہ: چمن اردو بک ڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۷ء

۱۱۵۔ "تبلیغی اشتہاروں کا مجموعہ" مطبوعہ: ہمدرد برقی پریس، دہلی طبع اول: ۱۹۳۶ء

۱۱۶۔ "ایک سو چھبیس عید کارڈ" مطبوعہ: محبوب المطابع برقی پریس، دہلی، طبع چہارم: ۱۹۲۸ء

۱۱۷۔ "اسلام کے ضروری عقائد" مطبوعہ: ہمدرد برقی پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۵ء

۱۱۸۔ "بابا فرید گنج شکر کا روزنامچہ" مطبوعہ: دفتر خواجہ حسن نظامی، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۵ء

۱۱۹۔ "تاریخ مسیح" (لالہ جے چند کی انگریزی کتاب کا ترجمہ) مطبوعہ: حمیدیہ پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۷ء

۱۲۰۔ "سفرنامہ پاکستان" مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، طبع اول: ۱۹۶۳ء

۱۲۱۔ "تاریخ رسول" (تاریخ) مطبوعہ: حیدر آباد دکن طبع اول: ۱۹۳۸ء

۱۲۲۔ "ہمارا اردو سبق" (تعلیم) مطبوعہ: اہل بیت پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۴۴ء

۱۲۳۔ "قرآن مجید کے معجزات" مطبوعہ: ہمدرد برقی پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۶ء

۱۲۴۔ "گھریلو دھوبی گھاٹ" مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۷ء

۱۲۵۔ "گیارہویں نامہ" مطبوعہ: ہمدرد برقی پریس، دہلی، طبع پنجم: ۱۹۳۶ء

۱۲۶۔ "حدیث کی پیش گوئیاں" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۴۰ء

۱۲۷۔ "جمعہ اور عیدین کے اردو خطبے" مطبوعہ: ہمدرد برقی پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۶ء

۱۲۸۔ "ترکیب نماز" مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۵ء

۱۲۹۔ "روزہ کے سب احکام و مسائل" مطبوعہ: محبوب المطابع برقی پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۶ء

۱۳۰۔ "تعلیم اسرار تصوف" مطبوعہ: حلقہ مشائخ، دہلی، بارہواں ایڈیشن: ۱۹۵۱ء

۱۳۱۔ "شیخ چلی کی ڈائری" (مزاح) مطبوعہ: اہل بیت پریس، دہلی، طبع اول: ن۔ن

۱۳۲۔ "دلائل اسلام" (صفحات ۱۱۲) مطبوعہ: محبوب المطابع برقی پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۷ء

۱۳۳۔ "نادان وہابی" مطبوعہ: شاہجہان پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۵ء

۱۳۴۔ "روٹی سالن" مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، طبع اول: ۱۹۴۳ء

۱۳۵۔ "روپیہ عالم سکرات میں" مطبوعہ: خواجہ پریس، پٹیالہ، طبع اول: ۱۹۲۳ء

۱۳۶۔ "مرگی نامہ" مطبوعہ: خواجہ پریس، پٹیالہ، طبع اول: ۱۹۲۳ء

۱۳۷۔ "نظامی بنسری" مطبوعہ: اہل بیت پریس، دہلی، طبع دوم: ۱۹۴۵ء

۱۳۸۔ "ترک گاؤ کشی" مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۳ء

۱۳۹۔ "دہلی کی جان" مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی طبع اول: ۱۹۲۲ء

۱۴۰۔ "اردو سکھانے کے مضامین" مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۳ء

۱۴۱۔ "ہندو مذہب کے معلومات" مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، طبع دوم: ۱۹۲۷ء

۱۴۲۔ "حضرت امیر خسرو کا تذکرہ" مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، طبع دوم: ۱۹۲۵ء

۱۴۳۔ "دہلی کی آخری شمع" مطبوعہ: ریاست برقی پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۸ء

۱۴۴۔ "دلی کی سزا" طبع دوم: ۱۹۳۶ء

۱۴۵۔ "سر طامس منکاف کی ڈائری" مطبوعہ: محبوب المطابع برقی پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۵۰ء

۱۴۶۔ "عام فہم تفسیر"۔ مطبوعہ: درویش پریس، دہلی، طبع دوم: ۱۹۳۲ء

۱۴۷۔ "انسدادِ گداگری اور اصلاحِ خیرات" مطبوعہ: حمیدیہ پریس، دہلی، طبع دوم: ۱۹۳۷ء

۱۴۸۔ "بولتا قرآن" مطبوعہ: دفتر خواجہ حسن نظامی، دہلی

۱۴۹۔ "قرآن و حدیث کے فرمان" مطبوعہ: اہل بیت پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۴ء

۱۵۰۔ "نئی تہذیب کی بوتل کا کاگ" مطبوعہ: ہمدرد برقی پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۶ء

۱۵۱۔ "سناتن سندیسہ" مطبوعہ: محبوب المطابع برقی پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۵ء

۱۵۲۔ "اسلامی توحید" مطبوعہ: ہمدرد پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۶ء

۱۵۳۔ "قرآن مجید کے فوجداری قوانین" مطبوعہ: ہمدرد پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۵ء

۱۵۴۔ "حق پرستوں پر ستم" مطبوعہ: حمیدیہ پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۲۴ء

۱۵۵۔ "بندوق" (کتابچہ ۱۶ صفحات) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۵۶۔ "بم" (کتابچہ ۱۶ صفحات) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۵۷۔ "مچھر کا اعلانِ جنگ" (کتابچہ ۳۲ صفحات) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۵۸۔ "مکھی کا میدانِ جنگ" (کتابچہ ۳۲ صفحات) مطبوعہ: کارکن مشائخ دہلی

۱۵۹۔ "ہوائی جہاز" (کتابچہ ۱۶ صفحات) مطبوعہ: کارکن مشائخ دہلی

۱۶۰۔ "جرمن شہزادہ کی لاش" (کتابچہ ۱۶ صفحات) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۶۱۔ "قرام قبلہ تو شملہ" (لارڈ ہارڈنگ کے نام خط۔ صفحات ۱۸: کتابچہ) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۶۲۔ "مرشد" (کتابچہ ۳۰ صفحات) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۶۳۔ "دینی یادداشت" (کتابچہ) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۶۴۔ "ہمارے رسولؐ کی دعائیں" (کتابچہ) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۶۵۔ "آل انڈیا خاک ڈیپوٹیشن" (کتابچہ) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۶۶۔ "تشریح بخاری" مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۶۷۔ "دہلی کی جاں کنی" مطبوعہ: کارکن مشائخ دہلی

۱۶۸۔ "غدرِ دہلی کے اخبار" (کتابچہ) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۶۹۔ "کرشن کتھا" (کتابچہ) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۷۰۔ "خضری پہاڑوں میں محمدؐ کا نام" (سفرنامہ) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۷۱۔ "نادر شاہی قتلِ عام" (ترجمہ) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۷۲۔ "تاریخ فرعون" مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۷۳۔ "حسن نظامی کا پیام مسلم پریس اور مسلم لیڈروں کے نام" (کتابچہ) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۷۴۔ "مہاراجا" مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۰ء

۱۷۵۔ "سرکار کے خوشامدی سرکش" مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی

۱۷۶۔ "خلاصہ تعلیم تصوف" (کتابچہ) مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی، طبع اول ۱۹۳۷ء

۱۷۷۔	"عمر بڑھانے کے طریقے" (طب)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	
۱۷۸۔	"گورنمنٹ اور خلافت" (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	
۱۷۹۔	"تاریخ اولیاء" (ترجمہ)	مطبوعہ: اولیاء کتاب گھر، نئی دہلی،	طبع اول: ۱۹۶۰ء
۱۸۰۔	"انگریزوں کی چتا"	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	
۱۸۱۔	"تبلیغی کارڈ"	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	
۱۸۲۔	"بچوں کی کہانیاں" (باتصویر)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	
۱۸۳۔	"داعی اسلام"	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	
۱۸۴۔	"درویشی مولود" (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی،	
۱۸۵۔	"مرشد کو سجدہ تعظیم" (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن مشائخ، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۷ء
۱۸۶۔	"ہوم رول کی پہلی لڑائی" (کل صفحات ۱۱۲)	دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی،	طبع اول: ۱۹۱۸ء
۱۸۷۔	"حیدر آباد نامہ" (کتابچہ ۸۰ صفحات)	افضل برقی پرنٹنگ پریس، حیدر دکن،	طبع اول: ۱۹۳۷ء
۱۸۸۔	"حیدر آباد کے قانون دان (کتابچہ ۸۰ صفحات)	افضل برقی برنٹنگ پریس، حیدر آباد دکن،	طبع اول: ۱۹۳۹ء
۱۸۹۔	"اطبائے حیدر آباد" (کتابچہ ۳۲ صفحات)	افضل برقی پرنٹنگ پریس، حیدر آباد دکن،	طبع اول: ۱۹۳۹ء
۱۹۰۔	"جاگیردار" (کتابچہ ۳۲ صفحات)	دفتر "منادی" دہلی،	طبع اول: ۱۹۳۹ء
۱۹۱۔	"بنک کار" (کتابچہ ۱۲ صفحات)	دفتر "منادی" دہلی،	طبع اول: ۱۹۳۹ء
۱۹۲۔	"تجار" (صفحات ۲۸۸)	دفتر "منادی" دہلی،	
۱۹۳۔	"مرزا مغل کی بیٹی" (افسانے)		
۱۹۴۔	"حیدر آباد کے دکان دار" (کتابچہ صفحات ۳۲)	دفتر "منادی" دہلی،	
۱۹۵۔	"جواز عکسی تصاویر کی شرعی بحث" (کتابچہ صفحات ۴۸)	دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی،	طبع اول: س۔ن
۱۹۶۔	"تائید اسلام و تردید اسلام" (از مولانا حفیظ الدین کا ترجمہ)	جید برقی پریس	طبع اول: ۱۹۴۷ء
	اس کتابچے کے کل صفحات ۶۷ ہیں۔		
۱۹۷۔	"پرانی دہلی کے حالات" (کتابچہ صفحات ۹۶)	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی،	طبع اول: ۱۹۶۹ء
۱۹۸۔	"خلاصہ سیرۃ نبویؐ"	مطبوعہ کارکن مشائخ، دہلی،	
۱۹۹۔	"اسلام کا نظام" (کتابچہ)	عصر جدید پریس، میرٹھ،	
۲۰۰۔	"امام آخر الزماں کی آمد"	محبوب المطابع، دہلی،	
۲۰۱۔	"بچوں کی حدیثیں" (کتابچہ)	محبوب المطابع، دہلی،	
۲۰۲۔	"ذکر غوث پاک" (کتابچہ)		
۲۰۳۔	"سیرۃ امام حسین"		
۲۰۴۔	"قرآن کی کہانیاں"	حلقہ نام المشائخ، دہلی،	
۲۰۵۔	"پیغمبروں کی کہانیاں" (کتابچہ)	حلقہ نظام المشائخ، دہلی،	
۲۰۶۔	"محمدؐ درشن" (کتابچہ)	حلقہ نظام المشائخ، دہلی،	

نمبر	کتاب	ناشر	طبع
۲۰۷۔	" مجالس حسنہ " (کتابچہ)	حلقہ نظام المشائخ ، دہلی ،	
۲۰۸۔	" انتخاب توحید " (کتابچہ)	خواجہ پریس ، بٹالہ ،	طبع اول : ۱۹۲۲ء
	دفتر " منادی " ، دہلی ،	طبع دوم : ۱۹۳۷ء	
۲۰۹۔	" اسلامی رسول " " (کتابچہ)	دفتر " منادی " ، دہلی ،	
۲۱۰۔	" اسلام کیونکر پھیلا " (کتابچہ)		
۲۱۱۔	" ہندو لغت " (کتابچہ)		
۲۱۲۔	" اسلامی رسول ؐ کے معجزات " (کتابچہ)	حلقہ نظام المشائخ ، دہلی ،	طبع اول : ۱۹۳۷ء
۲۱۳۔	" تبلیغی مرثیے " (کتابچہ)	حلقہ نظام المشائخ ، دہلی ،	
۲۱۴۔	" عرب کا ارتداد اور اس کا بزور تیغ انسداد " (کتابچہ)	محبوب المطابع ، دہلی ،	طبع اول : ۱۹۳۶ء
۲۱۵۔	" محمودی حملوں کے اسباب " (کتابچہ)		
۲۱۶۔	" نمازوں کا بیان " (کتابچہ)		
۲۱۷۔	" تعلیم الاسلام " (کتابچہ)	حلقہ نظام المشائخ ، دہلی ،	طبع اول : ۱۹۳۵ء
۲۱۸۔	" عام فہم تشریح بخاری " (کتابچہ)	حلقہ نظام المشائخ ، دہلی ،	
۲۱۹۔	" آسان قاعدہ تعلیم القرآن " (پہلا اور دوسرا حصہ)	دلی پرنٹنگ ورکس ، دہلی ،	طبع اول : ۱۹۲۳ء
۲۲۰۔	" خلاصہ تعلیم تصوف " (کتابچہ)	حلقہ نظام المشائخ ، دہلی ،	طبع اول : ۱۹۳۷ء
۲۲۱۔	" تاکید تسلی " (کتابچہ)	حلقہ نظام المشائخ ، دہلی ،	طبع اول : ۱۹۳۵ء
۲۲۲۔	" کتاب تسلی " (کتابچہ)	حلقہ نظام المشائخ ، دہلی ،	طبع اول : ۱۹۳۵ء
۲۲۳۔	" کتاب الامر " (کتابچہ)	روز بازار پریس ، امرتسر ،	طبع اول : ۱۹۱۳ء
۲۲۳۔	" واجب الوجود " (کتابچہ)	روز بازار پریس ، امرتسر ،	طبع اول : ۱۹۱۳ء
۲۲۔	" رسول ؐ بیتی " (کتابچہ)		
۲۲۶۔	" پہلے درویش کے جنگی کارنامے " (کتابچہ)	**مینجر** راز و نیاز درویش ، میرٹھ ،	
۲۲۷۔	" خواجہ حسن نظامی کا روزنامچہ "	مطبوعہ : حلقہ کارکن مشائخ ، دہلی	طبع اول : ۱۹۳۵ء
۲۲۸۔	" انا الحق اور موت کا علاج "	مطبوعہ : حلقہ کارکن مشائخ ، دہلی ،	
۲۲۹۔	" پڑوس کے ستروپاجی " (کتابچہ)	مطبوعہ : حلقہ کارکن مشائخ ، دہلی ،	
۲۳۰۔	" پرندوں کی تجارت " (کتابچہ)	مطبوعہ : حلقہ کارکن مشائخ ، دہلی ،	
۲۳۱۔	" دیا سلائی " (کتابچہ)	مطبوعہ : حلقہ کارکن مشائخ ، دہلی ،	

وفات سے قبل مستقل پتا:

بستی درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء ، دہلی

نظریہ فن:

"یہ کوشش کرتا ہوں کہ واقعہ قطعی جھوٹا نہ ہو کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہو، اور میں ایک ذرہ کو آفتاب بنا دوں اور اسی بات کو اپنا کمال سمجھوں ـــــــ البتہ جب کوئی آواز یا صورت یا واقعہ یا خبر میرے دل پر اثر کرے تو سوچنے کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی اور ابتدائی عمر کی طرح قلم برداشتہ لکھتا چلا جاتا ہوں۔"

خواجہ حسن نظامی

(بہ حوالہ "میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں" مرتبہ: حکیم یوسف حسن، دار الادب پنجاب، بارود خانہ، لاہور)

○

(۱) "نقوش" لاہور (آپ بیتی نمبر) اور "بہترین انشائی ادب" مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی میں سال پیدائش اور سنہ وفات کا اندراج درست نہیں

(۲) دیکھیے: ماہنامہ "تصویر" لاہور، جنوری ۱۹۳۵ء۔ صفحہ نمبر ۹۔ ایشیا تک مووی ٹون لمیٹڈ، لاہور ڈاکٹر شاہ جی آغا کا ذاتی ادارہ تھا۔

خواجہ حسن نظامی

بہرا شہزادہ

بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں مہاراجہ بھاؤ نگر ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ برسات کا موسم تھا۔ سمندر میں صبح شام طوفان برپا رہتا تھا اور پانی کی آوازوں سے مسافروں کو قریب کی بات سننی بھی دشوار تھی۔

تاج محل ہوٹل میں ایک خانساماں ستر اسی برس کی عمر کا نوکر تھا۔ جو اپنے کام میں بہت ہوشیار اور تجربہ کار مانا جاتا تھا۔ اس خانساماں کا نام قسمت بیگ تھا۔ ایک دن صبح کے وقت مہاراجہ بھاؤ نگر نے پلنگ پر لیٹے لیٹے قسمت بیگ سے کہا "میں نے چند مہمانوں کو لنچ پر بلایا ہے۔ منیجر سے کہہ دینا کہ دس مہمانوں کا انتظام کر دے" سمندر کے پانی کا غل شور مہاراجہ بھاؤ نگر کی دھیمی آواز۔ اور بہرہ خانساماں یہ حکم کیونکر اس کے کانوں تک پہنچتا مگر قسمت بیگ کی تمیزداری کا یہ عالم تھا کہ ہونٹوں کی حرکت سے مطلب سمجھ لیتا تھا آج ایسے اسباب جمع ہوئے کہ قسمت بیگ مہاراجہ کے حکم کو نہ سمجھا۔ اور اس نے ذرا پلنگ کے قریب آکر نہایت تہذیب اور ادب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر سوال کیا کہ "جو ارشاد ہوا ہے اس کی تعمیل ہو جائے گی لیکن اگر تکلیف نہ ہو تو تھوڑی سی تفصیل اور فرمائی جائے۔" مہاراجہ بھاؤ نگر بالکل نہیں سمجھے کہ خانساماں نے ان کی بات نہیں سنی تھی۔ اور انھوں خانساماں سے دوبارہ کہا کہ جن دس آدمیوں کو بلایا ہے وہ اعلی درجہ کے لوگ ہیں۔ لنچ کا اہتمام اعلی قسم کا ہونا چاہئے۔ قسمت بیگ نے بات سمجھ لی اور ادب سے کہا "جو حکم۔ فرمان کی پوری تعمیل کی جائے گی" اور یہ کہہ کر بڑی تمیزداری کے ساتھ پچھلے قدم چل کر سامنے سے ہٹ گیا۔

مہاراجہ بھاؤ نگر دیر تک سوچتے رہے کہ انگریزی ہوٹلوں میں سب خانساماں انگریزی ادب آداب استعمال کرتے ہیں۔ یہ بڈھا کون ہے۔ جو پرانے زمانے کے مشرقی ادب آداب کو استعمال کرتا ہے اس کا حال معلوم کرنا چاہئے۔ انہوں نے خدمت گار کو بلا کر حکم دیا کہ "آج لنچ کے بعد ملاقات کے کمرے میں قسمت بیگ خانساماں کو بلایا جائے۔ ہم اس سے کچھ باتیں کرنی چاہتے ہیں۔" خدمتگار نے کہا "حضور! وہ بہت بدمزاج آدمی ہے۔ نوکری کے وقت تو بہت اچھا ہے لیکن دوسرے وقت میں وہ بہت بدمزاج ہو جاتا ہے۔" مہاراج نے کہا "ایسا کیوں ہے؟" خدمت گار نے جواب دیا "حضور! وہ کہتا ہے کہ میں ہندوستان کا بادشاہ ہوں۔ صاحب لوگ کہتے ہیں کہ اس کے دماغ میں کچھ خرابی ہے۔" یہ سن کر مہاراج مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ پھر خدمت گار سے کہا "کچھ پرواہ نہیں۔ قسمت بیگ سے کہہ دو کہ وہ لنچ کے بعد ہمارے پاس آئے۔"

مہاراجہ بھاؤ نگر اور چند عمائد بمبئی دوپہر کا کھانا کھا کر باتوں کے کمرے میں آئے۔ تو مہاراج نے قسمت بیگ کو بلایا۔ قسمت بیگ نہایت ادب سے حاضر ہوا۔ اور تین فرشی سلام کئے۔ مہاراج نے کہا "قسمت بیگ تم کون ہو؟" قسمت بیگ نے کہا "حضور گستاخی معاف۔ اس کا جواب تو آپ کو بھی معلوم نہیں ہے کہ ہم سب کون ہیں اور کیوں اس دنیا میں پیدا کئے گئے ہیں۔"

قسمت بیگ کی یہ عجیب تقریر سن کر حاضرین مبہوت رہ گئے "کہ خانساماں کیسی فلسفیانہ باتیں کر رہا ہے۔ مہاراج نے کہا "بے شک ہم کو اس کا جواب معلوم نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم نے زندگی کی ان مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے تم میرے سوال کا جواب دے سکتے ہو۔"

قسمت بیگ نے کہا "حضور میں ایک آدمی ہوں۔ نسل کے لحاظ سے تیموری مغل ہوں۔ پیشہ کے لحاظ سے تاج محل ہوٹل کا خانساماں

ہوں ۔ عمر کے لحاظ سے بڈھا ۔ طبیعت کے اعتبار سے کبھی بچہ اور کبھی جوان ۔ جھوٹ نہیں بولتا ۔ چوری نہیں کرتا ۔ خدمت خلق کو اپنا مقصد زندگی مانتا ہوں ۔ گدا ہوں لیکن دل کے تخت پر شہنشاہ ہوں "۔ قسمت بیگ کی موثر 'مسلسل اور برجستہ تقریر سن کر بے اختیار مہاراج کی زبان سے نکلا "کیا تم تیموری شہزادے ہو ؟ "قسمت بیگ کو جوش آگیا اور اس نے کہا "شاہ زادہ نہیں ہوں ۔ آہ زادہ ہوں 'تیموری خاندان تو اب مٹ چکا جس نے باوجود انسان ہونے کے دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کی کوشش کی تھی ۔ آپ نہیں تو آپ کے باپ دادا تو اس کے غلام تھے ۔"

یہ فقرہ سن کر مہاراج نے سر جھکا لیا ۔

کچھ دیر کے بعد قسمت بیگ نے کہا "حضور! میں ان لوگوں میں نہیں ہوں ۔ جو ماضی پر فخر کریں یا افسوس کریں میں ماضی کا مالک ہوں 'حال کا مالک ہوں 'اور مستقبل کا بھی مالک ہوں ۔ یہ آسمان بھی میرا ہے یہ زمین بھی میری ہے ۔ یہ سمندر بھی میرا ہے ۔ اور آپ سب لوگ بھی میرے ہیں ۔" یہ کہتے کہتے قسمت بیگ نے اچھلنا شروع کیا ۔ اچھلتا جاتا تھا 'اور کہتا جاتا تھا ۔ "میں ہوں ۔ میں ہوں ۔ جو کچھ ہے جو کچھ تھا ۔ کچھ ہو کچھ نہیں ہے ۔ کچھ نہیں ہے ۔ میں ہوں ۔ میں ہوں ۔ میں ۔"

اس کے بعد قسمت بیگ نے کہا ۔ "اب سنئے مجھ لاچار خانساماں کی کہانی سنئے ۔"

"بہادر شاہ بادشاہ کا بیٹا ہوں ۔ میری ماں لونڈی تھی 'اور بادشاہ کی معتوب ۔ غدر ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں میری عمر دس سال کی تھی ۔ گھبراہٹ میں بادشاہ کو میرا اور میری ماں کا شاید خیال بھی نہ آیا ہو گا 'کیونکہ میری ماں لال قلعہ کے باہر ایک مکان میں رہتی تھیں ۔ جب دہلی کے باشندے بھاگے تو میری ماں نے مجھ کو اپنے ساتھ لیا اور پیدل گھر سے روانہ ہوئیں ۔ دہلی سے نکل کر ہم دونوں قدم شریف کی درگاہ میں گئے اور رات بھر ایک ٹوٹے ہوئے مکان میں چھپ کر بیٹھے رہے ۔ صبح ہندوستانی فوج کے سپاہیوں نے میری ماں کو گرفتار کر کے ایک انگریز افسر کے سامنے پیش کیا ۔ جس نے تمام حالات سن کر حکم دیا کہ ان دونوں کو آرام سے رکھا جائے ۔ چنانچہ ہم کو ایک چھوٹا سا خیمہ دے دیا گیا ۔ اور دو وقت کھانا ہم کو مل جاتا تھا ۔

امن ہوا ۔ تو میری والدہ کے نام دس روپے ماہوار گزارہ کے لئے مقرر کر دئے گئے ۔ میں نے دہلی ہی میں ایک خانساماں کی شاگردی کر لی اور جب میری والدہ کا انتقال ہو گیا تو میں دہلی سے بمبئی چلا آیا 'اور اب مدت سے تاج محل ہوٹل میں ہوں ۔"

مہاراج نے ایک ٹھنڈا سانس لیا ۔ انہوں نے اسے ایک ہزار روپے کا چیک لکھ کر دیا اور کہا ۔ "آئندہ بھی ہر سال ہوٹل کے منیجر کی معرفت ہزار روپے تم کو مل جایا کریں گے "۔ قسمت بیگ نے پھر سلام کیا اور چیک لے کر رونے لگا اور پیچھے قدم ہٹ کر باہر چلا آیا ۔

○

نیاز فتح پوری

نام : نیاز محمد خاں (والدہ کی طرف سے)
تاریخی نام : لیاقت علی خاں (والد کی طرف سے)
بہ مطابق تاریخ پیدائش: ۱۳۰۲ھ
قلمی نام : نیاز فتح پوری
پیدائش : ۱۸۸۴ء بہ مقام سنی گھاٹ ضلع بارہ بنکی، بھارت۔
وفات : ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء بہ مقام کراچی (سندھ) پاکستان۔
تعلیم : میٹرک، مدرسہ اسلامیہ فتح پور ۱۸۹۹ء

فتح پور ہسوہ میں ابتدائی تعلیم مولوی حبیب الدین سے اور بعد ازاں لکھنؤ میں مولوی صدیق حسن غازی پوری سے پائی۔ دس برس کی عمر میں ۹۳۔ ۱۸۹۳ء مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں داخل ہوئے۔ جہاں سے ۱۸۹۸ء میں انگریزی مڈل پاس کیا۔ اس اثنا میں دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ اور مدرسہ عالیہ رام پور میں تقریباً ڈیڑھ برس مولانا عرب محمد طیب اور مولانا ناور الحق خیر آبادی کی شاگردی کی۔ بعد ازاں مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

مختصر حالات زندگی:

نیاز کے والد محمد امیر خان پولیس انسپکٹر تھے۔ آبائی وطن فتح پور ہسوہ (یو۔پی) تھا۔ والد کے تبادلوں کے سبب بارہ بنکی، فتح پور، لکھنؤ اور رام پور میں بچپن اور لڑکپن گزرا۔ تاہم ۱۸۸۴ء تا ۱۹۰۴ء تقریباً "اکیس بائیس برس فتح پور میں قیام رہا۔ ۹۷۔ ۱۸۹۶ء میں جب والد صاحب ریٹائر ہوئے اور رام پور میں وکالت شروع کی تو نیاز بھی ان کے ساتھ رام پور میں رہے، جہاں سے واپسی پر فتح پور سے مڈل اور میٹرک کے امتحانات پاس کیے۔ ان دنوں شعر کہنے لگے تھے۔ نیاز نے ۱۹۰۰ء میں بطور سب انسپکٹر پولیس مراد آباد میں پولیس ٹریننگ لی۔ ۱۹۰۱ء میں بہ حیثیت سب انسپکٹر تھانہ ہنڈیا (الہ آباد) میں تعینات ہوئے اور ۱۹۰۲ء میں مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۵ء مدرسہ اسلامیہ (انگریزی شاخ) کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۷ء باونی اسٹیٹ (کدورا) میں نواب ریاض الحسن خاں کے زمانہ میں ہیڈ ماسٹر، کوتوال شہر اور پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۰۷ء تا ۱۹۰۸ء اجے گڑھ اسٹیٹ بند یلکھنڈ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ۱۹۰۸ء تا ۱۹۰۹ء اسکرا اسٹیٹ ہانسی (ضلع حسار) میں بہ حیثیت میونسپل سیکرٹری ملازمت کی۔ ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۰ء دوبارہ مدرسہ اسلامیہ سے منسلک رہے۔ ۱۹۱۰ء میں اخبار "زمیندار" کے عملے میں چلے گئے۔ ۱۹۱۱ء میں ایک بار پھر ہانسی (ضلع حسار) میں میونسپل سیکرٹری کے طور پر کام کیا اور ہفتہ وار "توحید" کے معاون مدیر رہے۔ ۱۹۱۲ء میں تیسری بار مدرسہ اسلامیہ کے تدریسی عملے میں شامل ہو گئے، جہاں ۱۹۱۴ء تک کام کیا۔ اس کے بعد دلی چلے گئے اور حکیم محمد اجمل خاں کے قائم کردہ انگریزی اسکول کے نگران مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۲ء بھوپال میں رہے ۱۹۱۹ء میں اخبار "رعیت" کے مدیر اعلیٰ تھے۔ ۱۹۲۷ء تا ۱۹۶۲ء لکھنؤ میں قیام رہا۔ ۱۹۶۲ء میں پاکستان ہجرت کر آئے اور ۳۱ جولائی ۱۹۶۲ء تا وفات کراچی (پاکستان) میں قیام رہا۔ نیاز صاحب نے تین شادیاں کیں۔ پہلی شادی ۱۹۰۱ء میں بہ عمر سترہ سال، الہ آباد میں ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۲۴ء میں دوسری شادی بہ مقام لکھنؤ مختار بیگم سے ہوئی

۱۹۴۷ء میں مختار بیگم کا انتقال ہوا تو اسی سال مرحومہ کی چھوٹی بہن گلزار بیگم بنت محمد ولایت خاں سے لکھنؤ میں تیسری شادی ہوئی۔ فروری ۱۹۲۲ء میں ل۔ احمد کی تحریک پر آگرہ سے اپنا ادبی ماہنامہ "نگار" جاری کیا یہ پرچہ دسمبر ۱۹۲۲ء تک آگرہ سے، جنوری ۱۹۲۳ء تا جون ۱۹۲۷ء بھوپال سے، اور جولائی ۱۹۲۷ء تا جولائی ۱۹۶۲ء لکھنؤ سے نکلتا رہا۔ اگست ۱۹۶۲ء سے مئی ۱۹۶۶ء تک کراچی سے یہ پرچہ "نگار پاکستان" کے نام سے جاری رکھا۔ "نگار" کے اجراء سے قبل نیاز کی تحریریں "انتخاب لاجواب" لاہور، "صدائے عام" دہلی، "زمیندار" لاہور، "صوفی" امرتسر، "رعیت" میرٹھ، "خطیب" دہلی، "الہلال" کلکتہ، "تمدن" دہلی اور "نقاد" آگرہ میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۶۶ء کے آغاز پر معلوم ہوا ہے کہ نیاز سرطان کے مرض میں مبتلا ہیں، اس موذی مرض نے ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء تک مہلت دی۔

اولین تحریریں:

ابتدائی مضامین (۱۹۱۰ء تا ۱۹۲۰ء) "انتخاب لاجواب" لاہور، "صدائے عام" دہلی، "تمدن" دہلی اور "نقاد" آگرہ میں شائع ہوئے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر" مطبوعہ: "نقاد" آگرہ "تمدن" دہلی جنوری ۱۹۱۳ء
بقول نیاز، یہ افسانہ نمائش الہ آباد سے متاثر ہو کر ۱۹۱۰ء میں قلم بند کیا گیا تھا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "ایک شاعر کا انجام" (طویل مختصر افسانہ) — مساوات پریس، الہ آباد، — طبع اول: ۱۹۱۳ء
طبع دوم: نگار بک ایجنسی، لکھنؤ: ۱۹۲۹ء
طبع سوم: عبدالحق اکیڈمی، حیدر آباد دکن

۲۔ "نگارستان" (افسانے، مضامین) — صدیق بکڈپو، لکھنؤ، — طبع اول: س۔ ن

۳۔ "شباب اٹھ جانے کے بعد" (افسانے) — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ، — طبع: اول ۱۹۳۲ء

۴۔ "جمالستان" (افسانے) — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ، — طبع اول: ۱۹۳۳ء

۵۔ "حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے" (افسانے) — زاویہ ادبیہ، حیدر آباد دکن، — طبع اول: س۔ ن
یہ مجموعہ بعد میں "تاریخ کے گمشدہ اوراق" کے نام سے شائع ہوا۔

۶۔ "مختارات نیاز" (افسانے، مضامین) دہلی — طبع اول: س۔ ن
یہ مجموعہ ۱۹۳۹ء سے قبل شائع ہوا، اس میں ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۹ء تک کی تحریریں ہیں، جن میں سے بیشتر ترجمہ کردہ ہیں۔

۷۔ "شباب کی سرگزشت" (طویل مختصر افسانہ) — صدیق بک ڈپو، لکھنؤ، — طبع اول: س۔ ن
یہ کتاب ۱۹۳۹ء سے قبل شائع ہوئی۔ صدیق بک ڈپو نے ۱۹۴۳ء میں دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔

۸۔ "شبستان کا قطرۂ گوہریں" (طویل مختصر افسانہ) آخری بار یہ کتاب ادارہ ادب العالیہ، کراچی نے شائع کی۔

۹۔ "قربان گاہ حسن" (ارض بابل کا ایک تاریخی طویل مختصر افسانہ) — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۱۰۔ "کیوپڈ اینڈ سائکی" (طویل مختصر افسانہ) — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۱۱۔ "صحابیات" (سوانحی مضامین) — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۱۲۔ "المسئلۃ الشرقیۃ" — از مصطفیٰ کمال پاشا کا ترجمہ — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

یہ سیاسیات اسلامی سے متعلق کتاب کا عربی سے ترجمہ ہے۔

۱۳۔ "فلاسفہ قدیم کی روحوں کا اجتماع"

۱۴۔ "مکتوبات نیاز" (تین جلدیں) — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۱۵۔ "جذبات بھاشا" (مضامین) — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۱۶۔ "ترغیبات جنسی" (جنسیات، نفسیات) — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۱۷۔ "مجموعہ استفسارات و جوابات" (تین جلدیں) پہلی جلد — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ — طبع اول: ۱۹۳۴ء

دوسری، تیسری جلد — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ — طبع اول: ۱۹۳۶ء

۱۸۔ "انتقادیات" (تین جلدیں، مضامین) — عبدالحق اکیڈمی، حیدر آباد دکن

۱۹۔ "مذہب" (مذہبیات) — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ

۲۰۔ "مالہ و ماعلیہ" — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ

۲۱۔ "کہکشاں کا ایک سانحہ" — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ

۲۲۔ "اصحاب کہف" (تاریخ، سوانحی اشارے) — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ

۲۳۔ "جھانسی کی رانی" (سوانح)

۲۴۔ "چند گھنٹے علمائے کرام کی روحوں کے ساتھ" (تاریخ، خاکے)

۲۵۔ "مارمین کا مذہب" (مذہبیات، فلسفہ)

۲۶۔ "مشکلات غالب" (تنقید)

۲۷۔ "مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ" (فلسفہ، مذہبیات)

۲۸۔ "تاریخ الدولتین" از جرجی زیدان کا عربی سے ترجمہ (تاریخ اسلام) جامعہ ملیہ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

۲۹۔ "عرض نغمہ" از رابندر ناتھ ٹیگور کا ترجمہ المعروف "گیت انجلی"

۳۰۔ "فراست الید" (علم نجوم) — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ — طبع اول: س۔ن

۳۱۔ "مذاکرات نیاز" (۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۹ء کے مضامین) — آزاد بک ڈپو، دہلی — طبع: س۔ن

یہ کتاب ۱۹۳۹ء سے قبل شائع ہوئی۔

۳۲۔ "مطالعات نیاز" — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ

۳۳۔ "من و یزداں" (فلسفہ، مذہبیات) دو جلدیں۔

۳۴۔ "گہوارہ تمدن" (سماجیات) — ناشر۔ مولوی قمرالحسن، نور محل، بھوپال، طبع اول: ۱۹۲۲ء سے قبل

۳۵۔ "نقش ہائے رنگا رنگ"

۳۶۔ "محمد بن قاسم سے بابر تک" (تاریخ، سماجیات)

۳۷۔ "اسلامی ہند" (تاریخ بھارت)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ،	طبع اول: س۔ن
۳۸۔ "توقیت" (تاریخ)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ،	طبع اول: س۔ن
۳۹۔ "مریخی سیاح کی ڈائری" (مضمون)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ،	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

یہ مضمون ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا۔ اس کا مقصد ہوم رول کی تحریک کو مسلمانوں کے لیے مضر ثابت کرنا تھا۔

۴۰۔ "صدا بصحرا" (قومی نظم)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ،	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۴۱۔ "علماء قدیم" (تین مقالات)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ،	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۴۲۔ "حرکت کے کرشمے" (تین مقالات)	نگار بک ایجنسی، لکھنؤ،	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۴۳۔ "قمرزمانی بیگم (سوانح)	مطبوعہ: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی،	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

نوٹ: "نیاز فتح پوری پر ایک نظر" از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ: سالنامہ "نگار پاکستان" کراچی، ۱۹۶۳ء میں فراہم کردہ فہرست کتب میں کئی مطبوعہ کتب کے نام شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔

غیرمدون:

لاتعداد علمی و ادبی مضامین اور تبصرے۔ نیاز کے تحریر کردہ "نگار" کے خاص نمبر، جن کی اہمیت باقاعدہ مطبوعہ کتب کی سی ہے:

(۱) "ملاحظات نمبر" جنوری ۱۹۳۶ء
(۲) "ڈرامہ اصحاب کہف نمبر" جنوری ۱۹۳۷ء
(۳) "قرآن نمبر" جنوری ۱۹۴۵ء
(۴) "پاکستان نمبر" جنوری ۱۹۴۸ء
(۵) "ایک مستقبل کی تلاش نمبر" (نصف حصہ) جنوری ۱۹۵۱ء
(۶) "فرمانروایان اسلام نمبر" جنوری ۱۹۵۴ء
(۷) "علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر" جنوری ۱۹۵۵ء
(۸) "معلومات نمبر" جنوری ۱۹۵۸ء
(۹) "تنقیح اسلام نمبر" جنوری ۱۹۵۹ء
(۱۰) "غالب نمبر" جنوری ۱۹۶۱ء

اعزاز

۱۔ "پدم بھوشن" حکومت ہند کا اعلیٰ ترین سول اعزاز ۱۹۶۲ء

نظریہ فن:

سب سے زیادہ عجیب و غریب بات (جو غالباً "اصول افسانہ نگاری کے بالکل خلاف ہے) میں اپنے اندر یہ پاتا ہوں کہ آج تک میں نے کوئی افسانہ پلاٹ متعین کر کے لکھا ہی نہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات تو میں اس سے بھی بے خبر ہوتا ہوں کہ "زیر تحریر" لفظ کے آگے دوسرا لفظ مجھے کیا لکھنا ہے، لیکن چونکہ اکثر و بیشتر میرے افسانوں کا آغاز "تجزیہ سیرت" (CHARACTER ISATION) سے ہوتا ہے اس لئے ابتداء ہی میں کچھ ہلکے سے نقوش دماغ میں ایسے ضرور پیدا ہو جاتے ہیں جو پلاٹ کی تخلیق میں غیرارادی طور پر معاون ہوتے رہتے ہیں۔"

نیاز فتح پوری

(بہ حوالہ: "میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں" مرتبہ: حکیم یوسف حسن، دارالادب پنجاب بارود خانہ، لاہور: طبع اول: س۔ن)

نیاز فتح پوری

کیوپڈ و سائکی

یوں تو یونان کے عہد زریں کا ذرہ ذرہ بجائے خود اک حسن آباد تھا، لیکن سائکی کے شباب نے جس رعنائی جمال کا نمونہ پیش کیا وہ حقیقتاً "عورت کی دنیا" میں ایک سحر تھا، ایک اعجاز تھا۔

حسن کی نسبت بہترین شاعرانہ تخیلات کے زیر اثر ایک ماہر کوئی ایسی تصویر نہیں پیش کر سکتا تھا، جسے سائکی کے حسن عالم افروز سے کوئی نسبت دی جا سکتی، پھر یہ خدا کی شان ہے کہ علاوہ سائکی کے رئیس یونان کی دو بیٹیاں اور بھی تھیں، لیکن جب رات کو شاہی باغ کے صحن اور اس کے کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی، تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج سائکی باغ میں نقاب الٹ الٹ کر پھول توڑ رہی ہے۔

انگارس و کیوپڈس بھی غیر معمولی حسین تھیں، اور اگر قدرت کے پاس اک آخری نقش حسن و شباب (سائکی) اور نہ ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ یہ دونوں بہنیں بھی وہ چیز تھیں، کہ دنیا انہیں کے لیے ترستی، انہیں کے لیے تڑپتی، اس لیے وہ اگر اپنی چھوٹی بہن سے خوش نہ تھیں، تو جائے عجب نہیں تاہم چونکہ ان کی شادی ہونے والی تھی، اس لیے وہ اپنی تسلی اپنے انتقام کی تسکین اس خیال سے کر لیتی تھیں کہ ہر چند سائکی زیادہ حسین، سہی، مگر کم از کم وہ ان لذات سے تو ابھی آشنا نہیں ہو سکتی جن سے ہماری راتیں بہت جلد لبریز ہونے والی ہیں۔ "کیا واقعی سائکی کی زندگی میں کوئی رات نہ تھی؟" اب رئیس یونان کے پیش نظر صرف یہی اک فکر تھی، جس میں وہ شب و روز مستغرق رہتا، دنیا کے ہر گوشہ سے شادی کے پیغام آئے، خدا جانے کتنے شاہزادوں کی تصویریں مختلف سلطنتوں سے آئیں اور اگر ہم اس میں ان لوگوں کا بھی شمار کر لیں جو سائکی کی مواصلت کی صرف آرزو اپنے دلوں میں لیے ہوئے تھے اور زبان تک نہیں لا سکتے تھے تو اس پیدا و پنہاں پروانوں کے ہجوم کا کوئی شمار ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آئی کہ سائکی کے لیے کوئی بر کس طرح منتخب کیا جائے۔

اب سائکی کوئی بچہ تو تھی نہیں کہ اس کو برے بھلے یا اپنی طبیعت کے میلان کی تمیز نہ ہوتی وہ تو اب پوری جوان تھی اور اس لیے انتخاب شوہر کی حس، جو عورت کی جوانی کی تنہا حس ہے اس میں بدرجہ واتم موجود تھی اول تو بہت سی تصویریں اس کے سامنے پیش ہی نہ کی جاتی تھیں اور جو اسے دکھائی بھی جاتی تھیں، تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دفعہ تصویر پر نگاہ ڈالتے ہی لانے والے کو نہایت غور سے از سرتاپا دیکھ لیتی۔ ہاں اسے غرور تھا، اپنے حسن پر ناز تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس نے تصویر کی پشت پر لکھوا دیا کہ "اگر یہ انسان ہے تو مجھے انسان کی ضرورت نہیں۔" مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ اس فقرے سے اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک سچی پیشن گوئی کر رہی تھی۔

وہ خوب جانتی تھی کہ اس کے باپ کو کیا فکر لاحق ہے اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ ہر دنیا کے گوشہ میں اس کے حسن کے پرستار موجود ہیں تو اس کی زندگی میں بڑا پیارا انقلاب پیدا ہو گیا۔

وہ کسی شاعر کی بہترین تصویر اٹھا لیتی اور جذبات حسن و عشق میں یہاں تک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی، بارہا ایسا ہوتا کہ جب کتاب دیکھتے دیکھتے اسی حالت انہماک میں اس کی نگاہ کسی پھول پر پڑ جاتی تو وہ خدا جانے کیوں شرما جاتی اور پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتی غرض کہ اس کی تنہائی کی کوئی ایسی گھڑی نہ تھی خلوت کی کوئی ساعت ایسی نہ تھی جسے وہ اپنے حسن سے معمور نہ پاتی ہو، اور اس کا کوئی تخیل

ایسانہ تھا جو شرم و حجاب پر ختم نہ ہوتا ہو' اور چونکہ قریب قریب نصف حصہ اس کے اوقات کا اسی تخیل میں گزرتا تھا یا پھر ایسے کھیلوں میں' جن میں وہ خود کسی کو ڈھونڈھتا' یا اپنے تئیں ڈھونڈھا جانا پسند کرتی (یہاں تک کہ بعض دفعہ جب وہ اکیلی ہوتی تو مسندی کی بھول بھلیاں میں گھس جاتی اور آپ اپنی تلاش کرنے لگتی) اس لیے ہم کہ سکتے ہیں کہ ساگی نصف عورت تھی اور نصف انفعال و جستجو۔

دن گزر گئے' یہاں تک کہ ساگی کا شباب' سرور سے سکر' اور سکر سے سرشاریت کی حد تک پہنچ گیا' لیکن اس وقت تک کوئی فیصلہ انتخاب شوہر کے متعلق نہ ہو سکا۔

چاندنی رات تھی اور چاندنی بھی موسم بہار کی اور موسم بہار بھی یونان کا جس کی زمین کے نسبت فرش گل کا تخیل ادنیٰ ترین تخیل ہے۔ ساگی اپنے باغ کے ایک کنج میں جو نسبتاً زیادہ تاریک تھا بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سے جسے وہ صرف ایک طویل دن کہہ سکتی تھی' یہاں تک سیر ہو گئی تھی کہ اکثر تاریک مقامات میں وقت صرف کرنا پسند کرتی تھی۔ مگر وہ یہ دیکھ کر کیسی گھبراتی کہ ہر تاریکی اس کے لیے روشنی ہے اور اس کی ہر رات چاندنی' وہ کنج میں فرش سبزہ پر بیٹھی ہوئی ہنکریوں کے ڈھیر کو ایک ہاتھ سے منتشر کرتی جاتی تھی اور پتوں اور نازک شاخوں سے چھن چھن کر آنے والی کمزور شعاعوں کو دیکھ دیکھ کر گردن اٹھائے ہوئے اپنے ہی تصنیف کیے ہوئے شعر آہستہ آہستہ گن گنا رہی تھی' اپنا درد کہہ رہی تھی' شکایتیں کر رہی تھی کہ۔

"اے چاندنی تو تو آسمان کی ساگی ہے' آسمان ہی میں رہ' دنیا کو تیری ضرورت نہیں کہ وہ پہلے ہی ایک ساگی سے بیزار ہے' زمین جس میں اب مرد کی جنس پیدا ہونی بند ہو گئی ہے سنسان ہے۔ لیکن نہیں تو مجھے پتا بتا تو تو روز یہاں آ کے ڈھونڈھ جاتی ہے۔ میں بھی تیرا ملک دیکھوں گی' شاید میری راتیں وہیں چھپی ہوں۔ چراغ کی طرف پتنگا بیتابانہ آتا ہے میں اسے پکڑ لیتی ہوں اور گھنٹوں دیکھا کرتی ہوں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ کلی پر بیٹھنے سے پہلے بھنورے کو گرفتار کر لوں۔ تو ہنسے گی کہ میں نے اپنے مکان سے شمعیں اٹھوا دیں' اپنے باغ سے کلیاں نکلوا دیں' کہ جب شمع نہ ہوگی تو پتنگے کیا کریں گے' کلیاں نہ ہوں گی تو بھنورے کہاں جائیں گے۔ لیکن تجھے یقین دلاتی ہوں کہ اگر رات کو میری انگلیوں کے سرے چراغ کی لویں ہیں تو دن کو وہ چمپا کی کلیاں ہیں۔ میری گردن جس پر ہرنوں کی گردنیں فدا ہیں' ڈھلی جاتی ہے' میری وہ آنکھ جس پر جنگلی گایوں کی آنکھیں قربان ہیں' رونا چاہتی ہے' میرا وہ چہرہ جس پر اے چاندنی' ہر نقاب تیرا ہی ایک ٹکڑا نظر آتا ہے' افسردہ ہے کیونکہ دنیا میں کوئی مصور ایسا نہیں ہے جو میرے بعد میرا یادگار حسن باقی رکھے' کوئی شاعر ایسا نہیں جو میری تمناؤں کو لکھ سکے' اور کوئی مغنی ایسا نہیں جس کے رباب کے تار میری تعریف میں کانپ سکیں۔ پھر اے آسمان کی ساگی' تو ہی بتا کہ ایسا شخص جو نور کی تصویر بنا سکے' جو سمندر کو لکھ سکے' جو نکہت کو گا سکے' کہاں ملے گا۔"

ساگی جیسی حسین و جمیل تھی ویسی ہی لطیف الخیال شاعرہ اور نازک دست مصورہ بھی تھی' اور اس لیے وہ قدرتاً اس بات کی خواہشمند تھی کہ ویسا ہی حسین' اسی درجہ کا شاعرانہ مزاج رکھنے والا اور ویسا ہی بے مثل نقاش اس کی زندگی کا ہمدم ہو۔ وہ دیر تک اپنے بنائے گیت گاتی رہی اور بربط بجایا کی' یہاں تک کہ وہ خستہ سی ہو گی اور اس نے ایک آخری ضرب کے ساتھ جس سے تار کچھ دیر گونجا کیے۔ بربط کو پھینک دیا' گویا وہ اس سے بھی بیزار ہو گئی تھی اس نے چاندنی میں ایک جمائی لی' اور پھر انگڑائی لیتی ہوئی وہیں لیٹ گئی وہ اب سونا چاہتی تھی' یعنی اس کی شرابی آنکھیں جو یوں بھی ہمیشہ نیم خواب ہی رہتی تھیں' اب بالکل سو جانا چاہتی تھیں..... ساری فضا سو رہی تھی' آسمان و زمین سو رہے تھے' وہ شاہراہ زریں جس پر چاند کی شعاعیں ایک مستقل خاموشی کے ساتھ چڑھ اتر رہی تھیں' سو رہی تھی مگر سکوت خواب تو اس خوش نصیب کنج کا تھا جو بیہوش ساگی کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے سو رہا تھا۔

آہ' اس حالت کو نیچر گھنٹوں تک دیکھتا رہا!

پایان کار چڑیوں کی شیریں نغمہ سنجی شروع ہو گئی - یعنی صبح جاگی ' ہر شاخ پھول ہی پھول ہو گئی یعنی کلیاں جاگ اٹھیں - سا گی اٹھی اور کنج بھی اپنے مجسم آباد میں جاگ اٹھا ' وہ یہاں حقیقتاً سونے نہیں آئی تھی ' اور نہ اس کو یہ گمان تھا کہ وہ اس قدر جلد اور دیر تک یہاں سوتی رہے گی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس کی نزاکت موسیقی کا بار نہ اٹھا سکی ' جس کے ہر اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس کا شباب صرف ہوتا تھا - گیت کے بول جن میں اس کے سارے حسیات لطیفہ کی قوت گھٹتی جاتی تھی اس کو بہت جلد خستہ کر دینے والے ثابت ہوئے چنانچہ وہ سو گئی اور انھیں تمناؤں ' شکایتوں اور بیزاریوں کو اپنے دماغ میں لیے ہوئے سو گئی ' جن میں اس کے اجزائے روح گھل گھل کر مل رہے تھے - ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی پیاری پیاری آنکھوں نے بند ہونے پر کیا کیا دیکھا مگر ہاں جب وہ اٹھی تو اس کے اعضا دکھ رہے تھے ' اس کا سارا بدن خستگی سے چور ہو رہا تھا ' اس نے ہاتھ الٹ کر اپنی پیشانی کو چھوا اور پھر اپنے بازوؤں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ایک آدھ دفعہ بل دیا اور اپنے منتشر بالوں کو سمیٹتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ کنج سے نکل کر روش پر ہو لی۔

چھریرا بدن ہو اور نازک کمر ' تو رفتار میں لوچ کا پیدا ہونا ضروری ہے ' لیکن اگر رفتار کی لچک کوئی مستقل چیز ہے اگر سبک خرامی صرف کشیدہ قامتی کی صفت لازم نہیں ' بلکہ ایک جدا حسن ہے ' تو ہم کہ سکتے ہیں کہ وہ حسن صرف سا گی کی رفتار کو دیکھ کر سمجھ میں آ سکتا تھا - نغمہ کا کوئی نقش نہیں ' مگر ہوا اس سے معمور ہے ' بھنبھیری اڑ کر نکل گئی ' مگر اس کی لچک اور سبک پرواز اب بھی نگاہ میں تھرتھرا رہی ہے - سا گی کنجوں میں غائب ہو گئی ' لیکن اس کی رفتار کا ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے - وہ دبے پاؤں اپنی خواب گاہ میں پہنچی اور اپنی سیج پر گر پڑی ' اس نے سمجھا کہ بدن کا درد ' اعضا کی دکھن ' عدم آسودگی خواب کی وجہ سے ہے ' اور اس نے چاہا کہ پھر سو جاؤں ' لیکن وہ ابھی کروٹیں ہی لے رہی تھی ' کہ نسرین جو سا گی کی محبوب مطربہ تھی ہاتھ میں اپنا زریں بربط لیے ہوئے آئی اور پائیں کی طرف فرش پر بیٹھ گئی - اس نے بربط کے تار اپنی نازک انگلیوں سے درست کیے اور یہ دیکھ کر کہ شاہزادی کی رات شاید کرب میں گزری ہے ' اور وہ ابھی سونا چاہتی ہے ' اس نے افسوں خواب نہایت ہی نرم و شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا۔

"اے نیند آ ' اور گھنی پلکوں کو پھر ملا دے کہ ابھی ان میں کچھ نشہ باقی ہے ' اے نیند آ ' اور انکھڑیوں کو پھر بند کر دے کہ ابھی ان میں کچھ خمار ہے ' والئی یونان کی بیٹی کو افشردہ انگور کی ضرورت نہیں ' اس کا شباب خود شراب ہے ' میں نے چاندنی راتوں میں صحن باغ کے اندر سے اسے ٹہلتے دیکھا ہے ' اور اگر کسی رات وہ مجھ سے چھپ کر چلی گئی ہے تو صبح کو میں نے روشوں پر سے اس کے نشانات قدم اپنے ہاتھ سے مٹائے ہیں کہ کوئی اس کی لغزش رفتار نہ پہچان لے - اے نیند آ جا ' کہ ابھی سورج کی کرنیں ارغوانی بھی نہیں ہوئیں - سا گی کروٹیں لے رہی ہے ' اس کا بدن شاید دکھ رہا ہے ' رات کی شراب ابھی اچھی طرح آسودہ۔۔۔"

"نسرین خاموش - افسوں خواب کو ختم کر کہ میرا جی گھبراتا ہے - "

اب سا گی اٹھ بیٹھی تھی اور پیشانی پر ایک نازک شکن ' ایک ننھی سی موج بلوریں ' ڈالے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی ' آخر کار اس نے چونک کر نسرین کے ہاتھ سے بربط لے لیا اور یوں ہی بغیر کسی نظام و اصول کے اپنی انگلیاں تاروں پر آہستہ آہستہ چلانے لگی - نسرین خاموش مودب کھڑی ہوئی سا گی کی اس خلاف معمول بدمزگی سے ڈر رہی تھی ' یہ حالت اتنی دیر تک قائم رہی کہ آفتاب اچھی طرح نکل آیا اور تمام کنیزیں تعمیل احکام اور ضروریات صبح کے متعلق اپنے اپنے فرائض ادا کرنے حاضر ہو گئیں - لیکن سا گی نے ان کو فوراً رخصت کر دیا اور نسرین کو قریب بلا کر اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولی:

"اے نسرین آج تو ایسی بات اپنے منہ سے نہ نکال - جس پر کل تجھے افسوس کرنا پڑے۔ تیرے نغموں نے ہمیشہ میری روح کو مسرت پہنچائی ' لیکن اس وقت سے ڈر ' جب مجھے ان سے تکلیف پیدا ہونے لگے - کچھ ایسی باتیں کر کہ میرے بھولے ہوئے دن میرے سامنے آ جائیں ' تو مجھے سلانا چاہتی ہے تو میری ان راتوں کا ذکر نہ کر جن میں دیوانہ وار پھرتی

رہتی ہوں' تو تو مجھے لوریاں سنا کہ میں اپنی اس زندگی کو بھول جاؤں جس کا بار میرے لیے ناقابل برداشت ہے اور پھر ایک دفعہ بچہ بن جاؤں۔

اگر میری پلکیں نشہ آلود اور میری آنکھیں خمار آگیں ہیں تو کیا؟ اگر یونان کی بچی کا شباب عروج صہبا ہے تو کیا؟ کیونکہ اسے خود نہیں معلوم کہ اس میں کیا لذت پنہاں ہے میری زندگی تو اک ایسی صدا ہے' جو صحرا کی وسعت میں گم ہو جائے۔ پھول اگر اپنی نکہت سے آپ فائدہ اٹھا سکتا ہے' اگر کل اپنی رعنائی پر خود فریفتہ ہو سکتی ہے تو تو ہزار دفعہ وہی گا۔ جو ابھی گائی' ورنہ اپنے بربط کے تار توڑ ڈال' طربیں اتار دے' نغموں کو بھول جا' اور اپنا ساز کسی کونہ میں پھینک کر آ' اور میرے ساتھ کراہ۔"

قبل اس کے سائکی اپنی گفتگو ختم کرتی' وہی دونوں کنیزیں جن کو سب سے پہلے حکم دیا گیا تھا آئیں اور سائکی نسرین کو مبہوت و متحیر چھوڑ کر ان کے ساتھ چل دی۔

سائکی غسل سے فارغ ہو کر حمام سے نکلی اور نگاہ کی طرح فوراً آئینہ خانہ میں داخل ہو گئی۔ آج اس کی سترھویں سالگرہ تھی اور اسے حسب رواج دربار میں شریک ہونا تھا۔ ملک کے تمام شعرا' شاہزادے' سفیر' مغنی' سبھی موجود تھے۔ اور دربار میں سائکی کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ شام کو سائکی کتاں کی آسمانی رنگ کی چادر میں اپنا بدن چھپائے اور اسی رنگ کا ہلکا نقاب اپنے چہرہ پر ڈالے ہوئے برآمد ہوئی۔

سب گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے اور سائکی اپنی جگہ پر جو بہت مرتفع تھی' کنیزوں کے حلقہ میں بیٹھ گئی۔

اس کے بعد رسم نذر شروع ہوئی۔ ہر شخص جو بڑھتا تھا اس کے ایک ہاتھ میں ہار ہوتے تھے اور دوسرے میں وہ چیز جو نذر کے لیے مخصوص تھی۔ پہلے اس کے قدموں پر پھولوں کو ڈال دیتا تھا اور پھر نذر پیش کرتا تھا' چنانچہ تھوڑی دیر میں سائکی کے پیروں پر موسم بہار کی بہترین پیداوار اور صناعت انسانی کے نازک و لطیف ترین ہدایا کا انبار لگ گیا۔ شعرا نے اپنے قصائد شروع کیے مغنیوں نے اپنے ساز درست کیے یہاں تک کہ اختتام دربار کا وقت قریب آگیا۔ جس کے لیے ہر دل تڑپ رہا تھا اور جس ایک لمحہ کے لیے یہ سارے تکلفات تمہیدی برداشت کیے گئے تھے۔ یہ دستور تھا کہ جب دربار سالگرہ ختم ہو جاتا تو ان ہدایا کی پذیرائی میں سائکی کو ایک لمحہ کے لیے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دینا پڑتی تھی اور غالباً اس برق پاش رسم کا یہ اثر تھا کہ تمام عالم میں سائکی کی غائبانہ پرستش ہو رہی تھی اور ساری دنیا اس جلوہ عریاں کے لیے بے تاب نظر آتی تھی۔

سنا ہے کہ جس وقت سائکی پورے بارہ برس کی ہو گئی اور اول دربار میں نقاب پوش ہو کر آئی تو اس قدر ہجوم نہ تھا لیکن اس کے بعد جب اس کے بے نقاب ہونے کی خبر منتشر ہوئی تو ہر سال لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو تا گیا۔ یہاں تک کہ جب پانزدہ سالہ سائکی کی سالگرہ ہوئی تو تمام اقطاع عالم میں اس کے حسن کی آگ مشتعل ہو چکی تھی اور اس سال جب کہ اس کا شباب پورے سترہ سال کا تھا اتنا کثیر ہجوم ہوا کہ شاید سر زمین یونان نے اس سے قبل اتنے پروانوں کا ہجوم کبھی نہ دیکھا ہو گا' غرضکہ وہ ساعت آئی۔ جب سائکی کو بے نقاب ہونا تھا۔ یوں تو جب تک وہ وقت نہیں آیا تھا ہر شخص ایک مستقل اضطرار ایک نمایاں بے چینی بنا ہوا تھا' لیکن جب وہ وقت آیا اور نقیبوں نے اس ساعت کا اعلان کیا تو اتنے بڑے مجمع میں کوئی حرکت' کوئی صدا' اثر حیات کا پتہ دینے والی نہ تھی' لب باہم وصل ہو کر رہ گئے تھے اور آنکھوں نے جھپکنا ترک کر دیا تھا۔

آخر کار سائکی اٹھی اور اپنی بلوریں نازک انگلیوں سے نقاب کے دونوں سرے ایک جھٹکے سے سر کے اوپر کر لیے اور اپنے سحر حسن سے سب کو کم از کم ایک گھنٹہ کے لیے پتھر کا بنا کے چل دی۔

(۲)

اگر وینس (زہرہ) کو اپنے حسن و جمال پر ناز تھا' تو بے جا ناز نہ تھا' کیونکہ سارا آسمان اور تمام آسمان والے اس بات کو مان چکے تھے کہ وینس سا حسین ہونا' گویا خدا ہونا ہے اور معلوم نہیں یونان والوں کو یہ آسمانی عقیدہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ انہوں نے بھی وینس کو دیوی مان کر اس کی پرستش شروع کر دی' بت تراشوں نے اس کے مجسمے تیار کیے' مصوروں نے اس کی تصویریں بنائیں' شعرا نے اس کے حسن کی تعریف میں قصائد کہے اور مغنیوں نے اس کے ترانہ ہائے جمال سے دنیا کو مبہوت و متحیر کرنا چاہا۔ مگر یہ پرستاران حسن (خدا یونان والوں کی روحوں کو خوش رکھے) کچھ اس سے بھی زیادہ وسیع جذبات رکھتے تھے اور اس لیے آخر کار انہیں منہ کے بل اس کے سامنے گر کر کہنا پڑا کہ "اے ملکہ حسن تیرے مجسمے باوصف اس کے کہ ملک کے بہترین نقاشوں کے دماغوں نے اپنی بہت سی راتیں ان کی تیاری میں جاگ کر کاٹ دی ہیں' نادرست ہیں' ہمارے قصائد جن میں حسن کی نسبت لطیف ترین تخیلات کو پیش نظر رکھ کر تیری تعریف کی گئی ہے' ناکمل ہیں اور ہمارے راگ جن کو ہم اپنے بہترین سازوں کے ذریعہ سے اک ترانہ عبودیت کی صورت میں تیرے آستانہ جمال تک پہنچانا چاہتے ہیں' کمزور ناقص ہیں' پھر اے تو' کہ حسن سے بھی بلند کوئی چیز ہے' اے تو وہ کہ ہمارے خیال کی پرواز تیرے سامنے ایک مرغ پر شکستہ سے زیادہ نہیں ہمیں یہ نہ بتا کہ تو کیا ہے بلکہ ہمیں یہ دکھا کہ تو کیسی ہے!" ۔۔۔ یہ تھے دنیا کے خیالات وینس کے حسن کی نسبت اور یہ تھا اک عام بے چینی و وارفتگی کا حال۔

وہ زہرہ جو آج سے ہزاروں سال پیشتر یونانیوں کے سامنے جو سما میں چمکتی تھی' آج بھی شاید اسی انداز سے درخشاں ہے' لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اسے حسن کی دیوی سمجھتے تھے' اور ہم ایک کرہ غیر آباد یقین کرتے ہیں سو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں وہ آباد رہا ہو اور وینس وہاں کی ملکہ ہو' اور اگر نہیں ہو سکتا تو بھی ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ اس وقت اس ملک کی حکمراں ایک حسین و جمیل عورت تھی' جو ہر چند طبقہ انسان سے نہ تھی' مگر طبقہ انسان میں اس کا ذکر ضرور تھا اور اس نے آسمان میں وہی زمانہ پایا تھا جو سافو نے زمین میں۔

اسی زمانے میں ایک دن کا واقعہ ہے (ہم دن کہتے ہیں' مگر ہمیں معلوم نہیں کہ اس ملک میں دن رات کا کوئی مفہوم تھا بھی یا نہیں) بہرحال ایک جزو زمانہ کا واقعہ ہے' وینس اپنے کاشانہ بلور میں بیٹھی ہوئی کنیزوں کا تماشہ غسل دیکھ رہی تھی اور نہایت مسرور تھی' ایک بلوریں حوض جس کی تہہ اور دیواریں صیقل کیے ہوئے آئینہ کی تھیں' نہایت شفاف پانی سے لبریز تھا اور ان میں کنیز پریاں برہنہ نہا رہی' اور آپس میں کھیل رہی تھیں چونکہ وینس خود سمندر کے کف سے پیدا ہوئی تھی اس لیے وہ فطرتاً عریانی پسند تھی اور اس کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی تھا' غرضکہ وہ اپنی نوجوان کنیزوں کی اس جدوجہد کا تماشہ نہایت انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ ایک کنیز نے باہر سے آکر کسی کے آنے کی اطلاع دی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

اروش' وینس کے ملک کی مشہور سیاح اور شہرت کی دیوی' جو اس سے قبل کئی بار کرہ ارض کا سفر کر چکی تھی اور وینس کے بہت مقرب درباریوں میں تھی' وینس سے ملنے آئی تھی' وینس پہنچی اور نہایت تپاک سے پذیرائی کر کے اس کی نئی سیاحت دنیا کے متعلق پوچھنے لگی لیکن اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے وینس' میرے حالات سیاحت کے تمام جزئیات سے آگاہ ہونے کی خواہش نہ کر' کیونکہ ممکن ہے کوئی بات اس میں تیرے لیے اضمحلال و افسردگی کا باعث ہو"

وینس نے نہایت متحیر ہو کر پوچھا "اے اروش آخر تو وہ کونسی بات اب کے دیکھ آئی ہے جو مجھے تکلیف پہنچانے والی ہو گی' مجھے یقین ہے کہ تو نے کرہ ارض کے ان ذلیل باشندوں میں' جن کو ہوا نہ سنبھالے تو منہ کے بل زمین پر گر پڑیں' کوئی بات ایسی نہ پائی ہو گی' جس کو سن کر وینس جلے' کیا تو نے اس سے قبل وہاں کے حالات مجھ سے نہیں کہے اور کیا میں یہ سن کر ہنستے ہنستے بیتاب نہیں ہو گئی کہ انسان اپنے جسم کو جانوروں کی طرح ناخن سے کھجاتا ہے تو اس کے جسم پر مٹی کی لکیریں بن جاتی ہیں۔ اے اروش کہہ اور نہایت آزادی سے کہہ' جو کچھ تو نے دیکھا ہے میں دیکھتی ہوں کہ آج تو اپنی ملکہ سے خلاف معمول کچھ مذاق کرنا چاہتی ہے۔"

اروش جو تمام دیویوں میں نہایت سنجیدہ و متین دیوی تھی ' یہ سن کر کچھ چیں بہ جبیں ہوئی اور بولی ۔ "اے وینس مانا کہ کرۂ ارض کثیف ہے اور اس کے رہنے والے ' جن کی ساخت مٹی سے ہوئی ہے ذلیل ہیں ' لیکن اسے کیا کیا جائے اسی کرہ میں ایک جگہ یونان بھی ہے ' جس کا ذکر میں تجھ سے نہیں کرنا چاہتی تھی ' لیکن جب تو نہیں مانتی اور سمجھتی ہے کہ میں مذاق کر رہی ہوں تو سن میں بتاتی ہوں کہ والئ یونان کی چھوٹی بیٹی جس کا نام سائکی ہے ' ایسی حسین ہے اگر خاک پا مل جائے تو وینس کو چاہئے کہ اس کا غازہ بنائے اور فخر کرے ' کل اس کی سالگرہ کا دن تھا اور میں اس تقریب میں اتفاق سے پہنچ گئی تھی ' لیکن اے وینس یقین کر کہ میں جو اس وقت اتنی دیر سے وینس کو بے نقاب دیکھ رہی ہوں ' اور اس سے قبل ہزاروں بار دیکھ چکی ہوں ' اس ایک لمحہ کی تاب نہیں لا سکی ' جب سائکی نے اپنا نقاب چہرہ سے جدا کیا ۔ اے وینس ' میں افسوس کرتی ہوں اور رشک کرتی ہوں کہ کیوں نہ انسان ہوئی کہ اس کی معیت کی آرزو تو اپنے دل میں پیدا کر سکتی۔"

وینس جس کے نزدیک اس سے قبل کبھی اس امر کا امکان بھی نہ تھا کہ کوئی اس کے برابر حسین ہو سکتا ہے ' یہ سن کر کہ ایک عورت اور وہ بھی کرہ عرض کی ' اس سے زیادہ حسین ہے ' چونک پڑی اور اس کے غرور حسن کو اس بیان سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ سخت فکر مند ہو کر خاموش ہو گئی ' لیکن کچھ سوچ کر بولی ۔:

"اے اروش ٹھہر ' میں ابھی طلسمی آئینہ منگا کر سائکی کی تصویر دیکھتی ہوں ' اور اگر وہ ایسی نہ ہوئی جیسی تو ظاہر کرتی ہے ' تو یہ سمجھ رکھ کہ وینس جس طرح ' حسن خدمات پر انعامات کی بارش کرتی ہے اسی طرح وہ یہ بھی جانتی ہے کہ گستاخی اور جھوٹ کی بدترین سزا کیا ہے۔"

اس نے اروش کو رخصت کیا اور کنیزوں سے طلسم بند آئنہ منگوا کر اپنے سامنے ایک بلوریں میز پر رکھوایا اور سب کو علیحدہ کر کے تنہا اس کے روبرو آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی ' یہ آئنہ دیکھنے کا طریقہ تھا ۔ کوئی پندرہ منٹ تک وہ اسی طرح سر جھکائے اور آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی ' لیکن اس کے حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ تھی جب اس نے آنکھیں کھول کر آئنہ کو ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہوئے دیکھا ' جو حقیقتاً وینس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی ۔ اس کی نگاہیں کانپ کر گر پڑیں آئینہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور عجیب مضطربانہ انداز سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

کامل دو گھنٹے ہو چکے تھے اور وینس کا اضطراب کسی طرح کم ہونے میں نہ آتا تھا کہ دفعتاً " ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی اور نسبتاً بے تابی میں کچھ کمی پیدا ہوئی ۔ " بیشک میں سائکی کے حسن کا قیام نہیں دیکھ سکتی ' پھر مجھے وہ چیز تلاش کرنی چاہیے جو اس کے حسن کو جلد از جلد زائل کر دے اور اس کی رعنائیوں کو تباہ و برباد ۔ اس کو جلد سے جلد درس عشق دینا چاہیے ' اور عشق بھی نہایت شدید ' سخت ناکام و مایوس " یہ کہتی ہوئی وہ اٹھی اور اپنے باغ کی طرف نہایت تیزی سے چل دی۔

کیوپڈ ' وینس کا بیٹا شانہ پر کمان اور ترکش میں تیر لیے ' اپنے پردار بازوؤں کو سمیٹے ' روشوں پر ٹہل رہا تھا اور پھول توڑ توڑ کر ڈھیر لگا رہا تھا کہ ان پر مشق تیر انداز کرے (ہرچند اس وقت بھی ہمیں اس کی صورت ایک پردار معصوم بچہ ہی کی شکل میں دکھائی جاتی ہے ۔ لیکن حقیقت یہ کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا ' اس کا عنفوان شباب تھا اور اس لئے اس کی ناوک اندازیوں کی کوئی انتہا نہ تھی) وینس آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچی اور بیٹے کا منہ چوم کر کہنے لگی " اے کیوپڈ میں نے سنا ہے کہ جب تو تیر و کمان لے کر باہر نکلتا ہے تو ملک کی جوان لڑکیاں تیرے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ اچھے کیوپڈ جی ' چاہے ہمارے دلوں کو اپنے تیروں سے چھلنی کر دے ' لیکن خدا کے لیے پیروں میں زنجیر محبت نہ ڈال ' کیا واقعی تیرے تیروں کے زخم زنجیر محبت سے زیادہ آسان ہیں ' کیا میں دیکھ سکتی ہوں کہ ان تیروں سے کیونکر وہ زنجیر تیار کرتا ہے ' کرہ ارض میں رئیس یونان کی چھوٹی بیٹی سائکی تیری قائل نہیں ' جا اور اس کو بتا کہ وینس کا بیٹا کیسا تیر انداز و غرور شکن ہے "

کیوپڈ یہ سن کر پھڑک گیا ' نئے شکار کا حال معلوم کر کے اس کی چٹکیاں بے چین ہو گئیں ۔ کمان شانہ سے اتر کر ہاتھ میں آگئی اور تیر ترکش سے نکل کر کمان میں ۔ اس کے پروں کی شکنیں کھلیں اور دفعتاً " نگاہ سے غائب ہو گیا۔

(۳)

سالمی کی رسم سالگرہ، جس نے اس کے شباب میں ایک سال کا اور اضافہ قیامت کیا ختم ہو گئی اور سارا عالم پھر ایک سال تک اس لمحہ عریاں کے انتظار میں تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا گیا، جس کو وسیع دیکھنے کی تمنائیں اس درجہ شدید تھیں کہ اگر ساری دنیا سے اس وسعت کا کوئی عوض چاہا جاتا اور واقعی وہ عوض مان بھی لیا جاتا تو سالمی کے بے نقاب چہرہ اور نگاہ بے محابا کے سامنے خاکستر حیات کا ایک ڈھیر ہوتا اور پھر وہ تمام عمر کے لیے اپنے نقاب سے بے نیاز ہو جاتی۔ لیکن اس کا حسن معلوم ہوتا ہے کہ حیات کو رفتہ رفتہ دنیا سے اٹھانا چاہتا تھا، اور روحوں کو بتدریج گھلا گھلا کر فنا کرنے کا خواہشمند تھا۔ دنیا سے اب یہ خیال اٹھتا جاتا تھا کہ سالمی واقعی نوع انسان سے ہے اور یہ خواہش کہ کم از کم ایک ہی رات ایک ہی ساعت، ایک ہی لمحہ اس کے حسن و شباب میں فنا ہونے کے لیے میسر آجائے، آہ! یہ خواہش تو ایسی خواہش تھی، جو اب کفر میں داخل تھی کیونکہ اس کا حسن لوگوں کے دلوں میں اب ایک عجیب و غریب عظمت کی صورت اختیار کر چکا تھا اور اس سے محبت کرنے کا مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہ رہ گیا تھا کہ دنیا اس کی پرستش کرنے لگے، عالم اسے پوجنے لگے، سالمی کا نام لیا جائے تو لوگ سجدوں میں گر پڑیں اور جب اس کا واسطہ دلایا جائے تو ظالم سے ظالم قزاق اپنا ہاتھ روک لے اور خونخوار سے خونخوار قاتل کی تلوار جہاں تک اٹھ چکی ہے وہیں تک اٹھ کر رہ جائے اور دنیا میں صرف وہی عہد و پیماں قابل اعتبار سمجھا جائے جو سالمی کی قسم سے شروع کیا گیا ہو۔ غرضکہ رئیس یونان کو پورا یقین تھا کہ اب سالمی کی شادی کسی طرح نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر کوئی شخص منتخب بھی کیا جاتا تو یہ خبر اس کو کیونکر پہنچائی جاتی کہ وہ سالمی کا شوہر ہونے والا ہے۔ اول تو کوئی شخص ایسا نظر ہی نہ آتا تھا جو حقیقتاً اس بات کا اہل ہوتا کہ سالمی اس کے آغوش میں سپرد کر دی جائے اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یہ بالکل یقینی امر تھا کہ سالمی کے حسن کی برداشت اس کے امکان سے باہر ہے، بہرحال اس سترھویں سالگرہ کی تقریب میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید کوئی انتخاب ہو سکے گا لیکن افسوس ہے کہ اس میں بھی کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔

سالگرہ کے ٹھیک دوسرے دن شام کو سالمی اپنے باغ میں حوض پر بیٹھی ہوئی رنگین مچھلیوں کی بیقراری کا تماشہ دیکھ رہی تھی، وہ شاید چند لمحوں کے لیے اس بات کو بھول گئی تھی کہ وہ وہی سالمی ہے جس کی ناکامیاب رسم سالگرہ ابھی دو دن ہوئے ختم ہوئی ہے اور وہ اس سال بھی اپنے شباب کو خلوت و مجبوری میں کاٹنے کے لیے مجبور ہے اور نہ دربار سے واپس آنے کے بعد ایک دن تک اس کی افسردگی کا یہ عالم رہا کہ دنیا کی تمام تفریحیں اسے بے معنی نظر آتی تھیں اور مسرت کا وجود بالکل مفقود۔ وہ سمجھتی تھی کہ عورت ہونا، اور ذرا حسین ہونا ایک ایسا قہر ہے، جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں اس نے کھانا نہیں کھایا۔ کیونکہ غذا بقائے حیات کے لیے ہے اور وہ سمجھتی تھی کہ شاید عورت کا شباب عورت کی حیات سے جدا کوئی چیز ہے، بالوں میں شانہ کرتے کرتے ہی الجھا تو اٹھ بیٹھی کہ آخر کیوں؟ آئینہ دیکھا تو منہ پھیر لیا کہ آہ سالمی جہاں کہیں بھی ہے مغموم و نامراد ہے، پھولوں کے ہار یوں ہی رکھے رکھے سوکھ گئے اور اس نے نہیں پہنے کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ شاید مجروں کو کوئی اپنے لیے نہیں پہنتا۔ ہار اس لیے گردن میں نہیں ہوتے کہ ان کی نکہت کو صرف ہوا اڑائے لیے پھرے۔ ان سے یہ مقصود نہیں کہ وہ ایک افسردہ سینے پر پڑے پڑے سوکھ جائیں بلکہ شاید ان سے یہ مدعا ہے کہ کوئی دوسرا ان کی نکہت سے بیقرار ہونے والا ہو اور ان کی جنبش ایک دھڑکتے ہوئے دل کی جانب سے اسے بیقراری کا جواب دے، ورنہ یوں ناکام سینہ ایک مزار ہے اور مزار پر چڑھائے ہوئے پھول کیا، اس نے گانے میں بھی دلچسپی نہ لی کیونکہ وہ لحن میں کچھ نقصان محسوس کرتی تھی۔ سازوں کی نسبت اسے یہ گمان تھا کہ شاید ان کے تاروں میں کسی خاص تار کی کمی ہو گئی ہے اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ اگر موسیقی لذت ہے تو خدایا یہ کیسی لذت ہے کہ سینہ پھٹا جاتا ہے، اگر گانا سکون ہے، تو یارب یہ کیسا سکون ہے جو دل کو بیقرار کیے دیتا ہے۔

غرضکہ اس نے اپنے سارے محبوب مشاغل ترک کر دیے کیونکہ ان میں سے کوئی اس کے حسیات شباب کا جواب دینے والا نہ تھا، وہ راحتوں اور عشرتوں سے بیزار ہو گئی تھی، وہ اپنی گوری گوری کلائیاں دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ مضبوط ہاتھ انھیں پکڑے اور پھر نہ چھوڑے، وہ اپنی نازک کمر، وہ ایک مٹھی میں بھر کے آجانے والی پتلی کمر چاہتی تھی کہ کوئی اس کو دکھائے اور دکھائے جائے، وہ خواہشمند تھی کہ اس کی نزاکت

وینس کو یقین تھا' اور وینس کیا جو بھی کیوپڈ کی بے پناہ ناوک اندازیوں کا حال سن چکا ہے وہ یہی یقین کرے گا کہ ایک سائکی کیا اگر اس جیسی ہزار ہوں تو وہ چنگی کی صرف ایک جنبش سے سب کے دلوں کو چھلنی کر سکتا ہے۔ مگر فطرت کے پاس اک تیر اور تھا' اک ناوک اور تھا' جو کیوپڈ کے تیروں کی طرح بدنام تو نہ تھا' مگر ان سے زیادہ کارگر تھا اور جس وقت سائکی اس عالم میں آئی تو وہ ناوک اس کی نشیلی آنکھوں میں نگاہ بنا کر رکھ دیا گیا' کیوپڈ کو تو جراحت پہنچانے کے لیے قصد و ارادہ کی ضرورت تھی' اہتمام و انصرام درکار تھا کہ کمان میں تیر رکھے پھر چلہ کھینچ کر چنگی ڈھیلی کرے' لیکن سائکی کی مست آنکھوں کو یہ ہوش کہاں' نہ وہ کسی قصد کو جانتی تھی اور نہ کسی اہتمام کو' وہ نہ کسی ارادہ سے واقف تھی اور نہ کسی انصرام سے' ایک بار پلک سے پلک جدا ہوئی اور تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔

غرضکہ کیوپڈ' سائکی کے باغ سے زخمی ہو کر پھرا اور ایسا زخمی کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا دل پاش پاش تھا' اور اس کی روح یکسر جراحت کدہ۔

وہ باغ میں ٹہل رہا تھا اور نہایت انہماک کی حالت میں اپنے اضطراب و بیقراری کا لطف اٹھا رہا تھا کہ وینس آئی اور خلاف معمول اس کو درجہ مغموم و افسردہ دیکھ کر متحیر رہ گئی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ کیوپڈ کسی مہم سے ناکام و نامراد واپس آ سکتا ہے۔ چہ جائیکہ اس کا مضمحل ہو کر لوٹنا' وہ کچھ سمجھی اور سمجھ کر ٹھٹکی اور پھر آگے بڑھی اور ایک خاص انداز سے بولی "اے کیوپڈ مجھے اپنا ترکش دکھا کہ میں اسے خالی دیکھ کر خوش ہوں اور مجھ سے شکایت کر کہ آج تو تیر چلاتے چلاتے چٹکیاں دکھ گئیں' ہاں' ہاں' سمجھتی ہوں شاید اب تو افسوس کرتا ہو گا کہ کیوں سائکی کو زخمی کیا' وہ ایسی ہی حسین ہے' اور اے کیوپڈ یہی وجہ تھی جس نے اس کی تباہی و بربادی کو لازم کرایا تھا۔ اے کیوپڈ بول' جلدی کہہ کہ وہ دیوانہ وار دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے یا وادیوں میں کہیں خراب و خستہ پھر رہی ہے۔"

کیوپڈ' سائکی کی نسبت تباہی و خستگی کا ذکر نہ سن سکا اور بے قرار ہو کر بول اٹھا۔

"ہاں میرا ترکش بھی خالی ہے اور چٹکیاں بھی دکھتی ہیں' کیا تیرے فرمان سے قاصر رہنے کے لیے یہ عذر کافی نہیں ہیں' میں سائکی کے مجروح ہونے پر افسوس نہیں کرتا' کیونکہ وہ مجروح نہیں ہے اور اگر کہیں وادیوں میں پریشان پھر رہی ہے یا وادیوں سے سر ٹکرا رہی ہے تو وہ تنہا نہیں ہو گی' کیوپڈ نے اپنی کمان توڑ ڈالی' تیروں کو پھینک دیا اور اب اس کی زندگی صرف یہی ہے کہ وہ سائکی کے درد و مصیبت میں' اپنے تئیں مٹا دے۔ اے وینس مجھے ملامت نہ کر' کیونکہ وہ فن تیر اندازی میں مجھ سے زیادہ مشاق نکلی اور مجھ پر تاسف بھی نہ کر کیونکہ ساری عمر میں آج ہی تو یہ معلوم ہوا ہے کہ تیر چلانے سے تیر کھانے میں زیادہ مزہ ہے' آہ اگر مجھے یہ رشک نہ ہوتا کہ زمانہ اس تیر کو دیکھ لے گا' تو میں اس کو اس حال میں کہ وہ میرے خون کے بہترین قطرات سے رنگین ہوتا' اولمپس و ایلیس کی چوٹیوں پر نصب کر دیتا اور زمین کی اس بے مثل یادگار کی پرستش سارے آسمان والوں سے کراتا مگر نہیں وہ پہلو میں ہے اور وہیں رہے گا خواہ اس کے نکالنے کی کوشش میں جیوپیڈ میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر ڈالے۔"

غالباً اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ وینس پر کیوپڈ کی اس تقریر کا کیا اثر ہوا' وہ انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں وہاں سے چلی گئی' اور سب سے پہلا حکم جو اس نے واپس آ کر دیا یہ تھا کہ۔ "سامان سفر درست کیا جائے۔"

پریاں نہایت عجلت کے ساتھ اہتمام و تیاری میں مصروف ہو گئیں اور دربار کی کنواریاں وینس کے جلو میں چلنے کے لیے آمادہ۔ پردار گھوڑے جن کا ساز و یراق جواہرات کا تھا اور جن کی دم و دایال میں نہایت آبدار موتی گندھے ہوئے تھے' وینس کے زریں رتھ میں لگائے گئے اور معہ اپنی کنیزوں' اور پریوں کے دفعتہً بادلوں کی طرح جو سما پر چھا گئیں اور پھر تھوڑی دیر بعد آفتاب کی روشنی میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئیں۔

(۴)

سارا یونان ' آج چراغاں ہو رہا تھا۔ اور یونان کا ہر ہر گھر ' بزم رقص و سرود ۔۔۔ ایک سیلاب مسرت تھا کہ ہر پیشانی اس میں غرق نظر آتی تھی ۔ ایک طوفان نشاط تھا کہ ہر دل اس میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا' ہر گلی کوچہ میں زر و سیم کی بارش ہو رہی تھی 'شاہی انعامات کا سلسلہ برابر جاری تھا اور نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کے کسی جشن میں ایک بادشاہ کے دست کرم نے اس سے زیادہ وسیع حصہ لیا ہو ۔ آگسٹس 'والئی یونان کا عہد سلطنت نہ صرف اس وجہ سے عہد زریں سمجھا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا سیر چشم و فیاض تھا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ رعایا کا خیرخواہ بادشاہ یونان کی تاریخ میں اور کوئی دوسرا نظر نہیں آتا' وہ بہانہ تلاش کیا کرتا تھا کہ میں کس طرح رعایا کو زیربار احسان کروں اور اس سے بہتر موقع اس کے لئے اپنا حوصلہ نکالنے کا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی دو حسین بیٹیوں کی شادیاں کر رہا تھا' سارا دربار زر اندود تھا اور دربار کی ہر ہر چیز جواہر کار۔

یونان کے تمام امراء جمع تھے اور پایہ تخت کی ہر حسین لڑکی شاہی مہمان تھی ' اگلا رس و کیوپڈس ' سائکی کی دونوں بہنیں سر سے پاؤں تک جواہرات میں غرق دولہن بنی بیٹھی تھیں اور ان کے خوش نصیب شوہران کے پہلوؤں میں مست و سرشار ۔ ملک کی بہترین موسیقی سازوں سے نکل رہی تھی 'اور یونان کی لطیف ترین شراب بلوری و الماسی گلاسوں میں چھلک رہی تھی۔

ٹھیک یہی وقت تھا اور جشن طرب کا یہی عالم کہ دربار کے مکان کا ایک دروازہ کھلا اور کوئی چیز اندر آکر روشنی میں مل گئی اور بادشاہ چیخ مار کر تخت سے نیچے گر پڑا۔

نشے ہرن ہو گئے 'مسرتیں معنفوں ہو گئیں 'سکون کی جگہ اضطراب نے لے لی 'اطمینان پر سراسیمگی نے قبضہ کر لیا 'اور ہر شخص بادشاہ کی طرف دوڑ پڑا وہ بری طرح تڑپ رہا تھا' آنکھیں شدت درد سے ابل پڑی تھیں 'اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا بات ہے 'ملکہ چیخ کر بادشاہ سے لپٹ گئی 'کہ " خدایا یہ کیا ہوا ؟ " اس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا' مگر ہاں ایک وینس 'جو لوگوں کی نگاہ سے غائب گویا یہ کہتی ہوئی چل دی کہ " یہ ابتداء ہے 'انتقام کی ۔ سائکی 'وینس کے بیٹے کو بے قرار کر کے زندہ رہے 'ناممکن ہے ۔"

آن واحد میں سارے یونان کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کسی سخت مرض میں مبتلا ہے لوگ دوڑ پڑے 'ماہرین طب نے اپنی ساری تدبیریں ختم کر دیں 'شیوخ معابد دعا مانگتے مانگتے تھک گئے لیکن درد میں کسی قسم کی تخفیف نہ ہوئی اور اس لئے پایان کار تمام اراکین و عقلائے سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ سنگ مقدس سے چارہ جوئی کی جائے اور جو ہدایات اس کی ہوں ان پر عمل کیا جائے۔

جس عہد کا یہ واقعہ ہے اس وقت یہ دستور تھا کہ جب کوئی سخت مصیبت پیش آتی تھی اور کوئی انسانی تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی تو دیوتاؤں کی روحوں سے التجا کی جاتی تھی 'اور اس عرض و التجا کے لئے ایک خاص مقام مقرر تھا' یہاں ایک پتھر نصب تھا جسے سنگ مقدس کہتے تھے 'اس عرض کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پتھر پر ایک تحریر نظر آجاتی تھی جو نہ صرف اس مصیبت کی حقیقت سے آگاہ کرتی بلکہ دفع بلا کی تدبیر بھی ظاہر کرتی تھی ' چنانچہ اس وقت صعب میں 'جبکہ بادشاہ کی تکلیف ہر لمحہ بڑھ رہی تھی اور کسی طرح اسے آرام ہوتا نظر نہ آتا تھا' سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ سنگ مقدس سے مدد چاہی جائے ۔ چنانچہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ملکہ 'امرائے دربار 'اراکین سلطنت اور اپنی دونوں دلہن بیٹیوں کے ساتھ روانہ ہو گئی 'اور سائکی کو بادشاہ کی تیمارداری کے لئے چھوڑ دیا۔

سب وہاں پہنچے اور جلدی جلدی وہ تمام مراسم عبودیت ادا کئے گئے 'جن کا ادا کرنا ضروری تھا' مگر آہ کسے خبر تھی کہ وینس کے ہاتھ نے اس سنگ مقدس پر ایسا سخت فیصلہ لکھ دیا ہے 'جس کے دیکھنے اور سننے کے لئے نہایت سنگین دل کی ضرورت ہے۔

جب دعائیں اور التجائیں ختم ہو گئیں تو ملکہ دھڑکتا ہوا دل لیکر بڑھی اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس پردہ کو ہٹایا 'جو سنگ مقدس پر پڑا ہوا تھا ۔ اس تحریر کا مفہوم یہ تھا۔

" رئیس یونان بیمار ہے 'لیکن اس کی بیماری کا علاج انسانی قوت سے باہر ہے 'سارے عالم کے طبیبوں کو بلاؤ 'لیکن وہ نہ

دوشیزگی کا کوئی دشمن مل جائے اور اسے تکلیفیں پہنچائے۔ اب اس کا وہ غرور حسن باقی نہ رہا تھا کہ شاہزادوں کی تصویریں دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھی۔ اب تو وہ باغ میں طاؤس کو بھی مستی کے عالم میں رقص کرتے دیکھتی تھی تو بے اختیار اس سے لپٹ جانا چاہتی تھی اور ہنس کر بھی گردن اٹھائے' ابھرا ہوا سینہ نکالے پانی میں دیکھتی تھی' تو وہ چاہتی تھی کہ یہی بازو کھول کر اپنی آغوش میں لے لے اور اس کی نڈھال گردن پر اپنی زبردست گردن ڈال دے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی اول تمکنت نے معاملہ کی صورت کو اس قدر اہم بنا دیا تھا' اب چارہ کار اس کے سوا اور کوئی نہ تھا کہ وہ ایک دیوی کی سی زندگی بسر کرے۔ لیکن آہ' کون جانتا ہے کہ ایک دیوی' جس کو دنیا معصوم جانتی ہے' اس وقت کن کن گناہوں کی آرزو اپنے دل میں لیے ہوئے تھی۔

بہرحال وہ اس وقت حوض پر بیٹھی ہوئی تھی اور نسبتاً" کچھ مسرور نظر آتی تھی' کنیزیں پھولوں کے پنکھے لیے اسے ہوا پہنچا رہی تھیں اور سامنے دوسرے کنارے پر نسرین حسب معمول اپنا سرمود لیے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی' کہ ساگی یکبارگی چونک پڑی اور نسرین کی طرف خطاب کر کے بولی کہ "نسرین' یہ تو کیا گنگنائی' پھر کہہ' ذرا آواز سے کہہ' ساز لے اور گا' کہ مجھے کچھ لطف آیا۔" نسرین جو ساگی کی افسردگی سے بہت فکرمند تھی' خوش ہو گئی اور اس نے نہایت ہی شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا:

"وہ دن جب میں ایک مغموم خلوت خانہ میں منہ لپیٹے پڑی رہتی تھی' گئی وہ' راتیں جب سنسان کنجوں میں تنہا پڑی کراہا کرتی تھی گذر گئیں' اب تو جی چاہتا ہے کہ نقاب میرے چہرے سے جدا ہو اور پھر چاروں طرف کی چاندنی سمٹ کر ایک ہالہ نظر آئے' صبحیں آزردہ تھیں کہ میرا آفتاب سا چہرہ انہیں دیکھنا نصیب نہ ہوتا تھا' شاید میں افسردہ تھی کہ میری زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو سے وہ عرصہ سے محروم تھیں' راتیں کبیدہ تھیں کہ میرے نغموں نے انہیں عرصہ سے روشن نہیں کیا تھا' لیکن' اب اے صبح اپنا دامن پھیلا اور کرنوں کو جمع کر لے کہ میں آج پھر بے نقاب پھر رہی ہوں۔ اے شام اپنے تئیں خوب بسا لے کہ آج میرے بال پھر تیرے اندر رکھے ہوئے ہیں اور اے رات بیدار ہو جا کہ آج میری نازک انگلیوں میں پھر تاروں کی لرزش سے گدگدی سی پیدا ہو رہی ہے' میری آنکھیں اگر جادو ہیں تو وہ جادو ہی رہیں گی' انہیں مسحور ہونا نہیں آتا' میرا حسن اگر دیوتا ہے تو ہمیشہ اس کی پرستش ہی کی جائے گی۔ وہ خود کسی کا پرستار کیوں ہو دنیا اگر میرے لیے تڑپ رہی ہے تو تڑپے میں کسی کے لیے کیوں تڑپوں۔ میری رعنائی ایک مستقل استغنا ہے' اور سارے عالم کی حیات اس کے ایک جلوہ گریزپا کا ادنیٰ خراج۔"

ساگی یہ سن کر جوش میں آ گئی اور ایک شاہانہ انداز سے کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی' سیاہ ریشمی چادر جو اس کی رانوں سے لپٹی ہوئی کمر کی نزاکت کو اور بھی نمایاں کرتی ہوئی سر تک پہنچ گئی تھی' ڈھلک گئی' شانے کھل گئے' بیاض گردن سینہ کی عریاں سپیدی سے مل گئی' سیاہ ریشمی بال پیٹھ پر گھوم گھوم کر چھلے بن گئے' ابروئیں تن گئیں' مست آنکھیں اور متوالی بن گئیں' ٹھیک یہی وقت تھا اور یہی عالم کہ کیوپڈ اپنا تیر و کمان سنبھالے کنجوں میں سے نکلا اور اس ارادہ سے نکلا کہ آج اپنا ترکش ساگی پر خالی کر دیگا۔ لیکن نشانہ کو پیش نظر رکھنے کے لیے' کیوپڈ نے ساگی کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی تھا کہ تیر چٹکی سے چھوٹ گیا' کمان ہاتھ سے گر پڑی' چلہ اتر گیا اور کیوپڈ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔

آہ' کاش کوئی ساگی سے اس وقت جا کر کہہ دیتا کہ جس محبت کی اس کو جستجو تھی وہ خود اس کی آرزومند ہے' جس عشق کی اسے تمنا تھی وہ اب خود اس کا تمنائی ہے' صیاد خود اس کا مجروح ہے۔ عشق خود اس کا دیوانہ ہے اور تیر آپ اس کی نگاہ کا زخمی۔

اے کیوپڈ تو نے لاکھوں دلوں پر تیر چلائے ہوں گے' خدا معلوم کتنے سینے تو نے مجروح کیے ہوں گے' لیکن وہ تیر جو حسن کے ترکش میں پنہاں ہیں وہ پیکاں' جنہیں صرف اک حسین دوشیزہ ہی کی نیم باز آنکھیں چلا سکتی ہیں تیری ناوک اندازیوں سے کہیں زیادہ تباہ کن ہیں۔

جا' تیرا تیر' اب صرف شہپر ہے بازو سے جدا' تیری کمان صرف اک خمیازہ ہے بے مزہ' جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا' حوروں نے اپنے کاشانوں میں سن لیا کہ وینس کا بیٹا آج ساگی کے باغ میں بیہوش پڑا ہے۔

بتا سکیں گے کہ یہ بیماری کیا ہے، ساری دنیا کے اختر شناس جمع کرو، لیکن وہ نہ کہہ سکیں گے کہ یہ کیا بلا ہے کیونکہ وہ کوئی مرض نہیں جسے طبیب پہچان سکے، وہ کسی ستارہ کا اثر نہیں جسے نجومی دور کر سکے۔ وہ ایک قہر ہے جو بہشت کے مالک اور دیوتاؤں کے سردار جیوپیٹر نے اس پر نازل کیا ہے، یہ اس کا غصہ ہے کہ اگر اس سے جلد پناہ نہ مانگی گئی، تو سارا یونان بہت جلد تباہ ہو جائے گا، اگر یونان کی ملکہ، یونان کے امراء، یونان کی رعایا، اپنے بادشاہ کی صحت اور آئندہ امن و سکون کے آرزو مند ہیں تو ان کو چاہئے کہ شاہزادی سائکی کو کوہ الوند کی سب سے اونچی چوٹی پر لے جائیں اور شاہ بلوط میں باندھ کر چلے آئیں۔ جیوپیٹر اس قربانی کو کسی عفریت کے ذریعہ سے قبول کرے گا، اور بادشاہ فوراً صحیح و تندرست ہو جائے گا، اور اگر یہ قربانی دو دن کے اندر نہ کی گئی تو پھر ہزار سائیکیوں کی قربانیاں بھی اس مصیبت کو دور نہ کر سکیں گی۔"

ملکہ غش کھا کر گر پڑی، امراء متحیر رہ گئے، کنیزوں نے اپنا سر پیٹ لیا مگر اس غمگین جماعت میں، اس حلقہ ماتم میں دو روحیں ایسی بھی تھیں جن کی حقیقی مسرت کا یہ آج پہلا دن تھا، اور جن کے لئے اس ظالم پتھر کی یہ ظالم تحریر اک شعر سے زیادہ پر لطف ایک نغمہ صہبائی سے زیادہ مسرت بخش تھی۔

اگلا رس و کیوپڈس نے اپنی ماں کو اٹھایا اور ہوش میں لا کر جلد واپس چلنے پر اصرار کرتی ہوئی بولیں "" اے ماں اٹھ، خدا جانے بادشاہ کا کیا حال ہو گا۔ ہر چند جیوپیٹر کا فیصلہ نہایت شدید و ظالم ہے، لیکن اس کا غصہ اس سے زیادہ بے پناہ و بے رحم ثابت ہو گا۔ اگر سنگ مقدس کی تحریر پر عمل نہ کیا گیا۔"

بہرحال ملکہ کسی نہ کسی طرح واپس آئی، لیکن اک ایسے روح فرسا غم کا بوجھ اپنے دل میں لئے ہوئے کہ اگر خود اسے اپنی جان کی قربانی کرنی پڑتی، تو وہ نہایت خوشی سے اس کے مقابلہ میں برداشت کر لیتی، مگر نہیں فطرت اس وقت اس کے نسوانی فرائض کا امتحان لے رہی تھی، سخت المناک آزمائش میں ڈالنا چاہتی تھی، شوہر اس کا دل تھا اور بیٹی اس کی جان اور اس لئے کوئی قوت اس امر کے فیصلہ میں مدد نہیں دے سکتی تھی کہ وہ دل کو جان پر قربان کرے، یا جان کو دل پر۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ہاتھ سے دینا ناگزیر ہے، مگر کس کو دے اور کس کو لگائے رکھے، یہ ایک ایسی کشاکش تھی جس سے نکلنا آسان نہ تھا۔

وہ محل واپس آئی تو بادشاہ کے کرب میں اس نے اضافہ پایا، لیکن جب اس نے سائکی کو باپ کے پاس سخت حالت فسردگی میں بیٹھا پایا۔ تو وہ "ہائے سائکی" کہہ کر زمین پر گر پڑی۔ اور بیہوش ہو گئی، ہمیں خبر نہیں کہ وہ کب تک اس عالم میں رہی اور کن کن شدائد کا مقابلہ اس نے کیا، مگر ہاں، جس وقت صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو چہرہ کا رنگ بالکل اڑا ہوا تھا، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے اور ضعف اور نقاہت کا وہ عالم تھا کہ کسی کے سہارے سے اٹھنا بھی دشوار تھا۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی چاروں طرف دیکھا اور یہ یقین کرنا چاہا کہ جو کچھ گزرا یہ سب خواب تھا، مگر جب اس نے کئی بار اپنی آنکھوں کو کھولا اور بند کیا تو اسے سمجھنا پڑا کہ یہ سب حقیقت و واقعہ ہے اور ویسا ہی جگر خراش ہے جیسا اس نے اپنے پندار میں بحالت خواب و دہشت پایا تھا۔

نہ صرف امراء، دربار و اراکین سلطنت، بلکہ سارا یونان سراسیمہ تھا کہ دیکھئے ملکہ کس نتیجہ پر پہنچتی ہے، بعض کا خیال تھا کہ ایسا عادل بادشاہ، ایسا سخی و رحیم حکمران پھر یونان کو نصیب نہ ہو گا، اس لئے جس قدر گران قیمت پر بھی اس کی زندگی واپس مل سکے ارزاں ہے، لیکن بعض کی تمنا یہ تھی کہ جو کچھ ہو سائکی زندہ رہے، کیونکہ بادشاہ تو ضعیف ہے اور بہرحال یونان کو ایک نہ ایک دن اس کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہے لیکن سائکی جس نے ابھی اپنی زندگی کی صرف سترہ بہاریں دیکھی ہیں اور جس کی ذات ساری زمین کے لئے مایہ ناز ہے، روز روز پیدا ہونے کی چیز نہیں۔

اسی حالت منتظرہ میں دفعتاً " بادشاہ کی خواب گاہ سے سخت چیخ کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ بادشاہ دم توڑ رہا ہے۔ ملکہ نے دفعتاً"

آنکھیں کھول دیں۔ اور اس سکوت کے دور کرنے کے لئے جو اس وقت سارے دربار پر چھایا ہوا تھا' اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے جس کے سننے کے واسطے یونان کا ہر متنفس ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا۔ وہ اٹھی اس عزم کو اپنے خط و خال میں لئے ہوئے' اس عجیب و غریب استقلال سے اپنے اندرونی اضطراب کو چھپائے ہوئے' جس سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ اپنے تاثرات سے جنگ کرکے کوئی فتح حاصل کر چکی ہے' اور اب جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہے اس پر افسوس کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ سائکی بھی مثل میرے بادشاہ کی مملوکہ ہے اور اس لیے مجھے کوئی حق نہیں کہ ایک مالک کو اپنی مملوکہ سے نفع نہ اٹھانے دوں۔ اگر سائکی کو ہاتھ سے دے دینے کے بعد بادشاہ اپنی زندگی حاصل کر لے گا تو اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہو گی جیسے کوئی شخص اپنی محبوب ترین چیز دے کر کسی مصیبت سے نجات حاصل کرے۔

جب وہ اس تاویل سے اپنی تسلی کر چکی تو اپنے مریض شوہر کے بستر علالت پر گئی اور سب کے سامنے سائکی کو مخاطب کر کے بولی کہ:

"اے بچی' تیار ہو جا' میں تجھے اجازت دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوتی ہوں اور اس کی تعمیل کر کے اپنے فرض کو ادا کر' اے سائکی ہرچند مجھے یقین ہے کہ تیرے بعد میں زیادہ نہ جی سکوں گی۔ لیکن اگر مجھے اپنی ہی جان دینی پڑتی' کیا مجھے پس و پیش کرنا چاہئے تھا' پھر تیرا چلا جانا بھی تو میرا اپنی ہی جان کا چلا جانا ہے' اے میرے جگر کے ٹکڑے دیکھ' اپنی کمزوری سے اس وقت میرے ارادوں کو کمزور نہ کر دینا۔ تو زیادہ پریشان نہ ہو' کیونکہ تیری ماں بھی بہت جلد تجھ سے آ ملے گی اور پھر کبھی جدا نہ کرنے کے لئے تجھے اپنی آغوش میں لے لیگی۔"

اب ملکہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ امڈ کر آنے لگے اور اس کی آواز کانپنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ گئی اور مجبوراً آنکھ پر رومال رکھ کر اس بات کا اشارہ کرنا پڑا کہ۔ "بس اب سائکی کو لے جاؤ اور دیر نہ کرو۔"

ہم نہیں کہہ سکتے کہ سائکی نے اول اول اس خبر کو کہ وہ قربان گاہ پر چڑھائی جائے گی' کس طرح سنا اور اس حالت انتظار کو جب تک ملکہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کیونکر کاٹا' مگر ہاں یہ ایک واقعہ ہے کہ جب اس کی نسبت ایک قطعی رائے قائم کر لی گئی اور اسے پہاڑ پر لے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں' تو وہ بالکل مردہ سی تھی اور اس کے قوانے بالکل جواب دے دیا تھا۔

موت سے ڈرنا بالکل فطری امر ہے' اس لیے سائکی کیونکر مستثنیٰ ہو سکتی تھی لیکن اس میں کلام ہیں کہ جس غم نے اسے گونگا بنا دیا' جس صدمہ نے اس کی آنکھوں سے آنسو جذب کر لیے' وہ صرف یہ تھا کہ "میری جدائی کو ماں' کیونکر برداشت کر سکے گی۔" اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دیئے۔ بدن ڈھیلا کر دیا اور اس طرح گویا اس نے اجازت دے دی کہ اس جسم کو جہاں جی چاہئے لے جاؤ۔

اگلارس و کیوپڈس نے جلدی جلدی سارا انتظام روانگی کا کیا اور غریب سائکی کا زندہ جنازہ ایک گاڑی پر ڈال کر کوہ الوند کی طرف چل دیئے۔

سوگوار ماں' جس کی حالت دیکھ دیکھ کر لوگوں کے کلیجے پھٹے جاتے تھے ساتھ ساتھ تھی اور اک ہجوم تھا جو پروانہ وار اس شمع مردہ کو گھیرے ہوئے تھا' سارے شہر میں ایک کہرام برپا تھا' اور گھر گھر میں نالہ و ماتم۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو خونبار نہ ہو اور کوئی دل نہ تھا جو بیقرار نہ ہو۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت ساری کائنات پلٹ دی جانے کو ہے' اور آسمان ٹوٹ پڑنے کو۔

ایک گھنٹہ میں یہ جماعت اس چوٹی پر پہنچ گئی جہاں سائکی کی قربانی پیش کی جانے والی تھی اور جلدی جلدی اسے شاہ بلوط کے اس درخت سے باندھ دیا جو سب سے زیادہ نمایاں وہاں کے درختوں میں تھا۔

اب اس کی نازک کلائیاں جو ایک ایک چوڑی کا بار بھی برداشت نہ کر سکتی تھیں' پس پشت رسی سے باندھ دی گئی تھیں اور وہ کمر جس کی نزاکت کی پیمائش کے لئے ڈیڑھ بالشت فیتہ بھی زائد تھا درخت کے زبردست تنے سے کس دی گئی تھی' اس کی وہی ریشمی چادر جسے وہ نصف باندھتی اور نصف اوڑھ لیتی تھی اس کے جسم پر تھی' لیکن وہ نقاب جو ۵ سال سے اس کے چاند سے مکھڑے کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تھا' اب جدا تھا' کیونکہ یہ بھی رسم تھی کہ جس کی قربانی کی جائے اس کا سر و چہرہ برہنہ کر دیا جائے۔

سائکی کا یہاں تک لایا جانا' اس کی کمر اور کلائیوں کو باندھ کر درخت سے کس دیا جانا' یہ سب عالم بیہوشی میں ہوا' لیکن جس وقت اس کی ماں نے بیتابانہ اک آخری بوسہ اس کی پیشانی کا لیا تو سائکی کی آنکھیں کھل گئیں اور چونکہ اب وہ ہاتھ نہ جوڑ سکتی تھی (کیونکہ وہ بندھے ہوئے تھے) وہ قدموں پر نہ گر سکتی تھی' (کیونکہ وہ درخت سے کس دی گئی تھی) وہ کچھ کہہ نہ سکتی تھی (کیونکہ اس کے حلق و زبان خشک تھے) اس لئے اس نے وہ ساری التجائیں' وہ ساری لجاجتیں جو دیگر اعضا سے کی جا سکتی تھیں اب صرف اس کی آنکھوں میں کھینچکر آ گئی تھیں' اور اس لئے عالم یاس میں اس کی آنکھوں کا ماں سے رحم طلب کرنا' حقیقتاً ایک ایسا دل ہلا دینے والا منظر تھا جس کی تاب بھلا غریب ماں کیا لا سکتی تھی' وہ بیہوش ہو کر گر پڑی' لوگوں نے اسے اٹھایا اور سائکی کو یوں ہی تنہا پہاڑ کی چوٹی پر چھوڑ کر چل دیئے۔

مگر آہ' وہ سائکی کا کسما' کسما کر اک آخری نگاہ مایوس کے ساتھ دیکھنا اور اس وقت تک اپنی نڈھال گردن موڑ موڑ کر دیکھتے رہنا جب تک سب لوگ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے (کہ شاید اب بھی کوئی رحم کرے) ایسا دردناک نظارہ تھا کہ شاید اگر وینس خود موجود ہوتی تو وہ بھی آنسو بہاتی' مگر آہ' نہ وینس وہاں تھی کہ اسی کو کچھ رحم آتا' اور نہ ماں وہاں موجود تھی کہ پھر ایک بار چیخ کر اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگا لیتی۔ صرف ایک سنسان پہاڑ کی چوٹی تھی اور وحشت ناک جنگل کی خاموشی جس کی ساکن و وسیع فضا میں سائکی کی نگاہ واپسیں گم اور وہ خود ایک طرف گردن ڈال کر بے ہوش۔

(۵)

"اے خواب کی ملکہ اے نیند کی دیوی جا اور اس کی آنکھوں کو اک شیریں سکون بھر دے' اور تو بھی اے نسیم کی دیوی اٹھ اور اس کی کمر اور کلائی کے بند جدا کر دے' کیونکہ فانی نوع انسان میں ایسا ساحر و دلدوز حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا جلدی کرو کیونکہ میرا دل اس کی محبت میں پھنک رہا ہے۔" کیوپڈ کی اس التجا کو ان دیویوں نے سنا اور دفعتاً" کوہ الوند کی اس خوفناک چوٹی پر پہنچ گئیں' جہاں ایک شاہ بلوط کے تنے سے یہ چاند طلوع ہو رہا تھا۔

شاخوں میں جنبش شروع ہوئی۔ پتیاں ہلنے لگیں اور رفتہ رفتہ ایک لطیف و نکہت بیز ہوا نے سارے پہاڑ کو معطر کر دیا۔ سائکی کے دماغ کا اس عطر سے متاثر ہونا تھا کہ اس کی آنکھیں جھپک گئیں اور اس کا سونا تھا کہ باد نسیم نے درخت سے جدا کر کے' اپنے ہاتھوں پر سنبھال کر فرش پر لٹا دیا۔

سائکی بے خبر پڑی سو رہی تھی' چادر اس کے سرو سینہ سے جدا تھی اور اسے یہ ہوش نہ تھا کہ ایک حریص آنکھ اسے دیکھ رہی ہے۔ اس لئے اپنا عریاں حصہ جسم چھپا کر اسے سمٹ جانا چاہئے' اس کے بال ہوا سے اڑ اڑ کر اس کی پیشانی اور چہرہ پر آ رہے تھے اور اسے کچھ خبر نہ تھی کہ ایک غیر شخص اس منظر سے لطف اٹھا رہا ہے' اس لئے اپنے بال درست کر کے چہرہ پر نقاب ڈال لینا چاہئے۔

کیوپڈ نے اس سے قبل جب سائکی کو باغ میں دیکھا تو وہ بے نقاب ضرور تھی' مگر محو خواب نہ تھی' لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جب حسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے اور جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو ایک عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے۔

کیوپڈ خاموش و متحیر کھڑا دیکھ رہا تھا اور تباہ ہو رہا تھا' اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سائکی کی کھلی ہوئی بلوریں گردن کو دیکھا کرے یا صرف اس کے عریاں سیمیں سینہ کو' اس کے یاقوتی ہونٹوں پر جان دے یا اس کی کشادہ پیشانی پر۔ اس کی فہم اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ سائکی کی سیاہ خمدار ابروؤں سے محبت کرے یا اس کی متوالی آنکھ سے' وہ متحیر تھا کہ اس کی نازک کمر پر اپنے تئیں تباہ کرے یا اس کی کشیدہ قامتی کے انتہائی تناسب پر۔ وہ دیر تک اسی عالم حیرت و استعجاب میں کھڑا رہا' اور آخر کار یہ فیصلہ کر کے کہ سائکی کا رتبہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ

کوئی شخص اپنے تئیں اس سے محبت کرنے کا اہل سمجھے وہ اس کے قدموں پر گر پڑا اس کے رنگین تلووں پر ایک طویل بوسہ دے کر یہ کہتا ہوا اٹھ بیٹھا کہ:

"اے سائکی میں تجھ سے محبت نہیں کروں گا' تجھ سے پیار نہیں کروں گا' تجھ سے عشق نہیں کرونگا' کیونکہ یہ بھی ایک ناقص طریقہ اظہار جذبات کا ہے' میں تیری عظمت کروں گا' تجھے پوجوں گا' تجھ سے ڈروں گا' ایک ایسا ڈر اپنے دل میں لئے ہوئے جو کبھی جیوپیٹر کی طرف سے بھی مجھے پیدا نہیں ہوا' تجھے دیکھوں گا اور کانپا کروں گا' بدن کی اس کپکپی کے ساتھ جو کبھی میرے اوپر طاری نہیں ہوئی میں تجھے ایک ملکہ' نہیں' ایک دیوی آہ' یہ بھی نہیں بلکہ خدا جانے کیا سمجھوں گا' اور اگر تو نے اجازت دی تو اپنے تئیں تیرا ایک خادم' ایک ادنیٰ پرستار' آہ یہ بھی نہیں بلکہ ایک غریب فقیر' اک ذلیل گدا' ایک خوار بھکاری' اور اس سے زیادہ حقیر وہ کچھ سمجھوں گا' جسے میں الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔

مارفیس و زفر نے سائکی کو اٹھایا اور اپنے پروں پر رکھ کر شاداب کوہ اولمپس کی اس کنج میں لے گئیں جہاں کیوپڈ نے خاص طور پر ایک قصر' سائکی کے لئے تیار کرایا تھا' وہ اک برج میں جو اس قصر کا بہترین حصہ تھا' لٹا دی گئی اور مارفیس اپنی نیند اس کی آنکھوں سے لے کر زفر کے ساتھ غائب ہو گئی۔

سائکی اپنی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور سخت متحیر ہوئی جب اس نے اپنے تئیں اک طلائی برج میں جواہر کار فرش پر پایا' اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں کہ شاید یہ کوئی دلکش خواب ہے اور پھر کھول دیں کہ کاش خواب نہ ہو' مگر بے صبر کیوپڈ سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا اور اک شیریں آواز سائکی کے کانوں میں آئی کہ "یہ خواب نہیں حقیقت ہے" اور اسی کے ساتھ چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے' سونے کی بوچھاروں میں حسین کیوپڈ یہ کہتا ہوا نکل آیا کہ "متعجب نہ ہو' تیرا غلام تیرے سامنے حاضر ہے' اسے کوئی حکم دے شاہانہ لب و لہجہ کے ساتھ کچھ کرنے کو کہہ' کیونکہ تیری خدمت اس کی زندگی ہے' اگر تو نفرت نہ کرے تو میں کہوں کہ وہ عفریت میں ہی ہوں۔ جس کے لئے تیری قربانی چڑھائی گئی تھی' اور اگر تو خفا نہ ہو تو وہ عفریت تیری تمام خواہشات قلب مہیا کر دے۔"

سائکی کو سمجھایا گیا تھا کہ جب اس کی قربانی پیش کی جائے گی تو ایک بدصورت' مردم خوار عفریت اس کا شوہر بنے گا' لیکن وہ تو اپنے سامنے ایک حسین نوجوان کو دیکھ رہی تھی اور ہرچند وہ نقاب پوش تھا لیکن اعضا کا تناسب' اس کا کندنی رنگ جو نقاب سے چھنا پڑتا تھا' کہے دیتا تھا کہ اس نقاب کے نیچے ایک نہایت ہی خوبصورت اور پرشباب چہرہ چھپا ہوا ہے۔

اس کے وہ تمام حسیات جو یونان میں مردہ ہو چکے تھے' دب" زندہ ہو کر پھر اس کے خون میں دوڑنے لگے' اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا' انفعال سے بھیک گیا یعنی گلاب پر پھر وہی شبنم آ گئی جس سے اس کا حسن اور چمکنے لگتا تھا۔ وہ آخر کار اپنی تمنا سے مغلوب ہو کر اٹھ بیٹھی اور کیوپڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی کہ "اگر تو ہی میرا شوہر ہے تو پھر یہ حجاب کیوں؟ یہ نقاب کیسا؟ تجھے کیا حق حاصل ہے کہ ان آنکھوں کو مجھ سے چھپائے رکھے۔ جن میں مجھے اپنے جذبات' اپنی تمناؤں کی وسعت کو پڑھنا ہے' وہ جیسی بھی ہیں میری ہیں' میں ان سے محبت کرنا سیکھوں گی' گو انھیں مجھ سے محبت نہ ہو' میں اپنے بہترین ہدایائے عشق ان کے سامنے پیش کروں گی۔ خواہ وہ کتنی ہی مجھ سے چرائی رہیں" یہ کہتے ہوئے سائکی نے اس کا نقاب نوچنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کیوپڈ نے اس کی کلائیاں پکڑ لیں اور نہایت ہی نرم و پر لجاجت لہجہ میں بولا کہ:

"اے سائکی میں تیرا ادنیٰ غلام ہوں تو مجھے جو چاہے سمجھ لیکن مجھے اس بات پر مجبور نہ کر' جس کو میں اگر کر ڈالوں تو پھر تجھی کو افسوس کرنا پڑے' اگر تو مجھ پر صرف اس لئے رحم کر سکتی ہے کہ صرف نقاب کا جدا کرنا ہی اک ایسا کام ہے جس کے متعلق وہ تیرا فرمان ماننے کے لئے تیار نہیں' تو تو رحم کر' ورنہ اے سائکی پھر میں تجھ سے چھٹ جاؤں گا اور مر جاؤں گا۔"

سائکی کچھ تو اس تقریر سے متاثر ہو کر اور کچھ اس کے مردانہ گرم ہاتھوں میں اپنی نازک کلائیوں کو پا کر رک گئی۔ ٹھہر گئی اور ایسا

محسوس کرنے لگی ' گویا اس کے ہاتھ ڈھیلے ہیں ' اس کے بدن میں سکت نہیں ہے اور وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچی جا رہی ہے ۔ آخر کار اس نے سارے بدن کا بوجھ کیوپڈ پر ڈال دیا ' اپنے تئیں اس کے آغوش میں سونپ دیا اور اس نامعلوم لذت سے مست و سرشار ہو کر جو اس سے قبل اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی ' اور جس کے لیے وہ اک جستجوئے مبہم بنی ہوئی تھی ' آنکھیں پلٹ کر کیوپڈ کی گود میں بے حس ہو کر گر پڑی۔

ہر چند ' ملک ' وطن ' ماں باپ کو اس طرح یکایک چھوڑنے کا رنج ' ایسا معمولی رنج نہیں جسے ایک عورت اور عورت بھی ایسی حساس ' اور ایسی لطیف الخیال اور ایسی نازک طبع ' جلد فراموش کر سکے ' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شباب کے عالم میں اگر کوئی حقیقی اور سچی حس رکھتی ہے تو وہ وہی ہے جس کا تعلق صرف اس کے شباب سے ہے ' یہ ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں وہ دیگر مشاغل حیات میں بھی منہمک ہو ' مختلف اسباب تفریح سے بھی گہری دلچسپی کا اظہار کرے ' یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ذات سے وابستہ ہونے والے اور تمام تعلقات کے ساتھ یکسر محویت و استغراق ہو جائے ' لیکن اس کے سامنے اس کے حسن کا ذکر کرو جس سے اس کا شباب براہ راست متاثر ہو ' پھر یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا بھر کی تمام باتیں چھوڑ کر اس طرف متوجہ نہ ہو جائے ' یہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنے حسن و شباب کے متعلق جس قدر دوسروں کی رائے زنی سے خوش ہوتی ہے ' اتنی وہ خود آئینہ دیکھ کر بھی کبھی مسرور نہیں ہوتی ' حالانکہ وہ گھنٹوں اس کے سامنے گیسو سنوار سنوار کر مزے لیا کرتی ہے ' وہ چاہتی ہے کہ اس کی جوانی میں جوانی ہی کا ذکر ہو ' اور کوئی گفتگو اس کے سامنے نہ ہو۔

ہم نے مانا کہ سائکی کو اپنی ماں سے بہت زیادہ الفت تھی ' اپنے باپ پر جان دیتی تھی (اور اس نے دے ہی دی) اپنے وطن کی شیدا تھی ' لیکن یہ الفت یہ جاں نثاری یہ قربانی اسی وقت تک تھی جب تک کوئی اس کا چاہنے والا نہ تھا ' لیکن جب اس نے اپنے سامنے کیوپڈ ایسا حسین نوجوان دیکھا اور اس کی وارفتگی ' اس کی افتادگی اور اس کی پرستاری اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ' کانوں سے سن لی اور ہاتھوں سے چھولی ' تو وہ اپنے سارے افکار بھول گئی ' سارے غم طے کر گئی ' کیونکہ اب کوہ اولمپس کی وسیع خلوت میں سوائے اک حیات معاشقہ کے اسے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور وہ کچھ نہ سمجھ سکی تھی مگر یہ کہ وہ اپنے بار شباب سے خستہ ہو کر جس کی خستگی کو وہ کم از کم تین چار سال سے برداشت کرتی چلی آتی تھی ' آنکھ بند کر کے کیوپڈ کی محبت بھری آغوش میں گر پڑے ' اس نے سمجھ لیا کہ وہ نوجوان ہے ' حسین ہے اس لیے اس نے مطلق پروا نہیں کی ' اگر کیوپڈ کا چہرہ بے نقاب نہ تھا ' اس نے جان لیا کہ وہ اس سے محبت کرنے کے لیے آمادہ ہے ' اس لیے کون اور کیا کے جھگڑوں میں اپنے لطف کو خراب کرنا حماقت ہے۔

کیوپڈ کی خود کیا حالت تھی ' وہ سائکی کے نرم و نازک جسم کو اپنے جسم سے متصل پا کر کیا سوچ رہا تھا ؟ غالباً " یہ سوال جواب طلب نہیں ' کبھی وہ وہ سائکی کی آنکھیں چومتا تھا اور کبھی لب ' کبھی اس کے سینے سے آنکھیں ملتا تھا اور کبھی گردن سے ' غرضکہ وہ بالکل دیوانہ سا تھا ' مجنوں تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکر وہ سائکی سے سیر و آسودہ ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے سائکی کے پر نم ہونٹوں پر اپنے لب رکھ دیئے ' اور وہ بھی مست ہو کر اپنے تئیں بھول گیا اور اس کی آغوش میں بیہوش ہو کر پڑا رہا۔

(٦)

ابتداء آفرینش سے لے کر اس وقت تک کوہ اولمپس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی آبادی کو اپنے دامن میں جگہ دی ہو کیونکہ اس کی بلند چوٹیاں نہ صرف اس وجہ سے کہ خداوند جیوپیٹر کی تجلی گاہ تھیں ' بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کو آباد کرنا ایک انسانی قوت سے باہر تھا ہمیشہ سنسان اور ویران رہیں ۔ ناقابل پیمائش عمیق غاروں کی تاریک وسعت ' نہایت ہولناک سیاہ پانی کے عمیق چشموں کی اس وسعت میں روانی ' بڑے بڑے درختوں سے پیدا ہونے والا ' ہوا کا مہیب سناٹا ' خوفناک درندوں کی گرج کی آواز بازگشت ' بڑے بڑے کانٹوں والی جھاڑیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ ' اور اسی طرح کی اور بہت سی ڈراؤنی چیزوں اور جسم میں لرزہ پیدا کر دینے والے مناظر کا مجموعہ ! یہ تھا کوہ اولمپس جہاں کیوپڈ

نے سائکی کے ساتھ رہنا پسند کیا' اور یہ انتخاب اس نے اپنی کمسنی اور ناتجربہ کاری ہی کے لحاظ سے کیا تھا' کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب وینس کو خبر ہو جائے گی' تو وہ کوئی تدبیر سائکی کی ہلاکت کی نہ اٹھا رکھے گی۔ پھر وہ کہاں جاتا؟ کوہ اولمپس ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کسی کی رسائی نہ تھی اور وہ اپنی زندگی سائکی کے ساتھ امن و سکون کی حالت میں بسر کر سکتا تھا' کیونکہ جب جیوپیٹر کو کوئی عذاب کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی پہاڑ کی چوٹی پر اتر آتا تھا اور عذاب نازل کرتا تھا' چنانچہ اس سے قبل بارہا کوہ اولمپس کی چوٹیوں سے جیوپیٹر کا غصہ آگ بن کر نکلا اور دور دور آبادیوں کو تباہ و برباد کر گیا' پھر ایسی جگہ جو آسمان کے دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا کے غصہ کرنے کی جگہ ہو کون جا سکتا تھا' مگر چونکہ کیوپڈ' جیوپیٹر کا محبوب ترین بیٹا تھا اور اپنے فرائض کے لحاظ سے نہایت اہم مانا جاتا تھا اس لئے وہ وہاں پہنچ سکا' اور اپنے ساتھ رہنے والی مخصوص دیویوں' مارفیس اور زفیر کو بھی اپنے ساتھ لا سکا۔

اس زریں قصر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے' جو اس نے سائکی کے خوش کرنے کے لئے تیار کیا تھا' لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیوپڈ سے مواصلت کی مسرت' ایک ایسی مسرت سائکی کے لئے تھی کہ ایک ہفتہ تک تو اسے یہ ہوش بھی نہ ہوا کہ وہ ہے کہاں۔ مگر پورے ایک ہفتہ تک اس برج طلائی کی خلوت میں بند رہنے کے بعد وہ وقت آیا کہ سائکی کو اپنی نئی زندگی پر کچھ غور کرنا پڑا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ اب کیوپڈ اس سے زیادہ مسلسل وقت نہیں دے سکتا' کیونکہ انہیں آٹھ دس دن میں کیوپڈ کے معطل بیٹھ جانے سے کرہ ارض میں کج خلقی' بے رحمی' اور درندگی بہت پھیل گئی تھی اور اس لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنا تیر و کمان سنبھال کر نہایت سرگرمی کے ساتھ اس کمی کو پورا کرے' لیکن سوال یہ تھا کہ جب تک وہ نہ آئے گا سائکی کیونکر اپنا وقت بسر کرے گی' کن مشاغل میں اپنے تئیں الجھائے رکھے گی؟ اس کا جواب ذرا دشوار تھا' مگر آخر سائکی نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کیوپڈ سے التجا کی کہ وہ حوالی قصر میں ان تمام اسباب تفریح کو مہیا کر دے' جن کی وہ اپنے زمانہ دوشیزگی میں عادی تھی۔

کیوپڈ نے دو گلدستے اٹھا کر زمین پر دے مارے جو خود تو غائب ہو گئے' لیکن بجائے ان کے دو حسین فرشتے جن کے پروں میں الماس ٹنکے ہوئے تھے اور جن کی عمر ۱۳۔ ۱۴ سال سے زائد نہ تھیں نکل کر سائکی کے سامنے کھڑے ہو گئے' کیوپڈ نے ان سے کہا کہ "جاؤ اور قبل اس کے کہ ملکہ سائکی دروازہ تک پہنچے' تمام حوالی قصر کو ان مناظر سے آباد کر دو جو والئی یونان کے محل سے متعلق ہیں"۔ ان کو رخصت کر کے کیوپڈ نے جتنے گلدستے وہاں رکھے تھے سب کو فرش زمین پر پٹکنا شروع کیا' یہاں تک کہ چشم زدن میں سارا قصر حسین پریوں سے بھر گیا اور سائکی ان پردار پیش خدمتوں سے گھر گئی' ان کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ساز تھے' جن کے تاروں سے ارتعاش کے وقت عجیب مسحر خوشبو پیدا ہوتی تھی' سائکی اس زمانہ قیام میں اس نوع کے عجائب و غرائب سے اس درجہ آشنا ہو گئی تھی کہ اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی اور کیوپڈ کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر پریوں کے حلقہ میں قصر سے باہر نکلی' لیکن اس کی نگاہ دروازہ سے باہر نکل کر پھیلی ہی تھی کہ وہ ششدر و متحیر ہو گئی کہ شاہ یونان کا باغ مع اپنی تمام روشوں' نہروں' کنجوں' فواروں' درختوں اور حوضوں کے کیونکر یہاں منتقل ہو سکا' وہ اپنے اس باغ اور اس باغ میں کچھ فرق نہ پاتی تھی' سوائے اس کے کہ وہاں بلور کے ٹکڑے روشوں پر پھیلے ہوئے تھے اور یہاں ذرہ ہائے الماس تھے' وہاں حوض سنگ مرمر' بلور کے تھے اور یہاں شفاف طلا اور صیقل کی ہوئی چاندی کے' وہاں وہ اپنی دوشیزگی کی بے مزہ زندگی بسر کرتی تھی اور یہاں وہ کیوپڈ کے ساتھ مست و سرشار تھی۔ سائکی خوش خوش اس باغ میں داخل ہوئی اور ٹہلتے ٹہلتے ہر چیز کو دیکھتی ہوئی پھولوں کو سونگھتی ہوئی کیوپڈ کو لے کر ایک کنج کے اندر چلی گئی اور ساری پریاں باہر مودب کھڑی رہیں۔

شام ہو گئی تھی' چاند نکل آیا تھا۔ اس لئے پھر سائکی وہاں سے نہیں نکلی اور وہ رات قصداً" اس نے کیوپڈ کے ساتھ اس کنج میں بسر کرنا چاہی کیونکہ جب وہ یونان میں تھی تو یہی کنج تھا جہاں اس نے پوری ایک طویل رات نہایت کرب میں گزاری تھی۔

کچھ زمانہ اسی انداز سے گزرا کہ کیوپڈ دو چار دن کے لئے باہر چلا جاتا اور پھر اک نیا شوق 'نیا جوش لے کر واپس آتا اور سائکی کے پاس رہتا ہرچند سائکی بھی اس کی عادی بننا چاہتی تھی اور کیوپڈ کی غیبت میں انتظار کی گھڑیاں 'مختلف مشاغل تفریح میں کاٹتی تھی۔ لیکن وہ کیوپڈ کی اس گھڑی گھڑی کی مفارقت سے بعض اوقات بہت دل گرفتہ و مضمحل ہو جاتی 'اور وہ اپنے کنجوں 'پھولوں اور پریوں سے بیزار 'اب وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسی کا ہمجنس مل جائے اور اس سے اپنی موجودہ کامرانی کی داد لے۔ وہ ان پریوں سے صرف اشارہ سے کام لیتی تھی' کیونکہ کام کرنے والی پریاں بات نہیں کر سکتیں اور شاید کیوپڈ نے کسی مصلحت کی بنا پر ایسی کنیزیں مہیا نہیں کی' جن سے سائکی گفتگو کر سکتی۔ غرضکہ جب کیوپڈ چلا جاتا تھا تو وہ سخت متوحش ہو جاتی اور باوصف اس کے کہ کنیزوں کی ایک کثیر تعداد اس کی جلو میں ہوتی 'وہ ان بے زبان متحرک تصویروں سے گھبرا کر یہی سمجھتی کہ "میں تو اب بھی ویسی ہی اکیلی اور تنہا ہوں۔"

جس وقت تک عورت اپنی محبت میں کامیاب نہیں ہوتی 'اس وقت تک تو اس کی زندگی ایک کلی کی سی خلوت آرمیدہ زندگی ہے 'وہ نہ کہیں جانا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے بات کرنا۔ لیکن جب وہ اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتی ہے 'جب اس کی حیات معاشقہ اک عملی صورت اختیار کر لیتی ہے تو وہ پھر اگر تنہا بھی ہے تو بجائے خود اک انجمن ہے اور خلوت سے سخت بیزار 'جب تک اس کی محبت کا کوئی جواب دینے والا نہیں 'لیکن جب کوئی ایسا شخص اسے مل جاتا ہے اور اس کی جوانی کی لذتوں کو اس کے لئے قابل فہم بنا دیتا ہے 'تو پھر عورت اپنی مسرت کے بار کو برداشت نہیں کر سکتی اور اپنی ہی جنس کا کوئی فرد اپنے پاس چاہتی ہے۔ جس سے وہ اپنی لذتوں کا اظہار کرے یعنی جس طرح وہ اپنی ناکام زندگی میں دوسروں پر رشک کیا کرتی تھی اسی طرح اپنے مسرور و شاد کام زمانہ میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا بھی اس پر رشک کرے 'اس لئے سائکی بعض وقت گھبرا اٹھتی کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم اس کی بہنیں 'اگلارس و کیوپڈس ہی آ کے دیکھیں اور اس کی خوش قسمتی پر رشک کریں۔

ایک دن جبکہ کیوپڈ خلاف معمول کئی دن کے بعد آیا 'تو سائکی مچل گئی کہ میں تو اپنی بہنوں کو دیکھوں گی 'اور اگر میں وہاں نہیں جا سکتی تو انہیں کو یہاں بلواؤں گی 'یا تو وہ اس کے پاس ہٹانہ کرے یا پھر کیوپڈس و اگلارس ہی کو بلوا دے کہ چند دن انہیں کے ساتھ بسر ہوں۔

کیوپڈ خاموشی سے سائکی کی ضدوں کو دیکھتا اور سنتا رہا اور جب وہ کہہ چکی تو اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے سائکی میرے لئے اس سے زیادہ مسرت بخش امر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ تیرے احکام کی تعمیل میں اپنی ساری قوتوں کو صرف کر دوں 'لیکن میں ڈرتا ہوں کہ ان کا آنا میری مسرتوں کو منغص نہ کر دے 'یہ بالکل ممکن ہے کہ ان کے آنے سے تیری بعض ضدیں پھر از سر نو زندہ ہو جائیں اور وہی خدشات سامنے آ جائیں جن کے خیال سے میں کانپنے لگتا ہوں 'شاید وہ تیرے دل میں کوئی جستجو پیدا کر دیں اور یہی ایک چیز ہے جو میں تیرے دل میں دیکھنا نہیں چاہتا۔

مگر سائکی جسے اپنی محبت پر پورا اعتماد تھا اور جو کیوپڈ کے خلاف مزاج کسی بات کا کرنا اپنے لئے بالکل ناممکن خیال کرتی تھی 'اپنی ضد پر قائم رہی اور کیوپڈ کو بادل نخواستہ ماننا پڑا۔

اس نے مارفیس و زفر کو بلایا 'اور اگلارس و کیوپڈس کے بلانے کا حکم دیا 'لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تاکید کر دی کہ ان کو کسی طرح یہ نہ معلوم ہو کہ کس کے اشارہ اور حکم سے وہ طلب کی جاتی ہیں۔

> "میں ان راتوں پر رشک نہیں کرتی جو تیری معیت میں مجھ پر گذر جاتی ہیں 'کیونکہ جب تک تو میرے پہلو میں ہے صرف میرا ہے 'لیکن ہاں میں ان راتوں سے ضرور جلتی ہوں جو ادھر مجھ پر اور ادھر تجھ پر تنہا گزریں 'کیونکہ اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ تیری معیت صرف انہیں کے ساتھ ہے 'لیکن جب تو مجھ سے دور ہو تو یہ نہ سمجھ کہ میں تجھ سے جدا ہوں 'کیونکہ میں تو صرف ایک آرزو ہوں اور آرزو بھی صرف تجھے چاہنے کی 'تجھ سے محبت کرنے کی۔ پھر اگر تو مجھ سے علیحدہ ہو کر میری یاد اس طرح کرتا ہے جیسے کسی دور کی چیز کا خیال کیا جاتا ہے تو غلطی ہے کیونکہ وہ آرزو تو

تیرے ساتھ ہے پھر یہ تخیل کیسا؟ دیکھ تو اپنے مشاغل کے دوران میں ایک دفعہ چونک کر کچھ سوچنے لگتا ہے' خاموش ہو جاتا ہے' وہ سکوت وہ فکر میں ہی تو ہوں جو تیری نگاہوں کو تیرے کام سے تیرے دل کو تیرے فرائض سے ہٹا لیتی ہوں' تو رات کو کسی دور دراز زمین میں سوتے سوتے چونک پڑتا ہے' گھنٹوں جاگ کر کروٹیں لیا کرتا ہے' یاد رکھ کہ وہ بیداری اور کروٹ خود سائکی ہے جو تیری آنکھوں میں آ جاتی ہے' اور تیرے پہلو سے لپٹ جاتی ہے' لوگ کہتے ہیں محبت بری ہے' مگر میں دیکھتی ہوں کہ میرے زخمی کرنے کے لئے کوئی خاص تیر تھا جو کیوپڈ نے چلایا۔"

کیوپڈ کے جسم میں اس فقرہ سے ایک لرزش پیدا ہوئی لیکن اپنا اضطراب چھپانے کے لئے بول اٹھا کہ "اے سائکی' کیوپڈ نے کیا چلایا یہ کہو کہ میں نے چلایا؟"

سائکی بولی ہاں سچ ہے' تمہیں نے چلایا' تو کیا تم کیوپڈ ہو؟ نہیں تم کیوپڈ نہیں ہو سکتے کیونکہ میں نے سنا ہے وہ خود کسی سے محبت نہیں کرتا اس کے دل میں ذرا رحم نہیں ہے' اس کا سینہ گداز عشق سے خالی ہے' وہ سفاک ہے اور تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو' مجھے چاہتے ہو۔ کیوپڈ "ہاں میں کیوپڈ نہیں ہوں' مگر یہ خیال کہ کیوپڈ کو کسی سے محبت نہیں ہو سکتی' شاید درست نہ ہو' کیونکہ بہت سی باتیں غلط مشہور ہو جاتی ہیں۔"

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مارفیس اور زفر' سائکی کی بہنوں کو ہاتھوں پر لئے ہوئے آئیں اور جگا کر غائب ہو گئیں۔ سائکی اپنی بہنوں کو لے کر قصر میں گئی اور ایک ایک چیز وہاں کی دکھائی پھر وہاں سے باغ میں لائی اور فکر کے ساتھ ہر ہر کنج کی سیر کرائی' دل میں تو وہ اور جلیں کہ سائکی ابھی تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ ایسی شاہانہ زندگی بسر کر رہی لیکن ظاہر میں انہوں نے سائکی کو مبارکباد دی اور پوچھا کہ "یہ زر و جواہر یہ سامان نشاط کہاں سے آیا۔"

سائکی نے جواب دیا کہ "مجھے یہ نہیں معلوم کہ کہاں سے آیا اور وہ کون ہے' جس نے مہیا کیا؟" انہوں نے نہایت حیرت سے کہا "تو کیا اس وقت تک تیرے شوہر نے اپنا نام بھی تجھے نہیں بتایا؟"

"آہ میں اس کا نام نہیں جان سکتی' اس کی ممانعت ہے۔"

"مگر اے بہن' تو نے اس کا چہرہ تو ضرور دیکھا ہو گا' کیا بہت خوبصورت ہے۔"

"نہیں' میں نے اس کی صورت تو نہیں دیکھی کیونکہ وہ ہمیشہ نقاب ڈالے رہتا ہے۔"

"ہاں ہاں جب میں سو جاتی ہوں تو خواب اور میری نیندیں اس کے حسین چہرہ سے جگمگا اٹھتی ہیں۔"

بہنیں بولیں "اے لڑکی تجھے فریب دیا گیا' کیونکہ یہ وہی عفریت ہے جو کسی دن تجھے کھا لے گا۔" سائکی نے کہا "نہیں وہ عفریت تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔" مگر دونوں بہنوں نے پھر یہی کہا اور اس قدر اصرار کے ساتھ اس کے عفریت ہونے کا یقین دلایا کہ سائکی بھی کچھ متفکر سی ہو گئی۔ اس تفکر سے انہوں نے اور فائدہ اٹھایا اور آخر کار اسے مجبور کر دیا کہ ابھی جائے اور نقاب الٹ کر اس کا چہرہ دیکھے۔

رات ہو گئی تھی' کیوپڈ اپنی خواب گاہ میں بیہوش پڑا سو رہا تھا' سائکی آہستہ آہستہ گئی اور ڈرتے ڈرتے اس کے چہرہ سے نقاب الٹ دیا' مگر بجائے اس کے کہ وہ عفریت کی ڈراؤنی شکل دیکھتی اس نے ایک نہایت ہی حسین و جمیل شکل دیکھی اور اسی ایک لمحہ میں سائکی کی محبت نے خدا جانے کتنے مدارج اور طے کر لئے۔

کیوپڈ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور برہم ہو کر بولا کہ "اے بیوقوف سائکی یہ تو نے کیا کیا' کیا تو یہ نہ جانتی تھی کہ میں اک قوت غیر فانی ہوں اور کیا میں نے تجھ سے یہ بات بارہا نہیں کہی کہ کوئی انسان میرے چہرہ کو دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے باہر نکل جانا چاہا' لیکن بد قسمت سائکی نے اپنی ملتجی نگاہوں سے کیوپڈ کو دیکھ کر اپنے ہاتھ بڑھائے کہ کسی طرح وہ لوٹ آئے اور اس کی خطا کو معاف کر دے۔ ہر چند کیوپڈ' سائکی کی اس ادا سے بے انتہا متاثر ہوا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے' لیکن وہ رک گیا' کیونکہ اب ایسا کرنے سے

اس کی غیر فانی روح اس سے چھین لی جاتی ۔ اس لئے کیوپڈ فوراً ایک بادل اپنے اور سائکی کے درمیان حائل کر کے غائب ہو گیا اور سائکی بیہوش ہو کر گر پڑی۔

کیا خبر وہ کتنے عرصہ تک بیہوش رہی ' لیکن ہاں ' جب اس کی آنکھ کھلی تو نہ وہ قصر تھا ' نہ وہ اس کی مخملی خوابگاہ ' نہ وہاں باغ تھا ' نہ کوئی کنیز ' وہی وحشت ناک کوہ الوند کی چوٹی تھی جہاں وہ پہلی دفعہ قربانی کے لئے لائی گئی تھی ' اور وہی شاہ بلوط سامنے تھا جس کے تنے سے وہ کبھی کس کے باندھ دی گئی تھی ' پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ میں کوئی وحشت ناک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے یقین کر لینا پڑا کہ خواب نہیں ہے ' بلکہ خواب تو وہی تھا جس میں اس نے پر لطف زندگی بسر کی ' مگر ایسا خواب ' ایسا طویل خواب نہیں ہو سکتا ' مگر پھر کیا تھا!

آہ ' وہ اس حقیقت پر زیادہ غور کرنے کی طاقت اپنے میں نہ پاتی تھی ' وہ بالکل مبہوت تھی ' دیوانہ پن اس کے چہرہ سے برس رہا تھا اور وہ فوراً مرجانا چاہتی تھی۔

(۸)

سائکی دیوانہ وار پہاڑ پر پھر رہی تھی ' پاؤں کانٹوں سے مجروح تھے اور سارا بدن چوٹوں سے داغدار ' کراہتی تھی ' اور روتی تھی ' چیختی تھی اور گر گر پڑتی تھی ' لیکن وینس کی برہمی کا وہی عالم تھا ' اس نے آدمیوں کو حکم دیا کہ سائکی کو پکڑ کے سامنے لائیں اور خود یہ حکم دے کر جیوپیٹر کے پاس چلی گئی ۔ جیوپیٹر اس کا شوہر اولین تھا اور یہ کسی زمانہ میں اس کی محبوب ترین بیوی رہ چکی تھی ' اس لئے اس نے بعض خاص تدابیر پر عمل کیا اور اپنے پندار میں ایسی حسین بن کر بیٹھ گئی کہ سائکی کا حسن اس سے شرما جائے گا ' مگر جس وقت سائکی لائی گئی ' تو وینس یہ دیکھ کر کہ اس حالت خستگی میں بھی سائکی کے حسن کا وہ عالم ہے کہ وہ باوصف تمام تدابیر حسن افروز کے بھی مقابلہ نہیں کر سکتی ' عرق عرق ہو گئی اور یہ عزم کر لیا کہ سائکی کو مار ڈالنا چاہیے ' لیکن جیوپیٹر نے رات کو وینس کے خواب میں آکر اس کا خیال بدل دیا اور سائکی کی جان بخشی کی یہ شرط قرار دی گئی کہ وہ دیوی پر ' سرپائن کا طلسمی صندوق لے آئے جس میں طلائے حسن بند ہے۔

سائکی اپنی قسمت کا فیصلہ سن کر کانپ اٹھی ' کیونکہ اس کے نسبت مشہور تھا کہ وہ کوہ ہیڈس کے سب کے نیچے اور عمیق غار میں محفوظ ہے اور کسی کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی ' لیکن ایک آواز اس کے کانوں میں آئی جسے سوائے اس کے اور کسی نے نہیں سنا کہ "گھبرا نہیں ' تیرا محافظ تیرے ساتھ ہے " ۔ یہ محبت بھری آواز اسے کچھ آشنا سی معلوم ہوئی اور وہ اس شرط کے پورا کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی ۔ نہ اس نے دشوار گذار پہاڑی راستوں کی پروا کی اور نہ درندوں کی ' نہ اس نے کانٹوں کا خیال کیا اور نہ مہیب غاروں کا ' کیونکہ ایک روشنی تھی ' ایک محبت پاش جھلک تھی جو اس کے آگے آگے تھی ' اور اسے ان مصائب میں تسکین دیتی جاتی تھی ' راستے میں درندے اسے ملے ' مگر وہ اس کے حسن سے مسحور ہو گئے ' متلاطم دریا راہ میں آئے ' لیکن وہ بھی خشک ہو گئے ' غرضیکہ وہ کسی نہ کسی طرح پراسرپائن کے دربار تک پہنچی اور طلسمی صندوق اس سے حاصل کیا ' سائکی خوش خوش واپس آئی اور وہ صندوق وینس کے سامنے لا کر ڈال دیا ' اس امید پر کہ شاید وہ زمانہ پھر واپس آجائے جس کے لئے وہ تڑپ رہی تھی ۔ لیکن وینس ' سائکی کے اس عزم و استقلال سے اور زیادہ جلی اور بدعہدی پر آمادہ ہو گئی ۔ جیوپیٹر اس پر راضی نہ ہوا اور وینس کو حکم دیا کہ سائکی کو چھوڑ دے کیونکہ جب اس کے پاس طلسمی صندوق آگیا ہے تو اسے کسی کے حسن سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ' آخر کار اسے راضی ہونا پڑا اور سائکی کو جیوپیٹر نے خاص اپنی شراب الوہیت منگا کر پلا دی جس سے وہ بھی غیر فانی ہو کر آسمانی مخلوق میں مل گئی۔

(۹)

کیوپڈ و سائکی پھر اسی کوہ اولمپس پر چلے گئے اور سائکی کی پھر وہی زندگی شروع ہو گئی' جس زندگی کا خواب وہ ایک دفعہ دیکھ چکی تھی' اس کے بعد کیوپڈ نے اپنے چہرہ پر نقاب نہیں ڈالا' مگر ہاں اس وقت جب اسے انسانوں کی نگاہ سے چھپ کر ان پر تیر عشق چلانا مقصود ہوتا تھا۔

○

مہاشہ سدرشن

نام : پنڈت بدری ناتھ
قلمی نام : مہاشہ سدرشن / سدرشن
پیدائش : ۱۸۹۶ء بہ مقام سیالکوٹ
وفات : ۱۶ دسمبر ۱۹۶۷ء بہ مقام بمبئی
تعلیم : بی۔ اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مختصر حالات زندگی:

سیالکوٹ میں تھے لیکن ان کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز لاہور رہا۔ ۱۹۲۲ء میں بنارس جا کر سرسوتی پریس قائم کیا اور ۱۹۳۰ء میں بنارس سے ادبی مجلہ "ہنس" جاری کیا۔ ۱۹۳۰ء میں ہی لاہور منتقل ہو گئے اور سدرشن پبلشنگ ہاؤس قائم کیا، جہاں سے پہلی کتاب خود ان کی اپنی شائع ہوئی۔ یہ ان کا افسانوی مجموعہ تھا "طائر خیال"۔ ۱۴ افسانوں کا یہ مجموعہ بعد میں تاج کمپنی بھنڈار، لاہور نے بھی شائع کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ماہنامہ "چندن" جاری کیا۔ ۱۹۳۹ء تک تنگ دست رہے۔ مختلف کتب کے تراجم کر کے روزی کمائی۔ اسی سال لاہور کی ایک فلم کمپنی کے لیے کہانیاں، سکرین پلے اور مکالمے لکھے لیکن یہ کام ان کے مزاج نہ تھا، چھوڑ دیا۔ ڈراما "محبت کا انتقام" پر حکومت پنجاب نے پانچ سو روپے انعام سے نوازا۔

۱۹۴۵ء تک فری لانسر کی زندگی گذارنے کے بعد ایک بار پھر فلمی دنیا کا رخ کیا اور منروا اسٹوڈیو کے باقاعدہ ملازم ہو گئے۔
۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے بمبئی منتقل ہو گئے۔ بمبئی میں اپنے بیٹے شاش بھوشن کے ساتھ قیام تھا۔ ہمارے اولین ترقی پسند ادیبوں میں نمایاں تر تھے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"سدا بہار پھول" مطبوعہ: لگ بھگ ۱۹۱۳ء
یہ افسانہ سدرشن نے ۱۹۱۲ء میں قلم بند کیا تھا جب ان کی عمر سولہ برس کی تھی۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "سدا بہار پھول" (افسانے) — مطبوعہ: رام کنیا بکڈپو، لاہور، طبع اول: ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء
طبع دوم: رام کنیا بک ڈپو، لاہور، طبع دوم: ۱۹۲۶ء

۲۔ "چندن" (افسانے) مطبوعہ: رام کتیا بک ڈپو، لاہور، طبع اول: ۱۹۲۰ء

اس مجموعے میں ۱۵ افسانے ہیں۔ کتاب کا دیباچہ خواجہ حسن نظامی نے لکھا۔ یہ کتاب تاج کمپنی لمیٹڈ، قرآن منزل، ریلوے روڈ لاہور نے بھی شائع کی تھی۔

۳۔ "چٹکیاں" (مضامین) مطبوعہ: رام کتیا بک ڈپو، لاہور

۴۔ "قوس قزح" (افسانے) مطبوعہ: رام کتیا بک ڈپو، لاہور، طبع اول: ۱۹۲۱ء

۵۔ "بنگال بنبسی" (دو جلدیں) مطبوعہ: گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور، طبع اول: ۱۹۲۳ء

اس کتاب میں رابندر ناتھ ٹیگور، بابو پربھات کمار چٹرجی، شریمتی انپور نا دیوی، بابو شرت چندر چٹرجی، بابو شرچند گھوشال، بابو کیشو چندر گپتا، بابو جلدھر سین، بابو اپندر ناتھ گنگولی، سریندر موہن مکرجی، شریمتی نروپما دیوی، بابو ہیم ناتھ سرکار اور بابو گرجا کمار گھوش کی بنگالی کہانیوں کا انتخاب و ترجمہ ہے۔

۶۔ "وجے سنگھ" (ڈراما) مطبوعہ: گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور

یہ بابو ڈی۔ ایل۔ رائے کے بنگالی ناٹک کا ترجمہ ہے۔

۷۔ "عورت کی محبت" (ڈراما) مطبوعہ: گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور، طبع اول: ۱۹۲۷ء

یہ بابو۔ ڈی۔ ایل۔ رائے کے بنگالی ناٹک کا ترجمہ ہے۔

۸۔ "من کی موج" (مضامین) مطبوعہ: رام کتیا بک ڈپو، لاہور، طبع اول: ۱۹۲۴ء

۹۔ "پتھروں کا سوداگر" (ناول) مطبوعہ: گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور،

۱۰۔ "گناہ کی بیٹی" (ناول) مطبوعہ: گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور طبع اول: ۱۹۲۶ء

یہ ناول بنگالی سے ترجمہ ہے۔

۱۱۔ "آزمائش اور دیگر افسانے" (افسانے) مطبوعہ: راجپال اینڈ سنز، لاہور،

۱۲۔ "راج سنگھ" (ترجمہ / ناول) مطبوعہ: لاجپت رائے اینڈ سنز، دہلی، طبع اول: س۔ ن

بنکم چندر چٹرجی کے بنگالی ناول کا ترجمہ ہے، اس ناول کا مرکزی کردار بائی چنچل کماری کا حقیقی کردار ہے۔

۱۳۔ "قدرت کا کھیل" (ترجمہ / ناول از بنکم چندر چٹرجی بہ عنوان "رجنی") مطبوعہ: لاہور

۱۴۔ "گلدستہ سخن" مطبوعہ: نرائن دت سہگل، لاہور، طبع اول: ۱۹۲۲ء

اردو شاعری کی مختصر تاریخ معہ شعراء کے حالات زندگی و انتخاب کلام،

۱۵۔ "تہذیب کے تازیانے" از بنکم چندر چٹرجی کا بنگلہ سے ترجمہ مطبوعہ: لاہور

۱۶۔ "زہریلا آب حیات" از بنکم چندر چٹرجی کا بنگلہ سے ترجمہ مطبوعہ: لاہور

۱۷۔ "بے گناہ مجرم" (ترجمہ / ناول) مطبوعہ: گیلانی الیکٹرک پریس، لاہور،

۱۸۔ "محبت کا انتقام" (باتصویر) (ڈراما) مطبوعہ: تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور،

یہ کتاب پہلے ہندی میں شائع ہوئی تھی بعد میں سدرشن نے اسے اردو روپ دیا۔

۱۹۔ "طائر خیال" (افسانے) مطبوعہ: تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور،

۲۰۔ "قوم پرست" از بابو دیجندر لال رائے کے بنگلہ ناٹک کا ترجمہ مطبوعہ: تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور طبع اول: ۱۹۳۱ء

گیلانی الیکٹرک پریس۔

۲۱۔ "اندھے کی دنیا" (تین ایکٹ کا ڈراما) مطبوعہ: تاج آفس بمبئی، طبع اول: ۱۹۳۱ء

۲۲۔ "بہارستان" (افسانے) مطبوعہ: لاہور طبع اول: ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۹ء

سدرشن کے طبع زاد افسانوں کے اس مجموعے کا دیباچہ پریم چند نے لکھا ہے۔

۲۳۔ "چشم و چراغ" (افسانے) مطبوعہ: لاہور، طبع اول: ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۹ء

۲۴۔ "سولہ سنگھار" (افسانے) مطبوعہ: لالہ لاجپت رائے، لاہور، طبع اول: جنوری ۱۹۳۸ء

۲۵۔ "صبح وطن" (افسانے) مطبوعہ: لاہور،

۲۶۔ "پریم پچیسی" (دو جلدیں) مطبوعہ: لاہور

۲۷۔ "سنگیت مہابھارت" (ڈراما) مطبوعہ: لاہور

۲۸۔ "رشی دیانند" (ڈراما / ترجمہ) مطبوعہ: لاہور

۲۹۔ "پربلا" (ڈراما) مطبوعہ: لاہور

۳۰۔ "راجپوت کی شکست" (ڈراما) مطبوعہ: لاہور

۳۱۔ "چھایا" (ڈراما) مطبوعہ: لاہور

۳۲۔ "گناہ کا پرائشچت کنڈ" (ڈراما۔ چار جلدیں) مطبوعہ: لاہور

۳۳۔ "خوش انجام" (ترجمہ) مطبوعہ: لاہور

۳۴۔ "کنج عافیت" (ناول) مطبوعہ: لاہور

۳۵۔ "امرت" (بچوں کے لیے)

۳۶۔ "بچوں کے لیے ہتوپدیش" (بچوں کے لیے بھاشا کی اخلاقی کتاب کا ترجمہ) مطبوعہ: لاہور، ۱۹۳۹ء سے قبل

۳۷۔ "بچوں کے لیے مہابھارت" (بچوں کے لیے بھاشا کی اخلاقی کتاب کا ترجمہ) مطبوعہ: لاہور، ۱۹۳۹ء سے قبل

۳۸۔ "بچوں کے لیے رامائن" (بچوں کے لیے بھاشا کی اخلاقی کتاب کا ترجمہ) مطبوعہ: لاہور، ۱۹۳۹ء سے قبل

۳۹۔ "ہمارے رشی کی پیاری باتیں" (اخلاقیات) مطبوعہ: پنجاب پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۴۳ء سے قبل

۴۰۔ "پارس" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: مقبول عام پریس، لاہور، طبع اول: ۱۹۳۶ء

۴۱۔ "پھول وتی" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۳ء سے قبل

۴۲۔ "رستم و سہراب" (ڈراما بچوں کے لیے) مطبوعہ: پنجاب پرنٹنگ ورکس، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۳ء سے قبل

۴۳۔ "آنریری مجسٹریٹ" (فکشن)

اعزاز:

۱۔ ڈراما "محبت کا انتقام" پر حکومت پنجاب کا ایوارڈ

مہاشہ سدرشن

وزیر عدالت

ایک دن شام کے وقت جب کہ آسمان پر بادل لہرا رہے تھے ۔ ایک اجنبی ششوپال ' برہمن کے دروازے پر آیا اور لجاجت آمیز لہجے میں بولا " کیا مجھے رات کاٹنے کے لئے پناہ مل سکے گی ؟ " ششوپال اپنے گاؤں میں سب سے غریب تھے ۔ تاہم اجنبی کو دروازے پر دیکھ کر ان کا چہرہ شگفتہ ہو گیا ۔ انہوں نے کہا ۔ " یہ میری خوش نصیبی ہے ۔ آیئے تشریف لایئے ۔ "

ششوپال کے لڑکے نے اجنبی کی خاطر مدارت کی ۔ اجنبی اس پر لٹو ہو گیا ۔ اس نے برہمن سے کہا ۔ " آپ کا لڑکا بڑے کام کا ہے ۔ اس کی خدمت سے میرا جی خوش ہو گیا ۔ " ششوپال نے اس طرح سر اٹھایا ۔ جیسے کسی نے سانپ کو چھیڑ دیا ہو ۔ اور حقارت آمیز لہجہ میں کہا ۔ " تم ہمارے مہمان ہو ۔ ورنہ برہمن ایسے الفاظ سننے کی تاب نہیں رکھتے ۔ " اجنبی نے اپنی غلطی پر نادم ہو کر کہا ۔ " شما کیجئے ! میرا مطلب یہ نہ تھا ۔ مگر آج کل وہ برہمن کہاں ہیں ۔ اب تو آنکھیں ان کے لئے ترستی ہیں ۔ " ششوپال نے جواب دیا ۔ " برہمن تو اب بھی ہیں ۔ کمی صرف کشتریوں کی ہے ۔ "

" میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا ۔ "

ششوپال نے ایک عالمانہ تقریر شروع کر دی ۔ اجنبی حیران ہوا کہ ایک ایسے چھوٹے سے گاؤں میں ایسا تبحر بھی موجود ہے ۔

" مجھے خیال نہ تھا کہ گودڑ میں لال چھپا ہے ۔ مہاراج اشوک کو معلوم ہو جائے تو وہ آپ کو بہت بڑا عہدہ دے ۔ "

ششوپال (مسکرا کر) آج کل بڑی بے انصافی ہو رہی ہے ۔ جب دیکھتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے اجنبی (پینترا بدل کر) " شیر بکری ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں ۔ "

ششوپال ۔ " رہنے بھی دو میں سب جانتا ہوں "

اجنبی ۔ " نقص نکالنا آسان ہے مگر کچھ کر کے دکھانا مشکل ہے ۔ "

ششوپال ۔ " اگر مجھے موقع ملے تو دکھا دوں انصاف کسے کہتے ہیں "

اجنبی ۔ " اگر میں اشوک ہوتا تو آپ کی خواہش پوری کر دیتا ۔

(۲)

دوسرے دن مہاراجہ اشوک کے دربار میں ششوپال کی طلبی ہوئی ۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ ششوپال کے لئے یہ طلبی کا حکم پیام مرگ ہے سب کو یقین تھا کہ اب ششوپال زندہ نہ لوٹیں گے ۔ شام ہو گئی تھی ۔ جب ششوپال پاٹلی پتر پہنچے تو ان کو شاہی محل میں پہنچا دیا گیا ۔ اس وقت تک انہیں خیال تھا کہ شاید ان کے افلاس کی کہانی یہاں تک پہنچ گئی ہے ' اس لئے مہاراج نے کچھ دینے کے لئے بلایا ہو گا ۔ لیکن جب نوکر نے کہا مہاراج آ رہے ہیں تو ان کا کلیجہ دھڑکنے لگا ۔ اتنے میں مہاراجہ اشوک شاہانہ انداز سے کمرے میں داخل ہوئے ۔ اور مسکرا کر کہا ۔ برہمن دیوتا

غالبا آپ نے مجھے پہچان لیا ہو گا۔ ششوپال گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ اجنبی مہمان راجہ اشوک تھا۔ اگرچہ مہاراجہ کو دیکھ کر وہ بہت ڈرے۔ مگر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

(۳)

ششوپال۔ " مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہی مہاراج ہیں۔ ورنہ میں ایسی آزادی سے کبھی گفتگو نہ کرتا۔"

مہاراج۔ " ہوں "

ششوپال۔ " لیکن میری بات میں رتی بھر مبالغہ نہ تھا۔ "

مہاراج۔ " لیکن آپ کی غلطی تھی۔ "

ششوپال۔ " نہیں میں ثبوت دے سکتا ہوں "

مہاراجہ۔ " میں آپ کی آزمائش کرتا ہوں۔ دیکھوں تم کیسے انصاف کا ڈنکا بجاتے ہو۔ کل صبح سے تم وزیر عدالت ہو۔ سارے شہر پر تمہارا اختیار ہو گا۔ اور تم امن کے ذمہ دار سمجھے جاؤ گے۔"

(۴)

ایک ماہ گزر گیا۔ وزیر عدالت کے انتظام اور انصاف کی چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ رات کا وقت تھا۔ آسمان پر تارے کھلے ہوئے تھے۔ ایک امیر نے ایک عالی شان مکان پر دستک دی۔ دریچہ سے ایک عورت نے سر نکال کر پوچھا۔

" کون ہے ؟ "

" میں ہوں۔ دروازہ کھول دو۔ "

" مگر وہ یہاں نہیں ہے۔ "

" پروا نہیں تم دروازہ کھول دو "

" دروازہ نہیں کھل سکتا۔ شہر پر ششوپال کی حکومت ہے۔ "

" میں دروازہ توڑتا ہوں۔ "

امیر نے تلوار نکال کر دروازے پر حملہ کیا 'ایک پہرہ دار نے آکر اسے روکا' دونوں میں مقابلہ ہوا اور پہرہ دار قتل ہو گیا۔ اب تو امیر کا خون خشک ہو گیا۔ اس نے پہرے دار کی لاش کو ایک طرف پھینکا اور بھاگ گیا۔

(۵)

ششوپال کے تقرر کے بعد یہ پہلا وقوعہ تھا۔ اس نے سرگرمی سے تحقیقات کی 'مگر قاتل کا پتہ نہ لگا۔ آخر مہاراجہ نے اسے بلا کر کہا تم کو تین دن کی مہلت ہے۔ اگر اس عرصہ میں قاتل نہ پکڑا گیا تو اس کی جگہ تم کو پھانسی دی جائے گی۔ رات کا وقت تھا۔ مگر ششوپال کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ شہر کے اس گنجان حصہ میں گھوم رہا تھا۔ جہاں یہ واردات ہوئی تھی۔ یکایک ایک مکان کے دریچے سے ایک عورت نے جھانک

کر باہر دیکھا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ عورت نے آہستہ سے پوچھا۔ "تم کون ہو؟" پہرے دار؟" ششوپال نے جواب دیا۔ "نہیں میں وزیر عدالت ہوں۔" "ذرا ٹھہرو" کہہ کر عورت کھڑکی سے غائب ہو گئی۔ اور روشنی لے کر دروازے سے نمودار ہوئی۔ اور وزیر عدالت کو اپنے کمرے میں لے جاکر ایک چوکی پر بٹھایا اور کہا "یہ آخری رات ہے؟" ششوپال نے جواب دیا۔ "ہاں آخری رات۔" عورت تلملا کر کھڑی ہو گئی اور بولی "میں سب کچھ جانتی ہوں۔ قاتل جس کے پاس آیا کرتا تھا۔ میں اس کا نام نہیں لے سکتی۔ ایک دن جو وہ آیا تو وہ گھر میں نہ تھی۔ قاتل نے میری بات کا یقین نہ کیا۔ اور دروازہ توڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ پہرے دار نے روکا تو اس کے ہاتھ سے مارا گیا۔" وزیر عدالت نے قاتل کا نام پوچھا تو اس عورت نے سہمی ہوئی کبوتری کی طرح چاروں طرف دیکھا اور اس کے کان میں کچھ کہہ کر جلدی جلدی اسے رخصت کر دیا۔

(۶)

مہاراجہ اشوک نے کڑک کر ششوپال سے کہا۔ "میعاد گزر گئی۔ کہو مجرم کا پتہ لگا؟" اس نے کہا کہ "ہاں میں نے معلوم کر لیا ہے کہ مجرم کون ہے۔ لیکن شاستروں میں راجہ کی ذات مقدس تسلیم کی گئی ہے۔ اسے ایشور ہی سزا دے سکتا ہے۔ وزیر عدالت کو اختیار نہیں کہ اس کو سزا دے۔ اس لئے میں حکم دیتا ہوں کہ قاتل کے بت کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے اور مہاراج کو تنبیہہ کر دی جائے۔" یہ کہا اور ششوپال نے عدالت کی مہر اشوک کے سامنے رکھ دی اور اپنے گاؤں واپس جانے کی اجازت مانگی۔ لیکن اشوک نے اس کی طرف احترام کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا "آپ کی جرات تاریخ ہند میں یادگار رہے گی۔ یہ بار آپ ہی اٹھا سکتے ہیں۔"

○

رشوت کا روپیہ

آدم پور کا ہر بھگوان کئی سال کی کوششوں کے بعد پٹواری بنا۔ امیدواری کے دوران میں اس نے بہت دکھ اٹھائے اور بہت مصیبتیں جھیلیں لیکن وہ ارادے کا پکا تھا۔ چٹان کی طرح مضبوط کھڑا رہا جب بوڑھی ماں پھٹی پرانی سوتی دھوتی کو دیکھ کر آنکھوں سے آنسو بہاتی جب ضعیف باپ باسی خشک چپاتیاں کھا کھا کر تنگ آجاتا اور ترش روئی سے نالائق فرزند کو مخاطب کرتا تو وہ لاپروائی سے جواب دیتا۔ "دو چار ہی کڑوے گھونٹ اور باقی ہیں پھر دیکھنا اندر باہر روپیہ ہی روپیہ ہو جائے گا۔ دنیا جانتی ہے۔ کلرک بابوؤں کے ہاتھ میں پیسہ نہیں ٹھہرتا مگر پٹواریوں کی بیویاں سونے سے لدی رہتی ہیں۔ پٹواری کے روپے میں بڑی برکت ہوتی ہے۔"

(۲)

اسی موضع میں گنیش داس نامی ایک ساہوکار رہتے تھے۔ ان کے پاس روپے کی افراط کے ساتھ جنس شرافت و متاع دیانت کی بھی کمی نہ تھی۔ ان سے اور ہر بھگوان سے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ ہر بھگوان جب ملازمت کے لئے دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ تو گنیش داس ہی ان کے گھر کی خبر گیری کرتے تھے۔ ہر بھگوان کے والدین تھے تو غریب مگر دولت خودداری سے محروم نہ تھے۔ یہی باعث ہے کہ بھوکے رہتے پیاسے رہتے۔ مگر کسی کے روبرو دست سوال دراز نہ کرتے گنیش داس اس بات کو جانتے تھے اس لئے روز روشن میں کھلم کھلا امداد کرنے کی انہیں ہمت نہ پڑتی۔ رات کی تاریکی میں جاتے اور چپکے سے دس پانچ روپے ہر بھگوان کے آنگن میں پھینک آتے۔ غریب کنبہ گمنام محسن کو دعائیں دیتا۔ لیکن وہ کون شخص تھا۔ اس کا علم سوائے ہر بھگوان کے اور کسی کو نہ تھا۔ آخر مالا سمرن نے اثر دکھایا اور وہ آدم پور کا پٹواری ہو گیا۔

پٹواری ہوتے ہی اس کی حالت میں انقلاب آگیا۔ عجز و ادب کی جگہ نخوت نے اور افلاس کی جگہ امارت نے لی۔ جو نگاہیں تلاش معاش میں مصروف رہتی تھیں وہ روپوں کو ٹٹولنے لگیں۔ ضبط کے بند ڈھیلے ہوئے۔ برداشت کی لگام ہاتھ سے چھوٹی بات بات میں زبان سے گالیاں نکلنے لگیں۔ ملازمت سے سر پھر گیا۔ دن رات رشوت کھانے لگا۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کر دیا۔ روز روشن میں لوگوں کے سامنے رشوت لیتا۔ زمینداروں کو سربازار دھمکاتا لوگ پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے۔ مگر سامنے چوں نہ کر سکتے تھے۔ گنیش داس یہ سب کچھ دیکھتے اور پیچ و تاب کھاتے تھے۔ کئی بار اشارے کنائے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن لالچ کے بھوت نے ہر بھگوان کو اندھا اور بہرا بنا دیا تھا۔ آخر ایک دن وہ صاف الفاظ میں کہنے کا ارادہ کر کے اس کے گھر گئے۔ اس وقت وہ ایک نئے پلنگ کا معائنہ کر رہا تھا جو اس نے ساڑھے انیس روپے کو خریدا تھا۔ گنیش داس نے سنجیدگی سے کہا کہ بارہ روپے ماہوار تنخواہ پر یہ فضول خرچیاں کب تک چلیں گی۔ ہر بھگوان سے ترش روئی سے کہا کہ "بھلے آدمی تم پٹواری بنے ہو۔ کہ خدائی فوجدار۔ زمیندار تم سے نالاں ہیں۔ کاشتکار تم سے پریشان۔ سرزمین گناہ میں سرپٹ دوڑ رہے ہو۔" ہر بھگوان بجائے اس کے کہ نادم ہو کڑک کر بولا۔ "تو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی یہ نصیحتیں یہ کر رکھو۔ تم جو سلوک اپنے کاشتکاروں سے کرتے ہو۔ اس سے میں ناواقف نہیں ہوں۔"

گنیش داس کو پٹواری کی احسان فراموشی اور طوطا چشمی سے صدمہ پہنچا۔ گھبرا کر اٹھے اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔ "معاف کرو دوبارہ

یہ غلطی نہ ہوگی۔" ہر بھگوان خاموش بیٹھا رہا۔

(۳)

اس دن سے ہر بھگوان گنیش داس کا جانی دشمن ہو گیا۔ اور انہیں ہر ممکن ذریعے سے نقصان پہنچانے کا ارادہ کر لیا۔ ان کے تمام احسانات یک قلم فراموش کر دیئے اکثر سرکاری کام کرتے وقت ہیر پھیر کر ان کا ذکر چھیڑ دیتا' اور جب تک دس پندرہ گالیاں نہ سنا لیتا تب تک اطمینان نہ ہوتا۔ سننے والے ہاں میں ہاں ملاتے اور کہتے "جی ہاں وہ ہے ہی بد دماغ بد طینت۔ اس سے کسی کا بھلا نہ ہو گا" لیکن یہی جو ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ جب گنیش داس کے صحن میں بیٹھ کر حقہ پیتے۔ تو ہر بھگوان کو گالیاں دیتے تھے۔ اسی طرح دو سال گذر گئے۔ نہ تو گنیش داس نرم ہوا نہ ہر بھگوان کا غصہ فرو ہوا۔

(۴)

۱۹۰۱ء کا سال بھی کیسا منحوس تھا۔ یہی سال تھا کہ جب پنجاب میں پلیگ کی وبا نمودار ہوئی موت کا بازار گرم ہو گیا۔ اور سینکڑوں گھرانے برباد ہو گئے۔ شروع شروع میں تو آدم پور محفوظ رہا اور لوگوں نے بہت احتیاط کی۔ کہ پلیگ زدہ مقامات کے لوگ گاؤں میں نہ آئیں۔ مگر یہ بندش دیر تک قائم نہ رہی۔ آدم پور کے نمبردار کا ایک رشتہ دار جالندھر میں رہتا تھا۔ یہ امیر آدمی تھا۔ جب جالندھر میں پلیگ پھوٹی تو نمبردار نے اس کو آدم پور بلا بھیجا۔ شروع شروع میں تو اس نے متعدد خطوط کا جواب نہ دیا لیکن جب وبا زیادہ چمکی اور گھر گھر سے آہ و بکا کی آوازیں آنے لگیں۔ تو اس کا دل بھی متزلزل ہوا۔ پہلے ایک معذرت کا خط لکھا اور پھر ایک ہفتہ بعد مع عیال و اطفال کے وہ آدم پور جا پہنچا۔ نمبردار نے دن کو تو رسمی طور پر انکار کیا۔ مگر رات کو خوشی سے داخل کر لیا۔ چوکیدار نمبردار کا دل سے مخالف تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ نمبردار کے رشتہ دار طاعون زدہ علاقہ سے آدم پورہ میں داخل ہوئے ہیں تو اس نے بھی اپنے رشتہ دار کو بلا لیا۔ اب کیا تھا' راستہ کھل گیا۔ جالندھر کے لوگ جوق در جوق آدم پور آنے لگے۔ اور بیماری شروع ہو گئی۔ جس میں سب سے پہلی موت لالہ گنیش داس کی ہوئی۔

(۵)

گنیش داس کی عورت تھی نہ اولاد۔ اس لئے اس کی جائداد اور زمین اس کے یتیم بھتیجے گوکل چند کو پہنچتی تھی۔ ہر بھگوان نے انتقام گوکل چند سے لینا چاہا۔ یار دوست اکٹھے کئے۔ شہادتیں بنائیں جسے ٹھہرائے اور ایک غریب لڑکے بھگن مل سے درخواست دلوا دی کہ میں گنیش داس کا بیٹا ہوں۔ میری ماں اس کی بیوی تھی۔ زمین کا انتقال میرے نام کیا جائے۔ گوکل چند پٹواری کے پاس آیا رویا پیٹا ہاتھ جوڑے قدموں پر سر رکھا۔ لیکن ہر بھگوان نے کھانس کر جواب دیا کہ "بابا مجھے کیوں تنگ کرتے ہو جا کر اپنے گواہ بناؤ۔ تحصیلدار صاحب خود موقعہ پر آکر اس متنازعہ انتقال کا فیصلہ کریں گے۔"

اس سے ٹھیک پندرھویں دن تحصیل دار صاحب دورہ پر آئے' انتقال پیش ہوا پٹواری کی مدد سے زبردست شہادتیں بھگن مل کے حق میں ہوئیں اور داخل خارج اس کے حق میں کر دیا گیا۔ گوکل چند محروم ہو گا۔

(٦)

اس کامیابی کی خوشی میں بھگن مل کے مکان میں چراغ جل رہے تھے۔ جلسہ ہو رہا تھا۔ اور گاؤں سے باہر ایک درخت کے نیچے گوکل چند بیٹھا ہوا اپنی حالت پر آنسو بہا رہا تھا۔ اس کا حلق خشک آنکھیں پرنم اور چہرہ اداس تھا۔ اتنے میں بارش ہونے لگی۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی اور سردی کے مارے گوکل چند کے دانت بجنے لگے۔ اس نے حسرت سے گاؤں کی طرف دیکھا اور سرد آہ بھر کر درخت کے ساتھ پیٹھ لگا دی۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور زمین پر گر گیا۔ درخت کے ساتھ کالا ناگ لپٹا ہوا تھا اس نے گوکل چند کو کاٹ کھایا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہر بھگوان پٹواری کے ہاں قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ رات کو گوکل چند چل بسا۔

(٧)

صبح کو یہ خبر ہر بھگوان نے سنی تو سنانے میں آگیا۔ اسے خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ اس انتقام کا اس قدر تلخ انجام ہو گا۔ یہ خیال اس پر اس قدر غالب آیا کہ اس کے حواس میں فرق آگیا۔ رات کو سوتے سوتے بڑبڑا اٹھتا۔ جاگتا تو گوکل چند کا روتا ہوا چہرہ دکھائی دیتا۔ سوتا تو اس کے بین سنائی دیتے۔ منصبی کام میں غلطیاں ہونے لگیں اور سرزنش کے احکام افسروں کی طرف سے آنے لگے۔ تحصیل دار نے تنگ آکر رپورٹ کر دی کہ پٹواری کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ آخر چھ ماہ کے بعد وہ ایک رات کو اٹھا اور چھت سے یہ کہتا ہوا کود پڑا کہ گوکل میں آتا ہوں نیچے لکڑی کا ایک لٹھ رکھا تھا۔ ہر بھگوان اس پر گرا اور گردن ٹوٹ گئی۔ اس کی موت پر عام لوگ کہتے تھے کہ یہ رشوت کے روپیہ کی اجرت ہے۔

○
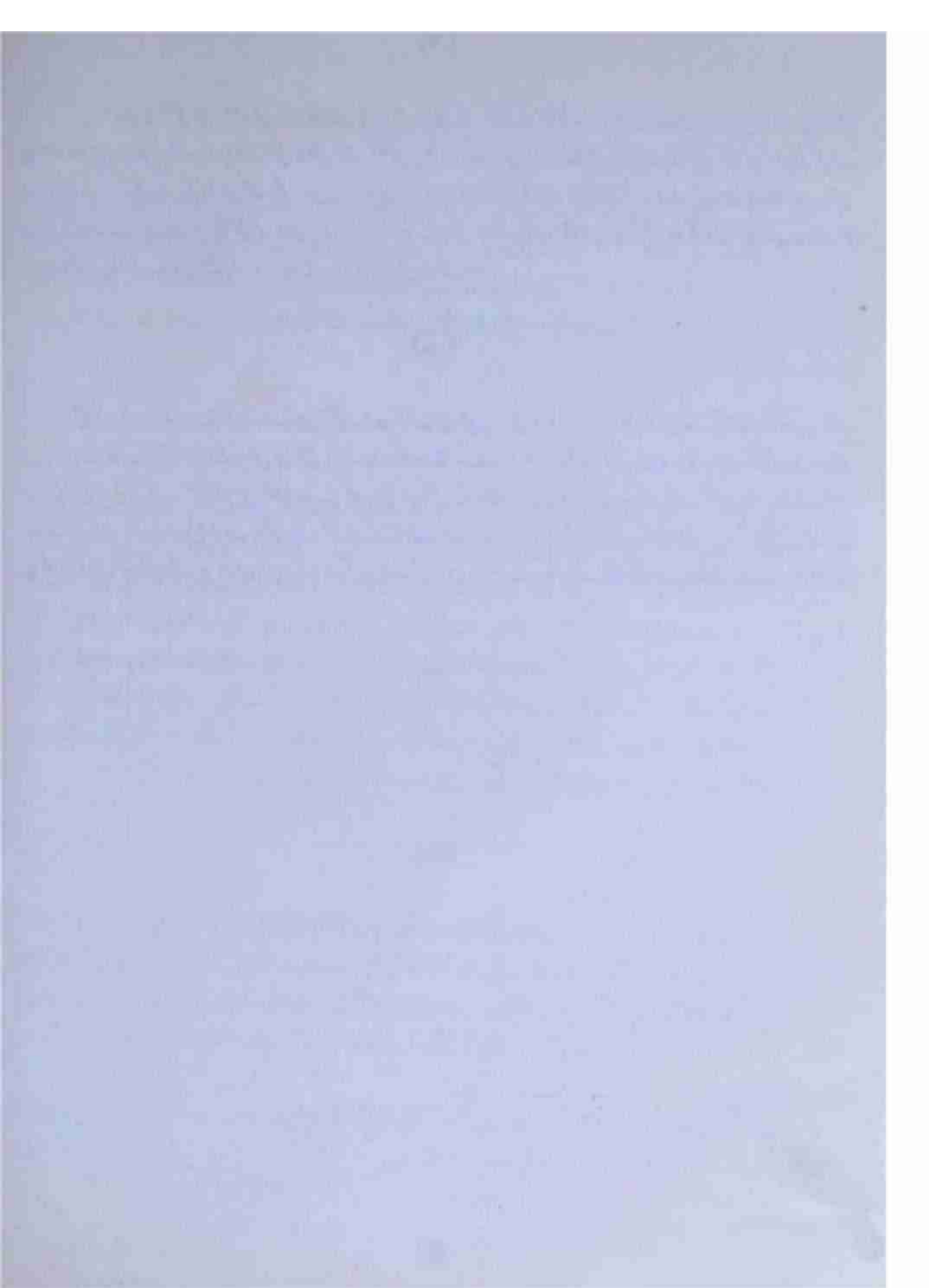
اعظم کریوی

نام : انصار احمد
قلمی نام : اعظم کریوی / ڈاکٹر اعظم کریوی
پیدائش : ۲۲ جون ۱۸۹۸ء بہ مقام موضع کری' پرگنہ چائل ضلع الہ آباد' بھارت
وفات : ۲۲ جون ۱۹۵۴ء' کراچی میں قتل کر دیئے گئے
تعلیم : انٹرنس
انگریزی' اردو' فارسی اور ہندی کے علاوہ بنگلہ' گجراتی اور سنسکرت سے بھی شد بد رکھتے تھے۔

مختصر حالات زندگی:

اعظم کریوی اپنے آبائی وطن موضع کری' پرگنہ چائل ضلع الہ آباد میں سرورویہ جیسے معزز گھرانے میں فیاض احمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ بچپن کھیل کود میں گزرا اور شعرو شاعری کا خبط رہا۔ ۱۹۰۵ء میں اپنے ماموں احتشام الدین کے ہاں سہارن پور میں مقیم تھے جب اسکول کے ایک پنڈت جی کے خلاف پہلا شعر کہا۔ اعظم تخلص اختیار کر کے سینکڑوں غزلیں کہیں۔ نوح ناروی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مشاعروں پر ایک وقت ایسا بھی آیا جب صرف ترنم نے داد پائی اور بدقسمتی سے اعظم کریوی خوش گلو نہ تھے' سو نظم کی بجائے نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس زمانے میں نوح ناروی کی زیر سرپرستی اعظم کریوی نے الہ آباد سے ادبی مجلہ "طوفان" جاری کیا تھا۔ "طوفان" الہ آباد میں شائع ہونے والے اپنے اولین افسانے "پریم کی انگوٹھی" سے شہرت پائی۔ اس سے قبل مجلہ "اکبر" الہ آباد کے مدیر اور تحت اللفظ میں مستغنی از داد غزلیں پڑھنے والے شعرا میں شمار تھا۔ لگ بھگ ۱۹۱۷ء میں شادی ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں ملٹری ہیڈ کوارٹرز میرٹھ کے ڈسٹری برانچ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور قیام پاکستان تک وہیں رہے۔ ۱۴ جون ۱۹۴۱ء کو ان کا بائیس برس کا جوان بیٹا مہتاب احمد جو بی اے کا طالب العلم تھا میرٹھ سے تیرہ میل دور نہر گنگ میں نہاتے ہوئے اتفاقاً ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ اس واقع کے بعد اعظم کریوی بجھ کر رہ گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے کراچی (پاکستان) چلے آئے۔ انتہا درجے کے خود دار شخص تھے کچھ یہی سبب ہے کہ ان کے سینکڑوں افسانے کتابی صورت میں یکجا ہونے سے رہ گئے۔ سرمایہ دار پبلشرز سے ان کی کبھی نہ بنی اور سستے داموں اپنے افسانوں کو فروخت کرنے پر گمنامی کی موت کو ترجیح دی۔ احباب نے حیوانی اور انسانی ہسپتالوں میں ان کی طویل مدت ملازمت کو دیکھتے ہوئے "ڈاکٹر" کہنا شروع کر دیا تھا جب کہ نہ تو پی ایچ۔ ڈی تھے اور نہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ کراچی میں ڈائریکٹوریٹ آف موریل آنڈ فورسز میں ڈیسک ورک کرتے تھے' وائسرائے کمیشنڈ آفیسر (عرف عام میں ڈسپنسر جمعدار) تھے۔ ۲۲ جون ۱۹۵۴ء میں جانے کن وجوہات کی بنا پر نامعلوم افراد نے انہیں کراچی میں قتل کر دیا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"پریم کی انگوٹھی" مطبوعہ: "طوفان" الہ آباد لگ بھگ ۱۹۱۴ء (۱)

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	"پریم پتر" (رومانی خطوط)	مطبوعہ: میرٹھ،	طبع اول: ۱۹۱۹ء
۲۔	"ہندی شاعری" (تاریخ و تنقید)	ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد،	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۳۔	"دیہاتی گیت" (تاریخ و تنقید)	عصمت بک ڈپو، دہلی،	طبع اول: ۱۹۳۹ء کل صفحات ۸۴
۴۔	"پریم کی چوڑیاں" (افسانے)	کتاب خانہ دانش محل، لکھنؤ،	طبع اول: ۱۹۴۳ء
۵۔	"دکھ سکھ" (افسانے)	مطبع انوار احمد، الہ آباد،	طبع اول: ۱۹۴۳ء
۶۔	"شیخ و برہمن" (سولہ افسانے)	کتاب خانہ دانش محل، لکھنؤ،	طبع اول: ۱۹۴۳ء
۷۔	"انقلاب اور دوسرے افسانے" (بارہ افسانے)	کتاب خانہ دانش محل، لکھنؤ،	طبع اول: ۱۹۴۴ء
۸۔	"کنول اور دوسرے افسانے" (افسانے)	عبدالحق اکیڈمی، حیدر آباد دکن،	طبع اول: ۱۹۴۴ء
۹۔	"روپ سنگھار" (افسانے)		
۱۰۔	"دل کی باتیں" (افسانے)		
۱۱۔	"ہندوستانی افسانے" (افسانے)		

غیرمدون:

۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۱ء اعظم کریوی نے "نگار"، "اکبر"، "عالم گیر"، "قوس و قزح"، "نیرنگ خیال"، "الناصر"، "یادگار"، "مخزن"، "تمدن"، "عصمت"، "زمانہ"، "کہکشاں" اور "ہمایوں" کے لیے بنگلہ زبان سے متعدد افسانے ترجمہ کیے۔ اس سلسلے کا پہلا ترجمہ "زمانہ" کانپور جنوری ۱۹۲۷ء میں "مولا" کے عنوان سے ملتا ہے۔ جب کہ دسمبر ۱۹۲۷ء کے شمارے میں "بابو" کے زیر عنوان افسانہ بھی بنگلہ زبان سے ترجمہ ہے۔ ان تراجم کے علاوہ مختلف ادبی جرائد میں لا تعداد تحقیقی و تنقیدی مضامین بکھرے پڑے ہیں۔ خصوصاً "عصمت کی کہانیاں"، "دکھیا کی کہانی، میری زبانی" اور ایک ناول "جونکیں" جو شائع نہ ہو سکا۔

نظریہ فن:

ثنائے خود بخود گفتن تراز ـ بد نے صائب" کے خیال سے میں خود اپنے قلم سے اپنے متعلق لکھنا مناسب نہیں سمجھتا

لو بجھنے لگا دل کا کنول دیکھنے والو
اب ختم ہوا جاتا ہے افسانہ ہمارا (اعظم)

○

(۱) بہ حوالہ "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ: بشیر ہندی (مطبوعہ لگ بھگ ۱۹۳۶ء)

اعظم کریوی

ساس اور بہو

پیارے لال کی پران پیاری' اس لوک کو چھوڑ کر پرلوک چل بسی۔ تو پیارے لال نے گرہستی چھوڑ کر سادھو بننے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کی بڑھیا چچی نے روک کر کہا "بیٹا! اس بڑھاپے میں میری کیا حالت ہو گی؟"

بچپن ہی میں پیارے لال یتیم ہو گیا تھا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد چچی ہی نے اس کی پرورش کی' جب پیارے لال جوان ہوا' تو اس کی بڑھیا چچی نے اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی اور ایک پریم کی پتلی نے آ کر اس کے گھر کو گلزار بنا دیا۔ بڑھیا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا' لیکن وہ پریم کی پھلواری زیادہ عرصے تک سرسبز نہ رہ سکی۔ بڑھیا کا گھر بس کر اجڑ گیا۔ پیارے لال کی دھرم پتنی اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ پیارے لال رونے لگا۔ بڑھیا بھی روئی۔ اس کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔

(۲)

شروع میں جتنا رنج و غم رہتا ہے۔ اگر وہی عالم آخیر تک رہے تو دنیا کا کام چلنا دشوار ہو جائے۔ کچھ دنوں کے بعد جب پیارے لال کی طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ سوچنے لگا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا اب رونا دھونا بیکار ہے۔ پیارے لال کی طبیعت بالکل سنبھل گئی۔ وہ پھر گرہستی میں پھنس گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی چچی نے کہا "بیٹا میرا کچھ اعتبار نہیں' آج نہ مری کل مری۔ اب تم اس گھر کو بسانے کی فکر کرو۔ یہ سچ ہے کہ ویسی اچھی بہو تو اب ملنے سے رہی۔ پھر بھی بیٹا میری بات مانو اور جلدی بیاہ کر لو رام لال کی لڑکی اچھی سیانی ہو گئی ہے۔ وہ بھی مجھ سے کئی بار کہہ چکا ہے۔ تم راضی ہو جاؤ تو وہیں بات پکی کر لوں۔" پیارے لال کو یہ باتیں بہت بری نہ لگیں اور رام لال کی لڑکی رنگیلی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

(۳)

پیارے لال کی نئی رنگیلی بڑی ہوشیار اور عقلمند نکلی۔ پڑھی لکھی تو نہ تھی لیکن اس کی ماں نے اس کو گرہستی کی چالاکیاں خوب بتا دی تھیں۔ اس نے سسرال میں آتے ہی اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا۔

پیارے لال نے دیکھا نئی بہو بہت خدمت گزار اور سیدھی سادی ہے۔ بڑے بوڑھوں کی سیوا کرنا اس کو خوب آتا ہے۔ چچی کی وہ بہت خدمت کرتی ہے۔ ان باتوں سے پیارے لال کے دل پر رنگیلی کا اثر ہونے لگا۔ رنگیلی سائے کی طرح پیارے لال کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ سوامی اب تک پہلی بیوی کی یاد سے غافل نہیں ہے۔ اس نے سوامی کا دل بہلانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اسی طرح دو برس گزر گئے رنگیلی کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ کیسے لاڈ پیار کا لڑکا تھا۔ بوڑھی چچی نے تو گویا ہاتھ بڑھاتے ہی آسمان کا چاند پا لیا۔ بھگوان ایسے سکھ کے دن بھی

دکھائیں گے۔ یہ کس نے سوچا تھا۔
رنگیلی کو اب بھگوان ہو گیا۔ اس نے جان لیا۔ "سوای اب اچھی طرح سے میرے قبضے میں آ گئے۔" ہوا کا رخ بدل گیا۔ چچی کی خدمت میں کمی ہونے لگی۔ چچی نے سوچا بہو ابھی لڑکی ہے بالک کی وجہ سے چھٹی نہیں ملتی۔ اس وجہ سے میری خدمت کا اسے موقع نہیں ملتا۔
لیکن، جب کام کاج میں اٹھتے بیٹھتے بڑھیا کے نقص نکالے جانے لگے۔ وہی بہو جو کبھی سر اٹھا کر بولتے بھی ہچکچاتی تھی۔ وہی اب بڑھیا کے کام میں عیب ڈھونڈنے لگی اور چچی کا پیارا بھتیجا بھی عورت کے حکم کے سامنے چچی کی پروا نہ کرنے لگا تو بڑھیا نے سمجھ لیا کہ گرہستی سے اس کا آسن ڈگمگا رہا ہے۔ اب وہاں ایک نئی دیوی آہستہ آہستہ اپنا قبضہ جمانے کی فکر میں ہے۔ چچی ہی کے پاس جمع خرچ کا حساب رہتا تھا۔ وہی گھر کی ملکہ تھی۔ لیکن اب وہ روپے کی صورت تک نہ دیکھ پاتی۔ کیش بکس کی کنجی نہ جانے کس طرح رنگیلی کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔
بڑھیا سب کچھ دیکھتی، لیکن برا نہ مانتی۔ اس نے سوچا، میری زندگی اب تھوڑی رہ گئی ہے۔ میرے تمام ارمان پورے ہو گئے۔ میں نے پیارے کے بیٹے کا چندر مکھ دیکھ لیا۔ اس سے زیادہ میرے لیے اور کونسی خوشی کی بات ہو سکتی ہے۔ اب تو سنسار کی مایا کے جال سے دور ہی رہنا میرے لیے اچھا ہے۔
رنگیلی کی سختیاں بڑھتی رہیں۔ اور بڑھیا انھیں خندہ پیشانی سے سہتی رہی۔ جو چچی کبھی پیارے لال کے لیے قابل پرستش دیوی تھی۔ جس کے چرنوں پر شردھا اور عقیدت کے پھول چڑھانے ہی میں وہ اپنی نجات سمجھتا تھا۔ وہی چچی اب اس کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگی۔ معمولی معمولی بات پر بھی وہ بڑھیا کو جھڑک دیتا۔ لیکن بڑھیا یہی سمجھتی تھی کہ رنگیلی گھر کی ملکہ بننا چاہتی ہے اور بس۔
بہو نے آہستہ آہستہ بڑھیا سے ہتک آمیز سلوک کرنا شروع کر دیا۔ اب بڑھیا کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ ساری حقیقت سمجھ گئی۔ لیکن اس ضعیفی میں وہ جائے کہاں؟ جس کو اس نے اپنی زندگی کی راحت اور ضعیفی کا سہارا بنایا تھا۔ کیا اس کو چھوڑ کر وہ خوش رہ سکتی تھی؟ یہ سب کچھ سوچ کر وہ ہنسی خوشی بہو کے طعنے سنتی، لیکن اف بھی زبان پر نہ لاتی۔ وہ تو اب اپنے مرنے کی راہ دیکھ رہی تھی۔
ایک دن دوپہر تک نہ تو بڑھیا نے اشنان ہی کیا۔ اور نہ کچھ کھایا۔ رنگیلی تو اس کی جان کی دشمن تھی ہی۔ اس نے خواہ مخواہ ساس کو برا بھلا کہا۔ بڑھیا کی طبیعت اس دن ناساز تھی۔ جلی کٹی باتیں سن کر خلاف معمول وہ ضبط نہ کر سکی۔ اور بولی۔ "بہو! تیرا گھر ہے۔ تیری گرہستی ہے۔ میری ناؤ تو ٹھکانے لگ چلی۔ اب مجھے زیادہ نہ ستا۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟"
پیارے لال گھر میں موجود تھا۔ اس نے رنگیلی کا ساتھ دیا اور چچی کو سخت سست کہا۔ آخر میں اس نے یہاں تک کہہ دیا۔ "تمہاری ہی وجہ سے تو میرے گھر کا دلدر نہیں دور ہوتا۔ میں نے کتنا کمایا۔ تم نے سب پھونک دیا، گھر میں کتنا اسباب تھا۔ اب آدھا بھی نہیں دکھائی دیتا۔ تم نے میرے ساتھ کونسا اچھا سلوک کیا ہے۔ بلکہ تم تو ہمارے حق میں ہمارے گھر کے لئے بلا ثابت ہوئیں۔"
بڑھیا خاموش رہی۔ اس نے چوں تک نہ کی۔ بھری دوپہر میں اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔۔۔ "ہائے میری ہی وجہ سے گھر کا دلدر دور نہیں ہوتا۔ میں گھر کی بلا ہوں۔"
وہ منہ میں بوند بھر پانی بھی نہ ڈال سکی۔ اس رات اسے بہت زور کا بخار چڑھ آیا۔ اس سے پیارے لال کی باتوں کی چوٹ نہ سہی گئی۔ وہ اس بخار میں تین دن بے سدھ پڑی رہی۔ چوتھے دن اسے کچھ ہوش آیا تو اس نے پیارے لال کو پکار کر کہا۔
"بیٹا پیارے! اپنے بچے کو میری چھاتی پر رکھ دے۔ بہو کو بھی بلا لے۔ آج میرے پاس تھوڑی دیر کیلئے بیٹھ جا۔ میں چلتے وقت تو جی بھر کر تم سب کو دیکھ لوں۔"
لیکن اب دیکھنے کا موقع گزر چکا تھا۔ بڑھیا کی شمع حیات بجھ گئی۔ اب رنگیلی گھر کی ملکہ تھی۔ دلدر دور ہو چکا تھا۔ گھر کی بلا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی تھی۔

اعظم کریوی

اچھوت

شکروا چمار اپنی جھونپڑی میں بیٹھا تاڑیل پی رہا تھا۔ قریب ہی اس کا اکلوتا لڑکا "بنی" کھیل رہا تھا۔ بنی کے سوا شکروا کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہی اب اس کی ضعیفی کا سہارا تھا۔ دن بھر کی محنت مزدوری سے جو کچھ مل جاتا اسی میں دونوں کا خرچ چلتا۔ لیکن دو دن سے وہ گاؤں کے زمیندار پنڈت رام پرشاد کے یہاں بیگار کر رہا تھا۔ زمیندار کو سرکار نے رائے صاحب کا خطاب دیا تھا۔ جس کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ دن بھر کی بیگار سے فرصت پاکر تھوڑی دیر ہوئی شکروا نے اپنی جھونپڑی میں قدم رکھا تھا۔ بنی نے باپ کے گلے سے لپٹ کر کہا۔ "بابا مو کا (مجھ کو) نئی دھوتی منگا دو۔"

" شکروا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "مالک کے یہاں کام ختم ہو جائے اور کچھ انعام ملے تو اسی سے تجھ کو دھوتی منگا دوں گا۔" بنی نے بال ہٹ سے کام لیا۔ "اوں اوں میں تو ابھی لوں گا۔ مالک کے یہاں سب لوگ اچھے اچھے کپڑے پہنے ہیں۔ میں بھی پہنوں گا۔"

شکروا نے کہا "پاگل نہ بن ہم غریب وہ امیر۔ ہمارا ان کا کیا مقابلہ؟" بنی نے بھولے پن سے کہا۔ "ہمیں غریب اور ان کو امیر کس نے بنایا ہے؟"

"ہاہا" شکروا نے قہقہہ مار کر کہا "تو بڑا پاگل ہے بھگوان بنائیں ہیں اور کون بنا سکتا ہے!"

"تو بھگوان نے ہم کو امیر کیوں نہیں بنایا؟"

"اب رام جانیں اگلے جنم میں ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہو گی۔ اسی کی سزا ملی ہے۔"

"اگر بھگوان ہم سے خوش ہو جائیں تو کیا وہ ہم کو امیر کر دیں گے؟"

"اور نہیں تو کیا؟ بھگوان کے ہاتھ میں تو سب کچھ ہے۔" "تو بھگوان کیسے خوش ہوتے ہیں؟"

"پوجا پاٹ سے۔" "تو ہم پوجا پاٹ کریں گے!"

"لیکن ہم مندر میں نہیں گھس سکتے۔" "کیوں؟"

"ہم لوگ اچھوت ہیں۔ پنڈت لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے گھسنے سے مندر ناپاک ہو جائے گا۔"

"تو کیا بھگوان مندر ہی میں رہتے ہیں اور کہیں نہیں"؟ "نہیں بھگوان تو ہر جگہ ہیں۔"

"تو میں بھی اپنی جھونپڑی میں ایک چھوٹا سا مندر بناؤں گا اور بھگوان کی پوجا کیا کروں گا۔" "لیکن بغیر کسی پنڈت کی مدد کے پوجا نہیں مانی جائے گی۔"

بنی کا دل ٹوٹ گیا اور کچھ پوچھ ہی نہ سکا۔ اتنے میں کسی نے باہر سے آواز دی۔ "اے شکروا" باہر نکل کر شکروا نے دیکھا کہ زمیندار کا پیادہ داتادین کھڑا ہے۔ شکروا نے ادب سے پوچھا "مہاراج کا حکم؟"

"ابھن (ابھی)؟ ہاں ابھی!"

"سرکار ابھن تو دن بھر کی بیگار سے واپس آئے ہوں۔" "میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے تجھے مالک کا حکم سنا دیا ہے۔ اگر تو ابھی اسٹیشن

پر نہیں جائے گا تو پھر خیر نہیں۔ " یہ کہہ کر مہاراج داتا دین تو اکڑتے ہوئے چل دیئے اور شکروا آسمان کی طرف حسرت سے دیکھ کر رہ گیا۔ دن بھر بیگار میں رہا۔ سمجھتا تھا کہ رات کو آرام ملے گا۔ مگر غریبوں کی قسمت میں آرام کہاں؟ کچھ چبینا بنی کو دے کر اسے گٹھڑی پر لٹا دیا۔ اور خود اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۲)

رائے صاحب رام پرشاد کے مکان کے سامنے ایک عالی شان شامیانے میں پنڈتوں کو بھوج دیا جا رہا تھا۔ پنڈت کون تھے؟ جو بظاہر غریب برہمن بنے ہوئے تھے۔ لیکن جن کے گھروں میں سونا برستا تھا۔ جو دعوتیں کھا کھا کر اتنے موٹے ہو گئے تھے کہ دو قدم چلنا مشکل تھا۔ اسی قماش کے برہمن آج تعلقہ دار کے یہاں انواع و اقسام کی مٹھائیاں کھا رہے تھے۔ ان سے دور پر چند 'فاقہ کش بیگاری مزدور جنھیں پنڈتوں نے اچھوت کا خطاب دے رکھا ہے۔ حسرت بھری نظروں سے پنڈتوں کی توند کو دیکھ رہے تھے۔

شکروا چمار کو رات بھر اسٹیشن پر رہنا پڑا۔ وہ تھوڑی دیر ہوئی مہمانوں کا سامان لے کر گاؤں میں واپس ہوا تھا 'اور اب تک اسے گھر جانے کی اجازت نہ ملی تھی۔ وہ ایک طرف لنگوٹی باندھے چپ چاپ کھڑا تھا۔ کہ ایک تلک دھاری پنڈت شبھو شنکر لٹیا میں گنگا جل لئے کھڑاؤں پہنے رام رام کی مالا جپتے ہوئے اس طرف سے نکلے زمین کچھ اونچی نیچی تھی۔ پنڈت جی لڑکھڑائے اور ان کا بدن شکروا چمار سے چھو گیا۔ بات معمولی تھی۔ پنڈت جی اپنے گھر کی مرمت اچھوتوں ہی سے کراتے تھے۔ مہاراجن کا ڈولہ چماری اٹھاتے تھے۔ لیکن اسوقت ان کے ہاتھ میں گنگا جل تھا۔ وہی گنگا مائی کا جل جس سے ساری دنیا سیراب ہوتی ہے جس میں بھنگی۔ چمار برہمن سب اشنان کرتے ہیں۔ وہی گنگا جل لٹیا میں بھر کر خود کو دیوتا سے بھی بڑھ کر سمجھنے لگے۔ غلطی تھی اپنی لیکن قصور بتایا گیا تھا۔ شکروا چمار کا۔ جب اس نے پنڈت جی کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھا تو ہٹا کیوں نہیں۔ بھری سبھا میں اس نے جان بوجھ کر پنڈت جی کی ہتک کی۔ اب ان کو پھر اشنان کرنا پڑے گا۔ اسی قسم کی باتیں سوچ کر پنڈت جی شکروا چمار پر برس پڑے۔ " پاپی چنڈال۔ بدمعاش۔ " غرض پنڈت جی کو جتنی گالیاں یاد تھیں وہ ختم کر دیں۔ تعلقہ دار صاحب شوروغل سن کر دوڑے آئے اور پنڈت جی سے پوچھا۔ " مہاراج کیا بات ہے؟ "

مہاراج نے بگڑ کر کہا۔ " جہاں پنڈتوں کو بھوج دیا جاتا ہے وہاں چماروں کا کیا کام؟ دیکھئے نہ اس پاپی نے جان بوجھ کر مجھے چھو لیا۔ اب آپ ہی بتایئے مجھے غصہ کیوں نہ آئے۔ رام رام! آپ نے چماروں کو بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ " مہاراج کے آخری جملے نے تعلقہ دار کو آگ بگولا کر دیا۔ انہوں نے شکروا چمار سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ پیادے کو اشارہ کر دیا کہ " مار سالے کو " وہاں تو حکم کی دیر تھی۔ شکروا بھوک کے مارے یونہی مرا جا رہا تھا۔ مار پڑی تو زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔ پیادے نے سمجھا کہ مکر کر رہا ہے۔ اس نے کس کر لات ماری۔ چوٹ تلی پر لگی اور وہ پھٹ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شکروا نے دم توڑ دیا جشن میں ایسی بدشگونی 'سب لوگ گھبرا گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے تعلقہ دار صاحب بھی پریشان ہو گئے۔ ان کو اس کا تو کوئی غم ڈر نہ تھا کہ ایک غریب کی ہتیا ہو گئی۔ بلکہ اس کا صدمہ تھا کہ کمبخت آج ہی کیوں مرا۔ سب برہمن کھا پی چکے تھے وہ سب رام رام کہتے ہوئے چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ وہ ایسے پاپ کی جگہ پر کیسے رہ سکتے تھے۔ برادری ان کو چھوڑ دیتی۔ لیکن تعلقہ دار کے پاس پنڈتوں کو رام رام کرنے کا نسخہ موجود تھا۔ لکشمی دیوی ان پر مہربان تھیں۔ ایسی صورت میں انہوں نے چماروں کو بلا کر حکم دیا کہ " شکروا کی لاش کو لے جا کر فوراً جلا دو۔ " ساتھ ہی دھمکی دی کہ اگر کسی نے پولیس میں مارپیٹ کی خبر دی تو اس کے حق میں اچھا نہ ہو گا۔

شکروا کو مرے بیس سال ہو چکے تھے۔ تعلقہ دار رائے صاحب رام پرشاد زندہ تھے۔ لیکن چراغ سحری 'مگر اس ضعیفی کے عالم میں بھی جب پرگنے کا حاکم ان کے علاقے میں آتا تو رائے صاحب فوراً حاکم کے سلام کے لئے حاضر ہوتے۔ ایک دن رائے صاحب نے سنا کہ ایک نئے حاکم مسٹر ڈیوڈ ان کے علاقے میں آئے ہیں۔ فوراً پڑاؤ پر پہنچے۔ سب سے پہلے پیش کار سے ملے وہ رائے صاحب کے پرانے نیازمندوں میں سے

تھا۔ اس نے رائے صاحب سے کہا " یہ صاحب رئیسوں سے بہت کم ملتے ہیں۔ آپ ان سے نہ ملیں تو بہتر ہے۔ "

" تو کیا مجھ سے بھی نہ ملیں گے ؟ "

" نہیں آپ جیسے رئیس سے تو ضرور ملیں گے لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ ان سے مل کر آپ کی طبیعت خوش نہ ہو گی۔ "

" میں نے تو سنا ہے کہ یہ نیچ ذات والوں سے بھی ملتے ہیں۔ پھر مجھ سے کیوں نہ ملیں گے۔ "

" ہاں یہ صاحب اچھوتوں سے بہت ملتے ہیں اور ان کو کرسی پر بٹھاتے ہیں لیکن رئیسوں سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ "

" عیسائی ہے نہ ' لیکن اب تو میں آ گیا ہوں مل ہی کے جاؤں گا۔ میری اطلاع تو کر دیجئے۔ "

" جیسے آپ کی مرضی " ۔ اتنا کہہ کر چپڑاسی ' ڈیوڈ صاحب کے خیمے میں داخل ہوا ' اور اطلاع کی حضور رائے صاحب رام پرشاد ملنے کے لئے آئے ہیں!

ڈیوڈ صاحب نے کچھ سوچ کر کہا۔ " اچھا اندر بھیج دو۔ رائے صاحب نے خیمے میں داخل ہو کر نہایت ادب سے صاحب کو جھک کر سلام کیا اور پھر حسب معمول خود ہی ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھے۔ لیکن ڈیوڈ صاحب نے ان سے ہاتھ نہ ملایا اور کہا " معاف کیجئے میں آپ جیسے عالی خاندان پنڈتوں سے ہاتھ نہیں ملا سکتا کیونکہ میں اچھوت ہوں۔ " رائے صاحب بولے۔ " حضور ایسی باتیں نہ کریں۔ راج کو ہم ایشور کا سایہ سمجھتے ہیں۔ "" لیکن میں اچھوت ہوں۔ "

" وہ کیسے ؟ "" یہ آپ کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ " ہاں یہ تو بتایئے آپ کے گاؤں میں کوئی شکروا رہتا تھا ؟ "

شکروا کا نام سن کر پنڈت جی کو بیس برس کی باتیں یاد آ گئیں۔ ڈر کے مارے ان کا چہرہ فق ہو گیا۔ انہوں نے دبی زبان سے کہا۔ " جی ہاں میرا ایک اسامی اس نام کا ضرور تھا۔ لیکن اس کو مرے ہوئے بیس سال ہو گئے۔ "

" ڈیوڈ صاحب نے کہا " میں نے سنا ہے آپ نے اس کو جان سے مروا ڈالا تھا۔ " رائے صاحب تن گئے " جھوٹ ' بالکل جھوٹ۔ بھلا کہیں ایسی جیوہتیا ہو سکتی ہے ؟ "" جی ہاں ' آپ ایسے بے درد تنگ نظر لوگوں سے جیوہتیا ہو سکتی ہے! رائے صاحب ادھر دیکھئے۔ جس کو اس وقت آپ حضور کہہ کر فخر کر رہے ہیں۔ جس کو سلام کرنے آپ یہاں حاضر ہوئے ہیں۔ وہ اسی بد نصیب شکروا چمار کا لڑکا بنی ہے۔ " رائے صاحب یہ سن کر بے ہوش ہو گئے۔ ڈیوڈ صاحب نے انھیں گھر بھیج دیا جہاں وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہوئے جب ان کی ارتھی ڈیوڈ صاحب کے کیمپ سے گزری تو وہ " رام نام ست ہے۔ " کی آواز سنتے ہی ٹوپی اتار کر کھڑے رہے۔

○

حامد اللہ افسر

نام : حامد اللہ
قلمی نام : حامد اللہ افسر/ افسر میرٹھی
پیدائش : ۱۹ نومبر ۱۸۹۵ء بہ مقام میرٹھ۔ بھارت
وفات : ۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء لکھنؤ
تعلیم : ایم۔ اے

ابتدائی تعلیم مولوی احمد علی محدث سے حاصل کی' بعد ازاں انہیں کی نگرانی میں عربی و فارسی کی تعلیم مدرسہ عالیہ' میرٹھ میں پائی۔ کچھ مدت دیوبند میں رہے' اس کے بعد انگریزی کی تکمیل میرٹھ کالج میں ہوئی جہاں سے بی۔ اے ۱۹۲۰ء میں کیا۔

مختصر حالات زندگی:

جدی پشتی میرٹھ کے تھے۔ معزز مفتی خاندان میں مفتی محمد عصمت اللہ کے ہاں پیدا ہوئے اور انہی کی زیر نگرانی ابتدائی تعلیم پائی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ابتدا کچھ مدت اخبار نویسی کی۔ شاعر' افسانہ نگار اور ناقد کے طور پر شہرت پائی۔ میرٹھ میں قیام کے دوران پہلی بار ۱۹۱۶ء میں پہلا مشاعرہ پڑھا۔ ان کے والد انہیں عربی اور فارسی کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ مدرسہ عالیہ میں جب افسر نے پچاس میں سے بچپن نمبر حاصل کیے تو ان کے والد نے بدظن ہو کر انہیں مدرسے سے اٹھا کر دیوبند بھیج دیا۔ جہاں ایسے بیمار پڑے کہ علاج کے لیے میرٹھ واپس آنا پڑا۔ صحت یاب ہوئے تو والد نے انہیں جامعہ الازہر' قاہرہ بھیجنے کا پروگرام بنایا لیکن پاسپورٹ نہ بن سکنے کی وجہ سے رہ گئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول میرٹھ میں براہ راست نویں جماعت میں داخلہ ملا۔ شتم پشتم آگے بڑھے۔ ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا' جہاں تپ محرقہ نے آ دبوچا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بورڈنگ ہاؤس میں ان کا کمرہ ملک بھر کے شعراء کی آماجگاہ تھا۔ جگر اور فانی اکثر ان کے مہمان رہے۔ میٹرک کے بعد نائب تحصیل داری کو ٹھوکر ماری تھی۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ جوبلی کالج' لکھنؤ میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ جہاں سے ۲۳ برس بعد ۱۹۵۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے آخری زمانے میں کالج کے وائس پرنسپل تھے۔ علی گڑھ سے شائع ہونے والے ادبی رسالہ "نو بہار" اور میرٹھ کے اخبار "اکلیل" کے مدیر رہے۔ ناقد۔ بات بے بات کھو کھلی ہنسی ہنسنے والے افسر میرٹھی نے بچوں کے شاعر کے طور پر بے پناہ شہرت پائی لیکن خود' عقد ثانی کے باوجود' لاولد ہی رہے۔ آخری ایام انتہائی عسرت میں بسر کیے۔ تپ دق کا شکار تھے۔ یو۔ پی اردو اکادمی اور حکومت نے کچھ مالی امداد کی۔ آخر بغرض علاج لکھنؤ میڈیکل کالج کے شعبہ تپ دق میں داخل کیے گئے۔ وہیں ۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء کی سہ پہر میں انتقال ہوا۔ تجہیز و تکفین اگلے روز ۲۰ اپریل کو ہوئی۔ قدیم اطبائے لکھنؤ کے خاندانی قبرستان' محلہ جھوائی ٹولہ کی مٹی میں مٹی ہو گئے۔

اولین تخلیق:

ایک اردو غزل: ۱۹۱۶ء

اولین افسانہ:

۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	"چار چاند" (۴ افسانے)	میرٹھ	طبع اول: ۱۹۱۷ء
۲۔	"ڈالی کا جوگ" (افسانے)	انڈین پریس' الہ آباد'	طبع اول: ۱۹۲۷ء
۳۔	"آنکھ کا نور" (افسانے)	ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس' میرٹھ'	طبع اول: ۱۹۳۲ء
۴۔	"پرچھائیاں" (افسانے)	دانش محل' لکھنؤ'	طبع اول: ۱۹۳۳ء
۵۔	"پیام روح" (شاعری)	انڈین پریس' الہ آباد'	طبع اول: ۱۹۳۷ء
۶۔	"جوئے رواں" (شاعری)	انڈین پریس الہ آباد'	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۷۔	"ماہ نو" (از رابندر ناتھ ٹیگور کا ترجمہ)	کتاب خانہ عزیزیہ' دہلی'	طبع دوم: ۱۹۲۳ء

یہ ٹیگور کی کتاب "کریسنٹ مون" کا ترجمہ ہے جو میرٹھ سے پہلی بار ۱۹۱۸ء میں طبع ہوا۔ اس کی اشاعت پر ٹیگور کے ناشر میک میلن کمپنی' برطانیہ نے ہرجانے کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اس مشکل کا حل بھی خود ٹیگور ہی نے نکالا۔

۸۔	"حکایات گاندھی"	سنگم کتاب گھر' دہلی'	طبع اول: ۱۹۵۴ء
۹۔	"نقد الادب" (تنقید)	بھارگو اسکول بک ڈپو' لکھنؤ'	طبع اول: ۱۹۳۶ء
۱۰۔	"نورس" (تنقید)	بھارگو اسکول بک ڈپو' لکھنؤ'	طبع اول: ۱۹۳۶ء
۱۱۔	"حق کی آواز" (شاعری۔ جنگ عظیم سے متعلق نظمیں)	لکھنؤ'	طبع اول: ۱۹۳۲ء
۱۲۔	"ہفت منظر" (ڈراما)	لکھنؤ'	طبع اول: ۱۹۳۲ء
۱۳۔	"کتابوں کی جنگ" (تنقید)	لکھنؤ'	طبع اول: ۱۹۳۸ء
۱۴۔	"ہمارا جھنڈا" (قومیات)	لکھنؤ'	طبع اول: ۱۹۵۸ء
۱۵۔	"پندرہ اگست" (قومیات۔ تاریخ تحریک آزادی)	لکھنؤ'	طبع اول: ۱۹۴۷ء
۱۶۔	"گاندھی جی کے ساتھ" (مہاتما کے اقوال)	لکھنؤ'	طبع اول: ۱۹۶۰ء
۱۷۔	"آسمان کا سایہ" (عملی نفسیات۔ بچوں کے لیے)	الہ آباد'	طبع اول: ۱۹۵۴ء
۱۸۔	"جانوروں کی عقل مندی" (بچوں کے لیے)	سنگم کتاب گھر' دہلی'	طبع اول:
۱۹۔	"گلیور کا سفرنامہ" (سوئفٹ کی کتاب کا ترجمہ)		

غیرمدون:

غیر مطبوعہ کتب میں ایک مسدس "رزم آخر" اورنگ زیب اور دارشکوہ کی جنگ سے متعلق' ایک طویل مثنوی "آدم نامہ"' تنقید سے متعلق ایک کتاب "ذوق ادب کی تربیت" اور نامکمل آپ بیتی' جسے ۱۹۶۷ء میں قلم بند کرنا شروع کیا تھا۔

حامد اللہ افسر

میوہ فروش

سیٹھ فاروق بمبئی کے مشہور تاجروں میں تھے۔ ان کے مال و متاع کا اندازہ مشکل تھا۔ ان کے مقدر کی قسم کھائی جاتی تھی۔ مٹی میں ہاتھ ڈالتے تو سونا ہو جاتی۔ وہ بمبئی کی سب سے بڑی جہازراں کمپنی کے مالک اور ایک بین الاقوامی بنک کے سب سے بڑے حصہ دار تھے۔ بمبئی کے علاوہ ان کی ایک کپڑے کی مل احمد آباد میں بھی تھی۔ اور وہاں کا مشہور ترین دیاسلائی کا کارخانہ انہیں کے روپے سے چل رہا تھا۔ سیٹھ صاحب یوں تو بمبئی کے روشن خیال طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر بخیل اور متکبر مشہور تھے۔ ایک پیسہ بھی خیرات نہ کرتے۔ خدا کے غریب اور نادار بندوں کا ان کے یہاں گزر نہ تھا۔ اس کے برخلاف نورانہ سیٹھ صاحب کی بیوی بڑی دین دار اور مخیر تھی۔ یوں تو وہ ایک غریب گھرانے کی بیٹی تھی۔ مگر بہت کشادہ طبیعت۔ کبھی کسی کو مصیبت میں نہ دیکھ سکتی تھی۔ گھر کے اخراجات میں سیٹھ صاحب بہت تنگ دل تھے۔ نورانہ گھر میں تنہا تھی۔ کوئی بات کرنے والا نہ تھا۔ میاں بیوی کی مزاج میں بعد المشرقین تھا۔ انس و محبت کا پتہ نہ تھا۔ میاں بیوی ایک ستار کے دو ایسے تار تھے۔ جو ہم آہنگ اور ہم ساز نہ ہو سکتے تھے۔

(۲)

جنگ یورپ کو ختم ہوئے ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے۔ دنیا اقتصادی الجھنوں میں گرفتار تھی۔ بڑے بڑے زبردست بنکوں کی بنیادیں ہل رہی تھیں۔ اور نئی نئی قسم کے کاغذی سکے جاری ہو رہے تھے کہ یکایک سیٹھ فاروق کے بین الاقوامی بنک کا دوالہ نکل گیا۔ ساری ملیں اور کارخانے اسی میں ہضم ہو گئے۔ تمام جائیداد ہاتھ سے نکل گئی۔ اور جو شخص تاجروں کا بادشاہ کہلاتا تھا۔ وہ آن کی آن میں فقیر ہو گیا۔

چار روز سے سیٹھ فاروق کا پتہ نہیں۔ سارے بمبئی میں کہرام مچ رہا تھا۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اکثر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ مطالبات پورے نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے روپوش ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ نہ تھی۔ مطالبات کی پوری رقم ادا ہو جانے کے بعد ایک مکان بچ گیا تھا۔ نورانہ پر ان تمام واقعات کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ مال و متاع کے جانے کا اسے غم نہ تھا کہ اس نے اس نعمت کی کبھی بہار نہ دیکھی تھی۔ اسے جو کچھ غم تھا۔ وہ سیٹھ صاحب کی روپوشی کا تھا۔ نورانہ اور سیٹھ صاحب کی شادی کو بیس برس سے زیادہ ہو گئے تھے۔ آپس میں محبت نہ تھی۔ لیکن کوئی خاص اختلاف بھی نہ تھا۔ مدت کے ساتھ سے ایک قسم کی ہمدردی اور رفاقت بھی موجود تھی۔ خلاف امید جدائی نے عورت کے سینے میں محبت کے خاموش جذبات کو مشتعل کر دیا۔

نورانہ پچھتا رہی تھی۔ "میں نے ان کی قدر نہ جانی۔ میں نے ان کی کوئی خدمت نہ کی۔ گھر میں سکھ اور چین نصیب ہوتا تو وہ آج اس طرح خود کو دنیا میں تنہا سمجھ کر کہیں چلے نہ جاتے۔ میں بغیر ان کے اس گھر میں کیوں رہوں۔ در و دیوار کھانے کو آتے ہیں خدا جانے وہ کب آئیں گے۔ ممکن ہے میرے منہ میں خاک۔ وہ کبھی نہ آئیں۔ اب کیا کروں اور کہاں جاؤں ...... نہیں میں اپنے شوہر سے جدا نہ رہ سکوں گی۔ ان کا پتہ کس سے پوچھوں؟ مگر پتہ کی کیا ضرورت ہے تلاش اور طلب صادق کو پتہ کی ضرورت نہیں پردہ! اب پردہ کس کے لئے کروں؟"

(۳)

اس واقعہ کو پانچ سال ہو گئے۔ لوگ سیٹھ فاروق کا نام بھی بھول گئے۔ گویا وہ دنیا میں تھا ہی نہیں۔ رات بھر کی بارش کے بعد صبح نمودار ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبک اور ہلکی ہلکی لطیف ہوا نہا کر آ رہی ہے۔ سورج کی کرنوں نے شام پور کے بازاروں کی دیواروں پر ایسا ملمع کر دیا تھا کہ جس میں زندگی کی جھلک معلوم ہوتی تھی۔ ایک میوہ فروش میلا سا تھیلا لٹکائے۔ ہاتھ میں انگوروں کی پٹاریاں لئے "کابل کا میوہ" بیچتا پھرتا تھا۔ اس کے چہرے پر مسرت اور راحت کا اثر نمایاں تھا۔ یہ سیٹھ فاروق تھا۔ فاروق نے اس قصبے میں اپنا نام بدل دیا تھا۔ داڑھی بڑھالی تھی۔ اس کو "عارف" کے نام سے قصبہ کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ وہ دن میں دو گھنٹے پھل اور مختلف میوہ جات گلیوں میں پھیری لگا کر فروخت کرتا تھا۔ اول اول اسے چار پانچ گھنٹے تک گشت لگانا پڑا۔ لیکن اب اس کے گھر سے نکلتے ہی لوگ جوق جوق ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور وہ بہت جلد سودا فروخت کر کے اپنی جھونپڑی میں داخل ہو جاتا ہے۔ میوہ فروشی سے جو نفع حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس کے گزارے کے لئے کافی تھا۔

عارف کو بڑی راحت نصیب تھی۔ اس کی سادہ زندگی مسرت اور شادمانی سے ہم کنار تھی۔ لیکن اب تکلیف دہ خیال نے اس کی خوشی کو ملال سے بدل دیا تھا۔ وہ نورانہ کے لئے بے چین تھا۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا تھا۔ "میں نے کم بخت نورانہ پر ظلم کیا ہے۔ وہ میرے ساتھ کبھی آرام و آسائش سے زندگی بسر نہ کر سکی۔ اور وطن چھوڑتے وقت بھی میری خود غرضی نے مجھے اس کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا"۔ عارف ایک مرتبہ بھیس بدل کر بمبئی گیا بھی تھا۔ لیکن وہاں نورانہ کا کچھ پتہ نہ چلا۔ صرف یہ معلوم ہوا کہ سیٹھ فاروق کے غائب ہو جانے کے بعد وہ بھی کہیں چلی گئی۔

(۴)

ایک روز کا ذکر ہے کہ عارف میوہ فروش صبح کے وقت اپنی جھونپڑی میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت میلے اور پیوند لگے کپڑے اور ایک پرانی چادر اوڑھے گھونگھٹ نکالے ہوئے آئی اور گڑگڑا کر کہا۔ "عارف خدا نے تیری دعا میں اثر دیا ہے تو خدا کا نیک بندہ ہے۔ میں دکھیاری ہوں۔ میرا خاوند پانچ برس سے لاپتہ ہے۔ تو خدا سے دعا کر وہ مجھے میرے عزیز شوہر سے ملا دے۔ یہ عورت نورانہ تھی۔ عارف نے نورانہ کی آواز نہ پہچانی۔ شاید یہ ہو کہ مصیبتوں کے ہجوم نے نورانہ کی آواز پر بھی کچھ اثر کیا ہو۔

مگر اتنا ضرور ہوا کہ عارف کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کہیں کھو گیا ہے۔ آخر اس نے اپنے جذبات پر قابو پا کر کہا۔ "بی بی تم کون ہو۔ کہاں کی رہنے والی ہو۔ تمہارے خاوند کا کیا نام ہے۔ وہ کیوں چلا گیا؟"

نورانہ نے یہ آواز ضرور کہیں سنی ہے۔ وہ جھجکی مگر پھر سنبھل کر بولی۔ "خدا کے نیک بندے میرے خاوند کا نام سیٹھ فاروق ہے۔"

عارف۔ "کون! کیا تو نورانہ ہے؟ نورانہ! نورانہ! جسے تو عارف میوہ فروش سمجھ رہی ہے وہ خود تیرا بچھڑا ہوا خاوند فاروق ہے۔"

○

مسز عبدالقادر

نام : زینب خاتون
قلمی نام : مسز عبدالقادر
پیدائش : ۱۸۹۸ء بہ مقام جہلم۔
وفات : ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۹ء بہ مقام لاہور
تعلیم :

گھر پر ہی معلم اور معلمات کے ذریعے سے ہوئی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق پیر نیک عالم ایڈوکیٹ سے اردو اور عربی کے علاوہ فارسی میں "گلستان" "بوستان" "پندنامہ" اور "کریما" ابتدائی کتب تھیں جو گھر پر ہی پڑھیں۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کے والد کا نام مولوی فقیر محمد تھا جو " آفتاب محمدی" " صحیفہ سیف الصارم " اور " حدائق الحنفیہ " کے مصنف ہیں۔ یہ ایک علمی گھرانہ تھا۔ مسز عبدالقادر کی دادی بیراگن کے قلمی نام سے پنجابی میں سی حرفی اور بارہ ماہ لکھتی تھیں۔ ننھیال اونچی ذات کا کشمیری گھرانہ تھا۔ مسز عبدالقادر کے والد مولوی فقیر محمد اپنے وقت کے جید عالم (فاضل دیوبند) اور دینی راہنما ہونے کے ساتھ ساتھ " سراج المطابع " جہلم اور " سراج الاخبار " جہلم کے مالک و مدیر تھے۔ مسز عبدالقادر کا بچپن جہلم میں گزرا۔ اپنی والدہ کی طرح سیاحت کا شوق بلکہ جنون بچپن سے تھا اور ساری زندگی ویران اور سنسان جگہوں کو دیکھنے کی شائق رہیں۔ اپنے گھر والوں سے اپنے کھانے پینے کے برتن ہمیشہ الگ رکھے۔ گوشت اور مچھلی کو کبھی چھوا تک نہیں اور ان سے ہمیشہ کراہت محسوس کی۔ یہاں تک کہ اگر ریزگاری ہاتھ سے چھو جاتی تو فوراً ہاتھ دھوتیں۔ آسمان پر اڑتے پھرتے بادلوں میں انہیں طلسماتی شہروں کی پر پیچ گلیاں، معروف و متحرک بازار، محلات اور وسیع و عریض ہیکل دکھائی دیتے تھے۔ اپنے گھر کی چھت پر لگی ہوئی پھول دار چھینٹ اور چھت کی کڑیوں میں بھی ویران کھنڈر اور تصوراتی جہان آباد دیکھتی تھیں۔ مظاہر فطرت چاند، سورج، ستارے، ہوا، آگ اور پانی کو دیکھ کر پہروں مقام حیرت میں گم رہتیں۔ لڑکپن میں ہر وقت سوچتے رہنے کی عادت سے لاغر ہو گئیں تو ڈاکٹر میر ہدایت اللہ اور حکیم قاضی عزیز احمد کے زیر علاج رہیں۔ پیر نیک عالم پلیڈر (جو ان کے فارسی کے استاد بھی تھے) کے مشورے پر پیر حافظ محمد عبداللہ آف بھاگووال کے ہاتھ بیعت کروائی اور شاید انہی کے مشورے کے مطابق ساڑھے تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی برادری ہی کے ایک پختہ عمر جوان رعنا (ریلوے انجینئر) میاں عبدالقادر سے ہو گئی لیکن ذہنی انتشار اسی طرح قائم رہا۔ اپنے میاں کے ساتھ کلکتہ، بنارس، دلی اور آگرہ کی جی بھر کر سیاحت کی، یہاں تک کہ پورا ہندوستان دیکھا، کنکھل کے مندر، ہیم کوڈا، ہری ہر آشرم، رشی کیش، سرسوتی کنڈ، لچھمن جھولا، سورگ آشرم، اجنتا، ایلورا اور ایلی فنٹا کے غار، دولت آباد، گولکنڈہ، گوالیار، رہتاس، اور کرکشا کے قلعہ جات ملاحظہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہندومت، شومت، برہمن مت، ہنومت، نیل مت، بدھ مت، جین مت، اور اگنی مت وغیرہ کی رسومات کے مطالعہ کے ساتھ پوتھیوں، پرانوں اور شاستروں کے مہاتی نسخہ جات کھنگال ڈالے لیکن رہیں راسخ العقیدہ مسلمان اور پابند صوم و صلوٰۃ۔ حج کیا، زیارات پر حاضری دی۔ یورپ دیکھا، لبنان، قاہرہ اور مصر میں رہیں۔ سراج الدین ظفر سمیت تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کی خوشیاں دیکھیں، فالج کے مریض میاں کے سوگ میں بیٹھیں

اور کہانیاں لکھیں۔ لیکن وہ بے کلی جوں کی توں رہی اور اس سے آخر دم تک نبھی۔ اٹھتر برس کی عمر تک یہ معمول رہا کہ موسم سرما' ساحل سمندر پر۔ موسم گرما پہاڑی مقامات پر' اپریل اور اکتوبر جہلم میں اور باقی وقت راول پنڈی' پشاور اور لاہور میں گزارتی تھیں۔ ان کے ایک شاعر بیٹے سراج الدین ظفر نے ادب میں نام کمایا۔ پہلا دل کا دورہ جاں لیوا ثابت ہوا اور ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں لاہور میں انتقال کرنے کے بعد شاہ بدر دیوان کے قبرستان واقع باغبانپورہ' لاہور میں مستقل ٹھکانہ بنایا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"لاشوں کا شہر" مشمولہ "لاشوں کا شہر اور دوسرے افسانے" لگ بھگ ۱۹۳۰ء میں لکھا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "لاشوں کا شہر اور دوسرے افسانے" اردو بک سٹال' لاہور' طبع اول: ۱۹۳۶ء

۲۔ "صدائے جرس" (آٹھ افسانے) اردو بک سٹال' لاہور' طبع اول: ۱۹۳۹ء

۳۔ "راہبہ اور دوسرے افسانے" (تین افسانے) اردو بک سٹال' لاہور' طبع اول: ۱۹۳۶ء
طبع دوم: ۱۹۴۸ء' طبع سوم: ۱۹۵۱' طبع چہارم: ۱۹۵۴ء' طبع پنجم: ۱۹۵۶ء' (اس کتاب میں "راہبہ" "" کاسہ سر" اور "شگوفہ" تین طویل مختصر افسانے ہیں)

۴۔ "وادی قاف اور دوسرے افسانے (افسانے) اردو بک سٹال' لاہور' طبع اول: ۱۹۵۴ء
پانچویں بار یہ مجموعہ شعاع ادب چوک انار کلی' لاہور نے بغیر سنہ اشاعت کے شائع کیا ہے۔

۵۔ "تخت باغ" (ناول) مکتبہ تعمیر ادب' راول پنڈی' طبع اول: ۱۹۶۰ء
دوسری بار یہ ناول شعاع ادب لاہور نے شائع کیا۔

غیرمدون:

ان پانچ مطبوعہ کتب کے علاوہ چار ناول نامکمل حالت میں یادگار چھوڑے۔ (۱)

نظریہ فن:

"میں نے کبھی کسی کہانی کا پلاٹ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی بلکہ جب کبھی مجھے کسی کہانی کے پلاٹ کی ضرورت پڑے تو میں کسی ویران اور سنسان کھنڈر میں چلی جاتی ہوں تو وہاں ماحول کے تاثرات سے کہانی کا پلاٹ خود بخود سوجھ جاتا ہے۔ مگر اس کہانی کو قلم بند کرنے کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے۔ کیونکہ میں ایک جگہ تو ٹک کر بیٹھتی ہی نہیں۔ میرے پاؤں میں چکر ہے اور لکھنے کا وقت نہیں نکال سکتی۔"

(مسز عبدالقادر)

○

(۱) بہ حوالہ "خود نوشتہ حالات زندگی" از مسز عبدالقادر (کل چار صفحات غیر مطبوعہ) مملوکہ: مرزا حامد بیگ۔

مسز عبدالقادر

بلائے ناگہاں

حیدر میرا بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے اور دونوں نے ایک ہی سکول میں تعلیم پائی تھی۔ سکول چھوڑنے کے بعد اس نے کٹھ کی تجارت اختیار کی اور اس تجارت کی وجہ سے اس کی بیشتر زندگی کافرستان میں گزری۔ اب وہ ایک دولتمند شخص کی حیثیت سے آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر باوجود اس آسودہ حالی کے اس کی زندگی غیر مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ اسے کسی کام میں دلچسپی نہ تھی۔ وہ سوسائٹی سے متنفر تھا۔ سوائے میرے کسی سے زیادہ میل جول نہ رکھتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اس کی افسردگی کا راز معلوم کروں مگر موقعہ نہ ملا۔ ایک دفعہ فصل کے موقعہ پر میرا اپنے حصہ داروں سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور مجھے اپنے گاؤں جانا پڑا۔۔۔۔ وہاں جا کر میں زمینداری کی بندھنوں میں ایسا گرفتار ہوا کہ دو سال تک چھٹکارا نہ ہوا۔ اس عرصہ میں حیدر سے میری خط و کتابت جاری تھی۔ اس کے خطوں سے اکثر وحشت اور مایوسی کا جذبہ ٹپکتا تھا۔ دو سال بعد جب میں واپس آیا تو میں نے سنا کہ حیدر بالکل گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ دو تین دن تو گھر کے معمولی کام کاج میں صرف ہو گئے۔ تیسرے دن شام کے قریب میں اس کے گھر گیا۔ میرا لڑکا سلیم میرے ہمراہ تھا۔ حیدر کی حالت دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن رہا تھا۔ اس کا رنگ مٹیالا اور جلد بدنما طور پر خشک ہو رہی تھی۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے خوف و ہراس کی علامات ظاہر تھیں۔۔۔۔۔۔ مجھے دیکھ کر ایک مردہ سی مسکراہٹ اس کے پژمردہ ہونٹوں پر کھیل گئی۔ میں اسے دیر تک حیرت سے تکتا رہا۔ میری حالت سے آگاہ ہو کر وہ مری ہوئی آواز سے کہنے لگا "کیا دیکھ رہے ہو" میں خاموش رہا وہ دوبارہ بولا "آؤ! تم نہیں جانتے میری زندگی کس عذاب میں ہے۔ میں نے آج تک اپنا راز تم سے پوشیدہ رکھا۔ مگر اب زیادہ دیر تک یہ میرے دل میں نہیں رہ سکتا' میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔"

(۲)

سلیم کمرے سے ملحقہ لائبریری میں رنگین پنسلوں سے تصویریں بنانے میں مصروف تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ حیدر کہنے لگا۔ "سکول چھوڑنے کے بعد میری دوستی ایک ایسے شخص سے ہوئی۔ جو کافرستان میں کٹھ کی تجارت کرتا تھا۔ یہ شخص انتہائی نیک نفس اور دوست نواز تھا۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا اور تجارت کا کام انجام دینے میں اسے بہت دقت ہوتی تھی۔ اس لیے اسے ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اس کے ماتحت کافرستان کے علاقہ میں دورہ کر کے کٹھ فراہم کرنے میں اس کی مدد کرے۔۔۔۔۔۔۔ ان دنوں میری عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی میں بالکل ناتجربہ کار تھا' تاہم اس نے مجھے دیانتدار اور محنتی پا کر تجارت میں حصہ دار بنا لیا اور میں نے اپنا کام اس قدر شوق اور محنت سے کیا کہ سال کے اندر اندر ہماری تجارت چمک اٹھی۔۔۔۔ انہی ایام میں ایک دفعہ میں اپنے کوہستانی ملازم کے ہمراہ دورہ کرتا ہوا رستہ بھول کر ایک غیر آباد علاقہ میں جا پہنچا۔ گو یہ علاقہ نہایت سرسبز تھا' میوے سے لدے ہوئے درخت ہماری خوراک کے لیے بکثرت موجود تھے اور پیاس بجھانے کو چپہ چپہ پر حیات بخش چشمے جاری تھے۔ لیکن رات کو سر چھپانے کے لیے جگہ ملنی دشوار تھی۔۔۔۔ تمام دن ہم جنگلوں میں بھٹکتے رہے حتیٰ کہ شام

قریب ہو گی۔ شکست خوردہ آفتاب دن بھر کی خجالت سے زرد رو ہو کر لیلائے شب کی سیاہ فام زلفوں میں منہ چھپانے لگا۔ جنگلی پرندے شور غل مچاتے ہوئے اپنے گھونسلوں کے ارد گرد طواف کرنے لگے' اور گھنے درختوں کی وجہ سے جنگل بے حد تاریک ہونے لگا۔۔۔۔۔ ہم اندھا دھند آگے بڑھتے گئے۔ یکایک جنگل ختم ہو گیا۔

ہم تاریک فضا سے باہر نکلے تو افق کے دلکش مناظر سے ہماری آنکھیں روشن ہو گئیں۔ ہم ایک شاداب و زرخیز میدان کے کنارے کھڑے تھے۔ کہیں دور سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ہم اس طرف بڑھے اور تھوڑی دیر میں ایک جھونپڑی کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔۔۔۔۔ جھونپڑی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی دودکشی سے دھوئیں کے بلغارے نکل رہے تھے۔ اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشگوار مہک اٹھ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے دستک دی۔ ایک خشک رو منحوس صورت شخص نے دروازہ کھولا۔ میں نے رات بسر کرنے کی درخواست کی۔ اس نے ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر ایک خوفناک قہقہہ لگاتے ہوئے اندر آنے کا اشارہ کیا۔۔۔۔۔ اس خوفناک قہقہے سے میرا دل ہل گیا۔ طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے۔ مگر تھکان سے مجبور ہو کر چپ چاپ اس کے پیچھے ہو لیا۔ جھونپڑی کی اندرونی حالت بہت ردی تھی۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ ہر چیز پر سیاہی مائل گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں ایک شکستہ تخت پر بٹھایا اور خود ہمارے کھانے کے بندوبست میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے بھنا ہوا گوشت اور مکی کی روٹیاں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میرے ملازم نے میرا بستر ایک طرف لگا دیا۔ مگر میرا دل سونے کو نہ چاہتا تھا۔ مجھے اس منحوس صورت آدمی کی آنکھوں میں شقاوت مسکراتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بدگمانی کے زیر اثر میرے دل میں ایک نامعلوم خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ وہ قہوہ لے آیا۔ نیند کو دور کرنے کے لیے میں نے خوب قہوہ پیا۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے سخت نیند کے جھونکے آنے لگے میں نے چاہا کہ ملازم کو خبردار رہنے کی تاکید کر کے خود سو جاؤں مگر دیکھا تو وہ پہلے ہی گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ میں نے اسے آوازیں دیں۔ جھنجھوڑا مگر بے سود۔ مجھ پر نیند کا غلبہ زیادہ ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ارد گرد کی چیزیں دھندلی نظر آنے لگیں۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔۔۔۔۔ رات کو مجھے نہایت خوفناک خواب دکھائی دیے۔ میں نے دیکھا کہ چند دیوزاد آدمی مجھے کندھے پر اٹھائے ہوئے کہیں لے جا رہے ہیں۔ یکایک میرے سر میں سخت ٹیس اٹھی ایک تشنجی کیفیت سے میرے پٹھے اینٹھنے لگے۔ دوران خون سر کی طرف زیادہ ہونے سے دماغ پھٹنے لگا۔ سخت تکلیف سے میری آنکھ کھل گئی۔ اف! پناہ بخدا' میں نے ایک ایسا بھیانک منظر دیکھا کہ میرا خون خشک ہو گیا۔ بدن کے روئیں سوئیوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ اور دل ایک بڑے کلاک کی مانند ٹک ٹک کرنے لگا۔۔۔۔۔ آہ! میں ایک تیرہ و تار ڈراونی غار میں ایک لمبی سی چوبی میز پر چت پڑا ہوا تھا۔ میری مشکیں کسی ہوئی تھیں اور سرہانے کی طرف ایک زبردست الاؤ جل رہا تھا۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی سرخ تھرکتی ہوئی روشنی میں دیواروں پر مہیب سائے ناچ رہے تھے۔ غار دوزخ کی بھٹی کی طرح لال اور گرم تھی۔ سخت گرمی سے میرا سر چکرا رہا تھا۔۔۔۔۔ میز کے قریب ایک دیوزاد آدمی کھڑا تھا۔ جس کا بالوں سے بے نیاز سر ایک پشاوری تربوز کی طرح بڑا تھا۔ اس کا سرخ چہرہ جس پر جلادوں کی طرح بڑے بڑے سیاہ لمبے گلپھے تھے۔ انگاروں کی لال روشنی میں خون سے رنگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک لمبا شکاری چاقو پکڑے کسی کو کچھ احکام دے رہا تھا۔ انتہائی دہشت سے میری زبان حلق میں دھنس گئی اور سانس رک رک کر آنے لگی۔۔۔ اتنے میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ جسے سنتے ہی سرخ چہرہ جلاد نے اپنا مضبوط ہاتھ اٹھایا اور چاقو سے میرے سر میں گھاؤ لگانے لگا۔ میں شدت خوف سے پہلے ہی نیم جاں ہو رہا تھا۔ زخموں کی تکلیف سے بے ہوش ہو گیا۔

(۳)

مجھے ہوش آیا' تو میں ایک صاف ستھرے کشادہ کمرے میں ایک آرام دہ بستر پر پڑا تھا۔ کمرے میں بالکل سکوت تھا۔ ایک طرف آبنوسی وردکھے پر رکھے ہوئے پیتل کے بڑے سے چراغ میں چنبیلی جل رہا تھا' جس کی کیف آور روشنی عطر کے قرابے لنڈھا رہی تھی۔ چاند کی حسین

کرنیں کھلی کھڑکی سے داخل ہو کر فرش زمین پر لوٹ رہی تھیں۔ میرے سر اور گردن کے پیچھے اکڑے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے سب واقعات یاد آنے لگے اور غار والا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ سرہانے کی طرف ایک سایہ سا دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں۔ فوراً کسی نے شفقت بھرا ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر ٹوٹی پھوٹی پشتو میں کہا۔ "طالع مند نوجوان' تمہیں اپنی زندگی اور جوانی مبارک ہو۔ تمہاری اس طویل اور مسلسل غشی نے مجھے تمہاری زندگی سے مایوس کر دیا تھا۔ مگر آج آٹھ دن کے بعد تمہیں ہوش میں دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔ اب کچھ فکر نہیں تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔۔۔۔۔" دلجوئی کے الفاظ سن کر میں نے مطمئن نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک چالیس سالہ وجیہہ اور شکیل آدمی تھا۔ اس نیک دل انسان کی بڑھی ہوئی ہمدردی اور ان تھک خدمت گزاری سے میری صحت بہت جلد عود کرنے لگی' اور میں بتدریج صحت یاب ہو تا گیا۔۔۔۔۔ دوران علالت میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے محسن کا نام جواں بخت ہے۔ اور وہ ایک قبیلے کا سردار ہے۔ میرے استفسار پر جواں بخت نے مجھے ایک عجیب و غریب داستان سنائی۔ اس نے کہا: "اس علاقہ میں کئی ایک ایسی وادیاں ہیں' جو ہنوز دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ ہر ایک وادی کا راستہ اتنا خفیہ اور پر اسرار ہے' کہ کوئی اجنبی ان میں داخل نہیں ہو سکتا' اور ہر وادی میں جدا جدا قبیلے آباد ہیں۔ چنانچہ یہ وادی بھی' جس میں میرا قبیلہ آباد ہے۔ اسی طرح کی ایک پوشیدہ وادی ہے۔ اور یہاں سے ایک دن کی مسافت پر ایک اور ایسی ہی پوشیدہ وادی ہے۔ جس میں ایک رہزنوں کا قبیلہ آباد ہے۔ ان کی سردار ایک عورت ہے۔ جس نے جوانی کا جوہر ایجاد کیا ہے۔ اٹھارہ سے پچیس سال تک کی عمر کے نوجوانوں کے سر سے وہ اس جوہر کو کیمیاوی طریقے سے حاصل کرتی ہے' اور اس جوہر کے اثر سے باوجود سن رسیدہ ہونے کے ابھی تک جوان اور نوخیز نظر آتی ہے۔ اس جوہر کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے ملازم مختلف علاقوں میں اس غرض کو چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ کسی طرح نوجوانوں کو اس کے لیے فراہم کریں۔۔۔۔۔ ان اسیر نوجوانوں کو اس کے ملازم منشیات سے بے ہوش کر کے خفیہ غاروں میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ عورت ان کے سروں سے جوہر کشید کرتی ہے۔" میں نے پوچھا "آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں۔" اس نے کہا "جوانی میں مجھے بھی ایک دفعہ اس کے آدمی پکڑ کر لے گئے تھے۔ لیکن میرے قبیلے کو اس غار کا کسی طرح کھوج مل گیا' اور اس نے شبخون مار کر مجھے عین اس وقت چھڑایا۔ جبکہ ایک سرخ چہرہ جلاد میرے سر کو زخمی کر رہا تھا"۔۔۔۔۔۔ جواں بخت نے کلاہ اتار کر اپنا سر مجھے دکھایا جس پر جا بجا بڑے بڑے سفید داغ تھے۔ پھر کہنے لگا "میں نے اب اس علاقہ میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ جب کوئی نووارد ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ تو مجھے اطلاع مل جاتی ہے اور میں چھاپہ مار کر ان نوجوانوں کو بچا لیتا ہوں۔ مگر وہ عورت احتیاطاً غاریں بدلتی رہتی ہے۔ مگر میں ہمیشہ کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ جس دن رہزن تمہیں اس ڈائن کے پاس لے جا رہے تھے۔ مجھے جاسوسوں نے مطلع کیا۔ جس پر میں نے کئی ایک غاروں میں تمہیں تلاش کیا۔ اور آخر کار ایک غار پر حملہ کر کے تمہیں نجات دلوائی۔ میں کئی دفعہ اس عورت پر حملہ کر چکا ہوں مگر وہ ہر دفعہ میرے ہاتھ سے بچ کر صاف نکل جاتی ہے۔ کاش مجھے اس کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے اور میں ہمیشہ کے لیے دنیا کو اس ڈائن کے وجود سے پاک کر دوں۔"

(۴)

میں تقریباً چھ ماہ جواں بخت کی وادی میں مقیم رہا۔ کئی دفعہ واپسی کا ارادہ کیا مگر اس کی بے لوث محبت میرے لیے زنجیر پا ہو گئی۔ چھ ماہ بعد میں نے دل کڑا کر کے اس سے اجازت طلب کی۔ وہ کچھ سوچ کر بے دلی سے کہنے لگا تم شوق سے جا سکتے ہو۔ مگر تمہیں یہاں سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر جانا ہو گا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ "یہ کیوں؟" وہ لجاجت سے بولا۔ "عزیز من تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ کہ یہ ایک پوشیدہ وادی ہے' اس لیے سوائے اپنے قبیلے کے کسی اور کو ان خفیہ راستوں کا راز بتانا ہمارے اصول کے خلاف ہے اور اس اصول میں بے قاعدگی کی وجہ سے نقصان کا سخت خطرہ ہے۔۔۔۔۔۔ کیونکہ اگر ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کی وادی کا راستہ معلوم ہو جائے' تو وہ شبخون مار کر وادی میں گھس آتے ہیں

اور قبیلے کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ گو مجھے تم پر کوئی بدگمانی نہیں مگر اپنے قبیلے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ ان کے قائم کردہ اصول کی خلاف ورزی میری طاقت سے باہر ہے۔" میں نے افسردگی سے کہا "تو پھر کیا میں یہاں کبھی نہ آ سکوں گا" "میرے خیال میں کبھی نہیں۔" اس نے کہا میں نے کہا "لیکن آپ کی ملاقات" وہ میری بات کاٹ کر بولا "یہ بھی تقریباً ناممکن ہے" ------ اس ناگوار گفتگو نے مجھے مایوس کر دیا مجھے اس سے دلی الفت تھی۔ اس لیے اس کے فیصلے سے میرے دل پر گہری چوٹ لگی' اور میرے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ رویا تو نہیں مگر اس کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ اس کے اضطراب کا شاہد تھا۔ وہ گاؤ تکیے پر کہنیاں ٹیکے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے شگفتہ چہرے پر سماوی تجلیاں نمایاں تھیں---- کامل وقفہ کے بعد اس نے سر اٹھایا اور اپنی نکھری ہوئی منور پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہایت ملامت سے کہنے لگا۔ "ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اگر تم میرے مذہبی طریقے پر قسم اٹھا کر میری برادری میں شامل ہو جاؤ تو میرے قبیلے کو اطمینان ہو جائے گا۔" میں نے اس شرط کو فوراً منظور کر لیا---- دوسرے دن جواں بخت نے اپنے تمام قبیلے کی دعوت کی' اور سب کے سامنے ایک نیم عریاں کاہن نے جواں بخت کی چھنگلیا سے چند قطرے خون نکال کر ایک طشتری میں ٹپکائے۔ پھر اپنی خاص زبان میں اس خون پر مجھ سے قسم لی گئی۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر میری وجہ سے جواں بخت کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے تو روحیں مجھے بھی وہی سزا دیں۔

اس کے بعد نیم عریاں کاہن کی ہدایت کے بموجب میں نے اس مقدس خون کو چکھا' اور اس رسم کے اختتام پر جواں بخت نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد قبیلے کے سب لوگ یکے بعد دیگرے میرے گلے ملے اور خوشیاں مناتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اگلے دن مجھے وادی کا راز بتا دیا گیا اور جاتی دفعہ جواں بخت نے تاکید کی کہ جب تک میری عمر ۲۵ برس سے تجاوز نہ کر جائے' اس علاقہ میں اکیلا یا کسی اجنبی کے ہمراہ سفر نہ کروں۔ جواں بخت کے خاص آدمی مجھے اس جگہ پہنچا گئے جہاں میرے حصہ دار کا ہیڈ کوارٹر تھا------- یہ خطہ جواں بخت کی وادی سے دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔ میرا حصہ دار جو میری زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ مجھے زندہ و سلامت پا کر بہت خوش ہوا---- جواں بخت کی دوستی سے میری تجارت کو بہت فائدہ پہنچا۔ کیونکہ جواں بخت کی وادی میں کٹھ بہت کثرت سے پائی جاتی تھی۔ اس کے آدمی ہمیشہ کٹھ پہنچاتے رہتے۔ انہی آدمیوں کے ساتھ میں بھی ہر دوسرے تیسرے مہینے جواں بخت سے ملنے جایا کرتا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے' میری عمر ۲۵ برس سے تجاوز کر گئی۔ اب میں بغیر محافظوں کے بے کھٹکے اس علاقے میں سفر کرنے لگا---- ایک دفعہ میں جواں بخت کو ملنے جا رہا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹی سی کوہستانی سرائے میں میری ایک خوش پوش مسافر سے ملاقات ہوئی' یہ شخص بڑا باتونی تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے ذکر کیا کہ فلاں راستے سے آتے ہوئے کئی دفعہ اس ندی کے کنارے جو نشیبی گھاٹی کے عمق میں ہے اس نے پریوں کو گاتے دیکھا ہے۔ اس وقت تو میں نے اسے جھٹلا دیا مگر دوسرے دن سفر کرتے ہوئے راستے میں مجھے اس ندی کا خیال آیا جو یہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔ میں نے گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا---- ندی کے کنارے گیا تو کہیں دور پار سے ہلکی ہلکی دلکش آواز جو نسیم بہار کی نرم رو لہروں پر مستی بکھیر رہی تھی سن کر میرے دل میں گدگدی پیدا ہونے لگی۔ میں نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ برساتی ندی میں پانی بہت کم تھا میں باسانی اسے عبور کر کے پار کے گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اب گیت کہیں قریب ہی سنائی دیتے تھے---- یہ نشاط انگیز راگنی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے آگے بڑھ کر معلوم ہوا کہ جنگل کو وسط سے کاٹ کر چھوٹا سا میدان بنایا گیا ہے' اور اس میدان میں ایک خوشنما جھونپڑی ہے جس کے ارد گرد خوش رنگ پھلواڑیوں کی بساط بچھی ہوئی ہے۔ قریب گیا تو فرط حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سوسن کی پھلواڑی میں ایک پری جمال حسینہ ایک پہاڑی ساز پر دلکش لے میں گیت گا رہی تھی اور چند کوہستانی لڑکیاں پاؤں میں گھنگرو باندھے اس کے سامنے ناچ رہی تھیں۔ اس حسینہ کو دیکھ کر میں پھڑک گیا۔ اس کی بڑی بڑی خوشنما صدفی آنکھوں سے ایک ایسا کیف کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ جس کی تیز رو میں میرے ہوش و حواس تک بہہ گئے--- مجھے دیکھ کر انہوں نے راگ رنگ ختم کر دیا۔ حسینہ نے مجھے بلا کر بڑے اخلاق سے اپنے قریب بٹھایا اور ٹوٹی پھوٹی پشتو میں باتیں کرنے لگی۔ جب میرے حواس قدرے درست ہوئے تو میں اس حسینہ سے نام وغیرہ دریافت کیا۔ "وہ کہنے لگی میرا نام مہ لقا ہے میں ایک کوہستانی رئیس کی لڑکی ہوں۔ والدین کے انتقال پر میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔ یہ جگہ کبھی میرے باپ کی شکار گاہ تھی یہاں اپنی کنیزوں کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہی

ہوں۔۔۔۔۔"

میں نے تمام دن اس حسینہ کی صحبت میں گزارا۔ خوشی کے لمحے چٹکیوں میں گزر جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ دن کی ڈھلتی چھاؤں وقت کی رفتار کا پتہ دینے لگی۔ مہ لقا سے رخصت ہو کر میں جواں بخت کی وادی کی طرف ہو لیا۔ میں ابھی تک محبت کی چاشنی سے نا آشنا تھا۔ آج پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میں اپنا دل اس لڑکی کو دے چکا ہوں۔ جواں بخت کی ملاقات کے بعد میں اپنے ڈیرے واپس آیا تو مہ لقا کی جدائی دن بدن مجھے شاق گزرنے لگی۔ بہت کوشش کی کہ اس کو بھول جاؤں مگر دل نہ مانا اور آخر کار اپنے کاروبار سے بد دل ہو کر زیادہ تر جواں بخت کے پاس رہنے لگا۔ جواں بخت میری اس تبدیلی پر متعجب تھا۔ لیکن میں نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے عشق کا راز اس سے چھپائے رکھا۔۔۔۔۔ مہ لقا کی جھونپڑی جواں بخت کی وادی سے زیادہ دور نہ تھی۔ اس لیے اکثر اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی وہ اکثر جائے رہائش دریافت کرتی۔ مگر میں نے کبھی اس سے جواں بخت کا ذکر نہ کیا۔ اسے ہمیشہ اپنے ڈیرے کا پتہ دیتا۔ جو میرے کاروبار کا مرکز تھا۔ یہ سن کر وہ بدگمانی سے منہ پھیر لیا کرتی۔ کیونکہ وہ ڈیرا یہاں سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔۔۔۔۔ ایک دن جب کہ اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا وہ بے اعتباری سے کہنے لگی۔ "تمہاری محبت کا میں کیسے یقین کر سکتی ہوں۔ جب کہ تم اپنی جائے رہائش تک مجھ سے چھپا رہے ہو۔" ندامت سے جھٹ بے سمجھے بوجھے میرے منہ سے نکل گیا۔ "دوسرے کا راز میں نہیں بتا سکتا۔" میرے اس جواب پر وہ اپنی حسین آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "تو آپ مجھے اس قدر ذلیل سمجھتے ہیں۔ کیا میری ذات سے کسی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔۔۔۔" درحقیقت آنسو عورت کا زبردست ہتھیار ہے۔ جسے دیکھ کر مضبوط سے مضبوط ارادے کا مرد بھی زیر ہو جاتا ہے۔ آہ میں بھی ان صدفان گوہربار کو دیکھ کر بے تاب ہو گیا اور ان خوشنما آنسوؤں نے مجھے مغلوب کر لیا۔ افسوس میں نے اپنا مقدس عہد توڑ کر اسے اس وادی کا راز بتا دیا۔

(۵)

رات کسی بد عہد گنہگار کے دل کی طرح تاریک تھی۔ جس کی نحوست سے کائنات دھواں دھار ہو رہی تھی۔ تیسری تاریخ کا نیا چاند افق کی تاریک گہرائیوں میں کھو چکا تھا تارے سیاہ بادلوں میں گم ہو چکے تھے۔ تمام دنیا ایک کالے دیو کی مٹھی میں بند معلوم ہوتی تھی۔ جواں بخت اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ مگر میری آنکھوں میں نیند مفقود تھی۔ ایک نامعلوم خطرہ مجھے قریب تر معلوم ہو رہا تھا۔ کسی مبہم خوف سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں جسمی اذیت محسوس کرتے ہوئے اپنے کمرے میں بے چینی سے چکر لگاتا رہا۔۔۔۔ آدھی رات کے قریب یکایک ایک گرجدار آواز سے تمام وادی گونج اٹھی۔ اس پرہول آواز سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آہ یہ اس مہیب نقارے کی آواز تھی۔ جس پر خطرے کے وقت چوٹ پڑتی تھی۔ خطرے کے الارم پر تمام قبیلہ بیدار ہو گیا۔ جواں بخت کے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ اس نے نہایت عجلت سے ہتھیار لگائے اور مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔۔۔۔ یکدم رہزنوں کا ایک زبردست گروہ جواں بخت کے محل پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کمال بہادری اور جوانمردی سے لڑا مگر رہزنوں کے ٹڈی دل کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔ وہ مجروح ہو کر گر پڑا۔ رہزنوں نے اس کے ساتھ ہم سب کی مشکیں کس لیں اور ہمیں برق رفتار گھوڑوں پر لاد کر وادی سے نکال لائے۔۔۔ ابھی وہ وادی سے نکلے ہی تھے کہ جواں بخت کا باقی قبیلہ تعاقب کرتا ہوا آ پہنچا۔ چند میل کے فاصلے پر دونوں لشکر آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ ادھر میدان کارزار گرم ہو رہا تھا ادھر ہم قیدیوں کو ایک غار میں پہنچا دیا گیا۔ غار میں الاؤ جل رہا تھا' اور ایک بپھرے ہوئے شیر کے پنجرے کے قریب ایک عورت کھڑی تھی۔ اس عورت کو دیکھ کر میں حیرت و استعجاب سے اچھل پڑا۔ آہ وہ مہ لقا تھی۔۔۔۔۔ وہ غصے سے دانت پیس رہی تھی۔ حالت غیظ میں اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ ایک کونے میں وہی خوش پوش مسافر کھڑا تھا جو کبھی مجھے سرائے میں مل چکا تھا۔ جس نے مہ لقا کے اشارہ ابرو پر جواں بخت کی مشکیں کھولیں' اور اسے خوفناک شیر کے پنجرے میں ڈال دیا۔ مہیب شیر نے آناً فاناً جواں بخت کو اپنی مضبوط رانوں میں دبوچ کر ہلاک کر دیا۔۔۔۔۔ عین اسی وقت رہزنوں کے لشکر میں بھاگڑ پڑ

گئی۔ اور حملہ آور مار دھاڑ کرتے ہوئے غار کے قریب پہنچ گئے۔

خطرے کو بھانپ کر مہ لقا فوراً غار سے باہر نکلی۔ اور اپنی جماعت سمیت جنگل میں غائب ہو گئی۔ حملہ آور جب غار میں داخل ہوئے تو انہیں جواں بخت کا حسرتناک انجام دیکھ کر ازحد صدمہ ہوا۔ اس کی لاش واپس وادی میں لائی گئی جہاں نہایت احترام سے اسے سپرد خاک کیا گیا۔ چالیس دن تک اس کا قبیلہ سوگوار رہا۔ آخر چالیسویں کی رسوم پر جب کہ تمام قبیلہ جمع تھا۔ نیم عریاں کاہن نے کہا "بھائیو میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ تم میں سے غدار کون ہے۔ لیکن تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ غدار سزا سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ تم لوگ مقدس خون پر جواں بخت سے وفاداری کی قسم اٹھا چکے ہو' اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ جواں بخت کی عمر اس وقت پچاس سال کے قریب تھی۔ اس لیے پچاس سال کی عمر میں غدار پر اس مقدس قسم کی لعنت پڑیگی' اور وہ شیر کے ہاتھوں ہلاک ہو گا۔" نیم عریاں کاہن کے اس اعلان سے سب کے دل دہل گئے۔۔۔۔۔ کاہن کے ان الفاظ کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔ مگر حوصلہ کر کے دل کو برقرار رکھا اور دوسرے دن اپنے ڈیرے کی طرف واپس ہوا۔ میں مجرم تھا۔ میرا سکون قلب رخصت ہو چکا تھا۔ اب تجارت میں بھی میرا دل نہ لگا۔ میں تجارت چھوڑ کر اپنے دیس چلا آیا۔ چونکہ میں نے جواں بخت کی بدولت بے شمار دولت کمائی تھی۔ میں امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن میرا دل کبھی مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نیم عریاں کاہن کے الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ اب جس دن سے میرا پچاسواں سال شروع ہوا ہے خوف سے مجھے زندگی وبال ہو گئی ہے۔ رات کو شیروں کے دہاڑنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ شیروں کے خوفناک سائے دیواروں پر متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر ملک الموت کے سرد پاؤں کی چاپ محسوس کرتا ہوں۔ روحیں میرے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ جواں بخت کی کفن پوش لاش مجھے اشاروں سے بلاتی ہے' اور اسی خوف سے گوشہ نشین ہو رہا ہوں"۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حیدر کی داستان سن کر میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ "تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ ورنہ ایسی قسمیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں اور نہ ہی تم نے جان بوجھ کر غداری کی۔ ایسی فضول قسموں کا خیال نہ کرو۔ یہاں شہر میں شیر کہاں سے آئے گا۔" میں بہت دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ بارہ بجے کے قریب میں اٹھا۔ میرا خیال تھا کہ سلیم لائبریری میں سو رہا ہو گا۔۔۔۔ میں لائبریری کی طرف گیا۔ تو وہ کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔ "ابا میں نے چچا کی تمام باتیں سنی ہیں۔ وہ بہت ڈرپوک ہے۔" میں نے اسے آہستہ سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "سلیم ایسا نہیں کہا کرتے۔" وہ شوخی سے بولا۔ "وہ درحقیقت بہت ڈرپوک ہے۔ دیکھو میں نے اسے ڈرانے کے لئے دیوار پر کیا بنایا ہے"۔۔۔۔۔ میں نے دیوار کی طرف دیکھا۔ سلیم نے اس پر اپنی رنگین پنسل سے ایک بہت بڑے شیر کی تصویر بنائی تھی۔ تصویر کو دیکھ کر بے اختیار ہنس دیا۔ اور اسے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔

(٦)

چونکہ رات کو میں دیر سے سویا تھا۔ اس لیے صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ ابھی میں بستر میں ہی تھا کہ حیدر کی موت کی خبر پہنچی۔ اسے رات کو کسی درندے نے ہلاک کر دیا تھا۔ میں اس وقت حیدر کے مکان پر پہنچا۔ وہاں پولیس جمع تھی۔ حیدر کی لاش بستر پر نہایت ابتر حالت میں پڑی تھی۔ اس کی شاہ رگ کے قریب ایک بہت بڑا گہرا زخم تھا۔ اور کسی درندے کے خون آلود پنجے بستر کی سفید چادر پر صاف نمایاں تھے۔۔۔۔ میں سراسیمگی سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لائبریری میں جانکلا۔ اچانک مجھے سلیم کی بنائی ہوئی تصویر کا خیال آیا۔ مگر دیوار کی طرف دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔

سلیم کی بنائی ہوئی۔ شیر کی تصویر دیوار سے غائب تھی۔

جلیل قدوائی

نام : جلیل قدوائی۔
قلمی نام : جلیل قدوائی۔
پیدائش : ۶ مارچ ۱۹۰۴ء بہ مقام اناؤ (اودھ) بھارت۔
تعلیم : ایم۔ اے (اردو) الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۳۳ء

گورنمنٹ ہائی سکول ضلع اناؤ (اودھ) سے ایس۔ ال۔ سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ ایف۔ اے میں احسن مارہروی سے اردو کا مضمون پڑھا۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۲۶ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں ایم۔ اے (اردو) کرنے کی غرض سے الہ آباد یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۳ء میں اول درجہ میں ایم۔ اے (اردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

جلیل قدوائی نے میٹرک تک کا زمانہ اناؤ (اودھ) میں گزارا۔ چھٹے ساتویں درجے سے ہی اردو شعرو ادبیات کا ذوق پیدا ہوا۔ اناؤ کے قصبہ موہان میں حسرت موہانی' عزیز صفی پوری اور جگت موہن لال رواں جیسی شخصیات قیام پذیر تھیں اور اناؤ میں جگر مراد آبادی' اصغر گونڈوی' جعفر علی خان اثر اور عزیز لکھنؤی اکثر آتے تھے۔ یوں اناؤ کی فضا شعرو شاعری سے معمور تھی۔ جلیل قدوائی نے زمانہ طالب العلمی سے ہی شعر کہنے شروع کیے اور "نقیب" بدایوں اور "صوفی" پنڈی بہاؤ الدین میں شائع ہونے لگے۔

۱۹۲۲ء میں حصول علم کے لیے علی گڑھ چلے گئے جہاں سید سجاد حیدر یلدرم مسلم یونی ورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ یلدرم ان کے سب سے بڑے مربی اور محسن ثابت ہوئے۔ ہم جماعت طالب العلموں میں خواجہ منظور حسین اور خواجہ غلام السیدین بہت نمایاں تھے اور اسی زمانے میں انہیں کا ساتھ رہا۔ خواجہ منظور حسین اور خواجہ غلام السیدین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ادبی مجلّہ کے مدیر تھے' جن کے بعد جلیل قدوائی نے ادارت سنبھالی۔ اسی زمانے میں "ہزار داستان" اور "الناظر" جیسے وقیع ادبی جرائد میں شائع ہونے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد جلیل قدوائی کو ظفر الملک علوی صاحب نے اپنے جریدہ "الناظر" کی ادارت کے لیے لکھنؤ بلا لیا۔ لکھنؤ پہنچ کر جلیل قدوائی نے "الناظر" لکھنؤ کے کئی یادگار نمبر مرتب کیے۔ چند ماہ بعد یلدرم نے انہیں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے دفتر میں ملازمت کی پیش کش کی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ علی گڑھ منتقل ہو گئے جہاں ساٹھ سے سو روپے ماہوار پر انتہائی کسمپرسی کے عالم میں رہے۔ مضمون نویسی اور شاعری کے ذریعے ایک پروفیشنل رائٹر کے طور پر "مخزن" لاہور' "معارف" علی گڑھ' "صوفی" پنڈی بہاؤ الدین اور "نیرنگ خیال" لاہور کی معرفت ابھرے۔

۱۹۳۱ء میں جب ایم۔اے (اردو) کرنے الہ آباد گئے تو سر راس مسعود وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے نہ صرف دو برس کی طولانی رخصت حاصل کرنے میں مدد دی بلکہ دو برس کا وظیفہ خود منظور کرنے کے علاوہ سر عزیز الدین احمد سے بھی وظیفہ دلایا۔ ۱۹۳۳ء میں جلیل قدوائی کو مسلم یونی ورسٹی کی انتخاب کمیٹی کے ممبران ڈاکٹر سر محمد اقبال اور مولانا سید سلیمان ندوی کی مخالفت کے باوجود شعبہ اردو میں لیکچرر منتخب کر لیا گیا۔ لیکچر شپ پر تقرر ۱۵۰ روپے ماہوار پر ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں خان بہادر سید نجم الدین احمد جعفری نے مشاہرہ ۲۰۰ تا ۳۰۰ روپے ماہوار پر شعبہ

اطلاعات' حکومت ہند میں سرکاری اخبار نویس کے طور پر بلا لیا۔ یہاں جلیل قدوائی کا مشاہرہ پہلے سے کہیں بڑھ کر تھا اور ۱۹۴۰ء میں بطور اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر مشاہرہ ۴۰۰ تا ۶۰۰ روپیہ ماہوار تک پہنچ گیا لیکن ادبی لحاظ سے یہ سب کچھ ترقی ، معکوس ثابت ہوا۔ جلیل قدوائی جتنا کام کر سکتے تھے اتنا نہ کر سکے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی سے منسلک رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے قائم کردہ ادارے راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی' کراچی کے لیے بھی کام کرتے رہے۔ اب جلیل قدوائی عمر کے اس حصے میں ہیں جو کام کی نہیں آرام کی عمر ہے۔

اولین مطبوعہ تحریر مطبوعہ:

"صوفی" پنڈی بہاؤالدین: ۱۹۱۹ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "سیر گل" (طبع زاد و ترجمہ کردہ افسانے) زمانہ بک ایجنسی' کانپور' طبع اول: لگ بھگ ۱۹۳۰ء
روسی افسانہ نگاروں خصوصاً "چیخوف سے ماخوذ و ترجمہ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔
۲۔ "نقش و نگار" (نظمیں / غزلیں) سول اینڈ صدیق بک ڈپو' طبع اول: ۱۹۳۰ء
۳۔ "انتخاب حسرت" (غزلیات کا انتخاب) طبع اول: ۱۹۳۰ء
۴۔ "اصنام خیالی" (طبع زاد و ترجمہ کردہ افسانے) اختر پرنٹنگ ورکس' علی گڑھ' طبع اول: ۳۲۔۱۹۳۱ء
۵۔ "مونا وانا" (ڈراما از مارس میترلنک) اختر پرنٹنگ ورکس' علی گڑھ' طبع اول: ۳۳۔۱۹۳۱ء
۶۔ "دیوان بیدار" (تحقیق) ہندوستانی اکیڈمی' الہ آباد' طبع اول: ۱۹۳۸ء
اس کتاب کا مقدمہ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۳ء کے درمیان لکھا جو رسالہ "ہندوستانی" الہ آباد میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں میر و سودا کے معتبر معاصر میر محمدی بیدار کے کلام کو پہلی بار یکجا کیا گیا ہے۔ دیوان بیدار کے ایک نایاب نسخے کی "دیوان بیدار" (مملوکہ: احسن مارہروی) سے تقابلی مطالعے کے بعد اشاعت ہے۔
۷۔ "تنقیدیں اور خاکے"
۸۔ "تذکرے اور تبصرے" مطبوعہ: اردو اکیڈمی سندھ' کراچی'
۹۔ "مکتوبات عبدالحق" (ترتیب و تہذیب) انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی' طبع اول:
۱۰۔ "تذکرہ شعرائے بدنام" (ترتیب و تہذیب) اردو اکیڈمی سندھ' کراچی' طبع اول: نومبر ۱۹۶۵ء
یہ کتاب جرات' انشا' ناسخ' امانت اور رند لکھنؤی کے کلام کا انتخاب ہے۔
۱۱۔ "مرقع مسعود" (سر راس مسعود سے متعلق)
۱۲۔ "خیابان مسعود" (سر راس مسعود سے متعلق)
۱۳۔ "شعلہ ء مستعجل" (سر راس مسعود سے متعلق)
۱۴۔ "ماموں جان" (ڈراما از چیخوف کا ترجمہ) یہ "انکل وانیا" کا ترجمہ ہے۔

۱۵۔ "چند اکابر چند معاصر" (خاکے)
۱۶۔ "قطرات شبنم" (نثری نظمیں)
۱۷۔ "چشمہ ء آفتاب" (نثری نظمیں)
۱۸۔ "نوائے سینہ تاب" (شاعری) طبع اول: ۱۹۵۱ء
۱۹۔ "خاکستر پروانہ" (غزل، نظم، رباعیات و قطعات)
۲۰۔ "اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری" (مرتبہ: مولوی عبدالحق نظر ثانی: جلیل قدوائی) انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی،
۲۱۔ "حسن انتخاب" (ترتیب و تہذیب) طبع اول: ۱۹۴۳ء سے قبل
۲۲۔ "کارنامہ ادب" (ترتیب و تہذیب) طبع اول: ۱۹۴۳ء سے قبل

غیر مدون:

جلیل قدوائی کی اپنی مرتب کردہ محولہ بالا کتب کے علاوہ ان کے متعدد علمی مضامین اور لاتعداد خطوط غیر مرتب حالت میں موجود ہیں۔

نظریہ فن:

"مجھے کہانیوں میں زندگی کی اصلی نقاشی بہت پسند ہے، اسی لیے میں کوشش کرتا ہوں کہ بیتے ہوئے واقعات کی کہانیاں لکھوں، واقعہ خواہ واقعتہً "پیش آیا ہو" یا وہ صرف دماغی کیفیت ہو یا ذہنی جدوجہد وغیرہ، میں نے افسانوں کے لئے کبھی خود سے کیرکٹر نہیں تخلیق کیے۔۔۔۔۔ مختصر افسانہ زندگی کی بہتی ہوئی ندی کی ایک لہر ہے، جسے برف کی قاش بنا کر ادب کے برفستان میں محفوظ کر دینا چاہیے۔"

جلیل قدوائی
بہ حوالہ: "میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں" مرتبہ: حکیم محمد یوسف حسن
دارالادب، پنجاب، بارود خانہ، لاہور، طبع اول: س۔ ن

جلیل قدوائی

پتنگے

اختر' قصبہ۔ س۔۔۔۔۔ کا ایک نو عمر رئیس (جس کی جائداد حال ہی میں کورٹ آف وارڈس سے چھوٹی تھی) اور آنریری مجسٹریٹ' اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا ایک مقدمہ کا فیصلہ لکھ رہا تھا۔ کچھ دن پہلے مقدمہ کی کارروائی ختم ہو چکی تھی' اور صبح تک اسے فیصلہ لکھ کر سنا دینا اور مسل کو اپنے حاکم تحصیل کے پاس بھیج دینا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ پانی ابھی ابھی برس کر کھلا تھا۔ اختر نے کمرے کی کھڑکیاں کھول دی تھیں اور دروازوں پر پردے چڑھا دئے تھے۔ تاکہ ہوا آسانی سے کمرے میں آسکے۔ لیکن ہوا رکی ہوئی تھی اور کمرے میں نہیں آ رہی تھی۔ تیز روشنی دینے والا لمپ جس کے اوپر گلوب نہیں چڑھایا گیا تھا کمرہ کی دیواروں پر روشنی ڈال رہا تھا۔ دیواروں کے بعض حصوں پر روشنی نہیں پہونچتی تھی جہاں تصویریں لٹک رہی تھیں۔ ان حصوں پر تصویروں کے سائے تیڑھے ترچھے ہو کر پڑ رہے تھے۔ لمپ کی چمنی نے کمرے کی چھت میں ایک بڑا ہلکے زرد رنگ کا گول دھبا ڈال رکھا تھا۔ سامنے آتش دان کے کارنس پر رکھی ہوئی تصویروں کے شیشے چمک رہے تھے۔

اختر نے اب تک کب کا فیصلہ لکھ لیا ہوتا۔ وہ محنتی آدمی تھا اور وقت کا پابند اور ہر کام کو اپنے وقت کے اندر ختم کر لیتا تھا۔ مگر کبھی کبھی جب اس کی طبیعت خراب ہوتی تھی۔ تو مجبوراً" اسے اپنے اصول توڑنے پڑتے تھے اور وقت کے خلاف کام کرنا پڑتا تھا۔ ادھر دو دن سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ موسم کی تبدیلی اور ہوا کے وقت ناوقت چلنے نے اس کے جوڑ جوڑ میں درد پیدا کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ کام کرنے کے لائق نہ رہا اور آرام کرتا رہا تھا۔ دن کو اس نے فیصلہ لکھ لینے کا ارادہ کیا۔ مگر ٹھیک اس وقت جب وہ کام کرنے جا رہا تھا۔ اس کے چند دوست اس سے ملنے آگئے۔ جنہوں نے اس کے کئی گھنٹے خراب کئے۔ اس وجہ سے وہ کچھ نہ کر سکا تھا اور اب لکھنے بیٹھا تھا۔

یکایک ایک بڑا سا سیاہ چیونٹا جس کے پر نکل آئے تھے۔ معلوم نہیں کہاں سے اڑ کے آیا اور لمپ کے چاروں طرف چکر کاٹنے لگا۔ چکر کاٹ کر وہ اختر کے سامنے کاغذ پر آکے گرا۔ جسے اس نے پھونک کر اڑا دیا۔ اس کے بعد ایک پروانہ آیا اور طواف شمع کرنے لگا۔ اختر نے اسے بھی پہلے کیڑے کی طرح اڑا دینا چاہا۔ مگر یہ زیادہ مستقل مزاج بلکہ ضدی تھا اور اس کی کوشش کے باوجود وہاں سے نہ ہٹا۔ دیکھتے دیکھتے پر دار چیونٹے پروانے' جنگلی بوٹ اور بے شمار کیڑے اور پتنگے جن کے نام کسی کو نہیں معلوم 'لمپ کے گرد جمع ہو گئے اور لمپ کی سطح پر میزپوش پر' کاغذ پر رینگنے لگے اور دوات اور اس کی قمیص کے اندر داخل ہونے لگے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے باری باری اڑ کر کاٹنا بھی شروع کر دیا۔ کچھ سیاہ رنگ کے ارد کی دال کے برابر کیڑے اڑتے اڑتے تھک کے ایک جگہ گر پڑے اور دیر تک بے حرکت گویا دم سادھے مردے کی طرح پڑے رہے۔ ان میں سے ایک طرح کی بد بو آنے لگی۔ کچھ کیڑے اور پتنگے اس کے گریبان اور آستینوں کی راہ سے اس کے کپڑوں کے اندر گھس گئے۔ بعض اس کے منہ اور رخساروں پر طمانچے مارنے لگے۔ ایک سیاہ پتنگے نے اپنے آپ کو اس کے قلم کے راستے میں لا ڈالا اور اس بات پر مصر ہوا کہ یا وہ لکھنا بند کر دے یا اسے پامال کر ڈالے۔ ایک اور کیڑا اس کے ایک کے اوپر ایک رکھے ہوئے کاغذات کی تہ میں گھس گیا اور کاغذ اچھالنے لگا۔ اس نے کاغذ اٹھایا اور اسے پھونک کر اڑا دینا چاہا۔ مگر وہ اڑ کر کسی اور طرف جانے کے بجائے اس کے منہ کے اندر چلا آیا۔ جسے اس نے بڑی مکروہ صورت بنا کر تھوک دیا۔

"یہ اتنے سارے کیڑے آتے کہاں سے ہیں؟" اختر پریشان ہو کر سوچنے لگا۔

"جب روشنی نہیں ہوتی تو یہ کہیں ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتے اور چراغ جلتے ہی ہر طرف سے اپنی جان ہتھیلی پر لے کر دوڑتے ہیں۔ شاید یہ اسی وقت پیدا ہوتے اور اسی وقت مر جاتے ہیں اور اس بری طرح جان دینے میں آخر انہیں کیا مزہ آتا ہے؟ اللہ ہی ان دیوانوں پر رحم کرے اور انہیں سمجھ دے۔ انہیں کوئی کیسے بھگائے؟ آدمی ہاتھی پکڑ سکتا ہے اور شیر مار سکتا ہے اور میدان جنگ میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا خون بہا سکتا ہے۔ مگر پروانے نہیں اڑا سکتا۔ اس نے انہیں غور سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی ننھی جانیں تھیں۔ جن کی زندگی کا کوئی مقصد سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ اڑتے تھے اور پھڑپھڑاتے تھے۔ رینگتے تھے اور ٹھہر جاتے تھے۔ بہت سے پروانے جل کر مر چکے تھے۔ اور بہتوں کے پر ان کے بازوؤں سے الگ ہو کر میز پوش کی سطح پر پڑے تھے اور وہ خود پرواز کی قوت کھو کے شمع کے گرد صرف رینگنے پر اکتفا کر رہے تھے۔

مگر ایسے کوئی لطف بھی کب تک اٹھائے اختر نے سوچا "اس کے لئے فرصت کی ضرورت ہے اور اچھی صحت کی۔ میرے پاس نہ فرصت ہے نہ اچھی صحت۔ مجھے کام کرنا ہے۔ میرے جسم میں درد ہو رہا ہے۔ مجھے آرام کرنا ہے؟"..... اس نے پھر لکھنا شروع کیا۔ مگر پتنگے اسے کام سے پھر روکنے لگے۔ اسے مقدمہ کی روئداد پڑھنا تھی۔ وکیلوں اور گواہوں کے بیانات اور بحثوں پر غور کرنا تھا۔ قانونی موشگافیوں سے سر کھپانا تھا اور خیالات اکٹھا کرنے تھے۔ مگر فی الحال ان سب سے زیادہ دشوار اور بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پروانے کیوں کر اڑائے جائیں۔ وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اس نے پیاز کے کچھ ٹکڑے لیمپ اور میز پر رکھے۔ اس کے بعد اس نے کمرے کی سب کھڑکیاں بند کر دیں اور دروازوں کے پردے گرا دیئے۔ لیکن کیڑوں کی تعداد میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

آخر وہ کیا کرے؟ اس کے پاس صرف یہی رات تھی اور اسی رات اسے فیصلہ لکھ کر تیار کر لینا تھا مگر وہ کیونکر لکھے؟ اگر صبح تک اس نے فیصلہ نہ لکھ لیا اور کل نہ سنا دیا اور مسل کو تحصیل نہ بھیج دیا۔ تو اس کی بڑی ہتک ہو گی اور اس کی ساری ساکھ خاک میں مل جائے گی۔ وہ ایک باعزت رئیس تھا اور سارے حکام اور رعایا پر اس کا بڑا اثر تھا۔ معلوم نہیں فیصلے میں دیر ہوئی تو اس کا لوگوں پر کیا اثر پڑے۔ ان پتنگوں کو کیا معلوم کہ ان کے اس ننھے سے مشغلہ تفریح میں اس کے لئے کیسی تلخ مصیبت کا سامنا تھا۔ اسے غصہ سا آنے لگا۔ کمرے کی گرمی اور امس نے اس کے مزاج میں اور برہمی پیدا کی۔ وہ دروازہ کھول کر لیمپ کو باہر پھینک دینا چاہتا تھا۔ اس کی پیشانی سے پسینہ کے چند قطرے کاغذ پر ٹپک پڑے جن کے سیل رواں نے اس کی کوششوں پر پانی پھیر دیا اور اس کے لکھے ہوئے کو مٹانا شروع کیا۔ اس نے تنگ آ کر قلم کاغذ پر زور سے ٹیک دیا۔ جس نے کاغذ اور میز پوش پر کئی گل بوٹے کھلا دیئے ان گل بوٹوں نے اس کے دماغی توازن میں ہلچل پیدا کی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے لیمپ کو پھونک مار کر گل کر دیا۔

یکدم تاریکی چھا گئی۔ کوئی چیز نہ دکھائی دیتی تھی اور چمک یا روشنی کی ایک شعاع بھی کسی طرف سے نہ آتی تھی۔ صرف تاریکی۔۔۔۔۔ بے امان تاریکی۔ کسی فوٹو گرافر کے ڈارک روم سے زیادہ تاریک کیونکہ اس میں بھی دھیمی سرخ روشنی حیات کا پتہ دیتی ہے۔ ملٹن کی بیان کی ہوئی مشہور تاریکی سے زیادہ سیاہ تاریکی ہر طرف چھا گئی۔ کائنات جو گویا روشنی کے وجود کے ساتھ زندہ تھی سیاہ ہو گئی۔ یکدم جیسے چپ ہو گئی، مر گئی...... آہستہ آہستہ اختر نے کمرے سے باہر جانے کے لئے قدم بڑھائے اور دروازے کو ڈھونڈا اور آہستہ آہستہ ٹٹولتے ہوئے وہ اپنے سونے کے کمرے میں پہنچا اور بستر پر پڑ گیا۔ دن بھر سرد ہوا چلی تھی اور اس وقت بھی خنکی تھی اور دن پھر وہ ملاقاتیوں کے ساتھ تکلف سے بندھا ہوا، جکڑا ہوا، اپنی طبیعت پر جبر کر کے تکلیف سے بیٹھا رہا تھا۔ وہ آرام نہ کر پایا تھا۔ جس سے اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اب پروانوں نے آ کر اس کے دماغ میں ابتری پیدا کر دی تھی۔ اس نے بستر پر پڑے پڑے کروٹیں بدلیں اور اپنے پیر بار بار دے مارے۔ اس کے دل و دماغ میں اس وقت ایک بے چینی تھی اور وہ اپنے کو ایک بہت بد قسمت آدمی خیال کر رہا تھا۔ "مجھے ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے... بہت کچھ.... مگر جب یہ پتنگے کچھ کرنے دیں۔" اس نے اپنے پیروں کے نیچے پڑا ہوا کمبل اٹھا کر اپنے بدن پر ڈال لیا اور سرہانے پڑا ہوا تولیا اپنے سر اور کانوں سے لپیٹ لیا۔

آہستہ آہستہ فضائے سیاہ کو چیر کر اس کمرے کی ہر چیز اس میں سے ابھرنے لگی اور صاف نظر آنے لگی۔ اس کے سرہانے اس کی چھوٹی میز تھی۔ جس پر سفید جھالر دار میز پوش پڑا تھا۔ داہنی طرف دیوار سے برابر لگے ہوئے بید کے مونڈھوں کی قطار تھی۔ سامنے کی دیوار سے لگی ہوئی

اس کی سنگار میز تھی۔ جس کا بڑا صاف آئینہ تاریکی میں چمک رہا تھا....ادھر دوسرے کمرے میں سے ستار کی لطیف اور دل ربا چھن چھناہٹ اور ہلکے رسیلے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ اس کی بیوی اور اس کی چھوٹی سالی تھیں جو موسیقی کی مشق اور آپس میں خوش فعلیاں کر رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں۔ کہ اختر کو اس وقت ان کے سریلے قہقہوں اور رسیلی آوازوں کے بجائے غمناک اور ترحم آمیز لہجوں' ہمدرد' غمگسار آوازوں کی ضرورت تھی۔ جو اس کے حال کو سنبھالیں ایک ایسے وجود کی ضرورت تھی جو اس کا حال پوچھے اور ممکن ہو تو...... اس کے پیر دبائے۔

"میرے پیر کون دبائے؟" اختر نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور پھر سوچنے لگا خیابان کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ جس طرح کمرے کی فضائے سیاہ میں سے ہر چیز آہستہ آہستہ ابھری اور اس کی آنکھوں کے سامنے آئی تھی۔ اس طرح اس کے دماغ اور خیال کی دنیا میں سے دبے ہوے گڑے ہوئے خیالات ابھرنے اور دیدہ دل کے سامنے آنے لگے۔ نہ معلوم کس طرح اسے ایک وہ رات یاد آگئی جب ہر طرف اس طرح کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس کی ماں اس کے باپ سے آہستہ آہستہ سرگوشی کر رہی تھی اور سسکیاں بھرتی جاتی تھیں۔ اسے صاف یاد آیا یہ وہ زمانہ تھا جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اسے ایک بے حد حسین لڑکی سے محبت ہو گئی تھی اور وہ اپنی ماں کی مرضی کے خلاف اس لڑکی سے شادی کرنے پر اصرار کر رہا تھا۔ مگر اس کی ماں کے آنسو اس کے جذبہ محبت پر غالب آئے تھے اور اس نے اس لڑکی سے شادی نہیں کی تھی اور اسے اس وقت نہ جانے کیوں یہ خیال کر کے افسوس ہونے لگا کہ اس کی شادی اس لڑکی سے نہیں ہوئی۔ جسے وہ اس قدر چاہتا تھا۔ جس کے لئے وہ دیوانہ ہو گیا تھا اور جو اب تک کنواری تھی۔ کیا اچھا ہوتا' اگر اس اپنی اس پہلی مایوس محبت کی یاد میں اپنی زندگی شادی کے بغیر گزاری ہوتی۔ لوگ اسے دیکھتے اور اسے ایک عجیب و غریب شخصیت سمجھتے' ایک پر راز ہستی جو ایک کھوئی ہوئی محبت کی یاد کو کلیجہ سے لگائے ہے اور اسی کے سہارے زندگی ختم کرنا چاہتا ہے۔

"مگر یہ کیا؟" اس نے خیال کیا۔ پتنگوں کو میری کھوئی ہوئی محبت سے کیا تعلق یہ خیالات میرے دل میں کیسے آئے؟" اور یہ وہ نہ سمجھ سکا۔ اس نے کروٹ لی اور اس کے جسم کی ہڈیاں چٹ چٹ بولیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے نیچے کا دھڑ اس کے بدن سے علیحدہ ہو گیا ہے اور اس کا نہیں ہے۔ کسی دوسرے کا ہے بستر پر اسے کل نہیں آ رہی تھی۔ اس کے دماغ کی کوئی کل بگڑ گئی تھی۔ اس کے خیالات میں ایک جنگ سی ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا' جیسے اس کے جسم کا ہر حصہ اس جنگ سے مغلوب ہے۔ وہ بستر سے اٹھا اور کمبل اور تکیے لے کر بستر کے نیچے فرش پر پڑ رہا تاکہ خیالات کی آمد کو روک سکے اور انتشار دماغی کو کم کرے لیکن ایسا نہ ہوا۔ اور اسے اپنی زندگی کے بعید سے بعید واقعات اور حادثات یاد آتے رہے۔ جیسے اس رات خیالات نے قسم کھا لی تھی کہ اس کی ساری گذشتہ زندگی اس کے سامنے لے آئیں گے۔----------

پورے دو گھنٹے گزر گئے۔

یکدم کہیں سے ایک روشنی نمودار ہوئی اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اس کی بیوی اپنے ہاتھ میں موم بتی لئے کمرے کے دروازہ کا پردہ ہٹا کر اندر آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک چھوکری کشتی میں چائے کا سامان لئے تھی۔ فوراً جیسے مردہ زندہ ہو جائے۔ اختر چونک پڑا اور سراسیمگی میں کمبل اور تکیوں کو اٹھا کے اپنے بستر پر آیا اور ایسے اہتمام سے چپ چاپ پڑ گیا۔ جیسے وہ گھنٹوں سے بے خبر پڑا سو رہا ہے۔

"میں سارے میں تمہیں ڈھونڈتی پھری کیا کام ختم کر لیا؟ ارے تم یہاں اندھیرے میں کیسے پڑے ہو؟ ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ میں تمہارے لئے چائے لائی ہوں۔" اختر نے اپنی بیوی کی یہ دلداریاں دیکھیں تو اس کا سارا انتشار دماغی اس ایک پر ترنم اور سکون آمیز صدا کی لطافت میں تحلیل ہو گیا۔

اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ فیصلہ نہیں لکھ سکا اور پھر کام کرنے بیٹھے گا۔ اس کی بیوی نے لیمپ روشن کیا۔ اسے چائے پلائی اور اس سے دیر تک پیار کی باتیں کر کے اس کا دل بڑھاتی رہی۔ خوب گہرے رنگ کی تیز چائے کی دو پیالیاں پی کر اختر کی جان

میں جان آئی پھر اسے نے کئی سگریٹیں سلگائیں اور ان کے دھوئیں اڑائے اور کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا....

کوئی گیارہ بجے کے قریب وہ اپنے دفتر کے کمرے میں پھر داخل ہوا اور میز کے سامنے بیٹھ کر دو بجے صبح تک خوب دھواں دار مضمون لکھتا رہا.... میز پوش پر پتنگوں کے پر اب تک پڑے تھے۔ مگر پروانے اڑنا اور باہر سے پتنگے آنا بند ہو گئے تھے۔

○

مجنوں گورکھپوری

نام : احمد صدیق
قلمی نام : مجنوں / مجنوں گورکھپوری
پیدائش : ۱۰ مئی ۱۹۰۴ء بہ مقام موضع پلدہ (بستی) ضلع گورکھپور (بھارت) (۱)
وفات : ۴ جون ۱۹۸۸ء بہ مقام کراچی، پاکستان
تعلیم : ایم۔اے (انگریزی) آگرہ یونی ورسٹی، آگرہ ۱۹۳۴ء
ایم۔اے (اردو) کلکتہ یونی ورسٹی، کلکتہ ۱۹۳۵ء

ابتدائی تعلیم سینٹ اینڈریوز سکول، گورکھپور میں پائی، جہاں سے ۱۹۲۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ انٹر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کالج، علی گڑھ سے ۱۹۲۷ء اور بی۔اے سینٹ اینڈریوز کالج گورکھ پور سے ۱۹۲۹ء میں کیا۔ درس نظامیہ اور بی۔اے تک کی تعلیم گورکھ پور، علی گڑھ اور الہ آباد میں حاصل کی۔

مختصر حالات زندگی:

مجنوں گورکھ پوری کے والد کا نام محمد فاروق دیوانہ تھا جو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر رہے۔ مجنوں کا خمیر موضع پلدہ (بستی) کی خاک سے اٹھا۔ یہ گورکھپور کی تحصیل خلیل آباد کا ایک دور افتادہ اور سیلاب زدہ گاؤں تھا جسے "ملکی جوت" بھی پکارا جاتا ہے۔ یہ مجنوں کا ددھیال تھا۔ ابتدائی تربیت خلیل آباد اور گھرے کے درمیان لکھنؤ جانے والی پختہ سڑک کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے گاؤں منجھریا میں ہوئی، یہ مجنوں کا ننھیال تھا۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں مجنوں کی ابتدائی زندگی کے چودہ برس گزرے۔ ان کا ددھیال علم و فضل اور فقر و درویشی میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتا تھا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں شادی ہوئی۔

مجنوں گورکھپوری کی زندگی کا بیشتر حصہ کالج اور یونی ورسٹی میں درس و تدریس میں گزرا۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

لیکچرر شعبہ انگریزی، سینٹ اینڈریوز کالج گورکھ پور ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۵ء

لیکچرر شعبہ انگریزی، سربراہ شعبہ تعلقات عامہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جولائی تا دسمبر ۱۹۳۵ء

لیکچرر (انگریزی و منطق) میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج گورکھپور، جولائی ۱۹۳۶ تا مئی ۱۹۳۷ء

پروفیسر انگریزی، صدر شعبہ اردو، سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور، جولائی ۱۹۳۷ء تا دسمبر ۱۹۵۸ء

صدر شعبہ اردو، گورکھپور یونیورسٹی ستمبر ۱۹۵۸ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر، علی گڑھ تاریخ ادب و ریڈر، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، نومبر ۱۹۵۸ء تا مئی ۱۹۶۸ء۔

۱۹۷۸ء تک کراچی یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔

اوائل جوانی میں مجنوں تخلص اختیار کر کے شاعری کی طرف مائل ہوئے لیکن پہچان افسانہ نگاری اور تنقید بنی۔ اولین طویل مختصر افسانہ "زیدی کا حشر" ۱۹۲۵ء میں مکمل کیا۔ اس سے قبل فلسفیانہ مسائل و مباحث سے متعلق مضمون نگاری کی۔ ۱۹۳۱ء میں ادبی مجلہ "ایوان" کا اجرا کیا۔ زندگی کا بیشتر وقت گورکھپور اور علی گڑھ میں گزرا۔ پہلی بار دسمبر ۱۹۶۷ء میں پاکستان تشریف لائے اور دوسری بار اپنی اکلوتی بیٹی اور آخری

اولاد تمینہ اور اس کے بچوں سے ملنے مئی ۱۹۶۸ء میں آئے۔ اس وقت تک فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ واپس جائیں یا یہیں کے ہو رہیں۔ یہاں تک کہ سوا برس تک ویزا بڑھواتے بڑھواتے آخر کار یہیں کے ہو رہے۔ ۱۹۷۸ء تک کراچی یونی ورسٹی میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے خدمات سر انجام دیتے رہے۔ دسمبر ۱۹۸۷ء میں مجنوں کے انتقال کی افواہ پھیلی۔ علی گڑھ، لکھنؤ اور گورکھپور میں تعزیتی اجلاس ہوئے۔ مجنوں نے اپنے انتقال سے متعلق خبر کی تردید علی سردار جعفری کو خط لکھ کر کی۔ مئی ۱۹۸۸ء میں یکلخت کمزوری بڑھنے لگی۔ ۳۰ مئی کو ہسپتال داخل کروایا گیا اور ۴ جون کو دل اور پھیپھڑے جواب دے گئے۔ ۴ جون کی صبح سات بج کر پچیس منٹ پر دنیا سے اٹھ گئے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"زیدی کا حشر" (طویل مختصر افسانہ) تین قسطیں مطبوعہ "نگار" قسط اول: مئی ۱۹۲۵ء، قسط دوم: جون ۱۹۲۵ء اور قسط سوم: جولائی ۱۹۲۵ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "خواب و خیال" (افسانے) صدیق بک ڈپو، علی گڑھ / انجمن لکھنؤ — طبع اول: ۱۹۳۲ء

۲۔ "سمن پوش اور دوسرے افسانے" (چھ افسانے) کتب خانہ علم و ادب، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۴ء

اس مجموعے کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں نکلا، جس کے کل ۱۵۲ صفحات ہیں۔ اس ایڈیشن میں "نگاہ بازگشت" (دوسرا مقدمہ: مرقومہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۲) "افسانہ کا افسانہ" (مطبوعہ: ایوان گورکھپور ستمبر ۱۹۳۴) "گریز" (پہلا مقدمہ: مرقومہ ۱۴ اگست ۱۹۳۴ء) کے علاوہ چھ افسانے بہ عنوان "دنیائے آب و گل سے دور" "سمن پوش" "بزبری" "حسن شاہ" "محبت کا جوگ" اور "تم میرے ہو" شامل ہیں۔

۳۔ "زیدی کا حشر" (طویل مختصر افسانہ) اردو اکیڈمی، ناگپور — طبع اول: ۱۹۴۶ء

۴۔ "نقش ناہید" (افسانے)

۵۔ "مجنوں کے افسانے" (افسانے۔ انتخاب) حالی پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ — طبع اول: ۱۹۳۸ء

۶۔ "سوگوار شباب" (افسانے۔ ترجمہ) ایوان اشاعت، گورکھ پور — طبع اول: ۱۹۴۱ء

۷۔ "صید زبوں" (افسانے۔ ترجمہ) ایوان اشاعت، گورکھ پور — طبع اول: ۱۹۴۴ء

۸۔ "سرنوشت" (افسانے) ادارہ اشاعت اردو: رزاقی مشین پریس، حیدر آباد دکن — طبع اول: ۱۹۴۴ء

۹۔ "سراب" (افسانے) ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد دکن — طبع اول: ۱۹۴۵ء

۱۰۔ "ہتیا اور دوسرے افسانے" (افسانے) حالی پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ — طبع اول: ۱۹۳۵ء

۱۱۔ "سنگھاسن بتیسی" (ہندی لوک کہانیاں) نو کشور، لکھنؤ — طبع اول: س۔ن

یہ کتاب ایوان اشاعت گورکھپور سے ۱۹۴۱ء میں بھی شائع ہوئی۔

۱۲۔ "افسانہ" (تنقید) ایوان اشاعت، گورکھپور — طبع اول: ۱۹۳۶ء

۱۳۔ "اقبال" (تنقید / فلسفہ) سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد — طبع سوم: ۱۹۵۳ء

۱۴۔ "تنقیدی حاشے" (تنقید) ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد دکن — طبع اول: ۱۹۳۵ء

۱۵۔ "تاریخ جمالیات" (تنقید تاریخ) انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی — طبع اول: ۱۹۵۹ء

۱۶۔ "زہر عشق" از نواب مرزا شوق (تالیف) ایوان اشاعت، گورکھ پور — طبع اول: ۱۹۴۰ء

نمبر	کتاب	ناشر	طبع
۱۷۔	"سالومی" از آسکر وائلڈ (ترجمہ / ڈراما)	کتابستان ' الہ آباد '	طبع اول: ۱۹۳۵ء
۱۸۔	"شوپنہار" (فلسفہ)		طبع اول: ۱۹۳۵ء
۱۹۔	"گردش" (ناولٹ)	کتب خانہ علم و ادب ' دہلی '	طبع اول: ۱۹۳۵
۲۰۔	"ادب اور زندگی" (تنقید / فلسفہ)	ایوان اشاعت ' گورکھ پور '	طبع اول:
۲۱۔	"نقوش و افکار" (تنقید)		
۲۲۔	"نکات مجنوں" (تنقید)		
۲۳۔	"شعر و غزل" (تنقید)		
۲۴۔	"دوش و فردا" (تنقید)	ادارہ انیس اردو '	طبع اول: ۱۹۵۹ء
۲۵۔	"غزل سرا" (تنقید)		
۲۶۔	"پردیسی کے خطوط" (تنقید ـ دو جلدیں)		
۲۷۔	"غالب: شخص اور شاعر" (تنقید)	مکتبہ ارباب قلم ' کراچی '	طبع اول: ۱۹۷۳ء
۲۸۔	"مریم مجدلانی" از مارس میٹرلنک (ترجمہ / ڈراما)	ایوان اشاعت ' گورکھپور '	طبع اول: ۱۹۳۷ء سے قبل
۲۹۔	"آغاز ہستی" از برنارڈ شا (ترجمہ / ڈراما)	ایوان اشاعت ' گورکھپور '	طبع اول: ۱۹۳۳ء سے قبل
۳۰۔	"ایوانخر" از ٹالسٹائی (ترجمہ)	یونائیٹڈ انڈیا پریس ' لکھنؤ '	طبع اول: ۱۹۴۴ء سے قبل
۳۱۔	"کنگ لیئر" از ولیم شیکسپیر (ترجمہ / ڈراما)	انڈین اکیڈمی ' دہلی '	طبع اول: س ـ ن
۳۲۔	"قابیل" از لارڈ بائرن (ترجمہ)	ایوان پریس: ایوان اشاعت ' گورکھپور '	طبع اول: س ـ ن
۳۳۔	"شمسون مبارز" از ملٹن (ترجمہ ـ رزمیہ)	ایوان اشاعت ' گورکھپور '	
۳۴۔	"حسن فطرت" از عبرت گورکھپوری (تالیف)		
۳۵۔	"ہندوستان کی بہادر عورتیں"		

نظریہ فن:

"میرے خیال میں فسانے کی اصل وغایت وہی ہے جو تمام فنون لطیفہ کی ہے 'یعنی حقیقت کو مجاز کے پردے میں اس طرح پیش کرنا کہ دنیا اس حقیقت کو پاسکے اور اس کی متحمل ہو سکے ـ فسانہ نام ہے حقیقت کی تلاش کا اور شاعری اور تصوف کی طرح فسانہ کی اصلیت بھی وہی ہے جو بہتر فرقوں کی جنگ کی ہے ـ یعنی "چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند"

فرق یہ ہے کہ یہ بہتر فرقے اس افسانے کو عین حقیقت سمجھتے ہیں اور ہم لوگ اس کو حقیقت کا "نعم البدل" جانتے ہیں۔"

مجنوں گورکھپوری

(دیباچہ "سمن پوش" طبع اول: ۱۹۳۴ء)

○

(۱) دستاویزی تاریخ پیدائش ۱۱ جنوری ۱۹۰۴ء ہے جو درست نہیں

مجنوں گورکھپوری

سمن پوش

"شہید زخم شمشیر تغافل اجہاوارد"

ناہید سے میرا تعارف لکھنؤ میں ہوا جب کہ میں نے پہلی بار اس کی تصویر اپنے ایک عزیز دوست ناصری کے کمرے میں دیکھی تھی۔ ناصری کو فن نقاشی سے خاص شغف تھا' جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ کوئی دلکش تصویر اس کی نظر سے گزر جاتی پھر ناممکن تھا کہ وہ اس کو کسی نہ کسی ذریعہ سے حاصل کر کے اس کی نقل نہ اتارتا۔ اس کو اس فن میں کافی مہارت ہو گئی تھی' اور مبصرین کی نگاہ میں وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ میں نے یہ جاننا چاہا کہ یہ کس کی تصویر ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ مگر خود ناصری کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ ایک مشہور دوکان سے خرید کر لایا تھا۔ اس سے مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کے ایک ماہر فن کی صنعت تھی۔ مصور کے نام کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا میں اس پیکر جمال میں محو ہو گیا جو صفحہ ء قرطاس سے مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خاموش مگر بلیغ تبسم تھا۔ چنبیلی کا ایک ہار اس کے سینے پر لٹک رہا تھا۔ انداز سے وہ ایکٹرس معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی کشش تھی جس نے میری آنکھوں کو مبہوت کر لیا 'گویا وہ کہہ رہی تھی " ٹھہرو! اور آغاز سے انجام تک میری داستان سن لو۔" 'اس کے رخسار گلابی تھے 'بکھرے ہوئے بال اس کے نیم برہنہ سینے سے کھیل رہے تھے اور میں خواب میں تھا یا واقعی ہوا میں چنبیلی کی مہک پھیلی ہوئی تھی؟ میں اپنے عالم محویت سے چونکا۔ ایک لرزش خفی میرے تمام اعصاب میں دوڑ گئی۔ میں وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا کہ ناصری جو اپنا سامان نقاشی لینے دوسرے کمرہ میں چلا گیا تھا واپس آگیا اور ناہید کی تصویر سامنے رکھ کر اس کا خاکہ کھینچنے لگا۔ میں رک گیا۔ ناصر کا قلم اپنی قدرت دکھا رہا تھا۔ میں غور سے مطالعہ کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تصویر میں ایک ناقابل بیان چیز ہے۔ جس کو کاغذ پر بجنسہ ظاہر کر دینا ناصری کا حصہ نہیں۔ البتہ جس صناع کا نام مجھے بتایا گیا تھا۔ وہ اس باب میں کامیاب ہوا تھا۔ اگر یہ واقعی اس کی صنعت تھی جس کا نہ مجھ کو اس وقت یقین تھا۔ نہ اب ہے۔ میں ناصری کے مکان سے خاموش روانہ ہو گیا۔ باہر برآمدہ میں پہنچ کر پیچھے دیکھا تو وہی دلفریب اور جاذب نظر صورت سامنے تھی' جو مجھ کو پکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مسکراہٹ جس میں تاثرات کی ایک دنیا پوشیدہ تھی' میرے حواس میں خلل پیدا ہو رہا تھا عجیب عجیب خیالات ذہن میں آرہے تھے۔ آخر کار خود اپنے توہمات سے خائف ہو کر برآمدہ سے نیچے اتر آیا اور اپنی اقامت گاہ کی طرف چلا۔ میں قیصرباغ کی طرف سے جا رہا تھا' یکایک میرے قلب کی حرکت خوفناک طریقہ پر تیز ہو گئی۔ میں حیران ہو کر جہاں تھا وہیں رک گیا' مجسمہ کے پاس بینچ پر بیٹھا ہوا کون پڑھ رہا تھا وہی سفید پوش عورت یہاں بھی سرنگوں بیٹھی تھی! اس کے گلے میں وہی چنبیلی کا ہار تھا۔ جس کے ساتھ وہ بلا ارادہ شغل کر رہی تھی۔ رعشہ براندام میں اس کی جانب بڑھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے وہ چونکی اور اس کی خمار آگیں آنکھوں نے ایک المناک تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا' باوجود دماغ کی پریشانی کے میں نے اس قدر جائزہ لے لیا کہ اس کا چہرہ زرد تھا' جسم کی ساخت نازک تھی' رنگ میں صباحت تھی' دوش تک وہ عریاں تھی' اس کی بلوری گردن دیکھنے والے کی آنکھوں میں تازگی پیدا کر رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے جھونکے اس کی شبنمی ساری میں شکن پر شکن ڈال رہے تھے' اور وہ ان کو برابر کرتی جا رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا راستہ چلنے والوں میں سے کوئی اور بھی اس زہرہ ارضی کو دیکھ رہا

تھا یا نہیں؟ لیکن کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی' اس لیے ہوئی کہ یہ کوئی ایسی صورت نہ تھی جو بغیر اپنا خراج لیے ہوئے کسی کو گزر جانے دیتی۔ میں کانپنے لگا' کیا اس کو میرے علاوہ کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا؟ کیا میرے مرکزی نظام عصبی میں کوئی اختلال رونما ہو چلا تھا؟ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں نے نفسیات' عضویات اور دیگر علوم جدیدہ کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ جس نے مجھ کو متشکک بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

اس منظر سے مجھ پر وہ ہیبت طاری ہوئی کہ میں بے ساختہ چلا اٹھا پھر دیکھا تو نشست خالی تھی۔ وہ عجیب الخلقت عورت وہاں سے جا چکی تھی اور چنبیلی کی شامہ نواز مہک بھی اپنے ساتھ لیتی گئی تھی۔ میں رگ رگ میں تکان محسوس کر رہا تھا۔ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا قیصرباغ سے باہر نکلا اور ایک تانگہ پر بیٹھ کر فرنچ ہوٹل میں کسی نہ کسی صورت سے پہنچ گیا۔ جہاں میں چند اپنے احباب کے ساتھ مقیم تھا۔ اپنی داستان اگر بیان کرتا مضحکہ کا نشانہ بنتا' لہٰذا میں نے اس تصویر کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ جس کو ناصری کے "نگار خانہ" میں دیکھ آیا تھا اور جس کی اثر آفرینیوں نے اس حد تک مجھ کو بے قابو کر دیا تھا۔ میرے احباب کی لغت میں زندگی نام تھا۔ صرف شاد کیشی کا' ہمارے بیشتر اوقات خوش باشیوں میں گزر جاتے۔ سیر و تفریح کی لذتوں اور مختلف دلچسپیوں نے "سمن پوش نازنین" کا تصور میرے ذہن سے مٹا دیا اور اگر کبھی اس کی یاد تازہ ہو جاتی تو میں اس سے پہلو بچا جاتا اس طرح دس بارہ روز گزر گئے۔

ایک روز ہم سب کو معلوم ہوا کہ الفریڈ تھیٹر آیا ہے۔ بالاتفاق یہ طے پایا کہ پہلی رات کا کھیل ضرور دیکھنا چاہیے' چنانچہ اس کا انتظام کیا گیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں تھیٹر دیکھ رہا تھا۔ مگر نہ تو تماشہ کی غایت کی طرف دھیان تھا' نہ اس پر تنقید کرنے کا ہوش' میں بس ایک چیز دیکھ رہا تھا' یعنی وہی عورت چنبیلی کا ہار زیب گلو کیے ہوئے ارکسٹرا میں بیٹھی ہوئی تھی اور محویت کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی' وہ تنہا تھی' اس کے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی' میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا۔ "اس کو دیکھتے ہو جو سامنے شبنمی ساری زیب تن کیے ہوئے بیٹھی ہے"؟ وہی جس کے گلے میں ہار ہے۔

میرے دوست نے نگاہ اٹھائی اور سر ہلا کر جواب دیا "نہیں تو! کہاں بیٹھی ہے؟"

"بالکل سامنے"۔ میں نے کسی قدر متحیر ہو کر پھر کہا "آرکسٹرا میں دیکھو وہ ہم کو دیکھ رہی ہے۔"

میرا مخاطب تعجب سے مجھ کو دیکھنے لگا "خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو؟ آرکسٹرا میں کوئی عورت نہیں ہے۔" اس نے مجھ سے کہا۔ "کوئی عورت نہیں!" اب مجھے ہوش آیا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "شاید مجھ کو مغالطہ ہوا" اور فوراً بحث بدل دیا۔ جب تک میں تھیٹر ہال میں تھا میرے احباب سمجھ رہے تھے کہ تماشہ دیکھنے میں مصروف ہے' مگر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی نظر اس جگہ سے ہٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ جہاں وہ اس متانت اور خاموشی کے ساتھ بیٹھی درد مند نگاہوں سے میری قوتوں کو سلب کر رہی تھی' آج اس کے سامان آرائش میں ایک چیز کا اضافہ نظر آ رہا تھا۔ یعنی ایک خوبصورت پنکھا جس کو کبھی کبھی جنبش دے دیتی تھی۔ رہ رہ کر ایسی پر حسرت انداز سے مسکراتی جس میں پوشیدہ تو بہت کچھ تھا لیکن جو اپنے راز کو افشانہ ہونے دیتا تھا۔ جب تماشہ ختم ہوا اور سب چلنے کے لیے کھڑے ہوئے تو وہ بھی اٹھی اور ساری کا آنچل ایک معصومانہ ادا سے سنبھالتی ہوئی' ہجوم میں غائب ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد میں نے شاہراہ پر پھر اس کی جھلک دیکھی' اس کا جسم اس قدر نازک تھا' وہ اس قدر کم عمر اور ناآزمودہ کار معلوم ہوتی تھی کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں ڈر رہا تھا کہ لوگوں کے اس طوفان میں کہیں اس کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے۔ "کیا یہ کوئی روح ہے جس کو کسی خاص غرض سے از سرنو اس دنیا کا قالب عطا کیا گیا ہے یا محض میرا واہمہ ہے جو مجھے پریشان کر رہا ہے۔" میں اپنے دل سے سوال کر رہا تھا۔ "لیکن اس کی صورت اس قدر غمگین اور آزردہ ہے کہ میرا دل اس کے لیے دکھ رہا ہے۔ خواہ وہ خواب ہی کی مخلوق کیوں نہ ہو۔"

اسی کشمکش میں جتلا اپنے دوستوں کے ساتھ مجمع کو پھاڑتا ہوا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے چھو کر مجھے چونکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک نازک ہاتھ میرے شانہ پر تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ آج میرے ذہن میں ایک تغیر رونما ہوا۔ یعنی میری دہشت دور ہو گئی اور مجھے خیال ہو گیا کہ یہ دلکش ہستی خیالی ہو یا مادی' عالم ارواح سے تعلق رکھتی ہو یا عالم اجسام سے' کسی نہ کسی غرض سے میرا تعاقب کر رہی ہے۔

میں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس کو دیکھ کر ڈروں گا نہیں بلکہ ہمت کے ساتھ واقعات کا ترتیب وار مطالعہ کروں گا اور مجھے اطمینان تھا کہ اگر استقلال سے کام لیا تو حقیقت کو ضرور بے نقاب کر سکوں گا۔

لکھنؤ میں پندرہ روز اور قیام رہا لیکن "سمن پوش" اس دوران میں پھر نظر نہ آئی۔ البتہ ناصری کے ساتھ جا کر میں نے اس کی تصویر کی ایک کاپی خرید لی جو میرے لیے ایک خاص اہمیت رکھنے لگی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ تصویر کو اصل سے کوئی مناسبت نہیں اور اس سے ناہید کی رعنائیوں اور دلربائیوں کا صحیح اندازہ کرنا محال تھا۔ اس کے بعد میں بارہ بنکی چلا آیا اور اپنی روزانہ مصروفیتوں میں ناہید کو پھر بھول گیا۔ میں نے اسی سال بی۔ اے کیا تھا اور دور تعطیل سے گزر رہا تھا جس سے سکول اور کالج کا زمانہ ختم کر کے کم وبیش ہر شخص کو گزرنا ہوتا ہے یعنی ابھی یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔

میرے ایک چچا کی لڑکی سائرہ ضلع سیتاپور کے ایک باوقار رئیس عبدالعلی کے لڑکے شمیم سے بیاہی ہوئی تھی۔ شمیم نے بھی اسی سال ایم۔ ایس سی کیا تھا اور چونکہ سرمایہ دار تھے اور کسب معاش کی فکر سے بے نیاز اس لیے ان کا ارادہ تھا کہ اپنی زمینداری کا انتظام کریں گے۔

ایک دن میری ماں کے نام سائرہ کی تحریر آئی جس سے معلوم ہوا کہ عبدالعلی صاحب نے حال ہی میں ایک نیا گاؤں مع ایک عالی شان عمارت کے خریدا ہے اور ان لوگوں کی خواہش ہے کہ ہم سب ان کی مسرتوں میں شرکت کریں۔ سائرہ کا اصرار تھا کہ کم از کم میں ضرور اپنی کیفیتوں سے اس کے لطف میں اضافہ کروں ورنہ وہ مجھے کبھی نہ معاف کرے گی۔ میں کہہ نہیں سکتا سائرہ کو میری مصاحبت میں کیا لطف ہو سکتا تھا جب کہ اکثر احباب کا خیال ہے کہ میری ہنسی مصنوعی ہوا کرتی ہے اور فی الحقیقت میرا خمیر المناکیوں سے ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں ہر قسم کی صحبت میں شریک ہو جایا کرتا ہوں، بہرحال سائرہ کو میری طرف سے حسن ظن تھا جو غلو کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ زندگی کے بیشتر فرحت ناک لمحے میری معیت میں گزریں۔ مجھے عذر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ وقت کاٹنے کے لیے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا میں نے فوراً سامان درست کر لیا، میری ماں البتہ چند اسباب کی بنا پر نہ جا سکیں۔

"جمال منزل" واقعی نہایت خوبصورت اور شاندار عمارت تھی۔ جو ایک وسیع احاطہ سے گھری ہوئی تھی۔ شمیم کی گاڑی نے جس وقت مجھے پیش گاہ میں لا کر اتارا تو میں اس کی شوکت سے مرعوب ہو گیا، جس نے ایسے دیہات میں اس "فردوس ارضی" کو اپنے لیے تعمیر کرایا ہو گا۔ اس میں ذوق سلیم اور حسن لطیف کہاں تک رچا ہو گا۔ اس کے علاوہ "جمال منزل" سے اس کے اصل مالک کی مالی استطاعت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ چونکہ میں شام کو پہنچا تھا اس لیے احاطہ اور باغ کی سیر صبح تک ملتوی رکھی گئی۔

عبدالعلی اور ان کی بیوی نے نہایت خلوص سے میرا خیر مقدم کیا۔ شمیم ضرورت سے زیادہ ہنس رہا تھا اور پھر بھی ان کو میری نظر نہیں آتی تھی۔ سائرہ نے سنجیدگی اور متانت سے اپنی خوشی کا اظہار کیا جیسا کہ اس کا دستور تھا۔ الغرض میرے آنے سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ کافی مسرور تھا۔

جب ہم رات کے کھانے پر بیٹھے تو ہماری گفتگو کا موضوع وہی گاؤں اور مکان تھا اور اس میں شک نہیں کہ موضوع دلچسپ ثابت ہوا۔ شمیم نے کہا "تم اس مکان پر اس حیثیت سے غور کرو کہ جس بدنصیب نے اس کو حوصلوں کے ساتھ تعمیر کرایا تھا وہ مصنف تھا، شاعر تھا، نقاش تھا، اور آج بیس برس سے زیادہ عرصہ گزرا ہے کہ اس نے خود کشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ تم اس کا نام جاننے کے لیے بے تاب ہو گے، اس کا نام "جمال الدین" تھا۔"

"جمال الدین" میں چونک پڑا۔ میں نے اس کے کچھ منتشر اشعار کا مطالعہ کیا تھا اور اس کا ایک ڈراما "ہذیان محبت" بھی پڑھا تھا جس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا تھا، یہ نہ جانتا تھا کہ وہ نقاش بھی ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان دی۔

سائرہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی، اور خوب واقف تھی کہ میرے اعصاب کتنے سریع الحس اور اثر پذیر ہیں۔ اس سے شمیم سے ناپسندیدگی کے لہجہ میں کہا۔ "آپ نے برا کیا۔ سہیل بھائی کے لیے تمام رات کروٹیں بدلتے رہنے اور سر دھننے کا سامان فراہم کر دیا۔ ابھی وہ سفر

سے ماندہ و خستہ چلے آ رہے ہیں۔ آپ نے ان کو راحت شب سے بھی محروم کر دیا۔"

"میں نے مسکرا کر کہا" نہیں انہیں اقصہ سننے کے لائق ہے۔ ہاں تو شمیم! یہ نہیں معلوم کہ ہمارا شاعر نقاش اپنی زندگی سے بیزار کیوں ہو گیا۔"

"میں ٹھیک نہیں کہ سکتا' سنا ہے اس کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی جس کو کسی نے واللہ علم کیوں قتل کر دیا۔ جمال الدین اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا اور غالباً ڈیڑھ سال کے بعد اس نے بھی اپنا عنصری جامہ اتار پھینکا۔ شاعروں بھی خفقانی اور اپنے دل کے غلام ہوتے ہیں اور ان کا کسی رو میں خود کشی کر لینا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔"

شروع سے آخر تک شمیم کے لہجہ سے تمسخر و استہزا ء پایا جاتا تھا' میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اس قدر بے حس ہوتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ " شمیم! تمہاری گفتگو نے تو مجھے بہت دکھ پہنچایا لیکن تم سے اس کے سوا امید ہی کیا ہو سکتی تھی' یہ کوئی تمہارا اپنا خیال نہیں' یہ مرض عالمگیر ہے' جو ساری دنیا میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ جو انسانیت اور الوہیت دونوں کو کائنات سے مفقود کر رہا ہے۔ لیکن تمہارے ذہن میں تو شاید ان الفاظ کے کوئی معنی بھی نہ ہوں۔ تم جو دل کو ایک پارہ گوشت سمجھتے ہو جو پمپ کا کام دیتا ہے' تم جو انسان کو ایک آلہ سمجھتے ہو' بتاؤ تم نے اتنی عمر ضائع کر کے کون سی نئی بات حاصل کی؟

ایک دل نام کردہ بہ مجاز
روبہ پیش سگاں کو انداز

شاید ہر شخص جو انسانوں اور حیوانوں کو متواتر چیرتا رہے اور کچھ دنوں تک برابر مشاہدہ کرتا رہے۔ اس قدر جان سکتا ہے کہ دل صنوبری شکل کا ایک ٹکڑا ہے جو غلاف قلب (pericardium) میں ملفوف ہے اور جس کا کام خون کو اندر کھینچنا اور باہر پھینکنا ہے' مگر تم کو کیا کہوں' بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا حکیم اپنی خود فریبیوں میں مبتلا ہے۔ وہ عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے اور وجدانیت و بداہت کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے' کارلائل نے اسی لیے ایسے لوگوں کا نام " منطق تراش " (logic Choppees) رکھا ہے۔ اسی لیے کسی چیز کی بابت کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ عقل کی افراط نے اس کی ربوبیت چھین لی اور اس کے ارتقا کا سدباب ہو گیا۔ وہ اپنا نصب العین بھول گیا بلکہ اپنی اصلیت بھی اس کو یاد نہ رہی۔ بیدل نے ہم کو بہت صائب رائے اس بارے میں دی ہے۔

ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

خیریت یہ ہے کہ دنیا میں چند ایسے نفوس ہمیشہ رہے جو کبھی کبھی حقیقت کی جھلک دیکھ لیا کرتے ہیں اور ہم کو اپنے آغاز و انجام سے آگاہ کرتے رہتے ہیں' ورنہ آج ہیمنتہ کی طرح یہ مخلوق بھی صفحہ ہستی سے مٹ جاتی جو "انسان" کہلاتی ہے۔

میرے ہیجان کا دور شروع ہو گیا۔ میں انسان کا " جہل مرکب " نہیں برداشت کر سکتا یہ بیماری شاید انسان کے علاوہ کسی دوسرے جانور میں نہیں پائی جاتی کہ وہ اپنی جہالت کو علم سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے اور اپنی اس دانستہ فریب کاری پر ناز کرتا ہے۔

شمیم بے کیف ہونے لگا تھا۔ میرا مباحثہ اکثر تلخ ہوا کرتا ہے اس لیے جہاں سوئی سے کام لینا چاہیے۔ وہاں میں نیزوں اور بھالوں کے وار کرنے لگتا ہوں اور سننے والے میری صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں مگر میرا مقابل ہمیشہ مجھ سے متنفر ہو جایا کرتا ہے' چنانچہ میرے چاہنے والوں سے وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہیں جو میری طرف سے اپنے دلوں میں غبار لیے ہوئے ہیں۔ شمیم نے میری رگوں میں چنگاریاں بھر دی تھیں اور میں آگ برسانے لگا تھا جس کا سلسلہ نہ جانے کہاں ختم ہوتا اگر ان کی والدہ درمیان میں نہ بول دی ہوتیں۔ اچھا اب بے کار بحث کو جانے دو ایک لطیفہ اور سنو گانے والوں میں مشہور ہے کہ " جمال منزل " روحوں کا مسکن ہے اور میرا خیال ہے کہ بیچنے والوں نے اسی وہم سے اس کو جدا بھی

کیا تھا مگر ہم لوگوں پر اس قسم کے جاہلانہ معتقدات کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔"

میں نے اپنے دل میں کہا "نہ جانے گانے والے جاہل ہیں یا آپ۔" شمیم سے پھر نہ رہا گیا اور مجھ پر حملہ کر ہی بیٹھے 'انہوں نے کہا مگر اب مجھے اطمینان ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسا محقق موجود ہے جو ہم کو اصلیت سے خبردار کر سکے گا۔"

"غلط خیال ہے" میں نے جواب دیا میری تحقیق و تدقیق سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے 'اگر کوئی راز مجھ پر منکشف بھی ہو گا تو میں اس کو تم سے مخفی رکھوں گا۔"

رات زیادہ ہو چکی تھی ہم ایک دوسرے کو "شب بخیر" کہہ کر اپنی اپنی خواب گاہ کو رخصت ہوئے۔ چلتے ہوئے سائرہ نے کہا۔ "آپ کا چہرہ دھندلا ہو گیا ہے 'دیکھیے سونا نصیب ہوتا ہے یا نہیں 'آج کے بحث پر زیادہ تبصرہ نہ کیجئے گا۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا "سائرہ 'بچوں کی سی باتیں نہ کرو" اور آکر بستر پر لیٹ رہا 'نیند کی کوئی علامت میری آنکھوں میں نہ تھی۔ میں دو بجے رات تک پڑھتا رہا 'گرمی کی سہانی رت تھی 'پچھلے پہر ہوا میں ایک سکون بخش خنکی پیدا ہوئی تو میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن پانچ ہی بجے کسی کے قدموں کی آہٹ سے جاگ گیا۔ دیکھا تو شمیم تھے میں اٹھ بیٹھا 'شمیم نے کہا۔ "ہوا خوشگوار ہے چلو باغ میں تفریح کر آئیں 'یا رات کی کبیدگی ہنوز باقی ہے؟"

"کہیں سائرہ نے رات بھر تمہارے کان تو گرم نہیں کیے "؟ میں نے پوچھا

شمیم ہنس دیے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے "تم شاید رات بھر سوئے نہیں؟ اچھا چلو ہوا کسل دور کر دے گی۔"

"ہاں! اس وقت کی سیر ضرور روح میں بالیدگی پیدا کرے گی" یہ کہہ کر میں شمیم کے ساتھ ہو لیا۔

باغ کو میں نے امیدوں سے زیادہ دلکش اور فرحناک پایا۔ احاطہ کے وسط میں ایک خوبصورت تالاب تھا۔ قسم قسم کے درخت اور مختلف رنگ و بو کے پھول روشوں کے کنارے علوئے تخلیل کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔ ہر چند کہ قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مدت سے ان کی پرداخت کرنے وہاں کوئی نہیں 'تالاب کے چاروں طرف چنبیلی کی کیاریاں تھیں جن سے فضا مہک رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اپنی "سمن پوش" یاد آگئی تھوڑی دیر کے لیے میں پھر عالم خیال میں گم ہو گیا۔ شمیم نے یہ دیکھ کر پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں" میں نے جواب دیا۔

شمیم نے کہا "اب آؤ میں تم کو جمال الدین کی بیوی کی قبر دکھاؤں۔" میں سراپا اشتیاق بن کر شمیم کے ساتھ آگے بڑھا چنبیلی کی ایک کیاری میں ایک پختہ قبر تھی جس کی شکستگی کہہ رہی تھی کہ اب ایسا بھی کوئی نہیں؟ جو اس کی مرمت کرانے کی زحمت گوارا کرے۔ لوح ٹوٹ کر علیحدہ زمین میں پیوست تھی اس پر گھاس اگ آئی تھی۔ اس سے پیشتر شمیم یا کسی اور کی نگاہ بھی اس پر نہیں پڑی تھی 'میں نے بیٹھ کر اس کو صاف کیا تو اس پر ناہید لکھا ہوا پایا۔ شمیم نے میرے ایماء پا کر ایک خدمت گار کو بلایا جس نے لوح کو زمین سے باہر نکالا 'دوسری طرف بھی کچھ کتبہ نظر آیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کوئی فارسی شعر ہے مگر باوجود سعی بسیار کے صحیح پڑھا نہ جا سکا اس لیے کہ وہ حصہ تقریباً ایک بالشت زمین کے اندر تھا 'اور زمانے کی رگڑ نے نقوش کو کافی مٹا رکھا تھا میری رگ رگ بے چین ہو رہی تھی کہ کسی طور سے اس کتبہ کو پڑھ لوں۔ لیکن کچھ بس نہ چلا۔ شعر بھی کوئی ایسا نہ تھا جو عام طور پر مشہور ہوتا تاکہ قیاس سے پڑھ لیا جاتا 'آخر کار مایوس لوٹنا پڑا۔

یہاں عبدالعلی صاحب سائرہ وغیرہ کے ساتھ چائے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ آج کی گفتگو کا مرکز "ناہید کا مزار" رہا۔ مجھے رہ رہ کر اسی کتبہ کا خیال آتا تھا۔ جس نے مجھے تاریکی میں رکھ چھوڑا تھا۔ سارا دن ہارمونیم 'فونوگراف 'تاش اور دیگر مشاغل میں ضائع ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ لکھوں 'مگر یہاں اس کی کوشش کرنا "بت پرستوں کے شہر میں نماز" کے لیے جہاد کرنے سے کم نہ تھا۔ شام کو شمیم نے گاڑی تیار کرائی اور مجھے لے کر ہوا کھانے نکل گئے۔ مختصر یہ کہ مجھے اس قدر موقع نہ ملا کہ ایک بار پھر ناہید کی قبر پر جاتا اور لوح پر نظرثانی کرتا۔ جب کھانے کے بعد اپنے بستر پر گیا تو کسی قدر سکون میسر ہوا۔ دل بہلانے کی غرض سے گھنٹوں مثنوی مولانا روم دیکھتا رہا۔

نیند کے آثار اس دن بھی غائب تھے، رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا۔ میرا مطالعہ بدستور جاری تھا، کبھی کبھی کتاب بند کر کے کچھ سوچنے لگتا تھا۔ تقریباً ایک بجے بستر سے اٹھا اور سامنے کے کمرے سے سگرٹ لے کر واپس ہو رہا تھا کہ مجھے چار پانچ گز کے فاصلے پر ایک عورت کی شکل دکھائی دی جو دیکھتے دیکھتے میرے مقابل تھی۔ یہ کون؟ وہی "کمسن پوش" اس وقت میں نے حیرت کو اعصاب پر قابو پانے دیا نہ ہراس کو۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں اپنے حواس قائم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے جس وقت ملیں تو اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا گویا مجھ سے کسی بات کی التجا کر رہی ہے۔

"تم یہاں کس لیے آئی ہو" میں نے آہستگی سے پوچھا۔ "اور میرا تعاقب کیوں کر رہی ہو؟"

اسی طرح اس نے پھر ہاتھ کو حرکت دی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس لیے کہ آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے۔"

"کیا تم سکون سے محروم ہو؟"

"یک قلم۔" یہ کہتے کہتے اس کا دم پھولنے لگا جیسے تشنج کا دورہ پڑ رہا ہو۔ میں گھبرا سا گیا تاہم سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیا۔

"اچھا تو بتاؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنی بیجانی آنکھیں اوپر اٹھا دیں جو نم آلود تھیں۔ "میرے لیے دعا کیجئے، جب سے میں مری ہوں کسی نے میرے لیے دعا نہیں کی۔ بیس برس سے کسی نے مجھ پر ترس نہیں کھایا۔" اس نے کچھ ایسے لہجہ میں کہا کہ میرا جی بھر آیا۔

"تمہاری موت کا سبب کیا ہوا تھا۔" میں نے سوال کیا۔

اب "کمسن پوش" قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، اس نے ایک غمگین انداز سے مسکراتے ہوئے اپنے سینہ سے ہار ہٹایا اور میں نے دیکھا اس جگہ اس کے کپڑے پر خون کے گہرے دھبے تھے۔ اس نے دھبوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر ان کو اپنے ہار سے چھپا لیا میں سمجھ گیا۔

"قتل؟" میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کسی کو اس کا صحیح علم نہیں" اس نے کہا "آپ میرا پورا افسانہ حیات سننا چاہتے ہیں تو سنئے! میں وہی ناہید ہوں جس کا مدفن آپ نے اس احاطہ میں دیکھا ہے"

"ہاں!--------"

"تم کو کس نے قتل کیا اور کیوں؟" میں نے بات کاٹ کر پھر پوچھا۔ میرے اعصاب پھر بے قابو ہو چلے تھے، میں سب کچھ اسی ایک منٹ میں جان لینا چاہتا تھا۔ خود ناہید کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک اندرونی کرب سے بے بس ہو رہی ہے، گویا اپنی داستان کو دہرانا اس کے لیے بڑی آزمائش کا کام تھا۔

ذرا صبر کیجئے تو میں کوشش کر کے اپنی زندگی کے واقعات آپ سے بیان کر دوں۔" اس نے کہا "میرا قاتل میرا شوہر ہے لیکن اس سے یہ حرکت ایک زبردست غلط فہمی میں سرزد ہوئی تھی۔ اس کو دھوکا ہوا، جس کا مرتے دم تک اس کو علم نہ ہو سکا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت جس کی مثال اس دور مادیات میں کم ملے گی۔ مبالغہ نہ سمجھئے، وہ مجھ کو پوجتا تھا۔۔۔

آپ خاموش سنتے جائیے۔ میرے لیے وہ اپنے عزیزوں سے کنارہ کش ہو گیا اور اس ویرانہ کو آباد کر کے بیٹھ گیا۔ وہ کہا کرتا تھا، میرے دونوں جہاں تیری آنکھوں میں ہیں۔ "جمال منزل" اس نے میرے لیے بنوائی تھی اور میں! میں تو یہ سمجھتی تھی کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، دن رات سب اس کی تجلیاں ہیں۔ مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ مجھے زندگی اس کے طفیل ملی ہے۔ اگر انسانی دنیا کی تمام زبانیں میرے جذبات کو معرض اظہار میں لانے کی متفقہ کوشش کریں تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں۔"

ناہید کی زبان میں کانٹے پڑ گئے تھے، وہ دم لینے کے واسطے رک گئی، میں بے خودی کی حالت میں اس کو دیکھ رہا تھا۔

"میں پارسی تھی یعنی "آتش پرست" اس نے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے پھر بیان شروع کر دیا "اور ایکٹنگ میرا ذریعہ معاش۔

لیکن اگرچہ مردوں کا ساتھ شب و روز رہتا تھا' مجھے کسی سے بھی انس نہ ہوا تھا۔ جمال نے مجھے ایک نئی لذت سے آشنا کیا۔ اس کو مجھ سے محبت پیدا ہو گئی۔ اس کے ایک ایک لفظ' اس کی ایک ایک ادا سے خلوص و صداقت کی بو آتی تھی۔ میں بھی اس کو دیوانوں کی طرح چاہنے لگی۔ اس کی ہستی مجھ کو دنیا سے نرالی نظر آئی۔ اس کی ہنسی میں ہمیشہ دکھ بھرا ہوتا تھا۔ اس کی آواز میں جیسے کی سی دلدوز تاثیر تھی' سوز و گداز اس کے خمیر میں تھا۔ وہ سراپا تصویر درد تھا۔ میرا میلان ٹریجیڈی کی طرف تھا اس لیے جمال نے مجھے آسانی سے جیت لیا۔"

وہ پھر ا— مرتبہ زبان تر کرنے کو رکی' میں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ترتیب وار اپنا سارا قصہ بیان کر جائے لہٰذا خاموش منتظر رہا۔

"…پ کے آرام میں مخل تو نہیں ہوں؟" اس نے نہ جانے کس حال سے پوچھا' اس کا چہرہ اس کے واردات قلب کا آئینہ بن رہا تھا۔

"بالکل نہیں! میں اس گھڑی کا مشتاق تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"میں سمجھتی تھی کہ آپ میری غم خواری کریں گے۔" اس نے مترحمانہ لہجہ میں کہا۔ "ورنہ آپ کا تعاقب نہ کرتی۔"

"ہاں تو ہماری محبت خوش آئند ثابت ہوئی۔ جمال نے مخالفتوں اور انگشت نمائیوں سے بے پروا ہو کر مجھ سے شادی کر لی اور ہم دونوں نے ہنگاموں سے دور اس جنگل میں ایک جنت بسائی۔ دونوں کی زندگی ایک مسلسل لمحہ مسرت تھی۔ جمال نے اپنی ساری دولت میرے لیے وقف کر دی۔ وہ متمول آدمی تھا۔ ادبیات اور مصوری سے اس کو انہماک تھا۔ مصوری کا وہ ماہر ہو چلا تھا۔ اس نے میری تصویریں کھینچیں اور ان سے اکثر کی پبلک میں نمائش بھی کی جن سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ چنبیلی کی کیاریاں میری محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ شام کو جب ہم باغ میں گلگشت کرتے ہوتے تو وہ پھول توڑ توڑ کر مجھے دیتا۔ میں ہار گوندھ کر خود پہنتی اور اس کو پہناتی۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔ یکایک زمانے نے ایسی گردش کی کہ بات کی بات میں ہمارے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جمال مجھ کو بے نقاب رکھتا تھا۔ میں نہ صرف اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کے سامنے' بلکہ عام مجمع میں بھی اس کے ساتھ بے پردہ رہتی تھی۔ جمال نے اگرچہ تنہائی اختیار کر لی تھی' تاہم کبھی کبھی اس کے احباب اس سے ملنے آ جایا کرتے تھے اور وہ ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے رشتہ داروں میں فیروز جو اس کا شیدا مشہور تھا' ہم کو دیکھنے اکثر آتا تھا اور ہفتوں آ کر رہا کرتا تھا۔ فیروز کی طبیعت مبتذل اور عامیانہ تھی' اس کی نفسانیت کی داستانیں اکثر سنی گئی تھی مگر جمال اس کی ہولناکیوں سے واقف نہ تھا۔ وہ معلوم نہیں کیوں فیروز کی قدر کرتا تھا' شاعر یا صناع انسان کو بحیثیت مجموعی کتنا ہی صحیح کیوں نہ سمجھ لے لیکن جہاں افراد سے سابقہ پڑتا ہے وہ اکثر دھوکا کھا جاتا ہے۔ فیروز کی نگاہیں مجھے گراں گزرتی تھیں' اس کی مسکراہٹ مجھے ناگوار ہوتی تھی۔ میں نے متعدد بار چاہا کہ جمال کو ہوشیار کر دوں مگر پھر یہ خیال ہوا کہ بیکار بدمزگی پیدا کرنا غلطی ہے۔ مجھے اپنی اخلاقی قوت پر اس درجہ غرور تھا کہ میں سمجھتی تھی فیروز مجھ سے مذاق کرنے کی بھی ہمت نہ کرے گا' اور چونکہ وہ عموماً میرے سامنے مہذب اور شائستہ رہا کرتا تھا اس لیے اور بھی مطمئن تھی اور جمال کو بھی مجھ پر اعتماد تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فیروز ہمارا مہمان تھا۔ جمال کو کسی اشد ضرورت سے سیتا پور جانا پڑا' رات کو آٹھ بجے جب کہ اس کی واپسی کا وقت تھا' میں اس کمرے میں جو آپ کے کمرے کے متصل ہے' بیٹھی کچھ دھیمی آواز میں گا رہی تھی دفعتاً "مجھ کو کمرہ تاریک ہوتا معلوم ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو فیروز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا" یہ روشنی کم کیوں کر دی؟" میں سوال ختم کرنے نہ پائی تھی کہ میرا بازو اس کی آہنی گرفت میں تھا اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بعض ساعتیں ہوتی ہیں جو کمزور سے کمزور دل میں خوفناک مجرمانہ جسارت پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے اپنے تمام جسم کی قوت صرف کر کے ایک بار اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا مگر کم بخت پر بہیمیت کا دیو مسلط تھا۔ دوسرے منٹ میں میں اس کی تنگ آغوش میں تھی۔ میں نے ابھی تک کسی نوکر کو اس لیے نہیں بلایا تھا کہ ان میں اس واقعہ کے متعلق خواہ مخواہ سرگوشیاں ہوں گی۔ اب میں نے ایک بار پھر فیروز کے مہلک پنجوں سے آزاد ہو کر خادمہ کو آواز دی۔ اس کے آنے میں تاخیر ہوئی۔ فیروز پھر میری سمت بڑھا لیکن اتنے میں جمال نے مجھے پکارا فیروز کمرے سے باہر نکل گیا اور میں جمال کے پاس دوڑی۔ میرا ارادہ تھا کہ اس سے بے کم و کاست سب ماجرا کہہ کر فیروز کو

اسی وقت نکلوا دوں گی' مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے فیروز کی آغوش میں دیکھ لیا تھا اور اپنی رائے قائم کر چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے جس وقت اس نے یہ دیکھا اسی وقت میں نے اپنے کو فیروز کی گرفت سے چھڑایا تھا۔ جمال اف! اف! کرتا ہوا اپنے سٹڈیو میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس کو کبھی غضبناک نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ صورت جوش غضب میں مسخ ہو گئی تھی۔ میں کمرے میں داخل بھی نہ ہونے پائی تھی اس نے مجروح شیر کی طرح میرے کلائی پکڑ لی اور کہا "دغا باز! تیری زندگی کا ایک ایک پل اب میری روح کو ناپاک کر رہا ہے۔" مجھ میں پندار ایسا تھا کہ "دغا باز" خطاب پا جانے کے بعد میں نے اپنی بریت کے لیے ایک حرف بھی نہ کہا اور وہ کچھ ایسے عالم میں تھا کہ اگر میں کچھ کہتی بھی تو وہ مجھے جھوٹا سمجھتا۔ جمال بے انتہا مغلوب الجذبات اور ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ اس کے عضلات پھڑک رہے تھے' اس کا دم گھٹ رہا تھا اس نے ایک نگاہ میری اس نامکمل تصویر پر ڈالی جس کے لیے وہ ان دنوں بڑی محنت کر رہا تھا اور میز کی دراز سے پیش قبض نکال کر میرے سینے میں اتار دیا۔ یہ سب ایسی غیر متوقع سرعت کے ساتھ ہوا کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "تباہی کا شیطان" فیروز پانچ منٹ کے اندر مجھ کو میری جنت سے محروم کر گیا۔ اس کے بعد ہر چند کہ جمال پر کوئی الزام نہ آیا اور مشہور ہو گیا کہ مجھے کسی دشمن نے قتل کر دیا ہے۔ لیکن اس کی زندگی اس قدر المناک ہو گئی کہ چھ مہینے کے بعد اگر اس نے خود کشی نہ کر لی ہوتی تو وہ جا کر قتل کا اقبال کر لیتا۔

ناہید کے آنسو گرنے لگے۔ میں تڑپ گیا' چاہتا تھا کہ اس کے آنسو پونچھوں لیکن اس نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر دیا اور پھر سلسلہ یوں شروع کیا۔

"آپ جمال کو خونخوار اور وحشی کہیں گے۔ مگر میرا ایمان یہ ہے کہ اس کو میرے ساتھ شدید قسم کی محبت تھی۔ یہ محبت کی انتہا تھی کہ اس نے محبت کے فنا ہو جانے کے ڈر سے مجھے ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس نے شیکسپیر کے مشہور ڈراما "اتھیلو" کا ترجمہ کر کے سنایا تھا۔ میں گھنٹوں ڈسڈیمونا" پر رشک کرتی رہی۔ میں نے جمال سے کہا تھا کہ کاش! مجھے اس کا پارٹ ہی کرنا نصیب ہوتا۔ اس پر اس نے مجھے بہت پیار کیا تھا۔ آہ!"

ناہید تھک گئی تھی لیکن اب اس کے چہرے سے آسودگی ٹپک رہی تھی۔ صبح کی سپیدی نمودار ہو چلی تھی۔ وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھی چلتے چلتے اس نے کہا "ہاں ایک بات بھول گئی۔ جمال نے ایک ظلم مجھ پر کیا ہے۔ مجھے مار کر اسے تسکین نہ ہوئی اس نے میرے مزار کی لوح پر یہ شعر کندہ کرا دیا

وفا آموختی ازما بکار دیگراں کردی
ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی

اس کو آخر وقت تک مغالطہ رہا۔ اب اس شعر کو مٹا کر یہ شعر کندہ کرا دیجئے

من کہ جز با تو نہ پرداختہ ام
گر بخود ساختہ ام ساختہ ام

بس مجھے اطمینان کلی میسر ہو جائے گا اور میں سکون کی سانس لے سکوں گی۔ آپ کو پھر کبھی تکلیف نہ دوں گی۔ ہاں! اگر آپ کا جی چاہے تو جا کر اس پیش قبض کو بھی دیکھ لیجئے جس نے دو ہستیوں کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا اور جو "اسٹڈیو" میں ابھی تک ایک بوسیدہ صندوق میں پڑا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر ناہید نے الوداع کہا۔ میں نے سمن مزار تک اس کو جاتے دیکھا' جہاں وہ نگاہ سے غائب ہو گئی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر چائے کے وقت سے پہلے ہی سائرہ سے تنہائی میں ملا۔ اس کو لے کر سیدھا اس کمرے میں گیا جو جمال کا "اسٹڈیو" رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ جس چیز پر ٹھہری وہ ایک شکستہ صندوق تھا۔ اس میں کرم خوردہ کاغذات کا ایک انبار تھا جس کے درمیان مجھے وہ پیش قبض ملا جو باوجود زنگ آلود ہونے کے اپنی خون آشامی کا اقرار آپ کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سائرہ سے کہا اس گھر میں جتنے افراد ہیں ان میں سے ایک تم ایسی ہو جس کے سامنے میں اپنے مشاہدات بیان کر سکتا ہوں اس لیے کہ تم مجھ کو کبھی دیوانہ یا فاترالعقل نہیں سمجھو گی۔"

میں نے سائرہ کو حقیقت سے آگاہ کیا۔ تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ وہ مجھ کو جھوٹا تو سمجھ سکتی تھی اور ایسی باتوں کو آسانی سے صحیح مان لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ سائرہ نے عبدالعلی اور شمیم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کیا اور بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ مزار کی لوح پر وہ دوسرا شعر کندہ کرایا جائے جو ناہید مجھے بتا گئی تھی۔ لیکن اس کا جواب وہی ملا جس کی مجھے امید تھی۔ یعنی میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی خوب مضحکہ اڑایا گیا۔

مجھ کو افسوس ضرور ہے کہ ناہید کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا مگر میرے امکان میں جو کچھ تھا وہ کیا اور اب بھی اس سے غافل نہیں ہوں۔ میں اس کے لیے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا ادعائی اعتقاد یہ ہے کہ روحوں کے تعلقات اس دنیا سے کبھی منقطع نہیں ہوتے۔

یہ واقعہ مدتوں میرے غور و فکر کا موضوع رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ محبت بھی کیا معمہ ہے۔ کوئی ایسا دماغ آج تک پیدا نہ ہوا جو اس طلسم کو توڑ سکتا۔ منطق اپنے اصول، موضوع اور علوم متعارفہ لیے ہوئے بیٹھا رہ جاتا تھا اور ہم دیکھ لیتے تھے کہ "ضدین" کا اجتماع اور "نقیضین" کا تطابق نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہستی کا اصل راز ہے۔ ہم اس گتھی کو مل، اسپنسر یا سینا اور فارابی کی مدد سے نہیں سلجھا سکتے۔ اب آخر میں علمائے نفسیات اور ماہرین عصبیات کو بھی اصل واقعہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اس کو خواب یا التباس نظر بتا کر غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لیں گے لیکن دوسری طرف مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ خود ان کو اپنی اس رائے پر بھروسہ کرنا ہو گا۔ وہ خود فریبیوں کے ذریعے سے اپنے اس کرب و اضطراب کو دور کرنا چاہتے ہیں جو تشکیک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کیسی مسرت کی بات ہے کہ علم انسانی کی تنگ مائیگی کا پردہ اب فاش ہو رہا ہے۔

افسانہ کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ ناہید کی جو تصویر ناصری کے پاس تھی وہ اس مشہور مصور کی صناعی نہیں ہے جس کا نام مجھے بتایا گیا۔ بلکہ جمال کی سحر طرازی ہے جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔

(تکمیل ۱۹۳۶ء)

○

(۱) یہ افسانہ "کفن پوش اور دوسرے افسانے" مطبوعہ: کتب خانہ علم و ادب دہلی، طبع سوم: ۱۹۴۷ء میں کسی قدر عبارت کے فرق کے ساتھ ملتا ہے "نقوش" افسانہ نمبر ۱۹۵۵ء کے لئے انھوں نے نظر ثانی کی ہے۔

علی عباس حسینی

نام : علی عباس حسینی
قلمی نام : علی عباس حسینی
پیدائش : ۱۸۹۷ء بہ مقام موضع پارہ، ضلع غازی پور (یو۔ پی) بھارت۔
وفات : ۱۹۶۹ء
تعلیم : ایم۔ اے (تاریخ) ۱۹۲۳ء

ابتداء میں دینی مدرسہ سے عربی اور دینیات کی تعلیم پائی۔ میٹرک ۱۹۱۵ء اور انٹرمیڈیٹ ۱۹۱۷ء میں کیا۔ ۱۹۱۹ء میں کیننگ کالج، لکھنؤ سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۱ء میں الہ آباد ٹیچرز ٹریننگ کالج، الہ آباد سے ایل۔ ٹی کیا اور ۱۹۲۳ء میں ایم۔ اے (تاریخ)

مختصر حالات زندگی:

موضع پارہ، ضلع غازی پور (یو۔ پی) کے سادات مولوی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ میں دینی تعلیم پانے کے ساتھ نماز، روزہ کی پابندی اختیار کی اور گھر والوں نے یہ دیکھ کر کہ ملائے مسجد بننے کی صلاحیت سے عاری ہیں، انھیں انگریزی پڑھنے کی اجازت دے دی۔ قصہ کہانیوں سے طبعی رغبت تھی چنانچہ دس گیارہ برس کے سن تک اردو میں "الف لیلہ" کے حافظ ہو گئے۔ سات بار فردوسی کا "شاہنامہ" پڑھا۔ اس زمانے میں عبدالحلیم شرر اور محمد علی طیب کا ادب میں طوطی بولتا تھا، حسینی نے بڑے بوڑھوں کی آنکھ بچا کر ان دونوں کی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ غرضیکہ عنفوان شباب سے پہلے اردو میں شائع ہونے والے جملہ ناول، مثنویاں اور واسوخت ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔

۱۹۱۷ء میں پہلا افسانہ "غنچہ نا شگفتہ" لکھا اور ۱۹۲۰ء میں "سر سید احمد پاشا" کے عنوان سے پہلا رومانی ناول مکمل کیا۔ ۱۹۲۱ء میں ایل۔ ٹی کرنے کے بعد سکول ٹیچر ہو گئے۔ ساری زندگی درس و تدریس میں گزار کر ۱۹۵۴ء میں پرنسپل کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ منروا مووی ٹون بمبئی کے مالک معروف ہدایت کار سہراب مودی کے لیے فلم "امیر تیمور" لکھی، لیکن یہ فلم نہ بن سکی۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"جذب کامل" مطبوعہ: "زمانہ" کانپور، جون۔ جولائی ۱۹۲۵ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "سر سید احمد پاشا" عرف "قاف کی پری" (رومانی ناول) بہار گو بک ڈپو، لکھنؤ، طبع اول: ۱۹۲۱ء
۲۔ "رفیق تنہائی" (افسانے) مکتبہ اردو، لاہور، طبع اول: ۱۹۳۲ء

کل صفحات ۲۹۴ ہیں۔ دوسرا ایڈیشن نیا ادارہ ' لاہور نے شائع کیا ہے۔

۳۔ "باسی پھول" (چودہ افسانے) — مکتبہ اردو ' لاہور ' — طبع اول: ۱۹۳۹ء

یہ کتاب چودھری اکیڈمی ' لاہور نے بھی شائع کی ہے۔ تیسری بار یہ کتاب سلیم برادرز رابندرا سرانی ' کلکتہ نے ۱۹۷۸ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں "باسی پھول" (۱۹۲۸ء)' "باسی پھول" (۱۹۳۰ء)' "گونگا ہری" (۱۹۳۴ء)' "بیوی" (۱۹۲۹ء)' "نئی ہمسائی" (۱۹۳۳ء) "عدیا تمبولن" (۱۹۳۲ء) "کے کا بھوگ" (۱۹۲۹ء) "عدالت" ۱۹۲۹ء "آم کا پھل" (۱۹۲۹ء) "امتحان قدرت" (۱۹۳۰ء) "شکار یا شکاری" (۱۹۳۸ء) "خوش قسمت لڑکا" (۱۹۳۹ء) "حق نمک" (۱۹۳۹ء) اور "کیا کیا جائے" (۱۹۳۸ء) کل چودہ افسانے ہیں۔

۴۔ "کانٹوں میں پھول" (افسانے) — اردو اکیڈمی ' سندھ ' کراچی

۵۔ "میلہ گھومنی" (افسانے) — نیا ادارہ ' سرکلر روڈ ' لاہور ' — طبع دوم:

یہ کتاب پہلی بار مکتبہ اردو ' لاہور ' نے شائع کی تھی

۶۔ "ایک ایکٹ کے ڈرامے" (ڈرامے) — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ' دہلی '

۷۔ "عروس ادب" (تنقید) — ساقی بک ڈپو ' دہلی ' — طبع اول: ۱۹۴۴ء سے قبل

۸۔ "ندیا کنارے" (افسانے) — پبلی کیشنز ڈویژن منسٹری آف براڈ کاسٹنگ اینڈ انفارمیشن ' دہلی ' — طبع اول: ۱۹۶۴ء

۹۔ "ہمارا گاؤں اور دوسرے افسانے" (۱۰ افسانے) — اور مینٹل پبلشنگ ہاؤس نمبر ۳ امین آباد پارک ' لکھنؤ ' — طبع اول: ۱۹۵۶ء

۱۰۔ "حکیم بانماز" (مزاحیہ قصے) — مبارک بک ڈپو ' کراچی ' — طبع اول:

۱۱۔ "شاید کہ بہار آئی" (ناول) — اردو کتاب گھر ' کراچی ' — طبع اول:

۱۲۔ "آئی۔ سی۔ ایس اور دوسرے افسانے" (چودہ افسانے) — انڈین پریس ' الہ آباد ' — طبع اول: ۱۹۴۰ء

اس کتاب میں "آئی۔ سی۔ ایس" "شیخو چچا" "جھوٹ" "دو شریفوں کا مقابلہ" "ملک خدا تنگ نیست" "بیلوں کی جوڑی" "قانون باطن" "بختیارک کا نسخہ" "ملاپ" "شیخ کریم کی نفرت" "سماج کی بھینٹ" "شریف مزدور" "دل کی آگ" اور "پیاسی جوگن" کل چودہ افسانے ہیں۔

۱۳۔ "یہ کچھ بھی نہیں ہے" (افسانے)

۱۴۔ "الجھے دھاگے" (افسانے)

۱۵۔ "نورتن" (ڈراما)

۱۶۔ "ناول کی تاریخ و تنقید" (تنقید)

۱۷۔ "کومل نگری" (ہندی)

۱۸۔ "پھولوں کی چھڑی" (ہندی)

۱۹۔ "گائے اماں" (ہندی)

اسکے علاوہ سکول کے مختلف درجوں کے لیے نصف درجن سے زاید نصابی کتب۔

نظریہ فن:

"اگر انسانیت کی تبلیغ ترقی پسندی ہے تو میں یقیناً ترقی پسند ہوں۔ اگر اس کے معنی مارکس کے فلسفے کو اساسی سمجھنا ہے تو میں یقینی ترقی پسند نہیں ہوں۔ حقیقت یہ کہ میں متشکک ہوں ـــــ میں آرٹسٹ کا کام 'مصوری اور دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھ دینا سمجھتا ہوں۔ نظریات کا پرچار مبلغ کا کام ہے اور ان کو عملی جامہ دینا مقنن کا۔"

علی عباس حسینی

("میرا بہترین افسانہ" مرتبہ: محمد حسن عسکری سے اقتباس)

علی عباس حسینی

خوش قسمت لڑکا

بوڑھی رحیمن ننھے حمید کا ہاتھ پکڑے گھر سے نکلی۔ دادی کے سوکھے ہاتھوں میں پوتے کی نرم نرم انگلیاں اس طرح تھیں جیسے خزاں دیدہ پتوں میں نودمیدہ کونپل! رحیمن کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ چہرے پر جھریاں پڑی تھیں۔ آنکھوں کے گرد باریک نشان تھے۔ گال دانتوں کے نہ ہونے سے پچکے ہوئے تھے۔ ٹھوڑی قریب قریب ندارد تھی۔ پاؤں کانپتے ہوئے پڑتے تھے۔ عصا کا سہارا لینا ضروری محسوس ہوتا تھا۔ پھٹا سا برقع جسم پر تھا اس کا نچلا حصہ کیچڑ میں اٹا ہوا تھا۔ پاؤں میں پرانی وضع کی پیوند دار جوتی تھی۔ ننھا حمید سر جھکائے ساتھ تھا۔ آواز بھرائی ہوئی۔ آنکھیں ڈبڈباتی ہوئی اور چہرے اور کپڑوں سے بلا کی حسرت برستی تھی۔

ضعیفہ نے کہا۔ "بیٹے! آٹھ برس کے سن میں نوکری بڑی قسمتوں سے ملتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھ بڑھیا کی فریاد سن لی۔ دیکھو خدا کا شکر ضرور ادا کرنا۔" حمید نے گردن جھکائے ہوئے کہا۔ "جی ہاں دادی اماں۔" ضعیفہ بولی۔ "اور دیکھو بیٹے! یہ جو تم کھٹ پٹی اس وقت پہنے ہو۔ اسے اتار کے رکھ لینا۔ اسے بقرعید میں پہننا۔ اب تم سمجھ دار ہو۔ آگم کا خیال رکھنا چاہئے۔ ایسے ویسے دنوں میں ننگے پاؤں چلنے میں کچھ ہرج نہیں۔ کھٹ پٹی رہے گی تو تیج تہوار کے دنوں سب کے ساتھ تم بھی کھٹ پٹ کرتے چلو گے"۔ حمید کی جھکی ہوئی گردن اور جھک گئی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "بہت خوب دادی اماں۔"

یہ دونوں کھیتوں کے کنارے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ سامنے سے منگو چمار آتا ہوا دکھائی دیا کاندھے پر لاٹھی تھی۔ اس میں نیا جوتا لٹکا ہوا تھا۔ سر پر چھوٹی سی پگڑی تھی۔ جسم مارکین کے کرتے اور زرد رنگ کی صاف دھوتی سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ گنگناتا مسکراتا چلا آ رہا تھا۔ بڑی بی کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ بولا۔ "کہاں جات ہو کھالہ " (کہاں جاتی ہو خالہ ؟) ضعیفہ بولی "گشائن پور بھیا۔ وہاں حمید کا کام لگ گیا ہے"۔ وہ سادگی سے بولا۔ "ارے کھالا! اس سن ماں اور کام! اے کھیلنے کا سن ون ہے نہ کہ کام کا۔ (ارے خالہ اس سن میں اور کام' یہ کھیلنے کا سن ہے نہ کہ کام کا)

ضعیفہ نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا۔ "ہاں بھیا مرے گھر سوائے اس کے اور کوئی مرد نہیں"۔ آگے بڑھ کے مولوی صاحب ملے۔ بڑی بی کو دیکھ کر بولے۔ "ایں رحیمن! یہ تم کہاں اتنے سویرے جا رہی ہو؟" ضعیفہ نے سلام کر کے کہا۔ "جی اس بچے کو کام پر لگانے جا رہی ہوں"۔ مولوی صاحب نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "ہوں ماشاء اللہ اتنے سن میں کمانے جا رہا ہے۔ خوب! بہت خوب! مگر تم نے اسے نماز سکھا دی ہے؟۔"

ضعیفہ کے زرد چہرے پر سرخی آگئی۔ بولی۔ "جی ہاں مولوی صاحب میں نے اسے نماز خود سکھائی ہے ہم غریب' خدا کا نام لینا خوب جانتے ہیں!" مولوی صاحب نے سٹ پٹا کے "نہیں نہیں! ہاں! ہاں ماشاء اللہ " کہا اور دونوں مسافر آگے بڑھ گئے۔

گوشائن پور کے مضافات شروع ہوئے۔ پختہ مکانات' سربفلک عمارتیں دکھائی دینے لگیں۔ شہر کے پھاٹک سے ملے ہوئے آموں کے درخت کے قریب ایک اندھا فقیر بیٹھا تھا۔ "ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا۔ ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا۔ اندھے فقیر کا سوال " کی رٹ لگی تھی۔ اس کے زرد زرد دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس کی میلی داڑھی کے بال الجھے ہوئے تھے۔ اس نے پاؤں کی چاپ سنتے ہی ان کی طرف رخ کیا۔ اپنا سوکھا ہوا زرد ہاتھ

پھیلا دیا۔ "بابا بھلا ہو گا۔ اندھے کا سوال۔ ایک پیسہ پاؤ بھر آٹا۔"

ضعیفہ نے پوتے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ فقیر کے قریب جا کر بولی۔ "بابا ہم نے سنا تھا تمہیں ایک لڑکا نوکر چاہئے۔ فقیر کے لب و لہجہ میں فرق آگیا۔ پہلے عاجزی تھی۔ اب حکومت۔ وہ بولا "تم لائی ہو" اور اس نے اپنے ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ بڑھیا نے حمید کو اس کے قریب کر کے کہا۔ "ہاں دیکھو ماشاء اللہ نواں سال ہے۔" اندھے بھکاری نے حمید کو سر سے پاؤں تک اس طرح ٹٹولا جس طرح بکری کو قصاب دام چکاتے وقت ٹٹولتا ہے۔ پھر بولا۔ "ہاں مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ کیا نام ہے؟" بچے نے بھرائی آواز میں جواب دیا۔ "حمید۔"

اندھے نے پوچھا۔ "تم مجھے سہارا دے کر گاؤں گاؤں لے چلو گے؟" ننھے حمید نے گرفتہ آواز میں کہا۔ "جی ہاں"۔ اندھے نے پھر پوچھا۔ "تم میرے ساتھ گا سکو گے؟۔" لڑکے نے چھوٹی سی زبان سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پھرا کے کہا۔ "جی آپ اگر سکھا دیں گے۔"

اندھے نے جھولی سمیٹی اور لکڑی اٹھائی۔ وہ بچے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا "آؤ چلیں یہاں بیٹھے بیٹھے کچھ نہیں ملتا۔ چلو پھیری لگائیں۔" حمید نے دادی کو حسرت سے دیکھا۔ پھر سڑک پر نگاہ ڈالی۔ بہت دور تک سپید سپید چمکتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ منزل کوسوں دور تھی۔ بالکل لاپتہ تھی وہ اندھے کے آگے چلنے لگا۔ اندھے کا ایک سوکھا ہاتھ بچے کے کاندھے پر تھا اور وہ اسکے ساتھ صدا لگا رہا تھا۔ "دے دے بابا۔ دے دے۔ ایک بے اندھا ایک بے بچہ! ایک ہی پیسہ! پاؤ بھر آٹا۔ دے دے بابا دے دے بابا"۔ ایک کی آواز میں خشونت تھی۔ دوسرے کی آواز میں رقت۔ ایک اپنا حق مانگ رہا تھا۔ دوسرا اپنی حق تلفی کا ماتم کر رہا تھا۔

دکھیں دیر تک اپنی کمزور آنکھوں سے پوتے کی غائب ہوتی ہوئی صورت دیکھتی رہی پھر آسمان کی طرف دیکھ کر بولی۔ "تیرا شکر ہے میرے مالک! تو نے میرے بچے کو اتنا خوش قسمت بنایا کہ وہ نویں ہی برس کام پر لگ گیا۔"

○

علی عباس حسینی

میلہ گھومنی

کانوں کی سنی نہیں کہتا۔ آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں۔ کسی بدیسی واقعے کا بیان نہیں اپنے ہی دیس کی داستان ہے۔ گاؤں گھر کی بات ہے۔ جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر چاہے رکھیے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سننا۔

دو بھائی تھے چنو' منو نام۔ کہلاتے تھے پٹھان۔ مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھی اور دادیہال سید واڑے میں۔ ماں پرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آئی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لیے اور نتیجے میں ہاتھ آئے' چنو منو۔ وہ تو یادگاریں چھوڑ کر جنت سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے۔ انہوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چنو منو کی پرورش کے لیے کچھ روپے دیے۔ وہ دونوں پلے اور بڑے اچھے ہاتھ پاؤں نکالے۔ چنو ذرا سنجیدہ تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور ہم سن میر صاحبان کا مصاحب بنا۔ منو لاابالی تھا۔ اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا کرتا اور نام کے لیے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کے کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انہوں نے چنو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر کے باندھ دیا۔ مگر منو چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی' چمار ٹولی' جولاہے ٹولی اور ہر سمت اور ہر محلے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انہوں نے عاجز آکر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ جب وہ گھونگھٹ نکالے لجاتی' سمٹتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آکر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا اس لڑکے کو روکو۔ ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ ہی چنو کی طرح اسے بھی کسی ناند سے لگا دیجئے۔"

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی قسم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی۔ وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے ہی رہے۔

اتفاق سے انہیں دنوں دوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیدانی بی نے صورت شکل دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں۔ پوچھنے گچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹکی بھی ہے۔ سیدانی بی اس درزی کی حرکات سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی اس نے میلے سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی کے سادہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا!

"اچھا گھر میں رہو اور کام کرو' دو چار دن میں تمہارے لیے کوئی بندوبست کروں گی۔"

ادھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے نووارد کی خبر دی۔ ایک صاحب نے جو ذرا ظریف طبیعت بھی تھے' اس کی تعریف یوں بیاں کی۔

"راویان صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی' ٹھکرائن سے پٹھانی' پٹھانی سے کبڑن' کبڑن سے درزن اور اب درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔"

ایک صاحب نے پوچھا "اور اس کے کے بعد ؟"

وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے "خدا جانے شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔"

میر صاحب جب گھر آئے تو بیوی نے ان محترمہ کی خبر دی۔ بہت جزبز ہوئے۔ اس سیرت کی عورت اور شرفاء کے گھر میں' وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلے میں سامنے آئیں۔ میر صاحب بل کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی۔ اگر انکار کرتے اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اسے معصیت کی طرف ڈھکیل دیتے ہیں۔ پیٹ کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں بار دیتے ہیں تو گھر میں ماشاء اللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں' کہیں چنو منو کی نسل اور نہ بڑھے۔ ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر منو کی ماں کو بلوا کر انہوں نے اسے نادر شاہی حکم دیا کہ۔

"ہم نے منو کی نسبت طے کر دی' اس سے کہہ دو کل اس کا عقد ہو گا"

بچاری جولاہن کو چون و چرا کی مجال نہ تھی۔ وہ بہت اچھا کہہ کر ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی' اس لئے بہت کھل کے باتیں ہوئیں جولاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی لیکن جانتی تھی میر صاحب کی خوشی اسی میں ہے' اختلاف کا یارا نہیں۔ رہنے کا ٹھکانا انہیں کا دیا ہے' چنو کی نوکری انہیں کی عطا کردہ ہے اور منو کی جوت میں کھیت بھی خود انہیں کے ہیں۔ غرض گھر آئی اور رات ہی میں منو کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اسے درزی ہی کے گھر بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا۔ جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے۔ منو کو نئی دھوتی' نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا۔ دلہن کو شاہانہ جوڑا اور چند چاندی کے زیورات ان کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور ان کی بیوی نے رونمائی کے نام سے دس روپے منو کی ماں کو دیئے اور دلہن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا۔

دن بیتتے گئے' دن بیتتے گئے۔ مہینے ہوئے' ایک سال ہونے کو آیا مگر منو اور اس کی دلہن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی چٹکلے میں اچھے ہو گئے۔۔۔۔ کہ دفعتا" ایک دن پھر جولاہن روتی بسورتی پہنچیں۔ معلوم ہوا منو نے مارا ہے۔ پوچھ گچھ سے کھلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہوا' اور جس طرح وہ نشہ بیوی پر اتارتا ہے اسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھری میں بے آب و دانہ بند رکھا۔ اب چھوٹی ہے تو فریاد لے کر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک سے شاید بری عادت نہ پڑنے پاتی۔ جولاہن سوائے "مامتا" کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انہوں نے حکم دیا "آج سے یہیں رہو' گھر جانے کی ضرورت نہیں۔"

مگر میر صاحب کو منو کی فکر ہو گئی۔ خون گندی نالی میں بہہ کر نہ بدل جاتا ہے اور نہ چھٹ کر سپید ہو جاتا ہے' اس لئے اسے بلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے' اور یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر پھر سنا کہ تو نے تاڑی پی تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑا ادھڑ جائے گا" ساتھ ہی پاسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ "اب اگر منو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ اٹھوا پھینکوں گا۔" غرض منو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی اور تاڑی بند ہو گئی..... نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد' سوکھا ہوا آم بن گیا اور کھانسی بخار کا شکار ہوا۔ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں اور منو بہو نے نینوں کے بان چلانا شروع کر دیئے تو انہوں نے پھر جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔ لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گزری جس طرح چوروں

کو پولیس کی نگرانی کھٹکتی ہے۔ دو چار ہی دن انگیز کرنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی۔ ساس بھلا کس سے کم تھیں۔ انھوں نے کلہ بہ کلہ جواب دینا شروع کر دیا ایک دن تو ہاتھا پائی تک پہنچی۔ جوانی اور بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ منو پلنگ سے جھپٹ کر اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر وہ لات دی کہ ہائے کرکے وہیں ڈھیر ہو گیا دونوں لڑنا بھول کر اسکی تیمارداری میں مشغول رہیں لیکن بلغم کے ساتھ تھوڑا تھوڑا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر قبر میں چلا گیا۔۔۔ اب رونا دھونا شروع ہوا۔ بین ہونے لگی اور ساس بہو میں اسی پر مقابلہ تھا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ روز تو اسی طوفان میں طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آکر سمجھانا پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ سیلاب غم گھٹنا شروع ہوا' ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتہ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی کہ دفعتا" چنو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچہ جن کر دیور کے پاس چلی گئی۔ بی جولاہن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا اور منو کی بیوہ کو عدت کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقع سے چنو غم بھلانے اور جی بہلانے دیورانی کے پاس آ بیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ درد بیان ہوئے' تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالا آخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی صبح سرخروئی سے ہوئی تو چنو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعہ مستحکم بنا دے۔ وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے۔ انھوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فتویٰ فورا صادر فرما دیا۔ بڑی بی دیر تک ایک وکیل کی طرح بحثتی رہیں۔ پر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں "چل بے گھر چل مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا۔ وہ اب تیری بیوی ہے' میں خوش میرا خدا خوش۔" چنو نے ماں کا کہنا کیا۔ مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دیا اور اپنے چاروں بچوں سمیت اس گھر میں منتقل ہو گیا۔

ایک مہینہ بیتا' دو بیتے' تین مہینے بیتے' مگر چوتھے مہینے چنو کی کمر اچک گئی۔ اکڑنا' برنا' تن کے چلنا' سب چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کے چلنے لگا۔ ہم سن میر صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے' ان کو دکھایا۔ انھوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ اور چلا۔ بدقسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس چنو کی کمر کچی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور آیا مگر افیون کی خشکی نے دبوچا۔ بی چینا بیگم مانگتی ہیں دودھ' مکھن' گھی' ملائی اور یہ چیزیں چار روپے۔۔۔ میں کہاں نصیب۔ وہ لگا کھسے نکال کے ہاتھ پھیلانے اور پیسے مانگنے۔ مگر اس پر جو کچھ ملتا بھاویں نہ سماتا اور افیون کی لت پڑ ہی چکی تھی وہ چھوٹتی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل و جگر کو چھلنی کیا اور چنو خاں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی اور اولے پڑنے والے تھے کہ چنو کو اختلاج شروع ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلے میں حاضر تھا۔ فورا اٹھ کر گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوندا لپکا اور جان پڑا اسی کے سر پر پڑا۔ اسی کے سر پر بجلی گری' منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ سنبھل کر اٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑتا تھا بے ساختہ "ارے ماں' ارے ماں" چیختا ہوا دوڑا۔ راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا مگر پاؤں پیسے کی طرح لڑھک رہے تھے۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا لڑکا ہوا۔ وہ ٹھوکر کھاتا' سنبھلتا' لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بجری کے نیچے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بھد سے گر پڑا اور اسی طرح اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔ بیوی "ارے کیا ہو گیا لوگو" کہتی ہوئی دوڑی چنوں نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا:

"اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟" اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

چنو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کمبھ کا میلہ گھومنے الہ آباد چلی گئی۔

○

محمد مجیب

نام : محمد مجیب
قلمی نام : محمد مجیب / پروفیسر محمد مجیب
پیدائش : ۳۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء بہ مقام لکھنؤ، بھارت
وفات : ۲۰ جنوری ۱۹۸۵ء بہ مقام دہلی، بھارت
تعلیم : بی۔ اے (آنرز تاریخ) آکسفورڈ یونی ورسٹی: ۱۹۲۲ء

مکتب کی تعلیم گھر پر ہوئی، اس کے بعد انھیں لور یٹو کانونٹ، لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا۔ ایک سال کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول، لکھنؤ میں منتقل ہو گئے۔ دہرہ دون کانونٹ سے سینیئر کیمبرج (۱۹۱۸ء) کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے ۱۹۱۹ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان چلے گئے، آکسفورڈ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۲ء میں وہاں سے بی۔ اے (آنرز تاریخ: عہد جدید) کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد طباعت میں ٹریننگ کے لیے برلن (جرمنی) چلے گئے۔ جہاں سے ۱۹۲۶ء میں واپسی ہوئی۔

مختصر حالات زندگی:

محمد مجیب چاندی کا نہیں، منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد محمد نسیم ایڈوکیٹ، لکھنؤ میں اپنے زمانے کے کامیاب ترین دیوانی وکیل تھے۔ محمد مجیب نے اپنے دور کے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں میں تعلیم مکمل کی۔ بی۔ اے (آنرز) آکسفورڈ سے کرنے کے بعد برلن (جرمنی) سے طباعت میں ڈپلوما لیا۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں بحری جہاز کے ذریعے ڈاکٹر ذاکر اور ڈاکٹر عابد حسین کی ہمراہی میں ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے اور براستہ کولمبو (سیلون) فروری ۱۹۲۶ء میں دہلی پہنچ کر بطور لیکچرر (تاریخ) جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے تدریسی عملے میں شامل ہو گئے۔ تین سو روپے مشاہرہ مقرر ہوا لیکن آپ نے صرف بیس روپے ماہانہ لینا منظور کیا۔ (۱) جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کشتی ۱۹۴۷ء تک ڈانواں ڈول رہی اور دیگر اساتذہ کی طرح مجیب صاحب کو بھی کئی کئی ماہ تنخواہ نہ ملی، عندالضرورت خازن سے دس پانچ روپے لے کر گزارہ کرتے رہے۔ جب کہ مجیب صاحب کی لیاقت کے لوگ اس دور میں بھی ہزاروں طلب کرتے تھے۔ مجیب صاحب 'ادبیات' سیاسیات اور تاریخ کے شعبہ جات میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ انھیں فنون لطیفہ کی مختلف شاخوں سے بھی ماہرانہ شغف تھا۔ ڈیزائن، فن تعمیر اور مجسمہ سازی (۲) میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد، دکن کے پروفیسر وہاج الدین کا ڈراما "نکاح بالجبر" مجیب صاحب کی ہدایت کاری میں جامعہ کی سٹیج پر پیش کیا گیا، جس میں جوتشی کا کردار خود انھوں نے ادا کیا۔ اسی سال جامعہ ملیہ کی مالی حالت کے پیش نظر "امنائے جامعہ" کی جگہ "انجمن تعلیم ملی" قائم ہوئی جس کے مجیب صاحب سمیت گیارہ اراکین نے عہد کیا کہ وہ کم از کم بیس برس تک یا تاحیات جامعہ کی خدمت کریں گے اور ڈیڑھ سو روپے ماہانہ سے زیادہ کا مطالبہ نہ کریں گے۔

۱۹۲۹ء کے آغاز میں ان کی شادی سندیلہ (یو۔ پی) کے ایک معزز خاندان میں آصفہ خاتون سے ہوئی۔ ۱۹۳۱ء میں مجیب صاحب کا پہلا ڈراما "کھیتی" خود مصنف کی ہدایت کاری میں جامعہ کی سٹیج پر کھیلا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں جامعہ کے اولین خازن سیٹھ جمنا لال بجاج کی جگہ مجیب صاحب کو خازن مقرر کیا گیا اور یہ اعزازی خدمت ۱۹۴۷ء تک انجام دی۔ جنوری ۱۹۳۴ء میں ان کا نام ماہنامہ "جامعہ" دہلی کے ادارہ تحریر میں شامل کیا گیا

اور اسی ماہ ان کا دوسرا ڈراما "انجام" نہ صرف جامعہ دہلی میں شائع ہوا بلکہ عید کے موقع پر (تقریباً وسط جنوری) حسب معمول مصنف کی ہدایت کاری میں سٹیج ہوا۔ مارچ ۱۹۳۵ء میں مجیب صاحب نے خالدہ ادیب خانم کے دورۂ ہندوستان میں ان کی راہنمائی کی۔ ۱۹۳۸ء میں نائب شیخ الجامعہ تھے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں جامعہ ملیہ کے یوم تاسیس کے موقع پر "ایران کے دربار میں عرب کے سفیر" اور "نکاح بالجبر" (دو ڈرامے) مجیب صاحب (نائب شیخ الجامعہ) کی ہدایت کاری میں جامعہ کی اسٹیج پر کھیلے گئے۔ جب کہ "نکاح بالجبر" میں انہوں نے ملازم کا کردار بھی ادا کیا۔ ۱۶ نومبر ۱۹۴۶ء میں جوبلی کی چار روزہ تقریبات (۱۵ تا ۱۸ نومبر) کے موقع پر مجیب صاحب کا تیسرا ڈراما "خانہ جنگی" خود ان کی ہدایت کاری میں اسٹیج ہوا۔ ۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی چلے جانے پر مجیب صاحب نے جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے چارج لیا۔ ۱۹۴۹ء میں حکومت ہند کے ایک وفد کے ساتھ یو این او جنرل اسمبلی میں شرکت کی۔ ۱۹۵۱ء میں انڈو چائنا فرینڈشپ کمیٹی کے تحت چین کا دورہ کیا۔ ۱۹۵۲ء میں جنیوا اور پیرس گئے۔ ۱۹۵۴ء میں یونسکو کے اجلاس میں شرکت کی۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۴ء میں یوگوسلاویہ کا دورہ کیا۔ مئی ۱۹۵۵ء میں مرکزی دینی تعلیمی بورڈ جمیعۃ العلمائے ہند کے شریک معتمد امور تعلیمی و انتظامی مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں تعلیمی نظام کے مطالعے کے لیے روس تشریف لے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں میکگل یونی ورسٹی مانٹریال' کینیڈا میں بطور وزیٹنگ پروفیسر چلے گئے۔ جہاں سے فروری ۱۹۶۲ء میں واپسی ہوئی۔ اپریل ۱۹۶۶ء میں حکومت ترکیہ کی دعوت پر انقرہ اور استنبول یونی ورسٹی میں لیکچرز دیئے۔ ۱۵ جولائی ۱۹۶۷ء میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز' لندن یونی ورسٹی کے زیر اہتمام (۱۷ تا ۲۲ جولائی) بین الاقوامی سیمینار میں تقسیم ہند کے موضوع پر مقالہ پڑھنے لندن تشریف لے گئے۔ ۱۹۶۹ء میں ترقی اردو بورڈ' نئی دہلی کے پہلے وائس چیئرمین منتخب ہوئے۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں غالب لیکچرز کے سلسلے میں امریکہ کی مختلف یونی ورسٹیوں کا دورہ کیا اور ترکی سے ہو کر واپس آئے۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ایم۔ اے (تاریخ) کے طلبہ و طالبات کے ساتھ قطب مینار گئے جہاں محسوس ہوا کہ ان کی یاداشت کام نہیں کر رہی' فوراً دماغی ماہرین سے رابطہ قائم کیا گیا تو پتا چلا کہ دماغ میں ایک جگہ رکاوٹ ہے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ان کا دماغی آپریشن کر کے وہ حصہ کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ تقریباً چار ماہ کی علالت کے بعد ۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو بہ حیثیت شیخ الجامعہ دوبارہ کام شروع کر دیا جہاں سے ۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو چھیالیس برس کی خدمت گزاری کے بعد جامعہ سے ریٹائر ہو گئے اور ۲۰ جنوری کی رات ایک طویل علالت کے بعد انتقال کیا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"باغی" مطبوعہ: "جامعہ" دہلی' فروری ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "کھیتی" (ڈراما) — مکتبہ جامعہ' دہلی' — طبع اول: ۱۹۳۱ء
دوسری بار ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ طبع دہم: ۱۹۷۸ء

۲۔ "کیمیا گر اور دوسرے افسانے" (نو افسانے) — مکتبہ جامعہ' دہلی — طبع اول: ۱۹۳۲ء
اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ نے ۱۹۳۸ء میں اور تیسرا ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔

۳۔ "انجام" (ڈراما) — مکتبہ جامعہ' دہلی' — طبع اول: ۱۹۳۴ء
یہ ڈراما اردو مرکز لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۴۔ "تاریخ فلسفہ سیاست" — ہندوستانی اکیڈمی' الہ آباد' — طبع اول: ۱۹۳۶ء

۵۔ "تاریخ ہندوستان کی تمہید (نو جماعتی نصاب)" — مکتبہ جامعہ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۷ء

دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔

۶۔ "دنیا کی کہانی" (ایڈیپائی نگاری) — مکتبہ جامعہ، دہلی — طبع اول: جون ۱۹۳۷ء

دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔

۷۔ "سلطان محمود غزنوی" (تاریخ) — ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد — طبع اول: ۱۹۳۰ء

۸۔ "روسی ادب" (دو جلدیں) — انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی — طبع اول: ۱۹۳۰ء

۹۔ "خانہ جنگی" (ڈراما) — مکتبہ جامعہ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۶ء

کل صفحات ۸۸۔ دوسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۷۸ء میں نکلا۔

۱۰۔ "شیدا اور دوسری کہانیاں" (بچوں کے لیے) — مکتبہ جامعہ، دہلی — طبع اول: ۱۹۳۸ء

۱۱۔ "حبہ خاتون" (ڈراما) — مکتبہ جامعہ، دہلی — طبع اول: اپریل ۱۹۵۲ء

۱۲۔ "ہیروئن کی تلاش" (ڈراما) — مکتبہ جامعہ، دہلی — طبع اول: اکتوبر ۱۹۵۳ء

۱۳۔ "دوسری شام" (ڈراما) — مکتبہ جامعہ، دہلی — طبع اول: اکتوبر ۱۹۵۶ء

۱۴۔ "آزمائش" (ڈراما) — مکتبہ جامعہ، دہلی — طبع اول: جولائی ۱۹۵۷ء

۱۵۔ "تاریخ تمدن ہند" (عہد قدیم) — ترقی اردو بورڈ، دہلی — طبع اول: ۱۹۵۱ء

۱۶۔ "ہماری آزادی" (از مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ)

یہ "انڈیا ونز فریڈم" کا ترجمہ ہے۔ — طبع اول: جنوری ۱۹۵۹ء

۱۷۔ "استاد بننے کا مزہ" (ترجمہ) — مکتبہ جامعہ، دہلی — طبع اول: نومبر ۱۹۶۵ء

۱۸۔ "آؤ ڈراما کریں" (بچوں کے لیے) — مکتبہ جامعہ، دہلی — طبع اول:

۱۹۔ "دیوان غالب" (مرتب) — کاویانی پریس، برلن (جرمنی) — طبع اول: لگ بھگ ۱۹۲۳ء

اس کتاب کی بیشتر کمپوزنگ کا کام خود مجیب صاحب نے کی تھی۔

۲۰۔ "نگارشات انشاء" (مرتب) — مکتبہ جامعہ، دہلی — طبع اول:

۲۱۔ "Yugoslavia - A Birdseye View,"

۲۲۔ "Ordeal: 1857" (a historical play) — Jan. 1958

۲۳۔ "World History - Our Heritage," — April 1960

۲۴۔ "Education and Traditional Values," — Dec. 1965

۲۵۔ "The Meaning of Indian History," (Basu Memorial Lecture)

۲۶۔ "Social Reforms among Indian Muslims," — April 1968.

(Evelyn Hersey Memorial lecture)

۲۷۔ "The Indian Muslims" 1967 (London)

۲۸۔ "Ghalib" — 1969

۲۹۔ "Akbar" — Feb. 1969

۳۰۔ "Mirza Ghalib" Dec, 1970

۳۱۔ "Islamic Influence of Indian Society" 1972

۳۲۔ "Dr.Zrkir Husain." A Biography March 1972

زندگی میں مستقل پتا:

جامعہ نگر، دہلی۔ بھارت

اعزاز:

۱۔ پدم بھوشن، حکومت ہند کا اعلیٰ ترین سول اعزاز ۱۹۶۵ء

نظریہ فن:

"دنیا، جس میں پاک دامنی ترغیب گناہ کی قید میں ہے اور کفارہ گناہ، اشارہ چشم و ابرو کا منتظر۔۔۔۔۔۔"

(بہ حوالہ آل انڈیا ریڈیو، دہلی کا ایک نشریہ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

○

(۱) بہ حوالہ: "مجیب صاحب" از مالک رام، مطبوعہ: "ہماری زبان" دہلی، یکم نومبر ۱۹۸۴ء

(۲) غالب صدی کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں مجیب صاحب نے غالب کا جو لکڑی کا مجسمہ تراشا تھا، وہ آج بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں ان کی یاد تازہ کرتا ہے۔

محمد مجیب

کیمیاگر

یہ قصہ اس زمانے کا ہے جب مسلمان ہندوستان میں نئے نئے آئے تھے۔ دہلی اور دہلی سے افغانستان کی سرحد تک ان کی حکومت کسی قدر مستحکم ہو گئی تھی۔ مگر دہلی سے مشرق کی طرف انہوں نے چند حملے کئے تھے۔ ہندو تصور نے عام طور پر مسلمانوں کی فتح تسلیم نہیں کی تھی اور نہ ہندوؤں کو یقین تھا کہ مسلمان ہمیشہ کے لیے ہندوستان میں بسنے والے ہیں۔ ابھی تک شیخ اور برہمن نے ایک دوسرے پر لعنت نہیں بھیجی تھی اور اس بے چینی کو دور کرنے کے واسطے جو ایک بدیسی قوم کے ملک پر حاوی ہو جانے سے پھیل گئی تھی اسلام کا یہ مژدہ کافی تھا کہ خدا کے تمام بندے برابر ہیں۔ اس کا گھر سب کا گھر ہے۔ اس کا نیا دین دنیا میں نئی جان پیدا کرنے آیا ہے۔

حکیم مسیح ترکستان سے اپنی بوڑھی ماں کو ساتھ لے کر ہندوستان آئے تھے۔ دہلی پہنچتے ہی انہیں حکم ملا کہ جونپور کی طرف کچھ اور نووارد ترکی خاندانوں کے ساتھ ایک بڑے گاؤں میں جس کا نام خالد پور رکھا گیا تھا۔ مسلمان آبادی کی بنیادیں ڈالیں۔ حکیم مسیح نے حکم کی تعمیل کی اور خالد پور میں جا بسے رفتہ رفتہ دوسرے خاندان بھی آ گئے اور مسلمانوں کی ایک مستقل آبادی ہو گئی۔ حکیم مسیح نے اسلامی دنیا کے تقریباً تمام مشہور طبیبوں کی شاگردی کی تھی اور اپنے فن میں ماہر تھے اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ وہ تھوڑے دنوں میں آس پاس مشہور ہو گئے اور ترکستان میں ان کے خاندان نے جو کچھ کھویا تھا وہ ہندوستان میں انہیں واپس ملنے لگا۔ ان کی ماں نے ایک ترکی رئیس کی بیٹی سے ان کی شادی بھی کرا دی جس سے انہیں شرافت اور سرمایہ داری کا تمغہ مل گیا۔

حکیم مسیح نہایت حسین، خوش مزاج اور شائستہ آدمی تھے۔ دنیا کی مصیبتیں ان کی طبیعت میں ذرا بھی ترشی یا تلخی نہیں پیدا کر سکی تھیں۔ وہ اونچا نیچا دیکھ چکے تھے، خود ہمدردی کی تلاش میں رہ چکے تھے اور اب ہر ایک سے اچھا سلوک کرنے پر تیار تھے۔ تجربہ نے انہیں انسان کی فطرت کے بھید بتا دیے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ محبت سے بات کرنے کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ مریض کو دوا سے کتنا فائدہ پہنچتا ہے اور طبیب کے اخلاق سے کتنا ان کا برتاؤ بیماروں اور تیمارداروں کے ساتھ ایسا تھا کہ لوگ محض ان کی توجہ کو کافی سمجھتے تھے لیکن وہ مرض کی تشخیص بھی بہت سمجھ کر کرتے تھے اور دوائیں نہایت احتیاط سے اکثر اپنے سامنے تیار کراتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی ناکامی کی وجہ علاوہ تقدیر کے اور کوئی نہیں سمجھی جاتی تھی۔

لیکن حکیم مسیح باوجود اپنی دلیری اور ہردلعزیزی اور شہرت کے اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے۔ کچھ اپنے وطن کی یاد بے چین کرتی تھی، کچھ ہندوستان کی فضا۔ مگر سب سے زیادہ انہیں یہ خیال ستاتا تھا کہ اب وہ یہیں دفن ہوں گے۔ ان کا دل ہر قسم کے تعصب سے پاک تھا، لیکن پھر بھی وہ ہندوؤں کو اپنے جیسا آدمی سمجھتے تھے، نہ ہندوستان کو اپنے جیسا ملک۔ ان پر کچھ اثر ان کی بیوی اور ان کی سسرال کا تھا۔ یہ لوگ کسی مجلس کو بغیر اپنے ملک کی یاد میں نوحہ خوانی کئے نہیں برخاست کرتے تھے اور بغیر ہندو قوم اور ہندو مذہب پر لعنت بھیجے کسی مسئلہ پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ حکیم مسیح کو ہندوؤں سے اس قدر سابقہ پڑتا تھا اور ہندو ان کی اس قدر عزت، ان سے اتنی محبت کرتے تھے کہ ان کا اپنی سسرال والوں کا ہم خیال ہونا ناممکن تھا۔ لیکن ان لوگوں کے تعصب کا اتنا تو اثر ضرور ہوا کہ حکیم مسیح نہ ہندوؤں میں اس طرح گھل مل سکے جیسے کہ ان کی فطرت کا تقاضا تھا اور نہ ہندوستان کے زمین آسمان کو اپنا وطن بنا سکے۔ عزت اور شہرت حاصل کرنے پر بھی ان کو اس کا ارمان رہ گیا کہ ایک دم

بھر کے لیے طبیعت میں وہ سکون پیدا کر سکیں' اپنی زندگی کو مستقل یا اپنے گھر کو گھر سمجھ سکیں۔

یوں ہی دن گزرتے گئے حکیم مسیح کی ماں کا انتقال ہو گیا اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئیں جو آبادی کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ لیکن حکیم مسیح کو کسی طرح سے یقین نہ آسکا کہ ہندوستان میں ان کی نسل نے جڑ پکڑ لی ہے' اور ان کی روحانی بے چینی انہیں پریشان کرتی رہی۔ "کاش! مجھے ایک ایسا کیمیا گر ملتا" انہوں نے اپنی بیوی سے ایک دن کہا "جو میری فطرت میں اس سرزمین سے مناسبت پیدا کر دیتا۔ آخر میں کب تک اپنے آپ کو مسافر یا مہمان سمجھتا رہوں گا؟۔"

اس کے جواب میں ان کی بیوی نے آنکھیں نکالیں اور طنز سے کہا

"جب جوانی تھی تو ہمت ہارے بیٹھے رہے۔ اب بڑھاپے میں کیمیا گر کی تلاش ہے۔ جو ارادہ کا کمزور ہو اس کی مدد کرنا قادر مطلق کے امکان سے بھی باہر ہے۔"

حکیم مسیح مسکرائے' ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئے۔

اس گفتگو کے کچھ دن بعد ہی ان کی مطب میں ایک طاعون کا مریض لایا گیا۔ حکیم صاحب نے اس کے لئے تو نسخہ لکھ دیا لیکن اپنے گھر کہلا بھیجا کہ خالد پور میں طاعون کا اندیشہ ہے اور سب کو فوراً سفر کی تیاری کرنا چاہیے۔ ان کے گھر سے دوسرے مسلمان گھرانوں میں خبر پہنچائی گئی اور ساری بستی میں کھلبلی مچ گئی۔ جب حکیم مسیح کے پاس شام تک اور مریض بھی پہنچے تو انہوں نے یہ اطلاع دی کہ طاعون کا حملہ غالباً شدید ہونے والا ہے۔ تو سب نے اسی رات بستی چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا۔ حکیم مسیح خود خالد پور میں ٹھہرنے کا ارادہ کر چکے تھے اور انہوں نے اپنی بیوی کو اس کی مصلحت سمجھانے کی بہت سی دلیلیں بھی سوچ لی تھیں۔ مگر ان کی بیوی ان سے زیادہ دور اندیش ثابت ہوئیں اور جب وہ مغرب کے قریب گھر کے اندر گئے تو انہوں نے دیکھا تمام نوکر بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے ہیں اور ان کی بیوی رو پیٹ رہی ہے۔ پہلے تو ان کو یہ شبہ ہوا کہ شاید گھر میں کوئی طاعون کا شکار بنا ہے مگر جب بڑی دقت سے انہوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ انہی کا ماتم ہو رہا ہے۔ ان کی بیوی نے محض اس اندیشہ میں کہ وہ خالد پور چھوڑنے سے انکار کریں گے صرف خود ہی رونا دھونا شروع نہیں کر دیا تھا بلکہ تمام محلہ والوں اور عزیزوں سے ان کی اس حماقت کی شکایت بھی کی تھی۔ اور ہر ایک کو رو رو کر ان کے ارادہ کی مخالفت پر آمادہ کر لیا تھا۔ حکیم مسیح کھڑے تدبیریں سوچ رہے تھے کہ ان کے خسر اور سالے آگئے اور انہیں گھیر کے کھڑے ہو گئے۔ باری باری سے ایک سمجھاتا دوسرا ڈانٹتا تھا اور دونوں اس قدر گھبرائے تھے کہ بہت دیر تک حکیم مسیح کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن وہ تو حکیم مسیح کو بات سمجھنے اور جواب سوچنے کا موقع ہی نہ دینا چاہتے تھے اور قبل اس کے حکیم مسیح زبان ہلا سکیں دونوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے اور خدا اور رسولؐ اور مسلمانوں کی جانوں کی قسمیں دلائیں ان کی جوان بیوی اور ننھے بچوں کی حفاظت کا فرض یاد دلایا اور آخر میں ہندو قوم پر لعنت بھیجی اور کہا کہ یہ اسی قابل ہے کہ طاعون اور ہیضہ میں ہلاک ہو اور کسی مسلمان کو اس کو بچانے کے لیے اپنی جان خطرہ میں نہ ڈالنی چاہیے۔

اب حکیم مسیح سمجھے کہ اس عجیب و غریب تقریر کا مقصد کیا ہے اور انہوں نے جو دلیلیں اپنی بیوی کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے سوچ رکھی تھیں ان سے کام لینا چاہا مگر ان کے خسر اور سالے نے ان کی ذرا سی خاموشی کو رضامندی قرار دیا اور چلا اٹھے۔

"ارے وہ بے چارہ تو کچھ کہتا ہی نہیں۔ وہ خود جانے پر تیار ہے۔"

حکیم مسیح پھر کچھ عذر کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی بیوی جو اپنے فریق کو مضبوط پا کر ان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھیں کہنے لگیں "آپ لوگوں کے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اطمینان اسی وقت ہو گا جب یہ خود اپنی زبان سے کہہ دیں کہ ہمارے ساتھ چلیں گے" "چلیں گے' کیوں نہیں" حکیم مسیح کے سالے نے کہا "تم سامان تیار کراؤ وہ اپنی مرضی سے نہ گئے تو ہم زبردستی لے جائیں گے۔"

یہ کہہ کر حکیم مسیح کے سالے نے اندر سفر کی تیاری کا دوبارہ حکم دیا اور حکیم مسیح کا ہاتھ پکڑ کر انہیں باہر لے گئے۔ یہاں انہیں قائل کرنے کے لئے بہت سے مسلمان ہمسایہ موجود تھے' بزرگ جن کی حکیم مسیح بہت عزت کرتے تھے' ہم عمر دوست جن کی صحبت کے بغیر ان کا زندہ

رہنا دشوار ہوتا' یہ لوگ بھی کبھی باری باری سے' کبھی ایک ساتھ تقریریں کرتے رہے مگر حکیم مسیح نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ انہوں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ ان کا خالد پور کے ہندو باشندوں کو اس طرح سے چھوڑ کر چلے جانا' ایک شدید اخلاقی جرم ہے جس کا الزام نہ وہ اپنی بیوی پر لگا سکتے ہیں نہ رشتہ داروں پر لیکن انہوں نے اس وقت کی بھی تصویر کھینچی جب خالد پور میں ایک مسلمان باقی نہ رہا ہو گا' ان کے سارے دوست اور عزیز ہندوستان کی وسعت میں غائب ہو گئے ہوں گے۔ وہ طرز زندگی جس سے وہ مانوس تھے ناممکن ہو جائے گا۔ وہ خود اگر زندہ رہے تو گھر میں اکیلے بیٹھے دوائیں بناتے رہیں گے اور اگر مر گئے تو اکیلے دفن ہوں گے اور ان کے جنازہ کی نماز تک پڑھنے کے لیے کوئی مسلمان نہ ہو گا۔ خالد پور چھوڑنا ان کے لیے ایک اخلاقی جرم ضرور تھا مگر ایسی زندگی برداشت کرنا کسی جرم کی سزا بھگتنے سے بھی انہیں مشکل معلوم ہوا۔ انہوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ انہیں زندگی کے فرائض سے جلد سبکدوش کیا جائے اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

جب رات کو مسلمان قافلہ بستی سے نکلا تو حکیم مسیح اس کے ساتھ تھے۔

ان کو امید تھی کہ اپنے ضمیر کو وہ کسی طرح سے سمجھا بجھا کر منا لیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی ساری تدبیریں پلٹ گئیں۔ انہوں نے ہزار کوشش کی کہ گذشتہ زندگی کو بالکل بھول جائیں۔ مگر ان کا تصور قابو سے نکل گیا اور ہر لحہ ایک نیا صدمہ پہنچانے لگا۔ ذرا کہیں کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور انہیں خیال آیا کہ اس وقت معلوم نہیں کتنے لوگ جن کو ابھی اس کی خبر نہیں ملی ہے کہ حکیم مسیح انہیں مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان کے دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹا رہے ہوں گے۔ کوئی بچہ رویا اور انہیں یاد آیا کہ ناگہانی موت کیسی بلا ہوتی ہے خالد پور میں کتنے بچے اس وقت اپنی مردہ ماؤں کے پیار کے لیے تڑپ رہے ہوں گے۔ کتنی مائیں اس وقت ہاتھ مل مل کر کہہ رہی ہوں گی کہ اگر حکیم مسیح چلے نہ گئے ہوتے تو ان کے بچوں کی جان بچا لیتے۔ حکیم مسیح کی آنکھوں میں بار بار آنسو بھر آئے۔ سر چکر کھانے لگا لیکن واپس جانے کی ہمت انہیں پھر بھی نہ ہوئی۔

قافلہ نے خالد پور سے کوئی دس میل پر جا کر منزل کی۔ حکیم مسیح تھک کر چور ہو گئے تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ نیند کسی طرح سے نصیب نہ ہو گی اور ہوا بھی یہی کچھ۔ کچھ دیر تک تو ان پر ایک غفلت سی طاری رہی جس سے ان کی تکان جاتی رہی لیکن پھر وہ پریشان خواب دیکھنے لگے۔ کبھی وہ پہاڑ کی چوٹی پر سے پھسل کر نیچے گرتے تھے' کبھی گھوڑے پر سوار ایک غار میں پھاند پڑتے تھے۔ جس کی تہ میں خوفناک تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ خواب ہی میں ان کو خیال آیا کہ وہ دہلی جا رہے ہیں۔ ایک تیز آندھی آئی جس میں ان کا گھوڑا کئی مرتبہ زمین پر سے اڑا۔ اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک وسیع میدان میں کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے ایک لمبی پتلی سی سڑک ہے جو دور جا کر کالے بادلوں میں گم ہو جاتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ایک اونچی منڈیر ہے اور منڈیر کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ہے جو کہیں ختم ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور کالی گھٹا کی طرف روانہ ہوئے۔ دہلی کا رخ وہی تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں سامنے سڑک کے کنارے ایک سیاہ نقطہ سا نظر آیا۔ پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی غالباً ستانے کے لیے منڈیر پر بیٹھا ہے۔ انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور آگے بڑھ گئے مگر کوئی دس قدم چلنے کے بعد ان کا گھوڑا رک گیا اور ایڑ اور چابک بھی اسے اس جگہ سے نہ ہلا سکے۔ واپس جانے پر وہ تیار تھا۔ آگے معلوم ہوتا تھا کہ اسے مردہ لیجانا بھی مشکل ہو گا۔ حکیم مسیح سمجھے کہ وہ کسی چیز کو دیکھ کر بھڑک گیا ہے اور اس کا مزاج درست کرنے کے لیے وہ تھوڑی دور واپس جانے پر راضی ہو گئے۔ مڑتے وقت ان کی نظر پھر اس مسافر پر پڑی وہ منڈیر پر بیٹھا انہیں تک رہا تھا۔ گھوڑا کسی وجہ سے خود بخود اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور حکیم مسیح نے سوچا کہ کچھ دیر اسی سے باتیں کر لیں۔

گفتگو شروع کرنے سے پہلے حکیم مسیح نے اسے غور سے دیکھا۔ مسافر کا لباس ایک خوشحال ہندو کاریگر کا تھا یعنی نیچے ایک موٹے سوت کی دھوتی' اتنے ہی موٹے کپڑے کی بنڈی اور سر پر ایک پگڑی جو اس نے اس وقت اتار کر اپنے پاس زمین پر رکھ دی تھی۔ اس کے کندھوں اور پیٹھ پر ایک موٹی سخت اون کی کملی پڑی ہوئی تھی۔ مسافر کا قد بہت لمبا تھا۔ سینہ چوڑا' پٹھے تنے اور ابھرے ہوئے' جس کی وجہ سے پہلی نظر میں وہ

ایک معمولی انسان نہیں بلکہ ایک زندہ فولاد کی ڈھلی ہوئی مورت معلوم ہوتا تھا۔ اس کی داڑھی کے لمبے سیدھے بال' اونچی پتلی ناک' چوڑی پیشانی' چہرہ کا نمایاں سکون' سب اسی وہم میں ڈالتے تھے کہ اس کا جسم آہنی ہے مگر آنکھوں کو دیکھتے ہی یہ سارا طلسم ٹوٹ جاتا اس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں ایک نرمی' محبت اور ایثار تھا۔ حکیم مسیح پر بھی ان آنکھوں کا اثر ہوا۔ وہ جواب میں مسکرا دیئے اور دیر تک مسافر کے مردانہ حسن کا لطف اٹھاتے رہے۔ آخر کار انہوں نے پوچھا۔

"اے آہنی جسم کے مسافر! تو کہاں جا رہا ہے؟"

مسافر نے پہلے سر جھکا لیا' پھر ان سے آنکھ لڑا کر کچھ مایوسی کے لہجہ میں کہا "خالد پورا"

"مگر ہاں تو طاعون ہے۔"

"وہاں میں اسی لیے جا رہا ہوں"

حکیم مسیح کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ کہہ سکے لیکن مسافر نے انگڑائی سی لی اور انہیں اس خوبصورت مردانہ جسم پر رحم آیا جو جان بوجھ کر موت کو دعوت دے رہا تھا۔ انہوں نے بڑی حسرت سے مسافر کی طرف دیکھا اور پوچھا:

"اے مسافر! کیا تجھے اپنی جان عزیز نہیں؟"

"مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے اور ہمیشہ رہے گی۔" مسافر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا "جتنی وہ مجھے عزیز ہے اتنی ہی خدا کو عزیز ہو گی' اگر میں نے اس کی راہ میں قربان کر دی۔"

حکیم مسیح پھر چپ ہو گئے۔ مسافر کی صورت سے ظاہر تھا کہ اس کا قول پکا ہے۔ انہیں اپنی کمزوری یاد آئی اور اس بلند ہمت اور پختہ ارادہ پر رشک آیا۔ لیکن انہوں نے سوچا کہ شاید یہ دنیا میں اکیلا ہو اور انتہائی ایثار سے روکنے کے لیے کوئی دنیاوی تعلقات نہ ہوں۔ کچھ وہ اپنا بچاؤ بھی کرنا چاہتے تھے۔

"اے مسافر! کیا دنیا میں تیرے ساتھ محبت کرنے والا کوئی نہیں؟"

"محبت کا جواب محبت ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں مجھ سے محبت کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر محبت مجھے کسی بھلائی سے نہیں ہو سکتی۔"

آخری جملہ حکیم مسیح کے سینہ میں تیر کی طرح لگا اور وہ بے تاب ہو گئے۔

"اے مسافر! تو آخر کہاں سے آیا ہے؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں خدا کا بندہ ہوں' کسی ملک کا باشندہ نہیں۔" مسافر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا' "جس ملک میں میرا خدا مجھے پہنچا دے وہی میرا وطن ہے' اسی کی خدمت میرا فرض ہے۔"

"لیکن تیرا مکان تو ضرور ہو گا؟"

"دنیا میں ہزاروں خدا کے بندے ہیں جن کے پاس مکان' بیوی' بچے کچھ نہیں۔۔۔۔ میں جہاں تھکا وہیں بیٹھ جاتا ہوں جہاں نیند آئی وہیں سو جاتا ہوں۔"

مگر مسافر تیرے بیوی بچے ہوتے تو تو کیا کرتا؟"

"عورت کی محبت سے بہتر اور کوئی نعمت خدا نے انسان کو نہیں بخشی ہے۔ میری اگر بیوی ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کے قدموں پر گرتا اور اس سے کہتا کہ مجھ میں طاقت نہیں' ہمت نہیں' صرف تیری محبت مجھے سیدھے راستے پر چلا سکتی ہے۔ چل میری رہبری کر' میں تیرے بغیر بالکل مجبور ہوں۔۔۔۔۔۔"

"مگر مسافر طاعون کا علاج محبت سے کیسے ہو سکتا ہے؟" حکیم مسیح نے مسافر کو ٹوک کر کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے کو تیار تھے اور بدن پسینہ سے شرابور ہو گیا۔"

"محبت ہر بیماری کا علاج ہے' ہر زخم کا مرہم ہے' محبت زندگی اور موت کا فرق مٹا دیتی ہے' ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ انسان کی محبت میں خدا کی رحمت کی تاثیر ہے۔ تجھے یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔"

حکیم مسیح! مسافر اچانک بول اٹھا "مسلمان کسی خاص ملک میں پیدا ہونے سے نہیں۔ بنتا اسلام کسی خاص طرز معاشرت کا نام نہیں۔ مسلمان بننا چاہتے ہو تو جاؤ' خدا کو سجدہ کرو' دنیا کی مصیبتیں جھیلو' دوسروں کی خدمت کرو' ان پر سے زندگی کا بوجھ ہلکا کرو' تمہارے دل میں ایمان کا خزانہ ہے۔"

حکیم مسیح کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس قدر روئے تھے کہ تکیہ بھیگ گیا تھا لیکن ان کو اب نہ اپنی سرخ آنکھوں کی پروا تھی نہ تھکے ماندے جسم کی انہوں نے "یا رسول" کا نعرہ مارا۔ پلنگ پر سے اچک کر دوڑتے ہوئے اصطبل گئے اور ایک گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہو کر خالد پور کی طرف چل دئے۔

رات کو حکیم مسیح کے جانے کی خبر سن کر خالد پور کے آبادی میں ادھم مچ گیا۔ کسی میں اتنی ہمت باقی نہ رہ گئی تھی کہ طاعون سے بچنے کی امید کرے اور ہر شخص اپنا ماتم کرنے لگا۔ لیکن سویرے جب حکیم مسیح کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو ہر ایک کی جان میں جان آگئی۔ جس نے بھی یہ خبر سنی وہ اپنا دل مضبوط کر کے ان کے مطب میں بھاگا ہوا آیا اور اس نے حکیم مسیح کو دواخانہ کے دروازہ پر بیٹھا پایا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شرمندگی سے ان کی نظریں نیچی تھیں۔ مگر جس کسی نے چاہا نبض دکھائی اور دوالی۔

ادھر صبح سویرے جب مسلمان قافلے نے کوچ کی تیاری کی تو معلوم ہوا کہ حکیم مسیح غائب ہیں۔ نوکروں میں سے ایک نے کہا کہ اس نے رات کے تیسرے پہر "یا رسول" کا ایک نعرہ سنا تھا۔ لیکن اسے زیادہ اور کچھ نہ بتا سکا۔ حکیم مسیح کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً سمجھ گئیں کہ وہ خالد پور واپس بھاگ گئے ہیں۔ وہ بہت روئیں' اپنے دونوں بچوں کو بھائی کے سپرد کیا اور بیوہ کی زندگی سے بچنے کے لئے بیوی کی موت مرنے خالد پور چلیں۔ جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو شام ہو چکی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سویرے سے دواخانہ کے سامنے بیٹھے ہیں نہ پانی پیا ہے' نہ کھانا کھایا ہے' بال پریشان ہیں' آنکھیں سرخ' لیکن مریضوں کا تانتا بندھا ہے اور وہ برابر نبض دیکھ رہے ہیں اور دوائیں دے رہے ہیں۔ انہوں نے نوکر کے ذریعہ سے کچھ کہلا بھیجا۔ مگر نوکر کو حکیم صاحب کے پاس پہنچنے میں زیادہ دیر لگی' اور جب وہ پہنچ گیا تو حکیم صاحب نے نہ اسے پہچانا نہ اس کی بات سمجھے۔ رات بھر انہوں نے حکیم صاحب کی آمد کا نہایت بے تابی سے انتظار کیا۔ لیکن جب وہ سویرے تک نہیں آئے تو خود باہر پہنچیں۔ وہاں ابھی سے لوگ موجود تھے لیکن انہیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا اور وہ حکیم صاحب کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ حکیم مسیح انہیں آسانی سے پہچان نہ سکے لیکن جب پہچان لیا تو مسکرائے' کچھ سوچا اور کہا'

"لالہ سیتا رام کی بیوی بیمار ہیں۔ میں نے دوا بھیج دی ہے لیکن ان کی تیمارداری کے لیے کوئی نہیں۔ اگر وہاں چلی جائیں------"

حکیم مسیح کی بیوی نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ پچھلے دنوں کی تکان کا نام و نشان نہ تھا' آنکھیں اب بھی سرخ تھیں مگر چہرہ سے نور برس رہا تھا۔ کپڑوں پر کچھ مٹی سی لگی رہ گئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو زمین پر سوئے ہیں۔ یہ ایک نظر کافی تھی' وہ باہر نکلیں اور راستہ پوچھتے پوچھتے لالہ سیتا رام کے گھر پہنچ گئیں....

خالد پور میں دو ماہ تک طاعون کا دورہ رہا' اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بیماروں کا علاج کیا جاتا تھا لیکن بیماری کو روکنے کی تدبیر کوئی نہ تھی۔ لیکن اگر حکیم مسیح نہ ہوتے تو غالباً ساری بستی تباہ ہو جاتی۔ ان کی موجودگی سے وہم اور خوف جو اکثر بیماری سے زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں لوگوں کے دلوں میں جڑ نہ پکڑ سکے۔ کوئی مریض ایسا نہیں تھا جس کو وہ دیکھ نہ سکے ہوں یا جس کی ہمت ان کے اخلاق اور ہمدردی نے دوگونہ نہ کی ہو۔ وہ دن رات مریضوں کو دیکھنے میں اور ان کے لئے دوائیں تیار کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن یہ بھی ان کو تسکین دلانے کے لیے کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مردوں کو نہلانے دھلانے اور جنازے کو شہر سے باہر پہنچانے میں مدد دیں لیکن اس کام کے لئے ان کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہ ان کی بیوی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا جس کو وہ علاوہ عورتوں کی تیمارداری اور یتیم بچوں کی دیکھ بھال کے کرتی تھیں۔ اپنی

اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس زمانے میں وہ اکثر ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکتے۔ مگر بستی والوں کو ان دونوں سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ حکیم صاحب کو ان کی بیوی کی اور ان کی بیوی کو حکیم صاحب کی خبر ہر وقت پہنچتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ بیماری اور موت کی پریشانیوں میں دوسرے انہیں بھول گئے اور ان کے ضمیر نے ملاقات کے لیے فرائض ترک کرنے کی اجازت نہ دی مگر ان کے دلوں میں خدا پر اس قدر قوی اور زندہ ایمان تھا کہ مایوسی' خود غرضی یا خوف ان کے پاس نہ پھٹکنے پائے اور وقت اور فاصلہ ان کی روحوں کو جدا نہ کر سکا۔

آخر کار طاعون کا زور کم ہوا اور اب وہ حالت ممکن ہونے لگی جسے حکیم مسیح موت کی سزا سے زیادہ تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ مریض کم ہوئے' کام کم ہوا فرصت کا وقت بڑھا مگر اب حکیم مسیح ہندو آبادی میں گھل مل گئے تھے۔ جو دیوار وہم نے ان کے اور ہندوؤں کے درمیان میں کھڑی کر دی تھی نیست و نابود ہو چکی تھی۔ بغیر کسی کوشش کے حکیم مسیح کا مکان بستی کی زندگی کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک درگاہ جہاں حاجت مند مدد کے لئے آتے تھے۔ ماہران فن قدردانی اور ہمت افزائی کے لئے' مظلوم شکایات کے لئے اور جھگڑالو انصاف کے لئے' ان کی شہرت کا ڈھنڈورا دور دور تک پٹ چکا تھا' لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے تھے اور دل میں اس کا افسوس واپس لے جاتے تھے کہ حکیم صاحب کافی مشہور نہیں۔ جس نے حکیم مسیح کا نام سنا وہ ان کی بیوی کی شخصیت سے بھی ضرور واقف ہو جاتا تھا۔ ان کے لئے ہر جگہ سے قیمتی تحفے آتے تھے' گھر کا سامان' کپڑے' جواہرات ایسے جو بادشاہوں اور لیڈروں کو بھی نصیب نہیں ہوتے مگر حکیم صاحب اور ان کی بیوی اپنے مکان میں غریبوں کی طرح سے رہتے تھے تجربہ انہیں سکھا چکا تھا کہ دنیا کی اصل نعمت کیا ہے اور تحفوں کو ہمیشہ اسی محبت سے دوسروں کو دے دیتے تھے جس سے وہ ان کی خدمت میں پیش کیے جاتے تھے۔

خالد پور میں کوئی ایسا ذاتی یا عام معاملہ نہ تھا جس کا حکیم مسیح اور ان کی بیوی کو علم نہ ہو اور نہ کوئی ایسی تقریب تھی جس میں ان کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو لیکن باوجود اس کے ان کی زندگی کا ایک پہلو تھا جس کا راز سوائے ان کے اور ان کے خدا کے کسی پر ظاہر نہ تھا۔ لوگ انہیں مصروف دیکھتے تھے انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں کے دل کہیں اور ہیں اور وہ محبت اور پیار کی نظریں جو وہ اوروں پر برساتے ہیں اسی محبت کا دھندلا عکس ہے جس میں ان کی ہستیاں فنا ہو گئی ہیں۔ وہ دونوں بھی جانتے تھے کہ یہ محبت کوئی پرائی چیز نہیں ہے' خود بخود پیدا نہیں ہوئی اور ہر حالت میں قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہی ان کی انسانیت کا جوہر ہے اور اگر وہ اس کی قیمت کم نہیں کرنا چاہتے تو انہیں وہ آگ جلاتے رہنا چاہیے جس میں وہ پختہ ہوئی تھی اس لیے جب حکیم مسیح نے دیکھا کہ طاعون انہیں بہت مصروف نہیں رکھتا تو انہوں نے خالد پور کے باشندوں سے ایک مسجد بنانے کی اجازت مانگی۔ وہ اس پر بہت خوشی سے راضی ہو گئے بلکہ یہ خواہش بھی کی کہ چندہ جمع کر کے ایک عالی شان عمارت بنائی جائے لیکن حکیم مسیح کو یہ منظور نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی بیوی کی مدد سے ایک چھوٹی سی کچی مسجد ایک بڑے سایہ دار درخت کے نیچے تیار کر لی جس میں صرف یہ خوبی تھی کہ اسے دو سچے مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنی محبت کو پختہ کرنے کے لیے بنایا تھا۔

ہر شام کو مغرب کے وقت حکیم مسیح اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اس مسجد میں جایا کرتے تھے۔ اور وہاں کبھی ایک گھنٹہ کبھی دو' کبھی ساری رات گزارتے تھے ایک مرتبہ ان کی بیوی کو آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے' ان کی بیوی پڑھ رہی تھیں۔ حکیم مسیح ان کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے ان کی بیوی نہایت خلوص سے نماز پڑھ رہی تھیں اور اس خلوص سے ان کے چہرہ پر ایسی رونق آگئی تھی کہ حکیم مسیح اپنی نظر نہ ہٹا سکے۔ دیکھتے دیکھتے انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اپنی بیوی سے نہ اپنے خواب کا ذکر کیا ہے نہ اس آہنی جسم والے مسافر کا جس نے ان کو خالد پور واپس بھیجا۔ وہ خود اس خواب کے اثر میں ایثار کی مصیبتیں جھیل سکتے تھے' اس بچاری عورت کو یہ روحانی تقویت بھی میسر نہیں ہوئی مگر اس پر بھی وہ ان سے ایک قدم پیچھے نہیں رہی۔ یہ ہمت سوائے اس محبت کے جو آہنی جسم والے مسافر کی طرح ہو حکیم مسیح بھی دل ہی دل میں اپنی بیوی کے قدموں پر گرے اور اس سے التجا کی کہ اپنی محبت سے ان کی ہمت کو دوگونہ کرے' ان کے فرائض یاد دلاتی رہے اور انہیں ادا کرنے کی قوت بخشے۔

جب ان کی بیوی نے سلام پھیرا تو انہوں نے دیکھا کہ حکیم مسیح کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں اور وہ ٹکٹکی لگائے ان کی طرف دیکھ رہے

ہیں۔ انہوں نے وجہ پوچھی۔ حکیم مسیح کچھ دیر تک جواب نہ دے سکے۔ پھر اپنے خواب کا سارا قصہ سنایا اور آخر میں کہا۔

"تم کو شاید یاد ہو' میں نے ایک مرتبہ اسی وقت شام کو ایک ایسے کیمیاگر کی آرزو کی تھی جو اس ملک کو میرا وطن بنا دے' اس قوم میں مجھے کھپا دے۔ دیکھو اس کیمیاگر نے ہم دونوں کو کیا سے کیا بنا دیا۔"

باتیں کرتے کرتے حکیم مسیح اپنی بیوی کے بالکل پاس پہنچ گئے تھے۔ ان کی بی بی نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر چوما' ان کے منہ پر ایک دعا پڑھ کر پھونکی اور پھر دونوں اپنے کیمیاگر کے تصور میں محو ہو گئے۔

○

اوپندر ناتھ اشک

نام : مادھو رام
قلمی نام : اوپندر ناتھ اشک
پیدائش : ۱۴ دسمبر ۱۹۱۰ء بہ مقام جالندھر' مشرقی پنجاب' بھارت
تعلیم : بی۔ اے' ایل ایل بی

دیانند اینگلو سنسکرت ہائی سکول' جالندھر (نزد قلعہ محلہ) کی پرائمری برانچ سے چوتھے درجے تک تعلیم پائی اور اس کے بعد ہائی سکول برانچ میں منتقل ہو گئے۔ بی۔ اے' ڈی۔ اے۔ وی کالج جالندھر سے ۱۹۳۱ء میں اور ایل ایل بی۔ یونیورسٹی لاء کالج' لاہور سے ۱۹۳۶ء میں کیا۔

مختصر حالات زندگی:

اشک کے والد شمال مغربی ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے جنہیں شراب پینے اور گھر سے بے پروا رہنے کی عادت تھی اور (۱) ماں برہمنوں کے مشر گھرانے کی دھرم پرائن' نیک سیرت' پاک طینت اور خدا ترس عورت۔ گھریلو حالات اکثر خراب ہی رہے اور اشک چھوٹی عمر میں ہی روزی کمانے لگے۔ آٹھویں درجے میں تھے جب پنجابی شاعری کا آغاز کیا۔ مکھی رام اور نی سی گجراتی کے انداز میں پنجابی بیت کہے اور پھر یکلخت اردو کی طرف آ گئے۔ جالندھر کے استاد آذر کی شاگردی قبول کی اور اردو غزلوں کے ڈھیر لگا دیے۔ ۱۹۲۶ء میں استاد آذر جالندھری کی تنگ دلی سے ناراض ہو کر افسانہ نگاری شروع کی۔

۱۹۳۲ء میں دیانند اینگلو سنسکرت سکول جالندھر میں مدرس ہو گئے لیکن جلد ہی لاہور منتقل ہو گئے۔ لاہور میں حصول رزق کے لیے اشک نے ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے اور سیلز ایجنٹ اور پبلشر کے طور پر کام کیا۔ بعد ازاں فلمی دنیا میں گئے تو بہ حیثیت مکالمہ نویس' کہانی کار' گیت کار اور اداکار' غرضیکہ سب کچھ کیا۔ پہلی شادی شیلا سے ہوئی' ان دنوں اشک " ویر بھارت " کے سب ایڈیٹر تھے۔ اس کے بعد اخبار "بندے ماترم" میں بطور سب ایڈیٹر چلے گئے۔ شیلا ٹی۔ بی کی مریضہ تھی اور گھر کا خرچ پورا نہ ہوتا تھا۔ یوں اشک نے مختلف قلمی ناموں سے Ghost Writing کی۔ ان کے لکھے ہوئے ہدایت نامے لاکھوں کی تعداد میں بکے لیکن اشک کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ شیلا کا علاج گلاب دیوی (ٹی۔ بی) ہسپتال' لاہور سے جاری تھا اور اشک نے منشاء خداوندی کے خلاف جدوجہد کو انتہا تک پہنچا رکھا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں انہوں نے سیشن جج بننے کی ٹھانی اور یونیورسٹی لاء کالج' لاہور میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۳۶ء میں شیلا چل بسیں اور اشک ایل ایل بی کر گئے۔ اشک نے شیلا کے سورگ باش ہونے کے بعد چار برس تک شادی نہ کی۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں پریت نگر چلے گئے جہاں دو برس "پریت لڑی" کے ہندی/ اردو ایڈیشنوں کی ادارت کی۔ فروری ۱۹۴۱ء میں دوسری اور ستمبر ۱۹۴۱ء میں تیسری شادی کی۔ (تیسری بیوی کوشلیا ہندی اور اردو کی نمایاں افسانہ نگار ہیں۔) ۱۹۴۱ء میں اشک آل انڈیا ریڈیو' دہلی سے منسلک ہو گئے جہاں تادیر رہے۔

اشک نے اپنی جوانی لاہور' دہلی اور بمبئی میں گزاری ہے۔ وہ حد درجہ انا پسند اور ضدی مشہور ہیں۔ لڑکپن سے بڑھاپے تک مہینوں نہیں برسوں تک' نکسیر' ملیریا' قولنج' دق' ای او سنوفیلیا' یرقان' ایکوٹ گیسٹرائٹس' کینسر اور دمہ کے مریض رہے ہیں لیکن عجب شان

سے زندہ ہیں ۔ ۱۹۷۶ء سے الہ آباد ریڈیو کے اعزازی پروڈیوسر ہونے کے علاوہ گذشتہ بیس برس سے تصنیف و تالیف کو ذریعہ روزگار بنائے ہوئے ہیں ۔ ۱۹۴۷ء سے اردو کی نسبت ہندی میں زیادہ لکھا' ہندی میں لگ بھگ پینسٹھ کتابوں کے مصنف ہیں ۔ ایک پنجابی افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے ۔ ان کا ناول "گرتی دیواریں" بلاشبہ دنیا کا عظیم ترین ناول ہے' جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ مجموعی طور پر ساٹھ سے زائد مطبوعہ کتب کے مصنف ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"ودھوا کے جذبات" مطبوعہ روزنامہ "پرتاپ" لاہور' (سنڈے ایڈیشن) ۱۱ مارچ ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب): افسانے:

۱۔ "نورتن" ۔ جالندھر: شام کلیا بک ڈپو: ۱۹۳۰ء ۔ ص ۹۳

مندرجات: (۱) دیباچہ نظم میں ۔ قیس جالندھری ۔ ص ج (۲) طالب امن ۔ ص ۳ ۔ ۱۴' (۳) وہ رو رہی تھی ۔ ص ۱۵ ۔ ۳۱ (۴) اتنے نزدیک ۔ ص ۳۲ ۔ ۴۳ (۵) شکستہ ص ۶۵ ۔ ۸۲ (۶) انتقام ۔ ص ۸۳ ۔ ۹۳

۲۔ "عورت کی فطرت" لاہور: چمن بک اسٹال: ۱۹۳۳ء ۔ ۲۰۹ ص

مندرجات: (۱) تعارف پریم چند ۔ ص ۷ ۔ ۸ (۲) تقریب ۔ ہری چند اختر ۔ ص ۱۱ ۔ ۱۶' (۳) عورت کی فطرت ۔ ص ۱۷ ۔ ۳۸ (۴) نئی زندگی ۔ ص ۳۹ ۔ ۵۸ (۵) تانگہ والا ۔ ص ۵۹ ۔ ۸۰ (۶) ناکام رقاصہ ۔ ص ۸۱ ۔ ۹۶ (۷) جاہل بیوی ۔ ص ۹۷ ۔ ۱۱۴ (۸) گودڑ کا لعل ۔ ص ۱۱۵ ۔ ۱۳۰ (۹) ایرما ۔ ص ۱۳۱ ۔ ۱۵۰ (۱۰) بہشتی کی بیوی ۔ ص ۱۵۱ ۔ ۱۷۲ (۱۱) کفارہ ۔ ص ۱۷۳ ۔ ۲۰۹

۳۔ "ڈاچی" ۔ لاہور: اردو بک اسٹال: ۱۹۳۹ء ۔ ص ۲۰۸

مندرجات: (۱) پیش لفظ ۔ اشک ۔ ص ۱۲ ۔ ۱۹ (۲) ڈاچی ۔ ص ۱۷ ۔ ۳۲ (۳) ۳۲۴ ۔ ص ۳۳ ۔ ۶۴ (۴) امن کا طالب ۔ ص ۶۵ ۔ ۷۷ (۵) لیڈر ۔ ص ۷۹ ۔ ۹۳ (۶) احساس فرض ۔ ص ۹۵ ۔ ۱۱۴ (۷) خاموش شہید ۔ ص ۱۱۵ ۔ ۱۱۹ (۸) مایا ۔ ص ۱۳۱ ۔ ۱۳۳ (۹) زندگی کا راز ۔ ص ۱۳۵ ۔ ۱۵۴ (۱۰) سیلاب ۔ ص ۱۵۵ ۔ ۱۶۴ (۱۱) ڈاکو ۔ ص ۱۶۵ ۔ ۱۸۱ (۱۲) حربہ ۔ ص ۱۸۲ ۔ ۱۹۰ (۱۳) محبت ۔ ص ۱۹۱ ۔ ۲۰۸

۴۔ "کونپل" ۔ لاہور: مکتبہ اردو: ۱۹۴۰ء ۔ ۲۳۴ ص

مندرجات: (۱) افسانے کا فن اور ترقی پسندی ۔ ص ۹ ۔ ۲۸ (۲) کونپل ۔ ص ۲۹ ۔ ۵۲ (۳) سنگدل ۔ ص ۵۳ ۔ ۷۱ (۴) تہذیب ۔ ص ۷۳ ۔ ۸۸ (۵) گوکھرو ۔ ص ۸۹ ۔ ۱۰۹ (۶) موتی ۔ ص ۱۱۱ ۔ ۱۲۷ (۷) یہ مرد ۔ ص ۱۲۹ ۔ ۱۴۳ (۸) زندگی ۔ ص ۱۳۵ ۔ ۱۶۱ (۹) راجکمار ۔ ص ۱۶۳ ۔ ۱۸۰ (۱۰) دولو ۔ ص ۱۸۱ ۔ ۱۹۶ (۱۱) ماں ۔ ص ۱۹۷ ۔ ۲۱۳ (۱۲) قفس ۔ ص ۲۱۵ ۔ ۲۳۴

۵۔ "چٹان" لاہور مکتبہ اردو ۱۹۴۱ء ۔ ص ۱۴۰

مندرجات: (۱) چٹان ۔ ص ۱۱ ۔ ۲۹ (۲) بینگن کا پودہ ۔ ص ۳۱ ۔ ۳۸ (۳) ابال ۔ ص ۳۹ ۔ ۵۳ (۴) بیدروی کے خواب ۔ ص ۵۵ ۔ ۶۲ (۵) ناسور ۔ ص ۶۲ ۔ ۸۰ (۶) کاکڑاں کا تیلی ۔ ص ۸۱ ۔ ۹۴ (۷) جھٹکے ۔ ص ۹۷ ۔ ۱۰۴ (۸) کالو ۔ ص ۱۰۷ ۔ ۱۲۰ (۹) چیتن کی ماں ۔ ص ۱۲۱ ۔ ۱۳۶ (۱۰) یہ انسان ۔ ص ۱۳۷ ۔ ۱۵۰ (۱۱) کھلونے ۔ ص ۱۵۱ ۔ ۱۶۰

۶۔ "ناسور" دلی: ساقی بک ڈپو: ۱۹۴۳ء۔ ص ۲۰۷

مندرجات: (۱) تعارف ۔ وقار عظیم ۔ ص ۷۔۲۰ (۲) تلاش ۔ ص ۲۱۔۲۲ (۳) جدائی کی شام کا گیت ۔ ص ۲۳۔۳۵ (۴) نشانیاں ۔ ص ۳۶۔۴۶ (۵) وہ میری منگیتر تھی ۔ ص ۴۷۔۷۰ (۶) پھول کا انجام ۔ ص ۷۱۔۷۴ (۷) نیجا ۔ ص ۷۵۔۷۰ (۸) بدری ۔ ص ۸۹۔۱۰۰ (۹) مغرور ساحرہ ۔ ص ۱۰۱۔۱۰۵ (۱۰) جہنم کا انتخاب ۔ ص ۱۰۶۔۱۳۳ (۱۱) سراب ۔ ص ۱۳۴۔۱۳۴ (۱۲) راہگذار ۔ ص ۱۳۵۔۱۴۹ (۱۳) نار بابو ۔ ص ۱۵۰۔۱۵۹ (۱۴) ترغیب گناہ ۔ ص ۱۶۰۔۱۹۰ (۱۵) ناسور ۔ ص ۱۹۱۔۲۰۷

۷۔ "قفس" ۔ دلی: ساقی بکڈپو: ۱۹۴۳ء ص ۱۷۸

مندرجات: (۱) حرف آغاز (اشک) ۔ ص ۵۔۸ (۲) قفس ۔ ص ۹۔۳۱ (۳) کالو ۔ ص ۳۲۔۳۶ (۴) بگولے ۔ ص ۳۷۔۴۰ (۵) وہ میری منگیتر تھی ۔ ص ۴۱۔۵۷ (۶) آرٹسٹ ۔ ص ۵۸۔۶۰ (۷) ایک جھلک ۔ ص ۶۱۔۷۱ (۸) ہار جیت ۔ ص ۷۲۔۸۷ (۹) ۳۲۴ ۔ ص ۸۸۔۹۷ (۱۰) زندگی ۔ ص ۹۸۔۱۰۹ (۱۱) شاعر کی شکست ۔ ص ۱۱۰۔۱۲۹ (۱۲) مایا ۔ ص ۱۳۰۔۱۳۸ (۱۳) ترغیب گناہ ۔ ص ۱۵۱۔۱۷۸

۸۔ "کالے صاحب" ۔ دلی: مکتبہ جامعہ: ۱۹۵۲ء ص ۱۸۷

مندرجات: (۱) پیش لفظ ۔ محترمہ صالحہ عابد حسین ۔ ص ۷۔۱۴ (۲) کالے صاحب ص ۱۵۔۲۸ (۳) تکلف ۔ ص ۲۹۔۵۲ (۴) مجیل لینڈ ۔ ص ۵۳۔۷۶ (۵) رواقی ۔ ص ۷۷۔۱۰۲ (۶) کش ۔ ص ۱۰۳۔۱۳۰ (۷) بچے ۔ ص ۱۳۱۔۱۳۲ (۸) مسٹر گھٹ پانڈے ۔ ص ۱۳۳۔۱۹۴ (۹) کیپٹن رشید ۔ ص ۱۹۵۔۱۸۷

۹۔ "پلنگ" کراچی: اردو پاکٹ بکس (پاکستان) طبع اول: س ۔ ن

۱۰۔ "بینگنے" ۔ دلی: ہند پاکٹ بکس ۔ طبع اول: س ۔ ن

۱۱۔ اشک کے پنجابی افسانے

ناول

۱۲۔ "ستاروں کے کھیل" ۔ دلی: ساقی بک ڈپو: ۱۹۴۲ء ص ۲۵۸

۱۳۔ "پتھر الپتھر" ۔ الہ آباد: نیا ادارہ: ۱۹۸۱ء ۔ ص ۱۷۲

مندرجات: (۱) پیش لفظ (اشک) ۔ ص ۷۔۱۴ (۲) مقدمہ 'اشک کے ناول اور پتھر الپتھر' ۔ ڈاکٹر عطیہ نشاط ۔ ص ۱۷۔۴۰ (۳) ناول ' ص ۴۱۔۷۲

۱۴۔ "بڑی بڑی آنکھیں"

طویل ڈرامے

۱۵۔ "قید حیات" ۔ لاہور: مکتبہ اردو: ۱۹۴۷ء ۔ ص ۱۴۳

مندرجات: (۱) یہ دو ڈرامے ۔ فکر تونسوی ۔ ص ۳۔۱۲ (۲) قید حیات ۔ ص ۱۳۔۸۶ (۳) شکاری ۔ ص ۸۷۔۱۴۳

۱۶۔ "پنجرے" ۔ الہ آباد: نیا ادارہ: ۱۹۷۹ء ۔ ص ۱۴۴

۱۷۔ "چھنا بیٹا" ۔ الہ آباد: نیا ادارہ: ۱۹۸۱ء ۔ ص ۱۱۳
مندرجات: (۱) پیش لفظ ڈاکٹر اطہر پرویز ۔ ص ۹ ۔ ۱۹ (۲) چھنا بیٹا ۔ ص ۲۱ ۔ ۱۱۳

۱۸۔ "گرداب" ۔ الہ آباد: نیا ادارہ: ۱۹۸۱ء ۔ ص ۹۶
مندرجات: (۱) پیش لفظ ۔ ڈاکٹر اطہر پرویز ۔ ص ۹ ۔ ۳۰ (۲) گرداب ۔ ص ۳۱ ۔ ۹۶

یک بابی ڈرامے

۱۹۔ "پاپی" ۔ لاہور: مکتبہ اردو: ۱۹۴۱ء ص ۱۹۶
مندرجات: (۱) دیوتاؤں کے سائے تلے ۔ ص ۱ ۔ ۱۶ (۲) بیوہ ۔ ص ۱۷ ۔ ۴۲ (۳) حقوق کا محافظ ۔ ص ۴۳ ۔ ۶۶ (۴) پاپی ۔ ص ۶۷ ۔ ۸۶ (۵) کراس ورڈ ۔ ص ۸۷ ۔ ۱۰۲ (۶) کشمی کا سواگت ۔ ص ۱۰۳ ۔ ۱۳۲ (۷) باہمی سمجھوتہ ۔ ص ۱۳۳ ۔ ۱۳۴
(۸) جونک ۔ ص ۱۳۵ ۔ ۱۹۶

۲۰۔ "چرواہے" ۔ لاہور: مکتبہ اردو: ۱۹۴۲ء ۔ ص ۱۷۲
مندرجات: (۱) چرواہے ۔ ایک مطالعہ ۔ مختار صدیقی ۔ ص ۸ ۔ ۲۴ (۲) چرواہے ۔ ص ۲۵ ۔ ۳۵ (۳) میمونہ ۔ ص ۳۶ ۔ ۹۴
(۴) مقناطیس ۔ ص ۶۶ ۔ ۹۲ (۵) معجزے ۔ ص ۹۳ ۔ ۱۰۸ (۶) چلمن ۔ ص ۱۰۹ ۔ ۱۲۴ (۷) کھڑکی ۔ ص ۱۲۵ ۔ ۱۳۹
(۸) سوکھی ڈالی ۔ ص ۱۴۰ ۔ ۱۷۲

۲۱۔ "ازلی راستے" ۔ سلطانی بک ڈپو، بمبئی: طبع اول: ۱۹۴۶ء

۲۲۔ "تولیے" ۔ الہ آباد: نیا ادارہ: ۱۹۷۹ء ۔ ص ۱۵۶
مندرجات: (۱) تولیے ۔ ص ۱۰ ۔ ۴۳ (۲) نیا پرانا ۔ ص ۴۵ ۔ ۷۰ (۳) کیسا صاب کیسی آیا ۔ ص ۷۱ ۔ ۹۲
(۴) پرسرام ۔ ص ۹۳ ۔ ۱۱۴ (۵) پکا گانا ۔ ص ۱۱۵ ۔ ۱۵۶

تذکرے:

۲۳۔ "منٹو میرا دشمن" ۔ الہ آباد: نیا ادارہ: ص ۱۲۳
مندرجات: (۱) گذارش احوال 'اشک ص ۹ ۔ ۱۶ (۲) منٹو میرا دشمن ۱۷ ۔ ۱۲۳
لگ بھگ چھیاسٹھ ہندی کتابیں اس کے علاوہ ہیں۔

شاعری:

۲۴۔ "برگد کی بیٹی" طبع اول: ۱۹۴۷ء
۲۵۔ "گرتی دیواریں" (ہندی) طبع اول: ۱۹۴۷ء
۲۶۔ "شہر میں گھومتا آئینہ" (ہندی) طبع اول: ۱۹۶۳ء

۲۷۔ "اک ننھی قندیل" (ہندی) طبع اول: ۱۹۶۹ء

غیر مدون:

متعدد مضامین، افسانے اور خاکے اشاعت کے منتظر ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کا ضخیم ترین ناول "گرتی دیواریں"۔

مستقل پتہ:

۵۔ خسرو باغ روڈ، الہ آباد، بھارت۔

اعزاز:

۱۔ سنگیت ناٹک اکیڈمی ایوارڈ: ۱۹۶۵ء
۲۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ (برائے ڈراما) ۱۹۷۲ء
۳۔ اردو اکیڈمی لکھنؤ، ایوارڈ (برائے ڈراما) ۱۹۷۳ء
۴۔ ساہتیہ ورودھی: ایوارڈ، الہ آباد

نظریہ فن:

"چونکہ میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی، مشورہ نہیں کیا۔ خود ہی کہانیوں کو بگاڑتا سنوارتا رہا۔ اس لئے مجھے ایک کہانی کو کئی بار لکھنے کی عادت پڑ گئی۔ جب تک میری تسلی نہیں ہو جاتی میں برابر لکھتا رہتا ہوں۔ مجھے کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن کامیابی سے مجھے کبھی اطمینان نہیں ہوا۔ میری بھوک ان مٹ ہے۔"

(بحوالہ "میرا بہترین افسانہ" مرتبہ محمد حسن عسکری)

○

(۱) "ترک نفوذ زن" از راجندر سنگھ بیدی مطبوعہ: "الفاظ" علی گڑھ مارچ تا جون ۱۹۸۲ء

اوپندر ناتھ اشک

پلنگ

دلہن کی آنکھوں پر جھکتی ہوئی کیشی کی نگاہیں اچانک پلنگ کے سرہانے گول شیشہ میں لگی اپنی ماں کی چھوٹی سی تصویر پر چلی گئیں ۔ حسین کتابی چہرہ بڑی بڑی آنکھیں ' غلافی پلکیں ' پتلی نازک ناک ترشے ہوئے ہنستے ہونٹوں میں موتیوں کی قطار -------- اور اچانک دلہن کے چہرے پر کیشی کی اپنی ماں کے خطوط ابھر آئے -------- ! دونوں کے قدو قامت ' ناک نقشہ میں کتنی مشابہت تھی -------- کیشی کا ذہن دھندلا گیا ۔ ایک کپکپی اس کی رگوں میں دوڑتی چلی گئی ۔ سر کو ذرا سا جھٹکا دے کر اس نے اس تصویر کو نگاہوں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کی لیکن بچپن سے لے کر ابھی کچھ ہی سال پہلے تک وہ نہ جانے کتنی ہی بار اسی طرح ماں کے سینے پر لیٹا تھا -------- اور وہ یاد اس لمحہ اس کے ذہن کے پردے سے ہو کر نکل گئی اور اپنی دلہن کی پھیلی پھیلی مخمور آنکھیں اور گیلے رسیلے ہونٹ چومنے کے بدلے وہ اچانک بائیں جانب کو پھسل پڑا ۔ چت لیٹ گیا ۔ پل بھر کو اس کی نگاہیں مسہری کے خالی فریم پر چھائے موتیا کے لمبے ہاروں پر چلی گئیں ۔ اس کا ہاتھ سیج پر بچھی بیلے کی کلیوں پر جا پڑا اور اس کے جی میں آئی کہ وہ اچھل کر اٹھے اور اس معطرو معنبر حجلہ عروسی سے باہر نکل جائے۔

لیکن وہ نہ اچھلا نہ اٹھا ' چپ چاپ لیٹا رہا ۔ دلہن نہ جانے کیا سمجھے ۔ یہی خیال لاشعور میں اسے پلنگ سے باندھے رہا ۔ سر کو جھٹکا دے کر اس نے لمحہ بھر پہلے کی تصویر کو نظروں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کی لیکن ایک کے بدلے کتنی ہی تصویریں ایک دوسری کے اوپر برساتی بادلوں سے امنڈ پڑیں۔

-------- اسی کمرہ میں ۔ اسی پلنگ پر اس کے پاپا اور ممی ساتھ ساتھ لیٹے ہیں ۔ برآمدے میں پلنگڑی پر وہ پڑا ہے اور ایک ٹک انہیں تک رہا ہے ۔ پاپا کے ساتھ لیٹی ماں کتنی چھوٹی ' کتنی حسین لگتی ہے۔

-------- ماں آئینے کے سامنے بیٹھی سنگار کر رہی ہے اور وہ دروازہ کے پیچھے کھڑا چپ چاپ اسے دیکھ رہا ہے ۔ آیا جس پری کی کہانی سنایا کرتی تھی ' ویسی ہی حسین تو اس کی ماں ہے ۔ وہ اسے دیکھ لیتی ہے اور پیار سے بلاتی ہے ۔ زمین پر گھٹنے ٹیک ' خوشی سے وہ اس کی گود میں سر چھپا لیتا ہے ۔ ماں ایک ہاتھ سے اس کے بال سہلاتی ہے ۔ دوسرے سے اپنے بالوں میں کنگھی کئے جاتی ہے۔

...... جانے پاپا کو کیا ہو گیا ہے ؟ ایک آدمی روز آتا ہے ' اس کے گلے میں دو سانپ سے لٹک رہے ہیں ' ان کا ایک ایک سرا دونوں کانوں میں لگا کر ان کا منہ وہ پاپا کی چھاتی پر جہاں تہاں رکھتا ہے پھر ان کے بازو میں سوئیاں چبھوتا ہے ۔ پاپا نہیں روتے ' پر وہ رونے لگتا ہے ۔ ممی اسے چھاتی سے لگا لیتی ہے اور دوسرے کمرے میں لے جاتی ہے۔

...... پاپا زمین پر لیٹے ہیں ۔ ہلتے ڈولتے نہیں ۔ گھر میں سب رو رہے ہیں ۔ وہ بھی روتا ہے ۔ ماں روئے جاتی ہے ۔ اسے چومے جاتی ہے ۔ روئے جاتی ہے ۔ عورتیں اس کی چوڑیاں توڑ دیتی ہیں ۔ اس کے ماتھے کا سندور پونچھ دیتی ہیں ۔ کیشی کو اس کی گود سے چھین لیتی ہیں ۔ وہ روتا ہے ۔ روئے جاتا ہے مگر اسے کوئی چپ نہیں کراتا۔

...... وہی پلنگ ہے ۔ وہ اپنے پاپا کی جگہ لیٹا ہے ۔ ماں اس کے ساتھ لیٹی ہے ۔ ایک سادی سی سفید دھوتی پہنے ہے ۔ صبح کا اجالا کمرہ میں جھانک رہا ہے لیکن ماں بے سدھ سوئی ہے ۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہتا ہے -------- پتلا نازک پریوں کا سا چہرہ بند آنکھیں کھلے بکھرے

ہاں ------- وہ اسے اس شہزادی سی لگتی ہے جو سحرزدہ سوئی تھی اور جسے شہزادے نے آکر جگایا تھا --------- وہ دھیرے دھیرے بڑھتا ہے اور اسے کسی ' (Kissy) کرلیتا ہے ۔ اس کی ماں جھک جاتی ہے ۔ باہیں پھیلا کر اسے اپنے سینے سے لگالیتی ہے اور اس کی پیشانی آنکھیں اور اس کے ہونٹ چوم لیتی ہے۔

...... وہ اپنی ماں کے سینے پر لیٹا ہے ۔ وہ اسے شہزادے کی کہانی سنا رہی ہے جو سات سمندر پار سے شاہزادی بیاہ لایا تھا۔ کہانی سنا کر وہ اس سے پوچھتی ہے۔ "کیا تو بھی ایسی شہزادی سے شادی کرے گا۔"

"میں تم سے بیاہ کروں گا ۔"

"دھت پگلے ! کبھی بیٹے بھی ماؤں سے بیاہ کرتے ہیں ؟"

اور وہ اسے یقین دلاتی ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی جیسی دلہن بیاہ کرلائے گی ۔

"میں پھر یہی پلنگ لوں گا ۔" وہ پلنگ کے سرہانے لگی اپنی ماں کی حسین تصویر کو دیکھ کر ٹھنکتا ہے۔

"ہاں ۔ ہاں یہ پلنگ میں تمہیں اور تمہاری دلہن کو دوں گی ۔"

اور وہ اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیتی ہے ۔

"کیا بات ہے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے ؟" اچانک دلہن کہنی کے بل ہو کر اس کی پیشانی اور بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتی ہے۔

"نہیں کچھ نہیں !" سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے یادوں کو پرے ہٹاتا ہوا کیشی ہنستا ہے ----- ایک ایسی ہنسی ' جو لمبی سانس جیسی معلوم ہوتی ہے۔

اس کی ماں نے تو سچ ہی کہا تھا ۔ ویسا ہی بوٹا سا قد ' حسین چہرہ ' بڑی بڑی آنکھیں ' تیکھے نقش ' نازک ہونٹ ' موتیوں جیسے دانت ۔ ماں واقعی اس کی دلہن اپنے ہی جیسی لائی تھی اور حالانکہ جہیز میں بڑا خوبصورت پلنگ آیا تھا مگر ماں نے برسوں پہلے کے اپنے وعدہ کے مطابق وہی اپنا والا ' بڑا سا قیمتی ' پلنگ حجلہ عروسی میں بچھوا دیا تھا ' پلنگ کیا ' اپنا کمرہ ہی دلہن کو دے دیا تھا۔

دلہن اس پر جھکی ' اس کی آنکھوں میں کہیں دور جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی ۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ چند لمحہ قبل کا اس کا جوش و خروش یک دم سرد کیوں پڑ گیا ؟ لیکن یہ جاننے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا اور نہایت حجاب آمیز پیار سے وہ اس پر تھوڑا جھکی اس کے بال سہلائے جا رہی تھی۔

کیشی چند لمحے چپ چاپ لیٹا رہا پھر اچانک اس نے دلہن کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا ! کتنی ہی دیر تک وہ اس کے سر کو اپنے سینے پر رکھے اس کے بالوں ' گالوں اور ہونٹوں کو سہلاتا رہا ۔ یہاں تک کہ اس کے دماغ سے تمام جالے دور ہو گئے اور سینے پر لیٹی دلہن اور اس کے گورے گداز جسم کی گرمی اس کے رگ و ریشے میں سما گئی ۔ اس نے آہستہ سے اسے چوم کر اپنے پہلو میں لٹا لیا اور اس کے گرم گداز سینہ پر سر رکھ کر لیٹ گیا ۔ بار بار اس کا جی چاہتا کہ وہ سر اٹھائے ' اپنی بیوی کو پیار کرے لیکن جیسے اس تصویر کا سامنا کرنے کی اس میں تاب نہ تھی ...... وہیں لیٹے لیٹے بائیں ہاتھ سے اس نے اپنا تکیہ اٹھا کر اندازے سے تصویر کے آگے رکھ دیا ' پھر اس نے سر اٹھایا لیکن وہ تصویر گویا اس تکیہ کے پیچھے چھپ کر اور بھی نمایاں ہو گئی تھی اور دلہن کے چہرہ پر کسی دوسرے چہرہ کے خطوط بننے لگے تھے ...... نہیں ...... نہیں ...... نہیں ! وہ جھنجلا کر دل ہی دل میں چلایا اور پھر پھسل کر ویسے ہی چت لیٹ گیا پھر نہ جانے کیسا بگولہ سا اس کے دل میں اٹھا کہ وہ اچھلا اور حجلہ عروسی سے باہر نکل آیا۔

برآمدے کی جھلمل سے چھت کی چاندنی بڑی شرمائی نگاہوں سے اندر جھانک رہی تھی ۔ لمحہ بھر کو وہ برآمدے کی محراب میں رکا ۔ چپ چاپ باہر پھیلی چاندنی میں تکتا رہا ۔ ٹھنڈی ہوا کے لمس سے اس کے تنے ہوئے اعصاب کو کچھ عجیب سی راحت ملی لیکن وہ پلٹا نہیں بلکہ باہر نکل آیا ۔ دائیں طرف پھولوں کی روش میں فلاکس اور نیا کھلے تھے ۔ سامنے ڈیلیا کے پودے ' پھولوں کے بارے جھکے ' ہلکی ہوا کے جھونکوں سے جھول

رہے تھے ۔ گھاس کے لان کے ساتھ کئی چھنٹی مندی کے پیچھے کیاری میں سوسن کھلا تھا اور گلاب کی بیل کے گرد گول تھالے میں نسٹرشیم کے ڈھیروں پھول گویا اس چاندنی میں نہا رہے تھے ـــــ کیشی ان راستوں میں اٹکتا بھٹکتا' پھولوں کے رنگوں کو جھک کر دیکھتا' بے خیالی میں انہیں چھوتا بڑھتا چلا گیا ۔ سورج کی تیز روشنی میں جو پھول اپنی رنگینی سے آنکھوں کو چوندھیا دیتے تھے وہ اس خنک چاندنی میں ہی دلکش' پرسکوں اور فرحت بخش معلوم ہوتے تھے ۔ زرد اور گلابی رنگ سفید سفید نظر آتا تھا اور گہرا سرخ' نیلا یا جامنی سیاہ دکھائی دیتا تھا ۔ وہ کاٹج کی چار دیواری کے پاس پہنچ کر وہاں رکا جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ آغاز بہار کا بیلا کھلا تھا ۔ چار دیواری کے نیم تاریک سائے میں بیلے کے پھول موتیوں کی مانند چمک رہے تھے ۔ پہلے کبھی جب چاندنی راتوں میں وہ بیلا کھلا دیکھتا تھا تو ہمیشہ کہیں پڑھے یا سنے گیت کی ایک لائن اس کے ہونٹوں پر مچل جاتی تھی اور وہ بے اختیار ہو کر گنگنا اٹھتا تھا۔

بہت دنوں کے بعد کھلا بیلا' میرا آنگن مہکا
آنگن مہکا

لیکن آج جب سچ مچ اس کا آنگن مہکا تھا تو وہ گیت نہ جانے ذہن کے کس تاریک گوشہ میں کھو گیا تھا ۔ اپنے تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ وہ کاٹج سے گیٹ تک اور گیٹ سے کاٹج تک چپ چاپ گھومتا رہا پھر جب وہ دوسری بار گیٹ سے واپس آ رہا تھا تو اس کی نظر کاٹج کے دوسرے کنارے والے کمرے کے شیشے پر گئی ۔ اندر روشنی تھی ۔ اس کی ماں یقیناً جاگ رہی تھی ۔ اس کی آنٹی اور دوسری عورتیں بھی جاگ رہی تھیں اور ...... شاید انہیں کے بارے میں سوچ رہی تھیں ...... اس کی ماں نے کتنی محنت اور شوق سے اس کا حجلۂ عروسی سجایا تھا ۔ سارا دن کنارے والے کھانے کے کمرے میں (جن کی میز کرسیاں باہر برآمدے میں رکھ دی گئی تھیں اور جس میں بہو کو اتارا گیا تھا) ماں' آنٹی اور دوسری عورتیں گنگنا' گتھل' مانگ بھرائی اور منہ دکھائی کی رسمیں پوری کرتی رہی تھیں ۔ ساتھ کے ڈرائینگ روم میں وہ اپنے دوستوں میں گھرا بیٹھا رہا تھا ۔ برابر کے اس کے اپنے کمرے میں دنیا جہاں کے سامان میں جہیز کا سارا سامان اور فرنیچر رکھا جاتا رہا تھا ــــــــــــــــــــــــ

ـــــ اور ادھر کے ماں والے کمرے کو سہاگ رات کے لئے سجایا جاتا رہا تھا ۔ دسیوں رسموں' مہمانوں کی آؤ بھگت اور دوسرے بیسیوں کاموں میں الجھی اور کئی راتوں کی جگی' اپنی ماں کو اس نے بارہا اس کمرے میں آتے جاتے دیکھا تھا ۔ آنٹی اور دور کے رشتے کی اس کی ایک جوان خالہ اس کام میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھیں ۔ ماں کی خوشی کی انتہا نہ تھی گویا اتنے رت جگوں' اتنی دوڑ دھوپ' اتنی جانفشانی اور اتنے ہنگاموں کا ماحصل بس اسی کمرے کی آرائش و زیبائش تھی ۔ وہ کئی بار بہانے سے آیا تھا کہ آخر وہ بھی تو دیکھے' اس کی ماں اور آنٹی وہاں کیا سجاوٹ کر رہی ہیں لیکن ہر بار اسے بھگا دیا گیا تھا ۔ رات سے پہلے اسے ادھر جھانکنے کی بھی اجازت نہ تھی۔

دوستوں سے باتیں کرتے رسموں میں شامل ہوتے اور عورتوں کے مذاق سنتے ہوئے کیشی کی نظریں بار بار اپنی ماں کے چہرے پر جا ٹکتی تھیں ۔ اگرچہ اس کی عمر اب چالیس کی ہونے کو آئی تھی اور بائیس برس کی طویل بیوگی نے کچھ عجیب سے سختی اس کے چہرے پر پیدا کر دی تھی اور اس کی آنکھوں کے گرد ہلکے سیاہ گڑھے بن گئے تھے لیکن سفید سلک کی ساڑھی میں اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی خوشی میں تمتایا اس کا چہرہ کیشی کو تمام دوسری عورتوں سے زیادہ حسین نظر آ رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں کے سیاہ حلقے نہ جانے کس جادو کے زیر اثر غائب ہو گئے تھے ۔ رسمیں ادا کرتی اور مہمانوں کا خیال رکھتی ہوئی اس کی ماں وقت نکال کر حجلۂ عروسی کو سجانے میں لگ جاتی ۔ تکان کا اس کے چہرے پر کہیں نشان تک نہ تھا۔

وہ جانتا تھا' اتنی تھکن اور شب بیداریوں کے باعث ماں بیمار پڑ جائے گی ان دنوں وہ ہر رات سونے سے پہلے ماں کے پاس جا کر اس سے کہتا تھا ۔ "ماں اب سو جاؤ!" لیکن خود سونے کی بجائے ماں اسے اس کی چارپائی پر لے جا کر ہلکا سا تیل اس کی کنپٹیوں پر ملتی اس کی بھوؤں کو سہلاتی' اسے سلا کر خود کام میں جا لگتی ـــــ کیشی کو بہت پہلے سر میں تیل ڈلوانے کی عادت پڑ گئی تھی ۔ امتحان کے دنوں میں جب وہ رات رات بھر پڑھتا تھا اور دن کو ایک آدھ گھنٹہ سونا چاہتا تھا اور اسے نیند نہ آتی تھی تو ماں اس کے سر میں تیل لگاتی تھی اور اس وقت کیشی اپنے سر

پر جھکے اس کے چہرہ کو ایک ٹک دیکھتا رہتا اور سوتا نہ تھا۔ تب ماں پیار سے اس کی آنکھیں بند کر دیتی تھی۔ انہیں آہستہ سے چوم کر اس کی بھوؤں پر اپنی ڈھیلی انگلیاں یوں جلدی جلدی چلاتی تھی اور اتنا پیار ان نرم انگلیوں میں بھر دیتی تھی کہ اس کی پلکیں بھاری ہو جاتی تھیں اور وہ گہری نیند سو جاتا تھا' کیشی نے خود بھی یہ فن اس سے سیکھ لیا تھا کبھی جب تکان یا فکر سے ماں کو نیند نہ آتی تھی تو وہ خود اس کے سرہانے بیٹھ کر بڑے ہی پیار سے اس کی کنپٹیاں سہلا کر اسے سلا دیتا تھا۔ جب وہ چھوٹا تھا' تیرہ' چودہ برس کا تو ایسے میں ماں کبھی کبھی اس کا سر جھکا کر اسے چوم لیتی تھی۔ جب وہ بڑا ہو گیا۔ بی اے' ایم اے کر کے یونیورسٹی میں نفسیات کا پروفیسر ہو گیا تو ماں ایسے موقعوں پر صرف اس کی پیشانی چومتی تھی اور کیشی بڑے پیار سے اسے **تھپتھپا** کر سلا دیتا تھا۔ وہ چاہتا تھا ــــــــ شادی میں آئی ہوئی عورتوں میں گھری اپنی ماں کو اٹھائے اور اسے کمرے میں لے جا کر گہری نیند سلا دے لیکن وہاں تو وہ سہاگ سیج سجانے میں لگی تھی' پھولوں کی کمی کی وجہ سے نہ جانے اس نے کتنے آدمیوں کو کہاں کہاں بھیجا تھا اور کتنا پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ ــــــــ "ماں! تم کیوں جان ہلکان کر رہی ہو۔ تمہارا پیار ان ساری رسموں' خوشیوں' آرائش و زیبائش سے بڑا ہے۔ میرے لئے اس کا مول ان سب سے کہیں زیادہ ہے تم بیمار پڑ جاؤ گی!" لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس کی ایک نہ سنے گی۔ "میری شادی تو بیٹے کچھ یونہی ہوئی تھی۔" اس نے کیشی سے ایک بار کہا تھا "تمہارے پاپا معمولی کلرک تھے اور کمپیٹیشن میں ابھی بیٹھے نہ تھے۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری بہو کے دل میں کوئی تمنا رہ جائے' پھولوں کا ایک گجرا تک نہ آیا تھا میرے لئے۔ تم ذرا دیکھنا! تمہاری دلہن کی سیج میں کیسے سجاتی ہوں۔"

اور جب حجلۂ عروسی کا پردہ اٹھا کر اسے اندر دھکیلتی اور! "دیکھو فلسفہ ہی نہ بگھارتے رہنا۔" کہتی اور ہنستی ہوئی اس کی جوان خالہ چلی گئی تھی تو کیشی لمحہ بھر کو حیران سا کھڑا رہ گیا تھا۔ کمرہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ پلنگ اور دوسرا ساز و سامان بھی اس کا جانا پہچانا تھا۔ ماں نے اپنا ڈریسنگ ٹیبل اپنا سنگھار دان' بہیرمیٹی کا چوڑی بکس بمبئی سے منگایا ہوا اپنا قیمتی ٹیبل لیمپ ــــ سب کمرہ میں کچھ اس ڈھنگ سے سجا رکھا تھا کہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ نمایاں نظر آتی تھی۔ لیکن جس چیز نے کمرے کو سب سے زیادہ حسین بنا دیا تھا وہ تھے آغاز بہار کے موتیے کے پھول' پلنگ پر مچھر دانی نہ تھی۔ اس کے فریم پر چھائے ہوئے موتیوں کے لمبے ہار دونوں جانب نیچے تک یوں لٹک رہے تھے کہ پھولوں کی مسہری سی بن گئی تھی۔ پلنگ پر بیلے کے پھولوں کی موٹی چادر بچھی تھی جس پر دلہن پھولوں کی دیوی بنی' ہلکا سا گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔

پل بھر کے لئے کیشی کی نگاہوں کے سامنے اس کی ماں کی شادی کا منظر گھوم گیا محکمہ انہار کے ایک معمولی کلرک کی دلہن۔ چھوٹی سی کوٹھڑی' معمولی چارپائی' لالٹین کی مدھم روشنی اور آسمانوں کو چھوتی ہوئی آرزوئیں! ــــــــ اس کے پاپا بعد میں ایگزیکٹو انجینیر ہو گئے تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ رہی تھی' لیکن ماں اس یاس و محرومی کو کبھی فراموش نہ کر سکی تھی۔ اپنے بیٹے کے حجلۂ عروسی کو اپنی مرضی کے مطابق سجا کر اس نے اپنی تشنہ خواہشوں کی تکمیل کر لی تھی' لیکن وہی سجاوٹ کیشی کے لئے وبال جان ہو گئی تھی ــــ جدھر بھی اس کی نگاہ جاتی' وہی مناظر اس کی آنکھوں میں ابھر آتے۔

"دیکھنا فلاسفی ہی نہ بگھارتے رہنا!" اچانک کیشی کے ذہن میں خالہ کا جملہ اور ہنسی گونج اٹھی ــــــ تو کیا وہ اپنے ہی جال میں پھنسا ہے؟ ــــ اس کی دلہن نہ جانے کیا سوچتی ہو گی؟ اس کے سامنے کئی واقعات گھوم گئے۔ جس میں پہلی رات مرد کی کمزوری دلہا' دلہن کی ازدواجی زندگی کو لے ڈوبی ــــــ "لیکن پہلی ہی رات مرد کے لئے اپنے کو مرد ثابت کرنا کیا ضروری ہے؟" یہ عورتیں اس کے لئے کیوں اتنا تردد کرتی ہیں۔ کیا یہ سب کی سب دوسروں کی حجلۂ عروسی کو سجانے میں اپنی اپنی سہاگ رات کا لطف پھر نہیں حاصل کرتیں؟ تو کیا اس کی ماں بھی ــــــ اس کے حجلۂ عروسی کو سجانے میں اتنی محنت کرنا۔ اپنا پلنگ وہاں رکھ دینا ــــــ اسے پھولوں سے ویسا سجا دینا جیسا کہ اس کے دل میں اپنے حجلۂ عروسی کو سجا دیکھنے کی تمنا تھی اور اس کے پاپا کی غربت اور بے دلی کی وجہ سے جو پوری نہ ہوئی تھی ــــــ کیشی نے سر کو جھٹکا دیا ــــ اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے کیوں کہا تھا' میں یہی پلنگ لوں گا؟ لیکن وہ تو بچہ تھا' کیا اس کی ماں بھی بچہ تھی؟ ــــــ

وہ واپس برآمدے میں آ گیا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا۔ دلہن محراب کے نیچے کھڑی ہے۔

"طبیعت کچھ خراب ہے جی؟"

"نہیں!"

"کیا مجھ سے کچھ قصور ہو گیا؟"

کیشی کا جی چاہا' زور سے قہقہہ لگائے۔ ایک ہی بات اس کی دلہن کے دماغ میں بھی چکر لگا رہی ہے۔ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے وہ اسے اندر لے گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ اپنے ذہنی انتشار کو جھٹک کر وہی کرے گا جس کی سب توقع رکھتے ہیں۔ اس نے دلہن کو تھوڑی سختی سے چارپائی پر لٹا دیا...... جھٹکے سے اس کے بلاؤز کے بٹن کھول دیئے...... وہ اس پر جھکا...... لیکن دلہن نے تکیہ کو پھر اس کی جگہ پر رکھ دیا تھا۔ کیشی کی نظر پھر اپنی ماں کی تصویر پر گئی۔ اس کا دماغ پھر دھندلا گیا۔ وہ اٹھا----- باہر جانے لگا تھا کہ دلہن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا بات ہے جی؟"

کیشی کی نظر درمیانی دروازہ کی طرف گئی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ماں نے اپنے اس کمرہ میں اس کی سہاگ رات کا اہتمام کرنے کی بجائے اس کے اپنے کمرہ میں وہ سب انتظام کیا ہوتا۔ لیکن اب تو اس کا کمرہ جہیز میں آئے ہوئے فرنیچر اور دوسرے سازو سامان کا گودام بنا ہوا تھا اور اس کی چابی بھی اس کے پاس نہ تھی۔

نہایت مجبوری سے اس نے باہر برآمدے کی طرف دیکھا۔ چاندنی اب بھی بدستور جھلملی سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ اچانک اس نے کہا۔

"دیکھو نا! کیسی چاندنی کھلی ہے۔ آؤ ذرا باہر گھومیں!"

دلہن اٹھی اس نے اپنے بے ترتیب لباس کو درست کیا ایک نگاہ غلط انداز آئینہ میں ڈالی۔ بالوں کی دو ایک لٹوں کو ٹھیک کیا اور ذرا سا گھونگھٹ کاڑھ کر' کیشی کے پیچھے ہو لی۔

دو بار برآمدے سے گیٹ تک اور گیٹ سے برآمدے تک چپ چاپ کیشی آیا۔ دلہن نے ایک دو بار چاندنی کی تعریف میں ایک آدھ جملہ کہا' لیکن کیشی کو خاموش دیکھ کر وہ بھی چپ چاپ اس کے ساتھ ٹہلتی رہی۔

اپریل کی چاندنی غیر مرئی شراب کی مانند ان کی رگ رگ میں سما رہی تھی لیکن وہ دونوں اس کی جانب سے بے نیاز تھے۔ دلہن کو اپنے شوہر کے اس عجیب رویہ سے الجھن ہو رہی تھی۔ اپنی سہیلیوں سے (جن میں سے کچھ دو دو بچوں کی مائیں تھیں) پہلی رات کے متعلق اس نے جو کچھ سن رکھا تھا۔ وہ جیسے اس کی گرفت میں آ کر دور چلا جاتا تھا۔ اپنے شوہر کی خوب صورتی' اس کی قابلیت اور فرض شناسی کی اس نے بہت تعریفیں سن رکھی تھیں۔ یونیورسٹی میں وہ پروفیسر تھا اور ڈیڈی نے نہ صرف اس کے ساتھی پروفیسروں بلکہ اس کے شاگردوں تک سے اس کے متعلق ہر طریق سے ہر طرح کی معلومات حاصل کی تھیں اور پوری طرح مطمئن ہو کر ہی انہوں نے یہ رشتہ منظور کیا تھا۔ اس کا ہونے والا منگیتر سنکی ہے یا اس کے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے؟ یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا تھا...... اپنے شوہر کی اس بے رخی کے متعلق سوچتی اور اپنے مستقبل کے قدرے مبالغہ آمیز اندیشوں میں گرفتار دلہن کبھی کبھی اپنے شوہر پر نظر ڈال لیتی اور چپ چاپ اس کے ساتھ ٹہلنے جاتی --- چاندنی کی طرف اس کا ذرا بھی دھیان نہ تھا۔

اور کیشی کا دماغ ایک دلدل بنا ہوا تھا۔ وہ کچھ بھی سوچ نہ پا رہا تھا۔ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کئے۔ بائیں ہاتھ کی کلائی کو دائیں ہاتھ سے باندھے کندھے ذرا جھکائے' وہ چپ چاپ ٹہلے جا رہا تھا۔ جب وہ دوسری بار گیٹ تک پہنچے تو اچانک کیشی نے کہا۔ "آؤ ذرا باہر چلیں۔"

"رات کافی ہو گئی ہے!" دلہن نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

کیشی کو اچانک اپنے ایک دوست کی بات یاد آ گئی جس نے بھی اپنے نئے عشق کا قصہ سناتے ہوئے اس سے کہا تھا کہ پانی کی ٹنکی سے گراؤنڈ ٹرنک روڈ کے پھاٹک تک سڑک اتنی سنسان' سایہ دار اور پراسرار لگتی ہے کہ محبت کرنے والوں کے لئے اس سے بہتر کوئی سڑک نہیں

----- اور وہ بولا۔ "بس ذرا پانی کی ٹنکی تک جائیں گے!"

کیشی بنگلہ کا پھاٹک کھول کر باہر نکلا۔ پانی کی ٹنکی کہاں ہے۔ دلہن کو معلوم نہ تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ کیشی اسے وہاں کا حدود اربعہ بتانے لگا کہ کس طرف کون سی عمارت ہے کس طرح وہاں پہلے زیادہ تر ریلوے کے انگریز افسران رہتے تھے' پھر کیسے آزادی کے بعد وہ لوگ چلے گئے اور وہ بنگلے ہندوستانیوں کے قبضہ میں آ گئے۔ آٹا مل کے پاس سے گذرتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہاں کیسے آٹا اور میدہ تیار کیا جاتا ہے۔ کیسے وہاں مالکوں نے کولڈ اسٹوریج بنا رکھا ہے۔ جہاں وہ لاکھوں من آلو ہر سال اسٹور کر کے بیچتے ہیں۔ پریس کے پاس پہنچ کر' اس کی کھڑکیوں کے شیشوں میں سے وہ بڑے جوش سے روٹری مشین کے کام کرنے کا ڈھنگ اسے سمجھانے لگا --- کس طرح ایک جانب سے کاغذ لگتا چلا جاتا ہے اور دوسری جانب سے پورا اخبار چھپ کر اور مڑ کر نکلتا جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے پھر پانی کی ٹنکی سے گرانڈ ٹرنک روڈ تک کی تنہائی کی یاد آئی اور وہ مڑ کر ریلوے پھاٹک کی جانب ہو لیا۔ پھاٹک بند تھا۔ لال بتی دیکھ کر کیشی نے کہا۔ "یہ پھاٹک بھی ایک مصیبت ہے۔ چوبیسوں گھڑی ایک نہ ایک گاڑی گذرتی رہتی ہے۔ اتنا بڑا اسٹیشن بن گیا' لیکن اس پھاٹک کی قسمت نہیں جاگی یہاں پل بنے تو مصیبت دور ہو!"

گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی' برابر کے راستہ سے نکل کر وہ پانی کی ٹنکی تک آ گئے۔ دائیں جانب سڑک کھلی اور روشن تھی۔ بائیں جانب تاریک اور سایہ دار۔ جب کیشی ادھر مڑنے لگا تو ایک بار پھر دلہن نے کہا۔ "چلئے! اب گھر چلیں۔ رات کافی ہو گئی ہے۔" لیکن کیشی نے اسے اپنے دائیں بازو میں لے لیا۔ "چلو! کچھ دور تک چلتے ہیں۔ کیسی چھٹکی ہوئی چاندنی سڑک پر پھیلی ہے۔"

"اس جانب کیوں نہیں گئے؟" بڑی کھلی سڑک ہے۔

"کیوں! ڈر لگتا ہے؟" اور ذرا ہنستے ہوئے جھک کر اس نے دلہن کی پیشانی چوم لی۔

دلہن تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکل گئی۔ "کیا کرتے ہو ---- سڑک پر -----!!!!"

کیشی نے ہنس کر پھر اسے اپنے بازو میں لے لیا۔

"کون ہے یہاں اس وقت؟" ہنس کر اس نے اسے چومنا چاہا' لیکن تبھی سامنے سے تیز روشنی اس کی آنکھوں میں پڑی اور لمحہ بھر بعد ایک بغیر باڈی کا ٹرک گھڑگھڑاتا ہوا ان کے پاس سے نکل گیا۔ ابھی ان کی آنکھوں کی چکا چوندھ دور بھی نہ ہوئی تھی کہ دوسرے کی بتی آنکھوں میں کوندی اور پھر تو ایک کے بعد ایک ---- ویسے کتنے ہی ٹرک گذر گئے ---- جانے کہاں سے آ رہے تھے اور کہاں جا رہے تھے۔ "کیا خوب سنسان اکیلی سڑک ہے!" کیشی نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کا سارا رومان ہوا ہو گیا۔

"چلئے اب چلیں۔" دلہن نے جو پہلے ٹرک کی بتی دیکھ کر ہی اس کے بازوؤں کے حلقہ سے نکل گئی تھی۔ تقریباً روٹھے لہجے میں کہا "میں تھک گئی ہوں۔"

"یہ کانپور روڈ ہے دن رات یہاں ٹرک اور موٹریں گھڑگھڑاتی ہیں۔" کیشی نے اسے سمجھایا۔ "چلو ایم۔ ٹی لائنز کی جانب چلتے ہیں گرچہ تنگ بالکل سونی سڑک ہے۔"

"واپس چلئے! میں تھک گئی ہوں۔" دلہن منمنائی۔

لیکن اسے پھر بازو میں بھرتا ہوا کیشی ملٹری لائنز کی کھلی سڑک پر بڑھ چلا۔

سڑک کی دونوں جانب بنگلوں پر چاندنی خاموش برس رہی تھی۔ ٹھرتی نتھری' جیسے حیران کھلی سڑک' کناروں پر درختوں کے نیچے اندھیرے اجالے کے جال---- تبھی کہیں سے خوشبو کا ایک تیز جھونکا آیا۔ کیشی کے تصور میں چاندنی ہی کی کھلی مسکراتی رات رانی گھوم گئی یہ سانس فضا کو معطر بنا رہی تھی۔

------ کیشی نے دلہن کو پھر بازوؤں میں بھر لیا اور سڑک کے کنارے پیڑوں کے سائے میں ہو گیا۔

"کیا بہت تھک گئی ہو؟"

دلہن نے جواب نہیں دیا۔ اپنے جسم کا بوجھ اپنے شوہر پر ڈال دیا اور پیڑ کے سائے میں اسے اپنے سینے سے لگائے کیشی نے اسے چوم لیا۔

جبھی پرے سڑک سے ٹارچ کی روشنی چمکی۔ دونوں الگ ہو گئے۔ کیشی کا رنگ فق ہو گیا اور دل دھڑک اٹھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ ایم ٹی لائنز میں بارہ کے بعد گھومنے کی اجازت نہیں۔

چودھویں کا چاند ہو' یا آفتاب ہو

جو بھی ہو تم' خدا کی قسم' لاجواب ہو

گہری ہری وردیاں پہنے تین چار فوجی کسی نئے فلم کا مقبول عام گانا گاتے چاندنی کے باوجود ٹارچ ان پر پھینکتے ہوئے سڑک سے گذر گئے۔ گانے کی پہلی لائن سنتے ہی کیشی نے چاہا تھا کہ اپنی دلہن کو بانہوں میں بھر لے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا گائے۔

چودھویں کا چاند ہو' یا آفتاب ہو

لیکن فوجیوں کی بدتمیزی نے اس کا سارا ولولہ ختم کر دیا۔ اسے ایک دوست کی یاد آگئی جو ایم۔ ٹی لائنز کے ایک بنگلہ میں اپنی بہن کے ساتھ کھانے پر آیا تھا۔ باتیں کرتے کرتے بارہ بج گئے تھے۔ جب ساڑھے بارہ کے لگ بھگ رکشہ نہ ملنے سے وہ پیدل آ رہے تھے تو انہیں سپاہیوں نے روکا اور دوست کو واپس بنگلہ پر پہنچ کر ثابت کرنا پڑا کہ وہ اپنی بہن ہی کے ساتھ وہاں کھانے پر آیا تھا۔۔۔۔ اس سے پہلے کہ دلہن گھر چلنے کی التجا کرتی کیشی واپس لوٹا۔ جب فوجی نے گانا گاتے گاتے ٹارچ کی روشنی اس کی دلہن پر ڈالی تھی تو مارے غصے کے کیشی کا جی چاہتا تھا کہ اسے کالر سے پکڑ' دو تھپڑ اسے جما دے لیکن اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ یونیورسٹی کا پروفیسر اپنی دلہن کے ساتھ آدھی رات کو اس سنسان مقام پر کیوں گھوم رہا ہے؟ تو وہ کیا جواب دیتا۔۔۔۔ اور اس کا سارا غصہ اپنی ماں پر' اس پلنگ پر اور اپنی ذہنی کمزوریوں پر امنڈ پڑا۔

وہ تیز تیز چلتا واپس آیا۔ دلہن ذرا اس سے پیچھے گھسٹتی چلی آئی۔ بنگلہ میں پہنچ کر اچانک کیشی کی چال دھیمی ہو گئی لیکن دلہن نہیں رکی۔ سکتی ہوئی وہ بڑھی چلی گئی اور جا کر پلنگ میں دھنس گئی۔ کیشی جب کمرہ میں داخل ہوا تو وہ ٹانگیں نیچے کئے چت لیٹی تھی۔ ساڑھی کا پلو ایک جانب لٹکا تھا۔ بلاؤز کے کھلے گلے سے اس کا گورا سینہ شیشے کی طرح جھلک رہا تھا۔ کیشی کا جی چاہا وہ گھٹنوں کے بل نیچے فرش پر بیٹھ جائے اور اپنا سر اس کی گود میں رکھ دے لیکن اپنی بیوی پر سے پھسلتی اس کی نظر غیر شعوری طور پر اپنی ماں کی اس تصویر پر چلی گئی اور وہ تذبذب کے عالم میں کمرہ کے درمیان کھڑا رہا۔

دلہن چپ چاپ چھت کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

کیشی کی نظریں اچانک بیچ کے دروازہ پر گئیں اور اس نے کہا۔ "یہ کمرہ تو باہر سے بند ہے نا؟"

"جی!" دلہن نے اسی طرح چھت پر نظریں جمائے جواب دیا۔

کیشی نے کمرہ کے دو چکر لگائے۔

"اس کی چابی کہاں ہے؟"

"آنٹی کے پاس ہو گی۔ سب سامان انہیں نے رکھوایا تھا۔"

کیشی باہر نکل' کاٹج کے دوسرے کونے تک گیا۔ ماں کے کمرہ کی بتی بجھ چکی تھی۔ تھکی ہوئیں عورتیں سو گئیں تھیں۔۔۔۔ اس کے دل میں آیا ماں کو جگائے لیکن خالہ جگ گئی اور اس نے مذاق کر دیا تو۔۔۔۔۔۔ وہ واپس پھرا۔ کمرہ میں آکر کچھ لمحہ گھومتا رہا۔ اس کی نگاہ دلہن پر گئی وہ اسی طرح چت لیٹی چھت کو تکے جا رہی تھی۔ اچانک بڑھ کر اس نے بیچ کے کمرہ کا دروازہ پیچھے کی طرف دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور نیچے کی چٹخنی لگی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر صرف اوپر کی چٹخنی لگی ہو گی تو اوپر کا شیشہ توڑ کر کھول لے گا لیکن اس کی ماں ہمیشہ کواڑوں کی

نچلی چٹخنیاں لگاتی تھی۔

پیچھے ہٹ کر اس نے دروازہ پر ایک نظر ڈالی ۔۔۔ دونوں کواڑوں میں تین تین شیشے لگے تھے اور پھر لکڑی کا پلہ تھا۔ اگر وہ تیسرا شیشہ توڑ دے تو بانہہ ڈالنے پر نچلی چٹخنی کھل سکتی تھی اور اس کے جی میں آیا کہ زور کا ایک مکا مار کر شیشہ چکنا چور کر دے لیکن تھکی ماندہ ماں کے جاگ پڑنے کا خیال اس کے جوش پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا بن گیا۔ دونوں مٹھیاں کمر کے پیچھے باندھ وہ کمرہ میں گھومنے لگا۔ دو تین چکر لگا کر وہ پھر دروازہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی نظریں دروازہ کے نچلے حصہ پر پڑیں۔ دائیں کواڑ کا کونا چوٹ کھایا تھا۔ نزدیک جا کر اس نے دیکھا۔ روغن میں ایک ہلکی سی لکیر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ پیٹھ اس نے پلنگ کی پٹی سے لگا لی اور ایڑی کا نچلا حصہ کواڑ کے اس چوٹ کھائے حصہ پر اڑا کر پورا زور لگایا۔ دروازہ تو نہیں ہلا لیکن پلنگ پیچھے کو کھسک گیا۔

چھت کی طرف تکتی ہوئی دلہن اسی طرح لیٹی رہی۔ پلنگ کے ہلنے کا جیسے اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اچانک کیشی نے اس پر ایک چور نگاہ ڈالی۔ دلہن نے اس کی جانب دیکھا۔ نہ جانے ان نگاہوں میں کیا تھا؟۔۔۔۔۔ طنز کی ایک خفیف سی جھلک ۔۔۔۔ جو کسی خبطی کے کرتب دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ کیشی کے سر پر جنوں سوار ہو گیا۔ اس کی سوچ سمجھ کی ساری قوتیں سلب ہو گئیں اچھل کر وہ اٹھا اور بڑھ کر اس نے زور کا مکا نچلے بیچ کے شیشہ پر دے مارا۔

شیشہ جھنجھنا کر ٹوٹ گیا۔

دلہن لیٹی نہ رہ سکی۔ تھوڑا گھبرا کر وہ اٹھی اور اپنے شوہر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟" اس نے چڑ کر کہا۔

کیشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی جانب دیکھا تک نہیں۔ ٹوٹ پھٹے شیشہ میں سے ہاتھ ڈال کر اس نے چٹخنی کھولی۔ اس کے جسم کے بوجھ سے اچانک دروازہ پیچھے ہٹ گیا۔

بائیں ہاتھ سے کواڑ تھام، کیشی نے آہستہ سے سنبھال کر، ہاتھ باہر نکالا۔ تو بھی کہنی کے اوپر خراش آ گئی۔

"ہائے آپ کیا کر رہے ہیں؟" اس کی پھٹی قمیض سے خون رستے دیکھ کر دلہن نے گھبرائے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہا اور اس کی خوفزدہ نگاہیں سارے کمرہ میں گھوم گئیں کہ کہیں کچھ ملے۔ جس سے وہ زخم پر پٹی باندھ دے۔

کیشی نے ادھر دھیان نہیں دیا۔ دونوں ہاتھوں سے کواڑ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ مشاق انگلیوں سے اس نے بجلی کا بٹن دبایا۔ کمرہ میں جہیز کا سارا سامان گڈمڈ پڑا تھا۔ فرنیچر ڈریسنگ ٹیبل الماری، کپڑوں کی گٹھڑیاں میوے مٹھائیوں کے تھال۔ ایک جانب وہ پلنگ بھی پڑا تھا۔ جو جہیز میں آیا تھا اور اس پر بے شمار کپڑے لدے تھے۔ دونوں بانہوں میں بھر کر اس نے کپڑے صوفہ پر پٹکے۔ دلہن اس کے پیچھے اندر آ گئی تھی اس کی آنکھوں میں طنز کی جگہ پھر خوف نے لے لی تھی اچانک پلٹ کر کیشی نے اسے دونوں کاندھوں سے تھام لیا۔ پل بھر وہ ان ڈری، سہمی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر، یکایک اس نے اسے دونوں بانہوں میں بھر کر چوم لیا۔

دلہن اور بھی سہم گئی لیکن اپنے شوہر کی آنکھوں میں اس نے کرختگی کی جگہ بے پناہ محبت پائی، رقصاں دیکھی اور اس کے گرم ہونٹوں کا لمس اپنے کانوں کے لوؤں کے نیچے گردن پر محسوس کیا تو اس کے سہمے ڈرے اعضا ڈھیلے پڑ گئے اور وہ اس کے بال سہلانے لگی۔

علی الصباح ماں باہر آئی تو حجلہ عروسی کا دروازہ چوپٹ کھلا دیکھ کر چونکی! دبے پاؤں بڑھ کر اس نے پردہ ذرا ہٹایا۔ دل دھک سے رہ گیا۔۔ .... سجا سجایا کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا اچانک اس کی نگاہیں بیچ کے کھلے دروازہ کے نزدیک فرش پر بکھرے شیشہ کے ٹکڑوں پر گئیں۔ چوری کے خوف سے گھبرا کر وہ ادھر بڑھی...... چوکھٹ ہی میں سن کھڑی رہ گئی...... کوچ کی گدیاں سر کے نیچے رکھے جہیز کے کھرے پلنگ پر دلہا، دلہن بے سدھ سوئے تھے!!

اشرف صبوحی

نام : سید ولی اشرف
قلمی نام : سید ولی اشرف صبوحی دہلوی / اشرف صبوحی دہلوی / اشرف صبوحی
پیدائش : ۱۱ مئی ۱۹۰۵ء بہ مقام دہلی
وفات : ۲۲ اپریل ۱۹۹۰ء بہ مقام کراچی
تعلیم : بی اے۔ پنجاب یونی ورسٹی' لاہور

ابتدائی تعلیم قرآن حکیم اور اردو خوانی پر مشتمل تھی جو والدہ کی زیر نگرانی گھر پر ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں اینگلو عربک ہائی سکول دہلی' سے میٹرک کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔ دسویں جماعت میں ان کے استاد سید محمد تھے جنہیں خواجہ حسن نظامی نے خطیب اعظم کا خطاب دیا تھا۔ میٹرک کے بعد مسجد فتح پوری کے اسلامی مدرسہ میں منشی فاضل کے امتحان کی تیاری کے لیے داخلہ لیا جہاں ناصر نذیر فراق دہلوی جیسے استاد ملے۔ "اخلاق جلالی" کا درس مولوی محمد اسحاق سے لیا۔ میٹرک کے زمانے میں انگریزی اپنے پھوپھا مولوی بشیرالدین احمد المعروف ڈپٹی صاحب (ابن ڈپٹی نذیر احمد دہلوی) سے پڑھی' بعد ازاں ادیب فاضل' منشی فاضل' ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی' لاہور سے پرائیویٹ طالب علم کے طور پر دے کر کامیابی حاصل کی۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کے والد کا نام علی اشرف تھا اور جد امجد سید اشرف جہانگیر سمنائی کچھوچھا شریف (فیض آباد) کے توسل سے آپ کا خاندان اشرفیہ کہلاتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔ صبوحی صاحب کے والد گرامی انڈین ریلوے کے شعبہ انجینئرنگ سے وابستہ تھے' اور آپ نے تو حج کیے تھے۔ ایک بڑے عالم دین ہونے کے حوالے سے آپ کی شہرت تھی' کچھ یہی سبب ہے کہ آپ کے خاندان میں اب بھی رشد وہدایت کا سلسلہ جاری ہے۔

اشرف صبوحی کو بچپن اور لڑکپن میں نانی اور پرنانی کی صحبت میسر رہی جنہوں نے دہلی کی بربادی' آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی کا احوال حکایتوں' پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کی صورت میں سنایا جو اشرف صبوحی کو اس قدر بھایا کہ کھیل کود میں دل نہ لگا۔ بچپن اور لڑکپن میں دوستی تھی تو پھوپھی زاد بھائیوں مبشر احمد اور شاہد احمد دہلوی سے' اور پھوپھی' اشرف صبوحی کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔

میٹرک کے زمانے میں پھوپھا نے اپنے بیٹوں کے ساتھ بٹھا کر انگریزی کا درس دیا اور رفتہ رفتہ کتابت کی کاپیوں کی تصحیح کے لیے ساتھ بٹھانے لگے۔ یوں ان کے تلفظ اور بلند خوانی کی تصحیح بھی ہوتی گئی۔ لائق اتنے تھے کہ انیس برس کی عمر میں اپنے پھوپھا مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کے مجموعہ کلام "دیوان بشیر" کی تقریظ لکھی' یہ ۱۹۲۴ء کا قصہ ہے۔ اشرف صبوحی نے ۱۹۲۹ء میں محکمہ ڈاک و تار کی ملازمت اختیار کی اور اس سال خاکہ نگاری اور افسانہ نویسی کا آغاز کیا۔ لیکن ان کی شہرت بطور شاعر اور خطیب ۱۹۲۰ء سے ہی ہو چلی تھی۔

نومبر ۱۹۲۹ء میں اشرف صبوحی نے محلہ چوڑی والاں دہلی سے ماہنامہ "ارمغان" جاری کیا تو ۱۹۳۰ء میں ان کے بچپن کے لنگوٹے یار اور

پھوپھی زاد شاہد احمد دہلوی کو رسالہ "ساقی" نکالنے کی سوجھی۔ یوں صبوحی کا "ارمغان" رسالہ "ساقی" کا پیش رو ثابت ہوا۔ اس زمانے میں صبوحی نثر لکھتے تو تھے لیکن شاعری کی طرف طبیعت زیادہ مائل تھی۔ پھر رفتہ رفتہ نثر نے شاعری کو دبا لیا۔ ماہنامہ "ارمغان" ٹھیک دو برس ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۱ء باقاعدگی کے ساتھ نکلا اور اس شان سے کہ ناصر نذیر فراق دہلوی کا "قصہ سات طاقتوں کی کہانیاں" اس میں قسط وار شائع ہوا۔ اس پرچے کے دیگر مستقل لکھنے والوں میں خواجہ حسن نظامی، میر ناصر علی خاں، (مدیر "صلائے عام") بے خود دہلوی، ایم اسلم اور شاہد احمد دہلوی جیسے نام تھے۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے ان کے ڈرامے، فیچر اور بچوں کی کہانیاں نشر ہونے لگیں۔ اسی زمانے میں بجلی کی فٹنگ اور بیٹری سازی کا کام سیکھا اور ریڈیو کے لیے بیٹریاں بنا کر بھلے وقتوں میں پچیس تیس روپے ماہوار پس انداز کرنے لگے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کا صدر دفتر دہلی منتقل ہوا تو بابائے اردو نے مسودات کی نظر ثانی کا کام سونپا۔ ۱۹۴۷ء میں لاہور منتقل ہو گئے۔ یہاں آ کر پہلے ایم اسلم کے ہاں رہے اور پھر اپنی لاہور کی قیام گاہ واقع بارود خانہ میں منتقل ہو گئے جہاں ایم اسلم کے ساتھ اپنی دوستی کے پچاس برس مکمل کیے۔ ۱۹۴۴ء کے آخر میں جب ہمدرد دواخانہ لاہور کے لیے عارضی ڈاکخانہ کھلا تو صبوحی صاحب اس کے پہلے پوسٹ ماسٹر بنے، اور یہ سلسلہ ۱۹۶۲ء تک چلا۔ حکیم محمد سعید کے ساتھ تادیر دوستی نبھائی، "ہمدرد صحت"، "نونہال" اور "ہمدرد صحت ڈائجسٹ" کے لیے افسانے، مضامین اور متفرق نویسی کی۔ ۱۹۶۳ء میں "شام ہمدرد" کا سلسلہ جاری ہوا تو اشرف صبوحی اس کے روح رواں تھے۔ بینائی زائل ہونے کے بعد کراچی میں قیام رہا اور یہیں وفات پائی۔

اولین مطبوعہ تحریر:

"تقریظ دیوان بشیر" از بشیر الدین احمد، مطبوعہ: دہلی، طبع اول: ۱۹۲۴ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "دلی کی چند عجیب ہستیاں" (خاکے) — مطبوعہ: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، طبع اول: ۱۹۴۳ء
مکتبہ صبوحی، لاہور — طبع دوم: ۱۹۶۲ء

۲۔ "جھروکے" (خاکے / افسانے) — مطبوعہ: کتب خانہ علم و ادب، دہلی

۳۔ "بغداد کا جوہری" (ترجمہ۔ ناول) — کتب خانہ علم و ادب، دہلی — طبع اول: ۱۹۴۰ء
یہ کتاب انگریزی سے ترجمہ کردہ ہے۔ طبع دوم ۱۹۴۳ء سے اس کتاب کا نام "سلمے" کر دیا گیا تھا، تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں آیا۔
اس کتاب کا دیباچہ مرزا محمد سعید دہلوی نے لکھا ہے۔

۴۔ "بن باسی دیوی" (ترجمہ۔ ناول) مقدمہ از مرزا محمد سعید دہلوی — مطبوعہ: کتب خانہ علم و ادب، دہلی — طبع دوم: ۱۹۴۵ء

۵۔ "موصل کے سوداگر" (ترجمہ۔ ناول) — کتب خانہ علم و ادب، دہلی

۶۔ "غبار کارواں" (خاکے / افسانے) — مکتبہ دانیال، کراچی — ۱۹۷۰ء

۷۔ "دھوپ چھاؤں" (ترجمہ۔ ناول) — دار الاشاعت پنجاب، لاہور — طبع اول: ۱۹۵۹ء
یہ لوئیز الکاٹ کے انگریزی ناول کا ترجمہ ہے۔ کل صفحات۔ ۵۱۲

۸۔ "نئی دنیا" (ترجمہ۔ ناول) — کتب خانہ علم و ادب، دہلی

یہ چینی مصنف آئی۔ لن چانگ کی ناول کا انگریزی کی معرفت ترجمہ ہے۔ اس ناول کو دوسری بار میری لائبریری 'لاہور نے "نئی دھرتی" کے عنوان سے شائع کیا۔

۹۔ "ناشکرا خرگوش" (ترجمہ کہانیاں) — مقبول اکیڈمی 'لاہور '

یہ رابرٹ لاسن کی انگریزی کہانیوں (بچوں کے لیے) کا ترجمہ ہے۔ جو موسسہ فرینکلن نیویارک کے تعاون سے شائع ہوا۔

۱۰۔ "بڑا ریچھ" (ترجمہ۔ کہانی) — غلام علی اینڈ سنز 'لاہور '

یہ لینڈ وارڈ کی باتصویر کہانی (بچوں کے لیے) کا ترجمہ ہے۔ جو موسسہ فرینکلن نیویارک کے تعاون سے شائع ہوئی۔

۱۱۔ "بزم آخر" از فیاض (مرتبہ: اشرف صبوحی) — انجمن ترقی ادب 'لاہور '

کتاب کو مشکل الفاظ کی فرہنگ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔

۱۲۔	"نرالے گویے" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ 'دہلی '	طبع دوم:
۱۳۔	"دلی کی شادی" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ 'دہلی '	طبع دوم:
۱۴۔	"بدر شہزادی" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ 'دہلی '	طبع دوم:
۱۵۔	"شریر لڑکا" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ 'دہلی '	طبع دوم:
۱۶۔	"بونا درزی" (کہانی۔ بچوں کے لیے)		
۱۷۔	"پریوں کی کہانیاں" (بچوں کے لیے)	انوار احمدی پریس 'الہ آباد '	طبع اول: س۔ ن
۱۸۔	"پریوں کی ہنڈیا" (بچوں کے لیے)		
۱۹۔	"لعل شہزادہ" (بچوں کے لیے)	صدیق بک ڈپو '	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۲۰۔	"شہزادہ نے نواز" (بچوں کے لیے)		
۲۱۔	"صبر بادشاہ زادہ" (بچوں کے لیے)		
۲۲۔	"تھوڑی تارا 'ماتھے چاند" (بچوں کے لیے)		طبع اول: ۱۹۳۶ء
۲۳۔	"ہیرا من طوطا" (بچوں کے لیے)		
۲۴۔	"گوہر شہزادی" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ 'دہلی '	طبع دوم:
۲۵۔	"ہرن کا دل" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ 'دہلی '	طبع دوم:
۲۶۔	"ماسٹر شامت" (بچوں کے لیے)		
۲۷۔	"شریر شیرا" (بچوں کے لیے)		
۲۸۔	"جادو کی سارنگی" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ 'دہلی '	طبع دوم:
۲۹۔	"جادو کا چھلا" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ 'دہلی '	طبع دوم:
۳۰۔	"بلوری جوتی" (بچوں کے لیے)		
۳۱۔	"باتونی کچھوا" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ 'دہلی '	طبع دوم:
۳۲۔	"دریا کی رانی" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ 'دہلی '	طبع دوم:
۳۳۔	"جادو کی لکڑی" (بچوں کے لیے)		
۳۴۔	"دعوت" (بچوں کے لیے)		

۳۵۔ " سر کے وال " (بچوں کے لیے)

۳۶۔ " رحمت شہزادہ " (بچوں کے لیے) مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، دہلی، طبع دوم:

۳۷۔ " نادان بلے " (بچوں کے لیے)

۳۸۔ " ننھا کمہار " (بچوں کے لیے)

۳۹۔ " سونے کا محل " (بچوں کے لیے)

غیر مدون:

ان مطبوعہ تحریروں کے علاوہ لاتعداد کہانیاں، ریڈیائی فیچر، ریڈیائی ڈرامے اور مضامین مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ مرتب شدہ غیر مطبوعہ کتب درج ذیل ہیں:

۱۔ کہاوتوں کی کہانیاں (تحقیق)

۲۔ " نجف کے موتی " (حضرت علیؓ کے ارشادات گرامی کا ترجمہ مع شرح)

۳۔ " مزاحیہ مضامین "

۴۔ " نور اسلام کی جھلکیاں " (اسلامی تاریخی واقعات)

۵۔ " دیو کے دیس میں " (انگریزی سے ترجمہ / کہانی)

۶۔ " بونوں کے دیس میں " (انگریزی سے ترجمہ / کہانی)

۷۔ " دیوان صبوحی " (غزلیات / قطعات / تاریخیں / نظمیں)

رسالہ " ساقی " دہلی، " چمنستان " دہلی اور " ماہ نو " کراچی / لاہور میں درج ذیل مواد غیر مرتب شدہ حالت میں موجود ہے۔

۱۔	" رزم بزم "	مطبوعہ: " ساقی " دہلی،	مارچ ۱۹۳۷ء	ص ۹۳
۲۔	" تمسخر حیات "	مطبوعہ: " ساقی " دہلی،	جون ۱۹۳۷ء	ص ۶۱
۳۔	" اسے کیوں ہم نے دیا دل "	مطبوعہ: " ساقی " دہلی،	اپریل ۱۹۳۱ء	ص ۱۴۴
۴۔	" وائٹریس "	مطبوعہ: " ساقی " دہلی،	اپریل ۱۹۳۱ء	ص ۱۴۰
۵۔	" خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا "	مطبوعہ: " ساقی " دہلی،	اکتوبر ۱۹۳۱ء	
۶۔	" شوہر پرست بیوی "	مطبوعہ: " ساقی " دہلی،	جولائی ۱۹۳۰ء	ص ۱۰۵
۷۔	" فولادی عشق "	مطبوعہ: " ساقی " دہلی،	جولائی ۱۹۳۷ء	ص ۱۳۱
۸۔	" نئی روشنی کا اندھیرا "	مطبوعہ: ساقی دہلی،	دسمبر ۱۹۳۷ء	ص ۵۳
۹۔	" قلعہ معلی کی ایک جھلک "	مطبوعہ: " ساقی " دہلی،	جنوری ۱۹۳۸ء	ص ۲۱۸
۱۰۔	" ریل کا ایک سفر "	مطبوعہ: " ساقی " دہلی،	اپریل ۱۹۳۸ء	ص ۸۸
۱۱۔	" ترلوکی پنڈت "	مطبوعہ: " ساقی " دہلی،	مئی ۱۹۴۰ء	ص ۴۲
۱۲۔	" تاریخ کا ایک صفحہ "	مطبوعہ: " ساقی " دہلی،	اگست ۱۹۴۰ء	ص ۴۰
۱۳۔	" مختصر حالات مولانا بشیر الدین احمد "	مطبوعہ: " ساقی " دہلی،	اپریل ۱۹۳۰ء	ص ۳۴

۱۴۔	" تقریظ دیوان بشیر " از بشیر الدین احمد	مطبوعہ : دہلی '	۱۹۲۳ء	
۱۵۔	" اردو "	مطبوعہ : " چمنستان " دہلی '	جنوری ۱۹۳۱ء	ص ۳۱
۱۶۔	" خدائی خوار "	مطبوعہ : " ساقی " دہلی '	جولائی ۱۹۳۹ء	ص ۱۵۶
۱۷۔	" شیخ زنبیلیے "	مطبوعہ : " ماہ نو " کراچی '	ستمبر ۱۹۴۹ء	ص ۳۵
۱۸۔	" نواب آسماں قدر "	مطبوعہ : " ماہ نو " کراچی '	جولائی ۱۹۵۰ء	ص ۳۰
۱۹۔	" خانصاحب کے گھر "	مطبوعہ : " ماہ نو " کراچی '	اگست ۱۹۵۱ء	ص ۸۵
۲۰۔	" کوئی صورت نظر نہیں آتی "	مطبوعہ : " ماہ نو " کراچی '	دسمبر ۱۹۵۳ء	ص ۴۹
۲۱۔	" مجھے کچھ کہنا ہے ان کی زبان میں "	مطبوعہ : ماہ نو کراچی '	اگست ۱۹۵۴ء	ص ۴۱
۲۲۔	" حاجی بغلول لاہور میں "	مطبوعہ : " ماہ نو " کراچی '	نومبر ۱۹۵۴ء	ص ۵۱
۲۳۔	" دوستی ناداں کی ہے "	مطبوعہ : " ماہ نو " کراچی '	جون ۱۹۵۵ء	ص ۴۵
۲۴۔	" خواب پریشاں "	مطبوعہ : " ماہ نو " کراچی '	اپریل ۱۹۵۶ء	ص ۵۷
۲۵۔	" کنج خرابات "	مطبوعہ : " ماہ نو " کراچی '	فروری ۱۹۶۱ء	ص ۴۰
۲۶۔	" کل کی بات "	مطبوعہ : " ماہ نو " کراچی '	ستمبر ۱۹۶۱ء	ص ۳۵

مستقل پتا:

کوزی ہومز ' ۵ / E بلاک A / ۱۳ گلشن اقبال ' کراچی

نظریہ فن:

" غبار کارواں سے کر رہا ہوں کارواں پیدا "

اشرف صبوحی دہلوی

اشرف صبوحی

موٹے آکا

غدر کے بعد بنے باز کی ہستی تومانی ہوئی ہستی تھی۔ مرزا ولی اللہ بیگ ابھی مرے ہیں، جن کو دعویٰ تھا کہ سو جوان ایک طرف کھڑے ہو جائیں اور وار کریں، میں سب کی چوٹیں بچاتا اور اپنی چوٹ کرتا نکل جاؤں گا۔ مگر پچھے رستموں میں ایک آکا مصطفےٰ بیگ کا دم باقی رہ گیا تھا۔ جنہیں لوگ عام طور پر موٹے آکا کہا کرتے تھے۔

چاوڑی بازار میں شاہ بولا کے بڑے قاضی کے حوض کی طرف چوڑی والوں کے محلے کے برابر حافظ داؤد کا کمرہ ہے۔ اس کمرے کے نیچے اب تک ایک دکان رفوگری کی ہے۔ اس زمانے میں یہاں مرزا یار نجان ایک کشمیری، ناٹا سا قد، ہاتھ پاؤں بھرے بھرے، ڈنٹر پھیلائے بیٹھے رفو کیا کرتے تھے۔ آکا مصطفےٰ بیگ اپنے آخری دنوں میں اسی کمرے پر آ رہے تھے اور اس لیے عصر کے بعد عموماً مرزا یار نجان کی دوکان کے آگے مونڈھے پر ان کی بیٹھک تھی۔ ایسے ڈیل ڈول اور کلے جبڑے کے آدمی اب دیکھنے میں نہیں آتے۔ مغل بچوں کا پورا نمونہ تھے۔ بڑھاپے میں چہرے سے خون ٹپکتا تھا۔ آواز ایسی کراری کہ بولتے تو یہ معلوم ہوتا شیر گرج رہا ہے۔ جسم کی کھال تو البتہ لٹک گئی تھی، لیکن ڈنٹروں کی مچھلیاں اب بھی ایسی طاقتور تھی کہ کیا مجال جو چٹکی تو لی جا سکے۔

کہتے ہیں کہ شاہی میں ان کے والد اپنے وقت کے بڑے بانکے تھے۔ انہوں نے بھی قلعہ میں پرورش پائی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد جس وقت تک ابوظفر سراج الدین کا چراغ ٹمٹاتا رہا، قلعہ ہی میں رہے۔ غدر ہوا تو زخمی ہو کر قید ہوئے۔ چھوٹے تو دو جانے جا پہنچے۔ ادھیڑ عمر میں دلی آئے اور جب تک جیئے اکنگ جیئے۔

آکا کی نسبت سنا ہے کہ بانک میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بانک خنجر بازی کا نام ہے۔ کبھی بچ بچ کی چھریوں سے اس کی مشق ہوتی تھی، پھر لکڑی کی چھریاں ہو گئیں اس میں بہت سے داؤں بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ہت کوڑا، بغلگیر، حلقوم، گولا لاٹھی، بازو بند وغیرہ جس طرح بنوٹ کی چوٹیں کاری سمجھی جاتی ہیں اسی طرح اس کے داؤں، لڑائیوں میں اس کا استعمال کب ہوتا تھا۔ صحیح نہیں معلوم، داستانوں میں عیاروں کی خنجربازی سنی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جنگ مغلوبہ میں جب تلوار چلانے کی جگہ نہ رہتی ہو گی تو خنجر اور کٹارے سے کام لیا جاتا ہو گا۔ بہرحال یہ بھی ایک سپاہیانہ فن تھا اور اس کے جاننے والوں میں آکا بھی تھے۔

آکا کی شہزوری اور بکیتی کی عام طور پر شہرت ایک اتفاقیہ واقعہ سے ہوئی۔ ان دنوں شاہ بولا کے بڑ کا تراہا سانڈوں کا اکھاڑہ تھا۔ تیسرے چوتھے روز ضرور ایک آدھ کشتی ہو جاتی۔ سیلانیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ اس میں کبھی کبھی بھاگ دوڑ میں لوگوں کے چوٹیں لگ جاتیں مگر یہ بھی ایک سیر تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ آکا، یار نجان کی دکان کے آگے مونڈھے پر آ کر بیٹھے ہی تھے کہ شاہ بولا کے بڑ کی طرف سے ایک شور اٹھا، معلوم ہوا کہ کوئی بڑی جوڑ چھوٹی ہے۔ اتنے میں سانڈ ڈکراتے ہوئے قاضی کے حوض کی طرف چلے۔ لوگ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ یار نجان نے آکا سے کہا اوپر آ جائیے سانڈوں کا رخ اسی طرف ہے۔ آکا نے ہنس کر جواب دیا مرزا ڈرو نہیں، جانوروں سے کیا بھاگنا آ رہے ہیں تو آنے دو۔

سانڈوں کو اپنے زور دکھانے سے کام تھا۔ کوئی روندن میں آ جائے یا کسی کا خوانچہ الٹ جائے، ان کی بلا سے۔ اتنے میں سانڈوں نے

دکان کے آگے آ کر سینگ جوڑ لیے۔ اب پھر یار نجان نے کہا۔

"آغا دکان کے اوپر کیوں نہیں آجاتے؟" آغا پھر ہنسے اور کہنے لگے۔

"مرزا یہاں بھی ایک سانڈ بیٹھا ہے۔ آنے تو دو۔" یار نجان کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ سانڈ آڑے ہو کر لڑنے لگے۔ سڑک پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا۔ دکان کی طرف جس سانڈ کی پشت تھی اس کا پاؤں رپٹا اور دوسرا اسے رگیدتا ہوا چلا۔ آغا کے مونڈھے کے قریب پڑی کے نیچے اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔

"آغا: بس بھئی بس۔ اب اس نے گھٹنے ٹیک دیے، تم بھی ہٹ جاؤ۔"

لوگ ہنسنے لگے کہ آغا جانوروں سے بھی ایسی باتیں کرتے ہیں، جیسے آدمیوں سے۔ بھلا سانڈ ان کی سنیں گے۔ دو چار نے آغا سے اصرار بھی کیا کہ اتنی جیداری اچھی نہیں اپنا مونڈھا ہٹا لیجیے مگر آغا قطب تھے۔ قطب از جانمی جنبد کے مصداق انہوں نے جب دیکھا کہ گرے ہوئے کو دوسرا مارے جاتا ہے تو آستین چڑھا کر بولے "نہیں مانتا، اب کیا میں اٹھوں۔"

اتنے میں بچھڑا ہوا سانڈ پڑی کے برابر لمبا لمبا لیٹ گیا تھا اور دوسرے نے اس کی چھاتی پر گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ آغا نے اٹھتے ہی پہلے تو چھچھناتے ہوئے سانڈ کی کوکھ پر ایک لات رسید کی۔ لات کو تو وہ پی گیا، بلکہ جھنجلا کر اس نے آغا پر حملہ کرنا چاہا تو آغا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے دونوں سینگ پکڑ لیے اور ایک رو میں اس کو سڑک کے بیچ میں لے گئے۔ سانڈ نے جھرجھری لے کر سینگ چھڑانے چاہے۔ سانڈ کا جھرجھری لینا تھا کہ آغا نے گاؤ کہ کا داؤں کیا۔ سانڈ اڑا اڑا کر زمین پر آ پڑا۔ تماشائیوں میں حیرت چھائی ہوئی تھی۔ سانڈ کے گرتے ہی شور مچ گیا کہ واہ آغا واہ کیا بات ہے سچ مچ کا گاؤ کہ آج ہی دیکھا ہے۔

سانڈ گر پڑا تو آغا نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور بولے "اسی برتے پر آغا کا مونڈھا انھوا رہا تھا۔ جا اب سیدھا چلا جا ورنہ بے چھری حلال کر دوں گا۔" سانڈ کوئی ایک منٹ تو چپ پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔

اس وقت بھی ڈپٹی کمشنر اور کمشنر وغیرہ کے بنگلوں پر بعض پرانی دیگ کی کھرچنیں قابوں میں لگ کر جایا کرتی تھیں۔ وہ جب حکام سے ملتے آزادی کے ساتھ اور اپنے کو لیے دیئے۔ حکام بھی ان کی ویسی ہی عزت کرتے۔ برابر کی ملاقاتیں ہوئیں مل کر بیٹھتے تو کام کی باتوں کے علاوہ شہر میں جو اچنبے کی بات ہوتی اس کے متعلق رائے زنیاں کی جاتیں۔ مسلمانوں میں ڈپٹی ہادی حسین خاں، شہزادہ سلیمان شاہ اور ہندوؤں میں لالہ بالا پرشاد نہروالے خصوصیت کے ساتھ اس بات کا خیال رکھتے کہ دلی والوں پر کوئی حرف نہ آئے۔

اچھا آغا مصطفیٰ بیگ کی سانڈ سے کشتی کے بعد جو ڈپٹی ہادی حسین خاں کی ڈپٹی کمشنر بہادر سے ملاقات ہوئی تو کہیں اس واقعہ کا بھی ذکر آ گیا۔ صاحب نے پوچھا یہ آغا کون شخص ہے۔ ہم اس کو دیکھنا چاہتے ہیں؟ ڈپٹی صاحب نے کہا "ایک باامن شہری ہے۔ لکڑی اور خاص کر بانک کے فن کا جاننے والا۔ اب ان کے سوا شاید دلی میں دوسرا نہیں رہا۔ ان کے دیکھنے کا سوال شام کو بلا ناغہ چاوڑی بازار میں حافظ داود کے کمرے کے نیچے ان کی نشست ہوتی ہے۔ جب جی چاہے ادھر نکل جائیے اور دیکھ آئیے۔"

صاحب بہادر: "وہ ہمارے بنگلے پر نہیں آئیں گے؟"

ڈپٹی صاحب: "ان آغاؤں سے آپ واقف نہیں۔ بے بلاوے یہ بادشاہوں کے دربار میں تو گئے نہیں اور گئے بھی تو پہلے یہ فیصلہ کر لیا کہ کہاں بٹھائے جائیں گے۔ کس طرح ان سے گفتگو کی جائے گی۔"

صاحب بہادر: "لیکن وہ زمانہ اور تھا۔ ان پرانے دستوروں کے ہم پابند نہیں۔"

ڈپٹی صاحب: "آپ پابند نہیں وہ تو پابند ہیں۔"

غرضکہ اسی طرح کی ردو بدل کے بعد صاحب بہادر نے وعدہ کر لیا کہ ہم کرسی دیں گے اور عزت کے ساتھ ملیں گے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا کہ میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ انہیں لا کر آپ سے ملا دوں۔

آغا کی نشست اکرام اللہ خان کے ہاں رہتی تھی - چنانچہ ہادی حسین خاں نے ان کے ذریعہ سے آغا کو ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر چلنے کے لیے مجبور کیا اور صاحب کو چھٹی لکھی کہ میں نے بڑی کوشش کے بعد آغا کو جناب کی ملاقات کے لیے رضامند کر لیا ہے - آپ جو دن اور وقت مقرر کریں انہیں لے کر حاضر ہوں - امید ہے کہ آپ ان کی واجب تعظیم فرمائیں گے - صاحب نے ہادی حسین خاں کی چھٹی کا فوراً جواب دیا - ملاقات کا دن اور وقت مقرر کر کے وعدہ کیا کہ ملاقات چونکہ نجی ہے اس لیے دوستانہ ہو گی۔

چنانچہ جب ڈپٹی صاحب آغا کو لے کر صاحب کے بنگلے پر پہنچے اور اطلاع ہوئی تو وہ بلا تامل باہر نکل آئے - ڈپٹی صاحب منحنی سے آدمی تھے اور ان کے مقابلہ میں آغا کے ڈیل ڈول اور چہرے پر نظر پڑی کہ ایک شیر ہے - ڈاڑھی چڑھی ہوئی جسم کا رنگ ململ کے باریک انگرکھے میں سے پھوٹا پڑ رہا تھا - حیران رہ گئے - آگے بڑھے پہلے ڈپٹی صاحب سے ہاتھ ملایا پھر آغا سے معلوم ہوا کہ فولاد کے پنجے میں ہاتھ ڈال دیا صورت دیکھنے لگے۔

صاحب: (آغا سے) "آپ اچھے ہیں؟"

آغا: "اچھا تو خدا کا نام ہے 'زندہ ہوں -"

صاحب: (ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھ کر) "کیا مطلب؟"

ڈپٹی صاحب: "آغا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ آپ جیسے حاکم جس شہر میں ہوں وہاں برائی کا کیا کام - خدا کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہم زندہ ہیں -

صاحب: (آغا سے) "مجھے آپ کی ملاقات کا بہت شوق تھا -"

آغا: "آپ کی مہربانی -"

صاحب: "آپ کے متعلق ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ پٹا بازی کا ہنر خوب جانتے ہیں۔"

آغا: "پٹا بازی کیسی' میں سمجھا نہیں -"

صاحب: "محرم میں تعزیوں کے سامنے لکڑیوں سے جو کھیل کھیلتے ہیں کیا آپ وہ نہیں جانتے۔"

آغا: "صاحب خدا خدا کیجیے ایک ستر برس کے بوڑھے کو کھیل سے کیا نسبت -"

صاحب: "ہم نے تو بوڑھے بوڑھوں کو اچھلتے کودتے دیکھا ہے اور ہمارے ڈپٹی صاحب کہتے تھے کہ آپ ان کے استاد ہیں۔"

آغا: "ہاں انہوں نے دو چار گھائیاں مجھ سے سیکھی ہیں -"

صاحب: "گھائیاں کیا؟"

آغا: "لکڑی کے فن کے داؤں یا چوٹیں -"

صاحب: "تو کیا اس میں بھی اچھلتے کودتے ہیں -"

آغا: "اچھل کود تو پٹا بازی یا بنوٹ میں ہوتی ہے - بانک اور بنوٹ کو ان بوزنہ حرکتوں سے کیا تعلق؟"

صاحب: "بانک اور بنوٹ میں کیا ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے؟"

آغا: ہلانے پڑتے ہیں لیکن صرف ضرورت کے وقت بنوٹ کے تو نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کی کوئی اوٹ نہیں - اس کے داؤں سے دشمن بچ نہیں سکتا - بانک والا بیٹھے بیٹھے اور لیٹے لیٹے بھی اپنا داؤں کر جاتا ہے - جس طرح نبوٹ کے لیے کسی ہتھیار کا ہونا لازمی نہیں - اس کا جاننے والا رومال کی گرہ سے بندوق کی گولی کا کام لے سکتا ہے - اسی طرح بانک کے اگر کسی کو دو چار داؤں بھی رواں ہیں تو مقابل کے سارے ہتھیار بیکار ہیں۔"

صاحب: "لیکن یہ فن اگلے زمانے میں شاید کچھ بکار آمد ہو - آج کل بندوق اور ریوالور کے مقابلے میں اسے سیکھنا وقت ضائع کرنا

ہے۔"

آغا: "بندوق اور طمنچہ کے سامنے واقعی بانک اور بنوٹ کی کاریگری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ آپ کا ارشاد بجا ہے۔ مگر ایسے بھی تو بہت سے موقعے آدمی کو پیش آجاتے ہیں جہاں یہ چیزیں نہیں ہوتیں۔ فقط ہاتھ پاؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔"

صاحب: ولایت میں بوکسنگ اور فنسنگ ہم لوگ بھی اسی مطلب کے لیے سیکھتے تھے۔ لیکن ریوالور کے مقابلے میں اب یہ چیزیں صرف کھیل سمجھی جاتی ہیں۔"

آغا: "بوکسنگ اور فنسنگ کیا ہوتا ہے؟"

صاحب: "گھونسے بازی اور شمشیر زنی۔"

آغا: "میں نے یہ کھیل نہیں دیکھے۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے ہاں کی کشتی اور لکڑی کے فن کے مقابلہ میں ان کی کیا حیثیت ہے۔"

صاحب: "میں نے بھی ولایت میں ان دونوں میں اچھا کمال پیدا کیا تھا۔"

آغا: "بہت مبارک۔ لیکن کبھی ان کے دکھانے کا کوئی موقع بھی ملا۔"

صاحب: "کیا مطلب؟"

آغا: "میرا مطلب یہ ہے جب سے آپ نے یہ فنون سیکھے ہیں۔ آپ کو کبھی دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ جب تک ایسی صورت پیش نہیں آتی کسی فن کی حقیقت نہیں کھلا کرتی۔"

صاحب: "مجھے تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر ہمارے ملک میں ایسے واقعات بہت ہوتے رہتے ہیں۔"

آغا: "وہ لوگ گھونسے کے مقابلے میں گھونسے اور تلوار کے مقابلے میں تلوار ہی چلاتے ہوں گے۔"

صاحب: "قطعی۔"

آغا: "اگر کسی کو گھونسا بازی نہ آتی ہو یا تلوار اس کے پاس نہ ہو اور دشمنوں میں گھر جائے۔"

صاحب: "تو اس کی موت ہے۔ دشمن اس پر غلبہ پالیں گے۔"

آغا: "لیکن ہمارا فن ہتھیاروں کے بغیر بھی اپنے جاننے والے کی جان بچا سکتا ہے۔"

صاحب: "کیا آپ کو تلوار کے مقابلے میں تلوار اور گھونسے کے جواب میں گھونسے کی ضرورت نہیں۔"

آغا: بالکل نہیں۔ بلکہ ایک دفعہ تو بندوق اور طمنچہ کی زد سے بھی بچ سکتے ہیں۔"

صاحب: "میں نہیں سمجھ سکا۔"

آغا: "سانڈ کے مقابلے میں میرے پاس کیا ہتھیار تھا؟"

صاحب: "مگر سانڈ تو جانور ہے۔"

آغا: "آپ کا کے باز ایسے موقعے پر کیا کرتا سانڈ کی جھپیٹ سے کیونکر بچتا؟ گھونسے تو اس پر کارگر نہ ہوتے۔"

صاحب: (کچھ سوچ کر) "اچھا آپ ہمارے کسی گھونسے باز کے مقابلے میں کیا کریں گے؟"

آغا: "کوئی گھونسے باز سامنے ہو تو بتاؤں ایک گھونسے کے بعد شاید اس کا ہاتھ مدتوں گھونسہ نہ بنا سکے۔"

صاحب: "ہم آپ کی اس شیخی کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے طریق پر اگر گھونسہ ماروں تو آپ کیا کریں گے؟"

آغا: (ہنس کر) "مگر میں آپ کو گھونسہ مارنے کی صلاح نہیں دوں گا۔ آپ حاکم وقت ہیں اور میں ایک گوشہ نشین امن پسند۔"

صاحب: "کچھ مضائقہ نہیں۔"

ڈپٹی صاحب: "کوئی دوسرا انگریز اس وقت دلی میں ایسا نہیں جو گھونسہ بازی جانتا ہو۔"

صاحب: (گھنٹہ کی طرف دیکھ کر) "قلعہ میں ایک میجر ہمارا دوست ہے گھونسہ بازی کا پورا مشاق ہے۔ وہ شاید ابھی آ جائے۔"

اتنے میں بیرے نے آ کر میجر کا کارڈ دیا۔ صاحب نے اسے اندر بلا لیا۔ دو چار باتوں کے بعد صاحب نے میجر سے کچھ انگریزی میں کہا۔ اس نے آغا کی طرف بغور دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں "بولا تم بڈھا آدمی ہم سے گھونسہ بازی کرنا مانگتا ہے؟"

آغا: "بازی وازی ہم کچھ نہیں جانتے۔"

میجر: "پھر؟"

آغا: "تم گھونسہ چلاؤ ہم دیکھیں وہ کیا چیز ہے۔"

میجر: "تم کیا کرے گا۔ اگر مر گیا۔"

آغا: "خون معاف لیکن اگر تمہارا ہاتھ ٹوٹ گیا۔"

میجر: (قہقہہ لگا کر) "کچھ پروا نہیں۔"

آخر فیصلہ یہ ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو ضرب شدید سے احتیاط رکھی جائے۔ چنانچہ میجر صاحب نے کوٹ اتار دیا۔ قمیض کی آستین چڑھا لیں اور آغا کی طرف اشارہ کیا کہ "آیئے میدان میں۔"

آغا: "آپ گھونسہ بازی شروع کیجیے۔"

میجر: (ہنس کر) "بیٹھے بیٹھے لڑے گا؟"

آغا: لڑنا کیسا' تمہارے صاحب کو ایک ذرا سا چٹکلا دکھانا ہے' میجر نے صاحب ڈپٹی کمشنر کی طرف دیکھا۔ انہوں نے سید ہادی حسین سے کچھ کہا۔ سید صاحب نے گردن ہلا دی۔ صاحب نے میجر کو اشارہ کر دیا۔ وہ پینترا بدلتا گھونسے ہلاتا آغا پر چلا۔ آغا دیکھتے رہے۔ جب میجر صاحب آغا کے قریب پہنچے اور گھونسہ ان کے منہ پر مارنا چاہا تو یکایک معلوم ہوا جیسے کسی درخت کا گدا ٹوٹا۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی جناب میجر زمین پر چت پڑے ہوئے دکھائی دیئے اور آغا صاحب پہلے کی طرح بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھے تھے۔ صاحب اور ڈپٹی صاحب اٹھ کر میجر کے قریب گئے۔ پوچھا "کیا ہوا۔" کہنے لگا۔ "ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ ہم نے گھونسہ مارنا چاہا بڈھے نے ہاتھ مروڑ کر ہمیں گرا دیا۔"

صاحب: (آغا سے) "ہم تو کچھ نہیں دیکھ سکے۔"

آغا: "آپ کہاں چلے گئے تھے۔"

صاحب: "ہم نے سمجھا تھا کہ آپ کے فن کا میجر صاحب کے فن سے دو چار منٹ مقابلہ ہوگا اس لیے پوری توجہ نہیں کی۔"

آغا: "ہمارے فن میں مقابل سے کھلاڑیاں کرنا کیا معنی؟ میجر صاحب نے گھونسہ مارا ہم نے کیلی کر کے انہیں بچھاڑ دیا البتہ اتنی رعایت کی کہ ان کا ہاتھ سلامت رہا۔ اگر ایسے موقعے پر واقعی کوئی دشمن ہوتا تو کہنی اتر جاتی یا بازو ٹوٹ جاتا۔"

صاحب: "کیلی کیا؟"

آغا: "ہتھیار چھیننے کا ایک داؤں ہے مارنے والے کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیتے ہیں۔"

صاحب: "مگر آپ نے تو بجلی کی سی پھرتی کی"

آغا: "ہمارے فن میں پھرتی ہی سے سارے داؤں ہوتے ہیں۔"

میجر صاحب نے دو چار منٹ تو اپنے ہاتھ کو پہونچے سے لے کر شانے تک سہلایا۔ اس کے بعد آغا کے قریب آ کر آغا کو پہلے تو بڑے غور سے دیکھا ان کی تیوری پر بل نہ کپڑوں پر شکن' نہ ان کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ پھر بڑے تپاک اور نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ آغا سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ "کیا آپ طمنچہ اور بندوق کی گولی کا مقابلہ بھی کر سکیں گے۔"

آکا: "بندوق مارنے والا اگر سامنے ہے تو ایک دفعہ شاید اس کی گولی بھی بچا جائیں گے۔"

صاحب: "ناممکن ہے۔"

آکا: "آپ نے گھونسے بازی کا تماشا تو دیکھ ہی لیا۔ اب ان سے کہئے کہ طمنچہ چلائیں' خدا نے چاہا تو چلنے سے پہلے طمنچہ زمین پر پڑا ہو گا۔"

صاحب نے میجر کی طرف دیکھ کر اس سے انگریزی میں کہا کہ "لگے ہاتھوں اس بڈھے کا یہ کمال بھی دیکھ لینا چاہیے لیکن ریوالور میں کارتوس نہ ہو تاکہ اسے نقصان نہ پہنچے" اور صاحب نے اپنا ریوالور لا کر میجر کو دیا۔

آکا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میجر نے ریوالور ہاتھ میں لیا اور دو چار قدم پیچھے ہٹ کر ریوالور تانا۔ ریوالور بندوق کی طرح نشانہ باندھ کر نہیں مارا جاتا۔ بلکہ اس کی نال اونچی کر کے آہستہ آہستہ سیدھا کر کے مقابل پر جھونکتے ہیں۔ چنانچہ میجر نے ریوالور ابھی سیدھا بھی نہیں کیا تھا اور اس کی گھوڑی دبانی چاہتے تھے کہ آکا ایک دفعہ ہی اپنی جگہ سے اڑے۔ ریوالور کی نال سیدھی ہونے نہیں پائی تھی۔ ہاتھ نیچے آ ہی رہا تھا کہ آکا کے ہاتھ کی گدی اس کی کلائی پر اس زور سے پڑی کہ ریوالور چھوٹ کر دور جا پڑا اور میجر صاحب ہاتھ پکڑ کر رہ گئے۔ آکا پھر بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔

صاحب: "آپ نے کیا کیا؟"

آکا: (مسکرا کر) "اسے ہت کی کہتے ہیں' میرے پاس لکڑی ہوتی تو یہی داؤں لکڑی سے کرتا۔ لکڑی نہیں تھی' میں نے لکڑی کا کام اپنے ہاتھ کی گدی سے لیا۔"

صاحب ڈپٹی کمشنر بہت متعجب ہوئے۔ سید ہادی حسین خاں سے آکا کی تعریف کی اور فرمایا "کہ اگر یہ ہم سے کبھی کبھی ملتے رہیں تو اچھا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد آکا رخصت ہو کر گھر آ گئے اور اس روز سے مرزا رفوگر کی دکان پر بیٹھنا بھی کم کر دیا۔

اب ایسے لوگ کہاں' قلعہ کی جو رہی سہی یادگاریں تھیں وہ بھی اٹھ گئیں۔

○

رشید جہاں

نام : رشیدہ
قلمی نام : رشید جہاں / ڈاکٹر رشید جہاں
پیدائش : ۲۵ اگست ۱۹۰۵ء بمقام : دہلی
وفات : ۲۹ جولائی ۱۹۵۲ء تدفین : ماسکو (سوویت یونین)
تعلیم : میٹری کولیشن : ویمنس مسلم گرلز کالج، علی گڑھ، ۱۹۲۲ء
ایف ایس سی : ازابیلا تھوبرن کالج، لکھنؤ : ۱۹۲۴ء
ایم۔بی۔بی۔ایس : لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج، دہلی : ۳۲-۱۹۳۱ء

مختصر حالات زندگی:

ایم۔بی۔بی۔ایس کرنے کے بعد میڈیکل ملازمت کے سلسلے میں (لیڈی ڈفرن ہسپتال) دہلی، کانپور، بلند شہر اور (کوئین میری ہسپتال) لکھنؤ میں قیام رہا۔ انڈین پیپلز تھیٹر کی بانی ممبر تھیں۔
۱۴ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں محمود الظفر (وائس پرنسپل ایم۔اے۔او کالج امرتسر) سے شادی کے بعد ملازمت سے مستعفی ہو کر امرتسر آگئیں اور پرائیویٹ پریکٹس شروع کی۔ سادہ اور بے تکلف۔ منہ پھٹ اور لڑاکا مشہور تھیں۔
۱۹۳۷ء میں میاں بیوی سب کچھ چھوڑ چھاڑ یورپ کے سفر پر نکل گئے۔ واپسی پر جب محمود الظفر نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیا تو دونوں دہرہ دون میں رہائش پذیر ہوئے۔ وہاں کچھ مدت رشید جہاں نے پرائیویٹ پریکٹس بھی کی لیکن زیادہ تر دونوں نے سماجی و سیاسی کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ واضح رہے کہ رشید جہاں کے والد شیخ عبداللہ اور والدہ وحید جہاں بیگم، اپنے زمانے کے بہت بڑے سماجی کارکن رہے تھے۔ وہ مسلم گرلز اسکول علی گڑھ اور ویمنس کالج علی گڑھ کے بانی اور تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے۔ رشید جہاں اور محمود الظفر، کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ ۱۹۴۲ء میں رشید جہاں اور محمود الظفر لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ رشید جہاں نے یہاں بھی پرائیویٹ پریکٹس جاری رکھی اور آل انڈیا ریڈیو کے لیے ڈرامے اور فیچر بڑی تعداد میں لکھے۔ ۱۹۴۲ء میں بیمار ہوئیں اور ۱۹۵۰ میں معلوم ہوا کہ رشید جہاں سرطان کی مریضہ ہیں۔ وہ ۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو بمبئی سے بذریعہ ہوائی جہاز علاج کے لیے ماسکو چلی گئیں۔ وہاں دو برس تک علاج ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ وہیں انتقال کیا اور ویڈنسکی گورستان، ماسکو میں دفن ہوئیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

انگریزی میں لکھا جو ازابیلا تھوبرن کالج لکھنؤ کے کالج میگزین میں ۱۹۲۴ میں شائع ہوا۔ آل احمد سرور نے اس افسانے کا ترجمہ بہت بعد میں "سلمیٰ" کے عنوان سے کیا۔ یہ افسانہ رشید جہاں کے افسانوی مجموعے "شعلۂ جوالہ" میں شامل ہے۔

(نوٹ) واضح رہے کہ رشید جہاں نے اپنے ابتدائی اردو افسانے کالج میگزین میں مختلف مردانہ ناموں سے شائع کروائے۔ کالج کے لیے بڑی تعداد میں ڈرامے لکھے اور ان میں اداکاری بھی کی۔ اداکاری کے میدان میں ان کی سگی بہن خورشید جہاں (المعروف: رینوکا دیوی / بیگم خورشید مرزا) نے شہرت پائی۔ رینوکا دیوی فلم "بھابی"، "جیون پربھات" اور "غلامی" جیسی مشہور فلموں کی ہیروئین تھیں۔ جب کہ ان کے بھائی محسن عبداللہ بمبئی ٹاکیز سے متعلق رہے۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "انگارے" مرتبہ: احمد علی (بہ اشتراک: احمد علی، سجاد ظہیر و محمود الظفر) طبع اول: دسمبر ۱۹۳۲ء

اس مجموعے میں رشید جہاں کا ایک افسانہ بعنوان "دلی کی سیر" اور ایک ڈراما بعنوان "پردے کے پیچھے" شامل ہے۔

۲۔ "عورت اور دیگر افسانے" (افسانوی مجموعہ) مطبوعہ: ہاشمی بک ڈپو، ریلوے روڈ، لاہور، طبع اول: نومبر ۱۹۳۷ء

(صفحات ۱۱۳ علاوہ اشتہارات)

اس مجموعے میں چھ افسانے بعنوان "سودا"، "میرا ایک سفر"، "سڑک"، "پن"، "غریبوں کا بھگوان" اور "استخارہ" کے علاوہ ایک ڈراما بعنوان "عورت" شامل ہے۔ ایک ایکٹ کے اس ڈرامے نے کتاب کے ۵۴ صفحات گھیر رکھے ہیں۔

۳۔ "شعلۂ جوالہ" (افسانوی مجموعہ) مرتبہ: ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر مطبوعہ: نامی پریس، نخاس لکھنؤ، طبع اول: ۱۹۶۸ء

اس مجموعے میں گیارہ افسانے بعنوان "افطاری"، "مجرم کون"، "چھدا کی ماں"، "فیصلہ"، "صفر"، "آصف جہاں کی بہو"، "وہ"، "ساس اور بہو"، "اندھے کی لاٹھی"، "وہ جل گئی" اور "بے زبان" کے علاوہ ایک ڈراما شامل ہے۔

۴۔ "وہ اور دوسرے افسانے" (افسانے، ڈرامے اور ایک مضمون) مطبوعہ: رشید جہاں یادگار کمیٹی، نئی دہلی، طبع اول: ۱۹۷۷ء

(کل ۳۰۴ صفحات)

اس کتاب میں گیارہ افسانے بعنوان "افطاری"، "آصف جہاں کی بہو"، "چور"، "سودا"، "چھدا"، "وہ"، "ساس اور بہو"، "میرا ایک سفر"، "بے زبان"، "مجرم کون" اور "صفر" کے علاوہ چھ ڈرامے بعنوان "گوشۂ عافیت"، "ہندوستانی"، "پردے کے پیچھے"، "پڑوسی"، "عورت" اور "کاٹنے والا" کے علاوہ ایک مضمون "منشی پریم چند اور ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس" شامل ہے۔ کتاب کا آغاز "اعتراف" کے عنوان سے آنند نرائن ملا نے اور پیش لفظ سید نور الحسن نے لکھا ہے۔ کتاب میں رشید جہاں سے متعلق ہاجرہ بیگم اور ڈاکٹر پرائس کے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔

غیر مدون:

رشید جہاں کے جملہ انگریزی افسانے اور مضامین تاحال یکجا نہیں ہو سکے۔

نظریۂ فن:

"میں اپنے افسانوں میں یہی کوشش کرتی ہوں کہ جو میرے خیال ہیں ان کی ترجمانی ایمانداری سے کروں"

(بہ حوالہ: "میرا بہترین افسانہ" مرتبہ: محمد حسن عسکری)

رشید جہاں

نئی بہو کے نئے عیب

لو آج صبح ہی سے انہوں نے پھر شور مچانا شروع کر دیا۔

"اے بہن کیا پوچھتی ہو کہ تمہاری ساس کیوں خفا ہو رہی ہیں۔ ان کی عادت ہی یہ ہے۔ ہر آئے گئے سب کے سامنے میرا رونا لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ ساری دنیا کے عیب مجھ میں ہیں۔ صورت میری بری، پھوہڑ میں، بچوں کو رکھنا میں نہیں جانتی، اپنے بچوں سے مجھے دشمنی، میاں کی میں بیری، غرض کہ کوئی برائی نہیں جو مجھ میں نہیں اور کوئی خوبی نہیں جو ان میں نہیں۔ اگر میں کھانا پکاؤں تو زبان پر رکھ کر فوراً تھوک دیں گی اور وہ نام رکھیں گی کہ خدا کی پناہ کہ دوسرا بھی نہ کھا سکے۔ شروع شروع میں تو مجھے کھانا پکانے میں کافی دلچسپی تھی۔ تم جانتی ہو کہ اپنے گھر پر بھی اکثر پکا لیتی تھی اور میری اماں کو اتنا اچھا کھانا پکانا آتا ہے کہ اپنے رشتے داروں میں ہر جگہ مشہور ہیں۔ یہاں تو جو پکایا اس میں برائی نکلی کہ نمک تو دیکھو زہر، مزا ایسا کہ مٹی کھا لو، ایک دن خود ہی بڑے پکائے کہ ہمارے سسر نے کہا کہ ایسے واہیات بڑے کس نے بنائے ہیں۔ خوب بڑبڑائیں کہ بس تمہیں تو بہو کے ہاتھ کی چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ ساری عمر یکی تو پکا پکا کر کھلاتی رہی ہے۔ اب میں کیا بولتی خوب ہنسے کہ لو تمہارا صبر پڑا۔ میں نے سوچا کہ کام کرو اور باتیں بھی سنو تو اس سے بہتر نہ ہی کرو۔ کھانے پکانے پر ہی کیا ہے۔

سینے پرونے میں جو کبھی کبھار ایک آدھ چیز درزی سے سلوالوں تو بس پھر سنو۔ مہینوں ہر آئے گئے کے سامنے تذکرہ ہوتا ہے کہ ہماری بہو صاحب تو میم صاحب ہیں۔ وہ تو درزی سے سلواتی ہیں۔ ہر چیز درزی سے سلواتی ہیں، ہر چیز اپنی بچوں کی، ان کے کرتے پاجامے خود ہی سیتی ہوں۔ لیکن کبھی کبھار کسی نئی قسم کی بلاؤز یا کوٹ کو دل چاہنے لگے تو درزی کو دے دیتی ہوں۔ چھپا کر دیتی ہوں۔ پھر بھی ان کے اتنے مخبر میرے پیچھے لگے رہتے ہیں کہ ہر بات کی خبر کر ہی دیتے ہیں۔ جب میں نئی نئی آئی تو ان کا ایک چکن کا کرتہ میں نے سی دیا تھا۔ ہر ایک کو دکھایا گیا اور برائی کی گئی۔ جو دیکھے چپ ہو جائے۔ اچھے خاصے کرتے کی کوئی کیسے برائی کر دے۔

جب کسی نے برائی نہ کی تو اس کو سارے کو ادھیڑ ڈالا اور پھر کسی اور سے سلوایا۔ دل تو میرا بھی چاہا کہ اب سب کو دکھاؤں۔ لیکن میں یہ کیسے کر سکتی تھی۔ وہ بڑا ہونے اور ساس بننے کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ہر وقت پڑھا لکھا ہونے کا طعنہ ہے۔ کوئی کتاب میرے ہاتھ میں دیکھیں تو جل جاتی ہیں۔ کسی کو خط لکھتا دیکھ لیں تو سمجھتی ہیں کہ ان ہی کی برائی لکھ رہی ہوں۔ کوئی بات ہی ان کو میری پسند نہیں اور سب سے بری بات جو لگتی ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی کبھی خوش نہ رہیں۔ کبھی اگر یہ کچھ میرے لیے لے آئیں اور خبر ہو جائے تو جل بھن کر رہ جاتی ہیں اور اٹھتے بیٹھتے ان کو طعنے ہیں کہ "تم تو بیوی کے غلام ہو" ہر وقت میری برائی ان کے سامنے کرتی ہیں۔ وہ سن کر ٹال جاتے ہیں کبھی ماں سے بگڑ بھی جاتے ہیں اور کبھی ہنس کر کہہ بھی دیتے ہیں کہ "ہاں بہت بری ہے اماں میری دوسری شادی کر دو" اس وقت تو ان کو باتیں سناتی ہیں کہ "جو تمہارے میں یہ ہمت ہوتی تو یہ سر ہی کیوں چڑھتی" اور دوسروں کے سامنے کہتی پھرتی ہیں کہ میرا لڑکا تو اپنی قسمت کو روتا ہے۔ مجھے کہتا ہے کہ دوسری کر دو۔ وہ تو میں ہی ہوں کہ اپنے بچے پر ان بیوی کے لیے ظلم کر رہی ہوں۔ کوئی دوسری والی ہوتی تو کبھی کا کر دیتی۔ نہ اس کروٹ چین ہے نہ اس کروٹ۔

بچوں کے اوپر لو۔ بالکل ناس ہو گیا ہے۔ جس بات کو میں ناکوں گی یہ نا۔ جس بات کو منع کروں گی یہ ضرور کر کے دیں گی۔ باہر کوئی

سودے والا پکارے۔ بچے تو ضرور مانگیں گے۔ مجھے یہ سودے والوں سے ٹھیوں کا بھنکتا سودا بچوں کو لے کر دینا پسند نہیں۔ میری ضد میں ضرور لے کر دیں گی۔ پچھلے سال برسات میں بڑے لڑکے کو ملائی کی برف کھا کر زور کا بخار چڑھا۔ دو مہینے لے بیٹھی رہی۔ اس میں ہر وقت لڑائی کہ بچے کو بھوکا مارے دے رہی ہے۔ انجکشن لگوا لگوا کر چھید کر دیے۔ روز نئے نئے تعویز آتے تھے اور ساتھ ہی مولوی صاحب جھاڑ پھونک کے واسطے لائے جاتے تھے۔ جب کسی طرح نہیں مانیں تو میں بیمار بچے کو اٹھا کر ہسپتال لے گئی کہ کچھ آرام ملے۔ وہ تو کہو بے چاری ڈاکٹرنی میری دوست ہے ورنہ کون کسی کی بات سنتا ہے۔ یہ وہاں بھی جا کر چار باتیں ڈاکٹروں' نرسوں کو اور دس مجھ کو سنا آتی ہیں۔

بچوں کو وقت پر دودھ دینے کی ہماری ساس ایسی دشمن ہیں کہ کیا بتاؤں۔ وہ کہتی ہیں کہ ماں ہو کر بچوں کی دشمن ہوں۔ بچے پھڑکتے رہیں اور میں بیٹھی دیکھتی رہتی ہوں اور میرا دل پتھر کا ہے۔ میں بچوں کو پیدا ہوتے ہی کسی پھل کا عرق یعنی نارنگی یا سیب کا دیتی ہوں۔ جب پہلے بچے کو میں نے دیا تو کھڑی اور بیٹھی پیٹتی تھیں کہ میں ہرگز نہیں دینے دوں گی۔ یہ تو بچے کو نمونیا کر کے مارنا چاہتی ہے۔ ہمارے سسر بچارے بڑے نیک ہیں۔ انہوں نے سمجھایا۔ جب یہ کسی طرح نہیں مانیں تو مجھے میرے میکے چھوڑ آئے۔ چھ مہینے وہاں رہی پھر یہ جا کر لے آئے۔ مہینوں بات نہیں کی رات کو کہتی تھیں کہ بچے کو اپنے پاس سلاؤ۔ میں الگ سلاتی ہوں تو ظلم کرتی ہوں۔ میرے تو تین بچے ہیں۔ سب پہلے دن سے الگ سوتے ہیں کہ کوئی بھوت پلیت چمٹ جائے گا۔ بچے کو اٹھا کر اپنے پاس سلاتی تھیں۔ اور تو اور رات کو دیکھو تو دودھ کٹوری سے بتی ڈال کر پلا رہی ہیں۔ جو میں منع کروں تو اتھواروں کی ٹھن جاتی ہے۔ ہر بچے پر اسی طرح وق کرتی ہیں۔

مجھ کو گندہ' پھوہڑ نہ معلوم کیا کیا کہتی ہیں۔ ذرا ان کی طرف جا کر دیکھو۔ ہر طرف پیک پڑی ہوئی کھیاں بھنکتی ہوئی اس کا نام صفائی ہے۔ اگال دان پاس رکھا ہے لیکن صحن میں جب تھوکیں گی تو زمین پر۔ پاس بیٹھے ہوئے گھن آتی ہے۔ لیکن میں جو ہر چیز جگہ پر رکھتی ہوں' چلمن کھیوں کی وجہ سے ڈالتی ہوں تو گندی ہوں۔

اب سال بھر سے یہ خفگی کہ چولھا الگ کر لیا۔ اب کوئی کسی وقت بھی دونوں باورچی خانے جا کے دیکھ لے۔ میرے ہاں کبھی نہ ترکاری پھیلی ملے گی نہ برتن۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرے ہاں ایک بھی مکھی نہ ملے گی۔ ان کے ہاں ہر وقت مکھیوں کی بارات لگی ہے۔ کہتی ہیں کہ میں ہر جگہ گھر میں فنائل ڈال ڈال کر نحوست پھیلاتی ہوں۔ ان کے خیال میں تو سلیقہ کے یہ معنی ہیں کہ نوکروں کو خوب تنگ کرو۔ پیٹ بھر کھانے کو نہ دو۔ ہر ایک روٹی اور چاول اور دال کو بیٹھے بیٹھے گنا کرو نوکر بھی تو آدمی ہوتے ہیں۔ دو روز میں گھبرا کر بھاگ جاتے ہیں۔ میں نوکروں کے لیے کپڑے بناتی ہوں۔ زبردستی نہلوا کر بدلواتی ہوں تو کہتی ہیں کہ میاں کے روپے کا درد نہیں نوکروں کو بادشاہ بنا رکھا ہے اور ایک الزام یہ بھی ہے کہ ان کے نوکر میرے نوکروں کو دیکھ کر خراب ہوئے جاتے ہیں میں گھر کے سب آدمیوں کو بگاڑ دیتی ہوں۔

اور تو اور گھر میں کوئی آ جائے تو خفا ہوتی ہیں کہ سامنے کیوں ہوتی ہو پردہ کیوں نہیں کرتیں۔ اب ان کے کئی دوست ہیں جن سے بے تکلفی ہے۔ بھابی بھابی کرتے ہوئے آ جاتے ہیں۔ ایک آدھ دفعہ ایسا بھی ہوا کہ یہ گھر پر نہ ہوئے بس قیامت اٹھائی کہ میم بن گئی ہے۔ مردوں سے ملتی ہے' بے شرم ہے' نہ معلوم کیا کیا کہا۔ جو میں نے کہا کہ آپ کی لڑکی بھی تو بے پردہ نکلتی ہے اس کا میاں تو زبردستی نکالتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ تو اتنی نیک ہیں کہ ان کا نکلنے کو جی نہیں چاہتا اور میاں کے ظلم سے باہر نکلتی ہیں میں اتنی خراب ہوں کہ میاں کی مرضی کے خلاف نکلتی ہوں۔ ہر ایک کے سامنے یہی کہتی ہیں کہ اپنی شرم کو غصہ کا گھونٹ پی کر چپ ہو جاتا ہے۔ ہماری نند تو کسی مدرسے میں بھی نہیں پڑھیں۔ شادی کے بعد میاں نے پڑھوایا لکھایا ہر جگہ آتی جاتی ہیں اور ہماری ساس کو بھی اچھی طرح معلوم ہے لیکن چھپا جاتی ہیں۔ پچھلی دفعہ آئیں تو میں نے اماں کے سامنے ہی پوچھا کہ سچ بتاؤ کیا زبردستی کی جاتی ہے جب باہر نکلتی ہو یا اپنی مرضی سے وہ بولیں کیوں کیا بات ہے؟ میں تو اپنی مرضی سے نکلتی ہوں۔ اب مجھے کوئی پردے میں رکھنا بھی چاہے تو نہ رہوں۔ تو ہماری ساس سن کر کہتی ہیں کہ میرے لڑکے کو تو مجھ سے چھڑا لیا ہے۔ اس کے دل میں میری نفرت بٹھا دی۔ اب میرے دوسروں بچوں پر بھی ہاتھ صاف کرو۔ ہر میرے بچے کے سامنے میری برائی کیا کرو۔ الٹ بھی ان کا پلٹ بھی ان کا۔ وہی کام میں کروں تو برا ہو جاتا ہے اور ان کی لڑکی کریں تو اچھا ہو جاتا ہے۔

ان کو کبھی میرے سے ہنس کر بات کرتے تو دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ انہیں سب سے زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ یہ مجھ سے کیوں محبت کرتے ہیں۔ میں کمرے میں آئی اور جو یہ خوش ہو کر مجھ سے بول لے تو غضب ہو جاتا ہے۔ اور تو اور ہر وقت میری صورت کی برائی ان کے سامنے ہوتی ہے۔ ان کو بھی شرارت سوجھتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ اماں اور تو سب عیب ہیں لیکن شکل تو بہت اچھی ہے۔ کہنے لگتی ہیں شرم نہیں آتی جورو کی تعریف میرے سامنے کرتا ہے۔ پھر تو وہ میری تعریف کرتی ہیں ان کو تو ہنسی آتی رہتی ہے میرا دل جل جاتا ہے۔ میں تو چپکی اٹھ کر چلی آتی ہوں۔ ہر وقت میرا مقابلہ بیٹے کے سامنے کرتی رہتی ہیں۔ بھلا کہاں ماں کہاں بیوی۔ ان کا تو اس دن کلیجہ ٹھنڈا ہو جس دن یہ مجھے یا تو ماریں یا گھر سے نکال دیں۔ یا دوسری شادی کر لیں اور بھی جو میری دیورانیاں جٹھانیاں ہیں وہ الگ الگ شہروں میں ہیں۔ جب وہ آ جاتی ہیں تو تھوڑے دن تو ان کی خاطر ہوتی ہے پھر ان میں بھی عیب نکلنے شروع ہو جاتے ہیں اور پھر یہ ہوتا ہے کہ میں سب کو ملا کر ان کے خلاف "مس کرت" ملاتی ہے۔ بڑی تو سب ہی ہو گئی ہیں لیکن سب سے بڑی میں ہوں اور بدقسمتی سے تھوڑی پڑھی لکھی ہوں تو میم صاحب کا خطاب مل گیا ہے۔ میں تو جب یہ اپنی بڑبڑاہٹ شروع کرتی ہیں تو میں ادھر جا کر کواڑ بند کر کے کچھ کام کرنے لگتی ہوں کہ نہ سنوں گی نہ برا لگے گا۔ اب صبح سے اس بات پر بڑبڑا رہی ہیں کہ بچوں کو میں نے کل ٹھنڈے نلکے کے نیچے نہلوا دیے۔ ان کو تھوڑا تھوڑا بخار ہے بڑا لڑکا بہت لاڈلا ہے۔ وہ جا کر پاس لیٹ گیا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر جو باتیں سنانی شروع کی ہیں اب دو گھنٹے تو ہو گئے۔ ابھی دیکھو کب تک سلسلہ چلتا ہے۔

○

عزیز احمد

نام : عزیز احمد
قلمی نام : عزیز احمد عثمان آبادی / عزیز احمد
تاریخ پیدائش : ۱۱ نومبر ۱۹۱۳ء ضلع بارہ بنکی 'حیدر آباد (دکن)
تاریخ وفات : ۱۶ دسمبر ۱۹۷۸ء ٹورنٹو 'کینیڈا
تعلیم : بی۔ اے (آنرز) مضامین: اردو 'انگریزی 'فارسی (درجہ اول) جامعہ عثمانیہ 'حیدر آباد دکن ۱۹۳۴ء
بی۔ اے (آنرز) انگریزی زبان و ادب 'لندن یونیورسٹی ۱۹۳۸ء
ڈی۔ لٹ (اعزازی) بطور اعتراف تواریخی تحقیقات 'لندن یونیورسٹی ۱۹۷۲ء

مختصر حالات زندگی:

عزیز احمد نے بطور ہفت زبان مترجم 'افسانہ نگار 'ناولسٹ 'اقبال شناس 'غزل گو 'محقق اور ناقد کے شہرت پائی۔

عزیز احمد کے والد بشیر احمد کاکوری کے محلہ کھما محل میں اقامت پذیر تھے۔ ان کا شمار حیدر آباد دکن کے نامور وکلاء میں ہوتا تھا۔ عزیز احمد بچپن میں والدین کی شفقت سے محروم ہو جانے کے بعد اپنے حقیقی ماموں محمد احمد کی سرپرستی میں چلے گئے۔ محمد احمد کا پیشہ وکالت تھا۔

عثمانیہ ہائی سکول عثمان آباد سے عزیز احمد نے میٹرک کے بعد (۱۹۲۸ء میں) جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔ وہیں سے ایف۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں اعزاز کے ساتھ بی۔ اے (آنرز) کیا۔ جامعہ عثمانیہ میں عزیز احمد کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق 'ڈاکٹر محی الدین قادری زور' پروفیسر عبدالقادر سروری 'مولوی وحیدالدین سلیم اور مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے اساتذہ میسر آئے۔ طالب العلمی کے زمانے میں دیگر اساتذہ کی نسبت سب سے زیادہ ربط ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور پروفیسر عبدالقادر سروری سے رہا۔ عبدالقادر سروری کے ماہنامہ مجلّہ "مکتبہ" کے لیے بطور معاون کام کرتے رہے۔ بی۔ اے (آنرز) کے بعد مولوی عبدالحق کی کوششوں سے عزیز احمد کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ ملا 'سو ۱۹۳۵ء میں انگلستان چلے گئے۔ لندن یونیورسٹی میں قیام کے دوران ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے توسط سے ای۔ ایم۔ فورسٹر سے ملاقاتیں رہیں۔ ۱۹۳۸ء میں لندن یونیورسٹی سے بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری لی اور کچھ عرصہ یورپ کی سیر و سیاحت میں گزارا۔ انہی ایام میں فرانس کی سوربون یونیورسٹی سے کچھ عرصہ منسلک رہے اور فرانسیسی زبان سیکھی۔ ۱۹۳۸ء میں وطن واپسی پر جامعہ عثمانیہ سے منسلک ہو گئے۔

۱۹۴۰ء میں شادی ہوئی اور ۱۹۴۱ء تک بطور لیکچرر شعبہ انگریزی 'جامعہ عثمانیہ 'حیدر آباد 'دکن میں رہے۔ ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۵ء یونیورسٹی میں Lien رہا اور وہ شہزادی درشہوار (نواب میر عثمان علی خاں کی بہو اور زوجہ ولیعہد نظام دکن علی خان بہادر) کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے۔ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۷ء ریڈر شعبہ انگریزی 'جامعہ عثمانیہ 'حیدر آباد۔ دکن اور ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء پروفیسر کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں استعفا دے کر پاکستان ہجرت کر آئے اور ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۰ء اسسٹنٹ ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات (مطبوعات و فلم پبلیکیشن) کراچی 'حکومت پاکستان رہے۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۳ء ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ تعلقات عامہ 'وزارت امور کشمیر اور ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۷ء ڈائریکٹر محکمہ تعلقات عامہ 'وزارت امور کشمیر رہنے کے بعد برطانیہ چلے گئے۔ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۲ء اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز 'لندن میں اوورسیز لیکچرر شعبہ اردو رہنے کے بعد کینیڈا منتقل ہو گئے '

جہاں ۱۹۶۲ء تا وفات' شعبہ اسلامیات ٹورنٹو یونی ورسٹی (کینیڈا) میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۶۹ء سے تا وفات کیلی فورنیا یونیورسٹی' لاس اینجلز' امریکا کے وزیٹنگ پروفیسر تھے۔

آخری عمر میں آنتوں کے سرطان کا شکار ہوئے۔ کینیڈا میں ان کے تین آپریشن کئے گئے۔ آخری آپریشن سے ان کی بڑی آنت نکال کر ایک پلاسٹک کی تھیلی لگا دی گئی تھی۔

عزیز احمد کو عربی زبان کی اچھی شدبد تھی۔ اردو' انگریزی' فرانسیسی اور فارسی زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا جبکہ ترکی' اطالوی اور جرمن زبانوں میں گفتگو کر لیتے تھے۔ آخری عمر میں نارویجن زبان سیکھ رہے تھے۔

ٹورنٹو (کینیڈا) میں ان کا قیام سینٹ جان بلڈنگ کے تین بیڈ روم اپارٹمنٹ میں رہا۔ وفات (۱۶ دسمبر ۱۹۷۸ء) کے ٹھیک چھ ماہ بعد ان کی مدت ملازمت ختم ہو رہی تھی۔ ٹورنٹو (کینیڈا) میں دفن ہوئے۔

اوائل ۱۹۷۵ء میں آخری بار قائداعظم میموریل لیکچرز کے سلسلے میں اسلام آباد (پاکستان) آئے۔ ان کی آخری پبلک میٹنگ ۱۸ نومبر ۱۹۷۸ء کی شام فیض احمد فیض کے اعزاز میں ہونے والے مشاعرہ منعقدہ (ٹورنٹو) کینیڈا میں شرکت تھی۔

ابتدائی مطبوعہ تحریریں:

عزیز احمد نے تصنیف و تالیف کا آغاز ترجمے سے کیا۔ ان کی پہلی دو مطبوعہ تحریریں:

۱۔ "بچپن" (رڈیارڈ کپلنگ کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ: لاہور "نیرنگ خیال" شمارہ ستمبر ۱۹۲۸ء

۲۔ "شریر لڑکا" (رابندر ناتھ ٹیگور کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ: لاہور "نیرنگ خیال" شمارہ دسمبر ۱۹۲۸ء

ان دو ترجموں کے بعد عزیز احمد نے اپنا اولین افسانہ "کشاکش جذبات" کے عنوان سے لکھا' جو پروفیسر عبدالقادر سروری کی ادارت میں شائع ہونے والے' مجلّہ "مکتبہ" حیدر آباد دکن' مکتبہ ابراہیمیہ شمارہ نومبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

افسانوی مجموعے

۱۔ "رقص ناتمام" ۱۹۴۵ء (گیارہ افسانے) مکتبہ جدید' لاہور' طبع اول: ۱۹۴۵ء

۱۔ "اور بستی نہیں یہ ----" ۲۔ پاپوش ۳۔ موشکا ۴۔ مدن سینا اور صدیاں ۵۔ رائیگاں تبسم ۶۔ پوشاماں ۷۔ روضۃ الکبریٰ کی ایک شام ۸۔ رقص ناتمام ۹۔ زون ۱۰۔ خطرناک پگڈنڈی ۱۱۔ جادو کا پہاڑ (کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا)

۲۔ "بیکار دن بیکار راتیں" دسمبر ۱۹۵۰ء (سات افسانے) مکتبہ جدید' لاہور' طبع اول: دسمبر ۱۹۵۰ء

۱۔ ستاپیہ ۲۔ جھوٹا خواب ۳۔ زریں تاج ۴۔ تصور شیخ ۵۔ زر خرید ۶۔ کالی رات ۷۔ بیکار دن بیکار راتیں (یہ مجموعہ احمد علی کے نام معنون کیا گیا ہے)

۳۔ "خدنگ جستہ' جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" میری لائبریری' لاہور' طبع اول: ۱۹۸۵ء
(دو طویل مختصر افسانے)

۱۔ خدنگ جستہ ۲۔ جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں

۴۔ "آب حیات" (تاریخی افسانے) مکتبہ میری لائبریری 'لاہور' (زیر طبع)

(شعلہ زار الفت 'میرا دشمن میرا بھائی 'مدن سینا اور صدیاں 'زریں تاج 'من لل 'روضۃ الکبریٰ کی ایک شام اور آب حیات کل سات افسانوں کا مجموعہ 'افتتاحیہ از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اور تعارفی تجزیات از ممتاز شیریں 'مسعود جاوید 'شہزاد منظر 'عتیق احمد اور ابو خالد صدیقی شامل کتاب ہیں)

نوٹ: مکتبہ اردو 'لاہور نے دو افسانوی مجموعے "میٹھی چھری" اور "کایا پلٹ" کے عنوانات سے شائع کرنے کا اعلان کیا تھا لیکن یہ دونوں مجموعے شائع نہ ہو سکے۔

تنقید:

۵۔	"ترقی پسند ادب" (تنقیدی تاریخ)	حیدر آباد دکن 'ادارہ اشاعت اردو'	طبع اول: ۱۹۴۵ء
۶۔	"اقبال نئی تشکیل" (تنقید)	کراچی کتاب خانہ تاج آفس'	طبع اول: ۱۹۵۰ء
۷۔	شعرائے عصر کے کلام کا انتخاب جدید (بہ اشتراک آل احمد سرور)	دہلی 'انجمن ترقی اردو (ہند)	طبع اول: ۱۹۴۳ء

۱۹۷۳ء تک انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی نے پانچ ایڈیشن شائع کیے۔ یہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۴۲ء کے شعرا کا انتخاب ہے۔ عزیز احمد نے تمہید کے طور پر ۱۱ صفحات شامل کتاب کیے ہیں۔

۸۔	"اقبال اور پاکستانی ادب" (تنقیدی مضامین: مرتبہ: طاہر تونسوی)	لاہور 'مکتبہ عالیہ'	طبع اول: ۱۹۷۷ء

ناول / ناولٹ:

۹۔	"ہوس" (ناول)	مکتبہ اردو 'سویرا پریس	طبع اول: ۱۹۳۱ء
		لاہور 'مکتبہ جدید	طبع سوم: ۱۹۵۱ء
۱۰۔	"مرمر اور خون" (ناول)	لاہور 'مکتبہ اردو 'سویرا پریس	طبع اول: ۱۹۳۲ء
	(دیباچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق)	لاہور 'مکتبہ جدید	طبع دوم: ۱۹۵۱ء
۱۱۔	"گریز" (ناول)	لاہور 'مکتبہ اردو 'سویرا پریس'	طبع اول: ۱۹۴۲ء
		لاہور 'مکتبہ جدید	طبع سوم: ۱۹۵۵ء
۱۲۔	"آگ" (ناول)	لاہور 'مکتبہ اردو 'سویرا پریس'	طبع اول: ۱۹۴۵ء
		لاہور 'مکتبہ جدید	طبع دوم: ۱۹۵۶ء
۱۳۔	"ایسی بلندی ایسی پستی" (ناول)	لاہور 'مکتبہ جدید	طبع اول: ۱۹۴۸ء
۱۴۔	"شبنم" (ناول)	لاہور 'مکتبہ جدید	طبع اول: ۱۹۵۱ء
۱۵۔	"مثلث" (ناولٹ)	لاہور 'مکتبہ میری لائبریری'	طبع اول: ۱۹۸۵ء

(عزیز احمد: حیات و خدمات 'از ابو سعادت جلیلی 'پیش لفظ از عتیق احمد 'ناولٹ کی روایت "مثلث" از شمیم احمد شامل کتاب ہیں)

۱۶۔	"تری دلبری کا بھرم" (ناول)	لاہور 'مکتبہ میری لائبریری'	طبع اول: ۱۹۸۵ء

(تعارفیہ 'از رفعت نواز' مقدمہ از پروفیسر عبدالسلام شامل کتاب ہیں ص ۹۳)

۱۷۔ "دو تاریخی (تیموری) ناولٹ" لاہور 'مکتبہ میری لائبریری' . طبع اول: ۱۹۸۵ء

(کتاب میں 'خدنگ جستہ' اور 'جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں' کے علاوہ تعارف از فاروق عثمان اور افتتاحیہ از ڈاکٹر نزہت سمیع الزماں شامل ہیں۔ کل صفحات ۱۵۲)

تراجم:

۱۸۔ "معمار اعظم" (ڈراما از ہنرک ابسن) دہلی 'انجمن ترقی اردو ہند' طبع اول: ۱۹۳۵ء

(نارویجن زبان سے "The Master Builder" کا انگریزی کی معرفت ترجمہ 'پہلے انجمن کے سہ ماہی مجلّہ "اردو" دہلی میں ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ نارویجن زبان انہوں نے بعد میں سیکھی)

۱۹۔ "فن شاعری" (Poetics از ارسطو) دہلی 'انجمن ترقی اردو (ہند) طبع اول: ۱۹۴۱ء

(بوطیقا 'کا ترجمہ معہ مقدمہ و حواشی۔ آخر میں بطور ضمیمہ مترجم کی طرف سے اشارات و تلمیحات کی وضاحت کر دی ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے ۱۹۷۷ء میں ۱۲۶ صفحات کی ضخامت میں شائع کیا۔)

۲۰۔ "رومیو جولیٹ" (ڈراما از ولیم شیکسپیر) دہلی 'انجمن ترقی اردو (ہند) طبع اول: ۱۹۴۱ء

("Romeo and Juliet" کا ترجمہ معہ مقدمہ و حواشی۔ اس ترجمہ کو انجمن نے کراچی سے ۱۹۷۱ء میں دوبارہ شائع کیا۔)

۲۱۔ "مقالات گارساں دتاسی" دو جلدیں (از گارساں دتاسی) دہلی 'انجمن ترقی اردو (ہند)

فرانسیسی زبان سے 1877 - 1871 A Langue Etla Litterature Hindustanies En کا ترجمہ بہ اشتراک: ڈاکٹر یوسف حسین خان و ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ پہلی جلد یوسف حسین خاں 'دوسری جلد اختر حسین رائے پوری و عزیز احمد۔ نظر ثانی: ڈاکٹر محمد حمیداللہ۔ کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل یہ ترجمہ انجمن کے مجلّہ "اردو" جلد ۱۹ شمارہ ۳ جولائی ۱۹۳۹ء تا اپریل ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ دوسری بار انجمن نے کراچی پاکستان سے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔

۲۲۔ "طربیہ خداوندی" دو جلدیں (Inferno از دانتے) دہلی 'انجمن ترقی اردو (ہند) طبع اول: ۱۹۴۳ء

(جرمن زبان سے ترجمہ معہ مقدمہ و حواشی "Divine Commedia" کا ترجمہ دوسری بار انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔)

۲۳۔ "تیمور" (از ہیرلڈلیم) لاہور 'شیخ غلام علی اینڈ سنز بہ اشتراک موسسہ فرینکلن'

("تمبرلین" کا ترجمہ امیر تیمور سے متعلق سوانحی فکشن)

۲۴۔ "چنگیز خان" (از ہیرلڈلیم) لاہور 'مکتبہ جدید' طبع اول: ۱۹۵۲ء

چنگیز خان سے متعلق سوانحی فکشن)

۲۵۔ "تاتاریوں کی یلغار" (از ہیرلڈلیم) لاہور 'شیخ غلام علی اینڈ سنز' طبع دوم: ۱۹۶۰ء

("The March Of The Barbarians" کا ترجمہ 'دیباچہ: مولانا غلام رسول مہر۔ بقول مولانا غلام رسول مہر یہ کتاب "مستقل تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔" ص۔ ۴۰۰)

۲۶۔ "دنیا کے شاہکار افسانے" حیدر آباد دکن 'مکتبہ ابراہیمیہ' (فرانسیسی افسانے) طبع اول: ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۳ء

مرتبہ: عبدالقادر سروری بہ اشتراک عزیز احمد

(یہ کتاب کئی جلدوں میں شائع ہوئی ۔ جرمن افسانے' فرانسیسی افسانے' روسی افسانے اور ولندیزی افسانے' نام کی جلدوں میں عزیز احمد کے تراجم بھی شامل ہیں۔ مثال کے طور پر فرانسیسی افسانے' نامی جلدیں اناطول فرانس' گاشہ موپاساں' ایمائل زولا' الکش نشر' وکٹر ہیوگو اور بالزاک کے افسانوں کو صوفی غلام مصطفیٰ تبسم' ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر' غلام عباس' معراج الدین شاہی اور بدالدین بدر نے اردو میں منتقل کیا۔

۲۷۔ رسل کی ایک کتاب کا ترجمہ (تاحال دریافت طلب) دیکھئے 'مکتوبات عبدالحق' مرتبہ: جلیل قدوائی ۔ ص ۵۵۴ ۔

تاریخ/پاکستانیت/اسلامیات/سماجیات:

۲۸۔ "نسل اور سلطنت" (تاریخ) دہلی' انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی طبع اول: ۱۹۴۱ء
یہ تاریخ سے متعلق عزیز احمد کی طبع زاد تصنیف ہے ۔ کل صفحات ۱۸۹۔ آریاؤں کی نسلی برتری کے جرمن ادعا کی تاریخی بنیاد پر تحقیق' علوم الابدان اور سماجیات کے حوالے سے۔

۲۹۔ "Studies in Islamic Culture In The Indian Enviornment" (تاریخ سماجیات) 'لندن' Oxford Varsity Press طبع اول: ۱۹۶۴ تا ۱۹۷۰ء

۳۰۔ "Islamic Modernism In India and Pakistn" 'لندن' Oxford Varsity Press طبع اول: ۱۹۶۷ تا ۱۹۷۰ء

۳۱۔ "An Intellectual History of Islam In India" 'جرمنی' Edinburgh Varsity Press طبع اول: ۱۹۶۹ء

۳۲۔ "Readings In Muslim Self_Statement In India and Pakistan 1957_1964" (بہ اشتراک Wiesbaden) طبع اول: ۱۹۷۰ء

۳۳۔ "Relitgion And Society In Pakistan" مشمولہ '(Contribution To Asian Studies) جلد دوم ۔ مرتبہ Lieden E. J. Brill' طبع اول: ۱۹۷۱ء

۳۴۔ "A History Of Islamic City" Storia Sella Sicilia Islamica جرمنی' Edinburgh Varsity Press طبع اول: ۱۹۷۵ء

۳۵۔ "Intellectual History Of Muslims" طبع اول: ۱۹۷۵ء

۳۶۔ "Quaid_e_Azam Memorial Lectures (سائیکلو سٹائل شدہ)

شاعری:

۳۷۔ "ماہ لقا اور دوسری نظمیں" حیدر آباد دکن' اعظم سٹیم پریس' طبع اول: ۱۹۴۳ء
اس مجموعے میں "عمر خیام" مثنوی مصنفہ ۱۹۳۲ء "ماہ لقا" مصنفہ ۱۹۳۸ء اور "فردوس بر روئے زمین" مصنفہ ۱۹۴۲ء شامل ہیں۔

ترتیب و تہذیب:

(۱) تحقیقی و ادبی مجلہ "مکتبہ" انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن۔ (پروفیسر عبدالقادر سروری کے شریک مدیر رہے۔)
(۲) "چار لقمے" مرتبہ: عزیز احمد، حیدر آباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ، طبع اول: ۱۹۴۷ء

غیر مدون: متفرق مضامین:

(۱)	"مرزا فرحت اللہ بیگ کا مزاحیہ اسلوب"	نقوش، لاہور، نمبر۱
(۲)	"ہماری زبان" (مسئلہ)	نقوش، لاہور، نمبر۲
(۳)	"فسانہ عجائب اور بدعات"	نقوش، لاہور، نمبر۵
(۴)	"کشکول"	نقوش، لاہور، نمبر۱۱، ۱۲
(۵)	"شاد عظیم آبادی"	نقوش، لاہور، نمبر۳۱، ۳۲
(۶)	"منٹو" (شخصیت)	نقوش، لاہور، نمبر۳۱، ۳۲
(۷)	"جدید اردو تنقید"	سویرا، لاہور، نمبر۴
(۸)	"اقبال اور فن برائے زندگی"	سویرا، لاہور، نمبر۵، ۶
(۹)	"افسانہ افسانہ"	سویرا، لاہور، نمبر۱۲
(۱۰)	"ادبی تنقید"	نیا دور، بنگلور، نمبر۱۳
(۱۱)	"کلاسیکی تصورات پر اقبال کی تنقید"	نیا دور، کراچی، نمبر۱۸، ۱۹
(۱۲)	"اقبال کا نظریہ فن"	رسالہ اردو، ۱۹۴۹ء
(۱۳)	"سب رس کے ماخذ و مماثلات"	رسالہ اردو، ۱۹۵۰ء
(۱۴)	"طلسم ہوشربا"	اردو ادب، لاہور، نمبر۲
(۱۵)	"اقبال کا رد کردہ کلام"	ماہ نو، کراچی، اپریل ۱۹۵۲
(۱۶)	"ناول"	ماہ نو، کراچی، مئی ۱۹۵۵ء

(۱۷) " Urdu Litrature In Cultural Hearitage Of Pakisatan "

(Eds. S. M. Ikram And Percival Kar. Oxford Varsity Press 1955 Spear)

(اس کتاب کا ترجمہ "اردو ادب ثقافت پاکستان" کے نام سے جلیل قدوائی نے کیا تھا جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا

Incyclopedia Of Islam جلد دوم، Leiden طبع اول: ۶۳ ۔ ۱۹۶۲ء

18. "DIN--ILAHI" Fasc.27.pp.296-7;
19. "Djam ' iyya" (India & Pakistan) Fasc.29.P.437;
20. "Djamati" Fasc. 29.pp.421-422

21. "Islam-d-Espagne et Inde Musulmane moderne" in(E'tudesd ' Orientalism de ' dices la Memoire de levi-Povencal) Paris: G.P. Moisonneuve et Lorose, 1962.

22. "Origin of Country love and the problem of Communication" (Islamic Culture, Vol. XXIII, 1949, pp.48-61).
23. "Sources of Iqbal's Perfect Man" (Iqbal, Vol. Vii, No. I, 1958).
24. "La Litterature De Langue Ourdou" (Orient, Vol. VII, 1958)
25. "Le Mouvement Des Mujahidin Dans I'Inde Au Xixe Siecle" (Orient. Vol.XV, 1960, pp.105-16).
26. Influence De La Litterature Francaise Sur La Litterature Ourdou" (Orient, Vol. XI, 1959,pp.125-36).
27. "Iqbal Et La Theorie Du Pakistan" (Orien, Vol.XVII, 1961).
28. "Les Musulmans Et Le Nationalism Indien" (Orient, Vol. XXII, 1962, pp.75-96).
29. "Remarques Sur Les Origines Du Pakistan" (Orient, Vol. XXVI, 1963, pp. 21-30).
30. "Sayyid Ahmad Khan, Jamal Al-din Al-Afghani and Muslim India" (Studia Islamica Vol. XIII, 1960,pp. 55-78
31. "Trends in the Political Thought of Medieval India" (Studia Islamica, Vol.XVII, 1963).
32. "El Islam Espanol Y La India Musulmana Moderna" Ford International, Vol. 1, No.4, 1960).
33. "Religious & Political Ideas of Shaikh Ahmad Sirhindi" (Rivista Degli Studi Oriental. Vol. XXXVI, 1961).
34. "Akbar, Heretique Ou Apostat?" (Journal Asiatique, No. 1, No. CCCXLIX, 1961).
35. "Monool Pressure in an Alien Land" (Central Asiatic journal, Vol. VI, No. 3, 1961).
36. "Moghul Indien Und Dar-Al-Islam" (Saeculum, No. 3, 1961).
37. "Political and Religious Ideas of Shah Wali-Ullah of Delhi" (The Muslim World, No. 4, 1962).

38. "The Sufi and the Sultan in Pre-Mughal Muslim India" (Der Islam, Nos. 1-2, 1962).
39. "Dar al-Islam and the Muslim Kingdoms of Deccan and Gujarat (journal of World History. No. 3, 1963).
40. "The Conflicting Heritage of Sayyid Ahmad Khan and jamal Al-Din Afghani in the Muslim Political Thought of the Indian Sub-Continent" in Trudi XXV Mejdunarodnovo Kongressa Vostokovedov, Moscova 1960, Moscow: Izdatelstvo Vostochnoi Literaturi, Vol. IV, 1963-64).
41. "Sufism and Hindu Mystik" Saeculum, Vol. XV, No. 1, 1964.
(CAMBRIDGE HISTORY OF ISLAM)

42. "India-Pakistan" being Chapter 6 in Part VIII, Vol. II Section on Urdu Literature in Chapter I, Literature, in Part X.
43. The Islamic Contribution to Civilisation: Vol. II.

44. "Mawdudi and Orthodox Fundamentalism in Pakistan" (Middle East Journal, Vol. 21, No. 3, 1967, pp. 369-380).
45. Universalqeschichte, No. 1/2, 1967, pp. 1-12).
1962 LEIDEN (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM)
Leiden (Encyclopaedia of Islam)
46. "Ghiyat-al-Din Tughluk I
47. "Ghiyat-al-Din Tughluk Shah (II p. 1076-77).
48. "Hali (III, p. 93-94).
49. "Hamasa" (Urdu Literature) III, p. 119.
50. "Hasan Dihlawi" (III, p.249).
51. "Hidia-IV Urdu" (III, p. 358-9).
52. "Hikaya - IV Urdu" (III, p.375-6).
53. "Hind - Islamic Culture" (III, p. 438 - 40).
54. "Epic and Counter-Epic in Medieval India" (Journal of the American Oriental Society, Vol. 83, No. 4, 1963, pp. 470-76).
55. "Cultural and Intellectual Trends in Pakistan" (The Middle East journal, Vol. 19, No. 1, 1965, pp. 35-44).
56. Approaches to History in the Late Nineteenth and Early Twentieth Century Muslim India" (journal of World History, Vol. IX, No. 4, 1966, pp. 987/1008).
57. "Problems of Islamic Modernism with Special Reference to Indo-Pakistan Sub-Continent" (Archives De Sociologie Des Religions, Vol. 23, 1967, pp. 107-116).
58. "An Eighteenth Century Theory of the Caliphate" (Studia Islamica, Fasc. XXVIII, 1968, pp. 135 - 44).
59. "Afghani's Indian Contacts" (journal of the American Oriental Society, Vol. 89, No. 3, July-Sep. 1969, pp. 476-504).
60. "Muslim Attitude and Contribution to Music In India" (Zeitschrift Der Deutschen Morgen Landischen Gesellschaft, Band 119, Heft I, 1969, pp. 86-92).
61. "L, Islam Et La Democratie Dans Le Sous-Continent Indo-Pakistanis", Orient, 51-52/3-4, (1969), pp. 9-26.
62. "The Role of Ulema in Indo-Muslim History" (Studia Islamica, Fasc. XXXI, voluminis Memoriae j. Schcht Dedicati: Paris Prior, Paris: G.P. Maisonneuve-Larose, 1970, pp. 1-13).
63. "Pakistan Faces Democracy" (The Round Table, No. 242m April 1970, pp. 227 - 238).
64. "Islam and Democracy in the Indo-Pakistan Subcontinent" in Religion and Change in Contemporary Asia, by Robert F. Spencer Ed., pp. 123 - 142. Minneapolis: University of Minnesota Press, 1971.
65. "The Formation of Sabk-i-Hindi", in Iran and Islam, in Memory of the Late Vladimir Minorsky, Ed. C. E. Bosworth, pp. 1-9. Edinburgh University.
66. "Indien"; in Fischer Weltqeschichte, Band 15: Der Islam II, Herausgegeben von G.E. von Grunebaum. Frankfurt Am Main: Fischer Taschenbuch Verlac GMBH. 1971, pp. 226-287.

۶۷۔ "ترقی پسند ادب کیا ہے؟" (مضمون) مطبوعہ: رسالہ اردو' اورنگ آباد۔ دکن اپریل ۱۹۳۵ء
۶۸۔ "فراق کی شاعری"
۶۹۔ "ن۔م۔ راشد"
۷۰۔ "ڈراما کیا ہے؟"
۷۱۔ "قائداعظم سے ایک ملاقات"

تبصرے:

(۱)	"لیلیٰ کے خطوط" (از: قاضی عبدالغفار)	مطبوعہ: رسالہ اردو' اورنگ آباد' دکن	اپریل ۱۹۳۵ء
(۲)	"موت سے پہلے" (از احمد علی)	مطبوعہ: نیا دور' بنگلور	شمارہ نمبر ۱۲
(۳)	"اور بنسری بجتی رہی" (از دیویندر ستیارتھی)	نیا دور' بنگلور	شمارہ نمبر ۱۲
(۴)	"آئینہ ہندی" (مرتبہ ایس۔ ایس عطاء الرحمن)	بلیٹن آف دی سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز	جلد اول' لندن' ۱۹۶۱ء
(۵)	"مجموعہ اشعار شمس بلخی (مرتبہ: سید حسن)	ایضاً"	۱۹۶۱ء
(۶)	"پنجابی قصے فارسی زبان میں" (از: ڈاکٹر محمد باقر)	ایضاً"	۱۹۶۱ء
(۷)	"مسلمانوں کے سیاسی افکار" (از: رشید احمد جعفری)	ایضاً"	۱۹۶۳ء
(۸)	"اسلام اور ــ" (از: رشید احمد جعفری)	ایضاً"	۱۹۶۳ء
(۹)	"خیرالمجلس" (از: خالق احمد نیازی)	ایضاً"	(جلد دوم) ۱۹۶۳ء
(۱۰)	"تعلیمات غزالی" (از: محمد حنیف ندوی)	ایضاً"	۱۹۶۳ء
(۱۱)	"الفقری" (از: جعفر شاہ پھلواروی)	ایضاً"	۱۹۶۳ء
(۱۲)	"تاریخ تصوف قبل از اسلام" (از: بشیر احمد ڈار)	ایضاً"	۱۹۶۳ء
(۱۳)	"Storie Dell E Letterature Del Pakistan" (By: Alessando Bausani)	ایضاً"	(جلد سوم) ۱۹۶۱ء
(۱۴)	"Religious And Politics In Pakistan" (By: Leonardo Binder)	ایضاً"	(جلد دوم) ۱۹۶۳ء
(۱۵)	"Akbar: The Religious Aspect" (By: R: Karishnamurti)	ایضاً"	(جلد چہارم) ۱۹۶۳ء
(۱۶)	"History Of Afghans In India" (By: M. A. Rahim)	ایضاً"	(جلد دوم) ۱۹۶۳ء
(۱۷)	"Arab Role In Africa" (By: J. Baulin)	ایضاً"	(جلد دوم) ۱۹۶۳ء

(۱۸) "Modern Islam" ایضاً (جلد سوم) ۱۹۶۳ء
(By: G.E. Von Gunebaum)

(۱۹) "Political Change In Morocco" ایضاً (جلد سوم) ۱۹۶۳ء
(By: D.E. Ashford)

متفرق افسانے (غیر مدن)

(۱) "نفرت کیوں تھی" مطبوعہ: نقوش، لاہور شمارہ نمبر۱
(۲) "جل منڈل" مطبوعہ: ایضاً شمارہ نمبر۲
(۳) "بازیابی" مطبوعہ: ایضاً شمارہ نمبر۱۵، ۱۶
(۴) "قاتل کبیر" مطبوعہ: ایضاً شمارہ نمبر۲۵، ۲۶
(۵) "کوکب" مطبوعہ: سویرا، لاہور شمارہ نمبر۱۵، ۱۶
(۶) "کٹھ پتلیاں" مطبوعہ: اردو ادب، لاہور شمارہ نمبر۲
(۷) "کشاکش جذبات" مطبوعہ: مجلّہ مکتب، حیدر آباد دکن نومبر۱۹۲۹ء

متفرق تراجم (غیر مدون)

(۱) "بچپن" (روڈیارڈ کپلنگ کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ: نیرنگ خیال، لاہور ستمبر۱۹۲۸ء
(۲) "شریر لڑکا" (ٹیگور کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ: ایضاً دسمبر۱۹۲۸ء
(۳) "خراب آباد" (WASTE LAND: BY T.S. ELIOT) مطبوعہ: رسالہ اردو ۱۹۳۶ء
(۴) "پجارن" (ٹیگور کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ: ماہنامہ انتخاب نو کراچی شمارہ نمبر۸ نومبر۱۹۸۲ء
(۵) عزیز احمد کی تقریباً ۱۵ منظومات مع انگریزی متن۔ مشمولہ "ساز مغرب"
مرتبہ حسن الدین احمد (بھارت)

متفرق فیچر / ڈرامے (غیر مدون)

(۱) "مزاحیہ فیچر" جامعہ عثمانیہ میں اسٹیج کیا گیا ۱۹۳۱ء
(۲) "کالج کے دن" (ڈراما) جامعہ عثمانیہ میں اسٹیج کیا گیا دسمبر۱۹۳۱ء مطبوعہ مجلّہ "عثمانیہ" ۱۹۳۲ء
(یہ ڈراما محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر سیادت علی خاں (پروفیسر شعبہ قانون) کی نگرانی میں اسٹیج ہوا۔ ہدایات سید محمد اکبر وفاقانی۔ اس ڈرامے میں مخدوم محی الدین، جمیل احمد، شکور بیگ، رفعت، اشرف اور ظفرالحسن نے مختلف کردار ادا کیے۔)
(۳) "آنسو" (دیکھئے عزیز احمد اور ان کی ناول نگاری، از حشمت اللہ نیر)

(۴) "مستقبل" ۔ بزم تمثیل حیدر آباد دکن نے اسٹیج کیا ۱۹۳۴ء
(بزم تمثیل کا پرانا نام 'حیدر آباد ڈرامیٹک ایسوسی ایشن' تھا۔ اس ادارے کے سرپرست نواب سر امین جنگ اور معتمد سید مصلح الدین تھے۔ ہدایات سید محمد اکبر وفاقانی کی تھیں۔)

غزلیں (غیر مدون)

غزلیں "بہ سلسلہ آغوش مرگ" ۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۸ء

متفرق خطبات (غیر مدون)

(۱) خطبات اسلام آباد (قائداعظم میموریل لیکچرز) مع زبانی گفتگو اور سوال و جواب۔ موضوعاتی نشستیں متعلقہ پاکستانیات، مسلم برصغیر، عالم اسلام، مسائل تواریخ نگاری اور سسلی سے متعلق خطبات۔ اوائل ۱۹۷۵ء (سسلی سے متعلق خطبات بطور ابواب کتاب متعاقب ایڈیشن میں شامل ہیں جبکہ بقیہ لیکچرز کا مجموعہ تاحال ترتیب طلب ہے۔
(۲) امریکہ و یورپ کی جامعات اور دیگر ادارہ جات میں پیش کردہ خطبات ترتیب طلب ہیں۔

ادبی تواریخ نگاری (غیر مدون)

(۱) "سب رس کے ماخذ اور مماثلات" ۱۹۵۰ء
(۲) "طلسم ہوش ربا"
(۳) "فسانۂ عجائب"
(۴) "پدماوت"

مترجمہ تصانیف

(۱) "ایسی بلندی ایسی پستی" (ناول)۔ از عزیز احمد) بعنوان THE SHORE AND THE WAVE (انگریزی)
ترجمہ: رالف رسل و عزیز احمد، مطبوعہ: لندن ۱۹۸۱ء سے قبل
(۲) "تاریخ سسلی" (تاریخ از عزیز احمد) اطالوی زبان میں ترجمہ
(۳) "URDU LITRATURE IN CULTURAL HARITAGE OF PAKISATN"
از عزیز احمد کا اردو ترجمہ بعنوان: اردو ادب: ثقافت پاکستان۔ از جلیل قدوائی۔ طبع دوم: ۱۹۶۷ء

زندگی میں مستقل پتا:

ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک سٹڈیز' یونی ورسٹی آف ٹورنٹو ۔ ۵ کینیڈا۔

اعزاز:

(۱) فیلو آف دی رائل سوسائٹی آف کینیڈا۔
(۲) اعزازی شہریت بمع سرزمین رقم من جانب حکومت اطالیہ (اٹلی)۔
(۳) عزیز احمد کے اعزاز میں یادگار مقالات کا مجموعہ ISLAMIC SOCIETY AND CULTURE
مرتبہ: ملٹن اسرائیل واین کے ویگل مطبوعہ: MANOHAR انصاری روڈ' ۲۔ دریا گنج' نئی دہلی ۱۹۸۳ء
(۴) عزیز احمد لیکچرز' سالانہ انتظام ٹورنٹو یونیورسٹی' کینیڈا۔
(۸) رکنیت اکادمی ادبیات' کینیڈا۔

نظریہ فن:

"افسانے میں جو چیز اہم ہے' جو اس کی جان ہے اور جو کسی تکنیک کی پابند نہیں' وہ واقعہ محض واقعہ ہے۔"

عزیز احمد
(بہ حوالہ: مضمون "افسانہ افسانہ" مطبوعہ: "سویرا" لاہور)

○

عزیز احمد

آب حیات

"اور خدائے تعالیٰ نے کہا۔ دیکھو آدمی ہمارے جیسا ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ نیک اور بد کو پہچاننے لگا ہے اور اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور زندگی کے درخت کا پھل بھی کھالے اور غیر فانی ہو جائے۔

اس لئے خدائے تعالیٰ نے اسے باغ عدن سے نکلوا دیا تاکہ وہ اس زمین میں ہل چلائے جس کی مٹی سے وہ بنایا گیا تھا۔

اس لئے اس نے انسان کو باہر نکلوا دیا اور اس نے باغ عدن کے مشرق میں فرشتوں کو مقرر کیا، جن کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلواریں تھیں جو ہر سمت پلٹ سکتی تھیں، تاکہ وہ زندگی کے درخت کے راستے کی نگہبانی کریں۔

(توریت۔ کتاب آفرینش)

گل گامش، بابل کا سب سے طاقت ور انسان، جس سے بابل کے دیوتا لرزتے تھے، اپنے دوست این کی دو کی لاش کے سامنے کھڑا تھا، اس کے چہرے کے اعصاب، غضب اور رنج کی شدت پر کھنچ گئے تھے۔ اس کے جسم کا فولاد اس آگ میں جل رہا تھا جو اس فولاد کو جلا سکتی تھی، پگھلا نہیں سکتی تھی۔

اور گل گامش نے یوں بین کیا، دیوتاؤں کے سے وقار سے۔

"میرے دوست، میرے چھوٹے بھائی جو پہاڑوں کی ڈھلوان پر میرے ساتھ جنگلی جانوروں اور میدانوں کے شیروں کا شکار کرتا تھا۔ این کی دو میرا دوست، میرا چھوٹا بھائی جو میرے ساتھ پہاڑوں کے دامن میں گورخر اور میدانوں میں شیروں کا شکار کرتا تھا، جو میرے ساتھ ساتھ ہر معرکہ سر کر سکتا تھا، جو چوٹی اور چٹانوں پر چڑھا اور جس نے آسمان کے سانڈ کو پکڑا اور ہلاک کر دیا۔ جس نے ہواوا کو اٹھا کے پٹک دیا جو جنگلوں میں رہتا تھا۔ بتا اب یہ کون سی نیند ہے جس نے تجھے جکڑ لیا ہے؟ تو سیاہ پڑ گیا ہے اور مجھے دیکھ نہیں سکتا۔"

گل گامش کے دوست کی لاش نے آنکھیں اوپر نہیں اٹھائیں۔ گل گامش نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ اس کے دل کی دھڑکن خاموش تھی۔

اور تب یہ ہوا کہ رنج کی جگہ غضب اس طاقت ور، اس ہیبت ناک انسان پر طاری ہونے لگا گل گامش پر جس سے دیوتا بھی پناہ مانگتے تھے۔ اس کا دوست کسی معرکے میں، کسی بڑی لڑائی میں، شیروں کے جنگل میں یا کسی اور انسان یا دیوتا کی تلوار سے ہلاک نہیں ہوا تھا۔ ایک بیماری تھی، ایک بخار تھا، جس نے اس کے طاقت ور ساتھی کو اس قدر جلد نیچا دکھایا۔ وہ جو گل گامش کا ساتھی تھا اور کوئی اس کو نیچا نہ دکھا سکتا تھا۔

گل گامش نے اپنے دوست کو چادر سے چھپا دیا تھا، جیسے دلہن چادر سے چھپائی جاتی ہے اور گل گامش کی شیر جیسی آواز گونج اٹھی۔ بار بار اور پھر بار بار وہ اپنے دوست کی طرف پلٹتا اور اپنے بال نوچتا اور اپنے ناخنوں سے اپنے جسم سے زرق برق لباس تک کو کسوٹنے لگتا۔ یہ نقصان ایسا تھا کہ وہ اسے حقیقت سمجھنے کے لئے تیار نہ تھا۔ گویا یہ محض ایک خواب تھا جس کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ یہ کہ این کی دو مر ہی نہیں سکتا۔ اور اسے سچ ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ سات دن اور سات راتیں گزر گئیں اور اس نے اپنے دوست کو دفن نہیں کیا۔ کیونکہ ابھی اسے یہ

امید تھی کہ اس کے بین کی آواز سن کر اس کا دوست جاگ اٹھے گا۔

یہاں تک کہ سات دن اور سات راتیں گزر جانے کے بعد ایک سفید سا کیڑا این کی دو کی ناک سے باہر نکلا۔ یہ اس کی نشانی تھی کہ اس کی لاش اندر سے سڑنے لگی ہے اور تب گل گامش کو یقین آیا کہ انسان کی تقدیر اس کے دوست این کی دو پر غالب آ چکی ہے۔ اور اب گل گامش کے لئے یہی باقی رہ گیا تھا کہ وہ کبھی چین نہ لے' آرام نہ اٹھائے اور بھٹکے ہوئے شکاری کی طرح گھاٹی گھاٹی' میدان میدان سر ٹکراتا پھرے۔

جنوبی بابل میں ایک شہر تھا اورک۔ اورک کے سردار ہی کا نام گل گامش تھا۔ وہ انسان تھا' دیوتا نہیں تھا۔ ہر قلیس کی طرح' ایک درمیانی کڑی جس میں انسان کی قوت اور مجبوری تھی' لیکن دیوتاؤں کا سا آہنی عزم اور استقلال۔ یہ گل گامش ظالم اور جابر تھا اور اس کی رعایا اس سے خوش نہیں تھی۔ یہ بھیڑ بکریوں اور عورتوں کا خراج وصول کرتا تھا۔ اس کے دل میں درد نہیں تھا اور اسے دوسروں کے درد کا احساس نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس کی رعایا نے تنگ آ کے بابل کے دیوتاؤں سے دعا مانگی کہ وہ گل گامش ہی جیسا ایک اور طاقت ور انسان پیدا کریں۔ اس کا ثانی تاکہ یہ دونوں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے رہیں اور رعایا کو چین ملے۔

دیوتاؤں نے اروک کی رعایا کی فریاد سن لی اور این کی دو کو پیدا کیا۔ لیکن گل گامش کا مد مقابل اور حریف بننے کی جگہ وہ اس کا دوست' ساتھی اور حلیف بن گیا۔ طاقت ور انسان اکثر ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ اور تب تو گل گامش کے کبر' اس کی طاقت اور اس کی چیرہ دستی کی کوئی حد نہیں رہی۔ اب وہ اپنی رعایا کو تو بھیڑ بکریوں کی طرح بہت معمولی شکار سمجھتا تھا۔ اس کی اور این کی دو کی زد سے آسمانی شکار محفوظ نہیں تھے۔ انسانوں کی کیا حقیقت تھی۔

ان دونوں نے دور دور اور بڑے بڑے خطرناک معرکوں کا بیڑا اٹھایا۔ یہ اس گنجان جنگل میں گھس گئے جو سورج کے دیوتا این لل کی ملکیت تھا اور جس کی حفاظت کے لئے اس نے ایک بڑے مہیب دیو ہواوا کو مقرر کیا تھا۔ لیکن ان دونوں نے ہواوا کو اٹھا کے پٹک دیا اور اسے ہلاک کر ڈالا اور سورج کے دیوتا این لل کے جلال کو مشتعل کر دیا۔

جب گل گامش اور این کی دو اس ہولناک شکار سے واپس آ رہے تھے تو ایشتر کی حسین آنکھ نے گل گامش کا مردانہ جلال و جمال دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہو گئی۔ یہ ایشتر اس زمانے میں اور اس ملک میں اتانہ کہلاتی تھی۔ ایشتر کے کئی نام تھے اور وہ عورتوں کی سرتاج اور زندگی کی خالق اور سب سے بڑی دیوی تھی۔ وہ کہیں ایشتر تھی' کہیں اشتارتے' وہی ستارہ تھی جسے آسمان پر زہرہ کہتے ہیں اور جو اپنی شہوت ناک نظروں سے انسانوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے' جس نے ہاروت اور ماروت کو بابل کے کنوئیں میں قید کیا' جیسے حضرت یوسف کے بھائیوں نے یا زلیخا نے حضرت یوسف کو۔۔۔۔۔ یہ ایشتر مصر میں آئی سس یا دریائے نیل تھی۔ یہی فروڈائے ٹی یا وی نس تھی یعنی حسن کی یونانی دیوی اور عشق کے دیوتا کیوپڈ کی ماں' لیکن یہی جونو بھی تھی۔ دیوتاؤں کے دیوتا زلیس کی بیوی۔ اصل میں یہ ایشتر تموز کی ماں' بیوی اور بہن تھی جو ہر سال قتل ہوتا تھا اور جاڑے آ جاتے تھے اور نباتات پر خزاں آ جاتی تھی اور انسان اور جانور مرجھائے سے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایشتر جا کے تموز کو زیریں دنیا میں پھر سے زندہ کرتی اور دنیا پر بہار آ جاتی۔ شاخوں سے شگوفے پھوٹ نکلتے' مصر میں دریائے نیل میں زمین کو زرخیز بنانے والی طغیانی آ جاتی' لبنان کے جنگل ہری ہری پتیوں سے لہلہانے لگتے۔ مندروں میں اور میدانوں میں عورتیں اپنے جسم اجتماعی عاشقی کے لئے وقف کر دیتیں' جانوروں کی جھولیں بھر جاتیں۔

یہی ایشتر تھی' یہی ایشتر جس کے راج کو صدیوں بعد یسوع مسیح نے درہم برہم کرنا چاہا اور مریم مجدلین کو اس چنگل سے چھین لیا۔ اسی کے چنگل میں حضرت یوسف کا حسن اسیر ہو ہی رہا تھا کہ بال بال بچ گیا۔ اور ان واقعات سے ہزاروں سال پہلے اس ایشتر نے گل گامش کا انسانی جمال دیکھا جو جلال کی ایک کیفیت تھی اور وہ گل گامش پر عاشق ہو گئی' جیسے وہ ہزاروں سال بعد وینس بن کے ایک چرواہے پر عاشق ہونے والی تھی۔

اِیشتر کی آنکھوں کے جادو نے گل گامش پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس کے خون میں غارت اور ریخت اور فتح کا جنون موجیں مار رہا تھا۔ عشق ایک تخلیقی فعل ہے اور عشق انا کی شکست ہے۔ اپنے اور اپنی حیات اور اپنے جسم کی شکست کا اعتراف ہے۔ عشق زمانے میں زندگی کے تسلسل کا بیج ہوتا ہے اور اس وقت فتح اور طاقت کے غرور میں گل گامش کے ذہن میں بھی یہ تصور نہیں آ سکتا تھا کہ وہ فانی ہے یا اس کی زندگی یا اس کا جسم فانی ہے اور یہ کہ زندگی کے تسلسل کے لئے یہ ضروری ہے کہ جب وہ مرجائے تو کوئی اور جسم باقی رہ جائے جو اس کے جسم کے تخم سے بنا ہو اور اس طرح زندگی موت کا' اور حیات فنا کا مقابلہ کرے۔ نہیں وہ اپنے آپ کو دیوتاؤں کی طرح لافانی' نہ مٹنے والی ہستی اور باقی سمجھتا تھا۔

اور جب اِیشتر نے دیکھا کہ اس کے حسن کا گل گامش پر کوئی اثر نہیں۔ ایک معمولی انسان ہو کے وہ دیویوں کو دیوی کو ٹھکرا رہا ہے۔ تو شدت غضب میں اس نے بھی وہی کیا جو مصر کی زلیخا کرنے والی تھی۔ اس نے گل گامش اور اس کے دوست این کی دو کو ہلاک کرنے کے لئے آسمانی سانڈ کو بھیجا جس کی سانس میں آگ تھی لیکن گل گامش اور اس کے دوست نے اس آسمانی سانڈ کو بھی ہلاک کر ڈالا۔ اور کچھ طنز اور کچھ جلال کے عالم میں گل گامش نے اس سانڈ کا فالس اکھیڑ کے اِیشتر کے منہ پر دے مارا۔

سورج کے دیوتا این لل کو اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ کیونکہ ابھی تک تو شاید وہ اور تموز الگ الگ تھے' مگر صدیوں بعد وہ ایک ہی تو ہونے والے تھے۔ تموز مصر میں اوسیرس اور ایشیائے کوچک اور روئے الکبریٰ میں اے تس اور یونان میں اڈونس بننے والا تھا۔ اور اِیشتر اس کی ماں' بیوی اور بہن تھی۔ ازلی تانیث۔ دیوی کی یہ ہتک وہ برداشت نہ کر سکا مگر گل گامش اور این کی دو پر ذاتی الزام جو اس نے لگایا وہ یہ تھا کہ گل گامش اور این کی دو نے اس مہیب دیو کو ہلاک کیا تھا جو اس کے جنگل کا چوکیدار تھا اور اس نے ایک معمولی سی بیماری' معمولی سا بخار بھیج کر گل گامش کے رفیق اور ساتھی این کی دو کو ہلاک کردیا۔

اور اس طرح این کی دو جس نے گل گامش کے ساتھ پہاڑوں کی ڈھلوان پر گورخر مارے تھے اور میدانوں میں شیر۔ جس نے ہوا وا اور آسمانی سانڈ کو ہلاک کیا تھا۔ بالکل اتنی آسانی ایسی حقیر آسانی سے مرگیا جیسے مکھی مرتی ہے یا مچھر مرتا ہے' یا جیسے کوئی برساتی کیڑا ہلاک ہوتا ہے۔

گل گامش کو اس پر سخت رنج و تعب تھا۔ اب وہ ظالم اور جابل نہیں رہا تھا۔ اور اب رعایا پر ظلم کرنے کا زمانہ نہیں رہا تھا۔ اب اس کے اپنے پیکر میں انسانی شعور نے پہلی مرتبہ قضا و قدر سے انصاف کا مطالبہ کیا۔ اس انصاف کا جو بابل کی رعایا اپنا حق سمجھتی تھی۔ یہ کہ ہر خطا انسان کے خلاف ہی ہو سکتی ہے اور اس کی سزا ملتی ہے لیکن قدرت میں' قدرت کے اعمال اور افعال میں خطا اور سزا اور جزا کا کوئی تصور نہیں۔ یہ کہ جس کی خطا زیادہ ہوتی ہے اسے سزا نہیں ملتی' بے گناہ کو ملتی ہے۔ مثلاً گل گامش اور این کی دو کا ہی واقعہ ہے۔ ہوا وا اور آسمانی سانڈ کو ہلاک کرنے میں بڑا حصہ گل گامش کا تھا لیکن وہ محفوظ رہا۔ اِیشتر کی ہتک گل گامش نے کی لیکن وہ محفوظ رہا۔ اور سورج کے دیوتا نے این کی دو کی جان لی جو محض اس کا شریک اور رفیق تھا۔ آخر موت کا کیا جواز ہے؟ اور انسان کو فنا کے دروازے سے کیوں گزرنا پڑتا ہے؟ گل گامش نے سوچنا شروع کیا۔ یقیناً" موت سب سے بڑی سزا ہے۔ یہ نفرت کی انتہا ہے۔ قتل اس کو کیا جاتا ہے جسے ہم اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں۔ اور اسے معاف نہیں کر سکتے اور اسے زندگی کے روپ میں نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن یہ سزا قدرت بلا کسی خاص امتیاز کے بلا معیار' بے انصاف' بے مقصد ہر ایک کو دیتی ہے' کبھی جلدی کبھی دیر میں۔ مگر کیوں؟ آخر کیوں؟

اس سوال کا جواب نہ اسے ملا نہ اہل بابل کو جنہوں نے اس کی داستان تخلیق کی اور وہ آوارہ پھرتا رہا۔ وہ این کی دو کا غم بھول گیا۔ وہ جو معمولی انسانوں سے لے کر آسمانی سانڈ تک سب کو زیر کر چکا تھا۔ اب صرف ایک دشمن کو زیر کرنا چاہتا تھا۔ موت کو۔

یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ گل گامش موت سے ڈرتا نہیں تھا۔ اگر وہ موت سے ڈرتا ہوتا تو اب سے بہت پہلے جب اس مہیب دیو سے لڑتے لڑتے این کی دو کی ہمت جواب دینے لگی تو وہ این کی دو کو سختی سے یہ کیوں سمجھاتا۔

"میرے دوست! وہ کون ہے جو آسمان کی بلندی تک بلند ہوا تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ سورج کے دیوتا شمش کے ساتھ ہم مکان رہے۔ وہ محض

انسان ہی تو ہے۔ اس کی زندگی کے دن محدود ہیں خواہ وہ کوئی معرکہ کیوں نہ سر کرے۔ وہ محض ہوا ہے۔ اور تم ابھی سے موت سے ڈرتے ہو۔ تمہاری ہمت اور طاقت کہاں ہے۔؟ دیکھو میں اس دیو پر حملہ شروع کرتا ہوں اور تم ٹھہر کے چلا کے کہو "ہاں بڑھو۔ ڈرو مت" اور اگر میں مارا جاؤں تو شہرت کی وجہ سے میرا نام تو زندہ رہے گا۔ لوگ کہیں گے مہیب دیو ہواوا سے لڑنے میں گل گامش مارا گیا۔

اس طرح کی موت کے تو کوئی معنی تھے مگر یہ کیا کہ معمولی سی بیماری آئے اور این کی دو جیسے کڑیل پہلوان کا کام تمام ہو جائے۔ اور گل گامش نے موت کا مقابلہ کرنے اور موت کو شکست دینے پر کمر ہمت باندھی۔ یہ اس کا آخری اور سب سے بڑا معرکہ تھا۔ سب سے بڑی مہم۔

اب ایک ہی خیال تھا' ایک ہی فکر' ایک ہی مقصد جو دن رات گل گامش کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ یہ کہ کس طرح موت کو شکست دی جائے' کس طرح فنا کو فنا کیا جائے اور سوچتے سوچتے گل گامش کو یاد آیا کہ اس کے اجداد میں سے ایک شخص تھا (شاید وہی جسے عبرانی خضر علیہ السلام کہتے ہیں) جو اب موت کے سمندروں کے اس پار' دنیا کے اس دوسرے سرے پر رہتا تھا' اس نے بقائے دوام حاصل کر لی ہے۔ صرف اس نے' کسی اور نے نہیں۔۔۔۔۔ اور کسی انسان کو بقائے دوام نصیب نہیں ہو سکی۔ بقائے دوام کا راز اسے معلوم ہو گا۔ گل گامش نے تہیہ کیا کہ وہ اس کے پاس جائے گا اور اس سے یہ راز دریافت کرے گا۔

چنانچہ تن تنہا گل گامش نے دور دراز کا سفر شروع کیا۔ اس نے ان پہاڑوں کو طے کیا جن کے اس پار آفتاب غروب ہوتا ہے۔ پھر اس نے وہ اندھیارا راستہ طے کیا' جس سے آفتاب رات بھر گذرتا ہے۔ وہ مایوس ہو گیا کہ اب پھر کبھی وہ روشنی کو نہ دیکھ سکے گا۔ اور بالآخر وہ ایک بحر ذخار کے کنارے پہنچا۔ راستہ میں اسے جو کوئی ملتا اس سے وہ اس لافانی بزرگ اتناپشتم تک پہنچنے کا راستہ پوچھتا اور بقائے دوام کی تفصیلیں پوچھتا اور بار بار اسے ایک ہی جواب ملتا۔

"گل گامش تم کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ بقائے دوام جس کی تمہیں آرزو ہے تمہیں نہیں مل سکے گی۔ کیونکہ جب دیوتاؤں نے انسان کو بنایا تو موت اس کے نصیب میں لکھ دی اور زندگی کا راز اپنے دلوں میں محفوظ رکھا۔ گل گامش کھاؤ پیو اور مزے اڑاؤ۔ چین سے زندگی بسر کرو۔ دن رات ناچو گاؤ۔ نئے نئے کپڑے پہنو' نہاؤ' پانی سے سر دھو لو۔ اپنے بچے کی طرف دیکھو جو تمہارا ہاتھ پکڑے ہے اور اپنی بیوی کو اپنی آغوش میں لے کے راحت بخشو۔ انسان کو انہیں چیزوں میں مگن رہنا چاہئے۔

لیکن گل گامش عام انسانوں کا راستہ چلنے نہیں نکلا تھا۔ وہ اپنی جستجو سے باز آنے والا نہ تھا۔ بقائے دوام کی آرزو اس کے تن بدن کو جلائے دے رہی تھی اور وہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سمندر کے کنارے اسے ایک کشتی ملی اور ایک کشتی بان جو اتناپشتم کا ملازم تھا۔ وہ اسے موت اور فنا کے اس بحر ذخار کے اس پار اتناپشتم کے پاس لے گیا۔ اس نے اتناپشتم سے پوچھا کہ بقائے دوام کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اتناپشتم بھی اس کی مدد نہ کر سکا کیونکہ خود اس کو بقائے دوام اتفاقاً" کچھ ایسے عجیب حالات میں حاصل ہوئی تھی' جن کا دوبارہ پیش آ سکنا ناممکن تھا۔ بہت عرصہ ہوا' بڑے قدیم زمانے میں جب دیوتاؤں نے انسان کی بدعنوانیوں اور گمراہیوں سے تنگ آ کر بنی نوع انسان کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کیا تو ان کے مشورے سے سورج کے دیوتا این لل نے زمین پر ایک عالمگیر طوفان بھیجا۔ اس طوفان میں اتناپشتم اور اس کی بیوی اور اس کے بچوں کے سوا سب ڈوب گئے۔ اتناپشتم کو پہلے سے آنے والے طوفان کی اطلاع مل گئی تھی۔ اس نے ایک بڑی کشتی بنائی جس میں وہ خود' اس کے بال بچے' تمام جانوروں کے ایک ایک جوڑے کے ساتھ سوار ہو گئے۔ این لل کو کچھ دنوں کے بعد افسوس ہوا کہ اتنا بڑا طوفان بھیجنا جلد بازی کا کام تھا' اور اسے خوشی ہوئی کہ اتناپشتم نے زندگی کے اتنے نمونے ہلاک ہونے سے بچا لئے۔ اس کے انعام میں اس نے اتناپشتم کو بقائے دوام عطا کی۔ لیکن ایسے واقعات بار بار پیش نہیں آتے۔

گل گامش سنتا رہا۔ وہ عبرانیوں سے بہت پہلے گزرا تھا' اس لئے وہ چونک نہیں پڑا کہ ہائیں یہ تو حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ ہے اور بقائے دوام نوح کو نہیں خضر کو عطا ہوئی اور این لل نے نہیں عطا کی' خدائے بزرگ و برتر نے عطا کی۔ گل گامش موجودہ سائنس دانوں سے بہت پہلے گزرا تھا اس لئے اس نے نظریہ نہیں بنایا کہ طوفان نوح شاید بحیرۂ روم کے بھرنے کی یاد ہو۔ جب جبل الطارق کے پاس کی چٹانوں کو توڑ کے

بحیرۂ اطلانٹک کا پانی ایک بہت بڑے رقبے میں گھس آیا' جس میں انسان آباد تھا' اور جہاں آبادیاں تھیں وہاں آج بحیرۂ روم ہے۔ اور نہ گل گامش نے یہ نظریہ بتایا کہ یہ بابل اور ار کی زمین میں خلیج فارس کا خروج تھا۔ اور نہ اس نے اس نظریے غور کیا کہ جب آخری برفانی دور کے گذر جانے پر قفقاز اور ارادات کا بہت سا برف پگھلا ہو گا تو شاید دجلہ اور فرات میں ایسی طغیانی آئی ہو کہ سارا ملک پانی میں ڈوب گیا ہو۔ نہیں گل گامش کو ماضی کے واقعات کی فکر نہیں تھی۔ وہ مستقبل کی فکر میں مبتلا تھا۔

اتنا پشتم نے گل گامش سے کہا۔ لیکن تمہیں موت سے لڑنے کی ایسی ہی تمنا ہے تو ضرور لڑو پہلے نیند سے لڑو۔ اور وہ اس طرح کہ ایک جادو کی نیند ہے' اگر تم اس نیند سے جاگ سکے تو ممکن ہے موت کے بعد جاگ سکو۔ گل گامش جادو کی نیند سو گیا لیکن جاگنا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ ہلاک ہونے ہی والا تھا کہ اتنا پشتم کی بیوی کو اس پر رحم آیا اور اس نے اسے جادو کی نیند سے جگا دیا۔

لیکن گل گامش کی مہم ناکام ہو چکی تھی۔ بالآخر اس ہیبت ناک ہمت ور آدمی نے ہار مان لی اور اتنا پشتم سے اروک واپس جانے کی اجازت چاہی۔ اتنا پشتم کی بیوی نے اپنے خاوند سے درخواست کی کہ رخصت ہوتے وقت وہ گل گامش کو کوئی تحفہ دے اور اتنا پشتم نے الوداعی عطیے کے طور پر اسے یہ گر بتایا کہ سمندر کی تہہ میں ایک درخت ہے' جس اس کے پتے کھالے اس کا بڑھاپا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہ مسلسل جوان رہتا ہے۔ یہ بقائے دوام کا راز تو نہیں تھا لیکن طبعی موت کا علاج ضرور تھا۔ اور گل گامش اس دوسری موت سے نہیں ڈرتا تھا جو دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں' کسی مہم کو سر کرنے میں آجائے۔ اتنا پشتم کے آخری تحفے سے پھر اس کی ڈوبتی ہوئی ہمت نے ایک نئی جولانی محسوس کی۔ امید کی ایک نئی کرن نظر آئی اور وہ اس لافانی مرد بزرگ سے رخصت ہوا۔

اتنا پشتم کا ملاح جو اسے موت کے سمندر کے اس پار لایا تھا' پھر اسے لے چلا۔ اس نے سمندر میں ٹھیک اس مقام پر اسے لا پہنچایا' جہاں سمندر کی اتھاہ گہرائی میں جوانی کو واپس لانے والا تحفہ تھا۔ گل گامش نے غوطہ لگایا اور سمندر کی تہہ سے اس بیش بہا پودے کو اکھیڑ لایا اور پھر گل گامش کو وہی ملاح جس کا نام ارشانابی تھا اس کے دارالحکومت اروک واپس لے چلا۔ وہ دونوں خلیج فارس کے کنارے پہنچے اور پھر شاندار پیدل زمین پر منزل مقصود کی جانب روانہ ہوئے لیکن دن بڑا گرم تھا' آفتاب تیز تھا' زمین تپ رہی تھی' منزل دور تھی اور سفر سخت تھا۔ ایک چشمہ نظر آیا جس کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی دیکھ کے اس کا جی چاہا کہ نہا کے ذرا ٹھنڈا ہو لے۔ اس نے کپڑے اتارے اور نہانے کے لئے چشمہ میں اتر پڑا۔ جوانی کو واپس لانے والے پودے کو بھی اس نے چشمہ کے کنارے ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک سانپ نے اس پودے کی خوشبو سونگھی' اپنے بل سے باہر نکلا' اور پودے کو لے کے غائب ہو گیا۔ وہ بھی تو ایک سانپ ہی تھا جس نے آدم و حوا کو نیک و بد کے درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی تھی۔ جس کی پاداش میں وہ جنت عدن سے نکالے گئے۔ اہل بابل بہرحال اس کے قائل تھے کہ چونکہ سانپوں نے گل گامش کے لائے ہوئے جوانی اور زندگی کے درخت کے پتے کھا لئے اس لئے سانپ کبھی نہیں مرتے۔ جب وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو پرانی کیچلی اتار پھینکتے ہیں۔ اور تب گل گامش نے اپنی پہلی اور آخری شکست پر ماتم کیا۔ چشمے کے کنارے بیٹھ کے ملاح ارشانابی سے خطاب کر کے اس نے رونا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ وہ جو کبھی نہیں رویا تھا' این کی دو کی موت پر بھی نہیں۔۔۔۔۔ اس کے دونوں رخساروں پر آنسو بہنے لگے اور اس نے کہا۔

"ارشانابی کس کے لئے میں نے اپنے بازوؤں کا اتنا زور' اتنی طاقت صرف کی' کس کے لئے میں نے اپنا خون جگر خرچ کیا؟
مجھے خود کوئی نعمت میسر نہ آسکی۔ ہاں زمین کے اندر رہنے والے سانپوں کی میں نے ضرور بڑی خدمت سرانجام دی۔
اور اہل بابل کو اپنے سوال کا جواب نہ مل سکا۔ اور وہ زندگی اور موت کا چیستان حل نہ کر سکے۔

۲

ایک یونانی نوجوان تھا۔ یا اسے نیم دیوتا' نیم نوجوان کہہ لیجئے کیونکہ اس زمانے تک انسانی ذہن خداؤں اور انسانوں میں زیادہ امتیاز نہیں

کرنے پایا تھا۔ خیر اس نوجوان کا نام فارسی سس تھا۔ یہ ایک چشمے کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور پانی میں عکس دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اپنا عکس۔

اور اسے یقین تھا کہ اس کے اپنے عکس سے زیادہ حسین اور کوئی شے نہیں۔ یہ کہ اس جیسا کوئی اور پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اسی طرح سالہا سال چشمے کے کنارے بیٹھا اپنا عکس دیکھتا رہا۔

یہ چشمہ بھی شاید ویسا ہی تھا' کہ شاید وہی تھا جیسے وہ چشمہ جس میں نہانے کے لئے گل گامش نے کپڑے اتارے تھے اور جس کے کنارے اس نے سدا بہار جوانی کا پودا کھو دیا تھا۔ جسے سانپ چرا لے گئے تھے۔ شاید یہ فارسی سس وہی گل گامش تھا۔ مگر اب وہ ہیرو نہیں رہا تھا۔ اس کی جلال کی خصوصیات رخصت ہو گئی تھیں' جمال ہی جمال باقی رہ گیا تھا۔

اور چشمے سے جو آواز بلند ہوئی صدائے بازگشت' وہ ایک پری بن گئی' ایک عورت۔ وہ اس خوش جمال انسان پر عاشق تھی۔ کہ اس کے اپنے بطن میں اس خوش رو نوجوان کا تخم پھلے پھولے اور وہ ایسے ہی حسین بچوں کی ماں بنے۔ آخر اس عورت کا حضرت حوا سے کچھ تو ناطہ تھا جنہوں نے سانپ کے کہنے سے نیکی اور بدی کے علم کا پھل پہلے خود کھایا پھر حضرت آدم کو کھلایا اور اس کے بعد خدائے تعالیٰ نے بقائے دوام کے درخت پر فرشتوں کو پہرہ دار مقرر کو دیا کہ کہیں انسان جو نیکی اور بدی کے علم سے واقف ہو گیا تھا' بقائے دوام بھی حاصل نہ کر لے۔

چنانچہ فارسی سس نے اس پری کی آواز نہیں سنی اور اپنا عکس دیکھتا رہا اور اپنے ہی عکس پر عاشق ہوتا گیا اور یہ پری' یہ عورت اس کے عشق میں گھل گھل کے محض صدا' محض ندا' محض صدائے بازگشت بن گئی۔ اور سدا بہار جوانی کا پودا سانپوں کے قبضے میں رہا۔ یہاں تک کہ فارسی سس کو اس چشمے پر شک ہوا' جس میں وہ اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ چشمہ محض ایک آئینہ تھا' ایک خطرناک آئینہ جس میں اپنے عکس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور شاید یہ آئینہ کسی کی حسین آنکھ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک عورت کی حسین آنکھ اور اسی آنکھ کی شکل کا ایک پھول ایران میں کھلا۔ ایرانیوں نے فارسی سس کا کچھ کچھ قصہ یونانیوں سے سنا تھا اور انہوں نے اس کا نام گل نرگس رکھ دیا۔

لیکن نہ یہ چشمہ اکیلا تھا' نہ یہ نوجوان اکیلا اور نہ وہ عورت وہ پری اکیلی تھی جو عشق کے غم میں گھلتے گھلتے صدائے بازگشت بن گئی تھی۔ کیونکہ بلاد فلسطین میں ایک مقدس درخت تھا۔ جس کے سائے میں ایک کنواں تھا ایک اور نوجوان چاند کی روشنی میں اس میں اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے حسین جسم کو چاند کی روشنی میں نیم عریاں کر دیا تھا۔ کیونکہ چاند کے حسن اور اس کے حسن میں ایک طرح کی مشابہت تھی۔ یہاں تک کہ اس نوجوان کے والد اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں آ نکلے۔ ان کی مقدس آنکھوں پر شک اور ملامت کا سایہ پڑا اور گزر گیا۔ اور انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا "یوسف اپنی پوشاک ٹھیک کر"

اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو کئی کنوؤں' کئی چشموں' کئی زندانوں سے سابقہ پڑا اور ان سب کا اپنا عکس جلوہ فگن تھا۔ فارسی سس کی طرح اپنا عکس انہوں نے چشمے میں نہیں' دلوں میں دیکھا۔ مگر کچھ دل کھرے ہوتے ہیں اور کچھ کھوٹے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں اناج کا ایک خوشہ ہے اور ان کے بھائیوں کے ہاتھوں میں بھی اناج کے خوشے ہیں مگر بھائیوں کے ہاتھ کے اناج کے خوشے ان کے ہاتھ میں اناج کا جو خوشہ ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔ مصر کی قحط سالی میں یہ خواب پورا ہوا' مگر اس وقت ان کے بھائیوں کو پسند نہیں آیا۔ پھر انہوں نے خواب میں دیکھا کہ سارے کواکب ان کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔ یہ خواب بھی ان کے بھائیوں کو پسند نہیں آیا' جو کچھ دنوں بعد ان کو ایک کنوئیں میں پھینک آئے۔

اور تین دن کنوئیں کی تہہ میں گزار کے حضرت یوسف نے تزکیہ نفس سیکھا۔ پھر فارسی سس کی صدائے بازگشت کی طرح زلیخا ان پر عاشق ہوئی۔ وہی نیکی اور بدی کا علم۔ مگر ابھی اپنے عکس کی محبت مٹنے نہیں پائی تھی اور اس مرتبہ جس غار' جس کنوئیں' جس زندان میں حضرت یوسف کو قضا و قدر نے اسیر کیا اس میں بجائے تین دن کے تین سال گذارنے پڑے۔ یہاں تک کہ تموز اور اوسیرس کا سبق ان کی آنکھوں نے یاد کیا کہ کس طرح ہر سال دریائے نیل میں طغیانی آتی ہے اور زرخیز مٹی کی ایک تہہ جم جاتی ہے' پھر سے زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ بہار میں زندگی کا پھر سے نمو ہوتا ہے۔ نباتات' جمادات اور انسان' اور زلیخا کو بالآخر عشق کا ثمر ملا اور حضرت یعقوب کی آنکھیں روشن ہوئیں۔

لیکن حضرت یوسف کے زمانے میں جب بیدار مغز اور نحیف الجثہ فرعون اخناتون 'مذہبی تجربہ کر رہا تھا۔ اس کے ہم وطن بقائے دوام کا ایک اور بڑا دلچسپ راستہ ڈھونڈھ چکے تھے۔ انہوں نے جسم کے زوال سے انکار کر دیا تھا۔ اگر جسم باقی رہ جائے تو روح ایک دن لوٹ ہی آئے گی۔ ایک دن مردہ جسم میں زندگی جاگ اٹھے گی' جیسے بہار میں مردہ درخت میں کونپل پھوٹتی ہے۔ جیسے مردہ زمین سے نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ اور اپنے مردہ جسم کی حفاظت شروع کی۔ پہلے ناک کے راستے سے تیز اوزار کے ذریعے سارا بھیجا نکال لیا' مسالے بھر دیئے۔ نفیس اور باریک کپڑے کی کئی کئی گز لمبی پٹیوں میں سارا جسم لپیٹا اور اس کو کپڑے میں ملفوف کر کے اس پر اسی مردے کی تصویر بنائی اور یہی تصویر لکڑی کے تابوت پر تاکہ جان دھوکانہ کھانے پائے اور جب واپس آئے تو اس جسم میں واپس آئے۔ حضرت یوسف کے ہمراہی عبرانی ہنستے تھے کہ مصری مردوں کو دیوتا مانتے ہیں اور ان کے دیوتا مردہ ہیں۔ اس سرزمین میں موت' حیات پر حاوی تھی فنون لطیفہ کی محرک اور ان کی سرتاج تھی۔ زندگی پر حاوی تھی۔ مگر انتظار زندگی ہی کا تھا زندگی کے دوام کا' زندگی کے واپس آنے کا' عبرانی ان پر ہنستے رہے' یوں معاذ اور قیامت اور مسیح موعود پر عبرانیوں کا عقیدہ بھی راسخ تھا۔ مگر خیر یہ دوسری بات ہے۔ اس وقت تک عبرانیوں کو وہ شبہ نہیں پیدا ہوا تھا جو ایک زوال پسند شاعر کو اپنے معشوق کے متعلق کئی ہزار سال بعد پیدا ہوا یہ کہ:۔

قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے

(۳)

ایک تھا" میں " تیرھویں صدی عیسوی میں 'مغربی یورپ میں ' میں نے ایک خواب دیکھا۔ یہ کہ بہار کا موسم ہے۔ جب نباتات میں نئے سرے سے زندگی کی لہر دوڑتی ہے۔ مئی کی صبح ہے اور بلا کسی مقصد کے محض زندگی کی جوئے رواں کے کنارے چلا جا رہا ہوں۔ لیکن رفتہ رفتہ اپنا مقصد' اپنی منزل مقصود کے محض ہوتی جاتی ہے۔ میں ایک باغ دیکھتا ہوں جس کے چاروں طرف چوکونی چار دیواری ہے۔ باغ کے باہر کی طرف ان تمام بھوتوں کی تصویریں ہیں جنہیں باغ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ ان بھوتوں کے نام ہیں حسد' بخل' نفرت' غم' ضعیفی' میں ان بھوتوں اور چڑیلوں کی تصویریں دیکھنے کے بعد باغ کی طرف دیکھتا ہوں۔ چاردیواری سے زیادہ بلند خوشنما درختوں کی ٹہنیاں ہیں جو غنچوں اور پھلوں سے لدی ہوئی ہیں' چڑیوں کے زمزموں کی آواز آ رہی ہے۔ میں ڈھونڈھ رہا ہوں کہ اس چاردیواری میں دروازہ کہاں ہے جس کے راستے میں باغ میں داخل ہوں۔ دروازہ آخر مل ہی جاتا ہے جس کی چوکیدار ایک عورت ہے' جس کا نام تن آسانی ہے۔ وہ مجھے بتاتی ہے کہ اس باغ کا نام باغ نشاط ہے اور نشاط دراصل ایک سردار ہے جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ درختوں کے سائے میں عیش مناتا ہے اور یہ درخت اس نے زیادہ تر مشرق سے یعنی عربوں کے ملک سے یہاں لا کے نصب کئے ہیں۔

اس باغ نشاط میں میں کئی دلچسپ مردوں اور عورتوں سے ملا۔ ایک تو حضرت مذاق تھے جن کے ہونٹوں پر ہمیشہ تبسم رہتا اور جو بزلہ سنجی سے باز نہیں آتے۔ ایک خاتون تھیں اخلاق بیگم' بات اس طرح کرتی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ جس سے مل کے میں متاثر ہوا ایک چھوٹا سا دیوتا تھا کیوپڈ۔ عشق کا دیوتا یہ وہ تھا جو بڑوں بڑوں کا مان توڑتا تھا۔ جس کی ایک نظر سے زہد مرجھا جاتا تھا۔ جس کی آنکھوں کی تپش سے عصمتیں پگھل جاتی تھیں۔ عشق کے دیوتا کے ساتھ ساتھ ایک اور نوجوان تھا جس کے ہاتھ میں دو ترکش تھے اور ہر ترکش میں پانچ تیر تھے۔ پہلے ترکش میں جو تیر تھے ان میں سے ہر ایک پر اس کا نام کھدا ہوا تھا اور ان پانچوں تیروں کے نام یہ تھے۔ حسن۔ سادگی۔ سخاوت۔ ساتھ' خوش وضعی اور دوسرے ترکش میں جو ٹیڑھے میڑھے تیر تھے ان کے نام تھے غرور۔ بد معاشی۔ بے شرمی۔ بے آرزوی۔ پریشان خیالی۔

عشق کے دیوتا کے ہاتھ میں ہاتھ دے میں نے ایک حسینہ کو آتے دیکھا جس کا نام حسن تھا۔ اور بھی کئی حسین جوڑے اس کے ہم رکاب

تھے لیکن مجھے یہاں ان کے تفصیلی ذکر کی فرصت نہیں۔ میں تو اپنی بپتا بیان کروں گا۔ عشق کے دیوتا نے اپنے ساتھی خوش منظر کو حکم دیا کہ مجھ پر تیر برسائے۔ اب میں باغ کے درختوں میں چھپتا پھرتا تھا اور عشق کا دیوتا اور اس کا ساتھی میرا تعاقب کر رہے تھے۔ تازہ گھاس اور پھل دار درختوں کے درمیان جہاں جہاں بھانت بھانت کی چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ یہ تعاقب جاری رہا۔ یہاں تک کہ تھک کے میں ایک کنوئیں کے کنارے بیٹھ گیا۔

وہی کنواں جس کے کنارے گل گامش نے سدا بہار جوانی کا درخت کھو دیا۔

یا وہ کنواں جس میں فارسی سس اپنے عکس کو دیکھتا رہا اور عاشق ہوتا رہا اور اس نے اس پری کو ٹھکرا دیا جو اس کے فراق میں گھل گھل کے صدائے بازگشت بن گئی؟

یا وہ کنواں جس میں حضرت یوسف کے بھائیوں نے انہیں قید کیا تھا۔ وہی قید جو زلیخا کو ٹھکرا کے بھگتنا پڑی؟

بہرحال میں ایک کنوئیں کے کنارے بیٹھ گیا جس کے کنارے صنوبر کا درخت تھا اور کہتے ہیں کہ فرانس کے بڑے پرانے بادشاہ پے چن کے زمانے سے اب تک ایسا خوبصورت درخت کبھی روئے زمین پر نہیں اگا۔ اس درخت کے نیچے سنگ مرمر کی ایک چٹان سے ایک چشمہ پھوٹ نکلا تھا۔ سنگ مرمر پر ایک چھوٹا سا کتبہ تھا۔ "یہاں حسین فارسی سس نے وفات پائی۔" میں اب آپ کو حسین فارسی سس کا قصہ کیا سناؤں 'وہ تو آپ سن چکے ہیں کہ پری اس کے فراق میں گھل گھل کے صدائے بازگشت بن گئی۔ مگر فارسی سس نے عشق کے دیوتا کی نافرمانی کی تھی اور عشق کے دیوتا نے اسے اپنے ہی عکس کے عشق میں مبتلا کر دیا تھا اور اپنے عکس کے بے مصرف' بے غرض' بے نتیجہ عشق میں اس نے جان دے دی۔ کیونکہ اس طرح بقائے دوام حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ چشمہ کنوئیں کے کنارے میں بہتا تھا آب حیات کا چشمہ نہیں تھا' نہیں یہ تو فارسی سس کا خطرناک آئینہ تھا' خطرناک چشمہ' جہاں زندگی فنا ہوتی ہے۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ ذرا جھانک کے تو دیکھوں کہ یہ چشمہ کیسا ہے۔ اس کا پانی صاف تھا اس میں آئینہ کی سی جلا تھی۔ اس کے اطراف دو دو انگل اونچی گھانس تھی۔ کبھی یہ کنواں خشک نہیں ہونے پاتا۔ لیکن میں نے جب غور سے اس کی تہہ کی طرف دیکھا تو مجھے دو چمکتے ہوئے سنگریزے نظر آئے۔ دو چمکتی آنکھیں۔ دو نرگس کے پھول۔ جب سورج چمکتا تو یہ دونوں سنگریزے اس طرح جگمگاتے کہ کنوئیں کی تہہ ان کی روشنی سے روشن ہو جاتی۔ پورے باغ کا عکس ان دونوں سنگریزوں میں نظر آ جاتا۔ تب میں سمجھا کہ یہی دو چمکتی آنکھیں' (معلوم نہیں کسی عورت کی آنکھیں؟ یا اس کی اپنی آنکھیں؟) وہ خطرناک آئینہ تھیں جن میں اپنی پرستش کر کے فارسی سس نے اپنی جان دی۔ خدا جانے فارسی سس کے علاوہ اور کتنوں نے اس آئینے میں اپنی صورت دیکھ کے ہلاکت کا راستہ اختیار کیا۔ کیونکہ وہ خطرناک منزل ہے جہاں بڑے بڑے دل گردے والے بے بس ہرن کی طرح شکار ہو جاتے ہیں' جہاں لوگوں کو غم و غصہ کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

لیکن اب میں اپنی داستان پھر سے بیان کرتا ہوں۔ ان سنگریزوں میں جہاں میں نے سارے باغ کا عکس دیکھا' وہاں میں نے ایک گلاب کا درخت بھی دیکھا۔ اس میں ایک گلاب کا پھول لگا تھا۔ یہ پھول کیا تھا ایک ایسی دوشیزہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا یہ سارا باغ اسی کے لئے لگایا گیا ہے۔ لیکن جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اس حسینہ کے اطراف ایک ایسا حصار تھا' خاردار جھاڑیوں کا' کانٹوں کا کہ اس تک پہنچنا ناممکن تھا۔ میں اس حسینہ گلاب کے دیدار ہی میں محو تھا کہ عشق کے دیوتا کو موقعہ مل گیا اور اس نے پے در پے پانچوں تیر چلائے۔ حسن' سادگی' سخاوت' ساتھ' خوش وضعی' میرے قلب و جگر ان تیروں سے چھلنی ہو گئے۔ زخموں سے چور چور ہو کے میں نے عشق کے دیوتا کی اطاعت قبول کی اور اس نے ایک سنہری کنجی سے میرے قلب کو مقفل کیا تاکہ میرے دل پر اسی کا راج رہے۔ اس نے مجھے عشق کے مراسم اور آداب سکھائے۔ اس نے کئی ساتھی میری مدد کے لئے مقرر کئے مثلاً خوش بیانی۔ ذکر حبیب۔ رازداں اور دیدار۔ لیکن سب سے بڑا دوست جو اس نے مجھے عطا کیا ایک شخص تھا جس کا نام چارہ ساز تھا اور جو اخلاق بیگم کا بیٹا تھا۔ چارہ ساز نے کہا کہ "جناب میں آپ کی گلاب کے درخت تک رہنمائی کروں گا' اس طرح کہ کانٹوں سے آپ کا دامن نہ الجھنے پائے" اس کی رہنمائی میں میں کانٹوں سے دامن بچاتا ہوا گلاب کے درخت کے قریب قریب پہنچ

گیا لیکن دفعتاً" ایک بد نہاد آدمی گلاب کے درخت کے قریب ہی کہیں سے نمودار ہوا۔ اس کا نام رقیب یا نگہبان تھا۔ یہ وہیں کہیں گھانس پات میں چھپا بیٹھا تھا کہ ہر ایسے شخص کو گرفتار کر لے جو گلاب کے پودے کی طرف ہاتھ بڑھائے اور یہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ اور بھی کئی عورتیں تھیں مثلاً زبان خلق' حیا' شرم۔ لیکن ان سب میں یہ رقیب جو اصلی نگہبان تھا بڑا ہی روسیاہ تھا۔ بڑا اونچا پورا۔ اس کی آنکھیں شعلوں کی طرح چمکتی تھیں۔ اس سے اور چارہ ساز سے پہلے تو کچھ بحث ہوئی مگر رقیب کے تیور دیکھ کے چارہ ساز بھاگ کھڑا ہوا اور میں رقیب کے نرغے میں اکیلا رہ گیا۔ مجھے ایک شریف خاتون نظر آئی جس کا نام عقل تھا اور جو عشق کو محض حماقت سمجھتی تھی۔ اس نے مجھے نصیحت کرنا شروع کی کہ عشق سے باز آؤ یہ محض جنون ہے۔ زبان خلق تمہیں بد نام کرے گی۔ حیا کو خود میں نے حسینہ گلاب کی حفاظت کے لئے مامور کیا ہے۔ اور جب وہ سب کچھ کہہ چکی اور مجھے قائل نہ کر سکی تو وہ بھی رخصت ہو گئی۔ عشق نے میرے لئے ایک اور مدد گار مقرر کیا یہ میرا رفیق اور رازدان تھا۔ اس رازدان نے کہا کہ یہ رقیب بڑا ہی بے ڈھب آدمی ہے مگر خوشامد سے یہ بھی رام ہو سکتا ہے۔ اس کی بات مان کے میں رقیب سے سمجھوتے کی بات چیت کرنے کے لئے بڑھا لیکن رقیب نے خاردار جھاڑیوں سے آگے مجھے نہ بڑھنے دیا۔ میں نے بہرحال اس سے لجاجت سے کہا کہ "میں اپنے کئے پر نادم ہوں کہ آپ کی اجازت کے بغیر اس گلاب کے درخت کے اس قدر قریب آگیا۔ کیا کروں میں عشق کے دیوتا کا غلام ہوں اور محبت نے مجھے مجبور کر دیا۔ مجھے صرف محبت کرنے کی اجازت دو۔ کیونکہ محبت کرنا یا نہ کرنا ایک ایسی بات ہے جو میرے اختیار سے باہر ہے' میں مجبور ہوں۔ میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا مگر مجبور ہوں" اس پر رقیب ذرا نرم پڑا اور اس نے کہا "تیری نیت ایسی بری نہیں معلوم ہوتی۔ تو میرے گلاب کے درخت سے دور رہ۔ تیرا جتنا جی چاہے دور سے محبت کر' مجھے اس سے سروکار نہیں مگر دوشیزہ گلاب سے دور رہنا" یہاں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ رقیب پرانے معنوں میں گلاب کے درخت کا نگہبان تھا۔ نئے معنوں میں میری طرح حسینہ گلاب کا عاشق نہیں تھا۔

بہرحال کچھ اپنی چرب زبانی سے اور کچھ اپنے رفیقوں کی مدد سے میں نے رقیب کو اس حد تک رام کیا کہ مجھے گلاب کے پاس جانے کا موقع ملا اور مجھے حسینہ گلاب کا پہلا بوسہ نصیب ہوا۔ لیکن یہ بوسہ جو وصال غرضی سے بھی بہت کم تھا' غضب ہو گیا۔ سب سے پہلے زبان خلق نے چہ میگوئیاں شروع کیں۔ پھر رشک اور حیا نے زور پکڑا۔ رقیب کو ان سب نے لعنت ملامت کی کہ وہ میری اور میرے ہوا خواہوں کی باتوں میں آ گیا اور اب رقیب نے خود افسوس کرنا شروع کیا کہ کیوں اس نے غفلت برتی۔ اب رشک نے حسینہ گلاب اور گلاب کے درخت کے اطراف ایک فصیل تعمیر کی' خندق بنائی اور میرے لئے اس تک پہنچنا ناممکن بنا دیا۔ رشک کے تمام ساتھیوں اور رقیبوں نے اس نئی فصیل کی حفاظت شروع کی۔ اب میں تھا اور فراق کا عالم میں' تڑپتا تھا اور کسی طرح گلاب تک پہنچ نہ سکتا تھا۔

لیکن اب عشق کے دیوتا نے امید کو میری امداد کے لئے مامور کیا۔ یہی نہیں عشق کے دیوتا نے اپنے تمام سرداروں کی ایک مجلس مشاورت طلب کی اور بالآخر ان سب نے مل کر اس حصار پر حملہ کیا جو رقیب نے حسینہ گلاب کے اطراف بنایا تھا۔ ایک ایک کر کے زبان خلق' شرم' حیا اور رقیب سب زیر ہو گئے اور مجھے گلاب تک رسائی نصیب ہوئی۔ گلاب کے درخت تک' حسینہ گلاب تک' گل بکاؤلی تک' بکاؤلی تک' یہ آب حیات کے چشمے تک پہنچنے کا دوسرا اصول تھا' جو سانپ نے حضرت حوا کو سکھایا تھا کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ چشمہ آب حیات حسینہ گلاب کا دہن ہے۔

(۴)

ایک تھا بادشاہ جس کا نام تھا عقل۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام دل تھا۔ اور عقل نے دل کو اقلیم بدن کا سردار مقرر کیا۔ یہ شاہزادۂ دل' اقلیم بدن کا نظم و نسق اچھی طرح چلا رہا تھا کہ کسی نے چشمہ آب حیوان کا ذکر چھیڑ دیا اور یہ ذکر سن کے دل دیوانہ سا ہو گیا کہ آخر یہ کیسا چشمہ ہے جس کا ذکر ہر زبان پر ہے لیکن جو ہر نظر سے پوشیدہ ہے۔ بالآخر دل نے اپنے ایک معتمد رفیق نظر کو روانہ کیا کہ دنیا بھر کا چکر لگائے اور

چشمہ آب حیواں کا سراغ لگائے۔

نظر' ملک ملک زمین زمین تلاش کے ارادے سے روانہ ہوا۔ سب سے پہلے وہ ایک شہر پہنچا جس کا نام تھا عافیت۔ یہاں کے شہریار کا نام ناموس تھا۔ یہاں نظر کی دال زیادہ نہیں گلی۔ اس نے شہریار ناموس کی نصیحتیں سنیں اور آگے روانہ ہو گیا۔ حصار زہد میں اس نے ایک پیر مرد خمیدہ کمر کو دیکھا جس کا نام زہد تھا اس نے اسے اپنے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ آگے بڑھتا چلا گیا اور شہر ہدایت پہنچا۔ یہاں کا بادشاہ قوم عاد سے تھا۔ فیل تن' دیو قامت' اس کا نام ہمت تھا اور بالآخر ہمت ہی سے اسے چشمہ آب حیات کا پہلا سراغ ملا۔

ہمت نے اسے خبر دی کہ ایک بہت بڑا شہنشاہ ہے جس کا نام عشق ہے یہ بڑا ہی باجبروت شہنشاہ ہے۔ یہ شہنشاہ عشق پتھر سے مقناطیس بناتا ہے یہ لوہے کو گلا کر موم کر دیتا ہے یہ عشق ہی تو تھا جس نے سب سے پہلی شمع جلائی اور اس پہلی شمع پر پہلا پروانہ نثار ہوا۔ اسی نے باغ میں لالے کھلائے اور بلبلوں کے دل کو داغ دیا۔ اس شہنشاہ عشق کی ایک لڑکی ہے جس کا نام حسن ہے۔ ایسی پری رو کہ آسمان کا چراغ اس کا پروانہ ہے' جہاں سوز ایسی کہ اگر دریا کی طرف دیکھے تو پانی میں آگ لگ جائے۔ شہنشاہ عشق نے اپنی اس بیٹی شاہزادی حسن کو شہر دیدار کی حکومت سپرد کی۔ یہ شہر دیدار کوہ قاف کے قریب واقع ہے۔ اس شہر میں ایک جنت نما باغ ہے جسے باغ رخسار کہتے ہیں۔ اسی باغ رخسار کے کنارے چشمہ آب حیواں واقع ہے۔

لیکن جہاں ہمت نے نظر کو شہر دیدار اور گلشن رخسار اور چشمہ آب حیواں کا پتہ بتایا' وہاں یہ بھی جتا دیا کہ یہاں سے لے کر چشمہ آب حیواں تک راستہ بڑا ہی دشوار گذار اور خطرناک ہے۔ راستے میں بڑے ہولناک بیابان آتے ہیں۔ بڑے خطرناک طلسمات ہیں۔ بڑے ہی سنگ سیرت آدمی خوار راستے میں ملتے ہیں جن کا سرتاج ایک مہیب دیو ہے جس کا نام رقیب یا نگہبان ہے۔ شہنشاہ عشق کے حکم سے یہ رقیب دیو سیرت دارالملک دیدار کا دربان ہے۔ اگر تو اس کے چنگل سے بچ کے نکل گیا تب کہیں شہر دیدار تک تیری رسائی ہو گی۔ جا۔ خدا تیری مدد کرے۔

نظر ہمت کے بتائے ہوئے راستے پر روانہ ہوا۔ اس کے آقا نے اسے چشمہ آب حیواں کا سراغ لگانے بھیجا تھا۔ وہ خطروں سے ڈرے بغیر ہمت کر کے بڑھتا چلا گیا اور جب وہ اقلیم عشق میں پہنچا تو دیکھا یہاں عجیب حال ہے۔ گرمی کا یہ عالم ہے کہ آگ ہوا ہے اور ہوا آگ ہے۔ زمین پتھر کی طرح سخت اور پتھر فولاد کی طرح مضبوط' یہاں سرسبزی بھی تھی لیکن کچھ اور ہی طرح کی' آنکھیں نرگس کا پھول بن گئی تھیں۔ اور لالے خون جگر سے سیراب تھے۔ جب اقلیم عشق میں قلعہ سنگ سار کے پاس اس کا گذر ہوا تو رقیب کے سنگ سیرت سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ جب نظر نے خود رقیب کو دیکھا تو سہم گیا۔ ایک سنگ سیرت' سنگ صورت سا شخص' قوی ہیکل' دیو پیکر' طول' بے اصول' ناقبول' ہول' دیو غول' رقیب نے اسے سرزنش کی کہ اس علاقے سے گذرنے کی تجھے آخر ہمت کیسے ہوئی جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ لیکن نظر ایک عیار تھا اس نے رقیب کو رشوت میں بہت سا سونا دیا اور اسے شہر دیدار اور باغ قامت تک پہنچا دیا گیا۔ باغ قامت کا سردار ایک بلند بالا' نازک اندام سا سردار تھا۔ اس نے رقیب دیو سیرت کو دیکھ کے پوچھا کہ اے پلنگ قلعہ زور آزمائی' اے نہنگ قلزم ناآشنائی' آج تیرے ساتھ یہ بیگانہ اور اجنبی سا آدمی کون ہے اور یہ یہاں کیسے پہنچا۔ رقیب نے کہا کہ مجھے دارالقلب کی عام بیماری ہے اور یہ شخص میرا طبیب ہے۔ میں اسے ساتھ لیتا آیا۔ قامت ایک فریس تھا' اس نے مجلس آراستہ کی اور دیو سیرت رقیب کو اتنی شراب پلائی کہ وہ مدہوش ہو گیا۔ پھر اس نے نظر سے اس کا حال پوچھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کس کام سے آیا ہے؟

اور جب قامت اور نظر کی کھل کے باتیں ہوئیں تو قامت نے نظر کو اپنا ہم راز بنا لیا۔ اسے باغ قامت کے عجائبات دکھائے۔ رخسار کے دو سرخ سرخ گلاب۔ ان پھولوں کے درمیان غنچہ دہن' موئے کمر' ابھی نظر باغ قامت کی سیر کر ہی رہا تھا زلف مشکبار شکار کھیلنے آئی' اس کے ساتھ سیکڑوں حبشی سو کرماوں کی فوج تھی اور یہ کمند ڈال کے نظر کو گرفتار کر کے لے گئی اور نظر نے بھی اس قید سے گلشن رخسار کا نظارہ کیا۔ گلشن رخسار میں اس نے اور بہت سے عجائبات دیکھے اور وہ مبہوت سا ہو گیا۔

نظر کا ایک بھائی تھا۔ ایک یوسف گم شدہ جو ترکستان اور خاور کی سرحد پر رہا کرتا تھا۔ نظر اس کے حال سے آگاہ نہیں تھا۔ اس کا نام غمزہ

تھا اور یہ شہزادی حسن کے دربار میں ایک بڑا ذی اثر افسر تھا۔ غمزہ نے شہزادی حسن کے حکم کی بنا پر نظر کو قید کر لیا اور قریب تھا کہ تلوار کے ایک وار سے اس کا سر قلم کر دے کہ اس نے دفعتاً" اس مہرہ کو دیکھ لیا جو نظر کے بازو پر بندھا ہوا تھا اور پہچان لیا کہ نظر جسے وہ قتل کرنا چاہتا تھا اس کا اپنا بھائی ہے۔ تلوار پھینک کے وہ اس سے بغل گیر ہو گیا۔

جب حسن کو یہ معلوم ہوا تو اس نے غمزے کو حکم دیا کہ نظر کو اپنے ساتھ گلزار رخسار میں لائے۔ جب خانہ و گلزار حسن کی نظر نے سیر کی تو اسے طرح طرح کے حسین نظر آئے۔ بتان چین و خطاء سمرقند کے شکریں دہن 'خوارزم کے بلا چشم' عراق کے نگار 'اصفحان کے سیہ چشم' شیرز کے تنگ دہن 'گلمائے تبریز' لیمحان عرب 'شکر ریزان مصر' منظر کثرت نظارہ اور شدت جمال سے مبہوت تھا کہ حسن نے اس سے سوال و جواب شروع کئے۔ حسن نے پوچھا ستارہ کا مقصود کیا ہے؟ نظر نے جواب دیا اس کی صنعت کا نظارہ کرنا۔ حسن نے پوچھا کہ چشم بینا کس لئے بنی ہے؟ نظر نے کہا رخسار زیبا کے مشاہدے کے لئے۔ اور اسی طرح کے سوال و جواب میں نظر نے اپنے شاہزادے دل کا ذکر کیا۔ حسن نے اپنا دل اسے دکھایا جو ایک گوہر نگین تھا۔ اس کے مقابلے میں جب نظر نے شاہزادۂ دل کا ذکر کیا جس کا دل دل عادل اور دل عاشق تھا تو حسن اس کی گرویدہ ہو گئی۔

اب عشق کی آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی۔ حسن کا ایک پری تمثال غلام تھا' جس کا نام تھا خیال۔ خیال کو حسن نے نظر کے ساتھ ملک بدن بھیجا اور حسن نے نظر کو ایک طلسمی انگوٹھی دی کہ وہ اسے دل تک پہنچائے۔ اس طلسمی انگشتری کی خصوصیت یہ تھی کہ جو اسے منہ میں رکھ لیتا وہ خود تو سب کی نظروں سے روپوش ہو جاتا مگر خود سب کو دیکھ سکتا۔ اس انگشتری کی مدد سے مملکت عشق کے سپاہیوں کی آنکھ سے بچ کے نظر' ملک بدن واپس پہنچ گیا۔ دل سے اس نے شہزادی حسن کے حسن و جمال کی کہانی سنائی۔ گلزار رخسار کا ذکر کیا کہ اس جنت ارضی میں چشمہ آب حیات پنہاں ہے اور بجز ساقیان حسن گل رو کے کوئی اس آب حیات کے چشمے سے واقف نہیں۔ نظر اور خیال کی لسانی سے دل کا عشق اور شدت اختیار کر گیا۔ اب عشق نے جنون کی کیفیت اختیار کی اور دل نے شہر دیدار روانہ ہونے کا ارادہ کیا لیکن دل کے ایک ناصح مشفق ہمدرد کو اس سفر کے بھید کا پتہ چل گیا۔ وہم نے دل کے والد شہنشاہ عقل کو آگاہ کر دیا اور عقل نے مصلحت اس میں دیکھی کہ اس جنون سے بچانے کے لئے اپنے بیٹے دل کو نظر بند کر دے۔ چنانچہ دل عقل کے حکم سے نظر بند کر دیا گیا۔ ادھر زندان میں دل کی حالت غیر تھی۔ ادھر نظر پھر شہر دیدار میں حسن کے پاس پہنچا اور گلزار رخسار میں تشنگی کے عالم میں اسے چشمہ آب حیواں نظر آیا۔ مگر جیسے ہی اس نے چشمے کا پانی پینے کے لیے منہ کھولا طلسمی انگوٹھی اس کے منہ سے چشمہ آب حیواں میں گر پڑی۔ نظر جو سب کی نظر سے چھپا ہوا تھا۔ سب کو نظر آنے لگا اور اسے رقیب نے گرفتار کر لیا۔

لیکن سب سے اہم واقعہ جو پیش آیا یہ تھا کہ چشمہ آب حیواں اس کی نظر سے غائب ہو گیا۔ جیسے سدا بہار جوانی کا درخت گل کامش کی نظر سے غائب ہو گیا تھا۔

نظر نے بہرحال رقیب کے چنگل سے نجات پائی حسن نے غمزے کو نظر کے ساتھ پھر دل کی تلاش میں روانہ کیا۔ راستے میں حصار زہد پڑتا تھا۔ غمزے نے اس حصار کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ پھر ان دونوں نے پوستین پوش ترک درویشوں کا بھیس بدلا اور اپنی باتوں سے ناموس کو قلندر بنا دیا۔ یہ ناموس عقل کی مملکت میں ایک بڑا سردار تھا۔

لیکن توبہ کے سامنے نظر اور غمزے کی ایک نہیں چلی۔ یہ توبہ بڑا سخت جان سردار تھا۔ یہ غمزے کا نشان چھین کے شہنشاہ عقل کے سامنے لے گیا اور عقل نے اپنے بیٹے دل کو سمجھایا۔ دل کو قائل کر دیا۔ اور دل ایک لشکر جرار لے کر اس ارادے سے روانہ ہوا کہ شہر دیدار کو مسخر کر لے لیکن اب غمزے نے ایک نئی چال چلی۔ آہو کا بھیس بدل کے اپنے ساتھ بہت سے آہوان ختن کو شریک کر لیا اور دل کے شکار کے شوق میں ان آہوؤں کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اس طرح اپنے لشکر سے بچھڑ گیا۔ اب شہنشاہ عقل نے خود ایک بڑے لشکر کے ساتھ شہر دیدار کی تسخیر کا ارادہ کیا اور شہر دیدار کے قریب پہنچ گیا۔ اپنے شہر کو عقل کی زد میں پا کے شہزادی حسن نے اپنے باپ شہنشاہ عشق سے مدد مانگی

اور عشق خونخوار کا مہیب لشکر دل کے لشکر کے مقابلے میں روانہ ہوا۔ زلف سرکش نے دل کی فوج پر شب خون مارا۔ ابروؤں نے کمان کڑی کی، مژگاں نے تیر چلا یا اور بالاخر خیال نے دل کو قید کر لیا۔ جب دل گرفتار ہو گیا تو عقل اور دل کی سپاہ کے قدم اکھڑ گئے۔ ادھر حسن نے دل گرفتار کو چاہ زندان میں گرفتار کر دیا۔

شہزادی حسن اپنے گرفتار یعنی شہزادۂ دل کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس کی ایک سہیلی تھی وفا۔ اس کے ساتھ وہ گلزار کی سیر کو نکلی اور یہی وفا دل کو چاہ ذقن کی قید سے باغ آشنائی میں لے آئی۔ آدھر نظر آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور شہزادی حسن سے اس نے شہزادہ دل کی سفارش کی حسن نے وفا سے مشورہ کیا۔ وفا تو یہ چاہتی تھی کہ حسن اور دل ایک دوسرے کے ہو جائیں لیکن ناز کا مشورہ تھا "خویش را مفرش ارزاں" ناز اور وفا میں بحث ہوتی رہی۔ بالاخر حسن نے خود ایک حل سوچا حسن نے دل کو تبسم سے بے خود بے ہوش کر دیا اور پھر اپنے پہلو میں جگہ دی۔

لیکن یہ وصال عارضی تھا۔ ابھی تک چشمہ آب حیواں کا نگاہوں سے دور تھا۔ اسی عالم میں دل پر ایک مصیبت پڑی۔ رقیب کی ایک بڑی ہی مکروہ صورت، مکروہ سیرت بیٹی تھی جس کا نام غیر تھا۔ وہ بھی دل پر عاشق تھی وار حسن سے جلتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایسی ساحرہ تھی جسے سحر سے صورت بدلنے میں کمال حاصل تھا غیر نے ایک دن حسن کی صورت بنائی اور دل کو پھانسنے کی کوشش کی۔ اس کی اطلاع خیال نے حسن کو دی۔ اب حسن کے جلال کا عالم ہی اور تھا۔ دل نے غیر کے پہلو میں بیٹھ کر اس سے بے وفائی کی تھی۔ دل کو پھر قید کر دیا گیا۔ اس مرتبہ چاہ ذقن میں نہیں بلکہ وادی عتاب میں۔ ادھر غیر جو فطرتاً "بد نہاد تھی۔ دل کے بھی درپے تھی۔ اس نے اپنے باپ رقیب سے دل کی شکایت کی اور رقیب نے دل اور اس کے رفیق نظر دونوں کو قلعہ ہجراں میں قید کر دیا جو بیابان فراق میں واقع ہے۔

لیکن غیر کی سازش کا حال شہزادی حسن پر آشکار ہو ہی گیا۔ اب اسے ندامت ہوئی کہ ناحق اس نے دل کو اتنی سخت سزا دی اور اب دل کے فراق میں خود حسن کی حالت بگڑنے لگی۔ خیال نے حسن کا خط دل تک اور دل کا نامہ شوق حسن تک پہنچایا۔ صبر اور ہمت نے دونوں کو ڈھارس دی اور بالاخر ہمت نے حسن اور دل کی اس والہانہ محبت کی اطلاع شہنشاہ عشق دی۔ ہمت نے شہنشاہ عشق سے کہا کہ قدیم زمانے میں ایک شہنشاہ تھا اس کا نام فرد تھا۔ یہ شہنشاہ بڑا ہی عادل تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے دو ٹکڑے اپنے دو بیٹوں میں تقسیم کر دیئے ان میں سے ایک مشرق کا تاجدار بنا دوسرا مغرب کا۔ ان میں سے ایک بھائی کی نسل سے شہنشاہ عشق ہے اور دوسرے بھائی کی نسل سے شہنشاہ عقل۔

قائل ہو کے عشق نے اپنے ایک معتبر وزیر مہر کو عقل کے دربار روانہ کیا اور جب عقل اقلیم عشق میں پہنچا تو عشق نے اس کی بڑی خاطر تواضع کی اور اسے اپنی نیابت کی کرسی پر بٹھایا۔ یہ اس لئے کہ عشق کا مرتبہ اور عشق کی طاقت ہر حال میں عقل سے زیادہ ہے۔ پھر عشق نے ہمت کو بیابان فراق اور قلعہ ہجراں کی سمت روانہ کیا کہ وہ دل کو رقیب کے چنگل سے چھڑا لائے۔ جب ہمت دل کو اس قید سے چھڑا لایا تو شہر دیدار میں نامت نے دل کا استقبال کیا۔ بالاخر عشق اور عقل نے حسن نے اور دل کی شادی رچائی اور تب دل کو معلوم ہوا کہ چشمہ آب حیواں دہن ہے ر پیار سے زندگی کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔

شادی کے بعد جب دل گلشن رخسار کی سیر کو نکلا تو ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ یہ آب حیواں کے چشمے کے کنارے تشریف رکھتے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے دل کو اس طلسمات کا راز سمجھایا۔ یہ کہ دل ہی اصلی خزانہ ہے اور دوسری اشیاء طلسمات ہیں جو اس خزانے کی حفاظت کے لئے بنائی گئی ہیں۔ دل جان ہے اور تمام ذرات جسم ہیں۔ نظر فکر صواب ہے اور ہمت فیض راہ ہیں ہے۔۔۔۔۔ رقیب دیو سیرت دراصل نفس دوں ہے، غیر ابلیس لعین ہے۔ یہ وہی سانپ ہے جس نے حوا کو بہکایا اور جو گل گامش کا سدا بہار جوانی کا پودا چرا لے گیا۔

اور رہ گیا یہ چشمہ آب حیات، یہ چشمہ آب حیواں۔ یہ کیسا عجیب چشمہ ہے کہ اس میں زندگی کھو بھی جاتا ہے مگر اس سے سیراب بھی ہوتی ہے۔ کبھی یہ سراب معلوم ہوتا ہے کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، کبھی اس کے کنارے سدا بہار جوانی کا پودا کھو جاتا ہے۔ اسی کنوئیں میں یوسف کو قید کی سزا ملتی ہے۔ اسی آئینے میں نارسی سس اپنا عکس دیکھ دیکھ کے ہلاک ہو جاتا ہے لیکن اسی سے زندگی ابلتی ہے اور زندگی کے

دریا چاروں طرف جاتے ہیں۔ چاروں طرف اُمڈتے ہیں۔ اسی سے ابر اٹھتے ہیں اور چاروں کھونٹ زندگی کا مینہ برساتے ہیں۔ گل کا مُش فنا ہو جاتا ہے۔ یوسف کا حسن ایک دن باقی نہیں رہتا۔ فارسی سس کا عکس مٹ جاتا ہے اور صرف چمکدار سنگریزے باقی رہ جاتے ہیں لیکن انسان فنا نہیں ہوتا۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل۔ اسی چشمے کے فیضان سے انسان زندہ ہے۔ سب سے مقابلہ کرنے کے لئے۔۔۔۔۔۔ سانپ سے ابلیس سے 'دیوتاؤں سے اور۔۔۔۔۔۔ اس موذی سے جو اس کے اندر چھپا ہوا ہے۔

سید فیاض محمود

نام : سید فیاض محمود
قلمی نام : سید فیاض محمود / فیاض محمود / گروپ کیپٹن فیاض محمود
پیدائش : ۳، اکتوبر ۱۹۰۶ء
تعلیم : ایم اے (انگریزی) پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۳۰ء
گورنمنٹ کالج لاہور (پنجاب یونی ورسٹی، لاہور) سے ۱۹۲۸ء میں بی۔ اے (آنرز) کیا اور ۱۹۳۰ء میں ایم۔ اے (انگریزی)

مختصر حالات زندگی:

ابتدائی تعلیم و تربیت سے فارغ التحصیل ہونے تک لاہور میں ہی رہے۔ ۱۹۰۳ء میں ایم۔ اے (انگریزی) کر کے چھ ماہ تک نواب صاحب ہوتی (مردان) کے پرائیویٹ سیکرٹری کے فرائض انجام دیے۔ اسی سال اسلامیہ کالج، لاہور میں انگریزی کے لیکچرر کی اسامی نکلی تو درخواست گزار ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں منتخب بھی ہو گئے۔

قیام پاکستان تک اسلامیہ کالج، لاہور میں بطور لیکچرر ملازمت کرنے کے بعد پاکستان ائرفورس کے شعبہ تعلیم سے منسلک ہو گئے، جہاں سے گروپ کیپٹن کے رینک پر ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کنٹریکٹ پر "شعبہ تاریخ ادبیات" پنجاب یونی ورسٹی، لاہور کے ساتھ منسلک ہو گئے اور کئی جلدوں پر مشتمل "تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند" مرتب کی۔

۱۹۲۹ء میں تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔ پروفیسر حمید احمد خاں کی معرفت ابتدائی چار افسانے رسالہ "ہمایوں" لاہور میں شائع ہوئے اور یہیں سے بطور افسانہ نگار شہرت ملی۔ ۱۹۴۰ء کے بعد "ادب لطیف" لاہور اور "ساقی" کے لیے تواتر کے ساتھ افسانہ نگاری کی۔ گزشتہ تیس برس سے انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ ادبی منظرنامے سے غائب اور گوشہ نشین ہیں۔

اولین تحریر:

"لاٹری" ڈراما، زمانہ تحریر: ۱۹۲۹ء

اولین افسانہ:

"وہ" زمانہ تحریر ۳۰۔۱۹۲۹ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"زبیدہ" مطبوعہ: "ہمایوں" لاہور جولائی ۱۹۳۲ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "بے رنگ و بو" (افسانے) مکتبہ اردو 'لاہور' طبع اول و دوم: ۱۹۴۰ء

۲۔ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند" پنجاب یونی ورسٹی 'لاہور

نظریہ فن:

"۔۔۔ رہی میری افسانہ نویسی 'اس کی بابت میں کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتا۔ صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ میری افسانہ نگاری کی زندگی کا آغاز اتفاقی طور پر ہوا۔"

فیاض محمد

(بہ حوالہ "ستاروں کی محفل" مرتبہ: بشیر ہندی 'طبع اول: ۱۹۴۶ء)

سید فیاض محمود

کام چور

مئی کے دن تھے۔ صبح تین بجے کا عمل تھا۔ گھر کے سب لوگ صحن میں سو رہے تھے۔ رات بھر مارے حبس کے آنکھ نہیں لگی تھی۔ اس وقت کہیں سے بھولی بھٹکی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آنے لگے تھے۔ اس ہوا میں اگر خنکی نہ تھی تو کم از کم حدت بھی نہ تھی۔ لوگ جو کروٹیں لیتے لیتے تھک گئے تھے، اب پاؤں پسار کے سو گئے۔ گزشتہ دن کی تکان جو اس قیامت کی رات میں دور نہ ہوئی تھی، اب تازی ہوا جسم کے بند بند سے اڑا لیے جا رہی تھی۔ دماغوں پر ایک پر کیف سکون طاری ہو رہا تھا۔ تمام صحن میٹھی نیند میں مدہوش تھا کہ اتنے میں پہلے آہستہ پھر ذرا زور سے اور پھر ذرا اور زور سے اور پھر بلند آواز سے ننھے نے رونا شروع کیا۔ بیوی گہری نیند میں سو رہی تھیں، ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ننھے کی ٹانگیں اور پھر بازو رونے کے ساتھ ہی ہلنے شروع ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی حرکت میں تیزی پیدا ہو گئی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ سرکتا سرکتا ماں کے پیٹ سے نزدیک تر ہو گیا اور اس کی ٹانگیں ماں کے جسم پر پڑنے لگیں۔ ساتھ ساتھ ننھے نے پوری آواز سے چیخنا شروع کر دیا۔ آخر مرغوب جاگ اٹھا۔ پہلے دو ایک منٹ تو اسے اپنی گھبراہٹ کی وجہ معلوم نہ ہوئی پھر اسے ننھے کے رونے نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے کہا "اماں! اماں! اور پھر اور زور سے "اماں" بارے بیوی کو ہوش آیا۔ ہڑبڑا کے جاگیں "کیوں؟ کیا ہے؟"

"ننھا دیر سے رو رہا ہے۔ سونے نہیں دیتا۔"

بیوی نے پہلے تو ننھے کو نیم خوابی ہی کی حالت میں تھپکنا چاہا۔ مگر ننھا چپ نہ ہوا۔ پھر ایک کہنی کے سہارے ذرا اوپر ہو کے دوسرے ہاتھ سے ننھے کو اٹھایا۔ دیکھا تو کپڑے خراب کیے ہوئے تھا۔ انہوں نے آواز دی "کریمن! اری او کریمن!" پھر "کریمن! کریمن" مگر کریمن سب سے دور اپنی چارپائی پر چت لیٹی آرام سے سو رہی تھی۔ آخر بیوی نے کہا، "اس کم بخت پر خدا کی مار لاکھ سر پٹکو جاگتی ہی نہیں۔ خدا جانے اسے سانپ کیوں سونگھ جاتا ہے۔ او کریمن، اے، اے کریمن! مگر کریمن کہاں۔"

تھک کے بیوی بالکل اٹھ بیٹھیں، دونوں ہاتھوں سے ننھے کو اٹھایا۔ سرہانے اسٹول پر لیمپ مدھم سا جل رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کے بتی کو اونچا کیا۔ دیکھا تو ننھے کا بچھونا سب لت پت تھا۔ اپنے جاگنے پر، اس بے وقت کی تکلیف پر اور باقی سب کے سوئے رہنے پر، بیوی کو بہت غصہ آیا۔ آواز دی، "مرغوب او مرغوب" وہ بیچارہ ابھی کچی نیند میں تھا پھر چونک پڑا اور ذرا ترشی سے بولا "کیا ہے؟"

"ذرا اٹھ کے اس نامراد کو جگا تو دو۔ مردوں سے شرط باندھ کر سوئی ہے۔" مرغوب طوعا" و کرہا" اٹھا۔ جا کے کریمن کے کندھے کو ہلایا جب اس سے کچھ اثر نہ ہوا تو ذرا زور زور سے اسے جھنجوڑا اور آوازیں بھی دیں۔ خیر کریمن کی آنکھ کھلی۔ جب چارپائی سے پاؤں نیچے رکھا تو بیوی نے غصے سے کہا ادھر آ مردار! میں گھنٹا بھر سے آوازیں دے رہی ہوں تیرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ پانی لا میں ننھے کو دھوؤں۔ کریمن آنکھیں ملتی ہوئی گھڑونچی سے جو صحن میں پڑی تھی لوٹا بھر لائی اور ننھے کو دھلوایا پھر بیوی کے کہنے پر غلیظ پوتڑے بستر سے اٹھائے اور نئے بچھائے۔ باورچی خانے میں جا کے ہاتھ دھوئے اور اپنے بستر پر آ کے لیٹ رہی۔

تقریباً آدھ گھنٹا گزر گیا۔ صبح کے چار بج رہے ہوں گے، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ صحن میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سانس لینے کی آوازوں پر بھی سکوت نے غلبہ پا لیا تھا۔ بیوی کے بائیں طرف کی ایک چارپائی پر ایک تین برس کا بچہ اٹھ بیٹھا اور اماں اماں کہہ کر چلانے لگا۔

جب دھیمی آواز سے کچھ نہ بنا تو اونچی آواز سے پکارنا شروع کیا۔ بیوی کی آنکھ کوئی بیس منٹ ہوئے لگی تھی کہ اب اور حملہ شروع ہوا۔ خراب کے جلدی جاگ اٹھیں۔ پوچھا کیا ہے؟ جواب ملا "پانی" اس پر بیوی نے آواز دی "کریمن، او کریمن!"

"جی"

"اری تو ایک آواز سے نہیں اٹھ سکتی۔ پہروں کوئی جگاتا رہے پھر کہیں اٹھتی ہے۔ بشیر کو پانی دے وہ پیاس سے ہلکان ہو رہا ہے۔"

کریمن نے اٹھ کر بشیر کو پانی پلایا۔ اور پھر گلاس کو گھڑونچی پر رکھ، جا کے سو رہی۔

اتنے میں پانچ بھی بج گئے۔ ہوا بدستور چل رہی تھی۔ اب تو اس کے جھونکوں میں کچھ خنکی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لیے سونے والوں میں سے بعض نے پائنتی سے چادریں اٹھا کر اوڑھ لی تھیں اور بے فکری کی نیند کے مزے لے رہے تھے کہ صحن کے ایک کونے سے کھانسنے کی آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں۔ پہلے تو آہستہ جیسے کوئی گلا صاف کرتا ہو، پھر رک رک کے، بھرپوری آواز سے۔ مگر آواز میں توانائی نہ تھی، کھانسی کے ایک حملے کے بعد حلق سے ایک آدھ تکلیف کا سانس بھی نکل جاتا تھا۔ یہ بیوی کی ساس تھیں۔ جوتی پاؤں سے ٹٹول کر پہنی اور چارپائی کی پٹی پر دونوں ہاتھوں کو دبا کے اپنے بازوؤں کے سہارے اٹھیں۔ اس وقت آسمان سے تاریکی غائب ہو چکی تھی۔ بیوی کے سرہانے لیمپ بدستور جل رہا تھا۔ اسے بجھایا بجھا کے اسے وہاں سے اٹھا کے صحن کی اس الماری میں جہاں لیمپ رکھے جاتے تھے رکھ دیا پھر ادھر ادھر اپنے لوٹے کے لیے نظر دوڑائی کیونکہ ان کا لوٹا مخصوص تھا کوئی اسے چھو نہیں سکتا تھا مگر وہ لوٹا نظر نہ پڑا۔ باورچی خانے میں بھی دیکھا، وہاں بھی نہ دکھائی دیا۔ باہر گھڑوں کے پاس بھی نہ تھا۔ حیران ہوئیں کہ لوٹا کہاں گیا۔ پہلے تو کسی اور لوٹے کی فکر میں نظر اٹھائی۔ مگر پھر جی نہ چاہا اس لیے صحن کے دوسری طرف کریمن کی چارپائی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اسے جگایا۔ وہ اٹھی، اٹھ کے بڑی بی بی کو سلام کیا اور پھر ان سے استفسار کے جواب میں لوٹا ڈھونڈنے چلی۔ صحن میں اس نے دیکھا، کہیں نہ تھا، بڑی بی بی نے پوچھا۔ "آخر تم رات برتن دھو کے سوئی تھیں یا نہیں؟"

"جی"

"تو میرا لوٹا بھی دھویا ہو گا۔"

"جی ہاں آپ کا لوٹا تو میں نے بہت احتیاط سے صاف کیا تھا۔ دیکھوں تو شاید باورچی خانے میں رکھ دیا ہو گا۔" باورچی خانے میں گئی اور وہاں سے کچھ کھڑکھڑاہٹ کے بعد بڑی بی بی کا لوٹا نکال لائی۔ صحن اب کافی روشن ہو گیا تھا۔ پہلے تو سوچا کہ ذرا تھوڑا سا اور سو لیا جائے پھر یاد آیا کہ رات برتن بہت سے تھے۔ اس لیے ان کو دھوتے دھوتے دیر ہو گئی تھی اور گھڑے نہیں بھر کے سوئی تھی۔ نیند تو بہت آ رہی تھی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں مگر بیوی کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ اس لیے اپنا بستر لپیٹ، چارپائی اٹھائی اور دیوار سے لگا دی۔ بستر کو فالتو سامان والی کوٹھڑی میں رکھ آئی۔

صحن کے ایک کونے میں ہاتھ سے چلا کر پانی نکالنے کا نل لگا تھا اس کے پاس گھڑے اٹھا لائی اور نل سے ایک، دو، تین حتیٰ کہ پانچ گھڑوں کا پانی نکالا۔ اٹھا اٹھا کے انہیں اپنی جگہ پر رکھا پھر صحن میں آئی اور بیوی کی پائنتی سے ننھے کے مستعمل ہوتے ہوئے پوتڑے لیے اور انہیں ایک طرف ایک تسلے میں ڈال آئی پھر ادھر جا کر وہ کپڑے جو رات کو دھلوا کے سکھانے کے لیے رسیوں پر ڈال رکھے تھے۔ اٹھا لائی۔ انہیں تہ کر کے بیوی کی پائنتی پر رکھ دیا۔ پھر ہاتھ منہ دھویا۔ گیلے گیلے ہاتھ بالوں پر پھیر کے جو جو بال سوتے میں بکھر گئے تھے انہیں جما دیا، مگر چونکہ رات گرمی کی وجہ سے بہت بے آرامی سے گزری تھی اور کروٹوں اور سر کے ہلنے جلنے سے بال کچھ معمول سے زیادہ بکھر گئے تھے، اس لیے وہ اپنی اسی سامان والی کوٹھڑی میں جہاں اس کا صندوق اور اس کی ایک آدھ دوسری چیز رکھی تھی، گئی اور ایک میلی سی دو تین ٹوٹے ہوئے دندانوں والی کنگھی نکال لائی۔ ابھی وہیں کھڑی کھڑی چوٹی کھول رہی تھی کہ صحن سے آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ "او کریمن اری او کریمن! کہاں غارت ہو گئی؟" کنگھی کو وہیں چھوڑ چوٹی کو باندھتی ہوئی "جی آئی" کہہ کر باہر نکل آئی۔ دیکھا تو بڑی صاحبزادی رقیہ اور میاں اصغر جاگے ہوئے ہیں اور وہیں سے چلا رہے ہیں "او کریمن، او کریمن، ارے کہاں مر گئی؟" کریمن نے کہا "جی میں تو یہیں تھی۔ کمرے میں بستر رکھنے گئی تھی۔" رقیہ

بولیں " اری جھوٹ کیوں بکتی ہے ' لیا ٹن کیس کی تو تو بال بناتی آئی ہے ۔"

" نہیں تو بی بی جی میں نے تو بالوں سے کنگھی تک نہیں چھوائی ۔ " توبہ کرری توبہ ! تو تو چنیا لپیٹتی چلی آ رہی تھی ' جھوٹی کہیں کی ' پانی لا منہ دھوئیں ' تو مجھے بھول جاتی ہے ' مجھے سکول جانا ہے ' اب بجے بجے کہتا ہے ' بجھے بجے!"

دوسری طرف میاں اصغر بولے " کریمن میرے کپڑے نکال لا ۔ مجھے بدلنے ہیں ؟ "

رقیہ " خود اٹھ کے کیوں نہیں پہن لیتا ۔ سستی کا مارا ہوا ۔ "

اصغر " تو آپا تمہیں کیوں نہیں پانی اٹھ کے لے لیتیں اور ابھی تو کسی نے آگ تک نہیں جلائی ' میں آج کھا کے کیا جاؤں گا ۔ اماں ' اے اماں ! اٹھو بھی نا ' اب سکول کا وقت ہوتا جا رہا ہے ۔ یہاں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔"

بیوی بھی جاگ اٹھیں ۔ کہنے لگیں " ابھی تو بہت سویرا ہے ' کیوں اتنا شور مچایا ہے ؟ " " شور کس نے مچایا ہے ؟ میں تو آپ کو جگا رہا تھا یہ آپا ہی صبح سے چلا رہی ہیں " ۔ " بکو مت اصغر ! اٹھتے ہی تو تم نے چیخنا شروع کر دیا ۔ میں نے کیا کیا؟"

" تو اماں کریمن سے کہو نا کچھ کرے ۔ میں کھا کے کیا جاؤں گا ؟ "

" او کریمن "

" جی ! بیوی !! ابھی آئی ۔ میں بی بی جی کے لیے صابن تولیہ لا رہی ہوں ۔ "

رقیہ نے کہا ۔ " اماں یہ کریمن ایک کام میں دس گھنٹے لگاتی ہے ۔ آپ اسے کچھ کہتیں بھی نہیں ۔"

بیوی نے رقیہ کو تو کچھ جواب نہ دیا کریمن سے کہا ۔ " مرغوب کو جگا دے ۔ " رقیہ منہ دھو رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ رات کی گرمی کی وجہ سے کپڑے بدن سے چپک رہے ہیں ۔ رات پسینا بہت آتا رہا ہے ۔ اس لیے منہ ہاتھ دھونا چھوڑ کر کریمن کو حکم دیا کہ غسل خانے میں صابن اور تولیہ رکھ آئے ' وہ ادھر گئی ' آپ اندر سے اپنے سکول کے کپڑے نکال غسل کرنے چلی گئی ۔ مگر اصغر اور مرغوب کو کون نہلائے ' انہوں نے منہ ہی دھونے پر اکتفا کیا اور اندر جا کر جلدی جلدی کپڑے پہنے ' کریمن نے رقیہ سے فراغت پا کر جلدی جلدی آگ جلائی اور دو چار روٹیوں کا آٹا گوندھ لیا ۔ اتنے میں اصغر اور مرغوب ناشتے کے لیے سر ہو گئے ۔ انہیں معمول کے مطابق چھوٹے چھوٹے نمکین پراٹھے پکا دیے اور ساتھ دہی دے دیا۔

رقیہ کے لیے اب لسی بنانی تھی ' کیونکہ وہ پراٹھے کے ساتھ ہمیشہ لسی پیا کرتی تھی ۔ مگر کریمن تو روٹی پکا رہی تھی ' لسی کون بنائے ؟ رقیہ نے شور مچانا شروع کیا ۔ " میری لسی کہاں ہے ؟ میری لسی نہیں بنائی ؟ کریمن نے پہلے کیوں نہیں بنائی ؟ " ------ خیر یہ گزری کہ اب تک رقیہ کی دادی نماز سے فارغ ہو چکی تھیں ۔ اس لیے بیوی نے ان سے کہا ۔ " اماں رقیہ کی لسی ذرا بنا دو اس نے شور مچا رکھا ہے ۔ " دادی اماں نے کریمن سے پوچھا " بلونی کہاں ہے ۔ " اس نے کہا " باورچی خانے میں ۔ " وہاں بڑی بی بی کو نہ ملی تو پھر شور ہوا ۔ " یہ کریمن کبھی چیز جگہ پر رکھتی بھی ہے یا نہیں اس پر خدا کی مار ' ابھی کل تو یہاں دیکھی تھی ' یہاں پڑی تھی ' یہاں ------ " کریمن نے کہا " باورچی خانے میں برتنوں کی الماری کے اوپر کے خانے میں رکھی تھی کسی دیگچی کے پیچھے ہو گئی ہو گی ۔ " بارے بلونی ملی ' لسی تیار ہوئی ۔ رقیہ نے ناشتہ کیا ۔ ادھر اصغر اور مرغوب نے بھی اپنا اپنا پراٹھا ختم کر لیا ۔ اتنے میں رقیہ کے سکول کی ملازمہ آ گئی ۔ وہ اس کے ساتھ سکول چلی گئی ۔ ادھر لڑکے بھی اپنے سکول کو روانہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد بیوی جی اٹھیں ۔ اٹھ کے پہلے شب خوابی کا میلا پاجامہ تبدیل کیا پھر ہاتھ منہ دھو کر اپنی ساس سے بالوں میں کنگھی کرائی ۔ اتنے میں کریمن چولھے کے کام سے فارغ ہو چکی تھی ۔ اس سے کہا گیا کہ بستر بڑھائے ۔ اس نے سب بستر اندر رکھے اور چارپائیاں اٹھا کر ایک طرف رکھیں پھر دالان کے آگے سے اور چولھے کے قریب قریب سے جھاڑو دی ۔ تھوڑی دیر میں مہترانی آ گئی اس نے کہا بی بی پہلے پوتڑے دھلوا لیجیے ۔ اس لیے کریمن سے پھر کہا گیا کہ پانی بھر بھر کے مہترانی سے کپڑے دھلوائے چنانچہ آدھ گھنٹے سے زائد وقت اس کام میں

صرف ہو گیا۔ بیوی کا اور اپنا ناشتہ بڑی بی بی نے تیار کر لیا تھا کیونکہ بیوی تو فقط تھوڑا بہت گوندوں کا حلوا جو بنا کر رکھا ہوا تھا، کھایا کرتی تھیں، باقی رہیں بڑی بی بی انہوں نے دہی سے ایک آدھ چپاتی کھالی۔

کریمن نے اس اثنا میں مسترانی کا گھڑا بھر دیا جس سے وہ نالیاں وغیرہ صاف کیا کرتی تھی۔ بعد میں اس نے ہاتھ وغیرہ دھو کے، نوکر کو آواز دی۔ اس سے گوشت اور میتھی پالک کا ساگ لانے کو کہا۔ خود گھر کا آٹا گوندھنے بیٹھ گئی۔ آج اسے کچھ فرصت سی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ بڑے میاں دورے پر جا چکے تھے اور آج ان کے ناشتے کی تیاری کا کام نہیں تھا۔ اتنے میں نوکر سودا سلف لے آیا۔ اس نے آواز دی کہ سودا لے لیجئے۔ کریمن آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس لیے نہ اٹھی۔ بیوی نے نوکر کی دوسری آواز پر خفا ہو کر کہا "کیوں ری اٹھتی کیوں نہیں اور کون تیرا باوا اٹھ کے جائے۔ سنتی نہیں وہ دیر سے کھڑا آوازیں دے رہا ہے۔" کریمن اٹھنے کو ہی تھی کہ بڑی بی بی نے کہا۔ "میں لے آتی ہوں تو گوندھتی رہ۔" جب آٹا گوندھ لیا تو مسالا پیسا، آگ جلائی اور گوشت چڑھا دیا۔ اب میتھی چن رہی تھی کہ آواز آئی "کریمن بھاگ کے آئیو، جلدی آ جلدی۔" کریمن چلی جا رہی تھی کہ پھر بیوی جی پکاریں "اری آتی ہے کہ نہیں ادھر ننھے نے سارا بستر خراب کر دیا ہے۔" بارے کریمن نے جا کے ننھے کو دھلوایا۔ نیچے کے کپڑے بدلوائے اور پھر سبزی کاٹنے لگی۔

کریمن کو اب شدت کی بھوک لگ رہی تھی کیونکہ صحت مند جسم ہونے کے باعث صبح ہی سے پیٹ خالی سا لگتا تھا۔ آج رات کی باسی روٹی بھی کوئی نہ بچی تھی اور صبح کے پراٹھوں کے بعد جو دو ایک چپاتیاں پکائی تھیں۔ وہ بڑی بی بی نے کھالی تھیں پھر بھی شاید ایک آدھ ٹکڑا بچا کچھا رہ گیا ہو اس لیے میتھی چھوڑ وہ باورچی خانے میں جانے کو تھی کہ بیوی جن کے آنکھیں دن بھر اور لوگوں کے کام میں گڑی رہتی تھیں۔" پکاریں اب کہاں سیر کے لیے جا رہی ہے۔ یہ میتھی جلدی جلدی صاف کر۔ لڑکے آدھی چھٹی میں ابھی آ جائیں گے۔" کریمن نے کہا۔ "جی ذرا دیکھنے چلی تھی کوئی ٹکڑا بچا ہو، بھوک لگ رہی تھی۔" بولیں "تجھے ہر وقت بھوک ہی لگی رہتی ہے۔"

کریمن نے ساگ کاٹ کر دھویا اور دیگچی میں ڈال دیا۔ اب ذرا ایک لمحے کی فرصت ہوئی تھی کہ بیوی نے کہا۔ "کریمن یہ لڑکیوں کے تکیوں کے غلاف بہت میلے ہو گئے ہیں۔ انہیں اتار کے لا اور ان کا ٹرنک بھی اٹھا لا میں تجھے دھلے ہوئے غلاف نکال دوں۔" چنانچہ غلاف بدلے گئے۔ بڑی بی بی نے پوچھا "دھوبن کپڑے نہیں لائی بہت عرصہ ہو گیا ہے کیا ہوا اسے؟" بیوی نے کہا "اس کی لڑکی بیمار ہے شاید اس لیے دیر ہو گئی ہو۔ کریمن جا تو رحیم کو آواز دے۔ اسے دھوبی کے ہاں بھیجیں اور وہاں اندر سے میلے کپڑے بھی اٹھا لا کپڑوں والی کاپی بھی لا کپڑے لکھوں۔" چنانچہ کپڑے لکھے گئے۔ رحیم سے جو کبھی کا ڈیوڑھی میں کھڑا تھا کہا کہ "دھوبن سے جا کے کہہ دے کہ آ کے کپڑے لے جائے پندرہ دن ہوئے خبر ہی نہیں لی۔"

کپڑے رکھ، ابھی چولھے کے پاس بیٹھی ہی تھی کہ بڑی بی بی نے کہا "کریمن ذرا میرے بالوں میں کنگھی کر دے، اندر سے اٹھا لا میری کنگھی۔ جانے سر میں کم بخت کھجلی کیوں ہوئی جا رہی ہے۔" کریمن نے اٹھ کے بڑی بی بی کی کنگھی چوٹی کی۔ خیال آیا کہ اب تو ذرا فرصت ہے۔ اپنے بالوں میں کنگھی کر لوں۔ اس لیے اپنی کوٹھڑی میں گئی اور وہاں بال بنا کے چوٹی باندھ رہی تھی کہ بی بی جی نے آواز دی "کریمن دیکھو سالن کو، کہیں جل نہ جائے۔" کریمن آ کے پھر پکانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اب دس بج گئے تھے۔ اصغر اور مرغوب آ گئے، انہیں جلدی سے روٹی پکا کر دی پھر باقی آٹے کی روٹیاں پکائیں۔ آگ بجھائی، پرات دھوئی، پھر بیوی اور بڑی بی بی کو کھانا دیا۔ رقیہ کے لیے الگ سالن نکال کے رکھا اور باہر رحیم کو روٹی دی، بعد اس کے آپ روٹی کھائی۔ اب سورج سر پر آ چکا تھا۔ سارا صحن تپنا شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے سب برتن اٹھا وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

بڑی بی بی نے اور بیوی نے کھانا کھا کر کریمن سے برتن اٹھانے کو کہا۔ ان کے برتن باہر کے برتن جمع کیے۔ انہیں مانجھا مگر برتنوں کو کریمن آہستہ آہستہ دھو رہی تھی اس ڈر سے کہ اگر جلدی جلدی دھو کے فارغ ہو گئی تو دیکھتے ہی بیوی کوئی نہ کوئی کام دے دیں گی لیکن ابھی دھو ہی رہی تھی کہ ننھے میاں کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے برتنوں کو ادھر ادھر ذرا زور سے فرش پر رکھنا شروع کیا کہ آواز سن کر بیوی سمجھ

جائیں کہ برتن مانجھ رہی ہے۔ مگر بیوی کیوں ننھے کو بہلانے کے لیے گود میں لے کر ادھر ادھر پھرتیں، وہیں سے آواز دی "او کریمن، او کر۔ ادھر آئیو" کریمن ہاتھ دھو کے گئی تو حکم ہوا کہ ننھے کو ذرا لے کر پھر، پنگوڑے میں بھی چپ نہیں ہوتا۔ کریمن نے پوچھا "بیوی دودھ کے لیے تو نہیں روتا؟" بیوی بولیں "تو مت مشورے دیا کر، دودھ میں نے اسے دس دفعہ پلایا ہے، اب وہ دودھ نہیں پیتا۔ معلوم نہیں اسے کیا خلل ہے؟ اسے لے کے ٹہل یہیں دالان میں۔"

یہ تھا دوپہر بھر کا کام۔ بی بی رقیہ جب اسکول سے آئیں تو انہیں کھانا دیا کچھ دیر پنکھا جھلتی رہی، مگر بیوی نے پھر بلا بھیجا۔ کریمن ادھر گئی ہی تھی کہ رقیہ نے پھر چیخنا شروع کیا۔ "او کریمن، کریمن!" وہ بیوی کے دالان میں، انہیں پنکھا جھل رہی تھی کیونکہ دوپہر کی گرمی میں وہ تو سو گئی تھیں، مگر کریمن کو حکم دے دیا تھا کہ پنکھا جھلتی رہ۔ صبح پانچ بجے سے اٹھی ہوئی تھی۔ ابھی تک سو دفعہ اندر باہر نکلی ہوگی۔ بدن چور ہو رہا تھا۔ پنکھا جھلتے جھلتے ذرا اونگھ گئی تھی کہ رقیہ کی آواز نے چونکا دیا۔ اب جواب دیتی ہے تو خطرہ ہے کہ بیوی جاگ نہ اٹھیں اور نہیں دیتی تو بی بی رقیہ سارا گھر سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ ناچار اٹھی اور رقیہ کے کمرے میں گئی۔ وہاں یہ کام تھا کہ ان کے کمرے کے دروازے بند کر کے باہر سے چکیں چھوڑ دی جائیں اور کہیں سے انہیں پنکھا ڈھونڈھ کے لا دیا جائے کیونکہ ان کے پنکھے پر تو ہر وقت چور لگے رہتے ہیں۔

پنکھا تلاش کرتی پھرتی تھی کہ بیوی کو مکھیوں نے تنگ کیا انہوں نے ننھے کے اوپر تو ململ کا ایک دوپٹا ڈال دیا تھا چونکہ کریمن انہیں پنکھا جھل رہی تھی اس لیے خود ویسے ہی پڑی تھیں۔ اب مکھیاں جو منہ ناک پر بیٹھنے لگیں تو وہ جاگ اٹھیں۔ کریمن کو کتنی مالزادی سب کچھ بنا دیا۔ خوب خفا ہوئیں۔ خیر گزری کہ ننھا سو رہا تھا۔ آواز بہت اونچی نہیں نکالتی تھیں ورنہ شامت ہی آ جاتی۔ کریمن آئی اور ساری دوپہر بیوی کے سرہانے پیڑھی پر بیٹھی اونگھتی ہوئی پنکھا جھلتی رہی۔ بہت دیر ایک جگہ بیٹھنے سے پاؤں بھی سو گئے مگر بیٹھی اونگھتی رہی۔

سہ پہر کے وقت پھر نقل وغیرہ کا سامان کرنا تھا۔ کسی کے لیے لسی بنائی۔ کسی کو خربوزے منگوا کے دیے اور بیوی کو حریرہ بنا کے دیا پھر شام کو سودا منگوایا۔ مسالا پیسا، ہنڈیا چولھے پر رکھی، سالن پکایا، روٹی پکائی۔ باقی دن اسی طرح گزر گیا۔ اس میں بی بی رقیہ کے کمرے میں جھاڑو دینا بھی شامل تھا کیونکہ ان کی چاندنی پر کسی نے میلا پاؤں رکھ دیا تھا۔ رقیہ نے اس کو اندھی، گدھی اور جو جو کچھ ان کے زبان پر آیا کہا اور یہ بھی کہا کہ ہمارے سر پر یہ عذاب معلوم نہیں کیوں سوار ہے۔ ایک آواز تو کبھی سنی ہی نہیں، دس آوازیں دو تو کچھ سنتی ہے اور پھر کام ایسا بد دلی سے کرتی ہے کہ نہ ہونے سے بدتر ہوتا ہے۔ معلوم نہیں اماں نے اسے کیوں رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال سرِشام کریمن نے صحن میں چارپائیاں بچھا دیں۔ ان پر سب کو کھانا کھلا کے، برتن جمع کر کے انہیں صاف کیا۔

اب رات کے دس بج چکے تھے۔ کریمن نے ابھی ابھی برتنوں سے فراغت حاصل کی تھی۔ اب کمرا صاف کر رہی تھی۔ ٹانگیں ایسی بوجھل محسوس ہو رہی تھیں جیسے ان میں سیسہ بھرا ہوا ہے۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں لہٰذا اس نے سوچا کہ پانی صبح اٹھ کے بھروں گی اب تو نل نہیں چلایا جائے گا اور پھر اس کے چلانے سے شور ہو گا اور سوچا کہ گھڑونچی کے گھڑے تو ابھی خالی نہ ہوئے ہوں گے کیونکہ سہ پہر کو دیکھے تھے آدھے آدھے بھرے ہوئے تھے۔ اس لیے اپنی چارپائی بچھانے چلی۔ آج پھر ہوا بند تھی مگر کل جتنا حبس نہ تھا۔ چارپائی تو بچھا لی، اندر سے بستر لانا دوبھر ہو گیا۔ بہرحال لے آئی اور بچھانے کے ساتھ جو پڑی تو ایک ہی منٹ میں سو گئی۔

ابھی رقیہ اور اصغر جاگ رہے تھے۔ اپنے اپنے سکول کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میاں اصغر کو پانی کی ضرورت ہوئی۔ وہ اٹھ کے لوٹا بھرنے گیا تو دیکھا کہ گھڑے میں پانی نہیں ہے۔ بس اس نے چلانا شروع کیا۔ "گھڑوں میں کبھی پانی ہوتا ہی نہیں۔ معلوم نہیں بہشتی کیوں نہیں رکھ لیتے۔ روز دیکھتا ہوں پانی نہیں ہوتا۔ اب میں کیا کروں؟" اصغر کی دادی غالباً جاگ رہی تھیں کہنے لگیں "بیٹا باورچی خانے میں سے لے لو" مگر اصغر کیوں جاتا۔ وہیں سے گیا اپنی والدہ کے سرہانے اور لگا انہیں جھنجوڑنے "اماں! اماں! اے اماں!!" ان کی ابھی ابھی آنکھ لگی تھی یکلخت جو جاگنا پڑا بہت غصہ آیا۔ کہنے لگیں۔ "ہے ہے تجھے صبر بھی نہیں پڑتا۔ کسی کو سونے بھی دیتا ہے کہ نہیں؟ سارا دن گرمی سے آنکھوں پر نیند حرام رہی، اب ذرا سوئی تھی کہ جلاد سر پر آن سوار ہوا۔"

"تو میں کیا کروں۔" اصغر نے جھلا کے جواب دیا "گھڑوں میں پانی بھی ہو، مجھے صحت خانے جانا ہے۔"

"تو میرے سر کیوں ہوا ہے نامراد، کریمن مردار سے کہہ وہ نواب زادی تو سرِ شام ہی سو جاتی ہے۔ اسے کہہ تجھے پانی نکال کے دے۔ ایسی کاہل بھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔ توبہ ایسی نیند کی پیاری ہے کہ پانی تک نہیں رات کو بھر سکتی۔ اٹھا اس کام چور کو! او کریمن------ او کریمن------ اے کریمن--------"

○

حیات اللہ انصاری

نام : حیات اللہ انصاری

قلمی نام : حیات اللہ انصاری

پیدائش : یکم مئی ۱۹۱۲ء بہ مقام فرنگی محل، لکھنؤ۔ بھارت

تعلیم : بی۔ اے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۳ء

"الکفایتہ الفکریہ" کی اعزازی سند، مراکش یونی ورسٹی

ابتدا اپنی نانی اماں سے قرآن مجید کا سبق لینا شروع کیا۔ اس کے بعد مدرسہ نظامیہ، فرنگی محل لکھنؤ سے "مولانا" کی سند لے کر ۱۹۲۹ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ مولانا سید علی نقی، مولانا سید سبط حسن اور خلیل عرب سے عربی کی تعلیم پائی۔ میٹرک ۱۹۲۹ء میں کیا۔ جوبلی کالج، لکھنؤ سے ۱۹۳۱ء میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی سے "فاضل ادب" کیا اور ۱۹۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے بی۔ اے۔ مراکش یونیورسٹی نے آپ کو "الکفایتہ الفکریہ" (ڈاکٹریٹ) کی اعزازی ڈگری دی۔

مختصر حالاتِ زندگی:

آپ کے جدِ امجد مولانا قطب الدین قصبہ سہالی، بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ مذہبی، علمی تصنیف و تالیف کا کام آپ کے خاندان میں ساڑھے چار سو برس سے ہوتا چلا آیا ہے۔ شہنشاہِ ہند جلال الدین محمد اکبر نے اپنی تخت نشینی کے چار برس بعد حیات اللہ انصاری کے جدِ اعلیٰ ملا حافظ کی علمیت کے اعتراف میں شاہی مکتوب سے نوازا۔ واضح رہے کہ تاحال اکبر کا یہ پہلا نجی خط شمار کیا جاتا ہے۔ اس خط میں جلال الدین محمد اکبر نے ملا حافظ کو چار القابات سے نوازا تھا۔

حیات اللہ انصاری نے ۱۹۲۷ء میں مدرسہ نظامیہ، فرنگی محل میں کچھ مدت درس دیا اور اس کے بعد سیاست کی طرف نکل گئے۔ کانگریس میں شمولیت اختیار کی، ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۲ء ہفتہ وار "ہندوستان"، ۱۹۴۰ء تا ۱۹۷۲ء ہفتہ وار "قومی آواز" اور ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۶ء ہفتہ وار "سب ساتھ" کے ایڈیٹر رہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اور تعلیم گھر، لکھنؤ سے وابستہ رہے۔ کل ہند تعلیم گھر، لکھنؤ کے بانی ہیں۔ حکومتِ ہند کی طرف سے دوستانہ مشن پر متعدد ممالک کا دورہ کیا اور جو ملک بچ رہے وہاں خود اپنے خرچ پر ہو آئے۔ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۶ء یو۔ پی کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر رہے۔ ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۲ء راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔ نومبر ۱۹۸۴ء میں راجیہ سبھا (ہند) کے ممبر تھے۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کے صدر نشین رہ چکے ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"بڈھا سود خوار" مطبوعہ "جامعہ" دہلی: جون ۱۹۳۰ء

یہ افسانہ ستمبر ۱۹۲۹ء میں قلم بند کیا۔ اس سے قبل بچوں کے لیے چند ڈرامے لکھ چکے تھے۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	"انوکھی مصیبت" افسانے		طبع اول: ۱۹۳۸ء
۲۔	"بھرے بازار میں" (افسانے)	مکتبہ اردو، لاہور	طبع اول: ۱۹۴۲ء

یہ در حقیقت "انوکھی مصیبت" کا دوسرا ایڈیشن ہے جبکہ اس میں چند نئے افسانوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ دیباچہ کے نیچے ۱۵ اگست ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج ہے۔

۳۔	ن۔م۔راشد (تنقید/کتابچہ)	دہلی،	طبع اول: ۱۹۴۴ء
۴۔	"شکستہ کنگورے" (آٹھ افسانے)	آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی،	طبع اول: ۱۹۴۵ء

دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

۵۔	"دس دن میں اردو" (اردو قاعدہ)	کتاب دان، لکھنؤ،	طبع اول: ۱۹۵۲ء
۶۔	"دس دن میں ہندی" (ہندی قاعدہ)	کتاب دان، لکھنؤ،	طبع اول: ۱۹۵۳ء
۷۔	"لہو کے پھول" (ناول)۔ پانچ جلدیں	کتاب دان، لکھنؤ،	طبع اول: ۱۹۶۹ء

اوپندر ناتھ اشک کے ناول "گرتی دیواریں" سے پہلے یہ اردو کا ضخیم ترین ناول رہا ہے۔

۸۔	"مدار" (ناول)	کتاب دان، لکھنؤ،	طبع اول: ۱۹۸۱ء
۹۔	"گھروندہ" (ناول)	کتاب دان، لکھنؤ	طبع اول: ۱۹۸۲ء
۱۰۔	قاعدہ نما" ("دس دن میں اردو" کا ہدایت نامہ)	کتاب دان، لکھنؤ،	طبع اول: ۱۹۷۵ء
۱۱۔	"ترقی اردو ریڈر" (مرتبہ)	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی،	طبع اول: ۱۹۷۸ء

تعلیم بالغاں کے سلسلے کی دوسری کتاب جس میں نظمیں، اور معلوماتی مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔

۱۲۔	"جدیدتی افسانے کی سیر" (تنقید)		طبع اول: ۱۹۸۸ء

مستقل پتا:

2/4۔B۔ ریور بینک کالونی، لکھنؤ، بھارت۔

اعزاز:

۱۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ: ۱۹۷۰ء

۲۔ الکفایتہ الفکریہ (اعزازی ڈاکٹریٹ) مراکش یونی ورسٹی۔

۳۔ کینز فلم فیسٹیول ایوارڈ یافتہ فلم "نیچا گھر" کی کہانی لکھی۔

نظریہ فن:

"زندگی کے چار مناظر بیماری' بڑھاپا' غریبی اور موت نے مہاتما گوتم بدھ کو نروان کی تلاش میں سرگرداں کر دیا تھا۔ تب زندگی ہلکی پھلکی تھی' پیداوار کی افراط تھی اور آج کی طرح کا استحصال نہ تھا' جو کہ دوکانداری اور پولیس سے لے کر حکمرانی اور عالمی جنگ تک جاتا ہے اور دوسری طرف وہ صحافت' تاریخ نویسی اور مذہب کی ترجمانی تک میں گھس جاتا ہے۔ آج تو گوشہ عافیت میں بھی مظلوم کی آہیں پہنچ کر سکون درہم برہم کر دیتی ہیں۔ اس تاریک خانے میں افسانہ نویس کا قلم' نروان تو بہت بڑی چیز ہے' روشنی کی چھوٹی موٹی کرنیں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ جہاں وہ مل جاتی ہے' مکڑی کی طرح اس کو الفاظ کے جال میں مقید کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ محررہ ۱۰ نومبر ۱۹۸۳ء)

حیات اللہ انصاری

آخری کوشش

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا:

"ٹکٹ!"

گھسیٹے نے گھگیا کر بابو کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ماں کی گالی دے کر اسے پھاٹک کے باہر دھکیل دیا۔ ایسے بھک منگوں کے ساتھ جب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں تو اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟

گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستہ بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سنیں، ٹھوکریں سہیں۔ بیسیوں بار ریل سے اتارا گیا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن پیدل بھی چلنا پڑا، ایک دن کے سفر میں بائیس دن لگے مگر ان باتوں سے کیا؟ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے ۔۔۔ وطن! پچیس برس کے بعد وطن۔ ہاں پچیس ہی برس تو ہوئے جب میں کلکتہ پہنچا تو کالی مل کھلی تھی اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آ گئے وطن۔ ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے۔ اگر یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو دو کوس کا کچا راستہ اور ۔۔۔ دو گھنٹہ کی بات۔

اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جن کا پچیس سال سے مزا نہیں چکھا۔ کلکتہ میں گھر کے نام کو سڑک تھی یا دکانوں کے تختے یا پھر شہر سے میلوں دور ٹھیکہ دار کی جھونپڑیاں، جس کی زمین پر اتنے آدمی سوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر کی جگہ نہ ملتی تھی۔ رہے اپنے لوگ، سو وہاں اپنا کون تھا؟ سب غرض کے بندے، بے ایمان، حرام زادے، ایک وہ سالا تھا بھوندو اور دوسرا تھا بھورا اور وہ ڈائن بھنگوی جو خونچے کی ساری آمدنی کھا گئی، وہ ملوں کے مزدور۔ بھائی ہیں بھائی ہیں، مگر مزدوری کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔ جہاں جاؤ کوئی دوسرا مزدور سفارش لئے موجود۔ یہاں سفارش کرنے والا کون تھا؟۔۔۔ جب جیلر نے آ کر مجھے حکم سنایا ہے کہ 'تیری معیاد ختم' تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے۔ بس ایک دم سے گھر کی یاد آ گئی۔ گھر! کیا چیز ہے؟

گھسیٹے کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی سکھ مل جائے گا، اور گھر اب قریب تھا۔

اسٹیشن سے کچھ دور آ کر گھسیٹے بھونچکا سا رہ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکر مل کھڑی دھواں اڑا رہی تھی۔ جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں۔ کچی سڑک کی جگہ اب پکی سڑک تھی اور اس کے برابر مل تک ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ سڑک خوب آباد تھی۔ مزدوروں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے غول آ جا رہے تھے۔ اتنی دیر میں کئی موٹریں فراٹے بھرتی نکل گئی تھیں۔ ایک مال گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی تھی۔ غرض کے جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اتر کر اپنے ہی قصبہ کا راستہ پوچھوں۔ یہ آپ ہی آپ ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور آ کر جب شکر مل کی حدیں ختم ہونے لگیں، اور اوکھ کے کھیتوں اور باغوں کے سلسلہ آ گیا۔ تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا میرا راستہ ٹھیک ہے۔

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد اپنے قصبے کے تاڑ دکھائی دینے لگے۔ ذرا اور چل کر شاہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جس کا ایک مینار تو ناچتی ہوئی بیلوں سے منڈھا اور جنگلی کبوتروں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلم زمین پر لیٹا کائی کی مخملیں چادر اوڑھے تھا۔ اس پر نظر پڑتا تھی کہ

بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چکی تھیں ۔ پچیس برسوں کے بھاری بوجھ کے نیچے ایکدم پھڑ پھڑا کر تڑپ کر نکل آئیں اور کم سن دیہاتی چھوکریوں کی طرح سامنے اچکنے کودنے لگیں ۔ وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جب اس مسجد کے گرد پانی بھر جاتا اور گاؤں بھر کے لونڈے ننگے اس میں نہاتے تھے ۔ اس وقت بھی یہ کھڑا تھا اور لینا چماریوں ہی لینا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا ۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہیرا ' بھاتی ' بلاقی ' تیتو ' نیولا ' سورج ' بلی اور وہ کنوا سالا کیا نام تھا اس کا اور کون کون ساری کی ساری ٹولی جمع ہوتی تھی اور دن دن بھر سیار مارا ڈنڈا اڑا کرتا تھا۔ وہ گڑھیا کے اس پار امرود کا ایک باغ تھا۔ اس پر بھی کبھی لونڈا ڈاکہ پڑا کرتا تھا۔ لونڈے گھس گئے اور چپکے چپکے کچے پکے امرود نوچ نوچ کر جیبوں میں بھرنے لگے۔ اور رکھوالا ماں بہن کی سناتا دوڑا اور ادھر آنا "فانا" میں سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے امرود کھسوٹ رہے تھے کہ ادھر سے ایک فقیرنی آنکلی جو منمنا منمنا کر گا رہی تھی۔ کچھ لونڈوں کو سوجھی شرارت۔ وہ چڑیل چڑیل چلا کر بھاگے ۔ پھر کیا تھا۔ سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے ۔ بلاقی رہ گیا۔ ارے ڈر کے مارے اس کی جو گھگھی بندھی ہے اور جو لگا ہے فقیرنی کے سامنے ہاتھ جوڑنے ۔۔۔۔۔۔۔۔

گھسیٹے یہ یاد کر کے بے اختیار ہنس پڑا ۔

سورج دن بھر کا سفر طے کر کے افق کے قریب پہنچ چکا تھا ۔ دھوپ میں ملائمت آگئی تھی اور ہوا میں خوش گوار خنکی ۔ راستے کے ایک طرف پتاور کے ہرے بھرے جھنڈ تھے ۔ جن کے بیچ بیچ سے بوڑھی سرکیاں سروں کو نکالے جوانوں کی طرح کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھیں ۔ دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا ۔ بسیرا لینے والی میناؤں اور کوؤں کا شور کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں ' ہلواہوں کی ہٹ ہٹ ' باغوں کے رکھوالوں کی ہو ہو ' ان سب سے ہوا اسی طرح بسی ہوئی تھی ' جیسے پتاوروں کی بھینی بھینی میٹھی میٹھی خوشبو سے معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے یعنی کھیت ' درخت ' ہوا ' آنے والی صدائیں اور خوشبو ' سب قریبی رشتہ دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں ۔

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آتا ہوا ملا ۔ آگے آگے ایک لڑکی چھٹی اوڑھنی سر سے لپیٹے گاتی چلی جا رہی تھی ۔ اس کے پیچھے ہلوں کو کندھے پر رکھے ' بیلوں کو ہنکاتے چھ سات مرد تھے ۔ ان لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ نہ کی ۔ مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص سے نگاہ ملی ۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا جیسے کوئی دور دراز سفر سے آنے والا اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے ۔

ادھر سورج افق کے دامن میں چھپا اور ادھر قصبہ آگیا ۔ اس کا نشان ایک اکل کھرا تاڑ تھا جس سے کچھ دور ہٹ کر آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھندلکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے ۔ اس مقام سے ایک بہت رومان بھری یاد انگڑائی لے کر اٹھی اور گھسیٹے کے پاؤں تھام لئے ۔ وہ بلا ارادہ کھڑا ہو گیا ۔ وہ سامنے کی جھاڑی اور گڑھیا یہیں دلاری سے چھپ کر ملتے تھے ۔ وہ بھرے جسم کی بھنا ایسی دلاری جس کے نہ روٹھنے کا ٹھیک پتہ چلتا تھا اور نہ منٹے کا ۔ وہاں بیٹھ کر وہ دلاری کا انتظار کرتا تھا ' تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے ۔ شہر جاؤں گا ' نوکری کروں گا ۔ دونوں وقت چنے چباؤں گا مگر روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھوں گا ۔ پھر جب ڈھائی سو روپیہ ہو جائے گا تو واپس آؤں گا اور ہیرا لال کی طرح ایک دم سے ایک گوئی بیل لے کر کھیتی شروع کروں گا ۔ اسی وقت دلاری میری کتنی خوشامدیں کرے گی ۔ میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا ۔ بس اس جگہ ٹہلنے آجایا کروں گا ۔ وہ آئے گی ضرور ' اور وہاں درخت کی جڑ پر بیٹھ ' گڑھیا میں ڈھیلے پھینکے گی ' گنگنائے گی۔ میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنسے گی ۔۔۔۔۔۔ بڑی چڑیل تھی نہ جانے اب کہاں ہے ؟

گھسیٹے درختوں کے اندر گھس کر دیکھنے لگا کہ پرانی گڑھیا اب تک ہے ؟ ہاں ہے تو اور وہ سامنے جمنی کا درخت بھی ہے جس کی جڑ پر وہ بیٹھتی تھی ۔ کیا زمانہ تھا!

گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پر آگیا اور قصبے کے اندر چلا ۔ مگر اب اس کی چال دھیمی تھی ۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سننا بھول گئے تھے ۔ ایکا ایکی ایک موڑ پر چونک پڑا جیسے کوئی بسری بات اک دم یاد آگئی ہو ۔ یہی جگہ تو ہے ۔ ہاں یہیں ا!

نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شبن میاں کی قمیض کا بٹن نوچ لیا تھا ادھر شبن میاں گھر کے اندر آئے اور ادھر ڈانٹ لگائی۔ "گھسیٹے! گھسیٹے" ----- کدھر مر گیا؟" ٹانگیں پھیلا کر دونوں بوٹ میرے منہ کی طرف بڑھا دیئے ان کو اتارو' پھر جرابیں اتارو' پھر انگلیوں کو تولیے سے پونچھو' پھر جوتی لا کر پاؤں کے نیچے دھرو ---- شبن میاں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ ان میں سے دو ایک ایک ہمارے پاس بھی ہوتیں! ہمارے پاس کیا تھا؟ ایک پھٹا کرتہ پاجامہ پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑے ہو جاتا تو خان صاحب پھر کسی کا پرانا دھرانا جوڑا دے دیتیں۔ "پھر پھاڑ لایا۔" "اس کے بدن پر تو کانٹے ہیں" - "یہ کہاں سے کھونچا لگایا؟" ---- کمینے کو کبھی تمیز نہ آئے گی۔ "ایک بار شبن میاں کے کمرے میں جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ قمیض کے کف کے دو بٹن پلنگ پر پڑے چم چم کر رہے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ایک مٹھی میں دبا لیا۔ تھوڑی دیر میں شبن میاں چلانے لگے۔ "ایک بٹن کیا ہوا؟ کون لے گیا؟" میں نے جی میں کہا۔ میں لایا ہوں۔ کہو کیا کہتے ہو؟ بٹن تو نہ دوں گا چاہے کچھ کرو۔ بلکہ اب تو تمہارے گھر کا کام بھی نہ کروں گا۔ سب کی آنکھ بچا کر باہر چلا آیا۔ میری قمیض میں آستیں کہاں تھی؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگایا کہ بٹن اور زنجیریں' دونوں چیزیں باہر چم چم کریں اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتوں کھیتوں گھومتا رہا۔ جب رات آگئی تب فکر ہوئی کہ اب کہاں جاؤں گا۔ میں ادھر ادھر دبکتا پھرتا تھا کہ ابا نے جو میری کھوج میں لگے تھے' دیکھ لیا۔ "تو شبن میاں کا سونے کا بٹن لے آیا ----- سونے کا بٹن" - دو تھپڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا۔ سونے کا بٹن۔ کلکتہ میں چار پیسے پتہ ملتا ہے جتنے چاہو اتنے لے لو۔

چھپروں اور نیچی نیچی کچی دیواروں پر شام کی سانولی رنگت چھا گئی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ جس سے دل کو عجب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چولھے جل گئے تھے جن کا دھواں اور سرخی چھپروں سے نکل نکل کر بلا کسی گھبراہٹ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کو لئے بھاگی جا رہی تھیں۔ دوارے پر لڑکے لڑکیاں اونچا نیچا کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے جیسے بسیرا لیتے وقت جنگلی مینائیں -- ایک گھوڑا دن بھر دوڑ دھوپ کرکے ابھی ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے ہنہنا رہا تھا۔

آخر مسجد آگئی۔ اسی کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔ پہلی تاریخوں کا ہلال مسجد کے ایک مینار سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بارات یاد آگئی۔ جو باجے گاجے لئے مشعلیں جلائے ایک کمزور سی ناؤ پر' چڑھی گنگا کی خونی لہروں کو پار کرکے کنارے آ اتری تھی۔

بنیا بھی آگئی۔ اس کے پار آبادی سے ذرا نکل کر گھر تھا۔ گھسیٹے کا دل امید و بیم سے زور زور سے دھڑکنے لگا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ آنکھوں کے سامنے گھر کی تصویر پھر گئی۔ بڑا سا صاف ستھرا لیپا پوتا چھپر۔ دو بڑی بڑی اناج کی کٹھیاں۔ رات کو نہ معلوم کب سے اٹھ کر اماں کا گھرڑ گھرڑ چکی پیسنا اور اس پر گانا۔ "موری چھاگل نہ بولے۔ "اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ۔ اور رو دھو کر اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی ہیں۔ جب اس کا جی چاہتا تب اٹھ کر چولھا جلاتی بمیا اور شبراتن! اوہ! دونوں کو اماں کتنا مارتی تھی۔ اور تھیں وہ بھی دونوں بڑی حرامزادی۔ کبھی جو کام کرتیں ----- ادھر ابا کلہاڑی کندھے پر رکھے بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلانے لگتا۔ ادھر اماں پر غصہ آیا اور جوتے پکڑ کر دھوئیں دھوکیں ----- واہ ری اماں جہاں کسی کا جی خراب ہوا اس کے جی کو لگ گئی۔ پھر تو یہ ہے۔ ارے آ جا۔ سر داب دوں" ---- ادھر آ نظر گجرا تاروں ---- چاندنی میں بیٹھ کر نہ کھا۔ "دونوں وقت ملتے نہ چلا۔ ہر وقت ٹھٹکا اتار رہی ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ دوا پلا رہی ہے ---- کھانے کی کتنی شوقین تھی۔ کچے پکے۔ گلے سڑے' کھٹے میٹھے جیسے ہی آم مل جائیں بڑے مزے سے بیٹھ کر سب کھا جاتی تھی۔ کچے پکے امرود' جھربیریاں' کیتھے اور کیا کیا سب شوق سے کھاتی تھی مگر بچوں کا کھانا اسے برا نہیں لگتا تھا۔ وہ قصہ جو ہوا تھا کہ اماں کو کہیں سے گڑ کی بھیلی مل گئی۔ اس نے طاق میں رکھ دی۔ میں ادھر سے آؤں چرا کر ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ شام کو ابا نے جو دیکھا تو ذرا سا گڑ تھا۔ وہ لگے ڈکارنے۔ کون کھا گیا؟" اماں سمجھ گئیں۔ سہولت سے بولیں۔ "چوہا کھا گیا ہو گا" ---- "تو کھا گئی ہے تو کیا چوہے بلی گڑ کھاتے ہیں۔؟" اماں نے کہا۔ "کیوں؟ "کیا ان میں جان نہیں ہے؟" میں نے جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لوٹوں گا تو گڑ کی ایک

پاری بھی لاؤں گا۔ تب تو یہی ابا چٹخارے ماریں گے۔" واہ کیا مچا ہے۔" ہمیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا کر تکیں گی۔ منہ سے پانی چھوٹے گا۔

گھر میں اب کون ہو گا؟ ابا اماں بھلا کیا زندہ ہوں گے؟ ستر اسی برس کون جیتا ہے۔ ہمیا اور شبراتن کہیں بیاہ دی گئی ہوں گی۔ ہاں فقیرا تو جوان ہو گا۔ بھورے کے تو بیوی بچے ہوں گے اور بکریاں؟ اوہ کلو کے ناتوں کی ناتنیں ہوں گی۔ کلو زندہ ہو تو پہچانے گی؟ جب بھوکی ہوتی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کر کیسا میں میں کرتی۔

۲

سامنے گھر ہے کہ نہیں؟ بغیا سے باہر آتے ہی گھسیٹے کے دل نے دھڑک کر بڑی بے تابی سے پوچھا۔۔۔ وہ جگہ تھی وہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اوس کی ماری بیمار چاندنی میں اندھیرے اجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصہ تو ٹیلے کی طرح ڈھیر تھا۔ آدھا جو کھڑا تھا۔ اس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر تھا جس کا پھونس دھواں کھائے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔ چھپر کے سامنے کی طرف چودھری کی جگہ جھاڑوں' تاڑ کے پتوں اور کسی سوکھی بیل کا ملا جلا ایک اژدہام تھا جن کے پتلے پتلے ٹیڑھے میڑھے سائے بچھوؤں اور کنکھجوروں کی طرح زمین پر بچھا رہے تھے۔ گھر اپنے سناٹے میں قبرستان تھا۔ اندر نہ چولھا جل رہا تھا نہ چراغ۔ گھر کی ایک ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہیں۔۔۔ تم کو کیا کھلائیں گے؟"

یہی گھر تھا جہاں مسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔ گھسیٹے کی امیدوں کا چمن جسے وہ بائیس روز سے پچیس برسوں کے کچلے ارمانوں کے خون سے سینچ رہا تھا' اکبارگی مرجھا گیا۔ اس کا دل بار بار شک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہو گا۔ وہ لوگ کہیں اور اٹھ گئے ہوں گے' اور بار بار بکریوں کے موت کی کراہند اور نابدان کی سڑاہند جو بوجھل ہوا سے دبی ہوئی گھر کے گرد مقید تھیں' ان بالو کے گھروندوں کو ڈھا دیتیں۔ گھسیٹے آدھ گھنٹے تک جہاں تہاں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دور کہیں پر ایک پلا رو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز سے ایک طرح کی ڈھارس بندھی اور یہ کھکھارا' جواب نہ ملنے پر پھر کھکھارا' بار بار کھکھارنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا

"اندر چلی آؤ نا۔"

اس دھوکے سے گھسیٹے کی ہمت اور سکڑ گئی۔ اب کی وہ سہارا لینے کو بیچ بیچ کھکھارا' پھر کہنے لگا

"کون فقیرا؟"

"ہاں!"

فقیرا ذرا چڑ کر بولا۔ "تم کون ہو؟"

"ذرا ادھر آؤ۔"

فقیرا نکل کر قریب آیا اور بولا۔ "تم کون ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ذرا سنو تو بھائی' تم فقیرا ہو نا؟"

"ہاں۔۔۔۔ کہہ تو دیا۔"

"تم یہیں رہتے ہو۔"

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصہ تو غائب ہو گیا مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہچنوائے۔ اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ کام بھی کرنا ہو گا۔ آخر دل کڑا کر کے بولا "میں بائیس روز کا سفر کر کے آرہا ہوں ۔۔ تمہارے پاس۔"

اب بھی فقیرا کچھ نہیں سمجھا مگر بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا "تو اندر آؤ۔"

اندر آکر گھسیٹے کی ہمت بندھی اور ساتھ ہی راحت پانے کی امید بھی بلاوجہ ہریانے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچ کر چراغ جلا دیا۔ چھپر کے نیچے سات بکریاں اور بکریوں کے بچے بندھے تھے۔ انہیں سے شاید گھرانے کی روٹی چلتی تھی زرا ادھر ہٹ کر زمین پر ایک چھید ا ٹاٹ بچھا تھا جس پر ایک میلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہو مگر چیتھڑا ہو کر گمنام ہو گئی تھی 'اوڑھنے کے لئے پڑی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے 'چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھا۔ دبلا پتلا 'آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کھردری اور اس پر دونوں طرف دو لمبی لمبی جھریاں 'جیسے کچی دیوار پر برکھا کے پانی کی لکیریں۔ بال کھچڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا! مصیبت زدہ گھسیٹے دیکھنے میں اس سے زیادہ جوان تھا۔

گھسیٹے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "بھیا تم تو جوانی ہی میں بوڑھائے گئے۔"

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا

"جوانی تو کھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے۔"

"سچ ہے بھیا ۔۔ بھورا' بھیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

اب فقیرا ٹھٹکا ۔۔ "پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو ۔۔ گھسیٹے تو نہیں ہو"۔

"ہاں گھسیٹے ہوں اور کون۔ بائیس دن ٹھوکریں کھا کر آرہا ہوں۔"

بھیا کہہ کر فقیرا اس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچ کر اسے لپٹا لیا اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے 'اس کے آنسو ڈھل ڈھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رو دیا۔

تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے کو ڈھارس دلائی کہ "اب نہ رو' یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آگئے۔۔ اماں کو دیکھو گے؟"

گھسیٹے کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اماں!۔۔ ہے کیا؟"

"ہاں"۔

چھپر کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فقیرا اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا "وہ پڑی ہے۔"

گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جوش میں ادھر بھاگا۔

یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن ایک انسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔ سر کے بال بیمار بکری کی دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑے نمدے کی طرح جم گئے تھے۔ آنکھیں دھول میں سوندی کوڑیوں کی طرح بے رنگ اپنے ویران حلقوں میں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ ان کے کونے کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت تھے۔ گال کی جگہ ایک جھلی سے کھال رہ گئی تھی جو دانتوں کے غائب ہونے سے کئی تہوں میں ہو کر جبڑوں کے نیچے آگئی تھی۔ گال کے اوپر کی ہڈیوں پر کچھ پھولا پن سا تھا' بد گوشت ہو یا ورم! جیسے روتے روتے ورم آگیا ہو۔ گردن اتنی سوکھی تھی کہ ایک ایک رگ نظر آرہی تھی۔ ننگے سینے پر چھاتیاں لٹک رہی تھیں جیسے بھنچی ہوئی الٹی بنڈی کی خالی جیبیں۔ چہرے کی ایک ایک جھری سخت گھناؤنی مصیبتوں کی مہر تھی جسے دیکھ کر بے اختیار ڈھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا

تھا۔

فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی۔ اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے جھوٹ موٹ کا نوالہ بنا کر اپنے منہ کی طرف بار بار لے جانے لگی۔ جیسے گونگا کھانے کو مانگے۔ بڑھیا نہ معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آیا تھا۔۔ باپ۔۔ باپ۔۔ باپ۔۔ باپ۔۔ باپ۔"

اس کی آواز ایسے ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھیں' جہاں کے رہنے والے آگ سے جل مرے تھے اور اب اس کے کھنڈروں میں دن کو بندر چیختے اور رات کو سیار روتے تھے۔

فقیرا نے گھسیٹے کی طرف دیکھ کر کہا جب اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔ چاہے جتنا کھلاؤ اس کا جی نہیں بھرتا۔ منہ سے نکل نکل پڑتا ہے' پھر بھی مانگے جاتی ہے۔"

آخر گھسیٹے بڑی کوشش سے بولا۔ "اماں۔"

آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کراہ رہا تھا۔ فقیرا نے کہا۔ "نہ وہ سنتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ بس کھانے کی بات سمجھتی ہے۔"

بڑھیا کا پوپلا منہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا' باپ کی آواز نکل رہی تھی' اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منہ کی طرف جا رہا تھا مگر ان حرکتوں پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ پنجر زندہ ہے۔

یہ وہی چوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منہ اندھیرے سے دوپہر تک مسلسل چکی پیسا کرتی تھی! جسے دن رات یہی دھن سوار رہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے۔ اس نے کیسا کیسا اپنا جی مارا۔ ذرا ذرا سی چیز کے لئے کیسا کیسا ترستی رہی۔

گھسیٹے کے دل میں ماں کے لئے ترس بھرا یا ابل پڑا جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ دعا مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر اور اب تو اسے ناپاک دنیا سے اٹھا لے۔ اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اسے سکون مل جاتا' مگر افسوس آنسوؤں جیسی نعمت کوسوں دور تھی۔

فقیرا کے لئے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے کہا۔۔ "بھیا! تم ذرا ہاتھ منہ دھو لو۔ میں کھانے پینے کا کچھ سیتا کروں۔"

فقیرا بھاگتا ہوا بنیا کے اس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا ادھار مانگ لایا اور پھر چولھا جلا کر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی چولھے کے پاس آ بیٹھا اور بولا "اتنا آٹا؟ کیا تم نے ابھی نہیں کھایا؟"

"نہیں' آج آٹا ختم ہو گیا تھا تو میں نے کہا کہ ایک رات یوں ہی سہی۔"

"اب کھیتی نہیں ہوتی۔"؟

"وہ کب کی بند ہو گئی۔ ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہو گئی میں اکیلا رہ گیا۔ دو برس تک ترکاریاں ورکاریاں بوئیں وہ بکیں بکائیں نہیں۔ لگان تک نہیں ادا ہوا۔"

"بھورے کاہے میں پکڑا گیا؟"

"سوتی چند کی ایک بکری بیچ لی تھی۔ پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اس کی بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہو گیا۔ مگر اس کی طرف سے کوئی کاہے کو کھڑا ہوتا؟ دو مہینے سب کو گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا۔ "فقیرا! مجھ سے تو اب تیری طرح نہ بھوکوں مرا جائے گا اور نہ اس گاؤں میں رہا جائے گا۔ بلا سے جیل ہو جائے چار دن' کیس تو کر لیں گے۔۔۔ دوسرے دن منہ اندھیرے کہیں نکل گیا۔۔ بانکے کہتا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔"

"بھیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

بھیا حرام زادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شبراتن کا دس کوس پر تکیہ والوں میں بیاہ ہوا ہے۔ ایک امرود کا باغ ہے کسی طرح گزر بسر ہو

جاتی ہے۔ مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی۔"

ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر فقیرا روٹی کا کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا "تمہارے جانے کے بعد بھیا وہ آفتیں آئیں۔ سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا جمانا تھا ابا کہا کرتے تھے کہ "یہ سب پلے پیٹ بھرے میں پیٹ بھرے"۔ سچ کہتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گزری ' جب چولھا نہ جلا ہو۔"

گھسیٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا اور لپکتے کوئلوں کی طرف تکنے لگا جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈ رہا ہو۔

فقیرا نے اس سناٹے کو توڑا۔ "کہاں رہے گھسیٹے؟"

ہم کلکتہ جا کر ایسے پھنسے کہ خط پتر کو بھی چار پیسے نہ بچے۔ گھر یاد کر کر کے کتنی بار رونا آیا۔ بڑی کٹھن گزری وہاں ' ملوں کی خاک چھانی ' امیدواری میں کام کیا ' بھوت گھر میں روئی ڈھوئی ' ہفتوں قبض رہتا تھا ' چار سال رکشا چلائی ' پھر خونچہ لگایا۔ ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس لینے دینے کو ذرا پیسہ ہو اس کے لئے تو وہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ایسے دیسوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو روئے رلائی نہیں نہیں آتی تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

فقیرا نے لال لال روٹی کپڑے پر رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

فقیرا بولا "بھیا ذرا چپکے چپکے کھاؤ ' اماں سن لے گی تو چلا چلا کر رات بھر نہ سونے دے گی۔"

گھسیٹے نے شک اور حیرت سے فقیرا کی طرف دیکھا۔ "تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی۔"

"ہاں ' مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سن لیتی ہے اور کھانے کی بو بھی پا لیتی ہے ' اور پھر ہاب ' ہاب کرنے لگتی ہے۔

گھسیٹے بجھتے انگاروں کی طرح تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ منھ کا نوالا بلا پانی کے گھونٹ کے نہ اتار سکا۔

۳

گھسیٹے گھر کے دوارے ہونٹوں پر بکری کا مسکا ملے ' دھوپ میں ننگے بدن بیٹھا ' اپنے میلے کرتے کے چلوے چن رہا تھا۔ کئی روز سے ہاتھوں ' پیروں اور ہونٹوں کو چٹکار دینے والی سرد ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے جن میں سینکڑوں میل کا گرد و غبار بھرا تھا جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پودے اور درخت ہوا کی چوٹ کھا کر جھک جاتے تھے اور بے کسی سے اپنے پتے پھڑ پھڑاتے تھے جیسے ہوا سے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو للہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی چادروں کو بدن پر سمیٹے ' ہاتھ پاؤں سکیڑے کندھوں کو آگے جھکائے سو سو کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اجاڑ اجاڑ تھی اور ہر چیز اتنی دکھ بھری کہ بے اختیار جی گھبرا گھبرا کر کہتا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں۔

گھسیٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے دوسرے ہی دن وہ ٹوٹے پھوٹے ویران چھپر بکریوں کے موت کی کھرائند اور اپنی ماں کی ہاب ' ہاب سے گھبرا گیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلانا اور بکریاں چرانا اور رات کو برے کی روکھی سوکھی روٹی اور کبھی کبھی تو رات کو فاقہ۔ پھر یہاں کی سردی! افوہ! بدن ہے کہ کٹا جاتا ہے۔ اوڑھنے کو کھویا پہننے کو دو آدمیوں کے بیچ میں ایک ' سب سے بڑی کوفت یہ کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گنوانے کے بعد گھسیٹے کو یہاں کی کسی چیز سے اب لطف نہ آتا تھا۔ چوپال کی باتیں روکھی پھیکی۔ گاؤں کی عورتوں میں شرم اور کھجاؤ۔ پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانے دار کی طرح اکڑ دکھاتا ہے اور فقیرا؟ وہ تو بات بات میں باپ بنتا ہے۔ سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ کہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں ' دمڑی دمڑی کے لئے فقیرا کی محتاجی۔ ہر بات میں اس کا دست نگر رہنا۔

گھسیٹے چلوے مار رہا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ دکانوں کے تختوں پر رات کاٹنا ' وہ سڑکوں پر جو جاڑوں میں برف کی سِلی اور گرمیوں میں دہکتا ہوا توا ہوتی تھیں ' خچر کی طرح رکشا لے کر دوڑنا۔ وہ کبھی کبھی تین تین فاقے کر لینا۔ اپنے گھر کی اس زندگی سے لاکھ درجہ بہتر

تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک پیسہ والی سنگل چاء۔ وہ دھیلے والا پان کا بیڑا! دو پیسے کی پچیس بیڑیاں! یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے لئے وہ یہاں ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور تک پھیلے ہوئے سبز کے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی رہی ہے۔ پندرہ سولہ برس کے سن تک باپ کے جمانوں کی مار کھائی۔ کھانے پینے کو ترستے رہے' پھر ہمت کر کے کمانے کھانے کے لئے شہر بھاگے' وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائیں' کہا چلو کلکتہ' وہاں پہنچتے ہی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور سب پاپ کٹ جائے گا' کلکتہ کے پچیس برس! افوہ! کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی' رکشا تک چلائی' سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لینا ہے تو' جمانتی لاؤ۔ میں کسے لاتا؟ جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے' گھرانے کے گھرانے رہتے تھے۔ جمانتی لے آتے تھے۔ پھمن بولا۔ دو آنے روز دو تو کلوٹا مہاجن جمانتی ہو جائے گا۔ دو آنے روز اسے دے' پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ اسے دور ہی سے دیکھ کر لوگ دور ہٹ جاتے تھے۔ جب سیٹھ سے خوشامد کرو کہ ایک اچھی گاڑی دے دو تو وہ اکڑ کر کہتا تھا کچھ روپیہ جمع کراؤنا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا۔ چار سال دوڑے مگر رہے وہی موچی کے موچی۔ بخار جو آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔ اسپتال میں پڑے پڑے مہینوں بیت گئے' اچھے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اب خبردار رکشا نہ چلانا اور نہ زیادہ محنت کا کام کرنا۔ پھر دو روپیہ قرض ادھار کر کے پان سگریٹ' دیا سلائی کا خونچہ لگایا۔ اب جو آتا کہتا سیزر لاؤ' کیپی کٹ لاؤ' یہ لاؤ' وہ لاؤ' یہاں کیا تھا؟ کہتے "نہیں ہے صاحب' نہیں ہے حضور۔" وہ بھی تماشا کچھ دنوں رہا' نہ بیٹھنے کو اچھی جگہ تھی نہ اچھا سامان تھا اس پر جو کچھ بھی آیا حرام زادی بھنگوئی کھا گئی۔ نہ جانے مجھ سالے کو عورت رکھنے کی کیا پڑی تھی۔۔۔ لنگوٹی میں پھاگ۔۔۔۔

گھسیٹے کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں فقیرا سامنے سے آیا اور آتے ہی کڑے پن سے بولا۔ "پھر تم نے چرا کر دودھ بیچ لیا۔ اب ہمارا تمہاری گزر نہیں ہو سکتا۔ جہاں جانا چاہو چلے جاؤ۔"

گھسیٹے نے جواب دیا۔ "کیسی چوری؟ کچھ پاگل ہو گیا ہے تو؟ روز کا یہی قصہ' روز کا یہی قصہ'۔ بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا۔ جیسے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں اور بکریوں میں میرا حصہ ہی نہیں۔"

"گھر میں حصہ' بکریوں میں حصہ' تو حصہ بٹائے گا؟ کام کا نہ کاج کا' دشمن اناج کا۔ پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے' گیا تھا روپیہ کمانے!"

گھسیٹے گرم ہو کر بولا۔ "کلکتہ میں کمانا کچھ آسان ہے؟ تو خود تو زندگی بھر قصبہ سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے جس کے دس جاننے والے ہوں جو اس کے لئے سکڑم لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس روپیہ ہو کہ کچھ کھو کر سیکھے۔ کام کچھ دنوں کے بعد آتا ہے کہ آپ ہی آپ؟"

فقیرا نے طعن سے کہا "ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں روپے کے ڈھیر تو لے کر جاتے ہی ہیں۔ بلی جو اتنا روپیہ لایا ہے تو کیسے لایا ہے؟"

اب تو گھسیٹے تلملا گیا۔ وہ سب کچھ سن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں رہ کر کچھ نہیں کیا بالکل ہی نہیں سن سکتا تھا۔ وہ چلا کر بولا

"اور تو نے کیا کر لیا ہے چوٹا کہیں کا۔ ان بکریوں میں' اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا؟ سب کا سب بیچ کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے۔ میں آج ہی اس منحوس گاؤں سے جاتا ہوں۔ بے ایمان کہیں کا......"

گھسیٹے سے بن نہیں پڑتا تھا کہ اپنا سر پھوڑ ڈالے یا جان نکال کر رکھ دے کیا کرے جو فقیرا کو یقین دلا دے کہ کلکتے میں میں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔

کچھ یوں ہی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر فقیرا بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ اندر سے اور یہ باہر سے بڑبڑاتے رہے۔ یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا بلکہ پورے چار مہینے سے ہو رہا تھا روز یہی جھگڑا اٹھتا' روز یہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا بڑبڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا تو پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کلکتہ کی یاد آئی اور وہ سوچنے لگا کہ

شاید اب میں ہمیشہ کے لئے اس اجاڑ گاؤں میں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بتانا ہے۔ کاش ایک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ پیسہ آجاتا جو میں کچھ دنوں اپنی تھکی ماندی آتما کو سکھ دے لیتا۔ چالیس برس کی تھکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو' دوارے بھینس بندھی ہو' کٹھیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھروالی ہو جو ساری کے پلو سے تھالی صاف کرے' اس میں دال بھات لا کر سامنے رکھ دے' اس کے پاؤں میں موٹے موٹے کڑے پڑے ہوں جو بدھی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف جھکے ہوں جیسے شرمائی سالی کا سر بس مجھے تو بس اتنا مل جائے کہ اپنا ایک الگ چھپر ہو' دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی ہو۔ بس ارے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔ اب کہاں گھروالی کی خواہش اور کہاں بچوں کا ارمان۔ چالیس کا سن ہونے کو آیا۔۔۔۔

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اٹھی اب دو چار برس جوانی اور ہے پھر اندھیرا پاکھ۔ جانے کب موت آجائے۔

ایک زبردست امنگ اٹھی کہ جیسے بنے ایک بار اور ہاتھ پاؤں مارو۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے فقیرا کو پکارا۔ "بھیا فقیرا!"

فقیرا پیار کی پکار سن کو فوراً پاس آگیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حقہ کا ایک دم لے چکا تو گھسیٹے بولا "میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔ مگر کوئی کام بھی تو ایسا ہو کہ جس سے کچھ ملے۔ ارے بھیا تم کہتے ہو کہ کلکتہ میں میں نے پچیس برس بھاڑ جھونکا' مگر میں کہتا ہوں کہ میں کم سے کم اتنا تو سیکھ ہی گیا ہوں کہ کون کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو پھیری لگائیں یہ کریں وہ کریں' سچ کہتا ہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار جما سکتا ہے؟"

گھسیٹے یہ کہہ کہ اس طرح خاموش ہو گیا جیسے ابھی بات نہیں ہوئی پھر فقیرا کی طرف دیکھ کر بولا "اگر کچھ مل سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر جو ہم کہتے ہیں۔۔۔۔ وہ تو تم مانتے ہی نہیں۔۔۔۔ اس میں تمہارا بھی بھلا' ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان بھی گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسے ہوں گے تو سب ہماری برائی کو بھی اچھائی کہیں گے۔ جوگیوں کو دیکھو' ان کے گھر دھن برس رہا ہے دھن کہنے کو ہم شریف اور وہ رذیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو آئے دن دوڑے جاتے ہیں کہ اچھے منگلو سیر بھر آٹا ادھار دے دو' دو کنکڑیاں نمک دے دو۔' ذرا سی تمباکو دے دو۔ وہ ٹال مٹول بھی کرتے ہیں' دھتکار بھی دیتے ہیں' مگر ہم پھر جاتے ہیں نہ جائیں تو کریں کیا؟"

فقیرا بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا' گھسیٹے دم لے کر پھر کہنے لگا "اور ہم تو کہتے ہیں کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا" کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں چین سے الگ ہی رہ لیں گے۔"

گھسیٹے نے اک دم سے کچھ یاد کر کے فقیرا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا۔

"ہاں تمہارا سادی بیاہ کرنا ہے روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری میں نہ سہی کسی اور میں سہی۔ ارے ہاں! اس طرح تو کہیں بھی نہیں کر سکتے اور پھر یہ اماں کے لئے بھی اچھا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھانے کو ملے گا۔"

فقیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھسیٹے کئی بار یہی باتیں کر چکا تھا۔ مگر تب انھیں سن کر فقیرا کو غصہ آگیا تھا۔ روپیہ کے لئے کہیں شرافت بیچی جاتی ہے؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج آیا تو کل گیا۔ اور شرافت وہ دھن ہے جو پیڑھیوں چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا ہے۔ شریف پھول کا برتن ہے جتنا بھی کیچڑ میں سوند جائے' جب بھی مانجھو چم چم کرنے لگتا ہے اور جہاں شرافت گئی پھر آدمی مٹی ہو جاتا ہے مٹی۔ مانا جوگیوں کے پاس روپیہ ہے پیسہ ہے' گھر گرہستی ہے' ہم ہی ان کی خوشامد کرتے ہیں وہ نہیں کرتے' ہم ہی ان سے روٹی ادھار مانگتے ہیں' وہ نہیں۔ مگر اس سے کیا؟ ہاتھی لاکھ لٹ جائے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ ہم اور وہ مکھیا کے گھر جائیں تو ہم تو چبوترے پر بیٹھیں گے اور وہ دور زمین پر۔

فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا' تب سے اس کے دل میں بھی کمانے کی تمنا پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن جیسے جیسے

دن بیتتے گئے اور گھسیٹے روپیہ کا گٹھر لے کر نہیں لوٹا' اس کی خواہش مرتی گئی۔ غریبوں کو کہاں پیسہ ملتا ہے۔ پیسہ مل جاتا تو کوئی غریب ہی کیوں رہتا؟ اس جیون میں بس یہی ہے کہ اپنا دوزخ پاٹ لو اور موقع ملے تو کسی سے ہنسی دل لگی کر لو' اور کیا دھرا ہے؟ بھورے کا حشر دیکھ کر تو رہی سہی آس بھی گہری نیند سو گئی۔ لیکن اب جو گھسیٹے روزانہ شام کو' جب یہ دونوں کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھتے' آس جگانے کا یہ منتر اسی موہنی سے پڑھتا رہا تو رفتہ رفتہ فقیرا کی سوئی ہوئی آس چونکی' انگڑائی لے کر اٹھی اور پر پرزے نکالنے لگی۔ وہی فقیرا جسے کل تک کی کوئی فکر نہ تھی' آج جو مایا کے مندر کی راہ سوجھائی دی تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے' ذرا یہ چھپر بدل جاتا' تھوڑی سی بکریاں اور ہو جاتیں اور ذرا چار پانچ روپے اکٹھے ہو جاتے تو پھر ہمارا گھر بس جاتا۔' ارے ہاں اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا' وہ رمضانی کی بیوہ' آنکھ ملاؤ تو کیسا ہنستی ہے' اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے' کیسا گدریا بدن ہے۔ جیسے پکا آم۔ کیسا ٹھمک ٹھمک چلتی ہے! اور کتنی محنتی ہے وہ'۔ دودھ دوہ دوہے' اوپلے وہ تھاپے' وہی وہ متھے' اکیلی جھوؤں پانس اٹھا اٹھا کر کھیتوں میں وہ ڈالے' کیا عورت ہے! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھا لے گا پھر میں منہ تکتا رہ جاؤں گا۔

جس دن سے فقیرا کے دل میں یہ خیالات گونجنے لگے' وہ رمضان کی بیوہ سے کنائی کاٹنے لگا۔ ادھر وہ سامنے دکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کر نکل جاتا۔ پندرہ بیس روز یوں ہی کٹ گئے۔ ایک دن یہ لکڑی چیر رہا تھا کہ وہ اکبارگی پیچھے سے آگئی۔ اسے بھاگتے نہ بنی' کچھ باتیں ہوئیں' کچھ ہنسی دل لگی ہوئی' پھر وہی جس کا فقیرا کو دھڑکا تھا یعنی اس دن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی۔

۴

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے فقیرا کو جگایا۔ دونوں تاروں کی مدھم روشنی میں اٹھے اور ایک ٹوکرے کو بانس سے لٹکا کر ایک ڈولی سی بنالی اور اس میں خوب سا پیال بھر دیا اور پھر بڑھیا کے پاس گئے۔ گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو چھپکلی کی طرح اٹھا لیا۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ وہ لگی باب' باب' باب کر کے اشارے سے کھانا مانگنے۔ گھسیٹے نے پہلی بار اسے چھوا تھا۔ اسے ایک عجیب اذیت ہوئی جس سے اس کا چہرہ عجب ہونق ہو گیا۔ ایک طرف تو آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے اور دوسری طرف بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے تھے۔ گھسیٹے نے اسے لے جا کر آہستہ سے جیسے کوئی شیشے کا برتن ہو' ٹوکرے میں رکھ دیا اور پھر اسے چیتھڑوں میں چھپا دیا۔

ایک طرف کا بانس فقیرا نے تھاما اور دوسری طرف کا گھسیٹے نے اور دونوں گھر کے باہر چلے۔ بکریاں ان لوگوں کو جاتے دیکھ کر بے کسی سے میں میں کرنے لگیں۔ جیسے یہ لوگ ان کو ہمیشہ کے لئے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے کالے پردوں کی اوٹ میں منہ چھپائے ہوئے گاؤں کے نکڑ پر آگئے تو پو پھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کر چلنے لگی۔ یہ خوش تھے کہ چلو ہم نظروں سے بچ کر نکل آئے کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے لگا

"کہاں چلے فقیرا؟"

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا فقیرا کے کلیجے کو برماتا نکل گیا۔ اس کے کندھے کا بانس کانپا۔ کسی وجہ سے گھسیٹے گھبرا کر فقیرا کی جگہ خود بول اٹھا

"شبراتن کا حال خراب ہے۔ اماں کے لئے وہاں جا رہے ہیں۔"

"اماں کو لئے؟ کسان اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

"شاباش تم لوگوں کو ـــــ اپنی مہتاری کی اتنی سیوا کرتے ہو!"

شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہو چکا تھا' اس وقت فقیرا اور گھسیٹے نے مسجد سے ذرا ہٹ کر' ایک گلی میں آ کر ڈولی رکھی گھسیٹے نے بڑھیا کو جو کنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی' اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پھر اس کا کانپتے ہوئے ہاتھ کو ٹوکرے میں دو چیتھڑے باندھ

کر اس پر رکھ دیا۔ یہ احتیاط تھی اس بات کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باب باب کرتے وقت کہیں ہاتھ بجائے منھ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے۔ مگر احتیاط فضول تھی کیونکہ دس برس سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منھ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگا کرے۔ اب سوائے ادھر کے اور کسی طرف جانے کی ہاتھ میں سکت ہی نہ تھی۔

بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ ہچکولے کھاتے کھاتے اور رات رہے سے اس وقت تک باب باب کرتے کرتے اتنی تھک گئی تھی کہ بلا چلائے اور کھانا مانگے' جیسے بٹھائی گئی تھی ویسی ہی بیٹھی رہی۔ یہ تو بری رہی۔ ساری کی کرائی پر پانی پھرا جاتا تھا۔ 'ضرورت ایجاد کی ماں ہے' فوراً گھسیٹے نے لپک کر سامنے کی حلوائی کی دکان سے ایک پیسہ کا جلیبیوں کا شیرا مانگا۔ اس نے تھال پر چمٹی ہوئی بھڑوں اور بھنکتی ہوئی مکھیوں کو اڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا اور جتنا شیرا بہہ آیا اسے انگلی سے پونچھ پانچھ کر ایک پتہ پر ٹپکا کر گھسیٹے کو تھما دیا۔ اس نے لا کر شیرے کی ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔ اس کا چٹانا تھا کہ وہ فوراً باب کر کے اور مانگنے لگی۔

چلو عمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آ گئی۔ گھسیٹے نے پتہ فقیرے کو پکڑا کر ہدایت کی کہ موقع پر بڑھیا کو ایک انگلی چٹا دینا۔ فقیرا زندگی میں تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی' بھیڑ بھاڑ اور بڑی بڑی دکانوں سے وہ بھونچکا ہو گیا تھا' عقل چندھیا گئی تھی اس کے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھسیٹے کی ہر بات میں خود اعتمادی آ گئی تھی۔ گھسیٹے مشاق پیراک کی طرح تھا جو دریا میں اترتے ہی چھلیں کرنے لگتا ہے اور فقیرا تو تنکے کی طرح جو پانی دیکھ دیکھ کر سما جاتا ہے' گھسیٹے فقیرے کو حکم دے رہا تھا اور وہ کل کی طرح اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آئے۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کٹی انگلیاں اور بیٹھی ناک والے کوڑھی منمنا کر ڈراونی آواز میں بولنے والی آ بیکی بڑھیاں' چندھے چپڑے بچے جن کے ہاتھ پاؤں سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے تھے' جو نہ جانے کیوں مسلسل ریں ریں کر رہے تھے' پھیکے' بے حیا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوؤں کا جنگل اور بدن پر میل کی کنگی' چیتھڑے' ٹھیکرے' میل' آخور' بلغم' ناک' پیپ' مکھیاں' جراثیم' فریب' جھوٹ اور ان سب کو ڈھانک دینے والی' لوریاں دے دے کر' تھپک تھپک کر سلا دینے والی مہاپاپن بے حسی۔!

اس سمندر میں گھسیٹے اور فقیرا نے بھی ماں کی ڈولی لے کر غوطہ مارا۔ میل کچیل ہو' چاہے ذلت ہو' حیوانیت ہو چاہے انسانیت ہو' مایا کے مندر کو یہی راستہ جاتا ہے۔ اس وقت جب کہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اکیلا یہ کھلا ہوا ہے۔ صاف اور سیدھا راستہ' تنہا راستہ' پھوٹی آنکھ کا دیدہ۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دے کر کہا

"ابے ادھر کہاں آیا؟ بھاگ یہاں سے۔"

پھر تو آس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غل مچانے لگے۔ کیونکہ ان کی ڈولی دیکھ کر ہر ایک کو اپنی روزی کی پڑ گئی۔ فقیرا کی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس نے جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھ وہاں سے ٹلنا چاہا مگر گھسیٹے نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اس نے دو چار ماں بہن کی سنا کر کہا "تمہارے باپ کی زمین ہے۔ چپ رہو' ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔"

ڈانٹ سنتے ہی فقیر نے زرا زرا بڑبڑا کر چپ ہو گئے مگر بڑھیاں اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نمازی نے جو جماعت کے لالچ میں دوڑا جا رہا تھا' ان کو ڈانٹا "چپ رہو بد نصیبو نماز ہو رہی ہے۔"

نماز کے خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے' کسی نہ کسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ اگر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی۔ کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا برتا ان لوگوں میں تھا ہی نہیں اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا قبضہ پا چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے۔ لیکن وہاں کی فضا سے فقیرا ایسا متاثر ہوا کہ اس نے بے سمجھے بوجھے بڑھیا کو ایک انگلی شیرا چٹا دیا۔ شیرا لگتے ہی گراموفون کے ریکارڈ کی طرح وہ بجنے لگی اور مشین کی طرح اس کے جبڑے اور ہاتھ چلنے لگے۔ اسے دیکھ کر ایک دو برس کے

بچے نے جسے ایک شخص پھونک ڈلوانے کو لایا تھا' گود میں سہم کر زور سے چیخ ماری اور بسورنے لگا۔ ایک جوان اینگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں بٹوا لئے ادھر سے گزر رہی تھی۔ اس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔' جیسے ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے بے تحاشا دو پیسے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیئے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کتے کے سامنے تر نوالہ پھینک دیتا ہے کو وہ ہمیں بھول کر اس میں جٹ جائے۔ پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اس کے ہاتھ میں تھوڑی دے گا' دے گا بڑھیا کو۔' اس کے سامنے کوئی چادر ہونی چاہئے جس پر آکر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنا انگوچھا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی غول کے غول باہر نکلنے لگے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا بھوکا ہوں بابا' بھوکا ہوں بابا' ایک فقیرنی ٹھنکیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک تگڑا فقیر حلق پھاڑ پھاڑ کر آوازیں لگانے لگا۔ "جب دے گا اللہ ہی دے گا۔" فقیرا بھیڑ بھاڑ' دھکم دھکا اور شیر چنانا بھول گیا گھسیٹے نے چلا چلا کر اسے کئی بار حکم دیا مگر جب دیکھا کہ اس کے حواس بالکل غائب ہیں تو جلدی سے پتہ چھین کر خود ہی چنا دیا۔ شیرے کو لگتا تھا کہ مشین پھر تیزی سے چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ گھسیٹے نے فوراً محسوس کیا کہ کیا کمی ہے۔ پہلے سے اس نے کوئی صدا تو سوچی نہیں تھی جلدی میں اس کے منہ سے نکلا "اللہ ہر آفت سے بچائے۔" اس صدا کو اس طرح دینے لگا' جیسے کوئی والنٹیر انقلاب زندہ باد کے' کیونکہ دوسری لے اسے یاد ہی نہ آئی۔ اس کی صدا میں اگر تاثیر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ ادھر دیکھ لیتے تھے' دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی۔ یہ درد انگیز نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔ آس پاس کے فقیر یا تو خالی ہاتھ یا ایک ایک دو دو پیسے لئے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے' وہ دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا چیز کیوں نہیں ہے۔ گھسیٹے اپنی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے متوالا ہو گیا۔ اور خوب کڑک کر صدا لگانے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشے میں وہ گھسا تھا اس میں چوٹی پر جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہوتا کہ جس پیشے میں گھسوں اس کا اچھا سامان' اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو مگر آخر آج دونوں نعمتیں میسر آ ہی گئیں۔ میرے پاس جو سامنے ہو وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا۔ دیکھو۔ پیسے کیسے برس رہے ہیں! تو ہی داتا ہے اور تو ہی جیون کا کھیون ہار ہے مالک۔ اماں زندگی بھر کوشش کر مریں کہ کچھ پیسہ جوڑ کر گھر کی حالت سدھاریں۔ ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مریں مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں۔ چلئے روزی بہانے موت۔

سہ پہر کی سنہری دھوپ میں گھسیٹے اور فقیرا ڈولی لئے شہر کے باہر ایک شاہی کھنڈر کے پاس آئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے لادے پھیری لگاتے رہے تھے' تکان سے چور چور تھے مگر پھر بھی آنکھوں میں اطمینان اور خوشی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے' گا رہے تھے اور زور زور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ایک کھنڈر کے سایہ میں ڈولی اتار دی گئی۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اس میں پانچ چھ آدمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے' دال بھات اور ترکاریاں ملی جلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈال کر ماں کی گالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں تھیں بہت سی تیل کی پوریاں' کئی قسم کی ترکاریاں' سیر بھر بے میل مٹھائی' چٹ پٹے کباب' مولیاں اور بیڑی کا بنڈل۔ آج کے پھیرے میں پونے دو روپے ملے تھے۔ جس میں سے ڈیڑھ کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے ابھی گھسیٹے کی جیب میں اچھل رہے تھے۔ گھسیٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں چن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں بھر کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا ڈھیر تھا۔ جس طرح چاہے کھاؤ اور جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی کی ایک ایک ڈلی منہ میں ڈالی اور بدحواسی سے ان کو نگل گئے پھر مر بھکوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹ پڑے۔ گویا زندگی بھر کی بھوک' اسی ایک آن میں بجھا دیں گے۔ پوریوں کی باری آئی' ایک ایک پوری کا ایک

ایک نوالہ۔ کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر غپ سے دوزخ میں اتار لیتے۔ اس شور سے بڑھیا جو سو رہی تھی جاگ پڑی اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی۔ اب ان دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ گھسیٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اسے اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔

"لو آج تم بھی مزے دار چیزیں کھا لو۔ کبھی کاہے کو کھائی ہوں گی۔"

گھسیٹے نے کچھ نکتیاں اس کے منھ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلتے ہی بدحواسی سے باب باب کرنے لگی۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہاتھوں پیروں کو ہلا جلا کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک ہی دفعہ اپنے منھ میں بھر لے۔ فقیرا اور گھسیٹے کے لئے دشواری یہ تھی کہ خود کھائیں یا اسے کھلائیں۔ ادھر اس کے منھ میں کچھ دیتے اور ادھر وہ نگل کر مانگنے لگتی۔۔۔۔۔ گھسیٹے جھلا کر بولا۔۔۔۔۔ "لو تم بھی کیا یاد کرو گی۔"

دانت سے کاٹ کر مولی کا ایک ٹکڑا بڑھیا کے منھ میں دے دیا۔ بڑھیا فوراً خوش خوش اسے چبانے لگی مگر چبتا کیا۔ وہ بار بار منھ سے نکل آتا اور پھر کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے اسے اندر ٹھیل لیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پاٹنے میں جٹ گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور آگے پیچھے جھوم جھوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اور تب دم نکلا۔ گھسیٹے اسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ نکلتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اس کا خزانہ لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ پھاڑ اسے پھر مانگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلا پکڑا دیا۔ بڑھیا نے اسے اپنی مٹھی میں زور سے دبا لیا اور منھ کی طرف لے چلی۔ مگر ایک تو ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے رس گلے کی پکڑ بے تکی تھی، وہ کسی طرح منھ کے اندر نہ جا سکا۔ رس گلا دب رہا تھا۔ اس کا شیرا ٹھنڈی باچھوں سے ہوتا ہوا گلے پر اور گلے سے چھاتیوں میں بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری میٹھی ہو گئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی تھی اور نہ وہ۔ رفتہ رفتہ بیٹوں کا ہاتھ تو سست ہوتا گیا مگر ماں کا باب باب تیز ہی ہوتا گیا۔ آخر جب گھسیٹے اور فقیرا میں نگلنے کی بالکل سکت نہ رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سے سرکا دیا، اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاتی رہی۔ آخر چلاتے چلاتے تھک کر وہ بھی ٹوکرے میں گر پڑی۔

فقیرا بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہو گا؟ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی جس میں چھپر نیا ہو گیا تھا۔ اس میں ایک طرف لپا پتا چولھا تھا جسے رمضانی کی بیوہ جھکی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چراغ جلے بکریوں کا ایک بڑا سا گلہ لئے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی کی بیوہ جلدی جلدی گرما گرم اور سرخا سرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ تھالی میں (گھر میں ایک پھول کی تھالی بھی آ گئی ہے) ایک طرف بکری کا مسکا بھی ہے۔۔۔۔ فقیرا خوش تھا۔ بہت خوش۔

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی سی کامیابی! پونے دو روپئے اور صرف ایک دن میں! پچاس روپیہ مہینہ! اففوہ! اگر ہم کہیں کلکتے میں ہوتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہو تو کلکتہ کی زندگی! سنگل چائے، بیڑیاں، تاڑی خانہ، بھنا گوشت، وہ سالی نخریلی رنڈیاں، وہ ان کا مٹک مٹک چلنا، گود میں مل کھا کھا جانا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ کچھ دیر انھی خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ فقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ سب بکریاں اپنی کر لی ہیں۔ حصہ مانگا تو سر اکڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب اماں میں بھی حصہ بٹائے گا۔۔۔۔۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں گھر دے دوں گا، بکریاں دے دوں گا، مگر اماں کو نہیں دے سکتا۔ آخر میں بھی تو اس کا لڑکا ہوں اور اب فقیرا کا حق ہی کیا ہے؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اسی کی رہی، آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ اماں کو میں نہیں دے سکتا۔ اگر وہ تکرار کرے گا تو ماروں گا، سر پھوڑ دوں گا۔۔۔ حرامی سالا فقیرا!"

گھسیٹے سوچ سوچ کر کھولنے لگا۔ فقیرا اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اس کو جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا "فقیرا سونا بعد کو، پہلے حصہ بانٹ لو۔ آج یہ جھگڑا چک جانا چاہئے۔"

"کاہے کا حصہ بانٹ؟"

"ہاں اب تو کہو گے 'کاہے کا حصہ ۔ ارے گھر کا 'بکریوں کا اور جو کمایا ہو اس کا"

فقیرا تملا کر اٹھ بیٹھا۔

"پھر وہی گھر' پھر وہی بکریاں ۔ ہزار بار کہہ دیا کہ ابا کا بنایا ہوا چھپر پندرہ برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہو گیا تھا ۔ یہ میں نے بنوایا ہے ۔ اور وہ بکریاں بھی مر کھپ گئیں ۔ یہ سب میری پالی ہوئی ہیں۔ چلا ہے حصہ بانٹ کرنے اور اتنے دنوں تو جو ہماری روٹی توڑتا رہا ہے؟"

فقیرا اب شہر والا فقیرا نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصے میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا 'اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی لے جاؤ ۔ مگر لاؤ ہماری اماں کو ہمیں دے دو۔ اتنے دنوں اگر تم نے کھلایا ہو تو اب ہم کھلائیں گے ۔

"ہاں اب تو تو کھلائے ہی گا؟ پندرہ برس میں پالتا رہا۔ گو موت صاف کرتا رہا۔ تب اماں کی یاد نہ آئی ۔ اب جو کمائی کے قابل ہو گئی تو اماں تیری ہے ۔ تجھے دے دوں؟ مجال ہے تیری تو لے جائے؟"

گھسیٹے پر بھوت سوار ہو گیا اور وہ غصے میں ماں کی طرف لپکا ۔ جیسے اس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا 'مگر فقیرا فوراً" کود کر سامنے آگیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارہ حد سے اونچا ہو گیا ۔ اس نے بڑھ کر فقیرا کو زور سے دھکا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح ہاتھوں میں دبوچ لیا گویا وہ کوئی گٹھری ہے ۔ جس طرح بلی چوہے پر جھپٹتی ہے۔ فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اسکے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلی کی طرح جس کا بچہ مر گیا ہو عو عو کر کے حلق پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔ مگر ان دونوں کی گالیوں اور غل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوئی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں آگئی۔ نہ جانے فقیرا نے زور کر کے چھین لیا یا گھسیٹے نے بڑھیا کے مر جانے کے ڈر سے اسے خود ہی چھوڑ دیا۔ مگر فقیرا جیسے ہی اس کو گالیاں دیتا پیچھے ہٹا 'گھسیٹے بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر پھاند پڑا۔ وہ تڑے کھڑے قد نیچے گر پڑا۔ اور بڑھیا چیخی' قلابازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ گھسیٹے فقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ نیچے سے اس کے سینے اور منہ پر گھونسے جمانے لگا۔ گھسیٹے جیسے جیسے گھونسے کھاتا ویسے ہی ویسے زور سے گلا دباتا۔ آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے اور دیے۔ فقیرا کی آنکھوں کے ڈیلے غلوں کی طرح باہر نکل آئے 'منہ بھیانک ہو گیا اور ہاتھ پاؤں بزر گئے۔ اب گھسیٹے کا غصہ اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کانپ کر کھڑا ہو گیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا کو گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ رام لیلا کے بچا کی طرح ہونق ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لیے ۔ کلکتہ میں ایسے ایسے کئی قصے یہ دیکھ چکا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھیوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ ڈر کس بات کا؟ فقیروں کے مرنے جینے کی کسے پروا ہوتی ہے۔ مر گیا۔۔۔۔ مر گیا۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔ فقیرا۔۔ ناحق مرا۔ مان لیتا میری بات۔ میں نے کیا برا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک اماں تم نے رکھی ہے۔ اب مجھے دے دو۔ ارے ہاں۔ میں بھی تو کچھ دنوں زندگی کی بہار دیکھ لوں۔ میرے بھی تو جان ہے۔ مجھے اینٹ پتھر سمجھا تھا' جیسا کیا ویسا بھگتا۔

ہاں اب جلدی سے اماں کو لو اور بھاگو ۔۔۔ پیاری اماں ۔۔۔ کلکتہ وہاں کی بھیک کا کیا کہنا! اب مزا ملے گا کلکتہ کا ۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مڑا' دیکھا تو وہ آدھی چت آدھی پٹ 'مٹی کے چوتھ کی طرح ڈھیر ہے ۔ آنکھیں چڑھ گئی ہیں ۔ منہ کلھیا کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور تھوک میں لتھڑی آدھی چبی آدھی پوری غذا نکل رہی ہے۔ نکتیاں' گلاب جامن' پوری کے بھیگے ہوئے ٹکڑے۔ لونڈے کے لونڈے' زرد زرد پھین۔ گھسیٹے نے بڑھ کر ہاتھ لگایا۔۔۔ بڑھیا میں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا ۔ کھنڈر کا ہر کونا بلاؤں کا بھٹ معلوم ہوتا تھا ۔ پت جھاڑ ہوا کے جھکڑ' ہیکڑوں میل سے درختوں کو تاراج کرتے مردہ پتیوں کو اٹھا اٹھا کر بھگتے۔ وحشت ناک سروں میں سائیں سائیں کرتے ایک طرف سے آرہے تھے اور دوسری طرف بھاگے جا رہے تھے۔ معلوم

ہوتا تھا کہ ہر چیز کو اڑا کر لے جائیں گے' گھسیٹے ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری طرف ماں کی۔ دونوں کے پہلو میں اس کی آخری کوشش کی بھی لاش تھی۔ جب تک ماں زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مر کر وہ اس کے دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔ یہ وہی ماں تھی جو اسکے ہر دکھ پر بیتاب ہو جاتی تھی۔ اس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتی تھی۔ فقیرا بھی آخر بھائی ہی تھا۔ زندگی کا سہارا۔ اس کی یاد کلکتہ کی بے کسی میں بھٹکے مسافر کا دیا تھی۔ ان دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دنیا کا رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ سمجھتا تھا کہ اب تو کشتی کنارے لگ چکی ہے' پیشہ مل گیا ہے اور اس کا بہتر سے بہتر سامان ہاتھ آگیا ہے۔ سب کچھ مل گیا تھا مگر ابھی خود اس کے قابل نہیں بنا تھا۔۔۔۔۔۔ امید کی آخری کرن ڈوب گئی۔ اب زندگی کی اتھاہ مصیبتیں' طوفانی سمندر کی طرح آگے پیچھے' دائیں بائیں' اوپر نیچے ہر طرف تھیں۔ اس کے بھیانک بھنور منہ پھاڑے بڑھ رہے تھے اور پاس تنکے تک کا سہارا نہ تھا۔

گھسیٹے سر جھکائے افق کی طرف چل کھڑا ہوا۔

احمد علی

نام : سید احمد علی

قلمی نام : احمد علی / پروفیسر احمد علی

پیدائش : یکم جولائی ۱۹۱۰ء بہ مقام دہلی ' بھارت

تعلیم : ایم۔اے (انگریزی) وہائٹ میموریل گولڈ میڈل

ابتدا مرزا پور اور گوڑ گاؤں کے پرائمری اسکولوں اور اس کے بعد ویسلے مشن سکول اعظم گڑھ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۳ء میں علی گڑھ منتقل ہو گئے اور ۱۹۲۵ء میں منٹو سرکل علی گڑھ سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۲۷ء میں انٹرسائنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ۱۹۳۰ء میں بی۔اے (آنرز) لکھنؤ یونی ورسٹی سے کیا۔ اسی یونیورسٹی سے ۱۹۳۱ء میں ایم۔اے (انگریزی) فرسٹ کلاس فرسٹ کے ساتھ پاس کیا اور وہائٹ میموریل گولڈ میڈل لے کر اسکالرشپ حاصل کی۔ اس شاندار کامیابی پر انھیں جھلاور گولڈ میڈل بھی ملا۔

مختصر حالات زندگی:

احمد علی کے والد سید شجاع الدین سرکاری ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں میں رہے۔ وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے جو ۱۹۱۹ء میں وفات پا گئے۔ احمد علی کا لڑکپن تھا اور وہ پرائمری درجوں کے طالب العلم تھے۔ احمد علی ۱۹۳۱ء تا ۱۹۴۱ء لکھنؤ یونی ورسٹی میں انگریزی کے استاد رہے' اسی دوران تقریباً دو برس کے لیے الہ آباد یونیورسٹی اور آگرہ کالج میں بھی پڑھایا۔ ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۴ء بی بی سی لندن سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۷ء پریذیڈنسی کالج کلکتہ میں صدر شعبہ انگریزی رہے۔ جنوری ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء چین کی نیشنل سنٹرل یونی ورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۴۹ء میں بھارت سے پاکستان ہجرت کر آئے اور پاکستان فارن سروس سے منسلک ہو گئے۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں انھیں ڈپٹی سیکرٹری وزارت خارجہ مقرر کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں بیرسٹر رؤف علی کی بیٹی بلقیس جہاں بیگم سے شادی ہوئی۔ ۱۹۶۰ء تک چین اور مراکش میں قونصلر اور ناظم الامور کے طور پر خدمات انجام دیں۔ واپسی پر ۱۹۷۰ء تک بزنس اینڈ انڈسٹری کے مشیر تعلقات عامہ رہے۔ ۱۹۷۰ء سے لومین فیرکس کے صدر نشیں اور مینجنگ ڈائریکٹر کے طور پر اپنا کاروبار کر رہے ہیں۔ حکومت پاکستان نے انھیں ۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۹ء کراچی یونی ورسٹی کا اعزازی پروفیسر مقرر کیا۔ اس دوران میں بیرون ملک کی متعدد یونی ورسٹیوں میں اعزازی خطبے دیئے۔

پروفیسر احمد علی نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۳۹ء میں "انڈین رائٹنگ" کے بہ اشتراک اقبال سنگھ' مدیر رہے۔ ۱۹۴۳ء میں بین الاقوامی شہرت یافتہ بھارتی ادیب راجا راؤ کے ساتھ مل کر "نومورو" مرتب کیا اور ۱۹۵۰ء میں "پاکستان پی ای این میلنی" کے مدیر رہے۔ احمد علی نے بطور افسانہ نگار' ناول نگار' نقاد' مترجم' براڈ کاسٹر' مولف اور سفارت کار کے شہرت پائی۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"پرانے زمانے کے لوگ" مطبوعہ: "نیا ادب" اور مجلہ "وشوانی" ۱۹۳۰ء۔ (۱)

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "انگارے" انتھالوجی مرتبہ: احمد علی، مطبوعہ لکھنؤ: طبع اول: ۱۹۳۲ء

اس مجموعے میں سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانوں کے ساتھ احمد علی کے دو افسانے "مہاوٹوں کی رات" اور "بادل نہیں آتے" شامل ہیں۔

۲۔ شعلے (بارہ افسانے) نیا سنسار الہ آباد: طبع اول: ۱۹۳۶ء

۱۔ "تصویر کے دو رخ" ۲۔ "استاد شموں خاں" ۳۔ "اس کے بغیر" ۴۔ "ہمارے ماسٹر" ۵۔ "چھپڑ کھٹ" ۶۔ "اس کے تحفے" ۷۔ "نوروز کی رات" ۸۔ "غلامی" ۹۔ آپ بیتی" ۱۰۔ "مزدور" ۱۱۔ "شادی" ۱۲۔ "آنکھیں"۔ کل بارہ افسانے شامل کتاب ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۶ء ہی میں مکتبہ اردو لاہور نے بھی شائع کیا تھا۔

۳۔ "ہماری گلی" (سات افسانے) انشاء پریس دہلی، طبع اول: ۱۹۴۲ء

۱۔ "ہماری گلی" ۲۔ "میرا کمرہ" ۳۔ "تکمیلہ" ۴۔ "مسز شمس الحسن" ۵ "مارچ کی ایک رات" ۶۔ "شراب خانے میں" ۷۔ "نوروز کی شام"

۴۔ "قید خانہ" (چار افسانے) انشاء پریس دہلی، طبع اول: جون ۱۹۴۴ء

۱"قید خانہ" ۲۔ "پریم کہانی" ۳۔ "قلعہ" ۴۔ "گذرے دنوں کی یاد"

۵۔ "موت سے پہلے" (ایک افسانہ) انشاء پریس دہلی، طبع اول: ۱۹۴۵ء

اس کتاب کا مقدمہ آرٹ، سیاست اور زندگی سے متعلق مفصل مقالہ ہے جسے بعد ازاں "نقوش" لاہور کے عصری ادب نمبر شمارہ ۱۲۹ ستمبر ۱۹۸۲ء میں شامل کیا گیا ہے۔ "موت سے پہلے" میں چھ تصویریں بھی شامل ہیں۔

نوٹ: "انگارے" میں شامل دو افسانوں سمیت احمد علی کے چاروں افسانوی مجموعوں میں کل ۲۶ افسانے ہیں۔ یوں صرف دو افسانے "پرانے زمانے کے لوگ" مطبوعہ: "نیا ادب" اور "وشوائی" اور "تنہائی کا خواب" مطبوعہ: سیپ کراچی شمارہ نمبر ۳، کتابوں میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، جنہیں ملا کر احمد علی کے کل افسانے ۲۸ بنتے ہیں۔

۶۔ "Mr Eliots Penn – World of Dreams" لکھنؤ یونیورسٹی پریس: طبع اول: ۱۹۴۱ء

۷۔ "آرٹ کا ترقی پسند نظریہ" انجمن ترقی اردو پریس اورنگ آباد دکن، طبع اول: ۱۹۳۶ء

۸۔ "Teaching of Poetry" میکسویل پریس، لکھنؤ طبع اول: ۱۹۴۰ء

۹۔ "Muslim China" کراچی: طبع اول: ۱۹۴۹ء

۱۰۔ "The Flaming Earth" کراچی: طبع اول: ۱۹۴۹ء

(انتخاب: انڈونیشیا کی شاعری کا ترجمہ)

۱۱۔ "The Bulbul And The Rose" کراچی: طبع اول: ۱۹۶۲ء

(انتخاب: اردو شاعری کا ترجمہ)

۱۲۔ "The Golden Tradition" کولمبیا یونیورسٹی پریس، نیویارک: طبع اول: ۱۹۷۳ء

(۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی کی اردو شاعری)

۱۳- "The Lamp of The Temple" طبع اول: ۱۹۷۰ء
(غالب کی فارسی شاعری)

۱۴- "The Quran" طبع اول: امریکا

۱۵- "Problem Of Style And Technique in Ghalib" پی۔ اے۔ سی۔ سی کراچی: طبع اول: ۱۹۶۹ء

۱۶- "Failure of An Intellect" آکاش پریس کراچی: طبع اول: ۱۹۶۸ء

۱۷- "Purple Gold Mountain" کیساک پریس لندن: طبع اول: ۱۹۶۰ء

۱۸- "First Voices" (بارہ نظمیں) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی: طبع اول: ۱۹۶۵ء

۱۹- "The Shadow And The Substance" کراچی یونی ورسٹی پریس، طبع اول: ۱۹۷۷ء

۲۰- "Twilight In Delhi" (ناولٹ) برطانیہ: طبع اول: ۱۹۴۰ء

۲۱- "دلی کی شام" یہ "Twilight In Delhi" کا ترجمہ ہے عکراش پریس، کراچی طبع اول: ۱۹۶۳ء
انگریزی سے یہ ترجمہ احمد علی کی بیگم بلقیس جہاں نے کیا ہے۔

۲۲- "Selected Short Stories From (Pakistan) Urdu" مرتبہ: احمد علی: مطبوعہ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد: طبع اول: س۔ ن
(دیباچہ پر جنوری ۱۹۸۳ء درج ہے)

۲۳- "Of Rats And Diplomats"

غیر مدون:

متعدد مضامین بہ زبان انگریزی و اردو اور دو افسانے۔

مستقل پتا:

۲۱۔ اے فاران سوسائٹی، حیدر علی روڈ، کراچی۔ پاکستان۔

اعزاز:

اکادمی ادبیات پاکستان کے فاؤنڈنگ فیلو۔

نظریہ فن:

"۔۔۔ افسانے میں وسعت نہیں ہوتی۔ افسانہ میں انسانی زندگی، اس کے اثرات اور تاریخ کے بدلتے ہوئے رخ کو ایک حد تک پیش

کر سکتا ہے اور اسی لیے لکھنے والے میں تشنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ گویا افسانہ ایک کڑی ہے جو اپنی جگہ معنی خیز ہونے کے باوجود محض ایک کڑی رہتا ہے۔ اس سے ذرہ بکتر نہیں بنتا۔"

احمد علی
(بہ حوالہ: "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" مرتبہ: طاہر مسعود ۱۹۸۵ء)

○

(۱) ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر انوار احمد نے بالترتیب "نگار پاکستان" کراچی، سالنامہ ۱۹۸۱ء اور "اردو افسانہ: تحقیق و تنقید" میں احمد علی کا اولین افسانہ "مہاوٹوں کی رات" مطبوعہ: "ہمایوں" سالنامہ جنوری ۱۹۳۲ء قرار دیا ہے، جو درست نہیں۔

احمد علی

ہماری گلی

میرا مکان پنڈت کے کوچہ میں تھا۔ میرے کمرے کے دروازے میں دو پٹ تھے۔ نیچے کا حصہ بند کر دینے سے صرف اوپر کا حصہ ایک کھڑکی کی طرح کھلا رہ جاتا تھا۔ یہ کھڑکی پتلی سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے مرزا دودھ والے کی دکان تھی اور میرے دروازے کے برابر صدیق بنیئے کی اور اس کے برابر عزیز خرادی کی اور آس پاس کمہاروں کی دکانیں' عطار کی دکان' پان والے کی اور دو چار اور دکانیں تھیں۔ مثلاً قصائی کی' بساطی کی' حلوائی کی دکان۔

ہمارے محلہ میں سے ہو کر لوگ دوسرے محلوں میں جا سکتے تھے۔ اس لئے سڑک برابر چلا کرتی تھی اور اس طرح کے لوگ راستہ بچانے کے لئے میری کھڑکی کے سامنے سے گذرتے کبھی کوئی سفید پوش گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں چھتری لگائے ہوئے چلا جاتا۔ کبھی شام کو کوئی ولایتی منڈا پہنے انگریزی ٹوپی لگائے چھڑکاؤ کے پانی سے بچتا ہوا۔ اپنے کپڑوں کو چھینٹوں بچاتا' بچوں اور لڑکوں سے کتراتا ہوا ان کے گھورنے پر غراتا اور آنکھیں نکالتا ہوا گزر جاتا۔ کبھی کبھی راہگیر عاجز آ کر لڑکوں کو مارنے کے لئے لکڑی یا چھتری اٹھاتا اور بھاگ کر لڑکے چلاتے "لولو ہے بے' لولو ہے"۔ پھر مرزا دودھ والے کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دیتی۔

"ابے لنڈو! کیا کرتے ہو؟ تم کو گھروں میں کچھ کام نہیں؟" اور اگر کوئی پاس بیٹھا ہوتا تو مرزا اس سے کہنے لگتا۔ "ان کی ماؤں کو تو دیکھو۔ لونڈوں کو چھوڑ رکھا ہے کہ سانڈ بیلوں کی طرح گلیوں میں رولا مچایا کریں۔ حرامزادوں کو گالی گلوچ اور دھینگا مشتی کے علاوہ اور کچھ کام ہی نہیں۔"

اور مرزا کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں جھپکنے لگتیں اور اپنی سفید تکونی داڑھی پر ایک ہاتھ پھیرتا اور کسی خریدار کی طرف مخاطب ہو جاتا اور کونڈے میں سے دہی یا کڑھاؤ میں سے دودھ نکال کر ملائی کا ٹکڑا۔ ڈالتا اور خریدار کی طرف بڑھا دیتا۔

لوگ کہتے تھے کہ مرزا کی رگوں میں شریف خون دورہ کرتا ہے' لڑکپن میں سبق نہ یاد کرنے پر اس کے باپ نے اس کو گھر سے نکال دیا اور کچھ روز مارے مارے پھرنے کے بعد اس نے دکان کر لی۔ اس کے بعد اکثر اس کے باپ نے اس سے معافی بھی مانگی اور خوشامد بھی کی لیکن مرزا نے شادی کر لی اور اس کا کام چل نکلا۔ اس کی دوکان کے چھوٹے چھوٹے ملائی کے پیڑے شہر بھر میں مشہور تھے اور اس کا دودھ بہت لذیذ ہوتا تھا۔ رات کو جب کوئی دودھ لینے آتا تو وہ اس کو آبخورے اور تبیا میں خوب اچھالتا یہاں تک کہ اس میں سے جھاگ نکلنے لگتا۔ پھر کھمچیر سے ملائی کا ٹکڑا اس صفائی سے توڑتا کہ دودھ ہلنے تک نہ پاتا تھا۔ اکثر اس کی بیوی دکان پر بیٹھتی تھی۔ وہ بوڑھی ہو گئی تھی۔۔۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی کمر جھک گئی تھی اور منہ میں ایک دانت باقی نہ تھا۔ اس کی اونچی پیشانی اور اس کے گورے رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے کی عورت ہے۔

لیکن اب ان کا کاروبار کم ہو گیا تھا کیوں کہ ضعیفی کی وجہ سے وہ زیادہ محنت نہ کر سکتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا مر چکا تھا اور اب ان کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا۔ ترک موالات کے زمانے میں جب آزادی کا خیال ملک میں ادھر سے ادھر تک ہلچل مچائے تھا' مرزا کا لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ جلوس میں شریک ہوا۔ گاندھی جی کی جے اور بندے ماترم کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ گھنٹہ گھر پر گوروں کی فوجیں مسلح کھڑی

تھیں ۔ کپتان پولیس، ڈپٹی کمشنر اور چند اور انگریز کھڑے تھے اور لوگوں کے ہجوم اور قومی غصہ کو پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ لوگ آگے جانا چاہتے تھے لیکن فوجیں ان کو آگے جانے سے روک رہی تھیں۔ لوگوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور ڈپٹی کمشنر نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں بہت لوگ کام آئے اور مرزا کا بیٹا بھی مرنے والوں میں تھا۔ بڑی دیر کے بعد جب لاش لے جانے کی اجازت ملی تو لوگ مرزا کے لڑکے کی لاش کو اس کے گھر لائے۔

ساری دکانیں بند تھیں اور محلہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جاڑوں کی دھوپ مردہ اور سرد معلوم ہوتی تھی۔ نالیوں میں صفائی نہ ہوئی تھی اور ان میں سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ جب لاش گھر میں آئی تو مرزا اور اس کی بیوی سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ ان کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ان کا بیٹا جو ابھی زندہ تھا، ہنس بول رہا تھا، جس نے صبح ہی بڑے تیار کئے تھے، کڑھاؤ مانجھا تھا۔ جو کپڑے بدل کر اپنے کسی دوست سے ملنے گیا تھا اب زندہ نہیں ہے بلکہ مرچکا ہے۔ وہ بار بار خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو دیکھتے تھے اور مرزا کی بیوی لاش سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ لوگوں نے اس کو الگ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک منٹ کے لئے لاش سے علیحدہ نہ ہوتی تھی۔ وہ "ہے ہے میرا لال" کہہ کہہ کر روتی تھی اور کبھی کبھی اس کے منھ سے چیخ نکلتی اور وہ چلاتی:

ان فرنگیوں کو خدا غارت کرے۔ میرے لال کو مجھ سے چھین لیا۔ خدا کرے کہ یہ غارت ہوں۔"

مرزا پاگلوں کی طرح کبھی گھر کے اندر کبھی باہر بولایا ہوا پھرتا۔ صدیق بنئے نے اپنی دکان کھولی تھی اور مرزا جو بال بکھیرے ہوئے ادھر سے گذرا تو کسی نے آواز دی اور پوچھا۔ "بھائی بڑا افسوس ہوا اور حادثہ کیا پیش آیا؟"

مرزا کی آنکھوں میں ایک آنسو باقی نہ تھا لیکن اس کے سارے چہرے پر کرب کی حالت تھی۔

"تقدیر پھوٹ گئی۔ میرا پلا پلایا لڑکا جاتا رہا۔" یہ کہہ کر مرزا گھر کی طرف چلا گیا۔

گاہک جو کھڑے ہوئے تھے پوچھنے لگے کیا ہوا۔ صدیق نے جھک کر دیکھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سڑک پر گرد و غبار اڑنے لگا۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا ہوا میں اٹھا اور کچھ دور اوپر جا کر الٹا پلٹتا نیچے کی طرف گرنے لگا۔ مرزا کے پھٹے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہ گلی میں غائب ہو گیا۔

"ہوا کیا۔ ترک موالات کرنے گیا تھا، گولی لگی اور مرگیا۔ نہ جانے اپنے کام میں دل کیوں نہیں لگاتے۔ سرکار کے خلاف جانے کا یہی نتیجہ ہے۔ کڑا جوان تھا۔ ان دوزخ کے بیونتوں اور کھدر پوشوں کا شکار ہو گیا۔"

یہ کہتے کہتے صدیق نے ایک مٹکے میں کفگیر ڈالا۔ بہت سے مٹکے دیوار میں گڑے ہوئے تھے اور گاہک کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ کفگیر میں دال نکال کر صدیق نے گاہک کی طرف بڑھائی۔ گاہک جو بے غوری سے صدیق کی باتیں سن رہا تھا۔ دال کو اپنے کپڑے میں باندھنے لگا۔ یکایک اس کی نگاہ دال پر پڑی اور بولا۔ "واہ میاں باشا! یہ کون سی دال دے رہے ہو میں نے تو ارہر کی مانگی تھی۔ ذری پھرتی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بیوی بکے گی۔"

گھر میں مرزا کی بیوی اپنا سر دے دے مار رہی تھی اور بین کر کے روتی تھی اور انگریزوں اور گاندھی کو کوستی تھی۔ یامین کی ماں کو جب اس حادثے کی خبر ملی تو وہ پرسے کے لئے آئی۔ اس کا جوان لڑکا بھی دیوار کے نیچے دب کر مرگیا تھا اور وہ اس کے ننھے بچوں کو سلائی کر کے پالتی تھی۔ دونوں گلے مل کر خوب روئیں اور مرزا کی بیوی کو ذرا تسلی ہوئی ----- آخر کار لڑکے کو دفن کرنے لے گئے۔ رات اندھیری تھی اور بے بسی تاریکی کی طرح سارے محلہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا سرد تھی اور محلہ میں سیل کی وجہ سے جاڑا زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ لیمپوں کی دھیمی روشنی میں محلہ بھیانک اور ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا اور سڑک پر کوئی جاندار چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ صرف مرزا کی دکان کے اندر کئی بلیوں کے غرانے اور کھڑ بڑ کی آواز آ رہی تھی۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد تک اکثر مرزا کی بیوی کے گانے کی آواز آیا کرتی تھی:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ ' نہیں میرے دل کو قرار ہے

لیکن پھر وہ خاموش رہنے لگی اور کام کاج میں مشغول رہتی۔

میرے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک پرانا کھجور کا درخت تھا۔ ایک زمانہ میں اس میں پھل لگا کرتے تھے اور شہد کی مکھیاں غذا کی تلاش میں نیچے اتر آتی تھیں۔ اس کی بڑی ڈالیوں پر آ کر بیٹھتے اور بھولے بھٹکے کبوتر راتوں کو بسیرا کر لیا کرتے تھے لیکن اب اس کے پتے جھڑ گئے تھے ' ڈالیاں گر چکی تھیں اور اس کا تنا سیاہ اور بدہیئت رات کی تاریکی میں اس بانس کی طرح کھڑا رہتا جو کھیتوں میں جانوروں کو ڈرانے کے لئے گاڑ دیا جاتا ہے۔ اب نہ اس پر جانور منڈلاتے تھے ' نہ شہد کی مکھیاں اس طرف آتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کوا اس کے ٹھنٹھ پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتا اور اپنا گلا پھاڑتا یا کوئی چیل اس پر ذرا دیر کو چلچلاتی اور پھر اڑ جاتی۔ صبح کو بڑھتی ہوئی روشنی میں تنا آسمان پر چمک اٹھتا تھا لیکن شام کو فضا کی بڑھتی تاریکی میں آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور رات میں مل جاتا۔ رات کو اکثر گھر میں داخل ہوتے وقت میری نگاہ اس موٹے اور بھیانک تنے پر پڑتی پھر اس کے ساتھ ساتھ اٹھتی ہوئی آسمان پر جاتی۔ تارے چمکتے ہوتے تھے اور ٹھیک اس کے سرے پر بنات النعش کا آخری ستارہ مجھ کو دکھائی دیتا تھا لیکن وہ تنا میری نگاہ اور آسمان کے درمیان حائل ہو جاتا اور میں تاروں کے پھیلاؤ کو نہ دیکھ سکتا۔

محلہ میں اکثر ایک پاگل عورت آیا کرتی تھی۔ کسی نے اس کے بال کاٹ دیئے تھے اور اس کا سر اس کے توانا اور بھاری جسم پر ایک اخروٹ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ خدا ترس لوگ کبھی کبھی اسے کپڑے پہنا دیا کرتے تھے۔ لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد وہ پھر ننگی ہو جاتی تھی۔ یا تو کوئی کپڑوں کو اتار لیتا یا وہ خود ان کو پھاڑ کر پھینک دیتی تھی۔ اس کے منھ سے ہمیشہ رال بہا کرتی اور اس کے ہاتھ ہمیشہ اکڑے ہوئے رہتے۔ وہ ہمیشہ مٹک مٹک کر سڑک پر ناچتی اور تھرکتی اور گونگوں کی طرح گن گن کرتی جیسے ہی وہ محلہ میں داخل ہوتی لڑکوں کا ایک غول اس کے پیچھے پیچھے تالیاں بجاتا اور "پگلی" کہہ کہہ کر پتھر پھینکتا اور منھ چڑاتا۔ عورت "ایں ایں" کرتی اور کونوں میں چھپتی۔ جب کبھی مرزا کی دکان کے سامنے یہ واقعہ ہوتا تو مرزا لڑکوں پر چیختا "ابے سسرو تمہیں مرنا نہیں ہے! بھاگو یہاں سے دور ہو۔"

لیکن ذرا دیر کے بعد لڑکے پھر جمع ہو جاتے۔

اکثر بڑے آدمی بھی اس سے مذاق کرتے۔ وہ بدصورت ضرور تھی لیکن اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اکثر منو جو کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا ' لیکن اب بدمعاشوں میں مل گیا تھا ' اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہتا "کیوں ' تیرے بچہ کب ہو گا؟"

اور پگلی ایک درد انگیز وحشیانہ آواز نکالتی اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا کے جو ڈھیلے اور لٹکے رہتے کسی راہ گیر یا دوکاندار سے مخاطب ہو کر منو کی طرف اشارہ کرتی۔ اس کی کریہہ آواز میں ایک منت ہوتی۔ ایک بے کس و بے بس شخص کی وہ التجا جو وہ اپنے حاکم یا اپنے سے زیادہ طاقتور انسان سے کرتا ہے کہ مجھے بخش دو اور بچا لو۔ مگر اور لوگ بھی مذاق کرنے میں شریک ہو جاتے اور زور زور سے قہقہہ لگاتے۔۔۔۔

ہندوستان میں ہزارہا لوگ ایسے ہیں جن کو سوائے کھانے پینے اور مر جانے کے کسی بات کا احساس نہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں ' بڑھتے ہیں ' کمانے لگتے ہیں ' کھاتے پیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں دنیا کی کسی بات سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسانیت کی بو ان میں نہیں ہوتی۔ زندگی کی عظمت کا ان کو کوئی احساس نہیں جیسے غلام کوئی کام کرنے اور مر رہنے کے علاوہ کوئی دوسری حقیقت ہی نہیں جانتے۔ زندگی کا طلوع اور موت کا غروب ان کے لئے دونوں یکساں ہیں۔ ان کے لئے دن کام کرنے اور راتیں سو رہنے کو بنی ہیں۔ بس یہی ان کی زندگی کی حقیقت ہے۔ اور صرف موت ان کو زندگی سے نجات دلا سکتی ہے۔

ایک اور چیز جو ہمارے محلے میں کثرت سے دکھائی دیتی تھی ' وہ کتے تھے ' مرے ہوئے اور فاقہ زدہ۔ اکثر کو کھجلی تھی اور ان کی کھال میں سے گوشت نظر آتا تھا۔ اپنے بڑے بڑے دانتوں کو نکوس کر وہ اپنے پنجے کھجاتے تھے یا قصائی کی دکان کے سامنے ایک ہڈی کے پیچھے ایک دوسرے کو نوچتے اور لہولہان کر دیتے۔ وہ اپنی دمیں ٹانگوں کے بیچ میں دبائے نالیوں میں سونگھتے دبے دبے آتے تھے اور قصائی کی دکان کے سامنے چھچھڑوں پر جھپٹتے لیکن اکثر جیسے ہی ان کو کوئی گوشت کا ٹکڑا یا ہڈی دکھائی دیتی تو چیلیں اوپر سے جھپٹا مارتیں اور ان کے سامنے سے گوشت کو اٹھا لے

جاتیں۔ پھر وہ ایک ایسے آدمی کی طرح جو خفیف ہو گیا ہو اپنی دم دبائے ہوئے سڑک کو سونگھا کرتے یا اپنی جھینپ آپس میں لڑائی کر کے اور ایک دوسرے کا خون بہا کر مٹاتے۔

صبح کو بہت سویرے شیرا چنے بیچنے والے کی آواز آتی۔ وہ اپنی جھولی میں گرم گرم تازہ بھنے ہوئے موٹے چنے گلی گلی اور کوچہ کوچہ بیچتا پھرتا تھا۔ اس کی عمر کوئی چالیس سال کے قریب تھی لیکن وہ دبلا اور سوکھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں ابھی سے نمایاں ہو گئی تھیں اور اس کی خشخشی داڑھی میں سفید بال آگئے تھے۔ اس کی آنکھیں ایک بیمار کی آنکھوں کی طرح تھیں جن کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور جن میں بھوک اور غربت اور مصیبت صاف جھلکتے تھے۔ ان کے ڈھیلوں میں باریک باریک سرخ رگیں دور سے دکھائی دیتی تھیں جیسے یا تو نشے میں یا کئی دنوں کے فاقے اور بخار کے بعد پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے سر پر ایک کپڑے کی میلی ٹوپی رکھی رہتی تھی۔ گلے میں پھٹی ہوئی قمیض اور اس کی اتنگی دھوتی میں سے پتلی پتلی ٹانگیں دکھائی دیتی تھیں۔

عرصہ ہوا وہ ہمارے شہر میں کسی نزدیک کے ضلع سے کام کی تلاش میں آگیا تھا۔ وہ رات کو ایک مسجد میں پڑا رہتا اور دن بھر شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا لیکن شہروں کی حالت روزگار کے معاملہ میں گاؤں اور قصبوں سے کسی طرح بہتر نہیں اور شیرا کو کوئی کام نہ ملا مسجد میں میر امان اللہ نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ شیرا نے ان کو اپنا قصہ سنایا۔ میر صاحب کو اس کی حالت پر ترس آیا اور وہ اسے اپنے گھر لے گئے۔ شیرا نیک اور دیانت دار آدمی تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد میر صاحب نے اسے پانچ روپے دیئے اور کہا۔

" ان سے کوئی کام شروع کر دینا اس لئے میں یہ روپے دیتا ہوں۔ جب تمہارے پاس پیسے ہوں تو یہ رقم واپس کر دینا ورنہ کوئی فکر کی بات نہیں۔"

شیرا نے دال اور کابلی چنوں کا خوانچہ لگایا۔ کچھ عرصے میں شیرا کو بہت سے محلّہ والے جان گئے اور اس کا سودا خوب بکنے لگا۔ سال بھر کے اندر ہی اس نے میر صاحب کے روپے واپس کر دیئے۔ اپنے بیوی بچوں کو بلایا اور ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگا اور بہت خوش تھا۔

اسی دوران میں عبدالرشید کو سوامی شردھانند کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا کا حکم ہو گیا۔ سارے شہر کے مسلمانوں میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ پھانسی والے روز جیل کے باہر ہزارہا آدمیوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب دروازہ توڑ کر اندر گھس جانا چاہتے تھے لیکن جب پولیس نے عبدالرشید کی لاش کو دینے سے انکار کر دیا تو لوگوں کے جوش اور غصے کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا۔۔۔ کہ کس طرح جیل کو مسمار کر دیں اور اس مرد غازی کی لاش کو ایک شہید کی طرح دفن کریں۔

اس دن شیرا کسی کام سے جامع مسجد کی طرف گیا ہوا تھا۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا اور سڑکیں ایک شہر خموشاں کی طرح اجاڑ اور سنسان معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کو کئی ایک بھوکے کتے پڑے ہوئے دونے چاٹتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک نالی میں ایک مرا ہوا کبوتر پڑا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو مڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں سخت اور نیلی اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے پر پانی میں بھیگ گئے تھے اور اس کی ایک آنکھ کریہہ معلوم ہو رہی تھی۔ شیرا کھڑا ہو کر اس کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں سامنے سڑک کے موڑ سے کلمہ کی آواز زور زور سے آنے لگی۔ لوگ ایک جنازہ لئے چلے آ رہے تھے۔ جوں جوں جنازہ شیرا کی طرف آتا گیا پیچھے بھیڑ اور زیادہ نظر آتی گئی۔ یہاں تک کہ دور دور آدمیوں کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ خلقت عبدالرشید کے جنازے کو کسی طرح لے بھاگی تھی۔ شیرا بھی جنازے کی طرف بڑھا اور کندھا دینے میں شریک ہو گیا۔ اتنے میں سامنے سے پولیس نمودار ہوئی اور انہوں نے جنازہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور کئی ایک آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں میں شیرا بھی تھا اور اس کو اس بلوے میں شرکت کرنے کی بدولت دو سال کی سزا ہو گئی۔

اب وہ قید بھگت چکا تھا لیکن اس کے گاہک اس کی آواز سے ناآشنا ہو چکے تھے اور اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ دوبارہ خوانچہ لگا سکے۔ کچھ لوگوں نے چندہ کر کے اسے دو روپے دے دیئے اور ان سے شیرا نے پھر کام شروع کیا اور اب چنے بیچتا پھرتا تھا لیکن اب اس کی پچھلا کرارا پن باقی نہ رہا تھا اور مصیبت اور تکلیف اس کی ہر پکار میں سنائی دیتی تھی۔ تاہم بچے اس کی آواز سن کر چنے لینے کو دوڑتے تھے اور وہ مٹھی

سے نکال کر چنے تولتا اور ان کو دیتا تھا۔

ایک اور شخص جو ہمارے محلے میں ہر روز رات کو آیا کرتا تھا وہ ایک اندھا فقیر تھا بہت چھوٹا تھا اور اس کی چپلی داڑھی پر ہمیشہ خاک پڑی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا بانس کا ڈنڈا رہتا تھا جسے ٹیک ٹیک کر وہ آگے بڑھتا تھا۔ وہ بالکل حقیر اور ناچیز معلوم ہوتا تھا جیسے کوڑے کے ڈھیر پر مکھیوں کا غول یا کسی مری ہوئی بلی کا ڈھینچر لیکن اس آواز میں وہ مایوسی اور درد تھا جو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ دیتا تھا۔ جاڑوں میں اس کی آواز جیسے سارے محلّہ میں بے بسی پھیلاتی ہوئی کہیں دور سے آتی۔ میں نے آج تک اس سے زیادہ اثر رکھنے والی آواز نہیں سنی، اور ابھی تک وہ میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ بہادر شاہ کی غزل اس کے منھ سے پھر پرانے زمانے کی یاد تازہ کر دیتی تھی۔ جب ہندوستان اپنی نئی بندشوں میں نہیں جکڑا گیا تھا۔ اس کی آواز سے صرف بہادر شاہ کے رنج کا ہی اندازہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ہندوستان کی غلامی کا نوحہ سننے میں آتا تھا۔ دور سے اس کی آواز آتی تھی۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے وہ میں ایک مشت غبار ہوں

لیکن محلّہ کے شرفا اس کو پیسے دینے سے گھبراتے تھے کیوں کہ وہ چرس پیتا تھا۔

ایک روز رات کو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ گرمیوں کی رات تھی اور کوئی دس بجے کا وقت۔ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں لیکن کوابی اور مرزا کی دکانیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ تو سو گئے تھے اور کچھ ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ ہوا میں خشکی اور گرمی تھی اور نالیوں میں سے سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ مرزا کی دکان کے تختے کے نیچے ایک سیاہ بلی گھات لگائے بیٹھی تھی جیسے کسی شکار کی فکر میں بیٹھی ہو۔ ایک شخص نے ایک آنہ کا دودھ لے کر پیا اور آبخورے کو زمین پر ڈال دیا۔ بلی دبے پاؤں تختے کے نیچے سے نکلی اور آبخورے کو چاٹنے لگی۔ اسی وقت میری کھڑکی کے سامنے سے کلو گذری۔ اس کا رنگ سیاہ تھا لیکن شباب نے اس کی چہرے پر ایک رونق اور خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ اس کی چال میں ایک بے باکی اور الھڑپن تھا اور جسم زندگی کے ابھار سے توانا اور سبک تھا۔ وہ منصف صاحب کے یہاں ملازم تھی جن کی بیوی نے اس کو بچپن ہی سے پالا تھا۔ اب وہ بیوہ ہو گئی تھی اور اسے بیوہ ہوئے بھی تین سال گذر گئے تھے لیکن محلّہ کے نوجوانوں کی نگاہیں اس کی طرف گڑی رہتی تھیں۔

جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچی تو منو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کلو جھنجھلا کر بولی:

"موا مشٹنڈا کہیں کا، تجھ پر خدا کی سنوار۔ ایک عورت کو اکیلا دیکھ کر ہاتھ ڈالتا ہے۔"

منو بولا

"تیری جوانی پھر کس دن کام آئے گی؟"

"ہٹ دور ہو، موئے میرا ہاتھ چھوڑ۔"

برابر ایک مکان کی چھت پر دو بلیوں کے لڑنے کی آواز آئی۔ اسی وقت کلو نے زور سے جھٹکا دیا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"بھاڑو پٹے، جوانا مرگ سمجھتا ہے مجھ میں دم نہیں۔ اتنا پٹواؤں گی کہ عمر بھر یاد کرے گا۔"

مرزا جو ایک خریدار کو دودھ دینے کے بعد ذرا دیر کے لئے گھر میں چلا گیا تھا اسی وقت واپس آیا اور کلو کا آخری جملہ اسے سنائی دیا اور وہ بولا:

"کیا بات ہے کلو! کیا ہوا؟"

لیکن کلو بغیر پیچھے مڑے تیزی سے گلی کے اندر داخل ہو گئی ۔ عزیز خیراتی جو اپنی دکان کے سامنے سو رہا تھا، شور سے اٹھ گیا ۔ منو کو کھڑا دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"ابے منو کیا بات ہے؟"

منو مایوسی اور غصہ سے بھرا کھڑا تھا ۔ اس کا منہ خشک ہو کر ستا ہوا معلوم ہو رہا تھا ۔ اس کی آنکھیں ایک سانپ کی آنکھوں کی طرح زہریلی اور تیز ہو گئی تھیں ۔ کوڑے کے ڈھیر پر ایک بلی کی آنکھیں ذرا دیر چمکتی ہوئی دکھائی دیں لیکن پھر غائب ہو گئیں ۔ منو نے ذرا دیر چھپی ہوئی ناامیدی کی آواز میں جواب دیا ۔

"کچھ نہیں یار، کلو تھی ۔"

"ابے کچھ سودا بھی پٹا؟"

"نہیں میاں ہتے نہیں چڑھی ۔ ہاتھ جھٹک کے بھاگ گئی ۔ لیکن بسی جائے گی کہاں؟"

اور بلیاں ابھی تک لڑ رہی تھیں ۔ وہ ایک بھیانک طریقے سے غرانے کے بعد زور زور سے چیختی تھیں ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسری کو کھا جائیں گی ۔ پھر میاؤں میاؤں کر کے ایک بھاگ نکلی اور بلا غراتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

عزیز خیراتی نے منو کو اپنے پلنگ پر بٹھا لیا اور سرہانے سے بیڑی نکال کر اس کی طرف بڑھائی لیکن منو نے اپنی قمیض کی جیب میں سے ایک چاندی کا سگریٹ کیس نکالا اور عزیز سے کہا۔

"لو میاں تم بھی کیا یاد کرو گے ۔ میں تمہیں بڑا بڑھیا سگریٹ پلاتا ہوں ۔"

اور ایک سگریٹ نکال کر عزیز کو دیا ۔

"ارے یار میں نے کہا اب کے کس کا مار لایا؟"

"میاں یاروں کے پاس کس چیز کی کمی ہے ۔ جس کو نہ دے مولا، اس کو دے آصف الدولہ ۔ اگر اللہ میاں کے بھروسے پر رہتے تو کام چل لیا ہوتا۔"

"میاں ہوش کی لو، اس سے ڈرو، دوزخ میں جلو گے، توبہ کرو ۔"

"جا یار یہ بھی کیا گدھوں کی باتیں کرتا ہے ۔ میں تو یہ جانتا ہوں کھاؤ پیو اور مزے کرو ۔ اس سے زیادہ استاد نے سکھایا ہی نہیں ۔ میں تو مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور پڑے پڑے اینڈتا ہوں ۔ کہاں کی دوزخ لگائی ۔ اگر ہوئی بھی تو بھگت لیں گے ۔ اب کہاں کا روگ پالا۔"

"بس یار بس ۔ کیوں خراب باتیں منہ سے نکال رہا ہے۔ سب آگے آگے آ جاتا ہے ۔ ساری اکڑ دھری رہ جائے گی۔"

"اچھا یار تو تو اس طرح باتیں کرنے لگا، میں اب چل دیا ۔"

ذری سن تو یار ۔ ایک بات مجھے دنوں سے حیران کر رہی ہے ۔ قسم کھا بتا دے گا؟"

"اچھا جا کیا یاد رکھے گا ۔ اللہ قسم بتا دوں گا ۔"

"یہ بتا تو آخر چوری کیوں کرتا ہے؟"

"بھئی اس کی نہیں بدی تھی"

دیکھ قول دے چکا ہے ۔"

"اچھا جا تو جیتا میں ہارا ۔ جو سچ پوچھو تو بات یہ ہے کہ میں کبھی چوری نہ کرتا ۔ تو جانتا ہے میرے رشتہ دار کافی امیر لوگ ہیں۔"

"جبھی تو میں اور بھی حیران ہو رہا ہوں ۔"

"میرا ایک بھائی لگتا تھا ۔ لونڈا نمکین تھا ۔ یہ کوئی دس برس کی بات ہے ۔ تو میری کچھ اس سے چل گئی تھی ۔ ہم دونوں مدرسے میں

ساتھ پڑھتے تھے۔ اس نے ماسٹر سے میرے شکایت کر دی اور چتیں لگوائیں۔ میرے اوپر بھوت سوار ہو گیا۔ میں نے کہا سالے بدلہ نہ لیا ہو تو پیشاب سے مونچھیں منڈا دوں گا۔ ایک موقع پر کر میں نے سالے کا بستہ چرا لیا۔ اس کے اندر بڑی بڑھیا بڑھیا چیزیں تھیں۔ اس سے شروعات ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ مجھے ایک ماموں کا سگریٹ کیس پسند آگیا۔ میں ان سے مانگ تو نہ سکتا تھا لیکن میں نے پار کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ ان حرامزادوں کے پاس روپے بھی ہیں اور اچھی اچھی چیزیں بھی۔ کیوں نہ اڑا لیا کرو' اور پھر تو میرا ہاتھ خوب صاف ہو گیا ہے۔ یار سچ پوچھو تو یہ لوگ بھی غریب کو مر کر بھی کوئی چیز نہ دیں۔ ان سے تو بس اسی طرح چیزیں وصول ہو سکتی ہیں۔"

"لیکن اگر کبھی پکڑے گئے تو"

"پھر تو نے وہی فضول باتیں شروع کر دیں۔ اچھا اب میں چلا نہیں تو گھر میں تو تو میں میں ہو گی۔" یہ کہہ کے وہ اٹھا اور عزیز کی کمر پر زور سے تھپڑ مار کر روانہ ہو گیا۔۔۔

ہمارے محلے کی مسجد میں نثار احمد اذان دیا کرتے تھے۔ یہ قوی ہیکل اور مضبوط تھے۔ ان کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور ان کی داڑھی مہندی سے سرخ رہتی تھی۔ ان کا سر تامڑی تھا لیکن پہلوؤں میں اور گدی پر ان کے چھپے بال پڑے رہتے تھے۔ ان کے ہاتھ پر ٹھیک بیچ میں ایک بڑا سا گٹا پڑ گیا تھا جس کا رنگ راکھ کا سا تھا اور الگ دور سے چمکتا تھا۔ اکثر وہ میری کھڑکی کے سامنے سے کھنکارتے ہوئے گذرتے تھے۔ وہ گاڑھے کا ڈھیلی موریوں کا پائجامہ اور گاڑھے کا کرتا پہنے رہتے تھے اور ان کے کندھے پر ایک بڑا سرخ رنگ کا چھپا ہوا رومال پڑا رہتا تھا۔ ان کی آواز میں ایک ایسا کرارا پن گرمی کے ساتھ ساتھ وہ نرمی تھی جو انسان کو کم عطا ہوتی ہے۔ ان کی اذان دور دور مشہور تھی اور ان کی آواز بہت دور سے سنائی دیتی تھی۔ شروع شروع میں ان کی آواز سے اس پکار کی شان ٹپکتی تھی جو مسلمانوں کو نماز کے لئے بلاتی ہے۔ پھر اختتام کے قریب آواز کی جھنکار میں کمی ہوتی اور ان کے جملے بل کھاتے ہوئے ایک سناٹا اور خاموشی پیدا کرتے ہوئے فضا میں کھو جاتے تھے۔ لوگ نثار احمد کو حضرت بلال حبشی کہتے تھے اور اس مقابلہ میں بہت سی باتیں دونوں میں مشترک تھیں۔ ان کی شاندار آواز اور ان کا سیاہ رنگ۔

ایک مرتبہ میں اپنے مکان کی چھت پر اکیلا بیٹھا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل بچھے ہوئے تھے اور سورج کی روشنی ان کے پیچھے سے پڑ رہی تھی اور ان میں سے ہلکی سی پھیکی روشنی نمایاں تھی۔ کیوں کہ مطلع صاف نہ تھا اور شہر کا گرد و غبار اور دور ملوں کی چمنیوں کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے شور و شغب کی جھنکار مکھیوں کے بھنبھنانے کی طرح آ رہی تھی۔ ساری فضا میں ایک دل شکن مایوسی تھی۔ وہ تکلیف دہ کیفیت جو ہمارے شہروں کی خاصی پہچان ہوتی ہے' جس میں غربت اور غلاظت' زندگی کی حقارت اور بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ گرد و غبار سے میلے اور پھیکے بادلوں میں ایک جنگلی کبوتر اڑتا ہوا گذرا اور ان کے گدلے رنگوں میں غائب ہو گیا۔ دور سے ملوں کی سیٹیوں اور ریل کے انجنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شہر کی اونچی ممٹیوں اور میناروں سے کبوتر اڑتے تھے یا منڈلا منڈلا کر ان پر بیٹھ جاتے تھے۔ دور دور جدھر نگاہ دوڑتی تھی گندی اور بدنما میلی کچیلی عمارتیں اور ان کی چھتیں دکھائی دیتی تھیں۔ دور دور جدھر انسان دیکھ سکتا تھا زندگی کی سرد مہری اور بے کاری کا احساس ہوتا تھا۔ کہیں کہیں کوئی دو منزلہ مکان بن رہا تھا اور اس کی پاڑیں آسمان اور نگاہ کے درمیان سد راہ ہوتی تھیں لیکن بانسوں اور بلیوں کے رنگ نگاہ کو تکلیف نہ پہنچاتے تھے اور بادلوں کے رنگوں میں مل کر ہلکے اور مدھم دکھائی دیتے تھے۔ اسی وقت نثار احمد کے کھنکارنے کی آواز آئی اور پھر ان کی اٹھتی سنہری آواز فضا میں پھیل گئی۔ یہ آواز کچھ ایسی مایوس کن لیکن تسکین بخش تھی کہ میری کوفت ایک خاموش رنج سے بدل گئی۔ اس آواز میں کوئی عظمت اور بڑائی نہ تھی بلکہ اس سے زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہوتا تھا۔ اس بات کا کہ دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے' اس بات کا کہ زندگی حقیر اور ناچیز ہے۔ اسی طرح جیسے بادلوں کے چہرے پر گرد اور دھواں اور غبار۔ اپنے موہوم خیالات کا شکار میں اذان سنتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اختتام کے قریب آگئی حی علی الصلوۃ کی خاموشی پیدا کرنے والی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ پھر حی علی الفلاح' حی علی الفلاح کی آواز سناٹا چھاتی ہوئی' دنیا کی بے ثباتی کا یقین دلاتی باریک لمبی تان کے دھیمے سروں میں ہوتی اس آہستگی اور دل بستگی سے ختم ہوئی کہ یہ نہ معلوم ہوتا کہ آواز رک گئی ہے یا ساری دنیا پر خاموشی طاری ہے' ایک گہری خاموشی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا سے پرے بہت دور ایک اور دنیا ہے

جس میں ازل اور ابد دونوں ایک ہیں اور یہ دنیا ہیچ اور موہوم ہے۔ آواز اس طرح فضا میں کھو گئی جس طرح افق پر زمین ختم ہوتی ہے اور آسمان شروع ہو جاتا ہے اور تمیز نہیں ہو سکتی کہ زمین ختم بھی ہو گئی یا ہر جگہ آسمان ہی آسمان ہے۔ اسی طرح آواز اس آہستگی سے رک گئی کہ آواز اور خاموشی میں امتیاز ہو سکتا تھا۔ آواز کانوں میں گونج رہی تھی لیکن یہی شبہ ہوتا تھا کہ صرف خاموشی کانوں میں ہیجان بپا کئے ہوئے ہے۔

اور میں سوچتا رہا کہ یہ اذان ہماری زندگی کی حقیقت کو کس خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔ وہی بے بسی اور مایوسی جو ہماری رگ رگ میں پیوست ہو گئی ہے۔ وہی ناامیدی اور خارجی حقیقت کا خوف جو ہم کو ایک داخلی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے' اس اذان میں موجود تھے۔ ہم دنیا کو چھوڑ کر ازل اور ابد کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ آدمی کو بھلا کر خدا کی تلاش میں مشغول رہتے ہیں اور ہماری زندگی کی ہر چیز ہم کو اس بات کی ترغیب دلاتی ہے۔ ہمارا ہر گیت ہمیں یہی لوریاں سناتا ہے۔ ہمارے پیروں میں بیڑیاں ہیں لیکن ہم ان کی رگڑ کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ وہ ہم کو ایک خاص حقیقت نہیں معلوم ہوتیں۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہیں' ہمارے گلوں میں طوق ہیں۔ ہماری زبانوں پر قفل ڈال دیئے گئے ہیں لیکن ہم کو کسی بات کا احساس نہیں' ہمارا جسم سن ہو چکا ہے' ہماری روح سو گئی ہے اور ہم اپنی بے بسی پر مگن ہیں اور لاپروائی اور بے حسی کی زندگی گزارتے ہیں حتیٰ کہ موت اپنے پنجے بڑھاتی ہے اور اپنی تاریک آغوش میں کھینچ لیتی ہے۔ ہماری نیک نامی اور بد نامی دونوں برابر ہیں۔ ہماری زندگی اور موت دونوں یکساں ہیں اور اذان کی آواز کی طرح ہم اس طرح زندگی سے موت میں بدل جاتے ہیں کہ کوئی تمیز نہیں کر سکتا ہم کبھی زندہ بھی تھے یا سب وہم و گمان تھا اور ہم موت کے دلارے ہمیشہ سے اس کی لوریوں سے مخمور غفلت کی نیند سویا کرتے تھے۔

ایک رات کو مرزا کی دکان پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو عزیز تھا' ایک کوابی اور ایک دو آدمی اور جمع ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے حقہ رکھا تھا اور وہ باری باری کش کھینچ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

"میں تو یار ہر ایک چیز میں اس شان دیکھ رہا ہوں۔"

اس پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں غور سے سننے لگا۔

اتنے میں ایک گاہک آیا اور اس نے مرزا سے پانچ پیسے کا دودھ مانگا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مرزا نے ایک آبخورہ اٹھایا اور دودھ نکالنے کے لئے ڈیا دودھ کی طرف بڑھائی۔ اس آواز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "پرلے دن میں چاندنی چوک میں سے جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک بچھیا آ رہی تھی۔ اسی جگہ ایک بچہ پڑا ہوا تھا۔ گائے بچے کے پاس آن کے رک گئی۔ میں نے سوچا کہ دیکھو اب کیا کرتی ہے۔ دلے میں صاحب اس بچھیا نے اپنے چاروں پیر جوڑ کر ایک قلانچ ماری اور بچے کو تاف لانگ گئی۔ مجھ کو تو اس جناور کی عقل میں اس کی شان نظر آ گئی۔"

مرزا کا ایک ہاتھ کڑھاؤ کے پاس تھا' دوسرے میں آبخورہ تھا اور بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ عزیز بولا:

"واہ واہ کیا اس کی شان ہے!"

مرزا نے ڈیا میں دودپ لیا اور اس کو اچھالنے لگا۔ اتنے میں ایک دوسرا شخص بولا:

"ہاں میاں اس کی شان کا کیا پوچھ رہے ہو۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمان کو حکم ملا کہ محل بناؤ۔ تو بس صاحب انھوں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ جناتوں نے آنا "فانا" میں بڑے بڑے فتر اور سلیں لا لا کر جمع کر دیں اور مدت لگ گئی۔ تم جانتے ہو جناتوں کا کام کتنی فرتی کا ہوتا ہے۔ آج اتنا کل وتنا۔ تھوڑے ہی دنوں میں محل آسمان سے باتیں کرنے لگ گیا۔ حضرت سلیمان روز اس بنگہ جا کے دیکھا کرتے تھے کہ کوئی کام میں سستی تو نہیں کر رہا ہے تو بس صاحب ایک دن محل کھڑا ہو گیا۔ اب صرف اس کے اندر کی قلیں اور فتر صاف کرنے رہ گئے۔ دوسرے روز پھر حضرت سلیمان اپنی لکڑی ٹیک کے کھڑے ہو گئے اور ملبہ باہر پھینکنے کا حکم دے دیا لیکن وقتے میں وہاں سے کچھ اور ہی حکم آ چکا تھا۔ اب دیکھئے محل کی شان کہ یہاں تو اس کی صفائی ہو رہی ہے اور وہاں اس لکڑی میں گھن لگنا شروع ہو گیا لیکن وہ ڈٹے کھڑے رہے یہاں تک کہ گھن لگتے لگتے موٹھ تک پہنچ گیا۔ لیکن ان کو ذری بھی خبر نہیں ہوئی اور لکڑی راکھ کی طرح یوں جھڑ گئی اور ان کا خود کا دم نکل گیا۔ ادھر تو ان کا کام تمام

ہوا ' ودھر جب جناتوں نے دیکھا کہ جن کا رعاب شعاب تھا وہ ہی نہیں رہے تو چپت بنے ۔ لیکن میں تو اس بات پر حریان ہو رہا ہوں کہ اب ان قاتوں اور فتروں کو کون صاف کرے گا؟"

عزیز کے ہاتھ میں حقہ کی نَے تھی اس کے منھ کے برابر رکھی ہوئی تھی ۔ اور وہ بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ مرزا کا ایک ہاتھ جس میں ٹیا تھی 'اور آبخورہ والا پچے 'اور وہ قصہ میں محو تھا۔

میں نے زور سے قہقہہ لگایا لیکن پھر سوچ میں پڑ گیا کہ واقعی ان " قتلوں " اور " فتروں " کو کون صاف کرے گا۔

ہوا کا ایک جھونکا زور سے آیا اور مٹی کے تیل کا لیمپ گل ہو گیا اور سڑک پر اندھیرا تھا۔ اس وقت لوگ مرزا کی دکان سے اٹھ کر روانہ ہونے لگے اور میں بھی گھر کے اندر چلا گیا۔

راجندر سنگھ بیدی

نام : راجندر سنگھ بیدی
قلمی نام : محسن لاہوری / راجندر سنگھ بیدی
پیدائش : یکم ستمبر ۱۹۱۵ء بہ مقام لاہور چھاؤنی صبح ۳ بج کر ۴۷ منٹ پر
وفات : ۱۱ نومبر ۱۹۸۴ء بہ مقام بمبئی
تعلیم : ایف۔ اے 'ڈی۔ اے۔ وی کالج 'لاہور

ابتدائی تعلیم لاہور میں پائی۔ میٹرک لاہور ہی سے ۱۹۳۱ء میں کیا۔ انٹر ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور سے ۱۹۳۳ء میں کر کے بی۔ اے میں داخلہ لیا لیکن تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

مختصر حالات زندگی:

بیدی کے والد ہیرا سنگھ بیدی ذات کے کھتری اور والدہ سیوادئی برہمن تھیں۔ ہیرا سنگھ بیدی جنرل پوسٹ آفس 'لاہور میں پوسٹ مین تھے اور انہیں جی۔ پی۔ او لاہور کے پچھواڑے کوارٹر ملا ہوا تھا۔ ان کا آبائی علاقہ "دلے کی" تحصیل ڈسکہ 'ضلع سیالکوٹ تھا۔ بیدی بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ وشنوماتا کے دوارے جموں گئے اور اکثر آریہ سماج لاہور کے مندر میں والد کے ساتھ حاضری دی۔ ماں تپ دق کی مریضہ تھیں۔ باپ اور بیٹے کی دعائیں قبول نہ ہوئیں اور سیوادئی دوسرے جہاں سدھاریں۔ جس دن ان کا انتقال ہوا 'اس شام ہیرا سنگھ اپنے بیٹے کے ساتھ غم غلط کرنے امرتسر گئے اور فلم "سوہنی مہینوال" دیکھی۔ بیدی نے بچپن اور لڑکپن میں انتہائی عسرت کی زندگی جھیلی 'کچھ یہی سبب ہے کہ انٹرمیڈیٹ (۱۹۳۳ء) کے فوراً بعد بہ حیثیت کلرک 'جنرل پوسٹ آفس 'لاہور میں ملازمت کر لی اور داخلہ لینے کے باوجود بی۔ اے نہ کر سکے۔ ۱۹۳۰ء میں افسانہ "بندے ماترم" لکھ کر افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور ۱۹۳۲ء میں پنجابی رسالہ "سارنگ" مرتب کیا۔ اٹھارہ برس کے تھے جب شادی سے بچنے کے لیے اپنے آبائی گاؤں "دلے کی" (تحصیل ڈسکہ) کے ایک اجاڑ کنویں میں چھلانگ لگا دی لیکن بچا لیے گئے اور ۱۹ برس کی عمر میں (۱۹۳۴ء) سوما دیوی (سسرالی نام: ستونت کور) سے شادی ہو گئی۔ ۱۹۴۳ء میں ڈاک خانے کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ (حکومت ہند) سے وابستہ ہوئے اور چھ ماہ بعد بطور سٹاف آرٹسٹ / سکرپٹ رائٹر 'آل انڈیا ریڈیو 'لاہور منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں ۱۵۰ روپے ماہوار پاتے تھے اور ماڈل ٹاؤن 'لاہور میں قیام پذیر تھے۔ ریڈیو کے لیے کئی یادگار ڈرامے لکھے جن میں سے ڈراما "حق مہر" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۹۴۶ء میں لاہور ہی میں سنگم پبلشرز لمیٹڈ کے نام سے اپنا اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ اسی زمانے میں چند فلموں کے سکرین پلے اور مکالمے لکھے۔ مئی / جون ۱۹۴۷ء میں فسادات کے پیش نظر اپنے بھائی ہربنس سنگھ بیدی کے ہاں روپڑ چلے گئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب بھارت کو آزادی ملی تو وہ شملہ میں تھے۔ ۱۹۴۸ء میں دہلی آ گئے 'جہاں سے رفیع احمد قدوائی کی معرفت ریڈیو جموں کشمیر کے اسٹیشن ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ شیخ عبداللہ کے ساتھ ان کے خصوصی مراسم رہے۔ ۱۹۴۹ء میں بخشی غلام محمد سے چپقلش ہو جانے کے سبب ملازمت سے استعفیٰ دیا اور دہلی آ گئے۔ دہلی سے ڈی۔ ڈی۔ کیشپ نے انہیں بمبئی بلا لیا اور بیدی نے ایک ہزار روپے ماہوار پر فلمیں لکھنی شروع کر دیں۔ بیدی نے یہاں رہ کر "بڑی

بمن " " داغ " " دیو داس " " مدھومتی " " پھاگن " " بسنت بہار " " مسافر " " انوپما " اور " ستیہ کام " جیسی معیاری فلموں کے سکرین پلے اور مکالمے لکھے۔ اس میں سے بیشتر کام رشی کیش مکرجی کے لیے کیا جبکہ سہراب مودی کے لیے "مرزا غالب" لکھی۔

مجموعی طور پر ستر سے زائد فلمیں لکھیں اور "پھاگن" " آنکھن دیکھی " " گرم کوٹ " اور " دستک " جیسی معیاری فلموں کے ہدایت کار کے طور پر سامنے آئے۔ ۱۹۷۷ء میں ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۷۸ء میں انہوں نے ایک نئی لڑکی سمن کو اپنی فلم " آنکھن دیکھی " کی ہیروئن کے لیے منتخب کیا اور اسے دل دے بیٹھے۔ ہائی بلڈ پریشر اور ذیابیطس کے پرانے مریض چلے آتے تھے۔ آخری زمانے میں کینسر بھی ہو گیا۔ بیٹے نریندر بیدی سے کبھی نہیں بنی۔ ستم بالائے ستم بڑھاپے کے عشق نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ بے تحاشا پینے لگے تھے جس کا نتیجہ ۱۹۷۹ء میں فالج کی صورت میں نکلا۔ موتیا بند کا آپریشن ہوا تو بالکل معذور ہو کر رہ گئے اور تقریباً دو برس اسی بیٹے کے رحم و کرم پر رہنا پڑا، جس سے کبھی نہ بنی تھی۔ اداکارہ سمن کی محبت میں سیتھیا سدن مانگا کی ساتویں منزل سے کود کر خودکشی کی کوشش ناکام رہی۔ آخری وقت انتہا درجے کی ذہنی پریشانی اور جسمانی معذوری کے ساتھ گذارا۔ ۱۱ نومبر ۱۹۸۴ء کو بمبئی میں انتقال کیا۔ اکلوتی اولاد، نریندر بیدی کا انتقال ان کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا جبکہ ایک انگریز عورت سے ناجائز اولاد (بیٹی) لندن میں مقیم ہے۔(۱)

اولین افسانہ:

" بندے ماترم " ، محسن لاہوری کے قلمی نام سے ۱۹۳۰ء میں لکھا۔

معلومہ اولین افسانہ:

" مہارانی کا تحفہ " ، مطبوعہ : " ادبی دنیا " ، لاہور ۱۹۳۱ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ " دانہ و دام " (افسانے) — مکتبہ اردو، لاہور — طبع اول: ۱۹۳۹ء
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی — طبع دوم: ۱۹۶۳ء

دوسرے ایڈیشن کے مندرجات: (۱) بھولا۔ ص ۹۔ ۲۴ (۲) ہمدوش۔ ص ۲۵۔ ۳۶ (۳) من کی من میں۔ ص ۳۷۔ ۵۳ (۴) گرم کوٹ۔ ص ۵۴۔ ۶۹ (۵) چھوکری کی لوٹ۔ ص ۷۰۔ ۸۶ (۶) پان شاپ۔ ص ۸۷۔ ۱۰۲ (۷) منگل اشٹکا۔ ص ۱۰۳۔ ۱۱۹ (۸) کوارنٹین۔ ص ۱۲۵۔ ۱۳۶ (۹) تلادان۔ ص ۱۳۷۔ ۱۵۲ (۱۰) دس منٹ بارش۔ ص ۱۵۳۔ ۱۶۵ (۱۱) وٹامن بی۔ ص ۱۶۶۔ ۱۸۰ (۱۲) بھولا۔ ص ۱۸۱۔ ۱۹۵ (۱۳) رد عمل۔ ص ۱۹۶۔ ۲۱۳ (۱۴) موت کا راز۔ ص ۲۱۴۔ ۲۲۴۔

تیسری بار ۱۹۸۰ء میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئی۔

۲۔ " گرہن " (۱۴ افسانے) — مکتبہ اردو، لاہور — طبع اول: ۱۹۴۲ء
نیا ادارہ، لاہور — طبع دوم:

۳۔ " سات کھیل " (ڈرامے) — لاہور۔ ادبی سنگم، — ۱۹۴۶ء، ۲۴۳ ص

مندرجات: (۱) خواجہ سرا - ص ۹ - ۴۴ (۲) چانکیہ - ص ۴۵ - ۷۲ (۳) تچھٹ - ص ۷۳ - ۱۱۴ (۴) نقل مکانی - ص ۱۱۵ - ۱۵۴ (۵) آج - ص ۱۵۵ - ۱۹۰ (۵) رخشندہ - ص ۱۹۱ - ۲۲۰ (۷) پاؤں کی موچ - ص ۲۲۱ - ۲۴۳۔

دوسری بار یہ کتاب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی نے جون ۱۹۸۱ء میں شائع کی۔ ۱۹۳۶ء میں اس کتاب کو مکتبہ اردو' لاہور نے بھی شائع کیا تھا۔

۴۔ "کوکھ جلی" (افسانے) کتب پبلشرز لمیٹڈ' بمبئی' میٹرو پریس' طبع اول: ۱۹۴۹ء

مندرجات: (۱) لمس - ص ۹ - ۱۹ (۲) کوکھ جلی - ص ۲۰ - ۲۷ (۳) بیکار خدا - ص ۳۸ - ۵۷ (۴) نامراد - ص ۵۸ - ۷۳ (۵) مہاجرین - ص ۷۴ - ۹۵ (۶) کشکش - ص ۹۶ - ۱۱۷ (۷) ایک عورت - ص ۱۱۸ - ۱۳۶ (۸) زین‌مین - ص ۱۲۷ - ۱۳۸ (۹) گالی - ص ۱۳۹ - ۱۹۱ (۱۰) خطِ مستقیم اور قوسین - ص ۱۹۲ - ۲۰۰ (۱۱) آگ - ص ۲۰۱ - ۲۲۱۔

۵۔ "ایک چادر میلی سی" (ناولٹ) نئی دہلی' مکتبہ جامعہ' ۱۹۶۲ء' ۱۳۶ ص

دوسری بار ۱۹۷۵ء میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئی۔

یہ ناولٹ پنجابی میں "اک چادر ادھورانی" کے نام سے شائع ہوا۔ پاکستان میں اس کہانی کو ہدایت کار و سنگیتا نے "مٹھی بھر چاول" کے نام سے فلمایا۔ یہ ناولٹ پاکستان سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

۶۔ "اپنے دکھ مجھے دے دو" (افسانے) نئی دہلی' مکتبہ جامعہ' ۱۹۶۵ء' ۲۶۰ ص

دوسری بار ۱۹۷۵ء میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئی۔

مندرجات: (۱) لاجونتی - ص ۹ - ۲۴ (۲) جوگیا - ص ۲۵ - ۴۶ (۳) بیل - ص ۴۷ - ۸۴ (۴) لمبی لڑکی - ص ۸۵ - ۱۳۰ (۵) اپنے دکھ مجھے دے دو - ص ۱۳۱ - ۱۵۶ (۶) زین‌مین سے پرے - ص ۱۵۷ - ۱۸۶ (۷) حجام الٰہ آباد کے - ص ۱۸۷ - ۲۱۲ (۸) دیوالہ - ص ۲۱۳ - ۲۳۸ (۹) یوکلپٹس - ص ۲۳۹ - ۲۶۰۔

یہ مجموعہ پاکستان سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

۷۔ "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" (افسانے) نئی دہلی' مکتبہ جامعہ ۱۹۷۴ء - ۲۴۰ ص

مندرجات: (۱) ہاتھ ہمارے قلم ہوئے - ص ۷ - ۳۵ (۲) صرف ایک سگریٹ - ص ۳۶ - ۷۴ (۳) کلیانی - ص ۷۵ - ۹۰ (۴) متمن - ص ۹۱ - ۱۰۹ (۵) باری کا بخار - ص ۱۱۰ - ۱۳۰ (۶) سونفیا - ص ۱۳۱ - ۱۴۳ (۷) وہ بڈھا - ص ۱۴۴ - ۱۸۷ (۸) جنازہ کہاں ہے - ص ۱۸۸ - ۲۰۶ (۹) تعطل - ص ۲۰۷ - ۲۲۶ (۱۰) آئینے کے سامنے ص ۲۲۷ - ۲۴۰

یہ مجموعہ پاکستان سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

۸۔ "مہمان" (۶ طنزیہ افسانے) طبع اول: ہند پاکٹ بکس - دہلی' (س - ن)
طبع دوم: اردو پاکٹ بکس (پاکستان) کراچی نمبر ۱۸' (س - ن)

۹۔ "جوگیا" (رومانی افسانے) طبع اول: اردو پاکٹ بکس (پاکستان) کراچی نمبر ۱۸' (س - ن)

۱۰۔ "کندن" (افسانے) طبع اول: مکتبہ اردو ادب' لاہور (س - ن)

۱۱۔ "بیدی کے افسانے" (افسانے) طبع اول: مکتبہ اردو ادب' لاہور'

۱۲۔ "چلتے پھرتے چہرے" (خاکے اور مضامین) طبع اول: مکتبہ اردو ادب' لاہور

۱۳۔ "بے جان چیزیں" (ڈرامے) طبع اول: مکتبہ اردو ادب' لاہور' ۱۹۴۳ء

۱۴۔ "مکتی بودھ" (افسانے) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی' طبع اول: ۱۹۸۳ء

۱۵۔ "لمبی لڑکی" (افسانے) نیا ادارہ، لا

۱۶۔ "بلی کا بچہ" (افسانے)

۱۷۔ "کار کی شادی" (ڈرامے)

۱۸۔ "روح انسانی" (ڈرامے)

۱۹۔ "اب تو گھبرا کے ----" (ڈرامے)

۲۰۔ "لاجونتی" (افسانے) نیا ادارہ، لاہو

۲۱۔ "لمس" (افسانے)

۲۲۔ "اک چادر ادھورانی" (پنجابی ناولٹ) مطبوعہ: دہلی،

(نوٹ شمار نمبر ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ راجندر سنگھ بیدی کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن ہیں۔)

اعزاز:

۱۔ پدم شری (حکومت ہند کا اعلیٰ سول اعزاز)

۲۔ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ

۳۔ مودی غالب ایوارڈ

۴۔ سجاد ظہیر، اردو ادب ایوارڈ

۵۔ فلم فیئر ایوارڈ

وفات سے قبل مستقل پتا:

۳۴۷۔ لنکنگ روڈ، کھار۔ بمبئی ۴۰۰۰۵۲۔ (بھارت)

نظریہ فن:

"مجھے تخیل فن پر یقین ہے، جب کوئی واقف مشاہدے میں آتا ہے تو میں من و عن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اسے احاطہ تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

(دیباچہ "گرہن" سے اقتباس)

○

(۱) بہ حوالہ: "بیدی سے ایک گفتگو" از پد ما پجویو ترجمہ: مرغوب علی، مطبوعہ "دستاویز" راولپنڈی ۱۹۸۷ء

راجندر سنگھ بیدی

متھن

بازار ہی لمبا ہو گیا تھا اور یا پھر کاروبار چھوٹا ------ معلوم ہوتا تھا پچھم کی طرف جہاں سڑک تھوڑا اٹھتی، آسمان سے لپٹتی اور آخر ایکدم نیچے گر جاتی ہے، وہیں دنیا کا کنارہ ہے جہاں سے ایک جست کریں گے، اس بینے کے ہاتھوں مریں گے۔

دن بھر سر دھننے کے بعد مکن نکلے ------ کباڑیے کو دو ہی چیزیں ہاتھ لگی تھیں۔ ایک فلورنٹین اور دوسری بھینی رائے۔ فلورنٹین کو تو شائد کوئی سرپھرا فلم پروڈیوسر کرائے پہ لے بھی جاتا، مگر بھینی رائے؟ کوئی بات نہیں۔ آج وہ اسے چھپا کر رکھے گا تو کل اس کے پوتے پڑپوتے ------ اس سے کروڑوں کمائیں گے۔ جیسے آج بھی پچھم میں کسی کے ہاں سے لیونارڈ کے اسکیچ نکل آئیں تو آرٹ کے بازار میں ان کی بولی لاکھوں لگ جاتی ہے۔ ان لاکھوں کروڑوں کے خیال ہی سے مکن لال کی آنکھوں میں بجلیاں کوندنے لگیں اور وہ یہ بھول ہی گیا کہ وہ چالیس بیالیس سال کا اور ٹکلا ------ گنجا ہونے کے باوجود کنوارہ ہے۔ اس لئے پوتوں پڑپوتوں کی بات ہی نہیں۔ مکن کرتا بھی کیا؟ وہ ایک عام ہندو تھا، اتنے بڑے فلسفے کا مالک ہونے کے باوجود جس کے اندر کا بنیا پن نہیں جاتا۔ وہ باتوں میں پیسے تو مایا ات آد کہہ کر اسے پرے دھکیل دیتا ہے، لیکن بھیتر سے اسے جی جان سے لگاتا ہے۔ دنیا بھر میں اگر کوئی اس کی پوجا کرتا ہے تو ہندو۔ آج بھی اس کے ہاں دیوالی کے روز پرات کے نیچے، جیوتی کے ساتھ دودھ پانی میں نہایا سیندور میں لگایا ہوا روپیہ ملے گا۔ دوسرے کے دن اس کی گاڑی پہ صد برگ کے ہار ہونگے اور سب نرناری مل کر لکشمی کے مندر کو جائیں گے۔ پوجا کے لئے۔ پیسے کے لئے تو وہ یوسف سا برادر، پدمنی ایسی پتنی کو بھی بیچنے کے لئے تیار ہو جائے۔

اور سامنے تھا سراجا ------ ایوزیزی کا ایجنٹ۔ اس کی دکان تھوڑا پیپل کے گھیر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ للّے ہندو جس پہ صبح کے وقت آکر پانی میں ملے دودھ کے لوٹے ڈال جاتے تھے اور دکان اور سڑک کے بیچ کی جگہ کیچ سے اٹ جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے سراجو کو للّے ہندوؤں کی اس رسم کا احترام کرنا ہی پڑتا تھا البتہ نہیں کرتے تھے تو وہ کتے جو دن بھر ٹانگ اٹھا اٹھا کر اس پیڑ پہ پیشاب کرتے رہتے تھے، جس کے بارے میں بھگوان نے کہا تھا ------ اور ورکشوں میں میں پیپل ہوں۔ ضرور وہ پچھلے جنم میں مسلمان ہوں گے۔ جو سینتالیس کے فسادوں میں ہندوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔

سراجا ہمیشہ پیپل کی گولریں کھاتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی وجہ بازار کا مندہ ہونا یا بھوک نہ تھی۔ سراجا ہر اس چیز کو کھاتا تھا جو اس کی منی کو مغلظ کر دے۔ ہاں، مسلمان لنگ کٹوں کا یہی ہے نا ------ کھانا، پینا اور بھوگ کرنا۔ وہ دماغی طور پر کوئی ہوبو، کوئی خانہ بدوش ہیں جو ہندوستان میں رہیں تو پاکستان کی باتیں کریں گے۔ پاکستان میں ہوں گے تو ------ میرے مولا بلا لو مدینے مجھے۔ انھیں کسی چیز سے لگاؤ نہیں۔ مکن للے نے کئی بار اس بارے میں سوچا بھی ------ ان کا اللہ، خوب عیش کرتا ہے۔ ایک اپنا بھگوان ------ جو نیچے کے بجائے اوپر ترکی کے آس پاس ہی منزل میں سوتا رہتا ہے۔ شاید سراجا جانے بوجھے بنا ایک تانترک تھا جو بندو رکھشا کے لئے کنڈلنی کو جگاتے اور اوپر کا راستہ بناتے تھے۔ وہ عورت کے اندر اکڑے پڑے رہتے، لیکن کسی طرح اپنے جوہر حیات کو نہ جانے دیتے۔

نجات کو اس خود غرضانہ طریقے سے پانے والوں، عورت کو صرف ایک ذریعہ بنانے والوں نے کبھی سوچا کہ اس بچاری کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ اسے بھوکا پیاسا، روتا، تڑپتا رکھ کر کیسے موکش کو پہونچ سکتا ہے کوئی؟ کس پرماتما کو پا سکتا ہے؟ پھر جو نجات بندو سے چھٹکارہ پا لینے میں

ہے ------ پرش کے لئے 'استری کے لئے ؟ سواتی بوند تو موتی نہیں نہ سیپی موتی ہے۔ موتی تو بوند کے گرنے اور سیپی کے اسے اندر لے کر منہ بند کر لینے میں ہے۔

رات ٹیک آئی تھی۔ باہر وہ دنیا کا کنارہ اندھیرے کے ساتھ کچھ اور بھی پاس رینگ آیا تھا۔ ریشم والے ولایتی رام 'کشمیری بڈشاہ' حتیٰ کہ اڈپی کے چکرپانی کی دکان بھی بند ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے مہینے کا دوسرا سنیچر ہونے کی وجہ سے اس کے سب ادلی دوے' سانبرروا' کیسری بک گئے ہوں۔ صرف سراج کی دکان کھلی تھی۔ نہ جانے وہ کس مار پہ تھا؟ شاید اس لئے کہ بیڑی کی ضرورت رات ہی کو پڑتی ہے۔ مگر وہ صبح' صبح کاذب ہی کو دکان کھول لیتا تھا' جو رات ہی کا حصہ ہوتی ہے' اس کا آخری حصہ۔ ورنہ صبح کہاں کسی کی رہی' وہ تو کمیونسٹوں کی ہولی' شاید سراج ٹورسٹ ایجنٹ مائیکل کے انتظار میں تھا کہ وہ دونوں مل کر اگلے روز کہیں آگرے کجراہو کا پروگرام بنالیں' تھوڑے پیسے کمالیں۔ نہیں سراج پیسے کے پیچھے تھوڑے جاتا تھا' وہ تو جاتا تھا ان ہپی عورتوں کے پیچھے جو کثیرالازدواجی کی وجہ سے بھوکی پیاسی آتی تھی اور یہاں آکر ممتاز کی محبت کو ادھر کے کسی بھی شاہجہاں طبیعت والے مرد پہ آزماتیں اور کجراہو کے متھن کو زندہ کرتی تھیں۔

جبھی سراج کی آواز نے مگن لال کو چونکا دیا۔

"ہیلو' سویٹی پائی ------"

سراج تقریباً ان پڑھ تھا' مگر ٹورسٹوں کے ساتھ رہنے سے اتنی انگریزی سیکھ گیا تھا۔ اس کی آواز سے مگن سمجھ گیا' کیرتی آئی ہے۔

وہ سچ مچ کیرتی ہی تھی' جو چھوٹے قد' گٹھے ہوئے بدن اور موٹے نقوش والی ایک اداس لڑکی تھی۔ اس کا رنگ پکا تھا' پھر اوپر سے جامنی رنگ کی دھوتی پہن رکھی تھی۔ جب وہ آئی تو یوں لگا جیسے اندھیرے کا کوئی ٹکڑا متشکل ہو کر سامنے آگیا۔ وہ ہمیشہ رات ہی کو آتی تھی' جیسے اسے اپنا آپ چھپانا ہے۔ سراج اپنی دوکان کے سامنے کھڑا تھا اور کیرتی ہمیشہ کی طرح سے اس کی طرف دیکھے' اس سے بات کئے بغیر نکل آئی تھی۔ اسکے باوجود وہ سیٹیاں بجا رہا تھا۔

مگر کیرتی بات ہی کہاں کرتی تھی۔ اس سے' کسی سے بھی نہیں۔ اس سے بات کرنے کے لئے سوال کچھ یوں وضع کرنے پڑتے تھے کہ ان کا جواب ہاں ہو یا نہ۔ صرف اوپر سے نیچے یا دائیں سے بائیں سر ہلانے سے بات بن سکے۔ سراج کا اسے چھیڑنا مگن کو بہت ناپسند تھا۔ اس نے کئی بار مگن سے کہا بھی تھا ------ "تو کہیں عشق کے چکر میں تو نہیں پڑ گیا' میرے یار؟ جوان لڑکی ہے' بھینچ ڈال۔ بہت ادھر ادھر رہا لکے کبوتر کی طرح سے تو وہ اڑ جائے گی۔" لیکن مگن نے اس ڈانٹ دیا تھا۔

در حقیقت مگن نکلے کا دھندہ سدباب ہوتا تھا۔ کیرتی کوئی لکڑی کا کام یا شلپ بنا کر بیچنے کی غرض سے اس کے پاس لاتی تو وہ اس میں بہت کیڑے نکالتا۔ کبھی کہتا ایسی چیزوں کی آج مانگ ہی نہیں اور کبھی یہ کہ وہ فن کے معیار و لچک پہ پوری نہیں اترتیں۔ کیرتی اور بھی منہ لٹکا لیتی' حالانکہ ان سب باتوں سے مگن لال کا ایک ہی مقصد ہوتا کہ وہ سو کی چیز پانچ دس میں دے جائے اور یہ اسے سیزن کر کے سینکڑوں میں بیچے۔

کیرتی نے یہ کام کسی آرٹ اسکول میں نہ سیکھا تھا۔ اس کا باپ نارائن ایک شلپی تھا۔ وہ بھاؤ واجبی اور بنجر برگس وغیرہ کے ساتھ نیپال اور جانے کہاں کہاں ہندوستان کی وراثت کو ڈھونڈتا پھرا تھا جو کہ دراصل لندن کے میوزیم' نیویارک اور شکاگو کی اینٹیق کی دکانوں میں رل رہی تھی۔ ہر سال ہمارے مندروں اور صنم خانوں سے سینکڑوں مورتیاں غائب ہوتیں اور ہزاروں میل دور کیوریو وغیرہ کی دکانوں میں جگہ پاتیں۔ نارائن مسلسل سفر سے تنگ آکر لوٹ آیا تھا اور گھر ہی میں شلپ بنانے شروع کر دیئے تھے' جنھیں کیرتی بڑے انہماک سے دیکھتی اور بیچ میں اوزار پکڑا دینے اور رف ورک کرنے میں باپ کی مدد بھی کرتی تھی۔ یوں گھر بیٹھ جانے میں نارائن اس بات کو بھول ہی گیا تھا کہ کھویا ہوا ورثہ پائے ہوئے سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے اور اس کے دگنے چوگنے ہی نہیں سوگنے دام ملتے ہیں شاید وہ جانتا بھی تھا لیکن وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جو پیسے کی مادیت کو سمجھ جاتے ہیں اور زندگی کو پھیلاؤ میں نہیں دیکھتے۔ وہ شلپ بناتا اور مشکل سے روٹی کماتا تھا آخر ایکدن دو روٹیوں کے درمیان اس کی موت واقع ہو گئی۔ وہ جگدمبا کا بت بنا رہا تھا جب کہ اس کا اپنا ہی چزل اس کے ہاتھ میں لگ گیا جس سے اسے ٹٹنس ہو گیا اور

وہ قریب کی چھاؤنی کے اسپتال میں مر گیا۔ کہتے ہیں وہ کتے کی موت مرا۔ کیوں نہ ایسی موت مرتا؟ ------ جب وہ دیوی کا بت بناتا تھا تو دنوں، مہینوں اس کی چھاتیوں اس کے کولھوں اور رانوں پہ ٹھہرا رہتا۔ چھوٹے شلپوں میں تو چھاتیاں خلا میں گھومتے ہوئے لٹو معلوم ہوتی تھیں لیکن بڑوں میں ناگنیں اور نار سو ایک طرح کی گھڑونچی تھے۔ اصل بات وہ دودھ کے بڑے بڑے مٹکے تھے جو اس پہ رکھے ہوئے تھے۔ اور کولھے ہتھنی کے ماتھے کی طرح سے جس کے نیچے سے ایک کی بجائے دو سونڈیں نکلتی تھیں۔ اس نے درگا کا شلپ بھی بنایا تھا جو بڑی جبر جنگ دیوی ہے۔ ایسی دیویوں کے بدن بناتے ہوئے نارائن کتے کی نہیں تو کیا ہماری آپ کی موت مرتا؟

"کیا لائی ہو؟" مگن ٹھلے نے کیرتی سے پوچھا۔

کیرتی نے اپنے دھوتی کے پلو سے لکڑی کا کام نکالا اور دھیرے سے اسے مگن کے سامنے رول ٹاپ کی میز پر رکھ دیا، کیونکہ اوپر کے لیمپ کی روشنی وہیں مرکوز ہو رہی تھی۔ اسے دیکھنے سے پہلے مگن نے ایک بیروق کری کیرتی کے سامنے سرکا دی۔ مگر وہ بدستور کھڑی رہی۔

"تمہاری ماں کیسی ہے؟"

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ایکبار پیچھے اس طرف دیکھا جہاں سڑک نیچے گرتی تھی اور جب چہرہ مگن کی طرف کیا تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔

کیرتی کی ماں وہیں چھاؤنی کے اسپتال میں پڑی تھی جہاں اس کے باپ نارائن نے دم توڑا تھا۔ بڑھیا کو مقعد کا سرطان تھا۔ اس کے پیٹ میں سوراخ کر کے ایک نلی لگا دی گئی تھی اور اس کے اوپر ایک بوتل باندھ دی تھی تاکہ بول و براز نیچے جانے کے بجائے اوپر بوتل میں چلے جائیں۔ پہلی بوتل کسی وجہ سے خراب ہو گئی تھی اور اب دوسری کے لئے پیسے چاہئے تھے۔ اگر وہ مگن کو بتا دیتی تو وہ شاید دوسرے طریقے سے بات کرتا، لیکن اس وڈ ورک کو دیکھ کر وہ ویسے ہی بھڑک گیا تھا۔

"پھر وہی" اس نے کہا "میں نے تم سے کئی بار کہا ہے، آج کل ان چیزوں کو کوئی نہیں پوچھتا ------ یہ لیٹے ہوئے وشنو، اور شیش ناگ ------ لکشمی پاؤں داب رہی ہے ------"

کیرتی نے بڑی بڑی آنکھوں سے مگن کی طرف دیکھا، جن میں سوال تھا۔ اور کیا بناؤں؟

"وہی؟ ------ جو آج کل ہوتا ہے۔"

"آج کل ------ کیا ہوتا ہے؟" کیرتی نے آخر منہ کھولا۔ مشکل سے اسکی آواز سنائی دی، جیسے کینری (canary) کی چونچ ہلتی دکھائی دیتی ہے مگر آواز سنائی نہیں دیتی۔

مگن نے کچھ رکتے، کچھ راستہ پاتے ہوئے کہا "اور کچھ نہیں ہوتا تو گاندھی ہی بناؤ، نہرو بناؤ ----" اور پھر جیسے اسے کوئی غلطی لگی اور وہ اپنے آپ کو درست کرتے ہوئے بولا۔

"کوئی نیوڈ ------"

"نیوڈ؟"

"ہاں ------ آج کل لوگ نیوڈ پسند کرتے ہیں۔"

کیرتی چپ ہو گئی۔ کنواری ہونے کے ناطے وہ شرما سکتی تھی، لجا سکتی تھی مگر یہ سب باتیں اس لڑکی کے لئے تعیش تھیں۔ اسے فکر تھی تو صرف اس بات کی کہ مگن اس وڈ ورک کو خریدتا، پیسے دیتا ہے یا نہیں! کچھ سوچتے رکتے ہوئے اس نے کہا ------ "مجھے نہیں آتا"

"کیا بات کرتی ہو؟" ------ تمہارے باپ نے بیسیوں بنائے۔"

"وہ تو ------ دیوی ماں کے تھے۔"

"فرق کیا ہے؟" مگن ٹھلے نے کہا "دیوی بھی تو عورت ہوتی ہے۔ تم وہی بناؤ مگر بھگوان کے لئے کوئی دیو مالا اسکے ساتھ نتھی مت

کرو ---- ایسی حرکتوں سے تو تمہارے پتا ایسی موت مر ---- سرگباش ہوئے۔ "

کیرتی نے اپنے جیون کے پچھواڑے میں جھانکا۔ اب جیسے وہ کھڑی نہ رہ سکتی تھی۔ کسی اور خطرے سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا' جسے وہی جانتی تھی' کوئی دوسرا نہیں' پھر بھی وہ بیروق کرسی پہ بیٹھی نہیں' اس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس طرف سے اس کے بدن کے حسین مگر جارحانہ خط دکھائی دے رہے تھے۔ کیا شیپ تھا' جسے اوپر کے نہیں نیچے کے نارائن نے بنایا تھا۔ مگن لال کے دماغ میں اختیار اور بے اختیاری آپس میں بنرد آزما ہو رہے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ برابر والی لڑکی کے اندر بھی وہی چارہ اور لاچاری آپس میں سر ٹکرا رہے ہیں۔ اس کا منھ سوکھ گیا تھا۔ کوئی گھونٹ سا بھرنے کی کوشش میں وہ بولی۔

"میں ----- میرے پاس موڈل نہیں"

"موڈل ؟" مگن نے اس کے پاس آتے ہوئے کہا "سینکڑوں ملتے ہیں۔ آج تو کسی بھی جوان' خوبصورت لڑکی کو پیسے کی جھلک دکھاؤ تو وہ ایکدم ---"

کیرتی نے کچھ کہا نہیں' مگر مگن نے صاف سن لیا ---- "پیسے!" ۔ اور خود ہی کہنے لگا "آدمی پیسہ خرچ کرے تبھی پیسہ بنا سکتا ہے نا۔"

اس بات نے کیرتی کو اور بھی اداس کر دیا۔ اس کی روح زندگی کے اس جبر کے نیچے پھڑپھڑا رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ عورت کا یہی عالم تو ہوتا ہے' جو مرد کے اندر باپ اور شوہر کو جگا دیتا ہے۔ چنانچہ مگن نے اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ اسے بازوؤں میں لے لے اور چھاتی سے لگا کر کہے ----- "میری جان' تم فکر نہ کرو ----- میں جو ہوں۔" لیکن کیرتی نے اسے جھٹک دیا۔ مگن کٹ گیا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ترپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ رول ٹاپ پر سے اس نے وڈورک کو اٹھایا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

جب تک کیرتی نے بھی کچھ سوچ لیا تھا۔ اس نے پہلے نیچے دیکھا اور پھر ایکایکی سر اوپر اٹھاتے ہوئے بولی ----- "اگلی بار نیوڈ ہی لاؤں گی۔ ابھی تم اسے ہی لے لو۔"

"شرط ہے؟" مگن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیرتی نے سر ہلا دیا۔ مگن لگلے کا خیال تھا' کیرتی ہنس پڑے گی مگر وہ تو کچھ اور بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے رول ٹاپ کو اٹھایا اور میز کے اندر سے دس روپے کا چڑا مڑا سا نوٹ نکالا اور اسے کیرتی کی طرف بڑھا دیا ---- "لو -----"

"دس روپے؟" کیرتی نے کہا۔

"ہاں --- تمہیں بتایا نا' میرے لئے یہ سب بیکار ہے۔ میں اور نہیں دے سکتا۔"

"ان سے تو -----" اور کیرتی نے جملہ بھی پورا نہ کیا۔ اس کے اندر گویائی' الفاظ سب تھک گئے تھے۔ پھر مطلب صاف تھا مگن سمجھ گیا۔

"اس سے تو بوتل بھی نہ آئے گی" "دوا کا خرچ بھی پورا نہ ہو گا ------"

"روٹی بھی نہ چلے گی" "قسم کے فقرے ہوں گے' سب مجبور اور نادار جن کی تے کیا کرتے ہیں۔ اس نے کیرتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا --- "مجھے بس" وہ" لا دو تو میں اچھے پیسے دوں گا۔" اور ایسا کہنے میں اس نے ہاتھ کی دو انگلیوں کا چھلا بنایا' تھوڑی آنکھ ماری جیسی ڈوم' سازندے نائکہ کو داد دیتے ہوئے مارتے ہیں۔

کیرتی باہر نکلی تو اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے۔ وہ تھوڑا ہانپ رہی تھی۔ لوٹنے پہ کیرتی ہمیشہ الٹی طرف سے جاتی تھی' حالانکہ اس میں اسے میل دو میل کا چکر پڑتا تھا۔ وہ نہ چاہتی تھی سراج سے اسکی ٹکر ہو لیکن آج وہ اس طرف سے گئی' جیسے اس میں کوئی مدافعت ابھر آئی تھی۔

مائیکل چلا آیا تھا اور سراج کے ساتھ مل کر کچھ کھا رہا تھا' جبکہ کیرتی منہ اوپر اٹھائے' ناک پھلائے ہوئے پاس سے گزر گئی۔ سراج نے کچھ کہا جو نگن کو سنائی نہ دیا۔ کیرتی میں وہ بغاوت ہی جذبہ تھا اور یا پھر وہ ان مصیبت زدہ لوگوں میں سے تھی جو دشمن کے ساتھ بھی بنا کر رکھنے کی سوچتے ہیں ------ مبادا انھیں سے کوئی کام آپڑے ------ یا شاید یہ عورت کی فطرت کا خاصہ تھا جو اس مرد کو بھی اپنے پیچھے لگا رکھتی ہے جس سے اسے کچھ لینا دینا نہیں۔ صرف اسلئے کہ اسے دیکھ کر ایک بار اس نے سیٹی بجائی یا اپنی چھاتی پہ ہاتھ رکھ کر سرد آہ بھر دی تھی۔

سراجا ضرور کوئی انفیرو ڈیزیاک کھا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے پائے ہوں جو مائیکل اس کے لئے لایا تھا۔ شاید وہ دونوں مل کر نگن نکلے کے پاس آتے اور اسے کچھ داؤ گھات بتاتے لیکن نگن نے دکان ہی بڑھالی تھی۔ دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے اس نے کیرتی کے وڈ ورک کو دیکھا جو بہت عمدہ تھا۔ شیش ناگ کا نچلا حصہ تو خوبصورت تھا ہی لیکن اوپر اس کی پنکبری کھال میں اس نے صرف گودنوں سے رنگ بھر دیئے تھے۔ وشنو میں وہی تھا جو کوئی بھی عقیدت مند عورت کسی مرد میں دیکھنا چاہتی ہے۔ البتہ لکشمی ڈھیری پڑی تھی اور اس کے بدن کے خط واضح نہ تھے۔ شاید کیرتی لکشمی کو اس کے کسی بھی روپ میں نہ جانتی تھی حالانکہ اسے روچک بنانا کتنا آسان تھا۔ جب عورت پاؤں دبانے کے لئے جھکتی ہے تو ظاہر ہے اس کے ہاتھ بازو بدن سے الگ ہوتے ہیں اور مخصوص عورت صاف اور سامنے دکھائی دیتی ہے۔ پھر پہلو پہ بیٹھی ہوئی اوپر کی عورت نیچے والی سے کتنی کٹ جاتی ہے اور مرد کی نظروں کو کیا کیا اونچ نیچ سمجھاتی ہے۔ اگر یہ کہیں کیرتی خود عورت تھی اس لئے عورت کی بہ نسبت اسے مرد میں زیادہ دلچسپی تھی تو یہ غلط ہو گا کیونکہ عورت اپنے حسن کے سلسلے میں اول اور آخر تک خود پرست ہوتی ہے اور جب اس کی یہ خود پرستی اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو کسی بھی مرد کی مدد سے اسے جھٹک دیتی ہے۔

نگن نے کیرتی کے وڈ ورک کو ایک ہاتھ میں لیا اور دوسرے میں چاقو لے کر اس پہ "سدہم نمہ" کے الفاظ کندہ کر دیئے اور پھر پچھلے کمرے میں پہونچ گیا جہاں کچی زمین تھی جسے کھود کر اس نے وڈ ورک کو نیچے رکھا' ایک اور مورتی کو نکالا جو کیرتی ہی کی بنائی ہوئی تھی اور پھر گڈھے پر مٹی ڈال کر اس پر کتھے کا پانی چھڑک دیا۔ پرانے بت کی مٹی جھاڑ کر اسے دیکھا تو بڑی بڑی دراڑیں اس میں چلی آئی تھیں اور وہ صدیوں پرانا معلوم ہو رہا تھا۔ اگلے دن جب وہ اسے لے کر ٹورسٹوں کے پاس گیا تو وہ بہت خوش ہوئے نگن نے انھیں بتایا کہ اس کا ذکر کالیداس کے رگھوونش میں آتا ہے۔ رگھو جی نے کونکن کے علاقے میں ترکٹ نام کا ایک شہر بسایا تھا' جہاں سے یہ بت برآمد ہوئے کچھ میسور کے چمار راجہ وڈیار کے پاس ہیں اور کچھ اپنے پاس چنانچہ اس بت کو نگن نکلے نے ساڑھے پانسو روپے میں بیچ دیا' جس کے لئے اس نے کیرتی کو صرف پانچ روپے دیئے تھے۔

اس واقعے کے ایک ہفتے کے اندر اندر کیرتی نیوڈ لے آئی۔ وہ بدستور بدحواس تھی۔ اسکی ماں تو بیمار تھی ہی' وہ بھی بیمار ہو گئی تھی۔ اسے قریب قریب نمونیہ ہو رہا تھا۔ وہ کھانس رہی تھی اور بار بار اپنا گلا پکڑ رہی تھی' جس پہ اس نے روئی کا لوگڑا ایک پھٹے پرانے کپڑے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

کیرتی نے معمول کی طرح سے شلپ کو نگن نکلے کے سامنے رکھا۔ اب کے اس نے اسے لکڑی میں نہیں' پتھر میں بنایا تھا اور وہ پھر امید وبیم کے ساتھ نگن نکلے کی طرف دیکھ رہی تھی نگن اگر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تو بہت بڑا جھوٹ ہوتا۔ اس لئے اس نے نہ صرف اسے پسند کیا' بلکہ جی بھر کر داد دی۔ اعتراض کیا تو صرف اتنا کہ وہ بہت چھوٹا تھا کاش وہ اسے قد آدم میں بناتی تو نہ صرف اسے بلکہ خود نگن کو بھی بہت فائدہ ہوتا۔

اس نے شلپ " یکشی " کو ہاتھ میں لیا اور غور سے دیکھا۔ کیرتی پھر بھی بیچ بیچ کا نیوڈ نہ بنا سکی تھی۔ بت کے بدن پہ کپڑا تھا جو گیلا تھا۔ کمال یہ تھا کہ اس کپڑے سے اب بھی پانی کے قطرے ٹپکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ کہیں تو بدن کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور کہیں علیحدہ بظاہر چھپانے کے عمل میں وہ عورت کے جسم کو بھی عیاں کر رہا تھا۔

شلپ پر نظر ہٹا کر نگن نکلے نے کیرتی کی طرف دیکھا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا ------ "واہ!" کیرتی جھینپ گئی اور اس جامنی

ساری کو آگے کھینچتے ' پیچھے ڈھانپنے لگی ۔ لیکن مگن سب جان گیا تھا کہ وہ برہنہ ہو کر خود کو آئینے میں دیکھتی اور اسے بتاتی رہی ہے کئی بار اس نے کپڑا بھگو کر اپنے بدن پہ رکھا ہو گا جس سے اسے سردی ہو گئی اور اب کھانس رہی ہے ۔ یہ صرف پیسے ہی کی بات نہیں عورت میں نمائش اور خود سپردگی کا جذبہ بھی تو ہے ۔ مگن سب سمجھ گیا تھا مگر تجاہل برتتے ہوئے اس نے پوچھا ۔ " ماں کیسی ہے؟"

کیرتی ایکدم برافروختہ ہو گئی ۔ اسے کھانسی کا فٹ سا پڑا اور خود کو سنبھالنے میں خاصی دیر لگی ۔ مگن گھبرا گیا تھا اور شرمندہ بھی تھا ۔ اس کے بعد سرہلاتے ہوئے اس اس نے سوال کیا ' وہ بھی غیر ضروری تھا ۔۔۔۔۔ "تو موڈل مل گیا تمہیں؟"

کیرتی نے پہلے تو نظریں گرا دیں اور پھر دکان سے باہر اس طرف دیکھنے لگی جہاں سڑک آسمان کو چھوتی ہوئی ایکا ایکی نیچے گرتی تھی ۔ مگن نے چاہا اسے اس کمزوری کے عالم میں پکڑے اور وہ داد دے جسکی وہ مستحق تھی اور جو شاید وہ چاہتی بھی تھی ۔ مگر اس نے سوچا ' ایسے میں دام بڑھ جائیں گے ۔ اس نے اپنے دل میں اب کے کیرتی کو سو روپے دینے کا فیصلہ کیا ۔ بوتل اور باقی کی چیزیں شاید سو کی نہ ہوں ۔ مگر وہ سو ہی دے گا ۔ اندر ہی اندر ڈر بھی رہا تھا کہیں کیرتی زیادہ کا مطالبہ نہ پیش کر دے ۔

" کیا دام دوں اس کے ؟ " اس نے یونہی سرسری طریقے سے پوچھا ۔

کیرتی نے اچٹتی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور بولی " اب کے میں پچاس روپے لونگی "

" پچاس ؟ "

" ہاں ۔۔۔۔ پائی کم نہیں "

مگن نے تسکین کے جذبے سے رول ٹاپ اٹھایا اور چالیس روپے نکال کر کیرتی کے سامنے رکھ دیئے اور بولا " جو تم کہو ۔۔۔۔ مگر ابھی چالیس ہی ہیں میرے پاس دس پھر لے جانا ۔۔۔۔ "

کیرتی نے روپے ہاتھ میں لے لئے اور کہا ۔۔۔۔۔ " اچھا "

وہ جانے ہی والی تھی کہ مگن نے اسے روک لیا ۔۔۔۔۔۔ " سنو "

کیرتی گت کے بیچ رک کر اس طرف " مجھے تھام لو " کے انداز میں دیکھنے لگی اس کے چہرے پر اداسیاں چھٹ جانے کی بجائے کچھ اور گھنڈ گئی تھیں جب کہ مگن نکلے نے پوچھا"

" اتنے پیسوں سے تمہارا کام چل جائیگا ؟ "

کیرتی نے سرہلا دیا اور پھر ہاتھ پھیلائے ' جس کا مطلب تھا ۔۔۔۔ اور کیا کرنا ؟ پھر اس نے بتایا ۔۔۔۔۔ ماں کا آپریشن آ رہا ہے ' جس کیلئے سینکڑوں روپے چاہیں ۔

" میں تو کہتی ہوں " اس نے کہا اور پھر کچھ رک کر بولی " ماں جتنی جلدی مرجائے ' اتنا ہی اچھا ہے " اور پھر وہ وہاں کھڑی پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی ۔ آخر وہ خود ہی بول اٹھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ " ایسے ایڑیاں رگڑنے سے تو موت اچھی ۔ "

جب مگن نے اس سے آنکھ ملائی تو کیرتی اٹھارہ انیس برس کی لڑکی کی بجائے پینتیس چالیس کی بھرپور عورت نظر آنے لگی ' جو زندگی کا ہر وار اپنے اوپر لے لیتی اور اسے بیکار کر کے پھینک دیتی ہے ۔

" ایک بات کہوں ؟ " نکلے نے پاس آتے ہوئے کہا " تم متھن بناؤ " آپریشن کا سب خرچہ میں دوں گا "

" متھن ؟ " کیرتی نے کہا اور لرز اٹھی ۔

" ہاں " مگن بولا " اس کی بہت مانگ ہے ' ٹورسٹ اس کے لئے دیوانے ہوتے ہیں "

" لیکن ۔۔۔۔۔ "

" میں سمجھتا ہوں " مگن نے سرہلاتے ہوئے کہا " تم نہیں جانتیں تو ایکبار کھجورا ہو چلی جاؤ اور دیکھ لو ۔ میں اس کے تمہیں پیشگی دینے کو

تیار ہوں۔"

"تم؟" کیرتی نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ دیر کے بعد بولی "تم کہہ رہے تھے تمہارے پاس اور پیسے نہیں؟"

مگن نے فوراً جھوٹ تراش لیا۔۔۔۔

"میرے پاس بچی پیسے نہیں" وہ بولا "میں نے دکان کا کرایہ دینے کے لئے کچھ الگ رکھے تھے۔۔۔۔۔"

پھر اس نے پیسے دینے کی کوشش کی، مگر کیرتی نے اپنے زعم میں نہ لئے اور وہاں سے چلی گئی۔ مگن نکلے نے لوٹ کر "یکشی" کو دیکھا اور پھر ایک چھوٹی سی ہتھوڑی لے کر اس کی ناک توڑی پھر ٹانگ توڑی اور اس کے سر کے سنگار پہ ہلکی ہلکی ضربیں لگائیں جس سے کچھ کرچیں گریں۔ پھر اندر جا کر اس نے اسے رسی میں باندھا اور نمک کے تیزاب میں ڈبو دیا۔ دھوئیں کے بادل سے اٹھے۔ مگن نے رسی کو کھینچا اور "یکشی" کے خدوخال دھندلے ہو گئے تھے اور کہیں کہیں بیچ میں سوراخ چناخ سے پڑ گئے تھے۔ اب وہ ہزار ایک روپئے میں بکنے کے لئے تیار تھی۔

اب کے کیرتی جو شلپ لائی وہ متھن ہی تھا۔ اور قد آدم۔ وہ ایک بوری میں بندھا ہوا۔ ٹھیلے پہ آیا تھا۔ کچھ مزدوروں نے اٹھا کر اسے مگن نکلے کی دکان پہ رکھا۔ پھر اپنی مزدوری لے کر وہ چلے گئے۔

کیرتی اور خود کو تنہا پا کر، تیز سانسوں کے بیچ مگن نکلے نے بوری کی رسیاں کاٹیں اور کچھ وارفتگی سے ٹاٹ کو شلپ پر سے ہٹایا۔ اب شلپ سامنے تھا۔ پرفیکٹ۔۔۔۔۔۔ مگن نے اسے دیکھا تو اس کے گلے میں لعاب سوکھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کیرتی اس کے سامنے اس شلپ کو نہ دیکھنے دے گی، مگر وہ وہیں کھڑی تھی۔ اس کے سامنے کسی بھی ہیجان سے عاری، شلپ میں کی عورت تکمیل کو پہونچ رہی تھی جبکہ مرد خودرفتگی کے عالم میں اسے دونوں کاندھوں سے پکڑے ہوئے تھا جسے مگن نکلے نے توجہ سے نہ دیکھا۔۔۔۔۔ وہ شاید اسے فرصت میں دیکھنا چاہتا تھا۔

"کتنے پیسے چاہئیں، آپریشن کے لئے؟" اس نے پوچھا۔

"آپریشن کے لئے نہیں۔۔۔۔۔۔ اپنے لئے"

"اپنے لئے؟۔۔۔۔۔ ماں۔۔۔۔۔۔۔۔"

"مر گئی۔۔۔۔۔۔ کوئی ہفتہ ہوا۔"

مگن نے اپنے چہرے پہ دکھ اور افسوس کے جذبے لانے کی کوشش کی، مگر شاید کیرتی نہ چاہتی تھی۔ اس کے ہونٹ ویسے ہی بھینچے ہوئے تھے۔ وہ ویسے ہی اداس تھی جبکہ اس نے کہا۔۔۔۔ "ہزار روپیہ لوں گی۔"

مگن بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کی زبان میں لکنت تھی۔۔۔۔ "اس کے ہزار روپئے بھی کوئی دے سکتا ہے؟"

"ہاں" کیرتی نے جواب دیا "میں بات کر کے آئی ہوں۔۔۔۔۔ شاید مجھے زیادہ بھی مل جائیں۔۔ لیکن میں نے تم سے وعدہ کیا تھا"

"میں تو۔۔۔۔۔۔۔ میں تو پانسو دے سکتا ہوں۔"

"نہیں" اور کیرتی نے مزدوروں کے لئے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ مگن نکلے نے اسے روکا۔۔۔۔ "سو دو سو اور لے لو"

"ہزار سے کم نہیں"

مگن نے حیران ہو کر کیرتی کی طرف دیکھا جس کے آج تیور ہی دوسرے تھے۔ کیا وہ بھوکا ہو گئی تھی؟ ٹورسٹوں سے ملی تھی؟ کسی بھی قیمت پہ کلاکار کو اس کی مارکیٹ سے جدا رکھنا چاہئے۔۔۔۔۔ مگر خیر۔۔۔۔۔۔ اس نے رول ٹاپ اٹھایا اور اٹھ سو کے نوٹ گن کر کیرتی کے سامنے رکھ دیئے۔ کیرتی نے جلدی سے گنے اور اس کے منہ پہ پھینک دیئے۔

"میں نے کہا نا۔ ہزار سے کم نہ لوں گی۔"

"اچھا تو سو لے لو"

"نہیں"

"ساڑھے نو سو ------ نو سو پچاس ------" اور پھر کیرتی کی نگاہوں میں کوئی عزم دیکھ کر اس نے سو سو کے دس نوٹ اس کے ہاتھ میں دیدئے اور نشے کی حالت میں منشن کی طرف لپک گیا۔ کیرتی کھڑی تھی۔ جیسے وہ اپنے فن کی داد لینے کے لئے ٹھٹک گئی تھی۔ نگن نے منشن میں کی عورت کی طرف دیکھا جو پھر کیرتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں تھے؟ کیا وہ لذت کی گرا نباری تھی یا کسی جبر کا احساس؟ کیا وہ دکھ اور سکھ' درد اور راحت کا رشتہ تھا جو کہ پوری کائنات ہے؟ پھر اس نے مرد کی طرف دیکھا جو اوپر سے لطیف تھا مگر نیچے سے بیحد کثیف۔ کیوں' کیرتی نے کیوں مرد ------ انسان کی "حماریت" پہ زور دیا تھا؟ ------ یہ منشن ہے ------ مگر وہ منشن تو نہیں' جو پرش اور پرکرتی میں ہوتا ہے ------؟ ٹھیک ہے۔ اتنا زیادہ پیسے ملیں گے ------

نگن نکلے نے اوپر کی بتی کو کھینچ کر پھر مرد کی طرف دیکھا اور بول اٹھا ------

"یہ ------ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔"

کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تم" ------ نگن نے جیسے پتہ پاتے ہوئے کہا "تم سراج کے ساتھ باہر گئی تھی؟"

کیرتی نے آگے بڑھ کر زور سے ایک تھپڑ نگن نکلے کے منہ پہ لگا دیا اور نوٹ ہاتھ میں تھامے دوکان سے نکل گئی۔

راجندر سنگھ بیدی

لاجونتی

"ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے ----"

(یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ری ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جاتے ہیں)

---- ایک پنجابی گیت

بٹوارہ ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا اور پھر سب مل کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے بدن صحیح و سالم تھے لیکن دل زخمی---

گلی گلی محلے محلے میں "پھر بساؤ" کمیٹیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تن دہی کے ساتھ کاروبار میں بساؤ "زمین پر بساؤ" "اور گھروں میں بساؤ" پروگرام شروع کر دیا گیا تھا لیکن ایک پروگرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا جس کا سلوگن تھا "دل میں بساؤ" اور اس پروگرام کی نارائن باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے بڑی مخالفت ہوتی تھی---

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لئے مندر کے پاس محلے "ملا شکور" میں ایک کمیٹی قائم ہو گئی اور گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے سندر لال بابو کو اس کا سیکرٹری چن لیا گیا۔ وکیل صاحب صدر، چوکی کلاں کا بوڑھا محرر اور محلے کے دوسرے معتبر لوگوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ اس کام کو کوئی اور نہ کر سکے گا۔ شاید اس لئے کہ سندر لال کی اپنی بیوی اغوا ہو چکی تھی اور اس کا نام بھی لاجو تھا۔ لاجونتی۔

چنانچہ پربھات پھیری نکالتے ہوئے جب سندر لال بابو، اس کا ساتھی رسالو اور نیکی رام وغیرہ مل کر گاتے --- "ہتھ لائیاں کملان نی لاجونتی دے بوٹے ---" تو سندر لال کی آواز ایک دم بند ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بابت سوچتا۔ جانے وہ کہاں ہو گی، کس حال میں ہو گی، ہماری بابت کیا سوچ رہی ہو گی، وہ کبھی آئے گی بھی یا نہیں؟--- اور پتھریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے۔

اور اب تو یہاں تک نوبت آ گئی تھی کہ اس نے لاجونتی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا غم اب دنیا کا غم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دکھ سے بچنے کے لئے لوک سیوا میں اپنے آپ کو غرق کر دیا۔ اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا--- انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر اسے ٹھیس لگ سکتی ہے۔ وہ لاجونتی کے پودے کی طرح ہے جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤ تو کمھلا جاتا ہے لیکن اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ اسے جگہ بے جگہ اٹھنے بیٹھنے، کھانے کی طرف بے توجہی برتنے اور ایسی ہی معمولی معمولی باتوں پر پیٹ دیا کرتا تھا۔

اور لاجو ایک پتلی شہتوت کی ڈالی کی طرح نازک سی دیہاتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا چکا تھا۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے قراری تھی۔ اس کا اضطرار شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ بن کر اس کے بڑے سے پتے پر کبھی ادھر اور کبھی

ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔ اس کا دبلا پن اس کی صحت کے خراب ہونے کی دلیل نہ تھی ایک صحت مندی کی نشانی تھی جسے دیکھ کر بھاری بھرکم سندر لال پہلے تو گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجو ہر قسم کا بوجھ، ہر قسم کا صدمہ حتیٰ کہ مار پیٹ تک سہ گذرتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا گیا اور اس نے ان حدوں کا خیال ہی نہ کیا جہاں پہنچ جانے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ سکتا ہے۔ ان حدوں کو دھندلا دینے میں لاجونتی خود بھی تو ممد ثابت ہوئی تھی۔ چونکہ وہ دیر تک اداس نہ بیٹھ سکتی تھی اس لئے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی سندر لال کے صرف ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکتی اور لپک کر اس کے پاس چلی آتی اور گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہہ اٹھتی۔۔۔ "پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی۔۔۔" صاف پتہ چلتا تھا وہ ایک دم ساری مار پیٹ بھول چکی ہے۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ مرد ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں بلکہ عورتوں میں کوئی بھی سرکشی کرتی تو لڑکیاں خود ہی ناک پر انگلی رکھ کے کہتیں۔۔۔ "لے وہ بھی کوئی مرد ہے بھلا عورت جس کے قابو میں نہیں آتی۔۔۔" اور یہ مار پیٹ ان کے گیتوں میں چلی گئی تھی۔ خود لاجو گایا کرتی تھی۔ میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی۔ وہ بوٹ پہنتا ہے اور میری کمر بڑی پتلی ہے لیکن پہلی ہی فرصت میں لاجو نے شہر ہی کے ایک لڑکے سے لو لگا لی اور اس کا نام تھا سندر لال جو ایک برات کے ساتھ لاجونتی کے گاؤں چلا آیا تھا اور جس نے دولہا کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا۔۔۔۔ "تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار، بیوی بھی چٹ پٹی ہوگی" لاجونتی نے سندر لال کی اس بات کو سن لیا تھا مگر وہ یہ بھول ہی گئی کہ سندر لال کتنے بڑے بڑے اور بھدے بوٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کی اپنی کمر کتنی پتلی ہے!

اور پربھات پھیری کے سے ایسی ہی باتیں سندر لال کو یاد آتیں اور وہ یہی سوچتا۔ ایک بار صرف ایک بار جو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسا لوں اور لوگوں کو بتا دوں۔۔۔ ان بیچاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ فسادیوں کی ہوس ناکیوں کا شکار ہو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا، انہیں اپنا نہیں لیتا۔۔۔ ایک گلا سڑا سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہئے۔ وہ ان عورتوں کو گھروں میں اور انہیں ایسا مرتبہ دینے کی پرینا کرتا جو گھر میں کسی بھی عورت، کسی بھی ماں، بیٹی، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا۔۔۔۔ انہیں اشارے اور کنائے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی چاہئے جو ان کے ساتھ ہوئیں۔۔۔۔ کیوں کہ ان کے دل زخمی ہیں۔ وہ نازک ہیں، چھوئی موئی کی طرح۔۔۔ ہاتھ بھی لگاؤ تو کمہلا جائیں گے۔۔۔۔

گویا دل میں بساؤ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے محلہ ملا شکور کی اس کمیٹی نے کئی پربھات پھیریاں نکالیں۔ صبح چار پانچ بجے کا وقت ان کے لئے موزوں ترین وقت ہوتا تھا، نہ لوگوں کا شور نہ ٹریفک کی الجھن۔ رات بھر چوکیداری کرنے والے کتے تک بجھے ہوئے تنوروں میں سر دے کر پڑے ہوتے تھے۔ اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے لوگ پربھات پھیری والوں کی آواز سن کر صرف اتنا کہتے۔۔۔ او! وہی منڈلی ہے! اور پھر کبھی صبر اور کبھی تنک مزاجی سے وہ بابو سندر لال کا پروپیگنڈا سنا کرتے۔ وہ عورتیں جو بڑی محفوظ اس پار پہنچ گئی تھیں گوبھی کے پھولوں کی طرح پھیلی پڑی رہتیں اور ان کے خاوند ان کے پہلو میں ڈنٹھلوں کی طرح اکڑے پڑے پڑے پربھات پھیری کے شور پر احتجاج کرتے ہوئے منہ میں کچھ منمناتے چلے جاتے۔ یا کہیں کوئی بچہ تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں کھولتا اور "دل میں بساؤ" کے فریادی اور اندوہ گیں پروپیگنڈے کو صرف ایک گانا سمجھ کر پھر سو جاتا۔

لیکن صبح کے سے کان میں پڑا ہوا شبد بیکار نہیں جاتا۔ وہ سارا دن ایک تکرار کے ساتھ دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے معنی کو بھی نہیں سمجھتا، پر گنگناتا چلا جاتا ہے۔ اسی آواز کے گھر کر جانے کی بدولت ہی تھا کہ انہیں دنوں جب کہ مس مردولا سارا بھائی ہند اور پاکستان کے درمیان اغوا شدہ عورتیں تبادلے میں لائیں تو محلہ ملا شکور کے کچھ آدمی انہیں پھر سے بسانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کے وارث شہر سے باہر چوکی کلاں پر انہیں ملنے کے لئے گئے۔ مغویہ عورتیں اور ان کے لواحقین کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر سر جھکائے اپنے اپنے برباد گھروں کو پھر سے آباد کرنے کے کام پر چل دیئے۔ رسالو اور نیکی رام اور سندر لال بابو کبھی "مہندر سنگھ زندہ باد" اور کبھی "سوہن لال زندہ باد" کے نعرے لگاتے۔۔ اور وہ نعرے لگاتے رہے حتیٰ کہ ان کے گلے سوکھ گئے.....

لیکن مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں 'جن کے ماں باپ 'بہن اور بھائیوں نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں ؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لئے انہوں نے زہر کیوں نے کھا لیا ؟ کنوئیں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی ؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے جان دے دی لیکن انہیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام کر رہی ہیں کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انہیں نہیں پہچانتے۔ پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی ---- ساگ وتی ---- ساگ والی ---- اور اپنے بھائی کو اس جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی ---- تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری ؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تھا رے ---- اور بہاری چلا دینا چاہتا۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کے نارائن بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا جو دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے جو صرف ایک حد ہے جسکے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں۔

لیکن فوجی ٹرک میں مس سارا بھائی تبادلے میں جو عورتیں لائیں ان میں لاجو نہ تھی سندر لال نے امید و بیم سے آخری لڑکی کو ٹرک سے نیچے اترتے دیکھا اور پھر اس نے بڑی خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کو دو چند کر دیا۔ اب وہ صرف صبح کے سمے ہی پر بھات پھیری کے لئے نہ نکلتے تھے بلکہ شام کو بھی جلوس نکالنے لگے 'اور کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنے لگے جس میں کمیٹی کا بوڑھا صدر وکیل کالکا پرشاد صوفی کھنکاروں سے ملی جلی ایک تقریر کر دیا کرتا اور رسالو ایک پیکدان لئے ڈیوٹی پر ہمیشہ موجود رہتا۔ لاؤڈ اسپیکر سے عجیب طرح کی آوازیں آتیں 'پھر کہیں نیکی رام 'محرر چوکی کچھ کہنے کے لئے اٹھتے لیکن وہ جتنی بھی باتیں کہتے اور جتنے بھی شاستروں اور پرانوں کا حوالہ دیتے اتنا ہی اپنے مقصد کے خلاف باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سندر لال بابو اٹھتا لیکن وہ دو فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا گلا رک جاتا' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور روہانسا ہونے کے کارن وہ تقریر نہ کر پاتا' آخر بیٹھ جاتا لیکن مجمع پر ایک عجیب طرح کی خاموشی چھا جاتی اور سندر لال بابو کی ان دو باتوں کا اثر جو کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے چلی آتیں 'وکیل کالکا پرشاد صوفی کی ساری ناصحانہ فصاحت پر بھاری ہوتا لیکن لوگ وہیں رو دیتے۔ اپنے جذبات کو آسودہ کر لیتے اور پھر خالی الذہن گھر لوٹ جاتے۔۔۔

ایک روز کمیٹی والے سانجھ کے سمے بھی پرچار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑھ میں پہنچ گئے۔ مندر کے باہر پیپل کے ایک پیڑ کے اردگرد سیمنٹ کے تھڑے پر کئی شردھالو بیٹھے تھے اور راماین کی کتھا ہو رہی تھی۔ نارائن باوا راماین کا وہ حصہ سنا رہے تھے جہاں ایک دھوبی نے اپنی دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا ---- میں راجا رام چندر نہیں جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آنے پر بھی سیتا کو بسا لے گا اور رام چندر جی نے مہاستونتی سیتا کو گھر سے نکال دیا۔ ایسی حالت میں جب کہ وہ گربھ وتی تھی "کیا اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے ؟" ---- نارائن باوا نے کہا ---- "یہ ہے رام راج ! جس میں ایک دھوبی کی بات کو بھی اتنی ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

کمیٹی کا جلوس مندر کے پاس رک چکا تھا اور لوگ راماین کی کتھا اور شلوک کا ورنن سننے کے لئے ٹھہر چکے تھے۔ سندر لال آخری فقرے سنتے ہوئے کہہ اٹھا۔۔

"ہمیں ایسا رام راج نہیں چاہئے بابا !"

"چپ رہو جی" -- "تم کون ہوتے ہو ؟" ---- "خاموش !" مجمع سے آوازیں آئیں اور سندر لال نے بڑھ کر کہا --- "مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

پھر ملی جلی آوازیں آئیں --- "خاموش ! --- ہم نہیں بولنے دیں گے" ---- اور ایک کونے میں سے یہ بھی آواز آئی --- "مار دیں گے۔"

نارائن بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا --- "تم شاستروں کی مان مرجادا کو نہیں سمجھتے سندر لال !"

سندر لال نے کہا ۔۔۔ "میں ایک بات تو سمجھتا ہوں بابا ۔۔۔ رام راج میں دھوبی کی آواز تو سنی جاتی ہے لیکن سندر لال کی نہیں۔"
انہی لوگوں نے جو ابھی مارنے پہ تلے تھے 'اپنے نیچے سے پیپل کی گولریں ہٹا دیں اور پھر سے بیٹھتے ہوئے بول اٹھے ۔۔۔ "سنو' سنو' سنو ۔۔۔"

رسالو اور نیکی رام نے سندر لال بابو کو ٹھوکا دیا اور سندر لال بولے ۔۔۔ "شری رام نیتا تھے ہمارے ۔ پر یہ کیا بات ہے بابا جی 'انہوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا' مگر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وشواس نہ کر پائے؟"
نارائن بابا نے اپنی داڑھی کی کھچڑی پکاتے ہوئے کہا ۔۔۔ "اس لئے کہ سیتا ان کی اپنی پتنی تھی ۔ سندر لال! تم اس بات کو مہانتا کو نہیں جانتے۔"
"ہاں بابا" ۔۔۔ سندر لال بابو نے کہا ۔۔۔ "اس سنسار میں بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں ۔ پر میں سچا رام راج اسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کر سکتا ۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا ہی بڑا پاپ ہے جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا ۔۔۔ آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے ۔ اس لئے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی ہے ۔۔۔۔ اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں اور بہنوں کی طرح ایک چھل اور کپٹ کا شکار نہ تھی؟ اس میں سیتا کے ستیہ اور استیہ کی بات ہے یا راکشش راون کے وحشی پن کی جس کے دس سر انسان کے تھے لیکن ایک اور سب سے بڑا سر گدھے کا؟"
"آج ہماری سیتا نردوش گھر سے نکال دی گئی ہے ۔۔۔ سیتا ۔۔۔ لاجونتی ۔۔۔ اور سندر لال بابو نے رونا شروع کر دیا ۔ رسالو اور نیکی رام نے تمام وہ سرخ جھنڈے اٹھا لئے جن پر آج ہی اسکول کے چھوکروں نے بڑی صفائی سے نعرے کاٹ کر چپکا دیئے تھے اور پھر وہ سب "سندر لال بابو زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے چل دیئے ۔ جلوس میں سے ایک نے کہا ۔۔۔ "مہاستی سیتا زندہ باد" ایک طرف سے آواز آئی ۔۔۔ "شری رام چندر ۔۔۔"
اور پھر بہت سی آوازیں آئیں ۔۔۔۔ "خاموش! خاموش!" اور نارائن باوا کی مہینوں کی کتھا اکارت چلی گئی 'بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہو گئے ۔ جس کے آگے آگے وکیل کالکا پرشاد اور حکم سنگھ 'محرر چوکی کلاں' جا رہے تھے 'اپنی بوڑھی چھڑیوں کو زمین پر مارتے اور ایک فاتحانہ سی آواز پیدا کرتے ہوئے ۔۔۔ اور ان کے درمیان کہیں سندر لال جا رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے ۔ آج اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گا رہے تھے۔
"ہتھ لائیاں کملان نی لاجونتی دے بوٹے ۔۔۔۔!"
ابھی گیت کی آواز لوگوں کے کانوں میں گونج رہی تھی ۔ ابھی صبح بھی نہیں ہو پائی تھی اور محلہ ملا شکور کے مکان ۴۱۴ کی بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کربناک سی انگڑائیاں لے رہی تھی کہ سندر لال کا "گرائیں" لال چند جسے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو دیا تھا دوڑا دوڑا آیا اور اپنی گاڑھے کی چادر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا ۔۔۔
"بدھائی ہو سندر لال ۔"
سندر لال نے میٹھا گڑ چلم میں رکھتے ہوئے کہا ۔۔۔ "کس بات کی بدھائی لال چند؟"
"میں نے لاجو بھابی کو دیکھا ہے ۔"
سندر لال کے ہاتھ سے چلم گر گئی اور میٹھا تمباکو فرش پر گر گیا ۔ "کہاں دیکھا ہے؟" اس نے لال چند کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ دے پانے پر جھنجھوڑ دیا۔
"واگہ کی سرحد پر ۔"
سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سا بولا "کوئی اور ہو گی ۔"

لال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔۔۔ "نہیں بھیا وہ لاجو ہی تھی' لاجو۔۔۔"

"تم اسے پہچانتے بھی ہو؟" سندر لال نے پھر سے بیٹھے تمباکو کو فرش پر سے اٹھاتے اور ہتھیلی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے رسالو کی چلم حقے پر سے اٹھالی اور بولا۔۔۔ "بھلا کیا پہچان ہے اس کی؟"

"ایک تیندولہ ٹھوڑی پر ہے' دوسرا گال پر۔۔"

"ہاں ہاں ہاں" اور سندر لال نے خود ہی کہہ دیا "تیسرا ماتھے پر" وہ نہیں چاہتا تھا اب کوئی خدشہ رہ جائے اور ایک دم اسے لاجو نتی کے جانے پہچانے جسم کے سارے تیندوے یاد آ گئے جو اس نے بچپنے میں اپنے جسم پر سجا لیے تھے جو ان ہلکے ہلکے سبز دانوں کی مانند تھے جو چھوئی موئی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہی وہ کمہلانے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح ان تیندولوں کی طرف انگلی کرتے ہی لاجو نتی شرما جاتی تھی۔۔۔ اور گم ہو جاتی تھی' اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی۔ گویا اس کے سب راز کسی کو معلوم ہو گئے ہوں اور کسی نامعلوم خزانے کے لٹ جانے سے وہ مفلس ہو گئی ہو۔۔۔ سندر لال کا سارا جسم ایک ان جانے خوف' ایک انجانی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھنکنے لگا۔ اس نے پھر سے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا۔۔۔

"لاجو واگہ کیسے پہنچ گئی؟"

لال چند نے کہا۔۔۔ "ہند اور پاکستان میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھا نا۔"

"پھر کیا ہوا۔۔۔؟" سندر لال نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا "کیا ہوا پھر؟"

رسالو بھی اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور تمباکو نوشوں کی مخصوص کھانسی کھانستے ہوئے بولا۔۔۔ "سچ مچ آ گئی ہے لجونتی بھابی؟"

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "واگہ پر سولہ عورتیں پاکستان نے دے دیں اور اس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں۔ لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہمارے والنٹیر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں ان میں ادھیڑ' بوڑھی اور بیکار عورتیں زیادہ ہیں۔ اس تنازع پر لوگ جمع ہو گئے۔ اس وقت ادھر کے والنٹیر نے لاجو بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا۔۔۔ "تم اسے بوڑھی کہتے ہو؟ دیکھو۔۔۔ دیکھو۔۔۔ جتنی عورتیں تم نے دی ہیں ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی؟" اور وہاں لاجو بھابی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تیندولے چھپا رہی تھی۔"

پھر جھگڑا بڑھ گیا۔ دونوں نے اپنا "مال" واپس لے لینے کی ٹھان لی۔ میں نے شور مچایا۔۔۔ "لاجو۔۔۔ لاجو بھابی"۔۔۔ مگر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیا۔

اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا' جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی۔ رسالو اور نیکی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندر لال کہیں اور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجو آئی بھی پر نہ آئی۔۔۔ اور سندر لال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا جیسے وہ بیکانیر کا صحرا پھاند کر آیا ہے اور اب کہیں درخت کی چھاؤں میں زبان نکالے ہانپ رہا ہے۔ منہ سے اتنا بھی نہیں نکلتا۔ "پانی دے دو" اسے یوں محسوس ہوا' بٹوارے سے پہلے اور بٹوارے کے بعد کا تشدد ابھی تک کارفرما ہے۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اب لوگوں میں پہلا سا دریغ بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو' سانبھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھابی بنتو۔۔۔ تو وہ جھٹ سے کہتا "مر گئے" اور اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر تاجر انسانی مال' انسانی گوشت اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے۔ مویشی خریدنے والے کسی بھینس یا گائے کا جبڑا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے تھے۔

اب وہ جوان عورت کے روپ' اس کے نکھار' اس کے عزیز ترین رازوں' اس کے تیندولوں کی شارع عام میں نمائش کرنے لگے۔ تشدد اب تاجروں کی نس نس میں بس چکا ہے' پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک رومال ڈال لیتے اور یوں "گپتی" کر لیتے۔ گویا رومال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے سودا ہو جاتا تھا۔ اب "گپتی" کا رومال بھی ہٹ چکا تھا اور سامنے سودے ہو رہے تھے

اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے تھے ۔ یہ سارا لین دین' یہ سارا کاروبار پرانے زمانے کی داستان معلوم ہو رہا تھا جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید و فروخت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ازبیک ان گنت عریاں عورتوں کے سامنے کھڑا ان کے جسموں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سا گڑھا پڑ جاتا ہے اور اس کے اردگرد ایک زرد سا حلقہ اور پھر زردیاں اور سرخیاں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لئے دوڑتی ہیں۔۔۔ ازبیک آگے گذر جاتا ہے اور ناقابل قبول عورت ایک اعتراف شکست' ایک انفعالیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازاربند تھامے اور دوسرے سے اپنے چہرے کو عوام کی نظروں سے چھپائے سسکیاں لیتی ہے۔۔۔

سندر لال امرتسر (سرحد) جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے لاجو کے آنے کی خبر ملی ۔ ایک دم ایسی خبر مل جانے سے سندر لال گھبرا گیا۔ اس کا ایک قدم فوراً دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے اور کمیٹی کے تمام پلے کارڈوں اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روئے لیکن وہاں جذبات کا یوں مظاہرہ ممکن نہ تھا۔ اس نے مردانہ وار اس اندرونی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو ناپتے ہوئے چوکی کلاں کی طرف چل دیا کیونکہ وہی جگہ تھی جہاں مغویہ عورتوں کی ڈیلوری دی جاتی تھی۔

اب لاجو سامنے کھڑی تھی اور ایک خوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی' وہی سندر لال کو جانتی تھی' اس کے سوائے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جب کہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ زندگی کے دن بتا کر آئی تھی' نہ جانے کیا کرے گا؟ سندر لال نے لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ خالص اسلامی طرز کا لال دوپٹہ اوڑھے تھی اور بائیں بکل مارے ہوئے تھی ۔۔۔ محض عادتاً ۔۔۔ دوسری عورتوں میں گھل مل جانے اور بالا آخر اپنے صیاد کے دام سے بھاگ جانے کی آسانی تھی اور وہ سندر لال کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی کہ اسے کپڑے بدلنے یا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ ہندو اور مسلمان کی تہذیب کے بنیادی فرق ۔۔۔ دائیں بکل اور بائیں بکل میں امتیاز کرنے سے قاصر رہی تھی۔ اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی ایک امیدوار ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ۔۔۔

سندر لال کو دھچکا سا لگا۔ اس نے دیکھا لاجونتی کا رنگ کچھ نکھر گیا تھا اور وہ پہلے کی بہ نسبت کچھ تندرست سی نظر آتی تھی۔ نہیں۔ وہ موٹی ہو گئی تھی ۔۔۔ سندر لال نے جو کچھ لاجو کے بارے میں سوچ رکھا تھا وہ سب غلط تھا۔ وہ سمجھتا تھا غم میں گھل جانے کے بعد لاجونتی بالکل مریل ہو چکی ہو گی اور آواز اس کے منہ سے نکالے نکالے نہ نکلتی ہو گی۔ اس خیال سے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے' اسے بڑا صدمہ ہوا لیکن وہ چپ رہا کیونکہ اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اگرچہ وہ نہ جان پایا کہ اتنی خوش تھی تو پھر چلی کیوں آئی؟ اس نے سوچا شاید ہند سرکار کے دباؤ کی وجہ سے اسے اپنی مرضی کے خلاف یہاں آنا پڑا لیکن ایک چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لاجونتی کا سنولایا ہوا چہرہ زردی لئے ہوئے تھا اور غم محض غم سے اس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ غم کی کثرت سے موٹی ہو گئی تھی اور صحت مند' نظر آتی تھی لیکن یہ ایسی صحت مندی تھی جس میں دو قدم چلنے پر آدمی کا سانس پھول جاتا ہے۔۔۔

مغویہ کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا لیکن اس نے سب خیالات کا ایک اثباتی مردانگی سے مقابلہ کیا اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ کسی نے کہا ۔۔۔ "ہم نہیں لیتے مسلران (مسلمان) کی جھوٹی عورت ۔۔۔"

اور یہ آواز رسالو' نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے محرر کے نعروں میں گم ہو کر رہ گئی۔ ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی پھٹتی اور چلاتی آواز آ رہی تھی۔ وہ کھانس بھی لیتا اور بولتا بھی جاتا۔ وہ اس نئی حقیقت' نئی شدھی کا شدت سے قائل ہو چکا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا آج اس نے کوئی نیا وید نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصے دار بنانا چاہتا ہے ۔۔۔ ان سب لوگوں اور ان کی آوازوں میں گھرے ہوئے لاجو اور سندر لال اپنے ڈیرے کو جا رہے تھے اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بن باس کے بعد اجودھیا لوٹ رہے ہیں۔ ایک طرف تو لوگ خوشی کے اظہار میں دیپ مالا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انہیں اتنی لمبی اذیت دیئے جانے پر تاسف بھی۔

لاجونتی کے چلے آنے پر بھی سندر لال بابو نے اسی شد و مد سے "دل میں بساؤ" پروگرام کو جاری رکھا۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے نبھا دیا تھا اور وہ لوگ جنہیں سندر لال کی باتوں میں خالی خولی جذباتیت نظر آتی تھی، قائل ہونا شروع ہوئے۔ اکثر لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس۔ مکان ۴۱۴ کی بیوہ کے علاوہ محلّہ ملا شکور کی بہت سی عورتیں سندر لال بابو سوشل ورکر کے گھر آنے سے گھبراتی تھیں۔

لیکن سندر لال کو کسی کی اعتنا یا بے اعتنائی کی پروا نہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آچکی تھی اور اس کے دل کا خلا پٹ چکا تھا۔ سندر لال نے لاجو کی سورن مورتی کو اپنے دل کے مندر میں استھاپت کر لیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت کرنے لگا تھا۔ لاجو جو پہلے خوف سے سہمی رہتی تھی، سندر لال کے غیر متوقع نرم سلوک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سندر لال، لاجونتی کو اب "لاجو" کے نام سے نہیں پکارتا تھا، وہ اسے کہتا تھا "دیوی" اور لاجو ایک ان جانی خوشی سے پاگل ہو جاتی تھی۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ سندر لال کو اپنی واردات کہہ سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے سب گناہ دھل جائیں لیکن سندر لال لاجو کی وہ باتیں سننے سے گریز کرتا تھا اور لاجو اپنے کھل جانے میں بھی ایک طرح سمٹی رہتی۔ البتہ جب سندر لال سو جاتا تو اسے دیکھا کرتی اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی، جب سندر لال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ "نہیں" "یونہیں" "اونہوں" کے سوا اور کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھکا ہارا سندر لال پھر اونگھ جاتا۔۔۔ البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندر لال نے لاجونتی کے سیاہ دنوں کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا تھا۔

"کون تھا وہ؟"

لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "جماں" ۔۔۔ پھر وہ اپنی نگاہیں سندر لال کے چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندر لال ایک عجیب سی نظروں سے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ لاجونتی نے پھر آنکھیں نیچی کر لیں اور سندر لال نے پوچھا۔

"اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟"

"ہاں۔"

"مارتا تو نہیں تھا؟"

لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا۔۔۔ "نہیں ۔۔۔۔" اور پھر بولی "وہ مارتا نہیں تھا، پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں تھی ۔۔۔ اب تو نہ مارو گے؟"

سندر لال کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا۔۔۔ "نہیں دیوی! اب نہیں ۔۔۔ نہیں ماروں گا۔۔۔"

"دیوی" لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن سندر لال نے کہا۔ "جانے دو بیتی باتیں! اس میں تمہارا کیا قصور؟ اس میں قصور ہے ہمارے سماج کا جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے ہاں عزت کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمہاری ہانی نہیں کرتا، اپنی کرتا ہے۔"

اور لاجونتی کی من کی من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب "دیوی" کا بدن ہو چکا تھا۔ لاجونتی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی بہت خوش لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور وسوسے۔ وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پا کر ایکا ایکی اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔

جب بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی۔ اس لئے نہیں کہ سندر لال بابو نے پھر وہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی بلکہ اس لئے کہ وہ لاجو سے بہت ہی اچھا سلوک کرنے لگا تھا۔ ایسا سلوک جس کی لاجو متوقع نہ تھی ۔۔۔۔ وہ سندر لال کی وہی پرانی لاجو

ہونا چاہتی تھی جو کاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی ' لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا۔ سندر لال نے اسے یہ محسوس کرا دیا جیسے وہ ---- لاجونتی کانچ کی کوئی چیز ہے جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی ---- اور لاجو آئینے میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے پر لاجو نہیں ہو سکتی۔ وہ بس گئی ' پر اجڑ گئی --- سندر لال کے پاس اس کے آنسو دیکھنے کے لئے آنکھیں تھیں اور نہ آہیں سننے کے لئے کان! ---- پربھات پھیریاں نکلتی رہیں اور محلہ ملا شکور کا سدھارک رسالو اور نیکی رام کے ساتھ مل کر اسی آواز میں گاتا رہا۔

جھ لائیاں کملاں نی ' لاجونتی دے بوٹے ---- "

حجاب امتیاز علی

نام : حجاب
قلمی نام : حجاب اسمٰعیل / حجاب امتیاز علی
پیدائش : لگ بھگ ۱۹۰۳ء بہ مقام حیدر آباد' دکن' بھارت (۱)
تعلیم : سینئر کیمبرج
عربی' اردو اور موسیقی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔

مختصر حالات زندگی:

حجاب کے والد سید محمد اسمٰعیل نظام دکن کے فرسٹ سیکرٹری تھے اور والدہ عباسی بیگم' (۲) اپنے دور کی نامور اہل قلم خاتون۔ آبائی وطن حیدر آباد' دکن تھا۔ حیدر آباد اگرچہ امرا اور روسا کا شہر تھا اور معاشرت نوابانہ تھی مگر ان دنوں خصوصاً" موسم سرما میں' وہاں طاعون کی وبا پھوٹ پڑتی اور لوگ بھاگ بھوگ کر جان بچاتے۔ حجاب کے والد نے بچوں کی تعلیم کے پیش نظر اپنے گھرانے کو مدراس منتقل کر دیا' جہاں کڑاکے کی گرمی پڑتی اور یہ گھرانہ موسم گرما کے چند ماہ نرساپور ضلع کرشنا' جنوبی ہند میں گزارتا۔ نرساپور دریائے گوداوری کے کنارے آباد تھا۔

نرساپور میں ان کے بنگلے کو حجاب کے نانا نے اعلیٰ قسم کے فرنیچر سے سجا رکھا تھا۔ حجاب آج بھی لمبے برآمدوں کے بالمقابل پائیں باغ کے چوڑ دروازے پر سایہ فگن املی کے درخت اور دریائے گوداوری کے ساحل کے خوابناک مناظر نہیں بھول پائیں۔

حجاب کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ عربی' اردو اور موسیقی کے استاد الگ الگ تھے۔ بچپن اور لڑکپن میں حجاب سخت تنہائی کا شکار رہیں۔ ان کی بڑی بہن ذکیہ عمر میں ان سے بہت بڑی تھیں اور پھر انہیں دنوں میں ذکیہ کی شادی بھی ہو گی۔ لے دے کر گھر میں والدہ کا دم غنیمت تھا اور عباسی بیگم نے ننھی حجاب کی دلجوئی بھی خوب کی۔ والدہ کی ناوقت موت نے حجاب کو یکسر تنہا کر دیا تو والد نے سرکاری دوروں میں حجاب کو اپنے ساتھ لے جانا شروع کیا۔ یوں کوچین سے پانڈی چری اور بمبئی سے مدراس تک کے ساحلی علاقوں پر حجاب کا بچپن اور لڑکپن بیتا لیکن والدہ سے بچھڑنے کا صدمہ حجاب کے ذہن پر دائمی نقش چھوڑ گیا۔ اس زمانے میں حجاب نے بے تحاشہ لکھا اور اکثر نثر لطیف میں مرحوم والدہ کی مرثیہ نگاری کی۔ (۳) سینئر کیمبرج کے امتحان کے دوران حجاب نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوئیں اور تادیر ذہنی معالج کے زیر علاج رہیں۔ حجاب "تہذیب نسواں" میں مستقل لکھتی تھیں اور امتیاز علی تاج اس پرچے کے مدیر تھے۔ خطوط کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں امتیاز علی تاج نے اپنا لافانی ڈراما "انار کلی" مکمل کیا اور پطرس بخاری کے مشورہ پر ۱۹۳۱ء میں یہ شاہکار حجاب سے معنون کر دیا۔ حجاب کے نام ایک خط میں تاج نے لکھا تھا:

"اتنا مختصر افسانہ اس سے پیشتر کبھی لکھا نہ آئندہ لکھوں گا۔ لیکن جن مخلصانہ جذبات کا اظہار مقصود ہے' وہ ایک ہزار لفظ میں بھی ادا ہو سکتے نہیں۔

اس مختصر عریضہ کو شرف قبولیت بخشیے۔ کتاب کا پڑھنا چنداں ضروری نہیں۔ اسے ایک ضمیمہ سمجھیے' طویل اور بے معنی۔

"تاج۔ دسمبر ۱۹۳۱ء"

۱۹۳۴ء میں سجاد حیدر یلدرم کی معرفت حجاب کی شادی امتیاز علی تاج سے بلماری' (جنوبی ہند) کے مقام پر ہوئی اور یوں حجاب لاہور کی مستقل شہری بن گئیں۔ ان کی شادی کے موقع پر سجاد حیدر یلدرم نے سہرہ لکھا: (۴)

اس میں کچھ نکہتِ ارمان فزا آتی ہے
ناز کرتی ہوئی جو باد صبا آتی ہے
للہ الحمد تجرد کی ہے تاریکی ختم
عیشِ مشروع کی اب شمع ہدیٰ آتی ہے

اس سہرہ کے دوسرے شعر سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ تاج اور حجاب نے اس زمانے کے اعتبار سے تجرد کی طویل زندگی گزاری اور دونوں کی شادی خاصی پختہ عمر میں ہوئی۔ حجاب نے "تہذیب نسواں" کی ادارت بھی کی لیکن ۱۹۳۶ء میں انہوں نے ازلی تنہائی سے تنگ آ کر ناردن انڈیا فلائنگ کلب کی رکنیت اختیار کی اور پارسی انسٹرکٹر دستور کی شاگردہ بنیں۔ اس زمانے میں "اے" لائسنس حاصل کرنے کے لیے چالیس سے پچاس گھنٹے کی پرواز مقرر تھی جبکہ حجاب نے یہ تربیت صرف اکیس گھنٹوں میں مکمل کر لی اور اس کے فوراً بعد سولو فلائیٹ پر نکل گئیں۔ یاد رہے کہ حجاب برصغیر پاک وہند کی اولین ہوا باز خاتون ہونے کا اعزاز رکھتی ہیں۔ ان کا یہ شوق آٹھ برس تک قائم رہا۔ حجاب نے راتوں کو پرواز کی' نیچی پرواز میں مہارت کا ثبوت دیا' یہاں تک کے انہیں ایک بار Forced Landing بھی کرنا پڑی۔

حجاب آج بھی ادبی سطح پر متحرک اور باخبر ہیں اور یہ ادا ان کے سن و سال کے کسی اور ادیب کو ودیعت نہیں ہوئی۔ ہنگامی زندگی سے بچا ہوا بیشتر وقت اپنی بلیوں کے ناز اٹھانے میں صرف کرتی ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"میری نا تمام محبت"' مطبوعہ: "نیرنگ خیال" لاہور: ۱۹۳۲ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "میری نا تمام محبت اور دوسرے رومانی افسانے" (افسانے) — دارالاشاعت پنجاب' لاہور' — طبع اول: ۱۹۳۲ء
۲۔ "لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے" (افسانے) — دارالاشاعت پنجاب' لاہور' — طبع اول: ۱۹۳۳ء
۳۔ "ظلمت کی انجمن" (ناول) — دارالاشاعت پنجاب' لاہور' — طبع اول: ۱۹۳۶ء
۴۔ "کاؤنٹ الیاس کی موت" (افسانے) — دارالاشاعت پنجاب' لاہور' — طبع اول: ۱۹۳۵ء
۵۔ "ادب زریں" (مضامین) — عصمت بک ڈپو' دہلی' — طبع اول: ۱۹۳۲ء
۶۔ "تحفے اور دوسرے شگفتہ افسانے" (افسانے) — دارالاشاعت پنجاب' لاہور' — طبع اول: ۱۹۳۹ء
۷۔ "صنوبر کے سائے اور دوسرے رومانی افسانے" (افسانے) — دارالاشاعت پنجاب' لاہور — طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۸۔ "نغمات موت" (نثر لطیف) — عصمت بک ڈپو' دہلی' — طبع اول:

یہ کتاب والدہ مرحومہ کے مرثیوں کا مجموعہ ہے اور حجاب کی اولین کتاب۔

۹۔ "ظالم محبت" (ناولٹ) — دارالاشاعت پنجاب' لاہور' — طبع سوم: ۱۹۴۰ء

اس کتاب کا ایک ایڈیشن آئینہ ادب' لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۱۰۔ "ممی خانہ اور دوسرے ہیبت ناک افسانے" (افسانے) — پبلشرز یونا ئٹڈ' لاہور' — طبع دوم:

۱۱۔ "ڈاکٹر گار کے افسانے" (افسانے) — دارالاشاعت پنجاب' لاہور' — طبع اول:

۱۲۔ "وہ بہاریں یہ خزائیں" (افسانے) — دارالاشاعت پنجاب' لاہور' — طبع اول: ۱۹۴۴ء

۱۳۔ "ممی خانہ اور دوسرے ہیبت ناک افسانے" (افسانے) — پبلشر یونا ئٹڈ' لاہور' — طبع اول: ۱۹۴۵ء

۱۴۔ "اندھیرا خواب" (ناول) — دارالاشاعت پنجاب' لاہور' — طبع اول: ۱۹۵۰ء

اس ناول کا دوسرا ایڈیشن آئینہ ادب' لاہور' نے شائع کیا۔

۱۵۔ "کالی حویلی" — دارالاشاعت پنجاب' لاہور' — طبع اول:

۱۶۔ "پاگل خانہ" (ناول)

۱۷۔ "موم بتی کے سامنے" (۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کا روز نامچہ) — آئینہ ادب' لاہور' — طبع اول: ۱۹۶۸ء

۱۸۔ "ننھی بیبیاں" (ناول از لوئزا الکاٹ کا ترجمہ) — دارالاشاعت پنجاب' لاہور' — طبع اول: ۱۹۶۸ء

یہ "little Women" کا ترجمہ ہے۔

۱۹۔ "تحفے" (ناولٹ)

۲۰۔ "تصویر بتاں" (مضامین)

۲۱۔ "لیل و نہار"

۲۲۔ "بہاریں' جنوں اور موٹر پمپ" (ڈرامے)

غیرمدون:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ چند افسانے اور چار ڈرامے (خصوصاً "قیدی" اور "سوکھے ہوئے پتے") غیر مرتب حالت میں موجود ہیں۔

مستقل پتا:

۹۸۔ D' ماڈل ٹاؤن' لاہور۔ پاکستان۔

نظریہ فن:

"میرا خیال ہے کہ جو کچھ لکھیں اس میں کہانی پن ہونا چاہیے۔ کہانی کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔"

(بہ حوالہ ماہنامہ "پاکیزہ" ستمبر ۱۹۷۹ء)

○

(۱) یلدرم کے بے تکلف سرے اور مختلف افسانہ نگاروں کی یادداشتوں پر مبنی تحریروں کے مطابق حجاب کی تاریخ ولادت لگ بھگ ۱۹۰۳ء ٹھہرتی ہے۔ جب کہ حجاب نے تاحال اپنی تاریخ پیدائش سے کسی کو آگاہ نہیں کیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ء کے ایک خط میں لکھتی ہیں "میں نے عہد کر رکھا ہے کہ میں اپنی عمر کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ تحریرات پڑھیں' کھوج لگانے کا فائدہ؟ اس سے مخفی اسرار متاثر ہوتا ہے۔"

(۲) ناول "زہرا بیگم" مطبوعہ دارالاشاعت' پنجاب' لاہور کی خالق۔ "تہذیب نسواں" لاہور' میں ان کے متعدد مضامین اور افسانے بکھرے پڑے ہیں۔

(۳) رسالہ "تہذیب نسواں" میں اس نوع کی تحریریں تواتر کے ساتھ شائع ہوئیں۔

(۴) کل نو اشعار ہیں۔ شادی کے تحفوں میں سب سے نمایاں عبدالرحمان چغتائی کی نارنجی اور براؤن رنگوں میں ایک پینٹنگ تھی۔

حجاب امتیاز علی

صنوبر کے سائے

میں جب سے ان پہاڑی علاقوں میں آئی تھی "نہر روحناک" کی رعنائیوں کا ذکر ہر خاص و عام سے سنتی تھی۔ لوگ کہتے' اس کے صنوبر کے سایوں سے ڈھکے ہوئے کناروں پر سہانے خوابوں کی رومان جھلملاتی ہے۔ پہاڑی خانہ بدوشوں کا بیان تھا کہ نامعلوم پہاڑوں کی بلندیوں نے ایک مقام پر آسمان کے نیل میں شگاف کر رکھا ہے اور روحناک کی نیلی دھار وہیں سے اترتی اور کوہساروں میں سے ہرتی پھرتی اس وادی میں ایک ندی بن کر آ نکلتی ہے۔

بھلا آپ غور کیجئے۔ ان رومانی فقروں کو سن کر مجھ جیسی سیر و سیاحت کی دلدادہ سے کب نچلا بیٹھا جا سکتا تھا؟

ایک دن میں نے اپنی محبوب سہیلی جسوتی سے مچل کر کہا "جسوتی ہمیں یہاں آئے دو ہفتے گزر چکے۔ مگر ہم نے نہر روحناک کی سیر اب تک نہیں کی۔ تم پسند کرو تو آج شام کشتی کی سیر کو چلیں۔"

جسوتی کو آپ جانتے ہیں۔ سفید چہرے والی سلیم الطبع لڑکی ہے۔ اس سفر میں' میں اسے اپنے ساتھ تقریباً کھینچ کر لائی تھی۔

اس نے مسکرا کر کہا "جیسی تمہاری مرضی روحی' لیکن پانی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

اسی وقت جسوتی کے ایک محبوب حبشی نژاد خانہ زاد نے کہا "خاتون میں نے سنا ہے ساحل روحناک پر ایک بہت مشاق سو سال کا بوڑھا ملاح رہتا ہے۔ اس کی کشتی کبھی لہروں پر نہیں ڈگمگاتی۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسی ملاح کی کشتی کرائے پر لے لی جائے۔"

میں نے بے پروائی سے کہا "کوئی ملاح اور کوئی کشتی ہو۔"

جسوتی کہنے لگی "سو سال کا ملاح' خاک کشتی چلاتا ہو گا۔"

خانہ زاد نے کہا۔ "خاتون سنا ہے وہ ستر سال سے کشتی بانی کرتا ہے' اور آج تک اس کی کشتی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔" غرض اسی وقت ہم نے اسے کشتی کرایہ پر لینے اور شام کی چائے کا انتظام کشتی ہی میں کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ جب ہم دونوں اس مقام پر پہنچے۔ جہاں سے سیاح' روحناک کی سیر کے لیے پانی کا سفر شروع کرتے ہیں تو ہم نے دیکھا' کہ ایک سرخ اور نیلے رنگ کا مرصع شکارا ہمارے انتظار میں ہے۔ اس کے موتیوں کے کانپتے ہوئے پردوں میں سے ایرانی قالین پاروں پر رکھے ہوئے خوش وضع اور خوش قطع تکیے دعوت استراحت دے رہے تھے۔

میں نے مسکرا کر جسوتی سے کہا۔ "یہ "خلیفہ بغداد کا محراب" تفریح معلوم ہوتا ہے۔"

اندر آرام سے نیم دراز ہونے کے بعد ہم نے مڑ کر کشتی چلانے والے کو دیکھا۔ ایک پیر صد سالہ کشتی کے پرلے سرے پر چپو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سفید لمبی داڑھی کے بال ہلکی ہلکی ہوا سے کانپ رہے تھے۔ پرانی آنکھوں میں زندگی کی تابانی و درخشانی نہ تھی۔ بلکہ ...... جیسے ایک دھند میں سے ماضی کی حسرت دیدار جھکتی نظر آ رہی تھی۔

حبشی خانہ زاد نے چاء تیار کر رکھی تھی۔ ہم گرم گرم چائے کے خوشگوار گھونٹ حلق سے اتارتے دھیرے دھیرے روحناک کی طرف جا رہے تھے۔ جس کے نیل پر غروب آفتاب مچل مچل کر شہاب پاشی کر رہا تھا۔

منظر بتدریج وارفتہ سا ہوا جا رہا تھا۔ ہواؤں میں نکہت بڑھ رہی تھی۔ پانی کی چھوٹی چھوٹی لہروں کی آواز پر شبہ ہوتا تھا۔ جیسے کہیں دور خواب کے جزیرے میں پانی برس رہا ہو، فطرت اپنی بے ساختہ رعنائیوں کا دامن پھیلائے ہمارے سامنے تھی۔ ایک تصویر جس میں ڈھلتے ہوئے سورج کا ہر لمحہ نئے انداز سے رنگین موقلم کی شعبدہ بازیاں دکھا رہا تھا۔ اے اللہ! سچ مچ وہ خواب کی سرزمین تھی، رومان کا جزیرہ تھا۔

سیدھے اور تناور صنوبر، جیسے دم بخود کھڑے تھے، اور ان کے درمیان سے کہیں پھولوں سے ڈھنپی ہوئی ڈھلوانیں نظر آتیں۔ کہیں ایک اچھوتے نور میں نمائے ہوئے ہرے ٹیلے اور کہیں افق کے سحاب پاروں میں کھوئے ہوئے کہسار۔

ہم چپ تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا، ہم کتنی دور نکل گئے، اور ہمارے شکارے کو چلتے کتنا وقت ہو گیا۔

یکایک حبشی خانہ زاد کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"جناب واپس چلئے۔ آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی کے راستوں پر ہم بھٹک جائیں۔"

بوڑھے ملاح نے ایسے چہرے سے، جس پر مسکراہٹ کا شبہ ہو سکتا تھا کہا۔ "راہ سے بھٹکنا ناممکن ہے۔ میں ساٹھ ستر سال سے ان آبی راستوں کا عادی ہوں۔"

میں ذرا دیر چپ چاپ ملاح کا چہرہ تکتی رہی۔ جس پر زندگی کے گرم و سرد نے طرح طرح کی جھریاں ڈال رکھی تھیں۔ پھر پوچھا "گویا تم قریب قریب ایک صدی سے یہاں رہتے ہو؟"

"جی ہاں"

"تمہارا مکان کہاں ہے؟"

"مکان کہیں نہیں خاتون ------ صنوبر کے ان سایوں تلے پڑ رہتا ہوں---"

مجھے محسوس ہوا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے ضعیف سینے نے اک آہ بھری ہے۔

"صنوبر کے سایوں تلے" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "بے پناہ گرمی اور لرزا دینے والی سردی، تمہیں زندگی سے بیزار نہیں کرتی۔ اس کا تمہارے پاس کیا علاج ہے؟"

"علاج؟" اس نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "میرے پاس پرانی یادیں ہیں۔ جس کے پاس کوئی یاد ہو۔ اس پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا۔" میری دلچسپی یکلخت بڑھ گئی۔ "تمہارا ماضی تو افسانوں سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔"

مگر بوڑھے نے میری بات کی طرف توجہ نہ دی۔ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔ "مجھے صنوبر کے سایوں تلے رہنا پسند ہے۔ مجھ پر ان سایوں سے چند گھنٹے کی مفارقت بھی شاق گزرتی ہے۔ جب ہی تو میں شہر میں مزدوری کرنے نہیں جاتا۔ میں ان سایوں تلے کشتی لیے ادھر ادھر پھرتا رہتا ہوں۔"

"کیا تم ہمیں اس راز سے آگاہ کر سکو گے کہ صنوبر کے سایوں سے تمہیں کیوں عشق ہے؟" میں نے التجا کے لہجہ میں پوچھا۔

"یہ کوئی راز نہیں۔" اس نے دم توڑتے ہوئے سورج کے مقابل ایک سیاہ تصویر بن کر کہا۔ "سبھی جانتے ہیں کہ مجھے صنوبر کے سایوں سے کیوں محبت ہے اور کیوں میں اپنی زندگی کے آخری سانس ان کے نیچے ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

جسوتی اور میں کہنیاں تکیوں پر رکھ کر متوجہ ہو گئیں کشتی بہاؤ پر جا رہی تھی۔ بڈھا چپو ہاتھ میں تھامے بے پروائی سے اپنی کہانی کہہ رہا تھا۔

(۳)

آج سے ستر سال پہلے کا ذکر ہے۔ کہ دنیا میری نظروں میں نوجوان تھی۔ زندگی کی ہر ہر کروٹ میں ہزاروں ہی دلفریبیاں محسوس ہوتی

تھیں۔ میں غریب ملاح نہ تھا۔ ان پہاڑی علاقوں کا ایک خوشحال تاجر تھا۔

بہار کے موسم میں ایک دن شام کے آسمان پر سنہرا چاند ہنس رہا تھا۔ جب میں اسی روحناک کے ساحل پر انہیں صنوبر کے سایوں تلے چہل قدمی کے لیے نکل آیا۔

میری نظر پہاڑی حسن کے ایک نادر نمونہ پر پڑی۔۔۔ ایک کمسن لڑکی پر' جو صنوبر کے سائے تلے ایک سبز پتھر پر بیٹھی ایک ٹوکری بن رہی تھی۔ مجھ سے تفصیل کی رنگینی نہ مانگئے۔ رات کا اندھیرا اتر آئے گا۔ کچھ لیجئے میں خود وہاں نہ آیا تھا۔ مجھے وہ قوت وہاں کھینچ لائی تھی۔ جو ہر نوجوان کے دل کو زندگی کے پھولوں کے درمیان کشاں کشاں لئے پھرتی ہے۔

ہم میں محبت شروع ہو گئی۔ ہم شباب کی ایک رنگین وارفتگی میں باہم محبت کرنے لگے۔ ہم ہر روز انہیں صنوبر کے کانپتے ہوئے سایوں تلے ملتے اور اپنی آرزوئیں ایک دوسرے کے دھڑکتے ہوئے دل سے کہتے۔ بہت جلد ہماری شادی ہو گئی۔"

اسی وقت اچانک صنوبر کے درخت پر سے ایک ناشاد بلبل یکایک چلائی۔ بوڑھے نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر لرز کر کہا۔ "یہ دیوانہ پرند کیا کہہ رہا ہے؟ یہی نا؟ کہ محبت بہت ظالم چیز ہے۔"

جسوتی نے مجھے اور میں نے جسوتی کو چپ چاپ دیکھا۔ اس بوڑھے دل میں یقیناً ابھی شعر کے چشمے ابلتے رہے تھے۔ بوڑھے نے چند ہاتھ چپو کے چلائے اور ایک آہ بھر کر بولا۔

"شادی کے بعد چھ مہینے نہایت سنہرے گزرے' پھر ایک نحس خواب نے ہماری زندگی کا رخ پلٹا دیا۔

ایک صبح جونہی میری بیوی نے تکیے پر نیند سے آنکھیں کھولیں۔ اداس لہجے میں بولی۔ "میں نے ایک ہولناک خواب دیکھا ہے۔"

میری محبت کی نظروں نے اس سے پوچھا۔ "کیا خواب؟"۔"

بیوی نے آہ کھینچ کر کہا۔ "میں نے رات تقدیر کے فرشتے کو دیکھا' جو پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے پر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے رات تک اپنے بالوں میں ایک کاسنی رنگ کا گلاب نہ سنوارا تو تمہارا گھر اجڑ جائے گا۔"

آج سے ستر سال پہلے دنیا بہت اوہام پرست تھی۔ چنانچہ بیوی کا یہ ہولناک خواب سن کر میرا عشق سہم سا گیا۔ میری پریشانی دیکھ کر بیوی بولی۔ "پر اتنے فکر کی کیا بات؟"

میں نے کہا۔ "فکر کیسے نہ ہو؟ شیریں ترین! کیا تجھے نہیں معلوم کہ کاسنی رنگ کا گلاب ان پہاڑی علاقوں میں نایاب ہے؟"

میری بیوی کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ "نایاب؟ پھر کیا کرو گے؟ کاسنی رنگ کا گلاب آج رات تک بالوں میں لگانا ضروری ہے۔ ورنہ ہمارا یہ مسکراتا ہوا گھر تباہ ہو جائے گا۔ فرشتے نے یہی کہا تھا۔"

نامعلوم اندیشوں سے گھبرا کر وہ رونے لگی۔ "میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور وعدہ کیا کہ اطراف کے علاقوں کے تمام باغوں میں' شہر کے باغبانوں کو بھیجوں گا اور تاکید کروں گا کہ کسی نہ کسی طرح اسے دستیاب کر کے کاسنی رنگ کا ایک گلاب لے آئیں۔"

میری بیوی اپنے لمبے لمبے بال کھول کر نہانے کے لیے چشمے پر چلی گئی۔ تاکہ گلاب کے آنے سے پہلے بال سنوار لے۔

میں پریشانی کے عالم میں اسی وقت کاسنی گلاب کی تلاش میں نکل گیا۔ شہر کے ہر باغبان سے ملا۔ مگر ایک ایک نے کہا کہ اس علاقہ میں کاسنی رنگ کا گلاب کہیں نہیں مل سکتا۔ بیزار اور مایوس ہو کر میں حاکم شہر کے باغبان کے ہاں گیا۔ اپنی ضرورت اس کے آگے کہی۔ وہ بڑا ہی سفاک آدمی تھا۔ سوچ کر بولا۔ "کاسنی گلاب ہمارے باغ میں ہے تو۔ پر اس کی قیمت چھ اشرفی سے کم نہیں۔"

میں نے چھ اشرفیاں اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ اور کاسنی گلاب لے کر خوش خوش گھر پہنچا۔

میری بیوی کاسنی گلاب دیکھ کر باغ باغ ہو گئی اور مسکرا کر بولی۔ "اگر آج میں کاسنی گلاب بالوں میں نہ سنوار سکتی تو جانے ہم پر کیا مصیبت آتی۔"

میں نے کہا۔ "اسے فوراً بالوں میں لگا لو۔"

پر نہ جانے اس نے کس خیال سے کہا۔ "میرے بال گیلے ہیں ابھی میں نہ لگاؤں گی۔ جب رات شروع ہو گی تو لگا لوں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک بلوری صراحی میں پانی بھرا' اور پھول کو ہاتھ میں دیکھ کر تازہ ہوا کے خیال سے صراحی دریچے میں رکھ دی۔ میں دن بھر گلاب کی سرگردانی میں اپنے کام پر نہ جا سکا تھا۔ دکان پر جا بیٹھا۔ رات کے وقت جب گھر واپس آرہا تھا' تو میرا پرانا دوست حمری مجھے میرے گھر کے قریب ہی مل گیا۔ اسے میں نے ادھر کئی ہفتوں سے نہ دیکھا تھا خوش ہو کر گلے سے لگا لیا۔

"میں تمہارے ہی ہاں گیا تھا تم نہ ملے تو مایوس ہو کر واپس آگیا۔"

اس نے یہ جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ میری نظر اس کی عبا کے کاج پر پڑ گئی۔ میرا خون میری رگوں میں جم گیا۔

میں نے بلکنت پوچھا۔ "حمری یہ کاسنی گلاب تمہیں کہاں سے ملا؟"

حمری ابعا" شوخ تھا۔ ہنس کر بولا۔ "کیوں؟ تمہیں کیونکر فکر پیدا ہوئی؟ میری محبوبہ نے مجھے تحفہ دیا ہے۔ نایاب چیز ہے۔"

میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں لڑکھڑا سا گیا۔ وہ خواب تقدیر کا فرشتہ! اس کی پیشین گوئی! سب جھوٹ تھا! محض حمری کی عبا کا کاج سجانے کے لیے میری بیوی نے یہ رنگین جھوٹ تراشا تھا۔ ہائے ظالم زندگی! سنگدل زندگی!"

(۴)

میں غصہ میں کانپتا ہوا گھر پہنچا۔

مجھے دیکھتے ہی میری بیوی دوڑی دوڑی آئی' اور اشک آلود آنکھوں سے بولی۔ افسوس' بدبختی دیکھو کہ وہ پھول غائب ہو گیا۔ اے خدا میں اب کیا کروں؟ ہم پر ضرور کوئی مصیبت نازل ہو گی۔" "ضرور نازل ہو گی۔" میں نے گرج کر کہا "موت سے زیادہ بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ سمجھ لو کہ تمہاری موت آگئی۔"

بیوی حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ مگر اس وقت مجھے اس کی ایک ایک حرکت سے عیاری ٹپکتی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پھر چیخ کر کہا "تمہاری موت آگئی۔ تقدیر کے فرشتے کی پیشین گوئی کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

وہ متعجب ہو کر بولی۔ "تم کیا کہتے ہو؟ ایسا نہ کہو۔ خدا کے لیے کاسنی گلاب کو ڈھونڈو۔ میں نے اسے باغ کی دریچی میں تازہ ہوا کے لیے رکھ دیا تھا۔ اندر بال سنوارنے گئی تھی۔ واپس آکر دیکھتی ہوں تو پھول وہاں نہ تھا۔"

اس کی ان مکار باتوں نے میرے تن بدن میں شعلے بھڑکا دیے۔ میں نے اس کے نرم بازوؤں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اس زور سے دیوار پر دھکا دیا کہ ٹکر کھا کر اس کے سر سے خون کا ایک سرخ فوارہ چھوٹ نکلا۔

راتوں رات میں نے اسے اسی صنوبر کے سائے تلے دفنا دیا' جہاں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

ایک جنون کی بے اختیاری میں میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ اتفاق سے میرا دوست حمری پھر مجھے ایک گلی کے موڑ پر مل گیا۔ اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

وہ ہنس کر بولا۔ "تمہاری آنکھیں ایسی سرخ ہو رہی ہیں جیسے تم خون کر کے آئے ہو۔"

وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا' گویا میں اس کے راز سے ناواقف ہوں۔

میں نے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور بولا۔ "بدمعاش! تو سمجھتا ہے کہ میں نے خون نہیں کیا؟ میں اسے ٹھکانے لگا چکا ہوں۔ یہ کہہ کر کاسنی رنگ کا گلاب میں نے اس کی عبا کے کاج سے نوچ کر زمین پر دے مارا' اور اپنے جوتوں کی مجنونانہ حرکت سے مسل ڈالا۔ حمری آنکھوں

میں دہشت لیئے میرا چہرہ تک رہا تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ میں نے اس کی محبوبہ کا خاتمہ کر دیا' اور اب اس کا کام تمام کر دینے پر آمادہ ہوں تو اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور کہنے لگا۔ "کوتاہ اندیش اور جلد باز! تو بدبخت ہے! وہ گلاب تو میں نے سڑک پر سے اٹھایا تھا۔ میں بازار میں سے گزر رہا تھا کہ گلاب کا پھول دیکھ کر اٹھا لیا۔ شاید تمہارے ہی دریچے سے نیچے گر پڑا ہو۔" یہ سن کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ایک ایسا اندھیرا۔۔۔۔۔ جس نے آج تک دنیا کی نیرنگیوں کو مجھ سے اوجھل کر رکھا ہے۔

(۵)

"تقدیر کے فرشتے کا کہنا درست نکلا۔ میری بیوی اس رات کاسنی گلاب اپنے بالوں میں نہ سنوار سکی۔ ہمارا گھر میری بے وقوفی اور جلد بازی کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔

آج اس قصے کو ستر سال گزر گئے۔ مگر میں اپنی غلطی پر نادم' اسی مٹی کی پرستش کر رہا ہوں۔ جس میں ان صنوبر کے سایوں تلے میری محبت دفن ہے۔"

کشتی ساحل سے آ لگی۔

اختر اورینوی

نام	:	اختر
قلمی نام	:	اختر اورینوی / ڈاکٹر اختر اورینوی
پیدائش	:	۱۴ اگست ۱۹۱۰ء بہ مقام قصبہ کاکو ضلع گیا، بھارت
وفات	:	۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء
تعلیم	:	ایم۔اے (اردو) ڈی۔لٹ۔

ابتدائی درس والدہ ماجدہ سے حاصل کیا۔ قرآن شریف مع ترجمہ، اردو، فارسی اور انگریزی وغیرہ کی تعلیم والد بزرگوں اور چچا جان سے حاصل کی۔ مونگیر ضلع اسکول سے ۱۹۲۶ء میں میٹریکولیشن فرسٹ ڈویژن سے پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۹۲۸ء میں آئی ایس سی سائنس کالج پٹنہ سے سکنڈ ڈویژن میں پاس کر کے وظیفہ یاب ہوئے۔ اس کے بعد ایم بی بی ایس کے پہلے سال میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۹ء میں اس کو پاس کر کے ایم بی بی ایس کے دوسرے سال میں آئے۔ علیل ہوئے اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک علالت کے سلسلے میں میں اورین میں ہی مقیم رہے۔ صحت یاب ہوئے تو پٹنہ کالج میں بی اے آنرز انگریزی کے ساتھ داخل ہوئے اور ۱۹۳۴ء میں شاندار کامیابی حاصل کر کے گولڈ میڈل لیا۔ ۱۹۳۶ء میں ایم اے (اردو) فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

حالات زندگی:

نقوی زیدی جا جنیری (سادات) خاندان کے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ سید احمد صوبہ بہار کے اولین فاتح اختیار الدین بن محمد بختیار خلجی کے لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے۔ پیشہ آباء سپہ گری تھا۔ سید وزارت حسین کے ہاں، کٹر قادیانی مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی مذہبی اور علمی ماحول ملا، جس کے اثرات آخری عمر تک رہے۔ قرآن حکیم کی سورتوں کی تفسیریں اور "الفضل" قادیان میں شائع ہونے والے مضامین ڈاکٹر اختر اورینوی کے مذہبی نکتہ نظر کے عکاس ہیں۔ ۲۵ مئی ۱۹۳۳ء کو قصبہ ارول ضلع گیا میں معروف افسانہ نگار خاتون شکیلہ اختر سے شادی ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں ٹی۔ بی کے مرض میں مبتلا ہو کر ڈیڑھ برس انکی سینا ٹوریم میں گزارا۔ ۱۹۳۸ء میں پٹنہ کالج سے بطور لیکچرر شعبہ اردو منسلک ہوئے۔ ساری زندگی درس و تدریس سے متعلق رہے۔ ۱۹۵۲ء میں پٹنہ یونی ورسٹی کے صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا کے انگریزی رسالہ "ہندوستان ریویو" پٹنہ میں ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۶ء کے تمام تبصرے اختر اورینوی نے لکھے۔ ۱۹۴۰ تا ۱۹۴۷ء "معاصر" پٹنہ کے اداریے لکھے۔ ادبی، سماجی، مذہبی اور قومی موضوعات پر ریڈیو کے لیے سینکڑوں تقاریر لکھیں۔ تا دم مرگ لاولد رہے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"بدگمانی" مطبوعہ: "شمیم" پٹنہ: ۱۹۳۱ء

اسی زمانے میں یہ افسانہ "بہارستان" پٹنہ میں بھی شائع ہوا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "شہنشاہ حبشہ" (ڈراما) — مکتبہ اردو، لاہور — طبع اول: ۱۹۳۸ء

۲۔ "منظر و پس منظر" (افسانے) — ناشر: مکتبہ اردو، لاہور — ۱۹۴۰ء

۳۔ "کلیاں اور کانٹے" (افسانے) — ناشر: مکتبہ اردو، لاہور — ۱۹۴۱ء

۴۔ "انار کلی اور بھول بھلیاں" (افسانے) — ناشر: اقبال بکڈپو، پٹنہ — ۱۹۴۴ء

۵۔ "سیمنٹ اور ڈائنا میٹ" (افسانے) — ناشر: ضلع شاہ آباد سے — ۱۹۴۷ء

۶۔ "کچلیاں اور بال جبریل" (افسانے) — ناشر: ساتھی بکڈپو، پٹنہ — ۱۹۶۰ء

۷۔ "حسرت تعمیر" (ناول) — ناشر: فروغ اردو، لکھنؤ — ۱۹۶۱ء

۸۔ "قدر و نظر" (تنقید) — ناشر: فروغ اردو، لکھنؤ — ۱۹۵۶ء

۹۔ "تحقیق و تنقید جدید" — ناشر: کتابستان، الہ آباد — ۱۹۶۳ء

۱۰۔ "کسوٹی۔" (تنقید) — ناشر: رام نرائن، الہ آباد — ۱۹۶۳ء

۱۱۔ "مطالعہ اقبال" (کتابچے) — ناشر: موتی لال بناری داس — ۱۹۶۰ء

۱۲۔ "مطالعہ نظیر" (کتابچے) — ناشر: موتی لال بناری داس — ۱۹۶۲ء

۱۳۔ "سراج و منہاج۔" (تنقید) — : موتی لال بناری داس — ۱۹۶۴ء

۱۴۔ "بہار میں اردو ادب کا ارتقاء ۱۹۵۸ء تک" — ناشر: بذات خود — ۱۹۵۶ء

۱۵۔ "انجمن آرزو۔" (شاعری) — ناشر: سنگم کتاب گھر، دہلی — ۱۹۶۴ء

۱۶۔ "زوال کیشن" (ایکانکی ڈراما)

۱۷۔ "کارواں" (ناول)

۱۸۔ "سپنوں کے دیس میں" (افسانے)

۱۹۔ "اختر اورینوی کے افسانے" — مرتبہ ڈاکٹر عبدالمغنی، بہار اکیڈمی، پٹنہ — طبع اول: ۱۹۷۷ء

یہ کتاب ۱۵ افسانوں کا انتخاب ۲۷۸ صفحات پر پیش کرتی ہے۔

۲۰۔ "ایک کاروباری" (افسانہ) — مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن

غیر مدون:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ شاعری کا ایک مجموعہ، ریڈیائی مضامین کے دو ضخیم مجموعے اور لا تعداد تنقیدی مضامین یادگار چھوڑے ہیں۔

نظریہ فن:

"میرے کئی شائع شدہ افسانے ایسے ہیں جن میں خود میں بھی چھپا بیٹھا ہوں' اور میرے دوستوں کے نزدیک میں نے ان افسانوں میں خود اپنی رسوائی کی ہے...... میرے دماغ و دل اور میری شخصیت کی تعمیر میں چند چیزوں نے بہت حصہ لیا ہے۔ احمدیت' اقبال کی شاعری' نیاز کی فسانہ نگاری' سائنس کا مطالعہ' گھر کی فضا' اشتراکیت کا تفصیلی مطالعہ اور میری مسلسل علالت۔"

اختر اورینوی
(بحوالہ: "میرا بہترین افسانہ" مرتبہ: محمد حسن عسکری)

کلیاں اور کانٹے

وہ تعداد میں نو تھیں ۔ گوری ' سانولی ' گوارا اور ناگوار ' بعض ان میں دلکش کہی جا سکتی تھیں مگر خوبصورت کوئی نہیں ۔ سورج اسی طرف سے طلوع ہوتا تھا جس طرف سے وہ اپنی سفید ساریوں میں ملبوس طیور صبح کے چہچہوں کے ساتھ بانس اور ڈورینڈا کی جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلتی دکھائی دیتی تھیں ۔ ہر صبح آٹھ ادھر آتی تھیں اور ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح مشرقی افق کی طرف سفر کر جاتی تھی ۔ درجہ اول کے کوارٹرز ' صحت گاہ کے عام وارڈوں سے تقریباً تین فرلانگ پورب کی جانب تھے ۔ ان میں اسے کسی ایک کی ڈیوٹی اسی طرف ہوتی تھی اور ڈیوٹیاں بدلتی رہتی تھیں ۔ ہر پندرہ روز ۔ عام وارڈ کے بھی دو درجے تھے ' دوم و سوم ۔ درجہ اول کے کوارٹرز تو خاصے بنگلے تھے ' ان کی اپنی شخصیت تھی ۔ وہ اسپتال نہیں گھر معلوم ہوتے تھے ۔ ساٹھ روپے ماہوار ان کا کرایہ تھا ۔ درجہ دوم کے چالیس روپے ماہانہ تھے ۔ ایک مریض کو دو کوٹھریاں مل جاتی تھیں ۔ ایک اپنے لئے ایک تیمار دار کے لئے ۔ تیسرے درجے کے معنی تھے ایک وسیع سا لانبا چوڑا کمرہ ۔ ایک کمرے میں آٹھ پلنگ ہوتے تھے اور جب حیات کے لعب و لہو کی رفتار میں زیادہ تیزی ہو جاتی تو سل و دق کے جراثیم کے چند اور شکار آ جاتے تھے اور کمرے کی آبادی بارہ تیرہ تک پہنچ جاتی تھی ۔ درجہ سوم کا کرایہ پچیس روپے ماہوار تھا ۔ زندگی ' موت اور زندگی ۔ موت کے درمیان بھی انسانیت درجوں میں بٹی ہوئی ہے۔ گھر ' اسپتال اور قبرستان ' ہر جگہ نمبر ایک ' نمبر دو اور نمبر تین کی تفریق ہوتی ہے ۔ کالوں کا قبرستان ' گوروں کا قبرستان ' شرفاء کے مدفن اور غریبوں کے گورستان ۔ ہر شہر ' ہر قصبے اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں ۔ " صحت گاہ " اسی کرہ پر قائم تھا اور اسی کے بھلے برے قانون کا پابند۔

ہم ان دنوں دس تھے ۔ " صحت گاہ " کے انتہائی جنوبی طرف تیسرے درجے کے وارڈ میں ' یہاں سے نرس کوارٹر سامنے نظر آتا تھا ۔ لوہے کے پلنگ پر پڑے ہوئے مریض درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان نرسوں کی اقامت گاہ کو اس طرح دیکھتے تھے جیسے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے مزدوروں کے ترسے ہوئے بچے پرستانی دوکانوں میں شیشے کی الماریوں کے اندر کھلونے دیکھتے ہیں ۔ وہ نو نرسیں ہم سے شناسا تھیں ۔ ان میں سے ہر ایک کی ڈیوٹی ہم لوگوں کے وارڈ میں کبھی نہ کبھی رہ چکی تھی ۔ اس کے علاوہ گاہے گاہے کی پارٹیوں اور پک نکوں میں ہم لوگوں کا ساتھ رہتا تھا۔ ہم سب نرسوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ہمیں۔ ہماری گفتگو کا اکثر حصہ انہی سے متعلق ہوتا تھا۔ ان کی تعریف ' ان کی برائیاں ' ان کے ناز ' ان کی سازشیں ' ان کی محبت و نفرت۔ ہم رومان سے تھک کر ٹھیٹھ حقیقت طرازی پر اتر آئے تھے۔ ہمارے گرسنہ جذبات رومانی بیانات کے شربت کو برداشت کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ ہمیں مصالحہ دار چٹپٹی چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہم میں سے اکثر افراد ایک سال اس وارڈ میں گزار چکے تھے اور چند ایسے بھی تھے جن کے تین سال ختم ہو گئے تھے۔ امید و ناامیدی کے تین سال ' ارمانوں اور محرومیوں کے تین طویل سال۔ ایک دو نو وارد تھے۔ یہ نو گرفتار سہمے سہمے ' سنجیدہ ' اثمل ' متردد ' بے بس اور ملتجی سے نظر آتے تھے۔ چند ہفتوں میں یہ بھڑک عموماً دور ہو جاتی تھی اور نئے بہت جلد پرانے بن جاتے تھے لیکن ایک دو پرانے بھی ایسے تھے جن کی مستقل مایوسی اور گھبراہٹ کبھی دور نہ ہوتی۔ بہرکیف موت اور بیماری کے درمیان بھی وارڈ کی مجموعی فضا خوشگوار تھی۔ استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ وقتوں میں ہم لوگ کھیلتے تھے ' ہنستے تھے ' جملہ بازیاں ہوتی تھیں ' قہقہے لگتے تھے ' نرسوں سے لگاوٹ ہوتی تھی ' اصلی اور نقلی آہیں کھینچی جاتی تھیں ' سرگوشیاں ہوتی تھیں اور رازداریاں بھی۔ ہم دسوں کا ایک خاندان تھا ' ایک مذہب۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ رنجیدہ۔ وارڈ میں بوڑھے بھی تھے اور

جوان بھی ' پر سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ کم از کم ایسا نظر آتا تھا۔ ہاں استراحت کے گھنٹوں میں ہماری اجتماعیت ٹوٹ کر بکھر جاتی تھی اور ہم میں سے ہر ایک اپنی دنیا بساتا تھا اور ویران کرتا رہتا تھا۔ رات کے آرام کے علاوہ دن بھر میں تین استراحت کے وقفے ہوتے تھے۔ باضابطہ طور پر نرسیں گھنٹی بجا کر مریضوں کو بار بستر ہو جانے پر مجبور کرتی تھیں۔ یہ بھی ایک علاج تھا' نیند اور گفتگو ممنوع' زندہ لاش کی طرح پڑے رہئے' جہاں تک ممکن ہو کم سے کم کروٹ لیجئے اور کچھ مت سوچئے' فکر و تردد ایسے مریض کے لئے مہلک ہے۔

"سوچا مت کیجئے۔ اچھے! ہاں ------- ں!"

نرسیں بڑے پیار سے کہتیں 'مگر بھلا کوئی کیسے نہ سوچے؟ ہم اکیلے پلنگ پر پڑے پڑے سوچتے رہتے تھے۔ زندگی کا سوچ 'موت کا سوچ ' سل کا سوچ ' دق کا سوچ ' آرزوؤں کی لاش ' ماضی کا ماتم ' مستقبل کا روگ اور سب سے بڑھ کر روح کی وہ مہیب کپکپی جو مادہ کے سہارے سے علیحدگی کے محض تصور سے ہی طاری ہو جاتی ہے۔ جسم! محسوس ' ٹھوس ' تپاں ' محرک ' خود نگر ' خوبصورت اور حقیقت کا اچانک سرد اور بے حس ہو جانا ' احساس و ادراک جھنجھنانے لگتے ہیں۔ فرد کے وجود کا نا معلوم ' تاریک ' بے پایاں ' لامکاں ' بے زماں وسعتوں میں تحلیل ہو کے فنا ہو جانا ' سوچنے والے دماغ ' دھڑکتے ہوئے دل ' تیرتے ہوئے خون کا تعطل اور لاعلمی کا لرزہ خیز ناقابل تصور پھیلاؤ۔ یہ کائنات کا سب سے الم ناک سانحہ ہے۔ ہم صحت گاہ کی خاموشیوں میں پھیلتے ہوئے لحات کو سرکی 'کھنچی ' ڈوبتی ہوئی زندگی کے انجام کو سوچ کر لرز اٹھتے تھے۔ ہم خیالات کے بوجھ کو فضا میں پھینک کر اپنی قمیصوں کے بٹن یا پلنگ کی پٹی کو پکڑ لیتے تھے تاکہ معلوم اور شناسا چیزوں کی ہستی کا ٹیک مل جائے۔ ہم گاہ ٹماٹر کے دام اور پتی کوٹ کے حاشیے کو تخیل سے چھو کر درد زندگی کی اذیتوں سے پناہ لیتے تھے اور کبھی بے خواب راتوں کی نیند کا کاجل گھول کر احساس کو افیون دینے کی کوشش کرتے۔ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح بوٹے نڈھال ہونے لگتے تو ---

"اوہ -------رے ------- ے! بڑے صاحب سے کہہ دوں گی ' یہ تو سونے لگے ہیں۔"

کی آواز سنائی دیتی اور گاہے گاہے گال یا پیشانی پر ایک آشنا سی چپت۔ یہ نجات دہندہ آواز میرے سر سے بوجھ اتار دیتی تھی۔ ہماری آنکھیں مسکراتی ہوئی کھل جاتیں۔

"میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا مس صاحب۔ سوتا کون ہے؟" "آئیے آپ بھی سو جائیے۔" یہ جواب ملتا۔ پھر کئی تسکین دہ رد عمل۔

وہ روز طلوع آفتاب کے بعد کرنوں کی طرح وارڈ میں آتی دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے نسائی آوازوں کے گھنگھرو بولنے لگتے تھے۔ ہم چوکنا ہو کر اس طرف دیکھتے۔ صحت گاہ کی ویرانیوں میں روزانہ کا واقعہ بھی کافی اہمیت رکھتا تھا۔ سفید ساریاں سبز جھاڑیوں سے نکلتیں جیسے بیلے کے پھول کو نزمی کے اخضرین پردے سے نکلتے ہیں۔ ہلکوں کا پرا قریب تر ہوتا ہوتا جاتا اور آوازیں زیادہ واضح۔

پھلجڑی چھوٹتی اور دو پھول ہم لوگوں کے وارڈ میں آ گرتے۔ ہم دسوں مریض انھیں اپنے دامن نظارہ میں لے لیتے۔

جب کسی نرس کی ڈیوٹی درجہ اول کے کوارٹر سے اس وارڈ میں بدلتی تو عموماً وہی ہوتا کہ بجا یا بے جا طور پر کردہ و ناکردہ غلطیوں پر ہم لوگوں کی سرزنش یوں کی جاتی:

"میں "اے" وارڈ میں بھلی تھی۔ کیسے اچھے مریض ہیں اے وارڈ کے "سی" وارڈ کے مریض تو جان کھا جاتے ہیں۔"

"کیسے اچھے ہیں اے وارڈ والے! اپنے نوکروں سے کام کرا لیتے ہیں بے چارے اور یہ لوگ تو جوتے سیدھے کرواتے ہیں جیسے میں ان کی لگائی ہوں --" "اور کبھی زیادہ دلدوز:

"گھر میں کرتے ہوں یہ ٹھاٹھ۔ شان دکھلانے آئے ہیں۔" "اے" وارڈ میں نواب صاحب اپنا منھ تک میلا نہیں کرتے تھے۔"

ہم دسوں مریض مختلف زاویوں سے درجہ اول کے کوارٹر کو معاندانہ دیکھنے لگتے اور کوارٹر کی سرخ اینٹیں طنزیہ ہنسی ہنستی نظر آتیں۔ معمر نواب صاحب کی موٹر ' ان کا جوان لڑکا منصف صاحب دھن راج جی کے بھائی کی توند اور شوخ چھوٹی چھوٹی آنکھیں صوبے کے صدر اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا گورا چٹا ' چالاک وفتنہ کار نور نظر ' بیمار وتیمار وار غرض درجہ اول کی ساری مخلوق سل کے کیڑوں کی طرح محسوس ہوتی ' جو

ہمارے پھیپھڑوں کو چھلنی کر رہی ہے۔ ہم ان سب کو اپنے اندر سے نکال کر تھوک دینا چاہتے تھے۔ تھوک دانی کے کاربالک ایسڈ میں فنا ہونے کے لئے۔

اس روز سینے کے گھاؤ زیادہ خلش پیدا کرتے اور ہم میں سے کئی نرس ستمگار کے جسم کا جغرافیہ بیان کر کے دل کی بھڑاس اور چھپے ہوئے جنسی ارمان نکالتے تھے۔

ہمارے دلوں میں بھی چور تھا اور ان کے دلوں میں بھی۔ ہمارے اندر کوئی ٹیڑھی سیدھی رگ ضرور ایسی تھی جو نرسوں کو ذلیل سمجھنے پر اکساتی رہتی تھی اور نرسیں بھی ہر وقت اپنی شخصیت اور پندار کے تحفظ کے لئے تیار رہتی تھیں۔ ان کے تجربے رنگ رنگ کے تھے ماضی کے نہاں خانے میں سینکڑوں مریض بیسیوں ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر چھپے ہوئے تھے۔ نرسوں کے دلوں سے ہو کر ایک تار گزرتا تھا جو ان مریضوں اور ڈاکٹروں کو گوندھتے ہوئے ہمیں بھی پروتا چلا جاتا تھا۔

تیسرے درجے میں خلوت کا سکون اور مواقع نہ تھے لیکن اجتماع کا تنوع' ہمدردی اور رونق تھی۔ "اے" وارڈ کے علاوہ "اپر سی" وارڈ اور "لوئر سی" وارڈ کے درمیان بھی رقابتیں تھیں مگر یہ دوسری رقابت ولولہ انگیز اور عمل پرور تھی۔ یہ اپر اور لوئر محض زمین کے نشیب و فراز کا فرق تھا۔ پہاڑی علاقوں میں زمین کا اونچ نیچ بہت ہی نظر نواز ہوتا ہے۔ دونوں سی وارڈ تیسرے درجے کے وارڈ تھے۔ دونوں کا اعتبار اور امکانات برابر تھے۔ لیکن ہمارے وارڈ کا ایکہ ساری "صحت گاہ" میں مشہور تھا۔ ہماری لاگ اور لگاؤ بس سمجھئے متحدہ ہی تھی۔

وارڈ کے انتہائی داہنی طرف اٹھارہ سال کے ایک گورے نازک سے لڑکے کا بڈ تھا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں "اے پی" دی جاتی تھی۔ یہ اس صحت گاہ کا معجزہ تھا اور مثالی نمونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مدراسی ڈاکٹر نے اسے حیرت انگیز طور پر سل کے پنجوں سے چھینا تھا۔ اسے بہت زیادہ آرام کرنے کی ہدایت تھی۔ پھر بھی وہ وارڈ کی دلچسپیوں میں کافی حصہ لیتا تھا۔ وہ نرسوں کا کھلونا تھا "ننھا گوپال" گوپال پندرھویں سال میں سینی ٹوریم آیا تھا۔ اس کے ایک جانب ایک مارواڑی تھا۔ بہت ہی موٹا تازہ۔ تین من اس کا وزن تھا۔ پر یہ غریب ساڑھے تین سال صحت گاہ میں رہ کر بغیر شفایاب ہوئے چلا گیا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں بڑے بڑے غار تھے۔ اس کے بڈ پر ایک مارواڑی ہی آیا۔ یہ اتنا دبلا تھا کہ ہم لوگ اسے منگی رام کا بھوت کہتے تھے۔ تیسری ہستی ایک سیاہ رنگ کے مریض کی تھی جو حیاتین کے جنون میں صرف ایک سیر ٹماٹر دن بھر میں کھا جایا کرتا تھا۔ وہ کم سخن مگر زندہ دل تھا۔ یہ حضرت مرمر کے بچے تھے۔ شاید ان کی صحت دیکھ کر ملک الموت بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ چوتھا خود میں تھا۔ صحت گاہ میں اپنی شادی کے سوٹ پہن پہن کر حسرت نکالنے والا۔ میرا دوسرا ہمسایہ نقی تھا۔ ایک طرف بھائی حاذق کی سیاہ فامی اور دوسری جانب نقی کا کافوری رنگ۔ ہم تینوں مل کر اس اشتہار کی تصویریں بن جاتے تھے جس کے نیچے لکھا رہتا ہے۔ "اب کالا کوئی نہیں رہے گا۔" نقی' حسین تھا اور بے حد جوان معلوم ہوتا تھا۔ شوخ' چونچال' بیباک اور ہنس مکھ۔ اس کی آمد سے لوئر سی وارڈ کا پلہ گراں ہو گیا تھا۔ پہلے اپر سی وارڈ میں گھوش' نرسوں کا مرکز ثقل تھا مگر اب ڈیوٹی ختم ہوتے ہی ساری نرسیں اپنے کوارٹر جاتے ہوئے لوئر سی میں چلی جاتی تھیں۔ گھڑی دو گھڑی کے لئے کھانے کی میز کے گرد بڑی دل نواز فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ چہل سالہ وکیل صاحب کے چست فقرے نرسوں کو بہت بھاتے تھے دوسرے وارڈ میں دو وکیل صاحبان تھے۔ ایک داڑھی رکھتے اور نقلیں کرتے تھے' دوسرے پیشانی پر چندن کا ٹیکہ لگاتے اور نرسوں سے فحش مذاق کرتے تھے۔ جونیئر وکیل صاحب کی تابناک پیشانی پر عبیر کی سرخ بیندی نرسوں کے لئے سرمایہ تفریح تھی۔ ان دونوں بزرگوں کی تکنیک ایک سی تھی۔ یہ پہلے بیوقوف بن کر اور جھلے سے کر اپنا حق جما لیتے تھے اور پھر معصومانہ انداز میں مذاق کا جواب دیتے تھے۔ ان دونوں کا نشانہ بے خطا تھا مگر ایک کی فطرت میں ایمائی طنز زیادہ تھا اور دوسرے میں واقفیت نمایاں۔

نقی کے بائیں پہلو میں ایک نوجوان مصری تھے۔ گورا رنگ' جس پر سرخی کی چھوٹ تھی۔ مصری بہت جذباتی اور رقیق القلب تھے۔ جسمانی طور پر یہ جو بھی رہے ہوں مگر ذہنی طور پر یہ بالکل کنوارے تھے۔ اچھوت کنیا کی طرح۔ مجھے' نقی اور مصری کو ایک پھیپھڑے میں "اے پی" دی جاتی تھی۔ مصری کہنہ مریض تھے۔ "اے پی" کا کورس ختم ہو چکا تھا۔ ان کے مریض پھیپھڑے کو "فرینک نرو" کی جراحت کے

ذریعہ معطل کر دیا گیا تھا۔ میں اور مصری میڈیکل کالج کے طالب علم رہ چکے تھے۔

نویں صاحب ایک اڑتالیس سال کے دیسی عیسائی تھے۔ یہ نہایت ہی سعادت مند قسم کے مریض تھے۔ استراحت کے گھٹنوں کے اندر اور اس کے بعد بھی وہ قطعی طور پر لکڑی کے تختے کی طرح چت لیٹے یسوع مسیح سے لو لگائے رہتے تھے۔ کوئی جنبش نہیں' کسی قسم کے آثار حیات نہیں۔ وہ جب ضرورتاً چلنے پھرنے پر مجبور ہو جاتے تھے تو یوں چلتے تھے کہ "زیر قدمت ہزار جان است" اصولاً وہ اپنے سل زدہ پھیپھڑوں کو کم سے کم حرکت اور زیادہ سے زیادہ آرام دینا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک گفتگو بھی زیان حیات تھی۔ ہر وقت' ہر روز' ہر سال یونہی زندگی گزارتے تھے جیسے سسرال میں نئی دلہن۔ "صحت گاہ" میں انھیں ڈھائی سال ہو چکے تھے۔

دسویں ہستی ایک بنگالی مسلمان لڑکے کی تھی۔ سولہ سترہ سال اس کی عمر ہو گی۔ موٹا گول مٹول سا' گردن ندارد۔ لڑکا غلام ربانی بھی پربھو بابو کا مرید تھا۔ کم سخن و کم آواز مگر بسیار خوار اور بسیار خراب۔ اسے ہم لوگ "مرغ" کہتے تھے اور پربھو بابو کو "پطرس ولی"۔ "مرغ" وضو کے علاوہ غسل بھی "بناتا" تھا۔

یہ دسوں مختلف طبائع کے لوگ ایک انوکھی ہمدردی کے ذریعہ ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ تھے۔ نرسوں سے مذاق کے وقت "پطرس ولی" بھی ایک دو مسکراہٹیں ضرور ارزاں کر دیا کرتے تھے۔ ویسے بھی وہ ہمارے رومانوں سے کافی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ کیتھرین اور ایشری کی آواز سنتے ہی "مرغ" بھی بانگ دینے لگتا تھا۔

یہ دو نرسیں جان سینا نوریم تھیں۔ ایشری بیس سال کی صندلی رنگ' دراز قد' چھوٹی مگر مسکراتی ہوئی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ چلتی تھی جیسے "اسپ تازی قدم" چلتا ہے۔ وہ اس کی گردن اور سینے کا "کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق" قسم کا خم! ایشری' ملنسار' دلنواز اور مجسم سپردگی تھی۔ وہ نسیم خوش خرام کی مثال آزاد و ہمہ گیر تھی۔ ایشری کیتھرین کو کٹو بوا کہتی تھی۔ کیتھرین پچیس سالہ بھرپور جوان عورت تھی۔ سانولا رنگ' جراحات جفا پر نمک ریز' اس کے پھیلے اور گداز کولھے' اس کی گول کمر' اس کی مثالی ہندی چال' مست ہاتھی کی طرح۔ وہ یوں افق نظر میں داخل ہوتی تھی جیسے سمندری سفر کے بعد جہاز ہچکولے کھاتا ہوا ساحل کی طرف آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بھاری کولھوں کے محور پر بالائی جسم چلتے وقت جھوم سا جاتا تھا جیسے پھل دار شاخ موٹے تنے پر لچک سی جائے' پھر اس کے کولھے پیش و پس ڈگمگا کے متانت سے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ وہ داہنے ہاتھ سے ہلکا سا اشارہ کر کے ساری کے پلو میں تناؤ پیدا کرتی اور چھوڑ دیتی تھی۔ آنچل کی پلٹن میں اس کے سینے ابھر آتے تھے اور پلو لہرانے لگتا تھا۔ کیتھرین عموماً متین سی رہتی تھی مگر اچانک طور پر وہ شوخ و سحر کار بن جاتی تھی اور پھر سنجیدہ۔ بجلی کا چنچل پن اور امنڈتے ہوئے کالے موج در موج بادل کی گمبھیرتا' یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کو نمایاں کر کے قاتل تر بناتی تھیں۔ اس کی فطرت میں بحرالکاہل کی گہرائی تھی۔

ان دو کے علاوہ سات اور تھیں۔ ایک جوڑا تھا' مارتھا اور لیسی۔ مارتھا مردانہ وار لانبی چپٹی سی عورت تھی' بلسوڑ اور بے جھجک۔ لیسی اس کے زیر حکومت تھی۔ نرس کوارٹر کے ایک ہی کمرے میں دونوں رہتی تھیں۔ وہاں دو پلنگ کے کمرے تھے۔ "لیسی تو فلاں مریض سے گھل مل کر کیوں ملی؟ فلاں نے تجھ سے چھیڑ چھاڑ کیوں کی؟" اس جوڑے کے "نصف بہتر" حصے پر ہر وقت پہرہ تھا۔ مارتھا' ہاں مصری سے خوش تھی۔ شرمیلے اچھوت کنیا سے مصری۔

ایک جوڑا تھا دو چچا زاد بہنوں کا۔ سلوی اور فلورنس۔ دونوں گوری گوری' گداز گداز' مائل بہ فربہی عورتیں' مگر لڑکیاں کہی جانے پر مصر۔ سلوی اخلاقاً یا ضرورتاً لڑکی کہی اور سمجھی جا سکتی تھی لیکن فلورنس تو بہت ہی بلند اخلاقی اور اشد ضرورت کے باوجود عورت سے لڑکی نہیں بن سکتی تھی۔

میگی اور ولاری کالی کالی چپٹی ناکوں والی نرسیں تھیں۔ خوش اخلاق' کرم فرما' ہر دل عزیز' ایثار پسند' میگی ادھیڑ عمر کی تھی اور ولاری جوان۔ اس کے چھوٹا ناگپوری سینوں کی سنگینی' ناک کے چپٹے پن کا اس حد تک کفارہ ضرور ادا کر دیتی تھی کہ اس کی پیشانی کے لحاظ سے نظریں

پھسل کر صدر میں ٹھوس سارے کے بل پر تھم جاتی تھیں۔

نویں تھی ڈولی۔ وہ سراپا ڈولی تھی۔ چھوٹا سا کھلونا' شریر آنکھیں مٹکانے اور چیں چیں کرنے والی گڑیا۔ گہرا سانولا رنگ' بوٹا سا قد' باچی آنکھیں' کھلنڈری' بے باک' لڑ پڑنے والی اور لڑ کر ہنس دینے والی۔ یہ سب سے کم عمر تھی۔ اٹھارہ انیس سال کی ہو گی' کبھی تو یہ بد صورت دکھتی تھی اور کبھی گوارا حد تک بھولی۔

"صحت گاہ" ایک ویرانے میں تھی۔ سب سے نزدیک کا گاؤں ڈیڑھ میل پر تھا اور سب سے نزدیک کا شہر اٹھارہ میل پر۔ "صحت گاہ" کی بس اپنی ایک چھوٹی سی دنیا تھی الگ تھلگ۔ دو ڈاکٹر' ایک کمپاؤنڈر' اک ڈریسر' ایک ایکس رے بابو' دو کلرک' نو نرسیں' ایک میٹرن اور سسٹر' آٹھ وارڈ بوائے' چند مہترانیاں اور پچاس کے لگ بھگ سل و دق کے مریض مع اپنے باورچیوں اور چند تیمار داروں کے' وارڈوں کے چاروں طرف باغ' جنگل' اور سرخ سرخ مورم کے بڑے بڑے ٹیلے تھے کچھ دور پر چھوٹی چھوٹی مگر پر شور پہاڑی ندیاں تھیں۔ جاڑوں اور گرمیوں میں یہ ندیاں مریضوں تئے آنسوؤں کے ساتھ خشک ہو جاتی تھیں۔

ایک روز میں اور نقی ایکس رے کے لئے نرس ڈولی کے ساتھ جا رہے تھے۔ ڈولی صبح سے غمگین اور چڑچڑی تھی۔ بڑے صاحب نے اسے ڈانٹا تھا۔ راستے میں اس نے دور سے بڑے صاحب کو دیکھا۔ کہنے لگی:

"بڑا بنتا ہے۔ ایکس رے کرنے کے بہانے ڈارک روم میں خود جو چاہے کر گزرے اور دوسروں سے جلتا ہے۔"

ڈولی نے غصے کی بے خیالی میں یہ جملے ادا کئے۔ ہم لوگوں کی موجودگی کے احساس نے اسے چونکا دیا۔ پردہ داری کے بغیر نہ رومان رہتا ہے نہ کشش' وہ کہہ چلی۔

"نرسیں اگر ایسی ہوتیں تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ خدا باپ ہم لوگوں کو بچا لیتا ہے۔"

بات یہ تھی کہ بڑے صاحب کے جذبہ اجارہ داری کے باوجود نرسوں کی انفرادیت ہمیشہ سرکشی پر تلی رہتی تھی۔ مہینے میں ایک روز نرسوں کو "ڈے آف" ملتا تھا۔ وہ تنہا یا دو تین ٹولی بنا کر شہر چلی جاتی تھیں مگر اجنبی شہر میں دل کی پیاس بجھنا بلاؤز یا پیٹی کوٹ کی لیس خریدنا تو ہے نہیں۔ نرسیں عموماً وہاں سے دل کا بوجھ اٹھائے ہوئے واپس آتیں بلکہ سینما دیکھنے کے بعد آرزوؤں کی خاکستر کے اندر چند چنگاریاں اور سلگ اٹھتیں۔

کواٹر میں دو دو نرسوں کی ٹولیاں تھیں۔ یہ ٹولیاں زیادہ تر زندگی کی ٹھوس حقیقتوں اور مطالبوں پر جانبدارانہ تبصرہ کیا کرتی تھیں۔ فاش صداقتوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تھیں۔ جب سب مل بیٹھتیں تو پھر مریضوں' ڈاکٹروں اور ڈے آف کی باتیں' طعنہ و طنز' چھیڑ چھاڑ اور کبھی جھوم کر گیت

آگے آگے میں چلی اور پیچھے پیچھے سیاں
سروتا کا ہے بھول آئے پیارے نند دیا

اور غزلیں:

اے عشق عطا کر دے وہ کیف کا پیانہ

سیاں تو خیر دور کی بات تھی مگر کیف کے پیانے کی تلاش جاری رہتی۔ ہر نرس کی کئی کئی داستانیں تھیں مگر ان سے ان کی طبیعت کبھی سیر نہ ہوئی۔ جوانی' عورت' بیوی اور ماں' ہمیشہ ان میں جاگتی رہتی تھیں اور نہ جانے کتنے جانے اور ان جانے روپ بدل بدل کر ان کے جزبوں پر چھا جاتی تھیں۔ سطح کے نیچے نا آسودگی اور بیزاری پوشیدہ رہتی تھی۔ ارادی اور غیر ارادی قوتوں نے انھیں زندگی کی اس منزل میں لا ڈالا تھا۔ لطافت مٹی نہ تھی۔ روپوش ہو گئی تھی۔

کچھ عجیب بات معلوم ہو گی مگر ایسا بھی ہوتا تھا کہ نرس نے مریض کے بلغم میں سل کے کیڑوں کے پائے جانے کے باوجود اس کے لئے

اپنے لب و رخسار ارزاں کر دیتے اور یہ مسلول سل کے کیڑوں کو مکمل طور پر اپنے دل و دماغ میں ہضم کر جاتے تھے۔ "مثبت" مریض گھمنا سانپ سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں مگر یہ دیویاں بس گھول کر پی جاتی تھیں۔ کون جانے محبت کے امرت میں ملا کے یا آتش بداماں ہوس کی آگ میں بجھا کر۔ مریض تو جراثیم کو تمنائے حیرت کی رو میں بہا دیتے تھے۔ وہ اتنی بار ٹی۔ بی' ٹی۔ بی۔ کا ورد کرتے تھے کہ ٹی۔ بی۔ بے حقیقت ہو جاتی تھی جیسے ملا کی تسبیح پر گھومتے گھومتے خدا بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ ایک بار بھائی حاذق نے اسپوٹم فلاسک میں سخت کھانسی کے بعد بلغم پھینکتے ہوئے مصرجی سے مسکراتے ہوئے کہا تھا:

"بھائی تم بی بی اور سفے بی (فیسی) دونوں سے لطف اٹھاتے ہو' میں صرف ٹی۔ بی سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔"

میں نے کہا تھا۔ "سیگی بھی تو ہم قافیہ ہے' اپنی غزل کے لئے آپ اسے استعمال کیجئے" بھائی حاذق ہنسنے لگے اور انھیں زور سے تکلیف دہ کھانسی آگئی۔

ہم لوگ کرسمس' عید' ہولی سب تیوہار منایا کرتے تھے اور یوں مریضوں کے علاوہ ذی فراش مریض بھی اپنے دکھ درد کو بھلا کر غم غلط کر لیا کرتے تھے۔ نقی کو صحت گاہ میں آئے ہوئے ساتواں مہینہ تھا اور مجھے پانچواں کہ کرسمس آگیا۔ اس عرصے کے اندر میں اور نقی بہت قریب ہو چکے تھے۔ عورتوں کے وارڈ والیاں ہمیں "سارس کا جوڑا" کہتی تھیں۔ زنانہ وارڈ ہم لوگوں کے وارڈ کے پہلو میں تھا۔ معصوم سے مصرجی وہاں برج یا کیرم کھیلنے کے لئے بلا لئے جاتے تھے۔ مسز شنکر اور مسز اکرام نے ایک دو دفعہ سارس کے جوڑے کو بلوا بھی بھیجا مگر ہم لوگوں نے تاب مقابلہ نہ پا کر بلاوے کو ٹال دیا۔ مگر جب ہم لوگ ڈرامے کھیلتے تھے تو پھر زیور اور کپڑے مانگنے کی تقریب سے جنس لطیف سے ملاقاتیں ہو ہی جایا کرتی تھیں۔ کرسمس کے موقع پر ہم لوگوں نے ڈراما کھیلا۔ نرسوں نے بھی شرکت کی مگر یہ کرسمس نرسوں کے جذبات میں طوفان برپا کرتا ہوا آیا۔

نقی لوئر سی وارڈ میں سب سے زیادہ خوبصورت اور زندہ دل نوجوان تھا۔ اس کی شوخ حسین آنکھیں چشمہ شیریں کی طرح تھیں۔ صنف نازک کے لئے دل کی پیاس بجھانے کا نہایت ہی شاداب ذریعہ۔ ہر نرس نے اس کی لانبی اور گھنی پلکوں کے نخلستان میں پناہ لینی چاہی مگر ایشری کی جراتوں کے سامنے بقیہ سب مقبی زمین کی آرائش بن کر رہ گئیں۔ ہاں ننھی ڈولی اس طرح وابستہ رہی جیسے ہندوستان کے ساتھ لنکا۔ ڈولی گلہری تھی' ہر درخت پر چڑھ کر پھل کترنے والی مگر چوری چوری یہ لے اور وہ بھاگ۔

ایشری بے حد جذباتی تھی۔ اس کے جذبات کی رو میں ماضی' حال اور مستقبل سب بہہ جاتے تھے۔ اس پر محبت کے دورے پڑتے تھے۔ دو تین ماہ سے زیادہ وہ شدت کے ساتھ کسی کو نہیں چاہتی تھی مگر نقی نے اسے رام کر لیا تھا۔ محبت کے دورے کے وقت بھی وہ کسی کے جذباتی مطالبے کو رد نہیں کر سکتی تھی۔ اے وارڈ کے منصف صاحب اس پر مرنے لگے تھے۔ ایشری نے ان کا دل بھی نہیں توڑا اور دل ہی کے لئے وہ انتہائی بخششوں سے کام بھی لے لیا کرتی تھی۔ "مجھ سے کسی کا کڑھنا دیکھا نہیں جاتا نقی اور ایک تم ہو۔"

ایشری نے میرے سامنے ایک بار جھولے کے سائے میں کہا تھا۔

وہ اپنے سارے قصے ہم لوگوں سے کہہ دیتی تھی۔ اس کا کوئی راز نہ تھا۔

کیتھرین، ایشری کی ضد تھی۔ وہ مجسم راز رہنے کی کوشش کرتی۔ تھی اس کی فتوحات پس پردہ ہوا کرتی تھیں۔ اپنے کو وہ نہایت ہی پارسا ثابت کرنا چاہتی تھی مگر نقاب و حجاب کا اتنا گوشہ وہ چٹکیوں سے اڑا دینا ضرور اٹھا دیتی تھی کہ اس کی محبوبیت اور گراں مایہ کی ارمان انگیز طور پر ظاہر ہو جائیں۔ کیتھرین نے بھی نقی کو اپنا شکار بنانا چاہا مگر نقی اس کی آہستہ خرامی اور رازدرانہ انداز کی فطرتاً تاب لا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ محبت میں جری تھا۔ بیباک ایشری کی ذات میں اس کو وہ ٹاپ مل گیا جو جذبات کے کھیل میں ہر رکاوٹ کو گناہ سمجھتا ہے۔

یہ سب کچھ ہو چکا تھا جب میں سینا ٹوریم آیا۔ ایک مہینے کے اندر میں اور نقی مکمل مل گئے تھے۔ ایشری میرے سامنے بھی نقی سے بے تکلف باتیں کرتی تھی۔ مگر کیتھرین نے جب ایک روز میرا بستر درست کرتے ہوئے چپ چاپ اوڑھنے والی چادر کے اندر میرے ہاتھوں میں گلاب

کا پھول دے کر آہستہ سے کہا۔ "ڈارلنگ!" اور میں نے اس سانحہ کا تذکرہ نقی سے کر دیا تو کیتھرین نے مجھ سے شکوے کئے "آپ تو بڑے نا سمجھ ہیں۔ دیکھئے نقی مجھے بھابی کہنے لگا ہے۔ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتی۔ میری بھی تو عزت ہے۔ وہ تو آپ سے۔۔۔۔" کیتھرین نے اپنی سنجیدہ شیریں ' لوچدار آواز میں شکایت کی اور بات کو مکمل کرتے کرتے دانستہ رک کر ہنسنے لگی۔

کرسمس کی تیاریاں خوب ہوئیں۔ ہم مریضوں نے رنگ برنگ کے کاغذوں کے زنجیرے اور جھنڈیاں بنائیں۔ ساری صحت گاہ کی آرائش کی گئی۔ چوبیس دسمبر کو ہر جگہ خوشی تھم تھم کر ابلنے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ نرسیں نو خیز ہرنیوں کی طرح کلیلیں کرتی تھیں۔ اس روز بڑے صاحب نے بھی رقابت اور فرض کی زنجیریں ڈھیلی کر دی تھیں۔ شام کو نرسیں وارڈ میں جھرمٹ بنا کر صرف یہ پیام دینے آئیں کہ وہ لوگ کرسمس کا "نغمۂ شب" گاتی ہوئی صبح کاذب کے وقت ہی وارڈ میں آئیں گی۔ سب لوگ ان کی پذیرائی کے لئے تیار ہیں۔ وہ سب کی سب وردی برطرف کئے حسین و آرزو خیز ساریوں میں لپٹی ' جذبات کے بوجھ سے لڑکھڑاتی فضا میں رقصِ مستانہ کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ایتھری طوفان و سیلاب تھی۔ کیتھرین نے اپنی فطرت کا نقاب الٹ دیا تھا۔ وہ بھی "کرسمس ایو" میں بے محابا تھی اور کون اس شام کو متحرک سپردگی نہ تھا۔ لوئر سی وارڈ میں کہربائی لہر دوڑ گئی۔ معمر وکیل صاحب (جنھیں ہم لوگ پیرِ مغاں کہتے تھے) سے لے کر غلام ربانی تک لوگ تلاطمِ محسوسات میں ڈانواڈول ہو رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ اٹھے نہ تھے لیکن ہمارے جذبات آغوش وا کئے ہوئے تھے۔ اف اسی وارڈ کے ممکنات اور مواقع کتنے محدود تھے ہمارے دل میں اپنی جبینیں اور "اے وارڈ" کی خلوتیں انفرادی شان میں آسودہ کھنک رہی تھیں۔

"نرسیں بڑے صاحب کے یہاں "کرسمس ٹری" بنانے جا رہی ہیں۔ جاگتے رہنا۔۔ ہاں!" ایک لوچ دار آواز فضا میں لہرا کر دلوں میں اتر گئی۔

"اوہ۔۔۔۔۔ رے۔۔۔۔۔ ے! نہیں سو کیسے جائیں گے۔ بوا تم بھی تو جان کے بتی ہو۔ بھلا آج رات نیند ہی کب آئے گی انھیں؟ ذرا مصری کو تو دیکھو۔۔۔"

ایک رہزنِ تمکیں ہوش نے دکھتی ہوئی رگ چھو لی پھر جلوۂ برق فنا قسم کا قہقہہ ترنم بار ہوا اور فیمی کو چھیڑتی ہوئی سب نرسیں یوں چلی گئیں ' جیسے آتشبازی چھوٹ کے رہ گئی ہو۔

وہ رات قیامت خیز تھی۔ نرسوں کے چلے جانے کے بعد ہم سب لوگ یک بیک محزون ہو گئے۔ بیس دسمبر کو گیارہواں مریض ہم لوگوں کے وارڈ میں داخل ہوا۔ بائیس کو وہ بہت ہی درد و کرب کے عالم میں جاں بحق ہو گیا۔ اس کا پھیپھڑا پھٹ گیا تھا۔ ہم دسوں کی نظریں خالی بڈ پر جا کر ہم آغوش ہوئیں۔ خاموش ماتم کی حالت میں پر بیتی آپ بیتی بنی جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک ہم سب ہمدردانہ انداز میں چپ چپ سے رہے۔ ہم اس اندوہ بلا سے پناہ چاہ رہے تھے اور انتقاماً ہم سارے جہاں کی خوشیاں چھین کر اپنے دل میں جمع کر لینے کی تمنا کر رہے تھے۔ "پیرِ مغاں" مغرب کی نماز پڑھنے چلے گئے وہاں سے انھوں نے کچھ سکون مستعار لیا اور سلام پھیرتے ہی آخر سب کی امیدوں کے تذکرے چھیڑ دیئے۔ ہم سب لوگ ٹوٹ کر ان تصورات سے لطف لینے لگے۔ نمبر گیارہ کے جسم کو پھر سے جلا کر ہم نے ذرات فضا میں بکھیر دئے اور اس کی روح خیالات کی انتہائی گہرائیوں میں دفن کر دی۔ اس شام کو ہم نے استراحت کے گھنٹے میں بھی بلند آواز سے گفتگو کی ' بے ہنسی کی ہنسی ہنسے اور نرسوں کا اتنے پہلو اور زاویوں سے تجزیہ کیا کہ ان کے جسم تحلیل ہو کر ان میں سما گئے اور ہم ان میں۔

نصف شب ہی سے نرس کوارٹر بیدار ہو گیا تھا۔ گیتوں اور ہنسیوں کی آوازیں ہماری مضطرب نیندوں کو اور بے کل کر رہی تھیں۔ ابھی رات ہی تھی کہ کرسمس کا حسین "نغمۂ شب" اچانک طور پر لوئر سی وارڈ کے بہت قریب سامعہ نواز ہوا۔ ہم غنودگی اور نیند کے درمیان سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ ہم میں سے اکثر نے جلد جلد اپنے الجھے ہوئے بال درست کر لئے۔ نرسیں ہارمونیم پر کرسمس کرول گاتی ' چہلیں کرتی ' لڑکھڑاتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ آ گئیں ' چیت کی سنکی ہوئی ہواؤں کی طرح ' شباب کی امنگوں کی مثال۔ کچھ دیر کے لئے نغمے رک گئے ' خندۂ بیباک تھم گئے اور فضا سکر و مستی سے لبریز ہو کر چھلکنے لگی۔ ولولہ بداماں خاموشی کا ترنم زندہ سکوت کی ابدی لے آغوشِ وجود میں تھرتھرا

رہی تھی۔ اس کے قبل کہ بڑھ کر کوئی بجلی کا بٹن دبائے بہت سی حسرتیں پوری ہو گئیں، بہت سی آرزوئیں جوان ہوئیں، کئی ارمان پیدا ہوئے اور ان گنت ناکردہ گناہ حسرت کی داد دینے کے لئے دردناک مضحکہ کا سامان بن گئے۔ آج انفعال خود جرأت رندانہ پر تلا ہوا تھا۔ باہر سطح مرتفع پر چلنے والی تیز ہوائیں سرد، بوڑھے خاموش، گہرے نیلے آسمان کے سائے میں الھڑ دوشیزاؤں کی طرح لغزیدہ تھیں۔ پورب کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے تاروں کی چند آوارہ شعاعوں کی مدھم روشنی میں مائل انحطاط فلورنس کو اپنے بہت قریب پایا اور جب کسی نے بھک سے روشنی جلا دی تو میں نے دیکھا کہ ڈولی اور نقی کے درمیان ایک سیکنڈ میں تھوڑی سی دوری پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی کئی قماش بنے اور بکھرے۔ نغمے پھر بلند ہوئے ہارمونیم ایشری بجا رہی تھی اور سالوی نے فادر کرسمس' کا سوانگ بھرا تھا۔ سرخ پاجامہ' سرخ عبا' نیلی اونچی خرطوی ٹوپی اور سفید لانبی داڑھی۔ ہم سب لوگ اسے دیکھ کر بے تحاشا قہقہے لگانے لگے "پیر مغاں" نے بڑھ کر فادر کرسمس' سے معانقہ کیا۔ اس پر ایک اور گونجتا ہوا قہقہہ لگا۔ دالان کے کھلے ہوئے حصے میں ایک حلقہ ڈال دیا گیا۔ رقص و نغمے شروع ہوئے۔ نرسیں اپنا بہترین لباس زیب تن کئے ہوئے مور کی طرح ناچ رہی تھیں۔ باری باری اور گاہ جھومر ڈال کر گا رہی تھیں۔ ان کی بے پناہ سپردگی ہم لوگوں کو مدہوش کر رہی تھی۔ گاتے گاتے ان کے حشر خیز اشارے' ناچتے ناچتے ان کا شانوں پر سر رکھ کر ذرا آسودگی حاصل کر لینا موت اور حیات کی سرحدیں ملا رہا تھا۔ "پیر مغاں" نے ایشری کے گلے سے بندھا ہوا ہارمونیم اتار کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ میں نے اور نقی نے ہارمونیم کو سہارا دیا۔ ہمیں اس گھڑی بھی مجروح پھیپھڑوں پر وزن بڑھانے کی مضرت بھولی نہ تھی۔ معمر وکیل صاحب نے جھوم جھوم کر خوب ولولہ خیز گت بجائے اور رات کی پریاں مجسم غزل الفرلات بنی ہوئی خدائے محبت کے جلووں کے خیر مقدم میں عرض نغمہ اور گذارش رقص پیش کرتی رہیں۔

کرسمس کے بعد حجابات اٹھ گئے تھے۔ صبح کی شرمیلی سرخی بڑے دن کے روز روشن کی تنویر بن گئی۔ ہم مریضوں کے جذبات کی جڑیں' صحت گاہ کی زمین سے زیادہ پیوست ہو گئیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بوڑھے کرسمس نے سینا ٹوریم کی بالائی سطح کھرچ کر مجرمانہ طور پر ایک نئی دنیا بنا دی ہے جس میں اسپتال کی تلخ حقیقتوں کے ساتھ گھریلو فضا کی لطافت اور ہمدردی بھی ہے۔ ہم لوگوں نے "پیر مغاں" کی شادی تفریحاً "فادر کرسمس" سے کر دی جو صبح ہوتے ہی چولا بدل کر "مدر کرسمس" تھی۔ "پیر مغاں" "اے میری گھر میں کے اصول سے میری" وارڈ میں "کہنے لگے۔ ایشری باضابطہ طور پر میری سالی بن گئی۔ اور کیسترن نقی کی "بھابی" تھی۔ اس نوع کی اور بھی کئی رشتہ داریاں قائم ہو گئی تھیں۔ ہم لوگ ان رشتہ داریوں کو یوں استعمال کرتے تھے جیسے لنگڑے بیساکھیاں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے یہ ذہنی سہارے فریب کی بنا پر قائم تھے مگر زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فریب حقیقت سے زیادہ حقیقی بن جاتا ہے۔ ہم لوگ کشتی شکستہ سندباد جہازی یا رابن سن کروسو کی طرح "صحت گاہ" کے صحرائی جزیرے میں بیٹھے سنسار سے الگ تھلگ انتظار کی دبی ہوئی آگ سینوں میں لئے بری بھلی اپنی ایک چھوٹی سی دنیا بنا رہے تھے۔ انسانیت کے دل میں کتنی لا انتہا حسرت تعمیر' بھری ہوئی ہے۔

یوں تو پہلے بھی نرسیں ہم لوگوں کے لئے "ڈے آف" میں شہر سے پھل اور میوے لے آتی تھیں مگر کرسمس کے تحفوں کی رنگینی اور دلآویزی سے ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی پہلے پھل اور میووں نے رومانی لطافتوں کی شکل اختیار کی۔ جذبے کی حدت نے انھیں حریری رومالوں اور عطر و سینٹ میں تبدیل کر دیا۔ حقیقت کی ایک سیال صورت رومان ہے جیسے برف سے پانی اور پانی سے بھاپ بن جاتا ہے مگر کچھ دنوں کے بعد رومان اور سینٹ تاریخ کے چکر میں پڑ کر چینی روٹی اور پڈنگ بن گئے۔ استمرار حیات کے لئے روز مرہ کی واقعیت کا وسیلہ لازمی ہے۔

گوپال بہت خوش تھا۔ اکثر کہتا "نقی بھائی" وارڈ میں بہت جی لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہے کہ میری بیماری اچھی ہو گئی ...... تب بھائی انور ہم جا کر پھر اسکول میں نام لکھا سکیں گے نا؟" اس کی آنکھوں میں زندگی کی آرزوئیں جھلکنے لگتیں۔ وہ ذرا انڈھال ہو کر کہہ چلتا۔ "مگر پوڈنگ اور چینی روٹی اور کٹو بوا کے گیت۔ سیمیت بہت گھبرائے گی یہاں سے جا کے ہے نا؟ پھر ہم سل کے مریضوں سے کون گھل مل کرے گا؟ سانپ سے کون کھیلے گا۔ ایشری بھابی اور کٹو بوا کا پریم کہاں ملے گا؟" نادان اور پر ارمان گوپال پر رقت سی طاری ہو گئی۔

لوئر سی وارڈ کے تعلقات میں اجتماعیت کا رنگ چوکھا تھا۔ پربھو بابو اپنی صوفیت اور گوپال اپنے کومل ارمانوں کے باوجود دوسرے وارڈوں

سے ہم سب لوگ زیادہ رقابت کرتے تھے ۔ وہ سل و دق کے بلاہل میں نسائی لطافتوں کا امرت انڈیل کر سمیت کو گوارا بنانے کے لئے بے چین تھے ۔ پربھو بابو کو اپنے بڑے سے کنبے کی ذمہ داریاں یاد آتی تھیں ۔ یسوع مسیح کی محبت ' برج اور کیرم کے کھیل یا نرسوں کا لوچ جو بھی زخم پر مرہم کا پھاہا رکھ دے جس سے بھی غم غلط ہو جائے ۔ ایک روز گوپال برہم برہم سا شل کہ واپس آیا ۔ اب اسے چند فرلانگ چلنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی اور سیر کے بعد اس کی حرارت کا درجہ بڑھتا نہ تھا ۔ ان دنوں وہ بہت مسرور تھا ۔ اسے امید تھی کہ وہ رفتہ رفتہ اسے بھائی حاذق کی طرح ایک میل سیر کی اجازت مل جائے گی ۔ گوپال کو بیزار اور برہم دیکھ کر مجھے اور نقی کو سخت تعجب ہوا ۔ ہم لوگ بھی دو میل کی سیر کے بعد پلنگ پر لیٹ کر تھرمامیٹر لگا رہے تھے ۔ اس کے بعد فوراً شام کی استراحت کا گھنٹہ شروع ہو گیا ۔ ڈولی کی ڈیوٹی تھی ۔ اس بک بک کرنے والی لڑکی نے ہم لوگوں کو باتیں کرنے نہیں دیں ۔ گوپال کا نازک سا چہرہ تمتما رہا تھا ۔ وہ کچھ کہنے کے لئے بے چین تھا اور ہم لوگ سننے کے لئے مگر قہر مریض برجان مریض ۔ ایک گھنٹہ ہم لوگوں نے عجب الجھن میں گزارا ۔ ٹن ٹن ٹن ٹن ! گھنٹی بجی اور گوپال جھٹ اٹھ کر میرے اور نقی کے پلنگ کے درمیان آ کھڑا ہوا ۔ ہم بھی اٹھ بیٹھے ۔ "کنو بوا آبزرویشن وارڈ میں مندر بابو سے ------ "گوپال رک گیا ۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "مندر بابو نے کنو کے گال میں---- "اب کے اس نے بوا نہیں کہا----- "انور بھائی کیتھرن سے مت بولئے----- "گوپال بہت خفا تھا۔ اس کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈیوٹی سے فراغت ہو گئی تو کیتھرن ہم لوگوں کے وارڈ میں آئی' کچھ شرمائی ہوئی اور خفیف۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی۔

"انور بابو مجھے ٹائی باندھنی نہیں آتی ۔ ڈرامے میں میرا مردانہ پارٹ ہے ۔ میں آپ سے ہی تو ٹائی کا ناٹ بندھواؤں گی ۔ "یہ کہہ کر وہ مسکرائی ' جھجکی اور دزدیدہ نگاہوں سے اس نے گوپال کو بھانپا ۔ کیتھرن نے بھی کار خیر کرتے وقت غالباً گوپال کو دیکھتے دیکھ لیا تھا ۔ یہ جملے آزمائشی تھے جن کے اندر احساس لغزش نے مشتبہ پزیرائی کو امید افزا بنانے کے لئے نوازش اور شیرینی کی آمیزش کر دی تھی ۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا ۔ اس نے کچھ اور چھیڑا تو میں ایک کتاب اٹھا کے پڑھنے لگا ۔ کیتھرن چلی گئی ۔ اس کے اندر نسائی پندار کافی تھا اور پھر راز کو وہ شرمندۂ عریانی کرنا کب گوارا کر سکتی ۔

ہم لوگوں میں بات چیت بند ہو گئی ۔ ایک روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی ۔ ایشری دوسرے وارڈ جاتے ہوئے میرے پاس آئی اور چپ چاپ سے صرف یہ کہہ گئی ۔

"کنو بوا کا آج ڈے آف ہے ۔ وہ شہر نہیں گئیں ۔ اپنے کمرے میں چادر سے منہ لپیٹے رو رہی ہیں ۔ "

ان دنوں ایشری بھی اے وارڈ کے منصف صاحب سے خوب پینگیں بڑھا رہی تھی میں نے اور نقی نے یہ مشورہ کیا کہ کیتھرن اور ایشری ان دونوں لات اور منات کو کشیدگی کا مزا چکھایا جائے ۔ اپنے فیصلے سے ہم نے اہل وارڈ کو مطلع کر دیا ۔ پربھو بابو اور پیر مغاں نے صاد کیا ۔ طے صرف یہ ہوا کہ میں صرف کیتھرن سے مراسم ترک کر دوں اور نقی صرف ایشری سے دوسرے مریض حسب سابق میل جول جاری رکھیں ورنہ وہ نرسیں وارڈ ہی سے گریز کر جائیں گی ۔

یہ چپ چپ ایک ہفتے تک جاری رہی ۔ ایک روز شام کی سیر سے پہلے اسٹور روم سے نقی عجوب سی ہنسی ہنستا ہوا نکلا اور مجھے لے جا کر کہنے لگا "سیلاب کو مضبوط دیوار روک سکتی ہے ۔ مگر سیلاب کو سیلاب بھی کہیں روک پاتا ہے ۔ چلو کشیدگی ہو چلی ۔ "

ایشری کی شخصیت کی طوفان وشی نقی کی شعلہ مزاجی کو پنکھا جھل گئی ۔ میں نے اسے بہت برا بھلا کہا ۔ وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بس اتنا بولا "منصف بھی کیا یاد کرے گا ۔ "

میں نے جواب دیا ۔ "مگر تم ایشری کو اپنا تو نہ کر سکے ۔ "

"تو کیا تم نے چپ رہ کر کیتھرن کو اپنا لیا ؟ " تنک کر بولا اور کامیاب ہنسی ہنسنے لگا ۔ میں نے واقعیت کا نحوس پن اور جذبات پروری کی نامرادی کا زہر پن محسوس کیا ۔ بات یہ ہے کہ گوپال کی رپورٹ میرے احساس کی بالائی سطح سے کافی نیچے اتر گئی تھی ۔ کرسمس نے ہم لوگوں کی

توقعات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا اور توقعات کا قیام شکل نامرادی میں بس بھر دیتا ہے اور میں ذرا مثالی بلندیوں پر اڑ کر غیر معمولی لذت حاصل کرنے کا عادی۔

دو تین روز بعد میں نقی رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وارڈ کے صحن کے ایک گوشے میں یوکلپٹس کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے۔ چاندنی رات تھی مگر ابر کے سفید سفید ٹکڑے چاند کو پیار کرتے ہوئے نیلے آسمان میں تیرتے جاتے تھے۔ بادِ شمال یوں چل رہی تھی جیسے آسودگی کے بعد خیالات ماضی کی رنگین و آباد وسعتوں میں لطفِ پرواز حاصل کرتے ہیں۔ ہم لوگ ذرا سنجیدہ حالات میں ایک دوسرے کے مستقبل کے متعلق ہمدردانہ سوچ بچار کر رہے تھے۔ یک بار ماحول میں کبھی طبیعت بڑی سنجیدہ اور گداز ہو جاتی ہے

اچانک خوشگوار ہنسی کا نغمہ ہوا کے فرش پر رقص کر گیا۔

"پاگلوں کو دیکھو۔" کیتھرن کی لوچ دار آواز عقب سے آئی۔

"پاگلوں سے بھی بڑے پاگل۔ بالکل باؤلے۔ اچھا یہ سارس کا جوڑا کیا کر رہا ہے؟ چاند سے پریم کر رہا ہے۔" یہ ایشری کی شوخ بولی تھی۔

میں نے کہا" آؤ ایشری! تم سے پریم کریں۔"

"واہ میں کیوں آؤں؟ اوہ ------ رے ------ ے! دیکھو نا کٹو بوا تمہیں منانے آئی ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ کیتھرن میرے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو! آج بڑے صاحب نے میرے بازو میں "کولو کیلسم" کا انجکشن دیا ہے۔ چھی! کتنا پھول گیا ہے۔ بہت بے درد ہے انور بابو ------ "اس نے مترحم نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا ------ میں بے گانہ سا بنا رہا۔ وہ کہہ چلی

"ارے ہم نرسوں کی زندگی کیا۔ غیروں کے لئے سب کچھ کرو۔ مگر کبھی کوئی اپنا نہ ہو' اور اپنا ہمارا کون بیٹھا ہوا ہے۔ ننھی تو یتیم ہے نا اور میں ------ میرا ایک بوڑھا باپ اور ایک سوتیلا بھائی ہے۔ ہو بھی جائے تی۔ بی مر جائیں گے تو کون دو آنسو بہانے والا آئے گا۔ بڑے صاحب کہتے تھے کہ کیتھرن کے لنگس بہت کمزور ہیں ------ اسی لئے تو یہ تھوڑی سوئیاں چبھوتے ہیں۔ چل ننھی کوارٹر' ذرا سینک دے اسے۔"

وہ ایشری سے مخاطب ہو کر اٹھنے لگی۔ نقی نے بڑھ کر کیتھرین کا بازو عیادتاً مس کیا۔ اس نے ناز سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا

"جس ڈالی پر میں گھائل پرندے کی طرح گھونسلہ بنانے آئی تھی وہ اکڑی ہوئی ہے تو پھر دوسری شاخ کیوں میری پوچھ کرے؟"

اب بیگانگی جرم تھی۔ تیر ہدف پر لگا۔ پرسش نے سکوت کی مہر توڑی۔ اس روز ہم لوگ کچھ دیر تک اپنی اور نرسوں کی زندگیوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں نے گوپال والی اطلاع سے گریز ہی کرنا چاہا۔ لیکن چلتے چلتے کیتھرن نے ایشری سے کہا:

"سنتی ہے ننھی؟ میں مندر کے حلق میں "منڈلس پینٹ" لگا رہی تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کیا انور بابو سے کہہ دیا۔ بڑا خراب ہے۔ میں تو اسی وقت ڈر ہی گئی تھی۔ یہ مریض بھی عجیب ہوتے ہیں۔ نرسوں کی عزت ان کے نزدیک کوڑی کی بھی نہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانا خوب جانیں

ایشری نے ہنستے ہوئے کہا:

"اتنا جلتے ہیں تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" دونوں ہنستی ہوئی چل دیں۔ بادِ شمال ان کے جانے کے بعد ذری دیر تک ان کی ہنسی کی لہریں ہم تک پہنچاتی رہیں۔

اس واقع کے تیسرے روز "پیر مغاں" صحت گاہ سے چل دیئے۔ وہ صحت یاب ہو چکے تھے۔ ایک سال کے بعد بڑے صاحب نے انہیں پریکٹس کی اجازت دے دی تھی۔ رخصت کے وقت نرس سلوی نے مذاقیہ طور پر رونے کی نقل کی۔ "پیر مغاں" بھی ہنستے ہوئے اپنی "وارڈ فیلن" سے رخصت ہوئے مگر جب وہ ہم لوگوں سے رخصت ہونے لگے تو ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ کتنے درد آگیں اور کتنے تفریحی دن ہم لوگوں نے ساتھ گزارے تھے۔ بڑے وکیل صاحب بڑے زندہ دل شخص تھے اور غمگسار۔ ہفتوں وارڈ سونا سونا سا رہا۔

ہم لوگوں نے چھوٹے وکیل صاحب کو "پیر مغاں" منتخب کیا اور صحت گاہ اپنے زخم و مرہم کے ساتھ اسی طرح چلتا رہا۔ ایک مہینے کے بعد پربھو بابو کو بھی جانے کا پروانہ مل گیا۔ وہ احتیاطاً ابھی سیناٹوریم سے جانا نہیں چاہتے تھے مگر مریضوں کی کثرت ہو رہی تھی اور جگہ محدود۔ ان کو جانا ہی پڑا۔ ہائے اس گرفتار کا آزاد ہونا جس کے بازو ٹوٹے ہوئے ہوں۔ پربھو بابو ساڑھے تین سال کے بعد گھر جاتے ہوئے جھجک محسوس کر رہے تھے۔ جانے پھر وہاں پھیپھڑے کیسے رہیں۔ وہ رخصت کے روز بہت دیر تک بائبل پڑھتے رہے اور روتے رہے۔ سیر کی انھیں اجازت تو تھی لیکن اسٹیشن جاتے ہوئے ان کے پاؤں ڈگمگانے لگتے۔ صحت گاہ میں صرف ایک ہی رکشا تھا۔ وہ صرف ذی فراش مریضوں کو وارڈ سے ایکس رے روم لے جایا کرتا تھا۔ پربھو بابو کی پژمردگی دیکھ کر نرس کو رکشا منگوانا پڑا۔ ان کو صحت گاہ سے اچھے ہو کر جانے کی مسرت تھی مگر اس مسرت کے آنسو کے ساتھ ان جانے مستقبل کا خوف بھی انھیں رلا رہا تھا۔ ایک دفعہ مجروح ہو کر گرفتار ہونے کے بعد وہ فضا میں پرواز کرنے سے ڈرتے تھے۔ ہم لوگ اسٹیشن تک انھیں پہنچانے گئے اور سہارا دے کر گاڑی پر چڑھایا۔ ہم سب لوگوں پر رقت طاری تھی۔ واپس آکر ہم لوگوں نے دیکھا کہ نرس دلاری رہ رہ کر روئے دیتی ہے۔ وہ پربھو بابو کو باپ کی طرح چاہتی تھی۔

ہم لوگوں کے وارڈ کے سبھی پرانے مریض اچھے ہو گئے تھے مگر سیناٹوریم کا اچھا ہونا بہت ہی لچکدار حالت ہے۔ کبھی غم دل کو کھاتا ہے اور کبھی دل غم کو۔ پہلے سل کے کیڑے ہمارے پھیپھڑوں کو کھا رہے تھے۔ اور اب ہمارے پھیپھڑے ان کیڑوں کو کھا رہے ہیں محاذ کا رخ کب پلٹ جائے یہ کابوس ہم لوگوں کے خیالات پر سوار تھا۔ ہم لوگوں نے اس خلش سے نجات پانے کے لئے تواتر کے ساتھ تمثیل و اداکاری کا سلسلہ جاری کیا۔ نرسوں نے اس کھیل میں بھی ہماری بہت مدد کی۔ کیتھرن اور ایشری نے ان دنوں ہم لوگوں پر الطاف و کرم کی بارش کر دی اور دونوں کی سیرت کا ایک خاص پہلو اجاگر ہو کر ہمارے سامنے آیا۔ اس ابتدا تو اس چاندنی رات ہی کو ہو گئی تھی۔ میں نے کیتھرن سے زندگی کے سنجیدہ مسئلوں کے متعلق گفتگو کی طرح ڈالی۔ وہ اپنے ماضی سے بیزار مستقبل کی طرف سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا چاہتی تھی۔ "انور بابو! تیرہ سال کے سن سے میں مشن اسکول میں پڑھنے لگی۔ وہاں کی لڑکیاں نرس بننے کو بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ وہ آزادی کو پسند کرتی تھیں۔ میں نادان تھی۔ میں نے چمک دمک کی طرف رخ کیا۔ بہت برا ہوا انور بابو!" کیتھرن نے ایک بار کہا۔

"آپ نہ ہوتیں تو یہ مریض اچھے کیسے ہوتے؟" میں بولا۔

"تو کیا ہماری اپنی زندگی کوئی نہیں؟ دوسروں کے لئے اچھی ہو، پر دوسرے ہمیں اچھا نہ سمجھیں۔ انور بابو! ہم صرف نرسیں تو نہیں، عورت بھی تو ہیں اور یہ مرد! بس جسم کے بھوکے ہیں۔ سب کچھ ان کے سامنے پیش کر دو، سب کچھ اور ادنیٰ سی عزت بھی نہ دیں۔" کیتھرن بیزاری سے کہہ اٹھتی۔

"سب تو ایسے نہیں ہوتے۔"

"کون! سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں، سب عورتیں ایک جیسی۔ مگر ہماری مٹھاس ہماری زندگیوں کو تلخ کر دیتی ہے اور مٹھاس کے لالچی مرد شہد کی مکھی کی طرح ڈنک مارتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ انور بابو! جب تک صحت ہے کام کرتی ہوں اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ شادی کر لوں گی، کر لوں؟" کیتھرن ہنسنے لگی۔

"ضرور کر لیجئے!"

"کرا دو نا!"

اسے "کرا دیجئے" کہنا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ آپ کہا اور میں نے بھی اسے آپ ہی سے مخاطب کیا۔ اس 'کر دو نا' کی بے تکلفی میں "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" کی حسرت پوشیدہ تھی۔ "ہم سل کے مریض آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟" میں نے یہ ٹھس سا جواب دیا۔

"تم نرسوں کو نہیں سمجھتے انور بابو!" اب کے بھی "تم" تھا۔

کیتھرن بڑی عمیق نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ زندگی اور تقدیر کی گتھیاں پر پیچ و خاردار راستوں کی طرح سامنے آگئیں۔

کیتھرن اس نوع کی درد آشنا بات چیت کی پیاسی تھی لیکن ایشری ان سنجیدہ باتوں کی تاب بھی نہیں لا سکتی تھی۔ جب اس طرح کی باتیں چھڑ جاتیں تو ایشری اکتا جاتی تھی۔ عین اسی وقت وہ ہمارا منہ چڑا دیتی یا پہلو میں چٹکی بھر لیتی۔ وہ صرف گرم جوشی کی قائل تھی حال اس کے لئے سب کچھ تھا۔ اپنی شادکامیوں اور محرومیوں کے ساتھ نتی نے ایک بار ایشری سے کہا:

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

ایشری نے جواب دیا۔

"کتنے مردوں سے شادی کروں؟ سب ہی تو شکنجے میں جکڑ کر اپنی من مانی مرادیں جی بھر کر پوری کرنی چاہتے ہیں۔"

نرس سلوی کو تجسس اور ادھر کی بات ادھر کرنے کی بہت عادت تھی۔ اس نے ایک روز کیتھرن کے سارے پوست کندہ حالات مجھے سنائے اور حال کے لگاؤ سے بھی آگاہ کیا۔ کیتھرن نے آج تک کسی کو کچھ تحفہ نہ دیا تھا۔ وہ صرف لینے کی عادی تھی۔ مندر "گھوش" وہ بڈیوں کی ٹی۔ بی والا ذی فراش مریض ہریش چندر سبھوں کو باری باری اس نے اپنا پروانہ بنایا تھا۔ کلرک 'کمپاؤنڈر' ایکس رے بابو' یہ سبھی اس کے گھائل رہ چکے تھے پر وہ رازداری کی قائل تھی اور داد و ستد کے بعد ایسا کٹ کر جدا ہوتی تھی کہ کسی کو بھنک تک نہ لگے۔ مندر سے اب تک کچھ سلسلہ تھا۔ وہ ایک صاحب ثروت تاجر کا لڑکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ کیتھرن نے اپنا اصول بدل کیسے ڈالا۔ اس نے مجھے بہت سے تحفے دیئے تھے کبھی کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا اور ایشری کا تو یہ عالم تھا کہ نتی پر اپنا سارا مشاہرہ صرف کر سکتی تھی۔ اس نے مختلف اوقات میں اونی سوئٹر' چائے کا طشت' گرم پائتابے' مفلر وغیرہ نتی کو دیئے تھے۔ ایک بار وہ نتی کا سوٹ بنوانے پر مصر تھی مگر نتی نے انکار کر دیا۔ ایشری کئی دنوں تک روٹھی رہی ہے۔ اس نے شکایتاً کہا۔ "آخر نرس میگی سین گپتا کو اپنا نصف مشاہرہ کیسے دے دیتی ہے۔"

ہم لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ تمیں سلہ میگی اور سین گپتا۔ سین گپتا بیس سال کا ایک گورا چٹا بنگالی لڑکا تھا۔ بہت ہی غریب۔ وہ مریض دوستوں کی مدد سے اور نہ جانے کیسے اپنا سینا ٹوریم کا خرچ چلا رہا تھا۔ یہ نیا انکشاف تھا کہ میگی اس کی مدد کرتی ہے۔

میگی کی الفت میں ماں اور بیوی کی محبت کا امتزاج تھا۔ وہ سین گپتا کی مربی بننے میں اپنے مادرانہ جذبات کی تسکین چاہتی تھی۔ نیز حیات کی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ کسی مرد کو اتنا قریب کر لینا چاہتی تھی کہ اسے اپنا سارا 'اپنا جزباتی ٹیک سمجھ سکے۔ ایشری نے بتایا کہ جب نرسیں اسے سین گپتا کے بارے میں چھیڑتی ہیں تو وہ خوش ہوتی ہے۔ شاید اس کی نسائیت تذکرہ التفات ہی سے وجد کرنے لگتی ہے۔ مگر اس کی جنسیت میں عجلت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اس نے سین گپتا کی خواہشوں کو ہمیشہ یوں روکا جیسے ماں بیمار بچے کو کھانے سے روکتی ہے۔ مگر ایشری اور میگی میں آکاش اور پاتال کا فرق تھا۔ ایشری مردوں سے اس طرح برتاؤ کرتی تھی جیسے وہ زندہ ساریاں اور بولتے ہوئے بلاؤز ہیں۔ آج اس کو سینے سے لگا لیا کل اس کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اسے سب ساریاں عزیز تھیں۔ نتی اس کی سب سے پیاری ساری کی طرح تھا۔ میگی گھریلو چکی کی طرح اٹل اور ایک محور کے گرد گھومنے والی تھی۔

مہینہ دو مہینہ پر سینا ٹوریم کا ڈاکٹر نرسوں کا ایکس رے اسکرین بھی کر لیا کرتا تھا۔ نرس ڈولی نے مجھے رازدارانہ طور پر بتایا کہ میگی اور نرس سوشیلا کے پھیپھڑوں میں داغ پائے گئے۔ یہ نئی نرس سوشیلا 'سلوی کی جگہ پر بلائی گئی تھی کیونکہ سلوی نوکری سے استعفیٰ دے کر ایک موٹر ڈرائیور سے شادی کرنے دلی جا رہی تھی۔ نئی نرس دوسری صحت گاہوں میں بھی کام کر چکی تھی اور بیمار پڑ کر عرصے سے گھر پر تھی لیکن مسلسل گھر پر انے گنے لوگ ہی رہ سکتے ہیں۔ اونچے خاندانوں کے لوگ 'بڑے لوگ' خلقت تو بائبل کی بد دعا کی شکار رہتی ہے "تیرے لئے اس زمین پر لعنتیں۔ اپنی زندگی کے سارے دن تجھے غم و اندوہ کے ساتھ غذا ملے گی۔ اپنے چہرے کے پسینے میں شرابور ہو کر تو روٹیاں کھائے گا۔"

سلوی چلی گئی۔ اب پھر وہ نو کی نو تھی۔ سوشیلا کو بھائی حاذق سے دلچسپی ہو چلی تھی۔ دونوں ہم رنگ تھے مگر بھائی حاذق اس سے پناہ مانگتے تھے۔ تاہم ہم لوگوں کی شہ پر سوشیلا کو ایسے مغالطے ہوئے کہ کیا کہنے۔ سوشیلا کے اظہار خلوص کا انداز نرالا تھا۔ وہ اپنے محبوب کو پیٹنے کی عادی تھی۔ بھائی حاذق ٹمپریچر چارٹ پر پٹا کرتے تھے۔ چپت کھاتے تھے کبھی سوشیلا کی چٹکیوں کی مسلن سے بلبلا اٹھتے اور ہم لوگوں کے نام پر صبر

کرتے تھے۔ وہ تو خیریت تھی کہ مریض تھے ورنہ وہ شہید ناز ہو چکے تھے۔ یہ حسن زنگار ترک ستمگار سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔ بھائی حاذق ردبلا کی دعائیں پڑھا کرتے تھے مگر یہ بھوت ان کے سر پر سوار ہی رہا۔ آخر کار وہ خود ہی سینا ٹوریم سے چل دیئے۔ لوئر وارڈ سے صرف وہی شخص تھے جو مسکراتے ہوئے رخصت ہوئے۔ شاید ان کی نگاہیں ہمیشہ اپنی ڈاک خانے کی کلرکی پر جمی رہتی تھیں اور جو تھوڑا بہت وارڈ سے انھیں لگاؤ تھا، وہ سوشیلا کی بے پناہ دلنوازیوں نے ہرن کر دیا تھا۔

بھائی حاذق کے بعد غلام ربانی بھی چلا گیا اور مصری جی بھی۔ مگر مصری جی یوں گئے جیسے کوئی سفر پر جاتا ہو۔ وہ لوگوں سے رخصت بھی ہوئے، نرسوں سے مل مل کر روئے بھی مگر ان کے انداز میں ایک ایسی بات تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فرقت کے دن زیادہ نہیں۔

سیناٹوریم کا ڈاکٹر نسبتاً اچھے مریضوں کو لوئر سی وارڈ میں جگہ دیتا تھا۔ کچھ تو یہ وجہ تھی اور کچھ یہاں کی خوش باشانہ روایات کا اثر کہ ذی فراش مریض ایک دو ماہ میں چلتے پھرتے ہنستے کھیلتے آدمی بن جاتے تھے۔ زندگی سے دلچسپی ضامن حیات ہے۔ ارادہ زیست بقا کا سب سے زبردست سامان ہے بد دل، اکتائے ہوئے فکر مند مریض اپنی قبر خود کھودتے ہیں۔ اپر سی وارڈ کے پنڈت گنیش اور فصیح کی حالت کچھ ایسی خراب نہ تھی لیکن ان میں حیات کی امنگ باقی نہ تھی۔ ان کا ارادہ بقا فکر مندیوں کی آغوش میں سویا ہوا تھا اور اس حسین کرہ کے نیرنگ حیات نہ ان کی نیکیوں کو اکساتے تھے اور بدیوں کو۔ ان کے لئے نہ ثواب میں لذت تھی اور نہ گناہ میں کیف۔ جب خدا اور شیطان دونوں مرجائیں تو پھر موت اور عدم بھی ایک واہی لاشے ہو جاتا ہے۔ زندگی کا پر تو تک کہاں!

وارڈ میں جو نئے مریض بھی آئے سوائے ایک کے سب صحت کی طرف قدم اٹھا رہے تھے مگر ابھی وہ ہم لوگوں سے بہت گھلے ملے نہ تھے۔ ہم لوگ صرف پانچ پرانے مریض رہ گئے تھے۔ نقی، میں، چھوٹے وکیل صاحب، گوپال اور مارواڑی۔ ہم لوگوں میں اب اضطرابی کیفیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ صحت کی قربت نے زندگی کی توقعات اور مطالبوں کو بڑھا کر اپنی محرومیوں اور نامرادیوں کے احساس کو تلخ تر بنا دیا تھا۔ آپس میں تو نہیں مگر دوسرے وارڈوں سے ہم لوگوں کی رقابت بہت بڑھ گئی تھی اور نرسوں سے ہم لوگ بے جا طور پر الجھ پڑتے تھے۔ آج مار تھا سے لڑائی ہوئی، کل لیسی کو ڈانٹ بتائی گئی۔ آخر میں ان نرسوں کی باری آئی جو ہم لوگوں سے زیادہ قریب ہوگئی تھیں یا جنھیں قریب ہونے کا مغالطہ تھا۔ ان نرسوں کی آپس میں بڑی رقابتیں تھیں ورنہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ پوری صحت گاہ میں ہم لوگوں کا ایک ہمدرد بھی نہ رہ جاتا۔ ہاں ایشری کو کسی سے رقابت نہ تھی لیکن وہ کبھی اتنی سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اپنی یا دوسری نرسوں کی تضحیک کے بارے میں سوچنا گوارا بھی کرے۔ بس وہ اتنا کہتی "چپ کرو!" پھر چل دیتی اور سب کچھ بھول جاتی۔

سینا ٹوریم میں بھی شہنشاہ معظم کی جوبلی منائی گئی۔ مٹی، پانی، آگ، ہوا اربعہ عناصر پر بادشاہ کی حکومت ہے۔ وارڈوں کے درمیان تزئین و آرائش کا مقابلہ ہوا۔ لوئر سی وارڈ اول آیا۔ ہم لوگوں کی خوشی مت پوچھئے۔ جب خوش ہونے کو بڑی بڑی باتیں نہ ہوں تو پھر کچھ تو خوش ہونے کو چاہئے کبھی انسان غم منا کر بھی غم غلط کرتا ہے اور یہ تو خوشی ہی تھی۔ نرسوں نے بھی خوشیاں منائیں اور نرس ڈولی تو اس روز کھلی جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں چند ہفتوں سے ڈولی بے حد ہنسوڑ اور چونچال ہوگئی تھی۔ جوبلی کے قبل وہ ایک مہینہ کی رخصت پر گھر گئی۔ وہاں سے آئی تو اس کا عجیب حال تھا۔ ہنسی ہنسی میں وہ ناگفتنی باتوں کا تذکرہ کر ڈالتی تھی۔ اب کے اس نے اپنے گھر کی کرسچن کالونی کے قریب مویشیوں کا اختلاط دیکھا تھا۔ وہ اس بات کا تذکرہ کرتی اور ہنس پڑتی تھی۔

عین جوبلی کے روز دس بجے کو کرن کے پھیپھڑوں سے شدت کے ساتھ خون آنے لگا۔ وہ ہمارے وارڈ کے پہلو کے وارڈ کا مریض تھا۔ بہت بلند پیشانی، لانبے لانبے بال اور وحشت ناک چھوٹی آنکھیں اور بیزار و باغی جذبات سے تملایا ہوا چہرہ، لانبا قد، دوہرا بدن، مگر بیماری سے ڈھیلا۔ وقفے وقفے سے اسے دن بھر خون آتا رہا۔ شام کو سارے سیناٹوریم میں چراغاں کیا گیا۔ پارٹی ہوئی۔ ریڈیو بجا کر کھیل کود ہوا، نرسوں نے گانے گائے، غرض بڑی تفریح رہی اور یہ ہوا کہ کرن کی اچانک علالت کے سبب ڈولی کی نائٹ ڈیوٹی ہو گئی۔ ہم لوگ شہنشاہ معظم سے وفاداری کا ثبوت دے کر اور اپنا جی بہلا کر وارڈ واپس آئے تو پہلو کے وارڈ سے اطلاع ملی کہ کرن اب تک خون تھوک رہا ہے۔ ہم سب لوگ افسردہ ہو گئے

مگر ڈولی ادھر سے ہنستی ہوئی آئی اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ آج وہ مذاق پر تلی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے بھی کرن کو بھول جانے کے خیال سے اس کی حسرتوں کی خوب داد دی اور ویسے بھی ہم لوگ ان جانفشار خوں فشانیوں کے عادی بھی ہو گئے تھے۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ مسہری کے پردے کے اندر اپنا بالائی جسم داخل کر کے کسی نے مجھے جگایا۔ میں چونک اٹھا۔ ڈولی نے میرے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں ابھی نیند کی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈولی کی سانس تیز اور گرم تھی۔ وہ بے قرار سی معلوم ہوئی۔ اس نے میرے لب شرارت سے اپنی چٹکیوں میں مسل دیئے۔ میری نیند غائب ہو گئی۔ مجھے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے یک بیک محسوس کیا کہ کرن کے سر کی بلا میرے سر پر سوار ہو رہی ہے۔ مگر ڈولی اس رات کو جذبات کی سیاہ آندھی تھی' روح تاریکی تھی۔ اس آندھی میں کون جانے میرا کیا حشر ہوتا مگر ہوا یہ کہ بغل کے بڈ پر شاید وکیل صاحب جاگ پڑے اور انھوں نے کچھ سمجھ کر مسلسل کروٹیں لینی شروع کیں۔ لوہے کا اسپرنگ دار بڈ رد بلا کے لئے طلسم کا بول ثابت ہوا۔

صبح کے آٹھ بجتے بجتے سینا ٹوریم بھر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ بھوزکوا ے وارڈ کے چوبے جی نے ڈولی کا سارا زہر دور کر دیا۔ برہمن تھے نا۔ بس پی کر بھی آنند ہی ہوئے۔ کتنی حریص دلچسپی سے ہم سب لوگوں نے اس کرامت کا تذکرہ سنا۔ بات یہ ہے کہ ناگن کی دم پکڑ کر اسے فضا میں چرخ دینے کی گدگدی تو سب کو ہوتی ہے مگر ڈسے جانے کا خوف اور نہ جانے کتنے قسم کے خیالی بچھو تصور میں رینگ رینگ کر سما دیتے ہیں۔

ہم سب لوگوں نے اپنی نیتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے چوبے جی اور ڈولی دونوں پر لعنتیں بھیجیں اس واقعہ کے بعد سے ہمارے وارڈ کے اکثر مریض ڈولی سے لڑ پڑنے لگے۔ ان کے دلوں کا بھوت انھیں انتقام کے لئے اکساتا تھا۔ آخر ایک دن میری ڈولی سے سخت لڑائی ہو گئی۔ اس نے ایک نئے مریض خانصاحب کو بس اتنا کہا تھا۔ "کہاں چلا جاتا ہے خان؟ میں حلق میں پینٹ لگانے کے لئے کب سے کھڑی ہوں۔" خان بگڑ گیا تھا۔ میں نے خان کی پاسداری کی۔ بات بڑھ گئی اور بڑھی تو اتنی کہ میں ڈولی کو کیا نہیں کہہ ڈالا۔ میں غصے سے کانپ رہا تھا اور وہ لڑتے لڑتے سسکیاں لے کر رونے لگی۔ ایک دوسرے کے خلاف رپورٹیں ہوئیں اور یہ ہوا کہ سلسلہ کلام قطعی بند۔ ایشری اور کیتھرن نے بات کو سلجھانا چاہا لیکن گرہ نہ کھلی۔

مجھے گیارہ ماہ سینا ٹوریم میں ہو گئے تھے اور تقی کو ایک سال سے کچھ زیادہ ہم دونوں اکتا گئے مگر گرمیاں درپیش تھیں اور اس موسم میں سینا ٹوریم سے جانا مناسب نہ تھا۔ کرن کے خون تھوکنے سے ہم لوگ اور گھبرا گئے تھے۔ وہ چلتا پھرتا مریض تھا کہ اچانک اس پر مرض نے حملے کا ارادہ کیا۔ کرن عجیب طرح ہماری زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ جوبلی کے بعد ایک ہفتے تک اسے خون آتا رہا۔ ایک ماہ ہوا تھا کہ وہ سینا ٹوریم میں آیا تھا۔ دو ہفتے ذی فراش رہنے کے بعد اسے سیر کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ کچھ پاگلوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اکثر چپ رہتا تھا اور گاہے معمولی سی بات پر بے تحاشا ہنسنے لگتا اور وہ اپنے لباس کی طرف سے بے پروا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسی باتوں سے چڑ جاتا جو پرسش دوستانہ کے تحت آئیں۔ اس کا کوئی ماموں اسے برما سے روپے بھیجتا تھا۔ لیکن اسنے اپنے ماموں کو خط لکھنے سے منع کر دیا تھا اس کا اور کوئی دنیا میں تھا بھی نہیں' یہ ایک راز تھا۔ وہ اپنے ماموں کو گالیاں دیتا تھا۔ کہتا۔۔۔۔۔ "اس نے مجھے مرنے کیوں نہ دیا۔ ناحق میرا علاج کرا کے مجھ میں زندگی کا لالچ پیدا کر دیا اور اب مسلسل خوف' جینے کی مصیبت' مرنے کا ڈر' سل کے مریض کا علاج! سینا ٹوریم میں جا کر ہم لوگ کیا کریں گے؟ آرام اور غذا! ہونہہ! آرام و استراحت کے گھنٹے! اصول! پروگرام! انڈے! دودھ! مکھن! چوزے! پھل! ہوادار مکان! اور کچھ فکر نہیں! گدھے کے بچے ڈاکٹر! جیسے بیماری سے پہلے ہمارے پیٹ بھری تو رہے تھے۔ سب نوجوانوں کو سل کے کیڑے کا انجکشن دے کر مار ڈالنا سماج اور حکومت کا فرض ہے نہ کہ بیماروں کا علاج کرنا۔" اس کی آنکھیں شعلہ بار ہونے لگتیں اور وہ پاگلوں کی طرح بکنے لگتا" جب میں خون تھوک رہا تھا تو اسے روکا گیا؟ میں دو گھنٹے میں مر چکا ہوتا اور اب کیسے مروں؟ خدا اور شیطان نے مل کر انسان کا جگر چھلنی کر دیا۔ یہ احمق انسان خدا اور انسان کے درمیان بٹ گیا ہے اور زندگی نہ خدا کے پاس ہے نہ شیطان کے پاس۔ یہ ہے ٹاٹا کے پاس' فورڈ کے پاس' برلا کے پاس۔ جو خدا اور شیطان دونوں سے زیادہ طاقتور اور زیادہ خطرناک ہیں۔ مگر انسان اس قابل ہے کہ اس کے ہر مرد کو ہلاک کر دیا جائے۔

کرن کلکتہ یونیورسٹی کا ایم۔ اے تھا۔ وہ نہ زندگی کے ماضی پر ایمان رکھتا تھا نہ مستقبل پر۔ اس میں عدمیت کی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ سب سے نفرت کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی غیر معمولی طور پر وہ بڑی محبت سے گفتگو کرتا۔ بچوں کی طرح اور باتیں کرتے کرتے اس پر رقت سی طاری ہو جاتی۔ وہ حیات کی آغوش کے کسی کھوئے ہوئے سرچشمے کو ڈھونڈھتا تھا۔

اب کے جو کرن کو خون آنا شروع ہوا تو ہم لوگ اس کی بیمار پرسی کو گئے۔ ایسی حالت میں بولنے کی سخت ممانعت ہوتی ہے مگر ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ زور زور سے بولنے لگا اور پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ اصولاً زہر تھا۔ کہنے لگا۔

"اب کے آسانی سے مر سکوں گا۔"

وہ دیر تک بکتا رہا۔ صبح کو نرس دلاری اور کیتھرن کی اس روز ڈیوٹی تھی۔ دلاری دوڑی ہوئی آئی کہ اسے لٹائے۔ ہم لوگوں نے بھی بہتیرا سمجھایا مگر وہ چیختا رہا۔ اسے دو دفعہ خون کی ابکائی بھی آئی۔ کرن نرسوں سے بہت چڑتا تھا مگر اس روز جب کیتھرن نے اسے آکر اپنے خاص انداز سے کہا۔ "کرن بابو!" تو وہ فوراً لیٹ گیا اور کیتھرن کو حسرت سے دیکھنے لگا۔ خدا جانے ان دو لفظوں میں نرس نے کتنی مٹھاس، شکایت، تادیب اور خلوص گھول دیا تھا کہ کرن رام ہو گیا۔

استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ میں اور نقی اس کی تیمارداری کرتے تھے۔ اسے برف کے ٹکڑے دینا، پھل کا عرق پلوانا اور چپ چاپ اس کے پاس بیٹھے رہنا۔ جریان خون کے دورے کے وقت وہ باولا ہو جاتا اور اس پر بحرانی حالت سی طاری ہو جاتی۔ وہ اٹھ جاتا اور پلنگ چھوڑ کر دوڑنے کی کوشش کرنے لگتا۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ یا تو میری بات ایک حد تک سنتا یا کیتھرن کی مان لیتا۔ کیتھرن نے مجھ سے دوپہر کو آکر کہا:

"انور بابو میں ہر وقت تو نہیں رہوں گی۔ پاگل ہے بالکل۔ آپ کا کچھ خیال کرتا ہے۔ رسٹ پیریڈ کے بعد کرن کو دیکھ لیا کیجئے گا۔ مجھے اسی وقت کرن سے بجلی کے کوندے کی طرح رقابت محسوس ہوئی۔ میں نے کیتھرن کے لہجے اور تیور میں کچھ محسوس کیا۔ بہرحال میں وہی کرتا رہا جو کیتھرن نے کہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیتھرن کا پاس تھا یا کرن کا خیال۔ کیتھرن کرن کے لئے غیر معمولی توجہ کا عملی اظہار کر رہی تھی۔

تیسرے روز کرن پہ بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ بڑے ڈاکٹر نے اے۔ پی۔ وی، ہارس سیرا، کیلیم، امیٹین، مورفیا اور کوگوروڈ کے انجکشن دئے مگر خون نہ تھما۔ رات کو حالت نازک ہو گئی۔ میں اور نقی کرن کے پاس تھے۔ اس نے یک بیک جیلی کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے سوائے رقیق غذا دینے کے اور کسی چیز کی اجازت نہ تھی مگر ایسی رقت اور لجاجت سے اس نے جیلی مانگی کہ ہم لوگ اسے منہ مانگی چیز دینے پر تیار ہو گئے۔ وارڈ میں جیلی نہ ملی۔ اسی درمیان میں پھر اس کے منھ سے خون آیا۔ میرے دل میں یہ خواہش سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی کی طرح پھیل گئی کہ کرن کا خون نہ تھمے اور وہ ختم ہو جائے۔ پھر یک بیک جیسے کسی نے اس روشنائی کو جاذب سے اٹھا لیا ہو۔ اب بھی ایک کالا سا دھبہ موجود تھا۔ میں نے اس داغ کو اپنی انسانیت کی نگاہوں سے چھپانے کے لئے فوراً اپنے پیسوں سے کرن کے لئے اسٹور سے جیلی منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھلائی۔ وہ بے پایاں ممنونیت کی نظروں سے مجھے دیکھ کر بس اتنا کہہ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ "تم خدا سے بہت بہتر ہو۔"

ایک ہفتے کے بعد کرن اچھا ہو گیا۔ سبھوں کو حیرت ہوئی اور کیتھرن کو حیرت کے ساتھ ناقابل بیان نوعیت کی مسرت بھی۔ وہ اپنے کو کرن کا فرشتہ حفاظت محسوس کرنے لگی تھی۔ مجھے کرن سے پوشیدہ نفرت ہونے لگی۔ میں کیتھرن پر فقرے کسنے لگا۔ وہ قسمیں کھاتی اور صرف اتنا کہتی "وہ پاگل ہے، بیچارہ کرن۔" اس بیچارے سے مجھے چڑ تھی مگر حالات نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کرن کو یوں چاہتی ہے جیسے کوئی نادان مگر شریر بچے کو پیار کرے۔ پھر بھی میرے دل میں عجیب سی کھوٹ تھی۔ کرن اچھا ہو کر کیتھرن سے، مجھ سے اور ڈاکٹر سے شدید نفرت کرنے لگا پر جیلی کو یاد کر کے اب بھی وہ میرا مخلصانہ شکریہ ادا کرتا تھا۔ کہتا تھا۔ "وہ میری جان بچانے کی کوشش نہ تھی۔ تمہاری خالص محبت تھی۔ حیوانی، بے عقل، آزاد، مہیب مگر پیاری اور اندھی محبت پر میں تمہیں اس محبت کے طفیل بھی معاف نہیں کر سکتا۔ تم اور کیتھرن۔" اس نفرت کے باوجود کیتھرن کرن کو چاہتی ہی رہی۔ وہ اس کے لئے کڑھتی تھی کہتی۔ "ایسے پاگل مریض کہیں اچھے ہوئے ہیں۔"

نہ میں سمجھ سکا اور نہ کیتھرن کو اپنی اصلیت معلوم تھی کہ وہ کرن کی مجنونانہ بے بسی کی وجہ سے اس کی طرف کھنچی تھی یا اس کی بے پناہ

پر شور ذہنی قوت کے سبب۔ وہ اب میرے پاس آآ کر زندگی، مستقبل، محبت، ملازمت کی پریشانیاں اور اپنی خیالی شادی کے متعلق گفتگو کرتی تھی۔ اسے میری اور کرن دونوں کی جذباتی احتیاج تھی۔ پر وہ اس کا تجزیہ نہ کرپائی اور میں نفرت کے کیچڑ میں کیڑے کی طرح تلملاتا رہا۔

گرمیوں میں سل کے مریضوں کی اور کثرت ہونے لگی۔ بہت سی درخواستیں سیٹ کی کمی کی بنا پر واپس کر دی گئیں لیکن کچھ تو تھیں ایسی بھی ہیں جن کی درخواستیں رد نہیں کی جاسکتیں۔ یہاں ڈاکٹر کی کشش و بچ کا مسئلہ نہیں بلکہ خالص اثر و رسوخ اور زر کا مسئلہ تھا۔ ایسے طبقے کے چند لوگوں کو جگہ کی ضرورت تھی جس کے افراد دوسرے طبقات کے سر آنکھوں پر اٹھائے جاتے ہیں۔ اے وارڈ میں جگہ نہ تھی اور وہاں کے ہٹایا جانا۔ وہاں والوں کی رگوں میں بھی تو خون تھا۔ تو طے یہ ہوا کہ فوری طور پر سی وارڈ میں جگہ خالی کی جائے اور پھر موقع ملنے پر ان بیش قیمت ہستیوں کو اے وارڈ میں منتقل کر دیا جائے۔ گوپال، نقی اور جونیئر وکیل صاحب کو بیک قلم ڈسچارج کر دیا گیا۔ میں نے کچھ ایسی گھبراہٹ محسوس کی، بس ارادہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ سے کہوں کہ میرا نام بھی کاٹ دے مگر جون کے مہینے میں سینا ٹوریم چھوڑنے کے خوف سے لرز گیا اور خود حفاظتی کی حس میرے دوسرے احساسات پر غالب آگئی۔

گوپال اضطراب میں ڈاکٹر کے جانے کے بعد ٹہلنے لگا وہ پہلے بہت خوش ہوا پھر اس پر حیرانی اور تذبذب طاری ہوا۔ آخرکار وہ رونے لگا وہ میرے پاس آیا اور لپٹ گیا۔ " نور بھائی تم بھی چلو نا۔ گھر جائیں ہم انور بھائی؟ وہاں اے۔ پی کون دے گا؟ جاڑے میں جاتے یہاں سے۔ ساڑھے تین برس اسی وارڈ میں رہے۔ ڈھائی سال تو اس بڈ پر ہو گئے۔ گوپال نے اپنے خاص گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں امنڈ آئیں۔ " پھر ہم سب لوگ، نقی بھائی، آپ، پیر مغاں، مصری جی، بھائی حاذق، پربھو بابو، انور بھائی! پانچوں آدمی چلے شہر کے کنارے کرایہ کا مکان لے کر رہیں۔ " اس نے اس پروگرام کی دقت کو محسوس کیا اور مجبوری کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں، نقی اور وکیل صاحب سب بے چین تھے۔ میری اور نقی کی رفاقت سینا ٹوریم میں مثال کے طور پر مشہور تھی۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ ہم سب لوگ ملے جلے، واضح اور مبہم جذبات کو نوع در نوع اثرات کے تصادم کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے آنسو بہا رہے تھے جیسے کسی بھاری چٹان کے نیچے سے پانی کا سوتا رس رہا ہو۔ نرسوں نے بھی اس خبر کو بے چینی سے سنا۔ ایشری تو اس اچانک حادثے سے بدحواس ہو گئی۔ یہ تینوں مریض دوسرے روز جا رہے تھے۔ ہم لوگ دن بھر باتیں کرتے رہے۔ دکھ درد، امید و ناامید، خوشی اور موت، رفاقت اور غمگساری، بیماری اور صحت کی باتیں۔ ہم لوگوں میں وعدے وعید ہوئے کہ ایک دوسرے کو خط لکھیں گے۔ لوئر سی وارڈ کے خاندان کا بقیہ بھی بکھر رہا تھا۔ مریض صحت پا کر جا رہے تھے مگر اس ناقابل بیان مسرت کے ساتھ شکست رفاقت کا عجیب غم بھی تھا۔ سینا ٹوریم کی رفاقت بھی میدان جنگ کی رفاقت سے کم نہیں۔ کیسے کیسے قاتل لمحات کا ہم لوگوں نے مل جل کر مقابلہ کیا تھا۔ کتنی ناامیدیوں کو ہم نے شکست دی تھی۔ کتنے ارمان، کتنی حسرتوں کو ہم سب نے ساتھ پالا تھا۔ مسرت اور فریب کی گھڑیاں! بے آسرا شامیں! تاریک صبحیں، دلداریاں، غمگساریاں، ہمدردیاں سب یاد آ رہی تھیں۔ موت سے ہم لوگوں نے لڑائی جیتی تھی۔ وقتی ہی سہی۔ فتح کے احساس سے بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ کاش اس سیاہ بھیانک عفریت کے آئندہ حملوں کے وقت بھی ہم سب لوگ ایک ساتھ رہتے۔ آہ زمانہ ہر دانے کو علیحدہ علیحدہ کر کے اپنی چکی میں پیس لیتا ہے۔

ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ایشری، نقی سے ملنے آئی۔ سبھی نرسیں آئیں۔ ایشری سب کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک ٹھہری رہی۔ وارڈ کے صحن میں ہم لوگ ساتھ بیٹھے۔ وہ نقی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے روتی جاتی اور باتیں کرتی جاتی تھی۔ جیسے نقی کے ہاتھ کبوتر کا ایک جوڑا ہو جیسے کسی بچے کے ہاتھ سے چھین لئے جانے کی دھمکی دی جا رہی ہو۔ وہ ہاتھوں کو اس طرح دبائے ہوئے تھی کہ انہیں کبھی نہ چھوڑے گی۔ اس نے رخصت ہوتے وقت نہایت بیباک خلوص کے ساتھ کہا:

" اگر مجھے یہ خیال ہوتا کہ تم جون ہی میں چلے جاؤ گے تو میں دعا کرتی کہ ابھی بیمار ہی رہو۔ میں تمہیں بیمار دیکھ سکتی ہوں مگر تم سے بچھڑنے کی تاب نہیں لا سکتی۔ "

وہ تینوں چلے گئے۔ مارواڑی اور میں رہ گئے۔ نو مریض اور تھے پھر بھی ہم لوگ سخت تنہائی محسوس کر رہے تھے۔ میرا جی تو بالکل نہیں

لگ رہا تھا ۔ بیزار اکتایا ہوا اور کچھ خائف ۔ تنہائی میں بیماری کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور اس کا خوف دامن گیر ۔ کیتھرن نے میری بڑی دل دہی کی لیکن نہ جانے کیوں ان دنوں اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں دنیا میں یکا و تنہا ہوں ۔ مجھے یہ شدید احساس ہو رہا تھا کہ ہر فرد کی زندگی ایک علیحدہ کال کوٹھری ہے جس کے اندر کوئی دوسرا نہیں آ سکتا ۔ دور سے وقتی طور پر اس کے اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے ۔ دو قیدیوں کا مل جانا محال ہے ۔ آنی جانی دلچسپی ممکن ہے مگر اور زیادہ دردناک ۔ ہم ایک دوسرے کی روح میں جھانک کر دیکھتے ۔ اس سے نفرت یا محبت کرتے گزر جاتے ہیں ۔ ہماری روحیں مل نہیں سکتیں ۔ ایک ہو جانا فریب ہے ۔ سراسر فریب مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کیتھرن نے دو دن کے لئے میری باطنی زندگی میں جھانکا اور اب دوسری روح کی کھڑکیوں کے پٹ کھول رہی ہے ۔ سچ ہے کوئی جنگلے سے لگا ہوا کوٹھری کے اندر کب تک جھانکتا رہے ۔ وصال داخلی ناممکن ہے اور خارجی اتصال فریب احساس ہے ۔ المناک طنز ہے اور مضحکہ خیز بھی۔

ایک روز میں نے کیتھرن کو صاف کہہ دیا "دھوکا دینے سے کیا فائدہ ؟ آپ کرن کو چاہتی ہیں ' چاہئے۔"

وہ بگڑ گئی ۔ " چاہتی تو ہوں مگر ـــــ اور آپ کتنے تنگ نظر ' سنگ دل ' بدظن اور ناقابل اعتبار ہیں۔"

مجھے آگ ہی تو لگ گئی ۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرا مقابلہ کرن سے کیا جا رہا ہے اور مجھے مردود قرار دے دیا گیا ۔ اگر یہ جملے کبھی اور مجھ کے جاتے تو میں صرف ہنس دیتا مگر اس میں مقابلہ کا اشارہ پایا جاتا تھا ۔ یہ ستم میری خودی کا دم گھونٹ رہا تھا ۔ میں تلملا اٹھا ۔ کیتھرن نرس روم میں چلی گئی ۔ میں نے اپنا بکس کھول کر اس کی دی ہوئی بچی کچھی چیزیں نکالیں اور انہیں واپس کرنے ڈیوٹی روم میں گیا ۔ میں نے انہیں کیتھرن کے ہاتھ میں لوٹا دینا چاہا ' پر اس نے لیا نہیں اور تنک کر جھنجھلاتی ہوئی دوسری جانب چلی گئی ۔ میں نے سب چیزیں اس کے سامنے پٹک دیں اور لوٹ آیا ۔ کیتھرن بھڑ گئی اور میں نے واپس ہوتے ہوئے یہ جملے سنے:

" مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں ۔ کس پر ناز کرتے ہیں یہ مغرور آدمی! میں کسی کی بیاہتا نہیں ہوں ۔ بڑے آئے ہیں کہیں کے ـــــ"

نازک دھاگا ٹوٹ چکا تھا ۔ میں اپنی تنہائیوں میں اور زیادہ تنہا ہو گیا تھا ۔ کوئی سہارا نہیں ' کوئی تسکین نہیں۔

کرن کے بعد اب میری باری تھی ۔ جون کے ایک دو دن باقی تھے کہ سوتے سوتے چار بجے صبح کو میرے منہ سے خون آ گیا ۔ میں بستر پر لیٹا ہوا خوف کے مارے پسینے پسینے ہو گیا ۔ ایسا محسوس ہوا کہ یہ دنیا یہ کرہ سارے سامان حیات کو لے کر میرے سامنے گولی کی طرح شن سے کائنات کی انجان وسعتوں میں دور نکل گیا اور میں خلاء تاریک و سرد خلا میں معلق ڈوب جانے کے لئے اکیلا رہ گیا ۔ موت کی کالی کالی موجیں مجھے ڈھانپے جا رہی ہیں اور میں فنا کے غار میں غرق ہو رہا ہوں ۔ آس اور نراس کے درمیان زندگی کے عنکبوتی تانے بانے کو ایک سال ' مکمل ایک سال تک بنا تھا ۔ طوفان کے بعد پھر سے تنکے اکٹھا کر کے آنسو اور مسکراہٹوں کے بندھن سے باندھا تھا اور اب ایک نئی آندھی آشیانہ حیات کو نوچ کر برباد کر رہی تھی ۔ میں نے کتنی باتوں کو بھلایا تھا ۔ کتنی یادوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا ۔ کتنے ارمانوں کو بہلا کر خاموش کر دیا تھا اور پھر زندگی کی خشک شاخ پر نازک نازک ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں ' کلیاں بھی پھول بننے کا سندیسہ دے رہی تھیں اور آرزوؤں کی نئی بسنت ' بہار تازہ کا پیغام لا رہی تھی ۔ مستقبل پر فریب تمنا دے رہا تھا اور یہ اچانک موت کے ترکش کا ایک تیر آ لگا ۔ ہر طرف خزاں تھی ' ویرانیاں تھیں اور بے بس سکوت!

زندگی کی نیرنگی نا امیدیوں میں بھی امید کے بت تراش لیتی ہے ۔ یہ کیفیت گزر جانے کے بعد مجھے یہ خیال آیا ۔ شاید کیتھرن یوں واپس آ جائے ' شاید روایتی خون ' ٹوٹی ہوئی رگوں کو جوڑ دے ' مجھے مسرت ہوئی ۔ میں نے زہر سے امرت بنا لیا ۔ انسان میں بھی کتنی الوہیت ہے وہ ہر آن اپنے کو پجوانا چاہتا ہے اور اس کے لئے اپنا اور دوسروں کا خون بھی بہا سکتا ہے ۔ خدا تو صرف دوسروں کا خون بہاتا ہے ۔ اپنا خون بہا کر لذت آزار حاصل کرنے کا اسے تجربہ کہاں ۔ یہ انوکھا احساس اس کے بس سے باہر ہے۔

مجھے بھی بار بستر کر دیا گیا ۔ وہی باتیں ہوئیں جو کرن کے ساتھ ہو چکی تھیں ۔ ڈاکٹر نے مجھے تسکین دی کہ پھیپھڑے کی حالت بہت اچھی

ہے سل کے مریضوں کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے ہی ہیں۔ جراثیم خفتہ حالت میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی سوئے سوئے بھی پھیپھڑے کی رگوں کو چاٹتے رہتے ہیں۔ کسی رگ کی دیوار پھٹ جاتی ہے اور خون آنے لگتا ہے۔ تمہارے پرانے زخم میں فائبروسس ہو چکی ہے' نئے ریشے نکل آئے ہیں اور مرض قبضے کے اندر آگیا ہے۔ یہ گزر جانے والا دور ہے۔ گھبراؤ مت!" نرسوں نے بھی عیادت کی' جی بہلایا اور تشفی دی۔ مگر میں عجیب حالت میں تھا۔

گذشتہ سال جو میرے منہ سے ایک ماہ تک خون آتا رہا تھا۔ تو میں نے اپنے جذباتی سہارے کے لئے روحانی 'مابعد الطبیعاتی عالم کی طرف رخ کیا۔ اب کے میرا دل بنجر تھا' بالکل بنجر۔ بالکل بنجر زمین کو سب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یہ ٹھنڈک عورت کے جسم میں نظر آئی۔ حیرت انگیز طور پر مجھے حواسی عشرت کی طلب ہوئی مگر محرومی نے دل میں جہنم سا بھڑکا دیا۔ موت سے قربت ہو تو خدا یاد آتا ہے لیکن شاید مادہ کے بچھڑ جانے کے احساس نے مجھ میں مادہ جسم اور دنیا کی شدید حریصانہ محبت پیدا کر دی تھی۔ جو چیزیں پھٹ جانے والی ہوں ان سے کتنا جناب عشق ہوتا ہے۔ پائیدار اشیاء تو اکثر اکتاہٹ پیدا کرتی ہیں۔ فنا کے سبب بقا سے محبت ہوتی ہے اور غیر فانی ہستی بھی اتنی مستحکم' وزنی اور عظیم و جلیل معلوم ہونے لگتی ہے کہ اس کے وزن اور باقی و حاضر ناظر ہونے کے تصور سے روح پسی جاتی ہے۔ خدا اتنی بڑی حقیقت ہے کہ دل اس کو بھول کر اپنے کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کا آنی جانی ہونا ہی کشش کا باعث ہے۔ اس مادی دنیا کی سب سے حسین ترکیب مادہ' عورت ہے۔ مادہ کا نقطہ کمال' جسم کے حسن تعمیر کا عروج جمیل۔ اس لئے مادی سہارے میں سب سے بڑا سہارا عورت ہے۔ میں بستر پر لیٹا لیٹا فنا کا خیال کر کے جب لرزنے لگتا تھا تو دل میں ایک ہوک اٹھتی تھی اور حیات کا ذرہ ذرہ جنس لطیف کو ڈھونڈتا تھا۔ مجھے اٹھنے کی اجازت نہ تھی مگر جذبہ دل ایسی حرکتوں پر اکساتا تھا جو سامان بقا ہیں۔ مجھے اپنی رومانی مثال پسندی سے نفرت ہونے لگتی۔ میں سوچتا کہ نرا گاؤدی ہوں۔ بدن کی رومانیت مجسم اور حقیقت مثالی کو چھوڑ کر جذب و کشش کی لطافتوں کے جالے میں الجھے رہنا بے بسی' بے عملی اور نامرادی کی دلیل ہے۔ مجھے تقی اور اس کی قوت اقدام و عمل یاد آتی اور میں انتہائی محرومی و کارناکردگی کے غم میں غلطاں ہو جاتا۔ یہ فطرت کا کتنا الم ناک طنز تھا کہ اس بجھی ہوئی خاکستری حالت میں مجھے عمل کے چراغ جلانے کی شدید تمنا ہو رہی تھی۔ میں نرسوں کو صرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ انہیں چھونا' سننا' دیکھنا اور چکھنا چاہتا تھا۔ عورت ہی ایک ایسا عطر مجموعہ ہے جو سارے حواس کو بیک وقت شاد کام کرتا ہے۔ جس گھڑی میرے منہ سے خون آنا' میں مجبوری و محرومی کے احساس میں غرق ہو کر اپنے ہی جسم کو انتہائی پیار و محبت سے چھو کے رونے لگتا۔ مجھے اپنا ہاتھ' اپنی انگلیاں بہت ہی عزیز معلوم ہوتیں۔ میں نے ان سے اتنی شدید محبت کا احساس کبھی نہیں کیا تھا۔ اتنی بار میں نے کبھی ان کو اتنے انہماک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے جو امید قائم کی تھی کہ کیتھرن اس سال میں تو ضرور مجھ سے مل ہی جائے گی' ٹوٹ گئی۔ کیتھرن بس ڈیوٹی کے طور پر وارڈ میں آتی اور چلی جاتی۔ اس نے میرا حال تک دریافت نہ کیا۔ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ غم کی گھٹائیں موج در موج ہوتی ہیں۔ کیتھرن کتنی خوددار و خود بین تھی۔

مگر اس کے خلاف ڈولی جسے میں نے کیا نہیں کہہ ڈالا تھا' جس سے میری کوئی توقع وابستہ نہیں تھی' وہ ڈیوٹی نہ ہونے کے باوجود میری علالت کی خبر سنتے ہی بھاگی ہوئی آئی اور مضطرب مسکراہٹ کے ساتھ میری خیریت دریافت کی۔ میں چپ رہا۔ خفگی سے نہیں شرمندگی سے۔ اس وقت وہ چارٹ دیکھ کر چلی گئی پھر وہ برابر آتی رہی۔ مجھے وارڈ کی بے کلی سے وحشت ہوتی تھی' لہذا مجھے معائنہ کے کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ ایک دوپہر کو ڈولی مزاج پرسی کے لئے آئی۔ میں انتہائی ندامت میں گڑ گیا اور ہیجان جذبات نے مجھے رو پڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ڈولی کا ہاتھ پکڑ کر بدقت معافی مانگی۔ وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور صرف اتنا کہا۔ "انور صاحب! آپ نہیں جانتے....."

میں نے ان آنسوؤں میں ماضی کے کانٹوں کی چبھن محسوس کی اور زندگی کے کمیاب حسن کی چند نورانی کلیاں کھلتی ہوئی دکھا دیں۔ انوکھے طور پر محسوس کیا کہ عورت ہی مرد کی ابدیت کا ذریعہ ہے۔ فانی انسان عورت ہی کی مدد اور ربوبیت سے چند قطروں کو ناپیدا کنار سمندر بنا دیتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ انسانیت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر عورت کی آغوش سے نکل کر ازل اور ابد کو گھیرے ہوئے ہے۔

آخر کار میں اچھا ہو گیا۔ چند ماہ اور سینا ٹوریم میں رہ کر مجھے گھر واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ میں بہت اکتا بھی گیا تھا۔ ادھر کیتھرن

نے مجھ سے روٹھ کر اپنی زندگی ہی بدل لی تھی ۔ وہ سب سے تعلقات توڑ چکی تھی ۔ اگر وہ مجھ سے باتیں نہیں کرتی تھی تو وہ اور لوگوں سے بھی گریزاں ہی رہتی تھی ۔ شاید وہ اپنی زندگی کے تجربات تلخ و شیریں کے بعد شکست فریب کی تلخیاں برداشت کر رہی تھی ۔ اب وہ صرف کھیلنا نہیں زندگی بسر کرنا چاہتی تھی ۔

درخت کا اکھڑنا کچھ آسان نہیں ہوتا ۔ درد زندگی میں سب سے بڑا دکھ انتقال ہے ۔ جڑیں وصل زمین سے محروم کئے جاتے وقت کراہنے لگتی ہیں ۔ میری حیات کا درخت بھی صحت گاہ میں ڈیڑھ سال تک نصب رہا تھا اور علیحدگی کے وقت اعصاب کے سوتے دردناک ہو رہے تھے ۔ میں رخصت سے پہلے نرسوں سے ملنے ان کی اقامت گاہ کو گیا ۔ سب بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں ۔ سبھوں نے بڑے انس اور خلوص سے میری پذیرائی کی اور بعض نے خوشی کا اظہار کیا کہ اب میں اچھا ہو کر اپنے گھر جا رہا تھا مگر کیتھرن وہاں بھی خاموش رہی ۔

رخصت کی صبح کو ایشری نے مجھ سے کہا ۔ "کٹو بوا' رات بھر روتی رہی ہیں اور ڈولی بھی' آپ کو سبھی لوگ چاہتے ہیں ۔"

میں نے کہا ۔ "جو میری خطرناک حالت میں بھی بے گانہ رہا ہو' وہ بلاؤز کے پیرس بٹن ٹوٹ جانے پر تو رو سکتا ہے مگر میرے لئے اس کے آنسو کی ایک بوند بھی نہیں ہو سکتی ۔ ہاں ڈولی سے میں بے حد شرمندہ ہوں۔"

ایشری مجھ سے باتیں کر رہی تھی کہ کیتھرن آئی اور اس نے ایشری کو ڈیوٹی روم میں بلا لیا ۔ ذرا دیر میں وہ مسکراتی ہوئی لوٹ آئی اور ہنس کر کہنے لگی۔

"جائیے مل لیجئے! بوا بلاتی ہیں ۔"

نہ جانے کیوں میں ارادے کے خلاف اندر چلا گیا اور وہ ایشری وارڈ میں مریضوں کا ٹمپریچر لینے چلی گئی۔

خود دار و خود بین کیتھرن کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس نے مجھے دیکھا ۔ میں اس کے قریب چلا گیا ۔ اس نے میرا ہاتھ زور سے جذباتی انداز میں پکڑ لیا اور اس حال میں میز پر ٹیک لگا کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگی ۔ اسے اپنے آنسو دکھلانے میں بھی عار تھی ۔ اچانک اس نے سر اٹھا کر کہا:

"انور بابو! آپ نے ہم نرسوں کو عورت نہ سمجھا ۔ بس ایک گڑیا 'ایک گڑیا 'ایک گڑیا!"

○

غلام عباس

نام : غلام عباس
قلمی نام : غلام عباس
پیدائش : ۱۷ نومبر ۱۹۰۹ء بہ مقام امرتسر مشرقی پنجاب، بھارت (۱)
وفات : یکم نومبر ۱۹۸۲ء کی رات بہ مقام کراچی
تعلیم : ایف۔ اے، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۴۴ء

ابتدائی تعلیم دیال سنگھ ہائی سکول، لاہور میں پائی۔ تعلیمی سلسلہ ٹوٹ ٹوٹ کر جڑتا رہا۔ ۱۹۴۱ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ادیب عالم کیا، ۱۹۴۲ء میں میٹرک اور یہیں سے ۱۹۴۴ء میں ایف۔ اے کیا۔ بی۔ اے کا امتحان دینا چاہتے تھے لیکن حالات نے اجازت نہ دی۔

مختصر حالاتِ زندگی:

آپ کے والد کا نام میاں عبدالعزیز تھا۔ غلام عباس کی تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی اور ادبی زندگی کا آغاز تیرہ برس کی عمر میں ہوا، دیال سنگھ ہائی سکول کے طالب العلم تھے۔ یہ زمانہ ۱۹۲۲ء کا ہے جب انھوں نے اپنا اولین افسانہ "بکری" قلم بند کیا۔ پندرہ برس کی عمر میں ان کا پہلا ترجمہ "جلاوطن" (مصنف ٹالسٹائی) جنوری ۱۹۲۵ء کے رسالہ "ہزار داستان" لاہور میں شائع ہوا۔ انیس برس کی عمر میں فری لانس ادیب اور صحافی کے طور پر عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۷ء بچوں کے معروف رسالے "پھول" لاہور اور خواتین کے محبوب پرچے "تہذیب نسواں" کے نائب مدیر رہے۔ واضح رہے کہ یہ دونوں پرچے دارالاشاعت لاہور کے مالک اور ادبی دنیا کی مشہور و معروف ہستی امتیاز علی تاج کی زیرِ نگرانی نکلا کرتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے منسلک ہوئے اور ریڈیو کے رسالہ "آواز" کے مدیر مقرر ہوئے۔ انھوں نے اسی سال ریڈیو کا ایک اور رسالہ بہ زبان ہندی "سارنگ" بھی جاری کیا۔ قیام پاکستان کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے، ریڈیو کی ملازمت برقرار رہی۔ ۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان کا رسالہ "آہنگ" ان کی ادارت میں جاری ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں کچھ وقت مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات سے وابستہ ہو کر بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۹ء میں بی بی سی لندن سے بطور پروگرام پروڈیوسر وابستہ ہوئے، ۱۹۵۲ء میں وطن واپس آ کر ایک بار پھر "آہنگ" کی ادارت سنبھالی جہاں سے ۱۹۶۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ بی بی سی کی ملازمت کے دوران فرانس اور سپین میں کچھ وقت گذارا۔ دو شادیاں کیں، پہلی شادی ۱۹۳۹ء میں اور دوسری ۱۹۵۲ء میں۔ پہلی بیوی کا تعلق علی گڑھ سے تھا جبکہ دوسری برطانوی نژاد انگریز خاتون تھیں، جنھوں نے مولانا احتشام الحق تھانوی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ غلام عباس نے ریٹائرڈ زندگی کراچی میں گزاری۔ یکم نومبر ۱۹۸۲ء کی رات حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوا اور پی ای سی ایچ سوسائٹی، کراچی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"مجرم" مطبوعہ "کارواں" لاہور، ۱۹۳۳ء

○

اولین مطبوعہ تحریر:

"جلا وطن" (ٹالسٹائی کی کہانی کا ترجمہ) مطبوعہ: "ہزار داستاں" ۱۹۲۴ء

اولین تحریر:

"بکری" (کہانی) تکمیل: ۱۹۲۲ء (اس وقت دیال سنگھ ہائی اسکول کے طالب العلم تھے۔)

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "آنندی" (دس افسانے) مکتبہ جدید لاہور، طبع اول: ۱۹۴۸ء

۱۔ "جواری" ۲۔ "ہمسائے" ۳۔ "کتبہ" ۴۔ "حمام میں" ۵۔ "ناک کاٹنے والے" ۶۔ "چکر" ۷۔ "اندھیرے میں" ۸۔ "سمجھوتہ" ۹۔ "سیاہ و سفید" ۱۰۔ "آنندی"

۲۔ "جاڑے کی چاندنی" (چودہ افسانے) سجاد اینڈ کامران پبلشرز، کراچی، طبع اول: جولائی ۱۹۶۰ء

۱۔ "اوور کوٹ" ۲۔ "اس کی بیوی" ۳۔ "بھنور" ۴۔ "باسے والا" ۵۔ "سایہ" ۶۔ "سرخ جلوس" ۷۔ "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" ۸۔ "بردہ فروش" ۹۔ "ٹنکے کا سہارا" ۱۰۔ "چکی بائی" ۱۱۔ "مکرجی بابو کی ڈائری" ۱۲۔ "ایک درد مند دل" ۱۳۔ "دو تماشے" ۱۴۔ "غازی مرد"

۳۔ "کن رس" (نو افسانے) المثال، لاہور، طبع اول: ۱۹۶۹ء

۱۔ "کن رس" ۲۔ "بہروپیا" ۳۔ "بحران" ۴۔ "سرخ گلاب" ۵۔ "یہ پری چہرہ لوگ" ۶۔ "جوار بھاٹا" ۷۔ "فرار" ۸۔ "لچک" ۹۔ "اوتار"

نوٹ۔ غلام عباس کے افسانوی مجموعوں میں کل ۳۳ افسانے یکجا ملتے ہیں اور اگر ان میں درج ذیل چھ افسانوں:

(۱) "مجسمہ" مطبوعہ: "کارواں" لاہور، ۱۹۳۳ء

(۲) "نواب صاحب کا بنگلہ" ۱۹۷۱ء کے منتخب افسانے، مرتبہ: ناصر زیدی، ص ۹ تا ۱۱

(۳) "رینگنے والے" جریدہ پشاور (۱) ص ۲۴۹ تا ۲۵۹

(۴) "روحی" "تخلیقی ادب (۱) ص ۲۳۲ تا ۲۵۹

(۵) "بندر والا" "افکار" اکتوبر ۱۹۸۱ء ص ۵۳ تا ۵۶

(۶) "محبت کا گیت" محررہ: ۳۲۔۱۹۳۳ء

کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان کے افسانوں کی کل تعداد ۳۹ ہو جاتی ہے۔ جس سے ان کی سست رفتاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۴۔ "جزیرہ سخنوراں" (طنزیہ) کتب خانہ ہزار داستاں: جید پریس، دہلی، طبع اول: ۱۹۳۱ء

پہلے یہ کتاب ہفتہ وار "شیرازہ" میں قسط وار شائع ہوئی۔ اس تصنیف کا بنیادی خیال آندرے موروا کے ایک طنزیہ سے مستعار ہے۔

۵۔ "دھنک" (افسانوی تحریر) سجاد کامران پبلشرز، کراچی، طبع اول: جون ۱۹۶۹ء

۶۔ "گوندنی والا تکیہ" (ناول) سجاد کامران پبلشرز، کراچی، طبع اول: ۱۹۸۴ء
۷۔ "الحمرا کے افسانے" (از واشنگٹن ارونگ کا ترجمہ) دارالاشاعت پنجاب، لاہور، طبع اول: ۱۹۳۹ء
۸۔ "زندگی، نقاب، چہرہ" (منتخب افسانے) طبع اول: ۱۹۸۴ء
۹۔ "برف کی بیٹی" (بچوں کے لیے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۳ء
۱۰۔ "چاند کی بیٹی" (بچوں کے لیے)، (جاپانی کہانیاں) دارالاشاعت پنجاب، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۷ء
۱۱۔ "ثریا کی گڑیا"، (بچوں کے لیے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۴ء سے قبل
۱۲۔ "چاند تارا" (بچوں کے لیے نظمیں)
۱۳۔ "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" (از ایوب خان کا ترجمہ) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، محمود پرنٹنگ پریس، طبع اول: ۱۹۶۷ء
یہ فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان کی انگریزی خود نوشت "Friends Not Masters" کا ترجمہ ہے۔ کل صفحات ۳۳۰ ہیں۔
۱۴۔ "دنیا کے شاہکار افسانے" (تین جلدیں) بہ اشتراک ترجمہ، مرتبہ: عبدالقادر سروری، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن، طبع اول: ۲۳۔ ۱۹۲۲ء
۱۵۔ "جادو کا لفظ" (بچوں کے لیے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور، طبع اول: لگ بھگ ۱۹۴۳ء

زندگی میں مستقل پتا:

مکان نمبر ۷، ایچ بلاک ۳، پیر الٰہی بخش سوسائٹی، کراچی، پاکستان۔

اعزاز:

۱۔ پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس پرائز برائے "آنندی" ۱۹۳۸ء
۲۔ آدم جی ادبی انعام برائے "جاڑے کی چاندنی" ۱۹۶۰ء
۳۔ ستارۂ امتیاز (حکومت پاکستان کا اعلیٰ ترین سول اعزاز) ۱۹۶۷ء
۴۔ چیکوسلواکیہ بین الاقوامی افسانوی ادب انعام برائے "آنندی"

ان کے بین الاقوامی شہرت کے حامل افسانہ "آنندی" پر بھارت کے عالمی شہرت یافتہ ہدایت کار شیام بینگل نے ۱۹۸۳ء میں فلم "منڈی" بنائی۔

نظریہ فن:

"۔۔۔۔۔ افسانہ نگاری ادب کی سب سے زیادہ آسان صنف ہے۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی جو صرف خط لکھنا جانتا ہو، تھوڑی سی کوشش سے افسانہ لکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ یہ جانتا ہو کہ زندگی کی حقیقتوں کو کم سے کم لفظوں میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے اور افسانہ، نثر کی تمام اصناف میں اسی لیے برتری رکھتا ہے کہ وہ چند صفحات میں لکھا جا سکتا ہے اور زندگی کی حقیقت کو پیش کر سکتا ہے۔"

(بہ حوالہ: ایک انٹرویو از اطہر نفیس، روزنامہ "جنگ" کراچی، ۱۰ جولائی ۱۹۷۸ء)

○

(۱) "اردو افسانہ: تحقیق و تنقید" از ڈاکٹر انوار احمد میں سنہ پیدائش ۱۷ جنوری ۱۹۱۹ء درج ہے، جو درست نہیں۔

غلام عباس

آنندی

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ اور دردمند سمجھے جاتے تھے۔ نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے۔

"------اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گذرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ، نیم عریاں بسواوں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساڑیوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پر مسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔"

"------اور صاحبان پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ ہمارے نونہالان قوم جو درس گاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا۔ انہیں بھی صبح شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگار کئے راہرو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر و سناں برساتی اور اسے دعوت حسن پرستی دیتی ہیں۔ کیا انہیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے ناتجربہ کار جوانی کے نشے میں محو، سود و زیاں سے بے پرواہ نونہالان قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسن زاہد فریب ہمارے نونہالان قوم کو جادہ مستقیم سے بھٹکا کر، ان کے دل میں گناہ کی پر اسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا------"

اس موقعہ پر ایک رکن بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرس رہ چکے تھے، اور اعداد و شمار سے خاص شغف رکھتے تھے بول اٹھے۔

"صاحبان، واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رکن جو چشمہ لگائے تھے اور ہفتہ وار اخبار کے مدیر اعزازی تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا "حضرات ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری اور پرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری، اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جا رہا ہے، منشیات کا استعمال بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنان بازاری کا ناپاک وجود ہے کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلف گرہ گیر کے اسیرے ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقہ سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جامہ انسانیت سے باہر ہو جاتے اور قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جان عزیز سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں

میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کش مکش حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر ستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سایہ میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے۔ تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی تھی اور لہجہ فریاد کا انداز لئے ہوئے تھا۔ بولے صاحبان رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ۔ ان کی گلے بازیاں 'ان کے عشاق کی دھینگا مشتی' گالی گلوچ' شور و غل ہا ہا ہا ہو ہو ہو' سن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفا کے کان پک گئے ہیں۔ ضیق میں جان آگئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں انکے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو برا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحب اولاد خود کر سکتا ہے۔

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ بد قسمتی سے ان کا مکان اس بازار حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثار قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب ہمارے اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں۔ جب وہ اس بازار سے گذرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھگنا' اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے۔ مگر سر بڑا تھا۔ جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں حد درجہ متانت تھی۔ بولے "حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لئے باعث صد عار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟"

ایک صاحب بول اٹھے۔ "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبار شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب صدر بولے۔ "حضرات یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انھیں اپنے گھروں میں گھسنے نہ دیں گے اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لئے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے' یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے۔ "بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔"

صدر نے کہا۔ "صاحبان یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔"

یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہیے اور انھیں رہنے کے لیے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دیدینا چاہیے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنان بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کئے جاتے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ تاکہ اس عرصے میں وہ نئے علاقہ میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس سے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی بستی ہو گی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے۔ اور دن دہاڑے الو بولتا تھا۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے' یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روز روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنے وابستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادل ناخواستہ اس علاقہ میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے' ان کے دام انہیں اچھے وصول ہو گئے تھے اور اس علاقہ میں زمین کی قیمت برائے نام تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھانی لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی' منتخب کی گئی زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابک دست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ' مٹی' چونا' شہتیر' گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان گاڑیوں' چھکڑوں' خچروں' گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی صاحب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انھیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے مزدور ادھر ادھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور ایک ہنگامہ رہتا۔ اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر ستانے کی غرض سے' اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گذاری کے خیال سے' سب سے پہلے اسی کی مرمت کی چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا۔ اس لیے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کو بارہ بجے' جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دو ڈھائی سو راج' مزدور' میر عمارت' منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے' اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سن کر آگئی۔ اس کے ساتھ ایک خورد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ' بیڑی' چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گذرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنویں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترا بنا' پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو جو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر لے لو خربوزے' شہد سے میٹھے خربوزے! کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا' گھر سے سری پائے پکا دیگچی میں رکھ' خوانچہ میں لگا' تھوڑی سی روٹیاں مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے کے آموجود ہوا اور اسی بستی کے کارکنوں کو جنگل میں گھر کی ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت' میر عمارت' منشی' معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک

مخلص مسجد میں جا کر اذان دیتا' پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں میں ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف' پنجسورہ' رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آموجود ہوا۔ اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان ٹوکرا اٹھائے آجاتا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولھا بنا' کباب' کلیجی' دل اور گردے سیخوں پر چڑھا' بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لیے پھونس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی' پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے روڑوں کو لڑھکاتا اودھر ادھر گشت کرتا دیکھنے میں آجاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے' کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آجاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آجاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انھیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے 'اوباش و بیکار مباش کچھ کیا کر' کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آجاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے دور ہٹ کر ان کے گرداگرد چکر لگاتے رہتے فقرے کستے بے تکے قہقہے لگاتے۔ عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں پہلے ہی دن' پہلے ہو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقہ کی ویرانی میں ان بیسواؤں کو یہاں آکر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی' وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتیں تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا۔ جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن ایک صبح کو بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس دھواں اٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر' لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے ارد گرد پھر رہا اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لے کر کنویں پر آیا' اور پانی بھر بھر کر مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنویں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا "جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا! میرے باپ دادا' ان کے مجاور تھے۔" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کراماتیں بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیئے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے اللہ ہو کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گذرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھی۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لیے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی۔ جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے بنائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے' جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدہ کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لیے تھا۔ اس میں سنگ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن' اسی بستی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کرا کر شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو' بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دو پہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا' جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکیئے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لیے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے زر بفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے' عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے' ادھر ادھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے' اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے باریک ساریوں میں ملبوس' غازوں اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی نازنین' اٹکھیلیوں سے چلتیں' اور رات بھر رقص اور سرور کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں سازوسامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہو گئیں۔ جھاڑ' فانوس' ظروف بلوری' قد آدم آئینے' نواڑی پلنگ' تصویریں اور قطعات سنہری' چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے۔ اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے' غزلیں یاد کرنے' دھنیں بٹھانے' سبق پڑھنے' تختی لکھنے' سینے پرونے' کاڑھنے' گراموفون سننے' استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے' ضلع جگت' نوک جھونک سے جی بہلانے سونے میں گذارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں' جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا' یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو دھول ہینوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے۔ ان کی قوس قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں' بناؤ سنگار کئے برآمدوں میں ٹہلتی' آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں' ہنستیں کھلکھلاتیں۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے نوکروں میں شراب کی بوتلیں' پھل پھلاری لیے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں جن کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود' ساز کے سر' رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگھروؤں کی آواز' قلقل مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے۔ جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکان دار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پر کرنے کے لئے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور اسے ممبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی' بعض ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی تصویریں بھی پرانے رسالوں سے نکال کر لئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگریٹ' تین تین چار چار پیکٹوں' بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں' دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں' پانوں کی

دھوئی' پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا' تیسری میں حلوائی اور شیر فروش' چوتھی میں قصائی' پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافے پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا چونکہ دکان خاصی کھلی تھی۔ ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار' گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انھیں چنگیر میں ڈال ایک ایک مکان پر لے جاتا۔ اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ' سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا' مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گذر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان پر ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے۔ سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکتے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گذرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی' بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیرباد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر' قسم قسم پاوڈر' صابن' کنگھیاں' بٹن' سوئی' دھاگا' لیس' فیتے' خوشبودار تیل' رومال' منجن' کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار کوئی بزاز' کوئی پنساری' کوئی نیچہ بند' کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھتے ہوئے کرایہ سے گھبرا کر اس بستی میں آ پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار' جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے۔ ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دوکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں' شربت کی بوتلوں اور مربے' چٹنی اچار کے مرتبانوں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر' قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی وہاں انھوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دئے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آ موجود ہوتے اور شربت بزوری' شربت بنفشہ' شربت انار اور ایسے ہی اور نزہت بخش' روح افزا شربت و عرق' خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں' ان میں جن بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش چوسر اور شطرنج کھیلتے' بدن پر تیل ملواتے' سبزی گھوٹتے' بیٹروں کی پالیاں کراتے' تیتروں سے "سبحان تیری قدرت" کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دوکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں' ستار' طنبورے' دلربا وغیرہ ٹانگ دیئے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام وہ اپنی دوکان میں ستار بجاتا' جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دوکان دار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آ جاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی' سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا' غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملاجی، جب تک تو یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیسات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جبکہ انھیں دونوں وقت مرغن کھانا با فراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں پڑھنے آنے لگے، جس سے ملاجی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرایہ اور اپنی بے مائگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اسی بستی کا رخ کیا اور ان بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے ایکٹر ایکٹری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی کرتے تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ، کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت مشقت کی کسر شور و غل، خرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسری اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کستے، گالی گلوچ بکتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازار حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولہا ہلاتا، کبھی منہ چلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا، عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنھیں دیکھ کر یہ لوگ زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے "آؤ، کوئی نئی بستی کو" شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہونچکر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے۔ منہ سے ہارن بجاتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا برا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے، تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم دام پر سواریاں بٹھا، طرارے بھرتے اور گھنگرو بجاتے اس بستی کو جانے لگتے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق در جوق اس پر اسرار بازار کی سیر دیکھنے آتے، جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انھیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوتی تھیں اب اس کی دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمینیں خرید ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں۔ مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکان دار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لئے درخواست بھیجی گئی، جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاکخانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بوڑے میاں ڈاکخانہ کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ اور قلم دوات رکھ، بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا۔ جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہئے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی

میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشائی اگر بائسکوپ شروع ہونے سے پہلے آجائیں تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ لوگ یونہی ستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیر گاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو دار والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے، کاندھے پر میلا کچیلا تولیہ ڈالے 'دل پسند' دل بہار مالش کی صدا لگاتے درد سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں ہوٹل کھل گیا۔ جس میں رات کو قیام کرنے کے لئے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا' ایک فوٹو گرافر' ایک سائیکل کی مرمت والا' ایک لانڈری والا' دو پنواڑی' ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دوکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹو گرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بستی میں نل' روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں' جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔۔۔۔۔۔

اس واقعہ کو بیس برس گذر چلے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پرا شہر بن گئی ہے۔ جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی' کچہری بھی اور جیل خانہ بھی' آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج' دو ہائی اسکول' ایک لڑکوں کے لئے' ایک لڑکیوں کے لئے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں' جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں' اور چار بنک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزانہ' تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی' دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی' ایک صنعتی' ایک طبی' ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں' پندرہ مندر اور دھرم شالے' چھ یتیم خانے' پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں سے ایک صرف عورتوں کیلئے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "حسن آباد" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے "حسن آباد" کے "حسن آباد" کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حسن اور حسن میں امتیاز نہ کرتے آخری بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا۔ جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی اور وہ نام ہے "آنندی"۔

یوں تو سارا شہر بھرا پڑا' صاف ستھرا اور خوشنما ہے مگر سب سے خوبصورت' سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے' جس میں زنان بازاری رہتی ہیں۔

آنندی بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے' ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنان بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے' کیونکہ ان کا وجود انسانیت' شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں۔ "معلوم نہیں' وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیر اثر ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیم اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دی گئی۔۔۔۔۔۔"

اس مرتبہ ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

غلام عباس

اوور کوٹ

جنوری کی ایک شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا اور چیرنگ کراس کا رخ کر کے خراماں خراماں پٹری پر چلنے لگا۔ یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔ لمبی لمبی قلمیں' چمکتے ہوئے بال' باریک باریک موچھیں گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں بادامی رنگ کا گرم اوور کوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا ایک آدھ کھلا پھول اٹکا ہوا' سر پر سبز فلیٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی' سفید سلک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا' ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں' دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی وہ مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ بھرپور جاڑے کا زمانہ۔ سرد اور تند ہوا کسی تیز دھات کی طرح جسم پر آآ کے لگتی تھی مگر اس نوجوان پر اس کا کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا تھا اور لوگ خود کو گرم کرنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے' مگر اسے اس کی ضرورت نہ تھی جیسے اس کڑکڑاتے جاڑے میں اسے ٹہلنے میں بڑا مزہ آ رہا ہو۔

اس کی چال ڈھال سے ایسا بانکپن ٹپکتا تھا کہ تانگے والے دور ہی سے دیکھ کر سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکتے' مگر وہ چھڑی کے اشارے سے نہیں کر دیتا۔ ایک خالی ٹیکسی بھی اسے دیکھ کر رکی' مگر اس نے "نو تھینک یو" کہ کر اسے بھی ٹال دیا۔

جیسے جیسے وہ مال کے زیادہ بارونق حصے کی طرف پہنچتا جاتا تھا' اس کی چونچالی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ منہ سے سیٹی بجا کے رقص کی ایک انگریزی دھن نکالنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں بھی تھرکتے ہوئے اٹھنے لگے۔ ایک دفعہ جب آس پاس کوئی نہیں تھا تو یکبارگی کچھ ایسا جوش آیا کہ اس نے دوڑ کر جھوٹ موٹ بال دینے کی کوشش کی۔ گویا کرکٹ کا میچ ہو رہا ہے۔

راستے میں وہ سڑک آئی جو لارنس گارڈن کی طرف جاتی تھی' مگر اس وقت شام کے دھندلکے اور سخت کہرے میں اس باغ پر کچھ ایسی اداسی برس رہی تھی کہ اس نے ادھر کا رخ نہ کیا اور سیدھا چیرنگ کراس کی طرف چلتا رہا۔

ملکہ کے بت کے قریب پہنچ کر اس کی حرکات و سکنات میں کسی قدر متانت پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنا رومال نکالا جسے جیب میں رکھنے کے بجائے اس نے کوٹ کی بائیں آستین میں اڑس رکھا تھا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرا۔ تاکہ کچھ گرد جم گئی ہو تو اتر جائے۔ پاس گھاس کے ایک ٹکڑے پر کچھ انگریز بچے ایک بڑی سی گیند سے کھیل رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا بچے کچھ دیر تک اس کی پروا کئے بغیر کھیل میں مصروف رہے۔ مگر جب وہ برابر تکے ہی چلا گیا تو وہ رفتہ رفتہ شرمانے سے لگے اور پھر اچانک گیند سنبھال کر ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ گھاس کے اس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔

نوجوان کی نظر سیمنٹ کی ایک خالی بنچ پر پڑی اور وہ اس پر آ کے بیٹھ گیا۔ اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی اس کی یہ شدت ناخوشگوار نہ تھی' بلکہ لذت پرستی کی ترغیب دیتی تھی۔ شہر کے عیش پسند طبقے کا تو کہنا ہی کیا وہ تو اس سردی میں زیادہ ہی کھل کھیلتا ہے تنہائی میں بسر کرنے والے بھی اس سردی سے ورغلائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اپنے کونوں کھدروں سے نکل کر محفلوں اور مجموں میں جانے کی سوچنے لگتے ہیں تاکہ جسموں کا قرب حاصل ہو۔ حصول لذت کی یہی جستجو لوگوں کو مال پر کھینچ لائی تھی اور وہ حسب توفیق

ریستورانوں 'کافی ہاؤسوں 'رقص گاہوں 'سینماؤں اور تفریح کے دوسرے مقاموں پر محظوظ ہو رہے تھے۔
مال روڈ پر موٹروں 'تانگوں اور بائیسکلوں کا تانتا بندھا ہوا تو تھا ہی پٹڑی پر چلنے والوں کی بھی کثرت تھی۔ علاوہ ازیں سڑک کی دو رویہ دکانوں میں خرید و فروخت کا بازار بھی گرم تھا۔ جن کم نصیبوں کو نہ تفریح طبع کی استطاعت تھی نہ خرید و فروخت کی وہ دور ہی سے کھڑے کھڑے ان تفریح گاہوں اور دکانوں کی رنگا رنگ روشنیوں سے جی بہلا رہے تھے۔
نوجوان سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھا اپنے سامنے سے گذرتے ہوئے زن و مرد کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر ان کے چہروں سے کہیں زیادہ ان کے لباس پر پڑتی تھی۔ ان میں ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ تھے۔ بڑے بڑے تاجر 'سرکاری افسر 'لیڈر 'فن کار 'کالجوں کے طلبہ اور طالبات 'رئیس 'اخباروں کے نمائندے دفتروں کے بابو زیادہ تر لوگ اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے اوور کوٹ قراقلی کے بیش قیمت اوور کوٹ سے لے کر خاکی پٹی کے پرانے فوجی اوور کوٹ تک جنہیں نیلام میں خریدا گیا تھا۔
نوجوان کا اپنا اوور کوٹ تھا تو خاصا پرانا مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا پھر وہ سلا ہوا بھی کسی ماہر درزی کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کالر خوب جما ہوا تھا۔ باہوں کی کریزیں بڑی نمایاں 'سلوٹ کہیں نام کو نہیں 'بٹن سینگ کے بڑے بڑے چمکتے ہوئے۔ نوجوان اس میں بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔
ایک لڑکا پان بیڑی سگرٹ کا صندوقچہ گلے میں ڈالے سامنے سے گزرا نوجوان نے آواز دی
"پان والا۔"
"جناب۔"
"دس کا چینج ہے؟"
"ہے تو نہیں۔ لادوں گا۔ کیا لیں گے آپ؟"
"نوٹ لے کے بھاگ گیا تو؟"
"اجی واہ۔ کوئی چور اچکا ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔ اعتبار نہ ہو تو میرے ساتھ چلئے۔ لیں گے کیا آپ؟"
"نہیں نہیں ہم خود چینج لائیں گے۔ لو یہ اکنی نکل آئی۔ گولڈ فلیک کا ایک سگرٹ دے دو اور چلے جاؤ۔"
لڑکے کے جانے کے بعد مزے مزے سے سگرٹ کے کش لگانے لگا۔ وہ ویسے ہی بہت خوش نظر آتا تھا۔ گولڈ فلیک کے مصفا دھویں نے اس پر سرور کی کیفیت طاری کر دی۔
ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی بلی سردی میں ٹھٹھری ہوئی بنچ کے نیچے اس کے قدموں کے پاس آکر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس نے پچکارا تو اچھل کر بنچ پر آچڑھی۔ اس نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا "پور ش سول!"
اس کے بعد وہ بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سڑک کو پار کر کے اس طرف چلا جدھر سینما کی رنگ برنگی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ تماشا شروع ہو چکا تھا۔ سینما کے برآمدے میں بھیڑ نہ تھی۔ صرف چند لوگ تھے جو آنے والی فلموں کی تصویروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ تصویریں چھوٹے بڑے کئی بورڈوں پر چسپاں تھیں۔ ان میں کہانی کے چیدہ چیدہ مناظر دکھائے گئے تھے۔
تین نوجوان اینگلو انڈین لڑکیاں ان تصویروں کو ذوق و شوق سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک خاص شان استغنا کے ساتھ مگر صنف نازک کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ مگر مناسب فاصلے سے ان تصویروں کو دیکھتا رہا۔ لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتی جاتی تھیں اور فلم پر رائے زنی بھی۔ اچانک ایک لڑکی نے جو اپنی ساتھ والیوں سے زیادہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی۔ ایک قہقہہ لگایا اور پھر وہ تینوں ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔ نوجوان نے اس کا کچھ اثر قبول نہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خود بھی سینما کی عمارت سے باہر نکل آیا۔
اب سات بج چکے تھے اور وہ مال کی پٹڑی پر پھر پہلے کی طرح سرگشت کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک ریستوران میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔

اندر سے کہیں زیادہ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں زیادہ تر موٹروں کے ڈرائیور، کوچوان، پھل بیچنے والے جو اپنا مال بیچ کے خالی ٹوکرے لئے کھڑے تھے۔ کچھ راہ گیر جو چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے، کچھ مزدوری پیشہ لوگ تھے اور کچھ گداگر۔ یہ اندر والوں سے کہیں زیادہ گانے کے رسیا معلوم ہوتے تھے، کیونکہ وہ غل غپاڑا نہیں مچا رہے تھے، بلکہ خاموشی سے نغمہ سن رہے تھے حالانکہ دھن اور ساز اجنبی تھے۔ نوجوان پل بھر کے لئے رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور چل کر اسے انگریزی موسیقی کی ایک بڑی سی دکان نظر آئی اور وہ بلا تکلف اندر چلا گیا۔ ہر طرف شیشے کی الماریوں میں طرح طرح کے انگریزی ساز رکھے تھے۔ ایک لمبی میز پر مغربی موسیقی کی دو ورقی کتابیں چنی تھیں۔ یہ نئے چلتر گانے تھے سرورق خوب صورت رنگ دار مگر دھنیں گھٹیا۔ ایک جھلتی ہوئی نظر ان پر ڈالی، پھر وہاں سے ہٹ آیا اور سازوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک ہسپانوی گٹار پر جو ایک کھونٹی سے ٹنگی ہوئی تھی ناقدانہ نظر ڈالی، اور اس کے ساتھ قیمت کا جو ٹکٹ لٹک رہا تھا اسے پڑھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک بڑا جرمن پیانو رکھا تھا۔ اس کا کور اٹھا کے انگلیوں سے بعض پردوں کو ٹٹولا اور پھر کور بند کر دیا۔

دکان کا ایک کارندہ اس کی طرف بڑھا۔

"گڈ ایوننگ سر۔ کوئی خدمت؟"

"نہیں شکریہ۔ ہاں اس مہینے کی گراموفون ریکارڈوں کی فہرست دے دیجئے۔"

فہرست لے کے اوور کوٹ کی جیب میں ڈالی۔ دکان سے باہر نکل آیا اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا بک سٹال پڑا۔ نوجوان یہاں بھی رکا۔ کئی تازہ رسالوں کے ورق الٹے۔ رسالہ جہاں سے اٹھاتا بڑی احتیاط سے وہیں رکھ دیتا اور آگے بڑھا تو قالینوں کی ایک دکان نے اس کی توجہ کو جذب کیا۔ مالک دکان نے، جو ایک لمبا سا چغہ پہنے اور سر پر کلاہ رکھے تھا، گرم جوشی سے اس کی آؤ بھگت کی۔

"ذرا یہ ایرانی قالین دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتاریے نہیں یہیں دیکھ لوں گا۔ کیا قیمت ہے اس کی؟"

"چودہ سو بتیس روپے۔"

نوجوان نے اپنی بھنوؤں کو سکیڑا جس کا مطلب تھا "اوہو اتنی۔"

دکاندار نے کہا۔ "آپ پسند کر لیجئے۔ ہم جتنی بھی رعایت کر سکتے ہیں کر دیں گے۔"

"شکریہ، لیکن اس وقت تو میں صرف ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔"

"شوق سے دیکھئے۔ آپ ہی کی دکان ہے۔"

دو تین منٹ کے بعد اس دکان سے بھی نکل آیا۔ اس کے اوور کوٹ کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا جو ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا تھا۔ وہ اس وقت کاج سے کچھ زیادہ باہر نکل آیا تھا۔ جب وہ اس کو ٹھیک کر رہا تھا۔ تو اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف اور پر اسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پھر اپنی سیر گشت شروع کر دی۔

اب وہ ہائی کورٹ کی عمارتوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اتنا کچھ چل لینے کے بعد اس کی طبیعت کی چونچالی میں کچھ فرق نہیں آیا تھا، نہ تکان محسوس ہوئی تھی نہ اکتاہٹ، یہاں پٹڑی پر چلنے والوں کی ٹولیاں کچھ چھٹ سی گئی تھیں اور ان میں کافی فصل رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بید کی چھڑی کو ایک انگلی پر گھمانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور چھڑی زمین پر گر پڑی۔ "او سوری" کہہ کر زمیں پر جھکا اور چھڑی کو اٹھا لیا۔۔۔۔

نوجوان نے شام سے اب تک اپنی سیر گشت کے دوران میں جتنی انسانی شکلیں دیکھی تھیں ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا تھا۔ فی الحقیقت ان میں کوئی جاذبیت تھی ہی نہیں یا پھر وہ اپنے حال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے سے اسے سروکار ہی نہ تھا۔ مگر ایک دلچسپ جوڑے نے، جس میں کسی افسانے کے کرداروں کی سی ادا تھی، جیسے یک بارگی اس کے دل کو موہ لیا تھا اور اسے حد درجہ

مشتاق بنا دیا کہ وہ ان کی اور بھی باتیں سنے اور ہو سکے تو قریب سے ان کی شکلیں بھی دیکھ لے۔

اس وقت وہ تینوں بڑے ڈاک خانے کے چوراہے کے پاس پہنچ گئے تھے لڑکا اور لڑکی پل بھر کو رکے اور پھر سڑک پار کر کے میکلوڈ روڈ پر چل پڑے۔ نوجوان مال روڈ پر ہی ٹھہرا رہا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ فی الفور ان کے پیچھے گیا تو ممکن ہے انہیں شبہ ہو جائے کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اسے کچھ لمحے رک جانا چاہئے۔

جب وہ لوگ کوئی سو گز آگے نکل گئے تو اس نے لپک کر ان کا پیچھا کرنا چاہا مگر ابھی اس نے آدھی ہی سڑک پار کی ہوگی کہ اینٹوں سے بھری ہوئی ایک لاری پیچھے سے بگولے کی طرح آئی اور اسے روندتی ہوئی میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گئی۔ لاری کے ڈرائیور نے نوجوان کی چیخ سن کر پل بھر کیلئے گاڑی کی رفتار کم کی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی لاری کی لپیٹ میں آگیا اور وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاری کو لے بھاگا۔ دو تین راہ گیر جو اس حادثے کو دیکھ رہے تھے۔ شور مچانے لگے "نمبر دیکھو، نمبر دیکھو"۔ مگر لاری ہوا ہو چکی تھی۔

اتنے میں کئی اور لوگ جمع ہو گئے۔ ٹریفک کا ایک انسپکٹر جو موٹر سائیکل پر جا رہا تھا رک گیا۔ نوجوان کی دونوں ٹانگیں بالکل کچل گئی تھیں۔ بہت سا خون نکل چکا تھا اور وہ سسک رہا تھا۔

فوراً ایک کار کو روکا گیا اور اسے جیسے تیسے اس میں ڈال کر بڑے ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ جس وقت وہ ہسپتال پہنچا تو اس میں ابھی رمق بھر جان باقی تھی۔

اس ہسپتال کے شعبہ حادثات میں اسسٹنٹ سرجن مسٹر خان اور دو نوعمر نرسیں مس شہناز اور مس گل ڈیوٹی پر تھیں۔ جس وقت اسے سٹریچر پر ڈال کے آپریشن روم میں لے جایا جا رہا تھا تو ان نرسوں کی نظر اس پر پڑی۔ اس کا بادامی رنگ کا اوور کوٹ ابھی تک اس کے جسم پر تھا اور سفید سلک کا مفلر گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جا بجا خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ کسی نے از راہ دردمندی اس کی سبز فلیٹ ہیٹ اٹھا کے اس کے سینہ پر رکھ دی تھی تاکہ کوئی اڑا نہ لے جائے۔

شہناز نے گل سے کہا "کسی بھلے گھر کا معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔"

گل دبی آواز میں بولی "خوب بن ٹھن کے نکلا تھا بے چارہ ہفتے کی شام منانے۔"

"ڈرائیور پکڑا گیا یا نہیں؟"

"نہیں بھاگ گیا۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے۔"

آپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے جنہوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کے سارے حصے کو چھپا رکھا تھا۔ اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔ اس نے سر میں جو تیز خوشبو دار تیل ڈال رکھا تھا۔ اس کی کچھ کچھ مہک ابھی تک باقی تھی۔ پٹیاں ابھی تک جمی ہوئی تھیں۔ حادثے سے ان کی دونوں ٹانگیں تو ٹوٹ چکی تھیں مگر سر کی مانگ نہیں بگڑنے پائی تھی۔

اب اس کے کپڑے اتارے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے سفید سلک کا گلوبند اس کے گلے سے اتارا گیا۔ اچانک نرس شہناز اور نرس گل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ چہرے جو دلی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں، جراحی کے نقاب تلے چھپے ہوئے تھے اور زبانیں بند۔

نوجوان کے گلوبند کے نیچے نکٹائی اور کالر تو کیا، سرے سے قمیض ہی نہیں تھی۔ اوور کوٹ اتارا گیا تو نیچے سے ایک بوسیدہ اونی سویٹر نکلا۔ جس میں جا بجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سویٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آ رہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سے گلے پر لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی تہیں بھی خوب چڑھی ہوئی تھیں۔

ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا البتہ گردن خوب صاف تھی اور اس پر ہلکا ہلکا پوڈر لگا ہوا تھا۔ سوئٹر اور بنیان کے بعد پتلون کی باری آئی اور شہناز اور گل کی نظریں پھر بیک وقت اٹھیں۔

پتلون کو پیٹی کے بجائے ایک پرانی دھجی سے جو شاید کبھی نکٹائی ہو گی خوب کس کے باندھا گیا تھا۔ بٹن اور بکسوئے غائب تھے۔ دونوں گھٹنوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا اور کئی جگہ کھونچیں بھی لگی تھیں۔ مگر چونکہ یہ حصے اوور کوٹ کے نیچے رہتے تھے اس لئے لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

اب بوٹ اور جرابوں کی باری آئی اور ایک مرتبہ پھر مس شہناز اور مس گل کی آنکھیں چار ہوئیں۔

بوٹ تو پرانے ہونے کے باوجود خوب چمک رہے تھے' مگر ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے بالکل مختلف تھی۔ پھر دونوں جرابیں پھٹی ہوئی بھی تھیں۔ اس قدر کہ ان میں سے نوجوان کی میلی میلی ایڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

بلا شبہ اس وقت تک وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم سنگ مرمر کی میز پر بے جان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ جو پہلے چھت کی سمت تھا کپڑے اتارنے میں دیوار کی طرف مڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور اس کے ساتھ روح کی اس برہنگی نے اسے خجل کر دیا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں سے آنکھیں چرا رہا ہے۔

اس کے اوور کوٹ کی مختلف جیبوں سے جو چیزیں بر آمد ہوئیں وہ یہ تھیں۔

ایک چھوٹا سا سیاہ کنگھا' ایک رومال' ساڑھے چھے آنے' ایک بجھا ہوا آدھا سگریٹ' ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں لوگوں کے نام اور پتے لکھے تھے نئے گراموفون ریکارڈوں کی ایک ماہانہ فہرست اور کچھ اشتہار جو مٹر گشت کے دوران میں اشتہار بانٹنے والوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دئے تھے اور اس نے انہیں اوور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

افسوس کہ اس کی بید کی چھڑی' جو حادثے کے دوران میں کہیں کھو گئی تھی۔ اس فہرست میں شامل نہ تھی۔

سعادت حسن منٹو

نام : سعادت حسن

قلمی نام : آدم / سعادت حسن منٹو / منٹو

پیدائش : ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء بہ مقام سمبرالہ ضلع لدھیانہ ،مشرقی پنجاب ،بھارت

وفات : ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء بہ مقام لاہور ،مغربی پنجاب ،پاکستان

تعلیم : میٹرک مسلم ہائی سکول امرت سر (پنجاب یونی ورسٹی لاہور) ۱۹۳۱ء

امرت سر، لاہور، علی گڑھ اور دہلی کے مختلف سکولوں میں زیر تعلیم رہے۔ میٹرک کا امتحان مسلم ہائی سکول، امرتسر سے پاس کرنے میں چار برس لگ گئے۔ تین بار فیل ہوئے(۱) اور آخر کار ۱۹۳۱ء میں یہ امتحان درجہ سوم میں پاس کیا۔ اردو کے پرچے میں برابر فیل چلے آتے تھے، چوتھی بار میٹرک تو پاس کر گئے لیکن اردو کے مضمون میں فیل ہی رہے۔ انٹر کے طالب العلم کی حیثیت سے پہلی ہندو سبھا کالج امرتسر میں داخلہ لیا اور اس کے بعد ایم اے او کالج، امرتسر چلے آئے۔ انٹر تو نہ کر سکے البتہ ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچ گئے، جہاں چند ماہ گذارے۔ یونی ورسٹی حکام نے انہیں تپ دق کا مریض قرار دے کر یونی ورسٹی حدود میں داخل ہونے پر پابندی لگا دی۔

مختصر حالات زندگی:

منٹو کے والد میاں غلام حسن حکومت پنجاب کے محکمہ انصاف میں سب جج تھے اور منٹو کی والدہ سردار بیگم ،میاں صاحب کی دوسری بیوی۔ مسلم ہائی سکول امرتسر میں زمانہ طالب العلمی کے دوران رات دن انگریزی ناول پڑھتے، دوستوں میں چوری کے پلاٹ سنا کر داد سمیٹتے اور خالص ناسیانہ انداز میں انگریزی بولتے تھے۔ چنانچہ اسکول کے ساتھیوں میں ان کا نام "ٹامی" پڑ گیا۔ اس زمانے میں کثرت مطالعہ نے انہیں کہیں کا نہ رکھا، گھر سے پیسے چراتے، رشتہ داروں اور دوستوں سے قرض لے کر ناولیں خریدتے۔ یہاں تک کہ ایک بار امرتسر ریلوے اسٹیشن پر قائم ڈبلیو ایچ وہلر کے بک سٹال سے کتاب چرائی اور پکڑے گئے۔ پولیس کے سپاہی تھانے لے جانے لگے تو "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔ لوگ سمجھے سیاسی ملزم ہے، ہجوم اکٹھا ہو گیا اور پولیس کو ناچار پیچھے ہٹنا پڑا۔(۲)

سکول کے زمانے میں اردو کے استاد رانا مبارک خان سالک صہبائی منٹو کو روزانہ املا لکھواتے ،لیکن "لکھے موسیٰ پڑھے خدا" والا معاملہ رہا۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۵ء تک رہا، بقول مولانا حامد علی خاں ، "ہمایوں" کا روسی ادب نمبر مرتب کرنے کے دنوں میں منٹو نے انہیں ایک افسانہ "ریش و موش" کے عنوان سے سنایا ،"موش" سے مراد "مونچھ" تھا(۳)۔ میٹرک میں تین بار ناکام رہنے کے بعد چوتھی بار امتحان کے دنوں میں منٹو بغیر اطلاع کے بمبئی بھاگ گئے۔ مسلم ہائی سکول امرتسر کے ہیڈ ماسٹر محمد عمر خاں (معروف فکاہی کالم نگار نصر اللہ خاں کے والد) کی نشاندہی پر واپس آنا پڑا تو ہیڈ ماسٹر صاحب کے خلاف منٹو نے حسن بن صباح کمیٹی تشکیل دی اور اس پارٹی کی جانب سے شہر کی دیواروں پر ہاتھ سے لکھے پوسٹر لگائے ،جس کا مضمون یہ تھا:

"ہیڈ ماسٹر محمد عمر خاں

ملت اسلامیہ کے ہونہار فرزندوں کا قاتل ہے۔ وہ ہر وقت طالب علموں کو پڑھا کر انھیں برباد کرنا چاہتا ہے۔ اگر اسے جلد از جلد ہیڈ ماسٹری سے علیحدہ نہ کیا گیا تو انجمن اسلامیہ کے خلاف تحریک چلائی جائے گی۔

کارکنان انجمن حسن بن صباح"

یہ الگ بات ہے کہ اس بار منٹو امتحان میں کامیاب بھی ہو گئے۔ میٹرک کے امتحان کے بعد منٹو چند ماہ کے لیے علی گڑھ گئے اور چپ چاپ امرتسر واپس آگئے۔ اب انھوں نے غازی عبدالرحمان کے اخبار "مساوات" امرتسر کے لیے ترجمہ نگاری کی۔ یہی زمانہ ہے جب منٹو نے باری علیگ کی ہدایت پر ۱۹۳۳ء میں وکٹر ہیوگو کے ناول "The Last Days of Condemned" کا ترجمہ "سرگزشت اسیر" کے نام سے اور آسکر وائلڈ کے ایک ڈرامے کا ترجمہ (یہ اشتراک حسن عباس) دارالاحمر امرتسر کے لیے "ویرا" کے نام سے کیا اور راتوں رات شہرت حاصل کر لی۔ پہلے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں بطور سکرپٹ ایڈیٹر گئے وہاں منور نجن پکچرز کی فلم "بنجارہ" لکھی اور اس کے بعد بمبئی پہنچ گئے۔ اس وقت فلم انڈسٹری میں بڑے بڑے گھاگ بیٹھے تھے، انھیں کسی نے گھاس نہ ڈالی تو جھٹ ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا، ہفتہ وار فلمی اخبار "مصور" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ فلمی نماں خانوں میں جھانکتے ہوئے اس اخبار کے ذریعے اپنی شہرت کا وہ ڈھنڈورا پیٹا کہ اک طوفان مچ گیا اور اس طوفان میں ایک نئی لہر کا اضافہ اس وقت ہوا جب "دھواں" "کالی شلوار" "بو" "کھول دو" اور "ٹھنڈا گوشت" سے متعلق فحش نگاری کے الزام میں منٹو کو انجمن ترقی پسند مصنفین سے نکال باہر کیا گیا اور حکومتی سطح پر مقدمے چلائے گئے۔ منٹو بمبئی سے آکر لاہور کی عدالتوں میں حاضری دیتے رہے۔ ۱۹۳۸ء میں ان کی والدہ بھی امرتسر سے بمبئی پہنچ گئیں اور بیٹے کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے مئی ۱۹۳۸ء میں منٹو کا نکاح کشمیری خاندان کی ایک سادہ سی لڑکی صفیہ سے کروا دیا، البتہ رخصتی ۲۶ اپریل ۱۹۳۹ء کو ہوئی۔ اس وقت منٹو ہندوستان سنے ٹون فلم کمپنی سے منسلک تھے اور ان کے لیے فلم "اپنی نگریا" لکھ کر مالی حالت میں بہتری لا چکے تھے۔ بمبئی میں رہ کر بہت عزت پائی لیکن مالی حالت ہمیشہ ڈانواں ڈول رہی۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں لاہور منتقل ہو گئے۔ ان کا قلم رواں رہا لیکن معاشی مسئلہ کو سلجھا نہ سکے۔ منٹو کی مخصوص سنک اور شراب کی لت نے کہیں کا نہ رکھا۔ دو بار ذہنی امراض کے شفاخانے میں رہے۔ زندگی کے اس اہم موڑ پر گھریلو سطح پر بھی تلخیوں نے جنم لیا اور جب یہ عظیم فنکار ہوش میں آیا تو موت نے مہلت نہ دی۔ ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو مرتے وقت منٹو نے اپنی صابر بیوی صفیہ سے کہا: "اب یہ ذلت ختم ہو جانی چاہیے۔"

اولین مطبوعہ افسانہ:

"تماشا" (یہ افسانہ "آدم" کے قلمی نام سے لکھا) مطبوعہ: ہفت روزہ "خلق" امرتسر: ۱۹۳۳ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "آتش پارے" (آٹھ افسانے) اردو بک سٹال لاہور: مجتبائی پرنٹنگ پریس، طبع اول: ۱۹۳۶ء

۱۔ خونی تھوک ۲۔ انقلاب پسند ۳۔ جی آیا صاحب ۵۔ تماشا ۶۔ طاقت کا امتحان ۷۔ دیوانہ شاعر ۸۔ چوری (کتاب کے دیباچے پر ۵ جنوری ۱۹۳۶ء کی تاریخ درج ہے)

۲۔ "منٹو کے افسانے" (چھبیس افسانے) ساقی بک ڈپو، دہلی، طبع اول: اگست ۱۹۴۰ء

۱۔ نیا قانون ۲۔ شغل (میکسم گورکی کی یاد میں) ۳۔ چھاہا ۴۔ ٹیڑھی لکیر (ایک سٹڈی) ۵۔ شرابی (جواہر لال نہرو کے نام)

۶۔ تماشا ۷۔ شوشو ۸۔ خوشیا ۹۔ بانجھ ۱۰۔ نعرہ ۱۱۔ شہ نشین پر ۱۲۔ طاقت کا امتحان ۱۳۔ اس کا پتی ۱۴۔ موسم کی شرارت ۱۵۔ خود کشی کا اقدام ۱۶۔ بیگو ۱۷۔ منتر ۱۸۔ انقلابی ۱۹۔ میرا اور اس کا انتقام ۲۰۔ اسٹوڈنٹ یونین کیمپ ۲۱۔ موم بتی کے آنسو ۲۲۔ دیوالی کے دیئے ۲۳۔ جنک ۲۴۔ ڈرپوک ۲۵۔ دس روپے ۲۶۔ مسز ڈی کوسٹا۔

(بعد کے ایڈیشنوں میں سے پھاہا' شرابی' تماشا' طاقت کا امتحان' خود کشی کا اقدام' انقلابی اور اسٹوڈنٹ یونین کیمپ خارج ہو گئے اور ان کی جگہ "پہچان" اور "بلاؤز" نے لے لی۔

۳۔ "دھواں" (بائیس افسانے دو ڈرامے) ساقی بک ڈپو' دھلی' طبع اول: ۱۹۴۱ء

۱۔ دھواں ۲۔ کبوتروں والا سائیں ۳۔ الو کا پٹھا ۴۔ نامکمل تحریر ۵۔ قبض ۶۔ ایکٹریس کی آنکھ ۷۔ وہ خط جو پوسٹ نہ کئے گئے ۸۔ مصری کی ڈلی ۹۔ ماتمی جلوس ۱۰۔ تکون (ڈرامہ) ۱۱۔ سجدہ ۱۲۔ ترقی پسند ۱۳۔ نیا سال ۱۴۔ چوہے دان ۱۵۔ چوری ۱۶۔ قاسم ۱۷۔ دیوانہ شاعر ۱۸۔ کالی شلوار ۱۹۔ لالٹین ۲۰۔ انتظار (ڈرامہ) ۲۱۔ پھولوں کی سازش ۲۲۔ گرم سوٹ ۲۳۔ میرا ہمسفر ۲۴۔ پریشانی کا سبب۔

۴۔ "افسانے اور ڈرامے" (سات افسانے' ایک ریڈیائی ڈرامہ' ایک فیچر' چار سٹیج ڈرامے) ادارہ اشاعت اردو' حیدر آباد دکن: طبع اول: ۱۹۴۳ء

۱۔ بلاؤز ۲۔ شیرو ۳۔ مس فریا ۴۔ آم ۵۔ خونی تھوک ۶۔ مسز ڈی سلوا ۷۔ غسل خانہ

(اب ظفر برادرز لاہور نے اسی مجموعے کو "ایک مرد" کے نام سے شائع کیا ہے)

۵۔ "لذت سنگ" (تین افسانے) نیا ادارہ لاہور' طبع اول: ۱۹۴۷ء

۱۔ بو ۲۔ دھواں ۳۔ کالی شلوار

(ایک ایڈیشن مکتبہ جدید دہلی نے بھی شائع کیا ہے)

۶۔ "چغد" (نو افسانے) کتب پبلشرز' بمبئی' طبع اول: جون ۱۹۴۸ء

۱۔ ایک خط ۲۔ ڈھارس ۳۔ چغد ۴۔ پڑھئے کلمہ ۵۔ مس ٹین والا ۶۔ بابو گوپی ناتھ ۷۔ میرا نام رادھا ہے ۸۔ جانکی ۹۔ پانچ دن۔

۷۔ "ٹھنڈا گوشت" (آٹھ افسانے) مکتبہ جدید' لاہور' طبع اول: ۱۹۵۰ء

ابتداء میں "زحمت مہر درخشاں" الحاقی صفحات کا دیباچہ

۱۔ ٹھنڈا گوشت ۲۔ گولی ۳۔ رحمت خداوندی کے پھول ۴۔ ساڑھے تین آنے ۵۔ پیرن ۶۔ خورشٹ ۷۔ باسط ۸۔ شاردا

(یہ کتاب مکتبہ نو' دہلی نے ۱۹۲ صفحات پر ۱۹۵۰ء میں شائع کی ہے)

۸۔ "خالی بوتلیں' خالی ڈبے" (تیرہ افسانے) مکتبہ جدید' لاہور' طبع اول: ستمبر ۱۹۵۰ء

۱۔ خالی بوتلیں خالی ڈبے ۲۔ سائے ۳۔ ٹوٹو ۴۔ رام کھلاون ۵۔ بسم اللہ ۶۔ ننگی آوازیں ۷۔ شانتی ۸۔ خالد میاں ۹۔ دو قومیں ۱۰۔ مجید کا ماضی ۱۱۔ حامد کا بچہ ۱۲۔ لائسنس ۱۳۔ کتاب کا خلاصہ

۹۔ "نمرود کی خدائی" (بارہ افسانے) نیا ادارہ لاہور' طبع اول: ۱۹۵۰ء

۱۔ کھول دو ۲۔ سوراج کے لئے ۳۔ ڈارلنگ ۴۔ بد تمیز ۵۔ عزت کیلئے ۶۔ ہارتا چلا گیا ۷۔ شیر آیا' شیر آیا دوڑنا ۸۔ شریفن ۹۔ ہرنام کور ۱۰۔ شہید ساز ۱۱۔ بی زمانی بیگم ۱۲۔ دیکھ کبیرا رویا۔

۱۰۔ "بادشاہت کا خاتمہ" (گیارہ افسانے) مکتبہ اردو لاہور' طبع اول: ۱۹۵۱ء

۱۔ بادشاہت کا خاتمہ ۲۔ تقی صاحب ۳۔ والد صاحب ۴۔ عورت ذات ۵۔ عشق حقیقی ۶۔ کتے کی دعا ۷۔ پری ۸۔ خود فریب ۹۔ بڑی لڑکی ۱۰۔ نوبھا بائی ۱۱۔ ایبی ڈوو۔
ایک ایڈیشن گوشہ ادب 'لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۱۱۔ "یزید" (نو افسانے) مکتبہ جدید 'لاہور' طبع اول: نومبر ۱۹۵۱ء
۱۔ یزید ۲۔ گورمکھ سنگھ کی وصیت ۳۔ آخری سیلوٹ ۴۔ جھوٹی کہانی ۵۔ ٹیٹوال کا کتا ۶۔ ۱۹۱۹ء کی ایک بات ۷۔ چور ۸۔ بگی ۹۔ ممی۔

۱۲۔ "سڑک کے کنارے" (گیارہ افسانے) نیا ادارہ 'لاہور' طبع اول: ۱۹۵۳ء
۱۔ شاداں ۲۔ شیکارانی ۳۔ نفسیاتی مطالعہ ۴۔ موتری ۵۔ نطفہ ۶۔ سڑک کے کنارے ۷۔ سراج ۸۔ سو کینڈل پاور کا بلب ۹۔ خدا کی قسم ۱۰۔ موذیل ۱۱۔ صاحب کرامات
(ایک ایڈیشن نیو تاج آفس دہلی نے بھی شائع کیا ہے)

۱۳۔ "سرکنڈوں کے پیچھے" (تیرہ افسانے) ادارہ فروغ اردو 'لاہور' طبع اول: اکتوبر ۱۹۵۴ء
۱۔ بلونت سنگھ مجیٹھیا ۲۔ آنکھیں ۳۔ جاؤ حنیف جاؤ ۴۔ شادی ۵۔ اللہ دتا ۶۔ پھنی ۷۔ سرکنڈوں کے پیچھے ۸۔ وہ لڑکی ۹۔ محمودہ ۱۰۔ پھسپھسی کہانی ۱۱۔ جھمن ۱۲۔ ممد بھائی ۱۳۔ حسن کی تخلیق ۱۴۔ منٹو (خاکہ) (اس کتاب کا ایک ایڈیشن حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے بھی ۱۹۵۵ء میں شائع کیا ہے)

۱۴۔ "پھندنے" (گیارہ افسانے ایک ڈرامہ) مکتبہ جدید 'لاہور' طبع اول: جنوری ۱۹۵۵ء
۱۔ نوبہ ٹیک سنگھ ۲۔ فرشتہ ۳۔ پھندنے ۴۔ بدصورتی ۵۔ مس مالا ۶۔ دودا پہلوان ۷۔ مسٹر معین الدین ۸۔ سودا بیچنے والی ۹۔ عشقیہ کہانی ۱۰۔ منظور ۱۱۔ مس اڈنا جیکسن ۱۲۔ اس منجدھار میں (ڈرامہ)

۱۵۔ "بغیر اجازت" (گیارہ افسانے) ظفر برادرز 'لاہور' طبع اول: ۱۹۵۵ء
۱۔ سونے کی انگوٹھی ۲۔ تانگے والے کا بھائی ۳۔ مسز حمیدہ ۴۔ بغیر اجازت ۵۔ قدرت کا اصول ۶۔ خوشبودار تیل ۷۔ شترنج ۸۔ جسم اور روح ۹۔ اب اور کہنے کی ضرورت نہیں ۱۰۔ رشوت ۱۱۔ قیمے کی بجائے بوٹیاں۔
(یہ انگریزی اور روسی افسانوں کے تراجم ہیں)

۱۶۔ "برقعے" (گیارہ افسانے) ظفر برادرز 'لاہور' طبع اول: ۱۹۵۵ء
۱۔ پسینہ ۲۔ گھوگا ۳۔ تیقن ۴۔ خط اور اس کا جواب ۵۔ موج دین ۶۔ ایک بھائی ایک واعظ ۷۔ چودھویں کا چاند ۸۔ باردہ شمالی ۹۔ قرض کی پیتے تھے ۱۰۔ پراسرار نینا ۱۱۔ برقعے۔

۱۷۔ "شکاری عورتیں" (بارہ افسانے) ظفر برادرز 'لاہور' طبع اول: ۱۹۵۵ء
۱۔ میرٹھ کی قینچی ۲۔ شکاری عورتیں ۳۔ جینٹلمینوں کا برش ۴۔ حجامت ۵۔ مرزا غالب کی حشمت خان کے گھر دعوت ۶۔ لعنت ہے ایسی دوا پر ۷۔ جج اکبر ۸۔ اولاد ۹۔ موچنا ۱۰۔ نواب کاشمیری ۱۱۔ لاؤڈ اسپیکر ۱۲۔ دودا پہلوان

۱۸۔ "رتی ماشہ اور تولہ" (دس افسانے 'ایک ڈرامہ) ظفر برادرز لاہور' طبع اول: ۱۹۵۵ء
۱۔ جھٹکے ۲۔ شلجم ۳۔ برف کا پانی ۴۔ چند مکالمے ۵۔ رتی ماشہ' تولہ ۶۔ گاف گم (ڈرامہ) ۷۔ نفسیات شناس ۸۔ انجام بخیر ۹۔ ملاقاتی ۱۰۔ سگریٹ اور فاؤنٹین پین ۱۱۔ تین میں نہ تیرہ میں۔

۱۹۔ "انارکلی" (دس افسانے) مکتبہ شعر و ادب لاہور' طبع اول: س ۔ ن
۱۔ انارکلی ۲۔ نیمہ ۳۔ بدتمیزی ۴۔ قادرا قصائی ۵۔ خودکشی ۶۔ پشاور سے لاہور تک ۷۔ بجلی پہلوان ۸۔ ایک زاہدہ ایک فاحشہ

۹۔ شیدا ۱۰۔ بڈھا کھوسٹ

۲۰۔ "ایک مرد" (آٹھ افسانے، چار ڈرامے، ایک فیچر) ظفر برادرز لاہور، طبع اول: س۔ن

۱۔ ایک مرد (ڈرامہ) ۲۔ شیرو ۳۔ بلاوز ۴۔ دو ہزار سال بعد (فیچر) ۵۔ آم ۶۔ تین انگلیاں (ڈرامہ) ۷۔ مس فریا ۸۔ غسل خانہ ۹۔ خونی تھوک ۱۰۔ تحفہ (ڈرامہ) ۱۱۔ مسز ڈی سلوا ۱۲۔ قانون کی حفاظت (ڈرامہ) ۱۳۔ تین تحفے۔

یہ مجموعہ منٹو کی کتاب "افسانے اور ڈرامے" کا جعلی ایڈیشن ہے۔ اسی کتاب کا ایک اور جعلی ایڈیشن "ایک مرد" کے عنوان سے گلفام برادرز ترکمان گیٹ دہلی نے ۱۹۰ صفحات کی ضخامت میں شائع کیا ہے جس میں صرف چار افسانے اور پانچ ڈرامے شامل کیے گئے ہیں۔

۲۱۔ "پردے کے پیچھے" (دس ڈرامے اور افسانے) کل صفحات ۱۷۵ مکتبہ رنگین، دہلی، طبع اول: ۱۹۵۳ء

۲۲۔ "شادی" (سات افسانے) کتب خانہ آریہ ورت لال کنواں، دہلی، طبع اول: س۔ن

اس کتاب کے کل ۱۴۲ صفحات ہیں۔

۲۳۔ "پھندے" (پانچ افسانے) مکتبہ جدید، دہلی، طبع اول: ۱۹۵۳ء

کتاب کے کل صفحات ۱۴۴ ہیں۔

۲۴۔ "اوپر نیچے اور درمیان" (اٹھارہ افسانے، خاکے اور مضامین) عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ، طبع اول: ۱۹۵۳ء

کتاب کے کل صفحات ۱۸۷ ہیں۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن گوشہ ادب، لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۲۵۔ "بیس غیر مطبوعہ کہانیاں" (بیس افسانے) مکتبہ نقوش ۴۳۰، چاندنی چوک، دہلی، طبع اول: ۱۹۵۲ء

کتاب کے کل صفحات ۱۰۰ ہیں۔

۲۶۔ "جنازے" (ڈرامے) ساقی بک ڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۴۲ء

۲۷۔ "منٹو کی بیس کہانیاں" (مرتبہ: ڈاکٹر اے۔ بی اشرف / ڈاکٹر انوار احمد) کاروان ادب، ملتان، طبع اول: ۱۹۸۶ء

کتاب میں منٹو کی شخصیت اور فن پر مرتبین کے مضامین بھی شامل کتاب ہیں۔ کل صفحات ۳۰۳ ہیں۔

۲۸۔ "کالی شلوار" (افسانے) ظفر برادرز، لاہور، طبع اول: س۔ن

کل صفحات ۲۳۶ ہیں۔

۲۹۔ "لاؤڈ اسپیکر" (افسانے اور مضامین) آزاد بک ڈپو، امرتسر، طبع اول: ۱۹۵۵ء

کل صفحات ۲۸۸ ہیں (یہ کتاب گوشہ ادب، لاہور نے بھی شائع کی ہے)

۳۰۔ "تلخ ترش شیریں" (مضامین اور افسانے)

۳۱۔ "سیاہ حاشیے" (افسانچے) ادبیان، لاہور،

۳۲۔ "طاہرہ سے طاہر" (افسانے) ظفر برادرز، لاہور، طبع اول:

۳۳۔ "بغیر عنوان کے" (ناول)

۳۴۔ "منٹو کے نمائندہ افسانے" (مرتبہ: ڈاکٹر سلیم اختر) مکتبہ علم و فن، لاہور، طبع اول: ۱۹۸۴ء

کل صفحات ۲۰۸ ہیں۔

۳۵۔ "آؤ" (ڈراما) مکتبہ اردو، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۰ء

۳۶۔ "سرگزشت اسیر" (ڈراما از وکٹر ہیوگو کا ترجمہ) اردو بک سٹال، لاہور، طبع اول: ۱۹۳۳ء

اس میں وکٹر ہیوگو کا لکھا ہوا دیباچہ (۱۵ مارچ ۱۹۳۱ء) بھی ترجمہ کر کے شامل کتاب کیا گیا ہے۔

۳۷۔ "منٹو کے ڈرامے" (ڈرامے) — مکتبہ اردو' لاہور' — طبع اول: ۱۹۴۳ء

۳۸۔ "وی را" (از آسکر وائلڈ کا ترجمہ بہ اشتراک حسن عباس) شمالی برقی پریس' دارالاحمر' امرتسر' — طبع اول: ۱۹۳۴ء

یہ کتاب دوسری بار مکتبہ شعر و ادب' سمن آباد' لاہور نے ۱۹۷۵ء میں شائع کی ہے۔

۳۹۔ "عصمت چغتائی" (خاکہ)

۴۰۔ "گلاب کا پھول" (افسانے)

۴۱۔ "ناخن کا قرض" (افسانے)

۴۲۔ "چشم روزن" (افسانے)

۴۳۔ "روسی افسانے" (ترجمہ) — دارالاشاعت پنجاب' لاہور' — طبع اول: ۱۹۳۴ء

۴۴۔ "گورکی کے افسانے" (از میکسم گورکی کا ترجمہ) — مکتبہ شعر و ادب' لاہور' — طبع دوم: س ـ ن

اس کتاب میں منٹو نے دیباچہ کے طور پر گورکی کی شخصیت اور فن پر ۳۱ صفحات کا مقالہ رقم کیا ہے۔ افسانوں میں "میدانوں میں" "چھبیس مزدور اور دوشیزہ" "خان اور اس کا بیٹا" اور "خزاں کی رات" کل چار افسانے شامل کتاب ہیں۔

۴۵۔ رسالہ "ہمایوں" لاہور' روسی ادب نمبر(۵) (مدیر: حامد علی خاں بہ اشتراک سعادت حسن منٹو)

مئی ۱۹۳۵ء جلد نمبر ۲۷ شمارہ نمبر ۵۔ کل صفحات ۴۳۵۔

۴۶۔ رسالہ "عالمگیر" لاہور' روسی ادب نمبر(۶) (مرتبہ سعادت حسن منٹو)

۴۷۔ "گنجے فرشتے" (خاکے) — البیان' — لاہور

۴۸۔ "نور جہاں سرور جہاں" (خاکہ) — مکتبہ ڈائرکٹر' لاہور' — طبع اول:

۴۹۔ "کروٹ" (ڈرامے) — اردو اکیڈمی سندھ' کراچی' — طبع اول:

نظریہ فن:

"پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب ایسی داستانیں فضول ہیں۔ کیوں نہ ایسی عورت کا دل کھول کر بتایا جائے جو اپنے پتی کی آغوش سے نکل کر دوسرے مرد کی بغل گرما رہی ہو اور اس کا پتی کمرے میں بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہو گویا کچھ ہوا ہی نہیں رہا۔ زندگی کو اس شکل میں پیش کرنا چاہیے۔"

(بہ حوالہ: "منٹو کے خطوط ندیم کے نام" مرتبہ: احمد ندیم قاسمی)

(۱) بہ حوالہ: "میرا بہترین افسانہ" (مرتبہ: محمد حسن عسکری) خود تحریر کردہ کوائف صفحہ نمبر ۲۲۵

(۲) بہ حوالہ: "کیا قافلہ جاتا ہے" از نصراللہ خان مطبوعہ: مکتبہ تہذیب و فن، کراچی طبع اول: ۱۹۸۴ء۔ صفحہ نمبر ۱۵۸

(۳) بہ حوالہ: انٹرویو مولانا حامد علی خاں مدیر "ہمایوں" لاہور ۱۹۷۴ء بہ مقام پاک ٹی ہاؤس، حلقہ ارباب ذوق (ادبی) لاہور کا خصوصی پروگرام "ظفر علی خاں کی یاد میں۔"

(۴) "کیا قافلہ جاتا ہے" از نصراللہ خان صفحہ نمبر ۱۵۲

(۵) ان دونوں پرچوں میں شامل اکثر نظمیں، افسانے اور کہانیاں خود منٹو نے ترجمہ کیں۔ رسالہ "ہمایوں" میں ان کا ایک مضمون "روسی ادب پر ایک طائرانہ نظر" بھی شامل ہے۔

(۶) ایضاً

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیشگوئی کی تھی۔ "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔"

اور جب گاما چودھری نے اس سے پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا۔ "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے، دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا۔

"یہ کسی پیر کی بد دعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو، چھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ دعا دی تھی، جا، تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے ------- اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ "یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہو گا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہو گی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آ جائے گا یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔"

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آ جاتی نہ معلوم کیوں وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آ کر بل مار کہ سگریٹ پیتا یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس "گورے" کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

"------" یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا۔ "آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں------"

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی------ جیسے کوڑھ ہو رہا ہے------ بالکل مردار ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے"------- یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیض کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آ گیا ہوں جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آ جائے۔"

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا------ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا "چل بیٹا، چل بیٹا------ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلاف معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا------ بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا۔ اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا

بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے ان مارواڑیوں کو گالی دی ------- "غریبوں کی کٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ----- نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہو گا۔"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ----- سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا "لا ہاتھ ادھر ----- ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ------- تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اگ آئیں۔"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے ------- مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دوران گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا "تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے، یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔"

استاد منگو موجودہ سوویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لئے اس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ انہیں "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب بھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!" ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس سے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا۔ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو چنانچہ اس کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا "ٹوڈی بچے!"

جب بھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلباء کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا:

"نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں اگر ------- صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔"

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔"

"ہاں' ہاں' کیوں نہیں۔"

"وہ بیکار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو کمی ہو گی۔"

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو "نیا قانون" وہ دن میں کئی بار سوچتا "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آ جاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔ پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم تھا بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا ہوا میں تازگی تھی پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی ------- وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی ------- آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز' کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے' دکانوں کے بورڈ' اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ' بازار میں چلتے پھرتے آدمی ------- ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں' لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے' دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔" اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے جو طلباء کالج کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انار کلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ نہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوت کا نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے مگر استاد منگو کے لئے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گذارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہو گا مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے

متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا۔
"تو ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

استاد منگو طبعاً" بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہشمند تھا بلکہ متجسس تھا اس کی بیوی گنگاوتی اس کی اس قسم کی بیقراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی "ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔"
کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بیقرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہئے تھا وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہرلال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔
لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس اور ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔
انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا۔
"چلو یہ بھی اچھا ہوا ------- شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔"
چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا --- جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔
وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابل غور بات کو آئین جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کی اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔
جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا۔ "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں۔ ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"
خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا۔
"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"
اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھچ گیا اور پاس ہی گال کے اس

طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی۔ ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس "گورے کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔"

جب "گورے" نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگرٹ سلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا' وہ اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گورے نے سگرٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا "جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے" اس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اسے طوعاً" کرہاً" بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیئے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوان ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا۔ "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

استاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا "ہیرا منڈی۔"

"کرایہ پانچ روپے ہو گا۔" استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلایا۔ "پانچ روپے۔ کیا تم ------؟"

"ہاں' ہاں' پانچ روپے۔" یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟"

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھوڑی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر اور متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا۔

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں ------ پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں ------ اب ہمارا راج ہے بچہ"
لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہی تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔
"وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے ------ اب نیا قانون ہے میاں ------ نیا قانون!"
اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔
استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون' نیا قانون" چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔
"نیا قانون' نیا قانون' کیا بک رہے ہو ---- قانون وہی ہے پرانا!"
اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

سعادت حسن منٹو

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی، جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی۔ ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ یہاں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا۔ "دس لیف ----- ویری بیڈ۔" یعنی یہ زندگی بہت بری ہے، جب کہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھا چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نپٹا کر بیس تیس روپے پیدا کرتی تھی۔ یہ گورے، اس کے ہم وطنوں کے مقابلہ میں اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ کہہ دیا کرتی تھی۔ "صاحب ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتی۔" اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینی شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ کہتی۔ "صاحب! تم ایک دم الو کا پٹھا ہے ----- حرامزادہ ہے، سمجھا۔" یہ کہتے وقت وہ لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی۔ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے جہاں اس نے یہ سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں مگر صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی نہ مانتا تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتلایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے کہا۔ "بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہیں دیں گے۔" جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا۔ "دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو میں نہ لوں گی۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔" چھٹے آدمی نے یہ سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں ------ دروازے بند کر کے اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا "لایئے ایک روپیہ دودھ کا۔" اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی چونی جیب میں سے نکال کر اس کو دیدی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا مال غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ----- بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا۔ جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لئے اس پاخانہ میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکتی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے یہ خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص طور سے ہم لوگوں کی رہائش کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ زنجیر اس لئے لٹکائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے۔ مگر جونہی زنجیر

پکڑ کر اس نے اٹھنا چاہا اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈرو کوئین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر باہر نکلا اور سلطانہ سے کہنے لگا۔ "کیا ہوا ------ چیخ تمہاری تھی۔"

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ " یہ موا پیخانہ ہے کیا ------ بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا۔ میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی۔ پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ ایسا دھماکہ ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔"

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانہ کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھا چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا اس لئے اس نے اس عورت کو پیشے بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے وہ اس کی تلاش میں انبالہ آیا۔ اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی۔ اس لئے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ وہ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ اس نے ایک فوٹوگرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بھی بنوایا۔ دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا چنانچہ اس نے تھوڑے ہی عرصے بعد اپنا اڈا انبالہ چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد لوگوں سے واقفیت ہو گئی چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعے سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے اور اس کی آمدنی پہلے سے دوگنی ہو گئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لئے بندے خریدے' ساڑھے پانچ تولہ کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوالیں' دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی۔ مگر ایکا ایکی نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ وہ خدا بخش کو اپنے لئے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی شہر کی تعریف سن چکی تھی پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا جس میں وہ دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لئے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں نیچے دکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ' چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں۔ اس لئے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوتی تھی' پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی۔ "یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے۔" یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں کوئلوں کی دکان لکھا تھا وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی

تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں " شرفاء کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے۔ " یہ لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اس کارخانہ کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لئے وہ رات میں انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دوکان کھولتے ہی گاہک تھوڑی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی پر جب دو مہینے گذر گئے اور کوئی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خدا بخش سے کہا۔ " کیا بات ہے خدا بخش! دو مہینے آج پورے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے کسی نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا ــــــ مانتی ہوں آجکل بازار بہت مندا ہے پر اتنا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل ہی میں نہ آئے۔ " خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصے سے کھٹک رہی تھی، مگر وہ خاموش تھا پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا۔ " میں کئی دن سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آئی ہے وہ یہ کہ لوگ جنگ کے دھندوں میں پڑنے کی وجہ سے ادھر کا راستہ بھول گئے ــــــ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ــــــ "

وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ تھے کھانا پینا کپڑے لتے۔ دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں آئیں تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالہ میں بنوائیں تھیں آہستہ آہستہ بک گئیں آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا " تم میری سنو اور چلو واپس انبالہ میں یہاں کیا دھرا ہے۔ بھئی ہو گا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں۔ تمہارا کام وہاں خوب چلتا تھا، چلو وہیں چلتے ہیں، جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ یہ آخری کنگنی بیچ کر آؤ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی یہاں سے چل دیں گے۔"

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا۔ " نہیں جان من! انبالہ اب نہیں جائیں گے یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، وہ بڑا کارساز ہے یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی۔ بچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت رنج ہوتا تھا پر کیا کرتی پیٹ کو بھی آخر کسی حیلے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گذر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلہ میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ وقت کاٹ سکتی تھی۔ پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا چنانچہ رفتہ رفتہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی، کبھی چھالیہ کاٹتی رہتی کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی بالکونی میں آ کر جنگلے کے پاس کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری

رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہروقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک اور پھک پھک کی صدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب حال اسے نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک عجیب شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اٹھتے تھے اور ہولے ہولے ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دیکر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور خود بخود جا رہی ہے دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔۔۔۔۔۔ نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہو گا۔

یوں تو بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور کھڑے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔ پر طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہوا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے یہاں آیا کرتے تھے پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے' چنانچہ جب اس قسم کے خیالات اس کو آنے لگے تو اس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا دیکھو' میرے حال پر رحم کرو یہاں گھر میں رہا کرو میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی "جان من۔۔۔۔ میں باہر کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں بیڑا پار ہو جائے گا۔"

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستین کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لئے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا وہ اس ساڑی کے نیچے سفید بوسکی کا کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے اس ساڑی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی۔ وہ بڑا نازک تھا سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کیلئے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے گھر بالکل خالی تھا خدا بخش بھی حسب معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ کو سر کے نیچے رکھے لیٹی رہی پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو وہ اٹھ کر باہر بالکونی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہیں تھا شام کا وقت تھا چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس لئے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے یہ عجیب و غریب خیال دماغ سے نکالنے کی خاطر جب اس نے پھر سڑک کی طرف دیکھا تو وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا۔ وہی جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا

تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے پوچھا "کدھر سے آؤں۔" سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔
سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لئے کہا "آپ اوپر آتے ہوئے ڈر رہے تھے۔" وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا "تمہیں کیسے معلوم ہوا ----- ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟" اس پر سلطانہ نے کہا کہ۔ "یہ میں نے اس لئے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے۔" وہ یہ سن کر مسکرا دیا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا پھر بالکونی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لئے اور ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے بہت پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کمرہ کا جائزہ لینا شروع کیا کردیا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا سلطانہ نے پوچھا "آپ جا رہے ہیں" آدمی نے جواب دیا "نہیں میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں ---- چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔"
سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیئے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا جب وہ دونوں پھر اس کمرہ میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا "میرا نام شنکر ہے۔"
سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا انسان تھا۔ مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف و شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے گرم پتلون پہنے تھا سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔
شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا چنانچہ اس نے شنکر سے کہا "فرمائیے ----"
شنکر بیٹھا تھا 'یہ سن کر لیٹ گیا۔ "میں کیا فرماؤں 'کچھ تم ہی فرماؤ 'بلایا تمہیں نے ہے مجھے۔" جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا "میں سمجھا 'لو اب مجھ سے سنو جو کچھ تم نے سمجھا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے جایا کرتے ہیں ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینی ہی پڑتی ہے۔"
سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی۔ مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"
شنکر نے جواب دیا "یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔"
"کیا؟"
"میں ----- میں ---- میں کچھ بھی نہیں کرتی۔"
سلطانہ نے ہنس کر کہا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ------ آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔"
شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی۔"
"جھک مارتی ہوں۔"
"میں بھی جھک مارتا ہوں۔"
"تو آؤ دونوں جھک ماریں۔"
"میں حاضر ہوں۔ مگر میں جھک مارنے کے دام کبھی نہیں دیا کرتا۔"
"ہوش کی دوا کرو ------ یہ لنگر خانہ نہیں۔"
"اور میں بھی والنٹیر نہیں ہوں!"
سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا "یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا۔ "الو کے پٹھے۔"

"میں بھی الو کی پٹھی نہیں۔"

"مگر وہ آدمی جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الو کا پٹھا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔" یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا۔ "تم ہندو ہو اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔"

شنکر مسکرا دیا۔ "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ پنڈت مالویہ اور مسٹر جناح اگر یہاں آئیں تو وہ شریف آدمی بن جائیں۔"

"جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو ------ بولو، رہو گے!" "اسی شرط پر جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔"

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تو جاؤ رستہ پکڑو۔"

شنکر آرام سے اٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا۔ "میں کبھی کبھی اس بازار سے گذرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو، بلا لینا ------ میں بہت کام کا آدمی ہوں۔"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالہ میں آیا ہوتا جہاں وہ خوش حال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دیکر باہر نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ اداس رہتی تھی۔ اس لئے شنکر کی باتیں پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا۔ "تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟"

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا کہنے لگا "پرانے قلعے سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔"

"کچھ انہوں نے تم سے کہا؟"

"نہیں ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے ------ پر سلطانہ، میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی۔ سارا سارا دن باہر غائب رہتے ------ میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں نہ کہیں جا سکتی ہوں۔ محرم سر پر آ گیا۔ کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ کیا ہو گا؟ ------ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو، کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا۔ "پر یہ کام شروع کرنے کے لئے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہئے ------ خدا کے لے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ پر جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لئے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے کچھ دیر اور تکلیف برداشت کرنے کے بعد ہم ------"

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "تم خدا کے لئے کچھ کرو چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو۔ پر مجھے شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی

ایک قمیص پڑی ہوئی ہے۔ اس کو میں کالا رنگوا لوں گی۔ سفید شفون کا ایک دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ وہی جو تم نے دیوالی پر مجھے لا کر دیا تھا۔ یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی رنگوا لیا جائیگا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو ------ دیکھو تمہیں میری جان کی قسم، کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو ------ میری بھی نہ کھاؤ اگر نہ لاؤ۔"

خدا بخش اٹھ بیٹا۔ "اب تم خوامخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو ------ میں کہاں سے لاؤں گا ------ افیم کھانے کے لئے تو میرے پاس پیسہ نہیں۔"

"کچھ بھی کرو مگر ساڑھے چار گز کالی شلوار کا کپڑا لا دو۔"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔"

"لیکن تم کچھ نہیں کرو گے ------ تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی۔ اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے۔"

"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔ "لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لاتا ہوں۔"

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش پرانے قلعہ والے فقیر کے پاس چلا گیا۔ سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی کچھ دیر سوئی رہی۔ ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے بعد اس نے اپنا شفون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔

یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکونی میں آ کھڑی ہوئی۔

قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکونی میں کھڑی رہی۔ اب شام ہو گئی تھی بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آ رہے تھے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی تھی۔ مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے تانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً اسے شنکر نظر آیا مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیرارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا

جب شنکر اوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بنا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا۔ جیسے اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اسنے کہا۔ "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ ------ میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔"

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی کہنے لگی۔ "نہیں بیٹھو تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔"

شنکر اس پر مسکرا دیا۔ تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔"

"کیسی شرطیں؟" سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟------"

"نکاح اور شادی کیسی؟ ------ نہ تم عمر بھر میں کسی سے نکاح کرو گی نہ میں ------ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لئے نہیں ------ چھوڑو ان فضولیات کو، کوئی کام کی بات کرو۔"

"بولو کیا بات کروں؟"

"تم عورت ہو ------ کوئی ایسی بات کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے ------ اس دنیا میں صرف دکانداری ہی دکانداری

نہیں، کچھ اور بھی ہے۔"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی، صاف صاف کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"جو دوسرے چاہتے ہیں۔" شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا۔"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں۔"

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی، پھر کہا "میں سمجھ گئی ہوں!"

"تو کہو کیا ارادہ ہے؟"

"تم جیتے، میں ہاری، پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔"

"تم غلط کہتی ہو ------ اسی محلہ میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے یقین نہ کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو ------ تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟"

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا۔ "میرا نام شنکر ہے ------------ یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو اندر چلیں۔"

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ "شنکر! میری ایک بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا۔ "پہلے بات تو بتاؤ؟"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی۔ "تم کہو گے میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں، مگر ------"

"کہو کہو، ------ رک کیوں گئی ہو؟"

سلطانہ نے جرات سے کام لے کر کہا "بات یہ ہے کہ محرم آرہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم سن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لئے دیدیا ہے!"

شنکر نے یہ سن کر کہا۔ "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم کالی شلوار بنا سکو۔"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا۔ "نہیں میرا یہ مطلب ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار بنوا دو۔"

شنکر مسکرایا۔ "میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال، میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لو بس اب تو خوش ہو گئیں۔ پھر سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر شنکر نے پوچھا، "کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"

سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "تم انہیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بندے ہیں ----- زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہونگے۔"

اس پر شنکر نے ہنس کر کہا "میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو؟"

"لے لو" یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دیدئے۔ اس کو بعد میں افسوس ہوا، لیکن شنکر جا چکا تھا۔

اختر حسین رائے پوری

نام : سید اختر حسین
قلمی نام : ناخدا / اختر حسین رائے پوری / ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
پیدائش : ۱۲ جون ۱۹۱۲ء رائے پور (سی۔ پی) بھارت
تعلیم : ایم۔ اے (تاریخ) پی ایچ ڈی (پیرس) سوربن یونی ورسٹی، پیرس، فرانس

ابتدائی تعلیم مولوی محمد یاسین کے مکتب میں پائی۔ ۱۹۲۸ء میں رائے پور سے میٹرک کیا۔ کلکتہ یونی ورسٹی سے ایف اے، علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ایم۔ اے (تاریخ) کیا۔ بنارس یونیورسٹی سے سنسکرت میں ایم۔ اے کی سطح کا امتحان "ساہتیہ النکار" پاس کیا۔ پیرس (فرانس) یونیورسٹی سے ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

مختصر حالاتِ زندگی:

آپ کا آبائی وطن پٹنہ (صوبہ بہار) تھا۔ آپ کے والد سید اکبر حسین علی گڑھ مسلم کالج اور طامس انجینیئرنگ کالج رڑکی (دکن) کے فارغ التحصیل تھے جو سرکاری ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں میں رہے۔ ان کا تعلق محکمہ آبپاشی سے تھا۔ اختر حسین رائے پوری کی علمی اور ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوتا ہے جب وہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے ہمراہ اورنگ آباد، دکن گئے اور اردو انگلش ڈکشنری کی ترتیب اور انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد کے ادبی مجلہ "اردو" کی ادارت میں ان کے معاون رہے اور رسالہ "اردو" میں "ناخدا" کے قلمی نام سے متعدد کتب و جرائد پر تبصرے قلم بند کیے۔ ہفتہ وار "ریاست" دہلی میں دیوان سنگھ مفتون کے نائب مدیر اور ہندی رسالہ "وشوانی" کے اعزازی مدیر رہے۔ ایک زمانے میں اپنا رسالہ "جہاں نما" جاری کیا۔ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۰ء کا زمانہ یورپ میں گذارا۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں واپس آکر دو برس آل انڈیا ریڈیو میں نائب نیوز ایڈیٹر کے طور پر کام کیا جہاں سے جون ۱۹۴۲ء میں مستعفی ہو کر بطور پروفیسر شعبہ تاریخ و وائس پرنسپل ایم اے او کالج امرتسر چلے آئے جہاں سے ۱۹۴۵ء میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے انہیں حکومت ہند کے محکمہ تعلیم میں معاون مشیر تعلیم کے عہدے کے لیے منتخب کیا۔ پہلے معروف ماہر تعلیم سرجان سارجنٹ کے نائب کے طور پر کام کیا اور اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد (وزیر تعلیم) کی معاونت کی۔ ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے بہ ذریعہ اسپیشل ٹرین پاکستان آگئے۔ ان کی خدمات ان کی مرضی کے مطابق وزارت تعلیم پاکستان کو منتقل کر دی گئی تھیں، یوں ۱۹۵۵ء تک حکومت پاکستان کے نائب مشیر تعلیم، ڈپٹی سیکرٹری تعلیم اور کراچی ثانوی تعلیمی بورڈ کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۵۶ء تا ۱۹۷۲ء یونیسکو سے وابستہ رہے اور بطور ناظم شعبہ ترقی ثقافت، یونیسکو، ان کا قیام ہیڈ آفس پیرس میں رہا۔ اسی حیثیت میں ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء صومالیہ اور ایران میں بھی قیام رہا۔ بعد ازاں یونیسکو کی کراچی شاخ کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ بینائی سے محروم ہونے تک جامعہ کراچی کے وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ مستقل قیام کراچی میں ہے۔

اولین مطبوعہ تحریر:

ہندی افسانہ "پراجت" (شکست خوردہ) مطبوعہ "مادھوری" ۱۹۲۸ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"زبان بے زبانی" مطبوعہ "نگار" مارچ ۱۹۳۴ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "محبت اور نفرت" (سولہ اردو افسانے) ساقی بک ڈپو، دہلی طبع اول: ۱۹۳۸ء

افسانے: ۱۔ زبان بے زبانی ۲۔ منزل ناتمام ۳۔ یوں ہوتا تو کیا ہوتا ۴۔ سمندر ۵۔ میرے خوابوں کا مندر ۶۔ وہ دونوں ۷۔ کاغذ کی ناؤ ۸۔ عورت ۹۔ بچپن ۱۰۔ زلزلہ ۱۱۔ میرا گھر ۱۲۔ اندھا بھکاری ۱۳۔ مجھے جانے دو ۱۴۔ موت ۱۵۔ مرگھٹ ۱۶۔ میری ڈائری کے چند ورق

یہ مجموعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا ہے۔ اردو اکیڈمی سندھ کا ایک ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں بھی طبع ہوا۔ ایک ایڈیشن مکتبہ ماحول، کراچی نے بھی شائع کیا ہے۔

۲۔ "زندگی کا میلہ" (آٹھ افسانے) مکتبہ رزاقی، کراچی طبع اول: ۱۹۴۹ء

افسانے: ۱۔ دل کا اندھیرا ۲۔ جسم کی پکار ۳۔ تلاش گمشدہ ۴۔ بیزاری ۵۔ قبر کے اندر ۶۔ دیوان خانہ ۷۔ کافرستان کی شہزادی ۸۔ پتھر کی مورت

(اردو اکیڈمی سندھ، کراچی نے یہ کتاب مئی ۱۹۵۶ء میں دوبارہ شائع کی ہے۔(ا)

۳۔ "آگ اور آنسو" (افسانے) طبع اول: ۱۹۴۶ء

۴۔ "شکنتلا" (از کالی داس کا ترجمہ) انجمن ترقی اردو، (ہند) اورنگ آباد دکن طبع دوم: ۱۹۴۳ء

۵۔ "پیغام شباب" (از قاضی نذر الاسلام کا ترجمہ) انجمن ترقی اردو، (ہند) اورنگ آباد طبع اول: ۱۹۳۸ء

۶۔ "گورکی کی آپ بیتی" (تین جلدیں) انجمن ترقی اردو، (ہند) اورنگ آباد
طبع اول جلد اول: ۱۹۴۰ء
طبع اول جلد دوم: ۱۹۴۳ء
طبع اول جلد سوم: ۱۹۴۵ء

۷۔ "پیاری زمین" (از پرل ایس بک کا ترجمہ) انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی طبع اول: ۱۹۴۱ء
(یہ "Good Earth" کا ترجمہ ہے۔)

۸۔ "مقالات گارساں دتاسی" (دو جلدیں) انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد
طبع اول جلد اول: ۱۹۴۵ء
طبع اول جلد دوم: ۱۹۴۳ء

یہ فرانسیسی زبان سے براہ راست "La Lanngue Etla Literature Hindustanies En 1871 - 1877" کا ترجمہ ہے۔ کتاب پر نظر ثانی ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کی۔ پہلی جلد کا ترجمہ یوسف حسین خان نے کیا جب کہ دوسری جلد کا ترجمہ اختر حسین رائے پوری اور عزیز احمد نے کیا۔ یہ کتاب دوسری بار انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی نے ۱۹۷۷ء میں شائع کی۔

۹۔ "حبش اور اطالیہ" (تاریخ) انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی طبع اول:

۱۰۔ "ادب اور انقلاب" (تنقید) طبع اول: ۱۹۴۴ء

۱۱۔ "روشن مینار" (تنقید) طبع اول: ۱۹۵۷ء

۱۲۔ "ہند قدیم کی زندگی: سنسکرت ادب کے آئینے میں" مطبوعہ: سوربن یونی ورسٹی، پیرس (ڈاکٹریٹ کا مقالہ) زیر نگرانی: پروفیسر لوئی رینو طبع اول: ۱۹۳۹ء

۱۳۔ "گردِ راہ" (خود نوشت) مکتبہ افکار، رابسن روڈ، کراچی طبع اول: ۱۹۸۴ء

مستقل پتا:

L-2 / ۱۵۳ پی ای سی ایچ ایس کراچی، پاکستان۔

نظریہ فن:

"لوگ میری تحریروں سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں یا میرے خیالات کیا ہیں۔"

(بہ حوالہ: "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" مرتبہ: طاہر مسعود)

○

(۱) "اردو افسانہ: تحقیق و تنقید" از ڈاکٹر انوار احمد میں سال اشاعت ۱۹۴۷ء درج ہے، جو درست نہیں۔

اختر حسین رائے پوری

تلاش گم شدہ

دوسرے درجہ کے مسافروں میں اختلاف رائے کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے چنانچہ سب نے سردار جھنڈا سنگھ کے اس اعلان کو جی بھر کر سراہا کہ بقائے حیات کے لئے جنگ از بس ضروری ہے۔ سردار جی نے سب کے سامنے کپڑے اتارتے اور چھپی ہوئی توند کا بھید اجاگر کرتے ہوئے کہا "لڑائیاں بند ہو جائیں تو سب لوگ نامرد ہو جائیں۔" توند پتلون کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی غبارہ کی طرح پھول گئی اور سردار جی کے قہقہوں کے اعتبار سے اس میں نشیب و فراز پیدا ہونے لگے۔

سردار جی کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی کمر ڈھیلی کرنا شروع کی اور تھوڑی دیر میں بجلی کے قمقمہ کے اردگرد منڈلانے والے پروانوں نے دیکھا کہ ڈبہ میں پلپلے اجسام کا انبار لگا ہوا ہے اور ان میں حس اس حد تک مفقود ہے کہ اگر انہیں کاٹ کر قصاب کی دوکان میں الٹا ٹانگ دیا جائے تو گاہک کی سمجھ میں یہ نہ آئے کہ بکرا کون ہے اور بیل کون!

سردار جی نے سونے سے پہلے گرونام جپا اور ہاضمہ کی دوا کھائی جس کا ردعمل ایک ہولناک ڈکار کی صورت میں ظاہر ہوا پھر تکیہ پر سر رکھ کر چشمہ کی کمانی کو داڑھی کے الجھنوں سے نکال کر اپنی ڈائری کا مطالعہ شروع کیا جس میں سرکاری ٹھیکوں اور ان کے متعلق انواع و اقسام کی چوریوں کا ذکر تھا۔

لالہ نتھومل نے سفید قمیض کے اندر چھپی ہوئی کثیف مرزئی کو اتارتے ہوئے توند کی سلوٹوں میں ایک عدد پسو کا انکشاف کیا اور چادر پر پان کی پیک ٹپکاتے ہوئے کہا "کلکتہ میں جندگی مشکل ہو گئی ہے۔"

اوپر کی برتھ پر ایک ڈپٹی صاحب تخلیہ میں کپڑے بدل رہے تھے کالر کا پچھلا حصہ کسی آنکھ او جھل کیل میں اٹک گیا تھا اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ گردن کیوں بھنچ رہی ہے۔ اس کھینچا تانی میں ان کا چہرہ نشان حیرت بن کر رہ گیا تھا!

جب سب لوگ اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے تو سپاہی نے چادر سے منہ نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ ذرا دقت سے اس کا دھڑ اوپر اچھلا اور پھر ایک نقلی ٹانگ ہوا میں ادھر لٹک کر روشنی میں چمکنے لگی۔ لکڑی کی یہ سڈول ٹانگ سیالکوٹ کے سرکاری کارخانے سے بن کر نکلی تھی۔ حکومت نے لنگڑے سپاہی کو اس ٹانگ کے ساتھ بیساکھی کا تحفہ دیا تھا۔ اللہ میاں کی عطا کردہ ٹانگ میں بھلا یہ رنگ و روغن کب ہوتا ہے۔ دوران جنگ میں سپاہی کی ٹانگ غائب ہو گئی تھی اسے خود نہیں معلوم کہ یہ حادثہ کب پیش آیا۔ وہ خندق میں بندوق چھپائے بیٹھا تھا کہ نزدیک ایک دھماکہ ہوا اور اس کی آنکھ بند ہو گئی۔ بہت دیر بعد جب ہوش آیا تو جسم ہلکا پھلکا اور ساتھ ہی ساتھ بے حرکت و ساکن ہو گیا تھا۔ ٹانگ خندق سے اڑ کر ایک پیڑ کے ڈنڈ پر جا لٹکی تھی۔ سپاہی یہ دعویٰ تو نہ کر سکتا تھا کہ وہ چیز جو الگنی پر میلے کپڑے کی طرح پھیلی ہوئی تھی اس کی اپنی وفا نا آشنا ٹانگ تھی لیکن یہ حقیقت بھی تو مسلمہ تھی کہ اس کی ایک ٹانگ بلا اطلاع غائب ہو گئی تھی اور سرسامی کیفیت میں اسے گمان ہوا کہ جس طرح کوئی فاحشہ لڑکی خاندان کو تج کر آوارہ گردی کے لئے نکل جاتی ہے۔ یہ نمک حرام ٹانگ باقی بدن سے الگ ہو کر ہوا خوری کے لئے چل کھڑی ہوئی ہے۔

سپاہی نے نقلی ٹانگ اتار کر بیساکھی بغل میں دبائی اور ادھر ادھر اچک کر اس کی سکت کو جانچنے لگا۔ باقی ماندہ ٹانگ نے کسی بیوہ کی طرح نا زندگی کے بار کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور بیساکھی کے گدگدے بیٹھے بغلی گھونسہ کی طرح اس کی پسلی سے باز پرس کرنے لگے تاہم یہ امر

ناقابل تردید تھا کہ بیساکھی نئی تھی اور اس میں سے تازہ وارنش کی بو آ رہی تھی۔

سپاہی کو نیند آ گئی اور اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ آیا اور اس کے گھٹنوں پر آب حیات اس طرح سینچا کہ اس کی جڑوں سے ایک تنا اور پانچ ٹہنیاں اگ آئیں۔ ہر ٹہنی میں ان گنت ٹانگیں لٹک رہی تھیں۔ لنگڑوں کے لئے تو گویا یہ طوبیٰ کا درخت تھا جو اس سے ٹانگیں نوچ نوچ کر اپنے بدن میں جوڑتے اور پھر بچھڑوں کی طرح اچھلتے کودتے چلے جاتے تھے۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو پورب کی گہرائیوں سے سورج انگارہ سا منہ نکالے گھور رہا تھا۔ سپاہی نے جلدی سے وردی پہنی اور بے چینی سے اگلے اسٹیشن کا انتظار کرنے لگا جہاں اتر کر اسے گھر پہنچنا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی کیوں کہ اب تک گھر والوں کو اس حادثہ کی اطلاع نہ ملی تھی اور اس لئے یہ سوچنا ناممکن تھا کہ ٹانگ کی گمشدگی ان پر کیا اثر کرے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے ٹانگ کی اہمیت کا احساس ہوا۔ جسم کے ہر عضو کو کسی نہ کسی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ٹانگ بیچاری بچپن سے لے کر بڑھاپے تک مٹی کے اس تودے اور اس کے گناہوں کا بار لادے ہر موسم میں بے تکان ماری ماری پھرتی ہے۔ میدان جنگ میں بھی یہ ہوتا ہے کہ وہ مالک کا ساتھ چھوڑ کر اکیلی بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

اتنے میں انجن نے سیٹی دی۔ ریل کی رفتار آہستہ ہو گئی اور پلیٹ فارم پر دیہاتی باجوں کا شور سنائی دیا۔ سپاہی نبو خاں نے وردی ٹھیک کر کے اکڑنے کی کوشش کی لیکن داہنے گھٹنے نے آنکھوں تک بے تار کی تار برقی سے ایسا پیغام بھیجا کہ ان میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ جب پلیٹ فارم سے نبو خاں زندہ باد کا نعرہ بلند ہوا تو سپاہی ہراساں و مایوس سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کسی نے پکار کر کہا "وہ رہے نبو خاں ۔۔۔۔ ارے نیچے آؤ یار!"

پلیٹ فارم پر دیہاتیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی وہ باجے اور پھولوں کے ہار لئے اپنے سورما کی آؤ بھگت کے لئے آئے تھے جو سمندر پار سے میدان مار کر واپس آیا تھا۔

نبو خاں نے چھڑی کا سہارا لیکر زمین پر قدم رکھا۔ باپ نے گلے لگایا۔ کسی نے ہار پہنایا، کسی نے ہاتھ ملایا اور دیہاتی بینڈ نے

میں تو چھورا کو بھرتی کرا آئی رے

کا ترانہ چھیڑ دیا۔

یک بیک کوئی پکار اٹھا "نبو خاں کی ٹانگ!"

نعرے سرد پڑ گئے بینڈ ساکت ہو گیا اور سب حیرت و ہیبت کے عالم میں نبو خاں کی داہنی ٹانگ کی طرف تاکتے رہ گئے۔

نبو خاں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "ابا یہ وہی ٹانگ ہے جو بچپن میں جل گئی تھی۔ اس کے بدلے مجھے نئی ٹانگ ملی ہے جسے بازار میں خریدنا چاہو تو ڈھائی سو سے کم میں نہ ملے گی۔ جب پرانی ہو جائے تو بدلوا لو۔ کہو کیسی ہے؟"

لوگوں نے دیکھا کہ نبو خاں کی نئی ٹانگ دھوپ میں ہیرے کی چھڑی کی طرح چمک رہی ہے وہ جب چاہے اسے بیچ کر بیل کی ایک جوڑی خرید سکتا ہے گویا اس کی ٹانگ سے دو بیل بندھے ہوئے ہیں۔

لیکن اصلی یا نقلی ٹانگ کی صحیح قیمت کا اندازہ روپیوں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ کسانوں نے سیالکوٹی ٹانگ کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھا اور ان میں سے ایک مفکر نے رائے زنی کی! "اس میں شک نہیں کہ یہ دیکھنے میں سہانی ہے اور اسے کبھی کوئی روگ نہیں لگ سکتا۔ نبو خاں اسے بیچ کر سرکار سے کہہ سکتا ہے کہ گم ہو گئی اور اسے پھر نئی ٹانگ مل جائے گی۔ یہ کاروبار برا نہیں۔ لیکن اللہ میاں کی دی ہوئی ٹانگ کی بات ہی اور ہے۔"

گھر پہنچنے کے بعد نبو خاں کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ سب چپ چپ سے رہتے ہیں۔ بوڑھی ماں بیساکھی کو چھو کر رونے لگتی ہے۔ شام کے دھندلکے میں اس کے بچے کھیت کی مینڈھ پر بیٹھے چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں ۔۔۔۔ "ابا! ایک جرمن کو پکڑنے دوڑے اور ایک گڑھے

میں گر پڑے لیکن ان کی ٹانگ نے دشمن کا پیچھا نہ چھوڑا اور اس کے پیچھے دور تک نکل گئی۔"

"بھیا! آدمی ایک دوسرے کو مارتے کیوں ہیں؟" بھائی نے اپنے ننھے سے سر کو کھجلاتے ہوئے کہا!" میں کیا جانوں بس اتنا معلوم ہے کہ لوگ روپوں کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ جو سپاہی جتنے زیادہ آدمیوں کو مارے اسے اتنا ہی زیادہ انعام ملتا ہے۔ میں بھی بڑا ہو کر سپاہی بنوں گا اور بندوق سے بہت سے دشمنوں کو ماروں گا۔ سب سے پہلے تو جلو کی جان لوں گا جس نے آج مجھے گلی میں پیٹا۔"

نبو خاں کے ماں باپ جب مل کر کنوئیں کی جگت پر بیٹھتے ہیں تو ان کی گفتگو کا موضوع اکلوتے بیٹے کی گم شدہ ٹانگ ہوتی ہے۔ بیٹے سے زیادہ انہیں اس کے گم ہونے کا دکھ ہے۔ دونوں نے مل کر اسے پیدا کیا اور پالا۔ اب جو وہ پھولنے پھلنے لگی تو نبو خاں اسے سمندر پار کے کسی دیس میں چھوڑ آیا اب دیکھو کہ وہ ایک ننگے مرغ کی طرح بیساکھی کی موٹھ پر ناچ رہا ہے۔

بوڑھا اپنے رندھے ہوئے گلے کو صاف کر کے کہتا ہے "بڑی بی پیر جمال شاہ کی درگاہ پر منت مانو شاید نبو خاں اچھا ہو جائے۔"

نبو خاں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سارا گاؤں کیوں اس کی صحیح سالم ٹانگ کو نہیں بلکہ اس کی بے وفا بمن کو ڈھونڈھتا ہے۔ اس کی چمکتی ہوئی بیساکھی کا رعب بھی اس کے رنگ کے ساتھ کم ہونے لگا اور ہرا ایرا غیرا اسے دیکھ کر پیچی ہوئی آواز میں یہ کہہ اٹھتا "ایسا اچھا جوان بے کار ہو گیا۔"

نبو خاں کے دوست جب نہر میں تیرتے یا گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر طرارے بھرتے نکل جاتے تو اس کے مجروح گھٹنے کے ڈنڈ پر کھجلی سی ہونے لگتی اور وہ بے اختیار چاہتا کہ پانی اور ہوا کی لہروں کو چیرتا ہوا نکل جائے۔

لیکن سب سے کٹھن گھڑی وہ ہوتی ہے جب اس کی بیوی اس کے گھٹنے پر مالش کرتی ہوئی پاس پڑوس کے نوجوانوں سے دن دہاڑے آنکھ ملاتی ہے اور اس کی ہر ادا پکار کر کہتی ہے کہ مجھے زندگی کا رس کون دے گا۔ چلنے میں وہ لڑکھڑاتی ہے گویا اپنے بوجھ سے آپ دبی جا رہی ہو۔ اس کی آنکھیں سامنے نہیں بلکہ دائیں بائیں دیکھتی ہیں اور جب وہ کھیت میں جاتی ہے تو دھان کی بالیاں سر ہلا کر جتاتی ہیں کہ اندر ---- اور اندر---- اس جھرمٹ میں تیرا یار مرچھپا بیٹھا ہے۔ جب وہ کھیت سے باہر نکلتی ہے تو اس کے کپڑے گھاس کے تنکوں سے منڈھے ہوئے ہوتے ہیں----------

نبو خاں یہ سب سمجھتا ہے اور اکثر اس کی بیساکھی بیوی سے دوچار بھی ہوتی ہے لیکن اس کے جوان بدن کی اینٹھن کسی اور قسم کی چوٹ چاہتی ہے۔ وہ مطلق پروا نہیں کرتی اور پھر اپنے محبوب مشغلہ میں مصروف ہو جاتی ہے۔

بے چارہ نبو خاں اس فکر میں گھلا جاتا ہے کہ ایک ٹانگ کی کمی یا زیادتی کتنا بڑا فرق پیدا کر دیتی ہے وہ کسی کے رحم و کرم کا محتاج نہیں پھر بھی سب اسے رحم و کرم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کوئی اس سے فطری تعلق نہیں رکھتا۔ ماں باپ ترس سے ' بیوی ڈھٹائی اور بے حیائی سے اور اس کے بچے خوف و ہراس سے پیش آتے ہیں اور گاؤں سے ہمیشہ ایک یہ جھنجھناہٹ سننے میں آتی ہے۔ "نبو خاں کی ٹانگ!!"

رفتہ رفتہ گم شدہ ٹانگ کا خیال نبو خاں پر جن کی طرح سوار ہو گیا اٹھتے بیٹھتے ' چلتے پھرتے وہ اسی دھیان میں رہنے لگا کہ دوبارہ ٹانگ پیدا کرے اور اپنی بیوی کی سرکشی کو اس کے تلے کچل دے۔ اسکے عضو عضو کی سرمستی کو اس سے روندے اور پوچھے کہ اب کیا حال ہے۔

رات کا وقت تھا۔ اندھیری رات ' نبو خاں بخار کی حالت میں برآمدہ میں پڑا ہوا تھا اور سب گرمی کے ستائے ہوئے باہر سو رہے تھے۔ یک بیک نبو خاں کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ دور کھیت کے پاس ماچس کی روشنی ہوئی اور بجھ گئی۔ اس اشارہ پر اس کی بیوی چارپائی سے اٹھی آس پاس اچھی طرح دیکھا اور دبے پاؤں چل کھڑی ہوئی۔

نبو خاں دم بخود دیکھتا رہا یہ عورت ایک غیر مرد سے ملنے کیوں جا رہی تھی۔ مگر------ وہ آوارہ جس کے پاس گھر ہے نہ زمین۔ اس کے پاس کیا ہے جو نبو خاں کے پاس نہیں۔ آخر وہ کیوں بازاری کتیا کی طرح اس کے پیچھے پھرا کرتی ہے۔ دفعتاً" اسے خیال آیا کہ یہ کرشمہ محض ٹانگ کا ہے۔ وہ جنس نایاب جو اس کے پاس سے کھو گئی۔

نبو خاں نے اٹھ کر اندر کی کوٹھڑی سے گنڈاسہ نکالا اور آہستہ آہستہ ۔۔۔۔ گویا میدان جنگ میں دشمن کی ٹوہ لینے نکلا ہو ۔۔۔ اسی روشنی کے نشان پر چلا قریب آ کر اس نے چھتری پھینک دی اور زمین پر رینگتے ہوئے بڑھنے لگا۔

ہر طرف خاموشی تھی ۔ بس جامن کے پیڑ کے نیچے کسی کے ہانپنے اور کسی کے کھل کھلانے کی آواز آ رہی تھی۔

نبو خاں کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا ۔ اسے فوج کے وہ سب داؤں گھات یاد آ گئے جو شب خون مارتے وقت استعمال کئے جاتے ہیں ۔ اس کی آنکھوں میں درندوں کی سی چمک آ گئی اور اس نے اندھیرے میں وہ دیکھا جو نہ دیکھنا چاہئے تھا۔

اس کے گنڈاسے کا بھرپور وار مہر کی داہنی ٹانگ پر پڑا اور وہ ران سے کٹ کر الگ ہو گئی ۔ ایک دہشت ناک چیخ سے فضا گونج اٹھی ۔ رقیب کی خون آلودہ ٹانگ نبو خاں نے اٹھائی اور اپنے زخمی گھٹنے سے باندھ لی۔

اور جب گاؤں والے وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مہر خون میں شرابور بے ہوش پڑا ہے' عورت ڈر کے مارے بے دم ہو گئی ہے اور نبو خاں وہ ٹانگ باندھے پاگلوں کی طرح ہنس رہا ہے!

○

اختر انصاری (دہلوی)

نام : اختر انصاری

قلمی نام : اختر انصاری / اختر انصاری دہلوی

پیدائش : یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء بہ مقام بدایوں، بھارت (۱)

وفات : ۶ اکتوبر ۱۹۸۸ء بہ مقام علی گڑھ

تعلیم : ایم اے (اردو) علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۴۷ء

بی۔ ٹی ٹیچرز ٹریننگ کالج، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۳۴ء۔

پہلے قدیم اینگلو عربک ہائی سکول، دہلی اور پھر سینٹ اسٹیفن مشن کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۴ء میں میٹرک اینگلو عربک ہائی سکول، دہلی سے کیا اور بی۔ اے (آنرز) تاریخ، سینٹ اسٹیفن مشن کالج، (دہلی یونیورسٹی) سے ۱۹۳۰ء میں کیا۔ ۱۹۳۱ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے انگلستان گئے لیکن والد کی ناوقت اور اچانک وفات کے باعث تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ ۱۹۳۱-۳۲ء میں قانون پڑھنا شروع کیا لیکن بوجوہ یہ سلسلہ بھی ترک کر دیا۔ بی۔ ٹی ٹیچرز ٹریننگ کالج علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۳۴ء میں کرنے کے بعد وہیں سے ۱۹۴۷ء سے ایم۔ اے (اردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

اختر انصاری دہلوی کا مولد بدایوں ہے لیکن انہوں نے وہاں زندگی کے محض چند ماہ گذارے۔ یہی سبب ہے کہ بدایوں سے زیادہ دہلی کو اپنا وطن خیال کرتے تھے۔ ان کے والد پنجاب میڈیکل سروس کے رکن تھے اس لیے زندگی کے ابتدائی تین چار برس اختر انصاری نے پنجاب کے مختلف شہروں میں گذارے۔ اس کے بعد ان کے والد دہلی منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں اختر انصاری تین برس کے بچے تھے، وہیں ہوش سنبھالا اور ابتدائی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ لگ بھگ ۱۹۲۸ء میں ان کے والد دہلی میں اسسٹنٹ سول سرجن رہنے کے بعد مستعفی ہوئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

اختر انصاری کی طبیعت نصابی کتابوں سے ہمیشہ باغی رہی۔ بدرجہ مجبوری امتحانات دیتے اور پاس ہوتے رہے۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان باقاعدہ تیاری کے ساتھ دیا اور امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ ۱۹۳۴ء میں نثر نگاری کی طرف راغب ہوئے اور افسانہ نگاری شروع کی۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۷ء مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے سٹی ہائی سکول میں ٹیچر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو میں لیکچرر کی حیثیت میں تقرر ہوا جہاں سے ۱۹۵۰ میں ٹیچرز ٹریننگ کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ منتقل ہو گئے اور ریٹائرمنٹ (۱۹۷۱ء) تک وہیں رہے۔ اس کے بعد علی گڑھ ہی میں مستقل قیام رہا اور تادم مرگ ادبی مشاغل کو جاری رکھا۔ جواہر لال نہرو میڈیکل کالج، علی گڑھ میں تھے جب ۷۹ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" مطبوعہ: ۱۹۳۴ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "نغمۂ روح" (قطعات، غزلیات اور نظمیں) — سول ایجنٹ: صدیق بک ڈپو، — طبع اول: ۱۹۳۲ء

یہ مجموعہ دوسری بار ۱۹۳۴ء میں طبع ہوا۔

۲۔ "اندھی دنیا اور دوسرے افسانے" (۲۳ افسانے) — مکتبہ جہاں نما، دہلی، — طبع اول: ۱۹۳۹ء

۱۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" (۱۹۳۴ء) ۲۔ ستارہ (۱۹۳۵ء) ۳۔ یوں بھی ہوتا ہے (۱۹۳۵ء) ۴۔ اسکول (۱۹۳۶ء) ۵۔ اٹھارویں صدی کا ظلم (۱۹۳۶ء) ۶۔ اسپتال (۱۹۳۶ء) ۷۔ متمدن دنیا کے غیر متمدن انسان (۱۹۳۶ء) ۸۔ بانو (۱۹۳۶ء) ۹۔ ایک شام (۱۹۳۶ء) ۱۰۔ ننھا بھکاری (۱۹۳۶ء) ۱۱۔ ڈپٹی صاحب (۱۹۳۷ء) ۱۲۔ ایک سبق (۱۹۳۷ء) ۱۳۔ ایک ملاقات (۱۹۳۷ء) ۱۴۔ چند خطوط (۱۹۳۷ء) ۱۵۔ دلی کی سیر (۱۹۳۷ء) ۱۶۔ بھوک (۱۹۳۷ء) ۱۷۔ اندھی دنیا (۱۹۳۸ء) ۱۸۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ (۱۹۳۸ء) ۱۹۔ گرمیوں کی ایک دوپہر (۱۹۳۸ء) ۲۰۔ خام مواد (۱۹۳۸ء) ۲۱۔ جرائم پیشہ لوگ (۱۹۳۸ء) ۲۲۔ پروفیسر صاحب (۱۹۳۸ء) ۲۳۔ مظلوم (۱۹۳۸ء)

۳۔ "نازو اور دوسرے افسانے" (۱۴ افسانے) — مکتبہ جہاں نما، دہلی، — طبع اول: ۱۹۴۰ء

۱۔ بہ بیں تفاوت رہ (۱۹۳۴ء) ۲۔ ایک افسانہ جو مکمل نہ ہو سکا (۱۹۳۴ء) ۳۔ میرے بچوں کی قسمت (۱۹۳۵ء) ۴۔ نازو ۵۔ دوست کی بیوی (۱۹۳۶ء) ۶۔ بزدل (۱۹۳۶ء) ۷۔ وہ کہاں ہے؟ (۱۹۳۶ء) ۸۔ زبیدہ (۱۹۳۹ء) ۹۔ سید صاحب (۱۹۳۹ء) ۱۰۔ بیرسٹر صاحب (۱۹۳۹ء) ۱۱۔ کسی کی کہانی چاندنی کی زبانی (۱۹۳۹ء) ۱۲۔ زینت (۱۹۴۰ء) ۱۳۔ غم نصیب (۱۹۴۰ء) ۱۴۔ جیسے کو تیسا (۱۹۴۰ء)

۴۔ "آبگینے" (قطعات) — مکتبہ اردو، حیدر آباد دکن، — طبع اول: ۱۹۴۱ء

۵۔ "افادی ادب" (تنقید) — نیا سنسار کتاب گھر، پٹنہ، — طبع اول: ۱۹۴۱ء

۶۔ "خونی اور دوسرے افسانے" (گیارہ افسانے) — مکتبہ اردو، لاہور، — طبع اول: ۱۹۴۳ء

۱۔ خونی (۱۹۳۶ء) ۲۔ نفرت (۱۹۳۹ء) ۳۔ فریب (۱۹۳۹ء) ۴۔ گونگا (۱۹۳۹ء) ۵۔ بھول (۱۹۴۰ء) ۶۔ لو ایک قصہ سنو (۱۹۴۱ء) ۷۔ دعا (۱۹۴۱ء) ۸۔ شہزادہ (۱۹۴۱ء) ۹۔ اٹھارہ آنے (۱۹۴۱ء) ۱۰۔ ایک واقعہ (۱۹۴۱ء) ۱۱۔ دریا کی سیر (۱۹۴۲ء)

۷۔ "خوناب" (غزلیات) — محبوب المطابع، دہلی، — اشاعت اول: ۱۹۴۳ء

۸۔ "خندۂ سحر" (نظمیں) — اشاعت: اول ۱۹۴۴ء

۹۔ "ایک ادبی ڈائری" (تنقید) — اشاعت اول: ۱۹۴۵ء

۱۰۔ "روحِ عصر" (قطعات، غزلیات اور نظمیں) — لاہور، — اشاعت اول: ۱۹۴۵ء

۱۱۔ "لو ایک قصہ سنو" (۱۲ افسانے) — یونی ورسٹی پبلشرز، علی گڑھ، — اشاعت اول: ۱۹۵۳ء

۱۲۔ "انتخاب اختر انصاری" (منتخب کلام) — یونی ورسٹی پبلشرز علی گڑھ، — اشاعت اول: ۱۹۵۷ء

۱۳۔ "یہ زندگی اور دوسرے افسانے" (۲۴ افسانے) — یونی ورسٹی پبلشرز، علی گڑھ، — طبع اول: ۱۹۵۸ء

۱۴۔ "غزل اور درسِ غزل" (تعلیم) — ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ — اشاعت اول: ۱۹۵۹ء

۱۵۔ "بادۂ شبانہ" (منتخب کلام) — اشاعت اول: ۱۹۶۱ء

۱۶۔ "حالی اور نیا تنقیدی شعور" (تنقید) — اشاعت اول: ۱۹۶۲ء

۱۷۔ "Studies in Language and Language Teaching" (تعلیم) — اشاعت اول: ۱۹۶۲ء

۱۸۔	"ٹیڑھی زمین" (قطعات)	اشاعت اول: ۱۹۶۳ء
۱۹۔	"سرور جاں" (غزلیات)	اشاعت اول: ۱۹۶۳ء
۲۰۔	"مطالعہ و تنقید" (تنقید)	اشاعت اول: ۱۹۶۵ء
۲۱۔	"A Background to Educational Theroy" (تعلیم)	اشاعت اول: ۱۹۶۵ء
۲۲۔	"پر طاؤس" (منتخب قطعات)	اشاعت اول: ۱۹۶۵ء
۲۳۔	"چند نظمیں" (نظمیں)	اشاعت اول: ۱۹۶۷ء
۲۴۔	"درد و داغ" (مثنوی)	اشاعت اول: ۱۹۶۷ء
۲۵۔	"شعلہ بجام" (رباعیات)	اشاعت اول: ۱۹۶۸ء
۲۶۔	"دہان زخم" (منتخب کلام)	اشاعت اول: ۱۹۷۱ء
۲۷۔	"Anecdotes from life of Ghalib"	اشاعت اول: ۱۹۷۲ء
۲۸۔	"شعلہ کہت" (منتخب رباعیات)	اشاعت اول: ۱۹۷۳ء
۲۹۔	"روح نغمہ" (منتخب ہندی قطعات	اشاعت اول: ۱۹۷۴ء
۳۰۔	"غزل کی سرگزشت" (تنقید)	اشاعت اول: ۱۹۷۵ء
۳۱۔	"ولی کا روزا" (سوانح حیات)	اشاعت اول: ۱۹۷۷ء
۳۲۔	"وقت کی بانسوں میں" (طویل نظم)	اشاعت اول: ۱۹۷۹ء
۳۳۔	"غزل اور غزل کی تعلیم" (تعلیم)	اشاعت اول: ۱۹۷۹ء
۳۴۔	"تعلیم، سماج اور کلچر" (تعلیم)	اشاعت اول: ۱۹۷۹ء
۳۵۔	"غزل کی سرگزشت" (تحقیق و تنقید)	

غیر مدون:

لاتعداد مضامین اور شعری تخلیقات۔

زندگی میں مستقل پتا:

"شہرزاد" جامعہ اردو روڈ، علی گڑھ (اتر پردیش) بھارت۔

اعزاز:

۱۔ "مودی غالب ایوارڈ" برائے اردو شاعری ۱۹۸۵ء

نظریہ فن:

"گذشتہ چند سالوں میں میری ادبی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو میرا ترقی پسندانہ رجحان رہا ہے۔ ابتدائی چند افسانوں کے علاوہ میں نے اپنے تمام افسانے اسی رجحان کے ماتحت لکھے ہیں۔"

(بہ حوالہ: "ستاروں کی محفل" مرتبہ: بشیر ہندی، صفحہ نمبر ۳۰)

○

(۱) "عالمی اردو ادب ۱۹۸۶ء" مرتبہ: نند کشور وکرم مطبوعہ: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی، صفحہ ۲۷۵ میں تاریخ پیدائش ۳۰ ستمبر ۱۹۰۹ء درج ہے۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء کی تاریخ "ستاروں کی محفل" مرتبہ: بشیر ہندی کے لیے اختر انصاری دہلوی کے مرتب کردہ کوائف سے لی گئی ہے۔

(۲) "دو ایک قصہ ستو" کے متعدد افسانے اس سے قبل "یہ زندگی" نامی مجموعے میں شامل کیے گئے تھے۔

(۳) "یہ زندگی اور دوسرے افسانے" میں ۱۹۳۲ء سے قبل لکھے گئے افسانوں کو یکجا کیا گیا ہے۔

اختر انصاری دہلوی

لو ایک قصہ سنو!

"میں بھامو میں نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان واپس آ رہا ہوں۔"

چھوٹے بھائی کے متعدد خطوط جو اس مضمون پر مشتمل تھے' برما سے آ چکے تھے۔ میری کاہلی جواب لکھنے کی اجازت ہی نہ دیتی تھی۔ روز یہ ارادہ کرتا تھا اور روز یہ ارادہ ملتوی ہو جاتا تھا۔ جب نصف درجن خطوط جمع ہو گئے اور یوں بھی اپنی خیریت کا خط لکھے بغیر کم و بیش دو مہینے گذر چکے' تو ایک دن غیر معمولی عزم سے کام لے کر کاغذ اور قلم دوات لے کر بیٹھا اور تہیہ کر لیا کہ نہایت مفصل خط لکھوں گا اور انتہائی چرب زبانی اور دلائل آفرینی سے کام لوں گا تاکہ بنن میاں ہندوستان واپس آنے کے خیال سے تائب ہو کر بھامو میں اپنا قیام جاری رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔

بنن میاں! خدا تمہیں خوش رکھے! تم خدا کو سرمایہ داروں کے دماغ کی پیداوار سمجھتے ہو لیکن میں اس خدا پر ایمان رکھتا ہوں جس کا وجود سرمایہ داروں کے وجود سے بہت پرانا ہے۔ اس لئے بھائی! میں تو اپنا خط اسی دعا سے شروع کروں گا کہ خدا تمہیں خوش رکھے۔ نیک اعمال کی توفیق دے' اور ایمان کی روشنی عطا فرمائے۔ آمین! لو ایک قصہ سنو!" ایمان کی روشنی" پر یاد آ گیا۔

بہت دنوں کی بات ہے کہ میں برسات کا لطف اٹھانے کے لئے مہرولی میں یوسف کے یہاں مقیم تھا۔ ایک دن قطب مینار کی سیر کو گئے۔ ہم لوگ ہانپتے کانپتے سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے پیچھے نوجوانوں کی ایک ٹولی تھی' اور کہیں ان کے قریب ہی کچھ برقع پوش عورتیں تھیں۔ عورتیں برقع پوش ضرور تھیں مگر ان کے چہرے بے نقاب تھے اور وہ آزادی کے ساتھ ہنستی بولتی' قہقہے لگاتی اور "اوئی اللہ" "اور" ہے ہے" کرتی ہوئی غیر مردوں کے دوش بدوش سیڑھیاں طے کر رہی تھیں۔ ماحول کی تبدیلی بھی کسی عجیب چیز ہوتی ہے۔ بنن میاں! ذرا غور کرنے کی بات ہے یہی عورتیں جو شہری زندگی اور معاشرتی زندگی کی حدود میں رہتے ہوئے ہمیں اپنی جھلک بھی دکھانا گوارا نہ کرتیں' اب اس زندگی سے دور۔۔۔ بلکہ بلند!۔۔۔۔۔ ہو کر اپنے آپ کو کس قدر آزاد محسوس کر رہی تھیں! خیر' نوجوانوں کی اس ٹولی میں ایک بگڑے دل بھی موجود تھے۔ دو چار گوری چٹی صورتیں جو دیکھیں تو اتر آئے شرارت پر۔ اپنے کسی ساتھی سے بولے "اماں یار! روشنی تو یہاں بہت ہے پھر لالٹینوں کی کیا ضرورت ہے؟" ان عورتوں کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ اس نے پٹ سے جواب دیا "میاں صاحبزادے! ایمان کی روشنی چاہئے۔ یہ لالٹینیں تو بہت جلد بجھ جائیں گی۔" نہ پوچھو کیا حال ہوا سننے والوں کا۔ جتنے تھے سب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ کیا منہ توڑ جواب دیا ہے بڑھیا نے! کمال کر دیا سچ مچ افلاطون کی نانی تھی کمبخت! تو غرض یہ ہے بنن میاں! کہ ایمان کی روشنی بڑی چیز ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ تمہید کے طور پر تھا۔ اب کام کی باتیں سنو۔ ماموں جان کے خطوط سے اور خود تمہاری تحریروں سے یہ معلوم ہوا کہ بھامو میں تمہارا جی نہیں لگتا اور تم وہاں رہنا فضول سمجھتے ہو۔ میں نے اپنے پچھلے خط میں یہ لکھا تھا کہ تم اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف کرو۔ اس سے ان فائدوں کے علاوہ جو مطالعے سے حاصل ہوتے ہیں' ایک بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ تم اپنا وقت آسانی سے کاٹ سکو گے لیکن تم نے میرے اس خیال کو مہمل سمجھا۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ پڑھنے سے تمہیں دلچسپی تھی ہی کب جو اب ہو گی۔ جب طالب علمی کے زمانے میں نہیں پڑھا اور لغو سیاسی مشاغل میں وقت ضائع کیا تو اب کیا خاک پڑھو گے۔ تم کو پڑھنے کا مشورہ دینا واقعی ایک فضول اور مہمل سی بات ہے۔ مگر بنن میاں! تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ میں چونکہ بھامو جیسے وحشت خیز مقام پر نہیں رہا ہوں' اور گھر سے نکل کر کہیں گیا ہوں تو انگلستان گیا ہوں'

اس لئے تمہاری پریشانی اور بے لطفی کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ یقین مانو تمہاری دماغی حالت اور قلبی کیفیت سے اتنا واقف ہوں جتنے تم خود بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں کوئی صاحب کرامات بزرگ ہوں اور غیب کا حال جانتا ہوں' بلکہ صرف یہ کہ میں بھی ان حالات سے دوچار ہو چکا ہوں اور یہ آفت مجھ پر بھی بیت چکی ہے۔ تم نے میرے لندن جانے کا ذکر ناحق کیا۔ میں اس کی شکایت نہیں کرتا کہ تم نے میرے اوپر ایک ہلکی سی چوٹ کی اور ایک لطیف طنز سے کام لیا بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنی موافقت میں کوئی بات نہیں کہی۔ جو کچھ کہا میری موافقت میں کہا۔ سوچ سمجھ کر بات کیا کرو بنن میاں! کیا تم نہیں جانتے کہ جس دن میں لندن پہنچا اس کے دوسرے دن لندن سے متنفر ہو گیا اور وطن کی یاد میں آنسو بہانے لگا؟ تہذیب جدید کا یہ عظیم الشان مرکز اپنی گوناگوں رعنائیوں' دلچسپیوں اور مصروفیتوں کے باوجود میری توجہ کو جذب نہ کر سکا۔ چنانچہ چند ماہ نہایت بدمزگی کے ساتھ گزارے اور ہندوستان واپس آگیا۔ میری زندگی کے اس افسوسناک واقعہ سے تم کیا نتیجہ نکالو گے؟ یہی ناکہ پردیس میں جی کا لگنا پردیس کی رنگینی یا بے رنگی پر منحصر نہیں' اگر آپ بھامو میں رہ کر وطن کے لئے بے قرار رہتے ہیں تو لندن میں بھی آپ کا یہی حال ہو سکتا ہے۔

بات یہ ہے بنن میاں! کہ انسان جب اپنے وطن اور اہل وطن سے جدا ہو کر کسی اجنبی ملک میں جاتا ہے تو اکثر و بیشتر "ہوم سک" ہو جاتا ہے "ہوم سک نس" ایک عام مرض ہے اور بہت سے غریب الوطن اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں۔ اس میں بچوں' بوڑھوں' مردوں اور عورتوں کی تخصیص نہیں۔ نہ بھامو اور لندن یا مسقط اور پیرس کی تخصیص ہے۔ لو ایک قصہ سنو!

میں جس زمانے میں لندن میں تھا اس زمانے میں وہاں ایک ہندوستانی ریستوران "کوہ نور ریستوران" کے نام سے جاری تھا۔ یہ ٹاٹنم کورٹ روڈ یعنی لندن کے عین مرکزی علاقے میں واقع ہے۔ دو بھائی جو ہماری اپنی دہلی کے ایک کاستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے' اس کو چلا رہے تھے۔ میں لندن پہنچ کر دہلی کے لذیذ اور چٹپٹے کھانوں کو ترس ہی گیا تھا۔ یہ حالت تھی کہ بریانی' شامی کباب' روغن جوش اور خیا محل کی نہاری کے مزے یاد آتے تو سچ مچ منہ میں پانی بھر آتا چنانچہ "کوہ نور" کا کھانا میرے لئے حقیقتاً نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن کئی میل کا سفر کر کے وہاں پہنچتا اور ان کا ڈھائی شلنگ کا ڈنر کھاتا۔ کسی اور دن جاؤں یا نہ جاؤں اتوار کو ضرور جاتا تھا کیونکہ اس دن جلیبیاں بھی ڈنر کا ایک جزو ہوتی تھیں۔ تو بنن میاں! قصہ یہ ہے کہ ایک اتوار کی شام کو میں وہاں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس وقت میرے سوا وہاں کوئی اور نہ تھا' کیوں کہ اصل میں ابھی ڈنر کا وقت نہیں ہوا تھا اور میں جلیبیوں کے لالچ میں ذرا وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا۔ میں نہایت اطمینان کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ میں نے ایک نظر میں صرف اتنا دیکھا کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ اس سے زیادہ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مغرب کے بڑے بڑے شہروں میں لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ دوسروں کو بے سبب گھورنا یا ان کے کاموں میں دخل دینا وہاں بدتہذیبی خیال کی جاتی ہے اور اصل یہ ہے کہ ان فضول باتوں کے لئے ان کے پاس وقت بھی نہیں ہوتا۔ یہ صاحب آئے اور مجھ سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئے۔ میں اپنے کھانے میں مشغول رہا اور ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ایک آدھ اچٹتی ہوئی نظر ان کے چہرے پر پڑ گئی ہو تو اس کی مجھے خبر نہیں۔ تھوڑی دیر میں ویٹر آیا اور یہ پوچھنے کے لئے کہ آپ کے واسطے کیا چیز حاضر کی جائے ان کے پاس گیا۔ جونہی ان کے منہ سے پہلا لفظ نکلا میں چونک پڑا۔ میں ان کی آواز پہچانتا تھا۔ آواز کو یاد رکھنے میں میرا حافظہ بہت اچھا کام کرتا ہے۔ لو ایک قصہ سنو!

یہ کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں دہلی سے بریلی بڑے ابا کے ہاں جا رہا تھا۔ علی گڑھ سے جو گاڑی ملی اس میں بہت بھیڑ تھی۔ انٹر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے تھرڈ میں جگہ ملی۔ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ اتنی بھی گنجائش نہ تھی کہ آزادی کے ساتھ ادھر ادھر مڑ کر دیکھ سکیں۔ بس جہاں بیٹھے ہو وہیں بت بنے بے حس و حرکت بیٹھے رہو۔ خیر بیٹھ گئے اور گاڑی چل پڑی۔ علی گڑھ کے اسٹیشن سے نکلے ہی تھے کہ ڈبے میں ایک سحر آفریں نغمہ بلند ہوا۔ کیا خبر تھی کہ مسافروں کی اس بھیڑ میں ایک جادو نوا مغنی بھی ہے۔ یہ شخص مجھ سے بہت دور بیٹھا تھا اور چونکہ میری پشت اس کی طرف تھی' میں اس کو دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ دیکھنے کی میں نے کوشش بھی نہیں کی۔ اس کے گانے کو "سرود خانہ

ہمسایہ " سمجھ کر سننے لگا۔ کیا بتاؤں اس کی بھاری آواز میں کتنا درد اور کتنی گھلاوٹ تھی ۔ طبیعت پر نشہ سا چھا گیا۔ سفر کی ساری کلفت دور ہو گئی۔ علی گڑھ اور بریلی کے درمیان یہ شخص وقتاً" فوقتاً" گاتا رہا اور اس کے گانے کی وجہ سے سفر خاصا دلچسپ رہا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اتنے لمبے سفر کے دوران میں میں نے اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھی ۔ بریلی پہنچنے کے تین چار دن بعد شام کے وقت ہم سب کوئی سات آٹھ آدمی مکان کے سامنے چبوترے پر مونڈھے اور کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے ۔ ایک صاحب جو اپنی وضع قطع سے ایک قلندرانہ شان کے بزرگ معلوم ہوتے تھے تشریف لائے ۔ گٹھا ہوا جسم 'گھنی سیاہ داڑھی ' آنکھوں میں سرمہ ' کالا تہمد اور گہرے کتھئی رنگ کا گھٹنوں سے نیچا کرتا ۔۔۔۔۔۔ وہ یقیناً " کوئی صوفی تھے ۔ آتے ہی بڑے ابا سے بغل گیر ہوئے اور بلند آواز سے باتیں کرنے لگے ۔ میں ان کی آواز سن کر اچھل پڑا ۔ میں نے کہا "" حضرت ! میرا خیال ہے آپ تین چار دن ہوئے دوپہر کی گاڑی سے بریلی تشریف لائے تھے ۔ "کہنے لگے "" جی ہاں ! آپ کو کیسے معلوم ؟ آپ بھی شاید اسی گاڑی سے آئے ہوں گے ۔ " میں نے کہا "" آیا تو میں بھی اسی گاڑی سے تھا ' لیکن میں نے آپ کو دیکھا نہیں ۔ """ پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اس گاڑی سے بریلی آیا ؟ " انہوں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا ۔ غرض کہ ان کے ساتھ بڑی دلچسپ گفتگو رہی اور آخر میں جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے آپ کو آپ کی آواز سے پہچانا تو وہ بہت متحیر ہوئے ۔ اس کے بعد بڑی دیر تک ہم نے ان کا گانا سنا ۔

تو بنن میاں بات یہ ہے کہ میں آدمی کو اس کی آواز سے پہچان لیتا ہوں ۔ "کوہ نور " میں بھی یہی ہوا جونہی وہ صاحب بولے میں ان کو پہچان گیا۔ وہ ڈاکٹر نصیر تھے جو کئی سال دہلی کے سول ہسپتال میں ہاؤس سرجن رہ چکے تھے ۔ انہوں نے مجھے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پایا تو وہ بھی مجھے پہچان گئے ۔ فوراً بولے " آپ دہلی سے تشریف لائے ہیں ؟ " میں نے کہا "" جی ہاں ' معاف کیجئے گا ڈاکٹر صاحب میں نے اب تک آپ کو پہچانا نہیں تھا ۔ " بولے "" ہاں ' میں بھی آپ کو پہچان نہیں سکا تھا ۔ " پھر میں نے کہا "" بہت کافی تبدیلی ہو گئی آپ میں ' دو تین مہینے کے اندر ۔ " انہوں نے لندن پہنچ کر نہ صرف داڑھی منڈا دی تھی ' بلکہ مونچھیں بھی صاف کر دی تھیں اور میرا اشارہ اسی تبدیلی کی طرف تھا ۔ وہ ہنسنے لگے " اور آپ پہلے کی نسبت کچھ دبلے بھی معلوم ہوتے ہیں ۔ " میں نے اپنے تبصرے کو جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ کہنے لگے " جی ہاں ' میری صحت یہاں آکر کچھ اچھی نہیں رہی ۔ شروع میں دو تین مہینے تو " ہوم سک " رہا اور اب اکثر قبض کی شکایت رہنے لگی ہے ۔۔۔۔۔ "" ہوم سک " سنتے ہو بنن میاں ! ڈاکٹر نصیر لندن پہنچ کر " ہوم سک " ہو گئے اور دو تین مہینے تک " ہوم سک " رہے ' اس قدر " ہوم سک " کہ ان کی صحت پر برا اثر پڑا اور صورت پہچانی مشکل ہو گئی۔

مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص اپنے گھر سے دور پردیس جا کر رہے گا تو وہ پردیس خواہ باغ ارم ہو ' خواہ ویرانہ ' اس کا " ہوم سک " ہو جانا تقریباً لازمی ہے ۔ جو لوگ تعلیم کے لئے یا کسی اور غرض سے یورپ جاتے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر اس دماغی بیماری میں کم از کم کچھ دنوں کے لئے ضرور مبتلا ہو جاتے ہیں ' حالانکہ یورپ کے وہ مقامات جہاں یہ لوگ جا کر ٹھہرتے ہیں ' رونق ' چہل پہل اور گہما گہمی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے ۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ بیماری عام طور پر دو ڈھائی مہینے رہتی ہے ' اس کے بعد ختم ہو جاتی ہے ۔ اگر کوئی شخص جلد سے جلد اس کے اثر سے نجات پانا چاہے تو اس کی یہی صورت ہے کہ وہ اپنے آپ کسی نہ کسی کام میں مصروف کرے اور کسی نہ کسی چیز میں دلچسپی لینا شروع کر دے ۔ مصروفیت اور دلچسپی ! مصروفیت اور دلچسپی ! یہی دو چیزیں ہیں جو تمہاری بد دلی کا علاج کر سکتی ہیں اور تمہاری بد مزگی کو دور کر سکتی ہیں اور اسی بنا پر میں نے تمہیں لکھا تھا کہ تم اپنے آپ کو مطالعہ میں مصروف کرو۔

یوں بھی مطالعہ ایک اچھی اور ضروری چیز ہے ۔ اگر تم مطالعے کو اپنے مشاغل کا ایک اہم جزو نہ بناؤ گے تو کیا دیس اور کیا پردیس ' ہر جگہ تمہاری زندگی اجیرن ہو سکتی ہے ۔ یار دوستوں کے ساتھ ہو ' حق کرنے میں انسان ۔۔۔ ایک معقول انسان ! ۔۔۔۔ اپنی ساری زندگی نہیں گزار سکتا ۔ ایک وقت آتا ہے کہ جب وہ اس روش سے اکتا جاتا اور اس کے فضول اور لغو ہونے کا قائل ہو جاتا ہے ۔ لو ایک قصہ سنو!

اصل میں یہ کوئی قصہ نہیں ہے ' بلکہ میں ایک مشہور مصنف کا قول دہرانا چاہتا ہوں ۔ سامرسٹ ماہم کا نام بھلا تم نے کاہے کو سنا ہو گا ۔ وہ انگریزی زبان کا ایک بہت بلند پایہ ڈرامہ نگار اور افسانہ نویس ہے ۔ اس نے کسی جگہ لکھا ہے کہ صرف وہی لوگ بے دلی ' افسردگی اور اکتاہٹ

کا شکار ہوتے ہیں جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں اور صرف گاؤدی قسم کے لوگ ہی اپنا دل بہلانے کے لئے خارجی دنیا کے محتاج ہوتے ہیں ۔ حقیقت بھی یہی ہے دنیا میں بہ کثرت لوگ ایسے ہیں جو تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی علمی افلاس اور ذہنی بے مائگی میں مبتلا ہیں ۔ وہ حصول مسرت کے ذرائع ہمیشہ خارجی دنیا میں تلاش کرتے ہیں اور اسی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں ۔ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ۔ ان کی زندگی کے دن مہینے اور سال گزرتے چلے جاتے ہیں ' لیکن کبھی اس بات کی نوبت نہیں آتی کہ وہ اپنے دل کو ٹٹولیں ' روح کی گہرائیوں کا جائزہ لیں اور اندرونی کیفیات کا تجزیہ کریں ۔ میرے نزدیک ایسے لوگوں کی زندگی گدھوں کی زندگی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔

اس لئے میرا مشورہ ہے بنن میاں! کہ تم اس بات کا بالکل خیال نہ کرو بھاموا ایک ویران ' پسماندہ اور غیر مہذب مقام ہے ۔ اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف کرو اور کتابوں میں دل لگاؤ ۔ تمہارے خالی لمحات کو پر کرنے کے لئے مطالعہ بہترین چیز ثابت ہو گا ۔ اور ہاں ' ایک بات اور ذہن میں آئی ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ دنیا کے ویران ' پسماندہ اور غیر مہذب مقامات اپنے اندر کوئی دلکشی نہیں رکھتے ۔ کیا بھاموں میں انسانی زندگی اور انسانی معاشرت نہیں ہے جس کا مطالعہ کیا جا سکے ؟ کیا وہاں صبح و شام کے مناظر بہتے ہوئے دریا ' کھلے ہوئے میدان اور گھنے جنگل نہیں ہیں جن میں قدرت کی جلوہ آرائیوں کا مشاہدہ کیا جا سکے ؟ مجھے یقین ہے کہ وہاں یہ سب کچھ ہے اور کسی ذی ہوش انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہاں رہ کر ان چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لے اور ایک تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر دہلی ' لکھنؤ ' اور لاہور کی ہنگامہ پرور صحبتوں کی یاد میں ٹھنڈی آہیں بھرے اور اپنی محرومی پر آنسو بہائے ۔ میں اس عقیدے کا انسان ہوں بنن میاں! کہ آدمی اگر قطب شمالی پر بھی جا کر رہے تو اس کے پاس بیکار اور نکما رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی ۔ وہ وہاں بھی اپنا وقت مفید مشاغل میں گذار سکتا ہے ۔ یاد رکھو دنیا میں بہت کم لوگ اتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کو گھر سے باہر نکلنے اور دنیا دیکھنے کا موقع ملے ۔ پھر لائق افسوس ہیں وہ لوگ جن کو ایسا موقع ملتا ہے اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے ۔ مجھے بھی قدرت نے ایک مرتبہ ایسا ہی بیش بہا موقع عطا کیا تھا لیکن میں اس سے مستفید نہیں ہوا ' کیوں کہ میں اس وقت اتنا ہی نادان تھا جتنے کہ آج تم ہو ۔ زندگی کو دیکھنے ' سمجھنے اور محسوس کرنے کی جو تڑپ آج میرے اندر ہے وہ اس وقت نہ تھی ۔ حیات انسانی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر میرے چاروں طرف پھیلا پڑا رہا لیکن میں نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور آج یہ حالت ہے کہ گویا زندگی کے خشک ریتیلے ساحل پر ماہی بے آب کی طرح پڑا تڑپتا ہوں ۔ افسوس! افسوس! افسوس! مگر اب افسوس کرنے سے بھی کیا حاصل ؟ خدا سے دعا ہے بنن میاں! کہ تمہیں اس طرح کبھی نہ پچھتانا پڑے!

بات سے بات نکلتی ہے ۔ سیاحت و سفر کا ایک بہت بڑا فائدہ یاد آیا ۔ جن لوگوں کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ گھر سے باہر نکل کر پردیس میں رہیں اور مختلف مقامات دیکھیں ان میں ایک خود اعتمادی اور ذہن و کردار کی ایک پختگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ خوبیاں ان لوگوں میں نسبتاً کم پائی جاتی ہیں جن کو سیر و سیاحت کے مواقع میسر نہیں آتے ۔ لو ایک قصہ سنو!

ابھی پچھلے دنوں ناصر بھائی نے اپنے ایک عزیز دوست سلمانی صاحب سے میری ملاقات کرائی ۔ وہ دریا گنج میں رہتے ہیں ۔ ایک دن انہوں نے مجھے اور ناصر بھائی کو مع ہمارے چند دوسرے احباب کے ڈنر پر مدعو کیا ۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ کوٹ اور شیروانیاں اتار کر بہت دیر تک ان کے خانہ باغ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے ۔ باتیں کرتے کرتے ناصر بھائی نے کہا " کیوں نہ ہم لوگ ٹہلتے ہوئے فیروز شاہ کے کوٹلے تک ہو آئیں ؟ " سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور مسز سلمانی نے بھی اجازت دے دی ۔ رات کے نو بج چکے تھے اور یوں بھی دریا گنج سے فیروز شاہ کا کوٹلہ دور کتنا ہے چنانچہ ہم سب جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح چلنے کے لئے کھڑے ہو گئے لیکن سلمانی صاحب نے کہا " ذرا ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں ۔ " اور کوٹھی کے اندر چلے گئے ۔ میں سمجھا کپڑے پہننے گئے ہیں مگر ناصر بھائی اور مسز سلمانی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے ۔ ناصر بھائی مجھ سے بولے " جانتے ہو یہ کہاں گئے ہیں ؟ " میں نے کہا " میں تو نہیں جانتا ۔ " اپنی والدہ سے اجازت لینے گئے ہیں ۔ " ناصر بھائی نے کہا " اجازت! کس بات کی اجازت ؟ " میں نے پوچھا ۔ " اجازت اس بات کی کہ فیروز شاہ کے کوٹلے تک ٹہل آئیں ۔ " ناصر بھائی نے ہنستے ہوئے کہا ۔ مسز سلمانی بھی ہنسنے لگیں ۔ میں اس مذاق کو خاک نہیں سمجھا بیوقوفوں کی طرح ان

دنوں کا منہ تکنے لگا۔ ناصر بھائی نے مجھے بتایا کہ سلمانی صاحب آج تک اپنی والدہ کی اجازت کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے۔ وہ کہیں جانے سے پہلے والدہ سے اجازت لینا ہمیشہ اپنا فرض خیال کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچپن سے لے کر اس وقت تک کہ ان کی عمر چالیس سے متجاوز ہو چکی ہے کبھی دو چار دفعہ سے زیادہ دہلی سے باہر نہیں گئے' اور ہمیشہ گھر پر اپنی والدہ کے سایہ عاطفت میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔

کچھ کچھے منی میاں! ہر چند کہ سلمانی صاحب کی یہ عادت کہ وہ گھر سے باہر جاتے وقت اپنی والدہ کی اجازت ضرور حاصل کر لیتے ہیں کوئی بری عادت نہیں ہے مگر پھر بھی میں اس کو ان کے کردار کی بہت بڑی کمزوری خیال کرتا ہوں۔ میں ابھی ان سے صرف دو چار ملاقاتیں کر سکا ہوں۔ اگر ان ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا تو میں یقیناً ان کی اس کمزوری کا اور ان کی زندگی پر اس کمزوری کے اثرات کا اچھی طرح مطالعہ کر سکوں گا۔ مگر اس وقت بھی یعنی کسی تفصیلی مطالعہ کے بغیر اتنی بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سلمانی صاحب خود اعتمادی سے بالکل محروم ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ صرف گھر سے باہر جانے کے لئے بلکہ زندگی کے ہر اہم اور غیر اہم اقدام کے لئے اپنی والدہ کی اجازت حاصل کرتے ہوں گے ور والدہ کی اجازت کے علاوہ بیوی سے بھی مشورہ کر لیتے ہوں گے۔ ممکن ہے بچوں کی رائے بھی لے لیتے ہوں اور کچھ عجب نہیں جو نوکروں سے بھی صلاح کر لیتے ہوں۔ وہ تنہا اپنی ذمہ داری پر دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے۔

اور ان کی اس خوفناک کمزوری کا سبب؟ یہی کہ وہ کبھی کسی قابل ذکر مدت کے لئے گھر سے باہر نہیں رہے' انہوں نے کبھی کوئی لمبا' دور دراز کا سفر نہیں کیا اور ان کو کسی ایک دن بھی یہ محسوس کرنے کا موقع نہیں ملا کہ آج میں اپنے عزیزوں' دوستوں اور غم خواروں سے دور ہوں اور جو کچھ کر رہا ہوں اس کا نتیجہ برا یا بھلا مجھی کو بھگتنا پڑے گا۔

اب تم خود سوچ لو منی میاں! کہ قدرت نے تمہیں برما کے سفر پر مجبور کر کے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کیا یا برا اور یہ کہ بھامو میں تمہارا قیام ضروری ہے یا نہیں۔

تم ہندوستان آنے کے لئے بیقرار ہو۔ پوچھئے کیوں' تو جواب ملتا ہے کہ بھامو میں نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں' اور اگر مل بھی سکتی ہے تو برسوں کے انتظار اور مدتوں کی امیدواری کے بعد! ماموں جان کے خطوط سے تمہارے ان خیالات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ وہ برابر یہی لکھ رہے ہیں کہ منی میاں کے لئے کوشش ہو رہی ہے اور خدا نے چاہا تو جلد کامیابی ہو گی۔ ماموں جان کا خدا بھی' وہ خدا نہیں ہے جس کو تم سرمایہ داروں کے دماغ کی پیداوار سمجھتے ہو۔ اس لئے میں بھی ان کے ساتھ اس امید میں شریک ہوں کہ جلد تمہیں کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔ لیکن تھوڑی دیر کے لئے میں تمہاری بات مانے لیتا ہوں اور یہ فرض کئے لیتا ہوں کہ جیسا تم کہتے ہو' ویسا ہی ہے' یعنی یہ کہ بھامو میں نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ تو اب اس کے بعد بھی میرا خیال یہی ہے کہ تمہیں بھامو میں رہنا چاہئے' کیونکہ ہندوستان میں نوکری ملنے کی امید اور بھی کم ہے۔

بات یہ ہے کہ تم ابھی تلاش معاش کے مصائب سے صحیح معنوں میں واقف نہیں ہو۔ دنیا میں لاتعداد نوجوان ایسے ہیں جو روزگار کی جستجو میں ادھر سے ادھر پھر رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر جلد سے جلد بلکہ فوراً کوئی ملازمت نہ ملی تو بھوک اور فاقے سے مفر نہ ہو گا۔ جستجو اور تلاش تو اسی کی ہے جو اس ہولناک احساس کے ساتھ اور اس بھیانک خوف کو دل میں لے کر نوکری ڈھونڈھے کہ اگر کل تک مجھے نوکری نہ ملی تو میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ لو ایک قصہ سنو!

معین الدین میرا ایک بہت پرانا دوست ہے۔ جس زمانے میں ہم پنڈت کے کوچے میں رہتے تھے' وہ بھی وہیں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بھی عربک اسکول میں پڑھتا تھا اور میں بھی' چنانچہ وہ اکثر ابا جان مرحوم سے انگریزی پڑھنے ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ تم اس کو نہیں جانتے کیوں کہ تمہارے ہوش سنبھالنے سے پہلے وہ انٹرنس کا امتحان پاس کر کے علی گڑھ جا چکا تھا۔ اس نے پانچ چھ برس میں علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر کے لئے مقابلے کے امتحان میں بیٹھا۔ جب نتیجہ شائع ہوا تو اس کا نام چوتھے نمبر پر تھا۔ اس سال چار آدمی لئے جانے والے تھے بس پھر کیا تھا معین صاحب کے ٹھاٹھ ہو گئے۔ فیسیں معاف کرا کر کے تعلیم حاصل کی تھی' لیکن بی۔ اے کرتے ہی ڈپٹی کلکٹری ملی۔ یہ وہ زمانہ

تھا جب میں انگلستان سے واپس آ چکا تھا اور گھر میں پڑے پڑے "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" کا ورد کیا کرتا تھا۔ یہ گویا نشے کے اتار کی حالت تھی اور طبیعت کی بے کیفی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ معین کی کامیابی کی خبر سنی تو اپنی ناکامی کو دیکھتے ہوئے دل کچھ زیادہ خوش نہ ہوا۔ مجھے چاہئے تھا کہ کم از کم ایک دفعہ جا کر اسے مبارکباد تو دے آتا لیکن جی نہ چاہا۔ معلوم نہیں یہ رشک و حسد کا نتیجہ تھا یا یہ کہ مجھے ایک ایسے شخص سے ملتے ہوئے شرم آتی تھی جو زندگی کی دوڑ میں مجھ سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ کچھ بھی ہو، میں اس سے ملنے نہیں گیا۔ اور میاں! ابھی یہ خبر تازہ ہی تھی کہ یکایک دوسری خبر ملی وہ یہ کہ معین صاحب ڈپٹی کلکٹری میں نہیں لئے گئے۔ ارے بھئی کیوں؟ یہ کیسے ہوا؟ پتہ لگا کہ فرقہ وارانہ تناسب کو قائم رکھنے کے لئے ایک عیسائی امیدوار کو لے لیا گیا جو بیسویں نمبر تھا اور معین صاحب کو رد کر دیا گیا۔ لیجئے بنا بنایا محل گر پڑا۔ وہ پہلی خبر سن کر مجھے خوشی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن یہ دوسری خبر سن کر یقیناً رنج ہوا۔ خیر اس کے بعد بہت دنوں تک میں معین کے حالات سے بے خبر رہا۔ بس اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ نائب تحصیلداری، اکسائز انسپکٹری اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے لئے مقابلے کے امتحانات میں شریک ہوا مگر کسی میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب میں تین سال کانپور میں رہ کر دہلی واپس آیا تو ایک دن سر راہ اس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ان دنوں ڈی۔ اے۔ جی۔ پی۔ ٹی کے دفتر میں چالیس روپے پر کام کر رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ کہاں ڈپٹی کلکٹری اور کہاں چالیس روپے کی کلرکی اور وہ بھی عارضی۔ خیر، اب پچھلے ہفتے ایک مدت کے بعد اس سے پھر ملاقات ہوئی۔ آج کل اجمیری دروازے سے باہر ایک عظیم الشان نمائش ہو رہی ہے اور وہاں بڑی رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ میں کسی شام ٹہلنے نکلتا ہوں تو اکثر و بیشتر قدم خود بخود اسی طرف کو اٹھ جاتے ہیں۔ ایک دن، رات کے ساڑھے آٹھ بجے میں ایک ریستوران میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ یکایک میری نظر معین پر پڑی جو ریستوران کے دفتر میں ایک کرسی پر مالکانہ اقتدار کے ساتھ بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "کمال کرتا یہ شخص بھی!" میں نے اپنے دل میں کہا "اب کلرکی کرتے کرتے ریستوران کھول بیٹھا۔" چائے ختم کر کے میں سیدھا اس کے پاس گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑا اور بوکھلا سا گیا "کہو بھئی معین!" میں نے کہا "کیا حال چال ہیں؟ یہ ریستورات کب کھولا؟" میرا سوال یکسر مہمل تھا کیونکہ میں نے اس کو وہاں بیٹھا دیکھ کر جو نتیجہ نکالا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ وہ ریستوران کا مالک نہیں بلکہ ایک ادنیٰ ملازم تھا اور صبح سے شام تک وہاں بیٹھ کر بل بنانے کی خدمت اس کے سپرد تھی۔ یہ معلوم کر کے میرے دل کو ایک دھکا سا لگا اور مجھے اس کی حالت پر بہت زیادہ رحم آیا لیکن میں نے کوشش کر کے اپنے جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور اپنے قدرتی انداز میں اطمینان کے ساتھ باتیں کرتا رہا تاکہ وہ یہ سمجھے کہ میرے نزدیک اس کا ریستوران میں ملازم ہونا کوئی افسوس ناک اور رحم انگیز بات نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جو خفت اس اچانک ملاقات سے اس کو ہوئی ہے اس میں مزید اضافہ کروں مگر اس نے خود ہی اپنے روزگار کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ اس کی ناکامیوں اور مصیبتوں کی داستان سن کے میرا تو دل ہل گیا۔ تقدیر کا کھیل دیکھئے کہ وہ شخص جو شاید ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار ہوتا، برسوں سے اس کوشش میں ہے کہ دو وقت کی روٹی کا اطمینان ہو جائے مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ اس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ آج اسے اس بات کا بالکل غم نہیں ہے کہ وہ ڈپٹی کلکٹر ہونے کی بجائے ایک عارضی ریستوران میں دو وقت کے کھانے پر ملازم ہے۔ غم ہے تو یہ کہ پندرہ بیس دن بعد جب نمائش ختم ہو جائے گی اور ریستوران نہ رہے گا تو یہ دو وقت کا کھانا کہاں سے آئے گا! عبرت! عبرت! عبرت!

بنن میاں! سچ پوچھو تو تم ابھی تلاش معاش کی تنگی سے دوچار ہی نہیں ہوئے اور خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا وقت آئے۔ تمہارے روزگار کا مسئلہ کوئی بہت نازک اور پریشان کن مسئلہ نہیں ہے۔ زندگی کی ابتدائی ضروریات یعنی کھانا، کپڑا وغیرہ حسب دل خواہ پوری ہوتی رہتی ہے اور آئندہ بھی ان کے پورا ہوتے رہنے کا امکان ہے، چنانچہ تم نہایت اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ روزگار کی تلاش اور مستقبل کی فکر کر سکتے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تمہیں اس آرام اور عافیت کی قدر کرنی چاہئے۔ بریا گئے ہو تو اب وہاں رہ کر کچھ کام بھی کرو۔ اگر اس وقت اپرنٹس ہو سکتے ہو تو ضرور ہو جاؤ، چاہے آئندہ مستقل ملازمت ملنے کی امید بالکل نہ ہو، معاوضہ نہ ملے تو اس کا بھی غم نہ کرو، کچھ نہیں تو تجربہ ہی حاصل ہو گا۔ دفتری کاموں کی نوعیت سے واقفیت پیدا ہو گی، معلومات میں اضافہ ہو گا، قابلیت بڑھے گی اور کچھ نہیں تو رخصت ہوتے وقت ایک آدھ

سرٹیفکیٹ ہی لے لو گے۔ غرض یہ کہ اگر بلا معاوضہ نوکری بھی ملتی ہے تو تمہیں اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔

اور جناب یہ کیا فرمایا کہ ہندوستان کو جنگ آزادی کے لئے سپاہیوں کی ضرورت ہے اور میں یہاں بیکار پڑا سڑ رہا ہوں؟ واہ' واہ! کیا کہنے ہیں بنن میاں! تمہارے! قربان جائیے اس بلند خیالی کے! مگر اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے ذرا اپنے حالات پر تو نظر ڈالی ہوتی۔ باوا مر چکے' گھر میں جو تھوڑی بہت پونجی تھی وہ ختم ہو چکی' بیوہ ماں اس انتظار میں جی رہی ہے کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے جب صاحبزادے اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اور دو وقت کی روٹی کمانے کے قابل بنیں۔ یہ تو جناب کے حالات ہیں اور بات وہ کہی ہے جو صرف مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو ہی کے منھ سے نکلی ہوئی اچھی معلوم ہو سکتی ہے۔ جنگ آزادی کا سپاہی بننا آسان کام نہیں ہے بنن میاں! اس کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں دولت سب سے اہم ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے تم یکسر محروم ہو۔ ایک مفلس اور قلاش نوجوان کو تو ادھر کا رخ بھی نہیں کرنا چاہئے۔ لو ایک قصہ سنو!

ہندو کالج میں میرے ساتھ ایک لڑکا بھگوان داس پڑھتا تھا۔ اس کے سیاسی خیالات کچھ تمہارے جیسے تھے لیکن تم نے تو (معاف کرنا بنن میاں) دو چار باتیں ادھر ادھر سے سن لی ہیں جن کو تم وقتاً فوقتاً دہراتے رہتے ہو۔ اس کے برعکس بھگوان داس نے سیاسی لٹریچر کثرت کے ساتھ اور محنت کے ساتھ پڑھا تھا۔ اس کی زبان سے جو بات نکلتی تھی وہ ایک وسیع مطالعے اور عمیق فکر کا نتیجہ ہوتی تھی۔ ابتداء میں اس کو فارسی سے بڑی دلچسپی تھی اور سعدی و حافظ کے سیکڑوں شعر یاد تھے۔ اردو سے بھی بہت شغف رکھتا تھا اور یہی وہ چیز تھی جس نے مجھ کو اس سے قریب تر کر دیا تھا لیکن اس کا یہ شوق جلد ہی ختم ہو گیا' کیوں کہ سیاست سے اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد بی۔ اے میں اس نے فارسی نہیں لی بلکہ انگریزی کے علاوہ تاریخ اور اقتصادیات لے کر مضامین کی مثلث کو پورا کیا۔ اب اس کے خیالات میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اردو فارسی ادب سے وہ بیزار ہو گیا۔ جس ادب کا کبھی دیوانہ وار عاشق تھا اب اس کو حقارت کے ساتھ "مڈل کلاس لٹریچر" کہنے لگا یہی نہیں' اور بھی بہت سی چیزیں اب اس کے نزدیک سرمایہ داروں اور دوسرے خوش حال طبقوں کی پیدا کی ہوئی اور بنائی ہوئی تھیں۔ مثلاً مذہب' مروجہ اخلاق' معاشری رسوم' مختلف سیاسی ادارے' فنون لطیفہ کے شاہکار اور ان سب کو وہ قابل نفرت خیال کرتا۔ "پرائیوٹ پراپرٹی" (ذاتی ملکیت) کو وہ دنیا کی سب سے بڑی لعنت اور زندگی اور سماج کی ساری برائیوں کا سرچشمہ تصور کرتا۔ جنگ' غلامی' غریبی' جہالت' ہر چیز اس کے نزدیک "پرائیوٹ پراپرٹی" کی پیداوار تھی۔ فرانسیسی مفکر و مدبر پرودھن کا مشہور جملہ "پراپرٹی از تھفٹ" (پراپرٹی سرقہ ہے) ہر وقت اس کی زبان پر رہتا۔ مجھ سے ملنے آتا تو دیوار پر کہیں نہ کہیں یہ جملہ ضرور لکھ دیتا۔ ایک دن مجھ سے بولا "تم تاج محل کو کیا سمجھتے ہو؟" میں نے کہا "میں تاج محل کو ایک ایسی عمارت سمجھتا ہوں جو سنگ مرمر سے بنائی گئی ہے۔" کہنے لگا "میرا یہ مطلب نہیں۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ تاج محل کے متعلق تمہارا کیا ہے؟" میں نے کہا "تاج محل کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت ہے۔" "تو گویا وہ تمہارے نزدیک ایک لائق تحسین چیز ہے؟" اس نے سوال کیا۔ میں نے کہا' "بے شک وہ فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے اور لائق صد تحسین ہے۔" "مگر میں اس کو قابل نفرت سمجھتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "ضرور سمجھو" میں نے کہا "آج کل اچھی چیزوں کو برا کہنا بھی فیشن میں داخل ہے۔ ایک صاحب نے نگار میں ایک مضمون لکھا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب جس کو اردو کا سب سے بڑا شاعر خیال کیا جاتا ہے دوسروں کے خیالات چرایا کرتا تھا اور اس لحاظ سے ایک معمولی درجے کا شاعر تھا۔" اس نے میری بات کو غور سے نہیں سنا اور اپنی کہے گیا۔ "میں تاج محل کو قابل نفرت سمجھتا ہوں۔ وہ اس زمانے کی یادگار ہے جب بڑے بڑے جاگیردار' راجہ اور مہاراجہ کسانوں کو بے دردی کے ساتھ لوٹتے تھے اور ان کے خون سے اپنی محفلوں کو رنگین بناتے تھے۔" "تمہارا خیال صحیح ہے۔" میں بیچ میں بول اٹھا' "لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو بھگوان داس! تم اس وقت اسٹیج پر نہیں ہو' بلکہ اپنے ایک دوست کے کمرے میں بیٹھے ہو۔ تم اپنے ماحول سے بڑی جلدی بے خبر ہو جاتے ہو۔ یہ تمہارے اندر بڑا عیب ہے۔" اس نے جواب دیا "اور تاج محل ایک ایسے سیاسی و معاشی نظام کی پیداوار ہے جو "ام مورل" تھا۔ بنیادوں سے لے کر چوٹی تک "ام مورل" اس لئے تاج محل بھی ایک "ام مورل" چیز ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر ام مورل ہے تو ہوا

کرے۔ خوبصورت تو ہے' اور یہی اصلی چیز ہے۔ ایک طوائف بھی "ام مورل" ہوتی ہے لیکن بعض اوقات وہ حسین بھی ہوتی ہے اور اس کا "ام مورل" ہونا اس کے حسین ہونے میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔" اس پر وہ طوائف کا مسئلہ لے بیٹھا' کہنے لگا' "طوائف "ام مورل" نہیں ہوتی۔ طوائف کو "ام مورل" کہنا قطعی جہالت ہے۔ طوائف "پرائیویٹ پراپرٹی" کی پیداوار ہے۔۔۔۔" میرے نزدیک اس کی گفتگو ہمیشہ ایک ہزیہ نظم ہوتی تھی اور "پرائیویٹ پراپرٹی" ٹیپ کا بند۔ جب وہ اس ٹیپ کے بند پر پہنچا تو میں اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا اور ایک زور کا قہقہ لگایا لیکن اس نے اپنے کلام کا سلسلہ جاری رکھا' "طوائف پرائیویٹ پراپرٹی" کی پیداوار ہے۔۔" میں نے کہا' "بھگوان داس! آج تمہارا بخار بہت تیز ہے' تھوڑی دیر خاموش لیٹ کر آرام کرو۔" وہ اٹھا اور مجھے جاہل' کوڑھ مغز اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ جلدی میں وہ پنسل بھی چھوڑ گیا جس سے اس نے میز پر پڑے ہوئے تقریباً تمام کاغذات "پراپرٹی از تھفٹ" کی مہر ثبت کر دی تھی۔

یہ تھا میرا دوست بھگوان داس اور یہ تھے میرے وہ خیالات جو بھوت بن کر یکایک اس کے سر پر سوار ہو گئے تھے۔ بہت جلد بھگوان داس جی اپنے مرکز ثقل سے اس حد تک ہٹ کر انہوں نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا "دیکھو بھگوان داس! اب تک جو بکواس تم و پرافو پراکرتے رہے ہو' اس کو میں نے کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا لیکن یہ حرکت جو تم اب کرنے والے ہو ایسی نہیں ہے کہ میں خاموش رہوں۔ اگر تم نے اس وقت اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا تو یاد رکھو زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ یہ عمر پھر لوٹ کر نہیں آئے گی' نہ یہ مواقع جو آج تمہیں حاصل ہیں پھر میسر آئیں گے۔" اس پر وہ بولا "مجھے بی۔ اے' ایم۔ اے کر کے کیا لینا ہے؟ حکومت کی نوکری تو کرنی نہیں ہے جو اپنی عمر اس طرح ضائع کروں۔" میں نے کہا "چلو یوں ہی سہی' تمہیں حکومت کی نوکری نہیں کرنی ہے۔ مگر تحصیل علم بذات خود بھی تو کوئی چیز ہے۔ علم کی اہمیت اور ضرورت سے تو تم انکار نہیں کر سکتے۔" "علم کی اہمیت موجودہ حالات میں کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "بس اتنا ہی بہت کافی ہے کہ ہم اردو اور انگریزی لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ محض عیاشی ہے۔" "' سبحان اللہ! کیا زریں خیالات ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہارے دماغ میں خناس سما گیا ہے' بھگوان داس! اور کوئی بات نہیں ہے۔" لیکن اس نے نہ کبھی میرے غصے کی پروا کی تھی نہ طنز و ملامت کی۔ چنانچہ حسب معمول اپنی کہے گیا۔ "کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنا ایک عیاشی ہے جو سرمایہ داروں کے لئے ہے' نہ کہ ان لوگوں کے لئے جو دنیا میں آزادی اور انصاف کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔۔۔" میں نے سمجھ لیا کہ اس کا مرض حد سے گذر چکا ہے اور اس کو کوئی سنجیدہ مشورہ دینا بالکل فضول ہے۔

اس نے کالج سے نام کٹوایا اور بمبئی جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اپنی اردو اور فارسی کی کل کتابیں مجھے بخش دیں۔ ان پر لکھ دیا کہ میں مزید تعلیم حاصل کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں اور بمبئی جا رہا ہوں تاکہ مزدوروں میں رہ کر کوئی مفید کام کر سکوں۔ ماں بے چاری بے پڑھی لکھی عورت۔۔۔۔۔۔۔ وہ بیٹے کی اس عظیم الشان سیاسی بیداری کو کیا خاک سمجھتی اور کیا خاک اس کی قدر کرتی۔ اسے تو اپنی زندگی بھر کی آرزوئیں ہی پامال ہوتی نظر آئیں۔ وہ ضلع روہتک کے کسی گاؤں میں ایک چھوٹی سی زمینداری سنبھالے بیٹھی تھی۔ مرحوم شوہر کی یاد اور اکلوتے بیٹے کے مستقبل کا تصور' یہی دو چیزیں اس کی زندگی کا سہارا تھیں۔ اب جو بیٹے کے خوفناک ارادے کی خبر پائی تو بلبلا اٹھی۔ خط پر خط لکھنے شروع کئے۔ بھگوان داس کو سمجھایا بھی اور دھمکیاں بھی دیں' اپنے فیصلے کے نتائج سے بھی آگاہ کیا اور اپنی محبت کا واسطہ بھی دلایا مگر اس اللہ کے بندے پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اس نے ہر خط کے جواب میں یہی لکھا: "والدین اور اولاد کی محبت سرمایہ دارانہ زندگی کا ایک عیاشانہ پہلو ہے۔ میرے دل میں دنیا کے عوام کی محبت ہے اور میں اس محبت کے مقابلے میں ماں کی محبت کو ایک قطعی غیر اہم چیز سمجھتا ہوں۔" آخر تنگ آ کر ماں نے لکھ بھیجا۔ "اگر تم تعلیم ترک کر کے بمبئی گئے تو میں بھی اپنے دل پر پتھر رکھ لوں گی اور خرچ بھیجنا بند کر دوں گی۔" مگر حضرت اپنے نئے خیالات کی ترنگ میں تھے۔ ان پر مجاہدانہ سرفروشی کا جذبہ طاری تھا۔ انہوں نے ماں کی اس دھمکی کی ذرا بھی پروا نہ کی اور بمبئی روانہ ہو گئے۔

اس بات کو مشکل سے چار مہینے گذرے ہوں گے کہ ایک دن صبح ہی صبح کیا دیکھتا ہوں کہ بھگوان داس جی تشریف لئے چلے آ رہے ہیں۔ قریب آئے تو دیکھا کہ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں' آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے ہیں اور جسم پر ایک پھٹی ہوئی قمیض ہے اور میلا کچیلا نیکر!

"آیئے تشریف لایئے!" میں نے کہا "آپ کا نام بھگوان داس ہے نا؟" مگر وہ کسی چہل کے لئے تیار نہ تھا۔ بے جان ہو کر کرسی پر گر پڑا اور بولا "میں بیمار ہوں اور بہت بھوکا ہوں۔ جلدی سے گرم دودھ منگواؤ۔"

ناشتے کے بعد جب میں اس کی داستان سننے میں مصروف تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ اکیلا نہیں آیا ہے بلکہ اپنے ساتھ کچھ خفیہ پولیس کے آدمی بھی لایا ہے۔ میں نے دل میں کہا "یہ کمبخت کہیں میرے سر پر کوئی آفت نہ لائے۔ ایسے خطرناک آدمی سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ دوستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسائیں اور بے گناہ مارے جائیں۔" میں نے جلد سے جلد اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی اور تیسرے دن ٹکٹ دلوا کر روہتک روانہ کر دیا۔

اب قدرتی طور پر تم یہ جاننا چاہو گے کہ بھگوان داس پر بمبئی میں کیا بیتی اور وہ کیوں وہاں سے اس قدر جلد واپس آگیا۔ لیکن یہ ایک طویل داستان ہے جس کو اگر میں بیان کرنے بیٹھوں تو بنن میاں! میرا یہ خط 'خط' نہ رہے گا بلکہ ایک اچھا خاصا ناول بن جائے گا۔ نہایت مختصر طور پر صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ بمبئی پہنچ کر بھگوان داس کو ایسی ذہنی و جسمانی تکلیف کا مقابلہ کرنا پڑا جو اس کے لئے بالکل نئی تھیں۔ بھلا کہاں ایک نازوں کا پالا نوجوان اور کہاں سیاسی زندگی کے مصائب۔ ماں نے انتہائی خوشامد کے باوجود روپیہ نہیں بھیجا اور اس سے ان مصائب میں چند در چند اضافہ ہو گیا۔ غرض کہ "دنیا کے عوام کی محبت" نے اچھی طرح اپنا اثر دکھایا اور بھگوان داس کو ایسے سخت جھٹکے دیئے کہ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ "آزادی اور انصاف کی حکومت" قائم کرنے کا خیال ترک کر دیا ماں کو لکھا "روپیہ بھیجو 'ہم دہلی واپس جا کر دوبارہ کالج میں داخل ہو جائیں گے۔"

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

یہ نہ سمجھنا بنن میاں! کہ بھگوان داس کی مصیبتیں یہاں ختم ہو گئیں۔ یہ تو اس کی بربادی کی محض ابتداء تھی۔ تعلیمی زندگی کا ایک سال ضائع کرنے کے بعد جب دوبارہ کالج میں داخل ہونے کے لئے آیا تو پرنسپل نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ غریب نے بہتیرا سر پٹکا مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً لاہور پہنچا۔ وہاں جس کالج میں بھی گیا یہی جواب ملا کہ تھرڈ ایر میں داخل کریں گے۔ اس نے فورتھ ائر سے پڑھنا چھوڑا تھا۔ اس لئے خیال تھا کہ فورتھ ایر میں ہی داخلہ مل جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک سال کی بجائے دو سال ضائع ہوتے ہوئے نظر آئے۔ طبیعت تعلیم سے پہلے ہی بیزار ہو چکی تھی۔ ان ناسازگار حالات سے دل اور بھی کھٹا ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مزید تعلیم کا خیال ہی چھوڑ دیا اور ملازمت کرنے کی جی میں ٹھانی مگر ایسے شخص کے لئے ملازمت کہاں! خفیہ پولیس نے اب تک پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ ملازمت بھلا کون دیتا۔ دو تین سال کی دوڑ دھوپ کے بعد مناسب روش یہی معلوم ہوئی کہ خاموشی کے ساتھ اپنے وطن چلے جائیں اور بیوہ ماں کی خدمت میں زندگی بسر کریں۔

چنانچہ اس وقت سے برابر ہمارے دوست شری بھگوان داس جی مستقل اپنے گاؤں میں رہتے ہیں۔ سال میں دو تین پھیرے دہلی کے کرتے ہیں اور ہر پھیرے میں چند کتابیں سیاسیات کی یا "مڈل کلاس لٹریچر" کی خرید کر لے جاتے ہیں۔ مطالعے سے جو وقت بچتا ہے وہ خطوط لکھنے اور حقہ پینے میں صرف ہوتا ہے۔

ان کا وہ "پرائیویٹ پراپرٹی" والا فلسفہ مدت ہوئی کہ دھواں بن کر اڑ گیا۔ اب ان کے خیالات کا انداز کچھ اور ہے دوسرے تیسرے مہینے مجھے خط لکھتے رہتے ہیں جس سے میں ان کی ذہنی قلابازیوں کا اندازہ لگاتا رہتا ہوں۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے آخری خط جو مجھے دو ماہ قبل موصول ہوا تھا خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔ "میں تم سے ایک بات نہایت سنجیدگی کے ساتھ پوچھتا ہوں۔ کیا زندگی کا مقصد حصول مسرت کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟ فرض کیجئے آپ نے دنیا میں رہ کر بڑے بڑے کام کئے عزت بھی ملی اور نام آوری بھی ہوئی۔ ایک دن آپ دنیا سے چل بسے۔ اب دنیا والے آپ کے نام کی مالا جپیں یا آپ کو غیر فانونی بنانے کی کوشش میں مختلف مقامات پر آپ کے مجسمے نصب کریں 'آپ کو کسی بات سے سروکار نہیں۔ آپ تو چپکے سے کون جانے کہاں چل دیئے۔ مرنے کے بعد معلوم نہیں آپ کا کیا ہوا۔ پھر بتایئے کہ آپ کی وہ عمر بھر کی جدوجہد تگ و دو اور جانفشانی کس کام آئی۔ ہاں ایک چیز ہے جو کچھ معنی رکھتی ہے اور وہ ہے مینائے حیات کا 'بادہ

عشرت سے سرشار ہوتا ہے یعنی دل کھول کر' پیٹ بھر کے' پوری طرح ڈوب کر زندگی گذارنا۔ لیکن یہ معموریت' جسم یا ذہن کو اذیت یا کوفت میں مبتلا کر کے ہی کیوں حاصل کی جائے؟ کسی شاہد رعنا کے آغوش میں کیوں نہیں۔ کیا یہ چیز میسر نہیں آسکتی؟ میں شعراء میں خیام کے سوا کسی کو نہیں مانتا۔ باقی سب مہمل بکتے ہیں۔ زندگی کا راز اگر کسی نے پایا تو وہ یہی دیوانہ فرزانہ تھا۔۔۔ میں اپنے چاروں طرف گل عذار بچے' زہرہ جبیں لڑکیاں اور حسین و رعنا لڑکوں کو دیکھتا ہوں۔ کل یہ نازک پھول کمہلا جائیں گے' یہ دوشیزائیں پوپلے منہ والی کھوسٹ بوڑھیا بن جائیں گی۔ میرا ایک عزیز ہے کیسا بانکا اور بجیلا جوان تھا وہ بھی' آج دق میں مبتلا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ موت کا بھیانک چنگل اس کی شہ رگ کے قریب آپہنچا ہے۔ یہ ہے زندگی کی حقیقت! حسن کا ضیاع' مسرت کا انحصار۔

یہ فطرت کے وہ قانون ہیں جن کی علت غائی آج تک کسی کو سمجھ میں نہ آسکی۔ دنیا ایک ماتم خانہ ہے! زندگی جنازہ بردوش ہے! میں شوپنہار کو زندگی کا سب سے عمیق مبصر خیال کرتا ہوں۔۔۔۔۔ فکر فردا اور غم دوش سے کچھ حاصل نہیں۔ کھاؤ' پیو اور مزے اڑاؤ! جب موت آئے تو اطمینان کے ساتھ کہ ہم نے اپنی زندگی کے لمحات گراں کو بد ذوقی اور بد توفیقی کی نذر کر کے برباد نہیں کیا۔۔۔۔۔ دنیا کے غریب؟ لیکن آپ کو ان سے کیا؟ ہمدردی! آپ کو ان سے ہمدردی ہے! خوب! مگر ان کو آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں' وہ جب چاہیں گے غاصبوں سے اپنا چھنا ہوا مال واپس لے لیں گے۔ ہمدردی منافقت دوسرا نام ہے! اخلاق! یہ اخلاق اور اس کی ذریات کا تقاضہ ہے؟ ہو گا! مگر میں اس کی فرسودہ اصطلاح سے بیزار ہوں۔ کس قدر پوچ اور سوقیانہ تخیل ہے!۔۔۔۔"

تم نے دیکھا بنن میاں! یہ وہی شخص ہے جو کبھی تاج محل کو "ام مورل" کہا کرتا تھا اور دنیا کی ہر اچھی بری چیز کو سرمایہ داروں کی عیاشی کہہ کر قابل نفرت ٹھہراتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کے متعلق بہت سے مختلف نظریئے ہو سکتے ہیں اور ایک سوچنے سمجھنے والے انسان کے لئے نہایت دشوار ہے کہ وہ کسی ایک نظریئے کا ہو جائے اور تازیست اسی کا ہو کر رہے۔ پھر تمہیں بتاؤ کہ کسی مخصوص فلسفے کو زندگی کا صحیح ترین فلسفہ سمجھ کر اس کی خاطر اپنے مستقبل بلکہ اپنی ساری زندگی کو خطرے میں ڈال دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ بھگوان داس کے حالات سے تم یہ بھی معلوم کر سکتے ہو کہ سیاسی کام ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے' جن میں اقتصادی خوشحالی اور معاشی اطمینان سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر تمہارے پاس یہ چیز نہیں ہے تو تم کبھی جنگ آزادی کے سپاہی نہیں بن سکتے۔ اور میاں! سپاہی وپاہی بننے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے۔ جس دن بھی ذرا سی بے عنوانی کا اظہار تمہاری طرف سے ہو گا' اسی دن جیل میں ٹھونس دیئے جاؤ گے۔ اب سال چھ مہینے تک پڑے سڑا کرو۔ بے اختیار یہی کہو گے کہ اس سے تو بھاڑ میں پڑے سڑتے رہتے تو بہتر تھا اور یہ نہ سمجھنا کہ جیل میں آرام کے ساتھ گذرتی ہے اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ یہ محض کہنے کی باتیں ہیں کہ سیاسی قیدیوں کو بہت سی مراعات ہوتی ہیں اور وہ ترجیحی سلوک کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جو سلوک معمولی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی سیاسی قیدیوں کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال کی بات دوسری ہے۔ تم جیسے آزادی کے سپاہیوں کو تو وہ ہتھکڑی پہنانے سے بھی نہیں چوکتے۔ لو ایک قصہ سنو!

کانپور میں میں جن صاحب کے مکان میں رہتا تھا وہ چمڑے کی تجارت کرتے تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہت زیادہ مالدار تھے۔ مالدار ہونے کے علاوہ وہ اور بھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے لیکن ان کا لڑکا نہایت پاجی تھا۔ مطیع اللہ نام! مگر اطاعت سے کوسوں دور! انتہائی کوششوں کے باوجود کم بخت نے کچھ پڑھ کے نہیں دیا۔ باپ نے روپیہ پانی کی طرح بہایا اور جس اسکول میں وہ پڑھتا تھا اس میں ہزاروں روپیہ بطور امداد کے دے ڈالا۔ مگر وہ کسی طرح ہائی سکول کے امتحان میں پاس ہی نہ ہوا۔ جب عمر بہت زیادہ ہو گئی تو مجبوراً تعلیم ترک کرا دی گئی۔ اب اسے لیڈری کا شوق چرایا۔ معلوم نہیں اس کے دماغ میں سیاسی بیداری کے جراثیم کہاں سے آگئے۔ غرضیکہ قومی و ملکی کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ایک کپڑے کی مل میں اسٹرائک ہوئی تو آپ ماشاء اللہ ان لوگوں میں تھے جو اپنے جھوٹے سچے دعووں اور اشتعال انگیز تقریروں سے مزدوروں کو بہکاتے اور ورغلاتے ہیں اور ان کو غلط راستے پر ڈال کر ان کی مظلومیت میں مزید اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ نتیجہ جو ہونا تھا' وہ مع اپنے تمام ساتھیوں کے دھر لئے گئے۔ پولیس نے بے تامل ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ انہوں نے بہت چیں چپڑ کی مگر وہاں بھلا کون سنتا ہے۔ چار و ناچار

سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ سب کو لاری میں ٹھونس دیا گیا اور لاری چل پڑی۔ لاری میں بیٹھتے ہی مطیع اللہ کو حاجت محسوس ہوئی۔ اس نے پولیس افسر کو اپنی خواہش اور ارادے سے مطلع کیا۔ پولیس افسر نے اس کی خواہش اور ارادے کو کمزور سمجھ کر کچھ اہمیت نہ دی' اور ڈانٹ کر کہا' "ابھی نہیں 'بیٹھے رہو!" چند منٹ مطیع اللہ نے صبر کیا مگر خواہش بہت قوی اور ارادہ نہایت مضبوط تھا۔ اس لئے زیادہ دیر تک صبر نہ کیا جا سکا۔

اس نے پھر پولیس افسر کو یاددہانی کرائی۔ وہ کمبخت نہایت ہی شقی القلب تھا۔ پھر ٹال گیا۔ مطیع اللہ نے کچھ دیر اور صبر کیا لیکن اب خواہش کی قوت اور ارادے کی مضبوطی اس قدر شدید ہو گئی کہ دونوں میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا ناممکن معلوم ہوا۔ اس نے تنگ آ کر پولیس افسر کو ایک ایسی دھمکی دی کہ وہ لاری روکنے پر مجبور ہو گیا۔ لاری جس جگہ رکی وہ ایک غیر آباد مقام تھا۔ سڑک کے ایک طرف کچھ کچے پکے مکانات تھے اور دوسری طرف ایک وسیع میدان دور تک چلا گیا تھا۔ مطیع اللہ لاری سے اتر کر ایک پولیس مین کو دور تک گھسیٹتا ہوا میدان کی جانب بھاگا جب دونوں ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے تو مطیع اللہ نے کہا' "ہتھکڑی کھولو' جلدی!" "ہتھکڑی تو میں نہیں کھول سکتا۔" پولیس مین نے کہا' "تمہارے پتلون کے بٹن کھولے دیتا ہوں۔۔۔"

میں نے یہاں تک لکھا تھا کہ بنن میاں کا ساتواں خط ملا "ہندوستان میں ستیہ گرہ شروع ہو چکی ہے' اور میں تقریباً اس خط کے ساتھ ساتھ یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں۔۔۔۔"

اب میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں کہ بنن میاں پر خاک ڈالوں اور تمام اردو دان طبقے کو مخاطب بنا کر کہوں۔

لو' ایک قصہ سنو!

○

ابوالفضل صدیقی

نام : چودھری ابوالفضل صدیقی
قلمی نام : ابو شاہد / چودھری ابوالفضل صدیقی / ابوالفضل صدیقی
پیدائش : ۵ ستمبر ۱۹۰۸ء بمقام عارف پور' بدایوں (یوپی) بھارت (۱)
وفات : ۱۴ ستمبر ۱۹۸۷ء بہ مقام کراچی ۔ (پاکستان) دو بج کر بیس منٹ پر بروز بدھ
تعلیم : سینئر کیمرج و فارسی مکتب

فارسی اور قرآن مجید پڑھنے کے بعد گورنمنٹ اسکول بدایوں (یو ۔ پی) میں داخل ہوئے ۔ اسی ہائی اسکول سے میٹرک کیا' سینئر کیمرج کرنے کے بعد کہیں اور داخلہ نہیں لیا ۔ سینٹ جارجز سکول' مسوری اور علی گڑھ میں عارضی قیام نے انہیں روشن مزاجی عطا کی۔

مختصر حالات زندگی:

' بدایوں میں عارف پور ان کے مورث اعلیٰ محمد عارف کی بسائی ہوئی بستی ہے' جہاں چودھری محمد ابن الحسن صدیقی بصیر ایم۔ اے' ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بدایوں کے مشہور وکیل تھے ۔ آپ کے آباؤ اجداد سید علاؤ الدین کے وقت سے بدایوں میں آباد تھے اور مورث اعلیٰ کو فوجی خدمات کے سلسلے میں ایک جاگیر اور " چودھری " کا خطاب شاہ کی جانب سے عطا ہوا تھا۔ شیخ محمد عارف کے والد شیخ مہتاب علی صاحب' سید علاؤ الدین کے سپہ سالار تھے ۔ ان کے اجداد میں غلام مصطفیٰ یک رنگ نے ایہام گوئی میں نام کمایا۔

ابو الفضل صدیقی نے بزرگوں کی روایت کو نبھایا اور ذریعہ معاش زمینداری اور باغبانی ہی پسند کیا ۔ طبیعت ہمیشہ سے دنیوی ذمہ داریوں سے مبرا رہی ۔ بیس برس کی عمر میں بنت عم سے منسلک ہوئے اور آزاد طبیعت ہونے کے باوجود نباہ کیا ۔ لڑکپن اور جوانی خونخوار کتوں' سبک رفتار گھوڑوں اور آہنی و آتشی آلات حرب کے ساتھ جنگلوں میں شکار کھیلتے گزری ۔ ۱۹۳۲ء میں ابو شاہد کے قلمی نام سے نیم مزاحیہ' اصلاحی مضامین اور افسانے' اخبار " ریاست " میں لکھے اور یہ سلسلہ ۱۹۴۱ء تک جاری رہا ۔ اس کے بعد " ادبی دنیا " " شاعر " اور " صوفی " میں ابوالفضل صدیقی کے نام سے لکھتے رہے ۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کر آئے اور تادم آخر کراچی (سندھ) میں رہے۔

اولین مطبوعہ تحریر:

مزاحیہ مضمون مطبوعہ : اخبار " ریاست " ۱۵ اگست ۱۹۳۲ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

" رہنمائے حقیقی " مطبوعہ : " صوفی " ۱۹۳۴ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

نمبر	کتاب	ناشر	طبع
۱۔	"ابرام" (افسانے)۔ دیباچہ: سلطان حیدر جوش	ہاشمی بکڈپو' لاہور'	طبع اول: ۱۹۳۵ء
۲۔	"تعزیر" (ناول)	کتب خانہ دارالبلاغ' لاہور'	طبع اول: ۱۹۳۶ء
۳۔	"رموز باغبانی" (پھلوں کی کاشت سے متعلق)	کتب خانہ دارالبلاغ' لاہور'	طبع اول: ۱۹۳۸ء
۴۔	"سرور" (ناول)	سلطانی حسین اینڈ سنز	طبع اول: ۱۹۵۷ء
۵۔	"انیس سو چوراسی" (جارج آرویل کے ناول ۱۹۸۴ء کا ترجمہ)	اردو اکیڈمی سندھ' کراچی'	طبع اول: ۱۹۶۰ء
۶۔	"چار ناولٹ" (۴ ناولٹ)	ادب نما' کراچی'	طبع اول: ۱۹۶۰ء
۷۔	"سرد لہو کا نوحہ" (افسانے)	ادب نما' کراچی'	طبع اول: ۱۹۸۵ء
۸۔	"شکار" (ناول)	مطبوعہ دارالبلاغ' لاہور'	
۹۔	"جوالا مکھ" (آٹھ افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اسلوب' کراچی'	
۱۰۔	"انصاف" (تین طویل افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اسلوب' کراچی'	
۱۱۔	"آئینہ" (تین طویل افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اسلوب' کراچی'	
۱۲۔	"ترنگ" (ناول)	مطبوعہ: مکتبہ اسلوب' کراچی'	

غیر مدون:

لاتعداد افسانے اور مضامین۔

وفات سے قبل مستقل پتا:

۷/۴ ایف' ۴ ناظم آباد' کراچی نمبر ۱۸' پاکستان

اعزاز:

P.E.N یونیسکو ایوارڈ ۱۹۵۶ء

نظریہ فن:

"افسانہ نگاری نثر نگاری کے شوق کا ذریعہ ہے' در حقیقت اچھی خوبصورت نثر کا شائق ہوں۔ افسانہ کے متعلق میرا نظریہ خلوص بیان اور گہرے پہلو دار مشاہدہ کی فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ ساتھ حقیقی معنی میں محسوس کرنے پر ہے ورنہ تھانہ دار کی ڈائری بھی تحریر ہوتی ہے مگر فن

نہیں ہوتی۔ افسانہ جتنا حقیقی زندگی سے قریب ہوگا اتنا ہی پر تاثیر ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ کسی بھی پروپیگنڈے سے پاک ہونا چاہیے۔"

(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ ستمبر ۱۹۸۴ء)

○

(۱) یہ تاریخ پیدائش "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ: بشیر ہندی' مطبوعہ: اردو محل لاہور س۔ن (لگ بھگ ۱۹۴۶ء) سے پہلے خود ان کے اپنے فراہم کردہ کوائف سے لی گئی ہے۔ خود مجھے صدیقی صاحب نے ۴ ستمبر ۱۹۱۰ء بتائی تھی جو درست نہیں۔

ابوالفضل صدیقی

جوالا مکھ

نہ معلوم کدھر سے عیدو کے اندر جیسے مرد تڑپ اٹھتا ـــ آنکھوں میں رس سا چھلک پڑتا اور سیدھا ہوتے ہوتے ہونٹ خاتون کے دہکتے رخساروں پر سے پھسلتے بیر بہوٹی سے ہونٹوں سے چپک جاتے اور ہاتھ نہایت چابک دستی کے ساتھ بھرے بھرے بدن کے گداز نقوش اور مخملیں خطوط کے نشیب و فراز کا جائزہ لینے لگتے اور پھر بڑے زور سے بھینچ لیتے اور وہ جیسے کاٹھ کے شکنجے میں کس جاتی اور یہی نہیں کہ خاتون ہی کا خون متھ جاتا عیدو کے ہونٹ بھی چپ چپا کر دہک سے جاتے۔ بیمار آنکھوں میں لال ڈورے اچھل آتے۔ سانس تھرتھرا جاتی۔ گویا بھولا ہوا سبق یاد آ جاتا اور پچھلے پانچ سال کے رات شب برات اور عید کے ہنگاموں میں سے بس اتنی ہی استعداد باقی رہ گئی تھی' جیسے سر کچلنے کے بعد سانپ میں بل اور اینٹھ باقی رہتی ہے اور فالج کے مارے ہوئے عیدو کے اندر جیسے شہد کی صورت بس لہراتا اور خاتون کو تو سچ مچ اس وقت سانپ سا ڈس لیتا.....

بقول شخصے زندہ درگور قبر میں پاؤں لٹکائے' زیر ناف کلیتا" مفلوج' نچلا دھڑ بے کار اور حرکت سے معذور' اور کمر کے خاص گریہ کو تو بالکل مردہ کئے مگر بقیہ پوری ریڑھ تندرست تھی اور اوپر کا بدن بالکل صحیح' پھر بھی خود اٹھ کر بیٹھ نہ سکتا تھا اور جب خاتون اٹھا کر بٹھا دیتی تو کھونٹا سا بیٹھا تو رہتا لیکن بس بیٹھا ہی رہ جاتا اور بغیر سہارے لیٹ نہ سکتا اور لیٹ کر بھی تختہ کی طرح پڑا ہی رہتا اور بغیر تھوڑے سے سہارے کے پوری لاش سے آسانی کے ساتھ کروٹ بھی نہ لے سکتا تھا۔

اور خاتون جب کھانا لے کر آتی تو بالعموم رات کے کھانے کے بعد لٹاتے ہوئے سہارا دیتے وقت مفلوج عیدو میں ڈیڑھ سال پہلے والا شوہر جاگ پڑتا اور پھر وہ کرموں جلی سر شام کی چھڑی مفت میں صبح تک چٹکتی رہتی..... خاتون میں شوہر گدگداتا رہتا' اور یہ بے خبر پڑا سوتا رہتا ـــ چھ فٹا کوروں کا تھا سا کھڑا' چلتے پھرتے کودنے پھاندتے خوابوں میں گم' جب اس کے بیس گرہ چکلے سینہ اور سولہ گرہ چوڑے پیٹ کے نیچے پھنسے کی طرح چھوترا سی کمر تھی جس میں جمنا پار بیل کی طرح مضبوط دو ٹانگیں لگی تھیں' جمنا پار بیل کی طرح مضبوط اور کاٹھیا واڑی گھوڑے کے طرح تند ٹانگیں جن کی دھمک کے مارے دھرتی پانی چھوڑتی اور پاتال تھرتھراتی ـــ عیدو کو لئے لئے پھرتیں اور عیدو تو خواب میں ہی عیدو ہوتا' مگر خاتون پر ساری رات جاگتے عیدو ہی عیدو سوار رہتا.....

فالج گرنے کے بعد چھ سات مہینے تو علاج کی مصروفیت اور تندرستی کی امید رہی پھر جب گاؤں اور قصبہ تک کے سب ویدوں' حکیموں اور ڈاکٹروں نے جواب دیدیا تو کچھ دنوں ابدی معذوری کا شدید احساس اور دائمی ناامیدی سنگین قنوطیت سی طاری رہی' مگر پھر حالات کے استقلال اور وقت کے مرہم نے صبر کی کیفیت پیدا کر دی اور مجبور حالت سے مطمئن ہوتے ہی بھولی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں' بے معنی سی رجولیت نے عود کیا۔ پہلے دو ایک روز تو ذرا ڈرتے ڈرتے شروعات کی اور پھر یہ عملی اختلاط اور پیار رات کے کھانے کے بعد کا معمول بن گیا......

جیسے خود کو دھوکا دیتے ہوئے خاتون نے شروع شروع میں تو کچھ دنوں نہ معلوم کیوں' شوہر کی دلشکنی کے لحاظ میں یا شاید باطل خود فریب سے امید میں اس جھوٹ موٹ......... کے کھیل کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ مگر اس کا جواب تو اس کا سوال ہی ہو سکتا تھا' اور جب سرے سے سوال ہی غائب ہے تو جواب کیا ہو سکتا تھا' جیسے کچھ اپنا منہ آپ ہی چڑا کر رہ جاتی' اور اس کے گلابی رخساروں اور ہنکھڑیوں سے ہونٹوں پر

جیسے سر شام کالا ناگ نہ معلوم کتنے پھن مار دیتا اس کے سینہ بازوؤں اور پشت پر اور نہ معلوم کہاں کہاں مشعل سی پھر جاتی اور پھر پوری رات انگاروں پر کٹ جاتی ' چٹ چٹ چٹا چٹ کباب کی طرح چٹختے ' جلتے ' سلگتے '...... اور ایک مرتبہ اندر ہی اندر جھنجلا کر ذرا سنجیدگی کے ساتھ شوہر کی اس طلب مجہول پر اعتراض کیا اور اس کا جواب مانگا تو عیدو ٹوٹتا ٹوٹتا دل سے اتر کر خاتون کی بات کا جواب تلاش کرتا پیٹ تک پہنچتا ۔ خیر یہاں تک تو شاید کچھ بازگشت جیسی آواز محسوس بھی ہوتی تھی مگر اک ذرا بڑھ کر کمر پر تو موت کا سناٹا تھا اور وہ عملی چیز بھی معدوم تھی '..... اور مس اور بوسہ خواہ حقیقی ہو یا مجازی تحریک تو رکھتا ہی ہے اور یہ تو نہ "یہ" ہوتا نہ "وہ" ! مگر اس بچاری کے لئے تو کسی مد میں نہ ہوتے ہوئے بھی طوفان سا تند اور آگ ساحر کی ہوتا...... اور بغیر کسی جواز کے عیدو اپنی حرکت سے باز آنے والا نہ تھا ' اس شوخ بچہ کی طرح جو تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی پر کنکریاں پھینک کر گول گول متلاطم لہروں کا تماشا دیکھتا ہے اور وہ بے چاری ہر رات جیسے پچھلی پانچوں سال کی عیش کوشیوں اور شب باشیوں کے رد عمل سے دو چار ہو کر صبح کو خمار زدہ شرابی کی طرح اٹھتی جس کے پس منظر میں شراب کے سرور کا بھی کوئی سراغ نہ ہوتا ---- خمار ہی خمار ! سر شام کا چڑھا صبح تک !! ---- اور صبح سے شام تک اعضاء شکنی اور چٹخن ہی چٹخن ! ہمہ وقت جلن ہی جلن ! ---- پیاس ہی پیاس سارا دن ! بھوک کی تمام رات..................

(۲)

خاتون نوجوان تھی ---- غضب کی تندرست اور بلا کی حسین ' اور کل کی بات ہے ' اس کی نوجوانی و تندرستی اور انسانیت اور زوجیت کے پورے پورے حقوق عیدو کندھے سے کندھا ملائے نہایت مستعدی کے ساتھ ادا کرتا رہا تھا ۔ اچھے بھلے فالج لگا اگر مرجاتا تو اس کی سوختہ نصیب جوان مٹی بھی سارے لگ ہی جاتی ' اور کہیں نہیں تو چار پنچ برادر دو بول پڑھوا کر شبراتی سے ہی پلو باندھ دیتے ۔ گھر کے گھر ہی میں ' اس سے کیا شبراتی دو بچوں کا باپ تھا اور اپنی جورو کا خصم ' تھا تو عیدو کا بڑا بھائی ' باپ کی جائیداد اور بھائی کی ناک کسی اور کے حوالے کیسے کردیتا ' میرے پار یا بھرے پار گھر کی بہو تھی ۔ بیوہ بھاوج نہ سہی دوسری بیوی بنا کر بھرتا ہی بھرتا ! --- اور اب اکیلا اپاہج بھائی کو چارپائی پر پڑے پڑے کھلا ہی رہا تھا اور پامردی سے اکیلا دھڑی بھر آٹا کھانے والے کنبے کو ذرا سی آبائی زمین کھود کر پال رہا تھا ' مگر خاتون تو سانپ کے منہ میں چھچھوندر تھی اور سانپ بھی گویہ ٹوٹا..... اور سانپ بھی نہیں مسلے ہوئے سنڈے کے پلے بندھی ہوئی..... اور خاتون کی زندگی کا دھارا ہر شام چڑھتا رہا اور ہر صبح اترتا رہا اور بہتا پانی تو اپنی سطح خود تلاش کرتا ہے...... اور پستی میں سکون پا کر ہی دم لیتا ہے.......

کمر ٹانگوں سے اپاہج عیدو کے حواس خمسہ بڑے ذکی الحس ہو گئے تھے ۔ ' کوئی موسم ہو وہ باہر تو نکل ہی نہ سکتا تھا ۔ ' جاڑا ہو یا گرمی معالجین نے ہر موسم میں بند جگہ میں لیٹے لٹائے پڑے رہنے کی ہدایت کر دی تھی ۔ تھوڑا بہت علاج معالجہ رسمی مالش ٹکور مستقل چلتی رہتی تھی ۔ جاڑے کے بعد پہلی گرمی آنے پر خاتون نے اندر کوٹھری میں اس کی چارپائی کے برابر اپنی چٹائی بچھالی اور بدستور وہیں لیٹی رہی . . . . . مگر جیٹھ ' بیساکھ اور ساون بھادوں کی جلتی ابلتی راتوں میں وہ کیسے اندر سو سکتی تھی ' پھر بھی شکایت نہ کی مگر عیدو کو خود ہی احساس ہو گیا اور اس نے اصرار کر کے اس کا بستر کوٹھری کے سامنے چھپر کے برآمدے میں لگوا دیا ' اور پھر جاڑوں میں برآمدے کے ایک گوشہ میں اس نے اپنا پیال ڈال دیا اور یہ اس کے مستقل سونے کی جگہ ہو گئی اور برآمدے میں تو خاتون اور بھی چوکی نیند سونے لگی پھر اتنے عرصہ میں شوہر کی نیند مرض کے مزاج کی بھی پوری محروم ہو گئی تھی ۔ رات کے ہر حصہ میں پہلی مضطر پر مچھلی کی طرح تڑپ کر بستر سے نکل آتی اور شوہر کی پٹی سے آ کھڑی ہوتی ' ایک دفعہ کوٹھری میں آواز دینے کی نوبت آ جایا کرتی تھی مگر برآمدے میں تو جیسے پہلی سانس سن لیتی ' ---- اور عیدو کے دماغ پر تو فالج نہ گرا تھا اس کی تیمارداری اور خدمت کا شدید احساس تھا ---- اس کے ساتھ اپنی تندرستی کے پانچ سالہ ازدواجی دنوں کی زندگی کی چہتشوں اور ہنگاموں کی یادیں اب بھی رنگین خوابوں کی طرح علیل خون میں گونجتی تھیں ' جیسے اسٹیج پر نغمہ ریزی کرتے ہوئے ۔ دو مغنی آہستہ آہستہ نغمہ ختم کرتے چلے جاتے

ہیں اور دور' اور پھر بڑی دور سے میٹھی میٹھی مدھم نسائی آواز مری مری سامعہ نوازی کرتی رہتی ہے اور اب! اب تو یک طرفہ نغمہ! دوسرا سرکنٹر ابھی نہیں' خاموش "گونگا!! اور آج! آج بھی اسے اس کی نوجوانی کے شدید تقاضے معلوم تھے اور وہ خاتون کے ہر پہلو کا آشنا تھا اور سچا محرم راز ..... اور اب اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے قہر گرانے کے ساتھ اللہ میاں نے اس کے حق میں فرشتہ رحمت بھی نازل کر دیا ہے' اور پروگرام کی پہلی شق سے لے کر اخیر شق تک رات کو بستر پر لیٹ کر سونے سے پیشتر روزانہ اس کی بند آنکھوں کے سامنے گھومتی۔ صبح ہی صبح پیشاب پاخانہ کے برتن لے آنا اور بٹھا کر رفع حاجت کرانا پھر تہمد کی گھنڈی لگا لٹانا اور پیشاب پاخانہ اٹھا کر لے جانا۔ تھوڑی دیر بعد گرم گرم دودھ کا پیالہ لے کر آنا اور پھر اٹھا کر ہاتھ سے پلانا دوپہر تک ایک دو مرتبہ پیشاب کرانا' اور وقت وقت پر کروٹ بدلوانا' پھر دوپہر کو شوربہ یا دال مین گلی ہوئی روٹی لے کر آنا ---- اور کھڑے ہو کھلانا' ---- سہ پہر تک دو مرتبہ پھر پیشاب کرانا اور چار کروٹیں بدلوانا اور پاؤں کمر پر مالش کرنا' سر میں تیل' دبا کر کنگھی کرنا' جمعہ کے جمعہ گرم پانی کی ناند بھر کر لانا اور روئی کے گالوں سے تمام بدن پر پچارا پھیرنا' سر میں بڑ اور کھلی ڈال کر صفائی کرنا' اور نہ معلوم کیا کیا کرنا' جتنی "کریں" تھیں۔ سب بیوی کے ہی ذمہ تھیں اور شوہر کے سر ایک بھی نہیں' اور شاید انہیں "کروں" کے شدید احساس سے اس کے ٹھنڈے خون میں رات کے کھانے کے بعد لہری اٹھتی اور اس کے ہاتھ خاتون کے بدن پر ناچنے لگتے اور ہونٹ رخساروں پر پھسل کر ہونٹوں سے جا چپکتے ---- یا نہ معلوم کیوں! ...... اور عیدو فلاسفر تو تھا نہیں آدمی تھا۔ آدمی بھی ایک چہارم' اور تین چہارم مٹی کا تودہ اگرچہ چہارم بھی آدمی نہ ہوتا اور سب کا سب مٹی کا تودہ ہی ہوتا تو بھی کہتے ہیں کہ مٹی کا تودہ بھی احساس کر لیتا ہے' لیکن اس چہارم آدمی میں ہی پورے چار آدمیوں کی حس تھی اور تین چوتھائی مٹی کے تودے میں بچھو کے ڈنگ جیسی سوزش! ------ وہ خوب سمجھتا تھا کہ وہ اس کی روزی کا کفیل نہیں۔ اس کو روزی بڑے بھائی کی محنت سے ملتی ہے۔ اس کی نوجوانی کے لہراتے جذبات کا کفیل نہیں اور شاید اس کی کفالت کسی پر نہیں ہے۔ جو روزی سے زیادہ شدید تقاضا ہے اور وہ بھرا بھر جوانی چوکڑی بھولی ہرنی ہے۔ ریت کے ٹیلوں میں گم! ------ جسے اپنا راستہ یاد نہیں' بس جستیں ہی جستیں اور تلاش ہی تلاش مقدر ہے.......

(۳)

اور ماگھ پوس کی ایک یخ بستہ اندھیری رات میں خدمت اور تیمارداری کے احسان کی چٹان تلے دبے بیمار و نزار عیدو کی خلاف معمول آنکھ کھل گئی۔ کوٹھری کے دروازہ کا ایک کواڑ بند تھا۔ دوسرا آدھا کھلا ہوا تھا۔ سامنے برآمدے میں پیال پر خاتون کا بستر تھا اور جیسے پیال پر اٹھنے کی سرسراہٹ ہوئی اور پھر برآمدہ کی دہلیز پر سایہ سا جاتا معلوم ہوا اور سایہ کی حرکت سے عیدو نے اندازہ کر لیا کہ خاتون اٹھ کر باہر گئی اور صحن میں دوسری جانب سے ایک اور سایہ بڑھا' اور کہرے اور دھوئی کی ڈولتی ہوئی متحرک کالی چادر میں لپٹے ہونے کے باوجود اس نے بڑے بھیا کے سائے کو پہچان لیا اور سمجھ لیا کہ شبراتی اپنے کوٹھرے سے باہر نکل کر آیا۔ صحن میں دونوں سائے جمع ہو گئے سامنے کٹی کا دروازہ تھا اور جیسے دونوں کٹھار کی جانب بڑھے اور کٹھار کی زنجیر اور کواڑ کھلنے کا مخصوص کھٹکا' جس سے عیدو کے کان بچپن سے خوب مانوس تھے اور پھر خواہ کتنے ہی آہستہ کواڑ بند ہوئے مگر ان کی چوخ چول تو عیدو کے کانوں میں پوتڑوں میں پڑی تھی ------ اور عیدو کی کوٹھری اندھیری تھی۔ خاتون کا برآمدہ اندھیرا تھا۔ گھر کا صحن گھٹا ٹوپ تھا اور کٹھار کی کوٹھری تاریک در تاریک تھی اور عیدو کی علیل نگاہ اپنی کوٹھری کے اندھیرے کو چیرتی' خاتون کے برآمدے کے اندھیرے کو چیرتی صحن کی اندھیری کو پھاڑتی کٹھار کے کواڑوں کو توڑ کر اس پار کی تاریکیوں میں سب کچھ دیکھ رہی تھی اور اندر کی گرمی اور نمی سی جیسے ناک کے نتھنے پر محسوس ہو رہی تھی۔ برسات کی سیلن سی' بدبو' بھکراند' ------ گویا اسکرین پر دو کھیلتی مورتیں' زندہ! ایک جان دو قالب رونگٹا رونگٹا متحرک ہی متحرک .... گرم ہی گرم' گرم و نم اور اسے ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی ماگھ پوس ملتی جنی رات میں لوکی سی جھرجھری! ------ مگر وہ تو حرکت سے بھی معذور تھا' گرمی سے بھی محروم ------ مگر ناک کے ٹھنڈے نتھنے سے لے کر ناف تک سنناہٹ ہو

گئی ---- جیسے کوئی چیز بڑی تیزی سے رینگتی چلی گئی۔ سن سن سناٹا شائیں ---- علیل خون میں جوار بھاٹا سا اٹھا اور کنارے سے دور کہیں آدھے راستہ پہنچ کر ہی مندھا گیا ---- لیکن دل تو مفلوج نہیں تھا اور دماغ بھی تندرست تھا' اور دل سے خون کی موٹی موٹی دھاریں صاف کر کر کے دماغ کی جانب اندھا دھند پھینکی شروع کیں ---- اور دماغ نے تجزیہ کیا' اور ایک لہر سیدھی نیچے کو بڑھی مگر کمر کے پتھریلے بند سے ٹکرا واپس آ گئی اور جیسے رد عمل میں سرسراتے ناگوں کی طرح لہراتی دماغ کی جانب لپکی' اور سینے میں سے گذرتے ہوئے لہراتے سانپ کترا کر جیسے دل کے کسی سوراخ میں جا چھپے' اور پھر خون صاف ہو کر ملامت روی کی چال چلنے لگا۔ چند منٹ میں پوری ایک کتاب دل و دماغ کے مجادلہ پر مرتب ہو کر سینہ کے صندوق میں محفوظ ہو گئی۔ کھٹکے پر کان چونکے' کٹھار کے کپاڑ کے کھلے ار بیوی اور بھائی کے سائے پھر صحن میں کانپتے سے معلوم ہوئے' پیال کے تنکے جھنجھنائے اور خاتون کا سایہ سامنے بستر میں دبک گیا'...... اور معذور مفلوج کے اندر سوال ابھرے اور اندر ہی جواب مل گیا' ہوں' جنس کا جائزہ لینے گئے ہوں گے بھاوج دیور کٹھار میں'..... "مگر آدھی رات جنس کے جائزہ کا کون وقت ہے!!---- ہوں او نہ'....... " اور اپنے آنکھیں بند کر لیں اور لحاف میں منہ بھی ڈھک لیا' اور آنکھیں بند کرتے ہی صبح کے پیشاب پاخانے سے لے کر نگاہ سوتے وقت کے دودھ کے کٹورے تک چڑھ گئی اور پھر زور سے بڑھ کر ہفتہ مہینہ اور سالوں تک پیچھے دھکیلتی چلی گئی اور الٹی چال کر پھر اور پھر آگے گئی اور زندگی کا ریگ زار تھا' تاریک والا محدود اور اس کا کنارا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود بھی کہیں دور دور بھی دکھائی نہ پڑا' خاتون یا معذوری کا سارا بڑھاپے کی ٹیک اور بیماری کی دوا ---- اور عیدو دھیاتی دل اور مجبوری میں سمجھوتہ کرا کر سو گیا' اور صبح کو بالکل مطمئن اٹھا۔ جیسے شیر خوار بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ماں کی دہی ہاتھوں کا تھپکا میٹھی لوری پر گہری بے خبر نیند سو کر ---- اور سورج کی پہلی کرن کے ساتھ تو جیسے اس پر ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ خاتون حسب معمول پیشاب پاخانہ کا برتن لے کر آئی۔ اپنی معذوری اور بیماری ---- اس کی خدمت اور تیمارداری ---- اور پھر جیسے رات کے واقعات کا ہلکا سایہ سا دماغ کے پردہ پر منعکس ہوا' اور فوراً ہی معدوم ہو گیا ---- خاتون کی بھر بھرائی جوانی ---- شبراتی کی جانفشانی ---- جو اپنے بل بوتے پر اکیلا ذرا سی آبائی زمین کے سہارے پورے کنبے کا بار اٹھائے ہوئے ہے! ---- اور سب سے زیادہ خود اس کا اپنا بار چارپائی پر پڑے پڑے! اور وہ اور خاتون دونوں اسی پر تو لدے ہوئے ہیں ---- اور پھر' پھر تو وہ یہاں تک جا پہنچا! ---- اور اگر شبراتی نے اپنے اوپر خاتون کا پورا بوجھ رکھ بھی لیا تو ایسی کیا بات ہے ---- اور سمجھوتہ راسخ تر ہو گیا ---- بار ٹل گیا ---- ادھار چک سا گیا..... دن کا دن چڑھا اور رات کا رات اترتا ہوا قرضہ صبح کے صبح پاک۔

(۴)

بہار کی ایک نمناک خنک صبح کو عیدو کی آنکھ جیسے کسی شور پر کھلی - چڑ چڑ چڑا چڑ چھت سے دو چڑے لڑتے ہوئے چارپائی کے برابر زمین پر آ گرے اور گتھ گئے اور چڑیوں کے دو جوڑے ہمیشہ سے چھت میں رہتے تھے اور عیدو کی تنہائی کے رفیق تھے اور عیدو ان میں سے ہر ایک کی جبلت کا پورا محرم تھا' اور دن کے سنسان گھنٹوں میں انکے مشاغل دیکھ دیکھ کر وقت کاٹتا اور دل بہلاتا تھا - دو تین روز سے بڑے چڑے کی چڑیاں غائب تھی ---- شاید کسی اور چڑے کے ساتھ چلی گئی تھی - یا باز شکرے نے جھپٹ دی تھی اور چھوٹے چڑے کی چڑیا اس وقت مابہ النزاع تھی - نیچے پہنچ کر دو منٹ پھدک پھدک کر چونچ پنجوں سے چلتی رہی پھر کشتی ہونے لگی کبھی یہ ادھر کبھی وہ ---- کچھ دور پر چڑیا بیٹھی دیکھتی رہی - جیسے نتیجہ کی منتظر' چارپائی پر پڑا عیدو دیکھتا رہا شاید نتیجہ سے بے خبر ---- اور جیسے دونوں چڑوں کے خون کا جوش عیدو کے سینہ میں سمایا' چیونٹیوں کا دل کا دل گردن سے رینگ کر کمر کی جانب بڑھتا محسوس ہوا ---- پھر آگے تو راستہ بند تھا جیسے کچھ اپنا تھا ہی نہیں "گویا کسی اور کے شاید شبراتی کے کمر کولہے رانیں پنڈلیاں فٹ تھیں اور اوپر نیچے میں ربط نہ تھا' اور جب اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو چھوٹا چڑا شکست کھا کر فرار ہو رہا تھا' اور دوسری نگاہ ڈالی تو سامنے کھنٹی پر بڑا چڑا اس کی چڑیا کے ساتھ اختلاط کر رہا تھا ---- عیدو نے ایک لمبی سانس لی ---- یہ

تو گردن سے لے کر دم تک پورے گریوں والا چڑا بھی شکست کھا گیا ۔۔۔ اور شکست کھانے کی قوت تو تھی اس میں ! اور یہاں تو یہ بھی نہیں ۔۔۔۔ شکست کھا کر بھی شکست کے لئے اسے کسی کی مدد درکار ہے پاؤں سے لے کر کمر تک افتاں و خیزاں نگاہ چڑی اور جیسے رونگٹے رونگٹے پر ٹھوکر کھاتی کمر پر پہنچ کر چاروں شانے چت جا پڑی ' آنکھیں بند ہو گئیں ۔ ذرا دیر میں بھاوج گرج اور بیوی کی چنچناہٹ پر کان چونکے ' صحن میں دونوں لڑ رہیں تھیں ۔ شروع شروع میں تو مکالے گول گول رہے ۔ مگر وہ دونوں سے اچھی طرح سمجھتا رہا اور لفظ لفظ کی وضاحت اس کے دماغ میں گونجتی رہی ' مگر وہ سمجھے رہا کہ دیورانی جٹھانی کی روایتی تو تو میں میں ہے ۔۔۔ اونہ ! گھریلو ۔۔۔۔۔ دال آٹے چاول ' گڑ ' تیل ' گھی کے گرد گھومتی ہوئی لڑائی جیسی گھر گھر ہوا کرتی ہے اور اس نے آنکھیں بند کر کے دبیز رضائی بھی منہ پر ڈھک لی اور خیر آنکھیں تو بند کئے بند بھی ہو جاتی ہیں ' مگر یہ کان کم بخت تو ہر وقت کھلے ہی رہتے ہیں اور سات تہوں میں دباؤ لاکھ انگلیاں ٹھونسو ظالم سنتے ہی رہتے ہیں اور عیدو کے کان تو جیسے اس کے دماغ کے اندر کی آوازوں سے پن بناپن بنا کر بھاوج کا کہا سن رہے تھے اور عیدو کی آنکھیں تو اندھیرے میں بھی دیکھتی تھیں ' کھلی بند یکساں اور اندھیرے کٹھار میں اور بھی زیادہ اور واضح ! ۔۔۔۔ اور یہ تو روز روشن تھا ! ۔۔۔۔ اور بھاوج قیافہ اور شبہ پر کہہ رہی تھی مگر عیدو کے کان بھی سن رہے تھے اور آنکھیں بھی دیکھ رہی تھیں ۔۔۔۔۔ اور بھی سجھائی کا کیا سجھنا ' اور اس نے تو دل تک کو سمجھ لیا تھا ۔۔۔ خاتون کے طلائی مکھن سے چکنے چکنے ہاتھ ہیں ۔ جن میں سہاگ کی چوڑیاں جھنجھناتی ہیں ' برف کی چوٹی سا سینہ ہے ' جس میں لاوا بھڑبھڑاتا ہے ۔ ریشم کی پوٹ سی کمر جس میں مچھلیاں سی تڑپتی ہیں اور انہیں کے بل پر کھڑی ہو کر وہ اس کے کچوے جیسے وجود کو پالتی ہے ' اور کچھوا تو نہ سن سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے ۔۔۔۔۔ اور پھر کمر ٹوٹا کچھوا تو رینگنے کا بھی اہل نہیں ہوتا تو وہ پھر کیوں دیکھے اور کیوں سنے ۔

مگر کمر ٹوٹا ' اندھا بہرا کچھوا تو سب سنتا رہا اور سب کچھ ہوتی رہی اور دیکھتا رہا ۔ " ہوں چھنال ۔۔۔۔۔ تیرا تو اللہ نے چھین لیا اور تو نے مجھ پر ہاتھ صاف کیا دن دہاڑے ۔ "

" چپ ' چھنال ہوئے گی تو آئی بڑی تہمت دھرنی ۔ " خاتون نے بڑی مشکل سے جھینپ دبا کر کہا ۔

" اچھا رنڈی ' تہمت ! تہمت ! کیا میں اندھی ہوں ؟ اور تو تو اندھرا لا گئی ہے ۔ آگ میں جیسوا ۔ " جیسے شبراتی کی بیوی کے منہ سے یکے بعد دیگرے شعلے نکل پڑے ۔

" چل ستر خصمی ...... " خاتون نے سنبھلتے ہوئے جیسے کسی اور کے حلق سے نکالا ۔

" جا جا چھنال ! چوری اور سینہ زوری بات کرنے کے قابل ہے تو بھی ..... " دروازے پر شبراتی کی متھار سنکر مدہم آواز میں کہا ۔

" چھنال تو کہ میں آئی بڑی کوئی وہ بن کے ۔ " شبراتی کی چاپ پر خاتون نے روہانسی آواز میں کہا ۔

اور اتنے میں شبراتی کی شیر کی سی گرج سنائی دی ' جس کے لوہے کی الاٹ سے قد میں بھینسے کی طرح چبوترہ سی سنگین کمر تھی ۔ جس میں جمنا پا دو بیل کی طرح مضبوط اور کاٹھیا واڑی گھوڑے کی طرح تند پڑتی ہوئی ٹانگیں لگی تھیں ۔ جن کی دھمک کے مارے دھرتی پائی چھوڑتی اور پاتال تھراتی تھی جو سب کا کفیل تھا اور ہر بات کا اہل ..... اور کمر ٹوٹا کچھوا بھی تو اسی کی اہلیت کے بل پر بلبلایا کرتا تھا ۔

شبراتی کی گرج پر خاتون تو سہم کر چپکی ہوئی شبراتی کی بیوی ایک دو چیخ چلائی اور پھر بیل ہانکنے کے ہنٹر کے ڈنڈے کی آواز سنائی دی ۔ شبراتی کے دونوں بچوں کی چیخ پکار اور بیوی کی آو بکا ' ذرا دیر بس شور ہی شور ! ادھر پھر ڈنڈا پیٹنے کی دھا دھم اور پھر مدھم شور اور مکمل خاموشی ۔

اور یہ روزانہ نہیں تو اٹھوارے میں چار دن کا معمول بن گیا اور ہمیشہ شبراتی کا ڈنڈا بیچ میں پڑ کر بیچ بچاؤ کر دیتا اور جب شبراتی کھیت پر ہوتا ' تو لڑتے لڑتے صبح سے دوپہر ہو جاتی ' اور دوپہر کو خاتون عیدو کیلئے دودھ روٹی لے کر آتی تو عیدو کی آنکھیں اس سے چار نہ ہوتیں ' گردن جھکائے ہی جھکائے کٹورا لے لیتا اور یک دم سڑوپ جاتا جیسے چڑا چڑا ذرا ذرا سا ۔۔۔۔۔ اور کھا پی کر بغیر رسمی ہوں ہاں کے لیٹ جاتا اور آنکھیں بند کر لیتا ۔ مبادا کہیں خاتون آج کی لڑائی کی بات چھیڑ دے .....

(۵)

اور بات تو کنھار سے نکل کر پہلے شبراتی کی بیوی کے کوٹھرے میں پہنچی تھی اور جب وہاں شبراتی کا ادھوڑی استر جوتا ختم نہ کر سکا تو نکل کر صحن میں ناچنے لگی اور اس ناچ کو شبراتی کا ڈنڈا نہ روک سکا' اور سب گھر والوں تک حتیٰ کہ ذہین اور تیز گوش قسم کے پڑوسیوں تک پہنچ چکی تھی البتہ عیدو کے منہ در منہ نہ پہنچی تھی۔ مگر سب کو یک گونہ حیرت ہوئی اور سب سے زیادہ عیدو کی بات تو بدستور چلتی رہی۔ مگر شبراتی کی بیوی خاموش ہو گئی اور چھے مہینے روز کی چیخ چیخ او دھائیں دھائیں کے بعد اس کی یہ سکون کی کیفیت حیرت زا تھی ------- حتیٰ کہ اب شبراتی کے کوٹھرے سے بھی بھوت چڑیل کے چیخنے کی آوازیں نہ آتیں۔

شبراتی کی بیوی کی پہاڑ سی اٹل نسائیت کا بڑی اقتصادی مصلحت کے ساتھ سمجھوتہ ہوا' اگرچہ اس کی عورت والی جبلت اندر ہی اندر لاوے کی طرح پکتی رہی مگر خارجی طور پر سکون رہا اور مصلحت کا پلو تو ہمیشہ سے بھاری رہا ہے اور وہ بھاری بھرکم پن کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ جیسے کسی خاص مطمع نظر کے تحت خونیں آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر بھی اندھی رہی' اور لالچ تو اندھا کر دیتا ہے اور بہرہ اور گونگا بھی اور آبائی زمین سے تو بڑی محبت ہوتی ہے----- اور شبراتی نے آبائی زمینداری کی کلی تو ریث کا سبز باغ اس کے دونوں لڑکوں کے حق میں دکھایا' اور عیدو اور خاتون کو نکال دینے سے آدھی زمینداری نکل جانے کا خطرہ ظاہر کیا----- اور زن' زر' زمین کے روایاتی جزبات پر زمین کا لالچ غالب آگیا اور اولاد کے مستقبل کے لئے تو ماؤں نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اور ان میں سے ایک یہ بھی تھی۔

مگر آج آثار شدید تھے۔ جیسے ہمیوں مہینے کے شور آج یک دم صحن میں پھٹ پڑے تھے۔ خاتون تو خیر علیحدہ تھی۔ آج منہ در منہ شبراتی اور اس کی بیوی میں ہو رہی تھی اور خلاف معمول شبراتی ڈھیلا اور بیوی تنی ہوئی تھی ---- تھوڑی تو تو میں میں کے بعد شبراتی دروازہ سے نکل گیا اور شبراتی کی بیوی گلے میں رسی ڈال کر چھپر کے شہتیر میں لٹکنے لگی' بچوں نے دوڑ کر شور مچایا اور چوپالی سے اٹھ کر شبراتی اندر کو بھاگا اور خیریت گذری کے وقت پر آگیا اور ابھی لٹکنے نہ پائی تھی کہ گلو خلاصی کر کے پکڑ لیا' تو دیواروں سے زور زور سے سر ٹکرانے لگی اور آج پہلی مرتبہ شبراتی نے اپنا ڈنڈا کھٹل محسوس کیا' اور پھانسی اترتے گلے پر ڈنڈا تو ڈنڈا ٹھوریں بھی کھٹل ہو جاتی ہیں...... اور شبراتی نے ہمیشہ لات سے اترنے والا بھوت بات سے اتارنا چاہا اور پھانسی کے پھندے سے نکلی ہوئی عورت کے رونگٹے رونگٹے سے زخمی شیرنی کی سی چنگاڑیاں چیخ پڑیں اور شبراتی کے کیوں کیوں کیا بات ہے کے رسمی سوال کے جواب میں جیسے چھ مہینے کی سینکڑوں خاموش عورتیں بکھر کر جا پڑیں۔ "تو نہیں جانتا کیا بات ہے! تیری وہ ہوئی سوتی تو سب جانتی ہے۔ گھوڑی چھنال نے تجھے نہیں بتایا پانچ مہینے بیت گئے بیسوا کو ------ اور تو' تو میری چھاتی پہ سال بھر سے دکھ دکھاتے مونگ دل رہا ہے منا بھنڈ کہیں کا مکار!"

"اور پانچ چھ مہینے بیت گئے!" سنکر تو ایک دفعہ کو شبراتی اچھل پڑا کہتے بن نہ پڑی' سٹ پٹا کر سنبھلا' چور ضرور تھا مگر کوتوال سے ساز باز کئے چور تھا۔ ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔ "جھوٹ بالکل جھوٹ بکتی ہے۔"

"میں جھوٹ بکتی ہوں ------ کل سب پر کھل جائے گا اور دور کیوں جاؤ اپنی اس گھوڑی بیسوا سے پوچھ لو' اور کاہے کو دیکھ لو نا وہ سامنے کھڑی ہے بھنڈ مٹکا سا پیٹ لئے۔" ----- اور خاتون مظلومیت کے انداز میں مکھے کی آڑ پکڑنے لگی جیسے کوئی پھنسا ہوا چور ----- اور کنکھیوں سے اس جانب دیکھ کر شبراتی اچھی طرح سنبھل گیا اور ڈھٹائی کے ساتھ بولا۔

"تو ہی بکی' چل! تو کیا بات ہے!"

اور جیسے شبراتی کی بیوی کے نتھنوں سے چٹیل سانپ پھنکار پڑے۔ "چل بھنڈ' مکار جھوٹے' فریبی' اور سال بھر سے مجھے دم دے رہا ہے بتا تیرے میرے بیچ کیا بات ہوئی تھی جو میں سال بھر سے منہ سیئے بیٹھی بھیر ہی بھیر پھنک رہی ہوں اور تو گل چھرے اڑا رہا ہے۔"

"کیا بات ہوئی تھی؟" شبراتی نے اپنے ڈھیلے ڈھالے انداز کو جھٹکے دار لہجے سے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"ہوں ----" اور جیسے سر سے پاؤں تک ناگنیں ہی ناگنیں لہرا پڑیں 'ادب لحاظ' تہذیب 'میاں بیوی سب رشتہ کٹ ہی گئے تھے۔ جو اب ظلمی ہی جواب ظلمی تھی "آج کیسا بورا بنتا ہے۔ سوا مکار سال بھر سے مجھ رنڈیا کو دم دلا سے دے رہا ہے کہ باپ کی سب جائداد تیرے لڑکے کو ملے گی اور میری آنکھوں میں تکلے گھونپ گھونپ کے سامنے....."

"تو کیا عیدو باپ کا بیٹا نہیں" ڈھٹائی اور عذر لنگ کے سہارے شبراتی نے بات بدلنی چاہی۔

اور جیسے شکاری کتا خرگوش کو جھنجھوڑ پھینکتا ہے۔ "چل دور ہو بٹ بنے! جھونٹے سب معلوم ہے کون کون حرامی باپ کا ہے اور تو کیا جانے گا۔ جانی کار حرامی بچے! تیری اماں چھنال کو بھی معلوم تھا۔ حلال کیا ہوتا ہے' منے جھنلے! نگوڑے پاپی 'موئے کتے اب بتا جو تو نے سال بھر سے مجھے دم دیئے' اور سوتیا ڈاہ کا جوالا مکھی بھڑ بھڑا 'بھڑ بھڑا کر لاوا اگل رہا تھا۔ "مگر سال بھر کی ڈھیل میں شبراتی کی ڈھٹائی چٹان کی طرح بے حس اور اٹل ہو گئی تھی' کچھ شوخی اور بے حیائی کے ملے جلے انداز میں کہتا ہوا باہر نکلا چلا گیا۔ "خیر یہی سہی مجھے اس سے کیا' میرے تو تینوں کو ملے گی۔"

(۶)

اور شبراتی کے پیٹھ پھیرتے ہی چھتوں 'اور چھتریوں پر گلہریوں اور چھپکلیوں کی طرح چپکی پڑوسنیں صحن میں اتر آئیں اور بات تو سب کی سب نہ معلوم کب سے جانے پڑی تھیں۔ آج نیا شگوفہ کھلا تھا' نیچے آتے ہی تجاہل عارفانہ سے دو طرفہ سوالات و جوابات کا روغن چھڑکا اور ہٹیاں پھر بھڑک اٹھیں 'ایک ہنوز بہم قہقہے لگا رہی تھی۔ دوسری مسخری ہنسنے پر مخصوص سنجیدگی سے ڈانٹ رہی تھی تیسری بول پڑی "گھر بیٹھے آیا پوتا' بویا نہ جوتا۔ "کوئی ٹھنڈی پنچا تین بول پڑیں "بویا نہ جوتا کیوں ہوا؟ اس کا تو سات ہاتھ کا خصم بیٹھا ہے۔ "جب تک ایک بڑی بوڑھی نے لقمہ دیا "بیٹھا کہاں ہے بن لیتا ہے۔ جبھی تو۔ "اور آنکھ مار کر شبراتی کی بیوی کی جانب اشارہ کیا اور شبراتی عیدو کی بیویاں غراتی ہوئی بلیوں کی طرح لڑتے لڑتے غٹ پٹ سی ہو گئیں۔ یہ لیکی وہ سہمی اور برآمدہ میں کوہنی اور بات "ڈیکرس ڈرال" سے بڑھ کر پیٹل پوائنٹ پر پہنچ گئی۔ دنا دن ہونے لگی۔ برآمد کی دہلیزی پر پہنچ کر شبراتی کی بیوی بڑے تڑانخے کے ساتھ بولی "نہیں آج کھلوا کر چھوڑوں گی۔ اتنی بیچ بیبیوں کے سامنے منہ پہ بیسوا' چھنال بارہ تالی سے!" اور پھر ایک زہر کا سا گھونٹ بھر کر کہا۔ "بتا چھنال بتا! یہ کہاں سے لائی؟ رنڈی!" اور ایک قدم برآمدہ میں کو بڑی خاتون بیچاری دو قدم پیچھے ہٹی اور عیدو کی کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گئی۔ عیدو تو بڑی دیر سے سب کچھ خاموش پڑا سن رہا تھا اور یہ تو عورتوں کی لڑائی تھی۔ کر قولوں کی جنگ ----- دھڑ مارا اپاہج کیا بولتا! لیکن جب لڑھتے پڑھتے بستر تک پہنچ گئی تو کمر کولے ہی تو مفلوج تھے' زبان حلق پر تو لقوہ نہ گرا تھا اور شبراتی کی بیوی نے جس وقت ایک قدم چوکھٹ کے اندر بڑھا کر منہ سے ایک شعلہ سا نکالا "نہیں آج کھلوا کر چھوڑوں گی چھنال سے 'بول کسی اپنے کھتے کا نہیں ملا تو میرے کار رکھ لیا۔ ایسی لات ماروں گی جو پل سے نکل کر جا پڑے "تو جیسے عیدو کے اس کولہے سے اس کولہے تک کرنٹ نے شاک مار دیا۔ وہ بجلا کر جا پڑا۔ سیلی بارود کے تودے پر انگارہ سا آ پڑا۔ منہ سے غلیظ دھواں نکلا اور گویا کمر کا مفلوج گر یہ چنانخ سے بولا۔ "تو بھی نکما کہتی ہے۔ سیتی ستیا! ذرا گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھ ابھی تو عیدو کی آنکھیں کھلی ہیں کہے تو بال بال میں رکھ دوں! سب بھول گئی نیک بخت" اور پھر مخصوص انداز میں لہجہ بدل کر کہا۔ "اس کا خیر آج شبراتی کا ہے' پھر یہ نکما نہ ہوتا تو تیرے دونوں کہاں سے آتے کچھ یاد ہے کل کی ہی بات ہے....."

ادھر عیدو کے ڈھیر میں سے گویا دو مردوں نے تن کر بیوی کو پاک دامنی کی چادر میں ڈھانک لیا۔ ادھر خاتون سینہ تانے دندناتی برآمدہ میں آ پڑی اور شبراتی کی بیوی ایک دھکے سے الٹ کر باہر صحن میں جا پڑی' آواز حلق میں بند' ساری اکڑفوں ڈھیلی غصہ کافور' یا تو لال بھبھوکا ہو رہی تھی یا پیلی پھنکار پڑ گئی۔ آنکھیں اپنے آپ جھک گئیں اور کڑی سے چاٹنے لگی۔ جیسے عیدو نے اس کے سر پر گو سے بھرے ہوئے دو گھڑے ٹکرا کر

چھوڑ دے .... اور خاتون صحن میں پینچ کر بیچ بیویوں کے بیچ کھڑی گرج رہی تھی۔ "لے 'حیادار جب تو نہیں 'اب کھا پھانسی------ لونڈے گھرنی بڑی ناک والی ہے تو لٹک جا...... 'اور حقارت کے ساتھ ہونٹ بچکا بچکا کر پڑوسنوں سے داد طلب کر رہی تھی 'اور جب تک "ذہن تحز" پڑوسنیں بات لے اڑیں۔

"ہے ہے بیو برا زمانہ ہے۔"

"چودھویں صدی ہے چودھویں! حرام حلال ہے حلال حرام!"

"اور بوا کسی کے کیے کوئی حرامی ہو جاتا ہے۔"

"اری جس کا باپ زندہ ہے اسے کون حرامی کہے!"

"اے تو بہن دو تو بچھلی پولیس کھول رہا ہے اور اب تو معصوم ہے 'آپی گھور میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔"

"ہاں بیو خدا جانے------ تین برس تو منہ پہ موچھیں رکھائے کوارا اجھیارا بھاوج کے کولہے لگا کھاتا رہا ہے۔"

"ہوں 'بہن تین چار برس بھر کے کمائی کھائی تو برے جیون برے حوالوں کہیں جا کر چوتھے برس بیاہ منگنی کی بات اٹھاتی۔"

"ہاں ہاں 'سو اس وقت سب کچھ دیور کے مال کمائی حصہ بانٹ کے مارے بسورتی ہے۔"

"ہاں ہاں بی بی ہم بھی یہی کچھ تھے۔ مال کھا رہی ہے کوارے دیور کا اس لئے بیاہ منگنی نہیں پنپنے دیتی 'لو آج گل کھلا!"

"کچھ مت کہو بیو توبہ کرو توبہ! چودھویں صدی ہے۔ نگوڑی چودھویں۔ شیطان ہوا پلک مارتے ڈگاتا ہے۔"

"اب دیکھو لونہ آج اس بے چاری خصم والی پہ کیسی دندنا دندنا 'چڑھ چڑھ بیٹھتی تھیں اور اپنی سب بھول گئیں۔ نطفہ لیک!"

"دھوئی دھائی چندا ہی۔"

"کیوں نہ 'زمانہ سیدھا ہے۔ آج مسٹنڈے خصم والی جو ہیں 'لمبی ناک ہے اور چاند سے بیٹوں کی اماں ہیں" (قہقہہ لگایا)

"پھر آج پوچھ جڑ سے لی اسے لچے نے!"

اور شبراتی کی بیوی کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی اپنے کوٹھرے کو چلی گئی اور بڑے زور سے پٹخ کر کواڑ بند کر لئے اور کواڑوں کے دھماکے پر سب پڑوسنوں نے ڈراپ سین والا قہقہہ لگایا 'اور جو کچھ باقی رہ گیا تھا 'وہ بڑبڑاتی اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔

(۷)

شام کو خاتون کوٹھری میں آئی عیدو پر چھائی ہوئی سی 'جیسے بیساکھ جیٹھ کی گرمیوں میں پیچ در پیچ آکاش بیل شاداب ہو کر گنبد کی صورت چڑھی ہوئی سوکھے سوکھے 'چوسے ہوئے درخت کی مٹھرائی مٹھرائی 'پتیوں اور اینٹھی اینٹھی 'روڑی بے جان سی شاخوں کو ڈھانپے ہوتی ہے----- قد مٹھی پر کھنچا ہوا سا 'سینہ پیٹ سے آگے ابلا پڑتا اور پیٹ 'سینہ سے آگے اٹھا جاتا تھا اور کولہوں پر تو جیسے دو دنبوں کی چکتیاں تھل تھلا تھل تھلا کر کپڑوں سے باہر نکلی پڑتی تھیں۔ عیدو نے اوپر سے نیچے تک بھانپا 'دائیں سے بائیں تک پر تالا 'اور وہ تو خاتون کے جوڑ جوڑ بند کا آشنا تھا۔ پانچ سالہ محرم راز اور تین سالہ رفیقہ حیات----- اندر سے باہر تک دیکھ کر اندازہ کیا کہ خاتون بن تری کی طرح پھول رہی ہے۔ جڑ سے پھنگی تک ہری بھری 'اینڈتی اکڑتی 'لال لال بیرا بوٹی جیسے پھل سے لدی ہوئی...... گلابی رخساروں پر برسات کی شفق پھوٹ پڑی ہے 'اور ہنکری سے ہونٹوں پر یا قوت کی چھوٹیں تڑپ رہی ہیں اور سراپے میں بجلی سی لہرا لہرا جاتی ہے۔ بشرہ کا ہرنی جیسا مخصوص انتشار اطمینان اور سکون سے بڑھ کر یا تمکین اور استغنا تک پہنچ رہا ہے 'جیسے ابھی ابھی گہری نیند سو کر دو چار انگڑائیاں لے آ کھڑی ہوئی ہے۔

عیدو نے کچھ عجیب سی نگاہ ڈالی 'اور خاتون نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اکھڑپن سے جواب دیا مگر جیسے اس کا جواب الٹا ہو کر اس کے

منہ پر پڑا ۔۔۔۔ اور عیدو نے معلوم کیا سوچ کر بال کی نوک سے لے کر پاؤں کی چھنگلی تک نشیب و فراز کا گہرا جائزہ لیا اور اپاہج نظریں بالوں کے گھونگھر سے نکل کر چمکتی بلند پیشانی سے پھسلتی رخساروں اور ہونٹوں کے پیچ و خم میں ناچتی آہستہ آہستہ صراحی دار گردن سے گھوم کر اتریں اور سینہ کی گولائیوں اور بازوؤں کے اتار چڑھاؤ میں چکرا گئیں' اور وہاں سے قلا بازی کھا کر کمر کولھوں کے گداز میں دھنستی لڑکھڑاتی رہیں اور پھر! بھٹک بھٹکا رجب پیٹ کے "پر معنی" ڈھلان پر پہنچیں تو جم کر رہ گئیں۔ بھترا پھیلائیں ٹس سے مس نہ ہوئیں ۔۔۔۔ اور عیدو نے دیکھا کہ خاتون انگیٹھی سی دہک رہی ہے۔ انگارے ہی انگارے بھرے! اور جیسے جوہڑ کے گدلے پانی کو شفق کا عکس چمکا دیتا ہے۔ عیدو کی علیل آنکھوں کے دھندلے آئینہ پر خاتون کی تمام سرخیاں مچل پڑیں .... اور اس وقت تو وہ عیدو کے لئے دودھ ملیدہ لے کر آئی تھی۔ تمام دن لڑائی کی بھینٹ چڑھا تھا نہ دوپہر چولہا گرم ہوا تھا' نہ اب' گھر بھر میں کسی کے منہ پر اڑ کے کھیل گئی تھی۔ صبح کا ایک کٹورا دودھ پئے عیدو بھی تمام دن کا یوں ہی پڑا تھا' ۔۔۔۔ شام کو دودھ دوہ کر شبراتی خاموشی سے کے ساتھ رکھ کر باہر چلا گیا تھا' اور وہ تو اوٹنی کھنوائی لئے اندر پڑی تھی۔ خاتون نے چپکے سے دودھ گرم کیا' جلدی جلدی دو روٹیاں پکائیں اور کھانڈ ملا کر ملیدہ کیا اور دودھ میں ڈال کر لے آئی ۔۔۔۔ کٹورا برابر تپائی پر رکھا اور معمول کے مطابق اٹھنے کو سہارا دیا' اور سہارے دیتے وقت تو دونوں کے چہروں میں بہ مشکل تین چار انچ کا فاصلہ رہ جایا کرتا تھا اور آنکھیں ایک دوسرے سے بھڑسی جایا کرتی تھیں' اور عیدو کی آنکھوں میں تو شعلے سے لپک اٹھے! نتھنے پھول گئے' کنپٹیاں پھڑک گئیں' اور بیمار' مفلوج' اپاہج بستر مرگ کی ارذل ترین سطح سے اچک کر زندگی کی ان ہیبت ناک بلندیوں تک جا پہنچا جہاں ملک الموت کے بھی پر جلتے ہیں' عیدو کے اندر مرد پھٹا' ٹائم بم کی طرح تند اور تلوار کی طرح تیز تین سال کی معذوریوں مصلحتوں اور سمجھوتوں کا تھپکا مردا اور بیٹھ کر سیدھے ہوتے ہوتے "غوں' غاؤں' غپ!! خاتون کا سر عیدو کے ہاتھوں کے شکنجہ میں تھا اور پتلی کھڑی ناک جبڑوں میں' اور جیسے عیدو کے جبڑوں میں تو ناہروں کا زور سمٹ آیا تھا اور خاتون کے ہونٹوں پر اس کی تھوڑی کی ڈاٹ لگ گئی تھی' بے چاری کی چیخ بھی منہ سے باہر نہ نکل سکی' اور جب کچ' کچ' کچ گاجر کی طرح چبا کر پوری ناک نگل گیا تو خاتون کا چہرہ گرفت سے اپنے آپ آزاد ہو گیا۔

○

ملک راج آنند

نام : ملک راج آنند
قلمی نام : ملک راج آنند / ڈاکٹر ملک راج آنند
پیدائش : ۱۲ دسمبر ۱۹۰۵ء بہ مقام پشاور ' صوبہ سرحد ' بھارت (حال پاکستان)
تعلیم : بی ۔ اے (آنرز) پی ۔ ایچ ۔ ڈی ۔

ابتدائی تعلیم پشاور میں پائی ۔ ۱۹۲۳ء میں پنجاب یونی ورسٹی ' لاہور سے بی۔ اے (آنرز) کیا۔ ۱۹۲۵ء میں سکالر شپ پر برطانیہ چلے گئے۔ لندن اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں فلسفہ کے ریسرچ اسکالر رہے اور ۱۹۲۸ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

مختصر حالات زندگی:

زندگی کے ابتدائی چند برس پشاور (صوبہ سرحد) میں گزرے ۔ اجداد ' جدی پشتی پنجابی تھے ۔ اس دور کا ہندوستان ناقابل برداشت باج گزاری اور معاشرتی بغاوت کا مرکز بنا ہوا تھا ۔ اس ناقابل برداشت حصار کو توڑنے کی خاطر چھوٹی عمر میں ہی قلم سنبھالا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ان ابتدائی اراکین (۱) میں سے ہیں جنھوں نے ۳۳ ۔ ۱۹۳۲ء میں اس ادبی تنظیم کے قیام کے لیے لندن میں میٹنگ کی ۔ ۳۶ ۔ ۱۹۳۵ء میں جب انجمن کا دستور العمل زیر غور تھا تو ملک راج آنند ' انجمن کے نصاب سے متعلق بحث مباحثوں میں سب سے زیادہ سرگرم دکھائی دیئے۔

لندن میں قیام کے دوران لندن کاؤنٹی کونسل سکولز میں انگریزی ادب اور فلاسفی کے لیکچرر کے طور پر عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بعد ازاں ہندوستانی ادبیات کے Lever Hulme فیلو اور بی بی سی لندن میں براڈ کاسٹر رہے۔ ایم۔ او۔ آئی (فلمز) کے سکرپٹ رائٹر کے طور پر کام کیا۔ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں ٹیگور پروفیسر آف آرٹ اینڈ لٹریچر کے طور پر وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال کی " اسرار خودی " اور مہاتما گاندھی کے افکار سے متاثر تھے ' آگے چل کر انڈین سوشلسٹ پارٹی کے سرگرم رکن رہے ۔ ایک مدت سے بمبئی میں قیام ہے اور فری لانس ادیب کے طور پر زندگی کرتے ہیں ۔ رسالہ " Marg " کے ایڈیٹر ہیں۔ جنوب مشرق کے اس انٹرنیشنل شہرت کے حامل ادیب کی زندگی اور فن سے متعلق چند اہم کتب طبع ہو چکی ہیں ' جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1. Mulk Raj Anand By Dr. M. k. Naik. Arnold-deinemann, publishers India Pvt. Ltd. AB/9. Safdarjung Enclave, New Delhi- 110016.
2. Mulk Raj Anand by Dr. K. N. Sinha. World Authors Series. Twayne Publishers. New York.
3. The Lotus and the Elephant by Jack Lindsay. Kutub Popular, 350. Tradeo Road. Bombay-400 034. Also reproduced in Decay and renewal by jack Lindsay. Published by Lawrence & Wishart. London. 1977. Available from Colette's Bookshop. Charing X Road. London.
4. An Ideal of Man in Anand's Writings by D. Riemenschneider. Kutub Popular, address as above.
5. Mulk Raj Anand, Man and novelist by Margaret Berry. Published by E. F. Beale. Amsterdam.
6. So Many Freedoms by Dr. Saros Cowasjee.
7. Mulk Raj Anand: Special Number. a Miscellaneous of various articles edited by Dr. Satyanarian Singh. Department of Englishe. Kakatiya University, Vidyaranyapuri. Warangal- 506 009. A.P. India.

اولین مطبوعہ افسانہ:

"اچھوت" مطبوعہ: "وشارت" ۱۹۳۵ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

No.	Title	Publisher
1.	Seven Summers	Orient Paperbacks.
2.	Morning Face (Novel)	Arnold Heinemann
3.	Confession of a Lover	Arnold Heinemann
4.	Homage to Tagore (Criticism)	
5	Lines Written to an Indian Air (Criticism)	
6.	On Education (Criticism)	
7.	King-Emperor's Enlgish (Criticism)	
8.	The Story of India	Arnold Heinemann.
9.	The Story of Man	
10	Indian Fairy Tales	
11.	More Indian Fairy Tales	
12.	The Lost Child	Lavanya
13.	Untouchable (Novel)	Orient Paperbacks
14.	Coolie (Novel)	Orient Paperbacks
15.	Two Leaves and a Bud (Novel)	Orient Paperbacks
16.	The Village (Novel)	Orient Paperbacks
17.	Across the Black Waters (Novel)	Vision Books
18.	The Sword and the Sickle (Novel)	
19.	The Barber's Trade Union and other Stories	Mayfair- Orient Paperbacks
20.	The Big Heart (Novel)	Arnold Heinemann
21.	The Tractor and the Corn Goddess (Novel)	
22.	Private Life of an Indian Prince	Orient Paperbacks
23.	Reflection on the Golden Bed and other Stories	
24.	The Old Woman and the Cow: Gauri	Arnold Heinemann
25.	Lament on the Death of the Master	orient Paperbacks
26.	Death of Hero	Orient Paperbacks
27.	Power of Darkness	
28.	Between Tears and Laughter	Sterling Paperbacks
29.	The Road	Sterling Paperbacks
30.	Persian Painting (Research)	Out of Print
31.	The Hindu View of Art (Research)	Out of Print
32.	The Golden Breath	Out of Print
33.	Apology for Heroism	Mayfair
34.	Album of Indian Paintings	National Book Trust of India
35.	The Volcano	University of Baroda
36.	The Third Eye	University of Baroda

۳۷۔ "سات سال" رضیہ سجاد ظہیر کا ترجمہ "Seven Summers" ناول ۱۹۴۳ء، مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
۳۸۔ "Indian Short Stories" اقبال سنگھ کے اشتراک سے انتخالوجی، The New India Publishing Co., London

غیر مدون:

محولہ بالا مطبوعہ کتب کے علاوہ "The Buble" اور "A World Too Wide" زیر طبع ہیں۔ علاوہ ازیں ملک راج آنند کے متعدد افسانے اردو رسائل اور انتھالوجیز میں بکھرے پڑے ہیں۔ خصوصاً سجاد ظہیر نے ان کے ایک ناول "قلی" کا ترجمہ کیا تھا جو "نقوش" لاہور شمارہ نمبر۵ میں شائع ہوا۔

مستقل پتا:

۲۵ کف پراڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۵۔ بھارت۔

اعزاز:

۱۔ فلاسفی آف آرٹ پرائز انٹرنیشنل اکیڈمی: ۱۹۸۵ء
۲۔ پدم بھوشن، اعلا سول ایوارڈ: ۱۹۶۷ء
۳۔ فیلو، للت کلا اکیڈمی: ۱۹۷۴ء

نظریہ فن:

"I think beyond literature of pleasure current in most parts of the world,there lie vast unknown areas of reality, about the lives of people who have never entered literature. I feel new generations of the young specially in Asia and africa will go into the interious and recreate the lives of the neglected, the insulted and the injured."

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۲۷ جون ۱۹۸۵ء)

○

(۱) ڈاکٹر ملک راج آنند، راجا راؤ، اقبال سنگھ اور سجاد ظہیر

ملک راج آنند

مرغزار

یہ واقعہ آج سے دس سال پہلے کا ہے۔ جو سیاحت کشمیر کے مختصر زمانہ میں مجھے پیش آیا۔ لیکن زمان و مکان ابھی تک ان اثرات کو دور نہیں کر سکے جو مدت تک میرے دل و دماغ کو پریشان کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ یادداشت کے طور پر یہ واقعہ سپرد قلم کروں۔

ہماری پارٹی میں میرے سمیت کل چار آدمی تھے۔ باقی تین میں ایک بلند و بالا بارعب سکھ تھا۔ جس کو خدا اور درزی دونوں نے بنایا تھا۔ دوسرا ایک حساس کشمیری شاعر تھا جس کا خاندان نقل مکانی کر کے میدانوں میں جا کر آباد ہو گیا تھا اور جس طرح عام کشمیری تارکان وطن کی حالت ہے کافی خوشحال تھا۔ کشمیر کو اگرچہ قلات کی فیاضیوں سے کافی حصہ ملا ہے۔ لیکن یہاں کے باشندے ہمیشہ مظلوم رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے کشمیری اپنے وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تیسرا ساتھی ایک پہاڑی لڑکا تھا جو ہمارے لئے کھانا تیار کیا کرتا تھا۔

ہم نے اپنا اسباب ایک تانگے پر رکھا اور اس ۲۷۵ میل لمبی سڑک پر پاپیادہ روانہ ہو گئے جو جموں سے پر سکون راوی اور ہنگامہ خیز چناب کی وادیوں میں سے گزرتی ہوئی ہمالیہ کو عبور کرتی ہے۔ بنی ہل کی چوٹی پر ہم اس ہوا سے ہمکلام ہوئے جو کشمیر کی نزہت بار وادیوں کی طرف سے آتی ہے اور جو اپنے دوش پر بیک وقت حسن و دلکشی، غم و الم، زعفران زاروں کی نکہت و لطافت اور محنت کشوں کی آہ و زاری کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔

یہاں سے ہم ویرناگ کے قدرتی چشمے پر آئے، جس کا پانی قطرہ قطرہ کر کے اسلام آباد کے مقام پر دریائے جہلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ دریا راوی کشمیر کو دو حصوں پر تقسیم کرتا ہوا جھیل وولر میں جا گرتا ہے اور اس کے بعد دو سو میل کا پہاڑی رستہ طے کرتا ہوا میدانوں کی طرف چلا جاتا ہے۔

ویرناگ ایک معمولی سا گاؤں ہے جس کی گلیاں پر پیچ اور تنگ و تاریک ہیں جھونپڑے گارے سے تیار کئے گئے ہیں۔ جنگلی چھتوں پر رنگ رنگ کے پھول لہلہا رہے ہیں اور ان کو دیکھ کر یہ اندازہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ان جھونپڑوں کی اندرونی زندگی کس درجہ المناک ہو گی۔ ویرناگ سے ہم اصل وادی میں آئے۔ جس کے بیچوں بیچ گرد و غبار سے اٹی ہوئی ایک سڑک گزرتی ہے۔ جس کے دونوں طرف چنار اور سرو کے درخت جھوم رہے ہیں۔

سری نگر پہنچ کر ہم نے ایک "ہاؤس بوٹ" میں قیام کیا۔ اس کے بعد "ٹورسٹ گائیڈ" کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے اردگرد کے مرغزاروں کی سیاحت کا فیصلہ کر لیا۔

یہ کتاب مہاراجہ صاحب کشمیر و جموں کی حکومت نے یورپی سیاحوں کے فائدے کے لئے تیار کرائی ہے، لیکن ہندوستانی سیاح بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ سرکاری زبان سے واقف ہوں۔

سب سے پہلے ہم نے وادی "سونا مرگ" میں قدم رکھا۔ جہاں صبح کی ارغوانی آنکھیں ہمیشہ برف سے چندھیائی رہتی ہیں، جو چھوٹے تبت پر سارا سال نظر آتی ہے اور جہاں رات کے سکون میں برف کے تودوں اور بڑی بڑی چٹانوں سے سر پٹختا ہوا سندھ خلل ڈالتا رہتا ہے۔

ہم ایک خطرناک پہاڑی پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے امرناتھ کے غار تک پہنچے جہاں پگھلتے ہوئے برف پاروں کے قطروں نے ٹپک ٹپک کر

ایک برفانی دیوتا کی شکل اختیار کر لی ہے اور جس کے درشن کے لئے ہر سال ہزاروں عقیدت مند اس جگہ آتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ یہ شیو جی کا لنگ ہے۔

ہم گلمرگ گئے جو جنگلی گلاب کی وادی ہے۔ لین مرگ بھی گئے جہاں کوسوں تک یاسمین کے کھیت ہیں۔ ہم اپروالٹ پر بھی چڑھے جو کشمیر کی سب سے اونچی چوٹی ہے اور جہاں شفاف پانی کی ایک جھیل ہے۔ اگر یہاں ہلکی سی سرگوشی بھی کی جائے تو گونج اٹھتی ہے۔

ہم نے گدھربل اور ہری پربت بھی دیکھے اور شالیمار اور نشاط کی سیر بھی کی۔ غرضیکہ ہم ہر جگہ گئے اور کشمیر کے مرغزاروں کی لطافت و دلکشی کے چشمہ سے سیراب ہوتے رہے۔ ہم یہاں کی پگڈنڈیوں پر آوارہ خرامی کرتے رہے۔ سبزہ زاروں میں گھومتے رہے اور یہاں کے ایک ایک لمحہ پر دنوں اور ہفتوں کو قربان کرتے رہے۔

اس کے بعد جھیلوں کی سیر کے سوا ہمارے مدنظر کچھ بھی نہ رہا۔ ہم جھیل ڈل میں اپنی کشتی کو نئے نئے مقامات پر ٹھہراتے رہے۔ باغوں کے سائے میں نئے نئے کنج عافیت ڈھونڈتے رہے اور ہمارا ملاح اپنے قلب نما چپو کو جدھر اس کا جی چاہا چلاتا رہا۔

ہمارے شاعر دوست کا ایک چچیرا بھائی مہاراجہ کشمیر کے دربار میں ملازم تھا۔ اس نے ہمیں ڈل کے ایک گمنام کونے میں آگھیرا اور ہم پر شراب، گوشت اور پھلوں کی بارش کر دی۔ اس کے بعد ہمیں اس جزیرے میں چلنے کی دعوت دی جو قریب ہی اسکی ملکیت میں تھا۔ ہم ایک "بڑے آدمی" کی دعوت سے خوش نہ ہوئے۔ کیونکہ اسے دوست بنانا ہمیں منظور نہ تھا۔ وہ ایک احمق سا نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ جس کے اطوار و عادات پسندیدہ نہ تھے۔ اس کی دعوت کا ہم نے شکریہ ادا کیا اور یہ کہتے ہوئے معذرت چاہی کہ ہم وولر جا کر اپنی سیاحت کو جلد سے جلد مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن حسن اخلاق کا جو جال اس نے ہمارے اردگرد پھیلایا تھا۔ اس میں سے نکلنا آسان نظر نہ آتا تھا۔ اس کی میٹھی میٹھی زبان نے ہمیں متاثر کر لیا اور غالباً اسی کے زور سے اس نے مہاراجہ کے دربار میں بھی ایک امتیازی جگہ حاصل کی تھی۔ وہ کہنے لگا "اگر آپ لوگ میرا مہمان بننا پسند نہیں کرتے تو میں آپ کا مہمان بنوں گا اور تبدیل آب و ہوا کی غرض سے آپ لوگوں کے ہمراہ وولر جھیل تک چلوں گا۔ میں اپنی موجودہ پر تصنع زندگی سے اکتا چکا ہوں میں آپ لوگوں کی طرح آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔

اس شخص کا نام نواب ظفر اللہ خاں تھا۔ اس نے ہم پر کرم فرمائیوں کی بارش کی تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر ہم انکار نہ کر سکے۔ اب اس کی مہربانیوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ میرے ساتھ میرے دوست بھی جانا چاہتے ہیں۔ اس لئے میں سامان خورد و نوش کا اور زائد ملاحوں کا انتظام کئے دیتا ہوں۔

ہم دام میں گرفتار ہو چکے تھے۔ ہم نے اس کی تمام تجویزوں کو قبول کر لیا کیونکہ اگر بحث شروع کر دیتے تو اس میں پورا اترنا مشکل تھا۔ لہٰذا ہم نے خود کو اس کے سرمایہ دارانہ ہاتھوں میں گروی رکھ دیا اور اس کے اور اس کے دوستوں کے ہمراہ ایک شام روانہ ہو گئے۔ اس کے دوستوں میں سے ایک تو کشمیر کے ہائی کورٹ کا ایک جج تھا اور دوسرا چمڑے اور کھالوں کا کاروبار کرتا تھا۔

رات کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور ہم گویا خواب میں زمین و آسمان کے درمیان تیر رہے تھے۔ البتہ کبھی کبھی نواب اور اس کے دوست ہمارے سکون میں خلل ڈال دیتے۔

دریا بہہ رہا تھا اور اس کے سینے پر ہماری کشتی بھی بہہ رہی تھی۔ ملاح کے ہمراہ اس کی بیوی اس کی بہن اور اس کی چھوٹی لڑکی بھی تھی لیکن ان کی امداد کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ کشتی خود بخود بہے چلی جا رہی تھی۔

لیکن ابھی ہم کسی کنج عافیت میں نہ پہنچے تھے کہ کھانے کا اعلان ہو گیا۔

نواب اپنے ہمراہ ایک پر تکلف کھانا لایا تھا۔ جو اس کے خادموں نے تیار کیا تھا کھانے میں بہت سی چیزیں شامل تھیں جن میں سے زعفران والا پلاؤ، مرغی کا شوربہ اور ۱۸۸۷ء کی شیمپئن قابل ذکر ہیں۔

جب ہم کھانا کھانے پر آمادہ ہو گئے تو نواب صاحب نے اپنے چٹکلوں سے محظوظ کرنا چاہا انہوں نے دو ایک گندی سے کہانیاں سنائیں اور

اس کے بعد کچھ ایسی بیہودہ باتیں کرنے لگے جن میں کم سے کم مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی چنانچہ میں ایک طرف ہو کر لیٹ گیا اور ستاروں کی طرف دیکھتا ہوا رات کی آغوش میں سو گیا۔

جب صبح ہم اٹھے تو ہماری کشتی روشنی کے سمندر میں داخل ہو چکی تھی کیونکہ جدھر ہم نظر اٹھاتے وولر کا نیلگوں پانی موجیں مار رہا تھا اور بالکل پارے کی اس چادر کی طرح نظر آتا تھا جو تمازت آفتاب سے جھلسی ہوئی پہاڑیوں کے درمیان بچھا دی گئی ہو۔

نواب صاحب نے اپنے گانے سے ہمیں محظوظ کرنا چاہا لیکن ان کی آواز پھٹی ہوئی تھی اس لئے صرف ان کے دونوں دوست انہیں داد دے رہے تھے اور ہم کشتی کے مختلف گوشوں میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے کبھی ہم کھانا پکانے میں دلچسپی لینے لگتے، کبھی کپڑے پہننے میں اور کبھی قدرت کے ان سحرکار ہاتھوں پر غور کرنے لگ جاتے جن کے ذریعہ سے ٹوٹے ہوئے بلور، شکستہ زمین اور نیلگوں سرخ شعلوں کی زبان میں ایک نظم کہی گئی تھی۔ یقیناً صبح کے وقت سرخ آسمان کی چھت کے نیچے وولر کا منظر دیدنی ہوتا ہے۔ میں مسرور ہو کر پانی کی شفاف سطح کا نظارہ کرتا رہا۔ میں نسیم صبح کے ان جھونکوں کی سرگوشیاں سنتا رہا جن کے اثر سے خوابیدہ کنول کے پھول اپنی آنکھیں کھول رہے تھے۔ میرا بے اختیار جی چاہا کہ ان سے جا کر لپٹ جاؤں اس لئے میں نے بے جھجک ہو کر ان کے درمیان چھلانگ لگائی اور جی بھر کر غسل کرتا رہا۔ اس کے بعد میں ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس چشمے کو دیکھتا رہا جس پر نواب اور اس کے دوست بیٹھے ہوئے تاش کھیل رہے تھے۔ دس بجے تک ہم باندی پور پہنچ چکے تھے۔ یہ گلگت جانے والی سڑک پر ایک چھوٹا سا غیر اہم گاؤں ہے اور ہندوستان کا آخری برطانوی قلعہ ہے۔ اس گاؤں سے آگے وسطی ایشیاء کی سرحد شروع ہو جاتی ہے جہاں گذریوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

نواب صاحب نے تحصیلدار کو حکم دیا تھا کہ دس مرغی کے چوزے پانچ درجن انڈے اور کچھ پھل ہمارے ناشتے کے لئے لائے۔ وہ ہمیں گاؤں کے بڑے بڑے مکانوں میں لے گیا تاکہ ہماری یا اپنی شہرت کا رعب جما سکے۔

ہمارا ملاح دوڑا دوڑا آیا اور کہنے لگا ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہئے کیونکہ دوپہر کے وقت جھیل میں ایک زبردست طوفان آیا کرتا ہے اس لئے ہمیں کم سے کم بارے بجے تک خطرے کی حد سے گزر جانا چاہئے۔

نواب نے اسے کشمیری زبان میں گالی دی اور بدقسمتی سے یہ زبان ایسی ہے کہ گالی بھی وہ اسے کم نظر نہیں آتی۔ ہم نے ملاح کی تائید کی اور چونکہ نواب صاحب کم سے کم ہمیں گالی نہیں دے سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کہا "میں بیگار پر کوئی آدمی پکڑ لاؤنگا تاکہ کشتی کو خطرے کی حد سے باآسانی بچایا جا سکے"۔ چنانچہ انہوں نے توقف کیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد ملاح دوڑا آیا لیکن بدقسمتی سے اس وقت نواب صاحب بیت الخلا تشریف رکھتے تھے۔ اس لئے ہم سب کو بے صبری سے انتظار کرنا پڑا۔ اس کے بعد نواب صاحب کو حجامت اور حمام کا خیال آیا لہذا انہوں نے یہ پروا نہ کی کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے جب وہ نہا دھو کر باہر آئے اور ملاح کی پراسرار التجائیں اور ہماری سفارشیں سنیں تو انہوں نے بڑی مہربانی کی کہ ایک راہ جاتے نوجوان لڑکے کو روک لیا اور اسے حکم دیا کہ کشتی کو سرینگر لے چلے۔

"لیکن حضور سرینگر یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے" نوجوان دیہاتی نے کہا "اور میری ماں ابھی ابھی فوت ہوئی ہے اور میں اس کے جنازے کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔"

"الو کے پٹھے! بدمعاش! تمہیں انکار کی یہ جرات" نواب نے غراتے ہوئے کہا "تم بالکل جھوٹے ہو۔"

"نہیں نواب صاحب" نوجوان گڑگڑا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "آپ بھگوان کی طرح رحمدل ہیں مجھے معاف کر دیجئے! میرے پاؤں سوجے ہوئے ہیں اور میں بیس میل کے پہاڑی سفر کے بعد تھک چکا ہوں۔ میں اپنے چچا کی گھوڑی لینے گیا تھا اب میری ماں مر گئی ہے۔ اس لئے مجھے ملا کو بلا کر لانا ہے۔"

"چلو دوڑو کشتی کی طرف دوڑو" نواب نے چیخ کر کہا۔ "ورنہ میں تمہیں تھانے دار سے پٹواؤں گا۔ جانتے ہو یہ علاقہ میرا ہے اور میں

یہاں کا جاگیردار ہوں۔ کیا تم بیگار سے انکار کر سکتے ہو؟"

"لیکن سرکار ۔۔۔" کشمیری نوجوان بڑبڑایا اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ نواب کے سامنے بولنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔ جس کا چہرہ تمتما رہا تھا نہ صرف حجام کے استرے کی رگڑ سے بلکہ اس غصے کی وجہ سے بھی جو نوجوان کے انکار کے باعث اسے آ رہا تھا۔

"گدھے! چل کشتی کی طرف" نواب نے اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے چیخ کر کہا۔ نوجوان نے سمجھا کہ نواب اسے مارنے لگا ہے اس لئے وہ رونے لگا بالکل بچوں کی طرح لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے وہ کہہ رہا تھا "ہائے میری ماں! ہائے میری ماں۔"

اس کی آواز میں وہ بزدلی موجود تھی جو کشمیریوں سے مخصوص ہو چکی ہے اور جس کی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں ایک فاتح کے بعد دوسرا فاتح آیا اور اتنے ستم ڈھائے کہ ان میں سے بہادری کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔

لیکن نواب کی عقل موٹی تھی۔ وہ لڑکے کی روح کی آواز نہ سن سکتا تھا۔ اس نے آنسوؤں سے خالی موٹی موٹی آنکھیں دیکھیں اور بے اختیار قہقہے لگانے لگا۔

"چھوڑئے بھی نواب صاحب" ہم نے کہا "ہم ملاح کی مدد کریں گے اور کشتی کو خود ہی بھگا لیجائیں گے۔"

"ٹھہرو! ٹھہرو!" نواب نے کہا اور نوجوان کو بائیں کان سے پکڑ کر ہنستا قہقہے لگاتا اور گھسیٹتا ہوا کشتی کی طرف لے گیا۔

وہ بیگاری جو صرف دھمکی ہی سے رونے لگ گیا تھا اب دھاڑیں مارنے لگا اور نواب کی انگلیوں کو اپنے کانوں پر محسوس کرتے ہی آسمان سر پر اٹھا لیا اور نواب جو پہلے صرف ہنس رہا تھا اب گھوڑے کی طرح ہنہنانے لگا۔ اس کے رخسار سرخ ہو چکے تھے۔

نوجوان نے اپنے کان نواب کی گرفت سے چھڑا لئے اور جب وہ کشتی سے پانچ گز کے فاصلے پر پہنچا تو اس کے پاؤں پر گر پڑا اور اسے خدا کے واسطے دے دے کر کہنے لگا کہ میرا قصور معاف کرو۔ لیکن نواب پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز سے چیخنے لگا۔

"دیکھو۔۔۔۔؟" اس نے کہا۔ وہ بے تحاشہ اپنے ہاتھ ہلا رہا تھا اس کے قہقہے ابھی بند نہ ہوئے تھے۔ دراصل موقع بہت نازک تھا۔ نوجوان کشمیری خاک پر لوٹ رہا تھا، تڑپ رہا تھا، سسکیاں لے رہا تھا اور انتہائی ذلت و پستی کا اظہار کر رہا تھا۔

"مت رو، مت سسکیاں لو بے وقوف" نواب نے کہا اور اپنی آنکھوں کو بھینچا۔ جن میں ہنسی کے آنسو لرزاں لے رہے تھے اور ملاح سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "اس مسخرے کو یہاں سے اٹھاؤ اور کشتی میں پھینک دو۔"

ملاح نے نواب کے حکم کی تعمیل کی اور نواب صاحب خود بھی بیگاری کے ساتھ ہی کشتی پر سوار ہو گئے۔

اب بیگاری نے تقریباً فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کام کرے گا۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر تھوکا اور چپو پکڑ لیا۔

نواب، جس کا سایہ لڑکے پر پڑ رہا تھا پہلے سے بھی زیادہ خوش نظر آتا تھا وہ پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ جھوم رہا تھا اور لڑکھڑا رہا تھا اس کے دونوں دوستوں نے اسے تھام لیا اور شامیانے کے نیچے آرام سے لٹانے کے لئے لے گئے اس نے اپنی توند کی ٹھوکر سے انہیں پرے ہٹانا چاہا اور نیم وحشیوں کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کی گھٹی ہوئی آواز میں اب بھی قہقہوں کی گونج سنائی دیتی تھی۔

کشتی نے جنبش کی اور جونہی چپو کی نوک نے پانی کی سطح کو پھاڑ کر علیحدہ کیا بیگاری کی چیخ و پکار بھی بند ہو گئی۔

"دیکھو!" نواب نے بیل کی طرح ڈکارتے ہوئے کہا، اس کی آواز میں کھانسی کا دھماکا بھی تھا جیسے بجلی میں کڑک چھپی ہوئی ہو "دیکھو" اس نے کہا اور بیگاری کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن اس کی پتلیاں اچانک پھرنے لگیں۔ اس کا چہرہ خوفناک حد تک سرخ ہو گیا اس کا منہ کھل گیا۔ اس کا گلا اس طرح بل کھانے لگا، گویا اس میں سے چیخ نکلنے والی ہے اور اس کا ہاتھ بے جان ہو کر اس کے پہلو میں آ گرا۔

ہم سب اس کی طرف دوڑے۔

اس کے ایک دوست نے نواب کا ہاتھ اس کے دل پر رکھ دیا اور دوسرے کی پیٹھ کو تھپتھپا رہا تھا۔ قہقہوں نے اس کا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔

کشتی دولر کی پر سکون سطح پر لڑھکتی جاری تھی اور ہم سب بالکل چپ چاپ بیٹھے تھے تا آنکہ بیگاری دوبارہ رونے اور سسکیاں بھرنے لگا۔
"ہائے میری ماں" ہائے میری ماں!"

○

ملک راج آنند

فطرت کا دل

دن بھر مطلع صاف رہا تھا، لیکن شام ڈھلتے ہی بادل گھر آئے تھے، اور بارش کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی، اور بادل گرج رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی ہیبت ناک دیو چنگھاڑ رہا ہو اور اس کے نوکیلے دانتوں کی چمک سے بجلی کوند رہی ہو۔ دفعتاً بادلوں کی وحشت ناک گڑگڑاہٹ وادی میں گونج اٹھی، اور کسانوں کی کی لڑکیاں مرغی کے چوزوں کی مانند سہم کر اپنی اپنی پھوس کی جھونپڑیوں میں دبک گئیں!

کرنل انتونیوڈی سلوا جو شمالی علاقے کے قیدیوں کے کیمپ کا نگراں تھا، اسی وقت شکار سے واپس آیا تھا، اور سارجنٹ کوسمو نے اس کے سامنے تھری اسٹار مارکہ پرتگالی شراب کی بوتل رکھ دی تھی، تاکہ کرنل اپنی تھکاوٹ اور پیاس دور کر سکے!

بنگلے کے برآمدے کے باہر کھردرے پتھروں کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے۔ قیدیوں نے ان پتھروں کو بارود کے ذریعے قریبی چٹان سے نکالا تھا تاکہ پریڈ کا میدان ہموار کیا جا سکے۔ دائیں جانب ایک قلعہ تھا جس کی دیواریں کافی بلند تھیں۔

شکار کے لئے دوڑ دھوپ کرنے کے بعد انتونیو خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ معاً اسے اپنے وطن کی یاد آگئی۔ جو لزبن کے قریب تھا، اور جہاں زیتون کے درختوں کے لاتعداد جھنڈ تھے۔ جب اس نے کوکا کولا ملی ہوئی شراب کا گھونٹ چڑھایا، تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا ہے۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کی اس اضطرابی کیفیت کا سبب کیا تھا۔ شاید یہ وجہ ہو کہ اسے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد بھی شکار ہاتھ نہ آیا تھا! اسے اپنے منہ کا تھوک بھی ترش محسوس ہونے لگا۔

"کوسمو! ان قبائلیوں سے کہو کہ رقص کریں۔"

اس نے حکم دیا۔

اس ویران مقام پر جہاں مغربی تہذیب کی آخری نشانی صرف وہ قلعہ تھا۔ اگر سیاحوں کی تفریح کا کوئی ذریعہ تھا تو وہ عورتوں کے مدھم سروں میں گائے ہوئے گیت یا نقاروں کی آوازیں جو آہستہ آہستہ شروع ہو کر کافی بلند ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن گاؤں ایک میل کے فاصلے پر تھا اور گاؤں والے اپنے رقص و سرور کی محفلیں رات گئے جمایا کرتے تھے۔ حکم سن کر تمام قیدی خاموش رہے، کوسمو یوں بے حس و حرکت کھڑا رہا جیسے اس نے کرنل کا حکم سنا ہی نہ ہو۔

آسمان پر گہرے بادل منڈلاتے رہے!

کرنل واقعی گرگ باراں دیدہ تھا۔ اس نے اس خطے کا ہر موسم برداشت کیا تھا۔ اس لئے کہ وہ حکومت پرتگال کی فوج میں کافی عرصے سے ملازم تھا۔ وہ انگلستان کی بارش کی جھڑی سے بھی مانوس تھا۔ اس لئے کہ اسے چھ ماہ سینڈ ہرسٹ میں ٹریننگ کے سلسلے میں رہنا پڑا تھا۔ وہ موسم کی خرابی تو برداشت کر سکتا تھا لیکن اپنی حکم عدولی کو گوارا نہ کر سکتا تھا، اس لئے وہ چیخا:

"کوسمو!"

کوسمو نے دبے پاؤں برآمدے کے قریب آکر سیلوٹ کیا۔

"کیا تم نے میری آواز نہیں سنی؟"

"جی نہیں جناب" کوسمو نے عمداً جھوٹ بولا۔

"میں نے قبائلیوں کے رقص کا حکم دیا تھا۔"

"قبائلی تو کل ہی رقص کے لئے آئے تھے جناب' اب وہ آج دوبارہ نہیں آئیں گے۔"

"لیکن میں نے انہیں بخشش دی تھی!"

کوسمو سر جھکائے کھڑا رہا۔ بادلوں کے سائے میں اس کا چہرہ کچھ زیادہ کالا نظر آنے لگا تھا۔ دفعتاً" آسمان پر گڑگڑاہٹ ہوئی اور تیز بجلی کوند گئی۔

"پہرے داروں سے کہو کہ ان کے سرغنہ بدمعاش ڈاکٹر آدم کو بلا لائیں' اور ہاں' پہرے داروں سے کہو کہ یہاں آکر شراب سے لطف اندوز ہوں۔"

کوسمو چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔

ماحول میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

"جاتے کیوں نہیں؟"

کوسمو نے نظریں اٹھائیں۔

"جاؤ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔"

کرنل اپنے پیر پٹکتا ہوا بولا۔

اسی وقت بجلی کڑکی اور کوسمو خوف زدہ ہو کر تیزی سے میدان کی طرف بھاگا۔

ہوا میں ہلکی حرارت آچلی تھی۔ بارش کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

لیکن پلک جھپکتے ہی گہرے کالے بادلوں کا جھنڈ آسمان میں آگے سرک گیا' اور انگولا کے زیریں حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ لیکن چند آوارہ بادلوں کے ٹکڑے اب بھی پہاڑی چٹانوں پر منڈلاتے رہے۔

کرنل نے آسمان کی جانب گھور کر دیکھا' اور فوراً ہی نظریں جھکا کر شراب کی بوتل پر جما دیں۔ اس نے گلاس اٹھا کر اپنے سوکھے گال سے لگایا' گویا گلاس کی ملائم سطح سے خنکی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

باہر قدموں کی آہٹ ہوئی اور وہ اپنی کرسی میں اکڑ گیا۔

ایک مختصر مجمع کے آگے آگے ڈاکٹر آدم نظر آیا جیسے وہ دفعتاً" بنگلے کے احاطے کی زمین کے اندر سے نمودار ہو گیا ہو ڈاکٹر آدم نحیف و ناتواں اور اوسط قد کا انسان تھا۔ اس کی آنکھوں کی سپیدی چمک رہی تھی' اور اس کے کوٹ کا رنگ اس کے گہرے سیاہ چہرے کے رنگ سے متضاد نظر آرہا تھا۔

"تم غالباً ڈاکٹر آدم ہو؟"

کرنل نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

ڈاکٹر آدم نے کوئی جواب نہ دیا اور کرنل سے پانچ چھ گز کے فاصلے پر ساکت کھڑا رہا۔

قلعے کے پانچ پہرے دار اور سارجنٹ کوسمو اس کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔

ہوا میدانوں میں چکر لگا رہی تھی۔ دفعتاً" قریبی پہاڑوں پر بجلی کوندی!

کرنل نے محسوس کیا کہ فطرت بھی اس قیدی پر مہربان ہے۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ سلسلہ کلام کیوں کر شروع کرے۔ پھر اس نے

اپنی حس مزاح کا سہارا لیا۔
" مجھے بتلایا گیا ہے کہ تم نے لندن میں فی کس ٹراٹ 'والز اور ٹینگو ڈانس سیکھا ہے ؟ "
ڈاکٹر آدم نے اثبات میں سرہلا دیا۔
" تمہیں انگریز حسینائیں ضرور پسند آئی ہوں گی ' خاص کر اس وقت جب وہ تمہاری آغوش میں رہی ہوں گی ؟ کیوں ؟ میرا خیال ہے کہ صرف خادماؤں نے تمہارے ساتھ رقص کیا ہو گا۔"
قیدی کے چہرے پر درد و کرب کے آثار ابھر آئے اور کرنل کی سوقیانہ گفتگو پر اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔
" اور تم اپنے ہم وطنوں کا قبائلی رقص بھول گئے ؟ "
ڈاکٹر آدم نے نفی میں سرہلا دیا۔
ان قبائلیوں کی تکلیف دہ خاموشی نے کرنل کو ہمیشہ پریشان کیا تھا۔ اس وقت بھی ڈاکٹر کی خاموشی اسے اذیت پہونچا رہی تھی۔ کیوں کہ وہ اس قیدی کے چہرے کے تاثرات سے اس کے اصلی جذبات کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ کیا یہ حبشی اپنے ردعمل کا اظہار کرنا جانتے ہی نہیں؟۔۔ کیا یہ افریقہ کے رہنے والے بھی انسان ہیں؟
" تو پھر کوئی قبائلی رقص پیش کرو۔ ہمیں تفریح چاہئے۔"
قیدی پتھر کے بت کی مانند کھڑا رہا۔
کرنل کے غصے کا پارہ چڑھ گیا اس نے سارجنٹ کو آواز دی۔۔
" کوسمو ! "
سارجنٹ آگے بڑھا۔
" اس بدمعاش کو وہ ٹوپی دے دو۔ وہی بے وقوفوں کی ٹوپی۔ سرخ رنگ والی جو کل میں نے قبائلیوں سے چھین لی تھی۔ اسے پہن کر ناچنے میں یہ بھلا نظر آئے گا؟"
کوسمو نے برآمدے میں ہیٹ اسٹینڈ کے قریب جا کر وہ ٹوپی اٹھائی اور کرنل کے قریب پہونچ کو ٹوپی اس کی جانب بڑھا دی۔
" بے وقوف ! اسے اس کے سر پر پہنچا دو۔ یا خود تم پہن لو۔ مجھے کیوں دے رہے ہو ؟"
کوسمو نے ڈاکٹر آدم کے سر پر وہ ٹوپی رکھ دی۔
ڈاکٹر آدم نے یہ بے عزتی بھی اسی سکوت کے ساتھ برداشت کرلی۔
قیدی کے سر پر وہ بے ڈھنگی ٹوپی دیکھ کر کرنل کے حلق سے ایک مصنوعی قہقہہ برآمد ہوا ' لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خاموش ہو گیا۔ کیوں کہ کسی دوسرے نے قہقہہ لگانے میں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔
دفعتاً" کرنل کے چہرے پر کرختگی آگئی۔
" ذرا اس بے وقوف کو دیکھو " ۔۔ اس نے پہرے داروں کو مخاطب کر کے کہا ' اور زور سے ہنس پڑا ۔۔۔ " تم لوگ اس پر ہنستے کیوں نہیں؟"
احاطے کی خاموشی میں گونجنے والے اس حکم کا ردعمل محض پہرے داروں کے چہرے پر ابھرنے والی شکنیں تھیں ' وہ لوگ کسی قیدی کو گولی کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ لیکن اس پر ہنسنے میں دشواری محسوس کرتے تھے ۔۔۔ کیوں کہ ایسا کرنے میں یہ خطرہ تھا کہ ممکن ہے قیدی بھی ان پر ہنسنے لگے یا ان کے منہ پر تھوک دے ۔۔۔ جیسا کہ متعدد افریقی پہلے کر چکے تھے ۔۔۔'
کرنل نے شراب کا گھونٹ اپنے خشک حلق کے نیچے انڈیل لیا ' اور تیزی سے بولا۔

"ناچو --- ناچو!"

آسمان پر بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ لیکن ڈاکٹر آدم نے اس مہیب گڑگڑاہٹ کو اس رقص کے لئے موزوں ساز تصور نہ کیا جس کا اسے حکم دیا جا رہا تھا!

کرنل اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا' اور قیدی کے قریب پہونچ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا --- اور اسے چکر دیتا ہوا چلانے لگا --

"ہا - ہا - ہا - قبائلی رقص - ہا - ہا - ہا"

قیدی خاموش رہا۔

بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے قیدی کو رہائی کا پیغام دیا - کیوں کہ اب بارش شروع ہونے والی تھی۔

لیکن کرنل اپنی ضد پر قائم رہا اور ہنستا رہا۔

"بے وقوف! اور بے وقوفوں کے سر پر بے وقوفوں کی ٹوپی - ہا - ہا - ہا"

دفعتاً" کرنل نے محسوس کیا کہ حاضرین اس کے کورس میں شریک نہیں! -- اس کا تمسخر شدید جھنجلاہٹ میں تبدیل ہو گیا -- اس نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر آدم کو ایک لات ماری ' اور ڈاکٹر آدم لڑھک کر پہرے داروں کی رائفل پر جا گرا ---

"ناچ ' بے خوف ناچ - نہیں تو جہنم میں جا -"

پہرے داروں کے جسم میں غصے کی لہر دوڑ گئی - انہوں نے جھک کر گرے ہوئے قیدی کو اٹھا لیا۔

کرنل برآمدے میں واپس پہونچ کر اپنی آرام کرسی میں دھنس گیا۔

احاطے میں ہوا کا تیز جھونکا در آیا -

کرنل قیدی کے چہرے پر نظریں گاڑے بیٹھا رہا۔

پہرے داروں کے سروں پر بارش کا پہلا قطرہ گرا۔

"بھاگ جاؤ -- نکل جاؤ!" کرنل چیخ اٹھا۔

بارش کی جھڑی لگ گئی - شاید بے دردی سے قتل کئے جانے والے افریقیوں کے بھوتوں کی بے بسی نے فطرت کا دل بھی پگھلا دیا تھا!!

○

احمد ندیم قاسمی

نام	:	احمد شاہ
قلمی نام	:	پیرزادہ احمد شاہ / احمد ندیم قاسمی
پیدائش	:	۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء بہ مقام انگہ، تحصیل خوشاب، ضلع شاہ پور (حال: تحصیل و ضلع خوشاب) مغربی پنجاب، پاکستان۔
تعلیم	:	بی۔ اے، صادق ایجرٹن کالج، بہاولپور (پنجاب یونی ورسٹی، لاہور) ۱۹۳۵ء۔

ابتدائی چار جماعتیں پرائمری اسکول انگہ سے پاس کیں۔ ۱۹۲۵ء میں کیمبل پور کے گورنمنٹ مڈل اینڈ نارمل سکول میں داخل لیا، جہاں سے آٹھویں کلاس پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج کیمبل پور منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں نویں اور دسویں کی جماعتیں کالج سے وابستہ تھیں۔ ابھی میٹرک کا امتحان نہیں دیا تھا کہ شیخوپورہ منتقل ہونا پڑا۔ گورنمنٹ ہائی سکول، شیخوپورہ سے ۱۹۳۱ء میں میٹرک کیا اور اگلے چار برس صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۳۵ء میں صادق ایجرٹن کالج، بہاولپور (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کے اجداد مجاہدین عرب کے ساتھ ایران سے ہوتے ہوئے ہندوستان آئے اور خوشاب سون سکیسر کے ویران پہاڑی علاقے میں اسلام آباد نامی گاؤں بسایا، جسے نادر شاہ کی یلغار نے برباد کر دیا بعد میں اس آبادی کی بنیادیں انگہ، تحصیل خوشاب سے اٹھیں۔ یہ خاندان تبحر علمی اور پرہیز گاری میں مشہور ہوا۔ احمد ندیم قاسمی کے والد کا نام پیر غلام نبی تھا جو اپنے علاقے میں "نبی چن" کے نام سے معروف تھے۔ وہ ساری زندگی جذب کی حالت میں رہے، نتیجہ "ندیم کا بچپن انتہا درجہ کے افلاس میں گذرا۔ ۱۹۲۳ء میں والد کے انتقال کے بعد ان کے بے اولاد حقیقی چچا پیر حیدر شاہ ریونیو اسسٹنٹ کیمبل پور (حال: اٹک) نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ چچا کا تبادلہ کیمبل پور سے شیخوپورہ ہوا تو ندیم ان کے ہمراہ تھے۔

۱۹۳۱ء میں ندیم شیخوپورہ سے میٹرک کرنے کے بعد بہاول پور چلے گئے۔ ان کے چچا ریٹائرمنٹ کے بعد، نواب آف بہاول پور کے مشیر مال مقرر ہوئے تھے۔ ندیم دوران تعلیم صادق ایجرٹن کالج بہاولپور کے مجلّہ "نخلستان" کے اردو اور انگریزی حصوں کے مدیر رہے۔ ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد ریفارمز کمشنر لاہور کے دفتر میں محرر کی حیثیت میں عملی زندگی کا آغاز کیا، جہاں سے مستعفی ہو کر اوکاڑہ میں نو دن ٹیلی فون آپریٹر رہے۔ وہاں سے استعفیٰ دے کر ایک عزیز کی وساطت سے جولائی ۱۹۳۹ء میں محکمہ آبکاری ملتان میں سب انسپکٹر بھرتی ہوئے جہاں سے ۱۹۴۰ء میں چھٹی لے کر منٹو کے پاس دہلی گئے۔ منٹو اس زمانے میں منور نجن پکچرز کی فلم "بنجارہ" لکھ رہے تھے۔ ندیم نے اس فلم کے گیت لکھے لیکن وہ فلم بن نہ سکی۔ محکمہ آبکاری سے ۲۰ ستمبر ۱۹۴۲ء میں مستعفی ہو کر ۲۵ ستمبر ۱۹۴۲ء کو امتیاز علی تاج کے ادارے دارالاشاعت پنجاب، لاہور میں "تہذیب نسواں" اور "پھول" کی ادارت سنبھالی۔ اس زمانے میں دارالاشاعت پنجاب سے انہیں ستر روپے ماہوار ملا کرتے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں "ادب لطیف" لاہور کے مدیر ہوئے۔ سالنامہ ۱۹۴۴ء میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ "بو" اور مضمون "جدید ادب" شائع کرنے پر حکومت پنجاب نے ان کے خلاف فحش لٹریچر کی اشاعت کے سلسلے میں مقدمہ کھڑا کر دیا جو ایک برس تک چلا۔ اس دوران میں ندیم شدید علیل رہے۔ مئی ۱۹۴۵ء

میں مقدمہ سے بری ہو کر عدالت کے پیش نظر فروری ۱۹۴۶ء میں "ادب لطیف" لاہور کی ادارت سے دست بردار ہوئے اور گاؤں چلے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد پشاور ریڈیو میں بطور سکرپٹ رائیٹر ڈیڑھ برس تک ملازمت کی ۱۹۴۸ء میں شادی کے بعد مستقل ہو کر لاہور آ گئے۔ ۱۹۴۷ء میں "سویرا" لاہور مرتب کرنا شروع کیا تھا' اب ۱۹۴۸ء میں لاہور آ کر منہ بولی بہن ہاجرہ مسرور کے ساتھ مل کر "نقوش" لاہور کی ادارت سنبھالی اور "نقوش" کے پہلے دس شمارے مرتب کئے۔ نومبر ۱۹۴۹ء میں انھیں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ "نقوش" اور "ادب لطیف" کے مالکان نے اپنے پرچوں کو انجمن کا آرگن بنانے سے معذوری کا اظہار کیا تو ندیم نے فیض' ہاجرہ مسرور' ممتاز حسین اور حمید اختر کے ساتھ مل کر الطاف پرواز کے پرچے "سحر" کو انجمن کا نظریاتی پرچہ بنانا چاہا مگر اس کا صرف ایک شمارہ ہی آ سکا۔ مئی ۱۹۵۱ء تا نومبر ۱۹۵۱ء سیفٹی ایکٹ کے تحت ندیم نے تقریباً سات ماہ جیل میں گذارے۔ ۵ مارچ ۱۹۵۳ء میں روز نامہ "امروز لاہور کے مدیر ہوئے اور ۱۹۵۴ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے انتشار کے سبب سکرٹری جنرل شپ سے دستبردار ہوئے اکتوبر ۱۹۵۸ء تا فروری ۱۹۵۹ء تک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظربند رہے۔ ۱۹۵۹ء کے اواخر میں ایوب خان کے پریس ٹرسٹ قائم کر دینے کے سبب "امروز" سے استعفیٰ دے دیا اور فری لانس ادیب کے طور پر "احسان" لاہور' "ہلال پاکستان" "حریت" کراچی اور "جنگ" کراچی کے لیے فکاہی کالم نگاری کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۳ء میں اپنا ادبی مجلہ "فنون" جاری کیا۔ ۱۹۷۴ء سے مجلس ترقی ادب' لاہور کے ڈائریکٹر ہیں اور مجلس کا مجلہ "صحیفہ" بھی ترتیب دیتے ہیں۔

اولین تخلیق:

ایک رشتہ دار غلام جیلانی کی والدہ اور ہمشیرہ کی وفات کا مرثیہ (اپریل ۱۹۳۰ء) (۱)

اولین مطبوعہ تحریر:

نظم: مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ (۲) "مطبوعہ: "سیاست" لاہور: جنوری ۱۹۳۱ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"بدنصیب بت تراش" مطبوعہ: "رومان" لاہور' فروری ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "چوپال" (چودہ افسانے) دارالاشاعت' پنجاب' لاہور' طبع اول: ۱۹۳۹ء

۱۔ بے گناہ ۲۔ دیہاتی ڈاکٹر ۳۔ بوڑھا سپاہی ۴۔ ننھا مانجھی ۵۔ ہرجائی ۶۔ مسافر ۷۔ غیرت مند بیٹا ۸۔ حق بجانب ۹۔ آرام ۱۰۔ وہ جا چکی تھی ۱۱۔ انتقام ۱۲۔ غرور نفس ۱۳۔ یہ دیا کون جلائے ۱۴۔ بے چارہ۔

۲۔ "بگولے" (بیس افسانے) مکتبہ اردو' لاہور' طبع اول: ۱۹۴۱ء

۱۔ طلائی مہر ۲۔ توبہ میری ۳۔ بھوت ۴۔ ننھے نے سلیٹ خریدی ۵۔ بچپنہ ۶۔ ماں ۷۔ کریا کرم ۸۔ بچے

۹۔ میرا رانجھا ۱۰۔ چوری ۱۱۔ کھیل ۱۲۔ پاؤں کا کانٹا ۱۳۔ ان بن ۱۴۔ قلی ۱۵۔ السلام علیکم
۱۶۔ خوش رہو ۱۷۔ سپنوں کا محل ۱۸۔ مانوں کی میاؤں ۱۹۔ سرخ ٹوپی ۲۰۔ پرچھائیاں۔

۳۔ "طلوع و غروب" (آٹھ افسانے ایک ڈراما) مکتبہ اردو' لاہور' طبع اول: ۱۹۴۲ء
۱۔ طلوع و غروب ۲۔ کنکھے ۳۔ گونج ۴۔ جلسہ ۵۔ میرا دیس ۶۔ جوانی کا جنازہ ۷۔ پکا مکان ۸۔ چھاگل

۴۔ "گرداب" (پندرہ افسانے) ادارہ اشاعت اردو دکن' حیدر آباد دکن: طبع اول: ۱۹۴۳ء
۱۔ مسجد کے مینار ۲۔ کھوٹے سکے ۳۔ نرل دل ۴۔ استعفیٰ ۵۔ ادھورا گیت ۶۔ بٹوے کی باچھیں
۷۔ روشندانوں کے شیشے ۸۔ بکلی ۹۔ غریب کا تحفہ ۱۰۔ الجونی ۱۱۔ ایک رات چوپال پر
۱۲۔ رنگ و سنگ ۱۳۔ فساد ۱۴۔ انسان اور حیوان ۱۵۔ ہسپتال سے نکل کر۔

۵۔ "سیلاب" (بارہ افسانے) ادارہ اشاعت اردو دکن' حیدر آباد دکن' طبع اول: دسمبر ۱۹۴۳ء
ابتداء میں دیباچہ بہ عنوان باتیں: ۱۔ نیم وا دریچے ۲۔ بڈھا کھوسٹ ۳۔ شادی ۴۔ جوانی کی سڑاند ۵۔ پلکوں کے سائے
۶۔ الجھن ۷۔ کانی آنکھ ۸۔ من کی ڈالی ۹۔ آزاد منش غلام ۱۰۔ معطر لفافہ ۱۱۔ سونے کی دھار
۱۲۔ نئی سارنگی (کل صفحات ۲۹۹) اس کتاب میں ایک ڈرامائی مکالمہ بہ عنوان: "من کی کرچیاں" اور ایک ڈراما "مستقبل کے سوداگر" بھی شامل کتاب ہے۔

۶۔ "سیلاب و گرداب" (انتخاب کل گیارہ افسانے) مکتبہ کارواں' لاہور' طبع اول: ۱۹۶۱ء
یہ کتاب مجموعہ "سیلاب" اور "گرداب" کے مندرجہ ذیل گیارہ منتخب افسانوں پر مشتمل ہے:
۱۔ الجھن ۲۔ بڈھا ("سیلاب" میں اس افسانے کا عنوان "بڈھا کھوسٹ" ہے) ۳۔ کانی آنکھ ۴۔ من کی ڈالی ۵۔ نیم وا دریچے
۶۔ ایک رات چوپال پر ۷۔ ادھورا گیت ۸۔ حیوان اور انسان۔ ("گرداب" میں اس افسانے کا عنوان "انسان اور حیوان" ہے)
۹۔ سونے کا ہار ۱۰۔ غریب کا تحفہ ۱۱۔ استعفا

۷۔ "آنچل" (گیارہ افسانے) ادارہ فروغ اردو' لاہور بہ اشتراک نیشنل لٹریچر کمپنی' لاہور' طبع اول: ۱۹۴۴ء
۱۔ محدب شیشے میں سے ۲۔ جان ایمان کی خیر ۳۔ نشیب و فراز ۴۔ خربوزے ۵۔ نامرد ۶۔ سائے ۷۔ حد فاصل ۸۔ انصاف
۹۔ مہنگائی الاؤنس ۱۰۔ سانولا ۱۱۔ شعلہ نم خوردہ (ندیم کے دیباچہ پر ۱۰ مئی ۱۹۴۴ء کی تاریخ درج ہے۔)

۸۔ "آبلے" (تین افسانے) ادارہ فروغ اردو' لاہور' طبع اول: جولائی ۱۹۴۶ء
افسانوی مجموعہ: آنچل کے کور پیج پر اس مجموعے کا اشتہار "رم جھم" کے نام سے دیا گیا ہے لیکن بعد میں ندیم نے اس نام کو اپنے شعری مجموعے کے لئے پسند کر لیا اور "آبلے" کے نام سے ان تین افسانوں کا مجموعہ منظر عام پر آیا۔
۱۔ کفارہ ۲۔ ہیرو شیما سے پہلے' ہیرو شیما کے بعد ۳۔ عبدالمتین ایم۔ اے
۱۹۴۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں "آنچل" کا ایک افسانہ "محدب شیشے میں سے" بھی شامل کر لیا گیا۔
پہلے ایڈیشن کے کل صفحات ۲۴۸ ہیں۔

۹۔ "آس پاس" (آٹھ افسانے) مکتبہ فسانہ خواں' لاہور' طبع اول: ۱۹۴۸ء
۱۔ اکیلی ۲۔ بھری دنیا میں ۳۔ افق ۴۔ کرن ۵۔ موت ۶۔ تکمیل ۷۔ ارتقاء ۸۔ چڑیل

۱۰۔ "در و دیوار" (آٹھ افسانے) مکتبہ اردو' لاہور' طبع اول: ۱۹۴۸ء
۱۔ میں انسان ہوں ۲۔ نیا فرہاد ۳۔ تسکین ۴۔ جب بادل امڈے ۵۔ سپاہی بیٹا ۶۔ ووٹ ۷۔ کہانی لکھی جا رہی ہے ۸۔ راجے مہاراجے

۱۱۔ "سناٹا" (دس افسانے) نیا ادارہ لاہور' طبع اول: ۱۹۵۲ء

۱۔ بڑی سرکار کے نام ۲۔ رئیس خانہ ۳۔ آتش گل ۴۔ ماسٹا ۵۔ الحمدللہ ۶۔ کنجری ۷۔ گنڈاسا ۸۔ چور ۹۔ نمونہ ۱۰۔ سناٹا

۱۲۔ "بازار حیات" (تیرہ افسانے) ادارہ فروغ اردو لاہور' طبع اول: ۱۹۵۹ء

۱۔ پرمیشر سنگھ ۲۔ گل رخے ۳۔ خون جگر ۴۔ وارورسن ۵۔ زلیخا ۶۔ بدنام ۷۔ ست بھرائی ۸۔ موچی ۹۔ کفن دفن ۱۰۔ بابا نور ۱۱۔ آئینہ ۱۲۔ ہیرا ۱۳۔ مجبر

۱۳۔ "برگ حنا" (دس افسانے) ناشرین' لاہور' طبع اول: ۱۹۵۹ء

۱۔ بیٹے بیٹیاں ۲۔ ماتم ۳۔ کھمبا ۴۔ دوربین ۵۔ شکنیں ۶۔ نصیب ۷۔ سمم بیگ ۸۔ وحشی ۹۔ جن وانس ۱۰۔ امانت

۱۴۔ "گھر گھر تک" (سترہ افسانے) راول کتاب گھر' راولپنڈی' طبع اول: ستمبر ۱۹۶۳ء

۱۔ تمبر ۲۔ فیشن ۳۔ سفارش ۴۔ مائیں ۵۔ پہاڑوں کی طرف ۶۔ گڑیا ۷۔ تھل ۸۔ پاگل ۹۔ ماسی گل بانو ۱۰۔ بے نام چہرے (یہ "فنون" میں گلدستہ خار کے نام سے شائع ہوا تھا) ۱۱۔ کپاس کا پھول ۱۲۔ سفید گھوڑا ۱۳۔ سکوت و صدا ۱۴۔ آسیب ۱۵۔ لارنس آف تھلیبیا ۱۶۔ قرض ۱۷۔ مشورہ

۱۶۔ "نیلا پتھر" (نو افسانے) غالب پبلشرز' لاہور' طبع اول: ۱۹۸۰ء

۱۔ احسان ۲۔ عورت صاحبہ ۳۔ جوتا ۴۔ اندمال ۵۔ عالاں ۶۔ نیلا پتھر ۷۔ بارٹر ۸۔ ایک عورت تین کہانیاں ۹۔ ایک احمقانہ محبت کہانی

اس کتاب میں شامل افسانہ "بارٹر" اس سے قبل "فنون" میں "بارٹر سسٹم" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

۱۷۔ "انگڑائیاں" (انتھالوجی: مرد افسانہ نگاروں کا انتخاب) ادارہ اشاعت اردو' حیدر آباد' دکن' طبع اول: ۱۹۴۴ء

۱۸۔ "نقوش لطیف" (انتھالوجی: خواتین کے افسانوں کا انتخاب) ادارہ فروغ اردو' لاہور' طبع اول: اپریل ۱۹۴۷ء

افسانہ نگار خواتین کی خود نوشت سوانح کے علاوہ اس انتھالوجی میں ندیم کے مرتب کردہ سوالنامے کا جواب بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا ہے۔

۱۹۔ "احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانے" (مرتبہ: مظفر علی سید) مکتبہ میری لائبریری' لاہور' طبع اول: س۔ن

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی اسی ادارے نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا ہے۔

۲۰۔ "رم جھم" (قطعات و رباعیات) ادارہ فروغ اردو' لاہور' طبع اول: ۱۹۴۴ء

۲۱۔ "جلال و جمال" (شاعری) نیا ادارہ' لاہور' طبع اول: ۱۹۴۶ء

۲۲۔ "شعلہ گل" (شاعری) قومی دارالاشاعت' لاہور' طبع اول: ۱۹۵۳ء

۲۳۔ "دشت وفا" (شاعری) کتاب نما' لاہور' طبع اول: ۱۹۶۳ء

۲۴۔ "محیط" (شاعری) التحریر' لاہور' طبع اول: ۱۹۷۶ء

۲۵۔ "دوام" (شاعری) مطبوعات' لاہور' طبع اول: ۱۹۷۹ء

۲۶۔ "تہذیب و فن" (تنقید) پاکستان فاؤنڈیشن' طبع اول: ۱۹۷۵ء

۲۷۔ "ادب اور تعلیم کے رشتے" (تنقید) التحریر' لاہور'

۲۸۔ "پاکستان کی لوک کہانیاں" (از میریلن سرچ کا ترجمہ) شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور' بہ اشتراک: موسسہ فرینکلن لاہور۔

ندیم نے ترجمہ کرتے وقت نظموں کا ترجمہ منظوم کیا ہے۔ اس کتاب کے مصور ایڈیشن کے کل صفحات ۲۳۲ ہیں۔

۲۹۔ "کیسر کیاری" (مضامین۔ ڈرامے۔ تراجم) ناشر: لطیف فاروقی: مکتبہ شعر و ادب لاہور: امرت الیکٹرک پریس ریلوے روڈ لاہور، طبع اول: س۔ ن (۱۹۴۴ء)

کتاب کے دیباچہ از ندیم بہ عنوان: "حنائے گفتنی" پر ۵ نومبر ۱۹۴۳ء کی تاریخ درج ہے۔
کتاب میں شامل مضامین: ۱۔ ہم ایک موٹر خریدیں گے ۲۔ ایکٹرس کے آنسو ۳۔ بھلوال کا چتر ۴۔ مسکراہٹ
۵۔ لمبے قد پر جواب مضمون ۶۔ میرے پڑوسی ۷۔ کتابیں پڑھنا ۸۔ ملتان کے تانگے ۹۔ سعید اللہ خان نیازی
۱۰۔ پٹھان اور گاڑی کا سفر ۱۱۔ تکیہ کلام ۱۲۔ ہمارے نقاد
ڈرامے: ۱۔ مفلس ادیب ۲۔ بگلا بھگت ۳۔ قاضی جی کا فیصلہ
تراجم: ۱۔ انٹرویو (مارک ٹوین) ۲۔ رومن راہبر (مارک ٹوین) ۳۔ لیل و نہار (آرٹیمس وارڈ)
۴۔ ایڈیٹر کا مہمان (ول کارلٹین)
اس کتاب کے کل صفحات ۲۰۸ ہیں۔

۳۰۔ "منٹو کے خطوط بنام احمد ندیم قاسمی" (ترتیب و تہذیب) کتاب نما، لاہور، طبع اول: ۱۹۹۳ء
۳۱۔ "دھڑکنیں" (قطعات) اردو اکیڈمی، لاہور: طبع اول: ۱۹۴۲ء
۳۲۔ "تین ناٹک" (بچوں کے لیے تین ڈرامے) پنجاب بک ایجنسی، لاہور: طبع اول: ۱۹۴۴ء

یہ کتاب اسی ادارے نے تیسری بار ۱۹۵۰ء میں شائع کی۔ کتاب میں تین ڈرامے بہ عنوان: ۱۔ باغ کے گوشے میں
۲۔ آسمان کے گوشے میں ۳۔ کتابی کیڑا" شامل ہیں۔

۳۳۔ "لوح خاک" (شاعری) اساطیر، لاہور، طبع اول: ۱۹۸۸ء
۳۴۔ "دوستوں کی کہانیاں" (بچوں کے لیے) پنجاب بک ایجنسی، لاہور، طبع اول: (لگ بھگ ۱۹۴۴ء)
۳۵۔ "نئی نویلی کہانیاں" (بچوں کے لیے) پنجاب بک ایجنسی کشمیری بازار، لاہور، طبع اول: (لگ بھگ ۱۹۴۴ء)
۳۶۔ "نذر حمید احمد خان" (ترتیب و تہذیب) مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع اول: ۱۹۷۷ء

نوٹ: ندیم کی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع پر اساطیر، لاہور نے ندیم کے جملہ تخلیقی کام کے نئے ایڈیشن شائع کیے ہیں۔

غیر مدون:

محولہ بالا مطبوعہ کتب کے علاوہ لاتعداد فکاہیہ کالم، تنقیدی مضامین، دیباچے، فلیپ غیر مرتب حالت میں ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل ندیم نے ایک ناول کے تین ابواب لکھے تھے۔ جو "ادب لطیف" لاہور میں "پت جھڑ" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ یہ عنوان سعادت حسن منٹو نے تجویز کیا تھا۔ (۲) مئی ۱۹۵۱ء تا نومبر ۱۹۵۱ء میں لاہور جیل میں اسیری کے دوران ندیم نے جان وولف گانگ گوئٹے کے ناول "Die Leiden Des Yungen Werther" کا اردو ترجمہ کیا تھا اور اس کا مفصل دیباچہ بھی لکھ لیا تھا لیکن یہ ترجمہ شائع نہ ہو سکا۔ یاد رہے کہ اس کتاب کا پہلا اردو ترجمہ ڈاکٹر ریاض الحسن نے "نوجوان ورتھر کی داستان غم" کے عنوان سے کیا تھا جو لٹریری سنڈیکیٹ الہ آباد: نسیمی پریس سے ۱۹۸ صفحات کی ضخامت میں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ترجمہ ندیم نے کیا تھا جو شائع نہ ہو سکا۔ تیسرا ترجمہ ڈاکٹر محمد افضل نے ۱۹۷۶ء میں کیا جسے مکتبہ شاہکار، لاہور نے شائع کیا۔

مستقل پتا:

۲۱۔ غالب کالونی، سمن آباد، لاہور، پاکستان۔

اعزاز:

۱۔ آدم جی ادبی ایوارڈ، برائے "دشت وفا" ۱۹۶۳ء
۲۔ آدم جی ادبی ایوارڈ، برائے "محیط" ۱۹۷۶ء
۳۔ آدم جی ادبی ایوارڈ، برائے "دوام" ۱۹۷۹ء
۴۔ "پرائیڈ آف پرفارمنس" حکومت پاکستان کا اعلیٰ سول اعزاز: ۱۹۶۸ء
۵۔ "ستارہ امتیاز" حکومت پاکستان کا اعلیٰ ترین سول اعزاز: ۱۹۸۰ء

نظریہ فن:

"افسانے میں افسانے کا عنصر بہر قیمت برقرار رہنا چاہئے۔ افسانے کی یہ افسانویت ایک منضبط پلاٹ کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے، کردار نگاری کی صورت میں بھی، ماحول نگاری کی صورت میں بھی اور باطن نگاری کی صورت میں بھی۔۔۔ لیکن اگر افسانے میں سے افسانہ غائب ہو گیا تو اس صنف کو افسانے کی بجائے کوئی اور نام دینا پڑے گا۔"

احمد ندیم قاسمی
(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ: مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۸۳ء)

○

(۱) بہ حوالہ: "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ: بشیر ہندی: اردو محل لاہور، طبع اول: س۔ن (لگ بھگ ۱۹۳۲ء)
(۲) بہ حوالہ "مکالمہ: اردو افسانے کی شناخت" مطبوعہ: "ماہ نو" "لاہور" فروری ۱۹۸۷ء ص نمبر ۳
(۳) بہ حوالہ: "مکالمہ: اردو افسانے کی شناخت" مطبوعہ: "ماہ نو" "لاہور" فروری ۱۹۸۷ء ص نمبر ۷

احمد ندیم قاسمی

الحمدللہ

شادی سے پہلے مولوی ابل کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ کھدر یا لٹھے کی تہبند کی جگہ گلابی رنگ کی سبز دھاریوں والی ریشمی خوشابی لنگی' دو گھوڑا بوسکی کی قمیض جس کی آستینوں کی چنٹوں کا شمار سینکڑوں تک پہنچتا تھا۔ اودے رنگ کی مخمل کی واسکٹ جس کی ایک جیب میں قطب نما ہوتا تو دوسری جیب میں نسوار کی نقرئی ڈبیہ ہوتی تھی۔ سر پر بادامی رنگ کی مشہور لنگی جس میں سے کلاہ کی طلا چوٹی چمکتی رہتی تھی۔ ہاتھ میں عصا جس پر جگہ جگہ گلٹ کے بند اور پیتل کے کوکے جڑے تھے۔ بالوں میں کوئی بڑا کافر تیل جس کی خوشبو گلیوں میں لٹکتی رہ جاتی تھی۔ قدرے اوپر اٹھی ہوئی پتلیوں والی آنکھوں کے پپوٹوں میں سرمہ تو جیسے رچ گیا تھا۔ انگلیوں میں حاجیوں کے لائے ہوئے بڑے بڑے نگینوں والی چاندی کی انگشتریاں جو وضو سے پہلے دن میں چار پانچ بار اترتی تھیں مگر ان کی ترتیب میں کبھی کوئی فرق نہ دیکھا گیا اور پھر مولوی ابل کی آواز! شکر ہے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی یہ نعمت کلام پاک کی تلاوت میں استعمال ہوئی ورنہ اگر مولوی ابل ماہیے کی کلی الاپ دیتا تو گاؤں بھر کی لڑکیوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ہر عید پر خطبے کے بعد اس کے سامنے گھر گھر سے جمع کئے ہوئے ڈیڑھ سو روپوں کی پوٹلی چھن سے آگرتی تو وہیں نمازیوں کے سامنے چالیس پچاس روپے گاؤں کے مسکینوں محتاجوں میں بانٹ دیتا اور ان سے کہتا مجھے دعائیں نہ دو۔ اس اللہ جل شانہ کو یاد کرو جو پتھر میں کیڑا پیدا کرتا ہے تو وہیں اسے خوراک بھی پہنچاتا ہے۔ مجھے دعائیں نہ دو۔ مجھے اس نے کیا نہیں دیا۔ صحت' اطمینان' بے فکری' مجھے تو اس کی رحمتوں کے خزانے سے اور کچھ نہیں چاہئے۔

لیکن شادی کے بعد اللہ جل شانہ کی رحمتوں نے ایک اور صورت اختیار کرلی۔ مولوی ابل کے ہاں اولاد کا کچھ ایسا تانتا بندھ گیا کہ جب ایک سال اس کی بیوی کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو وہ سیدھا حکیم کے ہاں دوڑا گیا۔ اسے یقین تھا کہ بچہ نہیں ہوا تو زیب النساء کے نظام تخلیق میں کوئی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے۔ زیب النساء کے ہاں بچہ پیدا نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے پوری رات گزر جانے پر بھی سورج طلوع نہ ہو اور جب اگلے سال سورج طلوع ہوا تو مولوی ابل کی جان میں جان آئی یقیناً" اولاد کی افراط خدائے ذوالجلال کی رحمتوں میں سے ایک رحمت تھی۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ ریشمی خوشابی لنگی صافی بن کر رہ گئی تھی۔ بوسکی کی قمیض برسوں پہلے پوتڑوں کا روپ اختیار کرتی غائب ہو چکی تھی اور اب اس کی جگہ گاڑھے کی چولی نے لے لی تھی جو کئی بار دھلنے کے باوجود یوں میلا میلا سا لگتا تھا۔ جیسے بنتے وقت جلاہے نے سوت کے تانے بانے میں تھوڑی سی غلاظت بھی بن ڈالی ہو۔ طلا کلاہ کی داڑھی موچھیں نکل آئی تھیں۔ انگشتریوں کی چاندی اور عصا کا گلٹ لڑکیوں کے بندوں جھمکوں کی نذر ہو چکا تھا۔ سرخ سرخ پپوٹوں والی آنکھوں میں پتلیاں کچھ اس طرح بہت اوپر اٹھ گئی تھیں کہ مولوی ابل ہر وقت نزع کے کرب میں گرفتار نظر آتا تھا۔ ناپ تول بہت سے بچوں کے ساتھ زمانے میں بھی ناپ تول تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ مولوی ابل نے اپنی پہلوٹی کی بیٹی مہر النسا کے لئے جو جوتا ایک روپے میں خریدا تھا اب وہی جوتا موچی نے اس کی سب سے چھوٹی بچی عمدۃ النسا کے لئے چھ روپے میں تیار کیا تھا اور جب مولوی ابل نے شکوہ کیا تو موچی بولا "میں نے مولوی جی آپ کی خاطر زیادہ دام نہیں مانگے۔ کوئی اور ہوتا تو چھ چھوڑ دس مار لیتا۔ چمڑے کو آگ لگ گئی ہے۔ قیمتیں یوں ایک دم زن سے اوپر گئی ہیں کہ لگتا ہے دنیا بھر کی گائیں بھینسیں کہیں کوہ قاف پر بھیج دی گئی ہیں۔ پونے چھ کی لاگت ہے۔ ایک چونی کما رہا ہوں۔ چلئے آپ چونی کو بھی جانے دیجئے۔ اس میں ذرا سا بھی جھوٹ ہو تو ڈوب کر مروں۔ جنازہ تک نصیب نہ ہو۔"

اگر دعاؤں کے کے بدلے میں آسمانوں سے ضروریات زندگی کا اترنا ممکن ہوتا تو اس روز مولوی ابل خدا سے اپنی عمدہ کے لئے جوتے مانگتا ۔ رات کو زیب النساء سے مشورہ کیا اور جب اس نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے لحاف کا ایک کونا اٹھا کر مولی ابل کو عمدۃ النساء کے پاؤں دکھائے تو وہ بچوں کی طرح ایک دم رو دیا اور دوسرے روز صبح کی نماز اور وظائف کے بعد پونے چھ روپے موچی کی نذر کر آیا اور موچی کی دکان سے اٹھ کر گلی میں آیا تو اللہ جل شانہ حاضر و ناظر مان کر نسوار سے توبہ کرلی۔

نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی تھی اور ضروریات زندگی کی قیمتیں گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی تھیں اور پھر اولاد بڑھ رہی تھی اور اولاد کے ساتھ مولوی ابل کے بالوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی ۔ ادھر مہرالنساء نے چودھویں سال میں قدم رکھا' ادھر مولوی ابل کی یہ حالت ہو گئی کہ رکوع میں گیا ہے تو اٹھنے کا نام نہیں لے رہا ہے ۔ سجدے میں پڑا ہے تو بس پڑا ہے ۔ ہوشیار مقتدیوں کو وقت پر کھانسی کا دورہ نہ پڑتا تو ممکن ہے مولوی ابل ایک ہی سجدے میں ظہر کو عصر سے ملا دیتا ۔ رمضان المبارک میں تراویح پڑھانے کی سعادت حسب دستور اسی کے سپرد ہوئی 'مگر وہ مولوی ابوالبرکات جو آیات و الفاظ کی غلطی تو کیا کبھی زیر و زبر کی غلطی کا بھی مرتکب نہیں ہوا تھا البقرہ سے النساء میں جا نکلا اور سورہ رحمٰن پڑھنا شروع کی تو ایک رکعت ہی میں اسے دوبارہ پڑھ ڈالا ۔ چودھری فتح داد کرسی نشیں و ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ نے جب اسے اس استغراق پر سرزنش کی تو ایک بار تو مولوی ابل کے جی میں آئی کہ پکار اٹھے ۔ " آپ کے ہاں تو لونڈوں کی کھیپ ہے نا چودھری صاحب ۔ آپ کے بھی کوئی بیٹی ہوتی اور وہ اب جوان ہو گئی ہوتی تو میں آپ کو سمجھاتا کہ ایک سورت کو دوبارہ کیسے پڑھ لیا جاتا ہے ۔ " لیکن چودھری فتح داد کی یہ سرزنش زیادہ تر مذہبی نوعیت کی تھی ورنہ یہی چودھری ہی تو تھا جو برسوں سے مولوی ابل کے گھر میں ہر شام کو گھی لگی ایک روٹی اور دال شوربے کا ایک سکورا اس التزام سے بھجواتا تھا کہ جیسے ایک وقت ناغہ ہو گیا تو سورج سوا نیزے پر اتر آئے گا اور حد یہ تھی کہ جس روز روٹی یا دال یا سالن بھجوانے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو چودھری فتح داد بہ نفس نفیس مولوی ابل سے معافی مانگنے آتا ۔ " آج وظیفہ دیر سے پہنچا ہو گا قبلہ ! میں اس غفلت کی معافی مانگتا ہوں ۔ چودھرائن ذرا بیمار تھی اور کھانا نائن نے تیار کیا ۔ وہ حرامزادی یہ بھول گئی کہ آپ کو یہاں سے وظیفہ وقت پر نہ گیا تو مجھے ایک روزہ رکھ کر کفارہ ادا کرنا ہو گا ۔ "

یہ "وظیفے" مختلف نوعیت کے تھے اور جمعرات کو تو مولوی ابل کے ہاں نہ آٹا گندھتا تھا اور نہ ہنڈیا چڑھتی تھی ۔ مولوی ابل کے عقیدت مندوں کے ہاں سے ایک درجن کے قریب بڑی جاندار روٹیاں آ جاتی تھیں ۔ ادھر زیب النساء نے گھر میں لڑکیوں کو قرآن شریف کا درس دینے کا سلسلہ بیاہ کے تین مہینے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا ۔ جمعرات کو ہر لڑکی چھوٹے چھوٹے سے "وظیفوں" پر ذرا ذرا سی شکر رکھ کر لاتی تو زیب النساء کو دو چنگیریں ان کے لئے الگ رکھ دینا پڑتیں ۔ اس روز دونوں وقت سب سیر ہو کر کھاتے ۔ جو وظیفے باقی بچتے انہیں دھوپ میں سکھا لیا جاتا اور مہینے میں چار بار انہیں گڑ کے شربت میں ابال کر میٹھے ٹکڑے تیار کئے جاتے لیکن مصیبت یہ تھی کہ انسان کو پیٹ بھرنے کے لئے روٹی کے علاوہ پیٹ ڈھانکنے کے لئے کپڑا بھی تو چاہئے ۔ چودھری فتح محمد ہر نئی فصل پر مولوی ابل کو ایک پوشاک بھی پیش کرتا تھا' لیکن جب بھی یہ پوشاک گھر میں آئی ایکا ایکی درزی کی دکان بچ گئی ۔ زیب النساء مہرن اور زبوہ اور شمس کو پاس بٹھا کر لٹھے کے تہبند کا تیا پانچا کر کے رکھ دیتی اور یوں ننھوں کے بہت سے چولے نکل آتے ۔ ململ کی پگڑی سے بھی کچھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا اور یوں چند مہینوں کے لئے مولوی ابل کی اولاد بالکل ننگی ہونے سے بچ جاتی ۔ اس دوران میں اگر کسی کی نکاح خوانی کے سلسلے میں یا جنازہ پڑھانے کے ضمن میں چند روپے آ نکلتے تو وہ مہرالنساء کے جہیز کی خاطر ٹین کے ایک ڈبے میں رکھ دیئے جاتے ۔ بچوں کے پیٹ بڑھ رہے تھے اور باقی جسم سکڑ رہا تھا ۔

زیب النساء کے کنگن جو کبھی اس کی سانولی کلائیوں میں گڑے رہتے تھے اب ذرا سے جھٹکے سے پنچے پر آ جاتے تھے اور اسکی لانبی لانبی پلکوں کے پیچھے جوانی کا بھوبھل سرد راکھ بن چکا تھا اور جب وہ پلکیں جھپکتی تھی اور اس کے چہرے پر یہ راکھ اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ خود مولوی ابل زندگی کے ذرا ذرا سے حادثوں کے درمیان بالکل پچی ہو کر رہ گیا تھا ۔ انہیں دنوں اسے مولوی ابوالبرکات کی بجائے مولوی ابل کہا جانے لگا تھا ۔ کنپٹیوں کے بال تو بالکل سفید ہو چکے تھے اور دانتوں پر مسوڑوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی ۔ تلاوت کرتے وقت کئی بار دانتوں کی

رہنوں میں سیٹیاں بج اٹھتی تھیں مگر آواز کا ٹھاٹھ وہی تھا۔ صحیح مخرج سے نکلے ہوئے حروف یوں بجتے تھے جیسے پیتل کی تھال پر بلور کی گولیاں گر رہی ہوں۔ البتہ اس آواز میں ایک لرزش سی ضرور آگئی تھی۔ جو پرانے نمازیوں کو بہت اجنبی معلوم ہوتی تھی لیکن چودھری فتح داد کو اس ارتعاش کا سبب معلوم تھا کیونکہ مولوی ابل اس سے مہرالنساء کے لئے رشتہ ڈھونڈنے کے سلسلے میں بات کر چکا تھا۔ چودھری نے اس مقصد کے لئے سارے گاؤں پر نظر دوڑائی تھیں۔ رات کو بستر پر لیٹ کر ایک ایک گھر میں جھانک آیا تھا اور کئی نوجوان اسے جچے بھی تھے مگر ساری مشکل یہ تھی کہ مولوی ابل کو سب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مہرالنساء سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہے اور سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہوئی جوانی میں خون کم ہوتا ہے اور آنسو زیادہ اور پھر یہ بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ اب مولوی ابل کو عیدین پر بیس پچیس روپے ملتے ہیں جن سے مہرالنساء کا جہیز تو خیر کیا بنا ہو گا دوسرے نو بچوں کے لئے جوتا ٹوپی بھی شاید ہی مہیا ہو سکے ہوں۔ ایک دو جگہ چودھری نے بات بھی کی مگر مخاطب کچھ یوں تیورا کر پیچھے ہٹے جیسے پھول کی پتیوں میں سے اچانک بھڑ نکل آئی ہو۔

لیکن مولوی ابل اور زیب النساء کی دعائیں رائگاں نہ گئیں۔ انہیں دنوں سابقہ خدایار اور حال شمیم احمد شہر سے گاؤں اٹھ آیا اور یہاں کپڑے کی چھوٹی سی دکان کھول لی۔ خدایار ایک حافظ قرآن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والد کے مرنے کے بعد مولوی ابل کے ہاں قرآن مجید حفظ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور جب مسیں بھیگنے لگیں تو بوڑھی ماں کو یہیں گاؤں میں چھوڑ کر شہر بھاگ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی ہیڈ کلرک کے ہاں ملازم ہو گیا ہے' اسی ہیڈ کلرک نے کچھ عرصے کے بعد اسے ایک دوکان کے سامنے گز بھر جگہ لے دی' جہاں وہ کٹ پیس بیچتا رہا اور اپنی ماں کو بھی شہر بلا لیا پھر جب اسنے تجارت میں کافی مہارت حاصل کر لی تو خدایار کے بجائے شمیم احمد کا نام اختیار کر کے گاؤں آگیا۔ اس نے بڑی منت خوشامد سے مولوی ابل کو مجبور کیا کہ وہی اس کی دکان سے بوہنی کرے تاکہ تجارت میں برکت ہو اور نقد سودا چلتا رہے۔

اس روز مولوی ابل نے اپنے شاگرد اور اس کی بوڑھی ماں کا دل رکھنے کے لئے اپنی زندگی کا شاید سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ زیب النساء کے پاس گیا۔ "عارف کی ماں شمیم احمد کہتا ہے کہ وہ میری ہی بوہنی سے کاروبار شروع کرے گا۔ تم کہو تو مہرن کے لئے ایک سوٹ کپڑا لے لیں۔ جہیز کے لئے ضرورت تو ہے ہی' ویسے سارے گاؤں والوں کے سامنے بوہنی کی رسم ادا ہو گی۔ اس لئے ذرا سا رعب بھی بیٹھ جائے گا۔ پھر شمیم احمد کا دل رکھنا تو میرا فرض ہے۔ ایک تو پرانا شاگرد ہے۔ دوسرے حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا نور نظر ہے بیچارہ" "مولوی ابل نے رک کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا۔ "عارف کی ماں! اللہ جل شانہ کی قسم مجھے تو کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے اللہ جل شانہ نے اسے مہرن ہی کے لیے آسمان سے اتارا ہے۔"

اس بات پر زیب النساء کی آنکھوں کی راکھ ایک لمحے کے لئے تو بھوبھل میں بدل گئی "تمہارے منہ میں گھی شکر۔" وہ بولی اور گلے میں لٹکتی ہوئی چابی قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر نکالی۔ صندوق کھولا اور ٹین کا ڈبہ نکال کر مولی ابل کے سامنے رکھ دیا۔ "خدا تیری زبان مبارک کرے۔ میں تو جب بھی مہرن کو دیکھتی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے پرانا توے پر دیر تک پڑے پڑے جلنے لگا ہے۔" وہ رونے لگی' ساتھ ہی ساتھ مسکراتی بھی رہی اور جب مہرالنساء کسی کام سے اندر آئی تو فوراً" بول اٹھی۔ "بیٹی! باہر دھوپ میں ٹکڑے سوکھ رہے ہیں نا۔ وہاں ہنڈیا الٹ کر رکھ دو ورنہ سب ٹکڑے کوؤں میں بٹ جائیں گے۔ جاؤں میری بیٹی ----" اور مہرالنساء کے گالوں کی لالی نے جواب دیا کہ میں سب سمجھتی اماں شمیم احمد کی دکان پر ابا میاں میری بوہنی کرنے چلے ہیں۔

مہرالنساء باہر چلی گئی تو مولوی ابل نے ڈبے کے کل متاع تینتالیس روپے نکال کر جیب میں رکھے اور اٹھتے ہوئے بولا۔ "دعا کرنا مہرن کی کہیں شادی لگ جائے تو میں پانچ سات برس کے لئے تو پھول کی طرح ہلکا پھلکا ہو جاؤں۔"

زیب النساء آنسو پونچھتی اور مسکراتی رہی اور مولوی ابل شمیم احمد کی دکان کو چل دیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے جن میں زیادہ عورتیں تھیں' جو ناکوں اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھے یوں کھڑی تھیں جیسے ان کی نظریں رنگ رنگ کے کپڑوں کے ساتھ سل کر رہ گئی ہوں۔

مولوی ابل دکان میں داخل ہوا تو شمیم احمد اس کے قدموں پر بچھ بچھ گیا اور جب مولوی نے اپنی خوبصورت آیت میں قرآن شریف کی چند آیات کی تلاوت کی ایک تو ایک سماں بندھ گیا۔ تلاوت کے بعد اس نے ایک کپڑا پسند کیا۔ گلابی رنگ پر نیلے پھول تھے اور نیلے پھولوں میں جگہ جگہ زرد رنگ کے دھبے تھے۔ "ایک زنانہ سوٹ کا کپڑا کاٹ دو" مولوی ابل نے معمول سے زیادہ بلند آواز میں کہا اور ایک نظر ہجوم کو بھی دیکھ لیا۔ شمیم احمد نے گز اٹھا کر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا اور سات گز کپڑا ناپا۔ قینچی اٹھا کر ایک بار پھر بسم اللہ پڑھی اور کپڑا کاٹا۔ تہ کیا اور آخری بار بسم اللہ پڑھ کر مولوی ابل کے سامنے یوں رکھ دیا جیسے مفت میں۔۔۔۔ محض تحفتاً" پیش کر رہا ہے۔

"قیمت؟" مولوی ابل نے اب کے حاضرین کی طرف نہیں دیکھا' صرف اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔

شمیم احمد مارے احترام کے سمٹنے لگا۔ ایک لمحے تک ہاتھ ملتا رہا' کھنکارا اور بولا "چھے روپے گز کے حساب سے بیالیس روپے ہوئے قبلہ!"

دوکان میں سجے ہوئے سب تھان جیسے مولوی ابل کے دماغ پر دھپ دھپ گرنے لگے۔ بوکھلا کر اس نے جیب سے ہاتھ نکالا اور ایک روپیہ واپس جیب میں رکھ کر باقی رقم شمیم احمد کے سپرد کر دی۔ عورتوں کی انگلیاں ہونٹوں سے اٹھ کر ناک' اور ناک سے ابھر کر ہوا میں جم کر رہ گئیں۔ مولوی ابل نے کپڑا بغل میں لیا تو شمیم احمد بولا "قبلہ! ابوبہنی فرمائی ہے اس لئے میں نے نرخ میں کوئی رعایت نہیں کی۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں۔ پھر تلافی کر دوں گا۔ انشاء اللہ۔"

مولوی ابل کپڑے کو بغل میں لے کر اٹھا تو جی چاہا کہ شمیم احمد کو کہہ دے۔ "اللہ جل شانہ ہی تلافی کرے گا عزیزی شمیم احمد' اس لئے کہ اگر تم نے کپڑا بیچا ہے تو میں نے بھی اپنی بیٹی بیچنے کی کوشش کی ہے۔" لیکن یہ تو ایک دم سے جیب خالی ہو جانے کا غبار تھا' جس پر اٹھتے ہی اٹھتے اس نے قابو پالیا اور وہ بولا۔ "یہ تو تمہارا حق تھا شمیم احمد' یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی! اللہ جل شانہ تمہیں اور تمہارے کاروبار میں برکت دے۔"

"آمین۔" شمیم احمد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"آمین" ۔ زیب النساء نے کپڑے کی نرمی اور بیقراری اور پھبن کو دیکھ کر مولوی ابل کے ان الفاظ کے جواب میں کہا۔ "اللہ کرے اس کپڑے میں ہماری مرن کا سہاگ مہکے۔"

چند ہی روز بعد ایک شام کو مولوی ابل کے دروازے کی زنجیر بجی۔ اس وقت آنے والے عموماً" چاول یا حلوہ یا کھیر لاتے تھے اس لئے زنجیر کی آواز سنتے ہی چھوٹے بچے ڈیوڑھی کی طرف لپکے لیکن جانے مولوی ابل کو کیا سوجھی' خلاف معمول کڑک کر بولا "ٹھہرو" بچے رک گئے' سب کے چہرے لٹک گئے' عمدۃ النساء تو رو دی۔ جونہی ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا خوشبو کا ایک فوارہ سا اٹھا اور ساتھ ہی آواز آئی "السلام علیکم قبلہ!"

یہ شمیم احمد تھا مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا تو لٹھے کا نیا تہہ بند نین کی طرح بج اٹھا اور حسب اسنے رک رک کر کہا۔ "آپ کی خدمت میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں قبلہ۔ اسی لئے آپ کو بے وقت زحمت دی۔" تو مولوی ابل کو شمیم احمد کی پوشاک سے امڈتی ہوئی مہک کچھ گنگناتی محسوس ہوئی۔ یہ درخواست یہاں ڈیوڑھی میں بھی سنی جا سکتی تھی' لیکن مولوی ابل گردن موڑ کر پکارا۔ "میں ابھی آیا عارف کی ماں" اور پھر وہ شمیم احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس تیزی سے مسجد کی طرف چلا کہ شمیم احمد کو نئے تہہ بند کا شور و غوغا روکنے کے لئے اسے دوسرے ہاتھ سے گھٹنوں تک اٹھا دینا پڑا۔

دونوں ایک حجرے میں پہنچے تو وہاں چند نمازی آگ جلائے ہارون الرشید کے انصاف کی کہانیاں سن رہے تھے۔ دوسرے حجرے میں اندھیرا تھا' یہاں عموماً" اندھیرا ہی رہتا تھا اور یہ اکتالیس اکتالیس دنوں کی مسلسل چلہ کشی کے لئے مخصوص تھا۔ شمیم احمد کو وہیں چھوڑ کر مولوی ابل پہلے حجرے سے جلتی ہوئی ایک لکڑی اٹھا لیا اور اندھیرے حجرے کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ ڈیوٹ پر کڑوے تیل کا چراغ جل اٹھا۔ اس نے

واپس جا کے لکڑی کو الاؤ میں پھینکا اور لپک کے شمیم احمد کے پاس آیا۔ شمیم احمد نے ان چند روز میں داڑھی نہیں منڈوائی تھی۔ گالوں اور گلے پر نہایت سلیقے سے خط بنے تھے اور داڑھی کے مشکی بالوں پر عطر حنا دیے کی روشنی میں چمکنے لگا تھا۔

"کہو"۔ مولوی ابل کچھ اس انداز سے بولا جیسے ابھی ابھی اپنے مہمان کے لئے ایک ایوان کی آرائش و زیبائش سے فارغ ہوا ہے۔

شمیم احمد کی آنکھیں جھک گئیں اور ہونٹ ذرا سا کھل کر کانپنے لگے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر چراغ کی طرف دیکھا جس کی لو بے پناہ دھواں چھوڑ رہی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے تنکے سے چراغ کی بتی کو کم کیا اور بولا۔ "آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں۔"

"کہو کہو" مولوی ابل نے شمیم احمد کے کندھے کو تھپکا اور پھر چونک کر اس کے دوسرے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔ شمیم احمد کے کندھے کی ہڈی پر گوشت کی اتنی بڑی گیندیں سی رکھی تھیں! "کہو نا عزیزم۔"

شمیم احمد نے اپنے ہاتھ ملنا شروع کئے' ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کوئی چیز بڑی مشکل سے نگلی اور بولا: "اصل میں یہ کام تو میری اماں کا تھا۔ انہی کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے تھا' مگر پچھلے چند برسوں سے ان کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے' بات بات پر رو دیتی ہیں اور برا بھلا کہنے لگتی ہیں' سو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی حاضر ہو جاؤں۔"

"تم نے اچھا کیا۔" مولوی ابل نے بڑی شفقت سے کہا۔

"میں آپ کا پرانا خادم ہوں۔" شمیم احمد نے سمٹتے' پھیلتے اور پھر سمٹتے ہوئے کہا "میری درخواست یہ ہے کہ حضور مجھے ہمیشہ کے لئے ---" اس نے ایک بار پھر چراغ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر اپنی آستین پر سے کوئی خیالی دھبہ اڑا دیا --- "حضور مجھے ہمیشہ کے لئے اپنی غلامی میں لے لیں ---" شمیم احمد نے نزع کے سے عالم میں کہا۔

مولوی ابل کا جی چاہا کہ چٹکی بجا دے' "رما" ذرا ہنستے ہوئے بولا۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا شمیم احمد۔"

شمیم نے بڑی حیرت اور دکھ سے مولوی ابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص نے قرآن مجید کے کئی مقامات اور فقہ کے بے شمار مسائل کو آن کی آن میں صاف اور سلیس انداز میں سلجھا دیا وہ "غلامی" کا مطلب نہیں سمجھتا۔ دبی دبی آواز میں جیسے اس نے نزع کی آخری ہچکی لی۔ "جی میرا مطلب ہے کہ حضور --- حضور مجھے اپنی غلامی میں لے لیں۔"

اور جیسے اس وضاحت سے مولوی ابل کی تسلی ہو گئی اور اس نے مزید تشریح طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھی شمیم احمد کچھ دیر تک نظریں جھکائے کھڑا ہاتھ ملتا اور مروڑتا رہا' اور جب مولوی ابل ایک لفظ تک نہ بولا تو اس نے اپنی نظروں کو جیسے دونوں ہاتھوں سے بعد مشکل اٹھا کر بے انتہا جھجک سے اوپر دیکھا' مولوی ابل کی داڑھی پر آنسوؤں کے قطرے رک گئے تھے' شمیم احمد کی داڑھی پر عطر حنا چمک رہا تھا اور مولوی ابل کی داڑھی میں آنسو ہنکا اور تھرتھرا رہے تھے اور چراغ کی لو پھر ڈھیروں دھواں اگلنے لگی تھی' مگر اب کے شمیم احمد کو بتی کم کر دینے کا خیال نہ آیا۔ وہ کچھ کہنے کے لئے بے تاب ہو گیا مگر صرف ہونٹوں کو کھول کر رہ گیا۔ مولوی ابل نے ایکا ایکی جیسے کچھ سوچ کر پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "لڑکی تیری کتنی مسکین مخلوق ہے اللہ جل شانہ! کتنی مسکین!" اس کی آنکھوں سے بہت سے آنسو ایک ساتھ نکلے اور داڑھی کے بالوں نے انہیں پرو لیا۔ "دینے کا مال ہے شمیم احمد! دوں گا۔ کیوں نہیں دوں گا؟ دینا ہی پڑے گی اور پھر تم تو میرے عزیز ہو' بھائی حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا بیٹا میرا اپنا بیٹا ہے --- آؤ' ادھر آؤ ---" اور مولوی ابل نے شمیم احمد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

جب وہ واپس گھر میں آیا تو زیب النساء نے چند قدم کے فاصلے سے ہی کہہ دیا۔ "کہاں سے آ رہے ہو؟ عطر کی لپٹیں آنے لگی ہیں۔"

مہرالنساء توے پر آخری روٹی ڈالے بیٹھی تھی' بولی "سچ ابا جی' سارا گھر مہک اٹھا ہے۔"

"کیا بات ہے؟ زیب النساء نے پوچھا۔

مولوی ابل نے بڑی آسودہ خاطری سے بچوں کی قطار کی طرف دیکھا۔ وہ خالی ہاتھ گھر میں آیا تھا اس لئے سب کے منہ لٹکنے لگے تھے۔

سب کو ایک ساتھ پیار کرنا مشکل تھا۔ اس لئے بولا۔ " آج میرے سب بچوں کو روٹی کے ساتھ گڑ کا ایک ایک ٹکڑا بھی ملے گا۔ " لٹکے ہوئے چہرے سنبھل اور سنور گئے اور ضرالنساء کی نظریں توے پر گڑ گئیں۔

" بات سنو عارف کی ماں۔ " مولوی ابل باہر جاتے ہوئے بولا۔

زیب النساء نے سب حالات سن کر کہا " میری سر پر ہاتھ رکھ کر کہو۔ "

مولوی ابل چیکا " اللہ جل شانہ کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں۔ اب تو اپنے سر کی قسم دیتی ہے تو نعوذ باللہ کیا تو اللہ جل شانہ سے بڑی ہے؟ کاش عورت کی عقل یہاں کہیں کھوپڑی کے آس پاس ہوتی " اور اس نے مسکرا کر زیب النساء کے تالو پر ایک چپت جڑ دی۔

زیب النساء بچوں کی طرح رونے لگی۔ وہ ان آنسوؤں کا مطلب سمجھتا تھا۔ وہ بھی تو ابھی کچھ دیر پہلے ایسے ہی آنسو گرا چکا تھا۔ ایک لمحے کے بعد وہ آگے بڑھا اور زیب النساء کے بھیگے بھیگے گالوں پر اپنی داڑھی رکھ دی۔

" دعائیں یوں قبول ہوتی ہیں عارف کی ماں۔ " مولوی ابل برسوں کی عبادت و ریاضت کا جلال چہرے پر لا کر بولا۔ " الحمد للہ! یوں سنتا ہے سننے والا، یوں دیتا ہے چھپر پھاڑ کے۔ سنتی ہو زلیخن۔ " آج مولوی ابل نے سہاگ رات کے بعد شاید پہلی بار زیب النساء کو عارف کی ماں کے بجائے زلیخن کہہ کر پکارا تھا۔

زیب النساء آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ " جب شمیم احمد خدایار تھا، جب وہ لڑکا تھا اور تمہارے پاس پڑھتا تھا تو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا تھا مہرن کو جیسے۔۔۔ کبھی کبھی تم مجھے دیکھ لیتے ہو۔۔۔ اللہ قسم۔ "

اور ابھی میاں بیوی آنسوؤں کو اچھی طرح خشک بھی نہیں کر پائے تھے کہ ایک بار پھر دروازے کی زنجیر بجی، بچے ڈیوڑھی کی طرف دوڑے۔

" ٹھہرو۔ " اب کے مولوی ابل کی آواز میں ڈانٹ نہیں تھی۔ " میں خود جاؤں گا۔ " پھر بچوں کے پاس آ کر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا " ندیدہ پن بہت برا ہوتا ہے۔ سمجھے؟ ہر آنے والا حلوہ اور چاول دینے نہیں آتا۔ کئی لوگ دوسرے کاموں کے لئے بھی آ نکلتے ہیں۔ سمجھے؟ جاؤ " پھر ذرا بلند آواز میں بولا " انہیں باہر سردی میں نہ نکلنے دو مہرن بیٹی، یہی بچے تو میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ "

وہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو گرم چادر میں لپٹے ہوئے چودھری فتح داد نے ہاتھ بڑھا کر مولوی ابل کو باہر گلی میں گھسیٹ لیا اور چھاتی سے لگا کر بولا۔ " مبارک ہو قبلہ! ہزار ہا مبارک ہو۔ آخر میری کوششیں بیکار نہیں گئیں۔ "

اس وقت مولوی ابل کی نظروں میں چودھری فتح داد کے فرشتے بننے میں بس پروں کی کمی رہ گئی تھی۔ " اللہ جل شانہ کا شکر اور آپ کا احسان ہے۔ " اس نے چودھری سے بڑے پگھلے ہوئے سیال لہجے میں کہا۔

" خدا نے مجھے آپ کے سامنے سرخرو فرما دیا۔ " چودھری فتح داد بولا۔ " اب جلدی سے شادی کی تاریخ بھی طے کر لیجئے شمیم احمد اچھا لڑکا ہے۔ پر آخر جوان لڑکا ہے اور پھر دکاندار ہے۔ دن میں بیسوں عورتیں اس کی دکان پر آتی ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ کیسا ننگا زمانہ آگیا ہے۔ لڑکے لڑکیاں بارود کے گولے ہو رہے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کب پڑے پڑے بھک سے ہو جائیں، شمیم احمد کو میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ رسم و رواج کے مطابق اس کی ماں آپ کے گھر میں آتی مگر بڑھیا سٹھیا سی گئی ہے۔ کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہو تو سات ہتھیں توم ڈالتی ہے کمبخت۔ ابھی ابھی شمیم نے بتایا کہ آپ نے حامی بھر لی ہے۔ میں نے اسے جلدی سے شادی کر لینے پر زور دیا تو بولا آپ ہی قبلہ مولوی صاحب سے تاریخ کا فیصلہ کرا دیجئے، سو میں اسی لئے حاضر ہوا تھا۔ آپ کل تک سوچ لیجئے اور یہ۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔ " چودھری فتح داد نے گرم چادر کے نیچے سے ایک پوٹلی سی نکالی۔۔۔ " یہ میری بیٹی کو دے دیجئے گا۔ "

مولوی ابل نے خاموشی سے پوٹلی لے لی تو چودھری نے آہستہ سے کہا۔ " اللہ قبول فرمائے۔ "

" آمین۔ " مولوی ابل کے منہ سے عادتاً یہ لفظ نکل گیا۔

مولوی ابل نے اندر آ کر پوٹلی کھولی تو ایک ٹرے سے ریشمی رومال میں سو کے ایک نوٹ پر سونے کے دو جھمکے رکھے تھے، جن کی ٹرے سے پیلے جتنی کٹوریوں میں جانے نگینے جڑے تھے یا مینا کاری کا کام تھا!

زیب النساء کسی اور چیز کی امید میں رومال کو جھاڑ کر چکی۔ "شمیم احمد نے بھیجے ہیں؟"

اور ابھی مولوی ابل جواب نہیں دینے پایا تھا کہ مہرالنساء بھاگ کر باہر نکل گئیں۔

"ارے!" مولوی ابل نے حیرت سے زیب النساء کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ایک ساتھ بے اختیار ہنس پڑے۔

"سمجھ گئی!" زیب النساء باہر دیکھتے ہوئے انگشت شہادت کو ناک کی کیل پر رکھ کر بولی۔

"تم نے بھی تو منہ بھر کہہ دیا۔۔۔ شمیم احمد نے بھیجے ہیں؟۔۔" مولوی ابل نے زندگی میں شاید پہلی بار عورت کی آواز اور انداز کی نقل اتاری، اور بچے جو ابھی تک محض حیرت زدہ تھے محظوظ ہو کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ عمدۃ النساء ڈرتے ڈرتے جھمکوں کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چودھری فتح داد دے گیا ہے، مہرن کے لئے۔" مولوی ابل نے بڑی بے پروائی اور رواداری میں راز فاش کیا۔

"اللہ قبول فرمائے۔" زیب النساء جیسے اپنی قبر میں سے بولی جس پر نیا نیا غلاف چڑھایا گیا تھا۔

چند ہی روز میں مہرالنساء مایوں بٹھا دی گئی۔ اس کے پیروں پر مہندی تھوپ دی گئی۔ ڈھولک تو خیر نہ بجی، کیونکہ شادی کا گھر سہی پر آخر مولوی ابوالبرکات کا گھر تھا، جس نے حضور پر نور صلعم کی مدینہ میں تشریف آوری پر مدینے کی لڑکیوں کے دف بجا بجا کر گانے کے متعلق تو پڑھا تھا مگر ڈھولک کا جواز کہیں موجود نہ تھا، اور پنجاب اتنا بدنصیب تھا کہ یہاں اب تک دف کا رواج ہی نہیں چلنے پایا تھا۔ "دف ہو تو لاؤ اور بجاؤ اور گاؤ تم ڈھولک لائیں تو میں اسے اٹھا کر چھت پر پھینک دوں گا۔" مولوی ابل نے میراثنوں کے ہجوم سے ڈانٹ کر کہا۔ آخر گاؤں کی لڑکیاں مہرالنساء کو اپنے دائرے میں لے کر بیٹھ گئیں اور ڈھولک کے بغیر ہی اپنی سریلی الاپوں سے رات بھر اس کے گرد محبت اور دوستی، پھولوں اور پھواروں، ملاقاتوں اور جدائیوں کے طلسمات بنتی رہیں۔

لیکن بھلا شمیم احمد کو ڈھول شہنائی بجوانے اور گولے چھوڑنے سے کون روکتا۔ برات ایسی دھوم سے آئی اور مولوی ابل کی ڈیوڑھی میں ہنگامہ مچا کہ معلوم ہوتا تھا ڈھول کی ہر چوٹ مولوی ابل کے کچے گھروندے کی بنیادوں پر پڑ رہی ہے۔

یہ دھوم دھڑکا دیکھ کر رات ہی رات مولوی ابل اور زیب النساء نے مکان کے ایک گوشے میں چند سرگوشیاں کیں۔ لڑکیوں کے گیتوں کے درمیان بکسوں کے گھسٹنے، کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں رینگتی رہیں اور جب دوسرے دن صبح کو جہیز کا سامان آنگن اور چھت پر بچھایا گیا تو گاؤں گاؤں پہلی نظر میں تو تیورا کر پیچھے ہٹ گیا۔ کپڑے تو خیر بن ہی جاتے ہیں پر یہ سونے کے اتنے اتنے بڑے بڑے جھمکے!

"مولوی کے پاس دست غیب کا تعویذ ہے۔" کسی نے رائے دی۔

ایک بڑھیا نے ٹھوڑی کی لٹکی ہوئی جھلی میں انگلی ڈبو کر کہا۔ "کپڑوں کے کئی جوڑے تو ان گنہگار آنکھوں نے پہچان لئے ہیں، کچھ تو بے چاری مرنے والیوں کے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو بی بی زیب النساء کو اپنی شادی پر ملے تھے۔ شکر ہے اس لئے اولاد کے لئے رکھ چھوڑے۔ کنگن اور یہ ناک کی کیل، یہ سب بی بی ہی کا ہے۔ پر یہ جھمکے؟" اور اس نے اپنی انگلی کو ٹھوڑی کی جھلی میں سے نکال کر آسمان کی طرف بلند کر دیا۔

مہرالنساء کو ڈولی میں بٹھایا گیا تو اکنیوں اور چھوہاروں کی ایک لہری اس پر سے نچھاور ہو گئی۔ گاؤں کے بچے ان پر جھپٹے۔ مولوی ابل کے بچے جو ڈیوڑھی میں ماں باپ کی دیکھا دیکھی رو رہے تھے ایک دم اپنی جگہ سے یوں اچھلے جیسے ان کے قدموں تلے لچک دار کمانیاں بھر آتی ہیں۔ "ٹھہرو" مولوی ابل گرجا۔ کمانیاں دھرتی میں اتر گئیں۔ بچے جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ صرف عارف ایک اکنی کو اپنے پنجے تلے چھپائے کھڑا رہا اور برات کے چلے جانے کے بعد اس کا یہ اثاثہ اس کے پاؤں سے ہاتھ تک کی مسافت طے کر سکا۔

مولوی ابل کچھ دور تک ڈولی کے ساتھ گیا۔ اس کے ناک اور آنکھیں سرخ تھیں مگر ان کے ساتھ چہرے کی زردی ضروری تھی اور

مولوی ابل کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دکھ اور اطمینان نے چہرے کی سرزمین کو اپنے اپنے مظاہروں کے لئے بانٹ لیا ہے۔ ایک موڑ پر جا کر وہ رک گیا اور دور تک ڈولی پر پڑے ہوئے ریشمی پردے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک لمبی گہری سانس لے کر اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر چٹخایا اور پلٹ کر گھر جانے لگا۔

گلی میں گاؤں کے بچے اب تک اکنیاں اور چھوہارے ڈھونڈ رہے تھے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑے ہوئے عارف اور دوسرے بچوں نے اپنے ابا کو دیکھا تو ایک آن میں بھوتوں کی طرح غائب ہو گئے۔ مولوی ابل کے ہونٹوں میں دیر سے جو سوزش اور کھجلی ہو رہی تھی وہ مسکراہٹ بن کر نمودار ہوتی اور اس کی آنکھوں تک پھیلتی چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے لگا تو اسے دیوار سے لگی ہوئی ایک اکنی چمکتی دکھائی دی لیکن وہ بڑی بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔ زیب النساء شاید کواڑ ہی سے لگی کھڑی تھی۔ مولوی ابل کا ہاتھ پکڑ کر بچوں کی طرح زار زار رونے لگی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی جب آنگن میں آئی تو دونوں ہاتھوں سے بڑے سے دائرے بنا کر بولی "ہمارے لئے تو بس یہ قبرستان کا سناٹا چھوڑ گئی ہماری مہرن۔"

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔" مولوی ابل نے اپنی مسکراہٹ کو اور پھیلایا۔ "مہرن چلی گئی تو کیا زہرہ کو بھی لے گئی؟ اور کیا حس بھی اس کے ساتھ چلی گئی؟" پھر ذرا سا رک کر بولا۔ "عارف میاں زہرہ کیا کر رہی ہے؟"

"جی رو رہی ہے۔" عارف دیوار سے لگے ہوئے بچوں کی قطار میں سے نکل کر بولا۔

"کہاں؟" مولوی ابل نے پوچھا۔

"جی، جہاں مہرن آپا مایوں بیٹھی رہیں۔" عارف بولا۔

"زہرہ۔" مولوی ابل پکارا۔ زیب النساء مسلسل روئے جا رہی تھی۔

زہرہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ نیا گلابی دوپٹہ آنسوؤں کی نمی کی وجہ سے جگہ جگہ سے سیاہی مائل سرخ پڑ گیا تھا اور زہرہ نے اپنے جن مہندی رچے ہاتھوں کو صبح اٹھ کر گھی سے چکایا تھا ان پر جگہ جگہ مٹی جم رہی تھی اور بالوں کی مینڈھیاں اجڑ رہی تھیں اور۔۔۔

مگر مولوی ابل تو زہرہ کو دیکھتے ہی سناٹے میں آ گیا تھا۔ مسکراہٹ ہونٹوں میں سمٹ کر یوں پھڑپھڑانے لگی تھی جیسے دم توڑ رہی ہے اور چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ زہرۃ النساء چند قدم پر آ کر رک گئی اور سسکیوں میں رونے لگی۔

اور پھر مولوی ابل نے زیب النساء کے ہاتھ کو ہاتھ میں جکڑ لیا اور اسے بے ڈھنگے پن سے کھینچ کر آنگن کے ایک گوشے میں لے جا کر یوں بولا جیسے گھر میں آگ لگنے کی اطلاع دے رہا ہے۔ "عارف کی ماں! سنو یہ زہرہ تو جوان ہو گئی ہے!"

اور زیب النساء آنکھیں پھاڑ پھاڑ زہرہ کی طرف یوں دیکھنے لگی وہ اب تک والدین کی بے خبری میں مہرن کے عقب میں بیٹھی پلتی بڑھتی رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد مولوی ابل نے بغیر ضرورت کے گلا صاف کیا اور دم بہ خود زیب النساء کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "فکر نہ کرو بیوی۔ اللہ جل شانہ کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر ہے۔"

زیب النساء نے مولوی ابل کا ہاتھ کسی قدر سختی سے اپنے کندھے پر گرا دیا۔ "شرم کرو۔ پہلے میرا ہاتھ پکڑے چلے آئے اور اب کندھا سہلا رہے ہو۔ جوان جہان بیٹیاں کیا کہیں گی کہ اولاد کے سامنے۔۔۔" زیب النساء نے فقرہ پورا کرنے کے بجائے اپنا وہی کندھا اچکا دیا۔

مولوی ابل کے ذہن میں خیال آیا، پکارا "شمس!"

شمس النساء قطار میں سے نکلی ہی تھی کہ مولوی ابل نے جیسے سہارا لینے کی خاطر اپنے عقب میں دیوار کو ٹٹولنے کے ہاتھ ہلایا اور کوئی سہارا نہ پا کر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح جھوم سا گیا۔ چلتے ہوئے شمس النساء کے پاؤں کے تلوے ایک دم چپے چپے زمین پر نہیں لگ جاتے تھے جبکہ اس کے جسم کی طرح اس کے پاؤں میں بھی لہراؤ سا تھا۔ سب سے پہلے ایڑی زمین کو چھوتی تھی۔ پھر تلوے خم جھکتا تھا اور اس کے بعد بچے کی اٹھی ہوئی انگلیاں باری باری جیسے لپک لپک کر دھرتی کو چھوتی تھیں، تب جا کر دوسرا قدم اٹھتا تھا۔

"کچھ نہیں بیٹی، کچھ نہیں، جاؤ۔" مولوی ابل تیزی سے ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔
شمس النساء حیران ہو کر اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔
اور زیب النساء زار زار روتی ہوئی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ زہرہ اور شمس اس کی طرف لپکیں۔
مولوی ابل نے باہر جا کر چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا اور پھر دیوار کے قریب سے چمکتی ہوئی اکنی اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی۔
گھر میں کل دو ہی بکس تو تھے۔ اب ان میں سے ایک میں سوکھے ٹکڑے رکھے جانے لگے تھے اور دوسرے میں قمرن اور عمدہ کی گڑیاں اور دوسرے ننھوں کی بلور کی گولیاں پڑی رہتی تھیں۔ گاؤں میں لڑکیوں کی پرائمری سکول بھی کھل گیا تھا۔ اس لئے اب کلام پاک کا درس لینے والی لڑکیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی اور اسی لئے سوکھے ٹکڑے اب بٹنے کی بجائے پندرہ روز بعد ابالے جانے لگے۔ نمازیوں کو بھی زمانے کی ہوا لگ گئی تھی بعض وقت تو مولوی ابل اذان دے کر وہیں بیٹھ جاتا اور جب دیکھتا کہ نمازیوں کے انتظار میں نماز قضا ہو رہی ہے۔ تو کچھ یوں کھویا کھویا سا اٹھ کر اندر مسجد میں آتا جیسے کوئی بڑا ناگوار فرض ادا کرنے چلا ہے۔ جمعہ پر چند کسان جمع ہو جاتے تو بڑی رقت سے خطبہ دیتا۔ اسلام میں نماز کی اہمیت اور علمائے دین کی خدمت کی برکات کا تذکرہ کرتا اور کہتا۔ "تمہیں یاد ہو گا کوئٹے میں زلزلہ آیا تھا! کیوں آیا تھا؟ ترکی میں بھونچال آیا تو کتنے ہی گاؤں کو زمین نگل گئی کیوں؟ مسلمان ہر جگہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں! کیوں ہو رہے ہیں؟ کیوں؟ کبھی سوچا ہے تم نے؟ اور بھلا تم کیوں سوچو، تمہیں تو گندم کے خمار نے دین سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ یہ نماز نہ پڑھنے اور علمائے دین کی خدمت نہ کرنے کے نتیجے ہیں۔ یہ قہر الٰہی ہے۔ یہ آثار قیامت ہیں سمجھے؟ اور کیا تم اپنے گاؤں کو بھی زمین کے پیٹ میں اتار دو گے؟ بتاؤ! بتاؤ!" اس قسم کے جذباتی خطبوں کے بعد مقتدیوں میں ذرا اضافہ ہوتا اور ایک دو روز تک گھی لگے وظیفے آنے لگتے مگر پھر وہی سناٹا عود کر آتا جس میں زہرہ کی آنکھیں چمکتیں، شمس کا جسم چٹکتا، نین کے خالی بکسوں میں سوکھے ٹکڑے اور بچوں کے بلوری بنٹے بجتے اور تالیاں بجاتے اور قمرن کی گڑیاں ننگی ہو ہو کر ایک دوسرے میں گھس پڑتیں۔
مولوی ابل کے بس دو ایسے سہارے تھے جو کبھی نہ ٹوٹے۔ اللہ جل شانہ اور چودھری فتح داد۔ اللہ جل شانہ کا یہی کرم کیا کم تھا کہ مولوی ابل اور زیب النساء اب تک زندہ تھے اور اب تک ان کی ساری اولاد زندہ تھی اور مہرالنساء کا بیاہ اس ٹھاٹ سے ہوا تاکہ زہرہ اور شمس کے لئے رشتے کے پیاموں کا سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہ آتا تھا لیکن مولوی ابل جس شدت سے مہرالنساء کے بر کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا اسی شدت سے وہ زہرہ النساء اور شمس النساء کے لے آنے والے پیاموں سے متنفر تھا۔ "ابھی تو کل کی بچیاں ہیں بھئی ابھی تو گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ شمس نے تو ابھی تک قرآن مجید بھی ختم نہیں کیا۔ میں ذرا ذرا سی پوئی ایسی بچیوں کو کس دل سے اٹھا کر پرائے گھر میں بھیج آؤں؟ زبان وبان نہیں دوں گا۔ اگلے سال دیکھا جائے گا۔"
"دیکھا جائے گا۔" وہ زیب النساء سے زہرہ اور شمس پر بے تحاشا آئی جوانی کی اطلاعیں پا کر کہتا۔ "اللہ جل شانہ رحم فرمائے گا۔ توکل بڑی چیز ہے عارف کی ماں! کسان جب دھرتی میں بیج بوتا ہے تو اللہ جل شانہ پر توکل کرتا ہے۔ توکل نہ کرے تو بیج وہیں مٹی میں مٹی ہو کر رہ جائے۔ توکل بیج کو چٹکاتا ہے اور دھرتی کو چیر کر پودا نکالتا ہے اور سبز پتیوں کی کوکھ میں بالیوں اور بھٹوں کو پروان چڑھاتا ہے، سمجھیں عارف کی ماں؟"
"پر کسان بیج تو بوتا ہے نا!" زیب النساء بحث کرتی۔ "" تم نے کیا کیا ہے؟"" "الحمدللہ۔" مولوی ابل کہتا۔ "میں نے بہت کچھ کیا ہے، میں نے ہر نماز کے بعد دعائیں مانگی ہیں۔"
اور زیب النساء لاجواب ہو جاتی۔
دعاؤں کے بعد مولوی ابل کا ذہن چودھری فتح داد کی طرف منتقل ہو جاتا۔ آج کتنے برسوں سے اس خدا ترس انسان نے اس کے گھر میں ہر شام کو وظیفہ بھجوایا تھا اور کتنی پابندی سے ہر فصل پر مولوی ابل کو پوشاک پہنائی تھی اور لطف کی بات یہ ہے کہ دوسروں کی طرح ڈھنڈورا

نہیں پیٹا تھا لیکن اب چند روز سے چودھری فتح داد بیمار رہنے لگا تھا۔ ایک بوڑھے نائی نے جو عرصے سے جراحی کا کام کرتا تھا' چودھری کی ریڑھ کی ہڈی کے پھوڑے کے آس پاس کچھ ایسی نشتر زنی کی کہ یہ پھوڑا شام تک سوج کر پھٹ پڑا اور بہنے لگا۔ ساتھ ہی چودھری فتح داد کو لرزے کے بخار نے آلیا اور علاقے کے حکیموں کا تانتا بندھ گیا۔ ان دنوں مولوی ابل کے گھر پر مردنی چھائی رہتی۔ ایک تو مہرالنساء سے اس کی ساس کا برتاؤ سوہان روح تھا' اس پر چودھری فتح داد کی علالت! بچے کسی وقت شور مچاتے تو مولوی ابل چیخ اٹھتا۔ "چپ رہو نامرادو! ادھر چودھری فتح داد بیمار پڑا ہے اور ادھر تم ہنس کھیل رہے ناشکرو! یہ چودھری نہ ہوتا تو آج تک ہم میں سے آدھے آدمی تو فاقوں سے مر گئے ہوتے۔ اللہ جل شانہ کے حضور میں اس کی صحت کی دعا کرو بدبختو!"

مولوی ابل ان دنوں ہر روز صبح و شام چودھری فتح داد کے ہاں مزاج پرسی کو کو جاتا۔ لیکن وہاں عیادت کرنے والوں کے ہجوم میں کبھی کوئی گھر کی بات نہ ہو سکی۔ بس اتنا ہوتا کو مولوی ابل کو دیکھ کر چودھری تعظیماً اٹھنے کوشش کرتا اور پھر کراہ کر اسی طرح منہ کے بل گر جاتا۔ "دعا فرمایئے قبلہ۔" وہ آہستہ سے کہتا اور مولوی ابل آنسو لا کر آسمان کی طرف انگلی اٹھاتا اور کہتا۔ "وہی شافی مطلق آپ کو صحت کلی عطا فرمائے گا" لیکن ایک روز جب مولوی ابل چودھری کے ہاں گیا تو وہاں سوائے اس کے ایک بیٹے کے اور کوئی نہ تھا۔ چودھری کی طبیعت بھی خلاف معمول سنبھلی ہوئی تھی۔ آج وہ حسب عادت تعظیماً کچھ اٹھا' لیکن کراہا نہیں۔ لڑکے کو اشارہ کر کے باہر بھیج دیا اور بولا۔ "بیٹیاں کیسی ہیں قبلہ؟"

"الحمد للہ اچھی ہیں۔ دعاگو ہیں۔ مولوی ابل نے جواب دیا۔

سنا ہے بہت پیغام آرہے ہیں؟" چودھری نے پوچھا۔

مولوی ابل ابھی تک یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ لڑکیوں کے یہ پیغام طرفین کے درمیان سربستہ رازوں کی حیثیت رکھتے ہیں وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جوانی کا ڈنکا پٹتا ہے تو کوئی راز راز نہیں رہتا۔ چونک کر بولا "جی ہاں بہت آرہے ہیں۔"

"پھر کوئی فیصلہ فرمایا آپ نے؟" چودھری مسلسل مولوی ابل کو دیکھے جا رہا تھا۔ مولوی ابل گھبرا سا گیا۔ کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر محسوس کیا کہ اچانک تالو' زبان اور حلق خشک ہو گئے ہیں۔ کچھ نگل کر بولا۔ "جی فیصلہ میں کیا کروں۔ یہ تو اللہ جل شانہ ہی کرے گا۔ جس خالی ڈھنڈار گھر میں خلال کے لئے تنکا نہ ملے وہاں بیٹیوں کے رشتے کون طے کرتا پھرے۔"

"تو قبلہ کیا میں مر گیا ہوں؟" چودھری فتح داد کی آواز میں شکایت کی بھراہٹ تھی۔ "آپ کے دشمن مریں۔" مولوی ابل فوراً بول اٹھا۔ "آپ اللہ جل شانہ کے فضل سے تندرست ہو جائیں تو پھر بیٹھ کر طے کریں گے۔"

"جی ہاں۔" چودھری نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ "فوراً طے ہو جانا چاہئے۔ گھر میں جوان لڑکی بیٹھی ہو تو ایک ایک دن ایک ایک صدی بن جاتا ہے' اللہ تعالیٰ سب سامان کر دے گا۔ وظیفہ تو باقاعدہ پہنچ رہا ہے نا؟"

"جی ہاں" مولوی ابل نے جواب دیا۔ "باقاعدہ"

اللہ قبول فرمائے" چودھری فتح داد نے آہستہ سے دعا کی۔

"آمین" مولوی ابل نے عادتاً اس دعا کی تائید کر دی۔

کچھ دیر خاموشی رہی' چودھری ذرا سا کراہا۔ پھر بولا۔ سنا ہے بٹی مہرالنساء اور شمیم احمد کی خوب نبھ رہی ہے' پر ساس اس کے پاؤں نہیں ٹکنے دیتی۔"

"جی ہاں" مولوی نے بڑے دکھ سے کہا" لیکن میں نے کبھی کوئی دخل نہیں دیا بیٹی بیاہ دی جائے تو پرائی ہو جاتا ہے"

"پر ساس سے کیوں نہیں بنتی؟"

"بس وہی غریبی مفلسی کے طعنے۔ تو کنگلی ہے' تو سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہے' تیرے کپڑوں سے کفن کی بو آتی ہے' تو اپنے ساتھ کیا لائی ہے؟ وہی عورتوں کی باتیں۔"

"ہوں۔" چودھری فتح داد کچھ دیر تک کچھ سوچتا رہا، پھر بولا "بیٹی پرائی نہیں ہو جاتی قبلہ! بیاہ کے بعد تو اس کے حقوق بڑھ جاتے ہیں۔ اب اگر ساس اس قسم کی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اسے اس طعنوں کا موقع ہی نہ دیں۔ وہ بیٹی مہرالنساء کو کتنی کہتی ہے نا؟ اب ہماری بیٹی کے بچہ ہو گا تو اس کے لئے آپ ریشم کے کپڑے، طلائی ٹوپیاں اور سونے کے گھنگھروؤں والے کنگن بھیج دیجئے۔ پھر دیکھئے کس طرح بیٹی کا مان بھی بڑھے گا اور بڑھیا کی پلید زبان بھی کٹ جائے گی۔ ٹھیک ہے نا قبلہ؟"

ٹھیک ہے۔ مولوی ابل نے سوچا، بہت حد تک ٹھیک ہے، مگر ایک حد تک محال بھی ہے۔ یہ سب سامان آخر آئے گا کہاں سے؟ اور ایک عارف کی ماں نے آج سے آٹھ مہینے پہلے مہرن کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ درست تھا۔ اب مولوی ابل کا وہاں دیر تک نچلا بیٹھا رہنا مشکل تھا۔ تو کیا سچ مچ مہرن بیٹی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ اس نے تو زیب النساء سے کبھی پوچھا ہی نہ تھا اور اب زیب النساء نے بھی حیا کے مارے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مولوی ابل بیٹیوں کے پیٹوں کو ٹٹولتے پھرنے کے خلاف ہے۔

مولوی ابل ڈیوڑھی ہی سے پکارا۔ عارف کی ماں!"

زیب النساء بھاگی آئی "خدا خیر کرے، کیا ہوا؟ چودھری کیسا ہے؟"

"اللہ جل شانہ رحم فرمائے گا۔ مولوی ابل بولا۔" عارف کی ماں! سنو، مہرن بیٹی کیسی ہے؟"

زیب النساء چونکی "تمہیں کس نے بتایا؟"

"کب تک ہو گا؟ مولوی ابل آج تو آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"بس اللہ چاہے گا تو آج کل میں" زیب النساء جھینپ کر بولی۔ پر تمہیں کس نے بتایا؟"

مولوی ابل تقریر کے سے انداز میں بولا۔ "بس یہی موقع ہے جب ہم مہرن بیٹی کو ساس کے طعنوں مہنوں سے چھٹکارہ دلا سکتے ہیں۔ ہم اپنے نواسے نواسی کے لئے بہت سا۔"

"اللہ کرے نواسہ ہو۔" زیب النساء نے مولوی ابل کی بات کاٹ دی۔

"جو کچھ ہو" مولوی ابل نے ٹوٹے تار کو جوڑا۔ "ہم بچے کے لئے بہت سا سامان بھیج کر اپنی بیٹی کا مان بھی بڑھائیں گے اور اس بدبخت بڑھیا کی پلید زبان بھی کھینچ لیں گے ہمیشہ کے لئے ٹھیک ہے نا؟"

"کہنا تو بڑا آسان ہے پر کرو گے کہاں سے؟" زیب النساء نے پوچھا۔

"توکل عارف کی ماں، توکل۔" مولوی ابل کے ذہن میں چودھری فتح داد کا میٹھا میٹھا ہمدردانہ لہجہ گھوم رہا تھا۔ "اللہ جل شانہ پر تکیہ کرو" خود مولوی ابل کو اس وقت چودھری پر تکیہ تھا۔

شام ہوتے ہی زیب النساء نے برقع اوڑھا۔ عارف کو ساتھ لیا اور مہرالنساء کے ہاں چلی گئی۔ رات گئے واپس آئی۔ برقعے کو ایک طرف رکھ کر آہستہ سے بولی جاگ رہے ہو عارف کے ابا!"

"ہاں عارف کی ماں۔ کیوں؟ مولوی ابل نے لحاف میں سے سر نکالا۔

"بڑی تکلیف میں ہے مہرن بیٹی شمیم احمد رو رہا تھا بے چارہ۔ شاید کل تک ہو جائے گا۔" زیب النساء نے بڑی کھنکتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

"سچ اماں؟" زہرہ تڑپ کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

"ارے؟" مولوی ابل اور زیب النساء حیران رہ گئے اور پھر اس موضوع پر مزید اظہار رائے کے بغیر ہی سو گئے۔

دوسرے روز بھی کچھ ایسی ہی کیفیت رہی۔ جب بیٹی مارے درد کے چیختی ہے اور ماں باپ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔

اور پھر آدھی رات کو ایک نائن نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولوی ابل نے لپک کر زنجیر کھولی۔ مہرن کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ سارا گھر

جاگ اٹھا اور جب کافی دیر کے بعد سب اپنی اپنی مسکراہٹیں سمیٹ کر اونگھنے لگے تو مولوی ابل زیب النساء کے پاس آیا "اب کیا ہو گا؟"

"چودھری کیسا ہے؟ زیب النساء نے پوچھا۔

"اللہ جل شانہ ہی رحم فرمائے" مولوی ابل کہا۔

زیب النساء اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی "طلائی ٹوپیوں اور سونے کے کنگنوں کو تو جھونکو بھاڑ میں۔ میں تو کہتی ہوں اگر ریشم کا ایک ایک چولا بچی ہی بنوالیں تو ناک رہ جائے کوئی سبیل ہے؟"

"سبیل؟" مولوی ابل سوچ میں پڑ گیا اور اب بولا تو اس کی آواز میں غصہ تھا "تمہاری عقل بھی تو ایڑی میں ہے اور جانے وہاں بھی ہے کہ نہیں۔ سات بیٹیاں ہیں اور پہلی ہی بیٹی کے بیاہ پر کپڑے لتے اور گہنے پاتے یہاں تک کہ انگلیوں کے چھلے بھی جہیز میں دے ڈالے۔ آخر ایک بھوکے مرجھلے امام مسجد کی بیٹی کا بیاہ تھا۔ وہ کوئی نواب زادی تو تھی نہیں کہ کوئی انگلی دھرتا۔ اب ہاتھ بھر لونڈا پیدا ہوا ہے تو اس کے لئے دو ہاتھ کپڑا موجود نہیں اور پوچھتی ہے کہ کوئی سبیل ہے؟۔۔۔۔۔۔ نہیں ہے کوئی سبیل کفن بھی تو نہیں کہ اٹھا کر نواسے کو پہنا دیا۔"

"بکنے کیوں لگے؟ زیب النساء بھی غصے میں بولی "کفن پہنیں اس کے دشمن۔ اللہ وہ سہرے باندھے۔ اب یہ تو مجھ سے نہیں ہو گا کہ خالی ہاتھ مٹکاتی مہرن کے پاس جاؤں۔ اس کی کمینی ساس کے سامنے زبانی زبانی صدقے قربان ہو کر واپس آ جاؤں۔ لعنتوں کی گٹھڑی اٹھا کر۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہو گا۔ جینا اجیرن ہو جائے گا میری بیٹی کا۔ ساس ناک میں دم کر دے گی۔ آنکھیں نہیں اٹھ سکیں گی کسی کے سامنے۔ زہرہ اور شمس کو بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ سب کو پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ تھا وہ ایک دم اگل بیٹھے اور اب وہی سوکھے ٹکڑے توڑتے پھرتے ہیں۔ ساری عمر کنواریاں بیٹھی رہیں گی۔"

"بیٹھی رہیں" مولوی ابل طیش میں آ گیا۔ "اب کہو تو سر پھوڑ ڈالوں اپنا۔ کہہ جو دیا کہ میرے پاس کفن تک نہیں اور تو ریشم کا کپڑا مانگتی ہے۔ کچھ نہیں میرے پاس، سمجھیں؟ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔" مولوی ابل باہر نکل گیا۔

زیب النساء کچھ دیر تک اس خیال سے چپ چاپ بیٹھی رہی کہ وہ آنگن میں کچھ دیر ٹہل کر اندر آجائے گا۔ مگر جب ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز آئی تو وہ بلبلا کر رو دی اور زہرہ النساء اور شمس النساء تڑپ کر بستروں میں سے نکلیں اور بلکتی ہوئی اپنی ماں سے لپٹ گئیں۔

مولوی ابل سیدھا مسجد میں گیا۔ وضو کر کے دیر تک تہجد پڑھتا رہا۔ پھر صبح کی اذان دے کر کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ چند نمازی آئے تو جماعت کرائی اور سورج طلوع ہونے پر گھر آیا تو زیب النساء اسی جگہ بیٹھی اپنی سوجھی سوجھی آنکھوں سے دیوار کو گھورے جا رہی تھی اور زہرہ اور شمس اس کے پاس گٹھڑیاں بنی ہوئی پڑی سو رہی تھیں۔ وہ مجرموں کی طرح چپکے سے اپنی چارپائی تک گیا اور یوں بے حس و حرکت بیٹھ گیا جیسے اسے تصویر اتروانا ہے۔

زیب النساء کی نظریں دیوار سے اتر کر زمین پر جم گئیں۔ مولوی ابل کی نظروں نے ان کا تعاقب کیا مگر مڈ بھیڑ نہ ہو سکی۔ پھر جانے اسے خیال آیا کہ اس نے زور کی ایک آہ بھری۔ اب زیب النساء سے نہ رہا گیا۔ فوراً اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مولوی ابل کے ہونٹوں پر مری مری مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں نے کہا "ادھر آؤ۔"

زیب النساء اٹھ کر اس پاس گئی۔ اب مولوی ابل معصوم ہو چکا تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے؟" زیب النساء نے بڑی پیار بھری شکایت کی۔

"مسجد میں۔" مولوی ابل نے بچوں کی طرح جواب دیا۔

"کیوں گئے تھے؟"

"کیوں جاتے ہیں؟"

"کچھ سوچا؟"

"ہاں"

"کیا سوچا؟"

"یہی کہ صبح ہو گئی ہے۔ تمہیں تو ماں ہونے کے سبب رات ہی کو مہرن کے ہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ رات کو نہ جا سکیں تو اب اس وقت تو تمہارا جانا بہت ضروری ہے۔"

"خالی ہاتھ۔"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"یہی تو سوچ رہا ہوں، تم نے کیا سوچا؟"

"یہی۔"

کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھ رہے۔

"سنو۔" زیب النساء بولی۔ "کہیں سے دس روپے تک قرضہ مل جائے گا۔"

مولوی ابل نے بھویں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ پھر ہونٹوں کو سکیڑ کر زمین کو گھورا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر یوں آہستہ آہستہ اٹھا جیسے کمر ٹوٹی ہوئی ہے تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ابوالبرکات کو کون عقل کا اندھا قرضہ دے گا عارف کی ماں۔ مجھے سب لوگ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ سوکھے ٹکڑے پیٹ میں جا کر آنکھوں میں سے جھانکنے لگتے ہیں۔ مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ سوچتا ہوں آج نواسے کے لئے دو گز کپڑا نہ بھیج سکا تو پھر اس گاؤں میں کاہے کو رہوں گا۔"

زیب النساء بڑی مہارت سے امڈے ہوئے آنسو پی گئی۔ بولی۔ "چودھری کیسا ہے؟"

"وہیں جاتا ہوں" مولوی ابل نے جماہی لے کر کہا۔ "ذرا سا بھی اچھا ہوا تو مہرن کو ضرور پوچھے گا۔ ہو سکتا ہے اللہ جل شانہ کوئی سبیل پیدا کر دے۔"

مولوی ابل کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ زیب النساء نے برقعے کو جھاڑ کر الگنی پر ڈال دیا اور عارف کو منہ ہاتھ دھونے اور تیار ہو جانے کو کہا۔ زہرہ اور شمس نے ضد کی کہ وہ بھی اپنے بھانجے کو دیکھنے جائیں گی۔ "ابھی ٹھہرو بیٹی!" زیب النساء یوں آہستہ سے بولی جیسے اس وقت ذرا سی بھی بلند آواز سے کوئی چیز چھن سے ٹوٹ کر رہ جائے گی۔

"انتظار ــــــــ"

"انتظار ــــــــ"

ماں کے تیور دیکھ کر بچے بھی سہمے بیٹھے تھے، اور ماں چڑیا کے اڑنے تک سے چونک کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

اور پھر ڈیوڑھی کے کواڑ دھڑاک سے بج کر کھلے اور مولوی ابل زندگی میں شاید پہلی بار بھاگتا اور ہانپتا ہوا اندر آیا اور چلایا۔ "عارف کی ماں، اے عارف کی ماں!"

زیب النساء باہر لپکی اور اس کے پیچھے زہرہ، شمس، عارف، قمرن، عمرہ اور دوسرے بچے یوں نکلے جیسے کمرے میں سے کسی بگولے نے انہیں اٹھا کر باہر پھینک دیا ہے۔

اور مولوی ابل اسی بجتے ہوئے لہجے میں چلایا "مبارک ہو عارف کی ماں! تم نواسے کے چولے کو رو رہی تھیں۔ اللہ جل شانہ نے چولے چنی اور ٹوپی تک کا انتظام فرمادیا۔ جنازے پر کچھ نہیں تو بیس روپے ضرور ملیں گے۔ ابھی کچھ دیر میں جنازہ اٹھے گا۔ چودھری فتح داد مر گیا

ہے!"

زیب النساء نے اس زور سے اپنی چھاتی پر دو ہتڑ مارا کہ بچے دہل کر رو دیے۔

اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی ابل کو گردن سے دبوچ لیا۔ اس کی اوپر اٹھی ہوئی پتلیاں بہت اوپر اٹھ گئیں۔ پھر ایک لمبے کے دردناک سناٹے کے بعد مولوی ابل جو مرد کے چلا چلا کے رونے کو ناجائز اور خلاف شریعت قرار دیتا تھا۔ چلا چلا کر رونے لگا اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر بھاگ گیا۔

احمد ندیم قاسمی

لارنس آف تھلیبیا

پلنگ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر جو کھیس بچھا تھا وہ چار کھیسوں کے برابر تھا۔ اس کے وسط میں مخمل کے ایک گاؤ تکیے کے سہارے بڑے ملک صاحب کے جسم کا ڈھیر پڑا تھا۔ ان کی انگلیوں' انگوٹھوں' پنڈلیوں' رانوں' کمر' پیٹھ' کندھوں اور سر کو بہت سے میراثی' نائی' جھیور' دھوبی' موچی' کمہار اور کسان دبا رہے تھے۔ میں ذرا دور بیٹھا تھا اس لئے وہاں سے مجھے یہ منظر یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے ایک بڑے سے غبارے کو ہوا میں اڑ جانے سے روکنے کے لئے اس کے ساتھ بہت سے بچے چمٹ کر رہ گئے ہوں۔ پھر خدا بخش نے چوپال میں قدم رکھا۔ بڑے ملک صاحب بولے۔ "آج چھوٹا ملک بہت خوش ہے آج اس کا یار آیا ہوا ہے لاہور سے۔" انہوں نے ایک لمبی کانکھ کے ساتھ پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی اور شاید مسکرانے کی بھی کوشش کی مگر یہ مسکراہٹ مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ ان کے سوجے ہوئے گالوں اور گھنے گل مچھوں سے ٹکریں مار کر وہیں کہیں مر گئی۔

میں دور اس لئے بیٹھا تھا کہ میرے لئے چائے آنے والی تھی۔ بشکو چوپال کے برآمدے کے آخری سرے پر دو کرسیاں اور ایک تپائی رکھ کر اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر' خدا بخش کو بلانے اور چائے لانے چلا گیا۔ بشکو خدا بخش کا بہت چہیتا نوکر تھا۔ نام تو اس کا بھی خدا بخش تھا مگر خدا بخش اسے بشکو کہتا تھا۔ چنانچہ یہی اس کا نام پڑ گیا۔

خدا بخش کی امی کو نزلے اور بخار کی شکایت تھی اس لئے وہ بار بار اندر حویلی کا چکر لگا آتا تھا۔ اب کے وہ واپس آیا تو میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بتایا کہ "اس کی امی کا بخار اب ہلکا ہے اور وہ آرام کر رہی ہیں۔ ان کا بخار تیز رہتا تو آج میں تمہیں باز کے شکار کا تماشہ نہ دکھا سکتا۔ وہ بولا۔ "لارنس آف عربیا کی طرز پر میں نے اپنے باز کا نام لارنس آف تھلیبیا رکھ لیا ہے۔ تھل کو تھلیبیا میں بدلنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" وہ ہنسا۔ "ابھی چائے کے بعد تم اور میں اور بشکو گاؤں سے باہر نکل جائیں گے۔ بشکو میرے باز کا سائیس ہے۔" وہ پھر ہنسا۔ "یوں سمجھ لو کہ وہ لارنس آف تھلیبیا کا اردلی ہے۔ وہ باز کو اپنی مٹھی پر بٹھائے گا اور ۔۔۔۔۔۔"

دھم دھم کی آواز سے ہم چونکے' دیکھا تو دو آدمیوں نے ایک اور آدمی کو پکڑ کے بڑے ملک صاحب کے سامنے جھکا رکھا تھا اور ملک صاحب اسکی پیٹھ پر مکوں کا مینہ برسا رہے تھے اور ساتھ ہی ایسی گالیاں بھی دیتے جاتے تھے جو صرف بڑے ملک ہی کسی کو دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ہانپ ہانپ کر کہتے جاتے تھے۔ "بھری مجلس میں کہتا ہوں' ملک جی' تہ بند سنبھالو' ننگے ہو رہے ہو۔ اس حرامزادے سے کوئی پوچھے کہ تمہیں کیا تکلیف تھی۔ میں ہی ننگا ہو رہا تھا تمہاری ماں تو ننگی نہیں ہو رہی تھی۔"

خدا بخش نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "آ گئی شامت بے چارے کی۔ اب جب تک یہ ہاتھ پیر ڈھیلے نہیں چھوڑ دیتا۔ ابا اسے کوٹتے ہی رہیں گے۔"

خدا بخش کے لہجے میں برتری کا غرور تھا۔ میں نے کہا۔ "خدا بخش تمہیں شرم نہیں آتی؟۔ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔"

خدا بخش نے معذرتی انداز میں کہا۔ "کیا کریں یار ۔۔۔۔۔۔ ان لوگوں سے یہی سلوک کیا جائے تو سیدھے رہتے ہیں۔"

اتنے میں بشکو چائے لے آیا طشت کو تپائی پر رکھتے ہوئے اس نے جھک کر خدا بخش کے کان میں کہا۔ "مسکین ایسا برا لڑکا تو نہیں

چھوٹے ملک۔ پھر اسے مار کیوں پڑ رہی ہے؟"

"اچھا تو یہ مسکین ہے!" خدا بخش نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ اس کے تو منہ میں زبان بھی نہیں ---- پانچ وقت کا نمازی ہے اذان ایسی دیتا ہے کہ چڑیاں مسجد کے میناروں پر اتر آتی ہیں۔ اس نے یہ کیا بک دیا ابا سے!

بڑے ملک صاحب کے دھموکوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ مسکین ان آدمیوں کے ہاتھوں میں لٹک گیا تھا جنہوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ملک صاحب کی آسانی کے لئے ان کے سامنے جھکا رکھا تھا۔

"اب چھوڑ دو اس کمینے کو۔" ملک صاحب کڑکے اور سکین منہ کے بل 'پتھر کی طرح گر پڑا۔ "اٹھا لے جاؤ اپنی ماؤں کے اس یار کو ---- ملک صاحب پھر گرجے اور ایک ہجوم کا ہجوم سکین کو اٹھانے یوں بے تابی سے بڑھا جیسے سب لوگ سکین کو اٹھانے کے بہانے ملک صاحب کو پلنگ پر سے اٹھا کر پھینکنے چلے ہیں۔ پھر جو لوگ سب سے پہلے بے حس و حرکت سکین کے پاس پہنچے تھے اسے اٹھانے کے لئے جھکے تو جھکنے والوں میں سے ایک سیدھا ہو گیا اور بڑی تشویش سے بولا۔ "سکین تو اذان پڑھ رہا ہے!"

پھر سکین خود ہی اٹھا بیٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جیسے ملک صاحب سے جانے کی اجازت لینے کے لئے بولا۔ "سورج تو بہت ڈھل گیا پیشی کی نماز تو ہو چکی ہو گی؟

سبھی کو خاموش پا کر وہ اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چھ فٹ کا ایک وجیہہ جوان تھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا' چوپال کے چبوترے کی سیڑھیاں اتر کر گلی میں جانے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے گلی میں ایک مینار چل رہا ہے۔

"آ جاتے ہیں ماں کے یار چوپال پر گپ لڑانے کے لئے۔" بڑے ملک صاحب کہہ رہے تھے۔ "چوپال پر بیٹھنے کی ایک تمیز ہوتی ہے۔ کہنے لگا ملک جی ننگے ہو رہے ہو ---- ہو بھئی میں ننگا ہو رہا ہوں تو تم دھیان نہ دو۔ انسان دوپہر کے وقت بھی آنکھیں بند کر لے تو اس کے لئے سورج ڈوب جاتا ہے۔ پھر تم آنکھیں پھاڑے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" ذرا سا رک کر انہوں نے پلٹنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں چھوٹے ملک؟ چائے پلا دی اپنے یار کو؟" جواب کا انتظار کئے بغیر فوراً ہی انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور بولے---- "لو بھئی اسے دبا دو۔ دکھنے لگا ہے حرامزادے کی ہڈیاں کوٹ کوٹ کر۔"

"یہ حرامزادہ کون تھا؟" میں نے آہستہ سے خدا بخش سے پوچھا۔

"اس کا نام سکین ہے؟" خدا بخش بولا۔ "ذات کا جولاہا ہے۔ یہ کھیس جو ابا کے پلنگ پر بچھا ہے اسی نے بنا ہے' بڑا کاریگر آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی مگر بہت بھولا ہے۔ نہ جانے ابا کو ٹوکنے کا حوصلہ کیسے ہوا اس بدنصیب کو! یہ تو بڑا ہی مسکین آدمی ہے۔"

بشکو فوراً بولا۔ "اس کا اصلی نام مسکین ہے جی۔ محمد مسکین۔ سکین سکین تو لوگ اسے ویسے ہی کہتے ہیں' جیسے مجھے بشکو کہتے ہیں۔"

"میں نے کہا۔ "یہاں آ کر معلوم ہوا کہ مسکین جیسے لفظ میں بھی بگڑنے کی گنجائش موجود ہے۔"

"آہستہ بولو یار۔" خدا بخش نے ڈر کر بڑے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ انہوں نے سن لیا تو شاید تمہیں تو کچھ نہ کہیں' میری آفت آ جائے گی۔"

"نہیں ---- اب کیا آفت اٹھے گی۔ اب تو ان کا ہاتھ دکھ رہا ہے۔"

خدا بخش کو میرا لہجہ اچھا نہ لگا اس نے جیسے ملامت بھیجتے ہوئے مجھے دیکھا اور بشکو سے کہا۔ "اصطبل میں جا کر دیکھو' تکے نے گھوڑے تیار کر لئے ہیں یا نہیں۔ زینیں کس لی ہوں تو تم جا کر لارنس کو اٹھا لاؤ۔ صبح کا بھوکا ہے۔" بشکو چلا گیا تو خدا بخش میری طرف مڑا۔ "دیکھو میاں یہاں آج تمہارا پہلا دن ہے اور تم آج ہی طنز کرنے لگے ہو میرے ابا پر ---- اس علاقے کا ایک مقولہ ہے کہ سر جتنا بڑا ہوتا ہے۔ درد سر کا رقبہ اتنا ہی پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ابا کو یہ پٹائیاں مجبوراً کرنی پڑتی ہیں ------ نہ کریں تو زمینداری کیسے چلے ---" وہ رک گیا' پھر بولا --- "تم کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ جس لمبے چوڑے پلنگ پر ملک صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اس کے پائے کتنے بڑے بڑے ہیں۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا تو وہ لکڑی کے نکلے۔"

حیران ہو کر خدا بخش نے پوچھا۔ "لکڑی کے نہ ہوتے تو اور کس کے ہوتے؟ تم نے پہلے کیا سمجھا تھا؟"

میں نے کہا۔ "میں سمجھا یہ پائے نہیں' بلکہ پلنگ کے ہر کونے کے نیچے ایک ایک مسکین کھڑا ہے۔"

"گاؤں کی کھلی فضا کا تم پر الٹا اثر ہوا ہے۔" خدا بخش بولا۔ "تم چکرا گئے ہو۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اور خدا بخش۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر یہ چاروں مسکین پلنگ کے چاروں کونوں کے نیچے سے نکل جائیں تو پلنگ زمین پر آ رہے۔"

"گھوڑے تیار ہیں چھوٹے ملک۔" بشکو ہمارے سروں پر بولا۔

بشکو کے بائیں ہاتھ کی بند مٹھی پر چمڑے کا دستانہ چڑھا ہوا تھا جس پر لارنس آف تھلیسیا بیٹھا تھا۔ اس کے پنجے میں باریک سی ایک زنجیر تھی جس کا آخری سرا دستانے میں اٹکا ہوا تھا۔ باز کی آنکھوں پر چمڑے کے کھوپے چڑھے ہوئے تھے۔ خدا بخش نے سر اٹھا کر یہ کھوپے ہٹائے تو میں نے دیکھا کہ باز کی آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی۔

"کیوں کیسا ہے میرا باز؟" خدا بخش نے پوچھا۔

اور میں نے اس کے کان میں کہا۔ "بازوں کا بڑا ملک معلوم ہوتا ہے۔"

خدا بخش ہنس پڑا۔ مگر یوں ہنسا جیسے نہ ہنستا تو اور کیا کرتا۔ اس نے باز کی آنکھوں پر پھر سے کھوپے چڑھائے اور ہم لوگ اصطبل کی طرف چلے۔

خدا بخش نے قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلایا کہ اس نے جو گھوڑا مجھے سواری کے لئے دیا تھا وہ ملک صاحب کے اصطبل کا مسکین ترین گھوڑا تھا۔ "اتنا موٹا تازہ گھوڑا مسکین تو نہیں ہو سکتا۔" میں نے شبہ ظاہر کیا۔ مگر اس نے مجھے بتایا۔ "اس کے اندر کا گھوڑا اپنا مار دیا گیا ہے اب یہ طبیعت کا بہت غریب گھوڑا ہے اسے موٹا تازہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ضلع کے افسر لوگ جو اس طرف دورے پر آتے ہیں اچھے سوار نہیں ہوتے' ہوتے بھی ہیں تو کاروں میں پھیل پھیل کر بیٹھنے کی عادت پڑی ہوتی ہے اور گھوڑے کی پیٹھ پر چوکس ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ سو ابا نے اس کام کے لئے یہ گھوڑا چنا کہ اس پر افسر سوار ہو تو اس کی افسری کی شان بھی قائم رہے اور یوں بھی نہ ہو کہ لگام کو ذرا سا بھی ڈھیلا پا کر وہ افسر کو اپنی پیٹھ پر سے ریٹائر کر دے۔ چنانچہ اس گھوڑے پر یا تو ڈپٹی کمشنر بیٹھے ہیں یا آج تم بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا۔ "تو جبھی اس وقت تم مجھے پٹواری لگ رہے ہو۔"

خدا بخش کا گھوڑا بہت منہ زور تھا۔ کنوتیاں اٹھا کر اور نتھنے پھلا کر وہ جیسے لگام کو چبا کر اڑ جانا چاہتا تھا۔ مگر خدا بخش اچھا سوار تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو میرے گھوڑے سے آگے نہ بڑھنے دیا جس کی کنوتیاں تو اٹھی ہوئی تھیں مگر چل یوں رہا تھا جیسے سسرال کے صحن میں پہلی بار داخل ہوتے ہوئے دلہنیں چلتی ہیں۔

بشکو باز کو ہاتھ پر بٹھائے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ بھاگ بھی نہیں رہا تھا اور چل بھی نہیں رہا تھا۔ بس بین بین کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔

کیکروں کے گنجان ذخیرے کا موڑ کاٹتے ہی حد نظر تک پھیلا ہوا ایک چٹیل ویرانہ تھا۔ جس میں کہیں کہیں بہت فاصلے پر کیکر اگے ہوئے تھے مگر یہ کیکر بیمار سے لگتے تھے۔ ان کے قد بہت چھوٹے اور شاخیں بہت ٹیڑھی اور ننگی تھیں۔ لالیاں شام سے پہلے انہی اکا دکا کیکروں پر آ کر بیٹھتی ہیں ــــــ" خدا بخش نے مجھے بتایا۔ "اور لالی باز کا من بھاتا کھاجا ہے۔ میرا لارنس آف تھلیسیا کی وہسکی ہے!

میں نے کہا۔ "خدا بخش لالی تو بڑا ہی معصوم پرندہ ہے۔ یہ تو چڑیا سے بھی زیادہ معصوم ہوتا ہے۔ اس کی پیلی پیلی' پکی پکی باچھیں اس پر کیسا بچپنا سا طاری کئے رکھتی ہیں۔ پھر یہ پرندوں میں شاید سب سے زیادہ بے ضرر ہے۔ یہ تو نہایت مسکین مخلوق ہے۔ آخر تم لوگوں کو

مسکینوں کا خون پینے کا اتنا شوق کیوں ہے۔؟"

خدا بخش بولا۔ "اگر تمہیں تقریر کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو راستے میں ابھی کوئی ٹیلا آئے گا' تم اس پر چڑھ جانا اور اپنی تقریر جھاڑنا۔ میں اور بشکو دست بستہ سنیں گے۔ مگر ابھی ذرا رک جاؤ۔ میرے لارنس کو دیکھو' بشکو کی مٹھی پر کیسے بار بار پھڑ پھڑا جاتا ہے۔ اس نے ویرانے کی بو' سونگھ لی ہے۔"

"لالی"! بشکو سانپ کی طرح پھنکارا اور خدا بخش نے گھوڑا روک لیا۔ میرا گھوڑا تو اس کی دیکھا دیکھی چل رہا تھا۔ چنانچہ وہ بھی رک گیا۔

خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارنے سے پہلے مجھے غور سے تماشہ دیکھنے کی تلقین کی۔

"یہ تمہاری زندگی کا ایک کبھی نہ بھولنے والا تجربہ ہو گا۔

اس نے کہا "مزہ آجائے گا جب باز لالی پر جھپٹے گا تو ایسی آواز پیدا ہو گی جیسے ہوا کو ہوا کاٹ رہی ہے۔

"دیکھو۔" خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارے اور اس کا رخ دور ایک ٹیڑھے میڑھے کیکر کی طرف کر دیا۔ جس نے ایک لالی کو لا بٹھایا تھا۔ ایک دم باز پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس نے دیکھ لیا لالی کو۔ خدا بخش نے خوش ہو کر مجھے بتایا اور بشکو نے باز کے پنجے کو اپنے دستانے سے آزاد کر دیا۔ موت کی تلوار ہوا کاٹتی ہوئی چلی گئی اور لالی اڑ گئی۔ مگر باز نے آن کی آن میں اس کو جا لیا۔ لالی کی ایک چیخ نے اس ویرانے کو ذرا سا چونکا دیا' اور پھر باز لالی کو اپنے پنجوں میں دبائے واپس بشکو کی مٹھی پر آبیٹا تب اس نے لالی کی چیر پھاڑ شروع کر دی۔ اس کی مڑی ہوئی چونچ لالی کے خون میں رنگ گئی' پھر اس نے لالی کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دیں اور خدا بخش بولتا رہا۔ "اس کے کھانے کا قرینہ دیکھو ---- ہڈی پر سے گوشت کیسے اتارتا ہے' انسان کو بھی ایسا سلیقہ نصیب نہیں اور پھر یہ تو کچا گوشت ہے تازہ اور وٹامن سے بھرپور!"

"لعنت!" میں نے کہا۔ "تمہاری ذہنیت تو آدم خوروں کی سی ہے۔"

مگر خدا بخش ہنستا رہا اور میری طرف یوں دیکھتا رہا جیسے میں بیمار ہوں اور وہ میری دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔

باز جب لالی کو چبا چکا تو جیسے اسے نشہ ہو گیا' اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا بخش بولا۔ "لارنس آف تھلیسیا آؤٹ ہو گیا----" پھر ہنستا ہوا وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ باگ موڑی مگر پھر رک گیا۔ کچھ سوچ کر بولا۔ "کیوں بشکو یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو بابا یارو کو کیوں نہ دیکھتے چلیں۔؟"

بشکو بولا۔ "بابا یارو کی آنکھ بھی باز کی طرح تیز ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے ہمیں دیکھ ہی لیا ہو' ہم واپس چلے گئے تو وہ ضرور گلہ کرے گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" خدا بخش میری طرف مڑا۔ "چلو تمہیں تھل کی چائے پلائیں۔ یہاں قریب ہی ہمارے پرانے مزارعے بابا یارو کا ڈیرا ہے' وہاں چلتے ہیں۔ تم اس سے مل کر خوش ہو گے۔"

باز نے جس وحشت سے لالی کو کھایا تھا' اس سے میری طبیعت بالکل مضمحل ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "جہاں چاہو چلے چلو۔"

ڈھائی تین میل کا فاصلہ طے کر کے ہم سرخی مائل مٹی سے لپے ہوئے ایک گھروندے کے پاس پہنچے۔ خدا بخش نے چپکے سے اترنے اور آہستہ آہستہ قریب جانے کی تجویز پیش کی۔ وہ بولا "ایک بار میں اور بشکو یونہی چپکے سے آئے اور بابا یارو کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بابا یارو اپنی رسیاں بٹنے میں مگن رہا' مائی بیگاں چولہے میں پھونکیں مارتی رہیں اور نگی ٹوکے سے چارہ کترتی رہی کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ پھر جب انہیں پتہ چلا تو بابا یارو اتنا شرمندہ ہوا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ منہ سے بس ہپ ہپ کر کے رہ گیا۔ مائی بیگاں اپنے بڑھاپے کو گالیاں دیتی رہی اور نگی تو اتنا ہنسی کہ جب بابا کی پھنکار پر بھی اس کی ہنسی رکنے میں نہ آئی تو وہ اندر کوٹھے میں بھاگ گئی۔"

گھروندے کے پچھواڑے گھوڑوں پر سے اتر کر ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے' صحن میں کیکر کے بڑے بڑے درخت تھے' نیچے ایک گائے

اور چند بھیڑیں 'بکریاں شاید عادتاً" بیٹھی تھیں کیونکہ درختوں کے سائے اپنے تنوں کے سائے سے بہت دور جا چکے تھے۔ ان بھیڑوں کے پاس کھٹولے پر بابا یارو بیٹھا اون بٹ رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چولہے میں آگ جل رہی تھی اور مائی بیگاں ہانڈی میں چمچ چلا رہی تھی جیسے پتھر ابال رہی ہے۔ دونوں اپنے اپنے کام میں ایسے محو تھے کہ انھیں ہمارے آنے کا پتہ نہ چلا پھر اچانک مائی بیگاں بولی۔ "ہائے مجھے تو بہت چنتا لگ رہی 'رنگی کو اب تک تو آجانا ہی چاہیے تھا۔

"آجائے گی۔" بابا یارو بولا۔ "کہاں گئی ہے" "اپنے ملکوں کے ہاں گئی ہے نا؟ تو پھر اپنے ہی گھر گئی ہے جانتی نہیں ہو ملک کی بیٹی اس کی کتنی پکی سہیلی ہے؟ وہ دوپٹہ یاد ہے جو اس نے پچھلی گرمیوں میں رنگی کو دیا تھا؟ اتنا بڑھیا ریشم تھا کہ رنگی اسے نہ کرتی گئی اور آخر وہ اتنا ذرا سا رہ گیا کہ تمہارے چنے کے چھلے میں آگیا۔ سو روپے کا ہو گا یہ دوپٹہ۔ وہ اپنی اتنی پیاری سہیلی کے پاس گئی ہے تو فکر کی کون سے بات ہے۔ رات بھی رہ لے تو سمجھو فرشتوں کے گھر مہمان ہے۔"

خدا بخش نے آہستہ سے کہا۔ میرے خیال میں واپس چلنا چاہیے۔ ان بے چاروں نے ہمیں دیکھا تو خاطر مدارات میں لگ جائیں گے۔"

بشکو بولا۔ "اور پھر چائے پکانا تو مائی کو آتا ہی نہیں جو شاندہ گھولتی ہے۔ رنگی ہوتی تو پی لیتے۔ ایسی چائے پکاتی ہے کہ نشہ ہو جاتا ہے۔"

خدا بخش بے اختیار ہنس پڑا تو مائی اور بابا نے چونک کر دیکھا اور ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ خدا بخش سے رکنے 'بیٹھے اور چائے پینے کی یوں التجائیں کرنے لگے جیسے اگر خدا بخش نے ان کی بات مان لی تو ان کا گھروندا سونے چاندی کے محل میں بدل جائے گا اور ان کی بکریاں گھوڑے بن جائیں گی۔

خدا بخش نے انہیں سمجھایا کہ "سورج ڈوبنے کو ہے اور ہم دشمنوں والے لوگ ہیں۔ شام کے بعد تو ہماری حویلی کی فصیل پر رائفلوں والوں کا پہرہ ہوتا ہے تم تو جانتے ہو بابا یارو امیں شام سے پہلے گھر نہ پہنچا تو بڑے ملک قیامت مچادیں گے 'ہمارا باز لالی کا شکار کرنے آیا تھا' سوچا تمہیں دیکھتے چلیں 'ٹھیک ہونا؟ کوئی تکلیف تو نہیں۔ اچھا اب تم بیٹھو ہم چلے۔" رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے خدا بخش بولا۔ "رنگی کی فکر نہ کرو' اگر اسے دیر ہو گئی تو میری بہن اسے روک لے گی۔۔۔۔ اور اب تو دیر ہو ہی چکی ہے۔"

بابا یارو بولا۔ "آج صبح اسے ایک جھاڑی کی جڑ میں اگی ہوئی بہت سی چونگیں ملیں۔ اس کی سہیلی کو چونگیں بہت پسند ہیں اس لیے رٹ لگا دی کہ وہ ملکوں کی حویلی میں جائے گی۔ کپڑے دھوئے 'سکھا کر پہنے اور پھر دوپہر کو چونگوں کی پوٹلی باندھ کر چلی گئی۔ ویسے تو وہ سیانی ہے پر سوچتا ہوں 'اگر اسے راستے میں شام پڑ گئی تو۔۔۔۔ تو ویرانہ ہے 'ڈر لگتا ہے۔"

خدا بخش نے اسے تسلی دی۔ "ہماری زمینوں پر ایک چڑیا تک کو خطرہ نہیں تو رنگی کو کیا ڈر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رنگی بابا یارو کی بیٹی ہے اور سب جانتے ہیں کہ بابا یارو کس کا آدمی ہے۔۔۔۔ تم فکر نہ کرو' لو ہم چلے۔"

واپسی پر خدا بخش نے بازوں اور شکروں کے سلسلے میں بے حساب معلومات سے مجھے لاد ڈالا 'میرے ذوق کی رعایت سے اس نے خوشحال خاں خٹک اور علامہ اقبال کے شاہینوں کا بھی ذکر کیا اور بعض پرانے سکوں 'تلواروں کے قبضوں اور لبادوں کے بٹنوں پر بازوں کی تصویروں کے بارے میں بتا کر ثابت کیا کہ باز ایک شاہی پرندہ ہے 'آخر میں اس نے یہ مسکت دلیل دی "تم نے آج تک کبھی نہیں سنا ہو گا کہ کسی غریب آدمی نے باز پالا ہو۔"

"غریب آدمی تو لالیاں پالتے ہیں۔" میں نے کہا۔

خدا بخش میرے طنز کا کچھ جواب دینے ہی لگا تھا کہ اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ کیکروں کے ذخیروں کے موڑ پر یکا یک ایک نوجوان لڑکی ہمارے سامنے آگئی تھی ۔۔۔۔ وہ رنگی تھی۔ نہ جانے اس کا اصل نام کیا تھا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ رنگوں کا ایک پیکر

ہے۔۔۔۔ سات رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اس کی آنکھوں' بالوں' چہرے اور ہونٹوں سے جو رنگ بچ رہے تھے وہ اس کی نہ بند کرتے اور اوڑھنی میں جذب ہو گئے تھے۔ اس وقت سورج سپاٹ میدان کے پرلے کنارے پر تھوڑی ٹیکے' جیسے زمین کا آخری نظارہ کر رہا تھا۔ آسمان کے وسط میں بادل کے چند ٹکڑے ابھی سے گلابی ہو گئے تھے اور یہ گلاب کیکروں کے ذخیرے کے اس موڑ پر برس رہا تھا۔ اگر ایک بے رنگ چپلی میں نکلے ہوئے رنگی کے پاؤں کے ناخن ٹوٹے ہوئے نہ ہوتے تو اسے زمینی مخلوق قرار دینے کے لئے مجھے اپنے آپ سے خاصی طویل جنگ لڑنی پڑتی مجھے ایسا لگا کہ کٹر سے کٹر ملحد کو بھی رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خدا کا قائل کیا جا سکتا ہے جو اس انتہا کا حسن کار ہے۔

یہ سب کچھ میں نے ایک لمحے میں سوچا جس میں بس اتنا ہوا کہ خدا بخش نے گھوڑی کی لگام کھینچی۔ رنگی ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور بشکو پیچھے سے بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ "دیکھا چھوٹے ملک" رنگی کتنی بے وقوف ہے۔ اری یہ بھی کوئی وقت ہے اتنے لمبے سفر کا؟ تجھے ملکانی نے روکا نہیں۔۔۔؟"

"چل واپس۔۔۔۔" خدا بخش نے بڑی اپنائیت سے حکم دیا۔ "جو ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے مزارعوں کے بھی دشمن ہیں' اور ہمارے دشمن بے شمار ہیں۔ سورج ڈوب رہا ہے' چاند کی رات بھی نہیں ہے' اتنا لمبا ویران راستہ ہے اور چل کھڑی ہوئی ہے اس وقت۔ چل واپس۔ میں جا کر اپنی بہن کی خبر لیتا ہوں کہ ایسا سلوک کیا جاتا ہے اپنی سہیلی سے۔ غریب سہی پر کیا انسان نہیں ہے رنگی؟ چل رنگی۔"

رنگی صرف دو لفظ بولی مگر انہوں نے بھی اس کے حسن میں جیسے ایک چھناکا سا پیدا کر دیا۔ "بابا بے چارہ۔"

"ہم سمجھا آئے ہیں بابا کو۔۔۔۔" خدا بخش فوراً بولا۔ "ہم نے کہہ دیا تھا کہ اگر رنگی ہمیں گاؤں کے پاس مل گئی تو ہم اسے واپس حویلی میں لے جائیں گے۔۔۔۔ ایسے وقت ویرانوں میں نہیں نکلتے نادان۔ زمانہ بڑا خراب ہے چل۔"

رنگی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ بشکو کے ساتھ حویلی' کی طرف چلی گئی اور ہم چوپال پر آ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد بڑے ملک صاحب نے مجھ سے باز کے شکار کا پوچھا اور پھر کافی دیر تک بازوں' شکروں' کتوں اور گھوڑوں کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے خدا بخش سے سرگوشی کی۔ کیا تمہارے ہاں شکروں اور کتوں کی باتیں ہوتی ہیں؟ انسانوں کی نہیں ہوتیں۔؟

"ارے چپکے رہو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "ورنہ ابا پکڑ کر سکین بنا ڈالیں گے۔"

بڑا ملک اٹھ کر چلے گئے تو چھوٹے ملک کی گپوں کی باری آئی۔ وہ بیشتر وقت اپنے لارنس آف تھلیسیا کی تعریف کرتا رہا اور ایک بار بشکو نے آ کر اس سے کوئی بات کی۔ اور وہ رکا سننے والوں کو داد تحسین کا موقع ملا۔ "بابا رحمن کہتا ہے وہ ایک صدی کا ہو رہا ہے مگر آج تک اس نے اس بلا کا باز نہیں دیکھا وہ کہتا ہے۔ چھوٹے ملک کا باز' بازوں کا شیر ببر ہے۔"

جب خدا بخش بھی حویلی میں چلا گیا اور بشکو بھی میرا بستر جما کر اور تپائی پر پانی کا ایک جگ رکھ کر روانہ ہو گیا تو میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔۔۔۔ آسمان اتنا صاف تھا کہ سیاہ ہو رہا تھا۔ تارے اتنے بے شمار تھے کہ انکی طرف دیکھتے ہوئے سر چکرا جاتا تھا۔ گاؤں پر مکمل سناٹا تھا۔ رات کا آغاز تھا اس لئے کتے تک سو گئے تھے' صرف جھینگر جاگ رہے تھے مگر جھینگروں کی آواز بھی تو سناٹے کا ایک حصہ ہی ہوتی ہے۔

تب رنگی کا پیکر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس تناؤ اور اعتماد کے ساتھ جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ کوئی نقص ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈو۔۔۔۔! میں نے رنگی کے اس پیکر کو جسے میں نے شام کے ایک گلابی لمحے میں اپنے ذہن کے اندر محفوظ کر لیا تھا ہر زاویہ سے جانچا اور تب میں نے کہا۔۔۔۔ "ہاں رنگی تم میں ایک نقص تو موجود ہے اور وہ نقص یہ ہے کہ تم انسان ہو' اور انسان بڑی کمزور مخلوق ہے۔"

چوپال کے زیریں آنگن میں کیکر پر چڑیوں نے واویلا مچایا' میری آنکھ کھلی۔ قریب ہی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی جانے والی تھی اور کوئی اونچی آواز میں تکبیر پڑھ رہا تھا۔ "قد قامت الصلوۃ' قد قامت الصلوۃ" صبح کے ہلکے ہلکے اجالے میں مسجد کے مینار آسمان کے پس منظر میں متحرک معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایک مینار کے کلس پر ایک چیل اتری اور اسے اپنا توازن قائم رکھنے کے لئے دیر تک پروں کو بار بار پھیلانا پڑا۔ اس پر

بھی جب تنگ کر نہ بیٹھ سکی تو اڑ گئی ۔ منہ اندھیرے یہ چیل کہاں سے آ گئی ؟ میں نے سوچا ۔ پھر میں نے خود کو جواب دیا " جہاں سے یہ چڑیاں آئی ہیں ۔ "

سورج ابھی نہیں نکلا تھا ۔ جب مشکو میرے لئے ملائی سے اٹا ہوا دودھ کا ایک گلاس لایا ۔ غسل خانے میں منہ پر پانی کا ایک چھینٹا مار کر میں باہر آیا تو تو خدا بخش چوبال کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا ۔ " چلو ذرا ذخیرے تک گھوم آئیں ۔ " اس نے کہا ۔ " وعدہ کہ آج میں تم سے انسانوں کی باتیں کروں گا ۔ "

" چلو ۔۔۔ " میں نے کہا ' پھر میں سیڑھیوں پر رک گیا ۔۔۔ " سنو ' کیا رنگی چلی گئی ؟ "

دفعتاً " خدا بخش کو اس زور کی ہنسی چھوٹی کہ وہ ہنستا ہنستا میرے پلنگ پر جا گرا ۔ " آخر کار چتر میں بھی جونک لگی تو ۔۔۔ قہقہوں کے دوران وہ اپنی رانوں کو پیٹ کر کہتا رہا ۔۔۔۔ " برف کی تہہ بہت موٹی تھی مگر آخر ٹوٹی تو ۔ " پھر وہ مجھ سے لپٹ گیا ۔ " یار مجھے تم پر ایک دم بہت سا پیار آ گیا ہے ۔ میں سمجھا تھا تو الو کے الو ہی ہو ۔۔۔ " بڑی مشکل سے سانسوں پر قابو پانے کے بعد بولا ۔ " وہ رنگی یونہی کیسے جا سکتی ہے ؟ " لسی پیئے گی ' پراٹھا کھائے گی ' اس کی سہیلی اسے یوں آسانی سے تھوڑی جانے دے گی ۔ اماں بیمار نہ ہوتی تو رنگی کو میری بہن اپنے کمرے میں سلاتی ۔ ابھی تو وہ اٹھی بھی نہ ہو گی ۔ " پھر ذرا سا رک کر بولا ۔ " جانے لگی تو تمہیں دکھائیں گے ۔ بلکہ آج شام کی چائے وہیں بابا یارو کے ہاں کیوں نہ پئیں ؟ "

" چھوٹے ملک ۔ " مشکو چلایا اور اتنی تیزی سے بھاگتا ہوا آیا کہ کیکر پر سے سب چڑیاں ایک ساتھ اڑ گئیں ۔

" کیا ہے ؟ اماں تو ٹھیک ہیں " خدا بخش نے گھبرا کر پوچھا ۔

" جی وہ تو ٹھیک ہیں ۔۔۔۔ پر ۔۔۔۔ " مشکو کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں ' نتھنے پھول رہے تھے اور منہ مسلسل کھلا تھا ۔

" پر کیا ؟ ۔۔۔۔ کچھ بکو ۔ " خدا بخش نے اسے ڈانٹا ۔

اور مشکو نے جیسے کائنات کے سب سے بڑے حادثے کی اطلاع دی ۔ " کسی نے آپ کے لارنس کی گردن مروڑ کر پھینک دی ہے ۔ لارنس مرا پڑا ہے ۔ "

خدا بخش کو جیسے سکتہ ہو گیا ۔ ایک خاصے وقفے کے بعد بولا ۔ " رنگی کو یہاں لے آؤ ۔ "

مشکو واپس بھاگا تو میں نے خدا بخش سے پوچھا ۔ " رنگی کو بلانے کا کیا مطلب ہے ؟ "

" ہے ایک مطلب ۔ " خدا بخش بولا ۔

حادثہ شدید تھا اس لئے میں خاموش رہا فوراً بعد مشکو واپس آیا ۔ " رنگی تو منہ اندھیرے ہی چلی گئی چھوٹے ملک ۔ "

اور خدا بخش اپنی لہولہان آنکھیں مجھ پر گاڑ کر بولا ۔ " دیکھا میں نہ کہتا تھا ۔۔۔۔ میرے باز کو اس کمینی نے مارا ہے ' رات وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ وہ مجھے مار ڈالے گی ۔ " میں نے کہا " لالیاں بازوں کو نہیں مار سکتیں ۔ " " نادان ۔ اسی نے مارا ہے میرے لارنس کو میں جانتا ہوں یہ قتل اسی بدذات ' کنگلی ' قلاش لڑکی نے کیا ہے ۔ میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گا ۔ میں اس کی .... "

○

کرشن چندر

نام : کرشن چندر چوپڑہ
قلمی نام : کرشن چندر
تاریخ پیدائش : دسمبر ۱۹۱۴ء بمقام وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ (پنجاب) صبح چھ بجے(۱)
تاریخ وفات : ۸ مارچ ۱۹۷۷ء
تعلیم : ایم۔اے (انگریزی ادب)، ایف۔سی کالج لاہور، ۱۹۳۴ء
ایل۔ایل۔بی، لاء کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۷ء
پانچ برس کی عمر میں مندرہ (کشمیر) کے گورنمنٹ پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ آٹھویں جماعت سے میٹرک تک وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول پونچھ، کشمیر میں تعلیم پائی۔ ایف۔ایس سی، بی۔اے اور ایم۔اے (انگریزی) ایف۔سی کالج لاہور سے پاس کیے۔ ایل۔ایل۔بی پنجاب یونیورسٹی لاء کالج لاہور سے کیا۔

مختصر حالاتِ زندگی:

وزیر آباد (پنجاب) کے چھتری خاندان میں گوری شنکر چوپڑہ ایم۔بی۔بی۔ایس کے ہاں پیدا ہوئے تعلیم سے فراغت کے بعد پروفیسر ست سنگھ سیکھوں کے ساتھ مل کر انگریزی پرچہ "The Northern Review" جاری کیا جو گیارہ ماہ تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۳۸ء میں ہی انگریزی ماہنامہ (بہ اشتراک فریدہ) "The Modern Girl" جاری کیا۔ اسی زمانے میں "نیا ادب" سے بھی منسلک رہے اور "نئے زاویے" کی دو جلدیں شائع کیں۔ پہلی جلد اگست ۱۹۴۰ء میں چھپ کر آئی۔ چند برس انگریزی مجلہ "کیریئر" کی ادارت کی۔ نومبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ بطور پروگرام اسسٹنٹ منسلک ہو گئے۔ لاہور، دہلی اور لکھنؤ میں ملازمت کی۔ ۱۹۴۲ء میں ڈبلیو۔زیڈ۔احمد کی فلم کمپنی "شالیمار پکچرز" پونا کی طرف سے لکھنے کی دعوت ملی تو ریڈیو کی ملازمت چھوڑ دی۔ شالیمار پکچرز کے ساتھ بھی نہ نبھی تو ۱۹۴۴ء میں بمبئی چلے آئے۔ اس وقت وہ انجمن ترقی پسند مصنفین (مرکز) کے سیکرٹری تھے۔ یہاں آکر فلم کمپنی "بمبئی ٹاکیز" سے تقریباً ایک برس منسلک رہے۔ ۴۶-۱۹۴۵ء میں نیشنل تھیٹرز کے اشتراک سے اپنی ذاتی فلم "سرائے کے باہر" مکمل کی اور ماڈرن تھیٹرز کے نام سے ذاتی فلم کمپنی قائم کر کے دو فلمیں "دل کی آواز" اور "راکھ" مکمل کیں۔ اس کے بعد ان کی فلم کمپنی ٹوٹ گئی اور انہوں نے دیگر فلم کمپنیوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ انہوں نے اپنی چالیس سالہ ادبی زندگی میں تقریباً ۵ ہزار افسانے، کئی درجن ناول اور متفرق مضامین لکھے۔ کرشن چندر کی شہرت عالمی سطح پر ہے۔

اردو کی اولین تحریر:

"پروفیسر بلیکی" مطبوعہ اخبار "ریاست"، دہلی۔

یہ تحریر ان کے فارسی کے استاد ماسٹر بلاقی رام کا خاکہ ہے جو ۱۹۲۸ء سے قبل شائع ہوا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"جہلم میں ناؤ پر" مطبوعہ "ہمایوں" لاہور ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	"ہوائی قلعے" (ہلکے پھلکے مضامین)	مطبوعہ: اردو بک سٹال' لاہور	طبع اول: ستمبر ۱۹۴۰ء
۲۔	"طلسم خیال" (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اردو' لاہور'	طبع اول: ۱۹۳۷ء
۳۔	"نظارے" (افسانے)	مطبوعہ: کتاب خانہ ادبی دنیا' لاہور	طبع اول: جون ۱۹۴۰ء
۴۔	"نئے زاویے" (انتخاب) پہلی جلد	مطبوعہ: مکتبہ اردو' لاہور'	طبع اول: اگست ۱۹۴۰ء
۵۔	"زندگی کے موڑ پر (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اردو' لاہور'	طبع اول: ۱۹۴۳ء
۶۔	"نموگنے" (مزاحیہ مضامین)	مطبوعہ: دفتر کتابت' جودھپور'	طبع اول: ۱۹۴۳ء
۷۔	"شکست" (ناول)	مطبوعہ: ساقی بک ڈپو' دہلی'	طبع اول: جنوری ۱۹۴۳ء
۸۔	"ٹوٹے ہوئے تارے" (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اردو' لاہور'	
۹۔	"نئے افسانے" (افسانے)	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس' دہلی'	طبع اول: ۱۹۴۳ء
۱۰۔	"دروازہ" (ڈراما)	مطبوعہ: اردو اکیڈمی'	لاہور'
۱۱۔	"پرانے خدا" (افسانے)	مطبوعہ: عبدالحق اکیڈمی' حیدر آباد دکن'	طبع اول: ۱۹۴۴ء
۱۲۔	"اجنتا سے آگے" (افسانے)	مطبوعہ: کتب پبلشرز لمیٹڈ' بمبئی'	طبع اول: ۱۹۴۸ء
۱۳۔	"ان داتا" (۳ طویل افسانے)	مطبوعہ: ایشیا پبلشرز' دہلی	طبع ثانی: ۱۹۵۹ء
۱۴۔	"ایک روپیہ ایک پھول" (۸ افسانے)	مطبوعہ: ایشیا پبلشرز' دہلی'	طبع اول: ۱۹۵۵ء
۱۵۔	"ایک گرجا ایک خندق" (۱۰ افسانے)	مطبوعہ: نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلی کیشنز' بمبئی	طبع اول: ۱۹۴۸ء
۱۶۔	"تین غنڈے" (افسانے)	مطبوعہ: انڈین بک کمپنی' دہلی'	طبع اول: ۱۹۴۸ء
۱۷۔	"دسواں پل" (۸ افسانے)	مطبوعہ: ایشیا پبلشرز' دہلی'	
۱۸۔	"دل کسی کا دوست نہیں" (۹ افسانے)	مطبوعہ: ایشیاء پبلشرز' دہلی'	
۱۹۔	"سپنوں کا قیدی" (۱۱ افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' نئی دہلی	طبع اول: ۱۹۶۱ء
۲۰۔	"سمندر دور ہے" (۱۱ افسانے)	مطبوعہ: نوہند پبلشرز لمیٹڈ' نئی دہلی'	طبع اول: ۱۹۴۸ء
۲۱۔	"شکست کے بعد" (۱۰ افسانے)	دیپک پبلشرز' جالندھر'	طبع اول: ۱۹۶۰ء
۲۲۔	"کتاب کا کفن" (۱۱ افسانے)	رسالہ بیسویں صدی' نئی دہلی'	طبع اول: ۱۹۵۶ء
۲۳۔	"کشمیر کی کہانیاں" (۱۲ افسانے)	الہ آباد پبلشنگ ہاؤس' الہ آباد'	

۲۴۔	"مزاحیہ افسانے" (۱۲ افسانے۔ باتصویر)	آزاد کتاب گھر' کلاں محل' دہلی	طبع اول: ۱۹۵۴ء
۲۵۔	"میں انتظار کروں گا" (۸ افسانے)	مکتبہ شاہراہ' دہلی'	طبع اول: ۱۹۵۷ء
۲۶۔	"نغمے کی موت" (۱۱ افسانے)	ایشیا پبلشرز' تمیں ہزاری' دہلی'	طبع اول: س۔ن
۲۷۔	"نئے غلام" (۱۰ افسانے)	قادری کتب خانہ' بمبئی نمبر ۳'	طبع اول: ۱۹۵۳ء
۲۸۔	"ہائیڈروجن بم کے بعد" (۴ افسانے' ایک ڈراما اور ایک خاکہ)	ایشیاء پبلشرز' تمیں ہزاری' دہلی'	طبع اول: ۱۹۶۵ء
۲۹۔	"پل کے سائے میں" (افسانے)	مکتبہ سلطانی' بمبئی'	طبع اول: ۱۹۴۹ء
۳۰۔	"ہم وحشی ہیں" (۷ افسانے فسادات پر۔ دیباچہ علی سردار جعفری)	کتب پبلشرز لمیٹڈ' بمبئی نمبر ۱'	طبع اول: ۱۹۴۹ء
۳۱۔	"یو کلپٹس کی ڈالی" (۵ افسانے ایک ڈراما)	ایشیا پبلشرز' تمیں ہزاری' دہلی'	طبع اول: ۱۹۵۵ء
۳۲۔	"ایک خوشبو اڑی اڑی سی" (افسانے)	مکتبہ افکار' کراچی'	
۳۳۔	"پانی کا درخت" (افسانے)	نیا ادارہ' لاہور'	
۳۴۔	"تاش کا کھیل" (افسانے)	رفعت پبلشرز' لاہور'	
۳۵۔	"درد کی نہر (افسانے)	کراچی بک ڈپو' کراچی'	
۳۶۔	"دشت خیال" (افسانے)	ممتاز اکیڈمی' لاہور	
۳۷۔	"دوسری برف باری کے بعد" (افسانے)	خیام پبلشرز' لاہور'	
۳۸۔	"سپنوں کا قیدی" (افسانے)	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' نئی دہلی	طبع اول: ۱۹۶۴ء
۳۹۔	"سپنوں کی راہ گذر میں" (افسانے)	خیام پبلشرز' لاہور'	
۴۰۔	"شانو" (افسانے)	رضا پبلشرز' لاہور'	
۴۱۔	"کاک ٹیل" (افسانے)	سنگم پبلشرز' لاہور'	
۴۲۔	"کالا سورج" (افسانے)	مکتبہ افکار' کراچی'	
۴۳۔	"کبوتر کے خط" (افسانے)	پاشا پبلشرز' لاہور'	
۴۴۔	"گھونگھٹ میں جلے گوری" (افسانے)	مکتبہ ماحول' کراچی' ساقی بک ڈپو' دہلی	طبع اول ۱۹۵۳ء
۴۵۔	"مینا بازار" (افسانے)	مکتبہ شاہراہ' دہلی' کتاب نما' لاہور'	طبع اول: ۱۹۵۳ء طبع دوم: س۔ن
۴۶۔	"ہم تو محبت کرے گا" (افسانے)	اسٹیشن بک سینٹر' کراچی'	
۴۷۔	"کرشن چندر کے بہترین افسانے" (مرتبہ: اختر جعفری)	چودھری اکیڈمی' لاہور'	
۴۸۔	"پھول کی تنہائی" (افسانے)		
۴۹۔	"کانچ کے ٹکڑے" (افسانے)		

۵۰۔ "طوفان کی کلیاں" (افسانے)

۵۱۔ "الٹا درخت" (افسانے)

۵۲۔ "کھڑکیاں" (افسانے)

۵۳۔ "ایک عورت ہزار دیوانے" (ناول) — مکتبہ افکار، کراچی

۵۴۔ "ایک وائلن سمندر کے کنارے" (ناول) — مکتبہ افکار، کراچی

۵۵۔ "باون پتے" (ناول) — شعاع ادب، لاہور

۵۶۔ "پانچ لوفر، ایک ہیروئین" (ناول) — کراچی بک ڈپو، کراچی

۵۷۔ "جنت اور جہنم" (ناول) — جاوید پبلی کیشنز، لاہور

۵۸۔ "چاندی کا گھاؤ" (ناول) — مکتبہ افکار، کراچی

۵۹۔ "دل کی وادیاں سو گئیں" (ناول) — مون لائیٹ بک ڈپو، لاہور

۶۰۔ "سڑک واپس جاتی ہے" (ناول) — مکتبہ افکار، کراچی

۶۱۔ "ایک گدھے کی سرگزشت" (ناول) — شمع بک ڈپو، نئی دہلی

۶۲۔ "محبت کی رات" (ناول)

۶۳۔ "مسکرانے والیاں" (افسانے)

۶۴۔ "کارنیوال" (ناول) — نسیم بک ڈپو، لاہور

۶۵۔ "بورین کلب" (ناول)

۶۶۔ "طوفان کی کلیاں" (ناول)

۶۷۔ "صبح ہوتی ہے" (ناول)

۶۸۔ "تاش کا کھیل" (ناول)

۶۹۔ "پہلا پتھر" (ناول)

۷۰۔ "دروازے کھول دو" (ڈراما) — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی — طبع سوم: ۱۹۷۷ء

۷۱۔ "خرگوش کا سپنا" (بچوں کے لیے ناول)

۷۲۔ "ستاروں کی سیر" (بچوں کے لیے ناول)

۷۳۔ "ہانگ کانگ کی حسینہ" (ناول) — اردو پاکٹ بکس، کراچی نمبر ۱۸

۷۴۔ "زرگاؤں کی رانی" (ناول) — اردو پاکٹ بکس، کراچی نمبر ۱۸

۷۵۔ "غدار" (ناول) — نیا ادارہ، لاہور

۷۶۔ "کاغذ کی ناؤ" (ناول) — کراچی بک ڈپو، کراچی

۷۷۔ "لندن کے سات رنگ" (ناول) — اعوان پبلی کیشنز، کراچی

۷۸۔ "مالا رانی" (ناول) — خالد پبلشنگ ہاؤس، لاہور

۷۹۔ "میری یادوں کے چنار" (ناول) — ادارہ فروغ اردو، لاہور

۸۰۔ "محبت بھی قیامت بھی" (ناول) — ایشیا پبلشرز، نئی دہلی — طبع اول: ۱۹۷۷ء

۸۱۔ "برف کے پھول" (ناول)
۸۲۔ "دادر پل کے بچے" (افسانے)
۸۳۔ "فٹ پاتھ کے فرشتے"
۸۴۔ "ایک گرجا ایک خندق"
۸۵۔ کالے کوس" (افسانے)
۸۶۔ "کرشن نگر" (مرتبہ تاج سعید)
۸۷۔ "دل کی وادیاں سو گئیں"
۸۸۔ "صبح ہوتی ہے" (ناول)
۸۹۔ "دوسری برف باری سے پہلے" (افسانے)
۹۰۔ "اجنتا سے آگے" (افسانے)
۹۱۔ "پودے" (رپورتاژ)
۹۲۔ سعادت حسن منٹو (خاکہ۔ کتابچہ)
۹۳۔ "اکسیر ویدک المعروف عرق پرکاش" (طنزیہ / مزاحیہ)
۹۴۔ "جب کھیت جاگے"
۹۵۔ "کالا باغ"
۹۶۔ "غدار"
۹۷۔ "آدھے گھنٹے کا خدا" (افسانے)
۹۸۔ "سرائے کے باہر" (ڈراما)
۹۹۔ "آسمان روشن ہے"
۱۰۰۔ "مٹی کے صنم"
۱۰۱۔ "سونے کی صندوقچی"
۱۰۲۔ "اس کا بدن میرا چمن" (ناول)

نوٹ: کرشن چندر کی کتابوں کے اس قدر جعلی ایڈیشن نکل چکے ہیں اور نکل رہے ہیں کہ ان کی مطبوعہ کتب کی تعداد گنتی شمار میں نہ تو لائی جا سکی ہے اور نہ ایسا ممکن ہے۔

اعزاز:

۱۔ سوویت نہرو ایوارڈ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۶۶ء
۲۔ پدم بھوشن جنوری ۱۹۶۹ء
۳۔ نہرو کلچرل ایسوسی ایشن ایوارڈ، بمبئی، نومبر ۱۹۷۳ء

زندگی میں مستقل پتا:

"دی نش" "سینٹ فرانس ایوی نیو" سانتا کروز ویسٹ، بمبئی (بھارت)

نظریہ فن:

"اجتماعی طور پر خوبصورتی کو پا لینے اور غریبی کو کھو دینے ہی کو میں انسانیت کے بنیادی مسائل سمجھتا ہوں اور اکثر انہی کے متعلق لکھنا پسند کرتا ہوں۔"

(بہ حوالہ: "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ: بشیر ہندی)

○

(۱) بحوالہ: "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ: بشیر ہندی اور ڈاکٹر احمد حسن نے "افکار" کراچی کے "کرشن چندر نمبر" میں تاریخ پیدائش [illegible] درج کی ہے جو درست نہیں۔

کرشن چندر

آدھے گھنٹے کا خدا

دو آدمی اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

اتنی بلندی سے وہ دونوں نیچے سپاٹ کھیتوں میں چلتے ہوئے دو چھوٹے سے کھلونوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دونوں کے کندھوں پر تیلیوں کی طرح باریک رائفلیں رکھی نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً ان کا ارادہ اسے جان سے مار دینے کا تھا۔ مگر وہ لوگ ابھی اس سے بہت دور تھے۔ نگاہ کی سیدھ سے اس نے نیچے کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اندازہ کیا۔ جہاں پر میں ہوں، وہاں تک ان دونوں کو پہنچنے میں چار گھنٹے لگیں گے تب تک ------ اس نے پرامید نگاہ سے گھوم کر اپنے اوپر پہاڑ کی چوٹی کو دیکھا۔ ساردو پہاڑ کی بارہ ہزار فٹ اونچی چوٹی، اس سے اب صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ ایک دفعہ وہ چوٹی پر پہنچ جائے، پھر دونوں کے ہاتھ نہ آ سکے گا۔ ساردو پہاڑ کی دوسری طرف گنڈیالی کا گھنا جنگل تھا جو اس کا دیکھا بھالا تھا۔ جس کے چپے چپے سے وہ اتنی ہی آگاہی رکھتا تھا جتنا اس جنگل کا کوئی جنگلی جانور رکھ سکتا ہے۔ اس جنگل کے خفیہ راستے، جانوروں کے بھٹ، پانی پینے کے مقام سب اسے معلوم تھے۔ اگر ایک دفعہ وہ ساردو پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا تو پھر اپنا پیچھا کرنے والوں کے ہات نہ آ سکے گا۔

جب وہ چوٹی پر پہنچ جائے گا تو اسے دوسری طرف کی سرسبز ڈھلوانوں پر گنڈیالی کا جنگل دکھائی دے گا اور جنگل سے پرے سرحد کا پل، جسے ڈائنامیٹ لگا کر اڑا دیا گیا تھا۔ گرے ہوئے پل کے اس پار اس کا اپنا دیس تھا۔ ایک بار وہ چوٹی پر پہنچ جائے پھر اسے نیچے ڈھلوان کے گھنے جنگل کو طے کرنے میں دیر نہیں لگے گی اگر پل نہیں ہے تو کیا ہوا، وہ بہت عمدہ تیراک ہے۔ وہ گنڈیالی ندی عبور کر کے اپنے دیس پہنچ جائے گا۔

اور چوٹی تک پہنچنے میں اسے صرف ایک گھنٹہ لگے گا اور وہ دونوں اس کے دشمن ابھی اس سے چار گھنٹے کی مسافت کے فاصلے پر تھے---

نہیں، وہ اسے نہیں پکڑ سکتے۔ وہ جوان ہے، مضبوط ہے اور چار گھنٹے ان سے پہلے چلا ہے۔ وہ اسے نہیں پکڑ سکتے۔ وہ ابھی اس چٹان پر پندرہ بیس منٹ بیٹھ کر دم لے سکتا ہے اور دور نیچے کھیتوں سے گذرتے ہوئے گھاٹیوں کی طرف آنے والے ان دونوں آدمیوں کو بڑے اطمینان سے دیکھ سکتا ہے جو اس کی جان لینے کے لئے آ رہے ہیں۔ وہ مسکرا بھی سکتا ہے، کیونکہ وہ ان سے بہت دور ہے۔

یقیناً انہوں نے اسے دیکھ لیا ہے کیونکہ نیچے کے کھیتوں سے چوٹی تک اس طرف کا پہاڑ جس کے اوپر وہ چل رہا ہے، بالکل ننگا ہے۔ بس چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہیں۔ سنتے کی اور لال مینا کی۔ جن میں آدمی چھپ بھی نہیں سکتا اور زمین سے لگی ہوئی پتلی چھدری گھاس ہے اور نیچی نیچی سیاہ چٹانیں۔ رات کی بارش سے بھیگی ہوئی اور پرانی کائی پھسلواں۔ اس پرانی کائی سے بند پانی کی بو آتی ہے اور بھربھری مٹی پر قدم پھسلتے ہیں۔ اسے بڑی ہوشیاری سے آگے کا فاصلہ طے کرنا ہوگا۔ جبھی تو اس نے اس فاصلے کو طے کرنے کے لئے، جو آدھے گھنٹے میں طے ہو سکتا ہے۔ ایک گھنٹہ رکھا ہے۔

بس اسے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ وہ نیچے کے گاؤں سے بھاگتے وقت کیوں اپنی رائفل ساتھ نہ لا سکا۔ بھاگتے وقت اس نے رائفل وہیں چھوڑ دی۔ یہ ایک ناقابل معافی حادثہ تھا۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا؟--- اگر اس کے پاس اس وقت اپنی رائفل ہوتی تو وہ دونوں نیچے سے آنے والے اسقدر بے خوفی سے اس کا پیچھا نہیں کر سکتے تھے وہ آسانی سے کسی چٹان کی اوٹ میں دبک کر کسی مناسب جگہ پر انکا انتظار کر

سکتا تھا اور اپنی رائفل کی رینج میں آتے دیکھ کر ان لوگوں کو گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا مگر وہ کیا کرے 'اس وقت وہ بالکل نہتا ہے اور اب ہر لحظہ اسکی یہ کوشش ہوگی کہ وہ ان کی بندوق کی مار سے آگے چلتا رہے۔۔۔!

اس نے تعاقب کرنے والوں کے پیچھے بھی دور تک کھیتوں کو دیکھا اور کھیتوں سے پرے سیب ' آلوچے اور خوبانیوں کے درختوں سے گھرے موگری کے گاؤں کو دیکھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے دل کے اندر اداسی کی ایک گہری سرخ لکیر کھینچتی چلی گئی۔ اس خنجر کی باریک اور تیز دھار کی طرح جس کا پھل اس وقت موگری کے دل میں پیوست تھا۔ موگری جو سیب کے پھولوں کی طرح خوبصورت تھی۔

کاشر کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ موگری کی جان لے لے۔ چمکتی ہوئی گہری سیاہ آنکھوں والی موگری۔ انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے ہونٹوں والی 'انیس برس کی موگری۔ وہ جب ہنستی تھی تو ایسا لگتا تھا گویا سیب کی ڈالیوں سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ ایسی کھنکتی ہوئی سپید ہنسی ' اس نے کسی دوسری لڑکی کے پاس نہ دیکھی تھی 'ہنسی جو سیب کے پھولوں کی یاد دلائے یا اچانک پر کھول کر ہوا میں کبوتری کی طرح اڑ جائے اور وہ ذرا سے کھلے 'ذرا سے بند انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے شریر ہونٹ۔ ان ہونٹوں پر جب وہ اپنے ہونٹ رکھ دیتا تھا تو اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے خون کے بہاؤ میں چنگاریاں سی اڑتی چلی جا رہی ہیں۔ جیسے جذبہ پگھل کر خون اور خون پگھل کر شعلہ اور شعلہ پگھل کر بوسہ بن گیا ہو اور وہ پوری طرح موگری کے چہرے پر جھک جاتا تھا۔ اتنے زور سے کہ موگری کی سانس اس کے سینے میں رکنے لگتی تھی اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کے منہ پر طمانچے مار کر ہی اپنا چہرہ اس کے چہرے سے الگ کر سکتی تھی۔

"تم بالکل جانور ہو کاشر"! وہ ہانپتے ہوئے کہتی۔

"اور تم آگ ہو!" وہ خود اپنے جذبے کی شدت سے ڈر کر ذرا پیچھے ہٹتا ہوا کہتا۔

"میرے گاؤں میں کوئی نہیں جانتا کہ میں ایک دشمن کے بیٹے سے پیار کرتی ہوں۔"

"میرے سپاہیوں میں سے بھی کوئی نہیں جانتا کہ میں گذیالی کے جنگل میں روز کسی سے ملنے جاتا ہوں۔"

وہ دونوں گذیالی کے جنگل میں جیپ کے کسی کچے راستے پر بیٹھ جاتے۔ دیودار کے ایک ٹوٹے ہوئے تنے پر پیچھے جیپ کھڑی ہوتی۔ سامنے ایک چھوٹی سی ڈھلوان کی گہری اور دبیز گھاس۔ کوئی چشمہ تقریباً بے آواز ہو کر بہتا تھا۔ جنگلی پھولوں پر پانی کے قطرے گر کر سو جاتے اور چاروں طرف بڑے بڑے ستونوں کی طرح اونچے اونچے دیودار اور ان کے گھنے چھتناروں میں سے سبزی مائل روشنی دور اونچے لٹکے ہوئے فانوسوں کی طرح چھن چھن کر آتی ہوتی۔۔۔۔ کاشر کو ایسا محسوس ہوتا گویا وہ کسی مغل بادشاہ کے دیوان خاص میں بے اجازت آ نکلا ہے۔ یہاں آکر وہ دونوں کئی منٹ تک جنگل کے گہرے سناٹے میں کھو جاتے اور آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگتے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے سارا جنگل چپ ہے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے سارا جنگل ان کے اردگرد سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہے۔

موگری ' علاقہ غیر کے گاؤں سے ایک ٹوکری میں پھل اٹھائے ہوئے گذیالی کے پل تک آتی تھی جو کاشر اور اس کے سپاہیوں کی عملداری میں تھا۔ سیب ' ناشپاتی ' کیلے ' آلوچے ' بہی ' کمب ' اودے انگوروں کے گچھے یا صرف اخروٹ اور مکی کے بھٹے اور وہ چھوٹی چھوٹی خوش رنگ خوبانیاں جنہیں دیکھ کر سنہری اشرفیوں کا دھوکہ ہوتا ہے اور موگری اتنی خوبصورت تھی کہ پل کی حفاظت کرنے والے سپاہی چند منٹوں میں اس کی ٹوکری خالی کر دیتے تھے۔ سب سے آخر میں کاشر آتا تھا اور جب کاشر موگری کے نزدیک آتا تھا تو سب سپاہی ہٹ جاتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے۔۔۔۔۔!

لیکن جس دن موگری کی مخبری پر علاقہ غیر کے گاؤں والوں نے گذیالی کا پل جو اس کی تحویل میں تھا 'ڈائنامیٹ سے اڑا دیا 'اسی دن اسے شدید دھچکا سا لگا جیسے اس کے دل کے اندر بھی کوئی پل تھا جو ڈائنامیٹ سے پرزے پرزے ہو گیا تھا اور وہ باہر کا پل تو کبھی نہ کبھی پھر بن جائے گا لیکن اندر کا پل کون بنا سکے گا پھر سے؟ اس لئے وہ وحشت زدہ سا ہو کر پل کے ٹکڑوں کو ان گہرے پانیوں میں تا ہوا دیکھتا رہا۔ جہاں لطیف سے لطیف جذبے بھی بھاری پتھر بن کر ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ پھر کبھی نہیں ابھر سکتے۔ وہ رونا چاہتا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آ سکے اور وہ

موگری کو گالی دینا چاہتا تھا۔ مگر اس کی زبان پر الفاظ نہ آ سکے وہ جانتا تھا کہ ہر سپاہی کی نگاہ اس پر ہے۔ وہ نگاہ جو بظاہر کچھ نہیں کہتی لیکن خاموش لہجے میں شکایت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جب وہ ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا تو اپنی رائفل لے کر گنڈیالی ندی میں کود پڑا اور اس کے سپاہی بھونچکے ہو کر اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

وہ ندی پار کر کے گنڈیالی کے جنگل میں گھس گیا۔ کئی دن تک وہ اکیلا بھوکا پیاسا اس جنگل میں گھومتا رہا اور وہ ان تمام جگہوں پر گیا جہاں پر وہ موگری کے ساتھ گیا تھا اور ان جگہوں پر جا کر اس نے ان تمام جذبوں کو بھلانا چاہا' جنہوں نے موگری کی موجودگی میں اس کے لئے دھندلے دھندلے شفق زار تعمیر کئے تھے۔ کئی بار وہ موگری کی عدم موجودگی میں بھی یہاں آیا تھا تو بھی اسے ہر جگہ موگری کی عدم موجودگی میں بھی اس کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ پیڑ کا تنا جہاں موگری بیٹھتی تھی۔ اس کے گرد اک ہالہ سا کھنچا معلوم ہوتا تھا۔ موگری نہ تھی پھر بھی گویا جھرنے کے پانیوں میں اس کی آواز کی روانی گھل گئی تھی۔ ہر پھول میں اس کے بالوں کی مہک تھی اور وہ زمین جہاں پر وہ بیٹھتے تھے' وہاں سے موگری کے جسم کی سوندھی سوندھی مہک آتی تھی ------ مگر آج وہاں کچھ نہ تھا۔ جذبوں کے شفق زار چھٹ گئے تھے۔ پیڑ کا تنا محض پیڑ کا تنا تھا اور پانی کا جھرنا' پانی کے جھرنے کی طرح بہہ رہا تھا۔ ہر چیز انجانی اور اجنبی اور اس سے الگ الگ کھڑی تھی۔ وہ چیخ مار کر سارے جنگل کو جگا دینا چاہتا تھا مگر اس کا حلق بار بار گھٹ رہا تھا۔ اس کے سارے احساسات پر اک دھند سی چھائی ہوئی تھی' جنگل میں بے سمت گھومتے گھومتے کئی بار اسے خیال آیا کہ اگر وہ اس دھند کو اپنے ناخنوں سے چیر دے تو شاید اندر سے موگری کا زندہ اور اصلی چہرہ صحیح و سلامت نکل آئے گا۔ وہ موگری جسے وہ اپنے دل سے پہچانتا تھا مگر دھند کسی طرح نہ چھٹی اور گہری ہوتی گئی۔ جنگل میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ پیڑوں کا گھیرا اس کے لئے تنگ ہونے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا' جیسے چاروں طرف سے جنگل کے پیڑ جھک کر اس پر گرنے والے ہیں۔

پھر وہ گھبرا کر جنگل سے باہر بھاگ نکلا اور گنڈیالی کا جنگل طے کر کے وہ سار دو پہاڑ کی برفیلی چوٹی کے دوسری طرف اتر گیا۔ جہاں موگری کا گاؤں تھا۔

کئی دنوں تک وہ بھیس بدلے ہوئے ٹوہ لیتا رہا کسی کو اس پر شبہ نہ ہوا کیونکہ اس کی شکل و صورت ایسی تھی جیسے علاقہ کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ اس کے کپڑے بھی پہنے ہوئے تھے اور وہ ان کی زبان بخوبی بول سکتا تھا اس لئے کسی کو اس پر شبہ نہ ہوا اور وہ ایک دن موقعہ دیکھ کر آدھی رات کو موگری کے گھر کے اس کمرے میں گھس گیا جہاں موگری سو رہی تھی۔ موگری کمرے میں اکیلی سو رہی تھی۔ اس نے آہٹ کئے بغیر کنڈی اندر سے چڑھا دی۔ رائفل کندھے سے اتار کر ایک کونے میں رکھ دی اور آہستہ آہستہ دبک کر وہ موگری کے بستر کے قریب چلا گیا۔ قریب جا کر اس نے اپنا خنجر نکال لیا۔

وہ خنجر ہاتھ میں لئے دیر تک کھڑا رہا اور موگری کی سانسوں کی پر سکون آواز سنتا رہا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا وہ موگری کے چہرے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک بار ماچس جلا کر موگری کا چہرہ دیکھ لے۔ مگر بڑی جانکاہ کاوش سے اس نے ایک اذیت ناک خواہش کو اپنے دل میں روک دیا۔ دیر تک وہ خنجر لئے یونہی کھڑا رہا اور موگری کے سانسوں کے اس بے آواز جھرنے کو سنتا رہا جو اب اس کے دل کی طرف بہہ رہا تھا وہ ہولے ہولے موگری کے چہرے پر جھک گیا۔ بس ایک الوداعی بوسہ اور پھر خنجر! ------ مگر جھکتے جھکتے اس کے سانس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ اس کے دماغ میں سنسناتی ہوئی گونجیں سی چاروں طرف پھیلنے لگیں اور اس نے اپنے جلتے ہوئے' کانپتے ہوئے ہونٹ موگری کے ہونٹوں پر رکھ دیئے ------ موگری کے سارے جسم میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا' جیسے موگری چیخ مارنے کو ہے مگر اس نے ایسی مضبوطی سے اپنے ہونٹوں کو موگری کے ہونٹوں سے ملا رکھا تھا کہ چیخ مارنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ پہلے تو موگری کا سارا جسم برف کی طرح سرد ہونے لگا اور ہمیشہ یونہی ہوتا تھا۔ اسے اس سے پیشتر کے بہت سے رنگین اور خوبصورت لمحے یاد آئے۔ جب موگری پیار کرتے کرتے یک لخت اس کے بازوؤں میں سرد پڑ جاتی تھی اور کئی لمحوں تک اس کی یہی کیفیت رہتی تھی جیسے وہ دل و جان سے اس کی مزاحمت کر رہی ہو پھر ہولے ہولے اس کے بوسوں کی آنچ سے اس کا سارا جسم گرم ہونے لگتا ہولے ہولے گویا برف پگھلنے لگتی اور بدن

میں انگڑائیاں اور پھر پھریریاں جاگنے لگتیں اور گرم گرم سانس آنچ کی طرح پگھلنے لگتا اور وہ بے اختیار ہو کر کاشر سے لپٹ جاتی اور اپنے بازو اس کے گردن میں حمائل کر دیتی ۔ موگری کے دل کے اندر غالباً محبت اور نفرت کا ہر آن بدلتا ہوا میزانیہ سا چلتا رہتا تھا ۔ اپنا دشمن سمجھ کر وہ اس سے نفرت کرتی تھی ۔ اپنا محبوب سمجھ کر اس سے محبت کرتی تھی اور کبھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی تھی۔

اس وقت بھی یہی ہوا ۔ موگری کا سرد پڑتا ہوا خوفزدہ اور اپنے آپ میں اکیلا جسم دھیرے دھیرے لو دینے لگا جیسے انگ انگ سے روشنی پھوٹ نکلے ۔ ایسی روشنی جسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں صرف ہاتھ محسوس کر سکتے ہیں ۔ موگری نے یقیناً اس بوسے کو پہچان لیا تھا ۔ خوبصورت اور پر خطر زندگی بسر کرنے والی عورت کی زندگی میں بہت سے بوسے آتے ہیں ۔ دیمک کی طرح چاٹ جانے والے بوسے اور جونک کی طرح چمٹ جانے والے بوسے ۔ روکھے سوکھے پاپڑ نما بوسے اور ایسے لجلجے اور گندے بوسے گویا ہونٹوں پر کیڑے چل رہے ہوں ۔ شرمائے ہوئے سہمے ہوئے بوسے اور خوفزدہ کمزور اور بیمار بوسے اور صحت مند اور شریر بوسے ۔ موگری ایسی خوبصورت عورتوں کو ہر قسم کے بوسوں سے واسطہ پڑتا ہے ۔ مگر وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ ان میں سے کونسا بوسہ ایسا ہوتا ہے جو دل پر دستک دیتا ہے ۔ صرف اسی دستک کے جواب میں وہ بوسے کے جواب میں بوسہ دیتی ہیں ورنہ صرف ہونٹ پیش کرتی ہیں۔

مگر اس بار موگری صرف چند لمحوں کے لئے برف کی طرح ٹھٹھری رہی پھر اس نے اپنے اوپر جھکے ہوئے ہونٹوں کے لمس کو پہچان لیا اور پہچان کر بھی گو وہ چند لمحوں کے لئے وحشت زدہ اور ٹھٹھری سی رہی مگر ہولے ہولے اس کی مغائرت دور ہوتی گئی ۔ آدھی رات کے نیم گرم اندھیرے میں کسی غیر متوقع خوشی سے اس کی ساری روح کانپ اٹھی اور وہ خود سے کاشر کی بانہوں میں آگئی اور اس طرح آئی 'جیسے اب تک کبھی نہ آئی تھی ۔ کاشر نے محسوس کیا جیسے آسمان زمین پر اتر آیا ہو اور زمین لمبے لمبے سانس لے کر ہانپنے لگی ۔ ایک شعلہ سا تھا جو برف کی پہنائی میں ڈوب رہا تھا ۔ برف کی ٹوٹتی ہوئی ٹکریاں گلاب کی بکھری ہوئی پتیاں سسک سسک کر سلگتا ہوا سنگیت ------ جسم کے حصار کو توڑنے کی کاوش میں افتاں و خیزاں ۔ یکایک حصار ٹوٹ گیا ------ مچھلیاں طوفان میں بہہ گئیں۔ بہت سارے چراغ اک دم گل ہو گئے پھر سارے احساس نیم غنودگی کی سبز جھیل میں کھو گئے------

جب وہ جاگا تو اسی طرح گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور موگری اس کی بانہوں میں بے خبر سو رہی تھی ۔ جانے اس بے خبری میں کب کاشر نے خود اپنے ہاتھ کا خنجر اپنے پہلو میں رکھ لیا تھا------!

اس نے پہلو بدل کر آہستہ سے خنجر نکالا ۔ آہستہ سے موگری نیند میں کسمائی ۔ جھکے ہوئے کاشر کو موگری کا ہاتھ اپنی پیٹھ پر محسوس ہوا ۔ تھپکتا ہوا ۔ نیند کی ترغیب دیتا ہوا ۔ پیشتر اسکے کہ وہ پھر اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جائے 'اس نے ایک ہی جھٹکے سے پورا خنجر ہتھی تک موگری کے دل میں اتار دیا۔

موگری چیخ بھی نہ سکی ۔ ہولے ہولے اس کا کانپتا ہوا جسم ٹھنڈا ہوتا گیا مگر کاشر نے موگری کو بہت دیر تک اپنے جسم سے الگ نہیں کیا۔ ہولے ہولے کاشر کے جسم نے موگری کے مرتے ہوئے جسم کے ہر ارتعاش کو اپنے اندر جذب کر لیا اور جب موگری کا جسم بالکل ٹھنڈا ہو گیا تو اس نے موگری کے جسم کو اپنے جسم سے الگ کر دیا۔ اس کے ٹھنڈے ہونٹوں کو پھر اس طرح بوسہ دیا' جیسے وہ کسی قبر کو بوسہ دے رہا ہو پھر کنڈی کھول کر باہر آنگن میں آیا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ آنگن کی دیوار پھلانگ کر ایک احمق کی طرح سرپٹ بھاگنے لگا کیونکہ اب اس کے دماغ کی ہر رگ اور نس تانبے کے تاروں کی طرح جھنجھنا رہی تھی اور جسم کے روئیں روئیں میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ سارا گاؤں نیند میں ڈوبا ہوا سو رہا تھا۔ کسی نے اس کے جسم میں بجتی ہوئی خطرے کی گھنٹیوں کی پر شور صدا کو نہیں سنا اور وہ کھیتوں سے نکل کر سار دو پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ صبح جب موگری کے بھائیوں نے موگری کی لاش دیکھی اور دیوار سے لگی ہوئی رائفل کو پہچانا تو اس کا تعاقب کیا مگر اب تک اسے چار گھنٹے کا اسٹارٹ مل چکا تھا۔

اتنی دوری سے وہ انہیں دیکھ سکتا تھا۔ موگری کے دونوں بھائی برابر قدم سے قدم ملائے تیز تیز چل رہے تھے۔ وہ موگری کے بھائیوں کو

جاتا تھا۔ وہ دونوں بہادر اور جری' دلیر اور جفاکش تھے۔ اس کی طرح پر خطر زندگی کے عادی تھے' مستقل مزاج' غیور اور انتقام پسند تھے۔ وہ ان سے کسی رحم کی توقع نہ کر سکتا تھا' درخواست بھی نہ کر سکتا تھا۔ پہلی بات ان کے کردار خلاف ہوتی۔ دوسری اس کے اپنے مزاج کو ناپسند ہوتی۔ اگر رائفل اس کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ ان دونوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ وہ اتنا فاصلہ ضرور رکھے گا کہ کسی طرح ان کی رائفل کی زد میں نہ آ سکے۔ وہ دونوں بہت تیزی سے سجھے ہوئے مشاق پہاڑی بجروں کی طرح چل رہے تھے۔ وہ بھی برابر یکساں لے میں چھوٹے چھوٹے سانس لیتا ہوا سارود کے اوپر چڑھ رہا تھا۔ مگر فاصلہ دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا کیونکہ وہ دونوں کھیتوں میں تھے۔ سیدھے اور سپاٹ راستے پر' اور وہ پھسلوان چڑھائی پر۔ جہاں کائی لگی چٹانیں تھیں اور بھربھری مٹی اور کل رات کو جب وہ موگری کی آغوش میں تھا' کسی وقت سارود پہاڑ کی اونچائی پر بارش ہو چکی تھی اور سارا پہاڑ گیلا تھا اور بھربھری مٹی میں دھنسی ہوئی چٹانیں اپنی جگہ سے ہلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور اسے ہر قدم نہایت احتیاط سے اور پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا اور جگہ جگہ رک کر ایک لمحہ کے لئے پیچھے مڑ کر بھی دیکھنا پڑتا تھا کہ وہ دونوں کہاں ہیں اور کتنے فاصلہ پر ہیں۔ پہاڑ اس قدر ننگا تھا کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور لمحہ بہ لمحہ اس تعاقب کا اندازہ کر سکتے تھے۔ بھاگنے والا بھی اور پیچھا کرنے والا بھی۔ دونوں اس تعاقب میں برابر ایک دوسرے کو نگاہ میں رکھنے پر مجبور تھے۔

دھیرے دھیرے صبح کے سپید' سنہرے اور گلابی پردے آسمان سے سرکا دیئے گئے اور سورج فلک کی نیلگوں کھڑکیوں سے نیچے جھانکنے لگا۔ دھیرے دھیرے اس کی روشنی تیز' سخت گیر اور بے رحم ہوتی گئی اور کاشر کو احساس ہونے لگا گویا سورج بھی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس کی گردن چہرے اور پیٹھ سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ روشنی اسے اپنی پلکوں پر بیٹھی ہوئی محسوس ہونے لگی اور کرنوں کے کوڑے متواتر اس کے جسم پر پڑنے لگے اور پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے تو بھی وہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ ساری صبح چلتا رہا۔ ساری دوپہر چلتا رہا' کبھی تیز' کبھی مدھم' کبھی مضبوط قدموں سے کبھی تھکے بھاری قدموں سے' ایک لمحہ رکے بغیر چلتا رہا۔ پیاس نے اس کا حلق بالکل خشک کر دیا تھا گال' زبان' تالو کاگ اور نرخرے میں ایسا لگتا تھا' گویا کہیں سے خاردار جھاڑیاں اگ آئی ہیں اور ہوا کی نالی سے ہوا یوں اندر باہر جاتی تھی جیسے لوہار کی خشک اور سخت کھردرے چمڑے والی دھونکنی سے نکلتی ہے۔ اب ہوا کی دھار تک کانٹے کی طرح تیز اور نکیلی تھی' تو بھی وہ چلتا رہا کیونکہ وہ رک نہ سکتا تھا' کیونکہ اس کا تعاقب کرنے والے بھی کہیں ایک لمحے کے لئے نہیں رکے تھے۔ چلتے چلتے جب وہ سارود پہاڑ کا تین چوتھائی سے زیادہ فاصلہ طے کر گیا اور جب اسے سارود پہاڑ کی برفیلی چوٹی اونچی اونچی لمبی چٹانوں سے گھری ہوئی اپنے سر کے اوپر نظر آنے لگی اور وہ سپید سپید بادل جو اس کے بالکل نزدیک منڈلا رہے تھے' اس کے کندھوں کو چھوتے ہوئے محسوس ہوئے تو اس نے چند لمحوں کے لئے آرام کرنا برحق جانا اور خطرے سے خالی بھی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا بالکل مجبور ہو کر چٹانوں میں دبے ہوئے ایک چھوٹے سے چشمے پر جھک گیا اور جانوروں کی طرح ڈیک لگا کر پانی پینے لگا۔ پانی پیتے پیتے اس نے بڑی کوشش سے اپنے آپ کو بیچ ہی میں روک کر نگاہ گھما کر نیچے کی طرف دیکھا۔ اس کے تعاقب کرنے والے پہاڑ کا راستہ آدھے سے زیادہ طے کر چکے تھے۔ پھر بھی وہ کافی عرصہ کے لئے خطرے سے باہر تھا اور اب چوٹی دو ہزار فٹ کے فاصلہ پر گویا اس کے سر کے اوپر اطمینان کا سایہ کئے کھڑی تھی۔ ایک جست اور ------ اور پھر وہ خطرے سے باہر تھا۔ ایک دفعہ وہ چوٹی پر پہنچ جائے' پھر گنڈیالی کے جنگل میں اسے کوئی نہیں پکڑ سکے گا۔

یہ خیال آتے ہی اس نے اطمینان کا ایک سانس لیا اور اپنا چہرہ سارے کا سارا چشمے کے پانی میں ڈبا دیا۔ پانی پی کر اس کا تنا ہوا گرم جسم ایک دم گویا سیراب سا ہو گیا۔ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بڑے اطمینان سے بند کر لیں۔ وہ وہیں چشمے کے کنارے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کے ٹانگیں پسار کے پڑ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چند منٹ کے لئے ستانے کے لئے ایک نیم غنودگی کے عالم میں کھو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد وہ تازہ دم ہو کے اٹھے گا اور پہاڑ کا آخری حصہ طے کر کے چوٹی پر ہو گا اور خطرے سے باہر پہنچ جائے گا۔

وہ یونہی چند منٹ کے لئے اسی نیم غنودگی کے عالم میں ستاتا رہا۔ چند منٹ کے لئے اس کے جسم کو جو آرام ملا تو اس کے دل سے وقت کا احساس زائل ہو گیا۔ آرام کا ایک گنگنا تھپکنے والا نشہ تھا جو اس کے جسم و جان میں اترا جا رہا تھا۔ اسی عالم میں اس نے پہلے دو ایک منٹ میں

چوٹی کی بھربھری مٹی سے پھسل کر گرنے والی چٹانوں کی ایوالانش کی آواز نہیں سنی۔ پھر جب یکایک بڑھتی ہوئی گڑگڑاہٹ کی وہ آواز اس کے کانوں میں آنے لگی تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھا پھر وہ خوف اور دہشت کی ایک چیخ مار کر چشمے سے ہٹا اور چوٹی سے گرنے والے ہزاروں ٹن مٹی اور چٹانوں کے خوفناک تیزی سے نیچے کو بھاگتے ہوئے ملبے سے اپنی جان بچانے کے لئے ایک طرف کو بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے بھی وہ اپنے آپ کو اس خوفناک ایوالانش کی زد سے نہ بچا سکا۔ ہزاروں توپوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک طوفان خیز زلزلہ سا گویا اس کے سر کے قریب سے گذرا اور وہ زمین پر بچھ گیا۔ اسے اپنے حلق میں اور نتھنوں میں اور سانس کی نالی میں مٹی کے ذرے گھستے ہوئے محسوس ہوئے اور ایک خوفناک کڑک سے ساری زمین کانپتی ہوئی محسوس ہوئی پھر کوئی انتہائی سخت سی چیز اس کی ٹانگوں سے ٹکرائی جیسے کسی نے بڑے زور سے کوئی آہنی ہتھوڑا اس کے دھڑ پر گرایا ہو اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو چند لمحوں تک اسے یہ احساس رہا جیسے وہ مر چکا ہے اور کسی گہری قبر میں دفن ہے۔ اس کے چاروں طرف دائیں بائیں اوپر نیچے مٹی 'کنکر' روڑے اور چھوٹی چھوٹی چٹانیں پڑی تھیں اور وہ ان میں اوندھا لیٹا تھا پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تو اسے اپنے دونوں ہاتھ نظر آئے جو مٹی میں دھنسے تھے۔ اس نے پہلے تو بڑی حیرت سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا پھر آہستہ سے انہیں ہلایا۔ جب وہ ہلنے لگے تو اس کا اچنبھا دور ہو گیا۔ اسے یقین آگیا کہ وہ زندہ ہے۔ اس نے بڑی کوشش سے لیٹے لیٹے پہلے اپنے دائیں ہات کو مٹی اور کنکر کے ڈھیر سے آزاد کیا پھر دوسرے ہات کو۔ پھر مٹی کھود کر اس نے اپنے دھڑ کو آزاد کرایا پھر اپنی بائیں ٹانگ کو پھر جب وہ کسمسا کر اور کروٹ لینے کے انداز میں اپنی دائیں ٹانگ کو آزاد کرانے کے لئے زور لگانے لگا جو ایک بڑی چٹان کے نیچے دبی تھی تو شدید درد اور اذیت کی ایک زور کی چیخ اس کے حلق سے نکل گئی اور وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو کر وہیں زمین پر پڑے پڑے ہانپنے لگا۔

جہاں پر وہ لیٹا تھا' اور جس زاویئے سے وہ لیٹا تھا' وہاں سے اسے پہاڑ کے نچلے حصے کا منظر بخوبی دکھائی دیتا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ ایوالانش کا بھاری ملبہ اس کے جسم سے بس چند فٹ کے فاصلے سے ہو کے گذرا ہے۔ چند لمحوں کی دیر ہو جاتی تو اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ جاتے یا چند لمحے اگر وہ خبردار ہو جاتا تو اس ایوالانش کی زد سے وہ صاف بچ جاتا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے دور تک پہنچے ایوالانش کے راستے کو دیکھا۔ ایوالانش جہاں جہاں سے گذری تھی جھاڑیوں کو اکھاڑتی ہوئی ٹیلوں کو مسمار کرتی' چٹانوں کو بہاتی اک گہری کھائی بناتی ہوئی گذر گئی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں یہ اطمینان بخش خیال آیا کہ وہ دونوں مر گئے ہوں گے۔ اس ایوالانش کی زد میں آکر لاکھوں ٹن مٹی کے نیچے ان کے جسم دب گئے ہوں گے۔ دوسرے لمحہ میں اس نے دیکھا کہ نیچے ایک چٹان کی اوٹ سے وہ دونوں بھائی صحیح و سلامت نکل رہے ہیں۔ رائفلیں اٹھائے ہوئے اور بڑی احتیاط سے پگ دھرتے ہوئے اپنی آنکھوں پر بار بار ہات رکھ کر اوپر کا راستہ دیکھتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ اس کے چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔

اپنے جسم و جان کا پورا زور لگا کر اس نے اپنی دائیں ٹانگ کو بھی اس بھاری چٹان سے آزاد کرا لیا۔ چٹان جو لڑھکی تو دیر تک نیچے کو گڑگڑاتی ہوئی اتر گئی۔ اس کی آواز سے نیچے تعاقب کرنے والے چونکے اور انہوں نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھ لیا مگر ابھی تک وہ بہت نیچے تھے اور وہ ان کی رائفل کی زد سے باہر تھا۔

اپنے بائیں گھٹنے پر پورا زور دے کر وہ ہمت سے اٹھ کھڑا ہوا مگر پہلا قدم لیتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کی دائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ بالکل شکستہ ہو چکی تھی اور اس کے دھڑ کے اندر خطرناک ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اب وہ چل نہ سکتا تھا تو بھی وہ کوشش کر کے پھر اٹھا اور اپنی دائیں ٹانگ کو اٹھائے ہوئے ایک ہی ٹانگ سے راستے پر پھلانگ پھلانگ کر چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ یقیناً نیچے تعاقب کرنے والوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور اب تیز تیز قدموں سے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ دانت پیس پیس کر پھلانگ پھلانگ کر آگے بڑھتا رہا مگر درد لمحہ لمحہ بڑھ رہا تھا اور وہ بیچ بیچ میں مجبور ہو جاتا کہ کسی چٹان پر بیٹھ کر جانوروں کی طرح ہانپ لے۔ درد کی ٹیسیں بڑھ رہی تھیں۔ اس کا سارا جسم اک کربناک اذیت سے کانپ رہا تھا اور فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ وہ دونوں نزدیک آرہے تھے۔ نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ وہ پھلانگے پھلانگتے تقریباً دوڑنے لگا۔

بڑی جاں برابر دوڑ تھی۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ایک لحظ کے لیے بھی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو زمین پر رکھتا تو آگ اور تیزاب کی ملی جلی جلتی ہوئی کیفیت سے دوچار ہوتا اور فوراً اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ اوپر اٹھا لیتا۔ پھلانگتے پھلانگتے وہ ہزار بارہ سو فٹ اور اوپر بڑھ آیا۔ چوٹی اب اس سے صرف پانچ سات سو فٹ کے فاصلے پر تھی مگر اب وہ بالکل بے دم ہو چکا تھا۔ اس کے جسم میں چھریاں سی چل رہی تھیں۔ بار بار اس پر نیم غشی کے دورے سے پڑتے اور آنکھوں میں ترمرے سے ناچنے لگتے۔ اب اس نے محسوس کیا کہ اس کا دھڑ بالکل بے کار ہو چکا ہے۔ اب وہ بالکل نہیں چل سکتا۔ کسی نہ کسی طرح زور لگا کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر جب اس میں ناکام ہوا تو اس نے سر نیچا کر کے لیٹے لیٹے ہی گھسٹنا شروع کر دیا اوپر کی طرف۔ اپنے بازوؤں کی قوت سے وہ ہر فٹ اوپر ہی اوپر گھسٹتا رہا۔ اس گھسٹنے میں اس کے گھٹنے چھل گئے۔ اس کی کہنیوں سے خون بہنے لگا۔ ہاتھوں کی انگلیاں چھلنی ہوتی گئیں۔ اس کے شانے چھل گئے پھر بھی وہ لمحہ بہ لمحہ آگے ہی کو اوپر ہی کو گھسٹتا رہا۔ ساری زندگی کی کاوش اور امید اور محنت اور اس کا درد انتظار اس کی آنکھوں میں کھنچ آیا تھا اور وہ اپنے جسم سے نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے چلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آخری سو فٹ۔۔۔۔۔۔ اب اس نے پیچھے کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ آخری پچاس فٹ۔۔۔۔۔ آخری تیس فٹ۔۔۔ وہ اوپر ہی اوپر گھسٹتا گیا۔ پھر دانت پیس کر اور اپنے جسم سے زیادہ اپنی روح کا پورا زور لگا کر اور اپنی حیات کی مخفی قوتوں کو آواز دے کر اس نے آخری تیس فٹ بھی انچ انچ گھسٹ کر طے کر لیے اور پہاڑ کی سب سے اونچی چٹان پر پہنچ گیا۔ جو تعاقب کرنے والوں کی طرف سیدھی بلم کی طرح کھڑی تھی۔ لیکن گڈیالی کے جنگل کی طرف ایک آرام دہ کرسی کی طرح ڈھلوان شکل اختیار کیے ہوئے تھی۔

چوٹی پر پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو اس چٹان کی اونچی آرام کرسی پر گرا دیا اور ہانپتے ہانپتے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو گڈیالی کا سرسبز اور گھنا جنگل دور نیچے تک اس کے قدموں میں پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ندی کے۔۔۔ پار اس کے اپنے دیس میں آفتاب غروب ہو رہا تھا اور دور دور تک افق تا افق اس کے دیس کی گھاٹیاں اور وادیاں' دھان کے کھیت اور لہراتی ہوئی ندیاں ایک نارنجی غبار میں کھو گئی تھیں اور جہاں پر کبھی پل تھا وہاں پر دھنک کی محراب پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دیر تک حیرت سے خوبصورت رنگوں کی اس نازک سی محراب کو دیکھتا رہا جو اس کے دل کے سپنوں کی طرح حسین تھی اور یکایک اسے احساس ہوا جیسے اس کے سفر کی آخری منزل آ گئی۔ اب جس جگہ پر وہ پڑا ہے' وہاں سے وہ ایک انچ ادھر ادھر حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ چوٹی پر پہنچ گیا تھا اور اس کے جسم نے اسے آخری جواب دے دیا تھا۔

اس نے سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے ٹوٹے ہوئے پل کے کنارے اپنے وطن کے سپاہیوں کو سلام کیا اور پھر آنکھ کے کنارے سے نیچے دوسری طرف پہاڑ پر چڑھنے والے موگری کے دو بھائیوں کو آتے دیکھا۔ اب وہ ان کی رائفل کی زد میں تھا۔ مگر وہ اسے مار نہیں سکتے تھے کیونکہ اس کی پیٹھ پر ایک مضبوط دبیز چٹان تھی۔ انہیں اسے مارنے کے لیے چوٹی تک آنا ہو گا اور چوٹی تک آنے میں انہیں ابھی آدھ گھنٹہ اور لگے گا۔

ان کے آنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے۔۔۔۔۔۔!

چند لمحوں میں وہ بہت دور اپنے بچپن کو لوٹ گیا اور ان پہلے چند لمحوں میں اسے اپنے بچپن کے اپنے گاؤں کے پہاڑ یاد آئے۔ اونچے ٹیڑھے میڑھے راستے۔ موڑ پر کھڑے ہوئے اچانک اجنبیوں کی طرح نظر آ جانے والے دیودار اور ندیاں' شریر چرواہوں کی طرح گھاٹی پر دوڑتی ہوئی اور دھوپ کا آنچل دھیرے دھیرے کسی وادی کے رخ پر سرکتا ہوا اور خوشبو تاریک شاموں کی' جن میں ننھے ننھے چراغ رات کے دھیمے سروں کی طرح جگمگاتے ہیں اور محبت کی سرگوشی کی طرح مہکتے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے وہ بہت دور وہاں لوٹ گیا' جو اس کی ابتدا تھی۔ پھر ابتدا سے وہ جو پلٹا تو اگلے چند لمحوں میں اپنی پوری زندگی پھلانگ گیا اور یکایک اسے محسوس ہوا کہ اب تک اس نے جتنی زندگی گزاری وہ دو سروں کے لیے تھی۔ موگری کی پہلی وفا کے لیے اور اس کی آخری بے وفائی کے لیے۔ اپنے ملک کی محبت کے لیے اور اس کے آخری انتقام کے لیے' اور آخر میں اس خندق کے لیے جو دلوں کو دلوں سے جدا کرتی ہے۔ قطرہ قطرہ کر کے جب اس نے اپنی زندگی کا سارا حساب چکا دیا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاس صرف یہی آدھ گھنٹہ بچا ہے جو مکمل طور پر اس کا اپنا تھا۔

مگر آدھ گھنٹہ تو بہت ہوتا ہے۔ وہ تو ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آسمان سے گلے مل سکتا ہے۔ زمین پر کھلے ہوئے بہشتی پھولوں کو سونگھ سکتا ہے۔ ہوا میں اڑتی ہوئی نازک بدن ابابیل اور زمین پر چلتی ہوئی کنواری ندی کو دیکھ سکتا ہے۔ اس آدھے گھنٹے میں وہ ایک پوری زندگی گزار سکتا ہے۔ آدھ گھنٹہ تو بہت ہوتا ہے۔

اور جب اس نے یوں محسوس کیا تو ایسا لگا جیسے وہ ابھی ابھی پیدا ہوا ہے۔

یکایک اس کے سارے جسم سے درد نکل گیا۔ اس نے اپنے آپ کو بالکل ایک نوزائیدہ بچے کی طرح ہلکا پھلکا اور معصوم محسوس کیا۔ یکایک اس کا جی چاہا کہ وہ بانہیں پھیلا کر زور سے قہقہہ لگائے۔ ایسا خوش نصیب آدھ گھنٹہ کس کی زندگی میں آیا ہو گا۔ شروع سے آخر تک اس کا اپنا' اس کے آغاز سے انجام تک مکمل باخبر۔ اس آدھ گھنٹہ میں وہ اپنی تقدیر پر پوری طرح قادر تھا۔ وہ اس آدھے گھنٹے کا خدا تھا۔

مسرت کی ایک لہر اس کے دل میں دوڑ گئی۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپنی ٹانگیں پسار دیں۔ اپنے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا اور دونوں آنکھیں بند کر کے سوگری کے بھائیوں کا انتظار کرنے لگا۔

کرشن چندر

کالو بھنگی

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رک گیا کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہو سکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو درکنار، کوئی سیدھا سادا افسانہ، بے کیف و بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں لکھا جا سکتا، کالو بھنگی کے متعلق پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہر افسانے کے شروع میں میرے ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کے پوچھتا ہے "چھوٹے صاحب! مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟ ---- کتنے سال ہو گئے تمہیں لکھتے ہوئے؟"

"کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟"

"ساٹھ اور دو باسٹھ"

"مجھ میں کیا برائی ہے چھوٹے صاحب۔ تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں۔ کالو بھنگی، آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟"

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا اس کے متعلق۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا۔ دراصل میں کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدت سے کر رہا ہوں لیکن کبھی لکھ نہیں سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اس لئے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لئے، اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لئے اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدہیئت پاؤں لئے، اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری وریدیں لئے، اپنے کولہوں کی ابھری ابھری ہڈیاں لئے، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لئے اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں لئے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، پھیلے پھیلے نتھنوں، جھریوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے اوپر ننگی چندیا ابھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے اب تک کئی کردار آئے اور اپنی زندگی بتا کر، اپنی اہمیت جتا کر اپنی ڈرامائیت ذہن نشین کر کے چلے گئے۔ حسین عورتیں، خوبصورت تیلی بیوئے، شیطان کے چہرے اس ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے اس کی چار دیواری میں اپنے دیئے جلا کر چلے گئے لیکن کالو بھنگی بدستور اپنی جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے۔ اس نے اس گھر کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے، اسے روتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے، سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے، زندگی کے ہر رنگ میں، ہر نہج سے، ہر منزل میں دیکھا ہے۔ بچپن سے بڑھاپے سے موت تک، اس نے ہر اجنبی کو اس کے گھر کے دروازے کے اندر جھانکتے دیکھا ہے اور اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اس کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ وہ خود پرے ہٹ گیا ہے۔ ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے، حتیٰ کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے اور ذہن کے مرکز میں آ گیا ہے تاکہ میں اچھی طرح دیکھ لوں۔ اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے۔ ایک عرصے سے میں اسے

دیکھ رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں گا اس کے بارے میں، لیکن آج یہ بھوت ایسے مانے گا نہیں، اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے، آج اسے بھی الوداع کہہ دیں۔

میں سات برس کا تھا جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا، اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا، میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا۔ کوئی فرق نہ تھا۔ وہی گھٹنے، وہی پاؤں، وہی رنگت، وہی چہرہ، وہی چندیا، وہی ٹوٹے ہوئے دانت، وہی جھاڑو جو ایسا معلوم ہوتا تھا، ماں کے پیٹ سے اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف کرتا تھا، ڈسپنسری میں فائل چھڑکتا تھا پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا۔ کمپونڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کے لئے جنگل لے جاتا اور دن ڈھلتے ہی انہیں واپس ہسپتال میں لے آتا اور مویشی خانے میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا۔ بیس سال سے اسے میں یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔۔۔ ہر روز، بلاناغہ۔۔۔ اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی بیمار نہیں ہوا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لئے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اسے ٹالتا آیا ہوں لیکن یہ شخص نہیں مانتا۔ زبردستی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اس لئے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے اور آپ پر اس لئے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ درحالیکہ اس میں کوئی ایسی بات ہی نہیں جس کے لئے اس کے متعلق اتنی سردردی مول لی جائے۔ مگر کیا کیا جائے کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھنچی کھنچی سی ملتجیانہ خواہش ہے، ایک ایسی مجبور بے زبانی ہے، ایک ایسی محبوس گہرائی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو، کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو، کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو، ہاں آٹھ سال سے متواتر میرے ذہن میں کھڑا ہے نہ جانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حسن اور حیوان کی بوقلمونی کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا۔ اس وقت بھی یہ وہیں تھا جب میں نے بالکونی سے جھانک کر ان داتاؤں کی غربت دیکھی اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ صم بکم مگر اب یہ جائے گا ضرور۔ اب کے اسے جانا ہی پڑے گا۔ اب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ للہ اس کی بے کیف، بے رنگ، پھیکی، میٹھی کہانی بھی سن لیجئے تاکہ یہ یہاں سے دور دفان ہو جائے اور مجھے اس کے غلیظ قرب سے نجات ملے اور اگر آج بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بعد بھی یہیں جما رہے گا اور ممکن ہے زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جا سکتا ہے۔ کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آباؤ اجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح، اسی حالت میں۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی، اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا، اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ننگی چندیا پر کسی جانور مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے، سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت کی مینڈ پر اکڑوں بیٹھا ہے اور ایک گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار، اور وہ وہیں اپنا سر چٹواتا اونگھ اونگھ کر سو گیا ہے۔ اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس اجاگر ہونے لگتا تھا اور کائنات کے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گمان ہونے لگتا تھا، میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دنیا کی حسین ترین عورتیں، پھولوں کے تازہ ترین نغمے، کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ایسی معصومیت، ایسا حسن، ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا جتنا اس منظر میں کہ جب میں سات برس کا تھا اور وہ

کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی ' اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی ' اسے گویا سہلاتی ہوئی کسر کسر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی ۔ جی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں اور اونگھتا اونگھتا سو جاؤں ۔ ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھے وہ پیٹا ' وہ پیٹا اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا ' دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کے لئے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا ۔ ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی اور کمپونڈر صاحب کی بکری بھی ' حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے ' عورت سے بھی بڑھ کے لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی ۔ ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی ' چارہ کھلائے تو کالو بھنگی ' جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی ۔۔۔۔۔ اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی ۔ وہ اس کے ایک ایک اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے ۔ میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں ۔ جنگل میں ' راستے میں وہ انہیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا تھا لیکن پھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے ۔ گویا تین دوست سیر کرنے نکلے ہیں ۔ راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کر منہ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ سنبلو توڑ توڑ کے کھا رہا ہے اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے اور خود بھی کھا رہا ہے اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے اور ان سے بھی برابر باتیں کئے جا رہا ہے اور وہ دونوں جانور بھی ' کبھی غرا کر کبھی کان پھٹپھٹا کر ' کبھی پاؤں ہلا کر ' کبھی دم دبا کر ' کبھی ناچ کر ' کبھی گا کر ' ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں ۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے ' پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا منا چشمہ ' تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے کیونکہ بے چارے انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے ۔ اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز سے اس کے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے ۔ اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ میں ایک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لئے سوزن کاری میں مصروف ہے اور یا کالو بھنگی کا سویٹر بن رہی ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا تھا ' جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا ۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لئے دوسرے کتوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا ' بھوکا اور زخمی رہتا ۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر و تواضع میں لگا رہتا اور کبھی تو صابن سے اسے نہلاتا ' کبھی اس کی چچڑیاں دور کرتا ۔ اس کے زخموں پر مرہم لگاتا ' اسے مکی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا لیکن یہ کتا بڑا خود غرض جانور تھا ۔ دن میں صرف دو مرتبہ کالو بھنگی سے ملتا ۔ دوپہر کو اور شام کو اور کھانا کھا کے اور زخموں پر مرہم لگوا کے پھر گھومنے کے لئے چلا جاتا ۔ کالو بھنگی اور اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی ' اور بڑی دلچسپ ' مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لیکن کالو بھنگی اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور چرند اور پرند سے شناسائی تھی ۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آ جاتا تو وہ اسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا کہیں کوئی نیولا بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا ۔ تیتر ' رسٹھ ' گنتاری ' لال چڑا ' سبزہ تھی ' ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا ۔ اس لحاظ سے وہ راہل سنکرا تائن سے بھی بڑا پنڈت تھا ۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ مکی کا بھٹا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا اور آگ پر اسے اس طرح مدھم آنچ پر بھونتا تھا کہ مکی کا ہر دانہ کندن بن جاتا اور ذائقے میں شہد کا مزا دیتا اور خوشبو بھی ایسی سوندھی ' میٹھی میٹھی ' جیسے دھرتی کی سانس ! نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے ' بڑی مشاق

سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اسے بھونتا تھا جیسے وہ برسوں سے اس بھٹے کو جانتا تھا۔ ایک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا، اتنی نرمی اور مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا گویا وہ بھٹا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا اور لوگ بھی بھٹا بھونتے تھے، مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کچے، ذائقہ اور معمولی سے بھٹے ہوتے تھے وہ کہ انہیں بس کی کا بھٹا ہی کہا جا سکتا ہے لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کے وہی بھٹا کچھ کا کچھ ہو جاتا اور جب وہ آگ پر سینک کے بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل اک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو بھنگی اس سے کتنی محبت کرتا ہے ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہاتھ کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا اور میں انہیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی۔ بری طرح۔ بچارا کالو بھنگی بھی پٹا مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے میں جھاڑو لئے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق اور کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آ رہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا۔ میرے لئے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا بلکہ یوں کہئے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کے لئے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لئے فاؤنٹین پن اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

"کالو بھنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟"

"کوئی خاص بات، عجیب انوکھی، نئی۔"

"نہیں چھوٹے صاحب۔" (یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا۔ اب آگے چلئے، ممکن ہے---!

"اچھا تم یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟" ہم نے دوسرا سوال پوچھا۔

"تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں" ----وہ سوچنے لگتا۔ آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے، پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا ہے---- "چار روپے کا آٹا لاتا ہوں---- ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ کتنے روپے ہو گئے، چھوٹے صاحب؟"

"سات روپے۔"

"ہاں سات روپے۔ ہر مہینے ایک روپیہ بنئے کو دیتا ہوں، اس سے کپڑے سلوانے کے لئے روپے کرج لیتا ہوں نا۔ سال میں دو جوڑے تو چاہئیں۔ کمبل تو میرے پاس ہے۔ خیر، لیکن دو جوڑے تو چاہئیں اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آ جائے!"

"وہ کیسے؟"

"گھی لاؤں گا ایک روپے کا، اور گھی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے۔"

اب بولئے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہو گئی، جب راتیں جوان اور چمکدار ہونے لگتیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کر کے کانپنے لگتے اس وقت بھی کبھی کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کر اس کے پاس جاتا۔

"کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟"

"نہیں چھوٹے صاحب۔"

"کیوں؟"

"اس علاقے میں میں ہی ایک بھنگی ہوں اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے چھوٹے صاحب۔ پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے!" (لیجئے یہ راستہ بھی بند ہوا)

"تمہارا جی نہیں چاہتا کالو بھنگی؟" میں نے دوبارہ کوشش کر کے کچھ کریدنا چاہا۔

"کیا صاحب؟"

"عشق کرنے کے لئے جی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی۔"

"عشق کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحب؟"

"عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ۔"

"عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟ شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ۔ بڑے لوگ عشق بھی کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب، مگر ہم نے نہیں سنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ رہی شادی کی بات، وہ میں نے آپ کو بتا دی۔ شادی کیوں نہیں کی میں نے، کیسے ہوتی شادی میری، آپ بتائیے؟" ------ (ہم کیا بتائیں خاک)

"تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟"

"کس بات کا افسوس؟ چھوٹے صاحب۔"

میں نے ہار کر، اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔ وہ کبھی بیمار نہیں ہوا تھا اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا۔ اسے ہسپتال میں مریض رکھوا دیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا۔ کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دوا انڈیل دیتا اور ایک چپڑاسی اس کے لئے کھانا رکھ آتا۔ وہ اپنے برتن خود صاف کرتا، اپنا بستر خود ٹھیک کرتا، اپنا بول و براز خود صاف کرتا اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتہ دار تھوڑی تھے، اس لئے اس کی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط ہو گئی۔ کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا اور جب وہ مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھلا، ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کئے، مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور گھر آن کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا، ریڈیو سنا اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے از راہ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے باہر چلاتی رہیں۔ جانوروں کی ذات ہے نا آخر۔

"ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟ بتا دے۔"

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔

کیوں بھئی، اب تو میں نے سب کچھ لکھ دیا، وہ سب کچھ جو میں تمہاری بابت جانتا ہوں اب بھی یہیں کھڑے ہو، پریشان کر رہے ہو، للہ چلے جاؤ، کیا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے؟ کوئی بھول ہو گئی ہے۔ تمہارا نام۔ کالو بھنگی۔ کام۔ بھنگی۔ اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے، شادی نہیں کی، عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی۔ کوئی اچنبھا معجزہ نہیں ہوا جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے، اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے، غالب کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمہاری زندگی میں۔ پھر میں کیا لکھوں، اور کیا لکھوں؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے، چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، ایک روپیہ بنے کا۔ آٹھ روپے ہو گئے، مگر آٹھ روپے میں کہانی نہیں ہوتی۔ آج کل تو پچیس پچاس سو میں نہیں ہوتی مگر آٹھ روپے میں تو شرطیہ کوئی کہانی نہیں ہو سکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اب بختی ہی کو لو، ہسپتال میں کمپونڈر ہے بتیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔

وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے جنہوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر ظلی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کر لیا۔ وہ جوان ہے۔ اس کے چہرے پر رنگت ہے' یہ جوانی یہ رنگت کچھ چاہتی ہے۔ وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیض پر کلف لگا سکتا ہے۔ بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر سکتا ہے۔ سرکار نے اسے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے' ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے اور خوبصورت مریضاؤں سے عشق بھی کر لیتا ہے۔ وہ نوراں اور ظلی کا واقعہ تمہیں یاد ہو گا۔ نوراں نمیا سے آئی تھی' سولہ سترہ برس کی الہڑ جوانی' چار کوس سے سینما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آ جاتی تھی۔ بڑی بے وقوف تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے دو جوانوں کا عشق قبول کئے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے آ جاتا تو اس کی ہو جاتی اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ بالکل واضح قاطع' یقینی امر سمجھتے ہیں۔ دراں حالیکہ یہ عشق بڑا متذبذب' غیر یقینی' گو مگو حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اس سے بھی ہے' اس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں نہیں ہے اور ہے بھی تو اس قدر وقتی' گر گئی' ہنگامی کہ ادھر نظر چوکی ادھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے اسی لئے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔

اس کا دل نمبردار کے بیٹے کے لئے بھی دھڑکتا تھا اور پٹواری کے پوت کے لئے بھی' اس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لئے بیتاب ہو اٹھتے اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو' چاروں طرف لہریں ہوں اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو' اور کشتی ڈولنے لگے' ہولے ہولے ڈولتی جائے اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے چلتی چلتی تھم جائے اور سانس رکتے رکتے رک سی جائے' اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں' اور زلفیں بکھرتی بکھرتی بکھر سی جائیں اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں' اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے رہ جائے اور کوئی اپنی باہوں میں بھینچ لے۔ ہائے --- پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نوراں کی' اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی --- نمبردار کا بیٹا' پٹواری کا بیٹا' پٹواری کا بیٹا' نمبردار کا بیٹا' وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی' دونوں سے شادی کرنے کا اقرار کر چکی تھی' دونوں پر مرتی تھی' نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انہیں اپنی بیوقوفی پر بڑا غصہ آیا اور پہلے نمبردار کا بیٹا نوراں کے پاس پہنچا اور اپنی چھری سے اسے ہلاک کرنا چاہا اور نوراں کے بازو پر زخم آ گئے' اور پھر پٹواری کا پوت آیا اور اس نے اس کی جان لینی چاہی' اور نوراں کے پاؤں پر زخم آ گئے مگر وہ بچ گئی کیونکہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں --- خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کمپونڈر پر زیادہ تھا۔ نوراں کی تیمارداری میں ظلی دل و جان سے لگا رہا۔ نوارں سے پہلے بیگماں' بیگماں سے پہلے ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا مگر وہ ظلی کے ناکام معاشقے تھے کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں۔ ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا۔ بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے اور خاوند تھے اور خاوندوں کی دشمن نگاہیں تھیں جو گویا ظلی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہش کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ ظلی کیا کر سکتا تھا مجبور ہو کے رہ جاتا۔ اس نے بیگماں سے عشق کیا' ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا' ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا۔ جانکی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہر روز صبح اٹھ کے منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور خوبصورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لئے لاتا۔ بہترین دوائیں' بہترین غذائیں' بہترین تیمارداری' لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے چلی گئی اور جانکی اچھی ہوئی تو اس نے چلتے وقت ظلی کے دیئے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے' اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر ظلی کی طرف دیکھا اور ظلی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کے رونے لگا۔ ریشماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی اسی شدت' اسی خلوص' اسی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا لیکن ظلی

کے لئے نہ رحشماں رکی' نہ بیگماں' نہ جانکی' اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا اور یہ دھڑکن روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شروع شروع میں نوراں کی حالت غیر تھی۔ اس کا بچنا محال تھا مگر غلی کی انتھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی' سڑاند دور ہوتی گئی' سوجن غائب ہوتی گئی' نوراں کی آنکھوں میں چمک اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آگئی اور جس روز غلی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراں بے اختیار ایک اظہار تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اتری تو اس نے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر' اور آنکھوں میں کاجل لگایا اور بالوں کی زلفیں سنواریں تو غلی کا دل مسرت سے چوکڑیاں بھرنے لگا۔ نوراں غلی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے غلی سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لئے اس سے معافی مانگنے کے لئے' اس سے شادی کا پیمان کرنے کے لئے ہسپتال آئے تھے' اور نوراں انہیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی' کانپنے لگتی' مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا جب تک وہ لوگ چلے نہ جاتے' اور غلی اس کے ہاتھ کو اپنے ہات میں لے لیتا' اور جب وہ بالکل اچھی ہو گئی تو سارا گاؤں اس کا اپنا گاؤں اسے دیکھنے کے لئے امڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہو گئی تھی ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے' اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا اور پٹواری بھی اور دونوں خردماغ لڑکے بھی جو اب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کئے پر پشیمان ہو رہے تھے اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے غلی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی۔۔۔ سارا گاؤں اسے لینے کے لئے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم' اور سینکڑوں قدم جو نوراں کے ساتھ چل رہے تھے' غلی کے سینے کی گھاٹی پر سے گذرتے گئے اور پیچھے ایک دھندلی گرد و غبار سے اٹی رہ گذر چھوڑ گئے۔

اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت رومانی زندگی تھی غلی کی' غلی جو مڈل پاس تھا' بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا' پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا۔ غلی جو جوان تھا' جو محبت کرتا تھا' جو اک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا' جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا اور عشق میں روتا تھا کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پر کیف زندگی تھی غلی کی لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ

۱۔ کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

۲۔ کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

۳۔ کالو بھنگی نے رحشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

۴۔ کالو بھنگی رحشماں کے بیٹے کو مکی کے بھٹے کھلاتا تھا۔

۵۔ کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا اور آتش دان میں لکڑیاں جلاتا رہا تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

۶۔ کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اٹھاتا رہا' تین ماہ دس روز تک۔

کالو بھنگی نے رحشماں کو جاتے ہوئے دیکھا' اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لئے حیران ہو جاتا پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چندیا چٹوانے لگتا لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں۔ پھر اور کیا لکھوں تمہارے بارے میں کالو بھنگی' سب کچھ تو کہہ دیا' جو کچھ کہنا تھا' جو کچھ تم کہہ رہے ہو' تمہاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی' تم مڈل پاس یا فیل ہوتے' تمہیں وراثت میں کچھ کلچر' تہذیب' کچھ تھوڑی سی انسانی مسرت اور اس مسرت کی بلندی ملی ہوتی تو میں تمہارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمہارے آٹھ روپے میں میں کیا کہانی لکھوں۔ ہر بار ان آٹھ روپوں کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا' ایک روپے کا نمک' ایک روپے کا تمباکو' آٹھ آنے کی چائے' چار

آنے کا گز' چار آنے کا مصالحہ' سات روپے' اور ایک روپیہ بنے گا۔ آٹھ روپے ہو گئے۔ کیسے کہانی بنے گی تمہاری کالو بھنگی' تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔ چلے جاؤ' دیکھوں میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی پھوٹی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا۔ اچھا بھئی اب میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں۔ شاید اب تیرے لئے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا اور بخت یار چپڑاسی کا آسرا لینا پڑے گا۔ بخت یار چپڑاسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا ویکسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے جس کے تین طرف چیڑ کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے' جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں اس نے کرم کا ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں اور بڑی الیچی اور کدو جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مر جاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بخت یار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے۔ بخت یار کے تین بچے ہیں' اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے' ایک دفعہ بخت یار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی' اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا' اور پالے کے مارے دانت بج رہے تھے' اور گھر سے بخت یار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بخت یار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لئے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بخت یار کی بیوی جو اب اپنے کئے پر پشیمان تھی اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے تھے اور پاؤں تلے چیل کے خشک جھومر پھسلے جاتے تھے' پھر بارش شروع ہو گئی پھر کریڑی پڑنے لگی اور پھر چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی' اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دیئے ہوں اور برف کی پریوں کو قطار اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو' برف کے گالے زمین پر گرتے گئے' ساکن' خاموش' بے آواز' سپید مخمل' گھاٹیوں' وادیوں' چوٹیوں پر پھیل گئی۔

"اماں ----" بخت یار کی بیوی زور سے چلائی۔

"اماں ----" بخت یار چلایا۔

"اماں ----" کالو بھنگی نے آواز دی۔

جنگل گونج کے خاموش ہو گیا۔

پھر کالو بھنگی نے کہا ---- "میرا خیال ہے وہ نکر گئی ہو گی' تمہارے ماموں کے پاس۔"

نکر کے دو کوس ادھر انہیں بخت یار کی اماں ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی۔ گرتی' پڑتی' لڑھکتی' تھمتی' ہانپتی' کانپتی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور جب بخت یار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لئے مزاحمت کی۔ پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہو گئی اور بخت یار کی بیوی نے اسے تھام لیا اور راستے بھر وہ اسے باری باری سے اٹھاتے چلے آئے۔ بخت یار اور کالو بھنگی اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چلا تھا اور انہیں واپس آتے دیکھ کر بچے رونے لگے اور کالو بھنگی ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھجانے لگا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بخت یار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں' چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے' مگر کالو بھنگی میں تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں۔ میں ہسپتال کے ہر شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ سکتا ہوں لیکن تمہارے متعلق اتنا کچھ کرید نے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا کیا جائے۔ خدا کے لئے اب تو چلے جاؤ' بہت ستا لیا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح ذہن پر سوار رہے گا اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لئے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا ہے۔ تو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی تھی۔ میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں' سن' تو چاہتا ہے کہ کوئی تیرے گندے کھردرے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کے ان سے غلاظت دور کرے' ان کی بیائیوں پر مرہم لگائے' تو چاہتا ہے تیرے گھٹنوں کی

ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں۔ تیری رانوں میں طاقت اور سختی آ جائے، تیرے پیٹ کی مرجھائی ہوئی سلوٹیں غائب ہو جائیں، تیرے کمزور سینے کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے بال غائب ہو جائیں، تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے انہیں گویائی بخش دے۔ تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے، تیرے گالوں میں لہو بھر دے، تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے، تجھے ایک مصفا لباس دے دے، تیرے اردگرد ایک چھوٹی سی چاردیواری کھڑی کر دے، حسین، مصفا، پاکیزہ۔ اس میں تیری بیوی راج کرے، تیرے بچے قہقہے لگاتے پھریں، جو کچھ تو چاہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔ میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں۔ جب تو گاہک سے اپنا سر چٹواتا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لئے مکی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے جس محبت و شفقت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے تو اپنے ذہن کی پہنائی میں اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے، جو ابھی نہیں آیا، جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اسے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا منہ چوما ہے، اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر جہان بھر میں گھمایا ہے۔ دیکھ لو یہ ہے میرا بیٹا۔۔۔ یہ ہے میرا بیٹا، اور جب یہ سب کچھ تجھے نہیں ملا تو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھجانے لگا اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں، ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ۔۔۔ آٹھ روپے۔ میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی لیکن ہو نہ سکی کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں، میں اک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں۔ اس کے لئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں۔ اسکے لئے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا اور ڈاکٹر اور کمپونڈر اور بخت یار اور گاؤں کے پٹواری اور نمبردار اور دوکاندار اور حاکم اور سیاست دان اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہر شخص کی، لاکھوں، کروڑوں، اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے، یہ کام نہ ہو گا، اور تو اسی طرح اپنی جھاڑو لئے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھوئے، اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔

یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا ہے!

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آ جائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے۔

O

ممتاز مفتی

نام : مفتی ممتاز حسین
قلمی نام : ممتاز مفتی
پیدائش : ۱۱ ستمبر ۱۹۰۵ء بہ مقام بٹالہ (ضلع گورداسپور) پنجاب۔ (۱)
تعلیم : بی۔اے۔ اسلامیہ کالج، لاہور: ۱۹۲۹ء
ایس۔اے۔وی۔ سینٹرل ٹیچرز ٹریننگ کالج، لاہور: ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء
ڈپلوما شارٹ ہینڈ / ٹائپ، لاہور: ۱۹۲۹ء۔ ۱۹۳۰ء

مختصر حالاتِ زندگی:

مفتی محمد حسین کے ہاں پیدا ہوئے جو محکمہ تعلیم پنجاب سے وابستہ تھے۔ ابتدائی تعلیم بٹالہ، امرتسر، میانوالی، ملتان اور ڈیرہ غازی خان میں پائی۔ میٹرک ۱۹۲۱ء میں ڈیرہ غازی خان سے اور ایف۔اے ۱۹۲۳ء میں ہندو سبھا کالج امرتسر سے کیا۔ اسلامیہ کالج، لاہور سے ۱۹۲۹ء میں بی۔اے کرنے کے بعد سینٹرل ٹیچرز ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا جہاں سے ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد محکمہ تعلیم پنجاب کے سینئر انگلش ٹیچر کے طور پر خانیوال، دھرم سالہ، گوجرہ، چک جھمرہ، جام پور، ساہیوال، باغبان پورہ، قصور، شیخوپورہ، سانگلہ ہل اور گورداسپور کے اسکولوں میں ۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۵ء پڑھاتے رہے۔ لاہور میں طالب العلمی کے زمانے میں سید فیاض محمود اور مجید ملک کے ساتھ دوستی رہی جس نے ادبی ذوق کو پیدا کیا۔ ۱۹۳۴ء میں ن۔م راشد سے ملاقات میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ پہلے دو مضامین گوجرہ ہائی سکول کے جریدے اور رسالہ "نخلستان" لاہور میں شائع ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں بطور سٹاف آرٹسٹ / سکرپٹ رائٹر آل انڈیا ریڈیو، لاہور کے ساتھ منسلک ہو گئے جہاں اوائل ۱۹۴۷ء میں اداکار کمار اور بیگم کمار، اداکارہ پرمیلا (۲) کی فرمائش پر "سلور فلمز" مین روڈ، دادر بمبئی سے منسلک ہو گئے۔ کرشن چندر اور میرا جی کے ساتھ قیام رہا اور سلور فلمز کے لیے فلم "رضیہ سلطانہ" کی کہانی لکھی، سکرین پلے اعظم مرزا نے تیار کیا تھا۔ یہ فلم فسادات کی نذر ہو گئی اور ممتاز مفتی ۱۹۴۷ء میں واپس لاہور آ گئے۔ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۴۹ء میں بطور سب ایڈیٹر ہفتہ وار "استقلال" لاہور نکالا۔ ۱۹۴۹ء میں پی۔آر۔ سی پاکستان ایئر فورس میں سائیکالوجسٹ ہو گئے۔ لیکن یہ محکمہ ۱۹۵۰ء میں ٹوٹ گیا۔ اسی سال بطور سٹاف آرٹسٹ / سکرپٹ رائٹر آزاد کشمیر ریڈیو، ترار کھل کے ساتھ منسلک ہو گئے جہاں ۱۹۵۱ء تک رہے۔ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۷ء اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر، کشمیر پبلسٹی ڈائریکٹریٹ، راولپنڈی رہے جہاں سے ۱۹۵۷ء میں تبدیل کر کے بطور فلم آفیسر D.A.F.P کراچی بھیج دیا گیا۔ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۰ء وہیں ایڈ ڈائریکٹریٹ کراچی میں رہے۔ ۱۹۶۰ء میں قدرت اللہ شہاب (سیکرٹری برائے اطلاعات) کے او۔ایس۔ڈی کے طور پر ایوانِ صدر، راولپنڈی آ گئے جہاں ۱۹۶۳ء تک رہے۔ اب ان کا تبادلہ بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر وزارتِ اطلاعات، راولپنڈی کر دیا گیا جہاں ۱۹۶۵ء تک کام کیا۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء تک او۔ایس۔ڈی، وزارتِ اطلاعات، راولپنڈی رہے۔ ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہو گئے۔ آخری زمانے میں وزارتِ اطلاعات اور براڈکاسٹنگ سے متعلق تھے۔ آپ کے اپنے بیان کے مطابق ابتدا میں دوستوفسکی، سگمنڈ فرائڈ، ژنگ، (۳) برٹرنڈ رسل، ڈاکٹر سٹیکل اور ڈاکٹر یونگ نے متاثر کیا۔ (۴)

اولین مطبوعہ افسانہ:

"جھکی جھکی آنکھیں" مطبوعہ: "ادبی دنیا" لاہور ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "ان کہی" (سترہ افسانے) مکتبہ اردو' لاہور' طبع اول: ۱۹۴۳ء

۱۔ آپا ۲۔ بیگانگی ۳۔ جھکی جھکی آنکھیں (اولین افسانہ مطبوعہ: ۱۹۳۶ء) ۴۔ آپ بیتی ۵۔ اندھیرا ۶۔ خلا ملط ۷۔ یہ دیوی ۸۔ نفرت ۹۔ محلّہ ۱۰۔ غسل آفتابی ۱۱۔ کرن محل کا بھوت ۱۲۔ مہندی والا ہاتھ ۱۳۔ اندھا ۱۴۔ ماتھے کا تل ۱۵۔ مورا ۱۶۔ انظام ۱۷۔ سیانی۔

مکتبہ اردو' لاہور کے ساتھ معاہدہ ۲۹' اپریل ۱۹۴۳ء کو طے پایا۔

۲۔ "گہما گہمی" (پندرہ افسانے) سندھ ساگر اکیڈمی' لاہور' طبع اول: ۱۹۴۴ء

۱۔ بدمعاش ۲۔ میاں کی مرضی ۳۔ وہ کمرہ ۴۔ حد ہو گئی ۵۔ جب اور اب ۶۔ چڑ ۷۔ دام خیال ۸۔ زندگی ۹۔ شرابی کا راز ۱۰۔ اس کوچے میں ۱۱۔ خواب ۱۲۔ الصدف ۱۳۔ ڈاکٹر کا استعمال ۱۴۔ وہ انجم ۱۵۔ کالے سلیپر

۳۔ "چپ" (پندرہ افسانے) مکتبہ اردو' لاہور' طبع اول: ۱۹۴۷ء

۱۔ نیلی ۲۔ چپ ۳۔ پل ۴۔ احسان علی ۵۔ شائستہ ۶۔ باجی ۷۔ دوراہا ۸۔ پریم نگر ۹۔ تین خدا ۱۰۔ پاگل ۱۱۔ دروازہ ۱۲۔ گہرائیاں ۱۳۔ سہارا ۱۴۔ لیڈی ڈاکٹر ۱۵۔ پیارا پالتو

مکتبہ اردو' لاہور کے ساتھ معاہدہ ۲۵' جنوری ۱۹۴۷ء کو طے پایا۔ اس کتاب کا دیباچہ فکر تونسوی نے لکھا ہے جبکہ مفتی کا خاکہ بشیر رومانی احمد بشیر کا تحریر کردہ ہے۔

۴۔ "اسمارائیں" (سترہ افسانے) مکتبہ جدید' لاہور' طبع اول: ۱۹۵۳ء

۱۔ سمیع وا سمارہ ۲۔ راں ڑیاں ۳۔ ہائے رے یہ نوجوان ۴۔ جوار بھاٹا ۵۔ اوئی اللہ ۶۔ احمق ۷۔ موقعہ ۸۔ وہ ہاتھ ۹۔ سو پور کی کھڑکی ۱۰۔ لکھ پتی ۱۱۔ ماں ۱۲۔ مسز کٹلے کا خاوند ۱۳۔ خدا بخش ۱۴۔ گھور اندھیرا ۱۵۔ ریت کی لہریں ۱۶۔ آپ بیتی ۱۷۔ گوبر کے ڈھیر۔

مکتبہ جدید' لاہور کے ساتھ معاہدہ' ۲۲' جنوری ۱۹۵۳ء کو طے پایا۔

۵۔ "نظام سقہ" (ڈراما) مکتبہ اردو' لاہور' طبع اول: ۱۹۵۳ء

۶۔ "علی پور کا ایلی" (سوانحی ناول) داستان گو' لاہور' طبع اول: ۱۹۶۱ء

ایک زمانے میں یہ اردو کا سب سے ضخیم ناول شمار ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں حیات اللہ انصاری نے "لہو کے پھول" (پانچ جلدیں) لکھ کر مفتی کا یہ ریکارڈ توڑ دیا اور اب اوپندر ناتھ اشک کا "گرتی دیواریں" اس سے بھی ضخیم ناول آیا چاہتا ہے۔ مفتی صاحب کے اپنے بیان کے مطابق اس ناول کے مقامات کو "ڈی کوڈ" کریں تو خان پور (ملتان)' جاوا (گوجرہ) دیپال پور (ساہیوال) اور بام آباد (ڈیرہ غازی خان) ٹھہرتے ہیں۔ اس ناول کے چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ طبع دوم' میری لائبریری لاہور ۱۹۶۹ء' طبع سوم' سنگ میل' لاہور ۱۹۸۵ء اور طبع چہارم سنگ میل' لاہور ۱۹۹۱ء۔ آخری ایڈیشن میں کرداروں کے اصل ناموں کی فہرست بھی شامل کر

دی گئی ہے۔

۷۔ "گڑیا گھر" (چودہ افسانے) گلڈ اشاعت گھر، کراچی، طبع اول: ۱۹۶۵ء

۱۔ گڑیا گھر ۲۔ کھونٹ والا بابا ۳۔ چار گوٹ ۴۔ ذاتی معاملہ ۵۔ مینا کے پاؤں ۶۔ دودھیا سویرا ۷۔ سکارلٹ روڈ ۸۔ نیلی رگ ۹۔ عطیہ ۱۰۔ نومان اور منیرہ ۱۱۔ گھر کی عزت ۱۲۔ جادوگرنی ۱۳۔ میرا گھر ۱۴۔ پردہ سیمیں۔

۸۔ "پیاز کے چھلکے" (خاکے) نیشنل پبلشنگ کمپنی، راول پنڈی، طبع اول: ۱۹۶۸ء

۹۔ "لبیک" (روداد حج) التحریر، لاہور، طبع اول: ۱۹۷۵ء

۱۰۔ "ہند یاترا" (سفرنامہ ہند) اظہار سنز، لاہور، طبع اول: ۱۹۸۳ء

کتاب کا معاہدہ ۱۹۸۱ء میں طے پایا

۱۱۔ "روغنی پتلے" (اٹھارہ افسانے) حرمت پبلی کیشنز، راولپنڈی، طبع اول: ۱۹۸۴ء

۱۔ سندرتا کا راکشش ۲۔ بش اور بشرو ۳۔ چپک ۴۔ باجوؤں کی ڈھونڈ ۵۔ کھلا بند ھنا ۶۔ روغنی پتلے ۷۔ ڈائری ۸۔ اپسرا حویلی ۹۔ آغا اور اسمارائیں ۱۰۔ بائنڈ موٹا ۱۱۔ ایک تھا بادشاہ ۱۲۔ املینیز ۱۳۔ پرانی شراب نئی دکان۔ ۱۴۔ حلوائی کی دکان۔ ۱۵۔ وہ ۱۶۔ ان پورنی ۱۷۔ وقار محل کا سایہ ۱۸۔ بت دیوتا اور سناٹا

کتاب کا معاہدہ فروری ۱۹۸۴ء میں طے پایا۔ کل صفحات ۲۴۲ ہیں۔

۱۲۔ "سے کا بندھن" (افسانے) فیروز سنز، لاہور، طبع اول: ۱۹۸۶ء

۱۔ سے کا بندھ ۲۔ ساری بات ۳۔ چٹ کپڑی ۴۔ چکٹ گاڑی، ہونکتا ہوڑ اور موم بتی ۵۔ ایک ہاتھ کی تالی ۶۔ ماتا نمانہ ۷۔ دیوی ۸۔ گرین ما ۹۔ بھی اور عفریت ۱۰۔ گرداس داس گرد ۱۱۔ دو مونہی ۱۲۔ کس لئے؟ کیا اسلئے؟ ۱۳۔ اندھا فٹ پاتھیا ۱۴۔ کمرہ نمبر ۱۵۱۷۔ ماڈ ہاؤس ۱۶۔ بیڑھی سرکار ۱۷۔ ا بمان اپ مین اپ ۱۸۔ تھرڈ مین

۱۳۔ "اوکھے لوگ" (خاکے) انٹرنیشنل بجرہ پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول: ۱۹۸۶ء

کتاب کا معاہدہ ۱۹۸۳ء میں طے پایا۔

۱۴۔ "حکایات" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور،

۱۵۔ "تین لوک کہانیاں" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور،

۱۶۔ "اولیاء اللہ" (دو جلدیں/ بچوں کے لیے معلومات) مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور،

۱۷۔ "تین لوک قصے" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور،

۱۸۔ "مفتیانے" (افسانوی کلیات) مطبوعہ: فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، طبع اول: ۱۹۸۹ء

۱۹۔ "اور اوکھے لوگ" (خاکے) مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور، طبع اول: ۱۹۹۱ء

۲۰۔ "الکھ نگری" (سوانحی ناول) مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور، طبع اول: ۱۹۹۲ء

۲۱۔ "کہی نہ جائے" (افسانے) مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور، طبع اول: ۱۹۹۲ء

۲۲۔ "جماعت اسلامی" (تجزیہ۔ ممتاز حسین عاصی کے فرضی نام سے) مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور، طبع اول: ۱۹۹۳ء

۲۳۔ "Delusion of Grandeur" (فرضی نام سے) مطبع: مکتبہ جدید، لاہور، طبع اول: ۱۹۹۵ء

غیر مدون:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ لاتعداد ریڈیائی ڈرامے' ریڈیائی فیچر' نشری تقریریں' مضامین اور خاکے غیر مرتب صورت میں بکھرے پڑے ہیں۔

مستقل پتا:

مکان نمبر ۲۲' گلی نمبر ۳۲ سیکٹر ایف ۱/۶ اسلام آباد

اعزاز:

۱۔ ستارۂ امتیاز' حکومت پاکستان۔
۲۔ "نقوش" ادبی ایوارڈ

نظریہ فن:

"ایک مرکزی خیال یا تاثر ضروری ہے۔ افسانے میں تاثر ہونا لازم ہے۔ اگر قاری کے دل میں تجسس پیدا کرے کہ پھر کیا ہوا تو بہت اچھے۔"

(مکتوب ۷ نومبر ۱۹۸۴ء بنام مرزا حامد بیگ سے اقتباس)

(۱) "ستاروں کی محفل" مرتبہ: بشیر ہندی میں ۱۹۰۶ء درج ہے' جو درست نہیں۔ تعلیمی اور سرکاری ریکارڈ میں تاریخ پیدائش ۴ جنوری ۱۹۰۶ء درج ہے۔
(۲) فلم "میرا لال" "" مدر انڈیا" "" جنگلی کنگ" اور "بجلی" کی مشہور اداکارہ۔ اداکار کمار اور پرمیلا نے ستور فلمز کے جھنڈے تلے "جھنکار" اور "بڑے نواب صاحب" جیسی مشہور فلمیں بنائیں۔
(۳) مفتی صاحب نے ڈاکٹر محمد اقبال کے تتبع میں "نطشے" لکھا ہے' درست "نٹشے" ہے۔
(۴) بہ حوالہ "ستاروں کی محفل" مرتبہ: بشیر ہندی

ممتاز مفتی

آپا

جب کبھی بیٹھے، بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے چھوٹا سا بلوری دیا آ جاتا ہے جو نیم لو سے جل رہا ہو۔

مجھے یاد ہے کہ ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے تھے میں، آپا اور امی جان، کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ ان دنوں بدو چھ سات سال کا ہو گا۔ کہنے لگا۔ "امی جان! میں بھی بیاہ کروں گا۔"

"اوہ ابھی سے؟" اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں۔ "اچھا بدو تمہارا بیاہ آپا سے کر دیں؟"

اماں کہنے لگیں۔ "کیوں آپا کو کیا ہے؟"

"ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔" بدو نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

"اونہوں!" بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں "کیوں دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں؟"

"میں بتاؤں کیسی ہے؟" وہ چلایا۔

"ہاں بتاؤ تو بھلا"۔ اماں نے پوچھا۔ بدو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈھ رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چولھے پر آ کر رکی، چولھے میں اپلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدو نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا "ایسی!" پھر بجلی کی روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا۔ "اور چھاجو باجی ایسی!" اس بات پر ہم سب دیر تک ہنستے رہے اتنے میں تصدق بھائی آ گئے۔ اماں کہنے لگیں۔ "تصدق بدو سے پوچھنا تو آپا کیسی ہیں؟" آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

"ہاں تو کیسی ہے آپا، بدو؟" وہ بولے۔ "بتاؤں؟" بدو چلایا اور اس نے اپلے کا ٹکڑا اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اسے ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی "اونہہ!" بدو رونے لگا تو اماں کہنے لگیں، پگلے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے، اس میں چنگاری ہے"۔۔۔ "وہ تو جلا ہوا ہے اماں!" بدو نے بسورتے ہوئے کہا۔ اماں بولیں۔ "میرے لال تمہیں معلوم نہیں اس کے اندر تو آگ ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔" بدو نے بھولے پن سے پوچھا۔ "کیوں آپا اس میں آگ ہے؟" اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ "میں کیا جانوں؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور پھکنی اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں بے مصرف پھونکیں مارنے لگی۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات ابھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسے پتے کی بات کہی تھی مگر میں کہا کرتی تھی۔ "آپا تم تو بس بیٹھ رہتی ہو۔" اور وہ مسکرا کر کہتی "پگلی!" اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کو کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے۔ ادھر بدو چیختا۔ "آپا میرا دلیہ۔" ادھر ابا گھورتے "سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی؟" بیچ میں اماں بول اٹھتیں۔ "بیٹا دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے؟" اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نپٹ لیتی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود جانے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا

تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اسے ادھر سے ادھر گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں سنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس۔ البتہ وہ مسکرایا اکثر کرتی۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ہاں تو میں سمجھتی تھی کہ آپا چپکی بیٹھی ہی رہتی ہے۔ ذرا نہیں ہلتی اور بن چلے لڑھک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو باجی کو چلتے دیکھ کر تو میں کبھی نہ اکتاتی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی چلتی اس طرح گردن موڑ کر پنچم آواز میں کہے "ہیں جی! کیوں جی؟" اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگیں۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری تھی۔

ساحرہ اور ثریا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ دن بھر ان کا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک بیٹھ رہنے والی آپا' ایک "یہ کرو۔ وہ کرو" والی اماں اور دن بھر حقے میں گڑگڑ کرنے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے ہوئے سنا۔ سچ تو یہ ہے مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے۔ "سجادہ کی ماں! معلوم ہوتا ہے ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔"

"کیوں؟" اماں پوچھنے لگیں۔

کہنے لگے۔ "بس تمام دن برتن ہی بجتے رہتے ہیں اور یا قہقہے لگتے ہیں جیسے میلہ لگا ہو۔"

اماں تنک کر بولیں۔ "مجھے کیا معلوم۔ آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔"

ابا کہنے لگے۔ "اوہو! میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی برتن بجنے لگے۔ بازار کے اس موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات نہیں۔" میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ "بڑی آئی ہے۔ سجادہ جی ہاں! اپنی بیٹی جو ہوئی۔" اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اسی بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ ابا جانتے ہی کیا ہیں۔ بس حقہ لیا اور گڑگڑ کر لیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گٹ مٹ گٹ مٹ کرنے لگے جیسے کوئی بھٹیاری مکی کے دانے بھون رہی ہو۔ سارے گھر میں لے دے کر صرف تصدق بھائی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور جب ابا گھر پر نہ ہوتے تو وہ بھاری آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔ جانے وہ کون سا شعر تھا۔۔۔ ہاں

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

آپا انہیں گاتے ہوئے سن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بدو کو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی۔ "بدو رونا" اور پھر آپ ہی بیٹھی مسکراتی رہتی۔

تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بیٹے بھائی تھے۔ انہیں ہمارے گھر آئے یہی دو ماہ ہوئے ہوں گے۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھی تو باتوں باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگی بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں۔ کہنے لگیں "اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب؟" پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئی۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی پچھلی تمام باتیں لے بیٹھتی ہیں۔ غرضیکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ اکتاتے۔ البتہ آپا سے وہ زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے بھی کیسے، جب بھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو آپا کے دوپٹے کا پلو آپ ہی آپ سرک کر نیم گھونگھٹ سا بن جاتا اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا ان کی باتیں غور سے سنا کرتی تھی گو کہتی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے لیکن صرف اسی وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے، پوچھتے۔ "بدو تمہاری آپا کیا کر رہی ہے؟"

"آپا؟" بدو لاپروائی سے دہراتا۔ "بیٹھی ہے ---- بلاؤں؟"

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے۔ "نہیں نہیں۔ اچھا بدو، آج تمہیں، یہ دیکھو اس طرف تمہیں دکھائیں۔"

اور جب بدو کا دھیان ادھر ادھر ہو جاتا تو وہ مدھم آواز میں کہتے۔ "ارے یار تم تو مفت کا ڈھنڈورا ہو۔"

بدو چیخ اٹھتا۔ "کیا ہوں میں؟" اس پر وہ میز بجانے لگتے۔ "ڈھگ ڈھگ ڈھنڈورا یعنی یہ ڈھنڈورا ہے، دیکھا؟ جسے ڈھول بھی کہتے ہیں ڈھگ، ڈھگ سمجھے؟" اور آپا اکثر چلتے چلتے ان کے دروازے پر ٹھہر جاتی اور ان کی باتیں سنتی رہتی اور پھر چولھے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی۔ اس وقت اس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا، بالوں کی لٹ پھسل کر گال پر آگرتی اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولھے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں۔ آپا کے ہونٹ یوں ہلتے گویا گا رہی ہو مگر الفاظ سنائی نہ دیتے۔ ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آجاتے تو وہ ٹھٹک کریوں اپنا دوپٹہ، بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آگھسا ہو۔

ایک دن میں، آپا اور اماں باہر صحن میں بیٹھی تھیں۔ اس وقت بھائی صاحب اندر اپنے کمرے میں بدو سے کہہ رہے تھے۔ "میرے یار ہم تو اس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے، کتابیں پڑھ سکے، شطرنج، کیرم اور چڑیا کھیل سکے۔ چڑیا جانتے ہو؟ وہ گول گول پروں والا گیند بلے سے یوں ڈز، ٹن، ڈز اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزے دار کھانے پکا کر کھلا سکے، سمجھے؟"

بدو بولا۔ "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔"

"اونہہ!" بھائی صاحب نے کہا۔

بدو چیخنے لگا۔ "میں جانتا ہوں تم آپا سے بیاہ کرو گے۔ ہاں!" اس وقت اماں نے مسکرا کر آپا کی طرف دیکھا۔ مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ "واہ تمہاری آپا فرنی پکاتی ہے تو اس میں پوری طرح شکر بھی نہیں ڈالتی۔ بالکل پھیکی۔ آخ تھو!"

بدو نے کہا "ابا جو کہتے ہیں فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہئے۔"

"تو وہ اپنے ابا کے لئے پکاتی ہے نا۔ ہمارے لئے تو نہیں!"

"میں کہوں آپا سے؟" بدو چیخا۔

بھائی چلائے۔ "او پگلا۔ ڈھنڈورا۔ لو تمہیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں۔ یہ دیکھو اس طرف ڈھگ ڈھگ۔" بدو پھر چلانے لگا۔ "میں جانتا ہوں تم میز بجا رہے ہو نا؟" --- "ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پٹتا ہے نا۔" بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ "کشتیوں میں، اچھا بدو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے، آؤ ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہوا گاما اور تم بدو پہلوان۔ لو آؤ، ٹھہرو، جب میں تین کہوں" اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔ "ارے یار تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے۔"

میرا خیال ہے آپا ہنسی نہ روک سکی اس لئے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا اور اماں نے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا کہ آواز نہ نکلے۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آگئے۔ کہنے لگے "کیا پڑھ رہی ہو بہنا؟" ان کے منہ سے بہنا سن

کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی ۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی ۔ نورجہاں کیسا پرانا نام ہے ۔ بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزا آنے لگتا ہے میں تو نورجہاں سن کر یوں محسوس کیا کرتی تھی جیسے کسی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سونٹا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہوں۔۔۔ مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوار دینے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے منہ سے ،بینا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور میں محسوس کرتی گویا ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجادہ سے سجدے کہا کرتے تھے مگر وہ تو پرانی بات تھی' جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی جان اسے سجدے نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لینے سے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دے دیا۔ "سکول کا کام کر رہی ہوں۔"

پوچھنے لگے " تم نے کوئی برنرڈ شا کی کتاب پڑھی ہے کیا؟"

میں نے کہا۔ " نہیں!"

انہوں نے میرے اور آپا کے درمیان دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ " تمہاری آپا نے تو ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہو گی ۔ " وہ انکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آپا نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا اور مدہم آواز میں کہا " نہیں!" اور سویٹر بننے میں لگی رہی۔

بھائی جان بولے " اوہ کیا بتاؤں ،بینا کہ وہ کیا چیز ہے 'نشہ ہے نشہ ' خالص شہد 'تم اسے ضرور پڑھو بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا ۔ میرے پاس پڑی ہے۔"

میں نے کہا۔ " ضرور پڑھوں گی ۔ "

پھر پوچھنے لگے ۔ " میں کہتا ہوں تمہاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ کیوں دیا؟"

میں نے چڑ کر کہا ۔ " مجھے کیا معلوم آپ خود ہی پوچھ لیجئے ۔ " حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آپا نے کالج میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا ۔ کہتی تھی میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا ۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی نمائش گاہ ہو ۔ درسگاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی جیسے مطالعے کے بہانے میلہ لگا ہو ۔ " مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی ۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھ رہنے کے لئے کالج جانا نہیں چاہتی ۔ بڑی آئی تھی نکتہ چین ۔ اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چڑ جاتی ۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی اور یہ آپا آپا کر رہے ہیں اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب ؟ میں کیا ٹیلیفون تھی ؟ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا' بیٹھی ہوئی گم سم آپا' بھیگی بلی۔

شام کو ابا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلا اٹھے ۔ " آج فیرنی میں اتنی شکر کیوں ہے ؟ قند سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔ سجادہ! سجادہ بیٹی کیا کھانڈ اتنی سستی ہو گئی ہے ۔ ایک لقمہ نگلنا بھی مشکل ہے۔"

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں ۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ زرد پڑ جاتا ۔ مگر اس وقت اس کے گال تمتما رہے تھے 'کہنے لگی ۔ " شاید زیادہ پڑ گئی ہو ۔ " یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت پیس رہی تھی ۔ " شاید ۔ کیا خوب ۔ شاید۔"

ادھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے ۔ " چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ فیرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے "۔ صحن سے اماں دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں ' جیسے ان کی عادت ہے ۔ " آپ تو ناحق بگڑتے ہیں ۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں؟ اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے اس کا تو خیال کرنا چاہئے۔" ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی' کہنے لگے۔ "ارے یہ بات ہے مجھے بتا دیا ہوتا میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں۔۔۔۔" اور وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپا' ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی ۔ آپا اس سے ملنا تو کیا بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی ۔ بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی ۔ میں نے خیال کیا ضرور کوئی بھید ہے اس بات میں 'کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اس پر چڑھ

کر ہماری طرف جھانکتی اور کسی نہ کسی بہانے سلسلہ گفتگو کو دراز کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتوں سے اسے ٹال دیتی۔ آپ ہی آپ بول اٹھتی۔ "ابھی تو اتنا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ خیر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر جب آپا لوٹ چکی تو کچھ دیر کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا پہنچی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے ذکر چھیڑ دیا۔ "آج آپا آئی تھی؟"

ساحرہ نے ناخن پر پالش لگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے نہ جانے کیا نام ہے اس کا ہاں! ہارٹ بریک ہاؤس"

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی۔ اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک جھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں پڑ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا۔ "آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے۔ دل توڑنے والا گھر؟ اس کے کیا معنی ہوئے؟" آپا پہلے تو ٹھٹک گئی، پھر وہ سنبھل کر اٹھی اور بیٹھ گئی۔ مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا۔

"اس لحاظ سے تو ہمارا گھر ہارٹ بریک ہے۔"

کہنے لگی۔ "میں کیا جانوں؟"

میں نے اسے جلانے کو کہا۔ "ہاں! ہماری آپا بھلا کیا جانے؟" میرا خیال ہے یہ بات ضرور اسے بری لگی۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھ دی اور بتی بجھا کر سو گئی۔

ایک دن یوں ہی پھرتے پھرتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی۔ پہلے تو بھائی جان ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر پوچھنے لگے۔ "بیبنا! اچھا یہ بتاؤ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے؟" میں نے کہا۔ "میں کیا جانوں؟ جا کر آپا سے پوچھ لیجیے۔" ہنس کے کہنے لگے۔ "آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟"

"کیوں میں لڑاکا ہوں؟" میں نے کہا۔

بولے۔ "نہیں ابھی تو لڑکی ہو شاید کسی دن لڑاکا ہو جاؤ۔" اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے۔ "دیکھو بیبنا مجھے لڑنا بے حد پسند ہے۔ میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک لڑ سکے، ذرا نہ اکتائے۔" جانے کیوں میں شرما گئی اور بات بدلنے کی خاطر پوچھا۔ "فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان؟"

بولے۔ "وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید، لال لال، کالا کالا، نیلا نیلا سا۔" میں ان کی بات سن کر بہت ہنسی، پھر کہنے لگے۔ "وہ مجھے بے حد پسند ہے، یہاں تو بیبنا ہم فرنی کھا کر اکتا گئے۔" میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہو گی۔ کیونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی "نعمت خانہ" پڑھ رہی تھی۔ اس دن کے بعد روز بلاناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس چلا جاتا تو جھٹ فروٹ سلاد کی کشتی چھپا دیتی۔ ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدو سے کہا۔ "بدو بھلا بوجھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے اس میں کیا ہے؟"

بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدو کو اور بھی چمکا دیا۔ میں نے کہا۔ "بدو جاؤ تو بھائی جان سے پوچھو اس کھانے کا کیا نام ہے۔۔۔"

بدو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر وہ کشتی اس سے چھین لی اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے مجھے کیوں گھورا تھا؟ اسی رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی، مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی

بات پہ بہت افسوس ہوا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

انہی دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب ساجو باجی کہا کرتے تھے 'میٹرک کا امتحان دینے کے لئے ہمارے گھر آ ٹھہری۔ ساجو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ساجرہ اور ثریا چارپائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں۔ بدو چھاجو باجی 'چھاجو باجی چیختا پھرتا اور کہتا۔ "ہم تو چھاجو باجی سے باہ کریں گے۔"

باجی کہتی۔ "شکل تو دیکھو اپنی 'پہلے منہ دھو آؤ۔" پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردن موڑتی کہ کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگتے اور وہ چشم تان میں پوچھتی۔ "ہے نا بھئی جاآن کیوں جی؟"

باجی کے منہ سے "بھئی جاآن" کچھ ایسا بھلا سنائی دیتا کہ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا "بھائی صاحب" کہتی تو کیسا بھدا معلوم ہوتا۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر "صاحب" جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو مگر باجی "صاحب" کی جگہ "جاآن" کہہ کر اسے سادے سے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ "جاآن" کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے۔

اس کے علاوہ "بھئی جاآن" کہہ کر وہ اپنی کالی کالی چمکدار آنکھوں سے دیکھتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتی تو سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا کے "بھائی صاحب" اور باجی کے "بھئی جاآن" میں کتنا فرق تھا۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہی رہ گیا۔ بدو نے بھائی جان سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے گرد طواف کرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج کبھی کیرم کھیلتی۔

باجی کہتی۔ "بھئی جاآن ایک بورڈ لگے گا" یا بھائی جان کی موجودگی میں بدو سے کہتے "کیوں میاں بدو! کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں لڑنا چاہتا ہو؟" باجی بول اٹھتی۔ "آپا سے پوچھئے۔" بھائی جان کہتے۔ "اور تم؟" باجی جھوٹ موٹ کی سوچ میں پڑ جاتی 'چہرے پر سنجیدگی پیدا کر لیتی ' بھویں سمٹا لیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی رہتی پھر کہتی۔ "اونہہ مجھ سے تو آپ ہٹ جائیں گے۔" بھائی جان کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے۔ "کل جو پٹی تھیں بھول گئیں کیا؟" وہ جواب دیتی۔ "میں نے کہا چلو بھئی جاآن کا لحاظ کر دو۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ مجھ سے ہار گئے۔" اور پھر یوں ہنستی جیسے گھنگھرو بج رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے میں ہی کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولھے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو چھاجو باجی چھاجو باجی کہتا ہوا باجی کے دوپٹے کا پلو پکڑے اس کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ کہتی تھی۔ "بھئی جاآن تو صرف ساڑھے چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فیرنی کی پلیٹ مل جائے تو قطعی مضائقہ نہیں۔ کریں بھی کیا۔ نہ کھائیں تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا 'ہے نا بھئی جاآن۔" ہم سب اس بات پر خوب ہنسے۔ پھر باجی ادھر ادھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی کو اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ آپا کچھ کہہ سکے باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی۔ "لیجئے بھئی جاآن" اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا۔ "اپ بھی کیا کہیں گے کہ ساجو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں۔"

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا۔ "خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے 'کس نے بنایا ہے؟" ساجو باجی نے آپا کی طرف نکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔ "ساجو باجی نے اور کس نے بھئی جاآن کے لئے"۔ بدو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا۔ "میں بتاؤں بھائی جان؟"۔۔۔ آپا نے بڑھ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ باجی کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا اور بدو کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا۔ پھر جانے انہیں کیا ہوا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں باجی کے چہرے پر گڑ گئیں 'جانے کیوں میں نے محسوس کیا جیسے کوئی زبردستی مجھے کمرے سے باہر گھسیٹ رہا ہو۔ میں باہر چلی آئی۔ باہر آپا'

انگنی کے قریب کھڑی تھی۔ اندر بھائی صاحب نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی۔ "چھوڑیئے چھوڑیئے" اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ بدو بھی کہیں ادھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی' کہنے لگی۔ "آج ایک دھندنا نابورڈ کر دکھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟" بھائی جانے بولے۔ "واہ' یہاں سے ٹک لگاؤں تو جانے کہاں جا پڑو"۔ غالباً انہوں نے باجی کی طرف زور سے پیر چلایا ہو گا۔ وہ بناوٹی غصے میں چلائی۔ "واہ آپ تو ہمیشہ پیر ہی سے چھیڑتے ہیں!" بھائی جان معاً بول اٹھے "تو کیا ہاتھ سے "----" چپ -- خاموش۔" باجی چیخی۔ اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ تک تو پکڑ دھکڑ سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا کہنے لگا۔ "آپا! اندر بھائی جان باجی سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ چلو دکھاؤں تمہیں چلو بھی۔" وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ بت بنی کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا۔ کہنے لگا۔ "ماں کہاں ہے؟" اور وہ ماں کے پاس جانے کے لئے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ "آؤ تمہیں مٹھائی دوں۔" بدو بسورنے لگا۔ آپا بولیں "آؤ دیکھو تو کیسی اچھی مٹھائی ہے میرے پاس۔" اور اسے باورچی خانے میں لے گئی۔

اسی شام میں نے اپنی کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس پڑی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ میں حیران ہوئی کہ بات کیا ہے۔ مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی خالی پڑی تھی۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

بھائی تصدق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ تھی۔ اس کے وہ قہقہے بھی نہ تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور ماتھے پر شکن چڑھی تھی۔ بھائی صاحب بھی چپ چاپ رہتے تھے۔ ایک شام اماں کے علاوہ ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے۔ بدو ساجو باجی سے بیاہ کرو گے؟"

"اونہہ!" بدو نے کہا۔ "ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا۔ ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔" اماں نے پوچھا "آپا سے کیوں نہیں؟" تو کہنے لگا "بتاؤں آپا کیسی ہے؟" پھر چولھے میں جلتے ہوئے اپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "ایسی!" "اور چھاجو باجی؟" میں نے بدو کی طرح بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "ایسی!" عین اسی وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا۔ "ہاں یاد ہے!" بھائی جان نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کے لئے باہر چلی گئی تو بھائی کہنے لگے۔ "نہ جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا۔ جلتی بجھتی سی رہتی ہے۔" آپا چپ چاپ بیٹھی چولھے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم سی آواز میں کہا۔ "اف کتنی سردی ہے؟" پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولھے کے سامنے جا بیٹھے اور ان سلگتے ہوئے اپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے۔ "ممانی سچ کہتی تھیں کہ ان جلسے ہوئے اپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔ کیوں سجدے؟" آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سی آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے۔ "اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ سجدے' دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے؟"

○

کوثر چاندپوری

نام : سید علی

قلمی نام : سید علی کوثر / کوثر چاند پوری

پیدائش : ۱۴ اگست ۱۹۰۸ء بہ مقام چاند پور، ضلع بجنور۔ (۱)

وفات : ۱۳ جون ۱۹۹۰ء بہ مقام دہلی (بھارت)

مختصر حالات زندگی:

وطن مالوف چاند پور، ضلع بجنور ہے۔ ایک زمانہ میں طبیہ کالج بھوپال میں استاد رہے اور ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے۔ پیشہ طبابت اور افسانہ نگاری رہا۔ افسانہ نگار، ناول نویس، مضمون نگار اور متفرق نویس کے طور پر شہرت پائی۔ آخری دنوں میں ہمدرد نرسنگ ہوم، دہلی سے وابستہ تھے۔ تدفین جامعہ ملیہ کے قبرستان میں ہوئی۔

اولین افسانہ:

"گداز محبت" مطبوعہ: ۱۹۳۶ء تھا جو امرتسر کے ایک پرچے میں شائع ہوا۔ (۲)

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

	کتاب	مطبوعہ	طبع
۱۔	"ہنی مون اور دوسرے افسانے" (افسانے)		
۲۔	"دلچسپ افسانے" (افسانے)		
۳۔	"شعلہ سنگ" (افسانے)	مطبوعہ: ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی	طبع دوم: ۱۹۶۳ء
۴۔	"رنگین سپنے" (افسانے)	مطبوعہ: سید عبدالرزاق تاجر کتب، حیدر آباد دکن	
۵۔	"عورتوں کے افسانے" (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اردو، لاہور	طبع اول: ۱۹۳۷ء
۶۔	"دنیا کی حور" (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اردو، لاہور	طبع اول: ۱۹۳۸ء
۷۔	"اشک و شرر" (افسانے)		
۸۔	"مسکراہٹیں" (افسانے)		
۹۔	"دلگداز افسانے" (افسانے)	مطبوعہ: صدیق بک ڈپو، لکھنؤ	طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
۱۰۔	"نوک جھونک" (افسانے)	مطبوعہ: مطبع عہد آفریں، حیدر آباد دکن	

۱۱۔ "جام جم" (افسانے) مطبوعہ مطبع عہد آفریں، حیدر آباد دکن، طبع اول: ۱۹۴۱ء
۱۲۔ "سب کی بیوی" (ناول) مطبوعہ: مطبع عہد آفریں، حیدر آباد دکن، طبع اول: ۱۹۵۲ء
۱۳۔ "چوہوں کی بستی" (ناول)
۱۴۔ "راکھ اور کلیاں" (ناول)
۱۵۔ "دانش و بینش" (تنقید)
۱۶۔ "آوازوں کی صلیب" (افسانے)
۱۷۔ "کارواں ہمارا" (دو رپورتاژ)
۱۸۔ "دیدۂ بینا" (تنقید / تحقیق)
۱۹۔ "جہان غالب" (تنقید و تحقیق) مطبوعہ: مکتبہ کائنات، لاہور، طبع دوم: ۱۹۶۶ء
۲۰۔ "ناشاد کانپوری" (تنقید و تحقیق)
۲۱۔ "محبت اور سلطنت" (ناول) مطبوعہ: مکتبہ کائنات، لاہور
۲۲۔ "ڈھانچے" (ناول) مطبوعہ: سید عبدالرزاق تاجر کتب، حیدر آباد، دکن،
۲۳۔ "عشق نہ دیکھے" (ناول)
۲۴۔ "توڑ دو زنجیریں" (ناول)
۲۵۔ "فریدہ موہنی کی ڈائری" (ناول)
۲۶۔ "مرجھائی کلی" (ناول)
۲۷۔ "مہکتی بہاریں" (ناول) مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، طبع اول: ۱۹۸۳ء
۲۸۔ "رات کا سورج" (۲۹ افسانے) ناشر: وسیم اختر، ۱۳۳۱ بلیماراں، دہلی نمبر۶، طبع اول: ۱۹۷۶ء
۲۹۔ "پتھر کا گلاب" (ناول) مطبوعہ: حلقہ فکر و شعور، ۳۱۷ اوکھلا جامعہ نگر، نئی دہلی، طبع اول: ۱۹۷۹ء
۳۰۔ "گونگا ہے بھگوان" (ناول)
۳۱۔ "حکیم اجمل خان" (شخصیت اور خاندان)
۳۲۔ "ویرانہ" (ناول) مطبوعہ: انوار احمدی پریس، الہ آباد، طبع اول: س۔ن
۳۳۔ "اغوا" (ناول)
۳۴۔ "پیاسی جوانی" (ناول)
۳۵۔ "شام غزل" (ناول) مطبوعہ: مشورہ بک ڈپو، دہلی، طبع اول: ۱۹۶۳ء
۳۶۔ "مسکرائی زندگی" (ناول)
۳۷۔ "موج کوثر"
۳۸۔ "خندۂ دل"
۳۹۔ "کوثرستان" (آپ بیتی)
۴۰۔ "اطبائے عہد مغلیہ" (تاریخ) مطبوعہ: ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، طبع اول: ۱۹۵۹ء
۴۱۔ "معجز القانون" (تحقیق) مطبوعہ: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی،

۴۲۔	"شیخ جی اور دوسرے افسانے" (مزاح)	مطبوعہ: لاجپت رائے، لاہور	
۴۳۔	"آدم خور" (جغرافیہ)	مطبوعہ: دفتر کتابت، جودھ پور	
۴۴۔	"محمد بیرم خاں ترکمان" (سوانح)	مطبوعہ: آگرہ اخبار پریس، آگرہ	۱۹۳۹ء سے قبل
۴۵۔	"حالی و لطائف غالب" (بچوں کے لئے)	مطبوعہ: انور احمدی پریس، الہ آباد	۱۹۴۴ء سے قبل
۴۶۔	"رشوت" (بچوں کے لئے)	مطبوعہ: انور احمدی پریس، الہ آباد	۱۹۴۴ء سے قبل
۴۷۔	"علم و تجارت" (بچوں کے لئے)	مطبوعہ: انور احمدی پریس، الہ آباد	۱۹۴۴ء سے قبل
۴۸۔	"چالاک بھیڑیا" (بچوں کے لئے)	مطبوعہ: مسعود پبلشنگ ہاؤس، حیدر آباد دکن	
۴۹۔	"بہروں کی کان" (بچوں کے لئے)	مطبوعہ: مسعود پبلشنگ ہاؤس، حیدر آباد دکن	
۵۰۔	"موتیوں کا انڈا" (بچوں کے لئے)	مطبوعہ: مسعود پبلشنگ ہاؤس، حیدر آباد دکن	
۵۱۔	"چیونٹیوں کی بستی" (بچوں کے لئے)	مطبوعہ: مسعود پبلشنگ ہاؤس، حیدر آباد دکن	
۵۲۔	"لڑکے کا خواب" (بچوں کے لئے)	مطبوعہ: عبدالحق اکیڈمی، حیدر آباد دکن	
۵۳۔	"سمندر کا شہزادہ" (بچوں کے لئے)	مطبوعہ: مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن	طبع اول: ۱۹۴۴ء
۵۴۔	"وفادار دوست" (بچوں کے لئے)	مطبوعہ: مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن	طبع اول: ۱۹۴۴ء سے قبل
۵۵۔	"محنت کا پھل (بچوں کے لئے)	مطبوعہ: کاروان ادب، کراچی	

زندگی میں مستقل پتا:

۳۱۷۔ اوکھلا، جامعہ نگر، نئی دہلی، بھارت

نظریہ فن:

"ہمارا منشا افسانہ نگاری سے یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایک بہترین اخلاقی روح کو حسن و عشق کے ساتھ ملا کر ایسے اعتدال پر پہونچا دیں کہ اول الذکر کی حدت و حرارت ہماری کمزوریوں کو جلا کر فنا کر دے۔ ہمارے حواس میں ایک ایسی ضیاء اور تنویر پیدا کر دے کہ ہم دنیا کے ہر اندھیرے کو اس کی امداد سے طے کر جائیں۔"

(بہ حوالہ: دیباچہ "دلگداز افسانے")

○

(۱) "بہترین انشائی ادب" مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی میں تاریخ پیدائش ۱۹۰۲ء درج ہے جو درست نہیں۔

(۲) بحوالہ: کوثر چاند پوری سے ایک انٹرویو از زبیش کمار شاد، مطبوعہ: "بیسویں صدی" دہلی، نومبر ۱۹۹۳ء

کوثر چاند پوری

میرا پیشہ

"جے جے رام"
"جے بھگوان"
"رادھے شیام"
"سیتا رام"

وہ تیزی سے یہ الفاظ دہراتا رہا۔ لوگ اس کے سامنے سے گزرتے رہے۔ جس چوراہا پر وہ بیٹھا تھا وہاں سے اسٹیشن مندر اور گوردوارہ جانے والے ہندو سکھ اور مسلمان گزرتے ہی رہتے تھے۔ اسٹیشن اور مندر جانے والوں کے پیروں میں چپل یا جوتے ہوتے، گوردوارہ جانے والے ننگے پاؤں ہوتے۔ ان کے پیروں کی آہٹ اس وقت کانوں میں آتی جب وہ بالکل قریب پہنچ جاتے یا آگے سے گزرتے ہوئے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے۔ ان میں سے کسی کو اس پر ترس نہ آتا وہ سوچتے ہی رہ جاتے کہ پیسہ دیا جائے 'یا نہیں آخری فیصلہ یہی ہوتا کہ نہ دیا جائے۔ نصف گھنٹہ بعد اسے خیال آیا کہ اب مندر کی طرف جانے والے باقی نہیں رہے۔ گوردوارہ سے بھی عورتیں لوٹنے لگیں اسٹیشن کی سمت آمدورفت کا سلسلہ ہروقت جاری رہتا۔ سفر کرنے والے ذرا دیر کو نرم دل بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کے احساس میں خدا ترسی کا جذبہ بھر جاتا ہے لیکن یہ انداز غلط نکلا اس نے اپنے راستہ کو بدلنا ضروری سمجھا اور گواردوارہ کے قریب بیٹھ کر چیخنے لگا۔

"جے گرو کی"
"جے بابا نانک کی"

سردار صاحبان کیسوں میں کنگھے لگائے چپ چاپ گزرتے رہے۔ ان کے آنے کا وقت بھی نہ رہا تو وہ بازار میں گھسٹتا دن ڈھلے مسجد کے دروازے پر جا بیٹھا۔ وہاں خدا اور رسول ؐ کے نام پر مانگنا شروع کیا۔ نتیجہ وہی رہا یعنی پیسہ نہ ملا۔ پھر ایک تنگ سی گلی میں گھس کر اس نے صدائیں لگائیں۔ ایک کبابیے نے دو پیسہ کا سکہ اس طرح اس کی طرف پھینکا جیسے کئی سال کی زکواۃ نکال رہا تھا۔ اسے روٹی کی ضرورت تھی۔ وہ دو پیسہ میں نہیں مل سکتی تھی۔ وہ لولا لنگڑا تھا دونوں پاؤں مشین میں دب کر کٹ گئے تھے پیروں پر گھٹنوں کے قریب اس نے روئی کی گیندیں باندھ لی تھیں۔ ہاتھوں میں لکڑی کے ہتوے تھامے رہتا تھا۔ ان چیزوں کی مدد سے وہ جانوروں کی مانند چاروں ہاتھ پیروں سے چلا کرتا تھا۔ گلی میں پیلی مٹی سے لدے ہوئے گدھے بھی ملے اور کتے بھی کہیں ایک آدھ گائے چلتی پھرتی دکھائی دی۔

اس نے ایک دو منزلہ عمارت کے نیچے ٹھہر کر بلند آواز سے کہا۔

"جے جے رام"
"جے بھگوان"
"رادھے شیام"
"سیتا رام"

ایک عورت نے اوپر سے جھانک کر دیکھا دراصل وہ اس کو نہیں بلکہ اس گائے کو دیکھ رہی تھی جو اس کے پیچھے ذرا فاصلہ پر نالیوں کے کنارے پڑے ہوئے کیلے کے چھلکے چباتی اور چبوتروں پر رکھی دال چاٹتی ایک ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ دو تین منٹ تک اسی جگہ بیٹھا اوپر دیکھتا رہا۔ عورت کا دل بیتابانہ دیکھ کر وہ اسی طرح کھسکنے لگا۔ دس بارہ فٹ چلنے پر وہ دم لینے کو رکا۔ اسی وقت تھپ سے کوئی چیز اوپر سے گلی میں گری۔ اس نے مڑ کر دیکھا عورت نے نیچے اوپر رکھی ہوئی چھ سات روٹیاں گائے کے لئے پھینکی تھیں۔ جی چاہا کہ چند ہاتھ پیچھے ہٹ کر وہ گائے سے اپنا حق چھین لے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا مکان کے دروازوں پر آدمی کھڑے تھے وہ پھر رینگنے لگا' بالکل ایک بے حقیقت کیڑے کی طرح' رات ایک پیالی چائے پی کر اس نے بڑے آرام سے فٹ پاتھ پر گزار دی۔ دور تک اس کے ہم پیشہ پڑے تھے ان میں وہ بھی تھے جو راہ چلتے لوگوں کی جیبیں کاٹ لیا کرتے تھے اور وہ بھی جو رات کو کسی دکان کا تالا توڑ کر اپنا حصہ نکال لایا کرتے تھے۔ اس کے بازو میں لیٹا ہوا نوجوان ایک دم اپنے اوپر سے ٹاٹ پھینک کر اٹھا اور سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار اسٹارٹ کر کے چلتا بنا۔ وہ سوچتا ہی رہا کہ یہ ڈرائیور تھا یا چور۔ سویرے ہی نل پر منہ دھو کر وہ ایک بہت بڑے میدان میں پہنچا وہاں ایک آدمی کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا۔ کبوتر سب جنگلی اور پردار تھے۔ دور دور سے اڑ کر آ رہے تھے۔ اس نے اپنے کٹے ہوئے پیروں کا گائے کے نعل جڑے ہوئے کھروں اور کبوتروں کے پروں سے مقابلہ کیا اور انسان کی غلط بخشی پر بپھر گیا اس نے سوچا کہ بھیک مانگنے کا زمانہ نہیں اسے کوئی دھندا کر لینا چاہئے۔ اسی وقت ایک نیا خیال ذہن سے ٹکرایا۔ وہ فوراً اپنے کوارٹر کی سمت مڑ گیا جہاں لیٹرین کے دروازے پر بڑا لمبا کیو لگا ہوا تھا۔ وہ آٹھویں نمبر پر لائین میں کھڑا ہو گیا ایک ہی قطار میں کارپوریشن نے چار لیٹرین بنوا دیں تھے۔ ان میں سے آدھے عورتوں کے لئے تھے۔ ان کا راستہ دوسری طرف سے تھا۔ سڑک کے دوسرے رخ پر ایک شاندار بلڈنگ تھی۔ اس کی دوسری اور تیسری منزل پر فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ نچلی منزل کے کوارٹروں میں رہنے والے کارپوریشن کی غریب نواز پالیسی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ بھی یہیں ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ جو اس کے ایک رشتہ دار کے نام الاٹ ہو چکا تھا۔ وہ آج کل سسرال میں رہنے لگا تھا۔ صرف قبضہ بحال رکھنے کی خاطر اسے بیرونی حصہ میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ رات کو وہ یہاں نہ پہنچ سکتا تو اپنی پرانی جاگیر فٹ پاتھ پر قبضہ کر لیتا جہاں کبھی کبھی پولیس والوں کے ڈنڈوں کا مزہ چکھنا پڑتا۔ جب اس سے اگلا آدمی لیٹرین میں چلا گیا تو پیچھے سے پنڈت بالکرشن شرما نے ڈانٹ کر کہا۔

"ہٹ لنگڑے آگے سے۔"

"کیوں؟"

"پہلے ہم جائیں گے۔"

"نئی ہے یہ پنڈت جی' مندر نہیں۔ تم کیوں کر جا سکتے ہو۔ آگے میں ہوں۔"

"ایسی تیسی تیری لات ماروں گا تو نالی میں جا کر گرے گا اوندھے منہ!"

"تمہاری بھی ایسی تیسی۔ میں اپاہج ضرور ہوں مگر کان کھول کر سن لو پنڈت جی مجھ سے الجھے ہو تو بہت پچھتاؤ گے۔"

"اے ہٹ بچ کہیں کے' لے اپنی باری کا سودا کر لے مجھ سے۔"

"لاؤ کیا دیتے ہو؟"

"ایک آنہ۔"

"پھر لگے رہو لائن میں۔ ایک نئی بند ہے ایک کھلی ہے جس میں تم جا سکتے ہو۔"

"دو آنے لے گا؟"

اس نے بارہ پیسے میں اپنی باری بیچ دی اور پنڈت جی کی جگہ سنبھال لی۔ تین چار منٹ کے اندر ہی وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ یہ روزگار بہت اچھا ہے' روپے کی قیمت گرنے اور بڑھتی ہوئی منگائی کی وجہ سے انسان نے مذہب اور اخلاق کو بھلا دیا ہے' اسے صرف اپنی ضروریات یاد

رہ گئی ہیں - ہر چیز بدل رہی ہے کمانے کے ڈھنگ بھی تبدیل ہو چکے ہیں ' مجھے بھی پرانا پیشہ چھوڑنا پڑے گا - اس کی جیب میں پنڈت کے دیئے ہوئے بارہ پیسے تھے وہ اپنی باری پر لیٹرین نہیں گیا - جلد ہی لوٹ آیا اور ہوٹل والے سے چائے کو کہا۔

"کپ ہے لنگڑے تیرے پاس - "

" نہیں - "

" ڈبہ اٹھالے نیچے پتھر پر رکھا ہے - "

اس نے ڈبہ اٹھا لیا اور ایک لڑکے نے اس میں گرم گرم چائے انڈیل دی -

چائے پی کر اس نے ڈبہ وہیں رکھ دیا اور بیڑی پینے لگا - اسی وقت گلا ٹھی صاحب چائے پینے آ گئے - وہ دوسری منزل کے پہلے فلیٹ میں رہتے تھے - وہ گلا ٹھی جی کو دیکھ کر بولا۔

" ڈبہ اٹھالو گلا ٹھی جی! "

" کیسا ڈبہ ؟ " انہوں نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

" نیچے پتھر پر رکھا ہے! " اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

گلا ٹھی جی ہنس پڑے - انہوں نے طنز کی چبھن محسوس کی۔

" آپ سے مخول کرنے لگا لنگڑا " منیجر چائے چھلنی میں کھولتے ہوئے پانی کو چھانتے ہوئے بولا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے اگلے دن کے لئے منصوبے بنانے شروع کر دیئے اور بڑے کاروباری ڈھنگ سے کوارٹر میں رہنے والوں کا جائزہ لیا - وہاں پندرہ بیس کنبے آباد تھے اور دو میں سے ایک لیٹرین میں تالا پڑا رہتا تھا - دوسرے پر روزانہ بڑی لمبی لائن لگتی تھی ' عورتیں ادھر نہ آتی تھیں ' بچے نالی پر بیٹھ جایا کرتے تھے ' اگلی صبح کو وہ جلد ہی جاگ گیا اور بندر کی چال چلتا لیٹرین کے سامنے جا پہنچا - وہاں ابھی فنائل چھڑکا جا رہا تھا اس کی بو سے کوئی الجھن نہ ہوئی بلکہ سویرے ہی سویرے انگریزی دواؤں کی ملی جلی مہک کچھ اچھی ہی لگی - لائن میں پہلا نمبر اسی کا تھا - دیر بعد سہگل صاحب کھانسی کے جھٹکوں سے خاموش اور نیم بیدار فضا کا سینہ چیرتے آئے - دور ہی سے للکار کر بولے۔

" سن بے لنگڑے پہلا نمبر میرا ہے - "

" وہ کیوں کر ؟ "

" ہم ہاتھ پاؤں والے ہیں لاٹھی سے بھینس ہانک سکتے ہیں - "

" جان تک داؤں پر لگائے بیٹھا ہوں ' شرمیان جی - "

" اور تیری جان ہے کے کوڑی کی - "

" ہاتھ لگا کر دیکھو - "

" میرا پیٹ خراب ہے ' لنگڑو دین - "

" دماغ میرا بھی خراب نہیں کہ سب سے پہلے یہاں آگیا ہوں - "

" نہیں مانے گا بھائی بندی سے - "

" دھینگا مشتی سے بھی نہیں! "

" سالے اپاہج پاؤں ہوتے تو آکاش سے تارے توڑ لاتا - "

سہگل صاحب کے ہاتھ میں ٹین کا ڈبہ تھا اس میں سے بوند بوند پانی ٹپک رہا تھا - وہ ڈر رہے تھے کہ پانی کم ہو گیا تو ڈبہ بھرنے نل پر جانا پڑے گا اس وقت تک کیو میں دو چار آدمی اور لگ جائیں گے - سہگل صاحب نے موڈ بدل کر کہا۔

ہٹ جا پیارے راستے سے۔"

"صفائی ہو رہی ہے۔ جمعدار کے نکلتے ہی میں جاؤں گا۔"

"نہیں مانے گا۔"

"بالکل نہیں۔"

"لے پانچ کا سکہ۔"

"یہ تو بھیک منگے بھی نہیں لیتے' خوشی سے۔"

"دس کا سہی۔"

"دو اور بڑھاؤ سنگل جی' پیٹ کی خاطر آدمی ہزاروں خرچ کر ڈالتا ہے۔ یہاں کھڑے کھڑے درد ہونے لگا تو ایکسرے کھنچوانا پڑے گا۔"

"دس بہت ہیں۔"

"پھریوں ہی چٹ پکڑے کھڑے رہو۔"

آخر کار بارہ پیسے لے کر اس نے سنگل صاحب کے لئے اپنی باری چھوڑ دی' لائن لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ کوارٹروں کے دروازے کھلنے لگے تھے۔ مرغوں کی بانگ رات کے سناٹے سے الجھ رہی تھی۔ پنڈت بالکرشن آج غائب تھے۔ وہ جن لوگوں کی کمزور رگ سے واقف ہو گیا تھا انہیں کا منتظر رہتا تھا۔ اس نے کل وید جی کے یہاں سنگل صاحب کو لون بھاسک پھانکتے دیکھا تھا اسے یقین ہو گیا تھا کہ سنگل جی ذرا سویرے ہی لیٹرین آئیں گے۔ پنڈت بال کرشن کے متعلق سب ہی جانتے تھے کہ وہ کرانک ڈسینٹری کے مریض ہیں۔ دن میں تین مرتبہ ٹٹی جاتے ہیں۔ آفس کا باتھ روم تو بقول ایک بابو جی کے ان کی نانی کا گھر ہے۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ انہیں دو جگہ بہت سکون ملتا تھا۔ ایک ٹٹی میں دوسرے ہسپتال میں۔ کل کے تلخ تجربہ کے پیش نظر پنڈت جی آج جلد اٹھ بیٹھے اور کان میں جنئو ڈالے۔ ڈبہ ہاتھ میں لئے لیٹرین کی سمت دوڑے۔ دور سے دیکھا کہ لنگڑا دروازہ گھیرے ہوئے ہے۔ اس سے پہلے ایک آدمی اور جا چکا تھا۔ دو تین اس کے پیچھے کیو میں لگے ہوئے تھے۔ وہ پنڈت جی کو آتے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر بولا۔

"پنڈت جی' پالا گن!"

پنڈت جی کے پیٹ میں بڑے زور سے بل پڑ رہے تھے۔ انہیں خیال ہوا کہ لنگڑا مذاق کر رہا ہے۔ جل کر بولے۔

"سالا سینچر کہیں کا!"

"میرے بس کی بات نہیں پنڈت جی' آپ تو گیہوں کھاتے ہیں۔ میں موٹا اناج لے رہا ہوں۔ ٹٹی پر میرا حق آپ سے زیادہ ہے۔"

"پگلا!"

"پنڈت جی مندروں پر تو پہلے ہی قبضہ جمائے بیٹھے ہو اب کارپوریشن کا یہ لیٹرین بھی غریبوں سے چھیننا چاہتے ہو۔ یہ دھاندلی نہیں چلے گی نکالو آٹھ آنے اور آ جاؤ میری باری پر۔"

"چار آنے دوں گا' بھاؤ نہیں بڑھا سکتا۔"

"اور دال' نمک اور مرچ کا بھاؤ کیوں بڑھا رہے ہو؟"

پنڈت جی کے پیٹ میں پھر درد ہوا انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا ایک اٹھنی لنگڑے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"چار آنے کل لگ جائیں گے۔"

اس نے اٹھنی قبول کر لی اور آہستہ سے کہا۔

"بھگوان کرے مروڑ اور بڑھے' پیٹ کا درد کبھی دور نہ ہو۔"

وہ بہت خوش تھا اسے اس دھندے پر بھروسہ ہوتا جا رہا تھا۔ دیا ہے ایشور کی ' کیا روزگار دیا ہے۔ اس سے بڑے بڑوں کا دیوالہ نکلا جا رہا ہے اور اچھے اچھے دوان مارے مارے پھر رہے ہیں۔ پاؤں سلامت تھے تو مل کے آفس میں کرسی پر بیٹھ کر کلرکی کیا کرتا تھا۔ لولے لنگڑے آدمی کو ایل۔ ڈی۔ سی کی سیٹ پر بٹھانا بھی پاپ ہے۔ مل مالک کے نزدیک۔

پنڈت جی کے باہر آتے ہی ایک آدمی اور آگیا۔ اس نے دور ہی سے دس کا سکہ دکھاتے ہوئے خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔

" بھیا باری مجھے دوا"

دس پیسے کے لئے دے سکتا ہوں ' اچھا ہوا تم نے بھگوان کا نام نہ لیا ' مجھے کسی نے پیسہ تک نہیں دیا اس کے نام پر ' میں کیونکر دے سکتا ہوں۔ تمہارے لئے اپنا ریٹ گرائے دیتا ہوں۔

دن گزرتے رہے گرانی اور ملاوٹ بڑھتی رہی۔ گھی۔ دودھ ' آٹا ہوا ' غرض کوئی چیز خالص نہ مل رہی تھی۔ بیماریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ پیٹ میں درد ' زخم اور کیڑوں کی شکایت عام ہو گئی تھی۔ اس کا کاروبار چمکتا جا رہا تھا۔ وہ کسی کے بیمار ہونے کی دعا نہ مانگتا بغیر دعا مانگے ہی لوگ بیمار ہو رہے تھے۔ لیٹرین کی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا پیشہ بھی اسی نسبت سے ترقی کر رہا تھا وہ شام ہی سے کوارٹروں میں رہنے والوں کی نسبت معلومات فراہم کرتا رہتا۔ ضروری باتیں بہت آسانی سے معلوم ہو جاتیں۔ اس نے چار بجے رات کے بعد کا سونا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ پیٹ کے سامنے نیند کی اہمیت بھی کیا ہے۔ ایک دن پتہ چلا کہ متھرا داس صاحب کل پیٹ کا ایکسرے کرا رہے ہیں۔ رات کو مسہل لینا ضروری ہے۔ اگلا پروگرام اس نے اسی وقت بنا لیا اور چار بجتے ہی لیٹرین کے دروازے پر جا بیٹھا۔ پانچ منٹ بعد ہی متھرا داس دوڑتے ہوئے آئے وہ انہیں دیکھتے ہی "چیخا اندر آدمی ہے گیٹ پر میں ہوں اپ لائن بنائیے جلدی سے۔"

" کیسٹر آئل پیا ہے بھیا رات کو۔ "

" نہ جانے اور کس کس نے پیا ہو گا۔ "

" پیارے رستہ دے۔ "

آپ کو اپنے لئے الگ فلش بنوا لینا چاہئے۔ یہاں تو سب برابر ہیں۔ لنگڑے ہوں یا اندھے اور کانے۔"

متھرا داس کی حالت خراب تھی۔ پیٹ میں زخم تھا۔ صبح آٹھ بجے ایکسرے لیا جا رہا تھا۔ سوچ رہے تھے کہ دیر ہو گئی تو آنتیں صاف نہ ہوں گی کوئی اور دہاں بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اس کے پیسوں کو بھی ایکسرے چارجز میں شامل کرتے ہوئے کہا۔ " تو نے تو دھندا ہی کر لیا پگلے "۔ یہ کہتے ہی انہوں نے جیب میں سے چند سکے نکال کر اس کی جانب پھینک دیئے۔

" کیا پھینک دیا متھرا داس جی؟ "

" ۲۵ پیسے۔ "

" ایکسرے کی فیس کیا دی ہے؟ تم مجھے کیسٹر آئل کی قیمت سے آدھے پیسے ہی دے دو ' اور جو کچھ پھینکا ہے اسے اٹھا لو۔ جھک کر پھر قاعدہ سے میرے ہاتھ پر رکھ دو۔"

ایک دن اسے اپنی جاب پر پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ وہ ساڑھے پانچ بجے آیا۔ نالی پر دس بارہ لڑکے برابر بیٹھے تھے۔ وہ غور سے انہیں دیکھتا تیزی سے لائن میں جا لگا۔ چار آدمی اس کے آگے تھے۔ لائن آہستہ آہستہ لمبی ہوتی گئی۔ پنڈت ہلکرشن گہری نیند سو گئے تھے۔ وہ سیپنگ پلس کے نشہ میں لڑکھڑاتے اس کے بعد پہنچے ادھر ایک اور محض کیسٹر آئل پی کر آیا تھا۔ پنڈت جی نے اس کا حق نکالتے ہوئے کہا۔

" ہٹ لنگڑے! "

" کتنی ٹیشن ہو گا پنڈت جی ' آج بلدیو بھی رستہ مانگ رہا ہے۔ "

پنڈت جی پرانے گاہک تھے انہیں دس کا سکہ بڑھا کر جگہ دے دی گئی۔ رفتہ رفتہ سب کو معلوم ہو گیا کہ اس نے کوارٹر والوں کو پریشان

کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا ہے خود کبھی صبح کے وقت نئی نہیں جاتا' شام کو جاتا ہے جب وہاں بالکل سناٹا ہوتا ہے۔ باہمی مشورے سے کارپوریشن میں اس کی شکایت کر دی گئی۔ ہیلتھ آفیسر حلقہ کے انسپکٹر کو ساتھ لے کر موقعہ دیکھنے آیا' اس کو بھی بلایا گیا وہ بالکل ہراساں نہ ہوا۔ نہایت اطمینان سے جواب دہی کے لئے تیار ہو کر آیا۔ ہیلتھ آفیسر نے نام پوچھا۔ پھر سوال ہوا پیشہ کیا ہے تمہارا؟

اس نے جوش میں آکر ہاتھوں میں دبے ہوئے لکڑی کے ہتوے زمین پر ڈال دیئے اور گھٹنوں پر بندھی ہوئی گدیوں کے سہارے کھڑے ہو کر بولا۔

"میرا پیشہ؟"

"میرا پیشہ؟"

"خدمت خلق"

ہیلتھ آفیسر ہنس پڑا اور آدمیوں کو بھی ہنسی آگئی۔ پھر اس نے کہا "پیشہ پوچھو بلیک کرنے والوں کا۔ رشوت خواروں کا یا ان لوگوں کا جو ہمارے ووٹ سے کرسی پر بیٹھتے ہیں اور ذرا سی دیر میں پارٹی بدل دیتے ہیں۔ میں کیا کرتا ہوں؟ چوری؟ گرہ کٹی؟ نقب زنی؟ یہ ایک نئی ہی میری بلڈنگ ہے اس پر پگڑی نہیں لیتا۔ دوگنا گنا کرایہ وصول نہیں کرتا۔ صرف باری بیچتا ہوں۔ چونی سے زیادہ مشکل ہی سے کوئی اس کی بولی لگاتا ہے۔ اس پر جیل بھیجنا چاہتے ہو؟ بھیج دو!"

○

میرزا ادیب

نام : دلاور علی

قلمی نام : میرزا ادیب عاصی / میرزا ادیب

تاریخ پیدائش : ۴ اپریل ۱۹۱۴ء بہ مقام محلہ ستھاں، چوک دتا، کوچہ مغلاں، اندرون بھاٹی گیٹ، لاہور (پنجاب)

تعلیم : بی۔ اے (آنرز) اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور، ۱۹۳۵ء

اسلامیہ ہائی سکول، لاہور سے ۱۹۳۱ء میں میٹرک اور اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے آنرز (فارسی) کیا۔

مختصر حالاتِ زندگی:

والد کا نام میرزا بشیر علی تھا جو پیشہ کے اعتبار سے درزی تھے۔ والد کو بیٹے کی تعلیم سے دلچسپی نہ تھی۔ دادی نے ایک بڑھئی کے سپرد کر دیا، جس کی چلم توڑ کر میرزا ادیب ایسے بھاگے کہ پھر واپس نہ گئے۔ اس کے بعد انہیں ایک لوہار کے سپرد کیا گیا جس نے ساتویں دن خود چھٹی کروا دی۔ پھوپھا نے رحم کھا کر میونسپلٹی کے اسکول میں داخل کروایا اور ماں نے جھڑکیاں سہہ کر بیٹے کی تعلیم جاری رکھی۔ اسکول کے ہی زمانے میں ادب کی چینگ دل میں جاگی اور عاصی تخلص اختیار کر کے کچی پکی نظمیں اور کہانیاں لکھیں (۱)۔ ۱۹۳۵ء میں "ادبِ لطیف" کی ادارت سنبھالی اور سترہ برس تک "ادبِ لطیف" کو درجہ اول کا پرچہ بنائے رکھا۔ ۱۹۴۰ء میں شادی ہوئی۔ ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۳ء ہفتہ روزہ "مصور" بمبئی کی ادارت کی۔ بمبئی سے واپسی پر ۱۹۴۳ء میں چند ماہ رسالہ "حسن پرست" لاہور کے مدیر رہے۔ بے کاری کے چند برس گذار کر آل انڈیا ریڈیو، لاہور سے بطور سٹاف آرٹسٹ / سکرپٹ رائٹر منسلک ہو گئے اور پندرہ برس ریڈیو کی ملازمت کی۔ اس دوران میں ۱۹۴۸ء کے اواخر تا ۱۹۶۵ء "ادبِ لطیف" کی مکرر ادارت سنبھالی۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۷ء فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور سے متعلق رہے اور اس کے بعد ریڈیو پاکستان، لاہور سے وابستہ ہو گئے، ریڈیو کے لیے ۱۹۷۳ء تک لکھا۔ ۱۹۷۷ء تا حال روزنامہ "نوائے وقت" لاہور میں "اذکار و افکار" کے عنوان سے کالم نگاری کرتے ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"افسانۂ خونیں" مطبوعہ: "ادبِ لطیف" لاہور سالنامہ ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "صحرانورد کے خطوط" (آٹھ افسانے) مکتبہ اردو، لاہور طبع اول: جولائی ۱۹۴۰ء

۱۔ افسانہ خونیں ۲۔ دخترِ صحرا ۳۔ ملکۂ صحرا ۴۔ مورتی ۵۔ سیل حوادث ۶۔ حکایت جنوں ۷۔ سمارت کا قیدی ۸۔ چاہِ بابل

۲۔ "صحرانورد کے رومان" (چار افسانے) نرائن دت سہگل، لاہور طبع اول: ۱۹۴۲ء

۱۔ ریوی ۲۔ طوفان حوادث ۳۔ تباہی کے بعد ۴۔ جزیرہ ہاموریں

۳۔ "موت کا تحفہ" (سات افسانے) پنجاب لٹریچر کمپنی 'لاہور' طبع اول: ۱۹۴۴ء

۱۔ موت کا تحفہ ۲۔ غلاموں کی بغاوت ۳۔ مال ۴۔ دیوانی ۵۔ شاہی رقاصہ ۶۔ قیدی کی سرگذشت ۷۔ سوکھی ہوئی ندی۔
(یہ مجموعہ دوسری بار رام دتہ مل اینڈ سنز 'لاہور نے شائع کیا)

۴۔ "دیواریں" (اٹھارہ افسانے) عالمگیر بک ڈپو 'لاہور' طبع اول: ۱۹۴۷ء

۱۔ روشنی ۲۔ آئینہ ۳۔ بادل ۴۔ شہ نشیں پر ۵۔ دروازہ ۶۔ نوجوان بازو ۷۔ دمساز ۸۔ کھڑکی ۹۔ زیر سنگ ۱۰۔ نئے انسان
۱۱۔ خلاء ۱۲۔ کلاک ۱۳۔ دیا ۱۴۔ گڑیا ۱۵۔ سرخ دوپٹہ ۱۶۔ کنگال دیس میں ۱۷۔ شبنم ۱۸۔ شباب۔

۵۔ "جنگل" (چودہ افسانے) مکتبہ اردو 'لاہور' طبع اول: ۱۹۵۲ء

۱۔ ایک دکان ۲۔ ۷۳ سال کے بعد ۳۔ مرکز ۴۔ آزادی ۵۔ شتر مرغ ۶۔ دیا ۷۔ جنگل ۸۔ بدھو میاں عبدالرحمن ۹۔ درون
تیرگی ۱۰۔ زیر سنگ ۱۱۔ کارپوریشن ایک ڈاکٹر اور بھس نگر ۱۲۔ قرارداد ۱۳۔ آرمینیہ کا ہیرو ۱۴۔ ایک مصنف۔

۶۔ "کمبل" (چودہ افسانے) بک لینڈ 'لاہور' طبع اول: اکتوبر ۱۹۵۷ء

۱۔ موت کا راگ ۲۔ اس کی حسین تصویر ۳۔ شاہی رقاصہ ۴۔ گونگی محبت ۵۔ ان داتا ۶۔ نوجوان خموش ۷۔ ٹیک ۸۔ روشنی
۹۔ دیا ۱۰۔ شبنم ۱۱۔ مائی پھاتاں ۱۲۔ کمبل ۱۳۔ دیو ۱۴۔ شعلہ بے دود۔

۷۔ "حسرت تعمیر" (ستر افسانے) التحریر 'لاہور' طبع اول: ۱۹۷۹ء

۱۔ نشہ ۲۔ نیلم پری ۳۔ کاکاچڑی مار ۴۔ استاد فضل الٰہی فضل ۵۔ شیشے کی کرچیاں ۶۔ گوٹے کناری والی چنیا ۷۔ سوہنی کمہارن
۸۔ یوسف زلیخا ۹۔ آپا کی مرغی ۱۰۔ پڑھی لکھی زینب ۱۱۔ نہیں جی ۱۲۔ لالو ماشکی ۱۳۔ صدر دین عرف صدرا ۱۴۔ میاں دین محمد
۱۵۔ ماسی ۱۶۔ پیچ و خم ۱۷۔ دشمنی۔

۸۔ "ساتواں چراغ" (بارہ افسانے) مطبوعات حرمت 'راولپنڈی' طبع اول: ۱۹۸۳ء

۱۔ امانت ۲۔ ساتواں چراغ ۳۔ گریٹ مین ۴۔ سائرہ ۵۔ بند گلی 'بڑا مسئلہ ۶۔ ریڑھی ۷۔ عنائت بی بی کا افضال ۸۔ درویش
۹۔ کاغذ کی ناؤ ۱۰۔ علیا کی ٹلی ۱۱۔ اس کی خاطر ۱۲۔ ایک منزل کئی راہیں۔

۹۔ "ان داتا" (افسانے) آگرہ اخبار برقی پریس 'آگرہ' طبع اول: ۱۹۳۵ء

۱۰۔ "اندھا دیوتا" (افسانے)

۱۱۔ "بے کسی" (افسانہ) رام دتہ مل اینڈ سنز 'لاہور' طبع اول: ۱۹۴۴ء

۱۲۔ "دنیائے آرزو" (افسانے) نرائن دت سہگل 'لاہور' طبع اول: ۱۹۳۱ء

۱۳۔ "غلاموں کی بغاوت" (افسانہ) کتب خانہ اردو 'لاہور' طبع اول: س ۔ ن

۱۴۔ "موت کا راگ" (افسانہ) نرائن دت سہگل 'لاہور' طبع اول: س ۔ ن

۱۵۔ "لاوا" (افسانے) عالمگیر اکیڈمی 'لاہور' طبع اول: ۱۹۴۷ء

۱۶۔ "صحرانورد کا نیا خط (افسانہ) ۔۔۔ 'لاہور' طبع اول: ۱۹۶۰ء

۱۷۔ "آنسو اور ستارے" (ڈراما) مکتبہ کارواں 'لاہور' طبع اول: ۱۹۵۳ء

۱۸۔ "لہو اور قالین" (ڈراما) ادارہ نو 'لاہور' طبع اول: ۱۹۵۵ء

۱۹۔ "ستون" (ڈراما) مکتبہ اردو 'لاہور' طبع اول: ۱۹۵۷ء

۲۰۔	"فصیل شب" (ڈراما)	گلڈ اشاعت گھر، کراچی	طبع اول: ۱۹۶۱ء
۲۱۔	"شیشے کی دیوار" (ڈراما)	الجدید، لاہور	طبع اول: ۱۹۶۳ء
۲۲۔	"ناخن کا قرض" (خاکے)	امتزاج پبلی کیشنز، لاہور	طبع اول: ۱۹۸۱ء
۲۳۔	"پس پردہ" (ڈرامے) (آدم جی ادبی انعام)	مکتبہ ادب جدید، لاہور	طبع اول: ۱۹۶۷ء
۲۴۔	"ماموں جان اور ماموں جان" (ڈرامے)	مقبول اکیڈمی، لاہور	طبع اول: ۱۹۶۸ء
۲۵۔	"خاک نشین" (ڈرامے)		طبع اول: ۱۹۷۵ء
۲۶۔	"شیشہ و سنگ" (ڈرامے) (آدم جی ادبی انعام)		طبع اول: ۱۹۷۹ء
۲۷۔	"پاکستان کو سلام" (ڈرامہ)		طبع اول: ۱۹۸۳ء
۲۸۔	"خوابوں کے مسافر" (نثر لطیف / مضامین)	کتب مینار، لاہور	طبع اول:
۲۹۔	"ہمالہ کے اس پار" (سفرنامہ)		طبع اول: ۱۹۸۳ء
۳۰۔	"تنقیدی مقالات" (مرتبہ: میرزا ادیب) دو جلدوں میں (برائے نصاب ایم۔ اے اردو)		
۳۱۔	"بہترین ادب" (انتخاب) مرتبہ: میرزا ادیب ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۵ء		
۳۲۔	"۱۲ انمول کتابیں" (انتخاب) فرینکلن نیویارک اہتمام: شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور		طبع اول: ۱۹۸۱ء
۳۳۔	"جدید امریکی افسانے" (انتخاب) ترجمہ: میرزا ادیب	آئینہ ادب، لاہور	طبع اول: ۱۹۶۳ء
۳۴۔	"پراسرار وادی" (ترجمہ)	تخلیق مرکز، لاہور	طبع اول: ۱۹۶۸ء
۳۵۔	"واشنگٹن ارونگ" (شخصیت و فن) ترجمہ: میرزا ادیب	فرینکلن نیویارک / لاہور	طبع اول: ۱۹۶۹ء
۳۶۔	"مٹی کا قرض" (آپ بیتی)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	طبع اول: ۱۹۸۱ء
۳۷۔	"افق کے اس پار" (ڈرامہ) ترجمہ: میرزا ادیب	لاہور	طبع اول: ۱۹۷۳ء
۳۸۔	"میرزا ادیب کے بہترین افسانے" مرتبہ: عرش صدیقی	مکتبہ میری لائبریری، لاہور	طبع اول: ۱۹۶۶ء
۳۹۔	"تیس مار خاں" بچوں کے لیے (ڈرامے)		طبع اول: ۱۹۴۵ء
	ادارہ بچوں کا ادب نے ۳۰ ایڈیشن شائع کیے (یونائیٹڈ بینک ادبی انعام)		
۴۰۔	"بگی کی گڑیا" (ڈرامے)		طبع اول: ۱۹۷۲ء
۴۱۔	"سنو پیارے بچو" (کہانیاں۔ تین جلدوں میں)		طبع اول: ۱۹۷۴ء
۴۲۔	"اے وطن میرے وطن" (بچوں کے لیے)		طبع اول: ۱۹۷۱ء
۴۳۔	"پانچ ڈرامے" (بچوں کے لیے)		طبع اول: ۱۹۶۸ء
	(یونائیٹڈ بینک انعام یافتہ)		
۴۴۔	"شہر سے دور" (بچوں کے لیے)		طبع اول: ۱۹۶۶ء
۴۵۔	"چچا چونچ" (بچوں کے لیے)		طبع اول: ۱۹۷۵ء
	(یونائیٹڈ بنک انعام یافتہ)		
۴۶۔	"نانی اماں کی عینک" (بچوں کے لیے)		طبع اول: ۱۹۷۷ء
	(یونائیٹڈ بینک انعام یافتہ)		

۴۷۔ "جب وہ جوان تھے" (بچوں کے لیے) طبع اول: ۱۹۷۲ء

۴۸۔ "مثالی طالب علم" (بچوں کے لیے) سائنس بورڈ، لاہور

۴۹۔ "اذکار و افکار" (ادبی کالم) لاہور، طبع اول: ۱۹۸۸ء

۵۰۔ "بہترین افسانے" (مرتبہ: میرزا ادیب) مکتبہ میری لائبریری، لاہور، طبع اول: ۱۹۹۳ء

۵۱۔ "پراسرار غار" (بچوں کے لیے) ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، (بہ اشتراک دیگر کہانی نویس)

(نوٹ) یہ فہرست نامکمل ہے۔ میرزا ادیب نے بچوں کے لیے ۳۵ کتابیں لکھیں اور شائع ہوئیں۔

غیرمدون:

لاتعداد ادبی کالم اور تبصرے۔

اعزاز:

۱۔ پرائڈ آف پرفارمنس (حکومت پاکستان کا اعلیٰ ترین سول اعزاز) ۱۹۸۱ء
۲۔ ۶ بار رائٹرز گلڈ آدم جی ایوارڈ / یونائیٹڈ بینک ایوارڈ
۳۔ ۳ بار قلم گریجویٹ ایوارڈ

مستقل پتا:

"لالہ صحرا" چوہان روڈ، کرشن نگر، لاہور (پاکستان)

نظریہ فن:

"ہر صنف ادب کی طرح کہانی کو بھی اپنے قاری سے ذہنی رابطہ استوار کرنا چاہئے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ خود کہانی کار اور اس کے معاشرے کے درمیان گہرا رابطہ ہو۔ کہانی کار اپنے لاشعور میں ڈوب کر نہ رہ جائے بلکہ اپنے عوام کے دلوں میں اتر کر اپنا مواد حاصل کرے۔ اس کا تجربہ اپنے اردگرد کے ماحول سے اثرات قبول کرے۔"

(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۸۴ء)

○

(۱) میرزا ادیب کی ابتدائی نظمیں "شباب اردو" لاہور ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئیں۔

میرزا ادیب

حکائیہ جنوں

حبیب دلنواز ---------!

اس وقت جب کہ میں تمہارے لئے تازہ "رومان" لکھ کر اپنی صحرائی زندگی کے متعلق کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تمہاری صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ تمہیں کیونکر بتاؤں کہ تمہارا دور افتادہ دوست تم سے ملنے، تمہارے موجودہ حالات زندگی سننے اور تمہیں اپنی زبان سے اپنے "صحرائی واقعات" سنانے کے لئے کس قدر بے تاب --- کس قدر مضطرب ہے۔ کاش تمہارا "رومانی ذوق" تمہیں یہاں کھینچ لائے اس سے ایک تو ہماری سیاحت زیادہ پر لطف، زیادہ رومان انگیز اور زیادہ دلچسپ ہو جائے گی اور دوسرے تمہاری آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری تمہیدی عبارت سے تم کسی حد تک ضرور لطف اٹھاتے ہو گے لیکن میرے دوست! یقین کرو کہ اس سے میری چاروں طرف بکھری ہوئی رنگینیوں، دلاویزیوں اور دلچسپیوں کا پر تو بھی تمہارے سامنے نہیں آ سکتا۔ تم یہاں آ جاؤ تو تمہیں معلوم ہو کہ علی الصبح پر اسرار اور کہر میں لپٹے ہوئے مشرقی افق کے سینے پر جب غاروں میں رینگتے ہوئے سانپوں کی طرح رنگ برنگ ابر پارے لہراتے ہیں تو ایک رومان پرست دل پر کیا اثر ہوتا ہے! اور جب شام کے وقت شفق کے دامن میں دھوئیں کے بادلوں کی مانند درختوں کے دھبے آہستہ آہستہ نگاہوں سے غائب ہونے لگتے ہیں تو انسان پر کیا کیفیت چھا جاتی ہے اور پھر جب اس عالم میں کسی برہ کے مارے ہوئے پرندے کی غمناک، دردانگیز آواز فضا میں تھرتھراتی ہے تو روح کی گہرائیوں میں کونسا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کسی دن تمہارا "رومان پرست دل" تمہیں "وحشت" سکھا دے اور تم اپنی آباد و ہنگامہ پرور دنیا سے نکل کر میری ویران و پر سکون دنیا میں آ جاؤ۔ کیا یہ ہو سکتا ہے؟

اس "رومان" کے متعلق کیا لکھوں۔ یہی سمجھ لو کہ اس نے میرے دل میں مدت سے سوئے ہوئے ایک جذبے کو بیدار کر دیا ہے اور میں پھر وادی "بیزا" کی چاندنی راتوں کو یاد کر کے تڑپنے لگا ہوں۔ امید ہے میری طرح تم بھی اس سے متاثر ہو گے --- یہ "داستان" جنوں انگیز محبت کی تباہ کاریوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے--!

محبت اور جنوں انگیز محبت ----- ! خدا کی پناہ!

محبت کا جذبہ پیدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے بچپن میں یہ قول میں بھی سنا کرتا تھا اور مجھے اس کی صداقت پر ذرہ بھر اعتبار نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ ایک وہم ہے اور ہر ایک شخص اس وہم میں اس لئے مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ بہت زیادہ شہرت حاصل کر چکا ہے اور کرتا جا رہا ہے لیکن اب میرا یہ نظریہ تبدیل ہو چکا ہے اور میں مندرجہ بالا مقولے کی صداقت کا بدل و جان قائل ہو گیا ہوں۔ واقعی محبت کی چنگاری ایک نہایت معمولی واقعے سے انسان کے دل کی گہرائیوں میں سلگنے لگتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب یہ ننھی سی چنگاری دل و دماغ کو بھسم کر دینے والے آتشیں شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کوئی انسانی تدبیر اس آگ کو سرد کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ موت کی آندھی کا تیز و تند جھونکا اس آگ کو اور اس کے ساتھ انسانی زندگی کی شمع کو ہمیشہ کے لئے بجھا دیتا ہے یا محبت ایک ایسا زہر ہے جو دل و دماغ کو مسموم کرتا ہوا روح کی گہرائیوں تک سرایت کر جاتا ہے۔ انسان اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس بے رحم دشمن کا مقابلہ کرتا ہے مگر بے سود۔ تا آنکہ موت کے سرد ہونٹ انسان کے ہونٹ سے لگ کر یہ ہولناک زہر اور اس ہولناک زہر کے ساتھ خون حیات کو بھی

چوس لیتے ہیں۔۔۔!

اس افسانے میں یہی ناگوار و تلخ حقیقت پائی جاتی ہے۔۔۔!

امید ہے' تم بخیریت تمام ہو گے۔۔!!

تمہارا صحرانورد

میں کیونکر دام محبت میں گرفتار ہوا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا اور اس کے بتانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ یہی کہہ دینا کافی ہے کہ جس طرح بدنصیب انسان محبت کے غار میں دھکیل دیئے جاتے ہیں اسی طرح میں بھی دھکیل دیا گیا۔ اس کے بعد جب مجھے اپنی حالت کا احساس ہوا تو میں نے خود کو تباہی سے بچانے کے لئے بتیرے ہاتھ پاؤں مارے' تمام احتیاطی تدبیروں پر سختی کے ساتھ عمل کیا لیکن میری ہر ایک کوشش خاک میں مل گئی۔۔۔ آہ! اس مصیبت سے نہ چھٹکارا ہونا تھا' نہ ہوا۔

میری محبوبہ' شہر کی حسین ترین لڑکی تھی۔ اس کی کشادہ چمکتی ہوئی پیشانی' چودھویں کے چاند کی شفافیت' اس کی لمبی کالی زلفیں' جاڑے کی راتوں کی تاریکی اور اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں' ہرن کی آنکھوں کی مقناطیسیت لئے ہوئے تھیں۔ اس کے رخساروں میں خون ناب اس طرح چھلک رہا تھا' جس طرح چاند کے سیمیں سینہ میں شراب احمریں کی موجیں اچھل رہی ہوں۔ وہ جب چلتی تو یہ معلوم ہوتا کہ تالاب کی سطح پر بط تیر رہی ہے اور جب وہ بولتی' تو یوں محسوس ہوتا گویا دور کہیں ترنم ریز ندی بہہ رہی ہے۔ وہ یگانہ روزگار مصور کے تخیل سے بھی زیادہ حسین تھی مگر میری انتہائی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ بہت سنگدل واقع ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں دل کی بجائے پتھر کا ٹکڑا تھا۔ وہ میری مجنونانہ محبت میری قابل رحم بے کسی کو دیکھتی اور نہایت سنگدلی کے ساتھ حقارت انگیز قہقہہ لگاتی ہوئی منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔ میری محبت کی قدر اس کی نگاہوں میں ذرہ برابر نہیں تھی۔! وہ ظالم ہستی محبت کرنا جانتی ہی نہ تھی۔ میں اپنے باغ کے حسین پھول لے کر' ایک جگہ کھڑے ہو کر اس کے انتظار میں کئی کئی گھنٹے صرف کر دیتا مگر جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑتی وہ انتہائی بے رخی سے اپنا راستہ تبدیل کر لیتی یا اگر میرے پاس سے گذرتی اور میں اس کے پاؤں پر پھول گرا دیتا تو ایک لفظ کہے بغیر پھولوں پر نظر ڈالے بغیر چلی جاتی' جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کئی بار دوستوں نے مجھ سے کہا "اگر تم مرتے دم تک بھی اسی طرح محبت کی آگ میں جلتے رہے جب بھی سلمیٰ (میری بے رحم محبوبہ) تمہاری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اپنی زندگی کو اس کی بے رحمانہ محبت میں تباہ نہ کرو۔ شہر میں ہزاروں حسین دوشیزائیں ہیں۔ کیا تمہیں محبت کے لئے اور نہیں ملتی؟ سلمیٰ کا خیال چھوڑ دو' ورنہ اس جنون میں تمہیں اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔!" اس کی سہیلیاں کہتیں۔ "ہم نے ہزار کوشش کی کہ سلمیٰ کے دل میں تمہارا خیال پیدا کریں مگر جس طرح پتھر میں سے پانی نہیں گذر سکتا' اسی طرح اس کے دل میں بھی تمہاری محبت نہیں پیدا ہو سکتی۔ تم بھی اس سے نفرت کرنے لگو!"

میں یہ سب کچھ سن کر اپنی بدقسمتی پر افسوس کرتا مگر سلمیٰ کا خیال دل میں نہ لاتا' سلمیٰ سے دور بھاگنا میرے لئے قطعی ناممکن تھا۔ معلوم نہیں کہ اس حسین ساحرہ نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا کہ جس قدر میں اسے بھلانے کی کوشش کرتا۔ اسی قدر اس کی محبت بڑھتی جاتی۔

میں جوش جنوں میں اکثر شہر سے باہر نکل جاتا اور پرانے قلعے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی بدقسمتی پر آنسو بہایا کرتا۔ یہ قلعہ مدت سے ویران پڑا تھا اور جب سے حکومت سامین نے فوج کشی کر کے یہاں کے پہلے حاکم ہاشم کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کے اندر کوئی بھی نہیں جا سکا تھا اور کوئی جا بھی کیونکر سکتا تھا؟ قلعے کے آہنی دروازے بند تھے اور ان کے آگے بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے تھے۔

یہ قلعہ چونکہ ایک مدت سے ویران پڑا تھا اور تھا بھی شہر سے دور' اس لئے لوگوں کا گمان تھا کہ اس میں بھوت پریت وغیرہ رہتے ہیں۔ ایک بوڑھا کسان کہا کرتا تھا کہ اس نے کئی بار قلعے کی ایک کھڑکی سے ایک حسین لڑکی کو جھانکتے ہوئے دیکھا ہے۔ الغرض اس پرانی ہیبت ناک عمارت سے طرح طرح کی افواہیں وابستہ تھیں۔

میں قلعے کی ایک سیڑھی پر پڑی ہوئی چھوٹی سی چٹان کے اوپر گھنٹوں بیٹھا رہتا اور دلسوز گیت گاتا رہتا۔ اس چٹان سے کچھ پرے ایک کھجور کا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے ایک بوڑھا آدمی بھی بعض اوقات بیٹھا رہتا تھا۔ میں اس بوڑھے آدمی سے بہت مانوس تھا۔ اس کا نام بابا حمدی تھا اور میں ہفتے میں دو تین بار اس سے ضرور ملا کرتا تھا۔ بابا حمدی محبت کو انسانی زندگی کے لئے خوفناک ترین مرض سمجھتا جاتا تھا اور چونکہ میرے واقعات محبت اس سے پوشیدہ نہیں تھے۔ اس لئے وہ مجھے اس جنون سے باز رکھنے کے لئے ہر وقت نصیحتیں کرتا رہتا۔ مگر اس کی نصیحتیں رائیگاں جاتیں۔ محبت کا جنوں کبھی نصیحتوں سے بھی دور ہوا ہے؟

دنیا میں صرف یہی ایک انسان تھا جس کی باتوں سے مجھے ہمدردی کی بو آتی تھی۔ میں نے اس سے کئی بار پوچھا۔ بابا تمہارا ٹھکانا کہاں ہے؟ تم کیا کرتے ہو؟ مگر وہ مجھے یہ کہہ کر ٹال دیتا۔ "پھر پھرا کر زندگی کے آخری دن گذار رہا ہوں۔ دنیا میں ہر جگہ میرا ٹھکانا ہے!"

جیسا کہ میں نے بتایا۔ حمدی نہایت ہمدردانہ لہجے میں مجھے ترک محبت کی صلاح دیتا اور اس سلسلے میں عجیب و غریب داستانیں بھی سنایا کرتا مگر بدقسمتی سے اس کی نصیحتوں اور داستانوں کو سن کر میرے دل میں محبت کی آگ اور بھڑک جاتی اور جب میں شہر کا رخ کرتا تو سلمٰی کی یاد اس درجہ بیقرار کرتی کہ اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

(۲)

اس دن میں خاص طور پر غمگین و مغموم تھا۔ بے رحم سلمٰی کی سرد مہریوں نے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور میں اپنے صد پارہ دل کو سینے میں لئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا پرانے قلعے کی طرف جا رہا تھا۔

دن بیت چکا تھا اور فضاؤں میں تاریکی کے بادل عفریتوں کی طرح چھا رہے تھے۔ دور مغربی گوشے میں ایک بلند اور گنجان درخت خوفناک دیو کی مانند ' آفتاب کی خونچکاں نعش بازوؤں پر اٹھائے آہستہ آہستہ تاریکی کی غار میں غائب ہو رہا تھا۔ میں اس خونی منظر کو دیکھنے لگا۔ میرے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ ایک دن میں بھی خون شدہ تمناؤں کو لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ اس خیال کے آتے ہی میری آنکھیں پرنم ہو گئیں اور میں ایک بندھی ہوئی کشتی میں بیٹھ گیا۔ میرے حقیر آنسو سطح آب پر ننھے ننھے دائرے بناتے ہوئے تحلیل ہونے لگے۔ اسی اثناء میں میں نے حمدی کو قلعے کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے دیکھا۔ میں کشتی سے نکلا اور حمدی کے قریب پہنچ گیا۔ حمدی نے قدموں کی آہٹ سن کر مڑ کر میری طرف دیکھا ' اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ہوا اور اس نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "آج تم بہت غمگین نظر آ رہے ہو۔"

"میرا دل ٹوٹ چکا!" میں نے جواب دیا۔

اس نے ایک لمبی آہ بھری اور غمناک لہجے میں کہا۔ "تم خود کو تباہ کر رہے ہو!"

"تو کیا کروں؟"

"اس آگ سے نکلو ' ورنہ اس کے آتشیں شعلے تمہیں جلا کر خاک کر دیں گے۔"

"میں مجبور ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا! اس کی محبت میرے دل کے ذرے ذرے کو محیط ہے۔"

حمدی کھجور کے درخت سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ یکایک ایک پرندہ پھڑ پھڑاتا ہوا ہمارے سروں کے اوپر گذر کر قلعے کی دیوار کے پاس تاریکی میں غائب ہو گیا۔ شاید وہاں وہ اپنے گھونسلے میں جا بیٹھا تھا۔ بابا حمدی قلعے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں پراسرار چمک پیدا ہو رہی تھیں۔ قلعے کی بلند ' مہیب دیواریں نظروں سے غائب ہوتی جا رہی تھیں اور یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ماضی کے دھندلکوں میں عظمت بیتیں اپنی جھلک دکھا رہی ہے۔

" بابا میں نے اس قلعے کے متعلق عجیب عجیب باتیں سنی ہیں۔ کوئی کہتا ہے ' یہاں بھوت پریت رہتے ہیں۔ کسی کا قول ہے ' یہاں مردوں کی روحیں چیختی چلاتی رہتی ہیں۔ بعض لوگوں نے یہاں سے گذرتے ہوئے چیخیں بھی سنی ہیں۔ ایک بوڑھے کسان نے کہا ہے کہ اس قلعے کی

کھڑکی میں سے ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی کو جھانکتے ہوئے دیکھا گیا ہے تم نے بھی کچھ سنا یا دیکھا ہے؟" میں نے حمدی سے پوچھا۔

بوڑھا خاموش رہا۔۔۔ خاموشی سے قلعے کی طرف دیکھتا رہا۔

میں نے دوبارہ استفسار کیا۔ اس پر اس نے کہا۔

"میں نے تو یہاں کچھ بھی نہیں دیکھا اور نہ کبھی سنا' لوگ یونہی افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں' مگر۔۔ جو اصل حقیقت ہے۔"

"اصل حقیقت کیا ہے؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"یہاں بھی حسن و عشق کا ایک خونی کھیل کھیلا جا چکا ہے!"

"حسن و عشق کا خونی کھیل! وہ کیونکر؟"

"لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ میری نصیحتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس صورت کیا سناؤں؟"

"یہ درست ہے مگر مجھے خود پر کچھ اختیار نہیں!" میں نے کہا۔

"تو کیا تم محبت کی ہلاکت آفرینیوں سے واقف نہیں؟"

"میں خود واقف ہوں مگر جو چیز اختیار میں نہ ہو' اس پر کیا بس چل سکتا ہے؟"

اگر تم مصمم ارادہ کر لو تو یقیناً محبت کے جال سے رہائی پا سکتے ہو۔ محب کے دل میں محبت کا جذبہ اس لئے شدت اختیار کرتا جاتا ہے' کیونکہ وہ اپنی محبوبہ کو بار بار دیکھتا ہے۔ اگر وہ اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر کہیں دور چلا جائے تو۔۔۔"

"لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا!" میں نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔ "جہاں بھی جاؤں گا' محبت کی آگ سینے میں لے کر جاؤں گا!"

حمدی کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ تم کوشش تو کرو میرے بیٹے! ممکن ہے یہ ہولناک مرض دور ہو جائے۔ محبت انسانی زندگی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ یہ ہر زمانے میں تباہی پھیلاتی رہی ہے اور پھیلاتی رہے گی۔ اگر تم نے اس سے نجات حاصل کرنے کی سعی نہ کی تو پھر تمہاری بربادی میں کوئی شبہ نہیں جیسا کہ میں نے ابھی کہا' تمہارے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ یہاں سے فی الفور چلے جاؤ!"

"اچھا بابا! میں ایسا کرنے کی کوشش کروں گا!"

بابا حمدی کی آنکھیں قدرے چمک اٹھیں۔ اس نے میرے شانے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا اور اپنی نرم و ہمدردانہ آواز میں کہنے لگا۔

"یہ قلعہ انیس سال سے ویران پڑا ہے۔ جیسا کہ تم جانتے ہو یہاں شہر کا حاکم ہاشم رہتا تھا۔ ہاشم بے حد ظالم' کینہ جو اور ختم مزاج انسان تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا اس کی کسی سے نہ بن سکی اور والی سامین "جعفر" سے تو اسے خدا واسطے کی دشمنی تھی۔ جعفر بہت نیک دل اور بہادر حکمران تھا۔ رعایا کا ہر فرد اس کا مطیع و فرمانبردار تھا اور چونکہ وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس لئے لوگوں کو امید تھی کہ کچھ مدت بعد ولی عہد سلطنت صولت' تخت نشین ہو جائے گا۔ صولت' باپ سے بھی زیادہ نیک دل اور شجاع تھا۔ عنفوان شباب میں اس نے کئی معرکے سر کئے تھے اور اب جب کہ وہ جوان تھا۔ اس کی شجاعت' دلیری اور نیک طینتی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ شہزادہ صولت' سیر و شکار کا بہت دلدادہ تھا۔ ایک دفعہ شکار کرتے کرتے بہت دور نکل گیا۔ اس کے ساتھ صرف دو وفادار خادم تھے۔ تینوں راستہ بھول کر آگے ہی آگے بڑھتے گئے رات کی تاریکی ہر طرف پھیل چکی تھی اور گھوڑے تھک کر چور چور ہو چکے تھے۔ آخر وہ ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ ایک کسان سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ "حمیرا" میں پہنچ گئے ہیں۔ حمیرا اس زمانے میں یہاں سے کچھ دور ایک گاؤں تھا۔ کوئی اور ہوتا تو فوراً وہاں سے چلا جاتا۔ کیونکہ اس وقت شہزادہ اپنے جانی دشمن کی سلطنت میں پہنچ گیا تھا مگر شہزادے نے اس کی قطعاً پروا نہ کی اور شب بسری کے لئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہیں ٹھہر گیا۔ جیسے ہی ہاشم کو کسان کے ذریعے شہزادے کی آمد کا حال معلوم ہوا وہ اپنی دیرینہ آرزو کے پورا کرنے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ اس نے اپنے خاص مصاحب شہزادے کو لانے کے لئے بھیجے۔ شہزادہ جانتا تھا کہ وہ دشمن کے ملک میں ہے...... اسے خبر تھی کہ وہ خطرے میں گھر گیا ہے لیکن اس نے ذرہ بھی احتیاط نہ کی اور اپنے وفادار خادموں کی مسلسل گذارشات کو کچلتے ہوئے حاکم شہر کے آدمیوں کے ساتھ محل میں پہنچ گیا۔ خادم حیران تھے

کہ آخر شہزادے کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ کیوں جان بوجھ کر خطرے میں گرفتار ہو رہا ہے۔ آہ! انہیں کیا خبر تھی کہ صولت' محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر موت کے منہ میں جا رہا ہے۔

صولت' ہاشم کی لڑکی "یاسمین" کی محبت میں گرفتار تھا اور یہی جذبہ محبت اسے کشاں کشاں محل کی طرف لے جا رہا تھا۔ نتیجہ۔۔۔؟

نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ رات کے آخری حصے میں شہزادے کو ایک تاریک اور زمین دوز کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس وقت اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ نہایت ہولناک فریب کیا گیا ہے۔ اس نے ادھر ادھر ٹٹولا مگر اس کی انگلیاں پتھر کی سخت دیواروں ہی سے مس ہوئیں۔ اس نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر بے سود۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ کافی دیر کے بعد اس کے کمرے میں ہلکی سی روشنی ظاہر ہوئی۔ اس روشنی میں اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک فراخ کمرے میں ہے جس کی دیواریں بہت مضبوط ہیں۔ ایک طرف آہنی دروازہ ہے جو مقفل ہے۔ شہزادے کو بہت افسوس ہوا۔ اب دست تاسف ملنے سے کیا ہو سکتا تھا؟

صولت کو یقین تھا کہ ظالم ہاشم اسے مار ڈالے گا مگر منتقم حکمران اسے اس طرح ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہزادے کا اس طرح زندہ رہنا زیادہ مفید ہے۔ ممکن ہے اس کے ذریعے وہ اپنے دشمن کی سلطنت پر قبضہ کر لے۔

اسی اثناء میں ایک خادم نے دروازے کی سلاخوں میں سے کھانا اندر داخل کیا۔ شہزادے نے خادم سے بہت کچھ پوچھا مگر اسے کسی بات کا جواب نہ ملا۔ خادم اپنا فرض ادا کر کے چلا گیا۔

ادھر تو شہزادہ اسیر ہو گیا۔ ادھر اس کے اسطرح پر اسرار طور پر غائب ہو جانے سے تمام سلطنت میں سنسنی سی پھیل گئی۔ لوگوں نے جنگل کا کونہ کونہ چھان مارا مگر شہزادہ کہاں؟ کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں ہے' زندہ ہے یا مر چکا ہے۔

ہاشم نے اس کے خادموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس لئے اب کسی ذریعے سے بھی شہزادے کی اسیری کی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔

دن پر دن گذرتے گئے۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ جنگلی درندوں نے شہزادے اور اس کے ہمراہیوں کو چیر پھاڑ ڈالا ہے۔

حمدی رکا' ایک لمبی پر درد آہ بھری اور اپنی نگاہیں پرانے قلعے کی دیوار پر جما دیں۔

ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ قلعے کے قریب ایک بلند' بے برگ و بار درخت کی شاخ پر کوئی حسرت نصیب پرندہ ماتمی صدا کے ساتھ اپنے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ درخت کے عین اوپر ایک سفید بادل چاند سے مس کرتا ہوا یوں گذر رہا تھا جیسے ایک بدقسمت محب اپنی محبوبہ کو الوداعی بوسہ دیتے ہوئے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہے۔

میں نے حمدی کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور قلعے کی دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے جھریاں پڑے ہوئے ماتھے کے نیچے غم میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جس طرح کسی شکستہ قبر کے گڑھوں میں نیم روشن و نیم تاریک دھبے جمے ہوئے ہوں! وہ کئی لمحے اپنے خیالات میں غرق رہا پھر اپنی لمبی' کمزور اور جھریوں میں لپٹی ہوئی انگلیاں پیشانی پر پھیریں اور غم انگیز لہجے میں کہنے لگا۔

جب آتش فشاں پہاڑ کے سینے سے آتشیں شعلوں کے فوارے پھوٹنے لگتے ہیں تو اردگرد کی تمام چیزیں جل کر خاک و خاکستر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ بعینہ جو آگ اسیر شہزادے کے دل میں بھڑک رہی تھی۔ اس کی حدت سے یاسمین کا دل بھی پگھلنے لگا۔ اس نے جب دیکھا کہ اس کا جاں نثار محب محل کے اس تاریک و خوفناک کمرے میں بند کر دیا گیا ہے جہاں سے آج تک کوئی سلامت نہیں نکل سکا تو وہ بے حد مضطرب و بے قرار ہو گئی۔ اس کا باپ بے کسوں کو دیکھ کر متاثر ہونا جانتا ہی نہ تھا۔ مگر اس کے برخلاف یاسمین کے پہلو میں ایک حساس اور دردمند دل تھا وہ کیونکر برداشت کر سکتی تھی کہ ایک پائیدار سلطنت کی امیدوں کا تنہا مرکز' شریف طبع اور پھر اس کا بہادر محب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے اور کسی کو اس کی خبر تک نہ ہو۔ پہلے تو اس نے اپنے تمام اختیارات سے فائدہ اٹھا کر اپنے تمام نسائی حربوں کو کام میں لا کر باپ کو شہزادے کی رہائی پر مجبور کیا مگر افسوس اس کی کوئی پیش نہ چلی بلکہ برعکس اس کے' ظالم حکمران اسیر شہزادے پر اور ظلم کرنے لگے۔

شہزادی کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی تمام امیدیں خاک میں ملا دی گئی تھیں تاہم اس نے ہمت نہ ہاری۔ محبت میں انسان کا

دل زیادہ مضبوط، اس کے ارادے زیادہ بلند اور اس کی روح زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ وہ ہر مصیبت کا مقابلہ کرتا ہے اور خندہ پیشانی سے کرتا ہے۔ شہزادی کے دل میں محبت کا تند جذبہ موجزن تھا۔ اس نے چند قابل اعتبار شخصوں کو اپنے ساتھ ملا کر شہزادے کو رہا کرانے کی کوشش شروع کر دی۔ عین اس وقت جب کہ ان کی کوشش کامیابی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ایک شخص نے غداری کی اور اس سازش کی خبر حاکم کے کانوں تک پہنچ گئی۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے اپنے ہی گھر میں اس کے خلاف سازش ہو رہی ہے ہاشم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے تمام سازشیوں کو بے رحمی کے ساتھ ہلاک کر کے شہزادی کو زمین دوز کوٹھڑی میں قید کر دیا۔

دونوں بدنصیب اسیروں کو کھانا پہنچانے کا فرض صفدر انجام دیتا تھا۔ صفدر شہزادی کا پرانا نمک حلال خادم تھا اور چونکہ محل میں ہر شخص کو اس پر اعتبار تھا اس لئے اس قسم کی ذمہ داریوں کا کام اسی کے سپرد ہوتا تھا۔ صفدر لوہے کی سلاخوں میں سے ہاتھ ڈال کر دونوں کو مقررہ وقت پر کھانا پہنچایا کرتا۔ اس کے علاوہ انہیں اس مصیبت میں تسلی بھی دیا کرتا۔ مصیبت کا احساس خواہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو مگر ایک ہمدرد دل کی ہمدردی سے بھری ہوئی باتیں اس کی تلخی کو بہت حد تک دور کر دیتی ہیں۔

یاسمین اور صولت دونوں علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیوں میں بند تھے اور ان دونوں کوٹھڑیوں کے درمیان نہ معلوم کتنا فاصلہ تھا اور یہ بھی امید بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ دونوں کسی وقت ایک دوسرے کو مل سکیں گے۔ دونوں رات دن پتھروں کی دیواروں میں قید تڑپتے رہتے۔ تڑپتے اور بدقسمتی پر آنسو بہاتے رہتے!

ایک دن صولت کوٹھڑی کی ایک دیوار کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ یکایک اسے چھوٹا سا سوراخ نظر آیا۔ اس نے پتھر کو ہٹانے کی کوشش کی تو ایک حد تک وہ کھسک گیا۔ جب صفدر آیا تو صولت نے اس سے لوہے کا اوزار لانے کے لئے کہا۔ وفادار خادم کے لئے یہ جان جوکھوں کا کام تھا لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح لوہے کا ایک اوزار صولت کو پہنچا دیا۔ صولت اوزار کی مدد سے پتھر کو ہٹانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پتھر کچھ اور ہٹ گیا۔ یہ دیکھ کر شہزادے کی امید بندھ گئی۔ وہ تمام رات پتھر کو ہٹانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دیوار میں کافی بڑا سوراخ ہو گیا۔ شہزادہ اس میں داخل ہو گیا اور یہ دیکھ کر کہ اس کے قدم زمین پر پڑ رہے ہیں۔ اس کا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ تاریکی میں چلتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا ہاتھ لوہے کی سلاخوں کو لگا۔ شہزادے کے دل میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ اس نے اپنی محبوبہ کو آواز دی۔ آواز ہلکی سی گونج پیدا کرتی ہوئی فضا میں غائب ہو گئی۔ اس نے دوبارہ آواز دی۔ اب کے آواز کے جواب میں ایک مضمحل سی چیخ تھرتھرائی۔ شہزادے نے سمجھ لیا کہ وہ اپنی محبوبہ کی کوٹھڑی کے آہنی دروازے پر کھڑا ہے۔ اس نے یاسمین کو تسلی دی اور اپنی کوٹھڑی میں واپس آ گیا اور آتے ہی دیوار میں پتھر لگا دیئے تاکہ کوئی آئے تو اسے خبر نہ ہو۔ دوسرے دن صفدر نے روشنی کا انتظام بھی کر دیا۔

رات کے وقت صولت دیوار میں سے نکل کر یاسمین کی کوٹھڑی کی طرف چلا۔ یاسمین سلاخوں کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ دونوں تمام رات راز و نیاز میں مصروف رہے ان کے درمیان موٹی موٹی خوفناک آہنی سلاخیں حائل تھیں مگر ان کے دل ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔ دو تین دن بعد صولت نے یاسمین کی کوٹھڑی کی دیوار میں سے بھی پتھر ہٹا کر آمد و رفت کا راستہ بنا لیا اور یہ دونوں کے لئے بڑی خوش قسمتی تھی۔ شہزادی کی کوٹھڑی میں رستہ بن گیا۔ اب تو صولت دن بھر اپنے کمرے میں رہتا اور رات بھر یاسمین کی کوٹھڑی میں۔

دن گذرتے گئے اور اس راز کا علم سوائے صفدر کے کسی کو نہ ہو سکا۔ ہاشم کو کئی بار اپنی بیٹی کا خیال آیا۔ آخر وہ باپ تھا لیکن صفدر نے یاسمین کے مشورے کے مطابق اس کو شہزادی سے بدظن رکھا۔ شہزادی کو یقین تھا کہ اس کوٹھڑی سے باہر نکل کر ایک تو وہ اپنے محبوب سے جدا ہو جائے گی اور دوسرے وہ اسے آزاد کرانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس طرح دو سال گذر گئے جعفر کو خبر مل گئی کہ اس کے دشمن نے صولت کو قید کر رکھا ہے۔ یہ سنتے ہی اس نے دشمن کے ملک پر چڑھائی کر دی۔ بدطینت، کینہ پرور اور انتقام جو ہاشم نے اپنے مسلح سپاہیوں کو حکم دیا کہ فوراً صولت کو قتل کر دو۔

رات کا وقت تھا اور چونکہ صولت بیمار تھا اس لئے یاسمین اس کے کمرے میں آ گئی تھی۔ مسلح سپاہی اندر داخل ہوئے۔ صولت کھڑا ہو

گیا۔ محبت کی پتلی یاسمین اپنے محبوب سے لپٹ گئی۔ فضا میں تلواریں چمکیں۔ وہ چیخیں، کونجیں اور اس کے ساتھ ہی دو لاشے خون میں تڑپنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد محب و محبوبہ دونوں دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔۔۔!"

حمدی کی آنکھیں اس طرح نم آلود ہو گئیں جس طرح خزاں رسیدہ زرد زرد، سوکھے سوکھے پتوں پر بارش کے قطرے گریں اور پھیل جائیں۔

اس نے میرے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر قلعے کی جانب دیکھا۔ لمبی آہ بھری، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں طوفان بپا ہے۔ وہ بے اختیار رونا چاہتا ہے مگر چند لمحوں ہی میں اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ اس کی افسردہ نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ مایوسیوں نے آنسوؤں کو چوس لیا ہے۔ وہ رونا چاہتا ہے مگر رو نہیں سکتا!

"یہی وہ محل ہے جس کے ایک کمرے میں دو محبت کرنے والی ہستیوں نے محبت ہی کے ہاتھوں موت کا جام پیا۔ اس واقعے کو بیتے کئی برس گذر گئے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی میرا دوست صفدر میرے سامنے بیٹھا ہوا اس دلدوز واقعے کو سنا رہا ہے!"

"صفدر آپ کا دوست تھا؟" میں نے پوچھا:

"ہاں وہ میرا دوست تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ سال تک زندہ رہا!"

(۳)

حمدی نے ایک سرد آہ بھری۔ قلعے کی طرف دیکھا۔ پھر استفسار انگیز نگاہیں مجھ پر ڈالیں اس کے بعد کسی گہری فکر میں غرق ہو گیا۔ وہ اس طرح خاموش بے حس و حرکت بیٹھا ہوا یوں نظر آ رہا تھا گویا ریت کا ایک تودہ ہے یا قلعے کی دیوار سے گرا ہوا ایک پتھر ہے۔ چاند اس بے قرار محب کی طرح جو اپنی محبوبہ کے شانے کو نزدیک دیکھ کر انتہائی تیزی کے ساتھ قدم اٹھانے لگے۔ آسمان کے ایک ابر آلود راستے پر اڑا جا رہا تھا۔

صولت و یاسمین کی داستان محبت سن کر میرا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ کاش میں بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنی محبوبہ کے لئے دنیا کی ہر مصیبت کو خندہ پیشانی برداشت کروں۔ زندگی کے ہر حملے کے سامنے سینہ سپر ہوں اور اس وقت جب کہ میری جان لبوں پر ہو۔ میری دلنواز محبوبہ ایک لطف انگیز نگاہ مجھ پر ڈال دے۔ یہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ یہی میری زندگی کا حاصل ہے! کاش!! اے کاش!!!

حمدی دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے لمبے لمبے ناخنوں سے زمین کو کریدنے لگا اور چند لمحوں خاموش رہنے کے بعد بولا:

"مجھے یقین ہے کہ اب تم اس تباہی سامان جنوں کو اپنے دل سے نکال دو گے؟"

"یہ جنوں۔۔۔ افسوس یہ جنوں میری رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے!" میں نے کہا۔

حمدی نے مایوس نظروں سے مجھے دیکھا اور سرد آہ بھر کر بولا۔ "تم بھولتے ہو نوجوان! اگر اب بھی تم اس مرض سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرو تو یقیناً کامیاب ہو جاؤ۔ ہر شخص کو محبت کی آگ سے بچنا چاہئے۔ محبت کی چنگاری شروع شروع میں تو مسرت انگیز و راحت سامان حرارت بدن میں دوڑاتی ہے مگر کچھ عرصے کے بعد جان سوز شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ میری نصیحت مانو اور محبت کی آگ سے دور بھاگو!"

"کاش میں ایسا کر سکتا!۔۔۔ کاش یہ بات میرے اختیار میں ہوتی۔!"

"سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے!"

"محبت کرنے والا دل محبت پر اختیار نہیں رکھ سکتا۔ اگر یہ بات غلط ہے تو کہو، صولت نے کیوں اپنی جان جوکھوں میں ڈالی، بدنصیب یاسمین نے کس لئے اپنی زندگی کو تباہ کیا؟"

"یہ --- یہ!" حمری آگے نے بول سکا۔ اس کی پلکیں نم آلود ہو گئیں۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ پھر بولا۔
"انہوں نے اپنی زندگی سے دشمنی کی -- لیکن تم ان کی پیروی کیوں کرو --؟"
میں خاموش رہا۔ اس کا جواب میں دے ہی کیا سکتا تھا --؟ حمری نے قلعے پر نگاہیں جما دیں۔ میں دوسری طرف منہ پھیر کر درختوں میں سے چمکتے ہوئے دریا کے پانی کی لمبی سی سفید لکیر دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ تاریکی میں چمکتی ہوئی اس سفید لکیر کی طرح میرے ظلمت کدہ دل میں بھی ایک ہلکی سی امید روشن ہے۔ اگرچہ آج سلمیٰ مجھ سے سرد مہری برت رہی ہے مگر ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں اس کی سرد مہری محبت میں تبدیل ہو جائے۔ اس وقت مجھے یقیناً دنیا کی سب سے بڑی نعمت حاصل ہو گی۔ لیکن ایسا کبھی ہو گا؟ ایسا کبھی ہو سکتا ہے؟
یہ سوال میرے دل میں اس طرح پیدا ہوا جس طرح دریا میں ایک دم طغیانی آ جائے سلمیٰ جو سلوک مجھ سے کر رہی ہے۔ اس کو مدنظر رکھا جائے تو پھر اس کے التفات کا گمان ذہن میں نہیں آ سکتا۔ اس پر ایک سفاک ساحرہ کی طرح اس کی سرد مہریاں مجھے یاد آنے لگیں تین سال سے میں مسلسل اس کے ظالمانہ سلوک کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اس دوران میں ایک دفعہ بھی اس نے مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ ایک بار بھی میری طرف توجہ نہیں کی تھی۔ یہ خیالات میرے ذہن پر چھا گئے۔
یکایک ایک خاص خیال کے دماغ میں آنے سے میں نے مڑ کر دیکھا --- حمری غائب ہو چکا تھا۔
قلعے کی مہیب دیواریں صدیوں کے راز، برسوں کے واقعات اور پھر صولت و یاسمین کی حسرتناک انجام محبت کی داستان سینے میں چھپائے نہ معلوم کس کا انتظار کر رہی تھیں؟ نہ معلوم کیوں سوگوار و زخم نصیب روحیں چاند کی مدھم شعاعوں کے ساز پر ماتمی اور فراقیہ نغمے گاتی ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر مضطربانہ اڑی جا رہی تھیں ---؟
میں کچھ دیر اور وہاں ٹھہرا، پھر گھر آ کر لیٹ گیا۔ نیند نے مجھے دنیا اور مافیہا سے غافل کر دیا۔
کچھ دیر کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ قریب ہی لمپ جل رہا تھا۔ اس کی شعاعیں جلتی ہوئی سلاخوں کی مانند میری آنکھوں میں چبھیں۔ میں نے پہلو بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ حمری کی سنائی ہوئی ٹریجڈی کے واقعات یکے بعد دیگرے میری آنکھوں میں پھرنے لگے۔ میں سوچنے لگا۔ اگرچہ صولت و یاسمین محبت ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تاہم ان کی خوش قسمتی میں ذرا بھر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صولت ایک بہت بڑی سلطنت کا ولی عہد تھا۔ ناز و نعم کے آغوش میں پرورش پایا ہوا۔ شاہانہ زندگی بسر کرنے والا، دنیا اور زندگی کے 'مصائب سے بے خبر اور محبت نے اسے دنیا کی دلچسپیوں سے یکسر محروم کر کے ایک تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا لیکن اس تکلیف دہ حالت میں بھی اس کی محبوبہ اس کے قریب تھی۔ دل و جان سے اسے چاہ رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں میں آزاد ہوں، جہاں چاہوں جا سکتا ہوں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ لیکن میری محبوبہ میری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی اس خیال کے آتے ہی میری آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ میں نے بے قرار ہو کر پہلو بدل لیا۔
یوں تو یہ تمنا کہ کاش میں موت سے پیشتر ہی اپنی ظالم محبوبہ کے دل کو فتح کر لوں۔ ہر وقت میرے دل میں بے قرار رہتی تھی۔ لیکن کسی وقت تو یہ تمنا میرے دل کے ذرے ذرے پر چھا جاتی۔
میں لیٹا رہا اور نہ معلوم کب میری یہ حالت رہی کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ آنے والا میرا نوکر تھا۔ لمپ کو جلتے ہوئے دیکھ کر اس نے حیرت سے مجھ سے کہا۔
"لمپ آپ نے ابھی جلایا ہے یا یہ تمام رات جلتا رہا ہے؟"
"بجھا دو اس کو!" میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ آفتاب نمودار ہو چکا تھا اور ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا خادم لمپ بجھا کر چپ چاپ چلا گیا۔ میں اپنے سر اور آنکھوں میں شدید درد محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے پھر لیٹ گیا اور اس وقت کمرے سے باہر نکلا جب دن کا کافی حصہ گذر چکا تھا۔ اب میرے دل میں تمنا تھی کہ دن بہت جلد بیت جائے اور میں شام کو حمری سے ملوں اور اس سے صولت اور یاسمین کے متعلق کچھ اور دریافت کروں۔ نہ معلوم مجھے ان کشتگان محبت سے کیوں اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ میں چاہتا تھا ہر وقت انہی کے

متعلق باتیں سنتا رہوں۔ ابھی شام ہونے میں کچھ دیر باقی تھی کہ میں اس باغ میں پہنچ گیا جہاں میری محبوبہ سیر کیا کرتی تھی۔ لوگ سیر و تفریح میں مشغول تھے لیکن میری محبوبہ کہیں بھی نہیں تھی۔ میں نے باغ کے حسین ترین پھولوں کو اکٹھا کر کے گلدستہ بنایا اور باغ سے باہر نکل کر اپنی محبوبہ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

مغرب کے خونیں گوشے میں زرد رو آفتاب اس مسافر کی طرح نظر آ رہا تھا جو چلتے چلتے تھک کر ہر طرف سے مایوس ہو کر مجبوراً ایک جگہ بیٹھ جائے۔ تاریکی ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ اچانک مجھے دور سلمیٰ کا شگفتہ ' مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ میرے دل کی ملکہ یوں نظر آ رہی تھی۔ گویا ندی کی شفاف سطح پر ہوا کے جھونکوں سے چاند کی سیمیں شعاع لہرا رہی ہو!۔

وہ تنہا تھی۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کا انتظار کرنے لگا ' یہاں تک کہ وہ میرے قریب آ گئی۔ میں نے گلدستہ اس کے قدموں پر ڈال دیا۔ وہ ذرا رکی ' حقارت انگیز نظریں مجھ پر ڈالیں اور پھر روانہ ہو گئی۔ میں دل مسوس کر رہ گیا۔

شام کی تاریکی کافی پھیل چکی تھی اور اس تاریکی میں خاک پر پڑے ہوئے پھول بزبان خاموشی مجھے میری بد نصیبی کی داستان سنا رہے تھے۔ آہ! میرے سوا دنیا میں کون جانتا تھا کہ یہ رنگین پھول میرے حرماں نصیب دل کے ٹکڑے ہیں۔ جنہیں نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا ہے۔

آخر میں قلعے کے پاس پہنچا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ ابھی تک سلمیٰ کی آمد کا منتظر ہوں۔ بجلی کی رو کی طرح اپنی ناکامی کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ میں نے آہ بھر کر اوپر دیکھا۔ یکایک قلعے کی کھڑکی میں سے ایک لمحے کے لئے ایک نہایت دل آویز حسین چہرہ میری نظروں کے سامنے آیا اور پھر غائب ہو گیا۔

میں ٹکٹکی باندھ کر کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ کافی دیر تک دیکھتا رہا ' مگر وہاں کچھ بھی نمودار نہ ہوا۔ کیا یہ سپنا تھا؟ میرے دل میں خیال پیدا ہوا مگر اس حالت میں سپنے کا خیال کیونکر پیدا ہو سکتا تھا؟ عالم بیداری میں سب کچھ دیکھ رہا تھا!

قلعے کی بلند ' سنگین اور مہیب دیوار کے سینے پر تاریک بادلوں کے ہجوم میں سفید ابر پارے کی طرح چاندنی کی چادر بچھی ہوئی تھی اور سفید چادر کے ایک گوشے میں مختصر سا خلا تھا ' جس میں سے ابھی ابھی ایک حسین و شاداب چہرے نے نمودار ہو کر میرے دل و دماغ میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔

میں نے بڑھ کر اپنا ہاتھ دیوار پر رکھ دیا۔ اس حالت میں بھی کچھ دیر وہاں رہا۔ آخر یہ خیال کر کے کہ شاید حمدی سے ملاقات ہو جائے ' میں وہاں سے ہٹا اور کھجور کے درخت کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ ہوا کے سست رو جھونکے درختوں کی شاخوں کو ہلا ہلا کر چاندنی سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا مگر وہاں حمدی کا نقش قدم بھی نہیں تھا۔ میں درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنی نگاہیں قلعے کی دیوار پر جما دیں اسی اثناء میں یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ "یہ حسینہ یاسمین تو نہیں؟" یہ سوال میں نے دل میں بار بار دہرایا ' مگر جب حمدی کے سنائے ہوئے واقعات کی روشنی میں اس پر غور کیا تو میرے دل کو یقین ہو گیا کہ یہ پراسرار حسینہ کسی صورت میں بھی یاسمین نہیں ہو سکتی۔ وہ تو کئی سال قبل اپنے محبوب کے ساتھ موت کے گھاٹ اتاری جا چکی ہے تو پھر یہ حسینہ کون ہے؟ انہیں خیالات کو ذہن میں لئے ہوئے میں سو گیا۔

خواب میں بھی وہ پراسرار حسینہ بار بار میری نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ رات کے آخری حصے میں میں بیدار ہو گیا۔ قلعے کی مہیب دیواریں چاندنی کو آغوش میں لئے ہوئے میرے سامنے کھڑی تھیں۔ میں ایک جذبہ بے تاب کے زیر اثر اٹھا اور اسی کھڑکی کے نیچے پہنچا۔ دیر تک کھڑکی کو دیکھتا رہا۔ جب بالکل مایوس ہو گیا تو پھر بادل ناخواستہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۴)

جیسے ہی شام ہوئی ' میں گھر سے نکلا اور قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا۔ حمدی اب بھی وہاں نہیں تھا۔ اس کے بعد کھڑکی کے نیچے چلا گیا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے دیکھ کر ایک دم کھڑکی سے الگ ہو گیا۔ چاند اب بھی

صورت تو میں نہ دیکھ سکا۔ لیکن میرے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ یہ وہی قلعے کی حسینہ تھی۔ وہ رات بھی میں نے وہیں بسر کر دی۔ نہ صرف رات بلکہ اور کئی راتیں بھی وہیں گذر گئیں۔ میں حیران تھا کہ آخر قلعے کی اس پراسرار حسینہ نے صرف ایک جھلک دکھا کر مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے؟ میں کیوں بار بار اس کھڑکی کے نیچے آکر کھڑا ہوتا ہوں؟

اسی طرح کئی دن گذر گئے میں محسوس کرنے لگا کہ قلعے کی حسینہ میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔ مقام حیرت یہ تھا کہ سلمیٰ کو بھی بہت حد تک میں نے بھلا دیا تھا۔

ایک رات میں قلعے کے پاس پہنچا اور اس دیوار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا جس کے پیچھے میں میرا سنہرا سپنا غائب ہو گیا تھا۔ میں دیر تک کھڑکی کو دیکھتا رہا۔ اس واقعہ سے قبل گاہے گاہے حمدی سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ مگر اب تو میں نے اس کی شکل بھی کہیں نہیں دیکھی تھی۔ نہ معلوم وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ حمدی اس حسینہ کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ میں اس سے ملاقات کرنے کے لئے اس قدر بے تاب و بے قرار تھا۔

میں قلعے کے چاروں طرف گھومتا رہا کہ کوئی راستہ اندر جانے کا مل جائے مگر ایک آہنی دروازے کے علاوہ کوئی راستہ اندر جانے کا نظر نہ آیا اور اس آہنی دروازے کا یہ حال تھا کہ اس کا آدھا حصہ بڑے بڑے پتھروں میں چھپا ہوا تھا۔ پہلے تو ان بڑے بڑے پتھروں کو ہٹایا جائے پھر کہیں جا کر دروازہ نظر آئے۔ اس کے علاوہ اس دروازے کو کھولنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ اچانک میری نظر قلعے سے کچھ دور شاہ بلوط کے ایک درخت کے قریب ایک نیالی چٹان پر پڑی۔ میں یہ سوچ کر کہ چٹان پر بیٹھ کر کھڑکی پر نگاہ پڑ سکے گی۔ اس طرف چلنے لگا اور وہاں بیٹھ کر کھڑکی دیکھنے لگا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا' پھر لیٹ گیا اور فراقیہ اشعار گنگنانے لگا۔ جیسے ہی میں نے پہلو بدلا مجھے چٹان کے پاس ایک غار نظر آیا۔ میں فوراً چٹان سے نیچے اترا اور غار میں داخل ہو گیا۔ غار کے ایک طرف ایک سیڑھی نظر آئی میں نے سیڑھی پر قدم رکھ دیئے۔ خوف سے میرا دل دھڑکنے لگا مگر قلعے کی پراسرار حسینہ کا شگفتہ و خنداں چہرہ میری نگاہ تخیل کے سامنے نمودار ہوا اور میں آگے چلنے لگا۔ آگے ایک اور سیڑھی تھی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی سیڑھیاں آئیں میں امید و بیم کے عالم میں نیچے اترتا گیا۔ تاریکی اس قدر تھی کہ خدا کی پناہ! ہر قدم پر اندیشہ تھا کہ اب زندہ باہر نہیں نکل سکوں گا۔ سیڑھیوں کے بعد ایک تنگ و تاریک راستہ تھا۔ میں ٹٹول ٹٹول کر قدم اٹھانے لگا۔ آخر میرا ہاتھ ایک دیوار سے لگا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ خدا کی پناہ! یہ دیوار ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ راستہ بند ہے۔ میں مڑا اور واپس آنے لگا۔ ارادہ تھا کہ گھر جا کر لیمپ لا کر پھر یہاں آؤں گا اور قلعہ کے اندر جانے کا راستہ معلوم کروں گا۔ میرے ہاتھ دیوار سے مس کر رہے تھے یکایک محسوس ہوا کہ دیوار میں ایک خلا ہے۔ میں وہاں ٹھہر گیا اور ہاتھوں سے آنکھوں کا کام لینے لگا۔ واقعی یہ ایک وسیع خلا تھا۔ میں خلا میں داخل ہوا۔ میرے پاؤں فرش پر پڑے اور میں آگے چلنے لگا۔ اس حسینہ سے ملنے کی امید راستے کی تاریکی کو روشن کر رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مجھے ہلکی سی روشنی نظر آئی اور اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ میرے سامنے پتھر کی سیڑھیاں ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل اچھلنے لگا۔ میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا کہ میں قلعے میں داخل ہو گیا ہوں اور عنقریب اس پراسرار حسینہ سے ملوں گا۔ سات آٹھ سیڑھیاں تھیں۔ ان سیڑھیوں کے بعد میں قلعے میں تھا۔۔!

چاروں طرف گھاس بے ترتیبی سے اگی ہوئی تھی۔ سرو اور بلوط کے درخت جابجا کھڑے تھے۔ حوض سوکھ گئے تھے' فوارے زنگ آلود تھے۔ تالابوں میں گرد و غبار پڑا ہوا تھا۔ میں ایک بے تابانہ ایک مجنونانہ جذبے کے زیر اثر اس پراسرار حسینہ کو تلاش کرنے لگا کبھی مجھے خیال آتا کہ میری وہ پراسرار حسینہ کسی سرو کے سائے میں سو رہی ہے۔ کبھی گمان ہوتا کہ وہ کسی سوکھے تالاب کے کنارے کوئی غمگین گیت گا رہی ہے اور کبھی شبہ ہوتا کہ وہ مجھے آتے دیکھ کر ایک ایسی جگہ چھپ گئی ہے جہاں میں انتہائی کوشش کے باوجود بھی نہیں پہنچ سکتا۔ حیران تھا کہ کہاں جاؤں' اسے کہاں تلاش کروں؟

آخر میں ایک تالاب کے کنارے بیٹھ گیا۔ چاند قلعے کے مینار کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ آسمان کی نیلگوں سمتوں میں ابر کا ایک ٹکڑا ایک بے تاب محب کی طرح آوارہ پھر رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے درختوں کے سوکھے پتے سوگوار کھڑکھڑاہٹ پیدا کرتے ہوئے تالاب میں گر رہے تھے۔

میں وہاں سے اٹھا اور یہ خیال لے کر اٹھا کہ اس کھڑکی کو تلاش کرنا چاہئے۔ جس میں اس حسینہ نے جھلک دکھائی تھی مگر اس کمرے کو جس میں وہ کھڑکی تھی، تلاش کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا میں کئی کمروں میں داخل ہوا۔ ادھر ادھر ہر جگہ اسے تلاش کیا لیکن میری کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر تھک کر میں ایک سرو کے درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ حسین تصورات کی نشاط زائیوں نے مجھے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ کئی راتیں عالم بیداری میں گذری تھیں۔ اب جو نیند آئی تو ایسی آئی کہ میں اس وقت بیدار ہوا، جب سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ روشنی میں میں نے اس کی تلاش شروع کر دی...... مگر فضول۔ آخر میں اسی راستے باہر نکل آیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ باہر نکلتے وقت کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

(۵)

دوسرے دن جب کہ آفتاب اپنے سفر کا تہائی حصہ ختم کر چکا تھا۔ میں اسی راستے سے قلعے میں داخل ہوا اور اس پراسرار حسینہ کو تلاش کرنے لگا۔ میں بے تابی سے ایک کمرے سے دوسرے میں جاتا۔ اضطراب کے عالم میں گنجان جھاڑیوں کے اردگرد نگاہیں ڈالتا اور دل میں شوق فراواں لئے ہوئے پیچیدہ راستوں کو طے کرتا۔ آخر تھک کر، مایوس ہو کر ایک سیاہ پتھر پر بیٹھ گیا۔ یہ سیاہ پتھر قلعے کے مینار سے گرا ہوا تھا۔ شام ہو چلی تھی۔ درختوں کے پودوں کے میناروں کے سائے لمبے ہو گئے۔ آفتاب لب بام کی زرد، مایوس اور تھکی ہوئی شعاعیں بلند درختوں اور میناروں کا سہارا لے لے کر فضا کی لامحدود وسعتوں میں پھیلی ہوئی تاریکیوں میں غائب ہو رہی تھیں۔ لمبے لمبے سائے، سسکتے ہوئے رینگتے ہوئے اندھیرے کے سمندر میں ڈوب رہے تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پراسرار حسینہ بھی ایک سایہ بن کر، سایوں کی اس دنیا میں غائب ہو رہی ہے ایک سوکھے ہوئے درخت کی ٹہنی پر چیل بیٹھی اپنی حسرتناک آواز سے فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ زرد، افسردہ اور سوکھے پتے ٹہنیوں سے گر گر کر آپس میں ٹکرا ٹکرا کر کھڑکھڑی کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ قلعے کے عین اوپر بڑے سیاہ بادل کے آخری سرے پر مدھم چاندیوں نظر آ رہا تھا، گویا ریت کے تودے پر پھول کی ایک نازک پتی لرز رہی ہے۔ ہوا کے جھونکے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی دبے پاؤں میرے پاس سے گذر رہا ہے۔ میں اٹھا، مڑ کر دیکھا۔ قریب و دور کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ ہوا کی لہروں سے ایک پودے کی شاخیں حرکت کر رہی تھیں۔ چاند کی مدھم روشنی درختوں اور پودوں میں چھن چھن کر گر رہی تھی۔ میں نے اس پودے کو پکڑ لیا اور دور تک نگاہیں دوڑائیں، ہر طرف متجسسانہ دیکھا مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ ہر قدم پر خیال ہوتا کہ قلعے کی پراسرار حسینہ پاس کے پودے میں چھپی ہوئی ہے۔ ہر لحظہ گمان ہوتا کہ وہ ساحرہ جمیل مجھے دیکھ کر کسی زمین دوز کمرے میں چلی گئی ہے۔ اگرچہ بار بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا تاہم ایک شدید، پرزور اور جنون انگیز جذبہ تھا جو مجھے ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر دوڑائے پھرتا تھا۔ نگاہوں کو کوئی ہستی نظر نہیں آتی تھی مگر دل کو کامل یقین تھا کہ وہ حسینہ اسی ویران قلعے کی پراسرار خلوتوں میں سانس لے رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ وہ دنیا کی حسین ترین دوشیزہ ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال کمر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا چہرہ نہایت دل آویز، نہایت شاداب ہے، وہ سحر و نغمہ کی ملکہ ہے اور ہر ہر قدم پر نشہ بکھیرتی پھرتی ہے۔

میں قدم اٹھائے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ قلعے کے آخری حصے میں پہنچ گیا۔ سامنے ایک سیڑھی نظر آئی۔ میں سیڑھی سے نیچے اترا۔ اب معلوم ہوا کہ یہاں قلعے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں گھاس بہت حد تک ترتیب کے ساتھ اگی ہوئی تھی پودوں کی ترتیب بھی کسی باغبان کی

رہین منت تھی۔ شاخوں پر طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ میرے دل میں نیا جوش 'نیا ولولہ اور نیا جذبہ پیدا ہوا مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ دوشیزہ جسے انتہائی بے تابی کے ساتھ ڈھونڈ رہا ہوں اور اپنے معطر جلووں سے میرے خوابوں کی فضاؤں کو مہکا رہی ہے' یہاں کسی پودے کے پیچھے یہاں کسی تالاب کے کنارے بیٹھی ہے۔ میں دیر تک پھرتا رہا۔ پھر حوض کے کنارے بیٹھ گیا اور مہکتے ہوئے نشہ برساتے ہوئے تصورات کے ہجوم میں تیرنے لگا۔ نیند ایک نرم رو نکہت بہ دامن جھونکے کی طرح میری آنکھوں میں آئی اور میں سو گیا۔ دیر تک سوتا رہا۔ یکایک میرے خواب حسین کے افق سے دور بہتی ہوئی ندی کے ترنم کی طرح ایک نغمہ اٹھا اور فضا میں تھرتھرانے لگا۔ میں بیدا ہو گیا۔ وہ نغمہ ابھی فضا میں لہرا رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ واقعی یہ عالم بیداری تھا۔ میں آگے بڑھا۔ ترنم ریز آواز برابر گونج رہی تھی۔ پھر یہ آواز بند ہو گئی اس کے ساتھ ہی شاخوں کے زور زور سے آپس میں ٹکرانے کی آواز کان میں آئی۔

ایک جگہ پہنچ کر میرے قدم خود بخود رک گئے۔ مجھ سے کچھ دور گھاس پر ایک بربط پڑی تھی۔ میرا دل و دماغ مسرت کی مستیوں میں یکسر ڈوب گیا۔ میں تیزی کے ساتھ بربط کے پاس پہنچا اور اسے اٹھا لیا۔

بربط نہایت حسین و جمیل تھی۔ اس کے سنہری تار چاندنی میں چمک رہے تھے میں دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ "بربط اس قدر حسین و دل آویز ہے تو پھر بربط والی کس درجہ خوب صورت ہو گی؟"

یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا اور اسی خیال کو لئے ہوئے 'پودوں کی شاخیں ہٹا ہٹا کر 'اس غزالہ رمیدہ کو ڈھونڈنے لگا۔

اسی اثناء میں کچھ دور مجھے سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ میں اس کی طرف چلا۔ مگر سایہ بہت جلد غائب ہو گیا۔ میں نے بربط کو ایک طرف رکھ دیا اور کھڑے ہو کر دور دور تک نظر ڈالنے لگا۔ میرا گمان تھا کہ جلد ہی اس پراسرار ہستی کو دیکھ لوں گا جس کی یہ بربط ہے' مگر میرا یہ خیال فریب تخیل ہی ثابت ہوا۔ ایک جنوں انگیز جذبہ میرے دل و دماغ پر چھا گیا تھا اور میں اس طرف چلنے لگا۔ جہاں ابھی ابھی میری نگاہوں نے ایک سائے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاخ کی ہر جنبش پر محسوس کرتا کہ وہ پراسرار ہستی کسی پودے کے پیچھے چھپ کر 'شاخوں کو ہٹا کر مجھے دیکھ رہی ہے۔ ہوا کی سرسراہٹ پر گمان گزرتا کہ وہ سحر طراز حسینہ مجھے دیکھ کر خوف کے مارے بھاگ رہی ہے۔ اپنی مسلسل کوششوں کی ناکامی کے باوجود میں نے تلاش جاری رکھی اسے ہر ہر گوشے میں تلاش کیا' ہر ہر کونے میں ڈھونڈا مگر شاید وہ پانی کی ایک لہر تھی جو دریا کے پہلو سے اٹھ کر تودۂ ریگ میں غائب ہو جاتی ہے۔ یا ایک تو وہ ریگ تھی جو سمندر میں گر کر پلک جھپکانے میں تحلیل ہو جاتا ہے' یا پھر وہ ایک روشن ستارہ تھی جو نمود سحر پر آسمان کی لامحدود پہنائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ پودوں کی شاخیں یوں جھکی پڑی تھیں گویا ان پر ایک عجیب و غریب طلسم کا بوجھ پڑا ہوا ہے۔

آسمان کی نیلگوں وسعتوں پر ننھے ننھے ستاروں کا کارواں 'خاموش 'دم بخود 'رکا ہوا۔ چاند کی سیمیں کشتی ایک بڑے سے سیاہ بادل کے طلسماتی غار میں آہستہ آہستہ غائب ہوتی ہوئی۔ ابرپارے مبہوت و ششدر۔ ہوا حیرت زدہ 'رک رک کر چلتی ہوئی۔ فضاؤں میں ہر ایک طرف طلسم کے دھندلکے' زمین پر ہر طرف سحرزا سائے اور اس طلسم سحر کی دنیا میں سحرانگیزیوں کی اس دنیا میں ایک پراسرار حسینہ سایوں میں چھپتی سائے بکھیرتی 'ایک سائے کی طرح رواں دواں۔۔!

یکایک ایک پودے کے قریب ایک سوکھی ٹہنی کو جنبش ہوئی 'میرا سانس رک گیا اور قدم رک گئے۔ خیالات کی رو رک گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر حمری کھڑا تھا۔

حمری دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے وہاں پہنچنا چاہا۔ ابھی دو ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ حمری غائب ہو گیا۔!

"حمری یہاں اس ویران قلعے میں! میں نے خواب تو نہیں دیکھا؟ میری آنکھوں نے دھوکا تو نہیں کھایا؟ نہیں میں عالم بیداری میں ہوں!" پھر۔۔؟ میں ادھر ادھر پھرنے لگا اور جب واپس آیا تو وہاں بربط کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ میں وہیں سو رہا۔ یہاں تک کہ قلعے کے مینار کے عقب سے سورج طلوع ہوا اور میں قلعے سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۶)

دوسرے دن جب مغربی آسمان ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی سے لالہ فام ہو گیا۔ میں گھر سے نکل کر سب سے پہلے قلعے کے پاس کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا اور ممدی کا انتظار کرنے لگا۔ وہاں امید و بیم کی حالت میں دیر تک بیٹھا رہا اور جب مایوس ہو گیا تو اسی پراسرار راستے سے قلعے کے اندر داخل ہوا۔ آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ابھی کوئی خلاف معمول واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ سینے میں دھڑکتا ہوا دل اور آنکھوں میں ایک دنیائے شوق و بے قراری لئے ہوئے میں قلعے کے اندر پہنچا۔

وہی طلسماتی دنیا تھی' وہی سحر آلود سائے اور پھر وہی میرا جذبہ تجسس' درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں اسی جگہ پہنچا۔ جہاں گذشتہ رات گذاری تھی اور پودے کے قریب بیٹھ کر آواز کا انتظار کرنے لگا۔ یکایک کسی کنج سے ایک شیریں و دل آویز نغمہ نکل کر فضا میں تھرتھرایا۔ میں آہستہ آہستہ سانس روکے اٹھا اور اسی کنج کی طرف جانے لگا۔ آخر ایک سائے کی طرح وہاں پہنچا۔ وہاں میری نظروں نے جو منظر دیکھا وہ میں تادم واپسیں بھی نہیں بھلا سکتا۔ ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ بیٹھی بربط پر گا رہی تھی۔ میں پودے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دوشیزہ کے سنہری بالوں کی لٹیں شعلہ رنگ رخساروں پر یوں بکھری پڑی تھیں۔ جیسے شفق کے سینے پر طلائی کرنیں تیر رہی ہیں۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور نہایت حسین تھیں اور ان پر بھویں یوں چھائی ہوئی تھیں گویا دریا کی سطح پر فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کی ایک لمبی قطار کا سایہ لرز رہا ہے۔ اس کی پتلی پتلی نورافگن انگلیاں بربط کے تاروں پر جنبش کر رہی تھیں۔ مجھ پر ایک نیم بے ہوشانہ کیفیت سی چھا گئی۔ ایک ناقابل تجزیہ نشہ میرے دل و دماغ کو محیط ہو گیا۔

وہ پراسرار حسینہ چاند کا ایک خواب جمیل تھی۔ پھولوں کے ذہن کا تصور حسین تھی اور پھر موسیقی کی روح سے نکلا ہوا ایک نغمہ رنگین تھی۔ میں بے اختیار ہو کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور ایک ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکل کر فضا میں تھرتھرائی!

"ڈرو نہیں" ---- میں نے کہا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ بربط گھاس پر گر پڑی۔

"ڈرو نہیں" ---- تمہیں ڈرنا نہیں چاہئے۔ میں تمہاری تلاش میں اتنا عرصہ سرگرداں رہا ہوں!" میں نے جلدی جلدی کہا۔

وہ اور پیچھے ہٹ گئی۔ "مجھے جانے دو ----" یہ کہتے ہوئے اس کی سہمی ہوئی آنکھیں نم آلود ہو گئیں' میں کھڑا رہا' اور وہ وحشی ہرنی کی طرح بھاگ کر نظروں سے غائب ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اسے ڈھونڈا' مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آئی

آخر تھک کر بربط کو اپنے سینے سے لگا کر میں لیٹ گیا۔ نیند تو نہ آ سکی لیکن خوشگوار تصورات' نکہت کی موجوں کی طرح میرے دل و دماغ پر چھائے رہے۔

اس واقعے کے بعد میں نے مسلسل کئی راتیں ویران قلعے میں گذاریں' مگر اس دوران میں قلعے کی ساحرہ کی جھلک تک بھی نہ دیکھ سکا۔ سوچتا تھا کہ نسوانی فطرت اتنی سنگدل ہوتی ہے یا یہ میری قسمت ہے کہ جس عورت کو بے تابانہ چاہوں وہی مجھ سے دور بھاگے' مجھ سے شدید نفرت کرے' پھر خیال آتا' ممکن ہے' یہ سب کچھ تخیل کی کرشمہ سازی ہو ---- اس سنسان اور ویران قلعے میں کوئی حسینہ نہ ہو اور میرے تخیل کی عجوبہ طرازیوں نے ایک دوشیزہ کا مرمریں پیکر اختیار کر لیا ہو' یا پھر دل میں کہتا۔ یہ جھلکیاں دکھانے والی -- جھلکیاں دکھا دکھا کر دل کو بے تاب کرنے والی کوئی "بدروح" نہ ہو جو مجھے ستا ستا کر اپنے لئے سامان مسرت پیدا کر رہی ہے۔

(۷)

ایک شام جب کہ چاند پوری تابانی کے ساتھ فضائے آسمانی پر چمک رہا تھا میں ایک گوشے میں اپنے خیالات میں غلطیاں و پیچاں بیٹھا تھا کہ اتنے میں ترنم کی لہر سامنے کے پودے کی پیشانی سے بلند ہوئی۔ میں تیزی سے وہاں پہنچا۔ وہی پر اسرار حسینہ وہاں بیٹھی بربط پر گا رہی تھی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی نازک کلائی پکڑ لی۔ کلائی پکڑتے ہی اس کے رخسار زرد پڑ گئے۔ وہ بمشکل بولی۔

"مجھے چھوڑ دو۔۔!"

"بھاگو گی تو نہیں۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ مجھے چھوڑ دو!" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"یاد ہے' پہلے تم بھاگ گئی تھیں۔ اس لئے۔۔۔۔!"

"مجھے چھوڑ دو' کلائی میں درد ہو رہا ہے۔ اوہ۔"

"اوہ کیا؟"

"میں جانا چاہتی ہوں۔!"

"اس کا مطلب ہے جونہی میں نے تمہیں چھوڑا' تم بھاگ جاؤ گی۔!"

"ہاں!" اس نے بے ساختہ کہا۔

"ابھی تو تم نے کہا تھا۔ میں بھاگوں گی نہیں۔ اب کہہ رہی ہو بھاگ جاؤں گی!"

"مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں؟"

"تم مرد جو ہوئے اور دادا جان کہتے ہیں' مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ عورتوں کو قتل کر دیتے ہیں۔" یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کے رخسار پیلے پڑ گئے!

"حمری نے یہ کہا ہے؟"

"نہیں! دادا جان نے!"

"تمہارے دادا جان کون ہیں؟"

"دادا جان۔۔؟ وہی جو میرے دادا جان ہیں۔"

قلعے کی اس بھولی بھالی دوشیزہ نے محبت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا "لو اب بھاگ جاؤ!"

حسینہ چند قدم چلی' پھر ٹھہر گئی۔ اور بربط کے تاروں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

"تم ظالم تو نہیں ہو نا!" اس نے مترنم آواز میں کہا۔

"میں تو ظلم کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" میں نے اس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"مگر دادا جان کہتے ہیں' ہر ایک مرد ظالم ہوتا ہے۔"

"تو پھر کیا تمہارے دادا جان مرد نہیں۔۔۔ ان سے کیوں نہیں بھاگتیں؟"

وہ چند لمحے خاموش رہی' پھر پودے کی ٹہنی ہلا کر کہنے لگی۔ "وہ ہرگز ظالم نہیں۔ وہ تو بڑے اچھے دادا جان ہیں!"

"تو پھر سمجھ لو میں بھی بڑا اچھا ہوں!"

"اگر تم بڑے اچھے ہو تو میں تم سے ضرور ملا کروں گی!"
"تمہارا نام کیا ہے۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔
"شاہینہ!"
"شاہینہ' بہت اچھا نام ہے۔ میرا نام پوچھو گی؟"
"نہیں! تم خود اپنا نام بتاؤ!"
"میں خود بتاؤں۔؟" میں نے قہقہہ لگایا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔
"میرا نام شباب ہے۔"
"شباب بڑا اچھا نام ہے۔"
"کھڑی کیوں ہو' بیٹھ جاؤ۔" میں نے اس کی کلائی پکڑ کر کہا۔
"اوہ! میری کلائی نہ پکڑو۔ تمہارے ہاتھ لوہے کے ہیں۔" اس نے کہا۔
"تم خواہ مخواہ ڈرتی ہو۔۔ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں کتنا عرصہ تمہاری تلاش میں سرگرداں رہا تو تم شاید بہت غمگین ہو جاؤ!"
"یہاں آئے کیوں تم؟"
"تمہاری تلاش میں۔۔ شاہینہ!"
"میری تلاش میں تم یہاں کیوں آئے۔؟" اس نے پوچھا۔
"کیونکہ میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ تم سے ہر وقت باتیں کرنا چاہتا تھا۔"
"مگر میں ہر وقت باتیں نہیں کر سکتی۔ دادا جان تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔"
"تم دادا جان سے یہ نہ کہنا کہ شباب یہاں آگیا ہے۔ سمجھ لیا نا شاہینہ! ورنہ دادا جان تم سے ناراض ہو جائیں گے!"
"میں نہیں کہوں گی دادا جان سے اور اب میں جاتی ہوں۔ دادا جان یہاں نہ آجائیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور پودے کے پیچھے غائب ہو گئی!

میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا۔ پھر قلعے سے نکل آیا۔

(۸)

جب دل کہیں اور ہو تو ایک لمحہ بھی قیامت کی گھڑی بن جاتا ہے اور مجھے تو جدائی کا پہاڑ سا دن گذارنا تھا۔
انتہائی بے چینی و بے تابی کے ساتھ طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک انتظار کی گھڑیاں گنتا رہا اور جب شام ہوئی تو بے تابی سے قلعے کی طرف روانہ ہو گیا اور اندر پہنچ کر اسی محبوب کنج میں اپنی محبوبہ دلنواز کا انتظار کرنے لگا۔
ماہ چار دہم کے بلوریں سینے سے نور کے دریا بہہ رہے تھے۔ ہر طرف چاندنی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے دل کی ملکہ نغمے اور خوشبوئیں برساتی اور خوشبوؤں کی سیڑھیوں سے اترتی میری طرف آرہی ہے۔ جب کافی وقت گذر گیا تو میں نے کنج سے نکل کر ادھر ادھر دیکھا کچھ دور وہ معصوم فطرت دوشیزہ سہمی سہمی سی گھبرائی سی منہ میں انگلی ڈالے کھڑی تھی۔
میں نے اسے بلایا' مگر وہ وہیں سنگ مرمر کی ایک مورتی بنی ہوئی کھڑی رہی۔
میں نے دوبارہ آواز دی۔ "آجاؤ شاہینہ!"

اس نے اپنے ریشمیں بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ دو قدم آگے چلی اور پھر رک گئی۔ میں اس کے پاس پہنچا۔
"کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں مگر تمہیں پرواہ ہی نہیں۔" میں نے کہا۔
"میں تو وہاں کھڑی تھی!"
"وہاں کھڑی تھیں، کب سے؟"
"بڑی دیر سے۔۔ شاید اس وقت تم یہاں نہیں تھے!"
"تو تم یہاں کیوں نہ آگئیں۔؟"
"اس نے مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
"تم آج بھی آگئے، کل بھی آئے تھے اور شاید پہلے بھی آتے رہے ہو"
"تم میرے آنے پر خوش نہیں؟"
"میں۔۔ مگر دادا جان۔۔۔ وہ دن بھر مجھے بتاتے رہے ہیں کہ نوجوان مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کئی قصے سنائے!"
"تم نے میری آمد کے متعلق دادا جان کو بتا دیا۔؟" میں نے مضطربانہ پوچھا۔
"وہ مسکرائی۔" میں نے کہا تو نہیں۔ مگر!"
"تم نے کہا نہیں تو پھر کوئی ڈر نہیں!"
"تو تم آئندہ بھی آیا کرو گے۔؟"
"کیوں نہیں۔۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ہر وقت یہیں رہوں۔!"
"اوہ! ایسا نہ کرنا۔ دادا جان دن کے وقت یہاں ہوتے ہیں۔ مگر تم کیوں یہاں آنا چاہتے ہو؟"
"کیونکہ جب کسی سے محبت ہو جائے تو دل کی یہی آرزو ہوتی ہے!"
"تمہیں کس سے محبت ہو گئی ہے؟"
"تم سے۔۔!"
"مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ اوہ!" وہ مسکرائی۔ "لیکن دادا جان جتنی محبت تم کبھی بھی مجھ سے نہیں کر سکو گے!"
میں اس کے معصومانہ چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔
"مجھے یوں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو۔ یہ بات ٹھیک نہیں۔ میں چلی جاؤں گی اور پھر اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلوں گی!"
"تم ناراض ہو گئیں۔؟ مجھے اس کا افسوس ہے مگر مجھے بتاؤ۔ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟"
"ہاں۔!" اس نے کہا۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔
"کتنی؟" میں نے پوچھا۔
"یہ تو میں نہیں جانتی۔ شاید اتنی محبت ہے، جتنی مجھے اپنی بربط سے ہے!"
یہ کہہ کر اس نے بربط کو سینے لگا لیا۔ بربط کے سر پر مور کی چونچ اس کے لعلیں لبوں کو مس کرنے لگی۔
"یہ تو کچھ بھی نہیں۔!"
"کچھ بھی نہیں۔؟" تو پھر تم بتاؤ تم سے کتنی محبت کروں، لیکن یاد رکھو، میں تم سے ہرگز اتنی محبت نہیں کر سکتی، جتنی اپنے پیارے دادا جان سے کرتی ہوں۔
"وہ محبت اس بوڑھے کے لئے رہنے دو!" میں نے ہنس کر کہا۔

وہ خاموش ہو گئی ۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی:

"پھر ۔۔!"

"پھر ۔۔ آہستہ آہستہ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا ۔"

وہ کچھ مضطرب سی ہو گئی ۔

"شاہینہ!" میں نے اسے مخاطب کیا ۔ "بولتی کیوں نہیں؟"

"ہاں! کہو!!"

"خفا ہو گئیں کیا؟"

"نہیں ۔۔ بالکل نہیں!"

یہ کہہ کر اس نے بربط کے تاروں پر انگلیاں پھیریں اور پھر بربط میری گود میں رکھ دی ۔ میں بربط بجانے لگا اور وہ مسرت انگیز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی ۔ نصف رات تک ہم بربط بجاتے رہے اور باتیں کرتے رہے ۔ آخر گھبرا کر دادا جان کے خیال سے مضطرب ہو کر وہ چلی گئی اور میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

(۹)

اس کے بعد میں خود کو نئی دنیا میں محسوس کرنے لگا ۔ میرے افسردہ ، پژمردہ دن ، محبت کے حسین اور نکہتوں میں لپٹے ہوئے تصورات سے رنگین و معطر ہو گئے اور میری مایوس و مضمحل راتیں قلعے کی ساحرۂ جمیل کے یاسمین جلووں سے پرنور خنداں ۔ اس سے پیشتر میں خود کو دنیا کا بدنصیب ترین شخص سمجھتا تھا ۔ مگر اب اپنی خوش قسمتی کو نقطۂ کمال پر تصور کرنے لگا ۔ میری تمام کائنات سمٹ سمٹا کر قلعے کی چار دیواری میں محدود ہو گئی اور میرے خیالات ہر چیز سے ہٹ کر صرف شاہینہ کے گرد گھومنے لگے ۔ رات کو میں مسرتوں میں ڈوبا رہتا اور دن کو ان مسرتوں کے خیالات میں غرق آہ! یہ زندگی کیسی عجیب زندگی تھی ۔ خوابوں کی رنگینیوں میں تیرتی ہوئی ۔ نکہتوں کے گہوارے میں جھولتی ہوئی اور مسرتوں کی لہروں میں بہتی ہوئی خوش نصیب زندگی! اب بھی اس خوشگوار و دل آویز زندگی کا خیال کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔

"میں ہر رات قلعے میں جا کر ، مخصوص تالاب کے کنارے بیٹھ کر اپنی معصوم صورت و معصوم فطرت محبوبہ کا انتظار کرتا ۔ وہ مسکراتی ہوئی خراماں خراماں آتی ۔ ہم دونوں شیریں و فرحت زا گیت گاتے ۔ تالابوں کے کنارے ٹہلتے ، ایک دوسرے کو چھیڑتے اور میٹھی میٹھی پیاری پیاری باتیں کرتے ۔ اسی طرح رات گذر جاتی اور جب سورج کی پہلی کرن میرے لئے رخصت کا پیغام لاتی تو اپنی محبوبہ جاں نواز سے اجازت حاصل کر کے قلعے سے باہر نکل آتا دن پر دن ، ہفتوں پر ہفتے گذرنے لگے ۔ اگرچہ میں ہر رات کو اپنی شیریں ادا محبوبہ کے پاس رہتا لیکن میرے انتہائی خواہش یہ تھی کہ دن کے وقت بھی وہیں رہوں مگر اس میں ایک بہت بڑا خطرہ تھا ۔ دن کے وقت حمدی شاہینہ کو عموماً اپنے سامنے رکھتا اور اس صورت میں اس سے ملاقات کا ذریعہ کیونکر پیدا ہو سکتا تھا؟ رات کو تو وہ بے فکر ہو کر سو رہتا اور شاہینہ کو کمرے سے باہر نکلنے کا موقعہ مل جاتا!

شاہینہ کو جو کچھ معلوم تھا ۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا ۔ لیکن ابھی تک دو باتیں قطعی طور پر میرے لئے ایک معما تھیں ۔ پہلی بات تو یہ کہ میں نہیں جانتا تھا کہ شاہینہ کون ہے اور حمدی اس کا حقیقی دادا ہے یا وہ اسے ویسے ہی دادا کہتی ہے ۔ دوسری بات یہ کہ حمدی نے شاہینہ کو اس ویران قلعے میں بند کر کے اسے مردوں سے کیوں اس درجہ بدظن کر دیا ہے؟ میں ان دونوں باتوں پر بہتیرا غور کرتا مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا ۔ اگرچہ

حمدی کو ہماری ملاقات کا علم نہ تھا مگر یہ بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی؟ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ایک رات میں شاہینہ کے زانو پر سر رکھے اس کے سنہری لٹوں سے کھیل رہا تھا کہ حمدی ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ بدن فرط غصہ سے کانپ رہا تھا۔ شاہینہ کانپتی ہوئی' لرزتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔!

"شباب!" حمدی نے غضبناک آواز میں کہا۔

میں خاموش رہا۔ شاہینہ نے حمدی کا ہاتھ پکڑ لیا' اور کہنے لگی۔

"دادا جان! یہ ان مردوں میں سے نہیں ہے جو۔۔۔"

حمدی نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور اگر میں اسے جلدی سے نہ تھامتا تو وہ یقیناً گر پڑتی۔

"بابا غصے کو قابو میں کیجئے!" میں نے کہا۔

"یہ الفاظ کہتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ کمینے انسان! میں اس معصومہ کو تم ظالموں کے سائے سے بچاتا رہا ہوں' مگر آج تم نے میری تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا" یہ کہتے ہوئے حمدی کی رگیں ابھر آئیں۔ آواز زیادہ غضبناک ہو گئی۔ "تم نے یہاں آنے کی جرات کیوں کی' تمہارا یہاں کیا کام تھا۔۔۔؟ تم اس لئے یہاں آئے کہ ایک معصوم فطرت دوشیزہ کو تباہ کر دو۔ ایک بوڑھے کے خون دل سے ہاتھ رنگو۔۔؟"

"بابا سوچ سمجھ کر بات کہئے! آپ خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں!" میں نے قدرے خفگی سے کہا۔

"یہ الزام ہے۔۔ ظالم کمینے۔۔ کیا میں تمہیں اچھی طرح نہیں جانتا۔ تمہارے دل کی ایک ایک بات سے واقف نہیں؟"

شاہینہ ایک طرف کھڑی تھی۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر حمدی کا ہاتھ پکڑ لیا اور عاجزانہ لہجے میں کہنے لگی۔

"دادا جان! چلئے میرے ساتھ۔۔ چلئے نا دادا جان!"

حمدی کہے جا رہا تھا۔ "میں بوڑھا ہوں' مگر یاد رکھو جب تک میرے کمزور و ناتواں جسم میں جان باقی ہے' تم اپنے ذلیل مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میں اپنے بوڑھے اور کمزور ہاتھوں سے طاقتور گردن کو مروڑنا جانتا ہوں۔ جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے دکھے ہوئے دل کی بددعاؤں سے ڈرو۔ اس مظلوم و بے کس کی آہوں سے ڈرو قدرت کے خوفناک انتقام سے ڈرو۔ جاؤ دور ہو جاؤ۔۔!"

"دادا جان چلئے میرے ساتھ دادا جان!"

"ابھی تک کھڑے ہو تم۔۔ مردار کتے!" حمدی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

شاہینہ نے حسرتناک نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور غمگین و حسرت ناک لہجے میں کہا۔ "جاؤ تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہئے۔"

میں مڑ کر چلنے لگا۔

"خبردار آئندہ یہاں نہ آیا۔۔!" حمدی نے غضبناک لہجے میں کہا۔

میں نے مڑ کر شاہینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

میں قلعے سے نکلا۔ یہ محسوس کرتے ہوئے نکلا کہ اپنی روشن' معطر اور رنگین دنیا کو چھوڑ کر ایک نہایت تاریک' بھیانک اور متعفن غار کی گہرائیوں میں اتر رہا ہوں۔ ایک گھنٹہ پیشتر میں انتہائی مسرور انسان تھا۔ میری قسمت کا ستارہ انتہائی بلندی پر چمک رہا تھا مگر اب وقت کے ایک حقیر ترین لمحے کے گزر جانے پر' میرے تمام روشن امیدیں' رنگین تمنائیں اور خوشگوار توقعات خاک میں مل چکی تھیں۔ آہ! مسرتوں کے زینے طے کرتے ہوئے' ثریا کی بلندیوں تک جا پہنچا اور پھر پامال و مجروح ہو کر تحت الثریٰ کی پستیوں پر آ کر گرا۔ کتنا ہمت شکن' کتنا روح فرسا انقلاب ہے!

حمدی کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی میری نگاہوں کے سامنے شاہینہ کا مرجھایا ہوا چہرہ بھی پھر رہا تھا۔ ہر قدم پر رک رک کر میں قلعے کی طرف دیکھتا تھا۔ ہر لمحہ میرے ذہن میں اپنی بدقسمتی کا احساس زیادہ تلخ ہو جاتا تھا۔

میں اسی کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چند لمحے ہی گذرے تھے کہ میرے دل میں سیلاب اشک موجزن ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور کافی دیر تک بہتے رہے۔ اس وقت مجھے کائنات کی ہر چیز روتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ درخت سسکیاں بھر رہے تھے۔ ہوا رو رہی تھی اور مایوس 'افسردہ چاند' ایک سیاہ مہیب بادل کی طرف رینگتے ہوئے اس طرح جا رہا تھا' جس طرح ایک بدنصیب محب' محبت کے زخموں سے نڈھال۔ ابنائے روزگار کے حملوں سے پامال' سینے پر داغ تمنا لئے ہوئے' موت کے اندھیرے غار کی طرف جا رہا ہو!

اسی درخت کے نیچے حمدی پدرانہ شفقت کے ساتھ میرے ٹوٹے ہوئے دل کو سہارا دیا کرتا تھا اور اب اسی درخت کے نیچے میں اس کے بے رحمانہ سلوک کو یاد کر رہا تھا۔ شاہینہ کہا کرتی تھی کہ جس دن دادا جان کو ہماری ملاقاتوں کا علم ہو گیا اسی دن وہ سخت ناراض ہو جائیں گے اور ممکن ہے تمہیں یہاں آنے سے روک دیں۔ مگر مجھے حمدی سے سنگدلانہ سلوک کی توقع نہ تھی۔

اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں آتے رہے۔ میں آنسو بہاتا رہا۔ آخر اشک ریزی ختم ہوئی۔ شاید میرے آنسو ختم ہو گئے تھے ورنہ دل تو اب بھی رونے کے لئے بے تاب تھا۔ میں نے قلعے پر حسرت آگیں نگاہ ڈالی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دن انتہائی بیقراری کے عالم میں گذرا۔ جب شام ہوئی اور طاق مغرب پر چراغ خورشید کا شعلہ تاریکیوں کے ہجوم میں سسکیاں لینے لگا تو میرے قدم خود بخود قلعے کی طرف اٹھنے لگے۔ قلعے کے پاس پہنچ کر کچھ دیر تک کھڑا رہا پھر قلعے کے اندر چلا۔ دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا اور اس کی دھڑکن برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک مجھے افسوس ہوا کہ میں بہت آگے نکل آیا ہوں۔ میں مڑا اور اسی جگہ پہنچا جہاں اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ مگر یہ دیکھ کر میرا دل مایوسی میں ڈوب گیا کہ یہ راستہ بند ہو چکا ہے۔ میرے ہاتھ کسی چیز سے مس کر رہے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ سیڑھیوں کے بعد جو آہنی دروازہ ہے جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا' بند ہو چکا ہے۔ کافی دیر تک میں وہیں کھڑا رہا۔ حیران و سراسیمہ کھڑا رہا پھر باہر نکل آیا۔ میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ تھی اور یہ انتہائی مایوسی انتقام کی آگ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس وقت اگر حمدی میرے قریب ہوتا تو یقیناً اس کی گردن مروڑ ڈالتا۔ میں پچھتانے لگا کہ کیوں شب گذشتہ قلعے سے باہر نکل آیا۔ کیوں نہ اسے ہلاک کر ڈالا۔

تمام رات میں قلعے کے اردگرد چکر لگاتا رہا کہ شاید اندر جانے کا کوئی راستہ مل جائے مگر میری کوششیں رائیگاں گئیں۔ آخر بالکل مایوس ہو کر میں گھر پہنچا۔ میرے دل میں ایک طرف امیدوں کی خاک بکھری ہوئی تھی اور دوسری طرف انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ دوسری رات بھی میں نے قلعے کے اردگرد چکر لگا کر گذار دی۔ اسی طرح کئی راتیں گذر گئیں ایک شام کو جب کہ میرا دل و دماغ غم و غصہ کی آگ میں جل رہا تھا۔ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ حمدی میرے سامنے کھڑا تھا۔ جی میں آئی کمبخت کو مار ڈالوں مگر اس کی مایوس آنکھوں کو دیکھ کر میرا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ حمدی چند لمحے گھور کر مجھے دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ "میرے ساتھ آؤ" یہ کہہ کر وہ راستے کی طرف چلنے لگا جو قلعے کے اندر جاتا تھا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم قلعے کے اندر تھے حمدی بیٹھ گیا اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں جب بیٹھ چکا تو وہ نرم اور محبت انگیز لہجے میں کہنے لگا۔

"جانتے ہو' میں تمہیں کیوں یہاں لایا ہوں؟"

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔

تو سنو! سب سے پہلے تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ قلعے کے اندر داخل ہو کر اور ایک معصوم فطرت دوشیزہ پر ڈورے ڈال کر تم نے سخت ظلم کیا ہے۔ کاش تمہیں اندر آنے کا راستہ نہ معلوم ہوتا۔ اپنی طرف سے تو میں نے کوئی کمی نہ کی مگر جو نہ ہونا تھا۔ وہ ہو کر ہی رہا۔"

وہ رک گیا' غمناک لہجے میں کہنے لگا۔ "شاہینہ کا معصوم دل دنیا کے حالات کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ زہر ہلاہل کو شہد سمجھ رہی ہے۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا!" میں نے پہلی دفعہ پرجوش لہجے میں کہا۔

"میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں بیٹا! محبت دنیا کا خوفناک ترین مرض ہے۔ اس ظالم مرض نے صولت و یاسمین کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اسی مرض سے بچانے کے لئے میں نے اپنی شاہینہ کو اس ویران قلعے میں بند کر رکھا تھا۔ مگر بدقسمت شاہینہ اس مرض میں مبتلا ہو ہی گئی۔"

"بابا تم میرے دل کا حال نہیں جانتے۔ کاش میں اپنے زخموں سے بھرے ہوئے سینے کو تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کر سکتا۔!"

"تمہیں واقعی شاہینہ سے محبت ہے؟" حمدی نے پوچھا۔

"بہ دل و جان۔"

"اس کا ثبوت؟"

"میرا دل راکھ ہو چکا ہے۔"

"کیا اس کے لئے قربانی کرو گے؟"

"میں اس کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار ہوں!"

"مگر یہاں قربانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ سلمیٰ!"

"سلمیٰ ـــ سلمیٰ کو میں بھلا چکا ہوں! وہ ایک حماقت ہے ـــ!"

"تو کل تم شاہینہ کو بھی بھلا دو گے' ایک اور حماقت سمجھ کر!"

"نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔! تادم واپسیں نہیں ہو سکتا۔! میں مرتے دم تک شاہینہ سے محبت کرتا رہوں گا۔! اس کا آپ کو یقین دلاتا ہوں!"

"تو شاہینہ کے لئے قربانی کرو گے؟" حمدی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

ہر وقت۔!"

"اگر تم قربانی کے لئے تیار ہو تو سمجھ لو کہ آج سے تمہیں یہیں رہنا ہو گا۔!"

"میری یہ انتہائی خواہش ہے۔ سب سے بڑی تمنا ہے!"

"تو آج سے تم یہیں رہو گے۔ قلعے میں سب کچھ ہے۔ تمہیں کسی چیز کی عدم موجودگی محسوس نہیں ہو گی اور اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو! شاہینہ کی آہ و زاری سے مجبور ہو کر میں تمہیں یہاں رہنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ اگر میں نے دیکھا کہ تمہاری محبت میں کمی آگئی ہے اور تم میری بچی کو دھوکا دے رہے ہو تو تمہارے اور اس کے درمیان سنگین دیوار کھڑی ہو جائے گی۔ تم ہمیشہ کے لئے اسے کھو دو گے۔ دنیا کی کوئی طاقت میرا ارادہ بدل نہیں سکتی۔ سن لیا تم نے' میں کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ شاہینہ کو دھوکا دیا جائے۔ یہ کہتے ہوئے حمدی کی آنکھوں سے آگ سی برسنے لگی۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں بابا' میں مرتے دم تک شاہینہ سے اسی بیتابی کے ساتھ محبت کرتا رہوں گا!"

تمہارے الفاظ مجھے یقین دلانے سے قاصر ہیں۔ خیر میں تم پر اعتبار کرتا ہوں اب سنو! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ شاہینہ کون ہے؟"

میں نے حمدی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس قسم کی چمک تھی جو سمندر کی سطح پر سورج کے غروب ہونے کے بعد بھی رہتی ہے۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ صولت اور یاسمین اسی قلعے میں رہتے تھے اور میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ قید خانے کی سنگین دیواریں انہیں جدا نہ کر سکیں۔ وہ آپس میں ملتے رہے ایک سال کے بعد ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ یہ بچی ابھی شیر خوار ہی تھی کہ اس کے والدین قتل کر دیئے گئے پھر بچی اسی غلام کے ہاں پرورش پانے لگی۔ جو ان شہیدان محبت کو کھانا پہنچایا کرتا تھا اور ان کا ہمراز تھا۔ آج وہ بچی شاہینہ ہے' اور وہ غلام صفدر' یہ بوڑھا حمدی ـــ!"

میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں!

"شاہینہ یاسمین کی بچی ہے؟" میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

"ہاں یہ اسی شمیدہ محبت کی یادگار ہے!"

"تو یہ زندہ کیونکر رہی؟"

"بچی اپنی ماں کی کوٹھڑی میں تھی اس لئے جلادوں کے پنجے سے بچ گئی۔ میں نے بچی کو اٹھا لیا۔ اس کے بعد میرے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ محبت دنیا کی سب سے بڑی بیماری ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے یہاں چھپائے رکھا ہے۔ اسے اپنے والدین کی کوئی خبر نہیں۔!"

میں نے حمدی کو اپنی محبت کا یقین دلایا اور انتہائی وفاداری کا وعدہ کیا۔ چند لمحوں کے بعد میں شاہینہ کے پہلو میں بیٹھا تھا۔

میں پھر قلعے میں رہنے لگا۔ اب میری زندگی اس قدر مسرور' اس درجہ مطمئن تھی کہ مایوسی و اضطراب کا ہلکا سا سایہ بھی میرے دل و دماغ کے قریب نہیں پھٹک سکتا تھا۔ شاہینہ کی خوبصورت آنکھیں دو چاند تھے' جن کی عطر آگیں روشنی میں میرے دل کی دنیا ہر وقت جگمگاتی رہتی اور ہر روز علی الصبح جب قلعے کے مشرقی کمر میں ملفوف مینار سے پرے' بلند درختوں کے اوپر خورشید کے پیکر نوریں سے روشنی کی ندیاں بہنے لگتیں۔ میں محسوس کرتا کہ میری یہ دنیا زیادہ روشن' زیادہ شاداب ہو گئی ہے اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ اب کوئی غم' کسی چیز کی فکر مجھے غمگین و ملول نہ بنا سکتی تھی۔

دن گذرتے جا رہے تھے۔ ہر لمحہ میری مسرتوں میں اضافہ کرتا جاتا تھا اور اسی طرح کئی مہینے گذر گئے۔ یکایک میں کچھ تھکاوٹ سی محسوس کرنے لگا؟ میرے اور شاہینہ کے درمیان محبت قائم تھی۔ وہ میری تمام مسرتوں کا سرچشمہ تھی اور اس کی تمام خوشیوں کا مرکز میں۔ پھر بھی ایک تھکاوٹ سی' ایک اضمحلال سا' ایک افسردگی سی میں اپنے دل و دماغ میں محسوس کرنے لگا۔ تغیر انسانی زندگی کا خاصا ہے اور شاید میری زندگی بھی کسی تغیر کی متمنی تھی۔ ایک دن میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ کچھ دیر کے لئے باہر سیر کر آیا کروں؟ اس خیال کا اظہار میں نے شاہینہ کے سامنے کیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی۔ "کیا مجھ سے اکتا گئے ہو؟"

یہ سن کر میرے دل پر برچھی سی لگی۔ "کتنا بے ہودہ خیال' نہ معلوم کبھی تم اتنی مایوس و یاس پرست کیوں ہو جاتی ہو؟ زندگی یہیں گذر رہی ہے۔ اس کے برعکس میں شہر میں پیدا ہوا' شہر میں رہا!"

"یہ درست ہے' تاہم میں ڈرتی ہوں' شہروں میں ہزاروں دلچسپیاں ہوتی ہیں۔"

"پاگل لڑکی! میں ہزاروں دلچسپیاں چھوڑ کر یہاں آگیا ہوں۔"

"اب مجھے ڈر ہے' تم مجھے چھوڑ کر ان ہزاروں دلچسپیوں کی طرف نہ چلے جاؤ!"

"ایسا کبھی نہ ہو گا۔" میں نے کہا۔ کافی دیر کی گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ رات کے وقت کچھ دیر کے لئے میں قلعے سے باہر جایا کروں اور چونکہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ حمدی اس کی اجازت نہیں دے گا۔ اس لئے اس سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔

میں قلعے سے نکل جاتا اور شاہینہ مغربی مینار کے قریب کھڑے ہو کر مجھے دیکھتی رہتی۔ مغربی مینار کے بائیں طرف قلعے کی دیوار کا کچھ حصہ گر پڑا تھا' اس لئے وہاں کھڑے ہو کر انسان دور دور تک بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔

ایک دن خلاف معمول میری طبیعت دن بھر متعفن رہی۔ میں شاہینہ سے اجازت لے کر قلعے سے باہر نکل گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس رات "میرؔ کا میلہ" ہے اس لئے میں یہ سوچ کر کہ وہاں سے شاہینہ کے لئے چند چیزیں خرید لوں گا۔ "تفریح باغ" کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں باغ میں پہنچا اور اپنے آپ کو اپنے آشناؤں اور عزیزوں کی نظروں سے بچا کر چیزیں خریدنے لگا۔ اسی دوران میں میں باغ کے آخری حصے میں پہنچ گیا۔ کچھ لوگ سو رہے تھے۔ کچھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میں واپس آنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ میرے سامنے دو سیاہ آنکھیں چمکنے لگیں۔ میں رک گیا۔ میرے سامنے سلمیٰ کھڑی گھور گھور کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور تیزی سے چلنے لگا۔ ایک آدھ اور چیز خریدی اور باغ سے نکل آیا۔ مگر محسوس کر رہا تھا کہ سلمیٰ میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔

اپنی محبوبہ دلنواز کی بے چینی کا خیال کر کے میں قلعے کو نزدیک ترین راستے سے جانا چاہتا تھا مگر جب یہ سوچا کہ کم بخت سلمٰی برابر میرا تعاقب کر رہی ہے تو میں نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ چند قدم طے کرنے کے بعد جب پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بدبخت عورت ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں نے منہ پھیرا اور جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا۔

قلعے کی سیڑھیوں پر پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا گویا ایک بوجھ جو میری روح کو تکلیف دے رہا تھا' اب موجود نہیں ہے۔ ایک سایہ جو میرے دل پر لرا رہا تھا۔ اب غائب ہو گیا ہے۔

اندر جا کر میں نے تمام چیزیں اپنی محبوبہ کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ اس کی بیقرار نگاہیں ایک دم مسرت سے چمک اٹھیں اور وہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگی۔

مگر نہ معلوم کیا بات تھی کہ میرا دل پھر بے چین ہو رہا تھا۔ آدھی رات گذرنے پر میں لیٹنے کو تو لیٹ گیا مگر نیند کہاں؟ ذہن میں خلش اور خیالات کا ہجوم بے قرار تھا اور میں بار بار سوچتا تھا یہ کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ سلمٰی' جس کے جور و ستم نے مجھ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا' اب میری طرف بار بار دیکھے' میرے پیچھے پھرے اور دیر تک پھرتی رہے؟ آخر اس تغیر کی وجہ کیا ہے؟ شاید وہ مجھے اپنے جال میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اس التفات کے پردے میں کوئی خطرناک چال پوشیدہ ہے۔ یہی بات ہے یقیناً یہی بات ہے! میں نے دل میں کہا۔ "لیکن میں اس کے دام تزویر میں ہرگز گرفتار نہیں ہوں گا۔ میرا دل' میرا دماغ' میری ہستی کا ذرہ ذرہ' شاہینہ اور صرف شاہینہ کے لئے وقف ہے۔ میری یہ محبوبہ جاں نواز کتنی نیک دل۔ کتنی پاکیزہ روح' کتنی معصوم فطرت لڑکی ہے!"

انہی خیالات میں رات کا بقیہ حصہ بھی گذر گیا۔ صبح صورت دیکھتے ہی شاہینہ مضطرب ہو گئی۔

"تمہاری آنکھیں اس درجہ سرخ۔ کیا بات ہے شباب؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں! میں نے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا اور اپنی ذہنی کوفت کو دور کرنے کے لئے اس سے باتیں کرنے لگا۔ شاہینہ بار بار مجھ سے میرے اضطراب کی وجہ پوچھتی رہی مگر میں اسے ہنسی مذاق میں ٹالتا رہا۔

دو دن تک میں قلعے سے باہر نہ نکل سکا۔ تیسرے دن میری طبیعت گھبرائی۔ میں شام کو قلعے سے باہر نکلا۔ پھرتے پھراتے آبادی کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں سے لوٹنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ میرے سامنے وہی بد بخت عورت آکھڑی ہوئی۔ میرے قدم رک گئے۔ دل دھڑکنے لگا۔ سلمٰی ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھنے لگی۔ چند لمحے گذر گئے۔ میں تیزی سے چلنے لگا۔ یہاں تک کہ قلعے کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا اور میں قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس رات میں نے شاہینہ کی بہت کم باتوں کا جواب دیا اور کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ مجھے خود پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ آخر میں کیوں اس بدبخت عورت سے ڈرتا ہوں۔ مجھے اس سے قطعاً محبت نہیں۔ پھر اس کی صورت دیکھ کر کیوں میرے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں؟ کیوں میری ہمت جواب دے جاتی ہے؟

میری نگاہوں کے سامنے سلمٰی کی لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے نیچے حرکت کرتی ہوئی آنکھیں پھرنے لگیں۔ میں سلمٰی کے تصورات کو ذہن سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر اس کی صورت میری نگاہوں تلے پھر رہی تھی۔

میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ صبح ہو گئی تھی۔ کہیں کہیں صاف فضا میں دھوئیں کے بادل بل پر بل کھاتے ہوئے لرا رہے تھے۔ شام کے وقت میں قلعے سے باہر نکل آیا۔ ابھی چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ سلمٰی میرے قریب آکھڑی ہوئی۔

"شباب! ذرا ٹھہرو ۔۔۔ اتنی تیزی سے کیوں چل رہے ہو؟" اس نے کہا۔

میرا دل دھڑکنے لگا' مگر میں اس کی طرف توجہ کئے بغیر چلتا گیا۔ وہ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ بولتی گئی۔ اس کی آواز میں حسرت تھی۔ اس کے لہجے میں التجا تھی اور اس کی آنکھوں میں مایوسی!

"میں تو اب تھک گئی شباب!" اور میرا ہاتھ پکڑنے لگی۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ ایک چھوٹے سے پودے پر گر پڑی اور میں تیزی

کے ساتھ چلتا گیا۔ ایک لمحہ توقف کیے بغیر چلتا گیا!

قلعے میں پہنچا تو دیکھا شاہینہ کا چہرہ اترا ہوا ہے۔ رخساروں پر جابجا آنسوؤں کے نشان ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

"آہ شباب! تم نے مجھے بڑا بے قرار کیا۔ تم کیا جانو مجھ پر کیا گذرتی رہی ہے!"

"تمہارے پہلو میں بہت نازک اور ننھا منا دل ہے۔ ذرا سی بات پر ڈر جاتی ہو" میں نے کہا۔

اس نے مجھے پرحسرت نگاہوں سے دیکھا اور میرے ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا۔ میں نے بھی اس کا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔ فضا میں ایک چکوری بے قراری سے ادھر سے ادھر' ادھر سے ادھر اڑ رہی تھی اور اس کی دردانگیز آواز ہوا میں تھرتھرا رہی تھی۔

"میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔! تم قلعے سے باہر کیوں جاتے ہو؟ آئندہ یا تو باہر نہ جایا کرو' یا پھر مجھے بھی لے جایا کرو! تم یہاں سے چلے جاتے ہو تو۔!"

"تم پاگل ہو شاہینہ! ذرا تفریح کے لئے باہر چلا جاتا ہوں!"

"باہر چلے جاتے ہو۔۔ تفریح کے لئے۔۔ تفریح۔۔ اچھا؟" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

میرا دل بے قرار ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو سینے سے لگا لیا اور میرے ذہن سے تمام کش مکش دور ہو گئی۔

چند دن کے بعد میں پھر قلعے سے نکلا۔ جب تک پھرتا رہا سلمٰی کی صورت نظر نہ آئی مگر جب قلعے کے قریب پہنچا تو میں نے اپنے قریب ایک سائے کو دیکھا۔ میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا کہ یقیناً سلمٰی نے قلعے کے اندر جانے کا پراسرار راستہ دیکھ لیا ہے۔ میں وہاں سے ہٹ گیا اور کافی دیر کے بعد قلعے کے اندر گیا لیکن جو یقین دل پر بیٹھ چکا تھا' وہ کیونکر دور ہو سکتا تھا؟

آندھی کے تیز و تند جھونکے 'گنجان درخت کو گرا سکتے ہیں۔ مگر اس درخت کی شاخ سے لپٹے ہوئے جالے کو نہیں ہٹا سکتے۔ اسی طرح میری مسلسل کوششیں سلمٰی کے تصورات کو بھی میرے ذہن سے نہ نکال سکیں ہر بار جب میں قلعے سے باہر نکلتا' وہ مجھے دکھائی دیتی۔ مجھ سے بولنے کی کوشش کرتی۔ اگرچہ میں اس کا جواب نہ دیتا۔ اس کی ذرہ بھر پرواہ نہ کرتا۔ تاہم وہ بدبخت عورت ایک ناگن بن کر میرے جسم کی نسوں میں گذرتی ہوئی دل کی انتہائی گہرائیوں میں اپنا زہر بکھیر رہی تھی۔

ایک دن اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

"ذرا سوچو تو سہی شباب! تمہاری یہ حرکت کتنی بے رحمانہ ہے۔ تم اس عورت سے بھاگ رہے ہو' جس کے نقش قدم بھی تم چومتے رہے ہو۔ میرے شباب!! اس تغیر کا سبب؟"

"مجھے تم سے کوئی واسطہ نہیں۔ بدبخت عورت!" میں نے کہا۔

"تمہیں مجھ سے کوئی واسطہ نہیں 'کوئی واسطہ نہیں۔ یہ الفاظ شباب تم کہہ رہے ہو؟"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"شاید تم میرا امتحان لینا چاہتے ہو۔ میں بھی تمہارا امتحان لیتی رہی ہوں!"

"میرا امتحان"

"میرے شباب! میں نے تمہارا امتحان لیا تھا۔ میرا دل محبت کی آگ میں جل چکا تھا۔ مگر میں تمہاری محبت کو آزمانے کے لئے تمہاری جانب دیکھتی بھی نہ تھی اور جب تم محبت کے امتحان میں پورے اترے تو یہاں سے چلے گئے۔۔ نہ معلوم کہاں؟ میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ تم آ گئے! انتظار کی کیفیت سے تو تم واقف ہو۔"

انتظار کا لفظ سن کر میں مضطرب ہو گیا۔ میں نے سلمٰی کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں اور سامنے دیکھا کچھ دور ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں

ایک نازک پودا اس طرح ہل رہا تھا' جیسے ابھی ٹوٹ جائے گا۔ میں نے قدم اٹھایا۔ سلمیٰ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"شباب! تم اتنے ظالم نہیں ہو سکتے!"

میں رک گیا۔ اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہ پچھلے واقعات دہرانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے!

"افسوس! میری کمزوری! وہ تمام منحوس رات میں نے سلمیٰ کے پہلو میں گذار دی!"

جب علی الصبح میں قلعے میں پہنچا تو شاہینہ کو مغربی مینار کے پاس کھڑے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھیں شب بیداری کے باعث سرخ تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور بال بے ترتیب و پریشان تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

"رات بھر کہاں رہے شباب؟"

"کہیں بھی نہیں۔ تم مضطرب کیوں نظر آ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"رات بھر کہاں رہے شباب؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"گھر چلا گیا تھا شاہینہ!" میں نے جواب دیا۔

"گھر چلے گئے تھے' سچ کہتے ہو؟"

"تو کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟ تمہیں میری بات پر اعتبار نہیں؟"

"شباب!" اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "تم پر اعتبار نہیں کروں گی تو دنیا میں کس پر کروں گی؟"

"تو پھر جو کچھ میں نے کہا ہے' اسے درست مانو"

"تم درست ہی کہہ رہے ہو۔ خیر چھوڑو اس بات کو!"

"شاہینہ! تم میں یہ بہت بری عادت ہے کہ تم بہت جلد بے چین ہو جاتی ہو!"

اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ دو تین لمحوں کے بعد اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور قریب ہی ایک پودے کے لرزتے ہوئے سائے کو دیکھنے لگی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی "جب تم یہاں نہیں ہوتے تو میرے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے تمہیں کیونکر بتاؤں کہ یہ رات میں نے کس بے تابی سے کاٹی ہے؟"

"اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم میری محبت کو بدگمان نگاہوں سے دیکھتی ہو!"

"نہیں یہ بات نہیں۔ مگر معلوم نہیں کیا بات ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

اپنی محبوبہ کی بے تابی دیکھ کر میرا دل پریشان ہو گیا اور اس دن میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ قلعے سے باہر نہیں نکلوں گا۔ ایک ہفتہ گذر گیا۔ میری طبیعت گھبرائی اور انتہائی بدقسمتی یہ کہ شاہینہ سے میری طبیعت اکتا گئی۔ میں قلعے سے نکلا اور دو راتیں اور دو دن سلمیٰ کے ہاں گذار دیئے۔ جس وقت واپس قلعے میں پہنچا تو حمدی نے مجھے اپنی وعدہ یاد دلایا۔ مجھے سختی کے ساتھ باہر جانے سے روکا اور منت سماجت سے کہا "شاہینہ پر رحم کرو۔" اس دن تو میرا دل موم کی طرح نرم ہو گیا مگر چند دن کے بعد یہ نرم دل پتھر بن گیا میں نے قلعے سے نکلنے کا ارادہ کیا اور شاہینہ سے اجازت مانگی۔

ہماری آخری ملاقات تھی۔ آسمان پر کالی کالی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں اور ایک گوشے میں مایوس و مضمحل' افسردہ و پژمردہ چاند یوں نظر آ رہا تھا۔ گویا کوئی فراق کے صدموں کی ماری' مجروح دل حسینہ بستر مرگ پر آخری سانس لے رہی ہے۔ شاہینہ جنون انگیز گیت گاتی رہی اور بار بار روتی رہی۔ وہ میرے ساتھ دروازے تک آئی۔ اس نے آنسو خشک کئے اور خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ہمارے قریب کھڑے ہو کر درخت کی ٹہنی سے دو پتے گرے۔ ایک تو شاہینہ کے بازو سے مس کرتا ہوا میرے پاؤں پر آ گرا اور دوسرا ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں کہیں

سے کہیں پہنچ گیا۔ میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

چار ہفتے، مسلسل چار ہفتے میں ظالم چڑیل سلمٰی کے دام فریب میں گرفتار رہا۔ وہ مجھے ہر لحاظ سے اپنی شدید محبت کا ثبوت دیتی رہی اور میں ظالم انسان، کمزور دل انسان اور پھر انتہائی بے وفا انسان اس کی باتوں میں آگیا۔ آہ! اٹھائیس دن اور اٹھائیس راتیں میں نے اس کے پہلو میں گذار دیں۔ اس کے بعد جب میرے دل کا شعلہ بھڑکا تو میں جنون انگیز عجلت کے ساتھ قلعے میں پہنچا۔ مگر اب وہاں کیا دھرا تھا۔ میں نے قلعہ کا ہر گوشہ چھان مارا لیکن نہ تو شاہینہ کہیں نظر آئی اور نہ جمری۔

دنیا میری آنکھوں تلے تاریک ہو گئی۔ دل مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔ انتہائی تلاش کے باوجود بھی مجھے ان میں سے کوئی نظر نہ آیا۔ دن کا آخری حصہ گذر رہا تھا اور میں قلعے میں وحشیوں کی طرح پھر رہا تھا۔ یکایک مغربی مینار کے پاس مجھے سفید سی چیز حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ میں "شاہینہ، شاہینہ" پکارتا ہوا اس کی طرف دوڑا وہاں پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ ایک متوحش خواب دیکھ رہا ہوں۔

میرے سامنے سلمٰی کا مسکراتا ہوا چہرہ بجلیاں سی برسا رہا تھا۔

"میرے شباب! وحشیاؤں کی طرح کیوں پھر رہے ہو؟" اس نے کہا۔

"تم۔۔ یہاں؟"

"میں یہاں کیوں نہیں آسکتی۔ آؤ میرے شباب! اس ویران قلعے سے باہر نکلیں اب ہماری محبت میں کوئی رکاوٹ نہیں!"

میرے دل میں نشتر چبھنے لگے۔

"کیا کہا تم نے؟" میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

میرے چہرے کو دیکھ کر وہ خوفزدہ سی ہو گئی اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی "میں نے کہا۔ میرے شباب! اب یہاں سے باہر نکلیں۔ دیکھتے ہو، قلعہ کتنا ویران اور سنسان ہے!"

"تم نے شاہینہ کو!"

"شاہینہ! کون شاہینہ؟" سلمٰی نے میرے الفاظ کاٹتے ہوئے کہا۔

میرے ہاتھ خود بخود اس کی گردن کی طرف اٹھنے لگے۔ دو تین لمحوں کے بعد اس کی گردن میری مضبوط گرفت میں تھی۔

"بتاؤ شاہینہ کہاں ہے؟ سچ سچ بتاؤ! ورنہ گردن مروڑ ڈالوں گا!" میں نے اس کی گردن دباتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔

"سنا ہے۔ وہ یہاں سے چلی گئی ہے!" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"سنا ہے؟۔۔۔ سنا ہے؟۔۔۔ سچ سچ نہیں بتاؤ گی؟ یہ کہہ کر میں نے اس کی گردن کی طرف پھر ہاتھ بڑھائے۔ وہ پیچھے ہٹ گئی اور ڈرتے ڈرتے کہنے لگی۔

"یہ سب کچھ محبت سے ہوا۔ مجھے تجھ سے محبت ہے، اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اور بھی تم سے محبت کرے۔ تمہارا تعاقب کرتی ہوئی میں دو تین دفعہ یہاں آچکی تھی اور مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ شاہینہ تم سے محبت کرتی ہے اور تم اس سے۔ اس لئے میری محبت نے مجبور کیا اس کانٹے کو راہ سے ہٹا دوں۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے میں نے تمہیں اپنے ہاں رہنے پر مجبور کیا۔ جب ایک ہفتہ گذر گیا اور تم وہاں نہ پہنچے میں نے قلعے میں آکر شاہینہ اور بوڑھے سے کہہ دیا کہ شباب اب قلعے میں نہیں آئے گا۔ وہ میرا محبوب ہے۔ اس کے ایک ہفتہ بعد جب میں پھر یہاں پہنچی تو وہ جا چکے تھے!"

"کہاں؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔ بوڑھے نے اس دن شاہینہ سے کہا تھا کہ شاہینہ! اب ہمیشہ کے لئے اس قلعے کو چھوڑ دیں۔ یقیناً وہ یہاں سے

ہمیشہ کے لئے چلے گئے ہیں!"

میرے کانوں میں حمدی کے وہی الفاظ گونجنے لگے جو اس نے قلعے میں کہے تھے۔

"ذلیل عورت! تو نے مجھے دھوکا دیا۔ اب تو بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔" میں نے کہا اور اس کی گردن پکڑ لی۔

"شباب! میرے شباب!" اور اپنی گردن چھڑانے لگی۔ میری گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ زخمی ہرنی کی طرح اس نے مجھے دیکھا اور بھاگی۔ یکایک فضا میں ایک ہلکی سی چیخ گونجی۔ میں نے نیچے دیکھا پتھروں پر خون میں لتھڑا ہوا گوشت نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی اپنے آپ کو نیچے گرا دینے کا ارادہ کیا۔ مگر جب یہ خیال آیا۔ شاید شاہینہ مل جائے "تو میں نے ارادہ ترک کر دیا اور قلعے سے باہر نکل آیا۔

(۱۳)

سالہا سال میں شاہینہ کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں مگر کہیں بھی اسے نہ دیکھ سکا۔ نہ معلوم حمدی اسے ۔۔ کہاں لے گیا ہے ۔۔۔ کائنات کے کس گوشے میں وہ سانس لے رہی ہے!

آج میں پھر قلعے میں بیٹھا ہوا یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ جس جگہ بیٹھا ہوں' وہی جگہ ہے جہاں پہلے پہل میں نے شاہینہ سے گفتگو کی تھی ۔۔ اور ۔۔۔ جہاں بیٹھ کر میں اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔!!

میری آنکھوں کے سامنے تاریک سائے پھر رہے ہیں۔ چند سانس باقی رہ گئے ہیں۔ کاش! میں ان آخری لمحوں میں بھی اپنی ۔۔ محبوبہ کو دیکھ سکوں۔!!

خواجہ احمد عباس

نام : احمد عباس
قلمی نام : خواجہ احمد عباس
تاریخ پیدائش : ۷ جون ۱۹۱۴ء بہ مقام پانی پت، ہریانہ۔
تاریخ وفات : یکم جون ۱۹۸۷ء کی صبح بہ مقام بمبئی۔
تعلیم : بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی، علی گڑھ یونی ورسٹی۔

ابتدائی تعلیم حالی مسلم ہائی اسکول قلندر صاحب شاخ، پانی پت (ہریانہ)، پانچویں سے ساتویں تک حالی مسلم ہائی اسکول، پانی پت۔ آٹھویں، یونی ورسٹی مڈل اسکول، علی گڑھ، نویں سے بارہویں تک علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج، علی گڑھ۔ بی۔ اے (۱۹۳۳ء)، ایل۔ ایل۔ بی (۱۹۳۵ء) علی گڑھ یونی ورسٹی، علی گڑھ سے کیا۔

مختصر حالاتِ زندگی:

آبائی وطن پانی پت، والد کا نام غلام السبطین انصاری، والدہ کا نام مسرورہ خاتون، جو مولانا الطاف حسین حالی کی پوتی تھیں۔ خواجہ احمد عباس نے صحافت کی ابتداء ۱۹۳۳ء میں "نیشنل کال" اور "ہندوستان ٹائمز" میں بلامعاوضہ لکھنے سے کی اور یہ سلسلہ ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔ طالب العلمی کے زمانے میں اپنا ذاتی ہفتہ وار اخبار "Aligarh Opinion" جاری کیا۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۷ء "بمبئی کرانکل" سے وابستہ رہے اس دوران میں اخبار کے فلمی ناقد کے علاوہ سنڈے ایڈیشن کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۴۰ء میں مجتبائی خاتون سے شادی ہوئی، ۱۹۵۸ء میں بیگم انتقال کر گئیں۔

۱۹۴۷ء میں "بمبئی کرانیکل" سے "Blitz" اخبار میں چلے گئے تھے۔ فلمی دنیا سے تعلق بمبئی ٹاکیز کے پارٹ ٹائم پبلسٹی منیجر کے طور پر قائم ہوا، آگے چل کر انڈین موشن پکچرز پروڈیوسرز ایسوسی ایشن، ڈاکومنٹری پروڈیوسرز ایسوسی ایشن، فلم ڈائریکٹرز ایسوسی ایشن اور فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے کرتا دھرتا رہے، بھارتیہ گیان پیٹھ کے مشیر اور فلم انسٹی ٹیوٹ آف پونا کے وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۶ء انڈین فلم ڈائریکٹرز ایسوسی ایشن کے صدر کے طور پر کام کیا۔ دنیا کا سفر انہوں نے دوسری جنگ عظیم سے قبل ہی ختم کر لیا تھا۔ وہ پہلے مشرق بعید گئے پھر جاپان، امریکہ، فرانس اور آخر میں برطانیہ سے ہوتے ہوئے بھارت واپس آئے۔ ۱۹۴۳ء میں پیپلز تھیٹر کی فلم "دھرتی کے لال" نہ صرف لکھی بلکہ پروڈیوس اور ڈائرکٹ بھی کی۔ مشہور فرانسیسی فلمی ناقد پروفیسر جارج سادوں نے اس فلم کو دنیا کی سو بہترین فلموں میں شمار کیا ہے۔ خواجہ صاحب کی دوسری فلم "انہونی" تھی اس کے بعد اپنی کامیاب ترین فلم "شہر اور سپنا" (پریذیڈنٹ گولڈ میڈل) کی تکمیل تک چودہ فلمیں "آوارہ"، "پردیسی"، "آج اور کل"، "ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی"، "میرا نام جوکر" اور "بوبی" کی کہانیاں، اسکرین پلے اور مکالمے لکھے۔ خواجہ صاحب کی اردو، ہندی اور انگریزی تصانیف کی تعداد تقریباً پینتالیس کے قریب ہے اور لگ بھگ اتنی ہی فلمیں لکھیں جن میں "سات ہندوستانی"، "نکسل باڑی"، "دو بوند پانی"، "ہوا محل"، "دھرتی کے لال" اور "شہر اور سپنا" کو عالمی سطح پر سراہا گیا۔ ان کی آخری فلم "فیصلہ" تھی۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"ابابیل" مطبوعہ: "جامعہ" دہلی ۱۹۳۷ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

	عنوان	مطبوعہ	طبع
۱۔	"ایک لڑکی" (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ اردو سرکلر روڈ، لاہور،	طبع اول: ۱۹۳۷ء
			طبع دوم: دسمبر ۱۹۳۹ء
۲۔	"محمد علی" (افسانے)	حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۶ء
۳۔	"زعفران کے پھول" (افسانے)	مطبوعہ: کتب پبلشرز، بمبئی،	طبع اول: ۱۹۳۸ء
۴۔	"اندھیرا اجالا"۔ (افسانے ہندی)		
۵۔	"کہتے ہیں جس کو عشق" (۳ طویل افسانے)	مطبوعہ: پروین بک ڈپو، الہ آباد،	طبع اول: ۱۹۵۴ء
			طبع دوم: ۱۹۵۴ء
۶۔	"زبیدہ" (ڈراما)		
۷۔	"یہ امرت ہے" (ڈراما)	مطبوعہ: عہد آفریں پریس، حیدر آباد، دکن،	طبع اول: ۱۹۴۴ء
۸۔	"چودہ گولیاں" (ڈراما)		
۹۔	"مسافر کی ڈائری" (رپورتاژ)	حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی،	طبع اول: ۱۹۴۴ء
۱۰۔	"نیلی ساری" (افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی،	طبع اول: ۱۹۸۲ء
۱۱۔	"انقلاب" (ضخیم ناول)		

اس ناول کا ایک روسی ایڈیشن "فرزندِ ہند" (سن آف انڈیا) کے نام سے نوے ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔

	عنوان	مطبوعہ	طبع
۱۲۔	"پاؤں میں پھول" (افسانے)		
۱۳۔	"میں کون ہوں" (افسانے)	مطبوعہ: نو ہند پبلشرز، بمبئی،	طبع اول: ۱۹۴۹ء
۱۴۔	"نئی دھرتی نئے انسان" (۱۵ افسانے)	مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی،	طبع اول: ۱۹۷۷ء
۱۵۔	"گیہوں اور گلاب" (۷ افسانے)	مطبوعہ: ایشیاء پبلشرز تمیں ہزاری، دہلی،	طبع اول: ۱۹۶۵ء
۱۶۔	"تین پہیے"		
۱۷۔	"چار دل چار راہیں" (ناول)	مطبوعہ:	طبع اول: ۱۹۵۹ء
۱۸۔	"چراغ تلے" (افسانے۔ ہندی)		
۱۹۔	"رقص کرنا ہے اگر" (ناول)		
۲۰۔	"سرخ زمین اور پانچ ستارے" (رپورتاژ)		
۲۱۔	"میں کوئی جزیرہ نہیں" (آپ بیتی بہ زبان انگریزی)		

۲۲- "فلمیں کیسے بنتی ہیں" (بہ زبان انگریزی)

۲۳- "دیا جلے ساری رات" (افسانہ) مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۵۹ء

۲۴- "آدھا انسان" (ہندی) مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۵۳ء

۲۵- "لوان مسوری" (افسانے۔ ہندی) مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۷۵ء

۲۶- "Blood And Stones" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۴۹ء

۲۷- "Rice And Other Stories" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۴۷ء

۲۸- "Tomorrow Is Ours" مطبوعہ:

۲۹- "One Did Not Come Back" مطبوعہ:

۳۰- "A Novel Of The India Of Today" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۴۸ء

۳۱- "I Write And Feel" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۴۸ء

۳۲- "Inqilab" (ناول) مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۴۵ء

۳۳- "Mussolini And Fascism"

۳۴- "Face To Face With Khruchev" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۶۰ء

۳۵- "Till We Reach The Stars" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۶۱ء

۳۶- "India Gandhi' Return Of The Rose" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۶۶ء

۳۷- "That Women-Her Seven Years In Power" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۷۳ء

۳۸- "An Indiam Looks AT America"

۳۹- "Mera Nam Joker" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۷۰ء

۴۰- "Boy Meets Girl" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۷۳ء

۴۱- "Face To Face With Indira Gandhi" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۷۴ء

۴۲- "Distant Dream" (ناول) مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۷۵ء

۴۳- "The Walls Of Glass" (ناول) مطبوعہ

۴۴- "Mad 'Mad' Mad World Of Indian Films" مطبوعہ: ۱۹۷۷ء

۴۵- "BARRISTER AT LAW" (ڈراما) مطبوعہ: ۱۹۷۷ء

یہ ڈراما پراگ جی دوسا کے اشتراک کے ساتھ مکمل کیا تھا۔

۴۶- "مسولینی فاشسٹ اور جنگ حبش" (سیاسیات) طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل

غیر مدون:

متعدد مضامین، سکرین پلے اور دو ایک افسانے۔

اعزاز:

۱۔ پدم شری (ادب) ۱۹۶۸ء
۲۔ میرا ایوارڈ، اردو اکیڈمی بھوپال۔
۳۔ بہار اردو جرنلسٹس ایوارڈ برائے قومی یک جہتی۔
۴۔ ہریانہ گورنمنٹ ایوارڈ (ادب) اور ایک شال۔
۵۔ پریذیڈنٹ گولڈ میڈل برائے فلم "شہر اور سپنا" ۱۹۶۳ء۔
۶۔ کارلووی واری (اطالیہ) فلم فیسٹیول کا آرٹ اکادمی ایوارڈ برائے ہدایت کاری۔
۷۔ گوون (اسپین) فلم فیسٹیول ایوارڈ برائے "شہر اور سپنا"۔
۸۔ سانتا باربرا (امریکہ) فلم فیسٹیول ایوارڈ برائے "شہر اور سپنا"۔
۹۔ فلم فیسٹیول (اطالیہ) میں سونے کی مور، برائے "تکملائٹ" (مکمل بازی)
۱۰۔ مودی غالب ایوارڈ ۱۹۸۳ء

وفات سے قبل مستقل پتا:

"فلومینا اپارٹمنٹ، چرچ روڈ، جوہو بمبئی ۴۰۰۰۴۹۔ بھارت

نظریہ فن:

"کچھ کہنے کی بات کو دلچسپ پیرائیہ میں بیان کرنا۔ میں لوگوں کو پہنچنا اور اپنے نظریات کو پہنچانا چاہتا ہوں۔"

(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ سے اقتباس)

خواجہ احمد عباس

سردار جی

لوگ سمجھتے ہیں کہ سردار جی مارے گئے۔

نہیں۔ یہ میری موت ہے۔ پرانے "میں" کی موت میرے تعصبات کی موت' اس منافرت کی موت جو میرے دل میں تھی۔

میری یہ موت کیسے ہوئی؟ یہ بتانے کے لئے مجھے اپنے پرانے مردہ "میں" کو زندہ کرنا پڑے گا۔

میرا نام شیخ برہان الدین ہے۔

جب دہلی اور نئی دہلی میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم اور مسلمان کا خون سستا ہو گیا تو میں نے سوچا واہ ری قسمت پڑوسی بھی ملا تو سکھ۔ حق ہمسایگی ادا کرنا اور جان بچانا تو کجا' نہ جانے کب کرپان بھونک دے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تک میں سکھوں پر ہنستا بھی تھا' ان سے ڈرتا بھی تھا اور کافی نفرت بھی کرتا تھا۔ آج سے نہیں بچپن سے میں شاید چھ برس کا تھا جب پہلی بار میں نے ایک سکھ کو دیکھا تھا۔ جو دھوپ میں بیٹھا اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ میں چلا پڑا "ارے وہ دیکھو عورت کے منھ پر کتنی لمبی داڑھی!" جیسے جیسے عمر گذرتی گئی یہ استعجاب ایک نسلی نفرت میں تبدیل ہوتا گیا۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں جب کسی بچے کے بارے میں نامبارک بات کا ذکر کرتیں۔ مثلاً یہ کہ اسے نمونیہ ہو گیا تھا' یا اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو کہتیں "اب سے دور کسی سکھ فرنگی کو نمونیہ ہو گیا تھا یا اب سے دور کسی سکھ فرنگی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی" بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کوسنا ۱۸۵۷ء کی یادگار تھا' جب ہندو مسلمانوں کی جنگ آزادی کو دبانے میں پنجاب کے سکھ راجوں اور ان کی فوجوں نے فرنگیوں کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اس وقت تاریخی حقائق پر نظر نہیں تھی' صرف ایک مبہم سا خوف' ایک عجیب سی نفرت اور ایک عمیق تعصب' ڈر انگریز سے بھی لگتا تھا اور سکھ سے بھی۔ مگر انگریز سے زیادہ۔ مثلاً "جب میں کوئی دس برس کا تھا' ایک روز دہلی سے علی گڑھ جا رہا تھا۔ ہمیشہ تھرڈ یا انٹر میں سفر ہوتا تھا' سوچا کہ اب کی بار سکنڈ کلاس میں سفر کر کے دیکھا جائے۔ ٹکٹ خرید لیا اور ایک خالی ڈبے میں بیٹھکر گدوں پر خوب کودا' باتھ روم کے آئینے میں اچک اچک کر اپنا عکس دیکھا' سب پنکھوں کو ایک ساتھ چلا دیا' روشنیوں کو کبھی جلایا' کبھی بجھایا' مگر ابھی گاڑی کے چلنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ لال لال منھ والے چار فوجی گورے آپس میں ڈیم بلاڈی قسم کی گفتگو کرتے ہوئے درجے میں گھس آئے۔ ان کو دیکھنا تھا کہ سکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا شوق رفو چکر ہو گیا اور اپنا سوٹ کیس گھسیٹتا میں بھاگا اور ایک نہایت کھچا کھچ بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں آ کر دم لیا۔ یہاں دیکھا تو کئی سکھ داڑھیاں کھولے' کچھے پہنے بیٹھے تھے۔ مگر میں ان سے ڈر کر درجہ چھوڑ کر نہیں بھاگا۔ صرف ان سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

ہاں تو ڈر سکھوں سے بھی لگتا تھا اور انگریزوں سے ان سے زیادہ' مگر انگریز انگریز تھے اور کوٹ پتلون پہنتے تھے جو میں بھی پہننا چاہتا تھا' اور ڈیم بلاڈی فول والی زبان بولتے تھے جو میں بھی سیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ حاکم تھے اور میں بھی چھوٹا موٹا حاکم بننا چاہتا تھا۔ وہ کانٹے چھری سے کھانا کھاتے تھے اور میں بھی کانٹے چھری سے کھانا کھانے کا خواہاں تھا تاکہ دنیا مجھے بھی مہذب اور متمدن سمجھے' مگر سکھوں سے جو ڈر لگتا تھا' وہ حقارت آمیز کتنے عجیب الخلقت تھے یہ سکھ۔ جو مرد ہو کر بھی سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے لمبے رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزی فیشن کی نقل میں سر کے بال منڈانا کچھ مجھے بھی پسند نہیں تھا' ابا کے اس حکم کے باوجود کہ ہر جمعہ کو سر کے بال خشخشی کرائے جائیں۔ میں

نے بال خوب بڑھا رکھے تھے تاکہ ہاکی اور فٹ بال کھیلتے وقت بال ہوا میں اڑیں جیسے انگریزی کھلاڑیوں کے۔ ابا کہتے "یہ کیا عورتوں کی طرح پٹے بڑھا رکھے ہیں" مگر ابا تو تھے ہی پرانے دقیانوسی خیال کے۔ ان کی بات کون سنتا تھا۔ ان کا بس چلتا تو سر پر استرا چلوا کر بچپن میں بھی ہمارے چہروں پر داڑھیاں بندھوا دیتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں اس پر یاد آیا کہ سکھوں کے عجیب الخلقت ہونے کی دوسری نشانی ان کی داڑھیاں تھیں اور پھر داڑھی داڑھی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ابا کی داڑھی جس کی نہایت اہتمام سے نائی فرنچ کٹ بنایا کرتا تھا یا تایا ابا کی جو نکیلی اور چونچ دار تھی۔ مگر یہ بھی کیا کہ داڑھی کو کبھی قینچی لگے ہی نہیں۔ جھاڑ جھنکار کی طرح بڑھتی ہی رہے بلکہ تیل اور دہی اور نہ جانے کیا کیا ملکر بڑھائی جائے اور جب کئی فٹ لمبی ہو جائے تو اس میں کنگھی کی جائے جیسے عورتیں سر کے بالوں میں کرتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ عورتیں یا مجھ جیسے اسکول کے فیشن ایبل لڑکے اس کے علاوہ دادا جان کی داڑھی بھی کئی فٹ لمبی تھی اور وہ بھی اس میں کنگھی کرتے تھے۔ مگر دادا جان کی بات اور تھی۔ آخر وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے دادا جان ٹھہرے اور سکھ پھر سکھ تھے۔

میٹرک کرنے کے بعد مجھے پڑھنے لکھنے کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجا گیا کالج میں جو پنجابی لڑکے پڑھتے تھے' ان کو ہم دہلی اور یو پی والے نچ جاہل اور اجڈ سمجھتے تھے۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ نہ کھانے پینے کی تمیز۔ تہذیب و تمدن چھو نہیں گئے تھے۔ گنوار' لٹھ یہ بڑے بڑے لسی کے گلاس پینے والے بھلا کیوڑے دار فالودے اور لپٹن کی چائے کی لذت کیا جانیں۔ زبان نہایت ناشائستہ' بات کریں تو معلوم ہو لڑ رہے ہیں۔ اسی' تسی' ساڈے' تہاڈے .... لاحول ولا قوۃ۔ میں تو ہمیشہ ان پنجابیوں سے کتراتا تھا مگر خدا بھلا کرے ہمارے وارڈن صاحب کا کہ انہوں نے ایک پنجابی کو میرے کمرے میں جگہ دے دی۔ میں نے سوچا چلو جب ساتھ رہنا ہی ہے تو تھوڑی بہت حد تک دوستی ہی کر لی جائے۔ کچھ دنوں میں کافی گاڑھی چھننے لگی۔ اس کا نام غلام رسول تھا۔ راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ کافی مزے دار آدمی تھا اور لطیفے خوب سنایا کرتا تھا۔

اب آپ کہیں گے ذکر شروع ہوا تھا سردار صاحب کا یہ غلام رسول کہاں سے ٹپک پڑا' مگر اصل میں غلام رسول کا اس قصے سے قریبی تعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ جو لطیفے سناتا تھا وہ عام طور سے سکھوں کے بارے میں ہوتے تھے جن کو سن سن کر مجھے پوری سکھ قوم کی عادات و خصائل' ان کی نسلی خصوصیات اور اجتماعی کیریکٹر کا بخوبی علم ہو گیا تھا۔ بقول غلام رسول کے:

سکھ تمام بیوقوف اور بدھو ہوتے ہیں۔ بارہ بجے تو ان کی عقل بالکل خبط ہو جاتی ہے۔ اس کے ثبوت میں کتنے ہی واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک سردار جی دن کے بارہ بجے سائیکل پر سوار امرتسر کے ہال بازار سے گذر رہے تھے۔ چوراہے پر ایک سکھ کانسٹیبل نے روکا اور پوچھا "تمہاری سائیکل کی لائٹ کہاں ہے؟" سائیکل سوار سردار جی گڑگڑا کر بولے "جمعدار صاحب ابھی ابھی بجھ گئی ہے' گھر سے جلا کر تو چلا تھا۔" اس پر سپاہی نے چالان کرنے کی دھمکی دی۔ ایک راہ چلتے سفید داڑھی والے سردار جی نے بیچ بچاؤ کرایا' "چلو بھائی کوئی بات نہیں لائٹ بجھ گئی ہے تو اب جلا لو۔" اور اسی قسم کے سیکڑوں قصے غلام رسول کو یاد تھے اور انہیں جب وہ پنجابی مکالموں سے سناتا تھا تو سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ اصل میں ان کو سننے کا مزہ پنجابی ہی میں تھا کیونکہ اجڈ سکھوں کی عجیب و غریب حرکتوں کے بیان کرنے کا حق کچھ پنجابی جیسی اجڈ زبان ہی میں ہو سکتا ہے۔

سکھ نہ صرف بیوقوف اور بدھو تھے بلکہ گندے تھے جیسا کہ ایک ثبوت تو غلام رسول کا (جس نے سیکڑوں سکھوں کو دیکھا تھا) یہ تھا کہ وہ بال نہیں منڈاتے تھے۔ اس کے علاوہ برخلاف ہم صاف ستھرے نمازی مسلمانوں کے جو ہر اٹھواڑے جمعہ کے جمعہ غسل کرتے ہیں' یہ سکھ کچھا باندھ سب کے سامنے نل کے نیچے بیٹھ کر نہاتے تو روز ہیں مگر اپنے بالوں اور داڑھی میں ناجانے کیا کیا گندی اور غلیظ چیزیں ملتے ہیں۔ مثلاً دہی۔ ویسے تو میں بھی سر میں لائم جیوس گلیسرین لگاتا ہوں جو کسی قدر گاڑھے گاڑھے دودھ سے مشابہ ہوتی ہے مگر اس کی بات اور ہے۔ وہ ولایت کی مشہور پرفیومری فیکٹری سے نہایت خوبصورت شیشی میں آتی ہے اور دہی کسی گندے سندے حلوائی کی دوکان سے۔

خیر جی ہمیں دوسروں کے رہنے سہنے کے طریقوں سے کیا لینا' مگر سکھوں کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ لوگ اکھڑپن' بد تمیزی' اور مار دھاڑ میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جرات کرتے تھے۔ اب دنیا جانتی ہے کہ ایک اکیلا مسلمان دس ہندوں یا سکھوں پر بھاری ہوتا ہے' مگر پھر یہ

سکھ مسلمانوں کے رعب کو نہیں مانتے تھے کرپانیں لٹکائے' اکڑ اکڑ کر مونچھوں بلکہ داڑھی پر بھی تاؤ دیتے چلتے تھے۔ غلام رسول کہتا ان کی ہیکڑی ایک دن ہم ایسی نکالیں گے کہ خالصہ جی یاد ہی تو کریں گے۔

کالج چھوڑے کئی سال گذر گئے۔ طالب علم سے میں کلرک اور کلرک سے ہیڈ کلرک بن گیا۔ علی گڑھ کا ہوسٹل چھوڑ نئی دہلی میں ایک سرکاری کوارٹر میں رہنا سہنا اختیار کر لیا۔ شادی ہو گئی۔ بچے ہو گئے' مگر کتنی ہی مدت کے بعد۔ میں مجھے غلام رسول کا وہ کہنا یاد آیا' جب ایک سردار صاحب میرے برابر کے کوارٹر میں رہنے کو آئے ـــــ یہ راولپنڈی سے بدلی کرا کر آئے تھے کیونکہ راولپنڈی کے ضلع میں غلام رسول کی پیشین گوئی کے موجب سرداروں کی ہیکڑی اچھی طرح سے نکالی گئی تھی۔ مجاہدوں نے ان کا صفایا کر دیا تھا۔ بڑے سورما بنتے تھے۔ کرپانیں لئے پھرتے تھے۔ بہادر مسلمانوں کے سامنے ان کی ایک نہ بنی۔ ان کی داڑھیاں مونڈ کر ان کو مسلمان بنایا گیا تھا۔ زبردستی ان کا ختنہ کیا گیا تھا۔ ہندو پریس حسب عادت مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے یہ لکھ رہا تھا کہ سکھ عورتوں اور بچوں کو بھی مسلمانوں نے قتل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اسلامی روایات کے خلاف ہے۔ کوئی مسلمان مجاہد کبھی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ رہیں عورتوں اور بچوں کی لاشوں کی تصویریں جو چھاپی جا رہی تھیں' وہ یا تو جعلی تھیں اور یا سکھوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے خود اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہو گا۔ راولپنڈی اور مغربی پنجاب کے مسلمانوں پر یہ بھی الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے ہندو اور سکھ لڑکیوں کو بھگا دیا تھا۔ حالانکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کی جوانمردی کی دھاک بیٹھی ہے۔ اور اگر نوجوان مسلمانوں پر ہندو اور سکھ لڑکیاں خود ہی لٹو ہو جائیں تو ان کا کیا قصور ہے کہ وہ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں ان لڑکیوں کو اپنی پناہ میں لے لیں' ہاں تو سکھوں کے نام نہاد بہادری کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ بھلا اب تو ماسٹر تارا سنگھ لاہور میں کرپان نکال کر مسلمانوں کو دھمکیاں دے۔ پنڈی سے بھاگے ہوئے سردار اور اس کی خستہ حالی کو دیکھ کر میرا سینہ عظمت اسلام کی روح سے بھر گیا۔

ہمارے پڑوسی سردار جی کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہو گی۔ داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی' حالانکہ موت کے منہ سے بچ کر آئے تھے۔ مگر یہ حضرت ہر وقت دانت نکالے ہنستے رہتے تھے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ در اصل کتنا بے وقوف اور بے حس ہے۔ شروع شروع میں انہوں نے مجھے اپنی دوستی کے جال میں پھنسانا چاہا۔ آتے جاتے زبردستی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ نجانے سکھوں کا کون سا تہوار تھا' اس دن پرشاد کی مٹھائی بھی بھیجی (جو میری بیوی نے فوراً مہترانی کو دے دی) پر میں نے زیادہ منہ نہ لگایا۔ کوئی بات ہوئی سوکھا سا جواب دے دیا اور بس۔ میں جانتا تھا کہ سیدھے منہ دو چار باتیں کر لیں تو یہ پیچھے ہی پڑ جائے گا۔ آج باتیں تو کل گالم گفتار۔ گالیاں تو آپ جانتے ہی ہیں سکھوں کی دال روٹی ہوتی ہے۔ کون اپنی زبان گندی کرے۔ ایسے لوگوں سے تعلقات بڑھا کر۔ ہاں ایک اتوار کی دوپہر کو میں اپنی بیوی کو سکھوں کی حماقت کے قصے سنا رہا تھا۔ اس کا عملی ثبوت دینے کے لئے عین بارہ بجے میں نے اپنے نوکر کو سردار جی کے ہاں بھیجا کہ پوچھ کر آئے "کیا بجا ہے۔" انہوں نے کہلوا دیا "بارہ بج کر دو منٹ ہوئے ہیں"۔ میں نے کہا "بارہ بجے کا نام لیتے گھبراتے ہیں یہ" اور ہم خوب ہنسے۔ اس کے بعد میں نے کئی بار بیوقوف بنانے کے لئے سردار جی سے پوچھا "کیوں سردار جی! بارہ بج گئے؟" اور وہ بے شرمی سے دانت پھاڑ کر جواب دیتے "جی اساڈے ہاں چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں" اور یہ کہہ کر خوب ہنسے۔ گویا یہ بڑا مذاق ہوا۔

مجھے سب سے زیادہ ڈر بچوں کی طرف سے تھا۔ اول تو کسی سکھ کا اعتبار نہیں' کب بچے ہی کے گلے پر کرپان چلا دے۔ پھر یہ لوگ راولپنڈی سے آئے تھے' ضرور دل میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ رکھتے ہوں گے اور انتقام لینے کی تاک میں ہوں گے۔ میں نے بیوی کو تاکید کر دی تھی کہ بچے ہرگز سردار جی کے کوارٹر کی طرف نہ جانے دیے جائیں۔ پر بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں چند روز کے بعد میں نے دیکھا کہ سردار کی چھوٹی لڑکی موہنی اور ان کے پوتوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ یہ بچی جس کی عمر مشکل سے دس برس کی ہو گی سچ مچ موہنی ہی تھی۔ گوری چٹی' اچھا ناک نقشہ۔ بڑی خوبصورت۔ کمبخت سکھوں کی عورتیں کافی خوبصورت ہوتی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ غلام رسول کہا کرتا تھا کہ اگر پنجاب سے سکھ مرد چلے جائیں اور اپنی عورتوں کو چھوڑ جائیں تو پھر حوروں کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ ہاں تو جب میں نے بچوں کو سردار جی کے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو میں ان کو گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا اور خوب پٹائی کی' پھر میرے سامنے کم سے کم ان کی ہمت نہ ہوئی کہ ادھر کا رخ کریں۔

بہت جلد سکھوں کی اصلیت پوری طرح ظاہر ہو گئی ۔ راولپنڈی سے تو ڈرپوکوں کی طرح پٹ کر بھاگ کر آئے تھے، پر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو اقلیت میں پا کر ان پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا ۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو جام شہادت پینا پڑا ۔ اسلامی خون کی ندیا بہہ گئیں ۔ ہزاروں عورتوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا گیا ۔ جب سے مغربی پنجاب سے بھاگے ہوئے سکھ اتنی بڑی تعداد میں دہلی میں آنے شروع ہوئے تھے، اس وبا کا یہاں تک پہنچنا یقینی ہو گیا تھا ۔ میرے پاکستان جانے میں ابھی چند ہفتے کی دیر تھی اس لئے میں نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کو ہوائی جہاز سے کراچی بھیج دیا اور خود خدا پر بھروسہ کر کے ٹھہرا رہا ۔ ہوائی جہاز میں سامان تو زیادہ نہیں جا سکتا تھا، اس لئے میں نے پوری ایک ویگن بک کرا لی مگر جس دن سامان چڑھانے والے تھے اس دن سنا کہ پاکستان جانے والی گاڑیوں پر حملے ہو رہے ہیں اس لئے سامان گھر میں ہی پڑا رہا ۔

۱۵ اگست کو آزادی کا جشن منایا گیا مگر مجھے اس آزادی میں کیا دلچسپی تھی ۔ میں نے چھٹی منائی اور دن بھر لیٹا ڈان اور پاکستان ٹائمز کا مطالعہ کرتا رہا ۔ دونوں میں اس نام نہاد آزادی کے چیتھڑے اڑائے گئے تھے اور ثابت کیا گیا تھا کہ کس طرح ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی سازش کی تھی ۔ وہ تو ہمارے قائد اعظم کا اعجاز تھا کہ پاکستان لے کر ہی رہے اگرچہ انگریزوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے دباؤ میں آ کر امرتسر کو ہندوستان کے حوالے کر دیا، حالانکہ دنیا جانتی ہے امرتسر خالص اسلامی شہر ہے اور یہاں کی سنہری مسجد جو Golden Mosque کے نام سے دنیا میں مشہور ہے .... نہیں وہ تو گردوارہ ہے اور Golden Temple کہلاتا ہے ۔ سنہری مسجد تو دہلی میں ہے ۔ سنہری مسجد ہی نہیں، جامع مسجد بھی ۔ لال قلعہ ہے، نظام الدین اولیا کا مزار، ہمایوں کا مقبرہ، صفدر جنگ کا مدرسہ ۔ غرض کہ چپے چپے پر اسلامی حکومت کے نشان پائے جاتے ہیں پھر بھی آج اسی دہلی بلکہ کہنا چاہئے شاہ جہان آباد پر ہندو سامراج کا جھنڈا بلند کیا جا رہا تھا، روئے اب دل کھول کے اے دیدہ خونبار ...... اور یہ سوچ کر میرا دل بھر آیا کہ دہلی جو کبھی مسلمانوں کا پایہ تخت تھا، تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا ۔ ہم سے چھین لیا گیا تھا اور ہمیں مغربی پنجاب اور سندھ بلوچستان جیسے اجڈ اور غیر متمدن علاقے میں زبردستی بھیجا جا رہا ہے ۔ جہاں کسی کو شستہ اردو زبان بھی بولنی نہیں آتی ۔ جہاں شلواریں جیسا مضحکہ خیز لباس پہنا جاتا ہے ۔ جہاں ہلکی پھلکی پاؤ بھر میں بیس چپاتیوں کی بجائے دو دو سیر کی نانیں کھائی جاتی ہیں، پھر میں نے اپنے دل کو مضبوط کر کے کہ قائد اعظم اور پاکستان کی خاطر یہ قربانی تو ہمیں دینی ہی ہو گی، مگر پھر بھی دلی چھوڑنے کے خیال سے دل مرجھایا ہی رہا ..... شام کو جب میں باہر نکلا اور سردار جی نے دانت نکال کر کہا "کیوں بابو جی! تم نے آج کچھ کُشتی نہیں منائی؟" تو میرے جی میں آئی کہ اس کی داڑھی میں آگ لگا دوں ۔ ہندوستان کی آزادی اور دل میں سکھا شاہی آخر رنگ لا کر ہی رہی ۔ اب مغربی پنجاب سے آئے ہوئے رفیو جیز کی تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی ۔ یہ لوگ دراصل پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے اپنے گھربار چھوڑ کر، وہاں سے بھاگے تھے ۔ یہاں آ کر گلی کوچوں میں اپنا رونا روتے پھرتے تھے ۔ کانگریسی پراپیگنڈا مسلمانوں کے خلاف زوروں پر چل رہا تھا اور اس بار کانگریسیوں نے چال یہ چلی کہ بجائے کانگریس کا نام لینے کے راشٹریہ سیوک سنگھ اور شہیدی دل کے نام سے کام کر رہے تھے ۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ ہندو چاہے کانگریسی ہوں یا مہاسبھائی، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں ۔ چاہے دنیا کو دکھانے کی خاطر بظاہر گاندھی اور جواہر لال نہرو کو گالیاں ہی کیوں نہ دیتے ہوں ۔

ایک دن صبح کو خبر آئی کہ دہلی میں قتل عام شروع ہو گیا ۔ قرول باغ میں مسلمانوں کے سیکڑوں گھر پھونک دیئے گئے ۔ چاندنی چوک کے مسلمانوں کی دوکانیں لوٹ لی گئیں اور ہزاروں کا صفایا ہو گیا ۔ یہ تھا کانگریس کے ہندو راج کا نمونہ ۔ خیر میں نے سوچا کہ دہلی تو مدت سے انگریزوں کا شہر رہا ہے لارڈ ماؤنٹ بیٹن یہاں رہتے ہیں ۔ کمانڈر انچیف یہاں رہتا ہے ۔ کم سے کم یہاں وہ مسلمانوں کے ساتھ ایسا ظلم نہ ہونے دیں گے ۔ یہ سوچ کر میں دفتر کی طرف چلا کیونکہ اس دن مجھے پراوڈنٹ فنڈ کا حساب کرنا تھا اور دراصل اسی لئے میں نے پاکستان جانے میں دیر کی تھی ۔ ابھی گول مارکیٹ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ دفتر کا ایک ہندو بابو ملا ۔ اس نے کہا یہ کیا کر رہے ہو جاؤ واپس جاؤ ۔ باہر نہ نکلنا کناٹ پلیس میں بلوائی مسلمانوں کو مار رہے ہیں ۔ میں واپس بھاگ آیا ۔

اپنے اسکوائر میں پہنچا ہی تھا کہ سردار جی سے مڈبھیڑ ہو گئی کہنے لگے۔ "شیخ جی فکر نہ کرنا۔ جب تک ہم سلامت ہیں تمہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا" میں نے سوچا اس کی داڑھی کے پیچھے کتنا مکر چھپا ہوا ہے۔ دل میں تو خوش ہے چلو اچھا ہوا مسلمانوں کا صفایا ہو رہا ہے..... مگر زبانی ہمدردی جتا کر مجھ پر احسان کر رہا ہے۔ بلکہ شاید مجھے چڑھانے کے لئے یہ کہہ رہا ہے کیونکہ سارے اسکوائر میں بلکہ تمام سڑک پر میں تن تنہا مسلمان تھا۔

پر مجھے ان کافروں کا رحم و کرم نہیں چاہئے۔ میں سوچ کر اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ میں مارا بھی جاؤں گا تو دس بیس کو مار کر۔ سیدھا اپنے کمرے میں گیا جہاں پلنگ کے نیچے' میری دو نالی شکاری بندوق رکھی تھی۔ جب سے فسادات شروع ہوئے تھے میں نے کارتوس اور گولیوں کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا پر وہاں بندوق نہ ملی۔ سارا گھر چھان مارا۔ اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔

"کیوں حضور! کیا ڈھونڈ رہے ہیں آپ؟"

یہ میرا وفادار ملازم ممدو تھا۔

"میری بندوق کیا ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے معلوم ہے۔ شاید اس نے چھپائی ہے' یا چرائی ہے۔

"بولتا کیوں نہیں؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

تب حقیقت معلوم ہوئی کہ ممدو نے میری بندوق چرا کر اپنے چند دوستوں کو دے دی تھی جو دریا گنج میں مسلمانوں کی حفاظت کے لئے ہتھیاروں کا ذخیرہ جمع کر رہے تھے۔

"کئی سو بندوقیں ہیں سرکار ہمارے پاس۔ سات مشین گنیں' دس ریوالور اور ایک توپ۔ کافروں کو بھون کر رکھ دیں گے۔ بھون کر" میں نے کہا "دریا گنج" میں میری بندوق سے کافروں کو بھون دیا گیا تو اس میں میری حفاظت کیسے ہو گی۔ میں تو یہاں نہتا کافروں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہاں مجھے بھون دیا گیا تو کون ذمے دار ہو گا؟" میں نے ممدو سے کہا۔

وہ کسی طرح چھپتا چھپاتا دریا گنج تک جائے اور وہاں سے میری بندوق اور سو دو سو کارتوس لے کر آئے۔ وہ چلا تو گیا مگر مجھے یقین تھا کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

اب میں گھر میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ سامنے کارنس پر میری بیوی اور بچوں کی تصویریں خاموشی سے مجھے گھور رہی تھیں۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ اب ان سے کبھی ملاقات ہو گی بھی یا نہیں لیکن پھر یہ خیال کر کے اطمینان بھی ہوا کہ کم سے کم وہ تو خیریت سے پاکستان پہونچ گئے تھے۔ کاش میں نے پراوڈنٹ فنڈ کا لالچ نہ کیا ہوتا اور پہلے ہی چلا گیا ہوتا۔ پر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے......

"ست سری اکال........ ہر ہر مہادیو"

دور سے آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ یہ بلوائی تھے۔ یہ میری موت کے ہرکارے تھے۔ میں نے زخمی ہرن کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ جو گولی کھا چکا ہو اور جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں' بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ کوارٹر کے کواڑ پتلی لکڑی کے تھے اور ان میں شیشے لگے ہوئے۔ اگر میں بند ہو بیٹھ بھی رہا تو دو منٹ میں بلوائی کواڑ توڑ کر اندر آ سکتے تھے "ست سری اکال۔ ہر ہر مہادیو۔"

آوازیں اور قریب آ رہی تھیں۔ میری موت قریب آ رہی تھیں۔ میری موت قریب آ رہی تھی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سردار جی داخل ہوئے "شیخ جی! تم ہمارے کوارٹر میں آ جاؤ۔ جلدی کرو۔" بغیر سوچے سمجھے اگلے لمحے میں سردار جی کے برآمدے کی چکوں کے پیچھے تھا۔ موت کی گولی سن سے میرے سر پر سے گزر گئی' کیونکہ میں وہاں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک لاری آ کر رکی اور اس میں سے دس پندرہ نوجوان اترے۔ ان کے لیڈر کے ہاتھ میں ایک ٹائپ کی ہوئی فہرست تھی۔ کوارٹر نمبر ۸ شیخ برہان الدین۔ اس نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے حکم دیا اور یہ غول کا غول میرے کوارٹر پر ٹوٹ پڑا۔ میری گرہستی کی دنیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اجڑ گئی۔ لٹ گئی۔ کرسیاں میزیں۔ صندوق۔

تصویر کتابیں ' دریاں قالین ' یہاں تک کہ میلے کپڑے ' ہر چیز لاری پر پہنچا دی گئی۔

ڈاکو!

لٹیرے!!

قزاق!!!

اور یہ سردار جی جو بظاہر ہمدردی جتا کر مجھے یہاں لے آئے تھے یہ کون سے کم لٹیرے تھے۔

باہر جا کر بلوائیوں سے کہنے لگے " ٹھہریے صاحب - اس گھر پر ہمارا حق زیادہ ہے - ہمیں بھی اس لوٹ میں حصہ ملنا چاہئے اور یہ کہکر انہوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو اشارہ کیا اور وہ بھی لوٹ میں شامل ہو گئے - کوئی میری پتلون اٹھائے چلا آ رہا ہے ' کوئی سوٹ کیس ' کوئی میری بیوی بچوں کی تصویریں بھی لا رہا ہے اور یہ سب مال غنیمت سیدھا اندر کے کمرے میں جا رہا تھا۔

اچھا رے سردار ! زندہ رہا تو تجھ سے سمجھوں گا - پر اس وقت تو میں چوں بھی نہیں کر سکتا تھا ' کیونکہ فسادی جو سب کے سب مسلح تھے مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھے ' اگر انہیں کہیں معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں......

ارے اندر آ تو سہی

دفعتاً" میں نے دیکھا کہ سردار جی ننگی کرپان ہاتھ میں لئے مجھے اندر بلا رہے ہیں - میں نے ایک بار اس ڈھیل چہرے کو دیکھا جو لوٹ مار کی بھاگ دوڑ سے اور بھی خوفناک ہو گیا تھا ' اور پھر کرپان کو جس کی چمکیلی دھار مجھے دعوت موت دی رہی تھی ' بحث کرنے کا موقع نہیں تھا ' مگر میں کچھ بھی بولا اور بلوائیوں نے سن لیا تو ایک گولی میرے سینے کے پار ہو گی - کرپان اور بندوق میں سے ایک کو پسند کرنا تھا - میں نے سوچا ان دس بندوق باز بلوائیوں سے کرپان والا بڈھا بہتر ہے - میں کمرے میں چلا گیا - جھجکتا ہوا خاموش۔

" اتھے نہیں ' اوس اندر آؤ - "

میں اور اندر کے کمرے میں چلا گیا جیسے بکرا قصائی کے ساتھ ذبح خانے میں داخل ہوتا ہے - میری آنکھیں کرپان کی دھار سے چندھیائی جا رہی تھی۔

" یہ لو جی - اپنی چیزیں سنبھال لو " یہ کہہ کر سردار جی نے وہ تمام سامان میرے سامنے رکھ دیا جو انہوں نے اور ان کے بچوں نے جھوٹ موٹ کی لوٹ میں حاصل کیا تھا۔

سردارنی بولی " بیٹا ہم تو تیرا کچھ بھی سامان نہ بچا سکے - " میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

اتنے میں باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں - بلوائی میری لوہے کی الماری کو باہر نکال رہے تھے اور اس کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے - اس کی چابیاں مل جاتیں تو سب معاملہ آسان ہو جاتا۔

" چابیاں تو اس کی پاکستان میں ملیں گی - بھاگ گیا نہ ڈرپوک کہیں کا ' مسلمان کا بچہ تھا تو مقابلہ کرتا۔ "

ننھی موہنی میری بیوی کے چند ریشمی قمیصیں اور غرارے نہ جانے کس سے چھین کر لا رہی تھی کہ اس نے یہ سنا - وہ بولی " تم بڑے بہادر ہو ! شیخ جی ڈرپوک کیوں ہونے لگے ' وہ تو کوئی بھی پاکستان نہیں گئے۔ "

" نہیں گیا تو یہاں سے کہیں منہ کالا کر گیا۔ "

" منہ کالا کیوں کرتے وہ تو ہمارے ہاں ......

میرے دل کی حرکت ایک لمحے کے لئے بند ہو گئی - بچی اپنی غلطی کا احساس کرتے ہی خاموش ہو گئی مگر ان بلوائیوں کے لئے یہی کافی تھا۔

سردار جی پر جیسے خون سوار ہو گیا ' انہوں نے مجھے اندر کے کمرے میں بند کر کے کنڈی لگا دی ' اپنے بیٹے کے ہاتھ میں کرپان دی اور خود باہر نکل گئے - باہر کیا ہوا یہ مجھے ٹھیک طرح معلوم نہ ہوا - تھپڑوں کی آواز ---- پھر موہنی کے رونے کی آواز اور اس کے بعد سردار جی کی

آواز - پنجابی گالیاں' کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کسے گالیاں دے رہے ہیں اور کیوں - میں چاروں طرف سے بند تھا اس لئے ٹھیک سنائی نہ دیتا تھا۔
اور پھر ـــــ گولی چلنے کی آواز ـــــ سردارنی کی چیخ۔
لاری روانہ ہونے کی گھڑگھڑاہٹ اور پھر تمام اسکوائر پر جیسے سناٹا چھا گیا' جب مجھے کمرے کی قید سے نکالا گیا تو سردار جی پلنگ پر پڑے تھے اور ان کے سینے کے قریب' سفید قمیص خون سے سرخ ہو رہی تھی - ان کا لڑکا ہمسائے کے گھر سے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر رکھا تھا۔
" سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟ " میری زبان سے نہ جانے یہ الفاظ کیسے نکلے - میں مبہوت تھا - میری برسوں کی دنیا' خیالات ' محسوسات ' تعصبات کی دنیا کھنڈر ہو گئی تھی۔
" سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟ "
" مجھے کرجا اتارنا تھا بیٹا! "
" قرضہ؟ "
" ہاں! راولپنڈی میں تمہارے جیسے ہی ایک مسلمان نے اپنی جان دے کر میری اور میرے گھر والوں کی جان اور اجت بچائی تھی - "
" کیا نام تھا اس کا سردار جی؟ "
" گلام رسول "
" غلام رسول! "
اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے ساتھ قسمت نے دھوکہ کیا ہو - دیوار پر لٹکے ہوئے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کئے - ایک ..... دو ..... تین ..... چار ..... پانچ
سردار جی کی نگاہیں گھنٹے کی طرف پھر گئیں جیسے مسکرا رہے ہوں اور مجھے اپنے دادا یاد آ گئے جن کی کئی فٹ لمبی داڑھی تھی۔
سردار جی کی شکل ان سے کتنی ملتی تھی - چھ ..... آٹھ ..... نو۔
جیسے وہ ہنس رہے ہوں ان کی سفید داڑھی اور سر کے کھلے ہوئے بالوں نے چہرے کے گرد ایک نورانی ہالہ سا بنایا ہوا تھا۔
دس ..... گیارہ ..... بارہ
جیسے وہ کہہ رہے ہوں " جی اساں دے ہاں تو چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں۔"
پھر وہ نگاہیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔
اور میرے کانوں میں غلام رسول کی آواز دور سے بہت دور سے آئی - میں کہتا نہ تھا کہ بارہ بجے ان سکھوں کی عقل غائب ہو جاتی ہے اور یہ کوئی نہ کوئی حماقت کر بیٹھتے ہیں - اب ان سردار جی ہی کو دیکھو نا ـــــــــ ایک مسلمان کی خاطر اپنی جان دے دی۔
پر یہ سردار جی نہیں مرے تھے - میں مرا تھا۔

خواجہ احمد عباس

ٹیری لین کی پتلون

شیشے کی دیوار کے پیچھے کھڑا ہوا صاحب اپنی نیلی کانچ کی آنکھوں سے منگو کو گھور رہا تھا۔
شیشے کی دیوار کے سامنے کھڑا ہوا منگو اپنی چکیلی کالی آنکھوں سے صاحب کو گھور رہا تھا۔

صاحب کے سر پر سلیٹی رنگ کا "ٹوپ" تھا۔ (اور دل ہی دل میں منگو نے اپنے آپ کو ٹوکا۔ "ٹوپ" نہیں "ہیٹ" ٹوپ تو گنوار بولتے ہیں۔ ") صاحب کے بدن پر چھوٹے چھوٹے چار خانوں کا کوٹ تھا۔ کوٹ کے کالر میں سے سفید قمیض اور کالی اور لال دھاریوں دار ٹائی جھانک رہی تھی۔ صاحب کی ٹانگیں نیلے رنگ کی پتلون میں تھیں۔ پتلون صاحب کے کولھوں پر کسی ہوئی تھی اور نیچے کالے شیشے کی طرح چمکتے ہوئے جوتوں تک آتے آتے گائے کی دم کی طرح پتلی ہو گئی تھی۔ پتلون کا کپڑا بڑا چمکیلا تھا۔ ملائم بھی ضرور ہو گا۔ منگو نے کانچ کی دیوار کو تاک لگاتے ہوئے سوچا۔

صاحب سے منگو کی کئی مہینے پرانی دوستی تھی۔ ہر روز منگو، صاحب کو دیکھنے آتا تھا مگر ان کے درمیان یہ کمبخت کانچ کی دیوار کھڑی تھی جو ان کو ملنے نہیں دیتی تھی۔ صاحب شیشے کی دیواروں کے اندر قید تھا۔ صاحب درزی کی دکان کے باہر نہیں آ سکتا تھا۔ منگو درزی کی دکان کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ صاحب کے کاٹھ کے بدن میں جان نہیں تھی۔ منگو کے بدن میں جان تو تھی مگر اس کی جیب میں دام نہیں تھے۔ سو دونوں مجبور تھے۔

منگو نے شیشے کی دیوار کے باہر ہی سے صاحب کے قد کو ناپ کر سوچا۔ ہم دونوں برابر ہی ہوں گے۔ صاحب کے کپڑے میرے بدن پر فٹ آ سکتے ہیں۔ "فٹ"! منگو نے سوچا یہ چھوٹا سا انگریزی کا لفظ بولنے ہی میں، نہیں سوچنے میں بھی کتنا اچھا لگتا ہے۔ "فٹ" جیسے ٹچ بٹن دبا کر لگانے کی آواز ٹچ۔ جیسے اس کے پلاسٹک کے تھیلے میں لگے ہوئے زپ کو کھینچنے کی آواز۔ زپ! ویسے ہی "فٹ"! جیسے صاحب کی ٹانگوں سے چپکی ہوئی پتلون۔ فٹ! جیسے صاحب کی چھاتی اور کمر پر منڈھا ہوا کوٹ۔ فٹ! جیسے صاحب کے سر پر بیٹھا ہوا ہیٹ۔ فٹ!

وہ صاحب کو سر سے لے کر پیر تک۔ ہیٹ سے لے کر جوتوں تک روز دیکھتا تھا۔ مگر اس کی نظر بار بار چمکیلے نیلے رنگ کی پتلون کی مہری پر جاتی تھی۔ جہاں کاغذ کی ایک پرچی لگی تھی جس پر انگریزی میں لکھا تھا۔ "ٹیری لین کی پتلون۔ اسی روپے۔"

اور جب وہ اس اسی روپے والی ٹیری لین کی پتلون کا مقابلہ اپنی ٹانگوں پر جھولتی ہوئی میلی ڈھیلی ڈھالی خاکی ڈبل زین کی پتلون سے کرتا تھا (جو اس نے کئی مہینے ہوئے بارہ روپے میں "ریڈی میڈ" خریدی تھی اور جو اس کے بدن پر بالکل "فٹ" نہیں تھی!) تو منگو کو ایسا لگتا تھا جیسے اس کی بیس سالہ زندگی کی ساری دوڑ دھوپ اسی ٹیری لین کی پتلون کو حاصل کرنے کے لئے تھی۔

منگو ہریانے کے ایک چھوٹے سے قصبے رہتک میں پیدا ہوا تھا۔ اس کو اپنا بچپن بہت کم یاد تھا۔ اس کی ماں تو منگو کے پیدا ہونے کے سال بھر بعد ہی مر گئی تھی۔ لیکن اس کو تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ بچپن میں وہ کوئی کھیل بھی کھیلتا تھا یا نہیں یا اس کے بچپن کے ساتھی اور دوست کون تھے۔ شاید کوئی تھے ہی نہیں لیکن اس کو اتنا ضرور یاد تھا کہ وہ کوئی پانچ برس کا تھا جب اس کے باپ نے اسے محلے کے میونسپل پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ داخلہ آسانی سے نہیں ہوا تھا۔ کئی بار اسے صبح سویرے اٹھ کر، منہ ہاتھ دھو کر گھر کی دھلی ہوئی دھوتی (جو اس کے

باپ کی پرانی دھوتی میں سے پھاڑ کر بنائی گئی تھی) اور قمیض پہن کر پہلی پہنک اور سلیٹ کو بغل میں دبا کر باپ کے ساتھ اسکول جانا پڑا تھا۔ تب جا کر ماسٹر جی نے رجسٹر میں اس کا نام لکھا تھا۔ مگر اگلے دن جب وہ اکیلا اسکول پہنچا تو اسکول کے چپراسی نے برآمدے میں پڑی ایک پھٹی ہوئی چٹائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہاں بیٹھ جا۔" اور منگو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جب دوسرے بچے اندر بنچوں اور ڈسکوں پر بیٹھے ہیں تو اس کو باہر برآمدے میں کیوں بٹھایا گیا ہے۔ اور ساری کلاس کے ساتھ وہ بھی "آ' آ۔ ای۔ ای۔ ا۔ او۔ " دو دونی چار" دو تیا چھ" چلا چلا کر یاد کرتا رہتا تھا۔ مگر اس کے چھوٹے سے سر میں ایک سوال شہد کی مکھی کی طرح بھن بھن کرتا رہتا۔ سب لڑکے اندر کمرے میں بنچوں پر بیٹھتے ہیں تو صرف مجھے ہی کیوں برآمدے میں گندی پھٹی چٹائی پر بیٹھنا پڑتا ہے؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ سوال کی زہریلی مکھی بھن بھناتی رہتی' کبھی کبھی ڈنک بھی مارتی' مگر نہ جانے کیوں اس کو یہ سوال زبان تک لاتے ہوئے ایسا عجیب ڈر لگتا تھا جیسا رات کے اندھیرے میں پرانے پیپل کے کھڑکھڑاتے ہوئے سائے میں بھوت سے ڈر لگتا ہے۔

پھر ایک دن کیا ہوا کہ اس کے باپ نے اسے معمول سے بھی سویرے سوتے سے جگا دیا اور جب وہ اسکول پہنچا تو اس نے دیکھا ابھی ایک بچہ بھی نہیں آیا۔ تینوں کمرے اور ان کے سامنے کا برآمدہ خالی پڑے تھے۔ اس کی کلاس کے کمرے کے دروازے کھلے تھے اندر بنچ اور ڈسک لائنوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا ایک بار جہاں اور لڑکے بیٹھتے ہیں وہاں بیٹھ کر تو دیکھوں۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ دبے پاؤں کمرے کے اندر گیا اور سب سے پچھلی لائن میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ سامنے ڈسک رکھا ہوا تھا جس میں روشنائی بھری دواتیں لگی ہوئی تھیں منگو نے ڈسک پر اپنی کتابیں اور تختی' سلیٹ' قلم' پنسلیں جما دیں۔ بنچ کے پیچھے لگی ہوئی لکڑی پر کمر ٹکا کر بغلوں میں ہاتھ دبا کر بڑی شان سے بیٹھ گیا۔

اس نے سوچا۔ "اگر ہر روز میں بھی یہاں بیٹھ جاؤں تو کیا ہرج ہے؟"

اور شاید اس ان کے سوال کے جواب میں چپراسی رام دین سر پر اپنا خاکی صافہ باندھتے ہوئے برابر کے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا اور منگو کو بنچ پر بیٹھا دیکھ کر چلا پڑا۔ "ابے او۔ تجھے یہاں بیٹھنے کو کس نے کہا ہے؟ اپنے ساتھ مجھے بھی پٹوائے گا۔"

عام طور سے رام دین' منگو سے بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا۔ ماسٹر جی کی طرح اس کے ہاتھوں پر قمچیاں نہیں مارتا تھا۔ سو منگو ڈر کے مارے ایک دم کھڑا نہیں ہو گیا۔ وہیں بیٹھا بیٹھا بولا "کاکا رام دین۔ میں یہاں کیوں نہیں بیٹھ سکتا؟ مجھے وہاں چٹائی پر کیوں بیٹھنا پڑتا ہے؟"

"اس لئے کہ تو اچھوت ہے" رام دین نے جواب دیا۔ منگو کو "اچھوت" کے معنی نہیں معلوم تھے مگر اسے یہ لفظ سنتے ہی اپنے آپ میں سے ایسی گھناؤنی بو آئی کہ وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور جلدی جلدی اپنی کتابیں سمیٹ کر برآمدے میں جا بیٹھا۔ مگر اس جلدی میں اس کی دھوتی کا سرا ڈسک میں لگی ایک کیل میں اٹک گیا۔ چرر سی آواز آئی اور منگو کی بائیں ٹانگ کولہے تک ننگی ہو گئی۔ پھٹی ہوئی دھوتی کو سنبھالتے ہوئے ابھی اس نے آلتی پالتی مار کر سامنے کتابیں رکھی ہی تھیں کہ رام دین نے اسکول کی گھنٹی بجانی شروع کی اور لڑکوں کی ٹولیاں بھاگ بھاگ کر اسکول میں آنے لگیں۔

لڑکے چھ کا پہاڑا یاد کرتے رہے۔ "چھ اکن چھ۔ چھ دونی بارہ' چھ تیا اٹھارہ۔" مگر منگو کے دماغ میں زہریلی شہد کی مکھی بھن بھناتی رہی۔ "اچھوت۔ اچھوت۔ اچھوت!"

لڑکے چلاتے رہے۔ "آج آم لا۔ کل کام پر جا۔ سچ بول' کم تول' وہ تیرا بھائی ہے تو اس کا بھائی ہے" مگر منگو کے کانوں میں سنائی دیتا رہا۔ "تو بنچ پر نہ بیٹھ۔ تو اچھوت ہے۔ گندی چٹائی پر بیٹھ۔ تو اچھوت ہے تو کسی کا بھائی نہیں ہے تو اچھوت ہے۔"

ماسٹر جی پوچھتے رہے "ہاں تو بچو بتاؤ۔ جھیل کیا ہوتی ہے؟ ساگر کیا ہوتا ہے۔ ٹاپو کیا ہوتا ہے؟"

اور منگو سنتا رہا۔ "ہاں تو بچو بتاؤ۔ اچھوت کیا ہوتا ہے؟ اچھوت کیا ہوتا ہے؟"

اور پھر ایک دم ماسٹر جی کی قمچی کی مار اس کی کمر پر پڑی۔ "اے منگو جواب نہیں دیتا۔ کیا سو رہا ہے؟ چل کھڑا ہو جا۔"

منگو گھبرا کر کھڑا ہوا تو دھوتی کا پھٹا ہوا پلو نیچے گر پڑا اور اس کی بائیں ٹانگ کولہے تک سب کے سامنے ننگی ہو گئی۔ سب بچے کھل کھلا کر

ہنس پڑے۔

ایک اور چھڑی کی مار منگو کی کمر پر پڑی اور اسے ایسے لگا جیسے ایک لمبی ڈنک والی بھڑ نے ایک دم اسے کاٹ لیا ہو ماسٹر جی نے چلا کر کہا۔

"پھر کبھی پھٹی دھوتی پہن کر آیا تو تجھے اسکول سے نکال دوں گا۔"

اسکول ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور سب بچے ہنستے شور مچاتے باہر بھاگے تو منگو نے انہیں غور سے دیکھا۔ ان میں سے ہر ایک قمیض اور نیکر پہنے ہوئے تھا۔ کوئی خاکی نیکر، کوئی نیلی نیکر، کسی کے پیروں میں موزے اور بوٹ تھے کسی کے پیروں میں چپل۔ مگر ننگے پاؤں کوئی نہیں تھا۔

اسکول سے گھر جاتے ہوئے منگو نے سوچا۔ "اچھوت وہ ہوتا ہے جو نیکر کی بجائے پھٹی ہوئی دھوتی پہنتا ہے اور ننگے پاؤں اسکول جاتا ہے اور اس نے گھر پہنچتے ہی باپ سے کہا "بابا۔ مجھے نیکر سلوا دو۔ اور چپل دلوا دو۔ میں ننگے پاؤں اسکول نہیں جاؤنگا۔"

تین دن کے بعد وہ نئے چپلوں کو چر چر کرتا نیلی کھدر کی نیکر پہن کر سویرے سویرے اسکول پہنچا اور رام دین سے پوچھا "کاکا اب تو میں اندر بیٹھ سکتا ہوں نا؟" اور رام دین نے چٹائی کی طرف اشارہ کر کے کہا "اپنی خیریت چاہتا ہے تو بیٹھ جا اپنی جگہ۔ نیکر پہن کر بھی تو ہے تو اچھوت۔"

اس دن اس نے باپ سے پوچھا "بابا! اچھوت کیا ہوتا ہے؟" باپ نے جو اس وقت سڑک پر جھاڑو دے کر آیا تھا جھاڑو ٹوکری پھینک کر جواب دیا۔ اچھوت وہ ہوتا ہے جسے کوئی اونچی جات والا چھو نہیں سکتا۔"

"مگر کیوں نہیں چھو سکتا؟ ہم میں کوئی گندگی ہے کیا؟"

"ہاں بیٹا۔ لگی تو ہے۔ ہم لوگ کوڑا کرکٹ جو اٹھاتے ہیں۔ ٹٹی صاف کرتے ہیں۔ گندی نالیاں دھوتے ہیں۔ سڑکوں پر جھاڑو دیتے ہیں۔ اس لئے ہم اچھوت ہیں۔"

منگو نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "تو پھر میں تو یہ گندا کام نہیں کروں گا۔"

اور باپ نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا "تو نہیں کرے گا تو اور کریں گے۔ یہ کام تو کسی نہ کسی کو کرنا ہی ہے اگر ہم یہ کام نہ کریں تو سڑکوں پر کوڑے کے ڈھیر لگ جائیں۔ ہر گھر میں ٹٹی اکٹھی ہو کر سڑاند آنے لگے۔ بیماریاں پھیل جائیں۔"

اس کا جواب منگو کے پاس نہیں تھا۔ مگر اس نے پھر کہا "میں تو کوئی اور کام کروں گا۔"

"تب ہی تو تجھے اسکول میں بھرتی کرایا ہے۔ چار جماعت پڑھ لے گا۔ تو تجھے دلی بھیج دوں گا۔ وہاں کچھ نہیں تو چپراسی کی نوکری مل جائے گی۔"

اور منگو نے کہا "چپراسی نہیں، میں بابو بنوں گا بابو۔"

منگو نے چار جماعتیں تو پڑھ لیں۔ مڈل اسکول میں بھی داخل ہو گیا۔ یہاں اس کو برآمدے میں چٹائی پر بیٹھنا نہیں پڑتا تھا کلاس روم میں ہی بنچ اور ڈسک پر دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ منگو کو اس کے باپ نے بتایا تھا کہ دیش آزاد ہو گیا ہے اور مہاتما گاندھی جی مرنے سے پہلے سب کو کہہ گئے ہیں کہ اچھوتوں کو اچھوت نہ کہیں "ہریجن" کہیں اور ان سے چھوت چھات نہ برتیں۔ سو سرکار نے ایک نیا قانون بھی بنا دیا تھا کہ چھوت چھات بند ہو جائے پر یہ قانون اسکول تک تو پہنچا تھا مگر ان کی بستی کے پاس جو اونچی جات والوں کا محلہ تھا اس کے کنوئیں تک نہیں پہنچا تھا۔ اچھوت "ہریجن" ہو گئے تھے مگر اس کنوئیں سے پانی نہیں بھر سکتے تھے۔ مڈل اسکول میں بھی دو چار دن تو منگو بہت خوش رہا کہ اب وہ بھی کرسی میز پر بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے لیکن چند روز کے بعد اسے عجیب سا لگا کہ ان کے کمرے میں دو دو لڑکے ایک ڈسک پر بیٹھتے ہیں لیکن منگو کے برابر جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے اور برابر والے ڈسک پر دو کے بجائے تین لڑکے پھنس پھنسا کر بیٹھتے ہیں۔

منگو نے مڈل پاس کیا تو باپ نے اسکول سے اٹھا لیا۔ ابھی وہ دلی جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا باپ بیٹھے بیٹھے میں مرگیا۔ یتیم منگو کو اس کے رشتہ دار میونسپلٹی میں بھنگی کی نوکری دلوانے کی سوچ رہے تھے کہ ان کی بستی کا ایک آدمی رلدو بمبئی سے واپس آیا، وہ وہاں کسی مل میں کام کرتا تھا۔ ایک دن منگو کو وہ راستے میں مل گیا تو اس نے پوچھا "کیوں منگو۔ بمبئی چلے گا؟"

سو رلدو نے اس کو بتایا کہ بمبئی میں وہ رلیا رام کہلاتا ہے۔ ایک مل میں کام کرتا ہے۔ جس چال میں وہ رہتا ہے وہاں ہر کوٹھری میں (جسے بمبئی کی بھاشا میں "کھولی" کہتے ہیں) بھانت بھانت جاتی کے لوگ رہتے ہیں کسی میں برہمن تو کسی میں شتری تو کسی میں مسلمان تو کسی میں کرستان' پارسی' سکھ' مدراسی' بنگالی اور تو اور رلدو عرف رلیا رام بھی وہیں رہتا ہے اور کسی نے آج تک اس سے یہ نہیں پوچھا کہ تو چھوت ہے یا اچھوت۔ "منگو' بمبئی میں سب لوگ رات دن کام کرنے میں جٹے رہتے' کسی کو ٹائم ہی نہیں ہے ایسے سوال و جواب کرنے کا۔"

پھر منگو نے پوچھا "مگر کھانے پینے میں تو چھوت چھات ضرور ہوتی ہوگی۔"

اور رلدو نے کہا۔ "ارے بمبئی کے ایرانی ہوٹلوں میں سب دھرم اور جات کے لوگ کھاتے پیتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کیا دھرم ہے کون جات ہو۔ بڑے شہر میں یہی تو مجا ہے۔ یہ چھوت چھات قصبوں اور دیہاتوں میں رہ گئی ہے۔"

رلدو واپس بمبئی گیا تو منگو بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔

پہلی بار وہ ریل میں بیٹھا تو اس کو ایسا لگا جیسے ریل نہیں چل رہی ساری دنیا پیچھے کو بھاگ رہی ہے۔ رہتک کے شہر' وہاں کا مکان' ہریجنوں کی بستی کی جھونپڑیاں' کنواں جہاں منگو کے بھائی بند پانی نہیں بھر سکتے۔ مڈل اسکول' پرائمری اسکول' منگو نے سوچا۔ میری ساری پرانی زندگی پیچھے کو جا رہی ہے صرف میں آگے جا رہا ہوں۔ آگے' جہاں بمبئی ہے وہ شہر جہاں عمارتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں جہاں رلدو رلیا رام کہلاتا ہے اور جہاں پہنچ کر منگو منگت سنگھ ہو جائے گا۔ "کوئی میری ذات بھی پوچھے گا تو کہہ دوں گا راجپوت ہوں۔" اس نے سوچ رکھا تھا۔

اس ریل کے سفر نے نہ صرف منگو کو رہتک سے بمبئی پہنچا دیا بلکہ اس کی سمجھ بوجھ کو بھی کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ریل سے زیادہ اہم منگو کو ریل کا پاخانہ لگا۔ جہاں ایک زنجیر کو کھینچنے سے ہر قسم کی گندگی کو بہا دیا جاتا ہے۔ منگو کو ایسا محسوس ہوا کہ اس زنجیر کے ساتھ اس کا اور اس جیسے کروڑوں ہریجنوں کا مستقبل بندھا ہوا ہے۔ اپنے باپ کی بات یاد کر کے اس نے سوچا۔ آج بابا مجھ سے پوچھتے اگر ہم یہ نہیں کریں گے تو صفائی کا کام کون کرے گا؟ تو میں جواب دیتا۔ ایک پانی کی ٹنکی اور ایک لوہے کی زنجیر یہ کام کرے گی۔ اور ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوت چھات سے آزاد کر دے گی۔

بمبئی پہنچ کر رلدو نے کہا۔ "منگو پہلا کام یہ کر کہ دو چار شرٹ پینٹ خرید لے۔ کرافورڈ مارکیٹ میں سلے سلائے کپڑے بکتے ہیں' اگلے دن ہی منگو نے دو ریڈی میڈ قمیض خریدیں اور دو پتلونیں۔ ڈبل زین کی۔ ایک خاکی ایک نیلی۔ پہلے دن ہی اسے ایسا لگا جیسے وہ ایک دم صاحب لوگ جیسا ہو گیا۔ رلدو کا ایک جان پہچان والا ایک صابن بنانے والی کمپنی کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ وہاں منگت سنگھ (یعنی منگو) کو چپراسی کی نوکری بھی مل گئی۔

منگو کو ایسا لگا کہ ایک شرٹ اور ایک پتلون نے اس کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ اب وہ ایرانی ہوٹل میں کھانا کھاتا۔ چوپاٹی پر راجستھانی چاٹ والوں سے چاٹ لے کر کھاتا۔ بوتل کو منہ لگا کر کوکا کولا پیتا اور کوئی اس سے یہ نہ پوچھتا کیوں بے تو اچھوت تو نہیں ہے؟

پھر جیسے جیسے اس دفتر میں دن گذرنے لگے اس کو آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ شرٹ' شرٹ میں اور پتلون' پتلون میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک اس کی ڈھیلی ڈھالی' میلی کچیلی پتلون تھی جو ہفتے میں ایک بار دھلتی تھی جس کی استری ایک دن بعد غائب ہو جاتی تھی دوسری منیجر صاحب کی پتلون تھی جس کی استری اتنی کیلی ہوتی تھی جیسے تلوار کی دھار۔ ایک رمیش بابو کی پتلون تھی جو نئے فیشن کے مطابق بندوق کے کندے کی طرح سڈول اور گاؤدم تھی یہاں تک کہ جوتے تک پہنچتے پہنچتے چوڑی دار پاجامے کی طرح پتلی اور تنگ ہو جاتی تھی اور تو اور ایک چندر اسٹینوگرافر کی پتلون تھی جو چمکیلے اور ملائم کپڑے کی تھی اور جو ہمیشہ ایسی لگتی تھی جیسے ابھی لانڈری سے ڈرائی کلین ہو کر آئی ہو۔

ایک دن منگو نے ہمت کر کے چندر سے پوچھ ہی لیا۔ تمہاری پتلون کی استری اتنے دنوں تک اتنی کڑک کیسے رہتی ہے؟ اور چندر نے بتایا کہ ایک نیا کپڑا ایجاد ہوا ہے جسے ٹیری لین کہتے ہیں جسے گھر میں دھو سکتے ہیں۔ لانڈری بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں اور جس کی پتلون بغیر استری کئے بھی ایسی لگتی ہے جیسے ابھی دھوبی نے استری کر کے دی ہو اور پھر اپنے دفتری سے چرچ گیٹ ریلوے اسٹیشن تک پیدل جاتے ہوئے منگو حسب

معمول راستے کی دکانوں میں سجے ہوئے سامان کو دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ اس کی ملاقات "صاحب" سے ہو گئی اور اس کو معلوم ہوا کہ ٹیری لین کی پتلون اسی روپے میں مل سکتی ہے۔

اس وقت تک منگو نے کسی لڑکی سے محبت نہیں کی تھی لیکن اس نے سنا تھا کہ جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو سوتے جاگتے ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتا ہے۔ تو پھر ضرور اسے بھی اس ٹیری لین کی پتلون سے محبت ہی ہو گئی ہو گی ورنہ یہ کیا کہ رات کو سوتے ہوئے خواب میں بھی اسے وہی دکھائی دیتی، کبھی وہ دیکھتا کہ ایک لق و دق میدان ہے جہاں ٹیری لین کی پتلون بن دھڑ کے آدمی کی طرح بھاگی چلی جا رہی ہے اور وہ اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ کبھی وہ پتلون ایک نیلے پروں والے پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی ہوا میں اڑ جاتی اور منگو اسے حسرت سے دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کبھی پتلون ایک نخریلی لڑکی کی طرح منگو کو اپنی طرف بلاتی مگر جب وہ اس کے پاس جا کر اسے چھونے کی کوشش کرتا وہ ایک جنگلی ہرن کی طرح چھلانگیں لگاتی ہوئی دور بھاگ جاتی اور بچنے کے زمین آسمان منگو پر ہنسنے لگتے اور پھر اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ لیٹا سوچتا رہتا کہ کہیں وہ پتلون بک تو نہیں گئی اور سو وقت سے بھی پہلے ہی وہ دفتر کے لئے روانہ ہو جاتا مگر جب وہ درزی کی دکان کے سامنے پہنچتا تو دیکھتا کہ "صاحب" وہاں اسی طرح کھڑا اپنی کانچ کی نیلی نیلی آنکھوں سے اسے دیکھ کر مسکرا رہا ہے، اس کے سر پر وہی ہیٹ ہے۔ اس کے بدن پر وہی چار خانے کا کوٹ اور وہی نیلی چمکیلی ٹیری لین کی پتلون ہے اور پتلون پر وہی پرچی لگی ہوئی ہے جس پر لکھا ہے "ٹیری لین کی پتلون قیمت اسی روپے۔"

اسی روپے! منگو نے سنا تھا کہ ان کے دفتر کا بڑا منیجر ایک دن میں اسی روپے کی شراب پی جاتا ہے۔ اسسٹنٹ منیجر مہینے میں اسی روپے کی سگریٹ پھونک دیتا ہے۔ مگر منگو کو تو مہنگائی الاؤنس ملا کر کل ملتے ہی تھے اسی روپے۔ اس میں سے وہ بیس روپے مہینہ کھولی میں رہنے کا کرایہ دیتا ہے جہاں وہ اور رلدو اور ان جیسے دو اور زمین پر سوتے تھے۔ چال پرانی تھی۔ ایسا لگتا تھا اگلی برسات میں گر جائے گی۔ کھولی اندھیری تھی۔ اتنی چھوٹی کہ چار آدمی جب سوتے تھے تو اس طرح کہ ایک کی ٹانگیں دوسرے کے سر سے ٹکراتی تھیں مگر کنوئیں سے پانی بھر کے لانا نہیں پڑتا تھا۔ کھولی کے ایک کونے میں موری تھی جہاں پانی کا نل لگا ہوا تھا۔ برآمدے کے پرلے کنارے پر دو پاخانے تھے ان کی صفائی کے لئے ہریجن بھنگی ٹوکرا جھاڑو لئے نہیں آتے تھے۔ پانی کی ٹنکی لگی تھی اور اس میں ایک زنجیر۔ زنجیر کھینچتے ہی پانی کا ایک ریلا آتا تھا اور گندگی کو بہا کر لے جاتا تھا اور منگو کو ایسا لگتا تھا وہ پانی کا ریلا ساتھ میں اس گندگی کو بھی بہا کر لے جاتا ہے جو منگو کی ساری جاتی پر ہزاروں برس سے لگی ہوئی تھی۔ اور اس کو چال میں صرف سونے کی جگہ کے بیس روپے مہینہ دینا منظور تھا مگر دس روپے مہینہ پر کسی جھونپڑی میں رہنا منظور نہیں تھا کیونکہ وہاں پاخانے میں پانی کی ٹنکی اور زنجیر لگی ہوئی نہیں تھی۔

سو اسی روپے میں بیس روپے کرائے کے دیتا، ساڑھے سات روپے مہینے کا اس کا ریلوے پاس تھا، ڈیڑھ روپیہ روز کھانے پر بھی لگتا تھا۔ مشکل سے اتنا بچتا تھا کہ وہ مہینے میں ایک بار کوئی فلم دیکھ سکے۔ اب اسی روپے کی ٹیری لین کی پتلون خریدے تو کیسے خریدے؟ سو اس نے تنخواہ ملتے ہی سیونگ بینک میں حساب کھول لیا اور فیصلہ کر لیا کہ ہر مہینے بیس روپے مہینہ بچا کر اس میں ضرور ڈالے گا۔ سینما جانا اس نے بالکل بند کر دیا۔ دوپہر کے کھانے کے بجائے کبھی دو کیلے کبھی ڈبل روٹی کھا کر ایک پیالی چائے پی لیتا۔ دفتر سے کہیں کام پر جانے کے لئے بس کا کرایہ ملتا تو وہ پیدل جاتا آتا اور کرائے کے پیسے بچا کر سیونگ بنک میں ڈال دیتا۔

ابھی بینک میں ساٹھ روپے ہی جمع ہوئے تھے کہ ٹیری لین کی پتلون خریدنا اور بھی ضروری ہو گیا۔ ان کے دفتر میں ایک نئی اسٹینوگرافر آئی تھی۔ مس کملا راٹھور، جو منگو کو بہت اچھی لگتی تھی۔ دبلی پتلی سانولی۔ مگر اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت تھیں اور اس کے سینے پر پڑی ہوئی دو چوٹیاں (جن میں کبھی گلابی کبھی نیلے ربن بندھے ہوتے تھے) منگو کو بہت اچھی لگتی تھیں۔ کملا کی پتلی لمبی انگلیوں میں جادو تھا۔ وہ ٹائپ رائٹر پر بجلی کی رفتار سے چلتی تھیں۔ منگو جب بھی کام سے خالی ہوتا وہ اپنے اسٹول پر بیٹھا بیٹھا کملا کو ٹائپ کرتے دیکھا کرتا تھا۔ اس کا اسٹول جس کونے میں تھا وہ کملا کی ٹیبل سے دور نہیں تھا لیکن پھر بھی ہر روز منگو اسکو دو چار انچ اور سرکا لیتا تھا یہاں تک کہ اب وہ اپنی جگہ پر بیٹھا بیٹھا نہ صرف کملا کو دیکھ سکتا تھا بلکہ اس کی بھینی بھینی خوشبو کو بھی سونگھ سکتا تھا۔ جس میں لکس ٹائلٹ سوپ اور کسی پاؤڈر کے علاوہ جوانی

کے پسینے کی سگندھ بھی شامل تھی۔

ایک دن کملا نے ٹائپ رائٹر کی مشین میں سے کاغذ نکالتے ہوئے گھنٹی بجائی تو منگو لپک کر اٹھا۔ "یہ چٹھی اندر صاحب کو دیدو۔" کملا نے کاغذ پکڑاتے ہوئے منگو سے کہا' کاغذ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گئے تو ان کی انگلیاں چھو گئیں اور منگو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سارے بدن میں بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔

دفتر میں ایک بوڑھا ہیڈ چپراسی تھا جو حوالدار کہلاتا تھا۔ ایک دن اس نے منگو کو الگ لے جا کر کہا۔ "بیٹا منگت۔ یہ تیری نجر کدھر پھسل رہی ہے' بیٹا؟ تجھ سے عمر میں کم سے کم چھ برس بڑی ہے۔"

منگو نے سوچا۔ یہ بڈھا جوانی سے جلتا ہے۔ مجھے تو کملا اتنی بڑی نہیں لگتی۔ مجھ سے بڑی ہوتی تو اس کو دیکھ کر میرا دل کیوں دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے؟

پھر ایک دن جب دفتر کے سب لوگ لنچ کی چھٹی میں آس پاس کے چھوٹے موٹے ہوٹلوں میں گئے ہوئے تھے' منگو نے دیکھا کملا اپنی میز پر ہی بیٹھی ایک کاغذ کے پیکٹ میں سے پوری بھاجی نکال کر کھا رہی ہے۔ منگو اپنے اسٹول پر ہی بیٹھا ڈبل روٹی اور کیلے کھا رہا تھا اس نے کملا کی طرف دیکھ کر کہا "کیوں جی آپ کھانا گھر سے لاتی ہیں؟"

کملا نے کھاتے کھاتے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔

"یہ کیلا کھائیں گی؟"

کملا پہلے تو ہچکچائی پھر مسکرا کر اس نے کیلا لے لیا۔

"تم پوری کھاؤ گے؟"

"کھا لوں گا جی۔"

دو پوریوں پر بھاجی رکھتے ہوئے کملا نے پوچھا۔ "چھوت چھات کا خیال تو نہیں ہے؟" اور جب منگو نے سر ہلا کر نہیں کہا تو کملا بولی۔

"کون جات ہو؟" اس سوال کے لئے تو منگو تیار ہی رہتا تھا۔ کھٹ سے اس نے جواب دیا "راجپوت۔"

"بہت اچھا" کملا نے جواب دیا۔ "ہم بھی راجپوت ہیں۔ لو پوری کھاؤ۔"

ابھی کملا سے منگو کی بات چیت کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ ایک دن اتوار کو رلدو منگو کو جوہو لے گیا۔ "جوہو بڑی خوبصورت جگہ ہے۔" رلدو نے کہا "اور پھر وہاں میرے سگے والے رہتے ہیں۔ کھانا بھی وہیں کھائیں گے۔"

منگو کو اتنے مہینے بمبئی میں رہتے ہو گئے تھے لیکن اس نے اب تک جوہو کی سیر نہیں کی تھی۔ دیکھا تو خوش ہو گیا سمندر کا کنارہ۔ نرم نرم ریت۔ اونچے اونچے ناریل کے پیڑ۔ بھیل پوری والوں کی دکانیں۔ رنگین ساڑھیاں' شلوار قمیض والیوں کے ہوا میں لہراتے ہوئے ڈوپٹے۔ منگو نے سوچا ایک دن کملا کو جوہو کی سیر کرانی چاہئے۔

جوہو ہوٹل اور سن اینڈ سینڈ ہوٹل کے سامنے سے گذرتے ہوئے وہ سمندر کے کنارے کنارے جا رہے تھے کہ ناریلوں کے جھنڈ میں ایک دو منزل کی بلڈنگ نظر آئی۔ رلدو نے کہا۔ "وہاں ہمارے سگے والے رہتے ہیں۔"

پہلے تو منگو نے سوچا۔ "رلدو کے سگے والے رہتے ہیں' ہے تو بڑی خوبصورت جگہ۔" بلڈنگ بھی پکی تھی اور ان کی چال کی طرح پرانی اور بوسیدہ نہیں تھی۔ مگر باہر ناریلوں کے جھنڈ میں تین بڑی بڑی موٹر ٹرکیں کھڑی تھیں۔ دو بند اور ایک کھلی ہوئی مگر تینوں میں سے بڑی بدبو آ رہی تھی جیسے دنیا بھر کی گندگی ان ٹرکوں میں بھری ہوئی۔ جب وہ ان کے پاس سے گذرے تو منگو نے دیکھا کہ کھلی ہوئی ٹرک گندے بدبودار کپڑے سے بھری ہوئی ہے۔ ایک کالا سا دبلا سا آدمی اوور آل پہنے اس کے پاس کھڑا ہوا بیڑی پی رہا ہے۔

منگو نے پوچھا۔ "یہاں کون رہتا ہے؟"

رلدو نے کہا۔ "یہاں ہم رہتے ہیں۔"

یہ بلڈنگ میونسپل کارپوریشن کی بنائی ہوئی تھی پکی بلڈنگ۔ ناریلوں کے جھنڈ میں سمندر کے کنارے بڑی خوبصورت جگہ۔ منگو کو رلدو نے بتایا کہ یہاں میونسپلٹی کے محکمہ صفائی کے مزدور رہتے ہیں یعنی بھنگی۔ "ہمارے تمہارے جیسے ہریجن۔"

"مگر" منگو نے حیرت سے پوچھا۔ "اب تو صفائی کا کام مشینوں سے ہوتا ہے۔ ہر گھر کے پاخانے میں گندگی بہانے کو پانی کی ٹنکی اور زنجیر لگی ہے اب تو یہ کام کوئی بھی کر سکتا ہے؟"

رلدو نے منگو کو ایسے دیکھا جیسے وہ اسے پاگل سمجھتا ہو۔ "منگو۔ یہ کام ہمارے سوا اور کوئی نہیں کرتا' اور کوئی نہیں کر سکتا۔ گندے گٹروں کے اندر ہمارے سوا اور کون گھسے گا۔ سڑک کے کنارے پڑے مرے ہوئے چوہے کون اٹھائے گا جھاڑو کون دے گا سارے شہر کے کوڑے کے ڈھیروں کو ٹرکوں میں ڈال کر کوڑی گاہ ڈالنے جائے گا۔ سوائے ان کے جن کے باپ دادا نے سینکڑوں برس سے یہی کام کیا ہے؟"

منگو نے کہا "پھر تو ہم وہیں کے وہیں ہیں' سوائے اس کے کہ پہلے کوڑے کرکٹ کو ٹوکروں میں اٹھاتے تھے اب ٹرک میں بھر کر لے جاتے ہیں۔"

رلدو نے کہا "منگو بیٹا یہ بھی کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ تو نے کبھی کوڑے کا ٹوکرا نہیں اٹھایا اس لئے تو نہیں جانتا ٹرک چلانا کتنی بڑی بات ہے۔"

اتنی دیر میں وہ دبلا سا سوکھا آدمی جو میلا اوور آل پہنے کھڑا تھا اس نے اپنی بیڑی زمین پر پھینکی 'کود کر ٹرک میں چڑھا' دھڑ سے دروازہ بند کیا اور بڑے زور سے انجن کو اسٹارٹ کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ گندگی سے بھرے ٹرک پر نہیں راجہ جی کے ہاتھی پر بیٹھا ہو۔

اب وہ بلڈنگ کے زینے پر چڑھ رہے تھے۔ منگو نے سوچا ہے' یہ بھی بھنگیوں کی بستی مگر ہماری حصار والی جھونپڑیوں سے تو بہتر ہے چھوٹے چھوٹے مگر صاف ستھرے کمرے تھے۔ رلدو نے بتایا میونسپلٹی کرایہ بھی بہت کم لیتی ہے صرف چھ روپے مہینہ۔ برآمدے میں لٹکے ہوئے گملوں میں پھول کھلے ہوئے تھے پھول شاید خوشبودار بھی تھے مگر نیچے کھڑے ہوئے ٹرک کی پھیلی ہوئی بدبو میں ان پھولوں کی خوشبو دبی ہوئی تھی۔

رلدو نے منگو کو اپنے سگے والے سے ملایا۔ منسا رام کو دیکھ کر منگو کو اپنا باپ یاد آگیا۔ چہرے پر ویسے ہی زندگی بھر کی محنت کی گہری لکیریں پڑی ہوئی تھیں اسی طرح بڑھاپے سے کمر جھکی ہوئی تھی۔ منسا رام ایک کمرے میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔ بیوی بازار گئی ہوئی تھی۔ بیٹی کونے میں بیٹھی ہوئی اسکول کا سبق یاد کر رہی تھی۔ "اری او منگتی۔ ادھر آ مہمان آئے ہیں۔ چائے بنا لے۔" لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی تو منگو نے دیکھا پندرہ سولہ برس کی سانولی سی لڑکی ہے۔ گھر کا دھلا ہوا اسکول کی یونیفارم کا نیلا فراک پہنے ہوئے وہ بالکل بچی لگتی تھی۔

"اری رلدو کاکا کو تو پہچانتی ہے نا اور یہ منگو بھی اپنے حصار کا ہی ہے اپنی برادری کا۔"

منگتی نے دونوں کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور منگو کی ہمت نہیں ہوئی کہ منسا رام سے کہے "بمبئی میں میرا نام منگو نہیں ہے۔ منگت سنگھ ہے۔" کیونکہ پھر یہ بھی کہنا پڑتا۔ "میں تمہاری برادری سے نہیں ہوں 'منسا رام جی۔"

منگتی چائے بنانے کے لئے تیل کا چولہا جلا رہی تھی اور منسا رام بیٹی کی تعریف کئے جا رہا تھا۔ "چھٹی کلاس میں پڑھتی ہے بڑی ہوشیار ہے۔ سب کے خط پتر یہی پڑھ کر سناتی ہے۔ ہندی کی کتنی ہی کویتائیں تو منہ زبانی یاد ہیں۔ گھر کے کام کاج میں بھی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے اسکول کی ماسٹرنی تو کہتی ہے اسے میٹرک تک پڑھاؤ مگر رلدو بھیا تو ہی بتا چھوکری اتنا پڑھ لکھ کر کیا کرے گی۔ اس کی ماں تو کہتی ہے اب کی دیوالی پر اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔"

اور یہ کہہ کر نہ جانے کیوں منسا رام نے منگو کی طرف دیکھا اور منگو نے منگتی کی طرف اور منگتی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی پیالیاں آپ سے آپ کھنکنے لگیں اور پیالی منگو کو پکڑاتے ہی وہ بھاگ گئی۔

واپسی میں وہ بس اسٹینڈ پر پہنچے تو دیکھا بڑا لمبا کیو لگا ہوا ہے۔ اتوار کے دن جو ہو پر بڑی بھیڑ ہوتی ہے اور شام ہوتے ہی سب شہر لوٹنے کی

سوچتے ہیں۔

منگو نے کہا۔ "رلدو کاکا۔ آج تو پھنس گئے۔ کم سے کم تین بسوں کے بعد اپنا نمبر آئے گا۔"

اتنے میں بدبو کے ایک جھٹکے کے ساتھ ایک کچرے کی ٹرک آ کر بس اسٹینڈ کے سامنے کھڑی ہو گئی جس کو دیکھتے ہی کتنے ہی آدمیوں نے اپنی اپنی ناک بند کر لی۔ ایک میم صاحب نے سینٹ لگا رومال اپنی ناک کے آگے ہلانا شروع کر دیا۔

"اے ڈرائیور۔ یہ کچرا گاڑی یہاں سے ہٹاؤ۔"

ڈرائیور جو ایک ہٹا کٹا جوان تھا اور اوور آل کو اس شان سے پہنے تھا جیسے وہ ملٹری کی یونیفارم ہو' اپنے دانت چمکاتے ہوئے بولا "ارے تو اس کچرے کے ڈھیر کو تمہارا باپ اٹھائے گا یہاں سے ؟"

اور جب تک کچرا ٹرک میں نہیں بھرا گیا وہ ٹرک وہیں کھڑی رہی اور میم صاحب کی ناک کے سامنے سینٹ بھرا رومال جھولتا رہا۔ یہاں تک کہ سینٹ ہوا میں اڑ گیا اور صرف کچرے کی بو رہ گئی۔

ٹرک اسٹارٹ کرتے ہوئے ڈرائیور نے رلدو سے پوچھا۔ "کیوں کاکا کہو تو ریل تک چھوڑ دوں۔"

رلدو نے منگو کی طرف دیکھا۔ منگو نے لبے کیو کو دیکھا' پھر وہ دونوں ٹرک میں ڈرائیور کے برابر بیٹھ گئے۔ ٹرک روانہ ہو گئی اور تب میم صاحب رومال بیگ میں واپس رکھتے ہوئے بولیں۔ "ان بھنگی لوگوں کا بھی کتنا دماغ ہو گیا ہے!"

اگلے دن منگو دفتر جانے سے پہلے خوب صابن سے رگڑ رگڑ کر نہایا' پھر دھوبی کے دھلے کپڑے پہنے' مگر پھر بھی جب وہ دفتر میں پہنچا اور کملا نے اس کی طرف مسکرا کر دھیرے سے کہا "ہیلو" تو بڑی دیر تک وہ کملا کی ٹیبل سے دور ہی دور رہا کہ کہیں اب تک اس میں کچرا گاڑی کی بو تو نہیں سمائی ہوئی ہے اور دل ہی دل میں وہ سوچتا رہا۔ "اگر کبھی کملا نے وہ بدبو سونگھ لی تو پھر کبھی مجھ سے مسکرا کر بات نہیں کرے گی۔"

چند روز کے بعد رلدو نے پوچھا۔ "کیوں' منگو' منگتی کیسی لگی ؟"

"کون' وہ منسا رام جی کی چھوکری ؟ ٹھیک ہی ہے!"

"منگو اور منگتی۔ تمہاری جوڑی اچھی رہے گی نا ؟"

منگو کو ایسا لگا جیسے اسے کسی نے گالی دی ہو۔ "کاکا کیا بات کر رہے ہو ؟"

"کیوں کیا ہوا ؟ چھوکری جوان ہے صورت شکل کی بری نہیں۔ چھ کلاس پڑھی بھی ہے۔"

منگو کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ "مگر ہے تو بھنگی کی ہے ؟"

رلدو کو پہلے تو ایسا لگا جیسے منگو نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا ہو۔ پھر وہ غصے کو پی کر بولا "اور تو کس کا بیٹا ہے؟"

"کچھ بھی ہو کاکا میں بھنگیوں میں بیاہ نہیں کروں گا۔" اور یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کھولی سے باہر نکل گیا۔ سیڑھیوں سے اترتا ہوا چال سے باہر نکل گیا۔ نہ جانے کب تک سڑکوں پر گھومتا رہا۔ تھک کر ٹھہرا تو دیکھا شیشے کی دیوار کے پیچھے "صاحب" ٹیری لین کی پتلون پہنے کھڑا مسکرا رہا ہے' شاید اسے بلا رہا ہے' کچھ یاد دلا رہا ہے۔

منگو نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیونگ بینک کی کتاب نکالی۔ اب اس کے حساب میں پچھتر روپے جمع ہو چکے تھے اس نے سوچا۔ "صرف پانچ روپے کی کسر ہے۔"

دوپہر کو دفتر کی سب میزیں خالی پڑی تھیں۔ صرف کملا اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ منگو دفتر کی کینٹین سے چائے پی کر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پیالی تھی جو اس نے کملا کے سامنے رکھ دی۔

"تھینک یو" کہہ کر کملا چائے پینے لگی تو منگو نے ایک اخبار جیب سے نکالا اور کملا کی طرف دیکھے بغیر ہی بولا۔

"ناز میں "آؤ پیار کریں" لگی ہے۔"

"سنا ہے اچھی مزیدار فلم ہے۔"

"اس اتوار کو دیکھنے چلوگی؟"

"پتا جی سے پوچھنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ہاں کہی تو جا سکتی ہوں۔"

"پھر پوچھ کر کل بتانا۔"

اگلے دن کملا نے منگو سے کہا۔ "اتوار کو تمہیں میرے گھر آنا ہوگا۔"

"اور فلم دیکھنے نہیں چلوگی؟"

"پہلے پتا جی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"تو میں ساڑھے چار بجے آجاؤں گا۔ تمہارے پتا جی سے مل کر چھ بجے سینما پہنچ سکتے ہیں۔"

اگلے دن منگو نے بینک سے پچھتر روپئے نکال لئے۔ پندرہ روپئے دفتر کے کیشیئر سے ایڈوانس لئے۔

کام ختم ہوتے ہی وہ چرچ گیٹ اسٹریٹ کی طرف بھاگا۔

شیشے کی دیوار کے پیچھے کھڑا "صاحب" اپنی نیلی کانچ کی آنکھوں سے اب بھی گھور رہا تھا۔

لیکن آج ان کے درمیان یہ شیشے کی دیوار نہیں رہے گی۔ منگو نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کرارے نوٹوں کو چھو کر اطمینان کیا اور پھر دکان میں داخل ہو گیا۔

"مجھے ٹیری لین کی پتلون چاہئے۔"

"کپڑا پسند کرلیجے۔"

"بس وہ چاہئے ریڈی میڈ جو صاحب پہنے ہوئے ہے۔"

"صاحب۔ اوہ وہ ڈمی کو جو پہنائی ہوئی ہے۔ میں ابھی لاتا ہوں۔ آپ فٹنگ روم میں جایئے ٹرائی کرلیجے۔"

درزی پتلون لے آیا۔ پہننے سے پہلے منگو نے کپڑے کو چھو کر دیکھا۔ سچ مچ بڑا ملائم تھا۔ اپنی خاکی ڈبل زین کی پتلون اتار کر اس نے نئی پتلون پہن کر دیکھی۔ بالکل فٹ۔

جیسے بٹن۔ جیسے زپ۔ ویسے ہی فٹ!

جیبوں میں ہاتھ ڈالا تو چکنی سلک کے استر پر ہاتھ پھسل گیا۔ واہ واہ اس نے سوچا۔ کیا پتلون ہے۔

درزی نے کہا۔ "صاحب۔ آئینے میں دیکھ لیجئے ایسا لگتا ہے آپ کے لئے ہی سلی ہے۔"

منگو نے آئینہ دیکھا تو وہاں حصار کے بھنگی واڑے والے منگو کے بجائے ایک کالے بالوں' سانولی رنگت کا صاحب کھڑا تھا۔ جس کی ٹانگوں میں نیلی ٹیری لین کی پتلون تھی۔ پتلون پر کاغذ کی پرچی لگی ہوئی تھی۔ ٹیری لین کی پتلون۔ قیمت اسی روپئے۔ اب مجھ میں اور صاحب میں فرق بھی کیا ہے؟

اس نے درزی سے کہا۔ "یہ لیجئے اسی روپئے اور پتلون کو کاغذ میں لپیٹ دیجئے۔"

کاغذ کے تھیلے میں ٹیری لین کی پتلون لئے منگو باہر نکلا تو ایسا لگا اتنی دیر میں دنیا ہی بدل گئی ہے۔ وہی چرچ گیٹ اسٹریٹ ہے مگر آج چہل پہل ہی الگ ہے۔ ہر آدمی خوش دکھائی دیا۔ ہر عورت خوبصورت۔ فلورا فاؤنٹن کے فوارے چل رہے تھے۔ دور سمندر کی طرف آسمان پر رنگ برنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے اور سڑکوں کی نیلی نیلی روشنیاں ایک ایک کر کے جلتی جا رہی تھیں۔ اب وہ خود بھی تو بدل گیا تھا۔ اب نہ وہ ایک بھنگی کا چھوکرا تھا۔ جس کو اسکول میں سب سے الگ ٹاٹ پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ نہ وہ ماڈرن سوپ کمپنی لمیٹڈ کے ہیڈ آفس کا آفس بوائے یعنی چپراسی تھا۔ اب وہ مسٹر منگت سنگھ تھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک بڑا موٹے کاغذ کا تھیلا تھا جس پر ایک بہت بڑی درزی کی دکان کا نام اور پتہ چھپا

ہوا تھا اور اس کاغذ کے تھیلے میں ایک ٹیری لین کی پتلون تھی۔

اس رات کو منگو کو کتنی ہی دیر نیند نہ آئی۔ وہ لیٹا لیٹا اپنی ٹیری لین کی پتلون کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے ساتھ شرٹ بھی بڑھیا ہونی چاہئے اور جوتا بھی نیا ہو تو اچھا ہے پھر وہ یہ سب پہن کر کملا کے گھر جائے گا۔ اس کے پتا سے ملے گا تو وہ بھی اس کے کپڑے دیکھ کر مان جائیں گے۔ لڑکا ضرور کسی بڑے اونچے گھرانے کا ہے۔ فوراً بیٹی کو اس کے ساتھ سینما جانے کی اجازت دے دیں گے۔ پہلے دو چار مہینے وہ دونوں سینما یا شام کو اکٹھے جایا کریں گے پھر ایک دن سارا اتوار جوہو پر گذاریں گے۔ سمندر کی لہروں میں ڈبکیاں لگائیں گے۔ ناریل کا پانی پئیں گے اور مسالے دار چاٹ کھائیں گے اور شام کو جوہو ہوٹل یا سن اینڈ سینڈ میں چائے پئیں گے، پھر ٹیکسی لے کر واپس ہوں گے اور راستے میں منگو کملا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہے گا۔ "کملا کیا تم میری۔۔۔۔؟"

مگر اس وقت تک وہ سو چکا تھا اور خواب میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی ٹیری لین کی پتلون ایک نیلے رنگ کا ہوائی جہاز بن گئی ہے اور وہ اس پر سوار ہو کر نیلے آسمان پر اڑتا ہوا کملا کے گھر کی طرف جا رہا ہے۔

اتوار کو ٹھیک ساڑھے چار بجے اپنے نئے بوٹ چرمراتا ہوا منگو کملا کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا دروازے پر کملا کے پتا کے نام کی تختی تھی اور ساتھ میں گھنٹی بھی لگی تھی کملا کے پتا جی نے خود دروازہ کھولا تو دیکھا ایک کسی قدر گھبرایا ہوا سا مگر اچھی صورت شکل کا بڑے صاف ستھرے کپڑے پہنے نوجوان باہر کھڑا ہے۔

"جی وہ مجھے مس کملا نے۔"

آؤ بھئی آؤ اندر آؤ۔ کملا تیار ہو رہی ہے۔ تم ادھر بیٹھو۔"

چھوٹی سی فلیٹ تھی اور اس کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔ وہیں کملا کے پتا نے منگو کو بٹھایا۔

منگو اپنی نئی ٹیری لین کی پتلون کی سلوٹ کو سنبھالتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کملا کے پتا جی غور سے اس کے منہ کو دیکھ رہے تھے اور منگو سوچ رہا تھا یہ بڑے میاں میری ٹیری لین کی پتلون کی طرف کیوں نہیں دیکھتے۔

"کہو بھئی تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی منگت سنگھ"

"سنگھ، تو تم بھی راجپوت ہو کیا؟"

"جی ہاں ہم راجپوت ہی ہیں۔"

"چندر بنسی یا سورج بنسی۔"

منگو یہ سوال سن کر بوکھلا گیا۔ پھر بات بناتے ہوئے اس نے کہا۔ "جی یہ سب تو پتا جی کو معلوم تھا۔۔۔"

"تمہارے پتا گذر گئے ہیں کیا؟"

"جی ایک برس ہوئے ان کا دیہانت ہو گیا۔"

"بڑا افسوس ہے کیا کام کرتے تھے تمہارے پتا جی؟"

"منگو نے اس سوال کا جواب پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ جلدی سے بولا۔

"جی وہ میونسپل کمیٹی میں نوکر تھے۔"

"تم کیا کرتے ہو؟"

"جی میں اسی دفتر میں کام کرتا ہوں جہاں کملا۔ مس کملا جی۔۔۔"

"ہاں مگر کیا کام کرتے ہو؟ تم بھی اسٹینوگرافر ہو؟"

"جی نہیں۔ اسٹینو گرافر تو نہیں۔"

"پھر کیا معمولی کلرک ہو؟" کملا کے پتا جی کی آواز میں ایک عجیب سے برفیلی ٹھنڈک بڑھتی جا رہی تھی۔

"جی نہیں کلرک بھی نہیں ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں تو ابھی ۔۔ آفس بوائے ہوں۔"

"آفس بوائے؟ یعنی چپراسی۔"

"جی ہی سمجھ لیجئے مگر ہمیں آفس بوائے ہی بولتے ہیں۔"

"پگھار کیا ملتی ہے؟"

"اسی روپئے" منگو نے جواب دیا۔ مگر اس کا جی چاہتا تھا کہے "بڑے میاں اسی روپئے تنخواہ ملتی ہے تو کیا ہے میرا دل کتنا بڑا ہے یہ تو دیکھو۔ میری اسی روپئے کی ٹیری لین کی پتلون کو غور سے دیکھو کسی بھی صاحب سے کم نہیں ہوں۔ آج اسی روپئے ملتے ہیں تو کیا ہوا۔ کل دیکھو کتنی ترقی کرتا ہوں۔"

"ہوں!" کملا کے پتا نے برف سے بھی ٹھنڈی آواز میں کہا اور اٹھ کر اندر چلے گئے۔

تھوڑی دیر میں کملا اکیلی باہر آئی۔ نائلون کی نیلی ساڑھی پہنے۔ بالوں میں نیلے ربن لگائے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ منگو کا جی چاہا۔ کہے "کملا۔ دیکھو۔ تمہاری نیلی ساڑھی اور نیلے ربن کی طرح میری ٹیری لین کی پتلون بھی نیلی ہے!" لیکن کملا کی آنکھوں کا سرمہ گالوں کے پاؤڈر پر پھیل رہا تھا اور گلابی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ابھی ابھی رو کر آنسو پونچھے ہیں۔

"سوری منگو" وہ بولی۔ "پتا جی سینما جانے کو منع کر رہے ہیں۔ تم جاؤ۔"

منگو دروازے سے باہر نکل رہا تھا کہ اندر سے کچھ سن کر ٹھٹک گیا۔ اندر کملا کے ماتا پتا جھگڑ رہے تھے اور ان کی آوازیں دروازے کے باہر بھی منگو کا پیچھا کرتی رہیں۔

ماں کہہ رہی تھی۔ "مجھے تو لڑکا ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔ کپڑے بھی اچھے پہنے ہوئے ہے۔ مگر تمہیں تو کوئی پسند ہی نہیں آتا۔ چوبیس برس کی تو ہو گئی۔ عمر بھر کنواری بٹھائے رکھو گے کیا؟"

اور باپ کہہ رہا تھا۔ "کنواری بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے۔ میں اسی روپلی پانے والے چپراسی سے تو اپنی لڑکی نہیں بیاہ سکتا!"

سڑک پر نکل کر منگو نے پتلون کی ریشمی جیب میں ہاتھ ڈالا اور "آؤ پیار کریں" کے دونوں ٹکٹ نکال کر پھاڑ ڈالے۔

ابھی اسٹیشن کی طرف جانے کے لئے سڑک پر مڑا ہی تھا کہ ایک بدبو کا جھپکا آیا اور ایک کچرے کی ٹرک پاس سے گذر گئی۔ منگو نے سوچا۔ اس نئی ٹیری لین کی پتلون کے باوجود میرے اندر کوئی بدبو بسی ہوئی ہے کیونکہ کملا کے پتا نے اسے سونگھ کر مجھے باہر نکال دیا۔

اسٹیشن پر چائے کی دکان پر کھڑے ہوئے اس نے سامنے لگے ہوئے قد آدم آئینے میں اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ بالکل صاحب لگتا ہوں آسمانی رنگ کی دس روپئے کی شرٹ۔ اسی روپئے کی ٹیری لین کی پتلون۔ مجھ میں کیا برائی نظر آئی؟

اسی روپئے!! اسی روپئے کی پتلون!! اسی روپئے پگھار! جات پات کی گندگی کو تو زنجیر کھینچنے سے پانی کا ریلا بہا کر لے گیا' لیکن اسی روپئے پگھار کے کلنک کو کون سا گنگا جل دھو سکتا ہے؟ چائے پی کر پیالی واپس کرتے ہوئے اس نے سوچا بمبئی میں چائے دیتے وقت کوئی جات پات نہیں پوچھتا۔ لیکن بیٹی کو کسی چھوکرے کے ساتھ سینما بھیجنے سے پہلے جات پات بھی پوچھتے ہیں اور پگھار بھی۔

اگلے اتوار کو سانتا کروز سے جوہو بس میں جاتے ہوئے منگو نے دیکھا لیڈو سینما میں بھی "آؤ پیار کریں" چل رہی ہے۔

منسا رام نے منگو کو دیکھا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "آؤ بیٹا۔ بڑے دنوں کے بعد آئے ہو۔ منگتی کی ماں یہ اپنا منگو ہے۔ اے منگتی مہمان آیا ہے' ذرا چائے تو بنا لے۔"

"چائے رہنے دیجئے میں تو سینما جا رہا تھا سوچا آپ لوگوں سے پوچھ لوں۔ چلیں گے آپ؟" یہ کہہ کر اس نے ایک لہراتی ہوئی نظر منگتی

کی طرف ڈالی۔

"بیٹا ہم بڈھے لوگ کیا سینما و ینما جائیں گے۔"

"یہیں جوہو کے لیڈو میں بڑی اچھی فلم چل رہی ہے۔"

"پاس میں ہی ہے تو منگتی چلی جائے گی۔ اے منگتی جلدی سے کپڑے بدل لے۔"

منگو کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آگیا۔ اندر منگتی کے ماں باپ کھسر پھسر کر رہے تھے۔

"۔۔۔۔۔۔ برادری والے کیا کہیں گے۔۔۔"

"ارے یہ نیا جمانہ ہے۔ رلدو کے ہے چھوکرا سریف ہے۔ پھر اپنی برادری کا ہے۔"

"۔۔۔ اری سینما جا رہی ہے تو یہ نہیں' وہ نئی والی ساڑھی پہن۔"

منگتی کپڑے بدل کر آئی تو منگو نے دیکھا کہ ساڑھی پہنتے ہی منگتی جوان ہو گئی ہے۔ ساڑھی سستی نقلی سلک کی تھی لیکن نیلی تھی اور منگتی کے گدرائے ہوئے جسم پر بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

جوہو کی سڑک پر اور سمندر کے کنارے سینکڑوں نوجوان جوڑے چلے جا رہے تھے۔ لڑکے سوٹ پہنے تھے' کرتا پاجامہ پہنے تھے۔ لڑکیاں ساڑھیاں پہنے تھیں' شلوار قمیض' کرتا چوڑی دار پاجامہ پہنے تھیں' سب خوش تھے' سب خوبصورت تھے۔ ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔

ان میں ایک سانولا سا نوجوان تھا' جو نیلے رنگ کی نیری لین کی پتلون اور نئے چرمر کرتے ہوئے جوتے پہنے تھا اور اس کے ساتھ نیلی ساڑھی پہنے ایک شرمیلی سی سولہ سترہ سالہ لڑکی تھی جو بات کرتے بھی گھبرا رہی تھی۔

"کیوں جی" اس نے دھیرے سے پوچھا۔ "ہم کون سی فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔"

منگو نے جواب دیا۔ "آؤ پیار کریں۔"

○

عصمت چغتائی

نام : عصمت خانم
قلمی نام : عصمت شاہد لطیف / عصمت چغتائی
پیدائش : ۲۱ اگست ۱۹۱۵ء بہ مقام بدایوں بھارت
وفات : ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء بہ مقام بمبئی
تعلیم : بی۔اے، بی۔ٹی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی

ابتدائی تعلیم آگرہ میں پائی، بی۔اے لکھنؤ یونیورسٹی اور بی۔ٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران کچھ مدت تاریخ اور انگریزی اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی سے پڑھی۔ جودھ پور میں عظیم بیگ چغتائی کے ہاں قیام کے دوران قرآن اور حدیث کے مطالعہ کے دوران بھائی سے مدد لی۔

مختصر حالاتِ زندگی:

عصمت کے والد مرزا قسیم بیگ چغتائی سرکاری ملازم تھے، جنھوں نے پنشن لے کر آگرہ کے موروثی گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عصمت کو بچپن میں بھائیوں کی صف میں جگہ ملی۔ آخری اولاد تھیں اور بڑی بہنیں بیاہی جا چکی تھیں۔ محلہ پنجہ شاہی، آگرہ کی گلیوں میں لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلنے اور چھت پر چڑھ کر پتنگ اڑانے کے دنوں میں پہلی بار اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے انھیں علی گڑھ کی فضا راس آئی۔ مرزا عظیم چغتائی کی زیرِ نگرانی بچپن میں ہی ٹامس ہارڈی، حجاب امتیاز علی، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کو گھول کر پی لیا۔

میٹرک کے بعد چار برس تک نصاب کی کتابیں مجبوراً پڑھیں، لیکن اس وقت تک شیکسپیئر، ابسن اور جارج برنارڈ شا کو حفظ کر چکی تھیں، جو بی۔اے میں کام آیا۔ لڑکپن میں حجاب امتیاز علی سے متاثر تھیں اور جوانی میں ڈاکٹر رشید جہاں کی چیلی کہلائیں۔ بطور اسکول ٹیچر جے پور میں رہیں۔

۱۹۳۷ء میں اسلامیہ ہائی سکول (برائے خواتین) بریلی کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ ۱۹۴۲ء میں شاہد لطیف سے شادی ہوئی، جن کا انتقال ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ کچھ مدت پونا میں قیام کرنے کے بعد بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اب فلم کے لیے اسکرپٹ نویسی اور تصنیف و تالیف کو ذریعہ روزگار بنایا۔ ۱۹۴۳ء میں پروڈیوسر کے۔ آصف کے لیے پہلی فلم "چھیڑ چھاڑ" لکھی۔ بطور رائٹر، ناول "ضدی" لکھنے پر ۱۹۴۱ء میں رائلٹی ایک سو روپیہ ملی۔ فلم "گرم ہوا" (۱۹۷۳ء) اور "جنون" (۱۹۷۹ء) کو ملا کر مجموعی طور پر لگ بھگ تیرہ فلمیں لکھیں۔ معمولی شکل و شباہت کی گول مٹول عصمت چغتائی کی ایک آنکھ قدرے چھوٹی تھی۔ مزاج کی تیز اور ہٹ دھرم عصمت، تاش، سگریٹ اور شراب کی رسیا تھیں۔ بعد از موت جلا دینے کی وصیت کی تھی۔ وصیت کی تعمیل میں انھیں ۲۴ اکتوبر کو بمبئی کے چندن واڑی میں نذرِ آتش کر دیا گیا۔

اولین مطبوعہ تحریر:

"فسادی" (ڈراما) مطبوعہ: "ساقی" دہلی، جنوری ۱۹۳۸ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"کافر" مطبوعہ: "ساقی" دہلی، ۱۹۳۸ء

قلمی آثار: (مطبوعہ کتب):

۱۔ "کلیاں" (افسانے) — ساقی بک ڈپو، دہلی — طبع اول: ۱۹۴۰ء

مقدمہ: صلاح الدین احمد — طبع دوم: آئینہ ادب، لاہور، ایک ایڈیشن اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے بھی شائع کیا۔

۲۔ "چوٹیں" (افسانے۔ ڈراما۔ خاکے) — ساقی بک ڈپو، دہلی — طبع اول: ۱۹۴۲ء

طبع دوم: اردو اکیڈمی سندھ کراچی، طبع سوم: آئینہ ادب، لاہور

۳۔ "ایک بات" (افسانے) — مکتبہ اردو سرکلر روڈ، لاہور — طبع اول: ۱۹۵۲ء

طبع دوم: نیا ادارہ سرکلر روڈ، لاہور

۴۔ "چھوئی موئی" (افسانے) — اردو اکیڈمی سندھ، کراچی — طبع اول: ۱۹۵۲ء

۵۔ "دو ہاتھ" (افسانے) — طبع اول: شیش محل کتاب گھر، لاہور — طبع اول: ۱۹۶۲ء

۶۔ "دوزخی" (خاکے) — نیا ادارہ، سرکلر روڈ، لاہور — طبع اول:

۷۔ "شیطان" (ڈرامے) — نیا ادارہ، سرکلر روڈ، لاہور — طبع اول: ۱۹۵۵ء

۸۔ "کنواری" (ہندی افسانے)

۹۔ "ہم لوگ" (خاکے) — طبع اول: رفعت پبلشرز، لاہور: — طبع اول:

۱۰۔ "زہر" (افسانے)

۱۱۔ "پہلی لڑکی" (افسانے)

۱۲۔ "دھانی بانکیں" (ڈرامے) — طبع اول: ۱۹۴۸ء

۱۳۔ "ضدی" (ناول) — ساقی بک ڈپو، دہلی — طبع اول: ۱۹۴۲ء

یہ ناول اردو اکیڈمی سندھ کراچی اور آئینہ ادب لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۱۴۔ "عصمت کے بہترین افسانے" (انتخاب)

۱۵۔ "بہروپ نگر" (ناول)

یہ کتاب بھارت میں "عجیب آدمی" کے نام سے شائع ہوئی۔

۱۶۔ "خرید لو" (افسانے)

۱۷۔ "لحاف" (افسانے)

۱۸۔ "بدن کی خوشبو" (افسانے)

۱۹۔ "آدھی عورت، آدھا خواب" (افسانے)

۲۰۔ "ٹیڑھی لکیر" (ناول) — طبع اول: مکتبہ اردو سرکلر روڈ، لاہور — طبع اول: ۱۹۴۵ء

۳۱۔ "معصومہ" (ناول) — طبع اول: نیا ادارہ سرکلر روڈ، لاہور، طبع اول: ۱۹۶۲ء
طبع دوم: نیا ادارہ سرکلر روڈ، لاہور،

۲۲۔ "سودائی" (ناول) — طبع اول: نیا ادارہ سرکلر روڈ، لاہور،

۲۳۔ "جنگلی کبوتر" (ناول)

۲۴۔ "انسان اور فرشتے" (ناول)

۲۵۔ "دل کی دنیا" (ناول) — طبع دوم: اردو پاکٹ بکس (پاکستان) کراچی نمبر ۱۸،

۲۶۔ "عجیب آدمی" (ناول)

۲۷۔ "باندی" (ناول)

۲۸۔ "ایک قطرہ خون" (واقعہ کربلا پر ناول) — طبع اول: ۱۹۷۶ء

۲۹۔ "کاغذی ہے پیرہن" (آپ بیتی)

۳۰۔ "تین اناڑی" (ناول۔ بچوں کے لئے)

۳۱۔ "نقلی راجکمار" (ناول۔ بچوں کے لئے)

۳۲۔ "دوزخ" (مضامین۔ ڈراما۔ افسانے)

اس مجموعے میں دو مضامین ایک ڈراما اور پانچ افسانے شامل ہیں۔

وفات سے پہلے مستقل پتا:

"انڈس کورٹ، فرسٹ فلور۔ چرچ گیٹ، بمبئی ۴۰۰۰۲۰۔ بھارت

اعزاز:

۱۔ "اقبال سمان" حکومت مدھیہ پردیش، بھارت۔ ۱۹۸۹ء
۲۔ مخدوم ایوارڈ
۳۔ ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ
۴۔ نہرو ایوارڈ

نظریہ فن:

"سچا ادیب وہی ہے جو راہنمائی سے کترا جائے۔ وہی لکھے جو اس کے دل کی گہرائی سے ابھرتا ہے، جو وہ دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے، جو اس پر بیتتی ہے۔"

عصمت چغتائی
(مضمون: "مجھے کہنا ہے کچھ ۔۔۔" مطبوعہ: "الفاظ" علی گڑھ مارچ تا جون ۱۹۸۰ء سے اقتباس)

عصمت چغتائی

ننھی کی نانی

ننھی کی نانی کے ماں باپ کا نام تو اللہ جانے کیا تھا۔ لوگوں نے کبھی انھیں اس نام سے یاد نہ کیا۔ جب چھوٹی سی گلیوں میں ناک سڑسڑاتی پھرتی تھیں' تو بفاتن کی لونڈیا کے نام سے پکاری گئیں۔ پھر کچھ دن "بشیرے کی بہو" کہلائیں۔ پھر "بسم اللہ کی ماں" کے لقب سے یاد کی جانے لگیں اور جب بسم اللہ جناپے کے اندر ہی ننھی کو چھوڑ کر چل بسی تو وہ "ننھی کی نانی" کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔

دنیا کا کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جو زندگی میں "ننھی کی نانی" نے اختیار نہ کیا ہو۔ کٹورا گلاس پکڑنے کی عمر سے وہ تیرے میرے گھر میں دو وقت کی روٹی اور پرانے کپڑوں کے عوض اوپر کے کام پر دھرلی گئیں۔ یہ اوپر کا کام کتنا نیچا ہوتا ہے یہ کچھ کھیلنے کودنے کی عمر سے کام پر جوت دیئے جانے والے ہی جانتے ہیں۔ ننھے میاں کے آگے جھنجھنا بجانے کی غیر دلچسپ ڈیوٹی سے لے کر بڑے سرکار کی سر کی مالش تک اوپر کے کام کی فہرست میں آ جاتی ہے۔

زندگی کی بھاگ دوڑ میں کچھ بھونا بھلسنا بھی آ گیا اور زندگی کے کچھ سال ماماگیری میں بیت گئے پر جب دال میں چھپکلی بگھار دی اور روٹیوں میں مکھیاں پرونے لگیں تو مجبوراً" ریٹائر ہونا پڑا۔ اس کے بعد تو ننھی کی نانی بس لگائی بجھائی کرنے' ادھر کی ادھر پہنچانے کے سوا اور کسی کرم کی نہ رہیں۔ یہ لگائی بجھائی کا پیشہ بھی خاصا منافع بخش ہوتا ہے۔ محلہ میں کھٹ پٹ چلتی ہی رہتی ہے۔ مخالف کیمپ میں جا کر اگر ہوشیاری سے مخبری کی جائے تو خوب خوب خاطر مدارت ہوتی ہے لیکن یہ پیشہ کے دن چلا' نانی لتری کہلانے لگیں اور دال گلتی نہ پا کر نانی نے آخری اور مفید ترین پیشہ یعنی مہذب طریقہ پر بھیک مانگنی شروع کر دی۔

کھانے کے وقت نانی ناک پھیلا کر سونگھتیں کہ کس گھر میں کیا پک رہا ہے۔ بہترین خوشبو کی ڈور پکڑ کر وہ گھر میں آن بیٹھتیں۔

"اے بیوی گھیاں ڈالی ہیں گوش میں۔" وہ بے تعلقی سے پوچھتیں۔

"نہیں بوا گھیبس نگوڑی آج کل گلیں کہاں ہیں۔ آلو ڈالے ہیں۔"

"اے سبحان اللہ۔ کیا خوشبو ہے۔ اللہ رکھے بسم اللہ کے باوا کو آلوؤں سے عشق تھا۔ روز یہی کہ بسم اللہ کی ماں آلو گوش۔ دیکھو آلو گوش۔ ہا..... اب تو مہینوں گزر جاویں آلو گوش جو آنکھوں سے بھی دکھ جاوے..... اے بیوی کوتھمیر چھوڑ دیا؟"

وہ ایک دم فکر مند ہو جاتیں۔

"نہیں بوا کوتھمیر نگوڑا سب مارا گیا۔ موا ستے کا کتا کیاری میں لوٹ گیا۔"

"ہے ہے بغیر کوتھمیر کے آلو گوش کیا خاک مزا دے گا۔ حکیم جی کے یہاں منوں لگا ہے۔"

"اے نہیں نانی' حکیم جی کے لونڈے نے کل شبن میاں کی پتنگ میں کنّی لگا دی۔ اس پر میں نے کہا خبردار جو چھجے پر قدم رکھا۔ تو....."

"اے میں کوئی تمائے نام سے تھوڑی مانگوں گی۔"

اور نانی برقع سنبھال سلیپریں سٹ پٹاتی حکیم جی کے ہاں جا پہنچیں۔ دھوپ کھانے کے بہانے گھسٹتی گھسٹتی کیاری کے پاس منڈیر تک پہنچ

جاتیں۔ پہلے ایک پتی توڑ کر سونگھنے کے بہانے چٹکی میں مسلتیں۔ حکیم جی کی بہو کی آنکھ بچی اور مارا نانی نے کوتھمبو پر ہاتھ۔ کوتھمبو مہیا کرنے کے بعد ظاہر ہے دو نوالے کی حقدار ہو ہی جاتیں۔

نانی اپنے ہاتھ کی صفائی کے لئے سارے محلّے میں مشہور تھیں۔ کھانے پینے کی چیز دیکھی اور لقمہ مار گئیں۔ بچے کے دودھ کی پتیلی منہ سے لگائی اور دو گھونٹ غٹ لئے۔ شکر کی پھنکی مار لی۔ گڑ کی ڈلی تالو سے چپکائی مزے سے دھوپ میں بیٹھی چوس رہی ہیں۔ ڈالی اٹھائی نیفے میں اڑس لی۔ دو چپاتیاں لیں اور آدھی نیفے کے ادھر' آدھی ادھر' اوپر سے موٹا کرتا آہستہ آہستہ حسب معمول کراہتی کونکتی کھسک گئیں۔ سب جانتے تھے پر کسی کو منہ کھولنے کی ہمت نہ تھی کیوں کہ نانی کے بوڑھے ہاتھوں میں بجلی کی سی سرعت تھی اور بے چبائے نگل جانے میں وہ کوئی عیب نہ سمجھتی تھیں۔ دوسرے ذرا سے شبہ پر ہی وہ بیل مچانے پر تل جاتی تھیں اور اتنی قسمیں کھاتی تھیں' قرآن اٹھانے کی دھمکیاں دیتی تھیں کہ توبہ بھلی۔ اب کون ان سے جھوٹا قرآن اٹھوا کر اپنی قبر میں کیڑے پڑوائے۔

قزاقی' چورا اور چکمہ باز ہونے کے علاوہ نانی پرلے درجہ کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو ان کا وہ برقع تھا جو ہر دم ان کے اوپر سوار رہتا تھا۔ کبھی اس برقع میں نقاب بھی تھی۔ پر جوں جوں محلّے کے بڑے بوڑھے چل بسے یا نیم اندھے ہو گئے تو نانی نے نقاب کو خیرباد کہہ دیا مگر کنگوروں دار فیشن ایبل برقع کی ٹوپی ان کی کھوپڑی پر چپکی رہتی۔ آگے چاہے سمین کرتے کے نیچے بنیان نہ ہو' پر پیچھے برقع بادشاہوں کی جھول کی طرح لہراتا رہے اور یہ برقعہ صرف ستر ڈھانکنے کے لئے ہی نہیں تھا بلکہ دنیا کا ہر ممکن اور ناممکن کام اسی سے لیا جاتا تھا اوڑھنے' بچھانے اور گڑی مڑی کر کے تکیہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی خیر سے نہاتیں تو اسے تولیہ کے طور پر استعمال کرتیں۔ پنج وقتہ نماز کے لئے جانماز اور جب محلّے کے کتے دانت نکوسیں تو ان سے بچاؤ کے لئے اچھی خاصی ڈھال۔ کتا پنڈلی پر لپکا اور نانی کے برقع کا گھیر اس کے منہ میں پھنکارا۔ نانی کو برقع بہت پیارا تھا۔ فرصت میں بیٹھ کر حسرت سے اس کے بڑھاپے پر بسورا کرتیں۔ جہاں کوئی چندی کتر لی اور احتیاطاً پیوند چپکا لیا۔ وہ اس دن کے خیال سے ہی لرز اٹھتی تھیں جب یہ برقع بھی چل بسے گا۔ آٹھ گز لٹھا کفن کو جڑ جاوے۔ یہی بہت جانو۔

نانی کا کوئی مستقل ہیڈ کوارٹر نہیں۔ سپاہی جیسی زندگی ہے۔ آج اس کے دالان میں تو کل اس کی گلی میں۔ جہاں جگہ ملی پڑاؤ ڈال لیا۔ جب دھتکار پڑی کوچ کر کے آگے چل پڑیں۔ آدھا برقع اوڑھا آدھا بچھایا' لمبی تان لی۔

مگر برقع سے بھی زیادہ وہ جس کی فکر میں گھلتی تھیں وہ تھی ان کی اکلوتی نواسی ننھی۔ کڑک مرغی کی طرح نانی پر پھیلائے اسے پوٹے تلے دابے رہتیں۔ کیا مجال جو نظر سے اوجھل ہو جائے مگر جب ہاتھ پیروں نے جواب دے دیا اور محلّے والے چوکنے ہو گئے۔ ان کی جوتیوں کی گھس گھس سن کر ہی چاق چوبند ہو کر مورچہ پر ڈٹ جاتے۔ ڈھٹائی سے نانی کے اشارے کنایہ سے مانگنے کو سنا ان سنا کر جاتے تو نانی کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ ننھی کو اس کے آبائی پیشے یعنی اوپر کے کام پر لگا دیں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد انہوں نے اسے ڈپٹی صاحب کے یہاں روٹی کپڑا اور ڈیڑھ روپیہ مہینہ پر چھوڑ ہی دیا۔ پر وہ ہر دم سائے کی طرح لگی رہتیں۔ ننھی نظر سے اوجھل ہوئی اور وہ بلبلائیں۔ پر نصیب کا لکھا کہیں بوڑھے ہاتھوں سے مٹتا ہے دوپہر کا وقت تھا۔ ڈپٹیائن اپنے بھائی کے گھر بیٹے کا پیغام لے کر گئی ہوئی تھیں۔ نانی منڈیر پر جامن کی چھاؤں میں جھپکی لے رہی تھیں۔ سرکار خس خانے میں قیلولہ فرما رہے تھے۔ ننھی پنکھے کی ڈوری تھامے اونگھ رہی تھی۔ پنکھا رک گیا اور سرکار کی نیند ٹوٹ گئی۔ شیطان جاگ اٹھا اور ننھی کی قسمت سو گئی۔

کہتے ہیں بڑھاپے کے آسیب سے بچنے کے لئے مختلف ادویات اور طلاؤں کے ساتھ حکیم' بید' چوزوں کی یخنی تجویز فرماتے ہیں۔ نو برس کی ننھی چوزہ ہی تو تھی۔

مگر جب ننھی کی نانی کی آنکھ کھلی تو ننھی غائب۔ محلّہ چھان مارا کوئی سراغ نہ ملا۔ مگر رات کو جب نانی تھکی ماندی کوٹھری کو لوٹی تو کونے میں دیوار سے لگی ہوئی ننھی زخمی چڑیا کی طرح اپنی پھیکی پھیکی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ نانی کی گھگھی بندھ گئی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے وہ اسے گالیاں دینے لگی۔۔۔۔ "ماڑ زادی اچھال چھکا۔ یہاں آن کر مری ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے پنڈلیاں سوجھ گئیں۔ ٹھہر تو جا' سرکار سے

کیسی چار چوٹ کی مار لگواتی ہوں۔"

مگر ننھی کی چوٹ زیادہ دیر نہ چھپ سکی۔ نانی سر پر دو ہتڑ مار مار چنگھاڑنے لگی۔ پڑوسن نے سنا تو سر پکڑ کر رہ گئیں۔ اگر صاحبزادے کی لغزش ہوتی تو شاید ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی مگر ڈپٹی صاحب..... محلے کے مکھیا۔ تین نواسوں کے نانا۔ پنج وقتہ نمازی۔ ابھی پچھلے دنوں مسجد میں چٹائیاں اور لوٹے رکھوائے۔ منھ سے پھوٹنے والی بات نہیں۔

لوگوں کے رحم و کرم کی عادی نانی نے آنسو پی کر ننھی کی کمر سینکی۔ آنے گز کا حلوہ کھلایا اور اپنی جان کو صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ دو چار دن لوٹ پیٹ کر ننھی اٹھ کھڑی ہوئی اور چند دنوں ہی میں سب کچھ بھول بھال گئی۔

مگر محلے کی شریف زادیاں نہ بھولیں۔ چھپ چھپ کر ننھی کو بلاتیں۔

"نہیں..... نانی مارے گی۔" ننھی ٹالتی

"لے یہ چوڑیاں پہن لیجو۔ نانی کو کیا خبر ہو گی....." بیویاں بے قرار ہو کر پھسلاتیں۔

"کیا ہوا..... کیسے ہوا....." کی تفصیل پوچھی جاتی۔ ننھی کچی کچی معصوم تفصیلیں دیتی۔

بیویاں ناکوں پر دوپٹے رکھ کر کھلکھلاتیں۔

ننھی بھول گئی..... مگر قدرت نہ بھول سکی۔ کچی کلی قبل از وقت توڑ کر کھلانے سے پنکھڑیاں جھڑ جاتی ہیں۔ ٹھونٹھ رہ جاتا ہے۔ ننھی کے چہرے پر سے بھی نہ جانے کتنی معصوم پنکھڑیاں جھڑ گئیں۔ چہرے پر پھنکار اور روڑاپن۔ ننھی بچی سے لڑکی نہیں بلکہ چھلانگ مار کر ایک عورت بن گئی۔ وہ قدرت کے مشاق ہاتھوں کی سنواری بھرپور عورت نہیں بلکہ ٹیڑھی میڑھی مورت جس پر کسی دیو نے دو گز لمبا پاؤں رکھ دیا ہو۔ ٹھگنی۔ موٹی، کچوراسی جیسے کچی مٹی کا کھلونا کمہار کے گھٹنے تلے دب گیا ہو۔

میلی صافی سے کوئی ناک پونچھے، چاہے کولھے، کون پوچھتا ہے۔ راہ چلتے اس کے چٹکیاں بھرتے، مٹھائی کے دونے پکڑاتے۔ ننھی کی آنکھوں میں شیطان تحرک اٹھتا..... مگر اب نانی بجائے اسے حلوے مانڈے ٹھسانے کے اس کا دھوبی گھاٹ کرتی مگر میلی صافی کی دھول بھی نہ جھڑتی۔ جانور ربڑ کی گیند 'ٹپا کھایا اور اچھل گئی۔

چند ہی سال میں ننھی کی چوکھی سے محلہ لرز اٹھا۔ سنا کہ ڈپٹی صاحب اور صاحبزادے میں کچھ تن گئی۔ پھر سنا مسجد کے ملا جی کو رجوا کمارنے مارتے مارتے چھوڑا۔ پھر سنا صدیق پہلوان کا بھانجہ مستقل ہو گیا۔

آئے دن ننھی کی ناک کٹتے کٹتے بچتی اور گلیوں میں لٹھ پونگا ہوتا۔

اور پھر ننھی کے تلوے جلنے لگے۔ پیر دھرنے کی رتی بھر جگہ نہ رہی۔ صدیق پہلوان کے بھانجے کی پہلوانی اور ننھی کی جوانی نے محلے والوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ سنتے ہیں دلی میں اس مال کی تھوک میں کھپت ہے۔ شاید دونوں وہیں چلے گئے۔

جس دن ننھی بھاگی اس دن نانی کے فرشتوں کو بھی شبہ نہ ہوا۔ دو تین دن سے تھوڑی چپ چاپ سی تھی۔ نانی سے بدزبانی بھی نہ کی۔ چپ چاپ آپ ہی بیٹھی ہوا میں گھورا کرتی۔

"اے ننھی روٹی کھالے۔" نانی کہتی۔

"نانی بی بھوک نہیں!"

"اے ننھی اب دیر ہو گئی سوجا۔"

"نانی بی نیند نہیں آتی۔"

رات کو نانی کے پیر دبانے لگی۔

"نانی بی..... اے نانی بی ذری" سبحانک اللھم" سن لو۔ یاد ہے کہ نہیں" نانی نے سنا" فرفر یاد۔

"جا بٹی سو جا۔" نانی نے کروٹ لے لی۔

"اری مرتی کیوں نہیں۔" نانی نے تھوڑی دیر بعد اسے صحن میں کھٹ پٹ کرتے سن کر کہا۔ "بھی۔ خانگی نے اب آنگن بھی پلید کرنا شروع کر دیا۔ کون حرامی ہے جسے آج گھر میں گھسا لائی ہے۔"

پر صحن میں گھور گھور کر دیکھنے پر نانی سہم کر رہ گئی۔ ننھی عشا کی نماز پڑھ رہی تھی۔ اور صبح ننھی غائب ہو گئی۔

کبھی کوئی دور دیس سے آتا ہے تو خبر آ جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے ننھی کو ایک بڑے نواب صاحب نے ڈال لیا ہے۔ ٹم ٹم ہے۔ منوں سونا ہے۔ بیگموں کی طرح رہتی ہے۔

کوئی کہتا ہے ہیرا منڈی میں دیکھا تھا۔

کوئی کہتا ہے فارس روڈ پر اور کسی نے اسے سونا گاچی میں دیکھا۔

مگر نانی کہتی ہے ننھی کو ہیضہ ہوا تھا۔ چار گھڑی لوٹ پوٹ کر مر گئی۔

ننھی کا سوگ منانے کے بعد نانی کچھ خبطی بھی ہو گئیں۔ لوگ راہ چلتے چھیڑ خانی کرتے۔

"اے نانی نکاح کر لو۔۔۔" بھابی جان چھیڑتیں۔

"کس سے کلوں؟ لا اپنے خصم سے کرا دے۔" نانی بگڑتیں۔

"اے نانی' ملاجی سے کر لو۔ اللہ قسم تم پر جان دیتے ہیں۔" اور نانی کی مغلظات شروع ہو جاتیں۔ وہ پینترے گالیوں میں نکالتیں کہ لوگ بھو نچکے رہ جاتے۔

"مل تو جائے بھڑوا...... داڑھی نہ اکھیڑ لوں تو کہنا۔" مگر جب ملاجی بھی گلی کی نکڑ پر مل جاتے تو نانی سچ مچ شرما سی جاتیں۔

علاوہ محلے کے لڑکوں بالوں کے نانی کے ازلی دشمن تو موئے گھوڑے بندر تھے جو پیڑھیوں سے اسی محلے میں پلتے بڑھتے آئے تھے جو ہر فرد کا کچا چٹھا جانتے تھے۔ مرد خطرناک ہوتے ہیں اور بچے بد ذات مگر عورتیں تو صرف ڈرپوک ہوتی ہیں۔ پر نانی بھی انہیں بندروں میں پل کر بڑھیائی تھیں۔ انہوں نے بندروں کو ڈرانے کے لئے کسی بچے کی غلیل ہتھیالی تھی اور سر پر برقع کا پگڑ باندھ کر وہ غلیل تان کر جب "اچکیں" تو بندر تھوڑی دیر کو ششدر ضرور رہ جاتے اور پھر بے توجہی سے ٹہلنے لگتے۔

اور بندروں سے ان کی آئے دن باسی ٹکڑوں پر چخ چلتی رہتی۔ محلے میں جہاں کہیں شادی بیاہ' چلا' چالیسواں ہوتا نانی جھوٹے ٹکڑوں کا ٹھیکہ لے لیتیں۔ لنگر خیرات بٹتی تو بھی چار چار مرتبہ چکمہ دے کر حصہ لیتیں۔ منوں کھانا بٹور لانے کے بعد وہ اسے حسرت سے تکتیں۔ کاش ان کے پیٹ میں بھی اللہ پاک نے کچھ اونٹ جیسا انتظام کیا ہوتا تو کتنے مزے رہتے۔ مزے سے چار دن کی خوراک معدے میں بھر لیتیں' چھٹی ہوتی۔ مگر اللہ پاک نے رزق کا اتنا اوٹ پٹانگ انتظام کرنے کے بعد پیٹ کی مشین کیوں اس قدر ناقص بنا ڈالی کہ ایک دو وقت کے کھانے سے زیادہ ذخیرہ جمع کرنے کا ٹھور ٹھکانا نہیں۔ اس لئے نانی ٹاٹ کے بیروں پر جھوٹے ٹکڑے پھیلا کر سکھا لیتیں پھر انہیں مٹکیوں میں بھر لیتیں۔ جب بھوک لگی ذرا سے سوکھے ٹکڑے چرمرکئے' پانی کا چھینٹا دیا' چٹکی بھر لون مرچ برکا اور لذیذ ملغوبہ تیار۔ لیکن گرمیوں اور برسات کے دنوں میں بارہا یہ نسخہ ان پر ہیضہ طاری کر چکا تھا چنانچہ بس جانے پر طوعا" و کرہا" ان ٹکڑوں کو اونے پونے بیچ ڈالتیں تاکہ لوگ اپنے کتوں اور بکریوں وغیرہ کو کھلا دیں۔ مگر عموماً کتوں اور بکریوں کے معدے نانی کے ڈھیٹ معدے کا مقابلہ نہ کر پاتے اور لوگ مول تو کیا تحفتاً" بھی ان فواکہات کو قبولنے پر تیار نہ ہوتے۔ وہی عزیز از جان جھوٹے ٹکڑے جنہیں بٹورنے کے لئے نانی کو ہزاروں صلواتیں اور ٹھوکریں سہنا پڑتیں اور جنہیں دھوپ میں سکھانے کے لئے انہیں پوری بندر جاتی سے جہاد مول لینا پڑتا۔ جہاں ٹکڑے پھیلائے گئے اور بندروں کے قبیلے کو بے تار برقی خبر پہنچی۔ اب کیا ہے۔ غول در غول دیواروں پر ڈٹے بیٹھے ہیں۔ کھپریلوں پر دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ چھپر کھسوٹ رہے ہیں اور آتے جاتے پہ خوخیا رہے ہیں۔ نانی بھی اس وقت مرد میدان بنی' سر پر برقع کا ڈھاٹا باندھے ہاتھ میں غلیل لئے مورچہ پر ڈٹ جاتیں۔ سارا دن "ہگے ہگے" کر کے شام کو بچا کھچا کوڑا بٹور

بندروں کی جان کو کوستی نانی اپنی کوٹھری میں تھک کر سو رہتیں۔

بندروں کو ان سے کچھ ذاتی قسم کی پرخاش ہو گئی تھی اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیوں جہان بھر کی نعمتوں کو چھوڑ کر صرف نانی کے ٹکڑوں پر ہی حملہ آور ہوتے اور کیوں بدذات لال پچھائے والا' انہیں کا عزیز از جان تکیہ لے بھاگتا۔ وہ تکیہ جو ننھی کے بعد نانی کا واحد عزیز اور پیارا' دنیا میں رہ گیا تھا۔ وہ تکیہ جو برقع کے ساتھ ان کی جان پر ہمیشہ سوار رہتا تھا۔ جس کی سیونوں کو وہ ہر وقت پکا ٹانکہ مارتی رہتی تھیں۔ بارہا نانی کسی کونے کھدرے میں بیٹھی تکیہ سے ایسے کھیلا کرتیں جیسے وہ ننھی سی بچی ہوں اور وہ تکیہ ان کی گڑیا' وہ اپنے سارے دکھ اس تکیے ہی سے کہہ کر جی ہلکا کر لیا کرتی تھیں۔ جتنا جتنا انہیں تکیہ پر لاڈ آتا وہ اس کے ٹانکے پکے کرتی جاتیں۔

قسمت کے کھیل دیکھئے نانی منڈیرے لگی برقع کی آڑ میں بیٹھے سے جوئیں چن رہی تھیں کہ بندر دھم سے کودا اور تکیہ لے یہ جا وہ جا۔ ایسا معلوم ہوا نانی کا کلیجہ نوچ کر لے گیا۔ وہ دھاڑیں' وہ چلائیں کہ سارا محلّہ اکٹھا ہو گیا۔

بندروں کا قاعدہ ہے کہ آنکھ بچی اور کٹورا گلاس لے بھاگے اور چھجے پر بیٹھے دونوں ہاتھوں سے کٹورا دیوار پر گھس رہے ہیں۔ کٹورے کا مالک نیچے کھڑا چکار رہا ہے۔ پیاز دے' روٹی دے۔ جب بندر میاں کا پیٹ بھر گیا' کٹورا پھینک اپنی راہ لی۔ نانی نے مٹھی بھر ٹکڑے لٹا دیئے پر حرامی بندر نے تکیہ نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ سو جتن کئے مگر اس کا جی نہ پگھلا اور اس نے مزے سے تکیہ کے غلاف پیاز کے چھلکوں کی طرح اتارنے شروع کئے۔ وہی غلاف جنہیں نانی نے چندھی آنکھوں سے گھور گھور کر پکے ٹانکوں سے گوتھا تھا۔ جوں جوں غلاف اترتے جاتے نانی کی بدحواسی اور بلبلاہٹ میں زیادتی ہوتی جاتی اور آخری غلاف بھی اتر گیا اور بندر نے ایک ایک کر کے چھجے پر سے ٹپکانا شروع کئے۔ روئی کے گالے نہیں بلکہ شبن کی فتوئی' بنو ستے کا انگوچھا ...... حسینہ بی کی انگیا......... منی بی کی گڑیا کا غرارہ۔ رحمت کی اوڑھنی اور خیراتی کا کچھنا......

خیرن کے لونڈے کا طمنچہ .... منشی جی کا مفلر اور ابراہیم کی قمیض کی آستین مع کف!

صدیق کی تہمد کا ٹکڑا۔ آمنہ بی کی سرمہ دانی اور بفاطن کی کلوٹی۔ سکینہ بی کی افشاں کی ڈبیہ -- ملا جی کی تسبیح کا امام اور باقر میاں کی سجدہ گاہ۔

بسم اللہ کا سوکھا ہوا مال اور کلاوہ میں بندھی ہوئی ننھی کی پہلی سالگرہ کی ہلدی کی گانٹھ' دوب اور چاندی کا چھلا اور بشیر خاں کا گلٹ کا تمغہ جو اسے جنگ سے زندہ لوٹ آنے پر سرکار عالیہ سے ملا تھا۔

مگر کسی نے ان چیزوں کو نہ دیکھا ------ بس دیکھا تو اس چوری کے مال کو جسے سالہا سال کی چھاپہ ماری کے بعد نانی نے لکھ لوٹ جوڑا تھا۔

"چور ------ بے ایمان ...... کمینی۔"

"نکالو بڑھیا کو محلے سے۔"

"پولیس میں دے دو۔"

"ارے اس کی تو ٹرنک بھی کھولو' اس میں نہ جانے کیا کیا ہو گا۔" غرض جو جس کے منہ میں آیا کہہ گیا۔

نانی کی چیخیں ایک دم رک گئیں۔ آنسو خشک' سر نیچا اور زبان گنگ! کاٹو تو خون نہیں۔ رات بھر جوں کی توں دونوں گھٹنے مٹھیوں میں دابے ہل ہل کر سوکھی سوکھی ہچکیاں لیتی رہیں۔ کبھی اپنے ماں باپ کا نام لے کر کبھی میاں کو یاد کر کے' کبھی بسم اللہ اور ننھی کو پکار کر بین کرتیں ...... دم بھر کو اونگھ جاتیں پھر جیسے پرانے ناسوروں میں چیونٹے چٹکنے لگتے اور وہ بلبلا کر چونک اٹھتیں۔ کبھی چپکی چپکی روتیں' کبھی خود سے باتیں کرنے لگتیں۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا اٹھتیں اور پھر تاریکی میں سے کوئی پرانی یاد کا بھالا کھینچ مارتا اور وہ بیمار کتے کی طرح نیم انسانی آواز سے سارے محلے کو چونکا دیتیں۔ دو دن اسی حال میں بیت گئے۔ محلّہ والوں کو آہستہ آہستہ احساس ندامت ہونا شروع ہوا۔ کسی کو بھی تو ان چیزوں کی اشد ضرورت نہ تھی۔ برسوں کی کھوئی چیزوں کو کبھی کا رو پیٹ کر بھول چکے تھے۔ وہ بے چارے خود کون سے لکھ پتی تھے۔ تنکے کا بوجھ بھی ایسے

موقع پر انسان کو شہتیر کی طرح لگتا ہے۔ لوگ ان چیزوں کے بغیر زندہ تھے۔ تن کی لنگوٹی اب سردیوں سے دھینگا مشتی کرنے کے قابل کہاں تھی۔ وہ اس کے ملنے کے انتظار میں اپنی بڑھوار تھوڑی روک بیٹھا تھا۔ حسینہ بی نے انگیا چولی کی اہمیت کو بیکار سمجھ کر اسے خیرباد کہہ دیا تھا۔ منی کی گڑیا کا غرارہ کس مصرف کا' وہ تو کبھی کی گڑیوں کی عمر سے گذر کر بنڈ کلیوں کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ محلے والوں کو نانی کی جان تھوڑی منظور تھی۔

پرانے زمانے میں ایک دیو تھا۔ اس دیو کی جان تھی ایک بھونرے میں۔ سات سمندر پار ایک غار میں ایک صندوق تھا' اس صندوق میں ایک اور صندوق اور اس صندوق میں ایک ڈبیہ تھی جس میں ایک بھونرا تھا۔ ایک بہادر شہزادہ آیا .... اور اس نے پہلے بھونرے کی ایک ٹانگ توڑی' ادھر دیو کی ایک ٹانگ جادو کے زور سے ٹوٹ گئی پھر اس نے دوسری ٹانگ توڑی اور دیو کی دوسری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی پھر اس نے بھونرے کو مسل ڈالا اور دیو مرگیا۔

نانی کی جان بھی تکیہ میں تھی اور بندر نے وہ جادو کا تکیہ دانتوں سے چیر ڈالا اور نانی کے کلیجے میں گرم سلاخ اتر گئی۔

دنیا کا کوئی دکھ' کوئی ذلت' کوئی بدنامی ایسی نہ تھی جو نصیب نے نانی کو نہ بخشی ہو۔ جب سہاگ کی چوڑیوں پر پتھر گرا تھا تو سمجھی تھیں اب کوئی دن کی مہمان ہیں۔ پر جب بسم اللہ کو کفن پہنانے لگیں تو یقین ہو گیا کہ اونٹ کی پیٹھ پر یہ آخری تنکا ہے اور جب ننھی کے منہ پر کالکھ لگ گئی تو نانی سمجھیں بس یہ آخری گھاؤ ہے۔

زمانہ بھر کی بیماریاں پیدائش کے وقت سے جھیلیں۔ سات بار تو چیچک نے ان کی صورت پہ جھاڑو پھیری۔ ہر سال تیج تہوار کے موقع پر ہیضہ کا حملہ ہوتا۔

تیرا میرا گو موت دھوتے دھوتے انگلیوں کے پورے سڑ گئے۔ برتن مانجھتے مانجھتے ہتھیلیاں چھلنی ہو گئیں۔ ہر سال اندھیرے اجالے' اونچی نیچی سیڑھیوں سے لڑھک پڑتیں۔ دو چار دن لوٹ پوٹ کر پھر گھسٹنے لگتیں۔ پچھلے جنم میں نانی ضرور کتے کی کلی رہی ہوں گی جبھی تو اتنی سخت جان تھیں۔ موت کا کیا واسطہ جو ان کے قریب پھٹک جائے۔ لیریاں لگائے پھریں مگر مردہ کا کپڑا کبھی تن سے نہ چھو جائے۔ کہیں مرنے والا سلونوں میں موت نہ چھپا گیا ہو' جو نازوں کی پالی نانی کو آن دبوچے اگرچہ عاقبت بندروں کے ہاتھ لٹے گی' اس کی کسے خبر تھی۔ صبح سویرے بہشتی مشک ڈالنے گیا تو دیکھا نانی کھپریل کی سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہیں۔ منہ کھلا ہے' مکھیاں نیم وا آنکھوں کے کونوں میں گھس رہی ہیں۔ یوں نانی کو سوتا دیکھ کر لوگ انہیں مردہ سمجھ کر ڈر جایا کرتے تھے مگر نانی ہمیشہ ہڑبڑا کر بلغم تھوکتی جاگ پڑتی تھیں اور ہونسنے کو ہزار صلواتیں سنا ڈالتی تھیں۔

مگر اس دن سیڑھیوں پر اکڑوں بیٹھی ہوئی نانی دنیا کو ایک مستقل گالی دے کر چل بسیں! زندگی میں کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ کروٹ کروٹ کانٹے تھے۔ مرنے کے بعد کفن میں بھی نانی اکڑوں لٹائی گئیں۔ ہزار کھینچ تان پر بھی اکڑا ہوا جسم سیدھا نہ ہوا۔

حشر کے دن ...... صور پھونکا گیا۔ نانی ہڑبڑا کر کھنکارتی ہوئی اٹھیں جیسے لنگری بھنک کان میں پہنچ گئی ہو .... فرشتوں کو صلواتیں سناتی اشتم پشتم پل صراط پر سے اکڑوں گھسٹتی خدائے ذوالجلال والاکرام کے حضور میں لپکیں! انسانیت کی اتنی بڑی توہین دیکھ کر خدا کا سر شرم سے جھک گیا اور وہ خون کے آنسو رونے لگا۔

اور خدا کے وہ خون میں ڈوبے ہوئے آنسو نانی کے کچے ڈھیر پر ٹپکے جہاں سرخ سرخ لالے کے پھول لہلہانے لگے۔

عصمت چغتائی

مغل بچہ

فتح پور سیکری کے سنسان کھنڈروں میں گوری دادی کا مکان پرانے سوکھے زخم کی طرح کھٹکتا تھا۔ ککیا اینٹ کا دو منزلہ گھٹا گھٹا سا مکان ایک مار کھائے روٹھے ہوئے بچے کی طرح لگتا تھا۔ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا وقت کا بھونچال اسکی ڈھٹائی سے عاجز آکر آگے بڑھ گیا اور شاہی شان و شوکت پر ٹوٹ پڑا۔

گوری دادی سفید جھک چاندنی بچھے تخت پر سفید بے داغ کپڑوں میں ایک سنگ مرمر کا مقبرہ معلوم ہوتی تھیں۔ سفید ڈھیروں بال' بے خون کی سفید دھوئی ہوئی ململ جیسی جلد' ہلکی کرنجی آنکھیں جن پر سفیدی رینگ آئی تھی' پہلی نظر میں سفید لگتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں۔ جیسے بسی ہوئی چاندنی کا غبار ان کے گرد معلق ہو۔

نہ جانے کب سے جئے جا رہی تھیں۔ لوگ ان کی عمر سو سے اوپر بتاتے تھے۔ کھلی کھلی گم سم بے نور آنکھوں سے وہ اتنے سال کیا دیکھتی رہی تھیں۔ کیا سوچتی رہی تھیں۔ کیسے جیتی رہی تھیں۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں وہ میری اماں کے چچا زاد سے بیاہی تو گئی تھیں مگر انہوں نے دلہن کا گھونگٹ بھی نہ اٹھایا۔ کنوارپن کی ایک صدی انہوں نے انہی کھنڈروں میں بتائی تھی۔ جتنی گوری بی سفید تھیں اتنے ہی ان کے دولہا سیاہ بھٹ تھے۔ اتنے کالے کہ ان کے آگے چراغ بجھے! گوری بی بجھ کر بھی دھواں دیتی رہیں۔

سرشام کھانا کھا کر جھولیوں میں سوکھا میوہ بھر کے ہم بچے لحافوں میں دبک کر بیٹھ جاتے اور پرانی زندگی کی ورق گردانی شروع ہو جاتی بار بار سن کر بھی جی نہ بھرتا۔ ادلا بدلا کر گوری بی اور کالے میاں کی کہانی دہرائی جاتی۔ بیچارے کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ اتنی گوری گوری دلہن کا گھونگٹ بھی نہ اٹھایا۔

اماں سال کے سال پورا لاؤ لشکر لے کر میکے پر دھاوا بول دیتیں۔ بچوں کی عید ہو جاتی فتح پور سیکری کے پراسرار شاہی کھنڈروں میں آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے جب شام پڑ جاتی تو کھوئی کھوئی سرمئی فضا سے ڈر لگنے لگتا۔ ہر کونے سے سائے لپکتے دل دھک دھک کرنے لگتے۔

"کالے میاں آ گئے۔" ہم ایک دوسرے کو ڈراتے۔ گرتے پڑتے بھاگتے اور ککیا اینٹ کے دو منزلہ مکان کی آغوش میں دبک جاتے۔ کالے میاں ہر اندھیرے کونے میں بھوت کی طرح چھپے محسوس ہوتے۔ بہت سے بچے مرنے کے بعد حضرت سلیم چشتی کی درگاہ پر ماتھا رگڑا۔ تب گوری بی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک گوری بی بڑی ضدی تھیں۔ بات بات پر اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ جاتیں۔ بھوک ہڑتال کی دیتیں گھر میں کھانا پکتا' کوئی منہ' نہ جھٹلاتا جوں کا توں اٹھوا مسجد میں بھجوا دیا جاتا' گوری بی نہ کھاتیں تو اماں باوا کیسے نوالہ توڑتے۔

بات اتنی سی تھی کہ جب منگنی ہوئی تو لوگوں نے مذاق میں چھیڑنے کیے۔

"گوری دلہن کالا دولہا۔"

مگر مغل بچے مذاق کے عادی نہیں ہوتے۔ سولہ سترہ برس کے کالے میاں اندر ہی اندر گھٹتے رہے۔ جل کر مرنڈا ہوتے رہے۔

"دلہن میلی ہو جائے گی خبردار یہ کالے کالے ہاتھ نہ لگانا۔"

"بڑے نازوں کی پالی ہے تمہاری تو پرچھائیں پڑی تو کالی ہو جائے گی۔"

"بڑا تیما ہے ساری عمر جوتیاں اٹھوائے گی۔"

انگریزوں نے جب مغل شاہی کا اختتام سنگسار کیا تو سب سے بری مغل بچوں پر بیتی کہ وہ زیادہ عہدے سنبھالے بیٹھے تھے۔ جاہ جاگیر چھن جانے کے بعد لاکھ کے گھر دیکھتے دیکھتے خاک ہو گئے۔ بڑی بڑی ڈھنڈار حویلیوں میں مغل بچے بھی پرانے سامان کی طرح جا پڑے۔ بھونچکے سے رہ گئے جیسے کسی نے پیروں تلے سے تختہ کھینچ لیا۔

تب ہی مغل بچے اپنے غرور اور خودداری کی تار تار چادر میں سمٹ کر اپنے اندر ہی اندر گھستے چلے گئے۔ مغل بچے اپنے محور سے کچھ کھسکے ہوئے ہوتے ہیں۔ کھرے مغل کی یہی پہچان ہے کہ اس کے دماغ کے دو چار پیچ ڈھیلے یا ضرورت سے زیادہ تنگ ہوتے ہیں۔ عرش سے فرش کی طرف لڑھکے تو ذہنی توازن ڈگمگا گئے۔ زندگی کی قدریں غلط ملط ہو گئیں۔ دماغ سے زیادہ جذبات سے کام لینے لگے۔

انگریز کی چاکری لعنت اور محنت مزدوری کسرِ شان' جو کچھ اثاثہ بچا اسے بیچ بیچ کر کھاتے رہے۔ ہمارے ابا کے چچا روپیہ پیسہ کی جگہ بچی کے جہیز کے پلنگ کے پایوں سے چاندی کا پترا اکھیڑ لے جاتے تھے۔ زیور اور برتنوں کے بعد لگے جوڑے نوچ نوچ کر کھاتے۔ پان دان کی کلھیاں سل بٹے سے کچل کر ٹکڑا ٹکڑا بیچیں اور کھائیں۔ گھر کے مرد دن بھر پلنگ کی ادوائین توڑتے۔ شام کو پرانی گھسی اچکن پہنی اور شطرنج پچیسی کھیلنے نکل گئے۔ گھر کی بیویاں چھپ چھپ کر سلائی کر لیتیں۔ چار پیسوں سے چولہا جل جاتا یا محلّہ کے بچوں کو قرآن پڑھا دیتیں تو کچھ نذرانہ مل جاتا۔

کالے میاں نے دوستوں کی چھیڑ خانی کو جی کا گھاؤ بنا لیا جیسے موت کی گھڑی نہیں ٹلتی ویسے ہی باپ ماں کی طے کی ہوئی شادی نہ ٹلی۔

کالے میاں سر جھکا کے دولہا بن گئے۔ کسی سرپھری نے عین آرسی مصحف کے وقت اور چھیڑ دیا۔

"خبردار جو دلہن کو ہاتھ لگایا' کالی ہو جائے گی۔"

مغل بچہ چوٹ کھائے ناگ کی طرح پلٹا' سر سے بہن کا آنچل نوچا اور باہر چلا گیا۔

ہنسی میں کھسی ہو گئی۔ ایک ماتم برپا ہو گیا۔ مردان خانہ میں اس ٹریجڈی کی خبر ہنسی میں اڑا دی گئی۔ بغیر آرسی مصحف کے رخصت ایک قیامت تھی۔

"بخدا میں اس کا غرور چکنا چور کر دوں گا۔ کسی ایسے ویسے سے نہیں مغل بچہ سے واسطہ ہے۔" کالے میاں پھنکارے۔

کالے میاں شہتیر کی طرح پوری مسہری پر دراز تھے دلہن ایک کونے میں گٹھری بنی کانپ رہی تھی۔ بارہ برس کی بچی کی بساط ہی کیا؟

"گھونگٹ اٹھاؤ۔" کالے میاں ڈکرائے۔

دلہن اور گڑی مڑی ہو گئی۔

"ہم کہتے ہیں گھونگٹ اٹھاؤ۔" کہنی کے بل اٹھ کر بولے۔ سہیلیوں نے تو کہا تھا۔ دولہا ہاتھ جوڑے گا۔ پیر پڑے گا پر خبردار جو گھونگٹ کو ہاتھ لگانے دیا۔ دلہن جتنی زیادہ مدافعت کرے اتنی ہی زیادہ پاکباز۔

"دیکھو جی تم نوابزادی ہو گی اپنے گھر کی ہماری تو پیر کی جوتی ہو۔ گھونگٹ اٹھاؤ ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں۔"

دلہن پر جیسے فالج گر گیا۔

کالے میاں چیتے کی طرح لپک کر اٹھے جوتیاں اٹھا کر بغل میں دابیں اور کھڑکی سے پائیں باغ میں کود گئے۔ صبح کی گاڑی سے وہ جودھپور دندنا گئے۔

گھر میں سوتا پڑا تھا۔ ایک اکا‌بی جو دلہن کے ساتھ آئی تھیں جاگ رہی تھیں۔ کان دلہن کی چیخوں کی طرف لگے تھے جب دلہن کے کمرے سے چوں بھی نہ آئی تو ان کے تو پیروں کا دم نکلنے لگا ہے ہے کیسی بے حیا لڑکی ہے۔ لڑکی جتنی معصوم اور کنواری ہو گی اتنا ہی زیادہ دند مچائے گی۔ کیا کچھ کالے میاں میں کھوٹ ہے۔ جی چاہا کوئیاں میں کود کے قصہ پاک کریں۔

چپکے سے کمرے میں جھانکا تو جی سن سے ہو گیا۔ دلہن جیسی کی تیسی دھری تھی اور دولہا غائب!

بڑے غیر دلچسپ قسم کے ہنگامے ہوئے تلواریں کھنچیں بڑی مشکل سے دلہن نے جو بیتی تھی کہہ سنائی۔ اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ خاندان میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک کالے میاں کی دوسری گوری بی کی طرفدار۔

"وہ آخر خدائے مجازی ہے۔ اس کا حکم نہ ماننا گناہ ہے۔"

ایک پارٹی جمی ہوئی تھی۔

"کہیں کسی دلہن نے خود گھونگٹ اٹھایا ہے؟" دوسری پارٹی کی دلیل تھی۔

کالے میاں کو جودھپور سے بلوا کر دلہن کا گھونگٹ اٹھوانے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ وہ وہاں گھوڑ سواروں میں بھرتی ہو گئے اور بیوی کو نان نفقہ بھیجتے رہے جو گوری بی کی اماں سمدھن کے منہ پر مار آتیں۔

گوری بی کلی سے پھول بن گئیں۔ ہر اٹھواڑے ہاتھ پیر میں مہندی رچاتی رہیں اور بندھے ٹکے ڈوپٹے اوڑھتی رہیں اور جیتی رہیں۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ باوا کی مرن گھڑی آپہنچی۔ کالے میاں کو خبر گئی تو نہ جانے کس موڈ میں تھے کہ بھاگے آئے۔ باوا موت کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ بیٹھے۔ کالے میاں کو طلب کیا دلہن کا گھونگٹ اٹھانے کی باریکیوں پر مسکوٹ ہوئی۔

کالے میاں نے سر جھکا دیا۔ مگر شرط وہی رہی کہ حشر ہو جائے مگر گھونگٹ تو دلہن کو اپنے ہاتھوں اٹھانا پڑے گا۔ "قبلہ و کعبہ میں قسم کھا چکا ہوں میرا سر قلم کر دیجئے" مگر قسم نہیں توڑ سکتا۔"

مغل بچوں کی تلواریں زنگھیا چکی تھیں۔ آپس کی مقدمہ بازیوں نے سارا کلف نکال دیا تھا۔ بس احمقانہ ضدیں رہ گئی تھیں، ایک انہیں کو کلیجے سے لگائے بیٹھے تھے۔ کسی نے کالے میاں سے نہ پوچھا تم نے ایسی احمقانہ قسم کھائی ہی کیوں کہ اچھی بھلی زندگی عذاب ہو گئی۔

خیر صاحب گوری بی پھر سے دلہن بنائی گئیں۔ لکھیا اینٹ والا مکان پھر پھولوں اور شمامۃ العنبر کی خوشبو سے مہک اٹھا۔ اماں نے سمجھایا۔

"تم اس کی منکوحہ ہو بیٹی جان۔ گھونگٹ اٹھانے میں کوئی عیب نہیں۔ اس کی ضد پوری کر دو مغل بچہ کی آن رہ جائے گی۔ تمہاری دنیا سنور جائے گی، گودی میں پھول برسیں گے۔ اللہ رسول کا حکم پورا ہو گا۔"

گوری بی سر جھکائے سنتی رہیں۔ کچی کلی سات سال میں نوخیز قیامت بن چکی تھی۔ حسن اور جوانی کا ایک طوفان تھا جو ان کے جسم سے پھوٹا نکلتا تھا۔

عورت کالے میاں کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ سارے حواس اسی ایک نکتہ پر مرکوز تھے۔ مگر ان کی قسم ایک میخ دار آہنی گولے کی طرح ان کے حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔ ان کے تخیل نے سات سال آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ انہوں نے بیسیوں گھونگٹ نوچ ڈالے رنڈی بازی، لونڈے بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی غرض کوئی بازی نہ چھوڑی مگر گوری بی کے گھونگٹ کی چوٹ دل میں پنجے گاڑے رہی۔ جو سات سال سہلانے کے بعد زخم بن چکی تھی۔ اس بار انہیں یقین تھا ان کی قسم پوری ہو گی۔ گوری بی ایسی عقل کی کوری نہیں کہ جینے کا یہ آخری موقع بھی گنوا دیں، دو انگلیوں سے ہلکا پھلکا آنچل ہی تو سرکانا ہے کوئی پہاڑ تو نہیں ڈھونے۔

"گھونگٹ اٹھاؤ" کالے میاں نے بڑی لجاجت سے کہنا چاہا مگر مغلئی دبدبہ غالب آگیا۔

گوری بیگم غرور سے تمتمائی سناٹے میں بیٹھی رہی۔

"آخری بار حکم دیتا ہوں۔ گھونگٹ اٹھا دو ورنہ اسی طرح پڑی سڑ جاؤ گی، اب جو گیا، پھر نہ آؤں گا۔"

مارے غصہ کے گوری بی لال بھبوکا ہو گئیں۔ کاش ان کے سلگتے رخسار سے ایک شعلہ لپکتا اور وہ منحوس گھونگٹ خاکستر ہو جاتا۔

بیچ کمرے میں کھڑے کالے میاں کوڑیالے سانپ کی طرح جھومتے رہے۔ پھر جوتے بغل میں دبائے اور پائیں باغ میں اتر گئے۔

اب وہ پائیں باغ کہاں؟ ادھر پچھواڑے لکڑیوں کی ٹال لگ گئی۔ بس دو جامن کے پیڑ رہ گئے تھے اور ایک جعفری بدگو بیلے چنبیلی کی روشیں، گلابوں کے جھنڈ شہتوت اور انار کے درخت کب کے لٹ پٹ گئے۔

جب تک ماں زندہ رہیں گوری بی کو سنبھالے رہیں ان کے بعد یہ ڈیوٹی خود گوری بی نے سنبھال لی ۔ ہر جمعرات کو مہندی پیس کر پابندی سے لگاتیں دوپٹہ رنگ چن کر ٹانکتیں اور جب تک سسرال زندہ رہی تہوار پر سلام کرنے جاتی رہیں۔

اب کے جو کالے میاں گئے تو غائب ہو گئے ۔ برسوں ان کا سراغ نہ ملا ۔ ماں باپ رو رو کر اندھے ہو گئے ' وہ نہ جانے کن جنگلوں کی خاک چھانتے پھرے ۔ کبھی خانقاہوں میں ان کا سراغ ملتا ۔ کبھی کسی مندر کی سیڑھیوں پر پڑے ملتے۔

گوری بی کے سنہری بالوں میں چاندی گھل گئی ۔ موت کی جھاڑو کام کرتی رہی ۔ آس پاس کی ریشمیں مکان کوڑیوں کے مول بکتے گئے ۔ کچھ پرانے لوگ زبردستی ڈٹ گئے ۔ گنجڑے قصائی آن بسے ' پرانے محل ڈھے کر نئی دنیا کی بنیاد پڑنے لگی ۔ پرچون کی دکان ' ڈسپنسری ایک مرگھلا سا جنرل سٹور بھی اگ آیا ' جہاں المونیم کی پتیلیاں اور لپٹن چائے کی پڑیوں کے ہار لٹکنے لگے۔

ایک مفلوج مٹھی کی دولت ریس کی بکھر رہی تھی ۔ چند محتاط انگلیاں سمیٹنے میں لگی تھیں ۔ جو کل تک اردوائین پر بیٹھتے تھے جھک جھک کر سلام کرتے تھے آج ساتھ اٹھنا بیٹھنا کسر شان سمجھنے لگے۔

گوری بی کا زیور آہستہ آہستہ لالہ جی کی تجوری میں پہنچ گیا ۔ دیواریں ڈھے رہی تھیں چھجے جھول رہے تھے بچے کھچے مغل بچے افیون کا انٹا نگل کر پتنگوں کے پیچ لڑا رہے تھے تیتر ' بٹیر سدھا رہے تھے اور کبوتروں کی دموں کے پر گن کر ہلکان ہو رہے تھے ۔ لفظ مرزا جو کبھی شان اور دبدبے کی علامت سمجھا جاتا تھا مذاق بن رہا تھا ۔ گوری بیوی کولہو کے اندھے بیل کی طرح زندگی کے چکڑے میں جتی اپنے محور پر گھومے جا رہی تھیں ۔ ان کی کرنجی آنکھوں میں تنہائیوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔

ان کے لیے طرح طرح کے افسانے مشہور تھے کہ ان پر جنوں کا بادشاہ عاشق تھا ۔ جونہی کالے میاں ان کے گھونگٹ کو ہاتھ لگاتے جٹ تلوار سونت کر کھڑا ہو جاتا ۔ ہر جمعرات کو عشاء کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتی ہیں تب سارا آنگن کوڑیالے سانپوں سے بھر جاتا ہے ۔ پھر سنہری کلغی والا سانپوں کا بادشاہ اجگر پر سوار ہو کر آتا ہے ۔ گوری بی کی قرآت پر سر دھنتا ہے پو پھٹتے ہی سب ناگ رخصت ہو جاتے ہیں۔

جب ہم یہ قصے سنتے تو کلیجے اچھل کر حلق میں پھنس جاتے اور رات کو سانپوں کی پھنکاریں سن کر سوتے میں چونک کر چیخیں مارتے۔

گوری بی نے ساری عمر کیسے کیسے ناگ کھلائے ہوں گے ۔ کیسے اکیلی نامراد زندگی کا بوجھ ڈھویا ہو گا ۔ ان کے رسیلے ہونٹوں کو کبھی کسی نے نہیں چوما ۔ انہوں نے جسم کی پکار کو کیا جواب دیا ہو گا؟

کاش یہ کہانی یہیں ختم ہو جاتی ۔ مگر قسمت مسکرا رہی تھی ۔

پورے چالیس برس بعد کالے میاں اچانک آپ ہی آن دھمکے ۔ انہیں قسم قسم کے لاعلاج امراض لاحق تھے ۔ پور پور سڑ رہی تھی روم روم رس رہا تھا ۔ بدبو کے مارے ناک سڑی جاتی تھی ۔ بس آنکھوں میں حسرتیں جاگ رہی تھیں ۔ جن کے سہارے جان سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔

"گوری بی سے کہو مشکل آسان کر جائیں ۔"

ایک کم ساٹھ کی دلہن نے روٹھے ہوئے دولہا میاں کو منانے کی تیاریاں شروع کر دیں ۔ مہندی گھول کر ہاتھ پیروں میں رچائی ۔ پانی سمو کر پنڈا پاک کیا ۔ سہاگ کا چکنا ہوا تیل سفید لٹوں میں بسایا ۔ صندوق کھول کر بور بور ٹپکتا جھڑتا بری کا جوڑا نکال کر پہنا اور ادھر کالے میاں دم توڑتے رہے۔

جب گوری بی شرماتی لجاتی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے سرہانے پہنچیں تو جھلنگے پر ہیکٹ تکیے اور گودڑ بستر پر پڑے ہوئے کالے میاں کی مٹھی بھر ہڈیوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ۔ موت کے فرشتے سے الجھتے ہوئے کالے میاں نے حکم دیا۔

"گوری بی گھونگٹ اٹھاؤ ۔"

گوری بی کے ہاتھ اٹھے مگر گھونگٹ تک پہنچنے سے پہلے گر گئے ۔

کالے میاں دم توڑ چکے تھے۔
وہ بڑے سکون سے اکڑوں بیٹھ گئیں، سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی کیں اور رنڈاپے کا سفید آنچل ماتھے پر کھنچ گیا۔

قدرت اللہ شہاب

نام : قدرت اللہ

قلمی نام : قدرت اللہ رونق / قدرت اللہ جعفر/ قدرت اللہ شہاب۔

پیدائش : ۲۶ فروری ۱۹۱۷ء بہ مقام گلگت۔ (۱)

وفات : ۲۴ جولائی ۱۹۸۶ء بہ مقام اسلام۔ پاکستان۔

تعلیم : ایم۔ اے۔ (انگریزی)

ابتدائی تعلیم چترال اور گلگت کے اسکولوں میں پائی۔ بابا اجیت سنگھ خالصہ ہائی اسکول' چمکور سے میٹرک کیا۔ ایف۔ ایس سی اور بی۔ ایس سی کے امتحانات پرنس آف ویلز کالج' جموں سے پاس کیے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے ان کی تعلیم کے لیے وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ گورنمنٹ کالج' لاہور سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

قدرت اللہ شہاب کے والد محمد عبداللہ اولین علیگ گریجویٹ تھے۔ ریاست جموں و کشمیر میں ملازمت کے دوران اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ مستر چترال کے دربار میں نمایاں عہدہ ملا' گلگت کے گورنر رہے۔ قدرت اللہ شہاب کی والدہ کا نام کریماں بی بی تھا۔
شہاب کا بچپن گلگت اور چترال میں گزرا۔ ان کے لڑکپن میں وہاں طاعون کی وبا پھوٹی تو شہاب کو چمکور' ضلع انبالہ بھجوا دیا گیا' جہاں سے میٹرک کیا۔ ایف ایس سی اور بی۔ ایس سی کرنے کے زمانے میں جموں میں قیام تھا۔ ایم۔ اے۔ (انگریزی) کرنے کے دوران لاہور میں رہے۔ ۱۹۴۱ء میں انڈین سول سروس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد جب تربیت حاصل کرنے سول سروس اکیڈمی' ڈیرہ دون گئے تو خود کو اس ماحول میں یکسر اجنبی پایا۔ تربیت سے متعلق ان کی ابتدائی خفیہ رپورٹ میں لکھا گیا تھا کہ: "یہ شخص اس سروس کے لیے مکمل طور پر مس فٹ ہے۔" (۲)

قیام پاکستان سے قبل بطور آئی۔ سی ایس افسر اڑیسہ' مغربی بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز رہے۔ ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے ہوا۔ سب سے پہلے رونق اور بعد ازاں جعفر تخلص اختیار کیا۔ شہاب کی خواہش کے مطابق آزادی کے بعد ان کی خدمات حکومت پاکستان کو تفویض کر دی گئیں۔ غلام محمد' میجر جنرل سکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خان کے سیکرٹری' وفاقی سیکرٹری برائے اطلاعات و نشریات اور وفاقی سیکرٹری تعلیم رہے۔ ایوب خان کے پرسنل سیکرٹری کے طور پر کام کرتے ہوئے پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد رکھی اور کاپی رائٹ ایکٹ منظور کروایا۔

تین برس ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر رہے۔ ۱۹۶۹ء میں جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کے فوراً بعد سرکٹ ہاؤس میں وفاقی سیکرٹریوں کے اجلاس میں بطور وفاقی سیکرٹری اطلاعات و نشریات شرکت کرنے کے بعد مستعفی ہو گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں دوبارہ وفاقی سیکرٹری تعلیم ہوئے۔ جون ۱۹۷۴ء میں جب ان کی بیگم ڈاکٹر عفت نے وفات پائی تو انہیں دائمی چپ سی لگ گئی اور محض دو برس بعد ریٹائرمنٹ لے لی۔
انتہائی کم گو' مردم بیزار اور انتہا درجہ غیر متاثر کن شخصیت کے مالک قدرت اللہ شہاب کو بہ یک وقت پہنچا ہوا ولی اللہ' سی۔ آئی۔ اے

کا ایجنٹ اور پاپی بیورو کریٹ سمجھا گیا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۸۶ء تک کا زمانہ "شہاب نامہ" لکھنے میں صرف کیا۔

اولین مطبوعہ:

"چندراوتی" مطبوعہ : "رومان" لاہور : ۱۹۳۹ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "یا خدا" (ناولٹ) لاہور اکیڈمی، لاہور : طبع اول: جون ۱۹۴۸ء

یہ کتاب لالہ رخ پبلی کیشنز، کراچی نے بھی شائع کی ہے۔

اس ناول کے کل تین ابواب ہیں : "رب المشرقین" "رب المغربین" اور "رب العالمین"۔ کل صفحات ۱۱۲

۲۔ "نفسانے" (سولہ افسانے) مکتبہ جدید لاہور : طبع اول: ۱۹۵۰ء

۱۔ غریب خانہ ۲۔ شلوار ۳۔ جگ جگ ۴۔ کئی ہے رات تو ۵۔ سب کا مالک ۶۔ ماما ۷۔ جال ۸۔ آیا ۹۔ تلاش ۱۰۔ دو رنگا ۱۱۔ جل ترنگ ۱۲۔ ڈاگی ۱۳۔ تین تارے ۱۴۔ پہلی تنخواہ ۱۵۔ صنم پبلکیت ۱۶۔ سٹینو گرافر

۳۔ "ماں جی" (سولہ افسانے) لاہور اکیڈمی لاہور: طبع اول: ۱۹۶۸ء

۱۔ شلوار ۲۔ جگ جگ ۳۔ آیا ۴۔ تلاش ۵۔ دو رنگا ۶۔ جل ترنگ ۷۔ پہلی تنخواہ ۸۔ پھوڑے والی ٹانگ ۹۔ پکے پکے آم ۱۰۔ ریلوے جنکشن ۱۱۔ سردار جسونت سنگھ ۱۲۔ ماں جی ۱۳۔ ایک پنچر ۱۴۔ نمبر پلیز ۱۵۔ اور عائشہ آ گئی ۱۶۔ سول لائن

(اس کے علاوہ ایک رپورتاژ "اے بنی اسرائیل"۔ چار طنزیہ مضامین، دو مضامین، اور دو سفرنامے بھی اسی مجموعے میں شامل ہیں) نمبر شمار ا تا ۷ کے افسانے "نفسانے" میں شامل ہیں۔

۴۔ "سرخ فیتہ" (افسانے)

۵۔ "شہاب نامہ" (خود نوشت / آپ بیتی)

زندگی میں مستقل پتا:

مکان نمبر ۲۱، گلی نمبر ۱۰، ایف ۶/۳، اسلام آباد۔ پاکستان۔

نظریہ فن:

"افسانے کے متعلق میرا کوئی خاص نظریہ فن نہیں ہے۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ لکھنے اور پڑھنے والے دونوں کا دل خوش ہو۔"

(بہ حوالہ : مکتوب بنام مرزا حامد بیگ محررہ ۲۲/ ستمبر ۱۹۸۳ء)

○

(۱) اکثر حوالہ جاتی کتب میں ۱۹۱۹ء درج ہے۔ ۱۹۱۷ء کی تاریخ سے خود مجھے خط لکھ کر مطلع فرمایا۔

(۲) بہ حوالہ : یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" مرتبہ : طاہر مسعود

قدرت اللہ شہاب

ماں جی

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔

جس زمانے میں لائل پور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لئے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرف عام میں لائل پور' جھنگ' سرگودھا وغیرہ کو "بار" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہو گی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیئے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے۔ لیکن سیدھے آدمی تھے۔ کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آباد کاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی' دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پور روانہ گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی۔ اس لئے پاپیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں۔ یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے اور پوچھ پاچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پاپیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقر عید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیئے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کے نزدیک سو روپے دس روپے' پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔ عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا اس کے بعد جب کبھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی لیکن لاہور اور کراچی

جیسے شہروں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لئے جمع کر رکھے تھے چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی' نہ کوئی زیور۔ اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے' ایک جوڑا دیسی جوتا' ایک جوڑا ربڑ کے چپل' ایک عینک' ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر کیسے کے نیچے رکھا رہتا تھا۔ تاکہ استری ہو جائے۔ تیسرا دھونے کے لئے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تھا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انہیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لئے انہیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انہیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بکل ماری اور جہاں کہیے چلنے کو تیار۔ سفر آخرت بھی انہوں نے اس سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر کیسے کے نیچے رکھے۔ نہا دھو کر بال سکھائے اور چند ہی منٹوں میں زندگی کے سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے دنیا میں رہی تھیں اسی خاموشی سے عقبیٰ کو سدھار گئیں۔ غالباً اسی موقع کے لئے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں "کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ چلاتے اٹھا لے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے.....

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی' دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں' لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں کبھی بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں۔ اکثر و بیشتر دوپہر کا شاذو نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا۔ خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لئے انہوں نے براہ راست کبھی کچھ نہ مانگا۔ پہلے دوسروں کے لئے دعا مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوق خدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انہوں نے اپنی زبان سے کبھی "میرے بیٹے" یا "میری بیٹی" کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال کہا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کا کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کوئی کام کر دیتا تو انہیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ احسان مندی سے سارا دن اسے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔ جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خورد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائل پور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں تو انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ انہیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا جو کہیں سر راہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہو گا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائلپور کے علاقے میں پاپیادہ بھٹکتا رہا۔ لیکن کسی راہ گزر پر انہیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آکر انہوں نے چک نمبر ۳۹۲ میں جو ان دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا ڈیرے ڈال دیئے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آکر آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھونس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انہی دنوں محکمہ مال کا عملہ پڑتال کے لئے آیا۔ نانا جی کے پاس الاٹمنٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انہیں چک سے نکال دیا گیا اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لیے۔ عملے کے ایک آدمی

نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتروالیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی جس سے ماں جی کے بائیں کان کا زیریں حصہ بری طرح سے پھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لئے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آیا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگو لیتیں تاکہ پیاس لگنے سے اپنے چھوٹے بھائیوں کو چساتی جائیں۔ اس طرح وہ چلتے چلتے چک نمبر ۵۰۷ میں پہنچے جہاں ایک جان پہچان کے آبادکار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گایوں کے لئے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انہیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے ابال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی امبیاں گری ہوئی مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توریئے اور کلتھے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آگیا۔ نانی مزدوری میں مصروف تھی۔ ماں جی نے ساگ چولہے پر چڑھایا۔ جب پک تیار ہو گیا اور ساگ کو الن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہہ کر چولہے میں آپڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولہے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۵۰۷ نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آبادکاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربعہ زمین مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر منید کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوب چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انہوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد و غبار کا ان پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دوبار جب انہیں مجبوراً ایئرکنڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہو گئیں اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گزرا۔

منید پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تحائف دیئے۔ دعوتیں ہوئیں اور پھر ماں جی کے لئے بر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لئے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لئے نانی جی انہیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں۔ ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا دوبھر ہو گیا تھا میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے۔ یہ خیال بخش مربع دار کی بیٹی جا رہی ہے۔ دیکھیے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔

"ماں جی آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟" ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

"توبہ توبہ پت" ماں جی کانوں پر ہاتھ لگاتیں۔ "میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لئے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائیداد رہن پڑی ہے چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انہوں نے ایسی جائیداد بنانے کا عزم کر لیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں اول آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اڑتے اڑتے یہ خبر سرسید کے کانوں میں پڑ گئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں بھیجا اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ اپنا رنگ نکالا اور بی۔ اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی ' عربی ' فلسفہ اور حساب کے لیکچرر ہو گئے۔

سرسید کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں میں جائیں۔ چنانچہ انہوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ انگلستان میں جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کر کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور انہوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرسید کو بے حد غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔ انہوں نے لاکھ سمجھایا بجھایا ' ڈرایا ' دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟" سرسید نے کڑک کر پوچھا۔

"جی ہاں" عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ تکا سا جواب سن کر سرسید صاحب آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انہوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں ' مکوں تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور کالج کی نوکری سے برخواست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا۔ "اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمہارا نام بھی نہ سن سکوں۔"

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے۔ اتنے سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انہیں سب سے دور افتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا چنانچہ وہ ناک کی سیدھ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی۔ انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبداللہ صاحب دلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں اتفاقاً یا شاید دانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے انہیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ روپے وصول کر لئے۔ عبداللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کئے لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بہت اصرار بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

"اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟ عبداللہ صاحب نے پوچھا۔

"اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوا دوں گی۔" ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انہوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی خوبصورت بنگلہ ' وسیع باغ ' نوکر چاکر ' دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ۔ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا۔ لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرہ بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول پر اثر انداز نہ ہوتا تھا بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سر یا کرنل بیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولیٹکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی بیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انہوں نے فراک پہنے ہوئے تھے اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انہوں نے لیڈی بیلی سے کہا "تمہاری عمر تو جیسے گزرنی تھی گزر ہی گئی ہے۔ اب آپ اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو۔" یہ کہہ کر انہوں نے مس بیلی کو اپنے پاس رکھ لیا اور چند مہینوں میں اسے کھانا پکانا سینا پرونا ' برتن مانجھنا کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کرزن سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کرزن نے اپنی تقریر میں کہا "مسٹر گورنر 'جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں 'براہ مہربانی میری طرف سے آپ ان کے ہاتھ چوم لیں۔"

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوٹ تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکی کی روٹی کھا رہی ہیں۔ ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا کہ لارڈ کرزن یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟"

"میں۔" ماں جی تنک کر بولیں۔ "میں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے"

"میں" عبداللہ صاحب نے ڈرامہ کیا میں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمہیں ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا۔ جیسے سرسید کے ہاں سے بھاگا تھا۔

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار ---- ماں جی رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں۔ جو عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات "گورنری" کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

"بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!"

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا۔ بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورنری تو دراصل تمہاری سوکن ہے۔ جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا حال سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آگئی۔ ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ کی خبر

لیں۔

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاپ سنگھ تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا افتاد آ پڑی۔ لیکن معاملے کی تہہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیر وزارت کے نام سے پکارا جائے ۔ ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

"اب تم دودھوں نہاؤ 'پوتوں پھلو"۔ کبھی ہمارے لئے بھی دعا کرنا۔

مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔ اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر صبر و شکر 'تسلیم و رضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دکھ۔ کتنے غم' کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کئے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالم شباب انگلستان جا کر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہا دیا کہ اللہ کا مال تھا اللہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خوب کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھردری چارپائی پر حسب معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائنتی پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کران کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکایک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے "بھاگوان شادی سے پہلے میلے میں میں نے تمہیں گیارہ پیسے دیئے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟"

ماں جی نے نئی نویلی دلہنوں کی طرح سرجھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں ان کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال امڈے آئے "ابھی وقت کہاں آیا ہے۔ سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے۔ لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نباہ کیا ہے۔ اس پر میں نے تمہارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمہیں پہنانی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔

لیکن قضا۔ قدر کے بہی کھاتے میں وقت آ چکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبداللہ گنے کی قاش منہ میں لئے گاؤ تکیہ پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بتیرا بلایا 'ہلایا' چمکارا لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے لگا لگا کر تلقین کی 'بچہ' رونا مت۔ تمہارے ابا جی جس آرام سے رہے تھے 'اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔"

کہنے کو تو ماں جی نے کہا دیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا ورنہ ان کو تکلیف پہنچے گی۔ لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ روئی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انہیں ایک الھڑ دلہن سمجھا اور جس نے "گورنری" کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی۔

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں 'جو قیامت تک انہیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا ملاں پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے

اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اگر رویا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔

○

سید رفیق حسین

نام : سید رفیق حسین جعفری
قلمی نام : سید رفیق حسین جعفری (۱) / سید رفیق حسین
پیدائش : ۱۸۹۴ء بہ مقام محلہ شاہ گنج، لکھنؤ، بھارت۔ (۲)
وفات : ۱۹۳۶ء
تعلیم : ڈپلوما مکینیکل انجینئرنگ، وکٹوریہ جوبلی ٹیکنیکل کالج، بمبئی ۱۹۲۰ء
ابتدائی تعلیم : ٹلمور وارڈ سکول اناوہ میں حاصل کی۔

مختصر حالاتِ زندگی:

سات برس کی عمر میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بچپن دربدری میں گزرا، کبھی بہن کے ہاں تو کبھی پھوپھی کے پاس۔ والد کے دوسری شادی کرنے پر قدرے زندگی میں قرینہ آیا لیکن اس وقت تک تعلیم کا سلسلہ اتنا بگڑ چکا تھا کہ پھر کبھی سدھر نہ سکا۔ سید رفیق حسین اپنے زمانہ طالب العلمی میں کبھی بھی اچھے طالب العلم شمار نہ کیے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں والد اناوے میں تھے اور یہ نویں درجے کے طالب العلم، جب گھر سے بغیر اطلاع کے بھاگے اور بمبئی پہنچے۔ چھ ماہ تک ڈھلائی کے ایک کارخانے نیپیئر فاؤنڈری ورکس میں بطور قلی دن بھر مشقت کرتے اور رات کو پڑھتے رہے۔ جب گھر سے رابطہ قائم کیا تو باقاعدہ خرچ آنے لگا اور انہوں نے وکٹوریہ جوبلی ٹیکنیکل کالج بمبئی سے ۱۹۲۰ء میں میکینکل انجینئرنگ میں ڈپلوما لیا اور جھانسی کی ریلوے ورکشاپ میں چھ ماہ تک ملازمت کی۔ ۱۹۲۱ء میں ریلوے ورکشاپ شاہ گڑھ چلے گئے۔ ملازمت کے سلسلے میں بارہ برس ترائی کے جنگلات میں گزارے۔ بحرِ ہند میں بحری جہازوں پر کام کیا، حج کیا۔ ساری زندگی نکر اور آدھی آستین کی قمیض پہنی۔ ۱۹۲۴ء میں انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز کے ایسوسی ایٹ ممبر کے طور پر چار ہزار روپے ماہانہ مشاہرہ پاتے رہے۔ ۱۹۲۷ء میں سرکاری ملازمت سے دست بردار ہو کر تجارت کی لگن میں شکر سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا۔ ۳۲۔۱۹۳۰ء کے لگ بھگ شکر سازی کا کارخانہ اپنے انجام کو پہنچا تو بہار کی ایک شوگر فیکٹری میں انتہائی قلیل تنخواہ پر ورکشاپ سپرنٹنڈنٹ کی جگہ ملی۔ اس کے بعد کچھ مدت علاقہ کریرا کی شوگر فیکٹری میں چیف انجینئر رہے۔ بقول سید رفیق حسین (بحوالہ فسانہ اکبر) چودہ ملازمتیں کیں۔ آخری زمانے میں گورنمنٹ سنٹرل ورکشاپ کانپور میں پلاننگ سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اردو میں املا کی یہ حالت تھی کہ اپنا لکھا، خود نہ پڑھ سکتے تھے۔

اولین افسانہ:

"امید" تکمیل: ۱۹۳۷ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"نقارہ" مطبوعہ: "ساقی" دہلی، ۱۹۳۰ء۔ (۳)

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "آئینہ حیرت" (افسانے) طبع اول: ساقی بکڈپو، دلی، ۱۹۴۴ء (۴)

غیر مدون:

اس کتاب کے علاوہ "نیا دور" کراچی شمارہ نمبر ۳۵ و نمبر ۳۶ میں رفیق حسین کے آٹھ افسانے (مشمولہ: "آئینہ حیرت") "گمریات" اور "ہندوستان کی تباہی کا راز" (دو مضامین) "نیم کی نمولی" اور "فنا" (دو طویل مختصر افسانے) اور فسانہ اکبر" (ناولٹ) شائع ہوئے۔ رسالہ "ساقی" کے افسانہ نمبر جولائی ۱۹۴۰ء میں سید رفیق حسین کا ایک یکسر مختلف افسانہ "شیریں فرہاد" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

نظریہ فن:

"جھوٹا ہوں، سچا ہوں، دیوانہ یا سنکی۔ جو کچھ بھی ہوں آپ کے آگے حاضر ہوں۔"

سید رفیق حسین
(بہ حوالہ: "افسانہ اکبر" مطبوعہ: "نیا دور" کراچی شمارہ ۳۵۔۳۶)

"زندگی سے الگ آرٹ کا کوئی تصور کم از کم میرے ذہن میں نہیں" (بہ حوالہ "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ: بشیر ہندی لگ بھگ ۱۹۴۶ء)

○

(۱) "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ: بشیر ہندی میں افسانہ "حضت وہ تو نکل گئے" پر افسانہ نگار کا نام سید رفیق حسین جعفری چھپا ہے۔
(۲) "میرا پسندیدہ افسانہ" میں خود نوشتہ کوائف میں انھوں نے اپنا سال پیدائش ۱۸۹۵ء لکھا ہے جو درست نہیں۔ یہ دستاویزی سال پیدائش ہے۔
(۳) "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ: بشیر ہندی میں شامل سید رفیق حسین کے خود نوشتہ کوائف میں افسانہ "کلوا" کو اولین افسانہ شمار کیا گیا ہے، جو درست نہیں۔
(۴) یہ مجموعہ پاکستان سے دوسری بار "گوری ہو گوری" اور تیسری بار بھارت سے "شیر کیا سوچتا ہو گا" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

سید رفیق حسین

گوری ہو گوری

چوماسہ کی اندھیاری رات تھی۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جھینگروں نے جھنکار مچا رکھی تھی۔ مینڈک بول رہے تھے۔ ٹر ٹر ٹر
پیپل کے سوکھے ڈگالے پر الو کہتا تھا۔ ہک ہو۔ ہک ہو۔

بسنتی نے کروٹ لی۔ پھر منہ پر تھپڑ مارا بولی "ہائے رے۔ ارے رام کیسے ڈانس لاگیں۔"

پیپل پر الو بولا۔ ہک ہو' ہک ہو۔

چھ مہینے کا بچہ پاس لیٹا تھا۔ اس پر ہاتھ رکھ لیا اور بسنتی بولی۔ "مری جائے۔ پھر آئے بیٹھا۔ بولت کیسے ناس پیٹا۔"

ہک ہو' ہک ہو۔

"اجی او جی۔ اجی او جی۔ اٹھو نا۔ گھگھو بولے۔ موہے ڈر لاگے۔"

مادھو نے اس کا ہاتھ جھٹکا' بولا۔ "سون دے ری۔ اری ناکھائے لے تو ہے۔"

"اٹھو جی اٹھو۔ موہے ڈر لاگے۔ تنی اڑائے دے۔ او نھو۔"

مادھو "ادھ سے تو را ڈر" کہتا ہوا آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ کھٹیا سے نیچے پیر لٹکایا۔ جلدی سے پھر اوپر کھینچ لیا۔ گھبرا کے پھر نیچے دیکھا۔ پھر
ادھر ادھر دیکھا چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ چھوٹی چمنی کی دھوئیں سے کالی لالٹین تھی۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھلملا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔

مادھو بولا "جو کا ہوا رے!"

بسنتی گھبرا کر اٹھی۔ بولی۔ "اجی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام۔ ھیکا کو جگالو۔ ارے رنکیا کو جگالو۔ ارے ان ہن کی پیڑھی کو۔ پانی آئے
گیا رے۔ ارے او ھیکا۔ رنکیا ہو ارے او رنکیا۔ سوئے جات رے۔ ارے اٹھ اٹھ او ھیکا۔"

آٹھ برس کی دبلی پتلی رنکیا جاگی۔ چھ برس کا ھیکا جاگا۔ دودھ پیتا پاس لیٹا بچہ جاگا۔ یہ رویا' وہ چلائے۔ "اری میاری' موہے لئے
لے باپو رے۔ اری میاری۔"

"چپ کرو چپ۔" مادھو نے ڈانٹا۔ خاموشی میں مادھو نے کان لگائے۔ بسنتی نے دھیان دیا۔ دور کہیں سے آواز آ رہی تھی۔ گڑپ۔
شل شل شل۔ گڑپ شل شل شل۔ گھگھو بولا' ہک ہو۔

بسنتی روتی ہوئی چلائی۔ "ارے پریتم بھیا آئی گئی۔ ارے مورے بچے کی جورے"۔ کھٹولے سے کود۔ پانی میں چھپھاتے بچے ماں سے
چپٹے۔ مادھو اٹھا' دیکھنے کو دروازے کی طرف چلا۔ بسنتی روئی۔ "اجی جاوت کہاں ہو جی۔"

باہر سے آواز آئی۔ "مادھو بھیا ہو۔ او مادھو۔ ارے باڑھ آئی۔ اٹھ رے اٹھ۔"

گڑپ' گڑپ' شل شل شل۔ پانی کے بہنے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

مم مم۔ میں۔ بکری بولی۔ ماں۔ ہاں آں۔ ماں۔ ہاں آں۔ کہیں گیاں چلا رہی تھیں۔ بارہ گھر کے گوجر پروے میں ہلچل مچ گئی۔ سب جاگ
اٹھے۔ سب بھاگنے لگے۔ کوئی پکارتا تھا۔ کوئی چلاتا تھا۔ کوئی روتا تھا۔

مادھو نے رمکلیا کو کوٹھے کی سیڑھیوں پر کھڑا کر دیا۔ ھیکا کو گود میں لیا اور سامان رکھنے اور اٹھانے میں لگ گیا۔ بسنتی نے گود والی لڑکی کو دبائے دبائے چون کی ککی اٹھائی' تیرتی ہنڈیا پکڑی۔ مٹکا کترایا ہوا پرے سے نکلا جاتا تھا۔ اسے پیر سے روکا۔ کھٹیا نے سر ہلایا۔ پھر وہ بھی گھومی۔ دری۔ بچھورا۔ کھتری سب کچھ اس پر تھا۔ لو وہ بھی چلی۔

گھر کے باہر آدمی اور جانور چلا رہے تھے۔ گھر کے اندر رمکلیا اور ھیکا رو رہے تھے۔ پانی کا شور اندر اور باہر سب جگہ تھا۔ بسنتی اور مادھو گھر کے سامان میں لگے تھے۔ شور ہوا "بھاگو بھاگو۔ او بسنتی نکل' ارے مادھو بھاگ۔"

پانی نے ہچکولا لیا۔ پنڈلی سے اچکا۔ رانوں تک آیا۔

"بھاگو بھاگو۔ مادھو بھیا بھاگو رے۔ ارے کا ہوئے گیا۔ نکست کاہے ناہیں۔"

باہر سے آوازیں آئیں۔ پانی نے پھر ہچکولا لیا۔ آگے بڑھا۔ پیچھے ہٹا اور ران سے کمر تک آیا۔

بسنتی روئی۔ "ارے مورے گڑوے۔ ارے موری ہنسلی تو نکال لے رے۔"

"چل چل' تو چل نکل۔ میں لایا۔ ارے نون چون تو لئے لوں۔ اڑھنا بچھورا تو دبائے لوں"۔

پانی کا شور تھا۔ چار آدمیوں کا چلاتا تھا۔ دروازہ پر دھکے تھے۔ وہ کھل گیا آدمی گھر میں آگئے۔ مادھو اور بسنتی کو پکڑ کر گھسیٹا۔ "چالو۔ چالو سب چھوڑو۔ جان ہی بچائے لو' چالو' چالو۔"

اس گڑبڑ میں' جلدی میں' گھبراہٹ میں' اندھیرے میں دری' بچھورے' کپڑوں کے لئے پکارتی۔ ناج اور ناج کی کٹھیوں کے لئے پکارتی۔ برتنوں اور زیوروں کیلئے پھڑکتی بسنتی نے یہ بھی کہا۔ "بھیا رے رمکلیا کوئے لے رے" لالٹین ڈوب چکی تھی۔ اندھیرے میں کسی نے جواب دیا۔ "موں اٹھائے لوں۔ تو تو چل۔ اری نکس باہرے۔"

پانی کی شل شل۔ رات اندھیری۔ بادل کی گرج' بجلی کی چمک۔ کمر کمر سینے سینے پانی میں بیس تیس آدمی۔ پچاس ساٹھ مویشی چلے۔ ہر آدمی بول رہا تھا۔ ہر جانور چلا رہا تھا۔ کوئی گرتا تھا دوسرا سنبھلتا تھا۔ کوئی ڈوبتا تھا۔ دوسرا ابھارتا تھا۔ شروع میں تو سب جتھا بنائے ایک دوسرے کو سنبھالتے پردے سے باہر چلے۔ آموں کے باغ کے اندر سے ہو کر پون میل کے فاصلے پر دور ریل کی اونچی پٹری کا رخ کیا تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے اندھیرے میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے۔

مادھو اور بسنتی ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے تھے۔ دودھ پیتی لڑکی اور ھیکا انکے ساتھ تھے۔ رمکلیا کو بھی کسی نے کوٹھے کے زینے پر سے اٹھا لیا تھا۔ ان کو اس کا اطمینان تھا مگر مادھو کو اپنی گائے اور چار بیلوں کی فکر تھی جو کہ گاؤں سے باہر کنوئیں کے پاس بنگیہ پر اسکے سالے کے ساتھ رہتے تھے۔ بسنتی کو ڈھوروں کی اتنی فکر نہ تھی۔ اب وہ اپنے بھائی کیلئے بیتاب تھی۔ "ادھر تو وہ اکلا ہی رہتا ہے۔ نہ جانے جاگا کہ ناہیں۔ کا جانے آیا کہ نہیں"۔ مادھو نے گرتی ہوئی جورو کو سنبھالتے ہوئے دہرایا۔ "کوؤ جانے جاگا کہ ناہیں۔ کا جانے بروے کھولے کہ ناہیں۔"

اندھیری رات تھی ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پانی کمر اور کمر سے اونچا تھا۔ ساتھی سب بچھڑ بچھڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ ادھر ادھر دور اور نزدیک آوازیں ان کی آ رہی تھیں۔

"جاگی ہو جاگی۔"

"آئے رہوں دادا۔"

"مری رے مری۔"

"بھلا رے بھلا۔ چالے چالو۔"

مادھو بھی بار بار سالے کو پکارتا تھا "ناگا او ناگا" اور جواب نہ آتا تھا۔ اب پانی میں شور کے ساتھ زور بھی بڑھا۔ کسی نے اندھیرے

میں پکار کر کہا۔ "لین کے لگے نریا ہے نریا"۔ کوئی بولا۔ "سنبھلے سنبھلے نکلے چالو"۔ کسی نے کہا "ڈنے رہو بھیا۔ ڈنے رہنا بھیا۔ آگئی لین۔"

ایک دفعہ اندھیرے میں ناگا کی آواز آئی۔ "مادھو بھیا ہو۔ کوؤ مادھو بھیا دیکھو؟" کسی نے جواب دیا۔ "بڑا دکھوئی یار ہاتھ لو تو لوکت ناہیں۔"

مادھو نے جلدی سے پکار کر جواب دیا۔ "بھلی ہے بھلی۔ آنت ہوں۔" "بروے لے آیا رے؟" ناگا چلایا۔ "بسنتی کتے بولت ناہیں!"

"ارے ہے رے مورے ساتھ۔ بروے کتے چھوڑے؟ لے آیا رے؟"

"آئے جاؤ۔ آئے جاؤ۔" "آر" کے آر کی لائن پاس آگئی تھی۔ ناگا دو گز پانی کے باہر کھڑا تھا۔

ڈکراتی بھینسیں' چلاتی گائیں' ممیاتی بکریاں' روتے بچے' سہمی عورتیں' پکارتے مرد' سب بھیگے' سب پانی نپ نپاتے ریل کی پٹڑی پر چڑھے۔ اندھیری رات میں سونی پٹڑی آباد ہو گئی۔ لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کون کون آگیا ہے اور کون کون رہ گیا۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کی فکر تھی۔ چھوٹے سے پروے کی پوری آبادی کی مردم شماری کی گئی۔

آدمیوں اور جانوروں دونوں کی گنتی ہوئی۔ جانور سب موجود تھے۔ آدمیوں میں ایک چمار کا لڑکا اور دو سگے بھائی کری کم تھے۔ بچوں میں رمکیا کم تھی۔

بسنتی نے رمکیا کے واسطے اور چمار چمارن نے لڑکے کے واسطے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ دونوں کری بھائیوں کے رشتہ داروں کو اطمینان تھا کیونکہ ایک تو دونوں تیراک تھے دوسرے کافی اونچے مکا کے کھیت میں بہت مضبوط اور اونچے مچان پر وہ سوئے ہوئے تھے۔

رمکیا کی ماں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی سب دلاسہ دیتے تھے۔ ہر کوئی سمجھاتا تھا۔ رو دھو نا' صبر کر۔ شاید دونوں کریوں میں سے ہی کوئی آگیا ہو گا۔ کسی درخت پر ہی لے کر بیٹھ گیا ہو۔ چمار کا لڑکا بھی تو وہیں تھا اسے ہی تو کہا تھا گودی لے لے گا وہی اسکو لے کر کسی درخت پر چڑھ گیا ہو گا۔ پر ماتا کی ماری دکھیاری چپ کیسے ہوتی۔ اس کا تو دل ہی ٹوٹا جاتا تھا۔ مادھو بھی چپکا کھڑا روتا تھا۔ ناگا ہچکیاں لیتا تھا۔ اور وہیں پر ان کی گوری گائے کھڑی اراتی تھی۔ تو کاں آں ھ' تو کاں ہاں ھ' یہ بھی دکھ بھنی ماں ہے ارے کوئی جانے نا جانے۔ بچھڑا اس کا بھی نہیں ملتا ہے۔ دکھیا روتی ہے تو کاں آں ھ۔

روتی ہچکیاں لیتی ہوئی بسنتی کے پاس بولتی ہوئی گائے آئی۔ بسنتی نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور روئی۔

"گوری رے۔ موری رمکیا...... اھ اھ اھ اھ

"گوری رے اب تو ہے کون چرائے...... اھ اھ اھ اھ

"گوری رے اب تو ہے کون کھلائے..... اوھ اوھ اوھ اوھ

"گوری رمکیا تو گئی رے..... اوھ اوھ اوھ اوھ

"گوری تو ری رمکایا..... "اھ اھ اھ اھ

گائے نے وہی لمبی آواز نکالی۔ کاں آں ھ

کوئی جانے نہ جانے' دل کی گتی رام جانے۔ گائے نے چلا چلا کر اور بسنتی نے سسکیاں لے لے کر آخر صبح ہی کر دی۔ نکلتے دن کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گوجر پروے کی طرف اٹھ گئیں۔ سامنے چھوٹا سا آموں کا باغ تھا۔ اس ہی کے برابر اور کچھ اس کی آڑ میں گوجر پروا آباد تھا۔ لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ آموں کے درخت تو تھے مکان بہہ چکے تھے۔ اور اگر کوئی بچا کھچا مکان ہو گا بھی تو درختوں کی آڑ میں ہو گا۔ سامنے تو باغ ہی باغ تھا۔ جس کے درخت اپنے ہرے ہرے ہاتھ پانی پر پھیلائے مل رہے تھے' اور پھر ان کے پار' میلوں میلوں جہاں جہاں تک

نظر جاتی پانی ہی پانی تھا۔ ریل کی لائن کے قریب ہی جہاں پر چھوٹا سا نالہ تھا پانی کا دھارا تیزی سے چل رہا تھا۔ لیکن پھر بھی چار نوجوانوں نے ہمت کی، لنگوٹی کس پانی میں کود پڑے۔ تیرتے ہوئے آموں کے باغ تک گئے۔ وہاں چمار اور دونوں کرمی بھائی تو موجود تھے رمکلیا نہ تھی۔ چمار کو تیرنا نہ آتا تھا۔ اور پھر ڈرتا بہت تھا۔ ان لوگوں نے ایک پیلا ڈھونڈ لیا تھا جو کہ درختوں میں الجھ کر تیرتا ہوا رہ گیا تھا۔ سب نے چمار سے بہت کہا کہ اس پنیلے پر دونوں ہاتھوں کا سہارا لے اور یہ لوگ کھیتے ہوئے اسے لے جائیں گے مگر اس کی عقل میں ہی نہ آئے۔ ڈر کے مارے مرا جائے۔ پانی میں اترے ہی نہیں، بہت سمجھایا، خوشامد کی لیکن راضی ہی نہ ہو۔ اور جب یہ لوگ اسے درخت پر چھوڑ کر چلنے کو تیار ہوں تو پھر بری طرح سے دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک کی سمجھ میں آگیا۔ چمار کے درخت پر چڑھ کر اور اسکی گردن پکڑ، مارے کس کس کے جو ہاتھ تو راضی ہو گیا پنیلے کے تختے پر دونوں ہاتھ رکھ کر تیرتا ہوا سب کے بیچوں بیچ ساتھ ہو لیا اور سب باری باری پنیلے کو دھکیلتے ہوئے لے چلے۔ راستہ میں کسی نے کہا۔ "لے اب بہائے رے سانچی سانچی ناہیں ڈبوئیں دیں تو بے اتے ہی۔" بچارے نے سب اگل دیا کہ ہاں وہ ڈر کے مارے ان چار آدمیوں کے ساتھ ساتھ تھا جو کہ مادھو اور اس کی بیوی بچوں کو نکالنے گئے تھے اور بنتی کے چلانے پر اسی نے کہا تھا کہ وہ رمکلیا کو گودی لے لے گا لیکن سب کے سب تو جلدی سے گھر میں سے نکل گئے اور وہ اکیلا جو رہ گیا تو ڈر کے مارے سیڑھیوں کے پاس ہی لوٹ آیا۔ باہر آیا تو وہ لوگ نہ ملے۔ پانی اور بڑھ گیا تھا۔ آخر جب باغ میں پہنچا تو اکیلے چلنے کی ہمت نہ پڑی۔ درخت پر چڑھ گیا۔ یہ سنکر سب نے کہا۔ "ڈبوئے دو ایسے پاپی کو۔ کیا کرنا لے جا کر ایسے وشت کو۔"

لیکن ڈبویا نہیں بلکہ ریل کی پٹڑی پر اتار ہی دیا۔ وہاں سیوا سمیتی کے سچے خدمت گار۔ کانگریس کے ذرا بڑے اور ذرا مغرور، تھوڑا کام اور بہت باتیں کرنے والے لیڈر، لال صافے والے پولس کے اینٹھتے اکڑتے سپاہی موجود تھے۔ مدد ان کی سب ہی اپنی اپنی طرح کر رہے تھے۔ تیل، گھی، آٹا، لکڑی، دال سیوا سمیتی والے لائے تھے۔ امن انتظامات پولس والوں کی طرف سے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چھولداریاں اور مرہم پٹی کا سامان، کانگریس والوں کی طرف سے تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہنسی خوشی کھانے پکنے لگے۔ کڑھائیاں چڑھ گئیں، پوریاں تلی جانے لگیں۔ دو چار، جن کے اندھیرے میں پانی میں گرتے پڑتے چلنے سے چوٹیں آئی تھیں۔ ان کی مرہم پٹی ہوئی۔ لیکن بنتی کے زخمی دل کی مرہم پٹی کون کرتا۔ مادھو اور ناگا خود ہی پریشان تھے۔ ایک ہمدرد گوری تھی جو رات بھر اسکے ساتھ روئی تھی۔ اب وہ بھی نہ تھی۔ "کا جانے بھور ہتے کتے چال گئی۔"

جب تک اندھیرا رہا۔ ہڑپ، گڑپ، گڑاپ کرتے پانی نے رمکلیا کو خوب ہی ڈرایا۔ اور روتے روتے بے دم گز بھر کی لڑکی کا آنے والے دن نے اپنی بھینی بھینی روشنی پھیلا کر دل ہی دہلا دیا۔ ایک دفعہ ہی چونک کر دیکھتی ہے تو نہ مکان ہیں نہ گاؤں ہے۔ آدھے سے زیادہ کوٹھا بہہ چکا ہے۔ ایک کونے پر خود بیٹھی ہے۔ دوسرے کونے پر ایک کالا سانپ کنڈلی مارے بل کھایا بیٹھا دوہری زبان نکال رہا ہے۔ سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے جس میں سے اکا دکا پیڑ کہیں جھانک رہے ہیں۔ پیچھے آم کا باغ آدھا ڈوبا آدھا نکلا طرح طرح کی لہریں اپنے درختوں میں سے نکال رہا ہے۔

ہراس اور خوف سے رمکلیا چلائی، اور پھر چلائی "ڈری" سہمی اور چاروں طرف اسنے گھبرا کر دیکھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ ایک وہ تھی اور دوسرا کالا ناگ تھا اور پانی ہی پانی تھا۔ جس میں پھر کی ایسے گھومتے کٹورے بنتے تھے اور ہڑپ ہڑپ کر کے غائب ہو جاتے تھے۔ رمکلیا نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں موندھ لی تھیں اور۔ "اری میاری، اور میری میا"۔ کہہ کر بلک رہی تھی کہ اسکے کان میں آواز آئی "تو کاں آں ہے۔"

رمکلیا چونکی۔ ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹے۔ آنسو بہتے مردہ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ آئی۔

"تو کاں آں ہے"۔ آواز پھر آئی۔

رمکلیا نے۔ "ہرے رام گوری بولے"۔ کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ کاہے دکھائی تو دی نہیں لیکن رمکلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا۔ "گوری ہو گوری۔"

جواب آیا۔ "تو کاں آں ہے۔"

اور پھر باغ میں سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رمکیا نے پھر پکارا۔ وہ اسکی طرف بولتی ہوئی بڑھی۔ لیکن دور سے ایک اور آواز آئی۔ "او ماں آں ہے"۔ باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔ گائے اسکی آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رمکیا کا ننھا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی۔ پھر بھی اپنی سکت بھر چلائی۔ "گوری ہو گوری۔ گوری ہو گوری۔"

"ارے گوری رے آئے جا۔

ہائے رے میا ناہیں آوت۔

گوری ہو گوری۔

گوری میا آئے جاری۔"

لیکن گوری نے رخ نہ بدلا۔ البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رمکیا کی طرف دیکھا۔ اڑا کر بولی اور پھر ادھر ہی تیرتی چلی گئی، جدھر سے بچھڑے کی آواز آ رہی تھی۔

باغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو بچھڑا اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آ گیا جہاں سرشام وہ، اس کا بچھڑا اور بیل باندھے گئے تھے۔ اب وہاں نہ کھیت تھا نہ جھونپڑی۔ جگہ وہی تھی۔ لیکن اب سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ماں بچے کی آواز کا جواب دیتی تیرتی تیرتی اسکے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی، اسے سونگھا۔ ایک دفعہ اس کی تھوتھنی بھی چاٹ لی اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی۔ مگر بچہ نہ چلا، وہیں تیرتا رہا۔ گائے پھر لوٹ آئی۔ چاروں طرف گھومی۔ برابر آ کر اپنی کمر اور پیٹ سے دھکیلا۔ ایک طرف چلی بچہ ساتھ نہ آیا تو پھر لوٹ آئی۔ اب وہ کچھ سمجھ گئی تھی۔ پچھ چھ فٹ نیچے زمین میں گڑے ہوئے کھونٹے میں رسی سے بندھا ہوا تھا اور رسی بس اس قدر لمبی تھی کہ اب تک تو کسی نہ کسی طرح بچھڑے کی ناک پانی سے باہر تھی، لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ جائے تو رسی کی وجہ سے ناک ڈوب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہو کر چلاتے بچے کو وہیں چھوڑا اور پھر رمکیا کی طرف رخ کیا۔

رمکیا رونے چلانے کی تھکن، ڈر خوف اور آخر میں انتہائی ناامیدی کا اب تک برابر مقابلہ کرتی رہی تھی لیکن آخر آٹھ برس کی ننھی جان ہی تو تھی۔ گائے جب اسکے پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بے ہوش پڑی تھی۔ گوری نے آ کر کئی آوازیں دیں اور جب بھی رمکیا کو ہوش نہ آیا تو پھر لمبی، کھردری گرم گرم زبان سے اس کا منہ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آ گیا۔ پہلے تو ڈری، پھر گوری کو دیکھا۔ "گوری میا گوری میا"۔ کہتی ہوئی اسکے گلے میں چمٹی۔ گوری نے دو پیر مارے آگے بڑھی۔ رمکیا چھت سے گھسٹ پانی میں آ گئی۔ اس نے ڈر کے مارے پیر چلائے اور چٹ چمٹا کر گوری کی پیٹھ پر آ گئی اور وہیں چھپکلی کی طرح لیٹی لیٹی چٹ گئی۔ گوری پھر بچھڑے کے پاس گئی۔ وہی حرکتیں پھر کیں۔ کئی دفعہ اسکے گرد چکر کھائے اور چلی اور جب بچھڑا ساتھ نہ چلا تو پھر لوٹ آئی۔ اب رمکیا کی بھی سمجھ میں آ گیا تھا کہ کیا بات ہے جیسے ہی ایک دفعہ پھر گائے تیرتی ہوئی بچھڑے کے پاس گئی۔ رمکیا نے اوندھے لیٹے ہی لیٹے ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسی کی گانٹھ نکال دی۔ بچھڑا آزاد ہو گیا۔ گائے اور بچھڑا دونوں تیرتے ہوئے چلے۔ رمکیا گائے پر چمٹی ہوئی تھی۔ باغ اور ریل کی پٹری کی طرف سے دھار چل رہی تھی۔ اسلئے یہ دونوں بہاؤ کی ہی طرف تیرتے چل دیئے اور ڈھائی گھنٹے کے بعد چکر کھا کر پھر اسی ریل کی پٹری پر چڑھ آئے۔ لیکن جہاں گاؤں والے تھے، تین میل دور یہ نکلے تھے۔ یہ سب بہت سویرے ہی چل دیئے تھے اور جب گاؤں کے بہادر تیراک تیرتے ہوئے باغ میں آئے تو وہاں نہ بچھڑا تھا نہ رمکیا تھی بلکہ مادھو کے مکان کا بچا کچھا حصہ بھی بہہ چکا تھا۔ دن کے بارہ بجے جسوقت آگے آگے گوری، پیٹھ پر رمکیا۔ پیچھے پیچھے بچھڑا "او ماں آں ہے" کے سوال جواب کرتے، گاؤں والوں میں پہنچے تو ہلچل مچ گئی لوگ مارے خوشی کے کودتے تھے۔ بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوئی کبھی رمکیا کو گلے لگاتی تھی کبھی بچھڑے کو اور کبھی گوری کے چمٹتی تھی اور گائے کہتی تھی۔ "تم۔ ماں آں ہے۔ ہم۔ ماں آں ہے۔"

آواز آئی۔ "بول گوری میا کی جے۔" پچاس آوازوں نے جے پکاری۔

پھر آواز آئی "بول گئو ماتا کی جے۔"

دیوندر ستیارتھی

نام : دیواندر بتا
قلمی نام : دیوندر ستیارتھی
پیدائش : ۲۸ مئی ۱۹۰۸ء بہ مقام: بھدوڑ ضلع سنگرور (ریاست پٹیالہ) بھارت (۱)
تعلیم : میٹرک لگ بھگ ۲۲۔۱۹۲۳ء
کالج میں داخلہ بھی لیا، لیکن تعلیم جاری نہ رکھ سکے، انہیں ہندوستان کے دیہی علاقوں کے گیت بلا رہے تھے۔

مختصر حالات زندگی:

دیوندر ستیارتھی کون ہیں اور کیا ہیں؟ یہ جاننے کے لیے ان کا افسانہ "ننگ پوش" مطبوعہ "ساقی" دہلی ۱۹۴۱ء دیکھنا ہو گا، جو ان کی زندگی کے ابتدائی تیس برسوں کی روداد سناتا ہے اور اس کے بعد کا قصہ سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانے "ترقی پسند" میں بیان کیا ہے۔ منٹو کے اس افسانے میں "جوگندر سنگھ" اور "ترپاٹھی" درحقیقت راجندر سنگھ بیدی اور دیوندر ستیارتھی ہیں۔

ستیارتھی کو پہلے پہل لاہور میں دیکھا اور پایا گیا اور اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں جب لوک گیت جمع کرنے گھر سے نکلے ہیں تو گجرات، آسام، بنگال، مدھیہ پردیش، راجستھان، کشمیر اور پنجاب میں ہر جگہ دیکھا گیا، سوائے اپنے گھر کے۔ ٹھیک بیس برس بعد واپس آئے تو ایک دنیا کو پتا چلا کہ انہوں نے اڑھائی سے پانچ لاکھ لوک گیت اکٹھے کر لیے ہیں، لیکن یہ دنیا دار لوگ اس وقت انگشت بہ دنداں دیکھے گئے جب ستیارتھی نے پطرس بخاری کو آل انڈیا ریڈیو کے لیے یہ چیدہ گیت فراہم کرتے وقت کاپی رائٹ اور حق ملکیت سے انکار کر دیا اور صرف اتنا کہا "حق ملکیت اگر کسی کا ہے تو اس دھرتی کا۔"

منٹو نے اسے پیار سے "فراڈ" کہا اور ستیارتھی، منٹو کے گرویدہ ہو گئے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ "گرہن" میں شامل لوک گیت، دیوندر ستیارتھی کی عطا تھی۔ گزشتہ پچاس برس سے دیوندر ستیارتھی کا معمول ہے کہ کھدر کے میلے کرتے پاجامے اور زرد سلک کے چغے میں ملبوف، بغل میں بھاری بستہ دبائے گھر سے نکلتے ہیں اور کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی شناسا چہرے کو شکار کر لیتے ہیں۔ اکثر سنا گیا۔ ہے کہ فلاں نے اپنے دشمن کو پانی پلا پلا کر مارا، ستیارتھی گزشتہ نصف صدی سے اپنے نئے اور پرانے جاننے والوں کو افسانے سنا سنا کر بے حال کیے ہوئے ہیں۔ ساٹھ سے زائد کتب کے مصنف ہیں۔

۱۹۳۸ء میں "ویدک ینترالیہ" اجمیر میں پروف ریڈر تھے۔ مئی ۱۹۳۶ء تا فروری ۱۹۳۸ء "انڈین فارمنگ" دہلی کے نائب مدیر رہے۔ مارچ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۵۶ء "آجکل" دہلی کی ادارت کی، لیکن درحقیقت ہمہ وقت فسانہ طرازی کی۔

اولین مطبوعہ تحریر:

مقالہ: "پنجابی گرام ساہتیہ" (ہندی) لوک گیتوں سے متعلق۔ مطبوعہ: "ہنس" الہ آباد: نومبر ۱۹۳۱ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"اور بانسری بجتی رہی" مطبوعہ: "ادب لطیف" لاہور، نومبر/دسمبر ۱۹۴۰ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "گدھا" (پنجابی۔ گورمکھی رسم الخط میں) امرتسر، طبع اول: ۱۹۳۶ء
۲۔ "نئے دیوتا" (افسانے) جتا جتا سنت نگر، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۳ء
۳۔ "اور بانسری بجتی رہی" (افسانے)
۴۔ "میں ہوں خانہ بدوش" (ہندوستان کے لوک گیتوں سے متعلق کتاب) مرکنٹائل پریس، لاہور
۵۔ "گائے جا ہندوستان" (ہندوستان کے لوک گیتوں سے متعلق کتاب)
۶۔ "کتھا کہو اروشی" (ہندی ناول) طبع اول: ۱۹۵۶ء
۷۔ "برہم پتر" (ہندی ناول) طبع اول: ۱۹۵۸ء
۸۔ "چاند سورج کی بیرن" (لوک گیت) طبع اول: ۱۹۵۳ء
۹۔ "دھرتی گاتی ہے" (لوک گیت) طبع اول: ۱۹۴۸ء
۱۰۔ "Meet My People" طبع اول: ۱۹۴۶ء

غیر مدون:

سیکڑوں اردو/ہندی افسانے

اعزاز:

۱۔ دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ: ۱۹۷۷ء
۲۔ پنجاب بھاشا وبھاگ ایوارڈ، ۱۹۷۷ء
۳۔ پدم شری، ۱۹۷۷ء

مستقل پتا:

۳۶/۵ سی، نیو روہتک روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵، بھارت

نظریہ فن:

"میں نئے لوگوں کا قائل ہوں ــــــــ نئے لوگوں نے موسیقی ' مصوری اور شاعری کی تمام حد بندیاں توڑ ڈالی ہیں ــــــــ کاش میں خوشیا ہوتا ــــــــ"

دیوندر ستیارتھی

(بحوالہ: دیوندر ستیارتھی ' مرتبہ: بلراج مین را ' مشمولہ: "کتاب نما" دہلی: مارچ ۸۴ء)

○

(۱) "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ: بشیر ہندی (لگ بھگ ۱۹۸۰ء) میں ستیارتھی نے سنہ پیدائش ۱۹۰۹ء لکھا ہے' جو درست نہیں۔

دیوندر ستیارتھی

نئے دیوتا

گاجر کے گرم حلوے کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک اٹھا تھا اور اگر کسی دعوت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ ہر کھانا نہایت سلیقے سے تیار کیا جائے اور معمولی معمولی چیز میں بھی ایک نیا ہی ذائقہ پیدا کر دیا جائے تو بلاشبہ دہلی کی وہ دعوت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

اتنی بھی کیا خوشی ہے ---------- میں سوچ رہا تھا: اتنا تو نفاست حسن پہلے بھی کما لیتا ہو گا؟ ڈیڑھ سو روپے کے لیے اس نے اپنی آزادی بیچ دی' اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع ہی سے باغیانہ طبیعت کا آدمی مشہور ہے' اس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں' پھر یہ نوکری اس نے کیسے کر لی؟ غریبوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں' زندگی کی ہتک کی جاتی ہے' سرمایہ دارانہ نظام مکڑی کی طرح برابر اپنا جالا بنتا رہتا ہے اور غریب کسان مزدور آپ سے آپ اس جالے میں پھنستے چلے جاتے ہیں' ان خیالات کا مالک آج خود مکھی کی طرح اس جالے میں پھنس گیا اور اس خوشی میں یاروں دوستوں کی دعوت دے رہا ہے --------- مگر میں نے اپنے خیالات کا اثر چہرے پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

دعوت میں کئی ادیب شریک تھے۔ میں سوچنے لگا ہندوستان کی آزادی کے متعلق ان ہیٹ پہننے والے ادیبوں سے زیادہ مدد کی امید نہ رکھنی چاہئے اور براؤننگ کا یہ خیال کہ "چند چاندی کے سکوں کے عوض وہ ہمیں چھوڑ گیا" میرے ذہن میں پھیلتا چلا گیا: ان رجعت پسندوں کو یہ گمان کیسے ہو گیا کہ وہ ترقی پسند ادب کا چرچا کر کے سننے والوں کی آنکھوں میں دھواں ڈال سکتے ہیں؟ کہاں ترقی اور آزادی کا حقیقی نصب العین اور کہاں یہ چاندی کی غلامی' نفاست حسن کے گورے چہرے پر ہنسی ناچ رہی تھی۔ سچ پوچھو تو یہ ہنسی مجھے بڑی بھیانک لگ رہی تھی۔

گاجر کا حلوا سچ مچ تھا بہت لذیذ اور میرے خیالات پر حاوی ہو رہا تھا --------- مقناطیس اتنا قریب ہو اور لوہ چون کے ذرے کھنچے نہ چلے آئیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مطلب یہ کہ اگر یہ حلوا نہ ہوتا تو میں نے نفاست حسن کو اور بھی زیادہ تنقیدی زاویے سے دیکھا ہوتا۔

بہتوں کے ناموں سے میں نا آشنا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کئی چہرے میرے لیے نئے نہ تھے۔ خاص نا آشنا چہروں میں مولانا نور حسن آرزو کو تو اس سے پہلے میں نے کبھی فوٹو میں بھی نہ دیکھا تھا۔ ان کی آواز مجھے بہت پیاری لگی۔ بہت جلد میں نے ان کی فصاحت کا لوہا مان لیا۔ یہ محسوس ہوتے بھی دیر نہ لگی کہ انھیں ایسی ایسی دلیلوں پر عبور حاصل ہے کہ موقع پڑنے پر وہ اپنے حریف کو گھاس کے تنکے کی طرح اپنی راہ سے اڑا سکتے ہیں۔ عمر میں وہ کوئی بوڑھے نہ تھے' ادھیڑ تھے اور نئے زمانے سے بس اتنا ہی رشتہ رکھتے تھے کہ سرکاری نوکری کی وجہ سے انھوں نے پاجامے اور شیروانی کو خیرباد کہہ کر انگریزی وضع کا سوٹ پہننا شروع کر دیا تھا۔

برف میں لگی ہوئی گنڈیریوں کے ڈھیر پر سب ادیب دوست بڑھ بڑھ کر ہاتھ مار رہے تھے۔ جونہی گنڈیری کا گلاب میں بسا ہوا رس حلق سے نیچے اترتا' مولانا آرزو کی آنکھوں میں ایک نئی ہی چمک آ جاتی۔

اب جو میں نے دھیان دیا اور غور سے سنا تو پتا چلا' نفاست حسن کہہ رہا تھا" ------ یہ گنڈیریاں خاص طور پر مولانا کے لیے منگوائی گئی ہیں۔"

"خوب -----' مولانا بولے "اور گاجر کا حلوا بھی شاید میرے ہی لیے بنوایا گیا ہے ----"

"جی ہاں ------" نفاست حسن کی بیباک نگاہیں مولانا کی شوخ آنکھوں میں گڑ کر رہ گئیں۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اسے اپنے محکمے میں نوکری دلانے میں مولانا کا بہت ہاتھ تھا مگر نفاست حسن ایسا آدمی نہ تھا کہ احسان مندی کو تصور میں بھی لا سکے۔ اس کا خیال تھا کہ خود وقت کی کروٹ کی بدولت ہی وہ یہ نوکری حاصل کر سکا ہے' اور گاجر کا لذیذ حلوا اور گلاب میں بسی ہوئی گنڈیریاں مولانا کا احسان اتارنے کے خیال سے ہرگز پیش نہیں کی گئیں ہیں۔

مولانا ادھر بہت موٹے ہو گئے تھے۔ وہ حیران تھے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے شہر میں لگاتار کئی سال گزارنے کے باوجود نفاست حسن نے اپنی بیٹھک میں ایک آدھ بڑی کرسی رکھنے کی ضرورت اب تک کیوں محسوس نہیں کی ہے۔ بڑھیوں نے ابھی بڑی کرسیاں بنانا ترک تو نہیں کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نئے زمانے میں اب لوگ بھی اتنے موٹے نہ ہوا کریں گے ----- اپنی گول گول گھومتی ہوئی آنکھیں انھوں نے میری طرف پھیریں اور میں نے دیکھا کہ ان میں غرور اور غم گلے مل رہے ہیں اور بیتے وقتوں کو پھر سے واپس آتا دیکھنے کے لیے بے قرار ہو رہے ہیں۔

دھیرے دھیرے محفل چھدری ہوتی گئی' نئے دوست یہ خیال لے کر لوٹے کہ نفاست حسن ایک نشاط پسند اور دوست نواز آدمی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ رسمی تکلفات کا کوئی بڑا حامی نہیں ہے۔ ہے بھی ٹھیک۔ دوستی ہونی چاہیے آزاد نظم سی' قافیہ اور ردیف کی قید سے آزاد۔

مولانا برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے "صاحب' سومرسٹ ماہم کا مطالعہ کیا ہے آپ نے؟"

انھوں نے یہ بات اس لہجے میں پوچھی تھی کہ مجھے گول مول جواب پر اترنا پڑا "صاحب' کہاں تک مطالعہ کیا جائے؟ ان گنت کتابیں ہیں اور ان گنت مصنف ----- خیر' اب میں سومرسٹ ماہم کا خیال بھی رکھوں گا ------"

"تو یہ کہیے نا کہ آپ نے سومرسٹ ماہم کی کوئی کتاب نہیں پڑھی ----"

میں نے جھینپتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں یہی سمجھ لیجیے!"

"تو اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ اب تک آپ نے یونہی عمر ضائع کی ہے ---"

اس پر نفاست حسن بگڑ اٹھا۔ گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ پتہ چلا کہ مولانا نے نفاست حسن کو چڑانے کے لیے سومرسٹ ماہم کا تذکرہ کیا تھا ------ ایک دن نفاست حسن نے یہی سوال مولانا سے کیا تھا' اور جب مولانا نے میری ہی طرح بات ٹالنی چاہی تھی تو وہ کہہ اٹھا تھا "تو اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ اب تک آپ نے یوں ہی عمر ضائع کی ہے ----"

ادھر مولانا نے انگریزی ادب سے ربط بڑھانا شروع کر رکھا تھا مگر نفاست حسن بدستور یہی سمجھتا تھا کہ یہ صرف ایک دکھاوا ہے اور انگریزی ادب کے نئے رجحانوں سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ جب بھی وہ ان کے ہاتھ میں کوئی انگریزی کتاب دیکھتا' اس کے ذہن میں طنز جاگ اٹھتی جیسے سانپ کے سر میں زہر جاگ اٹھتا ہے اس دکھاوے کی آخر کیا ضرورت ہے ----؟ بیہودہ دکھاوا -----! نیا رنگ تو سفید کپڑے ہی پر ٹھیک چڑھتا ہے!

مولانا بڑی سادہ اور پر اثر زبان میں شعر کہتے تھے۔ مضامین بھی لکھتے تھے۔ افسانہ نگاری کے باب میں انھوں نے کوئی کوشش نہ کی تھی۔ ہاں جب کوئی واقعہ سناتے تو یہی گمان ہوتا کہ کوئی کہانی جنم لے رہی ہے اور اگر اس وقت کوئی شخص ان کی تعریف کر دیتا تو وہ ان کی نگاہ میں بہت اونچا اٹھ جاتا۔ داد پا کر ہی وہ داد دے سکتے ہوں' یہ بات نہ تھی۔ اکثر وہ "معاوضے" کے بغیر بھی نوجوان ادیبوں کی پیٹھ ٹھونکتے رہتے تھے۔ ان کی یہ سرپرستانہ طبیعت نفاست حسن کے نزدیک وہ عیب تھا جس کی وجہ سے جیسا کہ اس کا خیال تھا' نہ وہ پرانے دور کی نمائندگی کرنے میں کامیاب ہوئے تھے اور نہ نئے نیا دور ہی سے رشتہ جوڑ سکے تھے۔

جب بھی نفاست حسن ان کے خلاف بس اگلتا' مجھے یوں محسوس ہوتا: ادب کا نیا دور اپنے سے پہلے دور کی ہتک کر رہا ہے۔ یہ تو اپنی ہی ہتک ہے۔ سطحی طور پر اس کا گھناؤنا پن آنکھ سے کتنا ہی اوجھل رہے مگر جب یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ادب ایک ارتقائی چیز ہے تو کوئی بھی

ادیب اپنا یہ وطیرہ جاری نہیں رکھ سکتا۔

ہاں تو سومرسٹ مام والا مذاق خاست حسن نہ سہار سکا۔ بولا "بس بس چپ رہیے 'اتنی زبان مت کھولیے۔۔۔"

خاست حسن کی زبان پر زندہ چلنے کا گمان ہوتا تھا۔ مولانا نے قدرے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور بولے "اتنے گرم کیوں ہوتے ہو میاں 'عمر ہی میں سہی 'میں تمہارے والد کے برابر ہوں۔۔۔۔"

"بس بس 'یہ شفقت اپنے ہی پاس رکھیے۔ مجھے نہیں چاہیے یہ کمینی شفقت۔۔۔۔۔ یہ سرپرستانہ شفقت۔۔۔۔۔ بڑے آئے ہیں میرے والد۔۔۔۔۔! اتنی زبان درازی!"

مولانا نے اب تک یہی سمجھا تھا کہ وہ مذاق ہی کی سرحد پر کھڑے ہیں لیکن معاملہ تو دوسرا ہی رنگ اختیار کر چکا تھا۔ ان کے چہرے پر غصے کی رہ چڑھ گئی۔ بولے "ایک سسرے سومرسٹ کی خاطر کیوں میری ہتک کرنے پر تلے ہو میاں۔۔۔۔؟ کمبخت سومرسٹ مام۔۔۔۔!"

بات تو تو میں میں کی شکل اختیار کر گئی۔ مجھے تو یہی خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں دونوں ادیب ہاتھا پائی پر نہ اتر آئیں۔

خاست حسن اس دن میزبان تھا اور گھر پر آئے ہوئے کسی مہمان کی شان میں ہر طرح کی زبان درازی سے اسے پرہیز کرنا چاہیے تھا اور پھر یہ مہمان کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ اس کا ہمعصر ادیب تھا۔ عمر میں اس سے بڑا اور زبان دانی میں کہیں بڑھ کر۔ میں سوچنے لگا کہ سومرسٹ مام پر خاست حسن اتنا کیوں فدا ہے؟ وہ بھی مولانا کی طرح ایک آدمی ہی تو ہے 'کوئی فرشتہ نہیں ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ خاست حسن کے کمرے میں پڑی ہوئی ہلکے بھورے رنگ کی ہر کرسی سے ہر لحاظ سے مولانا زیادہ قیمتی تھے۔ خاست حسن اتنا گرم کیوں ہو گیا تھا؟ وہ شاید اپنے مہمان کو کرسی سے اٹھا دینا چاہتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مولانا کی طنز ذرا تیکھی تھی مگر تھی تو آخر یہ طنز ہی اور اس کا جواب اگر طنز ہی سے دیا جاتا تو اس قدر دلخراش مظاہرہ تو نہ ہوا ہوتا۔

سومرسٹ مام آخر کیا لکھتا ہو گا؟ کیا اسے اپنے وطن انگلستان میں بھی خاست حسن جیسا کوئی عاشق زار نصیب ہوا ہو گا؟ تب مجھے یہ شک گزرا کہ خاست حسن کے بہت سے جملے جنہیں وہ موقع بے موقع نہایت شان سے اپنی گفتگو اور تحریر میں نگینوں کی طرح جڑنے میں ہوشیار سنار بن چکا ہے 'ضرور ولایت کی کسی فیکٹری سے بن کر آئے ہیں 'یہ نگینے اس کی اپنی تخلیق ہرگز نہیں۔ میں سوچنے لگا کہ پہلے پہل کب سومرسٹ مام کے قلم نے اس پر جادو سا کر دیا تھا۔۔۔۔۔ اور کیا یہ جادو کبھی ختم بھی ہو جائے گا؟

ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا تھا "عورت کس وقت سندر لگتی ہے؟"

مجھے کوئی جواب نہ سوجھا تھا میں نے کہا تھا "آپ ہی بتلایئے۔۔۔"

وہ بولا تھا: "ہاں تو سنو! جب وہ تین دن سے بخار میں مبتلا ہو۔۔۔۔۔ اور اس کے ہاتھوں کی رگیں نیلی پڑ جائیں 'تب عورت کتنی سندر لگتی ہے 'کتنی سندر!"

اب میں نے سوچا 'شاید یہ نگینہ بھی سومرسٹ مام کی فیکٹری سے بن کر آیا ہو۔

میں نے خاست حسن کو مخاطب کر کے کہا "خفگی چھوڑو میاں! سومرسٹ مام تو ایک دیوتا ہے۔۔۔۔۔"

وہ بولا "اور میں؟"

"آپ بھی دیوتا ہیں 'میاں!"

میں نے اسے بتایا کہ دیوتاؤں میں تین بڑے دیوتا ہیں: برہما 'وشنو اور شو۔ اپنی اپنی جداگانہ اہمیت کے باعث وہ بے حد ممتاز بن گئے ہیں۔ برہما جنم دیتا ہے 'وشنو پرورش کرتا ہے اور شو ٹھہرا موت کا ناچ ناچنے والا 'نٹ راج!

خاست حسن کا دھیان ادھر میری طرف کھنچ گیا۔ ادھر مولانا کی آنکھوں میں غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب وہ میری بات میں دلچسپی لے رہے تھے میں نے بتایا کہ ہر ادیب مختلف وقتوں میں برہما 'وشنو اور شو ہوتا ہے۔ جب ایک شخص ایک چیز لکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے 'میں اسے برہما

کہنا پسند کروں گا۔ وہ جب اس چیز کو سنبھال کر رکھتا ہے ہر ممکن اصلاح کرتا ہے اس وقت وہ وشنو کا ہم پلہ ہوتا ہے اور جب وہ اپنے ہی ہاتھ سے کسی تحریر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے وہ سو فیصدی شو کا روپ دھار لیتا ہے۔

مولانا بولے "بہت خوب! آپ کا تخیل مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے جھٹ سے کہا "میرا تخیل؟ نہیں مولانا نہیں' یہ میرا تخیل نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ یہ میرا طبع زاد خیال نہیں ہے۔۔۔۔۔۔"

"تو کسی کا خیال پیش کر رہے ہیں آپ؟"

"بمبئی کی پی۔ ای۔ این سوسائٹی میں بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے میری تقریر کے بعد صدارتی تقریر کرتے ہوئے یہ خیال پیش کیا تھا۔۔۔۔۔۔"

"بہت خوب ۔۔۔۔۔۔! تو بلبل ہند نے آپ کی تقریب کی صدارت کی تھی ۔۔۔۔۔۔! ہاں تو اب کوئی طبع زاد خیال سنائیے۔۔۔۔۔!"

"طبع زاد۔۔۔۔۔۔؟ طبع زاد کی بھی خوب کہی! مجھے تو سرے سے یہی شک ہو رہا ہے کہ طبع زاد نام کی کوئی چیز ہوتی بھی ہے یا نہیں؟"

غلاست حسن بوکھلایا "کیا کہہ رہے ہو میاں؟ سنئے میں ایک خیال پیش کرتا ہوں: جونہی صبح کی پہلی کرن آنکھیں ملتی ہوئی دھرتی پر اتری' پاس کی کچی دیوار انگڑائی لے رہی تھی۔۔۔۔۔!"

مولانا نے حیرت سے کہا "دیوار انگڑائی لے رہی تھی۔۔۔۔۔۔!"

میں نے بیچ بچاؤ کرتے ہوئے کہا: "اس وقت غلاست حسن ایک برہما ہیں' مولانا!"

"برہما؟"

"جی ہاں' برہما ۔۔۔۔۔ اور نہ جانے کب تک وہ وشنو بنے ہوئے یہ خیال سنبھال کر رکھیں گے ۔۔۔۔۔ اور پھر ایک دن وہ شو بن جائیں گے اور خود اپنے ہاتھوں سے اس خیال کا گلا گھونٹ ڈالیں گے۔ انہیں خود اپنی تخلیق پر ہنسی آئے گی ۔۔۔۔۔۔ صرف ہنسی' اس دھیان سے کہ ان کا خیال سو فیصدی طبع زاد خیال نہیں ہے ۔۔۔ اور اگر یہ سچ مچ ان کا سو فیصدی طبع زاد خیال ہے تب بھی انہیں شرم آئے گی۔۔۔۔"

غلاست حسن چاہتا تو جھٹ میرے خیال کی تردید کر دیتا مگر وہ چپ بیٹھا رہا۔ شاید وہ کچھ جھینپ سا گیا تھا اور اپنے کمتری کے جذبے کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

مولانا بولے "برہما' وشنو اور شو کے متعلق آج میں کچھ اور بھی سننا چاہتا ہوں۔۔۔۔"

میں نے کہا سنئے ۔۔۔۔۔ وشنو اور شو کے ہزاروں مندر ہیں لیکن برہما کا ایک بھی مندر نہیں ہے کہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"برہما کا ایک بھی مندر نہیں؟"

"جی نہیں! سنئے تو بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ ایک بار وشنو اور برہما میں یہ مقابلہ ہو گیا کہ کون پہلے شولنگ کی گہرائی اور اونچائی کا پتا لا سکتا ہے۔ وشنو جڑ کی طرف چل پڑا اور برہما چوٹی کی طرف۔ برہما اوپر چڑھتا گیا مگر شولنگ کی چوٹی کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اوپر سے چنبیلی کا ایک پھول گرتا ہوا آ رہا تھا۔ برہما نے پوچھا کدھر سے آتا ہوا؟ پھول بولا "شولنگ کی چوٹی سے۔" برہما نے پوچھا "کتنی دور ہے چوٹی؟" پھول نے کہا "دور بہت دور۔۔۔۔۔" برہما چنبیلی کے ہمراہ واپس ہوا۔ راستے میں اس نے پھول کو اتنا سا جھوٹ بولنے کے لیے رضامند کر لیا کہ وہ وشنو کے سامنے کہہ دے کہ وہ دونوں شولنگ کی چوٹی سے آ رہے ہیں مگر شو تو ٹھہرا انترجامی۔ برہما اور چنبیلی کو بڑی بھاری سزا دی گئی۔۔۔ رہتی دنیا تک برہما کا کہیں مندر نہ بنے گا چنبیلی کسی مندر میں پوجا میں نہ چڑھائی جائے گی۔۔۔۔"

غلاست حسن بولا "مگر یہ تو نیا زمانہ ہے۔ اب تو شاید برہما کا بھی مندر بن جائے کہیں اور میرا یقین ہے کہ اگر برہما پر کوئی پھول چڑھے

گا تو وہ بلا شبہ چنبیلی کا پھول ہی ہو گا۔۔۔"

غلاست حسن نے یقیناً اس وقت یہی سوچا ہو گا کہ وہ ایک برہما ہی ہے کیونکہ اس کے پبلشر نے اس کے افسانوں کا ضخیم مجموعہ شائع کرنے سے ابھی تک گریز ہی کیا ہے مگر جونہی اس کی کتاب شائع ہو گی' اس کی شہرت کا حقیقی مندر تعمیر ہوتے دیر نہ لگے گی' اور اس مندر میں چنبیلی کے پھول ہی چڑھائے جائیں گے۔

غلاست حسن کو اپنے متعلق جو غلط فہمیاں تھیں' ان کو رکھنے میں اس کے دو چار گہرے دوستوں کا بھی ہاتھ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اوشا کے گھونگھٹ کھولنے سے پہلے کی ساری سیاہی اور سرخی' اندھیارے اور اجالے کی گنگا جمنی سرگوشیاں' اس کی طبع میں بہت نمایاں نظر آتی ہیں اور اگر اس نے شروع میں روسی افسانوں کے ترجموں میں اپنی اٹھتی جوانی کا زور لگانے کے بجائے طبع زاد افسانے لکھنے میں سرگرمی دکھائی ہوتی تو آج اس کا نام صف اول کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اب بھی گرے ہوئے بیروں کا کچھ نہیں بگڑا' اگر یہ سو فیصدی طبع زاد افسانہ نگار' سو فیصدی وسیلہ ساز بھی ہو تا گیا تو یقیناً وہ ہندستان بھر کے افسانوی ادب کی چوٹی پر نظر آئے گا۔

ایک بار دوستوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ بڑا صاف گو ہے' چنانچہ سپنوں میں بھی یہ خیال اس کا تعاقب کرنے لگا کہ واقعی وہ بڑا صاف گو ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو سو فیصدی طبع زاد افسانہ نگار کو زندگی کے مطالعے میں حقیقی مدد دے سکتی ہے۔ جب اس نوکری کے لیے اس نے درخواست بھیجی تو اس سے پوچھا گیا کہ اس نے کس مضمون میں اپنا علم پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے' بلا جھجک اس نے لکھ بھیجا کہ اس نے اپنی بیشتر زندگی بیسواؤں کا مطالعہ کرنے میں گزاری ہے گو اس صاف گوئی سے کہیں زیادہ کسی کی سفارش ہی نے اسے یہ نوکری دلائی تھی مگر وہ برابر نئے ملنے والوں کے روبرو اپنی صاف گوئی کا تذکرہ بڑے فخر سے کیا کرتا۔ صاف گوئی سو فیصدی صاف گوئی! میں نے سوچا' شاید اس صاف گوئی کی سرحد نے ابھی گھر کی دیواروں تک پاؤں نہ پھیلائے ہوں گے۔ گھر میں آ کر تو اکثر بڑے بڑے ترقی پسند ادیب بھیگی بلی بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس کی ترقی پسندی بڑی حد تک عریاں جنسی بیان سے گھری رہتی تھی مگر کچھ عرصے سے اس کے ذہن میں یہ وہم سما گیا تھا کہ وہ کسی بھی جاندار یا بے جان شے کے گرد اپنے افسانے کو گھما سکتا ہے۔ اپنے ایک افسانے میں اس نے ایک پتھر کی سرگزشت بیان کی تھی جو ایک ایک کسی کنواری کی اٹھتی مچلتی ہوئی چھاتی سے ٹکرانے کے لیے بے قرار ہو اٹھا تھا۔ آدمی بدستور آدمی ہے مگر پتھر اب پتھر نہیں ہے یہ بات اس نے بڑی گہرائی سے لکھی تھی۔ نفسیات کی سرحدیں اب سکڑی نہ رہیں گی۔ پتھر اب پتھر ہی نہیں ہے' نہ بجلی کا کھمبا بجلی کا کھمبا ہی۔ وہ چاہتا تو اپنے سگریٹ کیس میں بھی دل ڈال دیتا اور اس کے گرد نفسیات کا باریک جال بن دیتا۔

اس کی زبان نہ بہت مشکل تھی نہ بہت آسان۔ یہاں وہاں نئی نئی تشبیہیں بھی حاضر رہتی تھیں۔ ابھی اسے کسی کا پھولا ہوا تھیلا دیکھ کر حاملہ عورت کے پیٹ کا دھیان آگیا ہے تو ابھی کسی کی ذہنی کمزوری اسے اس دوشیزہ سی نظر آئی جو آندھی میں اپنی ساری سنبھالنے سے قاصر ہو۔ کسی کے بول سوڈے کے بلبلے تھے تو کسی کی ناک چینی کی پیالی کی ٹونٹی جیسی۔

شام ہو چلی تھی غلاست حسن اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتا ہوا چھجے پر آگیا۔ نکلسن روڈ پر قریب ہی کے ٹیلر ماسٹر کی دکان میں برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ چھجے پر کھڑا غلاست حسن پلٹتے ہوئے بولا "مولانا چلو لگے ہاتھوں سردار جی ہی سے ملتے آئیں۔۔۔۔۔۔!"

میں حیرانی میں دبکا بیٹھا تھا۔ میں نے سوچا' یہ سردار جی کون ہیں جن سے ملنے کے لیے غلاست حسن اتنا مشتاق نظر آتا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ صرف اپنے فرق برائے فرق کے نظریہ کے مطابق ہی مجھ سے بھی لمبی ڈاڑھی والے کسی شخص سے ملنا چاہتا ہے حالانکہ خود اس کے چہرے پر ڈاڑھی تو ڈاڑھی' مونچھ تک کا نشان ہر دوسرے تیسرے دن مونڈ دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نے ایک ادیب کی مونچھوں کو محض اس لیے پسند کیا تھا کہ وہ مونچھیں مولانا نے ناپسند کی تھیں۔ اگر مولانا نے ان مونچھوں کی تعریف میں ایک آدھ بات کہہ دی ہوتی تو اس نے کہا ہوتا "مولانا آپ کی اندھا دھند پسند کی تو حد ہو چکی ہے' لاحول ولا قوۃ آپ نے بھی آدمیوں میں خوب آدمی چنا۔۔۔۔۔"

یہ سردار جی کون ہیں ؟ یہ سوال میرے ذہن میں پھیلتا چلا گیا۔ ان سے متعارف ہونے کی میری خواہش دیکھ کر غلاست حسن نے مجھے بھی اپنے ہمراہ لے لیا۔ وہ ایک عجب مستی کے عالم میں سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ اپنے پاؤں کو وہ ضرورت سے زیادہ زور سے زمین پر پھینکتا تھا اور پھسٹ پھسٹ کی آواز سے شور پیدا کرتا ہوا پڑوسیوں کے آرام میں مخل ہو رہا تھا۔ اس قسم کی حرکت کو وہ آزادی تصور کرتا تھا اور اسے کسی قیمت پر بھی کھونے کو تیار نہ تھا۔

ایک بڑے لمبے چوڑے بازار میں گھومتے گھامتے ہم آخر سردار جی کی دکان پر پہنچ گئے۔ پتا چلا کہ غلاست حسن اسم بامسمی ہے کیونکہ شراب کی دکان جہاں اس نے سردار جی سے ملاقات کا وقت مقرر کیا تھا' سخت بدبودار جگہ تھی۔ میز پر سنگ مرمر کی سلوں پر سوڈا اور وھسکی جمی ہوئی تھی اور ہماری نشست گاہ کے قریب ہی ٹوٹے ہوئے آبخوروں کا انبار لگا ہوا تھا۔ بغل میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ٹانگیں ایک بوسیدہ الماری کے اوپر ٹکائے' منہ پوری طرح کھولے بیہوش پڑا تھا۔ آبخوروں کے اتنا قریب ہونے کی وجہ سے اس کا کھلا ہوا منہ ایک آبخورہ ہی تو دکھائی دیتا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے گمان ہوا کہ غلاست حسن اسی شخص سے ملنے آیا ہے' گویا اپنے آپ سے اپنے سندر نام سے انصاف کرنے آیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد غلاست حسن نے اپنی کرخت آواز میں' جس سے ہمیشہ کی طرح خواہ مخواہ رندہ چلنے کا گمان ہوتا تھا پکارا "او میاں جماں۔۔۔۔۔۔ لاؤ تو سردار جی کو۔۔۔۔۔۔!"

میاں جماں ایک جھاڑن سے بوتل صاف کر رہا تھا۔ دن کے وقت وہ اسی جھاڑن سے سڑک پر سے اڑ کر آنے والی گرد کو شیشوں میں پڑی ہوئی چیزوں پر سے جھاڑا کرتا تھا' یا آبخوروں کے درمیان تنے ہوئے جالوں کو صاف کرتا رہتا تھا۔۔۔ کچھ دیر بعد جماں نے وھسکی کی ایک بوتل اور سوڈے کی دو بوتلیں میز پر لا رکھیں۔

مجھے سردار جی کی شخصیت سے واقف ہوتے دیر نہ لگی مگر میں بدستور افسانوں کی دنیا میں گھوم رہا تھا پھر میں نے بے محل ہی غلاست حسن سے پوچھا "آپ کے افسانوں کی تعداد تو خاصی ہو گئی ہو گی؟"

اس وقت تک وہ سوڈا اور وھسکی دونوں کو ملا چکا تھا۔ میں نے سردار جی سے متعارف ہونے سے انکار کر دیا تو اس نے اور مولانا نے گلاس ٹکرائے اور اپنے اپنے منہ سے لگا لیے۔ ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے غلاست حسن بولا "میں افسانے وغیرہ کبھی اکٹھے نہیں کرتا' میرے افسانے کبوتر کے بچے ہیں' جنہیں میں لکھتا ہوں' میں کہتا ہوں: او کبوتر کے بچو! اڑ جاؤ اور وہ اڑ جاتے ہیں۔۔۔"

اس تشبیہ کے اندازگی میں نے بہت تعریف کی' سچ پوچھو تو اس وقت میرے ذہن میں آئین سٹائن کا نظریہ اضافیت نمایاں ہو گیا تھا۔ ہر چیز کو دوسری چیز سے نسبت ہے۔ افسانے کو کبوتر کے بچے سے' فاحشہ عورت کی مسکراہٹ کو بدرو میں پھٹتے ہوئے بلبلے سے' صبح کی پہلی کرن کو انگڑائی لیتی ہوئی دیوار سے' غلاست حسن کو چرٹے سے۔۔۔۔۔

اس وقت میں نے سوچا کہ یہ تشبیہیں' نادر اور دور از کار تشبیہیں' اس عظیم الشان ادیب کے دماغ میں پیدا کہاں سے ہوتی ہیں ؟ پھر مجھے فوراً ہی خیال آیا' یہ تو ایک سیدھا سادہ سا عمل ہے۔ خود غلاست حسن نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ اسے قبض کی شکایت کبھی نہیں ہوتی۔ بعض مصنف تو سخت قبض میں مبتلا نظر آتے ہیں' بے چارے بہت زور لگا کر لکھتے ہیں۔ میں نے سوچا' غلاست حسن ہر روز رات کو دودھ کے ساتھ اطریفل زمانی کھاتا ہے اور وہ چھر' بلبلے' رگھبیر پہلوان' کتاب' میز' کرسی' قلم' دوات' ہر چیز پر لکھ کر ان کے مجموعوں کے نام دوڑو' بھاگو' روؤ' چیخو رکھ سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ میں بہت دیر تک ان افسانوں کی دنیا میں نہ رہ سکا۔ اس وقت تک دونوں ادیب وھسکی کی بوتل آدھی کے لگ بھگ ختم کر چکے تھے۔ معاً ان کے خیال میں قسم قسم کی شراب کو ملا کر پینے کی دھن سمائی چنانچہ جمن میاں نے بہت سی بوتلوں سے ایک ایک پیگ بنایا' پھر ایک بوتل میں یہ سب جمع کر کے ان کے سامنے بوتل رکھ دی۔۔۔۔۔۔۔ مولانا شراب میں اپنے آپ کو گھور رہے تھے' شاید انہوں نے اسی لیے غلاست حسن کی ادبی جولانیوں کو سراہنا چاہا' ملی جلی شرابوں کا پیگ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے انہوں نے غلاست حسن کو ایک تھپکی دی اور بولے "شاباش برخوردار! لکھے جاؤ۔۔۔۔۔"

غلاست حسن جو سردار جی کے مکان کی فضا سے بہت مانوس تھا اور جو بغیر بوکھلائے بہت سے پیگ پی سکتا تھا ' بولا " بس بس مولانا ! یہی ایک بات ہے جو مجھے سرے سے ناپسند ہے ۔ اس بیہودہ سرپرستی کی مجھے چنداں ضرورت نہیں ۔ آپ کی مدح و ذم کی مجھے مطلق پروا نہیں ۔ سمجھے آپ ؟ اگر آپ نے میرے افسانے پڑھے ہیں تو اس سے میرا کچھ سنور نہیں گیا ' اگر نہیں پڑھے ہیں تو میرا کچھ بگڑ نہیں گیا------"

مولانا کو اس بے جا گفتگو سے سخت حیرت ہوئی ۔ اپنے میزبان کے کندھے تھپکتے ہوئے بولے " برخوردار ! اگر تم افسانے نگاری کے بجائے مٹی کا تیل بھی بیچا کرتے تب بھی میرے دل میں تمہاری ایسی ہی عزت ہوتی-------"

دونوں ادیب آپس میں سنجیدگی سے گفتگو کر رہے تھے مگر میں اس ماحول میں بوکھلا سا گیا پھر مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں شراب پی رہا ہوں------- وہ دونوں تو پرہیزگار ہیں۔

ایک اور پیگ حلق سے نیچے اتارنے کے بعد غلاست حسن نے پاپڑ کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا اور کہا " مولانا میں لکھنا چاہتا ہوں------ بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں------ کبھی کسی چیز سے میری تسلی نہیں ہوتی------"

ابھی غلاست حسن نے گفتگو ختم بھی نہ کی تھی کہ مجھے خیال آیا کہ تسلی کیسے ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے افسانے تو کبوتر کے بچے ہیں اور جب تک وہ کبوتر کے بچے رہیں گے ' وہ پھر اڑ جائیں گے ' آخر غلاست حسن نے کوئی چھنار ابھی تو قائم نہیں کیا ہے کہ وہ اسی پر کبھی کبھی آ کر بیٹھ جایا کریں اور اپنے گذشتہ مالک کو دیکھ لیا کریں ------- وہ بچارے تو بے شمار آوارہ روحوں کی طرح ایک لایعنی آسمان پر پھڑپھڑاتے پھرتے ہیں-------

غلاست حسن اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولا " بس ایک چیز لکھ لوں ' ایک چیز ' تو میری تسلی ہو جائے گی ۔ اس کے بعد میں مر بھی جاؤں تو کوئی غم نہیں کہ میں نے زندگی میں ایک بڑا کام تو کر لیا ہے-------"

مولانا کے اور میرے حقیقی اور قیاسی نشے ہرن ہو گئے ۔ ہماری دونوں کی توجہ اس افسانے کا پلاٹ سننے کے لیے غلاست حسن کے پتلے اور نحیف چہرے کی طرف اٹھ گئی۔

غلاست حسن بولا " میں ان دنوں بمبئی میں رہتا تھا------- میرے کمرے اور غسل خانے کے درمیان ایک بند دروازہ تھا------ اس بند دروازے میں ایک درز تھی۔ بس ' اسی درز سے میں کنواری لڑکیوں کو بھی نہاتے ہوئے دیکھتا تھا اور ادھیڑ عمر کی اور بوڑھی عورتوں کو بھی-------- اس کے علاوہ جوان مردوں کو بھی------- آہ! انسان غسلخانے میں جو حرکتیں کرتا ہے ' وہ-------"

میں اس کی بات سمجھ نہ سکا ' لیکن میرے سامنے آئین اسٹائن کا نظریہ اضافیت تھا ' اس لیے میں نے چنداں پروا نہ کی اور سنتا چلا گیا۔

غلاست حسن بولا بس غسلخانے میں نہانے والیوں اور نہانے والوں کے متعلق میں لکھ کر مرجاؤں تو مجھے کوئی افسوس نہ ہو گا---- اس افسانے کا نام رکھوں گا " ایک درز میں ہے------!"

غلاست حسن کی اس بات پر مجھے بہت ہنسی آئی ۔ اگر میں غلاست حسن کا تذکرہ لکھ کر مرجاؤں تو زندگی میں کوئی حسرت نہ رہے گی------

مولانا جو غلاست حسن کی " بے تکیوں " کو بڑے غور سے سن رہے تھے ' کچھ نہ بولے۔

نہ جانے غلاست حسن کو کیوں محسوس ہوا کہ اس نے مولانا کی ہتک کی ہے ۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا ۔ اس نے اپنا دایاں گال مولانا کے سامنے پیش کیا ۔ مولانا نے تبرکاً ایک بوسہ لے لیا ۔ اس کے بعد غلاست حسن نے بایاں گال پیش کیا ۔ مولانا کے نزدیک اب تبرک کا مسئلہ نہیں رہا تھا لیکن انھوں نے بوسہ پھر لیا۔

میں ان کی باہمی لڑائی کا منتظر تھا لیکن اچانک مولانا نے اٹھ کر بڑے خلوص سے چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا " دیکھو بھائی ' اب تم مانو کے کہ میں سومرسٹ مام ہوں----"

غلاست حسن نے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میں سومرسٹ مام ہوں-----"

مولانا نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے "میں سومرسٹ مام ہوں------" پھر غلاست حسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "تم سومرسٹ مام ہو------------ ہم دونوں سومرسٹ مام ہیں--------- جو ہے سومرسٹ مام ہے، جو نہیں ہے وہ بھی سومرسٹ مام ہے---------- سومرسٹ مام بھی سومرسٹ مام ہے------!"

○

رفوگر

آسمان جیسے پھٹے ہشمنے کا شامیانہ۔
نیل گگن پہ دودھیا میگھ، جیسے مدھوبن میں مست ہاتھی۔ ہندوستان کی قسم۔ کارواں سرائے سلامت یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل!
ترہی والا سفید گھوڑے پر کالا شہسوار۔
ترہی بجی ـــــ پہلے دیو گیری بلاؤل پھر مالکوس۔
دوکان کی اونچی سیڑھیاں چڑھ کے آئی آئینہ خانم اور رفوگر سے بولی:
"پہلے میری شال رفو کیجئے۔ پیشگی مزدوری۔"
پانچ کا نوٹ دے کر وہ چلی گئی۔
جس کی چاہو سوگند لے لو۔ کوئی رائے قائم کرنی مشکل۔
دل کی دل ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی۔
برگد کی آنکھ میں ابابیل کا گھونسلا، جہاں سورج کی پہلی کرن داخل ہوتی۔
برگد تلے پگلی بھکارن بڑبڑاتی:
"کچھ نہ کہو لوگو: میرے علی کو کچھ نہ کہو۔"
کارواں سرائے اپنی خبر رکھتی ہے۔ محبوب کی سرگوشی ہو یا ماں کی لوری۔
جن کے قدموں کے نشان مٹ گئے، ہم ان کا کوئی پتہ نہ لگا سکے۔
رفوگر علی جو امام کی گنبد والی دوکان۔ اونچی سیڑھیاں، تین کھڑکیاں۔
دوستانہ جذبے سے چمکتی آنکھیں۔ جگ درشن کا میلہ۔ کون گرو کون چیلا:
ترہی والا اپنی دھن الاپتا رہا۔
وہی کارواں سرائے، وہی بیگم بازار، وہی دوڑتی نظریں اور وہی گم ہوتی پرچھائیاں۔ سب کی توجہ کا مرکز علی لجو امام۔
یہ علی جو تو ہوا، یہ علی لجو امام کیا ہوا؟
پیر باورچی بہشتی خر:
ہر فن مولا۔
کوئی اسے علی کہتا، کوئی امام۔ کوئی استاد۔
اس کے ہاتھ دعا کے لئے اوپر اٹھ گئے۔
یا پیر، دست گیر، روشن ضمیر!

سامنے دیوار پر کالا ریشم ' سنہرے حروف ' فاختی ' چوکھٹے میں جڑا شاعر کا کلام
رسم الخط کو سلام:

ڈھوتے ڈھوتے پربت غم کا ' پاؤں میں پڑ گئے چھالے
بین کرے دیوانی پچھوا ' رو دیئے ماتم والے
انسوں نی کا چاک گریباں ' کون رفو کر پائے
بول سپیرے ! تم نے اب کے ' کتنے سنپیر پالے

بغل والی دیوار پر لال صوفی کے ساتھ رفوگر کی تصویر۔ دونوں کی ہنسی ہم آغوش۔ بیس برسوں پہلے کی یادگار۔
لال صوفی ہوتا تو یہیں سے شروع کرتا اپنا سفرنامہ:
مکانوں کا عام رویہ ' دھینگا مشتی تاتا تھیا:
سدھی کا چمکار
من کے آرپار
مزار گل شہید پر قوالی کی رات۔
آتے جاتے لوگ۔ کارواں سرائے خوش: محفل میں چہل پہل:
کمائی کا کیا کمال: سپنا نہیں آگیا بیتال۔
رفوگر کی ننھی منی نواسی جگنی اپنی گڑیا سے کھیلتے ہوئے گیت کا بول اچھالتی:
جاگ اری جنت کی گڑیا   جاگ اری جنت کی چڑیا
کھالے یہ بیچ میل مٹھائی   اوری گڑیا ! اوری چڑیا
لال صوفی ہوتا تو جگنی کے ساتھ سر میں سر ملا کر گاتا۔
پنا لال کی تان یہیں ٹوٹتی کہ سب کتے کاشی گئے تو ہنڈیا کس نے چاٹی!
لال صوفے کو اولاد احمد اور وارث معصوم کا سلام۔ اس کا ایک اور نام گل شہید۔
خلیل اور رحمان نے یہ کہہ کر دم لیا کہ لال صوفی تو جوانی میں بڑھاپے کا مزہ لیتا رہا۔
"اللہ میگھ دے رے اللہ میگھ دے!" گنگناتے ہوئے اولاد احمد رفوگر کی دوکان میں آیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔
چنچل سنگھ اور پنا لال کا وہی مذاق کہ آ رہی ہے چائے دار جلنگ سے
آچار یہ مہادیو "دس آئے دس گئے!" کہتے ہوئے کتاب گل کی طرف چل دیئے۔
گل آئینہ خانم کی موڑ پر بوڑھا برگد ' رفوگر کا پڑوسی۔ امیر خسرو کی کہہ مکرنی۔
استاد سے پوچھا "آپ کی عمر؟"
بولے "برگد سے پوچھ لو۔"
برگد کی داڑھی ہلنے لگی۔ جیسے ہوا کہہ رہی ہو کہ بوڑھا برگد سب جانتا ہے۔
جگنی سے پوچھا "تمہاری عمر؟"

"میری گڑیا سے پوچھ لو" ۔ وہ ہنس پڑی ۔
آگے چلتے ہیں 'پیچھے کی خبر نہیں ۔۔۔۔ کعبہ میرے پیچھے ہے 'کلیسہ میرے آگے ۔۔۔۔
جو سب سے پیچھے رہنا چاہتا ہے 'اسی کو سب سے آگے بڑھاتی ہے کارواں سرائے ۔ ایک ہی داؤ میں پاسہ پلٹ سکتا ہو ۔
وہ خود ستائی بھی نہ کرتا ۔ گاہک سے یہی کہتا "شاید میرا کام آپ کو پسند نہ آسکے !"
اگر کسی کو اس کا کام پسند نہ آتا تو وہ جھگڑے میں پڑنے کی بجائے صاف صاف کہہ دیتا " آپ کچھ بھی نہ دیجئے اور رفو کی ہوئی اپنی اچکن لیتے جائیے ۔"
پنالال جگنی کو چڑیا کہہ کر چھیڑتا تو وہ کہتی :
"وہ چڑیا جاپان گئی !"
رفوگر کے ابا دست گیر کی موت پر چنچل سنگھ افسوس کرتے ہوئے کہتا :
" آگے مرنا پیچھے مرنا 'پھر مرنے سے کیا ڈرنا !"
کسی کے ہاتھ میں کئی تہوں میں لپٹا ہوا کاغذ ۔
کسی کی بات چاکلیٹ اور بسکٹ کے بیچ ۔
کسی کی نظر ایک کونے میں پڑی جگنی کی لنگڑی والی گڑیا پر ۔
پتھر کی دیوار پر رنگ برنگے پوسٹر :
" سچ کو سولی ۔۔ "
" آنکھ کا پانی مر گیا ۔۔۔ "
" ڈھائی دن کی بادشاہی ۔۔۔۔ "
"پاؤں میں سنیچر ۔۔ "
" سفرنامہ ابن بطوطہ ۔۔ "
" چوڑیاں پہن لو ۔۔۔ "
سفید گھوڑے پر کالا شہسوار ۔۔۔ "
امرت گیسٹ ہاؤس کے آگے مغل اعظم ہوٹل اور بیگم پل سے آگے ترکمان دروازہ ۔
بھول بھلیاں اور بارہ دری کے بیچ کتاب محل ۔
بک لینڈ پریس کی بغل میں لبرٹی کینٹین ۔
کہیں اوپر کوٹ 'کہیں نیچا نگر ۔
کہیں اشاذی لکس ہوٹل 'کہیں نیا محل ۔
کارواں سرائے کا نام بدل کر پانڈولپی رکھ دیا ۔
یہ اور بات ہے کہ لوگوں کی زبان سے کارواں سرائے نہیں اترتی ۔
واہ ری کارواں سرائے :
ندیا میں مچھلی جال
بھکارن پھٹے حال

نام بن پھول بائی۔
اس کی ہتھیلی پر پانچ پیسے کا سکہ رکھنا نہ بھولنا علی لجو امام اور ہتھیلی میں گدگدی ہونے لگتی۔
کل کی رنگی آج کی بھکارن۔ سونے چاندی کے سکوں کی کھنک اس کے پاؤں چومتی تھی۔
پانچ پیسے کا سکہ لیتے وقت آج اس کی آنکھیں پاؤں کی طرف جھک جاتیں۔
کون سی داستان سنو گے؟ کچھ سنائیں گے' ذرا اور قریب آجاؤ۔
دو نینوں کی ایک کہانی
ماں کی لوری ایک نشانی
جو گزرو گے ادھر سے' میرا اجڑا گاؤں دیکھو گے
شکستہ ایک مسجد ہے' پرانا ایک مندر ہے
"عمر بھر کون محو رقص رہا؟" رفوگر نے رفو کرتے ہوئے پوچھا۔
نغمے کی سوغات۔ قوالی کی رات۔ صبح گئے' سلامت آئے۔
شائستہ کے روپ میں کس یگ کی رچنا آگے آئی؟
ننھی منی جگنی اور اس کی بڑی بہن نسیم۔
"تو نسیم کی بہن ہے جگنی؟" پنالال نے پوچھا۔
"نہیں نسیم میری بہن ہے۔" وہ ہنس پڑی۔
کہاں تک چپ رہیں' جب سر سے اوپر ہو گیا پانی!
آچاریہ مہادیو یہ کہتے ہوئے محل میں آئے کہ سونار کی' ایک ہوہار کی:
"سونے سے مہنگی گھڑائی!" وارث معصوم نے تھاپ لگائی۔
"رام دہائی! رام دہائی!" سب کی ملی جلی آواز۔
"وہ اپنا دامن چھڑا کر چلی گئی۔ کام روپ کے پاس جا کر رکیں گے اس کے قدم۔" اولاد احمد نے کہا۔ اشارہ بن پھول بائی کی طرف۔
برات عاشقاں بر شاخ آہو ---- ہرن کے سینگ پر عاشقوں کی برات۔
کچھ اور پوچھئے' یہ حقیقت نہ پوچھئے!
پھولوں جیسے بازو' تھکن سے چور!
اپنی گڑیا کا بیاہ رچائے' جگنی گاتی رہی:

دھوئیں دھوئیں ! تو گھر کو جا!
تیری ماں نے کھیر پکائی!

بن پھول کو دیکھ کر رفوگر بادشاہ بن جاتا۔ گویا اس کے ہاتھوں میں اشرفیاں کھنکنے لگتیں۔

تیس دن ' چالیس میلے
میلے میں سب لوگ اکیلے
ہم کہاں سب سے الگ؟

آج پردیا چلی پچھوا کے بعد!

مرنے والے کی نہیں ' جینے والے کی موت ہے!
اے روشنی ء طبع تو بر من بلا شدی!
"میں تو بن پھول کو چتر لیکھا سے کم نہیں مانا" ۔ پنا لال کا اعلان ۔
وہ سوچتا ایک دن بن پھول سڑک پر چلتے چلتے ڈھیر ہو جائے گی اور اس کی ارتھی کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی بھیڑ کندھے بدلتی رہے گی ۔
کارواں سرائے کا یہی احساس کہ علی جو امام جس کا بھی کام کرتا ہے ' بڑی ایمانداری سے اور دن رات ایک کر کے ۔
وہ تو گاہک کو ان داتا مانتا تھا ۔
اس کی نظر پرندوں کے اسپتال پر ' جس کا سنگ بنیاد لال صوفی نے رکھا تھا ۔
چنچل سنگھ بات کو گھیر گھار کر لاہور تک لے آیا :
"لاہور شہر" ۔
گربانی کا شبد ---- جانے کون سا اشارہ ۔
"یہیں رہنا ہے ' جب تک سوئی دھاگے کا ساتھ ہے" ۔ رفوگر کا اپنا انداز ۔
"تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا!" اولاد احمد نے اپنی کتاب کا حوالہ دیا ۔
"سو سال جئیں ' سو سال دیکھیں" آچاریہ مہادیو کی تان یہیں ٹوٹتی کہ مندر میں دیوتا جاگے ۔
چنچل سنگھ یہ کہہ کر دم لیتا کہ وہ پانی ملتان رہ گیا!
اولاد احمد کے زور قلم کا نتیجہ "ادھورا آدمی ' آدھی کتاب ۔"
پنا لال کا قد ---- سوا تین فٹ مگر اس کا یہی دعویٰ :
"میں لنکا سے آیا!"
جیسے وہ اپنے آپ کو باون گزا مانتا ہو ۔
گل آئینہ خانم کی شان ---- نوگزے کی زیارت ' سب پر مہربان ۔
گڑیا سے باتیں کرتے کرتے جگنی بول اٹھی :
"اللہ اللہ لوریاں ' دودھ بھری کٹوریاں!"
راگ راگنی ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ۔
"پاؤں تلے پرکھوں کی ہڈیاں" ۔ آچاریا مہادیو گیان بگھارتے ۔
سر کٹے دھڑ کو دفنا کر مزار گل شہید کا نام دیا گیا ۔
لال صوفی کا ایک اور نام ---- گل شہید ۔
اولاد احمد کی کتاب کا انتساب ۔ گل شہید کے نام ۔
"لوگوں کے دماغ بھی رفو ہونے چاہئیں!" رفوگر مسکرایا ۔
آنکھ کی پتلی ---- پتلی بائی! ---- کار جہاں دراز ہے!
موتی جھیل غائب ---- اب وہاں چترلیکھا کالونی کی چہل پہل ۔
گاندھی گارڈن ---- کمپنی باغ کا نیا نام ۔
کبھی آواز کا چہرہ ' کبھی پہچان چہرے کی!

خوشبو سے کہو یہ کہ ہماری طرف آئے!
بھس میں آگ لگا کے جمالو دور کھڑی!
"کہیں بھی آگ لگے 'بچاری جمالو بدنام۔"
آسام سے آیا کام روپ 'جسے بن پھول نے الکھ نرنجن مان لیا۔
پیروں میں گھنگھرو باندھے 'وہ اس کے آگے ناچتی رہتی۔
پاگل بھکارن کی اور بات 'جو سڑک پر کھڑی آنے جانے والوں کو دعائیں دیتی رہتی۔
کام روپ کو دیکھ کر آسام سامنے آجاتا۔
اوپر کوٹ ------ سرگوشیاں ہی سرگوشیاں۔
بن پھول کے جوڑے پر گجرے کی خوشبو۔
گفتگو --- گل شہید کے مزار تک۔
علی جو امام یہ بتانا نہ بھولتا کہ وہ سورج اگنے سے پہلے ہی پیدا ہوا اور اسی روز اس کوٹھری میں ابابیل کا بچہ انڈے سے باہر نکلا۔
آچاریہ مہاریو جب بھی "کشمیری بے پیری!" کہہ کر چھیڑتے تو رفوگر کہتا:
"مہاراج! میں تو آپ کو بھی بے پیر مانتا ہوں۔"
وقت کا احساس جیسے جنگلی کبوتر کی اڑان۔ اڑتا ہی جائے بس اڑتا ہی جائے!
دنگے فساد شروع ہو گئے تو کام روپ مارا جائے گا اور اسے الکھ نرنجن مان کر پیروں میں گھنگھرو باندھے اس کے آگے ناچنے والی بن پھول کی جھنکار بھی ختم ہو جائے گی۔
کبھی میوزک کانفرنس 'کبھی کتابوں کی نمائش 'کبھی آل انڈیا مشاعرہ۔
ہیرا لال کا بیٹا موتی لال اور موتی لال کا بیٹا پنا لال۔ تینوں بونے۔ مگر نفرت کے خلاف جہاد 'ان کا ایمان: جیسے بسم اللہ خاں کی شہنائی یا پنا لال کا بانسری وادن۔
پٹھان کا پوت ------ کبھی اولیا 'کبھی بھوت۔
مغل کی اور بات۔
اب کیا شاہانہ آن بان!
تاتاری کا قصہ ختم!
لال صوفی --- تاتاری سوداگر کے خاندان کی آخری کڑی۔
"برف کے پھول سے اٹھتا ہے دھواں دیر تک!"
رفوگر رفو کرتے کرتے گنگناتا رہا۔
اتماس گوسوامی کا نام آتے ہی 'مس فوک لور اور گل ہما کا نام آئے بغیر نہ رہتا۔
گل ہما یعنی برف کا پھول۔
اتماس گوسوامی کی "نیل ۔کنٹھی" میں لال صوفی کو شردھانجلی دی گئی۔
بہار آئی ہے جو بن پر ابھار آیا۔
پیچھے رہ گیا بھٹیاری کا رنگ محل۔

ناک کے سیدھ چلے جاؤ تو کتاب محل کا ریڈنگ روم۔
کبھی گرمی کا رونا کہ چیل انڈا چھوڑے!
کبھی کڑاکے کی ٹھنڈ کہ بلبلیں مر گئیں اکڑ کے تمام!

(۲)

ایک روز اچاریہ مہادیو بس پر سوار ہونے سے پہلے نیند کی چودہ گولیاں کھا گئے اور بس سے اتر کر کارواں سرائے کے بارہ ٹوٹی چوک میں نیلا گنبد کے فٹ پاتھ پر گرتے ہی بیہوش ہو گئے۔
کسی نے ٹیگور اسپتال کو فون کر دیا۔ اسپتال کی وین آئی اور اچاریہ مہادیو کو لے گئی۔
وہاں انھیں مردہ سمجھ کر مردہ گھر میں بھیج دیا گیا۔
اگلے روز ان کا پوسٹ مارٹم ہونا تھا۔
صبح چار بجے آچاریہ مہادیو کو ہوش آیا تو اس کے ساتھ کئی مردے۔
اپنے آپ کو مردہ گھر میں پا کر ان کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پا سکے۔
دروازہ کھلا تھا۔
وہ سرکتے سرکتے باہر اندھیرے میں جا پہنچے اور پہرے داروں سے بچتے بچاتے اسپتال کے احاطے سے باہر۔
کئی گھنٹے تک یہی احساس رہا کہ موت دبے پاؤں ان کا پیچھا کر رہی ہے۔
یہی خدشہ لگا رہا کہ کہیں سرکار اقدام خودکشی کے الزام میں نہ دھر پکڑے۔
پرانے دوستوں میں سے، جس سے بھی ملے، وہی انھیں بھوت سمجھ کر سہم گیا۔
علی جو امام نے اولاد احمد اور وارث معصوم کو ساتھ لے ٹیگور اسپتال سے پوچھ تاچھ کی تو پتہ چلا کہ بارہ ٹوٹی چوک کے فٹ پاتھ سے لائی گئی لاوارث لاش کو سرکاری خرچ پر جلا دیا گیا۔
جب آچاریہ مہادیو اچانک بک لینڈ پریس کے پروف ریڈر پنالال کے سامنے آئے تو وہ انھیں بھوت سمجھ کر اتنا خوفزدہ ہوا کہ تین دن تک اسپتال میں رہنا پڑا۔
"میں بیراگی بھیا انوراگی ---" جانے کس کس بات پر زور دیتے رہے آچاریہ مہادیو۔
چاند تاروں کے تلے، کون سا قصہ چلے!
ہماری پہچان ------ رفوگر کی دوکان۔
بھاری ڈیل ڈول، لمبی داڑھی، بڑی بڑی آنکھیں، آنکھوں پر چشمہ۔ ہاتھ میں سوئی دھاگا۔
سگریٹ جلانے کے لئے ماچس نہیں، لائٹر --- گل ہما کی سوغات۔
"لونگ لو مس لوک لور! اور گل ہما زندہ باد!"
اولاد احمد تھاپ لگائی:
"کبھی تو ہنسائے، کبھی یہ رلائے ------ زندگی کیسی ہے پہیلی ہائے ---"
"ہم تو ہر آدمی کو اپنے سے آگے مانتے ہیں۔ اس کا پیار ہمیں ملے نہ ملے۔ وارث معصوم نے جیسے اندھیرے میں روشنی کی پگڈنڈی پر

ناس گوسوامی کو چلتے دیکھا۔ دائیں مس ٹوک لور، بائیں گل ہما۔
اب کیا ہو گا، کسے خبر! لوک یان کے لئے جینا اور مرنا اتناس گوسوامی کا دھرم ایمان۔
"پیار کر کے بھلانا نہ آیا ہمیں ـــ" رفوگر نے رفو کرتے کرتے کہا۔
کتاب محل بڑھیا لائبریری ہے جیسے کسی مفلس نے پرانے خزانے کا پتہ چلایا۔
"یہ کون سی پستک تھی، جو تم پڑھ رہے تھے۔" پنا لال نے چنچل سنگھ سے پوچھا۔
جتنی پرچھائیاں، اتنی سیڑھیاں ـــ ساتھ صدیوں پرانا ہے اپنا!
"دکھیا کیوں اتنا سنسار!" نظم بن پھول کا۔
ات پتا سا بول "پگلا کہیں کا!"
اپنے دھاگے، سدا آگے۔ کہیں خیر مقدم، کہیں الوداع۔
سوئی ڈگر ہو یا ہو میلہ۔ تشریف لائیے حضور!
"رفوگر کے لئے ضروری ہے کہ کپڑے میں جان ہو۔" رفوگر نے رفو کرتے کرتے کہا۔
"اب تو اپنے آپ پر آئے نہ وشواس۔" چنچل سنگھ بول اٹھا۔
بال بچے دار پنا لال نئی دلہن بیاہ لایا۔
دلہن نے اسے نیا خطاب دے ڈالا:
"چیونٹیوں بھرا کباب!"
گفتگو ہوتی رہی گھنٹوں۔
چنچل سنگھ کو یہی بات ناگوار گزرتی کہ کوئی اسے ہوٹل مہاراجہ سمجھ کر ہی اس کا احترام کرے۔
ہم کتنا ٹوٹ کے روئے جب لال صوفی کا دھڑ ملا، سر غائب۔
وارث معصوم گنگناتا رہا:

قصیدے سے نہ چلتا ہے، نہ یہ دوہے سے چلتا ہے،
حکومت کا ہے جتنا کام، سب لوہے سے چلتا ہے،

وہ کون تھا، جو منگرا کے پاس سے گذر گیا؟
آچاریہ مہادیو نے جوگی بننے کا سپنا دیکھا۔
یوگ آشرم سے لگاؤ۔
شادی سے دور۔
اس ہی کا ناش ہو، جس کی دوستی کے کارن انہیں مینڈکس کی لت پڑ گئی۔ مٹی میں مل گیا یوگ کا سپنا۔
ہاتھ میں اخبار کا سنڈے ایڈیشن۔

چرخ نے پیش کیش کہہ دیا اظہار میں
قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

اب کس بات کا پردہ، جب نقطہ گونج اٹھا؟
"بارہ دری" نے سدھارتھ سینما میں گولڈن جوبلی منائی۔

رفوگر کو کیا چاہئے؟ چاک گریباں یا پھٹا ہوا دامن۔
بلبلیں مرتی ہیں اپنی بات پر!
لال صوفی کے مزار پر پھول چڑھا کر چنچل سنگھ نے دعا مانگی۔
دولت خاں کی دولت کا کرشمہ کہئے یا جادو، جو سر چڑھ کے بولا۔
وہ تین بار لوک سبھا کا ممبر چنا گیا۔
یہ تہذیب کس نے سکھائی ہمیں؟
کون سے رسم الخط میں لکھتا رہا وارث معصوم؟
کالج کی کتاب پر بھی کا اتنا ہی اعتماد، جتنا کہ گڑیا کے کھیل پر۔
دھک دھک دھک دل کی ڈفلی
ڈم ڈم ڈم ڈم ڈمرو باجے!
واہ رے آگیا بیتال!
سامنے اس موڑ پر پرندوں کا اسپتال۔
محرابوں سے چھن کر آتی دھوپ۔
سو کے قریب پرندے ہر ہفتے علاج کے لئے آتے۔ آشیاں سے دور، بڑھیا علاج۔

(۳)

کارواں سرائے گل ہما کی طرح اپنی ہی بانہوں میں سمٹ جاتی اور کبھی نفرت کی آندھی پر جھنجلائی سی لگتی۔
پنا لال استاد کے لئے چلم بھر لاتا۔
سوالوں کی راتیں، جوابوں کے دن۔
جب آچاریہ مہاریو اخبار پڑھ کر سناتے تو پنا لال اور اولاد احمد انھیں مذاق کا نشانہ بنانا نہ بھولتے۔ ٹیگور اسپتال میں ایک بار انہیں لاوارث لاش مان لیا تھا۔
دنگے فساد کی خبریں سنتے سنتے کبھی رفوگر کی سوئی سے دھاگا نکل جاتا، کبھی سوئی ہاتھ میں چبھ جاتی اور خون کی بوند چھلک جاتی۔
بادلو! او بادلو! او بادلو
مر گیا طوطا ہمارا مر گیا!
علی جو امام کو پسند کرنے والوں کے ڈھیر سارے نام۔
"دیکھ مجھے جھوم گیا ندیا کا درپن!" بن پھول کا نغمہ۔
جانے کون کون سی یاد محفل کا دامن تھامتی رہی۔
چائے آئی اولاد احمد نے تھاپ لگائی:

چائے آئی چائے آئی
دنگے بھاؤ کی چائے آئی

(۴)

آچاریہ مماویو نے لائٹر سے سگریٹ سلگایا اور کش لے کر گنگناتے رہے:
"دوری نہ رہے کوئی ' آج اتنے قریب آ جاؤ!"
"چاندنی جب مل گئی 'ہم چاندنی سو لئے ---" اولاد احمد کی تھاپ۔
ہم نے تو ہر طرح کے پھول ہار میں پرو لئے ----" وارث معصوم کی تان۔
قصہ پنا لال کا۔
رفو کرتے کرتے علی ہو امام کو جانے کیا خیال آیا کہ اٹھ کر چلے گئے۔
جانے سے پہلے جیب سے نکال کر پچاس کا نوٹ چوکی پر رکھ دیا۔ شیشے کے پیپر ویٹ کے نیچے۔
اتنے میں پنا لال آیا اور چپکے سے نوٹ اٹھا کر نو دو گیارہ۔
اولاد احمد نے اسے نوٹ اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔
رفوگر واپس آیا تو اولاد احمد نے پنا لال کی شکایت کی۔
"وہ نوٹ تو اسی کے لئے تھا۔" رفوگر مسکرایا۔
رحمان یہ خبر لایا کہ دولت خاں نے کام روپ اور بن پھول کے لئے دونوں وقت کھانے کا انتظام کر دیا ساوانز ریستوران میں۔
"ووٹ حاصل کرنے کا نیا ہتھکنڈا۔" وارث معصوم ہنس پڑا۔
"آج قصے کو پھپھوندی لگ گئی! -----" اولاد احمد گنگناتے رہے۔

(۵)

قاتل بڑا بے رحم تھا' جو لال صوفی کا سر کاٹ کر لے گیا اور دھڑ جھاڑیوں میں چھپا گیا۔
سوال پوچھو' جواب دیں گے۔
"قتل ناحق صوفی معصوم کا!" اولاد احمد کی تھاپ۔
ذرا سی بھول یہ رنگ لائی۔
اب کہاں وہ کتھا گھاٹ!
پرندوں کا اسپتال ------ کارواں سرائے کی شان۔
اسپتال کی نئی عمارت پر دولت خان نے دولت نچھاور کی۔
سدھارتھ سینما کا مالک ------ دولت خان۔ بک لینڈ پریس کا بھی وہی پروپرائیٹر۔
سینما --- بیوی کے نام
پریس ---- چھوٹے بھائی کے نام
اصل بنیاد تو عقیدت ہے ---- یہی ایمان کی حقیقت ہے۔

سدھارتھ سینما میں نئی فلم "لوگ کہتے ہیں۔"
مر گئے، کھو گئے، جاتے رہے۔۔
اللہ اللہ لوریاں ۔۔۔۔ دودھ بھری کٹوریاں ۔۔
رشوت کا ایک نام ۔۔۔ چاندی کی لگام۔
کارواں سرائے پر علی جو امام کی چھاپ۔ اس کی دوکان کارواں سرائے کی پہچان

(۶)

پگلی بھکارن سوکھے پیڑ کے تنے پر پانی ڈالتی رہی۔
پیڑ پر نئے پتے آ گئے۔
خواب میں ہم اپنے ہی جنازے کے ساتھ چلتے رہے۔
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں!
پنالال کے دماغ پر سوار ۔۔۔۔ بن پھول۔
وہ مدھومتی کے کنارے موجود رہتا، جب بن پھول مدھومتی سے نہا کر نکلتی۔

اس نے بھیگے ہوئے بالوں سے جو جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

"میں نے پیروں میں گھنگھرو باندھے، جتنے کہو اتنے گھنگھرو بولیں۔" ناچنا شروع کرنے سے پہلے بن پھول کا اپنے الکھ نرنجن سے یہی نویدن۔
دولت خاں۔ چوتھی بار لوک سبھا کا انتخاب جیت گیا۔
علی جو امام کی اور بات۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کا احترام
ہو مبارک او علی جو او امام

سکھ دکھ رہتے جس میں مل کر، جھلمل بستی اس کا نام۔
لال صوفی کا سر کاٹ کر لے گیا ہتیارا
آج تک اس کا پتہ نہ چل پایا۔
پرندوں کا اسپتال ۔۔۔۔ اس کی بچی یادگار۔ وہ جب تک زندہ رہا، پرندوں پر جان چھڑکتا رہا۔
مارا گیا لال صوفی ۔۔۔۔ جو نفرت کو اپنے خون سے تولتا رہا۔
مزار میں دفن ۔۔۔۔ سر کٹا لال صوفی۔
لوگوں کا گل شہید، جو زندگی بھر نفرت کے خلاف لڑتا رہا۔
لال صوفی کا مرثیہ ۔۔۔۔ اولاد احمد کی کتاب کا حرف آخر

بانس کے پتے پر یہ شبنم
آنکھوں سے پلکوں کی باتیں
آنسو کی کیا آب و تاب
یہ زندہ اور مردہ لوگ
کیسا پلٹا ہے یہ موسم
وہی سوال اور وہی جواب

ماتم والے بولے کم کم
پھر ڈھو ڈھو روتے رہے ہم
کیسے پڑھتے رہے کتاب
آنسو میں موتی کی آب
دم توڑے پتوں پر شبنم
کہاں گیا وہ اپنا ہمدم

کھنڈر کے پیچھے چاندنی رات میں املی کے منڈوے تلے سو رہی تھی بن پھول۔
اسے ناگ نے ڈس لیا۔
اس کی ارتھی کے ساتھ علی جو امام دوکان سے شمشان تک چونیاں اور اٹھنیاں نچھاور کرتا رہا۔
اب کہاں بن پھول کی جھنکار!
اولاد احمد کی زبان پر جاپان کا ایک ہائیکو:
بس ایک تتلی ---- ننھی جان
مندر کے گھڑیال پر
بے خبر سوتی رہی!
کارواں سرائے پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔
بن پھول کے الکھ نرنجن کام روپ کی آتما بھی پنجرا خالی کر گئی۔
کارواں سرائے ارتھی کے ساتھ ساتھ۔
چھتیس گڑھ کے چودھری بھی شامل ہوئے
"رام رام ست ہے" کے ساتھ "اللہ ہو" کی آواز بھی بلند ہوتی رہی۔
چنچل سنگھ نے چندن کی چتا سجائی۔
آچاریہ مہادیو نے چتا کو آگ دکھائی
تیرہ دن تک کارواں سرائے کام روپ کا سوگ مناتی رہی ---- چولہے آگ نہ گھڑے پانی۔
بچوں کا شور:

دھوئیں دھوئیں تو گھر کو جا!
تیری ماں نے کھیر پکائی!

(۷)

آج مزار گل شہید پر قوالی کی رات۔
اپنا لال صوفی ---- کارواں سرائے کا گل شہید۔

یاد رہے گا اس کا لفظ :

وہ ہندو ہوں کہ مسلم ایک ہی مٹی کے برتن ہیں
کوئی ہیں شیخ جی ان میں ' کوئی ان میں برہمن ہیں

دائیں رحمان اور خلیل ' بائیں اولاد احمد اور وارث معصوم۔
بیچ میں آچاریہ مہادیو۔
چپ کیوں ہو گئے ؟ جواب دو۔
علی جو امام کیوں نہ آیا ہمارے ساتھ ؟
رفوگر کی دوکان سے چل کر وہ بیگم پل سے گذرے۔ دائیں کھجڑی پور ' بائیں چتر لیکھا کالونی۔
بارہ دری سے ہو کر عید گاہ مارگ پر چلتے چلتے کتاب محل کو پیچھے چھوڑا۔
جھلمل بستی سے آگے مزار گل شہید۔
شیطان طوفان ' اللہ نگہبان۔ ہم قربان!
ان کا یہی احساس کہ یہاں نہ کوئی دوست ہے نہ دشمن۔ نہ راجہ نہ بھکاری ' نہ رانی اور داسی کے بیچ کوئی دیوار!
جہاں ذر ' وہیں ہمارا گھر!
اب وہ زمانہ کہاں کہ سونا اچھالتے جاؤ۔
اولاد احمد کی یہی شکایت کہ اتماس گوسوامی تشریف نہ لائے۔
جھوٹی قسم کون کھائے :
وارث معصوم کہہ رہا تھا کہ گل ہما اور مس ٹوک لور ہی چلی آتیں۔
آچاریہ مہادیو بولے :
"اگر مس ٹوک لور کو بھی فرصت نہ تھی تو گل ہما ہی چلی آتی۔"
ہر طرف جنگل نظر آنے لگا
وصل ہو یا وصال ہو یا رب!
ہم قربان!
سات قرآن درمیان!
سب نے نہا کر کپڑے بدلے!
قوالی کی رات!
سازوں کی ہم آہنگی ہی سنگیت کی پہلی منزل ہے۔
اس وقت کی گردش یاد کرو ' جب ساز ملائے جاتے ہیں!
وارث معصوم اور اولاد احمد یہ دیکھ کر جھوم اٹھے کہ اتماس گوسوامی پہلے سے محفل میں موجود ہیں۔
مٹی میں گلاب کی سگندھ۔
آچاریہ مہادیو نے ہاتھ جوڑ کر اتماس گوسوامی کو پرنام کیا۔
جانے کون سی ان بوجھی پہیلی بوجھی جا رہی تھی۔

اپنے تو ہیں سو سو یار دھنے ، بجر اور منہار
دل کی دنیا بہت اندھیری اندھیارے میں کاروبار

اچانک درگاہ کے اندر ایک آدمی آ کر چلایا:
"فساد شروع ہو گیا!"
بکھرے بال، کندھے گھائل، سر لہولہان۔
چیختے چلاتے وہ گر پڑا۔
قوالی کی محفل درہم برہم۔
اب کیا ہو گا؟
خلیل اور رحمان کا کہیں پتہ نہ تھا۔
اولاد احمد اور وارث معصوم بولے:
"چلو آچاریہ مہاراج! اب بھاگ چلیں۔"
وہ چلتے رہے، گرتے پڑتے چلتے رہے۔
افراتفری، دہشت، غم کا پہاڑ۔
بلند عمارتیں آگ کی نذر۔
گلیاں لہولہان۔
کالی سڑکیں سرخ ہو گئیں۔
راہیں لاشوں سے پٹ گئیں۔
اپنی ہی دوکان کی سیڑھیوں پر مارا گیا علی جو امام۔
سفید گھوڑے کا کالا شہسوار
اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے ـــــ گھوڑے کی ایال پر!
آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے، گرتے رہے!
مارا گیا علی جو امام:
ایک ہاتھ میں سوئی، دوسرے میں دھاگا!.....

○
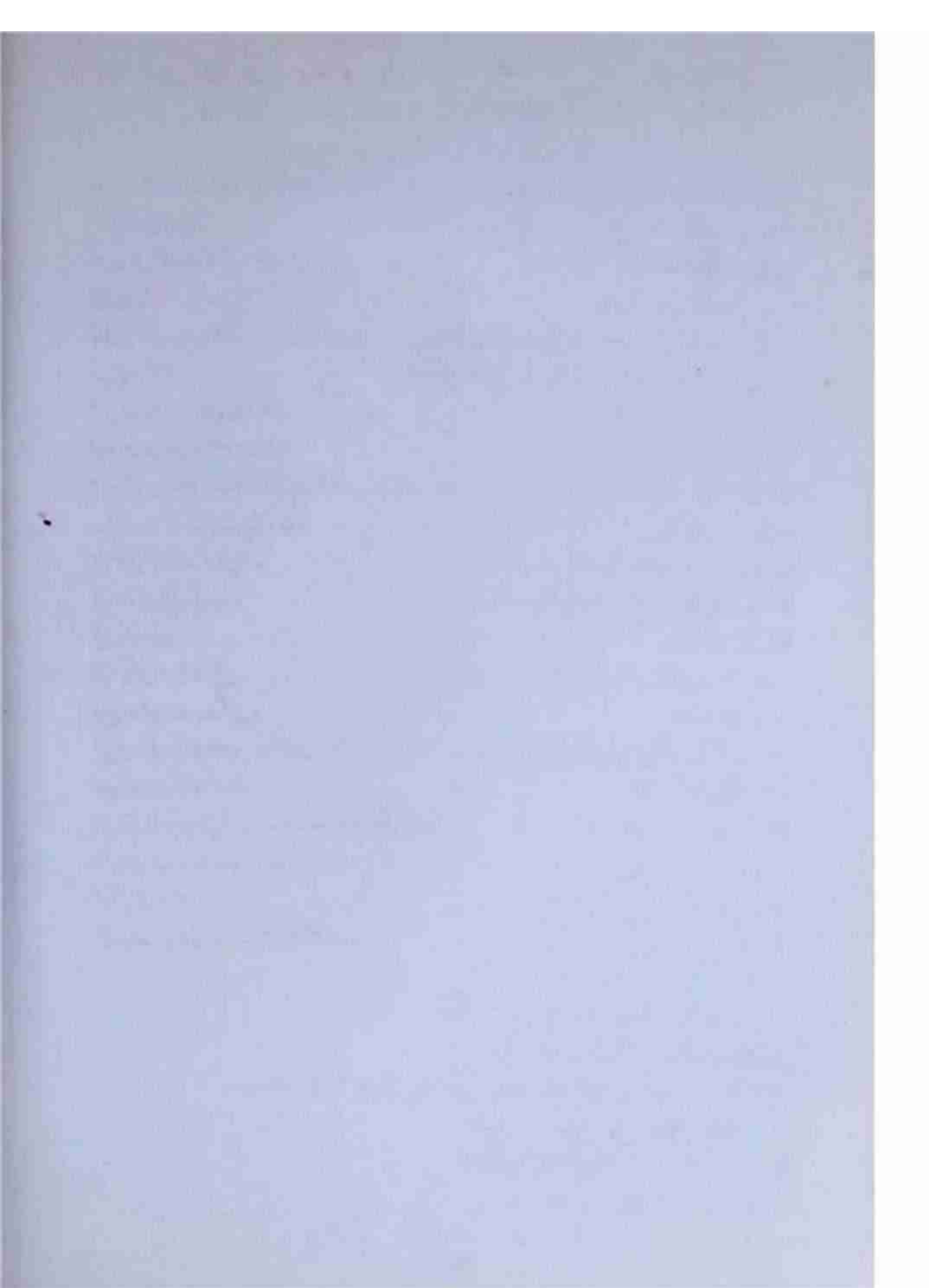
شفیق الرحمٰن

نام : شفیق الرحمٰن
قلمی نام : شفیق الرحمٰن
پیدائش : ۹ نومبر ۱۹۲۰ء بہ مقام کلانور، مشرقی پنجاب
تعلیم : ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (پنجاب)، ڈی۔ پی۔ ایچ (اڈنبرا برطانیہ)، ڈی۔ ٹی۔ ایم۔ اینڈ ایچ (لندن) فیلو آف کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز (پاکستان)

۱۹۴۲ء میں پنجاب یونی ورسٹی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا۔ آزادی کے بعد آپ کو پاکستان آرمی کی طرف سے اڈنبرا اور لندن یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بھیج دیا گیا۔ دو برس وہاں رہ کر ڈی۔ پی۔ ایچ اور ڈی۔ ٹی۔ ایم اینڈ ایچ کے ڈپلوما کورس کیے۔

مختصر حالاتِ زندگی:

آپ کے والد کا نام عبدالرحمٰن خان تھا۔ شفیق الرحمٰن کا بچپن سی۔ پی (بھارت) میں گزرا۔ کنگ ایڈورڈ کالج، لاہور میں زمانہ طالب العلمی کے دوران ڈرائنگ کلب کے سیکرٹری اور کالج میگزین کے ایڈیٹر (۴۲-۱۹۴۱ء) رہے۔ لڑکپن اور جوانی میں سیروسیاحت، کرکٹ، باکسنگ اور تیراکی میں جنون کی حد تک دلچسپی رہی۔ کارٹون نگاری، مصوری اور فوٹوگرافی کے خبط اس کے علاوہ تھے۔ (۱)

۱۹۴۲ء میں ساڑھے اکیس برس کی عمر میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرنے کے بعد میو ہسپتال لاہور میں چند ماہ ہاؤس جاب کیا اور اسی سال انڈین میڈیکل سروس میں چلے گئے۔ دوسری جنگ عظیم میں مختلف محاذوں پر ملازمت کرنے اور کئی ممالک دیکھنے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۷ء میں آپ کی تبدیلی پاکستان آرمی میڈیکل کور میں ہو گئی اور حکومت کی طرف سے آپ کو پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے سلسلے میں برطانیہ بھیج دیا گیا۔ پانچ برس کے لیے آپ کو بری فوج سے بحریہ میں منتقل کر دیا گیا جہاں سے ستمبر ۱۹۷۹ء میں سرجن ریئر ایڈمرل کے رینک سے بطور ڈائریکٹر میڈیکل سروسز ریٹائر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں آپ کو اکادمی ادبیات پاکستان کا چیئرمین مقرر کر دیا گیا جہاں سے مدت ملازمت ختم ہو جانے کے بعد آج کل راولپنڈی میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ کی شخصیت اور فن سے متعلق کام کرنے پر یوسف ساجد کو جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن نے ایم۔ فل (اردو) کی ڈگری سے نوازا ہے۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "کرنیں" (افسانے) مکتبہ اردو، لاہور : طبع اول: ۱۹۴۲ء
اس کتاب کا دیباچہ حجاب امتیاز علی نے لکھا ہے۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ جدید، دہلی نے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔
۲۔ "شگوفے" (افسانے / مضامین) طبع اول: ۱۹۴۳ء

۳۔ "لہریں" (افسانے) نفیس اکیڈمی، حیدر آباد دکن: طبع اول: ۱۹۴۳ء

یہ کتاب مکتبہ میری لائبریری، لاہور نے بھی شائع کی ہے۔ ۱۹۴۳ء میں ایک ایڈیشن ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد دکن نے شائع کیا۔

۴۔ "مد و جزر" (افسانے) امرت الیکٹرک پریس، لاہور: طبع اول: ۱۹۴۴ء

۵۔ "پرواز" (افسانے) طبع اول: ۱۹۴۵ء

اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ میری لائبریری، لاہور نے بھی شائع کیا ہے جبکہ مکتبہ جدید دہلی نے اس کا ایک ایڈیشن ۱۹۵۲ء میں نکالا۔

۶۔ "جنگ اور غذا کا مسئلہ" (معاشیات) نفیس اکیڈمی، حیدر آباد دکن: طبع اول: ۱۹۴۳ء

۷۔ "پچھتاوے" (افسانے) طبع اول: ۱۹۴۶ء

سولہ افسانوں کے اس مجموعے کو ادبی دنیا، اردو بازار، دہلی نے بھی شائع کیا۔

۸۔ "حماقتیں" (افسانے) طبع اول: ۱۹۴۷ء

اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ میری لائبریری، لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

۹۔ "مزید حماقتیں" (افسانے) مکتبہ میری لائبریری، لاہور: طبع اول: ۱۹۵۴ء

اس کتاب کا ایک ایڈیشن چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی نے بھی شائع کیا ہے۔

۱۰۔ "نئے شگوفے" (افسانوں کا انتخاب) ہند پاکٹ بکس، دہلی: طبع اول: س ۔ ن

۱۱۔ "دجلہ" (ناولٹ) غالب پبلشرز، لاہور: طبع اول: ۱۹۸۰ء

۱۲۔ "معاشرہ اور ذہنی صحت" (از الزبتھ ایم ڈاج کا ترجمہ) مقبول اکیڈمی، لاہور:

یہ کتاب موسسہ فرینکلن نیویارک کے تعاون سے شائع ہوئی۔ یہ "YOUR COMMUNITY MENTAL HEALTH" کا ترجمہ ہے۔

۱۳۔ "انسانی تماشا" (ناول از ولیم سرویاں کا ترجمہ) مکتبہ جدید، لاہور: طبع اول: ۱۹۵۶ء

یہ کتاب موسسہ فرینکلن نیویارک کے تعاون سے شائع ہوئی۔ یہ ناول "THE HUMAN COMEDY" کا ترجمہ ہے۔

۱۴۔ "آپ کا آپریشن" (جراحی / کتابچہ) از رابرٹ ایم گشکم۔ مقبول اکیڈمی، لاہور: طبع اول: ۱۹۶۵ء

یہ کل ۴۴ صفحات کا کتابچہ ہے۔

۱۵۔ "طبی تحقیق آپ کو مہلک امراض سے بچا سکتی ہے" (طب / کتابچہ) از گلبرٹ کانٹ کا ترجمہ، مقبول اکیڈمی، لاہور: طبع اول: ۱۹۶۴ء

یہ کل ۵۶ صفحات کا کتابچہ ہے۔

۱۶۔ "کیا میرا بچہ تندرست پیدا ہو گا؟" (طب / کتابچہ) از جان گولڈ کا ترجمہ، مقبول اکیڈمی، لاہور: طبع اول: ۱۹۶۴ء

یہ کل ۵۶ صفحات کا کتابچہ ہے۔

۱۷۔ "درس زندگی" (سماجیات) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور: طبع اول: ۱۹۶۵ء

از پطرس بخاری و ایڈورڈ مرو کی کتاب کا ترجمہ بہ اشتراک عبدالمجید سالک،

یہ کل ۱۹۸ صفحات کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

۱۸۔ "ذہنی امراض اور ان کا علاج" (ترجمہ) مقبول اکیڈمی، لاہور: طبع اول:

(نوٹ) شفیق الرحمن کے افسانوں اور مضامین سے متعلق معروف کتب کے موجودہ ناشر غالب پبلشرز، سمن آباد، لاہور ہیں۔

غیر مدون:

کم از کم دو مجموعوں کا مواد (افسانے / مضامین) زیر ترتیب ہے۔

مستقل پتا:

۱۔ ۲۶۔ ویسٹرج I، راول پنڈی، پاکستان۔
۲۔ معرفت۔ ایچ رحمٰن اینڈ کمپنی۔ ہارون آباد ضلع بہاولنگر، پاکستان

اعزاز:

۱۔ ہلال امتیاز (ملٹری)

نظریہ فن:

"جو خود پر بیتی اور جن حالات میں دوسروں کو دیکھا وہ لکھ دیا۔"

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ستمبر ۱۹۸۴ء)

(۱) بہ حوالہ "ستاروں کی محفل" مرتبہ: بشیر ہندی۔

۹۹ ناٹ آؤٹ

بڑی مشکلوں سے ہم نے وہ میچ جیتا یا یوں کہئے کہ ہارتے ہارتے بچے۔ سب سے زیادہ اسکور مقصود گھوڑے کا تھا۔ اس نے صبح سے کھیلنا شروع کیا۔ کوئی اسٹروک ایسا نہ تھا جو اس نے نہ دکھایا ہو۔ بولرز کو خوب سزا دی اور دو گھنٹے کے بعد تین رنز بنائے۔ اس کے بعد جو اچھل اچھل کر کھیلا ہے تو دوپہر تک تین سے دس تک اسکور پہنچا دیا۔ لنچ کے بعد وہ بے حد تیز کھیلا۔ آگے بڑھ کر وہ ہٹیں لگائیں کہ پانچ رنز کا اضافہ اور کر دیا۔ جب ہم شام کو رو پیٹ کر جیتے اور آخری کھلاڑی نے آخری ہٹ لگائی تو مقصود گھوڑا بیس رنز بنا چکا تھا۔

ہمارے مخالف بھی کافی گئے گزرے تھے، وہ بھی اسی طرح کھیلے تھے۔ ان کی بالنگ کا یہ حال تھا کہ گیارہ کھلاڑیوں میں سے دس نے بالنگ کی تھی اور گیارہواں وکٹ کیپر تھا اور مجبور تھا ورنہ وہ بھی حسب توفیق مدد کرتا۔ کھیل دیکھنے والوں کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ دونوں ٹیموں کو یہ ڈر نہیں ہے کہ کہیں ہار نہ جائیں بلکہ یہ خطرہ ہے کہ کہیں جیت نہ جائیں۔

میں مقصود گھوڑے کو لے کر شیطان کے ہوسٹل میں پہنچا ان کے کمرے میں مدھم روشنی میں ایک بڑے سے پلنگ پر چند حضرات رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے تھے۔ شیطان بولے "سردی زیادہ ہے اور ہم تھکے ہوئے ہیں۔" انہوں نے ہمارے لئے رضائی منگوائی اور ہم بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ مقصود گھوڑے نے پوچھا۔ "روفی صاحب آپ کیسے ہیں؟"

شیطان بولے۔ "میں بفضل خدا تعالیٰ بخیریت ہوں اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔ دیگر احوال یہ ہے کہ میں تندرست ہوں۔"

میں نے سیکنڈ شو کے لئے کہا اور پوچھا کہ "اب کیا بجا ہو گا؟"

شیطان گھڑی دیکھ کر بولے "جمعرات ہے!"

ویسے سینما میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ "شیطان بولے "ایک گھنٹے کا کیا ہے، دس منٹ میں گزر جائے گا۔ آج سینما اسی طرح چلیں گے.......... رضائیاں اوڑھ کر، اور نوکر حقہ ساتھ لے کر چلے گا۔"

بڑی بحث ہوئی۔ مقصود گھوڑا بولا۔ "میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ رضائیاں اوڑھ کر نہ چلیں بلکہ ...."

شیطان جلدی سے بولے۔ "میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ مجھے مشورہ نہ دیں۔ آج رضائیاں اوڑھ کر ہی چلنا ہو گا، سردی بہت ہے۔"

"اوورکوٹ پہن لو۔" میں نے کہا۔

"یہ اوورکوٹ کمبخت ایسا ہے کہ اسے پہن کر اور زیادہ سردی لگتی ہے۔"

"یہ وہی اوورکوٹ تو نہیں جسے الٹوایا گیا تھا؟"

"ہاں! وہی ہے! پہلے اسے الٹوایا گیا تھا، پھر سیدھا کرایا گیا ہے لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔"

"یہ روشنی بہت مدھم ہے۔" کسی نے کہا۔

شیطان نے نوکر سے پوچھا۔ "کیوں! یہ بلب کتنے ہارس پاور کا لائے ہو؟"
اس غریب نے بلب کی ہارس پاور بتا دی۔
شیطان بولے۔ "آج بجلی ہی بہت کم آ رہی ہے۔"
شیطان چلتے وقت اپنی عینک ڈھونڈنے لگے۔ کسی نے بتایا کہ ایک عینک تو ان کی ناک پر رکھی ہے۔
بولے۔ "آج کل میرے پاس تین عینکیں ہیں ایک دور کی چیز دیکھنے کے لئے دوسری نزدیک کی چیزیں دیکھنے کے لیے ...... اور تیسری ان دونوں کو ڈھونڈنے کے لیے۔"
میں یہی سوچ رہا تھا کہ اگر جج صاحب کے کنبے میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے ...... ذرا سی دیر میں ہم ٹھنڈی سڑک پر رضائیاں اوڑھے جا رہے تھے اور ہمارے پیچھے نوکر حقہ تھامے آ رہا تھا۔
سینما پہنچے۔ وہاں اتفاق سے میری نگاہ جج صاحب کی موٹر پر جا پہنچی۔ میں نے اندر جاتے وقت اپنی رضائی تو مقصود گھوڑے کے اوپر پھینکی اور شیطان کی نظر بچا کر دور جا بیٹھا۔ پیچھے مڑ کر جو دیکھتا ہوں تو جج صاحب بیٹھے تھے۔ میں بالکل سیٹ میں دھنس گیا کہ کہیں نظر نہ آ جاؤں۔ مگر ذرا سی دیر میں ننھی میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے پیچھے جانا پڑا مجھے ننھی کی سیٹ ملی۔ جج صاحب نے پہلے تو میرے نہ آنے کی شکایت کی۔ میں نے امتحان کا بہانہ بنا دیا۔
پھر بولے۔ "تمہارے ساتھ وہ خواتین کون تھیں؟"
"کون سی خواتین؟"
"ابھی ابھی جو تمہارے ساتھ تھیں ...... وہ جو سامنے بیٹھی ہیں۔" انہوں نے شیطان وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جو حقہ پی رہے تھے۔
"ارے! لاحول ولا قوۃ! یہ خواتین تو حقہ پی رہی ہیں" وہ چونک کر بولے۔
"جی نہیں ..... یہ خواتین نہیں ہیں .... کچھ اور ہی ہیں۔"
میں جو کہہ رہا ہوں کہ خواتین ہیں ..... غضب خدا کا ...... استورات کو حقہ پیتے میں آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔"
میں نے کن انکھیوں سے رضیہ کو دیکھا جو کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ان دنوں رضیہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی اور میں کافی بیزار تھا۔ شیطان مجھ سے بیزار تھے۔ بار بار وہ یہی کہتے کہ:
"میاں اگر کوئی بس یا لڑکی ہاتھ سے نکل جائے تو ذرا فکر نہیں کرنا چاہئے ..... دوسری ابھی آتی ہوگی۔"
ان دنوں میں جتنا اسے منانے کی کوشش کرتا اتنا وہ اور روٹھ جاتی۔ روٹھنے کی وجہ تھی ایک لڑکی جو ٹینس میں میری پارٹنر تھی۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن سب اسے عینک کہا کرتے۔ اس کے خدوخال میں سب سے نمایاں چیز اس کی عینک تھی۔ بڑی لمبی چوڑی اور وزنی عینک! اگر میں رضیہ کی جگہ ہوتا تو ہرگز بدگمان نہ ہوتا۔ ننھی نے ہمیں چند مرتبہ اکٹھے دیکھا اور رضیہ سے کہہ دیا پھر ایک شام کو عینک نے کہا کہ "میرے ڈیڈی شام کی ٹرین سے گزر رہے ہیں، مجھے اسٹیشن پر لے چلے"
اس کے پاس سائیکل نہیں تھی اور ٹرین میں بہت تھوڑا وقت تھا۔ میں اسے لے کر نکلا ہی تھا کہ رضیہ اور حکومت آپا مل گئیں۔ ادھر اسٹیشن پر ہمیں ایک نہایت ہی کرخت قسم کے دراز ریش بزرگ ملے جنہیں ہرگز ڈیڈی نہیں کہا جا سکتا تھا۔
میرا اور شیطان کا امتحان نزدیک تھا اس لیے ہم دونوں جج صاحب کے ہاں سے ہوسٹلوں میں چلے آئے تھے۔ ان دنوں جج صاحب بڑی سرعت سے کوٹھیاں بدل رہے تھے۔ شیطان جب کبھی ان سے ملتے یہی پوچھتے کہ آج کل آپ کہاں رہتے ہیں۔
ان کی پہلی کوٹھی میں ہمارے رہتے ہوئے چوری ہوئی۔ جج کے ہاں چوری! صبح صبح پتہ چلا کہ رات کو چوری ہوئی لیکن سب چیزیں جوں کی توں تھیں، پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ چرایا کیا گیا ہے۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ چور محض تفریحاً آئے تھے بعد میں پتہ چلا کہ میرے سارے کپ جو

انگیٹھی پر اور الماریوں میں رکھے تھے ' غائب ہیں ۔ خوب چمکیلے اور بڑے بڑے کپ تھے ۔ وہ کوٹھی ویسے تھی بھی سنسان سی جگہ میں ۔ ایک مرتبہ سارا کنبہ کسی دوسرے شہر میں گیا ہوا تھا ۔ میں اور شیطان سیکنڈ شو دیکھ کر دیر سے لوٹے ۔ کوٹھی میں بالکل اندھیرا تھا ۔ ہم دیوار کود کر چھوٹے راستے سے اندر چلے گئے ۔ اندھیرے میں آہٹ سنائی دی ' دبے پاؤں جا کر دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب تالا کھولنے کی کوشش فرما رہے تھے ۔ جب تالا کھل گیا تو شیطان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "یار بڑے افسوس کی بات ہے۔"

انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ہم نے انہیں کہیں نہ جانے دیا ۔ اندر لے آئے ۔ انہیں چائے پلائی گئی ' چاکلیٹ کھلائے گئے ۔ پھر کپوں کے متعلق پوچھا گیا ۔ انہوں نے قسم کھائی کہ انہوں نے نہیں چرائے ۔ اگر وہ چوری کرتے بھی تو کپ کبھی نہ چراتے ۔ سپورٹس مین معلوم ہوتے تھے ۔ ہم نے ہاتھ ملا کر انہیں رخصت کیا ۔ جج صاحب نے کوٹھی بدلی ' نئی کوٹھی میں بجلی کی فٹنگ بالکل غلط تھی ' پنکھا چلاؤ تو قمقمے جلتے تھے ' ٹیلیفون کرو تو پنکھا چلتا تھا ' ریڈیو بے حد ٹھنڈا رہتا ۔ ادھر سرد نعمت خانے میں موسیقی سنائی دیا کرتی ۔ پھر جو کوٹھی بدلی تو پڑوس میں دن رات قوالیاں ہوتیں ۔ بینڈ بجتے ' جلسے ہوتے ۔ غرضیکہ اسی طرح ہوتا رہا اب جو نیا مکان ملا تو ایسی جگہ کہ آس پاس بے شمار لڑکیاں رہتی تھیں۔ شام کو لڑکیاں سکول اور کالج سے واپس لوٹتیں ' خوب رونق ہوتی ۔ شیطان نے اس جگہ کا نام مینا بازار رکھا ۔ پروگرام یہ تھا کہ امتحان ختم ہوتے ہی ہم ہوسٹل چھوڑ کر جج صاحب کے ہاں آ جائیں گے ۔

جج صاحب بدستور ان خواتین کو دیکھ رہے تھے جو حقہ پی رہی تھیں ۔ رضیہ نے دوپٹہ اس انداز سے رکھا تھا کہ مجھے صرف اس کی ناک کا ذرا سا حصہ نظر آ رہا تھا ۔ میرے خیال میں وہ ان تمام ناکوں کے ذرا سے حصوں سے حسین تھا جو میں نے آج تک دیکھے تھے ۔ حکومت آپا مجھے بڑی بری طرح گھور رہی تھی ..... شیطان کا خیال تھا کہ حکومت آپا کو مجھ سے ایک حسرت آمیز نفرت تھی ۔

میں منّی کو کہانیاں سنا رہا تھا .... سنو منّی ...... ایک شخص اندھیری رات میں شیر کا شکار کھیلنے ایک بہت ڈراؤنے اور تاریک جنگل میں گیا ۔ شیر بولا ہرے .... اچھا ایک اور کہانی سنو ..... سنو ..... دو چیتے کے شکاری اور ایک چیتا ..... ایک چیتے کا شکاری اور ایک چیتا...... چیتا...... منّی باقاعدہ ڈر گئی ۔

چلتے وقت جج صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ ہمارا اگلا میچ دیکھنے ضرور آئیں گے ۔

ہمارے کلب کے کپتان گیدی صاحب تھے ۔ ان کا اصلی نام زیدی ' مہدی یا کچھ اسی قسم کا تھا ۔ ان کا قد بہت چھوٹا تھا ۔ اور بقول شیطان کے وہ سطح سمندر سے ساڑھے چار فیٹ بلند تھے ۔ ان کے ساتھ ہر وقت ان کے دو مشیر ہوتے اتفاق سے جو کافی دراز قد تھے ۔ گیدی صاحب ان کے درمیان میں چلتے ' شیطان نے ان تینوں کا نام ایک سو ایک "۱۰۱" رکھا ہوا تھا ۔ ان کے قدوں کے مطابق!

ٹیم کی انتخابی کمیٹی بھی تھی جو ایک ممبر پر مشتمل تھی ۔ گیدی صاحب پر! بڈی بھی ہمارے کلب کا ممبر تھا ۔ امریکہ وہ بیس بال کھیلتا رہا تھا۔ کرکٹ بھی وہ بیس بال کی طرح کھیلتا تھا ۔ ہمارے کلب کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہم لگاتار تین میچ جیت کر فائنل کھیلنے والے تھے ۔

سہ پہر کو ٹیم پریکٹس کے لیے آئی ۔ گیدی صاحب میچ کے لیے بیٹنگ کی ترتیب دینے لگے ۔ شروع میں وہ اور مقصود گھوڑا! ساتویں پر بڈی آٹھویں پر میں اور نویں پر شیطان ۔ حساب لگانے کے بعد جب شیطان کو معلوم ہوا کہ وہ گیارہویں کھلاڑی ہیں تو مچل گئے ۔ گیدی صاحب سے بولے ۔ " مجھے گیارہواں کیوں بھیجا جا رہا ہے ؟ "

" اس لیے کہ کوئی بارہواں نہیں ہوتا ۔ " جواب ملا ۔ "کپتان ہمیشہ صحیح اندازہ لگا سکتا ہے ۔ اس کا نظریہ ہمیشہ درست ہوتا ہے ۔ "

شیطان بولے ۔ " ہر شخص کے دو نظریئے ہوتے ہیں ۔ اس کا ذاتی نظریہ ...... اور غلط نظریہ ! "

مصیبت یہ تھی کہ شیطان نہ بالر تھے نہ بیٹسمین ' نہ وکٹ کیپر اور ان کا دعویٰ تھا کہ ایک اعلیٰ درجے کی ٹیم میں پانچ بہترین بیٹسمین ہونے چاہئیں ' چار بہترین بالر ' ایک اچھا وکٹ کیپر اور ایک روفی ۔ ویسے تقریباً ہر میچ میں شیطان کا اسکور صفر ہوتا ۔

ہر روز جب مشرق سے سورج نکلتا ہے تو کلیاں کھل کر پھول بن جاتی ہیں ۔ تتلیاں جاگ اٹھتی ہیں ' پرندے چہچہانے لگتے ہیں ۔ ہر روز

سورج ڈوبتے وقت آسمان گلابی ہو جاتا ہے چاندی رات میں ایک عجیب سا فسوں آسمان سے زمین تک چھا جاتا ہے۔ لیکن حکومت آپا کو ان باتوں کا علم تک نہ تھا۔

جب ہم جج صاحب کی کوٹھی میں پہنچے تو عجب سہانا سماں تھا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں ٹہنیوں اور پتوں پر رقصاں تھیں۔ باغیچے میں ایک فوارہ چل رہا تھا۔ گلاب کے سرخ پھولوں نے جیسے آگ سی لگا رکھی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ بیکار تھا۔ کیونکہ نزدیک ہی حکومت آپا بیٹھی تھیں۔

حکومت آپا مجھ سے خفا اس لیے ہوئیں کہ جب وہ موٹی ہو گئی تھیں تو میں نے ان کو دبلا ہونے کا مناسب نسخہ نہیں بتایا۔ میں نے فاقہ کشی تجویز کی۔ وہ بولیں ..... "نہیں کوئی کھانے کی ایسی تجویز بتاؤ جس سے دبلی ہو جاؤں۔"

بڑی مصیبتوں کے بعد میں نے ان کا لنچ چھڑایا۔ ایک روز جا کر دیکھتا ہوں تو وہ چائے پر پلاؤ کھا رہی تھیں ..... اور میں نے ان کا لنچ پھر شروع کرا دیا۔

شیطان کا خیال تھا کہ وہ صبح شام کلیاں گایا کرتی ہیں اور باتیں کرتے وقت وہ کہتی کچھ ہیں' ان کی نگاہیں کہیں اور ہوتی ہیں' دھیان کسی اور طرف اور باتوں کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔

ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائیں ..... اور سورج غروب ہو گیا۔

کھانے کے بعد مجھے یونہی خیال آیا کہ شیطان اور حکومت آپا دیر سے غائب ہیں۔ تلاش کرنے پر دیکھتا ہوں کہ دونوں فوارے کے پاس بیٹھے ہیں اور رومان انگیز گفتگو ہو رہی تھی۔ میں چھپ کر سننے لگا۔

شیطان بولے۔ "سچ سچ تم بہت پیاری معلوم ہو رہی ہو۔"

حکومت آپا بولیں "سچ سچ میرے پاس اس وقت روپے نہیں ہیں ورنہ ضرور قرض دے دیتی۔"

شیطان بولے "یقیناً" ان چند مہینوں میں تمہاری رنگت نکھر آئی ہے۔ جب تم جون میں آئیں تو تمہاری جون بدلی ہوئی تھی۔"

"یقیناً" میرے پاس روپے نہیں ہیں۔"

روپے کون مانگتا ہے تم سے ..... بھلا ایسی رومان پرور فضا میں جہاں باغ کا ایک تنہا گوشہ ہو' فوارہ چل رہا ہو' چاندنی چھٹکی ہوئی ہو اور تم سامنے ہو' وہاں روپوؤں کا کیسے خیال آ سکتا ہے۔ وہاں تو ایک معصوم سی آرزو دل میں کروٹ لینے لگتی ہے۔"

"سچ سچ؟" حکومت آپا شرما گئیں۔

"ہاں سچ سچ"

"بھلا اس وقت آپ کو کس چیز کی آرزو ہے۔"

"کلوروفارم کی" شیطان بولے "اور جانتی ہو حکومت کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟"

"کون ہے؟"

"آئینہ! اور کئی انسان آئینے کو بھی دھوکہ دے جاتے ہیں۔ آئینہ کچھ کہے' وہ ایک نہیں سنتے' ان میں سے ایک تم ہو!"

اب حکومت آپا کچھ بگڑنے لگیں۔ شیطان جلدی سے بولے "نہیں یہ بات نہیں ہے ..... یوں ہی منہ سے نکل گیا تھا۔"

پھر رومانی باتیں ہونے لگیں۔ حکومت آپا بولیں۔ "رومانی ادب میں تمہاری محبوب کتاب کونسی ہے؟"

"ڈکشنری!" شیطان نے جواب دیا۔

حکومت آپا شیطان کے چہرے کو غور دیکھتی ہیں پھر بولیں ..... "تمہاری ناک اتنی لمبی کیوں ہے؟"

شیطان نے ایک آہ بھری اور بولے۔ کیا بتاؤں ناک لمبی کیوں ہے! یہ فطرت کے راز ہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہارا ماتھا باہر کو کیوں نکلا ہوا

ہے۔ تمہارے کان مڑے ہوئے کیوں ہیں، تمہارے دانت خرگوش کی دانتوں کی طرح کیوں ہیں ...... حکومت تم ان ہستیوں میں سے ہو جن سے اگر وقت پوچھا جائے تو گھڑی بنانے کا طریقہ بتا دیں ...... تم ان صحرانوردوں کی طرح ہو جو آج یہاں ہیں ...... اور کل...... بھی یہیں ہیں۔ آج سے پانچ سال پہلے سب کہتے تھے کہ اس لڑکی کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور اب سب کہتے ہیں کہ اس لڑکی کا ماضی واقعی لاجواب ہو گا۔"

اب تو باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی اور مجھے بھی شامل ہونا پڑا۔ واپسی پر میں نے رضیہ کی بے رخی کا ذکر کیا۔ روٹھنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی بتایا کہ اسی لیے میں نے عینک سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔

شیطان بولے۔ "اگر میں تمہاری جگہ ہوں تو عینک کو ہر وقت سائیکل پر بٹھائے پھروں اور رضیہ کے گھر کے سامنے سے ہر روز دو مرتبہ گزرا کروں تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ لے۔ یہ روٹھنا روٹھنا سب درست ہو جائے۔ میری مانو تو آج سے تم بھی رضیہ سے روٹھ جاؤ اور عینک کے ساتھ خوب چہلیں کرو اور پھر قدرت کا تماشا دیکھو۔"

میں نے ان کو اپنا خواب سنایا۔ "کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ رضیہ نے آسمانی دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے جس میں سنہرے تارے ہیں اور روپہلی پلو جھلمگ جھلمگ کر رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور ہاتھ میں رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ ہے۔"

"تو جناب! آج کل خواب بھی ٹیکنی کلر میں دیکھتے ہیں۔ سب سے اچھا خواب جانتے ہو کیا ہے؟"

"کیا؟"

"یہی کہ کوئی خواب نہ آئے۔"

میں نے ان کو بتایا کہ "جب سے رضیہ روٹھی ہے میں تنہا سا رہتا ہوں اور میں محبت میں خوش نصیب ہرگز نہیں رہا۔"

وہ بولے۔ "محبت میں خوش نصیب صرف ایک قسم کے انسان رہتے ہیں ...... وہ ہیں کنوارے! ..... اور میاں تم اگر اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہو یا تنہائی سے ڈرتے ہو تو ہرگز شادی مت کرنا۔"

میں نے ایک رومان شروع کیا۔ وہ بولے۔ "محبت کی بہترین اور مختصر ترین کہانی میں تمہیں سناتا ہوں ..... سنو..... وہ بولا.... کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟.... وہ بولی نہیں .... اور اس کے بعد وہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔"

ہمارا میچ شروع ہوا۔ کچھ چھٹیاں تھیں اور کچھ مینا بازار کا قرب۔ ویسے بھی وہاں چاروں طرف لاتعداد ریٹائرڈ بزرگ رہتے تھے۔ وہ سب آئے۔ ساتھ بے شمار لڑکیاں آئیں۔ ہمارے کپتان نے حسب معمول ٹاس ہارا اور ہم فیلڈ کرنے چلے۔ لڑکیوں کی تعداد کا اندازہ ہمیں میدان میں پہنچ کر ہوا۔ جدھر نظر جاتی تھی رنگ برنگے ملبوسات دکھائی دیتے تھے۔

بڈی بولا۔ "بوائے او بوائے، آج مجھے امریکہ یاد آ رہا ہے۔"

گیدی صاحب نے چمکتی ہوئی نئی گیند میرے ہاتھ میں دی میں فیلڈ جمانے لگا۔ شیطان کا اصرار تھا کہ ان کو شامیانے کی طرف بھیج دیا جائے۔ غالباً اس لیے کہ وہاں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ تالیاں بجیں اور بیٹسمین شامیانے سے روانہ ہوئے۔ ایک صاحب بے حد موٹے تھے اور دوسرے بالکل ذرا سے تھے اور کم عمر بھی تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ کسی یار جنگ بہادر کے لڑکے ہیں۔ شیطان چونک کر بولے: "اچھا! اتنا کم عمر اور ابھی سے ایک یار جنگ بہادر کا لڑکا...... کمال ہے۔"

ان موٹے تازے حضرت کا نام قلندر صاحب تھا..... شاید قلندر بیگ ہو گا یا قلندر حسین! یہ نام ہمیں یوں معلوم ہوا کہ جب میری تیسری گیند ان کی توند سے چھو کر وکٹ کیپر کے برابر سے گزری تو یار جنگ بہادر کے صاحبزادے ادھر سے چلا کر بولے .... "قلندر صاحب وہیں ٹھہریے" دوسرے اوور میں ہمیں پتہ چلا کہ چھوٹے صاحب کا نام چنو میاں تھا۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی ہٹ لگائی۔ ادھر سے قلندر صاحب چلائے...... "چنو میاں وہیں ٹھہریے!"

دیر تک یہی ہوتا رہا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو وہیں ٹھہرنے کے لیے کہتے رہے۔ ایک گیند بڈی کے سامنے سے گذری لیکن اس نے

ہاتھ تک نہیں ہلایا.... معلوم ہوا کہ جناب لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ مفت کی ایک باؤنڈری ہو گئی۔ قلندر صاحب نے ایک گیند ہوا میں اٹھا دی۔ شیطان اسے بخوبی کیچ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے گیند کی طرف دیکھا تک نہیں۔ کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ سوائے بالر اور بیٹسمین کے ہر ایک رنگین لباسوں اور حسین چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب قلندر صاحب نے وکٹ کے سامنے ٹانگ اڑا دی اور میں نے چلا کر اپیل کی تو امپائر چونک پڑے..... جیسے جاگ کر بولے۔ "ایں؟ پھر آہستہ سے کہنے لگے۔ "بھئی معاف کرنا' میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔" یہ امپائر اچھے خاصے قبر رسیدہ بزرگ تھے' یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ہم ساری عمر بالنگ کرتے رہیں گے۔ اور قلندر صاحب چنو میاں ساری عمر کھیلتے رہیں گے۔

دفعتاً" قلندر صاحب نے ایک گیند آسمان میں چڑھا دی۔ گیند اونچی ہوتی گئی' حتیٰ کہ نگاہوں سے غائب ہو گئی ہم سب آسمان کی طرف یوں تک رہے تھے جیسے چاند دیکھ رہے ہوں۔ پھر ایک چھوٹا سا نکتہ نظر آیا اور ہم سب کیچ کرنے کے لیے بھاگے۔ وکٹ کیپر اور مقصود گھوڑا اتنے زور سے ٹکرائے کہ دونوں عارضی طور پر بے ہوش ہو گئے۔ ہم سب ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے' ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ پھر گیدی صاحب للکارے ...... "سب ہٹ جاؤ' یہ کیچ میں کروں گا۔" گیدی صاحب دونوں ہاتھ یوں پھیلائے کھڑے تھے جیسے بڑے خشوع سے دعا مانگ رہے ہوں۔ گیند بلند فضاؤں سے اترنی شروع ہوئی اور گیدی صاحب نے ہاتھ اور بھی اونچے پھیلا دیئے۔ گیند نیچے آئی۔ لیکن ان کے ہاتھوں میں نہیں...... شاید یہ گیند کی غلطی تھی...... وہ سیدھی ان کے ہیٹ پر لگی "ٹپ' سے آواز آئی..... گیند اچھلی۔ پھر "ٹپ" سے ہیٹ پر گری' پھر اچھلی' گری اور آہستہ سے ان کی گردن پر لڑھکتی ہوئی زمین کی طرف چل دی۔ پھر یکلخت وکٹ کیپر صاحب جو آنکھیں بند کیے بے ہوش پڑے تھے' چونکے اور گرتی ہوئی گیند کو دبوچ لیا۔

ادھر گیدی صاحب دھڑام سے گرے اور کچھ دیر کے لیے بیہوش ہو گئے۔ جب وہ واپس جا رہے تھے تو شیطان بولے۔ "قبلہ اب آپ کے بغیر یہ میدان خالی خالی سا معلوم ہو گا!" واقعی قلندر صاحب نہایت موٹے تھے۔

اب جو نئے صاحب آئے انہوں نے شیطان کو دیکھا اور ان سے لپٹ گئے۔ شیطان نے اب تک کوئی اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا۔

وہ بولے۔ "آپ مجھے پہچانتے نہیں' میں وہی بیزار اختر ہوں۔"

شیطان نے بغور دیکھا اور بولے...... "ممکن ہے کہ آپ وہی بیزار ہوں لیکن اختر وہ ہرگز نہیں ہیں جو پہلے تھے۔"

وہ بولے۔ "میں سچ مچ وہی ہوں۔ فقط ذرا بدل گیا ہوں۔ پہلے سے میرا قد چھوٹا ہو گیا ہے۔"

اب وہ دونوں ہیں کہ باتیں کر رہے ہیں اور ہم سب انتظار کر رہے ہیں۔ آخر امپائر نے ٹوکا۔ تب بیزار اختر صاحب نے کھیلنا شروع کیا۔ میری پہلی ہی گیند انہوں نے ہوا میں اٹھا دی۔ ایک صاحب کے پاس سے گزری تو انہوں نے دیکھا تک نہیں۔ جب میں نے ان کا نام پکارا تب چونک کر انہوں نے گیند اٹھائی اور ازراہ کرم میری طرف پھینک دی۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ جس کھلاڑی کی طرف گیند جاتی فوراً" اس کا نام لے کر اسے مطلع کیا جاتا۔

چنوں میاں نے گھوم کر ہٹ لگائی۔ آگے مقصود گھوڑا دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر مراقبے میں کھڑا تھا۔ "دھم" سے گیند اس کے پیٹ سے لگی۔ اس نے نعرہ لگا کر وہیں دبا لی۔ چنو میاں آؤٹ ہو گئے اور انہیں جاتے دیکھ کر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ شیطان دور سے بھاگے بھاگے آئے اور میرے کان میں بولے۔ "وہ جو دو لڑکیاں دیکھ رہے ہو...... وہ چنو میاں کی رشتہ دار معلوم ہوتی ہیں۔"

لنچ پر معلوم ہوا کہ شیطان درست کہتے تھے۔ چنو میاں ان دونوں لڑکیوں کو لے ہوئے۔ تعارف ہوا۔ ایک بوڑھے پروفیسر اپنی لڑکیوں سمیت آئے ہوئے تھے۔ ایک ہم جماعت مل گئی۔ رضیہ منہ پھیرے بیٹھی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں سے سوڈیڑھ سو لڑکیاں اور بھی آ جائیں تاکہ آج اس کے سامنے خوب چہلیں کی جائیں۔

شیطان بولے کہ "یہ ہجوم کافی بدمذاق معلوم ہوتا ہے کسی نے ہمارا آٹوگراف نہیں لیا۔"

لنچ کے بعد مجھے اور شیطان کو باؤنڈری پر بھیج دیا گیا وہاں ہم باتیں کرنے لگے۔ گیدی صاحب نے ناراض ہو کر ہمیں واپس بلا لیا اور

بیٹسمین کے بالکل قریب کھڑے ہو کر فیلڈ کرنے کو کہا۔ ایسی جگہ بہت سنجیدگی سے فیلڈ کرنا پڑتا ہے۔ ہم بہت گھبرائے' یہی دعا مانگ رہے تھے کہ کہیں کوئی کیچ نہ آ جائے۔ تھوڑی دیر میں ہم نے باتیں شروع کر دیں۔

میں نے کچھ کہا۔ شیطان بولے۔ "ملاؤ ہاتھ اسی بات پر" انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا ...... شوں سے ایک چیز آئی اور شپ سے شیطان کی ہتھیلی سے چپک گئی۔ لاحول ولا قوۃ! یہ تو گیند تھی۔ شیطان نے ایک نہایت لاجواب کیچ کیا تھا۔ اب ہم کھیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ پانچ وکٹوں پر سکور ایک سو اٹھانوے تھا اور وہ بیزار اختر صاحب بیاسی ناٹ آؤٹ تھے۔ ارے! یہ تو سینچری پر تلا ہوا ہے۔

چائے کے بعد گیدی صاحب نے نئی گیند لی' مجھے بلایا گیا میں نے بڑی تیز گیندیں پھینکیں لیکن ان بیزار صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نئی گیند پر وہ اور بھی محتاط ہو گئے۔ ادھر وہ قبر رسیدہ امپائر صاحب جو دن بھر کھڑے رہ رہ کر تنگ آ چکے تھے' اپنے پرانے قصے سنا رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا تو یہ کیا کرتا تھا..... "جب میں چھوٹا تھا تو یہ بات یوں تھی" شیطان بولے..... "اچھا تو کیا آپ سچ مچ کبھی چھوٹے بھی تھے؟..... اور وہ ناراض ہو گئے۔ اسی خفگی میں انہوں نے میری اپیل پر نفی میں سرہلا دیا۔ شام کو سات وکٹوں پر سکور ۲۴۰ تھا اور بیزار صاحب ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔

ہم لوگ زندگی سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ایک بڈی غریب تھا جو سب کو ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی باتوں پر کوئی ہنستا ہی نہ تھا۔ سب یہی کہتے کہ بھئی یہ تو میں نے پہلے سن رکھا ہے۔ حالانکہ بڈی کے لطیفے ہمیشہ نئے ہوا کرتے تھے۔ جب ہم بڈی کی موٹر میں واپس جا رہے تھے تو شیطان بولے " بڈی ذرا آہستہ چلاؤ۔ تم موٹر ہمیشہ اس طرح چلاتے ہو جیسے کسی حادثے کی ریہرسل کر رہے ہو۔ "

اگلے روز صبح اخبار جو پڑھتے ہیں تو اس میں شیطان کی خوب تعریفیں تھیں۔ شیطان کے ایک کیچ کا ذکر نصف کالم میں تھا۔ بیزار صاحب کی خوب برائیاں کی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا تو شیطان بولے ..... "اخبار کا رپورٹر وہاں موجود تھا۔ یہ اس کی بے لاگ رائے ہے۔"

جج صاحب ملے' بولے ...... " اور کچھ بھی ہو جائے لیکن اس لڑکے کی سینچری نہیں ہونی چاہئے۔ وہ نہایت بری طرح کھیلا ہے۔ اگر وہ ایک اور رن بنا گیا تو مجھے سخت افسوس ہو گا۔ "

کھیل شروع ہوا۔ بیزار صاحب ہر ایک گیند روک رہے تھے۔ ہجوم خاموش تھا۔ سب ان کی سینچری کے منتظر تھے۔

شیطان کو ہر اوور کے بعد باؤنڈری سے میدان عبور کر کے دوسری طرف جانا پڑتا تھا۔ ایک اوور میں انہیں دیر سے یہ خیال آیا کہ انہیں دوسری طرف ہونا چاہئے۔ اور وہ غلط جگہ کھڑے ہیں۔ وہ سرپٹ بھاگے۔ بھاگتے بھاگتے انہوں نے ایک گیند دیکھی جو ان کے قریب سے گزرنے والی تھی۔ انہوں نے یونہی پکڑ لی ...... کیچ ہو گیا۔ شیطان نے پھر ایک حیرت انگیز کیچ کیا تھا۔ سب نے یہی سمجھا کہ شیطان جان بوجھ کر بھاگے تھے۔

سکور وہی تھا لیکن بیزار صاحب ابھی تک ننانوے ناٹ آؤٹ تھے اور ہم سب کے سینوں پر مونگ دل رہے تھے۔ یکایک ہجوم میں سے چلا کر کسی نے کہا کہ "اس سے بالنگ کراؤ جس نے ابھی کیچ کیا ہے۔"

گیدی صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی۔ شیطان کو بلا کر گیند اس کے ہاتھ میں دے دی۔ شیطان نے آج تک کسی میچ میں بالنگ نہیں کی تھی۔

گیدی صاحب نے پوچھا۔ " تم تیز گیند پھینکتے ہو یا آہستہ ؟"

شیطان بولے " مجھے کیا پتہ .... ؟ابھی پھینک کر دیکھوں گا!"

انہوں نے کئی دفعہ قدم گنے اور مختلف جگہوں پر نشان لگائے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ شیطان اور کرکٹ' دونوں کے لیے معجزہ تھا اور بقول شیطان کرکٹ کی تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھے جانے کے قابل تھا۔ شیطان نے رومال سے گیند صاف کی۔ ادھر ادھر دیکھا اور عجیب بے ڈھنگے طریق سے بھاگنا شروع کیا۔ وکٹوں کے پاس آ کر ان کے قدم غلط ہو گئے اور ایک نہایت ہی بے ہودہ گیند انہوں نے پھینکی۔ بیزار صاحب

نے آگے بڑھ کر بلا گھمایا اور ایک غدر سا مچ گیا۔ لوگ چلانے لگے ' لوگ چنگھاڑنے لگے ' لوگ پاگل ہو گئے ' میدان تالیوں سے گونج اٹھا......
بیزار صاحب کی سینچری پر نہیں بلکہ ان کے آؤٹ ہونے پر! شیطان کی اس بیہودہ سی گیند نے اس بیہودگی سے ان کی وکٹیں اڑائیں کہ وہ ننانوے پر آؤٹ ہو گئے۔

اس کے بعد تھوڑی دیر میں ہم نے باقی کھلاڑیوں کو بھی آؤٹ کر دیا۔ ساری ٹیم دو سو چالیس پر آؤٹ۔ شیطان کی خوب تعریفیں ہوئیں۔ شاباش دینے کے بہانے انھیں پیٹ کر رکھ دیا گیا۔

اب ہماری اننگز شروع ہوئی۔ میں اور عینک' رضیہ کے قریب بیٹھے اور وہ دزدیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ مخالف ٹیم فیلڈ کرنے چلی اور شیطان کیمرہ لے کر لپکے۔ ان کی تصویریں اتاریں۔ پھر گیدی اور مقصود گھوڑا بلے لے کر شامیانے سے چلے۔ شیطان نے باقاعدہ پوز کرا کر ان کی تصویریں اتاریں۔ ہم دیر تک شامیانے میں نہ بیٹھ سکے۔ ہمارے کھلاڑی یکے بعد دیگرے آؤٹ ہوتے چلے گئے۔ ہمارے مخالف بالرز بڑے خطرناک ثابت ہوئے۔ یا ہمارے بیٹسمین شامیانے کی طرف دیکھتے رہے...... جو کوئی کھیلنے جاتا وکٹوں کو ہاتھ لگا کر واپس آ جاتا۔ جب ساتویں وکٹ پر بڈی گیا تو سکور صرف ۳۶ تھا۔ بڈی کے منہ میں چیونگ گم تھی اور ہاتھوں میں بلا' جسے اس نے بیس بال کے اسٹائل پر پکڑ رکھا تھا۔ جاتے ہی اس نے ترچھے بلے سے ایک چوکا لگا دیا۔ اگلی گیند پر چوکا پھر چھکا پھر چوکا۔ غرضیکہ بالرز کے چھکے چھڑا دیئے۔ تیز اور آہستہ! ہر قسم کی بالنگ کو وہ ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہا تھا۔ ادھر بال چلتا ادھر بڈی چلتا۔ جہاں گیند زمین پر پڑتی وہیں ہٹ لگتی۔ لیکن بڈی زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اس کے آؤٹ ہوتے ہی بقیہ کھلاڑی بھی نکل گئے۔ ساری ٹیم ننانوے پر آؤٹ' اسی ننانوے پر جو بیزار اختر اکیلے کا اسکور تھا۔

جج صاحب نے فیصلہ صادر فرمایا کہ ہم ضرور ہاریں گے۔

لنچ پر گیدی صاحب بے حد بیزار تھے۔ میں اور عینک باہر گھاس پر بیٹھے چلغوزے کھا رہے تھے۔ وہ اپنی کسی سہیلی کا ذکر کر رہی تھی۔ اتنے میں شیطان آ گئے۔

بولے۔ " آپ اسی لڑکی کا ذکر تو نہیں کر رہی ہیں جو لباس بہت اچھا پہنتی ہے ؟ "

" ہاں! "

" اور جسے لباس لگتا بھی خوب ہے۔ "

" ہاں....! "

" اور جو گاتی بھی خوب ہے!

اور جو بلا کی حسین بھی ہے! "

" ہاں... کیا آپ اس سے ملے ہیں ؟ "

" نہیں اب تک تو نہیں ملا... لیکن ایسی کسی لڑکی سے کون نہ ملنا چاہے گا ؟ کیا آپ کبھی اس سے تعارف کرا دیں گی ؟ "

" ضرور......! "

شیطان اس لڑکی کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ ہم دونوں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شیطان بڑا اشتیاق ظاہر کر رہے تھے۔ دفعتاً" ہمیں ایک ایسی ہستی نظر آئی کہ شیطان کے دیوتا کوچ کر گئے۔ یہ مس ریچھ صاحبہ تھیں۔ ان پر شیطان چند ماہ پہلے بری طرح عاشق تھے۔ عاشق کیا بلکہ بالکل دیوانے بنے ہوئے تھے۔

ادھر مس موصوفہ میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر کوئی عاشق ہوتا ہوا اچھا لگے۔ یہ نام بھی ان کو خوب زیب دیتا تھا۔ وہ بے حد طویل و عریض تھیں اور کبھی بہت ناپسند۔ ویسے وہ بھی اسی سانچے کی بنی ہوئی تھیں۔ بس ذرا پرانا سا ماڈل تھا۔ وہ میک اپ خوب کرتی تھیں۔ بعض اوقات تو وہ اپنی بچی سے بھی قدرے حسین معلوم ہوتی تھیں۔

شیطان کا خوب مذاق اڑایا ...... " ریچھوں کے سائے میں جو پل کر جواں ہوئے ہیں ...... سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ ...... تو ہی ناداں چند ریچھوں پر قناعت کر گیا۔ مانا کہ تیرے ریچھ کے قابل نہیں ہوں میں ...... تو اپنا ریچھ دیکھ مرا انتظار دیکھ ......!! "

لیکن شیطان باز نہ آئے اور اس وقت تک عاشق رہے جب تک کہ ان کا موڈ عاشقانہ نہ رہا۔ پھر خود بخود راہ راست پر آگئے۔

مس ریچھ سے تعارف نہایت پر لطف رہا۔ ہوا یوں کہ میں اور شیطان چھٹیوں سے واپس آرہے تھے۔ ایک جنکشن پر گاڑی بدلی' دوسری گاڑی چلنے والی تھی۔ بھاگا دوڑی میں سامان رکھوا رہے تھے کہ ہجوم میں ایک سفید ریش ار ضعیف شخص دکھائی دیا جو ایک بچے کی انگلی پکڑے جا رہا تھا۔ شیطان کو ایسے موقعوں پر فوراً" ترس آجاتا ہے اور اپنی جیبیں ٹٹول کر بولے ...... " میرے پاس نوٹ ہیں' تمہارے پاس کچھ ٹوٹا ہو تو اس بچارے فقیر کو دے دو۔ " جلدی تھی' گھبراہٹ میں کچھ ملتا ہی نہ تھا۔ بڑی مشکل سے دو آنے ملے جلدی سے اس فقیر کو دیئے اور قلیوں کے پیچھے بھاگے۔ ڈبے میں کافی جگہ تھی۔ گاڑی چلنے سے ذرا دیر پہلے کسی کا بہت سا سامان آگیا۔ اس کے بعد ایک سالم کنبہ۔ اور اس کے بعد وہی فقیر اس بچے کے ساتھ آیا اور بیٹھ گیا۔ سارا کنبہ اسے " ابا جان " " ابا جان " کہہ کر پکار رہا تھا۔ لاحول ولاقوۃ ہم بڑے شرمندہ ہوئے۔ وہ بزرگ جو ہمیں اس وقت فقیر معلوم ہوتے تھے نہایت معزز قسم کے مالدار حضرت نکلے۔ کچھ تو ان کا لباس ضرورت سے زیادہ سادہ تھا اور کچھ ہم ضرورت سے زیادہ گھبرائے ہوئے تھے اور کچھ شیطان کو ضرورت سے زیادہ ترس آگیا۔ انہوں نے ہمارے دو آنے واپس کیے اور بڑے مزے کی باتیں ہوئیں اسی کنبے میں مس ریچھ بھی تھیں۔ بس شیطان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً" عاشق ہو گئے۔ واپسی پر بڑی کو بتایا گیا۔ وہ بولا:

" شاید یہ پانچویں لڑکی ہے جس پر تم اس سال عاشق ہوئے ہو۔ "

شیطان بولے۔ " نہیں چوتھی ہے .... ایک لڑکی پر میں دو مرتبہ عاشق ہوا تھا۔ "

وہ تو شیطان کی خوش قسمتی سے مس ریچھ نے ہمیں دیکھا نہیں ورنہ وہ سیدھی ہمارے طرف آتیں۔

ہم فیلڈ کرنے جا رہے تھے تو ننھی آئی۔ بولی۔ " آپ اس طرح گیند کیوں نہیں پھینکتے ؟ "

پوچھا۔ " کس طرح ؟ "

بولی۔ " اسی طرح جیسے اس روز پھینکی تھیں۔ "

پوچھا۔ " کس روز ؟ "

بولی۔ " میں بھول گئی' ٹھہریئے ابھی پوچھ کر بتاتی ہوں! "

اور وہ سیدھی رضیہ کے پاس گئی ...... اچھا تو یہ سلطانہ رضیہ صاحبہ ہمیں ہدایات دے رہی تھیں۔ ننھی نے مجھے ایک کاغذ کا پرزہ لا کر دیا۔ میں نے سر ہلا کر کہا " اچھا "

گیدی صاحب غلطی پر غلطی کر رہے تھے۔ انہوں نے شیطان سے بالنگ کرائی۔ شیطان کی خوب پٹائی ہوئی۔ پھر گیدی صاحب کو جو جوش آیا تو انہوں نے خود بالنگ شروع کی اور وہ گیندیں پھینکیں جن کے متعلق ان کا ذاتی خیال یہ تھا کہ " گگلی " ہیں لیکن تھیں وہ کچھ بھی نہیں...... سکور خوب بڑھتا جا رہا تھا۔

شیطان بار بار مجھ سے شرط لگاتے ...... " لگاتے ہو دس روپے' چنو میاں پچاس سے اوپر اسکور کریں گے۔ " میں انکار کرتا تو وہ فوراً" کہتے ...... " اچھا تو پھر لگاتے ہو دس روپے چنو میاں پچاس سے نیچے سکور کریں گے۔ " میں برابر انکار کرتا رہا۔ اس وقت میں بالکل کنگال تھا۔

چائے پر ان کے چار کھلاڑی آؤٹ ہوئے تھے اور اسکور ڈیڑھ سو تھا۔ ننھی نے پھر کاغذ کا ایک پرزہ لا کر دیا اور پھر میں نے سر ہلا کر کہا۔ " اچھا۔ "

وہ پھر آئی۔ بولی۔ " آپا کہہ رہی ہیں کہ آپ نے ہمارا کہنا نہیں مانا۔ "

میں نے کہا۔ " ابھی مانتا ہوں۔ "

میں نے گیدی صاحب کو بڑی مشکل سے منایا۔ نئے سرے سے فیلڈ جمائی۔ دن بھر کے کھیل سے وکٹ کافی خراب ہو چکی تھی۔ پہلی گیند
ی تیز بریک ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ خود بخود اتنے بریک ہو رہے تھے۔ گیدی صاحب بولے۔ "یہ اتنے تیز بریک تم نے کب سے شروع
ے؟"

میں نے کہا۔ "آج سے...... بلکہ ابھی سے!"

ایک ہٹ کو بڑی صاحب نے یوں دبوچ لیا جیسے کوئی اڑتے ہوئے بٹیر کو دبوچ لے...... یہ بیزار صاحب آؤٹ ہوئے تھے۔ جب بیزار
احب شامیانے کی طرف جا رہے تھے تو ان کے آؤٹ ہونے پر سب خوش تھے سوائے بیزار صاحب کے!

اگلی گیند کو کھلاڑی نے گلانس کیا اور بڑی نے زمین پر لیٹ کر گیند پکڑ لی۔ اب تو شور مچ گیا۔ دو گیندوں پر دو کھلاڑی آؤٹ' آوازیں آ
ی تھیں کہ ہیٹ ٹرک کرو ہیٹ ٹرک کرو۔ لوگ طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے ہیٹ ٹرک کا خیال ہی ایسا ہے کہ ماتھے پر پسینہ آ جاتا
۔ میں نے سوچا دو چار کچھ نہیں' دور سے بھاگا بھاگا آیا اور گیند پھینک دی۔ بالکل معمولی سی گیند تھی۔ کھلاڑی نے گھوم کر ہٹ لگائی۔ گیدی
احب نے اچھل کر ہوا میں کیچ کرنے کی کوشش کی ان کا ہاتھ پہنچا بھی' گیند ہاتھ سے چھوئی بھی لیکن کچھ نہ بنا۔ گیند کا رخ بدل گیا۔ وکٹ کیپر
نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرایا لیکن کیچ پھر بھی نہ ہوا۔ گیند پھر چھوئی اور رخ بدل گیا۔ اتنے میں بڑی بجلی کی طرح تڑپا اور گرتی گیند دبوچ لی۔ ہیٹ
ک ہو گیا...... سچ مچ کا ہیٹ ٹرک۔

گیدی صاحب نے اپنا چھوٹا سا ہیٹ میرے سر پر رکھ دیا۔ میں نے وہی ہیٹ بڑی کے سر پر رکھ دیا۔ میرے اگلے اوور میں بڑی نے لیگ
ی طرف ایک اور بہت اچھا کیچ کیا۔ ایک کیچ مقصود گھوڑے نے بہت دور باؤنڈری لائن پر کیا...... ایک سو اٹھاون پر ساری ٹیم آؤٹ۔ چھ
ٹیں میری تھیں۔ محض لیگ تھیوری کی بدولت...... اور یہ مشورہ رضیہ کا تھا۔ ہماری ٹیم اب چست ہو گئی تھی۔ سب کے چہروں پر امید جھلک
ہی تھی۔

مینک نے دوڑ کر میرا استقبال کیا۔ شیطان دوڑے دوڑے آئے اور اور میرے کان میں بولے...... "اگر تم مجھے کسی طرح ریچھ سے
موظ رکھ سکو تو کل کے اخبار میں تمہاری تعریفیں ہی تعریفیں ہوں گی۔"

پوچھا۔ "کیونکر؟"

بولے۔ "رپورٹر میرا دوست ہے اور سب کچھ میرے کمرے میں بیٹھ کر لکھتا ہے۔"

میں انہیں سیدھا حکومت آپا کے پاس چھوڑ آیا جہاں ریچھ تو کیا' جن بھوت بھی پھٹک نہیں سکتے۔ ننھی نے مجھے ایک چاکلیٹ دیا۔
چھا۔ "کس نے دیا ہے؟"

بولی۔ "آپا نے!"

پوچھا۔ "کون سی آپا نے؟"

بولی۔ "نہیں بتاتے۔"

میں نے سر ہلا کر کہا۔ "ہم نہیں لیتے!"

بولی۔ "ان آپا نے۔"

میں نے ایک پرزے پر "شکریہ" لکھ کر اسے دیا اور کہا۔ "یہ رضو کو دے دینا۔"

بولی۔ "آپ ہماری آپا کا ادب نہیں کرتے۔ صرف رضو کہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپا وا پا ہوں گی تمہاری' ہمارے لیے تو وہ صرف رضو ہیں۔"

بولی۔ "میں ابھی جا کر کہتی ہوں۔"

اب ہمیں جیتنے کے لیے تین سو رنز درکار تھے۔ برابر ہونے کے لیے دو سو ننانوے اور ہارنے کے لیے دو سو اٹھانوے یا اس سے کم۔ شام ہو چکی تھی۔ کل تیس پینتیس منٹ باقی تھے روشنی کم تھی۔ گیدی صاحب اور ان کے لمبے لمبے مشیروں نے کچھ کانفرنس سی کی اور بولے۔ "اگر شروع کے اچھے کھلاڑی اس وقت گئے تو کہیں آؤٹ نہ ہو جائیں۔ بہتر یہی ہو گا کہ اناڑیوں میں سے دو کو بھیج دیں۔ اگر وہ آؤٹ بھی ہو گئے تو کوئی نقصان نہ ہو گا۔ ممکن ہے کہ وقت پورا کر دیں۔"

بڈی کو اور مجھے چنا گیا۔ ہمیں بے شمار ہدایتیں دی گئیں۔ ہم دونوں میں سے آج تک کوئی شروع میں نہیں گیا تھا۔ بڈی کی خاص طور پر منتیں کی گئیں کہ بس گیند روک لینا اور ہٹ وغیرہ ابھی مت لگانا۔

جب ہم دونوں بلے لے کر میدان میں گئے تو چاروں طرف تالیاں بج رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی بہت مشہور کھلاڑی ہوں اور ابھی کچھ کا کچھ کر کے رکھ دوں گا۔

کھیل شروع ہوا۔ چمکتی ہوئی نئی گیند بجلی کی طرح آتی اور جھلک دکھا کر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی ہیں' دیکھتا رہ جاتا۔ ادھر بڈی بھی حیران کھڑا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بھی گیند نہ چھو سکا۔ تیسرے اوور میں گیند بلے کی ملاقات ہوئی گیند بالر کے ہاتھ سے نکلی۔ خیال آیا کہ کٹ کروں۔ ابھی پاؤں اٹھایا ہی تھا کہ گیند کا رخ بدل گیا' سوچا کہ ڈرائیو کروں مگر رخ پھر بدل گیا۔ میں ہک کی تیاری کر رہا تھا کہ پھر ایک دم روکنے میں مصلحت سمجھی۔اور گلانس خواہ مخواہ ہو گیا۔ گیند نہایت تیز تھی۔ باؤنڈری ہو گئی۔ اب کچھ ہمت بندھی' جہاں گیند زمین سے چھوتی اچھل کر اسے وہیں روک لیتا۔ میں بالکل کتاب کی نقل کر رہا تھا۔ سیدھے بلے سے جب گیند کو آئینہ دکھاتا تو نعرے لگتے ...... "شاباش...... بہت اچھے۔"

بڈی کو گیند روکنا مصیبت ہو گئی۔ ہر گیند پر وہ ہٹ لگانے کے لیے بلا اٹھاتا لیکن پھر کچھ سوچ کر صرف روکنے پر اکتفا کرتا۔ لیکن ایسے عجب طریقے سے روکتا جیسے بلے سے گیند کو زمین میں ٹھوک رہا ہو۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں گیند کی چمک دمک سب اتار رکھ دی۔

خدا خدا کر کے وقت ختم ہوا جب ہم تالیوں کے شور میں واپس لوٹے تو میں گیارہ ناٹ آؤٹ تھا اور بڈی پندرہ ناٹ آؤٹ!

رات کو میں نے شیطان سے تصویروں کے متعلق پوچھا کہ "فلم کب دھلواؤ گے؟"

بولے "کون سی فلم؟"

کہا۔ "آج جو تصویریں اتاری ہیں' وہ فلم!"

بولے۔ "کیمرہ تو خالی تھا' آج کل فلمیں ملتی کہاں ہیں؟"

پوچھا۔ "تو پھر تصویریں اتارنے میں کیا مسخراپن تھا؟"

بولے۔ "ویسے ہی ذرا لطف رہتا ہے۔ ہاتھ میں کیمرہ ہو تو انسان ذرا سمارٹ معلوم ہوتا ہے۔"

اگلے روز اخبارات میں میری خوب تعریفیں تھیں۔ لطف یہ ہے کہ بانگ کا اتنا ذکر نہ تھا جتنا بیٹنگ کا! یہ سب شیطان کی کرامات تھیں۔

اگلی صبح جج صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ بس گیندیں روکتے رہو' باہر جاتی ہوئی گیند کو مت چھوڑو اور زبردستی ہٹ مت لگاؤ' سکور خود بخود ہوتا رہے گا۔

کھیل شروع ہوا۔ ہم گیندیں روک رہے تھے۔ جو گیند سیدھی آتی اسے روک لیتے جو باہر جاتی اسے چھوڑ دیتے۔ تھوڑی دیر میں ہمیں پتہ چلا کہ رنز خود بخود ہو رہی ہیں۔ ہم دونوں نے اسکور سو تک پہنچا دیا۔ بڈی آہستہ آہستہ اپنی اصلیت پر آ رہا تھا اور پھر شپ سے کسی نے اس کا کیچ کر لیا۔ بیالیس رنز کر کے وہ آؤٹ ہو گیا۔ گیدی صاحب آئے لیکن بہت ڈرے ہوئے تھے۔ ایک معمولی سی گیند پر آؤٹ ہو گئے اور آؤٹ ہوتے ہی انہوں نے نعرہ لگایا ...... "بہت اچھی گیند تھی ...... کمال تھی۔" بالر کی تعریفیں کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ مقصود گھوڑا آیا۔ اس نے ذرا کھیل جما دیا۔ مجھے اب گیند فٹ بال جتنی دکھائی دے رہی تھی۔

ہم لنچ کے لیے گئے تو سورج بھی لنچ کے لیے چلا گیا۔ بادلوں میں جا چھپا۔ لنچ کے بعد ایک ہی اوور میں ہمارے دو کھلاڑی نکل گئے۔ دو سو پر نئی گیند آئی اور مجھے ایک مرتبہ پھر قیامت کا سامنا کرنا پڑا۔

میں آہستہ آہستہ تھکتا جا رہا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ بیٹنگ بہت مشکل چیز ہے۔ آج تک کبھی اتنی دیر وکٹوں پر ٹھہرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میری ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ کمر بری طرح دکھ رہی تھی۔ میرا اسکور ستر ناٹ آؤٹ تھا۔ میں نے آج تک کبھی اتنا اسکور نہیں کیا تھا۔ سب کہہ رہے تھے کہ سینچری کرو اور میرا بھاگنے کا بالکل جی نہ چاہتا تھا۔ چائے پر ہمارا اسکور ڈھائی سو تھا۔ شیطان اور عینک کی سہیلی باتیں کر رہے تھے۔ وہ بولی۔ "مجھے لیفٹ ہینڈرز زیادہ پسند ہیں۔ وہ کھیلتے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

شیطان بولے "میں آج بائیں ہاتھ سے کھیلوں گا اگرچہ میں نے بالنگ داہنے ہاتھ سے کی ہے اور پھر یہ کرکٹ تو ہے بھی میرے بائیں ہاتھ کا کھیل۔"

مجھے ایک طرف لے جا کر بولے۔ اس لڑکی نے مجھ میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ تم دیکھنا آج میں کیسا کھیلتا ہوں اور وہاں آج رضیہ دن بھر اداس رہی ہے۔ روٹھنا ووٹھنا سب ختم ہو چکا ہے۔ جب بلائے بے شک چلے جانا۔۔۔۔ اور...... مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت..... والا برتاؤ کرنا۔

چائے کے بعد پہلی گیند پر ایک وکٹ نکل گئی۔ اب ایک ایک گیند پر تالی بجتی تھی۔ اسکور کرو نہ کرو ہٹ لگاؤ نہ لگاؤ' چاہے روکتے رہو صاف چھوڑ دو' شور ضرور مچتا تھا۔

یکلخت ہجوم خاموش ہو گیا۔ چاروں طرف ناامیدی چھا گئی۔ اب آخری کھلاڑی آ رہا تھا...... شیطان اپنی عینک سنبھالے 'بلا گھماتے' ایک عجیب شان سے تشریف لا رہے تھے۔ آتے ہی انہوں نے لیفٹ ہینڈر کا اسٹائل بنایا۔ میں نے بڑی منتیں کیں کہ "آج داہنے ہاتھ ہی سے کھیلو' یہ بائیں ہاتھ کا شوق کبھی پھر پورا کر لینا۔"

بولے۔ "ہرگز نہیں...... تم دیکھنا تو سہی' اگر زندگی نے وفا کی تو اسکور پورا کر کے دکھاؤں گا۔ جب میں جیتنے کی ہٹ لگاؤں گا تو عینک کی سہیلی کا چہرہ فخر سے اونچا ہو جائے گا۔"

شیطان کے محبوب سٹروک دو ہیں.... لیگ بائی اور آف بائی.... کبھی گیند پیڈوں سے بچ کر بلے میں بھی لگ جاتی ہے اور جب بلے سے نکل جائے تو لازمی طور پر وکٹوں میں جاتی ہے۔ آؤٹ ہونے کے بعد شیطان ہمیشہ بلے کو اس انداز سے دیکھتے ہیں جیسے اس میں کہیں سوراخ تھا جس میں سے گیند نکل گئی۔

پہلی گیند شیطان کی ٹھوڑی کے نیچے سے نکل گئی دوسری گھٹنوں میں سے' تیسری ناک کو چھوتی ہوئی گئی' چوتھی کمر میں لگی۔ لیکن شیطان لیفٹ ہینڈ کا سٹائل بنائے کھڑے رہے۔

پہلے اوور کے بعد شیطان مجھ سے ملنے آئے۔ ہجوم نے سمجھا کہ کھیل کے سلسلے میں مشورہ لینے آئے ہوں گے۔ خوب تالیاں بجیں۔ شیطان بولے۔ "وہ دیکھو شامیانے کے اس کونے میں عینک کی سہیلی بیٹھی ہے۔"

میں نے بتایا کہ وہ تو کوئی اور ہے اور ساتھ ہی انہوں نے عینک کے شیشے صاف کیے اور بولے...... "تو ہجوم میں کہیں ہو گی۔ کاش کہ اس وقت ایک دوربین ہوتی اور یہ پوائنٹ پر جو کھلاڑی کھڑا ہے۔ اس کی مونچھیں مجھے آؤٹ کرائیں گی۔"

اگلے اوور کے بعد پھر مجھے ملے۔ بولے۔ "جانتے ہو یہ وکٹ کیپر عینک کی سہیلی کا کوئی عزیز ہے۔ بیچارے نے آج ایک بھی کیچ نہیں کیا۔ جی چاہتا ہے کہ اسے ایک کیچ کرا دوں۔" میں نے پھر ان کی منتیں کیں اور وہ بمشکل باز آئے۔

شیطان اتنی بری طرح کھیل رہے تھے کہ لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ شیطان اس وقت کرکٹ نہیں کھیل رہے تھے بلکہ گلی ڈنڈا' کبڈی' ہائی جمپ اور بہت سی چیزیں ملا کر تماشے کر رہے تھے۔

مخالف بالر بولا۔ "یہ بیٹنگ کیسی ہو رہی ہے؟"

"اور یہ بالنگ کیسی ہو رہی ہے؟" شیطان نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اچھل کر ایک آف بائی سکور کی، اب وہ وکٹوں کے چاروں طرف کھیل رہے تھے اور بائی پر بائی اسکور ہو رہی تھی۔ اسکور دو سو اسی ہو گیا میں پچانوے ناٹ آؤٹ تھا اور شیطان نے دس بائی اسکور کی تھیں۔ میں اس قدر تھک چکا تھا کہ مجھے نہ کسی سکور کا چاؤ تھا نہ کسی میچ کا۔ بس جی یہی چاہتا تھا کہ پیڈ وغیرہ اتار کر کہیں گھاس پر لیٹ جاؤں۔

ایک گیند پر بائی لگا کر شیطان نے مجھے بلایا۔ میں چلایا اتنے میں گیند واپس آگئی۔ وہ چلائے واپس جاؤ، میں بری طرح بھاگا۔ گیند تیز تھی اس لیے دوسری طرف نکل گئی۔ انہوں نے پھر بلایا۔ میں پھر گیا۔ گیند واپس آگئی پھر واپس بھاگا۔ ہم دونوں خوب بھاگے دوڑے لیکن اسکور کچھ نہ ہوا۔ اگلی گیند پر شیطان نے پھر یہی حرکت کی۔ اس دفعہ تو میں رن آؤٹ ہوتے ہوتے بچا۔

شیطان اور وکٹ کیپر خوب مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ شیطان نے اسے کھانے پر مدعو کیا۔ آخری اوور آیا اور میں نے دل کڑا کر کے ایک چوکا لگا دیا۔ اب ننانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ اگلی گیند کو میں نے گلانس کیا اور شیطان کو بلایا، وہ نہیں آئے۔ چوتھی گیند پر پھر بلایا وہ پھر وہیں کھڑے رہے۔ وقت ختم ہو گیا۔ اسکور دو سو چھیاسی تھا اور میں وہی ننانوے ناٹ آؤٹ!

شیطان بولے۔ "میاں یہ ننانوے کا پھیر بہت برا ہوتا ہے۔ یہ ہندسہ ہمارے لیے بہت منحوس ہے۔ کہیں کل تمہارے ساتھ ان کا بالر وہی سلوک نہ کرے جو میں نے بیزار صاحب کے ساتھ کیا تھا جب وہ ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ "یہ آخری اوور میں کیا حرکت کی تھی۔ میرے بلانے پر کیوں نہیں آئے؟"

بولے۔ "اس لیے کہ اب اس خاکسار کی دو آرزوئیں ہیں۔ پہلی یہ کہ تمہاری سنچری ہرگز نہ ہو ورنہ تم ہم اناڑیوں کے زمرے سے نکل کر اپنے آپ کو بیٹسمین سمجھنے لگو گے، دوسری یہ کہ جیتنے کی ہٹ میں لگانا چاہتا ہوں۔ میں نے عینک کی سیلی سے وعدہ کیا ہے۔"

رضیہ ملی۔ بولی۔ "ذرا سنیئے۔"

میں چلا گیا۔ ہم دونوں باہر گھاس پر بیٹھ گئے۔ وہ بولی۔ "اتنے دنوں سے میں پڑھائی میں مصروف رہی اور کچھ میرا جی اچھا نہیں تھا۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی اتنے دنوں بہت مصروف رہا کچھ امتحان کی تیاری اور کچھ یہ ٹورنامنٹ کا سلسلہ۔"

میں نے لیگ تھیوری کا ذکر کیا کہ اسے یہ خیال کیونکر آیا بولی...... "مجھے آپ کا ایک پہلا میچ یاد تھا جس میں آپ نے اسی طرح وکٹیں لی تھیں۔"

میں نے پوچھا...... "کل کیا پروگرام ہے؟"

بولی۔ "کل چھٹی ہے۔"

پوچھا۔ "کل میرے ساتھ چلو گی، ایک جگہ پکنک ہے۔"

بولی۔ "اجازت لینا ہوگی، امی سے اور حکومت آپا سے!"

کہا۔ "عینک کی سیلی کا بہانہ کر دینا...... آج کل تم دونوں کافی دیر اکٹھی رہی ہو۔"

بولی۔ "کوشش کروں گی۔"

کہا۔ "کوشش ووشش نہیں...... وعدہ کرو۔"

شرما شرما کر بولی۔ "اچھا!"

میں شیطان کے ہوسٹل گیا۔ وہاں وہ وکٹ کیپر صاحب موجود تھے۔ کئی مرتبہ ننانوے ناٹ آؤٹ کا ذکر آیا۔ جب میں واپس آ رہا تھا تو مجھے ہر دیوار پر جلی الفاظ میں ننانوے ناٹ آؤٹ لکھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے ہوسٹل پہنچا تو بہت سے لڑکے ملے۔ سب نے یہی بار بار دہرایا۔ رات کو ٹائم پیس کی ٹک ٹک میں مجھے ننانوے ناٹ آؤٹ، ننانوے ناٹ آؤٹ سنائی دیتا رہا۔ رات بھر میرے کانوں میں کوئی چیخ چیخ کر کہتا رہا کہ

ننانوے ناٹ آؤٹ ننانوے ناٹ آؤٹ!

اگلے روز بہت زیادہ ہجوم تھا۔ میچ بے حد دلچسپ ہو گیا۔ مینا بازار سالم کا سالم وہاں موجود تھا۔ تالیوں اور نعروں کے شور میں جب ہم بلے لے کر نکلے تو میرا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

شیطان کی باری تھی۔ مخالف کپتان نے اپنے ایک فاسٹ بالر کو بلا لیا۔ اس کی پہلی گیند شیطان اور وکٹ کیپر دونوں کے اوپر سے گزر گئی.... بائی کی چار رنز ہو گئیں۔ اگلی گیند پر پھر یہی ہوا۔ چار رنز اور ہو گئیں۔ انہوں نے فالتو فیلڈ لے لی۔ بقیہ گیندیں بھی شیطان اور وکٹ کیپر کے اوپر سے گزریں لیکن مزید سکور نہ ہوا۔

دوسری طرف سے انہوں نے ایک نیا بالر لگایا جس کو میں اب تک نہیں کھیلا تھا۔ وہ اوور یونہی گزر گیا۔ اگلے اوور میں شیطان نے قلابازی سی لگائی اور ایک نہایت اعلیٰ درجے کا کٹ لگایا۔ اسکور دو سو ستانوے ہو گیا اور وہیں اٹک کر رہ گیا۔ چند اوور پھر ویسے ہی خشک گزر گئے۔ ہجوم کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر گیند کے ساتھ وہ شور و غل مچتا تھا کہ خدا کی پناہ۔

ایک گیند پر شیطان نے گھگے کا ہاتھ دکھایا اور گیند لیگ کی طرف نکل گئی۔ ہم نے دوڑ کر دو رنز بنا لیں۔ سکور دو سو ننانوے ہو گیا۔ ہم نے سکور برابر کر دیا تھا۔ اب ہمیں جیتنے کے لیے ایک رن کی ضرورت تھی اور مجھے سینچری کرنے کے لیے بھی ایک رن کی ضرورت تھی۔

اوور کی تین گیندیں ابھی باقی تھیں۔ ہر گیند پر شیطان بے تحاشا بلا گھمایا لیکن کچھ نہ ہوا۔ ادھر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا' جیسے میں عمر بھر سنچری نہیں کر سکتا۔ صدیاں گزر جائیں سینچری نہیں ہو گی اور یہ ننانوے ناٹ آؤٹ ایک تہمت ہے جو مجھ پر لگی ہوئی ہے۔ یہ ایک طوق ہے جو میرے گلے میں لٹک رہا ہے۔ یہ ایک سینگ ہے جو میرے سر پر اگ ہوا ہے اور میں اس کمبخت ننانوے ناٹ آؤٹ سے کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکوں گا۔

اب میری باری آئی' وہی نیا بالر گیند پھینک رہا تھا گز گز بھر کی بریک کراتا تھا۔ پہلی گیند روکی' تیسری' چوتھی.... میں کسی پر سکور نہ کر سکا۔ اب آخری گیند تھی۔ ادھر گیند آئی' ادھر میں نے آنکھیں بند کر کے بلا گھمایا۔ خدا جانے گیند بلے سے لگی' پیڈوں سے لگی' جوتوں سے لگی' لگی بھی یا نہیں.... بس گیند نکل گئی دو کھلاڑی پیچھے بھاگے۔ ادھر میں بھاگا' دوسری طرف پہنچا تو شیطان وہیں کھڑے تھے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا.... کھلاڑی گیند کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔ میں نے شیطان کو دوسری طرف جانے کو کہا مگر وہ وہیں کھڑے رہے۔ میں نے ان کو بازو سے پکڑ کر ہلایا لیکن وہ نہیں ہے۔ آخر میں ان کو زبردستی گھسیٹتا ہوا اپنی وکٹ تک لایا اور وہاں پہنچ کر تابڑ توڑ واپس بھاگا۔ بس رن آؤٹ ہوتے ہوتے بچا۔ ادھر پھر غدر مچ گیا۔ زلزلہ آ گیا زمین کی جگہ آسمان نے لے لی اور آسمان زمین کی جگہ آ گیا۔

بڈی بھاگا بھاگا آیا اور مجھے کندھے پر اٹھا کر شامیانہ کی طرف بھاگا۔ بار بار وہ یہی کہتا تھا۔ "بوائے او بوائے...... میں چیمپئن ہوں۔ میں نے ایک کپ جیتا ہے۔ اب میں کرکٹ کا کھلاڑی ہوں۔"

شامیانے میں پہنچ کر پتہ چلا کہ ہم جیت بھی گئے تھے اور ایک رن سکور بھی ہو گئی تھی۔ لیکن یہ امر بحث طلب تھا کہ اسے میں نے سکور کیا تھا یا محض بائی تھی۔ ایک امپائر کچھ کہتا تھا دوسرا کچھ۔ کوئی کہتا تھا۔ میں نے سینچری کی ہے' کوئی کہتا تھا کہ محض ننانوے ناٹ آؤٹ ہوں۔

ادھر شیطان اس وکٹ کیپر اور عینک کی اس سہیلی کے ساتھ ایسے غائب ہوئے جیسے کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔

جب میں اور رضیہ اکٹھے چل رہے تھے تو اس نے نہایت خوشنما کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں وہ سادہ سا ہار تھا جو میں نے اسے دیا تھا۔ وہ بولی۔ "یہ کوٹ ابا نے سالگرہ پر دیا تھا میں آج اسے پہلی مرتبہ پہن رہی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "اب تک کیوں نہیں پہنا؟"

بولی۔ "میں نے سوچا کہ کسی خاص دن پہنوں گی!"

میں نے اسے سائیکل پر بیٹھنے کو کہا۔ بولی۔ "کیریئر پر تو ٹوکری بندھی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "آگے بیٹھ جاؤ!"

بولی۔ "اور جو کسی نے دیکھ لیا تو؟"

کہا۔ "کسی نے دیکھ لیا تو میری خوش قسمتی پر رشک کرے گا۔"

وہ شرما کر آگے بیٹھ گئی۔ میرا چہرہ اس کے بالوں سے چھو رہا تھا۔ "یہ تم نے حکومت آپا کی خوشبو آج پھر چرائی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ نے بھی تو ان کا تیل لگا رکھا ہے!" وہ بولی۔

ہم دونوں درست تھے۔ جب ہم دو تین میل نکل آئے تو وہ پوچھنے لگی کہ پکنک کہاں ہو رہا ہے؟ میں نے بتایا کہ یہاں سے کچھ دور پرانے قلعے میں۔

اس نے پوچھا کہ پکنک میں اور کون کون ہوں گے۔ میں نے کہا کہ "صرف دو ہوں گے... میں اور تم!"

جب ہم دونوں چاندنی میں سائیکل پر واپس آ رہے تھے تو رضیہ بولی۔ "یہ میچ تو صرف آپ کا تھا' وہ ہیٹ ٹرک خوب تھا۔ گیند پھینکتے ہوئے آپ بہت اچھے لگ رہے تھے۔"

"وہ ہیٹ ٹرک تو تمہارا تھا۔"

"اور وہ ننانوے ناٹ آؤٹ؟"

"نہیں' سو ناٹ آؤٹ!" میں نے مچل کر کہا۔

"ہم تو ننانوے ناٹ آؤٹ ہی کہیں گے۔ بھلا کرکٹ میں کبھی ساتھیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر بھی سکور کیا جاتا ہے۔ یہ سب عینک کی اس سیلی کی برکت ہے۔"

"ذرا مسکراؤ!"

وہ مسکرانے لگی۔ "اب ذرا منہ بنا کر بھی دکھاؤ۔" میں نے منہ بنا کر دکھایا۔ "تم مسکراتی ہوئی کیسی اچھی معلوم ہوتی ہو.... تمہارے لیے بھی بہتر یہی ہو گا کہ ہر وقت مسکراتی رہا کرو.... آج آئینے میں دیکھنا۔"

"آپ آگے دیکھئے.... بالکل سیدھ میں سائیکل سیدھی چلایئے' کہیں ٹکر نہ ہو جائے۔"

رضیہ کو چھوڑ کر میں نے شیطان کے ہوسٹل کا رخ کیا۔ راستے میں وہی رپورٹر مل گیا۔ ...... بولا..... "مجھے بہت افسوس ہے کہ سینچری نہ کر سکے۔ میں نے اخبار میں آپ کے ننانوے ناٹ آؤٹ کی بڑی تعریف کی ہے۔"

"آپ سے یہ کس نے کہا؟"

"روفی صاحب نے!"

"ابھی چھپا تو نہیں؟"

"نہیں!"

میں نے اسے ساتھ لیا۔ راستے میں بڈی کو پکڑا۔ شیطان کے کمرے میں جا کر دیکھتے ہیں تو ایک بڑے پلنگ پر کچھ حضرات رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے ہیں۔ رضائیاں منگائی گئیں اور ہمیں بھی ساتھ بٹھا لیا گیا۔ میں بار بار شیطان کو اس آخری رن کے متعلق کہہ رہا تھا۔ میرا اصرار تھا کہ اسے میں نے سکور کیا ہے۔

شیطان بولے۔ "یار عجیب صبورنسمین ہو تم بھی' صرف ایک رن کے لیے اتنے پریشان ہو رہے ہو۔ اچھا تمہاری سینچری لکھوا دیں گے۔ بس..... چلو بھئی لکھ دو ان کی سینچری۔"

رپورٹر نے ہمارے سامنے بیٹھ کر سب کچھ درست کیا۔ بڈی کی سفارش پر میری تھوڑی سی تعریف بھی شامل کی گئی۔

اب سیکنڈ شو کا پروگرام بنا۔ شیطان نے وہ اوورکوٹ اتار دیا جس کو پہن کر سردی زیادہ لگتی تھی جو پہلے الٹوایا گیا تھا۔ پھر سیدھا کرایا گیا۔ سب نے رضائیاں اوڑھ لیں۔ چند حضرات ایک ایک رضائی میں دو دو ہو گئے۔ نوکر حقہ لے کر ساتھ ہو لیا۔

ذرا سی دیر میں ہم رنگ برنگی رضائیاں اوڑھے اتنی ٹھنڈ میں ٹھنڈی سڑک پر جا رہے تھے۔ تقسیم انعامات کا ذکر ہو رہا تھا۔ بڈی بار بار کہتا تھا.... "بوائے او بوائے' آج میں اپنے آپ کو ہیرو محسوس کر رہا ہوں۔ میں چیمپئن ہوں' میں نے کرکٹ کا ایک کپ جیتا ہے یاہو ہوؤ وؤ.....!"

اور جب ہم شہر کے بہترین سینما میں رضائیاں اوڑھے پکچر دیکھ رہے تھے اور حقے کے کش لگا رہے تھے تو ہمارے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ نہ ہمیں چیمپئن سمجھ رہے تھے' نہ ہیرو بلکہ غالباً" ایسی خواتین سمجھ رہے تھے جو حقہ پی رہی تھیں۔

محمد حسن عسکری

نام : اظہار الحق
قلمی نام : محمد حسن عسکری
پیدائش : ۵ نومبر ۱۹۱۹ء بہ مقام سراوہ ضلع میرٹھ (یو۔ پی) بھارت (۱)
وفات : ۲۸ جنوری ۱۹۷۸ء بہ مقام کراچی پاکستان
تعلیم : ایم۔ اے (انگریزی) الہ آباد یونی ورسٹی ۱۹۴۲ء

قرآن سے بسم اللہ موضع سراوہ ضلع میرٹھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مسلم پرائمری اسکول شکار پور (ضلع بلند شہر) سے حاصل کی۔ وہاں سے چار جماعتیں پاس کرنے کے بعد ڈی۔ اے انگلش مڈل اسکول سے مڈل پاس کیا اور ۱۹۳۶ء میں مسلم ہائی اسکول بلند شہر سے میٹرک۔ ۱۹۳۸ء میں میرٹھ کالج میرٹھ سے انٹر اور ۱۹۴۰ء میں الہ آباد سے بی۔ اے کرنے کے بعد وہیں سے ۱۹۴۲ء میں ایم۔ اے (انگریزی) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

عسکری صاحب کے والد محمد معین الحق ضلع بلند شہر میں "کورٹ آف وارڈز" کے ملازم تھے جہاں سے والئی شکار پور (بلند شہر) چودھری رگھو راج سنگھ کے ہاں بطور اکاؤنٹینٹ چلے گئے۔ قصبہ شکار پور بلند شہر سے تیرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ جہاں اس خاندان کا قیام ۱۹۴۵ء تک رہا۔

عسکری نے ۱۹۴۲ء تک کا زمانہ سراوہ (ضلع میرٹھ) شکار پور (ضلع بلند شہر) میرٹھ اور الہ آبادی میں گزارا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد عسکری دہلی منتقل ہو گئے اور پہلی ملازمت آل انڈیا ریڈیو دہلی میں بطور سکرپٹ رائٹر کی۔ شاہد احمد دہلوی کے ادبی مجلّہ "ساقی" دہلی کے ساتھ تعلق اسی زمانے میں قائم ہوا۔ کچھ مدت اینگلو عربک کالج دہلی میں انگریزی کے استاد رہے اور اس کے بعد میرٹھ کالج چلے گئے جہاں قیام پاکستان تک قیام رہا۔

۱۹۴۷ء میں لاہور منتقل ہو گئے اور سعادت حسن منٹو کے ساتھ مل کر مکتبہ جدید لاہور کے لئے دو ماہی ادبی جریدہ "اردو ادب" لاہور جاری کیا جس کے صرف دو شمارے شائع ہو سکے۔ ۱۹۵۰ء میں کراچی منتقل ہونے سے پہلے فری لانس ادیب کے طور پر ترجمہ نگاری کو ذریعہ روزگار بنایا۔ سید وقار عظیم کے بعد جنوری ۱۹۵۰ء تا جون ۱۹۵۰ء سرکاری ادبی مجلّہ "ماہ نو" کراچی کے مدیر رہے اور ۱۹۵۰ء میں ہی اسلامیہ کالج کراچی میں بطور استاد منتقل ہو گئے جہاں آخر تک رہے۔ انتہا درجہ کے قناعت پسند اور مردم بیزار واقع ہوئے تھے۔

اوائل عمری کی محبت ناکام ہوئی۔ عسکری صاحب نے کتابوں کبوتروں اور فوٹو گرافی میں غم غلط کیا۔ عمر بھر تجرد کی زندگی بسر کی۔ اس محبت کی یادگار بالزاک کے دو مطبوعہ تراجم ہیں جن پر عسکری کا نام نہیں۔ یہ کام آپ نے ۴۴-۱۹۴۳ء میں کیا تھا۔ آخری زمانے میں حد درجہ کے مذہبی ہو جانے کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو کے چاہنے والوں میں رہے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۸ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"کالج سے گھر تک" مطبوعہ: "ادبی دنیا" لاہور: اگست ۱۹۴۰ء

واضح رہے کہ یہ افسانہ ۹ نومبر ۱۹۳۹ء کو لکھ کر مکمل کیا گیا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "میری بہترین نظم" (مرتبہ) کتابستان الہ آباد: طبع اول: ۱۹۴۲ء

یہ کتاب دوسری بار ساقی بک ڈپو' دہلی نے ۱۹۴۴ء میں شائع کی۔

۲۔ "میرا بہترین افسانہ" (مرتبہ) ساقی بکڈپو' دہلی: طبع اول: ۱۹۴۳ء

اس کتاب میں مختلف افسانہ نگاروں کے اپنے پسندیدہ افسانوں کے علاوہ حالات زندگی اور نظریہ فن سے متعلق تحریر کردہ موا بھی شامل کیا گیا ہے۔

۳۔ "ریاست اور انقلاب" (از لینن کا ترجمہ) ہند کتاب گھر' دہلی: طبع اول: ۱۹۴۳ء

۴۔ "میں ادیب کیسے بنا؟" (از میکسم گورکی کا ترجمہ) الجدید' لاہور: طبع اول: ۱۹۴۳ء

۵۔ "جزیرے" (آٹھ افسانے) ساقی بک ڈپو' دہلی: محبوب المطابع: طبع اول: ۱۹۴۳ء

اس مجموعے میں ۱۔ "کالج سے گھر تک" ۲۔ "پھسلن" ۳۔ حرام جادی" ۴۔ "میلاد شریف" ۵۔ "چائے کی پیالی" ۶۔ "اندھیرے کے پیچھے" ۷۔ "ایک معمولی خط" ۸۔ "دو تین" افسانے شامل کتاب ہیں۔

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن آئینہ ادب' لاہور نے ۲۵۶ صفحات پر شائع کیا۔

۶۔ "قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے" (تین افسانے) ساقی بک ڈپو' دہلی: طبع اول: ۱۹۴۷ء

اس مجموعے میں ۱۔ "ذکر انور" ۲۔ "گٹھلیوں کے دام" ۳۔ "قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے" افسانے شامل کتاب ہیں

۷۔ "آخری سلام" (از کرسٹوفر اشروڈ کا ترجمہ) "جدید' لاہور: طبع اول: ۱۹۴۸ء

یہ ناول "Good by to Berlin" کا ترجمہ ہے۔

۸۔ "مادام بوواری" (از گستاؤ فلابیئر کا ترجمہ) مکتبہ جدید' لاہور: طبع اول: ۱۹۵۰ء

یہ ناول "Madame Bovary" کا ترجمہ ہے۔

۹۔ "انسان اور آدمی" (تنقید) مکتبہ جدید' لاہور: طبع اول: ۱۹۵۳ء

۱۰۔ "انتخاب طلسم ہوشربا" (مرتبہ) مکتبہ جدید' لاہور: طبع اول: ۱۹۵۳ء

۱۱۔ "انتخاب میر" ماہنامہ "ساقی"' دہلی (میر نمبر) طبع اول: ستمبر ۹۵۸

۱۲۔ "میں کیوں شرماؤں" (از شیلا کزنس کا ترجمہ) کتابستان' الہ آباد: طبع اول: ۱۹۵۹ء

اس ترجمہ شدہ ناول کا ایک ایڈیشن لاہور سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

۱۳۔ "ستارہ یا بادبان" (تنقید) مکتبہ سات رنگ' کراچی: طبع اول: ۱۹۶۳ء

۱۴۔ "Distribution of wealth in Islam" مکتبہ دارالعلوم' کراچی: طبع اول: ۱۹۶۳ء

(از مفتی محمد شفیع کا ترجمہ بہ اشتراک پروفیسر کرار حسین)

۱۵۔ "موبی ڈک" (از ہرمن میلول کا ترجمہ) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور: طبع اول: ۱۹۶۷ء

۱۶۔ "Answer to modernism" مکتبہ دارالعلوم، کراچی: طبع اول: ۱۹۷۶ء
(از مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ بہ اشتراک پروفیسر کرار حسین)

۱۷۔ "جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ" آپ حیات، راول پنڈی: طبع اول: ۱۹۷۹ء

۱۸۔ "سرخ و سیاہ" (از ستاں دال کا ترجمہ) مکتبہ جدید، لاہور: طبع اول: ۱۹۵۳ء

۱۹۔ "وقت کی راگنی" (تنقید) مکتبہ محراب، لاہور: طبع اول: ۱۹۷۹ء

۲۰۔ "جھلکیاں" (ادبی کالم) دو جلدیں، مکہ بکس، لاہور: طبع اول:

نظریہ فن:

"میں صرف آرٹ چاہتا ہوں، صرف و محض آرٹ ۔۔۔۔۔ خواہ اس میں معاشیات، سیاسیات یا دوسری فضولیات کی بھی آمیزش (آلائش) ہو، مگر سب سے پہلے اسے آرٹ ہونا چاہیے۔ میرا اعلان نامہ Gauguin کے الفاظ میں حاضر ہے:" آرٹ تفریح کی خاطر؟ کیوں نہیں؟ آرٹ، آرٹ کی خاطر؟ کیوں نہیں؟ جب تک وہ آرٹ ہے، اس سب سے کیا ہوتا ہے۔"

(بہ حوالہ: دیباچہ "میرا بہترین افسانہ")

○

(۱) "اردو افسانہ: تحقیق و تنقید" از ڈاکٹر انوار احمد میں مقام پیدائش بلند شہر اور تاریخ پیدائش ۱۹۲۱ء درج ہے۔ مجھے اصل مقام اور تاریخ پیدائش سے عسکری صاحب کے بھائی محمد حسن مثنی نے مطلع فرمایا۔ عسکری صاحب کا اصل نام اظہار الحق تھا جو سنہ پیدائش ۱۳۳۸ھ بہ مطابق ۱۹۱۹ء تاریخی نام بھی ہے۔

محمد حسن عسکری

چائے کی پیالی

حالانکہ وہ دیکھنا تو یہ چاہتی تھی کہ اس ایک سال کے دوران میں کون کونسی نئی دکانیں کھلی ہیں اور کون کون سے پرانے چہرے ابھی تک نظر آتے ہیں' وہ گورا گورا سنار کا لڑکا اب بھی دکان پر بیٹھا ہوا اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے یا نہیں' سنگر کے ایجنٹ کے یہاں وہ ننھی سی سینے کی مشین ابھی تک سامنے رکھی ہے یا بک گئی۔ مگر جب تانگے والے نے شہر سے باہر باہر جانے والی سڑک پر تانگہ موڑا تو اس نے کوئی احتجاج نہ کیا بلکہ اپنی نگاہیں گھوڑے کی طرف پھیر لیں۔ وہ گزرتے ہوئے مکانوں پر دوسری نظر ڈال کر انہیں اتنی اہمیت ہی کیوں دے وہ اس زبردست تحریص کا اتنی کامیابی سے مقابلہ کر سکنے پر خوش تھی اور خود کو بڑا ہلکا اور سبک محسوس کر رہی تھی جیسے وہ کسی آزمائش سے اپنے آپ کو صحیح و سالم نکال لائی ہو۔ اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا' اور سیٹ پر خوب کھل کر بیٹھ گئی۔ دوڑتی ہوئی لکیریں تانگے کے نیچے سے نکلی چلی جا رہی تھیں---- ہیچ مقدار اور ناچیز' بلکہ مضحکہ خیز لکیریں---- اور وہ بلندی پر بیٹھی ان کی سراسیمگی سے لطف اٹھا رہی تھی۔ اگر وہ بازار کے راستے سے جاتی تو گھوڑا گن گن کر قدم رکھتا' اور وہ کسی نہ کسی دکان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔ اتنی بات تو ضرور تھی کہ دکاندار اسے دیکھ کر چونک سے پڑتے' ان کی نگاہیں دور تک اس کا پیچھا کرتیں' اور وہ سوچتے: "اوہو' اب یہ کتنی شاندار ہو گئی ہے' اس کے بال کیسے چمکیلے ہیں' اور کپڑے کتنے عمدہ ہیں!" مگر ان کے دل میں تحیر اور تجسس کبھی نہ پیدا ہوتا' اور نہ ان کی آنکھوں کی چمک یہ پوچھتی: "کون ہے بھئی یہ؟ کہیں باہر سے آئی معلوم ہوتی ہے۔" اس کے برخلاف ان کا انداز تو سرپرستانہ ہوتا' اور ان کے خیالات کچھ اس قسم کے ہوتے: "بھئی ہماری اس لڑکی نے تو خوب رنگ روپ نکالا ہے! شاباش' شاباش!" جیسے اس کے رنگ روپ نکالنے میں ان کی کوششوں کو بھی دخل ہو' اور وہ اس سے زیادہ اپنے آپ کو ایسی پر تجمل چیز کے حصول پر مبارکباد دے رہے ہوں۔ ان کی ہلکی زیرلب مسکراہٹ سے معلوم ہوتا کہ وہ یہ پوچھنے والے ہیں: "کہو' اچھی تو رہیں' بہت دن میں دکھائی دی ہو۔" پھر جیسے انہیں یہ توقع ہو کہ وہ ان کی طرف شناسا نظروں سے دیکھ ہی تو لے گی۔ سڑک کے گڑھے تک یہ پروا نہ کرتے کہ اب وہ یہاں کے "مشن گرلز اسکول" میں نہیں پڑھتی۔ جس پر دھندلے اردو حرفوں میں "لڑکیوں کا مدرسہ" لکھا رہتا ہے' بلکہ ایلی گڑھ کے "کرسچین گرلز انسٹی ٹیوٹ" کی طالب علم ہے۔ اور نہ وہ اس پر خفیف ہوتے کہ وہ جھٹکے دے دے کر اسے ہلا دے ڈال رہے ہیں۔ وہ تو بس زمین پر پڑے پڑے گستاخانہ کہتے رہتے' "ارے' اب تم سے کیا وہ' تم کوئی غیر تھوڑی ہو۔ مہینوں تم ادھر سے اسکول آتے جاتے گزرتی رہی ہو۔ نہ جانے کتنی بار تمہارے ٹھوکریں لگی ہیں اور ایک دفعہ تو شاید تمہارے پیر میں موچ بھی آ گئی تھی۔" بس بالکل اس بسکٹ بنانے والے کی طرح جو اسے دیکھ کر اپنے کالے ہاتھوں اور چہرے سمیت کھڑا ہو جاتا اور کہتا۔ "اوہ' یہ تو وہی ہے عیسائی کی۔" اور دکانوں کے چھجوں اور پردوں کے سائے تو دونوں طرف سے اسے گھیر لیتے' کھسکتے' رینگتے' گھسٹتے' اس کے پیچھے چلے آتے' اس کے قدموں سے لپٹے جاتے' اس کے جسم سے کہیں نہ کہیں چپک جانے کی کوشش کرتے بس کسی کے لہجے میں' بھینچے ہوئے گلے سے کہتے جیسے دم توڑ رہے ہوں: "بس ایک لمحہ ٹھہر جاؤ.... بس ایک نظر.... اپنے پرانے سایوں کی طرف" اور ان کی یہ عاجزی اور منت سماجت بیکار نہ جاتی۔

اس کے ڈھیلے پڑتے ہی وہ اس کے دل میں گھس آتے اور سینے میں ٹانگیں پھیلا کر سو جاتے' یہاں تک کہ اس کا سر ڈھلک جاتا۔ سانس باکا مگر بھاری پتھر ہو جاتا' اور اس پر کسلمندی طاری ہو جاتی' جس میں بے چینی بھی شامل ہوتی۔ لیکن تانگے والے کی صرف ایک اضطراری حرکت

نے اسے ان تمام تپتی ہوئی جیجیاتی الجھنوں اور جھنجھٹوں سے بچا لیا تھا۔ اب وہ کتنی آزاد اور ہلکی پھلکی تھی' اس کی شخصیت پگھل کر دوسری چیزوں میں نہیں مل جا رہی تھی۔ وہ اپنا آپ تھی' صرف اور محض۔ مس ڈولی روبنس۔۔۔۔ بغیر کسی جمع تفریق کے۔ گلابی فراک' سفید دوپٹہ اور اونچی ایڑی کا کالا جوتا پہنے ہوئے' سفید چکنی پنڈلیاں تانگے پر مضبوطی سے جمی ہوئی۔ کمنی تکئے پر' سنہرے بندے دونوں طرف جھول جھول کر چمکتے ہوئے' احتیاط سے بنے ہوئے کالے بال اور پاؤڈر کی خوشبو۔ اگر کوئی اسے "ڈولی" کہہ کر پکار لیتا تو وہ تانگے پر پیر مار کر کہتی۔ کیا فرمایا جناب نے؟ ڈولی! اگر معاف کیجئے گا میں تو مس روبنسن ہوں' کریچن گرلز انسٹی ٹیوٹ ایلی نگر کی ساتویں کلاس کی طالب علم اور میں موجود تو ہوں آپ کے سامنے دیکھ لیجئے' بھلا میں ڈولی ہو سکتی ہوں" اگر وہ محض مس روبنس بننا چاہتی تھی تو یہاں بھی کوئی سایہ' کوئی سیڑھی' کوئی دہلیز' کوئی گزھا ایسا نہ تھا جو خواہ مخواہ ضد کئے چلا جاتا: "مگر ٹھہو تو۔ ہم تمہیں مدتوں ڈولی کے نام سے جانتے رہے ہیں۔" شہر کے باہر جانے والی سڑک کی انفرادیت پسند کوٹھیاں اپنے آپ ہی بڑی خوددار' پر تمکنت اور بے نیاز واقع ہوئی تھیں' وہ باہر کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ اگر وہ اس پر بڑی مہربان ہوتیں تو ذرا سا مسکرا کر کہہ دیتیں "اچھا تو آپ کا نام مس روبنسن ہے! جی' بہت خوب۔" ان کوٹھیوں کے مطالبہ سے تو وہ یوں آزاد ہو گئی۔ مگر دوپہر کا سورج تو عملی طور سے اس کی مدد کر رہا تھا ایک سخت گیر آقا کی طرح اس نے اپنی نگاہ کرم سے سارے سایوں کو گھیر گھیر کر سامنے سے بھگا دیا تھا' اور وہ سہم سہم کر دیواروں سے لپٹے جا رہے تھے۔ تیز دھوپ نے عمارتوں کو ایسی آنچ دی تھی کہ ان کا رنگ ونگ سب اڑ گیا تھا اور ان کے دل سے خود نمائی کے ولولے نکل چکے تھے۔ اب تو وہ جلی بھنی کھڑی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ "چاہے دیکھو' چاہے نہ دیکھو۔ جہنم میں جاؤ! ان کی چڑچڑاہٹ اور کوستے بھی کتنے مضحکہ تھے۔ تم روٹھے ہم چھوٹے! تانگے کے تختے پر اس کے پیر کا دباؤ اسے برابر یاد دلائے جا رہا تھا کہ اسے ان گردو پیش کی چیزوں پر حاوی ہونے کا حق حاصل ہے کیونکہ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ مس روبنس ہے جس کے بازو گول اور گداز ہیں اور آستینوں سے باہر نکلے ہوئے' اور پھر یہ بھی کچھ کم نہیں کہ وہ ایلی نگر سے آ رہی ہے' جہاں شیشے کی طرح جھلکتی ہوئی کوٹھیاں' شاندار اسٹیشن اور فرح ناک کمپنی باغ۔ اگر وہ یہاں کی عمارتوں کی طرف دیکھ رہی ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ وہ اس کے لئے جاذب نظر ہیں۔ اب کیا وہ آنکھیں بند کر لے۔ اگر وہ رشک و حسد سے چٹکی جا رہی ہو تو خیر کر بھی لے۔

اب تو وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے جادو سے بڑی صفائی کے ساتھ بچاتی آئی تھی۔ مگر جب وہ اڈے کے قریب کی منڈی میں پہنچی تو اسے اپنی محبوب شخصیت کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ یہاں کے تربوزوں کے ڈھیروں' اناج کی گاڑیوں' اکوں گھاس والیوں' بھوری مونچھوں والے کسانوں' بکڑی کی جلیبیوں پر بھنکتے ہوئے تتیوں اور لوہے کی دوکانوں کی دوسرے شور و غل سے اوپر سنائی دینے والی ٹھناٹھن کے درمیان "مس روبنسن" ایک بے معنی سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ عجیب یا مضحکہ خیز نہیں۔۔۔۔۔۔ محض مہمل اور ناقابل توجہ جیسے مسز توبوز یا میڈم گاڑی۔ یہاں تو وہ محض ایک تانگے میں ایک لڑکی تھی۔۔۔۔ یا رعایتاً "ایک عیسائی لڑکی۔ بس جیسے اکے میں دو مرد' چار عورتیں' پانچ بچے' یا گاڑی میں لگا ہوا پہیہ۔ یا ڈھیر میں ایک تربوز۔ ہر چیز کی ہیئت معین تھی' واضح' روشن' قطعی' پوری طرح اپنی لکیروں کے درمیان۔۔۔۔۔ نہ کہیں سے رنگ بہا ہوا' نہ کہیں دھندلا۔ ہر چیز کی اپنی انفرادیت تھی۔۔۔ علیحدہ' ٹھوس' مستقل' جری' اپنی جگہ پر مطمئن' مرنجان مرنج' نہ تو وہ دوسروں کی شخصیت کا ایک حصہ دبا لینا چاہتی تھیں اور نہ گڑگڑا کر التجائیں کرتی تھیں کہ انہیں کوئی اپنے اندر مدغم کر لے۔ بڑا غضب تو یہ تھا کہ وہ عداوت پر بھی آمادہ نہ تھیں۔ ڈھیر میں دبا ہوا تربوز بھی چین سے نیچے پڑا تھا' اور اسے اوپر والے تربوز سے کوئی شکایت نہ تھی اور پھر ان سب نے ایک دوسرے کی فردیت کا احترام کرنے کا کچھ ایسا سمجھوتہ کر لیا تھا' اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہنے کی ایسی کوشش کر رہی تھیں کہ یہاں آتے ہی ہر چیز اپنا اختصاص اور ندرت کھو دیتی تھی۔ ایلی نگر کی مس روبنسن بھی۔ مس روبنسن کے لئے بھی اپنی شخصیت کو منوانے کی کوشش کرنا فضول اور غیر اہم بن گیا تھا۔ نمک کی کان میں آ کر نمک بن جانے کے خلاف مدافعت نہیں ہو سکتی تھی۔ ظاہر میں تو وہ یہاں کے بے ڈھنگے پن پر ہنس رہی تھی' مگر مشکل تو یہی تھی کہ وہ اس سب سے بیزار نہیں تھی۔ اس پر تو ایک مطمئن تعطل کی کیفیت طاری تھی۔

یوں تو منڈی اور اڈے کا تھوڑا سا درمیانی فاصلہ بھی کوئی بہت روح افزا نہ تھا' اپنا یہی ایک آدھ پان اور سوڈا واٹر کی دکان تھی' یا پھر

درختوں کے نیچے نائی کے لڑکے اپنے بکسوں سے ٹیک لگائے، ایک دوسرے سے بیٹھے گپ لڑا رہے تھے مگر پھر بھی اسے ایک قسم کی رہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا حسیاتی جمود ختم ہو گیا تھا اور اب وہ کم سے کم اپنا رد عمل تو معین کر سکتی تھی۔ اس کا پیر ایک مرتبہ پھر تختے کو اس طرح دبا رہا تھا۔ تکیہ پھر اس کی کمنی کے نیچے واپس آ گیا تھا اور خود تانگہ بھی پہلے سے اونچا تھا۔ وہ یہ بتا سکتی تھی کہ کہ سامنے والی دکان کے گلاس میں سوڈا واٹر اس کے لئے نا قابل قبول ہے۔ وہ اس علم سے بھی لطف اندوز ہو سکتی تھی کہ نائی کے لڑکے جو اسے کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے اور زور زور سے بولنے لگے تھے، اس کی آنکھوں اور رخساروں کو چڑکا سکتے ہیں، اس کے ہونٹوں کو مائل بہ تبسم کر سکتے ہیں، مگر اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔۔۔ اتنا بھی نہیں جتنا سینما کے پردے پر نظر آنے والی ایکٹریس کا، کیونکہ وہاں تو وہ دو آنے دے کر کم سے کم ایکٹریس کے گالوں پر سسکیاں بھرنے کا حق خرید لیتے ہیں۔ مگر مس روبنسن اپنے جادو کے اڑن کھٹولے میں ان کے خیالوں تک کی پہنچ سے باہر تھی۔

لیکن فرحت کی یہ لہریں دیرپا ثابت نہ ہوئیں۔ اڈے پر پہنچتے ہی وہ کھڑکھڑاتے ہوئے اکوں، لاریوں کی قطاروں، موٹر کے ہارن کی آوازوں، اکے والوں کی لڑائیوں اور لاریوں کے ایجنٹوں کی صداؤں کے نرغے میں پھنس گئی۔ یہ بات نہیں کہ ایلی نگر کی مجلا و مصفا اور پر سکون فضا میں رہنے کے بعد یہ شور و غوغا، یہ ہنگامہ رستاخیز اور یہ گرد کے بادل اسے ناگوار گزر رہے ہوں اور اس نے دو ایک بار "فوہ...... فوہ!" کرنے کے بعد منہ پر رومال رکھ لیا ہو۔ یہ چیزیں تو سب جانی پہچانی تھیں، اور اتنی معمولی اور بے ضرر معلوم ہو رہی تھیں جیسے وہ روز یہاں آتی رہی ہو۔ وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گئی کہ وہ نیلے رنگ کی لاری بکھیڑے جاتی ہے اور لال رنگ کی ٹیکم پور، اور وہ ٹوٹی ہوئی چھتری والا اکہ بہت سست چلتا ہے، اور وہ ڈاڑھی والا آدمی چنگی کا منشی ہے۔ کوئی بھی چیز پر عناد نہ تھی بلکہ اگر وہ چاہتی تو گرد و پیش کی ساری چیزیں بڑے فخر و مباہات کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھیں، مگر، نہ جانے کیوں، وہ مس روبنسن کی شخصیت کو پھیلا کر اس ماحول پر مسلط کر دینے کے خیال سے ہی اپنے دل کو بیٹھتا ہوا محسوس کر رہی تھی اور نہ اس سے یہ ہوتا تھا کہ ڈولی بن کر اپنے آپ کو ان چیزوں کی گود میں دے دے۔ وہ تو پہلو بدلے جا رہی تھی، سمٹتی تھی، سکڑتی تھی، طرح طرح سے اپنے بازو کو سامنے لاتی تھی، جیسے کوئی وار روک رہی ہو۔ کبھی تو یہ چاہتی تھی کہ تانگہ چلتا ہی رہے، چلتا ہی جائے، اور کبھی یہ کہ بہت سے اکے سامنے ہو جائیں اور تانگہ رکا کھڑا رہے یہاں تک کہ شام ہو جائے اور وہ بغیر کسی کی نظر پڑے اپنی لاری میں بیٹھ جائے۔ اس کی حالت بس بالکل اس نوخیز لڑکی کی طرح تھی جو اپنی ماں کی نگاہوں سے اپنا پیٹ چھپاتی پھرے اور اگر کبھی ایسا حادثہ رونما ہو جائے تو گھنٹوں ہونٹ کاٹتی رہے اور وہ اپنے قصبے کی لاری کو جائے پناہ سمجھ کر اس کی طرف بڑھ بھی رہی تھی اور اس کے خیال سے جھجک بھی رہی تھی۔ کیونکہ وہی تو سب سے زیادہ مانوس چیز تھی اور اسی کو تو اسے سب سے زیادہ تفصیل یاد تھی جب اس کی اپنی لاری کے بجائے کہیں اور کی لاری سامنے آتی تھی تو اسے خوشی ہوتی تھی کہ چلو تھوڑی دیر کو تو اور بلا ٹلی۔ مگر جب اس کی لاری کے ایجنٹ نے تانگے کے قریب آ کر کہا "کہاں جانا ہے؟ ٹیکم پور؟" تو اسے ایک گونہ تکلیف ہوئی۔۔۔ اس خیال سے کہ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اسے پہچانتا نہ ہو۔ اس نے بڑی گلوگرفتہ آواز سے جواب دیا "ہاں.... نہیں۔ سعد آباد۔"

"وہ کھڑی ہے لاری آخر میں۔" ایجنٹ نے ایک اکے کی طرف جاتے ہوئے کہا: "وہ بھورے رنگ کی..... بس تیار ہے۔"

تانگہ رکنے سے پہلے اس نے تانگے والے کو پیسے دئے، اور جلدی سے نیچے کود پڑی۔ لاری میں دو ایک مسافر اندر کی طرف بیٹھے تھے، اور ڈرائیور کھڑکی سے ٹیک لگائے، اسٹیرنگ وہیل پر پیر رکھے سونے کی کوشش میں سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ پہلے تو ڈولی نے تکلفات کو بالائے طاق کر دینا چاہا، مگر ہونٹوں تک آتے آتے اس کے لفظ بدل گئے۔ اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا جیسے اسے ڈرائیور پر اعتماد نہ ہو۔ "کہاں جائے گی یہ لاری؟"

"سعد آباد۔" ڈرائیور نے سر پھیر کر جواب دیا۔

حالانکہ ڈرائیور کا رویہ ایسا تکلف آمیز نہ تھا مگر اس کی آواز سنتے ہی ڈولی کو ایسا معلوم ہوا جیسے سرو، سنسناتی ہوئی ہواؤں کے درمیان یکا یک ایک کمرے نے آ کر اسے چھپا لیا ہو۔ لاری کے انجن کا لمس تک اس کے لئے اسم اعظم کی وہ تختی بن گیا تھا جو اسے ہر قسم کے آسیوں

سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ اس نے ڈرائیور کو اور ملائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کے بجے جائے گی لاری؟"

"لاری؟...... یہی کوئی ڈھائی تین بجے۔"

"ہاں...... بس تین بجے چل پڑے گی لاری۔"

وہ اپنی کوشش کے نتیجے کے بارے میں متذبذب تھی۔ وہ ایک لمحے دیکھنے کے بعد اس نے پوچھا "اور اب کیا بجا ہوگا؟"

ڈرائیور نے سامنے کے شیشے، کھڑکی اور تیل کے ڈبوں کو ٹٹولنے کے بعد جواب دیا۔ "کوئی ایک ہوگا۔"

گو یہ جواب کچھ بہت زیادہ تسلی بخش نہ تھا، مگر ڈولی نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا "اچھا تو......"

اب تک ڈرائیور کی غنودگی پر اس کی مردانگی غالب آچکی تھی اور اسے یہ بھی خیال آگیا تھا کہ آخر پادری صاحب سے سلام دعا ہے ہی۔ اس لئے وہ اٹھ بیٹھا، اور کلینر کو دو تین آوازیں دے کر ڈولی کا سامان اوپر رکھ دینے کے لئے کہا۔

سامان کی طرف سے تو وہ جلد مطمئن ہو گئی۔ مگر جگہ کا مسئلہ ابھی درپیش تھا۔ وہ باہر ہی سے کھڑی کھڑی، اندر کا جائزہ لے رہی تھی۔ پیچھے کی طرف ایک بڑھیا تنگ پائنچوں کا پجامہ پہنے، پیر اوپر رکھے بیٹھی تھی، اور اپنے پوپلے منہ سے پان چبا رہی تھی اس کے سامنے کی سیٹ پر ایک آدمی جو اس کا بیٹا معلوم ہوتا تھا، بیٹھا ایک گٹھڑی کو ٹھیک کر رہا تھا۔ بیچ کے حصے میں رجسٹروں کے ایک ڈھیر کے قریب نکر پہنے ہوئے اور چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا ایک جوان سا آدمی جو گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد رومال میں بندھے ہوئے پھلوں کو جو اس کے پاس رکھتے تھے اور قریب کھسکا لیتا تھا۔ ڈولی کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ آخر کہاں بیٹھے، اور ادھر دھوپ اب ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ وہ بیچ کا دروازہ کھولنے ہی والی تھی کہ ڈرائیور نے سر اٹھا کر کہا۔ "بیٹھو، اندر بیٹھو۔ بس اب چلے ہے لاری"

گو "بیٹھو" ذرا چونکا دینے والی بات تھی، مگر اس کی آواز سن کر ڈولی کے دل میں یہ امید پیدا ہو گئی کہ آخری فیصلہ ڈرائیور پر چھوڑ دینے سے خود اس کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے ڈرائیور کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہاں.... اچھا.... کہاں بیٹھوں؟"

"یہاں آجاؤ بیچ کی سیٹ پر۔" ڈرائیور کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔

"ہاں.... لیکن" ڈولی نے ڈرتے ڈرتے اپیل کی کہ۔ "اگر آگے۔"

"آگے؟.... آگے تو جی، آج درونہ جی جا رہے ہیں۔ آگے تو انکی جگہ ہے۔"

مگر جب ڈولی اسی طرح کھڑی رہی اور ہلی تک نہیں تو ڈرائیور نے ایک لمبی سی انگڑائی لی اور کانکھتا ہوا نیچے اتر آیا۔ "آگے بیٹھو۔" اس نے نصیحت آمیز انداز میں کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ ہمیں کیا وہ۔ ہارے سے چاہے کوئی بیٹھے۔ لیکن درونہ جی جا رہے ہیں آج۔"

"ڈولی نے اندر بیٹھتے ہوئے اس طرح دروازہ بند کیا جیسے وہ اپنے مورچے کے لئے بالکل آخر تک مقاومت کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ گو گدا اتنا موٹا نہ تھا کہ سیٹ کی لکڑی کو اسے تکلیف دینے سے روک سکے، مگر وہ حالات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس لئے تیل کے ڈبوں کے درمیان جہاں تک ہو سکا اس نے اپنی ٹانگیں پھیلا لیں اور اپنے بدن سے گرمی نکالنے اور سانس ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کئی منٹ تک رومال سے ہوا کرنے کے بعد اسے اتنا ہوش آیا کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہو سکے۔ جب اس نے یکایک یہ دیکھا کہ لاری میں دونوں طرف آئینے لگے ہوئے ہیں جن میں اس کا چہرہ نظر آرہا ہے۔ تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ مگر دوسری نگاہ نے حیرت کو کسمساہٹ میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بال جگہ جگہ سے نکلے ہوئے تھے اور گرد سے بھورے ہو گئے تھے۔ گرمی نے اس کے چہرے کو تمتما دیا تھا، اور وہ گرد آلود ہو رہا تھا۔ خشک پپڑیوں نے اس کے ہونٹوں کی سرخی زائل کر دی تھی، اور اس کی آنکھیں میلی اور متوحش تھیں۔ اس نے شرما کر گھبراتے ہوئے رومال سے بالوں کو جھاڑا۔ زور زور سے چہرے کو رگڑا اور بار بار ہونٹوں پر زبان پھیری۔ یہاں تک کہ وہ دانتوں سے چھل بھی گئے۔ آخر اس نے جھنجلا کر آئینے کی طرف سے نگاہ پھیر لی اور باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ برابر والی لاری پر مس کجن کی تصویر لگی ہوئی تھی، ستاروں والی ہری ساڑھی، لمبے لمبے بندے، پتلی سی ناک جس میں کیل چمک رہی تھی، سرخ چہرہ، بڑی بڑی سرگیں آنکھیں۔ مگر یہ تصویر تو اسے آئینے کی یاد دلائے دے رہی تھی۔ اس

لئے اس کی نگاہیں آگے بڑھ گئیں' اور وہ اپنی آنکھوں کے کونوں کو پلکوں سے بند کر کر کے تصویر کی طرف جانے سے روکنے لگی۔ لاریوں کی قطار کی قطار کھڑی تھی مگر اسے صرف ان کے انجن اور مڈگارڈ نظر آ رہے تھے سامنے دو اکے والوں نے ایک کسان کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے' اور اپنے اپنے اکوں کی طرف کھینچ رہے تھے۔ وہ ایک خوانچے والے' پانی جلانے والا اور چند کلینر جمع ہو گئے تھے اور آدھے ایک اکے والے کو شہ دے رہے تھے اور آدھے دوسرے کو۔ اخبار والا نانبائی کی دکان کے سامنے تخت پر کچھ تھکا ہوا سا بیٹھا تھا وہیں برابر میں ایک آدمی بیٹھا سائیکل کی مرمت کر رہا تھا' اور اس کے گرد تین چار لوگ کھڑے جلدی کرنے کا تقاضا کر رہے تھے۔ اس کے بعد سڑک پر کنکروں کا ایک اونچا سا ڈھیر تھا جس پر بالٹی رکھ کر ایک تانگے والا اپنے گھوڑے کو دانہ کھلا رہا تھا۔ سڑک کے پار ایک وسیع و عریض میدان تھا' خشک اور بالکل سفید دھوپ کی سختی کے باوجود مطمئن اور ساکن۔۔۔ بے نیاز جیسے کوئی معمر اور جہاں دیدہ روایتی فلسفی۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ میدان سے ہلکے ہلکے غبار کا بادل اٹھتا تھا' اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھ جانے کے بعد نڈھال سا ہو کر کھیتوں میں کٹے ہوئے گیہوں کے سنہرے انباروں کی طرف اڑتا چلا جاتا تھا۔ کھیتوں سے کچھ دور آگے پیڑوں کی قطار تھی جن میں سے کسی گاؤں کی کچی دیواریں اور چھپر دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی عورت یا بچہ درختوں سے باہر نکل آتا تھا اور ایک آدھ منٹ تک نظر آنے کے بعد پھر غائب ہو جاتا تھا۔

وہ بہت دیر تک مکمل انہماک کے ساتھ سامنے دیکھتی رہی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم ایک نورانی اور لطیف مادے کی شکل میں تبدیل ہو کر تفکرانہ انداز میں اس میدان کی وسعتوں پر چھا گیا ہے جس کے دونوں کنارے ہوا سے اڑتی ہوئی چادر کی طرح اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا تھا جیسے اس کی روح اپنے جسم کو وہیں چھایا ہوا چھوڑ کر علیحدہ ہو گئی ہو' اور ایک ننھی سی ابابیل کی طرح کبھی تو ڈراؤنے خوابوں کے خوف و ہراس کے ساتھ اور کبھی بہار کی شاموں کے سکون و بہجت کے ساتھ سارے میدان پر چیت پٹاتی پھر رہی ہو۔ ٹانگیں ملا کر اور بازوؤں دونوں طرف پھیلا کر' سر کو کچھ تو اضمحلال اور کچھ جذبہ تسلیم و رضا کی سرشاری سے نیچے ڈھلکائے ہوئے وہ بگولوں کے ساتھ اوپر چڑھتی چلی گئی تھی جو اسے فضا میں معلق چھوڑ کر نیچے اتر جاتے تھے اور وہاں سے آسمان کی متخیل نیلاہٹیں اسے اپنے اندر کھینچ کر بے حس بنا دیتی تھیں۔ وہ ایک آم کے پیڑ سے لگ کر گاؤں کی ایک کچی دیوار کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی تھی' اس نے آم کے پتوں کی تر و تازہ کر دینے والی خوشبو سونگھی تھی' فضا کی طراوت اور خوابناکی اس کے جسم میں اتر گئی تھی' اور وہ کچی دیوار اسے اپنی پرانی بھولی معلوم ہونے لگی تھی۔

اس لئے جب پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس کی نگاہیں بڑی ہچکچاہٹ کے بعد سامنے سے مڑیں۔ ایک اکے میں سے دو تین عورتیں' بچے اور کچھ مرد اترے تھے اور اب ان کا سامان لاری پر رکھا جا رہا تھا۔ ڈولی کو پیچھے پھر کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس دوران میں پچھلے حصے میں چند آدمی اور بیٹھ چکے تھے۔ ان کے قریب ہی نیچے چاٹ والا خوانچہ لئے بیٹھا تھا جسے دیکھتے ہی بچوں نے پیسہ مانگنا شروع کر دیا تھا' اور اپنی ماؤں کو اوپر چڑھنے کی بھی اجازت نہ دے رہے تھے۔ اب کچھ لاریاں قطار میں سے نکل کر تیل لینے کے لئے پیٹرول کے پمپ کے پاس جمع ہو رہی تھیں اور ان کے کلینر زور زور سے آوازیں لگا رہے تھے تاکہ چلتے چلتے بھی جتنے مسافر اور مل سکیں لے لیں۔ لاریوں کے چلنے کی آوازیں سنتے سنتے اور ان کی نقل و حرکت کو غیر دلچسپی سے دیکھتے دیکھتے یکایک ڈولی کی نظر ایک مکان پر پڑی جو پیٹرول کی دوکان کے قریب بن رہا تھا اور جس کی طرف اس نے ابھی تک خیال کیا ہی نہیں تھا۔ پہلے یہ خالی زمین پڑی تھی جہاں کتے اپنی کھلاڑیوں سے گرد اڑاتے رہتے تھے' اور کبھی کبھار کوئی خوانچے والا ستانے کے لئے آ بیٹھتا تھا۔ لیکن اب تو وہاں پاڑیں لگی ہوئی تھیں اور ایک نیا مکان بنا کھڑا تھا' بس چھت پوری ہونے کی کسر تھی۔ مکان کے اندر اندھیرا سا تھا' اور اس کی زمین ابھی تک سیلی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ ایسی ہلکی ہلکی' پر کیف اور ذہن کو کند کر دینے والی خنکی تھی جو ڈولی کی ٹانگوں اور سینے میں سمائے جا رہی تھی' اس کے شانوں کو ڈھیلا اور خون کو سست کئے دے رہی تھی۔ داہنی طرف کچھ خوانچے والے بیٹھے تھے جنہیں دیکھ کر اسے خیال آیا کہ جب وہ گھر پہنچے گی تو اس کا چھوٹا بھائی فریڈی اس کا بستر کر لے گا' اس کا ٹرنک کھولنے کو بیتاب پھرے گا یہ دیکھنے کے لئے کہ بوا اس کے واسطے کیا لائی ہیں' اور جب وہ کچھ نہ پائے گا تو بہت مایوس ہو گا اور شاید مچلنے بھی لگے۔ لاری کے آٹھ آنے اور سامان اٹھانے والے کے ایک آنے کے بعد اس کے پاس چار آنے بچتے تھے۔ ایک آنہ برنس کو خط لکھنے کی لئے بھی سی۔

تین آنے میں کچھ نہ کچھ لیا جا سکتا تھا۔ اس لئے وہ اتر کر پھلوں والے کے پاس گئی، اور ایک منٹ تک اس کے ٹوکرے کو بے خیالی سے دیکھنے کے بعد پوچھا۔ "سنترے کیا حساب دئے ہیں؟"

امیدوں سے بھرے ہوئے لہجے میں پھلوں والے نے کہا: "پانچ پانچ پیسے دے رکھے ہیں میم صاحب۔"

"پانچ پیسے کا ایک؟"

"ہاں، پانچ پانچ پیسے، بڑے میٹھے ہیں، میم صاحب۔ لو چکھ کے دیکھو۔"

"نہیں، نہیں، رہنے دو۔" اس نے تین آنے کو پانچ پیسے تقسیم کرتے ہوئے کہا: "تین تین پیسے نہیں؟"

"تین تین پیسے کی تو خرید بھی نہیں ہیں، میم صاحب۔" پھل والے نے اپنی باطل امیدوں کے اصلیت سے آگاہ ہو کر طنز سے کہا۔ "لو۔ کیلے لو۔ پانچ پیسے کے دو دئے ہیں۔"

ڈولی اب بھی اپنی تقسیم کے نتیجے سے مطمئن نہ تھی۔ اس نے آدھی مایوس ہو کر پوچھا "کچھ کم نہیں کرو گے؟"

"کم؟ ابھی تمہیں نہیں لینا دینا۔ لاؤ کیلا، میں چلوں" اور پھر پھل والے نے ایک گزرتے ہوئے کسان کو پکار کر کہا۔ "لو چودھری صاحب، چوس لو، رسیلے ہو رہے ہیں، رسیلے۔"

یکایک اس کے حلق میں ڈاٹ سی اڑ گئی، اور سانس لینے کی کوشش میں کنپٹیوں میں رگیں ابھر آئیں، اس کے شانے خود بخود کام کرنے والی مدافعتی آلات کی طرح نیچے جھک گئے، اور بازو سخت ہو کر سینے پر آ گئے۔ اسے یہ معلوم ہونے لگا کہ جیسے وہ جگہ جہاں وہ جہاں کھڑی تھی دفعتاً بلند ہو گئی اور ساری دنیا کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئی ہیں۔ اس کا گلا صاف ہوتے ہی پیر اپنے آپ بسکٹ والے کی طرف مڑ گئے اور اس نے تین آنے پھینکتے ہوئے کہا۔ "بسکٹ۔"

"بسکٹ؟" یہ محض ایک لفظ بسکٹ والے کے لئے کسی قدر مبہم تھا۔ اس نے پوچھا: "ایک آنے درجن والے کہ تین پیسے درجن والے؟"

"کوئی سے۔" ڈولی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے بغیر کچھ کہے سنے تین بنڈل ہاتھ میں پکڑ لئے اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنی جگہ پر واپس چلی آئی مگر بیٹھنے کے بعد تو اس کا دل اس تیزی سے دھڑ دھڑ کرنے لگا جیسے اب نکل کے بھاگنے والا ہو۔ ہر کھٹکے کے ساتھ تھوڑا سے نیچے کھسکتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چھاتیاں بڑی بوجھل اور گرم ہو گئی تھیں اور ان میں کوئی چیز ابل رہی تھی، سنسنا رہی تھی، گول گول چکر لگا رہی تھی۔ ماتھے پر اور ناک کے نیچے پسینہ تھا کہ آئے چلا جا رہا تھا، جسے خشک کرنے کی کوشش میں اس کا سانس بھاری اور دشوار بن کر اس کے دل کی حالت کو اور بے قابو کئے دے رہا تھا۔ وہ جتنی نیچی ہو سکتی تھی ہو گئی اور دوپٹہ سر اور خون سے بھرے ہوئے گالوں پر کھینچ لیا۔ دوپٹے کے اس میں تسکین تھی، دلاسا تھا، ہمدردی اور غمگساری تھی، شفقت اور محبت، اور آخری وقت تک اس کا ساتھ دینے اور محافظت کرنے کا وعدہ۔ اس کی کھال سے دوپٹہ کیا چھوا تھا آگ پر پانی پڑا تھا۔ اس کا جسمانی اضطراب آہستہ آہستہ مدھم پڑتا گیا اور چند ہی منٹ میں اس کے خون اور سانس کی رفتار بالکل متوازن ہو گئی۔ مگر وہ ایسی گرانی اور تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی جیسے ایک دن کے بخار کے بعد۔

تھوڑی ہی دیر بے حرکت رہنے سے سیٹ کا تختہ اس کے چبھنا شروع ہو گیا۔ دو ایک جماہیاں لینے سے بھی اس کی تسکین نہ ہوئی، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ لمبی سی انگڑائی لے، یا ٹانگوں کو خوب تان کر پھیلا دے۔۔۔ لاری کے فرش کی مخالفت کے باوجود۔ مگر لاری کے لوہے سے زور آزمانا۔ اس کی ٹانگوں کے مان کا نہ تھا اور انگڑائی لینے میں یہ خدشہ تھا کہ اس کا دوپٹہ پھسل جاتا اور بازو اونچے اٹھتے جہاں سب کی نظریں ان پر پڑتیں۔ جب پہلو بدلنے سے کام نہ چلا تو اس نے ڈرائیور کو پکار کر بلایا، اور وقت پوچھا۔

"اب چلے ہے" ڈرائیور نے کہا۔ "گھبراؤ کیوں ہو۔"

مگر ویسے بجا کیا ہے؟"

"سوا دو بج رہے ہیں اب"

ابھی پورا پون گھنٹہ باقی تھا اور یہاں بیٹھے بیٹھے اس کی رانیں پتھر ہوئی جا رہی تھیں۔ پہلے تو وہ مارے کوفت کے اپنی سیٹ کی پشت پر ڈھلک گئی، مگر اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ لاری والوں کے قاعدے کرم کے قانون سے کسی طرح کم اٹل نہیں ہیں۔ اس نے کسی المیہ کے ہیروئن کی سی شان کے ساتھ اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا، اور بسکٹوں کے بنڈلوں سے کھیل کھیل کر اپنا دل بہلانے لگی۔ اس نے سوچا کہ وہ بسکٹوں کو بیٹھک میں چھپا دے گی، اور پھر اندر آ جائے گی۔ فریڈی اسے دیکھتے ہی؟ ڈولی بوا، ڈولی بوا" چیختا دوڑے گا اور آکر اس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا۔ وہ پوچھے گا: "ڈولی بوا کیا لائی ہو؟ دکھاؤ...... انگریزی مٹھائی لائی ہو؟...... تم کہہ گئی تھیں!" جب اسے سارے سامان کی تلاشی لے چکنے کے بعد کچھ نہ ملے گا تو وہ ٹھن ٹھنانے لگے گا۔ وہ اسے چھیڑ چھیڑ کر ہنستی رہے گی۔ یہاں تک کہ جب وہ بالکل ہی رو دے گا تو وہ چپکے سے ایک بنڈل چھپا کر لائے گی اور کہے گی: "اچھا، آنکھیں بند کرو، دیکھو، ہم تمہیں ایک چیز دیں۔" فریڈی یقین نہیں کرے گا، اور بڑی دیر کی بحث کے بعد آنکھیں بند کرے گا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں بسکٹوں کا بنڈل دے دی گی، جسے دیکھ کر فریڈی کا چہرہ مسکرا پڑے گا، اور وہ اسے گود میں اٹھا کر خوب پیار کرے گی ---- جب فریڈی بسکٹ کھانے لگے گا تو وہ اس کے ہاتھ سے بسکٹ چھین لے گی، اور کہے گی "ہم جب دیں گے بسکٹ جب تم ہمیں پیار کرو گے۔" فریڈی اپنے چھوٹے چھوٹے ہونٹ اس کے گال سے لگا دے گا جیسے کوئی اوس سے بھیگا ہوا گلاب رکھ دیا۔ اس کے جسم میں رس اترتا چلا جائے گا اور وہ فریڈی کی ٹانگوں کو اپنے پیٹ پر بھینچ لے گی۔ اسکے گال پر فریڈی کا تھوک لگ جائے گا۔ مگر وہ اسے صاف نہیں کرے گی، بلکہ یوں ہی رہنے دے گی ---- اس طرح یہ تینوں بنڈل کم سے کم ایک ہفتے چلیں گے۔ گو اس نے جلدی میں تین آنے پھینک دئے تھے، مگر خیر ٹھیک ہے ---- اب وہ برنس کو لفافہ کے بجائے کارڈ بھیجا کرے گی۔ چلتے ہوئے برنس نے بڑا پکا وعدہ لیا تھا خط لکھنے کا۔ چونکہ وہ وعدہ کر آئی ہے، اس لئے چھٹیوں بھر اسے خط بھیجتی رہے گی ---- لفافہ نہ سہی تو کارڈ تو ضرور...... مگر کارڈ پر لکھا ہی کتنا جائے گا؟.... بہر حال وہ کوشش کرے گی کہ لفافہ بھیجے۔ کبھی کبھی وہ فریڈی کا پیسہ چھپا لیا کرے گی۔ مشین کے اشتہاروں کی ردی بیچ کر بھی کچھ پیسے جمع ہو سکتے ہیں اور جب پاپا تنخواہ لایا کریں گے تو وہ ایک دو آنے لے لیا کرے گی۔ اسی طرح جب ماما چماریوں کو بائبل سنا کر اناج لایا کریں گی تو کسی دن وہ ان سے اناج لے لیا کرے گی، اور پاپا کے پاس پڑھنے والے لڑکوں میں سے کسی کو بازار بھیج کر اس کے پیسے منگوا لیا کرے گی۔ وہ کم سے کم پندرہ دن میں ایک دفعہ تو ضرور خط بھیجے گی.... کل رات وہ اور برنس دونوں ڈیڑھ بجے تک ایک چارپائی پر لیٹی باتیں کرتی رہی تھیں، یہاں تک کہ ان کے پیر اور آنکھوں کے پپوٹے ٹھنڈک محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے تھیں، اور باتوں کے جوش میں بعض اوقات ان کے سینے مل جاتے تھے۔ ان کے تھوک نگلنے کی آواز بار بار ہوا میں گونج تھی۔ دونوں کے بازو جل رہے تھے مگر ان کا مس کتنا راحت بخش تھا، اس کا جی چاہتا تھا کہ یہ بازو بس یوں ہی ملے رہیں۔ مگر بغیر کسی خاص سبب کے اسے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی خفیہ کام کر رہی ہے اور ڈر ہے کہ لوگ کہیں دیکھ نہ لیں، اور پھر اس راحت کے احساس کی شدت بھی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس لئے اسے بار بار بانہیں الگ کرنی پڑتی تھیں۔ اسے رخصت کی رات برنس نے اپنے سارے راز جنہیں وہ ہمیشہ چھپاتی رہی تھی ایک ایک کرکے بتا دئے تھے۔ اس نے سنایا تھا کہ ایک دن جبکہ سارا اسکول مل کر سینما گیا تھا تو ایک لڑکا جو اس کے پیچھے بیٹھا تھا، برابر اس کی طرف دیکھتا رہا، برنس نے بھی چند مرتبہ مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا، اور اندھیرے میں اس نے ایک پھول برنس کی گود میں پھینک دیا تھا۔ لیکن برنس کی داستانوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اس لڑکے کا قصہ تھا جو اسے چھٹیوں میں ملا تھا جب وہ اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔ یہ قصہ سنانے سے پہلے اس نے رکتی ہوئی آواز میں کہا: "ذرا اور قریب کھسک آؤ۔" برنس نے اپنا بازو مضبوطی سے اس کے گرد ڈال لیا تھا، اور اس کی کمر تھپ تھپاتی جاتی تھی۔ اس کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا، اور جسم سے لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ لڑکے کا نام اس نے دیوی داس بتایا تھا جو اسکے بھائی کے ساتھ پڑھتا تھا، اور بڑا گورا اور خوبصورت تھا اور ریشمی سوٹ پہن کر آیا کرتا تھا، دیوی داس کی خوش مزاجی نے اس کی مدافعت پر جلد قابو پا لیا تھا۔ جب اس کا بھائی ادھر ادھر ہوتا تو وہ اسے گود میں بٹھا لیتا تھا، اور خوب بھینچ بھینچ کر پیار کرتا تھا، "اور وہ" برنس نے اپنی ٹھوڑی سے سینے کی

طرف اشارہ کر کے لفظ چباتے ہوئے کہا تھا: یہاں ہاتھ رکھے رہتا تھا۔" قصہ سناتے سناتے برنس نے رک رک کر تکیے سے سر اٹھا لیا تھا اور چند لمحے اس کی طرف دیکھتے رہنے اور آنکھیں جھپکانے کے بعد ملتجیانہ لہجہ میں کہا تھا "ڈولی' ہم پیار کر لیں تمہیں" اور اس کی خاموشی کو رضا مندی پر محمول کرتے ہوئے اس نے اپنے گرم ہونٹ ایک طویل بوسے کے لئے اس کے گالوں پر رکھ دیئے تھے' اس کے بوسے کے نیچے ڈولی کو ایسا اطمینان' بے فکری اور محفوظ ہونے کا احساس حاصل ہوا تھا جیسے چھوٹے سے کینگرو کو اپنی ماں کی تھیلی میں بیٹھ کر۔۔۔۔۔ قصے کے دوران میں اس نے اپنی ٹانگیں اکڑا اکڑا کر یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ برنس کی ٹانگوں سے دور ہیں 'مگر اس کا سینہ ہر سانس کے ساتھ خود بخود آگے کھسکتا چلا جاتا تھا۔ اس کے روکنے کے باوجود اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹنے کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک جاگتی رہی تھیں' اور بار بار چادروں سے منہ اور ہاتھ نکال کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتی تھیں۔۔۔۔۔ چلنے سے پہلے وہ دونوں ساتھ ساتھ پھرتی رہی تھیں۔ اگر ان میں ذرا سا بھی فاصلہ ہو جاتا تھا تو ایسی کھٹن محسوس ہوتی تھی جیسے ان کے بدن جڑے ہوئے ہوں۔۔۔۔۔ برنس کی آواز میں کیسی نرمی اور حسرت اور حلق میں گھٹے ہوئے آنسوؤں کی نمی تھی۔۔۔۔ برنس کی جدائی کی وجہ سے وہ آج بہت دیر تک اداس رہی تھی' خصوصاً" ریل میں۔ وہ کھڑکی پر کہنی رکھے باہر دیکھتی رہی تھی کھیت' جھاڑیاں تار کے کھمبے' درخت قریب آنے کے بعد ناچتے ہوئے گھوم گھوم کر افق کی طرف نکلے چلے جاتے تھے' گویا وہ اسے ذرا سا دلاسا بھی دینے کو تیار نہیں ہیں انہیں دیکھتے دیکھتے اس کے سینے اور گلے میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا تھا۔ بار بار اس کے سینے کے بیچوں بیچ کوئی چیز تیرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی جو اندر اترتی چلی جاتی تھی۔ اس کا جی چاہا تھا کہ سر کھڑکی پر رکھ دے' اور نزع میں پھڑ پھڑاتے ہوئے پرندوں کی طرح اپنا سینہ دیوار کے ٹھنڈے ٹھنڈے تختے سے لگا دے اور ساری دنیا سے غافل ہو جائے۔۔۔ جب وہ لال پل آیا تھا تو اسے ذرا ڈھارس بندھی تھی کہ اس نظارے سے اس کی افسردگی دور ہو جائے گی۔ مگر ان دیوؤں کی سی سرخ ٹانگوں سے جو اسے دریا کے نیلے نیلے' چمکتے ہوئے پانی کو اچھی طرح دیکھنے نہ دیتی تھیں اور اس دھڑ دھڑ اور گھڑ گھڑ سے وہ اتنی بیزار ہوئی تھی کہ اگر پل جلدی ختم نہ ہو جاتا تو وہ مارے وحشت کے رو دیتی..... اسے کچھ پتہ نہیں رہا تھا کہ باقی لڑکیاں کیا کر رہی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی ہوا کی بھنچی ہوئی آواز' یا گریس کی چیخیں جسے شاید لڑکیاں ہمیشہ کی طرح تنگ کر رہی تھیں' یا آئرین کا بلند قہقہہ ایک لمحے کے لئے اس کے وجود کے پگھلاؤ کو روک لیتا تھا۔۔۔۔۔ برنس تو اب تک اپنے گھر بھی پہنچ لی ہو گی' وہ اپنے بھائی بہنوں سے باتوں میں مشغول ہو گی جو اس کے گرد جمع ہو رہے ہوں گے..... برنس دھوپ سے سفید پلیٹ فارم پر اتری ہو گی' اور اسکے ہرے جوتوں کی ایڑیاں پتھروں پر کھٹ کھٹ بولی ہوں گی..... اس نے قلیوں کو پکار کر اپنا سامان اتارنے کے لئے کہا ہو گا۔ اسٹیشن آنے سے پہلے ہی.....

برنس کی گاڑی اسٹیشن کے قریب آ ہی رہی تھی کہ ڈرائیور نے بھڑ سے دروازہ کھول کر ڈولی کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ لیکن کہیں سر اور ہاتھ ہلانے جلانے کے بعد جا کر وہ یہ سمجھ سکی کہ حالات کا رخ کیا ہے۔ لاری پوری بھر چکی تھی اور اب ڈرائیور گاڑی چلانے کے لئے ہینڈل نکال رہا تھا۔ پیچھے سے کئی آوازیں آئیں۔ "لو بھئی' چلی تو کسی طرح"

"کچھ معلوم بھی ہے؟" ڈرائیور نے کلینر کو ہینڈل دیتے ہوئے کہا "پورے دس منٹ پہلے چھوڑ رہا ہوں۔"

لاری کا انجن بھر بھرانے لگا۔ ننھے ننھے چکر اسکے پیروں میں داخل ہوئے اور گول 'گھومتے' ہلکی ہلکی چھلانگیں مارتے اور چڑھتے چلے گئے' پنڈلیوں' زانوں' پیٹ' چھاتیوں' بغلوں' بازوؤں' کانوں اور انگلیوں کے پوروں میں پھیل گئے۔ اس نے اپنے پیر سامنے کی لوہے کی چادر پر رکھ دیئے تاکہ اس کے پیر اور جھنجھلانے لگیں۔ مگر ایک دفعہ چکروں کا ایک ایسا زبردست ریلا آیا کہ وہ دھکا پیل میں آگے نہ بڑھ سکا' بلکہ پیٹ کے نچلے حصے میں اٹک کر ادھم مچانے لگا' یہاں تک کہ ڈولی نے بجلی کی سرعت سے پیر کھینچ لئے اور اپنے دونوں گھٹنے خوب کس کر ملا لئے۔ لاری اسے ہلکے ہلکے جھکولے دیتی آگے بڑھی' مگر وہ ابھی رینگ رینگ کر ہی چل رہی تھی کہ پٹرول کے پمپ کے پاس پھر رک گئی۔

"کیوں بھیا" کسی نے پچھلے حصے سے پکارا: "کیا اور بٹھاوے ہے؟ یہاں پہلے ہی گھٹے جا رہے ہیں' مرے یار۔"

مگر ڈرائیور نے اسے ناقابل اعتنا سمجھتے ہوئے دروازہ کھولا' اور اتر کر پمپ والے سے دو گیلن تیل بھر دینے کے لئے کہا..... پمپ کے اجلے

صاف شیشے میں نقرئی سیال اٹھلا اٹھلا کر اور ٹھمک ٹھمک اوپر چڑھنے لگا۔ سب سے زیادہ جو چیز ڈولی کو پسند آئی وہ چھوٹے چھوٹے بلبلے تھے جو اٹھتے ہوئے شفاف تیل میں شریر پریوں کی طرح دوڑتے پھر رہے تھے۔ پٹرول کی بو کے باوجود اس نے سر نہیں پھیرا تھا اور تیل کو چڑھتے اترتے دیکھتی رہی تھی جس سے اس کی طبیعت شگفتہ ہو گئی تھی، اور اس کی ہنسلی کی ہڈیوں میں سرسراہٹ ہونے لگی تھی جو اسے مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔

لاری گزرتے ہوئے اکوں کو گرد کے بادلوں میں چھپائی پھر روانہ ہوئی۔ ڈرائیور گاڑی کو ٹھیک رفتار پر لا رہا تھا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ کلچ پر پہنچا تھا، ڈولی سانس کو حلق ہی میں روک کر کسی گمنام اور مبہم توقع کے ساتھ اپنے سینے کو جو اس وقت انتظار اور ارتعاش، کیف اور درد کی ملی جلی کیفیتوں کی شدت سے ایک کھنچاؤ اور اینٹھن محسوس کر رہا تھا، ہوا پر جس کی ہستی اسے ٹھوس اور مرئی معلوم ہو رہی تھی آگے جھکا دیتی تھی ۔۔۔۔۔ ایسی خود سپردگی اور یقین کے ساتھ جیسے کسی دیوی کے سامنے اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا رہی ہو اور جب کلچ کی چیخ ختم ہوتی تھی تو گویا وہ ایک گولی کی شکل اختیار کر کے اس کی ران میں گھس آتی تھی جسے وہ زور لگا کر وہیں کے وہیں روک لیتی تھی اور آگے نہ بڑھنے دیتی تھی، اور ساتھ ہی اپنی پنڈلیوں کے پٹھوں کو ایسی سختی سے اکڑاتی تھی جیسے ان کے ڈھیلے پڑتے ہی اس کی زندگی بھی گل کر بہہ جائے گی۔

سعد آباد کی سڑک پر مڑنے کے بعد لاری کی رفتار کینڈے پر آ گئی اور اب ڈولی کے اعصاب کو کلچ کے زیر و بم کے ساتھ ہم آہنگ رہنے کی ضرورت باقی نہ رہی ادھر سے ادھر کھسک کھسک کر اس نے گدے کا ایک حصہ دریافت کر لیا جو نسبتاً" نرم تھا اور جہاں سے اس کی ٹانگیں پہلے سے زیادہ پھیل سکتی تھیں۔ دروازے کی طرف کا حصہ مدور تھا، ایسا گول کہ اس کہ کمر اس میں بالکل ٹھیک آتی تھی اس نے اپنے جسم کو اس حلقے کی آغوش میں گرا دیا اور کھڑکی کو مضبوطی سے تھام لیا جیسے اسے وہاں سے علیحدہ کر دیے جانے کا خوف ہو، اگر لوگ دیکھ نہ رہے ہوتے تو شاید وہ اپنا گال بھی دیوار سے لگا دیتی۔ ہوا گرم تھی، اور لاری کا دروازہ باہر سے جل رہا تھا مگر اس کے باوجود اس کا اضمحلال کوسوں دور چلا گیا تھا۔ اپنے اعضاء کو آرام دینے کی خواہش ہی بجائے خود ایک منفرد اور مستقل کیف بن گئی تھی جس سے ہر ہر بند پورے شعور و ادارک کے ساتھ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہر ہر چیز میں اسے روشنی، تازگی، دلچسپی، ندرت اور گرمیوں کی صبح کا سا تبسم نظر آ رہا تھا، جیسے کسی عجیب و غریب سرزمین میں ایک سیاح کو۔ اس آرام کے لمحے میں وہ اپنی آنکھوں کو دور دور دوڑانا نہیں چاہتی تھی، بلکہ اپنی توجہ کو صرف سڑک کے کناروں تک محدود کیے ہوئے تھی، اور جب سڑک کا پہلا پتھر تک ایک فوری جادو کے زیر اثر دلفریب بن گیا ہو تو پھر کسی اور عجوبے کی تلاش میں آنکھوں کو سرگرداں کرنے سے کیا فائدہ! دھوپ سے چمکتی ہوئی سڑک سیدھی پھیلی ہوئی تھی، اور ایک ہیشہ آگے بڑھتے ہوئے نقرئی ستارے پر ختم ہوتی تھی۔ سڑک کے کنارے درخت بھی تھے، مگر تیز دھوپ نے ان کی آدھی شخصیت اپنے اندر جذب کر لی تھی۔ لاری عجب خود اعتمادی اور پندار کے ساتھ بے نیازی سے چلی جا رہی تھی، اس کی آواز دور سے سنتے ہی بیل گاڑیاں جلدی جلدی بالکل سڑک کے کنارے پر ہو جاتی تھیں، اور شہر سے لوٹتے ہوئے کسان ایسے گھبراتے تھے کہ بجائے الگ ہٹ جانے کے سڑک کے ایک طرف سے دوسری طرف بھاگنے لگتے تھے۔ لاری کی رفتار اور خصوصاً" بیل گاڑیوں پر اس کی فوقیت ڈولی کے دل میں رفعت کا احساس پیدا کر رہی تھی، اور اسے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مادے کی نجاست میں اس کی آلودگی اوروں کی نسبت کم ہو گئی ہے۔ انجن کی بھن بھناہٹ نے اسے دوسرے مسافروں کی گفتگو اور بحث و مباحثہ کی چیخ چاخ سے محفوظ کر دیا تھا، اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس تھرتھراہٹ نے اس کے گرد ایک ایثری حلقہ بن دیا تھا۔ جہاں اس کے خیال کے مطابق، اسے کوئی نہ دیکھ سکتا تھا، اور اس لئے پوری آزادی کے ساتھ اس کے نتھنے پھول سکتے تھے، اور بند ہو سکتے تھے، اور چہرہ جو رنگ چاہے اختیار کر سکتا تھا۔ اپنے اس قلعہ بند گوشے میں سے وہ سڑک کے گزرتے ہوئے نظاروں کی سیر کر رہی تھی، وہ کئی ٹیلوں، مزاروں، کنوؤں اور باغوں سے اچھی طرح آشنا تھی، بلکہ بعض بعض درخت تک ایسے تھے جنہیں وہ پہچان سکتی تھی۔ رہٹ کنویں کو دیکھتے ہی اس نے بتا دیا تھا کہ اب اس کے کھجور کے پیڑ والا باغ آئے گا شہر سے دو میل آگے کنجروں کا ایک بنگلہ تھا جہاں کچھ مرد اور عورتیں سینکوں کے چھاج اور سرکیاں بنایا کرتے تھے۔ اول تو ڈولی کو ان لوگوں کے بڑھے ہوئے بالوں اور وحشت ناک حلیوں ہی سے کچھ کم دلچسپی نہ تھی۔ مگر دو دفعہ اس نے یہاں ایک چھوٹے قد اور دوہرے بدن کی

عورت دیکھی تھی جس کی بڑی بڑی پر فن آنکھیں ہر وقت چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں' اور جس کی غیر معتدل چھاتیوں کی نظروں کو شرما دینے والی جنبشوں نے اس پر موٹے موٹے حرفوں میں "نامناسب" اور "مشتبہ" لکھ دیا تھا مگر جو ان ہی اوصاف کے سبب سے قابل توجہ بن گئی تھی۔ ڈولی نے لاری سے سر نکال کر اسے بار بار دیکھا تھا اور آج بھی وہ اسے کم سے کم ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر جب لاری وہاں سے گزری تو بنگلے کے باہر کوئی بھی نہ تھا۔ صرف تین بچے آپس میں لڑ رہے تھے۔ لیکن ڈولی کو کوئی خاص مایوسی نہ ہوئی' اور وہ پھر سڑک کی نت نئی سیروں کی طرف متوجہ ہو گئی....

مگر صرف ایک چیز تھی جسے وہاں پانے کے لئے وہ پہلے سے تیار نہ تھی اور جسے وہاں پر کر اسے تعجب ہوا۔ یہ ایک نیا اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ چاروں طرف پکی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے' ایک بہت اونچی چمنی سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا اور چند مزدور ٹوکریاں لئے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے تھے' مگر بھٹے کا رقبہ اتنا بڑا تھا کہ یہ جگہ پھر بھی بے طرح خالی خالی نظر آ رہی تھی۔۔۔ ایسے اڈے پر ایک نیا مکان بن رہا تھا جس کی ہر اینٹ میں ایسی طمانیت بخش نمی تھی کہ ڈولی کا دل چاہ رہا تھا کہ اینٹوں پر ہاتھ رکھے رہے' گیلی ہوئی مٹی کی بھینی خوشبو سونگھے' اور کونے میں کھڑے ہو کر وہاں کے ہلکے ہلکے اندھیرے کو اپنے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے سنے۔۔۔۔ اس مکان کی تری کی یاد اس کے خیال کو جاڑے کی ان شاموں کی طرف لے گئی جب اسکول کے فیلڈ کے ہر طرف سے دھیما دھیما دھواں ہلکے ہلکے اٹھ کر وہاں باقی بچی ہوئی لڑکیوں کو حلقے میں لے لیتا تھا اور بیرونی دنیا سے ان کا تعلق منقطع ہو جاتا تھا' اور اسکول انسانی آبادی سے کوسوں کے فاصلے پر کوئی یکہ و تنہا اور مسحور خطہ بن جاتا تھا' اور وہاں کی رہنے والی مقید شہزادیوں کی کھلی ہوئی بانہوں اور ٹانگوں پر جاڑے کی ٹھنڈک ایسے آ کر لگتی تھی جیسے کسی نے برفیلا ہاتھ رکھ دیا ہو' اور کندھے اور سینے تھرتھرانے لگتے تھے۔ مگر موسم میں کچھ ایسی کم گشتگی اور اپنے آپ کو سپرد کر دینے کا تقاضا کہ دو چار لڑکیاں جھوٹ موٹ کھیل میں مشغول باقی رہ ہی جاتی تھیں۔ ایسے ہی وقت وہ نیلے سوٹ والا لڑکا ادھر سے گزرتا تھا۔۔۔۔۔ جب تھوڑی دور سے بھی اچھی طرح شکل پہچاننے میں نہ آتی تھی۔ مگر وہ چہار دیواری سے جتنا ممکن تھا قریب ہو کر چلتا تھا' اور ڈولی کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ تین دن کے اندر ہی ڈولی کو اس کی نظروں کی سمت کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ رہی تھی' اور وہ بھی اس کے انتظار میں چہار دیواری کے قریب سے قریب تر رہنے اور کم سے کم ایک بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ نہ معلوم وہ اتنا اکیلا اکیلا کیوں معلوم ہوتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس کے ہمراہ کبھی کوئی ساتھی نہ دیکھا گیا ہو' بلکہ اس کا چہرہ بھی ہمیشہ کسی سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ جب ڈولی کی نگاہیں اس سے مل جاتی تھیں تو ان آنکھوں کی پر تفکر ادا ایک مختصر ترین لمحے کے لئے اس کے دل میں بھی کسک پیدا کر دیتی تھی۔ نیلے کوٹ میں سے اس کے گورے گورے ہاتھ باہر نکلے ہوئے کیسے اچھے معلوم ہوتے تھے' اور اس کے چمکدار بالوں اور پر متانت چال کے تصور نے اس کی کتنی راتوں کو مشغول رکھا تھا۔۔۔ وہ گرمیوں میں بھی آتا رہا تھا' اور جاڑوں کی دھند ہٹ جانے کے بعد اب اس کے ہونٹ بھی صاف نظر آنے لگے تھے جن سے اس کے مزاج کی نرمی اور محبت اور اس کے دل کی حسرتناکی ٹپکتی تھی۔ وہ آج بھی یقیناً آئے گا' مگر میدان کو بالکل خالی پا کر بہت مایوس ہو گا۔ وہ کس طرح پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہے گا' اور ہر لمحے اس کی مایوسی بڑھتی چلی جائے گی۔ وہ دو تین دن برابر آئے گا' مگر آخر اس کی امید بالکل ٹوٹ جائے گی...

.. اس کے رنج کا خیال خود ڈولی کے دل میں بار بار ٹھوکنیں سی مار دیتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ آج ٹھہر گئی ہوتی! جب وہ گزر رہا ہوتا تو وہ کسی سے پکار کر کوئی ایسی بات کہتی جس سے یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ چھٹیوں میں گھر جا رہی ہے' یا کوئی اور تدبیر اختیار کرتی۔ اس سے کم سے کم یہ تو ہوتا کہ اس کو اتنی شدید مایوسی کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا.... شاید وہ اسے اپنی کوئی یادگار دیتا۔ مثلاً وہ اپنا رومال چہار دیواری کے اندر پھینک دیتا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہوتا' اور وہ اسے پکار کر کہتی۔ "ذرا سنئے.... کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کل چھٹیوں میں گھر جا رہی ہوں؟" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہتی کیونکہ اس کا چہرہ خود اس سے کہیں زیادہ کہہ دیتا۔ وہ چہار دیواری کے پار چلا آتا اور دونوں کسی چیز پر بیٹھ جاتے۔ سڑک پر ایک راہ گیر بھی نہ چل رہا ہوتا اور میٹرنیں وغیرہ سب اسکول کے اندر ہوتیں۔ وہ اس کے کندھوں کے گرد بازو ڈال لیتا' اور اسے پیار کرتا...

.. مگر سینما میں تو اس نے دیکھا تھا کہ گالوں کے بجائے ہونٹوں کا بوسہ لیا جاتا ہے۔ اس لئے فلم کی ہیروئن کی طرح اس کا چہرہ آہستہ آہستہ اوپر

اٹھتا اور سر پیچھے کو جھک جاتا۔ وہ اس دعوت کو رد نہ کر سکتا' اور اس کی ٹھوڑی اپنے انگوٹھے اور انگلی سے پکڑ کر ایک لمحہ دیکھتے رہنے کے بعد اس کے ہونٹوں پر ہلکے سے اپنے ہونٹ رکھ دیتا' فلمی ہیرو کی طرح اس کے ہونٹ پتلے اور نرم ہوتے..... خود ڈولی اپنے جسم کو اس سے جس قدر قریب ممکن تھا لگا دیتی اور اپنے گوشت میں اس کے بدن کی گرمی داخل ہوتے ہوئے محسوس کرتی..... گرمیاں یکایک جاڑوں میں بدل جاتیں' اور ہر طرف سے دھواں اٹھ کر انہیں دوسروں کی نظروں سے محفوظ کر لیتا۔ گرمیوں کی شام کی واقعیت اور آنکھوں کو تکلیف دینے والی ماہیت اور خاکیت کی جگہ جاڑوں کی پر اسراری' ابہام اور ماورائیت لے لیتی۔ بتدریج تاریک ہوتے ہوئے لمحوں کی بیدرد گریز پائی وہیں کی وہیں جم کر رہ جاتی' وہ ایک دوسرے سے اپنا جسم لگائے ہوئے پیار کی باتیں کرتے رہتے' کرتے رہتے' یہاں تک کہ ان کی یکجائی' کا ایک ایک لمحہ ابدیت سے ہمکنار ہو جاتا..... بخارات کی طرح دھجی دھجی ہو کر اڑتے ہوئے اندھیرے سے جدوجہد کرنے والے اکیلے ستارے کی روشنی میں وہ کتنے معصوم' آمیزش و آلائش سے پاک اور مصفا و منزہ معلوم ہونے لگتے۔۔ جیسے آدم و حوا عرش بریں کے سائے میں اپنی ملاقات کے پہلے دن..... بہجت و مسرت کی اس فراواں منظری کے ساتھ ساتھ ڈولی کے تحت الشعور میں طرح طرح کے تمدید آمیز خدشے اور وغوغے جڑ پکڑ رہے تھے۔ جب وہ اپنے تخیل کی سحر کاری سے اچھی طرح لطف اٹھا چکی اور کسی بچی بچائی چیز کے کھوج میں ذرا سا رکی' تو وہ فتنے اپنی کمیں گاہ سے باہر نکل آئے۔ یہ خیال اسے بار بار ڈرائے دے رہا تھا کہ اگر کہیں ایسا ہوا کہ چھٹیوں کے بعد وہ اسے نظر نہ آیا تو۔۔۔؟ ممکن ہے وہ اس دوران میں کہیں باہر چلا جائے' یا اتنی دور مکان لے لے کہ وہاں سے آنا مشکل ہو جائے یا پھر کسی اور کی طرف متوجہ ہو جائے اور وہ نیلا سوٹ کسی اور سڑک پر نظر آیا کرے اور یہ بھی بالکل قرین قیاس ہے کہ اتنے دن تک نہ دیکھنے کے بعد اسے ڈولی پسند نہ رہے' اور وہ ایک غیر دلچسپ چیز کے پھیر میں آنا محض حماقت سمجھنے لگے' اور کیا خبر کہ وہ شروع سے ہی ڈولی کو کوئی اہمیت نہ دیتا ہو' اور محض تفنن طبع کے لئے اس سے نظر بازی کرتا رہا ہو اور اب اس مذاق سے اس کا دل بھر جائے..... اگر وہ نہ آیا تو ڈولی کی دنیا کیسی ویران ہو جائے گی' کھیل ویل میں اس کا بالکل جی نہ لگے گا۔ وہ بار بار سڑک کی طرف دیکھے گی۔ مگر ہر دفعہ اس کی نگاہ کسی خوانچے والے یا کسی بڈھے ٹہلنے والے سے ٹکرا کر واپس آ جایا کرے گی' چند دن تو وہ رات تک ٹہل ٹہل کر انتظار کرے گی' مگر پھر اس کا دل اتنا رنجیدہ اور بیزار ہو جائے گا کہ وہ سب سے پہلے واپس ہو جایا کرے گی۔ وہ جھنجلا جھنجلا کر اپنے ہونٹ چبایا کرے گی' اور بولنا بالکل کم کر دے گی..... اسے چاہیے تھا کہ پہلے سے حفاظتی تدابیر اختیار کرتی تاکہ وہ کم سے کم اسے یاد تو کر لیا کرتا۔ مثلاً وہ دیوار کے اس طرف کوئی چیز گرا دیتی' اور اس سے دوستانہ مگر انکسار کے لہجے میں کہتی: "مہربانی سے ذرا سے اٹھا دیجئے۔" جب وہ اٹھا کر دیتا تو وہ اس کا مسکرا کر شکریہ ادا کرتی اور وہاں سے ہٹنے سے پہلے چند لمحے ٹھٹکی رہتی اور کئی دفعہ متشکرانہ اس کی طرف دیکھتی۔ تب تو یقین تھا کہ وہ اس کے دل میں جگہ پا لیتی' اور وہ چھٹیوں کے بعد بھی آنا نہ چھوڑتا..... یا پھر کسی دن ہمت کر کے اور ساری دنیا سے مخالفت پر کمر باندھ کر وہ اسے روک لیتی اور پوچھتی: "کیا آپ کو میں اچھی نہیں لگتی؟ کیا آپ کو میرا رنگ پسند نہیں ہے' یا میری شکل میں کوئی خرابی ہے؟ آخر آپ اتنے الگ تھلگ اور بے پروا سے کیوں نکلے چلے جاتے ہیں؟..... میں تو آپ کے خیال میں راتوں کو کتنی کتنی دیر تک جاگتی رہتی ہوں' یہاں تک کہ میرا سر درد کے مارے پھٹنے لگا ہے کلاس میں بیٹھے بھی میں آپ کے بارے میں سوچنے لگی ہوں اور ٹیچر نے جو کچھ کہا اس کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکی ہوں۔" وہ خاموشی سے سنتا رہتا اور آخر کہتا کہ..... مگر کون جانے کہ وہ کیا کہتا!۔۔۔۔۔ یا پھر کسی دن ایسا ہوتا کہ وہ دونوں ساتھ بیٹھے ہوتے اور وہ اس سے شرماتے ہوئے کہتی: آیئے' لو' لائک' ہیٹ (Love like Hate) کھیلیں..... میں سلیٹ کے ایک طرف کسی کا نام لکھ دوں گی اور آپ کو دکھاؤں گی نہیں' آپ دوسری طرف Love یا Like یا Hate لکھ دیجئے۔" وہ پہلے اوروں کے نام لکھتی' جن کے مقابلے میں وہ کبھی تو Hate دیتا اور کبھی Like لکھ دیتا اور جب وہ اسے نام دکھاتی تو دونوں خوب قہقہے لگاتے۔ آخر میں وہ اپنا نام لکھتی' اور بے چینی سے اس کے لکھنے کا انتظار کرنے لگتی وہ سلیٹ پر Love لکھ دیتا اور جب سلیٹ الٹی جاتی تو وہ ظاہر میں تو جھینپ کر مسکراتے ہوئے نیچے دیکھنے لگتی' مگر اس کے دل میں خوشی کا دریا امنڈ آتا' اور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگتے۔ اور پھر وہ..... مگر نہ جانے پھر وہ کیا کرتا! شرما کر بھاگ جاتا؟ یا اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیتا؟۔۔ ممکن ہے کہ ڈولی کے کپڑے اسے پسند نہ آئے ہوں..... کیا اچھا ہو اگر چھٹیوں کے بعد جب وہ لڑکا ادھر سے گزرے تو وہ اپنی کا سا

ریشمی فراک پہنے ہو۔ سفید زمین پر چھوٹے چھوٹے سبز پھولوں والا' جس کے گریبان پر خوبصورت سی بوٹی ہوئی تھی..... ایمی نے بڑے فخر سے اپنا فراک سب کو دکھایا تھا' اور وہ اس کپڑے کی قیمت دو روپے گز بتا رہی تھی..... دام تو بہت زیادہ ہیں..... مگر ایسا بھی کیا ہے..... جب وہ گھر پہنچے گی اس کی ماما کہیں گی :"تمہارے پاپا دلی گئے تھے' وہاں انہوں نے ٹکڑوں والے کی دکان پر فراک کا ایک کپڑا دیکھا۔ انہوں نے سوچا کہ ڈولی کے لئے لیتا چلوں۔ بڑا سستا مل گیا وہ۔ بس ایک فراک کا ہی تھا۔" وہ ماما سے جگہ پوچھ کر بھاگی بھاگی جائے گی' اور کپڑا نکال کر دیکھے گی تو وہ وہی سبز پھولوں والا ہو گا..... وہ اپنے فراک کو بہترین وضع کا ترشوائے گی' اور گریبان پر سیپ کے نیلے بٹن ٹکوائے گی۔ جب وہ اسے پہنے گی تو کیسی اچھی معلوم ہو گی۔ وہ اس دن دوپٹہ بالکل نہ اوڑھے گی۔ اول تو دوپٹے سے گریبان کی ساری خوبصورتی چھپ جاتی ہے' دوسرے دوپٹہ کیا ہوتا ہے عذاب جان ہوتا ہے۔ ہر وقت سنبھالتے رہو' ہاتھ ادھر ادھر ہلاؤ تو پھنس جائے۔ مسلمان سے لگنے لگتے ہیں دوپٹہ اوڑھ کر..... یہ اچھے قاعدے ہیں اسکول کے : باہر جاؤ تو دوپٹہ اوڑھ کر جاؤ' ساڑی نہ پہنو' میٹرن کے بغیر کہیں نہ جاؤ..... وہ میٹرن ایک چڑیل ہے' ذرا سامنے سے کھسکنے نہیں دیتی۔ گرجا سے لوٹتے ہوئے کتنی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کمپنی باغ کے اندر سے ہو کر چلے' مگر میٹرن نے ایک نہ مانا اور کھیل کے میدان میں بھی ایسی کن سوئیاں لیتی پھرتی ہے جیسے چوری کی سازش ہو رہی ہو..... اور ہاں' ساڑھی پہننے میں بھلا کیا نقصان ہے؟ آخر گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کی لڑکیاں بھی تو ہیں۔ وہ رنگ برنگ کی ساڑھیاں پہن کر جاتی ہیں لاری میں دس بجے..... یہاں صبح پانچ بجے ہی اٹھا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ اٹھنے میں دیر کرو تو ایک چیخ پکار' آفت۔ چاہے نیند کے مارے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہوں مگر چل کر ناشتے کی روٹی پکاؤ۔ یہ بھی تو نہیں کہ اس کے بدلے ایک تکیہ ہی زیادہ مل جائے۔ وہاں تو الٹی میٹرن صاحبہ چلاتی ہوئی آئیں گی :"اس مہینے میں گھی بہت خرچ ہو گیا مجھے دکھا کر لیا کرو روز" اور پھر اوپر سے چھوٹی لڑکیوں کی ضدیں :"وہ لیں گے ہم' وہ بڑی ہے۔" کام کے وقت تو پڑی سوتی رہیں' اور جب سب ناشتہ واشتہ تیار ہو گیا تو چلیں نخرے کرتی ہوئی۔ یہ جی چاہتا ہے کہ بس دھکا دے اٹھا کے' اور کچھ نہ کرے' یہ سب ہنگامہ ختم ہو کے چکے تو پھر چلو اسکول۔ وہاں الگ مصیبت : سوال کیوں نہیں کئے؟ مضمون کیوں نہیں لکھا؟ دم مارنے کی مہلت ملے تو کچھ کیا بھی جائے۔ پلنگ پر پڑ کے بھی تو چین نہیں ملتی : حکم ہے کہ دس بجے کے بعد کسی کی آواز سنائی نہ دے..... اور ہاں' اسکول میں ایک گھنٹے کی چھٹی ملے تو چلو' کھانا پکاؤ۔ اتوار کا دن ہو تو بچیوں کی جوئیں دیکھو' میلے میلے' الجھے ہوئے' جنہیں چھوٹے کو بھی جی نہ چاہے' بیٹھے کریل رہے ہیں انہیں..... کسی دن سیر کو بھی جانا نصیب ہو جائے تو میم صاحب ساتھ انگریزی بولنے کی مشق کراتی ہوئی۔ آگے آگے پکارتی چلتی ہیں :"پلیز' کھم ٹو می" (Please come To me) اور پھر لڑکیوں کی قطار اس فقرے کو دہراتی ہے۔ اگر میم صاحب نے سن لیا کہ کسی نے "کھم" کے بجائے "کم" کہا ہے تو بس اب اس کے پیچھے ہیں' جب تک وہ بالکل صحیح انگریزی لہجے میں لفظ ادا نہ کرے اس کا پیچھا چھوٹنا مشکل۔ یہ سیر کیا ہوئی مصیبت ہوئی۔ نہ کسی چیز کو دیکھ سکو نہ کچھ۔ بس قواعد سی کرتے جاؤ اور ایسے ہی واپس آجاؤ۔ اس کے مقابلے گورنمنٹ اسکول کی لڑکیاں ہیں۔ اپنا ٹھاٹھ سے دس بجے نکلتی ہیں لاری میں۔ جیسے کپڑے جی چاہتا ہے پہنتی ہیں۔ کوئی روک نہ ٹوک..... اگر وہ بھی گورنمنٹ اسکول میں ہوتی تو کیسا مزا رہتا۔ وہ اطمینان سے سو سلا کر اٹھتی اور اپنی گلابی ساڑھی پہن کر اسکول جایا کرتی۔ وہ اس نیلی لاری کی کھڑکی سے لگ کر بیٹھتی اور اس کی کہنی باہر نکلی رہتی۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ ہوا سے اڑتی جاتی' اور ساری دنیا اس کی نظروں کے نیچے سے کھسکتی رہتی..... مگر وہاں کی فیس کتنی زیادہ تھی۔ وہاں ساتویں' کے پانچ روپے لئے جاتے تھے' حالانکہ یہ صرف چندے کے چار آنے دیتی تھی..... فیس زیادہ سہی' مگر اس کا وہاں داخل ہونا کچھ ایسا ناممکن بھی نہ تھا..... گھر جا کر وہ پاپا سے کہے گی کہ وہ گورنمنٹ گرلز اسکول میں پڑھنا چاہتی ہے۔ پاپا تھوڑے سے اصرار کے بعد راضی ہو جائیں گے۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ اپنا سرٹیفکیٹ لینے اسکول جائے گی' ایمی کتنا جلتی ہے۔ دیکھو تو زرد' پلی پتلی' جیسے بھوکوں ماری بلی اور اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتی ہے بھلا اسٹیشن پر کیسا بن بن کر چل رہی تھی۔ ٹرین میں سے ہر گزرتے ہوئے لڑکے کی طرف جھانک کر دیکھتی تھی جیسے وہ اس پر دیوانہ ہی تو ہو گیا ہے۔ وہ ہر وقت یہ دکھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے کہ وہ بہت امیر ہے۔ اپنے کپڑے ہر ایک کو دکھائے گی' ان کی قیمتیں بتائے گی' طرح طرح سے یہ جتائے گی کہ وہ اسکول کی پوری فیس دیتی ہے اور سب دوسروں کی معاف ہے۔ اسٹیشن پر بھی جب دوسری لڑکیاں ملائی کی برف لے رہی تھیں تو وہ ہاتھ میں ریشمی رومال

بلاتی ہوئی اسٹال پر گئی تھی اور ایسی آواز میں کیک اور لیمینڈ مانگا تھا کہ سب سن لیں..... ایمی اس سے پوچھے گی: "سرٹیفکیٹ کیوں لے رہی ہو تم' ڈولی؟" وہ بڑے فخر سے جواب دے گی: "میں تو اب گورنمنٹ اسکول میں جا رہی ہوں!"۔ ایمی اس کی طرف رشک سے دیکھتی رہ جائے گی' اور وہاں سے کندھے اور سر اٹھائے چلی آئے گی' اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے گی۔ پھر وہ روز دس بجے نیلی لاری میں گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول جایا کرے گی.... اور لڑکیوں کے ساتھ ہنستی بولتی۔ روز طرح طرح کی ساڑھیاں پہن کر.... کپڑوں کا خیال آتے ہی اسے یاد آیا کہ دراصل وہ سبز پھولوں والے فراک کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس لئے ارادہ کر لیا کہ جب وہ پہلے پہل فراک پہنے گی تو اس دن نہا کر اچھی طرح بال بنائے گی۔ ان میں گلاب کا پھول لگائے گی' چہرے پر سیل کھڑی (جو اس کے ہاں بطور پاؤڈر کے استعمال ہوتی تھی) ملے گی' اور جوتے کو پالش سے خوب چمکا لے گی۔ اسی دن وہ اپنے چار آنے والے بندے بھی نکالے گی جن میں اودی گولیاں لگی ہوئی ہیں۔ پہلے وہ خود آئینہ دیکھ کر اطمینان کرے گی کہ وہ واقعی اچھی بھی معلوم ہوتی ہے یا نہیں۔ پھر وہ جمیلہ کے یہاں جائے گی۔ اس کے باہر نکلتے ہی سارے دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے۔ راستے میں اسے طاہر' ایوب اور دیپ چند ملیں گے۔ ان کی یہ ہمت تو نہ ہو گی کہ اس سے کچھ بولیں' مگر وہ ہمیشہ سے زیادہ تیز نظروں سے اس کی طرف گھورنے لگیں گے۔ آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف اشارے کریں گے اور ان میں سے ہر ایک اپنے کوٹ کا کالر کھینچ کھینچ کر اور خواہ مخواہ انگریزی لفظ بول بول کر یہ دکھانے کی کوشش کرے گا کہ وہ دوسرے سے زیادہ فیشن ایبل اور پڑھا لکھا ہے۔ مگر وہ ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی' اس کی رفتار کی ہمواری میں کسی قسم کا فرق نہ پڑے گا اور وہ بڑی متانت اور وقار کے ساتھ گزری چلی جائے گی۔ تاہم اس کا دل بلیوں اچھل رہا ہو گا' اور اس کی آنکھوں کے پپوٹے پھڑپھڑانے لگیں گے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کو روک سکے گی۔ سقے کی شبراتن بھی اس وقت اپنا ٹاٹ کا پردہ اٹھائے جھانک رہی ہو گی۔ وہ بھی اسے دیکھ کر بڑی متعجب ہو گی۔ وہ آہستہ سے پکارے گی "ڈولی!" اور ہاتھ کے اشارے سے اسے بلائے گی۔ مگر ڈولی اس کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرا دے گی اور آگے بڑھتی چلی جائے گی' اور جمیلہ تو بالکل مبہوت رہ جائے گی' وہ ڈولی کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھے گی' اور اس کا نچلا ہونٹ لٹکا رہ جائے گا۔ وہ اپنے دوپٹے کو خوب پھیلا کر اچھی طرح نیچے کھینچ لے گی۔ جیسے اپنے تنگ پائنچوں کے بیجامے کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جائے گی' اور وہ مارے رشک کے تھوڑی دیر تک کچھ نہ بول سکے گی۔ اس کی اماں بھی مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھیں گی' اور فقرہ چست کرنے کی فکر میں کہیں گی' "اوہ' آج تو بڑے ٹھاٹھ سے ہو' ڈولی!" پھر جمیلہ کی بھی زبان کھلے گی: "ہاں' ڈولی' آج تو بہت ٹھاٹھ میں ہو!" وہ اس دن جمیلہ کے ساتھ ساتھ نہ پھرے گی۔ اگر کہیں باورچی خانے وغیرہ میں اس کے فراک پر دھبہ لگ گیا تو؟ وہ بس ایک جگہ جا کر پلنگ پر بیٹھ جائے گی اور تھوڑی ہی دیر میں چلے آئے گی یہ کہہ کر: "اچھا' اب تم کام کرو گی۔ میں چلوں۔"..... وہ جمیلہ کو بتائے گی: "اسے بو (Bow) کہتے ہیں۔" وہ بہت سے نئے فیشنوں کا ذکر کرے گی' اور کئی انگریزی لفظ بولے گی جنہیں سن سن کر جمیلہ بہت مرعوب ہو گی اور شرم کے مارے ان کا مطلب بھی نہ پوچھے گی' بلکہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرے گی کہ ہاں وہ سب سمجھ رہی ہے..... بالکل جاہل ہے جمیلہ بھی۔ پاؤڈر کو پوڈر کہتی ہے بھلا! اردو تک تو آتی نہیں اسے اور یہ لوگ بنتے ہیں بہت وہ کہ ہم لوگ بہت بڑے زمیندر ہیں۔ کپڑے تو ذرا صاف نہیں رکھ سکتی۔ بس صبح پہنے اور شام کو میلے۔ اس کے کپڑے کتنے گندے رہتے ہیں' اور ان میں سے پسینے کی بو آتی رہتی ہے۔ بالوں کو تو بالکل جھاڑ رکھتی ہے۔ کبھی یہ بھی تو نہیں کرتی کہ ذرا بیٹھ کر ان میں کنگھی ہی کر لے.... شاید عید کے دن کچھ اچھے کپڑے پہنتی ہو۔ اب کی عید کو اس کا جی چاہا تھا کہ ذرا جا کر دیکھے کہ جمیلہ نے کیسے کپڑے پہنے ہیں' مگر وہ اس خیال سے رک گئی کہ کہیں اسے ندیدہ نہ سمجھا جائے... اس کے یہاں جمیلہ کے گھر سے سوئیاں آئی تھیں' اور اگلے دن جب وہ گئی تھی تو جمیلہ نے کہا تھا: "تم کل نہ آئیں۔ ہم تو تمہارا انتظار کرتے رہے۔ آتیں تو ہم تمہاری دعوت کرتے"..... جمیلہ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ایسے کسی کے گھر بے بلائے نہیں جایا کرتے..... وہ اب کے کرسمس پر ضرور جمیلہ کی دعوت کرے گی اور انگریزی میں رقعہ لکھے گی جسے ترجمے کی کتاب میں سے نقل کیا جا سکتا ہے۔ رقعہ دیکھ کر جمیلہ کچھ نہ سمجھ سکے گی' اور پوچھے گی۔ "کیا ہے یہ؟" تب وہ اسے مطلب سمجھائے گی..... مگر جمیلہ کہیں باہر تو نکلتی نہیں..... تو کیا ہے؟ وہ خود جمیلہ کے ابا سے کہے گی کہ وہ اسے جانے دیں۔ اس کے کہنے سے وہ اجازت دے دیں گے۔ پھر جمیلہ آئے گی' رات کو

برقع میں لپٹی لپٹائی سمٹی ہوئی۔ وہ اسے کرسی پر بٹھائے گی۔ جمیلہ کو میز پر بیٹھ کر کھانا عجب معلوم ہو گا اور وہ کچھ سٹ پٹا سی جائے گی۔ جب جمیلہ پلاؤ کو ہاتھ سے کھانا شروع کرے گی تو وہ جلدی سے اس کی طرف چمچہ بڑھائے گی۔ لو لو چمچہ سے کھاؤ۔ جمیلہ بڑی شرمندہ ہو گی اور ادھر ادھر دیکھنے لگے گی۔ وہ جمیلہ کو فلموں کے قصے' اسکول کے کھیلوں کا حال اور میم صاحب کی باتیں سنائے گی جو اسے پریوں کے ملک کی داستانیں معلوم ہو گی جہاں کی سیر کا وہ خیال تک نہیں کر سکتی۔ خصوصاً یہ سن کر اسے بڑی حیرت ہو گی کہ فلم دکھانے سے پہلے سینما میں اندھیرا کر دیا جاتا ہے۔ میز پر کیک دیکھ کر جمیلہ دل میں تعجب کر رہی ہو گی کہ یہ کیا چیز ہے۔ آخر وہ خود ہی جمیلہ کی طرف کیک بڑھاتے ہوئے کہے گی: "لو کیک لو..... یہ کیک ہے' انگریزی ہوتا ہے یہ اسے انڈروں سے بناتے ہیں۔" وہ یہ بھی پوچھ لے گی۔ "تم نے چاکلیٹ کھائی ہے جمیلہ؟"..... انگریزی مٹھائی ہوتی ہے وہ"..... اتی بڑی بڑی ٹکیاں سی ہوتی ہیں۔ بڑی مزیدار ہوتی ہے' ہمیں تو میم صاحب بانٹا کرتی ہیں"..... وہ اسے یہ بھی سنائے گی کہ ریل میں لڑکیاں کتنا ہنستی ہی' گاتی ہیں مذاق کرتی ہیں' اور کیسا کیسا لطف رہتا ہے۔ جمیلہ للچا للچا کر رہ جائے گی اور کچھ کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگے گی..... وہ جمیلہ کو یہ بات بتائے یا نہ بتائے کہ اسٹیشن پر ایک لڑکا۔۔

ایک مٹھی ریت آکر اس کے چہرے پر اس بری طرح گرا کہ اس کی آنکھیں اور منہ کرکرانے لگے۔ ہوا بہت تیز ہو گئی تھی اور درخت دیوانہ وار ہل رہے تھے' آسمان گرد سے بالکل اٹ گیا تھا' اور خالی کھیتوں میں دور دور تک بگولوں نے اٹھنے اور پھر گرنے کا سلسلہ باندھ رکھا تھا' گویا انہوں نے ایک دوسرے سے شرط بد رکھی تھی۔ برے کی طرح چکر بناتے ہوئے اوپر چڑھنے کے باوجود ان کے ناچ کو کسی قدر دلچسپی سے دیکھا جا سکتا تھا' مگر نیچے گرنے میں ان کی سستی' شراؤ' نیم رضامندی اور ہچکچاہٹ ناقابل برداشت تھی۔ بعض دفعہ تو وہ ایسے معلق ہو جاتے تھے گویا انہوں نے بالکل ہمت ہار دی ہے اور اب بالکل آگے نہ بڑھیں گے۔ ان کی کاہلی دیکھ دیکھ کر ڈولی اپنے آپ سے تنگ ہوئی جا رہی تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ شیشے پر مکا مارے یا کوئی ایسی ہی وحشیانہ حرکت کرے جس سے کم سے کم یہ تو معلوم ہو کہ اس کے اندر زندگی ہے۔ کھیت بالکل صاف پڑے تھے صرف کہیں کہیں کھونٹیاں دکھائی دیتی تھیں۔ بعض جگہ خالی کھیتوں کے پارے تھوڑی سی گرد آلود ہریالی بھی زمین کے قریب قریب چپکی ہوئی نظر آتی تھی' خشک اور تر کا یہ میل گنجی چاند کی طرح ایسا گھناؤنا تھا کہ ڈولی کو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کھیت اس کے پیٹ میں سے اٹھ کر حلق میں اڑ گئے ہیں اور اسے قے سی آ رہی ہے سڑک کے درخت اس کے بائیں آنکھ کا نشانہ باندھ کر تیر کی طرح اڑتے ہوئے آتے تھے جیسے اس کے دماغ کو توڑ کر پار ہو جائیں گے' مگر جب وہ قریب پہنچتے تھے تو جلدی سے بچ کر نکل جاتے تھے۔ ڈولی اس پر بالکل تیار تھی کہ وہ اس کا سر پھوڑ دیں' مگر اس کے لئے یہ پر فریب مذاق بہت تکلیف دہ تھا' اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا' اور آنکھوں میں پانی بھر بھر آتا تھا' اس کی آنکھوں کے ڈلے جل رہے تھے اور پلک جھپکانے سے بجائے تسکین کے الٹی چبھن ہوتی تھی۔ پیچھے بیٹھنے والے چیخ چیخ کر بے معنی بحثیں کر رہے تھے اور اتنے لوگ ایک ساتھ مل کر بول رہے تھے کہ لاری مینارۂ بابل بن گئی تھی۔ ایک آدمی اپنی آواز دوسرے سے بلند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اڑے جناح' جناح.... جناح نے تو وہ کیا جو...... 'چند آدمی' کسان...... کسان.... "کہہ کر اپنی بات شروع کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہے تھے' مگر دوسرے آدمی ان کی بات کاٹ کر خود بھی "کسان.... کسان..... "کہنا شروع کر دیتے تھے' ڈولی ہزار کوشش کر رہی تھی کہ اس طرف سے کان بند کر دے مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی لفظ ضرور آخر اس کے مغز میں آکر ڈھیلے کی طرح لگتا تھا۔ انجن نے الگ غوں غوں' غوں غوں مچا رکھی تھی جس کی دھن پر چکر کھاتے کھاتے اس کا سر بالکل مفلوج ہو گیا تھا اور گرا پڑ رہا تھا..... اس سے پلک تو نہ جھپکائی جاتی تھی مگر اس کے پپوٹے اب ڈلوں کے کانٹوں کے عادی ہو چکے تھے۔ اس نے ہرچہ بادا باد کہہ کر اپنی آنکھوں کو نیم باز چھوڑ دیا اور بالکل بے حرکت ہو گئی۔ آنکھوں کا کھلا ہوا حصہ پانی سے ڈھک گیا جس کی چپک نے پلکوں کو نیچے کھینچ لیا' اور اس کی آنکھیں آخر بند ہو گئیں..... نیند ہونے کے باوجود وہ انجن کی بھن بھناہٹ صاف سن رہی تھی۔ مگر وہ اس کے سونے میں مخل ہونے کے بجائے اسے لوری دے رہی تھی' اور دوسری صداؤں سے بچا رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ مگر اس سے زیادہ اسے زمان و مکان کا کوئی شعور نہ تھا۔ وہ اپنا جسم تک کھو بیٹھی تھی۔ وہ کسی لطیف شے میں بھی تبدیل نہ ہوئی تھی۔ بلکہ محض ایک شناخت' صرف ایک خیال۔۔۔

"میں"۔۔۔۔ باقی رہ گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف ایک بھوری تاریکی تھی جس میں کبھی کبھی پھیکی سی سفیدی کے دھبے دکھائی دے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکتی تھی کہ وہ انجن کی بھن بھناہٹ کے اندر سفر کر رہی ہے۔ صرف ایک دفعہ اسے سر کے بال اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ نظر آیا تھا جسے اس نے پہچان لیا تھا کہ آرین کا ہے' مگر وہ ایک جھلک کے بعد ہی غائب ہو گیا تھا' اور اندھیرے کی روانی پھر اس طرح جاری ہو گئی تھی.....

لاری کے ایک دھچکے سے اس کی آنکھ کھلی۔ لاری ایک گاؤں کے پاس سے گزر رہی تھی' سڑک کے ایک طرف جھونپڑی کے سامنے ایک عورت گئی کاٹ رہی تھی' اور دوسری طرف کائی سے ڈھکا ہوا ایک تالاب تھا جس میں تین چار بھینسیں تیر رہی تھیں اور سر اٹھا اٹھا کر لاری کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔ بچے اپنا کھیل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے' اور انتظار کر رہے تھے کہ لاری آگے بڑھے تو اپنے گلے سے ہارن بجاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگیں۔ ڈولی کا درد تو اب اچھا ہو گیا تھا مگر سر بھاری تھا اور آنکھیں نیند کی وجہ سے اچھی طرح کھل نہ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اسے کچھ زکام سا بھی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا سر تو بالکل بے حس ہو گیا ہے اور اس کے بجائے تھوڑی کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔ اس نے گردن اکڑ کر انگڑائی لی' اور سڑک کے نظاروں میں دلچسپی لینے کی کوشش کرنے لگی تاکہ اس کی گرانی کچھ دور ہو جائے۔ گاؤں سے تھوڑی دور آگے ایک بچہ روتا ہوا جا رہا تھا جو لاری کو دیکھ کر چپ ہو گیا اور اس نے ننگی ٹانگوں پر سے اپنے کرتے کا دامن سمیٹ کر ایک ہاتھ میں اوپر اٹھا لیا' اور لاری کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک بیل گاڑی میں ایک عورت بیٹھی تھی جس نے اپنا زرد دوپٹہ دانتوں میں دبا رکھا تھا' اور جس کی ناک میں سونے کی کیل چمک رہی تھی۔ مگر ڈولی کو اس کے پیلے پیلے دانت بالکل پسند نہ آئے اور وہ لاری کے لیمپوں کی طرف دیکھنے لگی۔ لیمپ تو کچھ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے لاری سے جڑے ہوئے ہی نہیں ہیں۔ وہ تو گویا ہوا میں معلق تھے اور ایک تعجب خیز ہم آہنگی کے ساتھ لاری کے آگے آگے بھاگ رہے تھے.... مگر ان چیزوں کے ساتھ وہ اپنی مصنوعی دلچسپی کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکی' اور اسے یقین ہو گیا کہ اپنا دل بہلانے کے لئے اسے اپنے اندر ہی کوئی چیز تلاش کرنی پڑے گی۔ کئی یادوں اور واقعوں کو رد کر دینے کے بعد اسے خیال آیا کہ صرف "غزل الغزلات" ہی سے اس کی کار برآری ہو سکتی ہے جس سے اس کا تعارف برنس نے کرایا تھا۔ ایک رات وہ بائبل لئے ہوئے اس کے پاس آئی تھی' اور لجاتے ہوئے نیچی آواز میں اس سے کہا تھا: "تم نے یہ دیکھا ہے' ڈولی؟" اس نے "غزل الغزلات" کا ایک صفحہ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا' اور اپنے آپ سیدھی بیٹھ کر مضطرب انداز میں دانتوں سے ناخن کاٹنے لگی تھی۔ اور جب ڈولی کو بھی اس میں بہت مزا آیا تو وہ اپنی دریافت کی کامیابی پر بہت مسرور تھی۔ ان دونوں نے پوری "غزل الغزلات" کو کئی دفعہ ساتھ بیٹھ کر پڑھا تھا' اور ڈولی نے اکیلے میں بھی' یہاں تک کہ اسے کئی مزیدار حصے یاد ہو گئے تھے اور اس کے کتنے ہی ویران اور آرزدہ لمحوں میں رنگینی کا سامان بن چکے تھے۔

.... اس دن کہ جب اسے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ وہ لڑکا اس کی طرف دیکھتا ہوا چلتا ہے' وہ رات کو پلنگ پر لیٹی ہوئی دیر تک ان حصوں کو یاد کرتی رہی تھی۔ اس نے اپنی رانیں خوب بھینچ لی تھیں' بانہیں تکیے کے دونوں طرف پھیلا کر الٹی لیٹ گئی تھی' اور چھاتیوں کو پلنگ سے لگا کر سینے کو پوری قوت سے دبایا تھا جس کی ہلکی سی کسک میں اسے انتہائی لطف ملا تھا..... ان ٹکڑوں کو یاد کرنے سے پہلے اس نے ہر طرف سر گھما کر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ کہیں لاری میں اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ جیسے وہ اپنے بدن کا کوئی حصہ عریاں کرنے والی ہو۔ اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ ایک ایک دو دو جملے دہرانے شروع کر دیئے تاکہ وہ ہر ایک سے پوری طرح فیضیاب ہو سکے..... ہماری ایک چھوٹی بہن ہے۔ ابھی اس کی چھاتیاں نہیں اٹھیں.... تیری دونوں چھاتیاں دو آہو بچے ہیں.... تیری ناف گول پیالہ ہے..... وہ اپنے منہ کے چوموں سے مجھے چومے..... میرا محبوب جو رات بھر میری چھاتیوں کے درمیان پڑا رہتا ہے.... میرے محبوب کی آواز ہے جو کھٹکھٹاتا ہے اور کہتا ہے میرے لئے دروازہ کھولو میری محبوبہ! میری پیاری! میری کبوتری!...... دیکھ تو خوبرو ہے۔ دیکھ تو خوبصورت ہے..... اس کا بایاں ہاتھ میرے سر کے نیچے ہے اور اس کے داہنا ہاتھ مجھے گلے سے لگاتا ہے..... اس پر ڈولی کو یاد آیا کہ کرسمس کی چھٹیوں میں جب ایک دن فریڈی کہانیاں سنتا سنتا اس کے پاس سو گیا تھا تو وہ رات بھر اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے رہا تھا۔ وہ خوب گرم رہی تھی اور اسے بڑی گہری نیند آئی تھی۔ اس لئے اس نے

ارادہ کر لیا . چھٹیوں بھر فریڈی کو اپنے پاس سلائے گی...... ایسے ہی جب ایک دفعہ برنس اس کے ساتھ سوئی تھی تب بھی وہ نیند میں بالکل بیہوش ہو گئی تھی۔ اگلے دن عیسائیوں کا سالانہ جلوس نکلنے والا تھا جس کے لئے وہ دن بھر کام کرتی رہی تھیں۔ وہ تھک کر چور ہو گئی تھیں' اور انھیں پھر صبح سویرے اٹھنا تھا۔ برنس کا تو اتنا برا حال تھا کہ اس سے ہلا بھی نہ جاتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے کمرے کو نہ گئی بلکہ ڈولی کے ساتھ ہی سو رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے حال سے بالکل غافل ہو گئیں۔ مگر پھر نہ جانے یہ کیسے ہوا کہ ان کی بانہیں ایک دوسرے کے گلے میں پڑ گئیں اور ٹانگیں الجھ گئیں.....

صبح کو وہ تقریباً ایک ساتھ جاگیں' اور انھیں اپنی کیفیت دیکھ کر تعجب بھی ہوا۔ مگر ان کے سینے مل رہے تھے اور ان گھگے پن اور زماہٹ میں ایسی خاموش ہنسی تھی کہ وہ پندرہ منٹ تک ویسے ہی لیٹی ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔ اٹھ جانے کے بعد بھی وہ شرما اور لجا نہیں رہی تھیں بلکہ ایسی مطمئن تھیں جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہ ہو...... وہ دونوں جلوس کے ساتھ گئی تھیں۔ جلوس کتنا لمبا تھا! آگے آگے بڑے پادری صاحب تھے ان کے بعد مرد' پھر عورتیں' پھر لڑکیاں' اور آخر میں مرد۔ وہ اور برنس دونوں ایک ہی لائن میں چل رہی تھیں' اور گانے کے بیچ میں چپکے چپکے باتیں کرتی جاتی تھیں۔ سب ایک ساتھ مل کر گا رہے تھے' اور گانے کے ٹکڑے لمبی لمبی سلاخوں کی طرح معلوم ہوتے تھے جیسے دو دو تین تین کے مجموعے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہوں اور مشین کی طرح اٹھ اور گر رہے ہوں..... ہاتھوں میں میخیں گاڑ کر سولی پہ چڑھا دیا..... یسوع نے تیرے واسطے اپنا لہو بہا دیا..... اور وہ بھجن بھی گایا گیا تھا: میٹھو میٹھو من میں آجا' ہم کو بچا جا' پاک بنا جا..... یہ گانا اسے اچھا تو معلوم ہوتا ہے لیکن خود گاتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے۔ اب یہ کوئی اچھی بات ہے کہ سڑکوں پر سب کے سامنے گاتے پھرو؟ اسی دن ایک بیٹھی ہوئی ناک والا لڑکا جو ہاکی اسٹک لئے سائیکل پر جا رہا تھا' جلوس کو دیکھ کر اتر پڑا تھا' اور اس کی طرف شریر اور ندیدی آنکھوں سے دیکھنے لگا تھا۔ خصوصاً جب وہ اپنے پان میں سنے ہوئے چھوٹے چھوٹے دانت نکال کر ہنستا تھا تو اسے اتنی نفرت ہوئی کہ اس نے دوپٹہ سر اور چہرے پر کھسکا لیا تھا اور بہت دیر تک خاموش نیچی نظریں کئے ہوئے چلتی رہی تھی...... ہاں ایمی جلوس کے دن بڑی خوش رہتی ہے' اسے اپنے کپڑے اور خوبصورتی دکھانے کا موقع مل جاتا ہے نا! گاتے ہوئے ہر طرف نظریں دوڑاتی رہتی ہے کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں یا نہیں...... اس کے امیر ہونے کی وجہ سے لڑکیاں بھی اس کی چاپلوسی کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مشن کا ولیم سنگھ بھی۔ آج بھی کہ جب وہ ریل میں لڑکیوں کی نگرانی کے لئے بھیجا گیا تھا' وہ ایمی کی خوشامد میں لگا رہا تھا۔ اوروں کو تو وہ گاڑی سے قدم باہر نکالنے پر بھی ٹوک دیتا تھا' مگر ایمی سارے اسٹیشن پر گشت لگاتی پھرتی رہی تھی اور وہ اسے ایک لفظ نہ کہہ رہا تھا..... اور اب تو وہ اپنے آپ کو قابل بھی سمجھنے لگی ہے۔ آئرین نے اسے بتایا کہ ایمی کو اب کے فرسٹ آنے کی امید ہے۔ کہیں آئی نہ ہو! اب تک ہمیشہ ڈولی فرسٹ آتی رہی ہے' اور اس مرتبہ تو مس جونسن نے اسے اپنے گھر بلا کر پڑھایا تھا...... بہت ہی اچھی ہیں مس جونسن! ان کا جوان ہنس مکھ چہرہ' اور اس پر سنہری عینک' کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے اور اس پر تو وہ بہت ہی مہربان ہیں۔ سب سے زیادہ نمبر اسی کو دیتی ہیں اور اس سے بڑے نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔ امتحان کے قریب بیچاریوں نے خود اسے بلا کر پڑھایا تھا' اور اسے کہہ دیا تھا کہ اگلی کلاس میں وہ شروع سال سے ہی ان کے پاس پڑھنے آیا کرے۔ ایک دن جب وہ ان کے ہاں بیٹھی سوال نکال رہی تھی وہ اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں' اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور بال ٹھیک کرتی رہی تھیں...... جب وہ گلابی ساڑھی پہنتی ہیں تو ایسی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں کہ اس کا جی چاہتا ہے کہ جھک کے ان کا گال چوم لے۔ کتنی مرتبہ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ ان سے کہہ دے کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ انھیں اپنے سینے سے لگا لے اور اپنے بازوؤں میں لئے رہے' مگر وہ ہر بار شرما شرما کر رہ گئی اور ان سے اپنے دل کا راز نہیں کہہ سکی ہے..... ایک مرتبہ وہ اسے اپنے ساتھ سینما بھی لے گئی تھیں۔ وہاں سے وہ گئی گانے بھی یاد کر لائی تھی..... اب کیسے چھپو گے سلونے ساجنا اب کیسے چھپو گے..... ان کے ساتھ تو وہ چلی بھی گئی' ورنہ ویسے تو وہ سینما کے لئے ترستی ہی رہتی ہے۔ مگر کیا کرے' اسکول والے کمبخت ذرا نہیں نکلنے دیتے۔ ایمی سے "اچھوت کنیا" اور "پکار" کی تعریف سن کر اس کا کیسا کیسا جی لوٹا ہے کہ کسی طرح اسے بھی دیکھنے کو مل جائیں' مگر بس تڑپ تڑپ کر ہی رہ گئی...... اب کے جب وہ چھٹیوں کے بعد لوٹے گی تو ضرور

کوشش کرے گی کہ سینما جانا مل جائے..... وہ مس جونسن ہی سے کہے گی کہ وہ سینما دیکھنا چاہتی ہے..... یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ کلاس میں بیٹھی پڑھ رہی ہو' اور یکایک اس کے خالہ زاد بھائی جوزف سامنے آکھڑے ہوں۔ وہ نیلا سوٹ پہنے ہوئے ہوں گے' اور ان کے سنہری عینک لگی ہو گی لڑکیاں بھونچکا ہو ہو کر انکی طرف دیکھیں گی' اور یہ بوجھنے کی کوشش کریں گی کہ وہ کس سے ملنے آئے ہیں۔ جب وہ اسے بلائیں گے تو سب لڑکیاں اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھیں گی' اور پھر پڑھنے سے ان کا دل اچاٹ ہو جائے گا۔ جب تک وہ کھڑے رہیں گے وہ کن انکھیوں سے باہر دیکھتی رہیں گی۔ وہ اس سے کہیں گے: "ڈولی' میں ابھی ابھی آرہا ہوں۔ آج کل یہاں "اچھوت کنیا" ہو رہا ہے۔ ہمارے ساتھ چلو شام کو سینما" وہ خوش خوش تیار ہو جائے گی' اور شام کو اپنی گلابی ساڑھی پہن کر ان کے ساتھ سینما جائے گی..... جوزف بھائی کے سنہرے بال کیسے چمکتے ہیں' اور ان کے گورے رنگ پر نیلا سوٹ تو بہت ہی سجے گا..... وہ سینما ہال میں بیٹھی ان سے ہنس ہنس باتیں کر رہی ہو گی اور اتنی خوش ہو گی کہ عمر بھر میں کبھی بھی نہ ہوئی ہو گی۔ وہ دیکھے گی کہ وہ گانا۔۔ بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے۔۔ جسے ایمی نے گا گا کر سارے اسکول میں پھیلا دیا ہے' کس موقع پر گایا جاتا ہے۔ گھنٹی بجے گی' اور ہال میں اندھیرا چھا جائے گا' اور پھر پردے پر.....

سامنے وہ سفید دھرم شالہ نظر آرہی تھی جس کے معنی تھے کہ اب گھر قریب آگیا ہے۔ اس علم کے تقریباً ساتھ ساتھ اسے وہ نیا مکان زمین میں سے ابھرتا دکھائی دیا جو اڈے پر بن رہا تھا' اور اگلے جھٹکے میں وہ پورا زمین کے باہر نکل آیا۔ اس مکان کی نمی اور ٹھنڈک اب بھی باقی تھی' مگر اب اس میں کچھ تمکنت' خود اختیاری' اور تفکر کا سکوت اور سنجیدگی آگئی تھی۔ اب وہ خواہ مخواہ گن گن نہ کر رہا تھا' بلکہ اس نے اپنے رازوں کو چھت کے اندھیرے میں کھینچ لیا تھا۔ یہ اندھیرا اب پہلے سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا تھا' اور اس میں سے چھت بہت اونچی نظر آرہی تھی۔ کونے میں کھڑے ہو کر خود سنسنانے لگنے کے بجائے اب ڈولی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنا سر اتنا اونچا کر دے کہ اندھیرا اسے ڈھک لے..... ڈولی نے اپنا اوپر کا جسم اٹھا کا لاری کے باہر پھینک دیا۔ جو شیشے میں سے سورج کی کرنی کی طرح آسانی سے نکل گیا' اور ڈولی کی طرف منہ کر کے ہوا میں کھڑا ہو گیا۔ وہ گویا نصف مجسمہ تھا' حالانکہ اس کے رنگ میں سنگ مرمر کی سی درشتی نہ تھی' بلکہ اس کے رنگ زندگی کے رنگ تھے۔ یہ مجسمہ بالکل عریاں تھا۔ یہ چہرہ تھا تو ڈولی کا ہی' مگر وہ کسی قدر لمبا ہو گیا تھا' خصوصاً اس کے کنپٹیوں کے پاس کے حصے اب اتنے ابھرے ہوئے نہ رہے تھے۔ چہرے کے خطوط میں اب وہ ہیجانی بے ترتیبی نہ تھی' بلکہ وہ ایک نورانی سوچ کے ساتھ میانہ وار اوپر سے نیچے آرہے تھے۔ پیشانی بھی کشادہ تھی' اور اس کی متین لمبی پلکیں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بھرے بھرے' صاف شفاف سینے پر سے پھسلتی ہوئی انتہائی سکون کے ساتھ دو سڈول شانوں کے درمیان چھاتیوں کو دیکھ رہی تھیں جو بے داغ' نرم گلابی رنگ کی' موزوں' متناسب' بے جھجک اور مطمئن تھیں۔ وہ آرزوؤں اور تمناؤں کی گدگدی سے پرجوش نہ تھیں' بلکہ ان سب سے اونچی ہو کر محض اپنی خوش کامی اور سیرابی کے احساس ہی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ اس مجسمے کے انداز میں آرام' قرار' جمالیاتی غور و فکر' اس سے منتج سرشاری اور محویت تھی گویا وہ اس حقیقت کے بارے میں سوچ رہا ہو کہ "چنگی ہی سب کچھ ہے۔"......

اب اور زیادہ نشانیاں آنی شروع ہو گئی تھیں جو اسے بتا رہی تھیں کہ گھر نزدیک تر آتا جا رہا ہے۔ اس تھوڑے سے وقت کو گزارنے کے لئے وہ یہ اندازہ لگانے لگی کہ اس کے یہاں کیا ہو رہا ہو گا..... شاید ماما کبرون کا سایہ پہنے جھاڑو دے رہی ہوں...... شاید پاپا بزار سے لکڑیاں لے کر آئے ہوں' اور ماما ان پر بگڑ رہی ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ بھیگی ہوئی آواز میں آنٹی کی خوش نمیسی کا تذکرہ کر رہی ہوں' اور اسکے مقابلے میں اپنی..... مگر ڈولی کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ان چند باقی ماندہ لمحوں کو جو بہتر طریقے سے بھی گزارے جا سکتے تھے' خیالات کی اس روش سے مکدر کر لے چنانچہ اس نے نئی ریل چڑھائی.... فریڈی اپنا نیلا نکر اور ہری قمیض پہنے گیند سے کھیلتا پھر رہا ہو گا۔ وہ اسے دیکھتے ہی چلا کر بھاگے گا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا..... پاپا ابھی دورے سے واپس آئے ہوں گے' اور سائیکل رکھ کر جوتا کھول رہے ہوں گے۔ وہ پوچھیں گے "ارے کون ہے؟" فریڈی دوڑ کر انہیں بتائے گا: "ڈولی بوا آگئیں' پاپا!"۔ وہ کہیں گے: "تو آگئی' بیٹی ڈولی؟" اور وہ خواب دیگی: "جی ہاں' پاپا"..... ماما باورچی خانے میں اس کے لئے کوئی اچھی سی چیز تیار کر رہی ہوں گی۔ آواز سن کر وہ باہر آئیں گی اور کہیں گی: "آگئیں لو ڈولی

بھی ابھی تو کہہ ہی رہی تھی کہ اب آتی ہو گی۔ تمہارے پاپا کہہ رہے تھے کہ نہیں، شام تک آئے گی۔ کئی دن سے یاد کر رہا تھا فریڈی تمہیں روز پوچھ لیتا تھا کہ اب ڈولی بوا کے آنے میں کے دن رہ گئے.... اور آج تو وہ صبح ہی سے تیار پھر رہا تھا".....ماما سفید ساڑھی پہنے ہوں گی۔ وہ اسے بتائیں گی کہ اس کے پاپا اس کے لئے ایک چھوٹی سے سفید بلی لائے ہیں جس کی اسے بڑی خواہش تھی۔....

سوچنے کو تو وہ سوچے جا رہی تھی، مگر ویسے اس کا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہے۔ پھر بھی وہ اس آخری تنکے سے چمٹی ہوئی تھی، اور اسے چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔ ہر نئی جھونپڑی یا کنواں دیکھ کر اس کے دل پر چرکا لگتا تھا اور اس کے گلے کی رگیں چٹ چٹ بول رہی تھیں۔ وہ یہ خیال کرنا چاہتی تھی کہ ابھی تو گھر بہت دور ہے مگر اسے اس کے خلاف ناقابل تردید شہادتیں لئے چلی جا رہی تھیں۔ وہ امید کر رہی تھی کہ لاری مجنونانہ جوش میں قصبے کے پاس سے نکلی چلی جائے گی اور پھر کبھی نہ رکے گی۔ یا قصبہ خود پیچھے ہٹتا چلا جائے گا اور لاری اسے کبھی نہ پکڑ سکے گی۔ مگر یہ علم اس کی جان نکالے لے رہا تھا کہ لاری کا چلنا تقدیر کی طرح اٹل اور ناگزیر ہے۔ وہ ہر قسم کے نتائج سے بے نیاز رکاوٹوں کو توڑتی، کنکروں کو کچلتی، بھاگی چلی جائے گی جیسے کوئی خود سر دیو، اور اسے قصبے کے اڈے پر لا کھڑا کرے گی جس کے سامنے وہی گڑھوں والی کنکر کی سڑک بچھی ہے جو اس کے گھر کی طرف جاتی ہے۔ لاری اپنی بھنبھناہٹ پر خود ہی مست ہو ہو کر تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی اور اسے ڈولی کے جذبات کی مطلق پروا نہ تھی ڈولی بچاری تو درختوں سے بھی مدد نہ مانگ سکتی تھی، وہ تو پہلے ہی اس کے دشمن بنے ہوئے تھے، اور اسے گھر کے قریب لائے جا رہے تھے..... آخر اس نے ایک گہرا سا سانس لیا اور پانی کے ریلے کے سامنے اپنا سر جھکا دیا......

اڈے کے قریب پہنچ کر جب لاری کی رفتار کچھ کم ہوئی تو اس کی امید پھر ذرا جاگی کہ شاید لاری اسی طرح رینگتی ہی رہے، ورنہ کم سے کم تھوڑا سا وقت تو اور لگ جائے۔ مگر جلد ہی کلچ ایک درشت کڑ کڑ کے ساتھ بولا، اور انجن رک گیا۔ ڈولی کے کانوں میں خاموشی بھربھرانے لگی، اور اسے یہ معلوم ہوا کہ جیسے دنیا ڈوبی جا رہی ہے۔ سب لوگ لاری میں سے اتر رہے تھے۔ مگر وہ ہلی تک نہیں۔ آخر جب ایک لڑکے نے آخر اس سے پوچھا کہ "اجی سامان چلے گا؟" تو اس نے گھٹے ہوئے گلے میں سے بڑی کوششوں کے بعد "ہاں" نکالا، اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس طرح دروازہ کھولا جیسے اب کوئی چارہ نہ رہا ہو، او۔ آخر کار اس نے اپنے آپ کو گلوٹین کے تختے پر چڑھنے کے لئے تیار کر لیا ہو......

لڑکا لاری کی چھت پر سے سامان اتروا رہا تھا جس کے انتظار میں وہ سڑک کے اس پار سب سے الگ کھڑی ہو گئی۔ اس کا جسم اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ ٹانگیں اچھی طرح بوجھ برداشت نہ کر رہی تھیں۔ اسے اس خیال سے بے چینی ہو رہی تھی کہ لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ درحقیقت ڈولی کو اس وقت اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں یا کیا نہیں کر رہے۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ اسے ان کی حرکتوں کا احساس تک نہ رہے۔ اس لئے وہ افق کی طرف دیکھنے لگی۔ ہوا اب بالکل مدھم ہو گئی تھی، اور درختوں کی ڈالیاں اپنی مرضی کے خلاف جبراً و قہراً سرسرائے جا رہی تھیں، زمین کا غبار اٹھ اٹھ کر آسمان پر پھیل گیا تھا، اور اس نے آسمان کو گدلا بنا دیا تھا۔ گرد کی اس عریض چادر پر سورج کی حیثیت ایک کسی قدر روشن داغ سے زیادہ نہ رہی تھی، اور اس سے باہر نکل آنے کی کوششوں میں وہ الٹا اور دھول میں اٹا جا رہا تھا۔ چند بنجر کھیتوں پر سے دھوپ ڈھل چکی تھی، اور وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے ایسے تک رہے تھے جیسے کسی معتمد شخص نے ان کے ساتھ دغا کی ہو اور اب ان میں گلے شکوے کی بھی خواہش باقی نہ رہی ہو.....

بلونت سنگھ

نام : بلونت سنگھ
قلمی نام : بلونت سنگھ
پیدائش : جون ۱۹۲۱ء بہ مقام گوجرانوالہ 'مغربی پنجاب 'بھارت (۱)
وفات : ۲۷ مئی ۱۹۸۶ء بہ مقام الہ آباد 'بھارت
تعلیم : بی۔ اے الہ آباد یونی ورسٹی ۱۹۴۲ء

گوجرانوالہ کے ایک گاؤں کے پرائمری اسکول سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ کچھ وقت میانوالی اور جالندھر کے پرائمری اور مڈل سکولوں میں تعلیم پائی۔ دہرہ دون کے اے۔ پی مشن سکول سے میٹرک پاس کیا۔ الہ آباد یونی ورسٹی سے ایف۔ اے اور اس کے بعد یہیں سے بی۔ اے (۱۹۴۲ء) سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

مختصر حالات زندگی:

بلونت سنگھ اپنے عقائد' وضع قطع اور طور اطوار کے اعتبار سے ٹھیٹھ سکھ تھے۔ گھریلو ماحول مذہبی تھا اور گھر میں پردے کی پابندی کروائی جاتی تھی' لیکن ان کا گھرانہ مذہبی تنگ نظری کا شکار نہ تھا۔ ان کے والد میانوالی میں نہایت درجہ کے معمولی سرکاری ملازم تھے۔ بلونت سنگھ ابھی پرائمری درجوں میں تھے کہ والد کا تبادلہ میانوالی سے جالندھر ہو گیا اور اس کے فوراً بعد انہیں دیرہ دون کے پرنس آف ویلز ملٹری کالج کے اسٹاف میں لے لیا گیا۔ اب گھریلو حالات کچھ بہتر ہوئے اور بلونت سنگھ کو دیرہ دون کے ایک کیمبرج اسکول میں داخل کروا دیا گیا لیکن بہت جلد حالات نے پلٹا کھایا اور انہیں واپس گوجرانوالہ آنا پڑا۔ کیمبرج سکول کے بعد گوجرانوالہ کے معمولی سکولوں میں بلونت سنگھ کا جی نہ لگا اور وہ گھر سے بھاگ نکلے۔ کافی مدت آوارہ گردی کی بالآخر پکڑے گئے اور تعلیم کا ٹوٹا ہوا سلسلہ دوبارہ جاری ہوا۔ قبلہ والد صاحب سخت گیر انسان تھے اور مالی حالات حد درجہ ناگفتہ بہ۔ یوں بلونت اپنی گھریلو زندگی سے ہمیشہ متنفر رہے۔ تین مرتبہ گھر سے بھاگے۔ سکول میں حاضری ہمیشہ کم رہی' زیادہ تر وقت مار دھاڑ اور سیر و شکار میں گزارا۔ بچپن اور لڑکپن میں موسیقی اور مصوری سے لگاؤ تھا' جو آخر تک رہا۔ بانسری خوب بجاتے تھے۔ پہلا افسانہ "ڈنڈ" (مطبوعہ: "پرتاپ" افسانہ ایڈیشن) اسکول کے زمانے میں لکھا۔ ابتدا میں "سکی دنیا" اور "تیج و ملک" میں تواتر سے لکھا۔ اس کے بعد "سہیل" کی سطح تک آئے اور "ساقی" دہلی میں پہلا افسانہ "سزا" کے شائع ہوتے ہی صف اول کے افسانہ نگاروں میں شامل ہو گئے۔

۱۹۴۶ء میں دہلی آگئے اور ٹھیک اڑھائی برس تک وزارت اطلاعات ' پبلی کیشنز ڈویژن حکومت ہند کے رسائل " آج کل " ' "بساط عالم" اور " نونہال " کے ادارتی عملے میں رہے۔ جون ۱۹۴۸ء میں والد کے انتقال کے بعد الہ آباد منتقل ہو گئے اور میر گنج میں طوائفوں کے چوبارے کے سامنے اپنے والد کے قائم کردہ "امپیریل ہوٹل" 'چوک الہ آباد کو سنبھال لیا۔ اس زمانے کے بلونت سنگھ کی بابت اوپندر ناتھ اشک لکھتے ہیں:

" وہ بے حد خوبصورت اور قابل دید آدمی تھا۔ پورے رکشا پر کسی تھانے دار کی طرح وہ اپنے تنومند جسم کے ساتھ بیٹھا ہوتا تھا۔ اس کے پیروں میں ایک بڑا سا السیشن کتا لیٹا رہتا تھا اور وہ اس شان سے رکشا پر بیٹھا' کبھی سول لائنز میں اور کبھی پاور ہاؤس والی سڑک پر نظر آجاتا۔" (۲)

اس زمانے میں بلونت سنگھ نے محمود احمد ہنر کے ساتھ مل کر رسالہ "فسانہ" جاری کیا، جو صرف افسانوں سے متعلق پرچہ تھا۔ بعد ازاں ہوٹل بیچ کر بیناجی نگر، منتقل ہو گئے تب بھی دوپہر کو بلا ناغہ سول لائنز آتے اور لوک بھارتی میں کچھ وقت گزارتے۔ ۱۹۴۸ء میں پہلی شادی کی اور ۱۹۴۹ء میں بیوی سے علیحدگی ہو گئی۔ اس کے بعد اکیس بائیس برس تک اکیلے رہے۔ دوسری شادی شیلا سندھو سے اس وقت ہوئی جب بلونت کی عمر پچاس سے تجاوز کر رہی تھی۔ شیلا ان سے بیس پچیس برس چھوٹی اور الہ آباد کے ایک اسکول میں معلمہ تھیں۔

بلونت ۱۹۷۵ء سے بیمار رہنے لگے۔ انہیں آنتوں یا معدے میں تکلیف تھی۔ ۱۹۷۵ء سے ہی انہوں نے اردو میں لکھنا ترک کر دیا اور صرف ہندی کو ذریعہ اظہار رہنے دیا۔ کچھ مدت بعد ذیابیطس کے مریض ہوئے اور بینائی تقریباً زائل ہو گئی۔ آخری عمر میں چندی گڑھ منتقل ہونا چاہتے تھے لیکن بیگم ملازمت ترک کرنے کے حق میں نہ تھیں۔ شاید انہوں نے آنے والے وقت کو بھانپ لیا تھا۔

مارچ ۱۹۸۶ء میں بلونت سنگھ نے اپنے سر کے بال کٹوا دیئے تھے اور ڈاڑھی تقریباً نہ ہونے کے برابر ترشوالی تھی۔ ۲۷ مئی ۱۹۸۶ء کو الہ آباد میں انتقال کیا اور بیناجی نگر، الہ آباد سے ان کا جنازہ ۲۸ مئی کی صبح دس بجے اٹھا۔ ان کے جنازے کے ساتھ کسی نمایاں ادیب اور شاعر کو نہیں دیکھا گیا۔ کسی روزنامے نے ان کی موت کی خبر ڈھنگ سے شائع نہ کی اور یوں تہذیبی دارالخلافہ الہ آباد سے بلونت سنگھ بے یارو مددگار چلا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"ونذ" مطبوعہ "پرتاپ" (افسانہ ایڈیشن) دہلی لگ بھگ ۱۹۴۰ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

نمبر	کتاب	ناشر	طبع
۱۔	"جگا" (افسانے)	مکتبہ اردو، لاہور :	طبع اول : ۱۹۴۳ء
۲۔	"کالے کوس" (ناول)	نیا ادارہ، لاہور :	
۳۔	"پہلا پتھر" (افسانے)	نیا ادارہ، لاہور :	
۴۔	"تارو پور" (افسانے)	نیا ادارہ، لاہور :	طبع اول : ۱۹۴۴ء
۵۔	"سنہرا دیس" (افسانے)	مکتبہ جدید، لاہور :	
۶۔	"ہندوستان ہمارا" (بارہ افسانے)	سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد :	طبع اول :
۷۔	"بلونت سنگھ کے افسانے" (افسانے)	مکتبہ اردو، لاہور :	طبع اول :
۸۔	"پنجاب کی کہانیاں" (منتخب افسانے)	ناشر : اونکار شرد، ہر پرکاش :	طبع اول : ۱۹۵۴ء
۹۔	"رات چور اور چاند" (ناول)	ادارۂ فروغ اردو، لاہور :	طبع اول : ۱۹۵۰ء
۱۰۔	"ایک معمولی لڑکی" (ناول)	اردو پاکٹ بکس، کراچی :	طبع دوم :
	یہ ناول شاہین پبلی کیشنز، راول پنڈی نے بھی شائع کیا ہے۔		
۱۱۔	"عورت اور آبشار" (ناول)	اردو پاکٹ بکس، کراچی :	طبع دوم :
	یہ ناول شاہین پبلی کیشنز، راول پنڈی نے بھی شائع کیا ہے۔		
۱۲۔	"راوی بیاس" (ناول)		
۱۳۔	"میں ضرور روؤں گی" (ہندی افسانے)		طبع اول : ۱۹۵۵ء

۱۴۔ "چک پیراں کا جتا" (افسانے) مکتبہ احباب، لاہور : طبع اول :
۱۵۔ "چلمن" (افسانے)
۱۶۔ "دیوتا کا جنم" (افسانے)
۱۷۔ "صاحب عالم" (ہندی ناول)
۱۸۔ "سونا آسمان (ہندی ناول)
۱۹۔ "دو اکل گڑھ" (ہندی ناول)
۲۰۔ "آگ کی کلیاں" (ناول)
۲۱۔ "باسی پھول" (ناول)
۲۲۔ "پھر صبح ہو گی" (ناول)
۲۳۔ "راکا کی منزل" (ناول)

غیر مدون:

"عہد نو میں ملازمت کے تیس مہینے" (طویل مختصر افسانہ) اور چند ہندی افسانے۔

زندگی میں مستقل پتا:

۵۱۷۔ مینا نگر نئی بستی، کیڈگنج، الہ آباد، بھارت

اعزاز:

۱۔ یو۔ پی گورنمنٹ، ادبی ایوارڈ
۲۔ پٹیالہ گورنمنٹ، ادبی ایوارڈ

نظریہ فن:

"میں کہانی بہت کم لکھتا ہوں۔ اس لیے کہ میں زیادہ لکھ ہی نہیں سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں اس بات سے بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں میں افسانہ نویس ہو کر ہی نہ رہ جاؤں۔ مجھ کو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، محمد حسن عسکری، عصمت شاہد لطیف، سعادت حسن منٹو بہت پسند ہیں۔"

(بہ حوالہ: "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ: بشیر ہندی صفحہ ۱۵۵)

○

(۱) بہ حوالہ: "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ: بشیر ہندی (خود نوشتہ حالات زندگی۔ صفحہ ۱۵۱۔)
(۲) بہ حوالہ: "کہانی کار: بلونت سنگھ" مطبوعہ: "الفاظ" علی گڑھ مئی تا اگست ۱۹۸۸ء

بلونت سنگھ

جگا

ماجھا کے علاقہ میں سکین ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے' زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی۔ یہاں کی ایک بات تھی۔ وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر پر رومان پرور ہوتی کہ سسی پنوں' سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھے کے قصے بھی مات ہو جاتے تھے ــــ اور اب کے قرعہ گور نام کور کے نام پڑا تھا۔

گورنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ ایک گڑیا کی مانند تھی' چینی کی مورت' چلتی تو اس سبک رفتاری کے ساتھ کہ نقش قدم معدوم' سرگیں اور بدمست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آتا تھا۔ لیکن ابھی وہ معصوم تھی۔ شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے فکر اور پرشباب دوشیزہ کی پرزور حس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموش اور پرسکون شے میں کہیں دور سے شہنائی کی اڑتی ہوئی آواز سنائی دے جائے۔ ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کر دیتی' وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی' ابھی اس میں پندار حسن پیدا نہ ہوا تھا' اس لئے جو بھی شخص اس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گرنام اس سے محبت کرتی ہے ــــ ایک مرتبہ تو شنگارا سنگھ نے اعلانیہ نوجوانوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گرنام کو بھگا لے جائے گا۔ اس وقت دلیپ سنگھ ادھر سے گزرا تو دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گرنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے سن پایا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر لیں گے۔ اس پر شنگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بکرا بلا دیا۔ اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شنگارے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا۔" یہ تو نے بکرا کیوں بلایا ہے؟"

شنگارے نے تہبند کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلہ پر آن کھڑا ہوا۔ دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔ قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھ جائیں مگر سب نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ــ آخر کہاں تک؟ ایک دن خونی پل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا۔ دلیپ کا تختہ اتر گیا اور دلیپ کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے شنگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا' جان تو بچ گئی مگر صورت بگڑ گئی۔ اس دن سے سب کو کان ہو گئے اور اب دلیپ کے جیتے جی گرنام کا دعوے دار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

رات بھیگ چکی تھی' چاند جوبن پر تھا' گاؤں پر ایک پراسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے پاس ایک جنگلی بلا بیٹھا دم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔

یہ رہٹ اروڑیوں کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی پیپل کا ایک بہت بڑا اور گھنا درخت' جس پر ایک جھولا پڑا تھا۔ چونکہ بیلوں کو ہانکنے والا کوئی تھا نہیں' جی چاہتا چل دیتے' جی چاہتا ٹھہر جاتے' اس وقت خاموشی سے کھڑے سینگ ہلا رہے تھے۔

اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد پیپل کے نیچے آکر رکا' اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ سانڈنی بلبلا کر چلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہات میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلاف معمول بات نہیں' مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ہاتھوں

اور چہرہ کی رگیں ابھری ہوئی، آنکھیں سرخ انگارہ، ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو، جوڑے پر رنگ برنگ کی جالی، جس میں سے تین بڑے بڑے پھندنے نکل کر اس کی سیاہ ڈاڑھی کے پاس لٹک رہے تھے، کانوں میں بڑے بڑے مندرے، کالے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر، بدن پر لانبا کرتا اور مونگیا رنگ کا دھاری دار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا گریبان کا تسمہ کھلا ہوا، اور اس کے سینہ پر کے گھنے بال نمایاں، اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمکدار چھوی۔

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے، اس نے جوتے اتارے، تہبند کو اوپر اٹھایا اور اپنے موٹے کڑے کو پیچھے ہٹا پانی کی جھال کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ ہاتھ دھویا، زور سے کھانسا اور پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے شملے سے منہ پونچھنے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لئے گھڑا جھال کے نیچے کیا اس کی گوری کلائی پر کی کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یک جا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار، چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا، سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں، جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گھڑے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کولھے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک نشیں خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں اولو سے باہر نکالا اور اسے جھٹک کر جوتا پہن لیا۔ پھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا۔ تب وہ اپنی چھوی ہاتھ میں لئے ہوئے اروڑی پر جہاں کہ ایک سفید مرغی کے بہت سے پر پڑے تھے، کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی جس پر اپلے رکھے تھے۔ جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اپلا نیچے گرا دیا جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جا کر گرا۔ اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر، تلووں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیوں کو روند کر چلے آ رہے ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا۔ مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سرگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا۔ مرد نے بھاری بھرکم اور کرخت آواز میں پوچھا۔ "تو کون ہے؟"

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں، یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اسے اس قدر بے مروتی کے ساتھ مخاطب کیا۔ اس کے سرخ سرخ نازک ہونٹ پھڑکنے لگے جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں، مگر مرد غیر معمولی طور پر بھیانک تھا۔ مرد نے اسی لہجہ میں اپنا سوال دہرایا۔ "تو کون ہے؟"

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ اس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں۔"

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

دوشیزہ کی آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ بولی "گرنام!"

"تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"میری ماں ہے، بے بے، ویر، چاچا، باپو سب ہی رہتے ہیں۔"

"مجھے اپنے گھر لے چل"۔ مرد نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں، اس نے اپنی دلہن کی طرح آراستہ سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجہ میں پوچھا۔ "کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو گیا؟"

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ "لیکن مجھے تم سے خوف معلوم ہوتا ہے۔"

"کیوں؟" مرد نے اجڈپن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لئے اس کی چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھا۔ "تم ہنستے کیوں نہیں؟"

"ارے یہ بات؟" یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا' جیسے کوئی پانی سے لبریز مٹکا زمین پر انڈیل دے' اس کے قہقہہ کی آواز سن کر چمگادڑیں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

گرنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا۔ اس کی ممٹی تو بہت دور سے نظر آتی تھی۔

دروازہ کے سامنے پہنچ کر اجنبی رک گیا اور گرنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا:

"واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح!"

"واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح!"

اجنبی بلا کسی ہچکچاہٹ کے بولا۔ "میں دور سے آ رہا ہوں' رات زیادہ گزر چکی ہے۔ میں آج یہیں ٹھہروں گا۔"

باپو درانتی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار شخص تھا مگر اجنبی کی بھیانک شکل اسے شش و پنج میں ڈالے ہوئے تھی۔ خیر اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہر طرح سے خدمت کے....."

پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کر سکے۔ اجنبی سانڈنی لڑکے کے سپرد کر کے دروازہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کل سامان غریبانہ تھا مگر گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواریں اس کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہ تھیں۔ گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے' سوائے چار کے۔

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہو گیا۔ ایک بچہ سینہ سے گلی ڈنڈا لگائے سو رہا تھا۔ صحن مویشیوں کے موت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا ایک طرف کھرلی کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی۔ بھس اور کھلی کی سانی کی بو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ رسی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف خراس' دوسری طرف تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے لگا ہوا چھکڑے کا پہیہ' یہ بڑے بڑے اپلے' کونے میں کپاس کی چھڑیاں' چولہے کے پاس جھوٹے برتنوں کا انبار' ایک کمرہ میں سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی تاگے میں پروئے ہوئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے واسطے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کر بوڑھا باپو اجنبی کو دروازہ سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھا دی گئی تھی۔ سوکھے ہوئے اپلے جو جلانے کے کام میں آ سکتے تھے اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔ یہاں پر ایک چارپائی ڈال دی گئی۔ چارخانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اس پر رکھ دیا گیا۔

گرنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی۔ جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے کھسک گئی۔ اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے۔ دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرہ پر پڑ رہی تھی ——— اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

شلغم کی ترکاری' ایک کٹورے میں شکر گھی' ڈیلوں کا اچار' دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں اور آٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گرنام اس کو دے آئی۔

جب اجنبی نے اونچے سر میں تین چار ڈکاریں لیں اور بڑے زور شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر کلی کی تو گرنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برتن اٹھانے گئی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے۔ جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کر تکیہ کے قریب رکھنے لگا تو

سونے کا ایک کنٹھا نیچے گر پڑا، گرنام ٹھٹک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا۔ "گرنام اب جا رہی ہو کیا؟"

گرنام حسب معمول اپنے دلفریب انداز سے مسکرائی اور اوڑھنی سنبھالتے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی۔ "سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی۔"

اجنبی دور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شرینہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیووں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ لنڈ منڈ بیریوں پر چڑیوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔

ایسے سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے، کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کے مسرت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

اگے وچ کیلا ای
نکل کے مل ہالو!
ساڈا او مجھنے دا او یلا ای
نکل کے مل ہالو!

اتنے میں گرنام دبے پاؤں، شلوار کے پائنچے اٹھائے، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میں گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔

اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے۔ قریب تھا کہ گرنام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے ایک چیخ نکل جاتی مگر اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گرنام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی، ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخر کار اس نے اپنی باتوں سے آپ ہی اکتا کر ایک گہری سانس لی اور تکان زدہ آواز میں بولی۔

"کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو ــــ؟ میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو۔ مجھے جیب کتروں، چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے۔ وہ بھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں"۔ یہ کہہ کر گرنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی۔ جیسے کوئی سچ مچ کا قاتل اس کا گلا دابنے کو آ رہا ہو۔

"مت گھبراؤ۔ تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات کا خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔"

گرنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تہ دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی۔ "تم کتنے اچھے ہو ــــ یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لئے لائے ہو گے نا؟"

"ہاں!"

"گرنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا:

"تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا تو ہونے والی بیوی کے لئے لائے ہو؟"

اجنبی نے اپنی داڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی۔ بنے گی بھی یا نہیں" گرنام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر اپنی آنکھوں کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے، ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا۔ "ہاں

تم کالے ہو ذرا۔"

اجنبی کے سینہ میں جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔

مگر گرنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید وہ اجنبی کے لئے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

"یہ زیور تم لے لو۔"

گرنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ "پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟"

اجنبی کو کچھ جواب 'نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔ "پھر میں تم سے لے لوں گا۔"

گرنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ تالی بجا کر بولی۔ "میں ان کو اپلوں میں چھپا دوں گی۔۔۔ کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے زیوارت پہن کر کھیتوں میں جایا کروں گی۔"

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا۔ "گرنام تم بھی تو مجھ کو کچھ دو۔"

گرنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ "میرے پاس کیا ہے؟"

"کچھ بھی ہو۔"

گرنام چہرہ سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کوڑیوں اور خربوزہ کے رنگ برنگ کے بیجوں کا ہار اتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر جھینپ سی گئی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گرنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا۔ "یہ میری انگلی میں پہنا دو۔ دیکھوں کیسی لگتی ہے۔"

اجنبی نے اپنے کالے کالے میلے کچیلے لمبے چوڑے ہاتھوں میں گرنام کا کنول سا ہاتھ لیا۔ گرنام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارفتگی کے عالم میں اس کے خوبصورت سیپوں جیسے پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا' جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں کی کل طاقت کشید کی جا رہی ہو۔

گرنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اماں کھانس رہی ہے۔۔۔ اب میں جاتی ہوں۔"

اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔

گرنام نے آگے جھک کر لرزاتی آواز میں پوچھا۔ "جاؤں کیا؟"

اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیوارات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے۔

اجنبی جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ گرنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن اور چھاچھ کا دیا اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گرنام رونے لگی۔ اجنبی نے آہستہ سے کہا۔ "روتی کیوں ہو؟"

"تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مت جاؤ۔"

اجنبی ہنس پڑا۔ "میں پھر آؤں گا۔"

باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

باپو اجنبی کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا۔ "کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں!" اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرہ پر گاڑ کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنی دھوپ میں چمکنے والی چھوی کی طرف فخریہ انداز سے

دیکھتے ہوئے مزید کہا۔ "اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔"

بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا۔

اجنبی سانڈنی پر سوار ہو گیا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا۔ "آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔"

جگا ڈاکو' اصلی نام سردار جگت سنگھ ورک وہ خوفناک شخص تھا کہ جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ قتل' غارت گری' ظلم' لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں ہی گزر گیا۔ بہت سی زمین کا مالک تھا۔ بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا' غریب خوش تھے۔ اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہ کر سکتا تھا۔ اب تیس برس سے اوپر سن تھا۔ موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔ محبت' حسن شفقت' نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم متعین نہ تھا۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی۔ علاقہ بھر اس سے تھراتا تھا' اس کے دل پتھر' بازو آہن' غصہ قیامت' دہن شعلہ۔۔۔۔۔ وہ قہر تھا۔

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنا لئے تھے۔ نوجوان جھوم جھوم کر ان کو گایا کرتے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا۔

پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں تے
چھویاں دے کل ٹٹ گئے...... جگیا

یا پھر لائل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا اور بچ کر واپس بھی آ گیا تھا۔ اس کا ذکر یوں ہوتا تھا۔

جگے ماریا لائل پور ڈاکہ' جگے ماریا
جگے ماریا لائل پور ڈاکہ تے تاراں کھڑک گیاں آپے

اس کی طویل' تاریک اور ہیبت ناک شب حیات میں ایک تارا طلوع ہوا جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کر دیا' اور وہ تارا تھی۔۔ گرنام!

گرنام بیچاری نادان چھوکری' اسے عشق و محبت کا پتہ ہی نہ تھا۔ اسے لوگ کنکھیوں سے دیکھتے وہ ہنس دیتی' اس کے جذبہ پندار حسن و شباب کو کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ دیدہ دانستہ شکار کھیلے' بسملوں کا تڑپنا دیکھے اور اس لذت سے محظوظ ہو جو صیادوں کے لئے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی سادہ رو چھوکری یہ جانتی ہی نہ تھی کہ وہ شاہین جس کو زخمی کرنے کے لئے پنجاب کے شہزور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں' اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا وہ اسے چھو کر اور کند ہو کر زمین پر گر پڑتا تھا' وہی شاہین اس کے تیر غلط انداز کا شکار ہو کر نیم بسمل اسکے پیروں کے پاس پڑا تھا اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگا ان کے ہاں آتا اور سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اس نے خود کو ایک متمول زمیندار ظاہر کیا۔ باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ گرنام کی کشش اسے کھینچ لاتی تھی۔ اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اس فرشتہ کو اپنانے سے پہلے خود کو کیونکر اس کے قابل بنائے' اس نے کبھی بھی اس سے محبت جتلانے کی کوشش نہیں کی' وہ نہیں جانتا تھا کہ کیونکر اس کا آغاز کرے' وہ سوچتا تھا کہ نامعلوم اس کے اظہار محبت کرنے پر گرنام کیا رویہ اختیار کرے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی تھی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سنا کرتا۔ کبھی کبھی اس کو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ صورت تو اس کی پہلے ہی مکروہ تھی۔ مگر اس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔ گرنام تھی کہ اس نے کبھی بھی اس سے اظہار نفرت نہ کیا۔ وہ نہایت مہر و محبت کے ساتھ اس سے پیش آتی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لئے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی' اگرچہ اس نے آج تک اس کو چھونے کی جرات نہ کی تھی۔ گرنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑکا پیدا کر دیتی تھی۔ اس کا ملکوتی جمال اس کا سرنگوں کر دیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سنا کہ:

جگے نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے ہی گزر گیا۔
جگا صبح و شام پاٹھ کرتا' غریبوں کو کھلاتا پلاتا' دان کرتا' گوردوارے میں جا کر سیوا کرتا' ہر کسی کے ساتھ نرمی اور ملیمی سے گفتگو کرتا۔

اس نے باپو کی منت کی کہ گرنام کور کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔ اس نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے' اور جو کچھ اس نے لوٹا وہ سب بڑی توند والوں کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ ان کو دینے کو تیار تھا اور باپو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔ لیکن گرنام کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ وہ جگا ڈاکو تھا اور نہ ہی اسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پریم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔ نیک باپو نے سب کچھ منظور کر لیا۔
جگا ھیکن سے چودہ کوس پرے رہتا تھا۔ اس کی آمدورفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ اول تو وہ آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرا وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا تھا وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا تھا۔ جگے کو دنیا جانتی تھی مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔
جگے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی' اب وہ چاہتا تھا کہ گرنام کی زبان سے بھی اس عشق کا اقرار کروا لے' خواہ اسے یہ بتلائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔
ایک دن بعد از غروب آفتاب وہ ھیکن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرنام ساتھ والے گاؤں میں جولاہوں کو سوت دینے کے لئے گئی ہوئی تھی۔
جگے نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی کو ذرا ایج کیا۔ شملہ کو ذرا اور بلند کیا اور پھر اس نے سب کی نظریں بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر الٹ لیا اور اسے اپنی گھنی اور کھردرے بالوں والی گرد آلود ڈاڑھی پر خوب اچھی طرح مل لیا۔ پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔
ہر طرف دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی ملگجی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی پڑتا تھا۔
دور سے ایک صورت دکھائی دی۔ اسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کوئی عورت تھی اور یقیناً وہ تھی بھی گرنام۔
جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔
گرنام قریب آتے ہی مسکرا دی۔ لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھڑی تھی۔ "میری تو گردن ٹوٹ گئی۔"
"اس گٹھڑی میں کیا بھر لائی ہو؟" یہ کہتے ہوئے جگے نے ایک ہاتھ سے یہ من بھر بوجھ اس کے سر پر سے یوں اٹھا لیا جیسے کوئی دو سال کے بچے کو ٹانگ پکڑ کر اٹھا دے۔
"اپلے --- اور ہوتا کیا؟" گرنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا۔ "آ رہی تھی' رستہ میں اپلے چننے لگی۔ یہاں تک کہ شام اسی میں ہو گئی۔"

دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔
آج جگے نے گرنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے گے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کئے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا بھید کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا۔ کیونکہ گرنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی۔ "گرنام!" یہ کہتے کہتے رال اسکی ڈاڑھی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اسے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر بولا۔ "گرنام! تم کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔"

گرنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے سی شوخ اور المونہ رہی تھی مگر چونکہ بگے سے کافی مانوس تھی۔ اس لئے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔

بگے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔ "کیوں گرنام کس سوچ میں ہو؟"

گرنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ "میں بہت پریشان ہوں --- میں بہت دنوں سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سناؤں لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"شرم آتی تھی"۔ گرنام نے جھینپ کر جواب دیا۔

بگا کچھ کچھ تاڑ گیا۔ زیر مونچھ مسکرایا۔ "ارے مجھ سے شرم کیسی؟"

گرنام چپ رہی۔

بگا کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر گرنام نے بتایا۔ "وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔"

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ کسی روپیہ پیسہ والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں اور کسی سے....."

یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

بگے نے اپنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے شملہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا۔ پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا۔ "نہیں گرنام، نہیں۔ جو کو تم چاہو گی اسی سے تمہاری شادی ہوگی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا..... ہاں تو..... مگر وہ ہے کون؟"

بگے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔

گرنام نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چوڑے شانوں اور صندوق جیسے سینہ کو چھو کر گونہ تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

بگا گھبرا گیا۔ اس نے اس کو چمکارا اور دلاسا دیا اور پھر اس شخص کا نام پوچھا۔

گرنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رک گئی...... اور زور زور سے رونے لگی۔ بگے نے تسکین دی تو وہ بولی۔ "تم ضرور میری مدد کرو گے، ان سب کے ہاتھوں سے سخت بیزار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام......"

بگے کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"اس کا نام ہے دلیپ..... دلیپ سنگھ"

بگے کو سانپ نے ڈس لیا۔

اس کا چہرہ یکایک بھیانک ہو گیا۔

"دلیپ سنگھ اس کا نام ہے۔" گرنام نے دہرایا۔

بگے کی مونچھیں تھلنے لگیں۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی رگیں پھول گئیں۔ گرنام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"گھر جاؤ۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم فوراً واپس چلی جاؤ۔" اس نے کرخت لہجہ میں گرج کر کہا۔ گرنام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھری سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ عقاب کی چونچ نما ناک سرخ ہو گئی، آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں چہرے سے بربیت ٹپکنے لگی ۔۔۔ معاً اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا "۔۔۔ دلیپ سنگھ؟۔۔۔"

موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا۔ نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی اور نہ چاند کی چاندنی۔ پل بڑے بڑے اور بھدے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی اور پانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو، انسان کو ہڑپ کر لینے کے لئے منہ کھولے بیٹھا ہو، یا جیسے کسی مردے کی دو بڑی بڑی آنکھیں جن کی پتلیاں کوے نوچ کر کھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا اور کچھ فاصلہ پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص ادھر سے گزرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس پل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی "خونی پل" رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچے تو دن کے وقت بھی اکیلے ادھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سرکٹا سید رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا سر تو پل کے نیچے دلدوز چیخیں مارا کرتا اور وہ خود بلا سر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔ نصف رات گزر چکی تھی۔ دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ سنار کا کام بھی کرتا تھا اور پنساری کی دکان بھی۔ اس کی اپنی تیار کردہ گلقند خوب بکتی تھی۔

وہ نوجوان تھا۔ خوش رو و خوش وضع، مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں۔ گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران، آنکھیں، شربت سے لبریز کٹورے، سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوئے تھا، اس کا ایک چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا الغوزے خوب بجاتا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لئے جاتا ہے، اس واقعہ کو وارث شاہ کی ہیر سے بڑی دردناک لے میں گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

دلیپ طاقتور اور دلیر نوجوان تھا۔ مگر خونی پل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ وابستہ خونی روایات اس جگہ کو اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سسک سسک کر بہنے والے پانی کی آواز سن کر اس کے دل کو کوفت سی ہونے لگی ۔۔۔ اس نے ذرا بلند آواز میں "چھلی" گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سن کر اس کو تسکین ہوئی۔

اس کا گدھا پل پر سے پار ہو چکا تھا۔ وہ عین پل کے درمیان تھا۔ دل میں شاداں تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ معاً پیچھے سے اسے اپنی گردن میں کسی تیز شے کی چبھن محسوس ہوئی اور جیسے کوئی اس کے کرتے کو پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو ۔۔۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔

ایک دیو ہیکل مرد پل کی دیوار پر سے اچکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چھوی پیچھے سے اس کی قمیض میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"تم کون ہو؟" دلیپ نے ہمت کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

"ادھر آ" بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔

دلیپ اس کی طرف بڑھا ۔۔۔ یکایک اس نے اجنبی کو پہچان لیا۔ بولا۔ "مجھے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ میں نے تم کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔

کیا تم وہی شخص نہیں جس نے تین سال پہلے چند اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا...... ہاں شاید وہ ننکانہ صاحب کا میلہ تھا۔ تبھی کا واقعہ ہے...... اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے۔"

"بے شک میں وہی ہوں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ ہے۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نو عمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار بنا ---- اور قتل تو میں نے بہت کئے ہیں' اسی پل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں...... اور آج مجھ کو بارھواں قتل کرنا ہے۔"

دلیپ کو اس کے اجڑ پن پر تعجب ہوا۔ بولا "میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ تم تو میرے محسن ہو۔"

"تو گرنام سے محبت کرتا ہے جو صرف میری ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے شنکرا سنگھ کو اسی پل پر سخت زخمی کیا تھا---- آج تیرا میرا فیصلہ ہو گا۔"

یہ کہہ کر اجنبی نے چھوی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا "...... اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آ جائے۔"

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔"

اجنبی نے گرج کر جواب دیا۔ "تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے ہی تخم سے ہے تو میرے سامنے آ"۔ یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیرت آ گئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا وہ ڈنڈا جو گدھے کے ہانکنے کے لئے ہاتھ میں لئے تھا اس نے اس کے منہ پر دے مارا۔ لیکن اجنبی نے وار روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اب کے کان پر رسید کی' ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جوش میں تھا' اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مکہ اس کے منہ پر رسید کیا جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بگڑ گیا.. ... مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی ڈاڑھی کو تر کر رہا تھا۔ ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھارا چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی ---- مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔

پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا۔ "اس طرح نہیں' دلیپ! تم ابھی محض بچے ہو۔ لیکن جگا کوئی طفلانہ حرکت نہیں کرنا چاہتا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا عین اصلی جگہ پر آ گیا---- دلیپ جگے کا نام سن کر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔

اجنبی اپنی چھوی پکڑ کر بولا'

"تیرے پاس چھوی ہے؟"

"نہیں!"

"تلوار ہے؟"

"نہیں!"

"صفا جنگ؟"

"نہیں!"

"مگر لاٹھی تو ہے وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں ٹھنسی ہوئی۔"

دلیپ مارے تعجب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"جا!" اجنبی نے پکار کر کہا۔ "لاٹھی لے آ۔۔۔۔ میں نے سنا ہے کہ تو علاقہ بھر میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ مرنے دے گی۔"

دلیپ بہادر تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالا نہ پڑا تھا۔

جگے نے چھوی اتار کر علیحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھائی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

ان کی للکار کی آواز سن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑ پھڑانے لگے۔ گیدڑوں نے ہوا ہو ہوا ہو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست چالاک نو آموز اور نوجوان چھوکرا۔ بجلی کی طرح بے چین 'جوڑ جوڑ میں پارہ۔ جگا بھاری بھرکم 'قوی ہیکل 'کہنہ مشق دیو۔ باوجود موٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سرک لگاتا تھا تو ایسے معلوم پڑتا جیسے سطح آب پر مُنگیری پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے خالی دے کر چلایا۔ "ایک!"

دلیپ نے پھر وار کیا۔ جگا اسے بچا کر گرجا۔ "دو!"

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگا اسے بھی روکا اور کڑکا۔ "تین!" یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا۔ "او سنبھل بے چھوکرے اب جگا وار کرتا ہے۔"

پسینہ کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً چھرا لے کر جھپٹا۔ جگے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پل کی دیوار سے ٹکرا کر گرا پڑا۔

اب جگے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیے کی مانند حلق سے ایک خوفناک آواز نکالی اور پھر دونوں ایڑیاں اٹھا کر آگے کی طرف اچک کر اس نے بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے چھرا سنبھالا اور چیتے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا۔ مگر کہنہ مشق استاد کا وار اپنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کے سر کو توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینہ تک پہنچ جاتی مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔ سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کی مانند نہر کے کنارہ پر جا گرا۔۔۔۔۔ کچھ دیر تک چلتا رہا اور پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی جیسے خونی پل قہقہے لگا رہا ہو۔

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں میں سے ہوا سسکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی۔

زرد چاند بدلی میں سے نکل آیا۔ مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں الجھ کر رہ گئیں۔

جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آور پیشانی کو صاف کیا۔ منہ ہاتھ دھویا 'کان پر پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھی۔ اس نے دلیپ کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھوی اٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لاد کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے پچیس دن بعد۔

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔ گرنام کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عورتیں چرخہ کات رہی تھیں 'بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے اور بچے شرارتوں میں مصروف۔

اتنے میں جگا اندر داخل ہوا۔

شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھ میں چھوی چمک رہی تھی۔ سب نے اس کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا۔

گرنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ بے بے نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا مگر اس نے بتایا کہ اس کی ڈاچی باہر کھڑی ہے اور اسے جلدی واپس جانا ہے۔

چند لمحوں کے لئے اس نے سکوت کیا۔ پھر نہایت مختصر اور فیصلہ کن انداز سے کہنا شروع کیا۔ "میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لئے آیا ہوں کہ آپ گرنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی ۔۔۔ بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہو گی جس سے کہ میں چاہوں گا۔"

سب لوگ حیران تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گرنام کا ہونے والا خاوند وہ خود ہی تھا۔ مگر چونکہ انہیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی اس لئے وہ خاموش رہے۔

"..... اور وہ شخص یہ ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا ۔۔۔ اور دلیپ اندر داخل ہوا۔

ہر شخص پر حیرت زا خاموشی طاری ہو گئی۔

گرنام نامعلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔ اس کو شرما جانا چاہئے تھا مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

جگے نے دلیپ کے کان میں کہا۔ "اگر گرنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے۔ دلیپ! تم مرد ہو۔ میں نے اچھی طرح سے تم کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ میں چاہتا تو تم کو قتل کر ڈالتا۔ مگر مردوں سے مجھ کو محبت ہے۔ اب جبکہ تمہاری گرنام تمہارے سپرد کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہ کرو گے...."

دلیپ نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔

جگا بلند آواز میں بولا۔ "باپو! ماں!! بے بے!!! میں ان کی شادی کے لئے ضرورت سے بھی کہیں زیادہ روپیہ دوں گا اور ان کو بہت سی زمین دوں گا۔"

باپو اصل قصہ بھانپ گیا۔ لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیونکر ہو گیا۔ مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خونی پل پر قتل کر دیا تھا۔

دلیپ نے قصہ مختصر کر سنا دیا کہ خونی پل پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا۔ اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار دھرم سنگھ وہاں پہنچ گئے اور وہ اس قدر بہادری سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے اور ان کو بھاگتے ہی بنی۔ پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور تیمارداری کرتے رہے۔

جگے کی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ مسحور ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے جگے کا بھدا ہاتھ اپنے کنول ایسے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلے اس نے جگے کے بلند سینے اور اس کے غیر معمولی چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم کتنے اچھے ہو...... تم یہیں ہمارے پاس ہی رہا کرو۔"

قریب تھا کہ جگا چیخیں مار مار کر رو پڑے۔ مگر جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگولے کی طرح دروازہ میں سے باہر نکل گیا۔

شادی ہو گئی۔۔۔۔۔

کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گرنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کریلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ معاً دور سے غبار اٹھا، کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے، ان کی بجی سجائی سانڈھیاں، مردانہ اور دیو پیکر صورتیں، چمکتی ہوئی چھویاں ۔۔۔ عجب منظر پیش کرتی تھیں۔ ۔۔۔ ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا شخص تھا۔ گرنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی۔ "باپو! وہ کون لوگ ہیں؟ ۔۔۔۔ یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی پڑتا ہے۔"

نہیں بٹی نہیں، وہ دھرم سنگھ نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینہ سے لگا لیا ۔۔۔ اور ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب

ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "آج جگا ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے لئے جا رہا ہے۔"

کرتار سنگھ دگل

نام : کرتار سنگھ دگل
قلمی نام : کرتار سنگھ دگل
پیدائش : یکم مارچ ۱۹۱۷ء بہ مقام دھمیال ضلع راول پنڈی، مغربی پنجاب۔
تعلیم : ایم۔ اے (انگریزی) آنرز (پنجابی)

ابتدائی تعلیم پرائمری سکول دھمیال میں حاصل کی۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء گورڈن کالج، راول پنڈی میں زیر تعلیم رہے، اس کے بعد ایم۔ اے (انگریزی) کرنے لاہور چلے گئے۔ ایم۔ اے پنجاب یونی ورسٹی، لاہور سے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

موضع دھمیال، ضلع راول پنڈی کے تعلیم یافتہ کاروباری دگل گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن اور لڑکپن دھمیال میں گزرا۔ گورڈن کالج، لیاقت روڈ، راول پنڈی سے بی۔ اے کیا۔ یہاں طالب العلمی کے زمانے میں "گورڈونین" (ادبی مجلہ) کے ایڈیٹر تھے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ایم۔ اے (انگریزی) کرنے لاہور چلے گئے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن رہے۔ ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ریڈیو جالندھر سے منسلک ہو گئے۔ ترقی پسند نظریات کے سبب ان کا تبادلہ کبھی حیدر آباد ہوا تو کبھی اندور، غرضیکہ پورے ہندوستان کی سیر کی۔ چودہ برس تک ترقی سے محروم رہے۔ اپنے زمانے کے بہترین ڈراما پروڈیوسر کے طور پر شہرت پائی۔ ۱۹۶۶ء میں اسٹیشن ڈائریکٹر تھے، اس دوران میں پنجابی، اردو، انگریزی اور ہندی پروگرام ترتیب دیئے۔ ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۳ء سیکرٹری / ڈائریکٹر نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا رہے۔ ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۶ء میشر انفارمیشن پلاننگ کمشن تھے۔

سرکاری ملازمت کے دوران "انسٹی ٹیوٹ فار سوشل اینڈ اکنامک چینج"، "ڈاکٹر ذاکر حسین ایجوکیشنل اینڈ کلچرل فاؤنڈیشن"، "پنجاب آرٹس کونسل"، "ہندی سمیتی حکومت ہند" اور "پنجاب ساہتیہ اکیڈمی" کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ متعدد عالمی سطح کے سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی، متعدد ممالک گھومے۔ پبلشرز کے وفد کے ساتھ ۱۹۷۰ء میں روس کا دورہ کیا۔ انٹرنیشنل رائٹرز کانفرنس منعقدہ صوفیہ (۱۹۸۲ء) میں بطور ہندوستانی مندوب شرکت کی۔ تحریک آزادی فلسطین کے رسالہ "لوٹس" کے ایڈیٹر ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"سویر سار" (پنجابی) مطبوعہ : ۱۹۴۱ء

اولین مطبوعہ (اردو) افسانہ:

"سویر بازار" مطبوعہ : ۱۹۴۱ء

"سوہر بازار" مطبوعہ : ۱۹۴۱ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب :

۱۔ "کنڈے کنڈے" (پنجابی شاعری) لاہور : طبع اول : ۱۹۴۱ء

۲۔ "بند دروازے" (پنجابی شاعری) دہلی : طبع اول : ۱۹۴۸ء

۳۔ "اک صفر صفر" (پنجابی ڈرامے) لاہور : طبع اول : ۱۹۴۱ء

اس کتاب کا دیباچہ فیض احمد فیض کا لکھا ہوا ہے۔

۴۔ "سوہر سار" (پنجابی افسانے)

۵۔ "چپل چپیاں" (پنجابی افسانے)

۶۔ "کوڑی کمائی کر دی گائے" (پنجابی افسانے)

۷۔ "ڈنگر" (پنجابی افسانے)

۸۔ "کچا دودھ" (پنجابی افسانے)

۹۔ "اگ کھان والے" (پنجابی افسانے)

۱۰۔ "نواں گھر" (پنجابی افسانے)

۱۱۔ "نواں آدمی" (پنجابی افسانے)

۱۲۔ "لڑائی نہیں" (پنجابی افسانے)

۱۳۔ "پھول توڑنا منع ہے" (پنجابی افسانے)

۱۴۔ "کرامت" (پنجابی افسانے)

۱۵۔ "گئوراج" (پنجابی افسانے)

۱۶۔ "یاری میری" (پنجابی افسانے)

۱۷۔ "اک چیت چانن دی" (پنجابی افسانے)

۱۸۔ "سبھے سنجھیوال سندائیں" (پنجابی افسانے)

۱۹۔ "ماجھا نہیں مویا" (پنجابی افسانے)

۲۰۔ "سونار بنگلہ" (پنجابی افسانے)

۲۱۔ "دھویا ہویا بوہا" (پنجابی افسانے)

۲۲۔ "اقراراں والی رات" (پنجابی افسانے)

۲۳۔ "ترکالاں ویلے" (پنجابی افسانے)

۲۴۔ "اک کرن چاندنی کی" (اردو افسانے)

۲۵۔ "دیا بجھ گیا" (اردو ڈرامے) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی :

۲۶۔ "اوپر کی منزل" (اردو ڈرامے)

۲۷۔ "اجلا آنچل" (اردو ناول)
۲۸۔ "نوشیبی" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
۲۹۔ "سل وٹے" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
۳۰۔ "میل پتھر" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
۳۱۔ "تل پھٹ" (افسانوں کا انتخاب)
۳۲۔ میری سریشٹ کہانیاں" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
۳۳۔ "اودو گئے جن" (پنجابی ریڈیائی ڈرامے)
۳۴۔ "تن ناٹک" (پنجابی یک بابی ڈرامے)
۳۵۔ "ست ناٹک" (پنجابی یک بابی ڈرامے)
۳۶۔ "پرائیاں بو ٹلاں" (پنجابی ڈراما)
۳۷۔ "کوہ کن" (پنجابی ڈراما)
۳۸۔ "مٹھا پانی" (پنجابی ڈراما)
۳۹۔ "اک اکھ اک نظر" (پنجابی ڈراما)
۴۰۔ "آندھراں" (پنجابی ناول)
۴۱۔ "بل مرداں دا" (پنجابی ناول)
۴۲۔ "ماہ ہو جائے" (پنجابی ناول)
۴۳۔ "سرد پونم دی رات" (پنجابی ناول)
۴۴۔ "من پردیسی" (پنجابی ناول)
۴۵۔ "آپی نوں کیہہ ہو گئی" (پنجابی ناول)
۴۶۔ "نویں پنجابی کویتا" (پنجابی تنقید)
۴۷۔ "سفیر دی کویتا" (پنجابی تنقید)
۴۸۔ "دھرم نیرپکھ دھرم" (مذھبیات)
۴۹۔ "گیانی گورمکھ سنگھ مسافر" (سوانح)
۵۰۔ "موتیوں والی" (ہندی افسانے)
۵۱۔ "بچپن کہانیاں" (ہندی افسانے)
۵۲۔ "اک کرن چاندنی کی" (ہندی افسانے)
یہ کتاب پہلے پنجابی میں شائع ہوئی تھی۔
۵۳۔ "پھول توڑنا منع ہے" (ہندی افسانے)
یہ کتاب پہلے پنجابی میں شائع ہوئی تھی۔
۵۴۔ "سیما ریکھا" (ہندی افسانے)
۵۵۔ "اک اندھیری رات" (ہندی افسانے)

یہ کتاب پہلے پنجابی میں شائع ہوئی تھی۔

۵۶۔ "بل مریدوں کا" (ہندی ناول)

یہ ناول پہلے پنجابی میں شائع ہوا۔

۵۷۔ "چولی دامن" (ہندی ناول) اس کتاب کا ملیالم، سندھی اور روسی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

۵۸۔ "چیل اور چتن" (ہندی ناول)

۵۹۔ "سرد پونم کی رات" (ہندی ناول)

یہ ناول پہلے پنجابی میں شائع ہوا تھا۔

۶۰۔ "اس کی چوریاں" (ہندی ناول)

۶۱۔ "سویرا" (ہندی ناول)

۶۲۔ "من پردیسی" (ہندی ناول)

یہ ناول پہلے پنجابی میں شائع ہوا۔

۶۳۔ "بدم شرنم" (ہندی ڈراما)

۶۴۔ "میٹھا پانی" (ہندی ڈراما)

یہ ڈراما پہلے پنجابی میں شائع ہوا۔

۶۵۔ "اک آنکھ اک نظر" (ہندی ڈراما)

یہ ڈراما پہلے پنجابی میں شائع ہوا۔

۶۶۔ "پرانی بوتلیں" (ہندی ڈراما)

یہ ڈراما پہلے پنجابی میں شائع ہوا۔

۶۷۔ "کہانی کیسے بنی" (یک بابی ڈراما۔ ہندی)

۶۸۔ "Death of a Song" (Short Stories)

۶۹۔ "Come Back My Master" (- do -)

۷۰۔ "Twice Born Twice Dead" (Novel)

۷۱۔ "Contempvary Indian Short Stories" (Anthology Compitation) Vol.I)

۷۲۔ "What Ails Indian Broadcasting"

۷۳۔ "Book Bublishing in India"

۷۴۔ "Literary Encounters"

۷۵۔ "The Sikh Gurus - Their Lives and Teachings"

۷۶۔ "Folk Romances of PunJab"

۷۷۔ "Iqbal - a Commenorative Volume" - (Ed)

۷۸۔ "To Each a Window" (Radio Plays) Writers Workshop Lalcuttu 1981

۷۹۔ "Gurmeukh Sing Musafir" (Biography)

۸۰۔ "Securlar Perceptions in Sidh Faith"

۸۱۔ "RanJeet Singh : A secular Sikh Monarch"

مستقل پتا:

بی ۷ حوض خاص، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۲، بھارت۔

اعزاز:

۱۔ "پدم بھوشن" حکومت ہند کا اعلیٰ ترین سول اعزاز : ۱۹۸۸ء

۲۔ "غالب ایوارڈ" (برائے ڈراما) ۱۹۷۳ء

۳۔ ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ برائے "اک چیت چانن دی" پنجابی : ۱۸۶۶ء

۴۔ "اعزازی پرس" (برائے پنجابی ادب) حکومت پنجاب، ہند : ۱۹۶۴ء

۵۔ "سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ" : ۱۹۸۱ء

۶۔ انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف پنجابی رائٹرز اینڈ آرٹسٹس ایوارڈ : ۱۹۸۳ء

نظریہ فن:

"افسانہ شعر کی مانند سریلا ہوتا ہے، ناٹک کی مانند ڈرامائی ہوتا ہے اور قصہ کی مانند کہانی بیان کرتا ہے۔"

(بہ حوالہ : مکتوب بنام مرزا حامد بیگ : اگست ۱۹۸۴ء)

کرتار سنگھ دگل

پھول توڑنا منع ہے

اس روز جب میں بس میں سوار ہوا تو میں نے دیکھا 'ایک سیٹ خالی تھی - یوں وہ سیٹ خالی ہی تھی لیکن اس کے خاصے حصے پر اس سواری کا قبضہ تھا' جو اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

میں اس خالی سیٹ کے پاس پہونچ کر ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی نوجوان لڑکی نے اپنی تراشیدہ بھوؤں تلے سے آہستہ سے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس نے پل بھر کے لئے مجھے دیکھا اور پھر پلکیں نیچی کر لیں لیکن میری سیٹ کے کافی حصہ پر اسی طرح قبضہ جمائے رکھا۔

آخر 'سیٹ پر جو تھوڑی بہت جگہ خالی تھی میں اس پر بیٹھ گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو وہاں ٹکایا۔

میں بہت سنبھل کر بیٹھا تھا۔ میں نے اپنی دونوں ٹانگیں دوسری طرف کھڑے ہونے والی جگہ کی طرف کر لیں۔ بس کے ہر جھٹکے اور ہر موڑ پر میں اپنے آپ کو اس طرح سکیڑ کے قابو میں رکھتا کہ کہیں میرے ساتھ بیٹھی ہوئی اس نوجوان سواری کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔

اگلے اسٹاپ پر جب بس سواریوں کے لئے کھڑی ہوئی تو فوجی سپاہیوں کا ایک ریلہ کا ریلہ بس میں سوار ہو گیا۔ انہوں نے کھڑے ہونے والی ساری جگہ بھر دی۔ بس میں اس قدر بھیڑ بھڑ کا ہو گیا کہ مجبوراً اپنی ٹانگیں مجھے اندر کر کے اپنی سیٹ کے سامنے کی طرف کر لینا پڑیں۔ اس طرح کرنے سے پہلے میں نے ایک نظر اس نوجوان لڑکی کی طرف دیکھا لیکن اس نے جتنی جگہ میری سیٹ کی گھیر رکھی تھی اس پر اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

اپنی دونوں ٹانگیں سیٹ کے سامنے کی جانب کر لینے کی وجہ سے میرا ایک طرف کا سارا جسم اس حسین ہمسفر کے جسم سے لگنا شروع ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو انتہائی طور پر سکیڑ لیا لیکن اس کے باوجود میرا بازو اس کے بازو سے چھو رہا تھا۔

میرا بازو اس کے بازو سے مسلسل چھو رہا تھا اور وہ لڑکی اسی طرح اپنی سیٹ سے زیادہ جگہ پر قبضہ جمائے ہوئے بے پروائی سے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا کوٹ اسی طرح پھیلا ہوا تھا اس کی شلوار کے پائنچے اسی طرح جگہ گھیرے ہوئے تھے۔ اس کے جوڑے میں ٹنگی ہوئی ادھ کھلی سنہری کلی ویسی کی ویسی۔ مجھے یوں لگ رہی تھی جیسے اڑ اڑ کر مجھے جھانک رہی ہو۔

بس چل پڑی۔

جب بس چلی تو ایک جھٹکے کے ساتھ میرا جسم میری اس نوجوان ہمسفر کے جسم سے چھو گیا۔ میں نے پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ لیکن میرا بازو اب بھی مسلسل اس کے بازو سے چھو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بازو کا وہ حصہ جو ساتھ والے بازو سے چھو رہا تھا گرم ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے ایسے احساس ہوا جیسے میرے بازو کا وہ حصہ جو ساتھ والے بازو سے چھو رہا تھا وہ دہک کر انگارہ بن گیا ہو۔ پھر کچھ دیر بعد مجھے ایسے لگا جیسے میرے بازو کے اس حصہ کا لہو ساتھ والے بازو سے نسوں اور رگوں میں آ جا رہا ہے۔

مجھے ایک جھرجھری سی آئی اور میری آنکھیں جیسے نشے میں بند ہو گئیں مگر پھر ایک پل کے پل میں 'میں نے اپنے آپکو سنبھال لیا بس چلی

جا رہی تھی۔

میرے دائیں طرف کھڑے ہونے والے فوجی سپاہی ایک دیوار بنے کھڑے تھے بس سواریوں سے بری طرح بھری ہوئی تھی تازہ ہوا کے لئے مجھے بائیں طرف بار بار کھڑکی کی طرف دیکھنا پڑتا تھا اور میرے بائیں طرف ہی میری وہ نوجوان ہمسفر بیٹھی ہوئی تھی۔ خاموش، بے حس و حرکت، ایک بت کی طرح۔

"یہ لڑکی کسی فوجی افسر کی بیوی معلوم ہوتی ہے۔"

کچھ دیر بعد میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

"صدر بازار سے بس میں سوار ہوئی ہو گی۔ صبح ہی صبح گھر کا سودا سلف خریدنے کیلئے دہلی جا رہی ہے۔ گھریلو ضروریات کی چیزیں تو اس کا شوہر لاتا ہو گا۔ یہ تو صبح کے وقت یوں بن سنور کے اپنے کسی دوست سے ملنے کے لئے جا رہی ہو گی۔ یا پھر اس کی لپ اسٹک ختم ہو گئی ہو گی۔ پوڈر ختم ہو گیا ہو گا دس سے لیکر ساڑھے بارہ بجے تک کناٹ پلیس حسین عورتوں سے بھرا رہتا ہے شوہروں کے دفتروں میں چلے جانے کے بعد دہلی کی نوجوان عورتیں ہرنیوں کی طرح قطاروں کی قطاروں میں گھومتی ہیں۔ کناٹ پلیس میں گھومتی گھومتی جب یہ تھک جائے گی تو کوکا کولا پیئے گی۔ اپنے شوہر کے لئے چیونگم اور اپنے بچے کیلئے لالی پاپ خرید لے گی۔ ایک ڈیڑھ بجے اس سے پہلے کہ اس کا شوہر گھر پہونچے یہ بس میں سوار ہو کر واپس گھر پہونچ جائے گی ـــ اس طرح یہ خوش۔ اس کا شوہر خوش، اس کا بچہ خوش، اور اس کا خدا خوش۔ اس کی زندگی کا ایک حسین دن اور کم ہو جائے گا۔"

میرے بازو کا وہ حصہ جو ابھی تک اس کے بازو سے چھو رہا تھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے من من بھر کا ہو گیا ہو، جیسے میرے بازو کا وہ حصہ درمیان کے کوٹوں اور قمیضوں کی پابندیاں دور کر چکا ہے، جیسے میرے بازو کا وہ حصہ ساتھ والے بازو سے جڑ گیا ہو۔

یکایک میں چونک پڑا جیسے میں کوئی بہت بڑا گناہ کر رہا تھا۔ جیسے میں بے انصافی کر رہا تھا اپنی بیوی سے، اپنے بچے سے، اپنے اخلاق سے، اور اپنے مذہب سے ـــ اس ٹھنڈی یخ صبح کے وقت میرا جسم پسینے سے تربتر ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری بیوی مجھے کوس رہی ہے۔ میرا بچہ جیسے میرے پاس کھڑا مجھے گھور رہا ہو۔

میرے سارے جسم پر بار بار ایک لرزہ سا طاری ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں بالکل سرد پڑ گیا ہوں۔

اب نہ تو میرا بازو میری ہمسفر کے بازو سے چھو رہا تھا اور نہ میرا کوٹ اس کے کوٹ سے ٹکرا رہا تھا۔ میری سیٹ پر جو جگہ تھی میں خود بخود سمٹ سمٹا کر اس پر بیٹھ گیا تھا۔

بس چلی جا رہی تھی۔

اگلے اسٹاپ پر تمام فوجی سپاہی بس سے اتر گئے۔ اب دوسری طرف ٹانگیں رکھنے کے لئے جگہ خالی ہو گئی تھی اور میں اس طرف ٹانگیں سرکا کے قدرے آرام اور سکون سے بیٹھ گیا۔

بس میں جب ہجوم کم ہوا تو چاروں طرف سے ہوا آنے لگی۔ گھٹن سے نجات پا کر مسافر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے اور دفتروں کے بابو اپنے ساتھ لائے ہوئے اخبارات پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

بس چلی جا رہی تھی۔

اگلے اسٹاپ سے ایک تیرہ چودہ سال کی معصوم لڑکی بس میں سوار ہو گئی کسی اسکول کی طالبہ معلوم ہوتی تھی اس نے ایک نظر بس میں چاروں طرف بیٹھے ہوئے مسافروں کی طرف دیکھا اور پھر ایک ہاتھ میں کتاب پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی میری سیٹ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے سوچا، ابھی کوئی مسافر اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس معصوم کو بیٹھنے کے لئے کہے گا مگر دفتروں کے تمام بابو اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہے۔ چھاؤنی کے کچھ دوکاندار بھی اس سے بے خبر اپنی باتوں میں لگے رہے۔ تمام مرد بیٹھے ہوئے تھے اور وہ شرم و حیا میں ڈوبی

ہوئی چپ چاپ کھڑی تھی۔
میرے دل نے کہا۔
"آخر تو اپنی سیٹ اس کے لئے خالی کیوں نہیں کر دیتا؟"
لیکن میں نے اپنے دل کی یہ بات جیسے سنی ان سنی کر دی بار بار میرا دل مجھے غیرت دلا رہا تھا اور بار بار میں اسے ایسے نظرانداز کر رہا تھا جیسے مجھے کسی کا انتظار ہو' جیسے مجھے کوئی لالچ ہو' یا جیسے مجھے کوئی لطف آ رہا ہو۔ میں بے شرم بن کر بار بار اندر کے اشارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا۔
تھوڑی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ بیٹھی ہوئی میری ہمسفر مجھے دیکھ رہی ہے۔ دیکھے جا رہی ہے۔ دیکھے جا رہی ہے میں نے جلدی سے سر گھما کر دیکھا تو واقعی وہ مجھے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔
بس چلی جا رہی تھی۔ فرفر تازہ اور صاف ہوا آ رہی تھی۔ مسافروں کی باتیں اور آوازیں زیادہ بلند ہو رہی تھیں۔
میں نے ایک نظر اپنی ہمسفر پر ڈالی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میری نظریں اچک اچک کر بار بار اس کی طرح جا رہی تھیں۔
میں نے دیکھا۔۔۔ اس کی کریم رنگ کی ریشمی قمیض کی کالی کناری ایک جگہ سے ادھڑ چکی تھی اور جو حصہ ادھڑا ہوا تھا اسے ہاتھ سے سی دیا گیا تھا۔ ہاتھ سے سیتے وقت کالے دھاگے کی جگہ نیلا دھاگہ استعمال کیا گیا تھا جو دوسرے دھاگے سے صاف الگ نظر آ رہا تھا۔
میں نے دیکھا۔۔۔ اس کے پاؤں کے ناخنوں پر لگی ہوئی سرخ پالش کہیں لگی ہوئی تھی اور کہیں سے اتری ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں کی انگلیاں موٹی موٹی اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ اتنی گوری نہیں تھی جتنا کہ انگلیوں کی مالکہ کا چہرہ اور انگ انگ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنا ایک پاؤں قدرے ٹیڑھا رکھا ہوا تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ اس کے پاؤں کی ایڑیاں پھٹی ہوئی تھیں ایک لمبی عمر تک ننگے پاؤں گھر کا کام کاج کرتے رہنے کی وجہ سے ہندو عورتوں کی ایڑیاں پھٹ جاتی ہیں۔
میں نے دیکھا۔۔۔ اس کی شلوار کے ایک پائنچے پر بالکل سامنے کی طرف کیچڑ کا ایک داغ تھا۔ کیچڑ سوکھ کر مٹی جھڑ گئی تھی لیکن اس کے داغ کا نشان باقی تھا۔ شلوار کے دوسرا پائنچہ نیچے سے گھسا ہوا تھا شاید چلتے میں پاؤں تلے آ کر ایسا ہو گیا تھا۔ قمیض کے اگلے حصے پر دو چار سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں جو تازہ معلوم نہیں ہوتی تھیں۔۔۔ اور مجھے اپنی ایک حسین دوست یاد آ گئی جو کسی لباس کو چاہے چند لمحوں کے لئے ہی پہنے مگر دوسری بار استری کئے بغیر ہاتھ نہیں لگاتی۔
میں نے دیکھا۔۔۔ اس کے بالوں میں جگہ جگہ ہئیں لگی ہوئی تھیں یہ ہئیں بالوں کے نیچے کرنے کے لئے' بالوں کو اوپر کرنے کے لئے بالوں کو ٹیڑھا کرنے کے لئے اور بالوں کو دوہرا کرنے کیلئے لگی ہوئی تھیں۔ سر کے پچھلی طرف ان کا جوڑا اتنا بڑا اور بھاری تھا لیکن اس پر بھی اس نے اپنے سیاہ بالوں میں ایک کالا چٹلا لپٹا ہوا تھا۔
میں نے دیکھا۔۔ اس کے چہرے پر کریم کی ایک ہلکی سی تہہ تھی جس پر پوڈر اور سرخی لگی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک قدرے زیادہ ہی شوخ نظر آ رہی تھی۔ لبوں پر جہاں جہاں اس کی زبان لگ چکی تھی وہاں لپ اسٹک ذرا مدھم پڑ گئی تھی۔
میں نے دیکھا۔۔ اس کے کانوں میں کانٹے تھے۔ کانٹے قدرے بڑے تھے۔ اس کے چہرے پر کانٹے اس سے ذرا چھوٹے ہونا چاہیے تھے۔
جوں جوں میں اپنی ہمسفر کو اور زیادہ دیکھتا میرے منہ کا ذائقہ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔ میرا دل ہشمان سا ہو رہا تھا اور میری آنکھوں کا نشہ جیسے اتر اتر سا محسوس ہو رہا تھا۔
بس چلی جا رہی تھی۔
اخبارات پڑھنے والے مسافر کئی کئی صفحات الٹ چکے تھے۔ آپس میں باتیں کرنے والے اور زیادہ اونچی آواز میں بول رہے تھے۔

جب بس اگلے اسٹاپ پر رکی تو ایک عورت سوار ہو کر ہمارے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کسی مزدور کی بیوی معلوم ہو رہی تھی۔ یکایک میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی سیٹ اس عورت کے لئے خالی کر دی۔ میں اب کھڑا تھا ایک دو اور مسافر بھی کھڑے ہونے والے آگئے تھے۔

بس چلی پڑی۔

اگلے اسٹاپ سے اور سواریاں آ گئیں اور کھڑے ہونے کی جگہ پھر سے بھر گئی۔ اخبار پڑھنے والوں نے اپنے پرچے رکھ دیئے اور باتیں کرنے والوں کی باتیں دھیمی ہو گئیں۔

بس چلی جا رہی تھی۔

میں کھڑے کھڑے بس کے اگلے حصے میں چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے گھوم کر اپنی سیٹ کی طرف دیکھا تو اس پر مزدور عورت بڑے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی اور مزدور عورت کے ساتھ میری ہمسفر اسی طرح کسی بت کی مانند خاموش اور بے پروا بیٹھی خوشبو بکھیر رہی تھی۔

میں نے پھر دیکھا۔ مجھے ادھر سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی اس کے کوٹ کا ہلکا نیلا رنگ اسکے چہرے کو اور رونق بخش رہا تھا۔ اس کے یاقوتی لبوں پر مسکراہٹ جیسے جم چکی تھی۔ اس کے گالوں پر شگفتگی ناچ رہی تھی۔ اس کی سوئی سوئی اداس آنکھوں میں لاکھوں جادو چھپے ہوئے تھے۔ اس کے بال، اس کا جوڑا، اس کا ماتھا، اس کی ناک، اس کے چہرے کے خدوخال یوں تھے جیسے اجنتا کے کسی بت کے ہوں۔ اب اس کے کانوں میں کانٹے بڑے نہیں معلوم ہو رہے تھے بالکل اتنے ہی تھے جتنا انہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ اس کے گول چہرے کو لمبا کر رہے تھے۔ بس چلی جا رہی تھی۔ میں نے پھر گھوم کر دیکھا۔۔ کریم رنگ کے سوٹ میں وہ لڑکی مجھے یوں لگی جیسے عرش سے کوئی پری اتر آئی ہو جیسے سندر سپنا حقیقت بن گیا ہو۔ بس چلی جا رہی تھی۔ کھڑکی سے دھوپ کی ایک کرن اس حسین ہمسفر کے چہرے پر آ کر گرنے لگی موسم سرما کی صبح کی ہلکی تپش والی دھوپ۔ ایک دم ایسے لگا جیسے وہ ساری کی ساری کھل گئی ہو۔

بس اس اسٹاپ پر پہنچ چکی تھی جہاں مجھے اترنا تھا۔ میں نے اس پری کی طرف دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ کومل، نازک اور سندر۔ وہ مجھے یوں لگ رہی تھی جیسے کوئی نہایت پیارا پھول نازک پتیوں میں مہک رہا ہو۔ کسی باغ کا کوئی حسین پھول جس کے پاس بورڈ پر لکھا ہوا۔

"پھول توڑنا منع ہے۔"

○

شمشیر سنگھ نرولا

نام : شمشیر سنگھ۔
قلمی نام : شمشیر سنگھ نرولا۔
پیدائش : ۱۵ نومبر ۱۹۱۵ء بہ مقام امرتسر، پنجاب، بھارت۔ (۱)
تعلیم : بی۔اے۔ خالصہ کالج امرتسر ۱۹۳۵ء
میٹرک کا امتحان ۱۹۳۱ء میں پاس کیا تھا۔

مختصر حالاتِ زندگی:

امرتسر پنجاب کے ایک اوسط درجہ کے سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن اور لڑکپن میں والدین کی بے توجہی کا شکار ہوئے، طبیعت انوکھے پن کی طرف مائل تھی اس لیے کونین کی کڑواہٹ کو شہد تصور کر کے چاٹا، کواڑ کی چولوں میں انگلیاں دبا کر کواڑ کو زور سے بھیڑنے کی اذیت میں راحت پائی۔ بچپن میں ایک بار سڑک پر سے سو روپے کا نوٹ پڑا ملا تھا، جسے اٹھایا اور سات روز ذہنی الجھن کا شکار رہنے کے بعد وہیں رکھ آئے۔ صحت بہت اچھی پائی تھی اس لیے بچپن، لڑکپن اور جوانی میں کبھی بیمار نہیں پڑے۔ ساری زندگی کم کھایا اور کم سوئے۔ ہر ایک کی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت کا مشاہدہ کرنا واحد سامان تفریح رہا۔ کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ تاش کھیلی، ریڈیو سنا یا سینما دیکھا۔ انتہا درجہ کے تنہائی پسند اور مردم بے زار رہے۔

۱۹۳۵ء کے بعد سے متعدد اداروں اور اخبارات سے منسلک رہے۔ فطری طور پر ترقی پسند واقع ہوئے تھے سو انجمن ترقی پسند مصنفین کی فرنٹ لائین میں رہے۔ پہلا اردو افسانہ "ساقی" دہلی ۱۹۴۲ء میں اور پہلا ہندی افسانہ "ہنس" بنارس ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ جنسی یا جسمانی بھوک، بے کاری یا کسی عزیز کی موت کے باعث ادب کی طرف نہیں آئے بلکہ شروع سے ادب کے ذریعے قومی اور انسانی مسائل میں دلچسپی رہی۔ بقول ان کے "مجھے دوام کے لیے لافانی ادب لکھنے کی خواہش نہیں۔ میں اسی ایک ثانیہ کے لیے، اپنے وطن عزیز کے اس فیصلہ کن لمحہ کے لیے لکھ رہا ہوں۔ وطن پہلی اور واحد محبت ہے اور ادب اس کے ایفا کا ایک ذریعہ۔" (۲)

کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو میں لکھنا ترک کر دیا، جس کی واحد وجہ یہ رہی کہ ۱۹۴۷ء میں "ایک ہنگھری کی تیز دھار" کے عنوان سے اردو ناول لکھا جسے شائع کرنے کے لیے کوئی پبلشر نہ مل سکا۔ واضح رہے کہ یہ وہی ناول ہے جس کے بارے میں سید سجاد ظہیر نے اپنے ایک طویل ریویو میں لکھا تھا کہ "اگر ہندوستان میں فرقہ واریت کے خلاف معنی خیز جنگ لڑی جاتی ہے تو اس ناول کو لاکھوں کی تعداد میں بانٹا جانا چاہیے۔" ۱۹۴۸ء میں پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازمت اختیار کی اور وہاں سے ۱۹۷۳ء میں بطور انفارمیشن آفیسر ریٹائر ہوئے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"ساقی" دہلی ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	"جالے" (اردو افسانے)	ساقی بک ڈپو، دہلی	طبع اول: ۱۹۳۶ء
۲۔	"ایک ہنکھڑی کی تیز دھار" (ہندی ناول)	لوک کمل پرکاشن، دہلی	طبع اول: ۱۹۴۹ء
۳۔	"اندھیرے میں بھٹکتی کرن" (ہندی ناول)	لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد	طبع اول: ۱۹۷۳ء
۴۔	"آدھی رات کا سورج" (افسانے / ہندی)		
۵۔	"ہندی زبان کی سائنسی تواریخ" (ہندی) یہ کتاب انگریزی میں بھی شائع ہو چکی ہے۔		طبع اول: ۱۹۵۰ء
۶۔	"ہندوستانی لسانیات کا سماجی پس منظر" (ہندی)	لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد	طبع اول: ۱۹۷۴ء
۷۔	"تصنیف ناول کے مسائل" (ہندی)	لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد	طبع اول: ۱۹۷۶ء
۸۔	"ہندوستانی فلسفہ"		
۹۔	"ہندوستانی دیو مالا"		

غیر مدون:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ اردو افسانوں کا ایک مجموعہ "بے زبان" کے عنوان سے شاہد احمد دہلوی "ساقی" بک ڈپو، دہلی سے شائع کرنا چاہتے تھے، جس کا مسودہ شمشیر سنگھ نرولا نے ۹ جنوری ۱۹۴۷ء کو ان کے حوالے کیا۔ شاہد صاحب کراچی، پاکستان ہجرت کر آئے اور اس کے بعد اس مجموعے کی کوئی خبر نہ ملی۔

نیز ہندوستانی لسانیات سے متعلق ایک کتاب بہ عنوان "ہندی اور علاقائی زبانوں کی تواریخ" انگریزی اور ہندی میں اشاعت کی منتظر ہے۔

مستقل پتا:

۳۔ نوجیون وہار۔ نئی دہلی ۱۷، بھارت۔

نظریہ فن:

"میں افسانہ کو جدوجہد، تغیر و تبدل اور عوامی بیداری کا آلہ کار مانتا ہوں۔ افسانہ برائے زندگی، ایک بہت مبہم نعرہ ہے، جس کی وجہ سے ترقی پسند ادب ہر قسم کے لاابالی پن کو پناہ دیتا رہا۔ حاضر میں افسانہ اور ناول عوامی وقار اور انسانی مستقبل کو، جو پاؤں تلے روندے جا رہے ہیں، برقرار اور سرفراز کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ افسانہ روحانی پختگی پر اس وقت پہنچ پاتا ہے جب مثبت اقدار کا اظہار کرتا ہے اور تکنیکی پختگی

پر اس وقت' جب اس میں ایسے کیریکٹروں کی تخلیق کی جاتی ہے جو ان مثبت انسان دوست اقدار کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اگر اردو افسانہ نے ہندوستان پاکستان کی تمدنی زندگی میں فیصلہ کن رول ادا کرنا ہے تو اسے موجودہ ڈھرے سے نکل کر اپنے اپنے ملک کے غریب ترین اور پست ترین لوگوں کے احساسات کو زبان دینی ہو گی۔ ان بے زبان لوگوں کو صاحب زبان بنانا ہی اس وقت کا سب سے اہم فرض ہے اور اس کے بغیر ہمارے دونوں ملکوں کا مستقبل تاریک ہے۔"

شمشیر سنگھ نرولا

(بحوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مرقومہ ۱۱ ستمبر ۱۹۸۵ء)

○

(۱) "ستاروں کی محفل" مرتبہ: بشیر ہندی میں تاریخ پیدائش ۱۹۲۱ء درج ہے' جو درست نہیں۔
(۲) ستاروں کی محفل" مرتبہ: بشیر ہندی صفحہ ۱۰۹ مرقومہ ۱۹۳۶ء

شمشیر سنگھ نرولا

گئوہتیا

جب ستیل پرشاد دیساتی اکے میں ہچکولے کھاتا اپنے گاؤں کے قریب پہنچا تو تھکی ماندی شام اس طرف رینگ رہی تھی۔ وہاں کے بے حواس کتے بے دھڑک طریقے سے اس پر بھونک رہے تھے۔

وہ اکے سے اتر پڑا۔ سڑک پر بہت بڑا گڑھا جماہی لے رہا تھا اور اکا آگے نہیں جا سکتا تھا۔ وہ سڑک ہندوستان کی بیشتر سڑکوں کی طرح فٹ دو فٹ ریت اور مٹی کا ناہموار دشوار گزار راستہ تھی، جو برسات میں کیچڑ اور دلدل کی اچھی خاصی بدرو بن جاتی تھی۔ انہی خندقوں نے ہندوستانی دیہات کو دنیا کے مدوجزر سے علیحدہ کر کے وہاں کی زندگی کو ساکت اور غیر متبدل بنا دیا ہے۔

ستیل نے گڑھا پھلانگا اور گرد سے بھرے بال اور کپڑے جھاڑتا اور بار بار کھنکار کر مٹی سے اٹے سینے اور حلق کو صاف کرتا گاؤں کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ روشنی سے ڈری سہمی درختوں سے لٹکتی ہوئی چمگادڑوں نے سرمئی فضا کے دھول بھرے دھندلکے میں تیرنا اور ڈبکیاں لگانا شروع کر دیا تھا۔ مٹی کی بنی ہوئی گز دو گز اونچی جھونپڑیوں میں سلگتے ہوئے اپلوں کا دھواں بڑی سستی سے آسمانوں کی طرف کروٹیں لے رہا تھا۔ بعید الفہم خیالات ننھی ننھی سرسراہٹوں کی طرح ستیل کے دماغ میں رینگ کر اسے پریشان کر رہے تھے۔

چرواہے سوکھی سہمی گایوں کو جنگل سے واپس لا رہے تھے۔ جسے وہ لوگ جنگل کہتے تھے وہ بنجر بیاباں چٹیل زمین تھی۔ جس پر برسات میں تھوڑی سی گھاس اگ آتی جو ایک ماہ میں ہی ختم ہو جاتی۔ اس کے بعد تمام گلہ پیاس اور خشکی سے پھٹی ہوئی زمین کی دراڑوں میں مٹی اور موتھے کے ٹیلوں کے نیچے گھاس کی پتیاں یا جھاڑیاں تلاش کرتا پھرتا، اس خوراک سے انہیں جتنی قوت میسر ہوتی اس سے زیادہ اس کی تلاش میں خرچ ہو جاتی۔ ان کی پر قناعت آنکھوں کی گہری تہوں میں مدتوں کی بھوک چھپی ہوئی تھی۔ ان میں سے بہت سی گائیں صرف ڈھانچے ہی تھیں۔ جن کی بے ڈھب ہڈیاں، پتلی بے گوشت کھال میں سے بھیانک اور گھناونے طریقے سے جھانک رہی تھیں۔ تقریباً تمام کے جسم میں گھر کئے ہوئے زخم اور ناسور انہیں بیزار کر رہے تھے۔ ان پر مکھیوں کے ہجوم بھنبھنا رہے تھے۔ ان گئوپالوں نے کبھی بھی مویشیوں کے لئے چارہ نہیں بویا تھا۔ ان کے اپنے اناج کے لئے ہی زمین کافی نہیں تھی۔ عموماً ان گائیوں کی کوئی پروا نہ کی جاتی تھی کیونکہ ان میں سے بہت سی کئی برس ہوئے پاؤ آدھ پاؤ دودھ دے کر سوکھ چکی تھیں۔ یہ ہندوستان کی عام گائیں تھیں۔

چند بچھڑے گلے سے ہم قدم نہ رہ سکتے ہوئے ننھی کانپتی ٹانگوں سے اس کے پیچھے لڑکھڑا رہے تھے۔ ان کی سوکھی نرم ٹانگیں بڑی مشکل سے آگے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ رات کو انہیں جھونپڑیوں سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ ماؤں کا دودھ چوس کر اس پاؤ ڈیڑھ پاؤ دودھ کی دولت کو اور بھی کم نہ کر دیں۔ بھوک جنگل میں گھومنے کی تھکان یا رات کی سردی کی وجہ سے جب وہ زندگی کی تکلیفوں سے نجات حاصل کر لیتے تو ان کی کھال ادھیڑ کر اس میں گھاس پھونس بھر دیا جاتا۔ ٹانگوں کے نیچے چار چھڑیاں لگا دی جاتیں اور دودھ دوہتے وقت اسے گائے کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا تاکہ مامتا سے مجبور ہو کر وہ دودھ دیتی رہے۔

سب سے پیچھے گاؤں کی بوڑھی گائے لرزتی، ڈگمگاتی، لڑکھڑاتی بڑھے جا رہی تھی بھورا کسیلا رنگ، مریل دبلی ٹانگیں، سکڑی بھچی ہوئی دکھتی آنکھیں، ڈھیلے بوڑھے پپوٹے کناروں کے قریب سے پراسرار مگر سنجیدہ طور پہلو پر کی طرف اٹھے ہوئے جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہو۔

اس کی ہڈیاں بڑی سنگدلی سے گوشت کھال چیر کر باہر نکل رہی تھیں۔ ہر ایک ابھری ہوئی ہڈی کے کنارے دوسری ہڈیوں کے سائے میں سے دردناک طریقے سے جھانک رہے تھے۔ اس کے جسم پر بہت سے زخم پھوڑے اور پھنسیاں تھیں۔ ایک کوا کولھے کی ہڈی پر بیٹھا ایک گہرے زخم میں چونچ مار رہا تھا۔ ایک اور کوا کائیں کائیں کرتا ہوا اردگرد منڈلا رہا تھا۔ چرواہوں کے تیز چلانے کے لئے ہلانے مروڑنے سے اس کی دم کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ اس لئے وہ کوے کو اڑانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ سنیل اس بوڑھی گائے کی طرف بڑھا۔ درد سے اس کی بھوری پلکیں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ دانت کپکپا رہے تھے۔ اس نے ہونٹوں کو اوپر اٹھایا اور کپکپائی ہوئی آنکھوں سے سنیل کو دیکھا۔ سنیل نے مٹی کی دو مٹھیاں بھر کر اس کے زخموں پر بکھیر دیں اور جلد جلد گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔

مائی شنکری بھی اس وقت گاؤں میں داخل ہو رہی تھی۔ دو سال ہوئے جب وہ ہردوار کنبھ پر گنگا اشنان کے لئے گئی تھی تو اس کا اکلوتا لڑکا پاگل کتے کے کاٹنے سے مر گیا تھا۔ رات کو اردگرد کے اجاڑ بیابان سے گیدڑ آ جاتے اور ساری رات ان کی گاؤں کے آوارہ کتوں سے لڑنے کی آوازیں سنائی دیتی رہتیں۔ کئی مرتبہ پاگل گیدڑ کتوں کو کاٹ جاتے اور ہر سال دو تین درجن آدمی عورتیں بچے ان دیوانے کتوں کا شکار ہو جاتے۔ ان بیمار فاقہ زدہ کتوں کو مروایا نہ جا سکتا تھا کیونکہ وہ جیوہتیا کے پاپ کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بہت کوشش کے باوجود سنیل گاؤں والوں کو سمجھانے میں ناکام رہا۔

بیٹے کی موت مائی شنکری کے لئے بہت صبر آزما ثابت ہوئی۔ وہ پاگل سی ہو گئی تھی۔ جب کبھی عورتوں کو پنگھٹ کی طرف پانی بھرنے جاتے دیکھتی تو دمے کی کھانسی سے اٹکتی ہوئی آواز میں چلانے لگ جاتی "بیٹیو اپنے بچوں کو گھر اکیلے مت چھوڑ جاؤ"۔ گائیوں سے پوچھتی پھرتی کہ وہ بچھڑوں کو اکیلے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہیں۔ سارا دن کھیتوں میں چڑیوں کے پیچھے لڑکھڑاتی پھرتی اور ان سے التجا کرتی کہ وہ اپنے بچوں کو اکیلا نہ چھوڑیں۔ اس کے سر کے بال جھڑ چکے تھے۔ اس کا سکڑا ہوا چہرہ جھریوں سے بھر آیا تھا اس کی پرچھائیوں میں چھپی ہوئی غیر متحرک آنکھیں حلقوں میں ڈگر ڈگر کرتی رہتی تھیں اور لبوں کے کونے بڑے اجڑن طریقے سے نیچے کی طرف لٹک رہے تھے۔ سنیل کو دیکھ کر مائی شنکری کے پھٹے سوکھے لبوں میں مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر کھنچ جاتی لیکن اسے یہ مرجھائی ہوئی مسکراہٹ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش معلوم ہوتی۔

گاؤں کے شروع میں ٹھاکر دوارہ تھا۔ جس کے برابر میں مولسری کے درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھا وہاں کا زمیندار حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کے حواری اور خوشامدی اردگرد بیٹھے چرس اور گانجے کے دم لگا رہے تھے۔ حسب معمول لغو باتیں ہو رہی تھیں۔ ٹھاکر دوارے کی پکی دیواریں ناقوس اور سنکھ کی پرشور آوازوں سے گونج رہی تھیں۔ شام کی آرتی ہو رہی تھی اور مندر کے پجاری "اوم جے جگدیش ہرے" چلا رہے تھے۔ پچھلی طرف بڑ کا بوڑھا درخت کمر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے نیچے مندر کے ناکارہ سانڈ زمین پر لیٹے مٹی سے جسم رگڑ رہے تھے۔ جب بھی کسی کو سر پر آئی بلا کے لئے اپائے کرنا ہوتا یا ایشور سے کوئی سفارش کرنا ہوتی تو مندر کو ایک بیل دان کرنے کا وعدہ کرتا اور مراد بر آنے پر سستے سے سستا بیل لا کر مندر پر چڑھا دیتا۔ وہ بیمار کمزور بیل گایوں کی نسل خراب کرتے پھرتے۔ اب وہ بنارس سے اچھی نسل کے بیل کا انتظام کر کے آ رہا تھا۔ پچھلے برس گنیش چودس کے تہوار پر وہاں کے ڈیری فارم والوں نے گائیاں بیاہنے کے لئے لاتا تھا۔

سنیل ٹھاکر دوارہ سے آگے بڑھا۔ مندر کے کنوئیں پر عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ اس نے ان کے پیلے 'جوانی کی صحت سے نا آشنا چہروں کی طرف دیکھا۔ ان کو دیکھ کر اس کے دل میں ہمیشہ ایک ہوک سی اٹھتی اور وہ سوچنے لگ جاتا کہ ان بدنصیب عورتوں کے لئے کبھی جوانی آتی ہی نہیں۔ بچپن 'پھر لڑکپن کے بعد فوراً بڑھاپا اور اکثر اس سے پہلے ہی موت۔

کوئیں کی چرکھی کی کھڑکھڑ۔ ڈول کا دھڑم سے کوئیں میں گرنے کا دھماکا اور پھر اس کے اوپر کھینچے جانے کی چوں چوں اب اس کے لئے مانوس آوازیں بن چکی تھیں۔ حسب معمول پانی بھر رہی عورت دائیں ٹانگ کوئیں میں بڑھا کر میلے کیچڑ آلودہ پیر سے رسے کو چرکھی پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈول کے شکستہ پیندے میں کئی سوراخ تھے اور اوپر نکلنے تک اس کا پانی آدھے سے کم رہ جاتا۔

آدھی درجن کے قریب لڑکے لڑکیاں جو ماؤں کے ساتھ کوئیں تک آئے تھے۔ ایک دوسرے کے کرتوں کا پچھلا حصہ پکڑے چھک چھک

کرتے ہوئے ریل گاڑی کھینچ رہے تھے۔ قریب ہی ایک پانچ چھ سال کی لڑکی گائے بھینسوں کے پانی پینے والے حوض میں ڈبکیاں لگا رہی تھی۔ چند لڑکے بکریوں کی سوکھی ہوئی مینگنیاں اکٹھی کر کے ایک دوسرے پر اڑا رہے تھے۔
سنیل کا گھر گاؤں کے دوسرے کنارے پر تھا۔ تکان کی وجہ سے اس کی رفتار معمول سے کم تھی۔ راستہ میں کئی جگہ گوبر کے ڈھیر سڑک روکے ہوئے تھے۔ جن پر سے مکھیاں اڑ کر چند سیکنڈوں کے لئے اس کے گرد ہو جاتیں اور وہ سٹ پٹا کر قدم تیز کر دیتا۔ چندو ایک جھونپڑی کے ساتھ پیشاب کر کے بے احتیاطی سے سامنے کی طرف تھوکتا 'اسے رام رام کہتا ہوا' قریب سے گزر گیا۔ آگے راستہ میں ایک کھٹیا کے پائے پر دیا جل رہا تھا۔ برابر میں منگل کی بہو بیٹھی اپلوں کے لئے گوبر سنوارتے ہوئے اس زور سے ہاتھ مار رہی تھی کہ دور دور تک چھینٹیں اڑ رہی تھیں۔

منگت رام کی دکان جو سنیل کے گھر کے قریب ہی تھی بند ہو چکی تھی۔ بہت سے کتے دکان کے آگے کھڑے ہوئے خالی سکرے اور دہی چٹنی کے پتے چاٹ رہے تھے اور ایک دوسرے پر بھونک رہے تھے۔ سنیل کو دیکھ کر انہوں نے بھونکنا اور لڑنا بند کر دیا۔
کئی کتے اگلی ٹانگ اٹھا کر ادھڑی ہوئی کھال کھجانے لگے۔ کئی تھوتھنی پر بھنبھناتی ہوئی مکھیوں پر منہ مارنے لگے۔ ایک کتا دم ٹانگوں میں دبا کر بیٹھ گیا۔ ان کی سرخ بے بال چمڑی زخموں اور بیماریوں سے گل چکی تھی۔ جس میں سے فاقہ زدہ ہڈیاں اس طرح جھانک رہی تھیں جیسے مظلوم ظالم کی طرف دیکھ رہا ہو۔ یہ کتے دوزخی انسانوں کی ملعون پرچھائیوں کی طرح اپنے کوڑھی جسم لئے ادھر ادھر رینگتے سارا دن گلیوں اور کھیتوں میں غلاظت چاٹتے پھرتے اور خشمگیں غیرحیوانی آنکھوں سے ہر ایک کو گھورتے رہتے۔ وہ شام کو بلا ناغہ اس دوکان کے آگے آ اکٹھے ہوتے اور ساری رات لڑائی اور عف عف سے بلڑ مچائے رکھتے۔
منگت رام کی دوکان کی بائیں طرف بیری کے درخت کے نیچے ایک سپید گائے لیٹی ہوئی تھی۔ ڈیڑھ سال ہوا جب منگت رام کی ماں مرنے لگی تو اس نے گئودان کی خواہش ظاہر کی۔ وہ فوراً شہر جا کر گئوشالہ سے یہ گائے خرید لایا۔ پھوکا کرنے سے وہ کئی برس سے خشک ہو چکی تھی۔ اس کی ٹانگوں کے نچلے حصے کٹے ہوئے تھے۔ جنہیں غالباً کسی دوسری گائے کی ٹانگوں سے پیوند دیا گیا تھا۔ تاکہ وہ غیر قدرتی عجوبہ بن کر نمائش کے لئے زیادہ متبرک ہو جائے۔ اس وجہ سے منگت رام کو گائے بہت سستے داموں مل گئی تھی۔ براہمن کو رسمی طور پر دان کرنے کے بعد اسے یہاں لٹا دیا گیا تھا اور وہ درخت سے گرے پتے کھا کر زندہ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دو ہفتوں سے اس کی گردن پر چیچڑی چمٹی ہوئی تھی۔ جو اب بہت پھیل چکی تھی۔ اسے گائے کے دل تک پہنچنے میں ابھی چھ سات روز اور تھے۔ جب جیسا کہ منگت رام کہتا تھا۔ وہ قدرتی موت مر جائے گی۔ سنیل اس کے لئے شہر سے مرہم لایا تھا۔ گائے کے قریب جا کر چیچڑیاں ٹٹول ٹٹول کر وہ مرہم لگانے لگا۔
جب سنیل گھر پہنچا تو مختلف قسم کے خیالات اسے اپنا تعاقب کرتے جان پڑ رہے تھے۔ پچھلے چند مہینوں کی یادیں دائرہ نما سائے بن کر اس کی آنکھوں کے آگے پھیل سکڑ رہی تھیں۔ اسے اس گاؤں میں آئے پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تو سوچا کرتا تھا کہ ہندوستان میں سات لاکھ گاؤں ہیں۔ اگر سات لاکھ نوجوان ان کی بہتری اور بہبودی کے لئے زندگی وقف کر دیں تو دس سال میں ہی اس بدنصیب ملک کی کایا پلٹی جا سکتی ہے۔ وہ ایک ایسا ہی نوجوان بننا چاہتا تھا۔ کالج کی تعلیم کے بعد وہ اس گاؤں بھنجاد میں جو بالیا ریلوے اسٹیشن سے بائیس میل جنوب مغرب کی طرف تھا تین بیگھ زمین واہی پر لے کر آباد ہو گیا تھا۔
گاؤں کی حالت 'اس کے اندازہ سے بھی خراب نکلی۔ یہ ہندوستان کے دیگر دیہات کی طرح کیچڑ اور گوبر کی بنی ہوئی چھوٹی بے ڈھب جھونپڑیوں کا جمگھٹا تھا۔ جھونپڑیاں بنانے کے لئے مٹی ایک ہی جگہ سے کھودی گئی تھی جہاں بہت بڑا گڑھا ہو گیا تھا جو برسات میں اچھا خاصا جوہڑ بن جاتا۔ آہستہ آہستہ سوکھ کر اس کا پانی گاڑھا ہوتا جاتا۔ مویشی اسی میں نہاتے گاؤں کی نیچ جاتیوں کے لوگ اسی سے پینے اور نہانے کے لئے پانی لیتے اور اسی میں برہا اور کپڑے صاف کرتے۔ اس جوہڑ پر ہر موسم میں مچھر چھاؤنیاں لگی رہتی تھیں 'جو رات کے وقت لوگوں کو پل بھر کے لئے بھی چین نہ لینے دیتے تھے۔ ہر سال درجنوں جانیں ملیریا کا شکار ہو جاتیں اور موسمی بخار کا ایک آدھ حملہ ہر ایک کو مہینوں کے لئے ناکارہ

ٹا جاتا۔ سال دو سال بعد چیچک اور ہیضہ بھی رہی سہی کسر پوری کر دیتے۔

جھونپڑیاں بالکل کچی تھیں۔ پوال یا کھپریل سے ڈھانپی ہوئی مٹی کے بے جان دیواریں بارش ذرا زیادہ ہوئی تو یہ دیواریں بیٹھ جاتیں ورنہ چھتیں ضرور ٹپکنے لگتیں اور وہ چھت سے ٹپکتے پانی سے بچنے کے لئے کھاٹوں کو ایک کونے سے دوسرے کونے میں گھسیٹتے پھرتے۔ جاڑے کی راتیں یہ نیم برہنہ لوگ اپلوں کے الاؤ میں سکڑ سکڑ کر گزار دیتے۔ جب مئی اور جون میں آندھیاں اور جھکڑ چلتے تو پوال کی ہلکی چھتیں اڑ کر کئی کئی میل دور جا گرتیں اور وہ بغیر کسی پناہ کے رہ جاتے۔ جھونپڑیوں میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ چولھے کا دھواں اندر ہی چکر کاٹتا رہتا۔ لالٹین تو کیا مٹی کے تیل کے معمولی سے لیمپ بھی ان کی قسمت میں نہیں تھے۔ کڑوے تیل کے دیئے سے نکلتی ہوئی کالی سنپولیاں ہوا کو ڈس ڈس کر زہر بنایا کرتی تھیں۔ کسی بھی گھر میں پاخانہ نہ تھا۔ بچے گلیوں میں بیٹھ لیتے۔ مرد اور عورتیں باہر کھیتوں میں چلے جاتے۔ اس غلاظت کی وجہ سے کروڑوں مکھیاں، کیڑے مکوڑے اور دیگر حشرات الارض اتنا کہرام مچائے ہوئے تھے۔ کہ جینا دوبھر تھا۔ ہر طرف گندگی اور گرد تھی اور لوگوں کے دلوں میں اس سے بھی متعفن جہالت پڑی سڑ رہی تھی۔ ہندوستان میں پھولوں کے سوا ہر چیز بودار ہے۔

گاؤں میں آتے ہی سنیل وہاں کے سدھار میں تن دہی سے مشغول ہو گیا۔ بچوں کے لئے پاٹھ شالہ کھولی۔ اچھوتوں کے لئے پانی کا پمپ لگوایا۔ گلیوں میں موریاں کھدوائیں اور گندے پانی کے جوہڑ کی بجائے کھیتوں کی طرف جانے کا انتظام کیا۔ فصل کے اچھے بیج منگوائے۔ گاؤں کے پرانے ہل مشکل سے زمین کرید سکتے تھے۔ اس نے کسانوں کے باری باری استعمال کے لئے ایک درجن بڑھیا ہل بنوائے اور گاؤں کی زندگی کو ہر پہلو میں بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اسے اس کام میں بہت مشکلیں پیش آ رہی تھیں۔ لیکن وہ کسی کی خوشی یا ناراضگی کا خیال کئے بغیر اپنی دھن میں لگا ہوا تھا۔

گاؤں کا سب سے پیچیدہ مسئلہ وہاں کی گائیں تھیں۔ ایک سو ستر کے گلہ میں سے سو سے زائد تو سوکھی تھیں باقی صرف پاؤ ڈیڑھ دودھ دیتی تھیں۔ جو گاؤں والوں کی ضرورت کے لئے ناکافی تھا۔ رات کو یہ گائیں فصلیں خراب کرتی پھرتیں اور دن بھر باہر اجاڑ میں گھاس کی پتیوں کی تلاش میں گزار دیتیں۔ ان کے چارہ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ سنیل نے لوگوں کو چارہ بونے کی ترغیب دی اور خود مصری کلوور کی پت پتیاں گھاس منگوا کر اپنی زمین میں بوئی۔ وہ ایک دس سیر دودھ دینے والی گائے بھی خرید لایا تھا جس سے وہ اپنے اسکول کے بچوں کو دودھ پلایا کرتا تھا اور وہ گاؤں کی گایوں کی نسل کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

صبح اندھیرے سنیل آس پاس کے دیہات میں اطلاع دینے چلا گیا کہ اگلے دن وہ لوگ گائیں بیاہنے کے لئے لے آئیں۔ جب وہ شام کو لوٹا تو سارے دن کے سفر سے تھک کر چور ہو چکا تھا اور اس کے قدم بڑی مشکل سے اٹھ رہے تھے۔

حسب معمول چرواہے گایوں کی دمیں مروڑتے ان کی پیٹھ پر چھڑیاں برساتے گاؤں میں داخل ہو رہے تھے اور اسی طرح وہ بوڑھی گائے ان کے پیچھے پیچھے لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ معمول سے زیادہ تھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ غالباً اس دن اسے کچھ بھی میسر نہ ہو سکا تھا۔ یکایک وہ کھڑی ہو گئی اور گردن اٹھا کر حسرت بھری نظروں سے گرد کے بادلوں میں چھپے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگ گئی۔ اس کی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔ وہ زمین میں لیٹ گئی۔ ارد گرد گھومتے کتے اسے گرتا دیکھ کر ادھر دوڑے۔ یہ دیکھ کر کہ اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے وہ زور زور سے بھونکنے لگے۔ شور سن کر اور بہت سے کتے بھی ادھر آ جمع ہوئے۔ وہ پر اشتیاق تھوتھنیوں سے اسے سونگھنے اور خشک زبانوں سے اسے چاٹنے لگے۔ ان کے وحشتناک جبڑوں میں پانی بھر آیا تھا۔ ان کی بھوکی پسلیاں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ گائے نے سر اٹھا کر چند بار ادھر ادھر ہلایا اور پھر بے بس ہو کر زمین پر رکھ دیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ جس میں سے زبان لٹک رہی تھی۔ کتے بھونکتے، چیختے، غراتے، ہانپتے وحشی تیکھے دانت کچکچاتے اپنی شدید ضرورت سے مجبور اس کی بوٹیاں نوچنے لگے۔

سنیل بھی اتنی دیر میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ گائے ہانپ رہی تھی اور اپنی آنکھوں کی بھیگی خلا میں سے کتوں کو گھور رہی تھی۔ سنیل کو دیکھ کر کتے ڈرتے ڈراتے پیچھے ہٹ گئے سوائے ایک حاملہ کتیا' کے جس کی نیلی آنکھوں سے کئی ننھی بھوکی جانیں جھانک رہی تھیں۔ دوسرے کتے ڈگمگا

رہے تھے۔ اس نے ماتا سے مجبور ہو بے باکی سے لپک کر گائے کے منہ میں سے لٹکتی ہوئی زبان نوچ لی۔

گائے تڑپنے لگی اس کے ڈیلے ابھر آئے۔ ان میں نفرت اور غصہ جھلک رہا تھا اس کی لیکھوں بھری پلکیں پھڑپھڑانے لگیں۔ اس کے نتھنے پھول گئے اور چند لمحوں ہی میں وہ اپنے جسم کے دکھوں سے آزاد ہو گئی۔

ستیل کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ اسے آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ تلخ گھناؤنی الجھن سے اس کا دماغ چکرانے لگا۔ اس سے وہاں کھڑا نہ ہوا گیا۔ کتیا کی آنکھوں میں بھوک سے تڑپتی ہوئی ننھی ننھی جانیں۔ چچڑی زدہ سپید گائے کی موت کا انتظار اس کی کٹی ہوئی ٹانگیں۔ بھوری گائے کے زخموں میں چونچ مارتے ہوئے کوّے ان کے سوا راستہ میں اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہت ہی ملول زخمی آوازیں اس کے کانوں کے پردے ڈگڈگا رہی تھیں۔ کمرے میں پہنچ کر ستیل نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لیمپ روشن کیا' اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کے ذہن میں بے شمار متضاد خیالات ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ نیم غنودگی کے عالم میں اس کے آگے گاؤں کی تمام گائیاں گھومنے لگیں۔ مریل گائیوں کی ہڈیوں کے درمیانی گڑھے یکایک اسے بہت گہرے اور تاریک معلوم ہونے لگے' جن میں بے انتہا لوگ ٹھوکریں کھا کر گرتے جا رہے تھے۔ گائیوں کی بھوکی ننگی پسلیاں تیز چھریاں بن کر اس کا جسم چیرنے لگیں۔

ستیل نے لیمپ کی مدھم لو کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی کانپتی ہوئی ٹھوڑی کی طرف تاک رہی تھی اور اس کے ہیجانی جذبات کا بغور معائنہ کر رہی تھی۔ ماحول سے نفرت کا احساس اس پر غالب ہوتا جا رہا تھا۔ ملامت کے چبھتے ہوئے خیالات اس کے جسم پر لاتعداد کھٹملوں کی طرح رینگنے لگے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی نسوں میں خون کی جگہ زہر بھر دیا گیا ہے۔ کھوپڑی میں کڑوا دھواں اور وہ کھاری سمندر کو شہد کی ایک دو بوند میں ڈال کر میٹھا کرنے کی طفلانہ کوشش کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ لیمپ کے شعلے کو بڑے انہماک سے دیکھنے لگا۔ وہ اسے کہہ رہا تھا کہ شہری وہ مکھیوں کے چھتے ہیں جن میں تہذیب و تمدن کا شہد پیدا ہوتا ہے۔ جب تک ہندوستان کے کم از کم آدھے گاؤں اکٹھے کر کے شہر نہیں بنا دیئے جاتے تب تک یہ جہالت دور نہیں ہو گی اور ترقی خواب ہی رہے گی۔ اس کے بہت عرصہ بعد تک وہ چکاچوندہ آنکھوں سے لیمپ کا چہرہ تکتا رہا۔ اس کے دماغ سے عجیب قسم کے تصورات کے بخارات اٹھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ذہن پر بے بسی کا سکون چھا جاتا لیکن اسے اس سکون کے حملے خیالات کی بمباری سے بھی زیادہ پریشان کر دیتے۔

اچانک ستیل کو یوں محسوس ہوا کہ یہ خیالات اس کے بھیجے میں اس طرح رینگ رہے ہیں جیسے گلے سڑے امرود میں سفید کیڑے۔ وہ سٹپٹا کر کھاٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کنپٹیاں رگڑنے اور سر جھٹکنے لگا۔

گاؤں میں داخل ہوتے گیدڑوں کی ہو ہو ہپ ہپ کتوں کی دردناک عف عف' سوروں کی چیخیں' مچھروں کی بھنبھناہٹ' الوؤں کی ہوک اور دوسری سینکڑوں قسم کی ناقابل فہم' پر شور آوازیں اس کے کانوں میں بجنے لگیں۔ اسے یہ سب پرماتما سے موت کے لئے دعائیں معلوم ہو رہی تھیں۔ باہر ہوا درختوں کو جھٹکے دے رہی تھی۔ ان کے پتوں کی سرسراہٹ سے ستیل کو یوں محسوس ہونے لگا کہ پرندوں کے بے شمار جھرمٹ کسی دوسری دنیا کی طرف اڑے جا رہے ہیں۔ کتوں کی عف عف اسے موت کے لئے بے بس خواہش معلوم ہونے لگی۔ اس کا اپنا دل بھی موت کے لئے للچانے لگا۔ اس کے جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں اسے محسوس ہونے لگا کہ ایسے تصورات کا فوارہ اس کے دل میں پھوٹ پڑا ہے جنہیں اس کی فطرت سے کوئی نسبت نہیں اور یہ ابھی خیالات اس پر غالب ہوتے جا رہے ہیں اور اس کے ہاتھوں کو ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔

ستیل نے کھیتوں کے چوہے مارنے کا زہریلا سفوف آٹے میں گھولا اور اسے لے کر مکان سے باہر کتوں کی آوازوں کی طرف چلنے لگا۔ اسے ایک زبردست کشش ان کی طرف کھینچ رہی تھی۔ آسمان کی نیلی نیالی خاموشی میں ننھے ننھے بادل راستہ بھول کر بھٹک رہے تھے۔ اندھیرے کی گہری دھاریاں غم آگیں آنکھوں سے اسے تک رہی تھیں۔ جوہڑ کی ... میں ننھے معصوم ستارے کانپ رہے تھے۔ وہ منگت رام کی دوکان کے قریب پہنچا۔ تمام کتے سپید گائے کا حلقہ کئے ہوئے تھے۔ ان کے دانتوں میں ایک نئی وحشت تھی۔ بے بسی کے عالم میں جیسے کسی بیرونی طاقت کے

...آخر اس نے زہریلے آٹے کو کتوں کے آگے ڈال دیا۔ وہ لپ لپ اسے چاٹنے لگے۔ سنیل کے چلے آنے کے بعد چتکبری کی ستائی گائے نے بھی آس پاس رینگ کر اسے چاٹ لیا۔

اگلی صبح جب سنیل بیدار ہوا تو رات کی نیم خوابی کے نقوش اس کے ذہن سے پوری طرح نہیں مٹے تھے۔ جب وہ نہا کر کپڑے بدل کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ کتوں کے علاوہ سفید گائے بھی اس کی جرات پریشان کا شکار ہو چکی ہے۔ گاؤں والے کانا پھوسی کر رہے تھے اور سب اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

مختلف چیزیں بیچنے والے مندر کے ارد گرد ساماں سجا رہے تھے۔ نزدیکی دیہات کے لوگ میلہ دیکھنے آنے لگ گئے۔ بھینسیں جوہڑ سے نکل آئی تھیں اور گیلے کیچڑ بھرے جسم تماشائیوں سے گزر رہی تھیں۔ ایک بوڑھا براہمن مندر کے برابر میں بیٹھا 'مالا' 'کنٹھے' 'جینو' 'گنگا جلیاں فروخت کر رہا تھا۔ قریب ہی دو دیہاتی سگریٹ کی خالی ڈبی میں سے نکلے ہوئے چاندی نما ورق کے لئے تکرار کر رہے تھے۔ چار آنے کی فوٹو والے فوٹو گرافر کے محل اور باغیچے والے پردہ کا بہت سے لوگ معائنہ کر رہے تھے۔

اتنے میں ڈیری فارم کے ملازم سانڈ لئے آ پہنچے اور لوگ اس کے ارد گرد اکٹھے ہونے لگے۔ سنیل گاؤں کی دوسری طرف 'جہاں گائیں بندھی ہوئی تھیں بیل لے جانے کے لئے مجمع کو ایک طرف کرنے لگا۔ لوگوں نے اتنا موٹا اور تندرست بیل پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہو لئے۔ حسب عادت منع کرنے کے باوجود لڑکے اسے چھیڑنے لگے۔ ٹھاکر کیرت سنگھ کا لڑکا اس کی دم مروڑنے لگا۔ بیل درد برداشت نہ کر سکا اور اس نے ٹھاکر کے لڑکے پر حملہ کیا۔ دم چھڑا کر وہ لوگوں کے جھگڑے سے بھاگ نکلا تو لوگ بھی اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ زمیندار کے لڑکے کو چوٹ لگی دیکھ کر کئی آدمی بیل کو لاٹھیوں اور چھڑیوں سے پیٹنے لگے۔ بیل نے بھی چند اور آدمیوں کو چوٹیں لگائیں جس سے لوگوں کا غصہ اور بھی بھڑک اٹھا۔ انہوں نے بیل کو اس بے رحمی سے پیٹا کہ اس کی پیٹھ سرخ ہو گئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ سنیل سے لوگ ناراض تھے ہی بیل کو بچانے کی کوشش میں وہ بھی اتنا پیٹا گیا کہ نیم جان ہو کر گر پڑا۔ ڈیرہ کے ملازم جنہیں خود کم و بیش چوٹیں آئی تھیں۔ ان دونوں کو بھینسا گاڑی میں ڈال کر شہر کی طرف لے گئے مندر کے ایک براہمن نے گاڑی میں بے ہوش پڑے سنیل کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دیکھا ایشور نے گئوہتیا کے پاپ کی کتنی جلدی سزا دی۔

گاؤں میں گئوہتیا ہوئی تھی۔ اس لئے پجاریوں نے گنیش چودس کا تہوار منانے سے انکار کر دیا۔ شام کو ٹھاکر دوارہ میں اس کے پراشچت کے لئے تدبیریں سوچنے کے لئے پنچائت ہوئی۔ ایک سو ایک سیر گھی کا ہون ہونا ضروری تھا کیونکہ مندر کے پجاری دیسی گھی کے دام وصول کر کے اور بناسپتی گھی جلا کر کافی نفع حاصل کر لیا کرتے تھے۔ گئودان بھی لازمی تھا۔ ان پجاریوں کی سنیل کی دس سیر دودھ دینے والی گائے پر نظر تھی۔ مختلف قسم کے وید منتروں کے سوا لاکھ دفعہ جاپ ہونا تھا۔ گنگا جل گاؤں میں چھڑکا جانا تھا۔ اس سب پر انہوں نے دو روپیہ گنوا دئے۔ آخر بہت بحث مباحثہ کے بعد ایک سو روپیہ پر فیصلہ ہوا۔ جس میں سے آدھے زمیندار نے دینے کا وعدہ کیا۔ ہون گئودان اور دوسری رسومات کا چار دن کے بعد ہی مہورت نکل آیا۔

ٹھاکر کیرت سنگھ نے سنیل کی گائے اپنے پاس منگوالی۔ گاؤں والوں نے بھی دو دن میں پچاس روپے اکٹھے کر دیئے۔ تیسرے دن ٹھاکر سنیل کی گائے کو شہر لے گئے۔ اسے بوچڑ خانہ میں اٹھاسی روپیہ میں بیچ دیا اور پھر گئوشالہ کا رخ کیا۔ گئوشالہ کے دروازہ پر کرشن جی کی تصویر تھی۔ نیلے رنگ کے کرشن مراری صحت مند بشاش گایوں کی سبزی سے مست کر رہے تھے اور گئوشالہ کے اندر وہی بھوکی موت کا انتظار کرتی ہوئی گائیں تھیں۔ وہاں سے ٹھاکر جی نے ایک سوکھی گائے جیسی کہ گاؤں میں پہلے ہی بہت سی تھیں تیرہ روپے کو خریدی۔ اس کے بعد بازار سے پانچ روپے کے بتاشے لئے اور باقی ستر روپے سنبھال گاؤں لوٹ آئے۔

اگلی صبح ٹھاکر دوارہ خوب سجا ہوا تھا۔ آم اور نیم کے پتوں کی جھنڈیاں اس کے چاروں طرف لگی ہوئی تھیں۔ دروازہ پر کیلے کے پیڑوں کے ستون کھڑے کئے ہوئے تھے۔ اندر گیرو سے جا بجا گنیش کا نشان بنا ہوا تھا۔ سنگ مرمر کے فرش کو پوتر بنانے کے لئے اس پر گوبر کا لیپ کیا

ہوا تھا۔ کرشن جی کی مورتی پر چندر کلا کا سنہری مکٹ جو خاص خاص موقعوں پر باہر نکالا جاتا تھا لگا ہوا تھا۔

ہون کے بعد ٹھاکر کیرت سنگھ نے گائے منگوا بھیجی۔ اس کا سارا جسم گیرو سے رنگا ہوا تھا اور اس پر لگائے ہوئے چاندی کے سفید ورق بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے سینگوں پر کناری و ماؤلی لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے تمام لوگوں کا ہاتھ چھوا کر گائے براہمن کو دے دی۔ وہ سیتل کی گائے کی بجائے اس مرل گائے کو دیکھ کر بہت سٹ پٹائے لیکن خاموشی کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ ٹھاکر جی پچاس روپے اپنی گرہ سے نکال اور پچاس گاؤں والوں کے ڈال ایک سو پجاری کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ پتاشوں کا پرشاد لوگوں میں بانٹا پھر باقی کے بیس روپے بھی پجاری کے ہاتھ میں تھما کر بڑے فیاضانہ انداز میں کہنے لگے۔

"پنڈت جی یہ لو بیس روپیہ اور پوجا پاٹ خوب اچھی طرح کرنا' دیکھنا کوئی کسر نہ رہ جائے۔"

○

اشفاق احمد

نام : اشفاق احمد خان
قلمی نام : اشفاق احمد
پیدائش : ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء بہ مقام مکیسر' فیروزپور' مشرقی پنجاب' بھارت (ا)
تعلیم : ایم ۔ اے (اردو) گورنمنٹ کالج لاہور' اٹالین زبان میں ڈپلوما' روم یونیورسٹی (اٹلی)' فرانسیسی زبان میں ڈپلوما' گرینوبل یونیورسٹی پیرس فرانس' براڈکاسٹنگ ٹریننگ نیویارک یونیورسٹی امریکا' بریڈ لاف رائٹرز ورکشاپ ورماؤنٹ امریکا۔

مختصر حالات زندگی:

بچپن اور لڑکپن فیروزپور' مشرقی پنجاب میں گزرا۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے والدین کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے اور ایک چلے ہوئے مکان میں رہائش اختیار کی۔ گھریلو حالات اچھے نہ ہونے کے سبب اشفاق احمد دفتر روزگار پہنچے' گریجویٹ ہونے سبب ملازمت نہ مل سکی تو اگلے روز میٹرک کی سند دکھا کر محکمہ ریلوے میں ملازمت اختیار کی' جہاں صرف ایک دن گزارا۔ اس کے بعد مہاجرین کے کیمپ واقع والٹن میں ملازم ہو گئے۔ ایک دن سودی خانہ میں گزارا اور اگلے روز لاؤڈ اسپیکر پر اناؤنسمنٹ والے شعبہ میں منتقل ہو گئے۔ انہیں دنوں میں بانو قدسیہ سے شادی ہوئی۔ بانو اور اشفاق نے لاہور سے ادبی مجلہ "داستان گو" جاری کیا۔ ریڈیو سے تعلق اسی زمانے میں قائم ہوا۔ ریڈیو آرٹسٹ محمد حسین المعروف علی بابا نے ڈراما نگاری کے سلسلے میں راہنمائی کی تو اشفاق احمد نے "اچی ماڑی" جیسا مقبول ریڈیائی ڈراما قلم بند کیا۔ ۱۹۶۸ء میں اشفاق احمد نے لاہور ریڈیو سے "تلقین شاہ" پروگرام شروع کیا جو آج تک جاری ہے۔ بطور لیکچرر شعبہ اردو' دیال سنگھ کالج لاہور سے منسلک ہوئے اور وہاں سے روم یونیورسٹی' اطالیہ چلے گئے۔ دو برس "لیل و نہار" لاہور مرتب کیا۔ چار برس تک ڈائریکٹر آر۔ سی۔ ڈی ریجنل کلچر انسٹی ٹیوٹ رہے۔ ۱۹۸۷ء تک ریڈیو کے مستقل پروگرام "تلقین شاہ" کے علاوہ ۴۸ ریڈیائی ڈرامے لکھے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے لئے لگ بھگ ساڑھے تین سو فیچر اور ڈرامے قلم بند کیے۔ آج کل ڈائریکٹر جنرل ترقی اردو بورڈ (سائنس بورڈ) لاہور' پاکستان ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"توبہ" مطبوعہ "ادبی دنیا: لاہور ۱۹۴۲ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "ایک محبت سو افسانے" (۱۳ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور: طبع اول: ۱۹۵۱ء
۱۔ "توبہ"' ۲۔ "فہیم"' ۳۔ "رات بیت رہی ہے"' ۴۔ "تلاش"' ۵۔ "سنگ دل"' ۶۔ "مسکن"' ۷۔ "شب خون"

۸۔ "توتا کہانی"، ۹۔ "عجیب بادشاہ"، ۱۰۔ "بندرابن کی کنج گلی میں"، ۱۱۔ "بابا"، ۱۲۔ "پناہیں"، ۱۳۔ "امی"
واضح رہے کہ افسانہ "توبہ" کا عنوان اشفاق احمد نے "جعفری" رکھا تھا، جسے شاہد احمد دہلوی نے "ساقی" میں شائع نہ کیا اور مولانا صلاح الدین احمد نے "ادبی دنیا" کے لیے اس کا عنوان "توبہ" تجویز کیا۔

۲۔ "اجلے پھول" (۸ افسانے اور ایک رپورتاژ) بک لینڈ، لاہور: طبع اول: فروری ۱۹۵۷ء
۱۔ "اجلے پھول" ۲۔ "گل زریا" ۳۔ "تنکہ" ۴۔ "حقیقت نیوش" ۵۔ "توشے بلے" ۶۔ "صفدر ٹھیلا" ۷۔ "گڈریا"
۸۔ "برکھا" ۹۔ "ایل ویرا"۔ (روم سے متعلق رپورتاژ)

۳۔ "سفر مینا" (گیارہ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور: طبع اول: اپریل ۱۹۸۳ء
۱۔ "انوٹ مان" ۲۔ "قاتل" ۳۔ "قصہ گل دفتی" ۴۔ "چور" ۵۔ "مانوس اجنبی" ۶۔ "بیاجاناں" ۷۔ "محسن محلہ"
۸۔ "پانچ میل دور" ۹۔ "کالج سے گھر تک" ۱۰۔ "کاتو" ۱۱۔ "فل برائٹ"

نوٹ: اشفاق احمد نے (۱۹۸۸ء) تک کل ۳۵ افسانے قلم بند کیے ہیں۔ ۳۲ افسانے ان تین مجموعوں میں یکجا کر دیے گئے ہیں جبکہ تین افسانے ان مجموعوں میں شامل ہونے سے رہ گئے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:
(۱) "ماسٹر روشی" مشمولہ: "۱۹۷۱ء کے منتخب افسانے" مرتبہ: ناصر زیدی صفحہ ۲۵ تا ۳۶۔
(۲) "سوئی" مطبوعہ: "ادب لطیف" لاہور شمارہ ۳۔ ۴ بابت سال ۱۹۸۳ء صفحہ ۵۶ تا ۲۴۔
(۳) "بندر لوگ" مطبوعہ: "نیا دور" کراچی افسانہ نمبر

۴۔ "ٹاہلی تھلے" (پنجابی ڈرامے)
۵۔ "مہمان بہار" (ناولٹ) مکتبہ میری لائبریری، لاہور: طبع اول: ۱۹۵۵ء
۶۔ "وداع جنگ" از ارنسٹ ہیمنگوے کا انگریزی سے ترجمہ (دو جلدیں) ملک دین محمد، یونائیٹڈ بک ڈپو، لاہور: طبع اول: جنوری ۱۹۶۰ء
یہ "A Farewell to arms" کا ترجمہ ہے۔
۷۔ "چنگیز خاں کے سنہرے شاہین" از رتاشی کا انگریزی سے ترجمہ۔ مکتبہ معین الادب لاہور بہ اشتراک موسسہ فرینکلن نیویارک طبع اول: ۱۹۶۰ء
یہ "The Golden Hawks of genghis" (ناول) کا ترجمہ ہے۔
۸۔ "کھیا ویا" (پنجابی آزاد نظمیں) مطبوعہ سنگ میل، لاہور: طبع اول: ۱۹۸۸ء
۹۔ "توتا کہانی" (ٹی۔ وی ڈرامے)
۱۰۔ "قلکار" (مزاحیہ)
۱۱۔ "گرما گرم" (مزاحیہ)
۱۲۔ "ہفت زبانی لغات" مرکزی اردو بورڈ، لاہور (مرتبہ)
۱۳۔ "دوسروں سے نباہ" (از ہیلن شیکر کا ترجمہ) گوشۂ ادب، لاہور: طبع اول:
یہ ترای صفحات کی کتاب "Getting along with others" کا ترجمہ ہے۔

غیر مدون:

متعدد مجلسی تنقید کے مضامین اور افسانے۔

مستقل پتا:

داستان سرائے "۱۲۱ ۔ C" ماڈل ٹاؤن لاہور نمبر ۱۴، پاکستان۔

اعزاز:

۱۔ ممبر انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگو یجز اسلام آباد یونیورسٹی، ۲۔ ممبر پاکستان کورسز کمیٹی بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن لاہور، ۳۔ ممبر تعلیم بالغاں سوسائٹی گوجرانوالہ، ۴۔ ممبر بورڈ آف سٹڈیز (پنجابی) پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۵۔ ممبر اکادمی ادبیات پاکستان (مرکزی باڈی) اسلام آباد۔ پاکستان، ۶۔ ممبر ترقی اردو بورڈ کراچی، ۷۔ ممبر ہجری کمیٹی اسلام آباد۔ پاکستان، ۷۔ ممبر (مرکزی کمیٹی برائے پاکستان) برکلے اردو پروگرام برکلے یونیورسٹی امریکا، ۸۔ ممبر نیشنل کونسل آف دی آرٹس اسلام آباد۔ پاکستان، ۹۔ مدیر اعلیٰ (اعزازی) ماہنامہ "سکھی گھر" لاہور، ۱۰۔ "پرائڈ آف پرفارمنس" حکومت پاکستان کا اعلیٰ ترین سول اعزاز ۱۹۷۹ء

نظریہ فن:

"میں نے اپنے افسانوں میں پلاٹ پر کبھی زور نہیں دیا اور نہ مجھے یہ پسند ہے بلکہ میری تمام تر توجہ کردار پر ہوتی ہے، جو معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں اور کردار ہی پلاٹ کو اور کہانی کو مرتب کرتے ہیں۔"

اشفاق احمد

(بہ حوالہ: ایک انٹرویو، روبرو حسن وقار گل: مشمولہ: "نگار پاکستان" سالنامہ ۱۹۸۱ء)

○

(۱) دستاویزات میں ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء درج ہے۔

گڈریا

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے۔ میں اپنے گرم گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"کون ہے۔" میں نے چیخ کر پوچھا اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا، اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی "تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔"

"کیا؟" میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ کو پرے دھکیلنا چاہا۔ "کیا ہے؟"

اور تاریکی کا بھوت بولا "تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔۔۔ اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔"

"داؤ جی کے بچے" میں نے اونچے ہو کر کہا "آدھی آدھی رات تنگ کرتے ہو۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔۔۔ میں نہیں۔۔۔ میں نہیں آپ کے گھر رہتا۔ میں نہیں پڑھتا۔۔۔ داؤ جی کے بچے۔۔۔ کتے!" اور میں رونے لگا۔

داؤ جی نے چمکار کر کہا "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہو گا! پاس نہیں ہو گا تو بڑا آدمی نہ بن سکے گا، پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے؟"

"اللہ کرے سب مر جائیں۔ آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی ..... اور میں بھی۔۔۔۔۔۔ میں بھی ....." اپنی جوانا مرگی پر میں ایسا رویا کہ دو ہی لمحوں میں گھگی بندھ گئی۔

داؤ جی بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے، اور کہہ رہے تھے "بس اب چپ کر شاباش۔۔۔۔۔ میرا اچھا بیٹا۔ اس وقت یہ ترجمہ کر دے، پھر نہیں جگاؤں گا۔"

آنسوؤں کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا۔ میں نے جل کر کہا "آج حرامزادے رانو کو پکڑ کر لے گئے کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ تو....."

"نہیں نہیں" انہوں نے بات کاٹ کر کہا "میرا تیرا وعدہ رہا آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا۔۔۔ شاباش اب بتا "تھانے والوں نے رانو کو گرفتار لیا۔"

میں نے روٹھ کر کہا "مجھے نہیں آتا۔"

"فوراً نہیں کہہ دیتا ہے" انہوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا "کوشش تو کرو۔"

"نہیں کرتا!" میں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہنسے اور بولے "کارکنان گزمہ خانہ رانو را توقیف کردند۔۔۔۔ کارکنان گزمہ خانہ، تھانے والے۔ بھولنا نہیں نیا لفظ ہے۔ نئی ترکیب ہے، دس مرتبہ کہو۔"

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں، ناچار گزمہ خانہ والوں کا پہاڑ شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو داؤ جی نے بڑی لجاجت سے کہا

اب سارا فقرہ پانچ بار کہو۔ جب ہنگامہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا۔
"بھولنا نہیں! صبح اٹھتے ہی پوچھوں گا۔"
پھر وہ جدھر سے آئے تھے ادھر لوٹ گئے۔

○

شام کو جب میں ملاجی سے سیپارے کا سبق لے کر لوٹتا تو خراسیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے۔ مگر میں صرف 'موٹے ماشکی' سے واقف تھا جس کو ہم سب "کدو کریلا ڈھائی آنے" کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا۔ جس کے تین طرف کچے پکے مکانوں کی دیواریں اور سامنے رخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور خار دار جھاڑیوں کا اونچا اونچا جنگلا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا تھا' پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ گیرو رنگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پکا مکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا اور قدرے تنگ ہو جاتی پھر جوں جوں اس کی لمبائی بڑھتی توں توں اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بندوق کی نالی میں چلا جا رہا ہوں اور جونہی میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے "ٹھائیں" ہو گا اور میں مر جاؤں گا۔ مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راہ گیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید سی مونچھوں والا لمبا سا آدمی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے مکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی۔ ذرا سی خمیدہ کمر پر خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ۔ کھدر کا تنگ پائجامہ۔ اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا۔ جس نے عین اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹکے بغیر گردنوں کو ذرا ذرا موڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن میں اور میرا بھائی ٹمٹمیاں کے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آ رہے تھے تو نہر کے پل پر یہی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا اور اس کی سفید چٹیا میری مرغی کے پر کی طرح اس کے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے سلام کہا۔ "داؤ جی سلام۔" اور داؤ جی نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "جیتے رہو۔"

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بے حد خوش ہوا اور تھوڑی دیر بعد اپنی منحنی آواز میں چلایا۔ "داؤ جی سلام"

"جیتے رہو۔ جیتے رہو!!" انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا اور میرے بھائی نے پتاخ سے میرے زنانے کا ایک تھپڑ دیا۔

"شیخی خورے' کتے" وہ چیخا۔ جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنساتا ہے کمینہ۔۔۔۔۔
"بھلا کون ہے وہ؟"

"داؤ جی!" میں نے بسور کر کہا۔

"کون داؤ جی؟" میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

"وہ جو بیٹھے ہیں" میں نے آنسو پی کر کہا۔

"بکواس نہ کر" میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا "ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کتا۔۔۔۔ شیخی خورا۔"

میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داؤ جی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے میرے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اسکی عادت تھی۔ بڑا تھا نا اس لئے ہر بات میں اپنی شیخی بگھارتا تھا۔

داؤ جی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لئے میں کوشش کر کے گلی میں سے اس وقت گزرنے لگا جب وہ آ جا رہے ہوں۔ انہیں سلام کر کے بڑا مزہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ وہ جیتے رہو کچھ ایسی محبت سے کہتے کہ زندگی دو چند سی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا۔۔۔۔۔۔ سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر یونہی چلتا رہا اور اس اثناء میں مجھے اس قدر معلوم ہو سکا کہ داؤ جی گیرو رنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے' میں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑے گھڑائے دو فقرے ہوتے تھے۔ "تجھے کیا" اور "بکواس نہ کر" مگر خدا کا شکر ہے میرے تجسس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم۔ بی۔ ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا' تو وہی داؤ جی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤ جی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے۔ لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے زیادہ ہشیار تھا۔ اس کی پگڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ بلی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے اور باقی نیولا کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر میں داؤ جی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام ہی سے پکارتا تھا۔ اس لئے وہ میرا دوست بن گیا تھا اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکے یار بننے کا وعدہ کر لیا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسانے والی دوپہر تھی۔ لیکن شیخ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔

امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن۔ پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی۔ آگے مستطیل صحن۔ سامنے سرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ۔ عقیق کے چند پودے اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیرو رنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی سے ملحقہ بیٹھک میں کھلتی تھیں' اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو امی چند نے چلا کر "بے بے نمستے!" کہا اور مجھے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھی۔ اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا "بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے۔"

مشین رک گئی

"ہاں ہاں" بے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جزدان کی رسی مروڑتا اور ٹیڑھے ٹیڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آ لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا" بے بے نے پچکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنا نام بتا دیا۔

"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے" اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا "ہے نا بے بے؟"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا۔"

"آفتاب کیا؟" اندر سے آواز آئی' "آفتاب کیا بیٹا؟"

"آفتاب کا بھائی ہے داؤ جی" لڑکی نے رکتے ہوئے کہا "امی چند کے ساتھ آیا ہے۔"

اندر سے داؤ جی برآمد ہوئے۔ انہوں نے گھٹنوں تک اپنا پائجامہ چڑھا رکھا اور کرتہ اتارا ہوا تھا۔ مگر سر پر پگڑی بدستور تھی پانی کی ہلکی سی بالٹی اٹھائے وہ برآمدے میں آ گئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے "ہاں بہت شکل ملتی ہے۔ مگر میرا آفتاب بہت دبلا ہے اور یہ گولو

مولو سا ہے۔" پھر بانی فرش پر رکھ کے انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس کاٹھ کا ایک اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اوپر اٹھا کر انہوں نے آہستہ سے انہیں جھاڑا اور پھر بانی میں ڈال دیئے۔

"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انہوں نے بانی سے پانی کے چلو بھر بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی" میں نے ہولے سے کہا "پرسوں آیا تھا۔"

"کیا لکھتا ہے۔"

"پتہ نہیں جی' اباجی کو پتہ ہے۔"

"اچھا" انہوں نے سرہلا کر کہا۔ "تو اباجی سے پوچھا کرنا!۔۔۔۔ جو پوچھتا نہیں اسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا۔"

میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انہوں نے ویسے ہی چلو ڈالتے ہوئے پوچھا "کونسا سیپارہ پڑھ رہے ہو؟"

"چوتھا" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تیسرے سیپارے کا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی پتہ نہیں" میری آواز پھر ڈوب گئی۔

"تلک الرسل" انہوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے رہے۔۔ بے بے مشین چلاتی رہی۔ وہ لڑکی نعمت خانے سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور میں جزدان کی ڈوری کو کھوتا پینتا رہا۔ امی چند ابھی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور میں ستون کے ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا' معا" داؤ جی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا۔۔۔

"سورہ فاتحہ سناؤ۔"

"مجھے نہیں آتی جی" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

انہوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا "الحمدللہ بھی نہیں جانتے؟"

"الحمدللہ تو جانتا ہوں جی" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے "ایک ہی بات ہے! ایک ہی بات ہے!!" پھر انہوں نے سر کے اشارے سے کہا سناؤ۔ جب میں سنانے لگا تو انہوں نے اپنا پاجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا۔ اور جب میں نے ولا الضالین کہا تو میرے ساتھ ہی انہوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ ابھی اٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے۔ کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمد سنائی تھی تو انہوں نے بھی ایسے ہی آمین کہا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا۔ مگر داؤ جی اسی طرح بیٹھے رہے۔ بلکہ اور بھی پتھر ہو گئے۔ اتنے میں امی چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا "داؤ جی سلام" اور انہوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہولے سے جواب دیا "جیتے رہو"

بے بے نے مشین روک کر کہا "کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آ جایا کرو۔۔۔۔۔۔"

"ہاں ہاں آ جایا کر" داؤ جی چونک کر بولے "آفتاب بھی آیا کرتا تھا" پھر انہوں نے بانی پر جھکتے ہوئے کہا "ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور ہو گیا اور فارسی کا شعر سا پڑھنے لگے۔

یہ داؤ جی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی۔ اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤ جی بڑے کنجوس ہیں۔ حد سے زیادہ چپ سے ہیں اور کچھ بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤ جی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے

اماں نے قدرے تلخی سے کہا "تو مجھ سے پوچھ تو لیتا بے شک آفتاب ان سے پڑھتا رہا ہے۔ اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے ابا جی ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا سو اب تک ناراضی چلی آتی ہے۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا تو وہ خفا ہوں گے "پھر اماں نے ہمدرد بن کر کہا "اپنے ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

میں ابا جی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا، مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤ جی کے ہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے معتبری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے ہیں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے "گولو آگیا" پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے "کوئی گپ سنا" اور میں اپنی بساط اور اپنی سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھانڈ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنستے بس یونہی میرے لئے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی تھیں، پھر وہ اپنے رجسٹر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے لے ایک سوال نکال۔ اس بات سے میری جان جاتی تھی۔ لیکن ان کا وعدہ بڑا رسیلا ہوتا تھا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باتیں۔ اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ گپیں۔ چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن ان کے خودساختہ سوال کچھ ایسے الجھے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھتے یہ کیا ہے؟ "چٹائی" میں منہ پھاڑ کر جواب دیتا "اوں ہوں" وہ سر ہلا کر کہتے "فارسی میں بتاؤ" تو میں تنگ کر جواب دیتا "لو جی ہمیں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے" اس پر وہ چمکار کر کہتے "میں جو پڑھاتا ہوں گولو ------- میں جو سکھاتا ہوں ------- سنو! فارسی میں بوریا، عربی میں حصیر" میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "بخشو جی بخشو، فارسی بھی اور عربی بھی میں نہیں پڑھتا جی معاف کرو" مگر وہ سنی ان سنی ایک کر کے کہے جاتے فارسی بوریا، عربی حصیر اور پھر کوئی چاہے اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیتا داؤ جی کے الفاظ گھستے چلے جاتے تھے --- ای چند کتابوں کا کیڑا تھا۔ سارا دن بیٹھک میں بیٹھا لکھتا پڑھتا رہتا۔ داؤ جی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے، لیکن ان کے وار ای چند پر بھی برابر ہوتے تھے وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا داؤ جی نے کتاب سے نگاہیں اٹھا کر پوچھا "بیٹا کیا ہے اس نے گلاس کے ساتھ منہ لگائے لگائے "ڈیڈ" کہا اور پھر گلاس گھڑونچی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آگیا۔ داؤ جی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ اکیلے داؤ جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے ہانک لگا کر کہتے "قرۃ بیٹا یہ قینچی تجھ سے کب چھوٹے گی؟" اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی "تم نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے بیٹے لکھوا دیئے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہوتا شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں" اور داؤ جی ایک لمبی سانس لے کر کہتے "جاہل اس کا مطلب کیا جانیں" اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو کچھ آتا کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے، پھر بددعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی رکتی تو داؤ جی کہتے "ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برسنے کو، تم انہیں روکو مت، انہیں ٹوکو مت۔ پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب حصیر اٹھا کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

○

نویں جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بری عادت پڑ گئی اور اس بری عادت نے عجیب گل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبے کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجہ سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن باتیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے، جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹوٹکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں معجون کے چند ڈبوں، شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشی شیشوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریر اور حضرت سلیمان کے خاص صدری تعویذوں سے مریض کا علاج کیا کرتے تھے۔ انہی باتوں کے لئے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھنچے چلے آتے اور فیض یاب ہو کر جاتے، ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا، میں اپنے ہسپتال سے ان کے لئے خالی بوتلیں اور شیشیاں چرا کے لاتا اور اس کے بدلے وہ مجھے داستان امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لیے دیا کرتے۔

یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انہیں پڑھا کرتا۔ اور صبح دیر تک سویا رہتا' اماں میرے اس رویہ سے سخت نالاں تھیں' اباجی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا' لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات طلسم ہوشربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی' اور دن کلاس میں بینچ پر کھڑے ہو کر' سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ششماہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقعہ پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی نامہ' فسانہ آزاد اور الف لیلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے' فسانہ آزاد اور صندلی نامہ گھر پر رکھے تھے' لیکن الف لیلہ سکول کے ڈیسک میں بند رہتی۔ آخری بینچ پر جغرافیہ کی کتاب تلے سندباد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا...... بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی ہائی سکول پہنچی۔ امی چند' نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اول آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان بھنوں لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے رہٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے اور اب کدھر جانا چاہیے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمرو عیار کے ہتھکنڈوں اور سندباد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا۔ مگر پھر بھی کوئی راہ بھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ڈھونڈتی ادھر آ گئیں اور اباجی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچسپی نہ تھی' مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی۔ اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا' چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسب معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا کوڈو اور دیسو بیب مسجد کے پچھواڑے تال کے پاس بیٹھے مل گئے وہ لاہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دیسو بیب نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بھایا جی اکثر اپنے دوست فتح چند کے ٹھیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خرید لی تھیں' میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو بیب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہئے اور اس کے سامنے بڑا سا سائن بورڈ۔ سائن بورڈ دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی نوٹ لے رہا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر وضاحت چاہی تو کوڈو چمک کر بولا "یار دیسو سب جانتا ہے۔ یہ بتا' تو تیار ہے یا نہیں ؟"

پھر اس نے پلٹ کر دیسو سے پوچھا "انارکلی دفتر بنائیں گے نا ؟"

دیسو نے ذرا سوچ کر کہا "انارکلی میں یا شاہ عالمی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں۔"

میں نے کہا انارکلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انارکلی لاہور لکھا ہوتا ہے"

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں!

گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بوٹ پالش کر رہا تھا کہ نوکر نے آ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا "چلو جی ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔"

"کہاں ہیں ؟" میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"ہسپتال میں" وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی والا دروازہ کھول کر اباجی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ داؤجی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سہمے سہمے داؤجی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیر کے بعد جیتے رہو کی مانوس دعا سنی۔

"ان کو پہچانتے ہو؟" اباجی نے سختی سے پوچھا۔
"بے شک" میں نے ایک مہذب سیلزمین کی طرح کہا۔
"بے شک کے بچے 'حرامزادے' میں تیری یہ سب......"
"نہ نہ ڈاکٹر صاحب" داؤجی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے اس کو تو......"
اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تلخی سے کہا "آپ نہیں جانتے منشی جی اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملا دی۔"
"آپ فکر نہ کریں" داؤجی نے سر جھکائے کہا۔ "یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن......"
اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا اور انہوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا "کیسی بات کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے ہوتے کی برابری نہیں کر سکتا۔"
"کرے گا' کرے گا------ ڈاکٹر صاحب" داؤجی نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "آپ خاطر جمع رکھیں۔"
پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "میں سیر کو چلتا ہوں تم بھی میرے ساتھ آؤ راستے میں باتیں کریں گے۔"
اباجی اسی طرح کرسی پر بیٹھے غصے کے عالم میں اپنا رجسٹر الٹ پلٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جالی والا دروازہ کھولا تو داؤجی نے پیچھے مڑ کر کہا "ڈاکٹر صاحب بھول نہ جایئے ابھی بھجوا دیجئے گا۔"
داؤجی مجھے ادھر ادھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہر کے اسی پل پر لے گئے جہاں پہلے پہل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انہوں نے پگڑی اتار کر گود میں ڈال لی۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا "آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اول نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوا دوں گا۔ میرے ہر ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا......"
"مجھ سے پڑھائی نہ ہوگی" میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔
"تو اور کیا ہو گا گولو؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔
میں نے کہا "میں بزنس کروں گا' روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں ضرور آؤں گا' پھر دیکھنا......"
اب کے داؤجی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا "خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ایک ان پڑھ کی کار میں نہ میں بیٹھوں گا نہ ڈاکٹر صاحب۔"
میں نے جل کر کہا "مجھے کسی کی پرواہ نہیں ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی' میں اپنے یہاں خوش۔"
انہوں نے حیران ہو کر پوچھا "میری بھی پرواہ نہیں؟" میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے "میری بھی پرواہ نہیں؟"
"او گولو میری بھی پرواہ نہیں؟"
مجھے ان کے لہجے پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا "آپ کی تو ہے مگر......" مگر انہوں نے میری بات نہ سنی اور کہنے لگے اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی؟ اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا...... تو------ تو...... "انہوں نے فوراً پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کہنے لگے "میں حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ کتا۔ میں حضرت مولانا کی خاک پا سے بدتر بندہ ہو کر آقا سے یہ کتا لعنت کا طوق نہ پہنتا؟ خاندان ابوجہل کا خانوادہ اور آقا کی ایک نظر کرم۔ حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے جنتو کو منشی چنت رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی' میں کہتا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کفش بردار...... لوگ سمجھتے ہیں......" داؤجی کبھی ہاتھ جوڑتے' کبھی سر جھکاتے کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو

لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان سا' ان کا زانو چھو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا "داؤ جی! داؤ جی؟" اور داؤ جی "میرے آقا' میرے مولانا' میرے مرشد" کا وظیفہ کئے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہوا تو نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے "کیا اچھا موسم ہے دن بھر دھوپ پڑتی ہے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے" پھر وہ پل کی دیوار سے اٹھے اور بولے "چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سودا خریدنا ہے" میں جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا' اس سے کہیں زیادہ منفعل اور خجل ان کے ساتھ لوٹا۔ مجھے پنساری یعنی ویسو یب ہیب کے باپ کی دوکان سے انہوں نے گھریلو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اٹھا کر چل دیئے' میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا۔ مگر ہمت نہ پڑتی ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی ہچکچاہٹ مانع تھی اور اسی تامل اور جھجک میں ڈوبتا ابھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انہی کے ہاں سویا کروں گا۔ اور وہیں پڑھا کروں گا۔ کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اور اسکے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہرکین لالٹین بھی رکھی تھی۔

بزنس مین بننا اور ہاں ہاں کرتی پیکارڈ اڑائے پھرنا میرے مقدر میں نہ تھا۔ گو میرے ساتھیوں کی روانگی تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انہیں لاہور سے پکڑ لائے۔ لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں ہمارا دفتر' پتہ نہیں ترقی کے کون سے شاندار سال میں داخل ہو چکا ہوتا۔

داؤ جی نے میری زندگی اجیرن کر دی' مجھے تباہ کر دیا' مجھ پر جینا حرام کر دیا' سارا دن سکول کی بکواس میں گذرتا' اور رات' گرمیوں کی مختصر رات' ان کے سوالات کا جواب دینے' کوٹھے پر ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے' اور وہ مونگ رسول اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں' میں نے بالکل ٹھیک بتا دیا ہے' تو وہ پھر اسی سوال کو دھرا رہے ہیں' میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے اور انہوں نے پھر انہی نہروں کو آگے لا کھڑا کیا ہے' میں جل جاتا اور جھڑک کر کہتا "مجھے نہیں پتہ میں نہیں بتاتا" تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے' میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی کنکر بن کر پلکوں میں اتر جاتی۔

میں آہستہ سے کہتا "داؤ جی۔"

"ہوں" ایک گھمبیر سی آواز آتی۔

"داؤ جی کچھ اور پوچھو۔"

داؤ جی نے کہا "بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے ۔۔۔۔ اس کی ترکیب نحوی کرو۔"

میں نے سعادت مندی کے ساتھ کہا "جی یہ تو بہت لمبا فقرہ ہے صبح لکھ کر بتا دوں گا کوئی اور پوچھئے۔"

انہوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے کہا "میرا گولو بہت اچھا ہے۔"

میں نے ذرا سوچ کر کہنا شروع کیا بہت اچھا صفت' ہے حرف ربط مل کر بنا مسند......

اور داؤ جی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے ہاتھ اٹھا کر بولے جان پدر' تجھے پہلے بھی کہا ہے مسند الیہ پہلے بتایا کر۔"

میں نے ترکیب نحوی سے جان چھڑانے کے لئے پوچھا "آپ مجھے جان پدر کیوں کہتے ہیں جان داؤ کیوں نہیں کہتے؟"

"شاباش" وہ خوش ہو کر کہتے "ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ بھاشا کا ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بدن لکھتے یا بولتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں' روز بروز کہو یا دن پر دن اسی طرح سے......"

اور جب میں سوچتا کہ یہ تو ترکیب نحوی سے بھی زیادہ خطرناک معاملے میں الجھ گیا ہوں تو جمائی لے کر پیار سے کہتا "داؤ جی اب تو نیند آ رہی ہے!"

"اور وہ ترکیب نحوی؟" وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد چاہے میں لاکھ بہانے کرتا ادھر ادھر کی ہزار باتیں کرتا' مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے ہی بیٹھے رہتے' بلکہ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو

کرسی پر رکھی ہوئی پگڑی اٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا۔ ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

امی چند کالج چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی اور داؤ جی کے دل میں اس کی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤ جی بہت اچھے لگنے لگے تھے۔ لیکن ان کی باتیں جو اس وقت مجھے بری لگتی تھیں۔ وہ اب بھی بری لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے بھی کسی قدر زیادہ' شاید اس لئے کہ اب میں نفسیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور داؤ جی پرانے ملائی مکتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بری عادت ان کی اٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے پڑھتا رہے اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دے دے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لئے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا' لمبی سیر اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً سورج نکلنے سے دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے "اٹھ گولو مولو ہو گیا بیٹا" دنیا جہاں کے والدین صبح جگانے کیلئے کہا کرتے ہیں کہ اٹھو بیٹا صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا مگر وہ "مونا ہو گیا" کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے' میں منمناتا تو چکار کر کہتے "بھدا ہو جائے گا بیٹا تو' گھوڑے پر ضلع کا دورہ کیسے کیا کرے گا!" اور میں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "داؤ جی خدا کے لئے مجھے صبح نہ جگاؤ' چاہے مجھے قتل کر دو' جان سے مار ڈالو۔"

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی وہ فوراً "میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان داؤ جی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور داؤ جی ان سے بہت ڈرتے تھے' وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیا کرتیں اور داؤ جی کو کوسنے دیئے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بڑا غصہ آتا تھا مگر دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ ننگی گالیوں پر اتر آتیں تو داؤ جی میری بیٹھک میں آ جاتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر کرسی پہ بیٹھ جاتے۔ تھوڑی دیر بعد کہتے "غیبت کرنا بڑا گناہ ہے لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے' تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اسکی سرائے میں' میں' میری قرۃ العین اور تھوڑا تھوڑا' تو بھی' ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں۔" اور واقعی بے بے بھٹیارن سی تھی۔ اس کا رنگ سخت کالا تھا اور دانت بے حد سفید' ماتھا محراب دار اور آنکھیں چھیاں سی۔ چلتی تو ایسی گربہ پائی کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) کٹنی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ بچاری بی بی کو ایسی ایسی بری باتیں کہتی کہ وہ دنوں دن رو رو کر ہلکان ہوا کرتی۔ ایک امی چند کے ساتھ اس کی بنتی تھی شاید اس وجہ سے کہ دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے داؤ جی سے پیار نہ تھا۔ یوں تو بی بی بے چاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی تھی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں' داؤ جی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رک کر مجھے دیکھا پھر منڈیر سے جھانک کر بولی "داؤ جی! پڑھ نہیں رہا' تنکوں کی چارپائیاں بنا رہا ہے۔"

میں غصیلے بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا "تجھے کیا' نہیں پڑھتا' تو کیوں بڑ بڑ کرتی ہے ----- آئی بڑی تھانیدارنی۔"

اور داؤ جی نیچے سے ہانک لگا کر کہتے "نہ گولو مولو بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے۔"

اور میں زور سے چلاتا "پڑھ رہا ہوں جی' جھوٹ بولتی ہے۔"

داؤ جی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ جاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چارپائی دیکھ کر کہتے "قرۃ بیٹا تو اس کو چڑایا نہ کر۔ یہ جن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر بگڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا۔"

بی بی کہتی "کاپی اٹھا کر دیکھ لو داؤ جی اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے کھیل رہا تھا۔"

میں قہر آلود نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ لکڑیاں اٹھا کر نیچے اتر جاتی۔ پھر داؤ جی سمجھاتے کہ بی بی یہ سب کچھ تیرے فائدے کے لئے کہتی ہے۔ ورنہ اسے کیا پڑی کہ مجھے بتاتی پھرے۔ تو فیل ہو یا پاس اس کی بلا سے اگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے' تیری بہتری چاہتی ہے۔" اور داؤ جی کی یہ بات ہرگز سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیونکر چاہ سکتی تھی!

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے داؤ جی کے ہاں سے چل دیتا گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا

کھانا سکول بھیج دیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آ کے اپنی لالٹین تیل سے بھرتا اور داؤ جی کے یہاں آ جاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی مجھے داؤ جی کے گھر ہی بھجوا دیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی' داؤ جی سکول کی گراؤنڈ میں آ کر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا اس کی تفصیل پوچھتے' پھر مجھے گھر تک چھوڑ کر خود سیر کو چلے جاتے۔ ہمارے قصبہ میں منصفی کا کام مہینے میں دس دن ہوتا تھا اور بیس دن منصف صاحب بہادر کی کچہری ضلع میں رہتی تھی۔ یہ دس دن داؤ جی باقاعدہ کچہری میں گزارتے تھے۔ ایک آدھ عرضی آ جاتی تو دو چار روپے کما لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا اس کی کترپونت اور محلے والیوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتی تھی۔ چونکہ پچھلے چند سالوں سے گھر کا بیشتر خرچ اس کی سلائی سے چلتا تھا۔ اس لئے وہ داؤ جی پر اور بھی حاوی ہو گئی تھی۔۔۔۔ ایک دن خلاف معمول داؤ جی کو لینے میں منصفی چلا گیا۔ اس وقت کچہری بند ہو گئی تھی اور داؤ جی نانبائی کے چھپر تلے ایک بینچ پر بیٹھے گڑ کی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ہولے سے جا کر ان کا بستہ اٹھا لیا اور ان کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا "چلئے' آج میں آپ کو لینے آیا ہوں" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے ایک آنہ جیب سے نکال کر نانبائی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیئے۔

میں نے شرارت سے ناچ کر کہا "گھر چلئے' بے بے کو بتاؤں گا کہ آپ چوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں۔"

داؤ جی جیسے شرمندگی ٹالنے کو مسکرائے اور بولے "اس کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گڑ کی چائے سے تھکن بھی دور ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ایک آنہ میں گلاس بھر کے دیتا ہے۔ تم اپنی بے بے سے نہ کہنا' خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کر دے گی" پھر انہوں نے خوفزدہ ہو کر کچھ مایوس ہو کر کہا "اس کی تو فطرت ہی ایسی ہے۔" اس دن مجھے داؤ جی پر رحم آیا۔ میرا جی ان کے لئے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس میں میں نے بے بے سے نہ کہنے کا ہی وعدہ کر کے ان کے لئے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اور کبھی نوکر کی معرفت داؤ جی کے ہاں دودھ' پھل اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں مگر اس رسد سے داؤ جی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے رعایتی برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے' ایک صبح میں دودھ سے بھرا ناملوٹ ان کے یہاں لے کر آیا تھا اور بے بے گھر نہ تھی۔ وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ بابا ساون کے جوہڑ میں اشنان کرنے گئی تھی۔ اور گھر میں صرف داؤ جی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤ جی نے کہا "چلو آج تینوں چائے پئیں گے۔ میں دوکان سے گڑ لے آتا ہوں' تم پانی چولہے پر رکھو" بی بی نے جلدی جلدی چولہا سلگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا اور پھر ہم دونوں وہیں چوکے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ داؤ جی گڑ لے کر آ گئے تو انہوں نے کہا "تم دونوں اپنے اپنے کام پر بیٹھو چائے میں بناتا ہوں۔" چنانچہ بی بی مشین چلانے گی اور میں ڈائریکٹ ان ڈائرکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ داؤ جی چولہا بھی جھونکے جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اونچے اونچے بتاتے جاتے تھے گیلیلو نے کہا "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے" گیلیلو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ لکھ دینا کہ سورج کے گرد گھومتی تھی' پانی ابل رہا تھا۔ داؤ جی خوش ہو رہے تھے۔ اسی خوشی میں جھوم جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا گیت گا رہے تھے۔ او گولو! او گولو! گیلیلو کی بات مت بھولنا' گیلیلو کی بات مت بھولنا۔ انہوں نے چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولہے پر ہی تھا اور داؤ جی ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی گل بل گل بل کے ساتھ گولو گیلیلو! گولو گیلیلو کئے جا رہے تھے' میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا' بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے جاتی تھی اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پروں والی پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر داخل ہوئی۔ داؤ جی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو گیا۔ چمکتی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے چھوٹے چھلاوے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے اور ممنوعہ کھیل رچانے والا بڈھا موقع پر پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولہے کی طرف دیکھا اور داؤ جی نے چوکے سے اٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجہ میں کہا۔ "چائے ہے!"

بے بے نے ایک دوہتڑ داؤ جی کی کمر میں مارا اور کہا "بڈھے بروھا تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر بہار پھرے' تجھے یم سمیٹے' یہ تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھے کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے بھانویں میں کل کی مرتی آج مروں تیرا من راضی ہو۔ تیری آسیں پوری ہوں۔ کس مرنے جوگی نے جنا اور کس لیکھ کی ریکھا نے میرے پلے باندھ دیا........ تجھے موت نہیں آتی........ اوں ہوں تجھے کیوں آئے گی" اسی فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے بھیڑنی کی طرح چوکے پر چڑھی کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولہے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپا کے داؤ جی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر گرے اور وہ "اوہ تیرا بھلا ہو جائے! او تیرا بھلا ہو جائے" کہتے وہاں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور بیٹھک میں گھس گئے۔ ان کے اس فرار بلکہ انداز فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی ہنسے بنا نہ رہ سکے اور ہماری ہنسی کی آواز ایک ثانیہ کے لئے چاروں دیواروں سے ٹکرائی۔ میں تو خیر بچ گیا لیکن بے بے نے سیدھے جا کر بی بی کو بالوں سے پکڑ لیا اور چیخ کر بولی "میری سوت بنا بڈھے سے تیرا کیا ناطہ ہے' بتا نہیں تو اپنی پران لیتی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کی کنجی کیوں دی؟"

بی بی بچاری پھس پھس رونے لگی تو میں بھی اٹھ کر اندر بیٹھک میں کھسک آیا۔ داؤ جی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور اپنے پاؤں سہلا رہے تھے۔ پتہ نہیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدی ہوئی کہ میں الماری کے اندر منہ کر کے ہنسنے لگا' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے "شکر کردگار کنم کہ گرفتارم بہ مصیبتے نہ کہ معصیتے۔"

تھوڑ دیر رک کر پھر کہا "میں اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے سر مطہر پر کے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی۔"

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش' گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ شیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پر۔ وہ اپنے محبوب کے طفیل نار جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیم مجھے جرات عطا کرے' مولائے ایوب مجھے صبر کی نعمت دے۔"

میں نے کہا "داؤ جی آقائے نامدار کون ؟"

تو داؤ جی کو یہ سن کر ذرا تکلیف ہوئی۔ انہوں نے شفقت سے کہا "جان پدر یوں نہ پوچھا کر۔ میرے استاد' میرے حضرت کی روح کو مجھ سے بیزار نہ کر' وہ میرے آقا بھی تھے' میرے باپ بھی' اور میرے استاد بھی' وہ تیرے دادا استاد ہیں...... دادا استاد......" اور انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ آقائے نامدار کا لفظ اور کوتاہ قسمت مجوزہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤ جی سے سنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انہوں نے کتنی ہی دیر لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے کے بعد فارسی کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔"

جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا "داؤ جی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟"

داؤ جی نے مسکرا کر کہا "جو طویلے کے ایک خر کو ایسا بنا دے کہ لوگ کہیں یہ منشی چنت رام جی ہیں۔ وہ مسیحا نہ ہو' آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟"

میں چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ پھسل کر بستر میں پہنچ گیا' اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر داؤ جی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پنڈلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد ذرا سا ہنستے اور پھر خاموش ہو جاتے ------ کہنے لگے "میں کیا تھا اور کیا ہو گیا--- حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا تھی! میری طرف سر مبارک اٹھا کر فرمایا' چوپال زادے ہمارے پاس آؤ' میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ہفتہ چمار اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا' اور کسی کو آنکھ اوپر اٹھانے کی ہمت نہ تھی---- میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا' بھئی ہم تم کو روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انہیں چرنے چگنے کے لئے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو---- پھر حضور نے میری عرض سنے بغیر پوچھا کہ کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا چنتو---- حضرت مسکرائے--- تھوڑا سا ہنسے بھی--- فرمانے لگے پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے چنت رام ہو گا---

میں نے سر ہلایا۔۔۔۔۔ حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے گلے میں کھدر کا لمبا کرتہ تھا۔ پائجامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا۔ پاؤں میں ادھوڑی کے موٹے جوتے اور سر پر سرخ رنگ کا جانگیہ لپٹا ہوا تھا۔ بکریاں میری......"

میں نے بات کاٹ کر پوچھا" آپ بکریاں چراتے تھے داؤ جی ؟"

" ہاں ہاں " وہ فخر سے بولے " میں گڈریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں۔ "

حیرانی سے میرا منہ کھلا رہ گیا اور میں نے معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے جلدی سے پوچھا۔ " اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے " داؤ جی نے کرسی چارپائی کے قریب کھینچ لی۔ اور اپنے پاؤں پائے پر رکھ کر بولے " جان پدر اس زمانے میں تو شہروں میں بھی اسکول نہیں ہوتے تھے' میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں۔ آج سے چوہتر برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔ بی ہائی سکول کا نام بھی جانتا تھا؟ وہ تو میرے آقا کو پڑھانے کا شوق تھا۔ اردگرد کے لوگ اپنے لڑکے چار حرف پڑھنے کو ان کے پاس بھیج دیتے۔۔۔ ان کا سارا خاندان زیور تعلیم سے آراستہ اور دینی اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ والد ان کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم اور چوٹی کے مبلغ تھے۔ جدامجد مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ گھر میں علم کے دریا بہتے تھے' فارسی' عربی' جبرو مقابلہ۔ اقلیدس' حکمت اور علم ہیئت ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا۔ لیکن آپ کی زبانی ان کے تبحر علمی کی سب داستانیں سنیں' شیفتہ اور حکیم مومن خاں مومن سے ان کے بڑے مراسم تھے اور خود مولانا کی تعلیم دلی میں مفتی آزردہ مرحوم کی نگرانی میں ہوتی تھی......"

مجھے داؤ جی کے موضوع سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اس لئے میں نے جلدی سے پوچھا " پھر آپ نے حضرت مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا۔ "" ہاں " داؤ جی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے " ان کی باتیں ہی ایسی تھیں۔ ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں۔ جس کی طرف توجہ فرماتے تھے' بندے سے مولا کر دیتے تھے۔ مٹی کے ذرے کو اکسیر کی خاصیت دیتے تھے۔۔۔۔ میں تو اپنی لاٹھی زمین پر ڈال کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا' اپنے بھائیوں کے پاس بورئیے پر بیٹھو۔ میں نے کہا جی اٹھارہ برس دھرتی پر بیٹھے گزر گئے اب کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر مسکرا دیئے اپنے چوبی صندوقچے سے حروف ابجد کا ایک مثوا نکالا اور بولے الف۔ بے۔ پے۔ تے۔۔۔۔ سبحان اللہ کیا آواز تھی کس شفقت سے بولے تھے کس لہجہ سے فرما رہے تھے الف' بے' پے' تے " اور داؤ جی ان حرفوں کا ورد کرتے ہوئے اپنے ماضی میں کھو گئے۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر کہا " ادھر رہٹ تھا۔ اور اس کے ساتھ مچھلیوں کا حوض۔ " پھر انہوں نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا " اور اس طرف مزارعین کے کوٹھے' دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ اور سامنے ان کی عظیم الشان حویلی۔ اسی باغیچے میں ان کا مکتب تھا۔ در فیض کھلا تھا جس کا جی چاہے آئے نہ مذہب کی قید نہ ملک کی پابندی......"

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد باادب باملاحظہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا " حضرت مولانا کا اسم گرامی شریف کیا تھا؟ " تو پہلے انہوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور پھر بولے " حضرت اسماعیل چشتی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمیشہ انہیں جان جاناں کہہ کر پکارتے تھے کبھی جان جاناں کی رعایت سے مظہر جان جاناں بھی کہہ دیتے تھے۔ "

میں ایسی دلچسپ کہانی سننے کا ابھی اور خواہشمند تھا کہ داؤ جی اچانک رک گئے اور بولے " سب سنڈی ایری سسٹم کیا تھا؟ " ان انگریزوں کا برا ہو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ وکٹوریہ کا فرمان لے کر' سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دیتے ہیں۔ سوائے کے پہاڑے کی طرح میں نے سب سنڈی ایری سسٹم کا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انہوں نے میرے گرائمر اٹھائی اور بولے " باہر جا کر دیکھ کے آ کہ تیری بے بے کا غصہ کم ہوا یا نہیں " میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو چوکا صاف کرتے پایا۔

داؤ جی کی زندگی میں بے بے والا پہلو بڑا ہی کمزور تھا۔ جب وہ دیکھتے کہ گھر میں مطلع صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے' تو وہ پکار کر کہتے " سب ایک ایک شعر سناؤ " پہلے مجھی سے تقاضا ہوتا اور میں چھوٹتے ہی کہتا:

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجاتے اور کہتے "اولیں شعر نہ سنوں گا' اردو کا کم سنوں گا اور مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنوں گا۔"

بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی۔

شنیدم که شاپوردم درکشید
چو خسرو براتش قلم درکشید

اس پر داؤ جی ایک مرتبہ پھر آرڈر آرڈر پکارتے۔

بی بی قینچی رکھ کر کہتی۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

داؤ جی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے "بیٹا یہ شعر تو کئی مرتبہ سنا چکی ہے۔"

پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے "بھئی آج تمہاری بے بے بھی ایک سنائے گی" مگر بے بے ایک روکھا سا جواب دیتی "مجھے نہیں آتے شیر' بیت"

اس پر داؤ جی کہتے "گھوڑیاں ہی سنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے" اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی اور داؤ جی مین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی امی چند کا اور کبھی میرا نام ٹانک دیتے۔ پھر کہتے "میں اپنے اس گولو مولو کی شادی پر سرخ پگڑی باندھوں گا۔ برات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور نکاح نامے میں شہادت کے دستخط کروں گا۔ میں دستور کے مطابق شرما کر نگاہیں نیچی کر لیتا تو وہ کہتے "پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہوگی' ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہوگی۔ اس بدھو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادیاں گھوڑیاں ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو فرفر سب کچھ سناتی ہوگی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دوں گا پھر خط شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خط شکستہ نہیں آتا۔ میں تو اپنی بہو کو سکھا دوں گا ـــــ سن گولو! پھر میں تیرے ہی پاس رہوں گا۔ میں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پر بفرمائید بفرمائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منہ دیکھا کرے گا" پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے خیلے خوب خیلے خوب کہتے۔ جان پدر چرا ایں قدر زحمت می کشی ...... خوب ...... یاد دارم ...... اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہتے۔ بچارے داو جی! چٹائی پر اپنی چھوٹی سی دنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کئے جاتے ـــــ ایک دن جب چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دنیا بسا چکے تھے تو ہولے سے مجھے کہنے لگے "جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت بیوی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی ہے ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میرے امی چند کو بھی دے۔

اس کے خیالات کچھ مجھے اچھے نہیں لگتے' یہ سوانگ یہ مسلم لیگ یہ بیلچہ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلانا گتکا کھیلنا سیکھ رہا ہے میری تو وہ کب مانے گا' ہاں خدائے بزرگ و برتر اس کو ایک نیک مومن سی بیوی دلا دے تو وہ اسے راہ راست پر لے آئے گی۔"

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چپ محض اس لئے ہوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً" ایسی بات نکلے گی جس سے داؤ جی کو بڑا دکھ ہو گا ـــــ میری اور امی چند کی تو خیر باتیں ہی تھیں' لیکن بارہ جنوری کو بی بی کی برات سچ مچ آ گئی۔ جیجا جی رام پرتاب کے بارے میں داؤ جی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انہوں نے جو استخارہ کیا تھا اس پر وہ پورا اترا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی داؤ جی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سمدھی فارسی کے استاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا' بے بے زار و قطار رو رہی ہے' امی چند آنسو بہا رہا ہے اور محلے کی

عورتیں پھس پھس کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور داؤ جی میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں پکڑتی۔ میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا" بیجا جی کے باپ بولے "منشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے" تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چارپائی پر ڈالا' عورتیں ہوا کرنے لگیں اور داؤ جی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے۔ انہوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا "یہ کیا ہوا بیٹا۔ اٹھو! یہ تو تمہاری نئی اور خودمختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے اسے یوں منحوس نہ بناؤ" بی بی اسی طرح دھاڑیں مارتے ہوئے داؤ جی سے لپٹ گئی انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "قرۃ العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھا نہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید برخوردار رام پرتاب بھی۔ لیکن میں اپنے کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطاکار ہوں اور میرا انجل سر تیرے سامنے خم ہے۔" یہ سن کر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور داؤ جی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا "منشی جی آپ فکر نہ کریں میں بیٹی کو کریما پڑھا دوں گا" داؤ جی ادھر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "کریما تو یہ پڑھ چکی ہے' گلستان' بوستان بھی ختم کر چکا ہوں' لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی" اس پر وہ ہنس کر بولے "ساری گلستان تو میں نے بھی نہیں پڑھی' جہاں عربی آتی تھی آگے گذر جاتا تھا"۔۔۔۔ داؤ جی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے' بی بی نے گوٹہ لگی سرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چندر اور پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور سمیوں کے بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چلدی۔ داؤ جی میرا سہارا لے کر چلے تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا "لو یہ بھی رو رہا ہے۔ دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ او کولو...... او مردم دیدہ...... تجھے کیا ہو گیا...... جان پدر تو کیوں......"

اس پر ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور اکوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے امی چند اور میں اور ہمارے درمیان داؤ جی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ ذرا زور سے نکل جاتی تو داؤ جی آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ اٹھاتے اور کہتے "لاحول پڑھو بیٹا' لاحول پڑھو۔"

اور خود آنکھوں پر رکھے رکھے ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

رانو ہمارے محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا' بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے' اسی کا تھا۔ اس میں بیس تیس بکریاں اور گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام رانو گلی کے بغلی میدان میں بیٹھ کر بیچا کرتا تھا۔ تقریباً سارے محلے والے اسی سے دودھ لیتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گذرتے ہوئے وہ یونہی شوقیہ لاٹھی زمین پر بجا کر داؤ جی کو "پنڈتا جی رام جی کی" کہہ کر سلام کیا کرتا۔ داؤ جی نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں معمولی آدمی ہیں کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک بڑے پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا۔ لیکن رانو نہیں مانتا تھا وہ اپنی مونچھ کو چبا کر کہتا "ارے بھئی جس کے سر پر بودی (چٹیا) ہو وہی پنڈت ہوتا ہے"۔۔۔۔ چوروں یاروں سے اس کی آشنائی تھی شام کو اس کے باڑے میں جوا بھی ہوتا اور گندی اور فحش بولیوں کا مشاعرہ۔ بی بی کے جانے کے ایک دن بعد جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اسے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا "مورنی تو چلی گئی بابو اب تو اس گھر میں رہ کر کیا لے گا" میں چپ رہا تو اس نے جھاگ والے دودھ میں ڈبہ پھیرتے ہوئے کہا "گھر میں گنگا بہتی تھی بچ بتا کہ غوطہ لگایا کہ نہیں" مجھے اس بات پر غصہ آ گیا اور میں نے تاملوٹ گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس ضرب شدید سے خون وغیرہ تو برآمد نہ ہوا لیکن وہ چکرا کر تخت پر گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤ جی کو سارا واقعہ سنا کر میں دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا اور ابا جی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت رانو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور حوالدار صاحب نے ہلکی سی گوشمالی کے بعد اسے سخت تنبیہہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے رانو داؤ جی پر آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑایا کرتا تھا۔ اور واقعی داؤ جی کے فاضل سر پر وہ چھنی سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے "یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کر اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چمکاتی تھی گو میں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پگڑی اتارنے کی جسارت نہیں کی' لیکن

وہ جانتے تھے اور جب میں دیال سنگھ میموریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا "شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟" تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم سا سعادت مند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے۔ اور ہم سا خوش قسمت استاد بھی خال خال ہو گا۔ جسے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو' میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے' ہنس کر فرمانے لگے چنت رام ہمارے پاؤں نہ چھوا کرو بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے کہا اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لئے دوائی نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لئے نذر کروں لیکن میرا بس نہیں چلتا۔۔۔ خاموش ہو گئے اور نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے"۔۔۔ داؤ جی گذرے ایام کی تہہ میں اترتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"میں صبح سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دیتا "خادم آ گیا" مستورات ایک طرف ہو جاتیں تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلاتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوتا اور پھر حکم کا انتظار کرنے لگتا' وہ دعا دیتے میرے والدین کی خیریت پوچھتے گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے "لو بھئی چنت رام ان گناہوں کی گٹھڑی کو اٹھا لو" میں سبد گل کی طرح انہیں اٹھاتا اور کمر پر لاد کر حویلی سے باہر آ جاتا۔ کبھی فرماتے' ہمیں باغ کا چکر دو کبھی حکم ہوتا سیدھے رہٹ کے پاس لے چلو اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے چنت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر نہیں مانے یہی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے تو تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں وضو کرنے والے چبوترے پر بٹھا کر ان کے ہلکے ہلکے جوتے اتارتا اور انہیں جھولی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھسٹ کر صف کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ انہیں اس طرح جاتے دیکھا تھا اس کے بعد جرات نہ ہوئی۔ ان کے جوتے اتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپا لیتا اور پھر اسی وقت سر اٹھاتا جب وہ میرا نام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر میں قصبے کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر حویلی کو لوٹتا۔ تو فرماتے ہم جانتے ہیں چنت رام تم ہماری خوشنودی کے لئے قصبہ کی سیر کراتے ہو لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پر لدا لدا پھرتا ہوں دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں۔ اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطہ عروج ہے۔ اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لدا لدا پھرتا ہوں اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہما ہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لئے وقف کر دیا ہے۔۔۔۔ جس دن میں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انہیں سنایا۔ اس قدر خوش ہوئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی۔ دین و دنیا کی ہر دعا سے مجھے مالا مال کیا۔ دست شفقت میرے سر پر پھیرا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا۔ میں نے اسے حجر اسود جان کر بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دعائیں دے رہے تھے اور فرما رہے تھے جو کام ہم سے نہ ہو سکا وہ تو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے خدا نے تجھے یہ سعادت نصیب کی۔ چنت رام تیرا مویشی چرانا پیشہ ہے تو شاہ بطحا کا پیرو ہے اس لئے خدائے عزوجل تجھے برکت دیتا ہے وہ تجھے اور بھی برکت دے گا تجھے اور کشائش میسر آئے گی......"

داؤ جی یہ باتیں کرتے کرتے گھٹنوں پر سر رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آ رہا تھا اور داؤ جی سخت ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے میرے ہر فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ ایک مضمون سے عہدہ برآ ہوتا تھا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے اٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھتے جاتے شام کے وقت سکول پہنچنے کا انہوں نے وطیرہ بنا لیا تھا۔ ایک دن میں سکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ کی راہ کھسک گیا تو انہوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آ کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بد زبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤ جی کے بچے' گویا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو میں انہیں کتے کمینے سے بھی نہ

چونکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اس قدر کہتے "دیکھ لے ذومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اسے یہی بتاؤں گا کہ جان پدر یہ تیرے بڈھے باپ کو کتا کہتا تھا" میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ذومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انہیں زیادہ دکھ ہوتا تو منہ چڑھی ذومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انہیں غصہ آتا تھا نہ دکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انہوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب' برخوردار آفتاب کہہ کر انہیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے۔ جن میں گولو انہیں بہت مرغوب تھا طنبورا دوسرے درجہ پر مسٹر ہوتق اور اخفش اسکوائر ان سب کے بعد آتے تھے اور ذومنی صرف غصہ کی حالت میں۔ کبھی کبھی میں ان کو بہت دق کرتا۔ وہ اپنی چٹائی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں' مجھے الجبرے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سارے جہان کی ابجد کو ضرب دے دے کر تنگ آ چکا ہوں تو میں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے پرے دھکیل کر اونچے اونچے گانے لگتا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نیوں دسنا

داؤ جی حیرانی سے میری طرف دیکھتے تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر دیتا۔ نیوں نیوں نیوں دسنا۔ تے دکھ تینوں نیوں دسنا ۔۔۔۔ دسنا دسنا دسنا دسنا ...... تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گاما رونا رونا رونا سارے گاما رونا رونا ۔۔۔۔۔ تے دکھ تینوں نیوں دسنا۔ وہ عینک کے اوپر سے مسکراتے۔ میرے پاس آ کر کاپی اٹھاتے' صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے۔

"سن بیٹا" وہ بڑی محبت سے کہتے "یہ کوئی مشکل سوال ہے!" جونہی وہ سوال سمجھانے کے لئے ہاتھ نیچے کرتے میں پھر تالیاں بجانے لگتا "دیکھ پھر' میں تیرا داؤ نہیں ہوں؟" وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

"نہیں" میں منہ پھاڑ کر کہتا۔

"تو اور کون ہے؟" وہ مایوس سے ہو جاتے۔

"وہ جی سرکار" میں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا "وہ جی سرکار' وہ سب کا پالنے والا ۔۔۔۔۔ بول بکرے سب کا والی کون؟"

وہ میرے پاس سے اٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا "داؤ جی خفا ہو گئے کیا۔"

وہ مسکرانے لگتے "چھوڑ طنبورے! چھوڑ بیٹا! میں تو پانی پینے جا رہا تھا ۔۔۔۔ مجھے پانی تو پی آنے دے۔"

میں جھوٹ موٹ برا مان کر کہتا "لو جی جب مجھے سوال سمجھاتا ہو داؤ جی کو پانی یاد آ گیا۔"

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے "اخفش اسکوائر جب تجھے چار ایکس کا مربع نظر آ رہا تھا تو تو نے تیسرا فارمولا کیوں نہ لگایا اور اگر ایسا نہ بھی کرتا تو......"

اور اس کے بعد پتہ نہیں داؤ جی کتنے دن پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی اور **کافی** سنجیدہ ہو گیا تھا۔ لیکن جیومیٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤ جی نے بہت کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انہوں نے کہا کل باون پراپوزیشنیں ہیں زبانی یاد کر لے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انہیں رٹنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن جو پراپوزیشن رات کو یاد کرتا صبح کو بھول جاتی۔ میں دل برداشتہ ہو کر ہمت چھوڑ سی بیٹھا۔ ایک رات داؤ جی مجھ سے جیومیٹری کی شکلیں ہوا کر اور مشقیں سن کر اٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹکا تھا اور انہیں بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹا لگاتا رہا۔ مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے داؤ کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا' اور میں باہر صحن میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ کے بچ بچ رونے لگا' گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی

طرح بیٹھے بیٹھے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا تو میں نے داؤ جی کی عزت بچانے کے لئے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر چپکے سے نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کے لئے سر اوپر اٹھایا تو داؤ جی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤ جی نے میرا سر چوم کر کہا" لے بھئی طنبورے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تو تو بہت ہی کم ہمت نکلا۔ " پھر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا اور بیٹھک میں لے آئے بستر میں بٹھا کر انہوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اوپر کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے کہا" اقلیدس چیز ہی ایسی ہے۔ تو اس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے' میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں انہیں میں اچھی طرح پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اتار چکا تھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے الجھن ہوتی۔ میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر پڑا متساوی الساقین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات الجھ گئی میں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رو سے اس کا جواب ٹھیک آتا تھا لیکن علم ہندسہ سے پایہ ثبوت کو نہ پہنچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح سے رویا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اپنے دست مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا۔ لیکن جہاں مجھے الجھن ہوئی تھی وہیں حضرت مولانا کی طبع رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے "چنت رام اب ہم تم کو نہیں پڑھا سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور معلم کی طرف رجوع کرنا چاہیے" میں نے جرات کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا۔ لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر شوشہ میرے لئے حکم ربانی سے کم نہیں اس لئے خاموش ہوں بھلا آقائے غزنوی کے سامنے ایاز کی مجال! لیکن حضور مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ فرمانے لگے تم بیحد جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سن لی ہوتی' میں نے سر جھکا کر کہا ارشاد! فرمایا "دلی میں حکیم ناصر علی سیستانی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ لکھ دیں گے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا اپنی والدہ سے پوچھ لینا اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا۔۔۔ والدہ مرحومہ سے پوچھا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انہونی بات تھی۔ چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی لپائی تپائی کر رہا ہوں جب فارغ ہوں گا تو والدہ سے عرض کروں گا۔

چند ایام بڑے اضطرار کی حالت میں گذرے۔ میں دن رات اس شکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب برآمد نہ ہوتا۔ اس لاینحل مسئلہ سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دلی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے اجازت مل سکتی تھی نہ رقعہ' وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے۔ اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں۔۔۔۔ ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا۔ تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اس کی کل پونجی دو روپے چرائے اور نصف اس کے لئے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سر ان دونوں کرمفرماؤں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا۔۔۔ گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کے مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا "بدقسمت ہوں' بے اجازت جا رہا ہوں لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہوں گا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پر رکھ کر میں وہاں سے چل دیا۔۔۔۔ سن رہا ہے؟"

داؤ جی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے بیچ خارپشت بنے' میں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا "جی؟"

داؤ جی نے پھر کہنا شروع کیا" قدرت نے میری کمال مدد کی۔ ان دنوں جاکھل جنید براستہ حصار والی ریل کی پٹڑی بن رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دلی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دو دن چلتا' اس طرح تائید غیبی کے سہارے سولہ دن میں دلی

پہنچ گیا۔ منزل مقصود تو ہاتھ آ گئی تھی۔ لیکن گوہر مقصود کا سراغ نہ ملتا تھا۔ جس کسی سے پوچھتا حکیم ناصر علی سیستانی کا دولت خانہ کہاں ہے' نفی میں جواب ملتا۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت یاور تھی صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے لئے نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں کھیس پھینک کر گہری نیند سو جاتا۔ مثل مشہور ہے جویندہ یابندہ! آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی' وہ پتھر پھوڑوں کے محلہ کی ایک تیرہ و تاریک گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں فروکش تھے۔ اور چند دوستوں سے اونچے اونچے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا "کون ہے؟" میں نے سلام کر کے کہا "حکیم صاحب سے ملنا ہے۔" حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے "اسم گرامی" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "پنجاب سے آیا ہوں اور......" میں بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ زور سے بولے "اوہو! چنت رام ہو؟" میں کچھ جواب نہ دے سکا فرمانے لگے "مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے لکھتا ہے شاید چنت رام تمہارے پاس آئے۔ ہمیں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی مدد کرنا۔" میں اسی طرح خاموش کھڑا رہا تو پاٹ دار آواز میں بولے "میاں اندر آ جاؤ کیا چپ کا روزہ رکھا ہے؟" میں ذرا آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی عروس نو کی طرح بیٹھے رہے پھر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا "برخوردار بیٹھ جاؤ۔ میں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا' بھئی ذرا ٹھہرو مجھے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔ پھر حکم ہوا بتاؤ بندے کا کونسا مسئلہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انہوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کرتہ یوں اوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر برہنہ ہو گئی۔ پھر فرمایا "بناؤ اپنی انگلی سے میری کمر پر ایک متساوی الساقین۔" مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے' میاں جلدی کرو۔ نابینا ہوں۔ کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکلی کمر پر کانپتی ہوئی انگلی سے متساوی الساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے اب اس نقطہ س سے خط ب ج پر عمود گراؤ۔ ایک تو میں گھبرایا ہوا تھا دوسرے وہاں کچھ نہ آتا تھا۔ یونہی انگلی سے میں نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر عمود گرانا چاہا۔ تو تیزی سے بولے بے بے کیا کرتے ہو یہ نقطہ س ہے کیا؟ پھر خود ہی بولے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔ بائیں کندھے سے کوئی چھ انگل نیچے نقطہ س ہے وہاں خط کھینچو۔۔۔۔۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر کیا علم تھا۔ کیا آواز تھی اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور میں مبہوت بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیر متساوی الساقین بن کر ان کی کمر پر ابھر آئیں گی۔" پھر داؤ جی دلی کے دنوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا "پھر کیا ہوا داؤ جی؟" انہوں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "رات بہت گذر چکی ہے اب تو سوجا پھر بتاؤں گا۔" میں ضدی بچے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا تو انہوں نے کہا "پہلے وعدہ کر کہ آئندہ مایوس نہیں ہو گا اور ان چھوٹی چھوٹی پرابلموں کو پہاڑ نہیں سمجھے گا" میں نے جواب دیا "ملوا سمجھوں گا آپ فکر نہ کریں" انہوں نے کھڑے کھڑے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا "بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضوری میں رہا اور اس بحر علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کور آنکھوں کو دھویا۔ واپسی پر میں سیدھا اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ فرمانے لگے چنت رام اگر ہم میں قوت ہو تو ان پاؤں کو کھینچ لیں۔ اس پر میں رو دیا تو دست مبارک محبت سے میرے سر پر پھیر کر کہنے لگے' ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا' یہ کہتے ہوئے داؤ جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھے اسی طرح گم سم چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

امتحان کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھول رہا تھا۔ داؤ جی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے تھن متھنے ہاتھ پکڑ کر کہتے "اسپ تازی بن طویلہ خر نہ بن۔" مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گذرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے مسلسل عدم برت نے بھی ان پر کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر' اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انہوں نے مجھے آ جگایا اور میری منتوں' خوشامدوں' گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اٹھا کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا۔ پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

سردیوں کی صبح کوئی چار کا عمل۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد' تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤ جی مجھے اسی طرح سیر کو لے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے ابھی گراں خوابی دور نہیں ہوئی ابھی طنبورا بڑبڑا رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے کوئی سر نکال طنبورے' کسی آہنگ پر بج یہ کیا کر رہا ہے! جب ہم بستی سے دور نکل گئے اور صبح کی یخ ہوا نے میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤ جی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ سرداروں کا رہٹ آیا اور نکل گیا۔ ندی آئی اور پیچھے رہ گئی' قبرستان گذر گیا مگر داؤ جی تھے کہ کچھ آیتیں ہی پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جب تبہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گذرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اسی ٹیلے پر رہتی تھیں۔ اور آنے جانے والوں کا کلیجہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤ جی نے میرے گلے کے گرد مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا۔

سامنے ان دو کیکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ' پھر سو لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑ دو' تب میرے پاس آؤ' میں یہاں بیٹھتا ہوں' میں تبہ سے جان بچانے کے لئے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے سے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا اور ساتھ ہی حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گذر چکا ہو گا' اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح کیکروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب دس یعنی چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے دوسرے میری پسلی میں بلا کا درد شروع ہو گیا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ تبہ پر جا کر داؤ جی کو سوئے ہوئے اٹھاؤں اور گھر لے جا کر خوب خاطر کروں! غصہ سے بھرا اور دہشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا۔ داؤ جی تبہ کی ٹھیکریوں پر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سر مار رہے تھے اور اونچے اونچے اپنا محبوب شعر گا رہے تھے۔

جفا کم کن کہ فردا روز محشر

بہ پیش عاشقاں شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اوپر اٹھا کر انگشت شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو اور اس سے کہہ رہے ہوں دیکھ لو' سوچ لو' میں تمہیں...... میں تمہیں بتا رہا ہوں...... سنا رہا ہوں...... ایک دھمکی دیئے جاتے تھے۔ پھر تڑپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور جفا کم کن جفا کم کن کہتے ہوئے رونے سے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چیخ مار کر بجائے قصبہ کی طرف بھاگنے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤ جی ضرور اسم اعظم جانتے تھے اور وہ جن قابو کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جن ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ باتصویر والا جن تھا۔ جب داؤ جی کا طلسم اس پر نہ چل سکا تو اس نے انہیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے جفا کم کن جفا کم کن مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد داؤ جی آئے انہوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا "چل طنبورے" اور میں ڈرتا ڈرتا ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ میں انہوں نے گلے میں لٹکتی ہوئی کھلی پگڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑ لئے اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔

تیرے لے لے وال فریدا ٹریا جا!

اس جادوگر کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ان آنکھوں سے واقعی ان آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا سر تبدیل ہو گیا اس کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولنے لگیں اور اس کا سارا وجود جٹا دھاری ہو گیا۔۔۔ اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اڑا دیتا' میں ان کے ساتھ سیر کو ہرگز نہ جاتا!

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آ کر گرنے لگے۔ بے بے نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بچوں والی کتیا کی طرح داؤ جی سے چمٹ گئی۔ بچ بچ ان سے لپٹ گئی اور انہیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چلا رہی تھی۔ "بڈھے ٹونگی یہ سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری خاری ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو الٹا ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر میں

اینٹیں پھینکتے ہیں۔ اجازہ مانگتے ہیں۔ موت چاہتے ہیں۔" پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی "میں مر گئی' میں جل گئی' لوگوں اس بڈھے نے میرے امی چند کی جان لینے کا منصوبہ کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے' میرا انگ انگ توڑ دیا ہے" امی چند تو داؤ جی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس کی جان کے دشمن بھلا وہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن جنوں کی خشت باری انہیں کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ جب میں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داؤ جی نے زندگی میں پہلے بار مجھے جھڑک کر کہا "تو احمق ہے اور تیری بے بے ام الجاہلین۔۔۔ میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا' اے وائے کہ تو شعور کی بجائے عورتوں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس۔۔۔ صد افسوس" بے بے کو اسی طرح چلاتے اور داؤ جی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا۔۔۔ اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آ رہا تھا تو راستے میں رالو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا "سنا بابو تیرے کوئی اینٹ ڈھیلا تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمہارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں۔"

میں نے اس کمینہ کے منہ لگنا پسند نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤ جی مجھ سے جیومیٹری کی پراپوزیشن سنتے ہوئے پوچھنے لگے۔ "بیٹا کیا تم سچ مچ جن' بھوت یا پری چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے واقعی تو بہت بھولا ہے اور میں نے خواہ مخواہ جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح سے اینٹیں پھینک سکتے ہیں ہم نے جو ولی اور جیتے مزدور کو بلا کر برساتی بنوائی ہے' وہ تیرے کسی جن کو کہہ کر بنوا لیتے۔ لیکن یہ تو بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے کا کام ہی کرتے ہیں کہ چنائی بھی کر لیتے ہیں۔" میں نے جل کر کہا "جتنے مذاق چاہو کر لو مگر جس دن سر پھٹے گا اس دن پتہ چلے گا داؤ" داؤ جی نے کہا۔ "تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو تاقیامت سر نہیں پھٹ سکتا اس لئے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اٹھائی جا سکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے بے کے سر میں لگے گی۔"

پھر بولے "سن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی۔۔۔ سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا" میں نے چڑ کر کہا۔

ہمارے قصبہ میں ہائی سکول ضرور تھا۔ لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لئے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ صبح آ گئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لئے ضلع جا رہی تھی اور لاری کے اردگرد والدین قسم کے لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ اور اس ہجوم سے داؤ جی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ اور سب لڑکوں کے گھر والے انہیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے۔ اور داؤ جی سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اچھل کر موسم کے تغیر و تبدل پر پہنچ جاتے وہاں سے پلٹتے تو "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چور تھا ایک صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آئی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی" کہہ کر پوچھتے یہ کون تھا؟

"جہانگیر" میں نے جواب دیا۔ اور وہ عورت۔ "نور جہاں" ہم دونوں ایک ساتھ بولے۔۔۔۔ "صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟"

میں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے مثالیں؟ میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے۔ اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا۔ تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے۔ بریک ان اور بیک ان کو فقروں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سٹارٹ ہو چلی تو اس کے ساتھ قدم اٹھا کر بولے طنبورے مادیاں گھوڑی ماکیاں مرغی ...... مادیاں گھوڑی ...... ماکیاں ...... مرغی۔۔۔ ایک سال بعد خدا خدا کر کے یہ آواز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا۔!

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بھی بڑھ کر تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی اتوار کی صبح کو داؤ جی کا کوئی بیس صفحہ لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں میں نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سو میں سے اسی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل

ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جونہی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا داؤ جی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا اور "اسی نمبر!! اسی نمبر" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر تلخی سے پوچھا "کون سا سوال غلط ہو گیا؟" میں نے جھوم کر کہا "چار دیواری والا" جھلا کر بولے "تو نے کھڑکیاں اور دروازے منفی نہ کئے ہوں گے" میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیڑ کی طرح جھلاتے ہوئے کہا "ہاں جی ہاں جی۔۔۔ گولی مارو کھڑکیوں کو" داؤ جی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے "تو نے مجھے برباد کر دیا طنبورے سال کے تین سو پینسٹھ دن میں پکار پکار کر کہتا رہا سطحات کا سوال آنکھیں کھول کر حل کرنا مگر تو نے میری بات نہ مانی۔ تو نے میری بات نہ مانی۔ بیس نمبر ضائع کئے..... پورے بیس نمبر۔"

اور داؤ جی کا چہرہ دیکھ کر میری اسی فیصدی کامیابی بیس فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے۔ "اگر ممتحن اچھے دل کا ہوا تو دو ایک نمبر تو ضرور دے گا 'تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے" اس پرچے کے بعد داؤ جی امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے ہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آجاتے اور کمرہ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤ جی کو یوں چھوڑ دیا گویا میری ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سارا دن دوستوں یاروں کے ساتھ گھومتا اور شام کو ناولیں پڑھا کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤ جی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گذارا کروں تاکہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لئے بھی تیار کر دیں۔ لیکن میں ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سو بار فیل ہونا گوارا تھا اور ہے لیکن داؤ جی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑیئے ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا۔ انہوں نے کہا اس کا فارسی میں ترجمہ کرو' میں نے کچھ جواب دیا فرمایا اس کی ترکیب نحوی کرو۔ گوالداروں کی گائے اندر گھس آئی۔ میں اسے لکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤ جی پوچھ رہے ہیں COW ناؤن ہے یا ورب۔ اب ہر عقل کا اندھا پانچویں جماعت تک پڑھا جانتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر داؤ جی فرما رہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی TO COW کا مطلب ہے ڈرانا۔ دھمکی دینا۔ اور یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا۔۔۔۔ پھر ایک وہ دن بھی آیا جب ہم چند دوست شکار کھیلنے کے لئے نکلے تو میں نے ان سے درخواست کی کہ منصفی کے آگے سے نہ جائیں۔ کیونکہ وہاں داؤ جی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار' بندوق اور کارتوسوں کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دیتے تو میں کسی بغلی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر رہتا" ملنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤ جی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کہا کرتے۔ افسوس آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے میں شرارتاً "نیلے خوب نیلے خوب کہہ کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا اور اباجی لڈوؤں کی چھوٹی سی ٹوکری لے کر ان کے گھر گئے۔ داؤ جی سر جھکائے اپنے چھپر میں بیٹھے تھے۔ اباجی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اندر سے کرسی اٹھا لائے اور اپنے بوریئے کے پاس ڈال کر بولے "ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھئے' میرا خیال تھا کہ اس کی فرسٹ ڈویژن آجائے گی۔ لیکن نہ آسکی۔ بنیاد کمزور تھی......"

"ایک ہی تو نمبر کم ہے" میں نے چہک کر بات کاٹی۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا دل دو نیم ہو گیا ہے۔ خیر میں اسے منجانب اللہ خیال کرتا ہوں۔"

پھر اباجی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ گپیں لڑانے میں مشغول ہو گیا۔

اول اول کالج سے میں داؤ جی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا' اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤ جی کو بھی سلام کر آتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ۔ پتلون اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے۔ "اگر مجھے اٹھنے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لے" اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے میں جو کتابیں ساتھ لایا کرتا انہیں دیکھنے کی تمنا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن

خود ہمارے گھر آ کر کتابیں دیکھ جاتے ۔ اسی چند بوجوہ کالج چھوڑ کر بنک میں ملازم ہو گیا تھا ۔ اور دلی چلا گیا تھا ۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤ جی منصفی جاتے تھے۔ لیکن کچھ نہ لاتے تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔۔۔۔۔۔ کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤ جی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آپو تاپو کھیلا کرتی تھیں ہنت عم بن گئی تھیں۔ سیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی میں آپو تاپو میں گذارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے ایبٹ آباد کا طویل زیادہ تسکین دہ اور سہانا بن گیا۔

انہی ایام میں میں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا ایک پیکٹ خریدا تھا۔ اور ان پر نہ اباجی کو خط لکھے جا سکتے تھے نہ ہی داؤ جی کو۔ نہ دسہرے کی چھٹیوں میں داؤ جی سے ملاقات ہو سکی۔ نہ کرسمس کی تعطیلات میں ایسے ہی ایسٹر گذر گیا اور یوں ہی ایام گذرتے رہے...... ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بلوے ہوئے پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوا لیا۔ ہمارے لئے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ بنئے ساہو کار گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی! ایک دن ہمارے قصبے میں بھی چند گھروں کو آگ لگی' اور دوکانوں پر سخت لڑائی ہوئی۔ تھانے والے اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا۔ اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھوڑ کر چل دیئے' دوپہر کو اماں نے مجھے داؤ جی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پہچانی گلی میں عجیب و غریب صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر یعنی داؤ جی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھر آ کر بتایا کہ داؤ جی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ کہتے ہوئے میرا گلا رندھ گیا۔ اس دن مجھے یوں لگا جیسے داؤ جی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے ہیں اور اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤ جی ایسے بے وفا تھے!۔۔۔

کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کر کے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گذرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ جمع دیکھی' مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو پھاڑ کر مرکز میں گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا۔

"ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گیا۔"

"کون سے گھر میں؟" بزرگ نے پوچھا۔

"رہتی مہاجروں کے گھر میں" لڑکے نے کہا۔

"پھر کیا انہوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا۔"

اتنے میں بھیڑ میں سے کسی نے چلا کر کہا "اوئے رانو جلدی آ۔۔۔۔ اوئے جلدی آ۔۔۔۔ تیری سامی۔۔۔۔ پنڈت۔۔۔۔ تیری سامی۔"

رانو بکریوں کا ریوڑ باڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انہیں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا جیسے انہوں نے داؤ جی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا۔

یہ بڑا اچھا آدمی ہے بڑا نیک آدمی ہے۔۔۔۔ اسے کچھ مت کہو...... یہ تو...... یہ تو" خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گنڈاسی تول کر بولا۔

"بتاؤں تجھے بھی۔۔۔۔ آ گیا بڑا حمائتی بن کر۔۔۔۔۔۔ تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں نا" اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا "انصار ہو گا شاید۔"

میں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤ جی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو داؤ جی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا "اب بول بیٹا' اب بول" اور داؤ جی خاموش کھڑے تھے' ایک لڑکے نے پگڑی اتار کر کہا "پہلے بودی کاٹو بودی" اور

رانو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤ جی کی بودی کاٹ دی۔ وہی لڑکا پھر بولا "بلا دیں ہے؟" اور رانو نے کہا "جانے دو بڈھا ہے، میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا" پھر اس نے داؤ جی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "کلمہ پڑھ پنڈتا" اور داؤ جی آہستہ سے بولے:۔

"کون؟"

رانو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا "سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں!"

جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا "چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں۔"

اور ننگے سر داؤ جی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو!

قرۃ العین حیدر

م : قرۃ العین

ی نام : قرۃ العین حیدر (ادبی دنیا میں عینی اور پوم پوم ڈارلنگ کے ناموں سے پکارا گیا۔)

ائش : ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء بہ مقام علی گڑھ۔

لیم : ایم۔ اے (انگریزی)

ڈیرہ دون اور لکھنؤ کے کانونٹ سکولوں میں ابتدائی تعلیم پائی۔ گمساری منڈی اسکول، لکھنؤ (بنارس یونی ورسٹی) سے میٹرک کیا۔ ازابیلا تھوبرن کالج، لکھنؤ (بنارس یونی ورسٹی) سے بی۔ اے کرنے کے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی سے ۱۹۴۷ء میں ایم۔ اے (انگریزی) کیا۔ مزید برآں گورنمنٹ اسکول آف آرٹس لکھنؤ اور ہیڈ لیز اسکول آف لندن میں تعلیم پائی۔

تصر حالات زندگی:

سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد حیدر کی نامور بیٹی۔ ۱۹۵۰ء میں وزارت اطلاعات و نشریات، کراچی میں ملازم ہوئیں۔ لندن میں پاکستان ہائی یشن میں پریس اتاشی رہیں۔ پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز (P.I.A) میں انفارمیشن آفیسر ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۶ء۔ وزارت اطلاعات و نشریات میں ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۱ء ڈاکو مینٹری فلموں کی پروڈیوسر، رائیٹر کے علاوہ "پاکستان کوارٹرلی" کی ایکٹنگ ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ بعد ازاں پاکستان سے بھارت منتقل ہو گئیں اور "امپرنٹ" کی مدیرہ کے طور پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ "السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" سے بھی وابستہ رہیں۔ سنٹرل بورڈ آف فلم سنسر کی ممبر رہیں۔ ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۷ء ساہتیہ اکاڈمی جنرل کونسل کی اردو ایڈوائزری بورڈ کی رکن کے طور پر کام کیا۔ بمبئی میں قیام کے دوران انگریزی مجلہ "IMPRINT" کی منیجنگ ایڈیٹر کے طور پر کام کیا اور بینٹ کولن گروپ کی ممبر رہیں۔ آج کل دہلی میں مقیم ہیں۔

ولین تحریر:

بارہ برس کی عمر میں "بی چوہیا کی کہانی ان ہی کی زبانی" مطبوعہ: "پھول" لاہور، ۲۴ ستمبر ۱۹۳۸ء۔

ولین مطبوعہ افسانہ:

مطبوعہ: "ہمایوں" لاہور ۱۹۴۴ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- "ستاروں سے آگے" (افسانے) مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور، طبع اول: ۱۹۴۷ء

۲۔ "شیشے کے گھر" (افسانے) — مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور — طبع اول: ۱۹۵۶ء

۳۔ "سفینۂ غم دل" (ناول) — مطبوعہ: مکتبہ جدید، لاہور — طبع اول: ۱۹۵۶ء

۴۔ "میرے بھی صنم خانے" (ناول) — مطبوعہ: مکتبۂ جدید، لاہور — طبع اول: ۱۹۴۹ء

۵۔ "آگ کا دریا" (ناول) — مطبوعہ: مکتبۂ جدید، لاہور — طبع اول: ۱۹۵۸ء

۶۔ "ہمیں چراغ ہمیں پروانے" — مطبوعہ: مکتبۂ جدید، لاہور — طبع اول: ۱۹۵۸ء

از ہنری جیمز کا ترجمہ

۷۔ "پت جھڑ کی آواز" (افسانے) — مطبوعہ: مکتبہ جامعہ، نئی دہلی — طبع اول: ۱۹۶۷ء

۸۔ "آخر شب کے ہمسفر" (ناول)

۹۔ "کار جہاں دراز ہے" (ناول۔ دو جلدیں)

۱۰۔ "سیتا ہرن" (ناولٹ) — مطبوعہ: کتاب نما، لاہور

۱۱۔ "ہاؤسنگ سوسائٹی" (ناولٹ)

۱۲۔ "چائے کے باغ" (ناولٹ)

۱۳۔ "دلربا" (ناولٹ) — مطبوعہ: پاکستان — طبع اول: ۱۹۷۶ء

۱۴۔ "اگلے جنم مجھے بٹیانہ کیجو" (ناولٹ)

۱۵۔ "ستمبر کا چاند" (رپورتاژ)

۱۶۔ "کوہ دماوند" (سفرنامہ ایران)

۱۷۔ "پکچر گیلری" (مضامین) — مطبوعہ: قوسین، لاہور — طبع اول: ۱۹۸۳ء

۱۸۔ "چار ناولٹ" — مطبوعہ: نام مطبع ندارد، کتابت: ریاض احمد، الہ آباد — طبع اول: س۔ن

اس کتاب میں "دلربا"، "سیتا ہرن"، "چائے کے باغ" اور "اگلے جنم مجھے بٹیانہ کیجو" چار ناولٹ یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

۱۹۔ "جہان دیگر"

۲۰۔ "گلگشت (سفرنامہ روس)

۲۱۔ "فصل گل آئی یا اجل آئی" (افسانے) — مطبوعہ: خیام پبلشرز، لاہور

۲۲۔ "جہاں پھول کھلتے ہیں" (افسانے)

۲۳۔ "آلپس کے گیت" (ترجمہ)

۲۴۔ "جگنوؤں کی دنیا" (افسانے)

۲۵۔ "تلاش" (افسانے)

۲۶۔ "تین ناولٹ"

۲۷۔ "روشنی کی رفتار" (افسانے)

۲۸۔ "ڈان بہتا رہا" (از شولوخوف کا ترجمہ۔ ناول)

۲۹۔ "آدمی کا مقدر" (از شولوخوف کا ترجمہ۔) — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی — طبع اول: ۱۹۶۵ء

یہ "THE FATE OF MAN" (ناولٹ) کا ۵۳ صفحات میں ترجمہ ہے۔

۳- "کچے گھروندے"

۳- "اڑتے خاکے"

۳- "یاد کی اک دھنک جلے" (افسانے) مطبوعہ: رفعت پبلشرز، لاہور

۳- "اودھ کی شام"

۳- "ماں کی کھیتی" (ترجمہ / ناول از اعتماتوف چنگیز) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی: طبع اول: ۱۹۶۶ء

۳- "خضر سوچتا ہے"

۳- "کلیسا میں قتل"

۳- "میرے بہترین افسانے"

۳- "قرۃ العین حیدر کے منتخب افسانے"

۳- "ڈھمو" (ترجمہ / ناولٹ از آر فریمین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی طبع اول: ۱۹۶۶ء

۴- "یودوکیہ" (ترجمہ / ناول از ویرا پانووا) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی: طبع اول: ۱۹۶۵ء

۴- "شیر خان" (بچوں کے لیے)

۴- "بھیڑیے کے بچے" (بچوں کے لیے)

۴- "لومڑی کے بچے" (بچوں کے لیے)

۴- "میاں ڈھینچو کے بچے" (بچوں کے لیے)

۴- "بہادر" (بچوں کے لیے)

۴- "ہرن کے بچے" (بچوں کے لیے)

۴- "جن حسن عبدالرحمٰن" (دو جلدیں۔ بچوں کے لیے)

۴- "گردش رنگ چمن" (دستاویزی ناول) مطبوعہ: مکتبہ دانیال، کراچی

۴- "خیالی پلاؤ" (ترجمہ / ناول) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی: طبع اول: ۱۹۶۷ء

(نوٹ) شمار نمبر ۱۷ تا ۳۸، وہ کتابیں ہیں جو قرۃ العین حیدر کی اجازت کے بغیر پاکستان سے شائع کی گئیں۔

اعزاز:

۱- "ساہتیہ اکادمی ایوارڈ" برائے "پت جھڑ کی آواز" افسانوی مجموعہ: ۱۹۶۷ء

۲- "سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ" برائے تراجم: ۱۹۶۹ء

۳- "غالب ایوارڈ"

۴- "اقبال سمان" "قومی ایوارڈ ۱۹۸۷ء"

۵- "گیان پیٹھ ایوارڈ ۹۰۔۱۹۸۹ء"

مستقل پتا:

فلیٹ نمبر ۸ ' ٹاور اے ' ذاکر باغ - نئی دہلی (بھارت)

نظریہ فن:

"میں نے کوئی نسخے نہیں پیش کیے۔ میری بنیادی اپروچ انسان پرستی ہے' اس کی ساری دنیا کو آج کل ضرورت ہے۔ اس کی وضاحت کو میں ضروری نہیں سمجھتی"۔

قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر

کارمن

رات کے گیارہ بجے ٹیکسی شہر کی خاموش سڑکوں پر گزرتی ایک پرانی وضع کے پھاٹک کے سامنے جا کر رکی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کر بڑی قطعیت کے ساتھ میرا سوٹ کیس اتار کر فٹ پاتھ پر رکھا اور پیسوں کے لیے ہاتھ پھیلائے تو مجھے ذرا عجیب سا لگا۔

"یہی جگہ ہے؟" میں نے شبہے سے پوچھا۔

"جی ہاں" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں نیچے اتری، ٹیکسی گلی کے اندھیرے میں غائب ہو گئی اور میں سنسان فٹ پاتھ پر کھڑی رہ گئی۔ میں نے پھاٹک کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ تب میں نے بڑے دروازے میں جو کھڑکی لگی تھی اسے کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد کھڑکی کھلی۔ میں نے چوروں کی طرح اندر جھانکا۔ اندر نیم تاریک آنگن تھا جس کے ایک کونے میں دو لڑکیاں رات کے کپڑوں میں ملبوس آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ آنگن کے سرے پر ایک چھوٹی سی شکستہ عمارت استادہ تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے گھسیاری منڈی لکھنؤ کا اسکول یاد آ گیا جہاں سے میں نے بنارس یونی ورسٹی کا میٹرک پاس کیا تھا۔ میں نے پلٹ کر گلی کی طرف دیکھا جہاں مکمل تاریکی طاری تھی۔ فرض کیجئے۔۔۔۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ جگہ اچکیوں، بردہ فروشوں اور اسمگلروں کا اڈہ نکلی تو۔۔۔۔؟ میں ایک اجنبی ملک کے اجنبی شہر میں رات کے گیارہ بجے ایک گم نام عمارت کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی، جو گھسیاری منڈی کے اسکول سے ملتا جلتا تھا۔

ایک لڑکی کھڑکی کی طرف آئی۔

"گڈ ایوننگ! یہ وائی 'ڈبلیو' سی 'اے ہے نا؟" میں نے ذرا عجز سے مسکرا کر پوچھا "میں نے تار دلوایا تھا کہ میرے لیے ایک کمرہ ریزرو کر دیا جائے۔" "مگر کس قدر بور خستہ حال وائی 'ڈبلیو' سی 'اے ہے یہ! میں نے دل میں سوچا۔

"ہمیں آپ کا تار نہیں ملا اور افسوس ہے کہ سارے کمرے گھرے ہوئے ہیں۔"

اب دوسری لڑکی آگے بڑھی۔۔۔۔ "یہ گرلز ہوسٹل ہے۔ یہاں عام طور سے مسافروں کو نہیں ٹھہرایا جاتا" اس نے کہا۔

میں یک لخت بے حد گھبرا گئی۔ اب کیا ہو گا؟ میں اس وقت یہاں سے کہاں جاؤں گی؟ دوسری لڑکی میری پریشانی دیکھ کر خوش خلقی سے مسکرائی۔

"کوئی بات نہیں، گھبراؤ مت اندر آ جاؤ۔ لو ادھر سے کود آؤ۔"

"مگر کمرہ کوئی خالی نہیں ہے۔۔۔۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میرے لیے جگہ کہاں ہو گی؟"

"ہاں ہاں کوئی بات نہیں ہم جگہ بنا دیں گے۔ اب اس وقت آدھی رات کو تم کہاں جا سکتی ہو؟" اس لڑکی نے جواب دیا۔ میں سوٹ کیس اٹھا کر کھڑکی سے اندر آنگن میں کود گئی۔ لڑکی نے سوٹ کیس مجھ سے لے لیا۔ عمارت کی طرف جاتے ہوئے۔ میں نے جلدی جلدی کہا "بس آج کی رات مجھے ٹھہر جانے دو، میں کل صبح اپنے دوستوں کو فون کر دوں گی۔ میں یہاں تین چار لوگوں کو جانتی ہوں۔ تم کو بالکل زحمت نہ ہو گی۔"

"فکر مت کرو۔۔۔۔۔۔" اس نے کہا۔ پہلی لڑکی شب بخیر کہہ کر غائب ہو گئی۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچے۔ برآمدے کے ایک کونے میں لکڑی کی دیواریں بنا کر ایک کمرہ سا بنا دیا گیا تھا۔ لڑکی سرخ پھولوں والا دبیز پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گئی۔ "یہاں میں رہتی ہوں' تم بھی یہیں سو جاؤ۔" اس نے سوٹ کیس ایک کرسی پر رکھ دیا اور الماری میں سے صاف تولیہ اور نیا صابن نکالنے لگی۔ ایک کونے میں چھوٹے سے پلنگ پر مچھر دانی لگی تھی۔ برابر میں سنگھار میز رکھی تھی اور کتابوں کی الماری۔ جیسے کمرے ساری دنیا میں لڑکیوں کے ہوسٹلوں میں ہوتے ہیں۔۔۔ لڑکی نے فوراً دوسری الماری میں سے چادر اور کمبل نکال کر فرش کے گھسے ہوئے بد رنگ قالین پر بستر بچھا دیا اور پلنگ پر نئی چادر بچھا کر مچھر دانی کے پردے گرا دیے۔

"لو تمہارا بستر تیار ہے۔"

مجھے بے حد ندامت ہوئی۔ "سنو میں فرش پر سو جاؤں گی۔"

"ہرگز نہیں۔ اتنے مچھر کاٹیں گے کہ حالت تباہ ہو جائے گی۔ ہم لوگ ان مچھروں کے عادی ہیں۔ کپڑے بدل لو۔" اتنا کہہ کر وہ اطمینان سے فرش پر بیٹھ گئی۔ "میرا نام کارمن ہے' میں ایک دفتر میں ملازم ہوں اور شام کو یونی ورسٹی میں ریسرچ کرتی ہوں۔ کیمسٹری میرا مضمون ہے۔ میں وائی' ڈبلیو' سی' اے کی سوشل سکریٹری بھی ہوں اب تم اپنے متعلق بتاؤ۔"

میں نے بتایا۔

"اب سو جاؤ۔" مجھے اونگھتے دیکھ کر اس نے کہا۔ پھر اس نے دوزانو جھک کر دعا مانگی اور فرش پر لیٹ کر سو گئی۔ صبح کو عمارت جاگی۔ لڑکیاں سروں پر تولیے لپیٹے اور ہاؤس کوٹ پہنے غسل خانوں سے نکل رہی تھیں۔ برآمدے میں سے گرم قہوے کی خوش بو آ رہی تھی۔ دو تین لڑکیاں برآمدے میں ٹہل ٹہل کر دانتوں پر برش کر رہی تھیں۔

"چلو تمہیں غسل خانہ دکھا دوں۔" کارمن نے مجھ سے کہا اور ہال سے گزر کر ایک گلیارے میں لے گئی۔ جس کے سرے پر ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھری تھی جس میں صرف ایک نل لگا تھا اور دیوار پر ایک کھونٹی گڑی تھی۔ اس کا فرش اکھڑا ہوا تھا اور دیواروں پر سیلن تھی۔ روشن دان کے ادھر سے کسی لڑکی کے گانے کی آواز آ رہی تھی اس غسل خانے کے اندر کھڑے ہو کر میں نے سوچا۔ کیسی عجیب بات ہے۔۔۔۔ مدتوں سے یہ غسل خانہ اس ملک میں۔ اس شہر میں' اس عمارت میں اپنی جگہ پر موجود ہے اور میرے وجود سے بالکل بے خبر۔۔۔۔ اور آج میں اس میں موجود ہوں۔۔۔۔ کیسا بے وقوفی کا خیال تھا۔

جب میں نہا کر باہر نکلی تو نیم تاریک ہال میں ایک چھوٹی سی میز پر میرے لیے ناشتہ چنا جا چکا تھا۔ کئی لڑکیاں جمع ہو گئی تھیں۔ کارمن نے ان سب سے میرا تعارف کرایا۔ بہت جلد ہم سب پرانے دوستوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔۔۔۔ "اب میں ذرا اپنے جاننے والوں کو فون کر دوں۔" چائے ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔

کارمن شرارت سے مسکرائی "ہاں اب تم اپنے بڑے بڑے مشہور اور اہم دوستوں کو فون کرو اور ان کے ہاں چلی جاؤ۔ ہماری پروا کون کرتا ہے۔۔۔ کیوں روزا؟۔۔۔ ہم اس کی پروا کرتے ہیں؟"

"بالکل نہیں۔" کورس ہوا۔

لڑکیاں میز پر سے اٹھیں "ہم لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے ہیں' شام کو تم سے ملاقات ہو گی۔"

میگڈ یلنا نے کہا۔

"شام کو۔۔۔؟" امیلیا نے کہا "شام کو یہ کسی کنٹری کلب میں بیٹھی ہو گی۔"

کارمن کے دفتر جانے کے بعد میں نے برآمدے میں جا کر فون کرنے شروع کیے۔

فوج کے میڈیکل چیف میجر جنرل کیمو گلڈاس' جو جنگ کے زمانے میں میرے ماموں کے رفیق کار رہ چکے تھے۔ مسز انطونیا کو شیلو۔۔۔ ایک کروڑ پتی کاروباری کی بیوی' جو یہاں مشہور سماجی لیڈر تھیں اور جن سے میں کسی بین الاقوامی کانفرنس میں ملی تھی۔

الفانسو ولیرا ـــــ اس ملک کا نامور ناول نگار اور جرنلسٹ جو ایک دفعہ کراچی آیا تھا ـــــ "ہلو ـــــ ہلو ـــــ ارے تم کب آئیں ۔ ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی ؟ کہاں ٹھہری ہو ـــــ ؟ وہاں ـــــ ؟ گڈ گاڈ ـــــ وہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ ہم فوراً تمہیں لینے آ رہے ہیں۔" ان سب نے باری باری مجھ سے یہی الفاظ دہرائے۔ سب سے آخر میں میں نے ڈون گارسیا ڈیل پریڈس کو فون کیا ۔ یہ مغربی یورپ کے ایک ملک میں اپنے دیس کے سفیر رہ چکے تھے اور وہیں ان سے اور ان کی بیوی سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی ۔ ان کی سیکرٹری نے بتایا کہ وہ لوگ آج کل پہاڑ پر گئے ہوئے ہیں ۔ اس نے میری کال ان کے پہاڑی محل میں منتقل کر دی۔

تھوڑی دیر بعد مسز کو شیلو اپنی مری ڈیز میں مجھے لینے آگئیں ۔ کارمن کے کمرے میں آکر انہوں نے چاروں طرف دیکھا اور میرا سوٹ کیس اٹھا لیا ۔ مجھے دھکا سا لگا ۔ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی ۔ میں کارمن ' امیلیا ' برنارڈا ' دروزا ' اور گلدینا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔

" سامان ابھی رہنے دیجئے ۔ شام کو دیکھا جائے گا ۔ " میں نے ذرا جھینپ کر مسز کو شیلو سے کہا۔

" مگر تم کو اس نا معقول جگہ پر بے حد تکلیف ہو گی ۔ " وہ برابر دہراتی رہیں ۔ رات کو جب میں واپس آئی تو کارمن اور امیلیا چھانک کی کھڑکی میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھیں " آج ہم نے تمہارے کمرے کا انتظام کر دیا ہے ۔ " کارمن نے کہا ۔ میں خوش ہوئی کہ اب اسے فرش پر نہ سونا پڑے گا۔

ہال کی دوسری طرف ایک اور سیلے ہوئے کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر میرے لیے بستر لگا تھا دوسرے پر مسز سوریل بیٹھی سگرٹ پی رہی تھیں۔ وہ اڑتیس انتالیس سال کی رہی ہوں گی۔ ان کی آنکھوں میں عجیب طرح کی اداسی تھی۔ پولینیزین نسل کی کس شاخ سے انکا تعلق تھا' ان کی شکل سے معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ پلنگ پر نیم دراز ہو کر انہوں نے فوراً اپنی زندگی کی کہانی شروع کر دی "میں گام سے آئی ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "گام کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

" بحرالکاہل میں ایک جزیرہ ہے ۔ اس پر امریکن حکومت ہے ۔ وہ اتنا چھوٹا جزیرہ ہے کہ دنیا کے نقشے پر اس کے نام کے نیچے صرف ایک نقطہ لگا ہوا ہے ۔ میں امریکن شہری ہوں ۔ " انہوں نے فخر سے اضافہ کیا ـــــ گام ـــــ میں نے دل میں دہرایا ۔ کمال ہے ۔ دنیا میں کتنی جگہیں ہیں اور ان میں بالکل ہمارے جیسے لوگ بستے ہیں۔

" میری ایک لڑکی ایک وائلن بجانے والے کے ساتھ بھاگ آئی ہے ۔ میں اسے پکڑنے آئی ہوں ۔ وہ صرف سترہ سال کی ہے ۔ مگر حد سے زیادہ خود سر ـــــ یہ آج کل کی لڑکیاں ـــــ " پھر وہ دفعتاً" اٹھ کر بیٹھ گئیں ـــــ مجھے کینسر ہو گیا تھا۔

" اوہ ـــــ " میرے منہ سے نکلا ۔

" مجھے سینے کا کینسر ہو گیا تھا ۔ " انہوں نے بڑے الم سے کہا " ورنہ تین سال قبل ـــــ میں بھی ـــــ میں بھی اور سب کی طرح نارمل تھی۔"

ان کی آواز میں بے پایاں کرب تھا ـــــ " دیکھو ـــــ " انہوں نے اپنے نائٹ گون کا کالر سامنے سے ہٹا دیا ـــــ میں نے لرز کر آنکھیں بند کر لیں ۔ ایک عورت سے اس کے جسم کی خوب صورتی ہمیشہ کے لیے چھن جائے ۔ کتنی قہرناک بات تھی۔

تھوڑی دیر بعد مسز سوریل سگرٹ بجھا کر سو گئیں ۔ کھڑکی کی سلاخوں میں سے چاند اندر جھانک رہا تھا ۔ نزدیک کے کمرے سے گلدیلینا کے گانے کی آواز آنی بند ہو گئی۔ دفعتاً" میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔

اگلا ہفتہ فیشن ایبل رسالوں کی زبان میں " سوشل اور تہذیبی " مصروفیات کی آندھی کی طرح " آرٹ اور کلچر " کے معاملات میں گزارا۔ دن مسز کو شیلو اور انکے احباب کے حسین ' پر فضا مکانوں میں شامیں شہر کی جگمگاتی تفریح گاہوں میں بسر ہوئیں۔ ہر طرح کے لوگ ـــــ انٹلکچوئیل ـــــ جرنلسٹ ـــــ مصنف ـــــ سیاسی لیڈر 'مسز کو شیلو کے گھر آتے اور ان سے بحث و مباحثے رہتے اور میں انگریزی

محاورے کے الفاظ میں اپنے آپ کو گویا بے حد "اینجوائے" کر رہی تھی۔ میں رات کو وائی 'ڈبلو' واپس آتی اور ہال کی چوکور میز کے ارد گرد بیٹھ کر پانچوں لڑکیاں بڑے اشتیاق سے مجھ سے دن بھر کے واقعات سنتیں۔ "کمال ہے----!" روزا کہتی---- "ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں مگر ہمیں معلوم نہیں کہ ایسی الف لیلوی فضائیں بھی ہیں۔"

"یہ بے حد امیر لوگ جو ہوتے ہیں نا۔ یہ اتنے روپے کا کیا کرتے ہیں؟" امیلیا پوچھتی۔

امیلیا ایک اسکول میں پڑھاتی تھی۔ روزا ایک دفتر میں اسٹینو گرافر تھی۔ گلدینیا اور برنارڈ ایک میوزک کالج میں پیانو اور وائلن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ سب متوسط اور نچلے طبقے کی لڑکیاں تھیں۔

اتوار کی صبح کارمن ماس میں جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ کوئی چیز نکالنے کے لئے میں نے الماری کھولی تو اس کے جھٹکے سے اوپر سے ایک اونی خرگوش نیچے گر پڑا۔ میں اسے واپس رکھنے کے لئے اوپر اچکی تو الماری کی چھت پر بہت سارے کھلونے رکھے نظر آئے۔

"یہ میرے بچے کے کھلونے ہیں" کارمن نے سنگھار میز کے سامنے بال بناتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"تمہارے بچے کے----" میں ہکا بکا رہ گئی اور میں نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا۔ کارمن بن بیاہی ماں تھی۔

آئینے میں میرا رد عمل دیکھ کر وہ میری طرف پلٹی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے کہا---- "تم غلط سمجھیں۔" پھر وہ کھکھلا کر ہنسی اور اس نے الماری کی نچلی دراز میں سے ایک ہلکے نیلے رنگ کی چمکیلی "بے بی بک" نکالی دیکھو یہ میرے بچے کی سال گرہ کی کتاب ہے۔ جب وہ ایک سال کا ہو گا تو یہ کرے گا۔ جب دو سال کا ہو جائے گا تو یہ کہے گا۔ یہاں اس کی تصویریں چپکاؤں گی----- وہ اطمینان سے آلتی پالتی مار کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اس کتاب میں سے خوب صورت امریکن بچوں کی رنگین تصویروں کے تراشے نکال کر بستر پر پھیلا دیئے۔ "دیکھو میری ناک کتنی چپٹی ہے اور نک تو مجھ سے گیا گزرا ہے۔ تو ہم دونوں کے بچوں کی ناک کا سوچو کیا حشر ہو گا؟ میں اس کی پیدائش سے مہینوں پہلے یہ تصویریں دیکھا کروں گی تاکہ اس بے چارے کی ناک پر کچھ اثر نہ پڑے۔"

"تم دیوانی ہو اچھی خاصی 'اور یہ نک کون بزرگ ہیں؟"

اس کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا---- "ابھی اس کا ذکر نہ کرو۔ اس کے نام پر مجھے لگتا ہے میرا دل کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔"

مگر اس کے بعد وہ برابر نک کا ذکر کرتی رہی "میں اتنی بد صورت ہوں مگر نک کہتا ہے۔ کارمن---- کارمن مجھے تمہارے دل سے' تمہارے دماغ سے' تمہاری روح سے عشق ہے' نک نے اتنی دنیا دیکھی ہے۔ اتنی حسین لڑکیوں سے اس کی دوستی رہی ہے مگر اسے میری بدصورتی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔"

گرجا سے واپسی پر خلیج کے کنارے سڑک پر چلتے ہوئے' وائی ڈبلو کے غم ناک ہال میں کپڑوں پر استری کرتے ہوئے کارمن نے مجھے اپنی اور نک کی داستان سنائی۔ نک ڈاکٹر تھا اور ہارٹ سرجری کی اعلیٰ ٹریننگ کے لیے باہر گیا ہوا تھا اور اسے دیوانہ وار چاہتا تھا۔

رات کو میں مسز سوریل کے کمرے سے کارمن کے کمرے میں واپس آ چکی تھی۔ کیوں کہ مسز سوریل اپنی لڑکی کو پکڑ لانے میں کامیاب ہو گئی تھیں اور لڑکی اب ان کے ساتھ مقیم تھی۔ سونے سے پہلے میں مچھر دانی ٹھیک کر رہی تھی اور کارمن فرش پر آسن جمائے بیٹھی تھی۔

"نک-----" اس نے کہنا شروع کیا۔

"آج کل کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔"

"تم اسے خط کیوں نہیں لکھتیں؟

"نہیں۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تو بہت لمبا چوڑا مسئلہ ہے۔" میں نے جمائی لے کر جواب دیا۔ "مگر یہ بتاؤ کہ تم اسے خط کیوں نہیں لکھتیں؟"

"پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟"

"ہاں" میں نے بحث کو مختصر کرنے کے لئے کہا۔

"اچھا تو تم خدا کو خط لکھتی ہو؟"

عمارت کی روشنیاں بجھ گئیں۔ رات کی ہوا میں آنگن کے درخت سر سرا رہے تھے۔ کمرے کے دروازے پر پڑا ہوا سرخ پھولوں والا پردہ ہوا کے جھونکوں سے پھڑپھڑائے جا رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے ایک طرف سرکا دیا۔

"بہت خوب صورت پردہ ہے۔" میں نے پلنگ کی طرف لوٹتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ کارمن فرش پر کروٹ بدل کر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ میری بات پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "میں اور نک پہاڑی علاقہ میں کئی سو میل کی ڈرائیو کے لیے گئے تھے ----- سن رہی ہو؟"

ہاں ----- ہاں ---- سناؤ ---- "

"راستے میں نک نے کہا کہ چلو ڈون ریموں سے ملتے چلیں۔ ڈون ریموں نک کے والد کے دوست اور کابینہ کے وزیر تھے اور انہوں نے حال ہی میں اپنے ضلع کے پہاڑی مقام پر نئی کوٹھی بنوائی تھی۔ جب ہم لوگ ان کی کوٹھی کے نزدیک پہنچے تو سامنے سے سفید فراک پہنے بہت سی چھوٹی چھوٹی بچیاں ایک اسکول سے نکل کر آتی دکھائی دیں۔ مجھے وہ منظر ایک خواب کی طرح یاد ہے۔

پھر ہم اندر گئے اور مسز ریموں کے انتظار میں ان کے شان دار ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ کیبنٹ منسٹر گھر پر موجود نہیں تھے۔ ڈرائنگ روم اور اسٹڈی روم کے نزدیک جو دیوار تھی' اس میں شیشے کی ایک چوکور ڈبے ایسی کھڑکی میں پلاسٹک کی ایک بہت بڑی گڑیا سجی تھی جو کمرے کی نفیس آرائش کے مقابلے میں بہت بھدی معلوم ہو رہی تھی۔ ہم دونوں اس بد مذاقی پر چپکے سے مسکرائے پھر مسز ریموں بر آمد ہوئیں۔ انہوں نے ہمیں ٹھنڈی چائے پلائی اور سارا گھر دکھلایا۔ ان کے غسل خانے سیاہ ٹائل کے تھے اور مہمان کمرے کے نفیس دیوان بیڈ۔ سرخ پھول دار ٹیپسٹری (Tapestary) کے جھالروں والے غلاف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان پلنگوں کو دیکھ کر نک نے چپکے سے مجھ سے کہا تھا "بدمذاقی کی انتہا" اور میں نے اپنے دل میں کہا تھا۔۔ کوئی بد مذاقی نہیں۔ میں تو اپنے گھر کے لیے ایسے ہی پلنگ خریدوں گی اور اسی رنگ کے غلاف بنواؤں گی۔ اس کے بعد ----- میں جب بھی گھریلو سازو سامان کی دوکان سے گزرتی تو اس کپڑے کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹک جاتے ---- پھر میں نے تنخواہ بچا بچا کر اسی قیمتی کپڑے کا پردہ خرید لیا۔

"جب میں ایک مخصوص چینی ریستوران کے آگے سے گزرتی ہوں -----" وہ اسی آواز میں کہتی رہی "اور شیشے کے دریچے کے قریب رکھی ہوئی میز اور اس پر جلتا ہوا سبز لیمپ نظر آتا ہے تو میرا دل ڈوب سا جاتا ہے۔ وہاں میں نے ایک شام کو نک کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔"

مجھے نیند آ رہی تھی اور میں نک کے اس وظیفے سے اکتا چکی تھی۔ میں نے مچھر دانی کے پردے گراتے ہوئے کہا ----- "ایک بات بتاؤ ----- تم کو اس قدر شدید عشق ہے اپنے نک سے تو تم نے اس سے شادی کیوں نہ کر لی۔ اب تک کیوں جھک مارتی رہیں -----"

"مجھے دس سال تک ایک دور افتادہ جزیرے میں اپنے بابا کے ساتھ رہنا پڑا۔ اس نے اداسی سے جواب دیا۔ "پہلے ہم لوگ اسی شہر میں رہتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں بمباری سے ہمارا چھوٹا سا مکان جل کر راکھ ہو گیا اور میری ماں اور دونوں بھائی مارے گئے۔ صرف میں اور میرے بابا زندہ بچے۔ بابا ایک اسکول میں سائنس ٹیچر تھے ان کو ٹی۔ بی ہو گئی اور میں نے انہیں سینی ٹوریم میں داخل کر دیا جو بہت دور کے جزیرے میں تھا ---- سینی ٹوریم بہت منگا تھا۔ اس لیے کالج چھوڑتے ہی میں نے اس صحت گاہ کے دفتر میں نوکری کر لی اور آس پاس کے دولت

مند زمین داروں کے گھروں میں ٹیوشن بھی کرتی رہی مگر بابا کا علاج اور زیادہ مہنگا ہوتا گیا۔ تب میں نے اپنے گاؤں جا کر اناس کا آبائی باغیچہ رہن رکھ دیا۔ تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے ---- میں ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے میں کشتی میں بیٹھ کر جاتی اور زمین داروں کے محلوں میں ان کے کند ذہن بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے تھک کر چور ہو جاتی تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے۔ نک سے میری ملاقات آج سے دس سال قبل ایک فیسٹا (Fiesta) میں ہوئی تھی۔ اس دوران میں جب بھی دارالسلطنت آتی وہ مجھ سے ملتا رہتا۔ تین سال ہوئے اس نے شادی پر اصرار کیا لیکن بابا کی حالت اتنی خراب تھی کہ میں انکو مرتا چھوڑ کر یہاں نہ آسکتی تھی۔ اسی زمانے میں نک کو باہر جانا پڑ گیا۔ جب بابا مر گئے تو میں یہاں آگئی۔ اب میں یہاں ملازمت کر رہی ہوں اور اگلے سال یونیورسٹی میں اپنا مقالہ بھی داخل کر دوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ بابا کے کھیت بھی رہن سے چھوٹ جائیں۔ نک میری مدد کرنا چاہتا تھا مگر میں شادی سے پہلے ایک پیسہ نہیں لوں گی۔ اس کے خاندان والے بڑے بددماغ اور اکڑفوں والے لوگ ہیں اور ایک لڑکی کے لئے اس کی عزت نفس بہت بڑی چیز ہے۔ عزت نفس' خودداری اور خود اعتمادی۔ اگر مجھے کبھی یہ احساس ہو جائے کہ نک مجھے حقیر سمجھتا ہے۔ یا مجھے؟ سو گئیں ---- اچھا ---- گڈ نائٹ ------"

دوسرے روز وہ صبح تیار ہو کر حسب معمول سب سے پہلے ناشتہ کی میز پر انتظام کے لئے پہنچ چکی تھی۔ مسز سوریل کام واپس جا رہی تھیں اپنے ہونے والے داماد سے ان کی صلح ہو گئی تھی۔ وہ سویرے ہی سے آن پہنچا تھا۔ وہ ایک منّی سا نوجوان تھا اور برآمدے کے ایک کونے میں بھیگی بلی بنا بیٹھا تھا۔ فضا پر عجیب سے بشاشت طاری تھی۔ لڑکیاں بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ میں بھی بہت مسرور تھی اور خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ یہ ہلکے پھلکے اور مکمل پن کا احساس زندگی میں بہت کم آتا ہے اور صرف چند لمحے رہتا ہے۔ مگر وہ لمحے بہت غنیمت ہیں۔

کارمن جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے دفتر چلی گئی۔ " آج بھی تم اپنے شان دار دوستوں سے ملنے نہ جا رہی ہوتیں تو تم کو جیپنی (Jeepney) میں بٹھا کر شہر کے گلی کوچوں کی سیر کراتے ------" مگدیلینا نے مجھ سے کہا۔

" تمہارے لیے ایک کیڈی لک آئی ہے بھئی۔ " روزانے اندر آ کر اطلاع دی۔

"کیڈی لک ---- افوہ ---- !! " کورس ہوا۔

تمہارے لیے ایسی چغادری موٹریں آتی ہیں کہ ہم لوگوں کی رعب کے مارے گھگھی بندھ جاتی ہے۔ " برنارڈا نے خوش دلی سے اضافہ کیا۔ میں نے لڑکیوں کو خدا حافظ کہا اور اپنا سفری بیگ کندھے سے لٹکا کر باہر آگئی۔ میں سابق سفیر ڈون گارسیا ڈیل پریڈوس کے وہاں دو دن کے لیے ان کے ہل اسٹیشن جا رہی ہوں۔ ان کے وردی پوش شوفر نے سیاہ کیڈی کا دروازہ مودبانہ بند کیا اور کار شہر سے نکل کر سرسبز پہاڑوں کی سمت روانہ ہو گئی۔

پہاڑ کی ایک چوٹی پر ڈون گارسیا کا ہسپانوی وضع کا شان دار گھر درختوں میں چھپا دور سے نظر آ رہا تھا۔ وادیوں میں کہرہ منڈلا رہا تھا اور سفید اور کاسنی اور سرخ اور زرد رنگ کے پہاڑی پھول سارے میں کھلے ہوئے تھے۔ کار پھاٹک سے ہو کر پورچ میں رک گئی۔ قبائلی نسلوں والی شائستہ نوکرانیاں باہر نکلیں۔ بٹلر نے نیچے آ کر کار کا دروازہ کھولا۔ ہال کے دروازے میں ڈون گارسیا اور ان کی بیوی ڈونا ماریا میرے منتظر تھے۔ ان کا گھر سفید قالینوں اور سنہرے فرنیچر اور انتہائی قیمتی سامان آرائش سے سجا ہوا تھا اور اس طرح کے کمرے تھے جن کی تصویریں لائف میگزین کے رنگین صفحات پر پریڈ فرنیچر، انٹیریر ڈیکوریشن کے سلسلے میں اکثر شائع کی جاتی ہیں۔

کچھ دیر بعد میں ڈونا ماریا کے ساتھ اوپر کی منزل پر گئی۔ وہاں شیشے والے برآمدے کے ایک کونے میں ایک نازک سی بید کی ٹوکری میں ایک چھ مہینے کی بے حد گلابی بچی پڑی غاؤں غاؤں کر رہی تھی۔ وہ بچی اس قدر پیاری تھی کہ میں ڈونا ماریا کی بات ادھوری چھوڑ کر سیدھی ٹوکری کے پاس چلی گئی۔ ایک بے حد حسین' صحت مند' تر و تازہ اور کمسن امریکن نزدیک کے صوفے سے اٹھ کر میری جانب آئی اور مسکرا کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"یہ میری بہو ہے۔" ڈونا ماریا نے کہا۔
ہم تینوں ٹوکری کے گرد کھڑے ہو کر بچی سے لاڈ و پیار میں مصروف ہو گئے۔ دوپہر کو لنچ کی میز پر امریکن لڑکی کا شوہر بھی آ گیا۔
"یہ ہمارا بیٹا ہوزے ہے۔" ڈون گارسیا نے کہا۔
ہوزے کی عمر تقریباً پینتیس سال ہو گی۔ اپنی قومی کرمت کی ہلکے آبی رنگ کی قمیض اور سفید پتلون میں وہ خاصہ وجیہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نوعمر بیوی کو بے حد چاہتا تھا اور بچی پر عاشق تھا۔ زیادہ تر اسی کی باتیں کرتا رہا۔
رات کو میں اپنی بے حد پر تکلف اور بڑھیا خواب گاہ میں گئی جس کے سازو سامان کو ہاتھ لگاتے فکر ہوتی تھی کہ کہیں میلا نہ ہو جائے۔ اس وقت مجھے وائی 'ڈبلو کے سیلے ہوئے کمرے اور تنگ مچھردانی اور سبز سوریل اور ہال کی بدرنگ کرسیاں شدت سے یاد آئیں۔
دو دن بعد پریڈوس خاندان میرے ہی ساتھ دارالسلطنت واپس لوٹا۔
اپنے ماں باپ کو ان کے ٹاؤن ہاؤس میں اتارنے کے بعد ہوزے نے مجھے میری جائے قیام پر پہنچانے کے لیے کیڈلک دوبارہ اسٹارٹ کی۔ ہوزے اور اس کی بیوی ڈور تھی صرف دو ہفتہ قبل امریکہ سے لوٹے تھے۔ ان کا بہت سا سامان کسٹم ہاؤس میں پڑا تھا جسے چھڑانے کے لیے انہیں جانا تھا۔
شہر کے سب سے اعلیٰ ہوٹل کے سامنے ہوزے نے کار روک لی۔
"یہاں کیا کرنا ہے۔" میں نے اس سے پوچھا۔
"تم یہیں ٹھہری ہو نا؟"
"نہیں ڈیئر ہوزے میں وائی 'ڈبلو 'سی 'اے میں ٹھہری ہوں۔"
وائی 'ڈبلو ------؟ گڈ گاڈ! کمال ہے اچھا وہیں چلتے ہیں۔ مگر کیا تم کو یہاں جگہ نہ مل سکی۔ تمہیں چاہیے تھا کہ آتے ہی ڈیڈی کو اطلاع دیتیں۔"
اس وقت مجھے دفعتاً" خیال آیا کہ میں ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگوں کو اپنی افتاد طبع کے ذریعہ کم از کم اپنی حد تک ذہنی طور پر ہموار کرتی چلی جاتی ہوں۔ مگر ہوزے اور اس کے والدین ملک کے دس دولت مند ترین خاندانوں میں شامل تھے اور یہاں کے حکمراں طبقے کے اہم ستون تھے اور ان کو یہ سمجھانا بالکل بے کار تھا کہ مجھے وائی 'ڈبلیو کیوں اتنا اچھا لگا ہے اور میں وہاں ٹھہرنے پر کیوں اس قدر مصر ہوں۔
ہوزے نے گلی کے نکڑ پر کار روک لی کیوں کہ چینیوں کی ایک قطار نے سارا راستہ گھیر رکھا تھا۔ میں جب وائی 'ڈبلیو کے اندر پہنچی تو سب لوگ سو چکے تھے۔ میں چپکے سے جا کر اپنی مچھردانی میں گھس گئی۔ کارمن حسب معمول فرش پر سکون کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس کے سرہانے سانتو طوماس (سینٹ طماس) کی تصویر پر گلی کے لیمپ کا مدھم عکس جھلملا رہا تھا۔
صبح چار بجے اٹھ کر میں دبے پاؤں چلتی شکستہ غسل خانے میں گئی اور آہستہ سے پانی کا نل کھولا مگر پانی کی دھار اس زور سے نکلی کہ میں چونک اٹھی۔ اسی طرح چپکے سے کمرے میں آ کر میں نے اسباب باندھا تاکہ آہٹ سے کارمن کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ وہ فرش سے غائب ہے اور کچھ دیر بعد اس نے آ کر کہا "ناشتہ تیار ہے۔" وہ ٹیکسی کے لیے فون بھی کر چکی تھی۔
"کیسا سفر رہا۔" اس نے چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔
"بہت دلچسپ۔"
"یہ تمہارے دوست لوگ کون تھے جہاں تم گئی تھیں؟ تم نے بتایا ہی نہیں۔"
میں بات شروع کرنے والی ہی تھی کہ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے جلدی سے کمرے میں جا کر سوٹ کیس کھولا۔ ایک نئی بنارسی ساری نکال کر ایک پرچے پر لکھا۔ "تمہاری شادی کے لیے میرا پیشگی تحفہ------" اور ساری اور پرچہ کارمن کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

"ٹیکسی آ گئی" کارمن نے برآمدے میں سے آواز دی۔

ہم دونوں سامان اٹھا کر باہر آئے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی اتنے میں کارمن پھاٹک کی کھڑکی میں سے سر نکال کر چلائی------ "ارے تم نے اپنا پتہ تو دیا ہی نہیں۔" میں نے کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا پتہ گھسیٹ کر اسے تھما دیا۔ پھر مجھے ایک بے حد ضروری بات یاد آئی۔ "حد ہو گئی کارمن۔ تمہاری وائی ڈبلو نے مجھے اپنا بل نہیں دیا۔"

"بکو مت۔"

"ارے یہ تمہارا نجی گھر تو نہیں تھا۔"

"تم میری مہمان تھیں۔"

"بکو مت۔"

"تم خود مت بکو۔ اب بھاگو ورنہ ہوائی جہاز چھٹ جائے گا اور دیکھو جب میں شادی کا کارڈ بھیجوں تو تم کو آنا پڑے گا۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ ذرا سوچو نک تم سے مل کر کتنا خوش ہو گا۔"

مگر ہم دونوں کو معلوم تھا کہ میرا دوبارہ اتنی دور آنا بہت مشکل ہے۔

"خدا حافظ کارمن" میں نے کہا۔

"خدا حافظ ------" وہ کھڑکی میں سر نکال کر بہت دیر تک ہاتھ ہلاتی رہی ٹیکسی صبح کاذب کے دھندلکے میں ایر پورٹ روانہ ہو گئی۔ ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا۔ میں کسٹم کاؤنٹر پر سے لوٹی تو پیچھے سے ڈون گارسیا کی آواز آئی "---- نک------ میں ذرا سگار خرید لوں۔"

"بہت اچھا ڈیڈی ------" یہ ہوزے کی آواز تھی۔

میں چونک کر پیچھے مڑی۔ ہوزے مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ "دیکھا ہم لوگ کیسے ٹھیک وقت پر پہنچے۔"

"ہوزے ------" میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے پوچھا ------ "تمہارا دوسرا نام کیا ہے۔؟"

"نک ------ ڈیڈی جب بہت لاڈ میں آتے ہیں تو مجھے نک پکارتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر میں ہوزے ہی کہلاتا ہوں---- کیوں----؟"

کچھ نہیں ------ "میں اس کے ساتھ لاؤنج کی طرف چلنے لگی۔ "تم ------ امریکہ کیا کرنے گئے تھے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہارٹ سرجری میں اسپشلائیز کرنے ------ میں نے تمہیں بتایا تو تھا کیوں -----؟"

"تم ------ کبھی تم نے --- تم نے"

"کیوں -----؟ کیا ہوا ----؟ کیا بات ہے -----؟"

"کچھ نہیں" میری آواز ڈوب گئی۔ لاؤڈ اسپیکر نے دہرانا شروع کیا۔ "پین امریکن کے مسافر---- پین امریکن کے مسافر-----"

"ارے ----! روانگی کا وقت اتنی جلدی آ گیا؟" نک نے تعجب سے گھڑی دیکھی۔ ڈون گارسیا' سگار خرید کر شفقت سے مسکراتے ہوئے میری طرف آئے۔ میں نے دونوں باپ بیٹوں کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں خدا حافظ کہا اور تیزی سے مسافروں کی قطار میں جا ملی۔

دوڑتے ہوئے طیارے کی کھڑکی میں سے میں نے دیکھا۔ ڈون گارسیا اور نک نیچے ریلنگ پر جھکے رومال ہلا رہے تھے۔ طیارے نے زمین سے بلند ہونا شروع کر دیا۔

یہاں سے بہت دور خطرناک طوفانوں میں گھرے ہوئے پوربی سمندر میں ہرے بھرے جزیروں کا ایک جھنڈ ہے۔ جو فلپائن کہلاتا ہے۔ ان کے جاگتے جگمگاتے دارالسلطنت منیلا کے ایک بے رنگ سے محلے کی ایک شکستہ عمارت کے اندر ایک بے حد چپٹی ناک اور فرشتے کے سے معصوم دل والی فلپینو لڑکی رہتی ہے جو اپنے بچے کے لیے کھلونے جمع کر رہی ہے اور اپنے خدا کی واپسی کی منتظر ہے جس کی ذات پر اسے کامل یقین ہے۔

فوٹوگرافر

موسم بہار کے پھولوں سے گھرا بے حد نظر فریب گیسٹ ہاؤس ہرے بھرے ٹیلے کی چوٹی پر دور سے نظر آ جاتا ہے۔ ٹیلے کے عین نیچے پہاڑی جھیل ہے۔ ایک بل کھاتی سڑک جھیل کے کنارے کنارے گزرتی گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک تک پہنچتی ہے۔ پھاٹک کے نزدیک والرس کی ایسی مونچھوں والا ایک فوٹوگرافر اپنا سازو سامان پھیلائے ایک ٹین کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ یہ گم نام پہاڑی قصبہ ٹورسٹ علاقے میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے بہت کم سیاح اس طرف آتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی ماہ عسل منانے والا جوڑا یا کوئی مسافر گیسٹ ہاؤس میں آ پہنچتا ہے تو فوٹوگرافر بڑی امید اور صبر کے ساتھ اپنا کیمرہ سنبھالے باغ کی سڑک پر ٹہلنے لگتا ہے۔ باغ کے مالی سے اس کا سمجھوتہ ہے۔ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری کسی نوجوان خاتون کے لیے صبح سویرے گل دستہ لے جاتے وقت مالی فوٹوگرافر کو اشارہ کر دیتا ہے اور جب ماہ عسل منانے والا جوڑا ناشتے کے بعد نیچے باغ میں آتا ہے تو مالی اور فوٹوگرافر دونوں ان کے انتظار میں چوکس ملتے ہیں۔

فوٹوگرافر مدتوں سے یہاں موجود ہے۔ نہ جانے کہیں اور جا کر اپنی دکان کیوں نہیں سجاتا۔ لیکن وہ اسی قصبے کا باشندہ ہے۔ اپنی جھیل اور اپنی پہاڑی چھوڑ کر کہاں جائے؟ اس پھاٹک کی پلیا پر بیٹھے بیٹھے اس نے بدلتی دنیا کے رنگا رنگ تماشے دیکھے ہیں۔ پہلے یہاں صاحب لوگ آتے تھے: برطانوی پلانٹرز' سفید سولا ہیٹ پہنے کولونیل سروس کے جغادری عہدے دار' ان کی میم لوگ اور بابا لوگ۔ رات رات بھر شرابیں اڑائی جاتی تھی اور گراموفون ریکارڈ چیختے تھے اور گیسٹ ہاؤس کے نچلے ڈرائنگ روم کے چوبی فرش پر ڈانس ہوتا تھا۔ دوسری بڑی لڑائی کے زمانے میں امریکن آنے لگے۔ پھر ملک کو آزادی ملی اور اکا دکا سیاح آنے شروع ہوئے۔ یا سرکاری افسر' یا نئے بیاہے جوڑے' یا مصور یا کلاکار ایسے لوگ جو تنہائی چاہتے ہیں' ایسے لوگ جو برسات کی شاموں کو جھیل پر جھکی دھنک کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں' ایسے لوگ جو سکون اور محبت کے متلاشی ہیں جس کا زندگی میں وجود نہیں۔ کیونکہ ہم جہاں جاتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے' ہم جہاں ٹھہرتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے' فنا مسلسل ہماری ہم سفر ہے۔

گیسٹ ہاؤس میں مسافروں کی آوک جاوک جاری ہے۔ فوٹوگرافر کے کیمرے کی آنکھ یہ سب دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔

ایک روز شام پڑے ایک نوجوان اور ایک لڑکی گیسٹ ہاؤس میں آن کر اترے۔ یہ دونوں انداز سے ماہ عسل منانے والے معلوم نہیں ہوتے تھے' لیکن بے حد مسرور اور سنجیدہ سے وہ اپنا مختصر سامان اٹھائے اوپر چلے گئے۔ اوپر کی منزل بالکل خالی پڑی تھی۔ زینے کے برابر میں ڈائننگ ہال تھا اور اس کے بعد تین بیڈ روم۔

"یہ کمرہ میں لوں گا۔" نوجوان نے پہلے بیڈ روم کی میں داخل ہو کر کہا جس کا رخ جھیل کی طرف تھا۔ لڑکی نے اپنی سرخ چھتری اور اوور کوٹ اس کمرے کے ایک پلنگ پر پھینک دیا تھا۔

"اٹھاؤ اپنا بوریا بستر۔" نوجوان نے اس سے کہا۔

"اچھا۔" لڑکی دونوں چیزیں اٹھا کر برابر کے سٹنگ روم سے گزرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی جس کے پیچھے ایک پختہ گلیارہ سا تھا۔ کمرے کے بڑے بڑے دریچوں میں سے دو مزدور نظر آ رہے تھے جو ایک سیڑھی اٹھائے پچھلی دیوار کی مرمت میں مصروف تھے۔

ایک بیرہ لڑکی کا سامان لے کر اندر آیا اور دریچوں کے پردے برابر کر کے باہر چلا گیا۔ لڑکی سفر کے کپڑے تبدیل کر کے سٹنگ روم میں آ گئی۔ نوجوان آتش دان کے پاس ایک آرام کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ باہر جھیل پر دفعتاً" اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ دریچے میں کھڑی ہو کر باغ کے دھندلکے کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ نہ جانے وہ دونوں کیا باتیں کرتے رہے تھے۔ فوٹو گرافر' جو اب بھی نیچے پھاٹک پر بیٹھا تھا' اس کا کیمرہ آنکھ رکھتا تھا لیکن سماعت سے عاری تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کھانے کمرے میں گئے اور دریچے سے لگی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر قصبے کی روشنیاں جھلملا اٹھی تھیں۔

اس وقت تک ایک یورپین سیاح بھی گیسٹ ہاؤس میں آ چکا تھا۔ وہ خاموش ڈائننگ ہال کے دوسرے کونے میں چپ چاپ بیٹھا خط لکھ رہا تھا۔ چند پکچر پوسٹ کارڈ اس کے سامنے میز پر رکھے تھے۔

"یہ اپنے گھر خط لکھ رہا ہے کہ میں اس وقت پراسرار مشرق کے ایک پراسرار ڈاک بنگلے میں موجود ہوں۔ سرخ ساڑھی میں ملبوس ایک پراسرار ہندوستانی لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے۔ بڑا ہی رومینٹک ماحول ہے!" لڑکی نے چپکے سے کہا۔ اس کا ساتھی ہنس پڑا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں پھر سٹنگ روم میں آ گئے۔ نوجوان اب اسے کچھ پڑھ کر سنا رہا تھا۔ رات گہری ہوتی گئی۔ دفعتاً" لڑکی کو زور کی چھینک آئی اور اس نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا: "اب سونا چاہئے۔"

"تم اپنی زکام کی دوا پینا نہ بھولنا۔" نوجوان نے فکر سے کہا۔

"ہاں' شب بخیر۔" لڑکی نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پچھلا گلیارہ گھپ اندھیرا پڑا تھا۔ کمرہ بے حد پر سکون اور خنک اور آرام دہ تھا۔ زندگی بے حد پر سکون اور آرام دہ تھی لڑکی نے کپڑے تبدیل کر کے سنگھار میز کی دراز کھول کے دوا کی شیشی نکالی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اپنا سیاہ کیمونو پہن کر دروازہ کھولا۔ نوجوان ذرا گھبرایا ہوا سا سامنے کھڑا تھا۔

"مجھے بھی بڑی سخت کھانسی اٹھ رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا۔" لڑکی نے دوا کی شیشی اور چمچہ اسے دیا۔ چمچہ نوجوان کے ہاتھ سے چھٹ کر فرش پر گر گیا۔ اس نے جھک کر چمچہ اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ لڑکی روشنی بجھا کر سو گئی۔

صبح کو وہ ناشتے کے لیے ڈرائنگ روم میں گئی۔ زینے کے برابر والے ہال میں پھول مہک رہے تھے۔ تانبے کے بڑے بڑے گل دان برا سو سے چمکائے جانے کے بعد ہال کے جھلملاتے چوبی فرش پر ایک قطار میں رکھ دیے گئے تھے اور تازہ پھولوں کے انبار ان کے نزدیک رکھے ہوئے تھے۔ باہر سورج نے جھیل کو روشن کر دیا تھا اور زرد و سفید تتلیاں سبزے پر اڑتی پھر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد نوجوان ہنستا ہوا زینے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا ایک گچھا تھا۔

"مالی نیچے کھڑا ہے۔ اس نے یہ گل دستہ تمہیں بھجوایا ہے۔" اس نے کمرے میں داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا اور گل دستہ میز پر رکھ دیا۔

لڑکی نے ایک شگوفہ اٹھا کر بے خیالی سے اپنے بالوں میں لگا لیا اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

"ایک فوٹو گرافر بھی نیچے منڈلا رہا ہے۔ اس نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے تمہارے متعلق دریافت کیا کہ کیا تم فلاں فلم اسٹار تو نہیں؟" نوجوان نے کرسی پر بیٹھ کر چائے بناتے ہوئے کہا۔

لڑکی ہنس پڑی۔ وہ ایک نامور رقاصہ تھی مگر اس جگہ پر کسی نے اس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ نوجوان' لڑکی سے بھی زیادہ' مشہور موسیقار تھا مگر اسے بھی یہاں کوئی نہ پہچان سکا تھا۔ ان دونوں کو اپنی اس عارضی گم نامی اور مکمل سکون کے یہ مختصر لمحات بہت بھلے معلوم ہوئے۔

کمرے کے دوسرے کونے میں ناشتہ کرتے ہوئے اکیلے یورپین نے آنکھیں اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا اور ذرا سا مسکرایا۔ وہ بھی ان دونوں

کی خاموش مسرت میں شریک ہو چکا تھا۔
ناشتے کے بعد وہ دونوں نیچے گئے اور باغ کے کنارے گل مہر کے نیچے کھڑے ہو کر جھیل کو دیکھنے لگے۔ فوٹو گرافر نے اچانک چھلاوے کی طرح نمودار ہو کر بڑے ڈرامائی انداز میں ٹوپی اتاری اور ذرا جھک کر کہا:
"فوٹو گراف لیڈی؟"
لڑکی نے گھڑی دیکھی: "ہم لوگوں کو ابھی باہر جانا ہے 'دیر ہو جائے گی۔"
"لیڈی ۔۔۔" فوٹو گرافر نے پاؤں منڈیر پر رکھا اور ایک ہاتھ پھیلا کر باہر کی دنیا کی سمت اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "باہر 'کار زار حیات میں 'گھمسان کا رن پڑا ہے۔ مجھے معلوم ہے اس گھمسان سے نکل کر آپ دونوں خوشی کے چند لمحے چرانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ دیکھیے اس جھیل کے اوپر دھنک پل کی پل میں غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا' ادھر آیئے۔"
"بڑا لسان فوٹو گرافر ہے۔" لڑکی نے چپکے سے اپنی ساتھی سے کہا۔
مالی 'جو گویا اب تک اپنے کیو کا منتظر تھا' دوسرے درخت کے پیچھے سے نکلا اور لپک کر ایک اور گل دستہ لڑکی کو پیش کیا۔ لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ وہ اور اس کا ساتھی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ لڑکی کی آنکھوں میں دھوپ آ رہی تھی اس لیے اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں ذرا سی چندھیا دی تھیں۔
کلک۔ کلک۔ تصویر اتر گئی۔
"تصویر آپ کو شام کو مل جائے گی۔ تھینک یو لیڈی۔ تھینک یو سر۔" فوٹو گرافر نے ذرا جھک کر دوبارہ ٹوپی چھوئی۔
لڑکی اور اس کا ساتھی کار کی طرف چلے گئے۔
سیر کر کے وہ دونوں شام پڑے لوٹے اور سندھیا کی نارنجی روشنی میں دیر تک باہر گھاس پر پڑی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ جب کہرہ گرنے لگا تو اندر نچلی منزل کے وسیع اور خاموش ڈرائنگ روم میں نارنجی قمقموں کی روشنی میں آ بیٹھے۔ نہ جانے وہ کیا باتیں کر رہے تھے جو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ کھانے کے وقت وہ اوپر چلے گئے۔ صبح سویرے وہ واپس جا رہے تھے اور اپنی باتوں کی محویت میں ان کو فوٹو گرافر اور اس کی کھینچی ہوئی تصویر یاد بھی نہ رہی تھی۔
صبح کو لڑکی اپنے کمرے ہی میں تھی جب بیرے نے اندر آ کر ایک لفافہ پیش کیا: "پھوٹو گرافر صاحب یہ رات کو دے گئے تھے۔" اس نے کہا۔
"اچھا' اس کے سامنے والی دراز میں رکھ دو۔" لڑکی نے بے خیالی سے کہا اور بال بنانے میں جٹی رہی۔
ناشتے کے بعد سامان باندھتے ہوئے اسے دراز کھولنا یاد نہ رہی اور جاتے وقت خالی کمرے پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر وہ تیز تیز چلتی نیچے جا کر کار میں بیٹھ گئی۔ نوجوان نے کار اسٹارٹ کر دی۔ کار پھاٹک سے باہر نکلی۔ فوٹو گرافر نے پلیا پر سے اٹھ کر ٹوپی اتاری۔ مسافروں نے مسکرا کر ہاتھ ہلائے۔ کار ڈھلوان سے نیچے اتر گئی۔
وہ والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹو گرافر اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے اور اسی طرح اس گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک پر ٹین کی کرسی بچھائے بیٹھا ہے اور سیاحوں کی تصویریں اتارتا رہتا ہے جو اب نئی فضائی سروس شروع ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس طرف آنے لگے ہیں۔
لیکن اس وقت ایئر پورٹ سے جو ٹورسٹ کوچ آ کر پھاٹک میں داخل ہوئی اس میں سے صرف ایک خاتون اپنا اٹیچی کیس اٹھائے برآمد ہوئیں اور ٹھٹک کر انہوں نے فوٹو گرافر کو دیکھا جو کوچ کو دیکھتے ہی فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا' مگر کسی جوان اور حسین لڑکی کی بجائے ایک ادھیڑ عمر کی بی بی کو دیکھ کر مایوسی سے دوبارہ جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔
خاتون نے دفتر میں جا کر رجسٹر میں اپنا نام درج کیا اور اوپر چلی گئیں۔ گیسٹ ہاؤس سنسان پڑا تھا۔ سیاحوں کی ایک ٹولی ابھی ابھی آگے

روانہ ہوئی تھی اور بیرے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر چکے تھے۔ تانبے کے گل دان تازہ پھولوں کے انتظار میں ہال کے فرش پہ رکھے جھل جھل کر رہے تھے اور ڈائننگ ہال میں دریچے کے نیچے سفید براق میز پر چھری کانٹے جگمگا رہے تھے۔ نووارد خاتون درمیان بیڈ روم میں سے گزر کر پچھلے کمرے میں چلی گئیں اور اپنا سامان رکھنے کے بعد پھر باہر آ کر جھیل کو دیکھنے لگیں۔ چائے کے بعد وہ خالی سٹنگ روم میں جا بیٹھیں' اور رات ہوئی تو جا کر اپنے کمرے میں سو گئیں۔ گلیارے میں سے کچھ پرچھائیوں نے اندر جھانکا تو وہ اٹھ کر دریچے میں گئیں جہاں مزدور دن بھر کام کرنے کے بعد سیڑھی دیوار سے لگی چھوڑ گئے تھے۔ گلیارہ بھی سنسان پڑا تھا۔ وہ پھر پلنگ پر آ کر لیٹیں تو چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے دروازہ کھولا' باہر کوئی نہ تھا۔ سٹنگ روم بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ پھر آ کر لیٹ رہیں۔ کمرہ بہت سرد تھا۔

صبح کو اٹھ کر انہوں نے اپنا سامان باندھتے ہوئے سنگھار میز کی دراز کھولی تو اس کے اندر بچھے پیلے کاغذ کے نیچے سے ایک لفافے کا کونہ نظر آیا جس پر ان کا نام لکھا تھا۔ خاتون نے ذرا تعجب سے لفافہ باہر نکالا۔ ایک کاکروچ کاغذ کی تہ میں سے نکل کر خاتون کی انگلی پر آ گیا۔ انہوں نے دہل کر انگلی جھٹکی اور لفافے میں سے ایک تصویر سرک کر نیچے گر گئی جس میں سے ایک نوجوان اور ایک لڑکی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ تصویر کا کاغذ پیلا پڑ چکا تھا۔ خاتون چند لمحوں تک گم سم اس تصویر کو دیکھتی رہیں' پھر اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

بیرے نے باہر سے آواز دی کہ ایئرپورٹ جانے والی کوچ تیار ہے۔ خاتون نیچے گئیں۔ فوٹوگرافر نئے مسافروں کی تاک میں باغ کی سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ اس کے قریب جا کر خاتون نے بے تکلفی سے کہا:

"کمال ہے' پندرہ برس میں کتنی بار اس سنگھار میز کی صفائی کی گئی ہوگی مگر یہ تصویر کاغذ کے نیچے اسی طرح پڑی رہی۔" پھر اس کی آواز میں جھلاہٹ آ گئی" "اور یہاں کا انتظام کتنا خراب ہو گیا ہے۔ کمرے میں کاکروچ ہی کاکروچ۔"

فوٹوگرافر نے چونک کر ان کو دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر خاتون کے جھریوں والے چہرے پر نظر ڈال کر الم سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ خاتون کہتی رہیں۔ ان کی تو آواز بھی بدل چکی تھی۔ چہرے پر درشتی اور سختی تھی اور انداز میں چڑچڑاپن اور بے زاری' اور وہ سپاٹ آواز میں کہے جا رہی تھیں:

"میں اسٹیج سے ریٹائر ہو چکی ہوں۔ اب میری تصویریں کون کھینچے گا بھلا۔ میں ——— میں اپنے وطن واپس جاتے ہوئے رات کی رات یہاں ٹھہر گئی تھی۔ نئی ہوائی سروس شروع ہو گئی ہے نا۔ یہ جگہ راستے میں پڑتی ہے۔"

"اور ——— اور ——— آپ کے ساتھی؟" فوٹوگرافر نے آہستہ آہستہ سے پوچھا۔ کوچ نے ہارن بجایا۔

"آپ نے کہا تھا نا کہ کار زار حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ اس گھمسان میں وہ کہیں کھو گئے۔"

کوچ نے دوبارہ ہارن بجایا۔

"اور ان کو کھوئے ہوئے بھی مدت گزر گئی۔ اچھا' خدا حافظ۔" خاتون نے بات ختم کی اور تیز تیز قدم رکھتی کوچ کی طرف چلی گئیں۔

دالرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹوگرافر پھاٹک کے نزدیک جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

زندگی انسانوں کو کھا گئی۔

صرف کاکروچ باقی رہیں گے۔

آغا بابر

نام : آغا سجاد حسین
قلمی نام : آغا بابر
پیدائش : ۳۱ مارچ ۱۹۱۹ء بہ مقام : بٹالہ
تعلیم : ایم۔ اے (تاریخ) پنجاب یونیورسٹی' لاہور
میٹرک ایم۔ بی ہائی سکول' بٹالہ سے کیا۔ گورنمنٹ کالج' لاہور سے بی۔ اے (آنرز) اور بعد میں پرائیوٹ طالب العلم کے طور پر پنجاب یونیورسٹی' لاہور سے ایم۔ اے کیا۔ انفارمیشن سکول فورٹ سلوکم نیویارک کے گریجویٹ تھے۔

مختصر حالاتِ زندگی:

غلام اکبر خان کے ہاں بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ لڑکپن کا بیشتر وقت لاہور میں گزرا۔ ایم۔ اے اردو کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۵ء پنچولی آرٹ سٹوڈیو میں مکالمہ نویس کے طور پر کام کیا۔ ڈراما سے طبعی مناسبت کے سبب ابتدا میں بطور ڈراما نویس شہرت پائی۔ غیر منقسم پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں بطور رپورٹر کام کیا۔ کچھ مدت حکومت پنجاب (ہند) کے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں پبلسٹی افسر رہے۔ ۱۱ مئی ۱۹۴۹ء کو پاکستان آرمی میں کمیشن حاصل کیا اور ۱۱ جولائی ۱۹۴۹ء میں انٹر سروسز پبلک ریلیشنز ڈائریکٹوریٹ (G.H.Q) سے وابستہ ہو گئے۔ "مجاہد" اور "ہلال" کے مدیر رہے۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے ایک خیر سگالی وفد کے ساتھ سعودی عرب گئے۔ ۱۹۶۱ء میں انٹر نیشنل پریس انسٹیٹیوٹ کے زیر اہتمام کوالالمپور' ملائیشیا میں منعقد ہونے والے مدیروں کے سیمینار میں شرکت کی۔ میجر کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کے سیکرٹری رہے۔ ۱۹۷۸ میں نیشنل کونسل آف آرٹس' راولپنڈی کے ڈائریکٹر تھے۔ جہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد امریکا چلے گئے۔ آج کل "ریڈرز ڈائجسٹ" کے ساتھ منسلک ہیں۔

اولین معلومہ اردو افسانہ:

"سی اینڈ شی" مطبوعہ: "ہمایوں" لاہور۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ چاک گریباں۔ (آٹھ افسانے) مکتبہ جدید' لاہور' طبع اول: اگست ۱۹۴۸ء
۱۔ تعجب۔ ۲۔ بڑے میاں' سو بڑے میاں ۳۔ فرار ۴۔ زندگی کی شام ۵۔ میری سالیاں ۶۔ طلبہ کی فریاد ۷۔ ایک خط جو سفر ہو گیا ۸۔ محبت مسبب

۲۔ "لب گویا" (بیس افسانے) — گوشہ ادب' لاہور' — طبع اول: ۱۹۵۶ء

۱۔ کبو ۲۔ برقع کرا پارٹی ۳۔ زنانہ کلب ۴۔ بیوگی ۵۔ کوڑے کے ڈھیر پر ٦۔ غلام زہرہ مذروب ۸۔ دل کی بستی عجیب بستی ہے۔
۹۔ شاپ لفٹنگ ۱۰۔ شہسوار ۱۱۔ ہم بدلے نہ وہ بدلے ۱۲۔ دستر خوان ۱۳۔ سبز پوش ۱۴۔ مسیحائی ۱۵۔ روح کا بوجھ
۱٦۔ رات والے ۱۷۔ جستجوئے جمال ۱۸۔ وہ زندگی کی بات تھی ۔ ۱۹۔ چارلس بیجڑا ۔ ۲۰۔ چال چلن۔

۳۔ "اڑن طشتریاں" (۵ ڈرامے ایک سفرنامہ اوربارہ افسانے) گوشہ ادب' لاہور' — طبع اول: ۱۹۵۸ء

۱۔ باجی ولایت ۲۔ قصر شیخ ۳۔ غرارہ ۴۔ بیگانہ غم ۔ ۵۔ مواو ٦۔ گریز ۷۔ الائچیاں اور لونگ ۸۔ حب کا تعویز ۹۔ ممی
۱۰۔ جوئے نرم رو ۱۱۔ پرنس تلی ۱۲۔ حویلی

۴۔ "پھول کی کوئی قیمت نہیں" (تیرہ افسانے) — فیروز سنز' لمیٹڈ' لاہور' — طبع اول: ۱۹۸٦ء

۱۔ چنچی رمساں ۲۔ جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی ۳۔ پھول کی کوئی قیمت نہیں ۴۔ باد صحرا ۵۔ مرد کا فولاد ٦۔ واردات ۷۔ لکڑی والا
۸۔ نہ آئیں تم کو محبتیں کرنیں ۹۔ کڑوی بیل ۱۰۔ چھجے والا مکان ۱۱۔ خیری مری ۱۲۔ نیا پاکستان ۱۳۔ سروے۔

۵۔	"بڑا صاحب" (ڈراما)	مینار ادب' لاہور'	طبع اول: ۱۹٦۰ء
٦۔	"سیز فائر" (ڈراما)	مینار ادب' لاہور'	طبع اول: ۱۹۴۸ء
۷۔	"حوا کی بیٹی"	مکتبہ علم و ادب' راولپنڈی'	طبع اول: ۱۹۷۳ء
۸۔	"کہانی بولتی ہے"	فیروز سنز' لاہور'	طبع اول: ۱۹۸۹ء

غیرمدون:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ آغا بابر نے ولیم شیکسپیر کے ڈراما " A Mid Summer Night " کا ترجمہ "سردیوں کی ایک رات" کے عنوان سے اوپن ایئر تھیٹر راول پنڈی صدر کے لئے ۱۹٦۵ء میں کیا۔ افسانہ "تلاش" (انتخاب "ماہ نو" ۱۹۵۲ء تا ۱۹٦۵ء) "خال تاج" مطبوعہ: "سیپ" کراچی جولائی ۱۹۷۰ء "پگھلتا ہوا کاجل" مطبوعہ: "نقوش" لاہور جنوری ۱۹۷۷ء' "نسوانی آواز" مطبوعہ: "نقوش" لاہور ستمبر ۱۹۸٦ء' "خدوخال" مطبوعہ: "نقوش" لاہور دسمبر ۱۹۸۷ء اور ڈراما "آخری شب عرف میرجی کی موت" مطبوعہ: "نقوش" لاہور دسمبر ۱۹۸٦ء کسی کتاب میں شامل نہیں۔

مستقل پتا:

۱۵۔ بارلے سٹریٹ' راول پنڈی (صدر) پاکستان۔

نظریہ فن:

"میں جب کوئی افسانہ لکھتا ہوں تو سب سے پہلے اس کا اختتام میرے ذہن میں آتا ہے۔ پھر کردار اور باقی تفاصیل اور اس طرح میرے لیے افسانے کی عمارت کو کھڑا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔"

آغا بابر

(بہ حوالہ: "نیشن" لاہور مارچ ۱۹۹۱ء)

آغا بابر

گلاب دین چٹھی رساں

پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لمبے کمرے میں خاصی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ آج چٹھی رسانوں کے علاقے بدلے [گئے] تھے۔ چٹھی رساں گلاب دین کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

کرم الٰہی نے اکرام سے پوچھا "گلاب دین کی ماں کیوں مری ہوئی ہے؟"

"بھئی' اس کی بدلی ہیرا منڈی ہو گئی ہے۔"

کرم الٰہی نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا "سوں رب دی؟"

اکرام بولا "سوں رب دی۔" اور اس نے بھانڈ کی چپڑاس کی طرح اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر دے مارا۔ دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

"اس کا کیا مطلب ہوا جی؟ رزق دینے والا تو خدا ہوتا ہے۔ مجھے خواہ نوکری کیوں نہ چھوڑنی پڑے۔ میں تو بڑے صاحب کے پاس اپیل کروں گا۔ آپ خود سمجھ دار ہیں۔ افسروں کو کچھ تو خیال کرنا چاہیے کہ کون سا علاقہ کس کو دینا چاہیے۔" گلاب دین اپنے دل کی بھڑاس نکال [رہ]ا تھا۔

وہ پانچ وقت کا نمازی تھا۔ اپنے محلے میں تراویح کی نمازوں میں قرآن خوانی کا انتظام کرنا ہمیشہ اس کے ذمے ہوتا تھا۔ بازار میں معراج شریف کا چندہ اسی کے ایما سے اکٹھا ہوتا اور اسی کے ہاتھوں سے خرچ ہوتا تھا۔ میلادالنبی کے موقعے پر محلے کے لڑکے بالے اس کی ہدایت کے مطابق خوبصورت محراب نما دروازے بناتے اور جھنڈیاں لگاتے تھے۔ مسجد کے باقاعدہ نمازیوں میں اس کا شمار تھا۔ دیندار لوگوں کی صحبت سے مسئلے مسائل سے بھی خاصی آگاہی ہو چکی تھی۔ فرض شناسی اور ایمان داری کی بنا پر اپنے پرائے سبھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مگر آج اس کی عزت کا دم گھٹ رہا تھا ہیرا منڈی میں خط بانٹنے جائے گا۔ طوائفوں کے کوٹھوں پر چڑھ کر آواز دے گا 'بی بی جی خط آیا۔ غلیظ گلیوں میں [جا] کر پیشہ وروں کو ان کے یاروں کے خط دے گا' جو ہوس سے شروع ہو کر ہوس پر ختم ہوں گے 'جن کا مضمون صرف بدکاری ہو گا۔ کسی خط میں ماں کی مامتا نہ ہو گی۔ کسی خط میں باپ کا پیار نہ ہو گا۔ ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی جگہ سنکھیا ہو گا اور باپ کی نگاہوں میں بے غیرتی' بے شرمی' بے حیائی ۔۔۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اگلے دن پوسٹ ماسٹر کہہ رہا تھا "گلاب دین کیوں پیش ہونا چاہتا ہے؟"

سپروائزر بولا "آپ سے کوئی درخواست کرنا چاہتا ہے۔ صرف دو منٹ کے لیے پیش ہونے کو کہہ رہا ہے۔"

"بلاؤ"

گلاب دین کا چہرہ بڑے صاحب کی پیشی میں زرد پڑ رہا تھا۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کترے ہوئے لب زیادہ موٹے دکھائی دے رہے تھے۔ [د]اڑھی کے بال زیادہ گھنے نظر آ رہے تھے۔ وہ شاید تازہ تازہ وضو کر کے 'دعا مانگ کر' آیا تھا۔

"کیا بات ہے 'گلاب دین؟"

"جی' میں صرف یہ عرض کرنے کو پیش ہوا ہوں کہ میری تبدیلی ہیرا منڈی کر دی گئی ہے ۔۔۔۔۔۔"

"تو پھر"

"جی' ذرا خیال فرمائیے' میں پانچ وقت کا نمازی پرہیز گار آدمی ہوں - میری بڑی بے عزتی ہو گی-"

اس نے درخواست نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنے خالی کوٹ کی جیب سے کالے دانوں کی تسبیح نکال کر بولا "حضور' جس ہاتھ سے یہ تسبیح پھیری جاتی ہے وہ بدکاری کے اڈوں میں جا کر پیشہ ور عورتوں کو خط تقسیم کرے گا؟ استغفراللہ! مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا' جناب - میری گزارش ہے کہ مجھے فیض باغ کا علاقہ دے دیا جائے یا مصری شاہ میں رہنے دیا جائے۔"

پوسٹ ماسٹر نے پیپرویٹ کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا "تو تمہاری تبدیلی منسوخ کر دی جائے؟"

"آپ کے بچے جیتے رہیں - یہی کمترین کا مطلب تھا -"

"سردست یہ مشکل ہے - غور کرنے کے لیے تمہاری عرضی رکھے لیتے ہیں - مگر اس وقت تبدیلی منسوخ نہیں ہو سکتی-"

گلاب دین کے سینے میں ایک تیر سا لگا-

سراج اور گلاب دین' دونوں چٹھی رساں پانی والے تالاب سے ہوتے ہوئے جب نوگزے کی قبر پر پہنچے تو سراج رک گیا - اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی ڈاک کو چھانٹا اور بولا "مولوی گلاب دین آ - ادھر سے شروع کریں" وہ دائیں ہاتھ کو گھوم گیا - "یہ پہلا چوبارہ فیروزاں کا ہے - ادھر سب گانے والیاں رہتی ہیں-"

پھاٹک کے سامنے چارپائی بچھائے تین چار آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے - مکان کے پختہ تھڑے پر ایک عورت کندھے پر تولیہ ڈالے گیلے بالوں کو انگلیوں سے جھٹکے دے دے کر سکھا رہی تھی - دوپٹہ نہ ہونے کی وجہ سے گلاب دین کو وہ بہت بے شرم دکھائی دی - ہر جھٹکے کے ساتھ اس کا سینہ ---- اس کا جی چاہا وہ آنکھیں بند کر لے - اس نے اپنی پگڑی کا شملہ پکڑ کر ناک اور منہ چھپا لیا-

"کل سے میری جگہ یہ چٹھیاں تقسیم کیا کریں گے-"

"ہیں! نیا چٹھی رساں لگ گیا؟"

"جی ہاں"

لمبی لمبی مونچھوں والے نے تاش کے پتوں کو پتاخ سے بند کرتے ہوئے پہلے سراج کو دیکھا' پھر گلاب دین کی طرف نگاہ پھرائی - دیکھنے والے کی آنکھیں سرخ تھیں اور چارپائی کا کافی حصہ اس کے بھاری جثے نے گھیرا ہوا تھا - اس نے گھٹنا اٹھا کر لٹھے کی چادر کو چٹھوں میں دے لیا اور پھر آسودگی سے بیٹھ گیا - اس کی پنڈلیوں پر منڈے ہوئے بالوں کا کھردرا غبار پھیلا ہوا تھا-

"منشی ہوراں کا نام کیا ہے؟" نوجوان چھوکرے نے پوچھا-

سراج نے جواب دیا "گلاب دین -"

نوجوان چھوکرے نے ہنس کر کہا "او رانجھا چل گلاب دا میری جھولی ٹٹ پیا -"

"وے' شرم نہیں آتی تجھے؟ سلام دعا لینے کی بجائے مسخریاں کرنے لگا - " تھڑے پر کھڑی ہوئی طوائف نے جھڑکا - اس نے اپنا ایک پاؤں کٹہرے پر اٹھا کر رکھا تھا' جس سے اس کی وزنی رانوں کا اندازہ لگانے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی-

"ادب بی بی' اپنی شلوار جا کے سیو پہلے -"

اس نے اپنا پاؤں کٹہرے سے نیچے رکھ لیا اور بولی "تتے منہ' بے شرما -"

مونچھوں والے نے ڈبیا اٹھا کر گلاب دین سے کہا "سگرٹ پیو' مولبی جی -"

گلاب دین بولا "جی نہیں - مہربانی -"

سراج نے سگرٹ سلگا لیا اور سلام علیکم کر کے آگے چل دیا -

"یہ مونچھوں والا کون ہے؟"

"اس گلی کا چودھری۔"

"اور لچر سا چھوکرا؟"

"یہ بلو کے چاچے کا لڑکا ہے۔ یہ بلو ہی تو تھی۔ ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی ہے۔ یہ نچلی بیٹھک بالاں کی ہے' اور اوپر چوبارے میں تگی رہتی ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈاک میں سے ایک لفافہ نکال کر گلاب دین کو دکھایا' جس پر سرنامہ لکھا تھا زمرد سلطانہ عرف تگی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر گلیارے میں آ پہنچے۔ بیٹھک خالی پڑی تھی۔ دروازے پر موتیوں سے پروئی ہوئی لڑیاں آپ ہی آپ لرز رہی تھیں۔ سراج نے میلی میلی چاندنی پر خط پھینکتے ہوئے کہا "چٹھی لے لو جی۔" ایک ٹھنگنی سی عورت نے آ کر خط اٹھا لیا۔

سراج بولا "بی بی جی' کل سے یہ چٹھی رساں چٹھیاں بانٹا کریں گے۔"

"اچھا منشی" اس نے بے دھیانی میں کہا اور اضطراب سے لفافے کو دیکھ کر یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی "تگی جی' چٹھی آئی ہے۔"

واپسی پر تاش کھیلنے والوں کے پاس سے گزرتے وقت گلاب دین نے اپنی خالی خالی نگاہیں ہوا میں ڈال دیں تاکہ وہ لچر سا لڑکا اسے پھر مذاق سے کچھ کہہ نہ دے۔ مگر ان لوگوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون گزر گیا۔

بازار میں پہنچ کر گلاب دین نے ایک لمبا سا سانس لیا اور شملے کے سرے سے ماتھا پونچھا۔ سراج کہہ رہا تھا "یہ نکا پان والا ہے۔ یہ شابے کی دکان ہے۔ شابے کے پان ساری ہیرامنڈی میں مشہور ہیں۔ یہ اس کا شاگرد ہے۔ دن کو یہ بیٹھتا ہے۔ شابا اس وقت سویا ہوا ہو گا۔ شام کو بیٹھے گا۔ پان سگرٹ کی دکانیں دلالی کے اڈے ہیں' مولوی جی۔"

اس وقت گلاب دین کو چپ لگی ہوئی تھی۔ وہ سراج کے یوں براہ راست خطاب پر چونک پڑا۔ بولا "خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔"

"بازار میں یہ لوگ' جو ہم کو اس وقت دکانوں پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں' یہ طوائفوں کے ملازم ہیں۔"

ایک گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر سراج چٹھی رساں نے خطوں کو پھر چھانٹا "اس گلی میں پیشہ کمانے والی بیٹھتی ہیں۔" سراج نے بغیر کسی جذبے کے کورے گائیڈ کی طرح کہا اور گلاب دین کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ اس گلی میں سے سڑے ہوئے خربوزوں کی بو آ رہی تھی۔ گلاب دین نے شملے سے پھر اپنا منہ ڈھک لیا اور عاجزی سے بولا "اس گلی میں جانا ضروری ہے؟"

"صرف ایک خط ہے۔"

"کس کا؟"

"کنجروں کے چودھری حاقو کا۔ اس گلی کی بہت کم چٹھیاں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ہوتی ہے تو وہ چودھری کی یا کسی دلال کی ہوتی ہے۔"

چودھری کی خضاب لگی ڈاڑھی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور ایک شخص اس کی پنڈلیاں سونت رہا تھا قریب ہی ایک تیل مالشیا بیٹھا تھا۔

"کدھر ماشٹر؟" اس نے چٹھی رساں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"چودھریو! آپ کی یہ چٹھی تھی۔"

کسبیاں اپنی اپنی دہلیزوں پر لوہے کی کرسیاں رکھے بیٹھی تھیں۔ چہروں پر پھٹکار برس رہی تھی۔ گلاب دین نظریں نیچی کیے سراج کے ساتھ ساتھ گزر رہا تھا۔ اتنے میں کسی عورت کی آواز آئی "میاں مٹھو' چوری کھائی ہے؟"

گلاب دین نے چور آنکھ سے دیکھا۔ ایک کسبی نے اپنے دروازے پر طوطے کا پنجرا لٹکا رکھا تھا۔ چٹھی رساں کو دیکھ کر بولی "منشی جی' ہماری کوئی چٹھی نہیں آئی؟"

سراج نے جب نفی میں سر ہلایا تو بولی "ہائے! ہمیں کوئی چٹھی نہیں لکھتا۔"

دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ دوپٹہ اتارے' سینہ اکڑائے' ایک عورت کھڑی تھی۔ بولی "یاروں پٹی' اب تجھے کون چٹھی لکھے گا۔ مر گئے تیرے سب یار چٹھیاں لکھنے والے۔"

یہ دونوں آگے نکل گئے۔ سراج نے کہا "طوطے والی عورت کا نام گلابو ہے۔ اس گلی کی ساری رونق اس کے دم سے ہے۔ بہت سے تماشبین اس گلی میں اسی کی خاطر آتے ہیں۔"

گلی آگے سے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ تماشبین' جو چھدرے چھدرے دکھائی دیتے تھے' اب ان کی وجہ سے راستہ رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ گلاب دین کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے کھلی سڑک پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا' پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے وقت اسے یاد آیا کہ اس نے تماشبینوں کے ریلے میں ایک ڈاڑھی والے کو بھی دیکھا تھا جس نے ماتھے پر ہار لپیٹا ہوا تھا اور پھر کنجروں کے چودھری کی خضاب رنگی بھرویں ڈاڑھی اسے یاد آئی۔ وہ تھک چکا تھا اور اپنے کام سے بے زاری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا' کاش! اس کی نون تیل کی دکان ہوتی۔ آرام سے بیٹھا دکان کرتا۔ اسے معلوم نہیں تانگوں کے اڈے تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا۔ سینما کے قریب کا ماحول اسے کچھ مختلف لگا۔ اس کا جی چاہا سیڑھیوں پر بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہے تاکہ اس کے اعصاب پر سے کھچاؤ دور ہو جائے۔

سراج نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "کیوں منشی جی' تھک گئے؟"

"نہیں تو۔"

"بس یہ دو چٹھیاں اور باقی ہیں۔"

یہ کہہ کر سراج نے چار پانچ خط گلاب دین کو تھما دیے۔ گلاب دین کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے غلیظ خون سے بھرے لتے' کوڑے کے ڈھیر پر سے اٹھا کر اس کے باوضو ہاتھوں میں تھما دیے ہوں۔

اتنے میں سراج ایک مکان میں داخل ہو گیا' جس کی ڈیوڑھی بہت بڑی تھی اور جو خالی پڑی تھی۔ وہ بے دھڑک آگے صحن تک بڑھ گیا۔ صحن میں ایک طرف نواڑی پلنگ پر دو نوجوان لڑکیاں لسن کی تریاں چھیل رہی تھیں۔ سامنے لسن کے چھلکوں کا ڈھیر لگا تھا۔ زمیں پر چوکی بچھائے ایک چھوٹی سی لڑکی الگ بیٹھی لسن چھیل رہی تھی۔ سراج نے گلاب دین کے کان میں کہا' یہ بدرو اور قدرو کا مکان ہے اور گلاب دین کے ہاتھ میں تھمی ڈاک میں سے ایک خط جس پر بدرالنسا کا نام لکھا تھا' نکال لیا۔ ان کی آواز سن کر دونوں لڑکیوں نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

سراج بولا "خط آیا' جی۔"

دونوں لڑکیاں بے تابی سے آگے بڑھیں۔ سراج نے خط دینے کے لیے گلاب دین کو آگے دھکیلا۔ یہ پہلا خط تھا جو گلاب دین نے دیا۔ بدرالنسا خط کھول کر پڑھ رہی تھی کہ ڈیوڑھی میں سے دو بھاری بھرکم آدمی داخل ہوئے۔ سراج بولا "لو استاد ہوری بھی آ گئے۔ منشی جی' استاد نوردین کی چٹھی دیکھنا۔"

گلاب دین خط چھانٹنے لگا کہ بدرالنسا خوشی سے چلائی "آپا کے کاکی ہوئی۔" دونوں لڑکیاں بدرالنسا کے پیچھے بھاگ گئیں۔

استاد نورالدین صحن میں کھڑا کہہ رہا تھا۔ "او حیوانو! شیطانو! ہمیں چٹھی تو دکھاؤ۔"

برآمدے میں لگی چق کے پیچھے سے کسی معمر عورت کی آواز آئی "استاد جی' قمر کے کاکی ہوئی ہے۔"

"نصیبوں والی ہو۔ مبارکاں ہوں' اماں جی۔"

"آپ کو بھی ہوں۔ اری لڑکیو' چٹھی رساں کا منہ میٹھا کر دو۔"

استاد بولا "ایک چٹھی رساں نہیں' دو ہیں۔"

سراج مسکرا کر بولا "استاد جی' آپ بڑے جگتی ہیں۔۔ اپنا خط بھی لیا کہ نہیں؟"

گلاب دین نے نورالدین کو اس کا خط دے دیا جو محض اشارہ پانے کا منتظر کھڑا تھا۔ دوسرا بھاری بھرکم آدمی بولا "آج

آپ ----------"

سراج نے کہا "آج میرا آخری دن ہے۔ کل سے منشی گلاب دین چٹھیاں بانٹا کریں گے۔"

سراج کے ہاتھ میں قدرو نے آ کر دو روپے دے دیے۔ استاد نے گلاب دین کی طرف دیکھ کر جگت کی "بڑی قسمتوں والے ہو۔ کنجروں کے گھر سے پہلے دن ہی بونی کر چلے ہو۔"

بدرو بولی "مسخریاں چھوڑو' استاد جی۔ باہر جا کے اپنے ہوروں کو دیکھو اور کہو' گھر مٹھائی کی ٹوکری لے کر آئیں۔"

بازار میں پہنچ کر سراج نے لوہے کے جنگلے والے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہاں بیگماں رہتی ہے۔ وہ ساتھ والا مکان ببھو کا ہے۔ اس کے پیچھے وہ جو بیٹھک نظر آتی ہے' وہ استاد نورالدین کی ہے۔ اسے بدرنگے کی بیٹھک بھی کہتے ہیں۔ دیکھنا تو ایک چٹھی مشتری کی بھی تھی۔"

گلاب دین نے ڈاک دیکھ کر کہا "ہاں"

"یہ گھر زہرہ و مشتری کا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ سامنے برآمدے میں ایک عورت چارپائی پر کروٹ لے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے موٹے موٹے کولہوں پر سے قمیص ہٹی ہوئی تھی۔ قدموں کی چاپ سن کر بھی اس نے اس طرف نہ دیکھا' جیسے کوئی نشہ پی کر بے سدھ پڑی ہو۔

سراج نے کھانس کر کہا "چٹھی رساں آیا۔"

ساتھ والے کمرے سے ایک نازک سی دبلی پتلی لڑکی خط لینے کے لیے نکل آئی۔ سامنے والے کمرے میں دو سازندے بیٹھے ایک چھوٹی سی لڑکی کو سبق دے رہے تھے۔ جس نے ناک میں ننھی سی پھن رکھی تھی۔ ہاتھ کان کے پاس رکھے لمبی آواز میں کہتی جا رہی تھی "آ"----- اسی طرح پھر کے جا رہی تھی---- جا......

نئے بازار میں آ کر سراج نے دوبارہ گلاب دین کو ایک روپیہ دینے کی کوشش کی۔ دونوں روپے خود رکھ لینا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ اس نے ایک روپیہ زبردستی اس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا اور بولا "بزرگو' یہ کوئی حرام کا پیسہ نہیں ہے۔ سمجھنے کی بات ہے۔ کسی کی جیب سے روپیہ نکال لینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ روپیہ کا تو یہی حساب کتاب ہے۔ آج یہ ہماری جیب میں' کل دوسرے کی جیب میں۔ پرسوں وہاں سے تیسرے کے پاس۔ کسی کے پاس کب ٹھہرتا ہے۔"

گلاب دین کو وہ ننھی والی لڑکی یاد آ گئی جسے پہلا سبق یہی دیا جا رہا تھا----- آ----- جا----- پھر آ----- پھر جا-----

"یہ اب کدھر کو؟" گلاب دین نے سراج کو اب ایک تیسری گلی میں گھستے ہوئے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"ہمیں کس بھڑوے کا ڈر ہے' منشی جی؟ ہم اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ اس طرح تو آپ بھرپائے۔"

اس گلی میں کچے گوشت کی بساندھ آ رہی تھی' جیسی دنت مارکیٹ سے آتی ہے۔ دو رویہ کرسیوں پر پیشہ ور عورتیں مردوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی بے باکانہ بیٹھی تھیں۔ ان کی باتیں بے ہودہ اور حرکتیں بڑی لچر تھیں۔ کچھ اوپر چوباروں پر بیٹھی تاک جھانک کر رہی تھیں۔

سراج بولا "یہاں سب درڑ مال ہے۔" نصف گلی میں پہنچ کر اس نے کہا "منشی جی' فضل دین معرفت الٰہی جان کا خط نکالنا۔ اسے دے دو۔"

گلاب دین نے اس پتے کا خط الٰہی جان کو دے دیا' جس کے پاس سے اسے نسوار کی بو آئی۔ ایک دروازے کے سامنے بہت سے تماشبین ایک مشکی رنگ کی عورت سے چہلیں کر رہے تھے۔ جس نے تہبند باندھ رکھا تھا' کانوں میں موتیے کے پھول تھے اور بالوں میں سرخ گلاب اڑس رکھا تھا۔ سراج نے یہ کہہ کر علاقے کے باخبر چٹھی رساں ہونے کا مظاہرہ کیا۔ "یہ خانگی ذات کی مسلن ہے۔"

اس وقت گلاب دین کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ باہر نکلتے ہی اس نے بڑبڑا کر پوچھا "ان خانگیوں کی کتنی تعداد ہو گی؟"
"کوئی گنتی شمار نہیں۔ خانگیاں نہیں کہتے انھیں، مولوی جی۔ یہ کنجریاں ہیں۔ نئی پیشہ بیٹھنے والی کو خانگی کہتے ہیں۔"
"خوک" گلاب دین نے حلق کھرچ کر زور سے تھوکا۔
ڈاک تقسیم کرنے کے دو وقت تھے۔ ایک دوپہر، ایک سہ پہر۔ دونوں وقت گلاب دین کو علاقہ گھومنا پڑتا۔ چاروں طرف چٹھیاں بانٹنے جانا پڑتا۔ اس بات کا اسے بڑا افسوس تھا کہ وہ بدرو قدرو کے گھر سے لیا ہوا روپیہ واپس نہ دے سکا۔ اس روز سراج نے روپیہ زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اسے اسی طرح رہنے دیا کہ اگلے روز جا کر واپس دے دے گا۔ مگر اسے ادھر جانے کا حوصلہ نہ پڑا۔ اس نے سوچا کسی روز ان کی چٹھی دینے جائے گا، تو روپیہ بھی واپس کر دے گا۔ مگر چٹھی ہی نہ آئی۔ جس دن آئی اس سے دو روز پہلے اس کی جیب سے وہ روپیہ نکال کر اس کی بیوی نے مٹی کا تیل منگا لیا تھا۔
بدرو اور قدرو سفید چاندنی پر لیٹی تھیں۔ گاؤ تکیے پر ان کی چھوٹی بہن آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی اور آج اپنی عمر سے بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ پاس ان کا باپ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جب گلاب دین صحن میں داخل ہوا تو بدرو اسے دیکھتے ہی بولی "چٹھی رساں آیا۔"
گلاب دین نے ڈاک چھانٹ کر تین لفافے اسے پکڑا دیے۔ اس کا باپ بولا "آؤ منشی جی، جی آیاں نوں۔ لڑکیاں روز کہتی تھیں، چٹھی نہیں آئی۔ نئے منشی جی لگے ہیں۔ کہیں ہماری چٹھیاں دوسری جگہ نہ دے دیں۔"
گلاب دین بولا "جی نہیں۔ آپ کی چٹھی نہیں آئی تھی۔"
"میری بات کا خیال نہ کریں۔ آدمی بندہ بشر ہے۔ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ بازار میں میری لڑکیاں بدرو اور قدرو کے نام سے مشہور ہیں۔ اصل نام بدر النسا اور قدر النسا ہے۔ تیسری قمر النسا کراچی میں بیٹھک کرتی ہے۔"
قدر النسا چاندنی پر لیٹی لیٹی بولی "ابا جی تو اس روز کاکی کے پیدا ہونے کی چٹھی لائے تھے۔"
"بڑے مبارک قدم ہیں آپ، منشی جی۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ یہ منی آرڈر تو لکھ دیں۔" اس نے گاؤ تکیے کے پیچھے سے ایک منی آرڈر فارم اٹھا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا، بیٹھنے کے لیے جگہ خالی کر دی اور حقہ اس کی طرف موڑ کر نوکر سے کہنے لگا "اوئے، منشی جی کے لیے لسی لا۔"
"جی نہیں تکلیف نہ کریں۔"
"تکلیف کس بات کی، بھئی۔ گھر کی لسی ہے۔"
"کوئی لویرا ہے؟"
"بھینس ہے، منشی جی۔"
بدر النسا بولی "ہمارا گھرانہ تو مغلوں کے وقت سے آباد ہے۔"
گلاب دین کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ بدرو کا باپ بولا "ہم کوئی ایسے ویسے نہیں۔ بڑے خاندانی کنجر ہیں۔" پھر اس نے قمر النسا کے نام منی آرڈر لکھانا شروع کر دیا۔ جب آخری خانہ آیا تو بولا "یہ دو سو روپیہ تمھیں کاکی کی چوسنی کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ تمھاری ماں کی طبیعت اچھی نہیں جوں ہی اچھی ہوئی، تمھیں ملنے آ جائے گی۔
لسی کے شکریے کے طور پر گلاب دین نے پوچھ لیا "کیا تکلیف ہے گھر میں؟" "چکر آتے ہیں۔ ہم لوگ پرہیز بھی تو نہیں کرتے نا، منشی جی۔"
گلاب دین چلنے لگا تو بدرو کا باپ بولا "منشی جی، جس روز گھر کی لسی پینے کو جی چاہا کرے، بلا تکلف چلے آیا کریں۔"
آہستہ آہستہ گلاب دین کو سب کے اندرون خانہ کا حال معلوم ہوتا چلا گیا۔ مثلاً یہ گیروے رنگ کا کشادہ مکان جس میں بدرو اور قدرو

رہتی تھیں، ان کی پرداری کو ایک رئیس لالہ مکند لال نے بنوا کر دیا تھا اور یہ کہ اب وہ سب سے چھوٹی لڑکی مہراتسا کے لیے کسی اچھے رئیس کی تاک میں تھے۔ گزشتہ روز قدرو کو جب مجرے کے لیے گلبرگ جانا تھا تو بدرو نے مہراتسا کو کس کس طرح سجایا تھا اور وہ بقول ان کے نقطی پہنے ہوئے موتی گڑیا دکھائی دیتی تھی۔ بدرو اور قدرو کے باپ کا نام عبدالکریم تھا اور بھائی کا نام قیم تھا جو کانوں میں مندراں پہنے رہتا، اچھا کھاتا، اچھا پہنتا اور کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ بدرو اور قدرو کی ماں سخت پردہ کرتی تھی۔

زہرہ و مشتری کے گھر موٹے موٹے چوتڑوں والی عورت جو کروٹ بدلے لیٹی نظر آتی تھی وہ زہرہ و مشتری کی سوتیلی بہن ہے، جسے افیون کھانے کی علت ہے اسی طرح گولی کھا کر لیٹ جاتی ہے۔ زہرہ و مشتری کی ماں پردہ کرتی ہے اور پچھلے سال حج کرنے گئی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی گھر والوں کے سامنے بدرو اور قدرو کی ماں بھی حج کرنے کی خواہش کا اظہار کرتی رہتی ہے۔ مگر عبدالکریم اور اس کی تینوں بیٹیاں اس لیے حامی نہیں بھرتیں کہ ماں کی صحت کمزور ہے۔

گلاب دین کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس گانے والی کی بیٹھک زیادہ چمکے، دوسرے کے گھر فوراً خبر پہنچ جاتی ہے کہ فلاں کے ہاں آج محل زیادہ سوسائٹیاں آتی ہیں۔ یہ سب کام طوائفوں کے ملازم کرتے ہیں جو رات بھر ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔ دن بھر دکانوں پر بیٹھے تاش کھیلتے ہیں اور ہارنے والوں سے پیڑے کی لسیاں پیتے ہیں۔

جن جن مکانوں کے دروازوں پر دن کو موٹی موٹی چقیں اور تہہ دار ٹاٹ لٹکے رہتے ہیں، رات کو انہیں مکانوں کے دروازے اس زور سے کھلتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے چق اور ٹاٹ کی دھجیاں اڑ گئی ہیں۔ اسے یہ سب مکان پر اسرار نظر آتے تھے۔

وہ ایک دن تھکا ہوا تھا۔ پیاس بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا جی عبدالکریم کے گھر کی لسی پینے کو چاہا۔ اس نے سوچا یہ چار چٹھیاں بانٹ کر چوک کی طرف مڑ جائے گا۔ جوں ہی وہ چٹھیاں بانٹنے گلی میں داخل ہوا، وہاں شور مچا ہوا تھا۔ مسلن کی ایک رنڈی سے لڑائی ہو رہی تھی۔ چند رنڈیاں کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ جب گلاب دین وہاں سے گزرنے لگا تو مسلن اپنی مخالف رنڈی کی طرف لچر سا اشارہ کر کے بولی "جانی، تجھے چٹھی رساں۔۔۔۔۔۔

"جانی کھسمے، تجھے چٹھی رساں۔۔۔۔۔۔" دوسری نے پلٹ کر جواب دیا۔

سب رنڈیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور گلاب دین بغیر چٹھیاں بانٹے گلی میں سے نکل آیا اور عبدالکریم کے پاس پہنچا جو اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا "خیر ہے؟ آپ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں۔"

گلاب دین نے پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔

عبدالکریم اگلے روز گلاب دین کو چودھری حاتو کے پاس لے گیا جس نے اللہ رکھی مسلن کو خوب پیٹا اور گلاب دین سے کہنے لگا "دیکھو، منشی جی۔ آپ نے مجھے یہ تو نہیں بتایا نا کہ گلابو کی گلی سے گزرتے وقت پھونداں کنجری آپ کو پھکڑیں کیا کرتی تھی۔ جب آپ گزرتے وہ گلابو سے کہتی "نی تیرا خصم غلاب دین آیا ای۔" مجھ سے یہ شکایت دوسری رنڈیوں نے کی تھی اور میں نے ایک دن اس بات پر پھونداں کی پسلیاں بھی توڑی تھیں۔ ہمیں تو آپ کا پہلے ہی بڑا خیال ہے، منشی جی۔ مگر ایک بات آپ سے کہنی ہے مجھے، وہ یہ کہ گلیوں میں سے آپ مردوں کی طرح گزرا کریں۔ کھسروں کی طرح نہیں۔ اس علاقے میں تو آدمی کو بڑا استرا گل ہو کر رہنا چاہیے۔"

جب گلاب دین عبدالکریم کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو ڈیوڑھی سے باہر ایک لمبی سی سبز کار کھڑی دیکھ کر عبدالکریم بولا "میرا خیال ہے، راناجوری آئے ہیں۔"

بیٹھک میں خستہ صوفے پر، جس کا غلاف پرانی میل سے موم جامہ بن چکا تھا، رانا صاحب بیٹھے تھے۔ صوفے کے بازو پر بدرو بیٹھی تھی اور صرو ایرانی سلک کے تھان کو اپنے بازوؤں سے ناپ رہی تھی۔ پھیلتے بازوؤں سے اس کے سینے کی گوری گولائیاں سامنے آ کر آنکھیں لڑا رہی تھیں۔

رانا سے ہاتھ ملا کر عبدالکریم گاؤ تکیے پر بیٹھ گیا اور مہرو سے بولا "مجھے سے کو منشی کو لسی پلائے۔"
بدرو بولی "وہ بازار گیا ہے۔ میں جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ صوفے کے بازو پر سے اٹھ بیٹھی اور اندر سے لسی کا ایک گلاس لا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا پھر پر اسرار طریقے سے آہستہ سے بولی "آپ ابھی جائیں مت۔"
وہ وہاں سے اپنی ریشمی شلوار کو ہاتھوں میں سنبھالتی ٹاپ کر برآمدے میں پہنچی۔ وہاں سے بیٹھک میں آکر رانا سے بولی "اماں ہوری اندر بیٹھے بھینس کا سودا کر رہے ہیں۔"
پھر باپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی "منشی جی کہتے ہیں بھینس کا مالک کہتا ہے 'لینا ہے تو دو دن میں آکر اپنا مال لے جائیں۔"
باپ نے مسکرا کر رانا کی طرف دیکھا اور بولا "یہ دونوں بہنیں باری باری لسی بلوتی ہیں۔ اصل میں رانا جی 'اب ہماری بھینس سوکھ گئی ہے۔ روز کہتی تھیں ابا 'نئی لے دو۔"
رانا مہین سی نگاہیں بدرو کے چہرے پر ڈال کر بولا "تو لے لو نا۔ کتنے میں دیتا ہے؟"
"کیوں ابا جی 'آٹھ سو مانگتا ہے؟"
"ہاں پتر۔"
"کل مجھ سے چیک لے لینا" رانا بڑی بے غرضی سے بولا۔
بدرو نے چونچال پن سے وہیں کھڑے کھڑے کہا "اچھا منشی جی 'آپ اب جائیں۔ ڈوگر سے کہہ دیں 'ابا جی آکر بھینس لے جائیں گے۔"
بھینس؟ کیسی بھینس؟ وہ سوچنے لگا۔
اس نے باہر نکلتے ہی پنواڑی سے پوچھا "یہ رانا ہوری کون ہیں؟"
"جس نے بدرو کو سرفراز کیا تھا 'اس کا بھتیجا ہے۔ کوئٹے سے آیا ہے۔ بھولے نہ بنو منشی جی۔ مال لایا ہو گا۔ اب چھوٹی بھی جوان ہو گئی ہے۔ بڑا اسمگل آدمی ہے۔"
اسمگل کیا ہوتا ہے؟ وہ سوچتا ہوا نو گزے کی قبر کی طرف چل دیا۔
اگلے روز اسے رانا کو دیکھنے کا شوق پھر بدرو کے گھر لے گیا۔ بیٹھک میں ساتھ ساتھ دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر رانا بیٹھا نائی سے شیو بنوا رہا تھا۔ دوسری پر چائے کی پیالیاں وغیرہ بکھری پڑی تھیں۔ ان کا ملازم گنجا برآمدے میں کونڈی میں بادام رگڑ رہا تھا اور بدرو کا بھائی قیم ریشمی تہبند کو سمیٹے منڈی ہوئی پنڈلیاں ننگی کیے اس کے پاس بیٹھا کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ قدرو اور مہرو گاؤ تکیوں پر بیٹھی لہسن چھیل رہی تھیں۔
"چودھری ہوری ہیں گھر؟"
"نہیں منشی جی۔ میری کوئی چٹھی نہیں آئی؟" مہرو جلدی سے بن کر بولی جیسے دو دن میں اسے پر لگ گئے ہوں۔
"تیری چٹھی کہاں سے آئے گی گھٹنے" قدرو نے جھٹ سے اس کا پتا کاٹ دیا۔ ساتھ کے کمرے سے بدرو نکل آئی۔ جس نے نہایت خوبصورت سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوشبو کی شیشی تھی جو وہ اپنے لباس پر چھڑک رہی تھی۔ کچھ خوشبو اس نے رانا پر چھڑکی اور بولی "منشی جی 'کوئٹے کی سوغات لیتے جائیے۔ یہ چار سیب زہرہ مشتری کے گھر دیتے جائیں اور یہ دو آپ کا حصہ۔"
بدرو نے ایک پلو میں سے چھ سرخ سرخ سیب نکال کر گلاب دین کو تھما دیے جو اس نے اپنے چہرے کے تھیلے میں اڑس لیے اور لمبے لمبے سانسوں سے خوشبو کی لپٹیں لیتا ہوا باہر نکل گیا۔
زہرہ و مشتری اپنی بیٹھک میں دو اجنبیوں کے ساتھ بنیں رمی کھیل رہی تھیں کہ گلاب دین نے جا کر سیب ان کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں بہنوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا "منشی جی 'دیگ چڑھی ہے ان کے گھر؟" زہرہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں نے نہیں دیکھی" گلاب دین نے جواب دیا۔

برآمدے میں ان کی سوتیلی بہن کے تو بڑے نے کروٹ بدل کر گلاب دین کی طرف دیکھا اور پھر پیٹھ موڑ لی۔

اگلے دن ڈاک چھانٹتے وقت اسے زہرہ کے نام کی چٹھی ملی۔ وہ چاہتا تھا کہ بدرو یا قدرو کی چٹھی ملے تاکہ آج پھر ادھر کا پھیرا رہے۔

سہ پہر کو جب وہ ہاتھ میں زہرہ کی چٹھی لیے مکان میں داخل ہوا تو زہرہ اور مشتری مینٹی شو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ رانا برآمدے میں ان کی بہن سے ہملیس کر رہا تھا جو اسے اپنی جتنی موٹی موٹی گالیاں دے رہی تھی۔

ادھر بھینس خریدنے کو رقم دے آیا ہے۔ ادھر بھینس کی چنگی لے رہا ہے۔ رانا استرا گل آدمی ہے یا بھینسوں کا سوداگر! گلاب دین یہ سوچتا ہوا باہر نکل آیا۔

تین روز بعد اسے اڑتی اڑتی ایک خبر ملی۔ اس نے سوچا' بزازی کی دکان اس کے سامنے ہے' اسی سے تصدیق کرنی چاہیے۔

بزازی بولا "جو تم نے سنا ہے' ٹھیک ہے۔ رانا تو مہرو کے لیے تیار تھا۔ مگر بدرو کی ماں نہیں مانی۔"

گلاب دین نے پوچھا "عبدالکریم اور قیم راضی تھے؟"

"قیم تو سرائیاں گھوٹ گھوٹ کر پلاتا تھا" بزازی مسکرا کر بولا "جس کا مال اس کا گال منشی جی۔"

خوبصورتی کس طرح بیچی جا سکتی ہے۔ جسم کس طرح فروخت ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کی باتیں سوچتا بھی جاتا' بازار میں چلتی پھرتی طوائفوں کو خالی ذہن سے دیکھتا بھی جاتا اور چٹھیاں بھی بانٹتا جاتا۔ اس نے اپنے کام سے کام رکھا اور کتنے ہی دن بدرو قدرو کے گھر نہ گیا۔ ایک روز اسے موتی بازار میں عبدالکریم ملا جس کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ انھوں نے اب نئی بھینس خرید لی ہے۔ عبدالکریم نے کہا "کسی روز آنا۔ ہمارے گھر جلسہ ہونے والا ہے۔"

ایک روز بدرو کے نام پانچ سو روپے کا منی آرڈر آگیا۔ گلاب دین نے پڑھا۔ رانا حیات بخش نے کوئٹے سے بھیجا تھا۔ آخر میں لکھا تھا جلسے کے لیے روپیہ بھیج رہا ہوں۔ مجھے بھی اس دن یاد کر لینا۔

وہ چق اٹھا کر اندر گیا تو بدرو چارپائی پر لیٹی سگرٹ پی رہی تھی۔ آہٹ سن کر اٹھ بیٹھی "شکر ہے آپ بھی آئے' منشی جی۔"

"کوئی خط ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔۔۔"

"خط نہ ہو تو کیا آنا چھوڑ دیتا تھا۔ اے ہوری اتنا یاد کرتے تھے آپ کو۔"

کمروں میں سے عبدالکریم بھی نکل آیا۔ منی آرڈر کا سن کر سب کی باچھیں کھل گئیں۔ مہرو بھی چنگیر اٹھائے بھاگی بھاگی باہر چلی آئی۔

"اب منشی جی' آپ ذرا کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جائیں۔ کاکی اندر سے حقہ اٹھالا۔"

مہرو نے حقہ لا کر باپ کے پاس رکھ دیا جس نے منہ میں نے لے کر گلاب دین کو دیگوں کا مسالا لکھوانا شروع کر دیا۔ گلاب دین کی حیرت دور کرنے کو عبدالکریم نے کہا "ہم مہرو کی کاکی کی خوشی کرنا چاہتے ہیں۔ قیم تو ناکارہ آدمی ہے۔ کل میں اور آپ جا کر سودا لے آئیں گے۔ نائی کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔"

اس بات چیت میں قدرو اور بدرو بھی کبھی کبھی اپنی تجویز پیش کرتی رہیں۔ مہرو کچے فرش پر پالتی مارے لہسن چھیلتی رہی۔ گلاب دین نے اپنے کان پر اٹکی ہوئی پنسل کو اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے آج پوچھ ہی لیا۔

"اتنا لہسن کیا کرتے ہیں آپ؟"

قدرو نے کہا "ہمارے گھروں میں سالن اچھا پکتا ہے' اور بہت آدمیوں کے لیے پکتا ہے۔ اس میں ڈالا جاتا ہے۔"

بدرو بولی "ہم دن بھر کیا کام کریں۔ اسی طرح اماں کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔" مہرو اپنی اہمیت دکھانے کے لیے اور تیزی سے لہسن چھیلنے لگی۔

"اللہ خیر رکھے۔ اب اتوار کو دیکھ لینا نا" عبدالکریم گلاب دین کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

انہوں نے باسمتی چاول، خالص گھی اور مسالے کی پوٹلیاں تانگے سے اتار کر ڈیوڑھی میں رکھیں تو گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ عبدالکریم کے کہنے پر گنجا بازار سے چائے کا ایک سیٹ لے آیا۔ وہ چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ بدرو قدرو اور مہو تینوں بہنیں بھی سجائی بیٹھک میں داخل ہوئیں۔ بدرو ہنس کر بولی "اباجی، ہم تو بلاوا دے آئے ہیں۔"

آج بدرو معمول سے زیادہ پتلی اور جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔ قدرو کا بدن گدرایا ہوا تھا۔ اس کی ناک کی کیل بار بار چمک رہی تھی۔ اور مہو پر بہار شباب کی رنگینیاں لیے ان کے ہمرکاب اس طرح تھی۔ جیسے دبلی نکھری بدلیوں کے ہمرکاب بجلی کی کڑک۔

پروگرام یہ تھا کہ اتوار کو دوپہر کا کھانا اور رات کو گانا۔ گلاب دین کی طرف سے جب ڈھل مل اظہار ہوا تو عبدالکریم نے کہا "منشی جی، آپ کوئی اوپرے تو نہیں۔ ہمارے گھروں میں آپ کو کون نہیں جانتا۔ اول تو ہم نے زیادہ لوگوں کو بلایا نہیں۔ یہ اڑوس پڑوس کے چند گھروں کو بلایا ہے۔ باقی رہا گانا تو وہ آپ کی مرضی ہے۔"

"حافظ صاحب نے کیا فرمایا ہے، قدرو پتر؟"

قدرو نے کہا بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغان گوید۔ کیوں اباجی؟"

"کچھ نہیں پتر، منشی جی کو سگرٹ دو۔"

قدرو نے سگرٹ کی ڈبیا منشی جی کے آگے کر دی جس میں گلاب دین نے ایک سگرٹ نکال کر سلگایا۔

"بس آپ ڈاک بانٹ کر سیدھے ادھر ہی آ جائیں۔"

ہفتے کی شام کو نائی نے چولہا گاڑھ دیا اور اتوار کی صبح کو اس کے دو ساتھیوں نے آ کر کام سنبھال لیا۔ جاوتری، لونگ، دار چینی اور زعفران کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی اور دیگوں میں بڑا کفگیر گڑ گڑ بجنے لگا۔

گلاب دین پیدائشی منتظم تھا۔ عبدالکریم نے استاد نورالدین اور منشی گلاب دین کو دیگوں کی نگرانی پر بیٹھا دیا۔

بدرو کے سازندوں نے دالانوں میں کرائے کی چاندنیاں بچھا دیں۔ قیم اور اس کے دوستوں نے گاؤ تکیے لگا دیے۔ پھر آتشدان پر گلاب پاشیاں رکھ دیں اور پوچھنے لگا "آپا بدرو، ٹھیک ہے؟"

اس نے کہا "ہاں۔ جیتے رہو۔ ٹھیک ہے۔"

"آپا، سگرٹ کے لیے کچھ پیسے تو دے دو۔" بدرو نے دس روپے کا نوٹ دے دیا۔ وہ ادھر غائب ہوئی، یہ قدرو کو لے آیا اور بولا "بی بی، ہمارا انتظام ٹھیک ہے نا؟"

اس نے کمروں کا جائزہ لے کر کہا "ٹھیک ہے۔"

"بی بی سگرٹ کے لیے کچھ پیسے دے دو۔" اس سے بھی دس روپے کا نوٹ ہتھیا لیا۔

دوپہر ہوئی تو طوائفوں کی ٹولیاں آنی شروع ہو گئیں۔ انگلیوں میں سگرٹ لیے ہوئے، چھالیہ چباتیں، سرگوشیاں کرتیں، رنگا رنگ آوازیں، رنگا رنگ لباس، گورے چہرے، سنولائے چہرے، بھرے سینے، پتلی کمریں، دلبری کی تمام ادائیں اور نخرے، ابریشم و کمخواب کے تھانوں میں لپٹے ہوئے۔ کچھ جوان، کچھ سرشار، کچھ ادھیڑ۔ دالان جیسے قمریوں اور کبوتریوں کی غٹرغوں سے چہک اٹھا۔ نور پلاؤ، شیرمال اور قورمہ برتایا گیا۔ ایک آتا ایک جاتا رہا۔ زیادہ قریبیوں کے گھر کھانا پہنچا دیا گیا۔ اس ہجوم دلبراں میں گھرے ہوئے گلاب دین کی نیچے کی سانس نیچے، اوپر کی اوپر۔

مہمانوں کا بھگتان ہو چکا تو برتانے والوں کی باری آئی۔ پھر یہ سب کھا پی کر دالان میں بچھی چاندنی پر لیٹ کر سگرٹ کا دھواں اڑانے لگے۔ نائی اپنی دیگیں اور چولہے سنبھالنے لگا "پتا نہیں، اپنے چنچی رساں کو کچھ دیا ہے یا نہیں؟"

استاد نورالدین بولا "بی بی نے چاول دیے تھے۔"

برآمدے میں سے بدرو بولی "میں نے دیے تھے 'ابا جی۔"

"تمہارے لیے ہمیشہ اچھی خبریں لاتا ہے۔"

رات کو جب گلاب دین پہنچا' مجلس سج چکی تھی۔ فیروزہ نے سلمے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی سڈول کلائیاں سونے کی چوڑیوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ زہرہ نے ساڑھی کے ساتھ برائے نام سی چولی پہن رکھی تھی۔ جب ساڑھی کا پلو سرک جاتا تو سامنے سے اس کا کسا کسا پیٹ اور پیچھے سے چکنی چکنی کمر دکھائی دینے لگتی۔ نگ نے چوڑی دار پاجامے پر گھیردار قمیص پہن رکھی تھی' جیسے اکبر کے زمانے کی مغنیہ۔ جب چلتی تو جوتی کے ستارے اور قمیص کی گوٹ کے بادلے جھلمل جھلمل کرتے۔ ریشمی غرارے میں مشتری کے سرین بچلی کے دو پاٹوں کی طرح رگڑ کھا رہے تھے۔ غرارے کو انھوں نے اس طرح بھر دیا تھا جیسے اس میں انڈیلے گئے ہیں۔ مشتری کی چھوٹی بہن جو چند مہینے ہوئے آجا کا سبق لے رہی تھی۔ آج پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اس نے ماتھے پر جھومر لٹکا رکھا تھا۔ پلکوں کے تناؤ میں کئی اشارے اور کئی لگاوٹیں پل رہی تھیں۔ شعلہ جوالا بنی ادھر سے ادھر اپنا آپ دکھاتی پھر رہی تھی۔ بلو پھلجڑی بنی ہوئی تھی۔ اس نے سینے پر دو پٹاخے باندھ رکھے تھے۔ اس کے کئی روپ تھے۔ مہتابی' انار' پوپٹ' گولہ۔ لیکن بجلیاں نہیں تھیں۔ تمام بجلیاں آج بدرو کے حصے میں آگئی تھیں جس کی لم جھڑی آنکھوں پر دراز پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور نسوانیت کے ابریشمی پرتو سے چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ پان الائچی کی طشتری لیے چاروں طرف تواضع میں جتی ہوئی تھی۔ قدرو ہونٹ بیچ بیچ کر باتیں کرتی تو اس کے ہونٹوں کی یاقوتی تراش اور بھی غضب ڈھاتی۔ وہ اپنی انگلیوں کی خفیف سی حرکت سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو گردن سے ہٹاتی تو یوں لگتا جیسے انگلیوں کی پوروں سے بلوریں شبنم کی پھوار پڑ رہی ہے۔

مو مو ہی نہیں لگتی تھی۔ اس کی دنبالہ دار آنکھوں میں اتنی گھلاوٹ کہاں سے آگئی تھی۔ چوکڑیاں بھرتی پھر رہی تھی۔ تنگ لباس میں اس کا انگ انگ نظر آ رہا تھا۔ چھوٹی سی نھنی اس کے بڑے بڑے ارمانوں اور ان کے خیالوں کی چغلی کھا رہی تھی۔ اتنے میں ایک جوڑا اندر آیا۔ سرو قد لڑکی' چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی' سمٹے ہوئے ریشم کی طرح محفل میں داخل ہوئی۔ بڑی نزاکت سے ہاتھ کو قوس بنا کر سب کو آداب کیا۔

دالان کی دہلیز پر بیٹھے گلاب دین نے پوچھا "قیم جی' یہ لڑکی کون ہے؟"

وہ اینڈتے ہوئے بولا "شمو میری پھوپھی کی لڑکی۔ خواجہ صاحب کے گھر میں ہے۔"

گلاب دین کے سینے میں جیسے بہت سی سانس رکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ وہ خواجہ کی کوٹھی میں چٹھیاں بانٹ چکا تھا۔ وہ انھیں جانتا تھا۔

سر رہا کھلے ہوئے سارے پھول سامنے کے رخ اکٹھے ہو گئے تھے۔ رنگا رنگ ہنستے کھیلتے دمکتے چہرے پھولوں کا گلدستہ بنے دکھائی دے رہے تھے۔ خار گل کے ساتھ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خواجہ صاحب ان صوفوں پر جا بیٹھے جدھر مرد مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کو بیٹھ کر حقے کا دھواں اڑانے والے سازندوں میں سے ایک آدھ نے انھیں سلام کیا اور اپنے ساز لے کر قالینوں پر آبیٹھے۔ سب سے پہلے آہوئے رم خوردہ مشتری کی چھوٹی بہن الماس کو پکڑ کر بٹھایا گیا۔ اس کے گانے کے بعد شور مچا "بدرو' بدرو۔"

بدرو نے اپنی گھنی پلکوں کو اوپر اٹھایا' مردوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ پھر محفل کا ایک نظر سے جائزہ لیا اور اپنی ریشمی شلوار کی کریز کو چٹکیوں میں تھام کر پائنچے سنبھالتی بیچ میں آبیٹھی۔ گلاب دین دہلیز پر اور اونچا ہو گیا۔ اس نے بدرو کو اس رنگ میں کب دیکھا تھا۔ یا الٰہی! بدرو کی آواز کا لہرا تھا یا رم جھم۔ ایک مہمان نے نوٹ نکالا۔

گلاب دین نے ساتھ والے سے پوچھا "کتنے کا ہے؟"

"دس کا۔"

گلاب دین کے سینے سے پھر ایک لمبی سانس نکلی جو دیر سے رکی پڑی تھی۔ وہ سوچنے لگا بدرو کے اعضا میں یہ پلپلا پن کہاں سے اترا آ رہا

ہے۔ اس کی آواز نکھرتی جا رہی تھی۔ ایک نوٹ' دو نوٹ' تین' چار' پانچ۔۔۔۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"اپنے اپنے ملاقاتی ہیں۔ اپنی والیوں کو سلامیاں دے رہے ہیں۔"

اب خواجہ صاحب نے نوٹ دیا' پھر شمو نے' پھر خواجہ صاحب نے' پھر شمو نے۔ سب ہنسنے لگے۔

بدرو دو غزلیں گا کر بڑی نزاکت کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ اب تگ جی سے فرمائش ہوئی۔ تگ نے پکے راگ سے آغاز کیا۔ جب گلا کھنکلا گیا تو ساقی نامہ شروع کیا۔ آواز کا جادو ملاقاتیوں کے سر چڑھ کر نوٹ پر نوٹ دلوانے لگا۔ تگ نے جوش میں آ کر گھنگھرو باندھ لیے تو سارے لوگ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے۔ اس نے بتاوے دے دے کر کس کس حسن ادائیگی سے زاہد و محتسب کی چٹکیاں لیں۔ کس کس شان دلربائی سے کمر کو لپکا دے دے کر میکدے کے دروازے پر دستک دی کہ محفل کی محفل تڑپ اٹھی۔ بدرو نے اٹھ کر سینے سے لگا لیا اور بولی "تگ جی' زندہ باد!"

ایک کونے سے آواز آئی "ڈھولک۔" بلو نے چونکتے ہو کر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ بلو کے ملاقاتی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتایا' تیرا نیازمند ادھر بیٹھا ہے۔ بلو مسکرا دی۔ مرو نے ڈھولک لا کر بلو کے سامنے رکھ دی اور الماس کو لے کر خود بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈھولک کیا بجی' وضع داریوں کے بند ڈھیلے پڑ گئے۔ بعض مہمان صوفوں سے اتر کر قالینوں پر آ بیٹھے اور چٹکیاں بجانے لگے' تھاپ دینے لگے۔ رنگ محفل ہی بدل گیا۔ ایک صاحب پہلے نوٹ دیتے رہے پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر ناچنے لگے۔ چکر پھیریاں لیتے لیتے قدرو کے پاس جا پہنچے اور ہنستے ہنستے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لے آئے۔ شور مچا "شاباش! ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" ان صاحب نے قدرو کے گھنگھرو باندھ دیے اور استاد کو اشارہ کیا۔ طبلے پر ہاتھ پڑا' تھی۔ قدرو نے اپنے یاقوتی ہونٹوں کی ہنکھڑیوں کو بھینچ کر کلائی سے گرہ باندھی۔ ایڑی ٹھمکی۔ آنکھوں میں رس اترا۔ پلکوں کا ریشمی تناؤ ستاروں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر چاندنی میں گھلنے لگا۔ کائنات گردش میں آ گئی اور قدرو رنگوں کا پیکر بن کر گھومنے لگی۔

گلاب دین کے سینے میں اب کوئی رکی پڑی سانس باقی نہ تھی۔ وہ مجسم حیرت بنا دیکھ رہا تھا۔ اللہ غنی! یہ قدرو تھی۔ اس کے پاؤں تھے' یا خط چھانٹنے کی خود کار مشین! بھاپ نکل رہی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ ملازم محفل میں گرم گرم کشمیری چائے کے پیالے سینیوں میں رکھ پھر رہے تھے۔ چاروں طرف سگرٹوں کا دھواں پھیل رہا تھا۔ وہ ان رنگا رنگ آوازوں میں ابھی کچھ فیصلہ کرنے نہ پایا تھا کہ عبدالکریم اس کے پاس سے گزرتے گزرتے کہہ گیا "ابھی جانا مت۔"

رات بہت بیت چکی تھی۔ اس نے دو چار جمائیاں بھی لی تھیں' مگر چائے کے گرم گرم پیالے نے بدن میں پھر چستی پیدا کر دی تھی۔ ابھی اس کا پیالہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ محفل میں سے کسی نے الاپ لیا۔ وہ پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ شمو کی بلوری انگلیاں ہوا میں ایک دائرہ بنا رہی تھیں اور اس کے گلے میں سے نور کی آواز نکل رہی تھی۔ ایک مہک چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ لفظوں کو انتہا پر لے جا کر وہ اس یکی اور آہستگی سے انھیں لوٹا دیتی تھی کہ سینوں میں دل ڈول جاتے اور محفل میں واہ وا ہونے لگتی۔

اس کے بعد مشتری آئی۔ چہرے پر اک سلونا پن اور ان کے خیالوں کو جھلملاہٹ۔ ناک میں فیروزے کی کیل' ہاتھ میں فیروزے کی انگوٹھی۔۔ اونچی کرتی کے نیچے گول گول رانوں کو غرارے میں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ ایک کونے سے آواز اٹھی پنجابی۔ اس نے ہولے سے استاد سے کچھ کہا اور ماہیا گانے لگی۔ ایک کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرے پنجابی گیت کی فرمائشیں جب پوری ہو چکیں تو بدرو اور تگ نے کہا "آپا فیروزاں۔"

فیروزاں نے سگرٹ کا ایک بھرپور کش لے کر اسے مسل ڈالا۔ پھر اپنے لب لعلیں پر زبان پھیر کر خنجر خونچکاں کو آب دی اور سڈول کلائیوں میں چوڑیوں کو سنوارتی اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر ایک خاص تمکنت' وقار اور اعتماد تھا۔ معلوم ہوتا تھا کسی وقت میں بڑی باگی

صورت رہی ہوگی۔

کسی نے کہا "مرزا صاحباں" اس نے اس طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر کہا "اچھا۔"

رات کے سناٹے میں اس کی گھرج دار آواز بلندیوں کی خبر لانے لگی۔ جب مرزا کے بول دہرانے لگی تو جوش میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے بھی مطمئن نہ ہوئی تو دوپٹہ اتار کر پھینک دیا اور ہاتھ اٹھا کر لمبی لمبی تانیں اڑانے لگی' جیسے راوی کی لہریں بپھر کر کناروں سے اچھل جائیں۔ صاحباں کے بول گاتے وقت آواز کو اس طرح سمیٹ لیتی جیسے لہروں پر چاندنی رات میں چھوٹے چھوٹے پھول پڑنے لگیں۔ وہ ٹوٹ سیلی جاتی اور محفل پر اپنی لوچدار آواز کا سحر پھونکتی جاتی تھی۔

ایک کٹ بہار تھی جو ستاروں کی جھلملاتی روشنیوں کے ہمرکاب گزر گئی۔ مولوی گلاب دین اذان ہوتے ہی شاہی مسجد کے ایک دالان میں سے اٹھا اور حوض کے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا۔ آج نماز پڑھنے میں اسے بڑا لطف آیا۔ خدا کے اس وسیع و عریض گھر میں اور گلاب دین کی کشادگی دل میں بڑی مماثلت تھی۔ اس نے لمبے لمبے سجدے کیے اور روانہ ہو گیا۔

اس نے آس پاس کے علاقے کی ڈاک تو دو پہر کو بانٹ دی' دو چٹھیاں جو اس طرف کی تھیں ان کو رکھ لیا کہ سہ پہر کو سہی۔ جب سہ پہر کو اس نے عبدالکریم کے گھر جھانکا تو سب سوئے پڑے تھے۔ اگلے روز جب گلاب دین نے چق اٹھا کر دیکھا تو سب لوگ بیٹھک میں لیٹے ہوئے تھے۔

"آؤ منشی جی' کیا حال ہے؟"

"میں کل آیا تھا۔ آپ سب سوئے پڑے تھے۔"

"برا حال تھا ہمارا۔ لڑکیاں تھک گئی تھیں۔ کیوں' اچھی رونق رہی' منشی جی؟" عبدالکریم نے کہا۔

"او جی رونق! کمال ہو گیا۔ نگی جی نے تو حد کر دی۔"

"ابھی تمہارے آنے سے دو منٹ پہلے گئی ہے۔ چار سو ہو گیا اسے۔ لڑکیوں کو اپنے ساتھ بری امام لے جانے کو کہہ رہی تھی۔ پچھلے سال گئی تھی۔ بہت کچھ لے کر آئی تھی۔

"پھر؟"

"پھر یہ بھی تیار ہو گئی ہیں۔"

بدرو تاش پھینٹتے پھینٹتے بولی "جو اللہ کو منظور۔"

پندرہ روز تک تینوں کی ہمہ وقت توجہ کپڑے سلوانے پر رہی۔ درزی آتا تھا' جاتا تھا۔ گنجے کو ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ آخر استادوں نے تھیلے باندھے اور تینوں بہنوں کو لے کر دس دن کے لیے بری امام کے میلے پر چلے گئے۔

عبدالکریم کو ان کے خط کا بڑا انتظار رہا۔ گلاب دین خط لایا تو عبدالکریم حقے کی نے منہ میں سے نکال کر بولا "تم سے کون سا پردہ ہے۔ پڑھ کر بھی سنا دو۔"

بدرو نے خط میں لکھا تھا کہ پنڈی پہنچ کر خیریت کے ساتھ نور پور پہنچ گئے ہیں' جہاں دو کمروں کا اچھا ڈیرا مل گیا ہے۔ رات کو چوکی دیں گے تو اندازہ لگ سکے گا کہ میلہ کیسا جائے گا۔ ویسے میلہ بہت بھر رہا ہے۔ چاروں طرف سے طرح طرح کی گانے والیاں آئی ہیں۔ کچھ ابھی آ رہی ہیں۔ سنا ہے یہ میلہ اگلے سال نہیں لگے گا۔ فقط' آپ کی بیٹی بدرو۔

دوسرا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ خدا کے فضل و کرم سے میلے کے ساتھ ہم بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ پانچ دن کی آمدنی چار ہزار ہوئی ہے جو استاد جی آج پنڈی جا کر روانہ کر رہے ہیں۔ ہم اٹھارہ انیس کو لاہور پہنچ جائیں گے۔ ہمارے آنے سے پہلے صوفوں کا کپڑا بدلوا لیں۔ صوفوں کے سپرنگ بھی ڈھیلے ہو چکے ہیں' وہ بھی ٹھیک کرا لیں بلکہ صوفے ہی نئے خرید لیں۔ پردے بھی نئے ڈلوا لیں۔ سستی نہ کریں۔ وجہ اس

کی یہ ہے کہ مہو پر ایک گز پٹھان عاشق ہو گیا ہے۔ آپ نتھ اتروائی اس سے جو مانگیں گے ' دے گا۔ میں نے اور قدرو نے کہا یہ پردیس ہے۔ آپ لاہور آکر ہمارے مہمان ہوں۔ وہاں ہم آپ کی خدمت کریں گے۔ کہتا ہے ہم کو کیا کھلائے پلائے گا۔ قدرو نے کہا جو آپ کہیں۔ بولا ' استاد جی ہم کو بس شربت وصال پلادو۔ ہم بہت پیاسا ہے۔ استاد جی نے کہا ' خان صاحب ' آپ آئیں تو۔ ہم آپ کو شربت وصال کے کنویں میں ڈبکیاں دیں گے ' غوطے کھلائیں گے۔ مہو کے سر پر ہمیشہ سو سو روپے کے نوٹ رکھتا ہے۔ صدقے اور قربان ہو ہو جاتا ہے۔ مہو بھی اس سے بڑے نخرے کروا رہی ہے۔ گنگ کے نوکر کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے کیونکہ اس نے چاقو مار کر کسی کی انتڑیاں نکال دی تھیں۔

عبدالکریم نے خط سن کر اطمینان کا سانس لیا اور بولا "گلاب دینا ' خدا ایسی بیٹیاں سب کو دے۔ انھوں نے باپ کو بڑی بڑی رقمیں لا کر دی ہیں اور اس پر ان کو ہمیشہ فخر رہا ہے۔ اب اللہ کے فضل سے مہو بھی کماؤ ہو جائے گی۔ پھر ایک جلسہ کریں گے۔"

جب عبدالکریم نے چار ہزار کے بنک ڈرافٹ کا رجسٹری لفافہ گلاب دین کے ہاتھ سے وصول پایا تو اگلے دن ہی قیم جا کر نئے ڈیزائن کے صوفے اور پردوں کا کپڑا لے آیا۔ بیٹھک میں سفیدی ہو گئی۔ شیشے والی دیوار گیریوں پر پالش پھر گیا۔ نئے شیشے لگ گئے۔ ڈبی بازار سے کاریگر بلوا کر نیم چھتی سے لٹکے ہوئے پرانے جھاڑ فانوس کی صفائی کرا دی گئی۔ سارا گھر اجلا ہو گیا۔

لڑکیاں انیس کی صبح کو آ رہی تھیں اور انیس کو ہی پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لمبے کمرے میں چہل پہل دکھائی دے رہی تھیں۔

سپروائزر نے پوسٹ ماسٹر سے کہا "گلاب دین کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا عرض کرنا چاہتا ہے ' یہ ہر سال؟ بلا" پوسٹ ماسٹر نے چڑ کر سپروائزر سے کہا۔

دوسرے لمحے گلاب دین پوسٹ ماسٹر کے سامنے کھڑا تھا جو فائل پر نظریں جھکائے کہہ رہا تھا "یہ تمہاری پچھلے سال والی عرضی میرے سامنے پڑی ہے۔ تمہاری منشا کے مطابق تمہاری تبدیلی اب ہیرا منڈی سے واپس مصری شاہ کر دی گئی ہے۔ اب تم کیا عرض لے کر آئے ہو"

"حضور ' میری صرف اتنی عرض ہے کہ مجھے یہیں رہنے دیا جائے ------"

پوسٹ ماسٹر نے فائل پر سے نظر اٹھا کر گلاب دین کو حیرت سے دیکھا اور بولا "کیا کہا؟"

گلاب دین کی ڈاڑھی غائب تھی ' لمبی سی تھوڑی نکلی ہوئی تھی اور موٹے موٹے ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کا ہلکا ہلکا غبار تھا۔

○

محمد خالد اختر

نام : محمد خالد اختر۔
قلمی نام : محمد خالد اختر۔
پیدائش : ۲۳ جنوری ۱۹۱۹ء بہ مقام الہ آباد، بہاول پور ڈویژن۔ (۱)
تعلیم : بی۔ اے۔ بی۔ ایس سی (الیکٹریکل انجینئرنگ)

بہاول نگر اور بہاول پور میں ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۸ء تعلیم پائی۔ صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور سے ۱۹۳۸ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۳۹ء میں پنجاب کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی مغل پورہ، لاہور میں داخلہ لیا اور انجینئرنگ سے طبعی مناسبت نہ ہونے کے سبب ۱۹۴۶ء میں الیکٹریکل انجینئرنگ میں بی۔ ایس سی کی ڈگری لی۔ اگلے ڈیڑھ دو برس بسلسلہ پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ انگلستان میں گزارے، جہاں سے ۱۹۴۸ء میں واپس آئے۔

مختصر حالات زندگی:

محمد خالد اختر کے والد اختر علی، بہاول پور ڈویژن میں ریونیو ڈیپارٹمنٹ سے متعلق تھے، جو ڈپٹی کمشنر ریٹائر ہوئے اور فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان کے عہد میں ممبر قومی اسمبلی منتخب ہونے کے بعد ستمبر ۱۹۹۴ء میں فوت ہوئے۔ محمد خالد اختر کا بچپن بہاولنگر میں گزرا اور لڑکپن بہاول پور میں۔ بہ سلسلہ تعلیم ۱۹۳۹ء کے بعد کا بیشتر وقت لاہور میں گزرا۔ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۸ء کا زمانہ انگلستان میں گزرا۔ بطور الیکٹریکل انجینئر سرکاری ملازمت اختیار کرنے کا سوچا تو کامیابی نہ ہوئی اور کراچی جا کر ایک غیر ملکی فرم انگلش الیکٹرک کمپنی میں بحیثیت سیلز انجینئر ملازمت کر لی۔ جنوری ۱۹۵۲ء میں سابق بہاولپور ریاست کے محکمہ الیکٹرسٹی میں بطور ایس۔ ڈی۔ او منتقل ہو گئے۔ جب بہاولپور ریاست کا یہ محکمہ واپڈا میں مدغم ہوا تو یہ سلسلہ ملازمت، تین برس ملتان میں اور بقیہ وقت لاہور میں گزرا۔ جنوری ۱۹۸۰ء میں سپرنٹنڈنگ انجینئر (واپڈا) لاہور کے عہدے سے ریٹائر ہو کر اپنے آبائی شہر بہاول پور کو مستقل مسکن بنایا۔

دنیاوی معاملات کو نہ کبھی سمجھا اور نہ سمجھنے کی خواہش کی۔ زندگی کا بیشتر وقت انگریزی ادب کے مطالعہ میں صرف کیا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "۲۰۱۱" میں سو گیارہ (سیاسی و معاشرتی طنزیہ) مکتبہ جدید، لاہور : طبع اول : ۱۹۵۳ء

۲۔ "چاکیواڑہ میں وصال" (ناول) لارک پبلشرز، کراچی : طبع اول : ۱۹۶۵ء
اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سنگ میل، لاہور نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔

۳۔ "کھویا ہوا افق" (مضامین / افسانے) مکتبہ جدید، لاہور : طبع اول : ۱۹۶۷ء
اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سنگ میل، لاہور نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔

۴۔ "دو سفر" (سوات اور کاغان کے دو سفرنامے) ادارۂ مطبوعات 'لاہور : طبع اول : ۱۹۸۵ء

یہ سفرنامے پہلی بار مجلّہ "فنون" لاہور میں بالا اقساط شائع ہوئے تھے۔

۵۔ "ایلی دنیائے حیرت میں" (از لیوس کیرول کا ترجمہ) نیشنل بک فاؤنڈیشن 'پاکستان : طبع اول :

یہ لیوس کیرول کی کتاب "ایلس ان ونڈر لینڈ" کا ترجمہ ہے۔

۶۔ "چچا عبدالباقی کی کہانیاں" (سلسلہ وار افسانے) قوسین 'لاہور : طبع اول : ۱۹۸۵ء

۷۔ "مکاتیب خضر" (خطوط) سنگ میل پبلی کیشنز 'لاہور : طبع اول : ۱۹۸۹ء

غیرمدون / غیر مطبوعہ:

محمد خالد اختر کا ایک سفرنامہ "یاترا" قوسین 'لاہور سے زیر اشاعت ہے۔

لیوس کیرول کی کتاب "ایلس ان ونڈر لینڈ" اور "تھرو دی لوکنگ گلاس" کو یکجا کر کے یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن شائع کر رہی ہے۔ افسانوں کا ایک مجموعہ قوسین 'لاہور اور دو مجموعے سنگ میل 'لاہور نے شائع کرنے کے لئے منتخب کیے ہیں۔ افسانے 'مضامین اور خطوط اس کے علاوہ ہیں۔

مستقل پتا:

اختر علی ہاؤس 'سرکلر روڈ 'بہاول پور۔ پاکستان

اعزاز:

۱۔ رائٹرز گلڈ "آدم جی ادبی انعام" برائے "کھویا ہوا افق" ۱۹۶۷ء

نظریہ فن:

"سب سے پہلے اس میں ایک کہانی ضرور ہونی چاہیے۔ کہانی جس کا ایک آغاز 'ایک وسط اور ایک انجام (کلائمکس) ہو۔ اس کے کردار جیتے جاگتے 'پہچانے جانے والے ہوں۔ وہ اس معنی میں "ہوشربا" ہو کہ اسے ختم کیے بغیر چین نہ آئے۔ اسے پڑھ چکنے کے بعد اس کے کردار 'واقعات اور منظر تھوڑی دیر تک ذہن میں کلبلاتے اور ہل چل مچاتے رہیں اور اسے بے چین اور مضطرب رکھیں ---- یہ ایک بہت ہی مشکل اور پراسرار Ilusive عمل ہے جس کا راز صرف استاد افسانہ نگار ہی جانتے ہیں۔ تا شاید وہ بھی نہ سکیں۔"

(بہ حوالہ : مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۸۷ء)

○

(۱) اکثر مقامات پر تاریخ پیدائش ۲۳ جنوری ۱۹۲۰ء درج ہے 'جو درست نہیں۔

محمد خالد اختر

لالٹین

میرے خسر مستری مہتاب دین کا نام تم نے سنا ہو گا ---- اس لئے نہیں کہ وہ حکومت کا کوئی وزیر ہے یا کسی فلم کا ڈائریکٹر ہے کسی جماعت کا لیڈر ہے وہ تو ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ "ہے" کی جگہ پر "تھا" کہنا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ پچھلے مہینے کی پندرہ کو جمعہ کے مبارک روز' شام کے پانچ بجے' مستری موصوف کے فانی اور مستعار جسے کو میری آنکھوں کے سامنے سائیں ڈورے شاہ کے گورستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس کے غیر فانی اور دائمی حصے کے متعلق' جس کو اصطلاح عام میں روح کہا جاتا ہے' میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ کہاں ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر مجھے بالکل کوئی تعجب نہیں ہو گا اگر وہ حصہ سیدھا بہشت میں گیا ہو۔ مستری مہتاب دین ان بے ضرر' محنتی' غیر دلچسپ انسانی روبوٹوں میں سے تھا جو عمداً" گناہ کرنے کے اتنے ہی نااہل ہوتے ہیں جتنے نیکی کے ایک مثبت عمل کے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اپنی بیوی کا وفادار تھا' ایک مہربان اور منصف باپ تھا اور پانچوں نمازیں بلا ناغہ ادا کرتا تھا۔ مختصرا" وہ اس قسم کے لوگوں میں سے تھا جو سیدھے بہشت میں جاتے ہیں (اگر تم بہشت کی قسم کی چیزوں میں یقین رکھتے ہو تو!)۔ ہاں' اگر تم نے (غالبا") اس کا نام سنا ہو گا تو حال میں 'اخباروں میں' ایک خوفناک حادثے کے ضمن میں' جس میں ---- مگر شاید تم نے نہیں سنا اور مجھے تمہاری خاطر یہ کہانی خراب نہیں کرنا چاہیے۔

مستری مہتاب دین سے میری واقفیت تین چار سال سے تھی ---- اس وقت سے جب میں پہلے پہل اپنے مربی اور مہربان خان بہادر سخاوت علی کے توسط سے مل رائٹ شاپ میں بطور ایک غیر تربیت یافتہ مزدور بھرتی ہوا اور مستری کے ساتھ کام سیکھنے پر لگا دیا گیا۔ انسانیت کو کئی ایک لحاظ سے کئی ایک اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے ---- زندہ دل اور مردہ دل۔ باتونی اور چپ وغیرہ وغیرہ' اور میں نے بھی ایک تقسیم کا سوچا ہے جو اپنے طور پر اتنی ہی اچھی ہے جتنی کوئی اور مجھ سے پوچھو تو دنیا میں دو قسم کے آدمی بس رہے ہیں ---- ایک وہ جو مستری ہیں اور دوسرے وہ جو مستری نہیں ہیں۔ کم از کم میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مستریوں اور غیر مستریوں میں نفسیاتی لحاظ سے جو تفاوت کی خلیج ہے وہ کبھی پاٹی نہیں جا سکتی۔ میں نے کئی ایک مستریوں کے تحت کام کیا ہے' ایک دو سے میرے دوستانہ مراسم یہاں تک بڑھے ہوئے ہیں کہ میں ان کو ان کے نام سے بلاتا ہوں' اس لئے ان کے متعلق میری رائے ایک ایسے آدمی کی رائے ہے جو "جانتا" ہے میں یہ اقرار کرنے کو تیار ہوں کہ وہ سب قابل قدر آدمی ہوتے ہیں اور چسل اور پیمانے کے ایسے ایسے عجائبات کر سکتے ہیں جو کم از کم میرے لئے تو حیران کن اور قابل رشک ہیں مگر وہ "مستریانہ" فضیلت' وہ خاموش برتری کا انداز جس سے وہ باقی انسانیت سے ایک الگ اور ممتاز حیثیت کا دعویٰ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں' ایک ایسی خصوصیت ہے جو خالص مستریانہ ہے۔ یہ نہیں کہ ان کا اس "احساس برتری" میں کچھ اپنا قصور ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ اگر کل تم خود مستری بن جاؤ تو تم بھی اس برگزیدہ جماعت کے ایک فرد کی حیثیت میں کچھ الگ سی' کچھ سنجیدہ سی اور کچھ پدرانہ سی شفقت کی نمائش کرنے کی کوشش کرو گے۔ پرانی روایات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور میں خود جس دن سے مستری بنا ہوں بے حد متین اور اتنا ذمہ دار ہو گیا ہوں جیسے ایک دم میری زندگی کے دس مزید سال گزر گئے ہوں۔ مستری بننے سے پہلے میں زور زور سے ہنسنے کے لئے مشہور تھا' اب میں صرف مسکراتا ہوں اور مستری اور غیر مستری میں یہی ایک نمایاں فرق ہے۔ مگر یہ سب بحث غیر ضروری ہے اور اس تاریخ سے اس کا چنداں تعلق بھی نہیں۔ پھر بھی اس سے تم کو میرے مرحوم خسر کے کردار کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے گا کیونکہ وہ اپنی جماعت کا ایک مکمل نمائندہ تھا۔

مہتاب دین مل رائٹ شاپ میں ہیڈ مستری تھا ---- بھاری گٹھا ہوا جسم - کندھوں سے کچھ آگے کو جھکا ہوا چھوٹی مہین آنکھوں پر عینک لگی ہوئی - تنگ ماتھے پر گہری مستقل لکیریں - ہٹلر کی سی تراش کی موچھیں - جیسا کہ میں نے لکھا ہے وہ اپنی جماعت کا ایک صحیح نمونہ تھا - اس جیسے دس ہزار اور ہوں گے - ورکشاپ کے بیس برس اور ایک محنتی - وقت طلب عادت کی بدولت اس نے اپنے کام میں ایک حقیقی قابلیت اور مہارت حاصل کرلی تھی - سکھ چارج مین کو چھوڑ کر وہ شاپ میں سب سے زیادہ اہم اور معتبر آدمی تھا - ایک طرح اسی کی وجہ سے شاپ کی سوراخ کرنے اور کاٹنے والی مشینیں سارا سارا دن گھر گھراتی رہتی تھیں - اسی کے بنائے ہوئے ماپ کے پورے دائروں میں وہ سوراخ کرتی تھیں اور اسی کی کھینچی ہوئی سطروں پر وہ کاٹتی تھیں - یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ اگر وہ کسی دن نہ آسکتا تو شاپ کے کام کی کیا حالت ہوتی - غالباً" شاپ کی آدھی مشینوں کو بیکار رکا رہنا پڑتا - مگر مہتاب دین سورج کی طرح پابند اور گھڑی کی طرح باقاعدہ تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے وہ نہ تو کبھی بیمار ہوا اور نہ ہی کسی اور وجہ نے کبھی اسے اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر کیا۔

پہلے پہل مجھے اس کے ساتھ ہی کام پر لگایا گیا اور یہ اس کی بردباری اور تحمل کی دلیل ہے کہ جتنا عرصہ میں نے اس کے ساتھ کام کیا اس نے کبھی میرے ساتھ غصے یا خفگی کا اظہار نہیں کیا - مجھے یقین ہے کہ میں اس کے لئے زیادہ کار آمد نہ تھا - کئی کاموں کو میں نے بگاڑا ہو گا - میں نیا آدمی تھا اور اپنے کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا - مجھے غلط فہمی تھی کہ خدا نے مجھ کو مختلف اور بہتر چیزوں کے لئے پیدا کیا ہے اور ہمیشہ میرے دماغ میں سینما کا ایکٹر یا کتابوں کا مصنف بننے کی خواہشیں بسی رہتی تھیں - اندریں حالات کام میں دلچسپی خاک لیتا - میری بجائے شاید ایک گوریلا مستری کا زیادہ معاون اور مددگار ہو سکتا - شروع شروع میں مستری اور میرے تعلقات میں کچھ کھنچاؤ اور دوری سی رہی - ایک تو اس وجہ سے کہ ایک مستری (اور پھر ہیڈ مستری) اور ایک معمولی ورکر میں اصلی دوستی ہے ہی ناممکن - دوسرے میں اپنے آپ کو اس کے سامنے ایسا ہی محسوس کرتا جیسا کہ ایک کند ذہن لڑکا اپنے سکول ماسٹر کے سامنے - کبھی کبھی میں مستری کو ادھر ادھر کی باتوں سے ہنسانے کی کوشش کرتا - لیکن اگر کبھی وہ مجھے ممنون کرنے کے خیال سے مسکراتا بھی تو بڑی برتری اور دوری کے انداز میں - میرا مطلب ہے کہ مستری اور میں کبھی "لنگوٹیے" نہیں بن سکے ----- ان آخری دنوں میں بھی نہیں - اگرچہ اس نے کبھی کسی لفظ یا اشارے سے مجھ پر اس قسم کا کوئی اظہار نہیں کیا - پھر بھی میں یہ محسوس کرتا تھا کہ مستری مہتاب دین میری پیشہ وارانہ نااہلیت کو اور ہر بات میں میری سنجیدگی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا - سچی بات تو یہ ہے کہ اگر مستری اس قدر نیک دل اور متحمل نہ ہوتا تو خان بہادر کے مربیانہ رسوخ کے باوجود میں شاپ سے کبھی کا بغیر نوٹس کے نکالا جا چکا ہوتا - اس صورت میں اب غالباً" میرا خسر کوئی اور ہوتا۔

میں اور مستری مہتاب دین ایک ہی گلی میں رہتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم ہمسائے تھے - تم نے وہ گلی ضرور دیکھی ہو گی جو ہوٹل ڈی ریوٹی کی بغل میں سے ہوتی ہوئی لنڈے بازار میں مسجد شہید گنج کے سامنے آنکلتی ہے اور تم نے اس طرح جاتے ہوئے اپنے بائیں کو ان سیاہ اور مایوس کن بالا خانوں کی قطار بھی دیکھی ہو گی جن کی لکڑی کی عجیب منقش بالکنیوں پر ہمیشہ غلیظ اور دبیز پردے پڑے رہتے ہیں - اس قسم کے بالا خانے تم کسی وقت ریلوے روڈ یا کسی اور روڈ پر بھی دیکھ سکتے ہو - مجھے یہ علم نہیں کہ ان کو کس نے ایجاد کیا ' کون ان کا پہلا نقشہ گر تھا ' مگر وہ جو ایک دائمی اور مستقل انحطاط کی حالت ان پر چھائی رہتی ہے - میرے لئے ان کو رومانس کی چیزیں بنا دیتی ہے - تم نے گزرتے وقت کئی دفعہ تعجب کیا ہو گا کہ ان بالاخانوں میں کس قسم کے لوگ رہتے ہونگے اور شاید تمہارے تصور نے خوبصورت اور مہ چہرہ زلیخاؤں کے خواب دیکھے ہوں گے جو ان دبیز پردوں کے پیچھے ساری عمر ایک اداس کنوارپن میں گزار دیتی ہیں اور بوڑھی چڑیلیں ہو کر مرجاتی ہیں ' یا کبھی تم کچھ کچھ یہ امید کرنے لگ جاتے ہو گے کہ کوئی ہاتھی دانت جیسا زرد سپید ہاتھ جس کے اوپر نازک کلائی پر طلائی کنگن ٹھنا اور کھنکنا رہے ہوں گے ' تم کو پھٹے ہوئے پردے کے پیچھے کسی الغوزے یا طنبورے پر حرکت کرتا ہوا دکھائی دے گا اور ہو شربا الف لیلوی گانے کی لہریں نیچے تمہارے کانوں میں آئیں گی اور کوئی بوڑھا سفید مہربان داڑھی والا آدمی ' شاید بخارا کا کوئی سوداگر بچہ ' تم کو ہاتھ کی جنبش سے اوپر آنے کا اشارہ کرے گا ---- میرے دوستو - ان بالاخانوں میں نہ تو کوئی بخارا کا سوداگر بچہ ہے اور نہ اپنی جوانی کے کھنڈروں میں بیٹھی ہوئی زلیخائیں - ان میں نحوس اور معتبر اور

سنجیدہ آدمی رہتے ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ زندگی کوئی مذاق نہیں اور اس کے ساتھ سنجیدگی سے نمٹنا چاہیے ان بالاخانوں میں سے ایک میں مستری مہتاب دین اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ رہتا تھا اور اگر اب بھی تم ان مکانوں کے متعلق رومانی خیالات رکھنے یا سوچنے پر اصرار کرو تو یقیناً تم باؤلے ہو ۔۔۔ میری طرح ۔

اسی گلی کے نکڑ پر میرا یا یوں کہو کہ میرے دوست شیخ شیر علی ' شیر فروش کا بالا خانہ ہے اور اس کے نیچے اس کی دوکان ہے جس پر ہر وقت خالص دودھ مل سکتا ہے ۔ دودھ کے خالص ہونے کی میں خود گواہی دیتا ہوں ۔ مجھے دن میں کئی بار وہاں دودھ پینے کا اتفاق ہوتا ہے اور مجھے یہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ میں نے ہمیشہ دودھ کو عمدہ اور خالص پایا ۔ شیخ شیر علی "طبعاً" دوسرے شیر فروشوں کی طرح ملاوٹ کی قسم کی چھوٹی اور ذلیل کمینگیوں پر اتر ہی نہیں سکتا ۔ اگر تم کو اس دوکان کے پاس سے کبھی گزرنے کا اتفاق ہوا ہے تو تم نے ایک اونچے گنبد نما سر اور چشموں والے اوپلی ڈھال کے چہرے والے آدمی کو دودھ کی ایک بڑی کڑھائی میں چمچا پھیرتے دیکھا ہو گا اور اگر تم چہروں کو یاد رکھنے والے آدمی ہو تو وہ چہرہ جلدی نہیں بھول سکتے ۔ میرا یہ دوست ایک شاعر ہے ۔ ایک فلاسفر ' ان سڑی شاعروں اور فلاسفروں میں سے نہیں جو سوا اپنے آپ کے ساری دنیا سے بیزار معلوم ہوتے ہیں ۔ زندگی کے متعلق اس کی ایک اپنی انفرادی روشن فلاسفی ہے اور اس کے لئے کڑھتے ہوئے دودھ میں اتنا ہی رومان ' اتنی ہی شعریت ہے جتنی کہ ایک خوبصورت عورت میں ۔ بے حد قابل اور ذکی ہے میرا یہ دوست ۔ اس نے کچھ جدت پسند شاعری بھی لکھی ہے ۔ میرا مطلب اس شاعری سے ہے جس کا ایک مصرع بہت لمبا ہوتا ہے اور دوسرا بالکل چھوٹا اور جس کا مطلب صرف لکھنے والا شاعر سمجھ سکتا ہے اور وہ ایک معرکتہ الآرا علمی مضمون "قرون وسطیٰ کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت" کا بھی مصنف ہے جو ان اصحاب کے لئے جو بھینسوں میں کسی قسم کی دلچسپی رکھتے ہیں نہایت کار آمد اور مفید ہے میں نے اس کو ابھی تک نہیں پڑھا کیونکہ مجھے بھینسیں بالکل اچھی نہیں لگتیں ۔ اس کے علاوہ شیخ شیر علی نے فلم کمپنی کے لئے ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے ۔۔۔ منظر نامہ اور مکالمہ اور سب کچھ ۔ اس کا نام "دوشیزۂ فرانس عرف محبوبہ مصر" ہے ۔ سچے عشق کی کہانی ہے ۔ خاص کر آخری سین بے حد دردناک ہے جس میں شیخ کے لڑکے ہیرو اور شیخ کی لڑکی ہیروئن (ایک دوسرے شیخ کی) کی روحیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے قبروں میں سے آسمان کی طرف اٹھتی اور گاتی ہوئی دکھائی گئی ہیں ۔ شیخ شیر علی نے یہ ڈرامہ مشہور فلم کمپنی فصلی بنیرے لیمٹڈ کو بھیجا ہوا ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ اگر فصلی بنیرے تھوڑے بہت بھی اہل نظر ہوئے تو فوراً" اس ڈرامے کو اپنی اگلی فلم کے لئے خرید لیں گے ' وہ ڈرامے کو چھ سات ہزار سے کم میں قطعاً" نہیں بیچے گا ۔ غالباً" فصلی بنیرے اس کو اپنی فلم کمپنی میں مستقل مکالمہ نویس کے عہدے کی پیش کش بھیجیں گے ۔ اس صورت میں اس کا وعدہ ہے کہ وہ دودھ کی یہ دوکان مجھے سونپ جائے گا ۔

ہماری دوکان کے سامنے ایک دو گھر چھوڑ کر محمد الدین درزی کی دوکان کے اوپر مستری مہتاب دین کا بالا خانہ تھا جس کی بالکنی پر ہمیشہ تاریک اور غلیظ بوریاں لٹکتی رہتی تھیں ۔ سورج کتنا ہی چمکیلا کیوں نہ ہو اور آسمان کتنا ہی نیلا ' جس وقت تمہاری نظر ان تاریک بوریوں پر پڑتی (میری نظر اکثر ان پر پڑتی تھی) آسمان بھورا اور میلا سا ہو جاتا اور کثیف سے بادل تمہاری روح پر چھا جاتے اور تم کو مستری مہتاب دین پر اس کے مستری ہونے کے باوجود رحم سا آنے لگتا ۔ پھر مستری مہتاب دین ایک غیر دلچسپ ' معمولی سا آدمی تھا اور میں جانتا تھا کہ تصور کی بلند ترین پرواز بھی اسے بخارا کے سوداگر بچے میں تبدیل نہیں کر سکتی اور اس لئے وہ عجیب اسرار اور رومانیت کا ہالہ جو مجھے ساتھ کے بالا خانوں کے گرد نظر آتا تھا اور جو ان کی دائمی غلاظت کو ایک خوبصورت رومان کی شکل دے دیتا تھا ' مستری کے بالاخانہ کے گرد مجھے نظر نہ آتا ۔۔۔ (یہ احساسات اس دن سے پہلے کے ہیں جس دن میں نے ورکشاپ سے لوٹتے وقت بوری کے پیچھے سے ہاتھی دانت جیسے ایک زرد و سفید ہاتھ کو باہر گلی میں کدو کے چھلکے پھینکتے دیکھا ۔ اس دن سے تو میرا یہ عالم تھا کہ میری نظریں ہمیشہ ان تاریک غلیظ بوریوں پر یوں گڑی رہتیں جس طرح وہ دنیا کے خوبصورت ترین اور عجائب ترین حریری پردے ہوں ۔ اس دن سے بوڑھا مستری مہتاب دین بھی مجھے کچھ کچھ مہربان داڑھی والا بخارا کا سوداگر بچہ لگنے لگا ۔ اگرچہ اس خود فریبی کی تکمیل میں ایک خرابی یہ تھی کہ مستری مہتاب کی داڑھی نہ تھی ۔ تاہم ان سب باتوں کا ذکر مناسب موقع پر تفصیل سے آئے گا ۔ پہلے میں تم کو لالٹین کے بارے میں بتا لوں ۔۔۔ یا لالٹین کے ڈھانچے کے بارے میں جس کا اس تاریخ میں اتنا ہی اہم

مقام ہے جتنا کسی اور انسانی کردار کا تب بھی یہ لالٹین میرے لئے زندہ تھی۔۔۔۔۔۔ معصوم اور بے ضرر اور بے کار' بعد میں یہ میرے گمانوں سے بھی کئی حصے زیادہ زندہ نکلی اور پھر اتنی معصوم اور بے ضرر بھی نہیں جتنی یہ نظر آتی تھی۔

مستری مہتاب دین کے بالا خانے کے نیچے اس دروازے پر جہاں سے سیڑھیاں اوپر چڑھتی تھیں کوئی پچیس فٹ اوپر یہ لالٹین اٹکی تھی ۔۔۔ ایک ٹوٹا ہوا ۔ زنگ خوردہ لالٹین کا ڈھانچہ جس کا لوہا اب سیاہی مائل سرخ ہو کر بھر رہا تھا ۔ دیوار میں سے نکلتا ہوا لوہے کا ایک بازو اس کو نچلی کے اوپر سہارا دیئے ہوئے تھا اور لوہے کا بازو کئی برس سے یہ کام کرنے کی وجہ سے کچھ تھک گیا تھا یا اندر سے دیوار میں اس کی نشست کھلی اور کھوکھلی ہو گئی تھی کیونکہ اب وہ بازو کچھ نیچے جھک آیا تھا اور اس کے ساتھ لالٹین کا ڈھانچا بھی ۔ میرے خیال میں شاید ہی کبھی کسی نے اس کی طرف دھیان دیا ہو مگر میں اس کو دیکھ کر اکثر سوچا کرتا کہ شاید اس کو روشن ہوئے عمریں بیت گئی ہوں گی اور یہ کہ اب اس میں کبھی روشنی نہیں ٹمٹمائے گی ۔ وہ ایک خاموش اور رومانی دنیا کی نشانی تھی ۔ پھر یہ بجلی کے اونچے بدصورت کھمبے اس روشنی اور رومان میں کریہہ بدتمیز اجنبیوں اور غیرملکیوں کی طرح گھس آئے تھے پہلے بڑی سڑکوں اور شاہراہوں پر اور بعد میں ان چھوٹی گلیوں میں بھی اور وہ چوکور خود پوش لالٹینیں جو گلیوں کی نکڑوں پر سے اندھیری راتوں کو جگاتی تھیں اور شہر کے رہنے والوں اور باہر کے مسافروں کے لئے لامحدود ممکنات کی حامل تھیں ۔ جن کی مدھم زرد کانپتی روشنیوں میں گدڑی والا فقیر ایک بھیس بدلا ہوا ہارون الرشید لگنے لگتا تھا اور ناممکن ترین باتیں سچ ہونے لگتی تھیں ۔۔۔۔ وہ چوکور خود پوش لالٹینیں ماضی کی چیزیں ہو گئیں ۔ لوگ ان کو دیواروں میں سے اکھاڑ کر لے گئے ۔ اب ان دنوں تم لاہور کے سارے گلی کوچے چھان مارو ' تم کو شاید ہی لالٹین کا کوئی پرانا ڈھانچا کسی دیوار کے کونے میں اٹکا ہوا مل سکے ۔ کیونکہ جنگ کے بعد سے لوہا مہنگا ہو گیا ہے ' لوگ اب نحوس اور لالچی بن گئے ہیں اور دیوار میں لگی ہوئی لالٹین کی رومانیت اور شعریت کو وہ نہیں سمجھ سکتے ۔ ایسے زمانے میں اس لالٹین کے ڈھانچے کا دیوار میں اٹکا رہ جانا مجھے ایک عجیب بات لگا ۔ غالباً" کبھی کسی کا اس کی طرف دھیان نہیں گیا تھا کیونکہ یہ بہت اونچی تھی اور دیوار کی طرح بے رنگ تھی ۔ اگر کسی نے کبھی اس کی طرف دھیان دیا بھی ہو تو اس کا لوہا اب اس قدر زنگ خوردہ اور بیکار ہو چکا تھا کہ اس کو چاندی کے سکوں میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ یا شاید اسے ابھی اپنی قسمت کی تکمیل کرنی تھی اور انسانوں کے اس ڈرامے میں کرم کے ریکھے کے مطابق وہ آخری اور خوفناک پارٹ ادا کرنا تھا جس کے لئے یہ اتنے برس سے اس دیوار میں اس خطرناک حالت میں اٹکی ہوئی تھی ' ان دنوں جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے ماضی کی یہ نشانی مجھے بالکل معصوم اور بے ضرر سی نظر آتی تھی اور اس چیلنج میں جو وہ بجلی کے کھمبوں کو دیتی معلوم ہوتی تھی ایک دیدہ دلیری اور بہادری کا انداز تھا ۔ اس بے چاری حرماں نصیب لالٹین پر ایک الگ 'کہانی لکھی جا سکتی ہے اور اگر کوئی شاعر اس کو دیکھ پاتا تو اس پر ایک رباعی کی صورت میں ایک چھوٹا سا خوبصورت کتبہ لکھنے پر مجبور ہو جاتا جو اس لالٹین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیرفانی بنا دیتا ۔

شاید تم اس لالٹین کے اس قدر طویل بیان سے اکتا گئے ہو گے لیکن یہ لالٹین اس تاریخ کے اہم کرداروں میں سے ہے اور میں اس کو آسانی سے چار پانچ سطروں میں ٹال دینا انصاف سے بعید سمجھتا تھا ! ہاں اگر تمہاری خوشی یہی ہے تو میں اب اس کا ذکر نہیں کروں گا ۔۔۔۔ البتہ میں آخری صفحے کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ وہاں تو وہ خود آ ٹپکتی ہے بہرحال اب میں اسے چھوڑتا ہوں اور اپنی کہانی جاری رکھتا ہوں ۔

ہمسائے ہونے کے باوجود شاذ و نادر ہی میں اور مستری مہتاب دین گلی میں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہوں گے ۔ کبھی بہت سویرے جب میں ورکشاپ کی ٹرین کو پکڑنے کے لئے گلی میں سے دوڑتا ہوا جاتا تو وہ مجھے ایک مطمئن چال سے خراماں خراماں جاتا ہوا ملتا ۔ " ابھی وقت ہے ۔ " وہ اپنی چوڑی ' موٹی اور بھاری جیسی گھڑی کو مسترایانہ خود اعتمادی سے دیکھ کر مجھے بتاتا اور پھر ہم اکٹھے ہی ریلوے سٹیشن کے اس یارڈ تک جاتے جہاں سے ہماری ورکشاپ کی گاڑی چلتی ہے ' اکٹھے ہی ایک کمپارٹمنٹ میں بیٹھتے اور اکٹھے ہی کچی صبح میں انجنوں اور ریلوے لائنوں اور سگنلوں کے پاس سے تیس میل کی رفتار پر گڑگڑاتے ہوئے گزرتے ۔ ورکشاپ میں تو میں ہمیشہ رہتا ہی اس کے ساتھ تھا ۔ ورکشاپ سے واپسی کے وقت ہم قدرتاً" ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ۔ میں اس وقت جب کہ جسم اور دماغ بالکل تھکے ہوئے ہوتے تھے اس سنجیدہ اور غیردلچسپ

معمر آدمی کی صحبت پر اپنے ہم عمر بے فکروں کی صحبت کو ترجیح دیتا تھا۔ مستری کا بظاہر ایک کافی گہرا دوست تھا جو ساتھ کی لوکو شاپ میں کرین پر کام کرتا تھا وہ اور مستری ورکشاپ سے ہمیشہ اکٹھے لوٹتے۔ کبھی کبھی وہ چھٹی کا سائرن بولنے سے کچھ پہلے ہی شاپ کے باہر آکر مستری کا انتظار کرتا۔

اس کا نام مستری رحیم بخش تھا۔ وہ ایک موٹا بھاری 'عامیانہ قسم کا آدمی تھا ------ ایک لمبی مہندی سے رنگی ہوئی سرخ داڑھی والا آدمی جو بائلروں کی صحبت میں رہ رہ کر اب خود اس حد تک ایک بائلر لگنے لگ گیا تھا جس حد تک ایک انسان بائلر لگ سکتا ہے۔ اس کے ہونٹ موٹے اور وحشیانہ سے تھے۔ اس کی آنکھیں بالکل چھوٹی تھیں اور ان میں ایک عیارانہ دمک سی تھی۔ میں کئی دفعہ تعجب کرتا کہ مستری مہتاب دین اور مستری رحیم بخش عادات اور طبیعت کے اتنے اختلافات کے باوجود کیونکر اتنے گہرے دوست ہیں۔ میں نے سوچا شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مستری مہتاب دین اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے کسی سے اختلاف رائے نہیں رکھتا اور فوراً" ہر شخص سے ہر معاملے میں اتفاق کر لیتا ہے اور رحیم بخش جیسے شوریدہ اور ژولیدہ آدمی کو جسے اور کوئی منہ لگنے نہیں دیتا۔ مستری مہتاب دین میں ایک ایسا آدمی مل گیا ہے جو اس کی ہر بات میں ایک شاگردانہ انداز کی ہاں میں ہاں ملانے کو تیار رہتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ مستری رحیم بخش ہی تھا جو مستری مہتاب دین کی سوسائٹی کا متلاشی تھا ------ شاید روح کے کسی سکون اور اطمینان کی خاطر جو مستری کی صحبت میں اسے حاصل ہوتا تھا۔ کئی دفعہ وہ ہماری مل رائٹ شاپ میں آجاتا اور دیر تک ریلوے ورکشاپ کی اندرونی سیاست پر باتیں کرتا رہتا۔ اپنے چارج مینوں کو برا بھلا کہتا اپنی مرحومہ بیوی کو یاد کرتا اور جب وہ آدھ گھنٹے میں ایک سو ایک موضوعات پر بول چکتا اور مستری مہتاب دین اس کی ہر بات سے فوراً اتفاق کر چکتا تو وہ واپس اپنی شاپ میں اپنے کام پر چلا جاتا۔ اسے اپنی آواز سے محبت تھی جو کچھ اس قسم کی تھی جیسے ریل کے پہیے کی آواز جسے بریک لگا دی گئی ہو میں۔ اس سے قدرتاً" نفرت کرنے لگ گیا میں نے اس کی کبھی پروا نہ کی کبھی کبھی وہ ایک خاص پدرانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر مستری مہتاب دین سے پوچھتا " مہتابیا۔ یہ ہمارا چھوکرا اسمٰعیل کچھ سیکھ بھی رہا ہے؟ ---- " جیسے وہ ذاتی طور پر میری تربیت کا ذمہ دار اور میرا نگران ہو۔ ایسے وقت وہ مجھے بڑا برا لگتا۔ آدمی کے لئے اس کا ایک باپ ہی بہت کافی ہوتا ہے۔

مستری مہتاب دین کا شام کا وقت عموماً" اس موئی بوریوں کے پیچھے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ گزرتا تفریحات اور کھیل تماشے اس کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتے تھے ---- ہاں ایک دفعہ میں نے اس کو مستری رحیم بخش کے ہمراہ ایک سینما میں دیکھا۔ غالباً" اس کا یہ دوست جس کے سامنے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا' اس کو بوریوں کے پردے والی بالکنی کے سکون سے کھینچ کر یہاں لے آیا ہو گا ------ کچھ ساتھ کی خاطر اور کچھ شاید اس لئے کہ مستری مہتاب دین دونوں کے ٹکٹ خریدے گا ------ (انہوں نے غالباً" مجھے نہ دیکھا۔ فلم شاید " تھیز " تھی جو ڈائرکٹر "مارو ھاز" کی ہدایت کی ہوئی ہے پہلا ہفتہ تھا اور رش بڑا زبردست تھا۔ میں لوگوں کے سروں کے اوپر لیٹا ہوا ہاتھ ٹکٹ کی کھڑکی کے اندر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے عزیز دوست شیخ شیر علی نے مجھے پیچھے ٹانگوں سے سہارا دے رکھا تھا ---- آوہ وہ بے فکری کے پیارے دن!)۔

عموماً" میرا شام کا وقت بھی شیخ شیر علی سے مصنفوں اور کتابوں کی باتیں کرتے گزرتا۔ شاید ہی کسی شخص کو ان حیران کن آدمیوں کے متعلق جو کتابیں اور افسانے اور نظمیں لکھتے ہیں اتنی معلومات ہوں گی جتنی شیخ شیر علی کو۔ اس کی باتوں میں گہری، عقیدت سے زیادہ رشک کا رنگ ہوتا تھا۔ مجھ سے پوچھو تو واقعی وہ لوگ کمال کرتے ہیں۔ مجھے تو ایک خط لکھنا پڑتا ہے تو مصیبت پڑ جاتی ہے۔ آپ کی خیریت خیر مطلوب سے آگے ایک لفظ نہیں سوجھتا۔ (شیخ شیر علی کے کہنے پر میں نے ایک جاسوسی ناول " خوفناک نقاب پوش " کا آغاز کیا تھا مگر پہلے باب کے بعد جس میں ہیرو ہیروئن کو دیکھ کر فوراً" غش کھا کر گر پڑتا ہے اور اسے ہسپتال پہنچایا جاتا ہے میری ساری خلاقانہ طاقتیں جواب دے گئیں) خود شیخ شیر علی جو فی الواقع ایک جینیس 'ایک نابغہ ہے' ابھی تک اپنا نام کسی رسالہ میں چھپا ہوا نہیں دیکھ سکا۔ اس کا معرکتہ الآرا مضمون " قرون وسطیٰ کے سماج میں جینئسوں کی اہمیت " پانچ چھ رسالوں سے واپس آچکا ہے اور تو اور مدیر رسالہ " مویشی " تک نے بھی اس کو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ میں نے یہ کہہ کر شیر علی کی ڈھارس بندھائی کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مضمون اشاعت کے قابل نہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ

غافل لوگ بھینسوں کے ماضی یا مستقبل سے قطعاً" بے پروا ہیں۔ پھر بھی "مویشی" والا معاملہ ایسا تھا کہ اس کا جواب میرے پاس بھی نہ تھا۔

مہینے میں چار پانچ بار مستری مہتاب دین ہماری دوکان پر دودھ پینے آتا ـــــ کبھی اکیلا اور کبھی مستری رحیم بخش کے ہمراہ۔ ایسے موقعوں پر میں دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ میں فیاضانہ لہجے میں کہتا "بھائی شیر علی، مستری مہتاب دین کے گلاس میں بالائی ذرا زیادہ ڈالنا۔" مجھے اب تک صرف اس قدر اثر اور رسوخ حاصل ہو سکا ہے کہ لوگوں کے دودھ میں زیادہ بالائی ڈلوا دوں اور وہ بھی صرف شیخ شیر علی کی دوکان پر مستری مہتاب دین کے گلاس میں بالائی زیادہ ڈلوانے سے مجھے قطعاً" غلط فہمی نہ تھی کہ وہ میری اس فیاضانہ سفارش کی وجہ سے میرے بارے میں اپنی رائے بدل دے گا۔ اس کی توقع ہی فضول تھی۔ میرے متعلق جو مستری کی رائے ان دنوں تھی اس کا مجھے بخوبی علم تھا اور تم بھی اس کو جانتے ہی ہو۔ میں فقط اس کو اپنا ممنون کرنے کا خواہشمند تھا۔ دراصل میں مستری کو اپنی طاقت اور رسوخ کے مطابق ممنون کر کے صرف اپنی خود بنی کے جذبہ کو تسکین پہنچا رہا تھا (اگر تم کو زیادہ بالائی والا دودھ پینے کا شوق ہے تو میں دوست بنانے کے لئے مناسب ترین آدمی ہوں۔)

اور اب میں اس شام پر آتا ہوں جس کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے جب شرارت کا آغاز ہوا۔ جب ایک چھوٹے ہاتھی دانت جیسے سفید ہاتھ نے بوری کے پردے سے باہر ایک تھالی کو اوندھا کر کدو کے چھلکے تقریباً" میرے سر پر الٹ دیئے۔ مجھے تاریخ بھی یاد ہے۔ اگرچہ میں اس قسم کا آدمی ہوں جو کئی دفعہ سال تک بھول جاتا ہوں۔ مئی کے مہینے کی ستائیس تھی اور جمعہ کا دن تھا۔ میں معمول کے مطابق شام کو ریلوے اسٹیشن سے اکیلا واپس آ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن یہ بالاخانے مجھے روڈ سے کہیں زیادہ مایوس کن اور دل ڈھا دینے والے معلوم ہوئے۔ ان کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا جیسے کسی نے کیچڑ سے بھرا ہوا ہاتھ میرے دل پر رکھ دیا ہو اور میں کچھ سوچنے سا لگ گیا کہ آخر میں نے اب تک خودکشی کیوں نہیں کی۔ اصل میں اس روز میرے ساتھ ورکشاپ میں بعض باتیں ناخوشگوار ہو گئی تھیں اور اس وقت مجھے زندگی کچھ زیادہ روشن نظر نہیں آ رہی تھی۔ مستری مہتاب دین نے مجھے لوہے کا ایک ٹکڑا ماپ کے مطابق فائل کرنے کو دیا تھا اور میں نے غفلت اور لاپروائی کی وجہ سے اس کو اتنا زیادہ فائل کر دیا تھا کہ اس کی لمبائی ماپ سے آدھ انچ کم ہو کر رہ گئی تھی۔ مستری نے مجھے ایک لفظ بھی نہ کہا مگر میں اس کی آنکھوں میں اور بشرے پر لکھی ہوئی خفگی اور ناراضی پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے سارا دن مجھے کام میں مدد دینے یا نہ دینے کے لئے بلایا تک نہیں اور میں نے بھی شرمندگی اور خفت کی وجہ سے اس کے سامنے آنے کی بجائے شاپ میں ادھر ادھر گھوم کر وقت گزارنے کو بہتر سمجھا۔ یہ ہے بھی وقت گزارنے کا ایک نہایت خوشگوار طریقہ۔ میں ایک جگہ ورک مینوں میں کھڑا ہوا ان کے ساتھ گپیں ہانکنے لگا۔ وہ کام چھوڑ کر ہنس رہے تھے اور میرا خیال ہے میں ایک فلم میں ایک مشہور مزاحیہ ایکٹر کی نقل اتار رہا تھا کہ کیبن میں فورمین کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ وہ غصے میں بھاگتا ہوا آیا اور جو الفاظ اس نے میرے بارے میں استعمال کئے وہ تمہیں بتاؤں تو تم یقین ہی نہیں کرو گے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میری ڈیوٹی کہاں تھی۔ میں نے جواب دیا کہ میں مستری مہتاب دین کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ اس نے پوچھا۔ "تم اس وقت مستری مہتاب دین کے پاس کیوں نہیں ہو؟" میں حاضر جواب نہیں ہوں۔ میں نے جلدی میں ایک نہایت احمقانہ سا جواب دیا۔ "میں مستری مہتاب دین کو ڈھونڈنے ہی جا رہا ہوں۔ خدا جانے وہ کہاں گم ہو گیا ہے۔" فورمین نے میرے بارے میں چند مزید ناشائستہ کلمات استعمال کئے جو یہاں جگہ کی قلت کی وجہ سے لکھے نہیں جا سکتے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر میرے چارج مین کے روبرو لے گیا۔ سکھ چارج مین نیک دل آدمی تھا۔ وہ کسی کا برا نہیں چاہتا۔ اس نے کہا کہ اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے مہتاب دین کے ساتھ کام کرتے دیکھا تھا۔ مستری مہتاب دین کو بلوایا گیا۔ فورمین نے پوچھا۔ "ویل مستری صاحب 'یہ آدمی ابھی تمہارے ساتھ کام کرتا؟" مستری مہتاب دین نے پہلے مجھے ایک روٹھے ہوئے باپ کی طرح دیکھا اور پھر فورمین کو جواب دیا "ہاں صاحب! ابھی میرے ساتھ کام کر رہا تھا" ـــــ میں نے پہلے بھی تم کو بتایا ہے کہ مستری مرحوم دل کا صاف تھا مگر یہ کہہ کر تو اس نے گویا مجھے بے داموں مول لے لیا۔ میرا دل چاہا کہ اس کو گلے لگاؤں اور اس کو اس کی ہونٹوں کی مکھیوں (میرا مطلب اس کی موچھوں سے ہے) کے اوپر چوم لوں۔ فورمین مجھے مستری کے حوالے کر کے چلا گیا اور یوں میری خلاصی ہوئی۔ مگر اس واقعے کی ندامت ابھی میرے دل سے گئی نہ تھی۔ کبھی سوچتا کہ یہ ورکشاپ کی نوکری میرے بس کی نہیں 'اسے چھوڑ دوں۔ پھر خان بہادر کی ناراضی کا خیال آتا' کبھی دل میں فیصلہ کرتا کہ یہاں

میرا کیریکٹر تباہ ہو رہا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ رائل بینڈ میں نوکری کر لوں یا سالویشن آرمی میں شامل ہو جاؤں یا کافی ہاؤس میں پارٹ ٹائم بیرا بن جاؤں۔ وہاں کے دو تین بیرے میرے دوست تھے اور رائل بینڈ میں میرا ایک دوست جھانگی رام ملازم تھا۔ میں نے اس کو ایک دو بار شادیوں پر اپنی سرخ کاڑھی ہوئی شاندار یونیفارم میں بینڈ کے ساتھ بگل پھونکتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی خوش قسمتی پر رشک بھی کیا تھا۔

یہی خیالات لئے ان بالاخانوں کے پاس سے گزر رہا تھا کہ مجھے وہ سفید ہاتھی دانت کی انگلیاں بورے سے باہر ایک تھالی اوندھاتی نظر آئیں۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس چینے کی پکا چوند نے مجھے اس درجہ محو کر دیا کہ کم سے کم اس وقت مجھے مطلق پتہ نہیں کہ وہ اوندھاتی ہوئی چیز کیا تھی جو مجھ سے ایک قدم آگے نالے میں گری۔ پرانے ناولوں کے مصنفوں کے مطابق مجھے وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑنا چاہئے تھا مگر میں نے سوچا کہ بر سر بازار بے ہوش ہو کر گرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا اور میں نے اس کو (بے ہوش ہونے کو) کسی اور وقت پر اٹھا رکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے سفید لمبی مخروطی انگلیاں ناچنے لگیں۔ (میں وہاں سے ہٹا تو جب جا کر معلوم ہوا کہ تھالی میں سے کدو کے چھلکے گرے تھے۔)

یہ بالا خانہ وہی تھا جس میں مستری مہتاب دین رہتا تھا اور ان انگلیوں کی مالکہ یقیناً" اس کی لڑکی رضیہ کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ رضیہ کا نام میں نے ایک دو دفعہ مستری مہتاب دین اور مستری رحیم بخش کی باتوں میں سن لیا تھا۔ پھر ایک دفعہ میرے سامنے مستری مہتاب دین نے رضیہ کے رشتے کے بارے میں مستری رحیم بخش سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ کسی اچھے بر پر نظر رکھے۔ تب اس کا صرف نام ہی سن کر ایک گرم سیال سی ونک میرے سارے بدن میں سرایت کر گئی تھی اور اب رضیہ کی دو انگلیاں دیکھ کر تو میں اس کا غلام ہو گیا تھا۔ مجھے یکلخت خیال آیا کہ میری عمر اب چھبیس کے لگ بھگ ہونے والی ہے اور مجھے اب تک ایک شادی شدہ آدمی ہونا چاہئے تھا۔ کیا رضیہ میری بیوی بن سکے گی! لیکن مستری مہتاب دین نہیں مانے گا۔ وہ مجھے ایک نکما بے کار آدمی سمجھتا ہے جسے کام کرنے یا سیکھنے کا بالکل شوق نہیں۔ میں اس کی نظر میں مستقل مزاج لڑکا نہیں تھا۔ میں اب خوب دل لگا کر کام کروں گا اور مستری مہتاب دین کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر دوں گا۔

رات کو میں اور شیر علی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بعد میں شیر علی کو نیند آنے لگی اور مجھے اس کو جگانے کے لئے کئی بار اس کے چٹکی بھرنا پڑی۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح شام سے میں بالکل نیا آدمی ہو گیا ہوں اور شادی کتنی اچھی چیز ہے۔ ان باتوں کا شیر علی پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ وہ عورتوں کی پوری نسل ہی کے خلاف ہے۔ اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے تجربہ حاصل تھا کہ جس آدمی پر ایک بار صنف نازک کا جادو چل جائے اس کو سمجھانا اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ مگر ایک سچا اور وفادار دوست ہونے کی حیثیت سے اس نے مجھے چند ذہانت بھری تجویزیں بتائیں جن پر عمل کر کے میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا اگرچہ اس نے بعد میں یہ بھی جتا دیا کہ اس کی رائے میں منزل مقصود اس قابل ہی نہیں تھی کہ اس کے لئے اتنا قیمتی وقت برباد کیا جائے۔

میں نے کڑک کر کہا۔ "ابے چغد قاتنے میں نے رضیہ کے بارے میں تمہاری رائے پوچھی ہی کب تھی؟"

اس نے جواب دیا "مگر کیا تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ جن سفید انگلیوں نے تمہیں پاگل بنا دیا ہے' وہ شاید رضیہ کی نہ ہوں' اس کی ماں کی ہوں' مستری مہتاب دین کی بیوی کی۔"

اس امکان کا مجھے گمان ہی نہیں تھا کہ وہ انگلیوں رضیہ کے علاوہ کسی اور کی بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر میں اس بارے میں شبہ کر کے اپنی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ ان انگلیوں میں جو چمک تھی' وہ ادھیڑ عمر کی کسی عورت کی انگلیوں میں ہو ہی نہیں سکتی۔ شیر علی نے مجھے جو تجویزیں بتائیں ان میں سے پہلی تو یہ تھی کہ میں ورکشاپ میں جی لگا کر کام کروں۔ مستری مہتاب دین کے سامنے ہمیشہ ایک برخوردار بنا رہوں اور اس کی موجودگی میں کسی سے کوئی مذاق نہ کروں۔ وجہ یہ تھی کہ مستری سنجیدہ اور متین لوگوں کو بہت وقعت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ (اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میرا دوست شیر علی مستری کے خانگی حالات کے متعلق کافی واقفیت رکھتا تھا) مستری مہتاب دین کے دو چھوٹے لڑکے آوارہ تھے۔ پڑھنا پڑھانا تو ایک طرف' وہ سارا سارا دن گلی کے لونڈوں کے ساتھ کنکوا بازی میں گزارتے تھے میں نے ان میں سے ایک کو جس کی عمر یہی کوئی دس برس کی ہو گی' ایک دفعہ ایک فلم کی اشتہاری پارٹی کے ہمراہ ایک پوسٹر اٹھائے ہوئے بھی

دیکھا تھا۔

شیر علی نے کہا۔ "اگر تم مستری کے لڑکوں میں سے کبھی کسی کو ایسا کرتے دیکھو تو کان سے پکڑ کر اسے فوراً" مستری کے سامنے لے آؤ۔ اس طرح مستری محسوس کرنے لگے گا کہ تمہیں اس کے بیٹوں کا خاص خیال ہے۔ وہ تھوڑے ہی عرصے میں تم کو اپنے گھر کا آدمی سمجھنے لگے گا۔"

تیسری تجویز یہ تھی کہ مستری مہتاب دین کی بیوی حکیم علم علی، مشہور موجد سرمہ ------ کی تیسری بیٹی تھی۔ حکیم صاحب کا دعویٰ تھا کہ جو کوئی بھی ان کا سرمہ استعمال کرے گا' وہ دن کو تارے دیکھنے لگے گا۔ چنانچہ شہر لاہور میں اب تک ایسے لوگ موجود ہیں جن کو دن کے وقت صرف تارے ہی نظر آتے ہیں اور حکیم صاحب مرحوم کی روح کو دعائیں دیتے ہیں۔

شیر علی نے کہا کہ جب بھی تم مستری مہتاب دین سے ملو باتوں باتوں میں حکیم علم علی مرحوم کے سرمے کا ذکر ضرور لے آؤ۔ یہ ذکر ذرا اونچی آواز میں کرنا تاکہ اندر مستری کی بیوی بھی سن لے۔ مثلاً "تم قسم کھا کر ایک مادر زاد اندھے کا ذکر کر سکتے ہو جس نے مرحوم کا مشہور سرمہ استعمال کیا تو ایک ہفتے کے بعد دیکھنے لگا۔ یا تم اپنی ہی مثال دے سکتے ہو کہ جن دنوں تم یہ سرمہ استعمال کرتے تھے' تم نے عید کا چاند دو بجے دوپہر ہی کو دیکھ لیا تھا یا اسی قسم کی خرافات۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم مستری کی بیوی کے دل میں گھر کر سکتے ہو اور پھر ایسا وقت بھی آ سکتا ہے' جب وہ اپنے مستری سے صاف صاف کہہ دے کہ اس دنیا میں رضیہ کے لئے مناسب ترین رشتہ تمہارا ہی ہے۔ میری طرف سے لکھ کر رکھ لو کہ جو شخص کسی عورت کے باپ کی تعریف کرے گا' وہ اسے اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھنے لگے گی۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم حکیم کا ذکر اتنی عقیدت سے کرو گے تو مستری کی بیوی چق اٹھا کر بے دھڑک اندر چلی آئے گی اور تمہیں بیٹا کہہ کر اپنے والد مرحوم کی طبابت کا کوئی اور محیرالعقول معجزہ سنا دے گی۔ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

دوسرے دن صبح میں اٹھا تو اس پختہ ارادے کے ساتھ کہ آج میں مستری کے قلعے پر ہلّہ بول دوں گا اور اسے فتح کر کے رہوں گا۔ ورکشاپ میں میں نے پورا دن لگا کر مستری کا ساتھ دیا اور مناسب حد تک مودب رہا۔ شام کو واپس آ کر میں مستری کے بیٹوں کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ اس دن تم میری تلاش ناکام رہی۔ مگر دوسری شب کو میں نے ریوالی سینما کے پاس دو لڑکے دیکھے جو فلم "تھپڑ" پر بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک مستری مہتاب دین کا لڑکا تھا۔ میں نے لپک کر کہا۔ "اے فضلو! تم کہاں آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہو۔" پھر میں نے مستری کے بیٹے کو بازو سے پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا گلی میں لے چلا۔ اس نے میرا ہاتھ کاٹنے کی بار بار کوشش کی اور میری شان میں کچھ ناشائستہ کلمات بھی استعمال کئے جو طوالت کے خوف سے یہاں نہیں لکھے جا سکتے۔ لڑکے نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ کھڑکیوں میں سے کئی عورتیں چقیں ہٹا کر جھانکنے لگی تھیں۔ مستری مہتاب دین بھی سیڑھیاں اترا۔ میں نے چھوٹتے ہی کہا۔ "یہ سینما کے آس پاس آوارہ گردی کر رہا تھا۔ اس لئے میں اسے پکڑ لایا ہوں۔"

"مگر میں نے اسے آج خود ہی سینما دیکھنے کی اجازت دی تھی!" مستری حیران ہو کر بولا۔

"مگر......" میں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ آخر میں کہہ ہی کیا سکتا تھا۔ میں جب آج بھی سوچتا ہوں کہ اس وقت مجھے کیا کہنا چاہیے تھا تو کوئی معقول بات سمجھ میں نہیں آتی۔

"خیر کوئی بات نہیں" مستری بولا۔ "جاؤ فضلو' سینما دیکھو۔"

خاصی دیر کے بعد میں صرف اتنا کہہ پایا۔ "اس نے راستے میں میرا ہاتھ کاٹنے کی بھی کوشش کی۔" مگر افسوس کہ میرے اس فقرے کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ بلکہ الٹا اثر ہوا۔ سب لوگ مسکرانے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مجھے بھی مسکرا دینا چاہئے تھا۔ سو میں بھی مسکرانے لگا۔ بہت عجیب مسکراہٹ جو دکھائی دیتی بھی ہے اور نہیں بھی دکھائی دیتی۔

شیر علی کا بتایا ہوا پانسہ بالکل الٹا پڑا تھا مگر مستری مہتاب دین میری نیک نیتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ میرے سینے میں خالص سونے کا دل ہے۔ اس واقعے یا حادثے کے تین دن بعد مستری نے مجھے اور شیخ شیر علی کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ تب

مجھے معلوم ہوا کہ شیر علی کس بلا کا شاطر ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ سارا دن میں رات کے کھانے کے خواب دیکھتا رہا۔ میں آئینہ کم ہی دیکھتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ آئینہ دیکھنے کے فوراً بعد جو پہلا خیال میرے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ خودکشی کر لینی چاہیے۔ اس کے باوجود میں لاہور کے کم سے کم تین ایسے آدمیوں کا نام لے سکتا ہوں جن کے مقابلے میں مجھے بڑے اعتماد کے ساتھ خوبصورت کہا جا سکتا ہے اور پھر اصل چیز تو انسان کا دل ہوتا ہے اور اب تک پیارے قارئین تم پر ثابت ہو چکا ہو گا کہ میرا دل سونے کا ہے۔ اس روز میں نے کوئی دو گھنٹے بناؤ سنگھار میں صرف کئے۔ چار بجے کے قریب مولوی کرم الٰہی حجام کی دوکان پر (جو ہائی سکول میں میرا کلاس فیلو تھا) دوبارہ داڑھی منڈائی۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی اور مختلف زاویوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کس زاویے سے میں ذرا خوبصورت یا کم بدصورت نظر آ سکتا ہوں۔ کسی بھی زاویے کا نتیجہ حوصلہ افزا نہ تھا۔ مگر میں شاید ان لوگوں میں سے ہوں جن کے ساتھ آئینے پوری طرح انصاف نہیں کرتے۔ میک اپ کے بعد کپڑوں کا مسئلہ سامنے آیا۔ نتھو دھوبی کی لانڈری میں جا کر میں نے اس سے کسی گاہک کے کپڑے کرائے پر لئے' یہ سوٹ ایک بہت چھوٹی ٹانگوں والے بہت موٹے آدمی کا تھا۔ نتیجہ یہ کہ کوٹ بالکل ڈھیلا تھا اور پتلون میرے ٹخنوں سے چار ایک انگل اونچی تھی۔ وہاں سے میں شیخ شیر علی کو دم بخود کرنے کے لئے اس کی دوکان پر پہنچا۔ اس نے مجھ پر ایک نظر کچھ یوں ڈالی جیسے مجھے پہچانا تک نہیں اور ایک گاہک کو آنکھ مار کر اسے اپنے مذاق میں شامل کرتے ہوئے بولا۔ "کیوں صاحب بہادر دودھ ہتنیں گے؟" فوراً بعد مجھے معلوم ہوا کہ شیر علی مجھے بنا رہا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور بعد میں مجھے بتایا تھا کہ میں اس لباس میں پروفیسر لگتا ہوں۔ لوہے کے گولے اور کیلیں اگلنے والا پروفیسر۔

شام کو شیخ شیر علی اور میں مستری مہتاب دین کے بالاخانے پر پہنچے۔ مستری کی بیٹھک ایک سستے شریفانہ انداز میں سجائی گئی تھی۔ دو تین پرانے صوفے تھے اور دیواروں پر "بعد مدت کے لائے ہو تشریف" کے اکٹھے تین طغرے تھے اور ترک رہنماؤں کی رنگین تصویریں تھیں۔ ایک کونے میں گراموفون رکھا تھا جس پر قالو قوال کا ایک ریکارڈ بج رہا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک چغد قسم کا نوجوان بیٹھا سر دھن رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا اور بولا "السلام علیکم پروفیسر صاحب" اس کے بعد بھی وہ مجھے پروفیسر کہنے پر مصر رہا۔ بلکہ کھانے کے بعد تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں سب حاضرین کو تاش کے کھیلوں سے محظوظ کروں۔ میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ مذاق کی ایک حد ہونی چاہئے اور حد سے باہر جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذاق کرنے والے کی تربیت میں غفلت برتی گئی ہے۔ اس کے باوجود دعوت بہت کامیاب رہی۔ مستری مہتاب دین ہمیں فقیروں کی کرامات سناتا رہا۔ اس نے بتایا کہ کسی فقیر نے جھاڑی کے سائے میں آرام کیا اور جب وہاں سے اٹھا تو جھاڑی کو دعا دے گیا۔ ایک بار مستری مہتاب دین اپنے سات دوستوں کے ہمراہ اس جھاڑی کے پاس سے گزرا جھاڑی کے پتوں کا اثر ایسا تھا کہ دیکھتے ہی اشتہا پیدا ہو جاتی تھی۔ دوستوں میں سے ایک آدمی نے اس جھاڑی کے چند پتے کھا لئے اور یکایک اس کی بھوک اتنی بڑھ گئی کہ پہلے تو آٹھ آدمیوں کا بندھا ہوا کھانا چٹ کر لیا اور پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا "بھاگ جاؤ' ورنہ میں تم کو بھی کھا جاؤں گا۔" سب دوست اسے مذاق سمجھ کر زور زور سے ہنسنے لگے اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے سب ساتھیوں کو کھا گیا۔ سوائے مستری مہتاب دین کے جس کی طرف رخ کرنے کے بعد اسے ایک ڈکار آئی اور اس کی بھوک مٹ گئی۔ ان باتوں نے کمرے میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں اگر کوئی غیر ممکن الوقوع کہانی بھی سنائی جاتی تو اس پر فوراً یقین کر لیا جاتا۔ اس فضا نے میری حوصلہ افزائی کی اور میں نے حکیم حاجی علم علی کے مشہور سرمے کا ذکر چھیڑ دیا اور اس مادر زاد اندھے کا ذکر کیا جس نے یہ سرمہ استعمال کرنے کے بعد عید کا چاند دن کے دو بجے ہی دیکھ لیا تھا۔ میں نے یہ باتیں اونچے لہجے میں اور بڑے والہانہ پن سے سنائیں کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے پرلی طرف مستری کی بیوی اور اس کی بیٹی سب کچھ سن رہی ہیں۔

اس کھانے کے بعد دوسرے ہی دن مستری مہتاب دین نے ورکشاپ میں اپنے لڑکوں کی پڑھائی کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا اور اسی شام سے میں ٹیوٹر کی حیثیت سے ان لڑکوں کو مستری کی بیٹھک میں پڑھانے کے لئے جانے لگا۔ (میں مڈل پاس ہوں) میں وہاں زیادہ دیر تک تو نہ ٹھہرتا مگر جتنی دیر ٹھہرتا' زنانے کے دروازے کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتا' کیونکہ میرا خیال تھا کہ رضیہ یا اس کی ماں کا مجھے زیادہ واضح طور سے دیکھنا

میرے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہو گا (میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ میں صورت شکل کا کچھ ایسا ہی ہوں) تیسرے دن سے میں نے دیکھا کہ ورکشاپ سے چھٹی کے بعد مستری مہتاب دین خود ہی واپسی کے لئے میرا ساتھ ڈھونڈنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لئے ایک نئی روشنی سی دیکھی جو ایک آدمی کی آنکھوں میں اس شخص کو دیکھ کر آ جاتی ہے جس کو وہ دامادی کا شرف بخشنے کا آرزو مند ہو۔ مستری رحیم بخش سے اب وہ بظاہر بہت کچھ کھنچ گیا تھا اور ان کے تعلقات کے درمیان یقیناً" موٹے موٹے پردے حائل ہو رہے تھے۔ رحیم بخش اب بھی کبھی کبھی مہتاب دین سے گپیں ہانکنے کے لئے مل رائٹ شاپ میں آتا مگر دس بارہ منٹ بھی نہ ٹھہرتا اور اب جو باتیں وہ دونوں کرتے ان میں وہ پرانا بہاؤ بے تکلفی اور دوستی کی گرمی یکسر مفقود ہوتی۔ میرے لئے یہ معمہ سمجھ سے بالاتر تھا کہ کس طرح دو پرانے دوست بغیر کسی نمایاں وجہ کے ایک دوسرے سے کھنچے جا رہے تھے۔ لیکن میں دل ہی دل میں حالات کی اس روش پر خوش تھا۔ ایک تو یہ سرخ داڑھی والا آدمی مجھے مطلق نہیں بھاتا تھا۔ دوسرے مستری سے اس کی بے رخی اور کھنچاؤ میرے حق میں مفید ثابت ہو رہا تھا۔ میں رفتہ رفتہ مستری مہتاب دین کی دوستی اور اعتماد حاصل کر رہا تھا اور ایک لحاظ سے اس سرخ داڑھی والے آدمی کی جگہ پر قابض ہو رہا تھا۔

میں نے حالات کی اس غیر متوقع اور مبارک تبدیلی کا شیخ شیر علی سے ذکر کیا۔ اس نے مجھے کڑھائی کے اوپر سے رحم اور ترس کی نظروں سے دیکھا۔ وہ مجھے اس بے وقوف بکرے کی مانند سمجھ رہا تھا جو خود ہی قربان ہونے کے لئے بھاگا جا رہا ہو۔

اس نے کہا۔ "اب تمہارے لئے مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی۔ تم صاف تباہی کے گڑھے کی طرف جا رہے ہو۔"

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"بوڑھے مہتاب دین کے دل نے اب تم کو اپنا داماد قبول کر لیا ہے۔ صرف تمہارے ارادہ جتانے کی دیر ہے اور بوڑھا اچھل پڑے گا۔ میں تمہیں بتاؤں وہ اب صرف تمہاری منشا معلوم کرنے کے انتظار میں ہے۔ اب تباہی سے تمہارا بچنا مجھے محال دکھائی دیتا ہے۔"

"گدھے! اس کی انگلیاں سفید۔ لمبی اور مخروطی ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔" شیخ شیر علی بولا۔ "کئی عورتوں کی انگلیاں سفید' لمبی اور مخروطی ہوتی ہیں۔ خود میری انگلیاں لمبی اور مخروطی ہیں اس نے اپنی ہتھیلی کو داد بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کلبی ہے میرا دوست شیر علی 'صنف نازک سے نفرت کرنے والا۔ تاہم وہ ایک دوست کی خاطر سر کٹانے کو بھی تیار رہتا ہے۔ میں نے بمشکل اس کو اس بات پر رضا مند کر ہی لیا کہ وہ اس کام کو انجام تک پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لے اور مناسب طریق پر مستری مہتاب سے مجھے فرزندگی میں قبول کرنے کی درخواست کرے۔

"مگر ایک بات میں تم کو پہلے سے بتا دوں۔" شیخ شیر علی بولا۔ "جب تمہاری بیوی آ جائے گی تو تمہیں اپنے لئے ایک الگ مکان ڈھونڈنا پڑے گا۔ میں اپنے گھر میں کسی بے وقوف اور ہر بات میں دخل دینے والی باتونی عورت کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا' یہ میرے اعصاب کے لئے نقصان دہ ہے۔"

"نہیں۔ نیا مکان ڈھونڈنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ابھی چند دنوں میں تم کو فصلی بٹیوں سے مکالہ نویس کے عہدہ کی پیش کش آ جائے گی اور تم کو یہ مکان ہمیں سونپ کر مستقل طور پر بمبئی چلے جانا ہو گا۔ پھر بھی جب تم کبھی لاہور آؤ تو یہ یاد رکھنا کہ ہمارے مکان کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ کھلے ہیں۔ ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھنا۔ مردانے کی بیٹھک میں ایک بستر ہمیشہ تمہارے لئے بچھا رہے گا اور میں اور رضیہ تمہارے لئے چائے کی ایک پیالی اور ایک رکابی زیادہ خریدیں گے اور ہم انہیں کسی اور کو ہاتھ نہیں لگانے دیں گے۔ یہ تمہارے چچا شیخ شیر علی کے لئے ہیں۔ ہم اپنے نخوں سے کہیں گے۔"

اب یہ بتانا باعث طوالت ہو گا کہ کس طرح اسی شام شیر علی مستری مہتاب دین سے اکیلا ملنے کے لئے اس کے بالاخانے میں گیا اور کس طرح انہوں نے خوش اسلوبی سے اس معاملے کو طے کیا اور کس طرح جب شیخ نے مستری سے رخصت چاہی تو مستری کی عینک خوشی سے چمک

رہی تھی۔ معاملے کے طے پانے میں بالکل کوئی دیر نہ لگی کیونکہ جتنا میں داماد بننے کے لئے بے صبر تھا اسی قدر مستری خسر بننے کے لئے بے تاب تھا۔ دوسری صبح جب ورکشاپ کی ٹرین کی طرف جاتے ہوئے مستری مہتاب دین مجھے گلی میں ملا تو میں کچھ جھینپ سا گیا ---- سکول کے لڑکے کی طرح جو اپنی کسی شرارت پر شرمندہ ہو۔ مستری مہتاب دین بے حد خوش معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عینک ٹمٹمائی تھی۔ اسے یقیناً" مجھ میں وہ تمام خوبیاں اور اچھی عادات و صفات نظر آ رہی تھیں جن کی ایک مکمل اور مثالی داماد سے خواہش کی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود گاڑی میں ورکشاپ پہنچنے تک مہتاب دین کے چہرہ پر کبھی کبھی ایک تاریک سایہ سا آ جاتا جس طرح کوئی ضدی تکلیف دہ بھوت اس کی خوشیوں کے آنگن میں گھس آنے پر مصر ہو۔ کیا اس بھوت کا مجھ سے کوئی تعلق ہے؟ شاید مستری میرے چال چلن سے پوری طرح مطمئن نہیں؟ مگر اسی دن مجھ کو معلوم ہو گیا کہ اس تاریک سائے کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ---- اسی لمحے جب مستری رحیم بخش مل رائٹ شاپ میں مستری مہتاب دین کو ملنے کے لئے آیا۔

ہم کسی پہیے پر بولٹوں کا نشان لگا رہے تھے ---- خسر اور داماد دونوں خوشی اور اطمینان کی ایک ابدی جنت میں بیٹھے ہوئے تھے جس وقت وہ سرخ داڑھی والا آدمی ایک انسانی بائمر کی طرح دندناتا ہوا شاپ کے اندر آیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک کینہ ور اور خطرناک سی نظر رکی ہوئی تھی جس طرح ایک حملہ آور مرکھنے بیل میں ہوتی ہے اور اس کو دیکھ کر مستری مہتاب دین کا چہرہ خوف سے سیاہ پڑ گیا۔ ان دونوں کو دیکھ کر مجھ پر فوراً" اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا کہ پچھلے چند دن انہیں نہ صرف ایک دوسرے سے دور 'بے اعتنائی اور بے تعلقی کے صحرا میں لے گئے تھے بلکہ انہیں ایک دوسرے کے خوفناک جانی دشمنوں میں تبدیل کر دیا تھا۔

"مبارک ہو بھئی" اس نے بڑے طنز سے ہنستے اور مجھے کندھے سے پکڑتے ہوئے کہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں مطلق کوئی ہنسی نہ تھی۔ صرف ایک خوفناک دمک تھی۔

مستری مہتاب دین سے اس نے صرف ایک پر معنی لہجے میں یہی کہا "کہو تم آج شام کو گھر ہی پر ہو گے؟ مجھے تم سے ایک دو باتیں کرنی ہیں۔"

اور اس کے بعد وہ چلا گیا۔ میرے اعصاب بالکل تندرست ہیں۔ مگر میں اقرار کرتا ہوں کہ اس کے جانے کے آدھ گھنٹے بعد تک میں بالکل اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میں نے اور مستری مہتاب دین نے پہیے کے اوپر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہ سیاہ سایہ زیادہ گھنا ہو گیا تھا۔ مبارک؟ ایسی خوفناک مبارک کبھی کسی نے کسی کو نہ دی ہو گی ---- مبارک' جو ایک دھمکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کو میری منگنی کے بارے میں بتایا کس نے تھا؟ شاید مہتاب دین' اور میری نئی نئی دوستی سے اس نے یہ نتیجہ خود ہی اخذ کر لیا تھا اور پھر ایسی باتیں چھپی کب رہتی ہیں!

اس کے باوجود اگر شام کو میری ملاقات اس نوجوان سے نہ ہو جاتی جس سے مجھے مستری کے کہانے پر بار بار "پروفیسر" کہنے پر نفرت ہو گئی تھی تو میں اس واقعہ کا زیادہ خیال نہ کرتا۔ اس نوجوان کا نام میں نہیں بتاؤں گا اور کہانی کے مقصد کے لئے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ مال پر ایک فوٹوگراف کمپنی میں ملازم ہے اور مستری مہتاب دین کی بیوی رشتے سے اس کی پھوپھی لگتی ہے۔ میں اور شیخ شیر علی اپنے ادبی دیوتاؤں کی تلاش میں رات کو کھانا کھانے ایک ہوٹل میں گئے اور جب ہم کھانے کا آرڈر دینے کے بعد کھانا آنے سے مایوس ہو کر چند سیاہ اچکنوں اور گنجے سروں والے آدمیوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہے تھے' یکایک ایک گرجتی ہوئی "ہیلو پروفیسر" نے ہمیں چونکا دیا اور پیشتر اس کے کہ ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ پروفیسر کہنے والا کون ہے' وہی نوجوان ہمارے سامنے کرسی پر آ بیٹھا۔

اس وقت مجھے اس کے "ہیلو۔ پروفیسر" میں طنز آمیز تمسخر کی ذرا سی آنچ بھی معلوم نہ ہوئی اور نہ ہی مجھے اس کا "پروفیسر" کہنا زیادہ برا لگا۔ کیونکہ سیاہ اچکنوں اور گنجے سروں والے آدمی بھی اچانک مجھے دلچسپی اور رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگے ---- انہوں نے غالباً" یہ سمجھا کہ میں اصلی پروفیسر ہوں۔

" بڑی بھوک لگی ہے۔ " اس نے کہا " کھانے کا آرڈر دیا ہے یا کھا چکے ہو؟ اچھا۔ بہت اچھا۔۔۔۔۔۔ ہاں بھئی مبارک ہو۔۔ پھوپھی نے آج صبح مجھے بتایا۔ وہ پہلے بھی تمہی کو چاہتی تھیں۔ صرف بوڑھا مہتاب دین ششں و پنج میں تھا۔ وہ بھی تمہارے خلاف نہیں تھا مگر اس کے دل پر کچھ اور سوار تھا۔ تمہیں بتاؤں؟ اس کے دل پر کچھ عرصے سے وہ مستری رحیم بخش سوار تھا۔

خیر تم خوش قسمت ہو پروفیسر میرا مطلب ہے۔ اپنی شکل و صورت کے مقابلے میں تمہاری قسمت بہت اچھی ہے۔ رضیہ ہزاروں میں ایک لڑکی ہے۔ مجھے مٹھائی کھلاؤ۔ میں نے اور پھوپھی نے زور دار طریق پر بوڑھے مہتاب دین کے سامنے تمہارے حق میں وکالت کی " ہمیں پروفیسر چاہیے۔ پروفیسر جیسا اور کوئی نہیں۔ ہم نے مہتاب دین سے اصرار کیا اور آخر اسے منوا کے چھوڑا۔ میری پیٹھ ٹھونکو۔ تمہاری کامیابی کا سرا میرے سر ہے۔ "

بعد کی باتوں نے جو اس نوجوان نے مرغ پلاؤ اور شاہی ٹکڑوں کو " نگلتے " ہوئے کیں (کھانے کا لفظ اس کے لئے استعمال ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مہینوں کا بھوکا معلوم ہوتا تھا) ہم پر واضح کر دیا کہ وہ اپنی پھوپھی کے گھر کے اندرونی حالات سے کماحقہ 'واقفیت رکھتا ہے اور یہ کہ اس کی پھوپھی گھر کی کوئی بات اس سے چھپا کر نہیں رکھتی بلکہ وہ اس کا ہمراز اور مشیر تھا' بظاہر اسے اپنی پھوپھی کے خانگی معاملات پر سربازار ایک مکمل اجنبی سے بحث کرنے میں بھی کوئی عذر نہیں تھا۔

" رضیہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔۔۔۔۔۔۔ نہایت خوبصورت لڑکی۔۔۔ " اس نے اونچی آواز میں ہمیں اور سارے ہوٹل کو سناتے ہوئے کہا۔ " میں سمجھتا ہوں تم واقعی قابل رشک ہو۔ وہ ایسی بیوی ہے جس پر ایک پروفیسر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ "

اس نے ہمیں اس سرخ داڑھی والے آدمی مستری رحیم بخش کے بارے میں چند ایسی باتیں سنائیں جس سے میرا خون کھولنے لگ گیا اور اس سے میری نفرت دو چند ہو گئی۔۔۔ گھناؤنی شرمناک باتیں اور بالکل غیر متوقع۔ مستری رحیم بخش ایک یہودی تھا۔۔۔ میرا مطلب ہے اس کی عادات یہودیوں کی سی تھیں اور وہ اپنے ہمسایوں کو سود پر روپیہ دینے کا عادی تھا۔ کوئی عادت انسان کے بدترین اور اسفل ترین جذبات کو اس حد تک سطح پر نہیں لاتی جتنی یہ سودخوری کی عادت۔ مستری مہتاب دین بھی اس سرخ داڑھی والے آدمی کے قرضے کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔۔۔ قرضہ جو پہلے پہل مستری نے دوستانہ انداز میں تھوڑا تھوڑا کر کے لینا شروع کیا تھا اور جو اب دو ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ رحیم بخش کی پہلی بیوی دو تین سال ہوئے مر چکی تھی اور اس کی لومڑی کی سی آنکھیں ایک عرصہ سے رضیہ پر تھیں۔ جب تم ایک آدمی کے مقروض ہوتے ہو تو کسی وجہ سے اس کے روبرو تم میں ایک احساس کمتری سا پیدا ہو جاتا ہے' تم اس کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتے۔ کمزور سادہ لوح آدمی اپنے قرض خواہ کے ہاتھوں میں آسانی سے کٹ پتلی بن جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی کیفیت مستری مہتاب دین کی ہوئی۔ رحیم بخش نے مستری مہتاب دین کو ایک پاکباز اور صاف دل' سیدھا آدمی سمجھ کر اس پر ڈورے ڈالنے شروع کئے اور چالاکی کی باتیں کر کے اس سے یہ زبانی اقرار لینے میں بھی کامیاب ہو گیا کہ وہ رضیہ کا رشتہ مستری رحیم بخش کو دے گا۔ اس کے عوض مستری رحیم بخش یہ لکھ دینے کو تیار تھا کہ وہ مہتاب دین سے قرضے کی ایک ایک پائی وصول کر چکا ہے۔

دوسرے دن مستری مہتاب دین زیادہ خوش تھا۔ رات کو مستری رحیم بخش نہیں آیا۔ میں نے لڑکوں سے فارغ ہو کر مستری سے باتیں شروع کیں اور رات کو جو کچھ سنا تھا اس کا ذکر چھیڑا۔۔۔۔ مگر احتیاط کے ساتھ تاکہ اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ میری کیا غرض ہے۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھائی کہ دو ہزار کوئی بڑی رقم نہیں اور انشاء اللہ ہم دونوں مل کر مستری رحیم بخش کے قرضے کی ایک ایک پائی چکا دیں گے۔ مستری کے دل پر اس بات کا بے حد اثر ہوا کہ میں ابھی سے اپنے آپ کو اس کے گھر کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا۔ مستری کو اب میری موجودگی سے اطمینان محسوس ہوتا تھا۔

شیخ شیر علی نے مستری سے دوبارہ مل کر میری شادی کی تاریخ بھی طے کر لی۔ ستمبر کے پہلے ہفتے میں۔۔۔۔۔۔۔ دن اسی طرح کسی واقعے کے بغیر گزرنے لگے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ دن میرے لئے سخت انتظار اور بے پایاں خوشی کے دن تھے۔ ایک شام میں نے دروازے

کے پیچھے سے رضیہ کی جھلک بھی دیکھ لی تھی۔ خوبصورتی اور معصومیت کا وہ لشکارہ اب بھی میرے دل کو منور کر دیتا ہے ------ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میری نیندیں اس کے خوابوں سے چھلکنے لگی تھیں۔ رضیہ کی ماں اب مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی بلکہ میرے سامنے بے دھڑک آتی جاتی اور کھلم کھلا باتیں کرتی' وہ کافی باتونی عورت تھی (کون عورت باتونی نہیں ہے!) اور اس میں ایک دلچسپ قوت بیانیہ تھی جس سے وہ معمولی واقعات اور عام لوگوں پر ایسا رنگ چڑھاتی تھی کہ وہ آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے تھے۔ اس کی باتیں سننے کے بعد اس کا باپ ایک عام سرے کا بازاری موچد معلوم نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک پہنچا ہوا ولی' جس کا سرمہ اس کا ایک ادنیٰ ترین کرشمہ ہو۔ وہ دیندار بھی تھی اور صفائی پسند بھی اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتا کہ رضیہ نے بھی یہ ساری صفات اپنی ماں سے ورثے میں پائی ہوں گی۔ وہ بھی اتنی ہی دلچسپ باتیں کرتی ہو گی' وہ بھی دیندار اور صفائی پسند ہو گی۔ میں جلد ہی رضیہ کی ماں کا لاڈلا اور چہیتا بن گیا کیونکہ مجھے بڑی بوڑھیوں کو خوش کرنے کا ایک قدرتی ملکہ حاصل ہے------ وہ پھٹی ہوئی بوسیدہ بوریوں والا بالاخانہ اب میرے لئے چمکتی ہوئی چلمنوں والا شاندار محل تھا جس کے گرد میرے خواب منڈلاتے تھے اور وہ بدنصیب لالٹین بھی------ (مگر میں اپنا وعدہ بھول رہا ہوں اور پھر اس کا ذکر کر بیٹھا ہوں!) وہ لالٹین جو پس دیوار میں ذرا سی اٹکی ہوئی تھی' میرے تصور میں کئی دفعہ جلنے لگ جاتی۔

اور اب میں ستمبر کی پہلی کے خوفناک دن پر آتا ہوں ------ وہ دن جب تقدیر کی ضرب پڑی' بجلی کی طرح ناگہانی اور لرزہ خیز تقدیر کی ضرب۔ انسانوں پر ہمیشہ اچانک آ پڑتی ہے اور میرے خیال میں یہ مشیت کے لئے اچھی بات نہیں کہ --- (مگر نعوذ باللہ میں مشیت سے جھگڑنے والا کون) حسب معمول میں اور مستری مہتاب دین اکٹھے علی الصبح ورکشاپ جانے والی ٹرین میں سوار ہوئے۔ مجھے یاد ہے جب گاڑی چلی تو کسی نے زور زور سے نعت گانی شروع کر دی۔ فوراً ہی سارا ڈبہ گانے والے کا ساتھ دینے لگا اور میں اور مستری مہتاب دین بھی آہستہ آہستہ نعت کے الفاظ گانے والے کے پیچھے دہرانے لگے۔ میں نے دیکھا کہ وہ محبت اور مذہبی عقیدت کا جذبہ جو سادہ اور نیک طبیعتوں میں اس قدر قوی ہوتا ہے' مستری مہتاب دین پر طاری ہونے لگا------ اس حد تک کہ اس کا بدن تھرکنے لگا اور اس کی عینک بھیگ گئی اور اس کے شیشے دھندلا گئے۔ وہ عقیدت و وارفتگی سے کانپتی ہوئی آواز میں گائے جا رہا تھا۔ اس وقت اسے یوں عقیدت سے گاتا دیکھتے ہوئے مجھے یہ گمان تک نہ تھا کہ آج یہ سسکتی ہوئی گاڑی اسے آخری بار ورکشاپ کی طرف لے جا رہی تھی---- جہاں اس کے ماضی کا زیادہ تر حصہ پڑا ہوا تھا' جہاں اس نے اپنی بڑی لڑائیاں فتح کی تھیں' جہاں مشینیں اس کے اشارہ کی منتظر کھڑی رہتی تھیں۔

ورکشاپ میں مستری مہتاب دین بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ میں نے شاید یہ ذکر نہیں کیا کہ اس سے ایک دن پہلے اس کو ہیڈ مستری بنا دیا گیا تھا اور یہ امر قدرتی طور پر اس کی خوشی اور اطمینان کا موجب تھا۔ اس دن بھی میں نے اس کو ہنستے ہوئے تو نہیں دیکھا البتہ اس کی مسکراہٹیں پہلے سے زیادہ فراخ تھیں۔ ہم ایک گھنٹہ اکٹھے مل رائٹ شاپ میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد چارج مین نے مجھے ورک مینوں کی ایک پارٹی کے ہمراہ بینٹ فیکٹری میں واٹر پائپ لگانے کے لئے بھیج دیا۔ جب میں واپس آیا تو مستری مہتاب دین اپنے اوزار وغیرہ اٹھائے کچھ جھکا ہوا سا' مل رائٹ شاپ سے باہر لوکو شاپ کی طرف آ رہا تھا۔ جہاں لوہے اور بھاپ کے ان محیر العقول دیووں کی (جن کو تم آہنی پٹڑیوں پر بھاگتے ہوئے دیکھتے ہو) مرمت اور فٹنگ ہوتی ہے۔ اسے AIR ـ COMP پر کچھ کام کرنا تھا جو مل رائٹ شاپ میں دستیاب نہ تھی' میں بھی مستری مہتاب دین کے ساتھ ہو لیا کیونکہ لوکو شاپ دیکھنے کا جو موقعہ بھی آئے میں ہمیشہ اس کا خیر مقدم کرتا ہوں------ ہم ان ایک سو ٹن کے X.B پائپ کے دیووں کے پاس سے گزرے جو لوکو شاپ کے باہر بے کار اور ابدی انتظار میں کھڑے ہوئے تھے' کیونکہ وہ ایک ریلوے انکوائری بورڈ کی تحقیق کے مطابق بھاگتے بھاگتے لوہے کی پٹڑیوں سے نیچے اتر جانے کا رجحان رکھتے ہیں اب انہیں شریر لڑکوں کی طرح ایک طرف بے کار کھڑا کر دیا گیا ہے جہاں وہ کوئی شرارت نہیں کر سکتے تھے' شاید کبھی اب ریل گاڑی نہیں کھینچیں گے۔ ان کے غرور اور طاقت کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ مستری مہتاب دین نے فخریہ ان میں سے ایک انجن کی طرف اشارہ کیا جس کے پہیوں کی فٹنگ ۱۹۲۹ء میں اس نے کی تھی۔ انجنوں کے پاس سے ہوتے ہوئے ہم لوکو شاپ میں داخل ہوئے۔ مشینوں اور کلوں کی مسلسل گڑگڑ' غیر زمینی بدروحوں کی طرح چیختی ہوئی AIR ـ COMP کی سوراخ کرنے

والی سوئیاں گڑگڑاتی ہوئی ٹرالیاں' کلہاڑے اور ہتھوڑے کا شور' شعلوں کی لمبی لکیریں اندھیرے میں زبانوں کی طرح لپکتی اور غائب ہوتی ہوئیں۔ درمیان میں کہیں کہیں انجنوں کے مہیب اور سیاہ ڈھانچے کھڑے ہیں۔۔۔۔ خاموش اور بے حس' جن کی تیمارداری کے لئے لاتعداد مشینیں سارا دن گڑگڑاتی رہتی ہیں اور ہزاروں آدمی اپنا پسینہ بہاتے اور اپنے کپڑے سیاہ کرتے ہیں۔ کہیں کہیں دیوہیکل کرینوں کے آہنی پنجے نگاہ کو روکتے ہیں۔۔۔۔ آہنی پنجے جو گزرنے والوں اور کام کرنے والوں کے سروں کے اوپر دھمکی کے انداز میں جھولتے رہتے ہیں' آہنی پنجے جو بڑھائے جا سکتے ہیں اور سمیٹے جا سکتے ہیں جو دو دو من بھاری پہیے کو اس طرح آسانی سے اوپر اٹھا لیے ہیں جیسے ہم روئی کا پھاہا اٹھاتے ہیں۔ میں مسحور سا ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک آہنی پنجے کو ایک بائلر کو دبوچے اور اس کو دور ایک انجن کی طرف لے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ آہنی پنجے کی حرکات کو کرین کے اوپر ٹرالی میں بیٹھا ہوا سرخ داڑھی والا ایک آدمی کنٹرول کر رہا تھا۔۔۔۔ ٹرالی اپنی پٹڑیوں پر دوڑ رہی تھی اور اس بائلر کو اپنی منزل پر لئے جا رہی تھی۔

مستری مہتاب دین کچھ عرصے کے لئے ایک کیبن میں ایک اسسٹنٹ چارج مین سے باتیں کرنے کے لئے رکا۔ اسسٹنٹ چارج مین نے ایک خالی AIR ۔ COMP کی ٹیوب کی طرف اشارہ کیا جس پر اس وقت کوئی کام نہیں کر رہا تھا اور جسے مستری مہتاب دین اپنے استعمال میں لا سکتا تھا۔ میں پہلے AIR۔COMP سے سوراخ ہوتے نہیں دیکھا تھا اور مجھے اسے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ہم دونوں اس ٹیوب کے پاس جا بیٹھے اور مستری مہتاب دین پنسل سے اپنے نشانات کو زیادہ واضح کرنے لگا۔ ہمارے پاس ہی بائیں طرف ایک انجن کا آدھا اگلا ڈھانچا کھڑا تھا' چار پانچ آدمی کوئلے سے سیاہ اوور آلوں میں کھڑے ہوئے امید اور انتظار کے عالم میں اوپر چھت کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے بنی اسرائیل میں سے ہیں اور آسمان سے کسی نعمت کے اترنے کے امیدوار ہیں۔ ان میں سے ایک بے چین لہجے میں چلا رہا تھا۔ "ذرا آگے۔۔۔۔۔۔ اور دائیں۔۔۔۔ شاباش۔"

مستری مہتاب دین یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔ AIR ۔ COMP کی ٹیوب ذرا دور اور کچھ اونچی تھی اور وہ بیٹھے بیٹھے اس تک ہاتھ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میں نے انجن کے گرد کھڑے ہوئے آدمیوں کی نگاہوں کے مرکز کی طرف دیکھا۔ یہ مرکز اوپر کرین کی ٹرالی تھی جو اپنے آہنی جھولتے ہوئے ہاتھ میں ایک گول سلنڈر نما بائلر کو اٹھائے اس کو انجن کی طرف لا رہی تھی۔ پھر یکایک میں نے دیکھا کہ مستری مہتاب دین ٹھیک اس انجن اور اس آتے ہوئے آہنی پنجے کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ میں اس کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لئے چلایا۔ اسی وقت انجن کے گرد کھڑے ہوئے دوسرے آدمی بھی چلائے۔ میرے چلانے پر اس نے جلدی سے منہ میری طرف پھیرا اور عین اسی وقت بائلر ٹھیک اس کے منہ کے اوپر آ کر لگا۔۔۔۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں ایک لٹو پر کھڑا ہوں۔ ساری ورکشاپ میری آنکھوں کے سامنے گھوم سی گئی۔ پھر میں نے ایک پل کے لئے بائلر کی چمکتی ہوئی پیتل کور کو دیکھا جو مستری مہتاب دین کو ٹھوڑی سے جکڑے فرش پر گھسیٹ رہی تھی۔۔۔۔ جب کہیں وہ آہنی پنجا اور وہ بائلر اپنے دیوانے سفر کو روک سکے۔ مستری مہتاب دین کا جسم ایک گٹھڑی کی طرح نیچے فرش پر گرا۔ یہ سانحہ اتنا ہولناک اور اچانک تھا کہ اب بھی مجھے یہ ایک مبہم سا بدخواب معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔ میرے گرد ایک ہزار آدمیوں کا شور تھا۔ ہم سب مستری کے جسم کی طرف بھاگے۔ میرے آنکھوں کے سامنے اب بھی چرے ہوئے جبڑے کا عکس سا ہے۔ اوور آل میں ملبوس ایک ایک آدمی نے خون میں لتھڑے ہوئے جسم پر سیدھا ہوتے ہوئے کہا "۔۔۔۔ مر گیا۔۔۔۔"

بہت سے آدمی اوپر ٹرالی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھی اوپر دیکھا۔ کرین کی ٹرالی میں بیٹھا ہوا آدمی اوپر سے جھکا ہوا نیچے اپنے کئے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی داڑھی مہندی سے رنگی ہوئی سرخ تھی اور مجھے اس کے موٹے ہونٹوں میں ایک خوفناک سی ہنسی چنگاریاں چھوڑتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ مستری رحیم بخش تھا۔

بعد میں سب نے کہا کہ یہ ایک حادثہ تھا۔۔۔ ایک بہت افسوسناک حادثہ۔ مگر اس حادثے کے متعلق میرے اپنے خیالات تھے اور میں نے ان خیالات کو اپنے تک ہی رکھا۔ شاپ میں سب سے زیادہ مغموم خود مستری رحیم بخش معلوم ہوتا تھا۔ جس کی سرخ داڑھی آنسوؤں سے

پھیلی ہوئی تھی اور جو ہر ایک سے کہتا پھرتا تھا کہ وہ اپنے ایک ہی اور بہترین دوست کا قاتل ہے۔ دوسرے ورک مین اس کی ڈھارس بندھاتے، اس سے ہمدردی جتاتے اور اسے اطمینان دلاتے کہ اس میں اس کا مطلق قصور نہیں تھا اور مستری مہتاب دین کو موت قدرت کی طرف سے آئی تھی۔

(بعد میں انکوائری پر کمیٹی نے مستری رحیم بخش کو صاف بری کر دیا ـــــ اسے آئندہ صرف محتاط رہنے کی "سزا" دی گئی۔ شاید یہ حادثہ ہی تھا)

ان دنوں کا روزنامچہ لکھنا، لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کے لئے تکلیف کا باعث ہو گا۔ یہ وہی پرانی رونے دھونے اور رنج و الم کی کہانی ہے جو گھر کے روٹی کمانے والے کی موت کے بعد ہمارے ہزاروں گھروں میں دہرائی جاتی ہے۔ بیوہ اور رضیہ کا غم بیان کرنے کی بجائے تصور کیا جا سکتا ہے۔ میں اس بارے میں صرف اسی قدر لکھوں گا کہ میں مرحوم کی تجہیز و تکفین سے لے کر بعد کی دلدوز گھڑیوں تک اس غمزدہ کنبے کے لئے ڈھارس اور امید کا باعث بنا۔ بیوہ مجھ پر بیٹے کا دعویٰ رکھنے لگی اور میں بھی اسے اپنی ماں سمجھنے لگا۔

ان آدمیوں میں سے جو مرحوم کی ماتم پرسی اور چہلم پر آئے، مرحوم کے کچھ گوجرانوالہ کے رشتہ دار بھی تھے ـــــ معمولی چھوٹے سے آدمی جنہوں نے رسم کے طریقے پر بیوہ اور بچوں کو گوجرانوالہ چلنے اور ان کے پاس رہنے کا مشورہ دیا۔ بیوہ نے جو ایک خوددار عورت تھی اور رشتہ داروں کے ٹکڑوں پر پلنا غلط سمجھتی تھی، انکار کر دیا۔ پھر اس کو میرا بڑا سہارا تھا۔ ان رشتہ داروں کے علاوہ ورکشاپ کے کئی ورک مین ماتم پرسی اور ہمدردی کے لئے آئے کیونکہ اپنی دینداری اور خوش خلقی کی وجہ سے مرحوم مستری ورک مینوں میں کافی ہر دلعزیز تھا۔ ان لوگوں میں مستری رحیم بخش بھی شامل تھا اور اس کا غم دوسروں کے غم سے زیادہ گہرا اور حقیقی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے پاس عورتوں کی طرح آنسوؤں کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا، جسے وہ بات بات پر بہانے کو تیار تھا۔ (مگر مجھے کسی نیت پر شک کرنے کا حق نہیں پہنچتا) بیوہ بھی اپنے غم کے شدید ترین لمحوں میں چیخ چیخ کر مستری رحیم بخش کو اپنے خاوند کا قاتل بتا رہی تھی اور اس کو غائبانہ ہزاروں بددعائیں ارسال کرتی تھی، اپنے پرسکون لمحات میں اس بات کو ماننے لگی تھی کہ اس کا خاوند ایک حادثے میں مرا ہے۔ مجھے بھی کچھ کچھ یقین ہو گیا کہ مرحوم کی موت ایک حادثہ تھا اگرچہ اس یقین نے اس نفرت کو جو میرے دل میں اس سرخ داڑھی والے آدمی کے خلاف گھر کر چکی تھی، کسی طرح بھی کم نہ کیا۔

مستری مہتاب دین کی موت کے ڈیڑھ مہینے بعد میں شیخ شیر علی کی دوکان پر بیٹھا اپنی شادی کے سلسلے میں کچھ مشورہ کر رہا تھا کہ مستری کا چھوٹا لڑکا فضل پیغام لایا کہ اماں بلاتی ہیں۔ چھوٹا لڑکا کچھ ڈرا اور سہا ہوا سا تھا۔ میں نے اس سے کچھ پوچھے بغیر بالاخانے کا رخ کیا۔ اوپر پہنچا تو مجھے اندر کمرے میں سے وہ گھٹتی ہوئی شوریدہ آواز سنائی دی جو میری اس قدر جانی پہچانی تھی اور جس سے میں نفرت کرتا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ بیوہ کچھ ڈری اور سکڑی ہوئی نیچے دری پر بیٹھی تھی، مستری رحیم بخش لنڈے بازار کے ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ خود اعتمادی سی تھی اور ہونٹوں میں دبی ہوئی غولانہ مسکراہٹ جو میں نے اس وقت اس کے چہرے پر دیکھی تھی جب وہ ٹرالی میں سے جھکا ہوا نیچے مستری کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی میرے کانوں میں کہہ رہا تھا۔ "یہی قاتل ہے، قاتل یہی ہے۔" اس نے میری آمد کو مطلق کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ اپنی گھٹتی ہوئی قابل نفرت آواز میں کہہ رہا تھا۔ "مرحوم میرا تین ہزار روپے کا مقروض ہے۔ بے شک بہن، یہ سنگ دلی معلوم ہوتی ہے کہ میں اب اس روپے کا تقاضا کروں، جبکہ مرحوم کے خاندان پر یکلخت اتنی سخت مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ مگر میں کیا کروں مجھے فی الواقع اس روپے کی اس وقت شدید ضرورت ہے۔ نواں کوٹ میں میرے مکان کی تعمیر صرف روپے کی کمی کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔"

"مگر تمہارے وہ کاغذات کہاں ہیں جن پر قرضے کی لکھت پڑھت ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے ایک کینہ بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "بے شک مرحوم میرا بہترین دوست تھا مگر روپے کے معاملے میں یہ میری پرانی عادت ہے کہ میں زبانی قول اقرار سے لکھت پڑھت کو زیادہ محفوظ سمجھتا رہا ہوں۔ میرا مقولہ ہے کہ "حساب۔ حساب ہے۔" اس نے اپنے لمبے بھورے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے کاغذات کا ایک پلندہ نکالتے ہوئے کہا۔ "کاغذات اب بھی میرے پاس ہیں۔ یہ

سرکاری اسٹامپ والے کاغذ ہیں اور ان پر مرحوم نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے کہ اس نے فلاں فلاں تاریخ کو مجھ سے اتنا قرضہ لیا۔ عام آدمیوں سے میں روپے کے پیچھے چار آنہ سالانہ سود لیتا ہوں مگر مرحوم کو میں نے بغیر سود کے قرض دیا تھا۔"

"تین ہزار روپیہ!" بیوہ گڑگڑاتے لہجے میں بولی۔ "دیکھو بھائی رحیم بخش۔ تم اس کے اتنے گہرے دوست تھے۔ تمہیں معلوم ہے ہم پر کتنی بڑی مصیبت آئی ہے۔ اس وقت ہمیں ہوش نہیں۔ گھر کا کمانے والا چل بسا ہے اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس مہینے مکان کا کرایہ کیسے چکاؤں گی۔ میں تمہاری پائی پائی ادا کر دوں گی۔ مگر مجھے کم از کم تین چار مہینے کی مہلت تو دو۔"

"میں اس روپے کا بالکل تقاضا نہ کرتا۔" مستری رحیم بخش بولا۔ "اگر میرے نواں کوٹ والے مکان کی تعمیر روپے کی کمی کی وجہ سے رک نہ جاتی۔ تعمیر کے رکنے سے مجھے مالی نقصان ہو رہا ہے۔ اس وقت تک وہ مکان کرایہ پر چڑھا ہوا ہوتا۔ اب میں انتظار نہیں کر سکتا۔"

تھوڑی دیر تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ اس آدمی کی سنگ دلی اور بے حسی نے ہمیں کچھ عرصے کے لئے مبہوت کر دیا۔ اس خاموشی کو آخر اسی نے ہی توڑا "ہاں ' ایک صورت ہو سکتی ہے اور تم وہ جانتی ہو" اس کے چہرے پر وہی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ ایک اطمینان سا جیسا شاید اس مکڑے کو محسوس ہوتا ہوگا جو ایک مکھی کو اپنے جالے میں پھنسا ہوا دیکھ لیتا ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ صورت کیا تھی' جس کی طرف اس مکار بوڑھے نے اشارہ کیا تھا۔۔۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا! بیوہ بھی دل میں جانتی تھی کہ یہ ناممکن ہے۔ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کا ہاتھ اس بوڑھے کے ہاتھ میں دینے پر اس کی موت کو ترجیح دے سکتی تھی۔ مگر عورت ایک کمزور مخلوق ہے۔۔۔ کمزور اور متلون مزاج۔۔۔ مجھے فوراً" احساس ہوا کہ مستری رحیم بخش کے پھیلائے ہوئے جال میں کوئی چیز پھنس کر تڑپنے لگی ہے۔

بیوہ شاید اب بھی منت سماجت سے اس سنگ دل کو متاثر کرنے کی کوشش کرتی مگر میں بول پڑا "مستری رحیم بخش۔ تم ان عورتوں کو زیادہ تنگ نہ کرو۔ تم میرے ساتھ نیچے دوکان پر چلو۔ تمہارا سارا روپیہ میں چکاؤں گا۔۔۔ میں۔" اگرچہ مجھے اس کا ذرہ برابر بھی پتہ نہ تھا کہ میں اتنا سارا قرضہ کیسے چکا سکوں گا۔

بیوہ نے مجھے کچھ تشکر اور کچھ شک کی نظروں سے دیکھا۔ بوڑھا رحیم بخش اسی کینہ بھری مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم سیڑھیوں سے اترنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شیخ شیر علی کا بنک میں کچھ روپیہ جمع ہے۔ شاید وہ مجھے ادھار دینے پر رضامند ہو جائے یا شاید قانونی طور پر کوئی ایسا رخنہ مل جائے جس سے یہ بوڑھا مستری' بیوہ سے قرضہ وصول کرنے کا حقدار ثابت نہ ہو سکے۔ جو کچھ بھی ہو اس بات کا میرے دل میں پختہ ارادہ تھا کہ اب میں یہ نوبت نہیں آنے دوں گا کہ بوڑھا دوبارہ جا کر بیوہ اور رضیہ کو کڑھائے اور رلائے۔ جس وقت ہم بالاخانے سے اترے' رحیم بخش میرے ساتھ دوکان پر چلنے کی بجائے مجھے سیڑھیوں کے دروازے کے سامنے روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لومڑ کی سی عیاری تھی۔ وہ شاید اس شبے میں مبتلا ہو رہا تھا کہ کہیں میں سچ مچ ہی اس کا قرضہ نہ چکا دوں اور بیوہ کو اس کے چنگل سے رہائی مل جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔

"میری بات سنو" وہ کہنے لگا۔ "تم اس معاملے میں کیوں پڑتے ہو۔ تم نے کیا سارے جہاں کے دکھ درد کا ٹھیکا لے رکھا ہے کیا۔ یہ لوگ تمہارے قریبی رشتہ دار لگتے ہیں کہ تم ان کی خاطر تین ہزار سے ہاتھ دھونے کو تیار ہو رہے ہو؟ تم کو آج کے زمانے میں شاید روپے کی صحیح قدر و قیمت معلوم نہیں"۔۔۔۔۔ پھر اس نے اچانک پینترا بدلا۔ "میری بات سنو۔ مجھ سے ایک ہزار روپیہ لو اور اس معاملے میں دخل نہ دو۔ تم اس بات میں آؤ ہی نہیں۔۔ میں۔۔"

وہ اپنے فقرے کو مکمل نہ کر سکا۔ اس کی گھٹی آواز فوراً" گویا کٹ کر رہ گئی۔ اوپر خطرناک طور پر اٹکی ہوئی اس لالٹین کے ڈھانچے نے یہی لمحہ اپنے گرنے کے لئے چنا۔ میں نے لالٹین کو اس کے سر کے اوپر تڑاخ سے گرتے دیکھا۔ اس نے قدرتی طور پر اپنے بازو اور سر کو بچانے اور مقدمہ کے اس وار کو روکنے کے ارادے سے اٹھانے چاہے۔ مگر لالٹین تو ہاتھ اٹھنے سے پہلے گر چکی تھی اور مستری رحیم بخش دروازے سے باہر آخری سیڑھی پر منہ کے بل جا گرا تھا۔۔۔۔ ایک لمحے تک وہ درد اور تکلیف سے کلبلاتا رہا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ لالٹین اس کے سر کے

اوپر بیس فٹ کی بلندی سے گری تھی اور گری بھی سیدھی اپنی بھالا نما دم کے بل پر' جو ٹھوس لوہے کی تھی اور لالٹین کا سب سے بھاری حصہ تھی۔ وہ نوکدار دم اس ساری قوت کے ساتھ جو بیس فٹ کی بلندی نے اس میں پیدا کر دی تھی اس کے سر پر آگری اور اس کی پیشانی کو چھیدتی ہوئی نیچے سڑک پر کنکناتی ہوئی جا پڑی۔ شیخ شیر علی نے اپنی دوکان سے لالٹین کو مستری رحیم بخش کے سر پر گرتے ہوئے دیکھا دو تین راہ چلتوں اور دوکانداروں نے بھی یہ منظر دیکھا اور وہ بھاگتے ہوئے آپہنچے۔۔۔۔

جلدی سے مستری رحیم بخش کو ایک فوجی ٹرک میں ہسپتال پہنچایا گیا۔ مگر میں نے سنا ہے کہ وہ رستے ہی میں مر گیا۔۔۔۔۔ ایک حادثہ۔۔۔۔ نہایت افسوسناک حادثہ۔۔۔۔

رضیہ اب میری بیوی ہے اور ہم دونوں شیخ شیر علی کے بالاخانے میں رہتے ہیں۔ شیخ شیر علی کو ابھی تک فصلی بیئرلینڈ سے مکالمہ نویسی کی پیش کش نہیں آئی اور اس لئے اس نے چاروناچار اپنے آپ کو ایک باتونی عورت کی موجودگی برداشت کرنے پر رضامند کر لیا ہے۔ اسے شکایت ہے کہ اس طرح کچھ عرصے تک اس کے اعصاب پر غیر موافق اثر پڑے گا۔ مگر اس کا تو وہ بھی اقرار کرے گا کہ جو کھانے رضیہ بناتی ہے وہ بے حد لذیذ ہوتے ہیں اور ہوٹل کے کھانوں سے کہیں زیادہ ٹھوس اور قوت بخش۔ کہتے ہیں ایک اچھی بیوی اپنے ساتھ اچھی قسمت بھی لاتی ہے۔ دوسری بیویوں کے متعلق تو مجھے معلوم نہیں مگر رضیہ کی صورت میں یہ بالکل درست ہے۔ شادی کے دوسرے ہی دن مجھے فورمین نے بلا کر یہ خوشخبری دی کہ مجھے اسی مہینے سے مستری بنا دیا گیا ہے (خان بہادر کا اس میں مطلق کوئی ہاتھ نہیں)۔ رضیہ صرف میرے لئے ہی خوش قسمتی نہ لائی' بلکہ میرے دوستوں کے لئے بھی' کیونکہ جس روز مجھے مستری بنایا گیا۔ شیخ شیر علی کو مدیر رسالہ "بھینس" کا خط موصول ہوا جس میں اس کے مضمون " قرونِ وسطیٰ کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت " کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور استدعا کی گئی تھی کہ آئندہ بھی اسی پائے کے مضامین سے رسالے کی قلمی معاونت کو جاری رکھا جائے۔

اور کل ہی مجھے الہ دین انارکلی میں ملا۔ اسے کنڈکٹر سے ترقی دے کر چیکر بنا دیا گیا ہے۔۔۔۔۔ ایک دم چیکر!

رحمان مذنب

نام : رحمان مذنب

قلمی نام : رحمان مذنب

پیدائش : ۱۵ جنوری ۱۹۱۵ء بہ مقام لاہور، مغربی پنجاب

تعلیم : ابتدائی تعلیم مدرسہ نعمانیہ، لاہور میں۔ اس کے بعد اپنے والد مفتی محمد عبدالستار کی زیر نگرانی رہے۔

مختصر حالات زندگی:

لاہور کے ٹکسالی دروازے کی اونچی مسجد سے ملحقہ مکان میں رحمان مذنب کی جائے پیدائش ایسی تھی کہ ادھر عشاء کی اذان کان میں پڑتی اور ادھر مغنیہ کی تان سنائی دیتی۔ یہ بادشاہی مسجد، لاہور کے داہنی طرف کا علاقہ ہے۔ گھر سے فرلانگ بھر کے فاصلہ پر عزیز تھیٹر تھا، جہاں سارا سال ناٹک کمپنیوں کی آمد و رفت رہتی۔ عزیز تھیٹر سے متصل ہیجڑوں کی بیٹھکیں تھیں اور چند قدم پر نکیائیوں گلی (ٹبی) اور ڈیرہ دارنیوں کا بازار، جو شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کی شفاء منزل پر جا کر تمام ہوتا۔ اطراف و جوانب میں تکیے، جوا خانے اور چنڈو خانے تھے اور ان کے بیچ مدرسہ نعمانیہ، جہاں رات دن علم و عرفان کی بارش ہوتی رہتی۔ ہز ہائی نس اقبال بیگم، عنایت بائی ڈھیروں والی، استاد بڑے غلام علی خاں، خورشید بائی ہیجڑوں والی، استاد برکت علی خاں، مبارک علی، کامیڈین حسن علی عرف حسو، استاد عبدالوحید خاں کیرانے والے اور استاد عاشق علی خاں پٹیالے والے سبھی کا یہاں قیام تھا۔

رحمان مذنب کے والد مفتی محمد عبدالستار صاحب کا تعلق بادشاہی مسجد سے تھا۔ ان کا بیشتر وقت فقہی کتب کے مطالعہ، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گذرتا (۱) یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور مفتی صاحب کا فتویٰ چلتا تھا۔۔۔ فتوے کی رو سے چار سال تک کے مفقود الخبر فوجیوں کی بیویوں کو کسی اور شخص سے نکاح کی اجازت مل جاتی۔ لڑکپن میں رحمان مذنب نے رات گئے تک جاری رہنے والی، اپنے ہی گھر کی علمی محفلوں میں حاضری دی اور پہروں اپنے والد کی ذاتی کتب خانہ کی سیر کی۔ ۱۹۳۵ء میں والدہ خیر النساء کی شفقت اور ستمبر ۱۹۴۳ء میں والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہوئے۔ اس سے قبل رحمان مذنب کی تخلیقی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں ان کا ڈراما "جہاں آراء" عزیز تھیٹر کے اسٹیج پر کھیلا گیا۔ لگ بھگ ۱۹۴۰ء میں لاہور سے اندور اور وہاں سے بھوپال چلے گئے، اس کے بعد دہلی اور آخر کار ۱۹۴۶ء میں لاہور لوٹ آئے۔ بھوپال میں قیام کے دوران حاجی پور میں اپنے بہنوئی پروفیسر سید منظور علی کے لخت بند عزیز کی حسین بیٹی کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ اسی عالم میں براستہ دہلی، لاہور واپسی ہوئی۔ تب سے کاغذ اور قلم سے نباہ کیے جاتے ہیں۔ فری لانس ادیب کی حیثیت سے تقریباً ہر موضوع پر لکھا۔ بچوں کے لیے سینکڑوں کہانیاں اور ریڈیائی ڈرامے قلم بند کیے۔ روحانیات، ماخولیات، جادو اور تاریخ کے میدان مستقل طور پر ان کی قلم رو میں رہے۔ ٹیلی وژن کی "الف لیلیٰ" سیریز کے لیے رحمان مذنب کے لکھے ہوئے ڈراموں کو تادیر یاد رکھا جائے گا۔

اولین تحریر: ڈراما:

"جہاں آرا" برائے عزیز تھیٹر، لاہور: ۱۹۳۴ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"پیال" "" "جامعہ" دہلی، لگ بھگ ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

نمبر	کتاب	ناشر	طبع
۱۔	"یورج پلان" (سماجیات۔ از سرولیم یورج کا ترجمہ)	مکتبہ جامعہ، دہلی،	طبع اول: لگ بھگ ۱۹۴۱ء
۲۔	"ترقی پسند ادب کا مسئلہ" (تنقید)	ناشرین، لاہور،	طبع اول: ۱۹۵۷ء
۳۔	"جادو اور جادو کی رسمیں" (سماجیات / مذہبیات)	ناشرین، لاہور،	طبع اول: ۱۹۵۷ء
	(یہ کتاب دوسری بار "دین ساحری" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے)		
۴۔	"سرکش روحیں"	نسیم بکڈپو، چوک نیلا گنبد، لاہور،	طبع اول:
۵۔	"سو سال تک زندہ رہیے"	نسیم بک ڈپو، چوک نیلا گنبد، لاہور،	
۶۔	"لمبی عمر اور تندرستی"	فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور،	طبع اول:
۷۔	"خلائی تسخیر"	فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور،	
۸۔	"دنیا کے نامور جاسوس"	فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور،	
۹۔	"نامور جاسوس عورتیں"	فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور،	
۱۰۔	"مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے" (ترجمہ)	فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور،	طبع اول: ۱۹۷۱ء
	یہ "گلوری آف اسلام" کا ترجمہ ہے۔ انعام یافتہ کتاب۔		
۱۱۔	"مستقبل کے ذرائع"	فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور،	طبع اول:
۱۲۔	"روس میں اسلام کا خطرہ"	فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور،	
۱۳۔	"میرا پہلا تصویری اٹلس"	فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور،	
۱۴۔	"پانی"	فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور،	
۱۵۔	"گیس"	فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور،	
۱۶۔	"نہریں دریا اور بند" (علم آب)	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور،	طبع اول:
۱۷۔	"داستان آب و گل"	ناشرین، لاہور،	طبع اول:
۱۸۔	"تعمیر کی راہیں"	ناشرین، لاہور،	
۱۹۔	"نور پور کی بستی" (بچوں کے ناول)	فیرزو سنز لمیٹڈ، لاہور،	طبع اول:
۲۰۔	"بھورے خان اور بھیڑیا" (بچوں کے لیے ناول)	سن رائز ہیلی کیشنز، لاہور،	طبع اول:
۲۱۔	"لکڑ ہارا اور چور" (بچوں کے لیے ناولٹ)	گلڈ اشاعت گھر، کراچی،	طبع اول: ۱۹۶۳ء
۲۲۔	"فرعون کا خزانہ" (بچوں کے لیے کہانیاں)	ٹیکنیکل بک ڈپو، لاہور،	طبع اول:

۲۳۔ "لوہے کا آدمی" (بچوں کے لیے کہانیاں) ٹیکنیکل بک ڈپو' لاہور'

۲۴۔ "پگلی جان" (افسانے)

۲۵۔ "بالاخانہ" (افسانے)

غیر مدون:

محولہ بالا مطبوعہ کتب کے علاوہ

۔ "یونان کا عہد جاہلیت اور دیومالا کا ارتقاء" (مقالہ)	مطبوعہ: "اقبال" لاہور'	اکتوبر ۱۹۶۴ء' اپریل ۱۹۶۵ء (۲۶ صفحات)
۔ "دنیا کی پہلی طوائف" (مقالہ)	مطبوعہ: "ہمدرد ڈائجسٹ" کراچی'	اپریل ۱۹۷۰ء
۔ "شاعری اور ڈراما" (ترجمہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ)	مطبوعہ: "ساقی" کراچی'	
۔ "ڈرامے کے تاریخی محرکات اور میلانات" (مقالہ)	مطبوعہ: "ماہ نو" کراچی'	جولائی ۱۹۵۶ء
۔ "ڈرامے کی ابتداء (مقالہ)	مطبوعہ: "اقبال" لاہور'	اکتوبر ۱۹۵۷ء
۔ "سوفوکلیز" (مقالہ)	مطبوعہ "اقبال" لاہور'	اکتوبر ۱۹۵۹ء
۔ "یونان کا تھیٹر" (مقالہ)	مطبوعہ: "اقبال" لاہور'	اکتوبر ۱۹۶۰ء غیر مرتب حالت میں موجود ہیں۔

مستقل پتا:

۱۸۔ غزالی سٹریٹ' شیراز پارک' اتحاد کالونی' لاہور۔ ۱۸۔ پاکستان

اعزاز:

۱۔ پاکستان رائٹرز گلڈ ادبی انعام برائے "لکڑ ہارا اور چور" (ناولٹ) ۱۹۶۴ء

۲۔ ترقی ادبی بورڈ' کراچی' ادبی انعام برائے لکڑ ہارا اور چور" (ناولٹ) ۱۹۶۴ء

۳۔ پاکستان سائنس بورڈ' اول انعام برائے "وادی سندھ اور اسکا ماحول"

نظریہ فن:

افسانہ زندگی کی بکھری ہوئی حقیقتوں کا مظہر ہے۔ حقیقت بیانی اور انکشاف حقیقت اس کی مالا بد ہے۔ اچھی سوچ' اچھے عمل' بری سوچ اور برے عمل والے ۔۔۔۔ نیک و بد' منافق اور راستباز سبھی یہاں ملتے ہیں۔ ان کے ظاہر و باطن کو کماحقہ' جاننا افسانہ نگار کی اساسی ضرورت ہے۔

افسانہ نگاری کے طور طریقے اور اصول ہیں۔ کرداروں کو ملانے جلانے اور ٹکرانے کا عمل سہل نہیں۔ ان کے تصادم اور ملاپ سے

کہانی کو آغاز سے انجام تک لے جانے کے لیے دقت نگاہ درکار ہوتی ہے۔ پھر خود افسانہ نگار کی اپنی سوچ' اپنی راہ ہوتی ہے' اپنا نظریہ عدل ہوتا ہے۔ اپنے جذبات' تجربات اور مشاہدات ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ لکھنے کا تجربہ بھی ہوتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے نظریہ عدل سے سمت مقرر کرتا ہے۔ نیک و بد کو اپنے ترازو میں رکھتا ہے اور انصاف کرتا ہے۔ جرم و سزا کا نظام قائم رکھتا ہے' سیاہ و سفید کا فرق واضح کرتا ہے۔"

رحمان مذنب

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۸۷ء)

○

(۱) مفتی محمد عبدالستار صاحب ایک سیرۃ کی کتاب کے مصنف اور عربی کی دو کتب (مطبوعہ: ۱۹۳۶ء) کے مترجم تھے۔

رحمان مذنب

تپلی جان

تپلی جان کا آنا تھا کہ جانی کے یہاں صف ماتم بچھ گئی ۔ ذرا کشائش پیدا ہونے کو آئی تھی کہ پٹ بند ہو گئے ۔ پہلے ہی وہ کب نہال تھا کہ آفت کا یہ نیا پہاڑ سر پر آگرا ۔ غریب نے جو سنہرے خواب دیکھے اور جو کچھ سوچا تھا وہ سب دھرا کا دھرا رہ گیا۔

چوبارے کا حال خستہ تھا۔ کڑیاں ایک تو دھوئیں کی کالونچ سے اتنی بھیانک ہو رہی تھیں جیسے چڑیلوں نے اپنی ننگی باہیں پھیلا دی ہوں ۔ دوسرے جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھیں ۔ ان کے کڑاکے بول رہے تھے ۔ پوری چھت سن رسیدگی کے باعث دم توڑ رہی تھی اور اب تو جانی کے دم توڑنے کے دن بھی آ گئے تھے۔

جو حال چھت کا وہی دیواروں کا اور فرش کا۔ ہر روز کنستر بھر پلستر جھڑتا۔ فرش کی ٹیپ تو ٹیپ اینٹیں تک اکھڑ چکی تھیں اور کھرا تو اچھا خاصا چوبچہ بن گیا تھا۔ کسے امید تھی کہ اس چوبارے کی بھی سنی جائے گی ؟ پھر بھی جانی کی ہڈی بڑی کری تھی ۔ ہمت ہارنے والی آسامی نہ تھا۔ اس نے بکھرے ہوئے بالوں میں اطمینان سے کنگھی پھیری اور " ٹبن گھر آجا " والا مخصوص گیت گانے بیٹھ گیا۔

حاجی تنکا پر اب کے بھروسہ تھا" جانی کا سہارا تو ٹوٹ چکا تھا۔ اس خود غرضی کی کوئی حد تھی ۔ تپلی جان کا آنا تھا کہ جانی اس سے کٹ کر الگ ہو گیا۔

جانی نے نئے کپڑے پہن اور لپ سٹک لگا کر آئینے میں صورت دیکھی تو وہ دن یاد آ گیا جب یہ چوبارہ میلا اور خستہ نہ تھا۔ یہاں نئی دری بچھی تھی اور حاجی تنکا نے اچانک پیچھے سے آکر اس زور سے بھینچ لیا تھا کہ وہ چیخ کر رہ گیا تھا۔ "اس دن حاجی تنکا نے کہا تھا۔۔ جانی بٹیرے کو کنگنی دی ہے۔ جی توڑ کر لڑے گا۔ تیری قسم! سب کو بھگل کر دے گا۔ ہمارے بٹیرے کی دنیا عاشق ہے۔ بتا تیری رضا کیا ہے؟"--- پھر وہ بٹیر کو بھول گیا اور شراب کے گرد ہو گیا۔ دیسی کی پوری بوتل چڑھا گیا اور نشے میں آکر جانی کا برا حال کر دیا۔۔ جیسے کسی نے نئی روئی دھنک کر رکھ دی ہو۔

دیر تک جانی کے بدن میں لذیذ سی ٹیس اٹھتی رہی ۔ کوئی اسے تند اور جلادانہ وحشت سے نوچ لے تو وہ اف نہ کرے ۔ اسے تو مزا ہی تب آئے جب نرم نرم رگوں میں میٹھے میٹھے مگر تیکھے تیکھے کانٹے رینگنے لگیں، لیکن کوئی اس کا اپنا بنے تبھی تو۔

حاجی تنکا کا بٹیر بڑا جی مار نکلا ۔ اس نے سب بٹیروں کو میدان سے بھگا دیا اور اس فتح یابی کی خوشی میں چوبارے پر تمام رات گانا بجانا ہوتا اور شراب کا دور چلتا رہا، پھر نہایت وسیع پیمانے پر حرب و ضرب کی محفل گرم رہی۔

پھر زمانہ بدلا ۔ نہ نئی وردی رہی نہ چوبارے کا اجلاپن ۔ وہ گرم بازاری بھی جاتی رہی ۔ یہ سب ہوا تو جانی پر ہی ہوا اجڑا تو اسی کا چوبارہ اجڑا ۔ برابر کا چوبارہ تو رشک جنت بن گیا۔ اس سے جانی کے سینے پر سانپ نہ لوٹتے تو کیا ہوتا۔

برابر کے چوبارے کو کوئی پوچھتا نہ تھا ۔ جب سے موتی شاہ پکڑا گیا اور جوئے کا اڈہ بند ہوا تب سے یہ اجڑا پڑا تھا۔ یوں تو جانی کا چوبارہ بھی کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بن کر رہ گیا تھا تاہم یہ آس تو لگی تھی کہ ایک نہ ایک دن مولا مشکل کشا کے یہاں اس کی سنی جائے گی، پھر جانے کس کی دعا کا الٹا اثر ا ہوا کہ جانی کا چوبارہ کھٹائی میں پڑ گیا اور برابر کے چوبارے پر دھن برس پڑا۔ صابر شاہ کی خانقاہ پر تو وہ روز ہی جاتا لیکن شاہ جی کی نظر چوک گئی اور اور دھوکے میں ہمسایے پر جا پڑی۔

تپلی جان کے آنے سے جانی کا پا تو کٹا لیکن اس نے بڑی عقلمندی سے کام لیا۔ چڑھتے سورج کی پوجا نہ کرو پر اس کی نندا بھی نہ کرو! جانی کم از کم اسی اصول کا قائل تھا۔ اس نے بڑے حوصلے سے چھاتی پر وہ پتھر رکھ لیا جس نے اس کا مکان ڈھا دیا تھا۔

تپلی جان کا چوبارہ تین دن کے اندر اندر پرانے سے نیا ہو گیا۔ بوسیدہ چھت ادھیڑ کر نئی چھت ڈالی گئی۔ پلستر ہوا۔ لیپ ہوئی۔ سفیدی ہوئی اور یہ سب کچھ جانی نے جی کڑا کر کے دیکھا۔ وہی مسالہ جسے جانی کے چوبارے میں کھپنا تھا تپلی جان کے چوبارے میں لگا۔ ایک بار تو مستری بھولے سے نگاری تیشہ لئے جانی کے چوبارے پر ہی چڑھ آیا' پر جب جانی نے کولھے پر ہاتھ دھر کر یہ کہا تو وہ ہنس کے نیچے اتر آیا۔۔۔ "ہائے ہائے' صابر سائیں ہمارا نہیں تپلی کا ہے۔ میری جان! اسی نے ہوا کا رخ پلٹ دیا تو ادھر کیوں آئے؟ مسالہ میرے ہی چوبارے کا ہے پر لگے گا برابر کے چوبارے میں۔ مستری! تیرا بھلا ہو' جہاں کی مٹی ہے اسے وہیں لگا! اب یہ اپنے یہاں نہیں لگے گی۔"

مستری تو چلا گیا لیکن جانی دل مسوس کر رہ گیا۔ اسے یہ غم نہ تھا کہ اس کا چوبارہ مرمت سے رہ گیا اور تپلی جان کے چوبارے کی سنی گئی۔ اسے یہ غم کھا گیا کہ تپلی جان نے اس کے چوبارے کی گہما گہمی لوٹ لی۔ کون اپنا بھرا گھر اجڑتا دیکھ سکتا ہے۔ جسے قہقہوں کی برکھا میں رہنے کا چسکا پڑا ہو وہ تنہائی میں کیسے رہے؟

حاجی تنکا نے تو یوں آنکھیں پھیر لیں جیسے اسے جانی سے کبھی تعلق خاطر ہی نہ رہا۔ حالانکہ دونوں کا باقاعدہ نکاح پڑھا گیا تھا۔ لیکن حاجی تنکا اب کسی کی سنتا ہی نہ تھا۔ وہ تو صاف کہتا۔۔۔ "نکاح وکاح کوئی چیز نہیں۔ یونہی ڈھکوسلہ ہے۔ من کا سودا ہے۔ جب تک موج آئی' جانی سے یارانہ رکھا اور جب موج نہ رہی تو یارانہ توڑ دیا۔ کسی کا ٹھیکہ تو نہیں کہ یارانہ توڑو ہی نہیں۔"

جانی کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ حاجی تنکا نکاح کر کے مکر گیا تھا۔ اس میں اس کی بڑی بدنامی تھی۔ کون اپنی بے قدری گوارا کرتا ہے؟ ناک کٹ جاتی ہے اور برادری میں باتیں ہوتی ہیں۔ اس کی تو ہستی ہی مٹ گئی۔ ذلت نے اسے دو کوڑی کا کر دیا۔ لوگوں کی نظروں میں وہ چجا ہی نہ تھا۔ نیا یارانہ ہوتا تو وہ اتنا اثر نہ لیتا اور اتنی سبکی محسوس نہ کرتا۔ تپلی جان نے جانی کے یار کو نہیں اس کے خصم کو ہتھیایا اور اسے نظروں سے گرا کر خاک میں ملایا۔ " جانی خلیفہ جی کے پاس جا کر رویا پیٹا لیکن وہ بے چارہ کیا کرتا۔ اس نے محض اتنا کہا۔ جانی! صبر کر مولا مشکلشا تیری سنے گا اور تجھ پر اپنا فضل کرے گا۔ تو راستی پر ہے۔ مولا مشکلشا سچوں کا ساتھ دیتا ہے۔ گھبرائے بات نہیں بنتی۔"

جانی نے صبر تو کر لیا پر وہ کبھی کبھی یہ بات ضرور سوچتا کہ خلیفہ جی تپلی جان کو منع کیوں نہیں کرتے کہ کسی کو رسوا اور ذلیل نہ کرے۔ قصور آخر تپلی جان کا بھی تو تھا' لیکن پھر یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا کہ تپلی جان کو یہاں آئے آخر دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی وہ خلیفہ جی کی بڑائی کا قائل ہی نہ ہو گا۔ خلیفہ جی کا حکم تو اسی پر چل سکتا ہے جو ان سے عقیدت رکھتا ہو۔

جانی کا چوبارہ جانی سمیت اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس کا سہاگ قضا نے لوٹ لیا۔ رسوائی نے اسے سمیٹ لیا۔ وہ تاریکی کے بوجھ تلے دب گیا۔ چوبارے کا سارا پلستر اور ملبہ اس کے سر پر آگرا۔ سانس لینا اور جینا دوبھر ہو گیا۔ برابر کے چوبارے سے جب قہقہوں کا شور اٹھتا تو اسے بھالے لگتے اور سینہ چھلنی ہو جاتا۔ اس کا چوبارہ دوزخ کا ایک ایسا ٹکڑا بن گیا جہاں سب سے بڑا عذاب نازل ہو رہا ہو۔ ایسے میں اگر جانی سانس لیتا اور جیتا رہا تو یہ اس کے حوصلے کی خوبی تھی۔

رزق خدا دیتا ہے' چنانچہ جانی بھوکا نہیں مرا۔ سینے کی مشین اس کے پاس تھی۔ اس نے صابر سائیں کے مزار پر جا کر دعا مانگی' خلیفہ جی سے مشورہ لیا اور باوفا منکوح کی طرح زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چوبارہ چھوڑ کر ایک چھوٹی سی دکان میں جا بیٹھا۔ عذاب جہنم کسی قدر کم ہوا۔

تپلی جان کا ستارہ دیکھتے دیکھتے زمین سے اڑ کر آسمان پر جا پہنچا۔

یہ عجیب اتفاق ہے جس علاقے میں تپلی جان کا چوبارہ تھا اس کا کوئی نام نہ تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہاں کبھی کوئی لیڈر نہ پیدا ہوا۔ البتہ لیڈروں کا ادھر گزر ضرور تھا۔ چھوٹے موٹے لیڈر اور موری ممبر تو وہاں رات گزارنے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھتے لیکن ایسے

عارضی لیڈروں کے نام پر بازار کا نام نہ پڑ سکتا تھا۔ علاقائی لیڈر تھے۔ سو انہوں نے بھی معاملے کی نزاکت پر کبھی توجہ نہ دی۔ ایسی اہم جگہ اور نام سے محروم رہے۔ حالانکہ الیکشن کے دنوں میں ان کی توجہ بازار کی ایک ایک اینٹ' ایک ایک کواڑ' ایک ایک کھڑکی' ایک ایک دکان اور ایک ایک چوبارے پر رہی۔ ووٹ کے سلسلے میں وہ بیسویں بار خلیفہ جی اور چِکّی جان سے ملے بلکہ ایک لیڈر نے تو ایسے زریں موقعے پر بیٹے کی ولادت کو غنیمت جانا اور بازار بھر کو چِکّی جان کے ناچ گانے سے نوازا۔

ایک طرف کھلی سڑک تھی جو نورے پہلوان کے اکھاڑے کو نکل جاتی اور دوسری طرف رنڈی بازار تھانے تک پھیلا ہوا تھا درمیان میں فرلانگ بھر کا یہ بے نام ٹکڑا تھا جسے لوگ رفتہ رفتہ چِکّی بازار کہنے لگے۔

جانی کو بجا طور پر رنج تھا کہ وہ یہاں نہ جانے کب سے آباد تھا لیکن کسی نے اس کے نام پر بازار کا نام نہ رکھا۔ اسے حاجی تنکا نے گھر میں ڈال کر برباد کیا۔

چِکّی بازار بہت جلد مقبول ہو گیا۔ اس کے نام ہی میں جادو کا اثر تھا۔ اگر شیخ شریف سے اسے موسوم کرتے جس کا علاقے کی تین چوتھائی جائیداد پر قبضہ تھا۔ یا صابر سائیں کے نام سے فائدہ اٹھاتے تب بھی بازار کی شہرت کو ایسے چار چاند نہ لگتے جو اب لگے تھے۔ بازار نہایت آسانی سے لوگوں کی زندگی میں داخل ہو گیا نہ کسی وزیر نے رسم افتتاح کی' نہ بورڈ چسپاں ہوا نہ اخبار میں خبر چھپی۔ بات ہونے والی تھی سو ہو گئی۔

جو شوقین مزاج رنڈی بازار کی سیر کو آتے وہ چِکّی بازار سے ہو کر جاتے وہ بڑے غور سے بازار کی جان کو دیکھتے اور قدرت کے ہنر کی داد دیتے بعض تماش بین کچے بھی ہوتے جو ایسی سٹی بھولتے کہ چِکّی بازار کے ہو کے رہ جاتے۔

ایک حاجی تنکا ہی نہیں۔ چِکّی جان پر سارا جہاں مرنے لگا۔ کون تھا جو ادھر سے گزرتا اور چِکّی جان کا دیدار کئے بغیر چل دیتا لوگ اسے اس انہماک سے دیکھتے جیسے وہ عالم بالا سے اتری ہوئی نعمت ہو اور اسے دیکھنے سے مریض شفایاب ہو جاتے ہیں۔

چِکّی جان کی رنگت ایسی تھی جیسے گورے پن اور سانولے پن نے بیاہ رچایا ہو۔ جیسے صندل کے شربت میں ملائی کا رس ملا دیا ہو۔ اس کی پنڈلیاں اور بانہیں ولایتی کانچ کی طرح صاف اور چکنی تھیں۔ ان پر ہاتھ یوں پھسلتے جیسے ریشمی کپڑوں پر گرم گرم استری۔ آنکھیں یوں مٹکتیں جیسے تالاب میں ننھی ننھی مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ لمبی لمبی پلکیں سانپ کے پھن کی طرح جھومتیں۔ اسے دیکھ کر خیال آتا کہ چاند نے شفق کی نقاب اوڑھ لی ہے۔ کلائی پر زنانہ گھڑی بندھی رہتی۔ انگلیوں میں جڑاؤ انگوٹھیاں ہوتیں اور کانوں میں ٹاپس پڑے رہتے۔ عید بقر عید پر وہ گلے میں ہار ڈال لیتا۔

چِکّی جان کو مولسری کے پھولوں سے بڑی رغبت تھی۔ ہمیشہ دیر سے اٹھتا اور سورج جتنے بانس چاہے اوپر چلا جائے وہ مولسری کے پھول چننے کے لئے ضرور باغ میں جاتا۔ مولسری کے پیڑوں میں ایسی جاذبیت نہیں اور پھول دیکھنے میں ایسے خوشنما بھی نہیں لیکن ان کی خوشبو دلپذیر ہوتی ہے۔ مٹھی میں سمیٹ کر جب چِکّی جان انہیں سونگھتا تو یوں آنکھیں میچ لیتا جیسے خوابوں کے کسی ایسے انمول دیس میں کھو گیا ہو جہاں صرف کیف ہو' صرف لذت ہو' صرف مہک ہو۔

مولسری کے پھول کچھ ایسے مقبول ہوئے کہ ہھلیرے نے موتیا اور چنبیلی کے ساتھ مولسری کے پھول اور ہار بھی رکھنے شروع کر دیئے جب چِکّی جان حاجی تنکا کی دکان پر آکر بیٹھتا تو ہھلیرا بھی آکر کھڑا ہو جاتا اور یوں مولسری کے ہار بک جاتے۔ چِکّی بازار میں صرف مولسری کے ہار بکتے انہیں ٹھکانے لگا کر ہھلیرے کو رنڈی بازار کا رخ کرنا پڑتا۔

جب کوئی قدر دان مولسری کا ہار خرید کر چِکّی جان کے گلے میں ڈالتا اور اسے بازو سے پکڑ کر دکان سے اٹھا کر لے جاتا تو حاجی تنکا کو بڑا تاؤ آتا لیکن کیا کرتا؟ چِکّی جان نہ تو اسکا منکوح تھا اور نہ وہ چِکّی جان کا بوجھ اٹھا سکتا تھا' جو دن میں دو بار کپڑے بدلے اور ہر ہفتے ریشمی سوٹ بنوائے بیئرز سوپ کی سالم ٹکیہ سے بکرے اور چھترے کو نہلائے۔ تکیوں کے غلاف اور بستر پوش روز بدلوائے۔ نئی نئی قمیضیں شلواریں اور دوپٹے اس بے تکلفی سے مہترانی کے حوالے کر دے جیسے دادا جی کی فاتحہ کے لئے اسے کسی بہت بڑے حلوائی کی دکان مل گئی ہو اسے حاجی تنکا کیسے اپنے

کھاتے میں ڈالتا' پھر ایک اور بات بھی تھی ـــ ۔ پرانی ریتیں اور رسمیں منانا خالہ جی کا کھر سہی ۔ یوں تو وہ جانی سے منہ موڑ اور رشتہ توڑ چکا تھا لیکن اتنا اسے معلوم تھا کہ نکاح پر نکاح کرنے میں بڑی قباحتیں تھیں ۔ نکاح کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکتی تھی ۔ ان حالات میں وہ قناعت کے اصول پر چل رہا تھا ۔

جانی کا بھی گزارہ صبر و قناعت پر تھا اور حاجی تنکا بھی ۔ دونوں کا مرض بالکل ایک نہ تھا لیکن علاج ایک ہی تھا ۔ گویا صبر و قناعت اور امرت دھارا تھا ۔

بازار میں ایسا کوئی نہ تھا جس کی نظر عنایت چٹی جان پر نہ ہو۔ جب وہ مولسری کے پھول چن کر باغ سے لوٹتا یا یونہی چوبارے اٹھ کر بازار میں ٹہلنے چلا آتا تو گامو کی دکان کے پھولوں سے لدے پھندے چھبیے اسے اپنی طرف بلاتے۔ ریڈ بلڈ مالٹے اور سنگترے مسکرا مسکرا کر گامو کی جانب سے خیر سگالی کا سندیسہ دیتے۔ سردیوں کے زمانے میں انہیں سے دکان کی بہار ہوتی جب چٹی جان منہ کا ذائقہ بدلنا چاہتا تو گامو کی دکان پر جا پہنچتا اور مالٹے سنگترے اٹھا کر چھیلنے لگتا۔ کبھی کبھی چھیلتے چھیلتے باریک سی پھوار چھوٹ کر اس کی آنکھوں میں جا گرتی اور وہ ایک دم آنکھیں میچ لیتا۔ گامو جھٹ دھوتی کا پلو اٹھا کر اس کی آنکھیں پونچھ دیتا۔ چٹی جان کو اس سے کسی قدر سکون ملتا اور وہ مالٹے اور سنگترے کھانے میں مشغول ہو جاتا۔

گامو ہر موسم کا پھل لاتا ۔ جب مالٹے ' سنگترے کمیابی کی وجہ سے صرف بیماروں کے خریدنے کے لائق رہ جاتے تب بھی وہ چٹی جان کی بھینٹ چڑھانے کی خاطر ضرور لاتا ۔ کبھی کیلے آتے اور چٹی جان انہیں چھوڑ کر کسی اور پھل کی جانب ہاتھ بڑھاتا تو اس کی کلائی تھام کر بول اٹھتا ـــ "سوہنیا! ذرا یہ کیلا بھی کھا کر دیکھ! مولا جانے بڑا شیریں ہے ۔" ـــ پھر بن پوچھے چھلکا اتار دیتا اور کیلا بڑھا کر کہتا ـــ "شہزادیا! دکان تیری ہے جو من میں آئے کھا' لیکن ذرا یہ کیلا بھی کھا کر دیکھ! اس کے سامنے ہر چیز ہیچ ہے ۔" یہ درست ہے کہ کیلے لذیذ ہوتے ہیں ۔ گھلے ہوئے میٹھے اور خوشبودار لیکن چٹی جان ہمیشہ ان سے کتراتا۔ مگر جتنا وہ کتراتا گامو اتنا ہی اسے ستاتا اور آخر کیلے کھا کر ہی چٹی جان کی خلاصی ہوتی۔

جانی یہ سب کچھ دیکھتا اور جی ہی جی میں کڑھتا ۔ اسے گامو نے کبھی جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا تھا ۔

حاجی تنکا بھی جلتا ۔ اس کی دکان پر تو پان سگریٹ ہی ملتے اور چٹی جان کا صرف انہی پر گزارہ نہ تھا ۔ اسے مالٹے ' سنگترے اپنی طرف کھینچ لیتے ۔ حاجی مجبور تھا ۔ وہ پھل پھلاری کے دھندے سے بالکل ناواقف تھا ۔ ہاں چٹی جان کو خوش رکھنے اور گامو سے اس کا پیچھا چھڑانے کی نیت سے سوچ سوچ کر اس نے ایک ترکیب نکالی۔ وہ منڈی جا کر سستے داموں تھوڑا تھوڑا پھل لانے لگا۔ تھڑے پر جگہ بنا کر ٹوکرا جما دیتا لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی۔ گامو کی دکان پر جو بہار تھی وہ یہاں کہاں ؟ گاہک تو گاہک چٹی جان نے بھی توجہ نہ دی۔ وہ مالٹے لائے تو چٹی جان کیلے کھانے گامو کی دکان پر جا پہنچے حالانکہ اسے کیلوں سے نفرت تھی' پھر وہ کیلے لے آئے تو چٹی جان سردہ کھانے گامو کے پاس چلا جائے۔

حاجی تنکا سمجھ گیا کہ چٹی جان کو صرف پھل ہی سے نہیں گامو سے بھی رغبت ہے ۔ جہاں تک اڈے کا تعلق تھا حاجی تنکا کی دکان سے بہتر بازار میں کوئی اڈہ نہ تھا ۔ پٹڑے کی ایک طرف اتنی جگہ تھی کہ چٹی جان کی چوکی بچھ جائے ۔ سر پر ایک تختے کے اوپر ریڈیو جما رکھا تھا ۔ برابر میں نامی گرامی پہلوانوں اور ایکٹرسوں کی تصویریں لگی تھیں ۔ دکان کے وسط میں بجلی کا بلب آویزاں تھا۔ چوبارے سے آکر بیٹھنے کو جی چاہتا تو چٹی جان یہیں آبیٹھتا۔ ایک تو یہاں نمائش ٹھیک سے ہوتی۔ دوسرے سب شوقین مزاج سہولت سے جمع ہو جاتے۔ چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ لطیفے چلتے۔ ہنسی مذاق کی باتیں کی جاتیں اور گاہک پھنستے۔ اور کہیں یہ بات نہ تھی۔

گامو کی دکان چٹی جان کا اڈہ نہ بن سکتی تھی ۔ وہ اور ہی قسم کا آدمی تھا ۔ اس روانی اور بے تکلفی سے تخول کرتا کہ اچھے اچھوں کے منہ پھیر دیتا ۔ چٹی جان اس کے یہاں جا کر بیٹھتا تو گاہک بدک جاتے ۔ بھلا ایسا کون دکاندار ہوگا جو اپنے گاہکوں کی سہولت کا خیال نہ کرے ۔ ایک آدھ گاہک سے نہ بنتی ہو تو اور بات ہے ۔ سب سے تو نہیں بگاڑی جا سکتی ۔

گامو کی نسبت حاجی تنکا ذرا نرم طبیعت کا آدمی تھا' نہ ٹھول بازی میں مہارت رکھتا اور نہ چکی جان کے گاہکوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھتا۔ سچ پوچھو تو اس کی دکانداری چکی جان کی وجہ سے چمک اٹھی۔ جسے پان سگریٹ کی عادت نہ تھی اسے بھی یہ چسکا لگ گیا۔ کوئی خود پئے نہ پئے چکی جان کو تو سگریٹ پلانے اور پان کھلانے میں اپنی نجات ضرور سمجھتا۔ حاجی تنکا چکی جان کا احسان مند تھا اور اس لئے اسے کبھی گامو کی دکان پر جانے سے نہ ٹوکتا۔ چکی جان کو کس بات کی کمی تھی؟ حاجی تنکا ذرا ماتھے پر تیوری ڈالے تو وہ اٹھ کر جیجے کے قہوہ خانے میں جا بیٹھے اور پھر گاہک بھی بلا حیل و حجت وہیں پہنچ جائیں۔

سورج نکلنے سے پہلے پہلے جیجے کا قہوہ خانہ کھل جاتا۔ لال لال کوئلوں کی گود میں کیتلیاں رکھی ہوتیں۔ جن کی ٹونٹیوں سے بھاپ ناچتی ہوئی نکلتی اور ہوا میں غائب ہو جاتی۔ کیتلیوں کے اندر گدگدیاں اٹھتیں اور چائے کا تیز تیز فلیور چکی جان کو پاس بلاتا۔

جیجا چائے بناتا اور خوش الحانی کے ساتھ کبھی "میرے مولا بلا لو مدینے مجھے" کا ورد کرتا اور کبھی "چکی کمریا' ترچھی نجریا" کی رٹ لگاتا۔

دن چڑھے چکی جان کی آنکھ کھلتی تو وہ انگڑائیاں لیتا کھڑکی میں آبیٹھتا۔ جیجا اسے دیکھتے ہی زور سے سیٹی بجاتا' پھر ہاتھ کے اشارے سے بلاتا' کچھ دیر تو چکی جان متوجہ ہی نہ ہوتا۔ بس انگڑائیاں لئے جاتا اور اس وقت یوں محسوس ہوتا جیسے کائنات انگڑائیاں لے رہی ہو۔ نیند کا نشہ ایک دم کہاں اترتا۔ جب ذرا ہوش آتا تو جیجے کی طرف دھیان دیتا۔ جیجا ڈبل روٹی پر مکھن لگاتے لگاتے یا چائے تیار کرتے کرتے مسکراتا اور کہتا ---- "میری جان! چوبارے کا کھیڑا چھوڑ! ذرا ہمارے پاس آ! ہماری خاطر چائے کی ایک پیالی ہی پی لے ---" چکی جان کی آنکھیں دور سے نیم خوابیدہ ستارے کی طرح مستی میں کھوئی نظر آتیں۔ بڑے انداز سے صراحی دار گردن موڑ کر کہتا ---- "ہونہہ جسے کلیجے میں آگ لگانی ہو وہ چائے پیئے ---"

دولا حرامی چپ نہ رہتا پرانے سینما کی سیڑھیوں پر اس کا سری پائے کا دیگچہ کھلا رہتا اور چکی جان کو دعوت دیتا آنکھ مار کر کہتا۔ "مری جان! ذرا ہم پر نظر سوئی رکھنا۔ گرما گرم مال ہے۔ مغز اور کھد ملا کر دوں گا۔ آلو سہی۔ دانا جانے جلوہ آجائے گا۔"

ہجا پھاڈی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی جیجے کے قہوے خانے کو اور کبھی دولے حرامی کے دیگچے کو دیکھتا۔ پھر تھڑے سے اتر کر نالی میں پیشاب کرنے بیٹھ جاتا۔

صبح صبح ہجے پھاڈی کو کون خاطر میں لاتا؟ ہاں' دوپہر آتی اور اس کے یہاں کونڈی ڈنڈا کھڑکتا تو چکی جان وہاں چلا جاتا۔ اس وقت حاجی تنکا' گامو' جیجا' دولا حرامی اور خلیفہ جی سبھی آ جاتے۔ کبھی کبھی جانی بھی کچھ دیر کے لئے آ جاتا۔ مٹی کا پیالہ ساری رقابتیں اور کدورتیں مٹا دیتا۔

چکی جان کی ریشمی اور سرمئی آنکھوں کی دو پیالیاں سرخ نشے سے لبریز ہو جاتیں۔ ہونٹوں پر ہنسی رقص کرنے لگتی اور بہار نکھر جاتی۔ گامو گھڑا سنبھال لیتا اور ترنگ میں آکر گانے لگتا۔ دیر تک محفل جمی رہتی اور پھر ادھر چکی جان نہانے کے لئے اٹھتا اور ادھر جمی ہوئی محفل بکھر جاتی۔

جسے سب چاہیں اسے ایک آدمی کیسے بس میں لائے۔ حاجی تنکا یہی غنیمت سمجھتا کہ چکی جان اس کی دکان پر آبیٹھتا اور دکانداری کو چار چاند لگا دیتا ای دکان' اسی تھڑے اور اسی چوکی پر جہاں اب چکی جان بیٹھتا ہے۔ کبھی جانی بیٹھتا تھا' لیکن اتنی بکری کبھی نہیں ہوئی۔ اب حال یہ تھا کہ پانوں کی ڈھولی دو دن میں غائب اور کم از کم سگریٹ کا ایک بڑا ڈبہ بھی۔ سوڈا لیمن الگ درجنوں کے حساب سے اٹھتا۔ ایک پھل ہی نہیں بکے۔

چکی جان کا مزاج درویشانہ تھا۔ اس میں لالچ تو رتی بھر نہ تھا۔ بازار والوں سے یوں پیش آتا جیسے یہ اس کے عزیز ہوں جیجے کی چائے' گامو کے پھل اور دولے حرامی کے پائے رائیگاں نہیں گئے۔ وہ ان عزیزوں کا حق پہچانتا اور ادا کرتا اگرچہ یہ لوگ چوبارے پر خالی ہاتھ آتے لیکن جو چاہتے پالیتے۔ ہجے پھاڈی کا قرض اس کی دکان میں جا کر ادا کیا جاتا۔ رہا حاجی تنکا کا معاملہ سو وہ گھر کی بات تھی۔

رات کو بارہ ایک بجے جا کر بازار سونا پڑتا اور بیوپار بند ہوتے علاقے میں دو سینما تھے کوئی ان کے حساب سے دکان بڑھاتا تو رات کے دو بجے سے پہلے فارغ نہ ہوتا جس دن اتفاق سے مندا رہتا اس دن حاجی تنکا سینما کے حساب سے دکان بند کرتا ورنہ پہلے ہی فارغ ہو کر چکی جان کے چوبارے میں جا کر سو رہتا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد نیند بڑی پیاری لگتی' لیکن زندگی فقط نیند ہی تو نہیں۔ حاجی تنکا جانتا تھا کہ بعض راتیں ایسی بھی آتی ہیں جب نیند حرام ہو جاتی ہے ایسی راتوں میں صرف تین چیزوں کی موجودگی ضروری خیال کی جاتی ان میں سے ایک چیز وہ خود تھا' دوسری چیز چکی جان اور تیسری شراب۔ شراب کی اس کے یہاں کمی نہ تھی کیونکہ وہ اس کی بلیک کرتا تھا۔

چکی جان کو حاجی تنکا کی ذات سے اور تو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچتا۔ ہاں اتنی بات تھی کہ ہر وقت کی غم خواری کو ایک ساتھ میسر تھا۔ وقت بے وقت وہ آڑے آ سکتا تھا۔ ویسے تو خدا کے فضل سے محلے میں کتنے ہی ایسے تھے جو اس کے اشارۂ ابرو پر جان چھڑکنے کو تیار تھے لیکن وہ اپنا دکھڑا ہر ایک سے کیسے کہہ سکتا تھا۔

چکی جان کو لمبا چوڑا غم نہ تھا پھر بھی کبھی کبھار اپنے آپ کو اس بھری پری دنیا میں اکیلا اکیلا محسوس کرنے لگتا۔۔۔۔۔۔ جیسے کوئی اس کا درد مند نہ ہو' جیسے وہ دور سمندر کے اس پار کھڑا ہو جدھر سے جہازوں کا گزر نہ ہو جیسے اس کے شاندار حال میں اداس اداس مستقبل جھانک رہا ہو۔ وہ سوچتا کہ کوئی آفت نہ آ جائے اور اس کی سہانی زندگی کا شیرازہ نہ منتشر کر دے۔ گاہے گاہے اسے یہ فکر بھی دامن گیر ہوتا کہ چند سال بعد جب اس کے چہرے کے بالوں میں سختی آ جائے گی اور ان کی کھونٹیاں نکالنے میں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہو گی پھر اس کا کیا حشر ہو گا۔ ابھی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ تھوڑی پر چند بال تھے۔ موچنا لے کر بیٹھ جاتا تو چند منٹ کے اندر اندر انہیں صاف کر دیتا اور جلد یوں نکل آتی جیسے چودھویں کی چاندنی میں نکھری ہوئی گلاب کی پتیاں جیا اسے تازہ ڈبل روٹی کی طرح ملائم خیال کرتا اور گاموانناس کے گودے کی طرح نرم و لذیذ۔ ایسی اداسی کے عالم میں چکی جان گم سم حاجی تنکا کی دوکان پر جا بیٹھتا اور ہولے ہولے باتیں کر کے جی بہلاتا۔ حاجی تنکا اس کا مزاج آشنا تھا۔ اسے اداس دیکھ کر خود بھی اداس ہو جاتا اور اداسی کے یہ دونوں مجسمے ایک دوسرے کے بڑے ساتھی معلوم ہوتے۔

دولت سب سے بڑی چیز سہی لیکن چکی جان اس سے بھی بے نیاز تھا۔ دولت پیدا کرنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا' پر اسے وہ ہاتھ کا میل سمجھتا اور شیخ شریف مہینے کے مہینے کرایہ لینے آتا تو وہ نہایت بے پروائی سے نوٹ اٹھا کر پھینک دیتا۔ جنہیں شیخ شریف اس احتیاط سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا جیسے ان پر اعتبار نہ ہو۔ جیسے یہ بھاگے جا رہے ہوں۔ جسے چکی جان ہاتھ کا میل سمجھتا اسے شیخ شریف جان سے زیادہ عزیز جانتا۔ یہی ہاتھ کا میل تھا جو ہر سال گچ گارے میں تبدیل ہو کر دکانوں' چوباروں اور کوٹھوں کی شکل اختیار کر لیتا اور پھر ان کے ذریعے نئے سرے سے ہاتھ کا میل جمع ہونے لگتا۔ اسی ہاتھ کے میل کے طفیل اس نے موٹر خریدی جسے وہ تب استعمال کرتا جب اسے بڑے لوگوں سے ملنے جانا پڑتا ورنہ اپنی کٹڑی میں تو وہ یوں مسکین اور مفلس بنا رہتا جیسے اس کے پاس موٹر ہو ہی نہیں سکتی جیسے یہ بھی اس کٹڑی کی کسی نہایت معمولی کوٹھڑی میں رہنے والا "دہاڑی دار" مزدور ہو۔ جیسے یہ بھی کسی بوسیدہ دیوار کی ٹوٹی پھوٹی اینٹ ہو۔ چکی جان کے ہاں بھی بڑا میل تھا اور جانے یہ کہاں کہاں سے چھٹ چھٹ کر آتا۔ اگر کوئی اس چوبچے کا کیمیائی تجزیہ کرتا جو چوبارے کے پرنالے کے عین نیچے واقع تھا اور جسے منگو صبح دن میں تین چار بار صاف کرتا تو شاید کچھ نتیجہ نکلتا۔

شروع شروع میں چکی جان نے پیسے کی پروا کی اور اس سلسلے میں حاجی تنکا کا احسان اٹھاتا رہا چوبارے کی مرمت بھی اسی نے کروا دی لیکن بہت جلد اس کے یہاں دھن برسنے لگا اور وہ غنی ہو گیا۔ اب حاجی تنکا کی پیسوں والی صندوقچی پڑی رہتی اور چکی جان اسے ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ روپے کے بل پر حاجی تنکا اسے نہ جیت سکتا تھا ہاں' پیسے کے بغیر اس کا دل موہ لیتا تو اور بات تھی پیار بڑی چیز ہے۔ پہلے تو اس نے چکی جان کو چوبارہ لے کر دیا' پھر اسے اپنا اڈہ دیا' چوبارے کے سنگ ڈیرے ڈالے اور پھر دکان بھی اسے سونپ دی جس دن وہ سگریٹ کا کوٹا لینے اور سودا سلف خریدنے جاتا تو چکی جان کو اپنی جگہ پر بٹھا جاتا۔ یوں بھی کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے تھک جاتا اور سوٹا لگانے بودی سائیں کے تکیے میں چلا جاتا تو چکی جان کو بٹھا جاتا۔ چکی جان بے تکلفی سے صندوقچی سے پیسے نکال کر فقیروں اور بندر نچانے والوں کو دے دیتا۔ کبھی کبھی دکان پر حقے کا تمباکو ختم ہو

تو جیب سے دام نکال کر تمباکو منگواتا اور لانے والے چھوکرے چھوکری کو اکنی ادھنی تھما دیتا۔

حاجی تنکا نے کھانے پکانے کا بندوبست بھی چوبارے ہی پر کر رکھا تھا۔ وہ اس کام میں طاق تھا۔ جانی بھی بڑا کاریگر لیکن حاجی تنکا کا لوہا۔ جب کبھی جانی بیمار پڑا تو اسی نے چولھا چکی سنبھالا۔

ادھر بلو قصائی نے ریڑے سے گوشت اتارا اور ادھر حاجی تنکا پہنچا سب سے اچھی بوٹی چھانٹ کر لاتا وہ پہر کو ہانڈی تیار کر کے چکی جان کے سامنے لا دھرتا۔ دونوں مل کر کھا لیتے۔

جانی بڑا ہی گردے والا تھا اور کوئی ہوتا تو جان ہلکان کر بیٹھتا۔ وہی تھا کہ آنکھوں کے سامنے سارا تماشا دیکھتا اور اف تک نہ کرتا۔ حاجی تو چکی جان کا اتنا گرویدہ ہو چکا تھا کہ جیسے دونوں کسی فلم کے ہیرو اور ہیروئن ہوں جانی اس کا پیاسا تھا لیکن اس پر اس نے کبھی اتنی جان نہ کی تھی۔

ضبط کرنے کو تو کر لیا جاتا ہے۔ لیکن انسان آخر پتھر تو نہیں۔ جس دن چکی جان ریشمی شلوار سلوانے کی نیت سے جانی کی کوٹھڑی میں گیا جانی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سانپ کا جھلملاتا ہوا لال ٹکڑا کا تند شعلہ بن کر اس کی کھوپڑی میں داخل ہو گیا۔ غصے کا طوفان اٹھا اور موسلا دھار برسنے لگا پہلے تو اس نے چکی جان کو بے تحاشا گالیاں سنائیں اور پھر کمر سے پکڑ کر اسے زمین پر پٹخ دیا۔ سینے پر چڑھ بیٹھا اور دانتوں سے کاٹ کاٹ کر اسے لہو لہان کر دیا۔

شلوار اور قمیض کی دھجیاں ہوا کے شریر جھونکے اڑا کر لے گئے۔

سانپ کی چندیاں گلے میں لپٹائے اور خاک و دھول میں سن کر جب چکی جان آیا تو حاجی تنکا کے سامنے رو دیا اور کہنے لگا۔۔۔۔۔۔ مجھے اللہ کوڑھی کر دے جو میں جھوٹ بولوں۔ مولا علی کی قسم! میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ شلوار سینے کو ضرور کہا تھا مجھے کیا پتہ تھا اسے مجھ سے بدلہ لینا ہے۔ کسی اور سے شلوار سلوا لیتی۔ جانی کا ٹھیکہ تھوڑی تھا۔

حاجی تنکا نے جانی کا نام سنا تو جل بھن گیا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جانی کی یہ مجال کہ اس کے یار پر ہاتھ اٹھائے۔ اس نے برف توڑنے کا سوا لیا اور چھلانگ لگا کر دکان سے اترا' لپک کر جانی کی کوٹھری کی طرف گیا۔ جانی آنے والے طوفان سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے دور سے حاجی کو آتے دیکھا تو مضبوطی سے کواڑ بند کر لیا۔ حاجی کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے زور سے لات ماری لیکن کواڑ بڑا ڈھیٹ نکلا نہ کھلا۔ ہاں پاؤں میں چوٹ آ گئی۔ حاجی نے طیش آلود لہجے میں جھلا کر کہا۔۔۔۔۔۔ "رانی خان کے سالے! آج میں تیرا پیٹ پھاڑ کر دم لوں گا تو اپنے آپ کو بھولو پہلوان سمجھتا ہے۔ میں یخنی بنا دوں گا۔ تیرے حمایتوں کی ماں..... میں نے تیری بوٹی بوٹی نہ کی تو مجھے حاجی تنکا نہ کہنا' حرام کا جنا کہنا!"

شیخ شریف کا خدا بھلا کرے جس نے مضبوط کواڑ لگوا رکھے تھے ورنہ آج جانی کا پیٹ ادھڑ جاتا۔

دیر تک گوڈا گرم کر کے چکی جان حاجی تنکا کے پاؤں کی ٹکور کرتا رہا۔ اس وقت تو غصے کا بھوت سر پر سوار تھا پتہ نہ چلا لیکن اب درد نے بے چین کر دیا۔ جب رات بھر ٹکور کرنے کے بعد بھی درد نہ گیا تو حاجی بسے گوجر کو پاؤں دکھایا۔ موچ آ گئی تھی بسے گوجر نے پاؤں کو بے طرح ہلا دیا تو حاجی کی چیخیں ہی تو نکل گئیں معاملہ لمبا پڑ گیا۔

جیجے کو جانی کی حرکت اچھی تو نہ لگی لیکن وہ اسے اتنا خطاوار نہ سمجھتا۔ ایک لحاظ سے تو جانی حق پر تھا۔ چکی جان لاکھ بے عیب سہی لیکن جانی کا خون اس کی گردن پر تھا اور اگر جانی نے اپنے خون کا بدلہ لیا تو کیا برا کیا اسے اس کا حق پہنچتا تھا۔ پھر حاجی تنکا کہاں سے چکی جان کا خیر خواہ تھا چکی جان کا بدلہ لینے کو ایک حاجی ہی رہ گیا تھا۔ جیجا بھی تو بدلہ لے سکتا تھا اور اچھی طرح سے لے سکتا تھا۔ حاجی تو بالکل پاجی تھا۔ ایک جھانپڑ سے تو جانی کی جان نکل جاتی اور یہ ماں کا لاڈلا پہلوان سو لے کر چلا گیا جیسے یہی تو بازار میں اکیلا غنڈہ تھا باقی تو جیسے سب شدے تھے۔

چکی جان چائے پینے آیا تو جیجے نے حسرت آلود لہجے میں شکایتاً۔ کہا۔۔۔۔ "پیارے ہم بھی تیرے جن ہیں۔ حاجی ہم سے بڑا غنڈا تو

نہیں ۔ ہمیں کہنا تھا ۔ ہم جانی سے بدلہ لے کر دکھاتے ۔ اسی ماں کے مام بشک نے تو ٹانگ بھی تڑوائی اور بدلہ بھی نہ لیا ۔ بھلا جانی بھی کوئی شے ہے ۔ اس کی کیا ہستی ہے جو تیری طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھے ۔ کلیر والے کی سوں! میں اس کا لہو پی جاؤں ۔ تو کہہ تو سہی ۔"

پتلی جان کی آنکھوں میں خوف جھلکا اور دل میں رحم کی لہر دوڑ گئی ۔ وہ بولا ۔۔۔ "جس کا گھر اجڑ جائے ہو وہ کیا کچھ نہیں کرتا جانی کا اس میں کیا قصور ہے؟ اسے تو حاجی پر رنج تھا ۔ غصہ مجھ پر نکالا ۔"

"تیری خیر ہو! صابر پیر کی قسم! جانی بے قصور ہے ۔ کوئی مرد ہوتا تو حاجی کا اندر پیٹا باہر کر کے چھوڑتا ۔"

حاجی کا روگ بڑھتا ہی گیا ۔ بسا گوجر بڑا استاد تھا ۔ پہلوان اترے ہوئے جوڑ اسی سے چڑھواتے لیکن قسمت کی بات ہے' حاجی تنکا کی ٹانگ ٹھیک نہ ہوئی ۔ اب نہ تو وہ پابندی سے قصائی کی دکان پر جاتا اور نہ گرم جوشی سے چکی چولھا کرتا' گھر کا شیرازہ پریشان ہونے لگا ۔

ہر وقت ٹخنے پر پٹیاں لپٹی رہتیں اور وہ آہستہ آہستہ کراہتا رہتا ۔ دکان پر بیٹھے بیٹھے پیترے بدلتا اور دباتا سہلاتا رہتا ۔

وہی پتلی جان تھا ۔ وہی چوبارہ' وہی فرصت شب تھی اور وہی اندھا جنون لیکن رچاؤ نہ رہا تھا

دکان پر سکون نہ رہا بلکہ بیمار گھر کا سا ماحول پیدا ہو گیا ۔ پتلی جان کا دل کمزور تھا اور اس کی طبیعت نازک تھی ۔ جب ذرا گھبراہٹ محسوس کرتا اٹھ کر بازار میں گھومنے لگتا ۔ جانی یہ تغیر بڑے اشتیاق سے دیکھتا ۔

جب تک دکان پر ٹھٹھا مخول کرنے والے جمع رہتے محفل جمی رہتی ۔ پتلی جان مزے سے بیٹھا رہتا لیکن جب یہ چلے جاتے وہ دکان چھوڑ کر ادھر ادھر کھسک جاتا ۔ حاجی تنکا یہ سب کچھ دیکھتا اور دل ہی دل میں کڑھتا لیکن کچھ نہ کر پاتا ۔ وہ اب ایک لمحے کے لئے بھی پتلی جان سے الگ نہ رہنا چاہتا تھا ۔ پتلی جان پر وہ فریفتہ ہو چکا تھا ۔ اس کی خاطر اس نے اپنا گھر اجاڑا تھا ۔

حاجی تنکا کے دل میں ایسی ایسی ٹیسیں اٹھتیں جیسے کوئی اسے بار بار سولی چڑھا رہا ہو ۔ وہی برف کا سوا جو اس نے جانی کا مغز چھیدنے کے لئے اٹھایا تھا آنکس کی طرح اس کی کھوپڑی میں چبھتا رہتا اس ہر وقت یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی نشتر لے کر نہایت بے دردی سے اس کا سینہ کھرچ رہا ہو ۔ پاؤں کا درد پہلے اسے رات رات بھر سونے نہ دیتا اب اس میں ایک نیا درد' نئی ٹیس اور نئی تڑپ پیدا ہو گئی ۔

پتلی جان کی زندگی بھی جمی جمائی نہ رہی ۔ پہلے گھر کا کھانا میسر تھا ۔ تنہائی محسوس ہوئی تو حاجی تنکا کی صحبت میں سکون مل جاتا تھا مگر اب تو جیسے ہر شے گرد و غبار کی طرح بکھر کر رہ گئی تھی ۔ حاجی تنکا کی زندگی میں جو بد نظمی اور بد مزگی پیدا ہوئی اس کا اثر پتلی جان پر بری طرح پڑا ۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کا کیا علاج کرے اس نے آوارگی بڑھا دی' گامو کی دکان' جیجے کے ہوٹل اور بھیجے پھاڈی کے اڈے کے دن بھر چکر کاٹتا لیکن طبیعت سیر ہوتی نہ چین ملتا۔ ہاں اگر کچھ چین ملا تو جانی کو وہ یہ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا کہ پتلی جان حاجی تنکا کی دکان چھوڑ کر جیجے کے ہوٹل میں اٹھنے بیٹھنے لگا ہے۔ اب وہ وہیں کھانا کھاتا اور وہیں منڈلی جماتا۔ دوپہر کو یہ منڈلی اٹھ کر بھیجے پھاڈی کے یہاں جم جاتی۔ وہی روز کا سماں بندھتا۔ بھنگ گھٹتی' دور چلتے' گھڑا بجتا تانیں اڑتیں اور۔۔۔ اس کے بعد جب پتلی جان نہانے کی غرض سے اٹھ کر آ جاتا تو محفل کا شیرازہ بکھر جاتا۔

حاجی تنکا کی دکان کے بعد جیجے کا ہوٹل غنیمت ثابت ہوا اور پتلی نے وہاں سکون محسوس کیا۔ گپ باز وہاں آ جاتے اور یوں وقت کٹ جاتا۔ کبھی کبھار حاجی کی دکان پر بھی جا بیٹھتا لیکن وہاں اس کا جی نہ لگتا۔ ایک تو حاجی آہستہ آہستہ کراہتا رہتا اور دوسرے شکایتوں کا دفتر کھول بیٹھتا۔ پہلے کبھی اس نے ایسا نہ کیا تھا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا تھا اور وہ ہر ایک کو برا بھلا کہنے لگ گیا تھا۔ اس نے گامو' جیجے اور بھیجے پھاڈی کے خلاف خوب زہر اگلا بلکہ پتلی جان کی بے وفائی کا بھی گلہ کیا۔

جانی کے ڈوبے ہوئے دل میں امید کی ہلکی ہلکی لہریں ابھریں اور وہ سمجھا کہ مرجھائے ہوئے پھولوں میں جان پڑ گئی ہے۔ ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں سے پھر کونپلیں پھوٹ پڑی ہیں اور سوکھی کیاریوں میں شادابی آ گئی ہے۔ اس نے امید کی ایک ایسی دنیا دیکھی جس میں تازہ تازہ مہک بس گئی ہو۔ آس کا سہارا لے کر اس نے خلیفہ جی کے پاؤں پکڑے اور ان سے کہا۔۔۔ "آپ میرے مرشد ہیں۔ دین و دنیا میں مجھے صرف آپ ہی کا آسرا ہے۔ میں تو تھک ہار چکی ہوں۔ جیسے بھی بنے آپ میری مدد کریں۔ حاجی کو سمجھائیں۔ وہ خواہ مخواہ اپنی مٹی پلید کر رہا ہے۔"

پہلے تو خلیفہ جی نے خیال کیا کہ یہ معاملہ ان کے اختیار سے باہر ہے اور انہوں نے کوشش بھی کی تو حاجی اور جانی کی بچھڑی ہوئی جوڑی ے نہیں ملے گی لیکن جب جانی کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ضرور مداخلت کریں گے۔

رات گئے حاجی تکا اداسیوں کی گھمبیر گھٹاؤں میں گھرا بیٹھا تھا جیسے اسے سمندر نے دبوچ لیا ہو اور جیسے وہ اس تنہائی سے مرا جا رہا ہو۔ .ی نے آ کر اسے اونچ نیچ سے واقف کرانا چاہا لیکن وہ تو تمام اونچ نیچ سمندر کی لہروں میں کھو چکا ہو۔ اب تو اس کے سامنے گہرائی ہی گہرائی ۔ وہ کسی قیمت پر جانی کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسے بِلّی جان سے محبت تھی۔

خلیفہ نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور محبت کے اسرار سے کماحقہ واقف تھا۔ اس نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔۔ "حاجی جی! بن کا ں پنجرے میں قید نہیں رہ سکتا۔ بِلّی جان کو تم کیا سمجھتے ہو؟ آزاد طبیعت کی بندی ہے۔ اسے کسی سے محبت نہیں اور سب سے ہے۔ اسے نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی آدمی کی صفت الگ الگ ہوتی ہے۔ بِلّی جان کو خدا نے نرالی طبیعت دی ہے۔ اس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کو رکھے اور ایک کو ناراض کرے۔ اس کی تو ایسی طبیعت ہے کہ خوش رکھے تو سبھی کو خوش رکھے۔ میری مانو' جانی سے صلح کر لو! کہو تو پاؤں دوں۔ معافی منگوا دوں وہ تمہارے پاؤں دھو دھو کر پئے گا۔ مولا دستگیر جانے میں نے کبھی کسی کو غلط صلاح نہیں دی۔ مجھے بِلّی جان سے بیر ں لیکن جو سچی بات ہے وہ سچی ہی ہے اور میں نے کہہ دی ہے۔"

اس گفتگو نے حاجی تکا کو سوچ میں ڈال دیا۔ اس نے گردن جھکا لی۔ پہلے تو یوں لگا جیسے وہ کچھ کہے گا ہی نہیں۔ جیسے وہ بولنے کی تاب ہی ں رکھتا لیکن تھوڑی دیر بعد بولا۔۔ "جانی کا نام نہ لو خلیفہ! اس نے میری زندگی برباد کر کے رکھ دی ہے۔ اس کی تو میں شکل بھی نہیں دیکھنا ۔ مجھے بِلّی جان سے محبت ہے۔ آج نہیں تو کل اسے پا لوں گا۔ مجھے پتہ ہے کہ لوگ اسے بہکا رہے ہیں لیکن اسے ضرور ٹھوکر لگے گی۔ جو ۔ اسے بہکا رہے ہیں اسے دھوکا دیں گے پھر بِلّی جان میرے پاس آئے گی۔"

خلیفہ جی کے جانے کے بعد حاجی تکا کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے یہ سن کر دکھ ہوا کہ بِلّی جان کی آزاد مزاجی اسے ایک کے ساتھ وفا کرنے بور نہ کر سکے گی۔ وہ تو اس فکر میں تھا کہ کسی طرح بِلّی جان کو سب کے پنجے سے رہائی دلا کر اپنے بس میں لے آئے۔

خلیفہ جی نہ آتے تو اچھا تھا۔ انہوں نے آ کر تو اور بھالے مار دیئے۔ پہلے ہی وہ کانٹوں کی سیج پر لوٹ رہا تھا مگر اب تو یہ کانٹے اس کی ح کو بھی چھیلنے لگے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ کراہنے لگا۔ جوں جوں وہ سوچتا بِلّی جان کی محبت تیکھی ہوتی جاتی اور تیزی سے چبھنے لگتی۔ ایسا لگتا ے وہ آندھی کا پیچھا کر رہا ہو اڑتے ہوئے بٹیر کو بلا رہا تھا لیکن دانہ تو تھا نہیں پھر بٹیر کیسے پھنسے؟ خلیفہ جی نے رہی سہی امید بھی توڑ دی۔

دکان سونی پڑی رہتی جس کے دم قدم سے رونق تھی وہی نہ رہا تو رونق کہاں سے آئے؟ گاہکوں کی آمد کم ہو گئی اور اب تو وہی آتے جو ی و ضعداری نبھائے جا رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی اداسی کے ساتھ حاجی کا دل بیٹھ بیٹھ جاتا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے روشنی گل کر دی اور طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل رہا ہو۔ ڈوبے ہوئے دل نے بڑی مشکل سے انگڑائی لینا چاہی لیکن چر مرا ہو کر رہ گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے ر وہ دکان بند کر کے شیر شاہ کی درگاہ پر چلا گیا۔

درگاہ پر جا کر اس کے دل میں روشنی کی ایک کرن پھوٹی اور وہ بھنور سے نکل کر کنارے آ لگا۔ اس نے خانقاہ کے کنویں سے پانی نکالا اور سو کیا۔ نہایت خشوع اور خضوع سے درگاہ میں داخل ہوا۔ آج سے چند سال پہلے جب وہ حج کرنے گیا تھا تب بھی اس کے دل میں اسی طرح قیدت کا طوفان اٹھا تھا۔ اس نے تعویز کے قدموں میں جا کر ایک طویل سجدہ کیا اور اپنی محبت کی کامیابی کی دعا مانگی۔ اسے پورا پورا یقین تھا کہ ائیں شیر شاہ اس کی سنیں گے اور مراد پوری کر کے رہیں گے۔ ساری رات کبھی وہ سجدے میں جاتا اور کبھی بیٹھ کر ان دو چار آیتوں کو دہراتا جو ں نے حج پر جانے سے پہلے حفظ کر لیں تھیں۔ ساری رات یونہی گذر گئی اور صبح ہوتے ہوتے اسے نیند آ گئی۔ دن چڑھے تک اس کی آنکھ نہ کھلی۔ وہ شاید یونہی پڑا سویا رہتا لیکن ایک زائر نے آ کر اس خیال سے جگا دیا کہ درگاہ کی حدود دعا مانگنے کے لئے ہے سونے کے لیے نہیں۔

رت جگے سے اس کا سارا بدن درد کرنے لگا۔ وہ دکان پر جانے کی بجائے برابر کے تکیے میں چلا گیا اور چرس کا سوٹا لگا کر وہیں سو گیا۔

دوپہر کے وقت بیدار ہوا تو اٹھ کر دکان پر آگیا۔

جیجے کے ہوٹل میں قہقہوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ حاجی کی طبیعت جو رات بھر کی ریاضت سے کچھ ہلکی ہو گئی تھی۔ قہقہوں کی اس بوچھاڑ سے پھر بھر گئی۔ ماحول پھر غبار آلود ہو گیا اور ایک کڑا بوجھ سینے پر آگرا۔ قہقہوں میں جیجے اور چکی جان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ چکی جان نے بے نیازی کی حد کر دی۔ حاجی تنکا رات بھر غائب رہا اور اس نے خبر تک نہ لی۔ حاجی تنکا نے دل میں کہا۔ اس ظالم کو ذرا بھی لگن ہوتی تو ضرور اسے ڈھونڈ نکالتا اور شیر شاہ کے مزار پر جا پہنچتا۔ دونوں اکٹھے ہوتے اور مل کر دعا مانگتے تو کتنا مزا آتا۔ آخر شیر شاہ کا مزار ایسا کون میلوں دور تھا۔ بڑی مسجد کے برابر قلعے کے پیچھے ہی تو تھا۔ بہت ہو گا تو دس منٹ کا رستہ ہو گا۔ چکی جان کو معلوم تھا کہ حاجی تنکا دکان سے اٹھ کر جاتا تو صرف تین جگہ ــــ ایک سودا سلف لینے بازار دوسرے سوٹا لگانے بودی سائیں کے تکیئے میں اور تیسرے دعا مانگنے شیر شاہ کے مزار پر۔ اسے شیر شاہ سے بلا کی عقیدت تھی۔ زندگی میں کتنی بار ان کے کمال دیکھ چکا تھا۔ ایک دفعہ جب گنجا ٹھوٹھی جھانسا دے کر جانی کو بھگا لے گیا تھا تو شیر شاہ ہی کی مہربانی سے جانی بخیر و عافیت واپس آیا تھا پھر جب چوری ہوئی تو شیر شاہ نے نظر کرم کی چور پکڑا گیا اور مال برآمد ہو گیا۔

حاجی چپ چاپ دکان پر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جیجا چکی جان کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوٹل سے نکلا۔ اگر گامو پیچھے سے آکر گھونسا رسید نہ کرتا تو شاید یہ سلسلہ دیر تک جاری رہتا۔

جیجا اور چکی جان بھیجے پھاڈی کے اڈے پر چلے گئے۔ حاجی تنکا دیکھتا ہی رہا اسے خیال تھا کہ چکی جان آئے گا اور حال پوچھے گا۔ لیکن کہاں۔ چکی جان تو ایسا غائب ہوا کہ جب وہ بھیجے پھاڈی کے اڈے سے اٹھ کر سیدھا چوبارے پر چڑھ گیا تو حاجی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ حاجی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اگلے روز چراغوں کا میلہ تھا۔ چراغوں کے میلے سے حاجی کو بڑا عشق تھا۔ اس نے کبھی میلہ نہیں چھوڑا تھا۔ جب بھی میلہ آتا وہ ایک ہفتہ پہلے سے تیاریوں سے میں لگ جاتا جیجے 'گامو' بھیجے اور سب دوستوں کو بلاتا اور پروگرام تیار کرتا۔ مہینے بھر پہلے سے روپیہ جمع کرنے لگتا۔ بڑی سرگرمی دکھاتا۔ ایک دن پہلے اس کی پارٹی شالامار پہنچ جاتی۔ یہ لوگ اچھی سی اچھی جگہ دیکھ کر خیمہ لگاتے اور ڈیرے جماتے گانے کی محفل جمتی۔ چائے کے دور چلتے۔ مرغ بھنتے اور خوب گہما گہمی رہتی۔ کبھی یہ جوش و خروش تھا اور اب یہ حالت تھی کہ کسی نے بھولے سے بھی تو نہیں کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے۔ دنیا کیسی طوطا چشمی تھی گو اس میں جانے کی ہمت نہ تھی لیکن چکی جان دعوت دیتا تو وہ چلنے کے لئے تیار ہو جاتا اور پاؤں کا درد بھول جاتا۔

زوال کے بعد چکی بازار میں شور و غل ہونے لگا۔ گامو نے جیجے کو اور جیجے نے چکی جان کو آواز دی۔ تھوڑی دیر کے بعد بھیجے پھاڈی نے تھڑے پر کھڑے ہو کر بازار کا جائزہ لیا۔ دولا حرامی خوانچہ سنبھال کر جا رہا تھا۔ بھیجے پھاڈی نے کہا۔ "اوئے سالے! ابھی تو نے دکان بڑھانی ہے۔ تیار کب ہو گا اور کب میلے کو جائے گا؟"

دولے نے نہایت بے پروائی سے کہا ـــــ "ماں کے پہلوان! تجھے بڑی جلدی ہے تو تو بے شک چلا جا۔ میں تو اب جا کر تیاری کروں گا۔ مجھے ساتھ لے لیا تو خیر صلا۔ نہیں تو میں اکیلا بعد میں آجاؤں گا اور شالامار میں تم سے ملوں گا۔"

"تیری خوشی پیارے۔ ہم تو تیار بر تیار ہیں ـــــ"

دولا حرامی خوانچہ اٹھا کر گھر چلا گیا اور بھیجا پھاڈی تھڑے سے اتر کے نیچے نالی میں پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔

گامو ہرے رنگ کی ملتانی دھوتی' اس پر بوسکی کا نیا کرتہ اور گلابی ریشمی مندیل پہن کر نکلا۔ گامے شاہی نئی سرخ جوتی چمک رہی تھی۔ گلے میں سونے کا کنٹھا بہار دکھا رہا تھا۔ مونچھیں نوکوں تک بٹی ہوئی تھیں جیسے پولیس کے سپاہی ڈیوٹی پر کھڑے ہوں۔ چکی جان نے چوبارے سے بیٹھے بیٹھے اسے دیکھا اور مسکرانے لگا۔ گامو نے زبان میں دو انگلیاں ڈال کر اس زور سے سیٹی بجائی کہ چکی بازار گونج اٹھا۔ جیجا سیٹی سنتے ہی دکان سے باہر نکل آیا اس کے ترچھی لمبے شملے والی لنگی اور ڈھیلی ڈھالی شلوار فراغت اور چھٹی کا اعلان کر رہی تھی۔ ایک جیب میں باریک سگ

...ں رومال آدھا اندر اور آدھا باہر تھا۔

گامو نے سگریٹ کا دھواں منہ سے اڑاتے ہوئے کہا۔ "اوئے یار! میلے کب چلے گا؟۔"

جیجے نے چنگی جان کے چوبارے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔ "جب ہمارا دلبر چنگی جان چلے گا۔"

حاجی تنکا کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ ایک تو اس کا میلے سے رہ جانا ہی کچھ کم قیامت نہ تھا پھر چنگی جان کا ان سب کے ہجوم میں مل کر ...اور بھی غضب تھا کوئی کہاں تک صبر کرے؟ حاجی تنکا کو تو کسی نے انگاروں پر ڈال دیا۔

چنگی جان ابھی تک تیار نہ ہوا تھا۔ وہ کھڑکی میں بیٹھا دوسروں کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ بال بکھر رہے تھے جیسے رات سایہ ڈال رہی ہو۔ کھلے ...ن سے چکیلے بدن کا ننگا حصہ نظر آ رہا تھا جس نے شاید یدبیضا سے بھیک مانگ لی ہو۔ بھنگ پینے کے بعد سستی سی آ گئی تھی اور اس کا باسی ...چکی مسکراہٹوں کے بوجھ سے دب رہا تھا۔ اس کے نشے سے لبریز بڑی بڑی آنکھیں پورے بازار پر اس طرح پڑ رہی تھیں جیسے آفتاب ...ے پر کرنیں نچھاور کر رہا ہو۔ وہ کبھی گامو کو اور کبھی جیجے کو دیکھتا۔

جیجے پھاڑی نے سب کو مات کر دیا۔ اسے ساجی درزی نے اپنے خاص الخاص مشورے سے میلے کے لئے بش شرٹ سی دی اس نے اسے ...ر ہی پہن لیا حالانکہ ساجی نے پتلون بھی تیار کر کے دی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ ڈال کر نکلا تو بالکل گلفام نظر آیا۔

حاجی سب کے ٹھاٹ دیکھ کر جل بھن گیا۔ وہ ہرگز نہ چاہتا تھا کہ چنگی جان ان کے ساتھ جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ میلے کا دن چنگی جان اس ...ساتھ گزارے' اس کے پہلو میں بیٹھے اسے مدت ہی ہو گئی تھی۔ آج چنگی جان اسے بری طرح یاد آیا۔ تصور کی ایک زبردست لہر اٹھی اور وہ ...کے ساتھ بہہ گیا۔

نہ دکان رہی' نہ لنگڑا پاؤں اور نہ اس کی غمگیں زندگی۔ وہ ایک خوبصورت محل سرا میں جا پہنچا جہاں چنگی جان اسکے انتظار میں بے قرار ...تھا۔ آنکھوں سے آنکھیں ٹکرائیں۔ ایک بھرپور مستی دھیرے دھیرے حیران آنکھوں سے گزر کر حاجی تنکا کے بدن میں سرایت کر گئی۔ اس ...قریب جا کر چنگی جان کو بغلگیر کیا۔ ہلکی ہلکی آنچ یوں تحلیل ہونے لگی جیسے جذبات کو دم پخت کر رہی۔ ہو قریب ہی سنہری پلنگ بچھا تھا جس پر ...ن بچھونا لگا تھا۔ بچھونا بالکل سجرا تھا اور اس پر نام کو سلوٹ نہ تھے لیکن پھر دیکھتے دیکھتے اس پر سلوٹ پڑنے لگے۔ جو سلوٹ دلوں پر پڑ رہے تھے ...سلوٹ پلنگ پر نمودار ہونے لگے تھے۔ غائب ہو گئے۔ صرف غسل خانہ سامنے رہ گیا۔

نل کھلا اور پانی یوں ٹپ ٹپ گر رہا تھا جیسے استاد انترے کے بول گا رہا ہو۔ کبھی نل کی دھار ہلکی پڑ جاتی اور گیت انترے سے نکل کر ...لی پر آ جاتا۔ غسل خانے کا کواڑ نیچے سے شکستہ تھا۔ اس لیے اندر سے پانی کے چھینٹے اڑ اڑ کر باہر فرش پر پڑ رہے تھے پلنگ پر گہرے نیلے رنگ ...یشمی غرارہ دھرا تھا۔ اس میں ازاربند بھی اسی رنگ کا پڑا تھا۔ اگر سروں کو سنہری تاروں سے گوندھا نہ گیا ہوتا تو ازاربند کا پتہ ہی نہ چلتا۔ اس ...ہلکے نیلے رنگ کی رنگ کی نین کی قمیص رکھی تھی اور برابر میں گہرے نیلے رنگ کا ڈوپٹہ پڑا تھا۔ ایک طرف سرخ پرس رکھا تھا۔ پلنگ کے نیچے ...تلے کی جوتی دھری تھی۔

گامو' جیجا پھاڑی' دولا حرامی' بودی سائیں' منجا نھوتھی' ساجی درزی اور جیجا بجلی والا سب قہوہ خانے میں بیٹھے بے قراری سے چنگی جان ...چوبارے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دولا حرامی بولا ـــــ "یار چنگی نے تو بڑی دیر لگا دی۔"

جیجے نے جواباً کہا ـــــ "معشوق کا کام دیر لگانا ہی تو ہے۔"

پھر میلے کے پروگرام پر اظہار خیال ہونے لگا۔ حسو تانگے پر بیٹھا سوٹا لگا رہا تھا اور اس کا گھوڑا بار بار ہنہنا رہا تھا۔ ساتھ ہی کرمو اپنے ...ھے پر ٹانگیں پسارے پڑا تھا۔

حسو جمائی لیتے ہوئے مایوسانہ انداز میں بولا ـــــ "استاد جیجا! کتنی دیر اور ہے؟"

کرمو نے کان کھڑے کئے۔

بیچے بجلی والے نے بڑی بے تکلفی سے دو تین چالو قسم کی گالیاں فرمائیں اور پھر کہا ۔۔۔۔ "تجھے تو دہاڑی پوری ملے گی، تجھے دیر سویر سے کیا؟"

"ہاں ٹھیک ہے، مجھے دہاڑی سے غرض ہے۔ دیر سویر سے کیا؟" ۔۔۔۔ اور اتنا کہہ کر وہ پھر سوتا لگانے لگا۔ کرمو بھی تار کا سگریٹ نکال کر پینے لگا۔

نل بند ہوا۔ پانی کی ٹپ ٹپ رک گئی۔ کواڑ کھلا۔ تپلی جان مسکراتا مسکراتا باہر نکلا اور اس کا ننگا بدن یوں چمکنے لگا جیسے چاند دھل کر نمودار ہوا ہو۔ ایک دم زور کی چیخ نکلی اور تیز چھری اس کی نرم و نازک پسلیوں میں دھنس گئی۔ بھاگ کر کوٹھے پر چڑھنے لگا لیکن حاجی تنکا نے اس دہشت زدہ گائے کو لمبے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا اور اسی ٹانگ کے نیچے دبا لیا جو لنگڑی تھی۔ اب اس میں کوٹ کوٹ کر بجلی بھر گئی تھی۔ تپلی جان فریادی گائے کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن قصاب نے رحم نہ کھایا بلکہ تیز چھری کو نرخرے پر رکھ کر حلق میں اتار دیا۔ خون کی دھار نکلی اور حاجی تنکا کے کپڑوں کو تر کر گئی۔

ایک مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے سو گئی۔

ایک پھول دھول میں مل گیا۔

تپلی جان کی لاش تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی اور سارا بازار یوں سونا پڑ گیا جیسے کبھی دلی اجڑی تھی۔

سریندر پرکاش

: سریندر کمار اوبیرائے۔

ام : سریندر وشت / سریندر پرکاش۔

ش : ۲۶ مئی ۱۹۳۰ء بہ مقام لائل پور (حال: فیصل آباد) مغربی پنجاب۔

: باقاعدہ تعلیم کہیں سے بھی حاصل نہیں کی۔

ساڑھے تین برس کی عمر میں سینڈرن اسکول' امین پور بازار' لائل پور میں داخلہ لیا تھا لیکن پہلے روز ہی ماسٹر صاحب نے ایسا تھپڑ مارا کہ پھر کبھی اسکول کا رخ نہ کیا۔ اس کے بعد آپ کے والد نے اپنی دکان پر ہی اردو کی تعلیم دینا شروع کی۔ تاجور سامری' جھنگ اور چنیوٹ کے بازاروں میں ہفتے میں ایک بار لاؤڈ سپیکر پر ریڈیو کے کمرشل کی طرز پر پروگرام پیش کرتے تھے' سریندر پرکاش بھی ان کے ساتھ ہو لیے اور ان کی لائبریری سے استفادہ کرتے رہے۔ کچھ مدت بعد آپ کے والد نے سریندر کو باری ملیگ کے چھوٹے بھائی نذیر طالب' جو کہ اورنٹل کالج' لاہور میں اردو' ریاضی اور تاریخ پڑھاتے تھے' کے سپرد کر دیا۔ سریندر نے ان کی زیر نگرانی ادیب عالم کے امتحان کی تیاری کی اور صرف دو پرچے دیئے۔ یوں یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ ایک روز نذیر طالب صاحب نے سریندر کو نجمہ نامی ایک لڑکی کا محبت نامہ دیتے ہوئے کہا کہ اس کا جواب لکھو۔ پھر یہ خطوط کا سلسلہ ایسا چلا کہ سریندر نے ساڑھے تو سو خطوط کے جوابات لکھ مارے' تب یہ راز کھلا کہ نجمہ کی طرف سے نذیر طالب صاحب خطوط لکھا کرتے تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ سریندر کی تحریر میں پختگی آئے۔

تصر حالات زندگی:

آبائی وطن چکوال ضلع جہلم تھا۔ سریندر پرکاش کے والد کارخانہ بازار لائل پور میں سوڈا واٹر فیکٹری چلاتے تھے۔ اڑھائی برس کی عمر میں ریندر کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور ساڑھے تین برس کی عمر میں ہی اسکول سے بھاگ کر انہوں نے کاروبار میں والد صاحب کا ہاتھ بٹانا شروع کر ۔ چھ سات ماہ اپنے والد کی زیر نگرانی اردو پڑھنے کے بعد تاجور سامری کے ساتھ ہو لیے۔ جنہوں نے سریندر کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا اور سریندر نے اپنا نام سریندر وشت لکھنا شروع کر دیا۔ جب والد صاحب کو اس حقیقت احوال کا پتا چلا تو انہوں نے تاجور سامری کے خلاف بیٹے کے اغوا کا یس رجسٹر کروا دیا۔ معزز لوگوں کی وساطت سے سریندر اپنے گھر واپس آئے اور بعد ازاں والد کی منشا کی مطابق نذیر طالب صاحب کی زیر نگرانی لے گئے۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ ۴۵-۱۹۴۴ء میں تاجور سامری کی تحریک پر شروع کیا' جو انہیں ٹیگور ثانی بنانا چاہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کو یکھتے ہوئے مولوی محمد شفیع (جو ان دنوں دھوبی گھاٹ لائل پور میں قیام پذیر تھے) اور نذیر طالب کے مشورے پر سریندر پاکاش اور ان کے والد مرتسر منتقل ہو گئے۔ سوڈا واٹر فیکٹری مولوی محمد شفیع صاحب نے خرید لی اور نقد رقم کی ادائیگی امرتسر میں کی۔ پندرہ روز امرتسر ریلوے اسٹیشن پر بے یار و مددگار پڑے رہنے کے بعد بذریعہ ہوائی جہاز دہلی چلے گئے جہاں سریندر پرکاش کے بڑے بھائی ملازمت کرتے تھے۔ دہلی کے ایک بینک ں سریندر پرکاش کے والد کا بیس پچیس ہزار روپیہ موجود تھا۔ کچھ مدت تو وہ روپیہ کام آیا اور اس کے بعد باپ بیٹوں نے کناٹ پلیس میں کنگھیاں ر چاندنی چوک میں کیلنڈر بیچنے شروع کیے۔ کچھ مدت بڑے تیوہاروں پر مندروں کے باہر چھوٹی چھوٹی دکانیں چلائیں اور بالآخر دہلی میں ایک بار؛

سوڈا واٹر فیکٹری قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس زمانے میں سریندر پرکاش کا اٹھنا بیٹھنا وشواناتھ درد، ہنس راج رہبر، پرکاش پنڈت، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی اور پریم ناتھ پرواز کے ساتھ ہوا۔ بعد ازاں اس گروپ میں پنڈت ہری چند اختر اور دیویندر ستیارتھی بھی شامل ہو گئے۔ یہ سب لوگ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ممبر تھے۔

وقت نے ایک بار پھر کروٹ لی، سوڈا واٹر فیکٹری بند ہو گئی اور سریندر کا خاندان سنگرود چلا گیا۔ دریں اثنا سریندر اپنے ماموں کے ہاں لدھیانہ چلے آئے لیکن ایک دن ان سے بھی جھگڑا ہو گیا اور گھر چھوڑ کر لدھیانہ میں ہی سائکل رکشا چلانے لگے۔ ۱۹۶۳ء تک دہلی سے دور رہنے کے سبب لکھنے لکھانے کا کوئی کام نہ کیا۔ دہلی واپسی پر وشواناتھ درد کے ادبی مجلّہ " تخلیق " سے ادبی زندگی کا دوبارہ آغاز ہوا۔ ایک مدت سے بمبئی میں قیام ہے، جہاں فری لانس ادیب کے طور پر زندگی کرتے ہیں بھارتی ٹیلی وژن کے لیے دنیا کی بہترین کہانیوں پر مبنی سیریل "خزانہ" کو جسے لیش چوپڑہ نے پروڈیوس کیا۔ بمبئی میں فلمی دنیا سے متعلق رہ کر "وجے" "پربت کے اس پار" "اپنا جہان" "انامیکار" "جب اندھیرا ہوتا ہے" اور "سوال" وغیرہ متعدد فلمیں لکھیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"دیوتا" مطبوعہ: ہفت روزہ "پارس" لاہور: ۳۵-۱۹۳۴ء

واضح رہے کہ یہ افسانہ سریندر وشٹ کے قلمی نام سے لکھا جسے کرم چند پارس نے اپنے ہفت روزہ اخبار "پارس" لاہور میں شائع کیا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	"دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" (تیرہ افسانے، ایک رپورتاژ)	شب خون کتاب گھر، الہ آباد:	طبع اول جنوری ۱۹۶۸ء
۲۔	"برف پر مکالمہ" (افسانے)	دہلی:	طبع اول:
۳۔	"بازگوئی" (افسانے)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی:	طبع اول: ۱۹۸۹ء

اعزاز:

ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، برائے "بازگوئی" ۹۰-۱۹۸۹ء

مستقل پتا:

۴۔ یوگی راج آشرم، نیولنک روڈ، کالینا، بمبئی ۴۰۰۰۹۸۔ بھارتی

نظریہ فن:

"میں افسانہ کے کسی سکول سے متعلق نہیں ہوں اور نہ ہی افسانہ نگاری کے فن کی باریکیوں کو سمجھتا ہوں۔ لائل پور چوک گھنٹہ گھر کے لان پر ایک بزرگ سارنگی پر نثر کو گاگا کر اور ناچ ناچ کر داستان سنایا کرتا تھا۔ ۔۔۔۔ اور پھر بعد میں اپنے تماشہ کے عوض لوگوں سے بھیک لیتا تھا۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ بچپن کا یہ منظر کبھی ذہن سے محو نہیں ہوتا۔"

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۵ نومبر ۱۹۸۸ء)

سریندر پرکاش

رونے کی آواز

فلاور انڈر ٹری از فری

سامنے والی کرسی پر بیٹھا ابھی ابھی وہ گا رہا تھا۔ مگر اب کرسی کی سیٹ پر اس کے جسم کے دباؤ کا نشان ہی باقی ہے۔ کتنا اچھا گاتا ہے وہ ---- مجھے مغربی موسیقی اور شاعری سے کچھ ایسی دلچسپی تو نہیں ہے۔ مگر وہ کم بخت گاتا ہی کچھ اس طرح ہے کہ میں کھو سا جاتا ہوں۔ وہ گاتا رہا اور میں سوچتا رہا: "کیا پھول درخت کے سائے تلے واقعی آزاد ہی؟"

وہ اب جا چکا ہے۔ جن سروں میں وہ گا رہا تھا وہ اپنی گونج بھی کھو چکے ہیں۔ مگر الفاظ سے میں ابھی تک الجھا ہوا ہوں۔

فلاور انڈر ٹری از فری

اس سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ الفاظ کی عمر سر سے لمبی ہوتی ہے۔ شام، جب وہ مجھ سے ملا خاصہ نشے میں تھا۔ طالب علموں کے ایک گروہ نے دن میں اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اس کے ملک کے گیت اس سے سنتے رہے اور شراب پیتے پلاتے رہے۔ میرے کندھے پر اپنا دایاں رکھتے ہوئے اس نے مجھے سارے دن کا قصہ سنایا۔ اور پھر کہنے لگا۔ "گھر سے جب نکلا تھا تو میرے ذہن میں یہ فتور تھا کہ ساری دنیا پیدل گھوم کر اپنا ہم شکل تلاش کروں گا۔ آٹھ برس ہونے کو آئے مجھے دوسروں کے ہمشکل تو ملتے رہے مگر اپنا ہم شکل اب تک نہیں ملا۔"

"کیا کہیں تمہیں کوئی میرا ہم شکل ملا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں! اسکینڈی نیویا میں!" ---- اس نے میری طرف دیکھے بغیر اور اپنے ذہن پر زور دیئے بغیر جواب دیا۔

رات گئے تک ہم سڑکوں پر مارے مارے پھرتے رہے۔ جب تھک گئے تو گھر کا رخ کیا وہ کمرے میں داخل ہوا۔ کرسی پر بیٹھا وہ ایک منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے ایک دم اپنا مخصوص گیت گانا شروع کر دیا۔

میں نے پوچھا "اس گیت میں جو الفاظ ہیں ان کے معنی کیا ہیں؟"

"معنی کوئی ساتھ نہیں دیتا، صرف الفاظ دیتے ہیں۔ دیتے بھی کیا ہیں۔ بس اپنے معانی کی مہر ثبت کر دیتے ہیں اور ہم ان میں سے اپنے معنی تلاش کرتے ہیں!" اس نے جواب دیا۔

کرسی پر سے اٹھتے ہوئے اس نے کمرے کے بے ترتیبی کا جائزہ لیا اور پھر اچانک بول اٹھا۔ "تم شادی کیوں نہیں کر لیتے اچھے خاصے معقول آدمی ہو۔" میں بوکھلا سا گیا۔

"بات دراصل یہ ہے۔" میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "ہماری بلڈنگ کے اوپر والی منزل میں ایک وشنو بابو رہتے ہیں، وہ اس بلڈنگ کے مالک بھی ہیں ہم سب ان کے کرایہ دار ہیں۔ بہت سال پہلے جب وہ بالکل معمولی آدمی تھے تو انہوں نے ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ جس کا نام "سرسوتی" ہے۔ پھر اچانک وشنو بابو ایک مال دار عورت لکشمی سے ٹکرا گئے۔ تب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے "لکشمی" سے اپنا دوسرا بیاہ رچا لیا۔ اب لکشمی اور وشنو دونوں آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں اور بے چاری سرسوتی رات رات بھر سیڑھیوں میں بیٹھی روتی رہتی ہے۔ اسی ہنگامے کی وجہ سے میں بھی ابھی تک طے نہیں کر پایا کہ مجھے کسی سرسوتی سے شادی کرنی چاہئے یا کسی لکشمی

ہے؟"

اس نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا، اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے اس کے چہرے کو خوفناک بنا رہے تھے۔ پھر اس نے ایک دم سے گڈ نائٹ کہا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ اپنی اسی طرح کی حرکتوں اور باتوں کی وجہ سے وہ کبھی کبھی مجھے گوشت پوست کے آدمی کی بجائے کوئی خیال لگتا ہے جو سمندر پار سے یہاں آگیا ہو۔

جس عمارت کے ایک کمرے میں میں رہتا ہوں۔ اس کے سب کمروں کی دیواریں کہیں کہیں، جیسے تیسے ایک دوسری سے مشترک ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک کمرے کے اندر کی آواز یا خاموشی دوسرے میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں سوچتا ہوں، میری آواز یا خاموشی یا پھر چند لمحے پہلے کمرے میں گونجنے والی اس کے گانے کی آواز بھی کہیں نہ کہیں ضرور پہنچی ہو گی۔

باہر شاید رات نے صبح کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا ہے۔ اردگرد کے سب گھروں کی بتیاں بجھ گئی ہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے اور خاموشی دیمک کی طرح آہستہ آہستہ سب طرف رینگتے جا رہی ہے۔ میں دروازے کی چٹخنی چڑھا کر اور مدھم بتی جلا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا ہوں۔

مدھم روشنی میں سفید چادر میں لپٹا ہوا اپنا جسم مجھے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کی طرح لگتا ہے۔ تنہائی، خاموشی اور تاریکی میں ایسا خیال خوف زدہ کر ہی دیتا ہے۔ جیسے خواب میں بلندی سے گرتے ہوئے آدمی کا جسم اور ذہن سن ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی میری کیفیت ہے۔ دھیرے دھیرے میں نیچے گر رہا ہوں اور پھر اچانک مجھے لگتا ہے میں اپنے جسم میں واپس آگیا ہوں۔

باہر سے کسی کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ شاید سرسوتی اور لکشمی میں پھر جھگڑا ہوا ہے اور سرسوتی کے رونے کی آواز سیڑھی سیڑھی اتر کر نیچے میرے کمرے کے دروازے تک آگئی ہے، مگر یہ تو کسی بچے کے رونے کی آواز ہے! میں محسوس کرتا ہوں ----- ٹھیک ہے پڑوس والوں کا بچہ اچانک بھوک کی وجہ سے رونے لگ گیا ہو گا اور اسکی ماں بدستور نیند میں بے خبر سو رہی ہو گی یا پھر شاید ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مر گئی ہو اور بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو۔ آواز آہستہ آہستہ قریب ہو کر واضح ہوتی جا رہی ہے۔ پھر مجھے لگتا ہے ایک بچہ میرے ہی پہلو میں پڑا رو رہا ہے اور کفن میں لپٹی ہوئی میری لاش میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی ہے۔

"اگر درخت تہذیب کی علامت ہے تو ہم اس کے سائے میں روتے ہوئے آزاد پھول ہیں۔" میرے ذہن میں اچانک اس کے الفاظ کے معنی کھل اٹھے ہیں۔ جن کے سر وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

بچہ بدستور رو رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کی آواز میں درد اور دکھ کی لہریں شامل ہوتی جا رہی ہیں۔ جیسے اسے پتہ چل گیا ہو کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ مگر اسے یہ کس نے بتایا ہو گا؟ اس کے باپ نے؟ مگر وہ تو بدستور سو رہا ہے۔ کیونکہ اس کی آواز میں اس کے باپ کی آواز بھی شامل نہیں ہوئی۔ یہ تو ہر کسی کو آپ ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ مجھے نہیں پتہ چل گیا تھا! ------ بچے کے رونے کی آواز میری آواز سے کتنی ملتی جلتی ہے----!

پھر اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ "اچھے خاصے معمولی آدمی ہو۔"

میں واقعی معمولی آدمی ہوں۔ ہر صبح اپنے گھر سے تیار ہو کر نکلتا ہوں۔ دروازہ بند کرتے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہتا ہوں۔ سورج کی طرف منہ کر کے دن بھر بھاگتا رہتا ہوں اور رات ہونے پر اپنے آپ کو گھر کے دروازے پر کھڑا پاتا ہوں۔

صبح سب سے پہلے سارس کی طرح اڑتا ہوا میں اس عمارت تک جاتا ہوں۔ جہاں ایک عورت خوب صورت کیبن میں گلاس ٹاپ کی میز پر اپنی سفید مرمریں باہیں پھیلائے گھومنے والی کرسی پر بیٹھی رہتی ہے۔ وہ اپنے سفید بالوں کو ہر روز رنگ کے خضاب سے رنگ کر آتی ہے۔ میز پر پھیلی ہوئی اس کی باہیں --- اس طرح لگتی ہیں جیسے کسی عورت کی برہنہ ٹانگیں ہوں۔

کیبن کے اردگرد سے کئی سیڑھیاں اوپر چڑھتی ہیں۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں اس کیبن کے شیشوں میں سے اکثر جھانکتا ہوں اور سوچتا ہوں اگر واقعی وہ اپنی ننگی ٹانگیں میز پر پھیلائے ہوئے ہے تو-----

......! سیڑھیاں جہاں سے شروع ہوتی ہیں ' وہاں داہنے طرف ایک بڑی سی الماری لگی ہوئی ہے۔ جس میں چھوٹے چھوٹے بنک کے لاکروں جیسے کئی خانے بنے ہوئے ہیں جن میں ہر آدمی اپنی ذاتی چیزیں رکھ سکتا ہے۔ مگر میں ہر روز اپنی ذات ہی کو اس میں بند کر کے سیڑھیاں چڑھ جاتا ہوں اور پھر شام کو جاتے ہوئے دوبارہ اسے نکال لیتا ہوں۔

باہر تھیٹر والوں کی گاڑی کھڑی رہتی ہے۔ اس کا ڈرائیور مجھے آنکھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہتا ہے اور میں شہر کے جدید ترین تھیٹر میں پہنچا دیا جاتا ہوں۔ جس کا پنڈال بالکل سرکس کے پنڈال جیسا ہے۔ میں اس تھیٹر میں پچھلے اٹھارہ برس سے ایک ہی رول ادا کر رہا ہوں۔ سٹیج بالکل وسط میں ہے اور میرا پہلا میک اپ اتار کر "گلی ور" کا میک اپ اور لباس پہنا دیا جاتا ہے مکالے سب بیک گراؤنڈ سے ہوتے ہیں۔ مجھے صرف للی پٹ والوں کی مار کھانے کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ ان کے ننھے ننھے سوئیوں جیسے بھالے میرے جسم میں چبھتے ہیں۔ ان کے کمانوں سے نکلے ہوئے چھوٹے چھوٹے تیر میرے جسم میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ میرے مساموں سے خون کی بوندیں پسینے کی طرح نکلتی ہیں۔ مجھ میں خوبی یہی ہے کہ میں تکلیف کا اظہار نہیں کرتا اس لئے اتنے برسوں سے یہ سب چل رہا ہے۔ یہاں سے مجھے ملتا کچھ نہیں یہ تو محض ہابی کے طور پر ہے۔ پھر جب شو ختم ہو جاتا ہے تو مجھے ایک اسٹریچر پر لٹا کر ایک باتھ روم میں لے جاتے ہیں۔ جہاں الکوحل سے بھرے ہوئے ٹب میں مجھے ڈال دیا جاتا ہے۔ الکوحل میرے زخموں میں ٹیسیں پیدا کرتی ہے پھر ایک دم خنکی کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور میں تازہ دم ہو کر گھر کی طرف بڑھتا ہوں۔

ایک دن عجیب تماشا ہوا۔ جب اس عمارت کے دروازے بند ہونے کا وقت آیا 'تب میں پیشاب خانے میں تھا۔ میرے پیچھے دھپ سے دروازہ بند ہوا۔ میں گھبرا کر زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ تب ایک آدمی نے آکر دروازہ کھولا۔ میں اس تصور سے ہی اس قدر گھبرا گیا تھا کہ اگر مجھے ساری رات اس پیشاب خانہ میں بند رہنا پڑتا تو میری کیا حالت ہوتی۔ گھبراہٹ میں چلتے وقت میں نے اس کیبن کی طرف بھی دھیان نہ دیا کہ آیا وہ عورت چلی گئی ہے یا نہیں اور نہ اس لاکر میں رکھی ہوئی اپنی ذات ہی نکالنے کا خیال آیا۔ باہر تھیٹر کی گاڑی کا ڈرائیور ہارن پر ہارن بجائے جا رہا تھا۔ میں بھاگتا ہوا گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی چل دی۔

میں بہت پریشان تھا کہ آج اپنی ذات کے بغیر اپنا رول کیسے ادا کر پاؤں گا۔ مگر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس دن شو ختم ہونے پر بھیڑ اپنی کرسیوں سے اٹھ کر میری طرف لپکی اور میری اداکاری کو اتنا قدرتی بتایا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔

تب سے میں نے اپنی ذات کو اس لاکر ہی میں پڑا رہنے دیا ہے۔

ہوا کے ایک جھونکے نے کھڑکی کے پٹ کو زور سے بند دیا ہے۔ میں پھر اپنے کمرے کے ماحول کی خوشبو محسوس کرنے لگا ہوں ----

سڑھیوں پر بیٹھی ہوئی سرسوتی کی سسکیوں کی آواز روتے ہوئے بچے کی کرب ناک آواز میں اب ایک اور آدمی کی آواز بھی شامل ہو گئی ہے۔ شاید بچے کا باپ بھی جاگ گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی لاش اور بلکتے ہوئے بچے کو دیکھ کر ضبط نہیں کر سکا۔

ایک اچھے پڑوسی کے ناطے میرا فرض ہے کہ ان کے سکھ دکھ میں حصہ بٹاؤں۔ کیوں کہ ہم سب ایک ہی درخت کے سائے تلے کھلے ہوئے آزاد پھول ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے ' میں اپنے کمرے کے چاروں دیواروں میں سے ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر ارد گرد کمرے میں جھانک کر انہیں سوتے ہوئے یا روتے ہوئے دیکھوں۔ کیونکہ دونوں ہی حالتوں میں آدمی بے بسی کی حالت میں ہوتا ہے۔ مگر میں بھی کتنا کمینہ آدمی ہوں۔ لوگوں کو بے بسی کی حالت میں دیکھنے کے شوق میں سارے کمروں کی دیواریں اکھاڑ دینا چاہتا ہوں۔

میں نے پھر اٹھ کر ان کے کمروں میں جا کر ان کے رونے کی وجہ دریافت کرنے پر آمادہ کیا۔ رونے کی آوازیں اب کافی بلند ہو چکی تھیں اور انکی وجہ سے کمرے میں بند رہنا ممکن نہ تھا۔

میں نے وہی کفن جیسی سفید چادر اپنے گرد لپیٹی اور سیاہ سلیپر پہن کر دروازے کی طرف بڑھا۔ جوں ہی میں نے دروازے کی چٹخنی کی

طرف ہاتھ بڑھایا کہ باہر سے کسی نے دروازے پر دستک دی' میں نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔
سیڑھیوں میں بیٹھ کر رونے والی سرسوتی' بلک بلک کر رونے والا بچہ' مری ہوئی عورت اور اس کا مجبور خاوند' چاروں باہر کھڑے تھے۔
چاروں نے بہ یک زبان مجھ سے پوچھا۔
"کیا بات ہے' آپ اتنی دیر سے رو رہے ہیں؟ ایک اچھے پڑوسی کے ناطے ہم نے اپنا فرض سمجھا کہ ......!"

جوگندر پال

نام : جوگندر پال
قلمی نام : جوگندر پال
پیدائش : ۵ ستمبر ۱۹۲۵ء بہ مقام سیالکوٹ، مغربی پنجاب (ا)
تعلیم : ایم۔ اے (انگریزی) پنجاب یونی ورسٹی، چنڈی گڑھ: ۱۹۵۵ء

میٹرک گنڈا سنگھ ہائی اسکول، سیالکوٹ (پنجاب یونی ورسٹی، لاہور) سے ۱۹۴۱ء میں کیا۔ بی۔ اے مرے کالج، سیالکوٹ (پنجاب یونی ورسٹی، لاہور) سے ۱۹۴۵ء میں کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ سے ایم۔ اے (انگریزی) ۱۹۵۵ء میں کیا۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام لعل چند سیٹھی (۱۹۴۸ء۔ ۱۸۹۰ء) اور والدہ کا نام مایا دیوی (۱۹۲۶ء۔ ۱۸۹۳ء) تھا۔ جوگندر پال کے والد ایک معمولی دوکاندار تھے۔ جیسے تیسے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ بی۔ اے کے زمانے میں جب والد کی ہمت جواب دے گئی تو جوگندر پال نے پرائیوٹ ٹیوشن کے ساتھ ساتھ روزانہ اجرت پر ملٹری کی ایک پیراشوٹ فیکٹری میں ڈسپیچ کلرک کی ملازمت اختیار کرلی۔ کچھ مدت ایک اسپورٹس سپلائر کے ٹورنگ ایجنٹ کے طور پر بھی کام کیا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں ملٹری اکاؤنٹس میں کلرک بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں امرتسر جا کر رشتے کے ایک دولت مند ماموں کے ایجنٹ نما سیکرٹری رہے لیکن تین ماہ بعد سیالکوٹ واپس آکر مرے کالج میں ایم۔ اے (انگریزی) کرنے کی غرض سے داخلہ لے لیا۔ وہاں محض چند ماہ پڑھنے کے بعد مالی پریشانیوں کے سبب کالج جانا چھوڑ دیا اور فسادات کے پیش نظر انبالہ ہجرت کر آئے۔ ۱۹۴۸ء کا سال انبالہ میں اپنے والد کی ڈیری کی دکان پر دودھ ڈھوتے رہے، اسی سال والد صاحب کا انتقال ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں جوگندر پال کی شادی کرشنا سے ہوئی (اس وقت کرشنا پال جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں انگریزی کی لیکچرر ہیں) شادی کے بعد کرشنا کے ہمراہ نیروبی (ایسٹ افریقہ) منتقل ہو گئے جہاں ۱۹۴۹ء تا ۱۹۶۴ء کینیا ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے ڈیوک گلا سٹر اسکول، نیروبی میں اسکول ٹیچر رہے۔ ۱۹۶۴ء میں کینیا کی آزادی پر ایجوکیشن آفیسر کی ملازمت سے اختیاری ریٹائرمنٹ لے کر بھارت واپس آ گئے اور اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں سکونت اختیار کی ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۵ء ایس۔ بی۔ کالج، اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں شعبہ انگریزی کے پروفیسر اور ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۸ء پرنسپل رہے۔ ۱۹۷۸ء میں استعفیٰ دے کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ کینیا سے برٹش پینشن پاتے ہیں اور فری لانس ادیب کے طور پر زندگی کرتے ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"تیاگ سے پہلے" مطبوعہ: "ساقی دہلی" غالباً ۱۹۴۵ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "دھرتی کا کال" (افسانے) حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی: طبع اول: ۱۹۶۱ء

یہ گیارہ افسانوں کا مجموعہ افریقی سرزمین کی بو باس لیے ہوئے ہے۔ کتاب میں کرشن چندر کا ابتدائیہ اور دیوندر ستیارتھی کا خاکہ "جا ہو، جوگندر پال" شامل ہیں۔

۲۔	"میں کیوں سوچوں" (چھ فینٹسی، چھ افسانے اور چھ افسانچے)	ادبستان اردو، امرت سر:	طبع اول: ۱۹۶۲ء
۳۔	"اک بوند لہو کی" (ناول)	مکتبہء افکار، کراچی:	طبع اول: ۱۹۶۲ء
۴۔	"رسائی" (آٹھ طویل مختصر افسانے)	نصرت پبلشرز، لکھنؤ:	طبع اول: ۱۹۶۹ء
۵۔	"مٹی کا ادراک" (تیرہ افسانے)	لاجپت رائے اینڈ سنز، دہلی:	طبع اول: ۱۹۷۰ء
۶۔	"سلوٹیں" (افسانچے)	لاجپت رائے اینڈ سنز، دہلی:	طبع اول: ۱۹۷۵ء
۷۔	"آمدورفت" (ناولٹ)	انڈین بکس ہیلی کیشنز، اورنگ آباد:	طبع اول: ۱۹۷۵ء
۸۔	"بیانات" (ناولٹ)	انڈین بکس ہیلی کیشنز، اورنگ آباد:	طبع اول: ۱۹۷۵ء
۹۔	"لیکن" (بیس افسانے)	اردو پبلشرز، لکھنؤ:	طبع اول: ۱۹۷۷ء
۱۰۔	"بے محاورہ" (چوبیس افسانے)	کیلاش ہیلی کیشنز، اورنگ آباد:	طبع اول: ۱۹۷۸ء
۱۱۔	"بے ارادہ" (تیس افسانے)	زم زم بک ٹرسٹ، دہلی:	طبع اول: ۱۹۸۱ء
۱۲۔	"نادید" (ناول)	رابطہ گروپ، دہلی:	طبع اول: ۱۹۸۳ء
۱۳۔	"پریم چند کی کہانیاں" (مرتبہ)	ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی:	طبع اول: ۱۹۸۴ء
۱۴۔	"کتھانگر" (افسانچے)		
۱۵۔	"جوگندر پال کے منتخب افسانے" (انتخاب)		
۱۶۔	"کھلا" (افسانے)		

غیر مدون:

۱۔ انگریزی مضامین:

۲۔ اردو مضامین:

(۱) "فکشن کے آرٹ پر" ۔ شب خون ۔ ۱۹۷۱ء (۲) "نیا افسانہ" "نئے کلاسیک" مرہٹواڑہ یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء (۳) "ایک اور آباد کار" محمد طفیل کے خاکوں پر مضمون۔ نیرنگ خیال راولپنڈی۔ (۴) "کچھ بیدی کے بارے میں" "شیرازہ" سری نگر ۱۹۸۳ء (۵) "اردو افسانہ، زبان و بیان کے مسائل" "اوراق" لاہور، ۱۹۸۳ء (۶) "فکر تونسوی کی عمومیت" "آہنگ" گیا۔ (۷) "کولاژ" "اردو فکشن کے باب میں ایک تاثر۔ نئی نسلیں" علی گڑھ، ۱۹۸۴ء (۸) "ذی جان کہانیاں" "تناظر" نئی دہلی۔ (۹) "بیدی، خمیر و ضمیر" "دستاویز" راولپنڈی، ۱۹۸۵ء۔ (۱۰) "فکشن کی تنقید" "آج کل" نئی دہلی۔ ۱۹۸۵ء۔ (۱۱) "ایک نیا یاتری" سلیم آغا قزلباش کے افسانوی مجموعہ "انگور کی بیل" کا دیباچہ ۱۹۸۶ء۔ (۱۲) "فکشن کی تنقید کے باب میں اردو دانشوروں کا تشدد، تحکم اور تعصب" ساؤتھ ایشیا سیمینار، خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ ۔ ۱۹۸۲ء۔

۳۔ تراجم:

جوگندر پال کے افسانوں، افسانچوں اور ناولوں کے تراجم انگریزی، ہندی، پنجابی، مرہٹی، کنڑا، ملیالم اور روسی میں ہو چکے ہیں۔ اگر اس کام کو یکجا کیا جائے تو کتاب کی کئی جلدیں بنیں۔

مستقل پتا:

۲۰۴ - سنداکنی انکلیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۹ بھارت -

اعزاز:

۱- "اردو اکاڈمی اترپردیش ایوارڈ" برائے "بے محاورہ" ۱۹۷۸ء
۲- "میرا ایوارڈ" برائے "بے ارادہ" ۱۹۸۳ء
۳- غالب میموریل ویلفیئر سوسائٹی، فکشن ایوارڈ: ۱۹۸۳ء
۴- اترپردیش ہندی / اردو ادب ایوارڈ: ۱۹۸۳ء
۵- "پنجاب گورنمنٹ ایوارڈ" برائے "کتھا نگر"

نظریہ فن:

"افسانے کا فن اس قدر غیر رسمی ہے کہ جیسے بھی کہانی بن جائے اور اسے پڑھتے ہوئے محسوس ہو کہ اس میں جو کچھ پیش آ رہا ہے وہ زندگی کی کسی سچی واردات کے مانند پہلی اور آخری بار پیش آ رہا ہے۔ اس اعتبار سے میرے نزدیک کوئی تخلیقی تحریر ارتکاب کے مترادف ہے۔ یہ غلط نہیں کہ نئی وارداتیں نئے اسالیب کی متقاضی بھی ہو سکتی ہیں، مگر جس طرح ہماری شکلیں فطری طور پر ہمارے باطن کی آئینہ دار ہوتی ہیں اسی طرح ہر فن پارے میں اظہار کا ایک الگ مقامی تقاضہ ہوتا ہے اور اس تقاضے کے ادراک کے بغیر افسانہ نگار کو اپنے افسانے کی اصل شکل کا سراغ نہیں مل پاتا۔"

جوگندر پال (مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۲۸/ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

○

(۱) دستاویزات میں تاریخ پیدائش ۲ اپریل ۱۹۲۵ء درج ہے۔

جوگندر پال

باہر کا آدمی

جب بھی مجھے خیال آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے اس کا تھیلا گھومنے لگتا ہے' اس کے دائیں کندھے سے لٹکتا ہوا پھولا پھولا تھیلا' جس میں دنیا بھر کے --- لیکن ٹھہریئے' پہلے مجھے اس کا حلیہ بیان کرنا چاہیے --- اس کا چہرہ -- میری آنکھوں کے سامنے پھر اس کا تھیلا گھوم گیا ہے۔ دراصل اس کی ساری پہچان اسی تھیلے سے وابستہ ہے' شاید۔ شاید اس کا کوئی چہرہ ہے ہی نہیں۔ بس آپ کسی بھی چہرے کے بارے میں سوچ لیجئے کہ یہی اس کا چہرہ ہے' پر اس چہرے پر ڈاڑھی ضرور ہونی چاہئے' بڑی گھنی' بڑی سیاہ' منتشر ڈاڑھی جسے دیکھ کر لگے کہ چہرے پر کوئی چہرہ نہیں ڈاڑھی ہی ڈاڑھی ہے -- آنکھیں؟ -- اس کی آنکھیں اتنی چھوٹی ہیں کہ آپ غور سے نہ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے اسے آنکھوں کے بغیر ہی نظر آجاتا ہو گا۔

جب بھی میں اس پارک میں آنکلتا ہوں تو وہ سدا یہیں ہوتا ہے' نہ معلوم کہاں رہتا ہے' کیا کرتا ہے' کچھ کرتا بھی ہے یا نہیں' اور کچھ بھی نہیں کرتا تو اس کا تھیلا دنیا بھر کی اشیاء سے کیونکر بھرا رہتا ہے۔ ننھے منے بچوں کے لیئے چاکلیٹ' خوبصورت عورتوں کے لئے پھول' ٹورسٹس کے لئے تصویریں' بیماروں کے لیئے دوائیاں' شرابیوں کے لئے بائل او ہنز' سب کچھ --- سب کے لئے سب کچھ' بغیر قیمت کے' بغیر احسان کے' صرف اس لیے کہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہو جائے' بس!

ایک بار کسی عورت نے اس کا پھول قبول کر کے اسے پیسے ادا کرنا چاہئے اور --- کیا نام ہے اس کا --- تھیلا --- میں اسے تھیلا ہی کہا کرتا ہوں' --- تھیلا روہانسا سا ہو کر رہ گیا۔

"تم مجھے اس پھول کے دس پیسے یا دس روپے دینا چاہتی ہو -- ہے نا" -- پر میرا تھیلا اس لئے بھرا رہتا ہے کہ میں کسی سے ایک پائی بھی وصول نہیں کرتا۔"

اس عورت کے آدمی نے تھیلے کی جانب شک کی نظروں سے دیکھ کر اپنی بیوی کو آگے دھکیلنا چاہا' لیکن اس کی بیوی نے بدستور رکے ہوئے بڑے پیار سے پھول اپنے جوڑے میں سجا لیا۔

تھیلا خوشی سے اور پھولا پھولا معلوم ہونے لگا۔

"دیکھو بابو" اس نے عورت کے شوہر کو بتایا۔ "وہی جوڑا ہے لیکن میرے پھول سے کتنا رنگ دار نکل آیا ہے!"

"جاؤ' جاؤ بابا' کہہ دیا نا' اپنی راہ لو۔"

"تمہارا کیا لے رہا ہے جی" اس کی بیوی نے اسے ٹوک دیا۔

میں کسی سے کچھ نہیں لیتا' کیونکہ میرے تھیلے میں ہر چیز پہلے ہی سے موجود ہے -- جو چاہو لے لو۔"

تھیلے کو انبساط کا دورہ پڑ جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھڑے کھڑے چٹکیاں بجا بجا کر چھوٹے سے نیم دائرے میں ناچ رہا ہے ---"

لے لو بھیا' سب کچھ لے لو' دھرتی میری ہے نہ اس کی' سب کچھ اپنا مان کے لو لو -- لے لو!"

جیسے کسی جھونپڑی میں کوئی غریب بچہ سو گیا ہو اور سپنا دیکھ رہا ہو کہ ان کے دروازے پر کہیں سے اناج کی گاڑی آکھڑی ہوئی ہے اور وہ

نکل کر جوں کا توں سوئے سوئے دروازے پر آگیا ہو۔

"لاؤ!"

"لے لو!"

تھیلا اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا ایک طرف نکل جاتا ہے' اوجھل ہو جاتا ہے لیکن اس کی آواز کانوں میں پیہم بجتی رہتی ہے اور ہم اسے سن سن کر شاداب ہوتے رہتے ہیں۔

اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو میں اس پارک میں یہاں اسی بنچ پر پڑا مغموم بیٹھا تھا۔ میرے پچاس روپے جیب سے کہیں گر گئے تھے' یا کسی نے نکال لیے تھے اور مہینہ ختم ہونے میں ابھی پورے بیس روز باقی تھے' اور ہمارے دفتر میں پیشگی تنخواہ ادا کرنے کا دستور نہ تھا اور اس اجنبی شہر میں میری جان پہچان کے بہت کم لوگ تھے۔

وہ ہنستا ہوا میرے پاس آگیا۔

"کیوں پیارے؟ اتنے اداس کیوں بیٹھے ہو؟"

اس کی آواز کا اثر تھا یا میری ہمدردی کی تمنا' میں نے جھٹ اپنی ساری بپتا کھول کر بیان کر دی۔

تھیلے نے قہقہہ لگایا۔ "تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

تھیلے سے اس کا ہاتھ برآمد ہو کر میری طرف اس طرح بڑھا 'گویا تیز ہوا سے اڑ اڑ کر کسی ثمر آفریں درخت کی ٹہنی۔ "یہ لو' تمہارے پچاس روپے!"

میں حیرت آمیز مسرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

لے لونا' تمہارے ہی ہیں!"

"تو یہ بات ہے"۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ تمہیں اب کیا لینا دینا ہے۔ تمہارے پیسے وصول ہو گئے ہیں' یہی بہت ہے۔

میری آنکھیں کئی روز دو باوردی سپاہیوں کے مانند اس کے تعاقب میں لگی رہیں۔ 'ہو نہ ہو' وہ ضرور کوئی ایسا ویسا دھندا کرتا ہے۔

پھر ایک روز:

"بابا!"

وہ پارک کی ایک طرف جا رہا تھا کہ چند مشکوک قسم کے نوجوانوں نے اسے گھیر لیا۔

"لاؤ!"

تھیلے نے یہ بھی نہ پوچھا کہ کیا؟ -- اور اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر تاش کا پیکٹ ان کی طرف بڑھا دیا اور وہ سب تاش کھیلنے کے لیے وہیں اس کے قدموں میں گھاس پر بیٹھ گئے اور وہ مسکرا مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

"آؤ بابا' تم بھی کھیلو۔ ہم پیسے لگا کر کھیل رہے ہیں۔"

"مجھے پیسوں سے کیا کرنا ہے بھائی؟"

"پیسوں سے کیا کیا جاتا ہے -- شراب پیو --- اور پلاؤ۔"

"مجھے جو کچھ پینا ہوتا ہے وہ پیسوں کے بغیر ہی پینے کو مل جاتا ہے -- ہاں' تمہیں پینا ہو تو ---" اس کا ہاتھ شراب کی بوتل تھامے تھیلے سے نکلا۔ "یہ لو!"

"مفت؟"

"ہاں' لے لو' تمہاری ہی تو ہے۔"

تمہاری ہی تو ہے!۔۔ تو۔ تو اس کی ہر شے تمہاری ہی ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس نے واقعی میرے ہی پیسے مجھے لوٹائے تھے۔

"لے لو!"

میرے باوردی سپاہیوں کے ہاتھوں سے ہتھکڑی نیچے گر گئی اور کھنکا پا کر تھیلے نے اپنا سر میری طرف موڑ لیا۔

"ارے تم؟۔۔ آج پھر تو کسی نے جیب نہیں کاٹی؟"

میں خجل سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کچھ بولو بھئی' کہیں ایسا تو نہیں 'کہ اب کے تم ہی کسی کی جیب کاٹ کے آ رہے ہو؟"

تاش کے پتے بانٹنے والے نوجوان نے قہقہہ لگا کر پہلی بار میری طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ "اگر ایسا ہے تو آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ ہمارے مطلب کے آدمی ہو۔"

تھیلا پھر مجھے گورکھ دھندا سا معلوم ہونے لگا۔۔ کیا پتہ ۔۔۔ کیا پتہ' وہ ان لوگوں کا گرو گھنٹال ہو؟

"ان سب لوگوں سے ۔۔۔" اسے مخاطب کر کے میں چند قدم پرے آ گیا تاکہ وہ بھی میری طرف سرک آئے ۔۔ "ان سب سے تمہاری بڑی گہری جان پہچان ہے؟"

"نہیں' میں کسی کو نہیں جانتا' تمہیں یا انہیں ۔۔۔۔ نہیں' تم ٹھیک کہتے ہو' میری شاید سبھی سے بہت گہری جان پہچان ہے۔۔۔"

اپنی بات پر وہ کان دھر کر ہنس پڑا۔ پتہ نہیں' میں کیا بک رہا ہوں ۔۔۔ اور پتہ نہیں مجھے تم پر غصہ کیوں آ رہا ہے؟" وہ کھکھلا کر ہنسنے لگا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ سمجھدار لوگ مجھے بڑے بے وقوف لگتے ہیں۔" پھر وہ میری طرف دیکھے بغیر اپنے سامنے کی طرف چل دیا اور دیکھتے دیکھتے کچھ اس طرح گم ہو گیا گویا میری طرف پشت کیے میرے ذہن میں آ داخل ہوا ہو۔۔۔

اور وہ ساری رات میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور تھیلا بدستور میری طرف پشت کیے میرے ذہن میں چلتا رہا ۔۔۔۔ چلتا رہا اور وہیں کا وہیں دکھائی دیتا رہا اور میں بے چین سا پڑا رہا کہ وہ میری طرف منہ کر کے کھڑا کیوں نہیں ہو جاتا۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے دل میں اتر جانا چاہتا تھا تاکہ وہاں سے سارے کا سارا تھیلا اٹھا کر باہر لے آؤ اور پھر اس میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک شے کو ٹٹول لوں کہ اس میں کیا کیا بھرا ہوا ہے؟ ۔۔۔ اگر میں اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرتا تو آج کوئی سی' آئی' ڈی آفیسر ہوتا۔۔ اوائل ہی سے مجھے ہر بات کی ٹوہ لگانے کی پڑی رہتی ہے۔

میری طرف پیٹھ کئے تھیلا اپنی دھن میں چلا جا رہا ہے ۔۔۔ وہ!۔۔۔ اور وہ اس کے پیچھے۔

ٹھہرو!۔۔۔ یہ رکھ لو!۔۔ میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔

پولیس!۔۔۔ تھیلا ہنسنے لگا ہے ۔۔۔ تمہیں پولیس سے ڈر لگتا ہے ۔۔ ہاں' ہاں' خوب ڈرو ۔۔۔ جی بھر کے' تمہیں کوئی ڈاکو تھوڑا ہی بننا ہے۔ چور جتنا ڈر ڈر کے اپنا فرض پورا کرتا ہے اس کا کام اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔۔

جلدی کرو' پولیس ۔۔۔

ہاں' ہاں سن لیا بھائی' لیکن تم جسے پولیس کہتے ہو وہ ہے کہاں؟۔۔ کون؟۔ ایک بار مجھے بھی شک گزرا کہ پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اس کے آگے آگے دوڑ کر میرا دم پھول گیا ۔۔ ہہ ہاہہ!۔۔۔ معاملہ دراصل ہوتا یہ ہے کہ چور بیچارہ خود آپ ہی اپنے پیچھے لگا رہتا ہے۔۔ ہہ ہہ ہا!۔۔۔۔ چوری کر کر کے اس پر یہ راز افشا ہوتا ہے کہ اگر کبھی وہ گرفتار ہوا تو اپنے ہی ہاتھوں ہو گا ۔۔۔ ہہ ۔ ہہ ہا!۔۔۔ تھیلے کی داڑھی میں سے اس کے چہرے کے چھپے ہوئے نقوش اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے اس کے تھیلے میں اوپر تک ٹھنسا ہوا مال ۔۔ "پولیس سے کیا ڈر؟ ۔۔ ڈرنا ہی ہے تو اپنے آپ سے ڈرو' اپنی ذات کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دو' پھر تمہیں کسی سے ۔۔ پولیس سے بھی کوئی خطرہ لاحق نہیں۔۔۔۔"

میں نے اپنے بستر پر بے چینی سے پہلو بدلا' شاید میں سو گیا تھا اور --- اور میری آنکھیں کھلی تھیں اور --- تھیلا میرے سامنے ہوا میں لٹتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ "تمہیں جو کچھ بھی چاہئے بلا جھجک کہہ دو۔ میرے پاس سب کچھ ہے اور میرا سب تمہارا ہے' میرا نہیں' چور بے چارے کا مال اپنا کہاں' میرا سب کچھ تمہارا ہی ہے' بولو' تمہیں کیا چاہیے۔"

میں آپ کو سچ بتاؤں؟ --- میں نے بھی ایک بار چوری کی تھی۔ ان دنوں میں ایک بزنس مین کا سیکرٹری تھا۔ جب اسے خبر ملی کہ اس گھر کالے دھندے کے شک میں این فورس منٹ والے چھاپہ مارنے کی سوچ رہے ہیں تو اس نے گھر کی نقدی ادھر ادھر اوروں کے گھر رکھوا ۔ مجھے بھی اس نے پانچ ہزار رکھنے کو دیا۔ پر دو روز بعد میں نے تھانے میں جھوٹی رپورٹ کر دی کہ میرا ڈھائی ہزار روپیہ چوری ہو گیا ہے--- ڈھائی ہزار لے کر کانپتا ہوا' مالک کے پاس جا پہنچا--- اتنی بڑی ذمہ داری سنبھالنا مجھ غریب کے بس سے باہر ہے جناب' آپ اپنی پوری رقم ی تھوڑی کر کے میری تنخواہ سے کاٹ لیا کریں-- میرا مالک میری ایمانداری سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے دو چار مہینے پچاس پچاس روپے کر باقی کی رقم مجھے معاف کر دی--- آپ یقین کیجیے ان مفت کے ڈھائی ہزار نے مجھے چند ماہ کے لئے اتنا شاہ دل بنا دیا کہ کسی جان پہچان ے کو مشکل میں پا کر مجھے بڑی مسرت ہوتی اور بڑی مشکل سے اسے مدد قبول کرنے پر آمادہ کرتا--- لو بھائی' یہ تمہارے ہی ہیں!--- ایک ت غریب اور بوڑھے ہمسائے کو تو میں نے یک وقت پانچ سو روپے دے دیئے-- لو چاچا' روؤ نہیں' ان پیسوں سے ہنسی خوشی اپنی بیٹی کے ہاتھ کر دو-- اب یہ قصہ لے ہی بیٹھا ہوں تو باقی قصہ بھی سن لیجئے۔ بوڑھے کی بیٹی کو پتہ چلا تو اسی روز شام ڈھلتے ہی وہ سب سے چھپ کر میرے آ گئی اور میرے سینے سے سر جوڑ کر جی بھر کے روئی اور میں نے-- اب کیسے بتاؤں میں بڑا برا آدمی ہوں--- چلئے چھوڑیئے' یہی کیا کم ہے غریب کا کام ہو گیا۔

میں نے بے چین ہو کر بستر پر پھر پہلو بدلا۔

پھولے ہوئے تھیلے کا سامنے کا اوپری حصہ بڑی گھنی اور بے ترتیب داڑھی مونچھ سے بھر گیا ہے۔ گھاس پھوس کے اس تودے کے پیچھے مجھے کسی کی آواز سنائی دی ہے۔ ارے! یہ تو میری ہی آواز ہے' یا میری نہیں تو آپ کی' یا کسی اور کی' کسی کی بھی'--- "کہیں سے مجھے ہزار ہاتھ آ جائے تو اسی وقت ایک سو روپے کسی یتیم خانے میں دے آؤں اور پانچ ہزار آئے تو ڈھائی ہزار-- دس ہزار تو آٹھ --- ہاں' کی قسم' آٹھ ہزار-- میرے لیے دو ہی کافی ہیں--- اور پچاس ہزار آ جائے تو خوشی سے باؤلا ہو کر یہ سارے کے سارے پیسے کسی کی مٹھی تھماؤں اور ننگے پاؤں دوڑتا ہوا جنگل کی طرف نکل جاؤں----"

اپنے بستر پر لیٹے لیٹے میں بے تابی سے ہنس پڑا۔

تمہیں یقین نہیں آ رہا؟ ---- نہ سہی --- پر تمہیں معلوم نہیں' چور کتنا نیک ہوتا ہے۔ چرا چرا کر نیکی کا ڈھیر جمع کر لیتا ہے لیکن ری کا مال ہوتا ہے اس لیے اپنی نیکی کو اس طرح خرچ کرتا ہے کہ اس پر نیکی کا گمان نہ ہو' اس کی چوری پکڑی نہ جائے---"

شاید میری آنکھ لگ گئی تھی' یا اگر پہلے ہی آنکھ لگی ہوئی تھی تو نیند ہی نیند میں تھک کر میں خوابیدہ ہونے لگا تھا۔

دوسرے روز شام کے وقت --- ذرا دھیان سے سنئے' اصل میں یہی واقعہ سنانے کے لیے میں نے ساری کہانی چھیڑی ہے--- شام وقت تھیلے سے ملتے ہی میں نے بڑے اچانک پن سے' بڑی محبت سے یہ سوال کیا-- "تم کام وام کیا کرتے ہو؟"

میرا سوال سن کر اس کی آنکھوں میں چھپا ہوا کالا چور ابھر آیا اور مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ یہ کالا چور دیکھتے ہی دیکھتے میرا گلا گھونٹ ے گا لیکن عین اس وقت پولیس کا ایک سپاہی کہیں سے وارد ہو گیا۔

"کو بھیا' بیڑی پیو گے؟" دفعتاً تھیلے کے چہرے میں درویش صورت مسکراہٹوں کا ہجوم امنڈ آیا اور اس کا ہاتھ بیڑی کا ایک بنڈل لے ب سے نکلا' مانو اس نے خالی خولی ہوا میں ہاتھ ڈال کر معجزے کا سماں باندھ دیا--- "لے لو نا!--- تمہارا ہی ہے!!"

لیکن اس اثناء میں پولیس کے تین سپاہی اور آ گئے اور اسے گھیر لیا۔

درویش صورت مسکراہٹوں کے ہجوم سے گروانے لگی۔ "گھبراؤ نہیں' میرے تھیلے میں سب کچھ ہے۔۔ سب کچھ تمہارا ہی ہے۔۔۔ جو چاہو گے دے دوں گا۔"

ہم چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو چپکے سے ہمارے حوالے کر دو۔"

"ہاں' ہاں' ضرور۔۔" تھیلے نے ہاتھ اپنے تھیلے میں ڈالا اور ساری اشیاء کو ٹٹولتے ہوئے یکبارگی اس کا چہرہ اترنے لگا۔۔ "میں۔۔ میں تو اپنے تھیلے میں نہیں ہوں۔۔۔!"

اور پھر اپنی بات کو سن کر وہ ہنسی نہ روک سکا اور سرعت سے عقب کی خاردار جھاڑیوں کی طرف اچھل گیا اور چور نہ ہوتا تو ضرور پکڑا جاتا!

دیویندر اسر

نام : دیویندر ناتھ اسر
قلمی نام : دیویندر اسر
پیدائش : ۱۴ اگست ۱۹۲۸ء بہ مقام کیمبل پور (حال: اٹک) پنجاب (بھارت) حال پاکستان۔
تعلیم : ایم۔ اے (معاشیات) الہ آباد یونی ورسٹی: ۱۹۴۹ء
ایم۔ پی۔ ایس (MASTER OF PROFESSINOL STUDIES) کارنل یونیورسٹی، امریکہ: ۱۹۷۳ء

میٹرک، ایف۔ اے اور بی۔ اے ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج کیمبل پور سے اور ایم۔ اے (معاشیات) الہ آباد یونیورسٹی (۱۹۴۹ء) سے کیا۔ ۱۹۵۳ء میں دلی یونیورسٹی سے بی۔ ایڈ اور ۱۹۷۳ء میں کمیونیکیشن آرٹ میں ایم۔ پی۔ ایس کارنل یونیورسٹی، امریکہ سے کیا۔ کچھ مدت کانپور میں اور ۱۹۴۹-۵۰ء میں ایک برس امریکہ میں زیر تعلیم رہے۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام شری ناتھ اسر تھا۔ بچپن، لڑکپن اور اوائل جوانی کے دن کیمبل پور میں گذرے۔ ابتدائی تعلیم ماں کی زیر نگرانی ہوئی۔ گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں ڈاکٹر محمد اجمل اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق جیسے اساتذہ ملے۔ کالج میگزین "مشعل" کی ادارت کی اور "مشعل" کے لیے پہلا مضمون "منٹو: ایک سماجی جراح" قلم بند کیا۔ باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز "نظام" بمبئی میں شائع ہونے والے مضمون سے ہوا۔ ابتداء میں ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے، آگے چل کر جدیدیت کی تحریک کے سرخیل بنے۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا خاندان کیمبل پور سے الہ آباد ہجرت کر گیا۔ الہ آباد سے ایم۔ اے (معاشیات) کرنے کے بعد کانپور ۱۹۴۹-۵۰ء میں قیام کے دوران میلا رام وفا سے صحافت کے آداب سیکھے اور ۱۹۵۰ء میں دلی کے ایک پرائیویٹ کالج میں بطور لیکچرر (معاشیات) ملازمت کا آغاز کیا، یہاں آٹھ برس درس و تدریس سے متعلق رہنے کے بعد کچھ مدت سرکاری ملازمت کی، جہاں سے اگست ۱۹۸۶ء میں ایک انگریزی ماہنامہ کے مدیر کی حیثیت میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین الہ آباد، کانپور اور دہلی شاخ کے سیکرٹری رہے۔ ایران، اٹلی، برطانیہ، جرمنی، فرانس، ڈنمارک، سوئزرلینڈ، کینیڈا اور امریکہ کی سیاحت کی۔ آج کل دلی میں ہیں اور صحافت کو بطور پیشہ اپنا رکھا ہے۔

اولین مطبوعہ تحریر:

"منٹو: ایک سماجی جراح" (مضمون) مطبوعہ: مشعل "(TORCH)" گورنمنٹ ڈگری کالج، کیمبل پور ۱۹۴۶-۴۷ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"چوری" مطبوعہ: "نسوانی دنیا" لاہور ۱۹۴۶ء "رد عمل" مطبوعہ: "ساقی" دہلی ۱۹۴۷ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "گیت اور انگارے" (افسانے) آزاد کتاب گھر، دہلی: طبع اول: ۱۹۵۳ء
۲۔ "شیشوں کا مسیحا" (افسانے) حلقہ ارباب فکر، کراچی: طبع اول: ۱۹۵۵ء
۳۔ "کینوس کا صحرا" (افسانے) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی: طبع اول: ۱۹۸۳ء

اس مجموعے میں "نیند" "کالے گلاب کی صلیب" "تین خاموش چیزیں اور ایک زرد پھول" "سیاہ تل" "پرانی تصویر نئے رنگ" "روح کا ایک لمحہ اور سولی پر پانچ برس" "کلین" "بجلی کا کھمبا" "میں ونیس اور دو ہاتھ" "کالی بلی" "مردہ گھر" "مغرور" "کینوس کا صحرا" "ایک پری کتھا" "بچہ رو رہا ہے" "احساس کی کوئی منزل نہیں" اور "ہم شہر بدل گئے" کل سترہ افسانے ہیں۔

۴۔ "فکر اور ادب" (تنقید) مکتبہ قصر اردو، دہلی: طبع اول: ۱۹۵۸ء
۵۔ "ادب اور نفسیات" (تنقید) مکتبہ شاہراہ، دہلی: طبع اول: ۱۹۶۶ء
۶۔ "ادب اور جدید ذہن" (تنقید) مکتبہ شاہراہ، دہلی: طبع اول: ۱۹۶۸ء
۷۔ "مستقبل کے روبرو" (تنقید) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی: طبع اول: ۱۹۸۶ء

اس کتاب میں چودہ مضامین شامل ہیں۔ کل صفحات: ۱۳۸

۸۔ "خوشبو بن کے لوٹیں گے" (دستاویزی ناول) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی: طبع اول: ۱۹۸۸ء
۹۔ "پھول بچہ اور زندگی" (ہندی افسانے)
۱۰۔ "کالے گلاب کی صلیب" (ہندی افسانے) طبع اول: ۱۹۷۵ء
۱۱۔ "کراس پر ٹنگی تصویریں" (ہندی افسانے) طبع اول: ۱۹۷۵ء
۱۲۔ "کہانی کا انت" (ہندی افسانے)
۱۳۔ "پرندے اب کیوں نہیں اڑتا" (ہندی افسانے) طبع اول: ۱۹۸۱ء
۱۴۔ "انوکھا اپہار" (ہندی افسانے)
۱۵۔ "چنتن ساہتیہ" (تنقید / ہندی)
۱۶۔ "ساہتیہ اور مانوگیان" (تنقید / ہندی)
۱۷۔ "ساہتیہ اور آدھیونک یگ بودھ" (تنقید / ہندی) طبع اول: ۱۹۷۳ء
۱۸۔ "ساہتیہ، مکتی اور سنگھرش" (تنقید / ہندی) طبع اول: ۱۹۷۹ء
۱۹۔ "ساہتیہ ات ادھیونک چیتنا" (تنقید / ہندی)
۲۰۔ "سیکس، ہنسا، یودا پندھی" (ہندی)
۲۱۔ "اردو کی غزلیں" مرتبہ: دویندر اسر (ہندی)
۲۲۔ "اردو کی ہاسیا کہانیاں" مرتبہ: دویندر اسر (ہندی)
۲۳۔ "ادھونک اردو ساہتیہ" مرتبہ: دویندر اسر (ہندی)
۲۴۔ "منٹو نامہ" مرتبہ: دویندر اسر طبع اول: ۱۹۸۱ء
۲۵۔ "وورودہ اور ساہتیہ" مرتبہ: دویندر اسر

۲۶۔ "ساہتیہ، سنگھرش اور پریورتن" مرتبہ: دیویندر اسر

۲۷۔ "منٹو کی شرشٹھ کہانیاں" مرتبہ: دیویندر اسر

۲۸۔ "MODERN HINDI SHORT STORY" مرتبہ: دیویندر اسر (بہ زبان انگریزی)

۲۹۔ "اردو کی چارچیت کہانیاں" مرتبہ: دیویندر اسر (ہندی)

۳۰۔ "THOUGHT" مرتبہ: دیویندر اسر (بہ زبان انگریزی)

۳۱۔ "بھارتیہ سنسکرتی اور راشٹریہ ایکتا" (ہندی)

۳۲۔ "IMAGES OF KAMA" (بہ زبان انگریزی)

۳۳۔ "نمکین اردو کہانیاں" مرتبہ: دیویندر اسر (ہندی)

۳۴۔ "بھوشیہ سے سنواد" (ہندی / تنقید)

۳۵۔ "منٹو کی راجنیتک کہانیاں" مرتبہ: دیویندر اسر (ہندی)

skip

مستقل پتا:

بی ۳ / ۱۵۴ جنگ پورہ، نئی دہلی، بھارت۔

نظریہ فن:

"ہر افسانہ کسی نہ کسی پہلو میں "سب درشن" ہی ہوتا ہے۔"

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مرقومہ: ۵ جنوری ۱۹۸۹ء)

دیویندر اسر

پرانی تصویر نئے رنگ

تن ' رات کے گیارہ بجتے ہیں ۔ سامنے مکان کا در کھلتا ہے ' اور دو آنکھیں باہر جھانکتی ہیں ۔ میں بجلی کے کھمبے تلے ایک لمحے کے لئے رکتا ہوں اور پھر آگے بڑھ جاتا ہوں ۔ ایک رات ' دو راتیں ' تین راتیں ' اسی طرح کئی راتیں بیت گئیں ' تن ' رات کے ساڑھے گیارہ بجتے ہیں ' سامنے مکان کا در کھلتا ہے ' دو آنکھیں باہر جھانکتی ہیں ' میں بجلی کے کھمبے تلے ایک لمحے کے لئے رکتا ہوں اور پھر آگے بڑھ جاتا ہوں اور اس ایک لمحے میں وقت کی رفتار جیسے ٹھٹک کے تھم جاتی ہے۔

جب میں پہلی بار اس راستے سے گزرا تھا تو دور پیلے مکان کے پیچھے چاند نمودار ہو رہا تھا اور مکان کے سائے ریمبراں کی تصویروں کی طرح گلی ' فٹ پاتھ اور سڑک پر پھیلے ہوئے تھے۔ سامنے والے مکان کی دائیں طرف شیشم کا درخت سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ جیسے کسی گہرے سکوت کی آواز سن رہا ہو اور بجلی کا کھمبا اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ خاموشی ' تنہائی اور اندھیرا ' سب دروازے اپنے اندر غم اور خوشیاں سمیٹ کر بند ہو چکے تھے۔ دروازہ دھیرے سے کھلتا ہے ' خاموشی کی صدا بن کر ' اندھیرے میں کرن پھوٹتی ہے اور تنہائی کے سوز میں ساز بجتا ہے۔

سوبھ تم آ گئے ' سائے اور روشنی ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ نوجوان مرد نے کوڑائے کی بھوری پتلون اور کھلے کالر والی سرخ قمیص پہن رکھی ہے ۔ اس کے پاؤں میں چپل ہے اور سر کے بڑھے ہوئے بال بے ترتیبی سے سنورے ہوئے ہیں ۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی مگر تیز ہیں جیسے پارہ چمک رہا ہو ۔ وہ لڑکی کی پیشانی چوم لیتا ۔ لڑکی نے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی ہے اس کے سیاہ کھلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں ۔ لڑکی خوبصورت ' حسین جاذب توجہ ہے ۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔

" شیل " نوجوان نے دھیرے سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ وہ دیوار کے سائے میں کھڑے ہو گئے ۔ " رات کتنی حسین ہے۔ " شیل نے کہا۔ " ہر رات حسین ہوتی ہے جب حسن۔۔۔۔۔۔ "

شیل کے رخساروں پر حیا کی سرخی دوڑ گئی ۔ اس نے اپنی لمبی لمبی پلکیں جھکا لیں ۔ دیوار کا سایہ پیچھے سرک گیا اور چاند کی روشنی آگے بڑھ گئی۔

" بہت دنوں بعد آئے ہو ۔ " شیل نے نوجوان کی قمیض کے کالر کی شکن درست کرتے ہوئے کہا۔

" تمہاری تصویر بنا رہا تھا ۔ "

" ہوں ' دیکھو کتنے دبلے ہو گئے ہو ۔ کبھی آئینہ دیکھا؟ "

" آئینہ دیکھنے کی کسے فرصت ہے اور آئینہ تو صرف چہرے کا روپ دکھاتا ہے ۔ "

اس نے دونوں ہاتھ سے شیل کا چہرہ اوپر اٹھا لیا ۔

" میرے پاؤں میں خرابی ہے نا اس لئے میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ "

نوجوان مسکرایا ۔ میں نے نوجوان کے پاؤں کی طرف دیکھا ۔ مجھے کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔

" آؤ کچھ باتیں ' لمحے جو وقت کی رفتار سے چرائے ہیں ۔ انہیں اپنے پیار سے بھر لیں " اور نوجوان نے شیل کے ہونٹوں کو چھو لیا۔

"ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے موم سے تراشے گئے ہوں۔ میں آج کل موم کی مورتیں بنا رہا ہوں" نوجوان نے اس کے ہونٹوں کے کناروں کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے چھو کر کہا شیل نے اس کے سینے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"سوبھ۔ مجھے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔"

"غم نہ کرو شیل" سوبھ نے اسے سینے سے لگا لیا "انسان اس حقیقت سے زندہ نہیں رہتا جسے اس نے پا لیا ہے۔ بلکہ اس تصویر سے جسے وہ حقیقت کا روپ دینے کے لئے روشنی اور سائے کے سنگم پر رکتا ہے اور وقت کے رک جانے کے انتظار کا کرب برداشت کر رہا ہے۔"

"روشنی اور سائے کے سنگم پر وقت کے رک جانے کے انتظار کا کرب" میں نے سوبھ اور شیل طرف دیکھا شیل کی آنکھوں میں آنسو تھے اور سوبھ کے چہرے پر فکر کی لکیریں اور ایک سمٹی ہوئی پرچھائیں کی طرح اندھیرے میں گم ہو گئے۔ وہاں کوئی نہیں تھا شیل سوبھ شاید پھر سائے بن کر زمین میں جذب ہو گئے تھے یا شاید روشنی میں تحلیل ہو گئے تھے۔ یہ خواب تھا یا حقیقت یا محض ایک تصویر جو دل کے نہاں خانے میں حقیقت بننے کیلئے تڑپ رہی ہے۔ میں تھوڑی دیر بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا اور اس پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ بڑے خوش نصیب ہو دوست میں نے کھمبے سے کہا اور چلا آیا۔

اس بات کو کئی دن بیت گئے۔ میں اس راستے سے کئی بار گزرا، لیکن وقت کی رفتار سے چرائے ہوئے ان لمحوں میں اپنے پاؤں کی آہٹ شامل کر کے انہیں ڈرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے آگے بڑھ جاتا تھا۔

ہاں کبھی کبھی بجلی کے کھمبے کو چوم لینے کی ادھوری خواہش کو نہیں روک سکتا۔ ایک رات بارش نے مجھے راستے میں گھیر لیا۔ میں لپک کر بغل والے ریستوران میں داخل ہو گا۔ اس ریستوران میں وہی لوگ آتے ہیں جن کے سینے حسرتوں کے مدفن ہیں۔ معلوم نہیں اس ریستوران میں وہ کون سی قوت تھی، جو ہر غم کو اپنے اندر جذب کر لیتی تھی۔ میں نے چائے کا آرڈر دیا اور اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ اتنے کسی کے قدموں کی آواز آئی بالکونی سے ایک مرد اور عورت سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ مرد کے بال الجھے ہوئے تھے۔ اس کے کپڑے شکن آلود تھے اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ کا آخری حصہ تھا اسے دیکھ کر ایسا احساس ہوتا تھا کہ وہ دن بھر آندھی میں کھڑا رہا ہے اور اب اچانک کمرے میں آ گیا ہے۔ عورت نے سرخ بھڑکیلی ساڑی اور سیاہ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخی اور غازہ اس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے برش صاف کرنے والے کپڑے پر رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔ عورت کے لباس کو دیکھ کر مجھے برہنگی کا احساس ہوتا تھا۔

وہ میرے سامنے والی میز پر بیٹھ گئے۔ مرد نے دو پیگ کا آرڈر دیا اور میز پر سر رکھ کر بیٹھ گیا۔ عورت بے حجاب نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ میز پر گلاس رکھنے کی آواز سے وہ چونکا اس نے سر اٹھایا اور سگریٹ سلگایا، پہلی بار میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اس کے چہرے کے نقوش جانے پہچانے سے معلوم ہوئے۔ پارے کی طرح حرکت کرتی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اسے کہاں دیکھا ہے اوہ یہ تو سوبھ ہے۔

اس شکستہ حالت میں، اسے کیا ہو گیا؟

یہ ساتھ کون ہے؟ یہ شیل تو نہیں۔ کوئی فاحشہ نظر آتی ہے۔ میں نے اس عورت کی طرف دیکھا وہ ہنس دی۔ سوبھ نے اس کی مسکراہٹ کا تعاقب کیا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ حالانکہ وہ مجھے نہیں جانتا تھا۔ عورت نے ایک گھونٹ ہی میں گلاس ختم کر دیا اور سوبھ دھیرے دھیرے پیتا رہا اور نشے کی حالت میں وہ میز پر لیٹ سا گیا۔

بیرے نے بل پیش کیا۔

"پیسے نہیں ہیں۔" سوبھ نے کہا۔

بیرے نے سمجھا نشے میں ہے۔ اس نے بل آگے بڑھا دیا۔

اب گاڑی بیچ چوراہے پر آگئی تھی' دھوپ آج کے روز بہ نسبت خاصی سخت تھی اور گاڑی کھینچنے والا ہاتھ کو آنکھوں کے اوپر چھجے کی شکل میں کیے آس پاس متجسس نظروں سے جھانکتا پھر رہا تھا' پھر وہ ٹھہر گیا' سامنے نالی کے کنارے پر ایک پرندہ پیاس سے بے حال جھک جھک کر نالی سے پانی پی رہا تھا اور گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھ بھی رہا تھا' اسے کسی بات کا خدشہ بھی لگا ہوا تھا' جبھی گاڑی کھینچنے والے آدمی نے بانس والے ساتھی کو اشارہ کیا' بانس والے نے چپکے سے' لپک کر پرندے کو جالیا۔

ذرا دیر بعد جب اس نے رنگین شیشوں والی گاڑی کے دروازے کا پٹ کھولا اور دھیرے سے پرندے کو اندر دھکیل دیا' پرندہ ایک طرف کو لڑھک گیا تو' پھڑ کتی ہوئی گویا ایک بار زور سے گاڑی کے اندر شیشوں پر پھڑ پھڑانے لگی گویا بند شیشوں کو توڑ کر نکل بھاگے گی۔ بانس والے آدمی نے مسکرا کر شیشوں کے اندر جھانک کر دیکھا' اس کے چہرے اور آنکھوں میں چمک آگئی پھر اس نے شیشے پر ہلکے ہلکے تھپکیاں دیں' یوں گویا سہم کر ایک طرف ہو گئی۔

اس کے بعد ویسے ہی ہلکی چال سے گاڑی آگے بڑھی' گھنٹیوں کی آواز خاموش فضا میں سنائی دی' ٹن ٹن ٹن... ٹن ٹن ٹن...

ذرا دیر بعد گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"گئی' چلی گئی..."

ہاں چلی گئی۔ اس پرندے کو بھی لے گئی..." جب فضا کا سحر ٹوٹا تو گاڑی اتری علاقے کے سخت ڈھلان میں اتر چکی تھی اور اب دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی' فقط اس کے پہیوں سے اڑتی ہوئی دھول تھی' جو دھیرے دھیرے فضا سے ہاتھ چھڑا کر بیٹھ رہی تھی۔ پھر چند منٹ بعد تماش بینوں کے چہروں پر جو حیرت کے اثرات تھے' وہ زائل ہو گئے اور وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

اچھا بھائی جان... یہ پرندے والی گاڑی..."

سوال کرنے والا رک گیا اور خاصی دیر تک رکا رہا تب میں نے پلٹ کر دیکھا' ٹھیک میری پشت پر ایک دس گیارہ سالہ لڑکا کھڑا' میری طرف مجسم سوال بنا تک رہا تھا۔

یہ پرندے والی گاڑی"۔ وہ لڑکا اتنا کہہ کر پھر رک گیا' جیسے اسے خود پتہ نہیں کہ کیا پوچھنا ہے۔

"ہاں ہاں... میاں کیا پوچھنا چاہتے ہو پرندے والی گاڑی کے متعلق..."

"جی بھائی جان اتنا کہ ------ یہ کیا گاڑی ہے پرندے پکڑنے والی...؟"

ہاں میاں ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ کیا گاڑی ہے' ہر روز دوپہر میں آتی ہے اور شہر کے جتنے پرندے ہاتھ آتے ہیں سمیٹ کر چل دیتی ہے۔"

"اچھا بھائی جان..." ذرا دیر بعد اس لڑکے نے یوں چونک کر سوال کیا گویا اچانک کوئی بات یاد آگئی ہو۔ "اچھا بھائی جان۔ کیا یہ لوگ باجی کے لقا کو بھی لے جائیں گے؟"

"ہاں ضرور لے جائیں گے' دیکھنے کی دیر ہے......"

"پھر باجی اچھی کیسے ہوں گی' انہیں لقوہ ہو گیا ہے نا۔ حکیم جی نے کہا تھا دواؤں کے ساتھ لقا کبوتروں کے پروں کی ہوا بھی چاہئے۔" لڑکے نے بڑی حسرت سے کہا' یوں کہ میں اس کے افسردہ چہرے کی طرف یک ٹک دیکھنے لگا۔

"ہاں ہاں' بات تو ہے سوچنے کی' لقا کبوتر کو نہیں جانا چاہئے..."

"پھر میں کیا کروں' آپ ہی بتایئے بھائی جان... میں تو بہت چھوٹا ہوں نا' میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میری بھی سمجھ میں نہیں آتا میاں ----- اور سچ پوچھو تو میں بھی بہت چھوٹا ہوں۔"

"آپ چھوٹے ہیں..." وہ لڑکا کھلکھلا کر ہنس پڑا "آپ اتنے بڑے ہیں' واہ..." وہ لڑکا پھر قہقہے لگانے لگا۔

آنکھیں میرے چہرے پر نہیں میرے سینے پر ہیں۔
"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
وہ رکا۔
"میں رقم واپس نہیں کر سکتا۔" اس نے کہا اس کے لہجے میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔
"تم نشے میں بالکل بدل جاتے ہو۔" میں نے کہا۔
"کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟"
اس نے تعجب ظاہر کیا۔
"ہاں۔ ایک روز چاندنی رات میں دیوار کے سائے میں تمہیں اور شیل کو۔۔۔" وہ چونکا نہیں۔ اس نے میری طرف ایک لمحے کے لئے دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں۔
"اور آج تمہیں ایک فاحشہ کے ساتھ دیکھ کر۔"
وہ خاموش رہا۔
"کیا تم ایک لڑکی کے جذبات سے کھیل کر اپنی ہوس کی آگ۔" میرے لہجے میں درشتی تھی۔
"مسٹر آپ نے میرا بل ادا کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ میری توہین کریں۔" وہ سانپ کی طرح چوٹ کھا کر بولا۔
میں اسے مزید پریشان کرنا چاہتا تھا۔
"کیا یہ جھوٹ ہے کہ رات رات بھر شراب کے نشے میں چور' بازاری عورتوں کے جسموں سے لپٹے رہنے کے بعد تم کہتے ہو کہ تمہیں شیل سے پیار ہے۔"
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر غم کی لکیریں کھنچ گئیں۔
"تم انتہائی کمینے انسان ہو۔"
"اگر میرے پاس پستول ہوتی تو تمہیں گولی سے اڑا دیتا۔"
وہ کافی دیر خاموش رہا۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا جیسے پستول نکال رہا ہو۔
"میں خود ہی اپنے کو گولی سے اڑا دیتا لیکن اس کا تصور آتے ہی رک جاتا ہوں۔"
تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا:
"ایک بار میں نے خودکشی کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اس وقت میرے پاس پستول نہیں تھا۔
جب تک دماغ کے پرزے نہ اڑیں مجھے مرنا پسند نہیں۔" وہ خاموش ہو گیا۔
میں بالکل الجھ گیا۔
"میں اپنا دل و دماغ روح' جسم سب کچھ شیل کو سونپ چکا ہوں اور اس نے بھی مجھے اپنا سب کچھ ارپن کر دیا ہے۔ کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا جسم پھٹ جائے گا۔ اگر میں۔" میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ واقعی روحانی کرب میں مبتلا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:
"سوبھ تم ذہین آدمی ہو کر بھی ابھی تک روائتی اخلاق کے غلام ہو۔ عشق میں سب کچھ جائز ہے۔"
وہ تھوڑا مسکرایا۔ "آپ صحیح کہتے ہیں۔ لیکن اس جائز کی ذمہ داری لینے کی مجھ میں ہمت نہیں۔"
"تم بزدل ہو۔"

"ہاں، ورنہ ابھی تک زندہ کیسے رہتا۔"
"اور پھر بھی تم پیار کرتے ہو۔"
"ہاں۔"
میں خاموش ہو گیا۔
"ڈئیر جو کچھ تم کہتے ہو سب ٹھیک ہے۔ میرا ذہن اسے قبول کرتا ہے۔"
"تو پھر؟"
"میں ایک بیکار آدمی ہوں، پیار، جذبہ حسن اس چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ عشق میں آدمی ہوئے شیر لا سکتا ہے۔ بے کاری میں عشق نہیں کر سکتا۔ اسی باعث ہزار نہ چاہنے پر بھی ہم اس اخلاق کے غلام ہو جاتے ہیں۔ جسے تم روایتی اخلاق کہتے ہو۔
اگرچہ ہم اس نئے اخلاق پر عمل کریں تو سوائے خود کشی کے کوئی راستہ نہیں۔
جسم میں سانس کی آمد و رفت قائم رکھنا ضروری ہے جو پیسے کے بغیر ممکن نہیں اور جس کے بغیر پیار آہ سرد ہے۔ نفس کو آنچ نہیں۔"
"تم بڑے حقیقت پرست ہو اور ذہین بھی۔"
وہ زہریلی ہنسی ہنسا "اگر دل کے بجائے پاؤں خراب ہو جائے تو آدمی حقیقت پرست ہو جاتا ہے۔"
اس کے لہجے میں طنز تھا۔
"تم مجھے کبھی مہذب سمجھتے ہو اور کبھی وحشی۔ اگر میں نے اپنی شخصیت کو منقسم نہ کر لیا ہوتا تو شیل میری وحشت کا شکار ہو جاتی یا میں اپنا جسم پھونک لیتا۔ بتاؤ کیا عشق میں جسم کی تسکین شامل نہیں اور اگر آدمی بیکار ہو تو وہ وحشی نہیں ہو جائے گا یا اسے بھی وحشی نہیں ہو جانا چاہیے؟"
اس کا لہجہ رقت آمیز تھا۔ وہ وہی باتیں کر رہا تھا جو میں کہنا چاہتا تھا۔ فرق محض اتنا ہے کہ میں نے یہ باتیں عقل کی سطح پر کتابوں سے پڑھ کر سیکھی ہیں اور اس نے اپنی روح اور جسم پر اذیتیں سہہ کر انہیں اخذ کیا ہے۔
"میری ایک خواہش ہے" کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ "شیل کی انگلیاں بڑی خوبصورت ہیں۔ کاش میں اس کے لئے سونے کی انگوٹھی خرید سکتا۔"
اس نے نظریں جھکا لیں۔ ہم کافی دیر تک اکٹھے چلتے رہے۔ راج روڈ پر وہ مجھ سے علیحدہ ہونے لگا۔
"اب کہاں جاؤ گے؟" میں نے کہا۔
"اسٹوڈیو میں۔"
"تم آرٹسٹ ہو۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"تمہارا اسٹوڈیو کہاں ہے؟"
"جس عورت کو میرے ساتھ دیکھا تھا اس کے گھر میں" "اور اس کا گھر۔"
وہ ہنس دیا۔ ظاہر ہے وہ عورت فاحشہ تھی، راج روڈ کے چوراہے پر وہ مجھ سے الگ ہو گیا۔
ایک روز میں اس کے گھر گیا۔ اس کے کمرے میں رنگ اور برش بکھرے پڑے تھے۔ وہ بالکل برہنہ بیٹھا کوئی تصویر بنا رہا تھا۔ میں کافی دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ لیکن وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔
"یہ تم ننگے کیوں بیٹھے ہو"۔ میں نے سوال کیا۔
"ننگا انسان خدا کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔"

اس نے بغیر میری طرف دیکھے جواب دیا۔

"کیا تمہیں خدا میں یقین نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"جب میں تصویر بناتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ شاید خدا ہے۔ ویسے جب میں برہنہ جسم کی تصویر بناتا ہوں تو کپڑے پہن لیتا ہوں۔" وہ چھوٹی چھوٹی شرارتیں کرنے کا عادی تھا۔

"بہت دنوں سے نظر نہیں آئے۔"

میں نے پوچھا۔

"تصویر بنا رہا ہوں۔ دل اور جسم کی کشمکش میں روح کے کرب کو چہرے پر نمایاں کرنا چاہتا ہوں۔ کیسے ہو گا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میں نے ابھی تک زندگی کو تصویر میں دیکھا ہے۔ اب تصویر کو زندگی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

کافی دن بیت گئے۔ میں اپنے کاموں میں مصروف رہا' اور سوبھ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک روز آرٹ گیلری میں ایک تاریک کونے میں اس کی بنائی ہوئی تصویر دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کا خیال آگیا۔ بڑی مدت ہو گئی اس سے ملے ہوئے۔ تصویر میں روشنی اور سائے کے سنگم پر ایک زخمی عورت کا برہنہ جسم تھا۔

میں سوبھ کے گھر گیا۔ رنگ' برش' اور نا تمام تصویروں کے سوا وہاں کچھ نہ تھا۔ دیواروں پر جسم کے مختلف اعضا کی الگ الگ تصویریں تھیں اور ان کو اپنے تصور میں یکجا کرنے سے مکمل جسم کی تصویر بنتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے عالم جذب میں تصویر بنائی تھیں۔

میں نے اس فاحشہ سے پوچھا سوبھ کہاں ہے!" کون سوبھ۔ وہ آرٹسٹ۔ اس کی بات کرتے ہو' وہ تو پاگل تھا سنکی۔"

میں مایوس لوٹ آیا۔ میں اس مقام پر گیا جہاں پہلی بار چاندنی رات میں میں نے اسے دیکھا تھا۔ میں اس ریسٹوران میں بھی گیا جہاں وہ شراب کے نشے میں چور تھا۔ اس سڑک پر بھی گھوما جہاں ہم نے سرگوشیاں کی تھیں۔ لیکن وہ نہ ملا۔

جب میں کسی نوجوان کی خود کشی کی خبر پڑھتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں اور مجھے سوبھ کا فقرہ یاد آ جاتا ہے۔ میں نے جب اسے کہا تھا۔ تم بزدل ہو۔ تو اس نے جواب دیا تھا۔ ہاں ورنہ میں ابھی تک زندہ کیسے رہتا۔ شاید اور اس کے آگے میں کچھ نہ سوچ سکا۔

ہر رات کو ساڑھے گیارہ بجے میں اس مقام سے گزرتا ہوں۔ سامنے مکان کا در کھلتا ہے۔ دو آنکھیں باہر جھانکتی ہیں۔ میں ایک لمحے کے لئے رکتا ہوں اور پھر تیزی سے آگے بڑھ جاتا ہوں۔

مجھے خدا میں یقین نہیں۔

لیکن میں نے بجلی کے کھمبے تلے' دیوار کے سائے تلے' دیوار یا درخت کی چھایا میں ایسا نور دیکھا ہے جو خدا کے سوا اور کوئی نمو نہیں کر سکتا۔

غیاث احمد گدی

نام : غیاث احمد
قلمی : غیاث احمد گدی۔
پیدائش : ۱۷ فروری ۱۹۲۸ء بہ مقام جھریا (بہار) بھارت۔
وفات : ۲۵ جنوری ۱۹۸۶ء کی صبح ۵ بجے۔
تعلیم : اول سال بھر گدی مدرسہ، جھریا میں مولوی فضل الحق سے عربی کی ابتدائی تعلیم پائی بعد میں دو برس تک گھر پر مولوی قاسم سے اردو انگریزی اور حساب کا درس لیا۔ رسمی تعلیم سے محروم رہے۔ ان کے پاس کوئی ڈگری نہ تھی۔

مختصر حالات زندگی:

آپ جھریا (بہار) ــ ــ مسلمان گوالوں کے خاندان سے تھے۔ آپ کے والد کا نام احمد گدی تھا، جن کا آبائی پیشہ دودھ کا کاروبار تھا۔ بچپن میں ان کے سگے چچا حبیب گدی نے گود لے لیا اور غیاث احمد گدی کا بچپن بائی میں دودھ بھر کر گھر گھر بانٹنے میں گزرا۔ کچھ یہی سبب ہے کہ رسمی تعلیم سے محروم رہے۔

ان کے لڑکپن اور ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ ایک تھا۔ جھریا میں ایک چھوٹی سی پبلک لائبریری تھی جس کے طفیل غیاث احمد گدی اس دور کے نمایاں ادبی جرائد "ہمایوں"، "عالمگیر"، "خیام"، "ادبی دنیا"، اور "ادب لطیف" سے متعارف ہوئے اور ادب کی چینک دل میں جاگی۔ ۱۹۴۰ء میں کرشن چندر سے متاثر ہو کر افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور دس برس کی ریاضت کا نتیجہ یہ نکلا کہ پچاس کی دہائی میں جب ترلیش کمار شاد نے کرشن چندر کا انٹرویو کیا تو انہوں نے گدی کو مستقبل کے اردو افسانے کا اہم نام قرار دیا۔ ۱۹۴۴ء میں اپنے ہی خاندان میں بانو سے شادی ہوئی اور یہ رفاقت صرف آٹھ برس رہی ۱۳ فروری ۱۹۵۲ء کو بانو کا انتقال ہو گیا۔ غیاث احمد گدی دل کے مریض چلے آتے تھے ۲۴ اور ۲۵ جنوری ۱۹۸۶ء کی درمیانی شب دل کا دورہ پڑا اور صبح پانچ بجے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ نے "میراث" کے نام سے خالص افسانوی ادب کا ذاتی ادبی مجلہ جولائی ۱۹۶۳ء میں جاری کیا تھا، جس کے صرف چار شمارے نکل سکے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"دیوتا" مطبوعہ: "ہمایوں" لاہور ستمبر ۱۹۴۳ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "بابا لوگ" (نو افسانے) کچرل اکادمی، ریتا ہاؤس گیا، بہار: طبع اول: ۱۹۶۹ء

۱۔ بابا لوگ ۲۔ پیسہ ۳۔ منظر و پس منظر ۴۔ بابے ۔ ۵۔ ڈور تھی جون سین ۶۔ بد صورت سیہ صلیب ۷۔ پیاسی چڑیا
۸۔ جوہی کا پودا اور چاند ۹۔ صبح کا دامن

۲۔ "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" (سولہ افسانے) صبا پبلی کیشنز' دھرم شالہ روڈ' جھریا' بہار: طبع اول: ۱۹۷۷ء

۱۔ پرندہ پکڑنے والی گاڑی ۲۔ تج دو تج دو ۳۔ ڈوب جانے والا سورج ۴۔ ایک خون آشام صبح ۵۔ قیدی ۶۔ نارو منی
۷۔ خانے = خانے ۸۔ اندھے پرندے کا سفر ۹۔ افعی ۱۰۔ کالے شاہ ۱۱۔ ایک جھوٹی کہانی ۱۲۔ پرکاشو ۱۳۔ پاگل خانہ ۱۴۔ دیمک
۱۵۔ کیمیا گر ۱۶۔ ہم دونوں کے بیچ

۳۔ "سارا دن دھوپ" (بارہ افسانے) مکتبہ غوثیہ' شبستان' نیو کریم گنج' گیا' بہار: طبع اول: ۱۹۸۵ء

۱۔ طلوع ۲۔ کوئی روشنی ۳۔ سورج ۴۔ صبح کا دامن ۵۔ دھوپ ۶۔ آخ تھو ۷۔ کوڑھ ۸۔ چہرے پے چہرہ ۹۔ سائے اور ہمسائے
۱۰۔ سرنگ ۱۱۔ ایک بھیگا ہوا لب ۱۲۔ چٹکی بھر ہریالی

۴۔ "پڑاؤ" (ناولٹ) صبا پبلی کیشنز' دھرم شالہ روڈ' جھریا' بہار: طبع اول: ۱۹۸۰ء

غیر مدون:

محولہ بالا مطبوعہ کتب کے علاوہ پانچ نامکمل ناولٹ بعنوان: ۱۔ "نواب حشمت بیگ" ۲۔ "خانے = خانے" ۳۔ پیاسی چڑیا ۴۔ تج دو تج دو ۵۔ ڈوب جانے والا سورج" کے عنوانات سے یادگار چھوڑے۔ انہیں عنوانات کی مطبوعہ تحریریں ناولٹس کے مختلف اجزا ہیں۔

زندگی میں مستقل پتا:

جھریا' بہار' بھارت۔

نظریہ فن:

خوب سے خوب تر کی تلاش ---- میرے نزدیک یہ بات اہم ہے"۔

غیاث احمد گدی

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ محررہ ۳ نومبر ۱۹۸۰ء)

غیاث احمد گدی

پرندہ پکڑنے والی گاڑی

صبح ہوتی دن چڑھتا' اور جب ٹھیک نصف النہار پر پہنچتا' شہر میں ایک ایسی گاڑی آتی جو شہر کے پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی' ٹھیک ویسے ہی جیسے میونسپلٹی کی گاڑی کتے پکڑنے کے لیے نکلتی ہے۔ یہ گاڑی جو چاروں طرف سے رنگین شیشوں سے بند بے حد خوبصورت ہوتی کہ نگاہ اٹھ کر اٹک جاتی' اس کے چاروں طرف ننھی ننھی گھنٹیاں بندھی ہوتیں جو چلتے وقت دھیرے دھیرے بج رہی ہوتیں۔ گھنٹیوں کی آواز عجیب ہوتی' کچھ ایسی جیسے کوئی سحر پھونک رہا ہو' ایک لمبا' خمیدہ کمر' زرد رو آدمی گاڑی کو کھینچ رہا ہوتا۔ بالکل اسی طرح دوسرا آدمی گاڑی کے پیچھے چل رہا ہوتا' جس کے ہاتھ میں پتلا سا بہت لمبا بانس ہوتا' بانس کے سرے پر برش جیسا گچھا سا ہوتا جس پر گوندیا اسی طرح کی چپک جانے والی لس دار رطوبت لگی ہوتی' جس سے وہ پرندوں کو پکڑتا تھا۔

دیوار پر' چھتوں کی منڈیروں پر' ٹیلی فون کے کھمبوں' پیڑوں یا فرش پر دانہ دنکا چگتے ہوئے پرندے جہاں نظر آتے وہ آدمی بانس کو آگے بڑھا دیتا اور جن پرندوں کے پروں پر لیس دار رطوبت لگا ہوا گچھا چھوا دیتا۔ پہلے تو وہ پرندہ تڑپتا' پھڑ پھڑاتا' اڑنے کی کوشش کرتا پھر تھک ہار کر لس دار رطوبت سے چیں چیں کرتے ہوئے پروں کی قوت پرواز کے الجھ جانے کے باعث ایک طرف اوندھا ہو کر لڑھک جاتا۔ تب وہ آدمی جلدی سے بڑھتا اور دونوں ہاتھوں سے جھپٹ کر پرندے کو پکڑتا' دھیرے سے گاڑی کے چھوٹے سے دروازے کو کھولتا' اس میں پرندے کو دھکیل دیتا' دروازہ بند کرتا' پھر غور سے شیشے کے اندر دیکھتا' جہاں پرندہ پھڑ پھڑا کر تھک جاتا' اس وقت اس آدمی کے چہرے پر عجیب سی ہنسی بکھر جاتی اور آنکھیں اندھیرے میں بلی کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھتیں۔

ہر روز جیسے سورج سروں پر آتا' تیز کرنیں سروں پر گرتیں' پچھمی دروازے کی جانب سے چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی صدا سنائی دیتی' ذرا دیر بعد بڑی سبک خرامی سے ایک آدمی' جس کا چہرہ بے حد زرد ہوتا اور اس کی آنکھیں نیم وا ہوتیں' اس کی کمر سے پتلی سی رسی لپٹی ہوتی' جو گاڑی کے سرے سے بندھی ہوتی اور وہ نیم غنودگی کے عالم میں چلتا بڑھا آتا' پھر جہاں کوئی چڑیا کوئی پرندہ نظر آتا' وہ آدمی آپ ہی آپ رک جاتا اور اپنے پیچھے آنے والے آدمی کو پرندہ کی طرف اشارہ کرتا۔

یہ روزمرہ کا دستور ہوتا' دوکان دار دوکانوں میں ہوتے' راہ گیر چلتے چلاتے رہتے' موٹر کاریں تیزی سے پوں پاں کرتی گزرتی ہوتیں' ہوتا کا ٹھنے والا کاٹھتا رہتا' خرید و فروخت رہتی' شوروغل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی' لین دین کا بازار اتنا جواں ہوتا کہ اول تو گاڑی کی طرف کسی کی نظر ہی نہ اٹھتی' لیکن ان میں سے کسی کی نظر اٹھ بھی جاتی تو وہ سحر زدہ سا اس عجیب و غریب گاڑی اور اس کے حسن کو دیکھنے میں کھو جاتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی آدمی چونکتا اور ذرا حوصلہ سے الجھتا' گاڑی والے جب اس آدمی کو قریب آتے دیکھتے تو جھٹ اپنی لمبی جیب میں ہاتھ ڈالتے اور چند سکے نکال کر اس کی طرف اچھال دیتے' پھر وہ آدمی سکے چننے میں ایسا محو ہو جاتا کہ اسے کسی چیز کا ہوش ہی نہ رہتا۔ لوگ یہ منظر دیکھتے اور آنکھ اور چہروں سے حیرت کا اظہار کرتے۔ اس وقت ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں' یہ بھی کچھ زیادہ دیر نہیں رہتا' فقط چند منٹ' دس یا بیس منٹ تک۔ پھر حیرت کا یہ وقفہ کم ہوتا گیا اور ہوتے ہوتے محض چند سیکنڈ رہ گیا تو' اب اس کے بعد وہ منزل آنے والی تھی کہ

لوگ باگ اپنے کاموں میں مصروف ہیں اور پرندے پکڑنے والی گاڑی آگئی ہے' اور پرندہ پکڑتی چلی جا رہی ہے اور آدمی ہے کہ اس کی جانب نظر اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔

ایسی ہی کیفیت والا ایک دن تھا' جب میں نے ایک دکان دار کو جلیبیوں کی تھال کی طرف اشاہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہاں دیکھو جلیبیوں پر کتنی مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں؟... ابھی جب شہر میں بیماری پھیلی ہوئی ہے' یہ مکھیاں کتنی خطرناک...!"

"مکھیاں....؟" حلوائی نے کابلی سے ہاتھ ہلا کر مکھیوں کو اڑانے کی کوشش کی' مکھیاں ذرا دیر کو اڑیں پھر جلیبیوں کی تھال پر ٹوٹ پڑیں... "ہاں مکھیاں تو سالی اڑتی ہی نہیں۔"

حلوائی نے میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر تم کو کیا صاحب' تم کو تو نہیں خریدنا۔"

میں نے جواب میں انکار کیا تو حلوائی نے آنکھ ماری اور سرگوشیوں سے ذرا قریب کے لہجے میں کہا "اور مجھ کو بھی کیا صاحب' مجھ کو بھی تو کھانا نہیں...!"

بس یہیں سے میں چونک گیا کہ اصل بات کیا ہے۔ پرندہ پکڑنے والی گاڑی آتی ہے اور شہر کے پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے اور کوئی پوچھنے والا تو کیا ملے گا' کوئی خدا کا بندہ پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں ہے۔ میری سمجھ میں بات آگئی' میری پیشانی پر جو بہت دیر سے بلکہ کئی دنوں سے ایک تیوری کسی سنتری کی طرح کھڑی دکھ رہی تھی سمٹ گئی' پھر میں ہنسا اور میں نے بھی گفتگو سے ذرا دور کے لہجے میں کہا' "تو بھائی حلوائی ایک کام کرونا' ان گاڑی والوں کی توجہ مکھیوں کی جانب مبذول کرا دو...!"

حلوائی چونک گیا... اور اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا' لیکن پل بھر میں سنجیدہ ہو گیا۔

ارے ہاں... مگر کیوں صاحب' مجھے اس جھنجھٹ سے کیا فائدہ؟"

"یہ' جو مکھیاں جلیبی کا سارا رس..."

"ہاں یہ تو ٹھیک کہا سارا رس چوسے چلی جاتی ہیں کم بخت... مگر صاحب مجھے اس سے کیا نقصان' مجھے تو فائدہ ہے۔"

"وہ کیا" میں نے حلوائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا" فائدہ کیسے ہے؟"

حلوائی پہلے ہنسا پھر اس نے اپنے بنا سپتی میں چپڑے ہوئے توند پر ہاتھ پھیرا اور بے حد سنجیدہ ہو کر میری طرف جھک گیا۔ "بابو تم کیا جانو دنیا داری' یہ راز کی بات ہے۔ دنیا ایسے نہیں چلتی..." پھر حلوائی خاموش ہو گیا اور ذرا گمرا ہو کر پھر گویا ہوا... "پر تو اپنا ہمدرد لگتا ہے اس لیے بتاتا ہوں' کسی سے کہنا نہیں تو بابو جلیبیوں کا یہ رس جو مکھیاں چوستی ہیں تو پھر رس اور مکھیاں کہاں جاتی ہیں ذرا اتنا تو بتاؤ؟"

"کہاں جاتی ہیں... مجھے پتہ نہیں' حلوائی میاں تم ہی بتاؤ؟"

"کہیں نہیں جاتیں..." حلوائی فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "رس مکھیوں کے پیٹ میں اور مکھیاں جلیبیوں کے ساتھ پلڑے پر... سمجھے بابو؟ ایسے فائدہ ہوا!!"

لیکن میں بہت دیر تک سمجھ نہ سکا اور بے وقوفوں کی طرح حلوائی کے چہرے کو تکتا رہا' حلوائی پھر ہنسا' پھر مونچھوں پر تاؤ دیا' "نہیں سمجھے اب بھی...؟"

ابھی ہماری گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ پچھمی دروازے کی جانب گھنٹیوں کی آواز سنائی پڑی اور میری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی' ذرا دیر بعد وہ زرد رو خمیدہ کمر آدمی دکھائی پڑتا ہے' حسب دستور اس کی کمر سے پتلی سے رسی بندھی ہوئی تھی' جس کے پچھلے سرے پر وہ گاڑی پھنسی ہوئی تھی' آدمی اسی کاہلی سے سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا' پھر گاڑی سامنے آئی جس کے رنگین شیشوں کے اندر دو کبوتر اور ایک گوریا بند تھے' کبوتر تو سر نہوڑے ایک طرف کھڑے تھے یا پھر دھیرے دھیرے کاہلی سے سرقدمی کر رہے تھے لیکن گوریا تیزی سے ادھر ادھر پھدکتی پھر رہی تھی اور قدرے اضطراب کے عالم میں تھی۔

"کہہ دیا پیسے نہیں ہیں۔" یہ کہہ کر وہ پھر لیٹ گیا۔
بیرا ریستوران کے مالک کے پاس گیا اور وہ دوڑتا ہوا آیا۔
"جناب نشے میں ہیں۔ زیادہ پی لی ہے۔ بل حاضر ہے۔" منیجر نے نہایت عاجزی سے بل سوہھ کی جانب بڑھایا۔ لیکن اس نے کوئی حرکت نہ کی۔
"میں آپ سے مخاطب ہوں جناب۔"
منیجر کے لہجہ میں درشتی تھی۔
"کیا یہاں سب بہرے ہیں۔ کوئی نہیں سنتا۔ پیسے نہیں۔" وہ چلایا۔
"کیا مطلب؟"
منیجر غصے میں تھا۔
"مطلب۔ جتنے پیسے ملے صاحب کو دے دیئے۔" اور پھر اس نے اپنی دونوں جیبیں الٹ دیں۔
"تو پھر آپ نے آرڈر کیوں دیا؟"
منیجر غرایا۔
"ایک نشے کو دوسرے نشے سے کم کرنے کے لئے۔"
"یہاں فلاسفی نہیں چلے گی مسٹر۔"
اور منیجر نے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔
"تو یہ چلے گا۔ میں اس کا عادی نہیں۔"
"گڈ بائی" سوہھ اپنا گال سہلاتا ہوا اٹھنے لگا منیجر نے روک لیا اور اس دوران میں وہ عورت ریستوران سے باہر جا چکی تھی۔ مجھے یہ منظر بڑا عجیب سا لگا۔ میں منیجر کے پاس گیا اس کے ہاتھ سے بل لیا۔ تین روپے کچھ آنے تھے۔ میں نے پیسے نکالے اور بیرے کے ہاتھ میں دے دیئے۔
"شکریہ" منیجر نے کہا "کیا آپ انہیں جانتے ہیں۔؟"
"ہاں۔ میرا دوست ہے زیادہ پی لی ہے۔"
"جھوٹ۔ میں نے زیادہ نہیں پی۔ صرف ایک پیگ۔ حقیقت یہ ہے صاحب 'پیسے نہیں' معلوم نہیں لوگ سچ کو سچ نہیں مانتے۔"
اس نے میری طرف دیکھا کتنا احسان فراموش ہے یہ شخص مجھے اس پر انتہائی غصہ آیا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا۔
"تم کوئی شریف آدمی نظر آتے ہو۔" اس نے کہا۔ "اور تم کوئی بدمعاش؟"
وہ مسکرایا "شکریہ گڈ بائی۔" اس نے کہا اور باہر چلا گیا۔ دروازے پر وہ رکا اس نے ایک بار منیجر کی طرف دیکھا اور دہلیز پر تھوک دیا اور باہر نکل گیا۔ جب وہ باہر نکلا تو میں نے دیکھا وہ ایک پاؤں سے لنگڑا تھا۔ میں بڑی عجیب حالت میں تھا۔ کیا یہ وہی ہے جسے اس روز چاندنی رات میں میں نے دیکھا تھا۔ نہیں یہ وہ آدمی نہیں ہو سکتا۔ ان دو آدمیوں میں رنگ روپ خدو خال کے علاوہ اور کوئی مشابہت نہیں۔ چاندنی رات دیوار کے سائے میں کھڑا سوہھ نرم دل 'ذہین' نفاست پسند پیار کرنے والا نوجوان تھا اور ریستوران کی اس چار دیواری میں نظر آنے والا سوہھ لا ابالی اور سنکی نوجوان ہے۔ جس نے نفرت سے دہلیز پر تھوک دیا ہے۔ میں نے میز سے اپنا سگریٹ کیس اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ وہ دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پرزہ دیا۔ وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر آگے بڑھا۔ میں نے کاغذ کو الٹ کر دیکھا یہ میرا چارکول اسکیچ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ بڑی مدت سے میں اپنے ذہن میں جو اپنی تصویر بنا رہا تھا۔ یہ اس کا خاکہ ہے۔ اسکیچ میں میری

میں خاموشی سے بدستور اسے دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں کہا' میاں تم ہنس رہے ہو؟
"بھائی جان ایک اور بات پوچھوں؟ "اس نے ذرا ٹھہر کر دوسرا سوال کیا۔
"پوچھو میاں وہ بھی پوچھ ڈالو..."
"آپ اتنا اداس... بھائی جان آپ کبھی ہنستے کیوں نہیں؟"
میرا جی چاہا سچ سچ کہہ دوں' کیسے ہنسوں میاں' اس کارگہ شیشہ گری میں ہنسنا کوئی کھیل ہے' مگر میں اس معصوم بچے کو جو ذرا دیر پہلے تا کبوتر کے چلے جانے کی فکر میں اداس تھا اور اب ذرا دیر میں قہقہے لگا رہا تھا' کچھ نہیں بتا سکا۔ نھا پیار سے مجھے دیکھتا رہا۔
"بھائی جان میں آپ کو ہنسا دوں...؟" وہ لڑکا بڑی محبت سے میری طرف بڑھا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا..." آپ کہے تو میں آپ کو ہنسا دوں؟"
پہلے تو میں چونکا' دفعتاً" مجھے عجیب سے لگا' نا سمجھی میں اس لڑکے نے ذرا اپنے قد سے بڑی بات کہہ دی تھی' پھر میں نے ذرا محبت سے تاکید کی۔
"میاں آہستہ بولو' دھر لیے جاؤ گے' کسی نے سن لیا تو' پولیس والوں کو خبر کر دے گا کہ یہ کیسا لڑکا ہے کہ اس کی بہن بیمار پڑی ہے اور اس کا لقا کبوتر بھی چلا جانے والا ہے' اور یہ ہے کہ خود ہنستا بھی ہے اور دوسروں کو بھی ہنسانے کی سوچتا ہے' ہوش کے ناخن لو میاں' مفت میں پکڑے جاؤ گے۔"
"بلا سے پکڑ لیا جاؤں گا' لڑکے نے حوصلے سے کہا' آپ کہے تو ہنسا دوں آپ کو۔"
"ہنسا دو میاں بڑا کرم ہو گا' بڑی مہربانی ہو گی تمہاری..."
"تو پھر دوستی کیجے..." اس نے دوستی کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔
"تم سے دوستی؟ ارے چھٹنکی' تمہارے اتنے اتنے تو میرے بیٹے ہیں' میں تو تمہارے باپ کے برابر ہوں۔"
"تو کیا ہوا' باپ بھی تو دوست ہوتے ہیں۔ میرے مولوی جی کہتے ہیں۔ اچھے باپ اپنے بچوں کے دوست بھی ہوا کرتے ہیں۔"
"یہ بات ہے... تو ہوا دوست تمہارا آج سے۔" میں نے اس کے ننھے سے خوبصورت ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔
"پھر چلئے میرے ساتھ ندی کی طرف' وہاں آپ اور ہم دو ہی ہوں گے۔ وہاں میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں گا۔
اور وہ لڑکا گھسیٹتا ہوا مجھے ندی کی طرف لے چلا' میں پیچھے پیچھے اور وہ آگے آگے' راہ گیر پلٹ پلٹ کر ہماری دوستی کو دیکھتے رہے اور ہم پلٹ پلٹ کر راہ گیروں کو تک رہے تھے۔ جن کے کوئی دوست تھے بھی یا نہیں' جن کے کوئی ایسے پیارے بیٹے تھے بھی یا نہیں' اور یوں جب ہم ندی کے قریب پہنچے تو اس نے پہلے تو چالاک نگاہوں سے دائیں دیکھا بائیں دیکھا' ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو اس نے اپنے نیکر کی جیب سے ماچس کی ڈبیہ نکالی' مسکرایا میری طرف پلٹا اور گہری سرگوشی میں بولا' "اس میں ہے...!"
جواب میں میں نے بھی اتنی ہو ہوشیاری سے پہلے بائیں طرف دیکھا دائیں طرف دیکھا' جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو اتنی ہی سرگوشی میں پوچھا:
"کیا ہے اس میں؟"
"یہ ہے'... یہ ہے اس میں۔" لڑکے نے کہا اور جھٹ سے ماچس کے اندرونی حصے کو باہر دھکیل دیا۔
ماچس کی ڈبیا میں میری آنکھوں کے سامنے ایک بے حد خوش رنگ سی تتلی نیم جان سی پڑی تھی' جو باہر کی ہوا اور دھوپ لگتے ہی پھڑ پھڑانے لگی۔ اس کے ننھے ننھے پروں کے ارد گرد زعفرانی رنگ بکھرا ہوا تھا اور پروں کے درمیان عین ذرہ کے برابر سرخی تھی اور سرخی کے چاروں طرف گلابی رنگ سا چھلکا ہوا تھا اور پروں کے کنارے پر افشاں چمک رہی تھی... ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہ بے حد حسین دکھ رہی

تھی۔

تتلی کی غور سے دیکھتا رہا اور ذرا دیر رنگوں کی دنیا میں کھویا رہا... جب تک میں رنگوں میں ڈوبتا ابھرتا رہا' وہ لڑکا اتنے ہی انہماک سے میرے چہرے کے خط و خال پر کچھ ڈھونڈتا پھرا... میں نے تتلی کی طرف سے نظر اٹھائی' اس لڑکے کی طرف دیکھا تو وہ قدرے افسردگی سے میری طرف پلٹا... "آپ تو عجیب ہیں بھائی جان... آپ تو تتلی دیکھ کر بھی خوش نہیں ہوئے۔"

"ہاں میاں..." میں چونک اٹھا۔ اس دس برس کے بچے نے تو مجھے بہت دور پہنچ کر پکڑ لیا----- یہ تم نے کیا کہہ دیا میاں کہ میں..."

"ہاں' بھائی جان..." اس نے قطعہ کلام کرتے ہوئے کہا... "آپ تو تتلی سے بھی خوش نہیں ہوتے' کیسے ہماری دوستی نبھے گی..."

"نہیں نبھے گی میاں' کبھی نہیں نبھے گی..."

میں یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا' مگر ساتھ ساتھ تیزی سے چلتے ہوئے وہ لڑکا بھی ہم راہ رہا... "لیکن بھائی جان وہ میرا لقا کبوتر' وہ گاڑی..."

دوسرے دن میں بازار کے سارے لوگوں سے کہتا پھرا' جوتے گانٹھنے والے موچی سے' کپڑا بیچنے والے بزاز سے' بھیڑ میں گھرے رہنے والے ڈاکٹر سے' روئی اور دال بیچنے والے سے' راہ گیروں سے' سفید پتلون والے تیز رفتار بابو سے' بوجھ ڈھونے والے قلی سے' رنگین دوپٹے والی خاتون سے جو سڑک پر ہولے ہولے یوں چلتی ہے گویا سارے زمانے کو روند کر گزر جانے کا فیصلہ کر چکی ہے' دونوں سیاست دانوں سے' جو آپس میں سازشی انداز کی گفتگو میں مصروف لپکے چلے جا رہے تھے۔ ایک ایک آدمی سے پوچھتا پھرا' تیز رفتار گاڑیوں کو روکنے کی ناکام کوشش کی' کہ اس دس سالہ بچے کی جوان بہن لقوہ کی مریض ہے اور حکیم جی نے دواؤں کے ساتھ لقا کبوتر کے پروں کی ہوا کے لیے کہا ہے۔ اگر یہ گاڑی والے بچے کے کبوتر کو بھی لے گئے تو پھر کیا ہو گا؟

مجھے کسی نے جواب نہیں دیا' سب اپنی اپنی دنیا میں مصروف رہے' اس لیے میں دس سالہ بچے کے سوال کو پی گیا اور کوئی جواب نہیں دے سکا۔ مجھے افسوس تھا' اداس سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ میرے پاؤں تھک گئے تھے۔

دوپہر سے شام ہونے کو آگئی تھی' سرمئی اندھیرے کا جنم ہونے والا تھا کہ میری نظر چوک کے ایک کوٹھے پر گئی' جہاں شہر کی مشہور رنڈی منی بائی بالکونی میں کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ منی بائی کے سامنے اڈے پر اس کا طوطا دائیں بائیں گردن گھما گھما کر جھوم رہا تھا اور وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرتی جا رہی تھی اور طوطے کو پڑھاتی بھی جا رہی تھی۔

میں چپکے سے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ اس کے کمرے کو عبور کر کے بالکونی میں عین منی بائی کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ منی بائی میری آمد سے مطلق بے خبر طوطے کو پڑھانے میں محو تھی۔ "بول میاں مٹھو' نبی جی روزی بھیجو..."

میاں مٹھو نے اڈے میں دائیں اور بائیں جانب رکھی ہوئی دونوں پیالیوں کو گردن گھما کر دیکھا' پھر ایک پیالی پر جھک کر ہری مرچ کو کتر کر' منی بائی کی طرف مخاطب ہو کر بولا' نبی جی روزی بھیجو... نبی جی روزی بھیجو..."

"نبی جی روزی بھیجو"۔ طوطے نے اسی طرح اکڑ کر کہا۔

"سو میں آگیا"۔ اس کے پیچھے کھڑا' میں نے آہستہ سے کہا۔ منی بائی سن کر چونک اٹھی' اس نے پلٹ کر مجھے گھورا ذرا دیر کو سہم گئی' پھر ذرا ڈپٹ کر بولی:

"تم کیسے چلے آئے جی' کون ہو؟"

"سیڑھیوں سے جی' مجھے نہیں پہچانا' منی بائی' مجھے نبی جی نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

منی بائی یہ سن کر ہنس پڑی۔ "اچھا اچھا جی' چلو ادھر بیٹھو تخت پر۔" اس نے کنگھی کے دانتوں سے سنہرے بالوں کا گچھا نکالا۔ اس نے گولی بنا کر اس پر تھوکا پھر نیچے سڑک پر پھینک دیا۔

"بڑی طوطا چشم ہو منی بائی ذرا سا میں طوطے کی طرح رنگ بدلتی ہو" - جواب میں منی بائی نے ایک اور رنگ بدلا اور مسکرا پڑی۔

تخت پر بیٹھتے ہوئے میں نے اس کے قدموں پر چودہ روپے کے ایک ایک کے نوٹ رکھ دیے "میرے پاس اتنے ہی ہیں جی - تمہارے نبی جی نے آج بڑے غریب آدمی کو ادھر بھیجا۔"

"نہیں جی یہ بھی کیا کم ہیں... ہم تو اپنے آقاؤں کی خدمت کرنا جانتے ہیں۔"

لیکن بہت دیر ہو گئی اور میں نے منی بائی سے کوئی خدمت نہیں لی تو وہ جھلا گئی - "یہاں کاہے کو آئے ہو جی... اور یہ روپے کیوں دیے...؟"

"منی بائی برا نہ مانو' میں تو صرف اس لیے آیا ہوں کہ تم سے بھی پوچھ دیکھوں' تم کیا کہتی ہو؟"

"کاہے کے بارے میں؟"

"یہ جو آج کل ہر روز دوپہر میں پرندہ پکڑنے والی گاڑی آتی ہے اس کو دیکھتی ہو؟"

"ہاں دیکھتی ہوں کبھی کبھی -"

"تو تمہیں کیسا لگتا ہے...؟"

"اچھا جی... اچھا لگتا ہے... پیلے پیلے لال لال خوب صورت شیشوں میں سے پرندے چہکتے ہوئے بھلے دکھتے ہیں۔"

"بہت دور سے دیکھتی ہو نا... جتنی دور سے تمہیں تمہارے چاہنے والے دیکھتے ہیں۔"

"ہاں جی' اس بالکونی سے..."

"منی بائی' کسی دن نیچے جا کر قریب سے دیکھو..."

"وہ کیوں' مجھے اتنی فرصت نہیں جی -" منی بائی نے ناگواری سے میری اور دیکھا' پھر غالباً" اسے میرے چودہ روپے کے نوٹ یاد آگئے تو وہ مسکرا پڑی - "تم مجھے ذرا قریب سے دیکھو نا جی...؟"

"سو تو دیکھ رہی رہا ہوں منی بائی اور تم بھی دیکھ لو گی جس دن گاڑی والے تمہارے طوطے کو پکڑ کر لے جائیں گے..."

"میرے طوطے کو کیوں لے جانے لگے۔" منی بائی نے کڑک کر برجستہ کہا' یہ کوئی سڑک پر پھرنے والا آوارہ پرندہ ہے' یہ تو پالتو ہے میرا ہیرا من۔"

"ہاں منی بائی پہلے تو سڑک پر پھرنے والے پرندے کو پکڑیں گے پھر... کچھ دنوں کے بعد... لال لال پیلے پیلے خوب صورت شیشوں کے پیچھے سے اور پرندوں کے درمیان یہ تمہارا ہیرا من طوطا دیکھنے میں کتنا اچھا لگے گا - تم دیکھو نہ دیکھو' سڑک پر چلتے پھرنے والے لوگ باگ اور دکان میں سودا سلف بیچنے والے جنسے ضرور دیکھیں گے اور سڑک پر' جو پرندے والی گاڑی والے دونوں آدمی سکے پھینک دیتے ہیں' ان سکوں کو اور لوگوں کے ساتھ تم بھی چننے لگو گی اور یہ بھول جاؤ گی... کہ..."

"کیا بھول جاؤں گی...؟" بہت سے سکے مل جائیں تو ہیرا من کو کون روتا ہے - گاڑی والے اگر ڈھیر سارے سکے پھینک دیں گے تو میں سب چن لوں گی..... اور بازار سے نیا طوطا لے آؤں گی۔"

اے ہے منی بائی' ہوش کے ناخن لو' یہ دنیا ہے اور دنیا سالی بڑی مطلبی ہوتی ہے - مان لو' بازار میں طوطا نہ ملا' اور ملا تو ایسا پڑھنے والا نہ ملا اور یہ پڑھنے والا بھی مل گیا تو اس کی زبان میں یہ تاثیر...

منی بائی

منی بائی

منی بائی کھلکھلا کر ہنس پڑی' اور کچھ دیر تک ہنستے رہنے کے بعد بولی:

"واہ بہت اچھا بولتے ہو جی' کہاں رہتے ہو؟... کیا کام کرتے ہو؟"

"کہانیاں لکھتا ہوں منی بائی' رہتا وہتا کیا' جہاں پایا رہ لیا' جہاں چاہا سو لیا۔"

اے کہانیاں لکھنا بھی کوئی کام ہوا' لگتا ہے تم تو ہم سے بھی گئے گزرے ہو... تمہارا دھندہ تو ہمارے دھندے سے بھی گیا گزرا لگتا ہے جی... کیوں جی۔"

ہاں منی بائی' تم تو ذرا سا میں اکٹھے چودہ روپے رکھوا لیتی ہو اور مجھے چودہ روپے حاصل کرنے کے لیے آٹھ کہانیاں لکھنا پڑتی ہیں۔ دو روپے فی کہانی کے حساب سے جریدے والے نے دیے ہیں۔"

دو روپے فی کہانی... یہ تو بہت کم ہوتے ہیں۔ منی بائی نے مایوسی سے کہا' اچانک اسے کوئی بات یاد آگئی' دو روپے فی کہانی کے حساب سے آٹھ کہانیوں کے سولہ روپے بنتے ہیں... باقی دو روپے بھی نکالو جی... جلدی کرو۔"

"ہاں جی' بنتے تو سولہ ہی روپے ہیں' مگر ایک کہانی تو ناپ تول میں چلی گئی۔"

"ناپ تول میں؟ ارے واہ۔" منی بائی پھر ہنسی۔ "ناپ تول میں کیسے چلی گئی؟"

"وہ ایسے کہ جب جریدے والے کے پاس پہنچا اور اسے آٹھوں کہانیاں پڑھائیں تو وہ جھٹ اندر سے ترازو لے آیا۔"

"ترازو؟ کہانیاں تول کر بکتی ہیں؟"

"خدا کا شکر ہے منی بائی ابھی تک تو تول کر بکتی ہیں۔ کچھ دنوں بعد دیکھنا ہے تولے ہی بیچنا پڑیں گی۔"

"اچھا اچھا پھر وہ ترازو لے آیا..." منی بائی نے دلچسپی سے کہا۔

"ہاں ترازو لے آیا' ڈنڈی ملائی تو ایک طرف پاسنگ تھا اس نے جھٹ آدھی کہانی نوچ لی اور دوسری طرف والے پلڑے پر رکھ دی' جب پاسنگ برابر ہو گیا' ایک طرف وزن کے ساتھ پتھر رکھے اور دوسری طرف ساڑھے سات کہانیاں۔"

"میں نے کہا وزن کے سات ہی پتھر رکھے گئے ہیں' دیکھو تو کہانی والا پلڑا کتنا جھک آیا ہے------ آدھی کہانی تو تم نے پہلے لے لی..."

"پہلے لے کر آدھی کہانی کیا میں کھا گیا' پاسنگ نہ ملاتا ترازو کا؟" جریدے والے نے چڑھ کر کہا۔

بات سچ تھی' میں نے جلدی سے کہا "اچھا ٹھیک ہے' تم سچ کہتے ہو' پر دوسری طرف کا پلڑا جو اتنا جھک آیا ہے۔ منی بائی' یہ سن کر جریدے والا بگڑ گیا۔ ترشی سے کہا' اتنا جھک گیا تو دم نکل گیا تمہارا' کیا سونا تول رہے ہو' کہانیاں ہی تو ہیں۔"

"سچ ہی کہا۔ جریدے والے نے۔" منی بائی نے ہمدردی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر مجھے دل برداشتہ دیکھ کر منی بائی نے دکھ سے کہا' واقعی ہمارا دھندہ تمہارے دھندے بہت اچھا ہے۔

"ہاں منی بائی بہت اچھا ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی جی چاہتا ہے کاغذ' قلم پھینک کر تمہارا والا دھندہ ہی شروع کر دوں۔"

یہ سن کر منی بائی بے ساختہ ہنس پڑی اور جلدی سے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھک لیا۔

"اللہ' ایسا نہ کر بیٹھنا جی' ورنہ مفت میں ہماری روٹی ماری جائے گی۔"

بہت دیر تک ہنستے رہنے کے بعد جب منی بائی تھک گئی تو اسے کچھ یاد آیا۔

"اچھا جی' ایک کہانی ہم پر لکھو..."

"نہیں منی بائی' تم پر تو بہتوں نے کہانیاں لکھی ہیں۔ میں تو تمہارے طوطے پر ایک اچھی سی کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں۔"

"لکھو جی' ضرور لکھو----- میرے طوطے پر ہی لکھو..." منی بائی نے مسرت سے کہا' مگر کیا لکھو گے؟"

"یہ لکھوں گا کہ پرندہ پکڑنے والی گاڑی آگئی ہے' اور اب' جب بازار کے سارے پرندے ختم ہو چکے ہیں رنگین شیشوں سے گھری ہوئی گاڑی والے دونوں زہریلی آنکھوں والے آدمی چاروں اور گھور گھور کر ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہ کہیں سے کوئی پرندہ ہاتھ آ جائے' کہیں سے کوئی

کرک، نیل کنٹھ، کوئی مینا، کوئی طوطا دکھائی پڑے، اتنے میں ان کی چاروں زہریلی نگاہیں تمہارے طوطے پر پڑتی ہیں اور وہ دونوں مکمل اٹھتے ہیں پھر لمبے بانس والا آگے بڑھتا ہے اور چپکے سے طوطے کے بائیں بازو پر لس دار رطوبت والے لگے کو چھوا دیتا ہے، طوطا پھڑ پھڑاتا ہے، تھر تھراتا ہے، اڑنے کی کوشش کرتا ہے، اور برسوں کے اڈے کو غیر محفوظ جان کر باکئی کی رینگ کا سہارا لینا چاہتا ہے، مگر نہیں لے پاتا، اور تڑپتا ہوا نیچے رہتا ہے۔ جہاں وہ آدمی کھڑا ہوتا ہے۔ وہ لپک کر طوطے کو اٹھاتا ہے، طوطا... چیں... ں ں... کی آواز سے زور سے چیختا ہے، پھڑ پھڑاتا ہے، پھر پتہ نہیں اس کی ساتھ چھوڑتی ہوئی قوت پرواز کہاں سے لوٹ آتی ہے وہ خود اوپر اڑتا ہے لیکن پھر گر پڑتا ہے۔

وہ آدمی جس کی کمر سے گاڑی والی رسی بندھی ہوتی ہے، اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھتا ہے اور اطمینان سے مسکرا دیتا، ہے جس کے جواب میں اس کا رفیق پہلے اپنے ساتھی کو دیکھتا ہے، پھر فرش پر ہانپتے ہوئے طوطے کو دیکھتا ہے۔ اس کے بعد پھر اپنے ساتھی کو دیکھ کر اطمینان سے مسکرا دیتا ہے۔ اور آہستہ سے آگے بڑھ کر طوطے کو اٹھانے کے لیے جھکتا ہے...

لیکن دفعتاً" طوطا اس کی گرفت میں آنے کی بجائے تڑپ کر اچھلتا ہے اور اس کی کنپٹیوں پر جھپٹتا ہے اور گردن کا گوشت نوچ لیتا ہے۔

اس آدمی کے منہ سے چیخ نکلتی ہے، جسے سن کر اس کا دوسرا ساتھی لپکتا ہے اور طوطے کی گردن پر ہاتھ ڈالنا ہی چاہتا ہے کہ طوطا گھور کر دوسرے آدمی کو دیکھتا ہے، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھیل جاتی ہیں اور اس میں لہو اتر آتا ہے، وہ اپنی پوری طاقت کو سمیٹتا ہے اور لپک کر دوسرے آدمی پر بھی حملہ کرتا ہے اور اس کے سارے چہرے کو نوچ کر لہولہان کر دیتا ہے۔ وہ آدمی بھی چلا اٹھتا ہے، اور جلدی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے طوطے کو الگ کرتا ہے اور اسے زور سے زمین پر پھینک دیتا ہے۔

اب دونوں طوطے کے اطراف کھڑے حیرت سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اور طوطا آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا کبھی پہلے آدمی کی طرف جاتا ہے، پھر اس اطمینان سے ٹہلتا ہوا دوسرے آدمی کی طرف لوٹ جاتا ہے، اور دونوں کو اپنی خوں آشام نظروں سے گھور رہا ہوتا ہے...

..." اور اتنے میں " منی بائی جلدی سے کہہ اٹھتی ہے۔ " میں لپک کر جاتی ہوں اور اپنی چادر اس پر ڈال دیتی ہوں اور پرندے کو پکڑ کر گاڑی والے کے حوالے کر دیتی ہوں۔ اور اس سے بہت سے... "

" ... جب بہت سے پیسے ملنے والے ہوں تو کیا میں طوطے کو یہ سب کرنے دوں گی... "

منی بائی حقارت سے میری طرف دیکھتی ہے، اور تھوک دیتی ہے " ایسی ہی کہانی لکھی جاتی ہے... جی ؟ "

جواب میں میں منی بائی کے چہرے کو دیکھتا ہوں، اڈے پر ادھر سے ہوتے ہوئے طوطے کو دیکھتا ہوں اور پھر ایک بار پلٹ کر طوطے کو دیکھتا ہوں...

پھر گاڑی والے منی بائی کے نبی جی سے " روزی بھیجو " کی محنت کرنے والے طوطے کو بھی لے جاتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ شہر سونا ہو جاتا ہے، کہیں کوئی پرندہ، کوئی گویا، کوئی بلبل مینا، طوطا، کوئی مرغ، کوئی فاختہ نظر نہیں آتی۔

شام ڈھلے درختوں پر بسیرا لینے والی چڑیوں کی چہکار سنائی نہیں دیتی، لاجوردی آسمان پر سفید بگلے توازن سے اڑنے والے بگلے بھی نہیں دکھائی دیتے، بھری دوپہر کی خاموش فضا میں چیلوں کی درد بھری چیخ بھی سنائی نہیں دیتی۔ کبوتر کی غٹرغوں، پپیہے کی پی کہاں، پی کہاں، مینا کی توئیں توئیں کی آواز سے کان محروم ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ مولوی صاحب کے مرغ کی اذان بھی کہیں کھو گئی ہے۔

لیکن بازار اور رونق بازار میں کوئی فرق نہیں آتا، خرید و فروخت جاری ہے، شور شرابہ، یکہ والوں کی کھٹ کھٹ، ٹم ٹم والو کے گھوڑوں کے گھنگھیاں بجتی رہتی ہیں لمبی اور خوب صورت کاریں زوں زوں کر کے گذر جاتی ہیں۔ آمد رفت جاری ہے، کاروبار بدستور ہے، خریدنے والے اسی طرح بازار کی دکانوں پر جمے رہتے ہیں اور بیچنے والے اسی انہماک سے سودا سلف بیچ رہے ہیں۔ ایک ہنگامہ ہے کہ جاری ہے، ایک دوڑ ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی۔

پھر دن ڈھلتا، پھر رات آتی ہے اور اپنے تمام چھوٹے بڑے کھرے کھوٹے بچے چھوٹے بچوں پر آرام کی، سکون کی چادر تان دیتی ہے،

پھر رات بھی چلی جاتی ہے، پھر صبح نمودار ہوتی ہے اور خلقت بیدار ہوتی ہے۔

اب پرندہ پکڑنے والی گاڑی کم آتی ہے۔ دو چار دنوں میں، آٹھ دس دنوں میں، پندرہ بیس دنوں میں ایک بار آتی ہے، رنگین شیشوں میں سے ایک آدھ پرندہ، حیرت سے بازار والوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ گاڑی والے ادھر ادھر تیز نگاہوں کا جال پھینکتے، پھر سمیٹتے اور چاروں متجسس نظروں سے دیکھتے، ڈھونڈتے ڈھانڈتے آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کچھ ملتا ہے کبھی کچھ نہیں ملتا، کوئی پلٹ کر نہیں دیکھتا۔

ایک ایسا ہی دن تھا، دھوپ بہت سخت تھی، ہوا گرم تھی، فضا میں دھول اڑ رہی تھی جھکڑ چل رہے تھے، جسموں سے پسینہ بہہ رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح گرم گرم ہوا پھینک رہی تھی، کہ گاڑی آ گئی۔

گاڑی آ گئی، پرندہ پکڑنے والی گاڑی آ گئی.....

گاڑی عین چوک پر کھڑی ہو گئی۔ رنگین شیشوں کے اندر ایک ہی پرندہ تھا، جو ادھر سے سے قدم رکھتا ٹہل رہا تھا، اس کی دم مور کی طرح کھلی تھی اور آنکھوں میں افسردگی جھلک رہی تھی، ابھی گاڑی ٹھہر رہی تھی کہ دوڑتا ہوا وہ دس سالہ بچہ آ پہنچا، اس نے پہلے گاڑی والوں کو دیکھا، پھر شیشے کے اندر جھانک کر دیکھا، ذرا دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد دفعتاً اس نے لپک کر شیشے کے چھوٹے سے دروازے کو کھول دیا۔

اتنی ہی پھرتی سے بانس والے آدمی نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ پھر دروازے کو بند کر دیا اور جیب سے بہت سارے سکے نکال کر سامنے اچھال دیے۔ لڑکے نے سکوں کی طرف دھیان نہیں دیا، بانس والے آدمی نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر اسے ایک طرف دھکا دے دیا اور سکے اچھال دیے، لڑکے نے سکوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ گاڑی تیزی سے چلنے لگی، اس کے پیچھے پیچھے بانس والا آدمی تیز تیز قدموں سے چلنے لگا پھر گاڑی اور تیز ہو گئی، آدمی کے قدم بھی تیز ہو گئے، اب وہ دوڑنے لگا۔

لڑکا کچھ دیر خاموش، حیرت اور افسردگی سے تکتا رہا پھر جانے کہاں سے اس کے قدموں میں بجلی کی سی جھپٹ آ گئی، اس نے دوڑ کر بھاگتی ہوئی گاڑی کو دیکھا، پھر دوڑتا ہوا اسے جا لیا اور شیشوں پر زور سے گھونسہ مارنے والا ہی تھا کہ بانس والے آدمی نے اس کے وار کو اپنے ہاتھ پر روک لیا، اور بچے کو زور سے..... بہت زور سے دھکا دیا۔

لڑکا گیند کی طرح سڑک پر لڑھک گیا۔ اس کے سر اور گھٹنوں پر سخت چوٹ آئی، اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور دیر تک وہ سڑک کو تاکتا رہا، پھر جب اس کی بینائی پر چھایا ہوا اندھیارا ہٹا اور اس نے غور سے دیکھا تو گاڑی دور ڈھلان پر تیزی سے بھاگی جا رہی تھی، اور اس کے پیچھے صرف دھول ہی دھول تھی۔

لڑکے نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے اٹھا نہیں گیا، اس کے گھٹنوں کے درد نے اٹھنے نہیں دیا اور وہ پھر تلملا کر سڑک پر گر گیا۔

گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی، گاڑی میں لگی چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی سحر زدہ آواز کانوں سے اوجھل ہو گئی، اور بہت دیر ہو گئی..... بہت..... دیر۔

جب بہت دیر ہو گئی تب وہ لڑکا سڑک پر سے اٹھا، پہلے اس نے اپنے لہولہان گھٹنوں کو دیکھا۔ پھر اپنے کپڑوں کی دھول جھاڑی اس کے بعد اپنی آستین سے آنکھیں پونچھتے ہوئے تھکے تھکے قدموں سے چل کر میرے پاس آ کھڑا ہوا۔

"بھائی جان لقا بھی چلا......" اس نے گویا اپنے آپ کو اطلاع دی۔

"ہاں میاں، لقا بھی چلا گیا۔" میں نے مایوسی سے جواب دیا۔

ذرا دیر تک وہ سڑک کی اور دیکھتا رہا، اس کی نظریں ڈھلان کی طرف دوڑ گئیں۔ جہاں کچھ بھی نہیں تھا، اس نے دھیرے سے اس نیکر کی اس ابھری ہوئی جیب پر ہاتھ پھیرا جہاں ماچس کی ڈبیہ تھی۔

"بھائی جان..... اس، اس تتلی کو بھی لے جائیں گے نا؟"

جب تتلیاں بھی چلی گئیں تو کیا بچے گا شہر میں ؟؟

جواب میں' میں خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا' جہاں آنسوؤں اور سڑک کی دھول کے ملے جلے نشان تاحال مایوسیوں کو نمایاں کیے ہوئے تھے ۔ وہ لڑکا چونکا اور اس نے سامنے والی بڑی سی عمارت کی طرف اشارہ کیا:

بھائی جان' بھائی جان وہ دیکھیے .....

عمارت کے دروازے کے اوپر پتھر کا ایک پرندہ سر نہوڑے بیٹھا ہوا تھا..... میری اور اس دس سالہ معصوم بچے کی نگاہیں دیر تک پتھر کے اس پرندے پر ٹکی رہیں ۔

انتظار حسین

نام : انتظار حسین۔
قلمی نام : انتظار حسین۔
پیدائش : ۲۱ دسمبر ۱۹۲۳ء بہ مقام: ڈبائی ضلع بلند شہر، یو۔ پی (بھارت) (۱)
تعلیم : ایم۔ اے (اردو) میرٹھ کالج، میرٹھ ۱۹۴۶ء

ابتدائی اور مذہبی تعلیم گھر پر ہوئی۔ براہ راست کمرشل اینڈ انڈسٹریل اسکول ہاپوڑ کی آٹھویں کلاس میں داخلہ لیا۔ ۴۳-۱۹۴۲ء میں میرٹھ کالج سے بی۔ اے کیا اور اسی کالج سے ۱۹۴۶ء میں ایم۔ اے (اردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

انتظار حسین کے والد منذر علی مذہبی آدمی تھے۔ انہوں نے ڈبائی میں کھیتی باڑی بھی کی اور تجارت بھی لیکن ناکام رہے، ان کا رجحان مذہب کی تبلیغ کی طرف تھا۔ وہ انگریزی زبان سیکھنے کے حق میں نہ تھے اور اپنے بیٹے کو مذہبی تعلیم دلوا کر واعظ بنانا چاہتے تھے۔ والدہ محرم کی رسوم میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ انتظار حسین نے بچپن اور لڑکپن کے ابتدائی گیارہ برس ڈبائی میں گزارے۔ بچپن اور لڑکپن میں چھپ چھپ کر رام لیلا میں شرکت کی۔ کالج کے زمانے میں علامہ مشرقی کی تحریروں سے متاثر ہو کر فرقہ واریت کے حوالے سے مذہبی خیالات و تصورات کو رد کر دیا۔ اس میں کچھ دخل پروفیسر کرار حسین کا بھی رہا جو کالج کے زمانے میں انتظار حسین کے استاد رہے ہیں۔ اس زمانے میں ڈاکٹر محمد اقبال اور ن۔ م راشد سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی لیکن بات چند نظموں سے آگے نہ بڑھی۔

میرٹھ میں چند ماہ راشننگ ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے لاہور آ گئے اور صحافت کو ذریعہ روزگار بنایا۔ سب سے پہلے ہفتہ وار "نظام" لاہور کے مدیر ہوئے، ۱۹۴۹ء میں روزنامہ "امروز" لاہور سے منسلک ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں روزنامہ "آفاق" لاہور سے وابستہ ہو کر کالم نگاری کا آغاز کیا۔ کچھ مدت بے روزگار رہے اور "نوائے وقت" سے منسلک رہنے کے بعد روزنامہ "مشرق" کی ملازمت اختیار کی اور یہ سلسلہ ۱۹۸۸ء تک چلا۔ اس اخبار کے لیے "لاہور نامہ" کے عنوان سے مستقل کالم نگاری کی۔ اسٹیج کے لیے سب سے پہلا ڈرامہ "خوابوں کے مسافر" لکھا اور اس کے بعد گاہے گاہے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے بھی لکھتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں ادبی جریدہ "خیال" لاہور جاری کیا جس کے صرف تین شمارے نکل سکے۔ ایک زمانے میں "ادب لطیف" لاہور کی ادارت کی۔ شادی ۱۹۶۶ء میں ہوئی لیکن اولاد سے محروم رہے۔ اپنے دور کے ترقی پسند ادباء، حلقہ ارباب ذوق میں قیوم نظر کی چودھراہٹ اور لاہور کے روائتی طرز کے ادیبوں شاعروں کے ساتھ چونکھی لڑنے کے سبب ہمیشہ اردو ادب کی فرنٹ لائین میں نمایاں دکھائی دیے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"قیوما کی دکان" (تکمیل: اپریل ۱۹۴۸ء) مطبوعہ: "ادب لطیف" لاہور، دسمبر ۱۹۴۸ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "گلی کوچے" (گیارہ افسانے) شاہین پبلشرز، لاہور: طبع اول: ۱۹۵۲ء

۱۔ قیوما کی دکان ۲۔ خرید و حلوا بیسن کا ۳۔ چوک ۴۔ فجا کی آپ بیتی ۵۔ اجودھیا ۶۔ رہ گیا شوق منزل مقصود ۷۔ پھر آئے گی ۸۔ مفید خالہ ۹۔ روپ نگر کی سواریاں ۱۰۔ ایک بن لکھی رزمیہ ۱۱۔ استاد

۲۔ "کنکری" (چودہ افسانے) مکتبہ جدید لاہور: طبع اول: ۱۹۵۵ء

۱۔ مجمع ۲۔ اصلاح ۳۔ محل والے ۴۔ یاں آگے درد تھا ۵۔ آخری موم بتی ۶۔ دیولا ۷۔ کیلا ۸۔ ساتواں در ۹۔ پٹ بیجنا ۱۰۔ پسماندگان ۱۱۔ ٹھنڈی آگ ۱۲۔ جنگل ۱۳۔ مایا ۱۴۔ کنکری۔

۳۔ "آخری آدمی" (گیارہ افسانے) کتابیات لاہور: طبع اول: ۱۹۶۷ء

۱۔ آخری آدمی ۲۔ زرد کتا ۳۔ پرچھائیں ۴۔ ہڈیوں کا ڈھانچ ۵۔ ہم سفر ۶۔ کایا کلپ ۷۔ ٹانگیں ۸۔ سیکنڈ راؤنڈ ۹۔ سوئیاں ۱۰۔ شہادت ۱۱۔ سوت کے تار۔

۴۔ "شہر افسوس" (سترہ افسانے) مکتبہ کارروان لاہور: طبع اول: ۱۹۷۲ء

۱۔ وہ جو کھوئے گئے ۲۔ کٹا ہوا ڈبہ ۳۔ دہلیز ۴۔ سیڑھیاں ۵۔ مردہ راکھ ۶۔ مشکوک لوگ ۷۔ شرم الحرم ۸۔ کانا دجال ۹۔ بگڑی نسلیں ۱۰۔ دوسرا گناہ ۱۱۔ دوسرا راستہ ۱۲۔ اپنی آگ کی طرف ۱۳۔ لمبا قصہ ۱۴۔ وہ اور میں ۱۵۔ وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے ۱۶۔ اندھی گلی ۱۷۔ شہر افسوس۔

۵۔ "کچھوے" (سترہ افسانے) مطبوعات، لاہور: طبع اول: ۱۹۸۱ء

۱۔ قدامت پسند لڑکی ۲۔ ۳۱ مارچ ۳۔ فراموش ۴۔ بادل ۵۔ اسیر ۶۔ ہندوستان سے ایک خط ۷۔ نیند ۸۔ کچھوے ۹۔ پتے ۱۰۔ واپسی ۱۱۔ رات ۱۲۔ دیوار ۱۳۔ خواب اور تقدیر ۱۴۔ شور ۱۵۔ صبح کے خوش نصیب ۱۶۔ بے سبب ۱۷۔ کشتی

۶۔ "خیمے سے دور" (سترہ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور: طبع اول: ۱۹۸۶ء

۱۔ خیمے سے دور ۲۔ سفر منزل ۳۔ حصار ۴۔ زناری ۵۔ پورا گیان ۶۔ دھوپ ۷۔ برہنہ کہانی ۸۔ اجنبی پرندے ۹۔ برہمن بکرا ۱۰۔ وقت ۱۱۔ انتظار ۱۲۔ پلیٹ فارم ۱۳۔ چیلیں ۱۴۔ پرانی کہانی ۱۵۔ دسواں قدم ۱۶۔ خالی گھر ۱۷۔ خواب میں دھوپ۔

۷۔ "چاند گہن" (ناول) مکتبہ کارواں، لاہور: طبع اول: ۱۹۵۳ء

۸۔ "بستی" (ناول) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی: طبع دوم: ۱۹۸۳ء

۹۔ "دن اور داستان" (دو ناولٹ) ادارۂ ادبیات نو، لاہور: طبع دوم: ۱۹۸۱ء

۱۰۔ "نئی پود" از ایوان تور گنیف (ناول / ترجمہ) مکتبہ اردو، لاہور: طبع اول: ۱۹۵۲ء

۱۱۔ "زمین اور فلک اور" (سفرنامے) سنگ میل، لاہور: طبع اول: ۱۹۸۷ء

۱۲۔ ذرے (ادبی کالم) پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور: طبع اول: ۱۹۷۶ء

۱۳۔ "ناؤ اور دوسرے افسانے" امریکی افسانوں کا انتخاب (ترجمہ) آئینہ ادب، لاہور: طبع اول: ۱۹۵۸ء

۱۴۔ "فلسفہ کی نئی تشکیل" از جان ڈیوی (ترجمہ) شیش محل کتاب گھر، لاہور: طبع اول: ۱۹۶۱ء

۱۵۔ "علامتوں کا زوال" (تنقید) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی: طبع دوم: ۱۹۸۳ء

۱۶۔ "سن ستاون میری نظر میں" (ترتیب بہ اشتراک ناصر کاظمی) آئینہ ادب، لاہور:

۱۷۔ "سرخ تمغہ" از سٹیفن کرین (ناول / ترجمہ) یونائیٹڈ بک ڈپو' لاہور: طبع اول: ۱۹۶۰ء
یہ "Red badge of courage" کا ترجمہ ہے۔

۱۸۔ "ہماری بستی" ڈراما از تھارنٹن وائلڈر (ترجمہ) اردو اکیڈمی' سندھ' کراچی: طبع اول: ۱۹۶۷ء
یہ "Our Town" کا ترجمہ ہے کل صفحات: ۲۲

۱۹۔ "ماؤزے تنگ" (سوانح / افکار) از سٹیورٹ شریم (ترجمہ) نگارشات' لاہور: طبع اول: ۱۹۲۶ء
یہ ترجمہ دوسری بار چیلنجز پبلشنگ ہاؤس' لاہور نے شائع کیا۔

۲۰۔ "سارہ کی بہادری" (ناول / ترجمہ) از ایلس ڈ مگیش (باتصویر بچوں کے لیے) شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور: طبع اول: ۱۹۶۳ء

۲۰۔ "الف لیلہ" از رتن ناتھ سرشار۔ مرتبہ: انتظار حسین شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور

۲۱۔ انشاء اللہ خاں انشاء کی دو کہانیاں۔ مرتبہ: انتظار حسین مجلس ترقی ادب' لاہور

۲۳۔ "قائد اعظم کے لڑکپن تک کا زمانہ" پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ' لاہور

۲۴۔ "کلیلہ دمنہ" (بچوں کے لیے) یونیورسٹی گرانٹس کمیشن' اسلام آباد

۲۵۔ "باتیں اور ملاقاتیں" (مکالمے) مکتبہ عالیہ' لاہور

۲۶۔ "جنم کہانیاں" (افسانے / کلیات)' پہلی جلد' سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور

۲۷۔ "قصہ کہانیاں" (افسانے / کلیات)' دوسری جلد سنگ میل پبلی کیشنز' لاہور

غیر مدون:

لاتعداد کالم' ڈرامے اور چند افسانے نیز حکیم اجمل پر ایک کتاب زیر طبع ہے۔

مستقل پتا:

۱/۳۸ جیل روڈ' لاہور

اعزاز:

۱۔ رائٹرز گلڈ آدم جی ادبی انعام برائے ناول "بستی" (جسے وصول کرنے سے انکار کر دیا)
۲۔ پرائیڈ آف پرفارمنس (حکومت پاکستان کا اعلیٰ ترین سول ایوارڈ)

نظریہ فن:

"میری اردو یہاں کی چڑیاں اور درخت سمجھتے ہیں۔ میں چڑیوں کے لیے لکھتا ہوں۔"
(بہ حوالہ: "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" مرتبہ: طاہر مسعود' انٹرویو ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

○

(۱) "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" مرتبہ: طاہر مسعود' "نگار پاکستان" "افسانہ نمبر سالنامہ ۱۹۸۱ء مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری' "اردو افسانہ" از ڈاکٹر انوار احمد اور جملہ سوانحی کوائف مشمولہ نصابی کتب میں تاریخ پیدائش دسمبر ۱۹۲۵ء درج ہے' جو درست نہیں۔

انتظار حسین

آخری آدمی

الیاسف اس قریے میں آخری آدمی تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سوگند، میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور میں آدمی ہی کی جون میں مروں گا اور اس نے آدمی کی جون میں رہنے کی آخر دم تک کوشش کی۔

اور اس قریے سے تین دن پہلے بندر غائب ہو گئے تھے۔ لوگ پہلے حیران ہوئے اور پھر خوشی منائی کہ بندر جو فصلیں برباد اور باغ خراب کرتے تھے نابود ہو گئے۔ پر اس شخص نے، جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا کرتا تھا یہ کہا کہ بندر تو تمہارے درمیان موجود ہیں۔ مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں۔ لوگوں نے اس کا برا مانا اور کہا کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔

اس کے تیسرے دن یوں ہوا کہ الیعذر کی لونڈی گجروم الیعذر کی خواب گاہ میں داخل ہوئی اور سہمی ہوئی الیعذر کی جورو کے پاس الٹے پاؤں آئی۔ پھر الیعذر کی جورو خواب گاہ تک گئی اور حیران و پریشان واپس آئی۔ پھر یہ خبر دور دور پھیل گئی اور دور دور سے لوگ الیعذر کے گھر آئے اور اس کی خواب گاہ تک جا کر ٹھٹھک ٹھٹھک گئے کہ الیعذر کی بجائے ایک بڑا بندر آرام کرتا تھا اور الیعذر نے پچھلے سبت کے دن سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک نے دوسرے کو خبر دی کہ اے عزیز الیعذر بندر بن گیا ہے۔ اس پر دوسرا زور سے ہنسا۔ "تو نے مجھ سے ٹھٹھا کیا۔" اور وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ منہ اس کا سرخ پڑ گیا اور دانت نکل آئے اور چہرے کے خد و خال کھنچتے چلے گئے اور وہ بندر بن گیا۔ تب پہلا کمال حیران ہوا۔ منہ اس کا کھلے کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں اور پھر وہ بھی بندر بن گیا۔

اور الیاب، ابن زبلون کو دیکھ کر ڈرا اور یوں بولا کہ اے زبلون کے بیٹے تجھے کیا ہوا ہے کہ تیرا چہرہ بگڑ گیا ہے۔ ابن زبلون نے اس بات کا برا مانا اور غصے سے دانت کچکچانے لگا۔ تب الیاب مزید ڈرا اور چلا کر بولا کہ اے زبلون کے بیٹے! تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے، ضرور تجھے کچھ ہو گیا ہے۔ اس پر ابن زبلون کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور دانت بھینچ کر الیاب پر جھپٹا۔ تب الیاب پر خوف سے لرزہ طاری ہوا اور ابن زبلون کا چہرہ غصے سے اور الیاب کا چہرہ خوف سے بگڑتا چلا گیا۔ ابن زبلون غصے سے آپ سے باہر ہوا اور الیاب کا چہرہ خوف سے اپنے آپ سکڑتا گیا اور وہ دونوں ایک مجسم غصہ اور ایک خوف کی پوٹ تھے، آپس میں گتھ گئے۔ ان کے چہرے بگڑتے چلے گئے۔ پھر ان کے اعضاء بگڑے۔ پھر ان کی آوازیں بگڑیں کہ الفاظ آپس میں مدغم ہوتے چلے گئے اور غیر ملفوظ آوازیں بن گئے۔ پھر وہ غیر ملفوظ آوازیں وحشیانہ چیخیں بن گئیں اور پھر وہ بندر بن گئے۔

الیاسف نے کہ ان سب میں عقل مند تھا اور سب سے آخر تک آدمی بنا رہا۔ تشویش سے کہا کہ اے لوگو! ضرور ہمیں کچھ ہو گیا۔ آؤ ہم اس شخص سے رجوع کریں جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا ہے۔ پھر الیاسف لوگوں کو ہمراہ لے کر اس شخص کے گھر گیا۔ اور حلقہ زن ہو کے دیر تک پکارا کیا۔ تب وہ وہاں سے مایوس پھرا اور بڑی آواز سے بولا کہ اے لوگو! وہ شخص جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا کرتا تھا آج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے اور اگر سوچو تو اس میں ہمارے لئے خرابی ہے۔ لوگوں نے یہ سنا اور دہل گئے۔ ایک بڑے خوف

نے انہیں آ لیا۔ دہشت سے صورتیں ان کی چپٹی ہونے لگیں اور خد و خال مسخ ہوتے چلے گئے اور الیاسف نے گھوم کر دیکھا اور اسے سکتہ ہو گیا۔ اس کے پیچھے چلنے والے بندر بن گئے تھے۔ تب اس نے سامنے دیکھا اور بندروں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ جاننا چاہیے کہ وہ بستی ایک بستی تھی۔ سمندر کے کنارے اونچے برجوں اور بڑے دروازوں والی حویلیوں کی بستی' بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ کٹورا بجتا تھا۔ پردم کے دم میں بازار ویران اور اونچی ڈیوڑھیاں سونی ہو گئیں اور اونچے برجوں میں عالی شان چھتوں پر بندر ہی بندر نظر آنے لگے اور الیاسف نے ہر اس سے چاروں سمت نظر دوڑائی اور اس سوچا کہ میں اکیلا آدمی ہوں اور اس خیال سے وہ ایسا ڈرا کہ اس کا خون جمنے لگا۔ مگر اسے الیاب یاد آیا کہ خوف سے کس طرح اس کی صورت بگڑتی چلی گئی اور وہ بندر بن گیا۔ تب الیاسف نے اپنے خوف پر غلبہ پایا اور عزم باندھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا اور آدمی ہی کی جون میں مروں گا اور اس نے ایک احساس برتری کے ساتھ اپنے مسخ صورت ہم جنسوں کو دیکھا اور کہا۔ تحقیق میں ان میں سے نہیں ہوں کہ وہ بندر ہیں اور میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں سے نفرت کی اس نے ان کی لال بھبو کا صورتوں اور بالوں سے ڈھکے ہوئے جسموں کو دیکھا اور نفرت سے چہرہ اس کا بگڑنے لگا۔ مگر اسے اچانک زبان کا خیال آیا کہ نفرت کی شدت سے صورت اس کی مسخ ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ الیاسف نفرت مت کر کہ نفرت سے آدمی کی کایا بدل جاتی ہے اور الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا اور کہا کہ بے شک میں انہیں میں سے تھا اور اس نے وہ دن یاد کئے۔ جب وہ ان میں سے تھا اور دل اس کا محبت کے جوش سے امنڈنے لگا۔ اسے بنت الاخضر کی یاد آئی کہ فرعون کے رتھ کے دودھیا گھوڑیوں میں سے ایک گھوڑی کی مانند تھی اور اس کے بڑے گھر کے در سرو کے اور کڑیاں صنوبر کی تھیں۔ اس یاد کے ساتھ الیاسف کو بیتے دن یاد آئے کہ وہ سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان میں عقب سے گیا تھا اور چھپر کھٹ کے لئے اسے ٹٹولا جس کے لئے اس کا جی چاہتا تھا اور اس نے دیکھا لمبے بال اس کی رات کی بوندوں سے بھیگے ہوئے ہیں اور چھاتیاں ہرن کے بچوں کے موافق تڑپتی ہیں اور پیٹ اس کا گندم کی ڈیوڑھی کی مانند ہے اور پاس اس کے صندل کا گول پیالہ ہے اور الیاسف نے بنت الاخضر کو یاد کیا اور ہرن کے بچوں کو گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کے تصور میں سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے گھر تک گیا۔ ساس نے خالی مکان دیکھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا۔ جس کے لئے اس کا جی چاہتا تھا اور پکارا کہ اے بنت الاخضرا تو کہاں ہے اور اے وہ کہ جس کے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ دیکھ موسم کا بھاری مہینہ گزر گیا اور پھولوں کی کیاریاں ہری بھری ہو گئیں اور قمریاں اونچی شاخوں پر پھڑ پھڑاتی ہیں۔ تو کہاں ہے۔؟ اے الاخضر کی بیٹی!!! اے اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر آرام کرنے والی تجھے دشت میں دوڑتی ہوئی ہرنیوں اور چٹانوں کے دراڑوں میں چھپے ہوئے کبوتروں کی قسم تو نیچے اتر آ اور مجھ سے آن مل کہ تیرے لئے میرا جی چاہتا ہے۔ الیاسف بار بار پکارتا کہ اس کا جی بھر آیا اور بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا۔

الیاسف بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا مگر اچانک اسے ایعذر کی جورو یاد آئی۔ تو ایعذر کو بندر کی جون میں دیکھ کر روئی تھی۔ حالاں کہ اس کی ہڑکی بندھ گئی اور بہتے آنسوؤں میں اس کے جمیل نقش بگڑے چلے گئے اور ہڑکی آواز وحشی ہوتی چلی گئی۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ اس کی جون بدل گئی۔ تب الیاسف نے خیال کیا۔ بنت الاخضر جن میں سے تھی ان میں مل گئی اور بے شک جو جن میں سے ہے وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا کہ اے الیاسف ان سے محبت مت کر مبادا تو ان میں سے ہو جائے اور الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا اور الیاسف نے ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کو فراموش کر دیا۔

الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور اپنے ہم جنسوں کی لال بھبو کا صورتوں اور کھڑی دم کو دیکھ کر ہنسا اور الیاسف کو ایعذر کی جورو یاد آئی کہ وہ اس قریے کی حسین عورتوں میں سے تھی۔ وہ تاڑ کے درخت کی مثال تھی اور چھاتیاں اس کی انگور کے خوشوں کی مانند تھیں اور ایعذر نے اس سے کہا تھا کہ جان لے کر میں انگور کے خوشے توڑوں گا اور انگور کے خوشوں والی تڑپ کر ساحل کی طرف نکل گئی۔ ایعذر اس

کے پیچھے پیچھے گیا اور پھل توڑا اور تاڑ کے درخت کو اپنے گھر لے آیا اور اب وہ ایک اونچے کنگرے پر ایعذر کی جوئیں چن چن کر کھاتی تھی۔ ایعذر جھرجھری لے کر کھڑا ہو جاتا اور وہ دم کھڑی کر کے اپنے پیچھے پنجوں پر اٹھ بیٹھی اس کے ہنسنے کی آواز اتنی اونچی ہوئی کہ اسے ساری بستی گونجتی معلوم ہوئی اور وہ اپنے اتنی زور سے ہنسنے پر حیران ہوا۔ مگر اچانک اسے اس شخص کا خیال آیا۔ جو ہنستے ہنستے بندر بن گیا تھا اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا۔ اے الیاسف تو ان پر مت ہنس مبادا تو جنس کے ایسی بن جائے اور الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔ الیاسف محبت اور نفرت سے غصہ اور ہمدردی سے رونے اور ہنسنے سے ہر کیفیت سے گزر گیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ ان کا درختوں پر اچکنا۔ دانت پیس پیس کر کلکاریاں کرنا۔ کچے پکے پھلوں پر لڑنا اور ایک دوسرے کو لہو لہان کر دینا۔ یہ سب کچھ اسے آگے کبھی ہم جنسوں پر رلاتا تھا۔ کبھی ہنساتا تھا۔ کبھی غصہ دلاتا کہ وہ پر دانت پیسنے لگتا اور انہیں حقارت سے دیکھتا اور یوں ہوا کہ انہیں لڑتے دیکھ کر اس نے غصہ کیا اور بڑی آواز سے جھڑکا۔ پھر خود ہی اپنی آواز پر حیران ہوا اور کسی کسی بندر نے اسے بے تعلقی سے دیکھا اور پھر لڑائی میں جٹ گیا اور الیاسف کے تئیں لفظوں کی قدر جاتی رہی' کہ وہ اس کے اور اس کے ہم جنسوں کے درمیاں رشتہ نہیں رہے تھے اور اس کا اس نے افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنسوں پر' اپنے آپ پر اور لفظ پر۔ افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ وہ اس لفظ سے محروم ہو گئے۔ افسوس ہے مجھ پر بوجہ اس کے کہ لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال رہ گیا اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے۔ آج لفظ مر گیا اور الیاسف نے لفظ کی موت کا نوحہ کیا اور خاموش ہو گیا۔

الیاسف خاموش ہو گیا اور محبت اور نفرت سے 'غصے اور ہمدردی سے' ہنسنے اور رونے سے در گزرا اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے کنارہ کیا اور اپنی ذات کے اندر پناہ لی۔ الیاسف اپنی ذات کے اندر پناہ گیر جزیرے کے مانند بن گیا۔ سب سے بے تعلق' گہرے پانیوں کے درمیان خشکی کا ننھا سا نشان اور جزیرے نے کہا کہ میں گہرے پانیوں کے درمیان زمین کا نشان بلند رکھوں گا۔

الیاسف نے اپنے تئیں آدمیت کا جزیرہ جانتا تھا۔ گہرے پانیوں کے خلاف مدافعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد پشتہ بنا لیا کہ محبت اور نفرت۔ غصہ اور ہمدردی۔ غم اور خوشی اس پر یلغار نہ کریں کہ جذبے کی کوئی رو اسے بہا کر نہ لے جائے اور الیاسف اپنے جذبات سے خوف کرنے لگا۔ پھر جب وہ پشتہ تیار کر چکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے سینے کے اندر پتھری پڑ گئی ہے۔ اس نے فکر مند ہو کر کہا کہ اے معبود کیا میں اندر سے بدل رہا ہوں۔ تب اس نے اپنے باہر پر نظر کی اور اسے گمان ہونے لگا کہ وہ پتھری پھیل کر باہر آ رہی ہے کہ اس کے اعضا خوش' اس کی جلد بد رنگ اور اس کا لہو بے رس ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اس نے مزید اپنے آپ پر غور کیا اور اسے مزید وسوسوں نے گھیرا۔ اسے لگا کہ اس کا بدن بالوں سے ڈھکتا جا رہا ہے اور بال بد رنگ اور سخت ہوتے جا رہے ہیں تب اسے مزید خوف ہوا اور اعضا اس کے خوف سے مزید سکڑنے لگے اور اس نے سوچا کہ کیا میں بالکل معدوم ہو جاؤں گا۔

اور الیاسف نے الیاب کو یاد کیا کہ خوف سے اپنے اندر سمٹ کر وہ بندر بن گیا تھا۔ تب اس نے کہا کہ میں اندر کے خوف پر اسی طور غلبہ پاؤں گا۔ جس طور میں نے باہر کے خوف پر غلبہ پایا تھا اور الیاسف نے اندر کے خوف پر غلبہ پا لیا اور اس کے سمٹتے ہوئے اعضاء کھلنے اور پھیلنے لگے۔ اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے اور اس کی انگلیاں لمبی اور بال بڑے اور کھڑے ہونے لگے اور اس کی ہتھیلیاں اور تلوے چپٹے اور لمبے ہو گئے۔ اور اس کے جوڑ کھلنے لگے اور الیاسف کو گمان ہوا کہ اس کے سارے اعضاء بکھر جائیں گے تب اس نے عزم کر کے اپنے دانتوں کو بھینچا اور مٹھیاں کس کر باندھیں اور اپنے آپ کو اکٹھا کرنے لگا۔

الیاسف نے اپنے ہیئت اعضاء کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے اعضاء کی صورت بدلتی جا رہی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا کیا میں میں نہیں رہا ہوں۔ اس خیال سے دل اس کا ڈوبنے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا۔ کیا میں میں نہیں رہا ہوں۔ اس خیال سے دل اس کا ڈوبنے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے ایک آنکھ کھولی اور چپکے سے اپنے اعضاء پر نظر کی۔ اسے ڈھارس ہوئی کے اس کے اعضاء تو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس نے دلیری سے آنکھیں کھولیں

اور اطمینان سے اپنے بدن کو دیکھا اور کہا کہ بے شک میں اپنی جون میں ہوں۔ مگر اس کے بعد آپ ہی آپ اسے پھر وسوسہ ہوا کہ جیسے اس کے اعضاء بگڑتے اور بدلتے جا رہے ہیں اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اس کا دھیان اندر کی طرف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی اندھیرے کنویں میں دھنستا جا رہا ہے اور الیاسف نے درد کے ساتھ کہا کہ اے میرے معبود میرے باہر بھی دوزخ ہے۔ اندھیرے کنویں میں دھنستے ہوئے ہم جنسوں کی پرائی صورتوں نے اس کا تعاقب کیا اور گزری راتیں محاصرہ کرنے لگیں۔ الیاسف کو سبت کے دن ہم جنسوں کا مچھلیوں کا شکار کرنا یاد آیا کہ ان کے ہاتھوں مچھلیوں سے بھرا سمندر مچھلیوں سے خالی ہونے لگا اور اس کی ہوس بڑھتی گئی اور انہوں نے سبت کے دن بھی مچھلیوں کا شکار شروع کر دیا۔ تب ایک شخص نے جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کا شکار سے منع کرتا تھا کہا کہ رب کی سوگند جس نے سمندر کو گہرے پانیوں والا بنایا اور گہرے پانیوں کی مچھلیوں کا مامن ٹھہرایا سمندر تمہارے دست ہوس سے پناہ مانگتا ہے اور سبت کے دن مچھلیوں پر ظلم کرنے سے باز رہو کہ مبادا تم اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے قرار پاؤ۔ الیاسف نے کہا کہ معبود کی سوگند میں سبت کے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کروں گا۔ الیاسف عقل کا پتلا تھا۔ سمندر سے فاصلے پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اسے سمندر سے ملایا اور سبت کے دن مچھلیاں سطح آب پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے پر نکل گئیں اور سبت کے دوسرے دن الیاسف نے اس گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔ وہ شخص خود سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر یوں بولا کہ تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اس سے مکر کرے گا اور بے شک اللہ زیادہ بڑا مکر کرنے والا ہے اور الیاسف یہ یاد کر کے پچھتایا اور وسوسہ کیا کہ کیا وہ مکر میں گھر گیا ہے۔ اس گھڑی اسے اپنی پوری ہستی ایک مکر نظر آئی۔ تب وہ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑایا کہ پیدا کرنے والے تو نے مجھے ایسا پیدا کیا جیسا پیدا کرنے کا حق ہے۔ تو نے مجھے بہترین کینڈے پر خلق کیا اور اپنی مثال پر بنایا۔ پس اے پیدا کرنے والے کیا تو اب مجھ سے مکر کرے گا اور مجھے ذلیل بندر کے اسلوب پر ڈھالے گا اور الیاسف اپنے حال پر رویا۔ اس کے بنائے پشتے میں دراڑ پڑ گئی تھی اور سمندر کا پانی جزیرے میں آ رہا تھا۔

الیاسف اپنے حال پر رویا اور بندروں سے بھری بستی سے منہ موڑ کر جنگل کی سمت نکل گیا کہ اب بستی اسے جنگل سے زیادہ وحشت بھری نظر آتی تھی اور دیواروں اور چھتوں والا گھر اس کے لئے لفظ کی طرح معنی کھو بیٹھا تھا۔ رات اس نے درخت کی ٹہنیوں پر چھپ کر بسر کی۔

جب صبح کو وہ جاگا تو اس کا سارا بدن دکھتا تھا اور ریڑھ کی ہڈی درد کرتی تھی۔ اس نے اپنے بگڑے اعضاء پر نظر کی کہ اس وقت کچھ زیادہ بگڑے بگڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا کہ کیا میں 'میں ہی ہوں اور اس آن اسے خیال آیا کہ کاش بستی میں کوئی ایک انسان ہوتا کہ اسے بتا سکتا کہ وہ کس جون میں ہے اور یہ خیال آنے پر اس نے اپنے تئیں سوال کیا کہ کیا آدمی بنے رہنے کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان ہو۔ پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ بیشک آدم اپنے تئیں ادھورا ہے کہ آدمی آدمی کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور جو جن میں سے ہے ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور جب اس نے یہ سوچا تو روح اس کی اندوہ سے بھر گئی اور وہ پکارا کہ اے بنت الاخضر تو کہاں ہے کہ تجھ بن میں ادھورا ہوں۔ اس آن الیاسف کو ہرن کے تڑپتے ہوئے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کی یاد بے طرح آئی۔ جزیرے میں سمندر کا پانی امنڈا چلا آ رہا تھا اور الیاسف نے درد سے صدا کی اے بنت الاخضر اے وہ جس کے لئے میرا جی چاہتا ہے۔ تجھے میں اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر اور بڑے درختوں کی گھنی شاخوں میں اور بلند برجیوں میں ڈھونڈوں گا۔ تجھے سرپٹ دوڑتی دودھیا گھوڑیوں کی قسم ہے۔ قسم ہے کبوتروں کی جب وہ بلندیوں پر پرواز کرے۔ قسم ہے تجھے رات کی جب وہ بھیگ جائے۔ قسم ہو تجھے رات کے اندھیرے کی۔ جب وہ بدن میں اترنے لگے۔ قسم ہے تجھے اندھیرے اور نیند کی اور پلکوں کی جب وہ نیند سے بوجھل ہو جائیں۔ تو تجھے آن مل کہ تیرے لئے میرا جی چاہتا ہے اور جب اس نے یہ صدا کی تو بہت سے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ جیسے زنجیر الجھ گئی ہو۔ جیسے لفظ مٹ رہے ہوں جیسے اس کی آواز بدلتی جا رہی ہو اور الیاسف نے اپنی بدلتی آواز پر غور کیا اور ابن زبلون اور الیاب کو یاد کیا کہ کیوں کر ان کی آوازیں بگڑتی چلی گئیں تھیں۔ الیاسف اپنی بدلتی ہوئی آواز کا تصور کر کے ڈرا اور سوچا کہ اے معبود کیا میں بدل گیا ہوں اور اس وقت اسے یہ نرالا خیال سوجھا کہ اے کاش

کوئی ایسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعے وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا۔ مگر یہ خیال اسے بہت انہونا نظر آیا۔ اس نے درد سے کہا کہ اے معبود میں کیسے جانوں کہ میں نہیں بدلا ہوں۔

الیاسف نے پہلے بستی کو جانے کا خیال کیا مگر خود ہی اس خیال سے خائف ہو گیا اور الیاسف کو بستی کے خالی اور اونچے گھروں سے خفقان ہونے لگا تھا اور جنگل کے اونچے درخت رہ رہ کر اسے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ الیاسف بستی واپس جانے کے خیال سے خائف، چلتے چلتے جنگل میں دور نکل گیا۔ بہت دور جا کر اسے ایک جھیل نظر آئی کہ پانی اس کا ٹھہرا ہوا تھا۔ جھیل کے کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا۔ جی ٹھنڈا کیا۔ اس اثنا میں وہ موتی ایسے پانی کو تکتے تکتے چونکا۔ یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی اور الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آ لیا اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آ لیا تھا اور وہ بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ جیسے وہ جھیل اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے اور چھلنی ہونے لگے اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ مگر وہ بھاگتا گیا اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دی اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں ہاتھ پیروں کے بل تیر کے موافق چلا۔

انتظار حسین

زرد کتا

ایک چیز لومڑی کا بچہ ایسی اس کے منہ سے نکل پڑی۔ اس نے اسے دیکھا اور پاؤں کے نیچے ڈال کر روندنے لگا، مگر وہ جتنا روندتا تھا اتنا وہ بچہ بڑا ہوتا جاتا تھا۔

جب آپ یہ واقع بیان فرما چکے تو میں نے سوال کیا: یا شیخ لومڑی کے بچہ کی رمز کیا ہے اور اس کے روندے جانے سے بڑے ہونے میں کیا بھید مخفی ہے؟ تب شیخ عثمان کبوتر نے ارشاد فرمایا کہ لومڑی کا بچہ تیرا نفس امارہ ہے۔ تیرا نفس امارہ جتنا روندا جائے گا موٹا ہو گا۔ میں نے عرض کیا:

یا شیخ اجازت ہے؟

فرمایا: اجازت ملی۔ اور پھر وہ اڑ کر املی کے پیڑ پر جا بیٹھے۔ میں نے وضو کیا اور قلمدان اور کاغذ لے کر بیٹھا، اے ناظرین! یہ ذکر میں بائیں ہاتھ سے قلمبند کرتا ہوں کہ میرا دایاں ہاتھ دشمن سے مل گیا اور وہ لکھنا چاہا جس سے میں پناہ مانگتا ہوں اور شیخ ہاتھ سے پناہ مانگتے تھے اور اسے کہ آدمی کا رفیق و مددگار ہے "آدمی کا دشمن کہتے تھے۔ میں نے ایک روز یہ بیان سن کر عرض کیا۔

یا شیخ تفسیر کی جائے، تب آپ نے شیخ ابو سعید رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ سنایا جو درج ذیل کرتا ہوں۔

شیخ ابو سعید رحمتہ اللہ علیہ کے گھر میں تیسرا فاقہ تھا ان کی زوجہ سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے شکایت کی۔ تب شیخ ابو سعید باہر نکلے اور سوال کیا۔ سوال پر جو انہوں نے پایا وہ لے کر اٹھتے تھے کہ کوتوالی والوں نے انہیں جیب تراشی کے جرم میں گرفتار کر لیا اور سزا کے طور پر ایک ہاتھ قلم کر دیا۔ آپ وہ ترشا ہوا ہاتھ اٹھا کر گھر لے آئے، اسے سامنے رکھ کر رویا کرتے تھے کہ اے ہاتھ تو نے طمع کی اور تو نے سوال کیا، سو تو نے اپنا انجام دیکھا۔

یہ قصہ سن کر میں عرض پرداز ہوا، یا شیخ اجازت ہے؟ اس پر آپ خاموش ہوئے۔ پھر فرمایا:

اے ابو قاسم خضری "لفظ کلمہ" ہیں اور لکھنا عبادت ہے پس وضو کر کے دوزانو بیٹھ اور جیسا جتا ویسا رقم کر۔ آپ نے کلام پاک کی یہ آیت تلاوت کی:

پس افسوس ہے ان کے لئے بوجہ اس کے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور افسوس ہے ان کے لئے بوجہ اس کے جو کچھ وہ اس سے کماتے ہیں۔

اور یہ آیت پڑھ کر آپ ملول ہوئے۔ میں نے سوال کیا۔ یا شیخ یہ آیت آپ نے کیوں پڑھی؟ اور پڑھ کر ملول کس باعث ہوئے؟ اس پر آپ نے آہ سرد بھری اور احمد حجری کا قصہ سنایا جو من و عن نقل کرتا ہوں۔

احمد حجری اپنے وقت کے بزرگ شاعر تھے مگر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ شہر میں شاعر بہت ہو گئے۔ امتیاز ناقص و کامل مٹ گیا اور ہر شاعر خاقانی اور انوری بننے لگا۔ قصیدہ لکھنے لگا۔ احمد حجری نے یہ حال دیکھ شعر گوئی ترک کی اور شراب بیچنی شروع کر دی۔ ایک گدھا خریدا کہ شراب کے گھڑے اس پر لاد کر بازار جاتے تھے اور انہیں فروخت کرتے تھے۔ لوگوں نے بہت انگلیاں اٹھائیں کہ احمد گمراہ ہوا، کلام پاکیزہ سے

گزر کر شراب کا سوداگر ہوا۔ انہوں نے لوگوں کے کہنے پر مطلق کان نہ دھرا اور اپنے مشغلہ سے لگے رہے۔ مگر ایک روز ایسا ہوا کہ گدھا ایک موڑ پر آکر اڑ گیا۔ انہوں نے اسے چابک رسید کیا تو اس گدھے نے انہیں مڑ کر دیکھا اور ایک شعر پڑھا' جس میں تجنیس لفظی استعمال ہوئی تھی اور مضمون یہ تھا کہ میں دو راہے پر کھڑا ہوں۔ احمد کہتا ہے چل' احمد کہتا ہے مت چل۔ احمد حجری نے یہ سن کر اپنا گریبان پھاڑ ڈالا اور آہ کھینچ کر کہا کہ اس زمانے کا برا ہو کہ گدھے کلام کرنے لگے اور احمد حجری کی زبان کو تالا لگ گیا۔ پھر انہوں نے گدھے کو آزاد کر کے شہر کی سمت ہنکا دیا اور خود پہاڑوں میں نکل گئے۔ وہاں عالم دیوانگی میں درختوں کو خطاب کر کے شعر کہتے تھے اور ناخن سے پتھروں پر کندہ کرتے تھے۔

یہ واقعہ سنا کر شیخ خاموش ہو گئے اور دیر تک سر نیوڑھائے بیٹھے رہے۔ پھر میں نے عرض کیا: یا شیخ آیا درخت کلام سماعت کرتے ہیں۔ در آں حالانکہ وہ بے جان ہیں۔ آپ نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا' پھر فرمایا: زبان کلام کے بغیر نہیں رہتی۔ کلام سامع کے بغیر نہیں رہتا۔ کلام کا سامع آدمی ہے پر آدمی کی سماعت جاتی رہے تو جو سامعہ سے محروم ہیں انہیں سامعہ مل جاتا ہے کہ کلام سامع کے بغیر نہیں رہتا۔ پھر شیخ نے سید علی الجزائری کا قصہ بیان فرمایا۔ ملاحظہ ہو۔

سید علی الجزائری اپنے زمانہ کے نامی گرامی شعلہ نفس خطیب تھے۔ پر ایک زمانہ ایسا آیا کہ انہوں نے خطاب کرنا یک سر ترک کر دیا اور زبان کو تالا دے لیا تب لوگوں میں بے چینی ہوئی بے چینی بڑھی تو لوگ ان کی خدمت میں عرض پرداز ہوئے کہ خدارا خطاب فرمایئے۔ انہوں نے فرمایا کہ اچھا ہمارا منبر قبرستان میں رکھا جائے۔ اس نرالی ہدایت پر لوگ متعجب ہوئے۔ خیر منبر قبرستان میں رکھ دیا گیا۔ وہ قبرستان میں گئے اور منبر پر چڑھ کر ایک بلیغ خطبہ دیا۔ اس کا عجب اثر ہوا کہ قبروں سے درودکی صدا بلند ہوئی۔ تب سید علی الجزائری نے آبادی کی طرف رخ کر کے گلو گیر آواز میں کہا۔ اے شہر تجھ پر خدا کی رحمت ہو۔ تیرے جیتے لوگ بہرے ہو گئے اور تیرے مردوں کو سماعت مل گئی۔ یہ فرما کر وہ اس قدر روئے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی اور اس کے بعد انہوں نے بستی سے کنارہ کیا اور قبرستان میں رہنے لگے' جہاں وہ مردوں کو خطبہ دیا کرتے تھے۔

یہ قصہ سن کر میں نے استفسار کیا' یا شیخ زندوں کی سماعت کب ختم ہوتی ہے اور مردوں کو کب کان ملتے ہیں۔ ؟ اس پر آپ نے ٹھنڈا سانس بھرا اور فرمایا۔

یہ اسرار الٰہی ہیں۔ بندوں کو راز فاش کرنے کا اذن نہیں۔ پھر وہ پھڑپھڑا کر اڑے اور املی کے درخت پر جا کر بیٹھے۔ جاننا چاہیے کہ شیخ عثمان کبوتر پرندوں کی طرح اڑا کرتے تھے اور اس گھر میں ایک املی کا پیڑ تھا کہ جاڑے' گرمی' برسات شیخ اسی کے سائے میں محفل ذکر کرتے۔ چھت کے نیچے بیٹھنے سے حزر تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ایک چھت کے نیچے دم گھٹا جاتا ہے' دوسری چھت برداشت کرنے کے لئے کہاں سے تاب لائیں ؟ یہ سن کر سید رضی پر وجد طاری ہوا اور اس نے اپنا گھر منہدم کر دیا اور ٹاٹ پہن کر املی کے نیچے آ پڑا۔ سید رضی ابو مسلم بغدادی' شیخ حمزہ' ابو جعفر شیرازی' حبیب بن یحیٰی ترمذی اور یہ بندہ حقیر۔ شیخ کے مریدان فقیر تھے۔ میرے سوا باقی پانچوں مردان باصفا تھے اور فقرو قلندری ان کا مسلک تھا۔ شیخ حمزہ تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے اور بے چھت کے مکان میں رہتے تھے۔ وہ شیخ کی تعلیم سے متاثر تھے اور کہتے تھے کہ چھت کے نیچے رہنا شرک ہے۔ چھت ایک ہے کہ وحدہ لا شریک نے پائی ہے۔ بندوں کو زیب نہیں کہ چھت کے مقابل چھت پائیں۔ ابو مسلم بغدادی صاحب مرتبہ باپ کا بیٹا تھا۔ پھر گھر چھوڑ کر باپ سے ترک تعلق کر کے یہاں آ بیٹھا تھا اور کہا کرتا تھا کہ مرتبہ حقیقت کا حجاب ہے۔ ابو جعفر شیرازی نے ایک روز ذکر میں اپنا لباس تار تار کر دیا اور چٹائی کو نذر آتش کر دیا۔ اس نے کہا کہ چٹائی مٹی اور مٹی کے درمیان فاصلہ ہے اور لباس مٹی کو مٹی پر فوقیت دیتا ہے اور اس روز سے وہ ننگ دھڑنگ خاک پر بسیرا کرتا تھا اور ہمارے شیخ کہ خاک ان کی مسند اور اینٹ ان کا تکیہ تھی' املی کے تنے کے سہارے بیٹھتے تھے اور اس عالم سفلی سے بلند ہو گئے تھے۔ ذکر کرتے کرتے اڑتے' کبھی دیوار پر کبھی املی پر جا بیٹھتے کبھی اونچا اڑ جاتے اور فضا میں کھو جاتے۔ میں نے ایک روز استفسار کیا۔

یا شیخ قوت پرواز آپ کو کیسے حاصل ہوئی ؟ فرمایا۔

عثمان نے طمع دنیا سے منہ موڑ لیا اور پستی سے اوپر اٹھ گیا۔ عرض کیا' یا شیخ طمع دنیا کیا ہے؟

فرمایا: طمع دنیا تیرا نفس ہے۔ عرض کیا: نفس کیا ہے؟ اس پر آپ نے یہ قصہ سنایا:

شیخ ابو العباس اشقانی ایک روز گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک زرد کتا ان کے بستر میں سو رہا ہے۔ انہوں نے قیاس کیا کہ شاید محلہ کا کوئی کتا اندر گھس آیا ہے۔ انہوں نے اسے نکالنے کا ارادہ کیا مگر وہ ان کے دامن میں گھس کر غائب ہو گیا۔

میں یہ سن کر عرض پرداز ہوا۔

یا شیخ زرد کتا کیا ہے؟ فرمایا:

زرد کتا تیرا نفس ہے۔ میں نے پوچھا: یا شیخ نفس کیا ہے؟ فرمایا:

نفس طمع دنیا ہے۔ میں نے سوال کیا: یا شیخ طمع دنیا کیا ہے؟ فرمایا:

پستی علم کا فقدان ہے۔ میں ملتجی ہوا: یا شیخ علم کا فقدان کیا ہے! فرمایا:

دانش مندوں کی بہتات۔ میں نے کہا: یا شیخ تفسیر کی جائے۔ آپ نے تفسیر بصورت حکایت فرمائی کہ نقل کرتا ہوں۔ پرانے زمانے میں ایک بادشاہ بہت سخی مشہور تھا۔ ایک روز اس کے دربار میں ایک شخص کہ دانش مند جانا جاتا تھا' حاضر ہو کر عرض پرداز ہوا کہ جہاں پناہ دانش مندوں کی بھی قدر چاہیے۔ بادشاہ نے اسے خلعت اور ساٹھ اشرفیاں دے کر بعد عزت رخصت کیا۔ اس خبر نے اشتہار پایا۔ ایک دوسرے شخص نے' کہ وہ اپنے آپ کو دانشمند جانتا تھا' دربار کا رخ کیا اور بامراد پھرا۔ پھر تیسرا شخص' کہ اپنے آپ کو اہل دانش کے زمرہ میں شمار کرتا تھا' دربار کی طرف چلا اور خلعت لے کر واپس آیا۔ پھر تو ایک تانتا بندھ گیا۔ جو جو اپنے آپ کو دانش مند گردانتے تھے جوق در جوق دربار میں پہنچتے تھے اور انعام لے کر واپس آتے تھے۔

اس بادشاہ کا وزیر بہت عاقل تھا۔ دانش مندوں کی یہ ریل پیل دیکھ کر اس نے ایک روز سر دربار ٹھنڈا سانس بھرا۔ بادشاہ نے اس پر نظر کی اور پوچھا کہ تو نے ٹھنڈا سانس کس باعث بھرا؟ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

جہاں پناہ! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔

فرمایا! امان ملی۔ تو تب اس نے عرض کیا: خداوند نعمت تیری سلطنت دانشمندوں سے خالی ہے۔

بادشاہ نے کہا: کمال تعجب ہے۔ تو روزانہ دانشمندوں کو یہاں آتے اور انعام پاتے دیکھتا ہے اور پھر بھی ایسا کہتا ہے۔

عاقل وزیر تب یوں گویا ہوا کہ اے آقائے ولی نعمت' گدھوں اور دانش مندوں کی ایک مثال ہے کہ جہاں سب گدھے ہو جائیں وہاں کوئی گدھا نہیں ہوتا اور جہاں سب دانش مند بن جائیں وہاں کوئی دانش مند نہیں رہتا۔

یہ حکایت سننے کے بعد میں نے سوال کیا: ایسا کب ہوتا ہے کہ سب دانش مند بن جائیں اور کوئی دانش مند نہ رہے؟ فرمایا: جب عالم اپنا علم چھپائے۔ سوال کیا کہ یا شیخ! عالم اپنا علم کب چھپاتا ہے؟ فرمایا: جب جاہل عالم اور عالم جاہل قرار پائیں۔ سوال کیا کہ جاہل عالم اور عالم جاہل کب قرار پاتے ہیں۔ جواب میں آپ نے ایک حکایت بیان فرمائی جو اس طرح ہے۔

ایک نامور عالم کو تنگ دستی نے بہت ستایا تو اس نے اپنے شہر سے دوسرے شہر ہجرت کی۔ اس دوسرے شہر میں ایک بزرگ رہتے تھے۔ انہوں نے اکابرین شہر کو خبر دی کہ فلاں دن' فلاں گھڑی ایک عالم اس شہر میں وارد ہو گا۔ اس کی تواضع کرنا اور خود سفر پر روانہ ہو گئے۔ اکابرین شہر مقررہ وقت پر بندرگاہ پہنچے۔ اسی وقت ایک جہاز آ کر رکا۔ اس میں وہی عالم سفر کر رہا تھا۔ مگر ایک موچی بھی اس کا ہمسفر بن گیا تھا۔ وہ موچی حرام خور اور کاہل مزاج تھا۔ اس نے عالم کو سیدھا سادا دیکھ کر اپنا سامان ان پر لاد دیا اور چھڑی چھانٹ ہو گیا۔ جب جہاز سے دونوں اترے تو ایک ٹاٹ کے کرتے میں ملبوس کفش سازی کے سامان سے لدا پھندا تھا' اس پر کسی نے توجہ نہ دی اور دوسرے کو عزت و احترام سے اتارا اور ہمراہ لے گئے۔

وہ بزرگ جب سفر سے واپس آئے تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک شخص 'جس کے چہرے پر علم و دانش کا نور عیاں ہے' جوتیاں گانٹھ رہا ہے۔ آگے گئے تو دیکھا کہ اکابرین و عمائدین کی ایک مجلس آراستہ ہے اور ایک بے بصیرت مسائل بیان کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بزرگ سر سے پاؤں تک کانپ گئے اور بولے۔

اے شہر تیرا برا ہو 'تو نے عالموں کو موچی اور اور موچیوں کو عالم بنا دیا۔ پھر خود کفش سازی کا سامان خریدا اور اس عالم سے قریب ایک کوچے میں جوتیاں گانٹھنے بیٹھ گئے۔

یہ حکایت میں نے سنی اور سوال کیا۔ یا شیخ عالم کی پہچان کیا ہے؟

فرمایا! اس میں طمع نہ ہو۔

عرض کیا: طمع دنیا کب پیدا ہوتی ہے؟

فرمایا 'جب علم گھٹ جائے۔

عرض کیا! علم کب گھٹتا ہے؟

فرمایا۔ جب درویش سوال کرے 'شاعر غرض رکھے 'دیوانہ ہوش مند ہو جائے 'عالم تاجر بن جائے 'دانشمند منافع کمائے۔ عین اس وقت ایک شخص لحن میں یہ شعر پڑھتا ہوا گزرا:

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

آپ نے اسے پکار کر کہا۔

اے فلانے یہ شعر پھر پڑھ 'اس نے وہ شعر پھر پڑھا۔ پھر آپ پر مراقبے کا عالم طاری ہو گیا اور جب آپ نے سر اٹھایا تو یہ حکایت بیان فرمائی:

ایک شہر میں ایک منعم تھا۔ اس کی سخاوت کی بہت دھوم تھی۔ اس شہر میں ایک درویش 'ایک شاعر 'ایک عالم اور ایک دانشمند رہتا تھا۔ درویش پر ایک ایسا وقت آیا کہ اس پر تین دن فاقے میں گزر گئے۔ تب وہ منعم کے پاس جا کر سوالی ہوا اور منعم نے اس کا دامن بھر دیا۔ عالم کی بیوی نے درویش کو خوش حال دیکھا تو شوہر کو طعنے دینے شروع کئے کہ تمہارے علم کی کیا قیمت ہے؟ تم سے تو وہ درویش اچھا ہے کہ منعم نے اس کا دامن دولت سے بھر دیا ہے۔ تب عالم نے منعم سے سوال کیا اور منعم نے اسے بھی بہت انعام و اکرام دیا۔ دانش مند ان دونوں بہت مقروض تھا۔ اس نے درویش اور منعم کو امیر کے دروازے سے کامران آتے دیکھا تو وہ بھی وہاں جا پہنچا اور اپنی حاجت بیان کی۔ منعم نے اسے خلعت بخشی اور عزت سے رخصت کیا۔ شاعر نے یہ سنا تو زمانے کا بہت شاکی ہوا کہ سخن کی قدر دنیا سے اٹھ گئی اور اس نے منعم کے پاس جا کر اپنا کلام سنایا اور انعام کا طالب ہوا۔ منعم اس کا کلام سن کر خوش ہوا اور اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔

درویش کو جو مل گیا تھا اسے اس نے عزیز جانا کہ پھر فاقوں کی نوبت نہ آئے اور بخل کرنا شروع کر دیا۔ عالم نے اسی دولت سے کچھ پس انداز کر کے کچھ اونٹ اور تھوڑا سا اسباب خریدا اور سوداگروں کے ہمرہ اصفہان 'کہ نصف جہان ہے' روانہ ہوا اس سفر میں اسے منافع ہوا۔ تب اس نے مزید اونٹ اور مزید سامان خریدا اور خراسان کا سفر کیا۔ دانش مند نے قرض لینے اور ادا کرنے میں بڑا تجربہ حاصل کیا اور اپنا روپیہ سود پر چلانا شروع کر دیا۔ شاعر بہت کاہل نکلا 'اس نے بس اتنا کیا کہ چند اشعار اور لکھ لیے 'کچھ تہنیتی' کچھ شکایتی اور اسے مزید انعام مل گیا اور یوں درویش' عالم' دانش مند اور سوداگر۔۔۔ چاروں تو نگر ہو گئے۔ مگر اس کے بعد ایسا ہوا کہ درویش کو درویشانہ شان' عالم کا علم' دانشمند کی دانش اور شاعر کے کلام کی سرمستی جاتی رہی۔

شیخ نے یہ حکایت سنا کر توقف کیا۔ پھر فرمایا: حضرت شیخ سعدی نے بھی صحیح فرمایا اور میں شیخ عثمان کبوتر بھی صحیح کہتا ہوں کہ دمشق میں

عشق فراموش دونوں صورت ہوا ہے۔ پھر وہ دیر تک اس شعر کو گنگناتے رہے اور اس روز اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ معلوم ہو کہ ہمارے شیخ کی طبیعت میں گداز تھا اور دل درد سے معمور۔ شعر سنتے تھے تو کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ جب بہت متاثر ہوتے تو رقت فرماتے اور گریبان چاک کر ڈالتے تھے۔ آخری شعر جو آپ نے سماعت فرمایا اس کا ذکر رقم کرتا ہوں۔

اس روز رات سے آپ پر اضطراب کا عالم تھا۔ شب بیداری آپ کا شیوہ تھا پر اس شب آپ نے گھڑی بھر بھی آرام نہیں فرمایا۔ میں نے گزارش کی تو فرمایا کہ مسافروں کو نیند کہاں؟ اور پھر تسبیح و تحلیل میں مستغرق ہو گئے۔ ابھی تڑکا تھا اور آپ فجر کا فریضہ ادا کر چکے تھے کہ ایک فقیر پر سوز لحن میں یہ شعر پڑھتا ہوا گزرا:

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

آپ پر رقت طاری ہو گئی' فرمایا: اے فلانے یہ شعر پھر پڑھ۔ اس نے وہ شعر پھر پڑھا۔ آپ نے گریبان چاک کر ڈالا۔ فرمایا۔ اے فلانے یہ شعر پھر پڑھ۔ فقیر نے شعر پھر پڑھا۔ آپ کا جی بھر آیا۔ دکھ بھری آواز میں بولے: افسوس ہے ان ہاتھوں پر بوجہ اس کے جو انہوں نے مانگا۔ افسوس ہے ان ہاتھوں پر بوجہ اس کے جو انہوں نے پایا اور آپ نے اپنے ہاتھ پر نظر فرمائی اور گویا ہوئے کہ اے میرے ہاتھ' گواہ رہنا کہ شیخ عثمان کبوتر نے تمہیں رسوائی سے محفوظ رکھا۔ وہ فقیر کہ ہم نے اس سے پہلے دیکھا تھا نہ سنا تھا' اندر آگیا اور شیخ سے مخاطب ہوا کہ اے عثمان اب مرنا چاہیے کہ ہاتھ سوالی ہو گئے۔ آپ نے یہ سن کر گریہ کیا اور فرمایا۔ میں مرگیا اور پھر آپ نے اینٹ پر سر رکھا اور چادر تان کر ساکت ہو گئے۔

آپ نے اینٹ پر سر رکھ کر چادر تان لی اور آپ ساکت ہو گئے اور وہ فقیر جدھر سے آیا تھا ادھر چلا گیا اور میں بالیں پہ مشوش بیٹھا رہا۔ پھر مجھے لگا کہ چادر کے اندر کوئی شے پھڑکتی ہے۔ میں نے چادر کا کونہ اٹھایا۔ دفعتاً" چادر کے اندر سے ایک سفید کبوتر پھڑک کر نکلا اور دم کے دم میں بلند ہو کر آسمان میں گم ہو گیا اور میں نے چادر کا کونہ اٹھا کر شیخ کے چہرہ مبارک پر نظر ڈالی۔ اس چہرۂ مبارک پر اس آن عجب تجلی تھی۔ لگتا تھا کہ آپ خواب فرما رہے ہیں تب مجھ پر رقت طاری ہوئی اور میں نے یہ زاری کی کہ میں غش کر گیا۔

شیخ کے وصال شریف کا مجھ پر عجب اثر ہوا کہ میں اپنے حجرے میں بند ہو کر بیٹھ رہا۔ دنیا سے جی پھر گیا اور ہم جنسوں سے مل بیٹھنے کی آرزو مٹ گئی۔ جانے میں کتنے دن حجرہ نشین رہا۔ ایک شب شیخ اللہ' ان کی قبر نور سے بھرے بھرے خواب میں تشریف لائے۔ آپ نے اوپر نظر فرمائی اور میں نے دیکھا کہ حجرے کی چھت کھل گئی ہے اور آسمان دکھائی دے رہا ہے۔ اس خواب کو میں نے ہدایت جانا اور دوسرے دن حجرے سے باہر نکل آیا۔

جانے میں کتنے دن حجرہ نشین رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دنیا ہی بدل گئی ہے۔ بازار سے گزرا تو وہ رونق دیکھی کہ پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہزاری بزاری دکانیں صاف شفاف صراف کے برابر صراف۔ سینکڑوں کا سودا دم کے دم میں ہوتا ہے۔ سوداگروں کی خدائی ہے۔ دولت کی گنگا بہتی ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا کہ یا رب یہ عالم بیداری ہے یا خواب دیکھتا ہوں؟ کس شہر میں آگیا ہوں؟ تب میں نے سوچا کہ پیر بھائیوں سے ملنا چاہیے۔ حقیقت حال معلوم کرنا چاہیے۔ میں نے پہلے خانہ برباد سید رضی کا پتہ لیا۔ ڈھونڈتا ڈھونڈتا شہر کے ایک کوچے میں پہنچا اور ایک قصر کھڑا دیکھا۔ لوگوں نے کہا کہ سید رضی کا دولت کدہ یہی ہے۔ میں نے اس قصر کو دیکھا اور چلا کر کہا کہ خدا کی قسم' اے لوگو' تم نے مجھ سے جھوٹ کہا۔ سید رضی گھر نہیں بنا سکتا اور میں آگے بڑھ گیا۔ پھر میں نے ابو مسلم بغدادی کا پتہ لیا۔ ایک شخص نے مجھے قاضی شہر کی محل سرائے کے سامنے جا کھڑا کیا اور کہا کہ ابو مسلم بغدادی کا مسکن یہی ہے۔ میں نے اس محل سرائے کو دیکھا۔ اپنے تئیں حیران ہوا کہ ابو مسلم بغدادی نے مرتبہ لے لیا۔ میں آگے بڑھ گیا اور شیخ حمزہ کا پتہ لیا۔ شیخ حمزہ کا پتہ لیتے لیتے میں نے خود کو پھر ایک حویلی کے روبرو کھڑا پایا اور میں نے کہا کہ خدا کی قسم شیخ حمزہ نے چھت پاٹ لی۔ وہ مجھ سے دور ہو گیا۔ میں آگے بڑھا اور ابو جعفر شیرازی کا پتہ پوچھا۔ تب ایک شخص نے مجھے ایک جوہری کی

دکان پر لے جا کھڑا کر دیا۔ جہاں قالین پر گاؤ تکیہ سے کمر لگا کر ریشمی پوشاک میں ملبوس ابو جعفر شیرازی بیٹھا تھا اور ایک طفل خوب رو سے پنکھا کرتا تھا۔ تب میں نے چلا کر کہا: اے ابو جعفر! مٹی مٹی سے ممتاز ہو گئی اور میں جواب کا انتظار کئے بغیر مڑا اور وہاں سے آگیا۔ راستہ میں میں نے دیکھا کہ سید رضی ریشمی پوشاک میں ملبوس' غلاموں کے جلو میں بصد تمکنت سامنے سے چلا جاتا ہے اور دامن صبر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے بڑھ کر اس کی عبا کے بھاری دامن کو اٹھایا اور کہا کہ اے بزرگ خاندان کی یادگار اے سید السادات تو نے ٹاٹ چھوڑ کر ریشم اوڑھ لیا! اس پر وہ محجوب ہوا اور میں وہاں سے روتا ہوا اپنے حجرے کی سمت چلا اور میں حجرہ میں آکر تادیر رویا اور کہا کہ خدا کی قسم میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

دوسرے دن میں نے شیخ کے مزار شریف پر حاضری دی۔ وہاں میں نے حبیب بن یحیٰ ترمذی کو گلیم پوش اور بوریا نشین پایا۔ میں اس کے پاس بیٹھا اور کہا کہ اے حبیب تو نے دیکھا کہ دنیا کس طرح بدلی ہے اور رفقاء نے شیخ کی تعلیمات کو کیا فراموش کیا ہے اور کس طرح اپنے مسلک سے پھرے ہیں۔ وہ یہ سن کر افسوس کے آثار چہرے پر لایا اور آہ سرد بھر کر بولا کہ بے شک دنیا بدل گئی اور رفقاء نے شیخ کی تعلیمات کو فراموش کر دیا اور اپنے مسلک سے پھر گئے اور میں نے کہا کہ ہلاکت ہو بندہ دینار کو اور ہلاکت ہو بندہ درہم کو۔

اسی روز شام کو ابو مسلم بغدادی کا قاصد مجھے بلانے آیا کہ چل تیرا پرانا رفیق بلاتا ہے' اور میں وہاں گیا تو میں نے حبیب بن یحیٰ ترمذی کو اس کی صحبت میں بیٹھا پایا اور ابو مسلم بغدادی نے پیشانی پر شکن ڈال کے کہا کہ اے ابو القاسم خضری تو ہمیں شیخ کی تعلیمات سے منحرف بتاتا ہے اور ہلاکت ہلاکت کے نعرے لگاتا ہے۔ اس پر میں نے حبیب بن یحیٰ پر غصہ کی نظر ڈالی اور پھر ابو مسلم بغدادی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ! ابو مسلم کیا تو مجھے وہ کہنے سے منع کرے گا جو رسولؐ نے کہا اور جسے شیخ نے ورد کیا اور پھر میں نے پوری حدیث پڑھی۔

ہلاکت ہو بندۂ دینار کو اور ہلاکت ہو بندۂ درہم کو اور ہلاکت ہو بندۂ گلیم سیاہ کو اور پھٹے لباس کے بندے کو۔ اسی اثناء میں دسترخوان بچھا اور اس پر انواع و الوان کے کھانے چنے گئے۔ ابو مسلم بغدادی نے کہا۔

"اے رفیق کھانا تناول کر۔" میں نے ٹھنڈا پانی پینے پر قناعت کی اور کہا۔

اے ابو مسلم بغدادی دنیا دن ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں۔ ابو مسلم بغدادی یہ سن کر رویا اور بولا۔

سچ کہا تو نے اے ابو القاسم' اور پھر کھانا تناول کیا اور حبیب بن یحیٰ ترمذی بھی یہ سن کر رویا اور حبیب بن یحیٰ ترمذی نے بھی پیٹ بھر کر کھایا۔ جب دسترخوان تہہ ہوا تو کنیزوں کے جلو میں ایک رقاصہ آئی۔ میں اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ابو مسلم بغدادی نے اصرار کیا اے رفیق ٹھہر۔ میں نے کہا کہ اے ابو مسلم بغدادی دنیا دن ہے اور ہم روزہ دار ہیں اور میں وہاں سے چلا آیا اور اس چھنال کے پیروں کی دھمک اور گھنگھروؤں کی جھنکار نے میرا تعاقب کیا۔ پھر میں نے کانوں میں انگلیاں لے لیں اور بڑھتے چلا گیا۔

جب میں نے حجرے میں قدم رکھا تو دفعتاً" ایک لجلجی شے تڑپ کر میرے حلق سے نکلی اور منہ سے باہر نکل آئی۔ میں نے چراغ روشن کیا اور حجرے کا کونہ کونہ دیکھا مگر کچھ نہ دکھائی دیا اور میں نے کہا: بے شک یہ میرا وہم تھا اور میں چٹائی پر پہنچ کر سو رہا۔

دوسرے روز میں اٹھ کر پہلے حبیب بن یحیٰ ترمذی کی طرف گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کے بوریا پر ایک زرد کتا سو رہا ہے۔ میں نے کہا: اے یحیٰ ترمذی کے بیٹے تو نے اپنے تئیں نفس کے حوالے کر دیا اور منافق ہو گیا۔ اس پر وہ رویا اور کہا کہ خدا کی قسم میں تیرے ساتھیوں میں سے ہوں اور رفقاء کے پاس مسلک شیخ یاد دلانے جاتا ہوں۔ تب میں نے شیخ کی قبر پر' کہ خدا اس کو نور سے بھر دے' عقیدت مندوں کو زر و سیم چڑھاتے دیکھا اور میں نے کہا:

اے یحیٰ کے بیٹے تیرا برا ہو تو نے شیخ کو وصال کے بعد اہل زر بنا دیا۔ اس زر و سیم کا تو کیا کرتا ہے! حبیب بن ترمذی پھر رویا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ زر و سیم سید رضی' ابو جعفر شیرازی' ابو مسلم بغدادی' شیخ حمزہ اور میرے درمیان مساوی تقسیم ہوتا ہے اور میں اپنا حصہ مساکین میں تقسیم کر دیتا ہوں اور بوریا کو اپنی تقدیر جانتا ہوں۔

میں وہاں سے اٹھ کر آگے چلا اور میں نے سید رضی کے قصر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ اس کے پھاٹک میں ایک بڑا سا زرد

ا کھڑا ہے اور میں نے اس زرد کتے کو شیخ حمزہ کی حویلی کے سامنے کھڑا پایا اور ابو جعفری شیرازی کی مسند پر محو خواب پایا اور ابو مسلم بغدادی کی ں سرا میں دم اٹھائے کھڑے دیکھا اور میں نے اپنے تئیں سوال کیا۔ اے ابو القاسم تو یہاں کیوں آیا ہے؟ اور ابو القاسم نے مجھ سے کہا کہ ابو سلم بغدادی کو مسلک شیخ کی دعوت دینے کے لئے۔

اس رات بھی میں نے حبیب بن یحییٰ ترمذی کو ابو مسلم بغدادی کے دسترخوان پر موجود پایا۔ ابو مسلم بغدادی نے مجھ سے کہا کہ اے رفیق ھانا تناول کر اور میں نے ٹھنڈے پانی پر قناعت کی اور کہا کہ اے ابو مسلم دنیا دن ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں۔ اس پر مسلم بغدادی رویا اور ولا۔ سچ کہا تو نے اے رفیق' اور پھر جب زن رقاصہ آئی تب بھی میں نے یہی کیا اور اٹھ کھڑا ہوا اور اس زن رقاصہ کے پیروں کی تھاپ اور ھنگھروؤں کی جھنکار نے کچھ دور تک میرا تعاقب کیا۔ مگر پھر میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور آگے بڑھ گیا۔

تیسرے دن میں نے پھر شہر کا گشت کیا اور جو منظر پچھلے دو دن دیکھتا آ رہا تھا۔ اس میں سرمو فرق نہ دیکھا اور شب کو میں نے پھر اپنے ں ابو مسلم بغدادی کے در پر کھڑا پایا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ابو مسلم بغدادی کو شیخ کی تعلیمات یاد دلانے آیا ہوں۔ سو میں نے اپنے تئیں کوئی وال نہیں کیا اور اندر چلا گیا۔ آج پھر حبیب بن یحییٰ ترمذی دسترخوان پر موجود تھا۔ ابو مسلم بغدادی نے کہا اے رفیق کھانا تناول کر' اور مجھے ج تیسرا فاقہ تھا اور دسترخوان پر متنجن اور غذاؤں کے مزعفر بھی تھا جو ایک زمانے میں مجھے بہت مرغوب تھا۔ میں نے ایک نوالہ مزعفر کا لے کر ہاتھ کھینچ لیا اور ٹھنڈا پانی پیا اور کہا:

دنیا دن ہے اور ہم اس پر روزہ دار ہیں۔

آج یہ فقرہ سن کر ابو مسلم بغدادی نے رونے کے بجائے اطمینان کا سانس لیا اور کہا: اے رفیق تو نے سچ کہا۔ پھر زن رقاصہ آئی اور یں نے اسے ایک نظر دیکھا۔ چہرہ لال بھبوکا' آنکھیں مے کی پیالیاں' کچیں سخت اور رانیں بھری ہوئی' پیٹ صندل کی تختی' ناف گول پیالہ یسی' اور لباس اس نے ایسا باریک پہنا تھا کہ صندل کی تختی اور گول پیالہ اور کولھے' سیمیں ساقیں سب نمایاں تھیں اور مجھے لگا کہ میں نے مہکتے مزعفر کا ایک اور نوالہ لے لیا ہے اور میرے پوروؤں میں کن من ہونے لگی اور میرے ہاتھ میرے اختیار سے باہر ہونے لگے۔ تب مجھے ہاتھوں کے بارے میں شیخ کا ارشاد یاد آیا۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا کہ آج ابو مسلم بغدادی نے کھانے پر اصرار نہ کیا اور آج اس رنڈی کے پیروں کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار نے ایک شیریں کیفیت کے ساتھ میرا دور تک تعاقب کیا۔

جب میں گھر پہنچا اور حجرے میں قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے بوریے پر ایک زرد کتا سو رہا ہے۔ میں تو اسے دیکھ کر ششدر کالعجز ہن گیا اور مجھے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ آنے لگا۔ پھر میں نے اسے مارا پر وہ بھاگنے کی بجائے میرے دامن میں آکر گم ہو گیا۔ تب مجھے اندیشوں نے گھیرا۔ میری آنکھوں کی نیند غائب اور دل کا چین رخصت ہو گیا اور میں نے زاری کی۔ اے میرے معبود مجھ پر رحم کر کہ میرا دل الائشوں میں مبتلا ہوا اور زرد کتا میرے اندر سما گیا۔ میں نے زاری کی اور میں نے دعا کی۔ پر میرے جی کو قرار نہ آیا۔ یک بارگی مجھے ابو علی رودباری رضی اللہ عنہ' یاد آئے کہ کچھ مدت وسوسہ کی بیماری میں مبتلا رہے تھے۔ ایک دن وہ صبح نور کے تڑکے دریا پر گئے اور سورج نکلنے تک وہاں رہے۔ اس عرصہ میں ان کا دل اندوہ گیں ہوا۔ انہوں نے عرض کیا: اے بار خدایا آرام دے۔ دریا میں سے ہاتف نے آواز دی کیا آرام علم میں ہے اور میں نے خود سے کہا کہ اے ابو القاسم خضری یہاں سے چل کہ یہاں تیرے باہر اور اندر زرد کتے پیدا ہو گئے اور تیرا آرام چھن گیا۔

میں نے اپنے حجرے پر آخری نظر ڈالی اور منطق اور فقہ کی ان نادر کتب کو' جو برسوں کی ریاضت سے جمع کی تھیں' وہیں چھوڑ' ملفوظات شیخ بغل میں دبا' شہر سے نکل گیا۔ شہر سے نکلتے نکلتے زمین نے میرے پر پکڑ لئے اور مجھے شیخ کی خوشبو دار مجلسیں بے طرح یاد آگئیں اور اس زمین نے' جسے میں نے پاک اور مقدس جانا تھا۔ مجھے بہت پکڑا اور ان گلیوں نے جنہوں نے شیخ کے قدموں کو بوسہ دیا تھا' مجھے بہت پکارا اور میں ان کی پکار سن کر رویا اور بکا کی کہ یا شیخ تیرا شہر چھتوں میں چھپ گیا اور آسمان دور ہو گیا اور تیرے رفیقان گریز پا تجھ سے پھر گئے۔ انہوں نے لاشریک چھت کے مقابل اپنی اپنی چھتیں پاٹ لیں اور مٹی میں فصل پیدا کر دیا اور زرد کتے نے عزت پائی اور اشرف الخلق مٹی بن گیا اور مجھ

پر تیرا شہر تنگ ہو گیا۔ میں نے تیرا شہر چھوڑ دیا۔ یہ کہہ کر میں نے دل مضبوط کیا اور چل پڑا۔

میں چلتے چلتے دور نکل گیا۔ یہاں تک کہ میرا دم پھول گیا اور میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ اچانک میرے حلق سے کوئی چیز زور کر کے باہر آئی اور پیروں پر گر گئی۔ میں نے اپنے پیروں پر نظر کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک لومڑی کا بچہ میرے قدموں پر لوٹتا ہے۔ تب میں نے اسے پیروں سے روند کر کچل دینا چاہا۔ پر وہ لومڑی کا بچہ پھول کر موٹا ہو گیا۔ تب میں نے اسے پھر قدموں سے روندا اور وہ موٹا ہو گیا اور موٹا ہوتے ہوتے زرد کتا بن گیا۔ تب میں نے پوری قوت سے زرد کتے کو ٹھوکر ماری اور اسے قدموں سے خوب روندا اور روندتا ہوا آگے نکل گیا اور میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے اپنے زرد کتے کو روند ڈالا اور میں چلتا ہی گیا تا آنکہ میرے چھالے چھل کر پھوڑا بن گئے اور میرے پیروں کی انگلیاں پھٹ گئیں اور تلوے لہولہان ہو گئے۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ زرد کتا، جسے میں روند کر آیا تھا جانے کدھر سے پھر نکل آیا اور میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس سے لڑا اور اسے راہ سے بہت ہٹایا۔ پر وہ راہ سے سرمو نہ ہٹا، حتیٰ کہ میں تھک گیا اور تھک کر گھٹ گیا اور وہ زرد کتا پھول کر بڑا ہو گیا۔ تب میں نے بارگاہ رب العزت میں فریاد کی کہ اے پالنے والے آدمی گھٹ گیا اور زرد کتا بڑا ہو گیا اور میں نے اسے قدموں میں روندنا چاہا پر وہ میرے دامن میں لپٹ کر غائب ہو گیا اور میں نے اپنی پھٹی ہوئی انگلیوں اور لہولہان تلوؤں اور پھوڑا چھالوں پر نظر کی اور اپنے حال پر رویا اور کہا کہ کاش میں نے شیخ کے شہر سے ہجرت نہ کی ہوتی۔ تب میرا دھیان اور طرف گیا۔ میں نے مہکتے مزعفر کا خیال کیا اور صندل کی تختی اور گول پیالہ والی کا تصور باندھا اور شیخ کے مزار پر زر و سیم کی بارش پر قیاس دوڑایا اور میں نے سوچا کہ بے شک شیخ کے مرید شیخ کی تعلیمات سے منحرف ہو گئے اور حبیب بن یحییٰ ترمذی نے مخالفت کی راہ اختیار کی اور بے شک شیخ کی ملفوظات میرے تصرف میں ہیں، مناسب ہو کہ میں شہر واپس چل کر ملفوظات پر نظر ثانی کروں اور انہیں مرغوب خلائق اور پسند خاطر احباب بنا کر ان کی اشاعت کی تدبیر کروں اور شیخ کا تذکرہ اس طرح لکھوں کہ رفقاء کو پسند آئے اور طبیعت پر کسی کی میل نہ آئے پر مجھے اس آن اچانک شیخ کا ارشاد یاد آیا کہ ہاتھ آدمی کے دشمن ہیں اور میں نے سوچا کہ میرے ہاتھ مجھ سے دشمنی کریں گے اور اسی رات جب میں نے سونے کی نیت باندھی تو میں نے دیکھا کہ زرد کتا پھر نمودار ہو گیا ہے اور میری چٹائی پر سو رہا ہے۔ تب میں نے زرد کتے کو مارا اور اسے اپنی چٹائی سے اٹھانے کے لئے اس سے نبرد آزما ہوا اور میں اور زرد کتا رات بھر لڑتے رہے۔ کبھی میں اسے قدموں میں روند ڈالتا اور وہ چھوٹا اور میں بڑا ہو جاتا، کبھی وہ اٹھ کھڑا ہوتا اور میں چھوٹا اور وہ بڑا ہو جاتا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور اس کا زور گھٹنے لگا اور وہ میرے دامن میں چھپ کر غائب ہو گیا۔

تب سے اب تک میری اور زرد کتے کی لڑائی چلی آتی ہے۔ اس مجاہدہ کی فرعیں بہت اور باریکیاں بے شمار ہیں جنہیں میں نظر انداز کرتا ہوں کہ رسالہ لمبا نہ ہو جائے۔ کبھی زرد کتا مجھ پر اور کبھی میں زرد کتے پر غالب آ جاتا ہوں۔ کبھی میں بڑا ہوتا اور وہ میرے قدموں میں پس کر لومڑی کا بچہ ایسا رہ جاتا ہے۔ کبھی وہ بڑا ہوتا چلا جاتا ہے اور میں گھٹتے چلا جاتا ہوں اور مجھے مہکتے ہوئے مزعفر اور صندل کی تختی اور گول پیالے کا خیال ستانے لگتا ہے اور زرد کتا کہتا ہے کہ جب سب زرد کتے بن جائیں تو آدمی بنے رہنا کتے سے بدتر ہوتا ہے اور میں فریاد کرتا ہوں کہ اے پالنے والے میں کب تک درختوں کے سائے میں بنی آدم سے دور دور پھروں اور کچے پکے پھلوں اور موٹے ٹاٹ کی گدڑی پر گزارہ کروں اور میرے قدم شہر کی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔ پر مجھے شیخ کا ارشاد یاد آ جاتا ہے کہ واپس ہوتے ہوئے قدم سالک کے دشمن ہیں اور میں پھر اپنے قدموں کو سزا دیتا ہوں اور شہر کی طرف پشت کر کے اتنا چلتا ہوں کہ میرے تلوے لہولہان ہو جاتے ہیں اور پھر ہاتھوں کو سزا دیتا ہوں کہ راستے کے پتھر کنکر چنتا ہوں۔ اے رب العزت میں نے اپنے دشمنوں کو اتنی سزا دی کہ میرے تلوے لہولہان ہو گئے اور میرے پوروے کنکر چنتے چنتے پھوڑا بن گئے اور میری چمڑی دھوپ میں کالی پڑ گئی اور میری ہڈیاں پگھلنے لگیں۔ اے رب العزت میری نیندیں جل گئیں اور دن ملیامیٹ ہو گئے۔ دنیا میرے لیے تپتا دن بن گئی اور میں روزہ دار ٹھہرا اور روزہ دن بدن لمبا ہوتا جاتا ہے۔ اس روزے سے میں لاغر ہو گیا۔ مگر زرد کتا تو آتا ہے اور روز رات کو میری چٹائی پر آرام کرتا ہے۔ میرا آرام رخصت ہو گیا اور میری چٹائی غیر کے قبضہ میں چلی گئی اور زرد کتا بڑا اور آدمی حقیر ہو گیا اور اس وقت میں نے ابو علی رودباری رضی اللہ عنہ، کو پھر یاد کیا اور دریا کے کنارے دو زانو بیٹھ گیا۔ میرا دل اندر سے بھرا ہوا تھا اور میں نے بکا کی کہ

الٰہا آرام دے' آرام دے۔ میں نے رات بھر بکا کی اور دریا کی طرف دیکھا کیا اور رات بھر غبار آلود تیز ہوا زرد رو پیڑوں کے
میان چلا اور رات بھر درختوں سے پتے گرا کیے۔ میں نے دریا سے نظر ہٹا کر اپنے گرد میں اپنے جسم کو دیکھا' اپنے ارد گرد زرد پتوں کی ڈھیریاں
ھیں اور میں نے کہا کہ یہ میری خواہشیں اور ارمان ہیں۔ خدا کی قسم میں آلائشوں سے پاک ہوا اور پت جھڑ کا برہنہ درخت بن گیا پر جب تڑکا
ا تو مجھے اپنے پوروں میں میٹھا میٹھا رس گھلتا محسوس ہوا' جیسے وہ صندل کی تختی سے چھو گئے ہیں' جیسے انہوں نے گول سنہری پیالے اور نرم
م چاندی سی ساقوں کو مس کیا ہے' جیسے انگلیاں سونے چاندی میں کھیل رہی ہیں اور ان کے درمیان درہم و دینار کھنک رہے ہیں۔ میں نے
ھمیں کھولیں اور دھندلکے میں یہ دہشت بھرا منظر دیکھا کہ زرد کتا دم اٹھائے اس طور کھڑا ہے کہ اس کی پچھلی ٹانگیں فرش میں ہیں اور اگلی ٹانگیں
ری پیشانی پر اور اس کے گیلے گرم نتھنے میرے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو چھو رہے ہیں۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو یوں دیکھا جیسے وہ ابو سعیدہ
مۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں کی مثال کٹا ہوا مجھ سے الگ پڑا ہے اور میں نے اسے خطاب کر کے کہا کہ اے میرے ہاتھ' اے میرے رفیق تو دشمن
ے مل گیا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گڑگڑا کر ایک بار پھر دعا کی: بارالٰہا آرام دے' آرام دے۔

○

بانو قدسیہ

نام : قدسیہ بانو
قلمی نام : بانو قدسیہ
پیدائش : ۲۸ نومبر ۱۹۲۸ء بہ مقام فیروز پور ' مشرقی پنجاب ' بھارت
تعلیم : ایم ۔ اے (اردو) گورنمنٹ کالج ' لاہور ۱۹۵۰ء
ابتدائی تعلیم فیروز پور ' مشرقی پنجاب میں پائی۔ ۱۹۴۸ء میں کنیرڈ کالج ' لاہور سے بی۔ اے
اور ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ کالج ' لاہور سے ایم۔ اے (اردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

فیروز پور ' مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئیں ' بچپن اور لڑکپن وہیں گذارا۔ قیام پاکستان کے بعد والدین کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئیں۔ افسانہ نگاری کا شوق بچپن سے تھا۔ مشق کے طور پر بہت سے افسانے لکھے اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دیئے۔ میٹرک کے بعد کنیرڈ کالج ' لاہور میں داخلہ لیا ' جہاں سے بی۔ اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج ' لاہور میں داخلہ لیا اور ایم۔ اے (اردو) کیا۔ اشفاق احمد ان کے ہم جماعت تھے۔ شادی کے بعد دونوں نے مل کر ادبی مجلہ "داستان گو" لاہور جاری کیا۔ بانو اور اشفاق اس پرچے کو اپنے ذاتی پریس سے شائع کرتے تھے اور یوں بانو اور اشفاق "داستان گو" کے ایڈیٹر بھی تھے اور مشین مین بھی۔

بانو قدسیہ نے ۱۹۵۰ء میں باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ اسٹیج کے لیے سات ڈرامے : "آدھی بات" "اہل کرم" "منتظر تیرے لیے" "اک تیرے آنے سے" ، "بزدل" "یہ جنوں نہیں تو کیا ہے" اور "منزل منزل" کے علاوہ ریڈیو کے لیے "عاشمہ" "اس دیوانگی میں" "اذاری" "کرم فرما" "دھواں" "اچی ماڑی" "کچ دا بھانڈا" اور "سایہ گل" (سیریز) لکھی۔ ٹیلی ویژن کے لیے "سہارے" "لب پہ آتی ہے" "صبح کا ستارہ" "آدم کے بعد" "خلیج" "زخم خوردہ" "تکن اپنی اپنی" "میری ڈائری" "سانول موڑ مہاراں" "زاویے" "سد حراں" "ضرب جمع تقسیم" اور "زرد گلاب" جیسے خوبصورت ڈرامے اور سیریل لکھے۔

عموماً صبح دس بجے سے دوپہر بارہ بجے تک لکھنے کا کام کرتی ہیں ' اس کے بعد باورچی خانے میں چلی جاتی ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"واماندگی شوق" مطبوعہ : "ادب لطیف" لاہور ۱۹۵۲ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "بازگشت" (افسانے) شیش محل کتاب گھر ' لاہور : طبع اول :

۲۔ "امر بیل" (افسانے) — مکتبہ اردو، لاہور: — طبع اول:

۳۔ "کچھ اور نہیں" (افسانے) — مکتبہ اردو، لاہور: — طبع اول:

۴۔ "دانت کا دستہ" (افسانے) — شیش محل کتاب گھر، لاہور: — طبع اول:

۵۔ "ایک دن" (ناولٹ) — مکتبہ میری لائبریری، لاہور: — طبع اول:

۶۔ "موم کی گلیاں" (ناولٹ) — مکتبہ میری لائبریری، لاہور: — طبع اول:

۷۔ "پروا" (ناولٹ) — داستان گو، لاہور: — طبع اول: ۱۹۶۰ء

۸۔ "شہر بے مثال" (ناول) — الحمرا پبلیشرز، لاہور: — طبع اول:

۹۔ "راجہ گدھ" (ناول) — سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور: — طبع اول: ۱۹۸۱ء

۱۰۔ "آدھی بات" (سٹیج ڈرامے)

۱۱۔ "اک تیرے آنے سے" (سٹیج ڈرامہ)

۱۲۔ "منزل منزل" (اسٹیج ڈرامے)

۱۳۔ "ناقابل ذکر" (افسانے) — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور: — طبع اول: ۱۹۸۵ء

۱۴۔ "توجہ کی طالب" (افسانوی کلیات) — سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور: — طبع اول: ۱۹۸۵ء

۱۵۔ "فٹ پاتھ کی گھاس" (ڈرامے) — فیروز سنز، لاہور: — طبع اول: ۱۹۸۹ء

مستقل پتا:

داستان سرائے، ۱۲۱۔ C ماڈل ٹاؤن لاہور نمبر ۱۴ پاکستان۔

اعزاز:

ستارہ امتیاز (برائے ادب) حکومت پاکستان کا اعلیٰ ترین سول اعزاز: ۱۹۸۳ء

نظریہ فن:

" میرے افسانوں میں رومان سے زیادہ اس کا تجزیہ ہوتا ہے۔ "

بانو قدسیہ

(بہ حوالہ: "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" مرتبہ: طاہر مسعود صفحہ ۲۹۳)

انترھوت اداسی

یہ پہلی بار تھی - اس کے بعد دو بار اور ایسے ہوا -- بالکل ایسے -

جب میرا بایاں پاؤں بانس کی سیڑھی کے آخری ڈنڈے پر تھا اور میرا دایاں پیر صحن کی کچی مٹی سے چھ انچ اونچا تھا تو پیچھے سے ماں نے میرے بال ایسے پکڑے جیسے نئے نئے چوزے پر چیل جھپٹتی ہے - میرا توازن کچھ ایسا بگڑا کہ میں کپڑے کی گڈی جیسی اڑنگ بڑنگ کچی مٹی پر جا گری - ماں کو مجھے پٹخنی دینے یا دھپا مارنے کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ جب انسان کسی سے چھڑ کر آ رہا ہو تو اس میں اتنی جان ہی کہاں ہوتی ہے: مجھے تو ایک گرم سانس اس وقت چاروں شانے گرا سکتا تھا - ماں نے تو پھر ہیکا مار کر میرے بال جھنجھوڑے تھے -

"بول بول اس بھری دوپہر میں تو کہاں سے آ رہی ہے ؟ گشتی الفتی کہاں تھی تو اس وقت ؟ بول - گرمی ایسی کہ چھاؤں تلے دھرتی پھٹ جائے اور تو سخر کوٹھے پر کیا کر رہی تھی ناکھسی ؟--"

میں چپ رہی -

"بول کون ہے اوپر ؟ اوپر نہ کوئی کمرہ نہ ٹپی ' پھر اوپر کیا لینے گئی تھی تو ؟ جس یار حمایتی سے ملنے گئی تھی اس کا میں لہو پی جاؤں گی - بول اس کا نام--؟"

میں اور بھی گونگی ہو گئی -

میرا ابا بھی بڑا چپ آدمی تھا - لیکن اس کی چپ ' اس کا گونگا پن ' اس کے مرن برت سب ماں کو ستانے کے لیے ہوتے تھے - اسے ماں کو تڑپانے میں بڑا مزا ملتا تھا - وہ اپنی بڑی بڑی مونچھوں تلے مسکراتا رہتا پر ماں کی کسی بات کا جواب نہ دیتا - وہ اس کچہری میں اپنی صفائی کے لیے کبھی ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالتا - اسی چپ میں ابا کی ساری عزت اور زندگی بھر کی جیت پنہاں تھی - جب ماں بول بول کر ہلکان ہو جاتی : طعنے ' بد دعائیں کوسنے ' آہیں ' سسکیاں سب باری باری اپنا اپنا دور ختم کر چکتیں تو ماں ہلکان ہو کر دیوار کے ساتھ کھڑی چارپائی آنگن میں بچھاتی اور اس پر اوندھی لیٹ جاتی - ایسے میں باسی روٹی کی طرح اس کے چہرے پر ان گنت داغ دھبے نظر آنے لگتے - مجھے ماں پر بڑا ترس آتا - لیکن ابا مختلف تھا - عورت مرد کے اس کھیل میں جب وہ جیت چکتا - تو پھر چار خانے کا کھیس کندھے پر ڈال کر یوں نکل جاتا جیسے پہلوان اکھاڑے سے کشتی جیت کر جاتے ہیں - ماں ' میرے اور ابا کے درمیان بے طور ٹکرانے والی گیند تھی - مجھ دیوار سے ٹکراتی تو ٹپا کھا کر ابا کی طرف جاتی - وہاں پتھر سے سر پھوڑ کر پھر بڑک کر میری جانب آتی - ماں کی ساری عمر اسی بے مصرف پیش قدمی اور پسپائی میں گزر گئی اور ساری عمر اسے علم نہ ہو سکا کہ یہ کھیل صرف اسی کو تھکانے والا تھا - بڑی رات گئے ابا لوٹتا تو ماں ایسی نیند سوئی ہوتی جو زچہ کو بچے کی پیدائش کے بعد نصیب ہوتی ہے - میں کنڈی کھولتی ' ابا محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتا اور چپ چاپ اندر چلا جاتا - ابا کی ہر بات بن کہے مجھے سمجھ آتی تھی اور ماں کی باتیں ایسے تھیں جیسے گوندھے آٹے کی بھری کنالی پر اوپر ہی اوپر مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں - میرے پلے کبھی کچھ نہ پڑا -

ابا بڑا چپ آدمی تھا - لیکن ابا کی چپ میں ایک چال تھی -

میں ابا کی طرح چپ نہیں - میری چپ حویلی کے صدر دروازے کے قدموں میں گرے ہوئے اس قفل کی مانند ہے جسے پچھلی رات چور

دروازے کے کنڈے سے اتار کر پھینک گئے ہوں۔ ایسا تالا بہت کچھ کہتا ہے لیکن کوئی تفصیل بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ ساری واردات سے آگاہ ہوتا ہے لیکن اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ حفاظت نہ کر سکنے کا غم' اپنی ہیچ میدانی کا احساس' اپنے مالکوں کے ساتھ گہری دغابازی کا حیرت انگیز انکشاف اسے گم سم کر دیتا ہے۔ میری اور ابا کی چپ میں بڑا فرق تھا۔ ابا ان اونچے پہاڑوں کی طرح چپ تھا جن کے قدموں میں لہریں شور مچا مچا کر سو جاتی ہیں۔ میری چپ اس لاوے کی مانند تھی جو زمین کے اندر ابلتا' سڑتا' بہتا کہیں کا کہیں اتر جاتا ہے۔

"بول! چپ کیوں کھڑی ہے اپنے کمینے باپ کی طرح۔۔ بول کس یار کی بغل گرم کر کے آئی ہے نامراد؟۔۔" اسی مصیبت کے ہاتھوں ابا نے کچھ سال پہلے بڑی لمبی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ صفائیاں پیش کرنے کے جھنجھٹ سے فارغ ہو کر لمبی تان کر سو گیا تھا۔ میں ماں کو کیا بتاتی؟ کہاں سے شروع کرتی؟ اور کہاں جا کر ختم کرتی؟

"کتی! ہمارا کوٹھا سارے محلے سے نیچا ہے۔ کس کس نے تجھے آتے جاتے نہ دیکھا ہو گا۔۔ بول؟ کتنے عرصے سے یہ سلسلہ جاری ہے؟ کون سا مہینہ لگا ہے؟ بتا جلدی' کوئی ڈاکٹر دائی تو کر مروں عزت گنوانے سے پہلے۔۔؟"

یکدم آنسو میری آنکھوں سے بہنے لگے!

ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے بھی میری چوٹی پکڑ کر یہی کہا تھا۔ میں اماں کو کیا بتاتی کہ ابھی ابھی میں اس کے منہ سے بھی یہی سن کر آئی تھی۔ "بول' بتاتی کیوں نہیں' روئے کیوں جاتی ہے۔ کسی ڈاکٹرنی کی ضرورت ہے تو خرچ میں کروں گا۔ بول روتی کیوں جاتی ہے۔ کچھ بتاتی کیوں نہیں؟" نہ میں اسے کچھ بتا سکی اور نہ اماں کو۔۔۔ بچپن سے مجھے یوں لگتا ہے کہ اگر میں نے کسی سے کچھ کہا تو سمجھے گا نہیں' الٹا نہ جانے کیا سمجھ کر میرا دشمن ہو جائے گا۔

میں کچی مٹی سے اٹھی اور اندر غسل خانے میں چلی گئی۔

ماں کچھ دیر دروازہ دھڑ دھڑاتی رہی۔ پھر طعنے' کوسنے بد دعائیں جاری ہوئیں' ان کا سٹاک ختم ہو گیا تو وہ دیر تک دروازے کے ساتھ لگ کر روتی رہی۔ پھر اس نے اپنی پرانی تکنیک استعمال کی۔ آنگن میں چارپائی پر لیٹ گئی اور میرے پیدا ہونے سے لے کر آج تک کے تمام واقعات اونچے اونچے دہرانے لگی۔ میرا حمل اس پر کیسا بھاری تھا؟ مجھے جننے میں اس نے کیسی درد زہ برداشت کی تھی۔ پھر کیسے چھلے میں مجھے خسرہ نکل آئی اور وہ پورے انیس دن پلنگ پر بیٹھی رہی گود میں لے کر۔۔ مجھے پالنے پوسنے میں اسے جو جو مصیبت' مرحلے' قربانیاں درپیش رہیں ان کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے کرتے شام ڈھل گئی۔

جب میں باہر نکلی تو ماں کی ساری گیس نکل چکی تھی۔ وہ ایک چھوٹے معصوم بچے کی طرح الانی چارپائی پر گھوک سو رہی تھی اور اس کی بائیں گال پر بان کی رسیوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ شام کو نیم کے درخت پر ان گنت چڑیاں چہچہا رہی تھیں لیکن ماں کو ان کے شور کا علم نہ تھا۔ ایسے میں اگر میں کسی کے ساتھ بھاگ جاتی تو بھی ماں کو علم نہ ہوتا۔ لیکن میں بھاگتی کس کے ساتھ؟ جن عورتوں کو مرد بھگا لے جاتے ہیں خدا جانے وہ کیسی ہوتی ہیں؟ ہم جیسی لڑکیوں سے تو کوئی بھگا لے جانے کا وعدہ بھی نہیں کرتا!

میں چپ چاپ چارپائی کے پائے سے سر جوڑ کر بیٹھ گئی' ماں کے سوائے اس دنیا میں میرا تھا بھی کون۔ ابا کا بھی سوائے ماں کے دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ لاکھ بار گھر سے گیا اور پھر اس لیے لوٹ آیا کہ اس کھوٹے سکے کو سنبھال کر رکھنے والی ایک ہی تجوری تھی۔ میرا ابا اتنا نکھٹو تھا' اتنا نکھٹو تھا کہ منہ پر جھولنے والی مکھیاں بھی بالا آخر اسے چھوڑ جاتیں۔ وہ بہت کم کھاتا تھا کیونکہ اسے نوالے توڑنے سے وحشت ہوتی تھی۔ آدھے پنڈے سے زیادہ کو کبھی وہ ایک وقت میں صابن نہیں لگا سکا اسی لیے وہ نہانے سے بھی کتراتا تھا۔ سردیوں میں بغیر لحاف کے پڑا رہتا۔ گرمیوں میں پسینے میں نہائے نظر آتا لیکن پنکھا کبھی نہ جھلتا۔ ابا اس کھتی سے مشابہ تھا جو بچے گلی ڈنڈا کھیلتے وقت کھود لیتے ہیں۔ کبھی کبھی برساتی پانی اس میں آپ ہی آپ بھر جاتا ہے ورنہ زیادہ عمر اس کی منہ کھولے ہی گزرتی ہے۔

ماں نے ساری عمر ابا کا ساتھ دیا۔ بول کر' طعنے دے کر' ہلکان ہو کر' سسکیاں بھر کر دیا' پر دیا۔

ہم دونوں یکی دیواروں سے سر پھوڑ پھوڑ کر ماں بوڑھی ہو گئی ــــ اس بوڑھی نیم جان ' گھائل کو میں کیا بتاتی ۔ کہاں سے بات شروع کرتی اور کہاں جا کر ختم کرتی؟

ہمارے گھر میں ہر اس چیز کا فقدان تھا جس سے زندگی پروان چڑھتی ہے ' سرشار ہوتی ہے ۔ دولت ' شرافت ' محبت ' ان چیزوں کا ہمیشہ گھاٹا ٹوٹا رہا ۔ ہمیں تو ہر چیز ایسے ملی کی سانسیں قائم رہیں ۔ لیکن زندگی کے آثار کھل کر پیدا نہ ہوئے ۔ جب میں تین سال کی ہوئی تب سے ماں ایک قریبی فیکٹری میں کام کرنے جانے لگی تھی ۔ ابا اور میں گھر پر رہتے تھے ۔ ہم دونوں اپنی اپنی چپ کے قلعے میں بند سارا دن پاس رہتے ہوئے بھی بہت دور دور رہتے ۔ جب ابا گھر پر ہوتا تو یوں لگتا تھا جیسے کہیں باہر گیا ہوا ہے اور جب وہ باہر ہوتا تو لگتا تھا کہ ادھر ادھر ہی کہیں ہو گا!

کچھ عرصہ میں اسکول جاتی رہی ' پھر یہ سلسلہ خرچ کی زیادتی کے باعث بند ہو گیا ۔ یہ بھی اچھا ہوا کیونکہ اسکول مجھے دل سے برا لگتا تھا ۔ وہاں سب لڑکیاں بڑی خوش خوش آتی تھیں ۔ ان کے پاس بتانے کے لیے اتنی ساری باتیں ہوتی تھیں کہ وہ استانی کے پڑھاتے وقت بھی رقعوں پر پیغامات لکھ لکھ کر ایک دوسرے کو پہنچاتی رہتی تھیں ۔ مجھے میری کلاس کی لڑکیاں "بل بتوری ناساں چوڑی" چھیڑتی تھیں ۔ لیکن میں ان کو بھی پلٹ کر کچھ نہ کہتی تھی ۔ ان کی چھیڑ چھاڑ اس طعن و تشنیع کے مقابلے میں پھول کی چھڑی تھی جس سے میرا دل میری تواضع کیا کرتا تھا ۔ اسکول سے ہٹ کر میری زندگی پھر کنوئیں کی مال بن گئی ۔ ہر وقت وہی صبح و شام ' وہی چلو بھر پانی ' وہی چپہ چپہ بھر زندگی ' کبھی طغیانی نہیں ' کبھی سیری نہیں ۔

پھر ابا مر گیا ۔

اس رات اس نے چار خانے والا کمبل اوڑھا ' اپنی خاموشی کی مسہری تانی اور پھر ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا ۔ ماں دنگ ہی رہ گئی ۔ نہ اس نے اونچے اونچے بین ڈالے نہ دیواروں سے ٹکرائی ۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے وہ بنجر زمین کی طرح تیخ گئی ۔ ہمارے نہ کوئی رشتہ دار آئے ' نہ قرآن ختم ہوئے ' نہ گٹھلیاں پڑھی گئیں ۔ بس محلے والوں نے چندہ کر کے ماں کے سر سے بوجھ اٹھا دیا ' اور سوئم کے بعد ماں پھر فیکٹری جانے لگی ۔

اب ابا ہر وقت گھر میں رہنے لگا ۔

امی ابا سے خوف زدہ ہو کر میں کوٹھے پر چڑھ جاتی ۔ ہمارے گھر کی چھت پر اونچی اونچی منڈیریں نہیں تھیں ۔ بس ابھرواں کنارے تھے جن کی سوکھی مٹی میں تنکے چمکتے رہتے ہیں ۔ اسی کنارے پر بیٹھے ہوئے مجھے نکڑ سے آتی ماں دکھائی دیتی تو میں نیچے چلی آتی ۔ محلے میں بہت لڑکیاں تھیں لیکن میری چپ کا تالا کھول کھول کر وہ سب بیزار ہو چکی تھیں ۔ اب میں تھی اور کوٹھے کی منڈیر ' آسمان پر اڑنے والی چیلیں ' محلے کے کبوتر اور شام کو لوٹنے والی کووں کی قطاریں ۔

ایک روز چوتھے کوٹھے سے مجھے سیٹی کی آواز سنائی دی ۔ تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ سیٹی بجانے والا قدیر کھوکھے والا ہے ۔ تب مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قدیر کے پانچ بچے ہیں اور اس کی بیوی محلے کی سب سے خوبصورت عورت ہے ۔ مجھے تو صرف اتنا دکھائی دے رہا تھا کہ قدیر کا پکا گھر ہمارے محلے میں خوبصورت اور اونچا تھا ۔ اس کی کھڑکیوں میں پردے تھے اور اس کی دیواروں پر جالیاں بنی ہوئی تھیں ۔ سب سے اوپر ایک ہوادار کمرہ تھا جس کی کھڑکیوں پر نیم فیروزی ' نیم ہرا ' تازہ تازہ رنگ کیا ہوا تھا ۔

یہی کمرہ میرا پہلا گھر بنا ۔ اسی کمرے میں پہلی بار قدیر نے مجھے اپنے کھوکھے سے لا کر ٹھنڈی کوکا کولا پلائی ۔ پلاسٹک کے کلپ ' نقلی بار ' کانچ کی چوڑیاں اور ناک میں ڈالنے والا بڑا چمکدار لیکن جھوٹا کوکا دیا ۔ قدیر کی ہر بات اپنے کھوکھے کی طرح تھی ۔ وہ تھوڑی قیمت پر زیادہ مال خریدنے کا عادی تھی ۔ اس کے ہاں ادھار قطعی بند تھا اور وہ کسی گاہک کو بھی ناراضگی کا موقع نہیں دیتا تھا ۔

پتا نہیں میں ابا کے ڈر سے وہاں جاتی تھی؟

پتا نہیں ہوائی میں تنہائی کا سانپ کیوں ایسے بلوں میں لے گھستا ہے؟

خدا جانے میری ' طغیانی بھی بھر کر کچھ کھانے ' کچھ ہنس لینے ' کچھ وقت جھولی بھر کر گزارنے کی خواہش مجھے وہاں کھینچ کر لے جاتی تھی ۔

غالباً کبھی کبھی کوئی وجہ نہیں بھی ہوتی ۔ بس یونہی انسان زندگی کے ہتے میں ریشم کے تھان کی طرح الجھتا چلا جاتا ہے ۔ قدیر کو اپنے خاندان سے بڑی محبت تھی ۔ وہ ماسیوں 'پھوپھیوں' ہم زلفوں کی باتیں کرتا تھکتا نہ تھا ۔ اسے اپنی بیوی سے بھی بڑی محبت تھی کیونکہ اس کی بیوی اس کے خاندان کا ایک اہم حصہ تھی ۔ وہ وصال کے لمحوں میں بھی اسی کا نام لے لے کر مجھ سے لپٹتا رہتا ۔ اس کی محبت پھوکے انداز کی تھی جس سے میرے لہو کا طائر کبھی بھی زخمی ہو کر نہ گرتا ۔ بلکہ اوپر ہی اوپر --- اور اوپر اڑتا چلا جاتا ۔

اپنے بچوں کی باتیں کر کے قدیر کو بڑی خوشی ملتی تھی ۔ اپنی خاندانی روایات کا 'اپنی محلے کی ساکھ اور برادری کی عزت کا اسے بڑا پاس تھا ۔ قدیر بھی دراصل طغیانی سے ناآشنا تھا ۔ اس کی ساری زندگی بھی معاشرے کے پیمانوں میں ناپ تول کر گزری تھی ۔ وہ اتنی چھوٹی عمر سے کھوکھا چلا رہا تھا کہ اب اس کی اپنی زندگی خالی کھوکھے کے علاوہ اور کچھ نہ تھی ۔ ان سب قیود کے باوجود وہ بڑے اہتمام سے مجھے ملتا تھا' وہ بڑے حساب سے اپنے کھوکھے سے ایسی چیزیں میرے لیے لاتا جو اس کے بال بچوں کی حق تلفی نہ کرتیں ۔ وہ اپنی زندگی کی لذتیں یوں اکٹھی کرتا تھا جیسے کوئی بڑی بی حساب کا پان لگا رہی ہو ۔ برابر کا چونا' برابر کا کتھا' چٹکی بھر زردہ ۔ اس کی جذباتی زندگی بھی ایک خاص پیمانے پر چلتی تھی ۔ نہ یہاں کوئی ادھار تھا نہ فضول خرچی -- وہ جو کچھ مجھے دیتا فوراً اس کی قیمت وصول کر لیتا ۔

لیکن میری بول بلارے والی ماں یہ سب کچھ کیسے سمجھ سکتی تھی ؟

جب بڑی شام گئے اس کی آنکھ کھلی تو چند لمحے وہ مجھے دیکھتی رہ گئی ۔ میں سمجھی شدید غم نے اس کے ذہن کو ماؤف کر دیا ہے ۔ لیکن پھر وہ میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولی -- "بول بدبخت کون سا مہینہ لگا ہے تجھے 'بول مر؟ "میں اسے کیسے سمجھاتی کہ ایسے لیکھے داروں کے ساتھ مہینے نہیں چڑھا کرتے ۔ ایسے لوگوں کے ساتھ نہ کبھی نفع ہوتا ہے نہ نقصان ۔ صرف زندگی کا بہی کھاتہ ایسے ہندسوں سے بھر جاتا ہے جنھیں کوئی پڑھ نہیں سکتا ۔

"بول 'پھر ملے گی تو اس سے -- بول ؟"

پورے ہاتھ کا چانٹا آیا اور بجلی کی طرح میرے جسم سے گزر گیا ۔ میں ماں کو کیا بتاتی کہ مجھے قدیر سے ملنے کا کچھ ایسا شوق بھی نہیں تھا ۔ یہ بات اگر میں قدیر یا ماں کو سمجھانے کی کوشش کرتی تو غالباً وہ دونوں مجھے جان سے مار دیتے ۔

"بول کتنی -- بول حرام خور ملے گی اس سے -- ؟

میں نے ماں کے پاؤں پکڑ لیے ۔ اپنے دکھ کی وجہ سے نہیں ۔ میرے اپنے کوئی دکھ نہیں تھے ۔ لیکن میں اسے اس قدر ہلکان ہوتے دیکھ نہیں سکتی تھی ۔ اگر وہ مجھے مارتی رہتی تو شاید مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا ۔ لیکن اب وہ اپنے منہ پر چانٹے مار رہی تھی ۔ اپنے بال کھسوٹ رہی تھی ۔ اسے یوں اپنے سے بدلہ لیتے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی ۔

میں نے بڑی قسمیں کھائیں کہ پھر قدیر سے نہ ملوں گی ۔ قرآن اٹھایا ۔ اس کے بعد میں کبھی قدیر کے کوٹھے پر نہیں گئی ۔ لیکن ماں چونکہ سارا دن فیکٹری میں کام کرتی تھی اس لیے اسے کبھی یقین نہ آسکا کہ میرے عہد سچے تھے ۔ وہ مجھ سے بڑی محتاط ہو گئی تھی ۔ جب میں سو جاتی تو وہ چوری چوری آکر میری قمیض میرے پیٹ سے اٹھاتی اور بڑے پولے پولے ہاتھوں سے میرے پیٹ کی ٹوہ لیتی ۔ اسے پورا شک تھا کہ یہ اندر ہی اندر بڑھ رہا ہے ۔ کبھی کبھی رات کے پچھلے پہر وہ میرے سرہانے بیٹھ کر ہولے ہولے رونے لگتی' جیسے بلیاں مستی میں آکر بولتی ہیں ۔

قدیر نے میرے کھاتے کو پھر کبھی نہ کھولا ۔

نہ میں کبھی اس کے کوٹھے پر گئی ۔ ڈوبی رقم پر وہ زیادہ وقت ضائع کرنے کا عادی نہ تھا ۔

اتنے سارے میل جول کے باوجود نہ کوئی نفع ہوا نہ نقصان --- زندگی چلو بھر پانی کھینچتی رہی ۔ نہ کوئی طغیانی آئی' نہ سیری کا احساس بڑھا ۔ بس صرف سانس کی ڈوری نہ ٹوٹی ۔

پھر ایک دن فیکٹری سے ماں بڑی خوش لوٹی ۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا بڑا سا ڈبہ تھا ۔

"لے کھا باجرہ۔۔ کھا۔۔ تیرے تو نصیب کھل گئے آچند روپے مٹھائی کھا۔ تیری بات پکی کر کے آئی ہوں بادامی باغ میں۔۔"

بات پکی کرانے کا شوق میرے دل میں قدیر نے ڈالا۔ وہ اتنی پریت سے اپنی بیوی کی باتیں کیا کرتا تھا کہ میرا دل بھی کرتا کوئی میرے متعلق ایسی ہی باتیں کیا کرے۔ میرا خیال تھا کہ ایک روز مجھے دیکھنے والیاں آئیں گی۔ پھر ایک سہرے والا چہرے پر رومال رکھے آئے گا۔ میں اس کے چمکدار بوٹوں کو دیکھتی گھر سے رخصت ہو جاؤں گی۔ مجھے جنگل کے اس پار جانے کا بڑا شوق تھا۔

"آ۔۔ منہ میٹھا کر۔ نہ پڑی رہا کر۔ تیرا انتظام تو اللہ نے خود کیا۔ منیجر صاحب کی بیوی خود میرے پاس آئی۔"

"سن رہی ہے باجرہ؟۔۔ نازاں پی۔۔ سن رہی ہے۔۔؟"

"سن رہی ہوں ماں۔۔"

"پھر خوش کیوں نہیں ہوتی۔۔؟"

"خوش ہو رہی ہوں۔۔ ماں"

ماں رازداری سے میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور میٹھی ہوئی آواز میں بولی۔۔ "منیجر کی بیوی بولی میری بہن کا بیٹا ہے۔ پڑھا لکھا تو نہیں ہے' پر جائیداد کا اکیلا وارث ہے۔ ہم تو جائیداد کا لفظ بھی منہ سے نہیں لے سکتے' تو جائیداد والی ہو جائے گی۔ میں خود بادامی باغ گئی تھی منیجر صاحب کی کار میں' گھر دیکھ کر آ رہی ہوں۔ پکی حویلی ہے دو منزلہ۔ پنکھے' ریڈیو' ٹیلی ویژن' قالین' سب کچھ ہے گھر میں۔۔ لے لڈو کھا۔ اوپر والی منزل میں لڑکا رہتا ہے۔ بڑا گھر ہے' ساری عمر ریشم پہنے گی۔ اس کچے کوٹھے کے عذابوں سے بچی رہے گی۔

خوش ہو جا۔۔ جس کا کوئی سدھارنے والا نہ ہو' رب اس کے کام کرتا ہے۔۔ رج کھانا رج سونا۔۔"

بڑی دیر بعد میں نے پوچھا۔۔ "اور وہ۔۔ وہ کیسا ہے۔۔؟"

"جیسا گھر ہوتا ہے ویسے لوگ ہوتے ہیں اس میں رہنے والے۔ ایسے گھروں میں کوئی ہما شما تھوڑی رہتے ہیں۔"

"کیسی شکل ہے اس کی۔۔؟"

"ماں خوبصورت ہے تو بیٹا بھی خوبصورت ہو گا۔ گوری چٹی' یہ بڑا سا کوکا ناک میں' پورا بازو چوڑیوں سے بھرا ہوا۔ کوئی پیاری باتیں کرتی ہے باجرہ' کوئی پیاری باتیں کرتی ہے۔ بیٹھئے بہن جی۔۔ کھائیے بہن جی' یہ گدی کمر کے پیچھے رکھ لیں۔ ٹھنڈا پئیں گی کہ گرم۔۔ میرا تو جی وہاں سے آنے کو نہیں کرتا تھا' سچ باجرہ۔۔"

میں چپ رہی۔

"بادامی باغ والی کہہ رہی تھی باجرہ! بہن جی ہمیں صرف لڑکی چاہئے جو ہمارے گڈو کو خوش رکھے' اس سے ہمدردی کرے' اس کا دل لگائے۔ ہمیں کسی چیز کی طمع نہیں۔ ہمیں کچھ نہیں چاہئے' اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ اگر ہمیں لالچ ہوتا تو ہم امیروں کی لڑکی کبھی کی لے آتے۔ ہمیں تو یہ پتا ہے غریبوں میں غیرت ہوتی ہے' محبت ہوتی ہے' شرافت ہوتی ہے۔۔"

میں اندر ہی اندر ہنس دی۔ بادامی باغ والی نہیں جانتی تھی کہ ان ہی تینوں کے فقدان سے غریبی پیدا ہوتی ہے۔۔ دولت کا فقدان تو فقط غریبی کا سدا بہار رہتا ہے۔ اصلی بہار تو ان تینوں ہی کے نہ ہونے سے ہوا کرتی ہے۔

"لے موئیے کھا۔۔ اصلی موتی چور کے لڈو ہیں' لے کھا۔۔"

اماں اس روز بڑی خوش تھی۔ وہ ہانڈی بھونتے ہوئے کچھ گنگناتی رہی۔ پھر محلے والوں کو یہ خبر سنانے چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کا چہرہ دمک دمک کر رہا تھا۔ میں نے ماں کو اس قدر خوش کبھی نہیں دیکھا۔ نکاح سے ایک رات پہلے تو ماں اسی طرح ہنستی گنگناتی رہی۔ شادی سے ایک دن پہلے جب شام کو بادامی باغ سے لوٹی تو اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا اور وہ چپ چپ تھی۔ مشکل سے وہ سوٹ کیس لا کر آنگن میں رکھا جس میں کپڑے اور زیور تھے۔ اس کے بعد وہ بغیر مجھے آواز دیے اندر غسل خانے میں چلی گئی۔ نہ اس نے سوٹ کیس کھول کر مجھے کپڑا' زیور دکھائے'

نہ منہ سے کچھ بولی۔ اس رات کے بعد میری ماں نے پھر مجھ سے کوئی بات نہ کی۔

آدھی رات کو میں اس کی سسکیوں کی آواز سن کر جاگ گئی۔ وہ سوٹ کیس کھولے کپڑوں کو گھور رہی تھی۔

"کیا ہوا اماں۔۔؟"

"کچھ نہیں' تو سو جا۔۔"

"پھر تو رو کیوں رہی ہے۔۔؟"

"کچھ نہیں۔"

ماں مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے طعنے کوسنے' بد دعائیں زندہ ہوا کرتی تھیں۔ آج مجھے اس بغلگیری سے یوں لگا گویا اس کی جان جسم چھوڑ رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے بچھڑنے کا غم کر رہی ہے۔ لیکن میرا اپنا دل ہر قسم کے جذبات سے خالی تھا۔ یہاں نہ کسی سے ملنے کی خوشی تھی' نہ کسی سے بچھڑنے کا رنج۔ میری زندگی کا ماہ و سال تو یوں گزرے تھے جیسے کسی گودام میں نئے سال کا کیلنڈر لٹکا لٹکا پرانے سالوں سے جا ملے۔

ماں صبح تک مجھ سے لپٹی رہی اور روتی رہی اور جب میری شادی کا دن طلوع ہوا اور اس کی پہلی سفیدی ابھرنے لگی تو ماں بولی۔۔ "دیکھ باجرہ! نصیب سے نہ جھگڑنا۔ عورت کی ساری زندگی نصیب سے چلتی ہے۔ مجھے دیکھ تیرہ برس کی بیاہی آئی تھی۔ ایک دن شوہر کی کمائی کا کھوٹا پیسہ تک نہیں ملا۔ ایک دن اس گھر کے مالک نے مجھے بیچی بھر پیار بھی نہیں دیا۔ پر زمانے میں نے نصیب سے جھگڑا نہیں کیا۔ جو میرے کرم اچھے ہوتے تو سب کچھ مل جاتا' ہاتھ پاؤں مارے بغیر مل جاتا۔ سچ ہے کہ نہیں؟ کسی کو اللہ دولت دیتا ہے تو اولاد نہیں دیتا' اولاد ہوتی ہے تو صحت نہیں ملتی۔ اتنے تارے اللہ نے نہیں بنائے جتنے غم بنائے ہیں۔ سب اپنے اپنے تارے کا غم سہنے کو آئے ہیں اس جہان میں"۔ پہلی بار مجھے شک گزرا جیسے ماں مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے' مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے' کیونکہ ان دونوں کی اسے عادت نہیں تھی۔

"کیا بات ہے ماں۔۔؟"

"کوئی بات نہیں۔ ہر ماں بیٹی کو کچھ نہ کچھ ساتھ دیتی ہے۔ میں تجھے جہیز تو دے نہیں سکتی۔ دلاسہ بھی دے کر رخصت نہ کروں۔۔"

مجھے رونا آگیا اور میں ماں سے لپٹ گئی۔۔

"جب میں یہاں سے فیکٹری جاتی ہوں تو راستے میں کئی مین ہول کھلے ملتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں ان میں راہ گیر گر بھی پڑتے ہیں۔ باجرہ! یوں سمجھ لے سوہنیے ہمارے رب نے ہر چوڑائی کے' ہر گہرائی کے مین ہول بچھا رکھے ہیں اپنی دنیا میں۔ آخر آدمی کب تک بچے گا۔ بندہ بشر ہے لمبی سیاہ زندگی ہے' کسی نہ کسی کھڈ میں تو گر کر ہی رہے گا۔۔"

"تو مجھے صاف صاف بتاتی کیوں نہیں کیا بات ہے؟۔۔ ہوا کیا ہے۔۔؟"

"کوئی بات نہیں' کچھ نہیں ہوا۔ نیا گھر ہو گا' نئے لوگ ہوں گے۔ وہاں تیری ماں نہیں ہو گی لیکن غریبی بھی نہیں ہو گی۔ ہر جگہ کا اپنا سکھ ہے' اپنا دکھ ہے۔ جو لڑکی میکے کے سکھ یاد کرتی رہے وہ کبھی سسرال گھر جا کر خوش نہیں ہوتی۔۔"

"تجھے کسی نے کچھ کہا ہے ماں؟۔۔ بتا تو بتاتی کیوں نہیں۔۔؟"

میری ماں چپ رہی۔ اس کی چپ میری اور ابا کی چپ سے بھی اٹل تھی۔۔ کیونکہ شادی کی دوسری رات میری ماں چپ چاپ اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ میری سسرال والوں نے خاموشی سے اس کو سپرد خاک کر دیا اور مجھ کو نہ بتایا۔ وہ مجھے دو صدمے ایک ہی وقت میں نہ دینا چاہتے تھے۔

جس طرح ست ماھے بچے کو مصنوعی حرارت میں رکھ کر اس دنیا میں رہنے کے قابل بناتے ہیں' اسی طرح میری سسرال والوں نے مجھے آسائش' آرام اور بڑی چاپلوسی کی روئی میں بچا بچا کر کئی دن رکھا تا کہ گذو سے بہت پہلے میں اس گھر کی دولت بھری زندگی کی عادی ہو جاؤں۔

تنے دن گھر میں مہمان رہے' یہی سننے میں آیا کہ گڈو بیمار ہے اور نچلی منزل میں اپنی ماں کے کمرے میں ہے۔ کئی بار جی میں آئی کہ ایک نظر گڈو کو دیکھ آؤں' اس کی بیمار پرسی کروں۔ پر دوسری منزل سے نیچے جانے کی ہمت پیدا نہ ہوئی۔

میری ساس میری ماں کا الٹ تھی۔ گوری گوری' گول گول۔۔ چپ چپ سی' بڑی صابر' بڑی برداشت والی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا جیسے وہ اس دنیا کی مخلوق نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں اتنا غم ہوتا کہ مجھے اس سے ڈر آنے لگتا۔ ماں کی موت کے بعد سب سے پہلے میری ساس نے میرا دل جیت لیا۔ وہ چپ چپ بیٹھی ہوتی تو مجھے بڑا دکھ ہوتا' جیسے ماں کو دیکھ کر ہوتا تھا۔

جس رات پہلی بار میں گڈو سے ملی' دیر تک ساس میرے پاس بیٹھی رہی۔ اس کا ہاتھ میرے گھٹنے پر تھا اور وہ بار بار اسے تھپک رہی تھی۔ وہ جس بات کا سرا پکڑتی' بیچ میں ادھورا چھوڑ کر چپ چاپ میرا منہ تکنے لگتی۔

"گڈو صاحب کا اب کیا حال ہے جی؟۔۔"

"ٹھیک ہے اب تو' آج آئے گا تیرے پاس۔۔"

ان دیکھے دولہے کی آرزو روشن سورج کی طرح میرے دل سے طلوع ہو گئی۔

"کبھی کبھی جو تصور عورت دولہے کا بناتی ہے باجرہ! دولہا اس سے مختلف ہوتا ہے۔ پر ساری چیز عورت کا جذبہ ہے۔۔ گھر عورت بناتی ہے' بچے عورت جنتی ہے۔ مرد تو ایسے ہی گھر کے باہر نام کی تختی ہوتی ہے۔۔"

میرا دل پہلی بار ڈرا۔۔ لیکن پھر میں نے سوچا گڈو شاید بد صورت ہو اسی لیے یہ تمہید باندھ رہی ہے' شاید اتنے دن اسی لیے اسے میرے پاس آنے بھی نہیں دیا۔ لیکن میری ساس کو شاید علم نہ تھا کہ اتنے دن سسرال میں رہ کر میں پریشان ہو گئی تھی۔ اب مجھے اچھے برے آدمی کی پہچان نہ رہی تھی۔ مجھے اپنا شوہر درکار تھا۔

بڑی دیر تک ساس یونہی بے مصرف چپ چاپ میرے پاس بیٹھی رہی۔ پھر جب وہ آدھی دہلیز کے اندر اور آدھی باہر تھی' تب وہ بولی "سن باجرہ! ہم لوگ تیری بڑی قدر کریں گے' صرف تو گڈو کی قدر کرنا۔ وہ ہمارا اکلوتا بیٹا ہے' پانچ بہنوں کا اکیلا بھائی۔ دیکھ بیٹی! جو کچھ وہ تجھے نہ دے سکے تو ہم سے مانگنا۔ میرے پاس گڈو سے اور کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔۔"

میں اپنی ساس کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پر وہ جیسے اپنے دل کی بھٹی کو آنسوؤں اور باتوں سے ٹھنڈا کر رہی تھی۔۔ "میرے رشتہ داروں میں لڑکیوں کا کال نہیں ہے۔ لیکن میں غریب گھر کی لڑکی اس لیے لائی کہ غریبوں میں ہمدردی ہوتی ہے۔۔ وہ محبت کرنا جانتے ہیں۔ اب گڈو جیسا بھی ہے تیرا ہے باجرہ۔۔ جیسا بھی ہے۔۔ صرف تیرا ہے۔۔!"

میری ساس جلدی سے رخصت ہو گئی۔

اس کی بات ٹھیک تھی کہ گڈو صرف میرا تھا۔ لیکن افسوس میں اس کی اتنی بھی نہ ہو سکی جتنی میں قدیر کی تھی!

رات کے پچھلے پہر گڈو کمرے میں داخل ہوا۔ پہلے باہر کچھ کھسر پھسر ہوتی رہی' پھر گڈو اندر آیا۔ وہ اندر آتے ہی مجھے ایسے چمٹا جیسے ریچھ درخت سے جپھی ڈالتا ہے۔ اس کے پیچھے میری ساس اور بڑی دو نندیں کھڑی تھیں۔

"اماں میری دلہن۔۔ میری بیوی۔۔ میری اماں جی پاری پاری دلہن جی۔۔"

میری ساس نندوں نے جلدی سے اسے مجھ سے جدا کر دیا۔

"کیا کر رہا ہے گڈو۔۔!"

"دیکھو دلہن! یہ مجھے تمہارے پاس نہیں آنے دیتی تھیں۔ کہتی تھیں دلہن بھاگ جائے گی۔ تو بھاگے گی؟ بتا میں کوئی برا ہوں۔۔ میں اپنا قاعدہ لا کر تمہیں سناؤں؟ کہاں ہے میرا قاعدہ۔۔ لاؤ۔۔ لاتے کیوں نہیں؟ میں دلہن کو قاعدہ سناؤں!"

میری ساس نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی تو وہ رونے لگا۔

"سب مجھ سے برا سلوک کرتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں 'ہم تمہارا بھلا کر رہے ہیں۔ میں کیوں چپ رہوں بڑی آپا۔ تم چپ ہو جاؤ' تم دفع ہو جاؤ۔ میری دلھن ہے۔ میں اس سے بولوں گا۔۔ بولوں گا۔۔ ہاں بولوں گا۔۔"

ڈھیلی مسہری کبھی کبھی بانسوں کے ساتھ باندھ کر لگانی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ ایک سرے پر ڈنڈوں کا کراس ٹھیک کرو تو دوسرے سرے کے ڈنڈے سرک کر پائیوں کے نیچے سے نکل جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی میری ساس نندیں تو تھمبو کر کے گڈو کو انسان کے روپ میں پیش کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ ڈھیلی مسہری مجھ پر تان کر جلدی سے نیچے چلی گئیں۔ ان کا خیال تھا خطرے سے اوجھل ہوتے ہی خطرہ ٹل جائے گا۔

یہ آغاز تھا۔

مین ہول میں گرنے کا آغاز!

ایک نیم دیوانے شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی کا آغاز۔ میں نے اتنی عمر بغیر اچھا کھائے پیئے گزاری تھی کہ اگر گڈو عام سا دیوانہ ہوتا تو شاید میں بڑی رضا و رغبت سے آسائش اور دولت کی زندگی میں ڈوب جاتی۔ لیکن گڈو دیوانہ ہونے کے ساتھ عاشق مزاج بھی تھا۔

اسے بغلگیر ہونے 'چومنے' مساس کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ میں سارا سارا دن اس کے ساتھ پلنگ پر پڑی رہوں۔ وہ ناشتے کی میز سے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگتا۔۔

"گڈو ناشتہ کرنے دے ہاجرہ کو۔۔!"

"ایک بات ہے امی۔۔ میری پالی امی! پرائیوٹ بات۔ کمرے میں کرنے والی۔۔"

"ٹوسٹ تو ختم کر لینے دے بیچاری کو" میری بڑی نند کہتی۔

پھر وہ سب کے سامنے میرے کان میں منہ ٹھونس کر ایک آدھ ایسی بات کہتا جو سب کو سنائی دیتی اور جس کا تعلق جسم کے ایسے حصوں سے ہوتا جن کا ذکر عام طور پر لوگ نہیں کیا کرتے۔

"اٹھ ناں ضروری کام ہے۔۔"

"تو چل 'ابھی آ جائے گی ابھی۔۔"

وہ مجھے دوپٹے سے گھسیٹنا شروع کر دیتا۔

"جلدی چل۔۔ چل ناں۔۔"

کمرے میں پہنچ کر میرا پھنکارنا بولنا 'اسے پرے پرے کرنا سب بیکار تھا۔ وہ بندروں کی طرح اچک اچک کر مجھے چومنے لگتا۔ میں زیور کپڑا اتارنے میں حجت کرتی تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ جاتا۔ ایسے ہی لمحوں میں گڈو مجھ پر حاوی ہو جاتا۔ کیوں کہ اس سنہری بالوں والے دیوانے کو روتا دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے رحم کے اندر کہیں دکھ کی ٹیسیں اٹھنے لگتیں اور میرا جی اسے گود میں اٹھانے کو چاہتا۔

عجیب سے دن تھے 'عجیب سی راتیں۔ تیز بخار میں آنے والے خوابوں کی طرح ان کا حجم 'ان کی جسامت کچھ بھی درست نہ تھا۔ نہ جانے دن کو سورج نکلتا بھی تھا کہ نہیں 'خدا جانے راتوں کو اندھیرا ہوتا بھی تھا کہ نہیں۔ میری ساس میری آؤ بھگت میں لگی رہتی تھی 'نئے نئے زیور 'خوبصورت کپڑے آتے رہتے تھے۔ میری نندیں مجھ سے شرمندہ شرمندہ پرے پرے رہتی تھیں۔ میرا سسر البتہ کبھی کبھی مجھے پاس بٹھا کر زندگی کی اونچ نیچ سمجھایا کرتا تھا۔

گڈو پر کبھی کبھی سیانے پن کے دورے پڑتے تو مجھے بڑی امید بندھ جاتی۔ شاید کوئی معجزہ کوئی کرامت ہو جائے۔ ایسے دنوں میں کوئی گڈو کو پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ سر پر ٹوپی پہن کر 'بازو پر جائے نماز لٹکائے میرے پاس آتا اور بڑی میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا۔۔ "دیکھ ہاجرہ! میں مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں 'تم کھانا کھا کر سو جانا 'بیٹھی انتظار نہ کرتی رہنا۔"

پانچ بہنوں کے اکلوتے بھائی کی ایسی نارمل بات سن کر میری ساس کا لب و لہجہ نارمل ہو جاتا۔ "سو جائے گی سو جائے گی، تم فکر نہ کرو، تم آرام سے نماز پڑھنے جاؤ۔۔"

واپسی پر وہ سب کو سلام کر کے اپنے کمرے میں آتا۔ بڑی دیر تک وہ ایک معمر آدمی کی طرح دانت صاف کرتا رہتا۔ پھر صوفے میں بیٹھ کر بیڈ لیمپ کی روشنی میں وہ کتابیں دیکھتا رہتا جن کا پڑھنا اس کے لیے مشکل تھا۔ بڑی رات گئے وہ پلنگ پر آتا اور میری طرف پیٹھ کر کے سو جاتا۔ فرزانہ ہوتے ہی اسے مجھ سے کوئی غرض نہ رہتی تھی۔

ایسے ہی دنوں میں وہ بڑے تواتر کے ساتھ میرے سسر کے ساتھ فیکٹری جانے لگتا۔ واپسی پر خاموشی سے کھانا کھاتا، فیکٹری کے مسائل پر گفتگو کرتا اور پھر مجھے ملے بغیر سینما دیکھنے چلا جاتا۔

ان دنوں میری ساس زمین سے دو دو فٹ اونچا چلنے لگتیں

"ہم نے سب کچھ گڈو کے نام منتقل کروایا دیا ہے ہاجرہ! کوٹھی، مرسڈیز، فیکٹری، سب کچھ۔ یہ سب تو اپنے اپنے گھر چلی جائیں گی، سب کچھ تیرا ہے۔۔ میرا اور گڈو کا۔"

یہ دن بڑے پرسکون ہوتے تھے۔

اگر میں غلطی سے اسے کسی کے سامنے ہاتھ بھی لگا لیتی تو وہ بدک جاتا اور آواز گرا کر کہتا۔۔ "کیا کرتی ہے ہاجرہ! کسی کا لحاظ بھی نہیں تمہیں، میری جوان بہنیں دیکھتی ہیں۔۔"

لیکن یہ دن زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ ازلی ورد کی طرح کسی صبح اٹھتے ہی گڈو اپنے چولے کو اتار اصلی روپ میں آجاتا۔ جب گڈو ہوش میں ہوتا ان دنوں سسرال میں اوپر نیچے قہقہے ہی قہقہے ہوتے۔ میری نندوں کے رشتوں کی باتیں ہوتیں، سارا گھر میٹنی شو دیکھنے جاتا، رشتہ داروں کی دعوتیں ہوتیں۔ میری ساس فراخ دلی سے مجھے سب سے ملاتی اور اونچی آواز میں کہتی۔۔ "میری ہاجرہ کا جادو دیکھا بہن جی؟ جو کام ڈاکٹر نہ کر سکے، میری بہو نے کر دکھایا۔ دس سال سے سرت ماری گئی ہے گڈو کی۔۔ اب دیکھ لو چنگا بھلا۔۔ ہوش مند ہو گیا ہے۔۔ ہاجرہ نے اسے زندگی دی ہے۔۔ ہاجرہ نے اسے انسان بنا دیا ہے۔۔"

مجھے اپنی ساس کی فراخ دلی سے بڑی شرم آتی۔ وہ ماں تھی اس لیے اس کا جذبہ سچا تھا۔ اور میں عورت تھی اور چونکہ میری ضرورتیں ادھوری تھیں اس لیے جو کچھ بھی میں ظاہر کرتی تھی اندر محسوس کرنے سے عاری تھی۔

اگر میری ساس کا بس چلتا تو وہ خود گڈو کی بیوی بن جاتی اور ساری عمر اسے اپنے پروں تلے یوں چھپائے رکھتی جیسے بطخ سوں سوں کرتی اپنے انڈوں کو سیتی ہے۔ کبھی کبھی گڈو پلنگ پر پیشاب کر دیتا تو پوری پوری خود ہی چادریں، گدے دھو دیتی۔ مجھ پر گڈو کی دیکھ بھال کا کوئی بوجھ نہ تھا۔ میں اپنی ساس کو دیکھ کر سوچتی رہتی، "ایک انسان کی اتنی ساری کمزوریوں پر کوئی اس نفاست سے پردہ ڈال سکتا ہے؟ اتنی بڑی کوتاہی کے باوجود اسے اس قدر جی جان سے قبول کر سکتا ہے؟ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے اللہ میاں بھی اپنی مخلوق کو اسی لیے موت کے پردے میں چھپا لیتا ہے تاکہ ابلیس اس کی مخلوق کی کوتاہیوں کا مذاق نہ اڑائے۔

اپنی ساس کے سامنے مجھے اپنا وجود ایک چور کا سا لگتا تھا۔ اس گھر کی ساری آسائشیں، سارے آرام، چاؤ، چونچلے بیکار گئے۔ میں گڈو کے لیے اپنے دل میں جگہ نہ بنا سکی۔ میں کوشش کرتی تھی، عزم کرتی تھی، لیکن جہاں سلائی کی ضرورت ہو وہاں ٹانکے پن سے کام نہیں چلتا۔ جہاں تن من دھن سے تپسیا کی ضرورت ہو وہاں وقتاً فوقتاً کی چوما چاٹی سے گزر اوقات نہیں ہو سکتی۔

خدا جانے یہ گڈو کے باعث ہوا؟

خدا خبر ماں کی موت کے بعد میرا دل خالی پنجرے کی طرح ہو گیا تھا۔

یا اللہ کی مرضی تھی۔

زندگی بھی سیدھا راستہ نہیں پکڑتی۔ اسے تنگ پگڈنڈی' بنجر راستے' پتھریلے کنکریالے مقامات سے گزرنے کا بہت شوق ہے۔ مرغزاروں میں چلنے والے جان بوجھ کر کانٹوں سے الجھتے ہیں۔ امیروں کی زندگی میں ہمیشہ ڈاکٹر' دکھ اور بڑے بڑے ناسور ہوتے ہیں۔

یہ دوسری بار تھی!

جب میرا بایاں پاؤں آخری سیڑھی پر اور میرا دایاں پیر سنگ مرمر کے خوبصورت فرش سے چھ انچ اونچا تھا' میری ساس نے پیچھے سے میرے بال پکڑ لیے۔ جو انسان گناہ کے احساس سے میری طرح بوجھل ہو وہ تو اپنے پاؤں پر مشکل سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ اسے گرانے کے لیے مار پیٹ دھول دھپے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

"بول' یہ آدھی رات کو تو کدھر سے آ رہی ہے؟۔۔ بول حرام زادی!"

میرا سر چکنے فرش سے گالف کی گیند کی طرح ٹکرایا۔

"اوپر نہ کمرہ' نہ پاخانہ۔۔ صرف برساتی میں اتنی رات گئے تو کیا کرنے گئی تھی؟ نامراد بول!

میرا دل و دماغ' روح' خصلت سب پتھر کے ہو چکے تھے۔

"بول کون تھا وہ؟ کون ہے ہماری عزت کے ساتھ کھیلنے والا۔۔؟"

میری ساس تیسری منزل کو جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھی زار زار رو رہی تھی اور اوپر برساتی میں کمبل اوڑھے' دسمبر کی سردیوں میں میرا سسر ٹھٹھر رہا تھا۔ میں اپنی ساس کو کیا بتاتی کہ میں اس کی عزت کے ساتھ کھیلنے والی نہیں ہوں۔ میں تو اس کی عزت بنانے والی ہوں۔ لیکن کچھ باتیں جب ہونٹوں پر آتی ہیں تو عجب قسم کا جھوٹ لگتی ہیں۔

"کون تھا اوپر؟ کون ہے ہمارے گھر میں سیندھ لگانے والا؟ مردار' حرام خور' احسان فراموش' کچھ تو بول!"

میں ٹھنڈے فرش پر چت لیٹی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اپنی ساس کو کیا بتاؤں۔ کہاں سے شروع کروں اور کہاں جا کر ختم کروں؟ کیا وہ اتنی ساری الجھاؤ کی باتیں سمجھ بھی سکے گی؟

"سن ہاجرہ! یا تو تو اس کا نام بتا دے سیدھے سبھاؤ یا پھر میں تجھے کھڑے کھڑے طلاق دلا دوں گی۔"

مجھے اپنی ساس سے پیار ہو گیا تھا۔ میں اسے سیدھے سبھاؤ کیسے کسی کا نام بتا سکتی تھی؟

"ہاجرہ! میں نے تیری کیسی کچھ خدمت نہیں کی اور اس کا تو نے یہ بدلہ دیا کلموہی۔۔؟ بول' بتا اس کا نام' دیکھ میں نے آج تک کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا لیکن۔۔ لیکن بول ہاجرہ' بتا تو کون تھا اوپر۔۔؟"

میں اپنی ساس کو کیا بتاتی کہ میں نے بھی اس کی خدمتوں کے بدلے میں اتنی بڑی گناہ کی گانٹھ سر پر اٹھائی تھی۔ گانٹھ بازار کی ان گانٹھوں سے مشابہہ تھی جن سے پرانے بوہار استعمال شدہ صاحبوں کے کپڑے نکالا کرتے ہیں۔

شروع سردیاں تھیں۔ جب ایک روز میرا سسر میرے پاس آیا۔ اس روز گھر کے تمام لوگ گڈو کو لے کر ایک مزار پر دیگ چڑھانے گئے ہوئے تھے۔ مجھے بخار تھا اس لیے میں ان کے ساتھ نہ جا سکی تھی۔ میرے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی' جیسے کوئی چڑیا آ کر بار بار راستہ تلاش کرنے میں ٹکرا رہی ہو۔

بڑی دیر بعد ایک مری سی آواز آئی "ہاجرہ۔۔!"

میں نے دروازہ کھولا تو میرا سسر کھڑا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے اب۔۔؟"

"ٹھیک ہے جی۔۔"

جب میں لوٹنے لگی تو اس نے میری کلائی پکڑ کر بڑی نرماہٹ سے کہا "ڈاکٹر صاحب آئے تھے؟۔۔"

"آئیے تھے جی۔۔"

بڑی دیر تک وہ میرے پلنگ کے پاس صوفے میں بیٹھ کر دوائیوں کے پمفلٹ پڑھتا رہا۔ شاید وہ اپنے اندر کس مضمون تیار کر رہا تھا۔ جب میں نے تھک کر اس کی طرف پشت کر لی تو وہ کھنکار کر بولا۔

"تم سے ایک بات کرنی ہے ہاجرہ! پتا نہیں تم میری بات کو کس روشنی میں سمجھو۔۔؟"

"جی فرمایئے۔۔"

"گدو میرا اکلوتا بیٹا ہے اور میری ساری جائیداد اس کے نام ہے۔۔"

"اللہ نے چاہا تو گدو صاحب ٹھیک ہو جائیں گے جی۔۔ امی جی ترت مراد کے دیگ چڑھانے گئی ہیں۔"

"ٹھیک اس نے کیا ہونا ہے' امریکہ تو میں پھر آیا۔۔ ایک صورت ہے۔۔"

وہ کون سی صورت تھی؟ اس کے انتظار میں میں کتنی دیر ان کی طرف دیکھتی رہی۔

پھر یک دم میرے سسر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے' قطرہ' قطرہ۔۔

"گدو کے اگر بچہ ہو جائے تو میری عزت بچ سکتی ہے۔۔ اس گھر کا بوٹا ضرور لگنا چاہئے؟"

مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس گھر کو بوٹا کیوں لگنا چاہئے اور بوٹا لگنے سے کسی کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن مجھے اپنے بوڑھے سسر پر ترس آ رہا تھا۔

"مجھے بچا لو' میرے گھر کی خوشی کو بچا لو۔۔ اس گھر کی عزت' خوشی' نام سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے ہاجرہ!۔۔"

میری ساس تیسری منزل کو جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھی احسانات کی وہ فہرست گنوا رہی تھی جو اس تھوڑے سے عرصے میں اس نے مجھ پر کیے تھے۔ بازے کی شاپنگ' ہوٹلوں کے ڈنر' فلموں کے نام بار بار اس کے ہونٹوں پر آ رہے تھے۔ دور کہیں ایک مرغ۔ صبح خیز باریک سی آواز میں اذان دے رہا تھا۔ مجھے اپنی ساس کا وجود نیا کھائی گیند کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی اپنے دیوانے بیٹے کے عشق سے ٹکرا ٹکرا کر زخمی ہو چکی تھی۔ اس وقت پتا نہیں کیوں مجھے اپنی ماں بہت یاد آ رہی تھی!

"بول ہاجرہ! بتا دے خدا کے لیے۔۔ کون تھا وہ۔۔؟ ایک بار اس کا نام بتا دے۔ میں اس کا لہو چوس لوں گی۔ میرے گدو کی خوشیوں پر ڈاکہ ڈالنے والا مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔۔"

میں اپنی ساس کو کیا بتاتی کہ مجھے بھی گرز گاؤ سر زیر نہ کر سکتا تھا۔ مجھ پر ڈاکہ ڈالنے والے نے ابریشمی کمند کو استعمال کیا تھا۔ میں اپنی ساس کو سمجھا نہیں سکتی تھی کہ جو رشتہ عزت بچانے سے شروع ہوا تھا وہ حمل ٹھہر جانے کے بہت بعد تک کیوں جاری رہا؟ کئی باتیں تاریخ کے واقعات کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کی کئی تاویلیں کئی تھیوریاں تو ہو سکتی ہیں' لیکن سچائی اور اصلیت تک پہنچنا قریب قریب ناممکن ہے۔

"بتا ہاجرہ میں آخری بار پوچھ رہی ہوں' آخری بار بتا ہماری خوشیوں سے کھیلنے والا کون ہے۔"

میری ساس بیچاری' ماںمتا کی ماری ہوئی کیسے سمجھ پاتی کہ جب سے دنیا بنی ہے' ایک ہی کھیل انسان کا سچا اور اصلی کھیل رہا ہے۔ اگر لوگوں نے اس کھیل کے ساتھ عزت کو منسلک نہ کیا ہوتا تو بنی نوع بہتے کھیلتے بہت دور نکل جاتے۔ اب تو بندھے ٹکے اصولوں سے کوئی رتی بھر بھٹکا اور عزت کے لالے پڑ گئے۔ خدا جانے پہل کس کافر عشق نے کی۔ اور افزائش نسل کے کھیل کے ساتھ عزت کا تصور تعویذ کے طور پر باندھ دیا۔ پتہ نہیں کہ کس صدی میں کس نئی سوچ والے نے مذہب عشق اور جسمانی تعلقات کی ضرورت کو یکجا کر کے حدیث عشق تیار کی۔ اب تو عزت' اعضائے جنس اور محبت ایسے عجیب قسم کے تکون بن گئے ہیں جن کا ہر زاویہ صلیب کی طرح زاویہ قائمہ اور ہر ضلع قیامت سے بھی لمبا ہے۔

"ہاجرہ! میں آخری بار پوچھ رہی ہوں' تیرے پیٹ میں کس کا حمل ہے۔۔؟"

میرے جی میں آئی چیخ کر کہوں' آج تک کسی کو میرے حمل کی خوشی نہیں ہوئی۔ جو بھی جاننا چاہتا ہے یہی جاننا چاہتا ہے کہ حمل کس کا ہے ؟ کیا حمل بذات خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا ؟ کیا اسی حمل کی خوشی کی جا سکتی ہے جو جائز بندھے ٹکے اصولوں کے تحت ہوتا ہے ؟ اگر فطرت کا بھی منشا یہی ہوتا تو عورت کو اپنی ناجائز اولاد سے کبھی پیار نہ ہوتا!

"بول ہاجرہ! کون ہے وہ ۔۔ ؟ اگر تو بتا دے گی تو قسم خدا کی میں حرام کی اولاد کو بھی اپنی کہوں گی' پر اگر تو نے نہ بتایا تو ۔۔ تو تجھے طلاق دلوا دوں گی ۔۔"

میں اپنی ساس کو بتانا چاہتی تھی' لیکن مجھے اس عورت سے پیار تھا' اس کے دکھ سے گہری ہمدردی تھی۔ میں ایک ہی جملے میں اس کا دوہرا نقصان نہیں کر سکتی تھی۔

میں اپنے گھر چلی آئی ۔۔ چپ چاپ!

یہاں ہر وقت میرا ابا رہتا تھا۔ بولنے' جھڑکنے اور احسان جتانے والی ماں جانے کہاں چلی گئی تھی؟

اور آج اچانک بائیس برس گزر جانے کے بعد ۔۔۔

یہ تیسری بار تھی!

جس وقت میرا دایاں پیر سیڑھی کی آخری نیک پر تھا اور میرا بایاں پاؤں زمین سے سوا چھ انچ اونچا تھا' کسی نے پیچھے سے میرا چونڈا پکڑ لیا میرا جسم تو پہلے ہی زینہ اترنے سے ہانپ رہا تھا' اسے زمین پر گرتے دیر نہ لگی مجھے یوں لگا جیسے گرتے ہی میری کنپٹی سے ہلکی سی خون کی دھار نکلنے لگی ہے۔

"اس وقت آدھی رات کو تو کہاں سے آ رہی ہے ماں ؟ ۔۔ بول' بتا ۔۔ اور دوسری منزل میں تیرا کیا کام تھا اس وقت؟"

میں چپ رہی۔

جوان بیٹے کو میں کیا بتاتی کہ بیٹوں کو پالنے میں ماؤں کا کیا کچھ کر گزرنا پڑتا ہے۔

"میں نے ادھر ادھر سے بہت سی باتیں سن رکھی ہیں۔ تیرا کیا تعلق ہے مالک مکان سے ؟ بول ۔۔؟ شیخ صاحب سے تیرا کیا ناطہ ہے؟

میں چپ رہی۔

میں اسے کیا بتاتی کہ شیخ صاحب ہمارے محسن تھے۔ انہوں نے برسوں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ کرائے کے پیسے کبھی وصول نہیں کیے تھے اور اس کے علاوہ ہر طرح کی مدد کی تھی۔

"میں ۔۔۔ میں تجھے کیا سمجھتا تھا ماں ۔۔ میں میں سمجھتا تھا تو جنت کی حور ہے' فرشتہ ہے' میں سمجھتا تھا کہ ۔۔ کہ کیا ہوا میرا باپ دیوانہ تھا' میری ماں تو ۔۔"

جوان آدمی کے آنسو بے دریغ اس کی آنکھوں سے برس رہے تھے۔ وہ بچپن سے آج تک کی ساری محرومیاں گنوا رہا تھا۔ باپ کے گھر سے ٹوٹی ہوئی ہر آس اسے ڈس رہی تھی۔ وہ اپنے آپ سے جھگڑ رہا تھا' دنیا سے جھگڑ رہا تھا۔

"بول کون تھا اوپر ۔۔ بول ماں شیخ صاحب سے تیرا کیا ناطہ ہے ۔۔؟"

پہلی بار میری زبان کھلی۔ چپ کے مہیب دہانے سے آواز آئی ۔۔

"میرا کسی سے کبھی بھی کوئی ناطہ نہیں رہا بیٹا!"

میرا کسی سے بھی کوئی ناطہ نہیں رہا ۔۔

انور سجاد

نام : سید انور سجاد علی۔
قلمی نام : انور سجاد / ڈاکٹر انور سجاد۔
پیدائش : ۲۷، نومبر ۱۹۳۴ء بہ مقام چونا منڈی، لاہور، مغربی پنجاب۔ (۱)
تعلیم : ایم بی بی ایس (پنجاب) ڈی۔ ٹی۔ ایم اینڈ ایچ (انگلینڈ)

مشن ہائی سکول رنگ محل، لاہور میں پانچویں جماعت تک تعلیم پائی۔ چھٹی سے میٹرک تک سنٹرل ماڈل سکول، لاہور میں رہے، میٹرک ۱۹۴۹ء میں کیا۔ ایف۔ ایس سی کرنے کے لئے میڈیکل کے مضامین کے ساتھ گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخلہ لیا اور چھوڑ دیا۔ ۱۹۵۱ء میں انہیں مضامین کے ساتھ ایف۔ سی کالج، لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۳ء میں ایف۔ ایس سی تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ ایف۔ سی کالج، لاہور میں دو برس تک بی۔ اے کے طالب علم رہے لیکن امتحان نہیں دیا۔ ۱۹۵۵ء میں باٹنی اور زوالوجی کے ساتھ ایف۔ سی کالج، لاہور سے بی۔ ایس سی کرنے کے بعد ڈاؤ میڈیکل کالج، کراچی میں داخلہ لیا جہاں سے چھ ماہ بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور منتقل ہو گئے۔ فرسٹ پروفیشنل کا فائنل اسی کالج سے پاس کیا۔ ایم بی بی ایس کرنے میں پانچ کی بجائے پونے چھ سال لگ گئے۔ فزیالوجی کے پرچے میں فیل ہو کر سپلمنٹری امتحان کے ذریعہ ۱۹۶۱ء میں ایم بی بی ایس کیا۔ بعد ازاں لیورپول اسکول آف ٹراپیکل میڈیسن انگلینڈ سے ۱۹۶۶ء میں ڈی۔ ٹی۔ ایم اینڈ ایچ کیا۔

مختصر حالات زندگی:

انور سجاد کے والد مسلک کے لحاظ سے صوفی اور پیشہ کے اعتبار سے ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے۔ والدہ میر سردار حسین رئیس لاہور کی بھتیجی اور روشن خیال خاتون تھیں۔ ان کا گھرانہ والد کی طرف سے لوئر مڈل کلاس اور والدہ کی طرف سے اپر کلاس کا ملغوبہ رہا۔ والد نے ۲۷-۱۹۲۶ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں اپنے گھر کے قریب چونا منڈی میں پرائیویٹ کلینک شروع کیا تھا، سوشل ریفارمر تھے۔ لاہور میں تبیہ کالج کے قیام میں ان کی کوششوں کو دخل تھا۔ لاہور کارپوریشن کی ہیلتھ کمیٹی کے ممبر رہے۔

انور سجاد کا بچپن اور لڑکپن چونا منڈی کی لائبریریوں میں چھپ چھپ کر قصے کہانیاں پڑھتے، کتے پالنے اور مسجد میں اذانیں دینے میں گزرا۔ فارن سروس اور ائر فورس میں جانے کا شوق تھا جو قد اور وزن کم ہونے کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ پہلا افسانہ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگی تو انور سجاد آزاد خیال مصنفین کی انجمن کے شریک معتمد ہو گئے۔ آرٹس کونسل میں جانا آنا ہوا تو ۱۹۵۵ء میں تھیٹر میں اداکاری کا شوق چرایا ۱۹۶۲ء سے ریڈیو پر صداکاری کی، ڈرامے لکھے اور مصوری میں نام کمایا۔ ۱۹۶۱ء میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میو ہسپتال کے ویسٹ میڈیکل وارڈ میں ہاؤس جاب کیا تھا، لگ بھگ ۱۹۶۳ء میں اپنے والد کے کلینک پر آ گئے۔ ریڈیو اور اسٹیج کے لیے ۱۹۵۸ء سے لکھ رہے ہیں۔ ۱۹۶۵ء سے ٹیلی ویژن کے لیے لکھنا شروع کیا، تین فیچر فلموں کے سکرین پلے لکھے۔ بطور مصور ۱۹۵۵ء میں پہلی اجتماعی نمائش میں حصہ لیا۔ ۱۹۵۷ء میں پاکستان آرٹس کونسل، لاہور میں "ٹو مین شو"، ۱۹۶۷ء میں "ون مین شو" اور ۷۱-۱۹۷۰ء میں آخری بار اجتماعی نمائش میں حصہ لیا۔ پاکستان آرٹسٹس ایکوئٹی لاہور (قیام ۱۹۷۲ء) کے بانی رکن اور ۷۳-۱۹۷۲ء میں ایکوئٹی کے صدر رہے ۷۱-۱۹۷۰ء میں حلقہ ارباب ذوق، لاہور

(مرکزی شاخ) کے سیکرٹری اور اگست ۱۹۷۳ء تا اپریل ۱۹۷۵ء چیئرمین پاکستان آرٹس کونسل، لاہور رہے۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں حکومت پاکستان کے کلچرل ونگ کی طرف سے "تھری مین" ثقافتی طائفہ کے ساتھ جرمنی کا دورہ کیا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"ہوا کے دوش پر": مطبوعہ: "نقوش" لاہور: ۱۹۵۳ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	"رگ سنگ" (ناولٹ)	گوشہ ادب، لاہور:	طبع اول: ۱۹۵۶ء
۲۔	"چوراہا" (افسانے)	نئی مطبوعات، لاہور:	طبع اول: ۱۹۶۳ء
۳۔	"استعارے" (افسانے)	اظہار سنز، لاہور:	طبع اول: ۱۹۷۰ء
۴۔	"خوشبوں کا باغ" (ناول)	قوسین، لاہور:	طبع اول: ۱۹۸۱ء
۵۔	"آج" (افسانے)	مکتبہ عالیہ، لاہور:	طبع اول: ۱۹۸۳ء
۶۔	"نیلی نوٹ بک" (از عمانوئیل کزا کیویچ کا ترجمہ) ناولٹ۔	مکتبہ دانیال، کراچی:	طبع اول: ۱۹۸۳ء

لینن کی ڈائری / زندگی سے متعلق روسی ناولٹ کا یہ تیسرا ترجمہ ہے۔ پہلی بار اس کتاب کو "ڈائری کا راز" کے عنوان سے رئیس احمد جعفری نے آئینہ ادب، لکھنؤ کے لیے ۱۸۴ صفحات میں کیا۔ دوسری بار "نیلی نوٹ بک" کے عنوان سے ایک ترجمہ آزاد کتاب گھر، دہلی نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا تھا۔

۷۔	"جنم روپ" (ناول)	قوسین، لاہور	

غیر مدون:

متعدد تنقیدی مضامین، ڈرامے اور چند افسانے۔

اعزاز:

۱۔ پرائڈ آف پرفارمنس

مستقل پتا:

ای ۵۴۔ اگلی نمبر ۳۱، گلبرگ III، لاہور۔

نظریہ فن:

"موضوع اور ہیئت کے درمیان اس جدلیاتی توازن کا حصول، جو کسی بھی فن پارے کو دوام بخشتا ہے۔"

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۳۱، اکتوبر ۱۹۸۷ء)

(۱) میٹرک کی سند پر تاریخ پیدائش ۲۷ مئی ۱۹۳۵ء درج ہے۔

گائے

ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ اب گائے کو بوچڑ خانے میں دے ہی دیا جائے۔
اب اس کا دھیلا نہیں ملنا۔
ان میں سے ایک نے کہا تھا۔
ان مٹھی بھر ہڈیوں کو کون خریدے گا۔
لیکن بابا مجھے اب بھی یقین ہے۔ اگر اس کا علاج باقاعدگی سے۔
چپ رہو جی۔ بڑے آئے عقل والے۔
نکا چپ کر کے ایک طرف ہو گیا تھا اور بابا اپنی داڑھی میں عقل کو کریدتا ہوا اس کے بڑوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔
میں جب زبان ہلاتا ہوں تو یہ بوچڑ بن جاتے ہیں۔ جس روز سے میں نے انہی کو پہچانا ہے 'اسی روز سے چتکبری کو بھی جانا ہے اور جس دن سے یہ لوگ اسے بوچڑ خانے لے جانے کی سوچ رہے ہیں اس دن سے میں ہر لحہ یتیم ہوتا ہوں۔ میں 'کیا کروں یہ سب مجھ پر ہنستے ہیں کہ میں اس کی اتنی خدمت کیوں کرتا ہوں ان ہڈیوں سے اتنا پیار کیوں کرتا ہوں 'کیوں کرتا ہوں۔
آپ اسے بوچڑ خانے کے بجائے ہسپتال کیوں نہیں بھیج دیتے۔
نکے سے رہا نہیں جاتا تھا۔
تم نہیں سمجھتے یہ ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاج پر پیسہ خواہ مخواہ کیوں برباد کیا جائے۔
میں نا سمجھ ہوں ابھی تو کل ہی ماں نے دھاگے میں پندرھویں گرہ لگائی ہے۔
آپ علاج کرا کے دیکھیں تو سہی۔
بڑوں کی باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔
میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ سب کو بوچڑ خانے دے آؤں۔
پھر سب نے مل کر گائے کی زنجیر پکڑی تھی۔ لیکن جیسے گائے کو بھی سب کچھ معلوم تھا وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔ انہوں نے مار مار کے اس کا بھرکس نکال دیا تھا۔ نکا ایک طرف کھڑا پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
شاباش چتکبری میری گائے میری گؤ ماتا 'ہلنا نہیں تم نہیں جانتیں یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ جانا نہیں ہلنا نہیں ورنہ 'ورنہ نہیں تو۔
گائے اپنی جگہ پر اڑی 'مڑ مڑ کے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ ذرا ہٹ کر گائے کا بچھڑا کھونٹے کے ساتھ رسی سے بندھا بے تعلق بیٹھا تھا۔ ہڈیوں پر لاٹھیوں کی بوچھاڑ اسے نہیں سنائی دیتی تھی۔ نکے کے کان بھی بند ہو رہے تھے 'رفتہ رفتہ۔
سارے بزرگ ہانپتے ہوئے پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر فیصلہ ہوا تھا کہ اگر یہ اب چل بھی پڑے تو ممکن ہے راستے میں کھبا ہو جائے۔

اس لئے بہتر یہی ہے کہ اسے ٹرک میں ڈال کر لے جایا جائے۔ ٹرک میں تو اسے اٹھا کر بھی لادا جا سکتا ہے۔
اگلے روز ٹرک بھی آگیا تھا۔
ٹرک کی آواز پر گائے نے مڑ کے دیکھا تھا۔ آنکھیں جھپکی تھیں اور کھولی میں منہ ڈال دیا تھا جہاں نکا چارہ ڈال کے ابھی ابھی ٹرک کو دیکھنے گیا تھا۔
آپ لوگ اسے واقعی۔
اسے یقین نہیں آتا تھا۔
نہیں تو ہم مذاق کر رہے ہیں کیا؟
ایک نے کہا تھا۔
بابا' یہ گائے مجھے دے دو' میں اسے۔
حکیم کی اولاد۔
دوسرے نے کہا تھا۔
بابا اس کے بغیر میں۔
مجنوں کا بچہ۔
تیسرے نے کہا تھا۔
چوتھا' پانچواں سارے بزرگ' سارے بزرگ سالے ایک سے ہیں اور بابا جو اپنی داڑھی کو عقل کا گڑھ سمجھتا ہے' جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔
بیٹے ٹرک والے کو دس روپے دے کر بھی ہم بہت فائدے میں رہیں گے۔
او۔ کمبخت سوداگر مجھ سے لو روپے' مجھ سے یہ لو لیکن میری مٹھی میں اس وقت تو ہوا ہے جب' جب میں بڑا ہو جاؤں گا۔
ہاہاہا۔
جب' جب میں کمانے لگوں گا۔
ہاہاہا۔
تب' تب تک تو پنکبری کی ہڈیوں کا سرمہ بن گیا ہو گا۔ میں' میں کیا کروں۔
ان میں سے ایک' گائے کو لانے کے لئے کھرلی کی طرف گیا تھا۔ نکا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ یونہی دیکھنے کے لئے۔ بڑے نے اس کی زنجیر کھرلی تھی۔ گائے نے کھولی میں منہ مار کے دانتوں میں تنکے دبائے تھے "مڑ کے نکے کو دیکھا تھا اور جانے کے لئے کھر اٹھایا تھا۔
نہ' نہ' نہ۔
نکا چیخا تھا۔
بکو مت۔
گائے کھڑی ہو گئی تھی۔
ہے۔ ہے۔ ہے
بڑے نے زور لگایا تھا۔
نہ پنکبریے۔ نہ' نہ

چپ بھی کرو گے یا کھینچوں تمہاری زبان۔

گکے نے زبان کو قید کر دیا تھا۔ بڑے نے پھر زنجیر کو جھٹکا دیا تھا۔

چلو میم صاحب! ٹرک والا تمہارے باپ کا نوکر نہیں جو سارا دن کھڑا رہے۔

گائے کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ زبان' قید میں پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔ لیکن وہ مشت استخواں وہیں کی وہیں تھی۔ نکا مسکرایا' پھر فوراً اداس ہو گیا تھا۔

یہ تو بک بھی چکی ہے' اسے جانا ہی ہو گا۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر تھوڑی سے رقم لگا کے اس کا علاج باقاعدگی سے کیا جائے تو تو لیکن میں ان بزرگوں کا کیا کروں کاش میں حکیم ہی ہوتا۔ اس کچھڑے کو شرم نہیں آتی ماں کے جسم پر نیل پڑ رہے ہیں اور یہ باہر کھڑا الو کے پٹھوں کی طرح دیکھے جا رہا ہے۔

زبان پھڑ پھڑا کے رہ گئی تھی۔

پھر ان میں سے ایک کو بڑی اچھی سوجھی تھی۔ اس نے گائے کی دم پکڑ کر اسے تین چار بل دیئے تھے۔ وہ پیٹھ کے درد سے دور بھاگی تھی۔ اس نے گکے کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا تھا۔ پیٹھ کا درد گائے کو ہانکتا ہوا بالکل ٹرک کے پاس لے آیا تھا۔ گکے کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

در فٹے منہ' لعنت لکھ لعنت۔

ٹرک والے نے گائے کے چڑھنے کے لئے ٹرک سے زمین پر تختہ لگا دیا تھا۔ گائے نے تختے پر کھر رکھا۔

نہ چڑھنا۔

اس کی زبان کاٹ لو۔ یہ گائے کو ورغلاتا ہے۔

ڈراتا ہے۔

نکا پھر منہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گائے نے تختے کو دیکھا' پھر گکے کی طرف۔

در فٹے منہ' لعنت لکھ لعنت۔

گکے کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں' کیا کر سکتا ہوں۔

وہ ابھی تک نہیں ڈری تھی۔ پھر اس نے مشکوک نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر بڑے زور سے پھنکار ماری تھی۔

میری پنکھری جانتی ہے' جانتی ہے کہ وہ تختے پر قدم رکھ کر ٹرک میں چلی جائے گی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی کیوں' کیوں وہ چڑھنا نہیں چاہتی۔

ان سب نے مل کر اس کی پیٹھ پر لاٹھیاں برسائی تھیں' گائے کی ٹانگیں تھرکی تھیں لیکن وہ اپنی جگہ سے قطعی نہیں ہلی تھی۔ جب انہوں نے مل کر دوسرا وار کیا تو وہ تکلیف سے دور بھاگنے کو تھی کہ بابا کی داڑھی میں عقل نے جوش مارا تھا اور اس نے جما کر اس کے منہ پر لاٹھی ماری تھی۔ گائے پھر تختے کی طرف منہ کر کے سیدھی ہو گئی تھی۔ بابا نے ہانپتے ہوئے کہا تھا۔

آؤ پانچ۔

اور ان سب نے مل کر پھر لاٹھیوں کا مینہ برسایا تھا۔

نکا دور کھڑا تھا۔ بالکل بے تعلق' بے حس۔

یوں بات نہیں بنے گی۔

ایک نے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔

تو پھر؟

وہ ٹرک کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ جانے گائے کو کیا سوجھی تھی' پلٹ کر یکدم بھاگ اٹھی تھی اور دھول اڑاتی ٹکے کے قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گزر گئی تھی۔

ٹکا۔ جسم کا مفلوج حصہ۔

دیکھو' دیکھو' وہ تو بائیں طرف۔

ایک چونکا تھا۔

قدرتی بات ہے۔

بابا نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

گائے اپنے بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ بابا کی آنکھیں مکار سی مسکراہٹ سے چمک اٹھیں۔

اس بچھڑے کو یہاں لے آؤ۔۔ یہ چال تو ہمیں کل ہی چل جانی چاہئے تھی۔ ٹرک کے پیسے بھی بچ جاتے۔

ٹکا۔۔۔ مفلوج وجود۔

ان میں سے ایک نے بچھڑے کی رسی پکڑی تھی۔ ٹکے کی زبان لرزی تھی۔ گائے کچھ سوچتی' قدم اٹھاتی' رکتی چلتی' بچھڑے کے پیچھے پیچھے اس کے قریب سے گزری تھی تو آہستہ آہستہ سے ٹکے کی زبان سے گالی پھسلی تھی۔ بچھڑا' تختے پر چڑھ کے پنوسیاں مارتا ہوا ٹرک میں چلا گیا تھا۔ گائے تختے کے پاس جاکے پھر رکی تھی۔ بڑی حیرانی سے بچھڑے کو دیکھ کر آہستہ آہستہ گردن موڑ کے ٹکے کو دیکھا تھا۔ ایک نے فوراً بغل سے پتوں کا گٹھا نکال کر گائے کے آگے کر دیا تھا۔ اس نے چند ڈنٹھل دانتوں میں لے لئے اور پھر کچھ سوچ کر زمین پر گرا دیئے تھے اور اگلا کھر تختے پر رکھ دیا تھا' پھر دوسرا کھر۔

خدا معلوم ٹکے کو کیا ہوا تھا۔ یک دم اس کے سارے جسم میں تازہ تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آگیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے اور دماغ بے طرح بجنے لگا تھا۔ وہ بھاگا بھاگا گھر میں گیا تھا اور بابا کی دو نالی بندوق اتار کے اس میں کارتوس بھرے تھے۔ اس جنون میں بھاگتا ہوا باہر آ گیا تھا اور کاندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ باندھا تھا۔

اس نے کھلی آنکھ سے دیکھا۔ بچھڑا ٹرک سے باہر گائے کے گرائے ہوئے پتوں میں منہ مار رہا تھا۔ ٹرک میں بندھی گائے' باہر منہ نکال کر بچھڑے کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک گائے کو لے جانے کے لئے ٹرک میں بیٹھا تھا اور بابا ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی میں عقل کو سلاتا ہوا باہر کھڑے ڈرائیور سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا۔ ٹکے نے کسے نشانہ بنایا۔ گائے کو' بچھڑے کو' ڈرائیور کو' بابا کو' اپنے آپ کو' یا وہ ابھی تک نشانہ باندھے کھڑا ہے۔

کوئی وہاں جا کے دیکھے اور آ کے مجھے بتائے کہ پھر کیا ہوا۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ۔

خان فضل الرحمٰن

نام : فضل الرحمٰن
قلمی نام : خان فضل الرحمٰن
پیدائش : ۱۹۱۳ء بہ مقام رائے ضلع سہارن پور (یو۔ پی) بھارت
تعلیم : ایم۔ اے۔ ایل ایل بی لکھنؤ یونیورسٹی: ۱۹۳۸ء

چوتھی جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں مسلم ہائی اسکول 'انبالہ سے میٹرک کیا۔ ایف۔ اے (۱۹۳۴ء) اور بی۔ اے (۱۹۳۶ء) کے امتحانات گورنمنٹ کالج' لاہور سے پاس کیے۔ ایم۔ اے اور ایل ایل بی کے امتحانات لکھنؤ یونیورسٹی 'لکھنؤ سے ۱۹۳۸ء میں پاس کیے۔

مختصر حالات زندگی:

دہالہ کے ذیلی پہاڑ شوالک کے دامن میں خان فضل حق کے ہاں پیدا ہوئے۔ خاں صاحب کا تعلق انتہائی متمول گھرانے سے ہے۔ بچپن اور لڑکپن نہر جمن کے کنارے شوالک پہاڑ کے دامن میں رئیسانہ ٹھاٹ کے ساتھ گزرا۔ اکثر اپنا سفری تھیلا اٹھائے دیرہ دون سے سرینگر تک نکل جاتے۔ آبشاروں اور سبزہ زاروں سے پٹے پڑے اس ماحول نے انگریزی اور اردو میں شاعری اور افسانہ نگاری پر اکسایا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور شہر کو اپنا مستقل گھر بنایا اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ بیشتر وقت ہائی کورٹ سے متعلق رہے لیکن عدالت میں وکالت سے زیادہ اپنے باطن کی وکالت کی۔ تاریخ اور نامور شخصیات سے دلچسپی رہی اور ڈوب کر لکھا۔ ایک زمانے سے لاہور کی ادبی محفلوں کی رنگینی ان کے دم قدم سے ہے' اتنا لکھا کہ خود انہیں یاد نہیں۔ اوائل جوانی کا بیشتر کام ضائع ہو گیا' اس کے باوجود ہزاروں صفحات کا مواد غیر مرتب غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہے۔ گزشتہ بیس پچیس برس سے گرمیاں کوہ مری گزارتے ہیں اور یہاں بھی قلم کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"کمی شکر" 'مطبوعہ : "سویرا" ۱۹۵۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ادھ کھایا امرود" (افسانے) مکتبہ میری لائبریری 'لاہور' طبع اول: ۱۹۵۶ء
اس کتاب کی اشاعت کی تھوڑی مدت بعد حکومت پاکستان نے کتاب کی اشاعت اور فروخت پر پابندی عائد کر دی۔
۲۔ "ورشن رین" (افسانے) نام مطبع و سنہ ندارد

لاہور سے یہ کتاب ۱۹۸۴ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔ سول ایجنٹ کے طور پر مکتبہ میری لائبریری' لاہور کی مہر لگی ہے۔ پرنٹ لائن نہ ہونے کا سبب خان فضل الرحمٰن کی بطور جنس نگار اچھی یا بری شہرت ہے۔ اس سے قبل خاں صاحب کے اولین افسانوی مجموعے "اوہ کھایا امرود" کی فروخت پر حکومت پاکستان نے پابندی عائد کردی تھی۔ "درشن رین" میں کل پانچ افسانے مع نقشہ جات شامل ہیں افسانوں کے عنوان یہ ہیں۔

۱۔ "درشن رین" ۲۔ "چیڑی اور دو دو" ۳۔ "اگنی" ۴۔ گوری گوری کوری کوری" ۵۔ "پیلے روڑے ڈنڈے"

اس کتاب کے کل ۲۵۵ صفحات ہیں۔

۳۔ "ترک بہادر" (تاریخی ناول) مکتبہ میری لائبریری' لاہور' طبع: اول ۱۹۸۳ء

کتاب کے کل صفحات ۱۶۸۔

۴۔ "سلک اوک ٹاؤن" (ناول) مکتبہ میری لائبریری' لاہور' طبع اول: ۱۹۸۵ء

اس ناول میں بقول مصنف ایک صالح انگریز کی ثنا خوانی کی گئی ہے اور برطانوی عہد کی برکتوں کی تعریف۔ مصنف عہد انگلیشیہ کا پرستار ہے۔

غیرمدون:

محولہ بالا مطبوعہ کتب کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب برائے طباعت تیار ہیں:

۱۔ ٹرائے کے میدان پر کھیلے جانے والے کھیل سے متعلق ناول۔
۲۔ شیلے اور ہیرٹ کی ٹریجڈی سے متعلق ناول۔
۳۔ نیپال سے متعلق ایک طویل مختصر افسانہ۔
۴۔ علامہ اقبال سے متعلق ایک کتاب۔
۵۔ مرزا غالب سے متعلق ایک ناول۔
۶۔ افغانستان کی جنگ آزادی سے متعلق ایک ناول۔
۷۔ بھارت سے مسلمانوں کی ہجرت (۱۹۴۷ء) سے متعلق دو ناول۔
۸۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ سے متعلق ایک ناول۔
۹۔ حجاز مقدس کا سفرنامہ۔
۱۰۔ "آنکھوں کا ٹکڑہ" (ناول)۔
۱۱۔ متعدد ناول اور ناولٹ بہ زبان انگریزی۔

مستقل پتا:

نابھہ روڈ' پرانی انارکلی' لاہور۔

نظریہ فن:

"کنوس بہت وسیع ہونا چاہئے ورنہ گھٹن اور تواردجیسی برائیاں پیدا ہو جائیں گی۔ افسانوں میں نئے نئے الفاظ، قدیم اردو اور متروک الفاظ کا استعمال ہونا چاہیے۔ ماحول کی نقشہ کشی لازم ہے۔ اگر ہو سکے تو نقشے اور تصاویر بھی ہونا چاہیں۔"

(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

○

خان فضل الرحمٰن

پشچنجلی

پشچنجلی آئی تو تھی موضع بن کلہ میں شہر کا غم غلط کرنے، پر یہاں تو اسے ڈیکئے کے لڑکے راموں نے اور کلپا دیا تھا۔ وہ اپنے میزبان اور تایا میجر آمبر سنگھ کے ساتھ شام سے اس باغ میں ٹہل رہی تھی جو پہاڑیوں کے پاس کھیر کا جنگل صاف کر کے لگایا گیا تھا۔ آبپاشی تو اس ترائی میں نہر سے ہوتی تھی لیکن پینے کا پانی کنوئیں سے لیتے تھے۔ تایا بھتیجی لکڑے آم کے نیچے سے گزرنے لگے تو حسنا مقدم اپنی بیٹھک میں سے اٹھ آیا تھا۔ تاکہ میجر آمبر سنگھ جائزہ لے سکیں کہ کنواں اچھی طرح صاف ہو گیا ہے یا نہیں۔

مہمان اور میزبان ابھی من پر جا کر کھڑے ہوئے تھے کہ ڈیکیا اور اس کا پسر راموں بھی آ گئے۔ کام ابھی تھوڑی دیر ہوئی ختم ہوا تھا اور یہ کپڑے پہن کر فارغ ہوئے تھے۔ راموں نے گلے میں بے آستینوں والا سینڈو فیشن اتنا چھوٹا بنیان پہنا ہوا تھا کہ اس کے پیٹ کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی دھوتی پشچنجلی کو ایسی معلوم ہوئی جیسے وہ ڈھلک کر نیچے کو گرنے والی ہو۔ اوپر تاڑ پر بہت سے ریو لئے اور جنگلی کبوتر پھر رہے تھے۔ ان کبوتروں میں سے زیادہ کا رنگ سفید تھا۔ اور یہ دور سے بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس تمام وقت پشچنجلی کا دل دھلتا رہا۔ پھر وہ آدھی شرم اور آدھے چھرے پن میں اپنے کان کی طلائی بالیاں ہاتھ سے یوں ہی سہلانے لگی۔

چرن داس جس کے لئے یہ اطالوی سینورٹیا ایسی حسین نیتو والی اور چکن ایسی ہلکی پھلکی لڑکی دل و جگر تھامے ہوئے تھی۔ ٹریننگ کے لیے نربدا، چنبل، کشنا، بھاندی، تنگا بھور اور کاویری کے دیس، جنوبی ہند چلا گیا تھا۔ پشچنجلی کی طبیعت اس کی مفارقت سے اتنی کند ہوئی تھی کہ وہ ہوائی اڈے پر اسے رخصت کر کے تین گھنٹہ کے اندر اندر شہر سے اپنے تایا کے پاس اس گاؤں میں آ گئی تھی۔ راموں کو دیکھتے ہی چرن داس اسے گرگٹ ایسا معلوم ہونے لگا۔ اس کی ٹانگیں زیادہ پتلی اور لانبی معلوم ہونے لگیں۔ اتنی وٹامن بھری خوراک کھانے کے باوجود اس کے بدن پر بوٹی نہیں چڑھی تھی۔ اور یہ اب سے چھ مہینے بعد بڑے دن کی چھٹیوں میں میاں بیوی بننے والے تھے۔

راموں واقعی راموں ہی تھا۔ یعنی ریچھ کے بچے کی طرح بھولا لیکن چکنیا۔ اسے تو گویا دیوتا گائے کا مکھن کھلاتے رہے تھے۔ اس کا پیٹ ریس کی گھوڑی کی طرح سنتا ہوا تھا۔ راموں کی آنکھیں گوشت کے سبب کچھ بند سی تھیں اور پشچنجلی کا دل چاہنے لگا کہ اس کی آنکھیں اس طرح کھول کر دیکھے جیسے چھوٹے دیہاتی بچوں کی دکھتی آنکھیں کھول کر ان میں جست بھرا کرتے ہیں۔

میجر آمبر سنگھ کنوئیں کے پانی کا جائزہ لے کر پہاڑیوں کے پاس جنگل صاف کر کے لگائے ہوئے آموں کے باغ میں پہنچے، یہاں مالدہ پک رہا تھا۔ اس کی خشبو عطر سے بھی بہتر تھی۔ پھر تایا بھتیجی ٹھیکیدار کی بڑی میں بیٹھ گئے۔ جبھی آسمان پر پھرتی پھراتی سادھو کی تنہائی لٹ ایسی بدلی سورج پر آ گئی اور اس کا سایہ کھیر کے گھنی جنگلات سے پٹی ہوئی کوہ شیوالک کی نیچی نیچی، پہاڑیوں پر چھلاوہ کی طرح پھرنے لگا۔ ادھر ہی سے ایک ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی، جیسے جنت کا دریچہ کھل گیا ہو۔ کیونکہ ان نیچی نیچی پہاڑیوں کے پار تنومند ہمالہ سے ادھر، دون میں گھنگھور ٹوٹ کر برس رہے تھے اور یہ ہوا وہیں سے آ رہی تھی۔ تایا بھتیجی لنچ کے وقت گھر پہنچے۔ دونوں نے غسل کیا اور گھریلو کپڑے پہن کر کھانے کے کمرہ میں آ گئے۔ کھانے کا کمرہ رتن سنجن کے پھولوں کی خوشبو سے بسا ہوا تھا۔ جو اصلی چائنا کے دو بڑے بڑے گلدانوں میں سجے ہوئے تھے۔

میز پر کیا کچھ نہ تھا۔ ناریل کی کھیر، بادام پستہ اور بیر کا مربہ، مرغ کا نرگسی پلاؤ، اچار ادرک، اچار گل کویل اور مالدہ کے آم وغیرہ۔

چھت کا پنکھا بند تھا۔ کیونکہ شمالی کھڑکی میں سے اب بھی دون کی بھیگی بھیگی ہوا شوالک کی نیچی نیچی پہاڑیوں کو لانگھ کر فر فر آ رہی تھی۔

کیا اچھا ماحول تھا۔ سامنے کھیر کے گھنے جنگلات سے پٹی ہوئی شوالک کی پہاڑیاں جن پر کہیں کہیں بدلی کی چھاؤں چھلاوہ کی طرح پھرتی ہوئی۔ پاس والے کمرہ سے لچ کی موسیقی' جس کی دھن نرپا بھیرے لی گئی تھی۔ دھیرے دھیرے رنجھ رنجھ کر جھیلے جھیلے کر کانوں میں جذب ہوتی ہوئی' کھانے کا کمرہ رتن منجن کے پھولوں سے بسا ہوا تھا۔ لیکن ہنچنجلی تو یہ سوچ رہی تھی کہ کاش اس وقت دہی ڈیکے کا لڑکا اسے دمکیلے رنگ والی مور چھل جھل رہا ہوتا۔ وہ اس کے ہاتھ سے دمکیلی مور چھل چھین کر کان میں کو کرتی۔ پھر وہ دونوں باغ میں چلے جاتے' اور کوئی سگری سے انہیں سلا رہا ہوتا۔

پھر اسے پرم دکھ کا احساس ہونے لگا۔ وہ ڈیکیے کے لڑکے سے کبھی کسی صورت بھی نہیں مل سکتی۔ گیہوں کی فصل کے کھیت کھڑے تھے ان کی سوچھتر دانوں والی بالیں باجرہ کی چھوٹی بالیوں جتنی تھی۔ مگر انہیں اسی سرخ کیڑے "رولی" نے چاٹ لیا تھا جو گیہوں کی کھڑی تیار فصل کو لگ جاتا ہے۔

لچ کھا کر ہنچنجلی سو گئی۔ خواب میں اسے ہزاروں چنے تھم اس طرح سے نظر آئے جیسے کھجوروں کا جنگل کھڑا ہو اور ہر ایک چنے تھم پر ہیرو کے مجسمہ کی طرح راموں کھڑا تھا۔ وہی چکنے بدن والا راموں جسے اس نے کنوئیں کی من پر دیکھا تھا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس وقت اچھا سانجھا ہو گیا تھا۔ وہ بڑی شمالی کھڑکی سے کیل کی نیچی پہاڑیوں پر بادل اور سورج کی دھوپ چھاؤں کو دیکھنے لگی۔ بادل اب بھی خوب برس رہا تھا۔ کیونکہ ٹھنڈی ہوا فراٹے بھرتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

رات کو ہنچنجلی کوٹھی کے مشرق میں اونچے چبوترے پر شیشی لگا کر لیٹی۔ نیچے مشین سے برابر کٹا ہوا سبزہ تھا۔ اور چبوترے کی زو پر سنگ مرمر کی جالی لگی ہوئی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے فوارہ تھا اور ڈھلے کے پھول پھر تیلیا ہرے بیر پتوں' اور بندھی چھتری والے بھیڑیے کھڑے تھے۔ بہت بڑی طاقت کے آسمانی قمقمہ نے جو اونچے سنہری کھمبے پر لگایا ہوا تھا۔ چبوترے کے سبز جالیوں کے سنگ مرمر اور بیڑوں کو ایسا سانا پن بخشے ہوا تھا کہ یہ مغل مصوری کی سبزی معلوم ہوتی تھی۔

گاؤں میں کھڑی تال کے چوبولے ہو رہے تھے جو ایسا دیہاتی سوانگ ہوتا ہے' جس میں بڑھئی' لوہار' جولاہے' دھنیے' نائی' دھوبی' موچی' ڈیکیے' بھنگی ایسے پیشہ ور حصہ لیتے ہیں۔ اس سوانگ کی کھڑی کھڑی دھن سے ہنچنجلی کو یہ اشتباہ ہو رہا تھا' جیسے کسی راج کماری کا سوئمبر رچایا جا رہا ہو اور ڈیکیے کا لڑکا بھی اس میں امیدوار ہو۔

ہنچنجلی اپنا رخسار تکیے پر رکھے دیر تک فوارہ کی من کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ راموں اپنے اسی حلیہ میں جس میں وہ اسے دیکھ چکی تھی اس من پر بیٹھا ہوا کیسا لگے۔ جب وہ سونے لگی تو کھڑی تال کے چوبولے اس وقت بھی ہو رہے تھے۔ اب ساز اور موسیقی کی دھنوں میں جیت کا رنگ آ گیا تھا اور ہنچنجلی گویا ہوش میں آ کر بستر پر ہوا میں معلق ہو گئی تھی۔ اسے یہ خیال آ رہا تھا۔ کہ ڈیکیے کے لڑکے نے راج کماری جیت لی ہے۔ خواب میں اسے بے تھم نظر آ رہے تھے جن پر سوئمبر کا فاتح راموں ہیرو کے مجسمہ کی طرح بیٹھا تھا۔ جب وہ اجیالا ہوئے جاگی تو چبوترہ رتن منجن کے پھولوں کی باس سے مہکا ہوا تھا۔ جو چبوترے کے نیچے اردگرد لگے ہوئے تھے اور سو یر چڑیوں نے دیز پتوں اور گچھے دار بیڑوں میں شور مچا رکھا تھا۔ سورج ابھی تک افقی بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔

پھر وہ اوپر برساتی میں جا کر دور سے گاؤں کے کنوئیں کو دیکھتی رہی۔ نیچے آ کر ناشتہ سے پہلے نہر کے پل پر گئی۔ جس کے مشرق میں موٹے کھتری کی چھوٹی چھوٹی لبے نما پہاڑیاں تھیں۔ یہاں نہر کی بلند شرقی ڈھانگ میں بے انتہا سوراخ تھے۔ جن میں گلیوں اور سرخ منقار گرسلوں نے بچے نکالے ہوئے تھے۔ ان پرندوں اور بچوں نے کافی شور مچایا ہوا تھا۔ ہنچنجلی غربی کنارہ پر کھڑی ہوئی تماشہ دیکھ رہی تھی کہ ادھری سے ایک کپاس لٹکے اور دو پیا گھانی والی سیاہ فام لڑکی' موٹے کھتری کے باغ سے نکل کر کھیر کے جنگل میں چلی گئی اور راموں بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ یہ لڑکی باوجود سیاہ فام ہونے کے بڑی ہی نرموہی تھی۔ سری گوپی ناتھ کی "گوپی" اور گوپ محل کی راج کماری۔ میجر آمبر سنگھ خود اسے چاہے پر

بلانے کے لیے پہنچ گئے۔ چائے پیتے ہوئے ہنجیلی یہی سوچتی رہی کہ تایا نہ آتے تو وہ ان دونوں گنولیوں کا جنگل میں پیچھا کرتی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ رات کے وقت والے سوئمبر میں کیوں نہ شریک ہو گئی۔ ہو سکتا تھا جو راموں بجائے اس گوپی ایسی لڑکی کے اطالوی سینو رتیا ایسی ہنجیلی کو ہی پسند کر لیتا۔

موضع بن کلہ کے ڈبکئے اچھوت نہ سہی لیکن نیچ ضرور تھے اور وہیں مولے کھتری کی لڑکی نورحا بھی تھی۔ بھنڈ ایسی کالی اور چھوٹے چہرے پر بڑی بڑی آنکھوں والی راموں اور نورحا میں ایسا گپت ملاپ تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ ان دونوں کا عجیب معاملہ تھا۔ اول اول نورحا تو راموں کی پرستار نہ تھی بلکہ راموں کا اس کے لیے برا حال تھا اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ لڑکے نے عورت پہلی مرتبہ بطور عورت کے نورحا ہی میں دیکھی تھی۔ ان کا میل اس لئے چھپا رہا تھا کہ یہ روایتی مضطرب عشاق کی طرح سے جلد جلد نہ ملتے تھے۔ پندھرواڑہ سے پہلے ان کی ملاقات بھی نہ ہوتی اور بعض دفعہ تو مہینہ مہینہ گزر جاتا۔ یہ ہمیشہ کھیر کے جنگل میں شوالک کی پہاڑیوں پر ملتے۔

مولے کھتری کی دو منزلہ حویلی موضع بن کلہ کے شمال میں گاؤں کے آخیر پر واقع تھی اس کے پاس صرف گنڈریوں کے چھپر تھے۔ پرلی طرف شمال میں چھوٹا سا کربلا کا میدان تھا' جہاں محرم کی دسویں کو تازئے رکھے جاتے۔ کربلا کے میدان کے ختم ہوتے ہی پہاڑیاں اور کھیر کا جنگل شروع ہو جاتا۔ کربلا میدان کے غرب میں مولے کھتری کا باغ تھا۔ جب نورحا راموں سے ملنا چاہتی تو باغ میں جاتی۔ ادھر ہی کھیر کے جنگل میں ڈبکئے کا لڑکا راموں بھی آ جاتا اور یہ کچھ وقت وہاں گزار لیتے۔

جن دنوں ہنجیلی گاؤں میں آئی اس سے ایک مہینہ پہلے مولے کھتری کے گھر چور گھس آئے تھے لیکن جاگر کے سبب کچھ نقصان نہیں ہوا تھا۔ مولے کھتری نے دو شیرے باغ میں پالے ہوئے تھے اور وہ اتنے خونخوار' چرچرے تھے کہ کسی کو باغ میں گھسنے کا یارا نہ تھا۔ ان کی رکھوالی انسانی رکھوالی سے بھی کڑی تھی۔ اسی لیے مولے کھتری نے باغ میں کوئی رکھوالا نہیں رکھا ہوا تھا۔ نورحا کو یہ دونوں کتے پہچانتے تھے اس لیے وہ وقت بے وقت یہاں آ جاتی اور یوں آسانی سے کھیر جنگل میں جا کر دوست سے ملنے کا کارن نکل آتا۔ چوروں کے آنے کے بعد کھتری نے دونوں شیرے حویلی پر بلا لیے اور باغ میں رکھوالا بٹھا دیا۔ اب نورحا اور راموں بن میں نہیں مل سکتے تھے اور یوں ڈبکئے کا لڑکا برہا کی آگ میں جلنے لگا۔

جب وہ ایک مہینہ تک نورحا کو نہ مل سکا تو اس کی حالت جنونی سی ہونے لگی اور ایک رات جب آسمان پر برکھا کی پہلی ہیر دیز ہو رہی تھی۔ گھنگھور جھیل میں پڑی ہوئی بادل بے شمار کالی بھینسوں کی طرح چھائے ہوئے تھے اور ٹپا ٹپکی شروع ہو گئی تھی' راموں نے اپنی دہلیز کا دروازہ کھولا۔ سامنے حسنے مقدم کی دہلیز تھی جس میں اس کا پسر واجد جاگ رہا تھا۔ اس نے پہلے راموں کی آہٹ سنی اور پھر اسے گلیارہ میں پچھم کی طرف جاتے ہوئے اچھی طرح دیکھ لیا۔

راموں جدھر سے بھی گذرتا اسے کتے بھونکتے اور یوں واجد کو یقین ہو گیا کہ اس کا پڑوسی جنگل میں نہیں بلکہ گاؤں میں کسی خاص جگہ جانے کے واسطے گھر سے نکلا ہے۔ راموں سیدھا مولے کھتری کی حویلی پر پہنچا۔ مشرق کی طرف کچی سڑک پر احاطہ کا پھاٹک تھا جس میں لوہے کی پتریاں جڑی ہوئی تھیں۔ اور ان میں سے اندر بخوبی نظر آتا تھا۔ شمال اور جنوب میں وہ دالان تھے اور جنوبی دالان نوکروں کے لیے تھا۔ وہ سو رہے تھے۔ پھاٹک کے سامنے حویلی کی اونچی ڈیوڑھی تھی۔ اور ڈیوڑھی کے اوپر کھلا چوبارہ تھا۔

راموں نے پھاٹک کے پاس کھڑے ہو کر اندر نگاہ دوڑائی۔ اس نے سوچا کہ وہ جو ایک بلی پڑی ہوئی ہے وہ اسے دیوار کے ساتھ ترچھی کھڑی کر کے اوپر چڑھے گا' پھر حویلی کے اندر اسے نورحا مل جائے گی۔ وہ لوہے کی پتریوں کے جالیدار پھاٹک سے اندر اترا ہی تھا کہ زور کی بارش شروع ہو گئی۔ وہ خوش تھا کہ ایسے میں آہٹ سنائی نہ دے گی۔ اس نے ابھی بلی کو ہاتھ ہی لگائے تھے کہ پہلے تو شیروں کا جوڑا بھاری آواز سے بھونکا اور پھر وہ دونوں اونچی چھت سے نیچے کود پڑے۔ جو ان کتوں کی ٹانگیں زخمی نہ ہو گئی ہوتیں' تو یہ حد شکن کو ضرور جھنجھوڑ ڈالتے۔ بارے اس وقفہ میں کہ نوکر جاگتے راموں پھاٹک پار کر چکا تھا۔ مولے کھتری کے گھر تو سبھی یہ سمجھ رہے تھے چوروں نے دوبارہ پاؤں پسارا تھا لیکن

جب راموں گھر پہنچا تو واجد نے اسے آواز دی 'ابے جیسا گیا تھا ویسا ہی خالی ہاتھ آ رہا ہے۔ کیوں بے؟ ماں سے جا کے کہیے ٹنڑ کھول گھلو دے۔ راموں نے کچھ بھی جواب نہ دیا۔ بارش کا زور اب ٹوٹ چکا تھا اور صرف ٹپکا ٹپکی ہو رہی تھی اس کے کپڑے بالکل بھیگ گئے تھے۔

اگلے دن تمام گاؤں میں گویا دھموکے بج گئے تھے کہ موٹے کھتری کے گھر رات پھر چور پڑے۔ اور شیروں کا جوڑا کوٹھے سے کود کر ان پر حملہ آور ہوا تھا۔ یہ کتے بری طرح زخمی ہوئے پڑے ہیں۔ اب حسنے مقدم کا واجد بار بار راموں سے جا جا کر پوچھ رہا تھا "ابے چوری کرنے گیا تھا یا یاری" لیکن یہ صرف فضول تھا کیونکہ یہ کسی کے خیال میں ہی نہیں آ سکتا تھا کہ راموں چور ہے۔ پر اس نے جو یہ گھنی سادھ رکھی تھی۔ اس سے وہ مشکوک ہو گیا تھا۔

شام کے وقت حسنا مقدم "ہشپ وائیکا" میں آیا اور رازدارانہ طور پر بولا۔ "میجر صاحب دنیا کا کوئی ٹھکانا نہیں رات کو جب کھتریوں کے چور پڑ رہے تھے ڈیکٹے کا لڑکا راموں اپنے گھر سے آدھی پچھلی رات ادھر بھی آیا ہوا تھا۔ یہ سن کر بھتیجی کو یقین کامل ہو گیا کہ اس دن صبح کو موٹے کھتری کی لڑکی ہی راموں کے ساتھ بن میں گئی تھی اور آج رات کھتری کے گھر میں چور نہیں تھا 'یار تھا۔ سارے گاؤں میں صرف یہ لڑکی راز جان گئی تھی۔

بھتیجی کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر برساتی میں جا بیٹھی۔ اس نے بار بار اس کنوئیں کی طرف دیکھا جس کی من پر راموں کو دیکھ کر اسے دل بستگی پیدا ہوئی تھی۔ آسمان نیلا کانچ ہو رہا تھا لیکن کھیر پہاڑیوں پر سفید بادلوں کے کئی پھول گوبھی ایسے ٹکڑے ٹھہرے ہوئے تھے۔ پھر دن کی طرف سے گڑگڑاتی ہوئی کالی گھٹا آ گئی۔ جس میں گوبھی کے پھول ایسے ٹکڑے اس طرح گم ہو گئے جیسے بادبانی کشتیاں سمندر کی طوفانی موجوں میں کھو جائیں۔

بارش دن چھپنے تک برستی رہی لیکن مغرب میں تھوڑے سے بادل پھٹے ہوئے تھے 'جہاں ڈوبتے سورج نے آگ سی لگائی ہوئی تھی۔ پھر جب اندھیرا چھانے لگا تو سب سے پہلے بیٹروں پر چھایا' جو رات کے نقیب بن گئے اور بھتیجی نے شیشے کے طاقوں میں لگے ہوئے رنگین قمقمے روشن کر دیے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اور اس میں یہ برساتی گھر ہائے شب چراغ کا تاج بنی ہوئی تھی یا پریوں کا اتارا۔

جب تایا بھتیجی رات کے کھانے پر بیٹھے تو قلمی آموں کے ساتھ سفید برفانی شہد تھا 'میٹھے زعفرانی پلاڑے مزعفر' اور اناس کی فرنی بھی۔ جس وقت وہ بلوری فنجانوں میں بلا دودھ کی خوشبودار سبز چائے پی رہے تھے 'تو ڈنر کی ہلکی موسیقی ملحقہ کمرے سے چھن چھن کر آ رہی تھی 'نہر کے اوپر سے پانی کا شور سنائی دے رہا تھا اور کھڑکیوں کے ٹین دار چھجوں پر بارش کی ٹپاٹپ ہو رہی تھی۔

تو اصل راز تو گاؤں میں صرف بھتیجی کو معلوم تھا۔ لیکن واجد کو بھی بڑی ٹوہ لگی ہوئی تھی۔ راموں نے اپنے پڑوسی کے استفسار کا کوئی جواب تک نہ دیا تھا۔ گرام واسی نہر میں نہا رہے تھے۔ ہوا بند تھی۔ راموں گھر سے کنوئیں کی طرف چلا حالانکہ اسے نہانے کے لیے نہر پر جانا چاہیے تھا۔ واجد نے گویا اس کی پیڑ پکڑ لی اور پیچھا کیا۔ کنوئیں پر سے وہ میجر والے باغ میں چلا 'پھر شرقی حاشیہ کے کنارے ہوتا ہوا شمالی حاشیہ پر پہنچا۔ یہاں حاشیہ اور کھیر کے ٹیوں کے درمیان گلی سی بنی ہوئی تھی جس کا نکال کربلا میدان میں تھا۔

باغ کے حاشیہ پر اور کھیر کے جنگل کی طرف کانٹوں کی باڑ پر کندوریوں اور لال تریوں کی بیلیں سانپ کی طرح کانٹوں اور ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں۔ اس ہری بھری بھاٹ پر کئی جگہ گرگٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور چھوٹی چھوٹی چڑیاں بیٹھی ہوئی جھول رہی تھیں۔ گلی میں کئی جگہ عنابی رنگ 'کالے پیٹ والے لم دے جولاہے پھر رہے تھے۔ لدھر ہونے کے سبب ان کوے جتنے بڑے پرندوں سے زیادہ اڑا نہیں جایا کرتا۔ راموں کو نزدیک آتا دیکھ کر یہ جولاہے بھاگ کر بیلوں کی باڑ میں گھس جاتے جن پر پھولوں کی باغ باڑی لگی ہوئی تھی۔ بہت سے پھول گول گول ورچی آنکھوں ایسے تھے پتلی کی جگہ زرد تھی اور باقی پنکھڑیوں کا رنگ فیروزی تھا۔ باغ کی طرف تو خاموشی تھی لیکن کھیر کے جنگل میں پنچھی رول مچا ہوا تھا۔

راموں اس گلی سے ہوتا ہوا کربلا میدان میں پہنچا۔ اس نے اپنی نگاہیں دیر تک موٹے کھتری کے باغ میں جمائے رکھیں 'جس کا پھاٹک

کھلا ہوا تھا۔ پھر وہاں کچھ لوگ آ گئے جن میں واجد بھی شامل ہو گیا تھا۔ یہ لوگ حویلی کے سامنے سے گزر گئے اور ان کے بعد جب راموں گزرنے لگا تو زخمی شیرے اسے دیکھ کر بہت زور زور سے بھونکنے لگے۔ نودھا چوبارہ میں کھڑی اسے میت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور کلپ رہی تھی۔

وہ تیزی سے گزرتا تو چلا گیا لیکن جبھی واجد نے الٹ کر آتے ہوئے اس کی بانہہ پکڑ لی اور کہا "شیروں نے تجھے پہچان لیا ہے۔ تو اس رات یہیں آیا تھا۔ چل کھتری کے پاس چل"

"میں نہیں جانے کا میری کلائی نہ مروڑ مجھے کتوں سے بھے لگے ہے" راموں یہ کہتے ہوئے کلائی چھڑا کر بھاگ گیا اور واجد نے مولے کھتری کے پاس جا کر بات لگائی "ہم پھاٹک کے سامنے سے نکلے تو شیرے نہ بھونکے' راموں نکلا تو ان دونوں کتوں نے اسے بھونک بھونک کر اپنا برا حال کر لیا۔ راموں چور ہے۔ اس رات یہی چوری کرنے آیا۔ کتا اپنے مالک' دوست اور دشمن کو آدمی سے زیادہ پہچان سکے ہے تم ابھی پچاس کو گلیارہ میں لنگھا کر دیکھ لو' راموں کو بھی لنگھاؤ جو راموں کو دیکھ کر کتے بھونکنے لگیں' تو پھر تو یہ ضرور چور ہے"

کھتری نے اپنے نوکر راموں کے پیچھے دوڑائے تو وہ اپنے گھر میں جا گھسا اور کسی کے بلانے سے باہر نہ نکلا۔ مولے کھتری کی غصہ سے بری حالت تھی۔ اس نے تھانہ میں خبر پہنچا دی' جو بن کلہ سے کئی میل تھا۔ اگلے دن پولیس آگئی۔ تھانیدار "ہشپ واٹیکا" میں ٹھہرا۔ دو سپاہی راموں کو پکڑ لائے۔ اس وقت اس کے بھولپن میں بے گناہی' رقت' غریبی اور کورنش شامل ہو گئی تھی۔ وہ اسکول سے بھاگا ہوا طالب علم معلوم ہو رہا تھا اور چنچل چاہ رہی تھی کہ وہ اسے چھوڑ دیں۔ وہ اسے اسی طرح سے چھڑانا چاہتی تھی کہ اس بندھن سے چھٹ کر وہ اس کے بندھن میں آ جائے اور وہ اسے پھر کبھی نہ چھوڑے۔ وہ چور کی سفارش نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے یہ ارادہ تو کیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح راموں کو چھوڑا دے اور وہ ہی جانتی تھی کہ راموں چور نہیں ہے۔

جب بہت سے لوگ حویلی کے سامنے سے گذارے گئے اور شیرے صرف راموں کو دیکھ کر بھونکے تو راموں کا جرم ثابت ہو گیا۔ اس وقت بھی نودھا سب کے سامنے برملا اپنے دوست کو چوبارے پر سے کھڑی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ اس نے اب بھی دوپیا گھانی اور کپاسی لہنگا پہنا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت چاہ رہی تھی کہ وہ چھجے سے کود کر راموں سے جا لپٹے۔

سب "ہشپ واٹیکا" میں لوٹ آئے' راموں پر مولے کھتری کے گھر میں رات کے وقت سرقہ کی نیت سے مداخلت بے جا کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ جب اس کے ہتھکڑی لگا کر لے جانے لگے تو چنچل نے بڑھ کر تھانیدار سے کہا "ٹھہریئے آپ اسے نہیں لے جا سکتے"

"ہم اسے ضرور لے جائیں گے۔"

"اور جو یہ بے گناہ ہوا۔ پھر تو آپ اسے چھوڑ دیں گے۔"

"بے گناہ کو تو چھوڑنا ہی پڑے گا۔"

"تو وہ لڑکی جس نے کپاسی لہنگا' دوپیا گھانی پہنی ہوئی تھی۔ اسے اس نے اپنے گھر بلایا تھا۔ یہ آپ وہاں نہیں گیا۔ میں نے ان دونوں کو کیمر کے جنگل میں ایک جگہ ملتے ہوئے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔"

مولا کھتری "یہ جھوٹ ہے۔"

چنچل "یہ آپ کی لڑکی بتائے گی' جھوٹ ہے یا سچ۔"

مولا کھتری "وہ یہاں حاضر نہیں کی جا سکتی۔"

تھانیدار "ہم خود آپ کے گھر چلنے کو تیار ہیں۔"

اب راموں کا فیصلہ نودھا کے ہاتھ تھا۔ وہی اسے چھڑا سکتی تھی۔ لیکن اسے ایک بہت بڑے امتحان سے گزرنا پڑتا تھا' وہ سوچنے لگی۔ ایک طرف لگے چھپے کا لگوا ڑہ ہے۔ دوسری طرف خاندان ہے۔ ماتا پتا ہیں' اور لاج ہے۔ مجھے اکیلی کو ڈوبنا ہوتا تو خوشی سے ڈوب جاتی لیکن ہو

میں ڈوبی تو میرے ساتھ میرے سگے سگودرے 'اور سگے سمبندھی بھی ڈوبیں گے۔ جو میں تگی کر گھرانڈ پر گھسیٹی جاؤں' سگے سگودرے اور سگے سمبندھی بھی تو سب کے سب گھسیٹے جائیں گے۔

تو جب تھانیدار ہتھکڑی پکڑے لنگواڑ کو موٹے کھتری کی حویلی پر لایا تو نودھا کے من میں ایک دم ایسے وچار آ گئے تھے۔ تھانیدار نے اس سے سوال کیا "پتری اتو اسے جانتی ہے؟"

نودھا "نہیں"

تھانیدار (راموں سے مخاطب ہوتے ہوئے) "اب اب بتا تو سچا ہے یا یہ؟"

راموں "یہ"

تھانیدار "تو تو رات کو یہاں آ کر گھسا تھا"

راموں "اس کی گواہی تو کتے تک دے رہے ہیں۔"

تھانیدار "اسی لیے تو کھتی سارے گھر میں چھپا بیٹھا تھا؟ ابھی کچا چور ہے۔ بیٹا۔"

راموں "جی ہاں"

اس وقت وہاں پنچھی پہنچ گئی۔ اس نے نودھا کا انکار سن کر تھانیدار سے کہا "یہ لڑکی جھوٹی ہے۔ میں راموں کی صفائی دوں گی یہ دونوں کھیر جنگل میں ملتے رہے ہیں۔"

راموں "میں آپ کو پیش کرنا نہیں چاہتا۔"

اب تھانیدار اور موٹے کھتری میں سکوت ہوئی۔ مولا مقدمہ چلانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی کوئی چیز چوری نہیں گئی تھی لیکن جو یہ مقدمہ چل جاتا۔ راموں کو سزا ہو جاتی 'تو وہ برادری میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا اور جو اصل بات ہے وہ ظاہر ہو جاتی۔

پھر راموں کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔ جب وہ جانے لگا تو پنچھی سوچنے لگی 'جس نے پریت کی لاج رکھی اسے جیتہ و رتھ میں بٹھا کر بھیجنا چاہیے تھا۔ راموں کے سدا نند چہرے پر اس وقت رنج و اضمحلال کی دھملائی چھائی ہوئی تھی۔ اسے یہ ملال ہو رہا تھا کہ نودھا صرف سکھ سمپت کی ساتھی تھی اور جب موقع پڑا تو چھوڑ بھاگی۔ وہ تعذرے سے ٹوٹا جا رہا تھا۔

راموں واقعی فتح کی رتھ میں بیٹھ کر نکلنے کے لائق تھا اور پنچھی کا ارادہ اب بھی اسے مورتی کی طرح پوجنے کا تھا لیکن اسے ملن کا کوئی کارن بھائی نہ دیتا تھا۔ اس مد میں اس کی آخری کوشش تھانیدار کی آمد کے وقت شروع ہوئی تھی لیکن یہ بھی چندن گھسنا ثابت ہوا تھا۔

ادھر نودھا یہ سوچنے بیٹھی تھی کہ شائد راموں کو اس سے برگشتہ کرنے والی میجر کی بھتیجی تھی۔ دراصل اس نے اپنے لگواڑ کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ بچ ذات ڈیکلے کے لڑکے کو وہ اپنی قلابازی بھی کھلا دے 'اور اس کے دونوں پورے بھی بجا دے۔ وہ جب بھی نہ برا مانے گا نہ ساتھ چھوڑے گا۔ اسے اس کے یہ فقرے یاد آ رہے تھے۔ "میں تو تیری گیند ہوں 'ٹھوکر مار یا نہ مار' تیرے ہی پیروں میں پڑا رہوں گا" اسی کی حرص سے تو متاثر ہو کر یہ بھی اتنی اوچھی بار بن گئی تھی۔

لیکن جب وہ پندرہ واڑہ بھر سے زیادہ عرصہ تک بھی متوجہ نہ ہوا تو نودھا بلبلا ہی تو اٹھی 'اس کا دل دکھنے لگا تھا' اسے اس کی یاد باؤ رہنے لگی تھی۔ اس کا دل ہر وقت یوں پکارنے لگا۔ "سدا من آیو 'او سرے جائیو۔" یعنی اب جو وہ جیوں پر کھیر کی چھاؤں میں ملا تو وہ اسے اس کا پابند کرے گی کہ سویرے آنا 'دیر میں جانا۔ ادھر راموں کی بھی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہتا اور نودھا کی بابت ہی سوچتا رہتا۔

کئی دن سے بھر مجھیلے ساون کی ٹپا ٹپ ہو رہی تھی۔ آموں کے باغوں میں سب جگہ ہری ہی ہری سبزہ نظر آ رہا تھا جس پر جگہ جگہ ٹپکے کے آم پڑے ہوئے اچھے معلوم ہوتے تھے۔ پنچھی اور اس کا تایا اکثر باغ میں جاتے اور بانس کی لمبی کنتھ سے چھانٹ چھانٹ کر دیسی آم توڑتے۔

"جھولن جاترے" کا تہوار آ رہا تھا۔ جس میں ابھرتے چاند کے دنوں ہندو کرشن اور رادھا کی یاد میں جھولے جھول جھول کر پانچ دن رات محبت کے گیت گاتے ہیں۔

بن کلہ میں ہندو جھولن جاترے کا تہوار منا رہے تھے۔ اور ساون برس رہا تھا۔ آم کھا کھا کر نشہ سا جو ہو گیا تھا تو مرد تو اکثر بھیس تانے سو رہے تھے کیوں کہ خنکی ہو گئی تھی اور لڑکیاں جھونے لیتے ہوئے رادھا کرشن کے گیت گا رہی تھیں۔ پریت کے میٹھے اور معصوم گیت۔ پچھلی رات جب خوب سوتا پڑ گیا' تو نودھا دی بوری کی کھوئی اوڑھے گگرا اوپر چڑھائے ایک ہاتھ میں جوتیاں لیے دوسرے میں چ پکوائی اور اپنا تمام سونے کا گہنا اٹھائے راموں کی دہلیز پر پہنچی۔ اس وقت مینہ چادر بھگو برس رہا تھا۔ رات بہت ہی کالی اور ڈراؤنی تھی۔ جھینگروں کی جھنجھکا سے گاؤں گونج رہا تھا۔

آتے ہی نودھا کی نگاہ موچے پر سوئے ہوئے کے چہرہ پر پڑی' جو بجھتے ہوئے دیے کی روشنی میں سلا ہو' مگر قاں' دھلا دھلا' بلکہ خوب پھوالہ ہوا' مں اور دیواں معلوم ہو رہا تھا۔ جوانی کی نیند کسی نے ایسی تو نہ دیکھی ہو گی۔ سب جانتے ہیں کہ موچا دیہات کا بہت بڑا پلنگ ہوتا ہے جس پر آٹھ دس آرام سے سو سکتے ہیں اور اس موچے پر وہ تنہا سو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اور ٹانگیں خوب پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے وہی بلا آستین سینڈو فیشن بنیان پہنا ہوا تھا' اس نے راموں کے کانوں کے پاس منہ لے جا کر قو کیا۔ مگر ہائے رے جوانی کی نیند اس کے تو سول بھی بھبھو دیتے تو وہ نہ جاگتا۔ اب نودھا اس کے برہنہ بازو سہلاتے اور ہلاتے ہوئے بولی! جگ جوتی بہت نیند چکے جاگو' جاگو' جاگو۔ نیندو جی! جاگو اس ننديا کا ستیاناس ہو جائے' میرے چیپڑے کو نین نہیں کھولنے دیتی۔ پھر نودھا نے اس کی آنکھیں اس طرح سے کھولیں جیسے دیہاتی بچوں کی دکھتی آنکھیں چیر کر ان میں جست بھرا جاتے ہیں۔

سونے والے نے موٹی موٹی آنکھیں تھوڑی تھوڑی ٹمٹماتے ہوئے کہا" تو تو اس بیدڑلے کو نہیں جانتی ہو گی' جو مولے کھتری کے گھر چوری کرنے گیا تھا۔"

نودھا: میں تجھ پر نچھاور کرنے کے لیے اپنا سارا گہنا لائی ہوں۔ اور کھلانے کے لیے چ پکوائی۔ ان دونوں شیروں کو گولی لگ جائے جنہوں نے بھونک بھونک کر جاگر کر دی تھی' ورنہ ساجن تو گگرا توڑ کر برہمن سے ملنے آ ہی گئے تھے۔ آؤ سلوک کر لیں' میں اپنے ہاتھ سے چ پکوائی کھلاؤں گی۔

نودھا اس کا منہ کھول کر مٹھائی کھلانے لگی۔ اسنے ہونٹ اور دانت بھینچ لیے' اب وہ ہنستے ہوئے بولی:

تمیا ڈوبی رے ہر داس
گھوڑی دانہ کھائے نہ گھاس

پھر نودھا نے دیکھا کہ راموں نے تیوڑی چڑھائی ہوئی ہے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا سی کرنے لگی ہے۔" مسندر (آگ کے دیوتا) ٹھنڈا ہو جا" اس کا جواب راموں نے بڑا سخت دیا" کیوں تُرو کی طرح بولے جا رہی ہے میری تجھ سے کیا سگاوت ہے؟ میں تجھ ہوں تجھ۔" اس کے لہجہ میں درد تھا۔ اور نودھا جان گئی کہ پالا مار لیا۔ وہ ذرا زور دار آواز میں بولی" ڈھب سے بول مارو! بلے جلانے پائے نہیں تو گالوں میں بڑکی مارے مچا اتار لوں گی' اور چھاتی پہ چڑھ کر خون پی لوں گی۔ ہمیرا! کہیں کا' ریٹری انٹرا جھنجھلیا ڈھیلا اور تو تجھ نہیں ہے۔ تو کیا سور کی پچھ (پونچھ) ہے؟"

اب راموں کی برگشتگی دور ہو چکی تھی۔ اس کے ہونٹ ہنسی میں اتنے کھل گئے تھے کہ دانتوں کی دونوں قیا لڑیاں نظر آ جائیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی باہیں نودھا کے گلے میں تھیں مگر ابھی ہونٹ ہونٹوں سے نہیں مل پائے تھے۔ پیار بیوپار شروع نہیں ہوا تھا وہ صرف دیا بجھا

سکے تھے کہ لالٹین لیے واجد پہنچ گیا پیچھے پیچھے حسنا مقدم تھا۔ باپ نے نودھا کی بانہہ پکڑی' بیٹے نے گٹھا اٹھایا اور یہ تینوں دہلیز سے باہر نکل آئے۔ مینہ اب زور سے برسنے لگا تھا۔ نودھا بوری کی کھوئی اندر ہی چھوڑ آئی تھی۔ واجد کے سر پر چھاج تھا حسنے کے سر پر سرکی اور حسنے نے اپنی سرکی میں نودھا کو بھی لے لیا۔

یہ مولے کھتری کی حویلی میں گھٹنوں گھٹنوں پانی سے گزرتے ہوئے پہنچے۔ نودھا کو اب یہ ہوش نہ تھا کہ وہ اپنا گھگرا اٹھا کر پانی سے بچائے۔ اس کی جوتیاں بھی راستہ میں بہہ گئی تھیں۔ مولے نے باپ بیٹے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وعدہ لیا کہ بات پھوٹنے نہ پائے اور نودھا کو گردنی دیتے ہوئے زنان خانہ میں دھکیل دیا۔ اب نودھا کی بڑی نگرانی شروع ہو گئی تھی اور مولا کھتری اپنے پریوار سمیت بدری نارائن کے لیے تیرتھ یاترا پر جانے کی تیاری کرنے لگا تھا۔ آج سے نودھا رامُوں کی ملاقات ناممکن ہو گئی تھی۔

یہ بھر بھیلے ساون کی ایسی ٹھنڈی دوپہر تھی کہ اس میں اگر جڑاول بھی پہن لیتے تو ناگوار نہ گزرتا۔ ہنچلی "ہشپ وادیکا" کی برساتی میں بیٹھی تھی جس کا ٹین بوندوں سے جھجھما رہا تھا۔ مدی شیشہ کے طاقوں میں رنگین قمقمے لگے ہوئے تھے۔ جنہیں رات کو روشن کیا جاتا تھا۔ چھت میں سجاوٹ کے لیے جھاڑ کی طرح طوطا پری آموں کے بھوپے لٹک رہے تھے۔ دیوار پر صرف ایک تصویر لگی ہوئی تھی جس میں دیہاتی لڑکیاں دریا کے کنارہ پر گزری بگڑی یا کچھ کم پانی میں لنگا' بہ حد نیم عریانی اٹھائے ہوئے گزر رہی تھیں۔

آسمان پر گھور گھنگھور جھکے ہوئے تھے۔ لیکن ان سے بھی گھور' ان کے تلے آموں کے کالے نیٹ باغ نظر آ رہے تھے۔ کوٹھی کے احاطہ میں کھڑے ہوئے سال خوردہ جیڑوں کا بھی یہی حال تھا۔ بادل کی گرج پر مور بار بار نہایت بلند آواز سے جھنکار رہے تھے۔ جب بادل گرجنا بند ہو جاتا تو یہ بھی خاموش ہو جاتے۔ ہرنوں کی ڈاریں کوتل گھوڑوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی پھر رہی تھیں۔ نسر میں برسات کے اوپر پانی نے شور مچا رکھا تھا۔ کال بجھروالے ناپڑ پر ریلو لے اور جنگلی کبوتروں کی ڈاریں بیٹھی تھیں۔ سفید کبوتر زیادہ تھے۔ کم رنگین۔

جھولن جاترا میں رادھا کرشن کے گیت ختم کر کے اب لڑکیاں لوک گیت گا رہی تھیں۔ جن کی ہلکی ہلکی دھنیں آسمان سے اڑتی ہوئی شفق کی طرح فضا میں پھیل رہی تھیں۔ بلکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہیں دور رنگین پرندوں کی ٹولیاں نغمہ سرائی کرتی ہوئی پرواز کر رہی ہیں۔

ہنچلی کو نودھا کی افتاد کا علم نہ تھا۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ تو رامُوں میں چھپ گئی ہو گی۔ اس کے تو جی میں جی آ گیا ہو گا لیکن یہ ابھی تک بیٹھی ہوئی جھینک رہتی تھی۔ یوں ہی ایک ہفتہ گزر گیا اور اس کی تراس نہ گئی۔ اس کے تایا میجر آمبر سنگھ ان دنوں پہاڑ جایا کرتے تھے اور یہ بھی ان کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ ایک دن انھوں نے اس سے پہاڑ جانے کا ذکر کر دیا تو اس میں ایک ہوا سی بھر گئی۔ اسے دیوار' کیل اور پڑتل کے درختوں میں سائیں سائیں کرتی ہوئی گپھائیں یاد آنے لگیں۔ اور کئی کئی سو فٹ کی بلندی سے گرتے ہوئے جھرنے اور سفید بادلوں میں گڈمڈ ہو جانے والی برف کی چوٹیاں اور پہاڑی گھروں کے وہ چراغ یاد آنے لگے جن کا تاروں سے امتیاز کرنا مشکل ہوتا تھا۔ اس کا دل پہاڑی بادلوں میں سے گزرتے ہوئے ان کی عجیب بو سونگھنے کو چاہنے لگا۔ اور پہاڑی مٹی کی خوشبو اس کی ناک میں آنے لگی۔ جس کے کھیتوں میں پودوں سے لپٹی ہوئی بیلوں پر نیلی نیلی گول آنکھوں والے پھول کھلے ہوتے ہیں۔ وہ مہمیز لگے بوٹ پہن کر ناگن کی سواری کیا کرتی تھی اور اسے ایڑ لگا کر دوڑایا کرتی تھی۔ اب پھر اس کا ارادہ سی طرح کی گھڑسواری کا تھا۔

میدانوں سے پپیہا جا چکا تھا اور آمد بہار میں اپنے اونچے آکاش نیم پر بیٹھے ہوئے ایک پپیہے کی کوک سنی تھی۔ پہاڑی پپیہوں کو اس نے ٹولیوں میں کوکتے ہوئے اور پربت بن میں کہرام سا مچاتے ہوئے سنا تھا۔ وہ پھر پہاڑی جنگلوں میں ایسا ہی کہرام سا مچا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے وہ کنجشک خور گھر بھڑکیلے رنگوں والا پرند یاد آ رہا تھا' جسے اس کی آواز کی نسبت سے اہل کوہ "رب سچا" کہتے ہیں۔ وہ اس کا نک گھر شکاری پنچھی کے پنجوں سے پھدکتی چڑیاں جا کر چھڑانا چاہتی تھی۔ ہنچلی کو جانوروں کا وہ محفوظ پربت بن بھی یاد آ رہا تھا' جس کے بوتھ ہوسٹل کی چھت پر کھڑے ہوئے اس نے گولف کے میدانوں اور سبزہ زاروں میں لمبی داڑھی والے ترگول' اڑیال پاڑہ' مارخور' کاکڑ' پنکارہ کے گلے پھرتے ہوئے دیکھے تھے اور اس کا دل ترگوں کی لمبی داڑھی ہاتھ میں لے کر ہلانے کو چاہ رہا تھا۔ یہیں اس نے وہ شہد سے زیادہ شیریں چھوٹی بزجینے یاقوتی پھل

کھائے تھے جن کا نزاکت کا یہ حال تھا کہ گھنٹہ بھر کے اندر نہ کھایا جاتا تو یہ رس بن کو تحلیل ہو جاتے۔ اس لیے انہیں اس محفوظ پربت بن میں ہی کھایا جا سکتا تھا۔ وہ یوتھ ہوسٹل میں ٹھہر کر پھر یہ پھل کھانا چاہتی تھی۔ اور اب بن کلہ میں اس کا ٹھہرنا بے کار ہو گیا تھا۔

وہ ایک غم غلط کرنے بن کلہ میں آئی تھی، دوسرا غم غلط کرنے کے لیے اس نے پہاڑ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تایا بھتیجی ایک ہفتہ میں روانہ ہو جانے والے تھے۔

لیکن وہ تو آسمان پر گھٹاؤں کی ایسی چھاؤنیاں ڈٹی ہوئی تھیں کہ بادل کھلنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ باغوں میں ٹپکے کے آم بہے بہے پھر رہے تھے۔ نہر اوپر لے پانی سے پل کی چھت تک ابھری ہوئی چل رہی تھی۔ اور اس کی گنجار سے ڈر لگ رہا تھا۔ دون کا میدان، جس کے تین طرف شوالک کی پہاڑیاں تھیں ایک طرف ہمالہ اور جو پوری تحصیل پر مشتمل تھا۔ وہاں متواتر بارش ہو رہی تھی اور وہ میلے پانی کی وسیع جھیل بن گیا تھا۔ جس میں انسان اور حیوان ڈوب گئے تھے۔

اسی دوران میں ایک صبح جب کہ بھتیجی اور اس کا تایا صبح کا ناشتہ بھی نہ کر پائے تھے، ڈھم ڈھم کی آواز سنائی دی۔ محکمہ انسداد سیلاب کی طرف سے اعلان کیا جا رہا تھا کہ گاؤں خالی کر دیں۔ کیوں کہ دیکھ بھال کے ہوائی جہاز سے معلوم کر لیا گیا تھا کہ دون کا پانی بن کلہ کی نیچی پہاڑیوں کی طرف سے راستہ کرنے والا ہے اور پھر پتھروں لکڑیوں ملے پانی کا اتنا زبردست ریلا آئے گا کہ اس میں کسی کی بھی جان نہ بچ سکے گی۔ یہ سیلاب شوالک کی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ مشرق کی سمت چلتا ہوا دریائے جمنا میں جا گرنے والا تھا۔ اس بہاؤ کا تعین یقین کے ساتھ اس لیے کر سکتے تھے کہ ملکہ کے راج والا طوفان بھی اسی راستہ گزرا تھا۔

جبھی جھکنھا پہنے ہوئے کوٹھی کا معمار مالی آ گیا۔ اس نے یہ ہولناک داستان سنا دی۔ جب آپ کے بزرگوں نے جنگل صاف کرا کر گاؤں بسایا تو میرے بڑے بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔ پہلے یہ کوٹھی بنی تھی۔ ملکہ کا راج تھا۔ جب دون کا سیلاب پتھروں لکڑوں سانپوں چیتوں کو لیے ان پہاڑیوں سے گڑ گڑ کرتا ہوا آیا تھا۔ یہ بیڑے بہت پرانے ہیں اب ان کی چوٹیاں عمر کی وجہ سے جھک گئی ہیں۔ جب بھی نیم جتنے ہوں گے۔ میرا دادا کہا کرتا تھا اتنے پانی چڑھے تھے کہ ان بیڑوں کی چوٹیاں ڈوب گئی تھیں۔ کیوں کہ جب پانی اترا اور ہم یہاں آئے، تو ان کی چوٹیوں پر مرے ہوئے مینڈک ٹنگے ہوئے تھے۔

اب سارا گاؤں خالی ہو رہا تھا۔ ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ اور اسی نفسا نفسی میں جب شوہر سے بیوی، ماں سے بچے بچھڑ رہے تھے، نودھا کی کڑی نگرانی بھی ختم ہو گئی تھی۔ پل پر پہنچنے کا چوڑا راستہ مولا مختری کی حویلی کے سامنے سے ہی جاتا تھا، اس لیے یہیں زیادہ بھیڑ تھی۔ اپنے ریوڑ اور کسان، بیل گاڑیاں اور مویشی ادھر ہی سے ہانکے لیے جا رہے تھے۔

بن کلہ کے مشرق کی طرف والے دیہات میں منادی پہلے سے کرا دی گئی تھی، کیوں کہ ان کے لیے نہر پار کرنے کا راستہ صرف بن کلہ کا پل تھا۔ ان ہزاروں انسانوں اور مویشیوں نے بن کلہ میں آ کر سخت گڑبڑ مچا دی تھی۔ پولیس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لیے چوری ڈکیتی اور اغوا تک کی وارداتیں ہو رہی تھیں۔ کئی ایک کو دشمنی نکالنے کا موقع مل گیا تھا اور خون تک ہو گئے تھے۔

ہر شخص کی کوشش یہ تھی کہ وہی پہلے پل پار کر جائے اور اس ریلم ریلا میں کئی بھینچ کر پاؤں تلے روندے جا کر مر چکے تھے۔ ان کی لاشیں نہر میں بہائی جا رہی تھیں۔ اس بد نظمی کی خبر جب میجر امبر سنگھ کو پہنچی، تو پورے میجر کی وردی پہن، تمغے اور ریوالور لگائے پل پر آ گئے تھے۔ انہوں نے تحکمانہ فوجی انداز سے نظم و نسق قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور کافی کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ انہوں نے یہ نیت کر لی تھی کہ جب تک ایک بھی متنفس پل کے اس پار رہا، وہ بن کلہ سے نہ جائیں گے خواہ اس طرح انہیں طوفان میں کیوں نہ ڈوبنا پڑے۔ ان کے اس چلن کو دیکھ کر نہر کے پوربی کنارے سے پل پار پچھمی پٹڑی پر پہنچنے والی خلقت نعرے لگا رہی تھی۔ بولو دیا ویر، دیا ان میجر سنگھ کی ہے، بولو دیا ساگر، دی مرتی۔ میجر امبر سنگھ کی جئے۔

تو ایسی نفسا نفسی کو نودھا نے ملن کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ جانا۔ لوگوں کو اپنے مال جائداد، اہل عیال کی پڑی ہوئی تھی اور نودھا کو

ملن کی۔ وہ عام راستہ سے ماموں کے گھر نہیں جا سکتی تھی۔ کیونکہ اس پر تو پورب کی جانب سے آنے والی خلقت کا اتنا ہجوم تھا کہ کوئی ذی روح دو قدم مخالف سمت میں نہ چل سکتا تھا۔ اس لیے وہ ماروتی کے گھر کی راہ سے چلی۔ لیکن یوں وہ پچھواڑہ ہی پہنچ سکتی تھی۔ گھر میں داخل ہونا نا ممکن تھا۔

جب وہ پچھواڑے پہنچی تو اسے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہو گیا۔ راموں اور اس کے باپ نے پچھواڑے والی دیوار پھوڑ کر دروازہ بنایا ہوا تھا۔ کیوں کہ ولیئز کی طرف، جدھر منشی مقدم کا گھر بھی تھا، پکی سڑک پر بھیڑ کی وجہ سے قدم بھی باہر نہ نکال سکتے تھے۔ راموں اور اس کے ماں باپ اس عارضی دروازے سے کوراہ پڑ کر نہر کی پکی پٹڑی کے ذریعہ پل پر پہنچنا چاہتے تھے۔

نودھا نے راموں کو دور سے اشارہ کیا کہ وہ ملنے کے واسطے آئی ہے۔ یہ گھر پر ٹھہرے راموں نے اس کا جواب اثبات میں دیا پھر وہ کیوں کا مختصر کنبہ پل کی طرف چل دیا۔ راموں اپنے والدین کو پل میں داخل کر کے کوراہ سے گھر لوٹ آیا۔ جو ایک مرتبہ پل میں داخل ہو جاتے، کسی صورت بھی واپس نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے راموں اس فکر سے بے نیاز تھا کہ اس کے ماں باپ اب گھر لوٹیں گے۔

اب وہ دونوں زور زور سے قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔ وہ اپنے پورے زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ اتنے زور سے کوئی بھی نہیں ہنستا۔ گویا وہ پہلے جو خفیہ ملاقاتوں میں پھس پھس کیا کرتے تھے، یہ اس کا بدلہ تھا۔ اس کے بعد وہ بے ہنگم طریقہ پر ناچنے لگے اور گانے لگے۔

ناچتے گاتے ہوئے وہ پھر پہلے کی طرح زور زور سے ہنسنے لگے۔

راموں نے نودھا کی لائی ہوئی بیج پکوائی احتیاط سے منگوا رکھی تھی۔ وہ اسے لے آیا۔ ان دونوں نے یہ مٹھائیاں ایسی بے فکری سے کھائیں جیسے دلہا دولہن فراغت کے ساتھ حجلہ عروسی میں شب زفاف منا رہے ہوں۔ یہ آئی قیامت دوسروں کے لیے تھی۔ ان کے لیے تو یہ مہا تہوار تھا، آج ان کی تنہائی میں مخل ہونے والا نہ واجد تھا، نہ حسنا مقدم، مخلوق نفسا نفسی میں گرفتار تھی اور انہیں آج سے زیادہ تسکین قلب کبھی نصیب نہیں تھی۔ تو پھر اس گھڑی سے زیادہ ان کے لیے اور کونسی گھڑی مبارک ہو سکتی تھی۔

راموں نے پلنگ پر صاف دھلی ہوئی دوہتی بچھائی تھی اور تکیہ کا غلاف بھی بدلا تھا۔

بارش تمام دن لگاتار ہوتی رہی تھی۔ اسی دوران میں علاقہ کا مکمل انخلا عمل میں آ گیا تھا۔ جب شام پڑنے لگی تو ایک بھی پل پار کرنے والا موجود نہ تھا۔ اب میجر آمبر سنگھ نے شوفر کو حکم دیا کہ وہ لمبی کار جو نہر کی شرقی پڑی پر کھڑی تھی اسٹارٹ کی جائے۔ مالی، خانساماں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور اگلی سیٹ پر آ بیٹھی تھی۔ چر چلتے چلتے میجر آمبر سنگھ رک گئے۔ انھوں نے پل کی اونچی من پر کھڑے ہو کر دوربین سے مشرق کے علاقہ کو دیکھا کہ کہیں کوئی پیچھے رہا ہوا اب بھی پل کی طرف نہ آ رہا ہو۔ اس وقت بارش کچھ لمحہ کو رک گئی تھی۔ اس لیے وہ دور دور تک دیکھ سکتے تھے۔ یہ تمام علاقہ قطعی سنسان پڑا تھا۔ البتہ گلیوں میں جگہ جگہ آوارہ اور پلے ہوئے کتے رو رہے تھے۔ پلے ہوئے کتے اپنے مالکوں کو یاد کر رہے ہوں گے۔ کوئلیں اب بھی بول رہی تھیں اور کھیتوں میں مور ناچ رہے تھے۔ ایک جگہ نیولا مرغی کے بچوں کو پکڑ پکڑ کر کھا رہا تھا۔ کئی جگہ گھروں میں گیدڑ اور جنگلی بلے گھسے ہوئے تھے۔ جنگلی بلوں کو دیکھ کر کوؤں نے کاکا کاروں مچا رکھی تھی۔ گیدڑ اور جنگلی بلے مرغیاں پکڑ پکڑ کر دالانوں اور اساروں میں بیٹھے چٹ کھا رہے تھے۔ پالتو بلیاں کابکوں میں کبوتروں اور ان کے بچوں پر ہاتھ صاف کر رہی تھیں۔ اور کوئی طوطے کے پنجرہ کو رڑھاتی ہوئی پھر رہی تھی۔ پیچھے چھوڑے ہوئے بے کار مویشی عمر میں پہلی دفعہ بلا روک ٹوک فصلیں کھاتے ہوئے پھر رہے تھے۔ نہر کی ڈھانگ میں جو کلیوں اور سرخ منقار گر سلوں کے گھر تھے، ان سے اوپر تک پانی پہنچ چکا تھا۔ یہ پرندے واویلا کرتے ہوئے وہیں اڑ رہے تھے۔ "ہشپ وانکا" کی برساتی سے ایک دھپو دھن چڑی نے چھوٹی سی گوریا کو مار نکالا تھا اور خود اندر بیٹھی ہوئی چونچ کھولے بول رہی تھی۔ پھر وہاں طوطوں کا جھنڈ آ گیا تھا۔ جو طوطا پری کے جھونپوں کو کھا رہے تھے۔

جب میجر امبر سنگھ کو تسلی ہو گئی کہ اب کوئی پیچھے نہیں رہا تو وہ شوفر کے پاس کار میں آ بیٹھے اور کار اسٹارٹ ہو گئی۔ انہیں اس کا بڑا فخر ہو رہا تھا کہ اب کوئی انسانی جان تلف نہ ہو گی اور ان کی بھتیجی کو اس زیاں کا شدید احساس ہو رہا تھا، کہ وہ بے نیل و مرام واپس جا رہی ہے۔

کار نے ابھی پل پار ہی کیا تھا کہ پھر زور کی بارش آ گئی۔ ونڈ سکرین کے رین وائپر جلدی جلدی چل رہے تھے۔ پکے کولے والی شاہراہ جو ہوائی اڈے والے شہر کو جاتی تھی۔ پل سے دس میل جنوب مشرق میں تھی۔

سڑک پر پہنچتے پہنچتے مغرب کا وقت ہو گیا۔ لیکن ابھی خوب روشنی تھی۔ یہاں ہیتنجلی اور اس کے تایا نے سائرن کی آوازیں سنیں جن سے معلوم ہوا کہ اب طوفان آ چکا ہے۔ یہ خبر دیکھ بھال کرنے والے ہوائی جہاز کے ذریعہ معلوم ہوئی تھی۔ اور جب اگلے دن ہیتنجلی کو صبح ناشتہ کے لیے اٹھایا، تو وہ خواب میں ہزاروں بے تھم دیکھ رہی تھی۔ جس پر تنگ بنیان اور ڈھلکی ہوئی دھوتی باندھے اس کا پکینا ہیرو بیٹھا تھا۔ پھر جبھی اسے اس ہیرو کے ساتھ ایک جوئن نوجوان خوبصورت بیٹھی نظر آنے لگی۔ لوگ نودھا اور راموں کے جے کارے لگا رہے تھے۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر ہیتنجلی نے اخبار پڑھا۔ محکمہ انسداد سیلاب کے افسر اعلیٰ کے بیان سے معلوم ہوا ہے، جو متاثر علاقہ کی پرواز کر رہے تھے، کہ غروب سے کچھ ثانیہ قبل دون کا پانی شوالک کی نیچی پہاڑیوں سے دھاڑتا ہوا آیا۔ اس پانی میں بڑے بڑے ٹھے اور پتھر تھے، جو عمودی ڈھلان سے تیزی کے ساتھ لڑھکتے ہوئے آئے۔ پھر یہ سیلاب نہر کے پل کو غرق کرتا ہوا موضع بن کہ کے راستہ مشرق کی طرف ڈھلا دریائے جموئی میں جا گرا۔ موضع بن کلہ سیلاب کا دھارا بنا ہوا ہے۔ اور ٹھے پتھر بھنوریں سی بنائے ہوئے بہے جا رہے ہیں۔ کسی آبادی کا نشان تک موجود نہیں۔ باغات تک تہ آب ہیں اور درختوں کی چوٹیاں تک نظر نہیں آتیں۔ نہر کے پل سے دریائے جموئی تک ایک خوفناک اژدھا صفت اور طوفانی دریا رواں ہے۔

ہیتنجلی کو اس وقت وہ کنواں یاد آیا، جس کی من پر اس نے پہلی مرتبہ راموں کو دیکھا تھا۔ اور کال بجر کے ناپڑ پر ریولیوں اور جنگی کبوتروں کی ڈاریں بیٹھی تھیں۔ وہ راموں کو یاد کرتی ہوئی بن کلہ سے نکلی تھی اور اسی کو یاد کرتی ہوئی پہاڑ چلی گئی۔ جہاں بہت سے پپیہوں کو جنگل میں کہرام مچاتے ہوئے سن کر اس کے دل میں بھی کہرام مچ گیا۔ لیکن راموں اور نودھا تو آبی قیامت کے ذریعہ بیکنٹھ پہنچ چکے تھے۔

خان فضل الرحمٰن

نربسی

گاؤں کا ہر ایک آدمی اچرج میں تھا کہ نربسی کیسے وڑو لٹے کی لڑکی ہو سکتی ہے۔ پرانے مندر کے جگن جسی یاچک اور عزلتی کا بھی یہی خیال تھا۔ وڑو موٹا بھجس تھا جبکہ نربسی چھریری' دہ چھٹ آنکھا' یہ بڑ آنکھی' دہ گھور میل تھا' یہ ایسی تھی جیسے چنے کے اوپر سے ابھی ابھی چھلکا اتارا ہو۔ مگر جوانی پر چڑھتے ہی اس کا چہرہ گلابی گلابی ہو گیا تھا۔

وڑو کی آواز غوک اور بھنگے ایسی تھی۔ جبکہ کلا کا دگر نربسی کی آواز پر مرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ لڑکی اگر گاین بجائے' اور ساتھ کنچنی بھی' اور میلہ کرے' تو میلہ لوٹ لے' مجرا کرے' تو تماشینوں کی جیبیں خالی کر دے' کوئی دھن پتی اس کے ساتھ شب بسری کرنا چاہے' تو اپنے دھن سے ہاتھ دھو بیٹھے اور یہ بیچ بیچ دروڑی ہے۔

جب تک وڑو لٹے کی بیوی زندہ رہی۔ وہی نربسی کی پال پوس کرتی رہی' اور اس کے بعد وڑو لٹا اسے انگوٹھی کے نگ کی طرح سے رکھ رہا تھا۔

وڑو کی بیوی اس سے گت تھی جسے وہ سراؤگیوں کے گاؤں جین پورے سے لایا تھا۔ اس کے گاؤں میں کسی نے بھی اپنی لڑکی اسے دینے کی حامی نہیں بھری تھی۔ ایک مرتبہ اس نے ایک نوزائیدہ لڑکی کے لئے زچہ خانہ ہی میں شادی کا پیغام پہنچا دیا تھا اور اس کے کانوں میں گرام یاچک کی یہ آواز پڑی تھی: "وڑو تجھے تو یہ بات کہہ کر لاجنا چاہئے" تو اس نے جواب دیا تھا۔ "یاچک جی میں نے کچھ برا تو نہیں کیا۔ اگر میرا اس سے بیاہ ہو گیا' تو میں اسے آپ ہی پال لوں گا۔"

پھر جین پورہ سے وڑو کے ساتھ نربسی اور اس کی ماں آگئی تھی۔ اس سیٹھوں کے قصبہ میں یہ راجوں کے ساتھ مزدوری کرنے گیا تھا۔ جہاں اس نے کئی سال گذارے تھے۔ اسی قصبہ سے وہ نربسی اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر آیا تھا اور اسے گاؤں کی وہ زمین بھی مل گئی تھی۔ جسے اس کے مالک نے جین پورہ کے کسی سراوگی کے پاس رہن رکھا ہوا تھا۔ جین پورہ سے لوٹنے کے بعد اس نے اپنی زمین میں کھیتی شروع کر دی تھی۔

(۲)

گاؤں میں عزلتی یاچک کو بڑا دانندہ اور ودیا دان سمجھتے تھے۔ جب کسی نے اسے سے پوچھا کہ "یاچک جی۔ آپ تو گاؤں کے مہا جان ہیں تو نربسی اور وڑو لٹے کا بھید تو آپ ہی کھولیں گے۔ اس نے جواب دیا تھا۔ "میں کوئی دیوک تو نہیں اور جس کولھے کو براہما و شنو اور شیو نے ڈھانپا ہوا ہے' میں اس کولھے کو کھولنے والا کون؟ یہ راجوں کے ساتھ مزدوری کرنے گیا تھا' لوٹا تو جسے کوئی عورت نہیں ملتی تھی۔ وہ عورت والا بھی بن گیا۔ زمین بھی اسے مل گئی۔ نربسی کو اس کی دایادی کہتے ہیں۔ وہ کتنی بھدرک ہے۔ یہ کتنا بھدا۔ اتنے پتوں پر بھی کوئی اسے نربوجھ سمجھے تو یاچک اسے کیا سمجھا سکتا ہے۔ نربسی' نربسی نہیں کام لتا ہے۔"

نربی اس گاؤں میں ایسی تھی جیسے کھنڈے جیسے مکانوں کے درمیان کوئی تاج محل لا کھڑے کرے اور گرام یا چک کا لڑکا سوم دت واقعی سوم دت تھا۔ اس کے چاہنے والے اسے جگا بیر کہتے تھے اور ان غلوں کا بھی ایک ہجوم تھا۔
خوبصورتی میں یہاں سوم دت اور نربی کے سکے چل رہے تھے۔ مگر اس بکم میں وہی نسبت تھی جو مور اور مورنی میں ہوتی ہے۔ سوم دت نربی سے نمبر لئے ہوئے تھے۔ نربی تو مجہول النسب تھی جب کہ سوم دت جگن بنسی تھا۔ جو ہندوؤں میں اونچی ذات گنی جاتی ہے۔ نربی جب بھی سوم دت سے ملتی 'تو گذارش سی کرتی ہوئی معلوم ہوا کرتی تھی اور گذارش بھی شربت وصل کی۔ اس کا جی چاہا کرتا تھا کہ سوم دت اس کی ہتکا ہتکی 'ٹوکا ٹاکی نو کانو کی کرنے لگے۔

(۳)

اس گاؤں کے درمیان ایک نہر بہتی تھی۔ جس طرح سے لکھنؤ گومتی کے شمال میں آباد ہے اور جنوب میں بھی 'اس طرح سے گاؤں کا آدھا حصہ شمال میں تھا آدھا جنوب میں 'دونوں حصے ایک لکڑی کے پل سے ملائے ہوئے تھے۔ گاؤں سے کچھ دور مشرق میں نہر دو دھاروں میں پھٹ گئی تھی اور یہ دونوں دھاریں درمیان میں جزیرہ بنا کر بعد میں ایک ہو جاتی تھیں۔ جزیرے میں ہو گلے اور نیم کھڑے ہوئے تھے۔ دیہاتی بولی میں یہ مقام دھموئی کہلاتا تھا۔ جو دو حسنی کا بگڑا ہوا ہے۔ جس کے معنی دو منھوں کے ہیں۔
جس طرح سے مغربی یو۔ پی کے اس نواح کا کوئی بھی نوجوان گھر سے روٹھتا 'تو وہ لاہور آکر دم لیتا تھا۔ اس طرح سے اس گاؤں کے کسی نوجوان کو اپنی لگتی کا لب لباب کھینچنا ہوتا 'تو وہ اسے ساتھ لے کر دھموئی کی رنگ بھوم میں دم لیتا تھا۔ کسی آنے جانے والے نے نہر کی پڑی سے جزیرہ میں آنے جانے کے لئے نہر کی شاخ پر پہاڑ سے بہہ کر آنے والے چیڑ کے لمبے سلیپر کی سبیل بنا دی تھی۔
نربی نے بڑی التجاؤں 'تمناؤں' مرادوں اور رچھلوں کے ساتھ سوم دت کو راضی کیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ معانقے ہی نہیں بلکہ ٹوکا ٹوکی۔ نوکا 'نوکی کرے۔ اس کا تو بھاگ جاگ گیا تھا۔ نربی کی اس لڑکے پر ٹوٹ کر طبیعت آئی ہوئی تھی۔ اس کا دل اس کے دیکھتے ہی یہ چاہنے لگتا تھا کہ وہ دونوں دمن میں غلاطم غوطہ ہوں۔ کبھی وہ اس کے ہونٹوں کو دیکھے جایا کرتی تھی۔ کبھی چھاتی 'پیڑو اور رانوں کو۔۔۔۔۔۔
جنم اشٹمی کی رات 'بھادرا کی بدی آٹھ کو' نربی اور سوم دت دھموئی کے جزیرہ میں ملنے والے تھے۔ آج رات وہ اس لڑکے کے ہونٹوں 'چھاتی' پیڑو اور رانوں سے وہ کام لینے والی تھی جو اس کی ہونے والی دلہن کا حق تھا۔
سانجھے ہوئے سوم دت اپنے بزوئی والے کھیت میں اپنی بھینس کے لئے چری کاٹ رہا تھا کہ نربی نے جوار کی کچھ سٹیاں توڑیں اور سوم دت کے مارتے ہوئے کہا: "ارے کھوئے جانے اور نہ کاٹ تھک جائے گا۔"

(۴)

سوم دت نے یہ آواز سنی 'تو اس نے منہ اٹھا کر اوپر دیکھا اور نربی نے اپنی طلسماتی آنکھیں اس کی رس بھری آنکھوں میں ڈال دیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ شاید اس طرح سے سوم دت اسے ابھی اپنا لوازمہ بنا لے گا۔ وہ کھڑا ہو گیا تو لڑکی نے اس کے ہاتھ سے گرانسی اس طرح سے چھینی کہ اس کے ہاتھ سوم دت کے ہاتھوں کو خوب چھو سکیں۔
سوم دت نے نربی کو خود ہی گرانسی دیتے ہوئے کہا: "اچھا چتوان جی 'ہنیشی جی میرا ہاتھ بٹانے آئے ہو۔ تو چری تم ہی کاٹ کے دکھاؤ۔"

نربی نے کچھ ہی پودے کاٹے تھے کہ سوم دت نے نربی سے گراہی لیتے ہوئے کہا:

"بس بس کلائی میں پھندا آ جائے گا جب دھموئی پر کوئی تڑپ رہی تھی اور کوئی تڑپا رہا تھا' تو میرے کانوں میں ایسی ہی "بس بس" کی آواز پڑی تھی۔"

نربی: وہ آواز میری ہی تو تھی۔

سوم دت: تیرے ساتھ تو میرا ایسا پھندا کبھی نہیں پڑا۔ وہ ڈاک منشی کی کموری ہی کجریا سی دھی تھی جس کا ناس ونس ایسا روپوان ہے کہ اسے دیکھتے جائے۔

نربی: میرا ناس ونس کیسا ہے؟

سوم دت: تیری شیاول آنکھیں اچھی ہیں۔ جن سے تو مجھے اس طرح سے دیکھتی رہتی ہے۔ جس طرح سے ہماری بھینس دور رکھی ہوئی کنڈالی کو' جس میں اس کے لئے گڑ' پنیہ' اور چوکر ملی ہوئی ہوتی ہے پر تیرا گلابی گلابی چہرہ مہاسیو چھم ہے۔

نربی: سوائے میرے گلابی پن کے' تجھے میری اور کوئی شے اچھی نہیں لگتی؟

سوم دت: یہ میں بغیر دیکھے کیسے بتا دوں۔

نربی: ڈاک منشی کی لڑکی کے مقابل تو مجھے فالتو سمجھتا ہے۔

سوم دت: اس سے مجھے فارغتی مل چکی ہے۔ تجھ سے ملنا ہے۔ یہ تو بعد میں ہی فیصلہ ہو گا کہ فالتو کون ہے کبھی کبھی وہ میرے مہمان ہونے کے بعد اس طرح سے منڈ کاری بھی مار لیتی ہے کہ جیسے اسے مجھ سے کچھ بھی سروکار نہ ہو اور میں بلاؤں تو ہاں بھی نہیں کرتی۔ مگر یہ ستاؤ پلک جھپکنے تک کا ہوتا ہے کیونکہ وہ آپ سے آپ میری کھیاں کرنے لگتی ہے۔

نربی: میں کل کہاں ملوں؟

سوم دت: دھموئی پر ملیں گے۔ پر دکھن وشا سے جو چڑھا آ رہا ہے۔ جھم جھم ہو گئی تو؟ تو میگھ ناد نہیں سن رہی۔؟

نربی: سن رہی ہوں تو پرانے شوالے کے مانڈھے میں ملیں گے۔ جہاں آموں کا ویوریاں کھڑا ہے ہرے ہرے جھیلے' را مہک اور کرپایین میں توری نکوریوں سے باری ہوئی ہوں۔ تو وعدہ پر کبھی پورا نہ اترا' اور اپنی فضی جوانی ڈاک منشی کی کمودی کجریا سی پہ نچھاور کرتا رہتا ہے۔

سوم دت: میں اس پر اپنا کچھ نچھاور نہیں کرتا۔ وہ میری سیوکائی میں اپنا سب کچھ نچھاور کرتی رہتی ہے اور چلچلاتے ہوئے "بس بس" کرتی رہتی ہے۔ جتنی لوکائی اس میں میرے لئے ہے' اتنی تو تجھ ہی میں میرے لئے نہ ہو گی۔

نربی: میں دھموئی پہ تجھ سے پہلے پہنچ جاؤں گی۔

سوم دت: ہم دونوں کا وہاں ایک ایک ساتھ جانا ٹھیک بھی نہیں۔ پر جو تجھے وہاں میرا ' بھ رہ گیا؟

نربی: مجھے تو پیارا ہے تو تیرا گربھ بھی پیارا ہو گا۔

سوم دت: وہ سامنے ناس ونس والی میرا لایا ہوا گربھ پاتک کھایا کرتی ہے تو بھی کھایا کرتی ہے تو بھی کھا لینا۔

نربی: یہ تیری مرضی۔

سوم دت: وہ تو میرے پاس آتے ہی تنگ دھڑنگ ہو جایا کرتی ہے۔

نربی: اسے تنگ دھڑنگ ہوتے ہوئے ویریڑا نہیں آتی۔

سوم دت: اسے ویریڑا آئے یا نہ آئے تو اپنی بات بتا؟

زربی: جیسا تو کہے گا' ویسا ہی کروں گی؟
سوم دت: پہل کس کی ہو گی؟
زربی: تیری
سوم دت: نہیں تیری
زربی: اچھا منظور!

(۵)

شام ہوئے چٹھی رساں نے گاؤں میں خبر کر دی کہ وہ ڈاک تقسیم کر کے نہر کی پٹری آ رہا تھا کہ اس کا نگاہ دھموئی کے جزیرہ پر پڑی۔ جہاں ہنڈار آپس میں کھلاڑیاں کر رہے تھے۔ چٹھی رساں درست گو مشہور تھا۔ اس خبر پر کھا گڈریا اپنی بکریوں کی حفاظت کے لئے درکھال پر لٹھ لے کر بیٹھ گیا تھا۔ اور جن جن گاؤں والوں کو ہنڈاروں کی خبر پہنچی تھی' انھوں نے گھروں کے دروازے سویرے ہی بھیڑ لئے تھے۔ گرام پیپل تک گلیاروں میں "جاگو' جاگتے رہیو" کی آوازیں دینے کے لیے نہیں نکلا تھا۔

مگر ایک ہستی تھی جسے جزیرہ میں ہنڈاروں کی موجودگی کا علم تھا۔ پر وہ پھر بھی 'انت کی ریچھوار سلیپر کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تاکہ سوم دت کے آنے پر اس کے ساتھ جزیرہ میں جا سکے۔ اسے یقین تھا کہ ہنڈار جزیرہ سے چلے گئے ہوں گے۔ اس نے کال بنی میں ہنسیلی کے سفید پھول سجائے ہوئے تھے' ماتھے پر سیندوری بندی لگائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں سرمہ بھرا ہوا تھا۔ اسے سوم دت کا انتظار تھا۔ دیکھتے دیکھتے اتنی دیر ہو گئی تھی کہ ایک اونچے نیم کے اوپر آسمان میں کچ پچپا سجا ہوا تھا۔ بنات النعش گردوں اس کے سر پر آ گئی تھیں' اور جنم اشٹمی کا چیپڑ لگا۔ اردھ چندر نکل آیا تھا۔

جب کہ اس گاؤں کی کام لتا تو سوم دت کی آمد کے بعد رمن کے لئے پڑی کی طرف آنکھیں پتھرا پتھرا کر پھڑک رہی تھی کہ وہ آ کر اسے برومند کرے۔ وہ خود ڈاک منشی کی کموری اور کچریا سی خوبصورت ناس ونس والی لڑکی کے ساتھ پرانے شوالہ کے ویران مانڈھے میں ہنسا ہنگی' ٹوکا ٹوکی' ٹوکا ٹوکی کرتے ہوئے اسی کا بھرنا بھر رہا تھا۔ سوم دت کے سروانگ سے بھرو مند ہو رہی تھی اور سوم دت اس کے سروانگ سے بھرو مند ہو رہا تھا۔ ڈاک منشی کی لڑکی کے پھیرے ہو رہے تھے۔ جب کہ زربی کا ٹھینگا بج گیا تھا۔

اگلے دن دوپہر ہوئے جب ہاتیں' بالیوں کی روٹیاں لے کر کھیتوں میں جا رہی تھیں' بھادوں کا سورج بھر مانڈ پر پہنچ چکا تھا' تو چٹھی رساں نے خبر دی کہ وہ دھموئی کی طرف سے آ رہا تھا۔ جہاں اس نے پھٹے ہوئے زنانے کپڑے دیکھے اور وہیں کسی عورت کا سر پڑا ہوا تھا۔

(۶)

چٹھی رساں کی گفتگو دڑو لنجا بھی سن رہا تھا۔ زربی گھر سے رات ہوئے نکلی تھی اور اب تک اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اسی وقت زربی کے باپ' اجت پرشاد جین' کی موٹر بھی دڑو لنجے کے دروازہ پر آ رکی تھی۔ اس کی بیاہتا کا انتقال ہو گیا تھا۔ جس کے ڈر سے زربی اپنا ہی نہیں گئی تھی۔ زربی کی خانگی ماں کو اجت پرشاد کا پیٹ رہ گیا تھا۔ یہ زربی اپنے باپ کی واحد اولاد تھی اور وہ اب اسے لینے کے لئے آیا تھا۔

اجت پرشاد جین' دڑو لنجا' چٹھی رساں اور زربی کا سینہ برادر لمبی کار میں بیٹھ کر دھموئی پہنچے تو چٹھی رساں کی تصدیق ہو گئی۔ اجت پرشاد زور زور سے رو رہا تھا' دڑو کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور وہ سنگی ہو گیا تھا۔

موٹر زربی کی باقیات کو لے کر پرانے شوالہ پہنچی' تو سوم دت مانڈھے کے پاس قطعی بیگانہ سا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرہ پر غم کے کوئی
ار نہیں تھے۔ نہ اس لاڑھے کی آنکھوں میں چھوٹا سا آنسو۔ اس کے لیے تو زربی فصل میں کھڑا ہوا انجن تھی جو کٹ گیا تو کوئی بات نہیں
ں۔ اس نے ذرا سی جھلملاہٹ یا درماندگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ زربی کی رقیب 'ڈاک منشی کی خوبصورت تاس دنس والی' اور ٹکا ٹکی کے وقت
س بس" کرنے والی لڑکی ایک طرف کو اس طرح سے کھڑی ہوئی تھی جیسے وہ کسی مدمقابل کے ساتھ جھڑپنے والی ہو۔ وہ سوم دت سے بارم بار
بکدوش حاصل کر چکی تھی۔ جب کہ کالا کا وگر بجگ سا کھڑا ہوا تھا۔

گاؤں چھوڑنے سے پہلے زربی کے باپ نے جلے کی تمام رقم غریب غربا میں تقسیم کر دی تھی۔

خالدہ حسین

نام : خالدہ

قلمی نام : خالدہ اصغر / خالدہ اقبال / خالدہ حسین۔

پیدائش : ۱۸ جولائی ۱۹۳۸ء بہ مقام لاہور، مغربی پنجاب، پاکستان۔

تعلیم : ایم۔اے (اردو) پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔

لاہور کالج برائے خواتین سے بی۔اے اور اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔اے (اردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

پیدائش لاہور میں ہوئی اور ۱۹۶۵ء تک مسلسل وہیں قیام رہا۔ آپ کے والد ڈاکٹر اصغر انجینئرنگ یونی ورسٹی، لاہور کے وائس چانسلر تھے۔ سائنس کے شعبہ کے باوجود ان کا ادب سے گہرا لگاؤ تھا چنانچہ گھر کی نجی محفلوں میں خالدہ نے حفیظ جالندھری، احسان دانش اور فیض احمد فیض جیسے نامی شعراء کو دیکھا اور سنا۔

خالدہ اپنے گھر میں ایک بہن اور تین بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کے باعث والدین اور بہن بھائیوں کی بے حد لاڈلی رہیں۔ بھائیوں نے اردو شعروادب کے علاوہ مغربی فکشن کا ذوق پیدا کیا اور تازہ ترین کتب فراہم کرنے میں بخل سے کام نہ لیا۔ خالدہ نے ۱۹۵۴ء میں افسانہ نگاری شروع کی۔ ۱۹۶۵ء میں آپ کی شادی ڈاکٹر اقبال حسین سے ہوئی جو انجینئرنگ کے شعبہ سے متعلق ہیں۔ شادی سے پہلے خالدہ کا قلمی نام خالدہ اصغر رہا اور اس کے بعد دو ایک افسانے خالدہ اقبال کے نام سے لکھنے کے بعد ایک مدت تک ادبی افق سے غائب رہیں۔ اس تعطل کے بعد دوبارہ افسانہ نگاری شروع کی تو خالدہ حسین کے نام سے لکھا۔ ۱۹۶۹ء میں اپنے میاں کے ساتھ کراچی منتقل ہو گئیں۔ کراچی میں قیام کے دوران پی اے ایف شاہین کالج، شاہراہ فیصل، کراچی میں بطور لیکچرار درس و تدریس سے متعلق رہیں۔ ۱۹۸۱ء میں افریشیائی افسانہ نگاروں کی ورکشاپ منعقدہ دہلی میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ آج کل اسلام آباد میں ہیں۔ اور ایک مقامی کالج میں پڑھا رہی ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں" مطبوعہ: "قندیل"، لاہور: ۱۹۵۶ء

دوسرا مطبوعہ افسانہ:

"دل دریا" مطبوعہ: "ادب لطیف"، لاہور (سالنامہ) ۱۹۶۰ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	"پہچان" (افسانے)	خالد پبلی کیشنز، کراچی:	طبع اول: ۱۹۸۰ء
۲۔	"دروازہ" (افسانے)	خالد پبلی کیشنز، کراچی:	طبع اول: ۱۹۸۴ء
۳۔	"مصروف عورت" (افسانے)	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور:	طبع اول: ۱۹۸۹ء

غیر مدون:

محولہ بالا افسانوی مجموعوں کے علاوہ مضامین کا ایک مجموعہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ خالدہ حسین نے ایک ناول بھی شروع کر رکھا ہے جو ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔

مستقل پتا:

۲۳۰۔ اسٹریٹ ۳۲، جی ۸/۲، اسلام آباد۔ پاکستان۔

نظریہ فن:

"جب میں اپنے آپ کو محسوس کرنا چاہتی ہوں تو لکھتی ہوں۔ کہانی لکھنے کا عمل میرے لیے اپنے وجود کا رشتہ قائم رکھنے کی کوشش ہے۔ ان دونوں دنیاؤں کے ساتھ جو میرے اندر اور باہر بستی ہیں اور یوں مسلسل بہتی ہیں کہ دونوں کے بہاؤ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تو جب مجھے اپنا آپ خطرے میں محسوس ہوتا ہے، میں اپنے آپ کو لکھنے پر مجبور پاتی ہوں۔ شاید فنا کا خوف، بقا کی حسرت، زندگی کی محبت مجھے لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ میں اس حقیقت کا شدید احساس رکھتی ہوں کہ قلم انسان کے ہاتھ میں ایک بہت بڑی امانت ہے اور یہ امانت کسی منطق کے تحت کسی کو نہیں ملتی بلکہ جس کسی دیوانے کے نام قرعہ فال نکل آئے، اس کا امین ٹھہرتا ہے۔ مگر ہر کوئی یہ بار امانت اٹھانے کا اہل نہیں ہوتا۔ یہیں سے لکھنے والے کا المیہ شروع ہوتا ہے۔ وہ، جس کے نام پر قرعہ فال نکل آئے اور جو محسوس کرے کہ وہ یہ بار اٹھانے کا اہل نہیں اور جو پھر بھی اس صلیب کو اپنے کاندھوں پر لیے لیے پھرنے پر مجبور ہو کہ اس کے بغیر اس کے وجود کا کوئی جواز نہ بنتا ہو۔ اور یہ تو محض مقدر کی بات ہے کہ انسان کبھی وہ چیز لکھ سکے کہ دنیا میں اس کا آثار رائیگاں نہ جائے۔"

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۸ء)

خالدہ حسین

پرندہ

ہاں! میں انہیں خوب پہچانتا ہوں ۔ یہ اسی کے قدموں کی چاپ ہے ۔ زینے پر پوری گیارہ سیڑھیاں ۔ پھر دروازے کی ہلکی سی آہٹ اور وہ قدم' نرم رواں بادلوں کے سے تیرتے قدم ۔ ادھر اس دہلیز سے اندر ہوں گے اور اس کمرے کا وجود بدل جائے گا ۔ میں بدل جاؤں گا ۔ ایک ان دیکھا مفہوم اس کمرے میں' میرے' اس کے' ہر چیز کے گرداگرد تن جائے گا۔ وہ آہستگی سے اپنے سرد ہاتھ سے میری کلائی تھامے گی ۔ اس کی بے وزن انگلیاں میری نبض ٹٹولیں گی اور گھڑی کی ٹک ٹک چاروں سمت فضا بن کر بہنے لگے گی ۔

"گڈ" وہ سرہانے رکھے چارٹ پر جھک جائے گی ۔

"رات نیند کیسی آئی ؟" وہ کرسی میرے قریب کھسکا لے گی ۔ تب مجھے وہ تمام باتیں بھولی بسری ۔ دور افتادہ ' ادھر ادھر کونوں کھدروں میں پڑی ' خاک اٹی یاد آجائیں گی ۔ ایک دم سے ' ایک ساتھ ' ایک ہی ساعت میں اور میں اسے بتاؤں گا۔ دیکھو یہ جو ایک سیدھی لکیر کا تسلسل ہمارے تمہارے ذہنوں میں ہے سب فریب ہے۔ میں تو اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کہیں بھی کوئی پہلے یا بعد شروع اور آخر۔ آگے اور پیچھے نہیں۔ سب کچھ ایک ہی ہے ساعتیں ایک دوسرے میں گھل مل رہی ہیں۔ ایک محلول ہے' میرے سامنے میری زبان پر یا شاید میری آنکھوں میں' بے رنگ' بے ذائقہ محلول' جس طرح بے کار' بے ذائقہ زبان' اور یہی سب کچھ ہے۔ دراصل وجود ہے اور یہ سب کچھ میں اس سے نہایت آسانی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ اسی ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ سمجھ سکتی ہے۔ مگر یہ کہتے کہتے میرے سب الفاظ گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ اس کمرے کے بعد آگے قطار میں اور بھی کمرے ہیں اور سب میں ایک ایک میں' ہاں ایک ایک میں اسی طرح بستر پر کسی ایک ساعت کا منتظر۔ اس سے خائف' اس سے پناہ لئے پڑا ہے اور کیا معلوم میں ان میں سے کون سا ہوں۔ چنانچہ میں اس سے صرف اسی قدر پوچھتا ہوں۔

"کیا تم کو بھی ایک ساعت ۔ ایک پیچھے پیچھے لپکنے والی ساعت کا انتظار ہے اور تم اس سے خائف ہو۔ ایک تجسس کے ساتھ؟"

"ہاں ہم سب اس کے منتظر ہیں ۔ اس سے خائف ہیں اور متجسس ۔"

"مگر تم ابھی ۔ تمہیں مجھ پر کتنی ہی فوقیتیں حاصل ہیں!"

"تم نے پھر بھاری بھاری لفظ بولے ۔ دیکھو میں یہ فوقیتیں وغیرہ نہیں سمجھتی ۔ میں تو صرف اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ لفظ --- خالی لفظ نہایت مبتذل چیز ہیں۔"

"مبتذل ؟ تو کیا تم بھی ---"

"ہاں --- تم عجیب آدمی ہو --- نہ چاہتے ہوئے بھی میں تم سے وہ تمام باتیں کہہ دیتی ہوں جو میں کبھی کسی قیمت پر کسی اور سے نہ کہوں--- لفظوں میں سوچنا--- محسوس کرنا نہایت مبتذل حرکت ہے۔"

"تو پھر کس طرح سوچا اور محسوس کیا جائے ۔" میں آپس میں محلول ہوتی ساعتوں میں بہہ گیا ۔ ایک بے ذائقہ بے رنگ احساس میری زبان پر تھا اور یہی سب پر محیط تھا ۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔ اسی لئے میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔" اس نے کرسی کی پشت کے ساتھ سر لگا کے اطمینان سے کہا۔ مجھے اس کی خود فریبی پر ہنسی آگئی اور پہلی بار میں نے نہایت اعتماد کے محسوس کیا کہ میں ہر طرح سے اس سے کہیں بہتر ہوں۔ اس پر فوقیت رکھتا ہوں۔

"شاید اس لئے کہ تم لکھ ہی نہ سکتی تھیں۔ تم اچھی رائٹر نہ تھیں، لکھنے والے تو کبھی لکھنا نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ سب کے سب جھوٹے ہوتے ہیں۔ بناوٹی۔"

"ہاں شاید ---- یہ بھی درست ہو ---- میں نے کب کہا کہ میں لکھنے والی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں غصے کا سایہ لہرایا۔ لکھنے والا تو کوئی کوئی ہوتا ہے۔ ہاں یوں تو بہت سے لکھتے ہیں -- لکھتے رہیں گے۔ دراصل میں نے تو یہ جانا تھا ایک دم --- ایک عجیب خاموش، پرسکون دوپہر میں ---- اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ زندگی کہیں بھی نریشن نہیں۔"

"نریشن؟"

"ہاں! کہیں بھی نریشن نہیں ---- ہاں لفظ ہیں اور عمل اور وقت ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ وقت کا ایک ٹکڑا ہے اور کچھ ناقص لفظ اور ادھورا عمل، تو یہ نریشن تو دراصل ہم خود بناتے ہیں۔ عمل کو لفظوں میں لکھنے کے مجرم ہم خود ہیں۔ مجرم اس لئے کہ وہ تسلسل جو ہم پیدا کرتے ہیں۔ وہ منطق جو اس میں لا ڈالتے ہیں، اس کے جھوٹ سچ کو نہیں جانتے محض ایک مفروضہ کی بناء پر لکھ ڈالتے ہیں لہٰذا یہ غلط ہے۔"

"مگر جب ہم لکھیں گے نہیں تو لفظوں میں سوچیں گے ضرور۔"

"اور سوچ۔ سوچ بغیر عمل کے نہایت مبتذل ہے۔"

"تو پھر ہم کیا کریں؟"

"عمل ---- صرف عمل ---- اور لکھنا اور سوچنا تو صرف نبیوں اور ولیوں کا حصہ ہے۔"

"تم بھی حیران کرتی ہو --- سخت حیران۔" میں نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہو ---- لیٹے رہو --- اس نے آہستگی سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کے مجھے لٹا دیا۔

اور مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ میں تو منتظر ہوں۔ وہ سب بھی منتظر ہیں اور یہ جو میرے سامنے بیٹھی ہے، اس کو مجھ پر کتنی فوقیتیں حاصل ہیں۔ کوئی گننا چاہے تو نہ گن سکے۔

"دیکھو ---- یہ سب انتہائی غلط ہے کہ ہم اپنی سوچ کو یوں بحث میں لائیں۔ آئندہ ہم ایسا نہیں کریں گے۔"

"ہم" ---- تو کیا میرے تمہارے درمیان وجود کے مفہوم کا کوئی رشتہ بھی ہے۔ اگر ہے تو یہ صرف میرے ساتھ نہیں ہے۔ ان باقی تمام کے ساتھ بھی ہے، تو تم اس طرح علامت سی بن جاتی ہو اور یہ سب نہایت غلط بات ہے۔ بہرحال میں تو تمہیں بتانے والا تھا کہ میں وہاں پھر گیا تھا۔"

"تم --- تم وہاں گئے تھے؟ وہ اپنی حیرت نہ چھپا سکی اور فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ رہی۔

"ہاں --- میں وہاں گیا تھا۔ مگر تم کب یقین کرو گی ---" شاید میری آواز میں حد سے زیادہ آزردگی تھی۔

"نہیں ---- نہیں ---- اگر تم چاہو گے تو میں یقین کروں گی۔ تم وہاں گئے تھے؟"

"ہاں ---- میں وہاں پھر گیا تھا۔ آج بھی دھوپ بہت تیز تھی۔ سڑک تپ رہی تھی۔ میرا سر یوں تھا جیسے کیتلی میں پانی ابلتا ہو۔ پیاس کے مارے زبان پر کانٹے پڑ گئے تھے۔ مگر سنو یہ کتنی عجیب بات ہے۔ وہاں کی سڑکیں بالکل ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ وہ کناروں کناروں سے، جہاں جہاں سے گلیوں کی اینٹیں اکھڑی تھیں۔ اسی طرح تھیں۔ گھروں کی کھڑکیوں پر رنگین چقیں اسی طرح گری تھیں۔ وہ کونے والا مائی جنت کا مکان ہے۔ اس کا بوریئے کا پردہ تو ہوا میں ہلتا تھا اور حد ہے اس نے اب تک اس کا سوراخ مرمت نہیں کیا تھا۔ نالیوں میں خربوزے کے بیج اور آموں کے چھلکے پڑے تھے۔ تو جب میں اسکول والی گلی پار کر کے آگے بڑھا تو میرے گھر کا لکڑی کا دروازہ ادھ کھلا تھا حالانکہ ان گلیوں میں بھیڑ

بکریوں کا گھس آنا تو ایک عام سی بات ہے۔ پھر بھی ان لوگوں نے دروازہ کھلا رکھا تھا۔۔۔ تو میں بغیر دستک دیئے اندر چلا گیا۔ اندر نہایت اندھیرا تھا اور ٹھنڈک میں ڈیوڑھی پار کر کے صحن میں پہنچا تو بڑی اچھی پر سکون روشنی تھی۔ آنکھوں کو آرام دینے والی۔ سامنے برآمدے میں تخت پوش پر ماں بیٹھی سبزی بنا رہی تھی اور حقے کی نے اس کے منہ میں تھی۔ مجھے دیکھ کر ماں نے کہا۔ "بڑی سخت لو چل رہی ہے۔ تم کہاں گلیوں میں مارے مارے پھرا کرتے ہو۔ چلو نمکین لسی کا گلاس پیو۔ وہاں میز پر جگ رکھا ہے۔ میں میز کی طرف بڑھا تو ماں نے پیچھے سے کہا۔

"اور یہ کیا تم نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔ تم جانتے ہو مجھے ان سب کا سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔ پانی کی ناپاکی کی مصیبت الگ۔ تمہارے ابا بھی سخت ناراض ہو رہے تھے۔" میں نے حیران ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔

"کیوں۔۔۔ کیوں ناراض ہو رہے تھے؟"

"بھئی کیا عذاب ڈال رکھا ہے۔" اس نے چھت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ تب میں نے دیکھا برآمدے کی چھت میں جو بڑا کنڈا پنکھے کی خاطر لگا تھا اس میں رنگین ڈوری کے ساتھ وہ لٹک رہا تھا۔۔۔ ایک پنجرہ۔

"اس میں کیا ہے؟" میں گلاس چھوڑ کر آگے بڑھا۔ مگر اس پنجرہ پر کپڑا پڑا تھا۔ میں نے اسے ہٹانا چاہا تو ماں چلائی۔

"رہنے دو۔۔۔ یہ کپڑا نہیں ہٹاؤ۔ بیمار ہے بیچارہ۔۔۔ ڈر جائے گا۔۔۔ مر جائے گا۔" نفرت کی سیاہ لہر میرے پیٹ میں اٹھی۔

"تو پھر ادھر کیوں رکھا ہے اسے؟" میں دھاڑا۔ اس پر ماں بولی۔ "میں کیا جانوں تمہیں تو لے کر آئے تھے۔ رکھ گئے تھے بغیر کچھ کہے سنے۔"

"میں۔۔۔؟ ہاں تو کیا حرج ہے۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں نے ہی رکھا ہے۔۔۔ پھر۔۔۔؟" میں غصہ میں باہر آگیا۔ "کیا تم جانتی ہو وہ پنجرہ وہاں کیوں ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میں نہیں جانتی اور کیا تم جانتے ہو کہ وہ مکان' وہ گلیاں۔۔۔ آج سے بیس برس پہلے کارپوریشن والوں نے ڈھا دی تھیں۔ تمہاری ماں کی زندگی ہی میں؟"

"نہیں' نہیں۔۔۔ میں نہیں جانتا۔۔۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ میں وہاں گیا تھا۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"ہاں۔۔۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا اب میں چلوں۔ وقت ہو گیا ہے۔" اس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ مگر اس کے جانے کے بعد۔۔۔ فوراً بعد میں نے اگلے روز اس کے آنے کی ساعت کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ساعتیں ایک دوسرے میں مکمل مل کر سیال بنیں' میری آنکھوں کا خون' پورے وجود کے اندر باہر چاروں سمت بہہ نکلی تھیں اور وہ یہ کہہ گئی تھی کہ لفظوں میں سوچنا اور سوچ کے متعلق سوچنا نہایت مبتذل حرکت ہے۔ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ وہ اور میں۔۔۔ ہم دونوں ابتذال سے اس قدر خوفزدہ ہیں۔ مگر یہ کیا کہ وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔۔۔ اس کی آنکھوں میں اس کی آنکھوں میں ایک جانتا ہوا سا۔۔۔ راز بھرا احساس تھا وہ یقیناً جانتی ہے' سب جانتی ہے کہ وہ میرے برآمدے کی چھت سے لٹکا پنجرہ وہاں کیوں ہے۔ کیا میں اسے وہاں رکھ آیا تھا؟ ماں کہتی ہے۔۔۔ اور وہ اس پر لپٹا کپڑا؟ ہاں رات کو پرندے جانوروں سے ڈرتے ہیں۔۔۔ شاید اسی لئے۔۔۔ مگر ماں کہتی ہے وہ بیمار ہے۔ وہ پردہ ہٹا تو ڈر جائے گا' مر جائے گا۔ تو کیا وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔ شاید وہ مجھ سے چھپا رہی تھی۔ اب اس کے آنے کی ساعت' جو ایک روشن دیوار کی طرح کہیں میرے پیچھے کھڑی تھی اور میں اس کے سایہ میں تھا۔ اب اس دیوار نور کے میرے قریب آنے میں آوازوں' لفظوں اور ادھوری حرکتوں کے رینگتے سرسراتے ٹکڑے حائل ہیں۔

اسکے قدموں کی چاپ پر میں سنبھل کر ہی بیٹھا۔ میرا رواں رواں ساعت بن گیا اور گھڑی کی ٹک ٹک کا سمندر چاروں سمت بہنے لگا۔

"گڈ۔۔۔" اس نے آہستہ سے کرسی آگے کھسکائی۔ "رات نیند کیسی آئی؟"

"سنو روز تم مجھ سے پوچھتی ہو۔۔۔ آج تم بتاؤ۔۔۔ رات تمہیں نیند کیسی آئی؟" وہ کچھ ٹھٹکی' پھر ہلکی سی مسکراہٹ سے کہنے لگی۔

"نیند ---- ؟ نیند دراصل بہت ہی ذاتی قسم کی --- بے حد ذاتی قسم کی چیز ہے اور میں اس کا حجاب نہایت ضروری سمجھتی ہوں۔"

"تم مجھے حیران کرتی ہو۔ " میں نے پھر کہا۔ جب تم میں اور مجھ میں ایک خاموش معاہدہ ہے --- مگر میں تم سے یہی کہنے والی تھی کہ نیند سے پہلے کے چند لمحے وہ ہیں' جب ہم بالکل تنہا اور نہتے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے اردگرد کے تمام حصار ٹوٹ چکتے ہیں تو اس وقت محض ایک خوف مجھے گھیر لیتا ہے۔ وہ تم جانتے ہو---؟"

"ہاں میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں۔ "

"ہاں یہ خوف کہ یہ ننھا لمحہ اگر کبھی ختم نہ ہوا تو --- اگر یہی ہمارے حصے کا تمام وقت بن گیا تو --- ؟"

"ہاں --- تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر تم کو مجھ پر اتنی فوقیتیں حاصل ہیں۔ تمہیں ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ تم خود کہتی ہو یہ مبتذل ہے۔"

"یہ سوچ نہیں --- اس کے لفظ ہیں --- یہ تو احساس ہے۔

محض احساس ----دن کے اجالے میں ہم اپنے آپ کو دوسروں میں کھو دینے کی کوشش کرتے ہیں' سمجھتے ہیں کہ وہ لمحہ ختم ہوا۔ مگر یہ سب غلط ہے۔ رات' نیند اور فنا ہم پر تنہا آتی ہے۔ تم نے سنا --- تنہا۔"

"ہاں --- میں نے سنا --- میں نے سن لیا۔ مگر میں سوچتا ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ تنہا نہ ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں ؟ کیا یہ بالکل ناممکنات میں سے ہے ؟" میں نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے کہا --- مگر اس نے اپنے خوبصورت ہاتھ کے ذرا سے دباؤ سے مجھے لٹا دیا۔

"لیٹے رہو --- لیٹے رہو۔ یہ میں نہیں جانتی۔---" اس نے فوراً مجھ سے نگاہ چرائی۔ اور باہر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔

"تمہیں معلوم ہے یہ خزاں کا موسم ہے۔ باہر ٹھنڈی صبح --- تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ خشک بالکل خشک اور درختوں سے خشک پتے مسلسل ہر لمحہ۔ ہر آن گرتے چلے جا رہے ہیں۔ صبح و شام ---- اور کبھی کبھی اچانک بے حد مصروفیت میں رک جاتی ہوں --- یکدم مجھے خیال آتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میرا آخری دن ہے۔ چنانچہ میں اپنے اس آخری دن کو دیکھتی ہوں۔ اس کی اترتی دھوپ کو اور جب دیواروں کو اور سوچتی ہوں یہ میرا آخری دن ہے۔ یہ کیسا لگتا ہے اور شاید ہر کوئی بھی' کسی وقت اچانک رکتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ آخری دن ہے۔ مگر میں بھول گئی ہم نے طے کیا تھا کہ کبھی اپنی سوچ پر بات نہ کریں گے۔"

"نہیں ---- نہیں ---- ہمیں ضرور بات کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ بہت سی باتیں جب نہ کی جائیں تو ٹھوس واقع بن جاتی ہیں اور پھر ان کو ختم کرنا ان سے بچنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔" میں نے اسے روکنے کی نہایت کمزور سی کوشش کی۔ وہ گھڑی دیکھ رہی تھی۔

"تم وقت کی اتنی پابند ہو --- کیوں اتنی پابند ہو۔ تم ایک لمحہ پہلے آتی ہو نہ بعد میں۔ دو پل رک جانے کو کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔"

"کیوں ---- یہ تو محض تمہارا خیال ہے۔ دراصل مجھے گھر وقت پر پہنچنا ہوتا ہے۔ جب میں ان کو کھانا کھلاتی ہوں تو میری تمام بے کار سوچ مر جاتی ہے' میں خوش ہوتی ہوں۔ مگر پھر کچھ ہی دیر میں وہ لڑھکتے موتیوں کی طرح مجھ سے الگ۔ دور ہو جاتے ہیں اور عمل رک جاتا ہے۔ وقت رواں رہتا ہے' لفظ یلغار کرتے ہیں اور یہ سب انتہائی بے سود ہے۔"

"ہاں ---- تم ٹھیک کہتی ہو --- مگر ----"

"اچھا ----دوا کھانا نہیں بھولنا ---- اور سر اونچا رکھو ادھر تکیہ پر ---"

وہ بادلوں کے سے تیرتے قدموں سے چلی گئی اور دروازہ بند ہو گیا --- او خدا --- اس کے جاتے ہی یہ مجھے اتنا کچھ یاد کیوں آ جاتا ہے۔ مجھے تو اس سے پوچھنا تھا' اس پنجرہ کے متعلق اور اس کے اندر رہنے والے کے بارے میں۔ پھر یہ سب کچھ کل پر ملتوی ہو گیا۔ لیکن نیند سے پہلے کا ایک یہ ننھا لمحہ اگر طویل ہو گیا۔ محلول ہو گیا اور ساعتوں میں تو سب کا رنگ بدل جائے گا---- ذائقہ بدل جائے گا---- اور ہم

سب کے سب اس میں بہہ جائیں گے۔

مگر اچانک مجھے برابر والے کمرے سے پلنگ اور کرسیاں گھسیٹنے کی آواز آئی ---- پھر بوجھ گھسیٹتے' بمشکل سیڑھیاں اترتے ناہموار قدموں کا ہجوم ---- اور سب کچھ ختم گیا۔ تو یہ واقعی کسی کا' ساتھ والے کا آخری دن تھا۔ یہ کیسا تھا؟ میں نے کھڑکی میں سے باہر نظر دوڑانے کی کوشش کی ------ وہاں کہیں کہیں اکا دکا پتے اڑ رہے تھے اور بس ------ تو یہ دن بھی اور دنوں کا سا تھا اور پھر ایک دم مجھے ہنسی آگئی۔ تو ایک بار پھر وہ کوئی دوسرا تھا---- میں نہیں تھا۔ میرے پیٹ میں ایک تاریک ہستی قل قل کر رہی تھی۔ اچھا وہ کل سب سے پہلے مجھے یہی خبر دے گی۔

مگر میرا خیال غلط تھا۔ اس نے اگلے روز مجھے یہ خبر نہ دی۔ وہ اسی طرح ایک خوشگوار واہمے کی صورت وارد ہوئی' میری نبض گنی اور چارٹ پر جھک گئی۔ اس کی جھکی آنکھیں دیکھ کر مجھے گزری رات کی بھولی بسری ساعتیں یوں یاد آئیں جیسے صدیوں پہلے کی بات۔ اتنی جلد ان پر خاک اٹ گئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے خوشدلی سے پوچھا۔

"میری طرف دیکھو۔" میں نے ڈوبتی آواز میں کہا --- میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان وجود کے مفہوم کا کون سا رشتہ ہے۔ مگر وہ اسی طرح جھکی چارٹ پر لکھتی رہی شاید وہ بھی اس رشتہ کا تعین کرنا چاہتی تھی اور مجھے ایک دم غصہ آگیا۔ گرم لہو میری کنپٹیوں اور آنکھوں میں کھولنے لگا۔ میرا سر بھاپ بن کر اڑ گیا۔

"میری نبض نہ گنو---- میرا بلڈ پریشر نوٹ نہ کرو--- اس کاغذ کو چاک کر دو۔" میں نے گویا زہر گلے سے اتارتے ہوئے کہا۔

"اگر تم نہ بھی آؤ تو کیا ہے۔ لیکن یہ تو تمہارا فرض ہے۔ مجھے بتاؤ اور کیا کیا فرض ہے------ میں نے------ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔" میں نے غصہ سے کانپتی آواز میں کہا۔ میری مٹھیاں زور سے بھنچ گئیں۔

"سکون------- سکون---- لیٹ جاؤ------" اس نے مجھے آہستگی سے لٹانا چاہا۔

"نہیں---- تم نے ایک ان کیا معاہدہ توڑا ہے۔ تم نے مجھ سے بہت کچھ چھپایا ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دینا چاہا۔ مگر مجھ میں اتنی قوت کہاں تھی۔ وہ خاموشی سے کرسی میں بیٹھی رہی۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ خاموش رہی اور گھڑی ٹک ٹک بولتی رہی۔

"سنو----- اگر سن سکتی ہو تو سنو---- میں وہاں پھر گیا تھا۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تم کچھ نہیں جانتیں---- جب آج میں وہاں گیا تو ماں وہاں تخت پوش پر بیٹھی چاول چن رہی تھی اور گھر کا آنگن ایسا تھا جیسے ابھی ابھی اباجی ناراض ہو کر' بول بول کر' باہر نکلے ہوں----- ماں نے کہا بیٹھ جاؤ۔ آج جانے کیا بات ہے اس میں کوئی آواز نہیں آرہی----- کوئی ہل جل نہیں۔"

"کس میں سے؟" میں نے پوچھا تو اس نے برآمدے کی چھت سے لٹکے اس ڈھکے ڈھکائے پنجرہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے چاہا کہ لپک کر اٹھا کر دیکھوں کیا بات ہے۔ مگر ماں نے مجھے روک دیا۔

"نہیں نہیں------- رہنے دو۔ بیمار ہے بے چارہ۔ ڈر جائے گا۔ مر جائے گا۔ وہ آتی ہی ہوگی۔ خود ہی دیکھے گی۔"

"وہ کون------؟" میں نے پوچھا تو اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا---- میں نے دیکھا وہاں تم کھڑی تھیں --- تم---- اور تم کہتی ہو تم وہاں کبھی نہیں گئیں۔"

"میں کھڑی تھی؟" وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔

"ہاں تم--- اور پھر جانتی ہو' سب سے بڑا نستہ لمحہ وہ تھا جب تم نے مجھے دیکھنے کے باوجود نہ دیکھا۔ تم چپکے سے آئیں پنجرہ کا غلاف اٹھایا----- پھر تمہارے منہ سے عجب حقارت اور کراہت بھری آواز نکلی "اوں ہوں" تم نے انگلی اور انگوٹھے کے درمیان اسے کنڈے سے

اٹھایا۔

"اوں ہوں ------ سب کا سب کیڑوں سے بھرا ہے ------ "تم نے پنجرے کا دروازہ کھول کر اسے زور سے باہر نالی میں الٹ دیا--- اس کو جو اس کے اندر تھا۔ اس کے گرنے کی آواز آئی--- میں آگے لپکا کہ دیکھوں ------ اسے دیکھوں۔ مگر تم راستے میں کھڑی تھیں اور مجھے اس خوف نے آ دبایا کہ کہیں یہ اس نبتے لمحے کا آغاز نہ ہو اور میں رک گیا۔ چلا آیا--- چلا آیا بھاگتا ہوا۔ دیکھو میرے پاؤں میں چھالے پڑے ہیں۔"

نہیں ----- نہیں ------ مجھے نہیں دکھاؤ ----- "اس نے میری پیشانی پر اپنے خوشگوار ٹھنڈک بھرے ہاتھ رکھے۔ "مجھے نہیں دکھاؤ۔ یہ ہمارا معاہدہ ہے--- ہم ایک دوسرے کے زخم نہیں دیکھیں گے، مگر کیا تمہیں یقین ہے کل رات جو آوازیں برابر کے کمرے سے آئیں وہ اسی کمرے کی تھیں تمہارے کی نہ تھیں؟"

محمد منشایاد

نام : محمد منشا۔
قلمی نام : محمد منشایاد / منشایاد۔
پیدائش : ۵ ستمبر ۱۹۳۷ء، ضلع شیخوپورہ مغربی پنجاب، پاکستان۔
تعلیم : ڈپلوما سول انجینئرنگ، ۱۹۵۷ء
ایم۔اے (اردو۔پنجابی)

ایم۔بی ہائی اسکول حافظ آباد سے میٹرک کا امتحان ۱۹۵۵ء میں پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ سکول آف انجینئرنگ رسول سے ۱۹۵۷ء میں سول انجینئرنگ کا ڈپلوما لیا۔ ۱۹۶۳ء میں فاضل اردو اور ایف۔اے۔ کے امتحانات بطور پرائیوٹ امیدوار پاس کیے۔
۱۹۶۳ء میں پنجاب یونی ورسٹی، لاہور سے بی۔اے اور ۱۹۶۷ء میں حشمت علی اسلامیہ کالج، راولپنڈی سے ایم۔اے (اردو) بطور پرائیوٹ امیدوار کیا۔ بعدازاں پرائیوٹ طالب العلم کے طور پر پنجاب یونیورسٹی اور ینٹل کالج لاہور سے ۱۹۷۲ء میں ایم۔اے (پنجابی) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

ضلع شیخوپورہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پرائمری اسکول پاس کرنے کے بعد ایم۔بی ہائی سکول (حال گورنمنٹ ہائی سکول نمبرا) حافظ آباد، ضلع شیخوپورہ میں داخلہ لیا جہاں پہنچنے کے لیے سائیکل پر بیس میل کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔ بچپن اور لڑکپن میں لوک داستانیں اور پنجابی قصے کہانیاں پڑھتے پڑھتے شاعری اور افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ میٹرک کرنے کے زمانے میں ان کی چند نظمیں اور کہانیاں پندرہ روزہ "ہدایت" لاہور میں شائع ہوئیں اس پرچے کو نظر زیدی مرتب کیا کرتے تھے۔ والدہ کی وصیت اور خواہش کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب ادھورا رہا اور گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے انھیں میٹرک کے بعد سول انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کرکے ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ ۱۹۵۸ء میں پی ڈبلیو ڈی شعبہ بحالیات راول پنڈی میں بطور سب انجینئر آئے، کچھ وقت کوہ مری میں گزارا۔ ۱۹۶۰ء میں بطور سب انجینئر سی۔ڈی۔اے (دارالحکومت اسلام آباد کا ترقیاتی ادارہ) سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۷۳ء میں اسسٹنٹ انجینئر کے عہدہ پر ترقی ملی۔ ۱۹۸۰ء میں سی۔ڈی۔اے کے افسر تعلقات عامہ مقرر ہوئے۔ جولائی ۱۹۸۳ء میں "افسر اعلیٰ شکایات" سی۔ڈی۔اے مقرر ہوئے، آج کل ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔

حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کے بانی رکن ہیں۔ تقریباً دس برس تک حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد اور "بزم کتاب" اسلام آباد کے سیکرٹری رہے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے پنجابی اور اردو میں متعدد ڈرامے لکھے۔ اسلام آباد کی ادبی انجمنوں کی روح رواں ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"کمائی" مطبوعہ "داستان گو" لاہور نومبر ۱۹۵۹ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "بند مٹھی میں جگنو" (اردو افسانے) ماورا پبلشرز' راول پنڈی: طبع اول: ۱۹۷۵ء
اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ ء شاہکار لاہور نے شائع کیا ہے۔
۲۔ "ماس اور مٹی" (اردو افسانے) ماڈرن بک ڈپو' اسلام آباد: طبع اول: ۱۹۸۰ء
۳۔ "خلا اندر خلا" (اردو افسانے) مطبوعات حرمت راول پنڈی: طبع اول: ۱۹۸۳ء
۴۔ "وقت سمندر" (اردو افسانے) ماڈرن بک ڈپو' اسلام آباد: طبع اول: ۱۹۸۶ء
۵۔ "وگدا پانی" (پنجابی افسانے) پنجابی ادبی بورڈ' لاہور: طبع اول: ۱۹۸۷ء
۶۔ "۱۹۷۷ء کے شاہکار افسانے" (مختلف افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا انتخاب) مکتبہ ء شاہکار' لاہور: طبع اول: ۱۹۷۸ء
۷۔ "منتخب افسانے: ۱۹۷۹-۸۰ء" (بہ اشتراک: فتح محمد ملک) مطبوعات حرمت' راول پنڈی: طبع اول: ۱۹۸۱ء
۸۔ "منتخب افسانے: ۱۹۸۱ء" (بہ اشتراک: فتح محمد ملک) مطبوعات حرمت' راول پنڈی: طبع اول: ۱۹۸۲ء
۹۔ "منتخب افسانے: ۱۹۸۲-۸۳ء" (مرتبہ: محمد منشا یاد) مطبوعات حرمت' راول پنڈی: طبع اول: ۱۹۸۵ء
۱۰۔ "درخت آدمی" (افسانے) مطبوعہ: بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ' لاہور: طبع اول: ۱۹۹۱ء

غیرمدون:

لگ بھگ ایک افسانوی مجموعہ اور ریڈیائی و ٹیلی ڈراموں کا ایک مجموعہ۔

اعزاز:

۱۔ ہجرہ ایوارڈ برائے "وگدا پانی" ۱۹۸۷ء
۲۔ نقوش ایوارڈ

مستقل پتا:

۳۶۲۔ ای' سٹریٹ ۷۵' جی سکس فور' اسلام آباد۔ پاکستان۔

نظریہ فن:

"افسانہ اختصار اور وحدت تاثر کا حامل ہو۔ اس میں کہانی کا تار یا خیال کا تسلسل موجود ہو۔ اظہار فطری اور دل کش ہو، لیکن محض کسی واقعہ کا سادہ بیان نہ ہو۔ اس میں تخلیقی کاوش اور افسانویت موجود ہو۔ موضوع میں نیا پن اور تنوع ہو۔ فکر و احساس کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ پڑھنے والے کا اپنا تجربہ اور واردات بن جائے، بحیثیت مجموعی زندگی اور فن کو آگے بڑھائے۔"

(بہ حوالہ: مکتوب بنام مرزا حامد بیگ محررہ: مارچ ۱۹۸۶ء)

محمد منشا یاد

راستے بند ہیں

وہ میلہ دیکھنے آیا ہوا ہے اور اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

میں اس سے پوچھتا ہوں۔

"جب تمہاری جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی تو تم میلہ دیکھنے کیوں آئے ہو؟"

وہ پہلے روتا اور پھر ہنستا ہے اور کہتا ہے۔

"میں میلے میں نہیں آیا --- میلہ خود میرے چاروں طرف لگ گیا ہے اور میں اس میں گھر گیا ہوں۔ میں نے باہر نکلنے کی کئی بار کوشش کی ہے مگر مجھے راستہ بجھائی نہیں دیا۔"

مجھے اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس لئے میں پریشان ہو جاتا ہوں کیونکہ میں اس کی نگہداشت پر مامور ہوں۔ مجھے پتہ نہیں، مجھے اس کی نگہداشت پر کس نے مامور کیا ہے؟ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ہر وقت اس کے ساتھ رہنا اور اسے بھٹکنے سے بچانا ہے۔

میلہ زوروں پر ہے۔

چاروں طرف انسان ہی انسان نظر آتے ہیں جتنے لوگ میلے سے جاتے ہیں اس سے کئی گناہ زیادہ آ جاتے ہیں۔ سڑکوں پر ہر طرف تانگے، بیل گاڑیاں، بسیں، ٹرک، کاریں اور موٹر سائیکلیں ایک دوسری سے آگے نکلنے کی ناکام کوشش کرتی، ہارن بجاتی، دھواں اڑاتی نظر آتی ہیں۔ ہارن بجا بجا کر ڈرائیوروں کے اور مسلسل گھنٹیاں بجا بجا کر سائیکل سواروں کے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ پیدل چلنے والوں کے چہرے دھول سے اٹے ہوئے ہیں اور کپڑوں پر گرد جمی ہے لیکن میلے کے شور نے ان کے تھکے ہوئے نڈھال جسموں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ میلے کی فضا کو دھوئیں، گرد اور شور و غل کے بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ بڑے بڑے لاؤڈ سپیکروں پر انسانی آوازیں گرجتی اور چنگھاڑتی ہیں۔ جھولوں کی چیخیں، ڈھولوں کی گھمکاریں، مداریوں کی بانسریوں کی کوکیں اور خوانچہ فروشوں کی صدائیں ایک دوسری میں خلط ملط ہو رہی ہیں۔ ان سینکڑوں قسم کی آوازوں کے شور میں اسے سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی "ٹک" جیسی آواز سب سے اچھی لگتی ہے وہ اسے کسی سریلے نغمے کی طرح سنتا اور چاٹتا ہے۔ میں نے کئی بار چلا چلا کر اسے آگے بڑھنے کے لئے کہا ہے مگر وہ سوڈا واٹر کی بوتلوں کی دکان کے سامنے پتھر ہو گیا ہے۔ میرے لئے عجیب مشکل ہے۔ کاش میں اس سے علیحدہ ہو سکتا، اسے اس کے حال پر چھوڑ کر جا سکتا۔ میں اس کی کمینی حرکتوں سے عاجز آ گیا ہوں۔ عجیب ندیدہ آدمی ہے۔ صبح وہ کتنی ہی دیر تک اسی بھٹی کے قریب کھڑا جھلستا رہا جس پر پوریاں تلی جا رہی تھیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں، وہ بار بار جیب میں ہاتھ ڈالتا پھر خالی ہاتھ کو یوں گھورتا جیسے اس کی ہتھیلی پر گرم گرم پوری رکھی ہو۔ عجیب واہیات انسان ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے آدمی کے سامنے اکڑوں بیٹھے کتے کی آنکھ میں بھی اتنا ندیدہ پن نہیں ہوتا، جتنا حلوا پوری کھاتے اور فالودہ پیتے لوگوں کو دیکھ کر اس کی نگاہوں سے جھلکنے لگتا ہے۔

وہ میلہ دیکھنے آیا ہے۔

اور میلے میں دیکھنے کی سینکڑوں چیزیں ہیں۔ تھیٹر کے مسخرے' ناچتی گاتی عورتیں' سرکس کے جانوروں کے کرتب' موت کے کنوئیں میں چلتی موٹر سائیکل اور چلانے والے کی گود میں بیٹھی ہوئی لیڈی' اوپر نیچے جاتے جھولے۔ فلم کی ٹاکی پر دو گانے گاتے ہوئے عاشق و معشوق اور مداری کے توپ چلاتے طوطے لیکن اسے ان میں سے کسی چیز سے دلچسپی نہیں حالانکہ سرکس کے باہر فلمی ریکارڈوں کی دھنوں پر ناچتے مسخروں کو دیکھنے پر تو خرچ بھی کچھ نہیں آتا مگر اسے صرف کھانے پینے کی چیزوں سے دلچسپی ہے۔ اسے پھلوں' مٹھائیوں' فالودوں' آئس کریموں' سوڈا واٹر کی بوتلوں اور سیخوں میں پروئے ہوئے مرغوں کو دیکھنا' گھورنا اور ان کی خوشبو سونگھنا اچھا لگتا ہے۔ اور حالانکہ دونوں وقت پیر صاحب کے ڈیرے پر اسے بھنڈارے کی دال روٹی مل جاتی ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ رات وہ مجھے دیر تک ان مٹھائیوں' پھلوں اور چیزوں کے نام گنواتا رہا جو اس نے کبھی نہیں چکھی تھیں۔ یہ فہرست اتنی طویل تھی کہ میں اکتا گیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ صرف ان چیزوں کے نام بتائے جن کے ذائقے سے وہ آشنا تھا۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ لذیذ چیزوں کے ذکر سے حاصل ہونے والی لذت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔

میلے میں اس کی جان پہچان کے اور لوگ بھی ہیں۔

الٰہی بخش نمبردار کا لڑکا عاشق ہے جو اپنے یار دوستوں کے ہمراہ اپنے یکے پر آیا ہے اور اس کے ڈیرے پر ہر وقت مجرا ہوتا رہتا ہے اور شراب کی بوتلیں خالی ہوتی رہتی ہیں۔ طوائفیں سروں پر رکھے اور دانتوں سے پکڑے ہوئے نوٹ چن چن کر تھک جاتی ہیں۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ وہ عاشق کے ڈیرے پر چلا جائے۔ لیکن میں نے اسے منع کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ وہاں دن رات چلمیں بھرتا رہے۔ پھر سردار محمد تھانیدار ہے اسے اعتباری آدمیوں کی ضرورت بھی ہے لیکن میں نے اسے سردار محمد کے پاس جانے سے بھی منع کر دیا ہے۔ علیا نائی اپنے حال میں مست ہے۔ وہ میلے میں خالی ہاتھ نہیں آیا اپنے ساتھ رچھائی لیتا آیا ہے۔ اس کا جب جی چاہتا ہے حجامتیں بنانے لگتا ہے اور جب جی چاہتا ہے تھیٹر دیکھنے چلا جاتا ہے۔ تھیٹر دیکھتے ہوئے بھی وہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے ناخن تراشتا رہتا ہے۔ صرف مہرو سانسی ایک ایسا آدمی ہے جو اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور خوشی کے اظہار کے لئے جب بھی سامنے آتا ہے دانت نکالتا ہے یا پھر کالو ہے جو اسے دیکھتے ہی دم ہلانے لگتا ہے حالانکہ اس نے زندگی بھر اسے سوکھی روٹی کا ٹکڑا تک نہیں ڈالا۔

اسے مہرو سانسی اچھا لگتا ہے شاید اس لئے کہ مہرو گندی چیزیں سہی' ہر طرح کی کھانے پینے کی چیزوں کے ذائقوں سے آشنا ہے۔ پچھلی بار تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ رات کو جب اچانک آندھی آئی تو کالو کے ساتھ پناہ لینے کے لئے ایک تخت پوش کے نیچے گھس گیا' تخت پوش کے نیچے قلاقند سے بھری کڑاہی رکھی تھی جسے اس نے اور کالو نے خالی کر دیا۔ اس دن مہرو کو باہر نکل کر دوبار گلے میں انگلی ڈال کر قے کرنا پڑی تھی۔ اگر کالو کی دم اس کے پاؤں کے نیچے نہ آجاتی تو ایک آدھ بار اور قے کر کے وہ گلاب جامنوں کا بھی صفایا کر دیتا۔ اسے مہرو اور کالو پر رشک آتا تھا۔ اگر میں اس کے ہمراہ نہ ہوتا یا اس سے بے پرواہ ہو کر سویا رہتا تو وہ یقیناً بھٹک جاتا' چلمیں بھرتا' دلالی کرتا یا پھر کسی تخت پوش کے نیچے گھس کر قلاقند یا گلاب جامنیں کھا رہا ہوتا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کسی حلوائی کی دوکان یا کسی ہوٹل میں گھس کر جی بھر کے کھائے اور خود کو دکاندار یا پولیس کے حوالے کر دے۔ لیکن میں نے ہر لمحہ اسے ایسی حرکتوں سے باز رکھا ہے۔

میلے کا آج تیسرا روز ہے۔

اور میں نہایت مشکل میں ہوں۔

وہ بغاوت پر آمادہ ہے۔

مجھے اس کے تیور بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی بوتل کھلنے کی "ٹک" جیسی آواز سن کر اس کی تشفی نہیں ہوتی۔

وہ حلوہ پوری' قلاقند اور بالوشاہی کے ذکر سے مطمئن نہیں ہوتا۔

بھنے ہوئے گوشت اور روسٹ مرغ کی خوشبو سے اس کا جی نہیں بہلتا اور وہ پھلوں کے نام گنوا کر لذت حاصل کرنے پر قناعت نہیں کرنا چاہتا۔

میں نے اسے بہت سمجھایا ہے۔ لعن طعن اور ملامت کی ہے لیکن وہ مصر ہے کہ وہ ہر قیمت پر ان سب چیزوں کو چکھ کر دیکھنا چاہتا ہے جن کے ذائقے سے وہ نا آشنا ہے۔ گزشتہ رات ہم دونوں دیر تک لڑتے جھگڑتے رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے میں نے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیا تو گھٹ کر مر جائے گا۔

میں عجیب الجھن میں ہوں۔ شاید وہ وقت آگیا ہے۔ جب ہمیں فیصلہ کرنا ہو گا کہ ہم دونوں میں سے کسے زندہ رہنا چاہیے۔

میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

لیکن میں اسے بھی زندہ' خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں اور اسے مداری کے کرتب' جھولوں کے مناظر اور مسخروں کے ناچ دکھانا چاہتا ہوں لیکن وہ قیمہ کریلے' بھنے ہوئے گوشت' روسٹ مرغ اور قلاقند کے ذائقوں کے لئے قتل و غارت پر اتر آیا ہے۔

وہ کہتا ہے "جب یہ سب چیزیں موجود ہیں تو میں ان کے ذائقوں سے محروم کیوں ہوں۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اسے کیسے سمجھاؤں اور بھٹکنے سے کیسے بچاؤں؟ میلے کا آخری اور چوتھا روز ہے۔

رات مجھے ایک نہایت اچھوتا خیال سوجھا ہے اور میں نے بڑی مشکل سے یہ بات اس کے ذہن نشین کرائی ہے کہ اصل میں سب انسان ایک ہی انسان کا پرتو ہیں یا اصل میں انسان ایک ہی ہے جو مختلف شکلوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ کہیں وہ قلاقند کھا رہا ہے۔ کہیں ناخن تراش رہا ہے۔ کہیں روسٹ مرغ اڑاتا ہے اور کہیں بھنڈارے کی دال روٹی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس لئے جو کچھ بھی دنیا میں ہو رہا ہے یا کھایا پیا جا رہا ہے۔ اس کی لذت انسان کی مشترکہ لذت ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی کو حلوہ پوری کھاتے دیکھتا ہے تو اسے محسوس کرنا چاہیے کہ خود حلوہ پوری کھا رہا ہے اور اس لذت میں برابر کا حصہ دار ہے۔

مجھے اس کی یہ عادت بے حد پسند آئی ہے کہ جب اس کے ذہن میں کوئی بات بٹھا دی جائے تو وہ اس سے سرمو ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس نے جلد ہی میری اس انوکھی تجویز پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔

"پک" بوتل کھلنے کی آواز آتی ہے۔

ایک پتلا دبلا آدمی بوتل منہ سے لگاتا ہے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا مسکرا کر میری طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

"واہ واہ کیا ٹھنڈی ٹھار اور مزے دار بوتل ہے۔" پھر آستین سے منہ پونچھ کر کہتا ہے "مزا آگیا۔" سیخ کبابوں کی خوشبو لپکتی ہوئی آتی ہے اور اس کے قدم روک لیتی ہے۔

وہ منہ کھولے بغیر تکوں کو دانتوں سے کاٹتا چباتا ہے۔ پھر ان کی لذت محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"ذرا سخت ہیں مگر گوشت سخت ہی ہو تو مزا دیتا ہے۔"

میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔

اس کی نظریں بالو شاہی کے تھال پر ہیں۔ وہ دکان سے کچھ فاصلہ پر کھڑے کھڑے بالو شاہی کھانا شروع کر دیتا ہے۔ کھاتے کھاتے اس کا منہ تھک جاتا ہے۔ پیٹ پھول جاتا ہے مگر بالو شاہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ میں کہتا ہوں۔ "اور کھاؤ۔"

"نہیں بس" وہ ڈکار لیتے ہوئے جواب دیتا ہے۔ پاپڑ دیکھ کر میں کہتا ہوں۔

"منہ سلونا کرو گے؟"

"ہاں ---"

پاپڑ اس کے دانتوں تلے کڑکڑاتے ہیں۔

"کیسے ہیں"

"بہت اچھے ہیں بس ذرا مصالحہ تیز ہے۔"

"اور کیا پسند کرو گے؟"

"میں نے آج تک سیب نہیں چکھا۔"

میں اسے پھلوں کی دکان کے سامنے لے جاتا ہوں اور سیبوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں۔

"یہ سیب ہیں تم جتنے چاہو کھا سکتے ہو۔"

وہ ایک سیب نگاہوں سے اٹھاتا ہے' دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے۔

"یہ تو ناشپاتی ہے۔"

"یہ ناشپاتی نہیں سیب ہے' تم اسے سیب کی طرح محسوس کر کے کھاؤ۔"

وہ پھر دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے۔ "یہ امرود ہے۔"

"یہ امرود نہیں سیب ہے۔"

وہ پھر کوشش کرتا ہے پھر کہتا ہے۔

"یہ آرڑو ہے" ----

"یہ آرڑو نہیں ہے" ----

مجھے غصہ آجاتا ہے۔

"تم الو کے پٹھے ہو" ----

وہ مجھے اداس نظروں سے دیکھتا ہے پھر روہانسا ہو کر کہتا ہے:

"مجھے کیا پتہ سیب کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے میں نے کبھی کھایا ہی نہیں۔"

"اچھا چھوڑو" ----

میں کہتا ہوں۔

"اب آگے چلتے ہیں۔"

ہم باری باری ایک دوسرے کی انگلی پکڑے چلنے لگتے ہیں۔ ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔

"کیا بات ہے بھائی؟"

وہ پوچھتا ہے۔

"حادثہ ہو گیا۔ آدمی ٹرک کے نیچے آکر کچلا گیا----"

وہ پریشان ہو کر میری طرف دیکھتا ہے۔

پھر کہتا ہے -----

"ٹرک--- میرے اوپر سے ٹرک گزر رہا ہے!-----"

"نہیں----" میں چلاتا ہوں۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہوں وہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

بلراج کومل

نام : بلراج کومل
قلمی نام : بلراج کومل
پیدائش : ۲۵ ستمبر ۱۹۲۸ء بہ مقام سیالکوٹ، مغربی پنجاب۔
تعلیم : ایم۔ اے (انگریزی) پنجاب یونی ورسٹی، لاہور۔ ۱۹۵۳ء
بی۔ اے کا امتحان فیروز پور سے ۱۹۴۸ء میں پاس کیا تھا۔

مختصر حالات زندگی:

بچپن اور لڑکپن سیالکوٹ میں گذرا۔ ۱۹۴۷ء میں اپنے خاندان کے ساتھ دہلی منتقل ہو گئے۔ ن۔ م راشد، میراجی، فیض اور اختر الایمان کے بعد آزاد نظم کا اعتبار بحال رکھنے والے شعراء میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۸ء میں ہوا، جب انہوں نے اپنی پہلی نظم "اکیلی" لکھی۔ افسانے کے میدان میں بہت سست رو لیکن بہت عمدہ۔ آج کل دہلی میں ڈپٹی ایجوکیشن آفیسر، محکمہ تعلیم ہیں۔

اولین مطبوعہ تحریر:

نظم: "اکیلی" مطبوعہ: "سنگ میل" پشاور، مرتبہ: فارغ بخاری و رضا ہمدانی۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"روشنی روشنی" مطبوعہ: "ادبی دنیا" لاہور: ۱۹۶۳ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	"میری نظمیں" (شاعری)	دہلی:	طبع اول: ۱۹۵۴ء
۲۔	"رشتۂ دل" (شاعری)	لاہور:	طبع اول: ۱۹۶۳ء
۳۔	"ناریل کے پیڑ" (شاعری۔ منتخب نظمیں۔ دیوناگری حروف میں)	انجمن ترقی اردو، دہلی:	طبع اول: ۱۹۶۷ء
۴۔	"ہریالی کا ایک ٹکڑا" (ہندی ناولٹ)	لکھنؤ:	طبع اول: ۱۹۶۸ء
۵۔	"سفر مدام سفر" (شاعری)	الہ آباد:	طبع اول: ۱۹۶۹ء
۶۔	"انتخاب" (منتخب شاعری)	انجمن ترقی اردو، دہلی:	طبع اول: ۱۹۷۱ء
۷۔	"نژاد سنگ" (شاعری)	لکھنؤ:	طبع اول: ۱۹۷۵ء
۸۔	"آنکھیں اور پاؤں" (افسانے)	اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد:	طبع اول: ۱۹۸۱ء

۹۔	"پرندوں بھرا آسمان (شاعری)	دہلی:	طبع اول: ۱۹۸۴ء
۱۰۔	"ادب کی تلاش" (تنقید)	لکھنؤ:	طبع اول: ۱۹۸۵ء
۱۱۔	"شہر میں ایک تحریر" (شاعری)	دہلی:	طبع اول: ۱۹۸۷ء
۱۲۔	"منتخب نظمیں" (انگریزی ترجمہ)	دہلی:	طبع اول: ۱۹۸۹ء
۱۳۔	"خلا کے معجزے" (ازایم سندر راجن کا ترجمہ)	نیشنل بک ٹرسٹ 'دہلی:	طبع اول: ۱۹۸۰ء
۱۴۔	"تو رودت" (از پی سین گپتا کا ترجمہ)	ساہتیہ اکیڈمی 'نئی دہلی:	طبع اول: ۱۹۸۵ء

غیر مدون:

انگریزی اور اردو میں لکھے گئے لاتعداد مضامین / تبصرے اور نظمیں۔

مستقل پتا:

ای۔ ۱۳۹ کالکاجی 'نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹ 'بھارت

اعزاز:

۱۔	اترپردیش اردو اکادمی ایوارڈ	:	۱۹۷۱ء برائے "ہریالی کا ایک ٹکڑا" (شاعری)
۲۔	اترپردیش اردو اکادمی ایوارڈ	:	۱۹۸۲ء برائے "سفر مدام سفر" (شاعری)
۳۔	وزارت تعلیمات (ہند) ایوارڈ	:	۱۹۶۹ء
۴۔	امتیاز میر ایوارڈ، لکھنؤ	:	۱۹۷۷ء
۵۔	دہلی اردو اکادمی ایوارڈ	:	۱۹۸۲ء
۶۔	ساہتیہ اکادمی ایوارڈ	:	۱۹۸۵ء

نظریہ فن:

"شعر اور نثر کی حدبندیاں اگرچہ مبہم ہیں لیکن افسانہ بہرحال نثری صنف اظہار ہے۔ اس کی مخصوص ساخت ہی اس کی پہچان ہے۔ سفر واقعہ و کردار 'گوشت پوست اور زمین جزیات و تفصیلات کا سفر بھی ہے اور مرحلہ تکمیل میں لفظ و معنی کے استعاراتی امکانات کا سفر بھی۔ افسانہ آئینہ زندگی بھی ہے اور بعض اوقات شعری انداز میں تجربے کا جوہر بھی۔ افسانے کی علامتی نوعیت اس کے پورے وجود کا حصہ ہوتی ہے۔ محض جزوی شعبہ نہیں۔"

(مکتوب بنام مرزا حامد بیگ مورخہ ۲۷ اگست ۱۹۸۳ء سے اقتباس)

بلراج کومل

کنواں

جب میونسپل کارپوریشن کی طرف سے شہر کے بیشتر حصوں میں پانی کے نل مہیا کر دیے گئے تو شہر کے اکثر کنویں بے مصرف ہو گئے اور کافی عرصہ تک بے مصرف رہے۔ آخر ایک ذہین شہری نے ان کا ایک انوکھا مصرف ڈھونڈ نکالا۔ اس نے ایک جست میں کنواں پھلانگنے کا انوکھا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ نتیجتاً" اس ذہین شہری نے کنواں پھلانگنے کا مشغلہ باقاعدہ طور پر اختیار کر لیا۔ جب وہ ایک کنواں پھلانگ چکتا تو اس کی خواہش ہوتی کہ وہ ایک اور کنواں پھلانگے۔ ہر بار وہ پہلے سے زیادہ مشکل صورت حال کا انتخاب کرتا اور تماشائیوں کی تالیوں اور واہ واہ کے درمیان کنواں پھلانگنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کی مقامی شہرت رفتہ رفتہ قومی شہرت کا درجہ اختیار کر گئی اور اب اس کا نام بیرونی ممالک کے اخبارات میں بھی کہیں کہیں نظر آنے لگا۔

کسی بھی فرد کا کوئی دعویٰ ایسا نہیں ہے جس کو چیلنج کرنے کے لیے دوسرا فرد موجود نہ ہو۔ چنانچہ گو لنکر کے سلسلہ میں بھی یہی ہوا۔ ایک روز اسے ڈاک سے ایک خط ملا۔ یہ خط ایک اجنبی کی طرف سے تھا جس نے گو لنکر کو کنواں پھلانگنے کے مقابلہ کے لیے چیلنج بھیجا تھا۔ گو لنکر نے خط پڑھا اور خط پڑھتے ہی اس کے مردانہ وقار نے تقاضا کیا کہ وہ چیلنج منظور کر لے۔ چنانچہ گو لنکر نے فوراً چیلنج کرنے والے کو تحریری اطلاع دی کہ وہ کسی وقت بھی باہمی خط و کتابت کے ذریعہ طے شدہ شرائط کے مطابق مقابلہ کے لیے تیار ہے۔ اگلے چند ہفتوں کے اندر شرائط طے ہو گئیں اور مقابلے کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ مقامی اور قومی اخبارات میں مقابلہ کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا۔

اگرچہ گو لنکر کہنہ مشق کھلاڑی تھا اور بہت سے کنویں پھلانگ چکا تھا۔ جوں جوں مقابلے کی تاریخ قریب آتی گئی اس کے دل میں خدشات پیدا ہونے لگے۔ ان خدشات پر قابو پانے کے لیے گو لنکر نے فیصلہ کیا کہ چونکہ سوال اپنی شہرت اور وقار کو برقرار رکھنے کا ہے اس لیے مقابلہ سے قبل کنواں پھلانگنے کی کچھ مشق ضروری ہو گی۔ جو مقابلے کا فیصلہ 'نتیجہ کن انداز سے اس کے حق میں کرنے میں مفید ثابت ہو گی۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد گو لنکر نے شہر کے تمام کنوؤں کا (جن میں سے اکثر وہ پھلانگ چکا تھا) بغور جائزہ لیا۔ ہر ایک کنویں کا قطر ناپا۔ پھلانگنے کے زاویوں کا مطالعہ کیا۔ ظاہر ہے گو لنکر جیسی شہرت کے مالک کے لیے شہر کے کنوؤں پر مشق کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اس کام کے لیے شہر سے باہر ایک ویران کنویں کا انتخاب کیا۔ کنواں چاروں طرف سے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ باہر سے گزرنے والا آدمی اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ درختوں کے جھنڈ کے اندر کنواں ہے اس کنویں کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ کہ اسکی منڈیر' اس کا قطر اور اس کے چاروں طرف کی خالی زمین کا حدود اربعہ اس کنویں کے مماثل تھا جو آخری مقابلہ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

کنویں کا انتخاب کرنے کے بعد مناسب تیاری کی ضرورت تھی۔ گو لنکر نے تمام تیاری دو چار روز میں مکمل کر لی اور ایک صبح کنویں کی طرف روانہ ہو گیا۔

مارچ کی یہ صبح بڑی خوبصورت تھی۔ ہوا میں موسم بہار کا اثر تھا لوگوں کے چہروں پر مسرت تھی بچے انگنوں میں کھیل رہے تھے زندگی کا کاروبار معمول سے زیادہ حسن اور خوش اسلوبی سے چلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گو لنکر رنگ و بو کی اس محفل سے لطف اندوز ہوتا ہوا شہر کے دھیرے دھیرے تیز ہوتے ہوئے ہاؤ ہو میں سے گزر کر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف جا رہا تھا جہاں اسے کنواں پھلانگنے کی مشق کرنی تھی اسکا دل اس کا

دماغ اس کا پورا وجود زندگی کے نشے سے سرشار تھا۔ اس کے قدم اعتماد سے اٹھ رہے تھے اور اس کے چہرے پر کامرانی کا وہ نور تھا جیسے وہ مقابلے میں شامل ہونے سے پہلے ہی مقابلہ جیت چکا ہو۔

شہر کے ایک نواحی بستی میں وہ ایک پارک کے قریب سے گزرا۔ سبزے پر کچھ لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت کھیلنے والے لڑکے نے ایک شاندار چھکا لگایا۔ گو تنکر کا دل مسرت سے چھلک اٹھا۔ نواحی بستی سے نکل کر وہ اس سڑک پر آگیا جہاں خوبصورت بنگلوں کی ایک قطار دور تک چلی گئی تھی۔ ایک مکان کے باہر ایک گول مٹول' سرخ و سپید بچہ ٹافی کھا رہا تھا۔ گو تنکر نے اس کے ملائم صحت مند گالوں کو تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔

اب وہ درختوں کے جھنڈ کے بالکل قریب تھا۔ وہ رک گیا اور اس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ فطرت کا سارا حسن کھیتوں کی ہریالی اور سونے میں سمٹ آیا تھا۔ گو تنکر کچھ دیر اس حسن سے سرشار ہوتا رہا اور پھر جھنڈ کے اندر داخل ہو گیا۔ کنویں کے قریب پہنچ کر اس نے جو منظر دیکھا اسے دیکھنے کا امکان کے اس وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کنویں کی منڈیر پر سوکھا مارا چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا اور بڑے انہماک سے کنویں کے اندر جھانک رہا تھا اجنبی گو تنکر کی آمد سے بالکل بے خبر تھا اس لیے جب گو تنکر اس کے قریب پہنچا تو وہ چونک پڑا۔ گو تنکر نے اپنے رد عمل کا اظہار ایک سوال کی صورت میں کیا:

"تم کون ہو؟"

اجنبی اب بھی کنویں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا اور گو تنکر پر ایک تحقیر آمیز نظر کر کے کنویں کے اندر جھانکنے کے عمل میں دوبارہ مصروف ہو گیا تھا۔

گو تنکر کے سوال کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

گو تنکر نے اپنا سوال دہرایا:

"میں پوچھتا ہوں' تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو اور یہاں کس لیے آئے ہو؟"

اجنبی نے اپنی آنکھیں کنویں کے پیندے سے ہٹائیں اور گو تنکر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گو تنکر کو یکایک محسوس ہوا کہ اجنبی اس کی روح کے اندر جھانک رہا ہے اور اس کے ہر راز سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔ گو تنکر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس سے پیشتر کہ گو تنکر اپنے غصے کا اظہار کر پاتا۔ اجنبی کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے:

"دو انسانوں کے درمیان ہمدردی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ان کے مقاصد ایک جیسے ہوں۔"

"تو تم ہمدردی کی تلاش میں ہو۔"

"شاید میں نے غلط لفظ استعمال کیا۔ مجھے رشتہ یا تعلق یا اسی قسم کا کوئی عام لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال میں کسی سوال کا جواب نہیں چاہتا ہوں۔"

گو تنکر چکر میں آگیا۔ عجیب آدمی سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ اجنبی کو کچھ دیر بے بسی کے عالم میں دیکھتا رہا اور پھر بولا:

"دیکھو میں یہاں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ تم چاہو تو یہاں سے جا سکتے ہو۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو۔" گو تنکر نے پوچھا۔

"میں چاہنے یا نہ چاہنے کے عمل سے بہت دور نکل چکا ہوں۔"

گو تنکر کے ذہن میں ایک اور سوال کوندے کی طرح لپکا۔

"کیا تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟"

"زندگی اور موت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔" اجنبی نے جواب دیا۔
گو لنکر کے چہرے پر مسرت اور اعتماد کی روشنی نمودار ہوئی وہ اجنبی کی پراسرار شخصیت کے ایک گوشے کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
"کیا تم جانتے ہو کہ میں کس مقصد سے یہاں آیا ہوں؟"
"مجھے اب دوسروں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کسی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"
گو لنکر کی حیرت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔
"یقیناً تمہارا گھر ہو گا۔ تمہاری بیوی ہو گی' بچے ہوں گے۔"
"تھے اب نہیں ہیں۔" اجنبی نے ایک بار پھر کنویں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
"کہاں گئے؟"
"مر گئے۔"
"کس طرح مر گئے؟"
"جس طرح انسان مرتے ہیں۔ بھوک سے' بیماری سے' قتل سے۔"
"یہ تو عام بات ہوئی خاص طور پر تمہاری بیوی اور تمہارے بچے کیسے مرے؟"
"اجنبی شاید گو لنکر کے ضرورت سے زیادہ سوالوں کے جواب دے چکا تھا اس لیے برہم ہو کر بولا:
"میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ تم مجھے مجبور کیوں کر رہے ہو؟"
"کچھ سوالوں کا جواب تم نے اپنی خوشی سے دیا ہے۔ ویسے بھی مجھے تمہارے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے تمہارے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"
دوستی کے نام پر اجنبی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پورے زور سے چیخا:
"چلے جاؤ یہاں سے۔ تم کون ہوتے ہو میرے ساتھ دوستی کرنے والے۔"
گو لنکر مسکرایا۔
"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔"
"تو پھر تم کون ہو؟" اجنبی سوال پوچھ کر اپنے سوال پر خود حیران ہو گیا۔
ابھی کچھ دیر پہلے ٹھیک یہی سوال میں نے تم سے پوچھا تھا جس کا جواب دینے سے تم نے انکار کر دیا تھا لیکن میں انکار نہیں کروں گا۔ میرا نام گو لنکر ہے میرے نام سے اس شہر کے تمام لوگ واقف ہیں۔ میں مشہور کنواں پھلانگنے والا ہوں۔"
"مجھے تمہارے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"
"تمہیں میرے ساتھ دلچسپی ہے اس لیے تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کون ہوں؟"
اجنبی کی آنکھوں میں غصے کی بجلی ایک پل کے لیے لہرائی۔ اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ کہا:
"مجھے کنواں پھلانگنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"
"نہ سہی۔ لیکن میں کنواں پھلانگنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتا ہوں۔"
"میں جانتا ہوں تم جو کچھ کرتے ہو جھوٹ' چوری' ڈاکہ زنی' قتل' زنا بالجبر..."
اجنبی کے یہ الفاظ سن کے گو لنکر سناٹے میں آ گیا۔

"شاید تم اپنے کارناموں کی تفصیل پیش کر رہے ہو۔"

"جی ہاں۔ اپنے تمہارے تمام انسانوں کے۔"

"لیکن تمہارے بیوی بچے کیا ہوئے؟"

اجنبی کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ اس سوال کے جواب سے بھی گزرنا چاہتا ہے۔

جھوٹ' چوری' ڈاکہ زنی' قتل...."

"لیکن انسان کی زندگی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہے۔" گو لنکر نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔

"میں تمام فلسفوں سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ مت سمجھو کہ تم کنویں پھلانگتے پھلانگتے زندگی کے رازدار بن گئے ہو۔"

"خود کشی سے صرف تمہارا مسئلہ حل ہوتا ہے۔"

گو لنکر کو اجنبی کی باتوں سے جو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی مزید گہری ہو گئی۔

"لیکن اس زندگی کے اہم مسائل بھی تو ہیں جو میری اور تمہاری ذات کے مسائل سے زیادہ اہم ہیں۔"

"جی ہاں میں ان سے بھی واقف ہوں ان پر بھی جھوٹ' چوری' ڈاکہ زنی' قتل' زنا بالجبر حاوی ہیں۔ فرد سے اجتماع تک پہنچتے پہنچتے تفصیلات میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔"

"فرض کرو تم خود کشی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہو جس کا امکان بہت کم ہے کیوں کہ میں تمہیں ایسا ہرگز کرنے نہیں دوں گا۔ تو کیا تمہارے ذاتی مسائل اور دنیا کے مسائل حل ہو جائیں گے۔"

"مجھے اس سوال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مسائل حل ہوں یا نہ ہوں میں اپنا آخری فیصلہ کر چکا ہوں اور پھر میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا کا کوئی اجتماعی مسئلہ فیصلہ کن طریقے سے ہمیشہ کے لیے کبھی حل نہیں ہوتا۔ صرف عارضی طور پر حل ہوتا ہے میں صرف اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم نادان ہو۔"

"کون جانتا ہے کون نادان ہے۔"

دونوں آدمی اپنے سوالات اور جوابات میں الجھ گئے تھے تھوڑی دیر کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔ گفتگو کا دوبارہ آغاز اجنبی نے کیا:

"تم یہاں سے چلے جاؤ میں اپنے آخری فیصلے پر فوراً عمل کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے پہلے اپنے کسی فیصلے پر عمل نہیں کر سکے!"

اجنبی کے چہرے پر جھلاہٹ پیدا ہوئی۔

"میں اپنے ہر فیصلے پر عمل کرتا رہا ہوں۔"

"تو پھر اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے ہچکچاہٹ کیوں۔ تم اپنا مسئلہ ملتوی کیوں کرنا چاہتے ہو۔"

اجنبی کے چہرے پر مزید غصے کے آثار پیدا ہوئے:

"میں نے کہا نا کہ میں اپنے آخری فیصلے پر فوراً عمل کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"اگر یہ فیصلہ تمہارا آخری فیصلہ ہے اور تم اس پر عمل بھی فوراً کرنا چاہتے ہو تو میری موجودگی سے تمہیں کیا زحمت ہے۔"

"میں اپنی موت کے عمل میں تنہا شامل ہونا چاہتا ہوں۔ تم میری موت کے گواہ نہیں بن سکتے۔ میں یہ حق تمہیں کبھی نہیں دے سکتا۔"

"میں اسے ایک بار پھر کہتا ہوں کہ زندگی خوبصورت ہے۔ زندہ رہنے کی کوشش کرو۔"

"مجھے تمہارے امید افزا الفاظ بے معنی نظر آتے ہیں۔ بفرض محال اگر زندگی خوبصورت بھی ہے تو تمہیں اس سے لطف اندوز ہونے کی پوری آزادی ہے تم میرے معاملے میں ٹانگ کیوں اڑا رہے ہو۔"

"اس کا مطلب ہے تم اپنے آخری فیصلہ پر عمل کرنا چاہتے ہو۔ تم بخوشی خودکشی کرو۔ میں یہاں سے چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر گو لنکر وہاں سے چل پڑا۔ اجنبی کنویں کی منڈیر پر چڑھ گیا اور کنویں کے اندر کودنے کے لیے تیار ہو گیا۔

گو لنکر دو چار قدم چلنے کے بعد رک گیا اور واپس اسی جگہ آگیا جہاں وہ چند لمحے پہلے کھڑا تھا:

"میرا ایک آخری سوال باقی ہے۔"

"پوچھو" اجنبی نے فاتحانہ انداز میں کہا:

"تم نے خودکشی کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟"

"تم نے پھلانگنے کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟"

"میرے لیے یہ کنواں مناسب تھا۔"

"ٹھیک یہ بات میں کہتا ہوں۔ یہ کنواں میرے لیے مناسب تھا۔"

اس جواب سے گو لنکر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے اجنبی سے پوچھا؟

"کیا تم اپنی خودکشی چند منٹوں کے لیے ملتوی کر سکتے ہو؟"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں یہاں کنواں پھلانگنے کی مشق کرنے کے لیے آیا تھا کیوں کہ مجھے دو روز بعد کنواں پھلانگنے کے لیے مقابلہ میں حصہ لینا ہے۔"

"تو میں کیا کروں۔ تم سمجھتے ہو۔ اس مسخرے پن سے تم مجھے متاثر کر لوگے۔"

"تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں میں جس کام کے لیے یہاں آیا ہوں اسے پورا کر کے جاؤں جہاں تک تمہیں متاثر کرنے کا تعلق ہے۔ تم جہنم میں جاؤ۔ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"شوق سے پورا کرو۔ لیکن جلدی، کیونکہ میں اپنا فیصلہ زیادہ دیر کے لیے ملتوی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے صبر کی انتہا تک پہنچ چکا ہوں۔"

یہ کہہ کر اجنبی کنویں کی منڈیر سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ گو لنکر نے کنویں کی منڈیر سے مخصوص فاصلہ ناپ کر زمین پر کچھ نشان لگائے۔ ایک نشان پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا۔ اپنے جسم کو تولا اور اس کے بعد دوڑتا ہوا کنویں کی جانب بڑھا راستے میں ایک دوسرے نشان سے اس نے بھرپور جست لگائی۔ اجنبی کے دل کی دھڑکن اس دوران میں تیز ہو گئی۔ جست لگاتے ہی گو لنکر کا جسم ہوا میں ایک قوس سی بناتا ہوا کنویں کے اوپر سے گزرنے لگا اور عین اس لمحہ جب اجنبی کو توقع تھی کہ گو لنکر کنویں کے دوسری طرف ہو گا ایک پرزور دھماکہ ہوا گو لنکر کا جسم کنویں کی منڈیر کی اندرونی سطح کے ساتھ زور سے ٹکرایا اور پھر کنویں کی پوری گہرائی کا فاصلہ طے کرتا ہوا دھم سے پانی میں جا گرا۔

اجنبی کی آنکھیں پھیل کر روزن بن گئیں۔ اس کا پورا وجود فطری ردعمل کی زد میں آگیا اور وہ ڈوبنے والے کی تقدیر سے غافل اپنے ارادوں اور فیصلوں سے غافل، درختوں کے جھنڈ کو چیرتا، سرسبز و شاداب کھیتوں کو اپنے پاؤں تلے روندتا شہر کی جانب بھاگ نکلا۔

مرزا حامد بیگ

نام : حامد حسین

قلمی نام : مرزا حامد بیگ / ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

پیدائش : ۲۹ اگست ۱۹۴۹ء بہ مقام کراچی (سندھ) پاکستان۔

تعلیم : ایم۔ اے (اردو) پی ایچ ڈی (پنجاب)

گورنمنٹ پرائمری اسکول ٹھرڑی محبت، ضلع دادو (سندھ) میں ابتدائی دو کلاسیں سندھی میڈیم کے ساتھ پڑھیں، اس کے بعد میہڑ، حیدر آباد، دادو، ہالہ، سکھر، میرپور خاص (سندھ) شمس آباد (ضلع اٹک) میں پڑھتا رہا۔ گورنمنٹ ہائی سکول دادو (سندھ) کی معرفت ویسٹ پاکستان ڈرائنگ امتحان ۱۹۶۱ء میں پاس کیا۔ میٹرک ڈی۔ سی ہائی اسکول نواب شاہ (سندھ) سے ۱۹۶۶ء میں اور ایف۔ اے اسلامیہ کالج سکھر (سندھ) سے ۱۹۶۸ء میں کیا۔ بی۔ اے گورنمنٹ ڈگری کالج کیمبل پور (حال اٹک) سے ۱۹۷۱ء میں اور ایم۔ اے (اردو) پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور سے ۱۹۷۴ء میں کیا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (موضوع: "اردو ادب میں انگریزی سے نثری تراجم") کا نوٹیفکیشن پنجاب یونی ورسٹی لاہور نے ۸ فروری ۱۹۸۶ء میں جاری کیا۔

مختصر حالات زندگی:

نسلی طور پر علاقہ ہجیرہ ضلع کیمبل پور (پنجاب - پاکستان) کا مغل ہوں - جدامجد مرزا محمد بیگ ۱۷۵۰ء میں صوبیدار اٹک تھے - والدہ کی طرف سے سلسلہ نسب حضرت محمد یحییٰ اٹکی المعروف جی بابا نقشبندی (ولادت ۱۰۳۲ھ مطابق ۱۶۲۲ء) سے جا ملتا ہے جن کی قوم پختہ اور وطن ماوراء النہر ملک ترکستان تھا۔

میرے والد محمد اکرم بیگ سندھ پولیس میں تھے، اس لیے بچپن اور لڑکپن اندرون سندھ میں گذرا - بچپن میں پنجابی لوک قصے از قسم "جنگ نامہ زیتون" اور "داستان امیر حمزہ" پڑھتا رہا - ۱۹۶۵ء میں نواب شاہ کے قیام کے دوران انگریزی اور سندھی کے بزرگ ادیب آنجہانی ٹھاکور داس چنڈانی نے لکھنے پڑھنے کو دیا اور میری کچ مچ تحریروں کی پذیرائی کی۔ لڑکپن میں کرکٹ اور بیڈمنٹن کھیلنے کے ساتھ جی بھر کر پتنگ بازی کی۔ بیڈمنٹن کا ساتھ یونیورسٹی تک رہا، گورنمنٹ کالج کیمبل پور اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کا کلر ہولڈر رہا۔ نواب شاہ (سندھ) سے میٹرک کرنے کے بعد سندھ مسلم کالج کراچی میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں ۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۷ء ڈراما کلب کا ممبر رہا۔ اسی زمانے میں کراچی ریڈیو کی پرانی بلڈنگ کے قریب واقع میوزک اینڈ ڈراما سینٹر سے پیانو اور بینجو کی تربیت حاصل کی، لیکن یہ شوق زیادہ دیر تک نہ نبھ سکا۔ کچھ مدت آرٹس کونسل کراچی (صدر) کی مصوری کی کلاسوں میں حاضری دی، نیز پاکستان برماشیل کے منعقد کردہ ڈیزائننگ کے مقابلے میں حصہ لیا۔ ۱۹۶۶ء میں اس نمائش کا افتتاح فیض احمد فیض نے فرمایا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں والد صاحب ڈی۔ ایس۔ پی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تو ہم لوگ سکھر سندھ سے کیمبل پور منتقل ہو گئے، یہاں بی۔ اے کرنے کے زمانے میں سیاست سے دلچسپی رہی۔ مسلم سٹوڈنٹس لیگ کیمبل پور شاخ کا صدر تھا۔ ۱۹۷۱ء میں بطور انسپکٹر پولیس سندھ کی ملازمت سے بھاگ کر ایم۔ اے (اردو) کرنے چلا۔ ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۴ء طالب علمی اور بے روزگاری کے زمانے میں

حلقہ ارباب ذوق (ادبی) لاہور کا شریک معتمد رہنے کے ساتھ ساتھ گل فلم کارپوریشن قیوم خان بلڈنگ' رائل پارک' لاہور سے بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر منسلک رہا اور ہدایت کار و فلم ساز رحیم گل مرحوم کے اسسٹنٹ کے طور پر پشتو فلم "موسیٰ خان گل مکئی" مکمل کی' اور ینٹل کالج لاہور کا ادبی مجلہ لفظ مرتب کیا۔ ۱۹۷۲ء سے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے لکھنا شروع کیا' دو ایک اپنے ہی لکھے ہوئے ٹیلی وژن ڈراموں میں اداکاری بھی کی۔ پاکستان آرٹسٹس اکیڈمی' لاہور (قیام: ۱۹۷۲ء) کا بانی رکن ہوں۔ ۲۸ فروری ۱۹۷۴ء تا اکتوبر ۱۹۷۴ء بطور ریسرچ اسکالر اورینٹل کالج میں ملازمت کی۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو بطور لیکچرار گورنمنٹ ڈگری کالج جھکا گلی' کوہ مری چلا گیا۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۶ء کو تبدیل ہو کر گورنمنٹ گورڈن کالج' راولپنڈی آیا۔ ۸ مئی ۱۹۷۷ء کو شوکت جہاں سے شادی ہوئی۔ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۱ء ادبی مجلہ "گورڈونین" مرتب کیا۔ ۱۵ مارچ ۱۹۸۸ء سے بطور اسسٹنٹ پروفیسر (اردو) گورنمنٹ ڈگری کالج سیٹلائٹ ٹاؤن' راولپنڈی میں ہوں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ "دلیل کی ہیبت" مطبوعہ: نیرنگ خیال' لاہور (مرتبہ: حکیم یوسف حسن' شمارہ: ۵۴۲

۲۔ "افسانہ و افسوں کی خشیشی رات" ' مطبوعہ: "لفظ" یونیورسٹی اور ینٹل کالج' لاہور (مرتبہ: مرزا حامد بیگ) بابت: دسمبر ۱۹۷۲ء"

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔	"گمشدہ کلمات" (۱۶ افسانے)	مطبوعہ: خالدین' لاہور:	طبع اول: جنوری ۱۹۸۱ء
۲۔	"افسانے کا منظر نامہ" (تنقید)	مطبوعہ: مکتبہ عالیہ' لاہور	طبع اول: ۱۹۸۱ء
		اردو رائٹرس گلڈ' الہ آباد:	طبع دوم ۱۹۸۳ء
۳۔	"تیسری دنیا کا افسانہ" (تنقید)	مطبوعہ: خالدین' لاہور	طبع اول: مارچ ۱۹۸۳ء
۴۔	"تار پر چلنے والی" (افسانے / ناولٹ)	مطبوعہ: پولیمر پبلی کیشنز' لاہور	طبع اول: ۱۹۸۳ء
۵۔	"قصہ کہانی" (چھاچھی افسانے)	مطبوعہ: پنجاب ادبی بورڈ' لاہور	طبع اول: ۱۹۸۳ء
۶۔	"اردو اور صوفی ازم" (تنقید / تحقیق)	مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد	طبع اول: ۱۹۸۶ء
۷۔	"کتابیات تراجم: علمی کتب" (کتابیات)	مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد	طبع اول: ۱۹۸۶ء
۸۔	"عزیز احمد: کتابیات"	مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد	طبع اول: ۱۹۸۶ء
۹۔	"ترجمے کا فن: نظری مباحث" (تحقیق)	مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد	طبع اول: ۱۹۸۷ء
۱۰۔	"اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ" (تحقیق و تنقید)	مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد	طبع اول: ۱۹۸۷ء
۱۱۔	"کتابیات تراجم: ادب" (تحقیق)	مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد	طبع اول: ۱۹۸۷ء
۱۲۔	"مغرب سے نثری تراجم" (تحقیق و تنقید)	مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان	طبع اول: ۱۹۸۸ء
۱۳۔	"اطالیہ میں اردو" (تحقیق)	مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد	طبع اول: ۱۹۸۹ء
۱۴۔	"گناہ کی مزدوری" (افسانے)	مطبوعہ: ابلاغ' اسلام آباد'	طبع اول: ۱۹۹۱ء
۱۵۔	"مقالات" (تحقیق و تنقید)	مطبوعہ: پولیمر پبلی کیشنز' لاہور'	طبع اول: ۱۹۹۱ء

۱۹۔ "اردو افسانے کی روایت" (تحقیق و تنقید) مطبوعہ: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد طبع اول: ۱۹۹۱ء

غیر مدون:

فنون لطیفہ سے متعلق مضامین کا ایک مجموعہ، مصطفےٰ زیدی کی کہانی (احوال و آثار) ریڈیائی اور ٹیلی ڈراموں کا ایک مجموعہ اور تحقیقی و تنقیدی مضامین کے دو مجموعے۔

اعزاز:

رائٹرز گلڈ ادبی انعام برائے "قصہ کہانی" ۱۹۸۴ء

مستقل پتا:

فلیٹ نمبر ۱۴ بلاک ۲۔ اے گلی نمبر ۱۰ آئی۔ ایٹ۔ ون، اسلام آباد۔

نظریہ فن:

"سفید پوش طبقہ پرائیویٹ SELF پر پہرے بٹھاتا ہے اور ہمیں DECADENT کہا جاتا ہے جبکہ ہم نے لفظ کی ہمہ جہتی اور کلیت تک اپنی ذات کے حوالے سے رسائی حاصل کی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بہت بڑا انکشاف ہے، جس کا اظہار ہم نے اپنی چیدہ تخلیقات میں کیا ہے۔"

(مرزا حامد بیگ)

مرزا حامد بیگ

مغل سرائے

شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے اور وہ دونوں' ملگجے اندھیرے میں دھند لائے ہوئے متحرک دھبوں کی طرح چپ چاپ بڑھے چلے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ فٹ پاتھ پر سفیدے کی قطار میں بہتی ہوئی ہوا کی سرسراہٹ اب صاف سنائی دے رہی تھی' اور وہ دونوں ایک ساتھ قدم اٹھاتے' یہاں' اس جگہ پہلی بار ٹھٹک کر رکے تھے۔

ابھی کچھ دیر پہلے' پیچھے سے آتے ہوئے کھلنڈرے نوجوانوں کی ایک ٹولی بہت دیر تک انہیں اپنے گھیرے میں لے چلتی رہی تھی اور وہ ان کے بیچ' مجرموں کی طرح سر جھکائے' بہت آہستہ قدم اٹھاتے یہاں تک پہنچے تھے۔ اب وہ ہنستی گاتی ٹولی بہت آگے نکل گئی تھی اور دور تک کوئی نہ تھا' البتہ ان کے کندھے ابھی تک آپس میں رگڑ کھا رہے تھے۔ لڑکا قدرے جھک کر چل رہا تھا اور اس کا بل کھایا ہوا بایاں بازو لڑکی کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔

وہ دونوں اس خطے میں نووارد تھے اور محض سنی سنائی پر یہاں تک نکل آئے تھے۔ اب وہ سفیدے کی قطار کے اس سرے پر آخری درخت سے ٹیک لگئے کھڑے تھے اور دور تک ملگجا اندھیرا ہر طرف لوئیں لے رہا تھا۔

دونوں اپنے سفری تھیلوں کے بوجھ سے ذرا ذرا آگے کو جھکے ہوئے' کسی حد تک ہراساں بھی تھے۔ لڑکے نے ٹارچ نکال کر لوئیں لیتے ملگجے اندھیرے میں دودھیا روشنی کی کمندیں ہر طرف پھینکیں اور مایوس ہو کر سر جھکا لیا۔ دونوں کو اپنی ٹانگیں زمین میں دھنستی ہوئی محسوس ہوئیں اور وہ دیر تک یہیں اسی جگہ بھاری سفری تھیلوں کے بوجھ تلے دبے' بے بسی سے آگے پیچھے جھولتے رہے۔

ان کو ان حالوں کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا ہو گا کہ ایک بڑے شور کے ساتھ دو سرپٹ آتے ہوئے گھوڑوں کے پیچھے دائیں بائیں جھولتی ہوئی بگھی' ایک جھٹکے کے ساتھ ان سے چند قدم آگے نکل کر ساکت ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں اطراف کے دروازے کھلے اور چمکتے ہوئے بھالوں کو سنبھالے' دو بجھے ہوئے چہروں والے افراد نے انہیں کمال تہذیب کے ساتھ بگھی میں' نرم جھولا نما نشست پر لا بٹھایا اور چلے۔

لڑکی کو لپیٹ میں لیے ہوئے بازو کی گرفت اب ڈھیلی پڑ گئی تھی اور دونوں جس خوف کے ابھی کچھ دیر پہلے اسیر ہوئے تھے' وہ خواب خیال ہوتا جا رہا تھا۔ وہ عجب خود سپردگی کے عالم میں ہوا کے دوش پر تھے اور تیز ہوا میں ان کے اوپر کو اٹھے ہوئے نرم کالروں میں' آدھے چھپے ہوئے نیم خوابیدہ آنکھوں والے مطمئن چہرے دائیں بائیں جھول رہے تھے۔

ایک جگہ بگھی دھیرے دھیرے رکتی گئی اور انہوں نے جانا کہ جیسے ایک ٹھہرے ہوئے غضب ناک پانی کے دھارے کو راہ دی گئی ہو۔ وہ جب با ادب خدام کا سہارا لئے' بگھی سے باہر آئے ہیں تو سفری تھیلوں کے بوجھ سے ان کے کندھے آزاد تھے اور ان کے سامنے آبنوس کا پیتل جڑا' دیو ہیکل دروازہ دھیرے دھیرے کھلتا چلا جا رہا تھا اور اس کے اندر کی سمت کھنچتے اور قوسیں بناتے ہوئے زنجیر' غضب ناک پانی کے دھارے کا شور باہر اگل رہے تھے۔

دروازے کی دونوں چوکیوں پر ٹھہرے ہوئے لیمپ پوسٹ' اپنی زرد لرزتی ہوئی روشنی اگلتے' بہت نمایاں اور ایک حد تک افسردہ نظر آئے۔

وہ دونوں' ایک بار پھر کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگے۔ لڑکے کے بل کھائے ہوئے بازو نے لڑکی کو ایک بار پھر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سرخ بانات کی وردیوں میں' کمر کے گرد دھاری دار پٹکے لپیٹے ہوئے پستہ قد خدام' ان کے سفری تھیلوں کو احتیاط سے سنبھالے "رپ رپ" کرتے ان کے پیچھے چلے آتے تھے۔

استقبالیہ کی نیم روشن محراب تلے' لٹکی ہوئی مونچھوں اور گلوں سے کانوں کی طرف مڑی ہوئی نوکدار قلموں والے میزبان نے جھک کر انہیں خوش آمدید کہا اور ہمراہ ہو لیا۔ وہ راستے میں بچھتا چلا جا رہا تھا اور اس چرب زبان نے مجال ہے کہ انہیں بات کرنے کا موقع دیا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا:

"حضور' یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ کی خدمت کا موقع ہاتھ آیا۔ پرتگالی' ولندیزی' فرانسیسی اور انگریز بھی ہمارے سر آنکھوں پر' اور عرب ریاستوں کے شیخ تو ہمارے بھائی بند ہیں۔۔۔ حضور خاطر جمع رکھئے۔۔۔"

اس وقت وہ دھلی ہوئی سرخ اینٹوں والی راہداریوں پہ چل رہے تھے اور ان کے دونوں اطراف میں' کھلے تالابوں کے شفاف پانی میں درختوں کا گہرا عکس کانپ رہا تھا۔ وہ کندھے سے کندھا ملائے چلے جا رہے تھے اور سامنے بچھتا ہوا میزبان:

"بندہ پرور' ہمیں یقین ہے کہ مغل سرائے کا شہرہ سن کر ہی آپ چلے ہوں گے۔ یقیناً آپ نے جو کچھ سنا' وہ الف سے یے تک درست ہے' یہاں سرائے کے مہمانوں کو روایتی مغل رکھ رکھاؤ کے ساتھ ٹھہرایا جاتا ہے اور اب کیا عرض کروں' عنقریب آپ خود کمال مہربان ہوں گے اور ہماری خدمات کے معترف بھی۔۔۔"

گیندے کے پھولوں اور بنفشے کے دور تک پھیلے تختوں کو عبور کر کے وہ چڑھ کے چھوٹے دروازوں والی قطار کے ساتھ ہو لیے۔ پھر تنگ غلام گردشوں کا مرحلہ آیا۔ یہاں ہر دس قدم پر دروازوں کے ساتھ سیدھی اوپر کو اٹھی ہوئی مشعلوں کا دھواں نیچی چھت پر سیاہی کا لیپ کر رہا تھا۔ وہ احتیاط سے جھکے جھکے میزبان کے پیچھے چلتے رہے' پھر وہ ایک جگہ رکا اور ایک زنگ آلود تالے کو کھولتے ہوئے سامنے سے ہٹ کر ادب سے جھکا' تب ان کے سامنے ایک دروازہ مہیب چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ پھر وہ لپک جھپک اندر گیا اور آتش دان کو روشن کر آیا۔ وہ دونوں دروازے میں کھڑے تھے اور ملازمین ان کے سفری تھیلے کمرے میں ایک طرف رکھ کر کب کے جا چکے تھے۔ پھر میزبان نے جھک کر اجازت چاہی اور رفتہ رفتہ آتش دان میں چٹختی ہوئی لکڑیوں اور اڑتے ہوئے شراروں کی مدہم روشنی میں اندر کا ماحول واضح ہوتا چلا گیا۔

ان کے سامنے نیچی چھت کے نیم روشن کمرے میں بھاری پلنگ کے سرہانے آتش دان کے عین اوپر دو بلالی تلواریں' خیالے رنگ کے ڈھال کے آرپار ٹھہری ہوئی تھیں۔ کمرے میں دیواروں سے سہمے ہوئے ہرن اور بارہ سنگھے بس کمرے میں اتر ہی چاہتے تھے۔ پھر جانے کہاں سے جھک کر آداب بجا لاتی' چھلکتی ہوئی دو کنیزیں برآمد ہوئیں' دروازے میں سما ہوا جوڑا جڑ کر کھڑا تھا۔ وہ آئیں اور لڑکی کو سہارا دیتی ہوئی بغلی دروازے میں غائب ہو گئیں۔ لڑکا ہمت کر کے ان کے پیچھے چلا لیکن اس کے پاؤں نیچے بچھے ہوئے قالین میں دھنستے چلے جا رہے تھے اور وہ بڑی مشکل میں تھا' جانے کیوں اس پر غنودگی غلبہ پانے لگی اور وہ لڑکھڑا سا گیا۔ جب اسے ہوش آیا ہے تو اس نے دیکھا کہ اس کی ساتھی لڑکی' کوئی مغل شہزادی ہے' جو بڑے پلنگ پر اطلس و کمخواب میں ماہتاب کی طرح کھلی ہوئی ہے۔ اس لمحے وہ نیم غنودگی میں بغلی کمرے سے ہوتا ہوا دو نازک اندام کنیزوں کے بازوؤں میں لپٹا لپٹایا آگے بڑھ رہا تھا۔

اور وہ خود جیسے کوئی مغل شہزادہ' ڈھاکے کی ململ پر سنہری صدری اور کمر کے گرد پٹکے میں اڑسا ہوا جڑاؤ ٹھیک کا مڑا ہوا خنجر سنبھالے ہوئے تھا۔ جس کے دستے پر ریشمی پھندنا اس کے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ جھول رہا تھا۔

وہ نیم غنودگی میں لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اس نے تکیہ چاہا تھا۔ کمرے میں اب صرف مور چھل ہلاتی ہوئی دو کنیزیں رہ گئی تھیں اور شاید پلنگ پر نیم دراز مغل شہزادی نے کوئی فرمائش کر دی تھی۔ ایسے میں بغلی کمرے سے کوئی ایک وجود' بہت گرا گھونگھٹ نکالے ہوئے ظاہر ہوا تھا اور جھکی جھکی نظروں کے ساتھ چاندی کی اونچی ساوار' جس کے نیچے آگ دہک رہی تھی اور بڑے تھال میں خشک میوے اور منقش صراحیاں

اور بھاری پیالے قرینے سے سجا کر پلٹ گیا تھا۔

وہ لڑکا جیسے کوئی مغل شہزادہ' بغیر کچھ کھائے پیئے پلنگ پر چت لیٹ گیا اور اس کی آنکھیں مندھتی چلی گئیں۔ شاید کچھ دیر وہ سویا بھی ہو گا' اس اثناء میں برابر سے اٹھ کر اس کی ساتھی لڑکی۔۔۔ مغل شہزادی نے کمرے کا چکر لیا اور پائیں باغ کی سمت کھلنے والی کھڑکی میں ٹھہری رہی۔

پھر جیسے جیسے رات بیت رہی تھی' نیچے دور تک نکل گئے گھنے درختوں میں عجب طرح کی غراہٹوں کا شور ابھرتا چلا گیا۔ درختوں سے بھرا مار کر چڑیاں اور کوے شور کرتے ہوئے آسمان کی طرف اٹھنے لگے۔

شور بڑھ رہا تھا۔ باہر چاندنی میں راہداریوں کے ساتھ ساتھ تھوہر کی اونچی اونچی دیواریں' گھاس کے تختوں پر ٹھہری ہوئی سنگ مرمر کی کرسیاں اور کاسنی پھولوں سے گندھی' بنفشے کی موٹی جھیں سب رفتہ رفتہ ماند پڑ گئیں اور ہر سمت سے بڑھتا' کروٹیں لیتا ہوا' پاگل کر دینے والا شور ہر طرف بھر گیا۔

لڑکی گھبراہٹ میں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی گئی تھی' یہاں تک کہ کمرے میں میزبان کی آواز گونجی:

"حضور بے فکر رہئے۔ یہ شور خود کردہ ہے اور محض آپ کی تفنن طبع کی خاطر۔ اس وقت ہمارے تنخواہ دار ملازمین کی ٹولیاں پائیں باغ کے کونے کھدروں میں حرکت کر رہی ہیں۔ یہ بھیڑیوں اور گیدڑوں کی ملی جلی آوازیں' باہر کے مناظر میں قدرتی رنگ بھرنے کی خاطر ہیں۔ حضور۔۔۔ نچنت رہئے۔۔۔"

میزبان نے لپک کر باہر کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے سامنے ریشمی پردوں کو برابر کر دیا۔

آوازیں مسلسل آ رہی تھیں' جیسے بھیڑیوں کے غول نکل آئے ہوں اور انہوں نے سرائے کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہو۔ البتہ میزبان کی وضاحت سن کر لڑکی نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ پھر وہ پائیں باغ کو چلنے کے لیے ضد کرنے لگی۔ لیکن لڑکا تھکا ہوا تھا اور اسے نیند بھی آ رہی تھی۔

یکایک لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور متجسس نگاہوں کے ساتھ قلانچیں بھرتی ہوئی' کھڑکی سے دوسری طرف کود گئی۔ ایسے میں میزبان اسے پکارتا رہ گیا' اور وہ گھاس کے نرم تختوں اور کاسنی پھولوں پر بلا خوف و خطر چلتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے' تنخواہ دار ملازمین کو درندوں کی مصنوعی آوازیں پیدا کرتے ہوئے ڈھونڈ نکالنا چاہتی تھی۔ اوپر درختوں کی شاخوں سے الجھتے ہوئے پرندے اس کے سر پر چکر کھاتے' اس کے ساتھ ساتھ اندھیرے میں آگے بڑھتے رہے اور وہ اپنے آپ میں مگن مغل سرائے کے پائیں باغ سے ملحقہ گھنے جنگل میں اترتی چلی گئی۔

اندر' سرائے کے اس نیم تاریک گوشے میں لڑکا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا' اور اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نیند میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا ہو۔ وہ کچھ دیر یوں ہی گم سم بیٹھا رہا' پھر اس نے لڑکی کی بابت دریافت کیا۔ اس موقع پر میزبان کو اس نے پہلی بار پریشان دیکھا۔ وہ اپنے کمال تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی چرب زبانی کا بے مثل مظاہرہ کر رہا تھا لیکن اس کی کانپتی ٹانگیں اور اس کے چہرے پر کورے لٹھے کے کھلتے ہوئے تھان اور اس کی نمناک آنکھیں اور زبان کی لکنت' سب اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔

لڑکا اپنی سنہری صدری پر لپٹے ہوئے پٹکے میں اڑسا ہوا جڑاؤ تیک کا مڑا ہوا خنجر سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کانوں میں پہنے ہوئے سفید مندرے' گلے کی مالائیں اور جڑاؤ بازو بند وہیں نوچ کر پھینک دیئے' پھر وہ کونے میں رکھی ماند پڑتی ہوئی مشال کو ایک ہاتھ میں تھامے پائیں باغ میں اتر گیا' سرائے کا میزبان اس کے پیچھے گرتا پڑتا چلا آتا تھا۔ نیچے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور لڑکا سب سے بے نیاز اس کا نام پکارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بالآخر صبح کی دھندلاہٹ میں' وہ وہاں تک پہنچ ہی گیا جہاں چکر کھاتے اور اوپر سے جھکی ہوئی شاخوں میں الجھتے ہوئے پرندے واویلا کر رہے تھے۔ دفعتاً" قریب کی جھاڑیوں سے تیر کی طرح دو سائے نکلے اور جنگل کی ترائی میں گم ہو گئے۔

لڑکا اس کا نام لے کر وہیں جھک گیا تھا' بجھی ہوئی مشال وہیں رہ گئی تھی اور اس کے دوسرے ہاتھ کی گرفت کمر میں مڑے ہوئے خنجر پر

پھیلی پڑ رہی تھی۔

سورج اب دھیرے دھیرے خاصا اوپر اٹھ آیا تھا اور میزبان کہہ رہا تھا:

"حضور، مغل سرائے کی انتظامیہ اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے پر سخت نادم ہے۔ ہم خود حیران ہیں کہ پائیں باغ اور اس سے ملحقہ علاقے میں جانے کیسے، بچ بچ کے بھیڑیئے اور گیدڑوں کی ٹولیاں در آئی ہیں۔ حضور آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں، مرحومہ کی مٹی عزیز کرنے کے لیے ہمارے عملے کو آپ بہت جلد سرگرم عمل دیکھیں گے۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہو گی کہ آپ کے نقصان کی تلافی۔۔۔"

ادھر سرائے کے اس نیم تاریک گوشے میں دبیز سرخ قالین پر دو سفری تھیلے رہ گئے تھے اور ان کے قریب ہی چاندی کی اونچی ساوار، جس کے نیچے راکھ اڑ رہی تھی اور بڑے تھال میں خشک میوے اور منقش صراحیاں اور بھاری پیالے جوں کے توں قرینے سے سجے رکھے تھے۔

اشاریہ

تصاویر، عکس تحریر، آٹوگراف

راشد الخیری

سجاد حیدر یلدرم

مکتوب بنام جلیل احمد قدوائی

Hamid Manzil,
Marris Road
ALIGARH
7.6.44

سلطان حیدر جوش

پریم چند

چودھری محمد علی ردولوی

خواجہ حسن نظامی

دہلی کی جامع مسجد ہندوستان میں
ایک ایسی کتاب ہے جس پر ہر مشہور
دور نے اپنی آنکھوں سے دستخط کئے
ہیں۔ حسن نظامی ۱۷ اپریل ۱۹۳۶ء

نیاز فتح پوری

مہاشہ سدرشن

اعظم کریوی

دفتر اخبار مجاہد
میرٹھ کینٹ ۔ ۲۵ اگست سنہ ۵۱ء

برادرم سلمہ

بہت دنوں سے کوئی خیریت نہیں معلوم ہوئی ہے۔
جلد اپنی و اپنے گھر کی خیریت سے مطلع کرائیے۔
بچوں کو دعائیں۔

دعاگو
اعظم کریوی

حامد اللہ افسر

مسز عبدالقادر

جلیل قدوائی

یہ ہے بالیدگی ہے [illegible] ہستی
جہاں اٹھا تھا درد [illegible] تک وہیں ہے
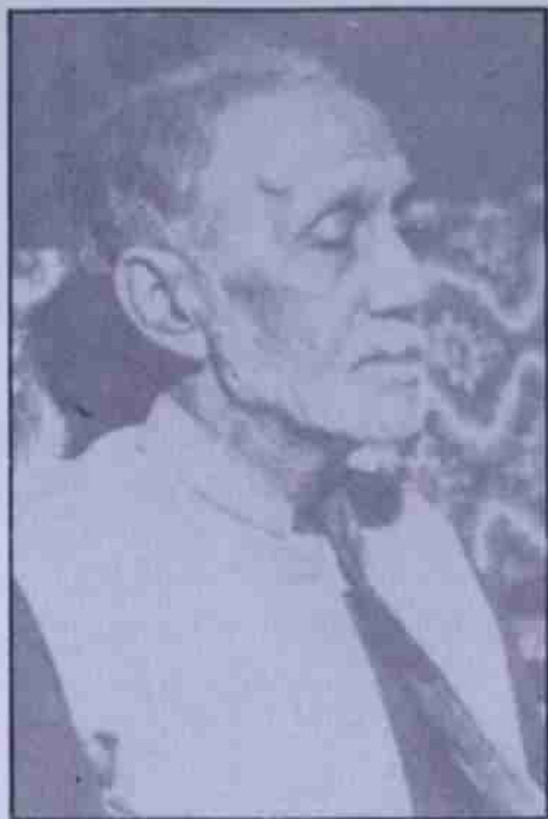
مجنوں گورکھپوری

مجنوں گورکھپوری

علی عباس حسینی

علی عباس حسینی

[illegible]

محمد مجیب

محمد مجیب

محبت اور خلوص کے ساتھ

اوپندر ناتھ اشک

اوپندر ناتھ اشک

اشرف صبوحی دہلوی

مخدومی رئیس صاحب محترم

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے

مخلص
اشرف صبوحی

خدا حافظ
رشید

رشید جہاں

عزیز احمد

[illegible]

سید فیاض محمود

I shall be
happy here.
With best wishes,
Yours sincerely,
Fayyaz
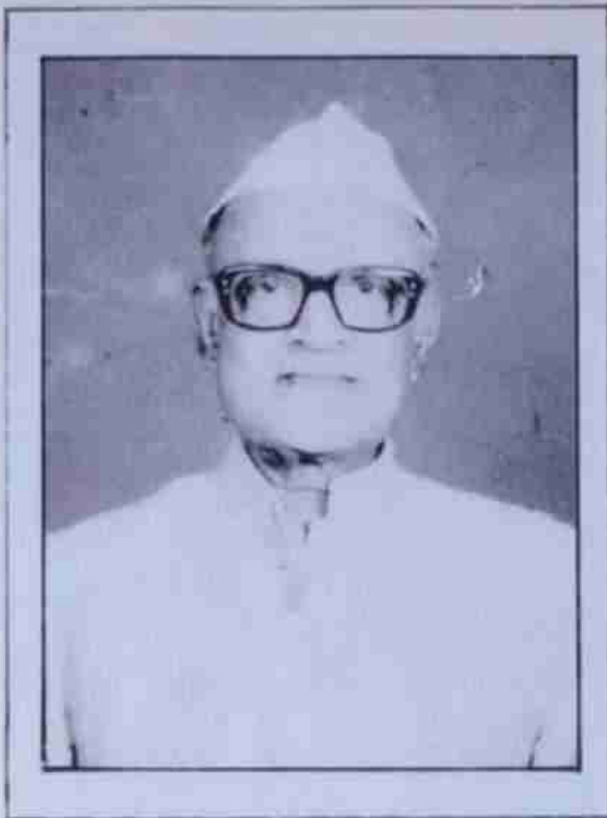
حیات اللہ انصاری

حیات اللہ انصاری
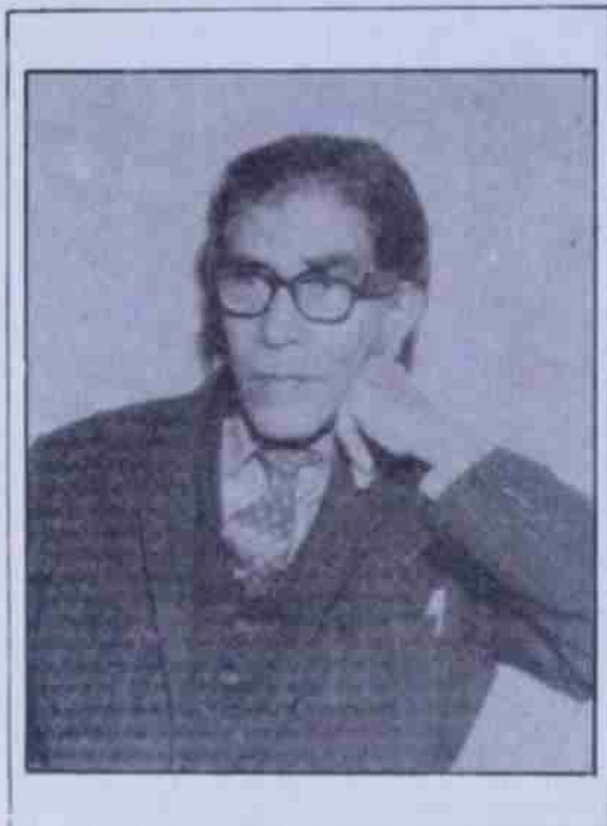
احمد علی

Ahmed Ali

اختر اورینوی

غلام عباس

میں دل میں سوچا کرتا تھا کہ ابھی مجھے موت سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی تو صوفی صاحب زندہ ہیں۔ افسوس کہ ان کی اچانک وفات سے میری زندگی کا یہ سہارا ٹوٹ گیا۔

غلام عباس

۲۸ مارچ ۷۸ء

ملک راج آنند

Mulk Raj Anand

احمد ندیم قاسمی

لاہور
۱۰-اپریل ۹۱ء

مکرمی و محترمی مرزا صاحب - سلام مسنون
"مورو رنگ" کا سابقہ پارسل شاید کسی نے اڑا
لیا - مجھے افسوس ہے کہ آپ کو دوبارہ زحمت کرنا پڑی۔
مجھ کو علم تھا کہ وہ ان کی ادبی یادگار ہے -
"فنون" مل گیا ہوگا -

دعا گو ساتھ مخلص

احمد ندیم قاسمی

کرشن چندر

کرشن چندر

ممتاز مفتی

افسانے کے متعلق میرا نظریہ فن

1. ایک مرکزی خیال یا تاثر ضروری ہے
2. افسانے میں تاثر کا ہونا لازم ہے
3. اگر قاری کے دل میں تجسس پیدا کرے کہ پھر کیا ہوا تو بہت اچھے

ممتاز مفتی
17.X.84

مکان 22 گلی 32
سیکٹر F6/1
اسلام آباد

جناب ناصر زیدی کی نذر!
کوثر چاند پوری
۸۵/۱۲/۱۷
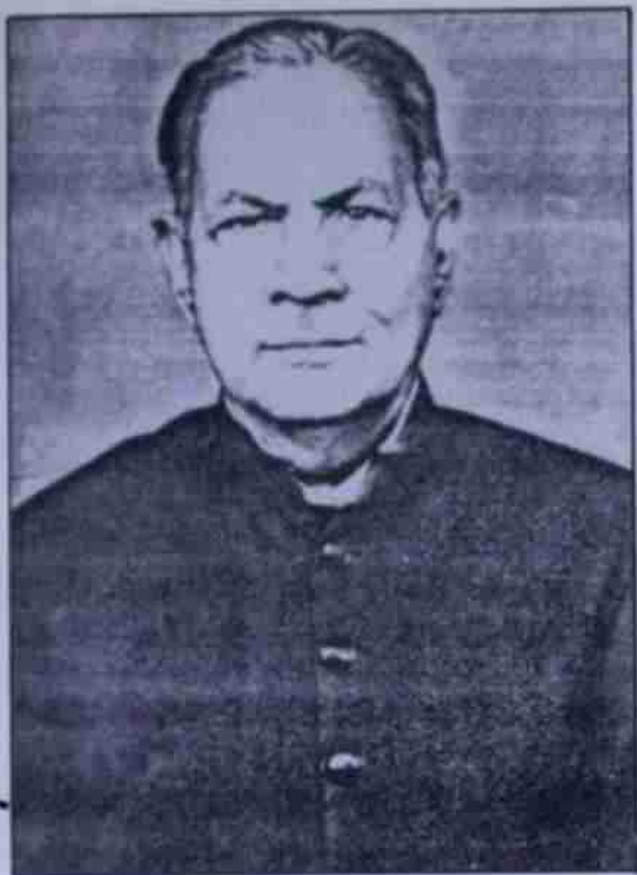
کوثر چاند پوری
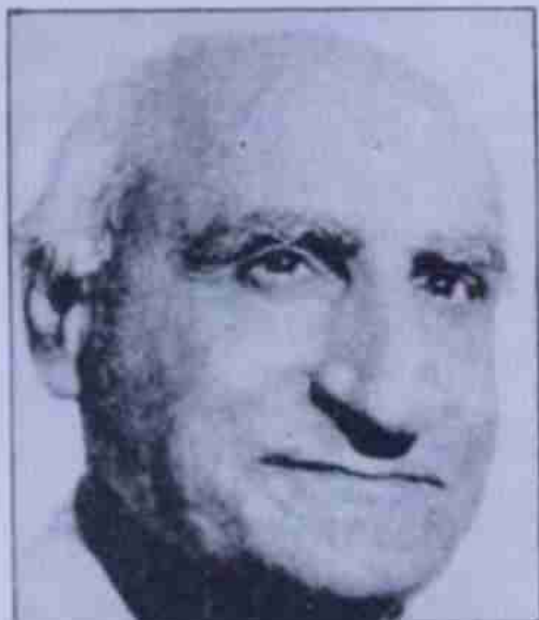
[illegible]

میرزا ادیب

خواجہ احمد عباس

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی
3, Indus court A Rd
Churchgate
Bombay 20
India) 15-10-76

قدرت اللہ شہاب

افسانے کے متعلق میرا کوئی خاص
نظریہ فن نہیں ہے۔ بس اتنا
چاہتا ہوں کہ لکھنے اور پڑھنے
والے دونوں کا دل خوش ہو۔
قدرت اللہ شہاب

سید رفیق حسین

محمد حسن عسکری

طارق کے لیے
محمد حسن عسکری
۱۵ دسمبر

بلونت سنگھ

برخوردار، حاضر ہوا تھا
لیکن تم نے تو آوارہ گردیوں پہ
کمر باندھ رکھی ہے — ہیلو۔ سب ہیں

اشفاق احمد

قرۃ العین حیدر

جوگندر پال

دیوندر اسر

غیاث احمد گدی

Ghayas Ahmad Gaddi

FATEHPUR LANE P.O. JHARIA

انتظار حسین

تمھارا

انتظار حسین

1/38 جیل روڈ

لاہور

31/X/84

خان فضل الرحمن

خالدہ حسین

مرزا حامد بیگ

ممتاز افسانہ نگار اور صاحب نظر نقاد ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی کتاب "اردو افسانے کی روایت" (۱۹۰۳ء تا ۱۹۹۰ء) ہماری اس اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے' جو اردو زبان کے مختصر افسانوی ادب سے متعلق اردو دنیا اور عالمی سطح پر محسوس کی جاتی ہے۔

یہ اردو افسانے کی ایک ایسی جامع تاریخ اور انتھالوجی ہے' جس میں محض رسمی اور اکتسابی تحقیق و تنقید پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ نتیجے کے طور پر اس کتاب میں آپ کو پرانا تعمیرشدہ تحقیقی اور تنقیدی ڈھانچہ منہدم ہوتا اور نیا منظرنامہ تشکیل پاتا دکھائی دے گا۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اس کتاب میں اردو کے اولین افسانہ نگاروں کی واضح نشاندہی کے ساتھ اردو افسانے کے مختلف ادوار قائم کر کے' ہر دور کے منتخب افسانہ نگاروں کے فنی مرتبے کے تعین اور تقدیم و تاخیر کے معاملات کو سمیٹنے کے ساتھ افسانہ نگاروں کے سوانحی خاکے' اصل و دستاویزی تاریخ پیدائش' وفیات نامے' اصلی اور قلمی ناموں' اولین تحریروں اور اولین مطبوعہ افسانوں کی نشاندہی کر دی ہے' نیز جملہ مطبوعہ کتب' غیرمدون قلمی آثار اور جملہ افسانہ نگاروں کے نظریہ فن کو بھی سائنٹفک انداز میں مرتب کیا ہے' جو اس سے قبل شاید ہی کہیں دیکھنے میں آیا ہو۔ یہ تمسکات' تنقید اور تحقیق کے شعبہ جات کے لیے خصوصی طور پر مستقل اہمیت کے حامل ہیں۔

اس کتاب کا ایک گوشہ داستان سے افسانے تک کے عبوری دور سے متعلق ہے' جس سے خواجہ ناصرنذیر فراق' عشرت لکھنوی اور میرباقر علی داستان گو کے افسانوی ادب سے متعلق اولین کام کی واضح نشاندہی ہوتی ہے۔ یوں بڑی تقطیع کے لگ بھگ دو سو صفحات پر مشتمل طویل تنقیدی مقالے اور تین سو صفحات کے قریب تحقیقی مواد' افسانوں میں برتی جانے والی زبان کے جائزے' نادر و نایاب تصاویر اور آٹوگراف کی شمولیت نے اس کام کو ایک مستقل حوالہ جاتی دستاویز کا درجہ دلا دیا ہے۔